زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

ادبِ عالیہ

(نقوش کی دس سالہ تحریروں کا انتخاب)

۷۹، ۸۰

اپریل ۱۹۶۰ء

مدیر

محمد طفیل

سالانہ قیمت	موجودہ شمارہ
۲۰ روپے	۱۲ روپے

ادارۂ فروغِ اردو، لاہور

ترتیب

طلوع — محمد طفیل

۱ — نقوش کے بارے میں میرے تاثرات — غلام رسول مہر ، ۱۱
۲ — نقاش و نقوش — ڈاکٹر اختر اورینوی ،
۳ — نقوش کے خاص نمبر — نثار احمد فاروقی ،

نوادر

۱ — تذکرۂ رحمانیہ — مولانا حالی ، ۳۳
۲ — اصولِ فارسی — مولانا حالی ، ۴۰
۳ — تقریظ — مولانا محمد علی ، ۴۵

شعر و شاعر

۴ — شعر اور زندگی — ڈاکٹر یوسف حسین خان ، ۵۳
۵ — قتیل دہلوی تھا یا فرید آبادی — ڈاکٹر مختار الدین آرزو ، ۶۴
۶ — مثنوی بہارِ عشق — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ، ۷۹
۷ — تنقید شعر اور حالی — پروفیسر عبد القادر سروری ، ۱۰۶
۸ — حج اکبر — پروفیسر حامد حسن قادری ، ۱۱۶
۹ — آوارہ گرد اشعار — قاضی عبد الودود ، ۱۲۴
۱۰ — دارا شکوہ کا دیوان — پروفیسر علم الدین سالک ، ۱۴۱
۱۱ — غالب کی مقبولیت کے اسباب — شیخ محمد اکرام ، ۱۵۰
۱۲ — آتش کی صوفیانہ شاعری — سید احتشام حسین ، ۱۵۴
۱۳ — مزے دار شاعر — محمد حسن عسکری ، ۱۶۱
۱۴ — اختر شیرانی — آل احمد سرور ، ۱۸۳
۱۵ — فیضی کا نظریۂ شعر — ڈاکٹر وحید قریشی

ادب و تنقید

۱۶ — برج بھاشا کی پہلی گرامر — سید مسعود حسن رضوی ، ۱۹۹
۱۷ — اردو اور پنجابی — ڈاکٹر محی الدین زور ، ۲۱۴

میں نقطہ نظر کی اہمیت
ـ مبقہ معتزلہ
۲۰ ـ [illegible] علی شاہ کی ایک [illegible] تصنیف
۲۱ ـ [illegible]
۲۲ ـ مرزا رسوا کی سیعد نگاری
۲۳ ـ آزاد کی سیاحت
۲۴ ـ نذیر احمد کی انفرادیت
گل بکاؤلی
نذیر احمد کا ذہنی تجزیہ
۲۷ ـ ماضی کے ادب عالیہ کے متعلق
۲۸ ـ مدیر نقوش کے نام (خطوط)

ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۲۲۳
نیاز فتحپوری، ۲۳۳
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ۲۴۰
سید وقار عظیم، ۲۶۴
ڈاکٹر محمد حسن، ۲۷۴
آغا محمد اشرف، ۲۸۸
ڈاکٹر سید عبداللہ، ۳۰۵
محمد عبداللہ قریشی، ۳۱۶
ڈاکٹر اعجاز حسین، ۳۲۹
ممتاز حسین، ۳۴۰
فراق گورکھپوری، ۳۵۱

شخصیات نمبر

آرہا ہے

۱ ـ	نواب عماد الملک	ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ۳۶۷
۲ ـ	سرسید احمد خان	مولوی عنایت اللہ دہلوی، ۳۹۰
۳ ـ	نواب صدر یار جنگ	مالک رام، ۳۹۴
۴ ـ	ابوالکلام	غلام رسول مہر، ۴۰۱
۵ ـ	مہدی حسن	مولانا عبدالماجد دریابادی، ۴۱۷
۶ ـ	علامہ عمادی	ابوالخیر مودودی، ۴۲۹
۷ ـ	ظفر علی خاں	شورش کاشمیری، ۴۴۴
۸ ـ	جگر صاحب	رشید احمد صدیقی، ۴۵۴
۹ ـ	ذاکر صاحب	ڈاکٹر سید عابد حسین، ۴۶۲
۱۰ ـ	مرزا عظیم بیگ چغتائی	شاہد احمد دہلوی، ۴۷۲

منٹو نمبر

۱ ـ	منٹو ماموں کی موت	حامد جلال، ۴۸۳
۲ ـ	میرا دوست، میرا دشمن	عصمت چغتائی، ۴۸۷
۳ ـ	منٹو میرا دشمن	اوپندر ناتھ اشک، ۵۰۳
۴ ـ	منٹو صاحب	محمد طفیل، ۵۲۸
۵ ـ	منٹو کا فن	سید وقار عظیم، ۵۴۵

مکاتیب نمبر

۱ ـ غالب، ۵۷۷	۳ ـ محمد حسین آزاد، ۵۸۸
۲ ـ سرسید، ۵۸۴	۴ ـ امیر مینائی، ۵۸۹

۵ - داغ ، ۵۹۱
۶ - ڈپٹی نذیر احمد ، ۵۹۲
۷ - مولانا حالی ، ۵۹۴
۸ - نواب محسن الملک ، ۵۹۶
۹ - نواب وقار الملک ، ۵۹۸
۱۰ - شبلی نعمانی ، ۶۰۱
۱۱ - اکبر الہ آبادی ، ۶۰۳
۱۲ - عبدالحلیم شرر ، ۶۰۴
۱۳ - ریاض خیر آبادی
۱۴ - حبیب الرحمٰن شروانی ، ۶۱۰
۱۵ - علامہ اقبال ، ۶۱۳
۱۶ - مولانا محمد علی جوہر ، ۶۱۴
۱۷ - راشد الخیری ، ۶۱۸
۱۸ - منشی دیا نرائن نگم ، ۶۱۹
۱۹ - نصیر حسین خیال ، ۶۲۰
۲۰ - سید سلیمان ندوی ، ۶۲۳
۲۱ - خواجہ حسن نظامی ، ۶۲۷
۲۲ - منشی پریم چند ، ۶۳۰

نظمیں، غزلیں

۱ — قطعات — جوش ملیح آبادی ، ۶۳۱
۲ — جھومتی برسات — جوش ملیح آبادی ، ۶۳۲
۳ — اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے — جگر مراد آبادی ، ۶۳۶
۴ — یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آ نہ — جگر مراد آبادی ، ۶۳۷
۵ — مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے — فراق گورکھپوری ، ۶۳۸
۶ — جگنو — فراق گورکھپوری ، ۶۳۹
۷ — بات سمجھنے والا — حفیظ جالندھری ، ۶۴۶
۸ — زندگی مجبوریوں کا راز ہو کر رہ گئی — آرزو لکھنوی ، ۶۴۷
۹ — یادِ غزال چشماں ، ذکرِ سمن عذاراں — فیض احمد فیض ، ۶۴۸
۱۰ — آگ میں پھول — فیض احمد فیض ، ۶۴۹
۱۱ — جو وہ در پردہ انھیں جلوہ نمائی کی نہ خو ہوتی — سیماب اکبر آبادی ، ۶۵۱
۱۲ — مرے جی میں ہے کہ پوچھوں کبھی مرشدِ مغاں سے — عبدالمجید سالک ، ۶۵۲
۱۳ — حضورِ یار آنسو نکل ہی آتے ہیں — تاثیر ، ۶۵۳
۱۴ — دل بلا سے نثار ہو جائے — چراغ حسن حسرت ، ۶۵۴
۱۵ — اُٹھا ساغر کہ دنیا در پئے آزار ہے ساقی — اختر شیرانی ، ۶۵۵
۱۶ — کسی طرح دن تو کٹ رہے ہیں فریبِ امید کھا رہا ہوں — وحشت کلکتوی ، ۶۵۶
۱۷ — حملہ جہاں بازیوں کا یار ہے ہیں — اثر لکھنوی ، ۶۵۷
۱۸ — کیا بھروسا ہو کسی ہمدم کا — احمد ندیم قاسمی ، ۶۵۸
۱۹ — غنچۂ چیر لگا کھلنے ! — احمد ندیم قاسمی ، ۶۵۹
۲۰ — خود دل میں رہ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی — اسرار الحق مجاز ، ۶۶۱
۲۱ — ایک گیت — میرا جی ، ۶۶۲
۲۲ — غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں — میرا جی ، ۶۶۳
۲۳ — وفا کی آخری منزل بھی آ رہی ہے قریب — صوفی تبسم ، ۶۶۴
۲۴ — چین پڑتا ہے دل کو آج نہ کل — عابد علی عابد ، ۶۶۵

۲۵ — ترے کرم سے خدائی میں یوں تو کیا نہ ملا — ن۔م۔ راشد، ۶۶۶
۲۶ — انقلابی — ن۔م۔ راشد، ۶۶۷
۲۷ — کچھ اس طرح سے نظر سے گزر گیا کوئی — حفیظ ہوشیارپوری، ۶۶۹
۲۸ — بزم میں جب وہ وفا نا آشنا بھی آئے گا — احسان دانش، ۶۷۰
۲۹ — تقابل — معین احسن جذبی، ۶۷۱
۳۰ — قطعات — جاں نثار اختر، ۶۷۲
۳۱ — خزاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں — اختر انصاری، ۶۷۳
۳۲ — سنبھال ساقیٔ محفل اب اپنے پیمانے — پنڈت آنند نرائن ملا، ۶۷۴
۳۳ — کچھ تو مجھے محبوب ترا غم بھی بہت ہے — فضل احمد کریم فضلی، ۶۷۵
۳۴ — وضع کا پاس کہاں تک کرتے ہم تو پھر دیوانے تھے — میکش اکبرآبادی، ۶۷۶
۳۵ — کوئی ادا شناسِ محبت ہمیں بتلائے — عندلیب شادانی، ۶۷۷
۳۶ — ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا — عرشی رام پوری، ۶۷۸
۳۷ — اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہگزر کہیں — اشک رامپوری، ۶۷۹
۳۸ — پس منظر — اختر الایمان، ۶۸۰
۳۹ — زباں پہ آپ کا نام آ رہا ہے — عدم، ۶۸۱
۴۰ — افسانہ آں شبے ..... — جگن ناتھ آزاد، ۶۸۲
۴۱ — خرد کے نام جنوں کا پیام لے کے چلے — قتیل شفائی، ۶۸۵
۴۲ — جب کبھی تذکرۂ شعلہ رخاں ہوتا ہے — ظہیر کاشمیری، ۶۸۶
۴۳ — ایک کوہستانی سفر کے دوران میں — مجید امجد، ۶۸۷
۴۴ — کسی کے دم سے راحت بھی ہوئی ہے — عبدالمجید حیرت، ۶۸۸
۴۵ — غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے — شعری بھوپالی، ۶۶۹
۴۶ — دولت کی خدائی — پروفیسر شور، ۶۹۰
۴۷ — کیا منزلِ غم سمٹ گئی ہے — سیف الدین سیف ۶۹۲
۴۸ — چمن میں کس نے کسی بے نوا کا ساتھ دیا — غلام ربانی تاباں، ۶۹۳
۴۹ — یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں — ابن انشا، ۶۹۴
۵۰ — کرن نگاہ کی بھلا گئی تو کیا ہوگا — ادا جعفری بدایونی، ۶۹۶
۵۱ — کھری باتیں بہ اندازِ سخن کہہ دوں تو کیا ہوگا — شاد عارفی، ۶۹۷
۵۲ — میراث — یوسف ظفر، ۶۹۸
۵۳ — دن ہو کہ رات کنجِ قفس ہو کہ صحنِ باغ — انجم رومانی، ۷۰۲
۵۴ — یہ پھول — قیوم نظر، ۷۰۳
۵۵ — وا ہوا پھر درِ میخانۂ گل — ناصر کاظمی، ۷۰۴

افسانے

۱ — دُور کا نشانہ — چودھری محمد علی ردولوی، ۷۰۵
۲ — اپنے دکھ مجھے دے دو — راجندر سنگھ بیدی، ۷۰۹

۳ — پرتیو کرشن چندر، ۷۲۸
۴ — ننھی کی نانی عصمت چغتائی، ۷۳۶
۵ — الحمد للہ احمد ندیم قاسمی، ۷۴۳
۶ — موذیل منٹو، ۷۵۹
۷ — سایہ غلام عباس، ۷۷۵
۸ — سہارے کی تلاش حیات اللہ انصاری، ۷۸۵
۹ — ڈیڈ لیٹر خواجہ احمد عباس، ۷۹۷
۱۰ — ممتا اختر اورینوی، ۸۰۴
۱۱ — جل پری علی عباس حسینی، ۸۰۹
۱۲ — صنم تراش کا خواب ل۔ احمد، ۸۳۱
۱۳ — ادئی اللہ ممتاز مفتی، ۴۸۰
۱۴ — یہ حادثے حجاب امتیاز علی، ۸۵۲
۱۵ — لندن لیٹر قرۃ العین حیدر، ۸۶۰
۱۶ — بھاگ بھری ہاجرہ مسرور، ۸۷۹
۱۷ — آندھی میں چراغ ممتاز شیریں، ۸۸۸
۱۸ — دادا خدیجہ مستور، ۸۹۵
۱۹ — کالی تیتری بلونت سنگھ، ۹۰۷
۲۰ — ریلوے جنکشن قدرت اللہ شہاب، ۹۳۱
۲۱ — چارہ گر تسنیم سلیم چھتاری، ۹۳۵
۲۲ — بھیا دیوج ابو الفضل صدیقی، ۹۶۷
۲۳ — پرواز کے زخم کشمیری لال ذاکر، ۹۷۹
۲۴ — مائی پھاتاں میرزا ادیب، ۹۹۱
۲۵ — گناری کے انڈے دیوندر ستیارتھی، ۹۹۹
۲۶ — زینو ابو سعید قریشی، ۱۰۰۹
۲۷ — جونکیں مہندر ناتھ، ۱۰۲۰
۲۸ — آخری سہارا شکیلہ اختر، ۱۰۲۹
۲۹ — زرد گلاب اے حمید، ۱۰۳۸
۳۰ — گڈریا اشفاق احمد، ۱۰۷۴

ڈرامے

۳۱ — آپا اوپندر ناتھ اشک، ۱۱۰۱
۳۲ — اصفہان کے گنبد سید امتیاز علی تاج، ۱۱۱۱
۳۳ — ہیلو جاوید اقبال، ۱۱۲۷

طنز و مزاح

۳۴ ـ تعبیر طلب — شوکت تھانوی، ۱۱۵۴
۳۵ ـ دوست کے نام — پطرس، ۱۱۶۲
۳۶ ـ برج بانو — کنہیا لال کپور، ۱۱۶۷
۳۷ ـ سفرنامہ جہاز بادسندھی — شفیق الرحمٰن، ۱۱۷۱
۳۸ ـ شہر اور گاؤں — فلک پیما، ۱۱۹۳
۳۹ ـ ایک انسان کی موت — فکر تونسوی، ۱۱۹۵

آرٹ

۱ ـ چند یادیں — عبدالرحمٰن چغتائی، ۱۲۰۳

نقوش کی دس سالہ تحریروں کی مکمل فہرست، ۱۲۰۹

مدیر نقوش (خاکہ) — محمد طفیل، ۱۲۴۹

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر نے نقوش پریس اردو بازار لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

طلوع

ادب کی براتیں اس سے پہلے بھی چڑھی ہیں اور بڑے دھوم دھڑکوں کے ساتھ چڑھی ہیں۔ ماضی کی یادوں میں گم ہو جائیے گا تو شہنائیوں کی آوازیں، آج بھی سنائی دیں گی۔

اور لاڈلوں کی طرح، نقوش بھی اس دنیا میں آیا۔ پہلے اس کی پرورش کے فرائض میرے بڑے بھائی احمد ندیم قاسمی اور چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور کے سپرد ہوئے۔ سیانے کہتے ہیں۔ بچپن کی تربیت ہی، مستقبل کی نشان دہی ہوا کرتی ہے۔

پھر نقوش میرے سب سے بڑے بھائی سید وقار عظیم کی آغوش میں پلتا رہا کسر کسی نے بھی نہ اُٹھا رکھی۔ سبھی نے لاڈ پیار سے رکھا۔

ابھی نقوش تین ہی ماہ کا ہوا تھا کہ سخت بیمار ہوگیا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ شرارتی بچوں کو اس کی پھبن بھاتی نہ تھی۔ انھوں نے ایسی چال چلی کہ یہ بے چارا چھ ماہ تک بے سُدھ پڑا رہا۔

جب نقوش ٹھمکنے اور ٹوں ٹاں کرنے لگ گیا تو اس کی پرورش میرے سپرد ہوئی۔ بیماری سمیت اُس وقت اس کی عمر کوئی ڈھائی برس ہوگی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ میری راتوں کی نیند اچٹ گئی۔ میں سوچتا تھا اتنا خوب صورت سا اور ہونہار بچہ، اگر میری نگرانی میں پنپ نہ سکا تو کتنی جگ ہنسائی ہوگی۔ میں تو لاجوں مرتا رہا۔

میرے مالی حالات بھی زیادہ اچھے نہ تھے۔ مگر میں چاہتا تھا اسے ولایت تک بھیجوں۔ حوصلے اتنے، وسائل محدود، اللہ کی بارگاہ میں دن رات دعائیں مانگیں۔

پھر تو کرنا خدا کا یہ ہوا۔ نقوش نے اپنے پرائے کا من موہ لیا۔ وہاں سے یہاں تک پہنچنے کے لیے اتنی محنت کی اور اتنے خلوص سے کی کہ اس نے ایک ایک سال میں، دو دو تین تین امتحان دینے شروع کر دیے اور خدا کی مہربانی سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔ اس کے کٹے ہوئے پرچے آج پاکستان اور ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں رکھ کے دیکھ لیں۔ اس شان سے کوئی بھی پاس نہ ہوا ہوگا۔

اس کی قابلیت نے، اس کے بہت سے حاسد بھی پیدا کر دیے ہیں۔ جو اس سے للّٰہی عناد رکھتے ہیں۔ گو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مگر اس سے دل دُکھتا ہے۔ حالانکہ یہ اپنی ہی دھن میں دیوانہ وار چلا جا رہا ہے۔ کسی سے کچھ غرض نہیں۔ مگر لوگ ہیں کہ اسے کنکریاں مارنے سے باز نہیں آتے۔ اس کے باوجود اس کے دل میں انتقام کا جذبہ نہیں۔ یہ رنجشوں کی بازی کو بھی محبتوں سے جیتنا چاہتا ہے۔

ماشاءاللہ نقوش اب جوانی میں قدم رکھ رہا ہے۔ کوئی اس کا بانکپن تو دیکھے۔ ڈرتا ہوں کہیں اسے میری ہی نظر نہ لگ جائے۔

للہ آپ میری باتوں پہ یقین نہ کریں۔ اسے میری نظروں سے نہ دیکھیں۔ میں تو دیوانہ ہوں۔ دیوانہ نہ ہوتا تو آج نقوش کو یہ مرتبہ نصیب نہ ہوتا۔

مگر مجھے اتنا ہوش ہے —— آج میرے بھی لاڈلے کی برات چڑھی ہے۔

محمد طفیل

بابائے اردو

نیاز فتح پوری

ڈاکٹر محی الدین زور

مالک رام

قاضی عبد الودود

ڈاکٹر عابد حسین

ڈاکٹر تاثیر

سید مسعود حسن رضوی

سید احتشام حسین

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

ڈاکٹر شوکت سبزواری

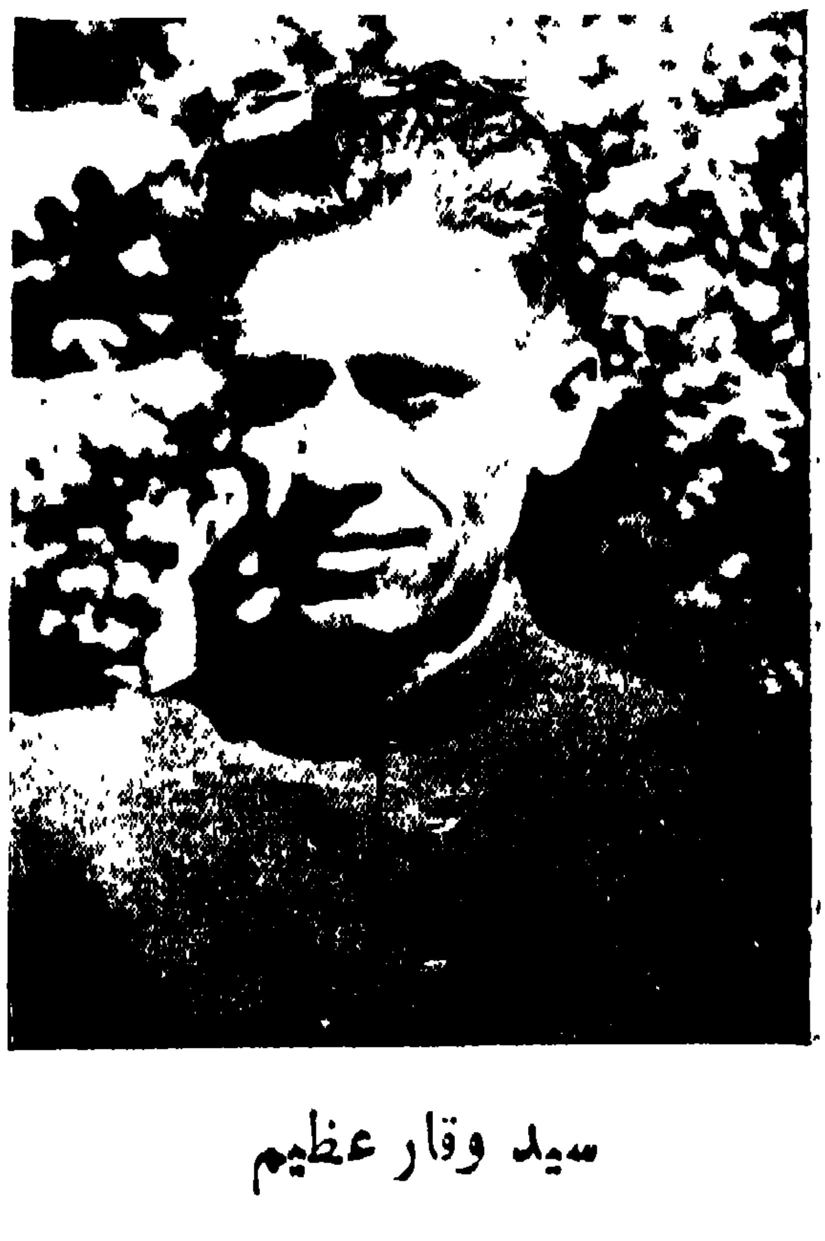

سید وقار عظیم

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

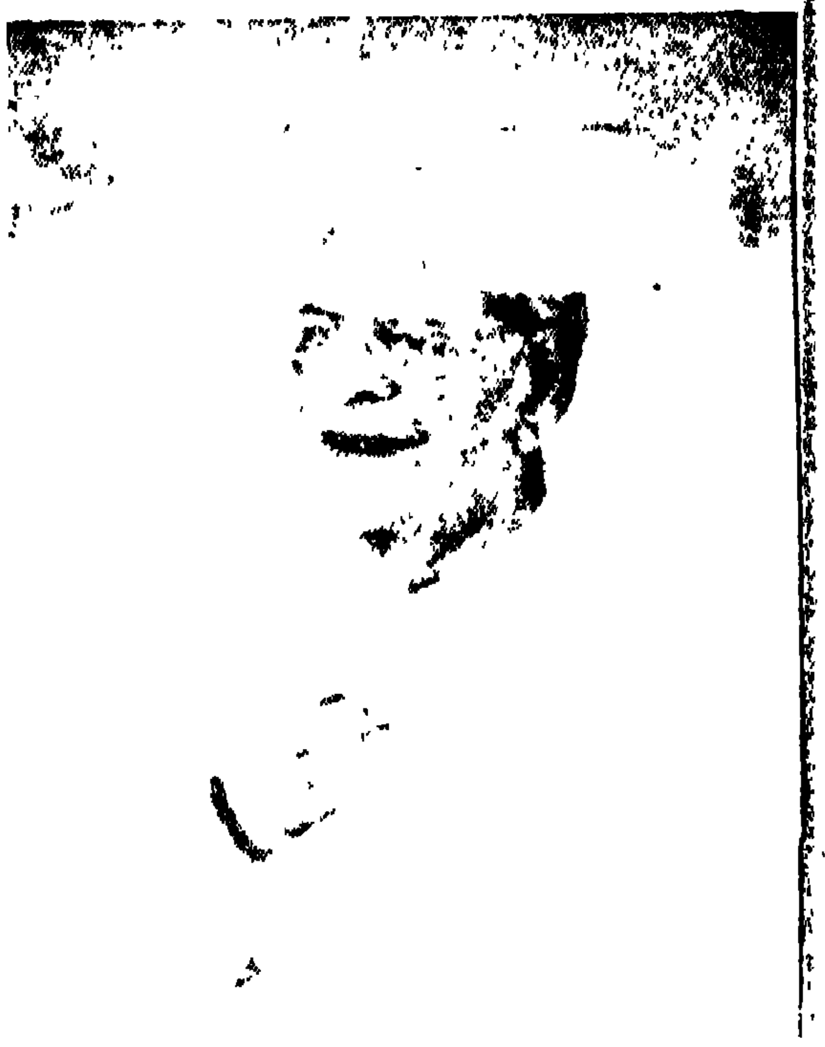
محمد علی ردولوی

محمد حسن عسکری

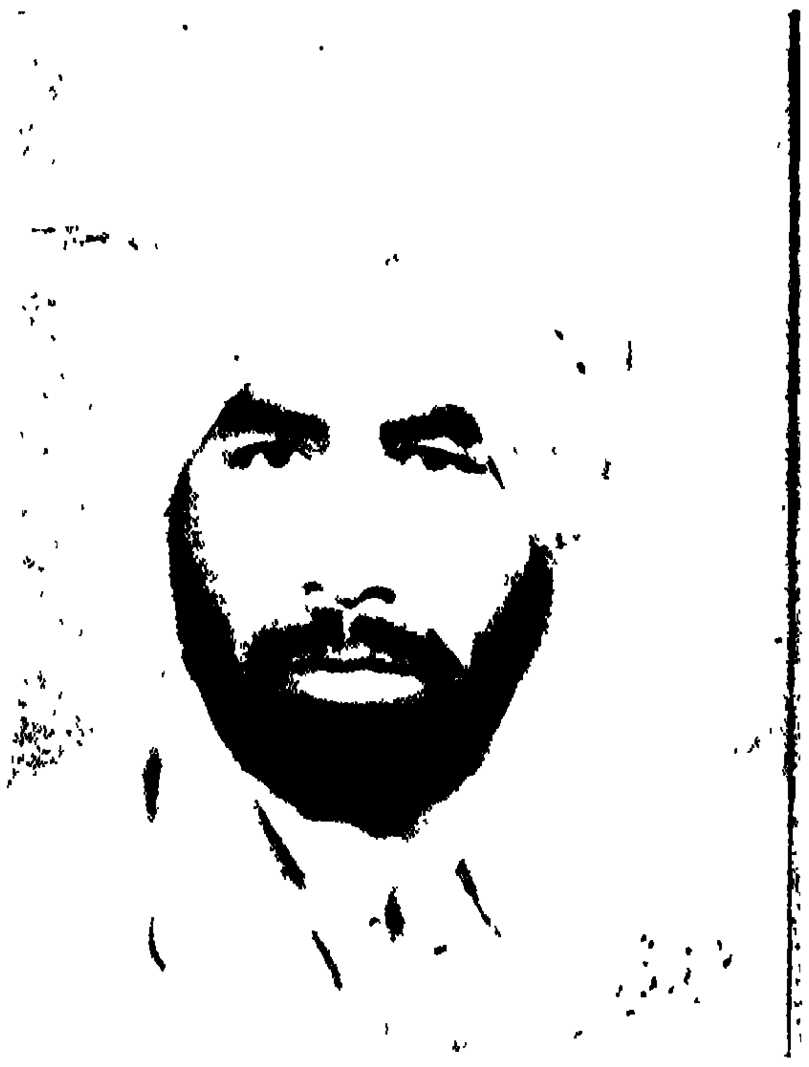
راجندر سنگھ بیدی

ڈاکٹر محمد حسن

حیات اللہ انصاری

عصمت چغتائی

قرۃالعین

ہاجرہ مسرور

خدیجہ مستور

حجاب امتیاز علی

ممتاز شیریں

کرشن چندر

منٹو

غلام عباس

احمد ندیم قاسمی

علی عباس حسینی

ممتاز مفتی

بلونت سنگھ

قدرت اللہ شہاب

اوپندر ناتھ اشک

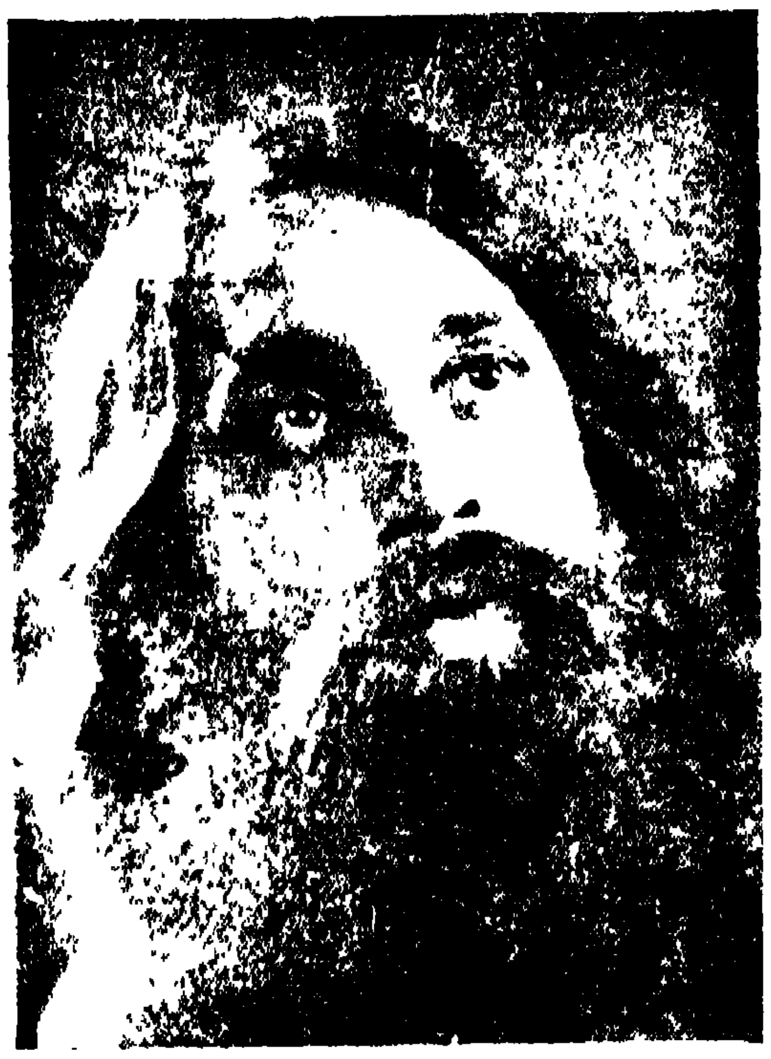

دیوندر ستیارتھی

کشمیری لال ذاکر

مہندر ناتھ

جوش ملیح آبادی

جگر مرادآبادی

فراق گورکھ پوری

حفیظ جالندھری

اثر لکھنوی

اختر شیرانی

فیض

عابد علی عابد

حفیظ ھوشیارپوری

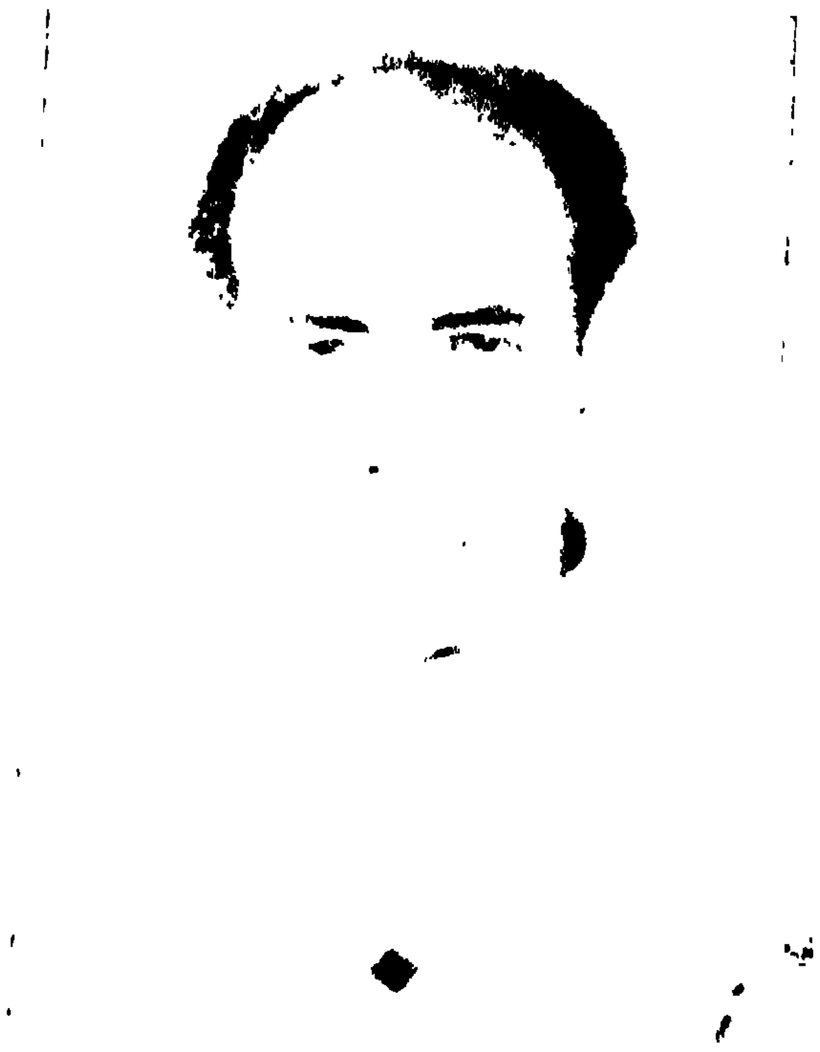

جذبی

عدم

اختر انصاری

جگن ناتھ آزاد

حیرت شملوی

غلام ربانی تاباں

میکش اکبرآبادی

قتیل شفائی

شاہد احمد دہلوی

پطرس

شوکت تھانوی

چراغ حسن حسرت

کنھیا لال کپور

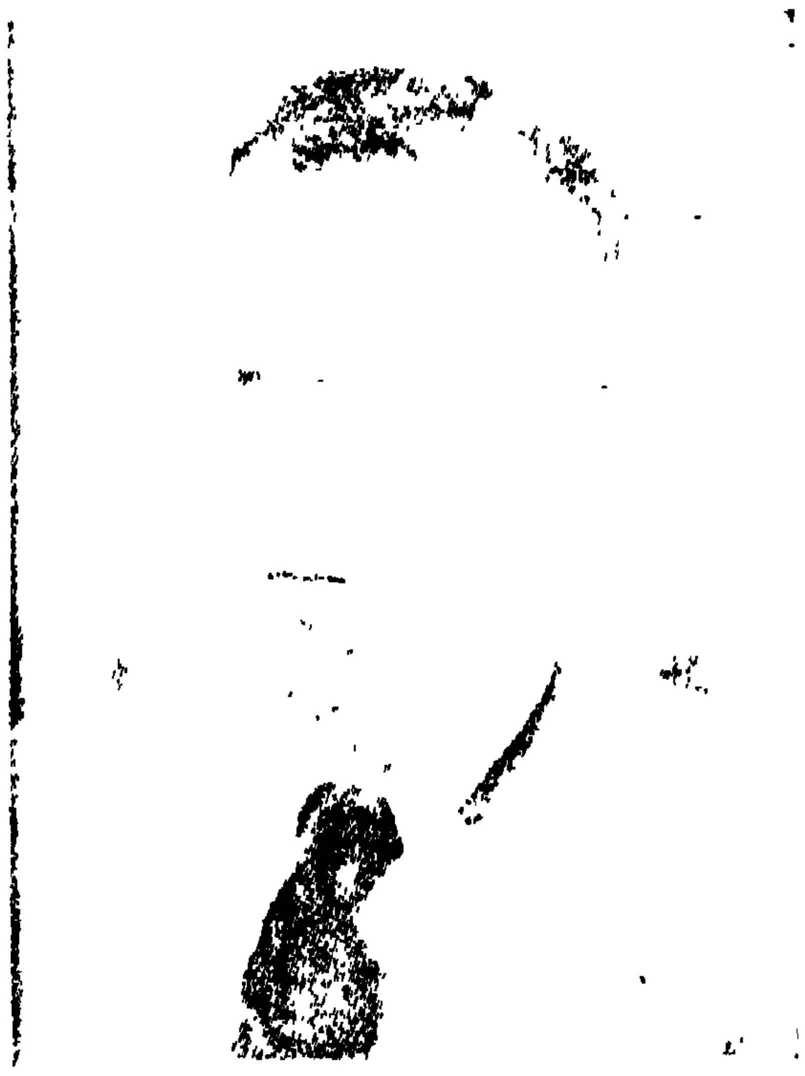

امتیاز علی تاج

شفیق الرحمن

ترتیب

نقوش کی اشاعت کو آج بارہ برس ہو گئے ہیں۔ چند لفظوں میں اس کے دس سالہ کارناموں کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہ ہوگا۔ پھر کہا سُنا تو اُن چیزوں کے بارے میں جاتا ہے۔ جسے صرف لکھنے والا ہی جانتا ہو۔ پڑھنے اور سننے والا نہ جانتا ہو۔ اس لیے میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ ہاں موجودہ نمبر کی ترتیب کے سلسلے میں چند باتیں سن لیں۔

کوئی دوسرا، میرے نقوش کا یوں انتخاب کرتا تو میں سٹ پٹا کے رہ جاتا۔ اس لیے کہ نقوش میں جو کچھ بھی چھپا ہے۔ اُس کی ادبی آبرو پر کوئی بھی حرف نہیں رکھ سکتا (ویسے برائے اعتراض، جو جس کا جی چاہے کہہ لے) یہی وجہ ہے کہ مجھے نقوش کی ہر ہر سطر میں حسن ہی حسن نظر آتا ہے۔ ایسے محبت کے مارے کو نقوش کی دس سالہ تحریروں کا انتخاب اپنے ذمہ نہیں لینا چاہیے تھا۔ مگر سوال یہ ہے، اگر میں یہ کام کسی اور کو سونپتا تو پھر میں خود کیسے زندہ رہتا ـــــ دونوں طرح اپنی موت!

مجھے نقوش کی نسبت سے ہر اچھائی بھی منظور ہے اور ہر بُرائی بھی، یہی وجہ ہے کہ اس سراسر جھگڑے والے کام کو بھی، سرانجام دے کر بُری بھلی باتیں سننے کے لیے آمادہ ہو گیا ہوں اب میرے سامنے نقوش کا ایک ایک لفظ ہے اور یہ جانِ ناتواں!

میری مشکلوں کی نوعیت مختلف ہے۔ ایک طرف اہلِ قلم ہیں۔ دوسری طرف قارئین، ایک سے ایک منہ زور، دہل رہا ہوں نہ جانے میری اس عاجزانہ کوشش کو پسند بھی کیا جائے گا یا نہیں۔ ڈھارس کی صرف ایک بات ہے۔ وہ یہ کہ اگر یہی کام کوئی دوسرا انجام دیتا (اللہ میاں کے سوا) تو کیا ادیب اور قاری مطمئن ہو جاتے؟ میرا خیال ہے۔ ہرگز مطمئن نہ ہوتے۔ اطمینان تو ادبی موت کی نشانی ہُوا کرتا ہے۔ جو نہ مجھے منظور رہے۔ اور نہ ہی نقوش کے قاری اور نقش کار کو منظور ہوگا۔

آئیے میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے زیرِ نظر تحریروں کے چناؤ میں، کن کن امور کا خیال رکھا ہے ـــــ مقالات کے سلسلے میں میں نے یہ چاہا ہے کہ مضمون نگار کی بہتر تخلیق کے ساتھ ساتھ، اس بات کا بھی خیال رکھوں کہ موضوع بے حد اہم ہو اور اُس موضوع پر یا تو لکھا نہ گیا ہو یا بہت کم لکھا گیا ہو۔ میں نے ایک چلتے ہوئے موضوع پر، ایک اچھا مضمون اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ اُس موضوع پر اور کئی چیزیں مل جاتی تھیں (جیسے نظم، غزل یا افسانے پر مضمون) برخلاف اس کے اُس مضمون کو لیا ہے۔ جس میں ہمارے لیے مواد کی ندرت اور موضوع کی اہمیت تھی۔ یعنی میں نے اس حصے کو مصنف کے جذبات سے زیادہ علمی اعتبار سے وقیع بنانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں بے بس ہوا ہوں تو اِکّا دُکّا ایسے مضمون بھی راہ پا گئے ہیں۔ ورنہ میری نیّت نہ تھی۔

افسانوں اور نظموں کے سلسلے میں میں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ اس میں لکھنے والے کا اپنا اسٹائل ضرور ہو۔ میں نے اُن چیزوں کو نہیں چُنا، جن میں مصنف کا اپنا رنگ نہ تھا۔ اُن چیزوں کو بھی نظر انداز کیا ہے۔ جو صرف زورِ بازو سے لکھی یا لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے خیال اور اندازِ بیان کے ساتھ افسانہ میں افسانویت، نظم میں نظمیت اور غزل میں غزلیت کو دوسری "فنکارانہ خوبیوں" پر ترجیح دی ہے یعنی میں نے نہیں چاہا کہ ایک خالص رومانی افسانہ نگار کا افسانہ میز یا کرسی پر آئے ـــــ اسی طرح میں نے شاعروں کی تخلیقات کے بارے میں سوچا ہے۔

نقوش کے خاص نمبروں کا انتخاب اور بھی کٹھن تھا۔ اس لیے کہ اپنے اپنے موضوع پر اُن میں بہت کچھ ہے۔ دفتروں کے دفتر، اب میں کہاں تک اچھی چیزوں سے اپنی نظریں چراتا۔ بہرحال خاص نمبروں کی تھوڑی بہت جھلک اس انتخاب میں مل جائے گی ـــ غزل نمبر اور افسانہ نمبر کو میں نے اس میں اس لیے شامل نہیں کیا کہ وہ پہلے ہی انتخاب تھے (البتہ اُن دونوں افسانہ نمبروں میں سے انتخاب کیا ہے۔ جو نئے افسانوں پر مشتمل تھے) میں تو اس نمبر میں اُن چیزوں کو لایا ہوں جو غیر مطبوعہ تھیں اور پہلے پہل نقوش میں چھپی تھیں۔

دیکھ لیجیے اس نمبر کی ضخامت کتنی زیادہ ہوگئی ہے۔ میں ایک ہزار صفحوں سے زیادہ کا انتخاب نہیں چاہتا تھا (ابھی تین چار سو کتابت شدہ صفحات روک لیے ہیں) اس لیے میرے وہ دوست جن کی تخلیقات اس نمبر میں نہیں آسکیں۔ وہ مجھے میری مجبوریوں کی بنا پر معاف کر دیں۔ اس لیے کہ میں تو چاہتا تھا کہ اس انتخاب میں وہ سب کچھ آجائے جو نقوش میں چھپ چکا ہے۔ مگر میری اس خواہش کی تکمیل ناممکن تھی۔

اس نمبر میں صرف چار مضمون غیر مطبوعہ ہیں۔ تین ابتدائی مضمون جو نقوش کے بارے میں میرے محسنوں اور دوستوں نے لکھے ہیں اسے ان کی محبت جانیے اور اس سے زیادہ کچھ نہ سوچیے۔ البتہ ایک مضمون میرا ہے اور مجھی پر ہے۔ اسے میں نے سب سے آخر میں ٹانک دیا ہے (یہ وہی مضمون ہے جس کے بارے میں میں نے ایک بار خود معرکۃ الآرا مضمون کی پھبتی کسی تھی) اگر کوئی اس نمبر میں فالتو اور فضول چیز ہے تو وہ میرا ہی مضمون ہے۔ جس کے لیے میں آپ سے درگذر کی درخواست کروں گا۔

(م ۔ ط)

نقوش کے بارے میں میرے تاثرات

مولانا غلام رسول مہر

مجھے پیش نظر کاموں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ اطمینان سے ہر رسالہ بالاستیعاب پڑھ سکوں۔ عموماً یہی ہوتا ہے کہ مختلف رسالوں کے متفرق مضامین فرصت کے اوقات میں جستہ جستہ دیکھ لیتا ہوں۔ ان میں ایک رسالہ "نقوش" بھی ہے، جس کے خاص نمبر اکثر میرے لئے حیرت و استعجاب کا موجب بنتے رہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ اردو رسائل میں خاص نمبروں کی ابتدا کب سے ہوئی اور کس رسالے کو اس میدان میں سبقت کا شرف حاصل ہے۔ خود میری نظر سے جو پرانے رسالے گزرے، ان میں سب سے پہلے خاص نمبر "مخزن" کا دیکھا، جو دسمبر ۱۹۰۳ء میں ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی پر نکلا تھا اور اس کا نام "دربار نمبر" تھا۔ "مخزن" کا سائز چھوٹا تھا اور اس خاص نمبر کی ضخامت "مخزن" کے دو ماہوار نمبروں کے برابر بھی نہ تھی۔ ہمارے عہد میں جو خاص نمبر نکلتے رہے، ان میں سے بھی اکثر دیکھے۔ تاہم اگر میں کہوں کہ "نقوش" نے خاص نمبروں میں یگانگی کا ایسا معیار قائم کر دیا ہے، جس کی کوئی نظیر کم از کم اردو زبان کے رسالوں میں نہیں مل سکتی، تو غالباً اسے مبالغہ نہیں سمجھا جائیگا۔ میں نے کم از کم محض احتیاط کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے کہا، حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی زبان کے رسائل میں ایسے خاص نمبر کبھی نہیں دیکھے۔ ایک زمانے میں افغانستان کا مشہور مجلہ "کابل" اس سے ملتے جلتے "سالنامے" نکالا کرتا تھا، لیکن یہ دوسری عالمی جنگ سے پیشتر کے دور کا ذکر ہے اور اس وقت مجلہ "کابل" کی زبان پشتو نہیں فارسی تھی۔

"نقوش" کے خاص نمبر

"نقوش" کے خاص نمبروں کی یگانگی محض ضخامت کی فخامت یا ظاہری تحسین و تزئین تک کبھی محدود نہ رہی۔ یعنی یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اوراق زیادہ سے زیادہ مقدار میں فراہم کر دئے گئے اور سرورق کو دل آویز نقش و نگار کے ذریعے سے بطور خاص جاذبِ کشش افزا بنا دیا گیا۔ اس سلسلے میں جو امر خصوصی توجہ کا مستحق ہے، یہ ہے کہ خاص نمبر کے معنوی لوازم کو ہر لحاظ سے پورا کرنے میں زیادہ سے زیادہ اہتمام پیش نظر رہا۔ گویا خاص نمبر کا جو موضوع تجویز کر لیا، اس کے ہر پہلو کے متعلق جتنی معلومات ضروری سمجھی جا سکتی تھیں، وہ سب فراہم کر دیں اور جو بھی خاص نمبر نکالا اسے مجوزہ موضوع کے باب میں جامع الحقائق بنا دیا گیا۔ اگر کوئی

صاحبِ ذوق کسی موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ بھی فراہم کر لے اور انھیں تفصیلاً دیکھ جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ذہن کا دامن اتنی معلومات شاید ہی اکٹھی کر سکے گا، جو "نقوش" کے ایک خاص نمبر میں مل سکتی ہیں۔

عام شیوہ یہ دیکھا گیا کہ جب خاص نمبر نکالا جاتا ہے تو اس کا ایک حصہ مخصوص مضامین کے لئے وقف کیا جاتا ہے، باقی اوراق میں دوسرے بے تعلق مضامین و مقالات چھاپے جاتے ہیں۔ خواہ یہ سبب ہو کہ ایک ہی موضوع کے تمام مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل مضامین فراہم کر لینا سہل نہیں اور سعی و اہتمام کو آخری منزل پر پہنچانے کے لئے جس قدر صبر و دل سوزی درکار ہے، اس سے ہر ادارۂ تحریر مسلسل کام نہیں لے سکتا، خواہ یہ سبب ہو کہ تخصیص کے باوجود تنوع اور بوقلمونی کو نظر انداز نہیں کیا جاتا اور خواجہ حالی مرحوم و مغفور کا یہ ارشاد مشعلِ راہ رہتا ہے کہ:

بزم میں اہلِ سخن بھی ہیں، تماشائی بھی

معنوی محاسن

"نقوش" نے اس لحاظ سے بھی شیوۂ عام کی پیروی کبھی نہ کی اور اپنے اختیار کردہ مسلک ہی پر قائم رہا۔ یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ "نقوش" کا ادارۂ تحریر تنوع کی جاذبیت سے ناواقف ہے یا اسے علم نہیں کہ مضامین میں بوقلمونی کی رعایت پیشِ نظر رہے تو مختلف اذواق اور مختلف درجاتِ علم کی نگاہوں کے دامن کھنچے آئیں گے۔ حاشا و کلا۔ تاہم اس نے خاص نمبروں کو ہمیشہ تجویز کردہ موضوع ہی سے وابستہ رکھا البتہ اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے تنوع کے اہتمام میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ مثلاً اگر نمبر کسی شخصیت کے متعلق تھا تو اس کے سوانح حیات بھی شائع کئے، ان خاص کارناموں کی تفصیل بھی بتائی، جن کی بدولت اس شخصیت نے ایک خاص نمبر کا استحقاق پیدا کیا۔ اس کی سیرت کے گوناگوں پہلو بھی ابھارے۔ مختلف اصحابِ علم و نظر کے تاثرات بھی فراہم کئے اور اس کی زیادہ سے زیادہ تحریرات و نگارشات کو بھی یکجا کر دیا۔ گویا جو کچھ اس نمبر میں چھپا، وہ برابر اصل شخصیت کے متعلق تھا۔ بایں ہمہ تمام مضامین میں زیادہ سے زیادہ تنوع موجود تھا۔ دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چن دئے، ہر شخص جن کھانوں کو پسندیدہ سمجھے اور اپنے ذوق کے مطابق پائے، اٹھا لے۔ باغ میں رنگ رنگ کے پھولوں کی کیاریاں سجا دیں، جن کی خوشبوئیں حد درجہ دل آویز و عنبر بیز تھیں۔ جسے جس رنگ اور جس خوشبو کا پھول پسند ہو، اس سے اپنے باصرہ و شامہ کی تواضع فرما لے۔ مثال کے طور پر "پطرس نمبر" کو لے لیجئے۔ مجھے معلوم نہیں بخاری مرحوم کے سوانح حیات کبھی ترتیب پائیں گے یا نہیں پائیں گے لیکن "نقوش" کے خاص نمبر نے یہ فرض کفایہ ادا کر دیا اور وہ سب کچھ فراہم ہو گیا جو مرحوم کی سیرت و سوانح، اخلاق و عادات، علم و فضل، خدمت ملک و ملت کے سلسلے میں ضروری اور قابلِ ذکر تھا، یہاں تک کہ ان کی بیشتر تحریریں اور تقریریں بھی شامل کر دیں۔

یگانگی کے مختلف پہلو

"نقوش" کے دوسرے خاص شماروں مثلاً "شخصیات نمبر" "مکاتیب نمبر" "افسانہ نمبر" "غزل نمبر" "مزاح نمبر" "منٹو نمبر" وغیرہ پر مفصل بحث کروں تو ایک ضخیم مجلّہ تیار ہو جائے گا۔ بہر حال میں نے "نقوش" کے خاص نمبروں کو مختلف وجوہ

سے یگانہ قرار دیا:

۱۔ اتنی ضخامت کے خاص نمبر شاید ہی کسی دوسرے رسالے نے مسلسل شائع کیے ہوں۔ کم از کم میرے علم میں کوئی مثال نہیں۔

۲۔ معنوی اعتبار سے بھی ایسے نمبر کہیں نہ دیکھے یعنی ہر مجوزہ موضوع کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی گئیں۔ کوشش یہ رہی کہ اس موضوع کا کوئی بھی پہلو اصحابِ ذوق کی نظروں سے اوجھل نہ رہ جائے۔ بہ ایں ہمہ تنوع، بوقلمونی اور وسعتِ مشرب کے تقاضے ہمیشہ پیشِ نظر رکھے۔

۳۔ یہ خاص نمبر اس انداز میں مرتب نہیں ہوئے کہ وقتی طور پر اربابِ ذوق کی دلچسپی کا سروسامان بن سکیں بلکہ اپنے خاص عنوانوں کے متعلق گراں قدر معلومات کا یہ ایسا ذخیرہ ہیں، جسے کتب خانوں کا نچوڑ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۴۔ ان کی اہمیت کا ایک پہلو غالباً اب تک پوری طرح ابھر نہیں سکا، اور وہ یہ ہے کہ ان نمبروں کی ایک مخصوص تاریخی حیثیت ہے۔ دس بیس سال گزر جانے کے بعد یہ موجودہ عہد کے علم و فضل اور ذوق و مشرب کا نادر و جامع مرقع رہ جائینگے اور محض انہیں سے ہمارے عہد کی بیسیوں خصوصیات کے متعلق زیادہ سے زیادہ روشنی مہیا کی جا سکے گی۔

۵۔ "منٹو نمبر" یا "پطرس نمبر" وغیرہ جیسے شماروں کو اس لحاظ سے بے حد بیش قیمت سمجھا جائے گا کہ بلند منزلت شخصیتوں کے متعلق معاصرین و احباب کے تاثرات کا کوئی بھی مرقع ان کے سوا باقی نہ ہوگا۔

۶۔ مکاتیب نمبر، شخصیات نمبر وغیرہ بھی اس لحاظ سے حد درجہ قابلِ قدر متصور ہوں گے کہ جو کچھ ان کے ذریعے سے یکجا ہو چکا ہے، وہ دوسری جگہ ہرگز نہ مل سکے گا۔

دعا

آخر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ تجزیہ نہ تو "دہ سالہ نمبر" کا مقدمہ و تعارف ہے اور نہ اس میں ان مضامین و مقالات کی کیفیت پیش کی گئی ہے جو دس سال کے شماروں سے منتخب کر کے یہ گراں قدر مجموعہ تیار کیا گیا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ "نقوش" کے خاص نمبروں کے باب میں اپنے تاثرات پیش کر دوں۔ ضروری نہیں کہ ادارہ "نقوش" یا اصحابِ علم و فضل ان سے حرفاً حرفاً متفق ہوں۔ ان خاص نمبروں کی افادی حیثیت کے مختلف پہلوؤں کا سامنے آ جانا اس لیے بھی ضروری نظر آیا کہ اگر پہلے بلا ارادہ یہ خدمات انجام پائیں تو اب ان کے لیے بالارادہ اور بالاہتمام سرگرم کوششیں جاری رہنی چاہئیں۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارہ "نقوش" کو بدرجہا زیادہ قابلِ قدر اور بہ اعتبارِ نتائج و اثرات وسیع تر خدمات کا سرچشمہ بنائے:

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

نقاش و نقوش

ڈاکٹر اختر اورینوی

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو صبا رفتار و برق بہ کنار زندگی کے نقوشِ رنگ رنگ زمانہ کی راہوں اور منزلوں میں بکھرے ہوئے پاتا ہوں۔ ماضی کو خواب و خیال کیسے کہہ دوں؟ ماضی سے بڑی حقیقت تو میرے لئے اور کوئی نہیں۔ حال کا زہرِ غم ابھی رگ و پے میں اس طرح سرایت نہیں کر سکا کہ وہ جانِ حزیں کا ایک حصہ بن جائے۔ زندگی کا اہم ترین حصہ عبارت ہے ماضی سے۔

کتنی پیاری ہستیاں، کتنے چاہنے والے لوگ، کیسے ہنستے ہوئے چہرے، کتنے تابناک واقعات، کیسی جاندار صحبتیں، کتنی گرم محفلیں، کیسی کیسی ادبی محفلیں اور کتنے محبوب جریدے میری حیاتِ مستعار کا جزو بن چکے ہیں۔ !

ماضی کبھی نہیں مٹتا۔ حال ماضی کا پروردہ ہے، ماضی کے نمو کا سرا ہے۔ حیاتِ گذشتہ پنہاں ہونے کے باوجود کسی نہ کسی رنگ و آہنگ سے حال و مستقبل کے لالہ و گل میں نمایاں ہوتی رہتی ہے۔

میرے دل میں اس وقت اُردو جریدوں کی یادیں بیدار ہو رہی ہیں۔ اور ان یادوں کے ساتھ نہ جانے اور کتنی حسین اور پیاری یادیں وابستہ ہیں۔ ماضی سے دُوری کا احساس دل میں ایسا گداز پیدا کر دیتا ہے کہ اُس کے پھول تو پھول کانٹے بھی عزیز ہو جاتے ہیں۔

میرے شباب نے دامنِ نگار میں آنکھیں کھولیں اور پھر نیرنگِ خیال نے اُسے پُرکار بنایا۔ شباب جب اور رسا ہُوا تو ساقی اور رومان کو ایمان و آگہی سے دوستی اور تمکین و ہوش کی رہبری کے لئے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ حُسن اور حُسن کاری کے عالمِ رنگ و بو میں میرے ذوق و شوق پل رہے تھے۔ ادب میرا ندیم تھا اور میں ادبِ لطیف کی فضائے معطّر میں سانس لیتا تھا۔

جریدے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ سب سے اہم نوع رسالوں کی وہ ہے جو ایک منفرد شخصیت، ایک مخصوص فضا اور ایک استوار روایت رکھتی ہے۔ میں جریدوں کو جیتے جاگتے انسانوں کی طرح پہچانتا اور انھیں یاد رکھتا ہوں۔ پرچے میرے مخلص و محبوب دوستوں کی طرح ہوتے ہیں۔ میں دونوں کو بہت چاہتا ہوں۔ مگر اظہارِ وفاداری میں استوار نہیں ہوں۔

شخصیت میں تسلسلِ روایت کا پرتو بھی ہوتا ہے اور ارتقا کی تبدیلیوں کا عکس بھی۔ آدمی اور جریدے دونوں اس قانون کے دائرے میں آتے ہیں۔ آدمی فوت ہوتے ہیں۔ پرچے بھی مر جاتے ہیں۔ کتنے پیارے لوگ اور کتنے اچھے پرچے وفات پا گئے۔ لیکن میرے دل کی دھڑکنوں میں وہ آج بھی زندہ ہیں۔ رومان (لاہور) کتنا محبوب رسالہ تھا! کوئی میری روح میں جھانک کر اس کی بہاروں کو دیکھے!

ملک کی تقسیم کے بعد کئی رسالے ہجرت کر گئے۔ اور میں ہجرِ ساقی میں اپنی تشنہ لبی کو دعائیں دے رہا ہوں۔
دِلّی دُور تھی مگر کراچی بہت دُور ہے، بہت دُور! ——— اور لاہور؟ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا؟
وہ شمع نگار اور [illegible]

ہے۔ میں ادبی دنیا سے دور و مہجور ہوں۔ نہ جانے نیرنگِ خیال و ادبی دنیا فوت ہو گئے یا زندہ ہیں؟

سنا ہے لاہور میں نئی بہاریں آئی ہیں۔ وہ شہرِ دلبراں ارژنگ چین بن گیا ہے۔ کچھ گل و یاسمن اور چند نقوشِ حسین اس صنم خانۂ ہند میں بھی آ جاتے ہیں۔ اور کعبہ کے بتانِ دیر بیرنگ و چمن کے کنارے آ بسے ہیں۔ اہلِ حرم اور اہلِ صنم کدہ میخانۂ اردو میں آ کر ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔

اردو جریدوں کی ادبی اہمیت تو ہے ہی۔ لیکن موجودہ حالات میں اُن کی جذبی، تہذیبی، سیاسی اور لسانی حیثیتیں بھی کم اہم نہیں۔ اردو وہ مرہم ہے جو تقسیم کے زخم کے اندمال کا باعث ہے۔ یہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے والی طاقت ہے۔ اردو نوائے محبت ہے۔ اس بنتِ ایشیا کا پریم ہی سنگار ہے۔ اردو پرچے سفرائے اُلفت ہیں۔

فی الحال میں گلستانِ اردو کے ایک گلِ نودمیدہ کے متعلق اپنے تاثرات پیش کر رہا ہوں۔ یہ پھول تقسیم کے بعد راوی کے کنارے کھلا۔ اس کے ایامِ غنچگی ندیم کی صحبت میں مسرور گذرے۔ انھوں نے اپنے خونِ جگر سے اس کی بہاروں کو پروان چڑھایا اور اس کے نقوش ابھارے۔ دوسرا دور آیا تو پر وقار آیا۔ شباب کا الھڑپن اور انقلاب کی سیمابیت دور ہو چکی تھی۔ متانت آئی۔ شوخ رنگینی اور شعلگی نے پختگی کی طرف قدم بڑھایا۔ نقوشِ بہار زیادہ رچ گئے، زیادہ سنور گئے، زیادہ دل نشین ہو گئے اور زیادہ فکر انگیز۔ پھول کھلتا رہا اور کھلتا رہا۔ یہ نکھار گلستان کے فیض سے بھی تھا اور بہار کے طفیل سے بھی۔ ع

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا !

تکمیلِ بہار ثمر وری ہے۔ نقوشِ بہار نے نقاشی کی اور نقوشِ گلستان پر کار و پائندہ ہو گئے۔ اردو کے گلِ نودمیدہ کے تیسرے دور کو اہلِ تماشہ عہدِ پختگی و ثمر وری کہتے ہیں۔ نقوشِ بہار نکھرے، بنے، پائندہ ہوئے، ان کی شخصیتیں اُبھریں اور یہ گلستان میں نکہتِ ابدی بن گئے۔ نقاشِ نو نے محض اپنی صلاحیتوں کے طفیل صرف اپنے جوشِ اظہار کے بل بوتے پر نقوشِ بہار کو سنوارا، نکھارا اور تاریخِ گلستان بنائی۔ نقوشِ چمن کے تیسرے دور کے نقاش نے دامانِ بہاراں کو بہت وسیع بنا دیا۔ یہ عہد تو بسیط و تشخّص ہے۔ اور اردو ادب کی تاریخ میں ایسے ایسے نقوش ابھرے جنھیں ہم نقوشِ مانی و بہزاد کہہ سکتے ہیں۔

تیسرے دور کا نقاش ساحر ہے۔ یہ اپنے پرایوں کی طرف گل و ثمر پھینکتا ہے مگر خانہ برانداز چمن نہیں بلکہ خانہ سازِ بہار ہے۔ یہ ماضی کے رنگ و نکہت کو سمیٹ کر لاتا ہے اور پرانے نقوشِ بہار کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔ یہ غزل سرا بھی ہے اور داستان گو بھی۔ اس نے شاہدانِ بہاراں کا ایک صنم کدہ بھی تعمیر کیا ہے۔ وہ خارہ شگافی کر کے جوئے شیر بھی لاتا ہے۔ اُس نے ایک دیوارِ قہقہہ بھی بنوائی ہے۔ وہ تصویرِ بتاں اور حسینانِ ادب کے خطوط جمع کرتا رہتا ہے۔ وہ بہروپیا ہے۔ دیکھو گلہائے منتخب کی ٹوکری سر پہ رکھے مالن کا بھیس بدلے چلا آ رہا ہے۔

اے خوشا روز کہ آئی و بہ صد ناز آئی !

نقوش کے خاص نمبر

نثار احمد فاروقی

اردو میں اخبارات کو نکلتے ہوئے مدت تو ایک صدی سے بھی زیادہ ہی ہوگئی لیکن رسالوں کا رواج، اور وہ بھی ایسے رسالے جو آج مضامین، افسانے، ڈرامے، نظمیں اور غزلیں سجا کر نکلتے ہیں، ان کا آغاز بیسویں صدی کے ساتھ ہی ہوا ہے۔ اردو میں علمی اور ادبی رسالوں کا جو معیار آج ہے وہ رفتہ رفتہ بنا ہے۔ ایک زمانے میں تہذیب الاخلاق، معارف، مصنف، عالمگیر، ہمایوں، ادبی دنیا، صلائے عام، نیرنگِ خیال، الناظر، نگار اور ساقی ایسے ادبی رسالے تھے کہ ان میں کسی مضمون کا شائع ہونا ہی ادیب کے ذی شعور اور پختہ کار ہونے کی علامت تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان رسالوں نے اس صدی کے بہت سے لکھنے والوں کو بنایا ہے، روشناس کرایا ہے یا ان کا "اکتشاف" کیا ہے۔

لیکن ہماری زبان میں بہت سی باتوں کے ساتھ ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ اس کے لکھنے والے اجتہادی فکر سے محروم ہیں اور لکیر کے فقیر بننے میں ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں چنانچہ اسی کی بدولت اب وہ روش جو کبھی بعض رسالوں کا طرۂ امتیاز تھی اتنی عامیانہ ہو چکی ہے کہ عام قاری اس سے متاثر نہیں ہوتا —— یورپ اور امریکہ میں جرنلزم ایک باضابطہ فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، وہاں باقاعدہ صحافت کی تعلیم اور تربیت دی جاتی ہے اس میں نئی نئی راہیں پیدا کی جاتی ہیں۔ اخبار، رسالے، میگزین اور صحائف ترتیب دینے کے سلسلے میں غور و فکر کے بعد کتابیں لکھی جاتی ہیں لیکن اردو میں ایسا کوئی فن یا کوئی کتاب موجود نہیں۔ لطف یہ کہ رسالہ کو ایڈٹ کرنا سب سے زیادہ آسان کام سمجھا جاتا ہے، دو چار مقالے، پانچ سات افسانے، دس پندرہ نظمیں غزلیں اور خطوط —— یہ سب جمع ہوئے تو ایک رسالہ ہو گیا! چنانچہ ہمارے ملک میں یہ ایک روایت بن چکی ہے کہ شاعر، ایڈیٹر اور مولوی "خدا ساز" ہوتا ہے اسے محنت اور مطالعے کی ضرورت نہیں، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگ سب کچھ کہہ گزرے ہیں اور علم و ادب کا کوئی گوشہ "ناپیمودہ" نہیں ہے اب کسی اجتہاد یا تجدید کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسالے اتنی کثرت سے نکلتے ہیں مگر ان میں انفرادیت یا نمایاں فرق بالکل نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ ایک خواندہ جسے ادب سے لگاؤ ہے وہ "فلاں" رسالہ کیوں خریدے اور "فلاں" کیوں نہ خریدے؟ یعنی کوئی تو خطِ امتیاز اور وجہ ترجیح ہونا ہی چاہیئے۔ مگر آپ اردو کے دو چار رسالوں کا تقابلی مطالعہ کر دیکھیے کوئی بات تخلیقی یا اجتہادی نہیں ملے گی۔ ادب کے نام پر وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ ادب کی پیروڈی معلوم ہوتا ہے۔

اب پڑھنے والوں کا مذاق بھی بدل چکا ہے۔ اگر کسی کام میں جی جان سے محنت کی جائے تو اس میں کامیابی بھی یقینی ہے اور اس کا کامیاب ہونا بھی مسلّم ہے۔ الہلال کی مثال دیکھئے مولانا آزاد نے اُسے ایسی شان سے نکالا تھا کہ نصف صدی کا عرصہ گذر جانے پر بھی کوئی اخبار اس کی ہمسری کا دعوےٰ نہیں کر سکا۔ مولانا کبھی دوسرے درجے کی چیز پر راضی نہ ہوئے، اخبار بھی نکالا تو پہلے پریس لگایا وہ بھی ٹائپ کا، جو اس وقت اگرچہ مقبول نہیں تھا لیکن اُسے سائنٹفک ہونے کی وجہ سے گوارا کیا۔ معیار کے اعتبار سے انگریزی اور عربی کے بہترین مصوّر اخباروں کو نمونہ بنایا ان کی بھی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کے اصول پر عمل کیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ آج اردو کے اخبارات الہلال کی مقبولیت اور انفرادیت پر رشک کرتے ہیں۔

علمی رسالوں میں معارف، برہان اور نگار آج بھی اپنی اپنی وضع پر نکل رہے ہیں اور انھوں نے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اعلےٰ درجے کے علمی مضامین و مقالات سے اُردو کو سرمایہ دار کر دیا ہے۔

اُردو میں غالباً 'نیرنگ خیال' نے خاص نمبروں اور سالناموں کی رسم کو آگے بڑھایا اور اب تو یہ رسم سے زیادہ 'وبا' ہو گئی ہے۔ بہت سے رسالے تو خاص نمبر کے بوجھ سے بیٹھ جاتے ہیں، مگر نکالنے سے باز نہیں آتے۔ ان میں عام اشاعتوں سے صرف ضخامت زیادہ ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ گویا اس اچھی بھلی روش کو بھی اتنا فرسودہ اور غیر دلکش بنا دیا ہے کہ اب کسی رسالے کے خاص نمبر کی کوئی اہمیت یا غیر معمولی حیثیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

'نقوش' اُردو کا اعلیٰ ترین ادبی مجلّہ ہے۔ اُردو کے معیاری علمی اور ادبی رسالوں میں اس کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ یہ ۱۹۴۸ء سے نکلنا شروع ہوا اور اب تک جب کہ یہ اپنی زندگی کے بارہ برس طے کر چکا ہے اس نے بہت سے قابل قدر اور عظیم الشان نمبر پیش کئے ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک دس سال کی مدت میں نقوش نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کا مکمل چارٹ اس کے دس سالہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ۱۷ مضامین، ۲۹۰ افسانے، ۱۲۱۳ خطوط، ۱۲ ڈرامے، ۶ ناولٹ، ۴۴۶ نظمیں، ۱۳۳۷ غزلیں چھاپی ہیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۲۲۷۶ صفحات ہوتی ہے۔ اس کے بعد طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر، خاص نمبر اور دو عام شمارے بھی چھپ چکے ہیں ان کے صفحات اور مشمولات بھی شمار میں لائیے تو یہ تعداد کہیں زیادہ بڑھ جائے گی۔

محنت میں برکت ہوتی ہے۔

محمد طفیل نے اپنے زمانۂ ادارت میں نقوش کو زندۂ جاوید کر دیا ہے اور اُن کی محنت نے اُنھیں بھی اَمر بنا دیا ہے جس طرح نگار کے ساتھ نیاز فتح پوری کا نام، انجمن ترقی اُردو کے ساتھ مولوی عبدالحق کا نام یا صلائے عام کے ساتھ مرزا ناصر علی کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گیا ہے اسی طرح اب نقوش اور محمد طفیل بھی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یہ اُن سے زندہ ہے وہ اس سے ـــــ عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خاص نمبروں کے میدان میں نقوش کا کوئی حریف ہندوستان یا پاکستان میں موجود نہیں۔

نقوش نے اب تک مجموعی طور پر اکیس نمبر شائع کئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) آزادی نمبر (۲) امن نمبر (۳) آزادی نمبر (۴) خاص نمبر
(۵) سالنامہ (۶) ناولٹ نمبر (۷) افسانہ نمبر ۱ (۸) پنج سالہ نمبر
(۹) افسانہ نمبر ۲ (۱۰) غزل نمبر (۱۱) شخصیات نمبر ۱ (۱۲) منٹو نمبر
(۱۳) افسانہ نمبر ۳ (۱۴) شخصیات نمبر ۲ (۱۵) سالنامہ (۱۶) مکاتیب نمبر ۱
(۱۷) مکاتیب نمبر ۲ (۱۸) دہ سالہ نمبر (۱۹) طنز و مزاح نمبر (۲۰) پطرس نمبر
(۲۱) خاص نمبر

ان خاص اشاعتوں کے صفحات کی مجموعی تعداد کئی ہزار ہوتی ہے اور ان کی افادیت دو گونہ ہے یعنی ان میں کچھ اشاعتیں تو بعض موضوعات سے مختص ہیں مثلاً افسانہ نمبر، غزل نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر۔ کچھ عمومی افادیت کی حامل ہیں مثلاً سالنامے، خاص نمبر، پنج سالہ نمبر، دہ سالہ نمبر وغیرہ۔ اور دو اشاعتیں ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں: منٹو نمبر اور پطرس نمبر۔

ان نمبروں کا سرسری جائزہ لینے کے لئے بھی کئی ہزار صفحوں کو پڑھنا اور ان کے محاسن یا معائب سے بحث کرنا آسان نہیں، ان پر اچٹتا ہوا تبصرہ کرنے کے لئے بھی ایک پورا دفتر درکار ہے —— میں یہاں ان خاص اشاعتوں کے تعارف کی رسم ادا کرتا ہوں۔ طوالت کے خوف سے ایجاز و اختصار کی پناہ گاہ سے قصداً باہر نہیں نکلا ہوں۔ پھر بھی ہزاروں صفحات کو پڑھنے اور ان کے بارے میں غور و فکر کرنے میں اچھا خاصا وقت صرف ہوا ہے۔

نقوش نے سب سے پہلے اپنا چوتھا شمارہ "آزادی نمبر" کی شکل میں پیش کیا تھا جو اس وقت پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا۔ اور ساتواں شمارہ "عالمگیر امن نمبر" تھا جسے ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں تمام چیزیں امن کے موضوع پر شامل تھیں۔ ان دنوں امن کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی ہوا تھا۔ ہنگامی طور پر یہ موضوع اچھا خاصا "چلتا ہوا" تھا۔ اس وقت نقوش ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا اور لمحاتی سیاست کا نقیب بن کر رہ گیا تھا۔ مجھے کسی تحریک یا "ازم" یا سیاسی عقیدے سے انکار نہیں لیکن ادب کو کسی ایک نظریہ کا پابند کرنا بھی سود مند نہیں سمجھتا۔ اچھا اور بڑا ادب حلقۂ شام و سحر سے آزاد ہوتا ہے اسے وقتی جذبات میں اسیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس نمبر میں جتنی تخلیقات شامل ہیں وہ سب ادب سے زیادہ سیاست کی نمائندہ تھیں۔ انھیں کسی اخبار کے ادارتی کالم میں جگہ دی جاتی تو اچھا ہوتا۔ اس اعتبار سے تحریک نے ہمارے ادب کو بہت نقصان پہنچایا۔ سیاست کو ممکن ہے کچھ فائدہ پہنچ گیا ہو۔ اس نمبر کی منظومات میں سے ایک نمونہ آپ بھی دیکھتے چلیں:

"چین، برما، ملایا، میں اک عہد نو آج انگڑائیاں لے رہا ہے ——
ایشیا اپنی کہنہ جکڑ بندیوں کو ——
بحر کاہل کے گہرے سبز پانیوں میں دھکیلے چلا جا رہا ہے
آج جاپان میں انقلابی جنم لے رہے ہیں
کوریا بھی طلسم زر و سیم کو توڑنے کے لئے مضطرب ہے ——

ہند میں ایک طوفان سمٹا ہوا ہے
ہندوکش کی بلندی پہ برفاب آگ کی جھلکیاں دے رہے ہیں . . ."

خدا را بتائیے کہ یہ نظم ہے یا لندھور بن سعدان کی داستان! نظم کے اس بند میں اور کسی اخبار کے گرما گرم اداریہ میں آپ کیا فرق و امتیاز کریں گے؟ کیا اسی روش پہ ادب کی تخلیق ہوتی رہتی تو "بڑا ادب" پیدا ہو جاتا؟ اور کیا یہی باتیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ جوش و خروش اور طمطراق کے ساتھ نثر میں نہیں لکھی جا سکتیں؟ ان باتوں پر غور کیجیے تو فیصلہ آپ خود ہی کر لیں گے ——— وہ زمانہ فراتفری کا تھا۔ پروپیگنڈے کا زور شور تھا۔ اب جذبات میں وہ اُبال نہیں ہے اب تو یہ سب باتیں آسانی سے سوچی جا سکتی ہیں۔ شکر ہے کہ "نقوش" بہت جلد سیاست کے چکر سے نکل گیا اور اب وہ بغیر کسی لیبل کے شائع ہوتا ہے، ہر مکتب خیال کی نمائندگی کرتا ہے، ہندوستان اور پاکستان میں اردو کے بہترین لکھنے والوں کی بہترین تحریریں پیش کرتا ہے اور کسی سیاسی مسلک کا نمائندہ نہ ہونے کی وجہ سے تمام حلقوں میں یکساں طور پر مقبول و معروف ہے۔

اس کے بعد پھر نقوش کا آٹھواں شمارہ "آزادی نمبر" تھا۔ اس میں اچھے لکھنے والوں کی اچھی چیزیں سلیقے سے جمع کی گئی تھیں۔ بھلا ایسا کیوں نہ ہوتا۔ احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور جیسے قابل اور سوجھ بوجھ والے مدیر جو تھے۔ وہ تو وقتی لہر ہی تھی جس کی زد میں یہ لوگ آ گئے تھے۔ ورنہ یہ بات نہیں کہ انھیں ادبی تحریروں اور سیاسی تحریروں میں تمیز نہ تھی۔ گیارھواں اور بارھواں شمارہ "خاص نمبر" کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ مئی ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ اس وقت سید وقار عظیم اس کے مدیر تھے جو اردو کے اچھے نقاد، مبصر، صحافی اور انشاء پرداز ہیں۔ ان دنوں یہ رسالہ ایک آزمائش سے گزر چکا تھا یعنی حکومت پاکستان نے جولائی ۱۹۴۸ء میں اس پر پابندی لگا دی تھی جو فروری ۱۹۴۹ء تک رہی اس کے بعد پھر کچھ زمانہ ناسازگار حالات رہے جن کی وجہ سے رسالہ وقت پر شائع نہ ہو سکا۔ مگر مدیر اور ناشر کے حوصلے بلند تھے۔ انھوں نے بڑی آن بان سے یہ خاص نمبر پیش کیا۔ قدیم اور جدید لکھنے والوں کی بہترین نمائندہ تحریریں اس میں موجود تھیں جن میں میر ناصر علی مرحوم (صلائے عام) کا بہترین انشائیہ "خطرہ لگائے دل" خاصے کی چیز تھا۔ اس کے علاوہ عبدالرحمٰن چغتائی، مولانا صلاح الدین احمد، نیاز فتحپوری، ممتاز شیریں وغیرہ کے مضامین موضوع کے اعتبار سے وقیع اور انداز کے لحاظ سے رفیع تھے لیکن سب سے زیادہ محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ قیوم نظر نے اندر سبھا کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا تھا۔

سید وقار عظیم کے زمانہ ادارت میں دو نمبر اور بھی نکلے ایک سالنامہ (شمارہ ۱۵-۱۶) دوسرا ناولٹ نمبر (شمارہ ۱۷-۱۸) یہ دونوں بہت ہی مقبول ہوئے خصوصاً "ناولٹ نمبر" کیونکہ تقسیم ہند کے بعد پہلی بار اتنا اچھا ناولٹ نمبر نکالا گیا تھا۔

شمارہ ۱۹-۲۰ سے محمد طفیل کی ادارت کا آغاز ہوا۔ اور سب سے پہلے اپنے "عہد معدلت مہد" میں انھوں نے اردو افسانے کے ساتھ انصاف کیا۔ یہ افسانہ نمبر (شمارہ ۲۵-۲۶) موضوع کی نمائندگی کرتا تھا۔ تیسویں شمارے پر "نقوش" کی عمر ۵ سال ہو چکی تھی اس کی سالگرہ منائی گئی اور "پنج سالہ نمبر" (شمارہ ۲۹-۳۰) شائع کیا گیا۔

پنج سالہ نمبر کے بعد پھر ایک افسانہ نمبر (شمارہ ۲۷-۲۸) پیش کیا گیا۔ یہ بھی پچھلے خاص نمبروں کی طرح امتیازی علامت رکھتا تھا۔

لیکن نقوش کی کامیابی اور خاص نمبروں کے میدان میں یکہ تازی کا آغاز غزل نمبر (شمارہ ۴۱-۴۲) سے ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زمانہ عروج میں غزل کی مخالفت بھی بڑے ہی جوش و خروش سے ہوتی تھی۔ لیکن اس کا رشتہ ہماری تہذیب اور ثقافت سے ہزاروں برس پرانا ہے۔ یہ رشتہ ایسا "نہ ٹوٹ" نہیں کہ بیک جنبش اسے ختم کر دیا جائے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے "غزل جتنی بدنام ہے اتنی ہی مجھے عزیز ہے۔ شاعری کا نام آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہوتا ہے۔ غزل کو میں فن نہیں، اپنی شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے دونوں کو سمت و رفتار ایک دوسرے سے حاصل ہوئی ہے اس پر نہ ہنسنا چاہیے نہ رونا۔ اس کا احترام کرنا چاہیے" چنانچہ یہ غزل کی قوت ہی ہے جو اب تک وہ نہ صرف یہ کہ مقبول رہی بلکہ کسی مخالف وار کا ہلکا سا اثر بھی اس نے قبول نہیں کیا۔ جنھوں نے غزل کی مخالفت کی وہ اپنی شاعری کو بھدا بنا بیٹھے غزل کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ "نقوش" نے غزل نمبر پیش کر کے اس کی مقبولیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ساڑھے چھ سو صفحوں میں بہترین غزلیات کا یہ انتخاب اتنی محنت اور سلیقے سے کیا گیا ہے کہ ہر دور کے نمائندہ شاعر اور ان شاعروں کا نمائندہ کلام اس میں آ گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موضوع اور معیار کے اعتبار سے نیز فن اور خیالات کے لحاظ سے غزل کا عہد بہ عہد ارتقا کس طرح ہوا ہے۔ یہ غزل نمبر اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے تین ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں اور چوتھا زیر طبع ہے[1]۔ میں یہ تجویز کرنا چاہتا تھا کہ بعض شعرا خصوصاً اساتذۂ متقدمین و متوسطین کے کلام کا اچھا اور نمائندہ انتخاب نہیں ہو سکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے دواوین یا تو چھپے نہیں یا عام طور سے دستیاب نہیں ہوتے۔ مثلاً قائم چاندپوری، مصحفی، میر حسن، بیاں وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان کے کلام کا انتخاب مختلف تذکروں اور بیاضوں سے کیا گیا ہوگا۔ اگر ایسے شاعروں کے دواوین سے براہ راست انتخاب کیا جاتا تو وہ اور زیادہ اچھا ہو سکتا تھا۔

"نقوش" کا شمارہ ۴۷-۴۸، ایک ایسا مہتم بالشان کارنامہ تھا جو اردو زبان میں پہلی بار کسی رسالے نے انجام دیا۔ پہلی کوشش عموماً ناقص اور خامیوں سے پُر ہوا کرتی ہے لیکن یہ اس کے برعکس بڑی ہی جامع، منفرد، اور عجیب و غریب تھی جس نے اچانک اردو والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میری مراد شخصیات نمبر سے ہے۔ اس نمبر کے دو حصے ہیں۔ دوسرا حصہ (شمارہ ۵۹-۶۰) منٹو نمبر اور افسانہ نمبر کے بعد چھپا تھا۔ شخصیات نمبر کے بارے میں اپنی رائے کسی حد تک پہلے ظاہر کر چکا ہوں (نقوش، شمارہ ۴۳، ۴۴) یہاں ان کے تعارف کے طور پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

پہلا حصہ (شمارہ ۴۷-۴۸) چھ سو اسی (۶۸۰) صفحوں کو محیط ہے اور اس میں کل جمع چھیاسی شخصیتوں پر خاکے اور مضامین شامل ہیں۔ جن پر خاکے ہیں ان کے چند نام یہ ہیں: محمد حسین آزاد، شبلی، مرزا رسوا، میر ناصر علی، مرزا فرحت اللہ بیگ، حسرت موہانی، ڈاکٹر عبدالحق، ابوالکلام، رشید احمد صدیقی، آتش لکھنوی، جگر مراد آبادی، چودھری محمد علی وغیرہ۔ ان پر لکھنے والے بھی اتنے ہی بڑے بڑے لوگ ہیں۔ ایک حصہ اس میں اور بھی ہے جس میں "لاہور کی چند ادبی شخصیتیں" اسی طرح دلّی، لکھنؤ اور حیدر آباد کی شخصیات کا مختصر اور جامع تذکرہ مہیا کر دیا گیا ہے۔ یہ ہر اعتبار سے دلچسپ ہے، اور ان میں بعض نئی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔

دوسرا حصہ (شمارہ ۵۹-۶۰) آٹھ سو اسّی (۸۸۰) صفحوں کا ہے۔ اس میں بھی ۸۸ مضامین ہیں۔ ان شخصیات میں

---

[1] یہ بھی بہت سے مفید اضافوں کے ساتھ یکم فروری سن ۶۶ء کو شائع ہو گیا ہے۔

بڑے لوگ، ادیب، سیاست داں، سماجی ریفارمر، شاعر، طنز نگار، صحافی، لیڈر سبھی آ گئے ہیں۔ ان پر لکھنے والے بھی بیشتر وہ ہیں جو ان سے بہت قریب رہے ہیں۔ یا ہم عصر ہیں۔ اس نمبر کی قدر و قیمت آج بھی بہت ہے مگر سو دو سو برس کے بعد تو ایک عجیب گراں بہا ماخذ کا کام دے گا۔ اگر بالفرض اس نمبر میں کوئی کام کی بات نہ ہوتی تب بھی ساڑھے سولہ سو صفحوں کا نمبر نکال دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ بڑے دل گردے کا کام ہے۔

یہ نمبر بے حد مقبول ہوا۔ اس نے 'نقوش' کو زندہ جاوید کر دیا اور اس کے مرتب محمد طفیل کو بھی۔

نقوش کا شمارہ ۴۹۔۵۰ منٹو کے لیے وقف تھا۔ منٹو اس عہد میں اردو کا بڑا ذہین افسانہ نگار تھا۔ ہمارے مردہ پرست ملک نے اپنی روایت کے مطابق جیتے جی اس کی قدر نہیں کی۔ لیکن اب اس کا قلم ہمیشہ کے لیے رک گیا ہے تو دوسروں کے قلم اس پر چلنے شروع ہوئے ہیں۔ منٹو کے انتقال کے بعد بہت سے رسالوں نے "منٹو نمبر" نکالے لیکن یہاں بھی انفرادیت نقوش ہی کی باقی رہی۔ اس میں منٹو کی بیس غیر مطبوعہ کہانیاں چھاپی گئیں جو ایک ایک دن کے وقفے سے لکھی گئی تھیں اور مطبوعہ کہانیوں میں سے بہترین دس کا انتخاب۔ پھر منٹو کے فن پر سات مضامین جن کے لکھنے والے قرۃ العین حیدر، وقار عظیم، حسن عسکری اور ممتاز حسین جیسے سنجیدہ اور دیدہ ور حضرات ہیں۔ چوتھے حصے میں منٹو کی شخصیت پر بہت ہی دلچسپ مضامین ہیں جو عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، ابو سعید قریشی، حامد جلال، غلام عباس اور محمد طفیل نے لکھے ہیں۔ ان سے منٹو کی شخصیت کے بہت سے نقوش ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ منٹو کے فن پر اب ریسرچ بھی شروع ہو چکی ہے چنانچہ ماسکو میں ایک روسی خاتون جو اردو کی طالبہ ہیں، منٹو کے فن پر تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں۔ وہ اس سلسلے میں ہندوستان بھی آئی تھیں۔ آئندہ بھی ہمارے ناقد اور محقق منٹو کی شخصیت اور فن پر توجہ کریں گے۔ اس وقت ان سب کے لیے منٹو نمبر بہترین اور مستند ماخذ ہوگا۔

۱۹۵۵ء میں نقوش نے ایک شاندار افسانہ نمبر پیش کیا (شمارہ ۵۳۔۵۴)۔ یہ ایک ہزار چونسٹھ صفحوں کا ایک ضخیم و بسیط سائیکلوپیڈیا ہے جس میں ۱۸۰۰ء سے ۱۹۵۵ء تک ڈیڑھ سو سال کے افسانوی ادب کا انتخاب آ گیا ہے۔ ان ڈیڑھ سو برسوں میں اردو افسانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اس کا اندازہ یہ انتخاب دیکھ کر ہی ہو جاتا ہے اور اداریے میں محمد طفیل نے بہت ہی لطیف استعارے میں یوں بیان کر دیا ہے:

> "کہانی کے گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جو بے حد ذہین، موٹا تازہ، اور ساتھ ہی بڑا باتونی تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں جب باتیں کرنے پر آتا تو چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کی وہ تمام اکھڑی اکھڑی اور سلسلہ در سلسلہ باتیں آج بھی سب کو یاد آتی ہیں۔
>
> مگر بدبختی یہ کہ شروع ہی سے اس بچے کو اپنی ماں کا دودھ نصیب نہ ہوا۔
>
> جب یہ بچہ کچھ بڑا ہوا اور اس کا شعور بھی کچھ کچھ پختہ ہونے لگا تو اسے اپنے تمدن اور اپنی معاشرت سے بے حد "انسیت" پیدا ہوئی شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے قدرے سنبھل کر اپنے مسائل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب اس کی باتوں میں وہ پہلی سی

یا وہ گوئی نہ رہی، قدرے اختصار کے ساتھ ایک ٹھہراؤ تھا، ایک تسلسل تھا اور ایک نقطۂ نظر تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا۔

اسی بے منزلی میں اس نے اپنے ملک سے دور، مغرب کے بچوں سے یارانہ گانٹھا کیونکہ وہ اس سے زندگی میں کئی قدم آگے تھے۔ یہاں بیٹھے ہی بیٹھے اس نے انھیں اپنا ذہنی امام تصور کر لیا اور اس کی باتوں کو اپنے الفاظ میں دہرا دہرا کر بہت کچھ سیکھا۔

مغربی بچوں کی دیکھا دیکھی جب اس نے اسی انداز میں یہاں زندہ رہنا چاہا تو اپنی چال بھی بھول گیا۔ نہ ان بچوں والی کوئی بات پیدا ہو سکی اور نہ اپنی ہی انفرادیت باقی رہی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ نہ سکا۔ کچھ بوکھلا سا گیا۔ بعضوں کو اس کی یہی بوکھلاہٹ بڑی عزیز ہے۔

تذبذب کی یہ کیفیت اس پر زیادہ عرصہ طاری نہ رہی۔ وہ بچے جن سے وہ بہت زیادہ مرعوب تھا اور جن سے واقعی اس نے بہت کچھ سیکھا تھا ان سے بھی اسے آنکھیں چار کرنے کی ہمت پیدا ہوئی۔ اور اس کا یہ گھمنڈ کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا۔

آپ کو سن کر حیرت ہو گی کہ وہ بچہ جو بعد کو بالغ ہو کر جوان بھی ہوا، آج نڈھال پڑا زندگی کے دن گزار رہا ہے۔

یہ کہانی اُردو افسانے کی تھی۔" (طلوع افسانہ نمبر)

انھی شگفتہ پیرائے میں اتنے مختصر لفظوں میں، ایسے دلنشیں انداز سے، اُردو افسانے کے متعلق اتنی بہت سی باتیں کہہ کر اُردو افسانے کی ابتدا، ترقی، عروج اور موجودہ "تحیّر" کا ایسا سماں باندھ دیا ہے کہ شاید ہی اس پر کچھ اضافہ کیا جا سکے۔ اسی لئے باوجود اقتباس کی طوالت کے یہاں میں نے تمام و کمال نقل کر دیا۔

اس میں خصوصیت سے آخری فقرہ بہت ہی چبھتا ہوا ہے۔ کیا واقعی ہمارا افسانہ روبہ زوال ہے؟ یہ ایک بڑا سوالیہ نشان ہے جو مسلسل غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ادب میں زوال کا نعرہ لگانا تو کچھ مشکل نہیں لیکن اس کے اسباب و علل پر غور کرنا اور اس کا صحیح حل پیش کرنا بہت مشکل ہے۔

ہمارے افسانے میں بالخصوص اور ادب میں بالعموم اگر زوال آیا ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ باعتبار موضوع ہے یا بلحاظ فن۔ یعنی بات ڈھنگ کی نہیں کی جا رہی ہے یا ڈھنگ سے کہی نہیں جا رہی ہے۔ اس موضوع پر بعد میں محمد طفیل نے ایک سمپوزیم بھی کیا تھا (نقوش خاص نمبر ۱۹۵۹ء) جس میں ملک کے بہت سے لکھنے والوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان خیالات پر ہم اپنا اظہار کسی دوسری جگہ کریں گے۔

بہرحال افسانہ نمبر میں سب سے پہلے تو اُردو کی پہلی کہانی "رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" مصنفہ انشاء اللہ خاں انشا شامل ہے۔ یہ انشا کا ایک اہم تجربہ تھا جس سے نہ صرف اُردو افسانے کا آغاز ہوتا ہے بلکہ ہندی والے بھی اسے

آدی کال کے ہندی کتھا ساہتیہ" میں پہلی جگہ دیتے ہیں۔

اس کے بعد طویل مختصر داستانوں کا دور آتا ہے جس میں طوطا کہانی، آرائش محفل، باغ و بہار، بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، انشائے نورتن، فسانۂ عجائب اور الف لیلہ شامل ہیں۔ پھر ناولوں کا دور ہے۔ یہاں نام ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، شرر، رسوا، اور راشد الخیری کے نظر آتے ہیں۔ ایک دور ہمارے ادب میں تراجم کا بھی گزرا ہے اور اس کے بہت سے دور رس فائدے ہوئے ہیں۔ یعنی اردو افسانے کو کچھ نئے تجربے ملے کچھ راہیں دریافت ہوئیں، طرز ادا میں تنوع اور سادگی پیدا ہوئی، موضوعات میں بھی اسی اعتبار سے وسعت آئی۔ ظفر علی خاں، عنایت اللہ دہلوی، عبدالرزاق ملیح آبادی، خواجہ منظور حسین، حامد علی خاں، تیرتھ رام فیروزپوری اور اسی صف کے نو حضرات تراجم کے دور کی نمائندگی اس نمبر میں کر رہے ہیں لیکن یہ دور یہیں ختم نہیں ہوا، اب تک جاری ہے۔ اور بعض ادیبوں نے جن میں شاہد احمد دہلوی کا نام سرِ فہرست ہے، غیر زبانوں کے بہترین تراجم پیش کئے ہیں۔ اس فہرست میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، ل۔ احمد اکبر آبادی اور حسن عسکری کے نام بھی شامل ہونا ضروری تھے۔

"افسانوی مضامین" کا دور خواجہ حسن نظامی سے شروع کیا گیا ہے۔ اس میں ناصر نذیر فراق، آغا حیدر حسین، چراغ حسن حسرت، اور اشرف صبوحی بھی شامل ہیں۔ پھر اردو افسانے کے پانچ دور کر دیئے ہیں۔ ان میں اسّی افسانہ نگاروں کے نمائندہ افسانے انتخاب کئے گئے ہیں۔

آخر میں مقالات کا حصہ ہے اور اس میں چار مقالے ہیں۔ ایک مذاکرہ ہے اس میں افسانے کے فن اور موضوعات سے متعلق بہت سے پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔

اردو افسانے پر اب تک کیا کچھ لکھا گیا ہے اسے دیکھئے تو متفرق چھوٹے چھوٹے مضامین سے قطع نظر دو تین کتابیں ہی سامنے آتی ہیں۔ عبدالقادر سروری کی دنیائے افسانہ، وقار عظیم کی "ہمارے افسانے" اور "ہماری داستانیں" کلیم الدین احمد کی "فن داستان گوئی" — ڈاکٹر احسن فاروقی کی "ناول کیا ہے" اور علی عباس حسینی کی "ناول کی تاریخ و تنقید" بھی اسی میں شامل کر لیجئے۔ اللہ اللہ خیر صلا — ان میں بھی افسانے پر دو ہی کتابیں ہیں۔ باقی داستانوں اور ناولوں سے متعلق ہیں — گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں اردو کا افسانوی ادب اچھا خاصا قد آور اور جاندار ہو گیا ہے۔ یہ ایسا معمولی اور حقیر سرمایہ نہیں کہ اسے بآسانی نظر انداز کیا جا سکے۔ صرف داستانوں ہی کو لیا جائے تو اردو میں جتنی داستانیں لکھی گئی ہیں انھیں پڑھنے کے لئے عمرِ نوح چاہیئے۔ صرف ایک داستان امیر حمزہ اپنی ضخامت میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے برابر ہے۔ ان داستانوں پر منصفانہ تنقیدی نظر ڈالنے کے لئے تو اور بھی محنت درکار ہوگی — اس کے بعد افسانوں کی طرف آیئے تو ہر دور میں دس پانچ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اچھے افسانہ نگار ملیں گے اور موجودہ زمانے کو تو ایک طرح سے "افسانوں کا عہد" ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر ہماری بے حسی بھی قابلِ داد ہے کہ ہم نے اب تک مغربی نقادوں کے چرائے ہوئے خیالات اور چبائے ہوئے نوالوں سے زیادہ اپنے ادب کے اتنے بڑے سرمائے پر کچھ نہیں لکھا۔ انگریزی ادب میں چاسر سے پہلے کوئی معقول چیز نہیں ملتی لیکن جو کچھ "نامعقول" تحریریں بھی ملتی ہیں اُن پر بھی تاریخی و تنقیدی نقطہ نظر

سے اتنا لکھا گیا ہے کہ اسے برسوں میں بھی نہیں پڑھا جا سکتا۔ مگر اردو میں ابتدائی نثر پر توجہ تو خیر کہاں ہوتی، اہم کتابوں کے صحیح متن تک ایڈٹ کر کے نہیں چھاپے گئے اور افسانے جیسی اہم صنف سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔ یہ ایک تازیانہ ہے جو ہمارے مردہ احساس پر لگنے کے بجائے کاش 'سمندِ ناز' پر لگتا!

ہمارے ناقدوں میں سید وقار عظیم نے اردو افسانے پر کام کیا ہے۔ اور ابتدائی داستانوں سے دورِ حاضر تک تمام سرمائے کو کھنگالا ہے۔ اسی سلسلے میں ان کی دو کتابیں "ہمارے افسانے" اور "ہماری داستانیں" شائع ہو چکی ہیں لیکن اتنے بڑے سرمائے کا تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ ایک فرد کا نہیں ایک ادارے کا کام ہے۔ نقوش نے اس میدان میں قدم اٹھا کر ایک بڑی ضرورت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کاش اس موضوع کو "بیابانِ خطرناک" سمجھ کر نقشِ قدم کا حسرت زدہ نہ چھوڑ دیا جائے۔

افسانہ نمبر کے بعد نقوش کے "شخصیات نمبر" کا حصہ ۲ شائع ہوا تھا (شمارہ ۵۹، ۶۰) اس پر مجملاً پچھلی سطور میں لکھ چکا ہوں۔ (شمارہ ۶۱، ۶۲) سالنامہ کی شکل میں نمودار ہوا اور ایک عام اشاعت کے بعد نقوش نے دوسرا لافانی کارنامہ مکاتیب نمبر (شمارہ ۶۵، ۶۶) پیش کیا۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ (۵۶۰) صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس کی ابتدا میں خطوط نگاری کی ابتدا سے متعلق چار پُرمغز مقالے غلام رسول مہر، سید عبداللہ، مالک رام اور محمد عبداللہ قریشی کے لکھے ہوئے شامل ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ چار مقالے ہی مل کر اردو میں مکتوب نگاری پر ایک اچھی تنقیدی کتاب بن سکتے ہیں۔ اس میں ۷۷ مکتوب نگاروں کے خطوط ہیں جن میں سب سے پہلے غالب کے آٹھ غیر مطبوعہ خطوط آتے ہیں۔ دوسرے اہم مکتوب نگاروں میں سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، امیر مینائی، داغ، حالی، شبلی، اکبر، شاد، اقبال، محمد علی جوہر، سلیمان ندوی، حسن نظامی، منشی پریم چند، فانی، محمود شیرانی وغیرہ شامل ہیں۔

مکاتیب نمبر کے دوسرے حصے میں ۴۸۸ صفحات ہیں اس میں بھی ۷۷ مکتوب نگار ہیں اور ان میں منیر شکوہ آبادی، جسٹس امیر علی، سید علی بلگرامی، محمد علی ردولوی، میر ناصر علی، اور سید حسین بلگرامی جیسے اہم لوگ ہیں۔ اس طرح مکاتیب نمبر کے دونوں حصوں کی مجموعی ضخامت ایک ہزار اڑتالیس صفحات اور مکتوبات کی کل تعداد تیرہ سو تیرہ (۱۳۱۳) ہوتی ہے۔ اردو میں آج تک اتنے اہم لکھنے والوں کے خطوط کا اتنا بڑا ذخیرہ نہیں چھاپا گیا تھا۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ چالیس مکتوب نگاروں کے فوٹو اور ۸۵ صفحوں پر خطوط کے عکس بھی دیئے گئے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جن کے مکتوب پہلی بار سامنے آئے ہیں، اور یہ حیثیت مکتوب نگاراں کا درجہ متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں تقریباً تمام خطوط غیر مطبوعہ، اہم اور معلومات افزا ہیں۔

خطوط بھی کسی شخصیت کو پرکھنے کا عجیب آلہ ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت کئی پہلوؤں سے ہوتی ہے، ایک تو یہ کہ مکتوب نگار بے تکلف ہو کر لکھتا ہے اور اس کے سوچنے کا زاویہ، ذہن کی افتاد، فطرت کے پیچ و خم، طبیعت کی سادگی یا پُرکاری فوراً معلوم ہو جاتی ہے۔ دوسرے، خطوط سے نجی حالات اور بہت سی وہ باتیں جو انسان عام حالات میں لکھنا یا بیان کرنا پسند نہیں کرتا معلوم ہو جاتی ہیں۔ تیسرے ان کی بے تکلفی کے باعث استدلال کا انداز، اسلوب کی بے ساختگی اور زبان پر قدرت کا حال کھلتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خطوط کی سوانحی اہمیت بھی ہوتی ہے۔ مرزا غالب نے اگر اپنے خطوط نہ چھوڑے ہوتے تو آج شاید

ان کی سوانح عمری اتنی تفصیل اور موشگافی کے ساتھ نہ لکھی جا سکتی۔ چنانچہ مکاتیب نمبر میں بھی ایسے خطوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے جن سے مکتوب نگاروں کے بارے میں یا ان کے تعلق سے دوسری ادبی، سیاسی، سماجی یا تاریخی شخصیتوں کے باب میں بہت سی نئی اور اہم معلومات ہمیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً منشی پریم چند کے ۲۸ خطوط اس میں شامل ہیں جن سے اُن کی بعض کتابوں کے زمانۂ تصنیف و طباعت کی تعیین کی جا سکتی ہے۔ بعض افسانے انھوں نے کب لکھے یہ ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جاتا ہے۔ اس معلومات کی اہمیت یوں زیادہ ہو گئی ہے کہ پریم چند کے بہت سے افسانوں کا محرک کوئی سیاسی یا سماجی حادثہ ہے۔ اور اس عہد کی سیاسی کشمکش اُن کی تحریروں میں اہم محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۸ جولائی ۱۹۲۰ء کے خط سے (مکاتیب نمبر ۲: ۵۸۹) اُن کے چھوٹے بچے کی تاریخ وفات کا علم ہوتا ہے۔ ابتدائی تصانیف کے بارے میں بھی ان خطوں سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

> "ہاں - ہم خرما و ہم ثواب، کشنا، وغیرہ میری ابتدائی تصانیف ہیں۔ پہلی کتاب نولکشور کے ناول پریس نے شائع کی تھی دوسری کتاب بنارس کے میڈیکل ہال پریس نے۔ یہ غالباً ۱۹۰۰ء کی تصانیف ہیں۔" (۲: ۵۹۲)

پریم چند کی بیوی شیورانی پریم چند نے ایک کتاب بہت سیدھی اور سرل زبان میں لکھی ہے جو ہندی میں شائع ہو چکی ہے اس کا نام ہے "پریم چند گھر میں"۔ اس میں اُنھوں نے پریم چند کی عادتیں، اُن کے مشاغل، گھریلو معاملوں میں اُن کا رویہ، اُن کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات، عمدہ پیرائے میں بیان کئے ہیں۔ انھوں نے ہی یہ بھی بتایا ہے کہ گاندھی جی کا گورکھپور میں آنا پریم چند کی زندگی میں ایک انقلاب کا آغاز تھا۔ اسی کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفا دے کر ترک موالات کرنے والوں کی صف میں شمولیت کی۔ وہ ملک کی آزادی کے لئے جی جان سے لڑنا چاہتے تھے اور ہندوستان کو آزاد دیکھنے کی تمنّا رکھتے تھے۔ لیکن بہت سی مجبوریوں کی وجہ سے وہ کبھی کوئی عملی حصّہ تحریک میں نہ لے سکے۔ ۸ فروری ۱۹۲۱ء کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی تاریخ کو گاندھی جی گورکھپور گئے تھے (۲: ۵۹۲)۔ اس تاریخ کا معلوم ہو جانا کوئی بڑی دریافت تو نہیں ہے لیکن میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ بعض اتنی جزدی اور بظاہر معمولی باتیں بھی سوانح نگار کو بہت مدد دیتی ہیں اور ان سے سوانح عمری کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک خط میں پریم چند لکھتے ہیں:

> "میں بھی ترک موالاتی ہوں۔ میرے دل و دماغ میں بھی آج کل وہی مسائل گونجا کرتے ہیں۔ ذہنوں میں بھی وہی خیالات جھلکتے ہیں۔ اور ادبی رسائل میں ان کی گنجائش نہیں۔" (۲: ۵۹۴)

اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا مصالح اور موانع پریم چند کے سامنے تھے اور وہ کس انداز سے سوچتے تھے اور کن افکار و حوادث کا عکس ان کی تحریروں میں کس کس طرح ملتا ہے۔

پریم چند پر ہندی میں متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں سوانحی حیثیت کی بھی اور تنقیدی بھی۔ لیکن اُردو میں لے دے کر ایک رسالہ زمانہ کانپور کا "پریم چند نمبر" ہے۔ دوسری ایک مختصر سی کتاب "پریم سوگ"! یا پھر ہنس راج رہبر کی کتاب "پریم چند"

جس کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ زمانہ کانپور کا نمبر تو واقعی اہم ہے کیونکہ یہ ایک معاصر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ پریم چند کے تعلقات دیا نرائن نگم سے جتنے گہرے اور پرانے تھے وہ سب جانتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد کسی نے اردو میں پریم چند پر لکھنے کا حق ادا نہیں کیا۔ رہبر کی کتاب چونکہ "بلامقابلہ" ہے اس لئے اُسے غنیمت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اب ڈاکٹر قمر رئیس کا تحقیقی مقالہ "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ" شائع ہونے والا ہے یہ شاید اس موضوع پر پہلی کامیاب کوشش ہوگی۔

پریم چند کے بعض خطوط رسالہ زمانہ میں چھپے تھے اور متفرق طور سے بھی شائع ہوئے تھے لیکن اتنے اہم اور اتنی تعداد میں کسی ایک جگہ نہیں ملیں گے۔ جتنے نقوش نے پیش کر دیئے ہیں۔

اور یہ تو صرف ایک پریم چند کی بات ہوئی جسے میں نے بطور مثال پیش کر دیا۔ اسی طرح کتنے ہی شاعر، ادیب، انشا پرداز، افسانہ نویس، اور اہم سیاسی حیثیت کے بزرگ ایسے ہیں جن کے خطوط نہایت مستند ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے ان سے استفادہ ناگزیر ہوگا۔

ان خطوں میں جو ضمنی مباحث علمی، لسانی یا ادبی نکات آ گئے ہیں وہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ مثلاً ایک جگہ لفظ "شروعات" کی بحث (۲ : ۵۷۷) یا عبدالرحمن بجنوری کے خط میں اصطلاحاتِ علمیہ کے ترجمہ کا مسئلہ (۲ : ۵۸۳)۔ ان سے بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔ مجھ سے ایک مشہور عالم اور ادیب نے برسبیل تذکرہ یہ فرمایا تھا کہ حسرت موہانی مرحوم نے "انتخاب سخن" کے عنوان سے جو سلسلہ قدیم شعرائے اردو کے انتخاب کلام کا چھاپا تھا وہ انتخاب دراصل براہِ راست دواوین سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ حسرت کو غالباً پٹنہ سے ایک ایسی قلمی کتاب مل گئی تھی جس میں بہت سے شاعروں کا منتخب کلام کسی باذوق جامع نے ترتیب دیا تھا اور اسی کو انھوں نے باقساط شائع کیا۔ یہ بات کچھ ایسی مستبعد نہیں معلوم ہوتی۔ مگر حسرت موہانی جیسے ثقہ انسان سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ حوالہ دینے سے گریز کریں اور کتمانِ حقیقت کے مرتکب ہوں۔ حسرت کے جو خطوط مکاتیب نمبر میں پیش کئے گئے ہیں اُن سے حسرت کے مزاج کی جفاکشی، وفاکیشی، سادگی، استقلال اور حوصلے کا اتنا صحیح اندازہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے ذریعے سے ممکن نہ تھا۔ ان میں بعض خطوط سے ان دواوین کے نام بھی مل جاتے ہیں جن سے حسرت نے یہ انتخاب کر کے چھاپا ہوگا۔ (مثلاً ۲ : ۲۰۹)۔

مولانا حسرت کی زندگی متضاد عناصر کا آمیزہ تھی اور اُن کے یہ خطوط اُن کی نجی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ان خطوں سے بعض اہم باتوں کی نشان دہی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً یگانہ چنگیزی نے اپنی زندگی میں گنجینہ نئی ترتیب اور اضافے کے ساتھ مرتب کر کے لالہ دوارکا داس شعلہ کے حوالے کر دیا تھا (۲ : ۷۱۵) یا یہ کہ سر آسمان جاہ کی درخواست پر میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس نے مولوی فضل حق خیرآبادی مرحوم کے فرزند مولوی عبدالحق خیرآبادی کو دو سو روپیہ وظیفہ تاحیات عطا کیا تھا۔ (۲ : ۷۹۴)

ایک خط اس میں منیر شکوہ آبادی کا بھی شامل ہے (۲ : ۷۹۸) اس سے پہلے غالباً منیر کا کوئی اردو خط شائع نہیں ہوا۔ اس خط سے بعض اور اُمور کے علاوہ منیر کے طرزِ نگارش کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

مکاتیب نمبر کے آخر میں "مشاہیر ادب" کے عنوان سے ان مکتوب نگاروں کے مختصر سوانح بھی ہیں جن کو محمد عبداللہ قریشی صاحب نے لکھا ہے۔ یہ حصہ بھی بہت اہم ہے اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ لیکن بعض فروگذاشتیں بھی رہ گئی ہیں مثلاً محمد حسین آزاد کے

والد کا نام 'باقر علی' لکھا ہے (۲ : ۹۲۲) مگر صحیح نام محمد باقر ہے (اورینٹل کالج میگزین۔ فروری ۱۹۳۹ء) یا ظفر الملک کے بارے میں کہتے ہیں کہ: "امروہہ میں کچھ سرکاری خدمات انجام دیں جس کی وجہ پہلے سررشتہ دار اور پھر معتمد صدر الصدور ہو گئے" (۲ : ۹۲۵)۔ ان خدمات کا تعلق امروہہ سے نہیں۔

مگر اتنی معمولی فروگذاشتیں قابلِ گرفت نہیں ہوتیں ان سے بچنے کی سہل ترکیب یہ تھی کہ فاضل مرتب ہر جگہ آخر میں اپنا ماخذ ظاہر کر دیتے۔

جہاں اس نمبر میں بہت سے تاریخی لحاظ سے اہم اور معلومات افزا خطوط ہیں وہیں بعض مکتوبات بہت رنگین، دلچسپ اور پُر بہار بھی ہیں۔ مثلاً عبد الحق کا مکتوب (۲ : ۹۷۱) یا پطرس کا خط عبد المجید سالک کے نام (۲ : ۹۷۵)

آخر میں فاضل مرتب نے یہ صراحت کر دی ہے کہ اس نمبر میں "زندہ ادیبوں" کے مکتوبات شامل نہیں ہیں (اگرچہ بعض مکتوبات شامل ہیں!) ہمیں امید ہے کہ وہ اسی طمطراق اور ساز و یراق کے ساتھ زندہ ادیبوں کے مکاتیب پر مشتمل ایک نمبر جاری کر کے یہ کمی بھی پوری کر دیں گے۔

۱۹۵۸ء میں نقوش نے اپنی زندگی کے دس سال پورے کر لئے تو "دس سالہ نمبر" نکالا جو ۴۵۲ صفحوں کا تھا اس میں ۱۷ افسانے ۲ ڈرامے، ۱ رپورتاژ ۴ مزاحیہ مضامین اور دس مقالے شامل تھے۔ ان میں سب سے اچھا تنقیدی مضمون "غالب کی شاعری" پر عطا محمد شعلہ کا ہے۔ انھوں نے غالب کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر بڑی متانت سے گفتگو کی ہے اور لب و لہجہ میں توازن برقرار رکھا ہے۔

دارا شکوہ کے دیوانِ فارسی پر ایک تعارفی مضمون جناب علم الدین سالک کا بھی اسی نمبر میں شامل ہے اور بہت قابلِ قدر ہے۔ "حضرت سید احمد دہلوی کی داستانِ جہاد" پر غلام جیلانی برق، اور گل بکاؤلی پر محمد عبد اللہ قریشی کے مضامین بھی علمی افادے کے اعتبار سے اہم ہیں۔

اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مدیر نقوش نے آغاز ہی میں ایک چارٹ پیش کیا ہے جس سے بیک نظر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دس برس کے اندر نقوش نے کیا کیا چھاپا ہے۔ چنانچہ میزان یہ ہے:

۵۱۷ مضامین، ۴۹۰ افسانے، ۱۲۱۳ خطوط، ۶ ناولٹ، ۳۴۶۰ نظمیں، ۱۳۴۷ غزلیں اور یہ سب چیزیں بارہ ہزار دو سو چھہتر (۱۲۲۷۶) صفحوں میں سمائی ہوئی ہیں۔ جتنا کچھ نقوش نے دس برس میں پیش کر دیا ہے وہ شاید بہت سے رسالوں کے پچاس برس کے فائلوں میں بھی نہ مل سکے۔ دس سالہ نمبر کے بعد طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر، خاص نمبر اور دو عام نمبر بھی نکل چکے ہیں انھیں بھی شامل کر لیں تو یہ تعداد اور بھی بڑھ جائے گی۔

۱۹۵۹ء میں نقوش نے تین نمبر بہت قیمتی اور بنیادی اہمیت رکھنے والے پیش کئے ہیں۔ ان میں ایک "طنز و مزاح نمبر" ہے (شمارہ ۷۱، ۷۲) جس کی ضخامت ۹۲۸ صفحات ہے۔ تفصیلی تبصرے کے لئے بجائے خود اس پر ایک نمبر نکالا جا سکتا ہے۔ سرسری تعارف کے لئے کہا جائے تو اس کی ترتیب پر ایک نظر ڈالئے۔ پہلے حصے میں آٹھ مقالے ہیں لکھنے والوں میں نام ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر کلیم الدین احمد، ڈاکٹر شوکت سبزواری، قاضی ظہور الحسن، ظفر احمد صدیقی

اور علم الدین سالک کے ملیں گے اور موضوعات کی ترتیب یہ ہے :

(۱) ہنسنے کی ابتدا اور اس کی اہمیت (۲) طنز و مزاح (۳) مزاح اور مزاح نگاری (۴) اُردو ادب میں طنز و ظرافت۔
(۵) اُردو شاعری میں طنز (۶) ہجو گوئی کی تاریخ (۷) پیروڈی اُردو ادب میں (۸) فارسی ادب میں طنز و مزاح۔

یہ تو گویا طنز و مزاح کا تاریخی، تنقیدی اور تحقیقی جائزہ ہوا، اب دوسرے باب میں "دنیا کی بڑی زبانوں کا طنزیہ و مزاحیہ ادب" پیش کیا گیا ہے اور ان زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی، فارسی، روسی، چینی، عربی، اطالوی، ہسپانوی، ترکی، بنگالی اور ہندی، شامل ہیں۔ سب ملاکر گیارہ نمونے ہیں جو ان زبانوں کے ادب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں سے سب مضامین تو "نمائندہ" نہیں ہیں ان سے بہتر انتخاب ہو سکتا تھا لیکن بہرحال ان سے ایک اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اردو میں ترجمہ ہو کر بھی بعض چیزیں کچھ کا کچھ ہو جاتی ہیں۔ ایسی مثالیں تو بہت ہی کم ہوں گی کہ اصل کی روح ترجمے میں بھی اسی طرح آجائے۔

تیسرے باب کا عنوان ہے "طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ابتدائی نمونے" ان میں مختلف اخباروں اور جریدوں کی نمائندگی کی گئی ہے خصوصاً "پنچوں کا دور" جس میں رفیقِ ہند، پنجاب پنچ، دہلی پنچ، لاہور پنچ، بنارس پنچ، آگرہ پنچ، دکن پنچ وغیرہ شامل ہیں۔

پھر اودھ پنچ کا دور آتا ہے اور اس میں وہ تمام مزاح نگار آگئے ہیں جنھوں نے اودھ پنچ سے لکھنا شروع کیا۔ اکبر الٰہ آبادی، منشی سجاد حسین، تربھون ناتھ ہجر، مچھو بیگ ستم ظریف، جوالا پرشاد برق، رتن ناتھ سرشار، نواب سید محمد آزاد، عبدالغفور شہباز اور حکیم ممتاز حسین عثمانی وغیرہ۔

اودھ پنچ کے بعد "فتنہ اور عطرِ فتنہ کا دور" ہے۔ اس میں پہلے فتنہ اور عطرِ فتنہ سے متعلق عقیل احمد جعفری کا ایک اچھا مضمون ہے۔ پھر ان کے انتخابات دیئے گئے ہیں۔ جن میں ریاض خیرآبادی کا باغ و بہار اسلوب اپنے شباب پر ہے۔ اس کے بعد "شیرازہ کا دور" ہے جس میں سندباد جہازی کا "جدید جغرافیہ پنجاب"۔ عبدالمجید سالک کا "منکہ ایک معتبر نائی" بھی شامل ہیں۔

اس کے بعد موضوع کے تاریخی ارتقا کے مطابق طنزیہ و مزاحیہ ادب کے شہ پاروں کا انتخاب ہے جو بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کیا گیا ہے۔ غالب، سرسید، نذیر احمد، محمد علی جوہر، مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی، ابوالکلام، مولوی عبدالحق، عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالغفار، خواجہ حسن نظامی، فلک پیما اور دورِ حاضر میں تمکین کاظمی تک بہت سے نام اور ان کی نمائندہ تحریریں آگئی ہیں۔

اسی کے دوسرے حصے میں جو طنزیہ و مزاحیہ ادب کے زریں دور سے منسوب کیا گیا ہے پطرس، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، ملّا رموزی، کنہیا لال کپور، شفیق الرحمٰن، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، فرقت کاکوروی، اور احمد جمال پاشا تک سب شامل ہیں۔

یہ تو حصہ نثر تھا ——— اب اُردو کے "طنزیہ و مزاحیہ شاعر" آتے ہیں اس میں پہلے تو شاعری میں طنز و مزاح کی

تاریخ و تنقید پر ایک پُرمغز مقالہ محمد عبداللہ قریشی کے قلم سے ہے جس میں سب سے آگے جعفر زٹلی ہیں ان کے بعد سودا، میر، انشا، مصحفی، رنگین، ضاحک، کمترین، بہادر الشعرا، نظیر اکبرآبادی، نازنین، بیگم، وغیرہ ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ اس میں میر بھی نہیں ہیں شاعروں میں اور بھی دو چار اچھے نام چھوٹ گئے ہیں۔ پھر دورِ جدید میں اکبر، شبلی، حالی سے لے کر احمق پھپھوندوی، شاد عارفی، مجید لاہوری، سید محمد جعفری، راجہ مہدی علی خاں وغیرہ بہت سے مزاحیہ شاعروں کا کلام آ گیا ہے۔ پھر ایک عنوان ہے "مزاحیہ کردار" — اردو میں بعض کیریکٹر اپنی خصوصیات کی وجہ سے زندہ جاوید ہو گئے ہیں مثلاً خوجی، حاجی بغلول، چچا چھکن وغیرہ۔ ان کرداروں کی نمائندگی بھی موجود ہے۔

اخباروں میں بھی مزاحیہ کالم کا رواج ہے۔ "مزاحیہ کالم" کے تحت ہمدرد، زمیندار، انقلاب، صدق، امروز، نوائے وقت، پٹھان، نمکدان، کے مزاحیہ کالموں سے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

آخر میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے جمع کئے ہوئے لطائف ہیں جن کا تعلق اردو کے ادیبوں اور شاعروں سے ہے۔ یہ گویا میں نے سرسری طور پر صرف طنز و مزاح نمبر کی فہرست کا تعارف کرایا ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اس میں کیا کچھ موجود ہے۔ ایک ہزار صفحات کے اس نمبر پر "تنقیدی" نظر ڈالنا اتنا آسان نہیں۔ اردو میں طنز و مزاح پر ابھی بہت کم لکھا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی کتاب "طنزیات و مضحکات" اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش تھی جسے انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی کی فرمائش پر لکھا تھا اور وہیں سے کتاب چھپی تھی۔ اس کا مقصد تحقیق یا تنقید سے زیادہ یہ تھا کہ اردو میں طنزیات و مضحکات پر جو کچھ سرمایہ ہے اس کا ایک بھرپور تعارف ہو جائے۔ اس وقت تو یہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ لیکن اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ رشید صاحب اس پر نظرثانی کریں۔ اور اضافوں کے ساتھ اس کا نیا ایڈیشن چھاپا جائے۔

رشید احمد صدیقی کے بعد کلیم الدین احمد نے طنز و ظرافت پر ایک طویل مقالہ لکھا اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بعض اہم مسائل کی طرف توجہ کی نئے انداز سے اردو کے تمام سرمائے پر ایک نظر ڈالی اور اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دیا۔ غلام احمد فرقت نے بھی پی ایچ ڈی کے لئے اپنا مقالہ اسی موضوع پر لکھ لیا ہے جو لکھنؤ یونیورسٹی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ "طنز و مزاح" کے نام سے اُن کی مرتب کی ہوئی ایک کتاب ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ نے چھاپی ہے جس میں اُردو ادب کے طنز و مزاح کا انتخاب کئی سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے۔ اس میں فرقت صاحب نے طنز و مزاح کی تعریف اور تاریخ بیان کی ہے اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ لیا ہے۔

ابھی پاکستان سے ایک کتاب "اردو ادب میں طنز و مزاح" ڈاکٹر وزیر آغا کی شائع ہوئی ہے۔ یہ ان کا پی ایچ ڈی کا تھیسس ہے۔ اس میں وزیر آغا نے اردو نظم و نثر میں طنز و مزاح کی رفتار متعین کر کے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب ہماری توقعات کے مطابق نہیں ہے اس میں بعض خامیاں ایسی رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے یہ کتاب تنقید کے معیار سے گر جاتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ نظم و نثر کے جائزے میں تناسب نہیں رکھا جن اشعار یا نثر کے ٹکڑوں کا انتخاب کیا ہے وہ غیر مربوط ہیں اور جس عنوان کے تحت یا جس مثال کی تصدیق کے لئے پیش کئے گئے ہیں ان کی نمائندگی نہیں کرتے۔ نتائج کے استنباط میں بھی وزیر آغا نے غور و فکر سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وہ کہیں زیادہ جذباتی ہو گئے ہیں مثلاً اکبر کے معاملے میں اُن کی رائے معروضی

OBJECTIVE نہیں ہے۔ انگریزی زبان سے مثالیں، اقتباس اور حوالے ضرورت سے زیادہ جمع کر دیئے ہیں جن سے اُردو طنز و مزاح کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی صرف مصنف کی وسعتِ مطالعہ، کا علم ہوتا ہے۔

بعض باتیں دلیل کی محتاج رہ گئی ہیں۔ لکھتے ہیں "لکھنؤ میں میر حسن نے عظیم، قصاب اور مکان پر بڑی مہذب اور پُر لطف ہجویں تحریر کیں" (۸۲) قطع نظر اس بات سے کہ ان نظموں کے لکھنؤ میں لکھے جانے کی کوئی خاص شہادت موجود نہیں، میر حسن کی یہ ہجویات خصوصاً "قصاب" والا "لطیفہ" اتنا غیر مہذب اور ناشائستہ ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ وزیر آغا نے "قائم چاند پوری" کی ہجویات پر بھی توجہ صرف نہیں کی، قائم کی ہجویات سودا سے پہلو مارتی ہیں۔

اُردو کی ابتدائی شاعری میں ہجویات کا اتنا ذخیرہ بآسانی مل سکتا ہے کہ اس پر ایک علیحدہ مقالہ یا کتاب لکھی جا سکے۔ وزیر آغا نے ان ہجویات کو ثانوی درجے میں لائق اعتنا سمجھا ہے۔ انتخاب اشعار کا معاملہ ذاتی ذوق اور پسند کا ہوتا ہے لیکن جہاں تمثیل کی ضرورت ہو وہاں یہ شرط اتنی کڑی نہیں رہتی۔ دعوے کی دلیل ذاتی پسند یا ذوق سے نہیں حقائق سے اور نظائر سے دی جاتی ہے۔ میرا دعوےٰ ہے کہ جو اشعار وزیر آغا نے مثالوں میں نقل کئے ہیں ان میں بیشتر ایسے ہیں جن سے دعوے کا اثبات نہیں ہوتا اور جو برمحل ہیں ان سے بہتر اشعار کا انتخاب کیا جا سکتا تھا۔

بہرحال اس کتاب پر مفصل تبصرہ تو میں پھر لکھوں گا سردست یہ کہنا چاہتا تھا کہ اردو میں اب تک طنز و مزاح پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت ناکافی ہے۔ نقوش کے طنز و مزاح نمبر نے اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے اتنا کچھ مواد ایک جگہ فراہم کر دیا ہے کہ اس کے سہارے سے طنز و مزاح کی ایک بھرپور تاریخ لکھی جا سکتی ہے اور نہ بھی لکھی جائے تو یہ نمبر خود اپنی جگہ ایک تاریخ ہے جو طنز و مزاح کے تدریجی ارتقا کو آئینہ کر دیتی ہے۔

مدیر نقوش نے ایک بات اچھی نہیں کی وہ یہ کہ انھوں نے "فحش" اور "غیر فحش" میں امتیاز کرتے ہوئے ہجویہ شاعری کے بہت سے حصے حذف کر دیئے۔ اس معاملے پر کئی پہلوؤں سے سوچنا چاہیئے ایک تو یہ کہ طنز و مزاح نمبر کا مقصد عافیت بخشوانا نہیں ہے دوسرے یہ کہ ہجو میں رکیک اور پھکڑ مضامین کا استعمال رواج زمانہ کے مطابق تھا ان سے آج برأت کا نفرت کا اظہار کرنا ایسا ہی ہے جیسے میر یا سودا سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ مارکسی کیوں نہ ہوئے؟ یا سرسیّد کی بجائے غالب نے یونیورسٹی قائم کیوں نہ کی۔ تیسرے یہ کہ ان رکیک، مبتذل، اور سوقیانہ مضامین سے اس عہد کی معاشرت اور نفسیات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اشعار جن کا مقصد صرف گالی گلوچ یا گندہ ذہنی تھا جیسے میر حسن کا "لطیفۂ قصاب"، یا قائم کی مثنوی جو کسی لاولد بقال کی ہجو میں ہے، انھیں نظر انداز کر دینا مناسب بلکہ واجب ہے لیکن اساتذۂ متقدمین کی ہجویات کے ساتھ یہ رویہ اچھا نہ ہوگا۔ طنز و مزاح کی تاریخ مرتب کرتے وقت جب ہم ریختی کی نمائندگی بھی کر رہے ہیں تو جعفر زٹلی کے ساتھ چرکین، بوم، زاغ وغیرہ خالص پھکڑ کے شاعروں کی نمائندگی بھی ہونی چاہیئے۔ طنز و مزاح کی بہت سی شاخیں ہیں، ذہانت، نکتہ آفرینی، مزاح، ٹھٹھول، ضلع جگت، پھکڑ، پھبتی، ہجو، وغیرہ ان سب کے بہترین نمونے جمع کرنے کے لئے ہمیں کہیں اخلاق سے معذرت بھی کرنی پڑے گی اور موضوع سے انصاف کرنا ہے تو یہ معذرت بھی کرنی چاہیئے۔

نقوش نے اب تک جو شاندار نمبر پیش کئے وہ زیادہ تر موضوعاتی تھے یعنی ادب کے چند اہم موضوعات مثلاً طنز و مزاح، افسانہ، شخصیات، وغیرہ۔ کسی ایک ادبی شخصیت پر پہلی کوشش "منٹو نمبر" تھی جس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ دوسرا یہ پطرس نمبر (شمارہ ۷۵، ۷۶) ستمبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔

پطرس کی شخصیت صحیح معنوں میں باغ و بہار ہے۔ اس کی تحریروں میں سب سے زیادہ شگفتگی اور تخلیقی آن ملے گی اردو میں شاید ہی کوئی مثال ایسی ملے کہ ایک شخص چند مضامین کا چھوٹا سا مجموعہ لے کر آیا ہو اور مورخ کے لئے اس عہد تک ناگزیر بن گیا ہو کہ اب اسے نظر انداز کر کے اردو میں طنز و مزاح کی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔

پطرس کی شخصیت اور فن کے بہت سے پہلو تھے۔ ان کی انسانیت، شرافت، اخلاق، وضعداری، مشرقی تہذیب سے ذہنی رابطہ، مغربی علوم و افکار کا طبیعت میں رچاؤ، اسلوب کی سادگی اور دلنشینی، مزاح کی واقعیت اور بے ساختگی ——— شخصیت کو دیکھئے تو وہ ایسی پرکشش ہے اور فن پر نظر ڈالئے تو موجودہ ادب کی ساری تاریخ میں کسی مزاح نگار کے یہاں وہ لطافت، شیرینی، سرگوشی کا سا انداز، بے ساختگی، برجستگی (ORGiNALLLY) بھی نہیں ملے گی جو پطرس کے مضامین کا حاوی عنصر ہے۔ محمد طفیل نے ۰۵۶ صفحوں کا ایسا ضخیم اور شاندار نمبر مرتب کر کے پطرس کو زندہ کر دیا ہے۔ ممکن تھا کہ ہمارا بے غیرت اور بے حس ملک پطرس جیسی شخصیت کو بھی فراموش کر دیتا لیکن اب یہ دھڑکا نہیں رہا۔

اس نمبر میں ۳۳ مضامین تو پطرس کی شخصیت پر ہیں جن کے لکھنے والوں میں ذوالفقار بخاری، سر ظفر اللہ خاں، عبدالمجید سالک، رشید احمد صدیقی، فیض، عصمت، مہر، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور اور محمد طفیل جیسے حضرات ہیں چار مضامین تنقیدی ہیں۔ جو ڈاکٹر احسن فاروقی، تمکین کاظمی، وزیر آغا اور راز لکھنوی نے لکھے ہیں۔ ان کے بعد پطرس کی تخلیقات میں وہ تمام مضامین، افسانے، ڈرامے، خطوط وغیرہ جمع کر دئے گئے ہیں جو پطرس نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ ان میں منظومات بھی ہیں افسانے بھی ڈرامے اور ناولٹ بھی۔ مزاحیہ مضامین، فنی مضامین، تنقیدی مضامین، نیاز مندان لاہور کا سلسلہ، ادب لطیف، دیباچے، سفرنامے، بچوں اور عورتوں کے لئے، خطوط، پطرس کے مضامین (مکمل کتاب)، اور تقاریر یہ سب چیزیں سمو دی گئی ہیں۔

جب پطرس کی شخصیت پر بیس مضامین ایسے لوگوں کے ہوں جنھوں نے خود پطرس کو دیکھا ہو اور سمجھا ہو، چار مضامین فن کے مختلف پہلوؤں سے سیر حاصل بحث کرتے ہوں۔ پطرس کی کوئی تحریر ایسی نہ ہو جسے تلاش کر کے اس نمبر میں نہ سمو دیا گیا ہو تو اب کیا کہنے کو باقی رہ جاتا ہے کسی کی شخصیت اور فن کے بارے میں اس سے بہتر نمبر آج تک نہیں نکلا جبھی تو نیاز فتح پوری نے یہاں تک لکھ دیا کہ "اگر طفیل صاحب میرے لئے بھی ایسا ہی خصوصی نمبر نکالنے پر آمادہ ہو جائیں تو میں اسی وقت مرنے کے لئے آمادہ ہوں۔"

۱۹۵۹ء کا تیسرا خاص نمبر (شمارہ ۷۷، ۷۸) دسمبر میں نکلا ہے۔ اب نقوش کے عام نمبر تو "خاص" طور پر نکلتے ہیں۔ اس نمبر میں بھی پندرہ افسانے، ایک اسکیچ، ساٹھ نظمیں غزلیں، سات مضامین شامل ہیں لیکن یہ خاص نمبر ایک "خصوصیت" کی وجہ سے ہو گیا ہے یعنی اس میں ایک سمپوزیم بھی ہے جس کا عنوان ہے "کیا موجودہ ادب روبہ تنزل ہے" اس

ہیں ۲۵ ذی ہوش ادیبوں اور ناقدوں نے اظہارِ رائے کیا ہے۔ افسانہ، شاعری، تنقید اور طنز و مزاح پر ان موضوعات کے مستند لکھنے والوں کے خیالات ایک جگہ جمع کر دینا معمولی کام نہیں۔ اور آج تک کسی رسالے نے اس نوعیت کا کوئی سمپوزیم پیش بھی نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ حصّہ لینے والوں میں منفی اور مثبت، مخالف اور موافق دونوں نظریوں کے لوگ شامل ہیں یعنی کوئی کہتا ہے ادب روبہ زوال ہے، کوئی کہتا ہے نہیں۔ ایسی صورت میں ایک عام قاری کو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے۔ کیا یہ صرف نقطۂ نظر کا ہیر پھیر ہے یعنی ؎

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو   تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

یا ادب کی سمت و رفتار کا تعیّن اور اس کی ترقی یا زوال کا تیقن کسی خاص معیار سے کیا جا سکتا ہے؟ ایسی صورت میں یہ ضروری تھا کہ اس بحث میں ایک حکَم بھی مقرر کیا جاتا جو ان سب حضرات کے دلائل و شواہد کو سامنے رکھ کر استنتاج کر سکتا۔

جہاں تک افسانے کا تعلق ہے اس کے فن میں نئے تجربے نہیں ہوئے ہیں اور موضوعات میں تنوّع نہیں انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ شاعری بھی پھر پرانی روش کی طرف رجعتِ قہقری کر رہی ہے۔ تنقید میں فکر انگیز باتوں کا فقدان ہے اور اس کے اصول و ضوابط آج تک نہیں مدوّن ہو سکے ہیں۔ تنقیدی نظریات اور عقائد ہم آج تک غیر ممالک سے درآمد کرتے ہیں اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ فقدانِ وسائل، تیزی سے بدلتے ہوئے حالات، نئی اور پُرانی قدروں کی کشمکش، نظریات کی فراوانی، کثرتِ تعبیر سے خوابوں کی پریشانی، نئے علوم سے ہماری بیزاری، اور زبان و ادب پر سیاست کا ردِّ عمل، یہ سب مجموعی طور پر ہمارے ادب کی ترقی میں مانع ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار علیحدہ کیا ہے۔

یہ سمپوزیم کوئی ناطق فیصلہ نہیں۔ ادب کے موجودہ موقف کی ایک رپورٹ ہے جس پر ہمارے نئے لکھنے والوں کو، ذہین اور ذی شعور ادیبوں کو سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنا چاہیئے۔

> محمد طفیل نے اپنے زمانۂ ادارت میں نقوش کو زندہ جاوید کر دیا ہے اور اُن کی محنت نے اُنھیں بھی اَمر بنا دیا ہے جس طرح نگار کے ساتھ نیاز فتح پوری کا نام، انجمن ترقی اُردو کے ساتھ مولوی عبدالحق کا نام یا صلائے عام کے ساتھ میر ناصر علی کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گیا ہے اسی طرح اب نقوش اور محمد طفیل بھی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یہ اُن سے زندہ ہے وہ اس سے
>
> ـــــ عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خاص نمبروں کے میدان میں نقوش کا کوئی حریف ہندوستان یا پاکستان میں موجود نہیں۔

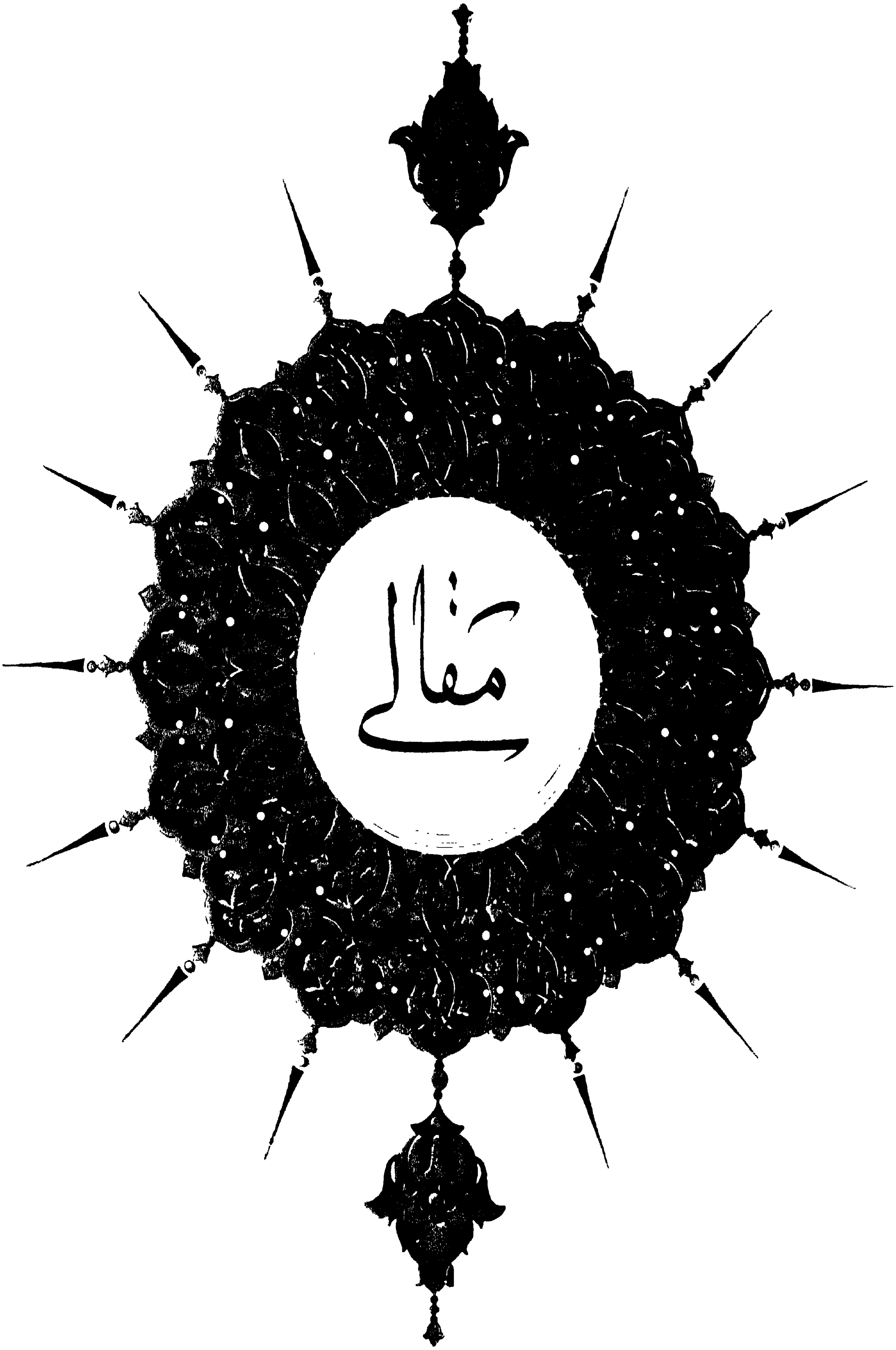

مقالے

تذکرہ رحمانیہ

مولانا الطاف حسین حالی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون

یہ مضمون جس کو شیخ محمد اسماعیل صاحب چھپوا کر شائع کر رہے ہیں والد مرحوم (مولوی الطاف حسین صاحب حالی) نے اپنے اُستاد اور اپنے وطن کے قابل فخر بزرگ حضرت مولانا قاری عبدالرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے چند روز کے بعد ۱۸۹۶ء میں لکھا تھا۔ شیخ محمد اسماعیل صاحب نے اس مضمون کی ایک نقل کوشش اور کچھ روپیہ خرچ کر کے مولانا مرحوم کے ایک دوست سے حاصل کی ہے اور اُس کو شائع کرنے سے آن کا مقصد یہ ہے کہ مضمون کے ساتھ اسلامی دنیا کے ایک مشہور بزرگ کے حالات بھی محفوظ ہو جائیں۔ جو پڑھنے والوں کے لئے سبق آموز اور آن کے دلوں میں اسلامی تعلیم کی وقعت پیدا کرنے والے ہیں۔

یہ بات کہ حضرت مولانا قاری عبدالرحمن صاحبؒ کس پایہ کے عالم اور بزرگ تھے اور یہ کہ مضمون نگار کے دل میں اپنے بزرگ اُستاد کی کس قدر عزت اور محبت تھی ذیل کے مضمون سے بخوبی معلوم ہو گی۔

میں شیخ محمد اسماعیل صاحب کا خاص کر اس وجہ سے شکرگذار ہوں کہ مطبوعہ نثرہائے حالی میں یہ مضمون پہلے نہیں چھپا اور اگر آن کو اس کا خیال نہ آتا تو ممکن تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد تلف ہو جاتا اور مسلمانوں کی آئندہ نسلیں ایک ایسے بزرگ کے حالات سے بے خبر رہتیں جو اس اخیر زمانہ میں سلف صالحین کا سچا نمونہ تھے۔ خدا تعالےٰ شیخ صاحب موصوف کو جزائے خیر دے اور سب مسلمانوں کو حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سے عبرت اور سبق حاصل کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

خاکسار
از پانی پت — سجاد حسین عفی اللہ عنہ
محلہ افغاناں — خلف خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم و مغفور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَا مِنْ رَزِيَّاتٍ اَكْبَرُ عَلَى الْاِسْلَامِ مِنْ مَوْتِ اَهْلِ اللّٰهِ وَعُلَمَاءِ الدِّيْنِ

(یعنی) اسلام پر کوئی مصیبت اہل اللہ اور علماء دین کی موت سے زیادہ بڑی نہیں۔

افسوس ہزار افسوس!! اور صد ہزار افسوس!!! کہ قدوۃ العلماء و بقیۃ السلف الصالحین جناب حاجی قاری مولوی عبدالرحمن صاحب

انصاری رئیس پانی پت نے تاریخ ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ ہجری یوم دوشنبہ شام کے تین بجے بعارضہ تپ و پیچش آٹھ سات دن بیمار رہ کر کچھ کم نوے برس کی عمر میں دنیا سے رحلت فرمائی اور رات کے دس بجے امیر مودود لاری قدس سرہٗ کے مزار کے قریب بڑ والے کھیت میں دفن کیے گئے۔ باوجودیکہ رات کا وقت تھا اور تجہیز و تکفین میں نہایت عجلت کی گئی تھی جس کی وجہ سے دیہات میں خبر نہ پہنچ سکی پھر بھی قریب پانچہزار آدمی کے جنازہ کی نماز میں موجود تھا اور سینکڑوں مرد اور عورتیں ڈھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ چاروں طرفوں کے رئیس۔ اہل حرفہ۔ کاشتکار اور سوداگر جنازہ کی مشایعت میں شریک تھے۔

مولانا مغفور قاری محمدی صاحب کے خلف الصدق اور قاری قادر بخش صاحب اور قاری احمدی صاحب کے (جو قلعہ دہلی میں اکثر سلاطین اور خاصکر بادشاہ کی اولاد کے اُستاد تھے) حقیقی بھتیجے تھے۔ اُن کے والد اور دونوں چچاؤں نے جناب قاری مصلح الدین صاحب پانی پتی سے جن کے صاحبزادے قاری لالہ صاحب تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ تجوید اور قرأت سیکھی تھی اور انھیں کے خاندان کی بدولت پانی پت۔ دہلی اور مضافات دہلی میں فنِ تجوید شائع ہوا۔ حفاظ و قرا کی تعداد ہزاروں سے گذر کر لاکھوں تک پہنچ گئی۔ خصوصاً مولانا مرحوم نے جس قدر قرآن مجید کی خدمت دس برس کی عمر سے اخیر عمر تک کی وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو گی۔

مولانا نے قرآن اور کسی قدر صرف و نحو اور قرأت دِلی میں اپنے والد ماجد سے (جبکہ وہ بخشی محمود خاں کے ہاں سے متعلق تھے) پڑھی تھی اور وہ اپنے والد کے ساتھ شاہ عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں جایا کرتے تھے جب والد کا انتقال دِلی میں ہو گیا۔ تو مولوی سید محمد صاحب۔ حاجی قاسم صاحب۔ مولوی رشید الدین خان صاحب سے کسی قدر کتب درسیہ اور زیادہ تر مولانا مملوک علی صاحب سے پڑھیں اور صحاح ستہ کی سند جناب مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب سے مِنْ اَوَّلِہٖ اِلٰی آخِرِہٖ حاصل کی اور اُن کے ہاتھ پر بیعتِ طریقت کی۔ اور امروہہ میں جا کر مولوی قاری امام الدین صاحب سے علمِ قرأت اور علمِ تصوف کا اکتساب کیا۔

طالب علمی کے زمانہ میں جو انہماک اور استغراق اُن کو تحصیلِ علم میں رہتا تھا۔ اُس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اُن کے عزیز اور ہم عمر دوست جو اُس زمانہ میں دِلّی اُن سے ملنے جاتے تھے۔ وہ اُن سے سلام علیکم یا سرسری مزاج پرسی کے بعد صاف کہہ دیتے تھے کہ "اس سے زیادہ فرصت ملنے یا بات چیت کرنے کی نہیں ہے۔ جب خدا بامراد ملائے گا اُس وقت ملیں گے۔" طالب علمی کے زمانہ میں جو سختیاں اور محن و مشاق اُنھوں نے اُٹھائی ہیں اُن پر اس زمانہ میں یقین آنا مشکل ہے۔

۱۲۵۸ھ میں جب حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ ہجرت کے ارادہ سے حرمین شریفین کو جانے لگے اُس وقت مولانا مرحوم بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ چونکہ مرحوم ذوالفقار بہادر نواب باندہ نے شاہ صاحب سے درخواست کی تھی کہ حرمین کو اس طرف سے تشریف لے جائیں۔ اس لئے شاہ صاحب اوّل باندہ تشریف لے گئے اور مولانا مرحوم کو نواب ذوالفقار بہادر کے پاس باندہ میں چھوڑ گئے تھے۔ تقریباً سولہ برس مولانا صاحب باندہ میں رہے اور اس عرصہ میں تمام علوم عقلیہ و نقلیہ کی درس و تدریس کرتے رہے۔ شاہ صاحب کے تشریف لے جانے کے دو سال بعد حج کو جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں جا کر بعد حج کے کچھ کم ایک سال رہے پھر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہے اور صحاح کی سند دوبارہ حرم محترم خاص حطیم میں بیٹھ کر حاصل کی۔

جب شاہ صاحب حرمین کو روانہ ہوئے تو قرآن مجید کا درس جو وہ ہر جمعہ کو فرمایا کرتے تھے اس میں تقریباً نصف قرآن شریف کا درس باقی رہ گیا تھا۔ مولانا مرحوم نے باجازت شاہ صاحب باندہ میں باقی سیپاروں کا درس ختم کیا۔ اور اس کے بعد

ابتدا سے قرآن کا درس دینا شروع کیا اور تقریباً پچاس برس برابر ہر جمعہ کو اُن کا درس ہوتا رہا۔ خاص خاص حالتوں کے سوا کبھی کوئی جمعہ ناغہ نہیں ہُوا۔ یہ قرآن بھی عنقریب ختم ہونے والا تھا صرف کسی قدر تیسواں پارہ باقی رہ گیا تھا کہ مولانا کے کوچ کا وقت آن پہنچا۔

چند سال سے مولانا مرحوم کی دونوں آنکھوں میں پانی اُتر آیا تھا۔ اُنھوں نے زیادہ تر اسی خیال سے کہ قرآن مجید کا درس ختم ہو جائے مظفر نگر جا کر ایک آنکھ بنوائی مگر اس سے اچھی طرح کارروائی نہ ہوئی۔ اس لئے ارادہ تھا کہ دوسری آنکھ بھی بنوائیں مگر چونکہ اجلِ مسمّٰی کا وقت ٹلنے والا نہ تھا۔ یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

مولانا ممدوح کے فضائل و کمالات اور اعلیٰ اخلاق اور پختہ خصائل بیان کرنے کے لئے ایک جُدا کتاب درکار ہے۔

مختصر یہ کہ جو خصوصیات علمی و عملی مولانا مرحوم میں پائی جاتی تھیں اُن کے لحاظ سے اُن کا نظیر اب دُور دُور نظر نہیں آتا۔ اُن کی تمام عمر کتبِ درسیہ کی تدریس میں گذری تھی۔ ایک ایک کتاب کو بیس بیس تیس تیس دفعہ اوّل سے آخر تک پڑھایا تھا۔ اس سبب سے تمام کتابیں ایسی منجھ گئی تھیں کہ مشکل سے مشکل کتاب بلا تردّد اور بغیر مطالعہ کے نہایت عمدگی سے پڑھاتے تھے صحاح ستّہ کو جس محدثانہ احتیاط اور ادب و تعظیم کے ساتھ وہ پڑھاتے تھے اُس کی نظیر کہیں نہیں دیکھی گئی۔

علم قرأت جس میں قرأ سبعہ اور اُن کے راویوں کے اختلافات اور نیز قرأتِ غیر متواترہ و شاذہ کا بیان ہے اُس میں مولانا مرحوم تمام ہندوستان میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اور چونکہ اس فن کو اُن سے بہت ہی کم لوگوں نے حاصل کیا تھا اس لئے اخیر عمر میں اُن کی دلی خواہش یہ تھی کہ لوگ اُن سے اس فن کو حاصل کریں۔ اور لوگوں کی اس طرف سے بے توجہی دیکھ کر خوف کیا کرتے تھے کہ مبادا یہ علم اِس ملک سے ناپید ہو جائے۔

اُن کی تمام عمر کتبِ درسیہ اور صحاحِ ستّہ کے درس و تدریس میں گذری تھی مگر اب اُن کو کوئی کام اور کوئی مشغلہ قرآن مجید کی تلاوت اور قرآنی علم قرأت اور علم تجوید کی تعلیم سے زیادہ عزیز اور مرغوب نہ تھا۔ باوجودیکہ کئی برس سے قویٰ میں نہایت اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ سماعت بہت کم ہو گئی تھی اور بینائی بالکل نہ رہی تھی مگر ہمیشہ بیس پچیس سبق قرآن مجید کے مردوں اور قوم کی عورتوں کو پڑھاتے تھے۔ سخت سے سخت مرض اور تکلیف میں بھی رمضان شریف کے روزے اور ایک قرآن تراویح میں سُنانا کبھی ترک نہیں ہُوا۔ حتیٰ کہ گذشتہ رمضان شریف میں باوجود کمال ضعف و ناتوانی کے سارا قرآن شریف تراویح میں سُنایا اور تمام رمضان شریف کے روزے رکھے۔

نماز سے جس کی نسبت رسولِ خدا صلعم نے قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ فرمایا ہے، اُنھوں نے عجیب طرح کا تعلق پیدا کیا تھا کہ نماز کا وقت ہوتے ہی وہ بے چین ہو جاتے تھے اور جب تک نماز اوّل وقت ادا نہ کر لیتے تھے دُنیا و مافیہا سے کچھ سروکار نہ رکھتے تھے۔

قرآن مجید جس کی تلاوت اور خدمت اور تعلیم میں تقریباً اسّی برس گذرے تھے گویا اُن کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ اس میں سرمو مبالغہ نہیں کہ اگر بالفرض وہ تمام قرآن سوتے سوتے ختم کر دیتے تو اُن کو ایک جگہ بھی متشابہ نہ لگتا اور ایک حرف بھی قواعد تجوید و ترتیل کے خلاف اُن کے مُنہ سے نہ نکلتا۔

وہ قرآن کے الفاظ و حروف کو بہ قصد و رویّت مخارج سے نہیں نکالتے تھے بلکہ تمام حروف کو اپنے مخارج سے ادا کرنا اُن کا سلیقہ اور طبیعت بن گیا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ مکّہ معظمہ کی اقامت کے زمانہ میں جب اور ضروری کاموں سے فرصت ہوتی تھی تو میں جہاں کہیں عربوں کے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو کھیلتے دیکھتا وہاں جا کھڑا ہوتا اور اُن کے لب و لہجہ پر غور کرتا اور جہاں تک ہو سکتا تھا اُسی طرح حروف و الفاظ کے ادا کرنے میں کوشش کرتا۔

رسولِ خدا صلعم کی نماز کی نسبت جو حدیث میں "اَخَفّ و اَتَمّ" کا لفظ وارد ہُوا ہے۔ اُس کے معنی مولانا مرحوم کی نماز اور تلاوتِ قرآن کا ڈھنگ دیکھ کر بالکل ذہن نشین ہو جاتے تھے۔ وہ قرآن مجید بہت جلد پڑھتے تھے مگر کیا امکان ہے کہ تجوید و ترتیل کے خلاف ایک حرف زبان سے نکلے۔

انھوں نے تمام قراٗتوں میں سے امام نافع کی وہ روایت جو اُن کے شاگرد امام قالون کے توسط سے پہنچی ہے، اختیار کر لی تھی۔ آخر دم تک اسی روایت کے موافق قرآن مجید پڑھایا۔ چونکہ اس روایت میں مدّ و شدّ بہت کم ہے اور مولانا مرحوم کی مشق و مہارت منتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی اس لئے باوجود نہایت جلد پڑھنے کے تجوید و ترتیل میں سرِ مو فرق نہ آتا تھا۔

اُن کے وعظ کہنے کا طریقہ تمام واعظین کے طریقہ کے بالکل برخلاف تھا۔ اُن کا وعظ درحقیقت درس ہوتا تھا جس میں لغو داستانیں اور فضول قصّے کہانیاں بالکل نہ ہوتی تھیں اور کوئی بات خارج از آہنگ معرضِ بیان میں نہ آتی تھی۔ اوّل قرآن کی آیت کے صاف اور سیدھے معنے بیان کرتے تھے۔ پھر اُس کی ترکیب کا حال اور نہایت ضروری تفسیر اور مسائل فقہیہ جو ائمہ مجتہدین نے اُس سے استنباط کئے ہیں، یا کوئی ضروری اور مفید بحث جو فی الواقع قرآن کے معانی و الفاظ سے تعلق رکھتی ہو بیان کرتے تھے۔ اس لئے اُن کے وعظ سے سامعین کو بے انتہا فائدہ ہوتا تھا اور نہایت مفید کام کی باتیں اور مسائل لوگوں کو معلوم ہوتے تھے۔

مذکورہ بالا اوصاف کے علاوہ مولانا مرحوم میں وہ اعلیٰ درجہ کی صفات بھی تھیں جو بڑے بڑے مقدس علماؔ و مشائخ میں بھی نہیں دیکھی جاتیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کی نسبت ارشاد ہُوا ہے کہ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔ جو کچھ اُن کے دل میں تھا وہی زبان پر تھا۔ جس بات میں خدا اور رسُول کی مرضی دیکھی گو سارا زمانہ اُس کے برخلاف ہو اُن کو اُس بات کے کرنے میں کچھ باک نہ تھا اور جس امر کو حکمِ الٰہی کے خلاف سمجھا۔ گو کہ ساری برادری اور کنبہ اُس کو اچھا جانے وہ ہمیشہ اس کے مخالف رہے اور جہاں تک ممکن ہُوا اُس کے مٹانے میں کوشش کی۔

اُنھوں نے شادی و غمی کی تمام بیہودہ رسمیں یک قلم اپنے ہاں سے موقوف کر دیں بلکہ بعض لغویات تمام برادری اور کنبے سے موقوف کرا دیں۔ مگر جیسا کہ حدیث میں آیا ہے بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ غَرِيبًا فَطُوبَىٰ لِلْغُرَبَاءِ۔ اُن کی ہدایتوں اور نصیحتوں پر زیادہ تر عمل کرنے والے اور اُن کا حکم بجا لانے والے غریب، اہلِ حرفہ، کاشتکار اور دکاندار لوگ تھے جو ہمیشہ اُن کی خدمت میں حاضر رہتے۔ آٹھویں روز اُن کی مجلسِ وعظ میں شریک ہوتے۔ اور برسوں دن تراویح میں اُن کا قرآن سُنتے تھے۔ اُن لوگوں نے صدہا رسوم و بدعات صرف مولانا مرحوم کی ہدایت سے ہمیشہ کے لئے ترک کر دیں۔

وہ صرف زبانی نصیحتوں پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ہمیشہ ترکِ رسوم و بدعات اور احیائے سُنن میں خود نمونہ بن کر

لوگوں کو اُس کی طرف مائل کرتے تھے۔

مولانا مرحوم تشخص، تعلّی اور نمود کی باتوں سے نہایت نفرت کرتے تھے۔ معاملات میں ایسے صاف اور کھرے آدمی دُنیا میں بہت کم ہوتے ہیں السیدٹ اور لیت ولعل اُن کے مزاج میں مطلق نہ تھی۔ نہ اپنا حق کسی کے پاس چھوڑتے تھے اور نہ دوسروں کے حق میں دست اندازی کرنا چاہتے تھے۔ آج کا حساب کل پر اور کل کا حساب پرسوں پر کبھی نہ رکھتے تھے۔ انتظام، تدبیرِ منزل، اوقات کی پابندی، کاموں کی ترتیب، مستعدی و استقلال اُن کی خاص صفتیں تھیں۔ اُن کی جزرسی اور کفایت شعاری بالکل مثنوی معنوی کے اس شعر کی مصداق تھی۔ ؎

اے بسا امساک کز انفاق بہ　　　مالِ حق را جُز براہِ حق مدہ

اگرچہ وہ فرائض و واجبات و سُنن کے سوا نوافل و اَوراد و وظائف کے زیادہ پابند نہ تھے مگر جس قدر نوافل یا اذکار کا انھوں نے التزام کر لیا تھا اُن میں بفحوائے أَحَبُّ الْأَعْمَالِ أَدْوَمُهَا کبھی فرق نہ آتا تھا۔

قصبہ پانی پت میں جو اولادِ حضرت ابو ایوبؓ انصاری صاحب الرحل اور ثانیاً شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ پیرِ ہرات کی چھ سو برس سے آباد ہے۔ مولانا بھی اسی قوم کے ایک رُکن تھے۔ اس قوم میں سُنّی اور شیعہ دونوں مذہب کے آدمی شامل ہیں۔ مولانا مرحوم کو اپنی قوم کے بچّوں، جوانوں اور بوڑھوں سے ایسی محبّت تھی کہ اُن کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے۔ باوجودیکہ اُن کی قوم کے آدمی بہ نسبت اور قوموں کے اُن کے فیضِ صحبت سے بہت کم مستفیض ہوتے تھے اور اُن کی خدمت میں کم حاضر ہوتے تھے۔ بایں ہمہ جب کوئی شخص اپنی قوم کا مل جاتا تھا تو اُس سے نہایت مہربانی اور عنایت اور محبت کے ساتھ ملتے تھے۔ اور ہمیشہ دل سے اپنی قوم کی خیرخواہی کا خیال رکھتے تھے۔

محلہ کی مسجد[1] جس میں مولانا مرحوم نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس کی مرمت کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی جو انصاریوں کے سوا کسی سے انھوں نے طلب نہیں کیا۔ البتہ اگر کسی نے غیر قوم کے لوگوں میں سے اپنی خوشی سے کچھ دیا تو اُس سے انکار بھی نہیں کیا اور جو کچھ کمی رہی وہ اپنے پاس سے پُوری کی۔ غیر قوم کے لوگوں سے انھوں نے صرف اس خیال سے نہیں طلب کیا کہ محلہ کی مسجد کو خود نہ بنانے اور غیر قوموں سے مدد لینے میں اُن کی اپنی قوم کو دھبّہ لگے گا۔ مسجد کے برابر ایک مکان نواب امان اللہ خان مرحوم انصاری کا تھا اس کو اُن سے مانگ کر مسجد میں شامل کر لیا اور اس طرح مسجد کو خالص انصاریوں کی امداد سے تیار کرایا۔ یہ بظاہر ایک ادنیٰ بات معلوم ہوتی ہے مگر یہی وہ چیز ہے جس کے نہ ہونے سے روز بروز مسلمانوں کی تمام جماعتیں پراگندہ اور کمزور و ضعیف ہوتی جاتی ہیں۔

مولانا مرحوم کی سیدھی سادی اور بے تکلّف وضع کو دیکھ کر ایک اجنبی آدمی اُن کو أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ سمجھتا تھا مگر ہندوستان کے تمام اطراف و جوانب میں اُن کے معتقدین و مسترشدین گنتی اور شمار سے خارج تھے۔ ملک کے ہر حصّے سے صدہا استفتاء اُن کے پاس آتا تھا اور سینکڑوں آدمی بیعت کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ بظاہر مولویت کے لباس میں تھے

---

[1] یہ مسجد "بڑ والی مسجد" کے نام سے مشہور تھی۔ (اسماعیل)

مگر درحقیقت بہت بڑے شیخ تھے اور وہ جو کسی بزرگ کا قول ہے کہ "قطبِ وقت کو پہاڑوں جنگلوں اور ویرانوں کی تنہائی اور عزلت میں نہ ڈھونڈو بلکہ بازاروں میں، بال بچوں میں، خرید و فروخت میں اور تمام دُنیاداری کے تعلقات میں تلاش کرو" سو یہ قول مولانا مرحوم کی شان میں پورا پورا صادق آتا تھا۔ اُن کے نزدیک ترک و تجرید کا نام فقر و درویشی نہ تھا بلکہ دُنیا کو مزرعۂ آخرت سمجھنا اور تمام دُنیا کے معاملات حکمِ خدا اور رسولؐ کے موافق طے کرنا اور بے ہمہ و باہمہ رہنا اسی کو درویشی سمجھتے تھے۔ اُن کا حال اس شعر کا مصداق تھا۔ ؎

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دُنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

اگرچہ اخیر عمر میں بسبب ضعف و ناتوانی کے اوقاتِ نماز کے سوا اور وقتوں میں بہت کم باہر نکلتے تھے اور گھر میں ایک علیحدہ بالاخانہ میں رہتے تھے مگر اپنی طاقت اور قوت کے موافق اپنے تمام کام خود ہی سرانجام کرتے تھے۔

مولانا مرحوم دین کے معاملات میں اپنی رائے اور قیاس کو کبھی دخل نہ دیتے تھے بلکہ جو کچھ شیوخ اور اساتذہ سے سُنا تھا یا جس طریقہ پر اُن کو چلتے دیکھا تھا یا جس طرح کتابوں میں پڑھا تھا۔ اُس سے سرِمو تجاوز نہ کرتے تھے۔ تنہائی میں یا مجمعِ عام میں اگر کوئی اُن سے کچھ مسئلہ پوچھتا تھا اور اُن کو اس کا جواب سرِدست معلوم نہ ہوتا تھا تو باوجود مرجعِ خلائق ہونے کے وہ صاف کہہ دیتے تھے کہ اِس وقت مجھے معلوم نہیں جب تک اُن کو اپنے جواب پر نہایت اطمینان اور وثوق نہ ہوتا تھا کبھی زبان سے نہ نکالتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں وہ باندہ میں تھے۔ جہاں کے لوگ اُن کے نہایت معتقد اور اُن کے حکم بردار تھے۔ تیس چالیس انگریز اور اُن کے بچے اور میمیں باغیوں کے خوف سے اُن کی پناہ میں آگئیں۔ اُنھوں نے سب کو پناہ دی اور اپنے معتقدین کو حکم دے دیا کہ جہاں تک ہو سکے اُن کی حفاظت کرو۔ اور برابر اُن کے کھانے پینے کی خبر لی۔ اور جنھوں نے جان کے خوف سے مسلمان ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اُن کو قاعدہ کے موافق مسلمان کر لیا چنانچہ وہ سب پناہ گیر مولانا مرحوم کے مدرسہ میں امن کے زمانہ تک رہے اور جب غدر رفع ہو گیا تو وہ بخیریت تمام اپنے اپنے ٹھکانے پر چلے گئے۔ ایک روز اُن میں سے ایک شخص جو بہت بڑا افسر تھا اپنے اصلی لباس میں مولوی صاحب سے ملنے آیا۔ اُنھوں نے اُسے مطلق نہ پہچانا۔ چونکہ وہ شخص بھی مولانا مرحوم کے ہاتھ پر مسلمان ہو چکا تھا اور اُنھوں نے اُس کا نام بھی مسلمانوں کا سا ہی رکھ دیا تھا اُس نے اپنا وہی نام لیا کہ میں وہ شخص ہوں۔ اُس وقت مولانا نے پہچانا۔ اس یورپین افسر نے کہا کہ آپ اپنے متعلقین کی طرف سے ایک درخواست لکھوا کر مجھ کو دیجیے۔ کہ اتنے یورپین مردوں اور عورتوں اور بچوں نے ہمارے ہاں پناہ لی تھی اور آخر تک مولوی صاحب نے اُن کو ہر ایک آفت اور حملہ سے بچایا۔ اُس کے صلہ میں ہم کو سرکار سے جاگیر یا انعام ملنا چاہیے۔ مولانا یہ سُن کر مسکرائے اور فرمایا کہ میں نے اپنے مذہب کے موافق اس وقت تمہاری حفاظت اور حمایت کرنی ضروری سمجھی تھی سو اُس کے موافق عمل درآمد کرنا میرا فرض تھا۔ میں یا میری اولاد ہرگز اس کا عوض تم سے یا سرکار سے نہیں چاہتی۔ تم اس کا خیال نہ کرو۔ یہ سُن کر وہ افسر نہایت ادب اور تعظیم سے مولوی صاحب کو سلام کر کے رخصت ہو گیا اور مولوی صاحب چند روز کے بعد پانی پت چلے آئے۔

مولانا مرحوم کے شاگردوں اور مستفیدوں اور مسترشدوں کی تعداد دائرۂ حصر و احصا سے باہر ہے۔ یہاں تک کہ اُن

کے بعض جلیل القدر شاگرد عرب میں بھی موجود ہیں۔ از ان جملہ مولوی حبیب الرحمٰن سندھی بنگالی نزیلِ مدینہ جو ایک مدت سے مدینہ طیبہ میں رہتے ہیں اور جن کا تمام مدینہ کے علمائ و مشائخ ادب کرتے ہیں مولانا مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور اُن کا شیخ ہونے کی وجہ سے وہاں کے علماً باوجود عدم ملاقات کے مولانا مرحوم کا نہایت ادب اور تعظیم کرتے ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ پانی پت ایک ایسے بزرگ سے خالی ہوگیا جو نہ صرف اہلِ پانی پت کے لئے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے باعثِ فخر تھا اور جس کا مثل آئندہ زمانہ میں پیدا ہونا محالاتِ عادیہ میں سے معلوم ہوتا ہے۔ ؎

فَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكُ وَاحِدٍ   وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

یعنی قیس کا مرنا ایک آدمی کا مرنا نہ سمجھو بلکہ وہ قوم کی بنیاد تھی جو گر گئی۔

یہ ایک بات عجیب ہے کہ مولانا مرحوم نے انتقال سے تین چار ہفتے پہلے جامع مسجد میں جو درس فرمایا تھا اس میں زیادہ تر موت کے مسائل یعنی تجہیز و تکفین اور غسلِ میت وغیرہ تشریح کے ساتھ بیان فرمائے تھے۔ یہ گویا آخری وعظ تھا۔ اس کے بعد پھر نوبت وعظ کی نہیں آئی۔

مولانا مرحوم کی ایک مستمرہ عادت یہ بھی تھی کہ اپنا درس ہمیشہ اِس کلمہ پر ختم کرتے تھے "باقی بیان انشاءاللہ تعالےٰ آیندہ ہوگا" مگر اس آخری وعظ میں بجائے اس کے یہ فرمایا کہ "باقی بشرطِ زندگی آئندہ"۔

عزیزی حافظ اخلاق حسین سلمہ اللہ تعالیٰ برادر زادہ راقم جو کہ مولانا مرحوم کے شاگردوں اور معتقدوں میں سے ہیں مولانا مرحوم کی تاریخ وفات قرآن مجید کے اس جملہ سے کہ لَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ نکالی ہے جس کو الہام کہنا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک یہ جملہ متبرکہ ضرور بالضرور مولانا مرحوم کی قبر پر کندہ کرانا چاہیئے۔

(عطیہ: محمد اسماعیل پانی پتی)

مولانا حالی کی ایک بے نظیر غیر مطبوعہ کتاب

اُصولِ فارسی

(پیش کردہ۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

حضرت شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی کے بہت سے نادر و نایاب تبرکات میں نے عرصہ دراز کی تلاش و جستجو کے بعد فراہم اور مہیا کیے تھے، جن میں سے بہت کافی حصہ تو ۱۹۴۷ء کی قیامت خیز آندھی اور ہلاکت آفریں طوفان کی نذر ہو گیا۔ جو بہت ہی تھوڑا سا حصہ میرے لڑکے محمد احمد اور مبارک محمود پانی پت سے بمشکل بچا کر لے آئے تھے۔ اُس میں سے ایک نہایت دلچسپ مضمون "تذکرہ رحمانیہ" کے عنوان سے "نقوش" کے پنج سالہ نمبر میں ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں۔ مکرمی محمد طفیل صاحب مدیر نقوش کے اصرار پر آج حضرت مولانا مرحوم کا ایک اور علمی تبرک قارئین نقوش کی خدمتِ عالی میں پیش کر رہا ہوں۔ مولانا نے آج سے ۸۵ برس پہلے ۱۸۶۸ء میں اصولِ فارسی کے نام سے فارسی صرف و نحو کے متعلق ایک بسیط اور مفصل کتاب اُردو میں لکھی تھی۔ جو نہ مولانا کی زندگی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو سکی اور نہ مولانا کی وفات کے بعد مولانا کے گرامی قدر فرزند حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب نے اُس کی طباعت کا خیال فرمایا۔ اور وہ اُن کے ذاتی کتب خانہ میں اُن کے محترم والد کی دوسری نایاب کتابوں کے ساتھ محفوظ رہی۔ ۱۹۴۶ء میں اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔ چونکہ حضرت خواجہ صاحب مرحوم کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس لیے مکان بند پڑا رہا اور یہ علمی تبرکات الماریوں میں مقفل رہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں پتہ نہیں کہ مکان مذکور لٹ گیا یا محفوظ رہا۔ اور ان تبرکات کا کیا حشر ہوا؟ اور یہ نایاب کتاب اس وقت کہاں ہے اور کس کے پاس ہے؟

میں نے ۱۹۱۸ء میں حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب کی لائبریری سے لے کر اس قلمی کتاب کا دیباچہ اور عنوانات و مندرجاتِ کتاب کی فہرست نقل کی تھی۔ جو آج پہلی مرتبہ ناظرین نقوش کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے مکرمی و محبی محمد طفیل صاحب کے حوالے کر رہا ہوں۔ تمام کتاب حضرت مولانا حالی کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ تحریر بہت خوشخط اور صاف ہے۔ بین السطور کھلا کھلا ہے۔ فی صفحہ ۱۵ سطریں ہیں اور فی سطر چودہ یا پندرہ لفظ ہیں۔ کتاب کا سائز فل سکیپ ہے۔ اور کتاب میں کہیں داغ دھبہ نہیں۔ البتہ کاغذ میلا ہو گیا ہے اور کتاب کو مع جلد کے کیڑے نے جگہ جگہ سے کھا لیا ہے۔ جلد بہت بوسیدہ ہے۔ کتاب کی تمہید ۹ صفحات میں آئی ہے۔ اُس کے بعد علم صرف کا حصہ ۱۲۴ صفحات میں مولانا نے لکھا ہے۔ بعد ازاں علم نحو کا بیان ۱۲۶ صفحات میں ہے۔ یعنی کل کتاب کے (۹ + ۱۲۴ + ۱۲۶) = ۲۵۹ صفحات ہیں۔ تمام کتاب کالی سیاہی اور نیزے کے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔

اس کتاب کا تعارف ناظرین کرام سے کراتے ہوئے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ چونکہ کتاب مذکور آج سے قریباً ستر برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ لہٰذا آج کل کے رسم الخط میں اور اُس وقت کی طرزِ کتابت میں کچھ فرق ہے۔ مثلاً کتاب مذکور کے مسودہ میں: ۔

۱۔ ہر جگہ بجائے "چونکہ" کے "جوکہ" لکھا ہے۔

۲۔ ساری کتاب میں کہیں ڈیش نہیں۔ اور نہ الگ الگ پیرے ہیں بلکہ مضمون مسلسل چلا گیا ہے۔ جہاں مولانا کو نیا فقرہ شروع کرنا ہو۔ وہاں علامت (ـــ) بنا دیتے ہیں۔ مگر یہ علامت کتاب مذکور میں اکثر جگہ بغیر نئے فقرہ کے بھی بعض الفاظ پر لکھی ہوئی ہے۔

۳۔ "اُنکی۔ اُسکی۔ اُس۔ اُن" وغیرہ الفاظ کو بالعموم اس طرح لکھا ہے "اونکی۔ اوسکی۔ اوس۔ اون" وغیرہ۔

۴۔ تمام کتاب میں نُونِ غُنّہ کا استعمال کہیں نہیں کیا گیا۔ ہر جگہ پورا ن لکھا ہے مثلاً "ہیں۔ زبانیں۔ نہیں" وغیرہ کو ہمیشہ ہین۔ زبانین۔ نہین لکھا ہے۔ یعنی لفظ نُون میں نقطہ ضرور دیا ہے۔

۵۔ جہاں جہاں کتاب میں "ٹ" آئی ہے اس کو ہمیشہ اس طرح لکھا ہے "تؕ"

۶۔ یائے مجہول کو بالعموم یائے معروف لکھا ہے۔ مثلاً "نے۔ جتنے۔ ہے" کو "نی۔ جتنی۔ ہی" تحریر کیا ہے۔

۷۔ حرف گ کو ساری کتاب میں ک کی طرح لکھا ہے۔ مثلاً اگر کو اکر۔ گورنمنٹ کو کورنمنٹ لکھا ہے۔

۸۔ "پیچھے۔ لکھی" وغیرہ الفاظ کو ہمیشہ "پیچہے۔ لکہی" وغیرہ لکھا ہے۔ صرف ایک جگہ "پارسی کہلانے لگی" کی بجائے "پارسی کھلانے لگی" لکھا ہے۔

۹۔ ساری کتاب میں مجھے کہیں اضافت کی علامت یعنی زیر نظر نہیں آئی میں زیرِ نظر پیشکش میں مولانا کی اس تحریر کو بعینہٖ اُسی شکل میں ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں جس رسم الخط کے ساتھ مولانا نے اُسے اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا تاکہ آج سے قریباً سو برس پہلے کی طرزِ کتابت سے بھی قارئین کرام روشناس ہو سکیں۔ وھو ہٰذا: ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید مطالب کتاب

خدا تعالیٰ نی جس طرح ہر ملک اور ہر ولایت مین نئی صورت اور نئی وضع اور نئے ڈہنگ کے آدمی بنائے اسیطرح ہر ملک کے آدمیون کو نئی بولی اور نئی زبان عنایت کی دیکھو عرب کی زبان اور ہے عجم کی زبان اور اور ہندوستان کی زبان ان دونون سے جدا ہے انکلستان کی زبان تینون زبانون سے نہین ملتی اسی طرح جتنی ملک ہین اوتنی ہی بولیان ہین اور ظاہر ہی کہ آدمی مدنی الطبع یعنی ہر کام مین آدمیون سے میل جول اور لین دین کرنے کا محتاج ہے اور یہہ بھی ظاہر ہے کہ دنیا کے معاملات کا مدار زبان کے سمجھنے اور سمجھانے پر

ہی پس آدمی جس قدر زیادہ زبانین جانتا ہوگا اوسی قدر اوسکے معاملات آسانی سے سرانجام ہونگے اور زبان کا جاننا ایک تو یہ ہے کہ انسان جس ملک مین پیدا ہوا اوس ملک کی بولی اپنے ماں باپ اور ناتے رشتے والون سے اور پھر ہر ایک کی زبان سے سنتے سنتے نہان کیا اور ضرورت کے وقت اپنے دل کے مطلب اوس بولی مین ادا کرنے لگا اور دوسرے یہ کہ اوس زبان مین جو خواص کا محاورہ اور بول چال ہے اوسکے موافق تقریر اور تحریر کر سکے سو یہ بات بدون اس کے حاصل نہین ہو سکتی کہ اہل زبان نے جو اصول اور قواعد اوس زبان کے تہذیب اور اصلاح کے لیے مقرر کیئے ہین اونسے واقف ہو اور اگر بالفرض اپنی زبان کی تقریر اور تحریر مین ان اصول اور قواعد کے جاننے کا محتاج نہین تو اسمین کچھ شک نہین کہ دوسرے ملک کی زبان بدون واقفیت اصول کے ہرگز نہین آ سکتی جو کہ ہماری گورنمنٹ کی ہمت عالی اسبات مین بہت مصروف ہے کہ جو زبانین ہندوستان مین رائج ہین یا جن زبانون کی کتابین ہندوستانیون کی درس و تدریس مین مستعمل ہین اونکی اصلاح بخوبی کی جائے اور اونکے اصول اور قواعد ایسے طور پر لکھے جائین کہ ہر ملبندی بہ ادنی توجہ اون قاعدون کے ذریعے سے ۔ اون زبانون مین تقریر اور تحریر کا سلیقہ پیدا کر سکے اور ایک اشتہار جو گورنمنٹ پنجاب دام اقبالہ نے سنہ ۱۸۶۸ عیسوی مین بوعدہ انعام جاری فرمایا ہی اوس کا عمدہ مطلب یہ ہے کہ زبان فارسی کے اصول اردو زبان مین بعبارت روشن و واضح بیان کیئے جائین اس لیے خاکسار ہیچمدان الطاف حسین انصاری پانی پتی خدا تعالیٰ کے بھروسے پر اس امر کا متصدی ہوا ہر چند مجکو اپنی بے لیاقتی اور ہیچمدانی سے توقع نہین کہ میری تالیف حضور گورنمنٹ دام اقبالہ مین پسندیدہ اور مقبول ٹھہرے لیکن اس رسالہ مین چند خصوصیتین ایسی ہین کہ اصول فارسی کے اگلی کتابون مین سے کسی خاص کتاب مین شاید نہ پائے جائین ایک یہ کہ اگلی کتابون مین لوگون نے جو زبان فارسی کے قاعدے لکھے ہین اون مین صرف و نحو کے اصول کو باہم ایسا مخلوط کیا ہے کہ صرف کے مسائل نحو کے مسائل سے ہرگز ممتاز نہین ہو سکتے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف و نحو ایک فن ہے فن کا نام ہی حالانکہ صرف ایک جدا فن ہی نحو جدا فن صرف مین مثلاً ایک حرف کا دوسرے حرف سے بدلا جانا اور مصدر کے حقیقی اور مصدرون کے وزن اور فعلون کی قسمین اور اشتقاق کی کیفیت اور ابدال و اسکان و تحریک و قلب و حذف و اشباع و ادغام و تخفیف و اشباع و امالہ کی بحث اور اسمون کے تغیرات لفظی کا بیان کیا جاتا ہے اور نحو میں مثلاً کلمون کی ترکیب دینے کا دستور اور اجزای کلمہ کے حالات اور اسناد اور اضافت و صفت و عطف و تاکید و بدل و مبتدا و خبر و فعل و فاعل و نائب فاعل و مفعول و مستثنی و تاکید و ترکیب ناقص و ترکیب تام اور حرفوں کے استعمالات معنوی کا بیان کیا جاتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ یہ دونون بحثین جدا جدا بیان کرنی منفعت سے خالی نہین سو اس کتاب مین صرف کی بحث نحو کے فن سے بالکل جدا ہے ۔

دوسرے اگلی کتابوں کی ترتیب مفید نہین یعنی جو باتیں پہلے لکھنے کی ہین وہ اون مین پیچھے لکھی گئین اور جو پیچھے لکھنے کی ہین وہ پہلے لکھی گئین اور ظاہر ہے کہ حسن ترتیب کو مطالب کے دلنشین کرنے مین بڑا دخل ہے سو اس رسالے مین رعایت ترتیب کی بہت ملحوظ رہی ہے ۔

تیسرے اصول فارسی کی اگلی کتابین جو رائج ہین اون مین نحو کے اکثر مطالب نہین بیان کیے گئے اور خاکسار نے حتی الوسع مطالب نحو کو جمع کرنے مین قصور نہین کیا ۔

چوتھے اصول کا لفظ کئی فنون کو شامل ہے صرف نحو معانی بدیع سو جب تک کتاب مین یہ سب فنون بیان نہ کیے جائین

کتاب ناتمام ہے حالانکہ اگلی کتابون مین کوئی رسالہ ایسا نہین دیکھا گیا جو ان پانچون فنون کو شامل ہو اور رسالہ عبد الواسع ہانسوی اور شجرۃ الامانی اور نہر الفصاحت وغیرہ مین جو ان فنون کا کچھہ کچھہ ذکر ہے وہ کافی نہین اس رسالہ مین یہ پانچون فن اپنے نزدیک اچھی طرح بیان کئے گئے ہین ہان مگر جو باتین ضروری نہین سمجھین یا جن کا بیان کرنا اولجھاؤ سے خالی نہ تھا اور مبتدیون کا فہم اون کے سمجھنے سے قاصر سمجھا گیا وہ باتین البتہ چھوڑ دی گئیں۔

پانچویں اکثر اوستادون کے شعر جو بطور سند کے لائے جاتے ہیں بعضے اون مین سے دقیق ہوتے ہین اور اون کے سمجھے بغیر قاعدہ طالب علم کے سمجھہ مین نہین آتا سو خاکسار نے ایسے شعرونکا ترجمہ کر کے اوسکا مطلب روشن اور واضح کر دیا ہے چھٹے ہر فن کے آخر مین تھوڑے تھوڑے سوال اوسی فن کے لکھہ دیئے ہین اور اون کا جواب نہین لکھا تاکہ پڑھنے والونکو اون کے دیکھنے سے بصیرت حاصل ہو اون کے امتحان مین بہی کام آئین۔

اگرچہ مین خوشہ چین انہین بزرگوں کا ہون اور اونکے تالیفین اور تصنیفین نہوتین تو بیشک مجکو کتاب لکھنی بہت دشوار ہوتی بلکہ شاید نہ لکھہ سکتا لیکن دستور یہ ہے کہ جس کام کی طرف سلطان وقت کی توجہ ہوتی ہے وہ کام حد کمال کو پہنچتا ہے اور جو بات کوئی اہل علم اپنے دل کی اوپج سے کرتا ہے اوس مین کچھہ نکچھہ نقصان رہجاتا ہے ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کے امتثال امر کے لیے جو اس زمانے مین لوگ سعی و کوشش کرینگے اور کرتے ہیں وہ اگلون نے کاہیکو کی ہوگی کیونکہ سلاطین ماضیہ نے اصول فارسی کی تہذیب کی طرف بہت توجہ نہین کی۔

تنبیہہ پارس جو ایک ولایت کا نام ہی سو وہ پارس بن پہلو بن سام بن نوح ؑ کی آبادی کی ہوئی ہے اس سبب سے اوس کو پارس کہتے ہین جو زبان کہ اوس ملک مین رائج ہوئی وہ پارسی کہلانے لگی اور اوسیکو فارسی کہتے ہین فارسی زبان کی کئی قسمین ہین دری پہلوی پارسی ہروی سگزی زاولی سغدی۔ دری کو بعضے کہتے ہین کہ بہمن اسفندیار کے درباریون کی زبان ہے اور بعضے کہتے ہین کہ کیانیون کے دربار مین بولی جاتی تھی اور بعضونکے نزدیک دری وہ زبان ہے جو درہ کوہ کے رہنے والے بولتے تھے اوسمین کسی غیر زبانکا ملاؤ نہ تھا بہرحال یہ زبان بہت فصیح گنی جاتی تھی پارسی اوس زبان کو کہتے ہین جو خاص بلاد پارس مین رائج تھی پہلوی کو بعضے کہتے ہیں کہ ولایت رے اور اصفہان اور ہمدان اور دینور اور اونکے مضافات کی زبان تھی اور چونکہ اس ملک کو پہلو کہتے ہیں اس لیے وہان کی زبان کو پہلوی کہنے لگے اور بعضی کہتے ہین کہ پہلو پارس بن سام بن نوح کے باپ کا نام تہا یہ زبان اوسکی طرف منسوب ہے بہرحال یہ تینوں زبانین رائج اور مستعمل رہین اور باقی چار زبانین ترک کی گئیں جب سے عجم مین اہل اسلام کی عملداری آئی عربی زبان کے لغت فارسی مین مخلوط ہو کر ایک نئی زبان بن گئی جیسے ہندوستان کی قدیم زبان فارسی اور عربی کے ملنے سے بالکل بدل گئی۔

اب جاننا چاہیئے کہ فارسی زبان کی ایسی معرفت جس سے آدمی فصحای اہل زبان کے طور پر تقریر اور تحریر کر سکے اور کلمونکے استعمال کرنے مین اور کلام کے ترکیب دینے مین غلطیون سے محفوظ رہ سکے کئی باتون کے جاننے پر موقوف ہے اول لغت اور اصطلاحیں اور محاورے دوسرے اشتقاق اور تصرف کے اصول تیسرے نظم کلام کا دستور چوتھے بحسب مقتضای حال گفتگو کرنے کا طریقہ پانچویں ایک مطلب کو نئے نئے اسلوب سے ادا کرنے کے قاعدے چھٹے یہ بات کہ بعد رعایت فصاحت و بلاغت کے کلام مین کن باتونسے حسن و خوبی زیادہ ہو جاتے ہی۔

انمین سے پہلی بات برہان قاطع اور فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ رشیدی اور فرہنگ سروری اور مدار الافاضل اور مؤید الفضلا

اور بہار عجم اور مصطلحات وارستہ اور سراج اللغۃ اور سوا انکے اور لغت کی کتابون سے طلب کرنی چاہیئے اور باقی پانچ مقدمے اس رسالے مین انشاء اللہ تعالے بہت بسط اور شرح کے ساتھ بیان کئے جائینگے اور اسیواسطے اس کتاب کے پانچ حصے کئے گئے۔

پہلا حصہ علم صرف کے بیان میں

مقدمہ صرف کی اصطلاحونکے بیان مین
پہلا باب حرفون کے بیان مین
دوسرا باب مصدر اور مشتق کے بیان مین
تیسرا باب جامد کے بیانمین
خاتمہ سوالات علم صرف مین

دوسرا حصہ علم نحو کے بیان مین

مقدمہ نحو کے اصطلاحونکے بیان مین
پہلا باب اسمون کے بیان مین
دوسرا باب فعلون کے بیان مین
تیسرا باب حرفون کے بیان مین
چوتھا باب مرکب ناقص کے بیانمین
پانچواں باب مرکب تام کے بیان مین
خاتمہ سوالات علم نحو مین

تیسرا حصہ علم معانی کے بیان مین

مقدمہ علم معانی کی اصطلاحونکے بیان مین
پہلا باب اسناد خبری کے بیان مین
دوسرا باب مسند الیہ کے بیانمین
تیسرا باب مسند کے بیان مین
چوتھا باب فعل کے متعلقات کے بیان مین
پانچواں باب قصر کے بیان مین
چھٹا باب انشا کے بیان مین
ساتواں باب فصل و وصل کے بیان مین
آٹھواں باب ایجاز و اطناب و مساوات کے بیان مین
خاتمہ علم معانی کے سوالات مین

چوتھا حصہ علم بیان مین

مقدمہ علم بیان کے اصطلاحون کے بیان مین
پہلا باب تشبیہ کے بیان مین
دوسرا باب استعارہ کے بیان مین
تیسرا باب مجاز مرسل کے بیان مین
چوتھا باب کنایہ کے بیان مین
خاتمہ علم بیان کے سوالات مین

پانچواں حصہ علم بدیع کے بیان مین

مقدمہ علم بدیع کے اصطلاحون کے بیان مین
پہلا باب صنائع معنوی کے بیان مین
دوسرا باب صنائع لفظی کے بیان مین
خاتمہ علم بدیع کے سوالات مین

تقریظ

مولانا محمد علی جوہر

۱۸۹۰ء کی گرمیوں میں جبکہ میری عمر ساڑھے گیارہ برس کی تھی میں اپنے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ جنھوں نے اسی سال انٹرنس (یا آج کل کی اصطلاح میں میٹریکولیشن) کا امتحان پاس کیا تھا، بریلی کے اسکول سے علی گڈھ کے مدرسۃ العلوم میں پڑھنے کے لیے آیا۔ میرے منجھلے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر غالباً ہم سے پہلے ہی علی گڈھ آچکے تھے۔ اس "نیچر گڈھ" میں تقریباً سبھی طلباء کی ایک ہی سی وضع قطع تھی۔ شیروانی، اچکن، ترکی ٹوپی، سیدھا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، قمیص، جراب، انگریزی جوتا یہی سب کا لباس تھا۔ کوئی شیروانی کی جگہ ترکی کوٹ پہنا کرتا تھا، ترکی ٹوپی کی جگہ کوئی سیاہ ایرانی ٹوپی اوڑھا کرتا تھا، کوئی کبھی کبھی کرتا بھی پہن لیا کرتا تھا مگر داڑھیاں سوائے ایک آدھ کے سب کی منڈی ہوئی ہوتی تھیں گو مونچھوں کے بھی صفایا کرانے کا فیشن اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ بال سب کے آگے سے بڑھے ہوئے پیچھے سے بتدریج زیادہ کترے ہوئے ہوتے تھے جو آج سارے ہندوستان میں رائج ہیں اور جنھیں ولایت تک کی عورتوں نے اسی طرح کتروانا قبول کر لیا ہے اور جو "ایٹن کراپ" کے نام سے موسوم ہیں لیکن جس کچی بارک میں ہم تینوں بھائی رہتے تھے اسی کے پاس والی کچی بارک میں اور اس بیچ والے کمرے میں جہاں ایک عرصہ سے "ٹول ہاؤس" بن گیا ہے ایک دراز قامت مگر خاصے دبلے پتلے صاحب رہتے تھے جو خالص ہندوستان کی پرانی وضع کی اچکن پہنا کرتے تھے، جن کی ٹوپی ان کے وطن امروہہ کی ساخت کی کشتی نما ہوتی تھی (جس کو اب "گاندھی کیپ"[1] کہا جاتا ہے) جن کا جوتا دہلی کا سلیم شاہی وضع کا مگر سادہ ہوتا تھا اور جن کے بال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لانبے تھے اور اگرچہ "بر دوش" نہ سہی لیکن "تا بناگوش" ضرور آتے تھے تاکہ ان لمبے بالوں کے باعث اچکن پر تیل وغیرہ کا دھبہ نہ پڑ جائے، وہ گردن میں ایک سفید خاصے کا رومال اسی طرح ضرور باندھا کرتے تھے جس طرح سرسید رحمۃ اللہ علیہ اپنے گلے کی رسولی چھپانے کے لیے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ وضع قطع اس زمانہ کے بزرگوں کی اس وقت تک باقی تھی لیکن علی گڈھ جیسے "نیچر گڈھ" کے کسی طالب علم کا اس وضع قطع کو برقرار رکھنا اس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ نمایاں تھا جتنا کہ کسی یوروپین لیڈی کا آج بڑے بال رکھنا، نیچا سایہ پہننا اور سینہ اور گردن، بازوؤں اور باہوں سب کو کپڑے سے ڈھانپنا نمایاں ہوگا

---

[1] امروہہ (یو۔پی) کی کشتی نما ساخت کی ٹوپی اور "گاندھی کیپ" میں نمایاں فرق یہ تھا کہ گاندھی کیپ تو عموماً سپید کھدر کی ہوتی تھی اور امروہہ ساخت کی ٹوپی ریشم اور کلابتون کی کڑھی ہوئی ہوتی تھی۔

اس لیے میری نظر بھی آتے ہی ان بزرگ پر پڑی اور اگر انھیں کسی اور طرح کا امتیاز نہ بھی حاصل ہوتا تب بھی میں ضرور اپنے بھائیوں سے پوچھتا کہ یہ اس عجیب و غریب وضع قطع کے بزرگ کون ہیں لیکن محمد داؤد صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ علی گڑھ کالج میں اس وقت سب سے زیادہ ممتاز اور ہر دلعزیز جو جماعت تھی اور جس میں محمد حبیب اللہ[1] خان صاحب، احمد حسین[2] مرحوم، قسیم بیگ[3] صاحب چغتائی جیسے طلبا شامل تھے اس کے سردار یہی پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کے کمرے پر بیسیوں ممتاز ترین طلبہ کا مجمع رہا کرتا تھا جن میں میرے بھائی ذوالفقار علی خان[4] گوہر بھی ہوتے تھے، حیدر آباد کے ممتاز افسر مال قطب الدین[5] صاحب دہلوی (ڈٹو) بھی ہوتے تھے، چودھری ممتاز حسین[6] صاحب بھی ہوتے تھے اور چھپا کوٹ کے ایک صاحب جن کا نام غالباً احمد معظم[7] صاحب تھا اور بورڈنگ کے باہر اپنے والد بزرگوار خان بہادر سید زین العابدین[8] صاحب کی کوٹھی پر رہنے والے سید زین الدین بھی ہر روز وہیں آیا کرتے تھے میں ان ممتاز طلبہ کی جماعت کے پاس ہی رہنے سے خوش بھی تھا مگر ساتھ ہی ساتھ تنگ بھی آ گیا تھا کیونکہ ان حضرات کو کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے گدگدی بہت لگتی ہے وہ مجھے پکڑ کر بہت گدگدایا کرتے تھے۔ مولانا طفیل احمد[9] صاحب اور

---

[1] یعنی خان بہادر محمد حبیب اللہ خان صاحب بی۔ اے (علیگ)، سابق کلکٹر یو۔ پی جنھوں نے مدت العمر اپنے مادر علمی کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی اس پیرانہ سالی میں انجام دے رہے ہیں اور علی گڑھ ہی میں مقیم ہیں۔

[2] احمد حسین بی۔ اے مرحوم ۱۸۸۸ء میں کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے پاس کر کے ریاست رام پور کے اسٹیٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے، عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔

[3] مرزا قسیم بیگ چغتائی بی۔ اے (علیگ) آگرہ کے رہنے والے ۱۸۸۵ء میں کالج میں فرسٹ ایر میں داخل ہوئے ۱۸۸۹ء میں بی۔ اے پاس کر کے اوّل علی گڑھ کے ایک کلکٹر "کینیڈی" کے جن کی آنکھیں خراب تھیں، پرسنل اسسٹنٹ ہوئے پھر کچہری میں مترجم ہو گئے اس کے بعد آگرہ کالج میں وارڈن رہے اور پھر اتفاق سے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ خان بہادر کا خطاب حاصل کیا۔ آخر میں جودھپور میں بھی رہے۔ بڑے لطیفہ گو تھے۔ ان کے کئی بیٹے تھے جن میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ادبیات و افسانہ نویسی میں بڑی شہرت حاصل کی۔

[4] یہ قادیانی فرقہ میں شامل ہو کر قادیان میں بھی مقیم رہے۔ ان کے ہم عصروں کا قول ان کے بارے میں ہے کہ بڑے لغو گو تھے۔

[5] یہ دہلی کے نہیں بارہ بنکی کے رہنے والے تھے ۱۸۸۸ء میں کالج میں آئے اور ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کیا۔ ابتداً فوج میں ملازمت کی، پھر ریاست حیدر آباد میں تعلقداری کا عہدہ ملا اور افسر مال رہے۔

[6] چودھری ممتاز حسین ولد علی بخش خاں ساکن پانی پت۔ ۱۰ / جون ۱۸۸۹ء کو داخل ہوئے اور ۱۸۹۱ء میں انٹرمیڈیٹ کر کے نائب تحصیلدار پھر تحصیلدار ہوئے۔ کچھ عرصہ ریاست دوجانہ میں منیجر بھی رہے۔

[7] مولوی احمد معظم عباسی ساکن چھپاکوٹ، علی گڑھ سے جا کر حیدر آباد میں کسی منصب پر فائز ہوئے۔

[8] خان بہادر سید زین العابدین مرحوم سر سیدؒ کے احباب خاص میں تھے۔ علی گڑھ میں عرصہ تک سب جج رہے۔

[9] مولانا طفیل احمد مرحوم ۱۸۷۹ء میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۱ء میں فورتھ ایر سے آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوئے۔ طبیعت کی یکسانیت کی وجہ سے داؤد صاحب سے ان کے بڑے گہرے تعلقات مدت العمر تک رہے۔ کالج، یونیورسٹی و کانفرنس کی گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ (عباسی)

داؤد صاحب تو اس قدر مقطع اور سنجیدہ بزرگ تھے کہ وہ کسی کو کیا دق کرتے مگر حبیب اللہ خاں صاحب، قسیم بیگ صاحب اور زین الدین[1] صاحب مجھے بے حد پریشان کیا کرتے تھے۔ ایک میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیتا دوسرا دونوں ٹانگیں، جب میں اس طرح "پا بدست دگرے دست بدست دگرے" ان رندانِ باصفا کی صحبت میں گرفتار رہتا تو تیسرا پیٹ میں گدگدی کرتا اور میں بیتاب ہو جایا کرتا۔ اس کے بعد تو میری پریشانی نے اس قدر ترقی کی کہ حبیب اللہ خاں صاحب مجھے دور ہی سے دیکھتے تو اس طرح اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے کہ گویا مجھے گدگدا رہے ہیں اور میں دور ہی سے بیتاب ہونے لگتا۔

اس زمانہ میں یونین کے افسروں کا انتخاب ہوا اور چونکہ اس وقت تک اسکول کے طلبہ بھی یونین کے ممبر ہو سکتے تھے ہم بھی انتخاب میں رائے دینے کی غرض سے ممبر بنائے گئے اور مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے بھی داؤد صاحب کی پوری پارٹی کے لیے بالکل اسی فہرست کے مطابق رائے دی جو ہم سب کو پہلے سے دے دی گئی تھی تاکہ ہم اس کے نام یاد کر لیں۔ بیسیوں نئے ممبر دونوں طرف سے بنائے گئے تھے اور بیک[2] صاحب خوش خوش پھر رہے تھے کہ یونین[3] کی آمدنی بھی بڑھی اور خیر اسی وجہ سے سبھی نئے ممبر تو داخل ہو گئے۔ اس سال غالباً مظہر الحق[4] صاحب "بھائی بھشتو" جن کے اس عرف کے لیے کالج کے کورس کا یہ شعر گھڑا گیا تھا؎

عجب ہے بھنگ کا پیالہ اہا ہا ہا اہو ہو ہو
ہوا بھشتو کا منہ کالا اہا ہا ہا اہو ہو ہو)

وائس پریزیڈنٹ اور محمد داؤد صاحب سیکرٹری منتخب ہوئے۔ دوسرے سال احمد حسین صاحب مرحوم اور حبیب اللہ خاں صاحب ان عہدوں کے لیے منتخب ہوئے اور غالباً تیسرے سال سید زین الدین صاحب اور مولانا شوکت علی۔ یونین نے ایک نظم کے لیے انعام کا بھی اعلان کیا تھا اور جن دو نظموں کے لکھنے والوں میں مقابلہ تھا ان میں سے ایک گورکھپور کے محمد اسمٰعیل[5] صاحب عرف "بخار" مرحوم نے لکھی تھی اور ایک اس خاکسار نے اور غالباً کسی کو یہ سن کر تعجب نہ ہوگا کہ انعام "بخار" صاحب ہی کے حصہ میں گیا اور ہم یوں ہی رہ گئے اور مولانا شبلی مرحوم کی سخندانی پر ایک عرصہ تک بے حد شک کرتے رہے کیونکہ انعام کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا۔

شعر میں جس شخص کے لیے اتنی کم عمری میں بقولِ غالب خود خواہش کی ہو کہ "گر دو فنِ او" وہ بھلا داؤد صاحب پر کس طرح عاشق ہوتا جبکہ اسے اسی زمانہ میں معلوم ہو گیا ہو کہ داؤد صاحب کا بھی یہی فن تھا۔ میں نے سنا تھا کہ چودھری ممتاز حسین صاحب کو آج کل کے کلکٹر

---

[1] سید زین الدین ایم۔ اے (علیگ) ابتداً ڈپٹی کلکٹر ہوئے پھر کلکٹر۔ ریٹائر ہو کر ریاست رام پور میں ریونیو منسٹر رہے۔ شروع شروع میں بڑے فیشن ایبل تھے آخر میں اعمالِ مذہبی کے حد درجہ پابند صوفی منش ہو گئے تھے۔

[2] مسٹر ٹی بیک ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۹ء تک کالج کے پرنسپل رہے۔

[3] علی گڑھ کالج کی مشہور یونین کا نام "سڈنس یونین" ہے جو مسٹر سڈنس (ہیڈ ماسٹر ۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۴ء) کے ریٹائر ہونے کے بعد مسٹر بیک نے ان کے نام سے قائم کی تھی۔

[4] ۱۷ر جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج میں داخل ہوئے ۱۸۹۳ء میں بی۔ اے کر کے پہلے نائب تحصیلدار پھر اکسائز انسپکٹر اور بعد میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔

[5] محمد اسمٰعیل مرحوم ولد نور الحق ساکن مچھلی شہر ۳ر جون ۱۸۹۰ء کو فرسٹ ایر میں داخل ہوئے تھے۔ (عباسی)

سیّد زین الدین صاحب کے ساتھ خاص الفت تھی مگر زین الدین صاحب جس طرح ۱۹۲۱ء میں نان کوآپریٹروں[1] پر ظلم کرنے میں مشہور تھے اسی طرح اس زمانہ میں چودھری صاحب پر یہاں تک ظلم فرمایا کرتے تھے کہ بیچارے چودھری صاحب نے خودکشی کی ٹھان لی تھی۔ اس قصہ کو داؤد صاحب نے ایک مثنوی کی شکل میں منظوم کیا تھا اور ۱۹۱۸ء سے مجھے اس کا ایک شعر یاد تھا جس میں زین الدین صاحب کا اپنی کوٹھی سے یہ سنتے ہی گھبرا کر باہر نکل آنا بیان کیا گیا ہے ؎

نہ ہوا سرد تھی نہ سر پہ چھاؤں   اس پہ طرّہ یہ تھا کہ ننگے پاؤں

اس مثنوی کو میں بھلا کہاں دیکھتا، لیکن کسی نہ کسی کی زبانی میں نے یہ شعر سن لیا تھا اور گو ذیابیطس کے باعث اب حافظہ بالکل برباد ہو گیا ہے لیکن الحمد للہ بچپن کے سُنے سُنائے اشعار اب تک یاد ہیں۔ جب میرے عزیز دوست محمود احمد عباسی نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اس مثنوی کو وہ پھر شائع[2] کرائیں گے اور تقریظ لکھنے کی مجھ سے فرمائش کر کے مجھے وہ مثنوی دکھائی تو میں نے سب سے پہلے اسی شعر کی تلاش کی اور عجیب مسرت ہوئی جب اس کو اسی طرح مثنوی میں اسی موقع پر جس کا میں نے اپنے حافظہ سے اوپر ذکر کیا ہے، پایا۔ افسوس کہ رختِ سفر باندھنے اور "ہمدرد" سے رخصت ہونے اور لڑکی کی شادی کرنے میں اتنا وقت بھی نہ مل سکا کہ اس مثنوی کو پڑھ سکتا البتہ "خم خانۂ جاوید" میں جو چند غزلیں اور متفرق اشعار اور یوسف خاں مرحوم کا مرثیہ شائع ہوا ہے ان کو پڑھ کر داؤد صاحب مرحوم کی بے تکلف شاعری اور ان کے سہلِ ممتنع کا لطف اٹھایا۔ ان اشعار میں سے بھی بچپن کے حافظہ نے ایک شعر کا اندوختہ مجھے عطا کیا تھا چنانچہ اس کو بھی اسی مسرت سے پڑھا ؎

یہ جھوٹ اور یہ ہم سے، بس اب رہنے دیجئے
ہم بھی تو رات جھانک رہے تھے دراڑ سے!

البتہ اب جبکہ میری عمر غالباً داؤد صاحب مرحوم کی عمر سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اس شعر کے "معاملہ" پر نظر پڑی تو تعجب ہوا کہ ان جیسا سنجیدہ اور متشرع بزرگ بھی کم از کم شعر میں دراڑ سے جھانک سکتا تھا! خدا نہ کرے کہ یہ شعر بھی مثنوی کی طرح صوبجات متحدہ کے نان کوآپریٹروں کے ایک قہرمان مسلمان کلکٹر کی شان میں کہا گیا ہو! مگر باوجود پوری سنجیدگی کے داؤد صاحب مرحوم کی طبیعت نہایت شگفتہ تھی اور مولانا حالیؒ کی ایک مشہور غزل کے مقطع پر جو تضمین انھوں نے لکھی تھی اس نے تو مولانا حالی تک کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل لے لیں صرف میرا تخلص مقطع سے نکال ڈالیں تو میں خوش میرا خدا خوش مگر تضمین بھی بلا کی تھی۔ ایک ہی مصرعہ نے مولانا مرحوم کے شعر کا ستیاناس کر دیا، سنئے ؎

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں   پہلے یہ دیکھے وہ اس کام کے ہے بھی شایاں
سن کے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے داؤد کے ہاں   ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

---

[1] یعنی تحریکِ عدمِ موالات و تعاون جو کانگریس نے حکومت کے خلاف چلائی تھی۔

[2] داؤد صاحب مرحوم کے کل مجموعۂ کلام کو شائع کرنا مقصود تھا۔ (عباسی)

بزرگوں کی شان میں داؔؤد صاحب نے صرف یہی ایک گستاخی نہیں کی تھی۔ کالج میں ایک عرصہ تک ”ہر نسل“ میں ایک طالبِ علم کو ”بوم“ کا لقب عطا ہوتا تھا۔ اس نسل کے ’بوم‘ کو مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہنے کا عشق تھا۔ جب کالج کا گروپ فوٹو کھنچنے لگا تو ”بوم“ صاحب فوراً مولانا شبلی کی کرسی کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے جس پر داؤد صاحب نے اسی وقت لکھ دیا ؎

آج کالج میں مچ رہی ہے دھوم — طلبہ کا ہے ہر طرف سے ہجوم
بول اٹھی روحِ سعدیؔ مرحوم — ”کس نہ آید بزیرِ سایۂ بوم“
الّا مولانا شبلیِ مخدوم

چودھری خوشی محمد[1] خان صاحب کالج کے ”پوئیٹ لاریٹ“ اور اپنے قد کے لحاظ سے ”لانگ فیلو“ تھے اور آرنلڈ صاحب اور مولانا شبلی خاص طور سے ان کے مداح تھے مگر چودھری صاحب کو زبان پر پوری قدرت نہ تھی اس لیے کبھی نظم میں داؤد صاحب اور کبھی نثر میں عبدالحق صاحب[2] (جو آج کل اورنگ آباد سے اردو کی خدمت کر رہے اور اس زمانہ میں کالج میں ”سینٹ پال“ کے عرف سے معروف تھے) چودھری صاحب کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ چودھری صاحب نے ٹامسن کی نظم ”سیزنس“ پڑھ کر جو ان کے کورس میں داخل تھی، ایک نظم لکھی تھی جس پر مولانا شبلی کے مشورہ سے آرنلڈ صاحب نے انھیں ایک انعام مرحمت فرمایا تھا۔ اس میں ایک موقع پر چودھری صاحب لکھ گئے تھے کہ ع

ناظرؔ اب سیرِ سبزہ کر ڈالو

ناظرؔ آپ کا تخلص تھا اور قد میں ناظر صاحب کے متعلق کہا جا سکتا تھا کہ ’انظر الی الابل کیف خلقت‘ اس لیے ناممکن ہو گیا کہ اس مصرع کی داد نہ دی جائے جو داؤد صاحب نے اس پر لگایا تھا۔

ناظرؔ صاحب فرماتے ہیں ——— ناظر اب سیرِ سبزہ کر ڈالو
داؔؤد صاحب اسی پر فرماتے ہیں ——— اپنے آگے کی گھانس چر ڈالو

نواب محسن الملک مرحوم جب حیدر آباد چھوڑ کر علی گڈھ چلے آئے اور وہ طلبہ جو سرسیّد کے ڈنڈے سے ڈرتے تھے اب نواب صاحب کے پاس جانے لگے اور علی گڈھ کے سدابہار کھانے کی حسبِ دستور شکایت کرنے لگے تو نواب صاحب نے بھی

---

[1] چودھری صاحب نے ۱۸۹۳ء میں علی گڈھ سے فرسٹ ڈویژن میں انگریزی و فارسی میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے کیا۔ عرصہ تک ریاست کشمیر میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ قومی نظمیں بہت لکھی ہیں۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جلسوں میں خاص طور سے پڑھتے تھے۔

[2] ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (بابائے اُردو) ولد منشی علی حسین مرحوم ساکن ہاپوڑ ضلع میرٹھ ۲۳ اپریل ۱۸۹۰ء کو درجہ نہم میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۵ء میں فرسٹ ڈویژن بی۔ اے کیا۔ عرصہ دراز تک ریاست حیدر آباد میں بسلسلۂ ملازمت رہے اور اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی کے زمانہ میں انجمن ترقی اردو کے ذریعہ اُردو زبان کی بیش بہا خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر وہاں سے دہلی چلے آئے اور انجمن ترقی اُردو کا دفتر، کتب خانہ اور پریس بھی وہیں منتقل کیا جو فسادات کے زمانہ میں سب لُٹ لٹا گیا۔ اس تباہی کے بعد کراچی آئے اور یہاں ازسرِ نو انجمن کا دفتر، کتب خانہ، پریس قائم کیا اور اُردو کالج کی بنیاد ڈالی جو اب ایک اعلیٰ پایہ درس گاہ ہے۔ (عباسی)

"حسبِ دستور" اصلاح کے بہت سے وعدے کیے، ان وعدوں سے خوش ہو کر چودھری صاحب نے فارسی میں ایک نظم لکھی جس کا قافیہ "جان" اور "نان" تھا اور مولانا شبلی کے شاگردِ رشید اور محبوبِ خاص نے اسے مولانا ہی کے انداز سے یونین میں پڑھا۔ ان کے بہت سے شاگرد آج نقل اتار سکتے ہوں گے، اسی بحر اور قافیہ میں داؤد صاحب نے بھی فوراً ایک شعر لکھ دیا اور اسی انداز سے اپنے خاص حلقہ میں پڑھ کر سنا بھی دیا، وہ یہ تھا ؎

"خوب تر صحرا نوردی می کند
اشترِ پنجاب در ہندوستان"

اب قارئینِ کرام داؤد صاحب کے لگائے ہوئے مصرعہ کا لطف پوری طرح اٹھائیں گے ؎

ناظر! اب سیرِ سبزہ کر ڈالو
اپنے آگے کی گھاس چر ڈالو

مگر جہاں تک مجھے یاد تھا اسی قسم کی ایک اور گستاخی کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے مشہور خاندان کی شان میں داؤد صاحب نے نہیں کی تھی بلکہ وہ میرے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر کی شرارت تھی[1]۔ محمد سلیمان صاحب اس زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس کے "پراکٹر" تھے گو اس وقت ان کا لقب "مینجر" تھا جسے وہ اس طرح لکھا کرتے تھے کہ عام طور پر طلبہ اسے "خچر" پڑھا کرتے تھے۔ مولوی سعید احمد صاحب غالباً محاسب تھے، مولوی بدر الحسن صاحب مرحوم (بھائی بدّو) میرے درجہ کے استاد تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی علاء الحسن صاحب اس وقت تک طالب علم ہی تھے۔ اس خاندان کو کالج کے ساتھ عشق تھا اور متعدد منتظمین اور طلبہ اس نے کالج کو بخشے تھے

---

[1] یہ گوہر کی شرارت نہ تھی، داؤد صاحب مرحوم ہی کی بذلہ سنجی تھی۔ گوہر کے کالج میں آنے اور ۱۸۸۹ء میں داخلہ لینے سے بقول خان بہادر مولوی محمد حبیب اللہ خاں صاحب برسوں پہلے سے داؤد صاحب کا یہ لطیفہ کالج میں مشہور اور زبان زدِ خاص و عام تھا۔ مولانا ظفر علی خان صاحب نے جو گوہر صاحب سے سالہا سال پہلے سے کالج کے طالب علم تھے، اپنے اخبار "زمیندار" کی ایک اشاعت میں ایک موقع پر لکھا تھا:۔

> "محمد داؤد مرحوم کو جو راقم الحروف کے زمانہ طالب علمی میں مدرسۃ العلوم کے ایک تلمیذِ رشید تھے مبداءِ فیاض سے سخن سرائی کا ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا۔ شعر فی البدیہہ کہتے تھے اور ظرافت تو مرحوم کا خاص حصہ تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کاندھلہ سے جتنے لوگ علی گڑھ آئے سب کے سب امام شعرانی کی ضد واقع ہوئے تھے اور قدرت نے ان کے جسم کو تو نہیں لیکن سروں کو ضرور فکرِ مقراض سے فارغ البال کر رکھا تھا، اس پر مرحوم کو ذیل کی پھبتی سوجھ گئی جو اسی وقت کالج کے ہر بے فکرے کی زبان پر تھی ؎
>
> آتا ہے کاندھلے سے جو لادے ہے سر پہ گنج
> قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا"

خود مولانا شوکت علی مرحوم نے اپنے مضمون میں جو داؤد صاحب مرحوم کے حالات پر لکھا تھا، اس لطیفہ کو مرحوم ہی سے منسوب کیا ہے۔ (عباسی)

مگر کالج کے ساتھ اس عشق کے ساتھ ہی ساتھ ایک خاصہ اس خاندان کا اور بھی تھا جس کو گوہر نے اس طرح باندھا تھا ؎

آتا ہے جو وہاں سے وہ لاتا ہے سر پہ گنج
قاروں نے کاندھلے میں لٹایا خزانہ کیا

قارئینِ کرام کو یقیناً آتش کا مشہور شعر یاد ہوگا ؎

نکلا جو گل زمیں سے سو آیا وہ زر بکف
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

یہ اسی مشہور شعر کی خرابی کی گئی ہے اور علاء الحسن صاحب مرحوم کی شان میں یہ تصرف کیا گیا تھا۔ محمود احمد صاحب عباسی کا خیال تھا کہ یہ ان کے مرحوم بھائی کا تصرف تھا کیونکہ انھوں نے داؤد صاحب کو ضرور اسے پڑھتے سنا ہوگا مگر مجھے یاد تھا کہ یہ تصرف میرے بڑے بھائی نے کیا تھا چنانچہ میری لڑکی کی شادی میں جب وہ تشریف لائے تو خود ان سے پوچھا گیا اور میرا حافظہ صحیح نکلا۔[1]

---

[1] مولانا ظفر علی خان و خان بہادر محمد حبیب اللہ خان و مولانا طفیل احمد صاحب مرحوم وغیرہ جو بہ نسبت مولانا محمد علی مرحوم کے اس زمانہ کے حالات سے زیادہ واقف تھے اور ان سے دس بارہ سال پہلے سے کالج میں موجود تھے اس لطیفہ کو داؤد مرحوم ہی کی شگفتہ طبعی سے منسوب کرتے رہے ہیں۔ علاوہ بریں گوہر صاحب کے کالج میں داخل ہونے سے بارہ برس پہلے سے کاندھلہ کا یہ خاندان وہاں موجود تھا۔ مولوی محمد اکبر مرحوم ۱۸۷۵ء سے عربی کے استاد تھے اور ان کے چھوٹے بھائی محمد سلیمان مرحوم بورڈنگ کے مینیجر تھے۔ یہ دونوں بھائی سرسید کے استاد مولوی نور الحسن کے فرزند تھے اور مولوی نور الحسن مفتی الٰہی بخش مرحوم ساکن کاندھلہ کے پوتے تھے۔ مفتی صاحب نے مثنوی مولانا روم کا ساتواں دفتر لکھا تھا جو طرزِ ادا میں مولانا رومی کے کلام کے ہم پایہ تھا۔ مفتی صاحب اپنے زمانہ کے جید عالم ہونے کے باوجود بڑے سادہ مزاج اور سید احمد شہیدؒ کے دست گرفتہ تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ساری عمر ہم نے مذہبی علوم کو پیسا' وہ دلیا تھا سید احمد شہید سے بیعت کرنے کے بعد وہ میدہ ہوا۔ سرسید کو چونکہ اس خاندان سے شاگردی کا تعلق تھا انھوں نے کالج کی ابتدا ڈالنے کے وقت سے ہی مولوی محمد اکبر اور مولوی محمد سعید کو کالج میں لا کر رکھا۔ مولوی محمد اکبر کے بڑے بیٹے بدر الحسن (بھائی بدو) ۲۶ جون ۱۸۷۵ء کو کالجیٹ اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۸۸۵ء سے فورتھ ایر سے تعلیم چھوڑ کر کچھ عرصہ اسکول میں مدرس رہے پھر سید محمود مرحوم کی سفارش سے منصف ہوئے اور سب جج تک ترقی کی۔ علاء الحسن ۱۸۷۷ء میں جب داؤد صاحب مرحوم نے داخلہ لیا ہے اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۳ء میں بی-اے پاس کیا۔ سید محمود مرحوم کی سفارش پر ڈپٹی کلکٹر ہوئے ان کے فرزند ظہیر الحسن بی-اے رئیسِ کاندھلہ ہیں۔ مولانا محمد علی نے یہ شعر بھی غلط نقل کیا ہے۔ بعض الفاظ کا ردّ و بدل ہو گیا ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے صحیح لکھا ہے' دونوں کے فرق کا اندازہ اہلِ ذوق بخوبی کر سکتے ہیں۔ آتش کے مشہور شعر کا پہلا مصرعہ بھی مولانا غلط لکھ گئے ہیں۔ اصل مصرعہ ہے:

؏ زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف

اس میں تصرف کر کے داؤد صاحب نے فرمایا تھا ؎

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے سر پہ گنج
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

(عباسی)

یہ سب اس گئے ہوئے پُرلطف زمانہ کی یاد تھی جو آ گئی اور علی گڑھ کی موجودہ تباہی پر ایک بار اور آنسو گروا گئی۔ بھلا اس کو کس طرح تقریظ کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام داؤد صاحب مرحوم کے اشعار کو خود ہی پڑھیں گے اور ان کا حظ اٹھائیں گے میں حاجب اور دربان بن کر ان کو زیادہ دیر تک روکنا نہیں چاہتا۔ پردہ اٹھا دیا گیا، دروازہ کھلا ہے، آگے بڑھیے اور داؤد صاحب کی شگفتہ ترین طبیعت سے ملاقات کیجیے اور ان کی روح پر فاتحہ پڑھ جائیے۔ میں بھی دست بدعا ہوں اور اشک ریز، لیکن اس دیدۂ تر کے ساتھ ہی ساتھ اس وقت ہونٹوں پر تبسم آئے بغیر بھی نہیں رہتا جب اس کا خیال آتا ہے جو لڑکا آج سے ۳۸[1] برس پیشتر داؤد صاحب کی وضع قطع پر تعجب کرتا تھا کہ علی گڑھ جیسے مقام پر رہ کر وہ لانبے بال رکھتے ہیں اور امروہہ کی کشتی نما ٹوپی اوڑھتے ہیں، گلے میں رومال باندھتے ہیں اور دیسی اچکن پہنتے ہیں اور دہلی کا سلیم شاہی جوتا، آج اس کے بال بھی ان ہی کی طرح لانبے ہیں، وہ بھی گاڑھے کا کرتا اور پاجامہ پہنے بیٹھا ہے، ایک نئی وضع کا جوتا پیروں میں ہے، داڑھی لانبی ہے، اچکن بھی نہیں بلکہ عبا پہنے ہوتے ہے اور علی گڑھ ہی نہیں آکسفورڈ بھی پڑھ چکا ہے اور اس وقت پی اینڈ او کمپنی کے جہاز پر صاحب لوگوں اور میموں اور فیشن ایبل ہندوستانیوں کے درمیان "ڈیک" پر بیٹھا ہوا یہ "تقریظ" لکھ رہا ہے اور مرتے مرتے یورپ کے دستِ شفا کو بھی آزما دیکھنے کی غرض سے عازمِ انگلستان ہے۔

ع رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

(غیر مطبوعہ)

(عطیہ محمود احمد عباسی)

---

[1] مولانا مرحوم نے یہ تقریظ ۱۹۲۸ء میں لکھی تھی جب وہ بغرضِ علاج انگلستان کے سفر پر جا رہے تھے۔

شعر اور زندگی

ڈاکٹر یوسف حسین

آرٹ یا شاعری کی جب اجتماعی توجیہ کی جاتی ہے تو ذہنی و فکری تصورات ایسے چھا جاتے ہیں کہ انفرادیت میں تخیل اور جذبے کی جو کارفرمائی ہوتی ہے وہ نظر انداز ہو جاتی ہے۔ غالب کے کلام کو اگر صرف اس نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ مغلیہ سلطنت کے زوال آمادہ جاگیری نظام سے وابستہ تھے تو یہ بات یک طرفہ ہوگی۔ غالب کی انانیت ان کی شانِ امارت اور طبقاتی زندگی کا عکس سہی لیکن میر صاحب کی انانیت کی کیا توجیہ کیجئے گا جو ایک متوسط طبقے کے فرد تھے میں سمجھتا ہوں کہ ان کی انانیت غالب کی انانیت سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس قسم کی سائنٹیفک توجیہ اکثر میکانکی بے جان اور بے لطف ہو جاتی ہے۔ جس میں من مانے طور پر بندھے ٹکے اصول مدِ نظر ہوتے ہیں جو زندگی کی پیچیدگی پر پوری طرح سے حاوی نہیں ہو سکتے۔ ان سے کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ انفرادیت میں تخیل اور جذبے کے نقش و نگار بھی خارجی احوال کا عکس ہوتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جذبہ و تخیل پر خارجی حالات کا اثر ہوتا ہے اور اگر کسی شاعر کے گردوپیش کے حالات کا علم ہو تو اس کے کلام کو سمجھنے میں ایک حد تک مدد ملے گی۔ اگر یہ حالات بدل جائیں گے تو شاعر کے تجربوں میں بھی یقینی طور پر تبدیلی پیدا ہوگی۔ قحط سالی کے زمانے میں عشق و عاشقی کے مشغلے میں اگر کمی آ جائے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ شیخ سعدی نے اسی نفسیاتی حکمت کی طرف نہایت بلیغ اشارہ کیا ہے۔

چناں قحط سالے شد اندر .....
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس شعر میں حقیقت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اور عام طور پر انسانوں کی نفسی کیفیات کو دیکھتے ہوئے اس کی صداقت غیر مشتبہ ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ اس کی فوری جبلّی ضرورت اس تقاضے پر حاوی آ جاتی ہے جو فوری نہیں ہے، آخر الذکر کے نقوش دھندلے پڑ جاتے ہیں اور اسی مناسبت سے ان کا احساس مبہم ہو جاتا ہے۔ مثلاً قحط کے زمانے میں جبلت کی ساری قوتیں روٹی کے حصول پر صرف ہوں گی۔ یا اگر کسی کو دشمن سے نبٹنا ہو جو جان کا لاگو ہے تو ایسی حالت میں جنسی جبلت عارضی طور پر دب جائے گی۔ ایسا ہونا قدرتی ہے اور زندگی کی حکمت کا یہی تقاضا ہے۔ ایسا ہونے کی ضرورت اس واسطے ہے تاکہ ارادے اور ہیجان کی سب توانائیاں فوری مقصد کے حاصل کرنے میں مؤثر بن سکیں اور ایسا نتیجہ برآمد ہو

جو مجموعی طور پر زندگی کو ترقی اور فروغ دینے والا ہو۔ خارجی عالم میں زندگی کا یہ عمل لازمی طور پر افادی پہلو لئے ہوتا ہے جو ہمارے شعور کی سطح پر چھا جاتا ہے۔

ممکن ہے قحط سالی کے زمانے میں بار لوگ عشق کو فراموش کر دیں لیکن قحط کے کم ہوتے ہی دبی ہوئی خواہشوں کے چشمے اُبل پڑیں گے اور ان کی شدّت معمول سے زیادہ ہو گی۔ اور غالب کا تو یہ خیال تھا کہ جذبہ خارجی احوال کے آگے چاہے وہ کیسے ہی نامساعد اور ہمّت شکن کیوں نہ ہوں اپنا سر نہیں جھکاتا۔ اس کے اسباب خود اس کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس شعر میں اسی جانب اشارہ ہے۔ ؎

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

فارسی اور اُردو شاعری میں فرہاد ایک علامتی ہستی ہے۔ وہ انوکھا مزدور ہے۔ وہ پیٹ کے لئے نہیں بلکہ عشق کے لئے مزدوری کرتا ہے! اس کے عمل نے زندگی کی معاشی تعبیر کو باطل ثابت کر دیا ہے۔ غالب نے ان سب باتوں کو جانتے ہوئے بھی ایک جگہ فرہاد کی مزدوری پر چوٹ کی ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کا عشق فرہاد کے عشق سے زیادہ بے لوث ہے۔ شعر ہے ؎

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

دراصل غالب اور شیخ سعدی کے خیال میں تضاد نہیں ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور دونوں میں اصلیت اور صداقت موجود ہے۔ بڑا مفکّر یا حسّاس فن کار اپنے تجربے میں ایک صداقت محسوس کرتا ہے جس سے زندگی کے کسی خاص رجحان پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ صداقت اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ جب کسی سطحی علم والے کے کان میں اس کی بھنک پہنچتی ہے تو وہ اسے ایک مستقل نظریہ بنا دیتا ہے جو اس کے نزدیک قانونِ فطرت کی طرح اٹل ہوتا ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے ہماری شاعری میں سیاسی اثرات کے تحت ایک خاص قسم کی حقیقت نگاری نے راہ پائی ہے اس میں شبہ نہیں کہ عشقِ بتاں کے ساتھ فکرِ معاش کا مسئلہ زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ شعر زندگی کی آئینہ داری اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ اس میں تمدنی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے میں سمونے کی صلاحیت ہو۔ انسانی زندگی کے پیچیدہ نظام میں معاشی عمل کی اہمیت واضح ہے۔ اس مضمون میں بھی احساس کی اصلیت اور صداقت اسی طرح پیدا کی جا سکتی ہے جس طرح عشق و عاشقی کے مضمون میں۔ اب تک ہمارے شاعروں نے تجمل حسین خاں کے عیش کا ذکر کیا لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب تجمل حسین خاں کے عیش میں کلّو اور کلیان بھی برابر کی شرکت کے دعویدار ہیں[1]۔ اس

---

[1] غالب کے ممدوح نواب تجمل حسین خاں والئی فرخ آباد کی طرف اشارہ ہے جن کی مدح میں غالب نے ایک قطعہ لکھا تھا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے

کلّو غالب کا خاص نوکر تھا۔ کلیان بھی ان کے ملازم کا نام ہے جو کہار تھا۔

حقیقت کو کوئی ادیب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے غزل کے مقابلے میں نظم میں معاشی نوعیت کے مضمون زیادہ روانی اور خوبی سے ادا ہو سکیں لیکن غزل میں بھی ان کی نسبت اشارے آجائیں تو کوئی قباحت نہیں۔ لیکن ذرا اس کا خیال رہے کہ شعریت مجروح نہ ہو۔ موضوع چاہے کچھ بھی ہو اگر شاعر نے اپنے حسنِ ادا سے شعریت کو برقرار رکھا تو اس کے کلام کا پایہ بلند رہے گا۔ جس طرح کوئی لفظ حقیر نہیں جسے شعر میں نہ استعمال کیا جا سکے اسی طرح کوئی موضوع ایسا نہیں جسے شاعر نہ برت سکے۔ ممکن ہے "تنگ نائے غزل" کی نسبت نظم میں سماجی اور اخلاقی مضمون زیادہ اچھی طرح کھپ سکیں۔ اسی لئے آئندہ ہماری زبان کی توسیع اور ترقی میں نظم جو کام کرے گی وہ شاید غزل نہ کر سکے۔

سائنٹیفک تنقید کی اصطلاح آجکل بہت کچھ سننے میں آ رہی ہے۔ اس سے غالباً مراد یہی ہے کہ خارجی احوال سے شعر و سخن کو پرکھا جائے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا خارجی احوال کے مقابلے میں اسی قسم کا ردِ عمل ہوتا ہے جیسے امیبا کا۔ یہ مفروضہ غلط ہے۔ بعض لوگوں کو اس میں شبہ ہے کہ کیا ادبی تنقید واقعی سائنٹیفک ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ اجتماعی علوم نے بھی بزعمِ خود دعوے کیا تھا کہ ہم سائنٹیفک ہیں۔ ان کے اس دعوے کا پول کھل چکا ہے۔ آج سماجیات، معاشیات اور سیاسیات یہ دعویٰ کرتے ہوئے ہچکچاتی ہیں۔ ان علوم کو اپنی نارسائیوں کا روز بروز احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ کیا معاشرتی اور معاشی قانون طبیعات کے قانونوں کی طرح اٹل ہیں۔ اس سوال کا یہ جواب ہے کہ انسانی اعمال کے محرک اور ان کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہیں کہ سائنس کی طرح انھیں سادہ اجزا میں تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ربط و ترتیب اسی وقت قائم ہوتا ہے جب کہ ان کے احوال و اسباب کے سلسلے کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نفسیاتی جائزہ میں بھی سائنس کی سی بے لوثی کبھی نہیں آ سکتی۔ لیکن پھر بھی اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ادب کی طرح اجتماعی علوم میں طبیعی علوم کی طرح بے جان اور بے حس اور بے ارادے مادہ سے بحث نہیں ہوتی بلکہ انسان سے بحث ہوتی ہے جو شعور اور ارادہ اور خواہش رکھتا ہے اور جس کو اپنے احوال میں ایک حد تک تصرف کرنے کی قدرت حاصل ہے۔ وہ مجبورِ محض نہیں ہے اور یہی عقیدہ اس کی اخلاقی بصیرت کا ضامن ہے۔ اسی لئے زندگی کے تمام مظاہر کی تحقیق علمی بھی ہے اور فنی بھی۔ بعض اوقات زندگی کو سمجھنے کے لئے ان غیر عقلی اور جبلی رجحانوں کا کھوج لگانا ضروری ہوتا ہے جو کسی خاص زمانے میں اجتماعی یا انفرادی زندگی میں محرک ہوتے ہیں۔

خارجی احوال کے علاوہ فن کار کی روحانی آزادی کو بھی ماننا چاہیئے۔ اعلیٰ درجے کے آرٹ کی تخلیق کسی بندھے ٹکے اجتماعی پروگرام کے تحت عمل میں نہیں آتی۔ جس میں انفرادیت کا وجود موجود نہ ہو۔ جن قوموں میں عام لوگوں کی تعلیم کا معیار اچھا خاصا ہے ان میں بھی فن کار اپنے آرٹ کو عوام کی ذہنی اور جذباتی سطح پر نہیں لاتا بلکہ عوام کو اپنے بلند معیار تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ دُنیا کے جتنے بھی بڑے فن کار یا شاعر ہوئے ہیں انھوں نے عوام سے اپنا رشتہ رکھتے ہوئے بھی اپنے معیار کو ان کی ذہنی سطح سے بلند رکھا ہے۔ دانتے، شیکسپیئر، گوئٹے اور غالب اپنے اپنے ماحول سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اس سے کس قدر بلند ہیں۔ گرد و پیش کے اثر کے باوجود ان کے کلام میں کس قدر عالمگیریت ہے۔

جس طرح سیاست و معیشت میں بنیادی سوال یہ ہے کہ فرد کا سوسائٹی سے کیا تعلق ہے اسی طرح آرٹ کا بھی

یہی بنیادی مسئلہ ہے۔ جدید تہذیب کا بڑا عیب یہ ہے کہ وہ ذہن کو میکانکی پستی کی طرف لے جاتی ہے۔ فن کار سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بنے بنائے سانچوں کے مطابق اپنی تخلیق کرے تاکہ پہلے سے مقرر کی ہوئی سماجی ضروریات کی تکمیل ہو۔ یہ سانچے ایسی معاشری قدروں پر مبنی ہوتے ہیں جن سے فنکار چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ وہ معاشیات کے رسد و طلب کے قانون کی پابندی اپنے فکر و فن میں بھی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کے تمدن میں کام کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ انسان کی روح سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ انسان اپنے کام میں کوئی تخلیقی لطف اور جوش نہیں محسوس کرتا۔ آج کسی کارخانے میں مشین کا کام کرنے والے کی حیثیت ازمنہ وسطیٰ کے کاریگر سے بنیادی طور پر مختلف ہے جو اپنی کاریگری میں اپنی شخصیت کا ایک جزو رکھ دیتا تھا۔ آج مشین پر کام کرنے والا صرف ایک پرزہ یا مشین کے ایک حصّہ کی نسبت واقفیت رکھتا ہے اور اسی حد تک اپنے کام کو محدود رکھتا ہے۔ اس کے کام کی تخصیص پوری مشین سے بھی اس کا کوئی عقلی یا جذباتی تعلق نہیں قائم ہونے دیتی۔ اسی لئے اس زمانے کا مزدور یا کاریگر اپنے کام میں کوئی لطف یا شوق نہیں محسوس کرتا۔ اس کا کام بھی میکانکی ہو کر رہ گیا ہے جس میں حُسن نام کو نہیں۔ اسی لئے جدید تمدّن کی مشقت انسانی صلاحیتوں پر بڑا ظلم ہے اس تخصیص میں کتنی ہی افادیت کیوں نہ ہو لیکن انسانی تخلیق سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ اس سے انسانی روح کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اس سے فرار کی شکلیں تلاش کرتا ہے جو نت نئے انقلابوں کا روپ دھارتی ہیں۔ اشتراکی سماج بھی اس مسئلہ کا کوئی ایسا حل نہیں پیش کر سکا جسے تشفی بخش کہا جا سکے۔ انسانی تخلیقی آزادی پر اس لئے بھی طرح طرح کی روکیں لگادی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ادبی تخلیق یہاں بھی سماجی پابندیوں سے دب کر رہ گئی ہے۔ ادب کو یقیناً سماج سے بے تعلق نہیں ہونا چاہیئے لیکن اگر کسی سماج میں فن کار کو پوری آزادی میسّر نہیں تو وہ جمالیاتی قدروں کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ فن کاری کا ایک انتہائی نظریہ یہ تھا کہ وہ موسیقی ہو جائے اور اب دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ صحافت بن جائے۔ جدید فن کاری کو ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اپنی راہ نکالنی پڑے گی اگر وہ انسانی قدروں کو فروغ دینا چاہتی ہے۔

شعر کی تخلیق طلسمی دنیا میں ہوئی۔ مذہب کے دامن میں اس نے ابتدائی نشو و نما پائی۔ عقل اور شائستگی نے اس کے جوبن کو نکھارا اور عشق و محبت نے اس سے مستی اور سپردگی کا مواد فراہم کیا۔ اب پروپیگنڈہ سے اس کی جان پر بن آئی ہے جس سے اس کو بچانا ضروری ہے۔ جدید تمدن کا اوچھا پن شاعر اور ادیب کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ اس کے خارجی ہیجانات میں افیون کی سی خاصیت ہے جس کے سبب سے ذہن اور شعور ماؤف ہو رہے ہیں۔ شاعر اور فن کار ان حالات میں کیا کریں؟ اگر وہ اپنے ماحول سے متاثر ہو کر اس کی رَو میں بہہ جائیں تو وہ اپنی اندرونی پکار پر لبیک نہیں کہتے بلکہ خارجی حالات کا کھیل بن جاتے ہیں۔ جدید انسان تمدّن کے خالق کی حیثیت سے خود اپنی مخلوق کی پیچیدگیوں اور گتھیوں سے گھبرا اُٹھا ہے۔ وہ خود اپنے آپ سے فرار چاہتا ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں۔ جس طرح انسان کے جسم کی بیماریاں اس کے ساتھ مرتے دم تک ہیں اسی طرح اس کے روح کی بیماریاں بھی اس سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ وہ اپنی روح سے کتنا ہی بچنا اور چھپنا چاہے وہ نہیں چھپ سکتا۔ ادب کا کام ہے کہ اس کو نہ چھپنے دے۔

ہر اعلیٰ درجے کے فن کار کی نظر میں حقیقت کی بدلتی ہوئی شان ہوتی ہے اسی لئے وہ کسی ایسے بندھے ٹکے اصول

کا پابند نہیں کیا جا سکتا جو کسی عارضی سیاسی یا سماجی مصلحت کا نتیجہ ہو۔ وہ اپنے گرد و پیش کی آئینہ داری کرتے ہوئے بھی اس کی پرورش اپنے تخیل میں اس طور پر کرتا ہے کہ مستقبل کے امکان اُجاگر ہو سکیں۔ وہ انسانیت کی پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی زندگی کا دلدادہ ہوتا ہے جس میں حقیقت کے مختلف رنگوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر فن کار کی روح آزاد نہیں تو وہ نقالی کا کام تو کر سکتا ہے لیکن تخلیق کا فرض انجام نہیں دے سکتا۔ جب وہ سماجی انقلابوں میں سے گزرے گا تو ان کے پیچ و خم کو اپنی روح سے وابستہ کرے گا تاکہ وہ تخلیق کے محرک بنیں۔ چونکہ زندگی کی دائمی حرکت اور اس کی بے کمالی اور ناتمامی پر اس کی نظر ہوتی ہے اس لئے وہ اس کو خارجی حقیقت سے کہیں زیادہ بلند اور برتر تصور کرتا ہے۔ وہ خارجی حقیقت کو غور سے دیکھتا ہے لیکن اس کو اپنا وجود زیادہ اہم نظر آتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے ذریعہ کائنات کی خواہشوں اور مسرتوں اور غموں میں شرکت کرتا ہے۔ اگر فن کار کو خود اپنے وجود کی اہمیت کا گہرا احساس ہے تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ اس کو کائنات کی صداقت کا بھی گہرا احساس ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تخیل اور جذبے کے اندرونی تجربے میں خارجی حس کے تجربے سے زیادہ صداقت اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ تخیل کافی بالذات بن جاتا ہے اور اپنے اُوپر اس کو اتنا اعتماد حاصل ہو جاتا ہے کہ اپنی رمزیت میں خارجی حقیقت کو سمو سکے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے دل کی داخلی حقیقت باہر کی ناتمام اور غیر مکمل حقیقت کی جگہ لے لیتی ہے۔ یہ جذبے اور تخیل کی ہم آمیزی کی کرامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ درجے کا فن کار جب کسی معمولی اور جانی بوجھی بات کو بیان کرتا ہے تو اس کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے اور اس میں عجیب انوکھا پن اور اپج پیدا ہو جاتی ہے۔

جدید زمانے کا انسان آج اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی جس منزل میں ہے وہاں وہ یہ سوچ رہا ہے کہ آیا زندگی اس قابل ہے بھی کہ زندہ رہا جائے۔ اس میں ایک عجیب جھنجھلاہٹ، اُلجھن اور بے زاری کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ فرد اپنی شخصیت کھو چکا ہے چاہے اس کا تعلق سرمایہ داری کے نظام سے ہو یا اشتراکی نظام سے۔ قدروں کا احترام اُٹھ گیا۔ تلوّن، برہمی اور بے اعتباری کا ہر طرف دَور دَورہ ہے جس کا اظہار خاص طور پر سیاست کے میدان میں ہو رہا ہے۔ دل عقیدت اور محبت سے خالی ہیں۔ بغیر عقیدت کے محبت کا نرم اور نازک پودا کیسے پنپ سکتا ہے۔ آرٹ اور ادب کا یہ کام ہے کہ وہ زندگی کے کھوئے ہوئے توازن کو پھر سے قائم کرنے میں مدد کریں۔ زندگی کی بے زاری کو دُور کریں۔ انسانیت کی محبت کو عقیدت کی بنیادوں پر استوار کریں۔ صنعتی دَور کے بعد نہ صرف انسانی زندگی بلکہ خود فطرت اپنے اصلی حُسن سے محروم ہو گئی ہے۔ آرٹ دونوں کے لٹے ہوئے حُسن کو پھر بحال کر سکتا ہے۔ سوائے اس کے یہ کام اور کوئی نہیں کر سکتا۔ علم اگر اس کی کوشش کریگا تو اس کو کبھی بھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ وہ اور اُلجھاؤ پیدا کرے گا۔

اب تک مغربی ادب میں کلاسکی ہیومن ازم کے اثرات کام کر رہے تھے لیکن کچھ عرصے سے نئے محرک کارفرما ہیں جن کے اثر سے نہ زندگی بچ سکی ہے اور نہ ادب۔ جدید زمانے کا فن کار پُرانی قدروں کی جگہ نئی قدریں بنانا چاہتا ہے اس واسطے کہ پُرانی دُنیا کی جگہ نئی دُنیا بسانے کا اسے حوصلہ ہے وہ صرف جمالیاتی طلسمی کیفیت سے متاثر نہیں بلکہ وہ زندگی کے مختلف اور پیچیدہ مسائل کی نسبت اپنے حل پیش کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اپنے دعوے میں کامیاب نہیں معلوم ہوتا۔ ایمجسٹ، سمبولسٹ اور سوریلسٹ فن کار اب تک کوئی مکمل فلسفہ حیات نہیں پیش کر سکے۔ وہ پُرانی قدروں کی جگہ کوئی نئی قدریں نہیں لا سکے جو زندگی کے مہیب

خلا کو پُر کر سکیں۔ یہ خلا روز بروز مہیب سے مہیب تر ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی کے حقائق میں جو تعلق پائے جاتے ہیں ان کو ذہنی طور پر درہم و برہم کرنا کافی نہیں جب تک کہ ان کی جگہ دوسرے حقائق نہ لائے جائیں جو زندگی پر حاوی ہوں۔ سوریلسٹ فن کار تحت شعوری تلازموں کو شعوری تلازموں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اچھا ترجیح دیں، انھیں اختیار ہے۔ لیکن نتیجہ کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ کسی چمن کے ایک تختے میں وہ حسین مجسمے کو دیکھیں انھیں وہ مجسمہ کسی غلاظت سے بھرے ہوئے گڑھے میں پڑا نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کبھی ایسا اتفاق ہو جائے کہ حسین مجسمہ غلاظت کی آلودگیوں میں لتھڑا نظر آئے لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا یہ معمول تو نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی مانا کہ سوریلسٹ فن کار کو ایسی تحت شعوری کیفیت محسوس کرنے کا حق ہے جس میں خواب کی سی بے ترتیبی اور اُلٹا پن پایا جاتا ہو۔

ہم اُلٹے بات اُلٹی یار اُلٹا

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی تحت شعوری کیفیت محسوس کرنے سے زندگی کے مسائل حل ہو جائیں گے۔

سوریلسٹ شاعروں کی انفرادیت پسندی کے ڈانڈے نراج سے جا کر مل جاتے ہیں۔ ان کے ہاں تحت شعور میں اس قدر غلو برتا گیا ہے کہ گویا عقل و فکر کو زندگی میں کچھ دخل ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس اسکول کے فن کاروں کے ہاں نہ صرف اخلاقی بلکہ جمالیاتی قدریں بھی باقی نہیں رہیں۔ ان کے بیان کی بے ترتیبی اور ایچ پیچ مضمون کو اتنا تنگ و تاریک بنا دیتا ہے کہ پڑھنے والے کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ وہ لفظوں کی بھول بھلیوں میں ایسا گم ہوتا ہے کہ ان سے باہر نکلنے کا راستہ بھی اسے نہیں ملتا۔ یہی حال سمبولسٹوں کا ہے۔ بودلیر، رمبو، ورلین، ملارمے اور اس طرز کے دوسرے شاعروں نے جو جیستانی ابہام کی بنا ڈالی اس کا اثر اب تک باقی ہے۔ پال ویلیری نے اپنی سنجیدگی سے ہر چند سمبولسٹوں کی بے راہ روی کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس طرز کے پیرو لفظوں کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور زندگی کی حقیقت سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ کم و بیش یہی کیفیت امیجسٹ کی ہے۔ ان کے خیالی تلازموں تک رسائی حاصل کرنا کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق ہے۔ بیان کی بے تکلفی تو انھیں چھو کر بھی نہیں گئی۔ لیکن ان کے عالمِ تصویر میں بعض ایسی صداقتیں ہیں جن کی طرف سے ادب و شعر آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔ غرض کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی ادب کے ان مختلف طرزوں اور دبستانوں میں بعض باتیں ایسی ہیں جن سے ہمارا ادب فائدہ اُٹھا سکتا ہے بشرطیکہ ذوق کی رہنمائی شاملِ حال رہے۔ اور محض نقالی کا شیوہ نہ اختیار کیا جائے۔ مغربی ادب کی ان مختلف تحریکوں سے ہم انتخاب تو کر سکتے ہیں لیکن پیروی کسی کی بھی نہیں کرنی چاہیے۔

مغربی ادب کے جدید رجحانوں میں سینما، ریڈیو اور اخباروں سے اور زیادہ پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ سینما کی تکنیک یہ ہے کہ کسی جذباتی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے مختلف واقعات کے الگ الگ ٹکڑے جوڑ دیئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان ٹکڑوں میں مبہم سا تعلق ہوتا ہے جو پوری داستان کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ریڈیو اور اخبار بھی زندگی کی تصویر کے الگ الگ ٹکڑے پیش کرتے ہیں۔ سمبولسٹ شاعر کی علامتوں اور امیجسٹ شاعر کی لفظی تصویروں میں کچھ اسی قسم کی کیفیت ملتی ہے۔ ان کی باتیں اَن مل بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں ان میں تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق جیسے تحت شعوری تلازموں میں

پایا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں عقل و شعور بھی تحت شعور کی نقالی پر اتر آئے ہیں۔ لیکن کیا واقعی شعور اور تحت شعور کے بیچ میں ایسی خلیج ہے جو پُر نہیں ہو سکتی۔ کہیں یہ تو نہیں کہ جس طرح وجدان اور عقلِ کُلّی کے ڈانڈے مل جاتے ہیں اسی طرح شعور اور تحت شعور بھی ایک دوسرے سے اتنے دُور نہ ہوں جتنا کہ تحلیلِ نفسی کے ماہر ظاہر کرتے ہیں۔ جدید تمدن و تہذیب کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ جس طرح اس نے وجدان اور عقل کے الگ الگ خانے بنائے اسی طرح اب شعور اور تحت شعور کو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق خیال کیا جا رہا ہے۔ جدید تہذیب کی بنیادی بے آہنگی یہی ہے۔ آرٹ ور ادب میں ایک طرف تحت شعور کے علم برداروں کی جماعت ہے جس میں سمبولسٹ، امیجسٹ اور سوریلسٹ شامل ہیں جن کے نزدیک انفرادیت یا نرگسیت ہی ادب کی جان اور ایمان ہے۔ اور دوسری طرف اشتراکی نقاد ہیں جو شعور و عقل کے اجتماعی معیار کے علاوہ ادب اور آرٹ کو کسی اور کسوٹی پہ پرکھنا نہیں چاہتے اور ان کو سائنس کا جزو بنا دینے پر مصر ہیں۔ جدید تمدن کی اندرونی کشاکش انہی رجحانوں کے تصادم کا نتیجہ ہے۔ آج یہ دونوں رجحان ہمارے ادب میں بھی آ چکے ہیں ن کی وجہ سے ہمارے فن کاروں کی ذہنی اُلجھنیں بڑھ گئی ہیں۔ یہ کوئی افسوس کی بات نہیں۔ مجھے توقع ہے کہ یہ اُلجھنیں ہمارے دب کو مالا مال کریں گی اور ان کی بدولت ہمارے فن کاروں کی تخلیقی صلاحیتیں اُجاگر ہوں گی۔ جس طرح بیسویں صدی کے انگریزی زبان کے سب سے بڑے شاعر ایٹس کے یہاں ان سب رجحانوں کے امتزاج سے ایک خاص نزاکت اور لطافت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے اسی طرح ہمارا ذوق بھی ان مختلف رجحانوں میں توازن قائم کرنے میں کامیاب ہو گا۔

تحلیلِ نفسی کے ماہروں نے شعر اور زندگی کی جو توجیہہ پیش کی ہے اس کی رو سے ذہن کو شعور اور تحت شعور رلاشعور) کے الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ لیکن ذہنی زندگی تو ایک کل ہے جو دونوں پر حاوی ہے۔ شاعر اس کل کو اس کے ٹکڑوں کی خاطر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ انسان کا عمل شعوری ارادے سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس ارادے کی تہ میں کیا ہے۔ تحت شعوری قوتوں کو جاننا ضروری ہے جب تک کسی انسان کی دبی ہوئی خواہشوں اور یادوں و نہ معلوم کیا جائے اس کے عمل کی صحیح توجیہہ ممکن نہیں۔ جدید شاعری میں چونکہ شعوری اور تحت شعوری ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق کر دیا گیا ہے اس لئے وہ ایسے مبہم اشاروں کا مجموعہ ہو گئی ہے کہ اچھا خاصا پڑھا لکھا شخص ان کو نہیں سمجھ سکتا ظاہر ہے کہ جب تک اس شاعری کے سننے والوں یا پڑھنے والوں کے ذہن میں وہی تلازمات (ایسوسی ایشن) موجود نہ ہوں وشاعر کے ذہن میں شعر کہتے وقت تھے اس وقت تک وہ اس شاعری کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس وجہ سے ہمیں جدید مغربی شاعری میں عجیب بے تکا پن سا محسوس ہوتا ہے جو مجذوب کی بڑ سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن آپ اس قسم کا بے تکا پن حافظ، گوئٹے اور غالب کے یہاں نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان استادوں نے وجدان اور عقل اور شعور اور تحت شعور کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے انسانی فطرت اور ذہن کی سالمیت کو برقرار رکھا۔ ہماری ادبی روایات بھی اسی جانب اشارہ کر رہی ہیں۔ یہ روایات جدید نفسیات کی بنیادی صداقتوں کو جذب کرتے ہوئے ہمارے ادب کو بے راہ روی سے بچا سکتی ہیں۔

انسان کا تجربہ پورے انسان کا ہونا چاہیئے نہ کہ اس کی زندگی کے کسی ایک رُخ کا۔ اس میں داخلیت اور خارجیت

دونوں کو اپنا اپنا مقام ملنا چاہیئے۔ بغیر اس کے جذباتی اور ذہنی انتشار سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ بالزاک نے اپنے ناول "لے شے دورا ین کنو" ("LE CHEFD OAMR INCONNU") میں اس قسم کی ایک رخی زندگی کا بڑا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کا ہیرو مصوّری سے دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ ایک تصویر کھینچتا ہے جس میں رنگوں کی افراتفری اور ابتری اپنی انتہائی صورت میں نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے تصویر میں بے تکاپن پیدا ہو گیا ہے۔ اسی تصویر کے ایک کونے میں عورت کی ٹانگ ایک طرف کو نکلی ہوئی ہے۔ یہ ٹانگ کسی انسان کی نہیں بلکہ کسی بھوت کی ٹانگ معلوم ہوتی ہے اس کا انداز بہت کچھ امپریشن اسٹ مصوری کے طرز سے ملتا جلتا ہے جس کے جذباتی انتشار کو آجکل حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بالزاک نے جس کا آرٹ سماجی اہمیت میں رچا ہوا ہے۔ اس تصویر کے ذریعہ دروں بینی کا مذاق اُڑایا ہے اس کا خیال بالکل درست ہے۔ ادیب اور فن کار کا فرض ہے کہ وہ ایسا مثالی نمونہ پیش کرے جو اصلیت پر مبنی ہو۔ اندرونی زندگی بالکل خود مختار تو نہیں کہی جا سکتی اور نہ وہ ایسے آزاد قوانین کے تحت نشو و نما پاتی ہے جو گردوپیش کی دُنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں۔ انسانوں کے جذبات اور خیالات بڑی حد تک اس کشمکش سے وابستہ ہوتے ہیں جو انھیں اجتماعی زندگی میں پیش آتی ہے۔ فن کار کا فرض ہے کہ وہ اُوپر، اندر، باہر سب طرف دیکھے اور اصلیت اور صداقت کا جہاں کہیں بھی وہ ملے خیر مقدم کرے۔ یہ صداقت ذہنی تجربہ نہ ہو بلکہ جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث مجازی اور انسانی ہونی چاہیئے۔ زندگی کی اصلیت اور صداقت کا یہ بھی اقتضا ہے کہ تہذیب و ادب کو حیوانی عناصر سے جہاں تک ممکن ہو الگ کر کے انسانی بلندی تک لے جائے۔ اس لئے شاعر یا فن کار کا موضوع چاہے کچھ ہی ہو وہ اپنے آپ کو اخلاق سے بے نیاز نہیں کر سکتا اور اگر وہ ایسا کریگا تو یقیناً اپنے فن میں ایک عیب کو راہ دے گا جس سے اس کے کمال کو بٹا لگ جائے گا۔ شاعر کا یہ کام ہے کہ اس کا موضوع چاہے خارجی حقیقت سے تعلق رکھے یا داخلی سے وہ ہمیں اس کا براہِ راست جلوہ دکھا دے اور ہمیں ایسا محسوس ہو جیسے وہ پردہ جو فطرت اور ہماری خودی کے درمیان اور خود ہمارے شعور اور ہمارے درمیان پڑا ہوا تھا اچانک طور پر ہٹ گیا۔ معلوم ہوتا ہے غالب کو اس بات کا احساس تھا کہ اعلیٰ درجے کے آرٹ میں خارجیت اور داخلیت شعور اور تحت الشعور اور بیداری اور خواب میں فرق و امتیاز باقی نہیں رہنا چاہیئے جس کی نسبت اس کے اس غیر مطبوعہ شعر میں اشارہ ہے۔

ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالب
جو جاگنے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

(آسی شرح غالب ص ۲۱۵)

یورپ کے جدید ادب میں بعض بنیادی صداقتیں ہیں جن کے معنی خیز ہونے میں کلام نہیں۔ ان کو ہمارا ادب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن انھیں جس یک طرفہ انداز میں برتا گیا ہے اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو ان صداقتوں کے اصلی عناصر غزل میں صدیوں سے موجود رہے ہیں۔ سمبولسٹ کی رمز و علامت، امیجسٹ کی لفظی تصویر کشی اور سوریل اسٹ کی تحت شعوری الجھن یہ سب کسی نہ کسی شکل میں غزل میں آپ کو ملیں گے۔ ہمارے غزل نگاروں نے شعر کے سب عناصر کو اس خوبی سے برتا ہے کہ ان میں معمے کی کیفیت نہیں پیدا ہونے پائی۔ اگر تعقید ابہام کی حد سے آگے بڑھ گئی تو وہ شعر کا عیب

سمجھا گیا ہے۔ اس کو اچھی نظر سے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ استعارہ، کنایہ اور رمز میں اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ معانی آفرینی کے باوجود ذہنی تلازم ایک دوسرے سے بہت دور نہ جا پڑیں اور تخیل کا دامن ادبی ضبط و توازن سے بندھا رہے۔ اس طرح اجتماعی فہم و تنقید فن کار کو بھٹکنے سے روکتی ہے۔ جتنا بلند تخیل ہوگا اتنا ہی بھٹکنے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ غالب کو اپنی مشکل پسندی بہت کچھ اسی اجتماعی تنقید کی وجہ سے چھوڑنی پڑی تھی۔ ان کے دوستوں نے جن میں خاص طور پر مرزا خانی اور مولوی فضل حق خیرآبادی کا نام لیا جاتا ہے انھیں مشورہ دیا کہ سننے والوں کی خاطر رمز و استعارہ کی پیچیدگی کو ذرا کم کریں۔ بعض طنز نگاروں نے یہ پھبتی بھی کس دی۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

انھیں باتوں کو سن کر غالب کو کہنا پڑا۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ہمیں معلوم ہے کہ شروع شروع میں غالب اس قسم کی تنقید پر بہت جھنجھلائے لیکن پھر بھی انھوں نے اس کا اثر قبول کیا اور پرانی روش کو بڑی حد تک ترک کر دیا۔ اگرچہ ان کے سہل ممتنع میں بھی خیال کی نزاکت اور رمز و استعارہ کا الجھاؤ موجود ہے لیکن زبان کی سادگی کی وجہ سے عام لوگ بھی ان کے بعد کے کلام سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس رنگ میں بھی ان کی انفرادیت اور ترنگ باقی رہی۔ یہ حقیقت کا الجھاؤ علامتی طور پر ہی تھوڑا بہت گرفت میں آتا ہے اس لئے اعلیٰ سے فن کار کے یہاں چاہے وہ کتنی ہی سادگی کیوں نہ برتنے کی کوشش کرے مطالب کا تھوڑا بہت اشکال پیدا ہو ہی جاتا۔

حقیقت پسندی کے جوش میں بعض نقاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ شعر کی حیثیت کو اسی حد تک ماننا چاہتے ہیں جس حد تک کہ وہ خارجی سماجی احوال کی ترجمانی کرے۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ خارجی حقیقت جب شعر کا جزو بنتی ہے تو اس کی خاصیت بہت کچھ بدل جاتی ہے۔ جب شاعر کسی منظر کو بیان کرتا ہے تو وہ صرف اس منظر کی بات نہیں کرتا بلکہ خود اپنے متعلق بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہہ دیتا ہے۔ اس کا اسلوب اور اس کا لفظوں کا انتخاب اس کی اندرونی حالت کی چغلی کھاتے ہیں۔ شعر کی تعریف اس کی ظاہری صورت (فارم) اور موضوع سے مکمل نہیں ہوتی اس کی صورت (فارم) ضروری ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ وہ ایک خاص قاعدے کے مطابق ہو لیکن یہ اس لئے ضروری نہیں کہ اس سے شاعر خارجی حقیقت کا فنی تعین کرتا ہے بلکہ اس واسطے ضروری ہے کہ وہ خود ایک روحانی اصول کی حیثیت رکھتی ہے جسے شعر سے کسی حالت میں بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ذریعے حقیقت کی پُراسرار کارفرمائیوں کو ظاہر کرنے میں مدد ملتی ہے۔

سائنٹسٹ کے لئے اس کی ذات سے باہر جو کائنات ہے وہ زیادہ اہم اور معنی خیز ہے لیکن شاعر کے نزدیک اس کی ذات خارجی حقیقت سے زیادہ اہم ہے جو اس کے احساس کو انفرادیت بخشتی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ آیا خارجی حقیقت زیادہ اہمیت رکھتی ہے یا اس کو ادراک و احساس کرنے والی صلاحیت بالکل اسی طرح جیسے ان سوالوں

کا جواب دینا دشوار ہے کہ بھوک زیادہ اہم ہے یا روٹی۔ محبوب کی خواہش زیادہ اہم ہے یا خود محبوب۔ جگرؔ نے اس دشواری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

سب کچھ ہوا مگر نہ کھلا آج تک یہ راز
تم جانِ آرزو ہو کہ ہم جانِ آرزو

شاعر چاہے کتنا بھی حقیقت پسندی کے دعوے کرے وہ اپنے شعر کے لئے جو اسلوب اور موضوع منتخب کرے گا اس میں اس کا ذاتی رجحان لازمی طور پر موجود رہے گا۔ اس کی اندرونی زندگی کا رنگ خارجی تصویر کشی میں اجاگر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کے جذبہ و خواہش کے اُلجھاؤ اور پیچ و خم چھپانے پر بھی ظاہر ہو جائیں گے۔ ہر شاعر اور خاص طور پر غزل گو شاعر اپنے موضوع سے جذباتی تعلق رکھتا ہے اور اگر نہ رکھے تو وہ شعر کا حق نہیں ادا کر سکتا۔ ضروری ہے کہ وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں اندرونی زندگی کے نغمے پہلے خود سُنے۔ اس کے بعد ہی اس کو یہ طاقت حاصل ہو گی کہ اپنے سُننے والوں کے شعور اور دل میں جو پردہ حائل ہے اسے اُٹھا دے تاکہ وہ اپنی اندرونی زندگی کو بہ نسبت پہلے کے بہتر سمجھنے لگیں۔ جب شاعر اپنے موضوع کو زبان و بیان کا جامہ زیب تن کراتا ہے تو غیر شعوری طور پر وہ اس کو اپنے جذباتی اور ذہنی نظام کا جزو بنا لیتا ہے۔ یہ جذباتی اور ذہنی نظام شعور اور تحت شعور دونوں پر حاوی ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ اس زمانے کے ادب اور آرٹ کا عام رجحان یہ ہے کہ زندگی کے خارجی احوال کو زیادہ اہمیت دی جائے اور ان کا اظہار کیا جائے۔ چنانچہ ہمارے ادب کے لئے بھی وقت کا سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ اس میں خارجی مسائل کو کس طرح سمویا جائے تاکہ ان کی نسبت ہماری بصیرت میں اضافہ ہو۔ یہ مضمون جب شعر میں ادا کئے جائیں گے تو لازمی طور پر ان میں فکری عنصر داخل کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ فکر تخیلی فکر ہو گی جو جذبے سے ہم آمیز ہو گی۔ اس طرح جب علامتی تخیل میں تصوّر و فکر پیوست ہو جائیں گے تو وہ تجریدی حالت میں نہیں رہ سکتے۔ تخیلی فکر کی قوت اس کی گہرائی میں پوشیدہ ہے۔ یہ قوت صورت پذیری اور طلسم آفرینی کے سارے انداز اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔ وہ جب خارجی حقائق کو اپنے اندر جذب کرتی ہے تو موضوع و معروض کی دوئی باقی نہیں رہتی۔ اس طرح عین اور حقیقت، فطرت اور آزادی، شعور اور لاشعور، انفرادیت اور اجتماعیت کے تضاد دُور ہو جاتے ہیں اور شعر زندگی کے ہر کیف و رنگ کا مظہر بن جاتا ہے۔

اگرچہ سماجی اور اخلاقی مسائل کا بیان نظم میں بہتر طور پر ہو سکے گا لیکن غزل میں بھی انہیں حکیمانہ نکات کے انداز میں داخل کیا جا سکتا ہے تاکہ جدید عہد کے انسان کی ذہنی کیفیت ظاہر ہو سکے۔ لیکن اس اظہار کے بہت سے طریقے ہیں۔ ایک اس طور پر خیالوں کو ظاہر کرنا ہے کہ وہ معاشی عمل یا تحت شعور کی ڈائری یا کھتونی معلوم ہوں اور ایک اس طرح کہ سُننے والا اپنی زندگی میں مسرت اور فراوانی محسوس کرے۔ اس کی بصیرت کو جلا ہو اور اس کی قدروں اور خواہشوں میں ہم آہنگی اور ہم ربطی پیدا ہو۔ قدر ہی وہ کنجی ہے جس سے زندگی کے سارے طلسم کھلتے ہیں۔ شعر کو قدر کا خادم ہونا چاہیئے نہ کہ اس کو مٹانے والا۔ غزل گو شاعر جب زندگی کا ذکر کرے گا تو لازمی طور پر اس کے لامحدود امکانوں کی طرف اس کی نظر جائے گی۔ وہ کبھی اپنی خواہشوں کا رنگ ان پر چڑھائے گا اور کبھی ان کے اثر سے اپنی آرزوؤں کی صورت گری

کرے گا۔ وہ حسن آفرینی بھی کرے گا اور قدر آفرینی بھی۔ لیکن یہ کام وہ تجرید اور منطقی مقدمات سے نہیں انجام دے سکتا جن کا لازمی نتیجہ کلام میں بے لطف یکسانیت اور سپاٹ پن ہوگا۔ شاعر کی فکر تخیلی اور وجدانی ہونی چاہیے جس میں اندرونی جذبے کا رس رچا ہوا ہو۔ بغیر اس کے کلام میں تاثیر اور دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر کی خوبی کا معیار نہ اسلوب میں پنہاں ہے اور نہ موضوع میں بلکہ شعریت میں جو دونوں سے بالاتر ہے۔ ہم بہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شعریت تخیلی فکر اور جذبے کی ہم آمیزی کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتی اور یہی دونوں جزو تغزل کی جان ہیں۔ انھیں سے حسنِ ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جو ادب کی بنیادی قدر ہے۔

قتیلؔ دہلوی تھا یا فرید آبادی؟

مختار الدین احمد

بارھویں صدی ہجری کے آخر اور تیرھویں صدی کی ابتدا میں مرزا قتیلؔ کی ذات بھی عجیب و غریب گزری ہے۔ فارسی زبان کا مشہور مصنف و شاعر، متعدد اُردو[1] شعرا کا استاد، لیکن آج تک اس کے نام کے متعلق جھگڑا ہے، اس کی وطنیت مشتبہ ہے، اس کی عمر کا پتہ نہیں۔ کہاں کہاں رہا، نہیں معلوم۔ کیا کیا کرتا رہا؟ نہیں کہا جا سکتا، کب وفات پائی؟ اس میں اختلاف، کب پیدا ہوا؟ اس کی تحقیق نہیں۔

اٹھارہ سال کی عمر تک اس کا کیا نام رہا؟ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، ایک تذکرہ نگار نے اس کا نام دلوالی سنگھ، ایک مورخ نے دِوالی سنگھ، ایک مضمون نگار نے دیوانی سنگھ، ایک مستشرق نے دَوالی سنگھ اور ایک مشہور اُردو شاعر نے دیوالی سنگھ بتایا ہے۔

مسلمان ہونے کے بعد اس کا نام تبدیل ہوا، نام کیا رکھا گیا؟ مختلف اصحاب مختلف نام بتاتے ہیں۔ ابو طالب نے اس کا نام محمد قتیل، نواب صدیق حسن، حکیم عبدالغنی، صاحب ریاض الفردوس، مصحفی اور عبرتی نے محمد حسین۔ ڈاکٹر عبدالحق اور پنڈت کیفی نے محمد احسن۔ بعض تذکرہ نگاروں نے (عبرتی کا بھی ایک جگہ یہی بیان ہے) محمد حسن۔ اور صاحب قاموس المشاہیر نے احمد حسن لکھا ہے۔

---

[1] تقریباً تمام تذکرے جو میری نظر سے گزرے ہیں قتیلؔ کی اُردو شاعری کے بارے میں خاموش ہیں، اس کے دیوان و کلیات کے متعدد نسخے دیکھنے میں آئے لیکن کسی میں اس کے اُردو اشعار نہیں ملے۔ صرف سعادت خاں ناصرؔ کے نایاب تذکرہ "خوش معرکۂ زیبا" میں اس کا ایک اُردو شعر درج ہے، اصل عبارت یہ ہے :-

چونکہ مولد اس کا ہندوستان تھا بحکم کل شئ یرجع الی اصلہ، کبھی کوئی مصرع یا بیت زبان ریختہ میں بھی کہتا چنانچہ یہ شعر :-

زنگی بچے کا حسن عدیم المثال ہے
ثانی جو اس کا ہے تو کوئی خال خال ہے

اگرچہ یہ شعر اس کا دونِ مرتبہ ہے مگر یہ ہندی گویوں کا تذکرہ ہے اور اکثر ہندی گو اس کے شاگرد ہیں، لکھا گیا"

دریائے لطافت میں بہت سے اُردو شعر ہیں جن کے متعلق یہ معلوم نہیں کہ کس کے لکھے ہوئے ہیں، مندرجہ ذیل شعر تعجب نہیں کہ قتیلؔ کا ہو :-

جہاں میں جنسِ محبت کا جا بجا ہے قحط
میں جانتا ہوں کہ دشمن مرا ہے یار مرا

سال ولادت۔ فرقتی دہلوی عظیم آبادی (؟) بحوالۂ امید امیٹھوی سنہ ۱۱۶۶ھ، عبرتی سنہ ۱۱۷۰ھ اور حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی سنہ ۱۱۶۰ھ بتاتے ہیں۔ صاحب نتائج الافکار کے بیان کے بموجب اس کی وفات تیرھویں صدی ہجری کے عشرۂ چہارم میں ہوئی۔ صاحب شمع انجمن کے نزدیک سال وفات سنہ ۱۲۴۰ھ ہے۔ عبرتی سنہ ۱۲۳۰ھ لکھتے ہیں۔ اور بیل سنہ ۱۲۳۲ھ۔ گلشن مشتاق، ناموس المشاہیر اور تاریخ اودھ میں سنہ ۱۲۳۴ھ درج ہے۔

میر وزیر علی عبرتی اس کی عمر ساٹھ سال، حسین قلی خاں اکسٹھ سال اور فرقتی دہلوی (؟) بحوالۂ امید امیٹھوی تریسٹھ سال بتاتے ہیں۔

عبرتی کا بیان ہے کہ اسلام لانے وقت اس کی عمر سترہ سال تھی۔ مصحفی اور قدرت اللہ اٹھارہ سال بتاتے ہیں۔ عاشقی کا بیان ہے کہ چودہ سال ہی کی عمر میں اس کے دل میں اسلام کی محبت موجیں مار رہی تھی۔ تذکرہ "سفینۂ ہندی" میں ہے کہ وہ صغر سنی میں مسلمان ہوا۔ گلشن مشتاق میں درج ہے کہ عنفوان شباب میں اسلام لایا۔

سفینۂ ہندی اور نتائج الافکار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہونے کے بعد وارد شاہ جہان آباد ہوا۔ اور وہیں عربی و فارسی کی تحصیل کی لیکن مصحفی لکھتا ہے کہ اس کی تعلیم شاہ جہان آباد میں نہیں بلکہ فیض آباد میں ہوئی۔

ان معاملات کے علاوہ قتیل کی وطنیت میں بھی کافی اختلاف رہا ہے اور ابھی تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ متقدمین اور متاخرین دونوں کے اقوال اس معاملہ میں مختلف رہے ہیں۔ تیرھویں صدی کے مؤرخ اور تذکرہ نگار ہی نہیں ہمارے زمانہ کے محققین اور مضمون نگار حضرات بھی اس معاملے میں مختلف الاقوال نظر آتے ہیں کہ اس کا وطن کہاں ہے۔

مصحفی نے اس کے بزرگوں کا وطن بٹالی، بھگوان داس نے بٹالہ، عبرتی نے پٹالہ، صاحب "ید بیضا"[1] (؟) نے بٹالہ، نواب صدیق حسن نے لاہور، محمد حسین آزاد نے لکھنؤ، ابو طالب نے دہلی بتایا ہے۔ ناصر نے "مولد اس کا ہندوستان تھا" کہنے پر قناعت کی ہے۔ اور یوں وہ اس جھگڑے سے صاف نکل گیا ہے۔

آزاد نے اس کا وطن لکھنؤ اس لحاظ سے بتایا ہوگا کہ اس کی نصف زندگی سے زائد لکھنؤ میں تمام ہوئی۔ وہیں اس نے وفات پائی اور وہیں کی خاک میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ جن تذکرہ نگاروں نے اس کا وطن لاہور بتایا، وہ شاید اس طرح کہ ریاست پٹیالہ مضافات لاہور میں ہے۔ پٹیالہ اور بٹالہ اس لئے اس کا وطن کہا جاتا ہے کہ اس کے آباؤ اجداد بٹالہ کے رہنے والے تھے اور کاتبوں کی غلط نویسی کی وجہ سے اس نام کی مختلف شکلیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ابو طالب اور عبرتی نے اگر اس کا وطن دہلی بتایا تو مقام تعجب

---

[1] نگار "مصحفی نمبر" میں ایک مضمون شائع ہوا تھا "مصحفی کی دو بیاضیں" جس میں دعوے کیا گیا تھا کہ "ید بیضا" مصحفی کی تالیف ہے اور ثبوت میں کچھ شعراء کے ترجمے بھی پیش کئے گئے تھے۔ من جملہ ان کے قتیل کا ترجمہ بھی تھا جس میں اسے بٹالہ کا بتایا تھا۔ پورا مضمون جعل و تحریف سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے فوراً ہی ایک طویل مکتوب حضرت نیاز فتحپوری کو لکھا جس میں اس نمبر پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی تھی اور "ید بیضا" والے مضمون کے جعل و تحریف کا پردہ چاک کر دیا گیا تھا۔ نیاز صاحب نے وہ خط "مصحفی نمبر کی بعض لغزشیں" کے عنوان سے شائع کر دیا تھا۔ ملاحظہ ہو نگار اپریل سنہ ۱۹۴۰ء۔

نہیں جب کہ قتیل خود ــ "مولدِ من خاک دہلی اے قتیل" کہتا ہے ——— لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ قتیل کے وطن کی نسبت فریدآباد کی طرف کس طرح جاتی ہے؟

زمانۂ حال میں قتیل کو فریدآبادی سمجھنے والوں میں زیادہ پیش پیش سید اسد علی انوری صاحب ہیں جو خود بھی فریدآباد کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالہ "قتیل کا وطن"[1] میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا وطن فریدآباد تھا۔ انھوں نے قدیم تذکروں کے متعدد اقتباسات بھی درج کئے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کسی میں اس کے فریدآباد ہونے کا ذکر نہیں۔ ریاض الفردوس میں اسے لکھنوی، نتائج الافکار اور شمع انجمن میں لاہوری، خلاصۃ الافکار میں دہلوی، عقدِ ثریا میں بٹالوی لکھا ہے۔ مخزن الغرائب، گلشن مشتاق، خوش معرکۂ زیبا میں اس کی وطنیت کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے فریدآبادی ہونے کا ثبوت قدیم تذکروں میں نہیں ملتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ سب سے پہلے کس نے اسے فریدآبادی لکھا۔ جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، اس کی اولیت کا سہرا مرزا غالب کے سر ہے۔ اور ان کے بعد اگر کسی نے اسے فریدآبادی لکھا ہے مثلاً حالی اور نجم الغنی تو یہ غالب کی تقلید میں ہے اور اس معاملہ میں یہ اصحاب غالب کے مقلدِ محض ہیں۔ اور یقین ہے کہ انھوں نے قتیل کی وطنیت سے متعلق ذاتی تحقیقات نہیں کی۔

غالب نے اپنے خطوط میں اسے متعدد جگہ فریدآباد کا بتایا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ مرزا، نہ تاریخ و تحقیق کے آدمی تھے اور نہ وہ اس کام کے لئے موزوں تھے۔ یہ بھی نہیں کہ انھیں قتیل سے کوئی خاص تعلق رہا ہو کہ حالات جاننے کی کوشش کی ہو۔ انھیں تو قتیل کا نام تک صحیح نہیں معلوم۔

انوری صاحب نے فرقتی کے تذکرہ "شمعِ انجمن" کا بھی حوالہ دیا ہے، یہ حوالہ جس طرح دیا گیا ہے، وہ ناکافی ہے[2]۔ اصل عبارت ہونی چاہیے تھی۔ اس تذکرے کا وجود مان بھی لیا جائے تو جو شخص ایک چھوٹے سے جملے میں دو غلطیاں کر سکتا ہے اس کی تیسری بات کا کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے نہ یہ صحیح ہے کہ قتیل سنہ ١١٦٦ھ میں پیدا ہوا اور نہ یہ درست ہے کہ وفات کے وقت اس کی عمر ٦٧ سال کی تھی۔ مزید یہ کہ یہ فرقتی کا قول ہو بھی تو اس بنا پر کہ نظر بظاہر اسے قتیل کے حالات معلوم کرنے کے خاص ذرائع حاصل نہ تھے چنداں وزن نہیں رکھتا۔ پھر فرقتی بہت بعد کے آدمی ہیں۔ ان کا بیان چنداں قابلِ اعتنا نہیں خصوصاً اس صورت میں جب کہ معاصرینِ قتیل کچھ اور کہتے ہوں۔ پھر ان تمام لوگوں کے بیانات غالب ہی سے ماخوذ ہیں۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ قتیل کی وطنیت فریدآباد کی قدیم ترین شہادت مرزا غالب کے وہ رقعات ہیں جن میں قتیل کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ ایک تو یہ کہ مرزا کو تاریخ سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ ان لوگوں میں تھے جن کو ماضی کی بہ نسبت حال سے زیادہ دلچسپی

---

[1] مطبوعہ نگار۔

[2] فرقتی کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے لیکن اس بات کا سراغ کہیں نہیں ملتا کہ اس نے کوئی تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ امید امیٹھوی صاحب کو یہ بتانا تھا کہ انھوں نے یہ تذکرہ کہاں دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ امید امیٹھوی کے حافظہ پر جو اعتماد انوری فریدآبادی صاحب کو ہے، اس میں دوسرے شریک نہ ہوں تو قابلِ الزام نہیں۔

ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک طویل اردو مکتوب میں جو اردوئے معلّیٰ یا عودِ ہندی میں شامل نہیں ہے[1]، وہ اسے لکھنوی بتاتے ہیں۔ غالب مولوی ضیاالدین خاں کو لکھتے ہیں: ۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنہ ۶۸ھ یا سنہ ۶۹ھ میں ہوس ناک لوگ فارسی کے فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے۔ نہ ایک دو بلکہ ہزار دو ہزار فرہنگیں فراہم ہو گئیں یہاں تک کہ قتیل نومسلم لکھنوی اور غیاث الدین ملّائے مکتب دار رام پور اور کہاں تک کہوں کون کون، جس کے جی میں آئی وہ متصدّیِ تحریرِ قواعد انشا ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس عبارت سے میرے خیال کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ مرزا نے قتیل کے وطن کے بارے میں کوئی خاص تحقیق نہیں کی۔ جب جی میں آیا فرید آباد کا لکھ دیا جب دل چاہا لکھنوی بنا دیا، مرزا نے ایک جگہ اسے دہلوی بھی لکھ دیا ہے[2]۔ مرزا کا بیان اگر مستند ہے تو ان کے سارے بیانات پیشِ نظر رکھنے چاہئیں۔

یہ مکتوب سنہ ۱۸۶۲ء کے بعد کا لکھا ہوا ہے اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے وہ واقعی قتیل کو فرید آبادی سمجھتے ہوں پھر بعد کو جب اس کا بطلان ثابت ہو گیا ہو تو اس لحاظ سے کہ اس کی زیادہ تر زندگی لکھنؤ ہی میں گزری (بہ روایت عاشقی عظیم آبادی) اسے لکھنوی لکھنا زیادہ مناسب سمجھا ہو۔ قتیلؔ دہلوی ضرور ہیں لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ وہ بارہ سال ہی کی عمر میں دِلّی چھوڑ کر عظیم آباد آ چکے تھے۔ پنڈت کیفیؔ نے بھی اسے فرید آبادی لکھا ہے۔ لیکن ان کے پاس بہ ظاہر مرزا غالبؔ کی تحریر کے سوا اور کوئی ثبوت نہیں۔

۲

فرید آباد قتیلؔ کا وطن کس طرح ہے؟ نہ وہ وہاں پیدا ہوا، نہ وہاں وفات پائی، نہ وہاں قیام کیا اور نہ وہاں سکونت اختیار کی۔ فرید آباد میں نہ اس کا توطّن ثابت ہے اور نہ اس کے آباؤ اجداد کا۔

اس کا باپ ڈاسنہ میں رہا یا شاہ جہان آباد میں، وہ خود سنہ ۱۱۷۲ھ میں دہلی میں پیدا ہوا۔ ۱۷ سال کی عمر تقریباً سنہ ۱۱۹۰ھ تک تحصیلِ علم کے سلسلے میں یا تو دہلی رہا یا فیض آباد۔ سنہ ۱۱۹۰ھ میں فیض آباد میں شہیدؔ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا[3]۔ اب تک وہ دیوانی سنگھ تھا اب وہ محمد حسن ہو گیا۔ مسلمان ہونے کے بعد گھر بار چھوڑ کر الگ ہو گیا اور ایک زمانہ تک اطراف شاہ جہان آباد میں بخفِ حال

---

[1] اس طویل مکتوب کا متن پہلی مرتبہ مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الٰہ آباد) نے رسالہ "ہندوستانی" میں چھاپا اور پھر انھیں کی عنایت سے راقم نے پورے خط کا عکس علی گڑھ میگزین "غالب نمبر" میں شائع کیا۔ مکمل خط چار صفحوں میں آیا ہے۔ ملاحظہ ہو غالب نمبر بعد از ص ۸۴۔

[2] غالب کا یہ قول میں نے کہاں دیکھا ہے بدقسمتی سے میرے کاغذات میں اس کا حوالہ درج نہیں۔ یہ قول جن ممکن مصادر میں مل سکتا تھا، دیکھے لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا، افسوس ہے، کہ اس امر پر میں اس وقت زیادہ توجہ نہ دے سکا۔

[3] مصحفی کا بیان ہے "در ایّامے کہ متعلقانش بہ حسب آب خورِ بہ فیض آباد رفتہ استقامت گرفتہ بر دست شہید ہیزدہ سالہ بود کہ مشرف اسلام پیوستہ" عقدِ ثریّا۔ ص ۴۰۶۔

کے لشکریوں کے ساتھ گھومتا رہا[1]۔ یہ ظاہر ہے کہ ۱۱۸۹ھ یا ۱۱۹۰ھ یعنی اسلام لانے سے پہلے تک وہ کافی سیاحت کر چکا ہوگا مصحفی عقدِ ثریا کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ جس زمانہ میں قتیل کا تعلق لشکرِ نواب نجف خاں سے تھا وہ دہلی آتا اور مصحفی کے مشاعروں میں شریک ہوتا۔ یہ مشاعرے ہمارے اندازے کے مطابق ۱۱۸۶ھ سے ۱۱۹۸ھ تک کی مدت میں ہوتے رہے ہیں۔ تذکرۂ عقدِ ثریا کی ترتیب کا خیال خود قتیل ہی نے اسے دلایا تھا "چوں مرزائے مزبور چندے سیاحت کردہ در مجلسِ وضیع و شریف رسیدہ نظمِ نثر از اشعار و احوالِ معاصرین جستہ جستہ بہ بیاضِ خاطرِ خود منقوش داشتے، روزے ..... فسونِ تالیفِ تذکرۂ معاصرین بگوشم دمید" ص ۲۔

یہ سطریں جب لکھی جا رہی تھیں، اس وقت نجف فوت نہ ہوا تھا، اس کا سالِ وفات ۲۲ ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۱۹۵ھ یا ۱۱۹۶ھ سے پہلے ہی وہ کافی سیاحت کر چکا تھا اور متعدد "مجلس وضیع و شریف" دیکھ چکا تھا۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس کی سیاحت اس کے اسلام لانے سے پہلے یعنی ۱۱۹۰ھ کی ہے۔ اس لئے کہ اسلام لانے کے بعد اس کا تعلق نجف خاں کے لشکریوں سے ہوا اور وہ ان کے ساتھ دہلی و اطرافِ دہلی کا گشت کرتا رہا۔ اتنا ظاہر ہے کہ یہ تعلق ۱۱۹۶ھ میں ختم ہو گیا۔ اب عاشقی کا بیان پیشِ نظر رکھیئے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"تا مدتے در اطرافِ شاہ جہان آباد بہ لشکرِ نجف خاں می گشت"۔ "تا مدتے" کا لحاظ کرتے ہوئے ماننا پڑیگا کہ کم از کم ۱۱۹۰ھ تک اس کا تعلق ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے قتیل کی سیر و سیاحت کا زمانہ یقیناً اس سے پہلے ماننا پڑیگا۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۱۸۲ھ سے[2] ۱۱۹۰ھ تک وہ دہلی، فیض آباد وغیرہ میں گھومتا رہا۔ ۱۱۹۶ھ تک وہ نجف خاں کے لشکر کے ساتھ پھرتا پھراتا رہا۔ ۱۱۹۷ھ سے ۱۲۳۳ھ یعنی اپنی موت تک وہ لکھنؤ میں رہا۔

اوپر کی سطروں میں ہم نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ و تذکرہ کا کوئی بیان ہمیں ایسا نہیں ملتا ہے جس سے قتیل کی وطنیت فریدآباد متحقق کیا معنی، اس پر ہلکی سی بھی روشنی پڑ سکے۔ وطنیت تو بہت بڑی چیز ہے، قدما کی تحریروں میں قتیل کا ایک لمحہ کے لئے بھی فریدآباد میں قیام کرنا ثابت نہیں[3]۔ ایسی صورت میں اسے فریدآبادی کہنا اور فریدآباد اس کا وطن بتانا قرینِ انصاف و تحقیق نہیں۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس کی ولادت دہلی میں ہوئی، ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی "نتائج افکار" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی کی تکمیل بھی اس نے دہلی ہی میں کی۔ اسلام لانے کے بعد وہ فیض آباد، دہلی اور اطرافِ دہلی کی سیر کرتا رہا اور آخر کار لکھنؤ میں جا بسا۔ اور وہیں کی خاک میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ اس کے مکاتیب کے مطالعہ سے کچھ اور مقامات کی

---

[1] "اہلِ بیتِ خود را بہ باد گفتہ کنارا بست و آزادانہ قدم بہ راہِ تجرید نہادہ تا مدتے در اطرافِ شاہ جہان آباد بہ لشکرِ ذوالفقار الدولہ مرحوم می گشت"، نشترِ عشق، ص: ۱۴۵۔

[2] ۱۱۸۲ھ اس لئے کہ ۱۱۷۲ھ قتیل کا سالِ ولادت ہے۔ کم از کم دس سال طفلی کے اس سے نکال دینے چاہئیں۔

[3] قیام نہ ہونے اور قیام ثابت نہ ہونے میں بڑا فرق ہے، میں چاہتا ہوں کہ ناظرین اس فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔

سیاحت کا پتہ چلتا ہے[1] لیکن فریدآباد کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

مالک رام صاحب[2] قتیل کے ایک بیان سے اس کے وطن کا کھوج لگانا چاہتے ہیں، انھیں قتیل کے خاندان کے ایک فرد سے ایک شجرہ ملا ہے جس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا خاندان بٹالہ کا رہنے والا تھا اور قتیل کی پیدائش بھی بٹالہ ہی میں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ اصلاً قتیل کا خاندان بٹالہ کا رہنے والا تھا، لیکن ان کا یہ خیال کہ اس کی پیدائش بٹالہ میں ہوئی محلِ نظر ہے۔

اس کے بزرگوں کی وطنیت کے بارے میں مصحفی کا بیان کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قتیل سے جو تعلقات مصحفی کے تھے وہ اہلِ نظر پر پوشیدہ نہیں۔ تذکرۂ عقدِ ثریا، قتیل ہی کی تحریک سے اس نے لکھنا شروع کیا تھا بلکہ بہت سا مواد بھی قتیل ہی کا جمع کردہ تھا۔ مصحفی نے خود قتیل کا مولد ہمیں نہیں بتایا لیکن اس کے اس قول سے "دراصل بزرگانش قوم کھتری بھنڈاری بٹالی بودہ اند" سے اس کے بزرگوں کی وطنیت بٹالہ ثابت ہوتی ہے۔

یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قتیل کے آباؤ اجداد کی وطنیتِ بٹالہ کی دلیلیں اب ختم ہو گئیں۔ ابھی میرے پاس ایک معتبر معاصر تذکرہ نگار کا بیان موجود ہے جس سے خود قتیل کے تعلقات تھے اور جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے اس سے سلسلۂ مراسلت بھی جاری تھا۔ میری مراد آغا حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی سے ہے جس نے فارسی شعرا کے حالات میں اکیس سو صفحات کا بڑا ضخیم تذکرہ لکھا ہے۔ اس میں قتیل کا تذکرہ چھ صفحات میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہاں اردو میں پیش کیا جاتا ہے۔

> قتیل کے آباؤ اجداد ایک چھوٹے سے قصبہ بٹالہ کے رہنے والے تھے، (بٹیالہ کے قریب جو لاہور کے قریب واقع ہے) کچھ زمانہ کے بعد جدِ سوم (غالباً سورت سنگھ۔ احمد) ایک شخص کے ساتھ جو کھتری تھا اور جس سے موانست و برادری تھی، بٹالہ سے ہجرت کر کے باغپت چلا آیا۔ قتیل کے باپ اور دادا درگاہی مل اور رائے لال جی مل کی ولادت یہیں باغپت میں ہوئی۔ ۱۱۳۷ھ میں لالہ لال جی مر گیا۔ اس کے بعد درگاہی مل نے باغپت کو چھوڑ کر ڈاسنہ میں جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور دہلی سے ۱۷ کوس پر واقع ہے، بود و باش اختیار کی، ۳ سال تک وہاں قیام کیا تھا کہ (۱۱۴۰ھ میں۔ احمد) نواب ہدایت علی خاں نے بمدِ نظرِ استحقاق روابط و تعلقات جو سید فیض اللہ اور رائے لال جی مل میں تھے،

---

[1] مرزا قتیل کے رقعات و مکاتیب کے متعدد مجموعے ہیں۔ صرف "رقعاتِ قتیل" میں اس کے مختلف سفروں کا پتہ چلتا ہے۔ رقعہ ۵۹ سے سفر الٰہ آباد، سلطان پورہ، پرتاپ گڑھ کا پتہ چلتا ہے۔ رقعہ ۷۳، سے سفرِ کانپور کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ رقعہ ۸۲ سے قیام سلطان پور پر روشنی پڑتی ہے اور رقعہ ۱۳۴ سے ہمیں اس کے دوبارہ سفرِ بہرائچ کا علم ہوتا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو رسالہ نگار۔

[3] قتیل کی پیدائش بٹالہ تو خیر بعد کی چیز ہے، نشترِ عشق، کا بیان مان لیا جائے اور نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں تو اس کے باپ اور دادا، درگاہی مل اور رائے جی مل کی بھی پیدائش بٹالہ میں نہیں بلکہ باغپت میں ہوئی ہے۔ قتیل کی پیدائش کیا بٹالہ میں ہوتی خود اس کی پیدائش سے بہت پہلے اس کے دادا، ایک کھتری کے ساتھ ترکِ وطن کر کے باغپت آ چکے تھے۔

قتیلؔ کے باپ درگاہی مل کو اپنے پاس بُلا لیا۔ بہت دلجوئی کی اور ہزار روپیہ ذات کا مقرر کر کے اجازت دی کہ اپنے گھر اہل و عیال کے ساتھ رہیں۔ درگاہی مل، مدت العمر کبھی ڈاسنہ رہا اور کبھی نواب ہدایت علی خاں کے یہاں۔ انھیں دنوں ۱۱۷۲ھ میں شاہ جہان آباد میں قتیل کی ولادت ہوئی۔"

۳

مرزا قتیلؔ کی ولادت شاہ جہان آباد میں ہوئی۔ اور وہ بلاشبہ دہلوی تھے۔ ان کی وطنیت کے بارے میں یہ رائے قائم کر لینے سے پہلے تذکرہ نگاروں اور مؤرخین کے بیانات کے ساتھ ساتھ قتیل کی بیشتر نثر و نظم پر بھی ایک نگاہ ڈال لی گئی ہے اور ان کی بعض تصانیف کے غیر مطبوعہ نسخے بھی پیشِ نظر ہیں۔

(۱) مرزا قتیل، والدش از قوم کھتری متوطن پبالہ (کذا) مضافات لاہور از قرابتانِ (رائے لال جی)[1] بودہ ..... خودش در شاہ جہان آباد رو نمودہ در صغر سن شرف اسلام پذیرفتہ ......"

(تذکرۂ سفینۂ ہندی۔ ۱۳۱ ب۔ مرتبہ بھگوان داس)

(۲) مرزا محمد حسن :۔ در ۱۱۷۲ھ تولدِ آں افصح البلغا در شاہ جہان آباد اتفاق افتاد و تا عمر ہفت دو سالگی از طبع خداداد عربی و فارسی تحصیل ساختہ طبیعت عالی پیدا کرد ...."

(نشترِ عشق عاشقی عظیم آبادی۔ ص۔ ۱۴۵۰)

(۳) "قتیل، دہلی کے کھتری تھے، انھوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ اب لکھنؤ میں رہتے ہیں اور فارسی کے بہترین عالموں میں ہیں۔"

(عیارالشعرا[2]۔ خوب چند ذکاؔ)

(۴) اسم نامیِ آں ...... مرزا محمد حسین است، مولدِ گرامیش شاہ جہان آباد، و اجدادش ساکن قصبہ بٹالہ، قوم کھتری بودہ اند، خیلے آزادانہ بسر می برد تا آں کہ از شاہ جہان آباد برآمدہ بہ لکھنؤ پیوست، و در ۱۲۲۰ھ بعمر شصت سالگی ودیعت حیات سپرد ......"

(تذکرۂ معراج الخیال، عبرتی عظیم آبادی)

(۵) نامش مرزا محمد حسن است از خوش معاشان قصبہ بٹالہ بودہ اند، مولد او و پدر بزرگوارش از خاکِ شاہ جہان آباد برنگاشتہ اند بہ عمر شصت و چند سالگی در ۱۲۳۳ھ ودیعت حیات سپرد۔"

(ریاض الافکار۔ عبرتی عظیم آبادی)

---

[1] "رائے لال جی" قیاسی تصحیح ہے۔ سفینہ کا جو مخطوطہ میرے زیرِ مطالعہ رہا ہے وہ کرم خوردہ ہے۔ ناظرین میں اگر کسی صاحب کی اس کتاب کے کسی عمدہ نسخے تک رسائی ہو تو براہِ کرم مطلع فرمائیں۔

[2] اس تذکرے کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں ہے اور ایک ناقص نسخہ پٹنہ کے ایک ذاتی کتب خانہ میں۔ لیکن ہمارا بیان اسپرنگر سے ماخوذ ہے۔ راقم نے ابھی حال میں اس تذکرے کے ایک اہم ترین نسخہ کا پتہ چلایا ہے جو تمام و کمال خود خوب چند ذکاؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ مصنف کا اصل ابتدائی مسودہ ہے۔

(۶) محمد قتیل ... اصلش از کھتریان ساکن شاہجہان آباد است۔
(خلاصۃ الافکار: ۲۴۴ ب۔ ابوطالب اصفہانی)

(۷) بیل نے قتیل کا نام محمد حسن۔ وطن دہلی اور سال وفات ۱۲۳۲ھ لکھا ہے۔
(اوریئنٹل بائیوگرافیکل ڈکشنری)

(۸) نظامی بدایونی نے اس کا نام مرزا احمد حسن اور وطن دہلی لکھا ہے۔
(قاموس المشاہیر ۱/۱۴۰)

(۹) خواجہ محمد علی تمنّا عظیم آبادی نے ایک ضخیم بیاض فارسی شعراء کی مرتب کی جس پر خود قتیل نے اپنے ہاتھ سے ایک دیباچہ تحریر کیا ہے۔ اس بیاض میں تمنّا نے جو اس کا خاص دوست تھا، اسے دہلوی لکھا ہے۔ (بیاضِ تمنا)[1]

(۱۰) صاحب مجموعۂ سخن نے بھی اسے دہلوی لکھا ہے۔

---

[1] اس بیاض کا نام "عمان المعانی" ہے۔ مرتّب خواجہ محمد علی تمنّا خلف خواجہ عبداللہ تائید ہیں۔ جو ۱۲۳۰ھ تک زندہ تھے۔ دیوان فارسی مرتب تھا۔ ایک مجموعہ غالباً "ریاض المنشآت" اور ایک ضخیم بیاض جس میں اساتذہ کی تحریرات نثر جمع کی ہیں نظر سے گذری۔ ایک مجموعے کا نام "منشورات" بھی ہے اور کتب خانہ خدا بخش میں ۱۵۳۲ نمبر پر موجود ہے۔ ان کا یہ اردو شعر کبھی نہیں بھولتا ہے

کب تک سدائے نوحۂ دل ہم سنا کریں
تنگ آ گئے ہیں زیست سے اللہ کیا کریں

اس بیاض میں امامی ہروی، ظفر خاں احسن، عنایت خاں آشنا خلف احسن، میرزا محمد رضا قزلباش خاں اُمید، امیر خاں انجام، آرزو، آبرو، اشتیاق دہلوی، میر اثر، جسونت سنگھ پروانہ، عظمت اللہ بے خبر، پیام اکبر آبادی، برہمن لاہوری، بیدل، برکت اللہ بلگرامی، افضل ثابت، عظیم ثبات خلف ثابت، نواب سید حسین علی خاں بہرام جنگ مرشد آبادی، غلام حسین خاں (سلمہ اللہ) ذوقی رام حسرت کے علاوہ بہت سے شعرائے فارسی کے اشعار کا انتخاب ہے۔ امید، آرزو، بیدل کے سو سو شعر اور افضل ثابت کے ۲۷۸ شعر نقل کئے ہیں جبکہ میر اثر کا صرف ایک اور آبرو کے صرف دو شعر نقل کئے ہیں۔

شعرائے بہار میں خواجہ امین الدین امین عظیم آبادی کے ۲۲۳، میر محمد علیم تحقیق کے ۳، نواب علی ابراہیم خلیل صاحب گلزار ابراہیم کے ۹۸۔ ہلاس رائے رنگین خلف راجہ مان رائے کے ۳۔ مجرم عظیم آبادی کے ۲، علی بخش مفتون عظیم آبادی کے ۲، اجاگر چند اُلفت کے ۴، راجہ رام نرائن موزوں عظیم آبادی کے ۵۔ مرتب نے خود اپنے دو شعر اور اپنے والد خواجہ عبداللہ تائید متوفی ۱۲۰۶ھ کے ۵۶۷ اشعار نقل کئے ہیں۔ جو بیاض کے صفحہ ۳۷ سے ۱۷۲ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بیاض کے ابتدا میں مرزا قتیل کا دیباچہ ہے۔ جو بہ قیاس غالب خود انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ مرزا قتیل کی کسی تحریر کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے اس لئے اس تحریر کا عکس ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ راقم کی نظر سے "کلیاتِ قتیل" کا ایک ایسا نسخہ بھی گذرا ہے جو قتیل کے پاس رہ چکا تھا اور سرورق پر اس کے دستخط موجود ہیں۔ قتیل کی تحریر کے علاوہ بیاض کے مرتب خواجہ محمد علی تمنا کی تحریر کا عکس بھی شائع کیا جاتا ہے۔ ان دونوں تحریروں کے لئے میں قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر بانکی پور پٹنہ کا ممنون ہوں۔

اُوپر کے بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قتیل کا وطن فریدآباد نہیں، بلکہ دہلی تھا۔ اور یہ دلائل ثبوت کے لئے کافی ہیں، لیکن ہم ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خود مرزا قتیل نے اپنے بارے میں کیا لکھا ہے۔

(۱) مرزا قتیل کا ایک فارسی شعر ہے ؎

گرچہ باشد مولدِ من خاکِ دہلی اے قتیل کم کسے چوں من ز ہر دو ابروان برخاستہ است

جب خود وہ اپنا مولدِ خاکِ دہلی بتاتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے صحیح نہ مانیں۔ لیکن ممکن ہے کوئی صاحب فرمائیں صاحب یہ تو شعر و شاعری کی باتیں ہیں شعر میں آدمی کیا کچھ نہیں کہہ جاتا ہے۔ ان کے لئے ایک دوسری صاف اور واضح سند بھی پیش کرتا ہوں جس کے بعد شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

(۲) قتیل نے مولوی سلامت کے نام ایک طویل رقعہ لکھا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دہلی سے کیسی محبت تھی۔ کیا یہ جذبہ حبِ وطن کے سوا کچھ اور ہے؟ اس رقعہ کے چند جملے یہ ہیں:-

...... داخلِ شہر شدہ بہ پاسِ خاطرِ داعی آثم روزے رونق افروزِ مسجدِ فتحپوری شدہ دکاکینِ بازار قریبِ مسجد مذکورہ را از طرفِ من سلام و درود دیوارِ شہر را اشتیاقے رسانیدن ضرورہ و از عنایاتِ دلی بعید نہ خواہد بود بہ خدا کہ من بہر کوچہ و ہر خانہ آں شہر عاشقم: ۲۰۹

(۳) اسی رقعہ کی ابتدا میں ایک جملہ ہے:-

"شاہ جہاں آباد مولد و وطن فقیر است"

میرا خیال ہے کہ قتیل کی وطنیت دہلی پر اب اس سے زیادہ روشن اور واضح دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ اور نہ اس سے بہتر حجت قائم ہوسکتی ہے۔

۴

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اب اچھی طرح سے ثابت ہو چکی ہے کہ قتیل کا وطن دہلی تھا۔ جو اصحاب اس بات کے مدعی ہوں کہ وہ فریدآبادی تھا۔ انھیں اس کا ثبوت معتبر معاصرین کے بیانات سے دینا چاہیئے۔ مجھے تو تذکرہ و تاریخ کا کوئی بیان ایسا نہیں ملا جس سے اسکی وطنیت فریدآباد ثابت ہو سکے۔ وطنیت تو بعد کی چیز ہے، قتیل کا تو قیام فریدآباد بھی متحقق نہیں۔ تاریخ و تذکرہ، روزنامچہ، مکاتیب اور بیاضوں کے مطالعے سے ہمیں قتیل کے مختلف شہروں میں رہنے اور آنے جانے کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی ایک دن کیا ایک لمحہ کے لئے بھی فریدآباد میں قیام ثابت نہیں ہوتا۔

قتیل، عاشقی کے بیان کے مطابق سنہ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوا۔ اور جمہور کے قول کے مطابق سنہ ۱۲۳۳ھ میں اس نے وفات پائی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس مدت میں کہاں رہا اور کہاں کہاں کی خاک چھانتا رہا۔

(سنہ ۱۱۶۲ھ)

۱۔ عاشقی کا بیان ہے کہ قتیل کی پیدائش سنہ ۱۱۶۲ھ دہلی میں ہوئی: "در سنہ ۱۱۶۲ھ تولدِ آں در شاہجہان آباد اتفاق افتاد"

۲۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک یعنی تقریباً سنہ ۸۹-۱۱۹۰ھ تک وہ تحصیل علم کرتا رہا۔ یا تو دہلی رہا یا فیض آباد۔ گو تاریخ

اذکار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی کی تحصیل اس شخص دہلی میں کی : ۳۵۱ (سنہ ۱۱۸۹-۹۰ھ)

۳ - سنہ ۱۱۹۰ھ میں وہ اسلام لایا۔ مصحفی کا بیان ہے : " در ایامے کہ متعلقانش بحسب آب خور بہ فیض آباد رفتہ اتفاقاً مدت گرفتہ بردست شہیدے ہیزدہ سالہ بود کہ بہ شرف اسلام پیوستہ " عقد ثریا : ۴۶ (سنہ ۱۱۹۰ھ) مسلمان ہونے کے بعد گھر بار چھوڑ کر الگ ہو گیا اور ایک زمانہ تک اطراف شاہ جہاں آباد میں نجف خاں کے لشکر کے ساتھ گھومتا رہا : " اہل بیت خود را اخیر باد گفتہ کنارہ جست و آزادانہ قدم بہ راہ تجرید نہادہ در اطراف شاہ جہاں آباد بہ لشکر ذوالفقار الدولہ نواب نجف خاں مرحوم می گشت " نشتر عشق : ۱۴۵۰

۴ - مصحفی عقد ثریا میں فدائی مشہدی کے ترجمہ میں لکھتا ہے کہ مرزا محمد حسن قتیل کے ہمراہ چاندنی چوک میں اس کی زیارت کا اتفاق ہوا (ص ۴۳)۔ مرزا ابو علی فدائی نجبائے ایران سے تھا اور بہ تقریب تجارت اسلحہ وارد ہندوستان ہوا تھا " چوں از دہلی مراجعت بہ وطن مالوف کرد در مشہد مقدس رسیدا از اسپ افتاد، ودیعت حیات سپرد " اس کا سال وفات اواخر سنہ ۱۱۹۶ھ ہے اور چاندنی چوک، دہلی کا مشہور محلہ ہے جہاں قتیل بسر کر رہا تھا۔ (سنہ ۱۱۹۶ھ)

۵ - اسی کتاب کے ترجمے میں مصحفی لکھتا ہے کہ میں سنہ ۱۱۹۸ھ میں شاہ جہاں آباد سے لکھنؤ آیا لیکن بہ سبب برہمی مزاج لکھنؤ چھوڑنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ قتیل نے ان کی ڈھارس بندھوائی " مؤخر الذکر مصحفی کے بیان کے مطابق اس وقت نواب کی ملازمت میں آ گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنہ ۱۱۹۸ھ میں قتیل لکھنؤ میں موجود تھا۔ (سنہ ۱۱۹۸ھ)

۶ - ابھی مصحفی کا تذکرہ فارسی عقد ثریا مرتب بھی نہ ہونے پایا تھا کہ قتیل دہلی سے غائب نظر آتا ہے " در ایام دوری آں آشنائے صادق ۔ ۔ ۔ تن تنہا قدم در بادیۂ تلاش اشعار و احوال ۔ ۔ ۔ مسودہ سرگذشت ہر یک را بر پارۂ کاغذی نگاشتم " ص ۳ ۔ تذکرہ عقد ثریا سنہ ۱۱۹۹ھ میں مرتب ہوا۔ زہے باغ باصفا " مادہ تاریخ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سنہ ۱۱۹۹ھ میں وہ دہلی سے غائب ہے۔ (سنہ ۱۱۹۹ھ)

۷ - تذکرہ ہندی میں مصحفی، نواب مہدی خاں رند کے ذکر میں لکھتا ہے :-

" فقیر بسبب اتفاق روزے برائے دیدن آں تہ رک تما با مرزا قتیل در ستم نگر بر مکانش گذر افکندہ بود " ص ۱۰۱ ۔

اس سے معلوم ہوا کہ قتیل بہ زمانہ ترتیب تذکرہ ہندی لکھنؤ میں موجود تھا۔ تاریخ اختتام تذکرہ سنہ ۱۲۰۹ھ ہے لیکن اس کی ترتیب کا کام سنہ ۱۲۰۱ھ سے پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ (سنہ ۱۲۰۱-۹ھ)

۸ - تذکرہ خلاصۃ الافکار میں قتیل کے ذکر میں لکھا ہے : " بہ عافیت و عزت بہ معاشرت شاگرداں و دوستاں در بلدۂ لکھنؤ بسر می برد " یہ عبارت قیام لکھنؤ پر دال ہے۔ یہ تذکرہ سنہ ۱۲۰۶ھ، سنہ ۱۲۰۷ھ میں لکھا گیا ہے۔ (سنہ ۱۲۰۶-۷ھ)

۹ - خواجہ محمد علی تمنا عظیم آبادی خلف خواجہ عبداللہ تائید عظیم آبادی متوفی سنہ ۱۲۰۶ھ نے جو نواب علی ابراہیم خاں خلیل کے معتمد تھے، ایک ضخیم بیاض فارسی شعرا کی مرتب کی ہے جس پر قتیل نے اپنے ہاتھ سے دیباچہ لکھا ہے۔ اس کے چند جملے یہ ہیں :- " قتیل بے سروپا گوید کہ چوں در سال ہزار و دو صد و دوازدہ ہجری بہ ملاقات شریف خواجہ محمد علی تمنا خلف ارشد خواجہ عبداللہ تائید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در لکھنؤ بہ دولت خانہ خان صاحب عبدالقادر خاں بہادر اتفاق افتاد " اس بیان کے غلط ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔

انڈیا آفس کی فہرست کتب خانۂ فارسی جلد دوم میں مشہور واقعات اور شعرا و اکابرین کے سنین ولادت و وفات وغیرہ دیئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۲ھ میں عبدالقادر خاں کارکن ایسٹ انڈیا کا قیام جان ہنڈن کی معیت میں لکھنؤ میں تھا۔ بہرحال ۱۲۱۲ھ میں عبدالقادر خاں لکھنؤ میں موجود تھا۔ اب رہا اس کے اور قتیل کے تعلقات[1] کا حال، سو اس کا بھی ثبوت ملاحظہ ہو:-

نہرالفصاحت کے رقعہ ۲۶ میں قتیل اپنے کسی عزیز کو لکھ رہا ہے کہ تمہارا سفر کلکتہ اور خان صاحب مولوی عبدالقادر خاں کی وساطت سے مسٹر جان ہنڈن سے ملاقات کا حال معلوم ہوا۔ "چوں ایں بے سروپا با خان صاحب ممدوح نیازے و اخلاصے است . . . ." معلوم ہوا کہ قتیل ۱۲۱۲ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا اور وہیں مولوی عبدالقادر خاں کے مکان پر اس کی ملاقات منّا سے ہوئی۔ (۱۲۱۲ھ)

۱۰۔ چار شربت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں وہ کالپی گیا اور ڈھائی سال تک وہاں مقیم رہا۔ صاحب تذکرۂ شمع انجمن کے قول کے مطابق وہ عمادالملک کا مصاحب بن گیا تھا۔ تذکرہ نتائج الافکار میں بھی یہی ہے کہ کچھ دنوں کالپی رہے اور بخیر و خوبی بسر کی۔ (۱۲۱۵ھ)

۱۱۔ چار شربت میں وہ خود لکھتا ہے کہ ۱۲۱۷ھ میں کالپی سے لکھنؤ واپس لوٹا۔ (۱۲۱۷ھ)

۱۲۔ حسین قلی خاں عاشقی تلمیذ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی کا بیان ہے:-

> ". . . الحال از عرصۂ سی و شش سال بہ لکھنؤ تشریف می دارد و از پانزدہ سال
> بہ سبب خلّت و اتحاد مرزا شجاعت علی خاں مشہور بہ آغا صاحب کہ مختار سرکار
> دولت مدار شہزادۂ آفاق مرزا اسکندر شکوہ بہادر . . . . بہ دولتِ شاہ زادۂ
> ممدوح استقامت پذیرفت" بعد تحریر احوال ناگہاں خبر جاں گداز رسید کہ
> آں فصاحت کیش بہ مرضِ استسقا بہ تاریخ بست و سوم ربیع الاوّل در
> لکھنؤ ودیعتِ حیات سپرد"

عاشقی یہ سطریں قتیل کی بالکل آخری عمر میں لکھ رہا ہے۔ اس کا سالِ وفات ۱۲۳۳ھ ہے۔ اگر اس سے ۱۵ سال نکال لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قتیل تقریباً ۱۲۱۸ھ میں سکندر شکوہ کے مصاحبوں میں داخل ہو چکا تھا۔ (۱۲۱۸ھ)

۱۳۔ دریائے لطافت کی ترتیب میں قتیل کا بڑا ہاتھ تھا اور نصفِ ثانی جو منطق و قوافی اور بیان و بدیع پر مشتمل ہے کلیتہً اس کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سعادت علی خاں مسند پر رونق افروز تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۲۲۱ھ ۱۲۲۲ھ

---

[1] عبدالقادر اور قتیل کے تعلقات پر روشنی "وقائع عبدالقادر خانی" سے بھی پڑتی ہے جس کا ایک ناقص نسخہ کتب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے۔ ایک نسخہ جامعۂ علی گڑھ میں بھی تھا لیکن اب موجود نہیں۔ راقم نے اپنے کام کے لئے کچھ اجزا کی نقل کتب خانہ حبیب گنج کے نسخہ سے کرالی ہے۔ اور اس وقت وہی پیشِ نظر ہے۔

میں قتیل لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۱۲۲۱-۲۲ھ)

۱۴۔ آزاد نے زعمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرزا حاجی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا، انشا، قتیل، مصحفی اور دوسرے شعرا جمع ہوتے، ناسخ جاتے، سب کو سنتے مگر وہاں خود کچھ نہ پڑھتے۔ (آبِ حیات: ۳۴۵) مرزا حاجی کے مکان پر مشاعرے کب ہوتے تھے اس کی ہمیں خبر نہیں، لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ انشا ایک روایت کی بنا پر ۱۲۲۵ھ میں خانہ نشین ہو گیا تھا۔ اس مجمع میں جرأت بھی نظر آتا ہے۔ اس کا سالِ وفات نئی تحقیق کی بنا پر ۱۲۲۴ھ ہے۔ یہ مشاعرے ظاہر ہے کہ ۱۲۲۴ھ یا اس کے لگ بھگ منعقد ہوا کرتے تھے جب کہ میر کے آخری ایام تھے۔ اور ناسخ کا ابتدائی دور۔

۱۵۔ معدن الفوائد، مرزا قتیل کے اُن رقعات کا مجموعہ ہے جو خواجہ امام الدین امامی نے اس کی زندگی ہی میں مرتب کیا ہے۔ اس کے ایک مکتوب میں قتیل رقمطراز ہے: "آقا صاحبان مخدوم مکرم بہ خیریت اند و ناہر سنگھ بہ کوٹھی ہستند و من بہ نخاس در خانۂ شما"، نخاس لکھنؤ کا ایک محلہ ہے۔ اور یہ مکتوب ۲۰ ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔ (۱۲۲۷ھ)

۱۶۔ ایک دوسرے مکتوب کے چند جملے یہ ہیں: "پیروز روز کہ شنبہ غرہ ربیع الثانی ۱۲۲۸ھ بود، عرضۂ شما و خطے کہ اسمی من بود در حویلی نخاس ہمسایہ از حضور بہ ایں تقریب کہ فردا روزِ مشاعرہ است رسیدم بہ مطالعہ درآمد۔" اس سے معلوم ہوا کہ ۱۲۲۸ھ میں وہ لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۱۲۲۸ھ)

۱۷۔ مولوی عبدالقادر خاں غمگین رام پوری اپنے روزنامچہ "وقائع عبدالقادر خانی" میں بہ سلسلۂ سفر لکھنؤ ۱۲۲۹ھ کے ذیل میں لکھتے ہیں: "روزے در محفل مشاعرہ کہ دراں ایام بہ خانۂ میر جعفر می بود، رفتم، مرزا محمد حسن قتیل، و مصحفی، میر نصیر دہلوی دراں زمرہ بہ گروہ بے شماری آمدند۔ و شیخ امام بخش ناسخ دراں ایام روز افزونی بہ ناموری دریں کار بود۔" (نسخۂ راقم: ق ۵) معلوم ہوا کہ قتیل ۱۲۲۹ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۱۲۲۹ھ)

۱۸۔ ۱۲۳۱ھ میں ہم اسے پھر کالپی میں موجود پاتے ہیں مظہر العجائب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ دورانِ تالیفِ کتاب میں وہ کالپی میں ہے۔ یہ کتاب ۱۲۳۱ھ میں لکھی گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ ۱۲۳۱ھ میں وہ کالپی میں موجود تھا۔ (۱۲۳۱ھ)

۱۹۔ راجہ امرت لال اپنے لڑکے مکھن لال کی شادی کے موقع پر قتیل کو جو وہیں لکھنؤ میں موجود ہے دعوت نامہ بھیجتا ہے:

"عرض اقدس می رساند کہ شب شنبہ برات بندہ زادہ مکھن لال بودہ در مکانے کہ بر چوپٹیا فروکش کردہ ام امیدوارم کہ امروز یا فردا برائے یک دو ساعت اگر غلام نوازی فرمایند موجبِ افتخار است۔"

مکتوباتِ امرت لال کے اس قلمی نسخے کی ابتدا میں کچھ اور سادہ اوراق ہیں جن پر کچھ ریختہ کے اشعار، کچھ نسخے اور کچھ قطعاتِ تاریخ درج ہیں۔ ایک قطعۂ تاریخ مکھن لال کی شادی کا بھی ہے جس سے صنعتِ تعمیہ میں ۱۲۳۲ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔ تقریب شادی لکھنؤ میں انجام پائی۔ معلوم ہوا کہ قتیل ۱۲۳۲ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۱۲۳۲ھ)

۲۰۔ اس کا سالِ وفات ۱۲۳۳ھ ہے اور اس امر پر تمام مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ اس کی وفات لکھنؤ میں ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ۱۲۳۳ھ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ (۱۲۳۳ھ)

ذیل کی سطروں سے معلوم ہوگا کہ قتیل کس سنہ میں کہاں رہا:۔

" ۱۱۷۳ھ دہلی۔ ۱۱۹۰ھ تک دہلی یا فیض آباد۔ ۱۱۹۶ھ میں دہلی۔ ۱۱۹۸ھ لکھنؤ۔ ۱۱۹۹ھ دہلی سے باہر غالباً لکھنؤ۔ ۱۲۰۶ھ۔ ۱۲۰۷ھ لکھنؤ۔ ۱۲۰۲ھ تا ۱۲۰۹ھ کے درمیان کسی ایک وقت لکھنؤ۔ ۱۲۰۷ھ کے دو چار برس پہلے سے لکھنؤ۔ ۱۲۱۲ھ لکھنؤ۔ ۱۲۱۵ھ کالپی۔ ۱۲۱۷ھ لکھنؤ۔ ۱۲۱۸ھ لکھنؤ۔ ۱۲۲۱ھ لکھنؤ۔ ۱۲۲۴ھ لکھنؤ۔ ۱۲۲۷ھ لکھنؤ۔ ۱۲۲۸ھ لکھنؤ۔ ۱۲۳۱ھ کالپی۔ ۱۲۳۲ھ لکھنؤ۔ ۱۲۳۳ھ لکھنؤ۔ اب مجھے بتایا جائے کہ آخر اس کا قیام فریدآباد میں کب تھا۔ نہ اس کا قیام وہاں ثابت۔ نہ اس کے باپ کا قیام متحقق۔ نہ وہ وہاں پیدا ہوا نہ اس کے باپ کی پیدائش وہاں ہوئی، نہ وہ وہاں مرا۔ نہ اس کے باپ کی وفات وہاں ہوئی۔ آخر یہ فریدآباد اس کا وطن کیسے ہو گیا؟

۵

یہ مضمون ۱۹۴۲ء میں ہائی اسکول کے امتحان کی فراغت کے بعد سپردِ قلم کیا گیا تھا، اور ۱۹۴۳ء کی ابتدا میں جب علی گڑھ میں فرسٹ ایئر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اشاعت کے لئے نگار کو بھیجا گیا تھا، جہاں وہ جون ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اب دس سال کے بعد نظرِ ثانی، ترمیم اور اضافہ کے ساتھ اسے پھر شائع کیا جا رہا ہے۔ اس اثنا میں کچھ نئے مواد تک بھی رسائی ہوئی اور بعض پرانے بیانات کی مزید تحقیق کا بھی موقع ملا۔ تحقیق کی دنیا میں دس ماہ کی مدت بھی بہت ہے اور کبھی کبھی ایک آدھ بات ایسی نظر آ جاتی ہے جس کی بنا پر پرانے نظریے باطل قرار دینے ہوتے ہیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ دس سال گزر جانے پر بھی جو ابتدائی مفروضہ میں نے قائم کیا تھا اور جو دعوے اس مضمون میں کیا گیا تھا، اس سے بال برابر ہٹنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی بلکہ اپنے دعوے پر اور مستحکم ہونے کا موقع ملا۔ اس اثنا میں بزرگوں اور دوستوں کی رائیں بھی معلوم ہوئیں۔ اپنے مخدوم قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مضمون کا بڑے غور سے مطالعہ فرمایا اور بڑے مفید مشورے دیئے ہیں۔ ان کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک دو مضمون بھی اس سلسلے میں لکھے گئے جن میں مخدومی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی کا مضمون قابلِ ذکر ہے۔

انھوں نے اپنے گرانقدر مضمون میں بعض نئی باتیں کہی ہیں۔ ان کی وضاحت ضروری ہے۔

فریدآبادی صاحب نے "مرزا قتیل کا وطن" کے عنوان سے ایک مضمون رسالہ اردو جنوری ۱۹۴۵ء میں شائع کیا ہے۔ تمہید کے بعد آپ رقمطراز ہیں:-

> " رسالہ نگار میں مختارالدین صاحب آرزو نے بڑی محنت اور قابلیت سے قتیل کے حالات مختلف تذکروں سے جمع کئے ہیں اور زیادہ وثوق سے عاشقی عظیم آبادی کی شہادت پیش کی ہے جو قتیل کا ہم عصر اور اس کے ساتھ خط و کتابت رکھتا تھا اور بڑی تفصیل سے اس کے حالات تحریر کرتا ہے۔ اس نے قتیل کی ولادت شاہ جہان آباد، دہلی، بتائی ہے۔ بعض اور معتبر تذکرے بھی اس کی طفلیت اور ابتدائی نشو و نما دہلی تحریر کرتے ہیں۔ مختارالدین صاحب کا بھی یہی خیال معلوم ہوتا ہے اور ہمیں ان کی تائید میں عذر نہیں۔ لیکن مضمون کے آخر میں یہ وہ سوال کرتے ہیں کہ "آخر فریدآباد اس کا وطن کیسے ہو گیا؟" جواب میں عرض ہے کہ اس کے دہلوی کہلانے اور فریدآبادی ہونے میں

کوئی تناقض نہیں ہے۔ کیونکہ فریدآباد، دہلی کے مضافات میں داخل اور "دریائے لطافت" میں اس کا نام دہلی کے محلوں اور بازاروں کے ضمن میں تحریر کیا گیا ہے اور یہ وہ کتاب ہے، جس کے آخری دو باب خود مرزا قتیل نے لکھے تھے۔"

عرض یہ ہے کہ جب دہلوی کہلانے اور فریدآبادی ہونے میں کوئی تناقض نہیں ہے تو اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔ اب ایسے بیان پر بھروسہ کرنا زیادہ بہتر ہے جس میں اکثریت کا اتفاق ہو۔ سارے قدیم تذکرہ نویس اسے دہلوی کہتے ہیں فریدآبادی کوئی نہیں بتاتا۔ اس لئے اسے دہلوی ہی کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے خصوصاً ایسی شکل میں کہ:۔

"تاریخوں اور تذکروں سے قطع نظر خود فریدآباد کا محلِ وقوع اور دہلی سے تعلقات ایسے رہے کہ اگر کوئی تذکرہ نویس قتیل کو ایک نواحی بستی کی تفصیل لکھنے کے بجائے اجمالاً دہلوی لکھتا ہے تو اسے غلط نہیں کہہ سکتے۔"

آخر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بہرحال اتنا یقینی ہے کہ غالب نے جو قتیل کے قریب العصر اور دہلی کے رہنے والے تھے، اس کے فریدآبادی ہونے کا حال کسی سے سنا ہوگا۔ ورنہ وہ خود اس کا وطن تصنیف نہ کرتے، یہ بہت بعید از قیاس بات ہے۔ پس جب تک ان کے کسی ہمعصر کی تردید میسر نہ آئے ہم حالیہ ردّ و قدح کو ان کے بیان کی تکذیب کے لئے کافی نہیں سمجھتے۔"

غالب کی تحقیق اور حاسۂ تاریخی کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے۔ پھر غالب نے اسے لکھنوی اور ایک جگہ دہلوی بھی تو لکھا ہے۔ غالب کے ایک قول کو تسلیم کیا جائے اور دوسرے اقوال کو کیوں ٹھکرایا جائے خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ اقوالِ صحت سے قریب تر ہونے کا امکان زیادہ رکھتے ہوں۔ آخری اقوال، ان کی عمر کے آخری دَور کے اقوال ہیں اور ہو سکتا ہے کہ انھیں بعد میں صحیح اطلاع ملی ہو اور وہ اپنے پہلے قول سے پھر گئے ہوں۔ اور جہاں تک وطن تصنیف کرنے کا تعلق ہے تو انھیں تو آدمی تصنیف کرتے دیر نہیں لگتی۔ عبدالصمد ہرمز ان کی تصنیف نہیں تو اور کیا ہے؟ رہا سوال ہمعصر کی تردید کا، تو پہلے یہ تو معلوم ہو کہ غالب کے علاوہ قتیل کی وفات کے وقت غالب کی عمر بیس اکیس سال کی تھی جو زمانہ ان کی جوانی کی رنگینیوں کا تھا، مرزا اس زمانہ میں دہلی میں تھے کبھی کبھار ننھیال آگرے چلے جاتے ہوں گے۔ ان کا اس زمانہ میں لکھنؤ جانا اور قتیل کا دہلی آنا ثابت نہیں۔ اس لئے ملاقات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان وجوہ سے ان دونوں کی معاصرت بھی کچھ ویسی ہی ہے۔ اور کون ایسے معاصر ہیں جو قتیل کو فریدآبادی بتلاتے ہیں۔ اور فاضل مضمون نگار عاشقی عظیم آبادی اور خواجہ تمنا عظیم آبادی کو قتیل کے معاصر کیوں نہیں سمجھتے۔ جن سے تعلقات، خط و کتابت اور ملاقات سب کچھ ثابت ہے؟

مصادر:۔

مرزا قتیل کی مطبوعہ تصانیف، تاریخ و تذکرے کی کتابوں اور رسائل کے علاوہ ذیل کے مخطوطات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا مرتبہ سعادت خاں ناصر، نسخۂ خدابخش بانکی پور، جامعۂ علی گڑھ۔

۲۔ تذکرۂ سفینۂ ہندی	مرتبہ بھگوان داس۔ نسخۂ خدا بخش بانکی پور
۳۔ تذکرۂ نشترِ عشق	مرتبہ آغا حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی۔ نسخۂ خدا بخش بانکی پور۔
۴۔ تذکرۂ معراج الخیال	مرتبہ میر وزیر علی عبرتی عظیم آبادی۔ نسخۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔
۵۔ تذکرۂ ریاض الاذکار	مرتبہ میر وزیر علی عبرتی عظیم آبادی۔ نسخۂ راقم۔
۶۔ تذکرۂ خلاصۃ الافکار	مرتبہ ابوطالب تبریزی اصفہانی۔ نسخۂ خدا بخش بانکی پور۔
۷۔ عمّان المعانی	مرتبہ خواجہ محمد علی تمنّا عظیم آبادی۔ نسخۂ قاضی عبدالودود صاحب بانکی پور۔
۸۔ کلیاتِ قتیل	از قتیل۔ نسخۂ خدا بخش، جامعۂ علی گڑھ، جامعہ بنارس، حبیب گنج۔
۹۔ رقعاتِ امرت لال	مرتبہ امرت لال۔ نسخۂ راقم۔
۱۰۔ وقائع عبدالقادر خانی	مرتبہ عبدالقادر خاں غمگین رامپوری۔ نسخۂ راقم[1]۔

---

[1] یہ مضمون کچھ دنوں سے گم تھا اور میں اس سے مایوس ہو چکا تھا کہ کہیں سے لے کے آفتاب زبیری صاحب نے اس کا مسودہ ڈھونڈھ نکالا، انھیں نے اس کی نقل بھی تیار کی، میں اس کے لئے ان کا ممنون ہوں۔ (مختار الدین احمد)

مثنوی بہارِ عشق

خواجہ احمد فاروقی

ہماری تنقید ایک عرصہ تک واعظ و محتسب کا کام انجام دیتی رہی ہے۔ اسی لیے مرزا شوقؔ کی مثنوی بہارِ عشق کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ ہم نے پیالہ کو مرقع کی آستین میں پوشیدہ رکھا۔ لیکن اس میں عکسِ یار دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم زاہدِ خود بیں سے سیکھنے میں مصروف رہے اور یہ کبھی نہیں سمجھے کہ رندِ قدح خوار سے بھی بہت سی باتیں سیکھی جاسکتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بہارِ عشق کسی کے دبے ہوئے لیکن پُرخروش جنسی رجحانات کی نشاط انگیز داستان ہے۔ یہ سیہ کاری اور عیش کوشی کی کہانی ہے۔ جس کو شاعر نے پوری بے باکی اور بے حجابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن اس نے رنگین پردہ ڈال کر پردہ کے نقش و نگار کو حقیقت باور نہیں کرایا۔ اور نہ معذرت پیش کر کے اپنے گناہ کو بدتر از گناہ بنایا ہے۔

مثنوی پڑھنے کے بعد ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں؟ کیا مرزا شوقؔ نے محض زندگی کی ترجمانی ہی کی ہے اسے بلند نہیں کیا؟ کیا ان کی پستی میں عفونت ہی عفونت ہے، کسی قسم کی لطافت نہیں ہے؟ کیا ان کی فتادگی بلندی کی منازل قطع کرنے میں کوئی بھی مدد نہیں دے سکتی؟

ایک شخص جو اپنے سر پر بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے اندھیری رات میں دشوار گذار سفر طے کرتا رہا ہے۔ وہ اگر راستہ کے پیچ و خم اور نشیب و فراز سے، دوسرے راہ گیروں کو مطلع کر دیتا ہے تو وہ ہسن کے الفاظ میں اپنا ہی بوجھ ہلکا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کا بھی بوجھ ہلکا کر دیتا ہے۔

خیامؔ نے ایک شیخ اور زنِ فاحشہ کا مکالمہ لکھا ہے۔ زاہد نے بدکار عورت کو جھڑکا کہ تو ہر وقت مست و خراب رہتی ہے۔ تو نے خیر سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے۔ اور شر سے وابستہ ہو گئی ہے۔ کچھ عاقبت کی بھی خبر ہے تجھے؟ اس نے کہا "حضور" میں تو جیسی ہوں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہوں کیا آپ بھی ایسے ہیں جیسے اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں؟

مرزا شوقؔ نے اپنے انداز میں اسی سوال کو دہرایا ہے اور اس سوال کی جبین اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

یہ قصہ جانِ عالم واجد علی شاہ کے اس لکھنؤ سے متعلق ہے جہاں فیضِ نسیم اور جلوۂ گل کی کمی نہیں تھی۔ ہر منظر جنتِ نگاہ اور ہر گوشہ بساط دامانِ باغباں بنا ہوا تھا۔ نظارہ جمال بھی تھا۔ اور شوقِ وصال بھی، رہس کے سوانگ، اندر سبھا کی پریوں کے جمگھٹے، درگاہ حضرت عباس اور قیصر باغ کے میلے اور شعر و سخن کی عام صحبتوں نے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکمِ قضا کو جامِ شراب کی گردش سے پھیر دیا ہے

اور شام و سحر کی یہ رنگینیاں قائم ہو کر رہ گئی ہیں۔

مے و رامش و رنگ و بو کی یہ فیض بخشیاں صرف "آفتاب سہ پہر جاہ و حشم" ہی کے لیے مخصوص نہیں تھیں جن کے اختیارات کم ہوتے ہوتے محدود ہو گئے تھے۔ بلکہ ہر غریب و امیر اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ہر خاص و عام کے آگے اسی طرح ایک نہ ایک جام سرشاری رکھا ہوا تھا۔ زہرۂ صبح بھی تھا، اور جام بلور بھی، صراحیٔ مے ناب بھی تھی اور سفینۂ غزل بھی، لوگ، ماضی و مستقبل کو حال کی سرمستیوں اور رنگینیوں میں بھلا چکے تھے اور دست افشانی اور پاکوبی کا مفہوم صرف یہ رہ گیا تھا کہ:-

بیا تا یک امشب تماشا کنیم
چو فردا شود فکر فردا کنیم

بہار عشق کے قصہ کی ابتدا اور انتہا اسی حسن ریز اور عشق خیز سرزمین میں ہوتی ہے۔

میر افسانہ لکھنؤ کا ایک خوب صورت نوجوان ہے۔ جس کا وقت انہی معصوم قہقہوں اور چہچہوں میں گزرتا ہے۔ وہ عشق و عاشقی سے قطعی ناواقف ہے اور دام الفت سے ناآشنا۔

دام الفت سے ہم نہ تھے آگاہ   کسی یوسف کی تھی نہ ہرگز چاہ
عیش و عشرت میں کٹتی تھی اوقات   چہچہوں میں گزرتی تھی اوقات
عشق کا سنتے تھے نہ افسانہ   شمع رویوں پہ تھے نہ پروانہ
جان دیتے نہ تھے کسی گل پر   ہنستے تھے نالہائے بلبل پر
آہ و زاری جو کوئی کرتا تھا   اک اچنبا ہمیں گزرتا تھا

لیکن ایک دن جب کہ وہ لکھنؤ کے شرفا کے دستور کے مطابق چوک میں سیر کرنے جا رہا تھا۔ اتفاقاً ایک کافر ادا سے آنکھیں چار ہو گئیں۔ اور اس کے ہوش و خرد کا سارا سرمایہ چھن گیا۔ وہ دل جہاں اب تک مسرت و اطمینان کی حکمرانی تھی، وہاں اضطراب و التہاب کا پرچم گڑ گیا۔ یہ داستان خود شاعر کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔

ایک دن جو برائے سیر اٹھا   دیکھی کوٹھے پہ ایک ماہ لقا
بام روشن تھا طور کی صورت   سر سے پا تک تھی نور کی صورت

"ماہ لقا" کی یہ تصویر کتنی مکمل اور دل کش ہے۔

حسن یوسف بھی اس کے آگے ماند   چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
گل سے رخسار، گول گول بدن   گات جس طرح ٹمکتے روشن
رخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال   رنگ گل سے وہ ہونٹ پان سے لال
سیہ مسی کے وہ دانت رشک قمر   جان عاشق نثار ہو جس پر
ناک میں نیم کا فقط تنکا!   شوخی چالاکی منتہا سن کا!
آستینوں کی وہ چنٹی کرتی   جسم میں وہ شباب کی پھرتی

قد میں آثار سب قیامت کے   گوری گردن میں طوق منت کے
رخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم   جس طرح گل پہ قطرۂ شبنم
عکس رخ موتیوں کے دانوں میں   بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
رگِ گل سی کمر لچکتی ہوئی   چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی
سرو سا قد تو گل سے رخسارے   شانے بازو بھرے بھرے سارے

کتنا مکمل اور صحیح نقشہ ہے یہ۔ مہ لقا کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ اس کی جوانی ابھی کانٹے میں تُل رہی ہے۔ اس کی خوبصورتی آرائش اور تکلف سے یکسر بے نیاز ہے، مرزا شوق نے بکھرے ہوئے بالوں، بے مسّی کے دانتوں، آستینوں کی پھنسی کرتی، جسم کی پھُرتی، ناک میں نیم کے تنکے، کانوں کی بجلیوں، بھرے بھرے بازوؤں، پسینہ کے چھوٹے چھوٹے قطروں، اور چوٹی کے لٹکنے کا ذکر کرکے مہ لقا کی تصویر اپنے باریک موقلم سے پوری خوبی و صناعی کے ساتھ کھینچی ہے۔ اس سراپا میں اور زہرِ عشق کے سراپا میں بڑا فرق ہے۔ اس سے مقصود نہ رخِ روشن کے آگے شمع رکھنا ہے اور نہ رسمی مقابلہ کرنا۔ بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آب و رنگ اور جزئیات کے اعتبار سے بہارِ عشق کی تصویر زیادہ دل پذیر ہے۔ زہرِ عشق کے اس قسم کے الفاظ، غیرتِ حور، کمال خلیق، رشکِ چشمِ غزال، بے عدیل و نظیر ہمارے سامنے مہ جبین کا پورا نقشہ پیش نہیں کرتے۔ بہارِ عشق میں یہ تعمیم نہیں ہے۔ مہ لقا کی ادائیں الگ ہیں۔ مخصوص ہیں، اُسی کے لیے ہیں۔ سراپا میں جس جگہ بھی نظر کیجیے یہ جی چاہتا ہے کہ عمر وہیں بسر کر دی جائے۔ ایک ایک کرشمہ دامنِ دل کو کھینچتا ہے اور کہتا ہے ’یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم!

میرِ مثنوی اس جوبن اور جوان منظر کی تاب نہ لا سکا۔ اور ایک ہی نگاہ میں دل ہی کا سودا نہیں ہوا بلکہ اس کا زمین و آسمان بھی پھس گیا۔

جب نظر سے نظر دوچار ہوئی   ایک برچھی جگر کے پار ہوئی
رنگ رخ دیکھتے ہی زرد ہوا   دل میں بے اختیار درد ہوا
دل جو صدمہ بڑا اٹھاتا تھا   ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا
غش نے کی دل سے کچھ ادائی سی   منہ پہ چھٹنے لگی ہوائی سی
سوزشِ داغِ دل دوچند ہوئی   آتشِ عشق سر بلند ہوئی
سوزِ دل نے یہ آگ بھڑکائی   جان گھبرا کے لب تلک آئی
منہ کو تاب و تواں نے پھیر لیا   ابرِ گیسو نے دل کو گھیر لیا
واں سے جنبش تلک ہوئی دشوار   تیر کھائے ہو جس طرح سے شکار
جان و دل مبتلائے درد ہوئے   یک بیک ہاتھ پاؤں سرد ہوئے
بس کلیجہ سا کوئی ملنے لگا   غم سے دل دو دو ہاتھ اچھلنے لگا

یہ آخری شعر بھی ملاحظہ ہو۔

شہر سارا اجاڑ تھا گویا   اتنا رستہ پہاڑ تھا گویا

یہ کیفیات اصلیت سے اتنی قریب ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پہلی نگاہ کی محبت اکثر نکتہ چینیوں کی نظر میں قابلِ اعتراض رہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محبت کو کسی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا اس کا کوئی وقت، کوئی لمحہ مقرر نہیں ہے۔" اس کا نہ کوئی قانون ہے، نہ کوئی "تاریخ" پھر اس قسم کا فیصلہ کرتے وقت ہمیں اُس زمانہ کے، اور اپنے ملک کے مخصوص حالات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہاں بہت سی عورتیں ہی نہیں، مرد بھی قفس میں بند رہتے ہیں اور کسی فتنہ طراز کو دیکھ کر ان کے تاثرات بھی اتنے ہی شدید ہوتے ہیں۔

یہ زخم اتنا کاری تھا کہ میر مثنوی کی تمام شب بے چینی اور اضطراب کے ساتھ گزری ——— عشق کا رات بھر تو جوش رہا؛ صبح ہوتے ہی پھر نہ ہوش رہا۔ دوست آشنا نہایت پریشان ہوئے، صدقے بیسلے اُترنے لگے۔ گلاب چھڑکا جانے لگا۔ اقربا کو بھی تشویش ہوئی۔ اور بعض کو تو یقین ہو گیا کہ یہ شخص اب جاں بر نہیں ہو سکتا۔ یہ بات مبالغہ آمیز ہو سکتی ہے لیکن ناممکن نہیں۔

روکے کہتا تھا کوئی غم ہے بڑا　　یک بیک آسمان ٹوٹ پڑا
کچھ دوا کرتے دل کو صبر آتا　　کاش بیمار پڑ کے مر جاتا
نہ سنی اور نہ کی نہ اپنی کہی　　دل کی حسرت تمام دل میں رہی
اللہ آمیں سے اس کو پالا ہے　　سارے گھر کا یہی اجالا ہے

سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا کہ خدا خدا کرکے اس مریضِ غم نے آنکھیں کھولیں اور اس بے ہوشی سے نجات پائی ———

تن بے جاں میں سب کے جان آئی

رنج اور غم دلوں سے ہو گئے دُور　　اپنے بیگانے سب ہوئے مسرور

اب لوگوں نے اس زخم بے نشاں اور تیر بے کماں کا پتہ لگانا شروع کیا۔ ایک آدمی قسمیں دے دے کر پوچھنے لگا۔ ناچار پوری داستان سنانا پڑی۔

ماجرا سب بتا دیا ان کو　　ان کے گھر کا پتہ دیا ان کو

دوستوں نے غم گساری اور چارہ سازی کا پورا یقین دلایا۔

آشنا بولے شہر چھانیں گے　　لائیں گے ہم جہاں سے جانیں گے
ہیں جو اس شہر میں تو آئیں گی　　ہم سے چھپ کر کہاں پہ جائیں گی

کچھ عرصہ اسی پریشانی اور اضطراب میں گزرا۔ عاشق کا کسی چیز میں دل نہ لگتا تھا۔ دریا کی سیر کی۔ باغ کی بہار، چوسر، شطرنج کوئی چیز اسے مسرور نہ کر سکتی تھی۔

بالآخر ایک دوست نے اس کے گھر کا پتہ لگا لیا۔ اور آکر یہ خوش خبری سنائی۔ لیکن دیکھئے کتنے لطیف انداز میں سنائی ہے۔

جس پہ عالم فریفتہ ہے آج　　حسن خود جس کا شیفتہ ہے آج
جس کو ہے ادعائے یکتائی　　آفتِ جاں ہے جس کی رعنائی
تیغ ابرو سے جس کی بسمل ہو　　تیر مژگاں سے جس کے گھائل ہو

جس کی خاطر ہوا ہے حال تباہ ؟   جس کی فرقت میں ہو کمال تباہ
کھاتے پیتے ہو اور نہ سوتے ہو   جس کی اُلفت میں جان کھوتے ہو
واسطے جس کے نالے کرتے ہو   جان دیتے ہو جس پہ مرتے ہو
دل پڑا جس کے غم میں جلتا ہے   جس ستمگر پہ دم نکلتا ہے
جس کا رہ رہ کے دھیان آتا ہے   جس پہ دم دشمنوں کا جاتا ہے
گھر بڑی محنتوں سے پایا ہے   آج اس کا پتہ لگایا ہے

اس کے جواب میں عاشق کا تاثر صرف یہ ہے

ہنس دیا، رنج دل سے دُور ہُوا

پھر گھبرا کے پوچھتا ہے وہ کب آئیں گی ؟

یا مجھے اپنے گھر بلائیں گی ؟

دوست ہنستا ہے اور کہتا ہے: ہوش کی دوا کرو۔ یہ کچھ ایسا سہل اور آسان تھوڑی ہے ۔

ہنس کے اس نے کہا حواس میں آؤ   ان مری باتوں پر نہ اتراؤ
ایسا آسان ان کا آنا ہے   سہل کچھ آپ کا بلانا ہے
کس نے یہ مشورہ بتایا ہے   دل کہیں اور بھی لگایا ہے
عشق آفاتِ آسمانی ہے   برسوں لوگوں نے خاک چھانی ہے

اس کے بعد عشق کے فلسفہ پر تقریر ہے۔ یہ طولانی ضرور ہے۔ لیکن اُردو لٹریچر میں اس کامیاب تجزیہ کی مثالیں ایک ہی دو جگہ مل سکیں گی۔

عشق آفاتِ آسمانی ہے   برسوں لوگوں نے خاک چھانی ہے
شمع ہو کے کہیں پگھلتا ہے   کہیں پروانہ بن کے جلتا ہے
کہیں سرمہ ہے، چشمِ تر ہے کہیں   کہیں صندل ہے، دردِ سر ہے کہیں
کہیں ہے کفر اور کہیں اسلام   کہیں دونوں کو کرتے ہیں یہ سلام
کہیں آتش ہے خود کہیں ہے خلیل   کہیں ساقط ہے مثلِ نبضِ علیل
کہیں فرقت کا دردمند ہے یہ   کہیں مغرور، خود پسند ہے یہ
کہیں زخمِ جگر کا پھاہا ہے   درد بن کر کہیں کراہا ہے
کہیں عارض کا خال بنتا ہے   کہیں چشمِ غزال بنتا ہے
کہیں افعیِ زلفِ یار ہے یہ   کہیں تریاق زہر مار ہے یہ
گریۂ چشمِ خونچکاں ہے کہیں   خندۂ زخمِ عاشقاں ہے کہیں

کہیں خود بینی اس کو نا مرغوب   کہیں آئینہ ہے رُخِ محبوب
کہیں خنجر ہے دستِ قاتل کا   کہیں مرہم جراحتِ دل کا
ہے کہیں تاج بادشاہی کا   کہیں کشکول ہے گدائی کا
گلِ رخسارِ آتشیں ہے کہیں   نالۂ بلبلِ حزیں ہے کہیں
سینکڑوں جی سے کھو دیئے اس نے   لاکھوں بیڑے ڈبو دیئے اس نے
بھولا فرہاد ساری کوہ کنی   جانِ شیریں پہ آخر آن بنی
وصل تم سمجھے آج ہی کل میں   قیس برسوں پھرا ہے جنگل میں

اس کے بعد دوست طریقۂ کار بتلاتا ہے۔ کہ پہلے ان سے ربط بڑھایا جائے۔ پھر باتوں باتوں میں تمہارا حال بتلایا جائے۔ کیا عجب ہے کہ وہ ترس کھائیں اور دیکھنے بھی چلی آئیں۔

پہلے بیگانہ وار جائیں گے   ربط اُن سے بہت بڑھائیں گے
ربط ہووے گا جب کمال اُن سے   کچھ کہیں گے تمہارا حال اُن سے
کہیں گے ہجر میں وہ مرتے ہیں   رات دن آہ و نالہ کرتے ہیں
غمِ فرقت سے ہے لبوں پر جان   کوئی دو چار دن کے ہیں مہمان
خوں کا الزام سر پہ کیوں لاؤ   ایک دن تم بھی جا کے دیکھ آؤ
اجر اس کا تمہیں خدا دے گا   جو سنے گا بہت دعا دے گا

دوست کی ہوشیاری میں شبہ نہیں، وہ پہلے سے سوچ لیتا ہے کہ اس اقدام کے اثرات کیا مرتب ہوں گے۔

پہلے یہ سُن کے ہوں گے چیں بجبیں   ایک کر دیں گے آسمان و زمیں
بیچ والے کی شامت آئے گی   پہلے ہم پر قیامت آئے گی
یوں ہی طے ہوں گے مرحلے دو چار   غصہ کم ہوتا جائے گا ہر بار
بے اثر کب یہ چاہ ہوتی ہے   دل سے اک دل کو راہ ہوتی ہے

جب محبت اپنی تاثیر دکھائے گی تو وہ کوئی نیا فقرہ بنائیں گے اور خود چلے آئیں گے۔

"عاشق" دوست کی یہ تقریر، تصویر بنا ہوا، چپ اور خاموش سنتا رہا۔ تمنا کی بے تابیاں اور دل کی بے قراریاں کسی تدبیر ہی کی آرزو مند تھیں۔ وہ بے چین ہو کر کہتا ہے۔

اس کی تدبیر اب شتاب کرو
میری مٹی نہ یوں خراب کرو

آخر میں کہتا ہے:-

میرے مرنے پہ ان کو لاؤ گے
جب میں مر جاؤں گا تو جاؤ گے

دوست وعدہ کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔ لیکن سراسیمہ، ششدر اور پریشان ہے کہ یہ کام کس طرح انجام دے اور کس کو ہمراز بنائے۔ اتفاق سے ایک ماما مل جاتی ہے، جس کی تصویر مرزا نے ایسی صناعی اور چابک دستی سے کھینچی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گوشت و پوست کی صورت میں، چہلیں کرتی ہوئی ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کی رہبری اور امداد سے ابتدائی دقتیں دور ہو جاتی ہیں۔

اتنے میں نکلی گھر سے ایک عورت   سانولا رنگ، چلبل صورت
لال بنفشہ، ازار بند بڑا   گچھا اک کنجیوں کا اس میں پڑا
کھیلتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی!   آنکھ ایک ایک سے ملاتی ہوئی
چاق چوبند سینہ زوری میں   پھول رکھے ہوئے کٹوری میں
آنکھ ایک ایک پر لگاوٹ کی   بات ایک ایک سے گھلاوٹ کی
حسن کے دن جوانی زوروں پر   رات کی باسی مہندی پوروں پر
دھیان ایک اک سے بدگمانی کا   ستیاناس ہو جوانی کا
یہاں ٹھہری کبھی وہاں ٹھہری   دو منہ ہنس بول لی جہاں ٹھہری

یہ ایک متوسط گھرانے کی ماما کا حلیہ ہے اور اس تاریخی ماحول میں بالکل کھپ گیا ہے۔ غالب نے بھی ایک خط میں ماما کا نقشہ کھینچا ہے اور اس میں ان ہی شوخ رنگوں سے کام لیا ہے۔

دوست نے اپنی ضرورت اس سے بیان کی اور کہا کہ اپنی بیگم کو کھڑے کھڑے دروازے تک بلا دو۔ ان سے ایک دو ضروری باتیں کہنی ہیں۔ میں کسی کو بیچ میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ بات ان ہی سے کہنے کی ہے۔ اس میں ان کو زحمت تو ہوگی۔ لیکن "غیر کے سننے کا پیام نہیں" ——— وہ ہی سن لیں تو بہتر ہے۔

ماما اقرار کر لیتی ہے وہ اس کو کوئی بڑا کام نہیں سمجھتی۔ وہ جانتی ہے کہ بات سننے میں ایسی قیامت نہیں ہے

وہ مٹکتی چلی گئی گھر میں
یہ اکیلے کھڑے رہے در میں

بیگم بہت خفا ہوئیں۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ بے پوچھے گچھے کیوں لے آئی اُسے قطامہ کہیں کی؟

بات کرنے کا ہے یہ کون طریق   کر لیا ہوتا خوب سا تحقیق!
آئے کس جا سے ہیں پیام ہے کیا   کس نے بھیجا ہے ان کا نام ہے کیا
پوچھا تو ہوتا ماجرا کیا ہے   تو بھی اے رنڈی کتنی خیلا ہے
بات کا کچھ سلیقہ خاک نہ ڈھول   نوج اتنا ہو کوئی اول جلول
جھوٹ سچ پائنچے ہلاتی آئی   چر چلے کرتی کھل کھلاتی آئی

اس کے بعد غصہ سے کہتی ہے۔

پھر یہ غصہ سے بولی او خود کام	کوئی کرتا ہے اس طرح کے کلام
دُور ہو بس کہ ہے قصور معاف	پاس کرتی ہوں جان کر اشراف
ورنہ اس کا مزہ چکھا دیتی — !	کیا کہوں جو تمہیں سزا دیتی
اب خبردار یاں نہ آئیے گا	پھر نہ یہ بات منہ پہ لائیے گا
میری جوتی سے زہر کھایا ہے؟	مجھ کو کس بات پر ڈرایا ہے
جان جائے گی ان کی جائے گی	میری پاپوش بھی نہ آئے گی

مہ لقا کے ذہن میں ایک کش مکش ہے۔ اسے آبرو کا بھی پاس ہے اور خونِ ناحق کا ڈر بھی ہے۔

دیکھیے یہ الفاظ ایک عام عورت کے کتنے آئینہ دار ہیں۔

اسے لو افیون کھائی قہر کیا	اور بھی اپنے حق میں زہر کیا
اب جو آئی بھی تھی نہ آؤں گی	جلے کو اور بھی جلاؤں گی
ان کی قسمت میں یوں ہی مرنا تھا	مجھ کو رسوائے شہر کرنا تھا

لیکن پھر سوچتی ہے کہ اس نے خودکشی کا اقدام کیا ہے۔ اگر وہ اس کی جان بچا سکتی ہے تو اسے بچانا چاہیے۔ انسانیت اور نسوانیت دونوں کا تقاضا یہ ہے رسوائی دونوں طرف ہو رہی ہے یوں خونِ ناحق بھی گردن پر رہ جائے گا۔

پر مرا دل بھی تھرتھراتا ہے	سُن کے لرزہ خدا کا آتا ہے
درگزر کس طرح کروں حق سے	ہول آتا ہے خونِ ناحق سے

جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو وہ جھنجھلا کر اپنے ذہن میں یہ ہی طے کرتی ہے۔

کیسی جلتی ہے جان رہ رہ کر	یہ ہی آتا ہے دھیان رہ رہ کر
گالیاں منہ پہ دیجیے چل کر	جھوٹ سچ دیکھ لیجیے چل کر

اس کے بعد کہتی ہے :۔

خیر اب جلد تم یہاں سے جاؤ	جس طرح ہو سکے دوا پلواؤ
پہلے اپنی طرف سے دم دینا	پھر مری جان کی قسم دینا

گھر کے اندر بیٹھنے والی۔ دنیا کے گرم و سرد سے ناواقف، نوجوان، نادان اور ناتجربہ کار لڑکی اگر اس ہم رنگ زمین دام میں گرفتار ہو گئی۔ تو ایسی حیرت کی یا دنیا سے نرالی بات نہیں ہے۔ اس کا یہ پیام دیکھیے کیا اس میں شرافت نفس کا کوئی جذبہ نہیں ہے

اور یہ کہنا او خدائی عذاب	یوں بھی کھوتا ہے کوئی اپنا شباب
یوں گنواتا ہے کوئی اپنی جان	سب سمجھتے ہیں جان ہے تو جہان
دو مہینے میں تم کو خبط ہوا	سال دو سال بھی نہ ضبط ہوا

ایک ساغر میں ہوش اُڑ گئے واہ   کتنے کم ظرف ہو معاذ اللہ

آخر میں کہتی ہے :-

پھر یہ بولی وہیں نہ رہ جانا   اک ذرا آ کے حال کہہ جانا
ہم بھی درگاہ آج جائیں گے   ہو گی فرصت تو واں بھی آئیں گے

دوست نے آکر یہ ساری رُوداد عاشق کو سنائی اور زہرہ اسے فقرے پر زور دیا۔

عزت اللہ نے بچائی آج   ہم تو سمجھے تھے منہ کی کھائی آج
آپ کے لیے بھی ضرر ہوتا   گر یہ فقرہ نہ کارگر ہوتا
پہلے غصہ تھا طور تھے بے طور   بکتے تھے قول و فعل اور ہی اور
جب کہا میں نے زہر کھایا ہے   سن کے لرزہ اُنہیں تب آیا ہے

مہ لقا کے آنے کی خوش خبری سن کر مہرِ افسانہ کے قالبِ بے جاں میں جان سی پڑ گئی۔

سن کے یہ ہاتھ پاؤں پھول گئے   رنجِ فرقت تمام بھول گئے

یہ دیوانی لڑکی ایک شریف بدمعاش کی باتوں پر اعتبار کر کے اور درگاہِ حضرت عباس کے جانے کا بہانہ کر کے یہ ثنوی کے ہاں پہنچ گئی۔ ماما اس کے ساتھ تھی۔ اس کی شوخی اور طراری کا وہی عالم تھا۔ جو ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں۔

پوچھتی آئی ہے یہاں تک گھر   ہاتھ رکھے کھڑی ہے کولھے پر
اپنے سایہ سے بھی بھڑکتی ہے   بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے
ہنسی ٹھٹھا جگت ضلع میں طاق   چل رہی ہے زباں تڑاق پڑاق
کھڑی ایک اک کا منھ چڑاتی ہے   ہنسے دیتی ہے لوٹی جاتی ہے
چوٹی لپٹی ہے باسی ہاروں سے   لڑ رہی ہے جگت کہاروں سے

مہ لقا کو پردہ کر کے باغ میں اتروایا گیا۔ اس کا آنا بھی قیامت کا آنا تھا۔

سب حیا سے بدن چرائے ہوئے   پائنچے ناز سے اُٹھائے ہوئے
شرم سے گو عرق تھا سب تن میں   پر شرارت بھری تھی چتون میں
نوک جھوک اک جمال سے پیدا   بانکپن چال ڈھال سے پیدا
شوخ و طرار چلبلی کم سن   حسن اُبلا ہوا بہار کے دن
کچھ گندھے کچھ کھلے وہ سر کے بال   سارے معشوقوں سے نرالی چال
ادا معشوق پن کی گھاتوں میں   شرم آنکھوں میں قہر باتوں میں
چال اٹکھیلیوں سے چلتی آئی   دل کو پاؤں کے نیچے ملتی آئی
جان عشاق ہوتی تھی پامال   دیتے تھے قتل کی صدا خلخال

گھنگھرو جوتی کے جگمگاتے تھے   ہاں میں ہاں اور یہ لانتے تھے
منتخب حسن اس کا لاکھوں میں   لال ڈورے نشیلی آنکھوں میں
گوری رنگت پری سی صورت میں   چلبلا پن بھرا طبیعت میں
آنکھوں پر سحر ہونٹوں پر اعجاز   بات کرنے کا اک نیا انداز
تھا عجب پیچ و تاب کاکل کا   پھٹا پڑتا تھا جوبن اس گل کا
خرمن جاں پہ برق آفت تھی   قہر تھی ، فتنہ تھی ، قیامت تھی

مہ لقا اجنبی جگہ آئی تھی۔ سارا جسم پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بار بار اسے یہ ہی ڈر تھا کہ کوئی آتو نہیں رہا۔ کوئی آواز تو نہیں دے رہا۔ میرِ مثنوی کی پیش دستیوں نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ اور زہر کھانے کا افسانہ محض اس کو یہاں بلانے کے لیے گھڑا گیا تھا۔

میں بڑا چکمہ کھا گئی افسوس   جو ترے چھل میں آگئی افسوس
کاش یہ دھوکا کبھی نہ دیا جاتا۔

اس کے بعد اختلاط اور وصل کی داستان ہے۔ چاروں طرف بے حیائی اور بے شرمی کے پردے پڑ جاتے ہیں اور خوب دل کھول کر دادِ عیش دی جاتی ہے۔ قیامت یہ ہے کہ جتنی یہ داستان عریاں اور غیر مہذب ہے اتنی ہی اس کی زبان شستہ و رفتہ، سادہ اور بے تکلف ہے۔ روانی اور صفائی کا یہ عالم ہے۔ جیسے شفاف پانی کا چشمہ پہاڑ کے دامن سے ڈھلک رہا ہو۔ جو بندش ہے۔ وہ چُست، جو محاورہ ہے وہ درست، جو لفظ ہے وہ برمحل۔

ہمارے پند آموز نقادوں نے ساری بحث اخلاق ہی پر آکر ختم کر دی۔ اُنہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ شاعری اچھی بُری نہیں ہوتی۔ شاعر اچھے بُرے ہوتے ہیں۔ اور شاعری کی اخلاقیت (Morality) اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی کہ وہ اظہار و اسلوب میں مکمل ہو۔ انہوں نے اخلاقی نکات تو ڈھونڈے لیکن جذبات نگاری کی قوت، بیان کی سلاست، زبان کی صحت اور روزمرہ کی قدرت پر غور نہیں کیا۔ یہ عریانی، تو اس زمانہ کے فیشن میں داخل تھی۔ خود "صاحب عالم" اور "سلطان عالم" اقراری مجرم تھے۔ اور ان داستانوں کو مزے لے لے کر نظم کرتے اور عوام کے سامنے بے حجابانہ پیش کرتے تھے۔ جب اس بارگاہِ سلطانی سے فتوے مے حاصل ہو جائے اور چشم یار بھی شہ دینے کے لیے موجود ہو، پھر ایک عام آدمی، معمولی گوشت و پوست کا آدمی، اپنی نظر پر، اپنے دل پر، اور اپنے قلم پر کس طرح قابو رکھ سکتا ہے۔

ہمارے تنقید نگار حور پری کے اس جواب کو بھول جاتے ہیں۔ جو اس نے اپنی برأت میں واجد علی شاہ کو دیا تھا۔

کہا حمل ثابت علی خاں کا ہے   خطا کی، خطا نام انساں کا ہے
نہیں ہیں فقط ایک تقصیر وار   کہ اس دام میں اور بھی ہیں شکار

حقیقت یہ ہے کہ اس حمام میں سب ہی ننگے تھے۔ صاحب عالم ہوں۔ یا بہارِ عشق کا ہیرو، حور پری ہوں یا مثنوی کی مہ لقا۔

پھر اس زمانہ کا مذاقِ سخن بھی ایک خاص سانچہ میں ڈھل گیا تھا۔ یہ سانچہ ٹوٹ سکتا تھا بدل نہیں سکتا تھا۔ دُور کیوں جائیے ابھی کل کی بات ہے ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی بیان کرتے تھے کہ ان کے ایک عزیز داغ کے دیوان سے میلاد شریف پڑھتے تھے اور زار و قطار روتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں رندی و زہد میں اتنا سخت تضاد نہیں تھا، جتنا آج ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری بیان کرتے ہیں کہ مولوی نصیر عالم صاحب نے ایک مرتبہ علامہ شبلی کے سامنے یہ شعر پڑھا۔

کارخانے میں خدا کے ہے کسے دخل بوا
بچہ تم پہلے جنیں بیاہ ہوا میرے بعد

مولانا آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے، اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ پہلے مصرع کو بار بار پڑھتے تھے اور اس کے محاورے سے لطف اُٹھاتے تھے۔

پروفیسر نعیم الرحمن صاحب ناقل ہیں کہ ایک مرتبہ لاہور کے اوری اینٹل کالج کے اہل ریش عربی کے طلبا نے علامہ اقبالؒ سے شکایت کی کہ حسانؔ کا دیوان نصاب سے خارج کرا دیجئے اس لیے کہ اس میں فحشیات ہی فحشیات ہیں۔ علامہ مرحوم نے نہایت معصومیت اور استعجاب سے سوال کیا: "کیا آپ کے درجے میں لڑکیاں بھی ہیں؟" کہا "نہیں" فرمایا "تو پھر کیا حرج ہے۔ آپ سب ماشاء اللہ مرد ہیں اور داڑھی والے ہیں۔ آپ کو یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیئے کہ عرب شرفا گالیاں کیسے دیتے تھے۔ آخر گالیاں بھی تو زبان اور ادائے خیال کا ایک طرز ہیں۔ اس سے بھی تو واقفیت ضروری ہے۔"

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس سخن گسترانہ بحث سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس اختلاط اور وصل کی داستان کو اس دور کے مذاق، اور حالات سے الگ کر کے نہ دیکھنا چاہیے۔ ورنہ ہم اپنے اُوپر بھی ظلم کریں گے اور مصنف پر بھی۔ یہاں ایک طرف اصرار اور التجا ہے دوسری طرف انکار اور غصہ۔

اچھے آتے ہی اختلاط بڑھائے   خوب نام خدا مزے میں آئے
بل بے فقرہ ترا معاذ اللہ   میرے تو ہوش اُڑ گئے واللہ
لوگ کہتے تھے ہے بھولی پہچان   مکر کے صدقے جھوٹ کے قربان
توبہ کس درجہ بے حیائی ہے   واہ کیا دیدہ کی صفائی ہے
میں بڑا چکمہ کھا گئی افسوس   جو ترے جُل میں آ گئی افسوس
جھوٹا، بدذات فعلیا مکّار   ان گنوں پر ترے خدا کی سنوار
گو یہ پہلے سے جان جاتی میں   مر بھی جانا جو تو نہ آتی میں
ایسے فقروں کو کوئی کیا سمجھے   اور تو کیا کہوں، خدا سمجھے

گہہ ڈرایا کہ کوئی آتا ہے   کبھی بولی کوئی بلاتا ہے
شرم سے سب بدن چرائے ہوئے   آپ ہی آپ کچھ چھپائے ہوئے

ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا
چھوٹے کپڑے کو ڈھانپتے جانا
بال رخ کے سنوارتے جانا
اونچی کرتی اتارتے جانا
زور کرنا کبھی کہ چھوٹیں ہاتھ
کبھی کہنا الٰہی ٹوٹیں ہاتھ
کبھی باتوں میں ہوش کھو دینا
کبھی کھسیانی ہوکے رو دینا
آنکھیں پھوٹیں جو بھر نظر دیکھے
ہم کو پیٹے اگر ادھر دیکھے
کبھی کہتی کہاں میں آن پڑی
کیا کروں کس غضب میں جان پڑی
گھر گئی آکے کیسی آفت میں
پڑ گئی جان کس مصیبت میں
کئی دن سے بخار آتا ہے
تن بدن سن سنایا جاتا ہے
کچھ عجب حال میرے جی کا ہے
دیکھو پنڈا ابھی سے پھیکا ہے
رحم مجھ پر نہیں کچھ آتا ہے
کوئی مہماں کو یوں ستاتا ہے
کبھی جھنجھلا کے سر پٹک دینا
ہاتھ سے کر کبھی جھٹک دینا
گہ کلائی مروڑنے لگنا
اور کبھی ہاتھ جوڑنے لگنا
کبھی تیوری چڑھا کے یہ کہنا
گہ زباں کو دبا کے یہ کہنا
کوئی اس طرح بھی بپھرتا ہے
ہاں۔ کوئی ایسی بات کرتا ہے
اشتیاق ایسا کیا زیادہ ہے
خیر ہے کہیئے کیا ارادہ ہے
فصد کھلواؤ تم کو سودا ہے
سنبھلو صاحب ذرا ہوا کیا ہے
نچلے بیٹھو تمہیں خدا کی قسم
بس زیادہ کرو نہ ناک میں دم
نوج اس طرح بھی کوئی بولائے
نوج کوئی اتنی ہول جول مچائے
کبھی کہنا ہماری بھتی کھائے
گر کہیں بے طریق ہاتھ لگائے
ہم کو پیٹے اگر مروڑے ہاتھ
ہم کو کفنائے گر نہ چھوڑے ہاتھ
گاہ ماتھے پہ ہاتھ کو دھرنا
کبھی اظہار دردِ سر کرنا
کبھی کہنا سواری منگواؤں
ہے یہی شرط گھر چلی جاؤں
کبھی کہنا کہ تم کو سودا ہے
جان کی خیر ہے ہوا کیا ہے
کچھ بہت خوش مزاج عالی ہے
تو نے یہ چڑمری نکالی ہے
بے حیائی کا جامہ پہنا ہے
خیر ہے لکھنؤ میں رہنا ہے
چربی آنکھوں پہ تیری چھائی ہے
کچھ نگوڑے کی شامت آئی ہے
جان ہلکان ہو گئی بخدا
چھوڑ غارت گئے مرا پیچھا

کبھی آفت نہ یہ اٹھائی تھی   چھائیں پھوئیں میں نوج آئی تھی
ہٹ کے بیٹھو بہت ستایا ہے   تم نے خبطا مجھے بنایا ہے
کیا دھما چوکڑی مچائی ہے   تیری بختاوری کچھ آئی ہے
تم تصدق گئے نثار ہوئے   خوب میرے گلے کا ہار ہوئے
مجھ کو یہ بات ہے نہیں مرغوب   اچھے کھل کھیلے واہ وا کیا خوب
بس زیادہ نہ آپ اترائیں   دیکھو کچھ شامتیں نہ آ جائیں

مہ لقا غصہ میں آ کر کہتی ہے۔

کچھ موئی نہ مجھ کو جانیے گا   دیکھیے پھر بُرا نہ مانیے گا
موئے جیتے اکھاڑ ڈالوں گی   مکڑی کی طرح جھاڑ ڈالوں گی
میں اگر بولنے پہ آؤں گی   لاکھوں دھترے تیرے اڑاؤں گی
ابھی سب کہہ کے سن کے رکھ دونگی   سات پیڑھی کو پُن کے رکھ دونگی
دیکھنا کیسی دھوم ڈالوں گی   رُوئی کی طرح تُوم ڈالوں گی

تھے اسی دن کو سب اٹھا رکھے   کیا کیا ارمان ہیں خدا رکھے
اب میں سمجھی جو قصد تیرا ہے   لے نوکم بختیوں نے گھیرا ہے
اور وہ ہوتیاں ہیں البیلی   میں نہیں کچی گولیاں کھیلی
نوج ایسے کا اعتبار کروں   ایڑی چوٹی پہ میں نثار کروں
لاکھ منت کرو بلائیں لو   وہ نہیں ہوگا تم جو سمجھے ہو
کوئی دل کا مزہ بھی کھوتا ہے   یہ زبردستیوں سے ہوتا ہے
میں تو مفت خدا ہوئی بدنام   اس محبت کو آپ کی ہے سلام
کچھ عجب ڈھنگ ہیں طبیعت کے   بہت آراستہ ہو صحبت کے
ہم کو بھاتے نہیں ہیں ایسے طور   یہ چہ میگوئیاں رہیں کہیں اور
بات مجھ کو نہیں یہ خوش آتی   ایسی بندی نہیں ہے اُدھماتی

اب تک ہیرِ مثنوی کی منت و سماجت کی آوازیں ہم تک نہیں پہنچیں، اور ان کو پہنچنا بھی نہیں چاہیئے تھا۔ صرف مہ لقا کی خفگی اور غصہ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ لیکن اس مرتبہ "عاشق" کے بلند بانگ دعوے اتنے جوش اور یقین کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں کہ ان کی آواز ہم تک بھی پہنچ جاتی ہے۔

وہ قدموں پہ گر کر کہتا ہے۔

ہر گھڑی دم تمہارا بھرتے ہیں
بخدا ہم تو تم پہ مرتے ہیں
جھوٹے کی جان پر ستم ٹوٹے
شاہ عباس کا علم ٹوٹے
ستیاناس جائے غارت ہو
اور پر جس کی کچھ طبیعت ہو
بخدا کوئی خوش جو آتا ہو
آنکھیں پھوٹیں جو کوئی بھاتا ہو
اسی اللہ کے ولی کی قسم
روضۂ مرتضٰے علیؑ کی قسم

مہ لقا جواب دیتی ہے۔

بولی باتیں بنا نہ میرے ساتھ
اب تو میں لگ گئی ہوں تیرے ہاتھ
مجھ پہ مرتے ہو تم قرآن کسوں
سچ کہو تم کو میری جان کسوں
مجھ کو بھی ہو یقیں کہ مرتا ہے تو
یا فقط اپنے منھ میاں مٹھو
اپنے مطلب کی یہ محبت ہے
تیری تو ذات بے مروّت ہے

اس کے بعد بدمستی کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ جہاں شرم کا لباس اتر جاتا ہے اور تہذیب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔

چپکے چپکے پکارتی تھی کبھی
ڈھیلے ہاتھوں سے مارتی تھی کبھی

لو کلائی اتر گئی ہے ہے
کیا غضب ہے میں مر گئی ہے ہے

قہر ہے ظلم ہے قیامت ہے
مجھ پہ ہے ہے یہ کیسی آفت ہے

میری ماما کدھر گئی لوگو
ہائے اللہ میں مر گئی لوگو

بس مرا ہو گیا ہے ناک میں دم
ہٹ کے بیٹھو تمہیں خدا کی قسم
اب جو تو بولے گا قرآن کسوں
اپنی اور تیری جان ایک کر دوں
گالیاں کیسی کوسنے دوں گی
میں بھی ایک اپنے نام کی ہوں گی
بس بہت ہیں سنے آدمیت کی
جو نہ کرنا تھی وہ مروّت کی
دیکھو پھر اب اگر ستاؤ گے
میری پرچھائیں بھی نہ پاؤ گے

میرِ مثنوی کو اس ظلم، اس حیوانیت، حسن و عشق کی اس توہین کے لیے کبھی بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ مہ لقا کو آخر وقت تک اس فریب پر غصہ، رنج اور ندامت ہے۔ لیکن ایک لڑکی کی بساط ہی کیا؟ ان حلقہ ہائے دام سے نکلنا اس کے لیے ناممکن تھا۔

خوب آنے کی دی سزا مجھ کو
اب نہ لائے کبھی خدا مجھ کو

یہ بھی اک آبرو کا کھونا تھا   نام بدنام سب میں ہونا تھا

لیکن کیا یہ ردِّ عمل کافی ہے؟ ایک مغربی افسانہ نگار نے اسی طرح ایک قصہ لکھا تھا۔ ایک دُودھ بیچنے والی لڑکی کو ایک آوارہ مزاج راہ گیر چھیڑتا ہے۔ اور اس کی عفت و نزاکت اس کے جبر و تشدد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ لڑکی زمین سے اٹھتے ہی وہ دُودھ کا برتن جو اس دھینگا مشتی میں خالی ہو چکا تھا، اس کے سر پہ دے مارتی ہے۔ اس قسم کا کوئی ردِّ عمل ہمارے عشق میں نہیں ہے۔ اور اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ سودا ایک ہی بار ہوتا ہے اور ایک ہی شخص سے ہوتا ہے چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا۔ دوسرے ملکوں میں اس متاعِ گم گشتہ کے بعد بھی بوالہوسانہ یا بے نیازانہ زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔

مہ لقا کو ایک ایک منٹ پہاڑ ہے۔ وہ جلد سواری منگانے کے لیے منتیں کرتی ہے۔

میری رخصت میں اب نہ کر تاخیر   ورنہ ہم صورتوں میں ہونگی حقیر
میں تو یاں پڑ گئی ترے بس میں   چرچے واں اور ہوں گے آپس میں
گھر میں سب ہونگے دیکھتے مری راہ   ڈھونڈنے جائے گا کوئی درگاہ
تو ادھر کی نہ میں اُدھر کی رہی   پھر کہو یہ بلا کدھر کی رہی
آبرو جائے میری جائے گی   تیری تو اس میں بھی بن آئے گی
اب تو جانے دے کبریا کے لیئے   منتیں کرتی ہوں خدا کے لیئے

سواری آجاتی ہے، میرِ مثنوی، مہ لقا سے چلتے وقت کہتا ہے۔

جاؤ پر تول ہارتی جاؤ   ہاتھ پہ ہاتھ مارتی جاؤ
بولو کب آؤ گی قرار کرو   کچھ تو تسکین جانِ زار کرو
کوئی شے منھ سے نکلی جاتی ہے   تم نہیں جاتیں جان جاتی ہے
یہ تو باور نہیں بلاؤ گی   کہہ دو کھا کر قسم کب آؤ گی

مہ لقا کہتی ہے کہ اس وقت اس کا جواب کیا دیا جا سکتا ہے۔ آئندہ کی کیا خبر۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ گھر سے نکلے ہوئے اتنی دیر ہو گئی تھی۔ گھر والے پوچھیں گے تو کیا کہا جائے گا۔ اس کا رنگ فق تھا، چہرہ اُترا ہوا تھا۔ دل کانپ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنے آپ کو بہت سنبھالے ہوئے اُتری، اور تیوری پر بل ڈال کے سب کے سنانے کے لیئے کہنے لگی۔

لوج نوچندی کو میں جاتی آج   آئی ہوں کیسی ہولیں کھاتی آج
بھیڑ نے آج دم تمام کیا   ایسی درگاہ کو سلام کیا
ساتھ ماما نہ آج گر جاتی   کیسی بختاوری مری آتی
یا خدا ہو بھلا بچاری کا   جو لگایا پتہ سواری کا
کیسی پچھتاتی ہوں میں جا کر آج   پہنچی یاں تک خدا خدا کر آج
گر قسم لے تو کوئی کھاؤں گی   کبھی نوچندی میں نہ جاؤں گی

اس دروغ مصلحت آمیز سے سب لوگ مطمئن تو ہو گئے لیکن خود اس کے دل کا حال عجیب تھا۔ وہ حیران تھی کہ یہ کیا ہوا۔ اور اب کیا ہوگا۔

کچھ مزا دل میں کچھ ندامت تھی   اک کشش و پیچ میں طبیعت تھی
کبھی کہتی تھی کیا ہوئی یہ بلا   کبھی کہتی تھی کیوں ہوئی تھی خدا
رہی اُلجھن سی تا سحر اس کو   نیند آئی نہ رات بھر اس کو
جب دل اس کا بہت ہلاک ہوا   تب گریبان صبح چاک ہوا

یہ ہی حال "عاشق" کا تھا۔

ہوئی فرقت سے یہ مری حالت   نہ وہ رنگت رہی نہ وہ صورت
راحت و عیش سب محال ہوا   دو ہی دن میں عجیب حال ہوا
ہو گئی دل کی ایسی حالتِ زار   جیسے برسوں کا ہو کوئی بیمار
نالہ رُک کر لبوں پہ آنے لگا   ضعف سے جسم تھرتھرانے لگا
مو بمو زلفِ یار کا تھا اسیر   ناتوانی تھی پاؤں کی زنجیر
رنج فرقت سے غیر حال ہوا   لینا کروٹ تلک محال ہوا
چین دن کو نہ رات کو آرام   یاد میں اس کی صبح سے تا شام

لیکن انیسویں صدی کا مجہول عاشق، کوئی اقدام نہیں کرتا۔ تپش ہجر سے مجبور ہو کر لڑکی ہی ماما کو بھیجتی ہے۔ سیلاب کی پہلی موج گزر چکی تھی۔ اور اب وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ماما سے کہتی ہے

میری اچھی تو اس کے گھر تک جا
دیکھ کر اس کو اُلٹے پاؤں آ

"اور جو پوچھیں انہوں نے بھیجا ہے"۔ تو کہنا ؎

ان کی پاپوش کو غرض تھی ہاں   جو مجھے بھیجتی خبر کو یہاں
گزری باتوں کی یاد ہے اب کیا   آپ کو پوچھنے سے مطلب کیا
الغرض جب کمال ہو عاری   اور کرے تجھ سے منت و زاری
کہنا کیوں پیچھے پڑ گئے کیا ہے   ہاں انہوں نے بھی تم کو پوچھا ہے

ماما آکر کہتی ہے۔

چین سے تم تو پڑ رہے سو کر   واں کٹی رات ساری رو رو کر
ہے انہیں غش پہ غش چلا آتا   اُٹھا بیٹھا تلک نہیں جاتا
بوٹی بوٹی میں درد ہے ان کے   رنگ چہرے کا زرد ہے ان کے

دل معشوق تو کباب کیا　　عشق کا نام بھی خراب کیا
اپنا مطلب نکال کر تم نے　　جھوٹوں پوچھی نہ پھر خبر تم نے
خوش کہ آزردہ ہو جیئے صاحب　　آپ کے پاؤں پوجیئے صاحب

ماما بھی یہ الزام لگاتی ہے کہ تم کو اتنی بھی توفیق نہ ہوئی کہ کسی سے مہ لقا کی خیر خبر بھی منگا لیتے۔ اس کے جواب میں وہ صرف یہ کہتا ہے۔

دل و جان سے نثار ان کا ہوں　　پر میں تقصیروار ان کا ہوں

اس کی خانگی مجبوریاں کچھ اس قسم کی تھیں کہ کوئی اندر تک جا کر پیام نہیں لا سکتا تھا الغرض اس کے بعد سے پیام و سلام ہونے لگے۔ قاصد ان اس طرف سے آتا تھا اور تحفے یہاں سے جاتے تھے۔ ایک دن ان کے ہمسائے میں ایک برات تھی۔ میر افسانہ بھی حسب الطلب گیا تھا۔ اتفاق سے ماہ لقا بھی بام پر موجود تھی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اشک بھر آئے۔ زیر بام کچھ باتیں بھی ہوئیں۔ جو ہر لحاظ سے نہایت اہم ہیں۔

مہ لقا کہتی ہے۔

گذری کیا کیا نہ جان پر میری　　خوب لی آپ نے خبر میری
اب نہ کہنا کبھی کہ مرتے تھے　　بس اسی منہ پہ پیار کرتے تھے
جھوٹ دم عاشقی کا بھرتا ہے　　کون صاحب کسی پہ مرتا ہے

میرِ مثنوی سے

سن کے میں نے دیا یہ انکو جواب　　بس زیادہ کرو نہ دل کو کباب
کس کو تم تک بتاؤ بھجواتا　　کون ایسا تھا جو خبر لاتا
مہندی چھٹتی نہ آپ گھس جاتیں　　دو گھڑی کو اگر چلی آتیں

مہ لقا کا جواب ایک شریف لڑکی کی بے کسی و بے بسی کا مرقع ہے — ایسی لڑکی جس کی رسم و رواج کے مطابق جلد شادی ہونا چاہیئے لیکن ابھی ہو نہیں سکی ہے۔ جو عورتوں کے سامنے بھی کھل کے بات نہیں کرسکتی اور جس کی نشست و برخاست، رفتار و گفتار، ایک ایک بات کی گرفت کی جاتی ہے۔

بولی شکوہ مرا تو ہے بے جا　　نوج ہو اور پھر ہو قہر خدا
نہیں واللہ دسترس اپنا　　قیدی بندی ہے کیا ہے بس اپنا
گو کبھی پر نہیں ہے یہ افتاد　　سب کے ماں باپ ہوتے ہیں جلاد
سارے عالم میں گو یہ آفت ہے　　ہم پہ لیکن سوا قیامت ہے
دن بھر ایک ایک منہ کو تکتا ہے　　بات کہنے میں عیب لگتا ہے
ناک میں دم ہے اشکباری ہے　　زندگی تک سے جان عاری ہے

اس کے بعد کہتی ہے۔

اپنے مطلب کا خوب یاد ہے ڈھنگ
ہو بلا سے کسی پہ قید فرنگ
کیا شکایت تمہاری کوئی کرے
تم کو کیا ہے کوئی جیئے کہ مرے
دھیان دل میں نباہ کا کب تھا
اپنے مطلب سے تم کو مطلب تھا
یاد رکھنا تمہارے بن اپنی
جان جائے گی ایک دن اپنی
زہر کھانا ہے جان کھونا ہے
ایک دن تم پہ خون ہونا ہے

اسی جگہ مہ لقا کے کچھ عزیز بھی تھے اور انہوں نے یہ ساری گفتگو سن لی تھی۔

تھے جو اشراف کچھ نہ بن آئی
مشورت اس طرح سے ٹھہرائی
شادی ان دونوں کی جو ہو جائے
کچھ تو منہ سے سیاہی دھو جائے
عیب کس طرح یہ چھپائیں گے
کالا منہ کس کو اب دکھائیں گے

والدین نے سمجھ داری کی اور خاندانی وقار کی غلط پاسداری نہ کرتے ہوئے دونوں کی شادی کر دی۔ اس طرح مثنوی کا خاتمہ وصل کی شادمانی پر ہوتا ہے اور یہ اختتام زہر عشق کے انجام سے بالکل مختلف ہے۔

میں نے اس مثنوی کا قصہ مس بالڈ کو جو سینٹ جانس کالج آگرہ میں انگریزی کی لیکچرار ہیں، سنایا۔ غرض یہ تھی کہ ایک غیر ہندوستانی پر جو عہد عود شاہی (Restoration) کے ادبیات سے بھی واقف ہیں۔ اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ اسی مرد سے جس نے لڑکی کو خراب کیا ہے شادی ہو جانا انوکھی بات ہے۔ مغرب میں شاید ایسا کبھی نہ ہوتا۔

لیکن میرے خیال میں نفس پرستی کے اس طوفان کے بعد دونوں فریق اپنے دل کا جائزہ لیتے ہیں جس سے یہ لشکر گزرا تھا۔ اور دل کے تقاضے اور دنیا کی مصلحت دونوں سے مجبور ہو کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کی اس لغزش کو دائمی محبت کے سرور میں تبدیل ہو جانا چاہیئے۔ مصنف نے بھی اپنی طرف سے اس گناہ عظیم کی اگر کوئی تلافی کی ہے تو یہی کہ ان دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا ہے عزیزوں اور رشتہ داروں کا بھی یہ فعل قابل قدر ہے کہ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس شادی کی مخالفت نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر بات نکل گئی تو سارے عالم میں بدنامی ہو گی اور پھر کوئی لڑکی کو پوچھے گا بھی نہیں۔

اس مسئلہ پر اس طرح سوچیئے کہ اگر اس لڑکی کی شادی کسی دوسری جگہ ہو جاتی۔ تو فریقین کی زندگی میں کیسی عجیب بدنمائی پیدا ہو جاتی۔ اس بدنمائی کا احساس اس وقت اور قوی ہو گا جب تصوریت کو چھوڑ کر ملک کے عام حقیقی حالات کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

میر مثنوی نے اپنے مہمان کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک روا رکھا وہ محبت کی دنیا میں کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا اور سخت سے سخت مذمت اور ملامت کا مستحق ہے۔ ممکن ہے اس کی براءت میں یہ کہا جائے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ اور یہ غلطی ہنگامی اور اتفاقی تھی۔ کیونکہ دام کا یہ حلقہ پہلے سے تیار نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن محبت کی نفاست اور نزاکت تو کسی قسم کی آلودگی کو برداشت نہیں کر سکتی

اسی کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ میر مثنوی کی یہ زندگی ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے۔ پورے مجموع کا حادثہ ہے۔ وہ واجد علی شاہ اور قطب الدولہ کے لکھنؤ، سرفراز پری اور یاسمن پری کے لکھنؤ، بھانڈوں اور سازندوں کے لکھنؤ۔ نواب آب رساں بیگم اور

نواب مصطفیٰ بیگم کے لکھنؤ اور جھومر والیوں اور گھونگھٹ والیوں کے لکھنؤ کی پیداوار ہے۔ اس کو انیسویں صدی کے اس مبتذل ماحول سے جب کہ زندگی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کا سارا رس نچوڑ لیا گیا تھا، الگ کر کے دیکھنا تاریخ اور تنقید کا خون کرنا ہے —— پھر وہ کوئی غیر معمولی نوجوان نہیں ہے۔ اسی دنیائے دوں کا، اسی گوشت و پوست کا معمولی انسان ہے۔ اس میں کمزوریاں بھی ہیں۔ اور خامیاں بھی۔ مرزا شوق نے اس کی غلطیوں پر پردہ نہیں ڈالا ہے بلکہ اس کی "ارضیت" اور "عمومیت" کو اور نمایاں کیا ہے۔ اس اعتبار سے مصنف کی حقیقت نگاری اور اصلیت پسندی قابلِ داد ہے۔

مرزا شوق نے مہ لقا کا کردار پیش کرنے میں وہ کمال نہیں برتا جو زہرِ عشق کی ملکۂ افسانہ کے کردار میں ہے اسی لیے اس کا مجموعی اثر کچھ بہت اچھا نہیں ہوتا۔ بعض جگہ تضاد ہے اور بعض جگہ رنگ اتنا گہرا ہو گیا ہے۔ کہ سارے میں پھیل گیا ہے۔ ایک لڑکی جس کی شرافت کا شاعر نے ہر جگہ ذکر کیا ہے۔ وہ اجنبی گھر میں جاتی ہے تو اس انداز سے۔

طرزِ گفتار بانکپن کے ساتھ!
شعر برجستہ ہر سخن کے ساتھ
کچھ رکھائی سی کچھ ہنسی کچھ شرم
تازے فقرے لطیفے گرما گرم

مانا کہ لطیفہ گوئی اور شعر گوئی اس زمانہ میں فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ لیکن ان حالات میں جن کا ذکر مثنوی میں کیا گیا ہے۔ ایک لڑکی کی زبان سے لطیفے اور شعر نہیں نکل سکتے۔ اسی طرح آرزوئے وصل پر جب بحث چھڑ جاتی ہے اور اصرار و انکار کا ایک دفتر کھل جاتا ہے تو ایک ہندوستانی لڑکی کا یہ کہنا۔

"دوسرا تیسرا یہ حملہ ہے
ایسا سمجھے کہ شہر شملہ ہے"

کسی طرح جائز نہیں۔

لیکن لڑکی کا کردار مہرِ مثنوی سے زیادہ بلند ہے۔ اور اس منظوم افسانہ میں اس کے کافی شواہد موجود ہیں کہ وہ شریف گھرانے کی لڑکی ہے جو ایک فریب کا شکار ہو گئی ہے۔ لیکن اپنی حیثیت اور عزت بالکل چھوڑ نہیں بیٹھی ہے۔ بہارِ عشق میں زہرِ عشق کے برخلاف، عشق یک طرفہ ہے۔ مرد پہلے محبت کرتا ہے اور عورت بعد میں۔ مرد اس راہ میں اپنی عزت اور شرافت سب کچھ کھو بیٹھتا ہے اور عورت یہ سب کھو کر بھی سب کچھ جیت لیتی ہے۔

گناہ کا معاملہ بھی عجیب ہے اور سوسائٹی کے قوانین اس سے بھی عجیب تر ہیں۔ ایک بھوکا آدمی فاقوں سے تنگ آکر چوری کرتا ہے۔ لیکن قانون اسے سزا دیتا ہے۔ ایک ترش رو اُستاد یا ایک ظالم باپ سالہا سال تک بچوں کی ذہنیت مسخ کرتا رہتا ہے لیکن قانون اُسے کچھ نہیں کہتا۔

ایک جوان پردہ نشین اور ناتجربہ کار لڑکی پہلی دفعہ یہ سنتی ہے کہ ایک شخص اس کی وجہ سے جاں بلب ہے۔ صرف اس کی موجودگی ہی اس کو بچا سکتی ہے۔ وہ کچھ مروّت، کچھ آدمیت اور کچھ محبت کی خاطر اس کی جان بچانے کے لیے پہنچتی ہے لیکن وہاں اسے ایک جال

میں پھانس لیا جاتا ہے۔ اور وہ کسی کی چیرہ دستیوں کی تاب نہیں لا سکتی۔ کیا اس کو بھی ہم غلطی یا گناہ ہی کہیں گے — اگر یہ غلطی ہے تو ایسی غلطی ہے جس میں سلامت روی کے نشانات موجود ہیں۔ اگر یہ گناہ ہے تو ایسا گناہ ہے جس میں پشیمانی کے آثار پوشیدہ ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بردباری کے بعد وہ لڑکی اس سے ملنے کا اقرار کیوں کرتی ہے؟ اس کے لیے بے چین کیوں ہوتی ہے؟ ماما کو کیوں بھیجتی ہے؟ کیا محبت اس نقطہ سے بھی شروع ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب اس لڑکی کو نہیں، ہماری معاشرت کو دینا چاہیئے۔ اور محبت کو معاشرہ سے جو تعلق ہے اس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہاں یہ اکثر ہوا ہے کہ جس سانپ نے ڈسا ہے اسی کی پوجا کی گئی ہے۔ یہ محبت یہ پرستش مصلحت یا نفس کی آسودگیوں سے پاک ہے۔ اس لیے کہ جو کچھ نذر کرنے کو تھا وہ تو نذر ہو چکا یا زیادہ صحیح لفظوں میں لٹ چکا۔ اب بجز آنسوؤں کی روانی اور دل کی تپش کے اور کیا باقی تھا۔ یہ جوئے کم آب جو اس وحشیانہ ظلم و تشدد میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اب بڑھ کر تند و تیز دریا میں تبدیل ہو گئی۔

مرتقا کے یہ الفاظ صرف اس کے دکھے ہوئے دل کی پکار نہیں۔ بلکہ ہماری عجیب و غریب معاشرت کا مرثیہ بھی ہیں اب تک ہماری نگاہیں واجد علی شاہی لٹریچر کی صرف منفی تجلیوں میں الجھی رہی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مثبت پہلو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

نہیں واللہ دسترس اپنا — قیدی بندی ہے کیا ہے بس اپنا
دن بھر ایک ایک منھ کو تکتا ہے — بات کرنے میں عیب لگتا ہے
ناک میں دم ہے اشکباری ہے — زندگی تک سے جان عاری ہے

شادی کے بعد نہ تر دامنی کی گرانی باقی رہتی ہے اور نہ خشک دامنی کی سبک سری کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شباب یا روزگار عذاب کی اس مستانہ لغزش پر روح کی اندرونی عدالت نے ان دونوں کو تو بری کر دیا ہے لیکن شادی نے ایک خلش پیدا کر دی ہے۔ مرزا شوق کا یہ کمال معمولی نہیں ہے کہ اگر وہ اپنے مسائل کا حل تلاش نہیں کر سکے تو کم سے کم ان مسائل کو پوری صفائی اور دیانت داری سے پیش تو کر سکے۔

بہار عشق پلاٹ یا کردار نگاری کے اعتبار سے کوئی بلند پایہ مثنوی نہیں ہے۔ اس کی عظمت کا راز زبان کے لطف اور محاورہ کی چاشنی میں پوشیدہ ہے۔ اس زمانہ میں جب لفظی صنعت گری کو حسن معنی سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ مرزا شوق نے سادگی و سلاست کے دریا بہا دیئے اور عشق و عاشقی اور حسن و جوانی کے راگ کو ایسی میٹھی بول چال میں چھیڑا کہ دہلی کے شیوا بیان اور شیریں زبان بھی انگشت بدنداں رہ گئے اس رسوائے عالم مثنوی کے کتنے اشعار ہیں جو آج بھی زبان زد خلائق ہیں۔

ناک میں نیم کا فقط تنکا — شوخی چالاکی مقتضا سن کا

وصل تم سمجھے آج ہی کل میں — قیس برسوں پھرا ہے جنگل میں

بے اثر کب یہ چاہ ہوتی ہے — دل سے اک دل کو راہ ہوتی ہے

اور جو کچھ بولوں تو بگڑتی ہے   تو تو ماما ہوا سے لڑتی ہے

کوئی مرتا ہے کیوں بلا جانے   ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

مرزا شوقؔ کی تصویریں سراسر حقیقت اور اصلیت پر مبنی ہیں۔ انہوں نے اندک و بسیار کا تقریباً ہر جگہ لحاظ رکھا ہے۔ جہاں ہلکے رنگوں کی ضرورت ہے وہاں ہلکے ہیں۔ جہاں گہرے کی ضرورت ہے وہاں گہرے۔ مثلاً ان مصرعوں کی احتیاط اور صحت دیکھئے جن میں خط کشیدہ لفظوں نے جان پیدا کر دی ہے۔

غم نے کی دل سے کچھ ادائی سی   منہ پہ چھٹنے لگی ہوائی سی

شہر سارا اجاڑ ہو گیا   اتنا رستہ پہاڑ ہو گیا

ع کچھ گندھے، کچھ کھلے وہ سر کے بال

ع کچھ رکھائی تھی، کچھ لگاوٹ تھی

ع شانے بازو بھرے بھرے سارے

ع قہر تھی فتنہ تھی، قیامت تھی

مرزا شوقؔ کو حقیقت نگاری میں کمال حاصل ہے۔ یہ کمال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب مشاہدہ وسیع ہو اور نظر ایک ایک جزو کو دیکھ سکتی ہو۔

ناک میں نیم کا فقط تنکا   شوخی چالاکی مقتضا سن کا
آستینوں کی وہ پھنسی کرتی   جسم میں وہ شباب کی پھرتی
رخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم   جس طرح گل پہ قطرۂ شبنم
عکسِ رخ موتیوں کے دانوں میں   بجلیاں چھوتی چھوٹی کانوں میں

اس مثنوی میں مرقع نگاری کی بہت سی کامیاب مثالیں موجود ہیں۔ مرزا شوقؔ کے خطوط نازک اور سبک ہیں لیکن اس صورت گری میں نفاست، اصلیت پر غالب نہیں آئی۔ ماما کی یہ تصویر ملاحظہ ہو۔

اتنے ہیں نکلی گھر سے ایک عورت   سانولا رنگ چلبلی صورت
لال نیفہ ازار بند بڑا   گچھا اک کنجیوں کا اس میں پڑا
کھیلتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی   آنکھ ایک ایک سے ملاتی ہوئی
چھاتی چھ بند سینہ زوری میں   پھول رکھے ہوئے کٹوری میں
آنکھ ایک ایک پر لگاوٹ کی   بات ایک ایک سے گھلاوٹ کی

حُسن کے دن جوانی زوروں پر   رات کی باسی مہندی پوروں پر

بعض تصویریں چند خطوں سے کھینچی ہیں لیکن مکمل ہیں۔

وہ مٹکتی چلی گئی گھر میں
یہ اکیلے کھڑے رہے در میں

مہ لقا ایک اجنبی گھر میں اس طرح آتی ہے۔

سب حیا سے بدن چرائے ہوئے
پائنچے ناز سے اٹھائے ہوئے

تھا عجب پیچ و تاب کاکل کا   پھٹا پڑتا تھا جوبن اس گل کا

بعض تصویریں اس سے بھی زیادہ چھوٹی ہیں لیکن ادھوری نہیں ہیں ۔

ع بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے
ع شرم آنکھوں میں قہر باتوں میں
ع جسم ڈوبا تھا سب پسینے میں
ع منتیں کرنے لگتا ڈر ڈر کے
ع بال رُخ کے سنوارتے جانا

مرزا شوق نے کیفیات و جذبات کی ترجمانی میں بھی اصلیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ روزمرہ اور محاورہ نے ان خاکوں میں حقیقت اور فطریت کا رنگ بھر دیا ہے۔

جب نظر سے نظر دوچار ہوئی   ایک برچھی جگر کے پار ہوئی
جان و دل مبتلائے درد ہوئے   یک بیک ہاتھ پاؤں سرد ہوئے
بس کلیجہ سا کوئی ملنے لگا   غم سے دل دو دو ہاتھ اچھلنے لگا

ہوگئی دل کی ایسی حالت زار   جیسے برسوں کا ہو کوئی بیمار
چین دن کو نہ رات کو آرام   یاد میں اس کی صبح سے تا شام

رہی اُلجھن سی تا سحر اس کو   نیند آئی نہ رات بھر اس کو
جب دل اس کا بہت ہلاک ہوا   تب گریبانِ صبح چاک ہوا

یہ نقشے کیسی صاف اور باریک لکیروں سے کھینچے گئے ہیں۔

بوٹی بوٹی میں درد ہے ان کے   رنگ چہرے کا زرد ہے ان کے

ناک میں دم ہے اشکباری ہے   زندگی تک سے جان عاری ہے

صاحب بہار عشق کو اثر آفرینی کے تمام گر معلوم ہیں۔ دیکھیے اس تدریجی اور پُرشکوہ بیان نے تاثیر میں کتنا اضافہ کر دیا ہے

جس پہ عالم فریفتہ ہے آج   حُسن خود جس کا شیفتہ ہے آج
جس کو ہے ادعائے یکتائی   آفتِ جاں ہے جس کی رعنائی
تیغ ابرو سے جس کی بسمل ہو   تیر مژگاں سے جس کے گھائل ہو
گھر بڑی محنتوں سے پایا ہے   آج اس کا پتہ لگایا ہے

جو گفتگو ہے وہ موقع اور محل کے مطابق۔ مہ لقا خفتہ سے آتش بدامن ہو جاتی ہے۔ لیکن اپنی بلند سطح کو نہیں چھوڑتی یہ گفتگو دیکھیے کتنی بلیغ ہے اور انداز کتنا شاہانہ ہے۔

دُور ہو بس کہ ہے قصور معاف   پاس کرتی ہوں جان کر اشراف
ورنہ اس کا مزا چکھا دیتی   کیا کہوں جو نہیں سزا دیتی
اب خبردار یاں نہ آئیے گا   پھر نہ یہ بات منہ پہ لائیے گا
میری جوتی سے زہر کھایا ہے   مجھ کو کس بات پر ڈرایا ہے

مرزا شوقؔ نے تلمیح، تشبیہہ اور استعارہ کا بھی اہتمام کیا ہے۔ لیکن اس میں وہی سلیقہ برتا ہے جو آنکھ میں سرمہ لگانے اور چہرہ پر غازہ ملنے کے لیے درکار ہے۔ تلمیحات و تشبیہات معمولی اور فرسودہ ہیں۔ لیکن برجستہ اور برمحل ہیں۔

بام روشن تھا طور کی صورت   سر سے پا تک تھی نور کی صورت
حُسنِ یوسف بھی اس کے آگے ماند   چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند

رُخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم   جس طرح گل پہ قطرۂ شبنم
رگِ گل سی کمر لچکتی ہوئی   چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی
سرو سا قد تو گل سے رخسارے   شانے بازو بھرے بھرے سارے
منہ کو تاب و تواں نے پھیر لیا   ابر گیسو نے دل کو گھیر لیا
واں سے جنبش تلک ہوئی دشوار   تیر کھائے ہو جس طرح سے شکار

ندرت ادا کی یہ شیشہ گری ملاحظہ ہو۔ عشق کے متعلق کہتا ہے۔

گریہ چشم خونچکاں ہیں کہیں   خندہ زخم عاشقاں ہے کہیں
کہیں خنجر ہے دست قاتل کا   کہیں مرہم جراحت دل کا

اس شعر میں دیکھیے۔ دل کی بے چینی اور پوری رات کی بے قراری کا نقشہ کھینچا ہے۔

جب دل اس کا بہت ہلاک ہوا   تب گریبانِ صبح چاک ہوا

مرزا شوق بول چال کی زبان خوب لکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گفتگو ہمارے سامنے ہو رہی ہے۔

ہنس کے اس نے کہا حواس میں آؤ   ان میری باتوں پہ نہ اتراؤ
ایسا آسان ان کا آنا ہے   سہل کچھ آپ کا بلانا ہے
کس نے یہ مشورہ بتایا ہے   دل کہیں اور بھی لگایا ہے

* * *

مہ لقا نوکرانی سے کہتی ہے۔

بات کرنے کا ہے یہ کون طریق   کہہ لیا ہوتا خوب سا تحقیق
آئے کس جا سے ہیں پیام ہے کیا   کس نے بھیجا ہے ان کا نام ہے کیا

* * *

جھوٹ سچ پانچے ملاتی آئی   چوچلے کرتی کھل کھلاتی آئی
اور جو کچھ بولوں تو بگڑتی ہے   تو تو ماما ہوا سے لڑتی ہے

ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عورتوں کی زبان اور لب و لہجہ مردوں سے مختلف ہے۔ اب چند در چند وجوہ سے یہ حد بندیاں ٹوٹتی جاتی ہیں۔ مرزا شوق نے یہ زبان جس خوبی اور کامیابی کے ساتھ لکھی ہے۔ اس کی مثالیں اردو نظم بھر میں بہت کم ہیں اس کے اشعار بہت سے اوپر گزر چکے ہیں۔ ہم صرف چند قند مکرر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

نوج نوچندی کو میں جاتی آج   آئی ہوں کیسی ہولیں کھاتی آج
بھیڑ نے آج دم تمام کیا   ایسی درگاہ کو سلام کیا
ساتھ ماما نہ آج گر جاتی   کیسی بختاوری بہری آتی
یا خدا ہو بھلا بچپاری کا   جو لگایا پتہ سواری کا
کیسی پچھتاتی ہوں میں جا کر آج   پہنچی یہاں تک خدا خدا کر آج

شمشیر کی یہ عریانی بھی ملاحظہ ہو۔

کچھ مزہ ہی نہ مجھ کو جانیے گا   دیکھیے پھر برا نہ مانیے گا
موئے جیتے اکھاڑ ڈالوں گی   ککڑی کی طرح جھاڑ ڈالوں گی
میں اگر بولنے پہ آؤں گی   لاکھوں دھرے ترے اڑاؤں گی
ابھی سب کہہ کے سن کے رکھ دوں گی   سات پیڑی کو پُن کے رکھ دوں گی
دیکھنا کیسی دھوم ڈالوں گی   روئی کی طرح توم ڈالوں گی

روزمرہ اور محاورہ کا جو لطف بہارِ عشق میں ہے۔ وہ اس فراوانی کے ساتھ مرزا کی کسی مثنوی میں نہیں ہے۔ ان اشعار کو دیکھئے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔

شہر سارا اجاڑ تھا گویا　　　اتنا رستہ پہاڑ تھا گویا

نہ سنی اور کی نہ اپنی کہی　　　دل کی حسرت تمام دل میں رہی

اللہ آمین سے اس کو پالا ہے　　　سارے گھر کا یہی اجالا ہے

آنکھ ایک ایک پر لگاوٹ کی　　　بات ایک ایک سے گھلاوٹ کی
یہاں ٹھہری کبھی وہاں ٹھہری　　　دو منہ ہنس بول لی جہاں ٹھہری

ہوتے سوتوں کو اپنے وہ بولائے　　　خوب گرمی کی، کیا مزے میں آئے

ایک ساغر میں ہوش اڑ گئے واہ　　　کتنے کم ظرف ہو معاذ اللہ

اپنے سائے سے بھی بھڑکتی ہے　　　بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے

اچھے آتے ہی اختلاط بڑھائے　　　خوب نام خدا مزے میں آئے
لوگ کہتے تھے ہے لبوں پہ جان　　　مکر کے صدقے جھوٹ کے قربان

اشتیاق ایسا کیا زیادہ ہے　　　خیر ہے کہئے کیا ارادہ ہے

کچھ بہت خوش مزاج عالی ہے　　　تو نے یہ چڑمری نکالی ہے

بے حیائی کا جامہ پہنا ہے　　　خیر ہے لکھنؤ میں رہنا ہے

کیا دھما چوکڑی مچائی ہے　　　تیری بھتاوری کچھ آئی ہے

تم تصدق گئے نثار ہوئے   خوب میرے گلے کا ہار ہوئے
بس زیادہ نہ آپ اترائیں   دیکھو کچھ شامتیں نہ آ جائیں

تھے اسی دن کو سب اٹھا رکھے   کیا کیا ارمان ہیں خدا رکھے
اب ہیں سمجھی جو قصد تیرا ہے   اے لو کم بختوں نے گھیرا ہے
بدمزہ پھیکی شوخیاں نہ کرو   بس چلو ٹھنڈی گرمیاں نہ کرو

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

کچھ عجب ڈھنگ ہیں طبیعت کے   بہت آراستہ ہو صحبت کے

نہ سمجھنا زمانہ اور ہے یہ   شاہ واجد علی کا دور ہے یہ

خوش کہ آزردہ ہو جیئے صاحب   آپ کے پاؤں پوجیئے صاحب

مہندی چھٹتی نہ آپ گھس جاتیں   دو گھڑی کو اگر چلی جاتیں

اس قسم کے بیسیوں شعر مثنوی میں ملیں گے۔ ہم نے اختصار کی وجہ سے طویل اقتباس سے پرہیز کیا ہے۔

بہارِ عشق اور زہرِ عشق کی بحر ایک ہے، انداز ایک، دونوں کا قصہ معمولی ہے، کچھ مختصر اور بے ترتیب سا۔ جس میں نہ کوئی جدت ہے، نہ فنی مضبوطی۔ لیکن زہرِ عشق میں جو بند فتادگی، برجستگی، درد اور کسک ہے وہ بہارِ عشق میں نہیں ہے، نور و ظلمت اور سفید و سیاہ کا جو خوبصورت پس منظر زہرِ عشق میں ہے اور جو اس قسم کی تصنیف کے لیے ازبس ضروری ہے، وہ بہارِ عشق میں نسبتاً کم اور بہت کم ہے۔ زبان کے اعتبار سے بہارِ عشق مرزا شوق کی سب سے مکمل مثنوی ہے۔ روزمرہ کی چاشنی، الفاظ کی ترتیب، محاورات کی برجستگی، یہ تمام خوبیاں اس میں بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ اس مثنوی کو پڑھ کر بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "وہ آرٹ ناقص ہے جس میں کوئی طرز اور اسلوب نہیں ہے۔"

تنقیدِ شعر اور حالی

عبدالقادر سروری

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ اُردو میں کم سے کم شاعری کی حد تک حالی کے تنقیدی کارنامے جدید عہد کے نقیب کہلا سکتے ہیں۔ حالی سے پہلے اُردو تنقید زیادہ تر صوری اور اسلوبی تنقید تھی۔ جس میں شعر کے صوری محاسن اور زبان اور اسلوب کی نزاکتوں کے بارے میں اشارے مل جاتے ہیں۔ اور بدیع معانی اور عروض پر کھل کر بحث کی جاتی ہے۔ نثر عام طور پر ہمارے اہلِ فکر ادیبوں کی چھان بین سے بے نیاز رہی اور شعر کی اہمیت کے مدِ نظر صاحبانِ ذوق کی توجہ زیادہ تر شاعری پر مرکوز رہی۔ جدید عہد سے پہلے اُردو نثر کی اصناف بھی گنی چنی تھیں۔ اور اگر کبھی کسی نے نثر کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا چاہا ہے تو توجہ صرف روزمرہ، محاورہ اور صحتِ الفاظ ہی تک محدود رہی۔ بعض وقت نثری کارناموں پر مستند ادیبوں نے تقریظیں لکھی ہیں۔ اور اس طرح کی تحریروں کا اچھا خاصا ذخیرہ اُردو میں مہیا ہے۔ لیکن تقریظیں معلق باتیں ہوتی ہیں۔ نثری تنقید سے متعلق کچھ اشارے بعض تحریروں میں ایسے بھی ملتے ہیں جن میں کسی ادبی کارنامہ کی زبان یا محاورہ پر تعریض کی گئی ہے۔ ایسی تحریروں میں رجب علی بیگ سرور کے "فسانۂ عجائب" کا دیباچہ قابلِ ذکر ہے۔ جس میں سرور نے میر امن کی "باغ و بہار" کی زبان پر تعریض کی ہے کہ:-

> "میر امن صاحب نے چار درویش میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے
> ذہن و حصّے میں یہ زبان آئی ہے۔ دلّی کے روڑے ہیں محاورے کے
> ہاتھ منہ توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے
> منفت میں نیک نام بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعوے کب سزاوار ہے۔
> کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔ مشک آنست کہ خود
> ببوید نہ کہ عطار گوید۔ یہ وہی مثل سننے میں آئی ہے کہ اپنے منہ سے دھنا بائی

ایسی تحریریں بہت مجمل ہیں۔ اور اکثر اوقات تعریض اور کبھی کبھی طنز و استہزاء کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسی تنقیدوں کو ہم ذوقی تنقید بھی نہیں کہہ سکتے ہاں گھٹیا جذباتی تنقید کی یہ مثالیں ہو سکتی ہیں۔

عہدِ جدید سے پہلے ہمارے یہاں ذہنی تنقید کے کچھ اشارے بعض وقت ہمارے سنجیدہ فکر تذکرہ نگاروں اور قدیم

دور کے چند شعرا کے کارنامے مل جاتے ہیں۔ لیکن یہ زیادہ تر شعر سے تعلق رکھتے ہیں اور صوری تنقید کی مثالیں کہی جا سکتی ہیں اس طرح کی تنقید کی ایک اچھی مثال گولکنڈہ کے قدیم شعرا میں وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" میں ملتی ہے۔ "در شرح شعر گوید" کے عنوان سے اس نے جو چند شعر لکھے ہیں ان میں وجہی نے شعر کو جانچنے کے معیار پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے:۔

کتا[1] ہوں تجھے پند کی ایک بات   کہ ہے فائدہ اس منے[2] دہات[3]
جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس   بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
نکو[4] کر تو ن کئی[5] بولنے کا ہوس   اگر خوب بولے تو یک بیت بس
اسی لفظ کوں[6] شعر میں لیائے تو ن   کہ لیایا ہے اُستاد جس لفظ کوں
اگر فام[8] ہے شعر کا تجھ کوں چھند
چنے لفظ لیا ہور[9] معنی بلند

گویا وجہی شعر میں ربط معانی و سلاست کو ضروری سمجھتا ہے۔ اور اس کی نظر میں شعر کی خوبی کمیت پر نہیں بلکہ کیفیت پر ہے۔ شعر میں مستند اور منتخب الفاظ اور بلندی معانی کی اہمیت پر بھی وہ زور دیتا ہے۔

گولکنڈہ کا ایک اور شاعر، ابن نشاطی بھی اپنی مثنوی "پھول بن" کے آخری حصے میں شعر کے فن کے بارے میں کچھ اصولی باتیں بتاتا ہے وہ کہتا ہے

اگرچہ شاعری کا فن ہے عالی   ولے کیا کام آوے بات خالی
کہے ہیں شعر کوں کر[10] خیر و حکمت   کہ بولے[11] ہے شرط کچھ ہونا نصیحت
اول بارے نصیحت اس میں اچھنا[12]   نصیحت نہیں[13] تو صنعت اس میں اچھنا

یہ شعر کا پرانا اخلاقی نظریہ ہے۔ ابن نشاطی معنوی اعتبار سے شعر کی اخلاقی قدروں پر زور دیتا ہے اور صوری اعتبار سے صنعت پر۔ صنعت نگاری کا وہ دل دادہ تھا۔ چنانچہ "پھول بن" میں اس نے جو صنائع بدائع استعمال کیے ہیں ان کے بارے میں کہتا ہے۔

ہنر کوئی دکھ ولے سو دکھایا   صنائع ایک کم چالیس لایا!
بندھا ہر حرف بیتن[14] میں یوں قرینہ   بوجھے[15] سچ بھی یہ صنعت کا نگینہ

غواصی نے کوئی عام معیار شعر کے نہیں پیش کیے لیکن خود اپنی شاعری کے بارے اس نے جو باتیں لکھی ہیں۔ ان سے بھی فن شعر کے کچھ معیار قائم ہوتے ہیں۔ قدیم اُردو شاعری میں غواصی مسلم الثبوت اُستاد مانا جاتا تھا اور اپنی اہمیت کا احساس بھی اسے تھا چنانچہ مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال "میں" در حسب حال خود گوید" کے عنوان سے وہ لکھتا ہے:

دکھایا ہنر موشگافی کیا   سلاست کے تئیں[16] سر تھے صافی دیا

---

[1] کہتا [2] میں [3] طرح [4] مت [5] بہت [6] کو [7] لانے [8] فہم [9] اور [10] کرکے۔ بیان کرکے [11] یہ [12] رہنا [13] نہیں۔ [14] سے [15] جان پڑے [16] کو از سرنو صفائی بخشی۔

نزاکت کون میں آپنے خیال تھے[1]   دکھایا ہوں باریک کر بال تھے
دیا تازگی شعر کی دھات[2] کون   سحر کو دکھایا ہر ایک بات کون

"طوطی نامہ" میں بھی "در سبب نظم ایں داستان گوید" کے عنوان کے تحت قدیم اساتذہ شعر کے محاسن کی طرف اشارہ کرتا ہوا کہتا ہے۔

جو یک بیت اتوں[3] کی اگر کوی پڑے[4]   اثر ذات کون بیگ بن مد چڑے[5]
گنے شعر کون جیو[6] سے کر دہی   کئے اپنا ناؤں[7] بر تر دہی!!

ان اشعار سے شعر کے جو معیار ہاتھ آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ شعر میں سلاست اور صفائی، نزاکت اور تازگی ضروری ہے۔ اور اثر شعر کا بنیادی وصف ہے۔

بیجاپور کے شعرا میں صنعتی نے (۱۰۵۵ھ) میں اپنی مثنوی "بے نظیر" کے آغاز میں سخن اور شعر کی تعریف میں کئی شعر لکھے ہیں۔ قدیم شعرا سخن، کلام اور شعر دونوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ صنعتی شعر کی رومانی قدروں کا زیادہ قائل نظر آتا ہے کہتا ہے۔

سخن گنج ہے عالم الغیب کا
سخن موج زن مُلک لاریب کا

آگے وہ شعر کی حلاوت اور اس کی جان بخش خصوصیت کے بارے میں کہتا ہے۔

سخن است مٹھائی میں حلوا اچھے   سخن سفرۂ من و سلوا اہے
رکھن ہار سرسبز دل کا چمن!!   سخن ہے سخن ہے سخن ہے سخن

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ غبی اور کند ذہن عمدہ شعر سرانجام نہیں کر سکتا۔

کہاں ہوئے کودن تے شعر سلیم
کرے کاٹ کان[9] ازہ برگِ نیم

صنعتی، سخن سنجی پر سخن فہمی کو فوقیت دیتا ہے۔

زیادہ ہے نزدیک اہلِ قیاس
سخن بولنے تے[10] سخن کا قیاس

شعر کے حسن و قبح کو جانچنے کے یہ معیار قدیم ہیں۔ مشرق میں یہی معیار پرانے زمانے سے مسلم رہے ہیں۔ مغرب میں یونانیوں کے یہاں بھی کچھ اسی طرح کے معیار ملتے ہیں۔ عموماً یہ ہوا ہے کہ ہر زبان کے علما اپنی معیاری اور مسلمہ ادبی اصناف کی بنا پر ادبی اور تنقید شعر کے اصول مرتب کرتے رہے ہیں۔ عربوں میں ابن رشیق اور دوسرے علما نے تنقید شعر کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ

---

[1] سے [2] اصل [3] ان رجع [4] پڑھے [5] چڑھے [6] جان [7] نام [8] ہے [9] کہاں [10] سے

زیادہ تر قصیدہ کو معیار مان کر لکھا۔ اصناف ادب کے ارتقار میں قومی مزاج اور طبیعت کو بہت دخل ہوتا ہے۔ علما نے اکثر یہ کیا ہے کہ اپنی مانوس ادبی اصناف کی بنا پر جو تنقیدی اصول مرتب ہو سکتے تھے انہیں عمومیت کی شکل دے دی۔ یونانی علما نے عموماً یہی کیا ہے۔ مثلاً قواعد زبان مرتب کرتے ہوئے انہوں نے اپنی زبان کے جو قاعدے ہو سکتے تھے انہیں معیار مان کر دنیا کی دوسری ساری زبانوں پر انہیں کو منطبق کرنے کی کوشش کی۔ زبان کی طرح شعری تنقید میں بھی انہوں نے یہی کیا۔ اپنی ادبی اصناف کے مطالعے سے جو اصول مستخرج ہوتے تھے انہیں عمومی شکل دے دی۔ یونانی شاعری میں رزمیہ۔ بزمیہ (غنائی) اور ٹریجڈی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس اعتبار سے جو اصول، تنقیدِ شعر کے ان کے یہاں مرتب ہوئے۔ ان کی بنیاد یہی اصناف تھیں اور جس طرح انہوں نے زبان کے قاعدوں میں تعمیم کر کے انہیں ساری دنیا کی زبانوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح اپنے شعری تنقید کے اصولوں کو شعر پر عام طور پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ یونان کے بہت کم علما ایسے تھے جو اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانیں بھی جانتے ہوں۔

یونان کی قدیم ترین شعری تنقید کے جو آثار ملتے ہیں۔ ان سے تنقید کے بارے میں دو تصورات واضح ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ شعر میں اثر یا دل کشی ہونی چاہیے اور دوسرے یہ کہ شعر صداقت کا مظہر ہوتا ہے۔

جہاں تک شعر کے اثر اور دل کشی کے اصول کا تعلق ہے مغرب اور مشرق میں ہم آہنگی ہے۔ صداقت شعری کے سلسلے میں تصورات بہت سے نشیب و فراز سے گزرے ہیں۔ شعری صداقت کا سائنٹیفک اور واضح تصور ابھرتے ابھرتے بہت عرصہ لگ گیا

حالی سے پہلے شعرا کے کلام کے علاوہ تنقید شعر کے کچھ اشارے ہم کو بعض تذکروں میں بھی مل جاتے ہیں۔ یہ اشارے اصول کی صورت میں بہت کم ہیں۔ مگر کچھ اصول عملی تنقیدوں سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ اس تلاش اور تحقیق سے جو اصول تنقید شعر کے بارے میں ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک تو مجمل ہوں گے دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر عربی اور فارسی شاعری میں مروج اور مقبول اصناف کی بنا پر مدون اور مرتب ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان اصول کو ساری دنیا کی شاعری پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح کسی اور زبان کے مخصوص اصناف شعر کے اصول پر اردو شاعری کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔

اصل بات یہ ہے کہ تنقیدِ شعر کے مجرد اور مطلق اصولوں کو ترقی کرتے اور نشو و نما پاتے پاتے کافی عرصہ لگ گیا۔ یہ اصول رفتہ رفتہ اور ذہنی نشو و نما اور تحقیق اور چھان بین کے طریقوں کے ترقی پانے کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاتے ہیں۔ سائنسی انداز تحقیق کے طریقوں سے مشرق اور ہندوستان عام طور پر انیسویں صدی عیسوی سے پہلے مانوس نہیں تھے۔ انیسویں صدی کے وسط سے اور خاص طور پر انگریزی ادب ایک برتر اور فاتحین کے ادب کی حیثیت سے اردو کے علما سے روشناس ہوا تو اس سے ہمارے علما کی اثر پذیری ایک فطری بات تھی۔ آزاد اور حالی کو لاہور میں کچھ تو بعض انگریزوں کی ترغیب دلانے پر خاص طور پر حالی کو ترجمے کے محکمے میں کام کرتے ہوئے مغربی ادبی کارناموں اور ان کے دیباچوں اور مقدمات سے آگاہی کی وجہ سے اپنے ادبی کارناموں کو بھی مغربی اصول تنقید پر جانچنے کی خواہش فطرتاً پیدا ہوئی۔ اس میں کچھ ضرورت کو دخل تھا۔ اور کچھ تقاضائے ندرت۔

حالی جب شعر و شاعری کا جائزہ لینے بیٹھے تو ان کے سامنے شعری تنقید کے کچھ عمومی اور مجرد اصول تھے۔ جن پر انہوں نے اپنے کارنامے "مقدمہ شعر و شاعری" کے ابتدائی حصے میں بحث کی ہے۔ اس کے آخری حصے میں، ان اصولوں پر اردو شاعری کی مختلف اصناف کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری ہندوستان کی جدید زبانوں میں شعری تنقید کے مغربی اصولوں پر لکھی ہوئی اولین کتاب ہے اُردو میں بلاشبہ یہ اولین مستقل کتاب ہے جس میں شعر کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے اور مروجہ شعری اصناف اور اسالیب پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے شعر کو پرکھنے کے جو معیار ہمارے انشا پردازوں کے سامنے تھے وہ بہت کچھ مختلف تھے۔ عام طور پر منظوم اور مقفیٰ کلام کو شعر سمجھا جاتا تھا یہ صحیح ہے کہ شعر کا مضمون اور اسلوب بھی پیش نظر ہوتا تھا۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ کم دیکھا جاتا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ بلکہ توجہ اس بات پر زیادہ رہتی تھی کہ کس طرح کہا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اہمیت زیادہ تر اس بات کو دی جاتی تھی کہ کوئی شاعر بحر اور قافیہ کے اصول کی کہاں تک پابندی کرتا ہے اور زبان روزمرہ اور محاورے کی صحت کا کس حد تک خیال رکھتا ہے۔

حالی سے پہلے کی تنقید کے نمونے ہمارے شعرا کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ تذکروں کا آغاز کسی شاعر کے کلام کی پسند سے ہوتا تھا۔ اچھے شعر بیاض میں یادداشت کے لیے لکھ لیے جاتے تھے اور شاعر کے بارے میں بھی کچھ معلومات قلمبند کر لی جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ تذکرہ نگاری کے کچھ اصول بھی نشوونما پا گئے اور یہ شاعری کی تاریخ کی شکل اختیار کرنے گئے۔ لیکن شعرا کی یہ تاریخ در اصل مطالعے کے لیے خام مال اکٹھا کر دیتی تھی۔ کیونکہ شاعر کی زندگی اور حالات کے بارے میں بہت کم چھان بین کی جاتی تھی۔ شعر کی پسند یا ناپسند کی بنیاد محض انفرادی ذوق ہوتا تھا۔ شعر کی تنقید جیسا کہ محترمہ صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے۔ شعر کو عروض کی کسوٹی پر کسنا۔ اس کے لفظوں اور ترکیبوں پر اساتذہ کی سند لانا اور تذکیر و تانیث کی بحثوں میں الجھنا سمجھا جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ حالی سے پہلے آزاد نے انجمن پنجاب کے نئے مشاعروں کی طرح ڈالتے ہوئے جو تمہیدی لکچر ۱۸۶۷ء میں دیا تھا۔ اس میں جدید تنقید کے کچھ اشارے ملتے ہیں۔ آزاد نے نظم اور کلام موزوں کے بارے میں خیالات ظاہر کرتے ہوئے شعر کی حیرت انگیز تاثیر پر بہت زور دیا تھا اور فلاسفہ یونان کے کچھ خیالات کی ترجمانی بھی کی تھی۔ آزاد کو فارسی شاعری سے جو لگاؤ تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ انہوں نے رومی اور سعدی کی شاعری کو نمونہ سمجھا اور شعر کا اہم مقصد پند و نصیحت اور ہدایت ظاہر و باطن قرار دیا تھا۔ آزاد کا یہ نظریہ در اصل شعر کی اخلاقی قدر والا پرانا نظریہ تھا جو شعر کے موجودہ نقادوں کے پاس تمام و کمال قابل قبول نہیں۔ اخلاقی قدر حقیقت میں حیاتی قدروں میں سے صرف ایک قدر ہے۔ شعر کی قدریں اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ اسی تقریر میں آزاد نے اُردو شاعری کے مروجہ انداز پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں تک عبارت کا زور اور مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کے سامان کا تعلق ہے۔ ہمارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ اس معاملے میں ہماری زبان کسی سے کم نہیں۔ لیکن انہیں افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر اس زور اور جوش کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ وہ چند غیر ضروری احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں۔ کیسی حسرت آتی ہے جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈال دیتے ہیں وہ جوش میں آ کر اپنے اہل وطن کو ابھارتے ہیں کہ:۔

" تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو نہیں تو تمہاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو گئی۔"

آزاد کی تقریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں کچھ تو غالب، میجر فلر یا کرنل ہالرائڈ کے ایما پر اور کچھ انگریزی شاعری کے نمونوں کو دیکھ کر اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اُردو شاعری کچھ غیر ضروری حدود میں گھر گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس اوگھٹ گھاٹی سے باہر نکلنے کی کیا سبیل انہوں نے بتائی تھی؟ اور شاعروں کے لیے کیا معین نظام تجویز کیا تھا؟ اس بارے میں آزاد کی تقریر اور لکچر سے کوئی رہنمائی نہیں ہوتی۔ صرف اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ منزل کا انہیں کچھ شعور تھا لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی معین راہ وہ نہ بتا سکے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ آزاد ایک انشا پرداز تھے۔ تجزیہ اور تحلیل سے ان کی طبیعت کو لگاؤ نہ تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے کہ آزاد مرض کی تشخیص تو کر سکے لیکن علاج تجویز نہ کر سکے۔ اس لیے آزاد کی تقریر اور لکچر شعری تنقید کا کوئی نظام مرتب نہیں کرتا۔ ان سے محض شاعر کے مطالعے میں نئے معیار کی تلاش کا پتہ چلتا ہے۔ اور موجودہ شاعری کے نہج سے اُکتاہٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بات کو آزاد نے اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ کہ ہمارے شعر نے اپنی فضا کو غیر ضروری طور پر محدود کر لیا ہے۔ حالانکہ وہ چاہتے تو فضا کی وسعتوں سے کام لے سکتے تھے۔

آزاد کے شاگرد غلام حیدر نثار کے ایک بیان سے جو نظم آزاد کے آخر میں چھپا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کی تقریروں نے کافی ہل چل برپا کر دی تھی۔ اور آزاد کے نبیرہ آغا محمد باقر بتاتے ہیں کہ آزاد کے "دو قدم راہ غلط" کرتے ہی ہر طرف سے ملامت کے تیر برسنے لگے۔

اس پس منظر میں جب ہم "مقدمہ شعر و شاعری" پر نظر ڈالتے ہیں تو ان اوراق میں پہلی دفعہ ہم کو شعر اور مطالعہ شعر کے سارے پہلوؤں پر ایک نئے انداز سے روشنی پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ حالی کی بحث اور تحقیق کا انداز اور ان کے اکثر مباحث وہی ہیں جو جدید تنقید کے موضوع ہیں۔

حالی کو شعر و شاعری پر قلم اٹھاتے ہوئے سب سے پہلے شعر کی ضرورت کا جواز دریافت کرنا تھا اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی تھی۔ کہ یونان کے سب سے بڑے مفکر افلاطون نے اپنے جمہوریہ کے خیالی ڈھانچے سے شاعر کو سرے سے خارج کر دیا تھا۔ افلاطون کے ذہن سے صحیح یا غلط طور پر سوچنے والے اور بھی کئی علما کے پاس سماجی نظام میں شاعر کی ضرورت مسلم ہی نہیں۔ بعض اہل رائے ایسے بھی ہیں۔ جو شعر کو جاہلیت کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اس لیے آج کی سائنسی دنیا میں انہیں شعر کا کوئی مقام نظر نہیں آتا۔ حالی کے لیے اس نقطۂ خیال کو رد کرنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے ملائم طبیعت اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی صلاحیت کی مدد سے اس نقطۂ خیال کی بڑی خوبی سے اصلاح کی ہے۔ حالی نے شعر کے جواز میں یہ استدلال پیش کیا ہے کہ "حکیم علی الاطلاق نے اس ویرانہ آباد نما یعنی کارخانہ دُنیا کی رونق اور انتظام کے لیے انسان کے مختلف گروہوں میں مختلف صلاحیتیں پیدا کی ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض جماعتوں کے کام ایسے بھی ہیں جو سوسائٹی کے حق میں چنداں سود مند نہیں معلوم ہوتے مگر چونکہ قسّام ازل سے ان کو یہی حصّہ پہنچا ہے۔ اس لیے وہ اپنی قسمت پر قانع اور اپنی کوششوں میں سرگرم ہیں۔ جو شخص اس عطیہ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا۔ ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے۔

حالی کا یہ استدلال اس انداز کا ہے کہ منکر بھی سوچنے پر مائل ہو جائے گا۔ حالی نے سماج میں شعر کی ضرورت کے مسئلے کو اور آگے بڑھانے کے لیے شعر کی تاثیر کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ استدلال کا یہ طریقہ جدید علمی طریقہ ہے جو کسی مسئلے کو ثابت کرنے

میں بہت وزنی ہوتا ہے۔

حالی نے ان لوگوں کے خیال کی بھی بڑے سلیقے سے اصلاح کی ہے جو شعر کو زمانہ جاہلیت کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ شاعری شائستگی میں بھی قائم رہ سکتی ہے۔

شعر کی اخلاقی قدروں کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ کچھ علما تو شعر کے ساتھ کسی افادی یا تربیتی مقصد کے وابستہ کیے جانے کے خیال ہی سے جز بز ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس پر زور دیتے ہیں کہ شعر کا مقصد محض شعر ہے۔ شعر سے ورا شعر کا کوئی مقصد قرار دینا اُن کے خیال میں بدذوقی ہے۔ کچھ اور علما اس خیال کو رد کیے بغیر شعر کی اخلاقی قدروں کو سب سے اہم سمجھتے ہیں۔ آزاد کا خیال اس بارے میں اوپر بتایا جا چکا ہے۔ حالی بھی اس مسلک کے حامی ہیں۔ چنانچہ مقدمہ میں یہ بحث انہوں نے بڑی خوبی سے کی ہے کہ شعر انسان کی رُوحانی خوشیوں کو اُکساتا ہے۔ انسان کی روحانی خوشیوں کے ساتھ اخلاق کا تعلق بدیہی ہے۔ پھر انہوں نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ شعر علم اخلاق کی طرح براہ راست تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب کہہ سکتے ہیں۔ اس کی تائید میں ان صوفیا کے مسلک کو پیش کیا ہے جو سماع کو قرب الٰہی اور "تذکیۂ نفس" کا ذریعہ مانتے ہیں۔ حالی کہتے ہیں کہ سماع کا رکن شعر ہی ہے۔

شعر کی ضرورت اور اہمیت کے مسئلے کو زینہ بزینہ اٹھانے کے بعد حالی ذہن کو شعر کی عظمت کی طرف منتقل کرتے ہیں شعر کی تاثیر کو مسلّم اور اس کی اخلاقی قدر کو بدیہی ماننے کے بعد حالی اپنے پیش رو علما کی ہم قدمی پر قناعت نہیں کر لیتے۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شاعری سب کچھ ہونے کے باوجود سوسائٹی کے تابع ہے۔ اس مسئلے پر حالی نے طویل اور مدلل بحث کی ہے۔ اور شعر کو عالم تخیل سے دنیائے آب و گل میں اتار دیا ہے۔ حالی کی بحث سے بظاہر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ شاعری میں جب بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کی وجوہات کی تلاش ہم کو سماج میں کرنا چاہیئے۔ لیکن اس اصول کو مان لینے کے بعد یہیں پر رکا نہیں جا سکتا۔ استقرا کی مدد سے ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ شاعری کا مبدا بھی سماج ہے۔ شاعری سماج سے اٹھتی ہے سماج میں جیتی ہے۔ سماج حیات ہی ہے اور حیات ہی عین حیات ہے۔ جو شاعری سماج سے اپنے رشتے توڑ لیتی ہے وہ حیات سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے۔ اور اپنے مبدا سے کٹ جاتی ہے۔ حالی نے شاعری کو سوسائٹی کے تابع بنا کر حقیقت میں اُردو شاعروں اور نقادوں کے ذہن کو نہایت ترقی پرور تصوّر سے روشناس کرایا تھا۔

شعر کی ماہیت اور شعر کے عناصر یا لوازم سے بھی حالی نے بحث کی ہے۔ یہ بحث بھی چند دھماکو عناصر سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً قافیہ اور ردیف کی جھنکار اور سہارے پر قدم اٹھانے والے شاعروں سے حالی کا یہ کہنا کہ "قافیہ اور ردیف شعر کے لوازم سے نہیں بلکہ نظم کے لوازمات سے ہیں۔ ان کی ساری ذہنی بنیادوں کو ڈھا دینے کے مترادف تھا۔

اپنے تجزیہ پسند ذہن کی مدد سے حالی نے شعر اور نظم یعنی "پوئٹری" اور "ورس" کے درمیان پہلی دفعہ فرق کیا۔ شاعری کی شرطوں میں سب سے اہم شرط انہوں نے مطالعہ کائنات کی مقرر کی ہے۔ یہی دراصل وہ پہلو ہے جہاں ہمارے پرانے شاعر پیچھے نظر آتے ہیں۔ اپنے الہام کے لیے۔ صحیفہ فطرت کا مطالعہ کرنے کی بجائے، انہوں نے اساتذہ کے دیوان ٹٹولنے کو زیادہ پسند کیا ہے دوسروں کی زمین غزل پر تصرف کرنا، بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ مضمون پر مضمون باندھنے کی عادت بھی، در اصل اسی کوتاہی کا

نتیجہ ہے۔

حالی نے یہ بھی تفصیل لکھی ہے کہ شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ یہ مواد اُن کو انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن سے حاصل ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں تاریخ تنقید میں، ملٹن کے تنقیدی خیالات کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں۔ ملٹن کا سب سے اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شعر میں قافیہ کے التزام کی مخالفت اور بے قافیہ نظم کی وکالت کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ بڑا شاعر تھا۔ اور حالی کے زمانہ میں وہ مقبول انگریزی شاعر تھا۔ اس لیے حالی نے اُس کے معینہ اصول کو تنقید شعر کے بنیادی اصول سمجھ لیا۔ اور اسی سے انہوں نے جہاں تک شعر کی معنوی تنقید کا تعلق تھا، کام لیا۔ سادگی، اصلیت اور جوش، جو ملٹن کی نظر میں، شعر کے لازمی اجزا ہیں۔ اُن میں دو اجزا، یعنی سادگی اور اصلیت سے۔ حالی سے پہلے کی شاعری بیگانہ ہو رہی تھی۔ جوش یا ایک اور نقاد کے الفاظ میں، جذبات کا ازخود چھلکاؤ، یا تو سرے سے پایا ہی نہیں جاتا تھا، اور شعر ذہنی کاوش کا نمونہ بن گیا تھا یا پھر بے موقع اور حد سے بڑھا ہوا تھا۔

حالی نے مطلق حیثیت سے، سادگی اور اصلیت کا جس احتیاط سے تجزیہ کیا ہے وہ آج بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ شاعری میں جوش کے مفہوم کو سمجھاتے ہوئے انہوں نے مروّجہ اردو شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ اور اس میں وہ سارے امور گنائے ہیں جن کی وجہ سے ہماری شاعری، سادگی، اصلیت اور جوش، سب سے دُور رہی ہے۔ یہ تبصرہ حقیقت میں حالی کے مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا نچوڑ ہے۔ انہوں نے ملٹن کے اصول کی روشنی میں، اُردو غزل اور قصیدہ کا بھی جائزہ لیا ہے۔ حالی کی صحت پسند طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ "خدائے سخن" میر کی شاعری میں ساری خوبیاں ہی خوبیاں دیکھے چنانچہ سادگی بیان کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے بعض شعرا ایسے بھی گذرے ہیں۔ جنہوں نے سادگی بیان کو سب چیزوں پر مقدم سمجھا ہے جیسے میر، درد، اثر اور مصحفی وغیرہ۔ لیکن چونکہ انہوں نے قدما کے خیالات و مضامین سے بہت کم تجاوز کیا ہے۔ اس لیے ان کے دیوان زیادہ تر بھرتی اور پُرکن اشعار سے بھرے ہوئے ہیں۔

سرسید اور حالی کے زمانے میں ایک اصطلاح "نیچرل شاعری" کی چل پڑی تھی جیسے ادبی حلقوں میں اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ نیچرل شاعری کو وہ یہ مفہوم پہناتے تھے کہ وہ شاعری ہے جو نیچریوں سے منسوب ہے اور جس میں نیچرل خیالات اور تصورات پیش کیے جاتے ہیں۔ سرسیّد اور حالؔی "نیچری" کہلاتے تھے۔ چنانچہ سرسید کی اصلاحی مساعی کے مخالفین اور ادیبوں کا وہ گروہ جو "اودھ پنچ" سے وابستہ تھا۔ انہیں "پیر نیچر" کے لقب سے موسوم کرتا تھا۔ اور سرسیّد اور اُن کے رفقائے کار کی خوب ہنسی اڑائی جاتی تھی۔ حالؔی نے نیچرل شاعری کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں یا دانستہ پھیلائی گئی تھیں ان کا تذکرہ کیا ہے اور نیچرل شاعری کے حقیقی مفہوم کو، جو ان کے ذہن میں تھا، واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

حالی نے شعر میں صوری لوازم یعنی زبان اور اس کی درستی کی اہمیت پر بھی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ ان کو خاص طور پر نیچرل شاعری کے جس کے وہ سرگرم وکیل تھے۔ اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیئے، اُردو کے مروجہ ذخیرۂ الفاظ اور اسالیب کی تنگ دامانی کا احساس تھا۔ اسی لیے وہ ہندی بھاشا سے استفادہ اور ہندی کے الفاظ کو اُردو میں داخل کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اس موقع پر حالی، بعض ایسی ذیلی بحثوں میں اُلجھ گئے ہیں جن کی یہاں قطعاً ضرورت نہیں تھی یہ زبان کے مستند مرکزوں

کی بحث ہے۔ یہ بحث دراصل حالی سے پہلے کے عہد کی ایک نزاعی بحث تھی۔ حالی کی بحث میں ایک کھلا تضاد ہے کہ وہ اُردو کو ہندوستان کی سب سے زیادہ وسیع اور عام زبان مانتے ہوئے بھی اسے لکھنؤ اور دہلی کے مرکزوں میں قید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصل میں یہاں حالی اپنے آپ کو ان ٹکسالوں سے وابستہ رکھنا اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ میں سے کوئی بھی حالی کو اہلِ زبان نہیں مانتا تھا۔ اور یہ روایت آج تک برابر چل رہی ہے۔ حالانکہ خود حالی کو اُردو دنیا نے ایک ایسی سند کے طور پر مان لیا ہے جس کی زبان نے اُردو کو دہلی اور لکھنؤ کی شخصی اور جغرافیائی قیود سے آزاد کر دیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حالی زبان کے سلسلے میں کوئی تعمیری اور منظم تجویز پیش نہ کر سکے۔ ہاں انہوں نے اُردو زبان کو وسعت دینے اور اس کی سند کے شخصی اور جغرافیائی معیاروں کو معروضی اور عملی بنانے کے لیے اُردو کی مستند لغات اور قواعدِ زبان کی تدوین کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

"مقدمہ شعر و شاعری" کا بڑا حصہ تنقیدِ شعر کی نظری بحثوں پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں عملی تنقید کے بھی چند نمونے اس سلسلے میں مل جاتے ہیں۔ جہاں انہوں نے اپنے معینہ اصولوں پر اُردو شاعری کو جستہ جستہ طور پر جانچا ہے۔ "مقدمہ" کا آخری حصہ اُردو شاعری کی عملی تنقید سے متعلق ہے۔ اس حصے میں انہوں نے اُردو کی مختلف اصنافِ شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزہ میں غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی اور دوسری اہم یا غیر اہم اصناف کو حالی نے تنقیدِ شعر کے لیے نئے اصولوں پر جانچنے کی کوشش کی ہے۔ غزل کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس کی حالت فی زمانہ ابتر ہے۔ اور وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف ہو کر رہ گئی ہے۔ قصیدہ کی حالت کو بھی وہ ناگفتہ بہ بتاتے ہیں۔ اور مثنوی کے محض عشقیہ قصوں تک محدود ہو کر رہ جانے کی انہیں شکایت ہے۔ مرثیہ قصائد ہی کے ذیل میں آ جاتا ہے۔ یہی تین اصناف ایسی ہیں جنہیں حالی، اُردو شاعری کا سرمایہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے بڑی وقتِ نظر کے ساتھ ان کا محاسبہ کیا ہے اور ان کی اصلاح اور انہیں مقتضائے زمانہ کے مطابق بنانے کی یہ تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔

حالی کا یہ جائزہ ان لوگوں کے لیے جو اُردو شاعری اور اس کی اصناف کو مثالی اور خطا سے بالاتر مانتے تھے۔ بڑا ہی ناگوار ثابت ہوا۔ حالی نے خاص طور پر غزل میں جو انہیں بنیادی مانی جا رہی تھیں، ان پر حملہ کر کے شعرا کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اسی لیے جیسا کہ محترمہ صالحہ عابد حسین نے کہا ہے۔ "مقدمہ" حالی کی سب سے زیادہ مشہور، سب سے زیادہ معتوب اور سب سے زیادہ مقبول کتاب ثابت ہوئی۔

حالی نے محض اصول اور ضابطے مدون کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ان اصناف کو اپنے بیان کیے ہوئے اصولوں کے مطابق برتا بھی۔ حالی کی عظمت کا حقیقت میں بہت بڑا یہ پہلو ہے۔ اصول سازی ہمیشہ آسان کام ہے۔ لیکن عملاً ان اصولوں کو اختیار کرنا۔ اتنا آسان نہیں۔

عملی شعری تنقید کے کارناموں میں حالی کی تصانیف "حیاتِ سعدی" اور "یادگارِ غالب" حالی کے مبسوط کارنامے ہیں "حیاتِ سعدی" میں سعدی کے کلام اور تصانیف پر حالی کی تنقید کا ایک حصہ ان کی تصانیف کی مقبولیت سے متعلق ہے۔ جو حصہ کلام اور تصانیف کی براہ راست تنقید سے متعلق ہے۔ اس میں بظاہر حالی نے "مقدمہ" کے معینہ اصولوں کی سختی سے پابندی نہیں کی۔ بلکہ بعض جگہ تنقید کے روایتی انداز سے بھی کام لیا ہے۔ اس حصے میں وہ تقابلی تنقید کے طریقے سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کرتے ہیں۔

اُردو شاعری کی عملی تنقید میں "یادگارِ غالب" کا وہ حصّہ اہمیت رکھتا ہے جس میں حالی نے مرزا کے کلام پر "ریویو" کیا ہے یہ حقیقت ہیں وہ مقام تھا جہاں حالی اپنے مقررہ اصولوں سے زیادہ سے زیادہ وابستہ رہ سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے بعض اور علما کی طرح اپنے آپ کو اصولوں سے سختی کے ساتھ بندھا ہوا رکھنے کی بجائے کسی قدر آزادہ روی سے بھی کام لیا ہے۔ اور خیالات کے بہاؤ کے رُخ پر نکل گئے ہیں۔ اصل میں اچھی تنقید بھی تخلیق ہوتی ہے اور تخلیق کے تحت شعور میں اصول کارفرما ہو سکتے ہیں۔ لیکن مصنف کا ان کے ساتھ ٹھک جانا، اکثر عمدہ تخلیق کا باعث نہیں ہوتا۔ حالی کی تنقید کا اصل موضوع تو مرزا غالب کی غزل گوئی ہے۔ لیکن ان کے قطعات اور رباعیوں کی جانب بھی مجمل اشارے ملتے ہیں۔

مرزا کی غزل پر حالی کی تنقید کا اسلوب کچھ روایتی سا بن گیا ہے۔ وہ غزل گوئی کا بہ حیثیت مجموعی جائزہ نہیں لے سکے ہیں بلکہ اپنے جائزہ کو انہوں نے خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ مختلف عنوانات قائم کر کے ان کے ماتحت غالب کے اشعار پیش کرنے اور ان کی شرح کرنے کے طریقے کو حالی نے پسند کیا ہے۔ ایک بات ضرور قابلِ توجہ ہے کہ حالی نے تنقید کو محض صوری اور اسلوبی تنقید تک محدود نہیں رکھا۔ اس تنقید میں یہ بات واضح ہے کہ حالی کی معلومات کا دائرہ محدود تھا۔ اس لیے وہ مغرب کے غنائی شعرا سے غالب کی غزل کا تقابلی مطالعہ نہیں کر سکے۔ انہوں نے عام طور پر فارسی کے غزل گو شعرا سے بھی غالب کا مقابلہ نہیں کیا اور یہ ضروری بھی نہیں تھا بلکہ بعض وقت ایسا مقابلہ خطرناک بن جاتا ہے۔ جہاں تک غالب کے کلام کی شرح اور تفہیم کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حالی کی تشریحوں نے اس کے محاسن اور معنویت کی جانب لوگوں کی توجہ منعطف کرانے میں بنیادی خدمت انجام دی۔

"یادگار" میں حالی نے مرزا کی اُردو نثر پر بھی نظر ڈالی ہے لیکن حالی کی نثری تنقید اس انشائیے کے موضوع سے خارج ہے

رجِ اکبر

حامد حسن قادری

حضرت اکبر الٰہ آبادی نے بہت لوگوں کے نام رکھے۔ کسی کا بُدّھو، کسی کا جُمّن، کسی کا لیڈر، کسی کا پنڈت۔ مولانا محمد علی رئیس الاحرار نے اکبر کا نام رکھ دیا "رجِ اکبر" بوزن "حجِ اکبر"۔ حضرت اکبر ویسے بہت مقطّع تھے، صرف شاعری میں "ہنسوڑ" تھے۔ مولانا محمد علی ظریف شاعر نہ تھے۔ مگر طبیعت سے بڑے چلبلے، باتوں میں بڑے مسخرے تھے۔ ایک روزنامہ ہمدرد کوچۂ چیلان دہلی سے نکالتے تھے۔ اس میں اکبر الٰہ آبادی کے تذکرے پر ان کو رجِ اکبر لکھا تھا۔ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ اسی لیے اس کو اس مقالے کا عنوان قرار دیتا ہوں۔

شاعری میں رمزیات کے بغیر چارہ کار نہیں۔ نام رکھنا بھی ایک رمز، ایک ایما، ایک استعارہ ہے۔ جس طرح بادہ و ساغر کے بغیر نہیں بنتی، اسی طرح رند و ساقی، شیخ و زاہد، واعظ و محتسب کے بغیر نہیں بنتی، اور اسی طرح مولوی مدن، شیخ چلی، موسیٰ و عیسیٰ، افلاطون و فرعون کے بغیر کام نہیں چلتا۔

کسی رمز یا نام کے استعمال کا بڑا فائدہ اختصار کے ساتھ ابلاغ ہے۔ ایک نام ایک اصطلاح بن جاتا ہے۔ سیرت یا صورت کا بڑا خاکہ یا نقشہ ایک لفظ میں سما جاتا ہے۔ جو نام سنتے ہی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کسی تفصیل سے وہ حُسن پیدا نہیں ہوتا اور وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو ایک چھوٹے سے نام سے ہو جاتا ہے۔ مثلاً بدّھو کا نام ہے۔ بُدھ یا بُدھی عقل کو کہتے ہیں۔ بُدّھو کے معنی ہوئے عقل مند۔ لیکن ازراہِ طنز و ظرافت بے عقل اور احمق کو بُدّھو کہتے ہیں۔ اکبرؔ کے ہاں اس کا لطف دیکھئے: ۔

بُدّھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو گرد راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

یہاں جُمّن میں وہ بات نہ نکلتی جو بُدّھو میں ہے۔ دوسری جگہ کہتے ہیں: ۔

مرزا غریب چُپ ہیں، ان کی کتاب ردّی
بُدّھو اکڑ رہے ہیں، صاحب نے یہ کہا ہے

یعنی صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ اصل میں غلط ہے، بلکہ مرزا کی کتاب میں جو کچھ ہے وہی صحیح ہے۔ لیکن بُدّھو احمق اس کو کیا سمجھیں، ان کے نزدیک تو صاحب کا فرمودہ ہی سب کچھ ہے۔ اب مرزا غریب صاحب کے خلاف کیا کہیں، چُپ ہیں، ان کی کتاب ردّی۔

متا تھو اکبر کی ایجاد نہیں۔ پرانا نام ہے۔ لیکن اکبر نے نئے نام اور اصطلاحات بھی ایجاد کئے ہیں۔ اور بعض بعض کو اس طرح لکھ گئے ہیں کہ اکبر والے معنی یاد آجائیں تو اچھے خاصے معقول لفظ سے سنجیدگی رخصت ہو جاتی ہے۔ مثلاً لیڈر کا لفظ کس قدر عام، ضروری اور کار آمد ہے، ایسا کہ اس کا کوئی مترادف اس قدر معنی خیز نہیں۔ لیکن اس کو اکبر کے اس شعر میں دیکھئے:۔

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

احمق کی جگہ لیڈر کہہ کر کیا لیڈروں کی قلعی کھولی ہے!

حضرت احمق پھپھوندوی بھی بڑے پختہ کار ظرافت شعار ہیں۔ لیڈر سے وہ بھی کام لیتے ہیں:۔

لیڈر ہے میرا نام، فلاکت کا ہوں میں جن
مدت سے اپنی قوم کے سر آرہا ہوں میں

دلچسپ بات کہی۔ لیڈروں کے باوجود قوم کی فلاکت دور نہیں ہوتی تو لیڈر کس مرض کی دوا ہیں۔ بلکہ ان کا بارِ لیڈری اور بھی قوم کی فلاکت کا باعث ہے۔ اکبر کا ایک اور "لیڈر" دیکھئے:۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کیساتھ

ایک وکیل صاحب نے قومی خدمت اختیار کی تو اکبر نے کہا:۔

پپیہے پکارا کئے پی کہاں
مگر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

جمعۃ الوداع یا عید کی نماز پڑھنے کبھی صاحب آجاتے ہیں، وہ "صاحب"، جن کے لیے اکبر کہتے ہیں:۔

رہ گئے نا آشنا۔ احباب غائب ہو گئے
ہم نفس دو اک جو باقی تھے وہ صاحب ہو گئے

تو پھر مسجد میں تماشا دیکھئے۔ جمن، وفاتی جیسے غریب نمازی جو نماز کے اہتمام میں دو تین گھنٹے پہلے سے آئے ہوئے بیٹھے ہیں پہلی صف سے اٹھا دیئے جاتے ہیں اور حکام کے لیے جگہ خالی کرا لی جاتی ہے۔ ایسے ہی منظر پر اکبر کہتے ہیں:۔

شانِ نماز اکبر شاہانہ ہو چلی ہے
مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاتی

میاں وفاتی پر کیسی بیکسی کا عالم طاری ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی "مرآۃ العروس" میں ماما عظمت ایک کیرکٹر ہو گئی ہے اور ضرب المثل۔ اکبر الہ آبادی کی بی نصیبن بھی ایک کیرکٹر ہی ہیں:۔

رہیں ہر پھر کے آیا بی نصیبن   وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

اکبر نے ناموں سے دلچسپ کام لئے ہیں۔ نام جس قوم کے فرد کا ہوتا ہے، اس قوم کی خصوصیات کا رمز وایما ہوتا ہے۔ اس لیے ناموں کو اکبر نے جہاں محض مناسبات کے لیے لکھا ہے، وہاں بھی مضمون میں اس نام اور قوم کے خصائص قومی و شخصی کا خیال رکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

ٹامی کے آگے ٹیمز کا دلچسپ پاٹ ہے
گنگو کی جانفزائی کو گنگا کا گھاٹ ہے

ڈوبے ہوئے ہیں یہ بھی مگر اپنی بات میں
پیرو بھی بہہ رہے ہیں خیالی فرات میں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمّن

رات افسوس سے کہتے تھے بر نبی بھائی
ہم سے ناحق ہیں الگ کانفرنسی بھائی

دھنا تے میں بھی بنا تے ہیں
کہتے ہیں مان جاؤ منسا رام

حکم انگلش کا۔ ملک ہندو کا
اب خدا ہی ہے بھائی ممّو کا

کہیں نام سے صرف قافیہ آرائی مقصود رکھی ہے۔ جیسے:-

قائم ہی بوٹ اور موزا رکھیے
دل کو مشتاق مس ڈسوزا رکھیے

ان باتوں پہ معترض نہ ہوگا کوئی
پڑھیے جو نماز اور روزہ رکھیے

لیکن دوسری جگہ نام سے کوئی خصوصیت ملحوظ رکھتے ہیں، مثلاً:-

حجابِ تمکنت کو دور کرتا ہے زبیدہ سے
سوا اس کے جو باتیں ہیں فقط اک پردہ پوشی ہے

"زبیدہ" کے ہم وزن حمیدہ، حمیرا وغیرہ بھی تھے۔ لیکن "تمکنت" کے محل پر "زبیدہ" کس قدر موزوں ہے۔ زبیدہ خاتون ملکہ ہارون رشید خلیفۂ عباسی کا نام ضرب المثل ہے۔

اصلی ناموں کو بھی علامت بنانے میں اکبر نے لطافت و جدت پیدا کی ہے۔ کہتے ہیں:-

جھکا ہے سر اپنا پائے بُت پر۔ زبان پہ ہے گلہ جفا کا
مرے عمل میں ہے طرزِ سید۔ غزل میں اندازِ لاجپت ہے

سر سید کی انگریز پرستی اور لالہ لاجپت رائے کی بغاوت پسندی کی طرف کس قدر خوبصورت اشارے ہیں۔

دو اور نام لکھتے ہیں۔ ان میں اگرچہ "طرزِ سید" اور "اندازِ لاجپت" کی خوبی نہیں مگر دونوں کا فرق خوب ہے۔ کہتے ہیں:-

ایک، شوکت اور ضیاء الدین وضع و خو میں ہیں
فرق اتنا ہی ہے، وہ جنگل میں ہیں۔ یہ زُو میں ہیں

مولانا شوکت علی کو تن و توش اور زور و شور کے سبب سے جنگل کا شیر کہا۔ اور ان کے مقابلے میں ڈاکٹر ضیاء الدین کو عجائب خانے کا۔

ڈارون کا نام اکبر نے بڑی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ڈارون کا نظریہ درست ہی سہی، لیکن اس کی گاڑی کا بندر پر آکر اٹک جانا اور انسان کا بندر سے رشتہ جوڑنا، ہندوستانیوں کی نظر میں مضحکہ خیز ضرور تھا جہاں بندر عجیب ذات واقع ہوئے ہیں۔

اکبرؔ کو ظرافت کے لیے ایک دلچسپ موضوع ہاتھ آگیا۔ بڑی گل افشانیاں کیں۔ لیکن جہاں اکبرؔ کو صرف ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر طنز و اعتراض مقصود ہے اور کوئی دوسرا مفید و دلچسپ پہلو نہیں پیدا ہوتا، مثلاً اس شعر میں :۔

کہا منصور نے خدا ہوں میں   ڈارون بولے بوزنا ہوں میں

یا اس سے بڑھ کر اس شعر میں :۔

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے   جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

یہاں اکبرؔ کا ذہن و فکر غلطی کرتا ہے۔ کسی علمی نظریہ و تحقیق سے بغیر دلیل کے اختلاف جائز نہیں۔ اور طعن و طنز کرنا نہایت نازیبا ہے۔ لیکن یہی ڈارونؔ کا نام ذیل کے شعر میں عجیب کام کر جاتا ہے :۔

باغِ امید کے پھل ہوتے ہیں روز ضائع
ہم کو خدا بچائے اولادِ ڈارون سے

اولادِ ڈارون یعنی انگریز۔ جس طرح بندر باغ کے پھل کو ضائع کرتے ہیں اسی طرح انگریز ہماری امیدوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ کس قدر بیباکی سے انگریز حکومت پر اعتراض کرتے ہیں۔

یا پھر ذیل کے شعر میں ڈارون کا نام پُرلطف ہے :۔

عقل سپردِ ماسٹر، مال سپردِ آنجناب   جان سپردِ ڈاکٹر، روح سپردِ ڈارون

جب ہر چیز کو کسی نہ کسی کے سپرد کرنا ٹھہرا تو روح سپردِ ڈارونؔ۔

اسی طرح بعض اور ناموں کو اکبرؔ نے مختلف موقعوں اور کاموں میں علامت قرار دیا ہے۔ اس میں بھی کہیں بے اعتدالی ہوگئی ہے۔ ہربرٹ اسپنسر اور جان اسٹوارٹ مل دو بڑے مشہور مفکر و فلسفی تھے۔ اکبرؔ کے زمانے میں جن یورپین فلاسفروں کی کتابیں کالج و یونیورسٹی کی درسیات میں شامل ہوئیں ان میں سب سے مقدم اسپنسر اور ملؔ تھے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبانوں پر ان کے نام تھے اور اردو میں ان کی تصانیف و مقالات کے ترجمے ہوئے۔ اس وجہ سے اکبرؔ کی زبان پر بھی یہی دو نام زیادہ آئے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

کتابِ دل فقط کافی ہے اکبرؔ درسِ حکمت کو
میں اسپنسرؔ سے مستغنی ہوں مجھ سے ملؔ نہیں ملتا

اس شعر پر کسی نقاد کا یہ اعتراض غلط ہے کہ "اکبرؔ محض تصوّر پرست ہیں" یا "علم کو بے معنی سمجھتے ہیں"۔ عقل و علم کو بامعنی سمجھنا اور ان سے کام لینا اکبرؔ کے قول و عمل دونوں سے ثابت ہے۔ اس شعر میں اسپنسرؔ و ملؔ کے فلسفۂ تفکیر و تعلیم اور فلسفۂ اخلاق و سیاست سے اکبرؔ کو انکار نہیں بلکہ اکبرؔ اپنی ایک کیفیت کو بیان کرتے ہیں جس میں فلسفے کی کتابوں کے علاوہ ایک اور کتاب یعنی "کتابِ دل" درسِ حکمت کے کام آتی ہے۔ ہندوستان میں اسی بیسویں صدی میں ایسے لوگ بھی پائے گئے ہیں جنھوں نے اسپنسرؔ و ملؔ کی کتابوں کے بعد "کتابِ دل" کا مطالعہ بھی مفید پایا ہے۔ یہ بات نئے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ سب باتیں ہر ایک کی سمجھ میں آجائیں۔ بہرحال اُوپر کے شعر میں اکبرؔ نے اسپنسرؔ و ملؔ کے نام برمحل استعمال کئے ہیں۔ لیکن ذیل کے شعر میں اُنکا موقع نہ تھا :۔

اسپنسرؔ و ملؔ کے ورق میں کس قیامت کے سبب   گل توپ خانہ اک طرف۔ بابو کی جرأت اک طرف

"بابو" سے مراد بنگالی بابو ہے۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال ہونے کے بعد چھ سال تک بنگالیوں نے فسخ تقسیم کے لیے شورش برپا رکھی۔ اس کی طرف اکبر اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بنگالیوں کی جرأت کا سبب اسپنسر و مل کی تعلیم تھی۔ لیکن یہ بات غلط ہے۔ ان فلاسفروں کی تعلیم کو بغاوت سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ مل کا تو درس ہی یہ ہے کہ سیاست میں زور و شور اور بغاوت کی جگہ نہایت تحمل و تامل کے ساتھ تفکر و تدبر کے انقلاب کے لیے راستہ بنانا چاہیئے۔ اکبر نے اصل میں اسپنسر و مل کو مغربی تعلیم کے لیے علامت قرار دیا ہے اور ان کا مفہوم یہ ہے کہ بنگالیوں کی شورش خود انگریزوں کی دی ہوئی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ تاہم ان ناموں کا استعمال اس شعر میں بے محل اور نازیبا ہے۔

مشہور تاریخی ناموں سے اکبر نے زیادہ کام نہیں لیا۔ سب سے زیادہ لیلے اور مجنوں سے ان کو دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے متعلق بہترین شوخ مضمون تو "مجنوں کا استعفا" ہے۔ لیکن یہ شعر بھی خوب ہے: ۔

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی   لیلیٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

مغربی تعلیم کی خرابی کا بیان اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں لیلیٰ و مجنوں جیسے تعلق والے نہ سہی۔ پھر بھی مختلف لوگ امن و عافیت سے رہ رہے تھے۔ پہلے مغربی سیاست نے آپس میں فوجداری کرانے کی ضرورت سمجھی اور پھر سیاست بے سیاست خود بخود فوجداری ہونے لگی۔ اس شعر میں اکبر کو مغربی تعلیم کے فوائد سے انکار نہیں، بلکہ اس کے ان عواقب و نتائج کی طرف اشارہ مقصود ہے، جن سے اہل ہند آخر میر کے ہم نوا ہو گئے: ۔

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم و گرم   کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

ناموں کے علاوہ خطابوں سے بھی اکبر نے ایما و علامت کا کام لیا ہے۔ مرزا کی آن بان مشہور بات ہے۔ "میرزا منشی" محاورہ ہے۔ اکبر بھی برتے کے متعلق کہتے ہیں: ۔

میرزایانہ ادا تھی سلطنت کی بات تھی

ذیل کے شعر میں بھی مرزا بطور علامت استعمال ہوا ہے: ۔

دربار دہلی اک طرف۔ لوکل مجالس اک طرف
مرزا کا چم خم اک طرف۔ بدھو کی گھس گھس اک طرف

ٹھاکر کے دو معنی ہیں۔ اکبر نے دونوں طرح لکھا ہے۔ کہتے ہیں: ۔

اُنہیں کی بھینس ہے بھائی کہ جن کی لاٹھی ہے   انہیں کا گاؤں ہے اکبر جو بن سکیں ٹھاکر

دوسری جگہ لکھتے ہیں: ۔

درِ دیر پہ میں نے ڈنڈوت کی   بھری تھی مرے دل میں ٹھاکر کی ہیبت
کیا شور چیلوں نے یہ ہر طرف   مہاراج کی جے! گرو جی کی جیت

یہ قطعہ اکبر کی ذہانت و ظرافت اور صناعت کی عجیب و غریب مثال ہے۔ چوتھے مصرعہ میں صنعت "حکایت الصوت" کا استعمال ہے۔ یعنی چوتھے مصرعہ کے الفاظ (جے۔ جی۔ جیت) کو کھینچ کر پڑھنے سے "چیل" کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اور تیسرے مصرعہ میں بڑی صنعت کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی چیلوں کا لفظ "چیلے" کی جمع اور "چیل" کی جمع دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے گویا چیلے کیا ہیں

چیلیں ہیں۔ یہ اکبر کا عجیب مسخرا پن ہے۔

یہاں شاید یہ بات بے محل نہ سمجھی جائے کہ اکبر جس بے تکی انگریز پرستی کے مخالف تھے اس کی ایک دلچسپ مثال ٹھاکر کی بگڑی ہوئی صورت ٹیگور ہے۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اصل میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹھاکر ہے۔ ٹیگور ہندوستان کی کسی زبان کا لفظ نہیں۔ انگریزی نما لفظ بنا لیا ہے۔ بنگالی زبان میں ڈاکٹر صاحب کے نام میں ٹھاکر ہی لکھا جاتا ہے۔

ایک اور دلچسپ خطاب دیکھئے:-

نہ سہی لطف ٹم، گھی ہی سہی
شیخ صاحب مہنت جی ہی سہی

اس مضمون کے لیے لالہ، پنڈت وغیرہ سب سے زیادہ مہنت جی ہی موزوں تھے۔

دو اور خطاب بڑے مزے سے لکھے ہیں:-

پکا لیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہمارا کیا ہے اے بھائی۔ نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

مسٹر اور مولانا دونوں کو پیسنے پکانے سے عار ہے۔ اس شعر کی قافیہ آرائی تو اکبر کا خاصہ ہی ہے۔ لیکن قافیہ آرائی کے شوق کا اعتراف اور اس کی "بے پناہ" مثال ذیل کے شعر میں دیکھئے:-

موج ہے دل میں مرے قافیہ پیمائی کی
جا کے گنگا پہ کہا کرتا ہوں "جے مائی کی!"

برگد کے مولوی کی اکبر نے ایسی ایسی تواضع کی ہے کہ ان حضرت کا جی ہی جانتا ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے اس "قوم" کے ساتھ اکبر کو کچھ "للہی" ہے۔ بہر حال ایک شعر میں بڑی بلیغ بات کہی ہے، یعنی:-

برگد کے مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے
مغرب کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے

"مولوی" کے لیے کہنا کہ "عربی میں ترجمہ ہے" کس قدر خوبصورت بات ہے۔ اور ظاہر ہے کہ برگد کا مولوی مغربی پالیسی کے پروپیگنڈے کا کام دیتا ہے۔

شیخ نہایت قدیم، صدہا سال کہنہ علامت ہے، اس میں لطف پیدا کرنا مشکل ہے جب تک ایسے جدید مضامین و اسالیب نہ ہوں جیسے ان دو تین شعروں میں ہیں:-

یاد کرتا ہے گذشتہ با اثر لاحول کو
شیخ کو طعنے دیا کرتا ہے شیطاں ان دنوں

یعنی شیخ میں اگلے لوگوں کا سا ایمان اور تقویٰ نہیں رہا، اس لیے شیخ کے لاحول میں اثر نہیں۔ اب اس سے شیطان نہیں بھاگتا۔

وہ تو گرجا بڑ کا اور یہ گیا کعبے کو پھاند
شیخ کا ٹٹو تو انجن سے بھی بڑھ کر تیز ہے

کعبے کو پھاند جانا یعنی کعبے سے بے تعلق رہنا یا کعبے کی حرمت و خدمت کا خیال نہ رکھنا۔ شریف مکہ کی "کعبہ فروشی" کے واقعات معلوم و مشہور ہیں۔

شیخ صاحب کی تعلی کی نہ قلعی کھل جائے
لارڈ صاحب کا کہیں حشر میں اظہار نہ ہو

لارڈ صاحب کی خوشامد میں شیخ صاحب کی ایماں فروشی کا کیا خوب بیان ہے۔

یا ذیل کے شعر کی سی اعلیٰ اور لطیف ظرافت پیدا کی جائے:-

سچ کہتے ہیں شیخ اکبرؔ ہے طاعت حق لازم
ہاں ترک مے و شاہد، یہ اُن کی بزرگی ہے

"یہ اُن کی بزرگی ہے" یعنی، یہ ان کا بڈھا پن ہے۔ اس شوخی کا جواب نہیں۔

یا پھر اس طرح کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو:۔

یہ قسمت شیخ جی کی ورنہ اکبرؔ
کہاں وہ بُت کہاں اٰمنتُ باللہ

یہ فرضی شعر آرائی نہیں، اصلی سانحہ ہے۔

سرؔ اور خان بہادرؔ کے خطاب یافتہ اکبرؔ کی زد سے کیا بچتے۔ فرماتے ہیں:۔

بے زور لنود کا اثر کیا
جب مغز نہیں تو لفظِ سر کیا

ایک اور شعر میں اپنی عادت کے مطابق بڑی لفظی رعایتوں سے کام لیا ہے جو بالکل بے لطف ہو جاتیں اگر ان کے ساتھ یہ لطیفہ نہ ہوتا کہ اکبرؔ نے کسی کے متعلق سُن کر کہ ان کو سرؔ کا خطاب ملا ہے اور اب وہ بالکل "انگریز" ہو گئے ہیں، بال میں ناچنے بھی لگے ہیں، فی البدیہہ کہا تھا:

پا کر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا
"سر" ہو گئے تو "بال" کا بھی شوق ہو گیا

ایک جگہ البتہ لطیف انداز سے کہا ہے:۔

خدا کے گھر سے اب آئے کی جو خبر آئے
بتوں کے پاؤں پہ ہم کو تو سر نظر آئے

یہاں سرؔ دونوں معنوں میں موزوں ہے۔

خود اکبرؔ کو خان بہادر کا خطاب ملا تو کہا:۔

شاعرانہ داد اچھی دی یہ مجھ کو چرخ نے
تیغ ابرو کا تھا عاشق خان بہادر کر دیا

نام رکھنے سے اکبرؔ نے اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا۔ کس بے تکلفی سے کہتے ہیں:۔

مدخولۂ گورنمنٹ اکبرؔ اگر نہ ہوتا
پاتے اسے بھی اک دن گاندھی کی گوپیوں میں

عورتوں کے خطابات میں بھی اکبرؔ نے بڑی شوخی، جدت اور معنویت سے کام لیا ہے۔ بیگمؔ، خاتونؔ، بیؔ، بیویؔ، لیڈیؔ، مسؔ، نہایت موزوں اور برمحل استعمال کئے ہیں۔ کہتے ہیں:۔

اکبرؔ دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

یہاں "بیگم" کی جگہ "بیوی" برمحل نہ تھا۔ "نوج" بیگماتی زبان ہے۔ اسی طرح اس شعر کو دیکھئے:۔

تعلیم لڑکیوں کو ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ایک محاورہ بڑے مزے سے لکھا ہے —— "ہم تو اے بی ؟ میں رہے، اغیار بی اے ہو گئے" —— اس میں اکبرؔ کی لفظی کاریگری کارفرما ہے مگر کس قدر دلچسپ اور موزوں ہے۔ مسلمان نوجوانوں میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ شادی کے بعد تعلیم ختم ہو گئی ہے۔

اور دیکھئے:۔

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر
شوہر پرست بیوی پبلک پرست لیڈی

مسؔ کے لفظ کی تو اکبرؔ کے کلام میں گنتی مشکل ہے۔ چونکہ فارسی میں بھی مسؔ (تانبا) کا لفظ ہے اس لیے لفظی رعایتوں کے شوق میں بھی اکبرؔ نے اس سے کام لیا ہے لیکن ایسے اشعار میں محض صناعی ہے۔ مثلاً:۔

حسرتِ عُشّاق بازارِ جہاں میں کچھ نہ پوچھ
زردھیا، زر ندارد، مس کی کثرت، سیم گم

سایہ کا ہم کو جنوں، وہ دھوپ میں مصروفِ کار
مس پہ ہے اپنی نظر اور سیم ان کے ہاتھ میں

لیکن بعض جگہ ان رعایتوں سے الگ ہو کر بھی خوب لکھا ہے۔ دیکھئے کیا شوخی ہے:-

شیخ کے دامن کو کل بوسہ جو اکبرؔ نے دیا
ہم نے برکت کیلئے اک مس کا سایہ چھو لیا

اور اس اعلیٰ ظرافت کا تو کیا کہنا:-

جو حسنِ بت کی جگہ حکمِ مس ہوا قائم
تو عشق چھوڑ کے ہم نے بھی نوکری کر لی

آوارہ گرد اشعار

قاضی عبدالودود

(۱) "آوارہ گرد اشعار" کی ابتدا سالنامۂ شاعر ۱۹۵۱ء سے ہوئی اور اس وقت تک اس کی کئی قسطیں مختلف رسائل میں طبع ہو چکی ہیں۔

(۲) کچھ امور کی تحقیق حسب دلخواہ نہ ہو سکی۔ مقالہ کتابی شکل میں چھپے گا تو ضروری اضافے کیے جائیں گے۔

(۳) مواد کافی نہ ہو تو اور امور درکنار یہ فیصلہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی شاعر جس کی طرف کوئی خاص شعر منسوب ہوا ہے فی الواقع اس کا مدعی تھا یا نہیں کہ یہ شعر میرا ہے۔

(۴) ایسے اشعار پر بھی جن میں خفیف اختلافات ہیں "آوارہ گرد" کا اطلاق ہوا ہے لیکن یہ التزام نہیں کہ اختلافات کا ذکر کیا جائے۔

(۵) اس قسط میں حسب ذیل مخففات مستعمل ہوئے ہیں:

آب = آب حیات ط ۱۹۱۷ء، آصفیہ = فرہنگ آصفیہ۔ انجمن = انجمن ترقی اردو۔ بیاض کوانتھ = یہ بیاض جو نمائش ہسٹوریکل ریکارڈس کمیشن پٹنہ فروری ۱۹۵۶ء میں کوانتھ سے آئی تھی ناقص الطرفین ہے اس لیے اس سے اس کے مؤلف کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ وہی ہے جس کا ذکر صفحہ ۹۸ میں ہے۔ حسن = تذکرۂ شعرائے اردو از میر حسن ط ۱۔ خمخانہ = خمخانۂ جاوید۔ سوسائٹی = کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ شفیق = چمنستان شعرا از شفیق۔ شورش = عکس مخطوطۂ آکسفورڈ۔ یہ شورش عظیم آبادی متوفی ۱۱۹۵ھ کا تذکرۂ شعرائے ریختہ ہے مگر اس میں کسی شخص نے تصرفات کیے ہیں۔ شوق = تذکرۂ قدرت اللہ شوق۔ شیفتہ = گلشن بے خار از شیفتہ ط ۱۹۱۰ء۔ صفیر = جلوۂ خضر جلد ۱ از صفیر بلگرامی۔ ط = طبع۔ طبقات = طبقات شعرائے ہند از کریم الدین۔ طوفان - تذکرۂ شعرا از ابن طوفان، مرتبہ راقم۔ عشقی = تذکرۂ عشقی عظیم آبادی نسخۂ راقم۔ قاسم = مجموعۂ نغز از قاسم۔ قائم = مخزن نکات از قائم۔ گردیزی = تذکرۂ ریختہ گویاں از فتح علی حسینی گردیزی۔ گلزار = گلزار ابراہیم نسخۂ م۔ م = کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ۔ مسرت = تذکرۂ مسرت افزا، یہ معاصر پٹنہ میں بہ اقساط طبع ہو رہا ہے۔ میر = "میر تقی میر، حیات اور شاعری" از جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ نساخ = سخن شعرا از نساخ۔ نکات = نکات الشعرا از میر ط ۲۔ نکہت = مخزن فوائد از نکہت دہلوی، یہ طبع ہو چکی ہے لیکن اس وقت پیش نظر نہیں اس

کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مخطوطۂ اُردو ۵۰م سے ماخوذ ہے۔ و = ورق۔ ہندی = تذکرۂ ہندی از مصحفی۔

(۶) لفظ آوارہ گرد، ممکن ہے کہ ایرانیوں کی زبان پر نہ ہو، لیکن محض اس بنا پر اسے قلمروِ اردو سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہرزہ گرد کی طرح ہے جو ایران میں مستعمل ہے۔ "آوارہ گرد" ہندوستان میں صدیوں سے رائج ہے۔ ۱۔ تاریخ ارادت خاں واضح متوفی ۱۱۲۸ھ م: "آوارہ گرد نزد اعظم شاہ آمد" و ۶۶۔ ۲۔ سفرنامہ آنندرام مخلص متوفی ۱۱۶۴ھ: "آوارہ گردانِ کوہ" ص ۸۵۔ ۳۔ بہارِ بے خزاں، مصنفہ اواسطِ مأۃ سیزدہم، منقول از "میر" "از آوارہ گردیہا آرمید" ص ۵۸۱۔ ۴۔ کلیاتِ میر، اشاعتِ آسی "پھرتا رہا ہوں گلیوں میں آوارہ گرد سا" ص ۵۳ "آوارہ گردی اپنی کھپی میر دلوں پر" ص ۲۹۰ "آوارہ گرد بادیہ ابتلا ہوں میں" ص ۷۵۵۔ ۵۔ آبِ بقا از خواجہ عشرت لکھنوی: "آوارہ گردی" ص ۹۔ ۶۔ "اندر سبھا امانت" از حسرت موہانی منقول از نگار دسمبر ۱۹۵۳ء: "سبز پری آوارہ گرد ہو جاتی ہے" ص ۴۲۔ ۷۔ حاشیۂ کلامِ انشا از مرزا محمد عسکری لکھنوی: "آوارہ گردِ غربت" ص ۴۰۹۔ ۸۔ خیام مصنفہ سید سلیمان ندوی: "آوارہ گردِ رباعیوں" ص ۲۸۰۔

(۷) ان اصحاب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے جن سے اس مقالے کی تحریر میں مدد ملی ہے۔ ان کے نام اپنی اپنی جگہ پر ملیں گے۔

(۱) کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے　　خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

صبا، شاگردِ آتش کا شعر ہے (دیوان طبع ۱۲۹۴ھ ص ۱۸۸) لیکن آصفیہ ۴ ص ۶۳۷ میں بنام میر۔

(۲) میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں　　گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

غالب کا طبعزاد ہے (دیوان مطبع نظامی کانپور ص ۱۳) مگر آصفیہ ۱ ص ۱۴۴ میں میر کے نام سے ہے۔

(۳) گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا　　آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا

میر کا مطلع ہے (کلیات ص ۲۲۸ عشقی) لیکن آصفیہ ۳ ص ۱۲۱ میں درد سے منسوب ہے۔

(۴) یہ جو چشمِ پُر آب ہیں دونوں　　ایک خانہ خراب ہیں دونوں

انتخاب دیوانِ میر مؤلفہ جناب ڈاکٹر عبدالحق ص ۶۳ میں مطلع شامل ہے اور باوجود اس کے کہ کلیات سے غیر حاضر ہے، مقدمۂ کلیات نوشتہ آسی مرحوم میں میر کے نام سے ہے ص ۱۳۴ "میر" میں ان اصحاب کی تقلید کی گئی ہے ص ۳۶۷، اور جناب عطا[1] کا بیان ہے کہ "اکثر لوگ اسے میر کی ملک سمجھتے ہیں (نگار جولائی ۱۹۵۲ء ص ۴۰) یہ درست ہو یا نہ ہو، ان کا یہ قول ضرور صحیح ہے کہ یہ مطلع طبقات[2] میں بالکل حضور شاگرد درد کے نام سے ہے۔ اس پر یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ اشاعتِ طبقات سے کم و بیش ۱۲ سال قبل شیفتہ (ص ۱۶) اور ان سے بھی بہت پہلے قاسم (۱ ص ۲۱۳) اسے حضور[3] کی طرف منسوب کر چکے ہیں۔ کوئی

---

[1] جناب شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی نے بھی ایک مقالہ "آوارہ گرد اشعار" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس کی ۶ قسطیں نگار ۱۹۵۲ء میں اپریل تا دسمبر شائع ہوئی ہیں۔ [2] طبقات ص ۲۴۹۔ [3] حضور، مجموعۂ نغز کے اختتام ۱۲۲۱ھ سے قبل ہی مر چکے تھے مگر مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے مشاعرۂ کریم الدین میں شریک ہیں۔

قدیم شہادت اس امر کی کہ میر کی تصنیف ہے، میرے علم میں نہیں۔

(۵) ”فغانِ دہلی“ ایک مجموعۂ اشعار ہے جو تفضل حسین کوکب نے ۱۲۷۹ھ میں شائع کیا تھا۔ اس میں بہ استثنائے بعض وہ نظمیں ہیں جو شورش ۵۷ء سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں۔ اردو کی مشہور غزل جو بحذف ۵ اشعار درج ذیل ہے جہاں تک میرا علم ہے پہلے پہل اسی مجموعے کی وساطت سے منظرِ عام پر آئی تھی۔ ”فغانِ دہلی“ میں یہ ”حسامی“ کی طرف منسوب ہے ؎

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے　　کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے
ساری رعایائے ہند تباہ ہوئی کہوں کیا کیا ان پہ جفا ہوئی　　جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے
وے شہر دہلی یہ تھا چمن کہ سب طرح کا یہاں تھا امن　　وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
شب و روز پھولوں میں جو تلیں کبھو تن خارِ غم سے وے چپ چھلیں　　ملے طوق قید میں جب انہیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
جو سلوک کرتے تھے اور سے اب ہیں دیکھو وہ کس طور سے　　وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے رہا تن پر ان کے نہ تار ہے
پڑے بال تن پہ ہے سر برا نہیں جان جانے کا ڈر ذرا　　بچے غم سے نکلے ہے دم مرا مجھے اپنی زندگی بار ہے
یہاں تنگ حال جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے　　یہاں بہار میں تو خزاں ہوئی واں خزاں انھوں کو بہار ہے
یہ ستم کسی نے بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بے گناہ　　وے کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی ان کے دل پہ غبار ہے
نہ تو دشمنائی ہے غیر میں نہ ہے اپنا یاں کوئی دہر میں　　چلا تیر اجل کا بھی شہر میں کیا لاکھوں کا جس نے شکار ہے

کیا حسامی ڈر تجھے حشر کا جو خدا رکھے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسول کا کہ ترا وہ حامی کار ہے[1]

یہ اشعار جو مختلف الانواع اسقام سے مملو ہیں بجنسہٖ ”فغان دہلی“ طبع ۱۳۱۳ھ سے نقل کئے گئے ہیں۔ ۱۲۷۹ھ کے بہت بعد ”بہارِ گلشن“ نامی ایک مجموعۂ اشعار غالباً لکھنؤ کے کسی مطبع نے چھاپ کر شائع کیا تھا۔ یہ اس وقت پیشِ نظر نہیں لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس میں اس غزل کے کچھ اشعار ظفر کے نام سے درج ہوئے تھے اور مقطع میں ”حسامی“ کی جگہ ”ظفر“ تھا۔ میرا خیال ہے کہ متن اشعار میں اور بھی اختلافات تھے۔ لیکن یہ یاد نہیں کہ اس میں کوئی ایسا شعر بھی تھا یا نہیں جو ”فغانِ دہلی“ میں موجود نہیں۔ خمخانہ ۲ اشاعت پذیر ہوا تو اس میں بہ تقلید فغانِ دہلی اس غزل کے ۸ شعر حسامی کے نام سے مرقوم ہوئے صہ ۴۲۴، لیکن ”بہادر شاہ ظفر“ مصنفہ امیر احمد علوی مرحوم میں اس زمین کے ۱۰ اشعار شامل ہیں جن میں سے ایک ؎

سبھی جا وہ ماتمِ سخت ہے کہوں کیسی گردشِ بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے

”فغانِ دہلی“ سے غیر حاضر ہے اور نہ معلوم کہاں سے لیا گیا ہے۔ باقی ۹ اشعار فغانِ دہلی میں ہیں لیکن دونوں کا متن بہت

---

[1] حسامی کا حال خمخانہ ۲ میں درج ہے۔

مختلف ہے۔ کتاب مذکور میں اشعار زیرِ بحث کے متعلق لکھا ہے: "اس دردِ مصیبت (۱۸۵۷ء) کی یادگار ایک نظم ہے جس کو ادا شناس ظفر کی تصنیف بتاتے ہیں مگر اس تمام کلام پر نظر کر کے بعض نکتہ رس اس کو حامی تخلص ایک غیر معروف شاعر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس دار و گیر میں الفاظ کی نشست پر غور کرنے کا کس کو موقع تھا؟ دل کے جذبات زبان پر بے ساختہ آئے اور اب تک دردمندوں کی زبان پر ہیں" ص ۱۱۱۔ "حامی" غالباً "حسامی" کا مصحف ہے اور میں نے کہیں اور یہ اشعار "حامی" کے نام سے نہیں دیکھے۔ خیال عظیم آبادی نے "مغل اور اردو" ص ۱۶۷ میں اس غزل کے ۴ شعر "فغانِ دہلی" میں سے پیش کئے ہیں اور وہ انھیں ظفر کی ملک قرار دیتے ہیں، اس کتاب میں مقطع کا مصرع اس طرح ہے۔

"تجھے خوفِ حشر ہے کیا ظفر تو خدا کے فضل پہ رکھ نظر"

خمخانہ ۵ سربرام کی وفات کے بعد پنڈت کیفی مرحوم نے شائع کیا تھا۔ اس کے ص ۷۴ میں "فغانِ دہلی" کے ۴ شعر بحوالۂ دیوانِ ظفر مندرج ہیں مگر یہ اشعار دیوان میں نہیں اور خمخانہ ۵ میں ان کا شمول غالباً پنڈت صاحب کا فعل ہے۔ میری رائے میں کوئی قابلِ قبول شہادت اس کی موجود نہیں کہ یہ اشعار ظفر کے ہیں: "سبھی جا ...... الخ" تو نہ معلوم کس کا ہے باقی حسامی کے ہیں۔

(۶) مضامینِ فرحت حصہ ۴: "غدر کے کئی برس بعد دلی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا اس میں کوئی طرح نہیں دی گئی تھی۔ بس یہی تھا کہ دلی کا مرثیہ کہو۔ یہ کل کلام ایک کتاب کی شکل میں چھپا ہے۔ اس مشاعرے میں آزردہ بھی شریک تھے۔ انھوں نے دلی کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کیا ہے ؎

ہوا اچھا جو مٹا نام و نشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی" ص ۱۸۲

خمخانہ ۴، ترجمہ حسین علی خاں شاداں: "فغانِ دہلی کی تحریر کے وقت بھی ان کی عمر تیرہ چودہ برس کی ہوگی کہ متعدد شعرا کے شدید تقاضے سے عاجز آکر انھوں نے دہلی کا مرثیہ کہا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشانِ دہلی
میری پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی" ص ۳۸۰

مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے جس کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے وہ "فغانِ دہلی" کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ مگر اس میں مشاعرے کا ذکر نہیں۔ شعرِ زیرِ بحث کی زمین میں تیس سے زیادہ شعرا کے اشعار البتہ ہیں، جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ مشاعرہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، طرح ضرور دی تھی۔ فغانِ دہلی میں آزردہ کا ایک مسدس ہے جس کا آخری بند یہ ہے ؎

روزِ وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے　　سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن آتی ہے　　مصطفےٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو　　قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو　ص ۱۲

ظہور علی ظہور دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ) شاگردِ ذوق وغیرہ کے دیوانِ مطبوعہ (اس وقت تحریری یادداشت پیشِ نظر)

ہیں آزردہ کی ایک غزل کی تضمین ہے۔ یہ بموجب صراحتِ دیوانِ شورش ۵۷ء سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی۔ دیوانِ ظہور کمیاب ہے اور یہ غزل کم لوگوں کی نظر سے گزری ہے اس لئے اس موقع پر نذرِ ناظرین کی جاتی ہے ؎

اگر ہم نہ تھے غم اٹھانے کے قابل   تو کیوں ہوتے دنیا میں آنے کے قابل
کروں چاک سینہ تو سو بار لیکن   نہیں داغِ دل یہ دکھانے کے قابل
ملیں تم سے کیونکر رہے ہی نہیں ہم   بلانے کے قابل نہ آنے کے قابل
رہی روز قصرِ تمنا کی تعمیر   نہ تھا یہ کبھی گھر بنانے کے قابل
چھٹے بھی قفس سے تو کس کام کے ہیں   نہیں جب چمن تک بھی جانے کے قابل
بجز اس کے تھے خاک پہلے ہی اے چرخ   نہ تھے خاک میں پھر ملانے کے قابل
کیا ترک دنیا میں جب تو یہ سمجھے   کہ دنیا نہیں دل لگانے کے قابل
وہ آتے دمِ نزع کیا کہہ سکیں ہم   نہیں ہونٹ تک بھی ہلانے کے قابل
خدایا یہ رنج اور یہ ناصبوری   نہ تھے ہم تو اس آزمانے کے قابل
رہے ہم نہ کچھ مصطفٰے خاں کے غم میں   نہ فکرِ سخن نہ پڑھانے کے قابل
نہ چھوڑیں گے محبوبِ الٰہی کے در کو   نہیں گو ہم اس آستانے کے قابل
ہمیں قید کرنے سے کیا نفع صیاد   نہ تھے دام میں ہم تو لانے کے قابل
نہ بالِ منقش نہ پر ہائے رنگیں   نہ آوازِ خوش کے سنانے کے قابل

وہ آزردہ جو خوش بیاں تھے نہیں اب
اشارے سے بھی کچھ بتانے کے قابل

تعجب ہے کہ مرزا صاحب شعرِ زیرِ بحث کا مصنف آزردہ کو سمجھے، یہ شاداں کا کہا ہوا ہے جیسا کہ صاحبِ خمخانۂ جاوید کا بیان ہے۔ لیکن صرف یہی شعر انھوں نے موزوں کیا تھا، فغانِ دہلی میں صراحتاً مرقوم ہے" بسبب کم فرصتی بر ہمیں یک مطلع اکتفا نمودہ اند" صفحہ ۵۵ مصرعِ خمخانہ میں اور دوسرا مضامینِ فرحت میں صحیح لکھا گیا ہے۔

(۷) آبِ ترجمہ سوز: "یہ قطعہ بھی ایک خاص موقع پر ہوا تھا اور عجب انداز سے پڑھا گیا:

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے   سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رو   ائے رے رے ائے رے رے رے ائے رے رے" صفحہ ۱۹۹

مگر دیوانِ ظہور میں بھی ہے اور چونکہ دیوانِ سوز (نسخۂ کوالٹہ و نسخۂ مملوکہ جناب علی حیدر) میں نہیں ہے اور آب کے سوا کہیں اور سوز کے نام سے نظر نہیں آتا، گمان قوی ہے کہ ظہور کے نتائجِ افکار سے ہے۔ اس صورت میں اس کی اصلی شکل یہ ہے جو دیوان میں ہے:

گئے ہیں التفاتاً کل سویرے   سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

وہاں بیٹھی ہوئی تھی ان کی بھینگی   ایرے رے رے ایرے رے رے رے ایرے رے

(۸) زندگی زندہ دلی کا ہے نام   مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

ناسخ کا شعر ہے (کلیات مطبع مولائی ص ۱۹۸) مگر آصفیہ ۲ ص ۴۱۴ میں بنام ذوق۔

(۹) وہ ستی وہ دیوانی کی صحبت   محمودہ کی وہ آدمیت

گلزار نسیم مصنفہ پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی (اشاعت چکبست ص ۲۹) کا شعر ہے لیکن آصفیہ ا ص ۵ میں بنام نسیم دہلوی (اصغر علی خاں)

(۱۰) کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں   پانی پیتی تھی کھاکے قسمیں

گلزار نسیم کا شعر ہے ص ۲۹ مگر آصفیہ ا ص ۱۵۹ میں بنام حسن۔

(۱۱) تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں   کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

غالب کا شعر ہے (دیوان ص ۱۵) لیکن آصفیہ ۳ ص ۳۲۵ میں بنام مصحفی۔

(۱۲) روندے ہے نقش پا کی طرح خلق یاں مجھے   اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

درد کا مطلع ہے (دیوان مطبع محمدی لکھنؤ ص ۳۱، حسن ص ۱۰۱، قائم ص ۴) مگر آصفیہ ۳ ص ۶۰۴ میں بنام ارشد

(۱۳) شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشک سرخ کا   تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

فغاں کا شعر ہے جو دیوان مطبوعہ کے علاوہ ان مخطوطات دیوان میں بھی ہے جو میرے پاس ہیں۔ تذکرے بھی اسی کے مؤید ہیں کہ فغاں کا زائیدہ طبع ہے (نکات ص ۷۵، قائم ص ۴۳، حسن ص ۱۴۳، گردیزی ص ۱۲ وغیرہ) لیکن نور اللغات ۴ ص میں اسے سودا کا نتیجۂ فکر قرار دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کلیات سودا ا ص ۱۹۰ میں یہ شعر موجود ہے لیکن صاحب نور اللغات کی نظر اس پر نہیں پڑی کہ سودا نے اسے تضمین کیا ہے۔ وہ قطعہ جس کے آخر میں یہ شعر آتا ہے سودا کی ایک غزل کا جزو ہے اور قطعے کا پہلا شعر یہ ہے ــ

سودا فغاں کو خط یہ لکھا اس کے یار نے
جس وقت اس کے حال کی اس کو خبر گئی   ص ۱۸۹

اس تضمین کا ذکر نکات و حسن میں بھی ہے۔

(۱۴) صحبت گل ہے فقط بلبل سے کیا بگڑی ہوئی   ان دنوں سارے چمن کی ہے ہوا بگڑی ہوئی

ظفر کا مطلع ہے (کلیات ط ۱۸۸۷ء ص ۳۴۴) مگر نور اللغات ۴ ص ۲۱۵ میں بنام جلال۔

(۱۵) مرحبا شاباش اے رحمت خدا کی آفریں   میرے حق میں تم نے یار غیر کا کہنا کیا

انشا کا شعر ہے (کلام انشا ص ۶، گلشن ہند ص ۳۶) لیکن آصفیہ ا ص ۹۸ میں بنام نظیر۔ لطف یہ کہ ۴ ص ۲۴۴ میں انشا کے نام سے بھی ہے۔

(۱۶) تجھ رو میں لطف ہے سو ملک کو خبر نہیں   خورشید کیا ہے اس کے فلک کو خبر نہیں

تجرد کا مطلع ہے (نکات ص۱۰۵، گردیزی ص۳۰، شفیق ص۵۴۵، حسن ص۶۵، شیفتہ ص۴۱) لیکن آب ص۴۳ میں بنامِ سودا۔ صاحبِ آصفیہ جو آزاد کو خضرِ راہ تحقیق سمجھتے ہیں، اس اعتراف کے باوجود کہ شمس البیان (طپش) اور شیکسپیئر کے لغت میں تجرد کے نام سے ہے، آزاد کے تتبع میں اسے سودا کا طبعزاد بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "شاید کلیات میں نکلے۔" (۳ ص۳۵۲) کلیات میں اس زمین کا ایک شعر موجود نہیں۔

(۱۷) از زلفِ سیاہِ تو بہ دل دھوم پڑی ہے ‎ ‎ آئینے کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے
اس زلفِ سیہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے ‎ ‎ آئینے کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے

" از زلف ۔ ۔ ۔ الخ " آب ص۹۷ میں صرف فطرت کے نام سے ہے اور " اس زلف ۔ ۔ ۔ الخ " ص۱۲۲ میں آرزو کے دوسرے اشعار کے ساتھ مندرج ہے لیکن حاشیے میں مرقوم ہے کہ انشا کی دریائے لطافت میں " از زلف ۔ ۔ ۔ ۔ الخ " قزلباش خاں امید سے منسوب ہے۔ " اس زلف ۔ ۔ ۔ الخ " کی نسبت حاشیے میں لکھا ہے کہ تذکرۂ سودا میں اسی طرح آرزو کے نام سے ہے۔

(ا) آزاد نے تذکرۂ سودا کا اس طرح حوالہ دیا ہے کہ گویا ان کی نظر سے گزرا ہے۔ لیکن آب ص۱۵۲ میں اسے " نایاب " بتاتے ہیں جو اس موقع پر بظاہر " ناپید " کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد کا ماخذ اصلی تذکرۂ قاسم ہے جس میں شعر کی دونوں شکلیں درج ہیں اور شکل ۲ کے متعلق لکھا ہے: " واللہ اعلم بحقیقۃ الحال کہ ۔ ۔ ۔ ہمیں طور بود یا مرزا (سودا) تصرف نمودہ " (۱ ص۲۵) قاسم سے پہلے کسی نے اس تذکرے کا ذکر نہیں کیا اور اس صورت میں کہ قائم و حسن، تلامذۂ سودا کے تذکروں میں اس کی طرف اشارہ نہیں، صرف قاسم کی شہادت پر اس کے وجودِ خارجی کا قائل ہونا ممکن نہیں۔ (ب) شعر کی صحیح شکل وہی ہے جس میں مناسبت زیادہ ہے (ج) دریائے لطافت (انجمن ص۲۵ و دیگر نسخ) میں امید نہیں، فطرت کے نام سے ہے (د) آزاد کی عبارت میں لفظ " بعض " گمراہ کن ہے۔ سچ یہ ہے کہ تذکرۂ قاسم سے قطع نظر، کوئی تذکرہ ایسا نہیں جس میں یہ شعر ہو اور فطرت کے نام سے نہ ہو (نکات ص۴۷، قائم ص۱۲، حسن ص۱۶۸) ——— (ہ) آرزو کا اس شعر سے کچھ تعلق نہیں، ہوتا تو میر اسے فطرت کی طرف منسوب نہ کرتے۔

(۱۸) ہیں عجب یہ رسم دیکھی مجھے روزِ عیدِ قرباں ‎ ‎ وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا
یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں ‎ ‎ وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

شعر ا، آب ص۲۳۲ میں بنامِ مصحفی اور بہ تبدیل بعض الفاظ مصحفی کے دیوان ۳ (نسخۂ م و دیگر نسخ) میں موجود ہے۔ شعر ۲، آب ص۳۰۸ میں انشا کے نام سے ہے اور کلیات انشا طبع دہلی[2] میں بھی ہے مگر محشی کلام انشا کا بیان ہے کہ خطی نسخے اس سے خالی ہیں ص۲۷ کلیات کے ۳ قلمی نسخوں (ایک نسخہ مملوکۂ جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی، ۲ م میں ہیں) اور دیوان (نسخۂ م) میں

---

[1] شاد عظیم آبادی نے تذکرۂ سودا کا حسین آباد میں ہونا لکھا ہے۔ لیکن وہاں کبھی تھا نہ اب ہے۔ وہ اصحاب جو حیاتِ فریاد، نقشِ پائدار وغیرہ کو دیکھ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ شاد کیسے راوی ہیں۔

[2] یہ نسخہ آزاد کے والد کے مطبع میں چھپا تھا۔

جو اس وقت پیشِ نظر ہیں، یہ شعر موجود نہیں۔ قرینہ ہے کہ نسخۂ مطبوعہ میں غلطی سے داخل ہو گیا ہے۔

(۱۹) ہماری خاک یوں اُڑتی پھرے اے ابرِ رحمت سے   بگولے کا کبھی صدمہ کبھی صرصر کی زحمت ہے

ثابت شاگرد فدوی کا مطلع ہے (گلزارِ عشق)، لیکن انشائے نورتن مصنفہ مجبور، شاگردِ جرأت (مطبع مجیدی کانپور ص۱۱) میں میر ضیا کے نام سے ہے۔ آزاد نے آب ص۱۷۶ میں اسے سودا کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن آب ص۴۹۴ اور دیوانِ ذوق ص۴۷ میں ذوق کی زبانی اسے میر کا طبعزاد لکھا گیا ہے۔

(۲۰) حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے   کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے

ذوق کا مطلع ہے اور اس کی اصلی شکل یہی ہے (اشاعتِ دیوان وغیرہ ص۱۳۹، اشاعتِ آزاد ص۱۵)، لیکن جناب کلیم الدین احمد نے بہ تبدیلِ بعض الفاظ غالب کے نام سے لکھا ہے (معاصر ۶ ص۵۵)

(۲۱) یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی   یا تنگ نہ کر ناصحِ ناداں مجھے اتنا

آصفیہ ۴ ص۲۸ میں بنام آزردہ مندرج ہے اور مقدمۂ کلیاتِ حسرتی و شیفتہ نوشتۂ نظامی بدایونی مرحوم میں کسی سند کے بغیر مرقوم ہے کہ یہ آزردہ کی اس غزل کا شعر ہے جو انھوں نے ۱۸۴۷ء کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی جسے شیفتہ نے منعقد کیا تھا (ص۱۳)۔ جناب عطا مدعی ہیں کہ بعض تذکروں میں آزردہ کے نام سے ہے لیکن کسی تذکرے کا نام نہیں بتاتے اور جناب عرش ملسیانی کے ایک "ریڈیائی فیچر" کے حوالے پر اکتفا کرتے ہیں (نگار اکتوبر ص۴۷)۔ کوئی ایسا تذکرہ جو جناب عطا کا مؤید ہو میرے علم میں نہیں، اور قریب بہ یقین ہے کہ جناب عرش کا ماخذ مقدمۂ دیوان ہے۔ جناب عطا نے اس پر اظہارِ حیرت کیا ہے کہ یہ شعر طبقات میں شتاب رائے تاب کشمیری کی طرف منسوب ہے لیکن یہ صرف طبقات ص۲۴۶ ہی میں اس کے نام سے نہیں۔ کریم الدین سے برسوں پہلے شیفتہ اسے تاب کی تصنیف قرار دے چکے ہیں (ص۳۹)۔ مشاعرہ ۱۸۴۷ء میں اس شعر کا پڑھا جانا باور کرنے کی بات نہیں، شیفتہ کا تذکرہ جس پر آزردہ کی تقریظ ہے کم از کم دو بار اس سے پیشتر معرضِ طبع میں آ چکا تھا۔

(۲۲) خمخانہ میں ترجمۂ تنہا، دامادِ صبا لکھنوی: "اگست ۱۹۰۵ء کے گلچیں میں جو غزل ان کے نام سے ہے اس کے بعض اشعار یوسف علی خاں ناظم کے ہیں مثلاً

خون ہوتے ہوئے دیکھا کبھی جلتے دیکھا   دل کو ہر بار نئے رنگ بدلتے دیکھا

اسی طرح دوسرا شعر بھی بہ تبدیلِ الفاظ انھی کا ہے ؎

زاہد و شیخ و برہمن مرے ہم مشرب ہیں   درِ میخانہ سے کس کس کو نکلتے دیکھا

ناظم کا مصرع یوں ہے: "زاہد و شیخ سبھی خوب ہیں کیا بتلاؤں" اسی طرح ناظم کا یہ مشہور شعر ؎

ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں   اور پھر بزم میں سب نے اسے چلتے دیکھا

بے تکلف اپنی غزل میں داخل کیا ہے۔ شاعری کی کائنات یہ ..... اور ... استادی کا دعویٰ!" ص۳۹۳ دیوانِ ناظم ص۱۴ سے صاحبِ خمخانہ کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ تنہا صاحبِ دیوان تھے مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ خبر نہیں اس کا خطی نسخہ موجود ہے یا نہیں اور ہے تو یہ اشعار اس میں ہیں یا نہیں۔

(۲۳) از کشاکش ضعفم نگسلد روان از تن   این کہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست

غالب کا شعر ہے (کلیاتِ فارسی ص۳۵۹) لیکن خمخانہ ا ص۲۶۶ میں ہے کہ عبد الغنی ارشد دہلوی نے یہ شعر اپنی وفات کے چند منٹ پیشتر کہا تھا۔

(۲۴) سُرمہ منظورِ نظر ٹھہرا ہے چشمِ یار کو   نیلگوں گنبد اٹھا یا مردمِ بیمار کو

کلیاتِ آتش مطبوعہ مطبع محمدی، مصححہ مصحف ص۱۴۸ میں موجود ہے۔ لیکن شیفتہ نے ایک گمنام شاعر محمد امین مغنی کی طرف منسوب کیا ہے ص۱۰۳ اور نکہت و ۲ ، ۲۷ آصفیہ ۴ ص۱۳۱ میں بہ تبدیلِ بعض الفاظ سلیمان شکوہ کے نام سے ہے۔ مؤخر الذکر کا دیوان ہے، لیکن مجھے اب تک اس کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

(۲۵) تھوڑی بھی نیک و بد کی گر دو تمیز رکھے   کافر ہو پھر جو دل کو اس سے عزیز رکھے

محمد رضا شکوہ کا مطلع ہے (ہندی ص۱۳۷ ، قاسم ا ص۳۴۶) لیکن خمخانہ ۵ میں میر ضیا کے نام سے ہے۔

(۲۶) اب اور لگا ہونے ایجادِ گلستاں میں   رازوں کو لگا رہنے صیادِ گلستاں میں

شیفتہ ص۸۵ و نساخ ص۱۷۶ و خمخانہ ۳ ص۳۲۹ میں بنام راسخ عظیم آبادی، لیکن ان کے دیوان کے کسی نسخے میں نہیں اور (انتخاب دیوانِ تنہا شاگردِ مصحفی (مؤلفہ حسرت موہانی) میں بہ تبدیلِ بعض الفاظ موجود ہے۔ بلکہ اس میں اس زمین کے اور اشعار بھی ہیں اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ تنہا کا نتیجۂ فکر ہے۔

(۲۷) دشمنی در پردہ کی اے فتنے تم نے کیا کیا   آپ تو پردے میں بیٹھے اور ہمیں رسوا کیا

شیفتہ ص۸۵ و نساخ ص۱۷۶ و خمخانہ ۳ ص۳۳۳ میں بنام راسخ، لیکن دیوانِ راسخ کے کل نسخوں سے جو میری نظر سے گزرے ہیں غیر حاضر ہے اور بہ تبدیلِ بعض الفاظ عشقی نے مراد بخش مراد، شاگردِ راسخ کے نام سے لکھا ہے۔ یہی صحیح ہے۔

(۲۸) ہوئے ہم بت کے بندے برہمن سے راہ کرتے ہیں   حرم کے رہنے والو تم سے عشق اللہ کرتے ہیں

قاسم ا ص۱۶۵ میں بنام جرأت، لیکن غمکدۂ چین (مصنفہ حقیقت، شاگردِ جرأت (ط سنہ ۱۲۶۳ھ ص۳۲) میں حسرت استاد جرأت کے نام سے ہے۔ جرأت نے پوری غزل بشمول مطلع کی تضمین کی ہے (کلیات م و۳۸۶) مقطع حسرت کی تضمین یہ ہے:

نہ پہنچے بوالہوس تو عاشقوں کی گرد کو ہرگز   نہیں ہے وہ جرأت ان کی آہِ سرد کو ہرگز
بھلاؤں گا نہ میں استاد کی اس فرد کو ہرگز   سخن آورد کا حسرت نہ پہنچے درد کو ہرگز
کہ اس پہ آہ نکلے ہے اور اس پرواہ کرتے ہیں

مجھے یاد تھا کہ یہ غزل دیوانِ حسرت نسخۂ کتب خانۂ رضائیہ رامپور میں موجود ہے، جناب عابد رضا، بیدار نے اس کی تصدیق کر دی۔

(۲۹) حقارت اپنے عاشق کی نہیں معشوق کو بھاتی   بیاں سعی اپنی رسوائی میں تا مقدور مت کیجو
کہا تھا ساربان کے کان میں لیلےٰ نے آہستہ   کہ مجنوں کی خرابی کا کہیں مذکور مت کیجو

جواہر سخن ۲ مؤلفہ جناب کیفی چریا کوٹی میں شعر ۲ بیاں کے نام سے ہے، لیکن حسن ص۹۳ میں بدر النسا بیگم، دختر

قمر الدین خاں، وزیر محمد شاہ کی طرف منسوب ہے۔ میں نے جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے اس کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دیوانِ بیاں کا جو نسخہ ان کے پاس ہے اس میں دونوں شعر آخر غزل میں یکے بعد دیگرے موجود ہیں۔ اس کا امکان ہے کہ بیاں نے تضمین کی ہو اور شعر فی الواقع بدر النسا بیگم کا ہو۔ واضح رہے کہ موخر الذکر کے شاعر ہونے کا مدار صرف حسن کے بیان پر ہے اور "کہا تھا ... الخ" کے علاوہ کوئی اور شعر ان کے نام سے نظر نہیں آیا۔

(۳۰) آنکھیں نہ جینے دیں گی تری بے وفا مجھے ‏ ‏ ‏ ‏ ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

ریاض خیر آبادی نے لکھا ہے کہ "صحیح ہو یا غلط" میں نے یہ شعر شمس (شاگرد آتش) کے نام سے سنا ہے (ریاض نمبر نگار ص۳۲) لیکن دیوانِ بحر (شاگرد ناسخ) مسمّیٰ بہ ریاض البحر مطبوعہ ۱۲۸۵ھ میں موجود ہے ص۲۵۷ اور ریاض کے استاد امیر مینائی نے بھی یہ شعر بحر ہی کی طرف منسوب کیا ہے (انتخاب یادگار ص۵۶)

(۳۱) توڑ بت زاہد نے کیوں مسجد یہ بتخانہ کیا ‏ ‏ ‏ ‏ تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

حسن ص۶۵ (گلزار مسرت ص۲۴) میں بنام میر اعلیٰ علی خلف میر ولایت اللہ، لیکن کلیات سید محمد خاں رند کے اس نسخے میں جو مصنف کی زندگی میں (۱۲۶۰ھ) میں طبع ہوا تھا بشکل ذیل میں موجود ہے:

توڑ بت مسجد بنی مسمار بت خانہ ہوا
جب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ ہوا ‏ ‏ ص۱۴۲

رند نے اپنی نثر میں جو دیوان اوّل کے بعد ہے، اعتراف کیا ہے کہ میں نے اوائل میں میر خلیق خلف میر حسن سے اصلاح لی تھی اور تذکرۂ حسن عجب نہیں کہ ان کی نظر سے گزرا ہو۔ چکبست کے مقدمۂ گلزارِ نسیم میں یہ حکایت درج ہے کہ ناسخ نے ایک مشاعرے میں نسیم لکھنوی کو مخاطب کرکے یہ مصرع "شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا" پڑھا اور بولے کہ دوسرا مصرع نہیں سوجھتا کہ شعر مکمل ہو جائے۔ ناسخ کی زبان سے یہ مصرع نکلا ہی تھا کہ نسیم نے یہ مصرع لگایا ـــ "تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا" حاضرین پھڑک اٹھے۔ ناسخ نے مذہبی چوٹ کی تھی، نسیم نے ٹھنڈا کر دیا، ص۲۵ گلزارِ نسیم مرتبہ چکبست کی اشاعت کے کچھ ہی بعد ریاض خیر آبادی نے لکھا تھا کہ (ا) یہ حکایت مصنوعی ہے، کہیں اور نہیں ملتی (ب) ناسخ و نسیم کے مرتبے میں بڑا فرق تھا۔ ناسخ انھیں قابلِ خطاب نہ سمجھتے ہوں گے (ج) ناسخ ایسے غیر مہذب نہ تھے کہ ایک ہندو اور "پھر محبوب ہندو" (؟) کو مخاطب کرکے ایسا دل شکن مصرع پڑھتے۔ (د) نسیم لاکھ حاضر جواب سہی مگر ناسخ کے سامنے ان کی زبان نہ کھلتی (ریاض نمبر ص۴۷) چکبست نے نہ پہلے یہ بتایا تھا کہ یہ حکایت انھیں کہاں سے ملی اور نہ جہاں تک میرا علم ہے انھوں نے ریاض کے اعتراض کے بعد اپنے ماخذ سے متعلق کسی قسم کی اطلاع دینے کی ضرورت محسوس کی۔ ریاض کا خیال ہے کہ وہ خود مخترع ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے کسی سے سنی ہوگی۔ نسیم سے جو غلو تھا اس نے اس پر غور کرنے کا موقع نہ دیا کہ کتنی دور از قیاس ہے۔ اعلیٰ علی نے جس زمانے میں یہ شعر کہا تھا نسیم کیا ان کے استاد آتش بھی اس وقت پیدا نہ ہوئے ہوں گے۔

(۳۲) حسرت اے تازہ اسیرانِ قفس آتی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ دھوم سے فصلِ بہار اب کے برس آتی ہے

مہدی علی زکی کا مطلع ہے۔ اور مکمل غزل الشمول مطلع مخطوطۂ دیوان مملوکۂ جناب سید نادر آغا، تاجر کتب لکھنؤ میں موجود ہے (مکتوب جناب سید نادر آغا بنام راقم)۔ یہ ۱۲۵۰ھ کے بعد تذکرۂ شیفتہ میں شامل ہو کر (ص ۹۳) منظرِ عام پر بھی آ چکا تھا۔ لیکن سید محمد خاں رند کے دیوان ۲ ص ۲۰۹ (صرف یہی اس زمین کا کوئی اور شعر نہیں) میں مرقوم ہے۔ رند نے اپنی نثر (رجوع بہ ۱۳) میں لکھا ہے کہ دیوان ۱ میں رجب ۱۲۵۰ھ تک کا کلام ہے، دیوان ۲ سے متعلق اس قسم کی صراحت نہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس میں اس کے بعد کے اشعار رہے ہوں گے۔

(۴۳) اے جان لب پہ آ کے ٹھہرنے سے فائدہ — رہنا ہوا تو رہ گئے چلنا ہوا چلے

کلیاتِ حسرتی و شیفتہ ص ۱۰۵ میں موجود ہے اور شیفتہ نے اپنے تذکرے میں بھی اسے اپنے نام سے لکھا ہے ص ۱۲۳، لیکن دیوانِ رند ص ۱۲۲ میں بھی ہے۔ رند کو اعلیٰ علی، زکی اور شیفتہ سے توارد ہوا ہے، یا یہ سرقے کے مرتکب ہوئے ہیں، اس کا فیصلہ دشوار ہے۔

(۴۴) کیا بسیج ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں — جل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

مراۃ الغیب، دیوان امیر مینائی پہلی بار ۱۲۹۰ھ میں چھپا تھا۔ مطلع ہٰذا اس میں شامل ہے (طبع ۱۳۰۹ھ ص ۲۱۶) اور رشاد لکھنوی کے دیوان ۲ سخنِ بے مثال میں جو مصنف کی وفات کے بعد طبع ہوا ہے، یہ مطلع ملتا ہے:

کیا بسیج ہیں کب کروٹیں لے کر سنبھلتے ہیں
جل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں ص ۶۱

(۴۵) تجھ بن تو غم سے فرصت ایک ذرا بھی ہات نہیں — دامن سے منہ ڈھانکے رہنا رونا پھر اں بات نہیں

افسوس کا مطلع ہے (دیوان م و ۱۷۵ عشقی)، لیکن قاسم ص ۲۲۴ میں ان کے شاگرد حیران کے نام سے ہے۔

(۴۶) کیا ہوا اور صاحب کا دل بھری محفل میں کم کیجے — ابھی سب تاڑ جاویں گے نہ اتنا تو ستم کیجے

انشا کا مطلع ہے (کلام انشا ص ۲۰۶)

(۴۷) خدا سے تاک تو او شیریں خبر لے اس بچارے کی — کیا فرہاد نے تیشے سے سر لہو لہان اپنا

تحفۃ الشعرا میں بنام ظہر (حاشیہ چمنستان شعرا ص ۲۵۳) لیکن در اصل انندرام مخلص کا ہے اور انتخاب دیوان کے اس نسخے میں جو خود مخلص کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے موجود ہے۔ اس پر راقم کا ایک مقالہ نوائے ادب میں طبع ہو چکا ہے۔

(۴۸) بروز حشر الٰہی چو نامۂ عملم — کنند باز کہ آں روز باز خواہ من است
مکن مقابلہ آں را ز سرنوشت ازل — اگر زیادہ و کم باشد آں گناہ من است

کلیات غالب اور سبد چیں طا میں یہ قطعہ نہیں ہے اور جہاں تک میرا علم ہے غالب کے دوران حیات میں کبھی یہ ان کے نام سے شائع نہیں ہوا۔ لیکن سید غوث علی شاہ (متوفی ۱۲۹۷ھ) کے ایک مرید نے غالب اور اپنے پیر دونوں کی وفات کے بعد تذکرۂ غوثیہ میں شاہ صاحب کی زبانی یہ لکھا ہے کہ یہ ان دو قطعوں میں سے ایک ہے جو غالب نے اپنے نام سے سنائے تھے۔ جناب مالک رام نے سبد چیں طـ۲ میں اسے کتاب مذکور کے حوالے سے شامل کر لیا ہے ص ۶۴۔ لیکن جناب ڈاکٹر محمد اسحٰق

نے اپنی انگریزی کتاب "چار سمر بر آوردہ شاعرات ایران" میں بحوالۂ "تذکرۃ الخواتین" اسے چندا (ماہ لقا) حیدر آبادی سے منسوب کیا ہے ص۵۱۔ فیصلہ کن بات ممکن ہے کہ تذکرۃ الخواتین کا ماخذ معلوم ہونے کے بعد کہی جا سکے۔

(۳۹) جو کوئی کہ آفت نہانی مانگے — اور ملک عدم کی کچھ نشانی مانگے
دکھلادے اسے تو اپنی یہ تیغ نگاہ — جس کا مارا کبھی نہ پانی مانگے

ہندی ص۲۰ و قاسم ۲ ص۱۴۹ میں بنام مرزا علی لطف۔ لیکن گلزار عشقی میں بہ تبدیل بعض الفاظ اولیا موہانی کے نام سے ہے۔

(۴۰) خدا کسی کو گرفتِ زلف کا نہ کرے — نصیب میں کسی کافر کے یہ بلا نہ کرے

سنتوکھ رائے بیتاب کا مطلع ہے (قائم ص۷۷، حسن ص۶۵) لیکن قاسم ا ص۱۲۸ میں اسی تخلص کے ایک دوسرے شاعر محمد اسمعیل سے منسوب ہے۔

(۴۱) آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا — کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

سودا کا مطلع ہے (کلیات ص۲۴۴) اور قائم نے اپنے تذکرے میں اپنے استاد کے جو اشعار دئے ہیں ان کا آغاز اسی سے ہوتا ہے (ص۳۶) لیکن شفیق نے خود قائم کو اس کا مصنف لکھا ہے ص۵۔

(۴۲) ہیں کہاں تو کہاں یہ کہتے ہیں — کہ یہ آپس میں دونوں رہتے ہیں

اثر کا مطلع ہے (دیوان ص۲۵، حسن ص۴۸، قاسم ا ص۴۵) لیکن مصنف مسرت نے اسے ان کے بھتیجے صاحب میر الم کے نام سے لکھا ہے ص۱۶۔ اس کا یہ بیان کہ یہ ان اشعار میں سے ہے جو مجھے خود الم سے ملے تھے، صحیح ہے تو یہ سرقہ ہے۔

(۴۳) مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہووے گا — مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

میر کا مطلع ہے (کلیات ص۵، نکات ص۱۵۶، قائم ص۱۴۱، حسن ص۱۰۵، گلزار) لیکن آب ص۱۲۲ میں آرزو کے نام سے ہے۔

(۴۴) کوئی نہیں کہ یار کی لادے خبر مجھے — اے سیلِ اشک تو ہی بہادے ادھر مجھے

میر حسن کا مطلع ہے، جو کلیات کے متعدد نسخوں (از آنجملہ نسخہ م و ۲۸۲) میں ملتا ہے لیکن گلزار عشقی میں حسن غیر حسن مذکور کے نام سے ہے اور قاسم ا ص۲۵ میں شوکت برادر سبقت سے منسوب ہے۔ بدیہہ گوئی مصنفہ ہوش بلگرامی میں عماد الملک بلگرامی کی زبانی مرقوم ہے کہ پہلا مصرع آصف الدولہ کا ہے، اس نے اعلان کیا تھا کہ مصرع لگانے والے کو ہزار روپے ملیں گے۔ ایک شہدے نے دوسرا مصرع کہہ کے انعام حاصل کیا۔ ص۶۱

(۴۵) نکہتِ گل نے جگایا کسے زنداں کے بیچ — پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

محتشم علی خاں حشمت کا مطلع ہے (نکات ص۴۳، قائم ص۲۷، حسن ص۷۹ وغیرہ) مگر قاسم ا ص۲۱۲ میں بنام محمد علی خاں حشمت۔ آسی مرحوم نے "دو نایاب زمانہ بیاضیں اور ان کا انتخاب" ص۵۶ میں لکھا ہے کہ مصحفی کے یہاں یہ مؤخر الذکر حشمت کے نام سے ہے۔ یہ صحیح نہیں، مصحفی بھی اس معاملے میں میر و قائم کے ہمنوا ہیں (ہندی ص۶۲)

(۴۶) وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں   اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں
آئے تھے کیوں عدم سے کیا کر چلے جہاں میں   یہ مرگ و زیست دونوں آپس میں ہنستیاں ہیں

حسن ص۱۲۶ و گلزار مسرت ص۱۱۵ میں بنام فتح علی شیدا، شاگرد سودا۔ لیکن شعرا گلدستۂ نشاط مؤلفہ منولال (ط کلکتہ) میں ہیبنگا شیدا کے نام سے ہے۔ اور آب ص۱۳۳ میں سودا کو اس کا مصنف لکھا ہے۔ پوری غزل بشمول ہر دو شعر کلیات سودا ص۱۰۹ میں بھی ہے۔ مگر معتبر نسخے اس سے خالی ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ غزل شیدائے مقدم الذکر کی ہے۔

(۴۷) وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا   کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا
ابھی دل کو لے کر گیا میرے آہ   وہ چلتا رہا میں پکارا کیا
قمارِ محبت میں بازی سدا   وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا
کیا قتل اور جان بخشی بھی کی   حسن اس نے احسان دوبارہ کیا

آب ص۲۵۸ میں بنام میر حسن، صاحب سحر البیان، مگر آزاد کو یہ دعوےٰ نہیں کہ ان کا کلیات میری نظر سے گزرا ہے۔ بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ "اب نہیں ملتا" ص۲۵۷۔ یہ قریب بہ یقین ہے کہ آزاد نے یہ اشعار چمنِ بے نظیر سے لئے ہیں جو پہلی بار شورش ۵۷ء سے چند سال قبل چھپا تھا اور جسے دتاسی بربنائے غلط فہمی اپنی تاریخ ادبیاتِ ہندی و ہندوستانی جلد ۲ ص۳۵۶، ص۳۶۱ میں خود محمد حسین (آزاد) کی تالیف بتاتا ہے۔ اشعار زیرِ بحث کتاب مذکور میں زیرِ عنوان "حسن" (نسخۂ نولکشوری ص۱۱۴) موجود ہیں اور اس زمین کا کوئی اور شعر ان کے ساتھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اس تخلص کے متعدد شاعر گزرے ہیں تو محض عنوان اس کے لئے کافی نہیں کہ یہ اشعار میر حسن کی طرف منسوب کئے جائیں، بلکہ یہ بات کہ مقطع میں لفظ "بخشی" آیا ہے اور یہ شیفتہ ص۵۹ و طبقات ص۲۱۲ دونوں میں خواجہ حسن مودودی کے نام سے ہے، اس کے خلاف پڑتی ہے، مگر آزاد کو میر حسن کے اشعار کی ضرورت تھی اور خواجہ حسن سے کچھ مطلب نہ تھا۔ انہیں مقدم الذکر کے نام سے درجِ کتاب کرنے میں تامل نہ ہوا۔ مجھے یاد تھا کہ مکمل غزل مؤخر الذکر دیوان (نسخۂ سوسائٹی) میں موجود ہے۔ جناب شاہ مقبول احمد کے خط سے اس کی تصدیق ہو گئی۔

(۴۸) حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا   کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

مجھے یاد آتا ہے کہ حسرت موہانی نے اردوئے معلّٰی کے کسی شمارے (سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۳ء) میں لکھا تھا کہ مجھے اس مطلع میں بیخود بدایونی سے توارد ہوا ہے۔ انتخاب دیوانِ حسرت ط ۱۹۱۹ء ص۲ میں یہ موجود ہے لیکن جیسا کہ مجھے جناب ظہیر احمد صدیقی سے معلوم ہوا ہے مطبوعہ دیوانِ بیخود اس سے خالی ہے۔ توارد سے واقف ہو کر اس کی ملکیت سے باز آ گئے ہوں گے۔ براہِ کرم وہ اصحاب جن کی رسائی مجلدات اردوئے معلّٰی تک ہے مطلع فرمائیں کہ میرا بیان صحیح ہے یا غلط۔

(۴۹) کس سوچ میں ہو نسیم بولو   آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

نسیم لکھنوی کی ایک غزل کا مقطع ہے جو گلزارِ نسیم میں شامل ہے ص۳۸۔ لیکن آصفیہ ۳ ص۱۲۱ میں اس کی مسخ شدہ شکل میر سے منسوب ہے:

میر کس سوچ میں ہو بولو   آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

(۵۰) غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی　　　دِوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزرا

غزالو تم تو حاضر ہو کہو مجنوں کے ماتم میں　　　دِوانا مر گیا جس وقت ویرانے پہ کیا گزرا

تذکرۂ حسن (ص۱۷۳) میں ہے کہ رام نرائن موزوں نے جو فارسی گو تھے اور اردو بالکل نہیں کہتے تھے، یہ شعر اس وقت فی البدیہہ کہا تھا جب انھیں قتلِ سراج الدولہ کی خبر ملی تھی" ہمیں شعر "غزالاں ..... الخ" از و یادگار ماند" ("گزرا" ط ۲ کے مطابق "گذری" جو ط ا میں ہے صحیح نہیں) مسرت میں "غزالو ..... الخ" "از ویرانے" قیاسی تصحیح خطی نسخے میں "میخانے") ایک غیر معروف بنارسی شاعر میرزا ابراہیم مشتاق کے نام سے ہے (ص۲۲۵)

(۵۱) گلگیر نے کاٹ کر سرِ شمع　　　پروانے سے شب جلی کٹی کی

طوفان (ص۳) میں بنام مصحفی، لیکن دواوینِ مصحفی (نسخ پٹنہ) میں یہ شعر نہیں۔ میں نے کسی جگہ عرش خلف میر کے نام سے دیکھ کر جناب عابد رضا بیدار سے دریافت کیا کہ دیوانِ عرش ط لکھنؤ میں ہے یا نہیں۔ ان کا جواب اس مضمون کا آیا کہ دیوان میں ہے۔

(۵۲) حیرت میں ہوں کہ تیرے تئیں اے شبِ وصال　　　ظاہر میں دیکھتا ہوں کہ عالم ہے خواب کا

حواشی طوفان (ص۲۴) میں بحوالہ گلزارِ اردو، لیکن ہدایت کا شعر ہے (نکات ص۱۳۱، حسن ص۲۱۵)

(۵۳) کیست کہ پیغامِ من بشہر شروان برد　　　یک سخن از من بداں مرد سخندان برد

گوید خاقانیا ایں ہمہ آشوب چیست　　　نہ ہر کہ گوید دو بیت نسبت بخاقان برد

یہ اشعار جمال الدین عبدالرزاق اصفہانی کے ہیں جن میں اس نے اپنے معاصر خاقانی سے خطاب کیا ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اپنے مقالے "نکاتِ سخن" میں انھیں اسی کے نام سے لکھا تھا۔ لیکن اردو ادب کے مسرت نمبر (ص۹) میں خاقانی کے نام سے ہے۔ یہ ادارۂ اردو ادب کی اصلاحات ہے یا میرا سہوِ قلم، اس کے متعلق مسودے کی طرف رجوع کئے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا اور مسودہ دفترِ اردو ادب میں ہے۔

(۵۴) بس از شوقِ مرنا عشق کو بدنام کرتا ہے　　　خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

(۵۵) مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے　　　آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

"ہماری شاعری" مصنفہ جناب مسعود حسن رضوی ادیب (ط۱) میں شاد عظیم آبادی کے صرف یہی دو شعر ہیں اور پہلے کو انھوں نے سہواً شاد لکھنوی کی طرف منسوب کیا ہے (ص۱۱۶)۔ یہ کلامِ شاد، میخانۂ الہام (ص۳۴) دونوں میں ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ شاد عظیم آبادی کا ہے۔ دوسرا شعر بھی ان دونوں کتابوں میں (میخانہ ص۱۲۵) موجود ہے۔ مگر "ہماری شاعری" (ص۷) میں اس کے پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ کس کا ہے۔ میں نے معاصر (ص۱۳) میں جو اعتراض کیا تھا کہ اس کتاب میں شاد لکھنوی کے نام سے ہے محض بے جا تھا۔ اس کا مجھے سخت افسوس ہے اور میں جناب ادیب سے معذرت خواہ ہوں۔ ہوا یہ کہ یہ بات ذہن میں تھی کہ شاد عظیم آبادی کے دو شعروں میں سے ایک شاد لکھنوی کی طرف منسوب ہو گیا ہے، وقتِ تحریر پہلے کی جگہ دوسرا شعر قلم سے نکل گیا۔ تعجب اس پر ہے کہ نگار نمبر (ص۱۳) میں یہی غلط اعتراض جناب عطا نے بھی کیا ہے۔

(۵۶) تذکرۂ گردیزی کے مرتب جناب ڈاکٹر عبدالحق نے اس تذکرے کے شعرا کی جو فہرست دی ہے وہ اس پر مشعر ہے کہ اس میں پاکباز کے بعد قزلباش خاں کا ترجمہ ہے۔ حالانکہ اس میں تراجم کی ترتیب میں حروفِ تہجی کا التزاماً لحاظ کیا گیا ہے۔ تذکرے کے ص۲۶ میں زیرِ عنوان "پاکباز" عبارتِ نثر اور شعرِ ذیل درج ہے:

جلوے تمہارے حسن کے تو ہیں پہ ہم کہاں تم تو بجن ہمیشہ ہو افسوس ہم نہیں

اس کے معاً بعد ایک نیا عنوان "قزلباش خاں" ہے اور اس کے تحت ذیل کی نثر و نظم مرقوم ہے (ص۲۶ و ص۲۷)

"این شعر خوشگاہِ قزلباش خاں[1] مرحوم است :

قفس کے در کو باز اے بلبل اب صیاد کرتا ہے خدا جانے کرے گا ذبح یا آزاد کرتا ہے

این بیت[2] بنامِ دیگرے ہم مسموع شدہ :

مجھے درد و الم رہتا ہے نت گھبرے میاں صاحب خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں صاحب
جواب نہ میرے تو پھر انتظار میں میرے خدا خزاں نہ دکھائے بہار میں میرے
تمام عمر شرابیں پیا کئے ساقی ہزار حیف کہ اب انتظار میں میرے"

گردیزی نے پانچوں شعر پاکباز کے نام سے لکھے ہیں، لیکن مرتب نے انھیں اس طرح پیش کیا ہے کہ صرف ایک ان میں آیا ہے اور کے بچتے باقی قزلباش خاں کو مل گئے ہیں۔ شفیق نے کل اشعار گردیزی کے منشا کے مطابق پاکباز سے منسوب کئے ہیں ص۳۵ لیکن جناب عطا مرتب کے ہمنوا ہیں اور شعر ۳ کے متعلق رقمطراز ہیں کہ متفقہ طور پر پاکباز کا سمجھا جاتا ہے لیکن گردیزی نے اسے پاکباز کے نام لکھ کر مشکوک بنا دیا ہے (نگار دسمبر ص۳۰) یہ نکات ص۸، قائم ص۴۵ اور مسرت ص۱۳ میں پاکباز کے نام سے ہے لیکن گلزار ارم میں صلاح الدین پاکباز کی جگہ صلاح الدین بیتاب ہے۔ اس نام و تخلص کا کوئی شاعر اس زمانے میں نہیں گزرا۔ "بیتاب" کتابت کی غلطی ہو تو عجب نہیں۔ صاحبِ مسرت نے شعر ۳ کو پاکباز کی طرف منسوب کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "مؤلف ..... بنام شخصے دیگر این قسم شنیدہ: "فراق کیا ہے یا وصل یار میں میرے خدا الخ" شاید شاعر برائے حسنِ مصرع تبدیل نمودہ یا توارد او داد ہ، واللہ اعلم۔" ص۳۲۔ یہ تبدیل شدہ شعر بیاض کوا تذ صغیر ص۱۰ میں آصف الدولہ کے نام سے ہے مگر اس کا دیوان (سوسائٹی) اس سے خالی ہے۔

(۵۷) کسی نے روم لی قسمت میں کوئی شام سے آیا نہیں کچھ یدرے نہ آیا ایک تیرا نام لے آیا

مصحفی نے ہندی ص۱۰۶ میں مہربان خاں رند کو "جاہل" کہا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کا "مخرجِ زبان" تک درست نہ تھا۔ قائم کا قول ہے کہ پہلے میر سوز وغیرہ ان کے یہاں پہنچے، اس کے بعد سودا کا فرخ آباد جانا ہوا تو رند نے انھیں اپنے رفقا میں داخل کر لیا۔ ص۵۰ حسن (ص۱۰۶) اور صاحبِ گلزار نے انھیں سوز و سودا کا شاگرد لکھا ہے لیکن حسن کا بیان ہے کہ "اکثر

---

[1] میرے نزدیک اس عبارت کا تعلق "قفس ..... الخ" سے ہے مگر اس کا امکان ہے کہ "جلوے ..... الخ" سے ہو۔

[2] یہ عبارت میری رائے میں "مجھے درد و الم ..... الخ" سے تعلق رکھتی ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ "قفس ..... الخ" سے متعلق ہو۔

اشعار سوز و سودا اور دیوان مہربان خاں یافتہ مے شود، ازیں جہت اشعار او را قلمی نکردم آنچہ دو سہ نوشتم بر آں اکتفا کردم" ص۱۲۱۔ شوق کہتے ہیں کہ "اکثر غزلیات مضبوط و مربوط او را بہ مرزا رفیع (سودا) و میر سوز وغیرہ نسبت میکنند خداوند کہ در واقع از کیست" قاسم نے ترجمۂ رند میں ایک غزل کے متعلق لکھا ہے: "ایں غزل در کلیات سودا ایں عاصی دیدہ و بسیار ناپسندیدہ" واص۲۷۶ "ناصر کا قول ہے کہ "رند کا دیوان مؤلف کی نظر سے گزرا ہے۔ مگر اکثر وہی غزلیں سوز کے دیوان میں موجود اور نام رند کا ان میں سے نابود۔ یہ نہ چاہیئے، جو چیز ہبہ بالعوض ہو اس کا دعوے انصاف سے بعید ہے"۔

شعر زیر بحث قائم نے رند کے نام سے لکھا ہے اور دیوانِ رند (سوسائٹی) میں اس زمین کے اور اشعار کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن شوق اسے رند کے ان اشعار میں شمار کرتے ہیں جنھیں لوگ سودا یا سوز کی ملک سمجھتے ہیں۔ مطبوعہ کلیات سودا ص۲۱۶ میں یہ شعر ملحقات تحت تنہا ہے۔ اس زمین کے اور اشعار اس کے ساتھ نہیں۔ حسن ص۱۱۱ میں سوز سے منسوب ہے اور مکمل غزل دیوانِ سوز (نسخہ محمود) نسخہ گواتھہ و نسخہ جناب علی حیدر میں شامل ہے۔

میرا خیال ہے کہ رند یا تو شاعر تھے ہی نہیں یا محض برائے نام شعر کہتے تھے "کسی نے روم ۔۔۔ الخ" اور اس زمین کے اور اشعار در اصل سوز کے ہیں جو زمانۂ ملازمت میں انھوں نے رند کو دیئے تھے۔ مگر انقطاع تعلقات کے بعد خود اپنے دیوان میں داخل کر لئے۔ سودا کا اس سے کچھ سروکار نہیں، کلیات کے معتبر خطی نسخے اس سے خالی ہیں۔

(۵۸) صحبتِ وعظ تو تا دیر رہے گی واعظ — یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

نظم طباطبائی کی شرح دیوانِ غالب (اناظر بک ایجنسی ص۵۹) میں یہ شعر اسی طرح مرقوم ہے لیکن نظم نے اس کے مصنف کا نام نہیں بتایا۔ میں نے جہانِ غالب، معاصر ۲ جنوری ۵۲ء میں لکھا تھا:

" اس دعوے کے ثبوت میں کہ باقر "وجدان صحیح" رکھتے تھے، مقدمہ نگار (خلف باقر) نے شاہ ظہور الحق مرحوم کی زبانی یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ کسی نے باقر کے سامنے یہ شعر پڑھا ؎

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی غالب
پاس ہی میخانہ ہے پی کے چلے آتے ہیں

انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ اسی دن خط لکھ کر حقیقت دریافت کی۔ غالب کا جواب جو بقول مقدمہ نگار شاہ ۔۔۔ مرحوم کو لفظ بہ لفظ یاد تھا یہ ہے: "اگر یہ شعر میرا ہو تو مجھ پر ایک ہزار لعنت، ورنہ جس نے اس کو بغلط میری جانب منسوب کیا ہے اس پر دس ہزار لعنت۔ مجھ پر کیا شامت آئی تھی کہ پاس ہی مے خانہ ہوتے ہوئے مجلسِ وعظ میں جا بیٹھتا" ص۴۵۔ عبارت حاشیہ: "یہ شعر در اصل یوں ہے: مجلسِ وعظ ۔۔ قائم ——— یہ ہے ۔۔۔ آتے ہیں" اور کچھ لوگ اسے قائم کی تصنیف سمجھتے ہیں مگر نہ "قائم" لازماً بطور تخلص آیا ہے اور نہ یہ شعر دیوانِ قائم (انڈیا آفس) میں ہے۔ حکایت کے صحیح ہونے کا میں ضامن نہیں" ص۲

جناب عطا نے نگار اپریل میں اس شعر کا مصرع اول اسی طرح لکھا ہے جس طرح کہ حاشیہ معاصر میں ہے اور جناب اعجاز رسول خاں، مقدمہ نگار دیوان نوشاد کے اس قول کی تردید کرتے ہوئے کہ یہ میر کا طبعزاد ہے، کسی ثبوت کے بغیر قائم کو اس کا

---

[1] شوق کہتے ہیں کہ کلیات رند ۵۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے لیکن سوسائٹی کا نسخہ زیادہ ضخیم نہیں۔

مصنف قرار دیا ہے ص۳۴۔ انھوں نے نگار اکتوبر میں اس سے دوبارہ بحث کی ہے اور میری تحریر کا ذکر کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ "جب تک اس کا کوئی دوسرا دعوے دار پیدا نہ ہو قائم کا ہے" ص۴۳۔

مقدمۂ دیوانِ باقر میں مصرع ۲ کی جو شکل ہے اس میں ایک سے زیادہ سقم ہیں اور حکایت مرقومہ صحیح ہو یا غلط غالب کو اس شعر سے کچھ علاقہ نہیں۔ مقدمۂ دیوانِ نوشاد میری نظر سے نہیں گزرا۔ ظاہرا اس میں مصرع ۱ اسی طرح ہے جس طرح کہ حاشیۂ معاصر میں ہے اور میر کی طرف شعر کے انتساب کی کوئی سند اس میں نہیں۔ کلیاتِ میر اس سے خالی ہے اور جہاں تک میرا علم ہے مقدمہ نگار دیوانِ نوشاد میر سے منسوب کرنے میں منفرد ہیں۔ رہا قائم کا معاملہ تو یہ جیسا کہ حاشیۂ معاصر میں لکھا گیا تھا دیوانِ قائم میں نہیں اور شبلی سے قبل کسی نے اسے ان کے نام سے نہیں لکھا۔ شعر کی اس شکل کے بھی جو حاشیۂ معاصر میں ہے وہی ذمہ دار ہیں (شعر العجم ۲ ط ۱۹۱۰ء ص۲۹۵)۔ شعر کی اصلی شکل وہی ہے جو شرحِ دیوانِ غالب میں ہے اور مجھے اس کا علم نہیں کہ دراصل کس کا ہے۔

(۵۹) روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

"میر" ص۳۱ و ص۲۹۵ میں غیر مصرح شکل میں میر کے نام سے ہے اور مسرت ص۴۲د و گلزار میں جرأت اس کے مصنف بتلائے گئے ہیں۔ کلیاتِ میر و کلیاتِ جرأت م اس سے خالی ہیں۔ میر کا تو ذکر ہی نہیں، کلیاتِ جرأت کے دو نسخوں میں بھی نہ ملے تو ان کا بھی نہیں۔ عشقی نے اسے ثابت، انشا [illegible] سے منسوب کیا ہے۔

(۶۰) چھپا ہے مانگ تیں دل جا کے اب میں ڈھونڈوں کدھر
کہ آدھی رات اُدھر ہے اور آدھی رات اُدھر

یہ شعر کم از کم ۷ شاعروں کی طرف منسوب ہے۔ یہ امتیاز شاید ہی اردو کے کسی دوسرے شعر کو حاصل ہو۔ حسن نے اسے بدھ سنگھ قلندر کا طبع زاد بتایا ہے ص۴۲د۔ شوق کہتے ہیں کہ بیدار تخلص دیدار کا نتیجۂ فکر ہے۔ گلزار میں حمزہ علی رند کے نام سے ہے، قاسم (ا ص۳۲) اور غالباً ذکا بھی اسے اصغر علی اصغر مارہروی کی تصنیف سمجھتے ہیں۔ مصحفی کے نزدیک یہ سکندر کی ملک ہے۔ شیفتہ (مخطوطہ ص۱۹) اور باطن (نغمۂ عندلیب ص۲۵۷) کی رائے میں عماد الملک نظام کے ذہن کی پیداوار ہے اور نکات ص۳۰ و آصفیہ ۲ ص۳۰ کے مطابق فقیر کے رشحاتِ قلم سے ہے۔

دارا شکوہ کا دیوان

پروفیسر محمد علم الدین سالک

شہزادہ دارا شکوہ شاہ جہاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ماں باپ دونوں اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ممتاز محل کی پہلی دو اولادیں لڑکیاں تھیں۔ شاہ جہاں کو لڑکے کی خواہش تھی۔ وہ اس غرض کے لیے اکثر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے آستانہ مبارک پر حاضر ہوا کرتا تھا۔ آخر اس کی دعا قبول ہوئی اور دارا ۲۹ صفر المظفر ۱۰۲۴ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء کو اجمیر کے مقام پر پیدا ہوا اور غرۂ محرم ۱۰۷۰ھ کو بمقام دہلی قتل کیا گیا۔ ایک شاعر نے اس واقعہ کی عجیب و غریب تاریخ کہی ہے۔

عقل پائے ادب گرفت و گفت　　قتل دارا شکوہ شد تاریخ
۲　　۲ + ۱۰۶۷ = ۱۰۶۹ھ

دارا کی تعلیم و تربیت عام مغل شہزادوں کی طرح بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ اس زمانے کے مشہور اساتذہ اور علماء اس کی تعلیم و تربیت پر مقرر ہوئے۔ ان میں مولانا عبداللطیف سلطان پوری، ملا میرک اور شیخ ہروی کا ذکر دارا کے اساتذہ کی فہرست میں ملتا ہے۔

خطاطی اس زمانے میں ایک شاہانہ وصف سمجھا جاتا تھا۔ دارا کو نستعلیق کا مشہور عالم استاد ملا عبدالرشید دیلمی میسر آیا۔ اور اس نے اس فن میں خوب مہارت حاصل کی۔ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں دارا کی لکھی کتابیں اور وصلیاں آج بھی ملتی ہیں جن سے اس کے کمال فن کا پتہ چلتا ہے۔

فنون سپہ گری کے بغیر شہزادوں کی تعلیم مکمل نہ سمجھی جاتی تھی۔ دارا نے اس میں بھی کمال حاصل کیا۔ ساموگڑھ کا معرکہ دارا کی سپاہیانہ مہارت کا آئینہ دار ہے۔

بہرحال دارا نے اپنے دادا جہانگیر اور اپنے باپ شاہ جہاں کی سرپرستی میں رہ کر گوناگوں کمالات حاصل کیے۔ اور سے "شاہ بلند اقبال" کا خطاب ملا۔ طبیعت میں تصوف کا مذاق موجود تھا۔ اس پر تلاش حق کا جنون دماغ میں سما گیا۔ اس لیے اس کی نیف میں ایسی ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو اسلام کے نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہیں۔ گو بعض ارباب تصوف نے انہیں مختلف معنے پہنا کر سلام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ دارا کی آزاد روی، تلاش حق کا سودا اور ریاضت و عبادت سے کنارہ کشی

کی وجہ سے اس قسم کی باتوں کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔

دارا جب جوان ہوا تو تصنیف کا قلم اس کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ ۱۰۴۹ھ میں جب وہ عمر کی پچیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنی پہلی تصنیف دنیا کے سامنے پیش کی۔ یہ سفینۃ الاولیا تھی۔ جس میں اس نے چار سو گیارہ بزرگانِ دین کے حالات لکھے ہیں۔ اس کتاب میں وہ اپنے آپ کو حنفی اور قادری کہتا ہے۔ یہ کتاب ۲۷ رمضان ۱۰۴۹ھ کو مکمل ہوئی جس کے تھوڑا عرصہ بعد وہ ملا شاہ بدخشانی کے مریدوں میں شامل ہوا۔

اس کے تین برس بعد ۱۰۵۲ھ میں اس نے اپنی دوسری کتاب سکینۃ الاولیا لکھی جس میں دارا نے بڑے مزے لے لے کر حضرت میاں میر کے حالات بیان کیے ہیں وہ اکثر انہیں حضرت باری تعالے کہتا ہے اور حسنات العارفین میں اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے :-

"چوں ایشاں در کوہ ماسے نزدیکے قصبہ باری عزلت گزیں بودند من ایشاں را باری تعالیٰ می گفتم"

دارا کو صوفیا سے والہانہ عقیدت تھی۔ وہ اکثر صوفیا سے ہمہ اوست اور فنا کے مسائل پر خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ یہ خط و کتابت بے حد دلچسپ ہے۔ اس سے دارا کی ادیبانہ شان ظاہر ہوتی ہے۔ فنا کے مسئلے پر وہ سرمد کو لکھتا ہے

"پیر و مرشد من! ہر روز قصد ملازمت دارم۔ میسر نمی شود۔ اگر من منم ارادۂ من معطل چرا؟ و اگر نیستم چہ تقصیر مرا؟ قتل امام حسینؓ اگرچہ مشیت ایزد است پس یزید درمیان چیست؟ و اگر غیر مشیت است پس معنے "یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید" چیست؟ نبی مختارؐ بہ جنگ کفار می رفت شکست در اسلام می افتاد۔ علمائے ظاہر می گویند تعلیم صبر است۔ منتہی را تعلیم چہ درکار؟"

سرمد نے اس کا جواب ایک نہایت بلیغ شعر میں دیا۔

اے عزیز ؎

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم!
اِلّا حدیث دوست کہ تکرار می کنم

غرض دارا نے اپنے اشعار میں بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ شاعر تھا اور قادری تخلص کرتا تھا۔ ہر مغل شہزادے کی طرح شعر و سخن کا دلدادہ اور شعرا کا قدردان و مربی تھا۔ اچھے شعر کی داد دل کھول کر دیتا اور شاعر کو انعام سے مالا مال کرتا تھا۔ رضی مشہدی نے ایک دفعہ ایک غزل کہی۔ اس میں یہ شعر دارا کو بہت پسند آیا ؎

"تاک را سرسبز کن اے ابر نیساں در بہار
قطرہ تا مے تواند شد چرا گوہر شود!

دارا نے اس پر اسے ایک لاکھ روپیہ انعام دیا اور خود اس شعر کے جواب میں یوں کہا ؎

سلطنت سہل است خود را آشنائے فقر کن

قطرہ تا دریا توانہ شد چرا گوہر شود!

یہ موقعہ نہیں کہ دارا کی تمام تصانیف پر مفصل بحث کی جائے۔ سردست ہم اس کے دیوان کے ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ دارا کا دیوان نہایت مختصر ہے اور بہت کمیاب۔ اس وقت تک اس کے بہت کم نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو نسخے نامکمل اور دو نسخے جو بظاہر مکمل ہیں دیمک خوردہ ہیں۔ ایک دفعہ نگار کے فاضل مدیر نے یہ دعوے کیا تھا کہ دارا کا مکمل دیوان ان کے پاس موجود ہے اور وہ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر تقریباً چوتھائی صدی گزر چکی ہے۔ مگر دیوان ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیوان دارا کا نہیں کسی اور کا ہے۔ گو سرخوش کلمات الشعرا میں اور طاہر نصیرآبادی اپنے تذکرہ میں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دارا صاحب کا دیوان تھا۔ اس کی تائید رضا قلی ہدایت ریاض العارفین میں کرتا ہے۔ خود دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہے کہ یہ دیوان دارا شکوہ کا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک مقطع ہے ؎

چوں بدارائے خویش دل بسپرد
قادری نیز ہمین دارا شد

اس کے علاوہ دیوان میں بہت سے ایسے تاریخی شواہد ملتے ہیں۔ اور ایسی تاریخی شخصیتوں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ جو دارا سے متعلق تھیں اور جن پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

دیوان قادری اپنے دور کی فارسی شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ زبان صاف شستہ اور سادہ ہے۔ خیالات صوفیانہ ہیں۔ جنہیں دارا بڑی آسانی سے بیان کرتا ہے۔ انداز میں سرمستی پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیالات اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں۔ یہی اس کی زندگی ہے اور یہی اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔ وہ انہیں بڑی بے تکلفی کے ساتھ نظم و نثر میں ادا کرتا ہے۔ یہ خیالات زیادہ تر تصوف کے نہایت اہم ترین مسائل ہمہ اوست اور فنا کے متعلق ہیں۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر وحدۃ الوجود یا ہمہ اوست کے متعلق کہتا ہے ؎

ہر سو کہ نظر کنی ہمہ اوست
وجہ اللہ عیان ست دبرو را

پھر اسی مضمون کو یوں ادا کرتا ہے۔

گفت انا الحق و داد خود فتوے
دار گفت و کشید و خود را خود
در پس پردہ گفتگو می کرد
پردہ برداشت دید خود را خود

وہ اس مضمون کو بار بار بیان کرتا ہے۔ مگر سیر نہیں ہوتا۔ وہ ہر بار ایک نیا انداز اختیار کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو

خویشتن را جدا نمی دانم

یک خود را خدا نمی دانم
قطرہ را نسبتے کہ بابحر است
بیشتر زیں روا نمی دانم

فنا کے متعلق اس کی یہ غزل دیکھئے۔ کس سرمستی سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے ؎

ہمہ موجود در وجود ما   گنج مخفی ست ایں نمودِ ما
گرچہ در پردہ داشتم آواز   شد زنے ظاہر ایں سرودِ ما
ما ندیدیم ہیچ غیرِ خود   غیر نہ نمود در شہود ما
وہم فانی شود نہ ما فانی   ہست باقی ہمہ وجود ما
سر ما خم کہ شد بجانب ما   از پئے خویش شد سجود ما
خویشتن را گرفتہ بنشینیم   اے خوشا ہم چنیں قعود ما
فرق در قادری و قادر نیست
بین اطلاق شد قیود ما

ایک اور غزل میں وہ ہمہ اوست اور فنا کے مقامات پر بحث کرتا ہوا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں کہتا ہے ؎

یک وجود ہوست لامحدود   کہ بروں بود ز حد حدود
کرد خواہش بدیدن رخ خویش   چوں کہ بر حسن گنج مخفی بود
پس ز ہو عاشقی ہویدا شد   از ہمی خواست جملہ شد موجود
حسن خود بر سبیل تجلے دید   نام آں گل محمد فرمود
از محمدؐ ہزار گل بشگفت   یک در نام احمدؐ و محمودؐ
گفت معشوق خویش در ایں نام   شد کلید در خزانۂ جود
بعد ازاں غیرتش خدائی خواست   شد خدا در رسول گفت و شنود
خاص چار دست حرف ہا گوید   گشت قرآن خویش را بستود
چوں نظر کرد در صفاتِ خویش   شد رحیم و کریم در رب و دود
آسمان و زمیں بشد پیدا   چوں حباب از میاں دریا زود
گفت ز آواز خویش آں دریا   از ہماں موج و نقش روئے نمود
گرمی و شور عشق چوں افتاد   نام خود کرد شاہد و مشہود
آخر از عشق جملہ پیدا شد   ایں گرہا تمام عشق کشود
نقطہ مہر چوں تمام بشد   عبد در نام گشتہ شد معبود

قادری جملہ از تو پیدا شد
آنچہ بود است و ہست و خواہد بود

ملا کی تنگ نظری سے مخلوق ہمیشہ نالاں رہی ہے۔ دارا کے مذہبی اعتقادات پر بھی اکثر لے دے ہوتی رہی ہے اور اس میں ملا ہمیشہ سب سے آگے ہوتا تھا۔ دارا اس کا زخم خوردہ تھا۔ اس واسطے وہ ملا کے متعلق اپنے دلی جذبات کا اظہار یوں کرتا ہے ؎

بہشت آنجا کہ ملائے نباشد   ز ملا بحث و غوغائے نباشد
جہاں خالی شود از شور ملا   ز فتوی ہاش پروائے نباشد
در آں شہرے کہ ملا خانہ دارد   در آنجا ہیچ دانائے نباشد
مبیں اے قادری تو روئے ملا
مرد آنجا کہ شیدائے نباشد

پیری مریدی اور بیعت کے جواز و عدم جواز پر ہمیشہ بحثیں چلتی آ رہی ہیں۔ دارا نے اس کے جواب میں ایک غزل لکھی ہے جس کے چند شعر یہ ہیں:-

طعن کردی تو بر ارادت من   من ز طعن تو کے شوم دل گیر
من چگونہ مرید کس نشوم   از ارادت مرا سرشت خمیر
من مریدم بحضرت میراں   ہست دشنام پیش من بے پیر
کے ارادت کنی تو با پیرے   نگذارد ترا چو نفس شریر
مردم شہر ما چو بے پیراند
قادری ماند فاش از تقدیر

دیوان میں اس زمانے کے مشہور روحانی بزرگوں کی منقبت بھی پائی جاتی ہے۔ چونکہ دارا کا پیر طریقت کبھی لاہور اور کبھی کشمیر میں رہتا تھا۔ اس لیے پنجاب۔ لاہور اور کشمیر اس کی ارادت کے خاص مرکز تھے۔ وہ پنجاب کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہوتا ہے ؎

باز چوں جان و دلم بیتاب ہست   باز چوں چشماں من بیخواب ہست
عشق پنجابم نمودہ بے قرار   زاں کہ نقش دوست در پنجاب ہست
کعبہ من حضرت لاہور داں   سجدۂ من سوئے آں محراب ہست
قادری را کعبہ دارا پور شد
کاندراں بسیار فتح الباب ہست

دارا پور لاہور کا ایک مشہور محلہ تھا جہاں حضرت میاں میرؒ قیام پذیر تھے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آج کل آپ کا مزار اور نادرہ بانو بیگم کی قبر واقع ہے۔ دارا نے یہ محلہ اپنے دادا پیر کے نام سے آباد کیا تھا۔ ایک اور غزل میں وہ حضرت میاں میرؒ کی منقبت

کرتا ہوا کہتا ہے ؎

دل شدہ فارغ از ہمہ تدبیر   می شود آنچہ ہست در تقدیر
خطرہ اندر دلم نمی آید   خطرہا دور کرد میاں میرؒ

داراشکوہ کی عقیدت کا دوسرا مرکز ملا محمد شاہ عرف ملا شاہ بدخشی ہے۔ جب تک حضرت میاں میرؒ بقید حیات رہے ملا شاہ گرمیاں کشمیر میں اور سردیاں لاہور میں بسر کیا کرتے تھے۔ مگر جب حضرت میاں میرؒ ۱۰۴۵ھ میں فوت ہو گئے تو انہوں نے مستقل طور پر لاہور میں رہنا شروع کر دیا۔ جہاں آرا بیگم نے ان کے لیے ایک نہایت خوب صورت خانقاہ سری نگر میں تیار کرائی جہاں دارا اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ یہ خانقاہ کوہ ماراں کے دامن میں واقع تھی۔ اب بھی اس کے کھنڈرات وہاں پائے جاتے ہیں اسی مناسبت سے دارا یہ شعر ان کی منقبت میں اکثر پڑھا کرتا تھا ؎

کوہ ماراں بکمر لعل بدخشاں دارد
ایں چنیں بخت کجا تخت سلیماں دارد

ملا شاہ کی منقبت میں بھی دارا کے دیوان میں کئی غزلیں ملتی ہیں۔ ایک غزل ہے ؎

مرا بخشیدۂ ملک ہدایت   کہ آں ملک مرا نبود نہایت
دلم پروائے صد دشمن ندارم   مرا چوں شاہ دارد در حمایت
تو کردی بخشش شاہانہ اے شاہ   نہ کرد از اولیا دیگر عنایت
تو کردی قادری را خانہ آباد
سلامت بر سرش دارد خدایت

ایک اور غزل میں آپ کی منقبت کرتے ہوئے دارا کہتا ہے ؎

ذات او ہست ہیچ اہل اللہ   اہل توحید را اماں باشد
صورت جامع حقیقت شرع   شرع او را نگہباں باشد

ایک نہایت عمدہ غزل حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح میں بھی ہے۔ جس کے لفظ لفظ سے عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ بیان نہایت سادہ، انداز نہایت دل نشین ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

حضرت میراں خداوند جہاں   غوث جن انس و شاہ عارفاں
محیٔ دیں شیخ عبدالقادر ست   آں کہ او را عرش باشد آستاں
سید سادات فخر اولیا   شیر دیں شہباز اوج لامکاں
رہنمائے شاہراہ احمدی   دستگیر جملۂ درماندگاں !
ہر کجا پائے نہادی بر زمیں   فخر کردے آسماں زیں آستاں

خواجہ بہاؤالدین نقشبندی سلسلۂ نقشبندیہ کے بانی ہیں دارا کو ان سے بھی عقیدت تھی۔ دیوان میں دو غزلیں ان کی مدح میں

بھی موجود ہیں۔ ایک کا مطلع ہے ؎

قطب دنیا و دین بہاؤ الدین
نقشبند یقین بہاؤ الدین

شاہ جہانی دور کی ایک مشہور شخصیت حضرت ایشاںؒ بھی تھی۔ ان کا نام محمدؐ اور عرف خواجہ خاوند محمود تھا۔ کشمیر میں سلسلہ نقشبندیہ کو انہیں کی وجہ سے فروغ ہوا۔ بعض سیاسی حالات کی بنا پر انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا مستقل قیام لاہور میں رکھیں چنانچہ انہوں نے لاہور کے سب سے امیر اور دولت مند محلہ مغل پورہ میں اقامت اختیار کی اور یہیں اپنی مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث اور مفسر تھے۔ ۱۰۵۲ھ میں فوت ہو کر یہیں دفن ہوئے۔ دارا نے آپ کا مرثیہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا کے تعلقات آپ سے نہایت مخلصانہ تھے۔ مرثیے کے چند شعر یہ ہیں ؎

چوں نہاشد آسماں با چشم تر   چوں سفر فرمود شیخ بحر و بر
شیخ ہفت اقلیم طاؤس خرام   پیشوائے اولیار معتبر
آں محمد کز نمی آمد برون   اہل شرق و غرب را گردیدہ سر
روز و شب می گرد بر گرد حرم   کاں چناں گردش نیا آید از بشر
اولیا را مرگ می باشد حرام   لائحہ تو است چوں اندر خبر
دو ہزار و پنج و دو چوں رفت او   روز سہ شنبہ و پنج از صفر
قادری گریاں بماند از ہجر او
گرد از دارے بقائے چوں سفر

دیوان سے دارا کے مذہبی اعتقادات خاص کر توحید رسالت، ختم نبوت، حب اہل بیت اور خلفائے راشدین سے عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ توحید کے بارے میں اس کا خیال ہے ؎

ترک زنار کردہ ام زاں رو   تار وحدت نبود در زنار
قادری نیست ہیچ جز قادر   وحدہٗ لا الٰہ الّا ہوٗ!
متوجہ مشو بغیر خدا   رشتۂ ہست سبحہ و زنار

رسالت کے بارے میں اس کے خیالات ملاحظہ ہوں ؎

چند بازی تو بر شریعت خود   احمدؐ مرسل از خداست سوا

ختم نبوت کے متعلق کہتا ہے ؎

تو ہم نشین من شد دیگر بداد نالم   چوں خاتم النبیین بابا دعا صحبت

خلفائے راشدین کے بارے میں کہتا ہے ؎

نیست بیچارہ ہیچ کار درست

نیست چیزے چو چار یار درست
بہر بخت منی ہمیں باید
پایۂ چار استوار درست

پنجتن ؎

ذاتِ او ہست پنج اہل اللہ
اہل توحید را اماں باشد

دارا کو جس لاڈ پیار سے ماں باپ نے پالا۔ جس طرح اسے عزیز رکھا۔ اور ہر بات میں اس کی ناز برداری کی۔ اس سے اسے یہ وہم ہوگیا تھا کہ وہ اپنے تمام بھائیوں سے ممتاز ہے۔ چنانچہ دیوان میں اس کے متعلق جابجا اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان اشعار سے پورا پورا حظ اٹھانے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ہم یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ شاہجہاں اپنی جگہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کا جانشین دارا ہوگا۔ اس نے اسے "شاہ بلند اقبال" کا خطاب بھی عطا کیا۔ اسے چترشاہی اور دیگر لوازمات شاہی استعمال کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ اس واسطے دارا اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے ؎

قرنہا ہم چو فت آدری باید   قادری صاحب قرآن گشتہ

ہر چند کہ نیست سایہ از ذات خدا   بیک لحظہ سایۂ شہ غیر نما

دانم چوں بگویند مرا سایۂ حق   ترسم کہ ازیں در می آید حق را

بعض اشعار سے دارا کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ حُبِ زر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس واسطے کہتا ہے ؎

دستِ زر آلود بد بو می شود
جان زر آلود را احوال چیست

دارا کے خیال میں بنیادی سچائیاں ہر مذہب میں موجود ہیں۔ اس لیے وہ ہر مشرب کے لوگوں سے راہ و رسم رکھتا تھا۔ اور ان سے میل ملاپ بڑھاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ دنیا پر ظاہر کرتا تھا کہ اس کا مسلک صلح کل ہے اور اسے کسی مذہب اور کسی فرقے سے عداوت نہیں۔ اس کی وجہ فلسفہ ہمہ اوست ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

قادری دید تا ترا در کُل
صلح کل کرد از عناد گذشت

دارا رازداری پر بہت زور دیتا ہے۔ اور تلقین کرتا ہے کہ روحانی اور مادی دنیا میں کامیابی کا راز یہی ہے کہ اپنے اسرار کو چھپاؤ اور اگر کوئی راز دار بنانا چاہتے ہو تو اپنے دل کے سوا کسی کو راز دار نہ بناؤ ؎

رازِ خود را بغیرِ دل تو مگو   رازداری بغیرِ دل نہ بود

بعض بعض اشعار شریعت کے نقطۂ نظر سے کھٹکتے ہیں جن پر فقہا خوردہ گیری بھی کرتے رہے ہیں اور جو آخر میں اس کی تباہی کا باعث بنے مثلاً

کفر و دیں در رہش پویاں   وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

قادری گشت قادرِ مطلق   از پئے ہر فنا کمال بقاست

قادری زود عین قادر شد   چوں مدد کرد قادرِ بغداد

ہم محمدؐ توئی و ہم اللہ   ایں عنایت تراست . . . .

قادری راز قدرتِ کامل   قادرِ ذوالجلال ساز وے

یہ داراؔ کے دیوان کا ایک نہایت سرسری جائزہ ہے افسوس ہے کہ دیوان کا کوئی اچھا نسخہ میسر نہ آنے کی وجہ سے بعض اشعار نہ پڑھے جا سکے۔ بہرحال جو کچھ مل سکا اس سے دارا کی افتادِ طبیعت، اس کے ماحول اور اس کے اعتقادات کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس سے داراؔ کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اور وہ اسباب بھی سامنے آجاتے ہیں جن کی بنا پر اسے ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر دیوان کے ساتھ ساتھ دارا کی دیگر تصانیف کو بھی سامنے رکھا جائے تو دارا اور اس کے دور کی بڑی دلچسپ تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ ایسی تاریخ جس کے آئینے میں اس دور کے مسلمانوں کی خوبیوں اور کمزوریوں کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور ان عوامل کا سراغ بھی مل سکتا ہے جو مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کے آناً فاناً زوال کا باعث بنے۔

غالبؔ کی مقبولیت کے اسباب

شیخ محمد اکرام

کلامِ غالبؔ کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے۔ مرزا کی شاعری زیادہ تر عشق و محبت کا بیان ہے لیکن دقیق اور پیچیدہ خیالات کے طالب کے لیے یہاں معنی آفرینی اور نازک خیالی کے وہ نمونے ہیں جو دیوانِ غنی میں بھی مشکل سے ملیں گے۔ شگفتہ طبع لوگوں کے لیے شوخی و ظرافت ہے اور انسانی فطرت کی داستان سننا ہو تو یہاں وہ پتے کی باتیں ہیں کہ جوں جوں چشمِ بصیرت کھلتی جائے گی ان کا لطف بڑھتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانِ غالبؔ میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے۔

اس ساز میں بے شمار نغمے ہیں اور ہر نغمہ دل آویز ہے۔ اس دل آویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلامِ غالبؔ سنی سنائی باتوں کا بیان نہیں بلکہ قلبِ غالبؔ کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس رباب پر دستِ قدرت نے سارے سُر ایک ایک کر کے بجائے ہیں اور دیوانِ غالبؔ انہی سُروں کی صدائے بازگشت ہے ؎

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زنم
کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم

مسٹر والٹر رالے نے شیکسپیئر کے متعلق لکھا ہے: "وہ کمیاب ترین چیز تھا یعنی ایک پورا انسان۔" شیکسپیئر کے متعلق تو یہ رائے اس کی کتابوں کے مطالعے پر مبنی ہے لیکن جن گوناگوں تجربوں سے مرزا کو واسطہ پڑا تھا اگر ان کا مقابلہ شیکسپیئر کے حالات سے کریں تو مرزا کا پلہ شیکسپیئر سے ہلکا نہیں رہے گا۔ مرزا کی زندگی میں ان کے ایک مخالف نے ان کے متعلق طنزاً لکھا تھا: "آپ انتخابِ زماں میں یکۂ دوراں ہیں۔ جس طرف طبیعت آئی اس کی خاک اڑائی۔ چنانچہ دخترِ رز سے جو ناک لگائی تو وہ ظرف پیدا کیا کہ میخانۂ گردوں میں شرابِ شفق جامِ آفتاب بادۂ پیش کش لایا اور قمار بازی پر جو دھیان کیا تو وہ چھٹے جواری ہوئے کہ مہرِ بساط او بکھیڑے داؤں کھانے لگے۔" (گلستانِ بےخزاں)

لیکن یہ تصویر کا فقط ایک پہلو ہے۔ مرزا اگر مے خانے اور قمار خانے کی پوری طرح خاک چھان چکے تھے تو شرع اور تصوف کی منزلوں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ دہلی کے دو بڑے عالم فضلِ حق خیرآبادی اور مولانا صدرالدین ان کے عزیز دوست تھے اور جس نفاست سے صوفیانہ راز و نیاز کی باتیں ان کے اشعار میں ادا ہوئی ہیں اردو کے بہت تھوڑے شعرا کے کلام میں ملیں گی۔ وہ رنگ رلیوں میں پل کر جوان ہوئے تھے لیکن زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے ترکش کے سارے تیر ان پر چلائے اور اگر وہ بزمِ نشاط اور محفلِ عشرت میں اجنبی معلوم نہ ہوتے تھے تو دردمندوں کے مصائب بھی خوب سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میخوار ہو یا محتسب، شوخی اور ظرافت کا دلدادہ ہو

یا غمزدہ فلسفی ہو یا عاشق مزاج، ان سب کے لیے کلامِ غالب میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔

مرزا کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نئے طرز کے آدمی تھے اور ان کے خیالات کا جو اسلوب تھا آج زمانہ اس کی تائید کر رہا ہے۔ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ مرزا تقلید کے قائل نہ تھے، اپنی سمجھ پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ ان کی جدت پسندی نئے نئے مضامین اور نئی تشبیہیں تلاش کرنے تک محدود نہ تھی بلکہ لغت، شعر، انشا اور دوسری علمی و ادبی باتوں کے علاوہ وضع قطع اور لباس میں بھی وہ اپنے پیشروؤں اور معاصروں کی پیروی کرنا ضروری نہ سمجھتے اور ان پر آزادانہ نکتہ چینی کرتے تھے۔ جب کلکتہ میں ان کے اشعار پر یہ اعتراض ہوا کہ انھوں نے قتیل کے وضع کردہ اصولوں کا خیال نہیں رکھا تو انھوں نے بڑے جوش سے کہا تھا ؎

من ہمایم، مگس چرا باشم　　زلّہ بردارِ کس چرا باشم

یہ آزاد خیالی اور تقلید سے نفرت عمر بھر ان کی امتیازی خصوصیت رہی اور قومی خیالات کے موجودہ عبوری دور میں بھی یہی طرزِ عمل زیادہ مقبول ہے۔ اسی طرح مرزا نے اپنے دوستوں کی کتابوں پر جو تبصرے لکھے وہ عام طور پر اگرچہ بلند پایہ نہیں لیکن ان میں اور مغربی طرز کی تقاریظ میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ کتاب اور مصنف کی تعریف میں مبالغے سے پاک ہیں۔ اس کے علاوہ زبان اور محاورے پر مضمون اور خیال کو مقدم رکھنے کی جو خصوصیت کلامِ غالب میں موجود ہے مغربی شاعری کے اصولِ تنقید بھی اس کے حامی ہیں۔ مرزا نے اُردو مکتوب نویسی میں جو رنگ اختیار کیا وہ فارسی فنِ انشا کی نسبت انگریزی خطوط نویسی سے زیادہ قریب تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوتی ہے مرزا کے کلام اور اپنے خیالات میں دوسرے مشرقی شعرا کی نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک پاتی ہے۔

دورِ حاضر میں غالب کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ عام خیال کہ غالب کے معاصرین نے اس کی بالکل قدر نہ کی، واقعات کے غلط اندازہ پر مبنی ہے۔ اگر غالب کی شاعری اور نثر نگاری کی تدریجی تبدیلیوں اور ترقیوں کو ذہن میں رکھیں تو خیال آتا ہے کہ اگر غالب کے اردو کلام کو فوری مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تو اس کا بڑا سبب کلامِ غالب کے اصلاح طلب پہلو تھے۔ ایک مدت تک مرزا رنگِ بیدل پر فریفتہ رہے۔ پھر چند روز کے لیے سنبھلے تو اردو چھوڑ کر فارسی شاعری شروع کی اور ایک ایسے گلستان کی آبیاری کی جس میں عوام الناس کو بار نہ تھا۔ فارسی نثر نگاری میں غالب نے ان اساتذہ کی پیروی کی جن کی پُرتصنع اور باتکلف نثر، بیدل کی مصنوعی شعریت کا جواب تھی۔ اگر معاصرینِ غالب نے ان چیزوں کو سر آنکھوں پر نہ رکھا اور انھیں قبولِ عام کی سند نہ ملی تو ہمیں حیران نہ ہونا چاہیے کیونکہ انھیں تو اب بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں اور اگر تمام حالات کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ بعض اہم امور میں زمانہ غالب کی نہیں بلکہ معاصرینِ غالب کی تائید کر رہا ہے۔

عوام الناس مرزا کا یہ مصرع

ع　شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں کہ مرزا کا وہی کلام آج الہامی سمجھا جاتا ہے جس کے متعلق ان کے معاصرین کہتے تھے ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہ رُباعی حکیم آغا جان عیش کی ہے جو شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے لیکن شعر فہمی میں ان کا وہ مرتبہ نہ تھا جو اس رباعی سے اختلاف رکھنے والے کئی دوسرے معاصرین (مثلاً نواب مصطفیٰ خان شیفتہ) کو حاصل تھا اور آخر یہ رباعی اسی منتخب دیوان کے متعلق نہیں جس کو سب شعر فہم حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔ اس میں جن اشعار کے دقیق ہونے کی شکایت ہے انھیں خود مرزا نے مطبوعہ دیوان میں شائع کرنے کے قابل نہ سمجھا اور لکھا کہ منتخب دیوان سے باہر میرے جو اشعار ملیں انھیں میرا نہ سمجھا جائے۔ اگر مرزا کی اس تحریر کے بعد بھی اس مسئلہ میں اختلاف کی کوئی گنجائش تھی تو اس کا جواب نسخہ حمیدیہ ہے جس میں خارج شدہ اشعار شائع ہوئے ہیں اور جنھیں دیکھ کر یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ مرزا کے معاصرین نے اگر ان اشعار کو الہامی نہ سمجھا تو ان پر کفر کا فتویٰ عائد نہیں ہوتا بلکہ اُردو ادب ان کا ممنون ہے کہ انھوں نے تنقید اور تمسخر سے مرزا کو سُرخ و سپید خزف ریزوں کے جمع کرنے سے روکا اور ان کی توجہ اس بحرِ شعر و سخن کی طرف کھینچی جس میں غوّاصی کا صلہ وہ بیش بہا موتی ہیں جو اُردو ادب کے لیے مایۂ ناز ہیں۔

موجودہ نسل کو پرانی طرز کے غزل گو شعرا میں سے غالب سب سے زیادہ پسند ہے لیکن جن لوگوں نے فنِ تنقید کے عام اصولوں سے گزر کر جزوی اور فروعی امور میں بھی مغربی شاعری کی تقلید کو شاعری کی معراج سمجھا ہے۔ انھوں نے غالب کے کلام پر کئی اعتراض کیے ہیں۔ بالعموم یہ اعتراض خاص غالب کے متعلق نہیں بلکہ تمام مشرقی شاعری پر کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ غالب نے بیشتر غزلیں لکھیں اور غزل شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ایک ناقص ذریعہ ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ غزل کے اشعار میں ربط، ردیف اور قافیے کی وجہ سے ہوتا ہے، مضمون کی وحدت سے نہیں اور غالب کی اکثر غزلیں الگ الگ اشعار کے گلدستے ہیں اور ایک وجدانی کیفیت کے مسلسل اظہار کے بجائے مضمون آفرینی اور خیال آرائی کے لیے وقف ہیں لیکن آخر یہ غالب کی بدقسمتی تھی کہ جب اس نے شعر گوئی شروع کی تو غزل کے علاوہ اور کوئی صنفِ شاعری مقبول نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس امر کا اعتراف نہ کرنا بھی بے انصافی ہے کہ غالب کے دیوان میں مسلسل غزلیات اور قطعہ بند اشعار کی جو کثرت ہے وہ کسی اور اُردو شاعر کے کلام میں شاید ہی ہوگی اور اس کی بہترین غزلوں میں کچھ قافیہ ردیف کی ہم آہنگی سے اور کچھ شاعر کی اپنی شخصیت کے پرتو سے ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جس میں مختلف اشعار کی انفرادیت کھپ گئی ہے اور کوئی تال بے سُر معلوم نہیں ہوتی۔

غزل پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں معنوی وحدت تو کوئی ہوتی نہیں اس لیے غزل گو شعرا اپنے سامنے چند قافیے رکھ لیتے ہیں اور اس کے مطابق اس وقت جو مضمون ذہن میں آئے اسے نظم کر کے غزل مکمل کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو شعر میں آمد ہوتی ہے اور غزل میں شاعر کے ذاتی نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ خیال کسی اور غزل گو شاعر کے متعلق صحیح ہو لیکن کم از کم مرزا اس سے مستثنیٰ ہیں۔ انھوں نے خود ایک خط میں بڑے زور سے اس خیال کی تردید کی ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

> "کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بچپن سے جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش رکھ لیے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل قصیدہ لکھنے لگا۔"

ایک اور خط میں غزل کے لیے عشق و محبت اور معشوق کی ضرورت کے متعلق لکھا ہے:

"شعر کیا کہوں گا، غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے، رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے۔ ہائے انوری گویا میری زبان سے کہتا ہے ؎

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل"

قطع نظر اس امر سے کہ مرزا قافیہ پیمائی سے خود متنفر تھے۔ ان کے کلام سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان کی غزل گوئی ان کی اپنی دلفریب شخصیت کا اظہار ہے۔ ایک شاعر کے خیالات میں بھی عام انسانوں کی طرح تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے اور اگر آج ایک بات کا ایک پہلو نظر آتا ہے تو کل دوسرا۔ چنانچہ دیوانِ غالب میں بھی یہ تنوع موجود ہے لیکن اس میں مشکل سے کوئی شعر ایسا ملے گا جسے غالب کی اس عظیم اور متنوع شخصیت سے منسوب نہ کیا جا سکے جس سے ہم یادگارِ غالب اور اردوئے معلّٰی کی بدولت خوب واقف ہیں۔ مرزا غالب کا زاویۂ نگاہ عام لوگوں سے کئی باتوں میں مختلف تھا اور ان کے زاویۂ نگاہ میں انہی اشعار کی ترجمانی ہوتی تھی۔ مرزا نے بہشت کا ذکر ہمیشہ استہزا سے کیا اور یہ ان کے شخصی نقطۂ نظر کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح فرہاد کا ذکر ان کے اشعار میں کئی جگہ آیا ہے اور سب جگہ طنزاً۔ مذہب کے متعلق ان کے بیسیوں اشعار ہیں اور ہر شعر ان کی وسعتِ نظر اور طبعی تشکک کا اظہار ہے اسی طرح رشک کے مضامین ہوں یا انسان کی فطری مجبوریوں کا ذکر، طرزِ اظہار کے اختلاف سے قطع نظر وہ مرزا ہی کے اسلوبِ خیال کو نمایاں کرتے ہیں اور بالعموم یہ خیال نہیں ہوتا کہ مرزا نے کوئی مضمون قافیے سے مجبور ہو کر باندھا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل ایک جامۂ موزوں ہے جو مرزا کی شخصیت پر راست آیا اور جس نے اس دلفریب شخصیت کو اور نمایاں کر دیا۔

پرانی طرز کے نقادوں نے مرزا کے کلام پر جو اعتراض کیے ہیں وہ یا تو زبان کے متعلق ہیں یا بقول سر واٹر رلے "بہی کھاتہ والوں کی نقادی" یعنی سرقہ اور توارد کی بحث۔ مرزا یاس اور مولانا آرگس (مولانا عبدالباری آسی ؟) نے محنت و تحقیق سے اساتذۂ قدیم کے کلام سے بعض شعرا ایسے ڈھونڈھ نکالے ہیں جن کے مضامین غالب کے اشعار سے ملتے جلتے ہیں۔ کسی زمانہ میں ملٹن کے اشعار کے متعلق بھی اسی طرح کا حساب کتاب ہوا کرتا تھا لیکن اس سے اس کی شہرت کو کوئی ضعف نہیں پہنچا کیونکہ ایک تو بقول گوئٹے "کائنات میں کوئی چیز بالکل نئی نہیں" اور دوسرے کسی شاعر کے چند اشعار میں توارد یا سرقہ ثابت کرنے سے اس کے باقی اشعار کی خوبیاں ضائع نہیں ہوتیں۔

آتش کی صوفیانہ شاعری

احتشام حسین

انگریزی، ہندی اور فارسی کی طرح اردو ادب میں بھی صوفیانہ شاعری کی ایک اہم روایت ملتی ہے۔ ولی، محمود بحری، سراج اورنگ آبادی، خواجہ میر درد، میر تقی میر، غالب، آتش، آسی غازی پوری اور اقبال اس سلسلہ کی مضبوط کڑیاں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک صوفیانہ اور روحانی تجربہ کے مختلف مدارج سے تعلق رکھتا ہے۔

تصوف حیات و کائنات کے سمجھنے کی صحیح کوشش ہے یا نہیں، اس بحث سے قطع نظر تصوف نے زندگی اور ادب میں ایسے رجحانات اور ایسی گہرائیاں ضرور پیدا ہوئیں جنہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ ادب کے ایک مخصوص دور میں تصوف شاعری میں اس طرح رس بس گیا کہ حقیقی اور مصنوعی جذبات اور حال و قال میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ شعراء جو عملاً صوفی تھے ان کا تو پوچھنا ہی کیا، جن کو تصوف سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا وہ بھی شیخ علی حزیں کے اس مقولہ پر عمل کرتے نظر آتے ہیں کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" چنانچہ اردو شعراء میں بھی دونوں طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ وہ واقعی اس وادی کے رہرو اور اس دریا کے شناور ہیں اور وہ جو مسائل تصوف کو دوسرے مضامین کی طرح ایک مضمون سمجھ کر شعر میں جگہ دیتے ہیں۔ دونوں حیثیتوں میں محض وہ فرق نہیں ہے جسے اظہار بیان کے نازک اختلاف سے واضح کیا جا سکے۔ بلکہ اس سے تصوف اور زندگی کے تعلق، روحانی و داخلی تجربے اور عملی انداز نظر کے اختلاف پر بھی روشنی پڑتی ہے اور حقیقی صوفیانہ شاعری، رسمی صوفیانہ خیال آرائی سے الگ ہوتی ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش صوفی شعراء میں گنے جاتے ہیں۔ اور ایسے صوفی شعراء میں جو محض قال کے شاعر نہ تھے بلکہ صاحب حال بھی تھے۔ وہ باقاعدہ صوفی نہ سہی لیکن ان کی زندگی اور شاعری پر نظر رکھ کر انہیں بڑے صوفی شعراء میں شمار کرنا ہی پڑے گا۔ وہ دہلی کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جہاں تصوف اور پیری مریدی کا زور تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں گھر کی وہ بہار نہیں دیکھی وہ وطن سے دور چڑھتے ہوئے سورج کے شہر فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ جہاں زندگی کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے انہیں آبائی مسلک کو خیرباد کہنا پڑا۔ بقول آزاد انہوں نے شاعری اختیار کی اور خاندانی طریقہ کو سلام کر کے ان میں سے فقط آزادی اور بے پروائی کو رفاقت میں لے لیا۔ آزاد کے یہ چند الفاظ آتش کی شخصیت اور مزاج اور ان کے تصوف کی نوعیت پر بہت اچھے تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تصوف کے اعلیٰ معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے آتش کو رومی، سنائی، عطار اور درد کی صف میں شمار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ چہ جائے کہ ان صوفی شعراء کا ہم پلہ قرار دینا جن کے اقوال اور ملفوظات سے تصوف کی تاریخ مرتب ہوئی ہے لیکن پھر بھی ان کی زندگی اور شاعری دونوں

میں تصوف کی روحِ صوفی کی وسعتِ نظر اور صفائے قلب، قناعت پسندی اور استغناء کے وہ جلوے نظر آتے ہیں کہ انہیں صوفی شعرا کی بزم میں جگہ دینا غلط نہ ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ باقاعدہ کسی صوفیانہ تحریک یا سلسلہ سے وابستہ نہ تھے۔ لیکن اپنی ذات سے ضرور صوفی تھے۔

اردو شاعری میں ابتدا ہی سے صوفیانہ خیالات ملتے ہیں۔ یہ ترکہ صرف فارسی شاعری سے نہیں بلکہ اس زندگی سے ملا تھا جو مذہب کے حدود کے اندر آزاد خیالی کا اور جاگیردارانہ تمدن کی تقسیم کے اندر عوام کی بہبودی کا تصور رکھتی تھی۔ اس میں ہندی تصوف کی آمیزش بھی نظر آتی ہے۔ دنیا کی تاریخ تصوف دیکھی جائے تو بہت سے خیالات میں یک رنگی اور یکسانی پائی جائے گی۔ حالانکہ ہر ملک میں اس کے ارتقاء کی نوعیت مختلف ہوگی۔ اسی وجہ سے بعض علماء کا خیال ہے کہ تصوف کا تعلق کسی مخصوص مذہب یا قوم سے نہیں بلکہ یہ زندگی کو سمجھنے اور کائنات کی حقیقت کا راز معلوم کرنے کی اس فطری خواہش کا نتیجہ ہے۔ جس سے کوئی دل خالی نہیں۔ لیکن اس راز کا معلوم کر لینا ہر شخص کے امکان میں بھی نہیں ہے۔ بقول آتش ؎

یہ کیفیت اسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں

ہر شخص، قوم اور ملک کی باطنی کرید مختلف نتائج برآمد کرتی ہے اور مختلف مسلک بن جاتے ہیں۔ بعض علماء نے اسے بالکل آریائی تصور روحانیت اور باطنیت قرار دیا ہے۔ بعض دوسرے مفکرین کا خیال ہے کہ اسلامی تصوف پر نو افلاطونی فلسفۂ اشراق کا گہرا اثر ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسری صدی ہجری سے اسلام پر یونان اور اسکندریہ کے فلسفیوں کا واضح اثر پڑنے لگا تھا اس لیے اگر مذہبی انتشار کے اس دور میں اشراقیت نے مسلمانوں کے عقیدۂ توحید کو متاثر کیا تو تعجب کی بات نہیں۔ پھر مسلمان صوفیوں اور مفکروں میں بہت سے ایسے ہیں جو اسے خاص اسلامی بتاتے ہیں۔ یہ علمی بحثیں ہیں۔ اور ان کے چھیڑنے کا یہ موقعہ نہیں تاہم اتنا کہنا ضروری ہے کہ اگر نقطۂ نظر کا اختلاف نہ ہوتا۔ اگر مختلف اثرات کی کارفرمائی نہ ہوتی اور تلاش حقیقت کا خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان نہ ہوتا تو خود صوفیوں کے اتنے مکتب خیال اور سلسلے نہ ہوتے۔ اس لیے ہندوستانی شاعری کے صوفیانہ خیالات میں، اگر اسلامی اثرات کے علاوہ ویدانتی اور اشراقیت جدیدہ کے عناصر بھی جھلک اٹھتے ہیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ مکاتبِ تصوف کی پیدائش میں عوامی تحریکوں کے اثرات کی جستجو بھی اس جگہ بے موقع ہوگی۔ کیونکہ آتش کا تصوف خود صوفیانہ تحریکوں کے زوال پذیر دور سے تعلق رکھتا ہے۔ آتش کی صوفیانہ شاعری کے سمجھنے میں تصوف کے کسی مخصوص سلسلہ کو پیش نظر رکھنا بھی مفید نہ ہوگا۔ بلکہ تصوف کی اس عام روح کو دیکھنا ہوگا جو مختلف مکاتب میں مشترک ہے۔

آتش کے صوفیانہ خیالات کی نمود سب سے زیادہ تو ان کی آزادگی پسندی، تصفیۂ قلب اور روحانی سرمستی میں ہوتی ہے جس سے ان کی شاعری بھری پڑی ہے۔ لیکن تصوف کے وہ مقامات بھی ان کے یہاں آتے ہیں جن کا تعلق معرفتِ نفس، فنائے خودی، وحدتِ وجود، ترکِ دنیا، مجاز و حقیقت، جبر و اختیار، ہستیٔ انسان کی بے ثباتی اور عظمت، ترکِ رسوم اور شوخیٔ تخیل سے ہے۔ یہی وہ کسوٹیاں ہیں جن پر آتش کا تصوف پرکھا جا سکتا ہے۔ اور انہیں اہم مسائل کی تشریح اور توضیح سے تصوف کے حدود معین کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک آتش کا تعلق ہے ان کا تصوف رسمی یا شاعرانہ نہیں تھا۔ بلکہ ان کی روح اور شخصیت، ان کے عقائد اور طرزِ معاشرت کا آئینہ تھا۔ ان کی قناعت پسند اور سادہ زندگی، بیباکی اور بے ریائی، احساسِ فروتنی اور جذبۂ عظمت سے ان کے اشعار مالا مال ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے صحیح مفہوم میں "مسائلِ تصوف"

نہیں ہیں۔ لیکن صوفی جس صفائے قلب اور تزکیۂ باطن پر زور دیتا ہے۔ اس کی اخلاقی مظہر یہی خصوصیتیں ہیں۔ آتشؔ کی شاعرانہ نشوونما لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدائی زمانے کو چھوڑ کر لکھنؤ کی شاعری میں تصوف کی بہت کمی نظر آتی ہے۔ اس کے اسباب تھے جن سے بحث یہاں ضروری نہیں۔ لیکن سب ہے یہ حقیقت کہ آتشؔ سے پہلے یہاں تصوف کا ذکر نہ صرف کم تھا بلکہ رسمی بھی نہ تھا۔ انہوں نے اپنی آزادہ روی، خلوص، استغنا، مستیٔ کردار اور رندانہ بانکپن سے تصورات کے خالی شیشوں میں تند و تیز شراب بھر دی اور خارجیت کی بے پناہ آندھی میں باطنی واردات کے چراغ جلائے۔

تصوف کا سب سے اہم مسئلہ معرفت خداوندی ہے۔ اور اس کے ہزاروں پہلو ہیں۔ مذہب اسلام نے بھی عقائد میں توحید کو پہلی جگہ دی ہے۔ لیکن صوفی کا وحدتِ وجود کا تصور توحید کے عام تصور سے بہت مختلف اور بہت پیچیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارا صوفیانہ نظام معرفت ہی کے گرد گھومتا ہے۔ الٰہیاتی تاویلات اور شاعرانہ نازک خیالیوں نے اور دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ سادہ الفاظ میں اسے کچھ یوں سمجھ سکتے ہیں، خدا ایک ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسے ایک کہنا بھی ٹھیک نہیں۔ خدا کے سوا کچھ اور نہیں ہے تو ہم کیا ہیں؟ کسی نے کہا ہم خدا ہیں، کسی نے کہا اس کا مظہر، کسی نے کہا اس کا ایک حصہ، روح اکبر کا پرتو، بحر حقیقت کا ایک قطرہ ——— یہی وجہ ہے کہ تصوف کے زیادہ تر مکاتب وجود انسانی کو خدا سے دوری اور ہجر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسی ذات میں مل جانے کو روحانیت کی معراج قرار دیتے ہیں۔

آتشؔ کے یہاں یہ مضمون مختلف اشاروں، تمثیلوں اور استعاروں میں والہانہ جوش کے ساتھ بیان ہوا ہے ؎

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا
تعلق روح سے مجھ کو جسد کا ناگوارا ہے
زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

اور اس قالبِ خاکی میں روح رہتی ہے
مکاں سے تنگ ہے مشتاق لامکاں ہوتا

آدمی کو موت کے آنے کی لازم ہے خوشی
عید ہے جس روز چھٹکارا ہوا محبوس کا

ان تمام اشعار میں ایک ہی ساز بج رہا ہے۔ خدا اصل ہے۔ اور انسان اس کا جزو۔ اس سے ملنے کے لیے بے قرار ہونا ہی حصولِ معرفت کا زینہ ہے۔ چنانچہ دوسرے صوفی شعراء کی طرح آتشؔ بھی بعض اوقات مذہب اور شریعت کی ظاہری قیدوں کو توڑ کر اس اصل حقیقت کی تلاش میں مجنوں بن جانا چاہتے ہیں۔ تاکہ کوئی اور چیز اپنی طرف مائل ہی نہ کر سکے۔ اس منزل پر پہنچ کر ظاہری رسوم مذہب، کعبہ و بت خانہ کے اختلافات بہت حقیر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اسے نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ دیوانگی مذہبی دیوانگی سے مختلف ہے۔ یہاں سارے مذہب کی سمائی ہے۔ اور وہاں اپنے مذہب کے سوا اور کسی کی نہیں۔ آتشؔ کے خیال میں قید مذہب کی گرفتاری سے چھٹنا ایسی دیوانگی ہے جو سب سے بڑی عقل مندی ہے ؎

قید مذہب کی گرفتاری سے چھٹ جاتا ہے
ہو نہ دیوانہ تو ہے عقل سے انساں خالی

کعبہ و دیر کے اختلاف کی حقیقت یوں بیان کی ہے ؎

کعبہ و دیر میں وہ خانہ بر انداز کہاں   گردش کافر و دین دار لیے پھرتی ہے

قول اپنا ہے یہ سبحہ و زنار کے لیے   دو پھندے ہیں یہ کافر و دیندار کے لیے

کوچۂ یار میں ہو روشنی اپنے دم کی   کعبہ و دیر کریں گبر و مسلماں آباد

کعبہ و دیر کے باہر اس سرزمین کی تلاش جہاں خدا کی تلاش گبر و مسلمان بن کر نہ کی جائے، صرف آزاد خیالی کی مظہر نہیں ہے بلکہ شریعت کی حدوں کے باہر نکل کر معرفت اور حقیقت کا بھید معلوم کرنے کی آرزو ہے۔ کعبہ اور بت خانہ کی حد بندی نے نگاہوں کی وسعت چھین لی ہے۔ ایسے میں اس روح کائنات کی جستجو جو ہر کافر و دین دار کی جان ہے۔ شریعت کی حدوں میں رہ کر نہیں کی جا سکتی ؎

تیرے کوچے کا ہے اے خانہ خراب افسانہ آج
شیخ کعبہ چھوڑتا ہے برہمن بت خانہ آج

اس جگہ تفصیلی بحث کا موقعہ نہیں۔ ورنہ یہ دیکھنا مشکل نہیں کہ آتش کے یہاں شریعت اور طریقت کی وہ جنگ نہیں ہے جو اکثر صوفی شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ اور دونوں میں زبردست خلیج حائل ہوتی نظر آتی ہے۔ آتش کے یہاں مذہبی جذبات اور خیالات بھی بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ مذہب سے زیادہ دور نہیں جانا چاہتے۔ ہاں ان کے یہاں تنگ نظری باقی نہیں رہتی ؎

ناقوس میں سے آئی صدائے ہو الغفور   ہم بتکدے سے گئے جو خدا سے ڈرے ہوئے

کرتے ہیں سجدہ اسکی طرف کیا سمجھ کے لوگ   کعبہ ہے نام ایک کنشت خراب کا

مختصر یہ کہ آتش خدا کی جستجو اور عرفان حق کی تلاش میں چل پڑنا چاہتے ہیں۔ اور جدھر سے اس کی آواز سنائی دے اس کی جھلک دکھائی پڑے ادھر ہی مڑ جاتے ہیں ؎

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی
ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی

یہی مسلکِ طریقت کے مقامات ہیں۔ سالک کو بڑی ہوشیاری سے قدم آگے بڑھانا چاہیئے۔ کیونکہ اس راہ میں بہکانے اور بھٹکانے والے بھی ملتے ہیں ؎

طریقِ عشق کا سالک ہے، واعظوں کی نہ سن
ٹھگوں کے کہنے کا کیا اعتبار راہ میں ہے

اگر کوئی راہ بھٹک گیا تو کسی طرف کا نہ ہوگا۔ آتش نے اس خیال کو کتنی خوبصورتی۔ کتنے جوش اور والہانہ پن سے ادا کیا ہے ؎

پار اترا وہ جو غرق ہوا بحرِ عشق میں
وہ داغ ہے جو دامنِ ساحل میں رہ گیا

اس طرح سالک خاص طرح کی مستی، وجدان اور بے خودی کے سہارے اپنی راہ طے کرتا ہے ؎

سالکِ راہِ محبت کو پس و پیش نہیں
مصلحت بیں نہیں ہیں عاقبت اندیش نہیں

اس کے سفرِ عرفان کی آخری منزل یہی ہے کہ قطرہ دریا میں مل جاتے اور دریا ہو جائے۔ چنانچہ آتشؔ بھی اسی جستجو میں زندگی کی تکلیفیں جھیلتے ہیں۔ لیکن حصولِ مقصد کے لیے دیوانوں کی خاک اڑاتے بڑھتے جاتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ خدا مسجد اور بت خانے میں نہیں دل ہی میں ہے۔ لیکن جب تک ریاضت اور صفائے نفس سے آنکھیں روشن نہ ہو جائیں، خودی کا طلسم ٹوٹ نہ جائے اس وقت تک وہ مل نہیں سکتا۔ تلمیحوں اور استعاروں میں یہ خیالات اس طرح ظاہر ہوئے ہیں ؎

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلے پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

واہ ری بے بصری واہ ری نابینائی
صورت آباد سے مشتاقِ بقا جاتے ہیں

عارف ہے وہ جو حسن کا جویا جہاں میں ہے
باہر نہیں ہے یوسف اسی کارواں میں ہے

انہیں یہ بھی یقین ہے کہ وہ ہاتھ آئے گا مگر مجاہدہ کی ضرورت ہے ؎

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھیر آتشؔ
گلِ مراد تو منزل میں خار راہ میں ہے

ٹھہرے نہ پھر جو راہ میں تیری نکل چلے
شل ہو گئے جو پاؤں تو ہم سر کے بل چلے

ہے اتحاد میرے ترے موج آب کا
اے بحرِ حسن اپنا سمجھ آشنا مجھے

منہ چھپا اب تو نہ مشتاقوں سے اے خورشید رو
چرخِ گرداں کی طرح برسوں ہی سرگرداں کیا

صدا یہ صید گاہِ عشق سے آتی ہے برسوں سے
نشانہ تیر کا ہو راہ کر فتراک سے پیدا

عرفان کی ان راہوں پر آتشؔ ایک واقف کار سالک کی طرح بے فکری سے چلتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے علائق دنیا سے اپنا دامن پاک رکھا ہے۔ اردو شعراء میں غالباً آتشؔ کے یہاں فقر و استغنا کا جذبہ سب سے زیادہ ملے گا۔ قناعت اور توکل کی دولت لے کر وہ اور تمام چیزوں کو ٹھکرا دینا چاہتے ہیں۔ سینکڑوں اشعار میں سے چند شعر دیکھئے۔ وہ آتشؔ کی ترجمانی خود کریں گے ؎

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں پہلے اتر لیتا ہے

کنجِ عزلت میں قناعت کی جو نانِ خشک پر
نعمتیں دنیا کی جو کچھ تھیں مہیا ہو گئیں

جو قناعت کے مزے سے آشنا ہو جائے گا
بھیک کا کاسہ اسے دستِ دعا ہو جائے گا

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار
بوریئے پر بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کر

طلب دنیا کو کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی
خیالِ آبروئے ہمتِ مردانہ آتا ہے

اس قسم کے تصوف کے اظہار میں شاید ہی اردو کا کوئی شاعر آتش کے قریب پہنچ سکے۔ کیونکہ یہ محض شاعری نہیں ان کی زندگی تھی۔ معمولی لباس میں گھٹیا سے مکان کے اندر، چھوٹی سی آمدنی کے سہارے اپنی چٹائی پر بیٹھے زندگی گذار دی۔ وہ حقیقتاً دنیا کی ان لذتوں کو ٹھکرا دینے کی طاقت رکھتے تھے جو ان کی شخصیت کو مجروح کرتی تھیں۔ ترک دنیا کا یہ جذبہ محض خانقاہ میں بیٹھ کر جہدِ حیات سے بچنے کے لیے نہیں تھا۔ بلکہ اس میں ان کے مزاج کے استغناء کا عکس ہے اور اگر استغناء میں بھی غرور پیدا ہو جائے تو آتش کی نگاہ اس کا پردہ بھی چاک کر دینے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ خدا پر بھروسہ تھا تو یہ توکل تھا ؎

قسمت میں جو لکھا ہے سو آئے گا آپ سے
پھیلائیے نہ ہاتھ نہ دامن پساریئے

اور جب فقیروں کے کبر و نخوت پر نظر جاتی تھی تو کہتے تھے ؎

رعونت کونسی شے پر ہے ان عزلت گزینوں کو
حصیرِ کہنہ دیکھا، دستِ خشک و پائے شل پایا

جبر و اختیار بھی صوفیانہ خیالات میں اہم جگہ رکھتے ہیں۔ صوفی عام طور سے تسلیم و رضا کا بندہ ہوتا ہے۔ اور سب کچھ خدا ہی کی طرف سے سمجھتا ہے۔ آتش کے یہاں بھی صوفیانہ روایت نظر آتی ہے ؎

پھرتا ہوں پھیرتا ہے وہ پردہ نشیں جدھر
پتلی کی طرح سے نہیں میں اختیار میں

اختیاری حرکت جان نہ مجبوروں کی
لیے جاتی ہے جدھر ہم کو قضا جاتے ہیں

وہ بھی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مجاز کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ؎

خدا یاد آگیا مجھ کو بتوں کی بے نیازی سے
ملا بام حقیقت زینۂ عشق مجازی سے

آتش میں بھی فروتنی، خاکساری اور عاجزی ہے لیکن جہاں انسانی عظمت کے اظہار کا موقعہ آتا ہے۔ وہاں وہ بھی اس عالم اصغر میں عالم اکبر دیکھتے ہیں ؎

سمجھے آتش نہ کوئی آدم خاکی کو حقیر
نہیں اسرار سے یہ خاک کا پتلا خالی

بہرحال آتش اردو صوفی شعراء میں ایک اہم جگہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے تصوف سے جو عارفانہ رنگ لیا۔ اس میں سپاہیانہ اور مردانہ جذبات کی آمیزش کر کے نہ صرف لکھنؤ کے شاعرانہ رنگ میں گرمی، زور اور چوکھا پن پیدا کیا بلکہ خود اردو شاعری کو نئے امکانات اور میلانات سے آشنا کر کے اس کا دامن وسیع اور گراں بار کر دیا۔ ان کی شاعری اسی تصوف کے اثر سے زیادہ تر آزادی اور عظمتِ انسانی کے صحت مند خیالات سے بھری ہوئی ہے۔ جسے وہ اپنے دور کے شاعرانہ رنگ میں غیر معمولی قوت اور جوش، روانی اور خلوص کے ساتھ پیش کرتے ہیں عموماً یہ خیالات تاریخی مجبوریوں کی وجہ سے اختلاطی انداز رکھتے ہیں۔ لیکن جہدِ حیات کی تمنائیں اور انسان کو حقیقت سے ہم آغوش اور ہم آہنگ بنا دینے کی خواہش آتش کو ان روایت پسند، بیمار اور اسلوب پرست شاعروں سے بہت بلند کرتی ہے۔ جن کے پاس کھوکھلے الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا +

مزے دار شاعر

محمد حسن عسکری

جرأت پر مضمون لکھنے میں اس انداز سے بیٹھا ہوں کہ جیسے امتحان کا پرچہ کرنا ہو۔ بلکہ اپنا امتحان لینے کے لیے ہی میں نے یہ موضوع چھانٹا ہے۔ میں نقاد نہ سہی، مگر ایسے مضمون تو لکھتا ہی رہتا ہوں جن میں مختلف قسم کے لکھنے والوں پر اپنی رائیں یا اپنے تعصبات کا اظہار کرتا ہوں۔ چنانچہ مجھے دیکھنا یہ ہے کہ میں تنقید نگار کس حد تک ہوں۔ آسکر وائلڈ نے کہا ہے کہ ہر قسم کا اسلوب تو بس نیلام والے کو پسند آتا ہے۔ یہ فقرہ فن کار کے لیے تو بڑی حد تک درست ہے اور تنقید نگار کے لیے بھی ایک حد تک درست ہے۔ لیکن پھر بھی ہم تنقید نگار سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذاتی مزاج کے اندر گھٹ کے نہ رہ جائے۔ بلکہ اپنی کائنات میں ایسی چیزوں کے لیے بھی جگہ نکالے۔ جو اس کے مزاج سے موافقت نہیں رکھتیں۔ موافق اور ناموافق کی کش مکش فن کار کے لیے بھی مفید ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ شیکسپیئر، ڈانٹے، جوئس، میر جیسے فن کاروں میں عظمت اور آفاقیت اسی کھینچا تانی کے ذریعے آئی ہے۔ لیکن جو فن کار اپنے مزاج کے اندر بند ہو کر بیٹھ جائے اور ناموافق چیزوں سے کراہیت اور حقارت کے سوا اور کچھ محسوس نہ کرے۔ اسے بھی ہم کسی نہ کسی حد تک اور تھوڑی بہت دیر کے لیے قبول کر لیتے ہیں۔ جیسے شبلی اور غالب۔ اس کے برخلاف اگر نقاد اپنے مزاج کو اچھی خاصی کال کوٹھری بنا لے اور جو چیز اس کے اندر نہ سما سکے، اسے کائنات ہی سے خارج کرنا چاہیے۔ اس کے اندر ایک سڑن پیدا ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کو متلی ہونے لگتی ہے۔ یہ حال ایرسن اور ان کے ساتھیوں کا ہے یا آج کل مڈلٹن مری کا۔ اگر مجھ میں نقاد بننے کی صلاحیت بھی ہو تو میں کم سے کم ایسا نقاد نہیں بننا چاہتا جو لوگوں کو پیام زندگی دیتا پھرے۔ لیکن مزاج کی عائد کردہ پابندیوں کے علاوہ بعض مجبوریاں اپنی خوش فہمیوں سے بھی پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے مدتوں سے کوئی افسانہ تو نہیں لکھا۔ لیکن کہتا یہی رہتا ہوں کہ مجھے افسانہ لکھنا ہے۔ اس اعتبار سے میں اپنا حق سمجھتا ہوں کہ میرے تجربات کا ایک مرکز اور میری کاوشوں کا ایک رخ ہو۔ چنانچہ میں پڑھتا بھی ایسی چیزیں ہوں جن سے مجھے پتہ چل سکے کہ متنوع تجربات ایک مرکز پر کیسے لائے جا سکتے ہیں۔ مجھے نہ تو غم جاناں والے پسند ہیں، نہ غم دوراں والے۔ نہ ایسے لوگ جو باری باری سے دونوں کا مزا لیتے ہوں۔ میں تو ایسے لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہوں جن کے یہاں غم جاناں اور غم دوراں دونوں مل کر اپنا غم بن جائیں۔ اپنے غم سے میرا مطلب یہ نہیں کہ آدمی بیٹھ کے اپنی محرومیوں کو رویا کرے ــــــ چاہے وہ محرومی "زکنار ما بکنار ما" والی مایوسی کی طرح غیر مادی ہی کیوں نہ ہو۔ اس اپنے غم سے مراد وہ تخلیقی درد ہے جو انسانی ہستی اور انسانی زندگی کی تفتیش کا ذریعہ بنتا ہے اور جس میں کائنات کا غم و نشاط بن جانے کی قوت اور گہرائی موجود ہوتی ہے۔ مثلاً ڈانٹے۔ چاسر۔ شیکسپیئر، اور جیمز جوئس کے یہاں یہ اپنا غم کس طرح شروع ہوتا ہے۔ اس کا بیان میر

نے بڑی اچھی طرح کر دیا ہے۔

دل نہیں مجھ کو ملا یہ کوئی جی کا ہے وبال گفتنی ہو تو کہوں اسے میرؔ میں کچھ اس کا حال
خود بخود جاتا ہے کہتا آرزو کیا ہے اسے چاہتا ہے سیم و زر یا کوئی دل بر خوش جمال
یا دیں ہیری ہؤا ہو کچھ سبب تو ہے بجا عشق بازی، مفلسی، آزردگی۔ رنج و ملال
نے کسو کے گیسو و کاکل کا وابستہ ہوں میں نے کسی کے چاند سے مکھڑے کا مجھ کو ہے وبال
کیا کروں ایذا لئے بے موجب عرض تجھ سے بیاں نے غم درد جدائی ہے نہ اندوہِ وصال

نیستم عاشق بظاہر لیک می کاہد دلم
عمر بگذشت و نمی دانم چہ می خواہد دلم

اُردو شاعری کی تاریخ میں بعض لوگ ایسے ہیں جن کے یہاں یہ غم پیدا ہو کر اپنی نفسیات کی تحقیق کا ذریعہ تو بن جاتا ہے مگر انسانی زندگی یا کائنات کی تفتیش تک نہیں پہنچ جاتا۔ مثلاً مومنؔ۔ پھر بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دُکھ درد کا ذکر تو کرتے ہیں۔ مگر اُن کی کامرانی یا محرومی محض ایک واقعے تک محدود ہو کے رہ جاتی ہے۔ اور اُنہیں اپنی پوری شخصیت پر بھی غور کرنے کی ترغیب نہیں دیتی۔ اس لیے اُن کے یہاں وقتاً فوقتاً عشق کا غم تو نظر آتا ہے۔ مگر اپنا غم پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً جرأت۔ اسی لیے میں نے اپنا امتحان لینے کے لیے جرأت کو چھانٹا ہے۔ میری طبیعت کو جرأت سے کتنی مناسبت ہے، یہ اسی سے ظاہر ہے کہ مضمون لکھنے کے لیے میں نے اُن کا دیوان تین دفعہ پڑھا۔ مگر مجھے اُن کا ایک بھی شعر یاد نہیں ہو سکا۔

یونگ نے میاں بیوی کے تعلقات پر ایک مضمون لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ ان دونوں میں ایک فریق تو CONTAINER ہوتا ہے۔ دوسرا CONTAINED پہلے فریق کی شخصیت اتنی پیچیدہ، متنوع اور پہلودار ہوتی ہے کہ دوسرا اس کے اندر سما جاتا ہے۔ مگر چونکہ پہلے فریق کے اندر بہت سے خانے خالی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے آسودگی دونوں کو نہیں ملتی۔ آسودگی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یا تو پہلا فریق سکڑے، یا دوسرا فریق پھیلے۔ چنانچہ مکمل ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے میاں بیوی میں ایک کش مکش سی شروع ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں بالکل یہی نقشہ ایک شاعر اور ایک قاری کے تعلقات کا ہے۔ خیر، ایسے شاعروں پر غور کرنے کا تو سوال ہی نہیں جن کی شخصیت ایک عام قاری سے بھی محدود ہو۔ انہیں تو ہم ادب کی تاریخ میں شامل ہی نہیں کرتے۔ لیکن ایسے شاعر بہت سے ہیں جو ہماری شخصیت کے بعض پہلوؤں کو پوری طرح مطمئن کرتے ہیں۔ اور ہم اُن سے تھوڑی دیر کے لیے جی بھر کے لطف لے سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ہماری شخصیت کے بہت سے تقاضوں کو تشنہ چھوڑتے ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے جیون ساتھی نہیں بن سکتے۔ مثلاً اکبرؔ۔ اس کے برخلاف میرؔ جیسے شاعر کو پڑھتے ہوئے ہم فوراً CONTAINED بن کے رہ جاتے ہیں۔ اور ہمیں ناآسودگی یہ رہتی ہے کہ شاعر کی طبیعت کے بہت سے عناصر کا جواب ہمارے پاس موجود نہیں۔ میرؔ کو پڑھنا تو ایک اچھی خاصی جنگ ہے جو عمر بھر جاری رہتی ہے۔ اس کا احساس اُس اُردو کے ہر شاعر کو رہا ہے، اور اُردو نے میرؔ کا صرف ایک CONTNTAINER پیدا کیا ہے ـــــ فراقؔ۔ [میں یہ دعوےٰ نہیں کر رہا ہوں کہ فراقؔ صاحب میرؔ سے بڑے شاعر ہیں۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ فراقؔ کے بعض مطالبات میرؔ سے بھی پورے نہیں ہوتے۔] یہ تشنگی یک طرفہ نہیں۔ اُن کی زندگی میں بھی لوگوں کو میرؔ سے جتنی عقیدت تھی اُس کے باوجود وہ اپنے پڑھنے والوں سے مطمئن نہیں ہو سکے۔

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولے   سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں
تاب کس کو جو حال میر سنے   حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

ان شعروں میں اُس زمانے کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات پر جتنی بھی تنقید شامل سمجھی جاسکے۔ اُس کے باوجود یہ حقیقت برقرار رہتی ہے کہ یہ ایک ایسی شخصیت کی ناآسودگی ہے جسے اپنے عقیدت مندوں میں بھی تسکین کے سارے پہلو نہیں ملتے۔ بلکہ یہ بات میر نے پوری وضاحت سے بھی کہی ہے ؎

تری چال ٹیڑھی، تری بات رُوکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

میر کے یہاں جو مشکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اُن کی وجہ صرف یہی نہیں کہ اُن کی شخصیت اوروں سے زیادہ پیچیدہ اور پہلودار تھی بلکہ وہ اپنی شخصیت پر مسلسل خلاقانہ عمل کے ذریعے متضاد عناصر کو گھلا ملا کر ایک نئی چیز پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے اندر جس قسم کا جدلیاتی عمل جاری تھا اُس کا ایک اشارہ اس شعر میں ملتا ہے ؎

نہیں میر مستانہ صحبت کا باب
مصاحب کرو کوئی ہشیار سا

مستانہ پن اور ہشیاری کے ان متضاد تقاضوں کو سہارنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اسی لیے اپنی سہولت کے لیے عام پڑھنے والوں نے یہ مشہور کر دیا کہ میر کی شاعری واہ نہیں آہ ہے لیکن جن شاعروں نے واقعی میر سے اُلجھنے کی کوشش کی، وہ عمر بھر ریزہ ریزہ پکارا کیے ——— سوائے فراق کے۔ [دوسرے شاعر تو یہی افسوس کیا کیے کہ نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب۔ لیکن فراق صاحب احترام کے ساتھ ساتھ اپنے اختلاف کا بھی اعلان کر گئے ہیں ؎

جو ہوتا: رنگِ میر و میرزا تو بات ہی کیا تھی۔]

غرض یہ کہ میر کو پڑھنا عمر بھر کا جھگڑا مول لینا ہے۔ اس کے برخلاف عام آدمی کو جرأت کے معاملے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی یہاں نہ کوئی CONTAINER بنتا ہے نہ کوئی CONTAINED۔ جرأت جیسے شاعر اور عام پڑھنے والے کا معاملہ بالکل اللہ ملائی جوڑی کا سا ہے۔ چُول پہ چُول بیٹھ جاتی ہے۔ نہ تو شاعر کو پڑھنے والے کی گرفت میں آنے کے لیے سکڑنا پڑتا ہے، نہ پڑھنے والے کو شاعر کے ساتھ ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے پھیلنا ضروری ہے۔ جرأت عام آدمی کے سارے جذباتی تقاضے پورے کرتا ہے۔ اور قاری کو اپنے ذاتی تجربات لکھے لکھائے مل جاتے ہیں۔ شاعری کی: "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" والی تعریف اگر کہیں صادق آتی ہے تو جرأت کی شاعری پر۔ یہ بات میر کے متعلق نہیں کی جاسکتی۔ میر کی شاعری جذبات کو بقول فراق صاحب "کچھ اور" بنا دینے والی شاعری جذبات کے بیان کی شاعری ہے۔ میر کی شاعری خلاقانہ ہے، جرأت کی شاعری بیانیہ۔

بیانیہ شاعری سے میں نے کیا مراد لی ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے میں پھر میر اور جرأت کا موازنہ کروں گا۔ میر کی شاعری محض اُن کی "شخصیت" کا اظہار نہیں ہے۔ اوّل تو اُن کی شخصیت کے اندر ہی مختلف عناصر میں تضاد اور تصادم ہے۔ پھر جو فنکار اس تضاد کو سمیٹ کر اس کی قلبِ ماہیت کرنا چاہتا ہے۔ وہ شخصیت سے الگ اور اُوپر بھی رہ سکتا ہے۔ جرأت کی شاعری اُن کی زندگی کا عکس ہے۔ میر اپنے

آپ سے مطمئن نہیں ہیں، اُن کے لیے خالی تجربہ کافی نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کچھ اور نہ بن جائے۔

بڑے سلیقے سے اپنی نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میر نفی میں اثبات ڈھونڈتے ہیں، اُن کے یہاں شکست تو مل جائے گی۔ مگر شکست خوردگی نہیں۔ اُن کی افسردگی ایک نئی تلاش کا بہانہ بنتی ہے۔ جرأت نہ تو ناکامی سے "کام لیتے ہیں" نہ کامرانی سے۔ بلکہ دونوں چیزیں اُن کے کام آجاتی ہیں۔ دونوں چیزیں اُنہیں دلچسپ سے دلچسپ تر بناتی ہیں۔ اس لیے نہ دونوں بجائے خود اور کسی نئی تشکیل کے بغیر بھی اُن کے لیے کارآمد ہیں۔ یہ چیز اُن کے لیے تجربات بھی نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ اسی لیے جرأت شاعر سے زیادہ واقعہ نگار ہیں۔ شاعری نہیں کرتے بلکہ اپنی سوانح عمری لکھتے ہیں۔ اُن کی شخصیت اور ان کی فن کاری بڑی آسانی سے ایک ہو جاتی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ اُن کی شخصیت کے لیے فن کار ایک ماہر اسٹینو گرافر کی طرح ہے جو واقعات اُنہیں پیش آتے ہیں۔ چاہے وہ خارجی ہوں یا داخلی، جرأت اُن کی تفتیش کرنے یا اُن کا رشتہ دُوسری قسم کے واقعات سے ملانے یا اُن کی سرحدوں کو توڑ کر آگے نکلنے یا انہیں پگھلا کر نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ تو نہیں کہا سکتا کہ وہ انشا کی طرح محض خارج ہیں ہیں۔ اور اُن میں داخلیت نہیں۔ جتنے واقعات انہوں نے اپنی شاعری میں بیان کیئے ہیں۔ اُن میں پچاس فی صدی تو ضرور داخلی نوعیت کے ہیں۔ مگر وہ ہر قسم کی وارداتِ قلب سے لُطف لیتے ہیں۔ اُس کا مطالعہ نہیں کرتے۔ اُن کے لیے ہر واقعہ اور ہر جذباتی کیفیت بجائے خود مکمل ہوتی ہے وہ اُسے کسی دوسرے واقعے سے ملنے یا ٹکرانے نہیں دیتے۔ اسی لیے اُن کے اندر کسی قسم کی کش مکش یا تصادم یا ٹکراؤ نہیں۔ خوش ہیں تو خوش، رنجیدہ ہیں تو رنجیدہ، اُن کی خوشی آتش کا سا نشاط نہیں بننے پاتی۔ اُن کا رنج میر کا سا درد نہیں بنتا۔ بلکہ رنجیدگی سے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ جیسا مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے یا جیسا مزاج اُن کا بن گیا وہ اُسی میں خوش رہے اور اُسی کے اندر رہ کے انہوں نے شاعری کی۔ اگر کسی شاعر کا ظاہر و باطن، زندگی اور فن ایک سا رہا ہے تو جرأت کا۔ اگر کسی کی شاعری میں مکمل "خلوص" (ادبی خلوص نہیں) ملے گا تو جرأت کے یہاں۔ سنتے ہیں کہ وہ خوش باش، خوش طبع، ظریف، لطیفہ باز اور عاشق مزاج قسم کے آدمی تھے۔ اہل دل نہیں تھے، بلکہ دل والے۔ بلکہ دل پھینک۔ یہ میں نے اعتراض یا طعنے کے طور پر نہیں کہا۔ میں صرف اُن کی شاعری کی صحیح تعریف معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اور میرا احساس یہ ہے کہ جرأت کی شاعری اُن کی خوش باشی ہی کا ایک حصہ تھی۔ میر کے اندر جو شاعر ہے وہ ان کی شخصیت کو کبھی قبول کرتا ہے، کبھی رد کرتا ہے کبھی دونوں باتیں ایک ساتھ کرتا ہے۔ بہرحال وہ اُن کی شخصیت سے باہر نکل جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ جرأت کے اندر جو شاعر ہے۔ وہ اُن کی شخصیت کے اندر رہتے ہوئے ذرا بھی بے چینی محسوس نہیں کرتا وہ تو صرف اس شخصیت کا ترجمان ہے۔

یہ نہ سمجھیے کہ مجھے جرأت سے کوئی چڑ ہے اور میں اُن کی شاعری کو محض خوش باشی کہہ کر ٹالنا چاہتا ہوں۔ اگر ٹالنا ہوتا تو پورا مضمون لکھنے کی کیا ضرورت تھی، ایک فقرے میں ہی کام چل جاتا۔ جرأت کی زندگی میں شاعری کا کیا مقام تھا۔ یہ انہیں کی زبان سے سنیئے۔ میر تو شاعری کے بارگراں سے گھبرا کر چیخ پڑے تھے ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد دل اتنے کیے جمع تو دیوان ہوا

بقول فراق صاحب، میر نے شعر نہیں کہا۔ تعریف کرنے والوں کے منہ پر جوتا مارا ہے۔ اس کے برخلاف جرأت کے لیئے

شاعری، سماجی مقبولیت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے ؎

جرأتؔ جواب میرؔ تو ایسا ہی کہہ کے بس
چاروں طرف سے شور سنے واہ واہ کا

[اس "جواب میرؔ" کی ستم ظریفی کا بھی جواب نہیں] شعر کہہ کر وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ میں مجلسی کمالات کی پوٹ ہوں اور فنِ شعر پر مجھے قدرت حاصل ہے۔ اسی لیے انہیں میرؔ، مصحفیؔ، سوداؔ جیسے اُستادوں کی زمین میں شعر کہنے کا خاص شوق ہے۔ اس سے اُن کا ہنر تو ضرور ظاہر ہو جاتا ہے، مگر وہ کھاتے ہیں اس لیے رہتے ہیں کہ دو مزاجوں کا تقابل اور تضاد پیدا ہوتے ہی اُن کے شعر کا ہلکا پن اُبھر آتا ہے مصحفیؔ کی غزل کا یہ مشہور شعر ہے:۔

صبح پر یار کا ہے وعدۂ وصل   ایک شب اور بھی جیجیے ہی بنے

اس کا جواب جرأتؔ یوں دیتے ہیں:۔

اُس کے آنے تک اے دلِ بیتاب   جس طرح ہو سکے جیجیے ہی بنے

مگر مجلس کا تقاضا ہے کہ اُستادوں کے رنگ میں یا کم سے کم اُن کی زمین میں کہا جائے! جرأتؔ اپنی ہر تیسری چوتھی غزل میں یہ بات یاد دلا دیتے ہیں کہ اُن کے گرد دوسرے آدمی نہیں بلکہ شعر سننے والے یار دوست جمع ہیں۔ اور انہیں اپنا بھرم رکھنا ہے۔ جتنے دو غزلے اور سہ غزلے جرأت نے کہے ہیں، شاید ہی کسی شاعر نے کہے ہوں۔ اور وہ ہر دفعہ جتا دیتے ہیں کہ ابھی کیا دیکھا ہے، آگے دیکھنا۔

ایک ہی پڑھ کر غزل جرأتؔ ہوا تو کیوں خموش
شعر ابھی تو اور بھی ہیں تجھ سے پڑھوانے کئی

ہے شگفتہ یہ غزل جرأتؔ غزل ہو اور بھی
دیکھیں مضمون اس سے بہتر اور تو کیا لاتے ہے

کہہ جرأتؔ ایک اور غزل وہ کہ سب کہیں
لکھنے سے اُس کے دفترِ اشعار گرم ہے

جرأتؔ غزل اک اور ملا تو کہ کہیں سب
کب ایسی گرہ اور غزل خواں نے لگائی

جرأتؔ نے اپنی شاعرانہ ذہنیت کی بالکل صحیح تعریف کر دی ہے، "وہ شاعری نہیں کرتے" غزل ملاتے ہیں"۔ دراصل جرأتؔ اُن لوگوں میں سے نہیں جو اپنی شخصیت اپنے آپ بناتے ہیں اور بناتے رہتے ہیں، جنہیں یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ ہم جو نئی شکل اختیار کریں گے

اُس کے متعلق دوسروں کا اور خود ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ جرأت تو ایک گھڑا گھڑایا کردار ہیں، اُنہیں بھی معلوم ہے اور دُوسروں کو بھی کہ اُن سے کن کن باتوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اُنہیں پُورا علم ہے کہ میں دلچسپ آدمی ہوں اور لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ اور وہ کسی بے ایمانی کے بغیر بڑے خلوص کے ساتھ چاہتے ہیں کہ لوگ مجھے اور بھی پسند کریں۔ انہوں نے دنیا بھر کے تماشے دیکھے ہیں، ہر جگہ آنکھ لڑائی ہے۔ دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر اُن کا دل خوش کرنے کے لیے اُنہیں سیکڑوں قصے یاد ہیں۔ یہ قصے اُنہوں نے نثر میں نہیں بلکہ شعروں کی شکل میں سنائے ہیں۔ اُن کی شاعری کی بنیادی تحریک یہی ہے کہ اپنے معاشقوں کے بارے میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ کی جائے تاکہ مجلس میں گرمی آئے اور لوگوں کے دل میں اُن کی قدر بڑھے۔ اس مقصد میں وہ کامیاب ہوئے ہیں اور لوگ ایک قصہ سُن کر دوسرا قصہ سننا چاہتے ہیں ؎

حسبِ حال اشعار کہیئے اپنے اب جرأت کچھ اور
یہ غزل تو تھی کئی یاروں کی کہوائی ہوئی

یہاں یہ تنبیہہ پھر ضروری ہے کہ دلچسپ آدمی بننے اور لوگوں میں مقبول ہونے کی خواہش کوئی بُری بات نہیں ہے زندگی میں ایسے مزاج ایسے آدمیوں اور ایسی شاعری کی بھی ضرورت ہے۔ میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ ایسی شاعری یاروں کی محفل کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ یہ خود کلامی نہیں بلکہ گفتگو ہے۔ جس کے لیے دل چسپ ہونا لازمی ہے۔ یہ شاعری پورے معنوں میں تخلیقی عمل یا داخلی تجربات کی تنظیم یا ماہیتِ قلب نہیں، بلکہ اُن واقعات کا بیان ہے جو شاعر کو پیش آئے۔ یہ ضروری نہیں کہ سارے واقعات طرب ناک ہی ہوں، یہ دل چسپ آدمی جسے بیسیوں قصے یاد ہیں۔ چونکہ خلوص اور صاف گوئی سے کام لے رہا ہے۔ اس لیے محرومیوں کی داستان بھی سنائے گا ؎

سنایا اُس کو یہ قصہ کہ بس آنسو نکل آئے

لیکن ذہنیت ہوگی قصہ گوئی کی ہی۔ اسی لیے جرأت کو مسلسل غزل بہت عزیز ہے۔ مسلسل غزل کہنے کے معاملے میں بھی جرأت غالباً سب شاعروں سے آگے ہیں۔ چونکہ یہ قصے یاروں کو سنائے جا رہے ہیں۔ اسی لیے اُن کی غزل میں ایسی روانی اور سلاست آئی ہے اور اسی لیے پڑھنے والے کو بڑی آسانی سے قربت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے اُن کا عشق اُن کی شعر گوئی کے لیے بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ انہیں سنانے کے لیے اتنے قصے مل گئے۔ پھر شعر گوئی کی قدرت کے سبب ان کا عشق بھی دلچسپ بن گیا۔ لیکن چونکہ اُن کے عشق کا ایک مصرف یہ بھی ہے کہ دوسروں کی تفریحِ طبع کا ذریعہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے عشق کو عام طور پر معاشقے کی سطح سے اُونچا نہیں اُٹھنے دیتے۔ ممکن تھا کہ وہ میرؔ کے زیرِ اثر اپنے عشق کے مطالعے کی طرف بھی راغب ہو جاتے۔ مگر یاروں کے زیرِ اثر انہوں نے اپنی محبتوں کو واقعات ہی رہنے دیا۔ اگر ہم جرأت کے ساتھ ذرا سختی برتنا چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ یاروں میں مقبول ہونے کے لیے شعر کہتے تھے اور شعر کہنے کے لیے عشق کرتے تھے۔ بہرحال اُن کی شاعری میں یہ احساس غالب ہے کہ شعر اور عشق دونوں مجلسی کمالات کا ایک حصہ ہیں اور خوش وقتی کا ایک وسیلہ۔

چنانچہ اُن کا فن اصل میں ناول نگار یا افسانہ نویس کا فن ہے، شاعر کا نہیں۔ یہاں زندگی کے سارے تجربات کو ایک سالم معنی میں لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہاں واقعات فرداً فرداً دلچسپ ہیں اور سلسلہ وار ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ یہاں تفصیلات ہی اہم

ہیں خصوصاً خارجی تفصیلات۔ اس قسم کا عشق مسلسل غزل میں بڑی اچھی طرح ڈھلتا ہے۔ جرأت کی بہت سی مسلسل غزلیں منظوم افسانے ہیں جن پر غزل کی حیثیت سے نہیں بلکہ مختصر افسانے کی حیثیت سے غور ہونا چاہیئے۔ مثلاً وہ غزل جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

نہ گرمی رکھے اُس سے کوئی خدایا
شرارت سے جی جس نے میرا جلایا

چونکہ یہ کہانی عشق کی نہیں بلکہ "گرمی" کی ہے، اس لیے شاعر کو اپنی پوری بپتا ساری تفصیلات سمیت یاد ہے۔ اور ان تفصیلات میں ایک منطقی سلسلہ قائم ہے۔ اس کہانی کی ایک ابتدا، ایک انتہا، ایک درمیانی حصّہ الگ الگ موجود ہے۔ یہاں وہ میرؔ والی بات نہیں کہ ابتدا اور انتہا سب ایک دوسرے میں مدغم ہو جائے۔ اسی طرح جرأت کا وہ مشہور مستزاد

جادو ہے نگہ چھب ہے غضب قہر ہے مکھڑا   اور قد ہے قیامت

ایک مکمل افسانہ ہے بلکہ اگر ہم چاہیں تو جرأت کے کلام سے اُن کی پوری سوانح عمری مرتب کر سکتے ہیں۔ ہم یہ پتہ چلا سکتے ہیں کہ اُن کے محبوب پردہ نشین بھی تھے اور بے پردہ بھی۔ معاشقہ کس طرح شروع ہوا، محبوب کی شکل و صورت کیسی تھی وہ اپنے عاشق کے ساتھ کس طرح پیش آیا، اقربا کا رویہ کیا رہا۔ رقیبوں نے کیا دراندازیاں کیں، عاشق کو کس قسم کی کامیابی یا ناکامی حاصل ہوئی۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض وہ لطیف واقعات بیان کر کے شاعری کرنا چاہتے ہیں ؎

یا تو اُس کے گھر سے آتے تھے نہ اپنے گھر کو ہم   یا اب اپنے گھر میں بیٹھے دیکھتے ہیں در کو ہم

تماشا ہے کہ جن روزوں میں اُس کے اقربا خوش تھے   تو ناحق پھر گیا تھا ہم سے دل اُس آفتِ جاں کا

اس لطیف واقعات بیان کرنے والی شاعری میں جرأت کے ذاتی مزاج کے علاوہ ایک اور بات کو بھی دخل ہے۔ معاملہ بندی اُس سماج میں چلتی ہے جہاں مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے بالکل الگ رہتے ہوں۔ ایسے حالات میں لوگوں کو گندی باتیں سننے کا شوق بڑھ جاتا ہے اور چلمن میں سے ایک جھلک دیکھ لینا یا آنچل نظر آ جانا بھی گندی بات بن جاتا ہے۔ یہاں ذرا سی تفصیل بھی بذاتِ خود لطف دینے لگتی ہے اور لوگ ذرا کھی کھی ہنس دیتے ہیں۔ اسی لیے سراپا کے بیان میں اُس قسم کی دلچسپی پیدا ہوتی ہے جو اکثر لکھنوی شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ یعنی سراپا کا مطلب جسم کی تفصیلات گنوانے کا ہو جاتا ہے۔ جرأت جیسے شاعروں کی بدولت اُردو شاعری میں حقیقت نگاری کا جو اضافہ ہوا وہ قابلِ قدر تو ضرور ہے۔ لیکن دلچسپ واقعات یا مزے دار قصّہ سنانے کے شوق میں جرأت اور معاملہ بندی والے شاعروں کو بعض دفعہ یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ قصّہ تو ہو گیا مگر شعر بھی ہوا یا نہیں۔

میں رو کر جو کہنے لگا دردِ دل
وہ منہ پھیر کر مسکرانے لگا

جرأت کے یہاں کتنے ہی شعر ایسے ملیں گے جو حقیقت نگاری کی وجہ سے پھسپھسے بن کے رہ گئے ہیں۔ چونکہ ایسی شاعری میں یہ خطرہ ہر وقت رہتا ہے۔ اس لیے جرأت کو زبان و بیان پر اُس قدرت اور اُس صناعی کی ضرورت پڑتی ہے جو میرؔ کے لیے

لازمی نہیں۔ اسی لیے میرؔ نے ہدایت کی ہے کہ ہم کو شاعر نہ کہو۔ میرؔ کا ذریعۂ اظہار، اُن کا اسلوب، اُن کی زبان تجربے کی اندرونی کشاکش سے پیدا ہوتی ہے۔ جراتؔ اپنی کہانی کو دل چسپ اور مزے دار بنانے کے لیے اپنی زبان دانی سے کام لیتے ہیں۔ میرؔ کو زبان سے ہر وقت کشمکش کرنی پڑتی ہے اس لیے اُن کے اچھے شعروں میں بھی بعض وقت بیان کا کچا پن مل جائے گا۔ جراتؔ کو مروجہ الفاظ میں نئی وسعتیں پیدا کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ اُنہیں تو صرف موزوں لفظ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اس لیے اُن کے اچھے شعر بالکل گھٹے گھٹائے ہوں گے۔ جو بے ساختگی آپ کو جراتؔ کے یہاں ملے گی، وہ میرؔ کے یہاں نظر نہیں آئے گی۔ جراتؔ عام طور پر اپنی بات پوری کہہ لیتے ہیں میرؔ بعض وقت پوری بات نہیں کہہ سکتے۔ بول روزمرہ تو دونوں ہی استعمال کرتے ہیں۔ مگر میرؔ کے یہاں وہ زبان ملے گی جو وسیع ترین انسانی تعلقات کے داخلی پہلو کی نمائندگی کرتی ہے۔ جراتؔ کے یہاں وہ زبان ہے جو خارجی حرکات کے بیان میں کام آتی ہے۔ پھر میرؔ کے یہاں زبان کی ایک اور معنویت بھی ہے۔ اپنی ٹیڑھی چال اور روکھی بات کی وجہ سے اُن کا رشتہ دوسروں سے منقطع ہو گیا تھا وہ زبان کی مدد سے یہ ٹوٹا ہوا رشتہ پھر جوڑتے ہیں۔ کیونکہ جو زبان میرؔ استعمال کرتے ہیں وہ سارے سماجی تجربے کا نچوڑ ہے۔ اپنے تجربے کو اس زبان میں سموتے ہوئے وہ اپنے آپ کو دوسروں میں پھر مدغم کر لیتے ہیں ؎

ضعف بہت ہے میرؔ تمہیں کچھ اس کی گلی میں مت جاؤ　　صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

بُرا حال اُس کی گلی میں ہے میرؔ　　جو اُٹھ جائیں واں سے تو اچھا کریں

اس کے برخلاف جراتؔ کی زبان سماجی تجربے کی زبان نہیں بلکہ سماجی تعلقات کی زبان ہے وہ لوگوں سے کہاں بھاگتے، لوگ انہیں خود گھیرے رہتے تھے۔ اس لیے انہیں اپنی معنویت دوسروں پر اور دوسروں کی معنویت اپنے اُوپر واضح کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ پھر وہ اپنے الفاظ میں متضاد قسم کے تجربے بھرنے کی کوشش کیوں کرتے؟ جن چیزوں کا وہ ذکر کرتے ہیں، اُن کی قدر و قیمت خود اُن کی نظروں میں اور دوسروں کی نظروں میں بھی معین ہے۔ سماجی تعلقات اسی مفاہمت کے بل پر چلتے ہیں۔ چونکہ انہیں یہ مفاہمت حاصل ہے لہٰذا وہ سماجی تعلقات کی زبان استعمال کرکے اس مفاہمت کو اور ترقی دیتے ہیں۔

اُن کی شاعری کی جو بنیادی تحریک میری سمجھ میں آئی تھی۔ وہ تو میں نے پیش کر دی۔ اب میں اُن کے عشق کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چونکہ میں ایسی باتیں کہوں گا جن میں جراتؔ کی تنقیص جھلکے گی۔ اس لیے میں پہلے ہی سے بتائے دیتا ہوں کہ میرا نقطۂ نظر وہ نہیں جو غدر کے بعد سے نیک اور ثقہ لوگوں کا رہا ہے اگر جراتؔ کی شاعری فاسقانہ ہے تو مجھے اس سے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ اگر ان کا محبوب بازاری ہے تو بھی کراہیت کی کوئی وجہ نہیں۔ جو شاعری یا جو محبت جسمانی خواہش کی پاکیزگی محسوس نہ کر سکے۔ وہ قوت اور عظمت سے بھی پاک ہوگی۔ ڈانٹے جیسی پاک محبت کس شاعر نے کی ہے۔ مگر پاؤلو اور فرانچسکا کی نفسانی محبت کے سامنے اس کا بھی سر احترام کے ساتھ جھک جاتا ہے۔ لیکن جو نفسانی خواہش انسانی ہستی کے باقی عناصر سے، انسانی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے اور کائنات کی پیچیدگیوں اور وسعتوں سے الگ ہو کر محض اپنے اُوپر مرتکز ہو جائے وہ بڑی شاعری پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر نفسانی خواہش آدمی کو اپنے چاروں طرف دیکھنے پر ابھار سکے تو گندی سے گندی بات بڑی سے بڑی بات بن سکتی ہے۔ مثلاً YEATS نے کہا ہے:۔

BUT LOVE PITCHED HIS MANSION IN
THE PLACE OF EXCREMENT;
IT CAN NEVER BE WHOLE OR SOLE;
THAT WHICH IS NOT RENT.

جنسی خواہش کے باوجود، بلکہ شاید جنسی خواہش ہی کی مدد سے، آدمی محبوب کے حسن میں ساری کائنات کا حسن دیکھ سکتا ہے مثلاً فراقؔ

تارے بھی ہیں بیدار زمیں جاگ رہی ہے
پچھلے کو بھی وہ آنکھ کہیں جاگ رہی ہے

لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محبوب کو دیکھ کر سسکی بھرتے ہیں۔ اور اُن کی شاعری بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔
خیر اب جرأتؔ کی طرف آیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ثقہ لوگوں کی رائے کے مطابق اُن کے یہاں بازاری قسم کے فقرے بازی، سوقیانہ بد مذاقی، گھٹیا اور چھچھورے طعنے، اور بازارِ حسن میں جاکر آوازے کسنے کا انداز موجود ہے۔

کیا کیا وہ خفا مجھ سے ہوا گھر سے نکل کے　　　جب میں نے پکارا اُسے آواز بدل کے

بندے کی سن سفارش بولے وہ یوں کسی سے　　　عاشق یوں ہی وہ صاحب سارے جہاں پہ ہیں

دوں جوابِ سخن اُس کو تو یہ جھنجھلا کے کہے　　　چل بے چل مجھ سے نہ ہر بات میں تکرار نکال

دام میں ہم کو لاتے ہو تم دل اٹکا ہے اور کہیں　　　شعر پڑھانا ہم سے لو مضمون گٹھا ہے اور کہیں

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں　　　ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

ایک طرح سے دیکھیے تو آخری شعر میں جرأتؔ نے جو کچھ کہا ہے، کاول کانتی اور جون ڈن نے اپنی ECSTASY میں، مارویل نے اپنی COY MISTRESS میں اس سے زیادہ اور کیا کہا ہے؟ بقول خاں صاحب، سب وہی بات ہے۔ میرؔ کے شعر میں بھی اس کے سوا اور کیا رکھا ہے؟ ؎

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

یہ صرف بڑے شاعر اور چھوٹے شاعر کا فرق نہیں ہے۔ یہ فرق ایک خواہش کو باقی سب خواہشوں سے علیحدہ ایک

سرگرمی کو باقی سب سرگرمیوں سے الگ کر لینے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ صاف صاف تو کیا کہوں، ثقہ لوگوں کے درمیان رہنا ہے۔ یوں سمجھئے کہ مندر بالا شعر ایسے آدمی کے ہی ہو سکتے ہیں جو عموماً اپنی ناک سے آگے نہ دیکھ سکتا ہو۔

لیکن اس بازاری پن کے باوجود یہ کہنا غلط ہوگا کہ اُن کا عشق محض چھیڑ چھاڑ یا ہنسوڑ پن ہے۔ یا اُن کے عشق میں شدّت اور خلوص نہیں۔ یہ چیزیں اُن کے اندر موجود ہیں۔ بلکہ اس شعر میں بھی موجود ہیں ؎

جب یہ سنتے ہیں وہ ہمسائے میں ہیں آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

لیکن بڑی شاعری اور بڑی شخصیت کی تعمیر محض شدت اور خلوص کی بنیادوں پر نہیں ہوتی۔ جذباتی خلوص اور اخلاقی خلوص میں بڑا فرق ہے۔ جذباتی خلوص تو ایک لمحے کی چیز ہوتا ہے۔ اخلاقی خلوص اُس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب مختلف قسم کے پُرخلوص اور شدید جذباتی لمحوں کو ایک دوسرے سے ملنے اور ٹکرانے دیا جائے۔ محض اتنا کہہ دینے سے کام نہیں چلتا کہ جرأت کی محبت دیرپا نہیں ہوتی یا وہ صرف وقتی تسکین ڈھونڈتے ہیں۔ ہنگامی عشق بازی تو شاید ذوقؔ نے جرأتؔ سے زیادہ کی ہوگی۔ ایسی محبت جس کے خلوص اور شدت میں ازل سے لے کر ابد تک کوئی فرق نہ آئے، انسانوں کا کام نہیں۔ واسوخت والی ذہنیت سے پاک رہ کر بھی فراقؔ صاحب نے کہا ہے ؎

یہ کہہ کر میں کرتا ہوں عرضِ تمنّا
نگاہِ محبت کے دھوکے نہ کھانا

جرأت کی محبت جھوٹی نہیں، مگر اُن میں خامی یہ ہے کہ اُن کا خلوص جذباتی ہے، اخلاقی یا خلاقانہ نہیں۔ انہیں تجربات تو بہت سے حاصل ہوئے ہیں۔ لیکن وہ سب مل کر ایک تجربہ نہیں بننے پائے۔ انہوں نے ہر تجربے کو اپنی اپنی جگہ قبول کر لیا ہے۔ سب تجربات پر ایک ساتھ اخلاقی یا تخلیقی عمل نہیں کیا۔ اُن کی زندگی لمحات کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس کے اندر کوئی ایسا لمحہ نہیں جس میں ساری زندگی سمٹ آئے۔ اُن کے یہاں تضاد تو بہت ملے گا۔ لیکن اس تضاد سے کوئی نئی وحدت وجود میں نہیں آتی۔ اُن کا روحانی سفر ایک رقص کی شکل کبھی اختیار نہیں کرتا بلکہ ایسا ہے جیسے کوئی منہ اُٹھائے چلا جا رہا ہو، اور وقتاً فوقتاً راستے کے مختلف نظاروں سے مختلف قسم کا لطف لے لیتا ہے۔ اسی لیے جرأت کے مزاج یا شاعری یا عشق کی جامع و مانع نہ سہی، اطمینان بخش تعریف بھی پیش کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔

اگر ہم یہ کہہ دیں کہ جرأتؔ کے عشق کا تعلق خارجی عمل سے ہے۔ داخلیت سے نہیں تو بات آدھی تہائی بیان ہوگی۔ خالص جسمانی اور وقتی خواہش میں بھی کچھ نہ کچھ داخلیت تو آ ہی جاتی ہے ——— داخلیت صرف عضویاتی معنوں میں نہیں۔ بلکہ ان معنوں میں بھی کہ آدمی کو اپنی جذباتی اور ذہنی ہلچل کا تھوڑا بہت شعور پیدا ہو۔ داخلیت تو جرأت کے بہت سے خارجی شعروں میں بھی موجود ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ داخلیت ہے کس قسم کی۔ ایک عشق تو وہ ہوتا ہے کہ چاہے آدمی اس پر دن میں دو منٹ صرف کرے۔ لیکن وہ دوسری سرگرمیوں پر بھی اثر انداز ہو، دوسری سرگرمیاں عشق پر اثر انداز ہوں۔ اور عشق کی بدولت آدمی کا خارجی اور داخلی رویّہ مکمل طور سے بدلنا شروع ہو جائے۔ دوسرا عشق وہ ہے کہ چاہے آدمی دن بھر اسی فکر میں پڑا رہے۔ لیکن عشق کا دوسری سرگرمیوں سے کوئی داخلی علاقہ پیدا نہ ہونے پائے۔ اور عشق آدمی کی شخصیت کے صرف ایک حصّے میں محدود ہو کے رہ جائے۔ جرأت کے عشق میں اسی انداز کی داخلیت ہے

مجھے اس سے انکار نہیں کہ جرأتؔ نے جسمانی خواہش کا اظہار بڑی صحت مندی کے ساتھ، بڑی صاف دلی کے ساتھ (بلکہ آپ چاہیں

تو معصومیت کے ساتھ بھی کیا ہے۔

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا　　چنپئی رنگ اور بدن اُس کا وہ گدرایا ہوا

گر وہ ہاتھ آئے تو زانو پہ بٹھائے رکھیے　　لب سے لب سینے سے سینے کو سٹائے رکھیے

بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کثرتِ شوق　　آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھیے

بیٹھ آ وصل میں اک لطف اُٹھانے دے مجھے　　اب ترے پاؤں پڑوں ہاتھ لگانے دے مجھے

ایک شب ساتھ اُس کے گر سونا میسر ہو تو ہائے　　شام سے لے تا سحر کیا کیا چمٹ کر سوئیے

تم تو رُوٹھے ہی رہے اور چلی وصل کی رات　　لو گلہ بخشیے مل جائیے اور سو رہیے

صرف یہی نہیں کہ وہ اپنی لذت یا ذاتی تسکین ہی چاہتے ہوں۔ جنسی معاملات میں اُن کی صحت مندی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ محبوب سے بھی جسمانی جواب کی آرزو رکھتے ہیں۔

لب اُس لب سے ملاتا ہوں تو بس یہ دل میں آتا ہے　　جو لذت اُس کو بھی مل جاوے کچھ تو کیا مزا ہووے

ہووے کس منہ سے بیاں وہ کہ دمِ بوس و کنار　　کسمسا کر جس ادا سے وہ بھرے ہے سسکی

اور جسمانی ہم آہنگی سے جو جذباتی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور جسمانی خواہش کی تکمیل جس طرح پیار بن جاتی ہے۔ اس کا بھی انہیں تھوڑا سا احساس ہے۔

یاد آتا ہے یہ کہنا جب تو اُڑ جاتی ہے نیند
اپنی ہٹ تو رکھ چکے لو اب تو ہٹ کے سوئیے

لیکن ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک بات یاد رکھنی چاہیے۔ جب عشق زندگی کی دوسری سرگرمیوں سے بالکل الگ اور شخصیت کے ایک کونے میں بند رہ جائے تو کامیابی اور ناکامی دونوں کی خاص شکلیں بن جاتی ہیں۔ محرومی کی صورت میں آدمی یا تو رونے جھینکنے بیٹھ جاتا ہے یا پھر دا سوخت پر اُتر آتا ہے (جس کی جرأت کی شاعری میں خاصی کثرت ہے)

لگا دیں گے دل ایسے سے کہ تم بھی رشک کھاؤ گے
یہ سُن لو تم کہ ہے ڈھب یاد ہم کو بھی جلانے کا

یہ تو ہوئی محرومی، کامیابی کا حال یہ ہے کہ اس قسم کا عشق اپنا اظہار خارجی عمل میں ضرور کرنا چاہتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جسمانی تسکین کی طلب نہ رکھنا کوئی فخر کی بات ہے۔ اس طرح کے عشق میں تو اور بھی سڑاند ہوتی ہے۔ لیکن اگر عشق عضویاتی تحریک کے علاوہ نفسیاتی تحریک بھی ہے تو اس میں کامیابی کی شکلیں اتنی محدود نہیں ہونی چاہئیں۔ اگر جسمانی تسکین سے بے نیاز ہونا شرم کی بات ہے۔ تو جبلت کو ارتفاع دینے کی صلاحیت سے محروم ہونا بھی کچھ ایسی قابل قدر چیز نہیں۔ جرأت کے یہاں جسمانی تسکین کو ایسی مرکزیت حاصل ہو گئی ہے۔ اُن کا عشق بڑی جلدی للچاہٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور منہ سے رال ٹپکنے لگتی ہے۔

مہ رُخسار نظر آتا ہے یوں خال سے خوب
کہ لگا دیجئے ہونٹ اپنا ترے گال سے خوب

رنگ پہ چہرے کے ہے کیا ہی جوانی کی تپک
اور بھرے گالوں پہ جی بوسے کو کیا للچائے ہے

پھر اس عشق اور شاعری کے لیے سراپا کی بھی ایک خاص اہمیت ہے اگر آدمی کو محبوب کے حسن یا اُس کی شخصیت کا احساس ہی نہ رہے اور وہ ہر وقت اپنے عاشقانہ جذبات ہی سے اُلجھتا رہے تو میں اسے بھی کوئی بہت بڑا عشق نہیں سمجھتا۔ لیکن جرأت کو تو عاشق ہونے کے لیے گداز جسم اور اُبھری ہوئی گات چاہیئے۔ انہیں محبوب کی تلاش نہیں ہوتی بلکہ چند مقررہ جسمانی خصوصیات کی۔ اُن کے یہاں محبوب کے حسن پر غور و خوض اور تفکر نہیں ملتا جس کی مدد سے اس قسم کے فقرے پیدا ہوتے ہیں :۔

HER BEAUTY LIKE A TIGHTENED BOW (YEATS)

اُن کے یہاں اس تفکر کے بجائے ایک چٹخارہ ہے، بلکہ ہونٹ چاٹنے کا انداز، جہاں انہیں اپنی مطلوبہ اشیاء نظر آئیں اور انہوں نے ران پر ہاتھ مار کے داد دی، جیسے محبوب نے اُبھری ہوئی گات نہیں دکھائی بلکہ کوئی لطیفہ سنایا ہے۔

ابرو ہیں چڑھے بکھرے ہیں بال اُبھری ہوئی گات   سچ دیکھو یہ کیا اُس نے دھواں دار نکالی

اک چاند کی جھلک سی جو پردے کی اوٹ ہے   کیونکر اُدھر نہ دیکھوں کہ دل لوٹ پوٹ ہے

اُس کی محرم پہ یہ کہتی ہے بُنت نرگس کی   دیکھے کوئی کہ لگی آنکھیں ہیں یاں کس کس کی

قد ہے قیامت اور غضب گات آپ کی   جو بات ہے سو قہر قیامت ہے آپ کی

سینہ کوبی کے سوا کچھ اور بن آتا نہیں   یاد جب ہم کو وہ کچھ اُبھری ہوئی گات آئے ہے

مکھڑا ہی فقط اس کا نہیں نام خدا گرم   کافر وہ سراپا ہے بھبوکا سا بلا گرم

بے قراری ہیں جوں موج نہ کیوں کر ہو کہ جب   لہر دریا کی طرح یار کا جوبن مارے

گو اس آخری شعر میں محبوب کی دل کشی کا مجموعی تاثر آگیا ہے۔ لیکن جرأت کی ذہنیت کو سمجھنے کے لیے دو شعروں کا مقابلہ کیجئے۔ جرأت کہتے ہیں:۔

کیا جانے کیا وہ اُس میں ہے لوٹے ہے اُس پہ جی
یوں اور کیا جہان میں کوئی حسین نہیں

فراق صاحب نے کہا ہے:۔

کوئی یوں ہی سا تھا جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی نور کا پتلا نہ کوئی زہرہ جبیں

”مٹا ڈالنے کا“ مطلب ہے ساری زندگی پر اثر انداز ہونا، اور ”جی لوٹنے“ سے مراد ہے صرف جنسی کشش۔ مٹا ڈالنے میں سراپا کا کوئی دخل نہیں، اور جی لوٹتا ہے محبوب کا سراپا دیکھ کر۔ کیونکہ دوسرے حسینوں سے اُس کا مقابلہ ہو رہا ہے۔

ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ جرأت کے عشق میں جسمانی تسکین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بھی نہ سہی تو کسی نہ کسی قسم کے خارجی تعلقات اور خارجی تحریکات کے بغیر اس عشق میں آسودگی نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ عشق رُوح کی پکار سے زیادہ جسم کی پکار ہے۔ پھر چونکہ یہ عشق شخصیت کے باقی حصّوں کو متاثر نہیں کرتا، اس لیے جنسی مطالبات پُورے ہوئے بغیر اس میں تسکین کا کوئی پہلو نہیں نکل سکتا۔ یہاں لگاؤ کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی لگاؤ کا خارجی اظہار۔

نے خط نہ کتابت ہے نہ پیغام زبانی   اس دل کی تسلی کی کوئی بات نہیں اب

ہمیں دیکھے سے وہ جیتا تھا اور ہم اُس پہ مرتے تھے   یہی راتیں تھیں اور باتیں تھیں وہ دن کیا گزرتے تھے

ہے وقت خوش اُنہوں کا کیا لطف ہم دگر ہیں   دل جن کے مل رہے ہیں اور پاس پاس گھر ہیں

یہ کہنا تو جرأت کے ساتھ بے انصافی ہے کہ وہ عشق میں جسمانی تعلقات سے آگے بڑھتے ہی نہیں۔ لیکن عشق کے خارجی اظہار پر اتنا زور دینے کی وجہ سے اُن کا لگاؤ، لگاوٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جرأت میر کے معنوں میں عاشق نہیں تھے بلکہ عاشق تن۔ وہ یکے بعد دیگرے مختلف محبوبوں سے سچی محبت کرتے چلتے ہیں، اور اپنی عاشقانہ زندگی کے ہر لمحے کو ایک دوسرے سے الگ رکھتے ہیں۔ انہیں محبوبوں کی اَن گنت ادائیں یاد ہیں، لیکن محبوب ایک بھی یاد نہیں۔ کوئی ہستی اُن کے دل میں اس طرح گھر نہیں کر سکی کہ اُن کی کائنات زیر و زبر ہو جائے۔ وہ محبوب سے جسمانی اور جذباتی ہم آہنگی تو چاہتے ہیں۔ لیکن جنسی تعلقات سے باہر نکل کر عام انسانی تعلقات والی ہم آہنگی کے خواہاں نہیں

ہوتے۔ YEATS نے اپنی محبوبہ کی بے مہری کا گلہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ محبت تو خیر میں اور بھی کر لوں گا۔ لیکن یہ روزمرہ کی زندگی میں جو ایک دوسرے کے ساتھ چھوٹی چھوٹی مہربانیاں ہوتی ہیں، یہ کہاں اور ملیں گی؟ جرأت اپنے عشق میں ایسی ہمہ گیر یک جہتی کے طالب نہیں ہوتے۔ اُنہیں تو عشق کی ایک طلب سی ہے۔ اور وہ بہرحال کہیں نہ کہیں پوری کرنی ہے اُنہیں تو خدا نے مزے دار جیوڑا دیا تھا، اور جی کی مزے داریاں انہیں ہر صورت دکھائی ہیں، اُن کے لیے عشق ایسا تجربہ نہیں جس کے بعد انہیں اپنی ساری زندگی کو از سرِ نو ترتیب دینا پڑے۔ انہیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ عشق کیا چیز ہے اور وہ اپنے آپ کو اس سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار پاتے ہیں۔ چنانچہ عشق اُن کے لیے کوئی رحمانی یا شیطانی قوت نہیں بلکہ محض من چلا پن ہے۔

لگا جاتا ہے جرأت اُس بُتِ خونخوار سے سچ ہے   وہی دم عشق کا مارے جو ایسا من چلا ہووے
ازل سے گرفتار پیدا ہوا ہے   یہ دل کیا مزے دار پیدا ہوا ہے

پوچھتے کیا ہو کہ اب اُلفت کسی کے ساتھ ہے   آہ یہ دل کا مزا تو اپنے جی کے ساتھ ہے

ان مزے داریوں نے محبوب کے ساتھ جرأت کے رویّے کو بھی عجب رنگ دے دیا ہے۔ محبوب کی بے اعتنائی پر شرم تو اور شاعروں نے بھی دلائی ہے اور کئی پہلوؤں سے۔

کیا کیا آپ نے کہ حسرت سے
نہ ملے، حسن کا غرور کیا

فراقؔ صاحب تو محبوب کے ساتھ ناز بھی کر لیتے ہیں:۔

کل پھر عشق نہ روٹھ سکے گا
آج منا لے آج منا لے

لیکن یہ وسیع، قوی اور رچی ہوئی شخصیت کا اپنے اوپر اعتماد ہے جو محبوب سے بھی ٹکر لے جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جرأت تو اپنی جنسی خواہش ہی کو اس بُری طرح حق بجانب سمجھتے ہیں۔ کہ اس کے مقابلے میں زندگی کے اور پہلوؤں کو خاطر ہی میں نہیں لاتے

حیف ہے اُس کے ہونے پر جو یاد کرو تم غیر کو جان   جرأت میں جو نہیں سو ایسی بات وہ کیا ہے اور کہیں

محو دیدار اپنا جیسا کر دیا تو نے مجھے   میں بھی جرأت ہوں کروں یوں تجھ کو حیراں تو سہی

دوڑ دوڑ آنے سے جرأت کے کدورت کیا کرے   اس بچارے کی طبیعت تم پہ ہے آئی ہوئی

جب یہ من چلا پن اپنی خود اعتمادی میں حد سے گزرنے لگتا ہے تو محبت اچھی خاصی پہلوانی بن جاتی ہے اور اپنی کامرانیوں کا غرور اوچھا پن اور ابتذال پیدا کر دیتا ہے ـــــ ساتھ ساتھ شاعری میں بھی۔

عاشقی کے فن میں جرأت آج خم ٹھوکوں ہوں میں
سامنے ہو جائے اب جو مرد ہو میدان کا

چنانچہ جب اُن کی عزت کو ٹھیس لگتی ہے تو اُس وقت بھی انسانی وقار یا خودداری کے سوال سے زیادہ رنگ یہ ہوتا ہے جیسے اُن کی اُستادی بلکہ اُن کی جنسی خواہش کی توہین کی گئی ہو۔

آج اس طرح سے جھڑکا کہ پھر اُس سے جا کر　　کچھ بھی غیرت ہو جو دل کو تو نہ زنہار ملے

منہ میں جو آئے ہے سو کہتا ہے　　مجھ کو کیا بے زبان پایا ہے

اب ذرا اس "عاشقی کے فن" کو بھی دیکھ لیجیے جس کے وہ ماہر ہیں۔ اصل میں جرأت عاشقی کے فن سے نہیں بلکہ اپنی طبیعت سے واقف ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ عشق لڑانے کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ اگر محبوب ہاتھ آ گیا۔ تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے، اپنی اُستادی مسلّم اور اگر ہاتھ نہ آیا تو جی کی مزے داریاں سلامت رہیں۔ آگے دیکھیں گے۔ اس کاروائی کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی نتائج سے بے نیاز ہو کر عشق لڑا سکتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں پہلے سے معلوم ہے کہ رنج دو چار دن سے زیادہ نہیں چلتا۔ چنانچہ اُنہوں نے پہلے ہی سے انتظام کر لیا کہ عشق زندگی کا ایک گراں بار تجربہ نہ بننے پائے۔ جرأت کی اصل پہلوانی یہ ہے کہ انہیں درد سے بچنے کے لیے داؤ پیچ معلوم ہیں وہ محبت کے میدان میں بڑی آسانی سے خم ٹھوک سکتے ہیں۔ کیونکہ محبت تو اُن کی کاروائی کے ہاتھوں ختم ہی ہو جاتی ہے اب انہیں کیسے ہرایا جا سکتا ہے۔

حسن اے جان نہیں رہنے کا　　پھر یہ احسان نہیں رہنے کا
ہجر کے غم سے نہ گھبرا جرأت　　اتنا حیران نہیں رہنے کا

محبت کا ختم ہو جانا تو الگ، یہ کاروائی تو محبت کو ہنسی مذاق اور دل لگی میں بدل دیتی ہے۔

پر وہ مت منہ سے اٹھانا زنہار　　مجھ میں اوسان نہیں رہنے کا
آن کر اپنی امانت لے جا　　پھر تجھے دھیان نہیں رہنے کا

پتہ نہیں جرأت نے ساتھ ساتھ یہ بھی کیوں نہ کہہ دیا کہ

آن کر پان تو کھا لے جلدی　　ورنہ پھر پان نہیں رہنے کا

جو چیز اُن کی محبت، اُن کی شخصیت، اُن کی شاعری کو بڑا بننے سے روکتی ہے، وہ یہ کہ یہاں درد نہیں، ٹیس اور کسک ہے۔ چونکہ اُس زمانے میں تصوف کا رواج تھا۔ پھر وہ میرؔ کے رنگ میں کہنے کی کوشش وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں، اس لیے وہ نظریاتی طور پر اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ دل میں درد ہو۔

گرچہ ہر قالب میں جرأت صورتیں ڈھلتی رہیں
پر بنا جو درد کا پتلا وہی انساں ہوا

لیکن اس احساس کے باوجود وہ درد سے گھبراتے ہیں۔ وقتی رنج تو وہ سہار لیتے ہیں، میرؔ کی پیروی کرنے کی فکر میں آخر

انہوں نے زار نالی کے مضامین باندھے ہی ہیں۔ اور میرؔ نے اُن کی طبیعت کی خاصی اصلاح کی ہے اور کئی جگہ اُن کا لہجہ بدلا ہے

رو دئے ہے بات بات پہ جرأت
ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں

لیکن وقتاً فوقتاً دل گداز ہو جانے کے باوجود اُن کے یہاں وہ "اپنا غم" نہیں ملتا جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا تھا۔ رنج ایک وقتی چیز ہے۔ درد میں ایک تسلسل اور ایک استقلال ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ درد صرف محرومی اور ناکامی سے ہی پیدا ہو۔ جرأت کے یہاں درد محض ناکامی کا احساس ہے۔ اُن کی خوشی یا رنج کا انحصار محبوب کے ملنے یا نہ ملنے پر ہے۔

دل اب ایسا کہیں آیا ہے کہ جی جانے ہے   یہ قلق ہم نے اٹھایا ہے کہ جی جانے ہے
کھوئے جاتے ہیں ہم اب دیکھ کے اُسکے حرکات   ہم نے محبوب یہ پایا ہے کہ جی جانے ہے

کسی خاص محرومی کے وقت اُنہیں قلق تو ہوتا ہے، لیکن محرومی کو سمجھنے میں جو اذیت پیدا ہوتی ہے اس سے وہ جان چراتے ہیں وہ وقتی رنج کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو میرؔ کی طرح اپنے دکھوں سے الگ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے دُکھ کی کہانی تو سنا سکتے ہیں لیکن اس کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی حالت بیان کر سکتے ہیں، اس حالت پر معصومانہ حیرت کا اظہار بھی کر لیتے ہیں لیکن اس حالت کے اندر ڈوبنے اور اس کی تفتیش کرنے کی خواہش انہیں نہیں ہوتی۔

آرام نہ ہو دل کو تو اسے یار کریں کیا   پھر پھر کے یہیں آتے ہیں ناچار کریں کیا
تماشا ہے کہ پاس اپنے وہ بٹھلاتا نہیں ہم کو   اور اُس سے گر جدا بیٹھیں تو پھر بیٹھا نہیں جاتا
ترے بن دیکھے جرأت کی یہ حالت ہو گئی غم سے   کہ اپنے سے تو اس کو بھر نظر دیکھا نہیں جاتا

اُن کے اندر محبت کے خلاف ایسی مدافعت نہیں جیسی حالیؔ میں ہے۔ انہیں محبت سو فی صدی قبول ہے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہے کہ اس میں تھوڑے بہت دُکھ بھی جھیلنے پڑیں گے۔ اوکھلی میں سر دیا تو چوٹوں کا کیا ڈر۔ چنانچہ نہ تو اُن کے اندر وہ کشمکش پیدا ہوتی ہے جو حالیؔ کے یہاں ہے۔ نہ وہ تضاد اور کھینچا تانی جو میرؔ میں ہے (میرؔ کے درد کا ایک سبب یہ اُلجھن ہے کہ آخر عشق بیک وقت رحمت اور عذاب کیوں ہے) چونکہ وہ فنِ عاشقی کے ماہر، گرگِ باراں دیدہ ہیں۔ انہیں سب حالات کا پہلے سے علم ہے وہ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کیا کرنا ہے اس لیے وہ درد کو اُٹھنے ہی نہیں دیتے۔

جو کرو گے ظلم تم، ہم سب سہیں گے کیا کریں   تم بنے اس کام کے اور ہم بنے اُس کام کے

پھرتے ہیں دن کو کُو بہ کُو گذرے ہے شب کراہتے   سہتے یہ کیوں خرابیاں گر نہ کسی کو چاہتے

اپنی توقع کے مطابق انہیں کبھی کبھی محرومی اور ناکامی یا محبوب کی بے اعتنائی کے سبب دکھ ہوتا ہے۔ کلیجے میں ہوک اُٹھتی ہے اور وہ اپنے خلوص، اپنی حق گوئی کے تقاضے سے مجبور ہو کر اپنی پہلوانی کے باوجود کراہ لیتے ہیں۔

کیا عالم آپ کا ہے میاں جرأت ان دنوں   عالم سے چھٹ گئی ہے ملاقات آپ کی

جب مرے پاس سے اٹھ کر وہ کہیں جا بیٹھے ہے　　جی میں گزرے ہے کہ اے کاش وہیں ہوتے ہم

ہم نے ہر چند کہا پر نہ وہ آیا یاں تک　　کیا کہیں بات بنا کر دل مجبور سے ہم

بعض دفعہ تو وہ اپنی کسک میں بھی ایک طرب کا پہلو پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ وہ بات نہیں کہ غم و نشاط گھل مل کر ایک ہو جائیں بلکہ ایسا ہے جیسے کسی کو سب سے الگ تھلگ منہ لٹکائے بیٹھا دیکھ کر اس کا غم غلط کرنے کے لیے اسے چھیڑتے ہوں۔

واں سے اول دل بے تاب تو کب آتا ہے
اور جو آتا ہے تو سو جا پہ مچل کر آتا

اس کے مقابلے میں داغ کا یہ شعر دیکھیے:۔

داغ وارفتہ کو ہم آج ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

جرأت نے محبوب کی کم ظرفی کا ذکر ایک جگہ یوں کیا ہے:۔

کل جو رونے پر مرے ٹک دھیان اس کا پڑ گیا
ہنس کے یوں کہنے لگا کچھ آنکھ میں کیا پڑ گیا

اس وقت تو خیر محبوب بچارے دل کے ساتھ زیادتی کر رہا تھا۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جرأت کے درد کی نوعیت اسی قسم کی ہے جیسے آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہو۔ یعنی ایک ایسا واقعہ جو تھوڑی دیر تکلیف دے کر پھر تکلیف دور ہو جاتی ہے۔ جرأت اس تکلیف سے اتنا گھبراتے ہیں کہ ایک جگہ تو انہوں نے بقول میر "کہہ کے سپردم بتو مایۂ خویش را" والا معاملہ کر دیا ہے۔

آوارہ در بدر ہوں میں جرأت بقول میر
خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

اصل میں جرأت کا نقص یہ ہے کہ وہ دو قسم کی شاعری کے درمیان بٹے ہوئے ہیں۔ ایک تو لکھنوی شاعری، دوسرے میر کی شاعری۔ اپنی ظریف طبعی کے باعث اور کچھ ماحول کے اثر سے انہوں نے اس طرح کی خیال آرائیاں بھی کی ہیں جہاں الفاظ یا نکتوں کو جذبات سے الگ کر کے ان سے کھیلا جاتا ہے۔ مثلاً

ہے یہ عالم چشم ساقی پر کہ وقت مے خوری
چشم بینا حق سے چاہے ہے کباب نرگسی

لیکن ان کی طبیعت میں انشا کا سا مسخرہ پن نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس رنگ میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کچھ میر کی پیروی کے شوق نے انہیں ادھر ٹھیک طرح چلنے نہ دیا۔ لیکن دوسری طرف لکھنوی رنگ نے میر کا رنگ خراب کیا۔ پتہ نہیں کہ اگر وہ لکھنؤ کے بجائے دلی میں ہوتے تو کس قسم کی شاعری کرتے، ان کے حزن میں وسعت اور گہرائی آ جاتی یا ان کا طربیہ انداز بھی مرجھا کے رہ جاتا۔ فی الحال صورت یہ ہے کہ وہ دیکھتے ہیں "آتش رخوں کے حسن کا بازار گرم ہے" اور اپنی گرمی دکھانا چاہتے ہیں۔ عشق جب خارجی کامیابی کی راہیں [illegible] پڑ گئی ہے

کہ وہ وقتاً فوقتاً دکھ جھیلنے کے باوجود دُکھ سے گھبراتے ہیں۔ اور اسے جی کا جنجال سمجھتے ہیں۔ جس عشق میں مصیبت اٹھانی پڑے۔ اس کے بعد انہیں افسوس ہوتا ہے۔ کہ آخر اس مصیبت میں ہی کیوں پڑے۔ بارِ غم کے نیچے تو میرؔ بھی پس پس گئے ہیں۔ مگر جراتؔ کے لیے کامیابی اور ناکامی کا فرق بہت معنے رکھتا ہے۔ پہلوانی کی ٹریننگ کے باوجود انہیں اپنے اس کچے پن کا احساس ہے۔

ہر روز کے جلنے کو کہاں سے جگر آوے

[اس کے مقابلے میں میرؔ کا شعر بھی یاد رکھیے :۔

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

میرؔ کے لیے عشق ایک "زندگی" ہے، جراتؔ کے لیے ایک الجھن ۔]

جراتؔ بلند مرتبۂ عشق ہے بہت
ہم پست ہمتی سے ابھی ہیں دبے دبے

مارا ہے تعلّق طبیعت نے ہمیں

جی کے لگ جانے کا کچھ پایا دلا تو نے مزہ   ہم نہ کہتے تھے بُری ہوتی ہے دیوانے لگی

جہاں جا بیٹھتے ہو دل نہیں لگتا میاں جراتؔ   کہو اب تو اُٹھائی کیفیت کچھ دل لگانے کی

لگایا غم یہ جوانی میں کیوں میاں جراتؔ   ابھی تو سیر تماشے کے تھے تمہارے دن

سختیاں دردِ محبت کی نہ پوچھو ہے ہے   جی ہی جانے ہے جو کچھ دل نے اذیت پائی

ملاؤں آنکھ ٹک اس سے تو سرِ تن سے جدا ہووے   کہاں لاکر پھنسایا اے ترے دل کا بُرا ہووے

جراتؔ سے درد تو واقعی برداشت نہیں ہوتا۔ لیکن جن حدوں کے اندر رہ کر وہ عشق کرتے ہیں اُن کے اندر رہتے ہوئے بھی اور اپنے کھلاڑی پن کے باوجود اپنے من چلے پن کے باوجود بہت سی جگہ جسمانی لگن کی شدّت اور خلوص کے باعث اُن کی شاعری میں کئی جگہ لہک اور مہک، والہانہ پن اور سرشاری بلکہ معصومیت تک آگئی ہے۔

کہاں آ کے کہاں بیٹھے سمجھتے کچھ نہیں جراتؔ   یہ ہو جاتی ہے ہم کو بیخودی سی واں سے گھر آکر

مری وحشت سے رُک کر دل ہی دل میں یوں وہ کہتا ہے   الٰہی لگ گئے کیوں ایسے دیوانے کو پیارے ہم

کیونکہ تم پاس سے ہم جائیں بھلا اور کہیں   جی تو لگتا ہی نہیں یاں کے سوا اور کہیں

کوچۂ جاناں سے جاتے ہیں پہ جا سکتے نہیں   گو اٹھاتے ہیں قدم پہ دل اٹھا سکتے نہیں

جی میں سو بار آئے ہے جرأت نہ ملیئے یار سے   یہ سمجھ کر دل میں کچھ سوگند کھا سکتے نہیں

اگر محض جنسی تسکین ہی کا سوال ہو اور معاملہ اس سے آگے نہ بڑھے تو اور بات ہے۔ لیکن اگر آدمی کے دل میں جسم کا احترام نہ ہی جسم اور جسمانی خواہش کی تھوڑی بہت قدر ہو رہا ہے وہ ابھری ہوئی گات ہی کی قدر سہی، تو یہ کسی نہ کسی حد تک انسانیت کی قدر بن جاتی ہے اور عیش پرستی میں بھی تھوڑا سا ارتفاع آجاتا ہے ——— لگاوٹ انسانی لگاؤ میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ جرأت بھی (غالب میر کے سہارے) اس طرف تھوڑا سا بڑھے ہیں۔ گو حسرت موہانی کے برابر کبھی نہیں پہنچے۔

مضطرب ہو کے دل اُس شوخ کا بھی دھڑکے ہے   آ کے بیٹھے ہے کبھی پاس جو مجھ مضطر کے

یا لاگ دلوں کی تھی بہم دم بدم افزوں   یا جی کی رکاوٹ ہے ادھر اور اُدھر بھی

جرأت کی زندگی میں دو چار لمحے ایسے بھی آئے ہیں جب یہ لگاؤ بڑھ کر محبوب کی قدر اور محبوب کے احترام کی شکل اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ مگر یہ آثار ہی رہے۔ ان کی نشوونما نہ ہونے پائی۔

ہوئی اور یاں تم سے جرأت تو کیا   مگر تم کو آ کر خفا کر چلے

یوں وہ آنکھوں میں کہے ہے جب کہ روتا ہے کوئی   پھوٹ پھوٹ اتنا نہ رو بدنام ہوتا ہے کوئی

کہا ہے میں نے تجھے کب کہ غیر کے پاس نہ بیٹھ   خدا کے واسطے مجھ پاس تو اُداس نہ بیٹھ

ایسے وقت اپنی جسمانی خواہش کے حق بجانب ہونے کا خیال بھی اُن کے دل سے نکل جاتا ہے اور وہ اپنے عاشقانہ تعلقات کو بھی عام انسانی تعلقات کے دائرے میں لانے کی تھوڑی بہت کوشش کرتے ہیں۔

جسے یاد اپنی لگایئے اُسے صاف دل سے بھلایئے   ٹک اِدھر تو آنکھ ملایئے یہی ہم سے قول و قرار تھا

کسی نے تیری خاطر خانہ ویراں کر دیا اپنا   بھلا تو بھی اُسے اے خانماں آباد جانے ہے

بھلا دیکھو تو ہم تم ایک ہی بستی میں بستے ہیں   سو تس پہ یہ غضب ہے دیکھنے کو بھی ترستے ہیں

لیکن اس آخری شعر میں انسانی ہستی کی پیچیدگیوں پر وہ استعجاب آمیز بیچارگی کا احساس نہیں آنے پایا جو میرؔ کے شعر میں ہے۔

وجہ بے گانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

جرأتؔ کے شعر میں تو صرف محبوب کی بے گانگی کا گلہ ہے۔ بہر صورت اُن کے یہاں بھی محبوب کے جسم نہیں بلکہ اُس کی شخصیت کی سچی طلب دو ایک جگہ ملتی ہے۔

کو درِ یار پہ پھر پھر کے نہ آتے جرأتؔ
در بدر روتے پڑے پھرتے جدھر جاتے ہم

مگر انہیں محبوب سے ایک منفی قسم کا فائدہ پہنچا ہے، یعنی وہ سرگشتہ نہیں ہونے پائے۔ آتشؔ کو محبوب کی بے رُخی میں بھی ایک مثبت چیز حاصل ہوئی ہے۔ اسی لیے آتشؔ کے شعر میں ایک بے پایاں سکون ہے۔ جس نے اضطراب کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ ایک ایسی ٹھنڈک ہے جو جرأتؔ کے شعر کو چھو بھی نہیں گئی۔

دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا
خاک پہ سنگِ درِ یار نے سونے نہ دیا

اچھا، اب جرأتؔ کی طرف سے محبوب کا رویہ دیکھئے کہ انہیں اپنی محبت کا جواب کیسا ملتا ہے۔ عام طور سے جرأتؔ کا محبوب اُن سے چھیڑ اور لگاوٹ کی باتیں کرتا ہے جو بے رُخی اور بے اعتنائی سے خالی ہیں۔ جرأتؔ کو دو انسانی ہستیوں کی درمیانی خلیج کا تجربہ نہ ہونے کے برابر ہے —— یعنی بعض وقت کی محرومی کے باوجود۔

دیکھ ہم خاک نشینوں کو وہ بولا کہ کہیں   اور جاگہ نہیں کیا یہ جو یہیں بیٹھتے ہیں
دیکھئے منت سے مرا کوئی بٹھانا جرأتؔ   اور اُس شوخ کا کہنا کہ نہیں بیٹھتے ہیں

میں یہ نظروں میں سبک ہوں کہ دمِ گریہ وہ شوخ   ہنس کے چھیڑے ہے کہ لو بس نہ کرو دل بھاری

کچھ لگاوٹ کے سبب اور نہیں یہ جرأتؔ   یہ وہ چاہے ہے کہ اس کو بھی لگائے رکھیے

لیکن جب یہ لگاوٹ لگاؤ میں بدلتی ہے تو محبوب رفاقت کا حق ادا کر دیتا ہے۔ محبوب کے معاملے میں بھی یہ ربط اور رفاقت کا احساس جسمانی آسودگی سے پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ انسانی تعلقات کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ فراقؔ صاحب نے ایک دفعہ اس تعجب کا اظہار کیا تھا کہ بعض شاعر محبوب کی بے اعتنائی کا رونا تو روتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں محبوب خود اُن پر عاشق ہو جائے تو کیا ہو؟ لیکن جرأتؔ کو ان شاعروں کی طرح، اس قسم کی پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی۔ وہ عشق لڑانا بھی جانتے ہیں اور عشق وصول کرنا بھی۔ کیونکہ اُن کے یہاں

عشق کا سارا کاروبار جسمانی مفاہمت پر منحصر ہے۔ چنانچہ انہیں محبوب کے لگاؤ کا احساس ہے اور اس کی قدر بھی —— بلکہ انہیں عشق میں سب سے بڑی ضرورت اسی چیز کی ہوتی ہے

کیا جانیے کم بخت نے کیا ہم پہ کیا سحر   جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

حیرت ہے کہ کل اُس نے کہی کان میں اپنے   وہ بات کہ مطلق جو نہ تھی دھیان میں اپنے

کئی دن بعد جانے پر ذرا جس سے کہ الفت ہو   غضب ہے اُس کا یہ کہنا کہ کتنے بے مروت ہو

رُوٹھے اُس شوخ ستم گر سے تو اُس نے ہم کو   ان دھڑکوں سے منایا ہے کہ جی جانے ہے

کامیاب عشق میں محبوب سے اتنی ہم آہنگی اور ربط حاصل کر لینے کے بعد بھی، عشق جرأت کے لیے انسانی زندگی یا کائنات سے ہم آہنگی حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں بنتا۔ یہ ربط صرف ایک آدمی سے حاصل ہوتا ہے اور وہ بھی اپنی اپنی شخصیتوں کے دو چار گوشوں میں۔ محبوب اُن کے رُوٹھ جانے سے تو ڈرتا ہے اور اُن کے کان میں ایسی بات بھی کہہ دیتا ہے جو اُن کے دھیان میں بھی نہ آئی تھی۔ لیکن یہ محبت کرنے والا محبوب اُن کے لیے کبھی وہ چیز نہیں بنتا جو فراق صاحب کا محبوب اُن کے لیے بن گیا ہے ——

تو دن کی طرح حسیں رات کی طرح پُرکیف
جہاں بھی جائے بہ اندازِ مہر و مہ جائے

جس عشق پر بسیط انسانی زندگی اور کائنات کا پَرتو نہ پڑے، وہ اُس سے زیادہ ہو بھی کیا سکتا ہے؟ جو آدمی محبوب کی اداؤں کو گنتا رہ جائے اور دوسری چیزیں چھوڑ دے، پورے محبوب کو بھی نہ دیکھ سکے۔ وہ اس سے بڑی شاعری کیا کر سکتا ہے؟ یوں تو جرأت نے سر سے پیر تک محبوب کے سارے دل کش اعضا کا نام لے دیا۔ لیکن وہ ہمیں اپنا محبوب تک نہ دکھا سکے۔ معاشقے کی تفصیلات بیان کرنے کے باوجود وہ عشقیہ تعلقات کی پیچیدگیوں سے دامن بچاتے رہے۔ انہیں ان پیچیدگیوں کا احساس تو ضرور ہوا۔ آخر پہلوانِ عشق تھے چنانچہ اس کا اشارہ انہوں نے کیا ہے ؎

دل دیئے مدت ہوئی ہے اب تلک لیکن مزاج
اُس بُتِ کافر کا کس کافر سے سمجھا جائے ہے

لیکن وہ اس الجھن میں نہیں پڑنا چاہتے۔ جب ایسی بات آتی ہے تو اُسے ہنس ہنسا کر صاف اُڑا جاتے ہیں۔ وہ تو بس یہ دیکھتے ہیں کہ محبوب مل رہا ہے یا نہیں مل رہا، اور کس طرح۔ یہ "کس طرح" ہی اصل میں اُن کی شاعری ہے لیکن یہ سوالات کہ محبوب کیوں مل رہا ہے اور کیوں نہیں مل رہا۔ خوش وقتی میں مخل ہوتے ہیں، یہ باتیں یار لوگ معلوم نہیں کرنا چاہتے۔ لہٰذا جرأت کنی کاٹ جاتے ہیں۔ محبوب مل گیا۔ تو سبحان اللہ نہ ملا تو خیر صلا۔ اور اگر عشق میں مرنے کی نوبت آ گئی تو بھی ؎

دیا اُس کے در پہ جو جرأت نے جی   تو الحمد للہ محنت ٹھکانے لگی

غرض انجام ہر طرح نقشے کے مطابق ہونا چاہیے۔ کیونکہ انہیں تو ایک کردار نبھانا ہے۔ کامیابی میں بھی اور محرومی میں بھی۔ بہرحال خاتمہ اس طرح ہونا چاہیے کہ یار دوست بھی اس کی صحیح نوعیت پہچان کر اطمینان کے ساتھ الحمد للہ کہہ سکیں۔ چونکہ جرأت کی مکمل سوانح عمری تو میسر نہیں۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی ذہنی دلچسپیاں محدود تھیں یا وسیع۔ یوں ہونے کو انہوں نے سیاست پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

سمجھے نہ امیر کوئی ان کو نہ وزیر انگریزوں کے ہاتھ اک قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے اسیر

پھر انہوں نے رسمی یا غیر رسمی طور پر کارداں، قفس وغیرہ کے مضامین بھی باندھے ہیں جن کی سیاسی تفسیریں کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان کی عشقیہ شاعری سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ اگر ان کی ذہنی دلچسپیاں محدود نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنی عشقیہ زندگی میں انہیں داخل نہیں ہونے دیا بلکہ یا تو اپنی شخصیت کا بہت بڑا حصہ عشق بازی کے حوالے کر دیا۔ ورنہ پھر عشق کو اپنی ہستی کے ایک الگ تھلگ گوشے میں بند کر دیا۔ چنانچہ ان کا عشق دوسری دلچسپیوں اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے بالکل اثر پذیر نہیں ہوا۔ اوپر سے ایک حرکت انہوں نے یہ کی کہ اپنے عشق کو الگ الگ لمحوں میں بانٹ دیا۔ ان کا عشق اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوا کہ وہ اسے ایک کل سمجھ کر کبھی نہیں دیکھ سکے۔ اجزا ہی سے الجھتے رہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو یہ فائدہ تو ضرور پہنچایا کہ ہماری شاعری چھوٹی چھوٹی اداؤں اور لمحاتی تاثرات کو بیان کرنا سیکھ گئی۔ لیکن جرأت میں اتنی قوت نہیں تھی کہ ان کا تخیل ان اداؤں کو پوری شخصیت کا نمائندہ بنا کے پیش کر سکتا۔ چنانچہ وہ تاثرات کے شاعر ہیں، تجربے کے شاعر نہیں، ان کا فن عکاسی ہے، خلاقی نہیں۔ اس لیے ان کا عشق عام تندرست آدمی کا عشق ہے اور ان کی عشقیہ شاعری کم سے کم عاشق مزاجوں میں ضرب المثل بن جانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔"

اختر شیرانی

آل احمد سرور

تقریباً بیس سال ہوئے جب میں کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ میں سائنس کا طالب علم تھا۔ مگر ادب سے دلچسپی زیادہ تھی۔ کلاس میں پروفیسر کیمیا اور طبیعات کے نادر موسے یا تجربات بیان کیا کرتے تھے۔ اور ہم پیچھے بیٹھے اردو کے شاعروں کا کلام پڑھتے یا ان کے حالات اور تذکرے دیکھتے۔ اس زمانے میں داغ کا کلام بڑا مزے دار معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی شوخی اور شرارت میں کچھ بازاری پن کا احساس ہوتا تھا۔ حسرت کی غزلیں زیادہ اچھی معلوم ہوتیں۔ اور جوش اور اختر شیرانی کی نظمیں۔ اس زمانے میں جنگل کی شہزادی۔ نامرادا، جوانی، دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے۔ تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے۔ تری تصویر سینے سے لگاؤں اور مرجاؤں، پڑھنا اور دوسروں کو سنانا میرا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ اختر کی سلمےٰ اس وقت ایک عجیب آسمانی مخلوق معلوم ہوتی اس کی تصویر کو سینے سے لگا کر مرجانا زندگی کا سب سے مقدس فرض نظر آتا ہے۔ اتنا اب بھی یاد ہے کہ جوش کی نظمیں ایک طوفان کی طرح بہالے جاتیں۔ مگر اختر کے اشعار میں ایک نشہ ہوتا تھا۔ ایک لذت ہوتی تھی۔ جو تھوڑی دیر کے لیے کسی اور دنیا میں پہنچا دیتی تھی۔

اور آج جب میں نے اختر شیرانی کے مجموعے نغمۂ حرم، اخترستان، لالۂ طور دیکھے تو مجھے وہ نشہ پھر یاد آگیا۔ نغمۂ حرم میں اختر کی اچھی نظمیں کم ہیں۔ دیہاتی لڑکی کا گیت۔ دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے۔ عورت، کلوپیٹرا، تاروں کی بستی۔ یہی اس مجموعے کی کائنات ہے۔ اختر دراصل ایک رومانی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری۔ ہماری جدید عشقیہ شاعری میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر عورتوں اور بچوں کے لیے نظمیں لکھتے وقت وہ بعض اخلاقی، سماجی اور ملی حقائق کے چکر میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ ان کے ایسے اشعار میں روانی اور دل کشی ہے۔ مگر جو بات اخترستان کی بیشتر نظموں میں ہے وہ نہ نغمۂ حرم میں ہے نہ لالۂ طور میں۔

او دیس سے آنے والے بتا۔ جہاں ریحانہ رہتی تھی۔ ایک حادثہ۔ سرزمین عشق، سلمیٰ، وادی گنگا میں ایک رات، انتظار، چودھویں سالگرہ کا تحفہ، ایک تصویر دیکھ کر۔ ایک نوجوان بت تراش کی آرزو۔ تاثراتِ نغمہ۔ دنیا کی بہاریں اختر کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ ان کے مطالعے سے اختر کی خوبیاں اور خامیاں ظاہر ہوجاتی ہیں۔ ان ہی میں وہ جوان۔ چنچل، شوخ اور مضطرب عشق ہے جو صرف حسن کا شیدائی نہیں پرستار بھی ہے۔ اس کی خاطر مرجانا چاہتا ہے۔ اور اس موت کو کیٹس کی طرح نعمت سمجھتا ہے۔ ان میں وہ شدید طوفانی دنیا پر چھا جانے والا جذبہ ہے جو انسان کی حسین ترین کمزوریوں میں سے ہے۔ اس میں خوابوں، جذبات، تمناؤں اور آرزوؤں کی وہ

جنت ہے جس سے کائنات کی آبرو قائم ہے۔ اختر کا عشق عنفوانِ شباب کا وہ فطری اور سچا عشق ہے۔ جب ہر عورت میں حوروں کا تقدس اور شہزادیوں کا جلال نظر آتا ہے۔ جب عورت سے بھی زیادہ عزیز اس کا تصور ہوتا ہے۔ جس میں دوری جادو ہے اور دھندلکا حسن۔ جس میں حقیقت خوابوں کے تانے بانے سے آراستہ ہو کر آتی ہے۔ جس میں جذبہ ہے ذہن نہیں۔ گرمی ہے روشنی نہیں شدت ہے گہرائی اور استواری نہیں جو زندگی کو شراب و شعر سمجھتا ہے۔ اور اس لیے اس کی تلخیوں کی شکل سے تاب لا سکتا ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ عقل کی تیز روشنی اور ذہن کی پختہ کاری بھی اس کا مذاق نہیں اڑا سکتی۔ اس کی معصومیت، فطری رنگ، بے ساختگی اور رنگینی اسے زندگی کا ایک روشن لمحہ بنا دیتا ہے۔ اس عشق میں ذہنی بچپن ہے۔ مگر زندگی کا ایک اہم دور یہ بھی ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خوابوں، جادو کے جزیروں اور سنہرے دھندلکوں کی یہ دنیا ہمیشہ زندگی سے گریز اور فرار سکھلاتی ہے۔ لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ خوابوں سے حقیقت کی طرف آتے ہیں اور دنیا کو جنت بنانے کی یہ آرزو انہیں سدا بے چین رکھتی ہے۔ کچھ زندگی سے ایسے بیزار ہو جاتے ہیں کہ (AXEL) کی طرح یہیں عالمِ حسرت میں مر جانا بہتر سمجھتے ہیں اور زندگی کرنا اپنے نوکروں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ اختر بھی بدلے ہیں۔ چنانچہ لالۂ طور کا سا اختر ویسا شگفتہ اور زندہ دل نہیں۔ اسے محبت میں ناکامیاں ہوئی ہیں۔ وہ آسمان سے زمین پر اتر آیا ہے پہلے دنیا اس کے لیے فردوس تھی۔ اب وہ "فریبِ ہستی" سے آگاہ ہو گیا ہے اور کبھی کبھی یہ بھی کہہ اٹھتا ہے ؎

حسن تو کچھ بھی نہیں، عشقِ جواں کچھ بھی نہیں
ہوش اے دل کہ جہانِ گزراں کچھ بھی نہیں

اب اس کے لیے ماضی کی سنہری یادیں اور زیادہ سنہری ہو گئی ہیں۔ "یادِ رفتہ" کو وہ چھوڑ نہیں سکتا۔ اس کی داستان جو کبھی "ستاروں کی کہانی" تھی اب "شعلوں کا بیان" بھی ہو گئی ہے۔ اس میں تلخی، زہرناکی، کلبیت دنیا سے بے زاری اور فرار کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا نغمۂ بہار جہاں نئے سرے سے بزمِ عیش سجانے کا عزم ظاہر کرتا ہے وہ بزمِ عیش کا زیادہ حقیقی تصور بھی پیش کرتا ہے ؎

ایک سلطان کو کشکولِ گدائی دے کر
ہر گدا کو کئی معموروں کا سلطاں کر دیں
منتظر عالمِ نو کا ہے جہانِ کہنہ
شبِ تیرہ سے عیاں صبحِ درخشاں کر دیں

اس مجموعے کی اچھی نظموں میں سے داستانِ حیات، نغمۂ بہار، ننھا قاصد اور میرا موجودہ مشغلہ ہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں اختر کی شاعری میں یہاں ایک انحطاط محسوس ہوتا ہے۔ اختر کی شاعری میں عشق کا جوش بھی ہے (PASSION) اور وجد و کیف بھی (ECSTACY) لیکن وجد و کیف زیادہ ہے اور ظاہر ہے صرف اسی کے سہارے انسان کب تک چل سکتا ہے۔

اختر کی شروع کی نظموں میں عورت سب کچھ ہے۔ انہوں نے جا بجا کہا ہے کہ جب تک یہ دنیا اور اس کی خوش نمائی ہے۔ ہماری زندگانی پہ عورت کی خدائی ہے۔ یہ عورت سلمیٰ ہو یا عذرا، ریحانہ یا شیریں، شمسہ یا کوئی اور، اختر نے اس کا سراپا بیان نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اختر نے اسے نگاہ بھر کر دیکھا بھی نہیں۔ سلمیٰ بقول راشد کے اختر کا جمالِ ذہنی ہے اور ورڈز ورتھ کی لوسی LUCY یا کیٹس کی (FANNY BRAWNE) کی طرح شاعر کے دل کی ملکہ۔ وہ بھی صاف نظر نہیں آتی۔ ایک مقدس پرچھائیں ایک پیکرِ مہتاب

ایک آسمانی حور ہے۔ دیکھیے :۔

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے
بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارا ہے
تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ

یہی حال سلمیٰ کی تصویر کا ہے ؎

یہ حسنِ نازنیں، یہ جلوۂ ناز آفریں تیرا
یہ معصومانہ چہرہ غنچۂ شاداب کا عالم
یہ مستانہ نگاہیں اک بہشتی خواب کا عالم
سراپائے خیالِ حور جسمِ نازنیں تیرا
مجسم خندۂ خوابِ پری روئے حسیں تیرا

اختر کی تصویریں حسین و دل کش ہیں مگر واضح نہیں۔ ان کے رنگ نہایت شوخ ہیں مگر خد و خال صاف نظر نہیں آتے۔ ہر چیز پر ایک سنہرا نقاب ہے۔ تشبیہات و استعارات نئے نہیں۔ احساس کی صداقت اور شدت نے انہیں بھی زندگی دے دی ہے۔

اختر کے کلام کی پہلی خصوصیت جو فوراً اپنی طرف متوجہ کرتی ہے یہ ہے کہ ان کا عشق قدیم شعرا کی طرح نہ کسی تخیلی موہوم کا عشق ہے، نہ متوسطین کی شاہدِ بازاری کا۔ نہ ایک سرد و بے رنگ عورت کا۔ بلکہ ایک ایسی عورت کا عشق ہے جو اس دنیا کی ہے۔ پہلو میں دل رکھتی ہے اور دل میں لطیف جذبات جو شاعر کے عشق سے متاثر بھی ہوتی ہے، اور اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتی ہے۔ لیکن بعض اوقات سماجی بندشیں اُسے اجازت نہیں دیتیں کہ محبت کا جواب محبت سے دے۔ اختر کے اس عشق میں کوئی نئی بات نہیں ہے بقول فراق کے ؎

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے

مگر انصاف یہ ہے کہ اختر سے پہلے کسی نے اس جوش اور جذبے سے اپنی محبوبہ کا نام نہیں لیا۔ عشق بہت سوں نے کیا اور غزل کے لطیف بلیغ اشاروں میں اسے بیان بھی کیا۔ مگر یوں اپنی محبوبہ، اپنے عشق، اپنی واردات، اپنی جوان راتوں اور اپنی پُرکیف شاموں کا مزے لے لے کر بیان نہیں کیا۔ بنتِ عم یا ستم پیشہ ڈومنی یا موتی اور جواہر یا حجاب کے نام ہمیں معلوم ہو جاتے ہیں مگر اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ اختر نے جہاں سلمیٰ یا عذرا یا ریحانہ کا ذکر کیا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں بلکہ اسی فردوسِ ارضی کی حوریں ہیں جو عشق کا جواب عشق سے دیتی ہیں، اور جن کے عشق پر فطرت مسکراتی ہے۔ ریحانہ کے متعلق لکھتے ہیں ؎

اسے پھولوں نے میری یاد میں بے تاب دیکھا ہے
ستاروں کی نظر نے رات بھر بے خواب دیکھا ہے
وہ شمعِ حسن تھی، پر صورتِ پروانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

عذرا کے ساتھ چند لمحوں کی یادگار ملاحظہ ہو ؎

فضاؤں کو جلوؤں سے روشن کیا
ہواؤں کو خوشبو سے مہکا گئی
شبستاں میں آئی کچھ اس ناز سے
کہ جیسے چمن میں بہار آ گئی
تمنا کی بے تابیاں بخش کر
جوانی کی راتوں کو تڑپا گئی

سلمیٰ کے وادی میں آنے کا انتظار اس طرح ہوتا ہے ؎

تمنا و حیا کی کشمکش کیوں کر مٹاؤں گا
میں اس کے یاسمیں پیکر کو کیونکر گدگداؤں گا
اور اس کے لعلِ لب سے عطرِ رنگت چراؤں گا
وہ پھولوں اور ستاروں سے بھی شرمائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

یعنی اختر کی شاعری میں مایوسی و ناکامی حسرت و حرماں، پامالی و بربادی کے بجائے چاہنے اور چاہے جانے کی لذت ہے اختر ان شعراء میں سے ہیں جو اپنی مشرقیت کے باوجود عشق کی لذت کو محسوس کرتے ہیں اور اسے بیان کرنا گناہ نہیں سمجھتے۔ ہماری پرانی عشقیہ شاعری میں احساس گناہ کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ لوگ کھل کر عشق بھی نہیں کر پاتے۔ وہ اس پر شرمندہ و پشیمان سے ہیں۔ اختر اس لحاظ سے جدید شاعر ہیں کہ ان کے ہاں پشیمانی نہیں ہے۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ٹالسٹائی نے ANNA KRENINA جیسی لازوال تخلیق میں بھی (ANNA) کے عشق کو ایک جرم، ایک عذاب، روح کو رہ رہ کر کچوکے لگانے والا نشتر قرار دیا ہے۔ چنانچہ (ANNA) اور اس کا عاشق جب پہلی دفعہ یکجا ہوتے ہیں تو بھی خوشی ان کی قسمت میں نہیں ہوتی۔ اختر کے لیے عشق ایک عبادت ہے۔ وہ اس فریضے کو ادا کرنے میں خوش رہتے ہیں۔ ان کا عشق سرود و مائیت، ماورائیت یا مابعد الطبیعی حسن کے بجائے ایک حسین جسم کا متلاشی ہے۔ ان کے یہاں جسم کی پرمستی (BODY'S RAPTURE) ایک لذتیت رکھتی ہے۔ اخلاق چاہے اسے کتنا ہی برا کہے لیکن انسانی فطرت اس کا جواز ہے۔ اس دور میں فراق اور جوش کے یہاں جسم کی یہ مستی اور بھی نمایاں ہے۔ "پگھلے ہوئے خطوط" اور "سینۂ شمان" اردو میں بالکل نئے نہیں ہیں۔ نظیر اور دوسرے شعراء کے یہاں ان کی بہار بڑی منظر فریب ہے۔ لیکن نظیر کے بعد ایک مہذب، شریف اور اخلاقی نقطۂ نظر نے اسے بازاری قرار دیا۔ وہ بھی اس پر صرف پردہ ڈال سکی اسے غائب نہ کر سکی چنانچہ عشقیہ شاعری میں جنسی کیفیات سے رنگینی آتی ہے۔ اور یوں بھی شعر و ادب کے خزانوں میں سب سے چمک دار موتی وہی ہیں جو جنسیات کے سمندر سے غواصی کے بعد نکالے گئے ہیں۔ ہمارا پرانا ادب مضمون جنس کو پردے پردے میں

پیش کرنے کا قایل تھا۔ سینۂ شفاف کے بجائے مستی میں اُلٹے ہوئے پیالے یا حباب خاستہ از بحر کا ذکر زیادہ مہذب تھا۔ اب جنسی جذبے کے صحت مند نشاط کو اتنی بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور ادب میں یہ ذہنی خشکی روز بروز کم ہو رہی ہے۔

اختر کے یہاں لذتیت ہے مگر عریانی نہیں۔ جسمانی محبت ہے مگر پستی اور ابتذال نہیں۔ عورت ان کی نظر میں کوئی کھلونا نہیں بلکہ دیوی ہے۔ ان کے نزدیک کائنات اور اس کی ہر چیز پر عورت کی خدائی ہے۔ مگر اختر کی عورت سے زیادہ اختر کا عشق اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اقبال کے عاشق ہرجائی کی یاد دلاتا ہے جسے حسن جہاں بھی ہے اور جس حال میں بھی ہے عزیز ہے ؎

گو حسین تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر
حُسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

KEATS نے شاعری میں افکار کی جگہ حسیات اور خیالات کی جگہ جذبات پر زور دیا ہے۔ غنائی یا عشقیہ شاعری میں جذبات کی گہرائی اور صداقت بہت کچھ ہیں۔ مگر عشقیہ شاعری میں بھی بڑی شاعری محض عشقیہ نہیں ہوتی اور بڑی شاعری کے لیے خیالات کی بلندی یعنی تخیل کی ندرت اور کائناتی یا آفاقی رنگ ضروری ہیں۔ یعنی عشق کو محض عشق نہیں زندگی بھی ہونا چاہیے۔ اختر کے یہاں افکار کی گہرائی یا بلندی نہیں ہے۔ ان کے یہاں جذبات ہی جذبات ہیں۔ جذبات میں شوق اور ذوق کی معتدی، حسن اور حسن کے اثرات اختر خوب بیان کرتے ہیں۔ ان کا یہ شعر نیا نہیں۔ مگر ان کی شاعری کی اچھی نمائندگی کرتا ہے ؎

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے خدائی میں حسیں معلوم ہوتی ہے

ان کی غزلوں میں بھی کلیمانہ اسلوب کے بجائے شاعرانہ رنگ اور جذباتی کیفیت ہے۔ مگر اس میں وہ والہانہ پن اور سپردگی ہے جو میر، داغ، حسرت، جوش اور فراق کی یاد دلاتی ہے۔ اردو میں یہی عاشق ہیں جو اپنے عشق پر شرماتے نہیں بلکہ فخر کرتے ہیں ؎

یہ مے چھلک کے بھی اس حسن کو پہنچ نہ سکی — یہ پھول کھل کے بھی اس کا شباب ہو نہ سکا
ناز سے گیسوئے سلمیٰ پہ بڑھے ہاتھ اختر — یوں نہ یاد تماشائے لب بام نہ کر
اس کے عہد شباب میں جینا — جینے والو تمہیں ہوا کیا ہے
مجھے مے خانہ تھرّاتا ہوا محسوس ہوتا ہے — وہ میرے سامنے شرما کے جب پیمانہ رکھتے ہیں
بھلا کیوں کر نہ ہوں راتوں کو نیندیں بیقرار اسکی — کبھی لہرائی ہو جس پہ زلف مشکبار اس کی
یوں تو ہر در پہ لٹکتے نظر آئے دامن — کھینچتے ناز سے ہم کو وہی داماں نہ ملا
خواب نوشیں میں ہے وہ جان بہار — نور و نکہت کی داستان خموش

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اختر کی غزلیں باوجود تیکھی اور فطری اور شگفتہ ہونے کے اس درجہ کی نہیں جو ان کی نظموں کا ہے۔ غزل میں جس بلاغت، جس بھرپور وار، جس نکتہ آفرینی کا کمال ملتا ہے۔ وہ ان غزلوں میں نہیں ہے۔ نظموں میں جہاں تصویریں زیادہ بڑی اور رنگ زیادہ شوخ ہیں انہیں زیادہ کامیابی ہوئی۔ ان کی موسیقی بھی نظموں ہی میں لطف دیتی ہے۔

چنانچہ اختر کے یہاں ایک نوجوان عشق، اس کی سپردگی اور لذتیت ہے۔ یہ لاکھ سطحی سہی مگر صحت مند ہے۔ اختر کی جنت یوں تو سلمیٰ، ریحانہ یا عذرا کی آغوش ہے۔ مگر اس کی جنت کی تعبیر میں فطرت کا حسن بھی ہے۔ یوں بھی فطرت کے آغوش میں اختر کو سکون ملتا ہے۔ ان کی جنت ارضی ہندوستان کی ایک ایسی بستی ہے جو دامن کوہ میں ہے۔ پہاڑوں کا پس منظر اس کی عظمت اور تقدس کا ضامن ہے۔ اس کے گرد ایک دریائے حسین لہراتا ہے۔ جیسے حور کی گردن میں نور کی ہنسلی۔ یہ دریا زندگی کی روانی اور ایک مسلسل حرکت کے احساس کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر وہاں نکہتیں ہیں، جھونکے ہیں۔ دلچسپ اندھیاریاں ہیں۔ آم کی شاخوں کے حریری پردوں میں نغموں کے خزانے ہیں۔ تارے نور کے پیمانے ہیں، اور چاند نور کی خوابیدہ پری ہے۔ مگر یہ سب یادیں ان کی غارتِ ایماں اور شمع شبستاں کی یاد کو اور روشن کرتی ہیں۔ اختر کے یہاں فطرت نہ (WORDSWORTH) ورڈز ورتھ کی طرح ایک مقدس ہستی ہے۔ نہ نظیر کی طرح محبوب کے لیے پھولوں کی سیج، اختر اور جوش دونوں فطرت پرست ہیں۔ اگرچہ اختر حسن کی طرح فطرت کی مصوری میں بھی دھندلکے یا ایک حسین ابہام کے عاشق ہیں۔ جوش اختر سے زیادہ واضح ہیں۔ اور ان کی نظر فطرت کی بے مہری پر بھی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ میں اختر کو اُردو کا پہلا رومانی شاعر سمجھتا ہوں۔ فطرت، عورت یا ماضی، ان سب کی مصوری میں اختر چیز سے زیادہ اس کے تصور کے عاشق ہیں۔ ان کا نوجوان عشق انہیں کسی چیز کو غور سے دیکھنے نہیں دیتا۔ ان کے یہاں رنگوں، نغموں اور خطوط کی بہاریں ہیں۔ چاندنی کی پھواریں اور فردوسی مناظر کی قطاریں ہیں۔ بعض اوقات یہ یادیں انہیں اس دنیا اور اس کی الجھنوں سے دور لے جاتی ہیں مثلاً سرزمینِ عشق میں ؎

ہنگامۂ عالم سے دور، آفت گہِ ہستی سے دور
اس مکر کی دنیا سے دور، اس ظلم کی بستی سے دور
اس رات اس دن سے الگ، اس اوج اس پستی سے دور —— اک سرزمینِ عشق ہے

اسی طرح تاثراتِ نغمہ میں وہ ایک خیالی جنت کی تصویر کھینچتے ہیں۔ مگر وہ اس دنیا کی بہاروں کے بھی دلدادہ ہیں۔ اور اس حد تک دلدادہ ہیں کہ جنت کی بھی آرزو نہیں کرتے ؎

یہ دنیا، یہ نظارے اور یہ رنگینی فضاؤں میں
یہ جلوے چاند سورج کے، یہ تابانی ستاروں کی
یہ نزہت لالہ زاروں کی، یہ رفعت کوہساروں کی

یہ بھینی بھینی آوارہ سی خوشبوئیں ہواؤں میں
یہ بکھری بکھری مستی جھومنے والی گھٹاؤں میں

یہ تیزی آبشاروں کی، روانی جوئباروں کی
یہ پھولوں کا ہجوم اور یہ لطافت سبزہ زاروں کی

یہ موسیقی جو رقصاں ہے پرندوں کی صداؤں میں

یہ نغمے یہ ترانے یہ شراب و شعر کا عالم
یہ آرائش مکانوں کی یہ زیبائش مکینوں کی
یہ رعنائی حسینوں کی یہ صحبت نازنینوں کی

یہ عمریں۔ یہ بہاریں یہ شباب و شعر کا عالم
نہ لے جا خلد میں یارب یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو

اس وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اختر کی رومانی شاعری میں فراریت کے بجائے زندگی کے حسن و مسرت کو جذب کر لینے کی تمنا ہے۔ اختر اورینوی نے لکھا ہے کہ "اختر کی شاعری میں گریز و ہجرت کی تمنا کروٹ لے رہی ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں اختر گریز و ہجرت کی طرف بھی جاتے ہیں۔ مگر زندگی اس کا حسن اور اس کا رومان انہیں اپنی جنتِ ارضی کی طرف لے آتا ہے۔

اختر کے یہاں عشق میں مرنے کی خواہش بھی ہے اور جنگ جوئی اور شمشیر زنی کا ولولہ بھی۔ اور آزادی کے نام پر مارنے مرنے کی آرزو بھی۔ ان چیزوں میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ مگر دراصل اختر کی رومانیت کے یہ مختلف پہلو ہیں۔ سلمٰی کی تصویر کو سینے سے لگا کر مر جانا ایک مقدس فریضہ ہے۔ اور آزادی کی جدوجہد میں وطن کی خاطر تلوار اٹھانا اور زخموں سے کھیلنا ایک عبادت۔ جوانی کو جہاں حوریں عزیز ہیں وہاں "خوں چکاں کفن کا بناؤ" بھی۔ وہ محبوب کی حنا کے ساتھ اپنے لہو کی رنگینی کو نہیں بھولتی۔ اس لیے یہ سپاہیانہ عشق جو بقول راشد کے ازمنۂ وسطےٰ کے ایک نائٹ کی یاد دلاتا ہے۔ جوانی اور لہو کی روانی کا عشق ہے۔ اور اس کی شدت اور تیزی باوجود سطحی ہونے کے دلچسپ ہے۔

رہی اختر کی فن کاری تو نظموں، گیتوں اور ترانوں کے اس شاعر نے تشبیہات و استعارات سے بڑا کام لیا ہے۔ اختر کی تشبیہات نئی نہیں۔ لیکن اختر کے مقصد کو پورا کرتی ہیں۔ اس سے اختر کا شعورِ فنی ظاہر ہوتا ہے۔ رومانی شاعری میں فوق فطری عناصر اور انسانوں میں فوق بشری عناصر کو دیکھتا ہے اختر نے اپنے استعاروں میں اسی اصول سے کام لیا ہے "تاثراتِ نغمہ اور پنچھیوں سالگرہ کا تحفہ" دونوں میں یہی اصول کارفرما ہے۔ جن کی وجہ سے ان میں روانی اور دلکشی آگئی ہے ؎

نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگین وادیاں گویا
شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی ساری فضائیں ہیں
افق پر موجزن مستانہ خوابوں کی ہوائیں ہیں
فضا پر بس رہی ہیں نور کی آبادیاں گویا
خلا میں پرفشاں ہیں حسن کی شہزادیاں گویا

ستارے نذر کر دوں، آفتاب نذر کر دوں
کلی کا حسن گلوں کا شباب نذر کر دوں

ریاضِ خلد کی شادابیاں کروں حاضر نگاہِ حور کا رنگیں حجاب نذر کروں
زبسکہ سالگرہ چودھویں ہے حسرت ہے کہ میں بھی چودھویں کا ماہتاب نذر کروں

غرض اختر کی رنگین، دھندلی دھندلی، سنہرے پردوں میں لپٹی ہوئی فضا کے لیے یہی فنکاری موزوں ہے۔ "تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے" یا "یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" یا "خوش آمدید" میں تشبیہات خیال انگیز نہیں ہیں۔ خیال کو بہلانے کے لیے ہیں اور پڑھنے والے کا ذہن پھسلتا ہوا ایک رنگین دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اس رنگین دنیا کا حسن کچھ عرصہ کے بعد ماند پڑ جاتا ہے۔ یہاں کے پھولوں میں کانٹے یہاں کی چاندنی راتوں میں سامنے ابھرتے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ سب ذرا بعد میں ہوتا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ نظمیں ہمیں "جادو کے دریچوں تک" پہنچا دیتی ہیں۔ اردو میں اختر ایسے شاعر ہیں جنہوں نے سانیٹ کی محدود اور تنگ دنیا میں شگفتگی اور روانی پیدا کی۔ سانیٹ ان سے پہلے عظمت اللہ خاں وغیرہ نے بھی لکھے۔ اور بعد میں ان کے اثر سے تو یہ عام ہو گئے مگر انہوں نے اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اگرچہ اردو میں سانیٹ کی وجہ سے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اور اسی وجہ سے حال میں اسے ترک کیا جا رہا ہے۔

کیا اختر کی شاعری بے وقت کی راگنی ہے؟ کیا اس کی عمر بہت کم ہے۔ کیا اس کا حسن ایک رنگین لمحے، ایک میٹھی یاد کا حسن ہے؟ کیا اس شاعری کی ہمارے ادب میں کوئی اہمیت نہیں؟ آج یہ سوال قدرتی طور پر ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ آج کی دنیا اور آج کے ذہن کی ELIOT نے اپنی ایک نظم میں بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے ؎

I HAVE LOST MY PASSION: WHY SHOULD I NEED TO KEEP IT,
SINCE WHAT IS KEPT MUST BE ADULTERATED

یہ ذہن بڑا سخت کافر ہے۔ یہ ہر حسین دھندلکے میں چھپے ہوئے غار، ہر ملکوتی حسن کے زوال، ہر جذبے کے نشیب و فراز سے واقف ہے اس لیے یہ رومان کے بجائے حقیقت، جذبے کے بجائے فکر، خواب کے بجائے بیداری اور ذہنی الجھن کے بجائے ذہنی توازن کو پسند کرتا ہے۔ یہ فیصلہ صحیح ہے۔ مگر اس کے باوجود اختر کی جنتِ ارضی کا حسن کم نہیں ہوتا۔ اس میں زندگی اور صداقت ہے۔ یہ زندگی ساری زندگی نہیں ہے۔ حسن صرف شباب کی آوارگی میں نہیں بلکہ فطرت کے بدلتے ہوئے نظاروں، زندگی کے نت نئے انقلابات، نئے تجربات اور رجحانات میں بھی ہے۔ اختر کی شاعری کا بڑا حصہ حسن کے اس تصور تک نہیں جاتا۔ اس میں ایک ذہنی بچپن ہے مگر اس بچپن کے باوجود اس کی کشش، تازگی اور رنگینی میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری اردو شاعری میں رونا بسورنا بہت ہے۔ پرانی شاعری ایک مریض سوسائٹی اور مریض عشق کی وجہ سے زندگی سے اور زندگی کے نشاط و انبساط سے محروم تھی۔ موجودہ دور میں زندگی کی سخت چکی نوجوانوں کو بہت جلد پیس ڈالتی ہے۔ ان کے منہ کا مزا کڑوا ہو جاتا ہے۔ وہ وقت سے بہت پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ان کا احساسِ محرومی انہیں کبھی کھل کر ہنسنے نہیں دیتا۔ اختر کی شاعری شباب اور اس کے رومان کی شاعری ہے۔ کیا ہوا اگر ان کا جادو زیادہ دیر تک نہیں رہتا۔ ان کے یہاں جادو تو ہے اور شاعری میں جہاں بھی جادو ہے بڑی چیز ہے اور جہاں جادو نہیں وہاں بڑی سے بڑی چیز میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔

فیضی کا نظریۂ شعر

ڈاکٹر وحید قریشی

فیضی کے نظریۂ شعر کو سمجھنے کے لیے ابوالفضل کے نظریۂ فن سے واقف ہونا ضروری ہے۔ فیضی ایک انفعالی کردار تھا۔ اس کا اپنے بڑے بھائی کے[1] نظریۂ فن سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ اسی میں ابوالفضل کی عظمت اور فیضی کے نقطۂ نظر کی صحت کا راز ہے۔ زندگی کے ابتدائی ایام ہی سے چھوٹے بھائی کی علمی فتوحات اور عام زندگی میں اس کے فیصلوں کی درستی نے مبارک پر واضح کر دیا تھا کہ فیضی پر ابوالفضل کو ترجیح حاصل ہے[2]۔ اس ترجیحی سلوک کو فیضی نے فوراً قبول کر لیا۔ اور ہمیشہ اپنے بھائی کی علمی تگ و دو اور معاملہ شناسی کا معترف رہا[3]۔ اس اندازِ نظر کا اثر فیضی کے نظریۂ شعر پر بھی پڑا[4]۔

ابوالفضل کے نظریۂ فن کے تین بنیادی نکات ہیں (ا) الفاظ و معانی کا رابطہ (ب) تقلید و انفرادیت اور تصوف (ج) ادب اور صوفیانہ اقدار کی اہمیت۔ اگر کسی دور نے باقاعدہ الفاظ اور معانی کی برابری اور گہرے رابطے کو تسلیم کیا ہے تو وہ فیضی اور ابوالفضل ہی کا دور ہے۔ اکبری مصنفین نے قدیم ادبا کی پیروی کو علمی مشکلات کے پیشِ نظر نادرست قرار دیا اور اپنے فن اور نظریۂ فن کو میکانکی ہونے سے بچا لیا۔ اس طرح جاندار اسلوبِ بیان کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ قدیم اسلوب پر ابوالفضل کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے۔

ہمگی بسیج بر آرائش الفاظ باشد و معنی را بپیرایۂ لفظ دانستہ بہ واژگوں روئے تگاپوئے[5] رود[6]

---

[1] بلوخمن (دیباچہ آئینِ اکبری صفحہ ۲) [2] انشائے ابوالفضل صفحہ ۲۳۱ [3] ابوالفضل نے ایک جگہ اکبرنامے میں اپنے بارے میں فیضی کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

صد سالہ رہ میانِ من و اوست در کمال
در عمر اگر ز دو سہ سالے فزوں ترم

[4] عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۲۹۹ پر فیضی کے حال میں لکھا ہے :-

"فیضی در اواخر بتقریب برادرِ خود کہ او را علامی می نویسند بجہتِ علوِ شان دراں وزن تخلص فیاضی اختیار نمودہ و سازگار نیامد و بعد از یک دو ماہ رختِ حیات از عالم برداشتہ"

[5] انشائے ابوالفضل صفحہ ۲۸۳ [6] اس لیے فیضی بھی محتشم کاشی کی شاعری میں لفظ و معنی کی برابری کا قائل ہے :-

حریر بافِ سخن محتشم کہ در کاشاں
بطرزِ تازہ ترا ز ہر سخنوری دارد
یکے ز نکتہ وراں گفت دیدم اشعارش
عبارتیست کہ معنی سرسری دارد
بگفتمش سخن او عبارت است ولے
عبارتے کہ بہ معنی برابری دارد
چہ طرف بندم ازیں رہروانِ قافلہ کش
کہ می کشند نخست از تنِ خیال لباس

ابوالفضل قدما کے علی الرغم اپنے نظریۂ شعر کا تصوف سے ناطہ جوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اکبری دور میں یہ آسانی اس لیے بھی ہے کہ اس زمانے سے ہندوستان میں ادبا رومی کے تصوف سے متاثر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ تصوف کی تخلیقات میں یہ امتیاز کہ رومی تو صوفی شاعر ہے اور جامی محض تک بند زیادہ گہرا ہونے لگا۔ نتیجۃً تغزل کی وہ ہفت رنگ چمک دمک شروع ہوئی جو "تازہ گوئی" کہلاتی ہے۔ 'رسمیات' کی مخالفت کا رجحان بھی بڑے زور شور سے اُٹھا۔ یہ بھی ایک حد تک رومی کا فیض ہے کہ ابوالفضل اور فیضی کا صوفیانہ درجہ "تقلید" کی منزل سے کہیں آگے اور "تحقیق" کے دم قدم سے آباد ہے[1]۔ شعر اور تصوف کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا اس لیے بھی ممکن تھا کہ جیسے تصوف زندگی بسر کرنے کا ایک انداز تھا اسی طرح فنِ شعر بھی اپنے تمام لوازم کے ساتھ ایک ضابطۂ حیات ایک راہِ عمل بن جاتا ہے فیضی تو یہاں تک کہہ جاتا ہے:۔

فیضیم عاشقِ جمالِ سخن　　کز دو عالم مرادِ من سخن است
از ہمہ روئے در سخن دارم　　قبلۂ اعتقادِ من سخن است
ہیچ گاہے از و گریزم نیست　　پیرِ من اوستادِ من سخن است

یہ پُرخلوص ذہنی رجحان جہاں فیضی کی شاعری کو جذباتی گہرائی اور وسعت عطا کرتا ہے وہاں اس کے نظریۂ شعر کو بھی صوفیانہ اندازِ فکر سے متاثر کرتا ہے۔ اس دور میں اس کے بغیر جذباتی وحدت ممکن ہی نہ تھی۔ یہ اشتراکِ عمل نظریۂ شعر اور تصوف کو ہم گام کر دیتا ہے۔ اور ہر دو رجحانات میں زبان کی وحدت بڑی آسانیاں پیدا کرتی ہے۔ "معنی" اور "صورت" واحد ذخیرۂ الفاظ ہی کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ ایک ذہنی افق کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ ابوالفضل کے نزدیک قدما و معاصرین "رہ زدۂ پندار" اور "غارت کردۂ تقلید" ہیں[2]۔ اور ان کے مقابلے میں اس کا اپنا اسلوبِ بیان "منبعِ شاد کامی"[3] جس ادب پارے میں محتویات صوفیانہ نہیں۔ ان کا لکھنے والا "ابو الاجدادِ عبارت"[4] اور وہ متاع "برادرانِ صورت"[5] کے لیے "بازیچۂ اسباب"[6] ہے۔ دنیاداری کے معاملات انسان کو "کیمیاگر"[7] نہیں بنا سکتے۔ اس کیمیاگری کے لیے تو ضرورت ہے "معاملاتِ صوری و معنوی کہ از صدق فروغی داشتہ باشد"[8] کیونکہ یہی چیز تو "بحر در ذرّہ آوردن" کے کام آتی ہے۔ بڑے ریاض کے بعد کہیں جا کر یہ نقطۂ نظر حاصل ہوتا ہے:۔

چشمِ جاں را سُرمہ کش فیضی کہ اربابِ نظر　　روئے معنی را بروزن ہائے عرفاں دیدہ اند

---

[1] رومی کہتے ہیں:۔

خلق را تقلیدِ شاں بر باد داد　　اے دو صد لعنت بریں تقلید باد

فیضی کہتا ہے:۔

دل بستگئ بسترِ تحقیقم بخش　　آزادگی ز قیدِ تقلیدم دہ

[2] انشائے ابوالفضل ص۲۴۴　[3] ایضاً

[4] ایضاً ص۲۴۶ (انوری کے بارے میں)

[5] ایضاً　[6] ایضاً

[7] ایضاً (حکیم سنائی کے بارے میں) ص۲۴۷　[8] ایضاً (ظہیر فاریابی کے بارے میں) ص۲۴۶

تصوف کی چھاپ جب نظریۂ شعر پر لگی تو فیضیؔ اور ابوالفضل کا ادبی زاویہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تصوف میں ان کی منزل ”تقلید“ سے آگے تھی تو فن میں بھی ”غارت گرِ تقلید“ کو انھوں نے ناپسند کیا۔ اس طرح ”تحقیق“ اور ”انفرادیت“ ہم معنی ہو گئے اور آگے راستہ صاف تھا۔

اس سے پہلے تصوف اور شاعری کو یوں گھلا ملا کر دیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ سبب شاید یہ تھا کہ ہر علم کی حدود مقرر تھیں اور یہ ضروری نہ تھا کہ ایک علم دوسرے کے ساتھ مل کر عقلی وحدت بنا سکے (جذباتی وحدت کا سوال ہی نہ تھا) اس لیے نظریۂ فن پر تصوف کا اثر و اقتدار اس سے پہلے ہمیں نہیں ملتا۔ اگرچہ اصطلاحات کی یگانگت پہلے بھی پائی جاتی تھی لیکن نظریۂ فن کا بنیادی تعلق تصوف کی بجائے عموماً علمِ معانی و بیان ہی سے رہا ہے۔ یہ اکبری دور کی خصوصیت ہے کہ شخصی کوششیں اجتماعی رنگ اختیار کرتی گئیں اور ترقی خواہ عناصر بروئے کار آ گئے۔ ان عناصر کی زیادتی نے فارسی شعر و ادب کی کایا پلٹ کر دی۔ اور اقدارِ ادب جیسے بنیادی مسائل جو اس سے قبل محض زبان کو اپنی اساس قرار دیتے تھے تصوف کے زیرِ اثر اقدارِ حیات کو بنیادی ماننے لگے۔ اگرچہ اس دور کے ادبا سے بھی ”زبان“ کی اہمیت سے پورا انکار نہ ہو سکا۔ پھر بھی قطعی فیصلہ خیالات و جذبات کی اہمیت کے پیشِ نظر ہی ہو سکتا تھا۔ وہ ادب گھٹیا ہے جس کے محتویات ارفع و اعلیٰ نہیں اور ارفع و اعلیٰ محتویات صرف صوفیانہ ہی ہو سکتے ہیں — یہ ابوالفضل اور فیضی کا عقیدہ تھا اس ترازو میں انوری کی شاعری پوری نہیں اترتی[1] اسی پر سنائی کی شاعری کا ایک حصہ ناقص قرار پاتا ہے[2]۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں خاقانی کی ”خودستائی“ لائقِ تعزیر بنتی ہے[3]۔

اے کاش اورا سخن خورش ایں قدر نفع رساندے تا از حسرتِ نایافت مراتب
و بزی نجات یافتہ بگلشن سرائے خرسندی رسیدے[4]

یہ اندازِ نظر بھی اتنا ہی خام ہے جتنا ”زبان“ کو بنیادی قدر مان لینا۔ تاہم اس سے ”جدت“ کا اندازہ تو ہوتا ہے۔ اگرچہ صوفیانہ شاعری کے سوا ہر شاعری کو گھٹیا قرار دے لینا خود فریبی سے کم نہیں۔ پھر اس نظریئے میں یہ خرابی بھی تو ہے کہ نقاد محض صوفیانہ خیالات ہی کے اظہار کو اہم مان لے اور اس طرح جامی اور اُن کے ساتھیوں کی خشک شاعری کے لیے راہ نکل آئے۔ اور جامیؔ بھی رومی کے درجے کا شاعر سمجھ لیا جائے۔ اگرچہ ابوالفضل کو اس کا احساس خفی ہے ورنہ وہ ”صدق“ کا لفظ استعمال نہ کرتا۔ لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ محض خلوص اچھی شاعری کا ضامن نہیں تو بات وہیں رہ جاتی ہے۔ اور اس طرح ابوالفضل کے اپنے وہ اشعار جو صوفیانہ خیالات کے حامل ہیں وہ بھی اعلیٰ درجے کی شاعری کہلا سکتے ہیں۔ حالانکہ ابوالفضل کی شاعری ایک خشک مولوی کی شاعری ہے اس کے برخلاف فیضی کی شاعری ایک زندہ دل صوفی کی شاعری ہے جس میں جذبات و احساسات کی رنگا رنگی اور زندگی کی تمام نشانیاں موجود ہیں۔ تو پھر فیضیؔ اس پھیکے پن سے کیسے دامن بچا گئے؟ حالانکہ صوفیانہ خیالات کی عظمت کے وہ خود بھی قائل تھے۔ اور رباعیات میں اس کا اظہار انھوں نے بڑے کھلے لفظوں میں کیا ہے۔ اس کا جواب ہمیں اس ردِ عمل میں ملتا ہے جو جامیؔ کے رفقا کے خلاف اس دور میں ہوا۔ اور جس میں فیضیؔ۔ عرفیؔ۔ نظیریؔ اور ظہوریؔ سبھی شریک

---

[1] انشائے ابوالفضل ص۲۴۵ — [2] انشائے ابوالفضل ص۲۴۴

[3] ” ص۲۴۲ — [4] ” ص۲۴۴

ہیں۔ یہاں پہنچ کر فیضی اپنے بھائی کے راستے سے الگ ہو کر دوسرے معاصرین کے گروہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔

فارسی شاعری کی بدنصیبی کے ادوار کا اگر کبھی جائزہ لیا جائے گا تو جامی اور اس کے معاصرین کی تحریریں بہت بڑے شواہد میں شمار ہوں گی۔ فنونِ لطیفہ کی ترقی و اشاعت کا زمانہ بھی کم و بیش یہی ہے اسی دَور نے بہزاد جیسے فن کاروں کو پیدا کیا۔ اور اسی دَور نے مصوری۔ فنِ تعمیر اور دوسری صنعتوں کو عروج تک پہنچایا۔ لیکن یہی وہ بدقسمت دور ہے جس نے فارسی شاعری کی آبرو کو خاک میں ملایا۔ خود نظریۂ شعر بھی اس دَور سے اگر متاثر ہوا تو صرف اس قدر کہ تنقیدی اصطلاحوں میں "سخن گذاری" DESCRIPTIVE کی ترکیب کا اضافہ ہوا۔ ورنہ شاعری تُک بندی بن گئی۔ اور نظریۂ شعر لفظی بحثوں کی آماجگاہ ہوا۔ فارسی ادب پر کوئی بڑا احسان نہ علی شیر نوائی کا ہے نہ جامی کا۔ ممکن ہے منگولوں کے حملوں کے دوررس اثرات خاص کر اقتصادی اثرات نے زندگی کی بنیادیں ہلا کر غیر مفید علوم کی بربادی کا سامان کیا ہو۔ لیکن یہ تو قطعی ہے کہ فارسی شاعری خشک فلسفیانہ موشگافیوں اور بے جان صوفیانہ خیالات کا مجموعہ بن گئی۔ جس میں جذبات و احساسات کی صداقت تو کُجا خود جذبات و احساسات کی موجودگی تک بحث طلب ہے۔ اس کا بلاواسطہ ردِّ عمل فغانی کی "رامش و رنگ" کی تحریک ہے۔ جس میں تصوّف کی جگہ دنیاداری نے لے لی۔ بہار و نگار کی بزم آرائیاں۔ چنگ و نے کی نغمہ سرائیاں اور بادہ و ساغر کی ہنگامہ آرائیاں مطمحِ نظر بن گئیں۔ ہندوستان کی سرزمین اس کے مقابلے میں بہار و نگار سے خالی نہ تھی۔ لیکن یہاں صوفیانہ ادب کی روایات مسلسل اور مربوط شکل میں باقی تھیں۔ یہاں تو متضاد عناصر میں یگانگت کی تلاش ہی سے نیا راستہ ممکن تھا۔ بابر کی آمد کے بعد ایرانیوں کا تانتا بندھ چکا تھا۔ اور افغانستان کی سرحدیں بھی سمٹ سمٹا کر مغلوں کی آغوش میں آ چکی تھیں۔ اور دربارِ شاہی میں فارسی زبان و ادب کے مربّی پیدا ہو گئے۔ اس نئی فضا میں اکبری دور تک نکھار آ گیا۔ اس زمانے میں محمد شاہی جوان تو نہ تھے لیکن محمد شاہی کس بل ضرور موجود تھا۔ مغلیہ تہذیب کی شائستگی۔ نفاست اور رہنے سہنے کے انداز کو آرٹ کا سلیقہ دینے کا دستور عروج پر تھا۔ اس فضا نے عرفی۔ فیضی۔ ابوالفضل اور سینکڑوں ادبا کو پروان چڑھایا۔ جن پر فارسی ادب کو آج بھی ناز ہے۔ بالکل اسی طرح کی احیائی تحریک دکن میں بھی پیدا ہو رہی تھی۔ جس سے ظہوری۔ ملک قمی اور بعض دوسرے شعرا نے کسبِ فیض کیا۔ اور یہ سب ادبا ادب کو نئی زندگی عطا کرنے والے تھے۔

شاعری ایک نئی تحریک سے زندہ ہو گئی۔ "تازہ گوئی" کا رواج ہوا۔ آگرہ۔ سیکری۔ اور دلّی کی گلیاں اس نئی بُو باس سے بس گئیں۔ یہ تبدیلی محض لفظی نہ تھی۔ اس کی تہہ میں عالم گیر عزائم اور جذبات کی امڈتی توانائی تھی۔ نظیری۔ عرفی اور فیضی کو گرد و پیش کے تغیرات کا احساس تھا۔ اور اسی احساس نے انھیں تازہ گوئی کا نمائندہ بنا دیا۔ وہ بات کہنے کا جذباتی انداز وہ رچا ہوا تغزل جو جامی کو نصیب نہ تھا۔ انھوں نے اُسے پا لیا۔ عظیم فن کاروں (حافظ۔ سعدی۔ رومی۔ خواجوی۔ خسرو وغیرہ) کے شہ پاروں کے زیرِ سایہ اظہار کے راستے نکالے۔[1] رسمیات کو ترک کر کے روایات کے جاندار حصّوں سے کسبِ فن کیا۔ انسانی شخصیت کی تہ در تہ جذباتی حیثیتوں کو اجاگر کیا گیا۔ مشاہدے کی ندرت اور فن کی پختگی سے تغزل کی ایک انوکھی سطح کا انکشاف ہو گیا۔

گفت و گوئے غمِ یعقوب نہ بُد پیشۂ ما　　بوئے پیراہنِ یوسف نہ بُد اندیشۂ ما
کوہکن صنعتِ ما داشت ولے زرق بسے ست　　قوتِ بازوئے دل می طلبد تیشۂ ما

---

[1] با ہمہ رنگِ سخن صاف ندیدیم دلت　　بے سبب نیست کہ چندیں سخنت ناصاف است　　(فیضی)

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود باده گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما[1]

یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس سے فیضی نے اپنے بھائی کے "زہدِ خشک" کا توڑ کیا اور اپنی شاعری کو مادی اور خاص کر "بہار و نگار" کے علائم سے ملا کر اُسے جادو، شراب اور خورشید کا ہم سنگ بنا دیا۔ جہاں عرفی نے غمِ دنیا کو غمِ معشوق بنا کر اپنے زمانے کی نئی رو کا ساتھ دیا تھا۔ فیضی نے بھی تصوف کو جذبات کی سطح پر لا کر دیکھا۔ اور اس کی وسعت، پختگی اور صد رنگی کو نمایاں کیا۔ اس سے اس کا نغمہ زیادہ شیریں اور طرب آلود ہو گیا۔

فیضی ایں بزمِ نشاط است لبِ شوق بہ بند از سخن زمزمہ ہائے طرب آلود بیار[2]
بہارِ فیض چو آمد بہ دورِ ما فیضی بشعرِ تر ہمہ آفاق را فرد گیریم
مگر کہ از اثرِ گریہ ام بود فیضی چنیں کہ گفتۂ من آبدار می آید
گرچہ فیضی براہِ زہد افتاد غزلش عاشقانہ افتاد است
حالِ خود گویم کہ می باشد بہ دل حرفِ عشق از ہر سخن نزدیک تر

انسانی عشق کو بیان کرنے والے الفاظ اور آداب و اشغال کو تصوف میں برتنے سے وہ رومانی اور جذباتی فضا بھی ساتھ رہی جو مادی عشق سے وابستہ ہے۔ یوں بعض مخصوص الفاظ (مے، نغمہ، جادو، شراب، خورشید، جام، آتش، مشعلِ قدسیاں، سرمستی، نوا، ارغنوں، حریف، نعرۂ مستانہ، صہبا، میکدہ، مے خانہ) کو ان کے EMOTIONA CONTEXT سے علیحدہ کر کے وسیع ترکیبوں پر استعمال کیا گیا ہے۔ تصوف کے ساتھ ساتھ اس دور کے شعرا کا دوسرا محبوب موضوع فنِ شعر ہے۔ خود شعر کو موضوع بنانے میں بھی یہی علائم کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔

جب تصوف طریقِ حیات ہے اور شعر بھی طریقِ حیات ہے تو خود شعر کا موضوع بن جانا آسان ہے۔ لیکن سب سے زیادہ قابلِ توجہ پہلو اور مرکزِ جذبات موضوع یا تو معاصر شاعر (رقیب یا حریف) ہو سکتے ہیں۔ یا پھر تخلیق کے وہ مراحل جو اپنے اندر جذباتی قدر و قیمت رکھتے ہوں۔ کیونکہ الہام کا سرچشمہ اور شعر کا منبع تو ہر حال میں دل ہے۔ دل، سوزِ دل، تجربہ، اظہار، اثرات یا بہ الفاظِ دیگر شاعرانہ عمل POETIC PROCESS کے مختلف مظاہر یقیناً موضوعِ شعر بننے کا آسان ترین حق رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر اس دور کے شعرا کا سرمایہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ اور فیضی کے ہاں تو دیوان کا تقریباً ایک ثلث حصہ انہیں موضوعات پر مشتمل ہے۔ عرفی اور ظہوری کے ہاں بھی ایسے اشعار کافی ہیں۔ لیکن نظیری اور فیضی اس معاملے میں سب پر سبقت لے گئے ہیں۔

شعر کو الہام تو پہلے سے مانا جاتا ہے۔ اور اکبری دور سے کہیں پہلے شعرا نے شعر اور صوفیانہ "الہام" کا مرکز دل کو مان لیا تھا۔ یہ دل عشق کا مرکز ہے چاہے یہ عشقِ شعر ہو یا عشقِ خدا۔ اس لیے شعر کو جب فیضی نے موضوع بنایا تو اس کے اثرات میں محبوب کی تمام صفات اور عشوہ طرازیاں بھی شامل ہو گئیں:۔

---

[1] دیوانِ عرفی (نولکشور پریس) ص۲

[2] نظیری کہتا ہے:۔
بزمِ خاص است دُرِ نکتہ بدستور بیار
معنیِ دور طلب کن سخنِ دور بیار

مستانہ سخن می رسد از دل بہ لبِ ما عشقست کہ بربستہ زبانِ ادبِ ما
با شمع نہ سوزیم و بہ مہتاب نسازیم خورشید بود انجمن افروزِ شبِ ما[1]
مطرب بلند ساز کن امشب ترانہ را در شعرِ من بخواں غزلِ عاشقانہ را
فیضی اگر ز نظمِ خود صیتِ بلند برکشی مشعلِ قدسیاں کنی معنیٔ دل فروز را
چہ جادویست ندانم بطرزِ گفتارش کہ باز بستہ زبانِ سخن طرازاں را
صریرِ کلکِ تو فیضی بہ بزم گاہِ صبح نوا بلند کند ارغنوں نوازاں را
فیضی حدیثِ ما ز نگاراں بند پرس کیں کارگاہِ سحر بہ جادو گداختیم
دوش رندانہ شنیدند ز فیضی غزلے کہ بہ صد نعرۂ مستانہ ز محفل بہ خاست
فیضی حدیثِ عشق رقم زن کہ خامہ ات معنی نگار و نکتہ طراز آفریدہ اند
گرچہ فیضی را جنوں انگیز می آید سخن طرزِ گفتارِ سخنگوئے مرا دیوانہ کرد
کلکِ فیضی می دہد گلہائے تر می رد و معنیٔ رنگیں شاخ شاخ
بتاں گرمِ رقص اند بر شعرِ فیضی زہے جادو آموزِ جادو خیالاں

فیضی ایں طرزِ دل آویز کہ داری بہ سخن
مگر از شوخ سخندانِ من آموختہ

فیضی کے نزدیک شعر کی یہ الہامی صفات اس وقت ظاہر ہوتی ہیں۔ جب دل عشق کی چوٹ کھائے ہوئے ہو۔ یہ خلش اضطراب شعر کی روحِ رواں ہے:۔

بشوقِ تازہ گلے گفتہ ایں غزل فیضی بیاد آر کہ از نکتہائے چیدۂ ماست
گرچہ فیضی از جہاں طومارِ ہستی در نوشت حسبِ حالِ عشق بازاں ماند دیوانِ غزل
شب کہ فیضی سخن از سوزِ دلِ خود می گفت دلِ صاحب نظراں از گرمیٔ معنی می سوخت
فیضی از حالِ دل و دیدہ سخن می رانی کہ سیاہی ز سرِ کلکِ تو خوں آمیز است
مجلسِ ما کہ ایں چنیں گرم است از نفسہائے آتشیں گرم است
دلِ من سوخت فیضی از سخنت کہ ز معنیٔ دل نشیں گرم است
نظمِ فیضی را چہ می بینی کہ عشق صد چنیں گلہائے رنگا رنگ داشت
بردند ز پردہ رازِ فیضی گل پیرہناں چاکِ دامن

---

[1] نظمِ من معنیٔ رخشندہ بداں می دارد کہ سیاہی بنویسند و نماید شنگرف
(فیضی)

لیکن اصل موضوع وہ تخلیقی عمل ہے جس سے جذبات اکائیوں میں تبدیل ہو کر شعر بنتے ہیں۔ بعض اوقات جذبات کی اموج عملاً کار ہوتی ہے۔ کہنے والا بزعمِ خود اپنے جذبات کے ابلاغ میں کامیاب ہوتا ہے لیکن شعر اپنا اثر نہیں دکھاتا:۔

دوش ہر بادہ کہ بر یادِ حریفاں خوردم
دلِ من سوخت و لے گرمیٔ احباب نداشت

بعض اوقات جذبات رُک رُک کر چلتے ہیں:۔

گوہرِ دل کم فتد بہ دستِ فیضی   پابکش اندر راہِ جستجو کہ تو داری
خوں گریم ازیں بخت کہ ہر کس ز گلستاں   گلدستۂ تر بندد و من خار بہ بندم

پھر بعض لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جذبات کا دھواں دھار لاوا اُبلتا چلا جاتا ہے:۔

فیضیٔ بے نوا کہ شد نکتہ سرائے قدسیاں   ہر دمش از نے قلم زمزمہ ساز یافتم
مگر ز تازگیٔ طبع زد رقمِ فیضی   کہ خانہ تر شدہ از نوکِ خامہ آب چکید
ز فرق تا بہ قدم مو بموئے من معنی ست   گماں مبر کہ دریں خانہ نقشِ دیوارم

اس کا تجزیہ تو ممکن نہیں بس ایک اندرونی خلش ہے جس پر فتح پانے کے لیے فیضی اپنی ناکامی کا سہارا "ہمت" کو بناتا ہے[1]۔

باخود بہ نبردیم دریں معرکہ فیضی   وقت است کہ ہمت برساند مدد ما
از خود و ہمتِ خود ایں قدر امید ہنوز   کہ بگنجینۂ غیب ایں ہمہ رہ بندم طرف

یہاں پہنچ کر شعری عمل کے تجزیے کی منزل آتی ہے:۔

عجب تر از دلِ فیضی ندیدہ ایم طلسم
کہ ہم گہر بود و ہم محیط و ہم غواص

لیکن شعری عمل محض ایک غیر واضح اور ناقابلِ فہم الہامی کیفیت ہی نہیں۔ اس کے سرے تو زندگی ہی سے ملے ہوئے ہیں۔ ایک طرف روایت (TRADITION) ہے اور دوسری طرف اپنی شخصیت کے گہرے نقوش اور تجربات کی اتھاہ گہرائیاں۔ تجربہ دل کے راستے ان گہرائیوں اور جھیلوں میں ڈوبتا ہے۔ روایت بھی اسی پر اثر انداز ہوتی ہے، شخصیت بھی اپنا رنگ روغن دے جاتی ہے۔ جب کہیں جا کر شعر میں نکھار، بانکپن اور رچاؤ ابھرتا ہے۔ ان تمام پیچدار منزلوں کو ایک قطعے میں فیضی نے یوں پیش کیا ہے:۔

فیضی منم کہ با خردِ آسماں نورد
یک چند سیرِ عالمِ انصاف کردہ ام

---

[1] ابو الفضل اسلوب کی والا پائگی کے لیے "عزمِ درست" کو ضروری قرار دیتا ہے اور اسکی تشریح میں یکتائی اندیشہ، جستجوئے سخت، تنومندی خردِ نیازمندی اور عنایت ایزدی کا شاملِ حال ہونا اہم شمار کرتا ہے (انشائے ابو الفضل صفحہ ۲۸۶) ہمت سے مراد غالباً یہی عزمِ درست ہے۔

باگونہ گونہ مردم عالم نشستہ ام
سیر بہشت و دوزخ و اعراف کردہ ام
ہم در زباں متابع اخلاق بودہ ام
ہم در سخن تتبع اسلاف کردہ ام
گر دُرد نیست در سخن من عجب مدار
کیں بادہ را بہ پردۂ دل صاف کردہ ام

اور یہی اس کے نظریۂ شعر کا خلاصہ ہے۔

کتابیات

(۱) انشائے ابوالفضل (نولکشور ایڈیشن) (۲) آئین اکبری مرتبہ بلوخمن (انگریزی ترجمہ) (۳) اکبر نامہ شائع کردہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی (۴) منتخب التواریخ۔ بدایونی (۵) مثنوی رومی — (۶) دیوان نظیری (۷) دیوان عرفی (۸) دیوان فیضی (مرتبہ مولوی فیروز الدین)

برج بھاشا کی پہلی گرامر

سید مسعود حسن رضوی ادیب

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ سلطنت میں کوکلتاش خاں یعنی بادشاہ کے کوکہ کی فرمائش سے ایک کتاب تحفۃ الہند کے نام سے لکھی گئی جس کا موضوع ہے اہلِ ہند کے علوم متداولہ۔ یہ کتاب چھپ کر کبھی شائع نہیں ہوئی۔ مگر اس کے چند نسخے مختلف کتبخانوں کی زینت ہیں۔ ایک نسخہ میرے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔ مصنف نے کتاب کا دیباچہ خود لکھا ہے، جو میرے نسخے میں مختصر اور دوسرے نسخوں میں طولانی ہے۔ مختصر دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اورنگ زیب کے مطالعے کے لیے لکھی گئی اور طولانی دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے کسی بیٹے کے لیے لکھی گئی۔ اس کا نام بعض نسخوں میں اعظم شاہ اور بعض میں معزالدین جہاندار بتایا گیا ہے۔ مصنف کے والد کا نام سب نسخوں میں فخرالدین محمد ہے، لیکن خود اس کا نام بعض نسخوں میں میرزا محمد اور بعض میں میرزا خان ہے۔

میرے کتب خانے میں قصائدِ عرفی کی ایک شرح، مفتاح النکات کے دو قلمی نسخے ہیں۔ شارح کا نام میرزا جان بن فخرالدین محمد ہے۔ یہ شرح ۱۰۴۳ھ میں یعنی اورنگ زیب کے عہدِ سلطنت میں لکھی گئی۔ کچھ عجب نہیں کہ مفتاح النکات اور تحفۃ الہند کے مصنف بھائی بھائی ہوں۔ اگر تحفۃ الہند کے مصنف کا صحیح نام میرزا خان تھا تو میرزا جان بن فخرالدین محمد اور میرزا خان بن فخرالدین محمد کا حقیقی بھائی ہونا اور زیادہ قرینِ قیاس ہو جاتا ہے۔

تحفۃ الہند میں ایک مقدمہ، سات باب اور ایک خاتمہ ہے، جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

مقدمہ۔ ناگری رسم خط اور بھاکھا کے قواعد کلیہ۔
پہلا باب۔ پنگل یعنی اہلِ ہند کا علمِ عروض۔
دوسرا باب۔ تُک یعنی اہلِ ہند کا علمِ قافیہ۔
تیسرا باب۔ النکار یعنی اہلِ ہند کا علمِ بیان و بدیع۔
چوتھا باب۔ سنگار رس یعنی اہلِ ہند کا علمِ عاشقی و معشوقی۔
پانچواں باب۔ سنگیت یعنی اہلِ ہند کا علمِ موسیقی۔
چھٹا باب۔ کوک یعنی عورت مرد کے اقسام اور عورتوں کے ساتھ معاشرت۔

ساتواں باب۔ سامُدریک یعنی اہلِ ہند کا علمِ قیافہ۔
خاتمہ۔ اہلِ ہند کے لغات و مصطلحات و کنایات۔

مقدمۂ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ناگری حروف اور رسمِ خط کا تفصیلی بیان ہے اور دوسرے میں بھاکھا کے "قواعدِ کلیہ" ہیں۔ مصنف، خود کو ان قواعد کا "مخترع" کہتا ہے۔ یعنی اس کا دعویٰ یہ ہے کہ بھاکھا (برج بھاشا) کی گرامر اس نے پہلے پہل لکھی ہے۔ میں نے ہندی کے مستند عالموں سے دریافت کیا مگر وہ اس سے پہلے کی لکھی ہوئی برج بھاشا کی کسی گرامر کا نام نہ بتا سکے۔ بظاہر مصنف کا یہ دعوےٰ صحیح ہے کہ یہ برج بھاشا کی پہلی گرامر ہے۔ اگرچہ یہ گرامر کی کوئی جامع کتاب نہیں ہے، پھر بھی تاریخی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اور اُردو کے بارے میں لسانی تحقیق کرنے والوں کے لیے بہت کار آمد ہے۔ اس سے کھڑی بولی اور برج بھاشا کا باہمی تعلق آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ مقدمۂ کتاب کے اسی دوسرے حصے کا اُردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

مصنف نے ہندی لفظوں کا وہ تلفظ اختیار کیا ہے جو بھاکھا والوں کی زبانوں پر جاری تھا اور ہر لفظ کا تلفظ تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کر دیا ہے کہ کسی شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ میں نے اختصار کے خیال سے ان بیانات کو حذف کر کے ہندی لفظ پر اعراب لگا دیئے ہیں۔

زبان کی کیفیت

اہلِ ہند کی زبانیں متعدد ہیں، لیکن وہ زبانیں جن میں نثر کی کتابیں اور نظم کے دیوان تصنیف کیے جاسکتے ہیں۔ اور جو طبعِ سلیم اور ذہنِ مستقیم کو پسند آتی ہیں تین ہیں۔

۱۔ **سَہَنسکرت**[1]۔ وہ ہر طرح کے علوم و فنون کی کتابیں زیادہ تر اس زبان میں تصنیف کرتے ہیں۔ اُن کے اعتقاد میں وہ عالمِ علوی کی زبان ہے اور وہ اس کو "آکاس بانی" اور "دیو بانی" کہتے ہیں، یعنی آسمان والوں کی زبان اور دیوتاؤں کی زبان جو کہ آسمانی اور علوی ہیں۔

۲۔ **پَراکرت**۔ بادشاہوں، وزیروں اور بڑے بڑے لوگوں کی مدح زیادہ تر اسی زبان میں لکھتے ہیں۔ وہ عالمِ سفلی کی یعنی اُس عالم کی زبان ہے جو زمین کے نیچے ہے اور اُس کو "پاتال بانی" اور "ناگ بانی" بھی کہتے ہیں، یعنی اسفل السافلین کے رہنے والوں اور سانپوں کی زبان جو کہ زمینی اور سفلی ہیں۔ یہ زبان مرکب ہے سہنسکرت سے جس کا ذکر پہلے ہو چکا اور بھاکھا سے جس کا ذکر اس کے بعد ہوگا۔

۳۔ **بھاکھا**۔ رنگین اشعار اور عاشق و معشوق کا بیان زیادہ تر اس زبان میں کرتے ہیں۔ یہ اُس عالم کی زبان ہے جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ "بھاکھا" کا اطلاق عموماً سہنسکرت اور پراکرت کے سوا اور کل زبانوں پر ہوتا ہے اور خصوصاً برج والوں کی زبان پر۔ "برج" ہندوستان کی ایک سرزمین کا نام ہے۔ اصل اس کی متھرا ہے (جو ایک مشہور و معروف مقام کا

---

[1] عشقی دکنی نے اس لفظ کو اسی تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے "رکھا کم سہنسکرت کے اس بول میں"
(مثنوی قصۂ بے نظیر)

نام ہے)۔ اور مظفر نگر کے گرد چار کوس تک برج کی حد ہے۔ برج والوں کی زبان سب زبانوں سے زیادہ فصیح ہے مشہور دریاؤں گنگا اور جمنا کے دوآب میں جو خطہ واقع ہے جیسے چندوار وغیرہ، وہ فصاحت کے لیے مشہور رہے۔ چندوار ایک مشہور و معروف مقام کا نام ہے۔ چونکہ یہ زبان رنگین شعروں، شیریں عبارتوں اور عاشق و معشوق کے بیان پر مشتمل ہے اور شاعروں اور طبیعت داروں میں زیادہ تر رائج اور مستعمل ہے اس بنا پر اُس کے قواعد کلیہ بنائے گئے ہیں اور اس چیز کا اختراع کرنے والا یہ نحیف ہے۔

شَبد کا بیان

شبد ہندسکرت زبان میں کلمے کو کہتے ہیں۔ بھاکھا والے اس لفظ کو سین مہملہ سے بولتے ہیں[1]۔ ہمارے نحویوں کی اصطلاح میں کلمہ وہ ہے جو کسی معنی کو ادا کرنے کے لیے بولا جائے۔ اہلِ ہند کی اصطلاح میں اُس کی تین قسمیں ہیں۔ سُنپاؤن، کُرتب اور کِرِتا۔

سَنپاؤن اُس کلمے کو کہتے ہیں جو تینوں زمانوں یعنی ماضی، مستقبل اور حال میں سے کسی سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اُس کی دو قسمیں ہیں:-

ایک وہ جو معنی پر دلالت کرنے میں کسی دوسرے لفظ کا محتاج نہ ہو۔ مثلاً رام جو اُن کے مشہور دیوتاؤں میں سے ایک کا نام ہے۔ یا جَل جس کے معنی ہیں پانی۔ اس قسم کے کلموں کو سنپاؤن کہتے ہیں۔ عربی کی اصطلاح میں اِن کو اِسم کہتے ہیں۔

دوسرے وہ جو معنی پر دلالت کرنے میں کسی لفظ کا محتاج ہو۔ مثلاً پَر عربی کے علیٰ اور فارسی کے بَر کے معنی ہیں۔ اس قسم کے کلموں کو کِرِت کہتے ہیں۔ عربی کی اصطلاح میں اُن کو حرف کہتے ہیں۔

کِرتَب فعل کو کہتے ہیں اور فعل کے معنی ہیں کچھ کرنا۔ کرتب وہ کلمہ ہے جو تینوں زمانوں یعنی ماضی، حال اور استقبال میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتا ہے۔ اِن تینوں زمانوں کو تِرِکال کہتے ہیں۔ کرتب کی پانچ قسمیں ہیں، بھوت، بَرتمان، بھَوِکھ، کِرِیا، کِرت۔

بھوت کا بیان

بھوت فعل ماضی کو کہتے ہیں۔ اور فعل ماضی وہ ہے جو گزشتہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ فعل ماضی لازمی صیغوں میں آتا ہے اور فعل لازمی وہ ہے کہ فعل اپنے فاعل پر تمام ہو جائے اور آگے بڑھ کر مفعول تک نہ پہنچے۔ وہ چار صیغے یہ ہیں:-

۱۔ آیو، یہ صیغہ واحد مذکر غائب، واحد مذکر حاضر اور واحد مذکر متکلم میں مشترک ہے۔
۲۔ آئے، یہ صیغہ جمع مذکر غائب، جمع مذکر حاضر اور جمع مذکر متکلم میں مشترک ہے
۳۔ آئی، یہ صیغہ واحد مؤنث غائب، واحد مؤنث حاضر اور واحد مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔
۴۔ آئیں، یہ صیغہ جمع مؤنث، جمع مؤنث حاضر اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔

---

[1] یعنی بھاکھا والے شبد کو سبد کہتے ہیں۔

فعل متعدی بھی اسی طرح چار صیغوں میں آتا ہے۔ اور فعل متعدی وہ ہے کہ فعل اپنے فاعل پر تمام نہ ہو بلکہ آگے بڑھ کر مفعول تک پہنچے۔ فعل متعدی کے صیغے مفعول کے اختلاف کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی اگر مفعول مذکر ہوتا ہے تو فعل مذکر لاتے ہیں۔ اور اگر مفعول مؤنث ہوتا ہے تو فعل مؤنث لاتے ہیں۔ مثلاً اگر مفعول واحد مذکر ہو تو کہیں گے ماریو اور اگر مؤنث ہو تو کہیں گے ماری اور اسی قیاس پر باقی صیغوں کو سمجھ لینا چاہیے۔

بَرتمان کا بیان

برتمان فعل حال کو کہتے ہیں۔ اور فعل حال وہ ہے جو گزشتہ اور آئندہ زمانوں کے درمیان میں ہو۔ فعل حال چار صیغوں میں آتا ہے:۔

۱۔ کرَت ہے۔ یہ صیغہ واحد مذکر غائب، واحد مؤنث غائب، واحد مذکر حاضر اور واحد مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔
۲۔ کرَت ہیں۔ یہ صیغہ جمع مذکر غائب، جمع مؤنث غائب، جمع مذکر متکلم اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔
۳۔ کرَت ہو۔ یہ صیغہ جمع مذکر حاضر اور جمع مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔
۴۔ کرَت ہوں۔ یہ صیغہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔

ان چاروں صیغوں میں لفظ کرَت کی ت کو اگر مضموم پڑھیں تو مذکر کا صیغہ ہو جاتا ہے اور اگر مکسور پڑھیں تو مؤنث کا صیغہ ہو جاتا ہے۔

بھوِکھ کا بیان

بھوِکھ فعل مستقبل کو کہتے ہیں۔ اور فعل مستقبل وہ ہے جو آئندہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ فعل مستقبل آٹھ صیغوں میں آتا ہے:۔

۱۔ کرے گو۔ یہ صیغہ واحد مذکر غائب اور واحد مذکر حاضر میں مشترک ہے۔
۲۔ کریں گے۔ یہ صیغہ جمع مذکر غائب اور جمع مذکر متکلم میں مشترک ہے۔
۳۔ کرو گے۔ یہ جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔
۴۔ کروں گو۔ یہ واحد مذکر متکلم کا صیغہ ہے۔
۵۔ کروں گی۔ یہ واحد مؤنث متکلم کا صیغہ ہے۔
۶۔ کرے گی۔ یہ صیغہ واحد مؤنث غائب اور واحد مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔
۷۔ کریں گی۔ یہ صیغہ جمع مؤنث غائب اور جمع مؤنث متکلم میں مشترک ہے۔
۸۔ کرو گی۔ یہ جمع مؤنث حاضر کا صیغہ ہے۔

کرِیا کا بیان

کرِیا چار طرح پر ہے:۔

۱۔ سُتم بھاو۔ یہ اثبات فعل ماضی ہے۔ مثلاً آیو۔
۲۔ اَسُتم بھاو۔ یہ نفی فعل ماضی ہے۔ مثلاً ناآیو۔
۳۔ بھاو —— یہ اثبات فعل حال و فعل مستقبل ہے۔ مثلاً کرُت ہے۔ کرسے گو۔
۴۔ اَن بھاو۔ یہ نفی فعل حال و فعل مستقبل ہے۔

نفی اور نہی کے لیے نونِ مفتوح (نہ) یا لفظ نا کلمے کے شروع میں لگا دیتے ہیں۔

کرُث کا بیان

کرُث مفعول کو کہتے ہیں۔ اور مفعول وہ ہے کہ فعل اُس پر واقع ہو۔ مفعول کے آخر میں ۃ لاتے ہیں۔ مثلاً ہنیو رام راونۃ یعنی رام نے راون کو مارا۔ اور کبھی مفعول کو فاعل سے پہلے لے آتے ہیں۔ مثلاً ہنیو راونۃ رام۔ اور کبھی ۃ کو جو ضمیر مفعول ہے لفظ کے آخر سے حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً ہنیو رام راون۔ اس محل پر فاعل کو مفعول سے پہلے لانا بہتر ہے۔ ورنہ قرینے اور قیاس پر نظر کرکے معنی نکال لیتے ہیں۔

کرتا کا بیان

کرتا فاعل کو کہتے ہیں۔ اور فاعل فعل کرنے والا ہے۔ اُس کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ سوادھین۔ وہ فاعل جو خود کام کرے۔ مثلاً کاجی یعنی کام کرنے والا۔
۲۔ پرادھین۔ وہ فاعل جو کسی دوسرے کو کوئی فعل کرنے کا حکم دے، خواہ امر کے ساتھ ہو خواہ نہی کے ساتھ۔

اور امر کسی کو کوئی کام کرنے کا حکم دینا ہے اور نہی کسی کو کسی کام سے روکنا ہے۔ امر حاضر تین صیغوں میں آتا ہے:۔

۱۔ کرُو —— یہ امر واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔
۲۔ کرِ —— یہ امر واحد مونث حاضر کا صیغہ ہے۔
۳۔ کرَوُ۔ یہ صیغہ جمع مذکر حاضر اور جمع مؤنث حاضر میں مشترک ہے۔

امر غائب بھی تین صیغوں میں آتا ہے:۔

۱۔ کرے۔ یہ صیغہ واحد غائب مذکر اور واحد غائب مونث میں مشترک ہے۔
۲۔ کریں۔ یہ صیغہ جمع غائب مذکر، جمع غائب مؤنث اور جمع متکلم میں مشترک ہے۔
۳۔ کروں۔ یہ امر واحد متکلم کا صیغہ ہے۔

نہی حاضر و غائب کے بھی یہی امر حاضر و غائب کے چھ صیغے ہیں جن کے شروع میں نہ یا نا بڑھا دیتے ہیں۔

پُرلنگ کا بیان

پُرلنگ مذکر کو کہتے ہیں۔ اور مذکر کے معنی ہیں مرد یا نر۔ اس کی دو قسمیں ہیں :۔

۱۔ وہ جو عَلَم ہو اور اس کے مقابل میں کوئی مونث ہو۔ مثلاً رام اور کانھ جو مشہور دیوتاؤں کے نام ہیں۔ اور عَلَم وہ ہے جو کسی معین شخص کا نام ہو۔

۲۔ وہ کہ اسم مذکر غیر علم کے آخر میں الف لگا دیں۔ مثلاً مِرگا کہ لفظ مِرگ (ہرن) پر الف بڑھا دیا گیا ہے۔

اِستری لنگ کا بیان

اِستری لنگ مؤنث کو کہتے ہیں۔ اور مونث کے معنی ہیں عورت یا مادہ۔ اُس کی دو قسمیں ہیں :۔

۱۔ وہ جو علم ہو یعنی کسی معین شخص کا نام ہو۔ مثلاً سیتا اور رادھا، جو دو مشہور عورتوں کے نام ہیں۔

۲۔ وہ جو عَلَم نہ ہو۔ اُس کی بھی دو قسمیں ہیں :۔

(۱) وہ جس کا مقابل کوئی مذکر اور نر ہو۔ مثلاً تُرنگِنی یا تُرنگی (گھوڑی) اور ہستنی[1] (ہتھنی)۔

(۲) وہ جس کے مقابل مذکر اور نر نہ ہو۔ مثلاً بَیار (ہوا) اور آگنِ (آگ)۔

یہ آخری قسم مونث سماعی ہے اور اس کا استعمال فقط محاورے کے سننے سے تعلق رکھتا ہے۔

جب پُرلنگ کو اِستری لنگ یعنی مذکر غیر علم کو مونث کر دینا چاہتے ہیں تو مذکر اسم کے آخر میں چند حرف بڑھا دیتے ہیں۔ وہ حرف یہ ہیں :۔

۱۔ الف۔ مثلاً بُڑدھ (بڈھا) سے بُڑدھا (بڑھیا)

۲۔ ی۔ مثلاً دیو سے دیوی۔

۳۔ آنی۔ مثلاً رُدر سے رُدرانی یعنی رُدر کی بیوی۔ رُدر عموماً دیوتا کے معنی میں آتا ہے۔ اور خصوصاً مہادیو کو کہتے ہیں۔

۴۔ نی۔ مثلاً ترنگ سے ترنگنی۔ کبھی آخری ی کو گرا دیتے ہیں اور صرف نون باقی رہ جاتا ہے مثلاً ترنگن۔

نپنسک لنگ کا بیان

نپنسک لنگ۔ خنثیٰ کو کہتے ہیں یعنی وہ جو حقیقت میں نہ مرد ہو نہ عورت۔ محاورے میں ایسے گنتی کے چند اسم ہیں۔ اُن سب کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔ اُن میں سے ایک لفظ کُنڈل ہے، جس کے معنی ہیں حلقہ۔ اس جنس کا استعمال سنسکرت

---

[1] ایک نسخے میں ہستنی ہے۔

کے محاورے سے مخصوص ہے۔ بھاکھا میں مستعمل نہیں ہے۔

بُہُوچَن کا بیان

بُہُوچَن جمع کو کہتے ہیں اور واحد سے زیادہ کو جمع خیال کرتے ہیں۔ جمع بنانے کے لیے واحد لفظ کے آخر میں حرف نون لگا دیتے ہیں۔ مثلاً گُلٹا (بدکار عورت) سے گُلٹان۔ اور نون سے پہلے کا حرف اگر ساکن یا موقوف ہوتا ہے تو اُس پر زبر لگا دیتے ہیں جیسے کرَ (ہاتھ) سے کرَن اور ٹنگ (پانوں) سے ٹنگَن۔ اور جس لفظ کے آخر میں وَ ساکن یا یَ ساکن ہو تو کبھی اُس واؤ یا یے کو اپنے حال پر ساکن رہنے دیتے ہیں اور کبھی اُس پر زبر کی حرکت لگا دیتے ہیں۔ مثلاً سکھی سے سکھیَن اور بھبھو سے بھبھوَن اور کبھی الف نون سے جمع بناتے ہیں۔ مثلاً سکھی سے سکھیاں۔

اسم اشارہ کا بیان

اسم اشارہ وہ اسم ہے جس سے کسی کی طرف اشارہ کریں۔ اسمائے اشارہ سات ہیں: —

۱۔ وَا — یہ واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے یعنی وُہ

۲۔ تا — یہ بھی واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے یعنی وُہ

۳۔ یا — یہ واحد حاضر کے اشارے کے لیے ہے۔ یعنی یہ

۴۔ جا — یہ بھی واحد غائب کے اشارے کے لیے ہے یعنی جو

۵۔ اُن — یہ جمع غائب کے اشارے کے لیے ہے۔

۶۔ اِن — یہ جمع حاضر کے اشارے کے لیے ہے۔

۷۔ جن — یہ جمع غائب کے اشارے کے لیے ہے۔

یہ ساتوں اسمائے اشارہ مذکر اور مونث میں مشترک ہیں۔

پُدبِرث کا بیان

پُدبِرث کلام کو کہتے ہیں۔ اور کلام دو کلموں سے مرکب ہوتا ہے۔ مثلاً رام آیو۔

سَمبَندھ کا بیان

سَمبَندھ ترکیب اضافی کو کہتے ہیں۔ اور ترکیب اضافی وہ ترکیب ہے جس میں کلمۂ اوّل کو کلمۂ ثانی سے نسبت ہو۔ بہ اصطلاح عرب میں کلمۂ اوّل کو مضاف اور کلمۂ ثانی کو مضاف الیہ کہتے ہیں۔ اہلِ ہند کی ترکیب اضافی تین کلموں سے مرکب ہوتی ہے۔ مثلاً پُوت رام کو یعنی پسرِ رام۔ اس میں کلمۂ پوت مضاف ہے اور کلمۂ رام مضاف الیہ ہے اور لفظ کو جو آخر میں ہے علامت نسبت ہے۔ جو عربی

کی مثال غلامٌ لِزَید میں لام مکسور کی جگہ اور فارسی کی مثال غلامِ زید میں مضاف کے آخری کسرے کی جگہ آیا ہے۔ ہندی میں جب مضاف الیہ کو مضاف پر مقدم کرتے ہیں تو لفظ کو جو علامتِ نسبت ہے درمیان میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں رام کو پوت۔ اس عمل پر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علامتِ نسبت کو حذف کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں رام پوت۔

اُن حرفوں اور کلموں کا بیان جو اسموں کے شروع اور درمیان میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

(۱) اَ (الف مفتوح)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کے معنی دیتا ہے اور اس کو اصطلاح میں ناس یعنی نفی کہتے ہیں۔ مثلاً اَجان یعنی نہ جاننے والا نادان۔

(۲) الف۔ اسموں کے درمیان میں آکر تواتر اور توالی کے معنی دیتا ہے، مثلاً چلاچل یعنی روارو۔ یہ الف فارسی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(۳) بِ (بائے مکسور)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بِکل یعنی بے قرار اور بے آرام، کیونکہ کل کے معنی ہیں قرار اور آرام۔

(۴) سَ (سینِ مفتوح)۔ اسم کے شروع میں آکر معیت اور ہمراہی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سَجل یعنی سیراب اور شاداب، کیونکہ جل کے معنی ہیں پانی۔ یہ سَ کبھی لیاقت اور قابلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سُپوت یعنی قابل اور رشید بیٹا۔ اور یہ حرف اس معنی میں اس لفظ کے سوا اور کہیں نہیں سُنا گیا۔

(۵) سُ (سینِ مضموم) اسم کے شروع میں آکر خوب اور اچھا کے معنی دیتا ہے مثلاً سُباس یعنی اچھی بُو والا، خوشبودار۔

(۶) کَ (کافِ مفتوح)۔ اسم کے اوّل میں آکر عدمِ لیاقت اور ناقابلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کَپوت یعنی ناقابل یا نالائق بیٹا۔ اور یہ حرف اس معنی میں اس لفظ کے سوا اور کہیں نہیں سُنا گیا۔

(۷) کُ (کافِ مضموم)۔ اسم کے شروع میں آکر بد اور بُرا کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کُرنگ یعنی بدرنگ، بُرے رنگ والا۔

(۸) نِ (نونِ مکسور)۔ اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً نِلجّ یعنی بے شرم بےحیا، کیونکہ لجّ اور لاج کے معنی ہیں شرم و حیا۔

اُن حرفوں کا بیان جو لفظوں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

(۱) الف۔ اسم کے آخر میں آکر وصفیت اور فاعلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کبتا یعنی شاعر اور موصوف بہ صفت شاعری، کیونکہ کبت کے معنی ہیں شعر۔ دیوا یعنی دینے والا اور موصوف بہ صفت دہندگی۔ کبھی الف تانیث کے لیے آتا ہے مثلاً بڑدھا یعنی بوڑھی عورت، کیونکہ بڑدھ بوڑھے مرد کو کہتے ہیں، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اور کبھی تانیث کے ساتھ وصفیت اور فاعلیت کے معنی بھی دیتا ہے۔ مثلاً گربا یعنی غرور کرنے والی اور موصوف بہ صفت غرور، کیونکہ گرب کے معنی ہیں غرور۔ اور کبھی الف تذکیر اور نری کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً ہرنا یعنی نر ہرن۔ اسم علم کے آخر میں الف ندا کا

فائدہ دیتا ہے۔ اور ندا کسی کو پکارنا ہے۔ مثلاً راما یعنی اے رام۔ الف ندائیہ فارسی اور عربی میں بھی مستعمل ہے۔

(۲) پ۔ اسم کے آخر میں آ کر صاحبی اور خداوندی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بھوپ یعنی صاحب و خداوند زمین، کیونکہ بھو کے معنی ہیں زمین۔

(۳) ت۔ اسم کے آخر میں آ کر مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً گنت یعنی گننا شمار کرنا۔

(۴) ٹ۔ اسم کے آخر میں آ کر فاعلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کھیوٹ یعنی ناؤ کھینے والا۔ اس ٹ کے آخر میں واؤ معروف بھی لگا دیتے ہیں مثلاً کھیوٹو۔

(۵) ج۔ اسم کے آخر میں آ کر پیدا ہونے کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بارج یعنی پانی سے پیدا ہونے والا۔ اس لفظ کا اطلاق کنول کے پھول پر اور ہر اُس چیز پر ہوتا ہے جو پانی سے پیدا ہو، کیونکہ بار کے معنی ہیں پانی۔

(۶) دِ (دال مکسور)۔ اسم کے آخر میں آ کر ظرف مکان کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً باردِ یعنی بادل، کیونکہ بار کے معنی پانی ہیں جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے۔

(۷) دھ۔ یہ بھی اسی معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً اُنبدھ یعنی سمندر، کیونکہ اُنب کے معنی ہیں پانی۔ یہ قاعدۂ کلیہ ہے کہ پانی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں دِ بادل کے معنی کا اور دھ سمندر کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔

(۸) ک۔ اسم کے آخر میں فاعلیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سیوک یعنی خادم۔ کیونکہ سیو اور سیوا کے معنی ہیں خدمت۔ یہ کاف کبھی مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً بیدھک یعنی طبابت۔

(۹) گ۔ اسم کے آخر میں آ کر راہ، روش اور رفتار کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً اُرگ یعنی سینے سے راہ چلنے والا: کیونکہ اُر کے معنی ہیں سینہ۔ اس لفظ سے سانپ مراد لیتے ہیں۔

(۱۰) ن۔ اسم کے آخر میں مصدری معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً چلن یعنی رفتن، رواج۔ کیونکہ چل اور چال کے معنی ہیں رفتار اور طریقہ۔ حرف نون کبھی فاعلیت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً موہن یعنی موہنے والا، فریفتہ کرنے والا، کیونکہ موہ کے معنی ہیں فریفتگی اور کبھی جمع کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً کرن جو کر کی جمع ہے اور کر کے معنی ہیں ہاتھ۔ اور کبھی تانیث کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً تُرنگن یعنی گھوڑی، کیونکہ تُرنگ کے معنی ہیں گھوڑا، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔

(۱۱) و (واو معروف)۔ اسم کے آخر میں آ کر فاعلیت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً پاہرو یعنی پہرا دینے والا، پاسبان، کیونکہ پاہرہ اور پہرہ کے معنی ہیں پاسبانی اور نگہبانی۔

(۱۲) ہ (ہائے مکسور)۔ اسم کے آخر میں آ کر مفعول بہ کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً واہِ یعنی اُس کو، کیونکہ وا کے معنی ہیں وُہ۔

(۱۳) ی۔ (یائے معروف)۔ اسم کے آخر میں آ کر نسبت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً اجمیری یعنی منسوب بہ اجمیر۔ اجمیر ہندوستان کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔ اور یہ ی فارسی میں بھی مستعمل ہے۔ کبھی ی صفت اور فاعلیت کا فائدہ دیتی ہے۔ مثلاً گربی یعنی غرور۔ کی صفت سے موصوف، غرور کرنے والا، کیونکہ گرب کے معنی ہیں غرور۔ اور کبھی ی تانیث کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دیوی یعنی دیو کی عورت، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔

اُن کلموں کا بیان جو اسموں کے شروع میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

ا۔ وہ کلمے جو اسم کے شروع میں آکر ندا کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں:۔

(۱) ہے۔ مثلاً ہے رام۔

(۲) اَہے۔ مثلاً اَہے رام۔

(۳) ہو۔ مثلاً ہو رام

(۴) آہو۔ مثلاً آہو رام۔

(۵) اِے۔ مثلاً اِے رام۔ یہ کلمہ فارسی میں بھی مستعمل ہے۔

(۶) اے ہو۔ جو اے اور ہو سے مرکب ہے۔ مثلاً اے ہو رام۔

(۷) ارے۔ مثلاً ارے رام۔ اس کلمے کو مونث کی ندا میں یائے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً اَری سکھی۔ اور سکھی کے معنی ہیں زنِ مصاحبہ۔

(۸) رے۔ بغیر الف اول کے۔ مثلاً رے رام۔ اس کلمے کو بھی ندائے مونث میں یائے معروف سے بولتے ہیں مثلاً ری سکھی۔

(۹) اے رے، جو اے اور رے سے مرکب ہے۔ مثلاً اے رے رام۔ ندائے مونث کے لیے اس کے دوسرے جز رے کو یائے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً اے ری سکھی۔

(۱۰) ارے اے، جو ارے اور اے سے مرکب ہے۔ مثلاً ارے اے رام۔ ندائے مونث کے لیے اس کے پہلے جز ارے کو یائے معروف سے بولتے ہیں۔ مثلاً اَری اے سکھی۔

ب۔ وہ کلمے جو اسم کے شروع میں آکر نفی اور سلبیت کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ دو کلمے ہیں:۔

(۱) نِر۔ مثلاً نِر بھو یعنی بے خوف، بے ترس، کیونکہ بھو کے معنی ہیں خوف اور ترس۔

(۲) اَن۔ مثلاً اَن رس یعنی بے مزہ، بے ذوق، کیونکہ رس کے معنی ہیں مزہ اور ذوق۔

اُن کلموں کا بیان جو اسموں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

ا۔ وہ کلمے جو اسم کے آخر میں آکر صاحبی اور خداوندی کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں:۔

(۱) ونت۔ مثلاً روپ ونت یعنی صاحبِ حسن و جمال، کیونکہ روپ کے معنی ہیں حسن و جمال۔ کبھی مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں الف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں روپ ونتا اور مونث کے لیے یائے معروف لگا دیتے ہیں روپ ونتی۔

(۲) کار۔ مثلاً گن کار یعنی صاحبِ علم و ہنر، کیونکہ گن کے معنی ہیں علم و ہنر۔

(۳) پال۔ مثلاً بھو پال صاحبِ زمین و ملک۔ بادشاہ، زمیندار اور صاحبِ ملک پر اس لفظ کا اطلاق کرتے ہیں کیونکہ بھو کے معنی ہیں زمین۔

(۴) پت۔ مثلاً مہی پت یعنی صاحب و خداوند زمین اور صاحب مملکت۔ اس لفظ کا اطلاق بھی بادشاہ، زمیندار اور صاحب مملکت پر کرتے ہیں، کیونکہ مہی اور مہیہ زمین کو کہتے ہیں۔ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جب زمین، ملک، دنیا اور مرد کے معنی دینے والے اسموں کے آخر میں پت کا لفظ آتا ہے تو وہ بادشاہ کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً مہی پت، دیس پت، جگ پت، نرپت۔ کلمۂ کنت بھی ان اسموں کے آخر میں اسی معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً مہی کنت۔ کلمۂ پت۔ جب تارہ اور رات کے معنی دینے والے اسموں کے آخر میں آتا ہے تو چاند کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً تارہ پت۔ نچھتر پت اور رینی پت۔ اور کلمۂ پت جب ندی کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آتا ہے تو دریا کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً ندی پت

(۵) ایس۔ جب اس کلمے کو کسی دوسرے کلمے سے ملاتے ہیں تو لکھنے میں الف کو حذف کر دیتے ہیں، کیونکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس کلمے کے شروع میں الف ہوتا ہے جب اس کو کسی دوسرے کلمے سے وصل کرتے ہیں تو الف کو حالت تحریر میں حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً مہیس یعنی صاحب و خداوند زمین، کیونکہ مہی اور مہیہ کے معنی ہیں زمین جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اس کلمے کو بھی بادشاہ، زمیندار اور صاحب ملک پر اطلاق کرتے ہیں۔

(۶) ایسر۔ مثلاً کابی سر یعنی صاحب و خداوند شعر، کیونکہ کاب کے معنی ہیں شعر۔ سنسکرت میں لفظ ایسر کو شین کے ساتھ بولتے ہیں۔

(۷) اِندر۔ مثلاً نرِندر یعنی صاحب و خداوند مرداں، کیونکہ نر کے معنی ہیں مرد۔

(۸) راج۔ مثلاً کب راج یعنی ملک الشعرا، کیونکہ کب کے معنی ہیں شاعر۔

(۹) ایث۔ مثلاً ڈھلیث یعنی صاحب سپر، کیونکہ ڈھال سپر کو کہتے ہیں۔

(۱۰) آوت۔ مثلاً لچھماوت یعنی دولت والی عورت، کیونکہ لچھمی کے معنی ہیں دولت۔ اور ت کے آخر میں یائے معروف بھی لاتے ہیں۔ مثلاً لچھماوتی۔ اور یہ کلمہ کنول کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں پدمنی کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً پدماوتی۔

ب۔ وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر فاعلیت کے معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ پانچ کلمے ہیں:۔

(۱) ایّا (ی کی تشدید کے ساتھ) مثلاً کھلیّا یعنی کھیلنے والا۔

(۲) وار۔ مثلاً کھلوار یعنی کھیلنے والا۔

(۳) آر۔ مثلاً کھلار یعنی کھیلنے والا۔ اس کے آخر میں یائے معروف بھی لاتے ہیں مثلاً کھلاری۔

(۴) آک۔ مثلاً پیراک یعنی پیرنے والا۔

(۵) آؤ۔ مثلاً بٹاؤ یعنی راستہ چلنے والا اور مسافر۔

ج۔ وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر مصدری معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔ یہ آٹھ کلمے ہیں:۔

(۱) بو۔ مثلاً بولبو یعنی بولنا۔

(۲) آئی۔ مثلاً ترنائی یعنی جوانی، کیونکہ ترن کے معنی ہیں جوان۔

(۳) آپو۔ مثلاً مٹاپو یعنی فربہی، کیونکہ موٹا کے معنی ہیں فربہ۔ روزمرہ کی بول چال میں اس لفظ کے آخر والے واؤ کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں مٹاپا۔

(۴) پن۔ مثلاً بال پن یعنی بچپن، طفولیت۔ پن کے آخر میں واو مجہول اور نون غُنّہ بھی لگاتے ہیں اور کہتے ہیں بال پنوں۔ روزمرہ کی بات چیت میں واو مجہول کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں بال پناں۔

(۵) نوں۔ مثلاً آونوں یعنی آنا۔ روزمرہ کی بول چال میں واو کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں آوناں۔

(۶) پت۔ مثلاً چکن پت یعنی رعنائی، زیبائی اور خودنمائی۔

(۷) آپ۔ مثلاً ملاپ یعنی ملنا، ملاقات کرنا۔

(۸) آو۔ مثلاً بناو یعنی بنانا، آراستہ کرنا۔

(ت) وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر وصفیت کے معنی دیتے ہیں۔ یہ دس کلمے ہیں:۔

(۱) تائی۔ مثلاً سیام تائی یعنی سیاہی، کیونکہ سیام کے معنی ہیں سیاہ۔ اس کلمے کو اس کے دوسرے جزو (ئی) کے بغیر بھی استعمال کرتے ہیں جیسے سیا تتا۔

(۲) آٹ۔ مثلاً چکناٹ یعنی دُہنیت اور چکنے ہونے کی صفت۔

(۳) آوٹ۔ مثلاً مہراوٹ یعنی زنانہ پن، کیونکہ مہری کے معنی ہیں عورت۔

(۴) آس۔ مثلاً میٹھاس یعنی میٹھے ہونے کی صفت۔

(۵) ایل۔ مذکر کے لیے لام کے آخر میں واو مجہول لگاتے ہیں اور کہتے ہیں رنگیلو یعنی رنگینی کی صفت سے موصوف مرد۔ روزمرہ کی بول چال میں واو کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں رنگیلا۔ مونث کے لیے یائے معروف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ رنگیلی یعنی رنگینی کی صفت سے موصوف عورت۔

(۶) سار۔ مثلاً ملنسار یعنی ملاقات یا میل جول کی صفت سے موصوف۔

(۷) کا۔ یہ لفظ مونث کے لیے مخصوص ہے۔ مثلاً ابھسارِکا یعنی فسق و بدکاری کی صفت سے موصوف عورت، کیونکہ ابھسار کے معنی ہیں فسق و بدکاری۔

(۸) آیوں۔ مثلاً ڈِھٹایوں یعنی بے حیائی اور بے شرمی کی صفت۔

(۹) اول۔ مذکر کے لیے لام کے آخر میں واو مجہول لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں منجھولو یعنی منجھلا ہونے کی صفت سے موصوف مرد۔ روزمرہ کی بات چیت میں واو مجہول کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں منجھولا۔ مونث کے لیے یائے معروف لگاتے ہیں اور کہتے ہیں منجھولی۔

(۱۰) اوہاں۔ مثلاً بھگوہاں یعنی نیم رنگ سُرخی کی صفت سے موصوف مرد، کیونکہ بھگوا نیم رنگ سرخ کو کہتے ہیں۔ مونث کے لیے اس لفظ میں الف کی جگہ یائے معروف لاتے ہیں۔ مثلاً بھگوہیں یعنی مذکورہ صفت سے موصوف عورت۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر تصغیر کا فائدہ دیتے ہیں

عربی کی اصطلاح میں تصغیر کسی کو چھوٹا اور حقیر کرنا ہے۔ یہ کلمے چار ہیں:-

۱۔ ڑا۔ مثلاً لنگر سے لنگڑا اور لنگر کے معنی ہیں شوخ۔ مونث کی تصغیر کے لیے ڑا کی جگہ یا لاتے ہیں۔ مثلاً گاگر سے گگریا اور گاگر کے معنی ہیں گھڑا۔ یا مذکر کے لیے نسبت کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً کنوجیا یعنی کنوج کی طرف منسوب مرد۔ کنوج ہندوستان کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔

۲۔ ڑا۔ مثلاً مینہ سے مینہرا اور مینہ کے معنی ہیں بارش۔

۳۔ اُوٹا۔ مثلاً ڈھوٹا سے ڈھٹوٹا۔ اور ڈھوٹا کے معنی ہیں لڑکا۔

۴۔ اوٹ۔ مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں واو مجہول لاتے ہیں اور کہتے ہیں کلوٹو اور کبھی اس کلمے ہیں واو معروف کی جگہ واو مجہول بھی لاتے ہیں مثلاً بھروٹو یعنی چھوٹی گٹھری۔ ان دونوں صورتوں میں روزمرہ کی بول چال میں آخری واو مجہول کی جگہ الف استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کلوٹا اور بھروٹا۔ اور مونث کے لیے الف کی جگہ یائے معروف لگاتے ہیں۔ مثلاً کلوٹی اور بھروٹی۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر دارندگی کے معنی کا فائدہ دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں:-

۱۔ دھر۔ مثلاً گردھر یعنی دارندۂ کوہ۔ گردھر کانھ کا نام ہے، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ کانھ نے ایک وقت پہاڑ کو ہاتھ پر لے لیا تھا۔ اس وقت سے ان کا نام گردھر ہو گیا۔ یہ کلمہ زمین کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں پہاڑ کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دھرادھر یعنی دارندۂ کوہ، کیونکہ دھرا کے معنی ہیں زمین۔ اور امرت یعنی آب حیات کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں چاند کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سدھا دھر۔ اور چاند کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں مہادیو کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً سسش دھر۔

۲۔ دھاری۔ مثلاً جٹا دھاری۔ یعنی جٹا رکھنے والا۔ اور جٹا کے معنی ہیں سر کے بال جو آپس میں چپک کر ایک ہو گئے ہوں۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر دہندگی کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں:-

۱۔ دائی۔ مثلاً دکھ دائی یعنی رنج دینے والا۔

۲۔ دائک۔ مثلاً سکھ دائک یعنی آرام دینے والا۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر کنندگی کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں :۔

۱۔ کَرَ۔ مثلاً دِن کَرَ یعنی دن کرنے والا۔ اِس کا اطلاق آفتاب پر کرتے ہیں۔

۲۔ کَرتا۔ مثلاً گُن کرتا یعنی فائدہ کرنے والا۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر لوٹ لینا، چھین لینا، لے بھاگنا کے معنی دیتے ہیں

یہ دو کلمے ہیں :۔

۱۔ ہَرَ۔ مثلاً مَن ہَرَ یعنی دلربا، دل لے لینے والا۔ اس کلمے کے آخر میں نون بھی لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں مَن ہَرَن۔ اور مونث کے لیے نون کے بعد یائے معروف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں مَن ہَرَنی یعنی دلربا عورت۔

۲۔ ہَرتا۔ مثلاً بائے ہرتا یعنی ہوا کا دور کرنے والا۔

وہ کلمے جو اسموں کے آخر میں آکر مختلف معنی دیتے ہیں

۱۔ ہار۔ ایک کلمہ ہے جو کسی اسم کے آخر میں آکر لیاقت اور سزاواری کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً ہُون ہار یعنی ہونے کے لائق، ہُشدنی۔

۲۔ اَوَٹ۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر آلے کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کَسَوٹ یعنی وہ چیز جس سے کسانی کی جائے۔ مذکر کے لیے اس کلمے کے آخر میں کبھی الف لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کَچھوٹا یعنی وہ چیز جس سے ستر عورت کیا جائے یعنی آگا پیچھا چھپایا جائے، کیونکہ کاچھ کے معنی ہیں عورت یعنی جسم کا وہ حصّہ جس کو چھپا رہنا چاہیئے۔ اور مونث کے لیے اس کلمے کے آخر میں یائے معروف لگاتے ہیں۔ مثلاً کَسَوٹی یعنی وہ چیز جس سے سونا چاندی پرکھتے ہیں، کیونکہ کس کے معنی ہیں پرکھنا۔ کبھی یہ کلمہ ظرفیت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً کجرَوٹی یعنی وہ چیز جس میں کاجل یا سُرمہ رکھتے ہیں۔

۳۔ بِن۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر بے اور بغیر کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً لال بِن یعنی بے معشوق اور لال کے معنی ہیں معشوق۔ اِس کلمے کے آخر میں الف نون بھی بڑھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں لال بِناں۔ اس کلمے کو کبھی اسم کے پہلے بھی لاتے ہیں اور کہتے ہیں بِن لال اور بِناں لال۔

۴۔ سالا۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر ظرف مکان کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دھرم سالا، یعنی عبادت، خیرات، دینداری، اور خدا پرستی کی جگہ۔ اِس کلمے کو کبھی بغیر آخری الف کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ٹک سال یعنی سکّے بنانے اور سونے چاندی کے پرکھنے کی جگہ۔

۵۔ آہند۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر بو کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً مچھلا ہند یعنی مچھلی کی سی تیز اور بُری بو۔

۶۔ چَر۔ ایک کلمہ ہے جو درخت کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر ہرن اور بندر کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً رُکھ چَر۔

اور جنگل، بیابان کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر یہی معنی اور جنگلی بیابانی آدمی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً بن چَر۔ پانی کے معنے دینے والے اسم کے آخر میں آکر ابرو باراں کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً جل چَر اور رات کے معنی دینے والے اسم کے آخر میں آکر بھوت کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً نِین چَر۔

۷۔ مئی۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر کثرت کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً جل مئی یعنی وہ جگہ جہاں کئی دریا بہتے ہوں یا ایسا دریا جس میں بہت پانی ہو، کیونکہ جل کے معنی ہیں پانی۔

۸۔ اَنش۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر حصہ کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً دَشوانش یعنی دسواں حصہ۔

۹۔ اَوْتی۔ ایک کلمہ ہے جو اسم کے آخر میں آکر مقدار اور اندازے کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً سمجھوتی یعنی سمجھنے کی مقدار اور اندازہ۔

اُردو اور پنجابی

ڈاکٹر محی الدّین زورؔ

زبانِ اُردو کا پنجابی سے جتنا قدیم اور جتنا گہرا تعلق ہے، اتنا کسی اور زبان سے نہیں ہے۔ اُردو دنیا کی ایک ایسی عجیب و غریب زبان ہے جو ہمیشہ غلط فہمیوں میں گھری رہی اور جس کو اپنوں اور بیگانوں نے اس کی بے تعصبی، ہمہ گیری اور باہمہ و بے ہمہ رہنے کے باوجود ہمیشہ نقصان پہنچانے ہی کی کوشش کی۔ اس کی شکل و صورت ہر دور میں بہت سوں کو دھوکہ دیتی رہی۔ اسی طرح اس کے آغاز و ارتقا کی نسبت بھی بڑے بڑے ادیب اور محقق اکثر بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اور بعض اب تک بھی بھٹک رہے ہیں۔ اس گمراہی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے پنجابی زبان کے اس حصّے کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے جو اس نے اُردو زبان کے بننے اور ترقی کرنے میں ادا کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اُردو کے آغاز و ارتقا کا سراغ اس وقت تک کسی ماہر لسانیات کو نہیں مل سکتا جب تک کہ اس کے ساتھ پنجابی کے تعلق پر غور نہیں کیا جاتا۔

بعض لوگ غلط فہمی یا مقامی تعصب کی وجہ سے اُردو کو ہندی یا سندھی یا برج بھاشا یا کھڑی بولی کی بیٹی سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایسی غلطی ہے کہ اس کو مان لینے کی وجہ سے ہر منزل پر نت نئی غلطیوں کو گوارا کر لینا پڑتا ہے۔ اور یہ سلسلہ لامتناہی بن کر بلند پایہ صاحبانِ فضل و کمال کو بھی گمراہ کر دیتا ہے۔ سچ کہا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رسد دیوار کج

یہ غلطیاں اور غلط فہمیاں زیادہ تر یورپی محققین اور ماہرینِ لسانیات کی پیدا کردہ ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جرمنی، فرانسیسی اور انگریزی ماہرینِ لسانیات نے ہماری زبانوں سے متعلق قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور ہم ان کے احسان کے ہمیشہ معترف رہیں گے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ احسان کے سعادت مندانہ اعتراف کے ساتھ ساتھ ہم ان کی غلطیوں کو بھی آنکھ بند کر کے قبول کر لیں۔

ہمارے ملک کی سیاسی و سماجی آزادی کے بعد سے ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اب اپنی ذہنی آزادی بھی حاصل کر لیں اور اپنی زبانوں اور ان کے ادب کے متعلق آزادانہ اور صحت مندانہ نقطۂ نظر کو پیشِ نظر رکھ کر تحقیقات کریں اور ایسے غلط نظریوں اور پا در ہوا خیالات کو چھان بین کے بعد علی الاعلان رَد کر دیں جن کو ہم اپنی کم علمی یا یورپ کے ماہرین لسانیات پر اعتقاد

یا ان کے بے جا رعب کی وجہ سے صحیح مان لیا کرتے تھے اور مان رہے ہیں۔

یہ عجب بات ہے کہ اُردو اور پنجابی کے اصلی تعلق کی نسبت کسی یورپی ماہر لسانیات کا ذہن اب تک منتقل نہیں ہوا۔ اس کی طرف سب سے پہلے ہم ہی لوگوں کی توجہ منعطف ہوئی اور ہندوستانی اہلِ قلم ہی نے اُردو اور پنجابی کے اس بنیادی تعلق کو سب سے پہلے بے نقاب کیا۔

آج سے ربع صدی قبل ۱۹۲۸ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں اس خیال کو نہایت واضح انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی راقم الحروف اُردو کے آغاز و ارتقا پر لندن یونیورسٹی میں لسانیاتی تحقیقات میں مصروف تھا۔ میرے مطالعے اور تلاش و جستجو میں بھی یہی حقیقت بے نقاب ہوئی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے یہ واضح کیا کہ جس زمانے میں اُردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ و جمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا تھا۔ برج بھاشا، کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالمِ وجود میں آئیں۔ چنانچہ میں نے اپنے مقالے میں اس نظریہ کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا۔ اس مقالہ کی تکمیل کے بعد راقم الحروف نے صوتیاتی نقطۂ نظر سے اس کی مزید توثیق کی اور اس سلسلے میں جو علمی تحقیقات کی تھیں ان کو کتابی صورت میں "ہندوستانی فونیٹکس" کے نام سے ۱۹۳۰ء میں پیرس میں شائع کیا۔ بعد میں اس نظریہ کی مزید وضاحت اور اہلِ اُردو میں اشاعت کے لیے ایک اُردو کتاب "ہندوستانی لسانیات" لکھی جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ غرض ۱۹۲۸ء کے بعد سے اہلِ اُردو اور ماہرینِ لسانیات کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اُردو کے سرزمینِ پنجاب میں پیدا ہونے اور لسانیاتی نشوونما حاصل کرنے کا نظریہ مستحکم اور مسلم الثبوت بن گیا۔

۱۹۴۲ء میں ہماری زبان کے ایک قابلِ احترام شاعر اور ادیب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اپنی کتاب "کیفیہ" شائع کی تو اس میں بھی انھوں نے راقم الحروف اور محمود شیرانی کے اس نظریہ سے اختلاف نہیں کیا۔ بلکہ صفحات ۲۵ تا ۳۹ پر میرے اس خیال کی تائید کی کہ اُردو کی پیدائش کے وقت شمالی اور شمال مغربی ہند کی زبان تقریباً ایک ہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی شاید دہلوی ہونے کی وجہ سے اس واقعہ کا صاف طور پر اعتراف نہیں کیا کہ اُردو پنجاب ہی میں پیدا ہوئی بلکہ ذرا دامن بچاتے ہوئے یوں لکھ دیا ہے کہ

> "راقم کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ کسی خاص مقام یا خطّے کو اُردو کا مولد ہونے
> کے امتیاز سے محروم کیا جائے یا یہ طرۂ امتیاز ایک سے چھین کر دوسرے
> کی دستار سے ٹانکا جائے۔"

بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ اُردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کی مخالفت بھی نہیں کی بلکہ اس کتاب کے کئی صفحات میں ایسے اسماء، افعال، ضمائر وغیرہ پیش کیے ہیں جن سے اُردو اور پنجابی کا تعلق ظاہر ہوتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں زبانوں کا تعلق نہایت گہرا اور نہایت قریبی ہے۔

پنڈت کیفی کے اس گومگو اندازِ بیان کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کتاب کی اشاعت سے دو سال قبل ہی مولانا سید سلیمان ندوی جیسے فاضل اجل کی ایک کتاب "نقوشِ سلیمانی" ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکی تھی جس میں مولانا کے مختلف مضامین

اور خطبے شامل ہیں۔ ان میں سے بعض بہت ہی قدیم یعنی ۱۹۱۵ء کے لکھے ہوئے ہیں لیکن ۱۹۳۳ء کے مقالے میں مولانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو سندھ میں بنی ہے چنانچہ وہ طویل بحث کے بعد جو نتیجہ اخذ فرماتے ہیں، وہ یہ ہے کہ

> "قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اُردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ اس وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔" ص ۳۱

اس سے پہلے کے ایک خطبے میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ

> "اُردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا کام نہیں بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے ......
> اُردو شاہجہان کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں خلجیوں اور تغلقوں ہی کے زمانہ میں یہ پیدا ہو چکی تھی۔" ص ۶

ایک اور مضمون میں مولانا نے یہ رائے قائم فرمائی ہے کہ

> "یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔" ص ۲۵

واضح ہو کہ مولانا سلیمان ندوی کے یہ عجیب و غریب اور متضاد بیانات "پنجاب میں اُردو" اور "ہندوستانی لسانیات" کی اشاعت کے بعد شائع ہو رہے ہیں۔ جن میں اس مسئلہ کو پوری طرح واضح کر دیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان تحقیقی اور لسانیاتی کتابوں کے مطالعہ کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائی۔ لیکن ان متضاد بیانات اور رایوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد جب پنڈت کیفی نے قلم اٹھایا تو قطعی طور پر کسی نتیجے پر پہنچنے سے گریز کیا۔ اور چونکہ یہ دونوں اصحاب لسانیات سے زیادہ تاریخ ادب و نقد شعر کے ماہر ہیں، اس لئے اپنے علم و فضل اور وسعت معلومات کے باوجود اصل مسئلہ سے دور ہو گئے۔ یا شاید دوسرے مصنفوں کی تحقیق یا نظریہ سے ہم خیال ہونے کو اپنے تبحر علم کے لئے کسر شان تصور کیا۔

غرض "نقوش سلیمانی" اور "کیفیہ" کی اشاعت کے بعد اُردو کے آغاز و ارتقا اور جائے پیدائش کے بارے میں اُردو اور ہندی کے ارباب قلم پھر تذبذب میں پڑ گئے۔ اور اُردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کے مسلم الثبوت نظریہ کو نظر انداز کرنے کا میلان شروع ہو گیا۔ اس میلان میں شاید اس لئے بھی تقویت پیدا ہونے لگی کہ اس نظریہ کے آغاز کا سہرا کسی یورپی محقق کے سر نہیں باندھا گیا تھا اور ہم ہندوستانیوں کے نزدیک اب تک انگریز یا جرمن یا فرانسیسی مصنف کا نام ہی کسی خیال یا نظریہ یا رائے کی صداقت و صحت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

دوسری وجہ شاید یہ ہے کہ اس میلان کو ہوا دینے والے اُردو اور ہندی ادیب چونکہ خود لسانیات پر کافی عبور نہیں رکھتے، اس لئے خود ذاتی تحقیق و تفتیش کرنے سے معذور ہیں۔

تیسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے اکثر صوبہ داری عصبیت کے شکار ہیں اور اتر پردیش اور دہلی کے سوا کسی اور مقام کو اُردو اور ہندی کا مرکز و منبع ماننے کے لئے تیار نہیں اور نہیں چاہتے کہ برج کی مقدس سرزمین اور اس کے نواحی علاقے

اس عظمت سے محروم ہو جائیں اور اُردو کے آغاز کا سہرا پنجاب کے سر باندھا جائے ۔

اُردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق اُردو کی جدید ترین لسانیاتی تحریروں کے تجزیہ سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی کی انگریزی کتاب " انڈو آرین اور ہندی " اور پروفیسر ڈاکٹر سدھیشور ورما کی اُردو کتاب آریائی زبانیں ،، کا بھی تذکرہ کیا جائے ۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی کلکتہ یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر اور ہندوستان کے سب سے بڑے عالم لسانیات اور محقق ہیں ۔ ان کی تصانیف کی اوّلیت و اہمیت اور ان کے تبحرِ علمی کی وجہ سے اگر ان کو عہدِ حاضر میں ہندوستانی لسانیات کا امام کہا جائے تو غلط نہ ہوگا ۔ ان کی تحقیقات نے یورپ کے بڑے بڑے ماہرین اور خاص کر " لسانی جائزہ ہند " کے مرتب سر جارج ابراہم گریرسن کی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے ۔ گجرات کی ورناکولر سوسائٹی نے ۱۹۴۰ء میں ان کو ہندی ، ہندوستانی کے نشوونما پر تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا تھا اور یہ تقریریں اس سوسائٹی کی طرف سے ۱۹۴۲ء میں " انڈو آرین اور ہندی " کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی گئی تھیں ۔ پروفیسر چیٹرجی نے اپنی اس کتاب میں " ہندوستانی لسانیات " سے ان الفاظ میں اتفاق کیا ہے کہ

> The language that they (Muslims) first adopted was naturally that current in the Punjab. Even in these days, there is not much difference between the Punjab dialects, particularly those of Eastern Punjab, from these spoken in the western most parts of the United Provinces ; and eight or nine hundred years ago, we might imagine that the difference was still less : it is even likely that an almost indentical speech was current in Central and Eastern Punjab and Western United Provinces." (p. 167)

اس کے بعد دہلی میں مسلمانوں کی آمد اور وہاں اپنی بنائی ہوئی بولی کو پنجاب سے ساتھ لانے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ۔

> " It is likely that Punjabi Mohamaddans who came to Delhi as followers of the Turki and Persian conquerers had the greatest importance of all the Indian groups, in the new capital. They brought their dialect to Delhi ; and their dialect, which agreed with those of the districts to the North and North West of Delhi in some important matters, gave the tone and supplied some salient characteristics to the new verkchess prache so business speech which came into being in the new capital city." (pp. 168-169)

اس بیان کے آخری حصے میں چیٹرجی نے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی عظمت قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے آگے چند صفحات بعد ہی ڈاکٹر چیٹرجی اُردو شہ پارے کے حوالے سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اُردو بولنے والے پنجاب ہی سے آئے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

> "Judging from the kind of speech the descendants of the North Indian Muslims, still speak in the Deccan, and from the language of early Dakvi Poetry of the 16th-17th centuries (*cf.* Urdu Shahpare, by Dr. S. Mohiuddin Qadri, Hydrabad Dakan Part I, 1929), it is clear that they mostly hailed from the Punjab and from the Bangaru and 'Vernacular Hindustani' dialects areas of North India." (p. 184)

مگر بڑا تعجب ہوتا ہے جب سنیتی کمار جیسا محقق آگے کی چند سطروں میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ دکنی اُردو کسی اور بولی سے بنی اور شمالی اُردو کسی اور بولی سے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "The North Indian Vernacular which became established in the South was sister speech to Hindustani, if not exactly identical with it, being of some Punjab and Western United Provinces origin." (p. 184)

چند اور سطروں کے بعد چیٹرجی پھر اُردو کا اصلی وطن پنجاب ہی کو قرار دینے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ چنانچہ شاہ برہان الدین جانم کی نظم "سکھ سہیلا" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "Shah Burhan's language has some distinct Punjabi affinities, and it is noteworthy that he calls it Guj (a) ri as contrasted with Bhaka, *i.e.* Braj Bhaka. This name Gujri gives an indication of the origin and affinity of this dialect: evidently the Gujars of the Punjab …….. had come in good numbers with the North Indian armies, and they maintained their name and their dialect in the Deccan for some time." (pp. 185-186)

یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی کے ان بظاہر متضاد بیانات کے اسباب اور ان کے حسن و قبح پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ البتہ اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ یہ مبہم بیانات بھی ان غلط فہمیوں کا باعث ہیں جو بعد کے

اُردو ارباب قلم کی لسانیاتی تحریروں کو گمراہ کر دینے کا باعث ہوئے اور جن کا ذکر آئندہ درج ہے۔

پروفیسر چٹرجی کی تقریروں کے اس مجموعہ کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر سدھیشور ورما کی ایک کتاب "آریائی زبانیں" میرے ہی مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔ سدھیشور ورما پرنس آف ویلز کالج جموں میں سنسکرت اور لسانیات کے عرصے تک پروفیسر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے موضوع کی مناسبت سے آریائی زبانوں پر تو اس کتاب میں تفصیل سے بحث کی ہے لیکن اس کی تمہید میں ہندوی زبان کے ماخذ و ارتقا پر بھی سرسری طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ پر غور ہی نہیں کیا۔ نہ تو محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اُردو" ہی پڑھی۔ نہ پنڈت کیفی کی "کیفیہ" اور نہ ہندوستانی لسانیات ہی کا مطالعہ کیا۔ اگرچہ چٹرجی کی مذکورہ بالا کتاب کے جا بجا حوالے دئے ہیں لیکن اُردو یا ہندوی کے آغاز کی نسبت اسی پرانے خیال کو دہرا دیا ہے کہ وہ دہلی کے بازاروں اور ضلع میرٹھ کی زبان سے مل کر بنی ہے۔ (صفحات ۱۲، ۱۳)

آخر میں اُردو اور ہندی کی ان کتابوں کا ذکر ضروری ہے جو گذشتہ چار پانچ سالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں خاص طور پر دو کتابیں اہمیت رکھتی ہیں اس لئے کہ وہ لسانیاتی انداز میں لکھی گئی ہیں اور اُردو کی ان معدودے چند کتابوں میں سے ہیں جو اس مخصوص موضوع پر اب تک شائع ہوئی ہیں۔

پہلی کتاب پروفیسر احتشام حسین کی "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" ہے۔ احتشام حسین صاحب نے دراصل جان بیمز کی مشہور کتاب "این آؤٹ لائن" کا ترجمہ اپنے ایک سیر حاصل مقدمے کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں شائع کیا ہے۔ ان کا مقدمہ اگرچہ بطور دیباچہ، کتاب کے ساتھ شریک ہے لیکن بجائے خود ایک مبسوط مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں احتشام صاحب نے اس موضوع کی تمام مطبوعہ کتابوں کے مطالعہ کا بہت عمدہ نچوڑ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن بڑی حیرت ہوتی ہے جب یہ جملہ بھی اس مقدمے میں نظر سے گذرتا ہے کہ

> "جیولز بلاک (فرانسیسی ماہر لسانیات) نے جو نظریہ پیش کیا ہے اور جسے
> ڈاکٹر زور نے تسلیم کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی
> میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا۔ بعد میں ایک پنجابی بن گئی۔ دوسری
> کھڑی بولی۔" (صفحہ ۵۳)

حالانکہ نہ تو پروفیسر جولز بلاک نے یہ نظریہ پیش کیا اور نہ میں نے کہیں اپنی کتابوں میں ان کے کسی نظریہ کی وضاحت کی۔ اس نظریہ کے اگر کوئی بانی قرار دئے جا سکتے ہیں تو وہ دراصل پروفیسر چٹرجی ہیں جن کی طرف میں نے "ہندوستانی لسانیات" میں صفحہ ۹۰ اور "ہندوستانی فونے ٹکس" میں صفحہ ۱۹ پر اشارہ بھی کیا ہے۔ پروفیسر جولز بلاک نے دراصل اپنے ایک مضمون میں اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہندوستانی کے آغاز و ارتقا پر غور کرتے وقت دہلی کے اطراف و اکناف کی بولیوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے اور ان کا یہ مضمون اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن کے بلیٹن میں ۱۹۲۶ء میں اس وقت چھپا تھا جب کہ میرا مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی مکمل ہو چکا تھا۔ اگر یہ مضمون اس کی ترتیب کے دوران میں چھپتا تو میں

اس کی تائید تو یقیناً نہیں شاید تردید ہی کرتا۔

پروفیسر جولز خود بھی محمود شیرانی کی کتاب اور میری تحقیقات سے اس وقت تک ناواقف تھے اور جب میں ۱۹۲۹ء میں لندن سے پی ایچ ڈی کر لینے کے بعد ڈی لٹ کے لئے پیرس پہنچا اور پروفیسر جیولز بلاک کے ساتھ گجراتی فارم آف ہندوستانی پر مقالہ لکھنا شروع کیا تھا تو وہ اس وقت ان مباحث اور نظریہ سے پوری طرح واقف ہوئے۔ چنانچہ جب پیرس ہی سے ہندوستانی فونیٹکس شائع ہوئی تو اس پر خود پروفیسر جیولز بلاک ہی نے مقدمہ تحریر فرمایا اور چونکہ وہ اس نظریہ کو سمجھ چکے تھے اس لئے اپنے مقدمے میں اس کی کوئی مخالفت بھی نہیں کی۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ ہندوستانی مصنفین کے لئے کسی یورپی محقق کا نام ہی ضمانت کا کام دیتا ہے چنانچہ جیولز بلاک کے اس ابتدائی خیال کو صحیح سمجھ لینے کے بعد پروفیسر احتشام حسین نے اپنے مقدمے کو اردو کے آغاز اور جائے پیدائش کے بارے میں کوئی قطعی نتیجہ قائم کئے بغیر ہی ختم کر دیا ہے۔

یہی حال اس کی ہم عصر ایک دوسری کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" کا بھی ہے۔ اس کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے طور پر مرتب کیا تھا۔ یہ مقالہ ابھی حال میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے اس مقالہ میں اگرچہ زیادہ تر پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور ان کی تحقیقات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ لیکن جیولز بلاک کے مذکورہ بالا مضمون کو بنیاد قرار دے کر پوری کتاب میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ پنجابی سے توجہ ہٹا کر ہریانوی کو آگے بڑھایا جائے اور کچھ اس انداز میں کتاب لکھی گئی ہے کہ پنجابی واقعی پس منظر میں چلی جاتی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین یہ تو مانتے ہیں کہ:۔

> "یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانی اور پنجابی میں خط فاصل قائم کرنا دشوار تھا۔" (ص ۱۰)

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عجیب و غریب خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ:۔

> "البتہ شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابلہ میں ہریانی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑیگا۔" (ص ۱۰)

اس کتاب میں مسعود صاحب سے ایک اہم فروگذاشت یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کئے ہیں۔ حالانکہ دکنی اردو نے جس وقت پنجاب میں نشوونما حاصل کیا اس وقت ہریانی اور کھڑی بولی تو کجا خود برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالم وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور خود انھوں نے پروفیسر شیرانی کے اس نظریہ کو قبول کیا ہے کہ ہریانی کی پیدائش مسلمانوں کی آمد دہلی کے بعد عمل میں آئی ہے۔ (ص ۱۳)

ڈاکٹر مسعود حسین مانتے ہیں کہ لاہور کی ترکی ہندی فضا میں خواجہ مسعود سعد سلمان پرورش پاتے ہیں۔ جو ہندوی زبان کے بھی پُرگو شاعر تھے۔ (ص ۱۲۸، ۱۲۹)

اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "خواجہ مسعود کسی ہندوی زبان میں بھی شاعری کرتے تھے اور شاید ان کا دیوان خسرو کے وقت

تک دستیاب تھا" لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہندوی زبان کون سی تھی۔ اس لئے قیاس قائم کرتے ہیں کہ زبان لاہوری ہوگی۔

یہ ایک عجیب قیاس ہے جب کہ ہم کو معلوم ہے کہ امیر خسرو ہر جگہ کی زبانوں کا فرق جانتے تھے اور اپنے عہد کے بہت بڑے ماہر و محقق لسانیات تھے چنانچہ انھوں نے اپنے عہد کی ہندوستانی زبانوں کی فہرست بھی لکھ دی تھی جس کو مسعود صاحب نے بھی صفحہ ۴۰ پر نقل کیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مسعود سعد سلمان کی زبان لاہوری ہوتی تو امیر خسرو اس کو لاہوری ہی لکھتے اور ان کی زبان اور مسعود کے دیوان کی زبان میں فرق ہوتا تو وہ ضرور یہ بھی واضح کر دیتے کہ میں نے دہلوی میں شاعری کی اور مسعود نے لاہوری میں۔

لیکن اس کی بجائے انھوں نے اپنی اور مسعود دونوں کی زبان کا نام ہندوی ہی لکھا۔

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ امیر خسرو نے اپنی زبانوں کی فہرست سے ہندوی کو الگ ہی رکھا اس لئے کہ یہ زبان بین صوبائی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ان کے عہد میں یہ کوئی مقامی زبان نہیں رہی تھی۔ اور انھوں نے جن زبانوں کے نام لکھے ہیں، وہ صرف مقامی ہیں اور ان مقامی زبانوں کی فہرست میں برج بھاشا کو انھوں نے دہلوی اور پنجابی کو لاہوری لکھا ہے۔

مسعود صاحب دہلوی کو اُردو سمجھتے ہیں اگر یہ صحیح ہوتا تو خسرو پر یہ الزام رہتا کہ انھوں نے برج بھاشا جیسی اہم زبان کا ذکر ہی نہیں کیا۔

قصہ مختصر یہ کہ ہریانی کو اُردو کا ماخذ ثابت کرنے کی کوشش میں ڈاکٹر مسعود حسین کی پوری کتاب ایسی گنجلک اور مبہم و متضاد بیانات سے معمور ہو گئی ہے کہ ان پر ایک سرسری تبصرہ کے لئے بھی کافی وقت اور فرصت درکار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب محنت اور تلاش و جستجو سے لکھی گئی ہے اور مصنف نے لسانیاتی مسائل سے گہرے شغف کا ثبوت دیا ہے لیکن محض جیولز بلاک کی سند پر ایک پورا نظریہ قائم کرنے اور پنجاب میں آغاز اُردو کے نظریہ کو غلط ثابت کرنے کی سعی میں اپنی ساری قابلیت وقف کر دی ہے۔

اس کی اشاعت کے بعد کوئی تعجب نہیں کہ اُردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں عام طور پر انتشار خیال پیدا ہوا اور ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان سب کتابوں اور ان کے مندرجہ مبہم و متضاد بیانات کی جانچ کی جائے اور ان میں جہاں جہاں غلطی ہے، اس کی تردید دلائل کے ساتھ پیش ہو۔ اور پنجابی اور اُردو دونوں زبانوں میں ایک ایسی مبسوط کتاب مرتب اور شائع کی جائے جس میں لسانیاتی نقطۂ نظر سے اور دلائل و براہین کے ساتھ اُردو کے آغاز و ارتقا اور اُردو اور پنجابی کے تعلق پر روشنی ڈالی جا سکے۔

اس کتاب میں ان امور کا پھر سے تفصیلی جائزہ لینا پڑیگا جن کے بارے میں شیرانی، کیفی، چٹرجی اور مسعود حسین خاں نے بھی بحث کی ہے اور جس کے سلسلے میں ان کے آپس میں اتفاق یا اختلاف رائے پیدا ہوا ہے۔

اس بات کو صاف طور پر واضح کرنا پڑے گا کہ ہریانی زبان کی پیدائش اُردو کی پیدائش کے بعد عمل میں آئی ہے۔ اور اگر قدیم دکنی اُردو کی بعض خصوصیات ہریانی زبان سے ملتی جلتی ہیں تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ اُردو ہریانی سے بنی بلکہ اس کا اصلی

سبب یہ ہے کہ اُردو اور ہریانی دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔

قدیم دکنی اُردو کی بہت سی کتابیں اس اثنا میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور آ رہی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جن تک چیٹرجی، شیرانی اور مسعود حسین خاں کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ اس لئے اب قدیم ترین زبان کے ان نمونوں کا گورو نانک، کبیر، تلسی داس، سور داس اور خود چند بردے کی زبان سے مقابلہ کر کے ان کے آپس کے لسانی اختلافات کو واضح اور معین کرنا پڑیگا۔

دکن کی طرح گجرات مالوہ اور خاندیس کے قدیم مصنفین کی کتابوں اور نظموں کی زبان بھی اس مقابلہ و موازنہ میں زیر بحث آنی ضروری ہے! اس لئے کہ ان علاقوں میں بھی سرزمین پنجاب ہی کے فیض یافتہ صدیوں سیاسی اور علمی حیثیت سے برسر اقتدار رہے ہیں۔

ان تمام امور کو پیشِ نظر رکھ کر جو کتاب مرتب ہو گی اس سے نہ صرف اُردو کی ابتدا اور جائے پیدائش کے مسئلہ کی یکسوئی ہو جائے گی بلکہ پنجابی اور پنجاب سے اُردو کے دیرینہ اور بنیادی تعلق کے بارے میں جو غلط نظریات عہدِ حاضر کے ادیبوں اور محققوں کے دماغوں میں نشو و نما پا رہے ہیں، ان کی تردید ہو جائے گی۔ اور اُردو، ہندی اور پنجابی تینوں زبانوں کے ارباب کو معلوم ہو گا کہ یہ تینوں زبانیں باہم دگر کتنی پیوست ہیں اور یہ کہ سرزمین پنجاب نے ہندی اور اُردو کی شکل میں ہندوستان اور پاکستان کو کیسی عظیم الشان نعمتیں عطا کی ہیں۔

تنقید میں نقطۂ نگاہ کی اہمیت

شوکت سبزواری

تنقید ایک مفید فن ہے۔ جس سے اچھا اور مفید کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب صحیح تنقیدی شعور سے کام لے کر تنقید میں باقاعدگی پیدا کی جائے اور ایک فن کی طرح اس کی عمارت ٹھوس علمی بنیادوں پر استوار ہو۔ تنقید کو باقاعدہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ تنقید کے اصول نہیں، شعر فہمی کے بندھے ٹکے قاعدے ہیں۔ کچھ پیمانے ہیں۔ جن کی مدد سے شعر یا نثر پارے کو ناپ کر اس کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ سونے اور چاندی کے پرکھیا کے پاس ایک کسوٹی ہوتی ہے۔ جس پر رگڑ کر وہ کھوٹے کھرے کی جانچ کر لیتا ہے۔ تنقید کے اصول بھی کسوٹی کی طرح ہیں۔ جن پر شعر کے کھرے کھوٹے کو پرکھا جاتا ہے۔ یہ اصول اگر طے ہو جائیں تو تنقید میں باقاعدگی آجائے۔ اور وہ ایک مفید اور علمی بنیادوں پر استوار فن کی حیثیت اختیار کر لے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک زمانہ تھا جب تنقید کے اصول مقرر تھے۔ جن پر شعر کو پرکھا جاتا تھا اور جو ان اصولوں کو جانتے تھے۔ وہ نقاد کہلاتے تھے۔ ان کے فیصلے اٹل ہوتے تھے۔ لیکن یہ اُس زمانے کی بات ہے جب تنقید لفظوں کی جانچ پرکھ اور ترکیب تول سے آگے نہ بڑھی تھی۔ نقاد کلمے کی فصاحت اور کلام کی بلاغت کے فیصلے صادر کیا کرتے تھے۔ اب تنقید بہت آگے بڑھ گئی ہے اب اس میں زندگی کی سی وسعت آگئی ہے۔ آج چند اصول مقرر کر کے انھیں معیار نقد قرار دینا ایسا ہے جیسے چھتیس انچی گز کی مدد سے اس وسیع اور پہناور کائنات کی وسعتوں کو ناپنا۔ آج کسی طرح بھی تنقید کے بندھے ٹکے اصول نہیں ہو سکتے۔ پھر تنقید میں باقاعدگی اور ایک فن کی سی استواری کس طرح پیدا ہو؟

اس سوال کا جواب مختلف نقادوں نے مختلف طریقوں سے دیا ہے۔ یہ نقاد مختلف نقطہ ہائے نگاہ کے مالک تھے۔ وہ زندگی کو جن زاویوں سے دیکھتے تھے۔ شعر و ادب کے کارناموں کے پرکھنے میں انہی زاویوں سے انہوں نے کام لیا۔ اس لیے ہر ایک نے اپنی تنقید کا معیار الگ بتایا۔ میرے خیال میں اس سے تنقید کی حیثیت واضح نہیں ہوتی اور نہ اس میں باقاعدگی آتی ہے۔ تنقید میں باقاعدگی اسی وقت آسکتی ہے جب زندگی کی بابت ان نقادوں کے زاویۂ نگاہ کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور معیار نقد مقرر کرنے سے پہلے اس نقطۂ نگاہ کی حقیقت دریافت کر لی جائے۔ جو اس معیار کے لیے اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے جس طرح تنقید کے بندھے ٹکے اصول نہیں۔ اس کا کوئی قطعی معیار بھی نہیں۔ معیار یا تو چند اصولوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جہاں اصول نہ ہوں۔ وہاں مجموعہ کہاں ہو سکتا ہے یا معیار ایک جامع اور کسی قدر مبہم اصول کا نام ہے جو اپنی جامعیت اور ابہام کی وجہ سے نہ تو واضح ہی ہے اور نہ قطعی۔ نہ منطق کے

اصولوں کی سی روشنی اس میں پائی جاتی ہے اور نہ کپڑے کے گز کی سی قطعیت۔ مثلاً حسن کاری، یا افادیت، یا زندگی کی تنقید، یا سماجی شعور وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کو معیارِ نقد قرار دیا گیا ہے۔ کسی کے نزدیک حسن کاری ادب ہے۔ کسی کے نزدیک افادیت، کوئی زندگی کی تنقید کو ادب بتاتا ہے اور کوئی سماجی شعور کو۔ حسن کاری کی حدود کیا ہیں؟ افادیت کسے کہتے ہیں؟ زندگی کی تنقید کا معیار کیا ہونا چاہئے؟ سماجی شعور کی اساس کیا ہے؟ ان میں سے کوئی چیز بھی واضح نہیں۔ تنقید کے اصولوں کی طرح ان میں سے کسی معیار کے بھی بندھے ٹکے اصول نہیں بتائے گئے۔

ادب کے متعلق دو بڑے نقطۂ نگاہ ہیں۔ جن پر تنقیدی نظریوں کی بنیاد قائم ہے۔ ایک نقطۂ نگاہ تو یہ ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے جسے زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ادب خود ایک مستقل اور آزاد نظام ہے۔ اس کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ادب سے زندگی کا ناتا جوڑنے والے آج کل اکثریت میں ہیں اور ان کے نقطۂ نگاہ کو آہستہ آہستہ سبھی مانتے جا رہے ہیں۔ یہ ادیب کو زندگی کا پرتو سمجھتے ہیں اس لیے ان کا خیال ہے کہ آج زندگی میں جو تنوع ہے جو رنگا رنگی ہے۔ ادب میں بھی وہی تنوع اور رنگا رنگی پائی جانی چاہئے۔ ان کے نزدیک ادب کی کسوٹی خود زندگی ہے۔ زندگی کے تمام گوشے ادب کا موضوع ہیں۔ اس کے ہر چھوٹے بڑے پہلو کو ادب میں بیان کیا جا سکتا ہے زندگی میں سادگی بھی ہے۔ اور پرکاری بھی۔ چھل بل بھی ہے۔ اور رس جس بھی۔ یہ سادگی، پرکاری، چھل بل، رس جس ادب میں بھی سمویا جا سکتا ہے ادب زندگی کا ترجمان ہی نہیں نقاد بھی ہے۔ اس میں زندگی کی تصویر کشی ہی نہیں کی جاتی، زندگی کی تنقید اور اصلاح کا کام بھی اس سے لیا جاتا ہے۔

لیکن اتنا کافی نہیں۔ زندگی کی بابت ان کا نقطۂ نگاہ کیا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہئے۔ اور ان کی تنقید کی حیثیت متعین کرنے کے لیے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ان کا یہ نقطۂ نگاہ کہاں تک حقیقت کے مطابق ہے۔ دنیا میں ہر چیز کی قدر و قیمت اسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جب اسے پرکھ کر دیکھا جائے۔ اس کا براہِ راست ادبی تنقید سے تعلق نہ سہی۔ لیکن پھر بھی اس کی جانچ پڑتال ضروری ہے۔ اس مکتبِ خیال کے تنقیدی فیصلوں کا دار و مدار جس نقطۂ نگاہ پر ہے۔ اگر اس کی حقیقت واضح ہو جائے۔ تو اس کا اثر تنقیدی فیصلوں پر بھی پڑ سکتا ہے۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک مادی، دوسرے غیر مادی۔ زندگی کی تعمیر جن دو کائناتی عناصر سے ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک مادہ ہے۔ دوسرے قوت۔ جسم مادہ کا مظہر ہے اور ذہن قوت کا۔ جسم کثافت ہے۔ اور ذہن لطافت۔ یہاں تک تو کوئی اختلاف نہیں۔ اس کے بعد ایک مکتبِ خیال کے نقاد زندگی کے مادی عنصر یعنی کثافت کو اصل زندگی سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مادہ قوت سے پہلے ہے۔ اوّل اوّل مادہ تھا۔ قوت بعد میں رونما ہوئی۔ بلکہ قوت مادہ سے الگ اور اس سے مختلف کوئی حقیقت نہیں۔ وہ مادے کی کسی قدر لطیف صورت کا نام ہے۔ اس میں تو شاید ہی کسی کو شبہ ہو کہ مادے کے تقدم و تاخر کا سوال براہِ راست تنقید سے متعلق نہیں۔ وہ طبیعیات کا مسئلہ ہے جسے نقاد کی بجائے ماہرِ طبیعیات ہی حل کر سکتا ہے۔ دوسری زبانوں کے ادبی نقاد محض ادب و شعر کے نقاد نہ تھے۔ فلسفہ، نفسیات اور طبیعیات کے ماہر بھی تھے۔ اس لیے انہوں نے اگر مادے کے تقدم کا دعویٰ کیا اور اسے اپنے تنقیدی نظریات کی بنیاد ٹھہرایا۔ تو کچھ سوچ سمجھ کر اور جانچ پرکھ کر ہی کیا۔ جس طرح ادبی تنقید ان کے غور و فکر کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح ان کے تنقیدی نظریے اور ان کی اساس بھی ان کی ذاتی کنج کاوی کی پیداوار ہے۔ لیکن اردو کے شاعروں نے اس بنیادی نظریہ کو کیسے اپنایا؟ وہ اُن کے ذاتی فکر اور کاوش کا نتیجہ نہ تھا۔ اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ فلسفہ اور سائنس کے ماہروں کی ایک بڑی تعداد آج بھی اس نقطۂ نگاہ کو صحیح نہیں سمجھتی۔

مادہ اور قوت اگر ساتھ ساتھ ہیں تو یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ ان میں سے مقدم کون ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی

یہ طے کرنے بیٹھ جائے کہ دن پہلے ہے یا رات۔ اصل سوال حقیقت کا ہے۔ زندگی کی حقیقت مادی ہے یا غیر مادی۔ فیصلہ جدید طبیعات کی رُو سے کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا ایک افادی پہلو بھی ہے۔ اگر یہ طے ہو جائے کہ زندگی کی حقیقت غیر مادی ہے۔ تو ادب میں مادی مطالبوں کو جو غیر معمولی اور اپنی حیثیت سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ قدرتی طور پر ان کی وہ اہمیت نہ رہے گی۔ اور اس کا ادب کے دوسرے مادی نظریوں پر بھی اثر پڑے گا۔ نیوٹن کے زمانہ تک مادے اور زندگی کے مادی عنصر کی بڑی اہمیت تھی۔ اس وقت تک مادے کو ایک ٹھوس چیز سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خیال عام تھا کہ مادہ مقدار رکھنے والے چھوٹے چھوٹے ذرات کا نام ہے جو اتنے سخت اور دبیز ہیں کہ نہ وہ کٹ سکتے ہیں اور نہ بٹ سکتے ہیں۔ مادی دنیا کی بنیاد یہ ذرات ہیں جو مادہ کی تین ابتدائی صفات یعنی وزن، صلابت اور حجم (بعد) کے حامل ہیں۔ لیکن جدید طبیعات کے نظریہ اضافیت و کمیت نے نیوٹن اور ڈالٹن کے قدیم طبیعاتی نظریہ کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ اور جدید تجربات نے یہ ثابت کر دکھایا۔ کہ ذرات کی کوئی اصلیت نہیں۔ جسم کی ترکیب برقی لہروں سے ہوئی ہے۔ جنھیں آئنسٹائن کے لفظوں میں "ہم رشتہ واقعات کا نظام" اور پروفیسر وائٹ ہیڈ کے لفظوں میں "عضویہ" کہہ سکتے ہیں۔ برقی لہروں کی تعمیر میں منفی اور مثبت دو قسم کی لہریں شامل ہیں۔ جدید طبیعات کی رُو سے زندگی کی حقیقت برقی لہر یا قوت کا بہاؤ ہے۔ اس نظام میں مادے کا درجہ بہت بعد میں آیا۔ اور یہ ترکیب کا نتیجہ تھا۔ برقی لہر سے برقی پارے بنے اور برقی پاروں کی ترکیب سے ذرے وجود میں آئے۔ اور آخر میں ان ذرات کے اجتماع سے اجسام کی دنیا خلق ہوئی۔ نئی طبیعات میں زندگی کی اصل لطافت ہے۔ کثافت کو لطافت نے اپنی رونمائی کا سہارا بنایا۔ غالب اُردو کا غزل گو شاعر ہے۔ اس نے جدید طبیعات کے اس نظریہ کو اپنی تخئیل کا رنگ دے کر اس طرح پیش کیا ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

مولانا روم یہی بات۔ اس سے پہلے اپنے سیدھے انداز میں کہہ چکے تھے۔

پیکر از ما ہست شد نے ما ازو　　بادہ از ما مست شد نے ما ازو!

اردو کے سب سے بڑے مفکر شاعر اقبالؔ کا خیال بھی یہی ہے۔

دمادم رواں ہے یمِ زندگی!　　ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود　　کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل　　خوش آئی اسے محنتِ آب و گل

اردو کے نقاد یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ زندگی کی اصل حقیقت مادہ ہے۔ یہ ان کی اپنی دریافت ہے۔ یہ بات وہ ایک خاص خیال کے مادہ پرست مفکروں کی تقلید میں کہتے ہیں۔ یہ بالکل اتفاق ہے کہ ہمارے بزرگ زندگی کی بابت جو نظریہ رکھتے تھے۔ جدید طبیعات نے اس کی توثیق کر دی۔ اُردو کے مادہ پرست نقادوں کو ایک خاص خیال کے مفکروں کی تائید محض جذباتی طور پر کرنا زیب نہیں دیتا۔ علمی مسائل میں ہمارے بزرگ بھی جذبات سے کام لیا کرتے تھے۔ اگر بزرگوں سے اختلاف کرنا ہی "صاحب نظری" ہے۔ تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ زندگی کی بابت وہ اپنے اس مادی نظریہ کے اظہار میں جذبات سے کام نہ لیں بلکہ دلائل کی روشنی میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

یہاں ایک اور بحث سامنے آتی ہے۔ جس کا تعلق تنقید کے بعض اہم نظریوں سے ہے۔ اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اکثر نقاد یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ ارتقا رجعت پسندانہ نظریہ ہے۔ ہم انقلاب کے ماننے والے ہیں۔ لیکن یہ نقاد کبھی ارتقا کی وضاحت نہیں کرتے اور انقلاب و ارتقا

ہیں جو نازک فرق ہے۔ اس کا ذکر بھی وہ ذرا کم کرتے ہیں۔ عام طور سے ارتقا اور انقلاب میں فرق مدّت کی کمی بیشی سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ جس تبدیلی میں وقت کم لگے وہ انقلاب ہے اور جس میں زیادہ وقت لگے وہ ارتقا ہے۔ یہ غلط ہے۔ مدت کی کمی بیشی کوئی معیار نہیں۔ خود ارتقا کی صورت میں کہیں زیادہ وقت لگتا ہے اور کہیں کم۔ ایک تخم جو زمین میں ڈالا جاتا ہے، اکثر چھ ماہ کی مدت میں ایک سرسبز اور لہلہاتے ہوئے کھیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن بعض تخم ایسے بھی ہیں جن کے برگ و بار لانے میں سال دو سال سے کم مدت نہیں لگتی۔ ارتقا اور انقلاب، دونوں کی حقیقت تبدیلی ہے۔ تغیر ایک ایسا عنصر ہے جو دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن ارتقا میں تغیر آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوتا ہے۔ اور انقلاب میں یک بیک اور دفعتاً۔ ارتقا کی صورت میں بدلنے والی چیز کے درمیانی مدارج بھی ہوتے ہیں۔ انقلاب میں ان درمیانی مدارج کی گنجائش نہیں۔ ایک بچے کی پیدائش کی مثال لیجیے۔ اوّل اوّل وہ ایک پانی کا قطرہ تھا۔ جس نے پہلے ایک پھٹک کی شکل اختیار کی۔ پھر گوشت کے لوتھڑے کی۔ اس کے بعد پٹھے اور ہڈی کی تہیں چڑھیں، اس کے بعد کھال کا پردہ آیا۔ اور آخر میں جان پڑ گئی۔ بالکل یہی کیفیت تخم کی ہے۔ زندگی میں ارتقا ہے۔ آج تک انقلاب نہیں دیکھا گیا۔ ڈاروِن نے انسان کی پیدائش کا جو نظریہ پیش کیا ہے اور جسے دنیا کے سبھی ماہرین حیاتیات نے صحیح مانا ہے، وہ بھی ارتقا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندو فلسفی نظریہ انقلاب یا کون و فساد کے قائل ہیں۔ اور بعض سامی مذاہب کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلا انسان یک بیک وجود میں آیا۔ اور درمیان کی تمام ارتقائی منزلوں کو پھلانگ کر وہ شعور کی آخری سرحد پر پہنچ گیا۔

الجھنیں بہت ہیں۔ کوئی کہاں تک سلجھائے۔ یہ طبیعاتی ارتقا کا ذکر تھا۔ معاشرے کا ارتقا بھی انھی خطوط کے برابر برابر ہوا ہے۔ زندگی میں پیچیدگیوں کے باوجود ایک طرح کی ہمواری ہے جنھیں قوموں کے عروج و زوال اور انسانی معاشرے کے مدوجزر کی داستانیں یاد ہیں۔ وہ فطرت اور تاریخ دونوں میں ارتقا کے قائل ہیں۔ آج تاریخ کی رفتار ترقی پہلے کے مقابلے میں تیز بتائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک کوئی قوم معاشری ارتقا کی تمام درمیانی منزلوں سے نہیں گزر لیتی۔ وہ جمہوریت اور مساوات کی آخری منزل پر نہیں پہنچتی (اور یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آخری منزل ہے) اس میں شبہ نہیں کہ انسانی مساوات کی منزل ابھی دور ہے۔ آج دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جو جمہوریت کے احساس سے محروم ہیں۔ اور ایسی قومیں بھی ہیں جو اس سے آگے بڑھ کر معاشی مساوات کے قریب پہنچ چکی ہیں۔ اس سے آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہی ہیں۔ جب تک کسی معاشرے میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ کبھی آگے نہیں بڑھتا۔ صرف چند افراد کی کوششیں اسے آگے بڑھانے یا انقلاب لانے میں مستقل طور سے نہ کبھی کامیاب ہوئی ہیں اور نہ آج اس کی امید ہے۔

ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ معاشرے کی تاریخی رفتار میں ارتقا کا امکان نہیں۔ دوسری طرف پرانے اور نئے نظامِ حیات کے درمیان ایک عبوری دور بتایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ نہیں ہو سکتیں۔ عبوری دور کا امکان صرف ارتقا کی صورت ہی میں ہے۔ اگر معاشرے کی تاریخ ارتقا کے لیے ناسازگار ہے۔ اس میں صرف انقلابی طوفان اٹھتے ہیں، اور انقلاب کے ہنگامہ خیز زلزلے آتے ہیں۔ تو اس میں کسی طرح بھی عبوری دور کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ اور اگر نکل سکتی ہے تو صرف اس وقت جب زندگی کے رواں دواں کارواں کو کسی ایک مقام پر ٹھہرا دیا جائے۔ جو زندگی کی تغیر پذیر اور سفر پسند فطرت کے خلاف ہے۔ اقبال کو لوگ رجعت پسند بتاتے ہیں لیکن اس نے ذیل کے شعر میں زندگی کی جو فطرت بتائی ہے اس پر اس زمانہ کی ترقی پسندی کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

ارتقا کی حالت میں زندگی درجہ بدرجہ آگے بڑھتی ہے پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے۔ اس لیے جب تک وہ آخری منزل پر نہ پہنچ جائے یہی کہا جائے گا کہ وہ عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ بیچ کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اگر زندگی ایک منزل سے دوسری منزل تک جست لگا کر پہنچتی ہے اور زندگی کی رفتار تیز ہو جانے کی وجہ سے آگے بڑھنے کی اب صرف یہی ایک صورت رہ گئی ہے (اور یہی انقلاب ہے) تو عبوری دور کا امکان اس صورت میں ہوگا کہ زندگی کسی منزل پر اتنی مدت تک ٹھہر جائے کہ اس کی تازگی جاتی رہے۔ یہ سکون ہے اور یہ زندگی کے مزاج کو سازگار نہیں۔

پھر عبوری دور کی جو علامت بتائی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نقادوں کے ذہن میں زندگی کا کوئی واضح تصور نہیں وہ زندگی زندگی کی رٹ لگاتے ہیں لیکن اس کی فطرت اور مزاج سے ناواقف ہیں۔ زندگی کی فطرت میں تضاد کاری ہے۔ جو اس کی روز افزوں ترقی یا چنچل پن کی ذمہ دار ہے۔ اگر زندگی میں باہم آویزش رکھنے والی کیفیات کا اجتماع نہ ہوتا تو ہم اس کی فطرت کو جدلیاتی کبھی نہ کہتے۔ زندگی کے عناصر کی آویزش ہی اس کی جدلیت ہے۔ میں نے زندگی کی حقیقت بے نقاب کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ وہ ایک برقی رو ہے جس میں مثبت اور منفی دو طرح کی لہریں گھلی ہوئی ہیں۔ زندگی اصلیت کے اعتبار سے اگرچہ لطافت ہے۔ لیکن جلوہ نمائی کے لیے اسے کثافت کا سہارا لینا پڑا۔ دو متضاد کیفیتوں میں توازن برقرار رکھنا بڑا دشوار کام ہے۔ جب توازن بگڑتا ہے تو زندگی سہارا ڈھونڈتی ہے یہی جدلیاتی عمل ہے۔

ادب کا زندگی سے جوڑ ناتا ہے اس کا تقاضا ہے کہ زندگی کی تضاد کاری کی جھلک ادب میں بھی نظر آئے۔ آج ادب میں جو متضاد نظریے زور پکڑتے جا رہے ہیں، ہمارے نقاد اس کی وجہ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی اس وقت عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ ابھی ہم کسی منزل پر نہیں پہنچے اس لیے ہمارے ادبی نظریوں میں تضاد ہے۔ ہم میں مختلف میلانات پائے جاتے ہیں۔ جن میں بظاہر سمجھوتہ ناممکن ہے۔ انفرادیت و اجتماعیت۔ روایت و بغاوت۔ واقعیت و تخیلیت۔ مقصدیت و رومانیت۔ داخلیت و خارجیت۔ جدت و قدامت۔ مادیت و روحانیت۔ یہ متضاد نظریے اگر ہماری موجودہ زندگی کی الجھنیں اور آزمائشیں ہیں۔ تو ہمارے ادیب مطمئن رہیں۔ وہ ان آزمائشوں سے کبھی نجات نہ پا سکیں گے۔ وہ انھیں عبوری دور کے "تذبذب" کی پیداوار کہہ کر ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ یہ متضاد نظریے ضرور رہیں۔ ان میں اختلاف اور آویزش مسلم ہے۔ لیکن یہ عبوری دور کی پیداوار نہیں۔ ان میں زندگی کی تضاد کاری ہے۔ زندگی کے متضاد پہلوؤں کی جھلک ہے ان متضاد میلانات میں توازن قائم رکھنا ادب ہے ان الجھنوں سے سلجھن پیدا کرنا ادب ہے۔ ان کے پیچ و خم کو قائم رکھتے ہوئے ان میں سے سیدھی راہ نکال لینا ادب ہے۔ یہ بھول بھلیاں ضرور ہے لیکن کامیاب وہ ہے جو اس بھول بھلیاں سے بچ کر نکل آئے اور اس میں کھو نہ جائے۔ اس میں کھو جانے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کو توڑ پھوڑ کر نئی راہ نکال سکیں گے۔ یہ زندگی سے منہ موڑنا ہے۔ دریا کی موجوں سے ٹکرانا زندگی ہے۔ موجوں کی تاب نہ لا کر ساحل پر محفل آرائی کرنے والے زندہ نہیں "زندگی طرب گاہ خسرو" نہیں "کوہ بے ستوں" ہے۔ زندگی کا ادب طرب گاہ خسرو کا مزدور نہیں ہوتا۔ کوہ کن ہوتا ہے۔ آج کے بے بصر ادیبوں سے تیز نظر تو وہ شاعر تھا جو زندگی کی تضاد کاری کی وضاحت کرتے ہوئے کہہ گیا تھا۔

زندگی انجمن آرا و نگہبان خود است
اے کہ در قافلۂ با ہمہ شو بے ہمہ شو ! !

یہاں نئی نسل کی ایک ذہنی الجھن سلجھاتے چلیں۔ جوش کے لفظوں میں یہ پختگان خامی ہی دراصل آج کے اردو ادب کی ساری ابتری اور اردو تنقید کی افراتفری کے ذمہ دار ہیں۔ زندگی کے مزاج کو پہچان کر ہی ہم ادبی نظریوں کی چھان پھٹک کر سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے

تین سلسلے ہیں، فطرت، معاشرہ اور ادب۔ فطرت ان میں مقدم ہے۔ معاشرے کی بنیاد فطرت پر ہے۔ اور ادب کی بنیاد معاشرے اور فطرت دونوں پر۔ فطرت نے جب ارتقا کی طرف قدم بڑھایا تو بالکل ابتدائی فطری تقاضوں نے ابتدائی معاشرے کو جنم دیا اور جیسے جیسے انسان حیوانی افق سے انسانی افق کی طرف بڑھتا گیا۔ معاشرے میں ترقی کے آثار رونما ہونے لگے۔ ایک زمانہ تھا جب انسان برہنہ تن گپھاؤں میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اور کچا گوشت کھا کر اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ اس وقت اس کی زندگی کی ضرورتیں جیسی سادہ اور ابتدائی قسم کی تھیں۔ اس کا معاشرہ بھی اتنا ہی سادہ اور ابتدائی تھا اس کی ابتدائی ضرورتیں اس کے جبلی تقاضوں تک محدود تھیں۔ لیکن مل جل کر زندگی گزارنے کی وجہ سے کچھ نئی اجتماعی ضرورتیں وجود میں آئیں جنھوں نے نئے تقاضوں کو ابھارا۔ یہ نئے تقاضے سماج کی پیداوار تھے۔ خالص سماجی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ اس لیے ان کی اساس سماج قرار پایا لیکن خود سماج کی اساس فطرت تھی۔ فطری اور جبلی تقاضوں نے انسان کو مل جل کر مشترکہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس لیے گو بواسطہ سہی فطرت کو بھی سماجی تقاضوں کی تمدنی پیداوار کی اساس قرار دینا ہوگا۔ ادب سماج کی اعلیٰ تمدنی تقاضوں کی پیداوار ہے اس لیے صحت مند ادبی نظریہ یہ ہے کہ ادب کے جدید رجحانات فطرت کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں اور معاشرے کے ارتقائی رُخ متعین کرنے میں ہماری مدد کریں۔

فطرت کا مزاج کیا ہے؟ اس سوال کے جواب پر ہمارے تمام تنقیدی نظریوں کی بنیاد ہے۔ اس لیے اس کی تعین تنقید سے پہلے ہو جانی چاہئے۔ اُردو کی جدید تنقید میں آج کل دو نظریے زیادہ نمایاں ہیں۔ ایک معاشی جو کارل مارکس کی طرف منسوب ہے۔ دوسرے جنسی جو فرائڈ کے ذہن کی تخلیق ہے۔ ان نظریوں کی بنیاد انسان کی دو ابتدائی اور فطری خواہشیں ہیں۔ ایک تلاش معاش دوسرے جنسی تجسس۔ میں نے ان خواہشوں کو فطری اس لیے کہا کہ ان کی پیدائش میں سماجی تقاضوں کو دخل نہیں۔ انسان یہ خواہشیں حیوانی زندگی کے دور سے اپنے ساتھ لایا جو انسانی دُنیا میں قدم رکھنے کے بعد بھی اگرچہ برقرار ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت یہاں آ کر ذرا بدل گئی۔ اوّل اوّل انسان کی زندگی کا مقصد اپنی ان خواہشوں کی تکمیل تھا۔ اس کے بعد غذا کو اس نے بقائے شخص کا وسیلہ سمجھا۔ اور جنس کو بقائے نوع کا۔ اوّل اوّل یہ خواہشیں مقصد کی حیثیت رکھتی تھیں۔ بعد میں یہ ایک اور اچھے مقصد کا ذریعہ بنیں۔ انسان نے حیوانی درجے سے ابھر کر انسانی درجے میں قدم رکھا اس لیے شروع میں حیوان اور انسان میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ حیوان کی طرح وہ جبلّت کا غلام تھا۔ اس کے سارے تقاضے پیدائشی قسم کے تھے۔ بھوک، گرمی، سردی، جسمانی تکلیف کا وہ صرف احساس کر سکتا تھا۔ جب وہ اس دور سے آگے بڑھا تو احساس نکھر کر جذبے کی شکل اختیار کی اور اس میں محبت، نفرت، غم و غصہ، ایثار و قربانی وغیرہ اعلیٰ پاکیزہ جذبات نے پرورش پائی۔ اس کے بعد عقل کے نشو و نما پاتے ہی اس کی دنیا بدل گئی اور دل پر عقل کا پہرہ بیٹھ گیا۔

آئی اے رچرڈس نے مذہب کو پرانی نسل کی الجھن بتایا ہے اور جنس کو نئی نسل کی۔ اس لیے میں نئی نسل کی الجھن کو لے کر اس مسئلے کو سلجھانا چاہتا ہوں۔ انسان اوّل اوّل عورت کو ـــ غذا کی طرح ـــ جنسی خواہش کی تسکین کا ذریعہ سمجھتا تھا اور ہر حسین اور موہنی صورت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس وقت تک اس جنس لطیف نے اس کے دل میں محبت کی جوت نہ جگائی تھی۔ محبت نے اُسے اپنانا سکھایا۔ پہلے وہ ہر شمع کا پروانہ تھا۔ اب ایک دیوی کا پجاری بنا۔ جس کی قربان گاہ پر اس نے اپنا سب کچھ چڑھایا۔ اس زمانے سے عورت اور مرد میں نباہ کے عہد و پیمان استوار ہوئے۔ لیکن جب تک انسان پر صنفی محبت کا بھوت سوار رہا وہ ہر عورت کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ جب ترقی نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ تو اس نے ماں، بہن، بیوی میں فرق کیا۔ اس سے پہلے فراعنۂ مصر بہنوں سے شادی کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ شادیاں ممنوع قرار پائیں۔ یہ جذبہ محبت کی تہذیب تھی۔

——— صنفی محبت کے جذبے کی تہذیب بھی ہوئی اور اس کی مثالیں بھی ہمیں پرانی تہذیبوں میں ملتی ہیں۔ قدیم ہندوستان میں عورت کو دیوی (معبودہ) کہا جاتا تھا۔ اور کہیں کہیں ناکتخدا لڑکیوں کی پرستش کا رواج بھی تھا۔ ہت اپدیش۔ اور پنچ تنتر کی بعض کہانیاں ہندوؤں کے اس عقیدے اور عمل کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یورپ کے سورمائی عہد میں ہمیں بڑے بڑے سورما عورت کے نام پر مہمیں سر کرتے نظر آتے ہیں۔ عرب جاہلیت کے اشعار میں عرب کے سربازوں کو عورت کی نظر میں امتیاز حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے دکھایا گیا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فطرت کا مزاج ابتدائی فطری تقاضوں کی تحسین و تہذیب ہے جو معاشری ارتقاد کے قدم بہ قدم ہوئی۔ اور ادب، جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، سماج کے تمدنی تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اس لیے تہذیب (یا تطہیر) فطرت کا مزاج ہی نہیں، سماج کا ارتقائی رُخ اور ادب کا منہاج بھی ہے۔ جو لوگ ادب کی بنیاد ابتدائی جنسی جذبے یا غذا کو قرار دیتے ہیں۔ وہ اُلٹے پاؤں پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہتے ہیں اور حیات و کائنات ساتھ لے چلنے کی جگہ اسے پیچھے دھکیل رہے ہیں۔ یہ اگر ترقی ہے تو معکوس قسم کی۔ شاعرِ انقلاب جوشؔ نے ذیل کے شعروں میں شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حیف دل کو "شکست زنداں نے"
کر دیا نسلِ تازہ سے مایوس

وائے بر وضعِ شاعرانِ جدید
راگ لکھ لُٹ، زبانہ مکھی چوس
ان کے اسلوب میں بہ سعیِ بلیغ
اہتمامِ ترقیِ معکوس

جنسی نظریۂ حیات کے اثر سے عورت اُردو کے نئے ادب میں اپنی پرانی جسمانی گرمیوں اور صنفی دعوتوں کے ساتھ آ رہی ہے اور ڈی ایچ لارنس وغیرہ جنس زدہ ادیبوں کی تقلید میں ہمارے یہاں بیگو اور کلونت کور جیسے کردار تخلیق کیے جا رہے ہیں۔ انسان کی دبی ہوئی خواہشیں کریدی جا رہی ہیں۔ سویا ہوا حیوان جاگ رہا ہے۔ اقبالؔ نے اُردو ادب کے اسی رجحان کو دیکھ کر کہا تھا:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس!
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

غذائی نظریۂ حیات کی برکت سے آج روٹی انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی جگہ لے چکی ہے۔ ہر خیال کی اچھائی اور برائی کا معیار اب صرف روٹی بن گئی ہے۔ مارکس نے جب یہ کہا تھا کہ "اپنے ماحول کے ساتھ میرا تعلق ہی میرا شعور ہے" تو اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ شعور ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ شعور اور ماحول کے تعلق پر زور دینا چاہتا تھا۔ ماحول سے وابستگی اس کے پیشِ نظر تھی۔ اور اس زمانہ کی تخیل پرستی کو دیکھتے ہوئے ماحول پر زور دینا کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ لیکن اس کا مطلب آج یہ لیا جا رہا ہے کہ ادیب اپنے ماحول سے چمٹا رہے اور اس سے بلند ہو کر نہ دیکھے۔ یہ ادب کی غایت، فطرت کے مزاج، معاشرے کے ارتقائی رُخ، سے ناواقفیت ہی نہیں، مایوس کن ذہنی نارسائی بھی ہے۔

زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں!

زندگی پر جھپٹنا نہ ماحول سے چمٹنا ہے اور نہ جسم سے لپٹنا۔ یہ اعلیٰ اخلاقی اور روحانی قدروں کے مطابق اس کو ڈھالنا ہے۔ اس کے لیے فکر کی پرواز اور بقول گوئٹے کی واقعات کی سطح سے بلند ہو کر واقعات پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ جس سے ہماری نئی نسل محروم ہے۔ مارکس اور اس کے ہم خیال مفکروں نے فکر کی پرواز کو لامرکزیت سے بچانے کے لیے ماحول اور حقیقت پر زور دیا تھا۔ بقول اقبال ؎

آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

یہ "بے پر و بال رقص دکھانے والے طاؤس" طائر فلک کے پر تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں ادب اور سیاست کا فرق واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سیاست میں براہِ راست تبلیغ ہوتی ہے۔ اور ادب میں بواسطہ ادب۔ ادب عوام کے ذہن کی تربیت کرتا ہے۔ اور انھیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ آنے والی تبدیلی کو قبول کر سکیں۔ سیاست۔ شورش بپا کر کے انقلاب لاتی ہے اور انقلاب جیسا کہ پریم چند نے لکھا ہے صحت مند طریقوں کی ناکامی ہے۔ ادب زندگی اور معاشرے کا خادم ہے۔ ہمارے ادیب اسے سیاست بنانا چاہتے ہیں۔ یہ خود مارکسی نظریۂ ادب کے منافی ہے۔ ٹراٹسکی نے اپنی مشہور کتاب ادب اور انقلاب میں ادیب کا اپنے ماحول سے تعلق بتلاتے ہوئے لکھا تھا۔

> "فنی تخلیق فن سے باہر وجود میں آنے والے جدید محرکات کے زیر اثر قدیم ہیئتوں کو پیچیدہ انداز سے الٹ کر کام لینے کا نام ہے۔ اس لحاظ سے فن کی حیثیت ایک خادم کی سی ہے۔ یہ کوئی ایسا منقطع عضو نہیں جو خود اپنے کو کاٹ کاٹ کر کھائے۔ یہ ایک متمدن انسان کا عمل ہے جو اپنی زندگی اور ماحول سے غیر منقطع طور پر وابستہ ہے۔"

ایک متمدن انسان کی ماحول سے وابستگی اس قسم کی نہیں ہوتی —— یا نہیں ہو سکتی۔ جس قسم کی وابستگی ایک غیر متمدن انسان کی اپنے ماحول سے ہوتی ہے۔ انسان کبھی ماحول کی پیداوار تھا۔ آج وہ اس کا خالق ہے۔ اپنے ماحول پر یہ تسلط سخت جنگ و پیکار کے بعد اسے حاصل ہوا ہے۔ تسخیرِ فطرت اس طویل جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ ادب نے اس جنگ و پیکار میں انسان کا قدم قدم پر ساتھ دیا۔ آج بھی اسے انسان کا معاون ہونا چاہیے۔ آج بھی اسے انسان کی اعلیٰ قدروں کا تحفظ کرنا چاہیے۔ انسان کی ضرورت قدر نہیں۔ اس کی تہذیب قدر ہے۔ پانی پینا قدر نہیں۔ خشک زمین سے پانی کے چشمے نکالنا قدر ہے۔ ماحول سے چمٹے رہنا قدر نہیں۔ اس کو ڈھالنا۔ بنانا اور سنوارنا قدر ہے۔ ادیب کو قدروں کا خالق اور ان کا محافظ ہونا چاہیے یہ زندگی کی خدمت ہے —— زندگی کو آگے بڑھانا ہے۔ روٹی کو آگے بڑھانا ہے۔ روٹی کو زندگی کی قدر قرار دینے والے زندگی کو آگے بڑھانے کی بجائے پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔ روٹی سیاست کی قدر ہو سکتی ہے۔ زندگی کا سہارا بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ نہ زندگی کی قدر ہے نہ ادب کی۔ جنسی خواہش انسان کی فطرت ہے۔ جس طرح غذا اس کی فطرت ہے۔ لیکن یہ دونوں جسم کے مطالبے ہیں اور انسان جسم ہی نہیں شعور بھی ہے۔ بلکہ جسم سے زیادہ شعور ہے۔ شعور نے انسان کو جنسی خواہش سے احساسِ جمال تک پہنچایا اور غذا کی طلب سے اخلاقی توانائی تک۔ ادب کو جمال، قوت، اور حق و صداقت

کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ اقبال نے ذیل کے اشعار میں انسان کی انہیں تعمیری تخلیقی صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم   سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی   خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اگر زندگی سے فرار ادب نہیں تو زندگی کی دلدل میں پھنس کر رہ جانا اور اس میں لوٹ لگانا بھی ادب نہیں ہو سکتا۔ آج کے سماج میں معاشیات کی جو اہمیت ہے۔ وہ مناسب ہے لیکن ادب میں اس کو جو جگہ دے دی گئی ہے وہ نامناسب ہے۔ اس کے اخلاقی اور روحانی قدریں پس منظر میں جا پڑی ہیں۔ ادب میں سیاست آ گئی ہے۔ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹا جا رہا ہے۔ سوئی سے پھوڑے کا کام لیا جا رہا ہے۔ یہ ادب نہیں۔ ایک مشہور نقاد کے لفظوں میں یہ ایسا ہے۔ جیسے کسی پل کی تعمیر سے اصلاح اخلاق کا کام لینا یا گھونسا مار کے آنکھ پھوڑنا۔ موجودہ نظام حیات اس قابل نہیں کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے۔ لیکن اس کی شکست و ریخت میں ادب کو اپنا مزاج، اپنا مقام اور اپنی روش فراموش نہ کرنی چاہیئے ادب قدروں کا خالق ہے۔ سیاست کے میدان میں اترنا اور معاشی برکتیں ایک طبقے سے چھین کر دوسرے طبقے کے حوالہ کرنا۔ اس کو زیب نہیں دیتا۔ یہ اس کے مزاج و منہاج کے لیے ناسازگار ہے اور بقول ہربرٹ ریڈ ننھی سی تتلی کو نرم و نازک پھول کی پتیوں سے اڑا کر گھر گھرانے والی مشین کے آہنی پہیئے پر بٹھانا ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ مارکس کے نزدیک تاریخ کا رخ متعین کرنے والا تنہا عنصر معاشیات ہے۔ اس کے رفیق اینگلز نے اپنے ایک خط میں اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سیاست، قانون، فلسفیانہ نظریات، مذہبی خیالات بھی تاریخی مسابقات پر اثر ڈالتے ہیں اور اکثر ان مسابقتوں کی شکل متعین کرنے میں غالب اور نمایاں حصہ لیتے ہیں" ادب بھی ان مؤثر عناصر میں سے ہے۔ ادب نے آج سے پہلے فلسفہ اور مذہب کا ساتھ دے کر ایک صالح انسانی تہذیب کی تعمیر کی تھی۔ آج بھی وہ یہ خدمت انجام دے سکتا ہے۔ اگر ادب نے سیاست کی جگہ لی اور اپنی ساری کوششیں غیر طبقاتی سماج کے قیام کے لیے وقف کر دیں تو اس کی موت زیادہ دور نہیں۔ طبقاتی کشاکش ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی دفن ہو جائے گا۔

ادب کا براہِ راست معاشی مسائل میں دخل دینا اور طبقاتی اونچ نیچ مٹانے کا بیڑا اٹھانا ایسا ہے جیسے مذہبی خیالات کی تبلیغ اور اخلاقیات کی نشر و اشاعت کا کام ادب سے لینا۔ دونوں ادب کے عمل دخل سے باہر ہیں۔ ادب ابلاغ ہے تبلیغ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود موجودہ معاشی تفاوت کو ادب کی حمایت حاصل نہ ہونی چاہیئے۔ ادب اپنی حدود میں رہ کر بھی ترقی پسندانہ رجحانات کی رہبری میں حصہ لے سکتا ہے۔ ادب کا کوئی خاص موضوع نہیں۔ ادب زندگی کا رفیق ہے۔ اس میں زندگی کی سی وسعت ہے کسی ایک طبقے کے لحاظ سے، وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ کسی ایک موضوع کے ساتھ ادب کو مخصوص کر لینا ادب کی بلند فطرت کے خلاف ہے۔ ادب سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے۔ آسان اور عام فہم زبان میں کہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ لیکن اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی سطح سے اتر کر وہ بات کہے جو عوام چاہتے ہیں۔ عوام کو اٹھانے کی بجائے خود گر جائے۔ ان کی ذہنی تربیت کو نظرانداز کر کے ان کے جسم پر تیل کی مالش کرنے لگے۔

مولانا اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں تو ان کی ذہنی سطح کے مطابق انہوں نے "کوا"، "ریل گاڑی" اور "ایک لڑکی بگھارتی ہے دال" جیسے سامنے کے موضوعات منتخب کئے۔ آج زندگی کے گوناگوں موضوعات میں سے کسان، مزدور، درانتی، ہتھوڑا، چین و روس کو ادب کے لیے مخصوص کیا جا رہا ہے۔ جس معنی میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری بچوں کی شاعری تھی۔ اس معنی میں آج کا اردو ادب عوام کا ادب ہے۔ وہ بھی محدود تھی یہ بھی محدود ہے۔ جوش کہتے ہیں: ۔

وہ دو عالم کا شاعر یکتا!! شعر میں گانٹھ دے جو چین و روس
اس کے ذوقِ سخن کی دنیا میں صرف اک فصل ہے، نہ ماہ نہ پوس
ایک ہی میکدے میں سب مدہوش
ایک ہی دائرے میں سب محبوس

طبقۂ معتزلہ

نیاز فتح پوری

افراد کی طرح قوموں کی بھی نفسیات ہوا کرتی ہے۔ جس میں واقعات و حوادث کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور جنہیں عروج یا زوال کا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض قوموں کی بھی تاریخ کا مطالعہ ہم کو یہ بتاتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ صرف ایک واقعہ نے یک لخت ساری نفسیات کو بدل کر رکھ دیا۔ اور ہوا کا رُخ دفعتاً ادھر سے اُدھر ہو گیا۔ تاریخ اسلام میں ہم کو ایک ایسا ہی واقعہ ملتا ہے جس کو عام طور پر کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ حالانکہ اس کی اہمیت اتنی بڑی ہے کہ اگر وہ واقعہ پیش نہ آتا تو آج ساری دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

رسول اللہؐ کی حیات میں اسلام کی اجتماعی حیثیت ایک ایسی رسی کی تھی۔ جس کی تمام لڑیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی تھیں لیکن آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ لڑیں ایک دوسرے سے جدا ہونے لگیں۔ اور اسلام کی "حبلِ متین" کمزور ہو گئی۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس اتحاد کے ختم ہونے کا سبب کیا تھا؟ اس کا جواب مشکل نہیں۔ کیونکہ جس نے تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کیا ہے وہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس کا سبب رسول اللہؐ کی جانشینی یا خلافت کا جھگڑا تھا۔ لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ذہن انسانی پھر سوال کرتا ہے کہ یہ جھگڑا کیوں ہوا۔ اس اختلاف کی وجہ کیا تھی۔ اور اس کا جواب ہم اس کے سوا کچھ نہیں دے سکتے کہ اس اختلاف و نزاع کا سبب صرف یہ تھا کہ رسول اللہؐ وقتِ رحلت نہ اپنا جانشین نامزد کر گئے اور نہ کوئی واضح ایسا اصول متعین فرما گئے جس کو سامنے رکھ کر ان کی جانشینی کا مسئلہ طے کیا جا سکتا۔ اور تاریخ اسلام کا یہی وہ ایک واقعہ ہے جس نے نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کا رُخ ادھر سے اُدھر کر دیا ——— ہر چند اس باب میں اہل السنّۃ والجماعۃ اور شیعی حضرات اپنی اپنی طرف سے متعدد دلائل پیش کرتے ہیں لیکن ان میں کسی کی کوئی دلیل قطعی اذعانی نہیں ہے۔ حجۃ الوداع کے خطبے میں رسول اللہؐ کا حضرت علیؓ کے متعلق یہ ارشاد کہ

مَنْ کُنْتُ مَوْلاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلاہُ

اپنی جگہ مسلّم۔ رحلت کے وقت آپ کا قلم کاغذ طلب کرنا جسے واقعۂ قرطاس کہتے ہیں۔ اپنی جگہ بالکل درست۔ اسی طرح زندگی کی آخری ساعتوں میں رسول اللہؐ کا حضرت ابوبکرؓ کو امامت کی خدمت تفویض کرنا بالکل صحیح لیکن ان میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جسے ہم رسول اللہؐ کا کھلا ہوا اور واضح فرمان یا قطعی دلیل قرار دے سکیں۔

رسول اللہؐ کے ہوش و حواس نے تقریباً اخیر وقت تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ اور اگر وہ چاہتے تو نہایت آسانی

کے ساتھ صاف صاف الفاظ میں مسئلہ خلافت کو طے کر سکتے تھے۔ آپؐ اگر یہ کہہ سکتے تھے کہ کاغذ قلم لاؤ تاکہ میں اپنے بعد کچھ ہدایات چھوڑ جاؤں یا یہ کہ فلاں شخص فرائضِ امامت انجام دے تو کیا وہ اس سے زیادہ مختصر بات یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ میرے بعد فلاں شخص کو اپنا سردار منتخب کرنا۔ یا وہ یہ نہ کر سکتے تھے کہ صحابہ میں سے کسی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دوسروں کو بھی دستِ ارادت بڑھانے کا اشارہ فرما دیتے۔ یقیناً آپ ایسا کہہ سکتے تھے ایسا کر سکتے تھے۔ اگر آپ چاہتے لیکن آپؐ نے ایسا نہیں چاہا۔ اور اس نہ چاہنے نے ہوا کا رُخ دفعتاً بدل دیا۔ آپؐ نے ایسا کیوں نہیں چاہا۔ یہ بالکل جدا مسئلہ ہے۔ جس کا ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہمارا مقصود تو بہ صورتِ تمہید صرف یہ بتانا تھا کہ اسلام کی اجتماعیت کے درہم برہم ہو جانے کا حقیقی سبب کیا تھا جس کی بنیاد پر اسلام متعدد جماعتوں میں بٹ گیا اور آپس کی خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔

یوں تو یہ تفریق اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب رسول اللہؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا گیا۔ کیونکہ یہ حضرت علیؓ کی توقعات کے خلاف ہوا تھا۔ اور ان کا ساتھ دینے والے اعزہ کو بھی یہ فیصلہ پسند نہ آیا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت علیؓ بڑے صلح کل انسان تھے۔ اس لیے وہ بالکل خاموش رہے۔ اور آخر وقت تک کوشش کرتے رہے کہ اسلام کا شیرازہ منتشر نہ ہو۔ لیکن جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اور اس کے بعد اس نے جنگِ جمل اور جنگِ صفین کی صورت اختیار کی تو وہ پھوڑا جو عرصے سے پکتا چلا آ رہا تھا پھوٹ گیا۔ اور جماعتِ اسلامی سنی، شیعہ، خارجی، باطنیہ وغیرہ متعدد فرقوں میں بٹ گئی۔ جن میں سے ایک معتزلہ طبقہ بھی تھا۔

اس وقت ہم سنی، شیعہ اور خوارج کے متعلق کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتے بلکہ صرف معتزلہ جماعت کی بابت مختصراً عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ انتخاب ہم نے صرف اس لیے کیا ہے کہ اس طبقے سے زیادہ اسلام کی علمی و ذہنی خدمت کسی اور طبقے نے انجام نہیں دی۔

رسول اللہؐ کے زمانے میں اسلام بہ لحاظ عقائد بہت سادہ مذہب تھا اور یہ سادگی اس وقت تک قائم رہی۔ جب تک اسلام سرزمینِ عرب تک محدود رہا۔ لیکن رسول اللہؐ کے بعد جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور عرب و عجم ایک دوسرے سے ملے تو دوسری قوموں کو مذہبِ اسلام کی حقیقت سمجھانے کے لیے نقل کے علاوہ عقل سے بھی کام لینا پڑا۔ اور یہی وہ چیز تھی جس نے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔ اور معتزلہ طبقہ ہی وہ طبقہ تھا جس نے علم کلام کو انتہائی ترقی تک پہنچایا۔

سب سے پہلے اختلافی مسئلہ جسے اعتزال کی اساسِ اولین کہنا چاہیے۔ مسئلہ جبر و قدر تھا۔ یعنی یہ عقیدہ کہ انسان سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں وہ خود اس کے اختیاری افعال ہیں اور خدا کی مرضی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس عقیدے کو سب سے پہلے معبد نے ظاہر کیا اور اسی لیے اس کی ماننے والی جماعت قدریہ کے نام سے موسوم ہو گئی۔ لیکن چونکہ اس اعتقاد کا اثر وقت کی سیاست پر بھی پڑتا تھا اور معبد حکومتِ بنی اُمیہ کا شدید مخالف تھا اس لیے عبدالملک بن مروان نے ۸۰ھ میں معبد کو قتل کرا دیا۔ مگر یہ عقیدہ معبد کے زمانہ ہی میں اس قدر رواج پا گیا تھا کہ بزورِ شمشیر اسے دبانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ معبد کے بعد غیلان دمشقی نے اس کی ترویج شروع کر دی اور اس میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مسئلہ کو بھی شامل کر دیا۔ جو حکومت کے لیے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ لیکن چونکہ یہ زمانہ عمر بن عبدالعزیز کا تھا وہ دیانت و امانت میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے اور غیلان کی سخت نکتہ چینیوں کو

بڑی خوشی سے گوارا کر لیتے تھے۔ اس لیے ان کے عہد تک تو غیلان پوری طرح کھل کر اپنے عقائد کی تبلیغ کرتا رہا۔ لیکن جب ہشام بن عبدالملک تخت نشین ہوا تو اس نے اسے گرفتار کرا کے پہلے ہاتھ پاؤں کٹوائے اور پھر قتل کرا دیا۔

واضح رہے کہ اس وقت تک معبد اور غیلان کی جماعت کو صرف قدریہ یا عدلیہ کہتے تھے اور اعتزال یا معتزلہ کا نام کوئی نہ جانتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بصرہ دارالعلوم کی حیثیت رکھتا تھا اور حسن بصری کے حلقۂ درس کا بڑا شہرہ تھا۔ ان کے شاگردوں میں عمرو بن عبید اور واصل بن عطا دو شخص ایسے بھی تھے جو غیر معمولی قوتِ اجتہاد رکھتے تھے اور منقولات سے زیادہ معقولات کے قائل تھے۔

اس وقت فقہ اسلامی کی چار اصطلاحیں کافر، فاسق، فاجر و منافق شدت کے ساتھ زیر بحث تھیں اور خصوصیت کے ساتھ یہ مسئلہ زیادہ مابہ النزاع تھا کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کیا کہنا چاہیے۔ اس سے قبل گناہ کبیرہ کے مرتکب کو فاسق و فاجر کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ لیکن خوارج نے کہا کہ ایسے شخص کو کافر کہنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک دن یہی مسئلہ پیش تھا کہ حسن بصریؒ نے کہا میرے نزدیک ایسا شخص مسلمان تو ہے لیکن منافق مسلمان" واصل بن عطا نے کہا: "میں ایک "تیسری صورت اختیار کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ایسا شخص نہ مسلمان ہے نہ کافر۔ حسن بصری یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور واصل و عمرو دونوں درس گاہ سے اٹھ کر چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے چلے جانے کے بعد حسن بصریؒ نے واصل کی بابت کہا" قد اعتزل منی" یعنی اس نے مجھ سے روگردانی اختیار کی اور اس کے بعد ہی اس کا لقب معتزلی ہو گیا۔

مجھے روایت کے اس آخری ٹکڑے سے اختلاف ہے کیونکہ حسن بصریؒ کے یہ الفاظ توہین کے تھے اور معتزلہ جماعت جو اپنے آپ کو فخریہ معتزل کہتی تھی کبھی اس نام سے موسوم ہونا گوارا نہ کرتی جس کی بنیاد توہین و تذلیل رہی ہو۔ علاوہ اس کے یہ بات تاریخی حیثیت سے بھی صحیح نہیں کیونکہ سیاسی نقطۂ نظر سے معتزلہ جماعت بہت پہلے وجود میں آ چکی تھی۔

جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو بعض اکابر صحابہ نے بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ جن میں طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے طلحہ اور زبیر نے تو علانیہ حضرت علیؓ کی مخالفت شروع کر دی۔ لیکن اور حضرات غیر جانب دار رہے۔ اہل مدینہ کی روش بھی عموماً غیر جانب دارانہ تھی۔ اور بصرہ کی تمیمی جماعت بھی نیوٹرل تھی۔ اور حاجب صبری نے اس جماعت کی غیر جانب دارانہ پالیسی کے لیئے لفظ اعتزال استعمال کیا ہے۔ نوبختی نے بھی ان نیوٹرل رہنے والوں کو معتزلہ کہہ کر یاد کیا ہے۔ اس لیے اعتزال اور معتزلہ کا لفظ حسن بصری کی درس گاہ سے نہیں نکلا بلکہ اس سے پہلے ہی وجود میں آ چکا تھا۔ اور چونکہ خلافت علیؓ کے مسئلہ میں واصل اور عمرو بن عبید نیوٹرل تھے اس لیے اگر حسن بصریؒ ان کو معتزلہ نہ کہتے تو بھی وہ معتزلہ ہی کہلاتے۔ اس غیر جانب داری کی مذہبی توجیہہ انہوں نے یہ کی تھی کہ حضرت علیؓ، طلحہ، زبیر اور حضرت عائشہؓ سب اپنی اپنی جگہ سچے مسلمان تھے لیکن آپس کی لڑائی نے ان کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پھر ظاہر ہے کہ ان دو میں سے صرف ایک جماعت ہی حق پر ہوگی۔ جس کا ہم کو علم نہیں۔ اس لیے نیوٹرل رہنا ہی مناسب ہے لیکن اس غیر جانب داری کے کچھ سیاسی اسباب بھی تھے۔

اس میں شک نہیں کہ واصل بن عطا ایک حد تک امویین کا مخالف اور علویین کا طرف دار تھا۔ یعنی وہ حضرت ابوبکرؓ اور

حضرت عمرؓ کو تو غاصب خلافت نہ سمجھتا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر مزید ترجیح دیتا تھا۔ اور یہی عقیدہ زیدیہ شیعی جماعت کا بھی تھا۔ جس کی فقہ واصل بن عطا نے ہی مرتب کی تھی۔ علویین کے ساتھ اس کی ہمدردی کا ایک سیاسی سبب بھی تھا اور وہ یہ کہ ٹھیک اس وقت امویین کا دور دورہ تھا، عباسیین نے ابھرنا شروع کیا جو اہل بیت ہونے کے لحاظ سے اپنے آپ کو مستحق خلافت ظاہر کرتے تھے اور جن سے واصل کو بڑی دلچسپی تھی اور جن کو کامیاب بنانے کے لیے علویین کو ملائے رکھنا ضروری تھا۔ لیکن وہ کھلم کھلا امویین کی مخالفت بھی نہ کر سکتا تھا کیوں کہ مذہب اعتزال آہستہ آہستہ اموی دربار میں بھی جگہ پیدا کرتا جا رہا تھا۔ بلکہ یزید بن عبدالملک نے تو علانیہ اس مسلک کو قبول کر لیا تھا۔

معتزلہ کی ترقی کا زمانہ بنو عباس کا دورِ خلافت تھا۔ سفاح پہلا فرماں روا تھا لیکن وہ صرف چار سال حکومت کر سکا۔ اور قیامِ سلطنت کی ابتدائی دشواریوں کی وجہ سے وہ کسی اور طرف توجہ نہ کر سکا۔ لیکن دوسرے فرماں روا منصور کے زمانے میں معتزلہ کے قدم پوری طرح جم گئے۔ واصل کا ساتھی عمرو بن عبید چونکہ منصور کا بچپن کا دوست تھا اور دونوں ہم سبق رہ چکے تھے۔ اس لیے اس کے دربار میں عمرو بن عبید کو بہت رسوخ حاصل ہو گیا اور منصور اس سے اس قدر محبت کرنے لگا کہ جب اس کا انتقال ہوا تو خود منصور نے اس کا مرثیہ لکھا جو اپنی نوعیت کا بالکل پہلا واقعہ تھا۔

واصل بن عطا چونکہ پہلے ہی سے آل عباس کا طرف دار تھا اس لیے اس زمانے میں اس کے مسلک کو یوں بھی مقبول ہونا چاہیے تھا لیکن اس کا ایک بڑا سبب اور بھی تھا وہ یہ کہ منصور استحکام سلطنت کی طرف سے مطمئن ہو کر علوم و فنون کی ترقی کی طرف مائل ہو گیا۔ اور مذہبی مناظروں کی عام اجازت دے دی۔ وہ چاہتا تھا کہ اسلام پر جو نکتہ چینیاں ہوتی ہیں ان کا رد عقلی دلائل سے کیا جائے اور اس خدمت کو معتزلہ ہی پوری طرح انجام دے سکتے تھے جن کا گل سر سبد اس وقت واصل بن عطا تھا۔

واصل کی زبان دانی اور لسانی مہارت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کوئی تقریر کرتا تھا وہ حرف ر سے بالکل خالی ہوتی تھی کیونکہ یہ حرف اس کی زبان سے ادا نہ ہوتا تھا۔ ایک شخص نے امتحاناً اس سے پوچھا کہ اگر تمہیں یہ کہنا ہو کہ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنا نیزہ "تانا" تو تم رکب علیٰ فرسہ وجرّ رمحہ" کی جگہ کیا کہو گے۔ اس نے جواب دیا میں کہوں گا "استویٰ علیٰ جوادہ وسحب عاملہ"

علوم مذہبی میں اس کے تبحر کے ثبوت میں اس قدر کہنا غالباً کافی ہوگا کہ مسائل فقہیہ کے استنباط کے لیے جو چار ماخذ: قرآن حدیث۔ اجماع اور قیاس مانے گئے ہیں وہ اسی کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ اصول فقہ کے بڑے بڑے مسائل سب سے پہلے اسی نے پیش کیے ملاحدہ کا رد بھی سب سے پہلے اسی نے کیا اور علم کلام کا موجد تو وہ خیر تھا ہی۔

الغرض معتزلہ جماعت میں واصل بن عطا بڑی زبردست شخصیت کا مالک تھا اور اس کے عقائد اس قدر مقبول ہوئے کہ ملک کے تمام بڑے بڑے علماء اپنے آپ کو معتزلی ظاہر کرنے پر فخر کرنے لگے۔ اور ایک فرقہ اسی نام سے منسوب ہو گیا جسے واصلیہ کہتے ہیں۔

خلیفہ منصور کے بعد ہارون الرشید کے عہد میں مذہبی آزادی ختم ہو گئی کیونکہ اس میں قدامت پسندی زیادہ تھی اور وہ مذہبی مناظروں کو پسند نہ کرتا تھا۔ تاہم چونکہ دربار خلافت میں برامکہ کا اثر زیادہ تھا جو بڑے علم دوست اور آزاد خیال تھے۔ اس لیے اعتزال کی آبیاری کچھ نہ کچھ ہوتی رہی۔ ہارون الرشید کے بعد جب مامون کا زمانہ آیا تو معتزلہ کو آگے بڑھنے کے لیے کھلا میدان ہاتھ آگیا۔ کیونکہ مامون خود معتزلی

عقائد رکھتا تھا۔ ابوالہذیل اور نظام مشہور معتزلی علما جو فلسفہ و حکومت کے زبردست ماہر تھے مامون کے استاد رہ چکے تھے ابوالہذیل کے متعلق مامون کہا کرتا تھا کہ "اظل ابوالہذیل علی الکلام کاظلال الغمام علی الانام" یعنی ابوالہذیل کا سایہ کلام پر ایسا ہے۔ جیسے بادلوں کا سایہ انسانوں پر۔

ہارون کے تعصب نے غیر قوموں کو یہ سمجھنے کا موقعہ دے دیا تھا کہ اسلام عقل کے مقابلے میں نہیں آسکتا۔ اور اس کی اشاعت صرف تلوار سے ہو سکتی ہے۔ لیکن مامون نے اس بدنامی کو دور کرنے کے لیے ایک بہت بڑی مجلس مناظرہ قائم کی اور جس میں مختلف مذاہب کے بڑے بڑے علماء کو شرکت کی دعوت دی۔ ان میں مانویہ مذہب کا پیشوا یزدان بخت بھی شریک تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے مامون نے ابوالہذیل کو اعتراضات کا جواب دینے کے لیے مامور کیا۔ یہ مناظرہ دنوں تک جاری رہا اور آخرکار میدان ابوالہذیل کے ہاتھ رہا۔ مامون نے نہ صرف بغداد بلکہ ملک کے تمام اضلاع میں مجالس مناظرہ کو رواج دیا اور ہر جگہ آزادی سے مذہبی گفتگو ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں طرف اسلام کی آزاد خیالی اور عقل پسندی کا شہرہ ہو گیا اور ہزاروں لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

ابوالہذیل کا استدلال بہت دلچسپ ہوتا تھا وہ فریقِ مخالف کے مسلمات کو سامنے رکھ کر جواب دیا کرتا تھا۔ ایک بار کسی مجوسی عالم سے مناظرہ ہوا جو اپنے مذہب کو اسلام پر فائق قرار دیتا تھا۔ ابوالہذیل نے دوران بحث میں اس سے پوچھا کہ "آگ کیا چیز ہے؟" اس نے کہا "خدا کی بیٹی ہے۔"

ابوالہذیل:۔ "اور گائے کا کیا مرتبہ ہے؟"

مجوسی:۔ "گائیں خدا کے فرشتے ہیں جن کے بازو کاٹ کر دنیا میں کاشت کاری کے لیے بھیج رہا ہے۔"

ابوالہذیل:۔ "پانی کیا ہے؟"

مجوسی:۔ "خدا کا نور۔"

ابوالہذیل:۔ "بھوک پیاس کیا ہے؟"

مجوسی:۔ "شیطان کا فقر و فاقہ۔"

یہ سن کر ابوالہذیل نے کہا کہ مجوس بھی عجیب طبقہ ہے۔ جس نے خدا کے فرشتوں کو ذبح کیا، خدا کے نور سے دھویا۔ خدا کی بیٹی پر رکھ کر اسے بھونا اور پھر شیطان کے فقر و فاقہ کے حوالے کر دیا۔

ابوالہذیل کی ذہانت کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ ملاحظہ ہو۔

ایک بار وہ امیر حسن بن کی مجلس میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک نووارد مسند کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ ابوالہذیل نے پوچھا "یہ کون ہے؟" امیر نے کہا کہ "یہ نجومی ہے اور نجوم کے حساب سے پیشین گوئیاں کرتا ہے۔" ابوالہذیل نے کہا "اگر اجازت ہو تو اس سے کوئی سوال کروں۔" امیر نے کہا "ضرور۔"

ابوالہذیل نے ایک سیب جو امیر کے سامنے ہی رکھا ہوا تھا، اٹھا لیا اور نجومی سے پوچھا "بتاؤ میں اسے کھاؤں گا یا نہیں۔" نجومی نے حساب کر کے جواب دیا کہ "آپ اسے کھائیں گے۔" ابوالہذیل نے سیب ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا "میں اسے ہرگز نہیں کھاؤں گا۔" نجومی نے کہا کہ "آپ اسے پھر اٹھائیں، میں پھر غور کرتا ہوں۔ شاید حساب میں کچھ غلطی ہو گئی ہو۔" ابوالہذیل نے اس مرتبہ دوسرا سیب اٹھایا، امیر

نے پوچھا: "دوسرا سیب کیوں لیا؟" ابوالہذیل: "اس لیے کہ اگر اس مرتبہ نجومی نے یہ کہا کہ میں اسے نہ کھاؤں گا تو کھاؤں گا!" نجومی بہت خفیف ہوا اور دربار سے اٹھ کر چلا گیا۔

ابوالہذیل کا ساتھی بلکہ اس کا شاگرد نظام جس کا نام ابھی لیا گیا۔ تمام معتزلی علماء میں تنہا اس خصوصیت کا مالک تھا کہ اسے لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ پھر بھی ادب، تاریخ، فقہ، کلام اور فلسفہ و حکمت کا زبردست ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ قرآن انجیل، توریت، زبور مع تفسیروں کے اس کو ازبر تھے اور شعرائے عرب کے ہزاروں اشعار اور فلسفہ و کلام کے تمام مسائل اس درجہ مستحضر رہتے تھے کہ وہ بلا تکلف ان کا حوالہ دے سکتا تھا۔

ایک دفعہ جعفر برمکی کی مجلس میں ارسطو کا ذکر آیا تو نظام نے کہا کہ مجھے اس کے بعض نظریوں سے اختلاف ہے۔ جعفر نے کہا کہ تم تو پڑھنا جانتے ہی نہیں۔ تم کیا سمجھ سکتے ہو؟ یہ سن کر نظام نے ارسطو کی کتاب کا ایک ایک مسئلہ اور ساتھ ہی ساتھ اس پر اپنا اعتراض بیان کرنا شروع کیا تو جعفر حیران رہ گیا۔

طبیعات میں سب سے پہلے اس نے ثابت کیا کہ رنگ، بو، آواز، ذائقہ، روشنی و حرارت وغیرہ مادی اعراض ہیں اور مادہ اعراض ہی سے مل کر وجود میں آتا ہے۔ وہ جزوِ لایتجزیٰ کا قائل نہ تھا۔ وہ معجزہ شق القمر اور وجود جنات کا بھی منکر تھا۔ وہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو بھی معجزہ نہ کہتا تھا، لیکن تناسخ کا قائل تھا۔

وہ بڑا لطیف الخیال شاعر بھی تھا۔ چنانچہ اس کا ایک شعر جس میں محبوب کی انتہائی نزاکت کا اظہار کیا گیا ہے ملاحظہ ہو:

ومرّ بقلبی خاطراً فجرحته
ولم ار خلقاً قط یجرحه الفکر

یعنی جب میں نے اس کا تصور کیا اور اس کا گذر میرے قلب میں ہوا تو وہ زخمی ہو گیا۔ میں نے آج تک کوئی انسان ایسا نہیں دیکھا جو محض تصور و خیال سے زخمی ہو جائے۔

افسوس ہے کہ عین عالم شباب میں اس کا انتقال ہو گیا۔ پھر بھی وہ اپنے بعد کافی تعداد شاگردوں کی چھوڑ گیا۔ جن میں جاحظ کا شمار ائمہ اعتزال میں ہوتا ہے۔ اور جس کی تصانیف میں کتاب الحیوان اور کتاب البیان والتبیین اب بھی مشہور و مقبول ہیں۔ بعد کو معتزلہ جماعت کے دو فرقے نظام اور جاحظ ہی کے نام سے منسوب ہو گئے جنہیں نظامیہ اور جاحظیہ کہتے ہیں۔

اتفاق دیکھیے کہ مامون کے بعد معتصم اور واثق تخت نشین ہوئے اور یہ بھی دونوں معتزلی تھے۔ ان کے عہد کے قاضی القضاۃ احمد بن ابی داؤد جو سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے، وہ بھی معتزلی تھے۔ اس لیے معتزلہ کی وہ ترقی جو مامون کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی معتصم اور واثق کے عہد میں انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ اور ساری دنیا کھنچ کھنچ کر اعتزال کی طرف آنے لگی۔

اس کے بعد متوکل تخت نشین ہوا تو یہ ترقی رک گئی۔ کیونکہ وہ فلسفہ و حکمت کا دشمن تھا۔ پھر بھی چوں کہ عراق عرب، خراساں، فارس، کرمان اور خوزستان وغیرہ اکثر اسلامی ممالک میں اعتزال پھیل گیا۔ اس لیے متوکل اسے آسانی سے مٹا نہ سکا۔ اور چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں بھی جب معتزلہ پر زوال آ چکا تھا۔ ابوعلی جبائی ایسا شخص پیدا ہوا جسے امام الاعتزال مانا جاتا ہے

معتزلہ کے زوال کی صحیح تاریخ ابوالحسن اشعری کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جو عقائد معتزلہ کے سخت مخالف تھے۔ چونکہ اب عباسیین کی سلطنت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اور سلاجقہ کے عروج کا زمانہ تھا۔ جو مذہبی آزادی کے سخت دشمن تھے اس لیے اب اعتزال کو جبراً بزور شمشیر مٹایا جانے لگا۔ اور چونکہ سلاجقہ کے بعد بھی جتنی مسلم حکومتیں ظہور میں آئیں سب کی سب اشعری عقائد کی پابند تھیں۔ اس لیے انہوں نے پوری قوت سے اعتزال کا استیصال شروع کر دیا۔ اور آخر کار رفتہ رفتہ عقلی اداروں کے دروازے اسلام پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔

واجد علی شاہ کی ایک نایاب تصنیف

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

واجد علی شاہ برصغیر کی سیاسی تاریخ میں ایک بدنام شخص ہے۔ اس کی عیش پرستی اور سلطنت سے بے خبری، ناچ اور گانے کے جلسے، نقالوں کی محفلیں، شاعروں کے اجتماع اور مصاحبین کی کثرت کو بعض لوگ سلطنتِ اودھ کی ضبطی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ہم اس وقت واجد علی شاہ کی زندگی کے اس سیاسی پہلو سے تعلق نہیں رکھتے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ واجد علی شاہ میں یہ خامیاں نہ بھی ہوتیں تو ایک نہ ایک دن سلطنتِ اودھ ضرور برطانوی ہند میں شامل ہو جاتی۔ آخر بہادر شاہ ظفر اپنے کردار میں واجد علی شاہ سے مختلف تھے۔ ان پر عیش پرستی، ناچ گانے اور اخلاقی پستی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن ان کا کردار سلطنتِ دہلی کو نہ بچا سکا۔ دراصل ۱۸۵۷ء سے کم از کم سو سال پہلے سے ہندوستانی سیاست پر برطانوی اقتدار آہستہ آہستہ چھاتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ انگریز اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک ایسی سلطنت کے مالک بن بیٹھے جہاں دریاؤں میں امرت بہتا تھا۔ زمین سونا اگلتی تھی۔ لیکن جہاں کے لوگ پیٹ بھر کر کھانے اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑے سے بھی محروم تھے۔

اس سیاسی تاریخ کی بحث کو چھوڑ کر اگر تاریخ ادبیات کی طرف آئیں تو یہ زمانہ جو ایسے انتشار اور زوال کا ہے نہایت اہم معلوم ہوتا ہے۔ خود واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر اور ان سے متعلق شعرا اور ادیبوں نے جو تخلیقات کی ہیں وہ اس ادبی تاریخ کا ایک مستقل باب ہیں۔ واجد علی شاہ اپنی ایک کتاب میں خود اپنی تصانیف کی تعداد ۴۶[1] بتلاتے ہیں اور ان میں سے بعض کی حصول میں ہیں۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں[2]:

"یہ سب فقیر کے کتب خانے میں موجود ہیں اور جو تزلزلِ سلطنت اور غارت بدمعاشاں میں تاراج ہوئیں وہ خارج از حساب ہیں"۔ اس عبارت کے لکھنے کے بعد بھی واجد علی شاہ زندہ رہے اور لکھتے رہے اس عرصے میں اس تعداد میں اضافہ ہی ہوا ہوگا۔

اس اعتبار سے واجد علی شاہ اپنے دور کے ایک ممتاز شاعر اور مصنف قرار پاتے ہیں۔ سلاطین اور امرا کے متعلق اکثر یہ گمان ہوتا ہے کہ جو کلام ان کے نام سے شہرت پاتا ہے وہ سب ان کی تصنیف نہیں ہوتا بلکہ درباری شعرا اور ادیبوں کی کاوشیں بھی ان کے نام سے منسوب ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے بعض حالتوں میں ایسا ہی ہو لیکن واجد علی شاہ کے بارے میں ہماری قطعی رائے ہے

---

[1] "بنی" ص ۲۴۳ [2] ایضاً

کہ جو چیزیں ان کے نام سے منسوب ہیں وہ واقعی ان کی اپنی تصنیف ہیں۔

ان تصانیف کے تنوع اور موضوعات کو دیکھ کر بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ان کے معاصرین میں سے جن شعرا اور فنکاروں کی تخلیقات محفوظ ہیں ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ ان کے خوشہ چیں نہیں ہیں۔ شاعری میں انکا انداز اگرچہ عام لکھنوی مذاق کا ترجمان ہے لیکن ان کا اپنا کردار اور ذاتی واقعات و حوادثات اس کثرت سے اس کلام میں موجود ہیں کہ ہمیں ماننے میں تامل ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کی تصنیف نہیں۔ لیکن شاعری کے دفتر سے قطع نظر واجد علی شاہ کی بعض تصانیف ایسی ہیں جیسی ان کے معاصرین میں کسی اور نے تصنیف نہ کیں انھیں سے واجد علی شاہ کی طبیعت کی اپج اور جدّت طرازی ان کے ذاتی مشاغل، مختلف علوم و فنون میں ان کی مہارت غرض ان کے مکمل کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک کتاب "بنی" ہے۔

اس کتاب میں واجد علی شاہ اپنا تعارف اس طرح کراتے ہیں:-

> "اختر شاہ آخر اودھ یہ فقیر حقیر راقم و مصنّف و مؤلف سراپا تقصیر ہے۔ پندرہ برس کے سن میں والد جنت مکان نے ولیعہد اور وزیر کیا۔ بیس برس کے سن میں تخت اودھ بجائے حضرت اعلیٰ قائم ہوا۔ تیس برس کے سن میں بلا صدور ظلم و ناانصافی و بے آزاری رعیت بے سبب تخت سے محروم کیا گیا۔ بیس برس سے کلکتہ محلہ موچی کھولہ ملقب بہ مٹیا برج میں قیام ہے۔ پچاس برس کا سن ہوا۔ چھبیس مہینے قلعہ ولیم فورٹ کلکتہ میں ناحق قید رہا۔ ساٹھ سے اوپر پر ماشاء اللہ چشم بد دور اولاد ذکور و اناث ہیں ۱۲۹۱ھ سے باعانت گورنمنٹ بیس ہزار روپیوں میں دو دختروں کا عقد کر دیا۔ سنا جاتا ہے کہ اس حساب سے بارہ دختریں سن آئندہ میں باعانت گورنمنٹ منعقد ہوں گی۔ پچاس برس کے سن میں اتنی جلدیں کتابوں کی تصنیف کیں۔ اس حساب سے "بنی" کا سنہ تصنیف ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۷ء قرار پاتا ہے۔"

کتاب کا موضوع: یہ کتاب جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے مختلف موضوعات پر حاوی ہے۔ مثلاً:- (۱) راگ مالا (۲) ناٹک و دربار (۳) رہس (۴) بھنڈیتوں اور مضحک نقلوں کے باب میں (۵) مثلی مشاعرہ (۶) شعبدے اور لطیفے (۷) پہیلیاں (۸) خطاب محلات و بیگمات و خطاب شہزادگان و ارباب عالم پسند (۹) خطاب جانوراں (۱۰) خطاب کبوتر خانہ معہ نام (۱۱) خطاب مینڈھا خانہ۔ (۱۲) خطاب مچھلیوں کے (۱۳) درخت (۱۴) خطاب کو ٹھیوں اور کمروں کے (۱۵) قانون اختری حفظ عصمت مرد و زن اور ہدایت بیگمات کے واسطے۔

راگ مالا:- موسیقی۔ ہندوؤں میں جزو عبادت ہے۔ چنانچہ ابتدائے تاریخ سے ہندوؤں نے اس فن کو پروان چڑھایا۔

---

۴ ایضاً ص ۲۴۱ ۵ ص ۲۳ ۶ ص ۲۹۳ ۷ ص ۳۰۵ ۸ ص ۳۰۸ ۹ ص ۳۴۵

۱ ص تا ۴۰ ۲ ص ۵۴ ۳ ص ۱۱ ۴ ص ۱۲۴ ۱۰ ص ۳۵۳ ۱۱ ص ۳۵۴ ۱۲ ص ۳۵۴

۱۳ ص ۳۵۵ ۱۴ ص ۳۶۰ ۱۵ ص ۳۶۵

اگرچہ اپنے دورِ زوال میں یہ فن بھی دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح صرف پست جذبات کی تسکین کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فنکاروں نے اسے مختلف زمانوں میں اپنے خونِ جگر سے سینچا اور بڑے ریاض سے اس میں محنت کر کے اصول اور قاعدے مرتب کئے۔ مسلمان روایتی طور پر گانے بجانے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان میں بھی صوفیوں کا ایک گروہ ایسا تھا جو سماع کو عبادت سمجھتا اور اس سے تزکیہ نفس کا کام لیتا۔ پھر ایک دور ایسا آیا کہ مسلمان فنکاروں نے اسے بحیثیت فن اختیار کیا اور اس میں بہت کچھ اضافے کئے۔ اور لوگوں کے علاوہ صرف ایک حضرت امیر خسرو کا تاریخی نام لینا کافی ہے۔ انھوں نے عربی اوزان کو ہندی راگوں میں ڈھالا۔ چنانچہ ہندی اور عربی موسیقی کی بھی آمیزش حضرت امیر خسرو کے مشہور قول میں ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار راگ اور راگنیاں بھی ایجاد کیں۔ مغلوں نے موسیقی کی سرپرستی کی تو تان سین جیسا فنکار پیدا ہوا اور یہ سلسلہ بطور وضعداری بعض ریاستوں میں اب تک جاری ہے۔ واجد علی شاہ گانے بجانے کے عاشق تھے۔ بعض لوگ اسے محض ان کی عیش پرستی اور جذباتِ ہوس کی تسکین کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن خود ان کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس فن کو استادوں سے حاصل کیا تھا اور اس پر اس قدر محنت کی تھی کہ خود استادی کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت اور تحریروں کے علاوہ 'بنی' کے پہلے حصے میں ملتا ہے جو راگ مالا سے متعلق ہے۔

اس باب میں مختلف فصلیں ہیں اور ہر فصل میں ایک ایک راگ کی تفصیل لکھی گئی ہے۔ مثلاً چوتھی فصل "خیال" کے باب میں ہے۔ اس میں راگ کے نام، اس کے گانے کا وقت، بول وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) خیال راگنی۔ رام کلی۔ تال دھیمہ۔ تتالہ۔ اس کا وقت صبح سے پہر دن چڑھے تک ہے۔

(۲) خیال ٹوڈی تال دھیمہ۔ تتالہ۔ اس کا بھی وقت صبح سے پہر دن چڑھے تک ہے۔

اس خیال کی مثال یہ ہے:-

آستائی مائی ری یہ جوبن مدھ ماتیاں
انترا اکھتر کے سنگ پریت کروں گی دھک دھک ہووت موری چھاتیاں[1]

(۳) خیال راگنی بھٹیار۔ اس کو ہر وقت برتتے ہیں[2]

آستائی، آج موئے گھر کاج مندیلا باجے مائی ری
انترا گلیوں گلیوں پُن برست ہے جھلکت ہے نگارا اکھتر پیارا ملک اودھ راجے

پانچویں فصل ساون کے بیان میں ہے۔

(۱) ساون تلک کامود تال روپک اور یہ شبانہ روز برتا جاتا ہے۔

آستائی۔ ستیاں بن لاگت بوند کٹاری
انترا سپنے میں آیو مرا من لے گیو اکھتر بن جیہ بہاری
ایضاً آستائی۔ پدمنیاں بوندوں برسے رے لکھ نیا بوندوں برسے

---

[1] ص ۱۱ [2] ص ۱۳

فصل چھٹی ٹھمری میں۔
ٹھمری جھنجھوٹی۔ یہ ہر وقت گائی جاتی ہے۔

"تال جلد تتالہ آستائی۔ مکھڑا دکھا جا میری سیمن پیاری
انترا۔ اکھتر تم گھونگھٹ تو کھولو پائل بجا میری دلہن پیاری

راگ مالا کا دوسرا باب[1] تال ادھیا میں ہے۔ اس میں ایک مقدمہ اور دو فصلیں ہیں۔ مقدمہ میں واجد علی شاہ لکھتے ہیں :۔

"جاننا چاہیئے کہ ناچ اور گانے میں تین طرح کی لَے درست ہے اور زیادہ اس سے صنعت طبعی ہے۔ پہلی ٹھا۔ دوسری دُون۔ تیسری تگن۔ اس باب کی پہلی فصل ٹکڑوں کے بیان میں ہے جو الفاظ سے ادا ہوتے ہیں اور دوسری فصل ٹکڑوں کے پھیروں کے بیان میں ہے جو گنتی سے ادا ہوتے ہیں :"

اس تحریر سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ گانا بجانا واجد علی شاہ کے لئے محض ایک تفریحی مشغلہ نہ تھا اور نہ اسے محض جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھنا چاہیئے۔ واجد علی شاہ نے اس مشغلہ کو بطور فن اختیار کیا تھا اور اس میں فنکاروں کی طرح اپنے کمال کا اظہار کیا۔ چنانچہ مختلف راگوں اور راگنیوں کے بول اس کی اپنی تصنیف ہیں۔ آگے چل کر اس کا بھی ثبوت ملے گا کہ اپنی تکمیل کے بعد واجد علی شاہ نے دوسرے فنکاروں کی تربیت کی اور اس طرح موسیقی کے ایک پورے دبستان کو پروان چڑھایا۔ راقم السطور کو اس فن میں زیادہ دخل نہیں اس لئے اس بارے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتا لیکن یہ ایسا موضوع ہے جو ہمارے فنونِ لطیفہ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مطالعے کے قابل ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہماری تاریخ میں ایسے سلاطین اور امراء تو بہت ملتے ہیں جنھوں نے فنونِ لطیفہ اور فنکاروں کی سرپرستی کی۔ لیکن ایسے بہت کم ملیں گے جو خود فن میں ڈوب گئے۔ واجد علی شاہ یقیناً ان میں سے ایک ہیں۔ راگ مالا کے بعد دوسرا حصّہ رقص یا ناٹک سے متعلق ہے۔ اس میں پہلی فصل دگت سے متعلق ہے۔ مثلاً

مؤدب گت[2] :۔ سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کو ناف سے ملا کر ناچے اور پسپا ہونے کے وقت داہنا پہلو ناچ دیکھنے والوں کی طرف رہے۔

فریاد گت :۔ اس میں دونوں ہاتھ کشادہ رہیں۔ یہاں تک کہ بغل کی سفیدی نظر آئے اور منہ رقاص کا ناچ دیکھنے والے کی جانب ہو، ناچے اور جاتے وقت یعنی پسپا ہوتے وقت داہنا ہاتھ ناچ دیکھنے والے کی طرف رہے۔

ناز گت :۔ داہنے ہاتھ کی انگلیاں ملا کر اس ہاتھ کی بیچ کی انگلی کو ٹھوڑی کے اوپر اس طرح رکھے کہ اس ہاتھ کی ہتھیلی نظر آئے اور بائیں ہاتھ کی صورت مؤدب گت کے بائیں ہاتھ کی صورت کے مطابق ہو اور ناچے۔ اور پسپا ہونے کے وقت داہنا پہلو مشاہدہ کنندہ کی سمت ہو۔

اسی طرح غمزہ گت۔ پیشواز گت۔ مکٹ گت۔ لکرا گھونگھٹ گت۔ وادھیہ گھونگھٹ گت۔ بنگالہ گھونگھٹ گت۔ بندھی سلامی گت۔ داہنی بانکی گت۔ بائیں بانکی گت۔ پیاری گت وغیرہ ملا کر سولہ گتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

دوسری فصل کھڑے کے ناچ میں ہے[3]

---

[1] ص ۴۷ [2] ص ۵۹ [3] ص ۶۲

کھرڑے میں فقط پانچ گتیں ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ پہلی چھری گت۔ داہنے ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پیٹھ پر رکھ کر دونوں انگوٹھوں کو کوکھے میں حرکت دے اور ایک دو کی گنتی پر ناچے۔ داہنے پاؤں سے ایک اور بائیں پاؤں سے دو اور کھرڑے کا سم ایک پر ہی ہوتا ہے اور داہنی طرف سے گھومنا اکطرفی مقرر ہے۔

باقی چار گتیں بھنگا گت۔ ٹھینگا گت۔ لہنگا گت اور پنکھا گت ہیں۔ ان کی بھی اسی طرح تفصیل بیان کی ہے۔ خاتمہ اس عبارت پر ہوتا ہے[1]۔

" جاننا چاہیے کہ کھرڑے میں فقط چار توڑے مستعمل ہیں۔ پہلا بائیں چوتڑہ پر، دوسرا داہنے پر، تیسرا دونوں زانوؤں پر، چوتھا کھڑے ہو کر۔" ان پانچوں گتوں کو تصویروں کے ذریعے سے بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان تصویروں کے متعلق سب سے پہلی بات یہ ہے کہ پانچوں تصویریں مردوں کی ہیں، کسی طوائف یا عورت کی تصویر نہیں ہے۔ ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ ناچ ایک طرح کی نمائش بینی ہے۔ طوائفوں کے رقص نے غالباً اس غلط فہمی کو تقویت پہنچائی ہے۔ ان تصویروں میں رقاص مرد ہیں اور صورت شکل سے پٹھان معلوم ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی کلاہ۔ اسی انداز کے بال اور مونچھیں۔ البتہ لباس میں پیشواز پہنے ہوئے ہیں۔ واجد علی شاہ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ سوتے میں بھی ان کے پاؤں کا انگوٹھا تال پر حرکت کرتا تھا۔ اور رقص میں انھیں ایسی مہارت تھی کہ گھنگھرو پہن کر اس طرح رقص کرتے کہ جس گھنگھرو سے چاہتے آواز پیدا کرتے اور جس گھنگھرو کو چاہتے ساکن و ساکت رکھتے۔

اس کے بعد کتاب کا سب سے اہم باب شروع ہوتا ہے یہ رہس کے متعلق ہے۔ امانت کو اردو ڈرامے کا باوا آدم اور اس کی اندر سبھا کو اردو کا سب سے پہلا ڈرامہ بتایا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ واجد علی شاہ کو رہس سے دلچسپی تھی اور انھوں نے رہس تصنیف کئے تھے۔ یہ مسئلہ اختلافی بنایا جاتا ہے کہ واجد علی شاہ نے خود بھی اس رہس میں کام کیا تھا ـــ یا نہیں، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ ان رہسوں میں کس قسم کی تکنیک استعمال کی گئی تھی، بعض لوگ کہتے ہیں کہ واجد علی شاہ کے رہس کی تعمیر میں کچھ فرانسیسی اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس میں ہندوؤں کے مذہبی رہس کا سا انداز ہے۔ یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے کہ واجد علی شاہ کے رہس اور امانت کی اندر سبھا کو ڈرامہ کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ ان میں سے بہت سے سوالوں کا جواب خود واجد علی شاہ کے قلم سے اس حصہ میں مل جاتا ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ تحریر اردو ڈرامے کے ایک اہم باب کو وضاحت اور سند کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

اس باب میں جو کتاب کا چوتھا حصہ ہے۔ دو فصلیں ہیں[2]۔ پہلی فصل میں چھتیس ۳۶ ایجادی رہس ہیں۔ یہ لفظ واجد علی شاہ نے خود استعمال کیا ہے اور اس لئے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ جملہ رہس خود واجد علی شاہ کی ایجاد یا تصنیف ہیں۔ رہس کی تیاری کے سلسلے میں واجد علی شاہ لکھتے ہیں[3]:

" سکھیاں پیشواز سے آراستہ ہو کر آئیں اور خاموش بیٹھ جائیں۔ سازندے ان کے ہمراہ یہ تصنیف راقم گائیں آشنائی چلو چلو سکھی اب رہس کریں۔ الکھ پیا کے من کو رجھائیں۔ جس وقت راقم کا تخلص لبوں پر آئے فوراً سب سکھیاں کھڑی ہو جائیں اور جس مقام

---

[1] صہ ۶۳ [2] صہ ۶۹ [3] ایضاً

پر رہس کے واسطے صف باندھ کر کھڑا ہونا مقرر ہو چکا ہو وہاں پر صف بستہ ہموار استادہ ہوں اور رہس کے وقت ہر گونہ اکل و شرب اور شور و غل سے محفوظ رہیں اور نہ مقامِ رہس سے تا اختتام باہر جائیں اور دو جوڑ چھوٹی چھوٹی جھانجھوں کی ہاتھ میں لے کر بجائے جائیں۔ کم کم ، ہر رہس کے ماقبل ضرور ہے کہ راقم کی تصانیف گائیں۔ بعدہٗ پکھاوجی کے ٹکڑے کے ہمراہ وہ نغمہ سم پہ تمام کیا کریں اور ہر رہس کے ختم کے بعد چرنجی رہو جانِ عالم یا جانِ عالم کی جے سر میں کہا کریں اور ایک ٹکڑا داہنی جانب اور دوسرا بائیں جانب اور تیسرا بالائے ناف تمام کریں اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے داہنی جانب دونوں ہاتھ کے میں بڑھائیں اور دوسری دفعہ بائیں جانب بھی اسی طرح سے اور تیسری مرتبہ ناف پر بائیں ہاتھ کی انگشتِ کلمہ اور انگشت نر ملا کر چٹکی کی صورت بنا کر رکھیں اور داہنا ہاتھ چٹکی بند سی ہوئی پیشانیوں پر اور ایک دو تین پر کمر کو ہلائیں ایک داہنے کولھے پر، دو بائیں کولھے پر اور تین پھر داہنے کولھے پر تمام کریں اور ہر چکر میں گلدستے اٹھایا اور دھرا کریں۔[1]

یہ عام ہدایات ہیں جن کا اطلاق ہر رہس پر ہوتا ہے۔ خاص رہسوں کے متعلق تفصیلی ہدایات الگ دی گئی ہیں۔ اس طرح اسٹیج ڈرامے کا ایک حصہ یعنی ہدایت کاری اپنے اولین نقوش اور ابتدائی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ مختلف رہسوں میں سے بعض کی ہدایات ملاحظہ ہوں[2]:-

رہس مہتاب مکھی نام:- دونوں ہاتھوں کی کلمے کی انگلیاں جوڑ کر مثلِ ہلال پیشانی پر رکھیں اور ایک کے بازو سے دوسری اپنے بازو نکال لائیں۔ اور زنجیرہ بندی کریں اور "مہتاب مکھی ناچو سکھی ری" گاتی ہوئی آگے آئیں اور حلقہ کریں یعنی مدوّر ہوں اور رقص کریں۔ من بعدہٗ ہاتھ جوڑ کر گاتی ہوئی ایک دو ایک دو تال میں پاؤں سے نکالتی ہوئی پسپا ہو کر جائے معمولی پر جائیں اور چرنجی رہو جانِ عالم سر میں کہیں۔

رہس آسمان مکھی نام[3]:- دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ملا کر اس کے بعد دونوں ہاتھوں کی انگشتانِ میانہ کو مساوی ایک دوسرے کا کر کے اس طرح سے کہ انگوٹھا علیحدہ رہے اپنی اپنی پیشانیوں پر رکھیں اور ایک کے بازو سے دوسری اپنا بازو نکال کر زنجیرہ بندی کریں پھر "آسمان مکھی ناچو سکھی ری" گاتی ہوئی آگے آئیں اور حلقہ کریں اور رقص کریں اور بطریقِ اول عمل میں لائیں۔

واجد علی شاہ نے تمہید میں جن چھتیس۳۶ ایجادی رہسوں کا ذکر کیا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:-

(۱) پہلا رہس سلام نام
(۲) دوسرا رہس سیدھی گل بال نام
(۳) تیسرا رہس ملاہن پنکھی نام
(۴) چوتھا رہس مروجہ نام
(۵) رہس شنائی
(۶) رہس مہتاب مکھی
(۷) رہس آفتاب مکھی
(۸) رہس آسمان مکھی
(۹) " چوطرفہ
(۱۰) " چورخہ
(۱۱) " افسر مبارک
(۱۲) " آداب
(۱۳) " چھتر
(۱۴) " خوش بنیاد
(۱۵) " برقع
(۱۶) " بھلا نام
(۱۷) " پیارا
(۱۸) " جان سکھی
(۱۹) " ہیہ سکھی
(۲۰) " چین سکھی
(۲۱) " راست دست
(۲۲) " چپ دست
(۲۳) " راودھا
(۲۴) " تعلیم

---

[1] ص ۷ [2] ص ۳ [3] ص ۴

(۲۵) رہس حُوّر (۲۶) رہس شمشاد (۲۷) رہس ہمایوں (۲۸) رہس خندہ
(۲۹) ” باادب (۳۰) ” خوب (۳۱) ” مخفی (۳۲) ” مطلوب
(۳۳) ” ہمزاد (۳۴) ” تحفہ (۳۵) ” من سکھی (۳۶) ” معشوق

یہ چھتیس رہس واقعی واجد علی شاہ کی ایجاد ہیں اور ان کا تعلق ہندوؤں کے مروجہ مذہبی یا نیم مذہبی رہسوں سے قطعاً نہیں ہے۔ تیئیسویں رہس کا نام رادھا ضرور ہے لیکن اس میں رادھا یا کرشن کے رومانی قصّے کا کوئی اشارہ نہیں۔ رہس یہ ہے :-

”تیئیسواں رہس رادھا نام۔ گھونگھٹ بطریق لکھنؤ گھونگھٹ نکالیں و بطریق احکام سابق عمل کریں۔“[1]

یہ رہس اسٹیج ڈرامے کے تین اجزا پر مشتمل ہیں (۱) ہدایت کاری (۲) موسیقی (۳) رقص۔ لیکن انھیں صحیح معنوں میں ڈرامے نہیں کہہ سکتے۔ ان میں کوئی قصّہ کہانی یا پلاٹ نہیں۔ نہ مکالمے اور مناظر ہیں جب تک یہ عناصر شامل نہ ہوں ڈرامے کا یہ تصور کہ وہ واقعات کو عمل کے ذریعے پیش کرنے میں تشنۂ تکمیل رہتا ہے۔ پہلے تین عناصر میں سے دو یعنی رقص اور موسیقی اگرچہ آج تک کسی نہ کسی حد تک اردو ڈرامے کے لازمی جزو بنے ہوئے ہیں تاہم ان کا بنیادی تعلق ڈرامے سے کچھ نہیں ہے۔ لیکن واجد علی شاہ نے رادھا کنہیا کے دو قصّوں کو الگ الگ دو رہسوں کی شکل میں ترتیب دیا ہے اور ان میں ڈرامے کے باقی عناصر بھی آگئے ہیں۔

پہلا قصّہ رادھا اور کنہیا کے اظہار حالات اور تعشق میں ہے[2]

دو سکھیاں کا چولی پہن کر بھاری جامۂ حسن پہنیں۔ ایک کا نام زعفران پری اور دوسری کا نام عنبران پری ہے اور ایک مرد شکل دیو کریہہ منظر بنے۔ اس کا نام عفریت ہے اور ایک سکھی جوگن بنے اس کا نام صحرا ہے اور ایک مرد خادم جوگن کا بنے اس کا نام غربت ہے۔ بعد ختم رہس سب سکھیاں بیٹھ جائیں اور ایک جانب دونوں پریاں کرسیوں پر بیٹھیں اور ایک طرف جوگن کرسی پر اجلاس کرے اور دیو پریوں کے سامنے کمر کسے ہاتھ باندھے کھڑا ہو اور غربت جوگن کے سامنے دست بستہ استادہ ہو اور ایک جانب رادھا کنہیا بالکٹ اور رشتہ بینہ لگائے ہوئے گھونگھٹ بنگالہ نکالے ہوئے کرسیوں پر اجلاس کریں اور رام چیرا دونوں کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہو۔ اور چار سکھیاں ایک کا نام للتا، دوسری ساکھا، تیسری چنبیلی، چوتھی لڑوا جیغہ کلغی لگائے ہوئے جھرمٹ کیے ہوئے علیحدہ کھڑی ہوں اور چار پنہارن مصنوعی کنوئیں سے ٹھمری گاتی ہوئی راقم کی تصنیف پانی بھرتی ہوئی ہوں اور ایک مرد مسافر کی صورت بنا ہوا معہ گٹھڑی اور عصا بدست حاضر ہو اور چار مکھن والیاں ہوری راقم کی تصنیف گاتی ہوئی اور مکھن نکالتی ہوئی ہوں۔ جوگن کو چاہیئے غمزدہ بیٹھنا۔

(سوال غربت کا اور عرض صحرا سے) جگ جگ جیو آنند رہو جوگن صاحب کیوں ملول ہو۔ کاہے جیا ملین ہے ؟
(صحرا کا ارشاد غربت سے) چوبیس برس ہوئے ایک رنج ہے۔
(عرض غربت) وہ کیا رنج ہے، ہم سے کہنے کا ہو تو کہیئے۔

---

[1] ص ۸۱ [2] ص ۸۶

(ارشاد صحرا) چوبیس برس ہوئے مدھ کا[1] اس گم[2] میں کہ رادھا کنہیا کا ناچ نہیں دیکھا۔

(عرض غربت) بس آپ کو اسی کا گم ہے۔ جاتا ہوں تدبیر کرنے کو۔

(غربت کا تجسّس کرنا۔ غربت چلا اور عفریت سے علیحدہ ملاقات کی اور کہا)

(غربت) السّلام علیکم میاں عفریت!

(جواب عفریت) وعلیکم السّلام السّین واللام اللّعام والکلام الکشمش والباوام میاں غربت علی خان بہادر بہادران کھٹ پٹ جنگ نامرئے وبرڑ جور۔

(پھر دونوں بغلگیر ہوئے۔ عفریت اس طرح سے ہنسا کاؤں کاؤں کھل کھل کھل کھل)

(غربت کا سوال عفریت سے) میاں عفریت! ہمارے تمہارے مدّت سے بھائی چارہ ہے۔ ہم کو تم سے ایک امر ضروری کہنا ہے اگر تم سے ہو سکے۔

(جواب عفریت) کیا کام ہے؟

(سوال غربت) ایک جوگن ہے اس کو ایک غم ہے۔

(جواب عفریت) وہ کونسا غم ہے؟

(سوال غربت) جوگن صاحبہ کہتی ہیں کہ مجھے رادھا کنہیا کے ناچ نہ دیکھنے کا غم ہے۔ میں وعدہ کر آیا ہوں کہ کوشش کرتا ہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو میرے وعدے کو پورا کرو۔

(عفریت کا جواب اور قسمیں) تنتی منتی دُم جیسی لوٹک لاٹا جھونٹک جھانٹا صندوق معلق شترہ گاؤ کی دُم اور بچوں کی قسم جو میرے کئے مطلب برآمد ہوگا ہرگز دریغ نہ کروں گا۔ میں سعی کرتا ہوں۔

(بس اسی وقت عفریت غربت کو ہمراہ لے کر روانہ ہوا اور کہنے لگا۔)

(عفریت) باباسا تور بازی۔ حمال بازی۔ نیزہ بازی۔ خلال بازی۔ شمشیر بازی۔ راست بازی! چلو میرے ساتھ اور بحضور زعفران پری و ازغوان پری حاضر ہوا اور عرض کی ایک جوگن رادھا کنہیا کے ناچ کے غم میں جوگن ہوئی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ ناچ دیکھے۔

(زعفران پری اور ازغوان پری جوگن کو طلب کرکے اس کے غم کا حال پوچھتی ہیں اور یہ معلوم کرکے کہ چوبیس برس سے رادھا کنہیا کے ناچ دیکھنے کے غم میں مبتلا ہے عفریت کو حکم دیتی ہیں کہ جوگن کو رادھا کنہیا کا ناچ دکھایا جائے چنانچہ ناچ کی تیاری ہوتی ہے)

اس تیاری اور ناچ کو واجد علی شاہ اس طرح بیان کرتے ہیں:-

رادھا کنہیا سکھیاں ناچو ہنڈولے کا ناچ

---

[1] یعنی مدھ کو معنی مجھ کو بہ لہجہ پوربی

[2] غم

" اس وقت سب سکھیاں برابر استادہ ہوں اور ایک سرا دوپٹے کا کنہیا تھامے دوسرا سرا رادھا جی وسط صف میں تھامے اور یہ ہنڈولہ گانی جائیں۔ اور ایک دو کی پاؤں تال میں لگانی جائیں اور سب سکھیاں متابعت رادھا جی کی کرتی جائیں اور کنہیا جی پیشقدمی پر مقابل رادھا کے ہو کر دوپٹہ کھینچ لیا کریں اور پس قدمی پر ڈھیل دیا کریں۔

آستائی کا ہنڈولہ، جھولے سیاما سیام گھنیس گھنہ چلت چون سنہ ننہ سنہ ننہ سنہ ننہ
پہلا انترا۔ سب سکھیاں مل پینگ بڑھاؤ لے کے تان ننہ تنہ تنہ ننہ تنہ ننہ
دوسرا انترا۔ مورمکٹ کٹ راکھر دہ کنڈر پائل باجے جھنہ ننہ جھنہ ننہ جھنہ ننہ

بعد اختتام ہنڈولہ سب سکھیاں راجہ رام چندر کی جے کہیں۔ من بعدہٗ رادھا کنہیا مقابل استادہ ہوں اور نصف سکھیاں کنہیا کی جانب اور آدھی رادھا کی طرف کھڑی ہوں اور رادھا کنہیا سے سوال جواب شروع ہوں اور نغمہ بجاؤ ہوتا جائے اور ارکان بجور یکہ وں میں داہنی جانب سے دونوں کے پاؤں سے ہر بیت اور ہر دوہرے کے بعد ادا ہونے جائیں۔

(زبانی رادھا المصنفہ) مجمع غیر میں ایسا ستم ایجاد کیا قتالا بھول کے ہم کو نہ کبھی یاد کیا
دوہرا میں برہن سنجوگ سنگ نہ کر لیو ساتھ ناری چھوٹ بید کے پھپھلا ہو گئے ہاتھ

(جواب کنہیا المصنفہ) نام میرا ہے کنہیا میں تجھے جانتا ہوں
رادھا جی جان ہے میں تجھ کو میں پہچانتا ہوں

دوہرا رادھا جی کے انگ پر بندیا او چھپ بیت
مانو پھولیں کینکی بھور باس لیت

(جواب رادھا المصنفہ) میں تیرے عشق میں دیوانی ہوں اے کانا
میں نے جی جان سے تجھ کو تو پہچانا

دوہرا آؤ پیارے موہن پلک ڈھانپ تو ہے لیہوں
نا میں دیکھوں اورن کو اور نا تو ہے دیکھن دیوؤں

چنانچہ یہ سوال جواب اسی طرح ہونے رہتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے بعد کنہیا حاضرین اور ناظرین سب کو زرچا کری تقسیم کرے اور سب ہاتھوں میں لیں اور آنکھوں سے لگائیں اور چومیں۔ اس کے بعد رادھا کا گانا شروع ہوتا ہے۔

زبانی رادھا ندی کنارے دھواں اٹھے ہے میں جانوں کچھ ہوئے
جا کے کارن جوگ کمایا وہو نہ جوتا ہوئے

کنہیا مونہہ مہتاب دا گلابی چشماں دے ہاتھ وچ سونٹراں دی ہتھکڑیاں
دل بھی دیکھا پردیس بھی جاندا راہ دی ڈکھیڑ کھڑیاں

لہ ص ۹۱

کنہیا کے سوال جواب کے درمیان رادھا کہتی ہے۔

راجن کے راج ادھراج مہاراج جگ جگ جیو آنند رہو وہ مرلی؟ جاہیں چھ راگ چھتیس راگنیاں جات
نہیں وہ مرلی کہاں پر چھوڑ آئے دی بجاؤ۔

کنہیا جی اس سوال پہ عذر کرتے ہیں کہ وہ مرلی کھو گئی۔ رادھا کہتی ہے میں تمھیں خوب جانتی ہوں وہ مرلی تم تو کبری کو دے آئے۔ یہ کہہ کر رادھا روٹھ جاتی ہے۔ کنہیا منانے کی کوشش کرتے ہیں۔ رادھا راضی نہیں ہوتی۔ کنہیا جی اپنے ملازم رام چیرا کو بلاتے ہیں اور پھر رادھا کو منانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ راضی نہیں ہوتی تو ایک ایک کر کے سکھیوں کو بیچ میں ڈالتے ہیں لیکن مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس وقت رام چیرا عرض کرتا ہے کہ مہاراج! رادھا کو دانا سے مانگو اور تپسیا کرو شاید مل جائیں۔ اس وقت کنہیا جی آسن مار کر داہنے ہاتھ سے ناک پکڑ کر سانس روکیں فوراً رادھا جی اٹھ کر گلے سے چمٹ جائیں۔ پھر سکھیاں لڈو پوجا کریں، لڈو پوجا سوال جواب اور ناچ گانا ہوتا رہتا ہے۔ رادھا کہتی ہے مہاراج! میں جب ہی خوش ہوں گی جب مرلی ڈھونڈ کر لاؤ گے۔ اور کنہیا مرلی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ ہر ایک سے پوچھتے ہیں ہمری مرلی کسی نے دیکھی ہے۔ ہمری مرلی کسی نے دیکھی ہے۔ رام چیرا مذاقیہ کردار بن کر سامنے آتا ہے اور کہتا ہے ہمری مرلی کسی نے دیکھی ہے۔ اس کے بعد کنہیا جی ایک کنوئیں پر پہنچتے ہیں جہاں چار پنہاریاں پانی بھرتی ہیں۔ کنہیا ان سے سوال کرتے ہیں اور وہ کہتی ہیں ہاں ہم نے دیکھی ہے۔ ماکھن لا دو تو ہم دیں۔ پنہاریں کنوئیں پر واجد علی شاہ کی تصنیف ٹھمری گاتی رہتی ہیں اور کنہیا جی ماکھن کی تلاش میں جاتے ہیں اور ماکھن چرا کر لاتے ہیں۔ پنہاریوں کو دیتے ہیں اور مرلی واپس لے کر بجاتے آتے ہیں۔ رادھا مرلی کی آواز سن کر دوڑ کر کنہیا کے گلے سے چمٹ جاتی ہے اور بہ دل راضی ہو جاتی ہے۔ رادھا اس وقت سازندوں کے بیچ میں جا کر یہ ٹھمری گاتی ہے اور خوب دل سے ارتھ بھاؤ نکھ پالس سمیت ادا کرتی ہے۔

استائی : بجن لاگی سیام کی بانسری رے
انترا : ندیا کنارے اکھتر بانسری بجاوت نکس جات جیا سے سانس رے

یہاں پہنچ کر قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ خاتمہ پر واجد علی شاہ لکھتے ہیں[1] :-

> "قصہ ختم ہوا۔ اگر شب بیداری منظور ہو تو ہر ہر سکھی علیحدہ علیحدہ ناچ اور گا گا کر رات کاٹ سکتی ہے مگر یہ قصے اور رہس وقت شب مرغوب اور بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ دن کو نہیں اچھے لگتے اس واسطے جب اس قصے اور رہسوں کی کیفیت دیکھیں وقت آراستہ کریں۔"

اس رہس میں واجد علی شاہ نے صرف رقص اور موسیقی سے متعلق ہدایات دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ پوشاک اور لوازمات کی بھی صراحت کر دی ہے۔ تفصیل پوشاک کنہیا جی کی: گھنٹہ معہ جانگیہ۔ گھانگرہ۔ گلوبند کارچوبی۔ پٹکہ کارچوبی چار عدد ہوئے۔

تفصیل پوشاک اور زیور رادھا جی کی:- نتھ۔ بینہ۔ تمام ہندوانی زیور۔ پھریہ۔ لہنگا۔ پیشواز۔ بندی یعنی سراسری۔ نقرہ بانسری

---

[1] ص۱۰۶

معہ مرلی آٹھ عدد ہوئے۔

اسی طرح سکھیوں اور پریوں کی پوشاک کی تفصیل ہے۔ دیو کی پوشاک دیکھیے:-

" جاکٹ سیاہ۔ پتلون سیاہ۔ دستانہ سیاہ۔ موزہ یعنی جراب سیاہ۔ چہرہ مقوی کریہہ منظر۔ گرز چوبی سیاہ۔ پر کلاں کاغذی سات عدد ہوئے۔ اسی طرح جوگن کی آلات و پوشاک مالکن والیوں کی۔ زیور اور پوشاک پنہاریوں کی۔ پوشاک مسافر کی۔ پوشاک غربت کی۔ پوشاک رام چیرا اور رہس والیوں کی الگ الگ تفصیل بیان کی ہے۔

اسی انداز کا رادھا اور کنہیا کا ایک دوسرا رہس بھی واجد علی شاہ نے لکھا ہے اس میں رادھا کنہیا۔ چاروں سکھیاں اور کم از کم بارہ رہس والیاں شریک ہوتی ہیں۔ دونوں قصوں کے غلاف پر لکھتے ہیں[1]:-

" نوشتہ بماند سیاہ بر سفید   نویسندہ را نیست فردا امید

المنتہ اللہ کہ تا ۱۲۹۲ھ مقام کلکتہ محلہ مٹیا برج میں یہ دونوں قصے الگ الگ معہ چھبیس رہسوں کے تیار اور مرتب ہیں البتہ مقدمات حلی اور زیور میں راقم سے اس قدر مہیا نہیں ہو سکا جو تکمیل کرتا۔ زمان سلطنت اور استقلال میں سب کچھ خدا نے عطا کیا تھا اور اب بھی اسی کی ذات سے امید ہے "

رہس میں جن لوگوں نے کام کیا ہے اور جو مختلف کردار انھوں نے ادا کیے ہیں اور جو ان کی تنخواہیں مقرر تھیں ان سب کی تفصیل ایک الگ باب میں بیان کی گئی ہے جس کا عنوان خطاب محلات، و بیگمات اور خطابات شہزادگان و ارباب عالم پسند وغیرہ ہے[2]۔

" فصل پہلا جو سب سے پہلے تیار کیں رادھا منزل والیاں یہ اٹھارہ اسم ہیں:- نواب ۱ صغیر محل صاحبہ والدہ اختری جاہ مرزا محمد ہاشم بہادر۔ دوسری ۲ نواب تیز دار صاحبہ بیگم افسر محل موصوفہ۔ موصوفہ معہ شہزادہ ایک سو تراسی روپے مہینے کے تنخواہ دار اور باقی سترہ اسموں کے فی اسم ایک سو تین روپے مقرر ہیں۔ مجموع ایک ہزار نو سو چوالیس روپے کے ماہواری رادھا منزل کی رہس والیوں کو دیتا ہے۔ تیسری ۳ نواب منجھلی بیگم صاحبہ عاشقہ راقم۔ چوتھی ۴ نواب عباسی بیگم صاحبہ کنہیا۔ پانچویں ۵ نواب نامدار بیگم صاحبہ رادھا۔ چھٹی ۶ نواب جانانہ بیگم صاحبہ ارغوان پری۔ ساتویں ۷ نواب ستارہ بخت بیگم صاحبہ زعفران پری۔ آٹھویں ۸ نواب سلطان بیگم صاحبہ صحرا یعنی جوگن۔ نویں ۹ نواب سنجھلی بیگم صاحبہ للتا سکھی۔ دسویں ۱۰ نواب ننھی بیگم صاحبہ ساکتہ سکھی۔ گیارھویں ۱۱ نواب عروسانہ بیگم صاحبہ چین سکھی۔ بارھویں ۱۲ نواب جاناں بیگم صاحبہ لڑ دا سکھی۔ تیرھویں ۱۳ نواب حجاب بیگم صاحبہ۔ چودھویں ۱۴ نواب ریحان بیگم صاحبہ۔ پندرھویں ۱۵ نواب وزیر بیگم صاحبہ۔ سولھویں ۱۶ نواب جناب بیگم صاحبہ۔ سترھویں ۱۷ نواب خوش قدر بیگم صاحبہ۔ اٹھارھویں ۱۸ نواب نور بانی صاحبہ۔ غلام حسین خاں مغنی شریک بندہ اور قائم خاں رقاص شاگرد بندہ اس جلسے کے معلم ہیں اور یہ اٹھارہ اسم راقم کی ممنوعات ہیں۔ سرکار راقم سے رہس کے وقت بھاری پیشوازیں مسالہ دار معہ دوپٹہ بر زر اور گھنٹہ تحفہ فی اسم علیحدہ ملا کرتے ہیں اور بعد رقص میرے توشک خانہ میں احتیاط سے صندوقوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں اور رادھا، کنہیا، پریوں، صحرا، عفریت، مسافر، رام چیرا، ان سب کا بھی اسباب معہ

---

[1] ص ۱۲۳   [2] ص ۳۰۵

پنہاریوں اور مالکن والیوں کے میری صرف عائد اور بیت کے حسابات میں شمول ہیں۔ ان کی تنخواہوں سے کچھ علاقہ نہیں۔ اس رہس کو ماشاء اللہ تیرھواں چودھواں برس شروع ہے۔ فنِ موسیقی میں طاق شہرۂ آفاق ہیں۔"

اس بیان سے رادھا کنہیا کے رہس کی ابتدا کی تاریخ ۱۴ - ۱۲۷۸ - ۱۲۹۲ قرار پائی ہے اور اس طرح امانت کی اندر سبھا یقیناً اس سے پہلے کی تصنیف قرار پائی ہے۔ ناٹک ساگر کے مصنفین اندر سبھا کی تاریخ $\frac{۱۲۷۰}{۱۸۳۵}$ بتاتے ہیں اور اس کے ثبوت میں یہ شعر پیش کرتے ہیں :-

ز روئے وجد بول اٹھے پریزاد　　جہاں میں دھوم ہے اندر سبھا کی

اس سے وجد کے دو یعنی "د" کے تعمیہ سے ۱۲۷۰ برآمد ہوتے ہیں لیکن ان کے دیوان موسومہ خزائن الفصاحت میں جسے ان کے صاحبزادے نے مرتب کیا ہے۔ یہ عبارت موجود ہے :-

> "بعد اس کے احباب نے فرمائش کی کہ قصۂ راجہ اندر اس طرح نظم کیجیے کہ جس میں غزلیں اور مثنوی اور نثر اور ٹھمریاں اور ہولیاں اور بسنت اور ساون اور دادرے اور چھند ہوں تاکہ اس زبان میں بھی طبیعت کی جودت اور ذہن کی رسائی دیکھیں بسبب اصرار ہر دوست دبارچار و ناچار ۱۲۶۵ میں یہ قصہ تصنیف کیا اور اندر سبھا اس کا نام رکھا۔"

اگر ۱۲۶۵ سنِ تصنیف ہے تو بہتر تاریخی مصرعہ سنِ اشاعت طباعت ہو سکتا ہے۔

واجد علی شاہ کی اس عبارت سے اس قضیہ کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے رہس میں کوئی پارٹ ادا نہیں کیا بلکہ رادھا منزل والیوں میں سے نواب عباسی بیگم صاحبہ کنہیا کا کردار ادا کرتی تھیں۔ یہ عبارت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ مردوں کا پارٹ بھی ایک عورت کو ادا کرنے کے لیے دیا جاتا۔ کیونکہ رہس میں عام طور پر تمام کردار مرد ہی ادا کرتے تھے اور یہ روش ایک عرصہ تک قائم رہی۔ خود واجد علی شاہ نے رقاص کا نام قائم خان لکھا ہے۔ تیسرے اس تمام تفصیل میں ایک موقع بھی ایسا نہیں آتا جہاں بعض حضرات کا بیان کردہ فرانسیسی اثر ظاہر ہوتا ہو۔ آگے چل کر ممکن کیا یقینی طور پر ڈرامے کے مغربی تصورات نے اردو ڈرامے پر اثر ڈالا لیکن اس ابتدائی دور میں یقیناً اس طرح کا کوئی اثر نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کو رہس سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور رادھا منزل والیوں کے علاوہ انھوں نے رہس کے اور بھی جلسے ترتیب دئے۔ ان سب کی تفصیل موجود ہے۔

(۱) سارده منزل والیاں۔ پندرہ اسم۔ ۱۲۸۵ھ میں قائم ہوا۔ پیر خان مغنی شاگرد واجد علی شاہ اور قلندر بخش رقاص شاگرد واجد علی شاہ جلسہ کے معلم تھے۔ پندرہ رہس والیاں واجد علی شاہ کی ممنوعات تھیں اور ان سب کو ملا کر آٹھ سو انسٹھ روپے آٹھ آنے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

(۲) بڑا جلسہ سلطان خانے والیاں۔ چوبیس اسم۔ ۱۲۸۴ھ میں قائم ہوا۔ ان کی تعلیم میں پہلے علی بخش خان مغنی شاگرد واجد علی شاہ اور ان کے بعد تاج خان مغنی اور قلندر بخش رقاص اور نثار علی خان پکھاوجی اور نعیش الدولہ بہادر عیش شاعر اور خلاصۃ الدولہ بہادر منشی جملہ

شاگردانِ واجد علی شاہ نے حصّہ لیا۔ اس رہس کے سلسلے میں واجد علی شاہ اپنے کمالِ فن کے بارے میں لکھتے ہیں[1]۔

> "گستاخانہ ادنیٰ عرض خدمت ناظرین اور شائقین اور طالبین اور مشتاقان اور
> استادانِ فن تال اودھیہ میں ہے کہ ایک دھیمے تالہ میں تین برس کے عرصے میں
> باون طرح کی لَے نثار علی خاں پکھاوجی کو معہ صاحبات جلسہ بتائی اور سب نے
> باعانتِ راقم اور شاگردانِ راقم یاد کیں مگر فرقہ نسواں ایسا کج فہم اور ناقص العقول
> ہے کہ سوائے خود آرائی اور خود پرستی گویا کوئی کام دنیا کا پروردگار نے ان کے
> متعلق نہیں کیا۔ چوبیس اسموں میں تین چار اسم تو ان لکھوں پر قادر اور قائم ہوتے
> مابقی سوائے لَے لَے کے لَے جو چاہیے وہ نہیں جانتیں ——"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ واجد علی شاہ رہس میں بھی بڑا ریاض کرتے تھے اور اس کا مقصد محض تفریح، یا اندرسبھا کی طرح کسی فرمائش کو پورا کرنا یا محض نثر و نظم اور مختلف راگوں کو جمع کر دینا نہ تھا۔

حسبِ دستور یہ چوبیس سلطان خانے والیاں بھی واجد علی شاہ کی ممنوعات تھیں اور ان سب کو ملا کر دو ہزار دو سو چونتیس روپے آٹھ آنے ماہوار ملتے تھے۔

(۳) حضور والیاں یا خاص منزل والیاں۔ گیارہ اسم۔ عنایت خاں مغنی خواجہ بخش طبلہ اور حیدر علی رقاص شاگردانِ واجد علی شاہ معلّم تھے۔ ان کو چار سو پینسٹھ روپے ماہوار ملتے تھے۔

(۴) سرود منزل والیاں۔ یہ بقول واجد علی شاہ "صاحبات سن رسیدہ بھی ہیں" سولہ اسم۔ فی اسم بیس روپیہ کی تنخواہ کل تین سو بیس روپے ماہوار۔ غرض اس طرح کے بائیس جلسوں کی پوری تفصیل ملتی ہے۔ خاتمہ پر واجد علی شاہ لکھتے ہیں[2]:

> "جاننا چاہیے کہ زیرِ تعلیم راقم تاتحریر پینتالیس اسم ہیں اور سب جلسہ ملا کر دو سو
> سولہ اسم گانے ناچنے والے اللھم زد۔ ماشاء اللہ چشم بد دور تاتحریر کتاب ہٰذا راقم
> کے پاس ہر وقت و ہر ساعت و ہر لمحہ موجود ہیں مگر ملاقات اور صحبت اور حکایات
> ہر روز انھیں سے ہوتی ہے جو پینتالیس اسم زیرِ تعلیم حضور ہیں۔ جملہ آٹھ ہزار پانچ
> سو اٹھانوے روپے مشاہرہ ہوئے۔"

اس حساب سے مختلف رہسوں پر ملا کر سالانہ خرچ ایک لاکھ تین ہزار ایک سو چھہتر روپے تک جا پہنچتا ہے اور اس میں صرف مختلف اسموں کی تنخواہ شامل ہے۔

پوشاک، زیورات، انعام و اکرام مغنی، پکھاوجی اور رقاصوں کی تنخواہ اس میں شامل نہیں۔ اگر اسے بھی ملا لیں تو صرف رہس سے متعلق واجد علی شاہ کا خرچ کم و بیش ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ تک جا پہنچتا ہے۔ اور یہ عالم اس وقت ہے جب واجد علی شاہ

---

[1] ص ۳۱۲

[2] ص

معزول ہو کر مٹیا برج میں مقیم ہیں اور ایک مختصر سی پنشن پر گذر کر رہے ہیں جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ ان جلسوں کی تیاری جیسی کہ قیامِ سلطنت لکھنؤ میں تھی مٹیا برج میں نہ ہو سکی۔ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لکھنؤ میں واجد علی شاہ اس مد میں کتنا خرچ کرتے ہوں گے۔

رہس والیوں کے علاوہ پندرہ مغنی۔ ایک گھنٹی والا۔ دو پکھاوجی تئیس طبلہ نواز چھیالیس سارنگی نواز۔ بائیس منجیرہ نواز۔ ایک نے نواز۔ چھ رقاص۔ ایک شعبدہ باز۔ دو ڈھولک نواز۔ ایک سُر سنگھار نواز اور انیس نفر نقار خانے اور چھ سرورِ محفل ملازم تھے جن کی تنخواہ تین ہزار دو سو اکسٹھ روپے ماہانہ یا انتالیس ہزار ایک سو بتیس روپے سالانہ مقرر تھی۔ سرورِ محفل ڈومنیوں کا خطاب تھا اور ان کے مرد بہارِ محفل کہلاتے تھے۔

واجد علی شاہ کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ ناچنے اور گانے والی عورتوں اور ان کے متعلقین جو ہر وقت بادشاہ کو گھیرے رہتے تھے، نے انھیں خراب کیا اور ان کی صحبت میں امورِ سلطنت کی طرف سے بے تعلق ہو کر پست افعال اور پست اقوال کی طرف مائل ہو گئے۔ کسی قدر یہ بات درست ہے لیکن رہس کے سلسلہ میں واجد علی شاہ کا ایک بیان ایسا ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈوم ڈھاڑیوں کے مزاج، عادات اور اطوار کو ناپسند کرتے تھے۔ خاص جلسے والیوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں[1]:-

> ”تیسرا سال منقضی ہوتا ہے کہ نحیف خود ان کی تعلیم دہی میں بدل و جان مصروف رہتا ہے۔ اب ماشاء اللہ نے سُر میں بخوبی واقفیت ہوتی جاتی ہے۔ نچانا، گوانا، ارتھ بھاؤ بتانا، ٹکڑے پاؤں سے لوانا، گتیں بجوانا سب مجھ سے متعلق ہے۔ کسی سازندے، نوازندے، مغنی، رقاص کو ذرہ دخل نہیں۔ بلکہ ان کے ہمراہ سوائے راقم اور کوئی نہیں ہوتا۔ جو کبھی ایسا ہی دل چاہا تو سازندوں کو ہمراہ بجوالیا۔ دوسرے تیسرے مہینے کے بعد چٹکیوں پر دھرپد، چترنگ، ترووٹ، ترانہ، دھمال، روپک، تیورا، چوتالہ، دھیمہ تتالہ، کبیر کبی، ہچپ برہ، بھمی، سولفاختہ، چھپ تالہ، چاچر، غزل، ادھیہ، خیال، ٹھمری کا تیاں سن۔ جو اہر مجھے کے چھوٹے ٹکڑ چھ پاؤں سے نکالتیاں ہیں۔ وہ تین سو چیزیں سب طرح کی آج تک بتا چکا ہوں اور بتائے چلا جا رہا ہوں۔

نقلیں بھی مضحک کرتیاں ہیں۔ سمجھدار ہو گیاں ہیں۔ صورت اس کی یہ ہوئی تو جلسے مرتب کئے یہ ادھا منزل والیوں اور سلطان خانے والیوں پر ایسی ایسی محفلیں کیں کہ صبح کا کھانا شام کو شام کا صبح کو نصیب ہوا مگر آخر کار ان صاحبوں نے بسبب تاثیر صحبت شبانہ روزی ڈوم ڈھاڑیوں کا سا مزاج پیدا کیا۔ مجھ اکیلے کا اثر نہ ہوا۔ تعلیم دہی میں بھی تفرقہ پڑا۔ علم کی طرف توجہ بالکل نہ کی مزے کی طرف رجوع ہوئیں۔ یہ حالات دیکھ کر راقم الحروف نہایت کبیدہ خاطر اور پریشان رہتا تھا کہ یا خدا کیا تدبیر کروں۔ بغیر سازندوں کے ایک کلمہ زبان سے نہ نکالتیاں تھیں۔ ایک دن شاہ زمانی نے مجھے رنجیدہ خاطر دیکھ کر کہا۔ صاحب تم کیوں شبانہ روز چپ رہا کرتے ہو۔ میں نے قصہ گذشتہ نقل کیا۔ انھوں نے صلاح دی

---

[1] صـ

> "تم خود کیا کم ہو جو اوروں کو تعلیم دینے میں شریک کرتے ہو۔ میں نے جواب دیا سب جلسوں کی عادتیں خراب ہو گئیں وہ اب میرے زیرِ تعلیم نہیں آ سکتیاں ہیں۔ انھوں نے ہنس کر جواب دیا ایک در بند کروڑ کھلے ہیں۔ گو زباں چھو کر ہاں بلواتی ہوں، کچی لکڑی کی طرح جدھر توڑو مروڑو گے بلا تکلف ٹوٹیں گی اور نواب بارگاہ محل صاحبہ اور اہلکار رنماقن داروغہ اشتغال السلطان اور نواب شہزادہ محل صاحبہ یہ سب بھی ایسے ہی کلمات زبان پر لائے، میں بھی راضی ہو گیا۔ الحق یہ صلاح یہاں تک مفید ہوئی کہ میں نے اب عہدِ واثق کیا کہ مدت العمر کسی ڈوم ڈھاڑی، میراثی، کلاونت، گویّے، دھرپدیے، خیالیے، رقاص پکھاوجی کے حوالے ایک اسم بھی نہ کروں گا۔"

اس تحریر میں واجد علی شاہ نے علم اور رہس کو الگ الگ سمجھا ہے اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم اور فن کے حصول اور اسی جذبے کی تسکین کے لئے یہ سب کچھ کرتے تھے یہ اور بات ہے کہ ایک والیٔ سلطنت کو ان فنون سے اس درجہ وابستگی پیدا کرنا مناسب بھی ہے یا نہیں لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جب واجد علی شاہ صحیح یا غلط اس طرف مائل ہوئے تو انھوں نے فنکاری کا حق ادا کر دیا۔

آخر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کے ان رہسوں اور جلسوں کا اردو ڈرامے کی تاریخ میں کیا درجہ ہے جنھیں ایجادی رہس جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے قصہ پن سے عاری ہیں۔ ان میں اداکاری نہیں، مکالمے نہیں، مناظر نہیں، پھر انھیں ڈرامے کی تعریف میں کیسے شامل کیا جائے۔ ان رہسوں پر یہ اعتراض درست ہے۔ دراصل یہ صرف موسیقی اور رقص کا امتزاج ہیں بلکہ ان میں موسیقی کم اور مختلف اعضا کی حرکات و سکنات زیادہ ہیں لیکن انھی رہسوں پر رادھا کنھیا رہس کی بنیاد ہے۔ رقص اور موسیقی ان رہسوں میں بھی نمایاں عناصر ہیں لیکن ان میں ایک قصہ پن بھی ہے، مکالمے بھی ہیں، مناظر بھی ہیں، مختلف کردار بھی ہیں جن میں مسخرے کا کردار بھی ہے۔ کنھیا رہس میں مناظر بار بار بدلتے ہیں مثلاً:-

(۱) (پہلا منظر) زعفران پری۔ ارغوان پری کا جلسہ۔ دیو سامنے کھڑا ہے۔ غربت جوگن کے سامنے دست بستہ استادہ ہے۔
(۲) (دوسرا منظر) رادھا، کنھیا، رام چیرا ملازم، چار سکھیاں۔
(۳) (تیسرا منظر) جوگن کا خادم غربت، مسافر کی صورت۔
(۴) (چوتھا منظر) غربت اور عفریت کی ملاقات۔
(۵) (پانچواں منظر) رادھا کنھیا کا رقص۔
(۶) (چھٹا منظر) کنھیا کا مرلی کی تلاش میں روانہ ہونا۔ پنہاریوں سے ملاقات۔
(۷) (ساتواں منظر) مکھن والیوں کی تلاش۔ ملاقات، مکھن چرا کر لانے کا منظر۔
(۸) (آٹھواں منظر) کنھیا مرلی بجاتے ہیں اور رادھا آ کر ان سے لپٹ جاتی ہے۔

ان تفصیلات میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ مناظر کس طرح بدلے جاتے ہیں۔ پردوں کا استعمال غالباً نہیں ہوتا تھا ورنہ کہیں نہ کہیں ان کا

ذکر ضرور ہوتا۔ اسٹیج کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی کیا شکل تھی۔ رادھا کنہیا رہس یا رام لیلا رہس جو ہندو تہواروں کے موقعوں پر ترتیب دیتے تھے عام طور پر کھلے میدانوں میں ادا ہوتے تھے اور سارے کردار مرد ادا کرتے تھے۔ واجد علی شاہ کے رہس ان کے محلات میں ہوتے تھے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کسی کشادہ جگہ پر سارے کردار الگ الگ بٹھا دئیے جاتے تھے اور تمام مناظر سلسلہ وار ادا ہو جاتے تھے۔ دیکھنے والوں کی اصل دلچسپی گانوں اور رقص تک محدود ہوتی تھی لیکن واجد علی شاہ کے رہس میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں۔ مکالمے نثر میں ہیں۔ دیو پریاں موجود ہیں لیکن بنیادی کردار رادھا۔ کنہیا، سکھیاں، ملازم، پنہاریں، گھمن والیاں وغیرہ ہیں۔ ان کی اداکاری فطری، سادہ اور دلچسپ ہے۔

جس زمانے میں واجد علی شاہ اپنے رہس تیار کر رہے تھے قریب قریب اسی عہد میں امانت نے اندر سبھا ترتیب دی۔ واجد علی شاہ کے رہس ان کے محلات تک محدود رہتے۔ امانت نے اندر سبھا عوام کی فرمائش پر عوام کے لئے لکھی۔ قدرتی طور پر اس میں فنی لوازمات پر اس قدر محنت نہیں کی گئی جس قدر واجد علی شاہ اپنے رہسوں پر کیا کرتے تھے۔ اس میں گانے زیادہ ہیں اور ان میں تک بندی معلوم ہوتی ہے لیکن عوام کے لئے یہ ایک نیا اور دلچسپ مشغلہ تھا۔ چنانچہ اس قدر مقبول ہوا کہ امانت کی طرح مداری لال نے اور پھر ان کو دیکھ کر اور لوگوں نے اندر سبھائیں اور دوسری سبھائیں لکھیں۔ یہ سب ڈرامے کے جدید فن پر پوری نہیں اترتیں لیکن اُردو ڈرامے کی پیشرو یقیناً یہی رہس اور سبھائیں ہیں۔

رہس کے گانے:۔

کنہیا رادھا کے رہسوں میں بکثرت گانے ہیں جن سے واجد علی شاہ کی فنکاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ سوال و جواب کے جو گانوں میں ہیں، ضمنی گانے بھی اکثر ہیں۔ ان میں دوہرے، دادرے، ٹھمریاں اور ہولیاں شامل ہیں۔ یہ سب گانے عام بلکہ عوام پسند ہیں۔ ان میں پکے گانے نہیں ہیں اور نہ غزلیں ہیں۔ پکے گانے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شاید ان کی فنی دقت اور جانکاہی رہس کے عوامی انداز کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اور غزل اس لئے نہیں کہ غزل کی فنی عظمت ایسی تھی کہ واجد علی شاہ اسے ناچ گانے میں استعمال کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بہر حال وجوہات کچھ ہوں اس قسم کے گانے ان رہسوں میں نہیں ہیں۔

رہسوں کے بعد کتاب کا پانچواں[1] باب شروع ہوتا ہے جو بھنڈیتوں اور مضحک نقلوں کے بارے میں ہے۔ واجد علی شاہ آغاز میں لکھتے ہیں:۔

> "جاننا چاہیئے کہ موجد بھنڈیتی اور جملہ حکایات اور لطائف اور نقلوں کے امیر خسرو دہلوی ہیں"

اس کے بعد مختلف علوم و فنون بالخصوص موسیقی میں امیر خسرو کے فنی کمالات کا ذکر تقریباً تین صفحوں میں کیا ہے اور اس سلسلہ میں امیر خسرو کی ایجادات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہمیں واجد علی شاہ کے اس بیان سے اختلاف ہے۔ امیر خسرو کی طبیعت ان کے مزاج کی افتاد، شعر و ادب میں ان کے رجحانات اور میلانات، حضرت نظام الدین اولیاؔ سے ان کا عشق، درباروں میں ان کی عزت اور مرتبے کے پیشِ نظر یہ بات قبول کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ امیر خسرو کبھی بھنڈیتی اور نقالی پر بھی اُتر سکتے ہیں۔

---

[1] ص ۱۲۴

اسی طرح واجد علی شاہ کا یہ قول بھی درست نہیں کہ "خالق باری[1] بھی ایک شہزادے کو بہلانے بہلانے موزوں کردیں اور اکثر ان کے سامنے آستین چڑھا کر اور زنار کر اور گال پھلا کر الفاظ ہائے معمولی سے جو بھنڈیتی ہیں بیان کروں گا مسخرا پن کر کے بہلاتے تھے" یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ امیر خسرو خالق باری[2] کے مصنف نہیں ہیں اور یہ کتاب ان کے کئی سو سال بعد تصنیف ہوئی نقالوں اور بھانڈوں کے فرقے سے متعلق ایک عجیب بات واجد علی شاہ کے بیان سے معلوم ہوتی ہے لکھتے ہیں[3]:۔

> "اس فرقہ کو راقم نے بچشم خود دیکھا کہ ایسے پابند صوم و صلوٰۃ ہوتے ہیں کہ سبحان اللہ ہزار روپے کی تھیلی سامنے دھر دو اور فرمائش کرو کہ نماز فوت ہونے دو۔ اگر نقل کئے جاؤ گے تو ہزار روپیہ تمھارا ہے کبھی قبول نہ کریں گے پر نماز وقت پر بجا لائیں گے۔"

اگر یہ درست ہو تو اسے بھی اس وضعداری کا ایک مظہر سمجھنا چاہیئے جو اس عہد کی تہذیب و معاشرت کا ایک اہم اور بنیادی جزو ہے اور یہ کہ ایسا طبقہ بھی جو بظاہر بہت بدنام نظر آتا ہے اخلاقی اعتبار سے بالکل دیوالیہ نہیں ہو چکا تھا۔ لیکن واجد علی شاہ کا یہ بیان بھی کچھ کھٹکتا ہے۔

نقلوں کی یہ فصل خاصی طویل ہے (ص۱۲۴ تا ص۲۹۳) اور تقریباً پونے دو سو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اس میں اکثر نقلیں ایسی ہیں جنھیں مضحک کہنا مشکل ہے۔ ان میں ایسا جوش ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ عام جلسوں میں یہ نقلیں کس طرح ادا کی گئی ہوں گی۔ مثلاً گوبندہ کی نقل جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے[4]:۔

> "ایک بی بی تھیں انھوں نے پتھر کا عضو تناسل آلہ مرد بنوایا تھا......"

ان مضحک حکایتوں اور نقلوں کے پڑھنے سے واقعی عبرت ہوتی ہے اور اخلاقی اعتبار سے ایک دیوالیہ معاشرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اس کے لئے واجد علی شاہ کہاں تک ذمہ دار ہیں۔ قدرتی طور پر بار بار قاری کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں واجد علی شاہ اپنے دور کی پیداوار ہیں۔ ان کے رہسوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رادھا کنہیا کا رہس جو انھوں نے سب سے پہلے تیار کیا ۱۲۷۰ھ سے شروع ہوتا ہے۔ امانت اس سے پہلے ۱۲۶۵ھ میں اندر سبھا لکھتے ہیں اور جیسا کہ امانت کے دیوان کے دیباچے کی عبارت سے ظاہر ہے، دوستوں کے تقاضے اور اصرار سے مجبور ہو کر لکھتے ہیں۔ گویا رہس یا ناچ گانے کا مذاق صرف واجد علی شاہ کی وجہ سے نہیں پھیلا بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ واجد علی شاہ خود اس کا شکار ہو گئے۔ واجد علی شاہ کی فطرت ان میں جا بجا جھلکتی ہے چنانچہ خاص منزل والیوں کے سلسلہ میں انھوں نے علم اور مرسے میں جو تمیز کی ہے اور جس طرح ڈوم ڈھاڑیوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا ہے۔ اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

اس فصل کے خاتمہ پر واجد علی شاہ نے اپنی ایک غزل بھی لکھی ہے گو بظاہر اس غزل کا یہاں کوئی محل معلوم نہیں ہوتا۔ غزل یہ ہے:۔

---

[1] ص۱۲۶ [2] ص ۵ ص پنجاب میں اردو ص [3] ص۱۲۷ [4] ص۱۵۷

نظارۂ رُخِ احمر سے رنگِ لالہ اوڑا   ہما کی طرح سرِ گوشۂ گل سے بالا اوڑا
کماں کی طرح ہوا پُرزے پُرزے دیکھ کے رُخ   مثالِ کبکِ فلک سبز مہ کا ہالا اوڑا
کبھی چمک کے جو نکلا فلک پہ عارضِ مہ   یہی میں سمجھا کہ تیرے مکاں کا جالا اوڑا
بتائیں کیا کہ عدالت ہی میں منشا ان لٹا   وہ گاؤ خورد ہے دفترِ رُخ قبالہ اوڑا
مجھے نہ صبر کیا آ کے ان نگاہوں نے   مری تڑپ سے تو رنگِ رُخِ غزالہ اوڑا
برائے ہیتر سرِ شامِ حُسن محفل میں   ہما کی طرح گلوئے پری سے مالا اوڑا
لکھی تھی اس میں جو تعریف اوجِ یار بلند   فلک پہ بازوؤں سے جلا کے رسالہ اوڑا
جو دیکھے بازی نیزہ تیری آہستہ   کمیت برق کی مانند میرا اُچھالا اوڑا

یہ غزل اپنے انداز اور آہنگ کے اعتبار سے خالص لکھنوی ہے اور تغزل کی کیفیت سے یکسر محروم ہے۔

لطائف کے بعد ایک فصل میں چند پہیلیاں ہیں لکھنؤ کے اکثر شعرا اپنی شاعری کے آخری دَور میں پہیلیوں اور چیستاں گوئی پر اُتر آئے ہیں۔ امانت سے لے کر محسن کاکوروی تک کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ شعرا جو داخلی جذبات اور قلبی کیفیات سے کم تر تعلق رکھتے تھے خارجی مضامین اور خیال آرائی و مضمون آفرینی کو معراجِ کمال سمجھتے تھے۔ خیال آرائی ہی کی ایک انتہائی شکل پہیلی ہوتی ہے اور یہ لوگ غالباً اسی منزل میں جا پہنچے تھے۔

اس کے بعد فصل شروع ہوتی ہے۔ اس میں محلات اور بیگمات کے خطابات ہیں۔ یہ حصہ تاریخِ ادب کے لئے شاید اہم نہ ہو سکتا۔ واجد علی شاہ کی زندگی اور ان کی تاریخ کے سلسلہ میں اسی حصہ میں سب سے اہم معلومات ہیں۔ ان کی بیگمات محلات، ممنوعات کی تعداد، ان کے نام، خطابات اور مراتب کا اندازہ اسی فہرست سے ہوتا ہے۔

محلات کی تعداد ۱۰۴ اور بیگمات ۳۲ ہے اور یہ ملا کر ۹۰ ہوتی ہیں۔ ان میں وہ محلات اور بیگمات شامل نہیں ہیں جو اپنے جلسہ رقص و غنا اور رہس کے سلسلے میں لکھی جا چکی ہیں۔ رہس کے آخر میں ان کی تعداد جو ناچنے گانے میں حصہ لیتی تھیں ۲۱۶ بتائی ہے جن میں سے ۳۴ اسم ایسے ہیں جو براہِ راست واجد علی شاہ کے زیرِ تعلیم تھے۔ ان سب کو ملا کر یہ تعداد ۲۹۴ تک جا پہنچتی ہے۔ ممنوعات میں سے واجد علی شاہ نے صرف چار کے نام لکھے ہیں[1]۔ معل پسند، اطاعت پسند، جمال لپند، اور امیر النساء خانم۔ لیکن ممنوعات کی تعداد یقیناً اس سے زیادہ ہے کیونکہ بقول شرر، واجد علی شاہ ایسے مذہبی آدمی تھے کہ نامحرم عورت کا سامنے آنا گوارا نہ تھا اور محل کی خادمائیں بھی ممنوعات میں شامل کر لی گئی تھیں اور نواب آب رساں اور نواب مصفا بیگم جیسے خطابات سے سرفراز تھیں۔ واجد علی شاہ کی زندگی کا یہ پہلو ایسا ہے جس کی کوئی معذرت پیش نہیں کی جا سکتی۔

اس سلسلہ میں ایک نکتہ نہایت دلچسپ ہے۔ واجد علی شاہ کو خطابات تقسیم کرنے کا غیر معمولی شوق معلوم ہوتا ہے۔ بیگمات محلات اور ممنوعات کے علاوہ شہزادیوں ۳۳، شہزادوں ۲۵، بہوؤں ۵، دامادوں ۲، مرشد زادوں ۱۵ اور مرشد زادیوں کے ۴۷ خطابات اور ہیں اور جو واجد علی شاہ نے لکھے۔ ان کے درباری مصاحب اور حکام جو لفظ دولہ مثلاً ذوالفقار الدولہ، طبیب الدولہ سے ممتاز تھے تعداد میں

---

[1] عہ ۳۲۶

۲۴ ہیں۔ آٹھ داروغگان باغ ان کے علاوہ تھے۔ یہ سب ملا کر ایک خاصی بڑی تعداد ہوتی ہے اور اگر اس میں ان کے دیگر ملازمین و متعلقین کو شامل کر لیں تو حیرت ہوتی ہے کہ واجد علی شاہ کے دم سے کتنے لوگ وابستہ تھے اور زوالِ سلطنت کا اثر کتنے خاندانوں اور افراد پر پڑا ہوگا۔ واجد علی شاہ نے یہ کتاب مٹیا برج میں ۱۲۹۲ھ میں لکھی جب ان کی گزر ایک مختصر سی پنشن پر ہو رہی تھی لیکن یہاں بھی متعلقین کی تعداد کچھ کم نہ تھی اور پھر واجد علی شاہ اپنے ان متعلقین کی بھی خبر گیری کرتے رہتے تھے جو ان کے چلے آنے کے بعد لکھنؤ میں رہ گئے تھے۔ چنانچہ نواب ممتاز محل صاحبہ اور ان کی والدہ کو بڑی پابندی سے روپیہ بھیجتے تھے[1]۔ جب ہم واجد علی شاہ کے عیب شمار کرتے ہیں تو ہمیں کم از کم ان کی سیرت کا یہ روشن پہلو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔

واجد علی شاہ کی طبیعت میں جو ایجاد کا مادہ تھا افسوس کہ اسے اظہار کے لئے صحت مند میدان نہ ملا۔ اس اپچ کا اندازہ خطابات کی فہرست سے ہوتا ہے۔ محلات، بیگمات، سرکاری حکام وغیرہ کو خطاب دینے کا رواج عام رہا ہے لیکن واجد علی شاہ کا یہ شوق شاید جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ جانوروں کے لئے جو خطابات انھوں نے تجویز کئے اور جن کے متعلق وہ دعوے کرتے ہیں[1] ان میں سوائے راقم کے، دوسرے کی فکر کو دخل نہیں بے شمار ہیں۔ ان میں جدت اور تازگی خیال ہے۔ مثلاً :

(۱) بلبل - ۴۶ خطابات - زیورِ گل، آشنائے چمن، عاشقِ گل، گلاب رنگ، خوش نوا، شاہدِ چمن، بلبلِ بیدار وغیرہ۔
(۲) لال - ۱۸ خطابات - دلفگار، سحر بیان، غزل خواں، مطرب، مغنی وغیرہ۔
(۳) کستوری - ۲۲ خطابات - ترانہ سرا، نازپیرا، رخت الحدید، انارکلی وغیرہ۔
(۴) شاما ۴ خطابات
(۵) بدّہ ۱۴ خطابات۔
(۶) ویر ۱۳ خطابات۔
(۷) چنڈول ۱۲ خطابات
(۸) اگن آٹھ خطابات۔ کالی چشم چھ خطابات۔ البقہ دس خطابات۔ ہریل نو خطابات۔ ملاگیر سات خطابات۔ پلک آٹھ خطابات۔

اسی طرح دھولی، طوطی، کلچڑی، بوٹے، مرغ فرنگ، کالنگڑا، ابیٹا، جھنگراج، بھوکنہ، پپیہا، غوغائی، لال سرخ، دراج، لوا، راما، کوئل، کنیری، بیا اور گلدم کے خطابات ہیں۔ جانوران اور اردلی خاص کے خطابات علیحدہ ہیں۔ خطابات نازی خانۂ زبان انگریزی۔ خطابات گاؤ خانہ، کبوتر خانہ، مینڈھا خانہ، مچھلیوں، سنگ پشت تک کو خطابات سے محروم نہیں رکھا ہے۔ ان کے بعد درختوں کے ۳۳۲ خطابات ہیں اور آخر میں کوٹھیوں، محلوں اور کمروں کے خطابات کی ایک طویل فہرست ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ طویل فہرست واجد علی شاہ کی ایک خاص نفسیاتی کیفیت کی ترجمان ہے۔ واجد علی شاہ جو خود کو سلطانِ عالم سمجھتے تھے عملاً ایک بے بس اور نظر بند انسان تھے۔ بادشاہت کا خواب انھوں نے دیکھا تھا لیکن بادشاہت

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ ممتاز ۲ ص ۳۴۵

کے اختیارات انھیں کبھی نصیب نہیں ہوئے۔ وہ شاہنشاہی ٹھاٹ اور رعب و داب پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن [illegible] مسلسل سے محروم تھے۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سیاسی حالات ایسے تھے جو انھیں کچھ نہیں کرنے دیتے تھے۔ وہ جس ماحول میں تھے وہ عملی جدوجہد کا نہ تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک جہاد یا ۱۸۵۷ء کی سیاسی جدوجہد سے نہ کوئی دلچسپی رکھتے تھے اور نہ اس میں حصہ لینے کے اہل تھے۔ قدرتی طور پر ایسا شخص اپنے جذبات، تخیلات، تصورات اور توقعات کی تکمیل کے لیے ایک تخیلی دنیا پیدا کرے گا اور اسی محدود خیالی فضا میں پرواز کرتا رہے گا۔ واجد علی شاہ نے ایسی ہی دنیا تخلیق کی تھی۔ اس میں ایک قسم کے فرار اور بے بسی کی کیفیت یقیناً پائی جاتی ہے اور کہیں ایسی چیزیں نظر نہیں آتیں جن کے بھڑک اٹھنے کا امکان ہوتا۔ عمل اور حقیقت کی دنیا سے بھاگ کر واجد علی شاہ نے راگ اور رقص میں پناہ ڈھونڈی۔ وہ [illegible] اور زر و جواہر نہیں بخش سکتے تھے اس لیے خطابات بانٹ کر ہی انھوں نے اپنے جذبہ کی تسکین کر لی۔ یہ سب [illegible] لیکن واجد علی شاہ اس دھوکے میں ایسے مبتلا رہے کہ آخر تک نجات نہ ملی۔ سلطنت کی ضبطی، فورٹ ولیم میں نظر بندی اور مٹیا برج کا ان کا قیام ایسے واقعات تھے جو ان کی آنکھیں کھول سکتے تھے۔ اس دور میں ان کے کلام میں بعض درد انگیز اشعار ملتے بھی ہیں لیکن کسی سیاسی یا سماجی شعور یا نفسیاتی کیفیت میں کسی تبدیلی کے ترجمان نہیں ہیں۔ واجد علی شاہ کو سلطنت اودھ کی ضبطی کی نسبت زیادہ باغ کے راگ و رنگ کی محفلوں کا غم ہے۔ انھیں ان پریوں اور ممنوعات سے بچھڑنے کا الم ہے۔ [illegible] کہ ہمیں کے لیے اب وہ پہلا سا اہتمام نہیں کر سکتے۔ یہی سب اسباب ہیں جن کی بنا پر واجد علی شاہ کے [illegible] پہلو کی [illegible] نہیں [illegible] یہ حال تنہا واجد علی شاہ کا ہی نہیں ان کے عہد کے دوسرے شعرا [illegible] وہ [illegible] جو کچھ لکھا گیا [illegible] اس کی نظیر نہیں ملتی۔

کتاب میں دو دلچسپ ضمیمے بھی شامل ہیں۔ ایک کا عنوان [illegible] قانون [illegible] ہے جس میں محل کے متعلق [illegible] اور [illegible] کے لیے [illegible] ہدایات [illegible] ہیں۔ انھیں ایک طرح سے واجد علی شاہ کے آداب محلات کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں جس سے واجد علی شاہ کی [illegible] رنگ اور رقص کی [illegible] محلات میں طرح طرح کی عورتوں کے [illegible] اور [illegible] کی عام [illegible] میں تو قدرتی طور پر خیال ہوتا ہے کہ یہ سارا ماحول اخلاقی اعتبار سے کس قدر پست ہوگا۔ لیکن ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] برعکس تھا۔ واجد علی شاہ لکھتے ہیں:

> دفعہ پہلی۔ کسی غیر مرد نامحرم کے منہ پر نظر بھی نہ کیجیے [illegible] مالک [illegible] نیچی۔ دفعہ دوسری۔ غیر مرد نامحرم سے بات کرنے کے وقت اپنی نظر نیچی رکھیں خواہ مالک کے آگے خواہ غیبت میں۔ دفعہ تیسری۔ جو شخص مالک کے روبرو بیٹھتا ہو کسی ضرورت کے وقت اگر ان کے سامنے بھی بیٹھ جاتے تو مضائقہ نہیں سوائے ویسے شخص لائق کے اور کسی نامحرم مرد کو قریب بٹھانے کی اجازت نہیں۔ دفعہ چوتھی۔ کسی غیر نامحرم مرد کو گلوری پان کی دینے کی اجازت نہیں۔ دفعہ پانچویں

کسی نامحرم غیر مرد کو حقہ پلوانے کی اجازت نہیں۔ دفعہ چھٹی۔ کسی غیر مرد نامحرم کا نام نہ لو خواہ پیش مالک خواہ پس مالک بلکہ اس فرقے کے نام سے اسے پکارو یعنی کوئی آدمی ہے یا کوئی کبوتر باز یا جانور باز یا داروغہ یا باغبان یا مکاندار یا ماہی پرور وغیرہ۔ یہ نہ کہو کہ نام تو نواب علی ہے پیار سے کہو نبّو یا فلاں یا بیگ یا خان ادھر آؤ یا میر صاحب یا مرزا صاحب یا شیخ صاحب۔ دفعہ ساتویں۔ کسی نامحرم غیر مرد کے دست بدست کوئی چیز نہ لو بلکہ لانے والا زمین یا اس جگہ پر بآرام و حفاظت دھر دے۔ بعد اس کے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر لینے والے اپنے مصرف میں لائیں۔ دفعہ آٹھویں۔ غیر مرد نامحرم جو رومالوں سے فرش کو صاف کریں نامحرم عورتیں ان کو صفائی کی خود جگہ دے دیا کریں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کا ہاتھ ان کے اجسام سے صفائی کے وقت مس ہو تو باعث ناخوشی مالک و غضب خدا ہو۔ چاہیے کہ ان آٹھوں ہدایتوں کو ہمہ وقت مدنظر رکھیں تا خاوند اور خداوند دونوں خوشنود رہیں اور دنیا کا کار بھی بند نہ رہے۔ اگر تم سب کو پردے ہی بٹھا دیا جائے تو کسی قدر تمہارے خاوند کو البتہ بے چینی ہوگی اور عجب نہیں کہ اس بے چینی کی حجت سے تم لوگ اپنے خاوند کی ملاقات سے محروم ہو جاؤ اور اگر اس ہدایت پر چلو گی تو اپنے خاوند کے پہلو میں رہو گی بلکہ ہر وقت دل میں گھر ہوگا۔ خدا تم عورتوں کا ہادی ہے و بس۔"

اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہدایت نامہ برائے ملازمین ہے جس میں چھ دفعات ہیں۔

دفعہ پہلی۔ اپنے مالک کی عورت پر نظر گاڑ کے نہ دیکھیں بلکہ جو کچھ کہنا ہو نیچی نظروں سے کہیں۔ دفعہ دوسری۔ اگر اپنے مالک کے روبرو بیٹھتے ہو تو کبھی وقت ضرورت اپنی مالکہ کے آگے بھی بیٹھو۔ دفعہ تیسری۔ گلوری اور حقہ نامحرم عورتوں سے نہ مانگو اور بسبب احترام اپنے مالک کے ان کے آگے کبھی نہ کھاؤ۔ دفعہ چوتھی۔ کسی مالک کی عورت کا نام آوے تو نہ لو اور حقارت سے نہ لو۔ دفعہ پانچویں۔ کبھی نامحرم عورت کے دست بدست کوئی چیز دو نہ لو بلکہ کہو کہ رکھ دیجیے میں اٹھا لوں گا۔ دفعہ چھٹی۔ فرش جھاڑو تو خیال رہے کہ ہاتھ ان کے کسی عضو سے مس نہ ہو جانے کہ جو موجب طغیان اور کفر ہو جب ان چھوں چیزوں کو بجا لاؤ گے کبھی دھوکہ نہ کھاؤ گے۔ اگر تمہارا مالک اپنی کل عورتوں کو پردے میں بٹھا دے تو کسی قدر اسے بے چینی بھی ہوگی اور تم زیارت سے محروم رہو گے ـــــ مرقومہ ہیجدہم شہر صفر المظفر ۱۲۹۴ھ

یہ ہدایات ملازمین اور خدمتگاروں کے لیے تھیں۔ محلات اور بیگمات کے لیے بھی آداب مجلسی کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان ہدایات سے اور کچھ ثابت ہو یا نہ ہو واجد علی شاہ کی طبعی نفاست، نزاکت، صفائی پسندی اور ضابطہ پرستی کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ بیس دفعات پر مشتمل ان دلچسپ ہدایات میں سے جو خاص طور پر بیگمات سلطان خانہ مبارکہ جواہر منزل

اور خاص منزل کے لئے تھیں۔ ملاحظہ ہوں:-

دفعہ پہلی۔ ہمیشہ اپنے کو خوشبو رکھیں۔ دفعہ دوسری۔ دھویا ہوا اُجلا کپڑا جو کچھ سرکار سے ملتا ہے یا اپنی لیاقت کے موافق جیسا بنا یا ہو پہنا کریں۔ زنہار زنہار میلی اور دھبے دار اور پھٹی پوشاک خواہ پائجامہ، خواہ دوپٹہ، خواہ چھوٹے کپڑے پہنا کریں۔ ورنہ جن کے سپرد ہیں اور جو ان کے اہتمام والے ہیں ان سے مواخذہ ہوگا اور وہی داروغہ لوگ اس کے جوابدہ ہوں گے۔ پاؤں اور تلوے ہمیشہ آئینے کی طرح صاف اور چمکتے رہیں کسی طرح کا میل اور آخور نہ ہوا کرے۔ بالوں میں خوشبو روغن اور آنکھوں میں کاجل یا سُرمہ، ہاتھوں میں مہندی پہنچوں تک ہمیشہ رہا کرے۔ جو کنواریاں ہیں وہ بغیر حکم از خود مسی نہ ملیں۔ کوئی بالا نہ چھیدنے کا قصد نہ کرے ممانعت قطعی ہے۔ بلانے کے وقت حتی الوسع جلد حاضر ہوا کریں۔ بیباک و بے حجاب حاضر ہوا کریں وغیرہ۔

یہ تمام تفصیلات شاید آج پڑھنے والوں کے دلوں پر بار خاطر گزریں لیکن ان کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کی صلاحیتیں جو سلطنت کے انتظام اور انصرام میں صرف ہو سکتی تھیں ایسی باریک بینی اور موشگافیوں میں صرف ہو رہی تھیں۔ جن کا تعلق صرف ان کی ذات سے تھا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ اپنے سیاسی اقتدار اور ملکی قوت سے اس درجہ محروم ہو چکے تھے کہ انہوں نے اپنے لئے ایک خیالی سلطنت تعمیر کر لی تھی۔ یہ سلطنت ان کے محلات تک محدود تھی جہاں ان کا ہی حکم چلتا تھا اور جہاں کا ذرہ ذرہ ان کے چشم و ابرو کے اشارے پر رقص کرتا تھا پھر ان تمام تفصیلات سے محلوں کی زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ مشرقی تمدن کے آخری نمونے کے جن مٹتے ہوئے نقوش میں شرر نے رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے وہ نقوش یہاں بغیر کسی تنقید کے اپنی پوری آب و تاب سے نظر آتے ہیں۔ واجد علی شاہ کا مورخ اور اس عہد کا داستان نگار اس باب کو مشکل سے نظر انداز کر سکتا ہے۔

اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ واجد علی شاہ کی تمام تصانیف میں ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت سے یہ کتاب نہایت اہم ہے۔ اس میں ذاتی تفصیلات اور معلومات جس طرح فراہم کی گئی ہیں وہ قطعی اور یقینی ہیں اور کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ واجد علی شاہ کی شاعری ممکن ہے بعض لوگوں کو صرف لفظی یا رسمی معلوم ہو، ممکن ہے بعض دوسروں کے نزدیک بڑی گھٹیا قسم کی ہو۔ لیکن جو لوگ ہندوستان کے مسلمان فنکاروں بالخصوص موسیقی اور رقص کے ماہرین کے کارناموں سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس کتاب کی درایت کو بڑا وزن دیں گے۔ اس کا انداز بیان صاف، سادہ اور دلکش ہے۔ اس میں لکھنوی تہذیب اور شاعری کا ضرب المثل تکلف یا تصنع بالکل نہیں پایا جاتا۔ نہ اس میں بات سے بات پیدا کی گئی ہے۔ نہ محض خیال آفرینی یا تخیل کی بلند پروازی ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی یہ کچھ کم اہم نہیں۔ اردو میں فنونِ لطیفہ پر کتابیں کم ہیں اور واجد علی شاہ کے زمانے تک تو یہ کمی اور بھی نمایاں تھی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا دلّی کا آخری یادگار مشاعرہ اب ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ واجد علی شاہ نے بھی اسی انداز کی ایک تمثیل مشاعرے کی نقل کے عنوان سے لکھی ہے جس میں ایرانی، ہندی، فارسی اور اردو شعرا کو شامل کیا ہے ان کی تعداد ۵۲ ہے۔ پہلا نام میاں ناسخ کا اور آخری نام جرأت کا ہے۔

بہادر شاہ ظفر ترتیب میں انتخاب میں جلوہ گر نظر آتے ہیں اور ان کے برابر واجد علی شاہ ہیں۔ خواتین میں زیب النسا مخفی، حضرت محل، صدر آرا اور ملکہ مخدرۂ عظمیٰ عالم آرا بیگم عالم شامل ہیں۔ ترتیب نہ تاریخی ہے نہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے اور نہ ہی شعرا کے مراتب کے اعتبار سے۔ اردو شعرا میں آتش، انشا، اشرف، امیر، بیدل، مہر، سودا، رند، میر وغیرہ بھی شامل ہیں۔ شعرا کا تعارف بھی بس ایک جملہ سے ہوتا ہے۔ یہ کون ہیں یہ میاں ناسخ ہیں۔ یہ کون ہیں یہ آتش ہیں۔ جرأت کا تعارف البتہ عجیب انداز میں ہے اور اس سے اس عہد کی عام پست مذاقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ واجد علی شاہ با آخر والیٔ ریاست تھے اور زوالِ سلطنت کے بعد اس امید پر قائم تھے کہ ایک نہ ایک دن سلطنت بحال ہو گی۔ شدید قسم کے مذہبی آدمی تھے۔ باب مذہب کے بارے میں کس قدر شدید تھے اس کی تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔ ان کی مذہبیت کا بھی کچھ اثر ہوا ہوگا لیکن افتادِ طبع اور ماحول کا اثر غالب آیا۔ جرأت کا تعارف اس طرح ہوتا ہے:

"اندھے جرأت کا یہ قول ہے کہ جرأت کو اب پیدا ہوتے ہیں۔ ہاتھ کو آنکھیں پر رکھ کر اٹھ چلتے اور دوسرے آدمی کا کاندھا کے پیچھے سے بہ مشکل کہتے کہ لے باوا! سامنے والا کہے کہ بیٹھا لیا ہے؟ وہ جواب دے کہ باوا میں بیٹھا نہ، سامنے والا کہے کہ بیٹھا جو آنے جو تو اٹھ آ۔ بس وہ فوراً اس کلمے کے ساتھ ٹٹولنا کے پیچھے سے نکلے۔ پھر جرأت کا اعلان اپنی آنکھیں اندھوں کے مانند بند کر کے ... یاں جاؤں اندھوں کا شعر بھی اندھا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی دیکھنا کس طرح سے۔ اس وقت یہ مطلع میاں جرأت کا نابینا پڑھتا جاتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے ہر طرف اندھوں کی طرح ٹٹولتا جاتا ہے۔ مطلع جرأت:

سنا ہے یار کی ہم نے کمر ہے ۔۔۔ کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے

مطلع پڑھنا تمام مشاعرے کے بعد ہو۔"

جرأت کی یہ نقل مشاعرے کے بعد۔ کہنے سے یہ مقصد تو حاصل ہو جاتا ہے کہ مشاعرے کی سنجیدگی میں فرق نہیں آتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پست مذاقی کا جو اثر پیدا ہے وہ مشاعرے کی سنجیدگی پر غالب آ جاتا ہے۔

اسیر کے بارے میں واجد علی شاہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی انہیں زیب نہیں دیتا۔ لکھتے ہیں:

"یہ شخص دس پندرہ برس کے سن میں دائم قائم پیالہ اور ہم نوالہ رہا اور صحبتِ مشاعرہ کوئی ایسی نہ ہوتی تھی جس میں اس کی اور میری ہمراہی نہ ہو۔ بلکہ یہ خطاب مدبر الدولہ، بہادر جنگ، تقیری کا عنایت کیا ہوا ہے۔ وہ محبت جتنا تھا وہ نوحہ گو تھا شعر ان میں لکھتا تھا۔ آبا عن جد اس کے نمک خوار میرے باپ دادا کے رہے۔ میری ولیعہدی میں عاشق اور میری زبان سلطنت میں مصاحب اور وزارت وغیرہ کل خاندان شاہ سرکار رہا اور جملہ صدر نویس تمام کچھ بابت سلطانی کا رہا اور یہاں تک میرے مزاج میں دخل تھا کہ شبانہ روز حاضرِ خدمت رہتا تھا۔ ۶۵ برس کے سن میں عقد کیا۔ زوجہ سے نہایت مانوس رہا کرتا تھا۔ جب اوضاعِ فلک منقلب ہوئے یعنی امر انتزاعِ سلطنت ادھر ہوا یہ مایوس جانب کلکتہ چلا، از بسکہ زوجہ کا مبتلا بہت تھا، حقِ نمک مالک یک قلم فراموش کر کے گھر میں جا چھپا۔ میں کلکتے میں داخل ہوا۔ بیس برس سے مجھ سے اس نے فراق تھا۔ طرفہ یہ ہے کہ اب والیٔ رامپور کو اپنا بادشاہ بنا کر بہ ستیزۂ بنی فاطمہ مل کر ان کا نمک کھاتا رہا۔ یہ مطلع اسی شخص نمک فراموش کا ہے:"

اس مشاعرے کے سلسلے میں واجد علی شاہ نے خود اپنا بھی مختصر سا تعارف کرایا ہے جو تمہید میں نقل ہوا۔ اس میں واجد علی شاہ نے اپنی ۴۶ تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض تصانیف کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں جن سے یہ تعداد پچاس سے اوپر ہو جاتی ہے ان کی فہرست حسب ذیل ہے:-

(۱) اختر ملک (۲) افسانۂ عشق (۳) ارشاد خاقانی (۴) ایمان (۵) الہدایت (۶) بحر الفت (۷) بحر مختلف (۸) بنی (۹) تاریخ مذہب (۱۰) تاریخ ممتاز (۱۱) تاریخ خاص (۱۲) تاریخ فراق (۱۳) تاریخ مشغلہ (۱۴) غزالہ (۱۵) تاریخ نور (۱۶) تاریخ جمشیدی (۱۷) تاریخ دہر (۱۸) نجی عشق (۱۹) جوہر عروض (۲۰) حزن اختری (۲۱) دریائے تعشق (۲۲) دستور واجدیہ (۲۳) دفتر ہمایوں (۲۴) دیوان مبارک (۲۵) دفتر پریشاں (۲۶) دلہن (۲۷) سخن اشرف (۲۸) شعبدۂ فیض (۲۹) صحیفۂ سلطانی (۳۰) صوت مبارک (۳۱) عشق نامہ (۳۲) نثر مضمون (۳۳) کلیات اختری (۳۴) کلیات سوم (۳۵) کلمۂ عاشقاں (۳۶) مسودات مرثیہ (۳۷) ناجی نامہ (۳۸) مرقع فرخ (۳۹) مباحثہ بین النفس والعقل (۴۰) ناجو (۴۱) نظم ناموں (۴۲) صناع اختری (۴۳) ہیئت حیدری (۴۴) لغت عزت زبان (۴۵) چار پارچے ان میں مراثی اور مصائب منظوم شہدائے کربلا ہیں جن کا حساب نہیں کیا۔ (۴۶) مجموعہ واجدیہ۔

آخر میں لکھتے ہیں:-

> "یہ سب نقیہ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اور جو تزلزل سلطنت و غارت بدمعاشاں میں تاراج ہو گئیں وہ خارج از حساب ہیں۔"

اس کے بعد واجد علی شاہ گیارہ بارہ برس اور زندہ رہے۔ اس زمانہ میں جو کچھ لکھا وہ بھی اس میں شامل نہیں۔ ان تصانیف میں سے بیشتر اب نایاب ہیں۔ یہ سب موجود ہوتیں تو واجد علی شاہ کے کردار پر عیش پسندی اور عریانی کے جو دھبے ہیں شاید دھل جاتے اور اس کی شخصیت اور کارناموں کا مکمل جائزہ لے کر اس کا صحیح مقام متعین کیا جا سکتا۔

ہماری داستانیں

وقار عظیم

کوئی کہتا ہے داستان —— تو یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

اور دل کے اس احساس اور ارادہ میں کسی شاعری کو دخل نہیں —— یہاں شاعری سے میری مراد محض مبالغہ آرائی سے ہے ورنہ سچ پوچھیے تو داستان اور شاعری میں بڑا قریبی تعلق ہے۔ دونوں کی پرورش تخیل اور تصور کی آغوش میں ہوتی ہے۔ اور دونوں احساسِ غم و اندوہ کا مرہم ہیں۔ میرے لیے اور ان سب کے لیے جو داستانوں کی گوناگوں لذتوں سے آشنا اور اس مے کے نشہ کے رسیا ہیں "داستان" کے لفظ سے نہ جانے کتنے عجیب و غریب تصور وابستہ ہیں کہ جب یہ لفظ کان میں پڑتا ہے، تصور یا تو بیتی ہوئی صحبتوں کی رنگین یاد میں ڈوب جاتا ہے اور یا پھر ایسے جہانوں کی سیر کرتا ہے۔ جہاں غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں غم کی خلش سے ناآشنا ہیں —— ہر چیز میں رفعت، کشادگی اور انوکھا پن۔

یہ داستانیں راتوں کی تنہائیوں میں چھپ چھپ کر بھی پڑھی جاتی تھیں اور اس طرح مہجور کی شب فرقت اختر شماری کے غیر شاعرانہ شغل کے بغیر سپیدۂ سحر کا منہ دیکھتی تھی اور گوشۂ تنہائی سے الگ دوست احباب کی محفلوں میں بھی، جہاں دنیا والے دن بھر کی سختیوں سے تھک ہار کر کسی ایسے جہان کی سیر کرنے کو یکجا ہوتے تھے جو ان پر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر سکے۔ کسی کھلے ہوئے میدان میں چاندنی کے فرش پر "یارانِ باصفا" کا ایک حلقہ جما ہوا ہے۔ اور ہر ایک کی توجہ کا مرکز صرف ایک شخص ہے جو ان سب کے حلقہ میں گھرا ہوا لفظوں سے رزم و بزم کی گوناگوں تصویریں کھینچ رہا ہے اور دیکھنے والے ہر نقش کو حیرت سے دیکھتے، وجد میں آتے اور خود فراموشی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ محفل روز جمتی اور دو تین گھنٹے اور کبھی کبھی آدھی رات گئے تک جاری رہتی۔ سننے والے یہاں سے اٹھ کر جاتے ہیں۔ اور خوابِ نوشیں میں بھی اس رزم و بزم کے وہی مرقعے دیکھتے ہیں جن سے ان کی زندگی محروم ہے۔

یہی محفل کہیں کہیں بزم آرائی کے سارے لوازم کے ساتھ منعقد ہوتی ہے۔ فرش، فروش، چاندنی، قالین، گاؤ تکیے، جھاڑ فانوس، عود، عنبر، فضا مصفا، منور اور معطر ہے۔ اور داستان سننے والے امید و شوق کو جلو میں لیے، غم و اندوہ کی دنیا کو خیرباد کہہ کر سرور و انبساط کا سرمایہ جمع کرنے کے لیے، ایک ایک کر کے آتے ہیں اور آنے والے وقت کے انتظار میں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ داستان

شروع ہوتی ہے، تخیّل کی بلند پروازی نئے نئے مناظر سامنے لاتی ہے اور ہر منظر کی مرقع کشی میں رنگینیٔ بیان کے دریا بہاتی ہے —— رنگینی بڑھتی جاتی ہے اور داد و تحسین کے نعرے بلند ہوتے جاتے ہیں۔ داستان سننے والوں کے جذبۂ شوق و جستجو کو بڑھاتی رہتی ہے اور اہلِ محفل داستان گو کے ساتھ نئے نئے طلسمات کی سیر کر کے وہ کچھ پا لیتے ہیں جو انھیں زندگی میں میسر نہیں۔

ایک منظر وہ ہے جب کوئی سرمست ناز محوِ استراحت ہے۔ لیکن خیال اب بھی زندگی کی پیچیدگیوں میں اُلجھا ہوا ہے اعصاب کو کسی ایسے دارو کی ضرورت ہے جس سے یکسوئی میسر آئے۔ کسی نے کسی داستان کا نغمۂ دل نشیں چھیڑا، پلکیں بوجھل ہوئیں اور تلخیوں اور پیچیدگیوں کی دنیا اس کے کیف میں ڈوب گئی۔

اور پھر جو بیماریٔ غم کسی اور طبیب کے نسخوں سے دور نہیں ہوتی، اس کی دلجوئی چار درویشوں کا قصہ سنا کر جاتی ہے —— داستان ختم ہوتی تو مریض کے غسلِ صحت کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔

غرض داستان کے تصوّر کے ساتھ وہ سارے تصوّر جیتے جاگتے بن کر سامنے آتے ہیں جو صدیوں سے اس کے ساتھ وابستہ ہیں، انجمن آرائی اس کا منصب اوّلین ہے۔ وہ مریضوں کے لیے داروئے شفا اور غم نصیبوں کے لیے سرمایۂ سرور و شادمانی ہے۔ اسے اپنا مونس و غم خوار بنانے والے بے خودی و خود فراموشی کی آغوش میں پرورش پاتے اور ہر آن تازہ جہانوں کی سیر کرتے ہیں۔

بے خودی کی یہ دولتِ بے پایاں اس دنیا کا مقصود ہے جسے داستانوں نے اپنا بنایا ہے —— یہاں کے حقائق ہماری آپ کی دنیا کے حقائق سے بالکل مختلف ہیں۔ اس میں جن، دیو اور پریاں آباد ہیں۔ یہ دنیا جادوگروں، نجومیوں، جوتشیوں، رمّالوں کی دنیا ہے —— اور یہ ساری مخلوق شاہوں، وزیروں، امیروں اور تاجروں کی زندگی میں دوستی یا دشمنی کے رشتہ سے منسلک ہے یہاں کے جنوں، دیووں اور پریوں کی طرح سارے انسان بھی عجیب الخلقت ہیں۔ حد درجہ خوبرو، حد درجہ بدوضع، حد درجہ نیک، حد درجہ خیر کے مجسمے، شر کے پیکر، ہر چیز کی انتہا، ہر چیز کی معراج، بلندی سے بلند اور پستی سے پست۔ ان سارے انسانوں کو رزم و بزم کے ایسے معرکے پیش آتے ہیں جو اس سے پہلے کسی انسان کے تصوّر میں بھی نہیں آئے تھے۔ یہ سارے معرکے سر ہوتے ہیں اور ان کا انجام ہمیشہ طرب و نشاط ہوتا ہے۔ یہاں غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں کا انداز جداگانہ ہے۔ غمِ عشق صرف دوستوں کے لیے، غمِ روزگار صرف دشمنوں کے لیے اور اگر عشق کو کبھی غمِ روزگار سے سابقہ بھی پڑے تو عشق کا نصب العین، تائیدِ غیبی سے، رہنمائی خضر سے، مشکل کشا کی دستگیری سے، اسمِ اعظم سے، لوح سے، تعویذ سے، سحر و تسخیر سے یا اپنی بے مثال قوتِ بازو سے اسے بناتا اور شر کو روسیاہی کے سپرد کر کے خود سرخروئی اور کامرانی کا تاج سر پر رکھتا ہے اور انجام کار یوں دادِ عیش دیتا ہے کہ جو سُنے، جو پڑھے وہ تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی، یہ بھول جائے کہ دنیا میں غم ہیں، تلخیاں ہیں اور نامرادیاں ہیں۔

داستانوں نے انسانوں کی دنیا کے سامنے اس عجیب و غریب دنیا کا تخیّل پیش کر کے رنگینی، بوقلمونی، کشادگی، فراوانی، رفعت، عظمت کا مفہوم پیش کیا ہے۔ بے بسوں اور محروموں سے ان کی بے بسی اور محرومی چھینی ہے کہ بے خودی اور خود فراموشی کے یہی بڑے انعام ہیں اور بے خودی کی دولت پر جتنا تصرف داستانوں کا ہے، کسی اور چیز کا نہیں —— اس کا خمار اعصاشکن نہیں، اسی سبب ہر زمانہ میں اور ہر طبقہ میں داستانیں محبوب و مرغوب رہی ہیں۔ اور یہ دعوے کرتے وقت میرے سامنے اردو کی داستانوں کی ڈیڑھ، پونے دو سو برس کی تاریخ ہے۔

یہ قصہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد کا ہے۔ بوستان خیال کے مصنف ۱۷۲۶ء میں گجرات سے دہلی آئے اور ۱۷۴۳ء تک تلاش روزگار میں مبتلا رہے، اس زمانہ میں جس مکان میں مقیم تھے اس کے قریب ہی ایک قہوہ خانہ تھا۔ یہاں ہر طرح کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ انھیں میں ایک صاحب ایسے تھے جو داستان گوئی کے فن سے آشنا تھے۔ انھیں دوسروں کے ہزاروں قصے یاد تھے۔ لیکن ان سب کو اپنی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ قصوں میں اپنی طرف سے بس تھوڑا بہت اضافہ کر لیتا تھا۔ اس کے باوجود اپنی فن کاری پر حد درجہ نازاں بلکہ مغرور تھا۔ ایک دن کہنے لگا "انسان ہر قدر علم و فضل میں دستگاہ پیدا کر سکتا ہے مگر فن قصہ گوئی ایسا دقیق و مشکل ہے کہ بغیر مناسبت طبیعت۔ ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ اہل صحبت نے بھی اس کے قول کی تصدیق کی۔" ایک دن اس شخص نے کوئی ایسی داستان بیان کی جو اہل مجلس میں سے ایک صاحب کہیں اور بھی سن چکے تھے۔ انھوں نے کہا کہ داستان فلاں شخص کی ہے۔ غرض یہ محفل ہر روز جمتی رہی اور روز کوئی نہ کوئی قصہ کھڑا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن محمد تقی خیالؔ نے ایک قصہ کی تمہید لکھ کر اس محفل میں سنائی۔ اس پر دلی کے داستان گو صاحب نے فرمایا کہ یہ قصہ تو فارسی میں تھا، لطف تو جب ہے کہ قصہ اردو میں ہو۔ اسی طرح کے اور بہت سے اعتراض کئے اور اس طرح مجلس میں دو فریق پیدا ہو گئے اور دونوں میں خاصا فساد ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ خیالؔ کی داستانگوئی کا شہرہ ہوا اور ان سے کہا گیا کہ جہاں امیر حمزہ کی داستان سنائی جاتی ہے وہاں تم بھی سنایا کرو۔ انھوں نے تعمیل کی ——— پھر ان کی رسائی ایک امیر تک ہوئی جو داستان سننے اور لکھوانے کے بڑے شوقین تھے۔ یہاں سے نواب رشید الدین بہادر تک رسائی ہوئی۔ اور ان کی فرمائش پر بوستان خیالؔ کو باقاعدہ طور پر لکھنا شروع کیا۔ دو جلدیں مکمل کر کے ——— تیسری جلد شروع کی تھی کہ امراء کی وساطت سے بادشاہ کی خدمت میں پہنچے اور بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے مکمل کیا جائے۔ مصنف کی فرمائش پر بادشاہ نے ۱۵ کاتب زود نویس اور خوش خط اس کام پر مقرر کئے۔ ابھی دو جلدیں مکمل ہوئی تھیں کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا (۱۷۴۸) اور محمد تقی بنگال پہنچ کر نواب سراج الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ اور انھیں کی فرمائش پر قصہ کو پندرہ جلدوں میں مکمل کیا۔

محمد تقی خیالؔ نے اپنے دہلی کے قیام اور قہوہ خانہ والی قصہ گوئی کی مجلس کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس بیان سے یہ نتیجے نکلتے ہیں کہ داستان لینے اور داستان سننے کا چسکا لوگوں میں عام تھا اور اس شوق میں عوام اور خواص، امیر، وزیر اور بادشاہ تک شامل تھے، داستانیں اردو اور فارسی میں کہی جاتی تھیں؛ وہ نہ صرف کہی جاتی تھیں بلکہ لکھی بھی جاتی تھیں، قصہ گو اپنے ذہن اور تخیل سے بھی قصے تراشتے تھے اور دوسروں کے قصوں میں ترمیم و اضافہ کر کے بھی سناتے تھے، لیکن پسندیدگی اور قدر دانی صرف طبع زاد قصوں کو حاصل تھی۔ ——— یہ زمانہ اب سے دو سو برس پہلے کا ہے۔ اردو کی اکثر داستانیں انیسویں صدی میں لکھی گئیں۔ منظوم داستانوں کا یہاں ذکر نہیں لیکن نثر کی پہلی داستان جو ہم تک پہنچی ہے تحسین کی نوطرز مرصع ہے جو ۱۷۷۵ء میں لکھی گئی۔ اس کے بعد وہ قصے جو فورٹ ولیم کالج کے اہتمام میں لکھے گئے۔ ان میں میرامن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل اور طوطا کہانی۔ خلیل علی خاں اشک کی داستان امیر حمزہ، ——— سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی زیادہ مقبول ہوئے۔ ان قصوں کا زمانہ تصنیف ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دوران میں فورٹ ولیم کالج سے الگ بھی بعض نثار ایسے قصے لکھنے میں مصروف تھے جن کا انداز داستانوں سا ملتا ہے ——— ۱۸۰۱ء میں زرّیں کی نوطرز مرصع (یا باغ و بہار) لکھی گئی۔ ۱۸۰۳ء میں انشاء نے رانی کیتکی کی کہانی لکھی۔ ۱۸۱۳ء میں مہجورؔ نے نورتن لکھی ——— یہ ایسے قصوں اور داستانوں کے نام ہیں جو تصنیف ہونے کے بعد بار بار چھپے اور مختلف حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے۔ قیاس کہتا ہے کہ اس عہد میں اور قصے بھی لکھے گئے ہوں گے۔ بہر حال اس کے بعد سے نثر لکھنے والوں نے داستان

کو ایک مستقل صنفِ ادب کی حیثیت سے اختیار کر لیا اور انیسویں صدی کے آخر تک اردو میں جتنی داستانیں لکھی اور چھاپی گئیں ان کی ضخامت مجموعی حیثیت سے اُردو کے دیوانوں سے زیادہ ہوگی۔ ۱۸۲۴ء میں سرور کی فسانۂ عجائب اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے گلزارِ سرور، شگوفۂ محبت اور شررِ عشق، الف لیلہ، بوستانِ خیال، طلسم ہوش ربا کی آٹھ ضخیم جلدیں، داستان امیر حمزہ اور اس کے سلسلے کے ۸ دفتر، بقیہ طلسم ہوش ربا کی دو جلدیں، طلسم نور افشاں اور طلسم ہفت پیکر کی تین تین جلدیں، الف لیلہ، سروشِ سخن، طلسم حیرت اور ان کے علاوہ بے شمار مترجم اور طبع زاد قصے اور داستانیں عوام اور خواص کے ذوقِ داستان خوانی اور داستان سرائی پر دلالت کرتے ہیں۔ اُردو کے اکثر اچھے داستان گو غدر سے پہلے اور غدر کے بہت بعد تک دہلی، اودھ، رامپور، بنارس اور حیدرآباد کے درباروں اور امیروں سے وابستہ رہے ہیں۔ اور اس تعلق اور وابستگی کے علاوہ شہروں میں داستان گوئی کی مجلسوں کا عام دستور رہا ہے۔ یہ داستان گو کبھی لکھ کر اور کبھی زبانی اپنی داستانیں سنا کر سننے والوں کے دلوں کو مسرور کرتے اور ان سے ہدیۂ تحسین و خراجِ عقیدت و محبت وصول کرتے رہے ہیں۔ اور دلّی اور لکھنؤ نے اپنے زوال اور انحطاط کے زمانہ میں بھی اپنی مجلسوں کو اس شمع سے روشن رکھا ہے چنانچہ دہلی میں ۱۹۲۹ء تک میر باقر علی داستان گو کی محفلیں مرجع خاص و عام تھیں اور لکھنؤ میں اب بھی عید کے دن داستان کے پرستار عیش باغ کے میدان میں مرزا تمن کی داستان سننے جاتے ہیں۔ یہ حالت تو بادشاہوں، وزیروں، امیروں اور عامیوں کی تھی ——— اب ذرا ایک جھلک ایسے ادیبوں کی دیکھئے جن کے ذوق کی نفاست اور لطافت ہر زمانے کے لوگوں کے لیے مثال اور نمونہ رہے گی۔

جمعرات کا دن ہے۔ شام کے ۴ بجے ہیں۔ غالب کے بلی ماراں والے گھر میں بچوں اور بوڑھوں کی ایک محفل جمی ہوئی ہے۔ داستان پڑھی جا رہی ہے اور سب شوق سے سن رہے ہیں۔ غالب میرِ محفل ہیں۔ داستان سنتے ہیں اور جہاں کہیں داستان گو مطالب کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا، داستان کا سلسلہ اپنے ہاتھ میں لیتے اور مکمل کرتے ہیں اور خوش ہو ہو کر کہتے ہیں کہ دہلی کی زبان انہیں داستان کہنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔

داستان سے غالب کو جو گہری وابستگی تھی۔ اس کا اظہار اوّل تو گلزارِ سرور اور بوستانِ خیال کے دیباچوں سے ہوتا ہے اور دوسرے اس مزیدار خط سے جو انھوں نے میر مہدی مجروح کو لکھا تھا۔ بوستانِ خیال کے دیباچہ کے دو تین جملے سنئے:

"افسانہ و داستاں میں وہ کچھ سنو کہ کبھی کسی نے دیکھا نہ سُنا"

"چند خردمند بیدار مغز تواریخ کی طرف بالطبع مائل ہوں گے لیکن قصہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کے بھی دل سے قائل ہوں گے"

"داستان طرازی من جملہ فنونِ سخن ہے۔ سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے"

اور اب دیکھئے میر مہدی مجروح والے خط کی عبارت، لکھتے ہیں:

"مرزا غالب علیہ الرحمۃ ! ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب

امیر حمزہ کی داستان اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستانِ خیال کی آگئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں۔ رات بھر شراب پیا کرتے ہیں ؎

کسے کیں مرادش میسر بود!
وگر جم نہ باشد سکندر بود

مختصر یہ کہ عوام اور خاص دونوں میں داستانیں سننے اور داستانیں پڑھنے کا شوق کسی نہ کسی انداز سے اب سے تقریباً دو سو برس سے قائم ہے۔ بیچ میں چند برس ایسے آئے تھے جب ناول اور مختصر افسانہ کے نئے فن نے داستانوں کو مختلف محفلوں سے نکال کر اس کی مسند پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اب پھر خواص ان داستانوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ انھیں پڑھنے کے لیے وقت نکالا جاتا ہے، انھیں گفتگو اور تنقید کا موضوع بنایا جاتا ہے اور انھیں ایک نعمتِ غیر مترقبہ کی طرح کتب خانوں میں محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے —— اور اب بھی بھارت جیسے دیارِ غیر میں طلسمِ ہوش ربا، داستان امیر حمزہ اور فسانۂ آزاد کے نئے ایڈیشن شائع کیے جاتے ہیں اور یہ سب کچھ قصہ کہانی کی ان بے شمار کتابوں اور ان ضخیم کتابوں کے خلاصوں سے الگ ہے جو پٹڑی پر بیٹھنے والے کتب فروش صبح سے شام تک بیچتے ہیں۔ اب بھی ان کے رزق کا سب سے بڑا سہارا یہی داستانیں ہیں۔

داستانیں کہنے اور داستانیں لکھنے میں ہمیشہ سے بڑا گہرا ربط رہا ہے۔ اور ہر زمانہ میں لوگوں کو داستانیں سننے اور پڑھنے سے یکساں دلچسپی رہی ہے اور ہر زمانہ میں کہی اور لکھی جانے والی داستانوں میں تخیل کی کارفرمائی سب سے زیادہ رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ داستان کہنے اور لکھنے والوں نے مقامی ماحول اور مقامی مذاق سے متاثر ہو کر داستانوں میں داستان کی ساری خصوصیتیں برقرار رکھ کر بھی ان کے مضمون اور انداز میں جزوی تبدیلیاں کی ہیں۔ ان میں سے بعض فرق ارادی ہیں اور بعض غیر ارادی طور پر تحریروں میں داخل ہو گئے ہیں۔ فسانۂ عجائب اس اثر کی بڑی نمایاں اور واضح مثال ہے۔ اس قصہ میں ایک طرف تو سرور کی شخصیت نے داستان کی تشکیل و ترتیب میں نئے نئے نقوش بنائے ہیں اور دوسری طرف لکھنوی معاشرت اور مذاق کے مخصوص انداز نے قصہ کی تفصیلات میں امتیازی رنگ پیدا کیے ہیں۔ یہی صورت ذرا کمتر طریق پر باغ و بہار، آرائشِ محفل اور بوستانِ خیال میں بھی موجود ہے۔ لیکن دہلی اور لکھنؤ کی داستان گوئی، اور داستان نویسی میں مقامی مذاق نے جو امتیازی فرق پیدا کیے ہیں۔ داستانوں کے مضمون اور ان کی بیانی تفصیلوں سے زیادہ اندازِ بیان میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جو داستان گو دہلی کے مذاق سے متاثر ہیں انھوں نے بیان میں سادگی، فصاحت اور سلاست کو اپنا شیوہ بنایا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جن داستان گویوں پر لکھنوی ماحول اور مذاق کا اثر ہے، تصنع، رنگینی اور عبارت آرائی ان کے طرز کی نمایاں خصوصیت ہے۔ طرزِ بیان کی ان منفرد اور امتیازی خصوصیات کے اظہار کے لیے بڑی آسانی سے میر امن کی باغ و بہار اور سرور کی فسانۂ عجائب کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان دو کتابوں سے الگ بھی دہلی اور لکھنؤ کے داستان گویوں کی لکھی ہوئی جتنی داستانیں ہماری نظر کے سامنے ہیں وہ بھی مذاق کے اس نمایاں فرق کی مظہر ہیں —— طلسم حیرت اور سروشِ سخن جو میر امن اور سرور کی حمایت میں لکھی گئی ہیں، اس فرق کے دو اور امتیازی نمونے ہیں۔ لیکن اس فرق کا جو عکس بوستانِ خیال کے ترجموں میں ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ لیکن اس فرق کی وضاحت سے پہلے شاید بوستانِ خیال کے ترجموں کی دلچسپ کہانی بیان کرنی ضروری ہے۔

یہ بات عام طور پر علم میں ہے کہ فارسی میں بوستانِ خیال کے ۱۵ حصے ہیں اور پہلے مترجم مرزا غالب کے بھتیجے خواجہ امان دہلوی ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے بوستانِ خیال کی تیسری اور چوتھی جلد کا ترجمہ حدائق انظار کے نام سے کیا اور اسی پر مرزا غالب نے اپنا دیباچہ لکھا۔ اس کے بعد انھوں نے باقی جلدوں کا ترجمہ کیا۔ آخری حصہ کے ترجمہ میں مصروف تھے کہ دل میں درد ہوا۔ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اسی درد میں ان کا انتقال ہوا۔ ترجمہ کا باقی حصہ ان کے صاحبزادے خواجہ قمرالدین خان راقم نے مکمل کیا۔ بوستانِ خیال اتنی مقبول ہوئی کہ بعض چھاپہ خانوں نے اسے چھاپنے کی اجازت طلب کی۔ خواجہ قمرالدین نے کسی وجہ سے اجازت نہیں دی۔ دوسرے چھاپہ خانوں والے تو چپ بیٹھ رہے لیکن منشی نولکشور کو ان کے چھاپنے کی دھن لگی اور انھوں نے بوستانِ خیال کا ترجمہ اپنے اہتمام میں کروا کے اسے اپنے مطبع میں چھاپا۔ یوں دلّی اور لکھنؤ والوں میں بوستانِ خیال کے دو الگ الگ ترجمے ہوئے۔ ان کی مختلف جلدوں کے نام دہلی اور لکھنو والوں نے الگ الگ رکھے لیکن سب قصوں کو ملا کر یہاں اور وہاں دونوں جگہ 'بوستانِ خیال' ہی کہا گیا۔ خواجہ امان کی ترجمہ کی ہوئی پہلی جلد ۱۸۶۶ء میں چھپی اور ان کا انتقال ۱۸۷۹ء میں ہوا ——— خواجہ امان نے جس جلد کا ترجمہ نہیں کیا تھا۔ اس کا ترجمہ لکھنؤ کے مرزا محمد عسکری (عرف چھوٹے آغا) نے کیا اور وہ ۱۸۸۰ء میں نولکشور پریس میں چھپا، اور باقی حصے بھی ۱۸۸۹ء تک مکمل ہوئے۔

اب بوستانِ خیال کے ان دو ترجموں کی عبارتوں کا مقابلہ کیجئے جن میں سے ایک کا ترجمہ ایک دِلّی والے نے کیا ہے اور دوسرے کا ایک لکھنوی نے، تو زبان و بیان میں دہلی اور لکھنؤ کے انداز کا وہ فرق اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے جس کا ذکر باغ و بہار ——— اور فسانۂ عجائب کے سلسلہ میں بار بار آتا رہا ہے۔ لیکن عبارتوں کے مقابلہ سے پہلے خود ترجمہ کرنے والوں کی کیفیت مزاج کی ایک جھلک دیکھ لیجئے جو ان کے ترجموں کے دیباچوں سے مترشح ہے۔

خواجہ امان اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> "جس تحریر یا تقریر میں آورد و ساختگی کا دخل ہوگا اور آورد بھی وہ کہ کوئی لفظ تک سے خالی نہ ہو، بلا ریب وہ زبان اہل زبان کے نزدیک زبانِ عوام ہے، اس طرح کی تک بندی اور زبان درازی انھیں افسانوں کے واسطے لائق و خوشنما ہے جن کی تمہید ایسی ہوتی ہے کہ ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ ——— نہ یہ قصہ سرِ دفترِ قصص۔ اگر احیاناً تصرفاً اس کے ترجمہ میں سوائے بیانِ مصنف کے کچھ بھی جودتِ طبع کی جاتی حسنِ قصہ ہرگز باقی نہ رہتا۔ خاکسار نے ترصیع بیان و درازیٔ زبان سے قطع کی اور اہل دہلی کے روزمرہ کا مقلد ہوا۔ لیکن وہ روزمرہ کہ جو خاص عمائد و اعزۂ شہر کے بے تکلف و بلا تصنع استعمال میں ہے۔"

مرزا محمد عسکری نے اپنے دیباچہ میں پہلے بوستانِ خیال کی اصل فارسی عبارت کی تعریف کی ہے اور پھر خواجہ امان کے اور اپنے ترجمہ کے انداز کا مقابلہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "عبارت رنگین، مقفیٰ و مسجع۔ فصاحت و بلاغت میں قلم توڑ دیئے ہیں۔ اشعار برجستہ اور حسب حال، ایسی عمدہ طرز سے موقع و محل پر لکھے ہیں کہ سبحان اللہ...... اگرچہ خواجہ امان صاحب دہلوی نے بھی نہایت عمدہ ترجمہ فرمایا ہے........ مگر جب اس ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیں گے، فصاحت و بلاغت، لطفِ زبان، نازک خیالیوں میں بدرجہا بڑھا ہوا پائیں گے۔"

اب دونوں جگہ کے ترجموں کا ایک ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے:

> خواجہ امان کی عبارت ہے: "راوی کہتا ہے کہ اس روز مرسلاق دیو بے پردہ قاف کو گیا تھا۔ تا نصف شب اپنے برادرِ خورد کے ہاں مہمان رہا۔ اس نابکار نے حیوانات نوری البتہ اور شراب غلیظ سے اکثر دیوانِ قاف کی دعوت کی تھی۔ جب نصف شب گذری مرسلاق دیو اپنے بھائی سے خواہانِ اجازت ہوا۔ اور کہا میں اس وقت پردۂ دنیا میں کسی کوہ پر جاؤں گا اور شراب کے نشہ میں اس آدم زاد کا نغمۂ خوش سنوں گا۔ ہر چند اس دیو مہمان دار نے کہا کہ یہ کیا وقت جانے کا ہے مرسلاق دیو نے نہ مانا۔ . . . ."

یہی عبارت لکھنؤ والے ترجمہ میں یوں ہے:

> "اب وہ کلمے دیو کے عرض کئے جاتے ہیں کہ جب وہ حرامزادہ پُر غرور یعنی مرسلاق دیو قاف میں گیا۔ اخوان الشیاطین میں سے ایک کا مہمان ہوا۔ سارا دن اور آدھی رات تک مرے ہوئے ہاتھی، ریچھ، سؤر، بلیاں، چوہے، گھونسیں کھایا کیا۔ یا انگور سے جو پُر آب . . . . . میں پڑے پڑے بغیر آتش جوش کھایا کئے تھے۔ جن میں تعفن سے بُلبلے اٹھتے تھے۔ ان کی شراب پیا کیا۔ نشہ میں اسے ترنگ سوجھی کہ چلوں آدم زاد کا گانا سنوں۔ بھائی سے رخصت ہوا۔ ہوا کی طرح چلا . . . . . ."

جس طرح دلی اور لکھنؤ کی تحریری داستانوں میں مقامی مذاق نے طرح طرح کے فرق پیدا کئے ہیں اور ایک اختصار اور دوسرا طول، ایک سادگی دوسرا رنگینی، ——— ایک روانی اور دوسرا سنجیدگی کی طرف مائل ہے۔ اسی طرح کہی جانے والی داستانوں میں بھی یہ فرق نمایاں ہے۔ چنانچہ دلی کے آخری داستان گو میر باقر علی کی داستانوں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سلاست اور فصاحت اس کا جوہر ہے۔ لکھنؤ کے داستان گویوں نے اپنے لیے الگ الگ رنگ مخصوص کر رکھے تھے۔ اور ہر ایک اپنے رنگ میں منفرد اور ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو بزم کے مرقعے کھینچنے میں ید طولیٰ حاصل تھا، کوئی رزم آرائی میں آپ اپنا جواب تھا۔ کوئی شعر و ادب کی کثرت سے داستان کو پُر لطف بناتا تھا اور کسی کی داستان ایک زعفران زار تھی کہ جو اسے سنتا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ غرض ہر ایک کا رنگ نرالا تھا اور رنگوں کا یہ تنوع سننے والوں کے مذاق کی رنگینی اور بوقلمونی کی بنا پر تھا۔ لیکن یہ ساری رنگینی، ساری بوقلمونی جیسے ایک خاص زمانہ کے لیے تھی۔ نئے زمانہ نے وہ ساری صحبتیں درہم برہم کر دیں۔ داستان گویوں کے قدرداں اور قدر شناس نہ رہے تو داستان گو داستان طرازی میں خونِ جگر کس کے لیے کھپاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بزم کی برہمی کے ساتھ شمعیں بھی گل ہو گئیں۔ داستان سننے والے بھی کہنے اور سنانے والے بھی، پڑھنے والے بھی اور لکھنے والے بھی اور کچھ عرصہ کے لیے داستانوں کے سارے ضخیم دفتر طاقِ نسیاں کی نذر ہو گئے۔

لیکن زمانہ کو ان کی گوشہ نشینی اور گوشہ گیری بھی گراں گزری اور اس نے انھیں ان طاقوں سے اتار کر کریدنا شروع کیا۔ کریدنے اور دیکھنے والوں نے ان دفتروں کو راکھ کا ڈھیر سمجھ کر کریدا تھا، لیکن راکھ کو الٹا پلٹا تو اس میں سے بہت سی چنگاریاں جگنو اور ستارے بن کر جھانکیں اور نظروں کو ان میں کشش نظر آئی، لیکن کچھ نظریں ایسی بھی تھیں جنھوں نے ان چنگاریوں میں تو کچھ نہ پایا اور راکھ کے ڈھیر کو سب کچھ سمجھ بیٹھے اور گن گن کر اس میں عیب نکالنے ——— اور اس طرح جہاں تھوڑے بہت لوگ اب بھی ایسے باقی تھے جن کے نزدیک داستانیں ایک خاص زمانہ اور خاص مذاق کی بڑی دلکش تصویریں تھیں، ایسے لوگ بھی خاصی تعداد میں پیدا ہو گئے

تھے جو ہر چیز کو صرف اسی نظر سے دیکھتے تھے جو نئے زمانہ اور اس نئے زمانہ کے مذاق نے انھیں عطا کی تھی۔

کہا جانے لگا کہ داستان ایک دفترِ بے معنی ہے ——— ایک ایسے ماحول کی پیداوار جو ہماری تاریخ پر اور ہمارے تمدن اور اخلاق کی روایات پر ایک بدنما داغ ہے۔ وہ یا تو ایسی زندگی کے ترجمان اور آئینہ دار ہیں جو سرتاسر زندگی کی کشاکش اور اس کے فطری تقاضوں سے بے نیاز ہے اور اس زندگی کے مصوّر جس کا سرے سے وجود ہی نہیں ——— جنوں، دیوں، پریوں اور جادوگروں کی دنیا، اس دنیا میں جو انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں وہ انسانی خصائص سے عاری ہیں۔ ان کی پوری ساخت اور سرشت غیر فطری ہے۔ ان کے جذبات، احساسات، فکر، عمل اور ردِّ عمل سب چیزیں عام انسانی دنیا کے تجربہ اور مشاہدہ سے بعید اور فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔ ان میں تخیل کی بدلگامی و بے لگامی ہے ——— یہ داستانیں فن کے احساسِ تناسب سے عاری ہیں۔ ان میں نہ اختصار ہے نہ اعتدال، ان کا سارا فن وحدتِ اثر کے لطف اور کیفیت سے خالی ہے۔ یہاں واقعات ارتقا کی فطری منازل طے کئے بغیر طرب و نشاط کی منزلِ آخر تک پہنچ جاتے ہیں ——— غرض داستانوں میں فن ایک بھی نہیں اور عیب ہزار۔

اب اگر کوئی ان سو طرح کی عیب جوئیوں اور نکتہ چینیوں پر اس نظر سے غور کرنے لگے کہ کیا داستانوں میں سچ مچ کچھ اچھا نہیں، تو ایک چیز تو اسے بھی محسوس ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ یہ داستانیں ہر طرح کے رطب و یابس سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن انصاف کی نظر کو اس میں حسن بھی نظر آتے ہیں اور جن باتوں کو عیب کہا جاتا ہے۔ وہ داستانوں کے لیے ناگزیر ہیں ——— یا یوں کہیے کہ ان کے بغیر داستان داستان ہی نہیں بنتی۔

داستانوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی تعمیر و تشکیل سرے سے غیر فطری عناصر سے ہوئی ہے۔ جن، دیو، پریاں، جادوگر، سحر، اسمِ اعظم، اسمِ تسخیر، لوحِ نقش، قلبِ ماہیت ——— اور ان سب کے ساتھ ایسے مرد جو طاقت، جوانمردی، جرأت، ہمت، جود و سخا، محبت، ایثار ہر چیز میں عدیم المثال ہیں اور ایسی عورتیں جن کے حُسن و محبوبی کی دونوں جہانوں میں نظیر نہیں۔ یا ایسے انسان جو بدی کا مجسمہ ہیں اور ساری بدیاں ان میں بیک وقت جمع ہیں۔ ایک بڑی سے بڑی مہم کو سر کرتا ہے، ہفت خواں طے کرتا ہے اور اپنی مرادِ عشق کو پہنچتا ہے اور دوسرا اپنی ساری غیر معمولی قوتوں کے باوجود پہلے سے متصادم ہوتا ہے تو روسیاہی نصیب ہوتی ہے۔ دانا و بینا اُلّو، واعظ و ناصح طوطے، فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دینے والی مچھلیاں، ہمدرد و ہمراز گیدڑ، غرض ایسی بے شمار باتیں جو نہ ہمارے مشاہدہ میں آئی ہیں، نہ تصور و تخیل کے احاطے میں آتی ہیں، اس دنیا کے حقائق ہیں۔ نئے زمانہ کا نقاد ان سب چیزوں کو غیر فطری کہتا ہے اور اسی بنیاد پر داستانوں پر سوختنی اور دریدنی ہونے کا حکم لگاتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہی غیر فطری عناصر داستان کے فطری عناصر ہیں۔ انھیں سے داستان داستان ہے۔ یہ نہ ہوں تو داستان داستان نہ رہے ——— اور داستان کی یہ ساری خصوصیتیں تخیل کی رفعت اور بلند پروازی اور فکر اور تصوّر کی ندرت اور جدّت طرازی کا کرشمہ ہیں۔ تخیل داستانوں کو نئے سے نئے رنگوں میں رنگتا اور تحیر آفریں اور پُر ہیبت واقعات سے بزم کی شمعیں جلاتا اور رزم کی صف آرائیاں کرتا ہے۔ اس رنگین، انوکھی، حیرت و استعجاب اور رفعت و شکوہ والی دنیا اور تخیل کی بلند پروازی اور جدّت طرازی میں لازم ملزوم کا رشتہ ہے۔ اور یہی دونوں لازم و ملزوم مل کر داستان کے فن کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہی دو چیزیں داستان کا پورا فن ہے اور اس لیے ان کی موجودگی داستان کو فن سے عاری نہیں بناتی بلکہ حقیقت یوں ہے کہ یہ دونوں چیزیں نہ ہوں تو داستان فن کے لوازم سے عاری ہو جائے۔ کہ یہی داستان کا فن ہے۔

لیکن داستان کا فن یہیں مکمل نہیں ہو جاتا ——— زندگی کا یہ غیر فطری انداز اور تخیل کی بے راہ روی اور بدلگامی فن کی تکمیل فن کی ابتدائی منزلیں ہیں۔ جو راہ رو صرف ان ابتدائی منزلوں میں اُلجھ کر رہ جائے اس کا مقصود و مقسوم حیرانی و سرگردانی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے

اچھے داستان گویوں نے ان دونوں ابتدائی منزلوں کو ابتدائی منزلیں سمجھ کر اپنے منصب کے دوسرے مطالبات اور مقتضیات پر بھی نظر رکھی ہے اور جس حد تک اور جس نسبت سے ان مطالبات کو عزیز یا بے وقر جانا ہے اسی حد تک اور اسی نسبت سے شہرت و بقائے دوام سے ان کا رشتہ قائم ہوا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ داستانوں کی دنیا اور اس دنیا کے بسنے والے عجیب الخلقت ہیں، ان کی ہر بات کا انداز غیر فطری ہے حسن کا، عشق کا، جرأت و مردانگی کا، کرم و ایثار کا ——— خیر کا، شر کا۔ ہر چیز کی ابتدا میں انتہا کی جھلک ہے، ہر بات مثالی ہے۔ لیکن اس مثالی دنیا میں فن کا ایک تقاضا اور ایک مطالبہ ہے۔ اور وہ یہ کہ اس دنیا کی ساری چیزوں میں ان کے عجب کے باوجود آپس میں ایک خاص تناسب ضروری ہے کہ انسان بھی ایسے ہوں تو ان کے مدمقابل بن سکیں۔ پریوں کا حُسن مُلک فریب ہے تو عشق بھی مجنوں سرشت ہو۔ اس دنیا کی ہر بات کی تعبیر اسی دنیا کی ہر بات سے ہونی چاہیئے جب یہاں انسانوں کی معمولی دنیا نہیں تو معمولی انسانوں کے سے عمل اور اخلاق کی دنیا موجود ہے۔ اعتدال کے منافی اور تناسب کے خلاف ہے۔ داستانوں میں فن کا وہ تناسب اور توازن تلاش کرنا جو نئے زمانہ کے ناول اور افسانہ کا مابہ الامتیاز ہے۔ بڑی عجیب سی بات ہے۔ لیکن اس کی پوری فضا اور پورے ماحول کے مختلف عناصر اور اجزا میں تناسب کا احساس فن کا ایک لازمہ ہے اور فن کے اس لازمہ کی طرف سے بے توجہی اور بے نیازی یقینی طور پر فنی کے لیے بڑا عیب ہے۔

لیکن فن کی کسی کمی کو ہم عیب محض اس لیے نہیں کہہ دیتے کہ وہ کمی بجائے خود کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ فن کے کسی ایک عنصر کے فقدان کو اس لیے قابلِ توجہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ فقدان دوسرے فنی عناصر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح ایک عیب بہت سے عیب بن کر فنی تخلیق، فنی مرتبہ اور عظمت کو متاثر کرتا ہے۔ داستان بھی فن کے اس نازک قانون سے مبرّا نہیں۔ داستان میں جہاں ایک طرف ہم اس کے مختلف عناصر میں پوری زندگی اور پورے ماحول سے مطابقت اور مختلف اجزا اور عناصر کے باہمی تناسب پر زور دیتے ہیں۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ داستان کے فن کا ایک بڑا تقاضا یہ ہے کہ اس میں لطفِ داستان یا افسانوی کشش اور دل نشینی بھی موجود ہو۔ اگر یہ بات نہ رہے تو پھر سرے سے داستان کا وہ سارا تصوّر جو رنگینیٔ تخیل اور جدّت و ندرت کے حُسن پر قائم ہے پارہ پارہ ہو جائے۔ لیکن خود اس لطفِ داستان اور افسانوی دل کشی کا انحصار اسی مطابقت اور تناسب پر ہے جس کا ابھی میں نے ذکر کیا ——— اور اس رومانیت اور اس کے بوقلموں اور گوناگوں مظاہر پر جنھیں تنقید جدید کے دربار سے 'غیر فطری' ہونے کی سند عطا ہوئی ہے۔ لیکن داستان کی محبوبی کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ 'غیر فطری' عناصر کا منبع و مرکز ہونے کے باوجود اس دنیا کے رہنے اور بسنے والوں سے ہماری ہمیشہ قائم رہنے والی شناسائی ہے۔ اور ہم جب ایسے ناموں کی فہرست مرتب کرنے بیٹھتے ہیں جنھیں یا تو یاد رکھنے کو جی چاہتا ہے یا یاد رکھنے پہ مجبور ہیں، جن کی کشاکش ہماری کشاکش، جن کی کامرانی ہماری کامرانی اور جن کے اسرار و رموز ہمارے اسرار و رموز ہیں تو عمر عیار اور ان کے لشکر کے بعض سپاہی، امیر حمزہ، خواجہ بدیع الجمال، ملکہ انجمن آرا، باغ و بہار کے پہلے درویش کی محبوبہ، نیشاپور کے وزیر کی حسین اور دانشمند بیٹی اس فہرست کی زینت بنتے ہیں۔ اور یہ نام وہ ہیں جو داستانوں کے سارے دفتر کا ایک سرسری سا تصوّر بغیر کسی کوشش کے نظر کے سامنے لے آتے ہیں۔ یہ کردار داستانوں کی مقبولیت کا ایک خاص پہلو ہیں۔ داستانیں انہیں کے کارناموں کے ضخیم دفتر ہیں اور ہم ان ضخیم دفتروں کو ان کے سارے بوجھ کے باوجود اس لیے پڑھتے، سنتے اور سناتے ہیں کہ یہ کارہائے نمایاں انھوں نے انجام دیئے ہیں جنھیں داستان گو اور داستان نگار کے فن نے ہماری دلچسپی کا مرکز بنایا ہے اور ہمارا جی چاہتا ہے کہ اگر ہم اور کچھ نہ کر سکیں تو کم سے کم یہ تو ضرور جان لیں کہ ان کی بامقصد زندگی کے قیمتی لمحے کس طرح بسر ہوتے ہیں، اور کس طرح وہ بڑی سے بڑی مہم کو سر کرتے اور سخت

سے سخت ہفت خواں کو طے کر کے کامرانی اور بامرادی کی منزلِ مقصود کو پہنچتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں رفعت، عظمت، مروت، انسانیت، کرم، ایثار، شجاعت، ہمت، جواںمردی اور بڑی سے بڑی مصیبت کے آگے سینہ سپر ہونے اور بالآخر مظفر و منصور ہونے کی جو صفات مجتمع ہیں ان میں انسان کو ایسے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے جو اس کی انتہائی آرزو کے باوجود حقیقت نہیں بن سکتیں ——— داستانوں کا یہ غیر معمولی اخلاقی پہلو بھی داستان کے فن کا ایک لازمی عنصر ہے اور داستان گو اس کے اظہار میں جس حد تک اعتدال و توازن قائم رکھنے میں کامیاب ہو اور جس حد تک اپنی شخصیت کو واعظ اور مصلح بننے سے محفوظ رکھ کر داستان گو کی شخصیت میں مدغم کرے اس کے کردار پڑھنے والوں کے لیے زیادہ حقیقی بنیں گے، ان سے انسیت اور لگاؤ پیدا ہوگا، اور اس طرح داستان کی چھوٹی سے چھوٹی چیز اس کے لیے کشش اور دلچسپی کا موجب ہو گی ——— اور یہی کشش اور دلچسپی ہر کہانی اور ہر داستان کے فن کا آخری پہلو ہے ——— آخری بھی اور پہلا بھی۔ داستان کی ابتدا اور اس کی انتہا فن کے اسی اصول کی پابند ہے اور داستان اپنی طوالت، اپنی غیر موزونیت، اپنے عدم توازن و اعتدال، اپنے غیر فطری عناصر، اپنے کج رو اور بے راہ رو تخیل کے باوجود دلچسپ ضرور ہیں اور اس طرح فن ایک اہم، سب سے اہم، ایک بڑا، سب سے بڑا تقاضا پورا کرتی ہیں۔

مرزا رسوا کی تنقید نگاری

ڈاکٹر محمد حسن

اردو میں ادب کی ماہیت اور اس کی فلسفیانہ توجیہہ کی طرف بہت کم نقادوں نے توجہ کی ہے۔ عام طور پر ادب کو ایک مسلمہ حقیقت سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور اس مرحلے میں بھی اس پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ اس کے رشتے ادبی روایت سے ملائے جائیں۔ اس عام میلان کے پیش نظر ایک ایسے ادیب کے تنقیدی مراسلے چونکا دینے کی حد تک جدید ہیں۔ جس کی ساری شہرت ناول نگاری کی بنا پر قائم ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا کو ادبی دنیا "امراؤ جان ادا" کے مصنف کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن وہ درحقیقت بڑی جامع صفات کے انسان تھے۔ فلسفہ ہیئت۔ علم نجوم۔ ریاضی، سائنس، الٰہیات اور اخلاق سبھی پر ان کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔

اس مختصر مقالے میں ان کے چند تنقیدی مراسلات کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ اس وقت اس قسم کے تین مراسلات میرے پیش نظر ہیں۔ یہ "مراسلہ" کے عنوان سے رسالہ "معیار" لکھنؤ کے مختلف پرچوں میں شائع ہوئے تھے اور انہیں بہت عرصے بعد مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے رسالہ "زمانہ" کانپور میں شائع کیا تھا۔

مرزا رسوا نے شعر و شاعری کے مسائل کو دوسرے تمام علوم سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ پہلے مراسلے کے پہلے پیراگراف میں اپنے مقصد کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :-

> "میرے اس خط اور دوسرے خطوں کا جو اس کے بعد لکھے جائیں گے یہ منشا ہوگا کہ علم شعر کی ان خوبیوں کو جنہیں اردو زبان کی شاعری ڈھونڈھ رہی ہے حتی الوسع بیان کر دوں۔ مگر یہ سخت مشکل ہے کہ ان امور کو سمجھنے کے لیے جنہیں میں ذکر کیا چاہتا ہوں۔ مبادی مسائل علم نفس سے واقف ہونا بہت ضروری ہے اور اس علم کی کوئی کتاب بالفعل اردو میں نہیں ہے۔ شیخ بو علی سینا کا ایک رسالہ فارسی زبان میں میرے پاس تھا اور اس کا ترجمہ بھی میں نے اردو میں لکھا تھا اور تحقیقات جدید کے موافق بعض حواشی تعلیقات اس پر زیادہ کر دیئے تھے وہ گم ہو گیا۔"

شعر کے بارے میں ایک واضح اور صاف بیان دوسرے مراسلے کی ابتدا میں ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا کی فکر پر اخلاق اور الٰہیات کا اثر غالب تھا۔ اور اسی کے پیش نظر انہوں نے مضامین کو "القائی اور الہامی" قرار دیا ہے۔ اور اخلاق سے ان کا بلا واسطہ ربط ملحوظ رکھا ہے۔

> "میں اور حیثیات سے قطع نظر کرکے صرف یہ کہتا ہوں کہ بعض اشعار اخلاق کے لیے مفید ہیں اور بعض مضر۔ مثلاً وہ اشعار جن میں اخلاقی مضامین ہوں۔ وہ قسم حُسن میں داخل ہیں۔ اور جن میں نفس پرستی کے مضامین ہوں وہ قبیح ہیں۔ لیکن ہمارے اور ہمارے بعض معاصرین کے بعض اشعار (بلکہ ہمارے اکثر اشعار) ان دونوں صفتوں سے معریٰ ہیں۔ نہ ان میں کوئی حُسن ہے نہ قبح۔ . . . ایسے شعر کہنا ایک فعل عبث ہے۔"

شاعری کا ملکہ اکثر خداداد قرار دیا گیا ہے۔ حالیؔ تک نے اسے اکتسابی سے زیادہ وہبی بتایا ہے۔ مرزا رسوا نے اس بات میں بھی ایک دل چسپ بات کہی ہے۔ مضامین کو "القائی اور الہامی" مانتے ہوئے اور موزونیت کو خداداد صلاحیت تسلیم کرنے پر بھی وہ اس بات کے قائل ہیں کہ موزونیت کی اوسط استعداد عام طور پر سارے انسانوں میں پائی جاتی ہے:

> "فطرت نے ہر انسان کو اواسط استعدادات عطا کیے ہیں۔ فطرت کے قواعد کلیہ میں اتفاقات و عوارض کو بہت کم دخل ہے۔ حدِ خاص سے زیادہ خوبصورت اور حدِ خاص سے زیادہ بدصورت بمشکل مل سکتے ہیں۔ . . . . اگر فطرت نے کسی کو موزوں طبع نہیں پیدا کیا تو وہ شعر موزوں کہنا کیسا موزوں پڑھ نہیں سکتا۔ مگر ایسے ناموزوں طبیعت والے مشکل سے ملیں گے لہٰذا اوسط درجہ کے دماغ والے اکثر موزوں طبع بھی ہوا کرتے ہیں۔"

اُردو تنقید میں مذاقِ سلیم کی ایک منطقی بنیاد قائم کرنے کی یہ ایک ابتدائی کوشش ہے۔ مرزا رسوا نے اس کی توجیہ میں ملکی اور عصری اثرات کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اور جہاں فطرت کے خداداد عطیے موزونیت کا ذکر کیا ہے۔ وہیں یہ بھی صراحت کر دی ہے کہ:۔

> " . . . . ملک، مزاج اور عادت کو بھی اس امر میں بہت کچھ لگاؤ ہے۔ فطرت نے ہر ملک کے مناسب ایک صورت خاص اور ایک طبیعت مخصوص ہر باشندہ کو عنایت کی ہے۔"

مذاقِ سلیم کی ماہیت، اس کے نشوونما اور تاریخی ارتقا پر مرزا رسوا نے تفصیلی بحث نہیں کی ہے۔ لیکن اوسط درجے کی موزونیت کو قومی مزاج کی خصوصیت قرار دے کر گویا انہوں نے شاعر کو غیر معمولی طور پر اور خداداد موزوں طبع قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ملک اور قوم کے مزاج کا آئینہ دار بتایا ہے۔ اس طرح شاعر اور غیر شاعر میں مرزا رسوا کے نزدیک بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں موزوں طبع ہوتے ہیں۔ ہاں ایک کی موزوں طبعی اوسط درجہ کی ہوتی ہے اور دوسرے کی زیادہ ترقی یافتہ۔

موزوں طبعی کی اس ترقی یافتہ شکل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ مرزا رسوا نے اسے "ابتدائی درستی" قرار دیا ہے۔ اور اس نہج سے ان کا نظریہ قدیم استادی و شاگردی کے ادارے تک پہنچ سکتا ہے۔ موسیقی کی مثال پیش کرکے کہتے ہیں۔

> "اکثر استعدادات بہ سبب عدم مزاولت کے ضائع ہو جاتے ہیں یا بہ سبب عدم علم کے ابتداءً خراب ہو کر درستی کے قابل نہیں رہتی۔ جو لوگ ابتدا میں کسی کامل اُستاد سے موسیقی حاصل نہیں کرتے۔ اور ابتدا ہی میں سرہیورہ ٹھیک نہیں کر لیتے ان کو بد آواز اور بے اصول گانے کی مشق ہو جاتی ہے لہٰذا

> ہر مبتدی کو اپنی ابتدائی درستی کا خیال نہایت ضروری ہے۔ اگر ابتدا ہی میں خراب ہو گئی تو استادِ کامل کی کوششوں سے بھی کوئی اثر مترتب نہ ہوگا۔"

مرزا نے خلافِ توقع اس کی مثال لکھنؤ کے عام طرزِ شاعری سے دی ہے اور اس بے روح صنعت گری سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے۔ جو لکھنؤ میں شاعری کی بنیاد سمجھی جانے لگی تھی:

> "مثلاً ہمارے شہر کے اکثر شعرا اور ان کے تلامذہ کو مناسباتِ الفاظ کا لحاظ حد سے زیادہ ہے اگرچہ یہ ایک صنعتِ شعری ہے اور محسناتِ کلام میں داخل ہے۔ مگر اب سلیقہ شعرا اس کو عیوبِ شعر میں شمار کرنے لگا ہے۔ اور اس بدعادت کا اثر اس قدر شائع و ذائع ہو گیا ہے کہ اب اس کا ترک من قبیلِ محالات سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح بعض تشبیہات جو کسی اگلے استاد نے کسی موقع پہ نظم کر دی تھیں ان کی اب اس کثرت سے جگالی کی گئی ہے۔ کہ سننے والوں کو ان سے نفرت ہو گئی۔"

اس بحث کو مرزا نے ایک دوسرے موضوع سے وابستہ کر دیا ہے۔ انہوں نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ تشبیہ اور استعارہ کے استعمال میں روایت اور تجربہ کا حصّہ کیا ہونا چاہیئے۔ آیا شاعر کو آزمودہ کار تشبیہیں استعمال کرنی چاہئیں یا تجربہ اور براہِ راست مشاہدے سے نئی تشبیہوں کی تشکیل کرنی چاہیئے۔ یہیں مرزا رسوا نے ایک دوسرا سوال یہ قائم کیا ہے کہ انسانی ذہن کو تشبیہ و استعارے سے کیوں لذت حاصل ہوتی ہے۔

> "ان امور میں صرفِ قوت باعثِ لذت ہے۔ یعنی قائل کا قول سامع کے لیئے صرفِ قوت کا باعث ہوتا ہے۔ قوت سے یہاں قوتِ ذہنی مراد ہے۔ توجیہہ مزید اس کی یہ ہے کہ انسان میں دو سبب لذت کے ہیں (۱) استعمال قویٰ بحالتِ صحت (۲) ارتفاعِ الم اور وہی استعمال قویٰ ایک حدِ خاص سے متجاوز کرنے کے بعد موجبِ الم ہو جایا کرتا ہے . . . ."

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "تشبیہاتِ غریب و بعید کے سننے کے بعد سامع کو قوتِ فکر کے استعمال کا موقع ملتا ہے۔ اور یہی موجبِ لذت ہوتا ہے۔ تشبیہ کی ندرت ایک استعجابِ خاص کا باعث ہوتی ہے اور استعجاب خود ایک فعلیتِ دماغی کا نام ہے۔ کیونکہ اس صورت میں دماغ کے ان مرکزوں تک اثر پہنچتا ہے۔ جو ایک مدت سے بیکار پڑے تھے۔ تشبیہات قریب و مبتذل میں نہ استعمالِ قوت کا موقع ملتا ہے نہ وہ باعثِ استعجاب ہیں اس لیے ان میں کسی قسم کی لذت نہیں ہے۔"

مرزا نے اس منزل میں بھی اعتدال پر زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک تشبیہ صرف اسی وقت مسرت بخش ہو سکتی ہے۔ جب قوتِ فکر کو حدِ اعتدال سے زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔ اگر اس کی نازک خیالی ابہام، دقتِ مضمون اور معنی بندی کے مراحل تک پہنچ جائے گی تو اس کی لذت ختم ہو جائے گی۔ اور بجائے انبساط کے انقباض کا باعث ہوتی ہے۔

> "بعض صاحب معنی بند شعر کہتے ہیں۔ ایسے لوگ دہلی میں بہت تھے۔ جن کے ہر شعر کو سمجھنے کے لیے قوتِ فکر کو حد اعتدال سے زیادہ محنت کرنا ہوتی تھی ...... دماغ کے پردے بہت ہی نازک ہیں۔ ان کی لذت کے لیے نازک خیالیوں کی ضرورت ہے۔ نازک خیالی اور دقتِ مضمون دو امر جداگانہ ہیں۔ ایک کے دھوکے سے دوسرے کو اختیار کر لینا بڑی غلطی ہے۔"

نئی تشبیہوں کی تلاش کے لیے مرزا رسوا نے ادبیات اور مطالعۂ کائنات سے پیدا ہونے والے دوسرے تمام علوم کا ربط قائم کیا ہے ۔ اور یہ ربط محض نادر تشبیہوں کی تلاش کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ اسی ربط کی بنا پر شعر کو دوسرے تمام علوم کے پہلو بہ پہلو دکھا جا سکتا ہے اور شعور کے اعلیٰ ترین مدارج میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ مرزا رسوا نے تقلیدی اور کتابی شاعری پر سخت الفاظ میں تنقید کی ہے اور فطرت سے جس وابستگی کا مشورہ دیا ہے وہ ایک معنی میں حالی کی نیچرل شاعری کے تصور سے بھی زیادہ جچتی ہے۔ اردو شاعری کے عام تقلیدی لہجے کے بارے میں لکھتے ہیں،

> "جس قسم کے اشعار آج کل ہمارے گلدستوں میں شائع ہوتے ہیں۔ کیا وہ "شاعری جزویست از پیغمبری" کے مصداق ہو سکتے ہیں۔ واللہ ایسا نہیں ہے اس کا ایک سبب کم علمی ہے۔ علم سے میری مراد بہت سی کتابیں پڑھ لینا یا کم از کم سلسلۂ نظامیہ کو کسی نہ کسی طور سے تمام کر لینا نہیں ہے عقل اور فطرت تحصیلِ علم کے لیے کافی ہے مگر عقل سے کام لینا اور فطرت میں تصرف کرنا کسی قدر محنت چاہتا ہے اور اس کی ہمیں فرصت نہیں۔
>
> جس قدر مضامین پیش پا افتادہ تھے۔ ان کو اگلے کہہ گئے اب ہماری استادی صرف اس سے استنباط کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اور اگر اس کا سلیقہ بھی ہم کو نہیں تو ان کو اور خراب کرتے ہیں۔ ہماری شاعری سماعی اور کتابی ہے نہ نظری۔ ہم خود فطرت کا مشاہدہ کر کے غور کرنے اور کتاب فطرت سے مضامین پیدا کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اگلوں کے مضامین کو اپنے لفظوں میں دہرا دینا ہمارا خاص کام ہے اور اس پر ہمیں فخر ہے۔"

اس تقلیدی روش اور استعارہ در استعارہ خیال بندی پر حالی نے بھی "مقدمۂ شعر و شاعری" میں سخت تنقید کی ہے۔ مگر اس کا حل ان کے نزدیک اخلاقی شاعری اور نیچرل مضامین کی فراہمی تھا۔ مرزا رسوا نے اس مسئلے کو پورے علمی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا کے نزدیک اخلاق کا تصور محدود نہیں تھا۔ اور شاعری کو وہ محض جذباتی ابال نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے شعور کا ایک برگزیدہ شعبہ گردانتے تھے۔ دوسرے رسالے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "علم طبیعات[1] ، الٰہیات[2] اور شعر[3] —— بظاہر ان کے مقاصد جدا جدا ہیں اور شاعر کو حکیم سے اوّل مرتبہ پر رکھا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حکیم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کو شاعر نازک خیال انجام دے سکتا ہے۔ فطرت سے دقیق مضامین کو اخذ کرنا اور اس کو عام فہم اور مؤثر الفاظ میں کہہ جانا خاص شاعر ہی کا کام ہے اور کسی سے نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے زیادہ ترقی کر کے کہتا ہوں۔

> کہ حقائق اور معارف کو جس پیرائے سے شاعر ادا سکتا ہے فلسفی کی مجال نہیں کہ اسے بیان کر سکے۔ خیال کے آئینہ خانہ میں عالم جبروت کی جھلک نظر آتی ہے۔ پیاری پیاری صورتیں مجسم ہوتی ہیں اور صورت و حرف کے ذریعے سے سامع تک پہنچتی ہیں "

شاعر اور حکیم کو مرزا رسوا نے ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ بلکہ شاعر کا مرتبہ حکیم اور فلسفی سے بہت کچھ زیادہ بتایا ہے آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

> "شاعری کی وسعت مثل صنعت عالم کے لا متناہی ہے۔ اس کی جولانگاہ فلسفہ کی حد رسائی سے کہیں آگے ہے۔ جن امور کو فلسفہ نے اب ثابت کیا ہے۔ شاعروں کی تخیل کئی قرن پہلے ان کو پا چکی ہے۔ شاعر اعلیٰ رموز حکمت کو اس طرز دلآویز سے کہہ جاتے ہیں۔ کہ فلسفی کو ان کے بیان کرنے کے لیے بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں"

اس اعتبار سے مرزا رسوا کا نظریۂ ادب اخلاقی یا فطرت پرستانہ سے کہیں زیادہ نفسیاتی معلوم ہوتا ہے۔ جو اس زمانے کے عام چلن کے پیش نظر کافی تعجب خیز بات ہے۔ پہلے ہی مراسلے میں مرزا رسوا نے علم النفس کی عام اصطلاحوں سے بحث کی ہے اور نہ صرف ان کے معنی اور مفہوم کو احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کو تنقید شعر اور نظریۂ ادب کے سلسلے میں استعمال کیا ہے :

> "...... ایسی چیزوں کو جو بذریعہ کسی حاسہ کے معلوم ہوں، محسوس کہتے ہیں۔ ذہن کے اس فعل کو جس سے محسوس کا علم ہوا ہے احساس کہتے ہیں۔ احساس کی تعریف یہ ہوئی، احساس مراد ہے۔ اس اثر کے شعور سے جو کہ نظام آلی پر کسی موثر کی تاثیر سے حادث ہوتا ہے "
>
> "...... احساس کے لیے شے محسوس کا حاضر ہونا شرط ہے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شے کی صرف ایک ہی صفت کا ہمیں احساس ہوتا ہے اور سب صفتیں ہم کو یاد آ جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ بالفعل غائب ہوں ...... یا ایک ہی حاسہ کے محسوس نے اسی حاسے کی ویسی ہی محسوس کو یاد دلا دیا ...... (یا) ایک حاسے کے محسوس نے دوسرے حواس کے محسوسات کو یاد دلا دیا"

اس کے بعد لزوم ذہنی کے قوانین سے بحث کرتے ہیں۔ اور قانون مماثلت اور "قانون مقارنت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کہ اکثر چیزیں جو یا تو ایک دوسرے کے مماثل ہونے کی وجہ سے یاد آتی ہیں۔ یا ایک ہی وقت میں ایک ہی ساتھ مشاہدہ میں آنے کی وجہ سے یاد آجاتی ہیں۔ خواہ وہ مماثل ہوں یا نہ ہوں۔

پھر ہر احساس کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں :۔

> " (۱) شعور محض (۲) اس احساس سے خاص لذت یا الم کا حاصل ہونا (جسے آگے چل کر مرزا رسوا نے وجدان کہا ہے) (۳) وہ احساس کسی خاص تحریک کا باعث ہو راسے مرزا نے ارادہ سے

> تعبیر کیا ہے، مثلاً گلاب کے پھول کو دیکھنے سے ایک تو یہ علم ہوا کہ اس کا رنگ ایسا شکل ایسی اور خوشبو ایسی ہے۔ یہ شعور محض ہے۔ دوسری یہ کہ گلاب کا رنگ اور شکل کے دیکھنے سے یا خوشبو کے سونگھنے سے ہم کو مسرت حاصل ہوئی یا مثلاً اس کا کانٹا چبھ جانے سے ہمیں الم ہوا۔ یا وہ لذت اس حد تک پہنچی کہ گلاب کے پھول کو توڑنے کا ہمیں شوق ہوا۔ چنانچہ ہم نے اسے توڑنے کا قصد کر کے اسے توڑ لیا۔ اور کانٹے کے چبھ جانے سے جو الم ہوا تھا اس لیے اس سے بچتے رہے"

پھر شعور کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کو بھی مختلف مدارج میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے درجے کا نام ادراک قرار دیا ہے اور اس کی تعریف اس طرح کی ہے: "یعنی کسی چیز کے مجموعۂ صفات کے احساسات سے اس چیز کو شناخت کرنا" دوسرا درجہ تعمیم کا ہے یعنی "چیزوں میں عموم اور خصوص کی نسبتوں کا قائم کرنا۔ صنف نوع اور جنس کا قرار دینا مثلاً ایک خاص طرح کی شکل اور رنگ اور خوشبو کے اعتبار سے گلاب ایک نام رکھ لیا۔ یا ایسی بہت سی چیزیں کہ اگرچہ ان کی رنگت اور شکلوں میں اختلاف ہے مگر بعض اوضاع خاص کی وجہ سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو پھول کہتے ہیں"

تیسرے درجے کو استدلال بتایا ہے جو "جزئیات سے کلی اور کلیات سے جزئی پر خاص حکم لگانے" کا نام ہے۔ اس استدلال کے بھی مختلف زاویے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً زید فانی ہے، عمر فانی ہے، بکر فانی ہے، خالد فانی ہے۔ لہٰذا انسان فانی ہے یا مثلاً کل انسان فانی ہیں۔ زید انسان ہے لہٰذا زید فانی ہے۔ پہلی صورت کو استقرا اور دوسری کو قیاس قرار دیا ہے۔ چوتھے تمثیل جو "ایک قسم کے مجموعۂ صفات کو بنا ایک فرد میں تجویز کر لینے" کا نام ہے اس تمثیل کو بھی مرزا رسوا نے دو صورتوں میں تقسیم کر دیا ہے "ایک یہ کہ جو صورتیں کبھی عندالذہن حاضر تھیں ان کو پھر ذہن کے سامنے لانا" دوسری "نئی صورتیں جو عالم خارجی میں موجود ہی نہ ہوں ان کو ایجاد کرنا"

یہ تمثیل دراصل فن کی بنیاد ٹھہرتی ہے۔ مرزا رسوا نے ایک اصطلاح کے تفصیلی تذکرے کے بعد یہ صراحت کی ہے:

> "بعض لوگوں کو یہ خیال ہو گا کہ تمثیل خواہ مخواہ ایک جدید اصطلاح ایجاد کی گئی ہے۔ حقیقتاً یہ وہی ہے جس کو تخیل کہتے ہیں اور محاکات[1] اور اختراع[2] اس کی دو قسمیں ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ تخیل ایک شرط ذہن کی ہے۔ جس کا نزول ابتدائے نشوونما سے ہوتا ہے اور جس پر وہ دو قانون "تذکر اور تقابل" کے قائم کیے گئے۔ جن کا ذکر سابقاً ہو چکا ہے۔ اور تمثیل کا ظہور ذہنی ترقی کا آخری درجہ ہے۔ جس سے اکثر اذہان بہت ہی کم بہرہ یاب ہوتے ہیں"

ہمارے تنقیدی ادب میں تخیل کے لفظ کو کافی بے پروائی سے استعمال کیا جاتا رہا ہے انگلستان میں (FANCY) اور (IMAGINATION) کی توجیہ و تعریف میں کافی بحثیں ہو چکی ہیں۔ اڈیسن، برک، کولرج کے مختلف تصورات نے ان دونوں الفاظ کو واضح طور پر الگ الگ کر کے پیش کیا ہے اور تخیل کو ایک ایسی تخلیقی قوت قرار دیا ہے جو صرف عالم خارجی میں موجود اشیاء پہلے حاصل کیے ہوئے مشاہدات کی مرہون منت نہیں بلکہ خود اپنی کائنات کی تخلیق کر سکتی ہے۔ ہمارے ادب میں غالباً مرزا رسوا پہلے تنقید نگار ہیں۔

جنہوں نے تخیل اور تمثیل کے اس فرق کو نمایاں کیا ہے۔ اور اس طرح اس کی فلسفیانہ توجیہہ کی ہے۔ آگے چل کر محاکات اور تمثیل کے فرق کو بیان کرتے ہیں :

> "اگر تمثیل کے اور اس کی دونوں قسموں کے ساتھ ساتھ لفظ شاعرانہ استعمال کر کے ہم شاعرانہ تمثیل، شاعرانہ محاکات اور شاعرانہ اختراع کہیں تو ہمارے مطلب کے لیے مفید ہو سکتا ہے محاکات وہ حالت ذہن کی ہے جب کہ وہ چیزیں جو کبھی عندالذہن حاضر تھیں ان کی صورتیں جو خزانۂ حفظ میں موجود ہیں۔ پھر ذہن کے سامنے آجائیں اس کو استرجاع کہتے ہیں۔ [جس کو ورڈز ورتھ نے (EMOTION RECOLLECTED IN TRANQUILITY) کہا ہے۔ م۔ح] اس کی دو قسمیں ہیں (۱) غیر ارادی (۲) ارادی اور باعتبار ان کے مدت تک ذہن کے سامنے حاضر رہنے کے استحضار کہتے ہیں۔ اور یہ بھی یا ارادی یا غیر ارادی۔ شاعرانہ محاکات کے لیے انتخاب کا سلیقہ چاہیے۔ تاکہ الفاظ کے ذریعے سے ان کا بیان کیا جائے تو وہ عندالسامع مقبول ہو یا موجب کسی قبض و بسط کا ہو۔"

یہاں قبض اور بسط کی تشریح طلب اصطلاحات کو بھی مرزا نے واضح کیا ہے۔ قبض ان کے نزدیک وہ حالت وجدانی ہے جو الم کے مشابہ ہے اور مضر اثرات سے دور رہنے یا ان کو دفع کرنے کی آمادگی ذہن میں پیدا کرتی ہے۔ جس طرح آنکھ میں کوئی ذرہ پڑنے کا خطرہ ہو تو یکایک پلک جھپک جاتی ہے۔ اسی طرح قبض کی حالت میں انسان اپنے کو ناخوش گوار صورت حال سے محفوظ کر لیتا ہے۔ اور نفسیاتی طور پر پیش بندی کر لیتا ہے۔ بسط ان کے نزدیک لذت یابی کی حالت ہے اور لذات سے متمتع ہونے کے شوق کا باعث ہوتی ہے۔ محاکات، تمثیل اور تخیل کے اس نازک فرق کو سمجھنے اور بیان کرنے سے مرزا رسوا کے تنقیدی مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے لکھتے ہیں :۔

> "محاکات محض واقعہ نویسی یا مورخ کے لیے زیادہ مفید ہے۔ نہ کہ شاعر کے لیے، اختراع صرف شاعر کا حصہ ہے۔"

تمثیل کو مرزا نے شعور، وجدان اور ارادہ کے اعتبار سے تین حیثیتوں سے پیش کیا ہے (۱) وہ جن کا تعلق شعور سے ہے (۲) جن کا تعلق وجدان سے ہے (۳) جن کا تعلق ارادہ سے ہے اور جب ان کے اجتماع کو عقل ایک فرد واحد میں پیش کرتی ہے تو اس سے ایک مثالیہ کا ظہور ہوتا ہے جسے کمال کہتے ہیں۔ اس طرح مرزا رسوا نے حسن، افادیت اور حقیقت تینوں اجزا کو ایک وحدت میں پرونے کی کوشش کی ہے اور اس طرح وہ تقریباً افلاطونی تصور تک پہنچتے ہیں۔ جس نے مغرب اور مشرق میں تنقید جمال کے سارے نظریات کو متاثر کیا ہے لکھتے ہیں۔

> "وہ ذاتِ مقدس جس میں یہ صفاتِ کمالیہ پائے جاتے ہیں۔ حق الحق[1]۔ جمیل لذاتہ[2]، خیر مطلق اور غایت الغایات ہے۔ مثالیہ اوّل یعنی حق موضوع فلسفۂ الوجود کا ہے۔ جمال موضوع علم ذوقیات کا ہے۔ خیر موضوع علم اخلاق کا اور تصوّر باری تعالیٰ عزاسمہٗ موضوع الہیات کا ہے۔ حقیقت

> نفس الامری سے وہ امر مراد ہے۔ جس کی موجودگی کو عقل خارج میں تجویز کرتی ہے نہ صرف ذہن میں بخلاف امر ذہنی کے جس کا وجود صرف ذہن میں ہے خارج میں نہیں ہے۔"

یہیں مرزا رسوا کے تصور جمال کے بارے میں چند اقتباسات پیش کرنا ضروری ہے۔ کانٹ نے جمالیات کی بنیاد PURPOSIVENESS WITHOUT PURPOSR. یعنی بغیر (روزی) افادیت کے کسی شے میں مقصد کے پائے جانے کو قرار دیا تھا اس پہلو کو مرزا نے بھی ملحوظ رکھا ہے:

> "جمیل سے مرغوب لذاتہ مقصود ہے۔ نہ وہ جس کو ہم کسی غرض سے دوست رکھیں جس کے حصول کا وہ واسطہ ٹھہرے بلکہ اس کا حصول عین مراد ہے۔"

یعنی بنیادی طور پر حسن اپنا مقصد آپ ہے۔ وہ کسی دوسرے مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں ہے یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے دوسرے مقاصد بھی حاصل ہوتے ہوں۔ لیکن وہ ضمنی اور ثانوی ہوں گے۔ اصلی اور بنیادی نہ ہوں گے بقول مرزا رسوا:۔

> "ممکن ہے کہ امر جمیل نافع بھی ہو یعنی کسی غرض ادنیٰ یا اعلیٰ سے اس کا حصول مطلوب ہو مگر جس حیثیت سے کہ وہ واسطہ کسی غرض کا ہے۔ اس حد میں داخل نہیں مرغوب لذاتہ کی ایک بہت عمدہ مثال بچوں کے کھیل سے مل سکتی ہے اس لیئے کہ اس سے ان کی کوئی غرض شخصی نوعی نہیں ہوا کرتی۔ یہی کھیل کا شوق جو بچوں میں پایا جاتا ہے۔ ترقی کرتے کرتے اس حد تک پہنچ گیا ہے۔ جس سے بت تراشی۔ مصوری۔ طراحی۔ موسیقی، شعر ایسے ایسے فنونِ لطیفہ نکل آئے ہیں۔ بچوں کے کھیل اور کھلونے بہت ہی سیدھے سادے ہوتے ہیں اور بڑھوں نے اپنے کھیلوں میں طرح طرح کی پیچیدگیاں اور لطافتیں پیدا کر لی ہیں۔ چشم حقیقت بیں کے نزدیک اصل دونوں کی ایک ہی ہے۔"

کھیل اور فن میں فلسفیانہ مماثلت کا تصور یورپ میں شلر کی تصانیف کے بعد عام ہوا ہے۔ ہمارے تنقیدی ادب میں اس تصور کو انصاف اور پوری شرح و بسط کے ساتھ پیش بھی نہیں کیا گیا۔ گو حالی نے مقدمہ شعر و شاعری کے پہلے یا دوسرے صفحے پر اس شخص کو بھی سماجی طور پر مفید بتایا ہے۔ جو ایک ویران پہاڑی پر بیٹھا اپنی دھن میں مست ہو کر بانسری بجا رہا ہے۔ لیکن بعد میں خود وہ بھی افادیت اور اخلاق کی پابندی میں بُری طرح گھر کر رہ گئے۔ مرزا رسوا کا تصور ان سے ذرا مختلف ہے۔ گو وہ بھی اخلاق اور فطرت پرستی کے قائل ہیں۔ ان کا دائرہ زیادہ وسیع اور فلسفیانہ طور پر زیادہ مابعد الطبیعاتی ہے۔ جمالیات کے سلسلے میں مرزا نے صاف طور پر لکھا ہے:۔

> "فنون لطیفہ کے مقابل وہ فن ہیں جن کو نافعہ کہنا چاہیئے۔ مثلاً فن میکانات (کلیں بنانے کا فن) کے ذریعے سے وہ چیزیں بنائی گئی ہیں۔ جو انسان کی بقا اور ترقی شخصی اور نوعی کے لیئے مفید ہیں۔"

لیکن یہ تضاد مرزا کے نزدیک مکمل اور قطعی نہیں ہے۔ جمالیات اور افادیت میں کوئی ایسا بیر نہیں ہے کہ دونوں ایک شے میں جمع نہ ہو سکیں۔ ہاں یہ مسئلہ ضرور قابل غور ہے کہ ادبیات میں کسی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگی۔ اور کس کو ثانوی۔ حسن اور افادیت یکجا

ہو سکتے ہیں۔ اور ان کو یک جا کرنا ہی فن کی سب سے بڑی منزل ہے:۔

> "کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جمال اور نفع دونوں صفتیں ایک ہی شے میں جمع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک خوبصورت جیبی گھڑی ایسی چیزیں عند الذوق و نیز عند العقل مستحسن ہیں۔"
>
> ہر صاحب فن کی غرض یہ ہونی چاہیئے کہ اس کی ایجاد میں دونوں صفتیں پائی جائیں مگر ایسا نہ ہو کہ ایک کی رعایت سے دوسرا ناقص رہ جائے۔ ہر ایک صاحب فن کی مراعات لازم ہے اگر اس سے دوسرا مطلب بھی نکل آئے تو فہو المراد۔ مثلاً شاعر کا مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ اس کا شعر اصول سے درست ہو۔ اس میں کوئی ذاتی خوبی ہو پھر اگر اس سے کوئی نصیحت بھی نکلتی ہے تو سبحان اللہ ورنہ نصیحت گری کو ناصح مشفق کے حوالے کرے اور خود بزم شعرا میں اپنی عزت بچانے کے لیے شعر عمدہ کہے۔"

اس کے بعد مرزا نے فنون لطیفہ کی تقسیم ان کے ذرائع اظہار کے اعتبار سے کی ہے۔ بت تراشی۔ طراحی اور مصوری کو پہلی قسم میں شمار کیا ہے۔ کہ ان کا تعلق دیکھنے سے ہے۔ اور ان میں شکل اور رنگ سے کام لیا جاتا ہے۔ دوسری قسم میں موسیقی کو گنا ہے۔ جس کا تعلق حسن سمع سے ہے اور لے آواز اور سُر سے کام لیا جاتا ہے۔ تیسری قسم فنونِ ادبیہ کی قرار دی ہے۔ جس کا تعلق نہ دیکھنے سے ہے نہ سننے سے بلکہ تخیل سے ہے اور جس کے اظہار کا ذریعہ الفاظ ہیں۔ مرزا نے فنون ادبیہ کے لیے شعر کی اصطلاح استعمال کرنے کا مشورہ دیا "لیکن اسے کلام منظوم کے لیے بولتے ہیں۔ لہٰذا خوف التباس سے" شعر کی بجائے فنون ادبیہ کی ہمہ گیر اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک شعر کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ وہ الفاظ کے ذریعے شعور اور وجدان کو متاثر کرے اور قبض و بسط کا موجب ہو۔

بنیادی طور پر مرزا کا تصورِ فن اخلاقی سے زیادہ نفسیاتی معلوم ہوتا ہے۔ وہ قبض و بسط کو ایسی ذہنی کیفیات کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ جن سے غلط اور اخلاقی طور پر بُرے کاموں سے احتراز کا مادہ پیدا ہو اور زندگی کی صحیح نعمتوں سے لذت یابی کی صلاحیت حاصل ہو۔ اس لحاظ سے ادب ان کے نزدیک ترجیحات (PREFERENCES) کا ایک موزوں اور مناسب سلسلہ پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ انسان میں قدر۔ دل کی ایک ایسی ترتیب پیدا کرنے کی کوشش ہے جو اچھی چیزوں کی طرف راغب کرے اور بُری باتوں سے روکے اور یہ کوشش بنیادی طور پر ترغیبی یا خارجی سے زیادہ نفسیاتی اور داخلی ہی ہو سکتی ہے۔

شعر کی یہ بنیادی تعریف کرنے کے بعد وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کہ فنون ادبیہ میں ضمناً اور "اغراض عمدہ" بھی شامل ہیں۔ مثلاً "حکایت، توجیہہ، استدلال، موعظت۔ اس صورت میں چاہیئے کہ مصنف ترتیب مقدمات میں ایسی لیاقت اور سلیقہ کو صرف کرے جس سے اس کی تصنیف ان دونوں غرضوں کے لیے بدرجۂ اتم و اکمل مفید ہو۔" اس کی مثال انہوں نے تاریخ اور سائنس سے دی ہے اور بتایا ہے کہ فنون ادبیہ میں جو قوت اظہار سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی ہے وہی دوسرے علوم میں بھی کام دیتی ہے۔

> "اگر کوئی مؤرخ کسی واقعہ تاریخی کو اس طرح بیان کرے جس سے سامع یا ناظر کی تخیل میں ہو بہو تصویریں کھنچ جائیں یا کوئی حکیم کسی قانونِ فطرت کی توجیہہ اس صورت سے کرے کہ ہر جزی میں ہمیں اس کے آثار نظر آجائیں تو کہا جائے گا کہ وہ بیان اور توجیہہ دونوں غرضوں یعنی غرض علمی اور

> غرضِ شعری) کے لیے بدرجۂ اتم و اکمل مفید ہے۔ وہ علم جو بہت ہی خشک خیال کیے جاتے ہیں مثلاً ریاضی (اور) منطق ان کے بیان میں بھی اگر سلیقۂ شعری سے کام لیں۔ تو سامع اور ناظر اس سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ غرضِ علمی بھی بخوبی حاصل ہوتی ہے بلکہ اس سے ایک قسم کی مدد بھی ملتی ہے۔“

یہاں سلیقۂ شعری کو اظہار بیان کا جوہر قرار دیا گیا ہے اور اس سلیقۂ شعری میں تخیل کے مناسب استعمال اور الفاظ کے ذریعے کسی واقعہ کی تصویر کھینچ دینے کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن مرزا نے ادبیات میں محاکات کے استعمال کو دوسرے فنونِ لطیفہ کی محاکات سے ممتاز کیا ہے وہ شاعری اور مصوری کے فرق کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور ان کے ذرائع اظہار کے فرق کو بھی۔

> ”فنونِ ادبیہ جملہ احساسات بلکہ جمیع وجدانیات و عقلیات کے استعمال پر بشرطیکہ وہ بذریعہ لفظ و عبارت کے ادا ہو سکیں قادر ہیں اگرچہ ادیب مصور کی طرح کسی چیز کی رنگت اور شکل آنکھ سے نہیں دکھا سکتا نہ خوش آئند سُر کانوں تک پہنچا سکتا ہے لیکن وہ الفاظ کے ذریعے سے ہر چیز کی صورت صفحۂ تخیل پر کھینچ سکتا ہے نہ صرف ایک رُخ سے بلکہ مختلف رُخوں سے اور یہ ذہنی تصویر بہ نسبت جسمانی تصویر کے زیادہ تر پائدار ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تالیف سے نہ صرف نظم بلکہ نثر میں بھی اصول موسیقی کا مزا پیدا کر سکتا ہے اور لطف یہ کہ ایسی حالت میں کسی اشکالِ تاریخی یا مسئلہ حکمی کا ثبوت اور حل بھی دیا جائے گا۔ جو اس کی غرض خاص ہے۔“

ارسطو نے تاریخ اور ادبیات کے فرق کی کافی الفاظ میں صراحت کی ہے۔ مرزا نے اس فرق کو ایک اور پہلو یعنی محاکات کے استعمال کو پیش کیا ہے اور جس طرح دونوں محاکات کو مختلف طریقے پر اور مختلف انداز سے استعمال کرتے ہیں۔ اس کو پیش نظر رکھا ہے ایک کا مقصد حقیقت کے تابع ہے دوسرے کا مقصد اختراع ہے ایک ترجمان ہے اور دوسرا خالق۔

> ”اگرچہ شاعر بھی واقعات کی ہو بہو تصویر کھینچنے میں محاکات سے بہت کام لیتا ہے۔ لیکن اس کے حسن کا تعلق خاص اختراع سے ہے۔ بخلاف مورخ کے جس کا تعلق محاکات سے ہے۔ جب شاعر محاکات سے کام لیتا ہے اس وقت بھی اختراع سے باز نہیں رہتا اس لیے کہ شاعر کی نظر اکثر مرغوب لذاتہ اور جمیل کی طرف رہتی ہے۔ لہٰذا اس کو انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً جب اسے کسی واقعے کی تفصیل بیان کرنا ہے تو وہ عدالت کے گواہوں کی طرح ہر جزئی ذکر کا پابند نہ رہے گا۔ بلکہ صرف ان امور کو انتخاب کرے گا جو اس کے مطلب کے لیے مفید ہوں۔“

یہاں اس عملی تنقید کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ جو اس ضمن میں مرزا رسوا نے مختلف اردو اساتذہ کے اشعار پر کی ہے ظاہر ہے کہ اس سے ان کا مقصد ان کے کلام پر اجمالی تبصرہ کرنا نہیں ہے اور جو اشعار انہوں نے منتخب کیے ہیں وہ صرف زیرِ بحث موضوع پر اپنے خیالات کی وضاحت کرنے کے لیے چن لیے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کے تنقیدی زاویۂ نظر کی غمازی عملی تنقید سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر محاکات کے ضمن میں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شعر سے جو تصور قائم ہو یا فضا تعمیر ہو وہ جمالیاتی طور پر خوش گوار اور آسودگی بخش ہو اس

میں ناگواری اور کراہت کا پہلو پیدا نہ ہو۔ لہٰذا جب شاعر یا ادیب کسی واقعے یا مضمون کو بیان کرنے کے لیے اس کے نمائندہ گوشے چن لیتا ہے اور چند مخصوص زاویوں سے اس کو پیش کرنا چاہتا ہے تو اس انتخاب میں خوش گوار اور جمیل پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ایسے تمام گوشوں کو ترک کرنا چاہیئے جو بقول ان کے مضر یا غیر مفید ہیں اور بسط و قبض دونوں کے لیے معاون ثابت نہیں ہوتے اور انقباض کا باعث ہوتے ہیں عملی تنقید میں وہ اس بات کو ایک کلیے کی حیثیت دے دیتے ہیں:۔

"ہم اس موقعہ پر ایک بہت ہی سہل قانون امور مکروہ سے احتراز کرنے کے لیے تحریر کیے
دیتے ہیں۔ اگر اسے یاد رکھیں گے تو شعرا اپنے مقصود میں عمدہ ہوگا وہ قانون یہ ہے ہر ایک
شعر کے ماحصل پر غور کر کے دریافت کریں کہ اس سے کس قسم کی تصویر ذہن میں پیدا ہوتی ہے
اگر اس تصویر کے اجزا یا لزومات قریبہ میں کوئی امر مکروہ شامل ہے۔ تو اس کو نفری کر دینا چاہیئے"

اس کی مثال میں انہوں نے تین اشعار پیش کیے ہیں۔ جن میں سے دو غالب کے ہیں اور ایک ذوق کا۔ ذوق کا مشہور شعر ہے ؎

واہ رے شورِ محبت خوب ہی چھڑکا نمک
استخواں میرے ہما کس مزے سے کھائے ہے

اس شعر پر ان کو اعتراض یہ ہے کہ "اس سے ایک تصویر ذہنی پیدا ہوتی ہے جس میں ایک امر مکروہ شامل ہے یعنی انسان کی ہڈیوں کا نمکین ہونا اور ایک جانور کا اسے کھانا عمدہ تخیل نہیں ہے"

ایک دوسرے شاعر کا شعر انہوں نے پیش کیا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی تصویر ذہنی کو بعید از قیاس مضحک اور مکروہ قرار دیا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

شغل اگر چاہتے ہو جی کے بہلنے کے لیے
دل میں آ بیٹھو کلیجہ مرا ملنے کے لیے

لکھتے ہیں:۔

"دل میں ایک شخص کا آ بیٹھنا اور ہاتھ بڑھا کر کلیجہ کو ملنا ایک مہمل سی بات ہے۔ اور یہ بھی ظاہر
ہے اس شعر میں مخاطب معشوقِ مجازی ہے۔ معشوق حقیقی اس سے منزہ ہے کہ کسی کے دل
میں بیٹھ کر اس کے کلیجے کو مسلے"

غالب کے جو اشعار انہوں نے نقل کیے ہیں ان میں ایک فارسی کا ہے اور دوسرا اردو کا ہے۔ فارسی شعر یہ ہے ؎

داغم ز سوزِ دل نہ خجل وارہم ز خلق
بوئے کہ تن ز سوختن استخواں دہد

"ہڈیوں کے جلنے سے جو رائحہ کا پیدا ہونا جو شاعر کو خلق سے خجل رکھتا ہے واقعی ایک مکروہ امر ہے"

غالب کے اردو شعر پر بھی انہیں یہی اعتراض ہے ؎

داغ دل گر نظر نہیں آتا بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

مرزا کا کہنا ہے:-

> "داغ دل کی بو میں چراندہ ضرور ہو گی صرف داغ دل کا ذکر کیا کم تھا کہ اس کے جلنے اور اس میں بو کے پیدا ہونے کا بیان مشرح کیا گیا ہے۔ اس موقع پر بُو کا استعمال اس امر مکروہ پر دلالتِ واضح ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ امور صرف مجازاً کہے گئے ہیں اس کی اصلیت کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ تو اس کا جواب دیا جائے گا۔ کہ مجاز کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے ذریعے سے ذہن نشین ہو کیونکہ مجاز میں اکثر امور عقلی کو محسوسات کے ذریعے سے جو اقرب الی الفہم ہیں بیان کرتے ہیں۔ .... اگرچہ وہ مجازات جو اشعار مرقومۂ بالا میں شامل ہیں اپنی حد میں درست ہیں۔ لیکن ان کا تخیل مکروہ ہے، اس سے اس کا لُطف معدوم ہو جاتا ہے۔"

پہلے رسالے کے آخر میں موضوع اور اندازِ بیان کی بحث اٹھائی گئی ہے۔ فلسفیوں سے لے کر ادیبوں تک ہر ایک کو زبان کی تنگی اور الفاظ کی محدود رسائی کی شکایت رہی ہے اور یہ بات عام طور پر کہی جاتی رہی ہے کہ دقتِ مضمون یا گہرے فلسفیانہ خیال کا اظہار سادہ صاف اور سلجھے انداز میں نہیں ہو سکتا۔ موضوع کی گہرائی اور دقتِ اظہار کی سلاست کو ختم کر دیتی ہے اور بیان کی مٹھاس اور روانی تصنع اور بناوٹ کی نذر ہو جاتی ہے۔ مرزا نے اس مسئلے کو اس انداز سے پیش کیا ہے۔

> "شعر پر نظر کرنے کے دو رُخ ہیں ایک آزادیٔ لفظ اور دوسرے آزادیٔ معنی۔ جس زمانے میں الفاظ کی باریکیوں کی طرف زیادہ فکر کی جاتی ہے توجہ اسی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ معنویت کا خیال جاتا رہتا ہے، اور جب معنویت کا خیال پیدا ہوتا ہے تو لفظی باریکیاں ترک ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں میں نسبت عکسی ہے۔ ایک کی افراط دوسرے کی تفریط کا موجب ہوتی ہے۔ اکثر ایسے شاعر جو مضمون عمدہ کہتے ہیں ان کے الفاظ میں وہ سلاست اور نزاکت نہیں ہوتی جو ان شاعروں کے کلام میں ہوتی ہے۔ جن کو مضمون کی جدّت اور ندرت کا چنداں لحاظ نہیں ہوتا۔ وہ صرف لطفِ زبان کے دل دادہ ہیں۔"

اسی بحث کا دوسرا پہلو مرزا نے اس طرح پیش کیا ہے:

> "....... جو شاعر خلاق مضمون ہیں ان کو مرزا دائے مقصود میں بڑی دقت پڑتی ہے اس لیے کہ ہر ایک جدید خیال کے لیے ایک جدید لفظ چاہیے ان کو زبانِ مروّجہ میں تصرفات کرنا ہوتے ہیں اور اس صورت میں ان کا کلام موافق روزمرہ عوام کے نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اکثر اشخاص جن کی نظریں سطحی ہیں ان کو ایک قسم کی اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔"

اس کی مثال میر کے دیوان کی پہلی غزل سے دیتے ہیں ؎

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

اور لکھتے ہیں :-

> "ذرا 'ہنگامہ گرم کن' کو دیکھئے اور اُردو زبان کو 'گرم' لانے کیا ؟ اس مضمون کو کسی اور طرح ادا
> کرنا ممکن ہی نہ تھا۔"

لیکن اس بحث سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ مرزا رسوا مشکل الفاظ اور خالص "ادبی زبان" کے استعمال کے قائل تھے وہ فصاحت اور سلاست کے درجے کا لحاظ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے مدارج کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ مثلاً غزل میں سلاست کا جو معیار ہوگا وہ قصیدے کی سلاست کا نہیں ہو سکتا۔ اس فرق کو انہوں نے اس استدلال کے ساتھ بیان کیا ہے :-

> "غزل میں زیادہ تر سلاست ہی مناسب ہے اس لیے کہ اس کا موضوع سنجیدہ نہیں ہوتا۔ قصیدہ
> اور مرثیہ وغیرہ میں خیالات اور ان کے ساتھ ہی زبان کو وسعت دینا چاہیئے۔"

اس بحث کا خلاصہ مرزا نے اس طرح کیا ہے کہ لفظی نزاع اور تکنیک کی باریکیوں سے نفس مضمون کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور جب بھی انداز بیان کے غیر ضروری اجزا پر زور دیا جائے گا اس کا انجام یہ ہوگا کہ شاعری صرف صنعت گری ہو کر رہ جائے گی اور اس میں جذبہ کی گرمی اور احساس کا خلوص اور شدت ختم ہو جائے گی۔

> "وزن اور قافیہ کی پابندی شاعر کے لیے کم نہ تھی کہ اس پر ردیف بڑھائی گئی پھر اور لفظی جھگڑے
> نکالے گئے۔ بے چارہ جدید مضمون کہاں سے پیدا کرے۔ لفظی جھگڑوں کے بڑھانے سے
> مضامین کا دائرہ تنگ ہوتا جائے گا۔"

اس دلیل کے ساتھ مرزا نے متوسطین اور متاخرین کی شاعری کو متقدمین کے مقابلے میں پست اور سطحی قرار دیا ہے اور معنویت کی طرف رجحان کو مبارک بتایا ہے۔ ان کے پہلے مراسلے کے آخری حصے میں واضح طور پر یہ صراحت کی گئی ہے۔

> "ہندوستان میں سو برس ادھر کی شاعری آج کی شاعری سے اچھی تھی۔ متوسطین نے جھگڑے حد سے
> زیادہ بڑھا دیئے۔ اس لیے مزا جاتا رہا۔ مگر اس زمانے میں پھر رجوع معنویت کی طرف ہے اس
> لیے مجھے ان مراسلات کے لکھنے کی جرأت ہوئی۔"

اس مختصر مقالے کا مقصد مرزا رسوا کی تنقیدی نگارشات کا تعارف کرانا ہے۔ پہلے مراسلے کے ساتھ ہی یہ مقالہ بھی ختم ہوتا ہے اگر یہ کاوش مقبول ہوئی تو مرزا کے دوسرے مراسلات بھی تعارفی حواشی کے ساتھ پیش کیے جائیں گے

اس مراسلے میں بھی جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں ان سے اندازہ ہوگا کہ تنقید نگار کی حیثیت سے مرزا رسوا غیر معمولی استعداد کے ادیب تھے جس طرح ادب کے نفسیاتی عوامل اور فلسفیانہ بنیادوں پر انہوں نے اظہار خیال کیا ہے وہ اُردو ادب کے تنقیدی سرمائے میں خاصے کی چیز ہے۔ ادب ان کے نزدیک صرف قدما کی پیروی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے رشتے علوم انسانی کے دوسرے تمام ذخیروں سے ملتے ہیں پھر یہ بات خاصی تعجب خیز ہے کہ مرزا رسوا کی تنقید میں مغرب سے غیر معمولی مرعوبیت کا انداز نہیں ملتا نہ وہ حالی کی طرح اخلاق اور اصلاح کے تصورات تک محدود رہتے ہیں اور نہ قدیم رنگِ سخن کے پیروؤں کی طرح محض لفظی نزاع، صحت زبان اور بیان کے فروعی مسائل میں الجھتے ہیں۔

ان مراسلات میں پہلی بار اُردو تنقید نگار نے ادب کے فلسفیانہ مباحث کو دوسرے تمام علوم سے منسلک کر کے پیش کیا ہے

پہلی بار تنقید، استعارے اور ادب کی تکنیک کو فلسفیانہ اور نفسیاتی انداز سے پرکھنے اور ان کے اصول و ضوابط قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگلے مراسلات سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ شاعری اور ادب میں احساس صحیح، تجربے کے خلوص (GENUINE EXPERIENCE) اور مشاہدہ کی ہمہ گیری کی طرف جس طرح مرزا رسوا نے رہنمائی کی ہے اس کی مثال ہمارے تنقیدی سرمائے میں بہت کم ملتی ہے۔ اپنے دور کے رواج کے برخلاف وہ شاعر یا ادیب کو صرف اپنی ذات میں گم ہو جانے والا انسان نہیں سمجھتے بلکہ اسے کائنات سے باخبر اور تجربے اور مشاہدے کی لامحدود پہنائی رکھنے والا مفکر قرار دیتے ہیں۔ یہ چند ایسے مسائل ہیں جن کی تازگی آج بھی قائم ہے اور ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو اب بھی ان پر غور کرنے اور ان پر بحث کرنے سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔

ممکن ہے مرزا رسوا کے تمام تر تنقیدی نظریات سے آج اتفاق نہ کیا جا سکے۔ لیکن ان میں سے کوئی نظریہ بھی ایسا نہیں ہے جو خیال انگیز اور خیال آفریں نہ ہو اور جو تخلیق و تعمیر فن کے سلسلے میں کارآمد خیالات کے لیے ممد نہ ہو۔ پھر اب سے اتنے عرصے پہلے لکھے ہوئے یہ مراسلات حقیقتاً اپنے دور میں انقلابی حیثیت رکھتے ہوں گے اور اس دور میں اس قدر جدید اور ہمہ جہت آگاہ ذہن سے ادبی مسائل پر سوچنا ادبی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ کارنامہ غالباً حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' کے بعد ہمارے تنقیدی سرمائے میں سب سے اعلیٰ اور بلند مرتبے کا مستحق ہے ٭

آزاد کی سیاحت

(سیرِ ایران)

(آغا) محمد اشرف

غدر ۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے پورے ۲۸ سال بعد (۱۸۸۵ء میں) مولوی محمد حسین آزاد نے ایران کا سفر شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۸ سال تھی۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔ ادبی دنیا پر آبِ حیات اور دوسری تصانیف کے ذریعے آزاد کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں کہ "مئی ۱۸۸۵ء میں ۲/۳ پنشن کی مقدار پوری ہو گئی۔ دل برسوں سے آرزومند ہے کہ رخصت لے کر جگہ سے حرکت اور خدا سے برکت لینی چاہیے۔"

سیاحتِ ایران کا محرک دو جذبوں کو کہا جا سکتا ہے۔ نایاب علمی اور ادبی کتابوں کی تلاش، اور بعض فارسی کی کتابیں جو عرصہ سے زیرِ تصنیف تھیں۔ ان کی تکمیل۔ اُس عہد میں معیاری کتابوں کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:-

> "ہر وقت ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور یونیورسٹی بھی کسی کو کوئی کتاب نہ دیتی تھی۔ کیونکہ نہ اُسے کسی سے مروت تھی نہ کسی قسم کی آمد۔ بعض دفعہ ہر روز ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ بھی نہ ملتی تھی۔"

اسی سلسلے میں آگے چل کر فرماتے ہیں:-

> "…… خدا سے التجا کی۔ کہ اگر مجھے وسعت ملے تو ایک کتب خانہ نظرگاہ خاص و عام میں آراستہ کروں۔ اور جس قدر ممکن ہو ہر فن کی کتابیں اس میں رکھوں۔ کہ کسی بد دماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔"

۱۸۸۳ء کی ایک تحریر کے مطابق اس وقت آزاد کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس قلیل رقم میں سے آزاد کتابوں کے لیے کس طرح روپیہ پس انداز کرتے تھے۔ اس کا حال انہی کی زبان سے سنیئے:-

> "اس عالم میں میں نے انتظام یہ رکھا کہ جو کچھ خدا دیتا کم اس میں سے خرچ کرتا۔ باقی جمع کرتا۔ خانہ برباودں کی طرح گذارہ کرتا تھا۔ اور اپنے مبارک ارادے سے خانۂ دل کو روشن کرتا تھا۔ اس اثنا میں

کوئی ایسی کتاب جو کم ہاتھ آئے۔ مل جاتی تو لے لیتا۔ کہ ایک دن کام آئے گی "

آزاد کو اپنی کم مائگی کا پورا احساس تھا۔ دوسرے رخشِ عمر تیزی سے منازلِ حیات طے کرتا چلا جاتا تھا۔ انھیں خیال آیا۔ جو کتابیں اس ملک میں نایاب ہیں۔ وہ عرب اور ایران میں ارزاں نہیں ملیں گی۔ اس لیے سفرِ ایران کا ارادہ کیا۔

اپنی تصانیف کی تکمیل کے سلسلے میں سخندانِ فارس اور فارسی کی ایک لغت کے مسودے ان کے سامنے تھے۔ سخندانِ فارس اور فارسی زبان کی لغت اصل میں ایک ہی پروگرام کی دو کڑیاں تھیں۔ سخندانِ فارس میں موضوعِ بحث فلالوجی تھا اور لغت کی ترتیب سے مقصد فارسی روزمرہ کے الفاظ کا ایک ذخیرہ مہیا کرنا تھا۔ جو پرانی لغات میں نہیں ملتے تھے۔ سخندانِ فارس کا منصوبہ سیاحتِ ایران سے پورا ہو گیا۔ مگر افسوس کہ لغت کے خیال کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ان کے انتقال کے بعد جو کتاب لغتِ آزاد کے نام سے منسوب ہوئی ہے۔ وہ بظاہر اس لغت کا پہلا چربہ معلوم ہوتی ہے۔ جس کا نقشہ آزاد کے ذہن نے قائم کیا تھا۔

قند پارسی کا مسودہ بھی تیار تھا۔ مگر آزاد اس کی زبان کی صحت روزمرہ محاورے کے مطابق ایران جا کر کرنی چاہتے تھے۔ آموزگار پارسی جن مسودات سے بعد میں ترتیب دی گئی ہے۔ یہ یادداشتیں بھی اسی سفر کا نتیجہ تھیں۔

سیاحتِ ایران کی ابتدائی منزلیں

روانگی سے قبل بہت سے ضروری امور تھے کہ جن کا طے کرنا ضروری تھا۔ بقولِ آزاد رخصت کا مقدمہ سب سے زیادہ سنگین تھا۔ غالباً محکمۂ تعلیمات کے ڈائریکٹر ڈاکٹر لائیٹنر جن سے آزاد کی نوک جھونک کچھ عرصے سے جاری تھی۔ ان کے راستے میں سنگِ گراں ثابت ہو رہے تھے۔ آخر یہ تمام مرحلے بھی طے پا گئے۔ اور ستمبر ۱۸۸۵ء میں خاص گورنمنٹ کی تحریر نے حصولِ رخصت سے آرام دلایا۔

سفر کے اخراجات اور کتابوں کی خرید کے لیے ایک مدت سے آزاد روپیہ پس انداز کر رہے تھے چنانچہ بنک میں دس ہزار روپیہ الگ کیا۔ اور بنک کو ہدایت کی کہ یہ رقم یکم جنوری ۱۸۸۶ء کو لاہور کے مشہور رئیس اور آزاد کے دوست نواب نوازش علی خاں قزلباش کے حوالے کر دے۔ نواب موصوف نے اس کے عوض میں سوداگرانِ ایران کے نام خط تحریر کر دیئے۔

تیسری دقت ان کی اپنی صحت سے متعلق تھی۔ خود لکھتے ہیں: ۔

> "انھیں دنوں تقدیر سے مجھے چند دل شکن صدمے پہنچے۔ جن میں سے سخت صدمہ ایک جوان بیٹی کی موت تھی۔ جو حقیقت میں سات بیٹوں سے گراں بہا تھی۔ وہ میری تصنیفات میں میرا داہنا ہاتھ تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا اور تصنیفات کا قلمدان الٹ گیا۔ یہاں تک کہ اکثر ہوشمندوں کو جنون کا شبہ ہو گیا۔"

اس کے علاوہ چند اور بیماریاں بھی لاحق تھیں۔ چنانچہ خویش و احباب نے ضعیفی۔ سفر کی صعوبتوں اور دشواریوں کی بناء پر آزاد کا ارادہ ترک کرانا چاہا۔ آپس میں بحث مباحثے ہوئے۔ آزاد علمی مزدوروں کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ احباب کہتے تھے آپ تنہا کیسے جائیں گے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا۔ کہ انھوں نے اپنے لڑکے آغا محمد ابراہیم کو جو اس وقت سروے میں ملازم تھے۔ نوکری چھڑا کر لاہور بلوا لیا مگر رخصت ملنے میں دیر لگی۔ ادھر انہیں ایک اور ملازمت مل گئی۔ اس لیے چار و ناچار تنہا سفر پہ کمر باندھی۔ دوستوں کو سمجھایا۔ کہ

اس سے پہلے (۱۸۶۵ء) بھی تو وسط ایشیا کا تنہا سفر کیا تھا۔ اور وہ بھی کس بے سروسامانی میں کہ ۱½ برس تک مفقود الخبر رہا تھا۔ اور سب سے بڑا آزاد کا وہی علمی اور ادبی ضرورتوں کا احساس تھا۔ فرماتے ہیں :۔

> "جن ضرورتوں کے لیے میں جاتا ہوں، ملک اس کا محتاج ہے۔ اور قوم کو خیال نہیں۔
> لیکن ہو گا ایک عرصے کے بعد اس سے بہتر ہے کہ میں ہی اس کام کو جاؤں خصوصاً فارسی کی
> جامع اللغات کہ بغیر فارس میں جانے کے اس کی تکمیل اور اعتبار ممکن نہیں"۔

ایک شخص نے تو ان کے منہ پہ یہاں تک کہہ دیا۔ کہ لوگ کہتے ہیں آپ کو جنون ہے۔ مبادا جنگل میں یا جہاز پہ اس کا ظہور ہو۔ اس وقت کیا ہو گا لیکن آزاد کی جوان ہمت نے کسی بات کی پروا نہیں کی۔ اور خدا پر توکل کر کے ۲۳ جنوری ۱۸۸۵ء کو بذریعہ ریل لاہور سے کراچی روانہ ہو گئے۔ کراچی میں ایک پرانے شاگرد عزیز مولوی عمر الدین ہیڈ ماسٹر سندھ مدرسہ کے ہاں قیام کیا۔ چونکہ ایران جانے والا جہاز ایک دن پہلے روانہ ہو چکا تھا۔ اس لیے مجبوراً ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑا۔ اگرچہ طبیعت کے شوق کو یہ ایک ایک دن کئی کئی مہینے کے برابر تھا۔

سفر کا مقصد چونکہ ادبی تھا۔ اس لیے ہر قدم پر کان نئے الفاظ اور نئی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ کراچی کے راستے میں سکھر سے کچھ لوگ گاڑی میں سوار ہوئے۔ جب انھوں نے بات چیت کی۔ تو آزاد کے کانوں کو محسوس ہوا کہ ان کی بولی میں بہت سے لفظ فارسی کے ملے ہوئے ہیں۔ اشتیاق نے مجبور کیا کہ اس کی اصل دریافت کی جائے۔ چنانچہ معلوم ہوا۔ کہ یہ مکرانی ہیں۔ وہی مکرانی جن کا ذکر کتابوں میں آزاد نے پڑھا تھا۔ اور جن کے راستے کئی مرتبہ لشکر اسلام ہند میں آیا تھا۔

کراچی سے بوشہر کو روانگی

۲ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو عربیہ ڈاک کے جہاز میں ۱۲۶ روپیہ کرایہ دے کر آزاد سوار ہوئے۔ سفر تیسرے درجے میں کر رہے تھے۔ کیونکہ دس ہزار روپے میں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ کتابوں پر صرف کرنا چاہتے تھے۔ دوران سفر میں ایک رفیق نے جو دوسرے درجے کے مسافر تھے۔ اپنا آرام دہ کمرہ اور اس کی آسائشیں دکھائیں۔ مگر آزاد نے یہ کہہ کر دل کو تسکین دے لی۔

> "اتنے روپے جمع کر کے کتابیں لو تو ایک خانہ الماری کا آباد ہوتا ہے۔ اس لیے تکلیف
> مجھے آرام معلوم ہوئی"۔

کراچی سے بوشہر تک دس روز کا سفر تھا۔ آج کل کے تیز رفتار سٹیمر اسے مشکل سے تین دن میں طے کرتے ہیں۔ جہاز میں دوران سفر اور برہمی طبع کی طرف سے بڑا اندیشہ تھا۔ کہ ان کا مزاج صفراوی تھا۔ مگر شوقِ سفر کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک دفعہ دوران سفر میں خیال بھی آیا۔ کہ خلل ہائے مذکور کا اثر طبیعت پر ہے یا نہیں۔ لیکن غور کیا تو کچھ بھی نہ تھا۔

جہاز گوادر اور جاسک کے سامنے سے گزرتا ...... پہاڑی سلسلہ کو دائیں ہاتھ پر چھوڑتا، مسقط سے پہنچا ہوا منزل مقصود کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ بندر عباس پر جہاز نے لنگر ڈالا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں چند نوجوان لڑکے خربوزے، ناشپاتیاں اور انڈے بیچنے کے لئے آئے۔ آزاد کی توجہ ان اشیاء کی نسبت بیچنے والوں کی زبان پر تھی۔ زبان کے محقق نے فوراً پرکھا کہ سب کی زبان خالص فارسی تھی۔ اور اس

سے پتہ لگایا کہ یہاں سے خاکِ ایران شروع ہوتی ہے۔ ہم سفر مسافروں کے بھی لفظ پر ان کا دھیان تھا۔ آغا عبدالکریم ایک ایرانی رفیقِ سفر سے ملاقات ہوئی۔ جو سویز سے براہِ کراچی کربلا جا رہے تھے۔ فارسی شاعری کا انھیں شوق تھا۔" عربی بھی بولتے مگر سواحل کی۔ انگریزی بھی بولتے مگر جہازی۔" بستر دونوں کا یکجا ہوا۔ کہ دونوں ایک دوسرے کو غنیمت سمجھتے تھے۔ آخر ۱۰ اکتوبر کو ان کا جہاز بوشہر کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔

بوشہر سے شیراز تک

بوشہر پہنچنے کے بعد آزاد کا پہلا تاثر یہ تھا:۔

> "یہاں سب سے نئی بات یہ معلوم ہوئی۔ کہ چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے تھے۔ فارسی بولتے تھے۔ جیسے "ہزار داستان"

زبان کی تحقیق کرنے والے اور علمِ زبان کے ماہر خوب جانتے ہیں۔ کہ اس فن کا رسیا ہر ہر قدم پہ ایک نئی بات محسوس کرتا ہے۔ جب کبھی کوئی فقرہ سنتا ہے۔ اس کے کان اسی طرف لگ جاتے ہیں کہ اہلِ زبان نے اس مطلب کو کیسے ادا کیا۔ محاورے میں یہ بات کیسے آئی۔ آزاد کا ذہن تھا۔ ان کے کان ان تمام کیفیتوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اور سفر کی منزلیں اس شوق میں آسان ہوتی چلی جاتی تھیں۔

آزاد کے مشن کے لحاظ سے بوشہر کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہاں کی زبان سند ہو سکتی تھی۔ نہ اس شہر میں علمی کتابوں کا ذخیرہ تھا لیکن اس کے باوجود کاروان کے انتظار میں آٹھ روز بوشہر ٹھہرنا پڑا۔ آخر ۱۷ اکتوبر کو ایک ایرانی راہوار کرائے پر لیا۔ اور شام کو شہر سے نکل کر کاروان میں شامل ہو گئے۔ یہ آج کل کا سا سفر نہیں تھا۔ کہ موٹریں دن رات سڑکوں پر دوڑتی پھرتی ہیں۔ آج سے ۶۰ - ۷۰ سال پہلے شہر پناہ سے نکلتے ہی قزاقوں اور ڈاکوؤں کا خطرہ دامن گیر ہو جاتا تھا۔ اس لیے بغیر قافلے کے ایک دم نہیں بڑھ سکتے تھے۔

بوشہر سے شیراز تک تقریباً ۱۵۰ میل کی مسافت ہے۔ اس سفر کو آزاد نے ۹ دن میں طے کیا۔

راستے میں سربفلک پہاڑوں اور گہری گھاٹیوں کو عبور کرتا یہ قافلہ جوں کی سی رفتار سے حرکت کر رہا تھا۔ کبھی کاروان میدان میں دھوپ کی شدت سہتا تھا۔ اور کبھی برف و باراں کا مقابلہ کرتا تھا۔ جہاں کہیں قافلے نے قیام کیا۔ آزاد خورد و نوش کا سامان مہیا کرنے کے بعد علماء اور کتابوں کی دھن میں گھر گھر اور مسجد مسجد تلاش کرتے پھرتے تھے۔ کھانے پینے کی طرف سے لاپرواہی کا یہ عالم تھا۔ کہ رات کو ایک جگہ پلاؤ مل گیا اسے کھا لیا۔ جو باقی بچا اسے ایک پڑیا میں باندھ کر جیب میں رکھ لیا۔ کہ خدا جانے اگلی منزل پہ کچھ کھانے کو ملے یا نہ ملے۔

کاوزانی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ آزاد نے یہاں ایک جوان عمر فاضل کو ڈھونڈ نکالا۔ ان کا نام شیخ محمد تھا۔ نجف سے تحصیلِ علم کی تھی۔ تین شخص معتدل ان کے پاس بیٹھے تھے۔ ایک شخص کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ شیخ نے یہ کتاب آزاد کو دی۔ اور کہا پڑھو۔ باقی حال آزاد سے سنئے:۔

> "میں نے کھول کر ایک جگہ سے پڑھنا شروع کیا۔ ایک لفظ پر انھوں نے ٹوکا۔ میں نے پوچھا کہ میں غلطی پر نہ تھا۔ پھر بھی میں سوچنے لگا۔ انھوں نے خود سوچ کر فرمایا۔ کہ شما درست خواندیدہ۔ بخوانید۔"

اس طرح دیر تک امتحان لیتے رہے۔ آخر فرمایا "شما زبانِ عربی را خوب ورزیدہ اید"۔ مگر اس قصبے میں کوئی کام کی کتاب ہاتھ نہیں آئی۔ شیراز سے ایک روز کی راہ پر داشتِ ارژن شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں کی ٹھنڈی ہوا کا جس قدر شہرہ تھا۔ اس سے زیادہ سردی آزاد کو لگی۔ گھبرا کر گھوڑے سے کود پڑے۔ کہ دوڑ کر گرمی پیدا کریں۔ ہزار تدبیر کی مگر گھٹنوں سے پاؤں تک کہیں حس نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ پاؤں میں بھی خون جم گیا تھا۔ آخر کوس بھر پیدل چل کر حواس درست ہوئے۔

۲۶ اکتوبر کی صبح کو شیراز میں وارد ہوئے اور ایک سرائے میں قیام کیا۔ مگر سفر کی صعوبت کے بعد یہاں بھی آرام کی صورت نظر نہ آئی۔ دل شکستہ ہو کر بسترِ خاک پر بیٹھ گئے۔ آخر اپنے آپ کو سنبھالا۔ گٹھڑی کھولی۔ کپڑے نکالے۔ چونکہ واپسی میں کتابوں کے انبار ساتھ لے جانے کا ارادہ تھا۔ اس لیے گھر سے بہت کم سامان لے کر نکلے تھے۔ حد یہ ہے کہ جبّہ تک ساتھ نہیں لائے تھے۔ خفتان پہنا اور شیراز کی سیر کو نکلے۔ لیکن ابتدا اچھی نہیں ہوئی۔ پہلے ہی جی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ غالباً محکمہ تلگراف میں ملازم تھے۔ اور ان کے ڈائریکٹر طہران سے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہہ دیا۔ ہمیں فرصت نہیں ہے۔ جب کتب خانہ دیکھنے کی اجازت چاہی تو بے رخی سے کہا۔ تمہیں اس سے کیا فائدہ ہو گا۔

شیراز کے ایک رئیس نواب حیدر علی خاں کے پاس پہنچے۔ وہاں بھی دعا قبول نہیں ہوئی۔ اندر ہی سے کہلا بھیجا کہ جب کام ہوگا تو آنا۔ ہم مدد کریں گے۔ اصل میں آزاد کا مشن اس قدر نرالا اور سفر کا مقصد ایسا انوکھا تھا کہ ایرانی رئیس اور امیرزادے اس کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ لیکن آزاد ان کی سرد مہری سے آزردہ نہیں ہوئے۔ کیونکہ اب اُن کی منزلِ مقصود ان کے سامنے تھی۔ نواب حیدر علی خاں ہی کے دروازے پر ایک دلال سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ انھیں ایک اور شخص کے گھر لے گیا اور کتابیں دکھائیں۔ کل ۳۲ جلدیں ۲۷ روپے کو خرید لیں۔ شیراز کی سرائے سے یہ تنگ آ چکے تھے۔ اس لیے کسی اور ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ آخر مرزا علی اکبر کے ہاں مہمان ہوئے۔ اس غریب زادے کی فلاکت پر بہت رحم آیا۔ ۱۳ روز تک اس کے ہاں قیام کیا اور اس کے صلے میں اپنے حوصلے سے بہت زیادہ رقم اسے دی۔ مگر اس کے بوڑھے باپ سے جو لوہار تھا۔ اور بندوقیں بناتا تھا۔ آزاد کا دم ناک میں آ گیا۔

ایک ایرانی امیر کی علم پروری

شیراز کے آخری دو روز نواب مرزا علی خاں صدر کے ہاں گزارے۔ اور یہاں معلومات کا سامان آزاد کو کمال وفور کے ساتھ ملا۔ نواب جس طرح مال و دولت اور جاہ و منصب سے امیر تھے۔ ایسے ہی علم و فضل اور کتب خانے کے اعتبار سے بھی امیر تھے۔ اس صاحبِ کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "باوجود دستگاہ امارت اور پیرانہ سالی کے جب دیکھو گرد کتابیں چُنی ہیں۔ ایک دو مُلّا پاس بیٹھے ہیں۔ بیچ میں آپ مطالعے میں مصروف ہیں۔ تصحیح کرتے ہیں۔ حواشی لکھتے ہیں۔ ایک خوشنویس کاتب ناقص کتابوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ مصوّر نقاشی کر رہا ہے۔ کھانے کا وقت ہوا۔ وہیں پہلو میں دسترخوان بچھا۔ اُٹھے پہلے سجدۂ شکرانہ بجا لائے۔ ایک روٹی کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا۔ پھر سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ گویا یہ بھی ایک فرض تھا۔ کہ

شکل میں پیش کریں گے۔ مگر دوسرے ادبی کاموں نے مہلت نہیں دی۔ کہ اس تصنیف کو مکمل کرلے۔

بقایا سفرنامے کی تاریخوں اور مقامات کا موازنہ کرنے سے سفر کا یہ نقشہ تیار ہوتا ہے۔ جس سے یہ دھندلے نقش کچھ اجاگر ہو جاتے ہیں۔

شیراز سے روانگی	۱۰ر نومبر ۱۸۸۵ء
اصفہان میں آمد	۲۵ر نومبر ״
(اصفہان میں قیام	صرف پانچ روز)
اصفہان سے روانگی	۳۰ر نومبر ۱۸۸۵ء
طہران میں آمد	۱۰ر دسمبر ״
(طہران میں قیام	تقریباً ۳ مہینے)
طہران سے روانگی	یکم مارچ ۱۸۸۶ء
مشہد میں آمد	۲۹ر اپریل ״
(مشہد میں قیام	۱۲ر روز)
مشہد سے روانگی	۹ر مئی ״

ہرات میں آمد کی تاریخ کا تعین نہیں ہو سکا۔ البتہ ہرات میں قیام ۲۸ روز رہا۔ ہرات سے قندہار کا سفر ۲۶ر دن میں طے ہوا۔ قندہار میں قیام ۵ دن تک رہا۔ قندہار سے ۱۱ر روز میں کوئٹے پہنچے۔ اگرچہ یہ سفر صرف ۵ روز کا تھا۔ اور وہاں سے بذریعہ ریل شروع ماہ جولائی ۱۸۸۶ء میں لاہور واپس ہوئے۔

اصفہان اور طہران

شیراز سے اصفہان تک معلوم ہوتا ہے۔ کہ اونٹ کے ذریعے سفر کیا تھا۔ سردی شباب پر تھی۔ مگر پھر بھی جس گاڑی میں جاتے تھے۔ علم و ادب کی جستجو جاری تھی۔ ہر جگہ جا کر پوچھتے۔ اور جو اہلِ علم ہوتا۔ اس سے ملاقات کرتے۔ آزاد کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ چھوٹی سے چھوٹی آبادی میں بھی ایک دو عالم بلکہ کہیں کہیں صاحبِ اجتہاد مل جاتے تھے۔ ان کی حالت پر آزاد کو تعجب ہوتا تھا۔ مثلاً کھیت سے گھٹے کے گھٹے گھاس کندھے پر لیے آتے ہیں۔ یا نہر پر کپڑے دھو رہے ہیں۔ لڑکا گھر کی دیوار چن رہا ہے۔ جب فارغ ہوئے۔ تو اسے شرع لمعہ یا قوانین الاصول کا سبق پڑھانے لگے۔ یہ علمی فضا تمام ایران میں انھوں نے پائی۔ جس کی وجہ شاہانِ سلف کی علم و ادب کی سرپرستی تھی۔ بار بار انھوں نے ایسے علمائے سے کہا کہ تم اپنے لڑکوں کو طہران یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیوں نہیں بھیجتے۔ آزاد ہندوستان میں علوم قدیمہ کے زوال کے اسباب خود دیکھ چکے تھے۔ اور زمانے کی روش سے واقف تھے کہ آئندہ یہ گھریلو کتب اور درس و تدریس کے ٹھکانے زندہ نہیں رہ سکتے۔ مگر جب آزاد ایرانی علماء سے زمانے کی ہوا بدلنے کا ذکر کرتے تو وہ ہنس دیتے۔

دورانِ سفر میں ان کے پاس کھانے پکانے کا سامان نہیں تھا۔ کسی گھر سے روٹی مول لیتے۔ کہیں سے انڈے کہیں سے گھی اور دہی کسی

کے گھر میں بیٹھ کر انڈوں کا قلیہ پکا لیتے۔ اس بہانے انہیں بہت سی باتوں کی تحقیق کا موقع بھی مل جاتا۔ چونکہ سفر کا یہ حصہ ماہِ محرم میں طے ہو رہا تھا۔ اس لیے جگہ جگہ مجالس عزا میں بھی شرکت کا موقع ملتا تھا۔ ان مجالس سے فیض روحانی حاصل کرنے کے علاوہ آزاد ایرانی شرفاء کی تہذیب اور آدابِ مجلس کا بھی بہت قریب سے مطالعہ کر سکتے تھے۔

راستے میں ایک مسخرا حاجی ان کا ہم سفر ہو گیا۔ جب مورچہ خاک گاؤں میں منزل ہوئی۔ تو اس بے برکت ایرانی گاؤں میں یہ دونوں گھر گھر روٹی خریدنے کے لیے دستک دیتے پھرے۔ حاجی کو بھی ضد ہو گئی۔ کہ جب تک روٹی نہیں ملے گی۔ کوئی گھر بغیر دروازہ کھٹکھٹائے خالی نہ چھوڑے گا۔ آگے وہ پیچھے آزاد۔ حاجی کہتا تھا۔ صاحب خانہ روٹی ہے۔ گھر میں سے کوئی بچہ نکل کر کہتا۔ نہیں۔ آزاد ہنس کر کہتے الحمدللہ حاجی کہتا ——— مرغ ہے آزاد آواز لگاتے "خدا نہ کرے"۔ آخر ایک شخص کو پیسے دکھا کر روٹی بیچنے پر آمادہ کیا۔ اس نے سوائی قیمت لے کر چار خشک روٹیاں دیں۔ وہ لے کر خدا کا شکر کرتے سرائے واپس آئے۔

سفر میں اس قسم کے دلچسپ حادثوں سے طبیعت کی کوفت دھل جاتی ہے۔

اصفہان کو اہل ایران نے نصف جہان کا خطاب دیا ہے۔ آزاد بھی اس تاریخی شہر کے خوبصورت خیابان۔ چھتے ہوئے بازاروں۔ شاندار مسجدوں اور شاہی محلات کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ زندہ رود کے پل کی تعریف کی اور اس شہر کو سلاطین صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ قرار دیا۔ آزاد صبح سے شام تک شہر کی سیر کرتے تھے۔ اور شام کو تھک کر بستر پہ آ پڑتے تھے۔ ملا باقر مجلسی کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے گئے۔ مسجد جامع کی زیارت کی۔ یہ جگہ مہینوں رہنے کی تھی۔ مگر جاڑے کے ڈر نے پانچ دن سے زیادہ نہ رہنے دیا۔ اب طہران کی منزل ان کے سامنے تھی۔ اور ارادہ وہیں ڈیرے ڈالنے کا تھا۔

اصفہان سے طہران کے راستے میں کاشان کے مخمل بافوں کی صناعی اور چابکدستی کی داد دی۔ ملا محسن کاشانی کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ اور قم میں حضرت امام علیؑ کی بیٹی کے مزار کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔

طہران کی علمی فضا

سفرنامے کی عبارت اور تاریخوں سے طہران پہنچنے کی تاریخ کا تعین ۱۰ دسمبر ہوتا ہے۔ طہران کی یونیورسٹی۔ کتب خانوں۔ سرکاری دفاتر۔ اور علمی مجلسوں کا شوق آزاد کو راستے میں کہیں سانس لینے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ دوسرے جن اغراض کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ وہ بھی اسی شہر میں پوری ہوتی تھیں۔ افسوس کہ اس شہر میں تین مہینے کے قیام کا پورا حال دستیاب نہیں ہو سکا۔ ورنہ معلوم ہوتا کہ کہاں کہاں انہیں علم کی جستجو لے گئی۔ البتہ اپنے لکچر میں اتنا حوالہ ضرور دیا ہے کہ کتابوں کی تلاش اور جامع لغات فارسی کے لیے سرمائے کی باقاعدہ جستجو شروع کی۔ اور سب سے پہلے شہزادہ فرہاد مرزا کے حضور میں پہنچے۔ جو شاہ ایران کے چچا تھے۔ سلطنت کے پیچیدہ معاملات انہی کی صلاح سے طے پاتے تھے۔ کئی عالم سرکار میں نوکر تھے۔ جو ہر وقت علمی ادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ تحقیق الفاظ کے سلسلے میں ان کے صاحبزادے احتشام الملک نے بھی آزاد کی مدد کی۔ یہ یورپ کے علوم جدیدہ کی تحقیق کے بعد طہران آئے تھے۔ اور فرنچ خوب بولتے تھے۔ ان کی وساطت سے آزاد کی رسائی دوسرے علماء اور امراء تک ہوئی۔ جن امراء کا آزاد نے تذکرہ کیا ہے۔ یہ سب مغربی علوم کے ماہر تھے۔ اور ان میں سے اکثر شاہزادے پیرس اور برلن سے ڈگریاں لائے تھے۔ اصل میں اس وقت ناصر الدین شاہ قاچار کی سیاحت

یورپ کی وجہ سے امرا اور شرفا میں بھی مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کا رواج عام ہو چکا تھا۔ اور ایرانی تہذیب پر مغربی کلچر اثر کر چکا تھا۔ بہت سے امیرزادوں نے آزاد کی تحقیقِ الفاظ میں مدد کی۔ اور اپنی مروّت، محبت اور ہمت سے آزاد کو خرید لیا۔

اس زمانے میں فارسی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کرنے کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس نے زور پہلوی عہد میں پکڑا۔ لیکن آزاد کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اس خیال کے زبردست حامی مرزا رضا خاں افشار بگشلو اس وقت بھی طہران میں موجود تھے۔ انہیں حکومت کی طرف سے دبیرانِ دبیر کا خطاب ملا تھا۔ اس کے علاوہ ترکی اور فرنچ بھی خوب بولتے تھے۔ مرزا رضا خاں کا خیال تھا کہ فارسی زبان سے فوراً عربی لفظوں کو خارج کر دینا چاہیے۔ اور اس کی جگہ فارسی قدیم جاری کرنی چاہیے۔ آزاد کو ان کے مقدمے سے ہمدردی تھی۔ لیکن طریقِ کار سے اختلاف تھا۔ آزاد کہتے تھے۔ کہ علماء جی کا اثر تمام ایران پر اس وقت جما ہوا تھا۔ اس خیال کی مخالفت کریں گے۔ اور عوام چونکہ اس مطلب کو سمجھتے نہیں۔ اس لیے ان کی تائید بھی میسر نہیں آ سکتی۔ اگر تمام تصانیف اور عام سرکاری کارروائی اس نئی زبان میں ہونے لگی تو پبلک گھبرا جائے گی۔ کیونکہ صدہا لفظ فارسی کے اب لوگ بھول چکے ہیں۔ اور ان کی جگہ عربی الفاظ لے چکے ہیں۔ ہزاروں کے لیے لفظ فارسی موجود ہیں۔ مگر مستعمل نہیں۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ادنے ادنے کام کے لیے ہر شخص ڈکشنری سے مدد لے۔

آزاد نے رائے دی۔ کہ جہاں تک ہو سکے الفاظ عربی کی جگہ فارسی الفاظ رکھو۔ اور وہ رکھو جو خاص و عام کے کانوں کو اب بھی مانوس ہیں۔ جس عربی لفظ کی جگہ اصل لفظ فارسی کا نہ ملے۔ وہاں فی الحال عربی رہنے دو یا مطلب کو کسی اور پہلو سے فارسی کے مانوس لفظوں میں ادا کر دو۔ آزاد کی رائے تھی کہ ہمیں اس بارے میں اخبارات سے بھی مدد لینی چاہیے۔ اور شاہِ ایران تک اس بات کو پہنچانا چاہیے۔ کیونکہ بغیر سرکاری امداد کے یہ کام ممکن نہیں تاکہ شاہی تصانیف میں اس بات کا خیال رہے۔

آزاد کو شکایت ہے کہ طہران میں کوئی شاعر بالاستقلال نہیں۔ اصل میں فارسی شاعری قاآنی پر ختم ہو چکی تھی۔ آزاد نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جس قدر تہذیب بڑھتی ہے شاعری گھٹتی ہے۔ دوسرے شاہ اور اہلِ دربار پر یورپ کا اتنا غازہ چڑھا ہوا تھا کہ یہ شاعری کی نسبت علوم و فنون کے زیادہ خواہاں تھے۔ پھر اہلِ دربار کس کی امید پر شاعری سے نکاح کرتے۔ آزاد دو چار شاعروں سے طہران میں ضرور ملے۔ لیکن نتیجہ یہ نکالا کہ کچھ شاعروں کی ساری خوشحالی بعض امرا کی قدردانی سے پہنچی جاتی ہیں۔ نہیں تو اللہ ہی اللہ ہے۔

طہران کی علمی صحبتوں میں ۳ مہینے تک آزاد کا خوب جی لگا رہا۔ مگر شوق کی پیاس کسی طرح نہ بجھتی تھی۔ اور دل اس سرچشمے سے سیر نہیں ہوتا تھا۔ ۳ مہینے غرض خوب محنت اور مصروفیت میں گزرے۔ طہران میں ٹھہرنے کا بہانہ سردی کا موسم بھی تھا۔ آخر جب مارچ کا مہینہ آیا۔ اور بہار نے ایران کی سرزمین پر لشکر آتارا۔ تو آزاد با دل نخواستہ طہران سے رخصت ہوئے۔ اب ان کی چھٹی بھی ختم ہو چکی تھی۔ اور ہر روز تنخواہ میں سے ۲½ روپے کٹ رہے تھے چنانچہ جب آخری برف باری ختم ہوئی۔ تو یہ شوق کا زادِ راہ اور عقیدت کا کارواں باندھ کر مشہد مقدس روانہ ہوئے۔

واپسی

سفرنامے کے مطابق طہران سے مراجعت کی تاریخ کا تعین تقریباً یکم مارچ کو ہوتا ہے۔ طہران میں ۳ ماہ تک رہنے اور علمی مجالس میں منہمک رہنے کے بعد آزاد پر فارسی زبان کا ایسا جادو چل گیا تھا کہ ان تاریخوں میں سفر کی یادداشتیں انھوں نے فارسی زبان میں

لکھی ہیں۔ لیکن یہ سفرنامہ نہیں رہا۔ بلکہ صرف ضروری یادداشتوں کے نوٹ ہیں۔

طہران سے مشہد جانے کے لیے آزاد نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ جو عام مسافر اور زائرین کے لیے مخصوص ہے۔ ایران کی سیاحت سے ایک غرض ان کی "خاک وطن کو سفر کا پیوند دکھانا" بھی تھی۔ اس لیے آپ ہمدان گئے۔ کہ جس کی خاک سے ان کے بزرگ پیدا ہوئے تھے اور جہاں سے ان کے اسلاف ہندوستان آئے تھے۔ ہمدان تک پہنچنے کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ البتہ مختلف منزلوں کے نام اور ان کی مسافت کا ذکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یکم مارچ کو طہران سے روانہ ہونے کے بعد یہ مشہد تقریباً ۲ مہینے بعد اپریل کے آخر میں پہنچے ہیں۔ ہمدان کے راستے میں کن کن علماء سے ملاقات ہوئی۔ ہمدان کی قدیم عمارتوں کو کیسا پایا۔ اور خاک وطن کو دیکھ کر آزاد کے حساس جذبات پر کیا گزری ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

اس حصۂ سفر کی یادداشتوں میں جا بجا مشہور مقامات کا ذکر ہے۔ ہر مقام پر جس جس بزرگ کا مزار ہے۔ اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ جگہ جگہ علم کی تلاش اور تاریخ کا تجسس آزاد کو تاریخی مقامات کا کھوج لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ بڑی بڑی سراؤں۔ مسجدوں اور مقبروں کے متعلق تاریخی عمارتوں کے حالات سے قطعاً نابلد ہیں۔ حد یہ ہے کہ علماء اور طلباء بھی ان کی بات کو ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ سبزوار میں جامع مسجد کے متعلق کوئی کہتا ہے کہ چار سو سال پہلے بنائی گئی۔ ایک اور شخص کا بیان ہے کہ اس کا بڑا دروازہ پچاس سال پہلے اپنے بچپن میں بنتے میں نے خود دیکھا تھا۔ جہاں جہاں انھیں کوئی تاریخی کتبہ کسی مدرسے یا عمارت پر ملتا ہے۔ فوراً کتاب میں لکھ لیتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اور مشہور تاریخی شخصیتوں کا ذکر نہایت محبت سے کرتے چلے جاتے ہیں۔ راستے میں جا بجا صفوی بادشاہوں کی سرائیں جو اب ویران ہو گئیں ہیں۔ آزاد سے ان کے حق میں کلمۂ خیر لکھواتی ہیں۔ اگر کسی کی زبانی شاہان قدیم کا کوئی واقعہ (خواہ وہ معمولی ہی سا کیوں نہ ہو) مل جاتا ہے۔ تو آزاد فوراً اسے قلمبند کر لیتے ہیں۔ اگر کسی قصبے یا قریے میں کسی صاحب علم کا پتہ چلتا ہے۔ تو بے تکلف آزاد اس کے دروازے پر حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور منزل پر آرام کرنے کی بجائے علم و ادب کے موتی جمع کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ جہاں کہیں کوئی محاورہ مل جاتا ہے۔ فوراً اسے لکھ لیتے ہیں۔ اہل زبان کے وہ فقرے جو کتابوں میں نظر نہیں آتے۔ اور صرف بولے جاتے ہیں۔ آزاد کے لیے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اگر کسی محاورے میں مقامی طور سے اختلاف پاتے ہیں تو وہ نوٹ کر لیتے ہیں۔ اہل اصفہان کی اصطلاح طاق کردن ہے۔ خراسان کے فصحا اس کی جگہ سر بودن بالا بودن بولتے ہیں۔ عوام 'پی او ر' کہتے ہیں۔ اسے بھی آزاد نے فوراً اخذ لیا۔ اہل صحرا کی اصطلاحیں بھی ان کی ژرف نگاہی سے نہیں بچتیں۔ راستے میں جب کہیں کسی عالم سے ملاقات نہیں ہوتی تو صحرانشینوں سے ہی باتیں کر کے علم کے موتی رول لیتے ہیں۔

سبزوار کے بعد نیشاپور کی مردم خیز سرزمین کا ذکر آزاد نے بہت محبت سے کیا ہے۔ اس وقت جو شرفا اس شہر میں آباد تھے ان سے مل کر ان کے نام اور خاندانی شجرے لکھے ہیں۔ شیخ فریدالدین عطار کے مزار پر فاتحہ پڑھی ہے۔ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں کے نام بھی دریافت کیے ہیں۔ مگر اس کی عظمت کے مقابلے میں اس کی اس درجہ بری حالت اور کھنڈر دیکھ کر آزاد رو پڑے۔

حضرت بایزید بسطامی کے وطن بسطام کی محبت نے آزاد کو راستے سے ہٹا کر اپنی طرف کھینچا۔ لیکن اب وہاں فقط ایک گاؤں باقی رہ گیا تھا۔ آزاد نے اسے بھی دیکھا۔ مگر سب سے زیادہ حیرت انہیں بالا خیابانی کے ایک چبوترے کو دیکھ کر ہوئی۔ اس چبوترے پر ایک بڑا اژدر و نصب تھا۔ اور پاس نادر کشوہ پڑے سوتے تھے۔

اگرچہ بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ مگر خراسان میں برف باری جاری تھی۔ ایک جگہ پر تکلیف اٹھانی پڑی۔ برف آباد اسم بامسمیٰ نکلا۔ راستہ تمام سفید تھا اور عالم گیر برف برس رہی تھی۔ آخر مشہد مقدس کا قصبہ دور سے نظر آیا۔ اور آزاد کی عقیدت مند آنکھیں امام رضا کے تصور میں نم ہو گئیں۔ فوراً گھوڑے سے اتر کر زمین چھو لی۔ آزاد کے والد کو امام ضامن سے جو عقیدت تھی۔ اس کا ذکر آزاد نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ مولوی محمد باقر امام اکثر ایک قصیدہ پڑھتے تھے۔ جس کے تیسرے شعر میں طرق کا ذکر ہے۔ جب آزاد طرق پہنچے۔ تو وہ شعر یاد آگیا۔ انہی کی زبانی آزاد نے سنا تھا۔ کہ یہ قصیدہ حضرت کے روضہ مبارک کے ایک دروازے پر آویزاں ہے۔

یارب ایں ارضِ مقدس چہ مقام است وچہ جاست
کہ زمین تا بہ فلک مظہرِ انوارِ خدا است

مشہد مقدس کی زیارت سے سرفراز ہونے کے علاوہ روضۂ مبارکہ سے ملحق کتب خانے کی فہرست بھی مہیا کی۔ آزاد کے بیان کے مطابق یہ لائبریری کتب عجیب و غریب سے علوم و فنون کا خزانہ ہے۔ کیونکہ سلاطین و امرائے سلف نے عمدہ عمدہ نایاب کتابیں بھیج کر ذخیرہ آخرت جمع کیا ہے۔ مشہد کی تجارتی حیثیت اس کے خوبصورت خیابانوں اور آب و ہوا کی لطافت سے بھی آزاد بے خبر نہیں۔ ایک جگہ بازار میں انگوروں کا خوشہ آویزاں دیکھا۔ ابھی انگور کا موسم شروع نہیں ہوا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ گزشتہ سال کے انگور ہیں۔ اگرچہ بعضے مرجھا گئے تھے۔ مگر بعض ان میں سے صاف اور درست تھے۔ یہ مشہد کی آب و ہوا کی تاثیر تھی۔

ہارون رشید کی قبر دیکھی علماء میں شیخ بہاؤ الدین آملی۔ شیخ حُرّ عالی۔ شیخ طبرسی کے مزار پر گئے۔ اور کتبے نقل کئے۔ شیخ بہائی کے مزار پر کئی مرتبہ حاضر ہوئے۔ شعراء میں فردوسی اور اسدی۔ طوسی کی قبروں پر گئے۔ اور اس مقدس مقام پر ۱۲ روز ٹھہر کر وطن کی طرف قدم اٹھایا۔

مشہد سے ہندوستان آنے کے دو راستے ہیں۔ ایک کرمان ہوتے ہوئے بندر عباس پہنچتا ہے۔ جہاں سے پھر جہاز میں بیٹھ کر کراچی آ سکتے ہیں۔ اور دوسرا ہرات اور قندھار سے کوئٹے کی منزل پر ختم ہوتا ہے۔ غالباً اس وقت تک وہ راستہ دریافت نہیں ہوا تھا جس پر آج کل کوئٹے سے مشہد تک زائرین سفر کرتے ہیں۔ آزاد نے بندر عباس کے راستے کو طولانی سمجھا۔ دوسرے اس راہ پر جانے والا کوئی کاروان نہیں تھا۔ اور انھیں اب رخصت ختم ہو جانے کی وجہ سے واپسی کی جلدی تھی۔ اس لیے مجبوراً ہرات اور قندھار کی راہ اختیار کی۔ کچھ لوگوں نے کہا بھی کہ راستے میں افغانوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ اس لیے سوداگر عموماً بندر عباس کے راستے آتے جاتے ہیں۔ مگر ایک گروہ نے رائے دی کہ اب امیر عبدالرحمن نے افغانستان کا بندوبست ایسا چست اور درست کیا ہے کہ آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ آزاد امیر عبدالرحمن کے عدل اور انتظام پر یقین کر کے توکل بخدا اس راستے سے مئی کے پہلے ہفتے میں روانہ ہو گئے۔

دوسری منزل جیبر بمانی میں ایک فاضل مُلّا محمد علی کو دیکھا کہ اپنے لڑکے کو شرح لمعہ کا درس دے رہے ہیں۔ لڑکے کی عمر ۱۴ برس کی تھی۔ آزاد کو یہ دیکھ کر بہت لطف آیا کہ سبق پڑھ کر لڑکا اُٹھا۔ اور تھوڑی دیر بعد کھیلنے کے لیے گھر کی دیوار پر چڑھ گیا۔ علماء کی سادہ زندگی اور علماء کی بے تکلف زندگی کا ان کے دل پر بہت اثر پڑا۔

تیسری منزل سے روانہ ہوئے۔ تو بقول ان کے نیند نے شبخون مارا یہ اونٹ پہ اونگھنے لگے۔ اور لڑھک کر سر کے بل زمین پر آن گرے۔ خدا کی قدرت سر بال بال بچ گیا۔ زیادہ تر پشت اور سینے پر صدمہ پہنچا اور پسلی ٹوٹ گئی۔ ساربان نے زمین پر سے اٹھا کر لحاف میں

لپیٹ کر اونٹ کی کمر پہ رسی سے جکڑ دیا۔ سب کو خیال تھا شاید مر گئے۔ صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر رستہ کھولا اور آواز دی تو انھیں ہوش آیا۔ تین دن عجیب حالت رہی۔ نہ کوئی جراح اور نہ حکیم۔ قدرتِ الٰہی نے جراحی کی اور پسلی آپ ہی جڑ کر اچھی ہو گئی۔ مگر اس کی گرہ باقی رہ گئی جو باقی عمر دم کے ساتھ رہی۔

اب شہر ہرات کے ویرانے۔ سلاطین تیموری کے قدیم آثار اور مساجد کے کتبے دیکھتے آزاد قافلے کے ساتھ قندہار کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ ہرات کی ایک مسجد کے اندر نہایت عمدہ خطِ ثلث میں کوئی فرمان لکھا دیکھا۔ کوشش کی کہ اس کو پڑھ کر نقل کر لیں۔ مسجد کے اندر چند خونخوار ملا حجروں میں بیٹھے تھے۔ ان کے ڈر کے مارے غور سے نہیں دیکھ سکے کہ کہیں کوئی چھرا نہ بھونک دیں۔ اور مفت میں جان جائے۔ کیونکہ ان کے نزدیک گائے اور آدمی کا کاٹنا برابر ہے۔ فقط اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ”آدم پرنگی (فرنگی) بود کاپر (کافر) بود۔ کہ میباند کہ کشتنی است۔“

اسی نواح میں مولانا جامی اور ان کے استاد مولانا صدر الدین۔ امام فخر الدین رازی۔ اور محمد حسین واعظ کاشفی کے مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ یہ وہی ملا حسین واعظ کاشفی ہیں جن کی انوار سہیلی آزاد بچپن میں پڑھ چکے تھے۔ یہاں بھی علماء کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ اور جس بزرگ سے ملے اس کی علمی قابلیت اور فضیلت کا حال نوٹ کر لیا۔ جو قابلِ ذکر نہیں تھے۔ ان کے متعلق صرف یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

”باقی علماء بسیار اند مگر قابل شمار نیستند“

قریب ہی مولانا جامی کے استاد شیخ جام کے مزار پہ عقیدت کے پھول چڑھائے۔ اور سلطان سنجر کے نامکمل مزار کو شاہ عباس صفوی کے ہاتھوں مکمل ہوتے دیکھا۔

کاریز کے مقام پہ ایک پیر مرد سے ملاقات ہوئی۔ اس کے پاس دو نایاب کتابیں تھیں۔ مگر وہ کسی قیمت پہ کتابیں دینے کو تیار نہیں تھا۔ آزاد کے پاس ایک ہاتھی دانت کی سرمہ دانی تھی۔ اس پہ پیر مرد کی رال ٹپک پڑی۔ آزاد سرمے دانی کے بدلے کتابیں لے کر خوش خوش روانہ ہو گئے۔

سفر میں جب کبھی بارش ہوتی تھی۔ سب سے پہلے انہیں اپنی کتابوں کا خیال آتا تھا۔ ایک مقام پہ اس زور کی بارش ہوئی کہ اونٹ پھسلنے لگے۔ قافلے والوں کو مجبوراً پڑاؤ کرنا پڑا۔ سردی کے مارے دم بند ہوا جاتا تھا۔ دوسرے مسافر بارش سے بچنے کی تدبیر کر رہے تھے۔ مگر آزاد نے بوجھ آگے پیچھے اوپر تلے لگا کر کتابوں کو محفوظ کیا۔ اور پانی سے بچاؤ کے لیے ان پہ موٹے موٹے گدے ڈال دیے۔ اور خود توکل بخدا بیٹھ گئے۔

آگے چل کر پھر بارش ہوئی۔ اگرچہ سردی اور ہوا کی طرف سے جسمانی تکلیف تھی۔ لیکن کتابوں کی طرف سے روحانی تکلیف کا احساس تھا۔ خدا خدا کر کے اگلی منزل پہ پہنچے۔ اس موقع پر بھی آزاد کی انشا پردازی کا زور کم نہیں ہوتا۔ فرماتے ہیں:—

> ”رفیقوں نے یہاں بھی کارسازی کے اونٹ بٹھلائے۔ اور باج گیروں کی آنکھوں میں ایسی خاک ڈالی۔ کہ اونٹ لاد پھاند کر اوپر اوپر غائب کر دیا۔ کسی کو خبر نہ ہوئی۔“

افغانستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہی بیدردانہ راہداری کی شدت سے پڑتال ہونے لگی۔ ہرات میں نائب کوتوال انھیں

سپہ سالار کے سامنے لے گیا۔ آزاد نے وہ پروانہ دکھایا۔ جو مشہد میں افغانستان کی حکومت کے نمائندے سے انہوں نے حاصل کیا تھا۔ افغانی سپہ سالار غالباً ان پڑھ تھا۔ کسی اور سے پڑھوا کر سنا۔ اگرچہ اس پر مہر لگی ہوئی تھی۔ لیکن سپہ سالار نے پوچھا۔ کہ کیا یہ مہر اصلی ہے۔ آزاد نے برجستہ جواب دیا:۔

> "حضور کے سامنے سند اصلی کو پیش کرتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہیں۔ جعلی کاغذ کون پیش کر سکتا ہے۔ اس جواب سے خوش ہو کر سپہ سالار نے کہا۔ بہت خوب تم روانہ ہو جاؤ"

اربابِ حکومت کی سختی کے علاوہ ہرات کے باشندوں کا سلوک بھی تکلیف دہ تھا۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک اور سپاہی سے لے کر بوڑھیا عورت تک ہر شخص سوال کرتا تھا۔ اور پھر آنکھیں بدلتا تھا اور کہتا تھا کہ کہاں سے آئے ہو۔ کیوں آئے ہو۔ کس راستے آئے ہو۔ کیا لائے ہو۔ کتابیں کیوں لائے ہو اور اتنی کتابیں کیوں لائے ہو۔ انھیں کیا کرو گے۔ یہ کیا کیا کتابیں ہیں۔ کس کس علم کی کتابیں ہیں۔ تم اس راستے کیوں آئے ہو۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ کس رستے جاؤ گے۔ اس رستے کیوں جاتے ہو؟

ایسے سوالوں سے آزاد کا ناک میں دم آگیا تھا۔ غیر ملک۔ اجنبی ماحول۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہ سکتے تھے کہ کہیں اور آفت میں نہ پھنس جائیں۔ جاسوسی کا الزام نہ لگ جائے۔ کفر کا فتوے لگا کر گردن زدنی نہ ٹھہرائیں۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے۔ یہاں ایک ایک گھڑی پہاڑ تھی مگر قافلہ نہ ملنے کی وجہ سے ۲۸ روز گزر گئے۔ ہرات کی سخت گیریوں سے تنگ آ کر آزاد کو ایرانیوں کی محبت اور ان کی مہمان نوازی یاد آگئی۔ کس خلوص سے لکھتے ہیں:۔

> "ہزار رحمت ہے ملک ایران پر کہ مہینوں وہاں رہا۔ جا بجا پھرا۔ اور سب سے ملا جلا۔ ہر قسم کی بات پوچھتا تھا۔ اور لکھتا تھا وہ بتاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ کسی بات کا شبہ دل میں نہ لاتے تھے"

ہرات سے قندھار اور کوئٹے کو روانگی

غالباً جون کے مہینے میں ہرات سے بہزار دقت آزاد روانہ ہوئے۔ ہرات سے قندھار ۱۲ یا ۱۳ منزل کی مسافت تھی۔ اور یہی سمجھ کر آزاد اس راستے سے آئے تھے۔ مگر یہ سفر پورے ۲۶ دن کا تھا۔

یہ علاقہ تمام ایرانی ہے۔ باشندے صحرا نشیں ہیں۔ جہاں پانی دیکھتے ہیں۔ کمبل تان کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایران کے سبزہ زاروں اور پُر لطف باغات کے بعد اس صحرا کو دیکھ کر آزاد کا دل اور بھی اچاٹ ہوا ہوگا۔ آزاد کے قافلے میں ۲۰۰ نفر تھے۔ اس لیے قافلے والے جدھر ہرا میدان اور آبِ رواں سنتے تھے۔ راہ چھوڑ کر ادھر نکل جاتے تھے۔ اور خواہ تھوڑی سی مسافت طے کی ہو۔ ہری گھاس دیکھتے ہی منزل کر لیتے تھے۔ ہر مسافر نے اپنے ساتھ کھانے کا توشہ باندھ لیا تھا۔ جہاں صحرا نشین قبیلے تھے۔ ان سے آٹا۔ گھی اور گھوڑوں کے لیے جو لے لیتے۔ اس علاقے میں روپے پیسے کا رواج نہیں۔ چیزوں کا آپس میں مبادلہ ہوتا ہے۔ آزاد نے بھی اپنے ساتھ سوئیاں انگشتانے۔ کنگھیاں۔ سرمہ۔ کالی مرچیں۔ سونٹھ وغیرہ خرید کر رکھ لی تھیں۔ انہی چیزوں کے بدلے میں روٹی، دودھ، چھاچھ اور گھی وغیرہ مول لے لیتے تھے۔ ان کے پاس پکانے کا سامان نہیں تھا۔ اس لئے بہت سی روٹیاں پکوا کر رکھ لی تھیں۔ یہ پانچویں دن سڑ گئیں۔

انہیں سکھایا۔ ایک جگہ گدھا پانی میں بیٹھ گیا۔ وہ بھیگ گئیں۔ جب کچھ اور نہ ملتا تھا۔ تو ۱۰۔ ۱۵۔ ۱۵۔ دن کی سوکھی روٹی پانی کے گھونٹ سے کھاتے تھے۔ لوگ اپنی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے۔ کہ ناپاک ہو جائے گی۔ کئی لوگ پتھر لے کر مارنے کو کھڑے ہو گئے۔ کہ کافر ہے۔ لیکن جب یہ کسی کو دودھ، دہی وغیرہ کھانے کی چیزیں دیتے تو لے لیتے۔ اصل میں ان کی سختی کسی خاص سبب سے نہیں تھی جانتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ روپے والے ہیں انہیں جس طرح ہو سکے دبا کر روپیہ لینا چاہیئے اور بہانہ ہاتھ آ جائے تو مارنے میں بھی دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔

قندھار پہنچ کر بھی یہ مصیبتیں ختم نہیں ہوئیں۔ یہاں پانچ روز گزارنے مشکل ہو گئے۔ ہرات کی طرح قندھار میں بھی راہ چلتے لوگ روک لیتے اور کہتے۔ "بیا بیا......"

ایک دن چل کر آزاد کو بازار میں حسبِ معمول ۲ آدمیوں نے روکا۔ اور وہی سوال کیا کہ کہاں سے آئے ہو۔ ان کا دل جلا ہوا تھا۔ انھوں نے جس طرح ان دونوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس کا دلچسپ حال آزاد سے ہی سنئے۔

انھوں نے کہا "از ہند آمدہ ام، باز بہ ہند میروم"

"چرا آمدی؟"

"تو بگو کہ چرا می پرسی؟"

ایک شخص نے بازو پکڑ کر کہا "نمیدانی ما می توانیم ترا بگیریم پیش امیر صاحب ببریم۔ تو جاسوس فرنگ ہستی"

آزاد بولے۔ "خیلے خوب۔ ما گوئیم۔ امیر صاحب مسافر ہستیم، بملک شما آمدیم۔ نمکِ شما را خوردیم۔ آرام یافتیم، دعا می کنیم می رویم۔ ایں ہا ہستند کہ حالا بخیر خواہیٔ شما دم می زنند۔ فوج فرنگ می آید۔ و در روی روند نوکری می کنند۔ یک تخم مرغ بہ ہم ریک ماکیاں بہ عسکری فروشند۔ باز وقتیکہ...... می آید۔ بہ کفر شما فتوی می نویسند"

آزاد کی ان سچی سچی باتوں کو سن کر دونوں افغان گھبرا گئے۔ اور ایک دوسرے سے کہا "گم کنید؟" اور آزاد سے کہا۔ "بروہ برو" آزاد اپنی فتح کو اس آسانی سے ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔ ایک چابک اور لگایا۔ پوچھا۔

"حالا اینہم بفرمائید کہ اسم شریف شما چیست"

ایک تیسرے شخص نے ان سے پوچھا "این چہ بلاست"

افغانوں نے تنگ آ کر کہا "ہماں خرس است کہ من میگذارم او نمی گذارد"

قندھار سے کوئٹے تک کا کرایہ دس روپیہ تھا۔ آزاد قندھار سے عاجز آ گئے تھے۔ اس لیے دس کی جگہ بارہ روپے دے کر سواری کرائے پر لی۔ اور پانچ روز کا راستہ ۱۱ دن میں طے کیا۔ اور کوئٹے پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس زمانے میں کوئٹے تک ریل کی لائن نہیں بنی تھی۔ اس لیے کوئٹے سے رنولی تک ابھی سفر باقی تھا۔ سفر کی یہ آخری منزل کس اہتمام سے طے کی اس کا ذکر بھی آزاد ہی کے لفظوں میں سنئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہفت خوان رستم طے کر کے الف لیلیٰ کے سیاح کی طرح اپنے

محبوب کو ساتھ لیے منزل پر پہنچ رہے ہیں :-

"دوسرے دن ایک چھکڑا کرایہ پہ کیا۔ اس میں کتابیں لادیں۔ اور آپ بچھونا بچھا کر اوپر بیٹھا۔"

سفرنامے کے متعلق رائے

سیر ایران نام کی جو کتاب اس وقت بازار میں ملتی ہے۔ اس کے پہلے حصے میں آزاد کا ایک لکچر ہے جو انھوں نے ۲۵ جولائی ۱۸۸۶ء کو لاہور میں دیا تھا۔ غالباً یہ تقریر انھوں نے پہلے سے لکھ لی تھی۔ جسے اخبار رفیق ہند نے شائع کیا۔ لکچر کتاب کے ۴۳ صفحات پر حاوی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ان کا سفرنامہ ہے جو ۱۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ لکچر میں بار بار آزاد نے سفرنامے کا حوالہ دیا ہے۔ اور اکثر مباحث کو یہ کہہ کر ختم کر دیا ہے کہ ان کی تفصیل سفرنامے میں پیش کریں گے۔ موجودہ سفرنامہ جو سیر ایران میں چھپا ہے آزاد کی یادداشتوں اور ان تحریروں کا مجموعہ ہے۔ جو دوران سفر میں یہ لکھتے رہے۔ سفر کے ابتدائی حصے میں بہت سی باتوں کی تفصیل ہے۔ مثلاً لاہور سے کراچی کا سفر۔ کراچی میں ایک ہفتہ قیام۔ کراچی سے بوشہر تک جہاز کا سفر اور بوشہر سے شیراز تک کی سیاحت یہ تمام حال سفرنامے میں خاصی تفصیل سے موجود ہے۔ لیکن جوں جوں سفر بڑھتا گیا۔ اور دوسری مصروفیات پیدا ہوتی گئیں۔ سفرنامے کی طرف سے آزاد کی توجہ کم ہوتی چلی گئی۔ طہران کے شہروں اور مشہور مقامات پہ پہنچنے کی تاریخیں بھی موجود ہیں۔ لیکن طہران میں ۳ مہینے کے قیام کے متعلق کوئی تفصیلی بیان نہیں ملتا۔ ہندوستان سے چلے تھے۔ تو شمسی اور قمری دونوں تاریخیں ڈالتے جاتے تھے مگر بعد میں صرف قمری تاریخیں نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ ایران میں قمری تاریخوں کا رواج تھا اور سفر کی مصروفیت میں قمری تاریخوں کے ساتھ شمسی تاریخوں کا دھیان کرنا مشکل ہو گیا۔ طہران سے روانگی کے بعد مشہد پہنچنے تک کا حال بہت مختصر ہے۔ یہ سفر انھوں نے میرے حساب سے تقریباً دو مہینے میں طے کیا۔ حالانکہ طہران سے مشہد کی مسافت ۹ سے زیادہ نہیں۔ سفرنامے میں ۲۲ جمادی الاول (یکم مارچ) طہران سے شاہ عبدالعظیم جانے کی تاریخ لکھی ہے۔ ۲۴ کو ایوان کیف قشلاق میں قیام کیا ہے۔ اور ۳۰ جمادی الاول کو اہوان کا نام نظر آتا ہے۔ اس کے بعد کسی شہر کا حال نہیں ملتا۔ البتہ چند شہروں کی مسافتیں درج ہیں۔ اگر یہ مسافتیں سفر کرنے کے بعد لکھی گئی ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ اصفہان کے راستے قزوین گئے۔ اور وہاں سے ہمدان کا سفر کیا۔ ہمدان سے سبزوار کس راستے گئے۔ اس کی کوئی خبر نہیں دی۔ لکچر میں بھی حیرت ہے کہ ہمدان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن طہران کی روانگی سے مشہد پہنچنے تک ۲ مہینے کا طویل عرصہ اس بات کی کافی شہادت ہے کہ یہ ہمدان ضرور گئے تھے ورنہ یہ سفر اتنے دن میں طے نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

مشہد سے روانگی کی تاریخ کا تعین بھی ممکن ہے۔ لیکن اس کے بعد کہیں تاریخ کا حوالہ نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی خوبصورت سرزمین سے افغانستان کی بے آب و گیاہ سرزمین پہ داخل ہونے کے بعد ان کا مقصد صرف ہندوستان پہنچنا رہ گیا تھا۔ دوسرے قدم قدم پر تکالیف اور مشکلات کا سامنا تھا۔ اس لیے سفرنامے میں سوائے ان شکایتوں کے یا چند ضروری یادداشتوں کے بے حد اختصار سے کام لیا ہے۔

لکچر کی زبان اور انداز وہی ہے۔ جو آزاد کی دوسری تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگرچہ دل بھی چاہتا ہے کہ ایران کا ذکر ایسی لطف اور بلاغت سے کیا جاتا۔ جو ہمیں سخندانِ فارس کے دوسرے حصے میں ملتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ سفر کی کسل اور تکان ابھی دُور نہیں ہوئی تھی۔ اور احباب کا تقاضا تھا۔ اس لیے جلدی میں یہ لکچر لکھ لیا۔ دوسرا قیاس یہ ہے کہ یہ تقریر آزاد نے بغیر کسی تحریری مدد کے کی تھی۔ اخبار نویسوں نے نوٹ لے کر اسے اخبار میں چھاپ دیا۔

سفرنامے کا ابتدائی حصہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ تفصیلی ہے اور اس کی زبان میں بھی بے تکلفی کے ساتھ انشاء پردازی کا رنگ موجود ہے۔ لیکن بعد میں جہاں مختصر نویسی نے صفحوں کا بیان چند فقروں میں ادا کیا ہے۔ وہاں انشا کی کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ جو مطالب اس اختصار سے لکھے گئے ہیں۔ انھیں لکھنے والے نے اس خوبی سے لکھا ہے کہ بعد میں ان سے دفتر تیار ہوں گے۔

سفرنامے کی تاریخی اہمیت

سیرِ ایران کئی لحاظ سے ہماری زبان میں ایک دلچسپ اور قیمتی سرمایہ ہے۔ اوّل تو یہ پہلی اور آخری کتاب ہے کہ جس کی مدد سے ہمیں آزاد کی اپنی تحریر سے ان کی زندگی کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ مشکل سے ۹ مہینے کی خود نوشت سوانح ہے۔ لیکن آزاد کی زندگی کے متعلق داخلی شہادتیں اس قدر کم یاب ہیں کہ اس بیش بہا مواد سے ہمیں بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ ان کا علمی ذوق، تجسّس۔ تحقیق کا شوق۔ طالب علمانہ زندگی۔ علماء اور فضلاء کی صحبتوں سے فیضان حاصل کرنے کا شوق یہ سب باتیں سیرِ ایران سے ہمیں پہلی مرتبہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ آزاد کے مذہبی اعتقادات۔ آلِ عبا سے والہانہ عقیدت اور بزرگانِ سلف سے محبت ان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر بھی خوب روشنی پڑتی ہے۔

آزاد نے سیاحتِ ایران جن مقاصد کے پیشِ نظر کی تھی۔ یہ اپنی جگہ ایسے بلند اور اعلیٰ مقاصد ہیں کہ انھیں ادبی سیاحوں کی فہرست میں بہت اونچے درجے کا استحقاق دیتے ہیں۔ ۵۵ برس کی عمر ہے جب کہ سب عزیز اور احباب انہیں آرام کی صلاح دے رہے تھے۔ آزاد ایک مشکل اور زبردست مہم پر کمر باندھ کر جوانوں جیسی ہمت کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ وطن کی محبت اور اہلِ وطن کی بہبودی کا انھیں ہر وقت دھیان ہے۔ جب احباب ان کی دلیلوں سے قائل نہیں ہوتے تو یہ کہہ کر انہیں خاموش کرنا چاہتے ہیں۔

> "جن ضرورتوں کے لیے میں جاتا ہوں۔ ملک ان کا محتاج ہے۔ اور قوم کو خیال نہیں۔ لیکن ہوگا۔ ایک عرصے کے بعد۔ اس سے بہتر ہے کہ میں ہی اس کام کو کر جاؤں۔"

یہ فقرے صرف ایک انشاء پرداز یا ادیب کے نہیں۔ بلکہ ایک غم خوار مصلح اور ماہر تعلیم کے ہیں۔ جو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ایک مدت سے جو کچھ خدا دیتا۔ اس میں سے کم خرچ کرتا۔ خانہ بربادوں کی طرح گزران کرتا اور صرف اپنے مبارک ارادے سے خانۂ دل روشن کرتا تھا۔

آزاد کی اصلاحی کوششیں جدید نظم اردو کی بنیاد ڈالنے کے بعد سے تمام ملک پر روشن ہو چکی تھیں۔ تعلیمِ نسواں اور دوسری اصلاحی تحریکوں میں بھی آزاد پیش پیش تھے۔ مگر ان کی اصلاح صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہی۔ ایران کے دیہات میں جب عالموں اور فاضلوں کو گمنامی کی زندگی بسر کرتے دیکھتے۔ تو انہیں اپنی اولاد کو طہران یونیورسٹی میں تعلیم دلانے کا مشورہ دیتے۔ آزاد

ہندوستان میں مغربی اثر کا بڑھتا ہوا اقتدار اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے۔ اِن کے سامنے دہلی کی قدیم علمی اور ادبی صحبتیں برباد ہو چکی تھیں۔ اور ان کی جگہ پنجاب میں یونیورسٹی اور کالجوں کو قائم ہوتے انھوں نے خود دیکھا تھا۔ یہ زمانے کے نبض شناس تھے اور جانتے تھے کہ ایران میں بھی یہ فضا چند روز کی مہمان ہے۔ ان کی نکتہ رس نگاہوں نے طہران کی بدلتی ہوئی فضا دیکھ کر فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ ایران میں بھی وہی ہونے والا ہے۔ جس کا تجربہ یہ خود ہندوستان میں ۵۷ء کے انقلابات کے بعد کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے سیرِ ایران انیسویں صدی کے آخری ربع کے ایران کی دلچسپ داستان ہے۔

اس سفر میں ایک کمی ہمیں نمایاں نظر آتی ہے کہ تمام سفرنامے میں عوام سے ملنے جلنے اور ان کے رہنے سہنے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن آزاد صرف ایک مقصد کے لیے گئے تھے۔ اور یہ مقصد انہیں ایک خاص طبقے کے لوگوں سے ملنے جلنے سے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اس بات کا کبھی دھیان نہیں کیا تھا۔ کہ یہ ایران کی معاشی اور سیاسی تاریخ لکھنے جا رہے ہیں۔ اس لیے اس کمی کو ہم نظر انداز کر سکتے ہیں۔

نذیر احمد کی انفرادیت

ڈاکٹر سید عبداللہ

یوں تو سر سید کے رفقا میں سے ہر ایک شخص غیر معمولی قابلیتوں کا مالک تھا۔ اور اپنے اپنے خاص شعبوں میں ان میں سے کسی کی نظیر آج بھی موجود نہیں مگر مولوی نذیر احمد — جنہیں بعض لوگ ڈپٹی نذیر احمد کہنا پسند کرتے ہیں — ایک ایسے مصنف تھے جن کی شخصیت اور جن کا رنگِ تصنیف دوسروں سے منفرد تھا۔ یہ انفرادیت ان کے اکثر کارناموں کی اس روح میں مضمر ہے کہ انہوں نے سر سید کے بعد شاید سب سے زیادہ عام زندگی اور عام مسائل سے رابطہ رکھا۔ شبلی ایک عالمانہ شان رکھتے تھے اور بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ادب میں بھی ان کا مذاق (اگر سوءِ ادب نہ ہو تو عرض کروں کہ) "بورژوائی" ہی سا تھا۔ شان اور تجمل، نفاست و لطافت "شرفائے ادب" کے سے ٹھاٹھ۔ غزل کدۂ بمبئی میں ہوں یا تربیت گاہ ندوہ میں — وہ ہر جگہ ایک اشرافی شان سے نمودار ہوتے ہیں۔ مولانا حالی — خوش صفات حالی — ان کی سلامتِ مزاج تو ہر جگہ ثالثی اور مصالحت ہی کی قائل تھی — وہ ایک نرم رو ادیب تھے۔ نرم زبان اور شریفانہ لب و لہجہ، ان کا امتیازِ خاص تھا اشرافیت سے دب کر چلنا ان کی وضع تھی — سر سید اپنے اشرافی پلیٹ فارم سے اتر کر عوامی اپیل تک ضرور آئے مگر ذہناً جمہوری اشرافیت ہی کے دل دادہ تھے — ان میں سب سے زیادہ جس شخص کو ہم عام لوگوں کے قریب پاتے ہیں وہ نذیر احمد تھے۔ جن کی اپنی زندگی عوام ہی کے ماحول سے ابھری تھی۔ اور ان تجربات سے مالا مال تھی جن سے زندگی کی معرفتیں پاکر انہوں نے جمہور کی زندگی کو سنوارنے کے لیے ادب پیدا کیا جتنا اس دور کے کسی اور شخص نے پیدا نہ کیا۔

نذیر احمد کے ضمن میں میں نے عوامی، اشرافی، بورژوائی وغیرہ کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ان سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ نذیر احمد کو تو ان اصطلاحوں کا ادراک ہی نہ ہوگا۔ — مگر ان کی تصنیفی روح کا تجزیہ یہی کہتا ہے کہ وہ تھے عوام دوست شخص۔ کیونکہ ان کی تصانیف کی غالب روح اس ہمدردی اور غمگساری کے جذبے سے لبریز ہے جو انہیں عام لوگوں کی زندگی کو سمجھنے اور ان کے لیے مناسب دستور العمل تیار کرنے پر مجبور کرتی رہی — اور یہی نہیں سر سید کے بعد شاید وہی بڑے مصنف تھے۔ جن کی زبان بھی عام لوگوں کی زبان کے قریب تھی — یہ صحیح ہے کہ اس میں ایک مخصوص عالمانہ طبقاتی محاورہ ضرور پایا جاتا ہے۔ مگر نذیر احمد کی گفتگو کی عمومی سطح عام ہی ہے۔

نذیر احمد نے بچوں کے لیے بھی کتابیں لکھیں اور قانونی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔

مگر ان کی تصانیف کے اہم موضوع دو ہیں۔ اوّل ان کی دینی تصانیف دوم ان کے قصے۔ ان دونوں اصناف میں وہ اپنے رفقا سے منفرد ہی ہیں۔ یوں کہنے کو تو سرسید اور ان کے سارے رفقا نیچری کہلاتے تھے۔ اور اس لحاظ سے نذیر احمد بھی نیچری ہی سمجھے جاتے تھے۔ مگر نذیر احمد کی نیچریت بھی ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ وہ مذہب کے معاملے میں آزاد اور تحقیق پسند آدمی تھے۔ وہ جس زمانے میں دہلی کالج میں داخل ہوئے اس زمانے میں وہابی حنفی اختلاف بڑے زوروں پر تھا۔ اس میں بھی وہ آزاد اور غیر جانبدار رہے۔ بعد میں سرسید کی رقابت میں جو دینی جھگڑے برپا ہوئے اُن میں بھی ان کی راہ اپنی ہی تھی —— وہ نہ تو سرسید کے اندھے مقلد تھے نہ سرسید کے مخالفوں کے پورے ہم نوا تھے۔ سرسید سے ان کا اشتراک صرف چند مسائل میں تھا۔ وہ سرسید کی طرح آزادیٔ رائے اور عقل کی اہمیت پر خاص زور دیتے تھے۔ تقدیر، توکل، خیر و شر وغیرہ کے متعلق ان کا نظریہ وہی تھا جو سرسید کا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مذہب عین فطرت ہے اور سائنس اور دین کا آپس میں کوئی تعارض نہیں اور ترک دنیا کا خیال ایک غیر اسلامی خیال ہے۔ مسئلہ تقدیر میں بھی وہ سرسید کے ہم نوا تھے۔ اور تعلیم جدید کے معاملات و مسائل میں بھی ان کے ہم آواز تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ سرسید کے خیالات سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔

وہ معجزات کے انکار میں ان سے متفق نہ تھے وہ مغربی معاشرت کے معاملے میں سرسید کی سب باتوں کو صحیح نہ سمجھتے تھے اور بزرگان سلف کے اجتہادات سے متعلق ان کو وہ بدظنی نہ تھی جو عام طور پر سرسید کی تصانیف سے مترشح ہوتی ہے حقوق و الفرائض میں انہوں نے ایک معتدل شریعت کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں زیادہ سے زیادہ لچک اور سہولت پائی جاتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد کی یہ دینی تصانیف اپنی جگہ خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ اُردو کے مشہور ادیب مہدی الافادی نے ان کے تبحر کو اس درجہ اہمیت دی تھی کہ رفقائے سرسید میں وہ سب سے زیادہ انہی کو اس کا استحقاق دیتے تھے کہ وہ اُردو میں ایک "قاموس اسلامی" مرتب کریں —— اور حق یہ ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد ایل ایل ڈی کو یہ فضیلت ضرور حاصل تھی کہ وہ اُردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تدوین کی ذمہ داری لے سکتے —— مگر نذیر احمد کا مزاج، ان کا ذہن، اور ان کی طرزِ انشا یہ کہتی ہے کہ وہ قاموس کی علمی اور فنی شان کو برقرار رکھنے کی طبعی صلاحیت نہ رکھتے تھے —— وہ تو ہر چیز کو ایک عوامی سطح اور عوامی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور تھے اور اسی سے انہوں نے ہر چیز کو دیکھا —— وہ تو قرآن مجید کے ترجمے میں بھی عامی یا عوامی زبان استعمال کرنے سے باز نہ رہ سکے۔ (—— اور یہ ایک واقعہ ہے کہ انہیں اپنی عوامیت کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا) تاہم نذیر احمد کے ذہنی تبحر سے انکار ناممکن ہے۔

نذیر احمد کی قابلیتیں دینی تصانیف سے زیادہ ناول میں ظاہر ہوئیں۔ انہوں نے دین کی خدمت میں ناولوں سے بڑا کام لیا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی دینی تصانیف کو وہ درجہ نہ دلوا سکے جو ان کے ممتاز ہمعصر شبلی کی علمی کتابوں کو حاصل ہوا۔ گو انہوں نے عوام میں دین کی تبلیغ شبلی سے کہیں زیادہ کی اس سے ان کو بھی شہرت حاصل ہوئی۔ اور ان کی تصانیف کو بھی قبول عام نصیب ہوا۔ غرض زبان۔ مزاج، لب و لہجہ، انداز فکر —— ان سب چیزوں میں نذیر احمد اپنے دوسرے رفقا سے الگ اور منفرد شخص تھے۔ وہ اوروں سے الگ طرز پہ سوچتے تھے اور ان سے الگ طریق سے بات بھی کہہ جانتے تھے۔

نذیر احمد نے بہت سے قصے لکھے، مراۃ العروس، ابن الوقت، فسانۂ مبتلا، توبۃ النصوح، ایامیٰ، رویائے صادقہ

ان سب میں نذیر احمد بہت اچھے ناول نگار نہ سہی ایک منفرد مبلغ اور بعض جمہوری معاشرتی مشکلات و مسائل کے اچھے ترجمان اور نبّاض ضرور ثابت ہوئے ہیں۔

نذیر احمد کی ناول نگاری کے متعلق عموماً یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ وہ قصہ نویس سے زیادہ واعظ تھے کیونکہ انہوں نے اپنے قصوں سے دینداری، خدا پرستی اور اصلاحِ معاشرت کا کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں قصہ نویسی کے فن پر عبور نہ تھا۔ ان کے پلاٹ کمزور ہوتے ہیں اور کردار کی تعمیر میں بھی انہیں کوئی چابک دستی حاصل نہیں۔ یہ سب درست ہے مگر نذیر احمد اردو کے اوّلین ناول نگار تھے جو واعظ بھی تھے ——— اسی لیے انہیں طنزاً یا حقیقتاً واعظ ناول نگار یا ناول نگار واعظ بھی کہا گیا ہے ——— مگر وہ فن کے پرستار نہ تھے نہ فن کار ہونا ان کے لیے کوئی بڑی کشش کی چیز تھی ——— وہ تو مصلح اور رفارمر ہونے میں ہی اپنی عزت سمجھتے تھے ——— اور اس اعزاز کے لیے انہوں نے وعظ اور ناول دونوں سے فائدہ اٹھایا۔ تقریر اور تحریر دونوں کے ذریعے انہوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ انہوں نے اپنی پُرزور خطابت سے اپنے سامعین کو جس طرح گرمایا اسی طرح اپنے موعظتی ناولوں سے اپنے قارئین کو تڑپایا ——— دونوں میدانوں میں "شئے" ایک ہی کام کر رہی تھی ——— بات ایک تھی مرقعے دو، بقول غالب ؎

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

بہرحال ان کو اگر کوئی ناول نگار نہیں کہتا نہ کہے مگر ناول کی کوئی تاریخ ان کے ذکر سے بے نیاز نہیں ہو سکتی ——— ان کے ناولوں کو ناول نہ کہیے قصہ کہہ دیجیے کہانی کہہ دیجیے انہوں نے اپنے زمانے کے عام لوگوں کی (جن میں متوسط درجے کے لوگ بھی شامل ہیں) زندگی سے اعتنا کیا ہے ——— یہ اور بات ہے کہ وہ ناول کے اصول کے مطابق بات نہیں کر سکے ——— مگر ان کے اوّلین ناول نگار ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے نزدیک وعظ اور ناول کے درمیانی فاصلے کچھ زیادہ نہ تھے ——— مگر انہوں نے پریوں اور جنّوں کی کہانیاں نہیں لکھیں۔ انہوں نے انسانوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ انہوں نے میر امّن کی طرح کوئی باغ و بہار بھی نہیں لکھی نہ چار درویشوں کو سیر کرائی۔ وہ تو اپنے زمانے کے "درویشوں" کی سیر کا مطالعہ کرتے رہے۔ اور ان کی سیر کے مرقعے تیار کرتے رہے جن کے سچے واقعات اور حقیقی زندگی صرف تفریح کے خیال سے نہیں عبرت و اصلاح کے خیال سے بھی داستانوں سے ہزار درجے زیادہ دلچسپ اور دل کش تھی ——— نذیر احمد بات کرنے کے ڈھنگ سے بے خبر سہی مگر باتیں ان کے اپنے ہی دور اور سوسائٹی کی تھیں ——— ناول کی طرح بات کرنے یا بات بنانے یا کہانی گھڑنے کا فن تو بڑی مدت کے بعد بھی ہمارے ملک میں لوگوں کو نہیں آیا مثلاً شررؔ کو دیکھیے وہ تو سامنے کی عام زندگی سے صاف بچ کر تاریخی ناول میں جا موجود ہوئے۔ (ان کے معاشرتی ناول بھی واقعیت سے کنّی کتراتے رہے ——— اپنے زمانے کی باتیں کہنے کو آسان ہیں مگر لکھنے کے لیے بڑی ہمت درکار ہوتی ہے) سرشار نے کچھ ہمت کی مگر زندگی کے مصوّر ہونے پر بھی وہ گالزوردی کے (CETHRU) کی طرح "بدی کے کوچے میں چراغ لے کر صرف گھومتے گھامتے رہے۔ سرگشتگانِ وادیٔ غفلت کو کوئی روشن راہ تو نہ دکھا سکے ——— ہاں نذیر احمد نے اس کوچے میں قدم رکھا اور مردانہ وار رکھا اور ان کے (CETHRU) نے تو "چراغِ سرِ راہ" کی مدد سے

لوگوں کو روشنی بھی دکھائی۔

ہمارے نقادوں نے نذیر احمد کے ناولوں کو موعظتی کہہ کر فنی لحاظ سے ان کی تنقیص کی ہے ——— اور خالص فن کے نقطۂ نظر سے ان میں نقائص ہیں بھی ——— مگر میں اب تک اس نظریئے سے مانوس نہ ہوسکا کہ ادب میں اخلاق و موعظت کا کوئی عنصر آ ہی نہیں سکتا ——— سوال تو صرف اتنا ہی ہے کہ ادب میں اخلاقی عنصر کا پیوند اس طرح نہیں لگانا چاہیئے کہ کہانی کا "امکانِ وقوع" برباد ہو جائے اور خلافِ عقل و قیاس پہلو پیدا ہو جائیں ——— یہ عیب تو نذیر احمد کے ناولوں میں موجود ہیں ——— مگر اخلاقی عنصر کا موجود ہونا تو کوئی عیب نہیں۔

نذیر احمد کے ناول اُردو کے اوّلین ناول تھے۔ اس لحاظ سے ان میں ترقی یافتہ ناولوں کی سب خوبیوں کی تلاش بے کار ہے۔ ان میں ہندوستانی مسلمانوں کے اہم دور کی معاشرت کی تصویریں ملتی ہیں۔ اس عہد کی ذہنیت، سماجی تصورات، معاشرتی نظریات کے بہترین مرقعے ——— جتنے نذیر احمد کے ناولوں میں ہیں اور کہاں دستیاب ہوں گے۔ ان کی وہی قدر و قیمت ہے جو ۱۸ ویں ۱۹ ویں صدی کے بعض انگریزی قصّوں کی ہے، جن میں ڈکنز، تھیکرے اور ہارڈی کے اجتماعی قصے اور EVANGELICAL NOVELS شامل ہیں ——— جس طرح انگریزی ناول کا یہ حصّہ اپنے نقائص کے باوجود زندہ ہے اور زندہ رہنے کے قابل ہے ——— اسی طرح نذیر احمد کے قصّے بھی زندہ ہی رہیں گے۔

اب آیئے نذیر احمد کے اہم قصّوں پر الگ الگ نظر ڈال لی جائے۔ سب سے پہلے ابن الوقت کو لیجئے۔ بعض مبصرین کے خیال میں ابن الوقت نذیر احمد کی ناکام ترین تصنیف ہے ——— ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ اس زمانے کے جدید تعلیم یافتہ گروہ کی کھوکھلی معاشرت اور نقالی کو اس سے زیادہ کس ناول نگار نے (اپنے کس ناول میں) پیش کیا ہے ——— فنی نقائص تو نذیر احمد کیا، اس دور کے ہر دوسرے ناول نگار کے ہر ناول میں بھی موجود ہیں۔ نذیر احمد کے ناول مقصدی اور موعظتی بھی ہیں اس سے بھی کسی کو انکار نہیں۔ پھر ناول کا رکنِ اعظم۔ جذبۂ محبت۔ نہ ان کے اس ناول میں ہے نہ کسی اور ناول میں۔ مگر ابن الوقت میں اس عبوری دور کی ذہنیت کی جو مرقع نگاری کی ہے۔ اس کی مثالیں تو بعد کے ناول نگاروں کی کتابوں میں بھی کم ہی ملیں گے۔ ابن الوقت اس عہدِ تداخل کے عام افکار اور شکوک و اوہام کا ایک پیکرِ مجسم ہے۔ ابن الوقت میں اس زمانے کی سیاسی فضا کے مناظر بھی اپنی پوری جزئیات کے ساتھ معرضِ تحریر میں آ گئے ہیں۔ انگریزوں کے خیالات، رعایا کے احساسات، سیاست و مذہب کی آویزش و مصالحت ——— اس کے زیر اثر ہندوستانی سوسائٹی کے تدریجی تغیرات ——— یہ سب باتیں نذیر احمد کے ناول سے باہر اور کہاں ملیں گی؟

ابن الوقت ایک ایسے شریف زادے کی خیالی سرگذشت ہے جو پرانی معاشرت کو چھوڑ چھاڑ کر مغربی وضع اختیار کر لیتا ہے اور انگریزوں کی تقلید میں انگریزی طور طریقوں کو اپنا لیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود انگریز حاکم حکمرانی کے غرور میں اس کے طرزِ عمل کو ناپسند ہی کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے اس تملق میں مغرور حاکم کو برابری کا ادعا نظر آتا ہے ——— اور یہ وہ جرم ہے جو اس زمانے کے انگریز کو کسی طرح گوارا نہیں تھا ——— نتیجہ یہ کہ ابن الوقت بے چارا از یں سو رانده و ازاں سو درمانده رہتا ہے ——— اس خیالی تصویر کا واقعاتی اور تاریخی رُخ اگر دیکھنا ہو تو کیری کی کتاب (GOOD OLD DAYS OF JHON COMPANY)

میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

خیال کیا گیا ہے کہ ابن الوقت کے لباس میں نذیر احمد نے سرسید پر چوٹ کی ہے اور وجہ یہ بتائی ہے کہ نذیر احمد نے سرسید کے عروج اور قبولِ عام کے خلاف کسی پوشیدہ جذبۂ رقابت سے مغلوب ہو کر یہ کتاب لکھی ہے۔ اور اس طرح دل کی بھڑاس نکالی ہے۔

مگر میں کہتا ہوں کہ یہ سب قیاس ہی قیاس ہے اور وہ بھی خاصا دُور از کار ـــــ یہ کتاب مولوی شبلی کی ہوتی تو ہم تسلیم بھی کر لیتے۔ کیونکہ شبلیؔ تو آخری دور میں صاف صاف سرسید کے خلاف طنز و تعریض کر دیتے تھے مگر غریب نذیر احمد پر تو یہ الزام محض اتہام ہے ـــــ اس لیے کہ نذیر احمد تو آخری عمر تک سرسید مرحوم کے مشن کے لیے تبلیغی اور واعظانہ دورے کرتے رہے۔ ایسی صورت میں ابن الوقت کو خواہ مخواہ سرسید کی تصویر قرار دینا خود سید صاحب کی ذاتِ ستودہ صفات پر ناروا حملہ ہے۔ ابن الوقت میں تو داخلی طور پر کئی باتیں ایسی بھی بیان کی گئی ہیں جو سرسید میں موجود ہی نہ تھیں۔ نذیر احمد تو درکنار شبلیؔ بھی سید صاحب کو اتنا گرا ہوا نہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کو انگریزوں کا خوشامدی سمجھتے ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ سرسید نے ملازمت کے باوجود بڑی غیورانہ زندگی بسر کی۔ مگر ابن الوقت تو وہ شخص تھا جو اعلیٰ قابلیت کے باوجود بعض اوقات بہت گر جاتا تھا۔ یہ بات سرسید میں کہاں تھی؟ اس کے علاوہ سید صاحب کا سا تدین ابن الوقت میں کہاں پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ابن الوقت سرسید کی تصویر نہیں بلکہ انیسویں صدی کے آخری نصف کے عام انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان کی تصویر ہے۔ جو انگریزوں کے وضع و اطوار کی نقالی میں اپنے آپ پر اور اپنی تہذیب پر ہنسا کرتا تھا اور بعض اوقات اپنی غیرت و حمیت کو بھی چھوڑ بیٹھتا تھا۔

اس سلسلے میں یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ سرسید سے ان کے رفقا کی کش مکش کے افسانے اس بے جا عقیدت کا نتیجہ ہیں جو عموماً کسی محبوب شخصیت سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اور جس کے ماتحت کسی کا معمولی اور دیانت دارانہ اختلاف بھی عقیدت مندوں کو گوارا نہیں ہوا کرتا ـــــ ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید کے تہذیبی عقائد سے ان کے تقریباً ہر رفیق نے جزوی اختلاف کیا۔ نواب محسن الملک سے زیادہ سرسید کا ہمدرد اور دوست کون ہو سکتا ہے؟ یہ وہی محسن الملک ہیں جن کو سرسید لحمک لحمی و دمک دمی (تمہارا گوشت میرا گوشت ہے اور تمہارا خون میرا خون ہے) کہا کرتے تھے۔ پھر کیا محسن الملک کے سرسید سے نظریاتی اختلافات کو ذاتی حسد و رقابت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ مولوی حالیؔ سے زیادہ شریف مزاج کون ہوگا۔ مگر انہوں نے بھی حیاتِ جاوید میں کئی مسائل میں سید صاحب سے اختلاف کیا ہے۔ یہ سب دیانت دارانہ اختلافات تھے ـــــ اور نذیر احمد تو اس اختلاف میں بھی اور دل سے کچھ دھیمے ہی تھے۔ ابن الوقت سرسید پر چوٹ ہو یا نہ ہو اس کھوکھلی معاشرت پر یقیناً ایک کاری حملہ ہے جس کو قومی اور ملکی روایات سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا ـــــ اور جس کا اختیار کرنا خود انگریز کی نظر میں ایک مضحکہ خیز فعل تھا۔ کیونکہ اس میں بلا ضرورت خوشامد کا رنگ غالب تھا ـــــ اور قاعدہ ہے کہ خوشامدی خود اپنے ممدوح کی نظر میں ذلیل ہو جایا کرتا ہے[۱]

نذیر احمد کی تصنیف ابن الوقت ایک لحاظ سے "قبل از وقت" تصنیف تھی ـــــ یہ دراصل ایک احتجاج تھا۔ اس بڑھتی ہوئی مغرب زدگی کے خلاف جس کا بھرپور اظہار جنگِ عظیم اوّل کے بعد کی تصانیف اور تحریکوں میں ہوا ـــــ ابن الوقت نذیر احمد

کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ حجۃ الاسلام جو نذیر احمد کا ہیرو ہے باتیں تو لمبی لمبی کرتا ہے۔ مگر پتّہ ہر جگہ ابن الوقت کا ہی بھاری رہتا ہے کیونکہ وہ قابل بھی ہے اور ذہین بھی!

یہ عجیب بات ہے کہ نذیر احمد کے بعض کردار ان کے محبوب کردار نہ ہونے کے باوجود ان کے بہترین کردار ہیں، مردانہ کرداروں میں ابن الوقت اور توبۃ النصوح کا کلیم اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ان کرداروں کی تعبیر سے انہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں فنّی صلاحیت بھی موجود تھی۔ اور اگر وہ چاہتے تو اپنے ناولوں کو اپنے زمانے کے معیار سے بھی) بلند تر سطح پر لے جا سکتے تھے۔

کلیم ایک رند لاابالی شخص ہے۔ مگر اس کے ساتھ بڑا با مذاق اور فن پرست بھی ہے۔ کلیم دین و مذہب سے بیگانہ سہی مگر علم و فن سے بیگانہ نہیں۔ اس کے پاس ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہے۔ جس میں آرٹ اور ادب کے گرانمایہ جواہر نظر آتے ہیں۔ اگرچہ نصوح کو ان انمول موتیوں سے محبت نہیں مگر اس کا "چشم و چراغ" انہی چیزوں سے محبت رکھتا ہے۔ کلیم میں وہ خود نگری بھی پائی جاتی ہے جو اکثر اہلِ کمال میں ہوا کرتی ہے۔ وہ طبعاً آزاد اور وسیع المشرب ہے۔ مگر میاں نصوح کے نزدیک یہ سب کچھ ہیچ ہے۔ نذیر احمد نے کلیم کی تخلیق میں اپنی ہنر وری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ بہرحال کلیم نذیر احمد کا لافانی کردار ہے۔ اور ظاہر دار بیگ بھی اردو ادب کا ایک زندہ رہنے والا نمائشی دوست ہے۔ اس کی ظاہرداری اور سخن سازی اور مہذب ریاکاری بھی ہر طرح سچائی اور حقیقت کے قریب ہے۔

مراۃ العروس کی اصغری اکبری میں بھی نذیر احمد نے بڑی احتیاط اور دقّتِ نظر کا ثبوت دیا ہے۔ مگر ان دو نسوانی کرداروں میں سچائی نہیں پیدا ہو سکی ——— سرسیّد نے مراۃ العروس کے متعلق یہ اعتراض کیا تھا کہ نذیر احمد نے مراۃ العروس لکھ کر زنانہ سوسائٹی پر ایک اتہام باندھا ہے ——— ممکن ہے یہ درست ہو اور سچ مچ نذیر احمد کے زمانے میں خواتین کی شائستگی بلند معیار کی ہو ——— مگر مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مراۃ العروس کے مردانہ کردار زنانہ کرداروں سے زیادہ عیب دار ہیں۔ عورتوں میں اور نہیں کم از کم اصغری سگھڑ اور باشعور تو ہے۔ مردوں میں تو میاں کامل ہو یا میاں عاقل یا کوئی اور سب بے شعور سے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مراۃ العروس اور بنات النعش اپنے رنگ کی اوّلین دلچسپ کتابوں کی حیثیت سے بہت مقبول ہوئیں ——— مگر یہ کتابیں ابن الوقت، توبۃ النصوح اور فسانۂ مبتلا کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

فسانۂ مبتلا نذیر احمد کا شاید کامیاب ترین قصہ ہے۔ اس کے تین لاجواب کردار مبتلا، غیرت بیگم اور ہریالی مصنف کی کردار نگاری کے کامیاب نمونوں کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں ——— ناول تو یہ بھی مقصدی ہے۔ مگر فن کے اسرار و رموز سے جو واقفیت اس قصے میں نظر آتی ہے۔ ان کے کسی دوسرے ناول میں موجود نہیں۔ اس میں پلاٹ کی تعمیر مناسب، مربوط اور معقول ہے۔ اس میں گفتگوؤں کا طول کم اور مکالموں کی ہیئت فطری ہے۔ اور مقصد فن کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ اعتراض کی گنجائش بہت کم نکلتی ہے۔

ایامیٰ اور رویائے صادقہ بھی ان کے قصے ہیں، ایامیٰ میں آزادی بیگم کے کردار میں خاصی سچائی ہے۔ اگرچہ اس قصے کے کردار بھی مکالموں میں باتوں کی بجائے لمبی تقریریں کرتے ہیں مگر ایامیٰ میں نذیر احمد نے نفسیاتی تجزیے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ رویائے صادقہ میں دیانت داری، خدا پرستی، اوہام باطلہ کی تردید، تعلیم جدید کی خرابیاں اور علی گڑھ کالج میں تعلیم و تربیت کا حال اور اس کے نقائص بیان کیے گئے ہیں مگر رویائے صادقہ میں نذیر احمد کی واعظانہ حیثیت سب سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔

نذیر احمد کے فن پر طرح طرح کے اعتراض کیے گئے ہیں مگر بڑے اعتراض دو ہیں، اوّل ان کے ناولوں کا واعظانہ انداز، دوّم ناول کی ہیئت کے متعلق بے شعوری۔ وہ فارم (ہیئت) سے زیادہ بیانات کو اہمیت دیتے ہیں۔ انہیں یہ اشتیاق رہتا ہے۔ کہ جو کچھ کہنا ہے سب کچھ (ساری جزئیات سمیت) فی الفور کہہ دیا جائے۔ محل مقام کی بیشی کا خیال وہ بہت کم رکھتے ہیں۔ پھر بھی یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ نذیر احمد کی قوت مشاہدہ تیز تھی اور انہیں جزئیات پر بڑا عبور تھا ——— ان کے قصوں کی کمزوری کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں اپنے نقطۂ نظر کو زور سے (خطابتی اور ہیجانی انداز میں) ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے زمانے کی عقل پسندی کے بڑے نمائندے ہیں۔ مگر اس عقل پسندی کے باوصف ان کی تکنیک میں عقلیت اور منطقیت کم ہے ——— ناول بھی تناسب، معقولیت، حدِ مناسب کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ سب چیزیں وہ ہیں جن میں نذیر احمد کی عقل پسندی دب سی گئی ہے وہ نظریاتی لحاظ سے عقل پسند ہیں، ورنہ یہاں سراسر جذباتی ہی معلوم ہوتے ہیں ——— اور ناول میں مقصد سے عشق کا اگر کوئی نقصان ہے تو یہی ہے کہ اس میں ناول نگار اپنی معقولیت کو فراموش کر دیتا ہے۔

گزشتہ مباحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ نذیر احمد کی قلم کاری کا نصب العین محض چند مخصوص سماجی اور معاشرتی تصورات کی اشاعت تھا۔ ورنہ شاید قصہ نویسی کا فن ان کا منتہائے مقصود تھا ہی نہیں، وہ سرسید کے ایک ہم کار اور رفیق اور اس دور کے ایک مذہبی اور مجلسی مصلح تھے ——— اور ان کے حق میں یہ کلمات ان کی شان اور ان کی اہمیت کی تنقیص کے مقصد سے استعمال نہیں ہوئے بلکہ فی الحقیقت خود ان کا اپنا مقصد اور نصب العین بالارادہ بھی یہی تھا۔ اس لیے فن کی بحث کو چھوڑ کر اب ہم ان افکار و تصورات کی اجمالی فہرست پیش کرتے ہیں۔ جن کی اشاعت کی خاطر نذیر احمد نے قصہ نویسی اختیار کی۔

نذیر احمد کے رجحانات اور تصورات تقریباً وہی تھے۔ جو سرسید کے رفقا کے مخصوص افکار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا اصل جذبۂ محرک تھا۔ قوم کی اصلاح و ترقی کا خیال اور نئے حالات میں مجلسی و دینی افکار کی جدید تعبیر و توجیہہ ——— سرسید کے سب رفقاء کی طرح نذیر احمد کا مقصد بھی یہی تھا جس کو انہوں نے اپنی دینی کتابوں کے علاوہ اپنے قصوں میں بھی پیش نظر رکھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ انہوں نے مذہب کی طرح خود تمدنی اور مجلسی امور میں عقل کی کارفرمائی کو بڑی اہمیت دی ہے۔ سرسید کے رفقا میں اگر شبلی کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے اسلامی تاریخ کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر تاریخ کا ایک معقول تصور ہمارے سامنے رکھا تو نذیر احمد کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے مجلسی زندگی کا ایک مثالی مگر معقول نمونہ قوم کے سامنے پیش کیا۔ بہرحال معقولیت ان کے تصورات کا بنیادی وصف ہے۔ اس میں نذیر احمد کی خاص خدمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ان "معقولی" صلاحیتوں کو گھروں کی آبادی اور خانگی زندگی میں خوشحالی اور مسرت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا ——— اور یہ اس معنی میں بہت بڑا کارنامہ ہے کہ خانگی مسرت قومی ترقی میں بہت بڑی حد تک ممد و معاون ہو سکتی ہے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے عورتوں کو منزلی زندگی کا سنگِ بنیاد قرار دیا کیونکہ اچھی عورتیں ہی کارکن مردوں کو کارہائے نمایاں انجام دینے کے قابل بنا سکتی ہیں۔ جن گھروں میں عورتیں مردوں کے لیے ذہنی تکلیف اور پریشانی کا باعث بن جاتی ہیں۔ وہاں کے مرد زندگی میں کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ ان کا سارا وقت اپنی عورتوں کے مسائل حل کرنے میں گزر جاتا ہے۔ نذیر احمد منزلی زندگی کے اس راز سے اچھی طرح باخبر تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ قومی ترقی کے لیے عورتوں کی تعلیم اور ذہنی تربیت کی بے حد ضرورت ہے۔ اس کے لیے انہوں نے اصغری، صادقہ اور آزادی بیگم کے مثالی کردار ہمارے

سامنے پیش کیے۔

نذیر احمد کے ان تصورات پر دو اعتراض کیے جاتے ہیں:- اوّل یہ کہ انہوں نے اپنے طبقے (متوسط طبقے کے نچلے درجے کے لوگوں) کے کردار پیش کیے ہیں اور قصہ نویسی سے مقصود بھی انہی کی اصلاح تھی۔ دوم یہ کہ ان کے نسوانی کردار جدید معاشرت میں زندہ رہنے کے مستحق نہیں —— ہمارے نزدیک یہ دونوں اعتراض بے جا ہیں —— نذیر احمد کے قصے عام مسلمانی معاشرت کے لیے آج بھی مفید اور نفع بخش ہیں۔ ان کے نسوانی کردار بلاشبہ جدید نہیں مگر ہماری معاشرت میں منزلی زندگی کو پُر اطمینان بنانے کے لیے "جدید سیرتوں" سے زیادہ نذیر احمد کی مثالی صورتیں آج بھی زیادہ کامیاب ہو سکتی ہیں —— اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغربی تصورات میں پلی ہوئی "بخود مشغول" اور "خود نگر" خواتین مردوں کی مشکلات میں اس طرح تعاون نہیں کر سکتیں جس طرح وہ خواتین جن کے نقشے نذیر احمد نے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔ ہماری سوسائٹی کو آج پھر اصغری کی ضرورت ہے۔

نذیر احمد نے توبۃ النصوح میں کلیم کو ایک فن دوست اور نصوح کو ایک فن دشمن کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے نصوح کی زبان سے فن اور ادب کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی بنا پر یہ رائے قائم کی گئی ہے۔ کہ نذیر احمد آرٹ اور ادب کے مخالف تھے اور محض "مولوی" تھے۔ وہ نہ چاہتے تھے کہ قوم کے تعلیم یافتہ لوگ آرٹ اور ادب میں دلچسپی لیں۔ مگر یہ نذیر احمد کے ساتھ زیادتی ہے۔ نذیر احمد آرٹ اور ادب کے مخالف نہ تھے۔ وہ ایک مقصدی دور کے ادیب تھے اور ادب کی افادیت کے قائل تھے۔ ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ آرٹ اپنی ذات میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جو آرٹ برائے آرٹ اور جو ادب برائے ادب ہے وہ بے بنیاد بلکہ مضر ہے۔ آرٹ اور ادب کو زندگی کے لیے مفید ہونا چاہیئے —— اخلاق اور ادب کے سوال پر بھی ان کا نقطۂ نظر یہی ہے۔ فحاشی اور عریانی سحرالبیان میں ہو یا گلستان میں، ان کے نزدیک مضر اور مہلک ہے —— بس یہی نذیر احمد کے خیالات ہیں اور یہ وہ خیالات ہیں جن پر بعد کے افادیت پسندوں نے خصوصاً اقبالؒ نے —— مہر تصدیق ثبت کر دی ہے —— نذیر احمد قومی تعمیر کے اوّلین دور کے رہنماؤں میں سے تھے اس لیے انہوں نے ادب اور خصوصاً رائج الوقت یا روایتی ادب کے متعلق جس نظریئے کا اظہار کیا وہ قابلِ اعتراض معلوم نہیں ہوتا —— اور اس سے ان کی کسی "مولویت" کا ترشح نہیں ہوتا —— اور اگر اس کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد کو کوئی شخص مولوی نذیر احمد کہہ دے تو ان کی یہ مولویت بھی نہایت مستحسن مولویت ہے۔

نذیر احمد کا دین کیا ہے؟ اصلاح معاش اور فکر معاد! ان کے نزدیک ایک مکمل دین دار وہ ہے "جو غصے کو پی جائے، انتقام نہ لے، جھوٹ نہ بولے، غیبت نہ کرے، حریص و طامع نہ ہو، جابر اور سخت گیر نہ ہو۔ ممسک اور بخیل نہ ہو مغرور اور متکبر نہ ہو وغیرہ وغیرہ" —— غرض اس میں ایک اعلیٰ درجے کے انسان کی جملہ صفات موجود ہوں۔ اس مکمل انسان کی صحیح تصویر وہ ہے جو نذیر احمد نے حجۃ الاسلام کی زبان سے ابن الوقت میں کھینچی ہے۔

نذیر احمد کا دین دار کوئی تارکِ دنیا عابد و زاہد نہیں بلکہ دنیاوی فہم و فراست سے بھی آراستہ ہے —— وہ سخت کوش بھی ہے اور نیک عمل بھی —— اس کی خدا پرستی اس کو دنیا داری سے نہیں روکتی۔ بلکہ ایک کامیاب دنیا دار بناتی ہے۔

نذیر احمد کی دنیاداری میں کفایت شعاری اور جزرسی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ دراصل ان کے ان تجربات کی وجہ سے ہے جو انہیں اپنی زندگی میں حاصل ہوئے۔ انہوں نے زندگی میں غربت و افلاس کی تکلیفیں اٹھائیں۔ اس لیے انہیں روپے کی قدر و قیمت کا بڑا احساس تھا۔ بنا بریں وہ یہ چاہتے تھے کہ قوم کے سب افراد اس کی اہمیت کو پہچانیں۔ خصوصاً غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کو اس کی بڑی ضرورت ہے کہ وہ روپے کا صحیح مصرف پہچانیں اور اپنا روپیہ فضول اور بیکار ضائع نہ کریں۔

اس صدی کے مخصوص سیاسی تعلیمی اور معاشرتی تصورات میں نذیر احمد کبھی سرسید کے ہم خیال نظر آتے ہیں کبھی مخالف! ابن الوقت کے بھیس میں انگریزی لباس پر جو لے دے کی ہے یا سید صادق کے خطوں میں علی گڑھ کالج کے غیر اسلامی ماحول کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ جدید انتہا پسندی اور غلو کے خلاف ایک ردِ عمل ہے مگر سیاسیات میں نذیر احمد سید صاحب سے پورے پورے متفق معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ مجلسی اور معاشرتی امور میں وہ اُن سے بہت مختلف تھے۔

نذیر احمد کے خیالات کے اس جائزے سے یہ بات اچھی طرح روشن ہے کہ وہ اس دور کے صحیح نمائندہ و ترجمان تھے ـــــ انہوں نے اپنے دوسرے رفقا کی طرح ذہن کو بدلنے کے لیے بہت سا ادب پیدا کیا ـــــ اور یہ ادب ایسا ادب تھا جس کا تعلق خواص سے زیادہ عوام سے تھا۔ اور اس لحاظ سے (جیسا کہ پہلے بیان ہوا) نذیر احمد کو سرسید کے رفقا میں سب سے زیادہ "عوامی" کہا جا سکتا ہے۔ (عوامی مزدور کا رکن کاشتکار کے معنی میں نہیں جمہور کے معنی میں)

شبلی کے علمی کارنامے اور حالی کے فنی شاہکار سب اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں (جیسا کہ تذکرہ ہو چکا ہے) مگر نذیر احمد کا دائرہ خطاب ان سب سے زیادہ وسیع اور اپنے زمانے کے نثر نگاروں میں ان کی مقبولیت سب سے زیادہ تھی۔ کیوں کہ ان کی کتابوں کو خاص اور عام، مرد اور عورت، امیر اور غریب، دین دار اور دنیادار سبھی پڑھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ ان کی کتابوں کی علمی سطح اتنی بلند نہیں جتنی ان کے دوسرے رفقا کی کتابوں کی ہے۔ ہم ان کو اُردو کے بہت بڑے مصنفوں اور انشا پردازوں میں شمار کرتے ہیں ـــــ اور ہر چند کہ فنی لحاظ سے ان کے ناولوں پر اور علمی لحاظ سے ان کی دینی کتابوں پر اعتراض وارد کیے گئے ہیں مگر ناولوں میں ابن الوقت۔ فسانۂ مبتلا اور توبۃ النصوح اور علمی کتابوں میں الحقوق و الفرائض اُردو ادب کے ساتھ دوامی عمر پائے گی ڈاکٹر جانسن کے بقول ادبی مذاق کے بدل جانے کے باوجود "فیلڈنگ کی TOM JONES ابھی متروک نہیں ہوئی" ہمارے نقادوں کی کڑی تنقید کے باوجود ابن الوقت اور فسانۂ مبتلا ابھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

نذیر احمد کا اسلوبِ بیان بھی ان کے فن کی طرح منفرد ہے ـــــ ان کے اسلوب کے خصائص ان کے رفقا کے اسلوب میں کہیں نہیں ملتے! وہ ایک خاص قسم کی زبان لکھتے ہیں جو علمی بھی ہے اور عوامی بھی ـــــ مولوی سعید انصاری نے اپنے رسالہ شبلی میں ان کی زبان کو سوقیانہ اور عامیانہ کہا ہے ـــــ مگر اس کے لیے صحیح لفظ شاید عوامی ہوگا۔ ان کی زبان عامیانہ نہ تھی عوامی تھی! اور عوامی وہ زبان نہیں جو درجۂ ادب سے گری ہوئی ہو بلکہ وہ زبان ہوتی ہے جس کو عوام اور خواص دونوں طبقے سمجھتے ہوں اور زندگی کے عام استعمال میں لاتے ہوں۔ یہ زبان صرف مخصوص اشرافیوں کی زبان نہیں ہوتی۔ نہ یہ زبان ایسی ہوتی ہے جس کو اشرافی منہ لگانا ہی پسند نہ کریں ـــــ یہ تو ایک عام استعمال کی زبان ہوتی ہے جو بات چیت، بحث و مباحثہ اور معاملہ و استدلال کے ہر موضوع میں استعمال ہو جاتی ہے۔

نذیر احمد کی زبان بھی اسی قسم کی ہے۔ اس میں ایک طرف وہ محاورات و کنایات ہیں جو قومی ذہانتوں اور معاشرتی لطافتوں کے آئینہ دار ہیں خصوصاً وہ جو گھروں میں استعمال ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ علمی محاورہ جو اس زمانے کے عام تعلیم یافتہ طبقے میں (بلکہ عام لوگوں میں) مانوس و مقبول تھا —— بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ نذیر احمد کی یہ دو رنگی زبان دو مختلف مزاجوں کی نمائندگی کرتی ہے جن سے نذیر احمد کا اپنا مزاج مرکب تھا —— چلئے یہ بھی سہی مگر اس دو رنگی زبان میں نذیر احمد نے جو یک رنگی پیدا کی ہے اس پر بدرنگی کا داغ نہیں لگا —— مجموعی لحاظ سے ان کی زبان خوش رنگ ہی رہتی ہے۔ عربی فارسی کے مقولے اور اصطلاحات نذیر احمد کے لیے روزمرہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان ثقیل عناصر کو اپنی رواں عبارتوں میں اس مزے سے کھپایا ہے کہ ساری عبارتیں پُرخروش نغمہ بن گئی ہیں —— کیونکہ یہی تو وہ نصب العین ہے جو نذیر احمد کے لیے ایک ذہنی غایت کا درجہ رکھتا ہے —— تند و تیز لہجہ اور پُرشور آہنگ ان کی اس خطابت کی یاد دلاتا ہے۔ جس کی گونج آج تک بھی کچھ بڑی عمر کے لوگوں کے سامعہ میں خروش پیدا کر رہی ہے —— پھر کیا اس پُرخروش آہنگ کے لیے لفظوں اور ترکیبوں کے خروش کی ضرورت نہ تھی؟ یقیناً تھی! ثقیل حروف اور ثقیل و غریب الفاظ نذیر احمد کی تحریروں میں بڑی قیمت پاتے ہیں —— دنیا جس متاع کو رد کر دیتی ہے نذیر احمد اسی سے اپنی دکان سجاتے ہیں —— نذیر احمد نرم الفاظ کے خریدار ہوں تب بھی ان کی انشا کی اصل سج دھج ثقیل اور کرخت الفاظ سے ہی بنتی ہے —— !

—— اور پھر یہ بھی ہے کہ نذیر احمد کی انشا میں اصل قوت بھی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کے قلم میں غم و غصہ اور زجر و قہر کے جذبات مواج ہو رہے ہوں —— نذیر احمد کی پیاری تحریریں بھی شاید وہی ہوں گی جو سب سے غصیلی باتوں کی قائم مقامی کر رہی ہیں —— ان موقعوں پر طنز و تعریض، شکوہ و احتجاج، قہر و عتاب، عربی کی ضرب الامثال، مصرعے اور مقولے، زنانہ اور طبقاتی محاورات، مسلسل اور مفرد تراکیب سب ایک ایسے آئین سے منظم ہو کر ایسے خوبصورت پیرایہ بیان میں متشکل ہو جاتی ہیں کہ ان کا اثر قبول کیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

نذیر احمد اپنے بیان میں جزئیات کو جس طرح لپیٹتے آتے ہیں۔ اس سے ان کے بازوؤں کے پھیلاؤ کی تشبیہہ سوجھتی ہے، جس کی لپیٹ میں ہر چیز سما جاتی ہے۔ کوئی چیز ان کے بازوؤں کے پھیلاؤ سے باہر نہیں رہ سکتی۔ نذیر احمد کے بیان کی اسی وسعت طلبی سے متاثر ہو کر مہدی الافادی پکار اٹھے تھے کہ اس شخص کی وسعتِ نظر تو یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ یہ اسلام کی قاموس لکھے —— یہ تو وسیع بازوؤں والا ادیب اور عالم ہے۔ اور ایک لحاظ سے یہ توقع غلط بھی نہ تھی۔ اگرچہ قاموس کی ہمہ گیری تفصیل بیان کی نہیں اعجاز بیان کی متقاضی ہوتی ہے۔ اور نذیر احمد کو اس ایجازِ بیان پر قدرت ہی نہیں تھی —— یہ تو شبلی کا خاصا تھا کہ وہ وسیع مضامین کو چند لفظوں میں ادا کر سکتے تھے۔ نذیر احمد اس میدان کے مرد نہ تھے وہ تو وہاں کام کے آدمی ثابت ہوتے تھے جہاں بازوؤں کے پھیلاؤ کی ضرورت ہوتی تھی۔ —— نذیر احمد قاموس کے لیے نہیں عوامی خطابت کے لیے موزوں تھے —— ان کی خطابت اور انشا کو قید نہیں کیا جا سکتا تھا —— وہ قید بھی ہوئے تو شاید ترجموں میں قید ہو سکے جہاں اصل کی پابندی قدم قدم پر انہیں ٹوکتی جاتی تھی کہ دیکھئے صاحب زیادہ بازو نہ پھیلا دیجئے گا —— اور یہاں بھی بسا اوقات ایسا ہوا کہ نذیر احمد تھک کر انگڑائیاں لینے لگے اور کچھ پابندیاں جو زور سے عائد کر رکھی تھیں وہ خود ہی توڑ ڈالیں —— ان کے قانونی تراجم بلاشبہ زیادہ مقید اور پابند ہیں۔ کیونکہ ان

میں قطعی اور معین حدوں میں چلے بغیر چارہ نہیں تھا ——— مگر باقی ہر جگہ پھیلاؤ ہی ان کی طبیعت کا رنگِ اصلی ہے۔

نذیر احمد ہی اردو کے وہ انشا پرداز ہیں جن کی باتیں زوردار ہوتی ہیں۔ حالی کی آواز دھیمی لہجہ مسکینوں جیسا، شبلی پکی مگر مختصر بات کہنے والے، آزاد میٹھی میٹھی (کبھی لمبی کبھی مختصر) کہانیاں کہنے والے، ان میں نذیر احمد ہی وہ انشا پرداز ہے جو پُرزور انداز میں بات کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے لہجے میں بھی قوت، کرختگی اور صلابت ہے اور ان کے الفاظ میں بھی رُعب اور طنطنہ ہے ——— نذیر احمد لمبے فقروں اور طویل پیراگرافوں کے مطلق العنان حاکم تھے ——— سرسید بھی فقرے لمبے لکھتے تھے۔ مگر جہاں سرسید کے فقروں سے یقین کا ملکہ پیدا ہوتا ہے وہاں نذیر احمد کے طویل پیراگرافوں سے خوف اور دہشت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ——— گھن گرج ——— کچھ جوش ملیح آبادی کی نظم کی طرح ——— بجلیوں کی چمک مگر رعد کی آواز ——— کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ——— مگر نذیر احمد کا منفرد اسلوبِ بیان دلوں پر اپنا سکہ جماتا چلا جاتا ہے ——— یہ خاص رنگ رفقائے سرسید میں سے کسی کو حاصل نہ ہُوا۔

گُل بکاؤلی

محمد عبداللہ قریشی

اُردو کے قدیم نثری قصوں اور منظوم افسانوں میں قصۂ گل بکاؤلی بہت مشہور ہے۔ جس میں تاج الملوک اور بکاؤلی کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ اصل کہانی کی تاریخ کا علم تو خود تاریخ کو بھی نہیں۔ البتہ ہندوؤں کی بعض قدیم کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ جن سے قیاس ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس کے متعلق کوئی کتاب سنسکرت وغیرہ میں لکھی گئی ہوگی۔ مگر اس کا کوئی ثبوت آج تک نہیں مل سکا۔

فارسی زبان میں یہ قصہ پہلے پہل عزت اللہ بنگالی نے ۱۷۲۲ء (۱۱۳۴ھ) میں اپنے ایک دوست مدرمحمد کی فرمائش پر لکھا اور اس دوست کی وفات کے بعد اس کی یادگار کے طور پر اسے شائع کیا۔

اس فارسی قصے کی مقبولیت دیکھ کر فورٹ ولیم کالج کے مشہور پرنسپل ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہند کے عہد میں نہال چند لاہوری سے اسے اُردو نثر میں ترجمہ کرایا۔ اس ترجمہ کا نام "مذہبِ عشق" ہے۔ کتاب کے آخر میں ہجری اور عیسوی تاریخیں اس طرح نکالی گئی ہیں ؎

غرض جس طرح سے کیا ان کو شاد — ہماری بھی دے یا الٰہی مراد
یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام — تو پھر فکرِ تاریخ تھی صبح و شام
یکایک سنی میں نے آوازِ غیب — کہ ہے "مذہبِ عشق" تاریخ و نام

۱۲۱۷ھ

ہوئی پھر یہ خواہش کہ کلکِ زباں — کریں عیسوی سال کو بھی عیاں
تو پھر ہاتفِ غیب نے دی ندا — کہ اس "مذہبِ عشق" میں کوئی آ
کرے "مشربِ جام" اگر اختیار — تو رازِ نہاں اس پہ ہو آشکار

۵۸۶

یعنی "مذہبِ عشق" کے ۱۲۱۷ اعداد میں "مشربِ جام" کے ۵۸۶ عدد ملانے سے ۱۸۰۳ء حاصل ہو جائیں گے۔

لالہ نہال چند کے آباؤ اجداد شاہ جہاں آباد دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد ترک وطن کرکے لاہور آئے

اور آگے چل کر لاہوری کہلائے۔ اس قصے میں انہوں نے نہایت صحیح، بامحاورہ اور باقاعدہ زبان لکھی ہے۔ پہلی مرتبہ یہ قصہ سنہ ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔ دوبارہ اشاعت کے وقت میر شیر علی افسوس نے نظر ثانی کی۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف مطابع میں کئی مرتبہ طبع ہوا۔ اور ہمیشہ شوق سے پڑھا جاتا رہا۔ سر ابراہیم گریرسن نے "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی فہرست دی ہے جو نہایت طویل ہے۔

"ڈاکٹر گیان چند جین ایم۔ اے ڈی فل صدر شعبۂ اردو حمیدیہ کالج بھوپال نے اس قصے کے مختلف نسخوں اور ترجموں کی کیفیت یوں بیان کی[2] ہے:۔

فارسی ۔ گل بکاؤلی از عزت اللہ بنگالی ۱۷۲۲ء (۱۱۳۴ھ)
مثنوی از فرحت اٹھارویں صدی کے آخر میں۔
اُردو ۔ دکنی نسخہ ۱۰۳۵ھ بارود خانہ اودھ کے کتب خانے میں (اسپرنگر)
مثنوی تحفۂ مجلس سلاطین۔ بقول دتاسی یہ تاریخی نام ہے۔ اور اس سے ۱۷۳۸-۹ء (۱۱۵۱ھ) نکلتا ہے۔ لیکن دراصل ۱۰۵۵-۶ھ نکلتا ہے۔ رام بابو سکسینہ "تحفۃ المجالس" نام دیتے ہیں۔ اور اس سے ۱۰۵۳ھ برآمد کرتے ہیں۔
گلگشت منظوم یا خیابان ریحان از ریحان الدین ریحان لکھنوی ۱۲۱۱ھ (انجمن ترقی اُردو)
مذہب عشق از نہال چند سنہ ۱۸۰۳ء (۱۲۱۷ھ) عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصہ کا ترجمہ۔
مثنوی گلزار نسیم از دیا شنکر نسیم سنہ ۱۸۳۷ء (۱۲۵۲ھ)
گل بکاؤلی قلمی منظوم سنہ ۱۲۶۱ھ از محمد داؤد ولی ۲۶ داستان اور پانچ لطیفے۔ مصنف حیدر آباد سے کلکتہ گیا۔ اور ٹیپو سلطان کے خاندان کی سرپرستی میں رہا (کتب خانہ مسعود حسن رضوی)
ہندی ۔ بکاؤ سمن از بیج سنگھ ورما سنہ ۱۸۶۴ء لکھنؤ۔ مذہب عشق کا ترجمہ۔
فرانسیسی ۔ از گارساں دتاسی سنہ ۱۸۳۵ء
انگریزی ۔ از ٹی۔ پی مینول۔ مذہب عشق کا ترجمہ۔
از لفٹیننٹ آر پی اینڈرسن سنہ ۱۸۵۱ء دلی۔
کلوسٹن نے دتاسی اور مینول سے لے کر سنہ ۱۸۸۹ء میں "اے گروپ ایسٹرن رومانس (A GROUP EASTRN ROMANCES) میں شامل کیا۔
از بادا پچر سنگھ سنہ ۱۹۰۳ء۔

مذہب عشق کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ پورب کے کسی بادشاہ زین الملوک کے چار بیٹے پہلے سے موجود ہیں، پانچواں

---

[1] ارباب نثر اُردو صفحہ ۲۳۱ [2] اُردو کی نثری داستانیں مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۵۸۶ و ۵۸۷۔

تاج الملوک پیدا ہوتا ہے جو بادشاہ کو بہت محبوب ہوتا ہے۔ مگر نجومی اسے بادشاہ کے لیے نحوست آثار قرار دیتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ اگر بادشاہ نے کبھی اسے دیکھ لیا تو اندھا ہو جائے گا۔ زین الملوک نے شیر خوار بچے کے لیے شہر سے باہر ایک مکان بنوا دیا۔ مگر تقدیر کے سامنے کیا چارہ۔ ایک روز بادشاہ شکار سے واپس آ رہا تھا کہ نورِ چشم پر نظر جا پڑی۔ اسی وقت آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ علاج کے لیے ہزاروں تدبیریں کیں مگر ایک نہ چلی۔ آخر ایک بزرگ نے کہا کہ شفا صرف اس پھول سے ممکن ہے جو بکاؤلی پری کے چمن میں ہے۔ بادشاہ کے چاروں بڑے بیٹے اس گلِ نایاب کی تلاش میں نکلتے ہیں اور سفر کرتے کرتے ایک شہر میں پہنچتے ہیں جہاں ایک بیسوا دلبر نامی رہتی ہے۔ وہ بازاری عورت چوسر کھیلنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور ایک بلی اور چوہے کی مدد سے ہمیشہ بازی جیت لیتی ہے۔ چاروں شہزادے اس کے ہاں جاتے ہیں۔ اور اپنی تمام دولت بلکہ آزادی تک ہار کر اس کے غلام بن جاتے ہیں۔ وہ انہیں قید کر لیتی ہے۔ بالآخر پانچواں شہزادہ تاج الملوک اپنے بھائیوں کی تلاش میں وہاں پہنچتا ہے۔ اور اس عیارہ کے مکر و فریب کو تاڑ کر ایک نیولے کی مدد سے اسے کھیل میں شکست دیتا، اسے اپنی لونڈی بناتا اور تمام شہزادوں کو اس کی غلامی اور قید سے نجات دلاتا ہے۔ پھر کئی قسم کی مصیبتیں جھیل کر گلِ بکاؤلی کی تلاش میں باغِ ارم کی جانب روانہ ہوتا ہے۔ راہ میں ایک ہیبت ناک دیو اسے ملتا ہے جسے دیکھتے ہی شہزادہ کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ دیو خوش ہوتا ہے کہ آج مدت کے بعد لذیذ شکار نصیب ہوا ہے۔ اتنے میں دیو کو چند اونٹ، آٹا، روغن اور شکر وغیرہ سے لدے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ غراتا ہوا جاتا ہے۔ اور ان سب کو اٹھا لاتا ہے۔ چونکہ بوجھ زیادہ ہوتا ہے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ تاج الملوک موقع غنیمت جان کر نہایت لذیذ حلوہ تیار کرتا ہے جو دیو کے ہوش میں آنے تک بالکل تیار ہوتا ہے۔ دیو شیرینی کھا کر بہت خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ اے آدمی زاد! مانگ کیا مانگتا ہے۔ شہزادہ گلِ بکاؤلی کی خواہش ظاہر کرتا ہے دیو وہاں کے بہت خوفناک نظارے بیان کرنے کے بعد آخر اپنی بہن حمالہ دیونی کے نام ایک خط دیتا ہے کہ اس آدمی زادے کی مدد کی جائے۔ حمالہ کے پاس ایک آدم زاد لڑکی محمودہ عرصہ سے مقید تھی۔ جسے وہ جان و دل سے عزیز رکھتی تھی۔ اس نے تاج الملوک اور محمودہ کے تعلقات میں ایسی مضبوط گرہ ڈال دی جسے جیتے جی کوئی نہ توڑ سکا۔ محمودہ کی سفارش سے حمالہ نے بہت سے دیووں کو چوہے بنا کر باغِ بکاؤلی تک ایک سرنگ کھدوائی۔ تاج الملوک اس سرنگ کی راہ اس حوض تک جا پہنچا۔ جس میں وہ پھول تھا۔ پھول اٹھا لیا۔ اور خواب گاہ بکاؤلی میں جا کر اپنی انگشتری نشانی کے طور پر اس سے بدل لی۔ بکاؤلی نے جب آنکھ کھولی اور وہ پھول وہاں نہ پایا تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بہت روئی، بہت پیٹی، کسی پر غصے ہوئی۔ کسی کو ڈرایا دھمکایا، کسی پر چوری کا الزام لگایا۔ مگر چور اصل کہیں تھا۔ اس کا پتہ نہ چلا۔

تاج الملوک وہ پھول لے کر دلبر بیسوا کے ملک میں پہنچا۔ تمام قیدیوں اور اپنے بھائیوں کو غلامی کا نشان لگا کر رہائی دلائی۔ مگر راستے میں چاروں بھائیوں نے وہ پھول اس سے چھین لیا۔ اور باپ کے پاس لے گئے۔ جس سے اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

ادھر بکاؤلی گُل کے فراق میں دیوانی سی ہو گئی۔ اسے پھول چرانے والے سے غائبانہ عشق ہو گیا۔ وہ اپنے پھول اور دل کے چور کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ ماری ماری پھرتی رہی اور بے شمار تکلیفیں اٹھانے کے بعد جب وہ زین الملوک کے ملک میں پہنچی۔ تو اس نے بادشاہ کے اندھا ہونے اور اپنے پھول کی کرامت سے دوبارہ بینائی حاصل کرنے کا چرچا سنا۔ وہ فوراً ایک خوبرو آدمی کا روپ دھار کر بادشاہ کے دربار میں پہنچی۔ بادشاہ اس کی باتوں سے اتنا خوش ہوا کہ اسے اپنا وزیر بنا لیا۔

تاج الملوک نے اپنے دیس پہنچ کر حمالہ دیونی کا ایک بال جو اس نے مشکل کے وقت کے لیے دیا تھا آگ پر رکھا۔ حمالہ فوراً حاضر ہوئی۔ اس نے پوچھا محمودہ کہاں ہے؟ کہا اس کے رہنے کے لیے نہ مکان ہے نہ باغ نہ حوض۔ اس لیے ان سب چیزوں کی ضرورت ہے حمالہ نے دیووں کی مدد سے تاج الملوک اور محمودہ کی خاطر قلعہ بکاؤلی کے نمونہ پر ایک عالیشان محل گلشن نگارین تعمیر کرایا جس کی دھوم بادشاہ زین الملوک تک پہنچی۔ بادشاہ اس سے ملنے کے لیے آیا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ بادشاہ کا وزیر فرخ (یعنی بکاؤلی) بھی ہمراہ تھا۔ تاج الملوک نے باتوں ہی باتوں میں بادشاہ سے پوچھا۔ آپ کے صاحب زادے کتنے ہیں؟ بادشاہ نے چاروں بیٹوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ کہ ایک اور بھی تھا مگر اس کم بخت نے تو مجھے اندھا کر دیا۔ یہ چاروں شہزادے بکاؤلی کا پھول لائے جس سے مجھے پھر بینائی نصیب ہوئی۔ تاج الملوک نے میوادبر کی زبانی چاروں شہزادوں کے کرتوت سے آگاہ کیا۔ اور جان جوکھوں میں ڈال کر بکاؤلی کے پھول تک پہنچنے اور سرنگ لگانے کا تمام ماجرا کہہ سنایا۔ باپ نے بیٹے کو گلے لگایا اور فرط محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

بکاؤلی نے جب اپنے تاراج ہونے کی کہانی سنی تو بے تاب ہو کر اپنے وطن گلزار ارم چلی گئی۔ وہاں سے تاج الملوک کو ایک فراقیہ خط لکھا۔ اور سمن پری کے ذریعے اپنے مکیں کو اپنے پاس ہی بلوا لیا۔ بکاؤلی کی ماں کو جب بیٹی کی نگاہ بازیوں اور لگاوٹوں کا حال معلوم ہوا تو اس نے تاج الملوک کو دریائے طلسم میں ڈال کر بیٹی کو قید کر دیا۔ تاج الملوک عجیب عجیب شکلیں اختیار کرتا رہا۔ آخر اسے ایک عصا اور ٹوپی دستیاب ہوئی۔ جس کی مدد سے وہ جہاں چاہتا پہنچ جاتا۔ اس طرح وہ ایک ایسے لق و دق صحرا میں پہنچا جہاں دیووں اور پریوں کی حکومت تھی۔ وہاں روح افزا نام ایک پری نے جو بکاؤلی کی چچا زاد بہن تھی تاج الملوک کو اپنا دکھڑا سنایا کہ کس طرح یہاں کے دیو نے اسے والدین سے جدا کر کے قید کر رکھا ہے۔ غرض لاٹھی اور ٹوپی کی مدد سے دونوں یہاں سے اڑ کر روح افزا کے وطن میں جا پہنچے۔ روح افزا کے واپس آ جانے پر گھر گھر خوشیاں ہونے لگیں۔ یہ خبر سن کر جمیلہ بھی اپنی بیٹی بکاؤلی کے ہمراہ مبارک سلامت کے لیے آئی۔ یہاں تاج الملوک اور بکاؤلی کی ملاقات بھی ہو گئی۔ روح افزا کی ماں حسن آرا اور خود روح افزا نے جمیلہ سے کہہ سن کر بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کرا دی۔ اور دونوں ہنسی خوشی باغ ارم میں رہنے لگے۔

شہزادہ کو جب وطن کی یاد آئی تو بکاؤلی کو ہمراہ لے کر گلشن نگارین میں آیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد بکاؤلی کو راجہ اندر نے یاد کیا۔ تاج الملوک بھی سایہ کی طرح تخت رواں کے ساتھ تھا۔ اور راجہ اندر کی محفل میں جہاں بکاؤلی ناچتی گاتی تھی برابر اس کے ساتھ رہتا تھا بکاؤلی ڈرتی تھی کہ راجہ کو خبر ہو گئی تو دونوں کو ہلاک کرا دے گا۔ مگر شہزادہ کی ضد سے مجبور تھی۔ جب راجہ بکاؤلی کے گانے سے خوش ہوا تو اس نے کہا کہ آج مانگ جو مانگنا ہے۔ میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔ بکاؤلی نے تاج الملوک کو دکھا کر اس کی فرمائش کی۔ راجہ اندر ایک آدم زاد کو اپنی محفل میں دیکھ کر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے بکاؤلی کو بد دعا دی جس سے اس کا نصف بدن پتھر کا ہو گیا جو بارہ برس تک رہا۔ شہزادہ بھی دربدر پھرتا رہا۔ جب سنگلدیپ میں آیا تو بکاؤلی کے نصف انسانی جسم سے درد فراق کی باتیں کیں۔ اس اثنا میں راجہ چتر سین والیِ سنگلدیپ کی لڑکی چتراوت شہزادے پر عاشق ہو گئی مگر وہ نہ مانا۔ آخر جب اس کو چوری کے الزام میں بے گناہ قید کر دیا گیا تو اس نے شادی کا اقرار کر لیا۔ شادی ہو گئی اور ایک عرصہ تک باہم ملتے رہے۔

بارہ برس گزرنے کے بعد جب بکاؤلی نے ایک کسان کے گھر نیا جنم لیا۔ تو تاج املوک بھی اس دہقان زادی کے حسن کا شہرہ سن کر وہاں پہنچا۔ چونکہ دل پہلے ہی سے ملے ہوئے تھے بغیر کسی تکلیف و تردد کے شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد دونوں چتراوت کے

محل میں آئے۔ اس کو ساتھ لے کر تاج الملوک اپنے وطن گلشن نگارین میں پہنچا جہاں دلبر اور محمودہ پہلے ہی سے بال بندھی موجود تھیں۔ تاج الملوک کا وزیر بہرام روح افزا پر عاشق ہو گیا اور آخر بکاؤلی کی سعی سے ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ غرض ؎

حاصل ہوئی ان گلوں کو بے خار   سیر شب زلف صبح رخسار
جس طرح انہیں بہم ملایا   بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا

اس قصے کے اجزائے ترکیبی کچھ ایسے ہیں کہ اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ تاج الملوک اور بکاؤلی کی شادی پر ختم ہوتا ہے۔ ایک حیثیت سے قصہ یہیں ختم ہو گیا ہے۔ وصل کی راہ میں جو مزاحمتیں تھیں وہ عبور کر لی گئی ہیں۔ تمام مشکلات اور مسئلے حل ہو چکے ہیں۔ ہمارے جذبۂ استفہام کو کسی بات کا انتظار نہیں رہتا۔ یہاں تک قصے پر فارسی رنگ ہے۔ اس کے بعد دوسرا جزو شروع ہوتا ہے اور بکاؤلی کے دوسرے جنم کے بعد اصلی حالت میں آنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ خالص ہندوستانی ہے۔ اس کے بعد کہانی کو آگے بڑھانے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ تیسرا حصہ بہت مختصر ہے۔ اس میں ہیرو اور ہیروئن بھی بدل جاتے ہیں۔ یہاں تاج الملوک اور بکاؤلی کی بجائے بہرام وزیرزادہ اور روح افزا منظر پر آجاتے ہیں[1]۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے قصے کو دوسرے حصے کے بعد اور بڑھانا چاہا مگر اس سے باسانی ممکن نہ تھا۔ کہ بکاؤلی اور تاج الملوک کو لے کر ہی کچھ اختراع کر سکے۔ اس لیے بہرام اور روح افزا کو قصے کے درمیان لایا گیا۔ یہ حصہ ایک ضمنی کہانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اصل کتاب سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کا خیال[2] ہے کہ اس قصے کے بعض حصے قدیم داستانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً دلبر بیسوا شہزادے کو گل بکاؤلی کی مہم سے روکنے کے لیے برہمن اور شیر کی حکایت سناتی ہے۔ یہ پنچ تنتر کے دکنی نسخے میں موجود ہے۔ شمالی ہند کے نسخوں میں کچھ اختلاف سے ہے۔

تاج الملوک اپنے بھائیوں کو زنداں سے رہا کراتا ہے۔ لیکن وہ اس سے دغا کرتے ہیں۔ یہی الف لیلہ میں شہزادہ خداداد کی کہانی میں ہے۔

پھول یا کسی اور چیز کے آنکھوں سے چھوانے سے بینائی کا عود کر آنا بھی نیا خیال نہیں۔ اس کی ابتدائی مثال حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ ہے۔

دیووں کے ذریعے محل تیار کرانا الہ دین چراغ عرب ہی میں نہیں ہندوستانی کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔

گل بکاؤلی میں ایک لڑکی دیو سے جنس تبدیل کر کے مرد ہو جاتی ہے۔ یہ مہابھارت کے ادھیوگ پرو سے لیا گیا ہے شکھنڈی عورت تھی لیکن مرد کی طرح پرورش کی گئی۔ شادی کے موقع پر وہ جنگل میں گئی اور ایک یکش سے جنس بدل کر مرد ہو گئی۔ طلسمی جنگل کے ایک حوض میں غوطہ لگا کر تاج الملوک عورت ہو جاتا ہے۔ جنس بدلنے کی مثالیں بیتال پچیسی کی چودھویں کہانی میں بھی ملتی ہیں۔ سندباد کی کہانی میں جنس بدلنے کے کنوئیں کا ذکر ہے۔ الف لیلہ کی دوسری کہانیوں میں چشمہ کا پانی پینے سے یا چشمہ میں غوطہ لگانے سے جنس بدلنے

---

[1] اردو کی نثری داستانیں صفحہ ۲۱۴

[2] اردو کی نثری داستانیں صفحہ ۱۶۲ - ۱۶۴

کا ذکر پایا جاتا ہے۔

قصہ گل بکاؤلی میں جو طلسم ہے اس کی مثالیں داستانِ امیر حمزہ یا بوستانِ خیال میں بھری پڑی ہیں۔

اندر سبھا کا ذکر سنسکرت ادب میں تفصیل سے ملتا ہے اور ہر شخص اس سے واقف ہے۔

بہارِ دانش میں چھٹے وزیر کی کہانی میں ایک شخص چھپ کر پری کے ساتھ پریوں کے ملک میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے شادی کر کے لوٹتا ہے۔ تاج الملوک کا اندر سبھا میں پہنچا دینا کوئی مشکل نہ تھا۔

قصے کے خاتمے میں بہرام کو ناختہ بنا دیا جاتا ہے۔ کامروپ میں اس کا رواج گل بکاؤلی سے پہلے تھا۔

داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قصہ گل بکاؤلی ہندوستان ہی میں لکھا گیا۔ پنچ تنتر کی کہانی، تکمنڈی کا قصہ اور اندر سبھا کا ذکر کافی ثبوت ہیں۔ دلبر بیسوا کا چوسر کھیلنا ہندوستانی بات ہے۔ بکاؤلی ایک مٹھ میں قید ہوتی ہے۔ مٹھ کے انہدام کے بعد وہاں سرسوں اُگتی ہے۔ اس کے تیل سے کسان کی بیوی کے حمل ٹھہرتا ہے اور بکاؤلی نیا جنم لیتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف آواگون یعنی تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہے۔ یہ قصے کی ہندوستانی اصل کا قوی ثبوت ہے۔ قصے کی عام فضا فارسی داستانوں کی سی ہے۔ تمام نام فارسی ہیں۔ قصے کا مرکزی نام بکاؤلی بھی ہندی یا سنسکرت کا نہیں۔ اس کے علاوہ مرغ اور صیاد کی حکایت میں حضرت سلیمانؑ کے دربار میں انصاف کہا جاتا ہے یہ کسی اسلامی روایت سے لیا گیا ہوگا۔

"مذہبِ عشق" کے چھبیس باب ہیں اور چونکہ ساری کتاب میں ایک ہی طویل قصہ ہے اور ہر باب میں اس کا ایک حصہ یا داستان بیان ہوئی ہے اس لیے ہر باب کو داستان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اکثر داستانیں "کہتے ہیں" سے شروع ہوتی ہیں۔ اُردو ترجمہ میں اصل کتاب کے بہت سے فارسی الفاظ باقی رکھے گئے ہیں اور زینتِ کلام کے لیے جو تکرار لفظی ہوئی تھی اس کو بھی برقرار رکھا ہے ترجمہ اصل سے بہت کم ہٹنے پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا طرزِ بیان ٹھیٹ اُردو کی کتابوں کی طرح زیادہ سادہ اور سلیس نہیں، جا بجا شاندار الفاظ اور فارسی ترکیبوں کے ترجمے پائے جاتے ہیں۔ ترجمہ میں آزادی کو مطلق کام میں نہیں لایا گیا۔ ساری کتاب پر فارسیت سوار ہے۔ بعض جگہ ہندی کے الفاظ بھی ہیں۔ لیکن جس زمانے کی یہ کتاب ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے بہت ہی کم ہیں۔ ان کے معاصرین میر امن، شیر علی افسوس اور مظہر علی ولا وغیرہ کی کتابوں میں ہندی الفاظ کا استعمال جس کثرت سے ہوا ہے اس کے مقابلے میں ان کی تحریر کو ہندی الفاظ سے بالکل خالی سمجھنا چاہیئے[1]۔ عبارت کا نمونہ دیکھئے۔ جب بکاؤلی نیند سے جاگی اور اس نے گلاب کے حوض میں گل کو نہ دیکھا تو اس کے چور کی تلاش میں نکلی۔ دیکھئے کیا نقشہ کھینچا ہے۔

> "جب بکاؤلی نے جادو بھری آنکھ کھولی اور خوابِ راحت سے چونکی، پشواز ناز سے پہنی، کنگھی سے بالوں کو سنوارا، دوپٹہ اوڑھا، آہستہ آہستہ جھومتی اٹکھیلیوں سے حوض کی طرف چلی۔ ہر ہر قدم پہ وہ گل اندام اپنے نقشِ قدم سے زمین کو پائیں باغ بناتی تھی۔ اور گردِ راہ سے چشمِ بلبل میں سرمہ لگاتی تھی۔ جب حوض کے کنارے پہنچی دستِ نگارین سے گلاب اپنے رخسار پر ڈالنے لگی۔ اور چہرے کا غبار کہ عنبر کے مانند تھا۔ دھو دھو کر گلاب میں ملانے اور حوض کو چاروں طرف چشمِ مستِ ناز

---

[1] ارباب نثر اردو از سید محمد ایم اے صفحہ ۲۲۵

سے دیکھنے بھالنے لگی۔ ناگاہ گل بکاؤلی کی جگہ پر نظر جا پڑی۔ ہر چند بغور و تامل نگاہ کی کچھ اس کا نشان نظر نہ آیا۔"

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔

"کہتے ہیں کہ تاج الملوک فقیروں کے بھیس میں اپنے بھائیوں کے پیچھے چلا جا رہا تھا کہ ان کا ارادہ کماحقہ دریافت کرے۔ الغرض وہ جہاں اُترے ہوئے تھے۔ وہ بھی آن پہنچا۔ اور ایک کونے میں بیٹھ کر ان کی لن ترانیاں اور جولانیاں جھوٹی جھوٹی سننے لگا۔ آخر رہ نہ سکا۔ سامنے آکر رُو بہ رُو کہنے لگا، آپس میں یہ کیا بے ہودہ باتیں کر رہے ہو۔ اپنا منہ دیکھو، گل بکاؤلی میرے پاس ہے۔ اور اسی وقت اس کو کمر سے کھول کر ان دغا بازوں کے سامنے رکھ دیا۔ شہزادے غصے میں آکر بولے بھلا اس کو مان، اگر تیری بات سچی نہ ہو تو ہم جو چاہیں تجھ کو سزا دیں۔ تاج الملوک نے کہا۔ سانچ کو کیا آنچ۔ بہت بہتر۔"

"جب تاج الملوک سے ان ناعاقبت اندیشوں نے گل بکاؤلی چھین لیا اور وہ بیچارہ دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ مثل ہے کہ قہرِ درویش بجانِ درویش۔ پھر کچھ ہنوں کے پیچھے پیچھے بعد چند روز کے اپنے باپ کی سرحد میں آیا۔ ایک جنگل جو درختوں کا مسکن تھا اس میں جا پہنچا۔ اور چقماق سے آگ جھاڑ کر حمالہ کے دیئے ہوئے بال کو اس پر رکھ دیا۔ چوتھائی بھی نہ جلا ہوگا کہ وہ اٹھارہ ہزار دیوں سمیت آپہنچی اور تاج الملوک کو فقیروں کے بھیس میں دیکھ کر آگ ہو گئی کہ اے شہزادے میری بیٹی کو کیا کیا اور تو نے اپنا حال کیا بنایا؟ تاج الملوک بولا کہ آپ کی توجہ سے سب خیریت ہے۔ لیکن ایک کام مجھے نہایت ضروری ہے اور اس کی تدبیر مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے آپ کو تصدیع دی ہے۔ حمالہ نے کہا کہ اے عیار باتیں نہ بنا۔ وہ کون ہے جلدی کہہ۔ تاج الملوک نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ایک محل اور باغ کہ ہو بہو بکاؤلی کے قصر اور باغ کا سا ہو، بناؤں۔ تم جس طرح جانو جلد بنوا دو۔ وہ بولی اے بیٹا! یہ کتنی بڑی بات ہے مگر میں نے اس باغ اور عمارت کو نہیں دیکھا۔ بھلا بن دیکھے مکان کا نقشہ کس طرح بناؤں اور بنوا دوں۔ تاج الملوک بولا جس طرح میں کہوں اسی طرح بنوا دو۔ حمالہ نے اسی وقت کئی سو دیو لعل بدخشانی کے لیے اور سینکڑوں عقیق یمانی کے لیے اور ہزاروں روپے اور جواہر بیش قیمت کے واسطے ہر چہار طرف بھیجے۔ دیووں نے تین روز کے عرصہ میں جواہرات وغیرہ

> کے جابجا تو دے لگا دیئے۔ پھر شہزادہ جس طرح بنانے لگا۔ اسی طرح وہ بنانے لگے۔ پہلے تو دو نیزے مٹی کھود کر پھینک دی اور وہاں زرِ خالص بھر دیا۔ اور اس طرح قطعہ طلائی پر جڑاؤ عمارتوں کی بنا ڈالی۔ غرض تھوڑے دنوں میں ویسا ہی قصر اور اس طرح کا باغ جواہر نگار جڑاؤ بہترین درختوں سمیت اور زبرجد اور یاقوت کے دو دالان عالی شان سامنے آمنے بیچ میں ان کے ایک حوض مرصع اسی قطعہ کا گلاب سے معمور بنایا۔ پھر ایک مکان میں فرش اسی رنگ کا بچھوایا۔ حاصل یہ کہ جتنا جواہر سونا روپیہ دیو لائے تھے اس میں سے آدھا مکانات کے بنانے میں خرچ ہوا۔ چوتھائی کارخانہ جات کی تیاری کو دے دیا۔ اور باقی خزانے میں داخل کیا۔"

ان مثالوں سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ زبان عام طور پر ہموار نہیں۔ دو تین سطریں سادہ و صاف ہوتی ہیں پھر فارسی ترکیبیں شروع ہو جاتی ہیں۔ جن سے روانی مجروح ہوتی ہے اور قدم قدم پر ٹھوکر لگنے کا احساس ہوتا ہے۔

اگرچہ اخلاقی حیثیت سے مشرقی ادب میں اس قصے کا کوئی درجہ نہیں پھر بھی جوئے کی خرابیاں جیسی تاج الملوک کے بھائیوں کو پیش آئیں۔ غیر کفو میں شادی یا محبت کے مصائب جو تاج الملوک اور بکاؤلی پر گزرے۔ جاہلانہ ضد اور نامناسب بے اعتباری کی آفتیں جو ہمارے ہیرو کے ہاتھوں راجہ اندر کے حکم سے بکاؤلی کو سہنی پڑیں۔ بے احتیاطی اور بھید کو محفوظ نہ رکھنے کا نتیجہ جس سے تاج الملوک نے وہ پھول اپنے ہاتھ سے گنوا دیا جس کے لیے اتنی دوڑ دھوپ کی، اتنے ہاتھ پاؤں مارے — اور اتنی سختیاں جھیلی تھیں۔ یہ سب اور ان کے علاوہ اور ایسی باتیں بھی اس کتاب میں موجود ہیں جن کی تعمیل انسانی زندگی میں نہایت سبق آموز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف تاریکی کو روشنی، عیب کو ہنر، زہر کے پیالے کو شربت کا گلاس کہہ کر پیش کرنے کے آرٹ سے ناواقف ہے۔ وہ بدی کے چہرے پر حسن و زینت کا نقاب ڈال کر اسے پیش نہیں کرتا۔ بلکہ بدی کی جب تصوری کرتا ہے تو ہانک پکار کر کہہ بھی دیتا ہے کہ یہ بدی ہے اس کے فریب میں نہ آنا۔ دیکھیے جب بادشاہ کے چاروں شہزادے ایک بازاری عورت کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں اور تاج الملوک انہیں چھڑاتا ہے تو مصنف کا قلم ان واقعات سے یہ نتائج نکالتا ہے:۔

> "اے عزیز! تو نے معلوم کیا کہ یہ میں نے کیا کہا؟ اس بات کا حاصل یہ ہے کہ دل عرش منزل تیرا جو رونق بخش تخت بادشاہی کا اور دیکھنے والا مادہ اور مجرد کا تھا۔ جب اس کی آنکھ اس خلیقت ناپاک پر پڑی۔ اس کی بصارت کو زنگ لگا اور دیدۂ روشن تاریک ہو گیا۔ اب اٹھ اور سرمۂ بینائی ڈھونڈ یعنی گل مراد کی تلاش میں کوشش کر۔ لیکن راہ میں دنیائے عیارہ کی بازی میں کہ تختہ فریب کا دھرا ہوا ہے مشغول نہ ہو جانا۔ مبادا ناحق تجھ کو پہلے فریفتہ کر کے بتا دے اور بعد اس کے مکر کی بتی اور فریب کے چوسے کی مدد سے اچھا پانسہ

> اپنی حسبِ مرضی پھینکے اور اچانک تیرے توکل کا سرمایہ آخر ہو جائے۔ تب تجھ کو دائم الحبس کر رکھے۔ اگر تو صبر کے نیزے کی اعانت سے اس مکارہ کی بازیِ طلسم کو درہم کر دے تو وہ فاحشہ جو بادشاہوں اور گردن کشوں کی ہم نشین ہے تیری فرماں بردار لونڈی ہو کر چاہے کہ تجھ کو اپنے حسن و جمال پر لبھائے۔ پھر اگر تو اس کے منہ پر الفت سے نگاہ نہ کرے تو یقین ہے کہ گلِ مراد کے دامن پر تیرا دسترس ہو۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک مقالہ[1] میں قصہ گل بکاؤلی سے مسائل تصوف ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے ہیں مثلاً:۔

تاج الملوک سفر کرتے کرتے سرحد ملکِ بکاؤلی تک پہنچا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ قلعہ بکاؤلی جہاں وہ گل مراد پوشیدہ ہے۔ اٹھارہ ہزار دیوؤں کی حفاظت میں ہے۔ اور سال سال بھر کی مسافت کے مقامات تک ان کی چوکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار پریاں ہر وقت نگرانی کرتی رہتی ہیں کہ کوئی پرندہ ہوا کے راستے بھی نہ پہنچ سکے۔ نیز چوہوں کا بادشاہ بے حد و حساب لشکر لیے زمین دوز راستوں کی پاسبانی کرتا رہتا ہے۔ تاج الملوک نے یہاں پہنچ کر ایک قوی ہیکل دیو کو کسی طرح اپنے موافق بنایا اور اس کی بہن حمالہ کو جو سب دیوؤں کی سردار تھی ملایا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی پروردہ ایک حسین لڑکی محمودہ کو اس کے نکاح میں دے دیا۔ مصنف ان اسرارِ معرفت کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:

> "اے عزیز! روشنیِ چشمِ ظاہر بیں کی سات پردوں میں ہے اور تجلی باری تعالیٰ کہ نورِ دیدۂ اولیا ہے ستر ہزار پردوں میں ہے۔ اگر یہ ارادہ ہے کہ وہ پردے درمیان سے اٹھیں تو پہلے اس بڑے نگہبان دیوِ نفس کا حجاب بیچ سے اٹھا کر اس کو بس میں کر کہ وہ لعین اپنی کج روی کو چھوڑ کر محمودہ کے مقام میں پہنچائے۔ لیکن یہ بات یاد رکھ کہ اگر دیو سے الٹا کیجیے تو بدھا پڑے۔"

تزکیۂ نفس اور عرفانِ حق کی اس سے واضح تر تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے؟ (معارف، جولائی ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۸)

تاج الملوک مصائب و آفات کا شکار بنتا ہے۔ طلسمی ٹوپی اور عصا الگ رکھ کر سو جاتا ہے۔ سو کر اٹھنے کے بعد ایک حوض میں نہاتا ہے تو مرد سے عورت بن جاتا ہے۔ طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد ایک اور حوض میں غوطہ لگا کر پھر اپنی اصلی حالت پر آتا ہے۔ یہ طلسماتی کارخانہ داستان نویس کی زبان سے ایک گنجینۂ حقائق و معارف بن جاتا ہے۔ وہ تاج الملوک کی طلسم سے رہائی پر کہتا ہے

> "اے یارانِ دہر! حق تعالےٰ نے بنی آدم کے سر پر کرامت کی ٹوپی پہنا کر اور عظمت کا عصا ہاتھ میں دے کر طلسم گاہ دنیا میں کہ مزرعۂ آخرت ہے عاقبت کی

---

[1] مولانا کا یہ مقالہ پہلے پہل رسالہ "معارف" اعظم گڈھ بابت جولائی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اب یہی مضمون "جھوٹ میں سچ" کے عنوان سے مضامین عبدالماجد دریابادی میں صفحہ ۶۹ تا ۸۰ پر طبع ہوا ہے۔

> تکمیل کے لیے بھیجا ہے۔ پس انسان کو چاہیئے کہ گل اور خار اور آب و سراب خوب پہچانے۔ ہر ایک باغ کے پھول کو نہ سونگھے۔ ہر ایک نہر سے گھڑا نہ بھرے کہ یہاں کانٹے گل سے رنگین اکثر اور شراب بصورت آب ادھر ادھر ہے۔ اے عزیز! اگر گوہر دنیا کے لیے چشمۂ جہاں میں غوطہ مارے گا۔ مقرر اس کا کلاہ اور عصا کھو دے گا یہ حکم اس بات پہ ہے کہ طالبِ دنیا مؤنث ہیں اور طالب مولا مرد ہیں۔ تیرا پیکر معانی جو مانندِ مرد کامل ہے بصورتِ زنان ناقص العقل ہو جائے گا۔ پس اس وقت شکیبائی کے سوا کچھ چارہ نہیں۔ چاہیئے کہ دم بخود ہو کر بھر دریائے ذکر الٰہی میں غوطہ مارے اس کے بعد جو سر اٹھائے گا تو وہی عصا اور وہی ٹوپی سر پر رکھے گا۔"

"اس قسم کی نصائح بہت پاکیزہ اثر رکھتی ہیں اور قصے کو تمثیل کا رنگ عطا کرتی ہیں۔ فوق فطرت کے بعد جب یہ بند آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ ایک تمثیل ہے۔ جس کی یہ تفسیر ہے۔ ان نصائح سے قصے کی فضا بلند ہو گئی ہے۔ قصے میں انہماک اور استغراق کے بعد ہم اس طرح چونک پڑتے ہیں جس طرح کسی دنیا میں پھنسے ہوئے آدمی کو یکایک رحمت کا پیغام دیا جائے۔ اسے اس حالت سے خبردار کر کے صحیح راستہ بتایا جائے۔ ان میں وعظ کی خشکی نہیں۔" (اردو کی نثری داستانیں ص۲۲۴)

مشہور فرانسیسی فاضل اور ادب اردو کے سرپرست و قدرشناس گارسن ڈی تاسی نے، جو انگریزی عملداری کی ابتدا میں مدت تک ہندوستان میں مقیم رہے، اپنے بعض لکچروں پر مشتمل ایک کتاب لکھی تھی جس کے فرانسیسی نام کا ترجمہ "تاج الملوک و بکاؤلی کے افسانۂ عشق کے فلسفیانہ مذہبی نتائج و نکات" ہے۔

قصۂ گل بکاؤلی ہی گلزار نسیم کا ماخذ ہے جو پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی نے سنہ ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) میں تصنیف کی۔ اور اسی قصے سے امانت لکھنوی نے اپنے مشہور ناٹک اندر سبھا کا پلاٹ تیار کیا جس کی تاریخ تصنیف سنہ ۱۸۵۳ء (۱۲۷۰ھ) کے قریب ہے۔ انگریزی میں بھی اس قصے کا ترجمہ ہو چکا ہے بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس نام سے کتابیں لکھی ہیں۔ جن سے اس قصے کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

"اگرچہ اس وقت نہال چند یا ان کی کتاب مذہب عشق کی کما حقہٗ قدر نہیں کی جاتی۔ کیونکہ نہ تو نہال چند کے طرز بیان میں کوئی ایسی خاص دل کشی ہے کہ اردو بولنے والے ہمیشہ اس کے گرویدہ بنے رہیں اور نہ مذہب عشق ہی کا قصہ اس زمانے میں لوگوں کی ضیافت طبع کا کچھ سامان بہم پہنچا سکتا ہے۔ اب اردو نے ترقی کے اتنے مدارج طے کر لیے ہیں اور اس میں لٹریچر کا اتنا کافی ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے کہ مذہب عشق اور اس کے ساتھ کی دیگر کتابوں سے لوگوں کا دلچسپی لینا ممکن نہیں مگر فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم نے اردو نثر کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں اور اردو نثر نویسی کے ابتدائی اور دشوار گذار مراحل کو جن محنتوں سے طے کر کے آنے والوں کے لیے راستہ صاف کیا ہے وہ ایسی نہیں کہ اردو بولنے والی نسلیں ان کو بھلا دیں۔ ہمارے ان پیشروان نثر میں نہال چند بھی ہیں اور اس لحاظ سے توجہ اور مطالعہ کے مستحق ہیں۔ ان کی قدامت ہی ان کی زندگی کے کارنامے کو اہمیت دیتی ہے"[1]

---

[1] ارباب نثر اردو از سید محمد ایم اے۔ صفحہ ۲۴۸۔

یہ قصہ یوں تو ایک قسم کا "ونڈر لینڈ" ہے۔ لیکن اس کی تہہ میں تاریخی حقیقت موجود ہے۔ جس کی تشریح مولوی سید احمد دہلوی مرحوم نے اپنی بیش بہا تالیف فرہنگِ آصفیہ میں کر دی ہے۔ فرہنگ آصفیہ کی اشاعت سے پہلے بھی بعض بزرگوں نے ہوشنگ آباد اور امرکنٹک کے سرکاری دفتر سے اس کی تصدیق کی ہے۔ اور بگھیل کھنڈ کی ایک قدیم تاریخ میں قلعہ امرکنٹک کے حالات پڑھ کر جس کا گل بکاؤلی سے خاص تعلق ہے اس کی بہت کچھ اصلیت معلوم ہو جاتی ہے۔ صوبہجات متوسط یعنی جبل پور وغیرہ میں اب بھی ایک خود رَو پودا پایا جاتا ہے جو اکثر پانی کے کنارے اُگتا ہے اور اس کے پھول کا عرق آنکھوں میں ڈالنے سے آشوب وغیرہ قسم کی کئی بیماریاں دُور ہو جاتی ہیں اس کا نام بکاؤلی ہے۔ جس کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آج سے نصف صدی قبل ایک جماعت قائم ہوئی تھی جس کا نام طلسم بکاؤلی ایکسپلورنگ ایسوسی ایشن تھا۔ اس نے بڑی تحقیق اور چھان بین کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچائی تھی کہ یہ قصہ محض فرضی افسانہ نہیں بلکہ ایک سچا واقعہ ہے۔ گو اس کے مصنف عزت اللہ بنگالی نے رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام لے کر اس کو بعید از قیاس بنا دیا ہے۔ حالانکہ اس واقعہ کے نقشِ پا اب تک موجود ہیں چنانچہ باغ بکاؤلی جس کو قصہ میں باغِ ارم لکھا ہے اب تک موجود ہے۔ طلسمی قلعہ بکاؤلی جہاں تک کوئی بشر پہنچ نہیں سکا۔ کوسوں لمبی اور بے حد گہری دلدل کے عین وسط میں اس وقت تک قائم ہے۔ بکاؤلی کا تالاب، مندر اور فوارہ گو مرورِ ایام سے شکستہ اور ریختہ حالت میں پڑے ہیں۔ مگر زبانِ حال سے اپنی قدامت اور اپنے وجود کا ثبوت دینے کے لیے باقی ہیں۔ دلبر بیسوا کے مکان کے کھنڈرات جنہیں وہاں کے باشندے لکھا پتریا کا محل کہتے ہیں۔ زبانِ حال سے بتا رہے ہیں کہ انہی محلوں میں دلبر بیسوا نے چوسر کھیل کر تاج الملوک کے چاروں بھائیوں کو اپنا غلام بنایا تھا۔ یہ سب نشانات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ؎

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی   پتہ دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

(کشمیری میگزین جنوری ۱۹۱۰ء صفحہ ۳۳)

امرکنٹک ہندوؤں کا ایک بہت بڑا تیرتھ ہے۔ یہاں سے دریائے نربدا نکلتا ہے۔ اس سے ایک میل مشرق میں ضلع منڈلہ (کمشنری ناگ پور ممالک متوسط) کا علاقہ اور جنوب میں سو میل کے فاصلے پر ضلع بلاس پور کا علاقہ ہے۔ مغرب اور شمال میں ریاست ریواں کی حدیں ملتی ہیں۔ خاص موضع امرکنٹک میں جو خوبصورت قلعہ واقع ہے اس میں پانچ چھ سو پنڈت اور پجاری آباد ہیں۔ امرکنٹک دراصل ایک جنگل ہے جس کے نام پر یہ موضع مشہور ہے۔ اس موضع کے ایک گوشے میں ایک مندر راجہ کرن کے زمانہ کا اب تک موجود ہے جو سمت ۹۵۲ بکرمی میں ریواں کا راجہ تھا۔ ایک دھرم سالہ مہاراجہ اندور نے بنوائی ہے جو آج سے پچاس ساٹھ سال قبل راج پاٹ چھوڑ بیٹھے تھے۔ اس سے مسافروں اور یاتریوں کو بہت آرام ملتا ہے۔

نربدا کے دھانہ پر ایک پختہ تالاب ہے۔ جس کے ایک طرف ایک مندر بھی ہے۔ اس مندر کے نیچے ایک قدرتی چشمہ جاری ہے۔ جس سے تالاب ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ تالاب کے مغرب کی طرف ایک اور حوض ہے جس میں پانی قطرہ قطرہ ہو کر داخل ہوتا ہے نربدا کی دھار سے جو حوض سے قریباً چالیس گز کے فاصلہ پر گرتی ہے یہ گھاٹ قدرتی آبشار کا کام دیتی ہے اور نہایت دل فریب سماں پیدا کرتی ہے۔ اس گھاٹ میں قریباً دو میل پہاڑ کی بلندی سے پانی گرتا ہے اس کو کپل دھارا کہتے ہیں۔ اشنان کرنے والے یاتری اس کی دھار اپنے سر پر لیتے ہیں۔ مگر بوڑھے اور کمزور آدمیوں کے لیے اس کی ممانعت ہے۔ تالاب کے چاروں طرف بیراگی اور پجاری

بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں کاتک، چیت اور ماگھ کے مہینوں میں میلہ لگتا ہے جو کئی ہفتے رہتا ہے۔ اس میں فقیروں اور محتاجوں کو کھانا بھی کھلایا جاتا ہے۔

سون ندی دریائے نربدا کے دہانے سے دو میل مشرق کی جانب بھارت کے علاقے میں جا نکلتی ہے۔ وہاں سے چکر کاٹ کر ریاست ریواں میں داخل ہوتی ہے اور پھر دریائے گنگا میں جا ملتی ہے۔ اسی سون وادی میں مونڈلہ کے قریب ایک بہت بڑا سرسبز و شاداب اور مختلف قسم کے خوشبودار پھولوں سے آباد ایک جنگل ہے اس جنگل کو بکاؤلی کا باغ کہتے ہیں۔ اسی جنگل میں ایک درخت ہے جس کے پھول ہلدی کے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اسے بکاؤلی کا درخت کہتے ہیں۔ گل بکاؤلی نربداجی میں بطور چڑھاوا چڑھتا ہے۔ پنڈتوں کا کہنا ہے کہ گھونگھر (جسے پنجابی میں گھنگ منکا کہتے ہیں) کے ساتھ گل بکاؤلی پیس کر اگر آنکھوں میں لگایا جائے تو آنکھوں کا جالا دور ہو جاتا ہے۔

کتاب تحفۂ خان بہادر میں لکھا ہے اور منشی محمد الدین فوقؔ مرحوم مدیر اخبار کشمیری لاہور نے آج سے پچاس سال قبل اپنے سفر بگھیل کھنڈ میں لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ مولوی سید بدر علی تحصیلدار رام نگر (علاقہ ریواں) جہاں تک پہنچ سکے انہوں نے اس علاقہ کی سیر و پیمائش کی مگر دلدل اور خاردار جھاڑیوں کی وجہ سے وہ جنگل میں دور تک نہ جا سکے۔ اگرچہ امرکنٹک ان کی تحصیل میں تھا۔ ان کو آرام و آسائش، راہ داری اور واقفیت کے تمام ذرائع حاصل تھے۔ اس کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ وہ پیپرمنٹ اور بکاؤلی کے کچھ پودے وہاں سے لے آئے جو امتحاناً لگائے گئے۔ پیپرمنٹ کے درخت تو کچھ عرصہ بعد خشک ہو گئے مگر بکاؤلی کے چند درخت سنہ ۱۹۰۵ء تک رام نگر میں موجود تھے۔ شاید اب بھی ہوں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصل بکاؤلی کے درخت نہیں بلکہ وہ درخت ہیں جو جمال ہم نشیں کے اثر یعنی اصلی درخت کی خوشبو سے ایسے ہو گئے ہیں۔ جیسے ہمارے پنجاب میں قصور کی میتھی بہت مشہور ہے جو اصلی تو بہت کم اور صرف ایک آدھ کھیت ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کی خوشبو سے دوسری قسم کی میتھی کے کھیت بھی اسی طرح خوشبودار ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے بکاؤلی کے یہ درخت بھی ایسے ہی ہوں۔

خان بہادر مولوی رحمان علی وکیل دربار ریواں مقیم ستنا نے منشی محمد الدین صاحب فوقؔ کو بتایا تھا کہ سید بدر علی تحصیلدار نے بکاؤلی کے بیس پچیس پھول بطور تحفہ میرے پاس بھی بھیجے تھے جن کو میں نے دوستوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ پھول زردی مائل اور خوشبودار تھے۔ تجربہ کیا گیا کہ جب کسی کی آنکھ آشوب کرتی تو اس پھول کا عرق ڈالنے سے آرام ہو جاتا۔

گل بکاؤلی کے حالات میں ایک کتاب تاریخ طلسم بکاؤلی بھی مشہور ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ امرکنٹک ایک جنگل کا نام ہے جو ایسا وسیع، پُرخار، وحشت ناک اور اتنی دور ہے کہ وہاں کوئی جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ امرکنٹک ریواں سے بارہ منزل بیان کیا جاتا ہے اس جنگل کی آج تک پیمائش نہیں ہوئی۔ اس کی حدود اضلاع سنبھل، بلاس پور اور منڈلہ سے ملتی ہیں۔ یہ اضلاع جنگل سے بارہ بارہ اور تیرہ تیرہ منزل کے فاصلے پر ہیں۔ اس جنگل میں بے شمار چشمے، درندے، گزندے، شیر، چیتے، ریچھ، بندر اور دیگر آفتیں ہیں۔ اس لیے باغ بکاؤلی تک تو لوگ بروقت پہنچ جاتے ہیں مگر قلعہ بکاؤلی تک کوئی نہیں جا سکتا۔ اور یہ ایک طلسم معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قلعہ سے ہر وقت دھواں اٹھتا رہتا ہے اور دن رات ہیبت ناک آوازیں آتی ہیں۔

قلعہ بکاؤلی کس نے بنایا، کب بنا؟ اس کے متعلق لکھا ہے کہ سمت ۹۵۲ بکرمی سے پہلے دکن کے ایک راجہ نے اپنے چھوٹے

بیٹے مجھوج سے ناراض ہو کر اسے کوہستانی جنگل اور غیر آباد ملک دے کر الگ کر دیا۔ جب راجہ کے گرو کو خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ یہ سخت ناانصافی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بڑے بیٹے شاستر جوگ کا ملک ہرگز سرسبز نہ ہو گا اور چھوٹے کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

غرض راج مجھوج تن بہ تقدیر اپنے حصہ ملک میں جو اس کی فوج کے لیے بھی کافی نہ تھا، آیا۔ جب اس جنگل میں پہنچا تو اسے رہنے کے لیے کوئی موزوں مقام نہ مل سکا۔ آخر ایک دن وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جن میں اکثر باطنی دان اور نجومی تھے۔ امرکنٹک میں پہنچا۔ وہاں اسے ایک بہت بڑا تالاب نظر آیا جس کی وسعت اور گہرائی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مجھوج نے یہ مقام پسند کیا۔ اس کے مشیروں نے اپنے علم اور تدبر کے زور سے تالاب کے وسط میں ایک قلعہ بنوایا۔ جس میں واقف کار لوگوں کے سوا کوئی جا نہ سکتا تھا۔ قلعہ کے علاوہ مکان اور طلسم آمیز باغات بھی تیار کر لئے جو بظاہر انسانی طاقت سے بعید معلوم ہوتے تھے۔

مجھوج راج کے گھر اسی قلعہ میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جو بہت حسین تھی۔ اور جس کی جنم پتری بنا کر نجومیوں نے اس کے نیک اختر ہونے کی بشارت دی تھی۔ اس لڑکی کے دو نام رکھے گئے۔ ایک مانیب یعنی پرمیشر کی امانت اور دوسرا نربدال جس کے نام پر نربدا مشہور ہے مگر یہ دونوں نام زیادہ مشہور نہ ہوئے۔ ایک بیراگی نے اس لڑکی کا حسن و جمال دیکھ کر اس کا نام بکاؤلی رکھا جو آج تک مشہور ہے۔

معلوم نہیں تاج الملوک اور بکاؤلی کے عشق و محبت کی داستان فرضی ہے یا اس میں کچھ اصلیت بھی ہے۔ بہرحال بکاؤلی میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔

نذیر احمد کا ذہنی تجزیہ

ڈاکٹر اعجاز حسین

اردو ادب کی تاریخ پر اگر نظر دوڑائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر انقلاب میں بڑے ادیب پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جب کبھی زندگی کو ہنگامہ خیز واقعات سے دوچار ہونا پڑا ہے تو اردو زبان نے بھی اپنا بہترین کارنامہ یا خاص جوہر دنیا میں پیش کیا ہے شاید یہ خصوصیت اس ماحول کا نتیجہ ہو جو اسے ابتدائی زندگی میں ملا تھا۔ چونکہ اس کی نشوونما اور ادبی حیثیت ہلچل اور ہنگاموں کے درمیان ہوئی اس لیے اس کو طوفانوں میں مسکرانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اپنی توانائی و رعنائی کا مظاہرہ یہ زبان اس وقت ہمیشہ سے زیادہ بہتر انداز میں کرتی ہے۔ میر۔ سودا وغیرہ ایسی ہی حالتوں کی علامتیں ہیں اور جب غدر کا زمانہ آیا اور اس سے سارے ملک میں ایک ہلچل پیدا ہوئی پرانی قدریں ماضی کے نقاب میں روپوش ہونے لگیں اور نئی قدریں ایک سیلاب کی طرح رونما ہوئیں تو اردو نے بھی متعدد گرانقدر ادیب پیدا کیے۔ سیلاب کے تھمتے ہی سرسید۔ نذیر احمد۔ محمد حسین آزاد۔ حالی اور کئی ایک اہل قلم زبردست دل و دماغ لے کر صفحۂ ادب پر چھا گئے۔ حالانکہ ان بزرگوں کو قسمت سے وہ ماحول ملا تھا جو صرف انتشار و پراگندگی کا مرقع تھا مگر ایسے ہی عالم میں جو کچھ ان لوگوں نے ادبی کارنامے پیش کیے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر اور اہم ثابت ہوئے۔ ان ہی ادبی معماروں میں اپنی تعمیری صلاحیتوں کی بدولت نذیر احمد بھی ایک ممتاز جگہ پکڑے ہیں۔ جو ماضی اور حال کی قدروں میں ایک خوشگوار امتزاج پیدا کرنے کی صحت مند فکر پیش کر رہے ہیں۔ نذیر احمد نے کیوں ایک خاص طریقہ سے سوچا اور ایک خاص طریقہ سے لکھا؟ جب ہم اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں تو پہلا سوال ان کے اس ماحول اور تعلیم کا آتا ہے جو ان کی ذہنی نشوونما میں کارفرما تھے۔ یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ان کی فکر، طرز تحریر و تخیل کی ساخت میں کیا کیا خاص عناصر، افراد، ادارہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوئے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات ذہن میں یہ آتی ہے کہ مغلیہ سلطنت اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کی حکومت پوری قوت کے ساتھ ہندوستان بھر میں اپنا اقتدار قائم کر چکی تھی۔ جس نے سمجھ دار طبقہ کو یقین دلایا تھا کہ اب عہد ماضی واپس نہیں آسکتا۔ نئے دور میں نئے حالات سے دوچار ہونا جس کے لیے عمل کی ضرورت ہے۔ خواب دیکھنے اور تعبیروں کے انتظار میں بیٹھے رہنا وقت ضائع کرنا ہے۔ مگر باوجود اس احساس کے کوئی تعمیری پروگرام لوگوں کے ذہن میں نہ تھا۔ مادی ترقی کے لیے بھی لوگ مذہب سے چارہ سازی کی امید لگائے تھے۔ اسی میں تمام مسائل کا حل تلاش کرتے تھے۔ اور عہد ماضی کے خواب اور تصور میں جی بہلا کر خوش رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ انگریز تمام ملک پر چھا گئے تھے کوئی ایک ایسی مرکزی طاقت نہ رہ گئی تھی کہ ان سے لوہا منوا لیتی۔ مگر ذہنی طور

پر لوگ ان کی حکومت، ان کی تہذیب و طرزِ معاشرت سے متنفر تھے۔ اپنے آبا و اجداد کے طریق کار کو سراہتے تھے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کو باعثِ فخر خیال کرتے تھے۔ بدلے ہوئے حالات میں بدل جانے کے لیے تیار نہ تھے اور نہ ان میں حالات کو بدل دینے کی صلاحیت تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ سب ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے۔ چونکہ ذہن میں کوئی اپج نہ تھی۔ اس لیے چار و ناچار وہی سب کچھ کر رہے تھے جو اس دور سے پہلے ہوتا آیا تھا۔ چنانچہ نذیر احمد کی ابتدائی تعلیم بھی مکتب ہی میں ہوئی اور ابتدائی نقوش ذہن پر اپنا وہی اثر ڈال رہے تھے جو ایسے مکتبوں میں پیدا کرتے تھے۔

نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بجنور کا شہر کوئی خاص شہر نہ تھا۔ اور پھر اس ایک تحصیل کی ذہنی فضا کا جو عالم اس وقت رہا ہوگا اسے سوچیے اور آخر میں اسی کے ساتھ یہ بھی تصور میں لائیے کہ اس تحصیل کا ایک گاؤں ریہڑ اس زمانہ میں کیسا خطہ رہا ہوگا جہاں نذیر احمد کی ولادت ہوئی تھی۔ ان کے والد سعادت علی کا سلسلہ نسب ایک بڑے بلند پایہ مولوی گھرانے سے ملتا ہے۔ وہ شاہ عبدالغفور اعظم پوری کی اولاد میں سے تھے اور خود بھی ایک خاص علمیت و بزرگی کے مالک تھے یہاں تک کہ ان کا شمار اپنے وقت کے مشاہیر اولیاء میں ہوتا تھا۔ علمیت اور مولویت اس خاندان میں دو طرف سے آئی تھی۔ دادیہال کے علاوہ نذیر احمد کی ننھیال کا بھی یہی حال تھا۔ اس میں بھی لوگ بڑے پایہ کے گزرے تھے۔ شاہی زمانہ میں قاضی رہ چکے تھے۔ غرض کہ نذیر احمد کا خاندان دونوں طرف سے مولویوں کا خاندان تھا۔ گھر کی پوری فضا مذہبی تھی۔ اس ماحول میں جو بچہ پیدا ہوا ظاہر ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت بھی ویسی ہی ہوئی ہوگی۔ جو وقت کا تقاضا نہیں بلکہ پرانے لوگوں کے ذہن کی کارفرمائی کا نتیجہ رہی ہوگی۔ معلوم نہیں کیا ایسے حالات ہوئے کہ نذیر احمد کے والد کو گاؤں سے شہر آنا پڑا۔ اس وقت نذیر احمد کی عمر صرف چار برس کی بتائی جاتی ہے۔ اس سن میں گاؤں کی تنگ و تیرہ فضا سے نکال کر شہر کی فضا میں بچہ کا آجانا قدرتی امداد سمجھی جا سکتی ہے۔ جب تعلیم کا وقت آیا تو کسی قدر بدلے ہوئے ماحول سے نذیر احمد کو سابقہ پڑا۔ ابتدائی تعلیم کچھ مکتب میں ہوئی اور کچھ ان کے والد کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ سلسلہ ۹ برس کی عمر تک چلتا رہا۔ نذیر احمد فارسی عربی پڑھتے رہے اس کے بعد ایک ڈپٹی کلکٹر مولوی نصر اللہ خاں سے نحو، منطق، فلسفہ کا درس لیا۔ کئی سال تک اسی ڈپٹی کلکٹر سے پڑھنے کا سلسلہ قائم رہا۔ ظاہر ہے کہ نذیر احمد کے ذہن میں پڑھنے کے ساتھ ہی سرکاری ملازمت کے جاہ و وقار کا بھی اثر پڑا ہوگا۔ ڈپٹی صاحب کے دنیاوی اعزاز کا نقش غیر شعوری طور پر بچے کے دماغ پر ایک مستقل حیثیت سے بن گیا ہوگا۔ بغیر سوچے سمجھے یہ احساس ہوا ہوگا کہ کاش یہ منصب مجھ کو بھی نصیب ہو وہ اپنے گاؤں بلکہ شہر میں بھی کہاں ڈپٹی کلکٹروں سے بڑے عہدے داروں کو دیکھتے رہے ہوں گے۔ لامحالہ خیال ہوا ہوگا۔ کہ ایک ڈپٹی کلکٹر دنیا کا سب سے بڑا آدمی نہیں تو کافی بڑا افسر ہوتا ہے۔ چونکہ نصر اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر سے پانچ سال تک فیض حاصل کرتے رہے جس میں علمی اکتساب بھی شامل تھا۔ اس لیے اُستادی و شاگردی کے رشتہ نے اور بھی عقیدت بڑھا دی ہوگی۔ ڈپٹی کلکٹری میں دینی و دنیوی دونوں احترام نظر آتے ہوں گے۔ اس لیے سرکاری ملازمت اور ڈپٹی کلکٹر بننے کا شوق خود بخود پیدا ہو گیا ہوگا۔ اس وقت ہندوستانیوں کے لیے ڈپٹی کلکٹری معراج تھی۔ اس سے بڑا عہدہ انگریزوں کے ہاتھ سے ملنا دشوار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت کا نقطہ عروج اسی نوکری کو نذیر احمد نے سمجھا ہو تو عجب نہیں۔ غالباً اس احساس و تمنا کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر نذیر احمد نے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی جگہ چھوڑ کر تحصیلدار بننے کو باعثِ افتخار سمجھا۔ علم و تعلیم کا اثر تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت و دماغ محکمہ تعلیم ہی کی نذر کرتے لیکن اس محکمہ میں رہ کر وہ اپنے ان جذبات کو مکمل نہ کر سکتے جو نصر اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر کی صحبت میں پیدا ہو گئے تھے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ جب ہم یہ دیکھتے

ہیں کہ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے عسرت کے ساتھ زندگی بسر ہوتی تھی تو ایک احساسِ کمتری بھی بچپن ہی میں پیدا ہو گیا ہوگا ڈپٹی صاحب کتنے ہی سادہ مزاج کیوں نہ رہے ہوں مگر کچھ نہ کچھ طمطراق تو دنیا اور کلکٹر کے دکھانے کے لیے کرنا ہی پڑتا رہا ہوگا اور مہینہ میں جو تنخواہ کی رقم ملتی رہی ہوگی اس کی آواز نذیر احمد کے کان تک بھی پہنچتی رہی گی۔ اس کو سن کر وہ بھی سوچنے لگتے ہوں گے کہ اتنی بڑی تنخواہ کیسے مل سکتی ہے۔ اپنی غریبی کو دور کرنے کے لیے ممکن ہے یہیں سے دولت مند بننے کی خواہش کی بنیاد بھی پڑ گئی ہو ایک بات اور قیاس میں آتی ہے۔ کہ بچپن میں نذیر احمد نے اپنے باپ کو دنیاوی ترقی کے لیے نمونہ سمجھا ہوگا۔ بلکہ نصر اللہ خاں کو ایسے اعزاز کا مرقع تصور کیا ہوگا۔ کیونکہ علم و خاندانی وقار کی وجہ سے ان کے باپ سعادت علی کی عزت ایک مخصوص طبقہ کرتا رہا ہوگا۔ لیکن یہ عزت زندگی کی آسائش سے بیگانہ تھی تمام عمر ان کے والد نے غریبی میں بسر کی۔ برخلاف اس کے ڈپٹی صاحب پڑھے لکھے آدمی ہوتے ہوئے بھی ضروریاتِ زندگی کی فکروں سے مستغنی رہے ہوں گے۔ اس لیے نذیر احمد کو بھی خیال ہوا ہوگا کہ علم وہی اچھا ہے جو دین و دنیا دونوں میں آدمی کا ساتھ دے ضروریاتِ زندگی بھی پوری ہوتی رہیں۔ کچھ پیسہ بھی پاس رہے اور لوگ قابلیت سے متاثر بھی ہوتے رہیں۔ یہ ساری باتیں قیاس پر مبنی لیکن قیاس بے بنیاد نہیں جب ہم نذیر احمد کے ماضی و مستقبل کا رشتہ ملانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ ۹ برس سے ۱۴ برس تک کا سن ایسا ہوتا ہے جب بچہ کی خواہشات ایک شکل اختیار کرنے کی فکر کرتی ہیں۔ اور شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ نذیر احمد ۹ برس کے سن سے ۱۴ برس کی عمر تک بجنور میں رہے اور ۹ برس کے تھے جب براہ راست نصر اللہ خاں سے سابقہ پڑا۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ ان کو دیکھتے رہے ہوں یا ان کے تذکرے سنتے رہے ہوں لیکن چونکہ کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس لیے اس قیاس کو کہ وہ پہلے سے ذہنی طور پر ڈپٹی صاحب سے مرعوب تھے ہم نظر انداز بھی کر دیں تو بھی پانچ سال کی مدت بچے کو متاثر کرنے کے لیے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اس لیے ان تمام باتوں کو وہم و گمان سے تعبیر کر کے ٹالا نہیں جاسکتا۔

نذیر احمد کی راہِ زندگی میں سب سے اہم موڑ تو وہ تھا جو ان کو دلی میں ملا۔ چودہ برس کی عمر میں باپ کے ساتھ نذیر احمد دلّی چلے آئے۔ ان کے باپ چونکہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو علم و فضل کا جویا تھا۔ پشت ہا پشت سے گھر میں دولتِ علم میراث کی طرح چلی آئی تھی۔ سب کچھ کھو کے بھی وہ علم سے اپنی اولاد کو محروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب وہ دلّی آئے تو غالباً ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے ہونہار بچے کو علم سے آراستہ کر دیں۔ غالباً تنگ دستی کی وجہ سے انہوں نے نذیر احمد کو ایک ایسے مدرسہ میں داخل کرا دیا جو ادھر اُدھر سے روٹیاں مانگ کر طالب علموں کا پیٹ بھرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعادت علی کو اس سے بہتر کوئی جگہ نذیر احمد کی تعلیم کے لیے نظر نہ آئی۔ کیونکہ بہتر حالات کے لیے مالی امداد کی بھی ضرورت رہی ہوگی۔ جس کا انتظام غریب باپ نہ کر سکتا ہوگا۔ اس لیے چار و ناچار مولوی عبدالخالق کے سپرد کر کے چلے گئے۔ یہاں جس عالم میں نذیر احمد نے اپنی طالب علمی کے دن پورے کیے وہ خود نذیر احمد کی زبانی سنیئے:-

"پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبری ہاتھ میں لے کر گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا کسی نے رات کی بچی ہوئی دال دے دی کسی نے قیمے کی لگدی ہی رکھ دی۔ کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں پر ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں ان کے یہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔

ادھر میں نے قدم رکھا ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی۔ . . . . . . بہرحال مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی۔"

اس واقعہ کو ذہن میں رکھیے اور دوسرا واقعہ جو اسی سے ملتا جلتا ہے اس پر بھی غور کر لیجیے تو نذیر احمد کی ایک مخصوص ذہنیت کی بنیاد و رغبت کا سراغ مل جاتا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں نذیر احمد کو اپنے استاد مولوی عبدالخالق کے گھر کا کام بھی کرنا پڑتا یہاں تک کہ ان کی خوردسال پوتی کو کھلانا بھی پڑتا۔ اس کو گود میں لے کر ٹہلانا پھرانا بھی ان کے فرائض منصبی میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ ستم ظریفی بھی قابل دید ہے کہ بعد میں اسی لڑکی سے نذیر احمد کی شادی ہو گئی۔

یہ اور اس قسم کے واقعات اردو کے پہلے ناول نگار کے لیے ادبی ماخذ بن گئے۔ اس کی ذہنیت کے اجزائے ترکیبی کی طرح عمر بھر کارفرما رہے۔ یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ کیوں نذیر احمد کو زنانے لٹریچر اور محاورات کا چسکا لگا۔ چودہ پندرہ برس کے سن میں ان کا گھروں میں اس طرح جانا کہ معمولی نوکر کے فرائض انجام دینے پڑیں، ظاہر کرتا ہے کہ وہ عورتوں سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ کیوں کہ وہ لوگ بغیر کسی تکلف کے ان سے کام لیتی تھیں اور آپس میں جو گفتگو کرتی تھیں اس کو اس وقت کا غریب طالب علم اور مستقبل کا مولانا نذیر احمد صاحب تصانیف ذہن میں محفوظ رکھتا تھا۔ آمد و رفت اور بے تکلفی کا سلسلہ شادی کے بعد اور بھی بڑھ گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے کہ نذیر احمد نے اچھی خاصی علمی قابلیت اس عمر میں حاصل کر لی تھی۔ وہ بچپن ہی سے بڑے ذہین تھے۔ اور قوتِ حافظہ کے لیے بڑے مشہور تھے۔ اس وقت جو گفتگو مستورات کرتی تھیں ان کو یہ بغیر کسی ارادے کے ذہن میں محفوظ کر لیتے تھے۔ چونکہ مزاج میں شوخی و شرارت بھی کافی تھی اس لیے عورتوں کے اندازِ بیان اور طور و طریقے میں ایک لذت بھی ملی ہو گی۔ بجنور سے آ کر یہاں کی زبان میں کافی فرق ملا ہو گا۔ دہلی کی ٹکسالی زبان اور وہ بھی شریف گھرانوں کی شستہ اور بامحاورہ زبان ایک پڑھے لکھے آدمی کے لیے سرمایۂ نشاط بن گئی ہو گی۔ وہ لڑکی جو ان سے مصالحہ پسواتی تھی اور اگر ان کا ہاتھ رک جاتا تھا تو بٹے سے انگلیاں کچل دیتی تھی ان کے ذہن میں ایک خاص کردار بن کر ہمیشہ کے لیے رہ گئی۔ اس کی اس ستم ظریفی اور بے رحمی پر غصہ بھی آتا رہا ہو گا۔ اور نفرت کی لہریں بھی جذبات میں دوڑ جاتی رہی ہوں گی۔ سوچتے رہے ہوں گے یہ کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکیاں نزاکت و امارت کی وجہ سے خود کام نہیں کرتیں اور جو کام کرتا ہے اس کے ساتھ اتنی بے رحمی کا سلوک کرتی ہیں کہ گویا وہ آدمی نہیں ہوتا۔ نذیر احمد کو محسوس ہوا ہو گا کہ یہ لوگ دولت و امارت کا بے جا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عالم انسانیت سے دور ہو جاتی ہیں۔ خود تو انسان رہی نہیں دوسرے غریب لوگوں کو بھی انسان سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی برائی کا کیا ٹھکانہ" یہ اور اس قسم کے اور بہت سے خیالات ایک ہونہار اور ذہین طالب علم کے دماغ میں آنا ضروری ہیں۔ وہ اپنے حاصل کردہ علم و اخلاق سے لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہے کردار کو اس پس منظر میں سوچتا ہے جو اس کو اپنے بزرگوں اور ماحول سے ملا ہے۔ نذیر احمد کے گھر کا ماحول جو کچھ رہا ہو گا اس کی تفصیل تو کسی کو نہیں معلوم مگر قیاس کہتا ہے کہ جب ننھیال دادیہال دونوں طرف سے بزرگان دین کی سرپرستی میں یہ گھرانا پروان چڑھا تھا۔ اور نذیر احمد کے والد بھی خود درویش اور متشرع عالم تھے تو لازمی ہے کہ گھر میں انسانیت، تمیز، تہذیب سب ایک مخصوص انداز کی رہی ہوں گی۔ اس طالب علم نے یہاں کی عورتوں کا اخلاق دیکھ کر کیا سوچا

ہوگا۔ اس پر کیا اثر پڑا ہوگا۔ اس کا صحیح اندازہ تو جب ہی ہو سکتا تھا کہ نذیر احمد کی کوئی خود نوشت سوانح عمری ہوتی۔ اور وہ اپنے محسوسات قلم بند کر گئے ہوتے۔ مگر اس کمی پر بھی آج ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک شریف پڑھے لکھے نوجوان کے ذہن میں ایسے گھروں کے بارے میں اس وقت بھی کیا خیالات ہوتے ہوں گے کیا وہ یہ نہ سوچ سکا ہوگا کہ اگر اس قسم کی لڑکیاں یوں ہی رہیں تو یہ گھرانے اور بھی جلد تباہ ہو جائیں گے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ایسے افراد کی اصلاح کی جائے۔ نذیر احمد چونکہ غریب گھرانے کے تھے۔ اس لیے ان کو یہ بھی خیال ہوا ہوگا کہ یہ فرق کیسا ایک جگہ تو لڑکے بھی لڑکیوں کے کام کرتے ہیں۔ مصالحہ پیستے ہیں، لڑکے کھلاتے ہیں۔ اور دوسری جگہ لڑکیاں شانِ امارت کا مجسمہ بن کر رہ گئی ہیں۔ لڑکوں کی مشقت کی داد بھی نہیں دیتیں۔ اور تکان رفع کرنے کے لیے ٹکیے تو پتھر سے کچل دیتی ہیں۔

شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی ان گھروں میں آنا جانا اور عورتوں سے دو چار ہونا نذیر احمد کے لیے ایک عملی مدرسہ ہو گیا۔ جہاں پڑھنے کی بجائے مطالعہ و مشاہدہ کا درس دیا جاتا ہے۔ تصنیف کا مواد فراہم کیا جاتا ہے۔ قلم چلانے سے ذہن کی تربیت ایک خاص نہج پر ہوتی ہے۔ اس مدرسہ میں جوہر مردانہ پر جلا ہوتی ہے اور خیال کو کسی نتیجہ پر پہنچنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ نذیر احمد نے گلیوں۔ گھروں، مدرسوں کی خاک چھان کر اپنی تصنیفات کو قبولِ عام کا شرف دلوایا تھا۔ اس لیے ان کے پاس تجربات تھے۔ ان کی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا تھا اور دماغ نے بہت کچھ سوچا تھا۔ تخیّل کی بنیاد خلا میں نہ تھی بلکہ ایک ٹھوس حقیقت پر قائم تھی جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ ان حالات میں نذیر احمد مولوی عبدالخالق سے تحصیل علوم و فنون کرتے رہے۔ مولوی صاحب طالب علم کی بردباری، ذہانت اور سعادت مندی سے بے حد متاثر تھے یہاں تک کہ آگے چل کر اپنی پوتی سے اس ہونہار شاگرد کا نکاح بھی کر دیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کو نذیر احمد گود میں کھلایا کرتے تھے۔ عمر کا تفاوت اور ذہنی سطح کی پستی بھی شاگردی و سعادت مندی کی نذر ہو گئی۔ نذیر احمد کی سوانح عمری میں اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ انہوں نے سن و سال اور علمیت کے فرق کا لحاظ کر کے اس شادی کے خلاف کوئی احتجاج کیا ہو بلکہ گیارہ ہزار روپیہ جو دین مہر کا مقرر کیا گیا اس پر بھی راضی ہو گئے۔ حالانکہ ان کی حیثیت اس وقت تک گیارہ سو کی بھی نہ تھی۔ اس واقعہ میں نذیر احمد کے کردار کا ایک ایسا پرتو نظر آتا ہے جو بتاتا ہے کہ ان کی طبیعت میں بغاوت کا مادہ نہ تھا اپنی حیثیت کو بلند کرنے کی زیادہ فکر تھی۔ اور باتوں کو نظر انداز کر جاتے تھے۔ مولوی عبدالخالق کا مرتبہ اس وقت معاشرہ میں کئی لحاظ سے بلند تھا اور نذیر احمد کے محسن و استاد بھی تھے اس لیے اس رشتہ میں نذیر احمد کو فائدہ بھی زیادہ نظر آیا ہوگا نقصان کم۔ ان کی زندگی سے ہم کو اور بھی مثالیں ایسی ملتی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذاتی فائدے و عروج کا ہر بات سے زیادہ خیال کرتے تھے اور اگر بغاوت کا عنصر بھولے بھٹکے ان کے یہاں کبھی نظر بھی آتا ہے تو اسی وقت جب ان کے ذاتی فائدے اور واقعات و خیالات میں تصادم ہو۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان کی ابتدائی کامیابیوں میں عورت کا زیادہ ہاتھ رہا ہے۔ شادی سے جوان کا وقار کم ہو گیا ہوگا اس کا اندازہ قطعی طور پر نہیں کیا جا سکتا لیکن غدر میں ایک میم کی جان بچانے کے عوض میں جو صلہ ملا وہ تو تاریخی واقعہ ہے اس کے باور کرنے میں کسی کو شک نہ ہونا چاہیئے۔ غدر کے بعد اس خدمت کو سرکار نے سراہا اور ان کو ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد مقرر کر دیا گیا۔ اس واقعہ اور الہ آباد کے قیام نے نذیر احمد کے ذہن و ترقی کے لیے ایک نیا راستہ سجھا دیا گورنمنٹ کی نظروں میں نذیر احمد کا جو

وقار ہوا وہ تو اپنی جگہ پر ہے مگر ذہنی طور پر وہ انگریزوں سے قریب ہو گئے ۔ اس قربت کا ثبوت یہ ہے کہ الہ آباد میں انہوں نے انگریزی پڑھنی شروع کی ۔ اور چونکہ فارسی و عربی زبانوں کی گرامر اور ان کے حسن و قبح سے پوری واقفیت تھی اس لیے انگریزی زبان سے بھی واقفیت بہت جلد حاصل ہو گئی ۔ کیونکہ ایک زبان کے جاننے والے کو دوسری زبان جان لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا چنانچہ نذیر احمد نے انگریزی میں بھی اچھی خاصی قابلیت حاصل کر لی ۔ قابلیت سے زیادہ انگریزی زبان کی لذت نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ موقع ہو یا نہ ہو وہ لکھتے یا بولتے وقت انگریزی الفاظ اردو زبان میں ٹھونس دیتے تھے ۔ اپنے انگریزی پڑھنے کے سلسلہ میں ایک لیکچر میں کہتے ہیں :-

" میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں ، والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دین دار ۔ صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مر جانا منظور ہے اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں ۔" باپ کا نذیر احمد بے حد احترام کرتے تھے ۔ ان کے اس زبردست جذبہ کا بھی ان کو خیال تھا ۔ چنانچہ والد کی زندگی میں انہوں نے انگریزی کی طرف رُخ نہیں کیا ۔ ان کے انتقال کے کئی سال بعد تک اس وضعداری کو نباہتے رہے ۔ ملازمت میں الہ آباد آنے کے بعد انگریزی پڑھنا شروع کی ۔ باپ کی ممانعت ترکِ اولیٰ نظر بہ ظاہر اس اقدام میں ایک طرح کی بغاوت ہے لیکن یہاں بھی ذاتی فائدے کا خیال پیش پیش ہے اور غالباً یہی فائدہ اس بغاوت کا سبب بھی تھا ۔ انہوں نے دیکھا کہ بغیر انگریزی جانے ہوئے انگریزوں کی حکومت میں ترقی کرنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے ۔ لہذا اس زبان کا بھی مطالعہ شروع کر دیا جو ان کے بڑے کام آیا ۔ تعزیرات ہند کے ترجمہ سے خوش ہو کر گورنمنٹ نے ان کو تحصیلداری عطا کی اور پھر جلد ہی ڈپٹی کلکٹر بنا دیا ۔

علم ہیئت کی ایک کتاب کا ترجمہ ان کی مزید ترقی کا باعث ہوا وہ حیدر آباد بلا لیے گئے اور وہاں پہنچ کر رفتہ رفتہ بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہو گئے ۔ سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہو گئی ۔ ایک اور مثال ایسی ملتی ہے جس سے ہماری اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ وہ ذاتی فائدے کے لیے مذہب سے بھی بغاوت کر سکتے تھے ۔ سود لینا اسلام میں جرم قرار دیا گیا ہے مگر نذیر احمد اس کے جواز پر اتنا مصر تھے کہ برابر سود لیتے رہے اور شرح بھی مقرر کر لی تھی ۔ ایک روپیہ سیکڑہ سود علانیہ لیتے تھے ۔ اپنی تصنیف الحقوق و الفرائض میں سود کے جائز ہونے پر بحث کر کے مختلف دلائل و تاویلات سے اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ یہ سب باتیں ان کی ذہنیت کا مظاہرہ کرتی ہیں ۔ نذیر احمد کے دل و دماغ پر عورتوں کے برتاؤ طرزِ معاشرت کا غیر معمولی اثر پڑا تھا ۔ ان کی صورت و سیرت نے دلی کی ابتدائی تعلیم و قیام کے زمانے میں ذہن پر نقوش پیدا کیے تھے وہی سب سے پہلے ان کی تصنیفات کا مرکز بنے ۔ چنانچہ مراۃ العروس ، بنات النعش سب سے پہلے وجود میں آئیں ۔ ان کتابوں سے نذیر احمد کی تصنیفی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے ۔ ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے سب مستورات کے بارے میں ہے ۔ عورتوں کی زبان ان کے لب و لہجہ میں نشست و برخاست کا مکمل نقشہ ان کی جیتی جاگتی تصویر اگر دیکھنا ہو تو ان کتابوں میں سب کچھ مل جائے گا ۔ اس کے پس پشت یہ راز بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گھریلو زندگی اور عورتوں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا ۔ ان کی خوبی و خرابی کو ناقد کی طرح دیکھا اور مصلح کی طرح سوچا تھا ۔ ان کو ان باتوں میں اتنی لذت ملتی تھی کہ کتاب پہ کتاب لکھے جاتے ہیں اور سیری نہیں ہوتی ۔ اس انہماک کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کا مطالعہ گھروں اور گھر والیوں کے بارے میں وسیع تھا ۔ ان کی بول چال میں نذیر احمد کی ادبی پیاس سیراب ہوتی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ

دہلی کی زبان ٹکسالی تھی۔ دہلی والے ہی اہل زبان سمجھے جاتے تھے۔ نذیر احمد دہلی کے نہ تھے اس لیے احساس کمتری تھا۔ وہ دہلی والوں کی صف میں آ کر اہل زبان میں شمار ہونے کا جذبہ حاوی ہو گیا تھا۔ اس لیے بھی وہ زیادہ سے زیادہ محاورات ضرب الامثال اور روزمرہ اپنی عبارتوں میں پیش کرنے لگے۔ تاکہ یہ سب کو اندازہ ہو جائے کہ مجھے بھی دہلی کی زبان پر اتنا ہی عبور رہے جتنا کسی اور کو ہو سکتا ہے۔ اس احساس کو انہوں نے ضرورت سے زیادہ اہمیت دی۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ زبان و بیان کا سیلاب ان کے ذہن کو بہائے لیے جاتا ہے۔ اور وہ بعض وقت مجبور ہو کر اس میں بہے چلے جاتے ہیں۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سنبھل نہیں سکتے ابتذال و رکاکت کلام میں آ جاتی ہے۔ مگر ان پر محاورات اور روزمرہ کا ایسا نشہ سوار ہے کہ وہ بے خبر سے معلوم ہوتے ہیں۔ حامد حسن صاحب قادری[1] نے جو اس سلسلے میں مثالیں پیش کی ہیں وہ اس دعویٰ کی بیّن دلیل ہیں ان ہی کو ہم یہاں بطور نمونہ پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں مثلاً الاجتہاد میں تذکرۂ ہجرت میں لکھتے ہیں :-

"اب تم ان حالات حقہ صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھ کر ٹھنڈے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعویٰ رسالت کر کے کسی مفاد کی توقع کر سکتے تھے۔ اس دعوے سے تو ان کی یہ گت بنوائی تھی کہ ؎

جھڑکی تو مدتوں سے مساوات ہو گئی
گالی کبھو نہ دی تھی سو اب بات ہو گئی
باقی ہے مار کھانی تو سن لو کے ایک دن
اس کی گلی میں اپنی یہ اوقات ہو گئی

اس دعوے نے ان کو شہر بدر کرایا۔ (الاجتہاد صہ ۸۳)

امہات الامہ میں اخلاق نبی کریمؐ اور اسباب نکاح کے تذکرے میں ہجرت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"تقویت اور حمایت اور حفاظت نہ ہوتی تو رسالت کی بیل ایک گھڑی بھی منڈھے چڑھنے والی نہ تھی۔ مگر صداقت کے بھروسہ پر پیغمبر تیرہ برس دشمنوں کے نرغے میں پڑے چھاتی پر مونگ دلوایا کیے۔ یہاں تک کہ آخر کو پائے ثبات جگہ سے اکھڑ گیا اور بھاگ کر مدینے جا پناہ لی۔"

ان مثالوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ متانت و سنجیدگی کا خون نہیں ہوا۔ چپکے سے سٹک گئے ان کی یہ گت جوائی، چھاتی پر مونگ دلوایا کیے، پائے ثبات اکھڑ گئے، بھاگ کر ...... یہ فقرے یا محاورے اس عظیم المرتبت ہستی کی شان میں ہیں جس کا نظیر صفحۂ ہستی پر پیدا نہیں ہوا۔ یہ صرف عام مسلمانوں کا عقیدہ نہیں خود نذیر احمد بھی رسالت مآبؐ کا دل سے اتنا ہی احترام کرتے تھے۔ مگر زبان دانی کا غرّہ اور محاورات کا چسکا ساری ذہنیت پر بھوت کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ نہ حفظ مراتب کا خیال اس کو دبا سکتا تھا اور نہ موقع شناسی اس کو اتار سکتی تھی یہ ضرور ہے کہ ان کا دل دھڑکا ہو گا۔ احترام کے جذبے نے قلم کو روکا ہو گا کہ کس کی شان میں یہ الفاظ استعمال ہو رہے ہیں کس موقع پر ان فقروں اور محاوروں کا صرف ہو رہا ہے مگر زبان دانی کے جوش اور الفاظ کے استعمال

---

[1] داستان تاریخ اُردو صہ ۵-۹-۱۰)

کرنے کا نشہ اس بے اعتدالی سے نہ روک سکا اور اس حد تک مدہوش کر دیا کہ نثری عبارت ناکافی معلوم ہوئی۔ تو چار مصرعے بھی چسپاں کر دیئے۔ حالانکہ اس موقع کے لیے یہ مصرعے نہایت نامناسب تھے۔ اسی بے تکے پن کی وجہ سے القرآن کی طرزِ تحریر مجروح ہو جاتی ہے۔ کلام میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ بات بلاوجہ بڑھائی جا رہی ہے۔ یہ سب اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو الفاظ سے عموماً کھیلنے کا ہوتا ہے۔ سب کچھ کہہ جانے پر بھی خیال ہوتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہا گیا۔ اس لیے کہ مخصوص اندازِ بیان کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے اور موضوع ختم ہو جاتا ہے۔

نذیر احمد ایسے دور میں تھے جب انگریزی تمدن کے اثر سے نئی قدریں تشکیل ہو رہی تھیں۔ لوگوں کو ان پر اعتماد ہو چلا تھا۔ انگریز اور یورپ کی ترقی کے راز کو سمجھنے کی کوشش ہندوستان میں ہو رہی تھی۔ ایک خاص طبقہ انگریزی تعلیم یا انگریزی اثر سے متاثر ہو کر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سائنس کی نئی تحقیقات و معلومات کا مطالعہ کیا جائے ان سے پرانی ذہنیت کو بدلا جائے مذہب کو عقل کی عینک سے دیکھا جائے، توہمات سے کنارہ کیا جائے۔ اور ایسی رسمیں جو مذہب کے نام پر جاری ہیں مگر حقیقتاً خیالِ خام کی پیداوار ہیں وہ قوم و ملک کے لیے زہر ہیں ان سے اجتناب کیا جائے۔ انگریزوں کی ترقی کا ایک بڑا راز تجارت میں مضمر سمجھا گیا۔ اصلاح کے لیے تقریروں اور تحریروں دونوں سے کام لیا جانے لگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ نذیر احمد کا دور نئی تخلیقات و تحقیقات سے اثر لے کر اپنی قوم میں بھی ترقی کی روح پھونکنا چاہتا تھا۔ اسی کو ذہنی طور پر آمادہ کرنے کے لیے معلومات کا ذخیرہ مغرب کے خزانہ سے لے کر عوام کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ حالی۔ سرسید۔ محمد حسین آزاد اور ان کے مقلد و ہم خیال ایسے ہی اصلاح کے علمبردار تھے۔ جس کو جو طبقہ مناسب معلوم ہوا اسی میں تبلیغ کرنے لگا۔ نذیر احمد نے پہلے پہل اس کام کے لیے طبقہ اناث کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ انہوں نے اس کارِ خیر کے لیے نئے آلۂ کار کا انتخاب کیا۔ ناول اُردو ادب کے لیے نئی چیز تھی اس کا نیا پن بھی لذیذ معلوم ہوا ہوگا۔ اور پیامات کی تازگی بھی چاہتی تھی کہ پرانے قصّے کہانی کو چھوڑ کر نئی صنف میں باتیں پیش کی جائیں اس لیے نذیر احمد کا یہ اقدام ناول میں اصلاحی مقصد کو پیش کرنے کا خیال بڑی نکتہ رسی پر مبنی تھا۔ بہرحال انہوں نے اصلاحی فریضہ ناول سے شروع کیا۔ اور لوگوں کی طرح نذیر احمد کے پاس بھی کوئی معاشرتی پروگرام ایسا نہ تھا کہ ان کی تخلیق سے تعبیر کیا جائے۔ درحقیقت ان کا ذہنی سرمایہ مغربی تمدن کا پرتو تھا۔ جس میں تقلید زیادہ تھی خلاقی کم۔ بہرحال جو کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آئیں اس کو قوم کی بہبود میں صرف کرنا انہوں نے ضروری سمجھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس اقدام میں خلوص تھا وہ دل و جان سے چاہتے تھے کہ مسلمان ترقی کریں مادی ترقی کے لیے ان کے نزدیک ضروری تھا کہ شعور میں بھی بلندی آئے قدامت پرستی کے تنگ دائرے سے نکل کر نئے علوم سے متعارف و مانوس ہوں تاکہ نئے راستے اور ان کی قدر و قیمت سمجھ میں آسکے۔ مختلف وجوہ سے نذیر احمد نے عورتوں کو زیادہ کمزور پایا اور مناسب سمجھا کہ ان کو پہلے مضبوط بنایا جائے۔ اس لیے ان کی ناولیں مرآۃ العروس اور بنات النعش وجود میں آئیں۔ جن میں علاوہ اور باتوں کے ذہن کی بالیدگی کے لیے سائنس کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ مثلاً بنات النعش میں زمین کی کشش وزنِ مخصوص، ہوا کا داب، کشش اتصال، مقناطیس، زمین گول ہے۔ اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ اور اس قسم کے اور بہت سے عنوانات ہیں۔ جن سے ظاہر ہے کہ ان مسائل کو اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ شعور میں عقلی عنصر غالب ہو جائے۔ زندگی کے رشتے منطقی طور پر سمجھ میں آجائیں۔ مفروضات سے ہٹ کر ذہن حقیقت کی روشنی میں چلنے پھرنے لگیں۔ اور نئی عقل کی توانائی کے ساتھ

آگے بڑھیے۔ نذیر احمد نے اپنی ذہنیت پر ایک جگہ خود تبصرہ کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا۔ تنگ خیال، متعصب، اکل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ۔ دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط، مسلمانوں کا ناداں دوست۔ تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا" گو وہ مولوی خاندان کے تھے مگر مولویت سے نفور تھے۔ اسی لیے مولویوں کو انھوں نے بہت بری نظر سے دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اقبال کی طرح سمجھ لیا کہ دین کیا چیز ہے۔ قوموں کی امامت کیا ہے۔ اس کو کیا جانیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

ان کے نزدیک قوم کی رہبری کے لیے اب وہی شخص موزوں ہو سکتا ہے جو ترقی یافتہ دنیا کے حالات و تغیرات سے بخوبی واقف ہو مذہب کا اصل منشاء بھی جانتا ہو اپنے پر بھی تنقیدی نظر ڈال سکتا ہو۔ تعصب و تنگ نظری کا شکار نہ ہو۔ مختصر یہ کہ ایسے کردار کا مالک ہو جو زندگی اور مذہب کی اصل حقیقت سے واقف ہو انسان کو انسان سمجھتا ہو۔

ان مختصر الفاظ میں نذیر احمد نے اپنے دور کے ممتاز لوگوں کی ذہنیت کا جائزہ پیش کر دیا ہے۔ انھی نکتوں سے اس وقت جو سربرآوردہ لوگ قوم کی رہنمائی اور ادبی خدمت کر رہے تھے، ان سب کے مزاج و مذاق کی تصویر اس اصول کے آئینہ یا نظریہ سے سرسید، حالی، آزاد اور نذیر احمد سب اسی نظریہ کے ساتھ [illegible] قیادت میں گامزن تھے۔ کبھی کسی سے لغزش ہو گئی ہو تو اسے انسانی کمزوری پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ عموماً ان بزرگوں کے سامنے یہی مسلک تھا۔ نذیر احمد کو اصلاح کے سلسلہ میں اتنا شغف تھا کہ وہ بیچ بیچ میں ناصح مشفق معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ناولوں میں کرداروں کی حرکات و سکنات بیان کرتے کرتے خود بیچ میں بول اٹھتے ہیں اور اس شدومد کے ساتھ بولتے چلے جاتے ہیں کہ پورا لیکچر دے ڈالتے ہیں۔ نہ ناول کی تکنیک کے مجروح ہونے کا خیال رہ جاتا ہے نہ موقع سے مناسبت و توازن کا لحاظ۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات سے ان کا دم گھٹ رہا ہے۔ بغیر بولے ہوئے ان کی حالت غیر ہو جائے گی۔ کچھ دنوں کا یہ عالم ہو اور بھی بے تکا ہو جاتا ہے۔ اس رویہ کے پس پشت نمائش و خود نمائی کا جذبہ نمایاں ہے۔ اور یہی جذبہ ان کی تمام ادبی کاوش میں ابل پڑتا ہے۔ ضرب الامثال و محاورات کی بھرمار اور انگریزی الفاظ کا بے ضرورت و بے محل استعمال ان کی اس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے جو خود نمائی کے ذوق پر محمول ہے۔

نذیر احمد کے ذہنی پس منظر میں سیاست کا زیادہ دخل نہیں مگر معاشرت اور سیاست میں جو فطری لگاؤ ہے وہ کبھی [illegible] کیا جا سکتا۔ اس لیے سیاسی مسائل پر بھی ان کے خیالات ملتے ہیں گو دبے دبے سے ہیں، تاہم ان خیالات کی تہہ میں اتنی معقولیت اور خودداری ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ نہ اس زمانہ میں لوگوں کا سیاسی شعور اتنا بلند تھا جتنا آج ہے۔ نہ آزادی فکر و گفتار آج کے ایسی حاصل تھی۔ پھر بھی انھوں نے مختلف صورتوں سے حاکم و محکوم کے رشتہ پر جو تبصرہ کیا ہے وہ اس وقت کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ ایک جگہ ابن الوقت کی زبان سے غدر کے بعد انگریزوں کے ضمن میں کہلواتے ہیں۔

"انگریزی سلطنت رعایائے ہندوستان کے حق میں ایک پہیلی ہے، جس کو اس وقت تک اکثر عوام الناس نہیں بوجھ سکتے۔ تبدیل سلطنت یوں بھی کچھ آسان بات نہیں اور پھر ایسا تبدل کہ حاکم و محکوم دونوں میں کسی طرح کی مناسبت نہیں۔ نہ وطن ایک نہ زبان ایک نہ مذہب ایک، بس ہندوستانیوں کے حق میں سلطنت کیا بدلی گویا ساری خدائی بدل گئی۔ اگلے تمام ذریعے معطل، ساری باتیں بے کار۔ کل تدبیریں بے اثر ...... اب ہر ایک منصف مزاج آدمی خیال کر سکتا ہے کہ اس گروہ کو انگریزی عملداری سے ناخوش ہونے اور رہنے کی وجہ معقول

تھی یا نہیں۔"

اس سلسلہ کی ایک کڑی اور ملاحظہ ہو، بنات النعش میں ایک جگہ بادشاہ اور رعایا کے تعلقات پر کچھ عورتوں میں بحث ہو جاتی ہے۔ استانی جی آخر میں اسے دیتی ہیں:-

"جتنے بادشاہ ہیں سب لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ جب دنیا میں بہت آدمی ہو گئے تو آپس میں لڑائی جھگڑا بھی ہونے لگا۔۔۔۔۔۔ تجویز یہ ٹھہری کہ آپس میں کسی شخص کو سردار بنا لیں۔ سب اس کا حکم مانیں اور اس کی اطاعت کریں اور اس سردار کا کام یہ ہو کہ وہ لوگوں کے جھگڑے طے کر دیا کرے۔ رعایا کی جان و مال و آبرو کا نگہبان رہے۔ اسی کا نام بادشاہ ہوا۔ لوگوں کا کام ہے اس کی اطاعت کرنا اور بادشاہ کا کام ہے رعایا کو آرام دینا۔"

اگر یہ مان لیا جائے کہ ان اقتباسات کے پس پردہ مصنف خود بول رہا ہے تو نذیر احمد کا سیاسی نظریہ واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ پہلے اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانیوں اور فرنگیوں میں مختلف وجوہ سے بُعد پاتے تھے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستانی اور انگریز کبھی شیر و شکر نہیں ہو سکتے۔ اتنے بنیادی اختلافات ہیں کہ ہندوستانیوں کا انگریزی عملداری میں خوش رہنا ناممکن ہے کیونکہ حاکم و محکوم دونوں میں کسی طرح کی مناسبت نہیں۔ انگریزوں کے آ جانے سے ہندوستانیوں کو محسوس ہو رہا ہے کہ ان کا سب کچھ کھو گیا اور وہ بیک جنبش قلم انگریزوں کی بدولت معطل ہو گئے۔ نذیر احمد سیاسی نہ تھے مگر ان خیالات میں انہوں نے نفسی تحلیل پیش کی ہے وہ ان کے نکتہ رسی کا پورا ثبوت ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کس طرح ملک و حالات اور واقعات کا مطالعہ کیا ہے اور حقیقت کو کتنی پختگی کی ساتھ محسوس کر لیا تھا۔ دوسرا اقتباس بھی ان کے خیالات کی بلندی اور آزادی فکر کی بیّن دلیل ہے۔ حالانکہ انگریزی شہنشاہیت اس وقت شباب پر تھی۔ غدر کے بعد ایک مدت تک انگریزوں کی سخت گیری زبان بندی کا کام کر رہی تھی۔ اور یہ کتاب (بنات النعش) غدر کے صرف پندرہ سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں عوام کی قوت و حقوق کو اس طرح بیان کرنا کہ بادشاہ لوگوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں بڑی دیدہ دلیری کا کام تھا۔ گویا عوام کو یہ سمجھانا تھا کہ تمہاری اجتماعی قوت بادشاہ کی قوت سے زیادہ ہے اور نیز یہ کہ بادشاہ کا فرض اولین ہے کہ رعایا کی جان و مال و آبرو کی نگہبانی کرے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے کو بے باکی کے ساتھ پیش کرنے کے عادی تھے۔ نہ حکومت سے ڈرتے تھے نہ مذہب والوں سے۔ جو کچھ سوچتے تھے اس پر پختگی کی مہر لگا دیتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اس کے علاوہ کوئی اور بات ناقابل قبول ہے۔ ان کی اصابت رائے میں شک ہو سکتا ہے۔ ان کے نظریئے سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی بے باکی پر دو رائے نہیں ہو سکتیں۔

نذیر احمد کی ذہنیت میں ایک بڑے مزے کا تضاد ملتا ہے جس قدر وہ روپیہ پیسہ خرچ کرنے میں کنجوس تھے اتنا ہی الفاظ کا ذخیرہ لٹانے میں فیاض تھے۔ بخل کی وجہ تو یہ تھی کہ وہ غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ مفلسی اور ناداری کے نشتروں سے دل پوری طرح واقف تھا۔ اس کو اب اپنے سے دور رکھنے کے لیے پائی پائی پر نظر تھی۔ مٹھی ہمیشہ بند رہی۔ لیکن الفاظ کے صرف میں ان کا رویہ بالکل برعکس تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی جز رسی کی تلافی روپے سے نہیں بلکہ الفاظ سے کرنا چاہتے تھے۔ جیسے روپیہ جمع کرنے میں ان کو لذت ملتی تھی۔ ویسے ہی الفاظ ضرب الامثال محاورات کے لٹانے میں مزا ملتا تھا۔ اور یہ مزا اس حد تک غلبہ پا گیا تھا کہ کسی قیمت پر اس کے ترک کرنے پر راضی نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ ان کی ایک کتاب امہات الامۃ نے ان کی ساری شہرت و نیک نامی میں آگ لگا دی

ازواج رسولؐ کے بارے میں لکھتے لکھتے الفاظ و محاورات کی بے اعتدالی اور اس مزے نے جو ان کو مذاق تھا غضب ڈھا دیا۔ کچھ ایسے نامناسب فقرے لکھ گئے جو ہر لحاظ سے قابلِ اعتراض تھے۔ ان کو پڑھ کر عام بے چینی پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کے جذبات نذیر احمد کے خلاف اتنے مشتعل ہوئے کہ ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ علماء کا اجتماع ہوا اور ان کی کتاب امہات الامۃ کا جتنا بھی ذخیرہ مل سکا سب کو یکجا کر کے آگ لگادی گئی۔ اس واقعہ پر نذیر احمد پر بڑا سخت اثر پڑا اس لیے کہ فطرتاً وہ رسولؐ اور ازواج مطہرات سے بڑی عقیدت مندی رکھتے تھے نہ معلوم کتنا ریاض ان بزرگوں کے اخلاق و سیرت کی اشاعت پر کیا تھا۔ اور آج ان ہی کو ان بزرگوں کا مخالف سمجھا جا رہا تھا۔ ان کو اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کے بعد نہ کچھ لکھ سکے نہ زیادہ دن تک جی سکے۔ یہ حادثہ ۱۹۱۱ء میں اور ان کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔

نذیر احمد کی ذہنیت کی تشکیل میں مذہب کا عنصر جزوِ غالب ہے وہ بغیر اس کے لقمہ نہیں اٹھا سکتے۔ ہر اخلاقی تعلیم میں مذہب کی چاشنی ضرور ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب و اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ناعاقبت اندیشی بلکہ حماقت ہے۔ توبۃ النصوح کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں۔ نیکی کو مذہب سے جدا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص روح کو جسد سے یا بو کو گل سے یا نور کو آفتاب سے یا عرض کو جوہر سے یا ناخن کو گوشت سے علیحدہ یا منفک کرنے کا قصد کرے: گویا ان کے نزدیک مذہب سے الگ ہو کر زندگی اخلاق کے دائرے میں نہیں رہ سکتی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے خیال میں اخلاق کا شیرازہ بغیر مذہب کے قائم نہیں رہ سکتا۔ دنیا کا کوئی اور قانون اس کو راہ راست پر نہیں رکھ سکتا۔ ان کا ذہنی ارتقاء رسوم و قیود کا سہارا لیے ہوئے ہے جو کچھ دیکھتے یا سنتے چلے آئے ہیں اسی پر اپنی تخیل کا محل تعمیر کرتے ہیں۔ اس سے الگ یا آزاد ہو کر کوئی نیا نظریہ یا نقطۂ نظر ان کے ذہن میں نہیں۔ چنانچہ نصوح کو جب حشر کے میدان میں لے جاتے ہیں اور وہاں کی روداد بیان کرتے ہیں تو خدا کو مجسٹریٹ اور اس کی جملہ کارروائیوں کو دنیا کی معمولی عدالتوں کا چربہ سمجھتے ہیں۔ خدا کے یہاں بھی حوالات دکھاتے ہیں۔ مجرم کے لیے فردِ جرم تیار کراتے ہیں۔ گواہ کی ضرورت ہوتی ہے سوال و جواب کا سلسلہ بپا کرتے ہیں۔ اور آخر میں عدالتی فیصلے کی طرح خدا بھی اپنا حکم مجرم کو سناتا ہے۔ گویا خداوند عالم کی جملہ کارروائیاں ویسی ہی ہوں گی جیسے یہاں کچہریوں میں ہوا کرتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جدت و اختراع کا مادہ نہیں۔ البتہ مذہب کی روح کو کماحقہ سمجھ لیا تھا۔ اور جو کچھ سوچا یا سمجھا تھا۔ اس پر سختی کے ساتھ کاربند تھے۔ اسی کو مشعلِ ہدایت بنا کر تمام دنیا کی تاریکیوں کو دور کرنے کی فکر تمام عمر کرتے رہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ماضی کے ادبِ عالیہ سے متعلق

ممتاز حسین

ایک ایسے زمانے میں جب کہ طبقاتی جنگ بہت تیز ہو جاتی ہے تو جذباتی وفور یا نظریاتی کمزوری کے باعث ادبی پرکھ میں غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ قصور سیاسی انتہا پسندی کا نہیں ہے کیونکہ سیاست تو تیز ہوتی ہی ہے۔ بورژوا نظام کے تضاد جوں جوں ابھرتے جائیں گے طبقاتی جنگ کا تیز ہونا لازمی ہے۔ تاریخ کا تقاضا تو انہیں تضاد کو زیادہ ابھارنے اور تیز کرنے ہی کا ہے۔ لیکن جب سماجی ارتقا کے قوانین کا اطلاق بہت بھونڈے اور میکانکی طور سے ادب پر کیا جانے لگتا ہے تو نہ صرف ادب ہی کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ انقلابی قوتیں بھی کمزور ہوتی ہیں۔ روسی تنقید میں اقتصادی بنیاد کی اولیت اور طبقاتی جنگ، ادبی پرکھ کا بہترین آلہ ہے۔ لیکن جب اس آلے کو بلا قاعدہ تمام حالات اور علوم کا جائزہ لیے ہوئے میکانکی طور سے استعمال کیا جاتا ہے تو یہی آلہ علم دشمنی اور جہالت کا حربہ بن جاتا ہے۔ اشتراکی انقلاب کے پہلے اور بعد میں نہ صرف روس ہی میں بلکہ اینگلز اور مارکس کے زمانے میں بھی خود جرمنی میں، ایسے ناقدین موجود تھے جو مارکسزم کو ایک میکانکی علم بنا کر ماضی کے ادب کو جانچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر مارکس اور اینگلز دونوں ہی نے اپنا قلم اٹھایا ہے۔ اسی طرح لینن نے [illegible] حملوں کے خلاف نہ صرف بہت کچھ لکھا ہے بلکہ عملی تنقید کے ذریعے ہماری رہنمائی بھی کی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اپنے ماضی کے ادب کی کسوٹی بناتے وقت ان کی تعلیمات کو سامنے رکھیں۔ قبل اس کے کہ ایک اتنے بڑے مسئلے کو اٹھایا جائے میں تمہیداً صرف سماجی ترقی کے مفہوم اور کلاسیکی ادب کے چند بنیادی مسائل کو پیش کروں گا۔

جسے ہم سماجی ترقی کہتے ہیں اس کا تعلق ترقی کے مختلف سمتوں سے ہے۔ معاشی اور سیاسی ترقی کے ساتھ اگر مادی اور ذہنی نقطہ نظر سے اور بنی نوع انسان کی وحدت کا تصور نہ ابھر سکے تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ابھی ہماری ترقی نہ صرف نامکمل ہی ہے بلکہ اس میں کھوٹ بھی ہے کیونکہ سماجی شعور ایک خلاقانہ قوت ہے جو معاشی بنیادوں پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ اگر سماجی شعور کی بنیادیں مستحکم نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمیں غلط معاشی نظام کی طرف لے جائیں یا روک دیں۔ یہی خطرہ ہمیں تصنیفات کے فوری اثر ہی کو دیکھنے تک محدود نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے دیرپا اثرات کا مطالعہ بھی لازم کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کسی زمانے کی ادبی تصنیف فوری اثر کے اعتبار سے کمزور ہو لیکن سماجی ترقی میں دیرپا اثرات کی حامل ہو۔ اس حقیقت کا ایک مخالف پہلو بھی ہے۔

یہ بات تو مسلم ہے کہ ادب اور تہذیب کی ترقی طبقاتی سماج میں ہوئی چنانچہ طبقاتی اثرات کی چھاپ تو ادب اور کلچر دونوں

آتا رہا ہے۔ لیکن جب ہم اس طرح سوچیں تو ہمیں سماجی ترقی کے مفہوم کو بھی اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ غلامی کا دور استحصالی نظام کو وجود میں لانے کے خیال سے ایک بڑا رجعت پسندانہ قدم کہا جا سکتا ہے۔ لیکن مادی تقاضے بتاتے ہیں اس دور میں انسان نے زیادہ ترقی کی ہے۔ اس لیے اس دور کا کچھ حصہ ترقی پسندی کا بھی دور رہا ہے۔ یونان کا تمام علم و ادب اسی دور میں بارآور ہوا۔ اس دور کے علم و ادب نے ترقی اور رجعت دونوں ہی قوتوں کی نمائندگی کی ہے۔ کسی بھی دور کی سب چیزیں ترقی پسند نہیں ہوتی ہیں۔ اور نہ انہیں تاریخی تقاضوں کا نتیجہ ہی ہمیشہ گردانا جا سکتا ہے۔ ترقی اور رجعت کی دو صفیں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں رہی ہیں۔ سماجی ارتقا ترقی کی قدیم روایات کو آگے بڑھا کر ایک نئی صورت میں تبدیل کرتا رہا ہے۔ وہ ناقص اور غیر صحت مند روایات کو ختم بھی کرتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم ہے۔ اگر بنیادی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ترقی دو لفظوں میں سمٹ گئی ہے۔ طریق پیداوار کو بڑھانے اور اس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دینے اور انسانیت کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں جن قوتوں نے حصہ لیا ہے انہیں ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ یہ قوتیں مختلف ممالک میں ایک ہی وقت میں اپنے ملکی حالات کے ماتحت مختلف صورتوں میں کام کرتی رہتی ہیں۔ ہم ایک ملک کی مثال کو دوسرے ملک پر میکانکی طور پر لاگو نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کہ علم و ادب کا رشتہ معاشی بنیادوں کے ساتھ طبقاتی نظام میں اتنا براہ راست نہیں رہا ہے جتنا کہ قبائلی نظام میں تھا۔ طبقاتی نظام میں تو ان چیزوں نے اکثر و بیشتر ایک بار معاشی بنیادوں سے متعین ہو کر اپنی ایک آزاد زندگی بھی اختیار کر لی ہے۔ اکثر ان کی یہ آزادی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے قوانین اور منطق بھی بنا لیتے ہیں۔ ہمیں فکری تحریکوں کو جانچتے وقت نہ صرف طبقاتی جدوجہد ہی کو دیکھنا ہے بلکہ ان کے تسلسل منطق اور قانون کا بھی پتہ چلانا ہے۔ چونکہ فکری تحریکیں ادب پر گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔ اس لیے ان کا مطالعہ اور ان کی منطق کے بہت ضروری ہے۔ فکری تحریکیں اس لیے بھی اہم ہیں کہ وہ ایک مخصوص عہد کے ذہنی نقطۂ نگاہ اور ادراک حقیقت کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ ان کی مدد سے ادب سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ادب کی تعریف لینن نے نہ صرف اس طرح کی ہے کہ ادب خارجی حقیقت کا آئینہ ہے بلکہ اس طرح بھی کہ ادب ادراک حقیقت میں بڑی مدد بھی کرتا ہے۔ انہیں معنوں میں ادب ہماری جسمانی، ذہنی اور جذباتی زندگی کا ایک ایسا مرقع ہے جس کی مدد سے کسی بھی زمانے کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ یہ تاریخ پورے سماج کی زندگی کی تاریخ ہوتی ہے جو طبقات میں نئے اور پرانے کی جنگ کی تاریخ ہوتی ہے۔ ترقی پسند ادیب کسی نہ کسی معنی میں نئے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس وقت یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ مکمل طور سے نئے کے ساتھ ہو کیونکہ جس حد تک ایک دور کی متضاد قدروں کی ”کشمکش“ عوام کے ذہنوں میں چلتی ہے۔ ادیب کا ذہن بھی کشمکش میں رہتا ہے۔ اسی لیے وہ اکثر متضاد باتیں بھی کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ بنیادی اعتبار سے پرانے کے خلاف جنگ کر کے کون سی نئی چیزیں لانا چاہتا ہے۔ اگر وہ صرف ماضی کی چیزیں واپس لانے کی کوشش کر رہا ہے تو ہم اسے رجعت پسند سمجھیں گے۔ خواہ وہ ایک مخصوص عہد کے پرانے پن کے خلاف ہی جنگ کیوں نہ کر رہا ہو۔ میں نے اس چیز کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ جب استحصالی حکمران طبقہ اپنے کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو بہت سے نئے تصورات کو بھی اپناتا ہے لیکن وہ ان تصورات کو صرف اپنے طبقاتی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے اس کی یہ کوشش اصل میں قدیم کو زندہ رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کی واضح مثال اسلامی تاریخ میں امام غزالیؒ کا زمانہ ہے۔ اس وقت اسلام کی شرعی حکومت انحطاط کی مکمل صورت میں تھی۔ شرع اور فقہ پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ دشمنانِ شرع یونانی علوم سے لیس تھے بالآخر امام غزالیؒ کو بھی یونانی علم الکلام کو مستعار لینا پڑا۔ لیکن امام غزالیؒ

نے اسے جن مقاصد کے لیے استعمال کیا وہ قطعی رجعت پسند تھے۔ اسے مادی ترقی کے بجائے روحانی استدراک کا ذریعہ بنایا۔ اسلام میں مابعد الطبیعاتی منطق کی ساری راہیں انہیں کی کوششوں سے کھلی ہیں۔ موجودہ دور میں اس کی مثال علامہ اقبالؒ کی فکری کوششیں ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسلام کی روحانی جمہوریت کو واپس لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں انہوں نے ان ذرائع کو بھی استعمال کرنا چاہا ہے جن سے یورپ میں ترقی ہوئی تھی۔ لیکن ایسے تمام ذرائع کو وہ اپنے مخصوص مقصد کا پابند بھی کر دیتے ہیں۔ اور یہی چیز ان کے کلام میں بھی تضاد پیدا کر دیتی ہے کیونکہ مادی ذرائع روحانی مقاصد کے ساتھ ہمنوا نہیں ہو سکتے ہیں۔ اگر انسان عناصر فطرت پر تصرف حاصل کرے گا تو اس کا مقصد صرف مادی ہوگا۔ یہی وہ سبب ہے کہ اقبالؒ کے کلام کے ترقی پسند اجزا خود اپنی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ یوں تو علامہ اقبال کا فلسفہ خودی بڑا جاندار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ شریعت یعنی ہدایات الٰہی کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کی بغاوت کی حدود بھی متعین ہو جاتی ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو شریعت کو ایک سیال تصور بنا کر ہر نئے نظام پر منطبق کر دیتے ہیں۔ شریعت کی نظریاتی بنیادیں بالکل متعین ہیں اور اس کے عمل کی تاریخ ایک بہت چوڑے دور پر پھیلی ہوئی ہے اگر ہم اسلامی تاریخ کے ایک بہت ہی مختصر سے وقت کو چھوڑ دیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ شریعت کو استحصالی طبقے نے استعمال کیا ہے اور جب تفسیریں لکھنے کا وقت آیا تو تمام فقیہوں نے ایسے ہی نکات پیش کیے جن سے حکمران طبقے کی پوزیشن مضبوط ہوئی۔ بالآخر خلافت (دینی ریاست) ایک ایسا ادارہ بن گیا جس کی مخالفت کو ایک مقدس وظیفہ بنا لیا گیا۔

شریعت کی مخالفت اسلامی تاریخ کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ اس بغاوت کی ابتدا ان وحدت الوجودی صوفیوں نے کی جو یونان کے فلسفہ وحدت الوجود سے متاثر تھے۔ یہ فلسفہ افلاطون کا نہیں تھا بلکہ فلوطینس کا تھا جس نے افلاطون کی عینیت اور دیمو قریطس کی مادیت کو ہم آمیز کرنے کی کوشش کی تھی۔ بغاوت کی اس آواز کو ذوالنون مصری، بایزید بسطامی اور حلاج نے اٹھایا۔ اس کے لیے یہ آواز اٹھانی ہی مشکل تھی۔ اگر یونانی وحدت الوجود کے فلسفے کو توحید مطلق کے فلسفے پر برتری حاصل ہوتی۔ توحید مطلق کے فلسفے میں مادہ مخلوق ہے اور ایک خاص زمان و مکان کا پابند ہے۔ اس کی ایک ابتدا اور انتہا ہے۔ وہ اپنی حرکت و صورت پذیری میں قادر مطلق نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا موجد اور خالق ایک دوسری قوت ہے۔ جس طرح اس قوت نے قوانین فطرت وضع کیے ہیں اسی طرح سماج (Society) سوسائٹی کے لیے من پسند قوانین وضع کر دیے ہیں۔

وحدت الوجود کے فلسفے میں مادہ روح کے ساتھ ہم وجود ہے۔ مادہ بھی روح کے ساتھ ساتھ ابدی اور ازلی ہے۔ مادے کا کوئی خالق نہیں ہے بلکہ مادہ اور روح ایک دوسرے کے لیے جزو لاینفک ہیں۔ اس طرح انسان کا عمل اور ارادہ مشیت ایزدی میں شامل ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کسی چیز کی تخلیق یا تخریب کرتا ہے تو اس میں مشیت کو بھی دخل ہے۔ کیونکہ مشیت کا اظہار مادے کے توسط یعنی انسانی عمل ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ وحدت الوجودی صوفیوں نے اسی منطق کی بنیاد پر اسلامی اخلاقیات کو سزا و جزا سے آزاد کر کے عمل کی راہ متعین کر رہا ہے۔ اور ان تمام مذہبی دیواروں کو گرانے کی کوشش کی جو انسانوں کے درمیان کھڑی کر دی گئی تھیں۔ ان اسباب کے ماتحت یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ صوفی عوام میں بہت مقبول تھے۔ وہ درباری زندگی سے گریز کرتے تھے اور انہوں نے اسلامی تاریخ میں دینی ریاست کے قائم ہونے کی مخالفت کی ہے۔ یہ تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ صوفیوں نے بظاہر کھل کر کسی عوامی شورش میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن عوامی تحریکوں کے ساتھ ان کی ہمدردی بالواسطہ شامل رہی ہے۔

جس حد تک یونانی وحدت الوجود کا فلسفہ اور ایرانی گبرو ترسا کے مادی فلسفے کی روایات توحید مطلق کے فلسفے کے ساتھ ہم آمیز ہوتی تھیں، صوفیوں کے انقلابی پن میں بھی کمزوری آتی گئی۔ اس فلسفے سے پہلی بیعت امام غزالیؒ کے ہاتھوں کی اور دوسری بیعت مجدد الف ثانی سرہندیؒ کے ہاتھ۔ امام غزالیؒ نے وحدت الوجود کو اس کے مادی جزو سے بالکل ہی آزاد کر دیا۔ محسوسات کے فلسفے کو خالص وجدانی اور باطنی فلسفہ کی بنا پر تصوف کو روحانی مشق و مہارت کی چیز بنا دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے شریعت اور طریقت کو بھی ہم آمیز کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح جب مجدد الف ثانی سرہندیؒ نے ہمہ اوست کو ہمہ از اوست میں تبدیل کیا تو مادے کو بالکل ہی مخلوق کی صورت دے دی۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ وحدت الوجود کا بذات خود یعنی فلسفہ جو مادے اور روح کو ہم آمیز کرتا ہے۔ بہت سے معنوں میں مہلک ثابت نہیں ہوا۔ ہر چند وحدت الوجودیوں نے مادے اور روح کی دوئی کو ہم آمیز کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ ثنویت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ انہیں روح کو فاعل اور مادے کو مفعول بنانا ہی پڑا۔ یہی وہ سبب ہے کہ اس فلسفے میں فکر کو عمل پر ترجیح دی گئی ہے۔ صوفیوں کی زندگی میں تفکر پسندی، خاموشی اور اعتکاف انہیں تصورات کے ماتحت آیا ہے۔ لیکن اس فلسفے کا ایک حسین پہلو بھی تھا۔ صوفیائے کرام انسان کو عالم اکبر تسلیم کرتے تھے اور نوامیس فطرت میں صرف انسان ہی کی جلوہ گری پر اپنا ایمان رکھتے تھے۔ میرؔ ایسا تغزل کا پیارا انسان بھی اس رمز سے واقف تھا ؎

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں ——— اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے ——— اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

یہاں تو خدا اور بندے سے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ جبر و اختیار کا جھگڑا تو صرف اس وقت باقی رہتا ہے جب کہ ہم مادے کو مخلوق تصور کریں۔ یہ کشمکش تو صرف توحید مطلق ہی کی دی ہوئی ہے۔ بھلا سترھویں صدی کا انحطاطی تصوف اس کی رو سے کیوں کر بچ سکتا تھا۔ بالآخر صوفیہ کو بھی اپنی خود مختاری کا اعتبار جاتا رہا۔

اسی طرح حلاج کا فلسفہ بقا باللہ بھی انحطاطی دور میں بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ صرف فنا فی اللہ کا لفظ یاد رہ گیا تھا۔ حلاج کے بقا باللہ کے اصول کے مطابق انسان ذات باری کی خلاقانہ صفات میں ضم ہو کر تخریب اور تخلیق پر آمادہ ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی تصور کے ماتحت انسان کو خالق بھی بتایا ہے۔ فنا فی اللہ کا وہ درجہ ہے جب کہ وہ اپنی تخریب کو نئی تخلیق کے لیے فنا کر دیتا ہے چونکہ بقا باللہ میں انسان کے بندہ رہنے کا تصور کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لیے توحید مطلق کے ماننے والوں نے اس کی شدید مخالفت کی اسے کفر کے برابر گردانا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ مسلمان صوفیوں نے زیادہ تر فنا فی اللہ ہی کو رواج دیا۔ پھر یہ کہ جاگیردارانہ نظام کا انحطاط اس خیال کو ہوا دینے میں اور بھی مددگار ثابت ہوا۔ زندگی میں کوئی بھی نئی تخلیق بغیر مادی علوم کے ناممکن ہے۔ یہاں اہل شرع اور اہل صفا دونوں ہی نے مادی علوم کو ادراک حقیقت سے خارج کر دیا۔ اہل صفا تو محسوسات سے چمٹے ہی رہے۔ لیکن اہل شرع نے تو اس کی بھی مخالفت کی۔ ان تمام چیزوں سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ وحدت الوجودی بنیادی طور پر اگر ایک طرف مظاہر فطرت کی وحدت کے قائل تھے تو دوسری طرف کائناتی تخلیق کے مظاہر کی عالمی حیثیت کو مانتے تھے۔ سماج کے بارے میں ان کا یہ تصور نہ تھا کہ فرد نے کسی معاہدے کی بنا پر اپنے اختیارات سماج کو تفویض کیے ہیں بلکہ یہ کہ انسانوں کا سماج اسی طرح ایک عالم ہے جیسے نباتات یا جمادات کی دنیا ہے۔ ان کا سماجی تصور (Civil) نہیں بلکہ عالمانی ہے۔ اسی وجہ سے بنی نوع انسان کی وحدت کا تصور

اس کی شاعری میں بہت قوی ہے۔ غالب کا شعر ہے ؎

پیوندے کہ مردم شود ز انجمن   شود تازہ پیوند جانہا بہ تن

اسی تصور کے ماتحت ان میں انسان دوستی کا جذبہ بھی بہت شدید تھا۔ لیکن چونکہ وہ مادے کے ارتقا اور اس کے جدلیاتی عمل سے واقف نہ تھے۔ اس لیے سماجی ارتقا کو طبقاتی کشمکش میں نہ دیکھ سکے۔ یہ راز تو یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد ہی آشکارا ہوا۔ پھر ہم صوفیوں سے اس کی توقع کیونکر کر سکتے ہیں۔

بڑی ضمنی سی بات ہے۔ لیکن کہہ دینے میں حرج ہی کیا ہے۔ یورپ کو پہلی دفعہ گوئٹے نے آفاقی ادب کا تصور دیا ہے اور اسے اتفاق ہی سمجھئے کہ گوئٹے وحدت الوجودی بھی تھا۔ اس گوئٹے کے بارے میں اینگلز نے لکھا ہے کہ "گوئٹے خدا کے تصور کے ساتھ کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو یہ لفظ ہی کھلا دیتا تھا۔ وہ تو صرف انسانوں ہی کے ساتھ مانوس تھا۔ اس کی یہ انسان دوستی، ادب سے مذہب کو آزاد کر دینے کی کوشش۔ گوئٹے کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ اس اعتبار سے نہ تو ماضی کے بڑے سے بڑے مصنفین اور نہ شیکسپیئر ہی اس کا مد مقابل ہے۔" لیکن میں اسے اتفاق نہیں سمجھتا ہوں۔ کیونکہ فارسی اور اردو ادب میں تو صرف وحدت الوجودی صوفیوں ہی نے خدا کے تصور کو تسلیم کیا ہے۔ میں فیضی اور غالب کے اشعار پیش کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ بلکہ میں مولانا روم کا ایک شعر پیش کر رہا ہوں۔ جس کی مدد سے آپ کو وحدت الوجود کا فلسفہ ہی سمجھ میں آ جائے گا ؎

می گفت دریا بار بند دل دربود
صوفی خدا ندارد اُو نیست آفریدہ

یہاں مولانا نے صاف لفظوں میں وضاحت کر دی ہے کہ چونکہ مادے کا کوئی خالق نہیں ہے۔ اس لیے انسان کا بھی کوئی نہیں ہے۔ یہی منطق حلاج کو اناالحق کی طرف لے گئی۔ اور اسی منطق کے ماتحت کتنے صوفی شعراء خاکم بدہن کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں جاگیردارانہ نظام کے زمانے تک انسانی عظمت کے گیت اسی فلسفے کے ماتحت آ سکے ہیں۔ وہ تمام صوفی شعراء جنہوں نے شریعت کے ہاتھ بیعت کر لی ہے، وہ بھی انسان کی عظمت کے ایک حد تک قائل ہیں لیکن اس سے آگے قدم اٹھانا نہیں چاہتے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ ایک درمیانی راستہ اصلاح کا اختیار کیا ہے۔ جس حد تک علامہ اقبال حلاج کے فلسفے سے متاثر ہیں انسان کو حریم کبریا میں لا کر کھڑا بھی کیا ہے لیکن جس حد تک وہ امام غزالیؒ اور سرہندیؒ کے تصوف سے متاثر ہیں۔ مادی نقطۂ نگاہ سے انسانی عظمت کی نفی بھی کی ہے۔ توحید مطلق اور وحدت الوجود کے متضاد دھاروں کے ملانے ہی کی کوشش میں علامہ اقبالؒ نے خدائے تعالیٰ کو لامحدود اور محدود دونوں ہی بتایا ہے۔ اور یہی کوشش اجتہاد اور تقلید کے تضاد کو بھی قائم رکھتی ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ اجتہاد ترقی کے زمانہ میں کرنا چاہیے اور تقلید انحطاط کے زمانے میں۔ جب بھی کوئی رہنما انسانوں کو مقام کبریا بتا کر اسے مخلوق کا منصب بھی دے دیتا ہے تو وہ اسے بندۂ محکوم بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس پر مزید روشنی ڈالنے کے لیے میں لینن کی تحریر کا اقتباس پیش کر رہا ہوں: "حقیقت میں یہ خدا کا تصور نہ تھا جس نے بہیمانہ انفرادیت پرستی کو دبایا ہے۔ یہ کام ابتدائی جماعتی زندگی نے کیا ہے۔ خدا کے تصور نے تو ہمیشہ سماجی جذبے کو کمزور کیا ہے .... خدا کے تصور نے کبھی بھی فرد اور سماج کے رشتے کو مضبوط نہیں ہونے دیا۔ بلکہ مظلوم طبقے کو غلامی کی زنجیروں میں اس عقیدت کے ماتحت جکڑے رکھا کہ حکمراں طبقے پر خدا کا سایہ رہتا ہے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ لینن نے جو کچھ لکھا ہے مغرب کی تاریخ کو سامنے رکھ کر لکھا ہے لیکن یہ غلط بھی نہیں ہے۔ کہ ظلِ سبحانی کا تصور۔ تو ہمارے یہاں بھی کارفرما رہا ہے۔ اور یہ تصور توحیدِ مطلق ہی کا جزو بن سکتا ہے۔ وحدت الوجود میں تو اس کی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن توحیدِ مطلق کے فلسفے سے متاثر ہونے کے بعد تو صوفیوں کے یہاں بھی ولیوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا جو یا تو سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے یا پھر ظلِ اللہ کی مراعات کے محتاج تھے۔ جہاں تک مادی فلسفے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا تعلق ہے۔ توحیدِ مطلق اور وحدت الوجود دونوں ہی یکساں غلط ہیں۔ لیکن جاگیردارانہ نظام کی گذشتہ تاریخ میں توحید وجودی نے سیاسی مطلق العنانی تقلیدی کٹرپن اور ریاکاری کے خلاف جنگ کی ہم اسے نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ اس نے اس جہان میں اور اس حقیقت کے ساتھ محسوسات کی شدید شعری چاشنی، نوشی اور کام و دہن کی لذت کو ابتدائی دیتے اور شعر و ادب میں محسوسات کی تمام رعنائیوں کو سمو دیا ہے۔ اس سے منصوری بہت زیادہ تھی۔ انہیں نے وحدت کی کسی بھی چیز کو ممنوع قرار نہ دیا یہ دوسری بات ہے۔ کہ اس نے ہر چیز کو ایک پردہ بنا دیا لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ یہ پردہ کبھی اٹھایا نہ جا سکا۔ کیونکہ انسانی دماغ مادے سے ماورا تصورات کو ذہن میں لا ہی نہیں سکتا ہے۔ اگر شاعری میں کچھ لوگ حافظ کے دیوان کا مطالعہ حقیقت کے رنگ میں کرتے ہیں تو اس میں کس کا قصور ہے۔ اگر گوئٹے اور دوسرے نے حافظ کو صرف مجاز ہی کے رنگ میں دیکھا تو علامہ اقبال کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ کم از کم دنیا کے ایک حصہ پر فلاطونی تصوف کی روحانیت کا رنگ نہیں ہے لیکن وہ اس بات سے بھی خوش نہ تھے۔ وہ تو یہی چاہتے تھے کہ حافظ کا مطالعہ صرف مذہبی رنگ میں کیا جائے تاکہ یورپ مغرب اور ایشیائی مسلمان اس کی ابدالی ہنگام کی مخالفت کرے۔ درویش ہے ثنائی دنیا کی بات تو اس کی مخالفت تو کوئی بھی ایسا شخص نہیں کر سکتا ہے جو مادے کو مخلوق سمجھتا ہے۔ کیونکہ اگر مادہ مخلوق ہے تو اس کی ایک ابتدا ہے اور انتہا بھی۔ کم از کم اہلِ شرع کو تو ثنائی دنیا کا گلہ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ مسلمان صوفیوں میں تو یہ چیز توحیدِ مطلق ہی کے فلسفے کے باعث آئی۔ ورنہ وحدت الوجودی آواز تو ہمیشہ یہی رہی ہے کہ ہم سے پہلے نہ تو ابد ہے اور نہ ہمارے بعد ازل۔ حلاج

پھر یہ چیز صرف صوفیوں ہی کے ساتھ کیوں منسوب کر دی گئی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ہراقلیطس کے قول کے مطابق وحدت الوجودی بھی اس بات کو مانتے تھے کہ ہر چیز ہے اور نہیں ہے۔ یعنی ہر چیز ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے ؎

ہر قطعہ پہ چمن کے ٹک غور سے نظر کر بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنا ہے (میر)
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں (میر)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (غالب)

شاید اسی سبب سے بہت سے صوفیوں پر حلولی ہونے کا الزام بھی لگایا گیا لیکن ہراقلیطس کے اس نکتے کو سائنسی طور پر سمجھنے کے لیے نیچرل سائنس کی ضرورت تھی۔ جس سے ایشیا مدتوں تک محروم رہا۔ ناچار تغیر و حرکت کو فنا کے ساتھ ہم معنی کر دیا گیا۔ یہ تو صحیح ہے کہ ہر چیز فنا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ ایک نئی صورت میں بدلتی رہتی ہے تسلسل زندگی کو ہے نہ فنا کو۔ یہ نکتہ قیامت اور زمان و مکان کے ارضی و سماوی تقسیم نے بھلا دیا۔ صوفی شعرا بھی اس اختلاط کے شکار ہوئے۔ چنانچہ میر اور غالب دونوں ہی کے یہاں یہ حریف کارفرما ہوتا نظر آتا ہے۔ دونوں ہی بقا کے راز کو فراموش کر کے فنا کو مقدم کر دیتے ہیں ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا (غالب)
پھرتی ہے اپنے ساتھ لگی متصل فنا — آب رواں سے ہم ہوئے نابود ہر جگہ (میر)
مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک — میں نقش پا کی طرح پائمال اپنا ہوں "
مرنا ہے، خاک ہونا، ہو خاک اٹھتے پھرنا — اس راہ میں ابھی تو درپیش مرحلے ہیں "

بہرحال اس تعریف و تخریب کا جو کچھ سبب ہو اس قسم کے انفعالی فلسفے سے حافظ کے زمانے سے الی الآن ہر ایک صوفی شاعر متاثر ہوا ہے۔ اس قسم کے خیالات کی جتنی مخالفت کی جائے کم ہے۔ لیکن جب ایک مخصوص خیال کو پردہ بنا کر صوفی شعراء کی اچھی باتوں کی بھی مخالفت کی جاتی ہے تو پھر یا تو جہل کی موافقت مدنظر ہوتی ہے یا اپنے ذہنی رجحان کا تحفظ۔ مثال کے طور پر حافظ کا ایک شعر لیجئے۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرفست
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

اس شعر کے بارے میں اگر کوئی شخص اس قسم کی رائے دے کہ جب حافظ نے یہ شعر کہا تھا تو ترقی پسند تھا لیکن اب رجعت پسند ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اسے یا تو کلاسکی ادب کے جانچنے کی سائنس نہیں معلوم ہے یا پھر وہ لوگوں کو کلاسکی ادب سے متنفر کرنا چاہتا ہے۔ غلامی کے عہد سے لے کر سرمایہ دارانہ نظام تک طبقاتی شعور کے مختلف منازل رہے ہیں۔ اگر آج کے دور کی طبقاتی جنگ میں جس کا شعور بہت ہی صاف تیز اور تند ہے، ہم غلامی کے عہد یا جاگیردارانہ نظام کے ادب کو جانچنے کی کوشش کریں گے۔ تو وہ ہمیں یقیناً حقیر معلوم ہوں گے۔ ایسی صورت میں ان کی معنوی افادیت کو ابھار کر ان کے جمالیاتی حظ کو بھلانا خود اپنے ساتھ ظلم کرنے کے برابر ہے۔ کارل مارکس نے یونان کے اساطیری ادب اور شیکسپیئر کو اس نظریئے سے نہیں جانچا ہے۔ اور نہ یہ نظریہ ماضی کے ادب عالیہ کے بارے میں روس ہی میں رائج ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ڈکنس کے ناولوں میں انسان دوستی کا جذبہ طبقاتی جنگ کے تضاد پر غالب آ جاتا ہے۔ آپ ڈکنس کو طبقاتی سمجھوتہ باز کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے ڈکنس کی عظمت گھٹتی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کا ناول نگار تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ بورژوا انسان دوست کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی دوستی مظلوم طبقے کے ساتھ بہت ہی واضح ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ڈکنس کے ناولوں میں جمالیاتی حظ نہیں ہے تو انسان دوستی ہی کے جذبے کے ماتحت سہی ڈکنس روس میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ اب آپ ایک سیڑھی اور اتریئے۔ شیکسپیئر کا کوئی بھی ایسا ڈرامہ نہیں ہے جس میں اس نے اپنے ہیرو کو قدر کے ساتھ ہم نوا نہ کیا ہو۔ بہ لفظ دیگر اس کا کوئی بھی ہیرو تقدیر کی تخلیق میں غالب نظر نہیں آتا ہے۔ شیکسپیئر کے ہیرو سوویٹ روس کے ہیرو کے شعور کو بیدار نہیں کر سکتے ہیں۔ پھر بھی شیکسپیئر روس میں پڑھا جاتا ہے اور ڈکنس کے مقابلے میں زیادہ جمالیاتی حظ کے ساتھ۔ اب آپ ایک سیڑھی اس سے بھی نیچے اتریئے۔ یونان کا کلاسکی ادب جس کا کائناتی نقطہ نگاہ بالکل ہی مفقود ہے۔ آج کی دنیا میں کیا افادیت رکھتا ہے لیکن کارل مارکس ہر سال پڑھتا تھا۔ اور اسے انسانیت کے زمانہ طفلی کے حافظے کے نام سے یاد کرتا تھا۔ اسی ادب کے بارے میں کارل مارکس نے یہ کلاسکی جملہ بھی لکھا ہے۔

یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ یونان کے فنون و ادب اور اس کے ادوار مخصوص قسم کے سماجی ترقی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہاں یہ سمجھنے میں یقیناً دقت ہوتی ہے کہ وہ آج بھی کیوں جمالیاتی حظ کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اور بعض معنوں میں ایک ایسا معیار قائم کیے ہوئے ہیں جس کو

حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ یونان کے کلاسکی ادب کے بارے میں کارل مارکس نے اپنے خیالات کا اظہار کئی جگہ پر کیا ہے۔ ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ ماضی کے ادب عالیہ کے بارے میں کارل مارکس کا نقطہ نظر یہی تھا۔ چونکہ اس کی حقیقت بیں نگاہیں ایک دور کو دوسرے دور کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرتی تھیں اور چونکہ وہ سماجی شعور کے مختلف منازل سے بھی واقف تھا۔ اس لیئے وہ جمالیاتی حظ حاصل کرنے سے پرہیز بھی نہیں کرتا تھا۔ آخر ادب کا بھی تو ایک حسن ہے۔ جسے مارکس نے ابدی حسن کہہ کر یاد کیا ہے۔ یہ ابدی حسن بقول حافظ ہر شخص حاصل نہیں کر پاتا ہے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند   نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

اگر مارکس کا نظریہ صحیح ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حافظ کا شعر نہ صرف ماضی ہی میں ترقی پسند تھا بلکہ آج کی تاریخ میں بھی حسین ہے کیونکہ وہ جمالیاتی حظ کا سبب بنتا ہے۔ اور جب ہم حافظ کے اس شعر کو مثال کے طور پر پیش کریں تو ہمیں یہ نہ کہنا چاہیئے کہ دیکھو ایسا کہو گے تو رجعت پسند ہوگا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اگر یوں کہو گے تو حسین ہوگا۔ لیکن یہ بات انہیں کے لئے صحیح ہے جو ماضی میں ترقی پسند روایات کے حامل رہے ہیں۔ اور جنہوں نے پرانے کے خلاف جنگ کی ہے کیونکہ حسن ترقی کے ساتھ آمیز ہے۔

اب میں حافظ کا ایک دوسرا شعر پیش کرتا ہوں ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو   کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

یہ واقعی بڑا رجعت پسندانہ خیال ہے کہ جو معما حکمت سے نہ کھل سکے مے و مطرب کیونکر کھول سکتا ہے۔ غالباً یہی فلسفہ خیام کا بھی تھا۔ پھر بھی خیام نے ایرانی ادب میں مادی اور حسی فلسفے کو جنم دیا۔ لیکن میں خیام کا سہارا کیوں لوں۔

حافظ کے اس رجعت پسندانہ فلسفے کے بارے میں میرا جو آج ردعمل ہے وہ سائنس اور مادی علوم کی بڑھتی ہوئی روشنی کے باعث ہے جب کہ روز بروز معمے پہ معمے کھلتے جا رہے ہیں۔ کیا یہی بات حافظ کے وقت کے لیے صحیح تھی؟ اگر آپ حافظ کے وقت کا جائزہ لیں اور یہ بات تیرھویں صدی عیسوی کی ہے۔ جب کہ یورپ میں بھی اندھیرا تھا۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حافظ کے زمانے میں مادی علوم کی تعلیم ہی نہیں ہوتی تھی۔ مدرسوں میں صرف معقولات اور منقولات کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ معقولات کا دائرہ فلسفہ الٰہیات تھا اور منقولات کا دائرہ احادیث فلسفہ الٰہیات سے۔ مادی علوم کو بالکل ہی خارج کر دیا گیا تھا۔ مادی علوم کے خلاف یہ جنگ تین سو سال پہلے سے جاری تھی۔ اس کی ابتدا معتصم باللہ کے زمانے سے ہوتی ہے جب کہ مادیین (لطف یہ ہے کہ اس وقت وحدت الوجودیوں کو بھی مادیین میں شمار کیا جاتا تھا) کو تہ تیغ کر دیا اور تمام مادی علوم کی تعلیم پر پابندی لگا دی گئی۔ اس وقت سے ایران مادی علوم سے دور ہوتا گیا۔ حافظ کے وقت میں تو خالصتاً فقہی تعلیم رہ گئی تھی۔ ایسے ماحول میں اگر حافظ نے فقہی حکمت کی موافقت کی تو کیا قصور کیا۔

یہاں جب حافظ حکمت کے خلاف ردعمل کرکے مطرب و مے کی طرف بڑھتا ہے تو اس کا اشارہ صرف محسوسات کی طرف ہے اور محسوسات علوم کے اولین زینے ہیں۔ انہیں معنوں میں خیام اور حافظ نے حسی فلسفے کو ایرانی ادب میں داخل کیا ہے۔ یہ ایرانی پیغمبر کی بازگشت تھی جو بالکل ایک مادی فلسفہ تھا ؎

گرمی گوید کہ ہست عالم نیست رب (رومی)

مادیت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لیے پہلے اپنے حواس کی قوتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ مادی علوم الٰہیاتی منطق کی کوکھ

سے نہیں پیدا ہوتا ہے۔ یونان کا مادی فلسفہ یونان کی پیگنزم سے پیدا ہوا۔ یورپ میں بھی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے زمانے میں فکر طبقے اور ادیبوں نے پیگنزم سے بے تکان عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ مادی زندگی کی مسرتوں کو ابھارے بغیر مادیت کا نظریہ مستحکم بھی نہیں ہوتا ہے۔

حافظ کے سامنے مادی علوم نہ تھے۔ وہ خود امام غزالی کے ہاتھوں بیعت کر چکے تھے۔ پھر بھی ان کی شاعری میں ایرانی پیگنزم حقیقت نگاری کے روپ میں ابھرا ہے۔ مادی حقیقت نگاری تو حقیقت نگاری کے بغیر وجود میں نہیں آتی ہے۔ حافظ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے الہیاتی منطق کے دشمنانہ طریق استدلال کے خلاف بغاوت کر کے تیز اظہار حقیقت سے ایرانی ادب کو مالا مال کر دیا۔ کیا یہ نظریہ رجعت پسندانہ ہے؟

اس موقعہ پر میرے سامنے علامہ اقبال کے وہ اشعار بھی ہیں جو انہوں نے کبھی حافظ کے بارے میں کہے تھے۔ مجھے موصوف کی اس تنقید سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں تک حافظ کے فلاطونی گوسفند ہونے کا تعلق ہے، ہر وہ شخص فلاطونی گوسفند ہے جو مادے کو غیر حقیقی سمجھتا ہے۔ پھر یہ کون کہتا ہے کہ حافظ "صہبا" کے اور زہر اجل دلوں میں لے ڈالتی ہے۔ کیوں ایک سے نظریے کا اظہار کیا جاتا ہے اور دوسرے کو الزام بنایا جاتا ہے کیا اس خیال سے کہ حافظ زیادہ ایرانی اور رنگین ہے۔ تیسری بات اور بھی پیچیدہ نظر آتی ہے۔ علامہ اقبال عرفی کی تتبع کے لیے ہدایت کرتے ہیں اور عرفی حافظ کی شاعری پر اپنا ایمان رکھتا ہے ؎

گر ندادی ہوس داری دُر ریزی سخن   بندگی حافظ شیراز می بایست کرد   (عرفی)

ان تمام باتوں میں علامہ اقبال نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے۔ وہ ہے حافظ کی جادو بیانی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں اس کا حاصل کرنا مشکل ہے اس کی نغمہ ناکی بھی ہے۔ وہ آہنگ ان لفظوں کو حسن نگاری سے رنگتی ہے۔ انہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن جمالیات کو صورت نظر کر دینا ہی شاعری نہیں ہے۔ شاعری ایک تخلیقی عمل ہے جو قدرت و ذہن کے باہمی طریق عمل سے ابھرتا ہے۔

پھر یہ عجیب سی بات ہے کہ کچھ لوگ حافظ سے اس قدر متعصب ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کے خلاف ہر بات رجعت پسندی ہو تو وہ حافظ کا تذکرہ کرتے ہیں شاید اس لیے کہ ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

اب دیکھنا ہے کہ ان غلطیوں کا بنیادی سبب کیا ہے جو ترقی پسند نقادوں سے سرزد ہوتی ہیں۔ پہلی غلطی تو مختلف ادوار کے تاریخی ارتقا کے سمجھنے میں ہوتی ہے۔ مذہب کا تاریخی ارتقا اور اس کا طبقاتی شعور الگ الگ تاریخی ارتقا اور طبقاتی شعور سے الگ نہیں۔ ہم صرف میکانکی طور پر ترقی پسندی لاگو نہیں کر سکتے۔ ہم تمام تاریخ کے مختلف ادوار کو اس طرح خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں کہ گویا ایک کا تعلق دوسرے دور سے تھا ہی نہیں۔ اکثر اوقات ہم میکانکی طور پر غلام تہذیب کی پیٹھ پر جاگیردارانہ نظام اور اس کی پیٹھ پر سرمایہ دارانہ نظام کی اینٹ چنتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اور ان تینوں دور کو ایک معنی میں ایک عہد (epoch) سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ذرائع پیداوار اور تہذیب کے مادی وسائل کے بڑھنے اور ترقی کرنے کا تعلق ہے ایک دور کو دوسرے پر برتری حاصل ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ غلام کے مقابلے میں جاگیرداری مزدور اور جاگیرداری مزدور کے مقابلے میں مل مزدور کی آزادی نسبتاً آگے بڑھتی رہی ہے لیکن ذرائع پیداوار پر ایک مخصوص طبقے کے قدرت حاصل کر لینے سے غلامی کا دور ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ طبقہ استحصال کی بنیادوں کو ختم نہ کر دے۔ یہی سبب ہے کہ مارکس نے ان تینوں ادوار کو ایک عہد (EPOCH) کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ پورا عہد غلامی کا عہد ہے۔ اس میں استحصال کی شکلیں

تو صورت بدلتی رہی ہیں لیکن استحصال ختم نہیں ہوا ہے۔ انہی معنوں میں اشتراکی انقلاب اپنے ماسبق کے انقلابات سے بہت مختلف ہے یہ فرق ایک بنیادی تبدیلی کا ہے۔ اشتراکی انقلاب کی یہ بنیادی خصوصیت اس طبقاتی شعور کا نتیجہ ہے جسے بورژوا نظام نے بہت ہی تیز کر دیا ہے۔ آج بورژوا نظام کے طبقاتی شعور میں جو تیزی اور تندی ہے اگر اس کی بنیاد پر آپ جاگیردارانہ نظام کے طبقاتی شعور کو جانچنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو بڑی ناکامی ہوگی۔ لیکن اس سے یہ معنے نہیں کہ جاگیردارانہ نظام میں طبقاتی جنگ یا طبقاتی شعور نہ تھا۔ اس سے صرف اتنا مراد ہے کہ اس وقت طبقاتی شعور اتنا آگے بڑھا ہوا نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔ کیونکہ اس وقت تک لوٹنے والے اور لوٹے جانے والے طبقوں کا تضاد اتنا ابھر نہیں پایا تھا۔ جاگیردارانہ نظام کے بہت سے دبے ہوئے تضاد کو سرمایہ دارانہ نظام نے ابھارا ہے اور بہت سے اس نظام کے دبے ہوئے تضاد کو اشتراکی نظام نے سمجھا ہے۔ میں وضاحت کے لیے ہندوستان کی تاریخ سے ایک مثال دینا چاہتا ہوں انگریزوں کے آنے سے پہلے دیہات کی زمینوں پر کسانوں کا قبضہ تھا۔ بظاہر زمین کی پیداوار پر تصرف انہیں کا ہوتا تھا۔ لیکن وہ اپنی محنت سے جو کچھ پیدا کرتے وہ نہیں اٹھا پاتے تھے۔ کیونکہ پیداوار کا ایک تہائی یا چوتھائی حصہ وہ جاگیردار کو بھی دیتے تھے۔ یہاں چونکہ ذرائع پیداوار پر براہ راست تصرف جاگیردار کا نہ تھا۔ اس لیے جاگیرداروں اور کسانوں کا طبقاتی تصادم بھی اتنا شدید نہ تھا جتنا کہ انگریزی راج میں ہوا۔ انگریزوں کے آنے سے یہاں کے طبقاتی تعلقات میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ انگریزوں نے دیہات کی جماعتی زندگی کو تباہ کرکے زمینیں محصول جمع کرنے والے طبقے یعنی زمینداروں کو دے دیں۔ اب ذرائع پیداوار پر براہ راست تصرف زمینداروں کا ہے۔ کیونکہ وہ انہیں بے دخل بھی کر سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج ان کی زندگی اتنی تلخ ہوتی ہے اور ان کا طبقاتی شعور بہت بیدار ہے۔ آج کی ایسی شعوری آگہی جاگیردارانہ نظام میں نہ تھی۔ لیکن طبقاتی کشمکش تو تھی ہی۔ یہ بات صحیح ہے لیکن اس کشمکش کا اظہار شاہی سیاست میں ہوتا ہے۔ اینگلز لکھتا ہے کہ تمام انقلابی عناصر جو جاگیردارانہ نظام کی تہوں میں اٹھتے تھے وہ سب کے سب شاہی طاقت کی طرف راجع ہونے لگے۔ اور آخر الذکر ان کی طرف راجع ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں جب ہم جاگیردارانہ نظام کی سیاست اور طبقاتی شعور کا پتہ چلانے کی کوشش کریں تو ہمیں بادشاہوں کی سیاست کو نظرانداز نہ کر دینا چاہیئے۔ یہ راستہ کافی مشکل ہے یہاں سرکھپانے کی ضرورت پڑتی ہے ہمیں جلد بازی میں کسی بھی استحصالی طبقے کے مفکر کی تنقید قبول نہ کرنی چاہیے کیونکہ وہ اپنے مخالف طبقے کی پول کھولنے میں تو بہت حد تک کامیاب رہتا ہے۔ لیکن وہ حقیقت کی تہوں تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔ اس کا استحصالی رجحان حقیقت تک پہنچنے میں ایک پردہ بن جاتا ہے۔ خیر یہ ایک ضمنی بات ہوئی ورنہ ستم ظریفی تو اس وقت شروع ہوتی ہے جب کہ میر اور غالب کی شاعری میں کسانوں کی بغاوت اور پلاسی کی جنگ کا تذکرہ نہیں ملتا ہے تو انہیں رجعت پرست کہہ کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ میکانکی تصور ہمیں دوسری قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی ہم اشتراکی اور فیوڈل نظام کو دو سطحوں میں رکھ کر موازنہ کرنے لگتے ہیں اور جب فیوڈل کا پلہ ہلکا نظر آتا ہے تو پھر ماضی کی حسین روایات پر بھی حقارت کی نظر ڈالنے لگتے ہیں۔

ماضی کی حسین روایات کو حقارت سے دیکھنے کا یہ جذبہ اصل میں تاریخ کو مٹانے کا جذبہ ہے۔ وہ تاریخ کو وہی مٹاتا ہے۔ جس میں کچھ احساس کمتری ہوتا ہے۔ وہ تمام ادیب اور شعراء جو اپنے فن کو اس حد تک چمکا نہیں سکے ہیں کہ اپنے کلام میں بھی ایک ادبی حسن پیدا کر سکیں۔ ماضی کی حسین روایات کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ادبی حسن کا واہمہ ہی ختم ہو جائے۔ پھر تو ناقص کے لیے میدان خالی رہ جاتا ہے۔

یہ ابدی حسن صرف یونان کے کلاسکی ادب ہی کے بارے میں صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ہر دور کی بہترین ادبی تخلیقات کے بارے میں صحیح ہے۔ ہر دور کے ادب کا نہ صرف مواد ہی بدلا ہوا ہے، بلکہ ہیئت بھی بدلی ہوئی ہے پھر بھی ان کے باہمی امتزاج سے جو حسن پیدا ہوا ہے وہ سب کو نصیب نہیں ہوا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو ماننا پڑے گا۔ اور اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے ہمیں ادب کے مقتضیات کا پتہ چلانا ہے۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ ادب مخصوص قدروں اور خیالات کی تبلیغ کرتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تبلیغ کا اثر وقتی ہے یا دیرپا۔ وہ ہمارے جذبات اور خیالات کو متحرک کرکے ایک دیرپا عمل کی تعمیر کرتا ہے۔ یا صرف وقتی جوش میں لاکر چھوڑ دیتا ہے وہ ہمارے احساسات اور نفسیات کی جوابی صلاحیتوں کو چھوتا ہے کہ نہیں۔ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ نہیں کہ وہ ہماری نفسیات پر اثر انداز ہوکر ہمیں حالات کے برتنے اور خود اپنے کو بدلنے میں مدد کرسکے۔ اور ہماری نفسیات کو نئی قدروں سے ہم نوا کرکے ایک نئی جذباتی تنظیم بھی کرسکے۔ اگر یہ قوت اور صلاحیت کسی شاعر کے کلام میں نہیں ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ قصور ماضی کی حسین روایات کا نہیں ہے یہ اس کا اپنا عجز ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو ایسے زندہ اور متحرک سانچوں میں ڈھال سکے جن کی بازآوری سے ہمارے اندر حیات نو پیدا ہوجائے۔ مشاہدے اور تجربے کی بند کلیاں کھلنے لگیں اور قدم قدم پر صداقت کی داد دیتی جائیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم عوام کو نئے خیال اور نئے معرکے کی طرف اکسا سکتے ہیں۔ یہ اکساہٹ اسی وقت دیرپا ہوسکتی ہے جب کہ وہ شاعر کے مشاہدے اور سچائی کو اپنے ذاتی تجربے کی سطح پر محسوس نہ کریں اور انہیں لفظوں، تشبیہوں اور تصویروں کے ذریعے محسوس نہ کریں جن سے ان کے حواس آشنا ہیں۔ یہاں ہمیں عوامی ادب اور ماضی کی روایات سے بہت سی چیزیں مستعار لینی پڑیں گی۔ یہ کام چیخنے اور چنگھاڑنے سے زیادہ چبھنے اور تپانے کا ہے۔ تقریر کا کام وقتی ہوتا ہے۔ لیکن ادبی شہ پارے کا اثر دیرپا ہوتا ہے وہ انسانی ذہن میں رینگتے رہتے ہیں۔ ہمیں بار بار اکساتے اور اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ترغیب عمل میں ایک ایسی پائداری ہوتی ہے جو کوہ گراں کا بھی مقابلہ کرسکتی ہے۔ یہ ایسا ہی ادب پھانسی پر جھولنے کا حوصلہ بھی بخشتا ہے۔ یہ مرتبہ تقریر کو حاصل نہیں ہوا کرتا ہے۔ شعر و ادب کی تخلیق تصورات کی بازآوری نہیں بلکہ از سر نو تخلیق کرنے کا کام ہے۔ اس پورے طریقے کے مادی اسباب ہیں جنہیں تفصیلات میں بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ انہیں معنوں میں یہ معجزہ بھی نہیں ہے۔ اس طریق کار کے سمجھنے میں مشاہیر علم و ادب کے کلام کا مطالعہ بہت ہی مدد کرتا ہے۔ گورکی کا ادب فلابیر کے ادب سے بنیادی طور پر مختلف ہے تاہم اس نے فلابیر سے لکھنا سیکھا۔ چیخوف کا فن کسی حد تک حزن و یاس اور افسردگی کے جذبات کا حامل ہے۔ پھر بھی گورکی کو یہ کہنا پڑا کہ میں جب تمہارے فن سے اپنے فن کا مقابلہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں قلم سے نہیں بلکہ بانس سے لکھ رہا ہوں۔

یہ ایسی مثالیں ہیں جو شعر و ادب کی تخلیق میں سنگ میل بن سکتی ہیں۔ اور اگر انسان محنت کرتا ہے تو وہ اپنے فن کو مانجھ بھی سکتا ہے۔ پھر بھی وہ صرف اسی راستے سے صحیح ادبی تخلیق تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اسے عوام کی زندگی سے سبق سیکھنا پڑتا ہے اور جب وہ یہ کام زندگی کے کسی انقلابی موڑ پر انجام دیتا ہے تو اسے ماضی کی روایات کو بھی جگانا پڑتا ہے۔ وہ ماضی سے نعرے، نام اور ملبوس سب قرض لیتا ہے تاکہ وہ نئی حقیقت کو عوام کے محبوب ملبوس میں پیش کرسکے۔ آج کا انقلابی شاعر جس حد تک اس حقیقت سے دور ہوتا جائے گا عوام سے بھی دور ہوتا جائے گا۔

اچھا شعر کہنا خون جگر اگلنے کے برابر ہے اپنی ناکامی پر اور زیادہ محنت کرنی چاہیئے نہ کہ لوگوں کو حسن کے معیار ہی سے برگشتہ کردینے کی کوشش کرنی چاہیئے

فراق کے خطوط

بنام محمد طفیل ایڈیٹر نقوش

(۱)

۸/۴ بنک روڈ۔ الہ آباد
۱۴ فروری ۱۹۵۳ء

برادرم طفیل صاحب۔ تسلیم۔

ایک مدت ہوگئی جب آپ کا محبت نامہ ملا تھا۔ میری بد توفیقی دیکھیے کہ اندازاً چار ماہ بعد جواب لکھنے بیٹھا ہوں، ادھر کئی برسوں سے میرے لیے بڑی مصیبت یہ ہوگئی ہے کہ میرے پاس جتنی بھاری ڈاک آتی ہے اس کا جواب دینا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ کے خطوط تو میرے دل و دماغ میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن بہت سے خطوط ایسے بھی آتے ہیں جن میں احباب خلوص و محبت کی باتیں تو لکھتے ہیں لیکن جنھیں پڑھ کر گویا تھکاوٹ سی محسوس کرتا ہوں۔ شہرت میرے لیے ایک مصیبت ہوگئی ہے۔ پھر میری حیثیتیں بھی کئی ہیں۔ اردو، ہندی، انگریزی تمام حلقوں سے نظموں، غزلوں، نثر کے مضامین، پیغامات، صلاح مشورے کی مانگیں آتی رہتی ہیں جو ذہن میں ایک پراگندگی اور انتشار پیدا کر دیتی ہیں۔ پھر لکچروں اور تقریروں کی بھی مانگیں آتی رہتی ہیں اور ان سب پر مستزاد انگریزی ادب کے کار منصبی کی ذمہ داریاں، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے لیے میری ڈاک صرف امیدوں کی حامل نہیں ہوتی بلکہ امیڈیم کی حامل ہوتی ہے۔ صحت کی خرابی، نیم خوابی، سودائی مزاج کی وجہ سے طبیعت کا انتشار، گھٹن اور گھبراہٹ، جسم کی مستقل تھکن، ہاتھ میں رعشہ آجانے کی وجہ سے لکھنے سے معذوری، ان تمام بلاؤں میں مبتلا ہوں، بہرحال کام میں لگے جا رہا ہوں اور ہانپ ہانپ کر ایک ادیب کے فرائض جیسے تیسے پورے کرتا جا رہا ہوں عمر بھی ساٹھ کے لگ بھگ ہے (تاریخ پیدائش، ۲۸ر اگست ۱۸۹۶ء) پھر بھی اپنے شعور کو کچھ ایسی تربیت دے سکا ہوں کہ داخلی سکون کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اس امر کا خیال رکھتا ہوں کہ جو جو طوفان اٹھتے رہیں وہ میری شخصیت کی سطحوں پر اگر ہلچل مچا دیں تو بھی میرے شعور کی گہرائیاں اپنا سکون و توازن قائم رکھیں۔

آپ نے ایک سانس میں کئی باتیں کہہ دی ہیں۔ لیکن میں سانس لے لے کر بھی سب باتیں کہنا چاہوں تو بھی آپ کی ساری باتوں کا جواب مشکل ہے۔ بہرحال آپ سے کچھ کہے بغیر جان چھڑانا بھی مشکل ہے۔ اس لیے آج یہ عرض کیے دیتا ہوں۔ کہ "مجھے شعر کہنے کے لیے

کسی خاص ماحول یا موڈ کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں ؟

بظاہر میری زندگی کا خارجی ماحول دوسروں کی زندگی کے خارجی ماحول سے زیادہ مختلف نہیں۔ میرا تعلق وسطی طبقے سے ہے اور اس طبقے کی عام خصوصیتیں اپنی زندگی میں بھی پاتا ہوں۔ اس طبقے کی اچھی بری باتیں خوبیاں اور کمزوریاں اپنی زندگی میں بھی پاتا ہوں۔ اس کے باوجود اپنی ایک انفرادی شخصیت بھی رکھتا ہوں جس کے نمایاں خدوخال ہیں۔ وہ مجھ کو اپنے ہم جنسوں سے متمائز کرتی ہے بچپن ہی سے میں اپنے بھائی بہنوں سے، اپنے کو بہت مختلف پاتا تھا۔ مثلاً میں ان سب سے زیادہ جذباتی تھا۔ اور نفرت کی غیر معمولی شدت میں اپنے اندر پاتا تھا۔ نامانوس چیزیں بھی مجھے حد درجہ مانوس اور حد درجہ عجیب محسوس ہوتی تھیں۔ مناظر قدرت سے میں اتنا متاثر ہوتا تھا کہ میں ان میں کھو جایا کرتا تھا۔ میرے بچپن کی دوستیاں بھی بہت شدید قسم کی ہوتی تھیں۔ بچپن کے کھیل اور کھلونوں سے بھی اتنی زبردست لگاوٹ محسوس کرتا تھا۔ کہ گھر والے تعجب کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی میرا مذاق اڑاتے تھے۔ میری دادی کا بیان ہے کہ دو تین برس کی عمر ہی سے میں کسی بدصورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کرتا تھا۔ بلکہ یہاں تک شور کرتا تھا کہ ایسے لوگ قریب نہ آنے پائیں۔ اس کی خوب ہنسی اڑتی تھی۔ اور کبھی کبھی اس کے سبب مجھے پیٹا بھی جاتا تھا۔ نو دس برس کی عمر ہی سے حسین لڑکی یا لڑکے، مرد یا عورت کو چپکے چپکے دیر دیر تک خوبصورت تصویروں کی طرح سے دیکھ کر ایک عجیب سرور محسوس ہوتا تھا۔ یہ میرا جسم ہے یا روح؟ یہ بات کھل کر رہ جاتی کہ شعوری ہو۔ یہ احساس حسن سے شگفتہ ہونے والی جنسیت میرے اندر سن بلوغ سے کافی پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں اچھائی، خلوص اور شرافت کی قدریں بھی مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کرتی تھیں۔ بعض گیتوں کہانیوں اور واقعات میں ان قدروں کی جھلک دکھائی دے جاتی تو اس سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ اگرچہ میرا گھر ایک بھرا ہوا گھر تھا اور محبت گھر کے سب سے ملتی تھی۔ پھر بھی بچپن ہی سے اپنے اندر ایک احساس تنہائی پاتا تھا۔ لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دوں کہ بچپن میں جو ابتدائی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں ان کے حسن اسلوب سے میں بہت متاثر ہوتا تھا۔ اور بد اسلوبی سے بدمزہ ہوتا تھا۔ اس طرح زندگی کے سترہ اٹھارہ سال کٹ گئے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنا چاہتا تھا لیکن جیسا پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری زندگی جذبات سے اتنی بھرپور تھی کہ اس کے ہیجانات اور جذبات کے لیے الفاظ نہیں ملتے تھے۔ وہ شعر گوئی کی خواہش گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھی۔ یہ گھٹن میرے لیے بسا اوقات مصیبت بن جاتی تھی۔ اتفاقاً اٹھارہ برس کی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میری بیوی کی صورت شکل وہی تھی بلکہ اس سے بھی کچھ کمتر جو ان لوگوں کی تھی جن کی گود میں جانے سے میں دو تین برس کی عمر میں ہی انکار کر دیا کرتا تھا۔ اور زندگی کی دوسری صلاحیتیں بھی ان پڑھ انسانوں سے کچھ بہتر نہ تھیں۔ میری شادی نے میری زندگی کو ایک زندہ موت بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کے عذاب ہو جانے کے باوجود میں نے خودکشی نہیں کی، نہ پاگل ہوا اور نہ جرائم پیشہ بنا، نہ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوا۔ اس لیے کہ شدید حسن پرستی کے باوجود زندگی کی شرافت کی جو قدریں مان چکا تھا۔ ان کا میں نے سہارا لیا۔ فرض شناسی نے مجھے برباد ہونے سے بچا لیا۔ یہ ضرور ہوا کہ سال بھر تک مسلسل نیند نہیں آئی اور صحت مستقل طور پر برباد ہو گئی۔ پھر بھی چونکہ علم دوستی کا جوہر بھی مجھ میں تھا۔ اس لیے کالج اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں بہت اونچی پوزیشن میں لاتا رہا۔ بی اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی میرے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت گورکھپوری جو شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے انتقال فرما گئے اور ایک بڑی گرہستی کے تمام مسائل میرے سر پر آ گئے۔ پی۔ سی۔ ایس اور آئی۔ سی۔ ایس دونوں کے لیے میرا انتخاب ہو چکا تھا۔ لیکن بد دلی اور بے دماغی نے مجھے اتنا اداس بنا دیا تھا۔ کہ میں

دونوں سے مستعفی ہو گیا۔ ان تکلیف دہ اور کرب آگیں حالات میں میں نے شاعری شروع کی اور بہت آہستہ آہستہ میں اپنی آواز کو پانے لگا میرا داخلی موڈ اور خارجی ماحول تو بچپن ہی میں بن گئے تھے۔ اب جب شاعری شروع کی تو میری یہ کوشش ہوئی کہ اپنی ناکامیوں اور اپنے زخمی خلوص کے لیے اشعار کے ذریعے سے مرہم تیار کروں۔ میری زندگی جتنی تلخ ہو چکی تھی اتنے ہی پُر سکون اور حیات افزا اشعار کہنا چاہتا تھا بلکہ یوں کہوں کہ تلخی کو شیرینی میں بدل دینا چاہتا تھا۔ عام طور پر رات گئے اشعار کہنا شروع کرتا تھا۔ اور غزل رات رہے ختم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے اُدھر پو پھوٹی اور اِدھر غزل کا مقطع ہوا۔

اُجلے اُجلے سے کفن میں سحرِ شامِ فراق
ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات کی کیفیتیں اور رات کی رمزیت جس طرح میرے اشعار میں فضا باندھتی ہیں وہ چیز کہیں اور نہیں ملے گی۔ میرے کلام کا ایک حصہ ایسا ہے جس کی بنا پر مجھے شاعرِ نیم شبی کہا جا سکتا ہے۔ مندرجہ بالا شعر کہنے کے پچیس برس بعد میں نے یہ رباعی کہی۔

دن ڈوب گیا تو بات کچھ اور بھی ہے
آنکھ اوجھل واردات کچھ اور بھی ہے
خاموشی و تیرگی و خنکی کے سوا
اے انجم و ماہ، رات کچھ اور بھی ہے

آدھی رات اور جھلکیاں' کے عنوان سے میری دو نظمیں رات کی ترجمانی اور مصوری کی مثالیں ہیں۔ اُن کے علاوہ میرے پورے کلام میں رات سے متعلق صدہا اشعار اور رباعیاں بکھری ہوئی ملیں گی۔ یہ خط اپنے اس مقطع کے ساتھ ختم کرتا ہوں ؎

فراقؔ دیکھ شبِ غم گدازِ قلبِ نجوم
چھڑا ہوا ہے سکوتِ ابد کا افسانہ

کچھ اور اشعار یاد آ گئے ؎

تاریکیاں چمک گئیں آوازِ درد سے   میری غزل سے رات کی زلفیں سنور گئیں

چھڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے   آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے

جب سازِ غزل کو چھوتا ہوں راتیں لَو دینے لگتی ہیں   ظلمات کے سینے میں ہمدم میں روز چراغاں کرتا ہوں

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے   اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

اچھا اب رخصت چاہتا ہوں۔ لیکن رخصتی سے پہلے اتنا پوچھنا چاہتا ہوں، کہ ایکا ایکی آپ کو میرے بچپن اور میری ذات سے اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ اگر ان باتوں کا صاف صاف جواب دیجئے گا، تو میں بھی صاف گوئی پہ بہ آسانی اُتر آؤں گا۔

ایک بولتی ہوئی غزل حاضر ہے۔ اپنی رائے سے مزدور اور جلد مطلع فرمایئے گا۔ اس لیے کہ شاعر ہر وقت داد کا محتاج ہے، اور مجھے تو میرے فن نے باقی شعراء سے کچھ زیادہ ہی بھوکا بنا دیا ہے۔

آپ کا

فراق

مکرر۔ میری صحت اب کسی طرح سنبھل نہیں سکتی۔ اگر کچھ دن جیتا بھی رہا تو اسی فکر میں جینا ہوگا کہ اپنا مجموعۂ کلام اور دیگر تصانیف کسی ایسے ناشر کو سونپ دوں جو میرے اس حاصل زندگی کو ضائع اور ناپید نہ ہونے دے

---

(۲)

۴ ہیسٹنگس روڈ۔ الہ آباد

۲۲ر فروری ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم

کبھی تو آپ بھی میری طرح ڈوب جاتے ہیں اور میں جواب کی راہ تکتا رہتا ہوں۔ لیکن اب کے آپ نے بڑی جلدی جواب دیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پہلے ہی سے جواب لکھ رکھا تھا۔ غزل کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ! البتہ مجھے آپ کی یہ بات بہت کھٹکی۔ کہ ایک شعر وزن میں نہیں۔ علامہ آثر لکھنوی صاحب! اُسے ایک بار پھر پڑھیئے، نہ تو اس شعر کو کاٹیئے گا اور نہ ہی خود ترمیم کیجئے گا۔ مجھے وہ شعر لکھ بھیجئے۔ میں خود اس کی نبض دیکھ لوں گا۔ آپ نے پہلے تو غزل کی بڑی تعریف کی۔ اور میں بڑا خوش ہوا کہ میرے کلام کو میری ہی طرح اور بھی عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن مقطع میں سخن گسترانہ بات سے نہ ٹلے۔

آپ میرے حالاتِ زندگی سے واقف ہونا چاہتے ہیں، تو میں بھی یہ کوشش کروں گا کہ آپ کی باتوں کا جواب لکھتا رہوں۔ اور اس طرح چار مہینوں کا سکوت اکٹھا توڑ دوں۔

میری زندگی کے داخلی اور خارجی ماحول پر زیادہ نہ سہی کچھ روشنی تو میرے پہلے خط سے پڑی ہوگی۔ اس خط میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ کن محرکات و مقاصد کے زیر اثر میں شعر کہتا رہا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ ازدواجی زندگی کے عذاب ہو جانے کے بعد کیا میری کوئی عشقیہ زندگی بھی رہی ہے۔ اور اس کا میری شاعری پر کیا اثر رہا ہے ـــ میں شاعری کا ایک مقصد یہ بھی سمجھتا ہوں۔ کہ زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار حالات و تجربات کا ایک سچا جمالیاتی احساس حاصل کیا جائے۔ زندگی کا ایک وجدانی شعور حاصل کرنا،

وہ آسودگی اور طمانیت عطا کرتا ہے جس کے بغیر زندگی کے دُکھ سُکھ دونوں نامکمل رہتے ہیں۔ یہی احساس میرے محرکاتِ شعری رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قوم کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ اور اس کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس کی اجتماعی زندگی کی کچھ بلند قدریں ہوتی ہیں۔ پھر تمام انسانیت کی زندگی بھی تاریخ ہوتی ہے۔ اور اس زندگی کی کچھ ارتقائی قدریں ہوتی ہیں۔ قومی زندگی اور عالم گیر زندگی کی ان قدروں اور ہندوستان کے کلچر کے مزاج کو اپنی شاعری میں سمونا ملکی اور عالمی زندگی کے پاکیزہ محرکات کو گویائی عطا کرنا ہی میرا مقصد شاعری رہا ہے۔ اُردو شاعری میں بہت سے محاسن کے باوصف بہت سی بلند چیزوں اور قدروں کی کمی رہی ہے۔ دو مثالیں لوں گا۔ حالیؔ اور اقبالؔ کی۔ حالیؔ کا دل بہت نرم ہے۔ نیکی اور شرافت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لیکن گہرا یا بلند تفکر یا فلسفیانہ دماغ اُن کے یہاں نہیں ہے۔ یہ چیزیں اقبالؔ کے یہاں بدرجۂ اتم ملتی ہیں۔ لیکن بدنصیبی سے ایک جنگجوئی کا جذبہ بھی اُن کے یہاں ملتا ہے۔ اور طاقت یا قوت خواہ کسی طرح کی بھی ہو اس کے لیے ایک اندھی پرستش بھی اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ جنگیں جیتنے، ملکوں کو فتح کرنے اور ان پر اسلامی حکومتیں قائم کر دینے کو اقبال بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ایک سنگین کرختگی مزاج کا اثر اُن کا کلام پڑھ کر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسلامی ملت کے تصور کی زنجیروں میں اُن کی شاعری جکڑی ہوئی ہے۔ شاعری میں میری کوشش بہت دنوں تک تو سماجی یا سیاسی یا وطنی موضوعات سے الگ رہی اور کافی دنوں تک تو اپنی شاعری میں حسن و عشق ہی کے جادو جگاتا رہا اور اس کی کوشش کرتا رہا کہ جنسیت کو کمزور کیے بغیر اور افلاطونی محبت یا عشقِ حقیقی سے قطع نظر کر کے جنسیت کو زیادہ سے زیادہ رچا سکوں۔ اور اسے رس جس سے مالا مال کر سکوں۔ عشق کے غم و نشاط اور حسن کے تصور کی تہذیب و تالیف شروع ہی سے میری کوشش تھی۔ عشقیہ شاعری کو سطحیت، تلخی، خشکی، خشونت، مغائرت اور چھچھورے پن سے بچانا۔ اور اس میں زندگی کی اعلیٰ ترین قدریں سمونا یہی میری کوشش رہی ہے۔ مغربی ادب خصوصاً ورڈسورتھ کی شاعری اور انگریزی ادب کے دیگر اکابر و مشاہیر کے کارنامے۔ سنسکرت ادب کے کارنامے۔ فارسی ادب کے کارنامے۔ مجھے برابر متاثر کرتے رہے ہیں۔ میری اُردو شاعری جذبات و خیالات کے معاملے میں اور معیار شاعری کے معاملے میں جتنی غیر اُردو ادب سے متاثر رہی ہے۔ اتنا اُردو شاعری سے متاثر نہیں رہی۔ البتہ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے۔ میں اُردو شاعری کے مشاہیر سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ پھر بھی اپنی اُردو کو اپنے وجدان کے سانچے میں ڈھالتا رہا ہوں۔ اور اس کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ میرے اسلوب میں کتابوں کی زبان کے بدلے زندگی کی اور تاثراتِ زندگی کی زبان جیتی جاگتی شکل میں اُجاگر ہو پھر کسی کیفیت کو محض مکمل طور پر بیان کر دینا میرا مقصد نہیں رہا۔ قادر الکلامی ایک طرح کا عجزِ بیان ہے۔ کیونکہ ہر کیفیت یا ہر خیال کے محدود و منطقی پہلو کے علاوہ اس کا ایک وجدانی پہلو ہوتا ہے۔ جس کے لیے صراحت کے ساتھ ساتھ اشاریت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اشاریت کو اپنے اشعار میں سمونا میرے خاص مقاصد شعری میں رہا ہے۔ اس طرف ہمارے اُردو کے شعرا کی توجہ بہت کم رہی ہے۔

جب میں زندگی میں عمل کی حیثیت سے متاثر ہونے لگا تو اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا نصب العین بھی سمجھ میں آنے لگا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سے میری متعدد نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں یہ خیالات جگہ پانے لگے۔ اشتراکیت کے فلسفہ میں عمل کے جو معنی ہیں وہ انسان کی گذشتہ تاریخ کے عمل کے فلسفوں سے بہت مختلف ہیں۔ اب میری کوشش ایسی نظموں میں یہ ہونے لگی کہ مسائل کو عالمگیر انسانیت کے ارتقا کی روشنی میں پیش کروں۔ محض متکیف ہونا یا زندگی جیسی ہے اُس سے متاثر ہونا، قومی کلچر اور قومی مزاج کے

تصور پر وجد کرنا اسے اب میں نادانی سمجھنے لگا۔ اب دنیا اور زندگی پر وجد کرنے کے بدلے دنیا اور زندگی کو بدلنے کا تصور میرے اندر کارگر ہونے لگا۔ دنیا کو بدل دینے کے عالم گیر عمل اور عوامِ عالم کی متحدہ کوششوں کی معنویت، وورسی اور اس کے وجدانی پہلو کو ادب میں چمکانے اور روشن کرنے کو میں بہت اہمیت دینے لگا۔ پھر بھی مجھے اُس کا اعتراف ہے کہ میری زندگی بہت حد تک جنسیت زدہ رہی ہے اور ہے ـــــ جنسیت سے چھٹکارا پانے کے بدلے میں نے اُسے شعوری اور وجدانی طور پر گہرا بنانے کی کوشش کی ہے۔ میری جنسی زندگی کو اس بات سے نہیں سمجھا جا سکتا کہ میرے کن کن سے تعلقات رہے ہیں۔ ان تعلقات کو میں نے کس طرح ہضم کیا ہے۔ جنسیت کو کتنا لطیف بنا سکا ہوں، جنسی جذبات و تجربات کو کتنا لطیف اور رنگین بنا سکا ہوں۔ اگر ان باتوں کا پتہ چلانا ہو تو میری غزلوں، رباعیوں اور عشقیہ نظموں میں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنا چاہیئے۔

میرے زمانے میں مرد اور عورت آزادی سے مل نہیں سکتے تھے اور نہ محبت کر سکتے تھے۔ چوری چھپے کی بات اور ہے۔ اب بھی تبدیلیٔ حالات کے باوجود صورتِ حال بہت کچھ یہی ہے۔ اس لیے مجھے کچھ عورتوں کے حُسن سے متاثر ہونے کے موقعے تو ملے ہیں لیکن اُن سے عشق برتنے کے موقعے نہیں ملے ہیں یا بہت کم ملے ہیں۔

پاکیزگی جنسی تعلق سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس تعلق کو وجدانیت اور جمالیاتی صفات سے متصف کرنے کا نام ہے جو چیز اس محبت کو بلند کرتی ہے وہ وہی ہے جو معمولی جانوروں کی جنسی زندگی اور جنسی تعلقات سے یا معمولی آدمیوں کی جنسی زندگی اور جنسی تعلقات سے ایک حساس اور رچے ہوئے دل و دماغ والے انسان کی جنسی زندگی کو داخلی طور پر مختلف بناتی ہے۔ جب جنسی جذبات کسی شخص کی پوری شخصیت میں حلول کر جائیں۔ اور اس کے مستقل کردار کا جزو بن جائیں۔ اور جب جنسی خواہش کے مقابلے میں احساس جمال بہت زیادہ بڑھ جائے اور بہت زیادہ گہرا ہو جائے، تب جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے ـــ کیا میرا عشقیہ کلام آپ کو یہ احساس کراتا ہے کہ جنسیت اپنی تمام کثافتوں سے پاک ہو کر میرے شعور اور کردار کا جزوِ لطیف بن گئی ہے؟

معاف کرنا میں نے اس خط میں خواہ مخواہ "خطیبانہ رنگ" اختیار کر لیا۔ آپ تو بعض اوقات ایسی اُلٹی سیدھی باتیں کر دیتے ہیں جو ہم نازک مزاجوں پر گراں گذرتی ہیں۔ اگر آپ پر میرا یہ لکھنا گراں گذرا تو آپ سے معذرت چاہنے میں بھی لطف آئے گا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے لاہور بلائیں اور میں نہ آؤں۔ البتہ جوش کا وعدہ میں نہیں کرتا۔ آپ اُن سے براہ راست خط و کتابت کریں۔ میں بھی لقمہ دے دوں گا۔ اور آپ کس کس کو بلا رہے ہیں۔

آپ کا

فراق

(۳)

۸/۴ بینک روڈ، الہ آباد
یکم مارچ ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم۔

آپ کا طویل خط ملا، شکر ہے کہ آپ دو سطری اشاروں سے تو نکلے، یا تو قائل ہو جیے یا کیجیے، بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ صاحب میں آپ کی اتنی سیدھی باتوں پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں، میری باتوں پر بے شک ایمان نہ لایئے۔ لیکن مجھے قائل کرنے کی کوشش نہ کیجیے، ورنہ میں آپ کے جوابوں میں الجھ جاؤں گا۔ اور بات آگے نہ بڑھ پائے گی۔ اور پھر آپ مجھے یہ طعنہ دینے بیٹھ جائیں گے کہ میں الفاظ کے جادو سے قائل کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایڈیٹروں کو تو خدا بھی قائل نہیں کر سکتا (خدا کا لفظ محاورے کے لیے لایا ہوں) اور میں تو ایک شاعر ہوں۔

اچھا ان باتوں کو چھوڑیے اور یہ دیکھیے کہ مجھے؟ پچھلے خطوں میں اپنے نفسیاتی تجزیہ کی دیانت دارانہ کوشش میں ہفت خواں طے کرنا پڑا کہ نہیں۔ جنسیت شہوانی تلذذ، عشق انسانی بہبودی اور ترقی، انسانیت کا صحیح نظریہ یا یوں کہیے کہ عشقیہ دلچسپیوں کے ساتھ غیر جنسی اور غیر عشقیہ اہم امور و مسائل میں دلچسپی ان تمام چیزوں اور رجحانات یا محرکات کو اپنے کردار میں سمونا اور اتنے مختلف اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی شخصیت کی ایک پوری اکائی بنانا، ان مختلف اجزاء میں ہم آہنگی پیدا کرنا یہی کوشش رہی ہے، اس خط میں پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری علمی، فلسفیانہ، سماجی اور سیاسی دلچسپیوں نے میری عشقیہ شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ ۱۹۳۶ء کے قریب میرا رجحان اشتراکیت کی طرف ہونا شروع ہوا۔ لیکن جیسا پہلے خط میں عرض کر چکا ہوں۔ لڑکپن ہی سے حسن پرستی کے ساتھ ساتھ اور اس سے ملی ہوئی میرے اندر کچھ اور صفتیں بھی تھیں۔ یعنی زندگی کی اعلیٰ قدروں، نیکی، خلوص، ہمدردی، شرافت، انسانیت دوستی، علم پرستی، حقیقی عظمت پرستی اور بعد کو اشتراکیت کا علم ہونے کے پہلے سے سچی وطن پرستی اور ہندوستان کی آزادی، ہندوستان کی عظمت کا احساس یہ تمام چیزیں میرے اندر کارفرما تھیں، اس لیے شروع ہی سے میری عشقیہ شاعری میں یہ تمام محرکات و اقدار اس طرح کارگر ہوتے رہے کہ عشقیہ جذبات میں شرافت اور تربیت یافتہ انسانیت کے عناصر گھل مل گئے۔ جنسیت یا عشق اگر محض جنسیت و عشق ہیں۔ تو تھوڑی سی اچھی عشقیہ شاعری کو یہ جنم دے سکتے ہیں۔ لیکن بلند عشقیہ شاعری اُس آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جو نری جنسیت یا نرے عشق تک اپنی دلچسپیاں محدود رکھتا ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ اور نئی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہر بیدار مغز روشن خیال ہندوستانی کی زندگی محض انفرادی دلچسپیوں کی حدیں توڑ رہی تھی۔ اور یہ عمل عشقیہ شاعری پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ قومی زندگی میں ایک بڑا پن آ رہا تھا۔ اس لیے ہماری عشقیہ شاعری میں بھی ایک بڑا پن آنے لگا تھا۔ داغ اور امیر کا انحطاطی دور مٹ رہا تھا۔ خود میری زندگی میں عشقیہ محرکات۔ کے ساتھ ساتھ جو دوسرے اچھے محرکات تھے۔ اور قومی زندگی میں جو نئے اقدار پل رہے تھے۔ ان دونوں نے مل کر میری عشقیہ شاعری کو پروان چڑھایا —— پھر ۱۹۳۶ء سے اشتراکی فلسفہ نے میرے عشقیہ شعور اور میری عشقیہ شاعری کو نئی وسعتیں اور نئی معنویت دی۔ یہ حقیقت دہرانے کی ضرورت ہے کہ صرف جنسیت

زندگی اور عشق زندگی نہ جنسیت کو چھپا سکتی ہے نہ عشق کو اور نہ عشقیہ شاعری کو۔ عشق اس وقت عشق بنتا ہے جب عاشق محض عاشق نہ ہو بلکہ کافی حد تک ایک مکمل انسان ہو۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ میری عشقیہ شاعری میں اور اردو کی پچھلی چوتھائی صدی کی شاعری میں قومی زندگی کی بیداری نئی توانائیاں اور نئے امکانات پیدا کرتی جا رہی ہے۔ لوگ ترقی پسندی کو بلند پایہ اور مؤثر عشقیہ شاعری کا دشمن غلطی سے سمجھ بیٹھے تھے۔ اجازت دیجیے کہ میں یہاں اپنے کچھ عشقیہ اشعار پیش کروں ؎

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ　　ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ
جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے　　اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

فرشِ مے خانہ پہ جلتے چلے جاتے ہیں چراغ　　دیدنی ہے تری آہستہ روی اے ساقی
خاک میں چوٹ دبی تھی یہ نہ جانے کب کی　　رگِ پیمانہ لہو دینے لگی اے ساقی

زندگی کو بھی منہ دکھانا ہے　　رو چکے تیرے بیقرار بہت

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے　　کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی

ہر گردشِ چشم آئینۂ گردشِ دوراں　　ہر ایک ادا موجِ شرابِ طرب آگیں
آغازِ تعارف ہی میں صد قربتِ پنہاں　　پہلی ہی نگاہوں سے جہانِ الفتِ دیریں
موسیقی فگن انداز سے ان ہاتھوں کا اٹھنا　　ہیں صاعقۂ طور ترے ساعدِ سیمیں
وہ ہر نفسِ حسن میں خوشبوئے محبت　　وہ رنگِ گل افشانی لبہائے نگاریں

خوفِ طوالت سے میں اپنی عشقیہ جمالیاتی رباعیاں یا نظمیں پیش نہ کروں گا۔ اور نہ غزلوں سے زیادہ اشعار کی مثالیں دوں گا لیکن مندرجہ بالا اشعار پہ اگر آپ غور کریں گے تو دو حقیقتیں کھل جائیں گی۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی سماجی سیاسی یا کوئی غیر عشقیہ یا افادی خیالات یا عناصر نہیں ہیں۔ یہ ٹھیٹ یا سو فی صدی عشقیہ شاعری ہے۔ لیکن بغیر علمی اخلاقی سماجی اور سیاسی محرکات کے یہ عشقیہ شاعری ممکن بھی نہیں۔ جنسی عشق، زندگی کی دوسری دلچسپیوں سے دست بردار ہو کر یا گریبان پھاڑ کر جنگلوں میں نکل جانے کے بعد یا تو جنون میں مبتلا ہو جائے گا یا نامرد ہو کر رہ جائے گا۔ ہمارے اردو شعراء جسمی لحاظ سے نامرد نہیں تھے۔ لیکن چونکہ زیادہ تر یہ شعراء وسیع دلچسپیاں نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی عشقیہ شاعری میں وہ قوت یا زندگی نہیں ہے، جو ان شعراء کی عشقیہ شاعری میں ہے، جو حیات وکائنات میں بھی دل چسپی رکھتے تھے، مثلاً میر، آتش، غالب۔

تو عشقیہ شاعری میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ نزاکت و صداقتِ جذبات کے ساتھ ساتھ اشاریت کیفیت ہمہ گیری داخلیت و

معنویت، تخلیقِ فضا اور زبان و بیان میں ایک عالمگیر لہجہ، انسان کے دل کی دھڑکنیں اور ایک آفاقیت پیدا کر سکوں۔ فنی محاسن اگر آئیں تو انہیں صفات اور مقاصد کو اجالنے اور چمکانے کے لیے آئیں۔ دنیا بھر کا عشقیہ ادب ہر مرتبے کا ہے۔ معمولی اوسط درجے کا اور بلند مرتبہ، آخر الذکر آفاقی ادب سے استفادہ کرنا بھی میرا مقصد رہا ہے۔ اور اس طرح عشقیہ شاعری کے لہجے میں زندگی بلندی اور پاکیزگی پیدا کرنے میں مجھے کافی مدد ملی ہے۔ شخصیت اور شاعری صرف اپنے بوتے یا اپنے سہارے ہرگز بلند نہیں ہو سکتیں دونوں بلندیاں اخذ کرتی ہیں، تہذیبِ انسانی سے۔ ہر شخص کی بلند شخصیت اور ہر شاعر کی بلند پایہ شاعری دوسروں کی دین ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہر خاص و عام اس دین کو حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

میں نے اپنی عشقیہ شاعری میں ایک اور قیمتی عنصر سمونا چاہا ہے اور وہ ہے حیات و کائنات پر مکمل ایمان۔ میرے لیے اس کی بالکل ضرورت نہیں تھی کہ خدا پر پہلے ایمان لا کر فطرت یا خلقت پہ ایمان لاؤں۔ یوں تو میری عشقیہ شاعری میں دُکھ، درد، غم آنسو، اضطراب، ناکامی، سبھی کچھ ہے۔ لیکن اثر اس شاعری کا حیات و کائنات سے بیزاری نہیں ہے۔ بلکہ حیات و کائنات پر ایمان کو تقویت پہنچانا ہے۔ تصوّف کا سہارا لیے بغیر مجازی دنیا کی پاکیزگی اور خیر و برکت کا احساس کرانا میری عشقیہ شاعری کا مقصد رہا ہے حقیقت جسے حقیقت کہتے ہیں، وہ میرے نزدیک اسی مجازی دنیا کا ارتقاء پذیر وجود ہے۔ البتہ اب سے بیس برس پہلے تک عینیت اور تصوّف کا کچھ اثر ضرور رہا ہے۔ لیکن عنصری کائنات کی طہارت و پاکیزگی کا براہ راست احساس میرے اندر ہمیشہ رہا ہے

بہت اچھا جب لاہور آؤں گا، تو آپ مجھ سے باقی باتیں پوچھ لیجئے گا۔ یہ خطوں کا سلسلہ بڑا دردِ سر ہے۔ جوش صاحب لکھنؤ کے مشاعرے میں آئیں گے۔ تو میں بھی اُن سے بات کر دوں گا۔ بات کیا کروں گا بلکہ بات پکّی کر دوں گا۔

آپ نے اندازے کے سلسلے میں جو رقم بھجوانا تھی، وہ اب تک نہیں پہنچی۔ براہ کرم اس کا بطورِ خاص خیال رکھیں۔

آپ کا

فراق

(۴)

۸/۴ بینک روڈ، الہ آباد
۳؍ جولائی ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم۔

آپ نے اپنے خط میں یہ کیا لکھ دیا کہ میں نے عشقیہ شاعری کے پردے میں بعض بہکی بہکی باتیں کی ہیں۔ اگر آپ کے خیال میں میں نے بہکی بہکی باتیں کی ہیں۔ تو آج ضرور ذرا کھل کر باتیں سن لیں۔ تاکہ میرا یہ بہکنا مجذوبانہ حد تک بے مثال بن جائے ——— یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ میں جنسی موضوعات پر آ کر پھسل جاتا ہوں۔ بلکہ میں بعض اہم شخصیتوں پر آزادانہ اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔

اچھا تو سنیئے۔ آغازِ شباب سے لمبی زندگی پانے والوں کی بھی عشقیہ یا جنسی زندگی زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر برس تک قائم رہ سکتی ہے۔ یعنی ۸۰ یا نوّے برس کی عمر تک۔ اس دوران میں کسی شخص کے جتنے بھی محبوب و معشوق ہوں، اُن سے وہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار بار مل سکے گا۔ یعنی زیادہ سے زیادہ تین چار سو معشوقوں سے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جنسی زندگی کا عملی حصہ یعنی بوس و کنار، وصل و ہجر، شکر و شکایت، وفا جفا، انتظار، نامہ و پیام اور اسی قسم کی مٹھی بھر باتیں عشقیہ زندگی کے اخیر تک قائم رہتی ہیں، لیکن انہیں مٹھی بھر باتوں سے عشقیہ شاعری ایک ہی شخص کے ہاتھوں ہزارہا عشقیہ اشعار کہلوا لیتی ہے مجھے انگریزی شاعر کیٹس (CEATS) کے ایک خط کی یاد آگئی کہ جس طرح ایک مکڑی دیوار کے دو تین نقطوں سے جالا بننا شروع کرتی ہے اور ہزارہا تار اور حلقے بنا لیتی ہے، اسی طرح شاعر انے گنے تجربوں کے سہارے ایک پورا ایوانِ عشق کھڑا کر دیتا ہے یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے۔ کہ زیادہ تر حالتوں میں کسی عشق کے معشوقوں کی تعداد دو تین ہی زندگی بھر میں ہوتی ہے۔ اور ان معشوقوں سے دو چار بار ہی وہ زندگی بھر میں مل پاتا ہے اور ان دو چار سو ملاقاتوں میں وہی مٹھی بھر باتیں اپنے کو دہراتی رہتی ہیں۔ آئے دن نئی وارداتیں نہیں ہوتیں۔ اور دیوان تیار ہو جاتا ہے۔ ہزاروں اشعار کا۔ اگر یہ تجربے نثر میں لکھے جائیں (اور افسانے کا سہارا نہ لیا جائے) تو شاید چالیس پچاس صفحات میں سب باتیں بیان ہو جائیں گی۔ لیکن یہ شاعری کا جادو ہے کہ ایک ایک بات اور واردات ہزار ہزار بار نیا جنم لیتی ہے۔ یہ تکرار و تجدیدِ جذبۂ عشق کے استقلال سے پیدا ہوتی ہے۔ مجہول لذت پرستی تخیل کی مدد سے قریب قریب لامحدود خلاقانہ صلاحیت حاصل کر لیتی ہے۔ اب اگر سارا دیوان محض چوما چاٹی سے بھرا ہوا ہو تو ماننا پڑے گا کہ شاعر کی زندگی و ذہنیت ناقابلِ اصلاح ہوس کاری کی شکار ہیں۔ لیکن اگر واقعی کسی کا دیوان لطیف پاکیزہ رنگین پُرمعنی عشقیہ جذبات اور جمالیاتی احساسات سے مالامال ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاعر کی جنسیّت عشق کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔ وہ عشق بھی محض شاعر کے کردار کا مستقل جزو نہیں بن گیا ہے۔ بلکہ شاعری کے رُوپ میں رنگا رنگ انداز سے جلوہ گر ہُوا ہے اور خلاقانہ خلوص ہی ایسا کرا سکتا ہے ؎

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہُوا
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے

اس خلاقی کا راز کیا ہے؟ چند محدود تجربے اور باتیں ہزاروں نئے روپ کیسے دھار لیتی ہیں، یہ ذرا پیچیدہ سوال ہے۔ شاید بات یہ ہے کہ داخلی کیفیات یا کوئی داخلی کیفیت گننے کی چیز نہیں ہے۔ جسے ہم ایک جذبہ کہتے ہیں۔ جب وقوف یا ادراک اُسے چھوتا ہے یعنی جب جذبۂ علم جذبہ بنتا ہے تو اس کے بے شمار پہلو نظر آنے لگتے ہیں۔ اس طرح وحدت سے کثرت پیدا ہوتی ہے، ہر حقیقت ایک ہوتی ہوئی بھی کئی حقیقتیں بن جاتی ہے۔

ایک عاشقی کی جنسی زندگی کو یا اس کے جنسی اعمال کو بے تہہ اشخاص بدکاریوں اور غلط کاریوں سے تعبیر کرتے ہیں ؎

زنخے میں آیا عشقِ اعظم
ٹوٹ پڑے دُنیا کے کمینے

ازل کی صبح سے اُس عشق کا نہ راز کھلا
جو شہر شہر ہے بدنام کُو بہ کُو رسوا

یہ راز اگر کہیں کچھ کھلتا ہے تو حقیقی عشقیہ شاعری میں کھلتا ہے یا عاشق کی زندگی کے اُن پہلوؤں اور کارناموں میں کھلتا ہے جن کا سر رشتہ لوگ جنسی یا عشقی زندگی سے ملا نہیں پاتے۔

جنسیت کا خواہش یا حاجت روائی کی سطح سے اُبھر کر ایک مستقل جذبے کی شکل اختیار کر لینا، اس میں ارتقائے حیاتِ انسانی کا کونسا مقصد پنہاں ہے ؟ ـــــ بقائے نسل کے لیے تو جنسی خواہش یا ایک خواہش مردار کافی ہے۔ عشق کس مد میں آتا ہے؟ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ ایک عظیم تہذیب میں عمل کی وسعتیں اور اس کے بے شمار پہلو مستقل عشقیہ جذبات کی دین ہیں۔

انساں کو محض کھاتے پیتے گذرے   اس منزل سے وہ پاؤں آگے نہ دھرے
وحشی کے عمل کی انتہا صید و شکار   گر عشق نہ ہو عمل ترقی نہ کرے

عشق کی خلاقی محض شعر و شاعری، رقص و سرود، تاج محل اور اجنتا یا دیگر فنونِ لطیفہ تک محدود نہیں۔ بلکہ تہذیب کا پورا کارنامہ اُس جنسیت کی تخلیق ہے۔ جو عشق کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کار آمد عمل یا افادیت سے شاعری اور دُوسرے فنونِ لطیفہ کا کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ کیا یہ فنون تاریخ کے مقاصد کی تکمیل میں ممد ہوتے ہیں۔ یا ان مقاصد سے الگ تھلگ چیز ہے ؟ کیا وجدان برائے وجدان ہوتا ہے یا برائے عمل؟

خطرہ تو اس کا ہمیشہ رہتا ہے کہ فنونِ لطیفہ آپ اپنے شکار ہو کر رہ جائیں اور نذرِ حال و قال ہو کر رہ جائیں۔ لیکن شاعر اور اس کے سماج کی بیدار مغزی اس خطرے سے شاعری کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اے شاعرِ خوشنوا تری ہے وہ ذات   جو سوئی ہوئی جوت جگائے دن رات
اپنی ہی لذتِ بیاں میں نہ ہو گم   دم بھر نہ چھٹے منصبِ نقادِ حیات

حقیقی شاعرانہ وجدان محض کائنات کے وجود کے احساس سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس وجود کے پیچھے علم اور اُسے سچی طرح سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس وجود کا سچا ادراک اس راز کا انکشاف کرتا ہے کہ وجودِ کائنات ہر لحاظ سے ایک متحرک اور تغیر پذیر وجود ہے۔ کائنات کی تخلیق ہو نہیں چکی بلکہ ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس مسلسل تخلیق کا ضامن آدمی کی ذات ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب سے سینکڑوں برس پہلے کی شاعری کے مشاہیر نے اپنے زمانے کی کائنات کو جس طرح سمجھا تھا وہ کائنات تو اب بدل چکی۔ اور وہ کائنات ہمیں واپس دی جائے تو ہم اُسے کوڑیوں کے مول بھی نہ خریدیں۔ لیکن۔ والمیکی، ہومر۔ ورجل۔ کالی داس۔ فردوسی، حافظ، تلسی داس اور شیکسپیئر کے کارنامے اب بھی سدا بہار بنے ہوئے ہیں۔ ان شاعروں کی دنیا لینے سے ہمیں انکار ہے اور ان کے کارنامے کھو دینے سے بھی ہمیں انکار ہے۔ یہ اس لیے کہ ماضی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک وہ پہلو جو حال و مستقبل میں اپنی ہیئت کو تبدیل کر کے قائم رہے گا۔ دوسرا وہ پہلو جو اب قائم نہیں ہے۔ شاعر ماضی کے دونو پہلو زندہ جاوید شکل میں پیش کر دیتا ہے۔ اور جس ماضی سے ہم اُبھرتے ہیں اس کا زندہ شعور ہمارے اندر پیدا کر کے ہماری بدلتی ہوئی زندگیوں کا تسلسل محفوظ کر دیتا ہے۔ یعنی ماضی کی زندہ روایتوں کی رُوح کو محفوظ کر دیتا ہے ہم ماضی سے کر کیا کریں گے لیکن ہم ماضی کی معنویت سے اگر چشم پوشی

کریں تو حال کو بھی کھو بیٹھیں گے۔ ہمیں حال کو ماضی نہیں بنانا ہے۔ لیکن حال اور ماضی میں جو رشتہ ہے اُسے سمجھنا از حد ضروری ہے۔ اگر ماضی کا ادب عالیہ سب کا سب فنا ہو جائے گا تو ہمیں حال و مستقبل کی تعمیر میں بہت سی رکاوٹیں پڑیں گی۔

آپ کے مضمون پڑھتا رہتا ہوں۔ تعریف اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں آپ اکڑنے نہ لگیں۔ اور یوں ہم اچھے مضامین سے محروم ہو جائیں۔

اور آخری بات یہ کہ خفا ہونا چھوڑ دیجیے۔ اتنے ثقہ آدمی ہوتے ہوئے۔ جب آپ بچوں کی طرح روٹھ جانا چاہتے ہیں تو بڑا عجیب لگتا ہے۔ فراق اور مشین میں تھوڑا سا فرق تو ہے۔ بہرحال غزل حاضر ہے اور اسلامی ادب کے بارے میں بھی چند سطور نذر ہیں۔ یہ آپ کے ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو اچھے بھلے تھے۔ اب تو ان کی بیماری لاعلاج معلوم ہوتی ہے۔

٭پچھلے دنوں سخت بیمار رہا ہوں۔ اس لیے جلد جواب نہ دے سکا۔ مجبوری تھی۔

آپ کا
فراقؔ

(۵)

۸/۴ بینک روڈ۔ الہ آباد
۱۷ر جولائی ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم

آج میں آپ کو بڑا معقول قسم کا خط لکھنا چاہتا ہوں۔ موضوع تو آپ کا ہے۔ لیکن لکھوں گا تو میں۔ کئی دنوں کے بعد آج طبیعت سنبھلی ہے۔ اگر قلم بھی سنبھل کے چلا تو مجھے وہ لطف نہ آسکے گا جو قلم کے پھسلنے میں ہے۔ بہرحال مسئلہ بڑا نازک سا چھیڑ رہا ہوں وہ یہ کہ میں اپنی شاعری سے خوش ہی خوش ہوں یا کسی قدر ناآسودہ بھی ہوں۔ میں معقول و مناسب حد تک اپنے کلام کے اُس حصہ سے آسودہ و مطمئن ہوں جسے میں اچھا سمجھتا ہوں۔ لیکن اپنے کسی شعر، غزل، رباعی یا نظم کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ میرؔ، غالبؔ، آتشؔ، اقبالؔ تک کے بلند ترین کلام کو میں اردو شاعری کا حرفِ آخر نہیں تسلیم کرتا۔ اپنے کلام کے جن حصوں کو میں غیر جانب دار ہو کر پسند کرتا ہوں اُن کی بھی مختلف سطحیں ہیں مختلف قدریں اور مختلف رُتبے۔ میرا ہر اچھا شعر عظیم ترین شاعری نہیں ہے لیکن کس شاعر کا اچھا شعر عظیم ترین شاعری ہے! میں جیسی اچھی اور جتنی اچھی شاعری کر سکا ہوں، اس سے کہیں اچھی شاعری کا تصور کر سکتا ہوں۔

اگر مجھے اپنے پورے کلام پر نظرثانی کرنے کی فرصت ملی (میں اس فرصت کو پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں) تو میں اپنے بہت سے اشعار کو اور بھی چمکا دینے کی امید رکھتا ہوں۔ خاص کر غزل کے اشعار اور اپنی بہت سی رباعیوں کو۔ انہیں پھر سے چھونے کی ضرورت ہے (THEY NEED RETOUCHING) ابھی میرے تحت الشعور میں سینکڑوں غزلیں اس طرح گنگنا رہی ہیں کہ میں گنگناہٹ سن نہیں سکتا۔ صرف ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرے اندر ایک سو گنگناہٹ سی ہو رہی ہے اور بس۔

اپنی نظموں کے بارے میں میں یہ محسوس کرتا ہوں مجموعی طور پر اُن میں کئی خوبیاں ہیں۔ لیکن جتنی اچھی نظمیں میں کہہ سکا ہوں اُن کی

دس گنی تعداد یا مقدار میں نظمیں کہنا چاہتا ہوں۔ میری دو نظمیں ادبی اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت سراہی گئیں۔ اگرچہ یہ دونوں نظمیں غیر مقفیٰ ہیں۔ لیکن آپ کے حضرت جگر مراد آبادی ایسے سراپا غزل شاعر اور حضرت جوش ملیح آبادی جیسے سراپا نظم شاعر نے بار بار ان پر وجد کیا اور جی کھول کر داد دی۔ اور اگرچہ ان نظموں میں کوئی کھلا ہوا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ صرف منظر نگاری اور تخلیق فضا ہے۔ پھر بھی علی سردار جعفری اور ان کے ہم نوا ہم عصر شعراء نے جی کھول کر ان کی داد دی۔ یہ دو نظمیں ہیں: "آدھی رات" اور "پرچھائیاں"۔ اکثر خیال آتا ہے کہ اس انداز میں کم از کم دس نظمیں اور کہوں۔ میری ایک اور نظم ہے: "رقص شباب" جسے میں بہت اچھی جمالیاتی نظم سمجھتا ہوں اور جو اُردو کے تمام مشاہیر سے داد حاصل کر چکی ہے، دو چار ایسی اور نظمیں کہنا چاہتا ہوں۔ اپنی ترقی پسند نظموں میں داستان آدم، روٹیاں اور کچھ دوسری نظمیں مجھے پسند ہیں۔ میں ان سے بھی بلند تر انداز میں پچاس اور نظمیں کہنا چاہتا ہوں۔

میں نہ تو اقبال، جوش، چکبست کی تقلید کرنا چاہتا ہوں (اگرچہ اُن کے محاسن کلام کا مجھے اعتراف ہے) نہ یورپ کے شعرا کی سو فی صدی تقلید کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن پروفیسر کلیم الدین احمد کے اس بیان سے متفق ہوں کہ اُردو کی نظمیں بھی غزلیت زدہ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ورڈزورتھ، کیٹس، شیلے، کولرج، ٹینی سن، میتھو آرنلڈ، سون برن وغیرہ شعراء کے اسلوب اور تکنیک میں جو خلاقانہ صلاحیتیں ملتی ہیں۔ اور گھلاوٹ اور نغمگی کے ساتھ جو سنجیدگی ملتی ہے اس نمونے کی کچھ نظمیں کہہ سکوں، کچھ ایسی نظمیں کہہ بھی چکا ہوں۔

ہمارے نئے شعراء غیر مقفیٰ نظم میں جو کوششیں کر رہے ہیں میں اُسے سراہتا ہوں لیکن مقفیٰ شاعری کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ انگلستان کی شاعری اُردو شاعری سے بہت پرانی ہے۔ لیکن آج تک اس میں رنگا رنگ مقفیٰ شاعری ہو رہی ہے۔ اگرچہ انگریزی شاعری کے جنم دن سے اس میں غیر مقفیٰ نظم (BLANK VERSE) داخل ہو چکی تھی۔ انگریزی کے مشہور ODE ایسی چیزیں ہیں جنہیں ہم اپنی مقفیٰ شاعری کے لیے نمونے بنا سکتے ہیں۔

اپنی شاعری کی خوبیوں اور اس میں جو کمی محسوس کرتا ہوں اُس کے بارے میں اظہار خیال کر چکا۔ اس دور کے شاعروں سے گذارش کروں گا کہ وہ انیسویں صدی کی مغربی شاعری کا بغور مطالعہ کریں۔ اور قدیم مشاہیر اُردو کے کلام کو بار بار پڑھتے رہیں۔ قدیم ادب سے استفادہ کیے بغیر کام نہ بنے گا۔ لیکن قدیم ادب کا شکار ہو جانے سے بھی کوئی کام نہ بنے گا۔ محاورے، روزمرہ، فصاحت ٹکسال اور وہ دیگر محاسن شعری جن کے نمونے قدما پیش کر چکے ہیں۔ انہیں نظر انداز کر کے ہمارے نئے شاعر کہیں کے نہ رہیں گے۔ ہاں نئے اسلوب ضرور پیدا کیے جائیں۔ روایتوں کی زنجیریں ضرور توڑی جائیں۔ لیکن جو نکتے شاعری کو زندگی بخشتے ہیں اُن کا ضرور لحاظ رکھا جائے — محض نئی بات کہہ دینے سے یا نئے انداز بیان سے یا چونکا دینے والی بات کہہ دینے سے شاعری زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری شاعری محض مختلف افراد کے دماغوں کی اُپج رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ نئی شاعری جبھی زندہ رہے گی جب وہ ہماری تہذیب اور ہمارے قدیم ادب کی دین ہو۔ ہمیں اپنی شاعری کو اپنے اور دنیا کے قدیم مستند ادب کا سہارا دے کر نیا بنانا ہے۔ ایک بات اور عرض کر دوں — انگریزی کے ایک بڑے ادیب کا مقولہ ہے کہ عظیم ادب شاذ ہی ادبی ہوتا ہے (GREAT LITRATURE IS SELDOM LITRARY) میں شروع ہی سے ادب کو ادبی زبان دینے کے بدلے زندگی کی زبان دینے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ زبان دانی کا حقیقی مفہوم ہے حیات دانی و حیات شناسی۔

آپ کا

فراق

(۶)

۴ بینک روڈ۔ الہ آباد
۵ راگست ۱۹۵۳ء

برادرم تسلیم

اس خط میں اُن مباحث پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ جو میرے پہلے خطوط میں زیرِ غور رہے ہیں اور میں آپ کی ان باتوں میں نہ اُلجھوں گا، جن میں آپ نے اڑنگے لگائے۔ بس میری باتوں کو چپکے سے سنتے جائیے۔ جب آج سے پہلے کا ادب موجودہ تہذیب کا ایک زندہ جزو بن چکا ہے تو یہ امر لازمی ہو جاتا ہے کہ ہر ذی کمال شاعر قدما سے اپنے مزاج و صلاحیت کے مطابق استفادہ کرے۔ میں نے اُردو اور دوسری زبانوں کی اچھی شاعری سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ میں میرؔ، غالبؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، آتشؔ، اقبالؔ، جوشؔ یا کسی بھی مشہور اُردو شاعر کا طبع دوم بن کر رہ جاؤں۔ میرا یقین ہے کہ اگر میرے کلام سے تمام مقطعے کاٹ دیئے جائیں اور دوسرے مشاہیرِ اُردو کے نمائندہ کلام سے اُن کے مقطعے کاٹ دیئے جائیں اور سب کو گڈمڈ کر کے ایک پلندہ بنا دیا جائے تو اہلِ نظر حضرات اس بے نام و تخلص پلندے میں سے میرا اور دوسرے شعراء میں ہر ایک کا کلام الگ الگ کر لینے میں قریب قریب سو فی صدی کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن اگر دورِ حاضر یا گذشتہ ادوار کے دوم اور سوم مرتبہ کے شعراء کا کلام اسی طرح گڈمڈ کر دیا جائے اور نواب جعفر علی خاں اثرؔ کے مجموعہ "بہاراں" کی غزلوں سے مقطع کاٹ کر اس دوم اور سوم درجے کی شاعری کے پلندے میں ملا دی جائیں تو ان شعراء کے کلاموں کو الگ الگ کرنے میں کسی کو کامیابی نہ ہوگی۔ کمزور شاعری خواہ اُسے کتنا ہی رچایا اور سنوارا جائے۔ خط و خال اور شخصیت سے محروم رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ میرؔ و غالبؔ سے کم تر حیثیت کا شاعر صاحبِ طرز نہیں ہو سکتا۔ جرأتؔ اور ناسخؔ، میرؔ و غالبؔ سے بہت کم تر ہیں۔ لیکن جرأتؔ و ناسخؔ دونوں صاحبِ طرز ضرور ہیں۔ اب اگر کوئی شاعر دوم سوم درجہ کی شاعری کرتا ہوا بھی ایسی کمزور شاعری کرتا ہے کہ اس کا کوئی اپنا رنگ نہ بن پائے اس کی شاعری میں نمایاں خد و خال نہ پیدا ہوں۔ ایسے صفات نہ پیدا ہوں، جن میں اس شاعر کا کوئی شریک نہیں تو اس شاعری کو تو ہم جان تو سکتے ہیں لیکن اُسے نہ ہم مان سکتے ہیں نہ پہچان سکتے ہیں۔

میں نے ارادتاً اس کی کوشش نہیں کی کہ اپنے طرزِ کلام کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناؤں۔ اگر میرے کلام کا ایک نمایاں اور مخصوص رنگ ہے اور ایک مخصوص طرز ہے تو یہ امتیازات میری شاعرانہ شخصیت سے میرے کلام میں داخلی طور پر پیدا ہوتے گئے۔ البتہ میری شاعری کے آغاز سے پانچ سات برس تک جسے دورِ تجربہ کہہ سکتے ہیں، میرے کلام میں تقلید کا عنصر قدرے زیادہ ہے۔ اور میری اپنی آواز ذرا دبی دبی سی ہے۔

لیکن جیسا عرض کر چکا ہوں ایک مخصوص رنگ اور نمایاں خط و خال دوم و سوم درجہ کی شاعری میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔ بلند مرتبہ شاعری یا وہ شاعری جسے ہم ادبیاتِ عالیہ کہتے ہیں۔ اس میں ایک منفرد شخصیت کے علاوہ فن اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کا مرکزی جوہر ہے حیات و کائنات کی عظمت، آفاقی وسعت، حیات و کائنات پر اٹل ایمان اور حیات و کائنات سے بیکراں محبت۔ یہ مرکزی جوہر عشقیہ شاعری اور دیگر موضوعات کی شاعری دونوں کو عظمت عطا کرتا ہے۔ آتشؔ اور آتشؔ کے شاگردوں کو لے لیجئے۔ آتشؔ کی اُستادی کا راز اُن کی زبان دانی، طباعی، ذہانت، مضمون آفرینی میں اس حد تک نہیں ہے جس حد تک آتشؔ کے تفکر کی آفاقیت میں

وہ راز پنہاں ہے۔ اور کلام آتش کی آفاقیت کے مزاج میں منطقی طور پر ممکن ہے کہ کئی موضوعات پر جو اور جس طرح آتش نے سوچا۔ اُسی طرح رند و صبا نے بھی سوچا ہو لیکن وہ موضوعات آتش کے وجدان میں اس سے زیادہ دُور رس، موثر، پُر عظمت اور پُر کیف بن گئے۔ جتنا وہ رند و صبا کے وجدان میں بن سکے تھے۔ بلند شاعری فی الحقیقت جمالیاتی عظمت کی تلاش ہے۔

جنسیت اور عشق کے بارے میں بھی پہلے کے خطوط میں کئی باتیں کہہ چکا ہوں۔ آج یہ کہنا ہے کہ بڑے عاشق کا عشق اتنا بڑا عشق نہیں ہوتا جتنا بڑے "انسان" کا عشق بڑا ہوتا ہے۔ بظاہر جنسیت محض جنسیت ہے۔ لیکن شیکسپیئر، کالی داس، حافظ، گیٹے، دانتے کی جنسیت عوام کی جنسیت سے بہت بلند تر چیز ہے۔ عشق صرف دل کا معاملہ نہیں ہے بلکہ دل سے زیادہ دماغ کا معاملہ ہے۔ چھوٹے دماغ کا آدمی بڑے سے بڑا عاشق ہو کر بھی کوئی بڑا عاشق ہوتا ہے۔ بڑا عاشق نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی اگر معشوق پر مر مٹ جائے، اپنے شدتِ خلوص سے وہ اپنے جسم کو چھلنی بھی کر ڈالے یا جنگلوں میں نکل جائے یا معشوق کی خدمت کے لیے اپنی زندگی قربان کر دے۔ پاگل بھی ہو جائے، خود کشی بھی کرے یا جو کچھ کرے۔ بلند دل و دماغ والے عاشقوں کی برابری نہیں کر سکتا۔ خواہ آخر الذکر کوئی ڈرامائی یا غیر معمولی حالت اپنی نہ بنائیں اور کچھ ہنس کھیل کر وارداتِ عشق کو برداشت کر لیں۔ دنیا کے معجزے دکھانا بڑے عاشق کا کام نہیں ہے، یوں تو میرؔ نے کہا ہے ؎

پرستش کی لے بت یہاں تک تری
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

لیکن یہ پرستش درِ جاناں پر جبیں سائی یا رونے یا گڑگڑانے کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک داخلی عمل ہے۔ اس داخلی عمل سے حسن کے اقدار کی تخلیق ہوتی ہے۔ جنسیت بجائے بقائے نسل کی ضامن ہونے کے ارتقائے تہذیب کی ضامن بن جاتی ہے۔ کسی مفکر کا بیان ہے کہ ایک تربیت یافتہ ناکام عاشق دیوتا معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ جنسیت کو عشق سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ ایسا عشق ناکام ہو ہی نہیں سکتا۔ جب حسرتؔ موہانی کہتے ہیں ؎

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

یہ افلاطونی عشق محض ایک برائے بیعت چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اس دور سے دیکھنے میں بھی جو جادو کارگر ہے۔ وہ جنسیت ہی کا جادو ہے۔

یہی بات ہم افراد سے گذر کر قوموں اور تہذیبوں کے لیے کہہ سکتے ہیں۔ وحشی یا نیم مہذب قومیں اس کی مثالیں تو پیش کر سکتی ہیں۔ کہ ان کے کئی افراد جذبۂ عشق کے تحت آگ میں کود پڑے۔ لیکن ایسی قوموں کا عشق ان مثالوں سے بڑا عشق نہیں بن جائے گا۔ البتہ قابلِ قدر عشق ضرور رہے گا۔ کیونکہ عشق کا مقصد معشوق سے وصال و قرب کے علاوہ جذبۂ عشق اور احساسِ جمال کو بلند بنانا ہے اور آگے بڑھ کر تہذیب و تمدن کی تخلیق کرنا ہے۔ شیکسپیئر کی عشقیہ شاعری ملکۂ الزبتھ کے زمانے کے غیر عشقیہ عظیم کارناموں سے غیر متعلق ہے۔ شیکسپیئر کی شاعری، بیکن کی تصنیفات، نئی دنیا کی دریافت، انگلستان کی نشاۃ ثانیہ، یہ سب ایک ہی تاریخی عمل یا دور کی پیداوار ہیں۔ ہماری اُردو شاعری نے کسی بڑی قومی زندگی کے آغوش میں نہ جنم لیا تھا نہ پروان چڑھی۔ جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں خود میری شاعری میں اگر واقعی کچھ بڑی چیزیں ہیں تو وہ سب کی سب ایجادِ بندہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس ہندوستان کی دین ہیں۔ جس کی نشاۃ ثانیہ راجہ رام موہن رائے کے وقت سے شروع ہو چکا تھا۔ جو عشقیہ شاعری ایک بڑی قوم، زندگی اور ایک بڑی اور زندہ تہذیب کی پیداوار ہو گی۔ وہ قوم کے لیے چھوٹے حال قال

یا محض تفنن طبع کا باعث نہ بنے گی۔ بلکہ وجدان و تفکر کی ایک بڑی یونیورسٹی ہوگی۔ بڑی عشقیہ شاعری کی نگاہ میں جہاں ایک طرف معشوق ہوتا ہے۔ وہاں دوسری طرف قومی زندگی اور اس کے امکانات ہوتے ہیں۔

ایک مسئلہ پر ابھی اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں، معشوق ذہنی اور اخلاقی طور پر کوئی فوق الانسان نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک معمولی انسان ہوتا ہے —— تو کیا اُس کا اس قدر گرویدہ ہو جانا کہ اُس سے قیمتی انسان کا تصور بھی ناممکن ہو جائے، ایک جھوٹ یا مبالغہ نہیں ہے؟

سوداؔ جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

محبت کی مشہور داستانوں یا واقعوں کے معشوق اپنے زمانے کے حسین ترین انسان تھے۔ لیکن ناقابلِ برداشت جنسی کشش عاشق میں پیدا کر دیتے تھے۔ اور غیر معمولی دل و دماغ رکھنے والے عاشقوں کے دلوں میں دنیا کے حسین ترین انسان نظر آتے تھے۔ عقلی طور پر تو یہ ایک بھرم ہے۔ لیکن اس بھرم میں ایک راز پوشیدہ ہے۔ اور وہ راز بقائے نسل نہیں ہے۔ بلکہ ارتقائے نسل ہے۔ بقائے تہذیب نہیں ہے بلکہ ارتقائے تہذیب ہے، معشوق کے جمال کی یہ داخلی کشش مجموعی حیثیت سے ایک بہتر نسل اور بہتر تہذیب کی ضامن ہے، جنسیّت شدید جذبات کے سہارے بہتر نسل پیدا کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اگر کسی مرد اور کسی عورت میں انتہائی عشق ہو تو اولاد بہت بلند تر پیدا ہوگی۔ لیکن امکان بہتر اولاد کے پیدا ہونے کا ضرور ہے۔ اولاد کی ترقی میں سب سے زیادہ حصّہ ماں باپ کی باہمی محبت ہے۔ اگرچہ اور چیزوں کا بھی اس معاملے میں حصّہ ہے۔ پھر بھی والدین کی باہمی محبت بچّے کی زندگی کو جنت بنا دیتی ہے۔ یعنی اُسے ترقی کے بہترین امکان فراہم کر دیتی ہے۔

لیکن ہم جنسوں کی پُرخلوص جنسی محبت سے اولاد تو نہیں پیدا ہوتی۔ پھر اس سے تہذیب کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک فائدہ عاشق و معشوق کی زندگیوں میں لطافت پیدا ہو جانا اور دونوں کی شخصیتوں کی تالیف و تہذیب۔ دوسرے اگر عاشق کی شخصیت معشوق سے بڑی ہے تو معشوق، جمال ہم نشیں در من اثر کرد کے مصداق بہت کچھ بن سکتا ہے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن جیسے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ہم جنسوں سے محبت انے گنے افراد تک محدود رہے تو اچھا ہے۔ پھر اگر ایسی محبت میں طرفین میں سے کوئی شاعر فن کار یا کسی دوسری کارآمد دلچسپیوں کا حامل ہے۔ تو یہ محبت اُس کی ان دلچسپیوں کو پروان چڑھانے میں بہت مدد دے سکتی ہے۔ یہاں بھی وہی بات کہی جائے گی۔ یعنی چھچھورے آدمیوں کی امرد پرستی کو سقراط یا بہت سے گمنام لیکن شائستہ تہذیب یا شائستہ عشق عشاق کی امرد پرستی سے کوئی نسبت نہیں۔ ہر امرد پرست غنڈا یا شہدا نہیں ہوا کرتا۔ اور نہ مخرب اخلاق ہوتا ہے۔ ایڈورڈ کارپنیٹر کی تصنیفات اس نازک مسئلے پر بہت بصیرت افروز ہیں۔

دیکھیے میں ان خطوں میں کتنی محنت کر رہا ہوں۔ تاکہ آپ کو میری ذات اور میرے خیالات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ میں نے آج تک کسی سے بھی اتنی کھل کر باتیں نہیں کی ہیں۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ کہ مجھے آپ کی ہر بات کی تعمیل میں ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اب مجھے اپنی زندگی پر کوئی بھروسہ نہیں رہا، نہ جانے کب مر جاؤں۔ کافی عمر ہو گئی ہے کب تک شعر کہہ کر جی سکوں گا۔ اور اب مجھے یہ امید بھی ہے کہ آپ میری زندگی میں یا میرے مرنے کے بعد ایک ایسا مضمون لکھ سکیں گے۔ جس سے میری بھرپور شخصیت سب کے سامنے آئے گی، کیا یہ کرم میری زندگی کے بعد ہوگا یا زندگی ہی میں۔

آپ کا

نواب عماد الملک (مولوی سید حسین بلگرامی)

ڈاکٹر عبدالحق

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کو ایک نئی قوم اور ایک نئی تہذیب سے سابقہ پڑا۔ یوں تو یورپ سے سب سے پہلے پرتگالی آئے اس کے بعد ولندیزی اور فرانسیسی۔ لیکن ان کا کوئی زیادہ اثر ملک پر نہیں ہوا۔ پرتگالی ہندوستان میں دو مقصد سے آئے تھے۔ مسالوں کی تجارت سے روپیہ کمانے اور عیسائی مذہب پھیلانے۔ ان دونوں مقصدوں کے حصول میں انھوں نے بڑے ظلم و جبر اور سفاکی سے کام لیا۔ ان کی یادگار اب ان کے کچھ لفظ اور کچھ دیسی عیسائی اور کچھ دوغلے مرد و زن باقی رہ گئے ہیں۔ ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کا کوئی قابلِ ذکر نشان باقی نہیں رہا۔ البتہ انگریزوں کے قدم یہاں ایسے جمے کہ وہ اکاس بیل کی طرح سارے ملک پر چھا گئے۔

ان سے قبل جتنے فاتح ہندوستان میں آئے وہ شمال مغرب کی طرف سے داخل ہوئے۔ مگر یہ یورپی قومیں سمندر کے راستے تجارت کے بھیس میں آئیں اور تجارت کی کوٹھیاں بناتے بناتے قلعے بنانے اور لشکر جمع کرنے لگیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنتِ دہلی میں انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے۔ صوبے خود مختار ہو گئے۔ یہ کبھی آپس میں لڑ مرتے، کبھی غیروں کی مدد سے ایک دوسرے پر حملہ کر بیٹھتے۔ کبھی مل کر غیروں سے جا بھڑتے اور کبھی غداری کر کے خود اپنی جڑ کاٹنے پر آمادہ ہو جاتے۔ انگریز ان حالات کا ایک شاطر کی طرح مطالعہ کرتا رہا اور کبھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ کبھی ایک کے ساتھ ہو گیا اور دوسرے کو شکست دی اور اس کمک کے معاوضے میں مصارف کے نام سے گراں قدر رقم لے لی اور کچھ حصہ ملک کا بھی ہتھیا لیا۔ کبھی کسی کو بڑھتا ہوا دیکھ کر چھیڑ خانی شروع کر دی اور اس کے حریفوں سے مل کر اس کے علاقے پر چڑھائی کر دی اور بندر بانٹ کے قدیم اصول پر اچھا حصہ اپنے لئے رکھ لیا اور منہ بھرائی کے طور پر ایک، ایک ٹکڑا ساتھیوں کے سامنے ڈال دیا۔ کبھی بادشاہ سے فرمان حاصل کر کے مقبوضہ علاقے کے قبضے کو جائز قرار دے لیا۔ ہمارے اسلاف ان فرنگیوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ ان کا لباس، کھانا پینا، رہنا سہنا، عادات و اطوار، ان کی زبان، غرض ان کی ہر بات ان کی نظروں میں نامانوس اور ناشائستہ تھی۔ ہمارے ایک لغت نویس نے فرنگی کی عجیب و غریب تعریف ان الفاظ میں کی ہے:-

"یکے از جانوران دریائی کہ گاہ گاہ بہ ساحل نمودار می شود"

اس میں "گاہ گاہ بہ ساحل نمودار می شود" کا کلمہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ ہمارے بزرگ زیادہ سے زیادہ ان کی تعریف یہ کرتے تھے کہ کاریگر اچھے ہیں، بندوق، توپ، گھڑی وغیرہ خوب بنانا جانتے ہیں۔ صاحبِ علم نہیں۔ وہ بھی مسلمانوں سے خوش نہ تھے اور اپنا وفادار خیال نہیں کرتے تھے بلکہ باغی سمجھتے تھے۔ ان کا ایسا سمجھنا کچھ بے جا نہ تھا اس لئے کہ سلطنت انھوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ اس لئے مسلمانوں سے بدگمان تھے اور بدگمان رہے۔ انھوں نے ابتدا میں جس مکر و فریب، جعلسازی، اندرونی سازشوں اور حکمتوں سے اپنا تسلط بڑھایا اور خاص کر اسلامی حکومتوں سے جو معاندانہ برتاؤ کیا اس نے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔ ان کے چہیتے اول درجے میں پارسی اور دوسرے درجے میں ہندو تھے۔ مسلمانوں کو اپنے اعتقادات، تہذیب و روایات اور علم و فضل پر غرہ تھا۔ وہ اس ملک کے فاتح اور حاکم رہے تھے۔ انھوں نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ملک کی کایا بدل دی اور باوجود زوالِ سلطنت کے انھوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور انگریز کے سامنے نہیں جھکے۔ وہ اسے حقیر اور نجس سمجھتے رہے۔

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا اس کارزارِ حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ہندو اس راز کو سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ملک میں ایسے کئی دور دیکھ چکے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ انھوں نے اس کی پروا نہ کی اور بالآخر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ مسلمانوں میں دو چار ہی خاندان ایسے تھے جنھوں نے اس کشمکش کے ابتدائی دور میں زمانے کے تیور پہچانے اور اپنی حیثیت اور وقار قائم رکھنے کے لئے بڑھے اور زمانے کا ساتھ دینے میں کچھ پس و پیش نہ کیا۔ ان میں ایک مولوی سید حسین بلگرامی کا خاندان تھا جس نے ہوا کا رُخ دیکھ کر انگریزی حکومت کا تقرب حاصل کیا۔

بلگرام اودھ کا نہایت مردم خیز قصبہ ہے۔ اس خاک سے ایسے جلیل القدر عالم و فاضل اُٹھے جن کے نام اپنے تبحر اور علم و فضل کی وجہ سے علمی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ سید حسین کے دادا سید کرم حسین کو انگریزی توسل حاصل ہوا اور وہ بہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہِ اودھ (۱۲۴۳ - ۱۲۵۲ھ) سرکارِ اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتے کے گورنر جنرل لارڈ بنٹنک کے دربار میں پہنچے۔ ان کی اولاد سید زین الدین حسین (والد سید حسین) اور سید اعظم الدین حسین نے وارن ہیسٹنگز کے بنا کردہ مدرسہ عالیہ میں علومِ مشرقیہ کی تکمیل کی اور ایسے زمانے میں جبکہ انگریزی پڑھنا حرام سمجھا جاتا تھا انگریزی بھی سیکھی۔ یہ پہلے مسلمان شریف زادے تھے جو اس بدعت کے مرتکب ہوئے اور باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کی۔

سید حسین کے چچا اعظم الدین حسین نے انگریزی حکومت میں بڑا اعزاز اور اعتماد حاصل کیا اور بڑی ذمہ داری کی خدمات پر مامور رہے۔ ابتدا میں لارڈ بنٹنک کے اے ڈی کان اور ترجمان رہے۔ اس کے بعد وہ سندھ میں حکومت کی طرف سے بطور سفیر یا پولٹیکل ایجنٹ امیرانِ سندھ و افسرِ اعلیٰ جہاز رانی دریائے سندھ متعین ہوئے۔ یہ عہدہ انگریزوں کے لئے مختص تھا۔ مگر امیرانِ سندھ اپنے ملک میں انگریز کا آنا پسند نہ کرتے تھے۔ سندھ میں سیدوں اور پیروں کی بے حد تعظیم و تکریم کی جاتی ہے اس لئے وہاں کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے۔ ہاتھ چومتے اور قدم لیتے۔ نواب عماد الملک فرماتے تھے کہ وہ کبھی کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھتے تاکہ لوگوں کو بدگمانی نہ ہو۔ اکثر سندھی ان کی خدمت میں تعویذ لینے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ اس لئے

جب کبھی کوئی عربی شعر یاد آتا یا آیت قرآنی تو وہ کاغذ پر لکھ کر ایک ٹوکری میں ڈال دیا کرتے تھے جب لوگ تعویذ مانگنے آتے وہ اس ٹوکری میں سے نکال نکال کر دے دیا کرتے۔ کچھ عرصے کے بعد کسی بدنفس نے یہ افواہ پھیلادی کہ یہ شخص دراصل انگریز ہے مسلمان بنا ہوا ہے۔ آدمی تھے گورے چٹے لوگوں کو یقین آگیا اور شورش برپا ہوگئی۔ اس سے ان کو جان کا خطرہ ہو گیا اور وہ راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر نکل بھاگے۔ اس کے بعد وہ ڈپٹی کلکٹر و ناظم بندوبست بہار چوبیس پرگنہ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ دو بار لیجسلیٹو کونسل بنگال کے ممبر نامزد ہوئے۔ حکومت نے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا کیا۔

سید اعظم الدین حسین کے دوسرے بھائی سید زین الدین حسین نے محکمہ مال میں ملازمت اختیار کی ۱۸۴۰ء میں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس ملازمت کے دوران میں انھیں ایک مدت تک اضلاع بہار و بنگالہ میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ مولوی سید حسین کی ولادت بھی مہاتما بدھ کی جنم بھومی ضلع گیا کے قصبہ صاحب گنج میں ہوئی۔ سید صاحب ۱۸۶۸ء میں پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

مولوی سید حسین کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ابھی چھ سات برس کے تھے کہ ان کو عربی شروع کرا دی گئی۔ وہ کہتے تھے کہ میری تعلیم کی ابتدا عربی زبان سے ہوئی حتیٰ کہ حساب اور اقلیدس بھی عربی میں پڑھی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ متداول عربی کی تحصیل سے فارغ ہو کر بھاگلپور پہنچے اور بعد ازاں کلکتے کے انگریزی مدارس میں تعلیم پاتے رہے۔ ۱۸۶۲ء میں میٹریکولیشن کی سند حاصل کی۔ ۱۸۶۶ء میں درجہ اوّل میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اپنے اثر سے کسی معقول سرکاری ملازمت میں منسلک کر دیں۔ لیکن نوجوان سید نے جو کالج کے کمروں سے تازہ تازہ نکلا تھا اپنے علمی ذوق کی بنا پر اس سررشتے کو پسند نہ کیا جو تمام سرکاری سررشتوں میں کم حیثیت سمجھا جاتا ہے اور ایک [illegible] [illegible] اس نے ڈپٹی کلکٹری پر معلمی کو ترجیح دی اور کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی زبان کی پروفیسری قبول کر لی اور اس طرح انھیں لکھنؤ میں مستقل طور پر رہنے کا موقع مل گیا۔

اس دوران میں ان کو لکھنؤ کی معاشرت اور وہاں کی تہذیب و آداب و اشغال اور مذہبی رجحانات دیکھنے کا اچھا موقع ملا اور وہاں کے علما و اکابر کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ شعر و سخن اور خاص کر مرثیہ گوئی کا مرکز تھا۔ ان تمام باتوں کا ایک قابل تعلیم یافتہ نوجوان پر اثر ہونا ضروری تھا۔ پروفیسری کے زمانے میں اخبار لکھنؤ ٹائمز کی اڈیٹری کے فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ یہ اخبار تعلقداران اودھ کے مفاد و اغراض کی حمایت کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ نے نہر سردہ نکالنی چاہی۔ اس سے تعلقداران اودھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے تعلقدار اس تجویز کے سخت مخالف تھے۔ اخبار پائنیر نے جو نیم سرکاری اخبار سمجھا جاتا تھا اس تجویز کی تائید میں پُر زور آرٹیکل لکھے۔ لکھنؤ ٹائمز کے نوجوان اڈیٹر نے ان مضامین کا جواب لکھا اور گورنمنٹ کی تجویز پر سخت نکتہ چینی کی۔ ایسی نکتہ چینی اور وہ بھی تعلقداران اودھ کے اخبار میں، حکومت کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ پروفیسر سید حسین معرض عتاب میں آگئے اور انھیں اڈیٹری سے دست بردار ہونا پڑا۔ اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ نواب سر سالار جنگ بہادر لارڈ نارتھ بروک کی ملاقات کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے لکھنؤ وارد ہوئے۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی مہمانداری اسی شان سے کی جیسی خود مختار رؤسائے عظام کی کی جاتی تھی۔ کل گورنران صوبجات ہند کو حکم پہنچ گیا تھا کہ ان کو اپنا مہمان سمجھیں۔ چنانچہ اسی غرض سے ریذیڈنٹ وقت مسٹر سانڈرس ہمرکاب تھے۔ لکھنؤ میں نواب صاحب جنرل ایبل ہیر چیف کمشنر کے ہاں فروکش ہوئے۔ جنرل ہیرو نے تعلقہ داران اودھ و دیگر امرائے شہر سے ملاقات کرائی۔ منجملہ ان کے پروفیسر سید حسین کا تعارف بھی نواب صاحب سے کرا دیا اور ان کی علمی و ادبی قابلیت کی بہت کچھ تعریف کی۔

نواب سر سالار جنگ بہادر بہت مردم شناس اور قدر دان تھے اور ان اصلاحات کے پیش نظر جو وہ حیدر آباد کی ریاست میں کرنا چاہتے تھے ان کی یہ تمنا تھی کہ ہندوستان کے قابل اور تجربہ کار اشخاص کو اپنی ریاست میں کھینچ لائیں۔ چنانچہ سید حسین سے ملنے کے بعد ان کو ریاست کی ملازمت کی ترغیب دی اور فرمایا کہ میں جب حیدر آباد واپس پہنچوں تو تم ضرور آؤ اور مجھ سے ملو۔ لیکن وہ حیدر آباد نہ گئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ فطرتاً ان کے مزاج میں استغنا تھا اور اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ دوسری وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ ریاست کی نوکری کو انگریزی ملازمت کے مقابلہ میں کمتر اور ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ نواب سر سالار جنگ کو اس کی بڑی شکایت تھی اور جب وہ اس قسم کی کوئی بات سنتے تھے تو انھیں رنج ہوتا تھا کیونکہ انھوں نے اپنی ریاست کو منظم اور باضابطہ بنانے میں بڑی حکمت اور تدبر سے کام لیا تھا اور اس کام میں انھیں ایسی ایسی مشکلات سے مقابلہ کرنا پڑا جن کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر خود نواب صاحب ہی نے اصرار کرکے بلا بھیجا۔ اس کے بعد بھی پس و پیش کرتے رہے اور آخر ۱۸۷۳ء میں حیدر آباد آئے اور آئے بھی تو تین مہینے کی رخصت لے کر۔ حیدر آباد پہنچے تو نواب سر سالار جنگ نے ان کے حال پر اس قدر شفقت اور عنایت فرمائی کہ وہ ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو گئے۔

ابتدا میں نواب صاحب نے انھیں اپنا پرسنل اسسٹنٹ (مددگار پیشی) بنایا۔ یہ خدمت بڑے اعتماد کی تھی۔ ریاستوں کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا یہ معاہدہ تھا کہ وہ کسی انگریز کو بغیر اجازت گورنمنٹ آف انڈیا ملازم نہیں رکھ سکتے۔ اس وقت حیدر آباد میں انگریزی معتمد (سیکرٹری) ایک انگریز مسٹر اولیفینٹ تھا۔ گورنر جنرل ڈلہوزی جو دیسی ریاستوں کا سخت مخالف تھا اور کئی ریاستوں کو ہڑپ کر چکا تھا۔ اس نے اس بنا پر کہ حیدر آباد کنٹنجنٹ کے مصارف کی رقم کئی سال سے ادا نہیں ہوئی تھی ریاست کے زرخیز علاقہ برار پر عارضی قبضہ کر لیا تھا۔ حضور نظام، ان کے امرا اور اہل حیدر آباد کو اس کا بہت صدمہ تھا اور یہ داغ ایسا تھا جو دولت آصفیہ کے دل پر آخر دم تک ہرا رہا اور ہر چند اس داغ کے مٹانے کی کوشش کی مگر زبردست مارے اور رونے نہ دے کا معاملہ تھا کامیابی نہ ہوئی۔ سر سالار جنگ نے اس مہم کا آغاز کیا۔ ان کی سب سے بڑی یہ آرزو تھی کہ یہ علاقہ انگریزی گورنمنٹ سے واپس لے لیا جائے۔ ان باتوں سے انگریزی گورنمنٹ بہت بگڑی تھی۔ نواب سالار جنگ نے غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کے بچانے میں جو بے نظیر مدد کی تھی وہ ایسا بڑا احسان تھا کہ انگریز ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجکتے تھے ورنہ کبھی کے ختم کر دیئے جاتے۔ برار اور اسی قسم کے دیگر اہم معاملات کے متعلق مراسلت انگریزی میں ہوتی تھی اور سیکرٹری مسٹر اولیفینٹ انگریزی حکومت کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ نزلہ بر عضو ضعیف ان پر برٹش گورنمنٹ کا عتاب نازل ہوا اور ان کو حیدر آباد چھوڑنا پڑا۔ مولوی سید حسین ان کے شریک معتمد

(جائنٹ سیکرٹری) تھے گو با اثر لیکن بے جرم تھے۔ حیدرآباد میں جب یہ افواہ پھیلی کہ مولوی سید حسین بھی معرضِ عتاب میں ہیں اور چند روز کے بعد نکال دیئے جائیں گے تو نواب سالار جنگ نے سن کر فرمایا کہ سید حسین کے نکالے جانے سے پہلے میں خود اپنے عہدے سے استعفا دے دوں گا۔ اس سے نواب صاحب کی کمال قدر دانی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ مولوی سید حسین کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان پر کامل اعتماد کرتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ کوئی انگریزی مراسلہ اس وقت تک جاری نہ کیا جائے جب تک مولوی سید حسین کی نظر سے نہ گزر جاتے۔

۱۸۷۶ء میں نواب صاحب نے یورپ کا سفر کیا تو مولوی سید حسین ان کے ہم رکاب تھے۔ واپسی پر مولوی صاحب کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری اور معتمد صیغۂ متفرقات مقرر فرمایا جس میں سررشتۂ تعلیم اور بعض چھوٹے موٹے محکمے شامل تھے۔ ۱۸۸۴ء میں جب حضور نظام (میر محبوب علی خان) مسند نشین ہوئے اور میر لائق علی عماد السلطنت بمدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو ایک کونسل آف اسٹیٹ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اہم معاملاتِ حکومت میں مشورہ دینا تھا۔ اس مجلس کے معتمد (سیکرٹری) مولوی سید حسین قرار پائے۔ اس کونسل کے میر مجلس خود بنفسِ نفیس اعلیٰ حضرت (میر محبوب علی خان) تھے۔ اس سال جشنِ نوروز میں ان کو علی یار خان مؤتمن جنگ کا خطاب عطا ہوا اور ۱۸۸۶ء میں بہ تقریب جشنِ نوروز عماد الدولہ اور ۱۸۹۰ء میں سالگرہ مبارک کے موقع پر عماد الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

کرنل مارشل کی علیحدگی کے بعد ۱۸۸۹ء (۱۳۰۶ھ) میں مولوی صاحب اعلیٰ حضرت کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے دستِ مبارک سے (اپنی زبان میں) ایک رقعہ مولوی صاحب کو لکھا جس کے الفاظ یہ ہیں :-

> "نواب عماد الملک بہادر۔ آپ کے واسطے خدمتِ خانگی پرائیویٹ سیکرٹری
> کی تقرر کیا ہوں جو اس خدمت کے واسطے کسی کو نہ سمجھا۔ ایسا قابل شخص
> انگریزی فارسی اردو اور بات کو مخفی رکھنے والا۔ اور جو اس خدمت کی
> کارروائی ہوگی وہ آپ کے پاس لکھ کر بھجوا دوں گا یا خود آؤں گا۔ مگر آپ
> کل دس بجے صبح میں آکر نذر دینا"

(دستخط یا محبوب)

۱۰ ؍ جمادی الثانی ۱۳۰۶ھ روز دوشنبہ شب سہ شنبہ

چند سال کے بعد ۱۹۰۲ء میں دوسرے مناصب سے کنارہ کش ہو کر وہ صرف ناظمِ تعلیمات (ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن) ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی کے عہدے پر متمکن ہوئے اور آخر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ یہ اگرچہ بعض اوقات اس سے بڑے مناصب پر سرفراز کئے گئے لیکن انھوں نے نظامتِ تعلیمات کو کبھی نہ چھوڑا اور ہر حال میں اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھیں بالطبع تعلیم اور علم و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ دوسرے وہ یہ سمجھتے تھے کہ بڑے عہدوں پر للچائی ہوئی نظریں پڑتی ہیں اور اقتدار کے بھوکے سفارشوں اور سازشوں کی مدد سے ان کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اہلیت و نااہلیت کوئی نہیں دیکھتا۔ نظامتِ تعلیمات ایک معمولی عہدہ ہے، تنخواہ بھی زیادہ نہیں اور قوت و اقتدار بھی واجبی ہی سا

ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرے یہ عہدہ دوسرے فوائد سے بھی محروم ہے۔ باوجود اس کے نواب عماد الملک کا وقار بوجہ علم و فضل اور اعلیٰ سیرت کے ایسا تھا کہ ان کے اعلیٰ افسر اور بڑے بڑے امرا و وزرا ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ تقریباً ۳۲ سال تک دوسری خدمات کے ساتھ بلا وقفہ اس عہدے پر رہے۔ ریاست حیدر آباد میں باقاعدہ تعلیم کی بنیاد آپ ہی نے رکھی اور سررشتۂ تعلیم کی جدید تنظیم آپ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مدارس اور طلبہ میں بہت کافی اضافہ ہوا۔ علاوہ اس فرض منصبی کے ان کے اثر اور صحبت سے حیدر آباد میں علمی ذوق کو بہت فروغ ہوا۔ صنعت و حرفت کے مدارس بھی ریاست میں آپ ہی نے قائم کئے۔ دیسی صنعت کے بڑے قدر دان تھے۔

حیدر آباد میں ان کے علمی ذوق کی دو بڑی قابل یادگاریں ایسی ہیں جن کی افادیت اور اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔ ایک کتب خانہ سرکار عالی اور دوسرا دائرۃ المعارف۔ اس کتب خانہ کے لئے مطبوعہ کتب کے علاوہ نادر اور کمیاب قلمی کتابیں ایسی جمع کیں کہ اس کا شمار اس برّ عظیم کے بہترین کتب خانوں میں ہو گیا۔ یہ نادر مخطوطات زیادہ تر عربی زبان کی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ جن کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ قلمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدر دانی پر ہے۔ بعض وقت سودا کرنے میں انمول کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پچھتاوا عمر بھر رہتا ہے۔ نواب عماد الملک کتاب کے بڑے قدر دان تھے اور اس قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آ گئی تو لئے بغیر نہ چھوڑتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ اس فیاضی کی بدولت کتاب فروش یا جن کے پاس کوئی اچھی یا نادر کتاب ہوتی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جو لوگ کتاب کی قدر و قیمت سے واقف نہیں تھے وہ اس پر بہت جھنجھلاتے اور اسے اسراف سے منسوب کرتے اور طعن کرتے کہ مولوی صاحب سرکاری روپیہ ان چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار انھوں نے چار پانچ عربی کتابیں آٹھ ہزار روپے میں خریدیں اور جب رقم کی منظوری کے لئے مطلوبہ مدار المہام سرکار عالی نواب وقار الامرا کی خدمت میں پیش ہوا تو کسی مصاحب نے چپکے سے کہہ دیا کہ سرکار! مولوی سید حسین صاحب کی عادت ہے کہ وہ کتابیں خریدنے میں سرکاری روپیہ بیدردی سے خرچ کرتے ہیں اور جو جتنی قیمت مانگتا ہے دے دیتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو بھی اس کی سن گن پہنچ گئی۔ انھوں نے مدار المہام سے کہا کہ کتابیں واپس فرما دی جائیں۔ میں انھیں خود خرید لوں گا اور یورپ بھیج کر اس سے چار گنی قیمت وصول کر لوں گا۔ مدار المہام نواب وقار الامرا نے جو بہت بامروت، فیاض اور سیر چشم امیر تھے بہت معذرت کی اور فوراً رقم ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک ایسا ہی واقعہ میرے سامنے پیش آیا۔ نواب عماد الملک نے کچھ کتابیں خریدیں اور رقم کی منظوری کے لئے ہوم آفس کو لکھا۔ سررشتۂ تعلیمات ہوم آفس کے ماتحت ہے۔ اس وقت ہوم سیکرٹری افضل العلما نواب حمید اللہ خاں فرزند مولوی سمیع اللہ خاں تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ بعض کتابیں جو مطبع نول کشور سے چند روپے میں مل سکتی ہیں ان کی قیمت ڈیڑھ ڈیڑھ اور دو دو سو روپے لکھی ہے تو انھیں تعجب ہوا اور لکھا کہ کتابیں ملاحظہ کے لئے بھیج دی جائیں۔ نواب عماد الملک نے لکھا کہ کتابیں کسی کے پاس نہیں جائیں گی جسے دیکھنا ہو یہاں آ کر دیکھے۔ ہوم سیکرٹری صاحب نے بے چون و چرا منظوری دے دی۔ نام کے افضل العلما صاحب کیا جانیں کہ ایک کتاب جو بازار میں دو چار روپے میں مل جاتی ہے وہی کتاب اگر مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہو یا اس کا کوئی قدیم صحیح

نسخہ مل جائے تو اس کی قدر و قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح نواب عماد الملک نے نایاب کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ سرکاری کتب خانہ میں جمع کر دیا۔

علمی لحاظ سے نواب صاحب کا دوسرا بڑا کام دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔ اس کا مطبع بھی ہے۔ اس ادارے نے عربی کی بہت سے نادر کتابیں طبع و شائع کی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے قلمی نسخے نایاب تھے اور دو ایک سے زیادہ دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں پائے جاتے تھے۔ ان کی قدر اور شہرت ہندوستان سے زیادہ عرب ممالک اور بلادِ یورپ میں ہوئی۔ اس ادارے کا قیام سنہ ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء) میں ہوا۔ اس وقت پانچ سو روپے ماہانہ اس کے مصارف کے لئے مقرر ہوئے۔ اس کے بعد نواب صاحب کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے سنہ ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۱ء) میں اسے ایک لاکھ روپیہ اور ایک سال بعد پانچ لاکھ روپے عطا فرمائے۔ بھارت کے ناجائز قبضے کے بعد ریاست حیدر آباد پر جو آفات نازل ہوئیں ان میں دو ایسی ہیں جن کا صدمہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ ایک عثمانیہ یونیورسٹی کی تخریب دوسری دائرۃ المعارف کا خاتمہ۔ افسوس نواب عماد الملک کی یہ بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے جو قابل قدر کام کیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور کبھی نہیں مٹ سکتا۔

نواب صاحب کو عربی زبان سے بے حد محبت تھی۔ دائرۃ المعارف اسی محبت کا نتیجہ تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:-

> "مجھے ایک مدت تک بالذات ان کی روزانہ صحبتوں میں شریک ہونے کی عزت حاصل رہی ہے اور ان کے طالب علمانہ مشاغل میں شریک ہو کر میں نے ان کے علم و فضل سے فائدہ اٹھایا ہے اسی سلسلے میں مجھے ان کی واقفیت عامہ، ان کے مذاق اور ان کے اسلوب زندگی کا اندازہ کرنے کا بخوبی موقع ملا۔ شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنے میں چند روز میں ان کے ساتھ شریک رہا اور نظر آیا کہ جیسی محققانہ و مبصرانہ نظر کلام عرب پر ان کی پڑتی ہے بہت کم کسی کی پڑتی ہے سچ یہ ہے کہ میں نے انھیں ادب عربی میں یکتائے روزگار پایا۔ جاہلیت عرب کے سادے اور خالص عربی مذاق کے دلدادہ ہیں۔ شعرائے جاہلیت کے کلام پر سر دھنتے ہیں اور مولدین کے کلام کو بالکل نہیں پسند کرتے۔"

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں آپ نے جامعۂ عثمانیہ کے ذکر کے دوران میں عربی زبان کی تعلیم کی خاص طور پر تاکید کی تھی۔ فرماتے ہیں:-

> "دوسرا امر جس کی طرف کارپردازان جامعہ علیہ کی توجہ مبذول ہونی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبان تعلیمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور کئے جائیں۔ اگر فقط اردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بجز ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبہ سے آپ کے کامیاب طلبہ پیچھے رہ جائیں گے اور آپ کی ساری محنت اکارت جائیگی۔ طلبہ کو وہ پایۂ فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی ان کو اور ہم کو اور ان کی قوم کو ضرورت ہے۔

عربی زبان کو مختلف حیثیتوں سے ہم مسلمانوں پر حق تحکم حاصل ہے۔"

اس کے بعد اس کی تفصیل بیان کی،

> "میں نے اورنگ آباد میں کالج قائم کرنے کی تجویز کی تھی۔ نواب صاحب کی تائید و تحریک سے جلد منظوری حاصل ہوگئی۔ قیام کالج کے بعد آپ نے ان طلبہ کے لئے وظیفے مقرر کئے جنھوں نے عربی زبان لی تھی اور ہر سال بغیر یاد دہانی یا تقاضے کے وقت پر میرے پاس چیک آجاتا تھا۔"

مولوی حبیب الرحمان خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ) نے مرحوم نواب صاحب کے علم و ادب کے شغف کے متعلق اپنی ایک تقریر میں یہ واقعہ بیان فرمایا:

> "جس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس گجرات میں منعقد ہوئی، وہاں پرانی علمی کتابوں کی تباہی دیکھ کر میں نے ایک اپیل شائع کی کہ روپے کی امداد دے کر ان کتابوں کے خریدنے اور محفوظ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ نواب عماد الملک بہادر مرحوم نے اپیل پڑھ کر خط لکھا کہ اپیل پڑھ کر کتابوں کی تباہی پر میں رو رہا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس روپیہ نہیں اس لئے ایک ہزار روپے کا چیک پیش کرتا ہوں۔ یہ تھی مرحوم کی کریم النفسی اور علم کی شیفتگی۔"

اسی طرح نواب اسحاق خان مرحوم سیکرٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ نے امیر خسرو کی تصانیف کی اشاعت کا اعلان کیا تو نواب عماد الملک بہادر نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور مالی امداد کا بھی وعدہ فرمایا۔ اس قسم کے علمی و ادبی کاموں کی امداد کے لئے وہ بغیر طلب اور تقاضے کے آمادہ ہو جاتے تھے۔

وہ اس قسم کے تمام علمی کاموں میں بڑی خوشی اور فیاضی سے مدد دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں نواب صاحب نے نواب محمد اسحاق خان آنریری سیکرٹری مدرسۃ علوم مسلمانانِ علی گڑھ کو خط لکھ کر امیر خسرو کی تصانیف کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ دلائی جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:

> "نہایت وثوق کے ساتھ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں گزرا ہے جس کی تصانیف اس درجہ لائقِ حفاظت و اشاعت ہوں جیسا کہ امیر خسرو . . . . اگر آپ کی کوشش سے اس مشہورِ زمانہ عدیم النظیر مصنف کا پورا کلامِ نظم و نثر جمع ہو کر چھپ گیا تو یہ قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی جس کا نفع غیر محدود ہوگا اور جو سعی کرنے والوں کے نام کو بھی زندۂ جاوید بنا دے گی۔
>
> میں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کے لئے اس کو وقف کر دیتا ——— بایں ہمہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مالی

مدد دوں گا اور اپنے احباب سے بھی کچھ رقم وصول کر کے بھیجوں گا۔ کام شروع کرنے کے لئے
خود ایک ہزار روپے اس وقت دیتا ہوں اور بوقتِ ضرورت ایک ہزار اور دونگا۔"

اس کے بعد نواب اسحاق خان بالکل آمادہ ہو گئے۔ نواب عماد الملک نے دو ہزار دئیے۔ سرکارِ عالی سے ساڑھے سات ہزار، نواب سالار جنگ سے ایک ہزار، مولوی انوار اللہ خان صاحب فضیلت جنگ سے پانسو کل گیارہ ہزار جمع کر کے بھیجے۔

اسی طرح وہ اہلِ علم کی مدد کرتے تھے اور جب کبھی ان کے علم میں آجاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش کر کے حکومت سے امداد دلوانے میں دریغ نہ کرتے۔

مولانا محمود حسن ٹونکی مرحوم ایک عالمِ متبحر تھے۔ علومِ اسلامیہ پر ان کی نظر بہت وسیع اور گہری تھی۔ بہت روشن خیال اور نہایت زندہ دل اور خوش مزاج بزرگ تھے۔ وہ مصنفینِ اسلام پر ایک کتاب گویا انسائیکلو پیڈیا لکھ رہے تھے۔ ایک جلد مصر میں طبع ہوئی تھی اور وہاں کے علما نے اسے بہت پسند فرمایا۔ دوسری جلد کی نوبت ابھی نہ آئی تھی کہ جنگِ عظیم کی آفت نازل ہوئی اور وہ مسودہ تلف ہو گیا۔ میں نے نواب عماد الملک بہادر سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فوراً اعلیٰ حضرت حضور نظام کو لکھ کر منظوری حاصل کی اور مولانا کو حیدر آباد طلب فرما کر اس کام پر مامور کر دیا اور ایک معقول تنخواہ ان کے لئے مقرر ہو گئی اور ایک مختصر سا عملہ بھی دے دیا گیا۔ یہ بہت وسیع اور عظیم الشان کام تھا۔ مولانا دن رات اس میں مصروف رہتے تھے۔ چند حصے دائرۃ المعارف میں طبع بھی ہوئے۔ باقی مجلدات عثمانیہ یونیورسٹی کے ادبی انبار میں پڑی سڑ رہی ہیں جن کا اب کوئی قدردان نہیں۔ اس تصنیف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب اس کے بعض حصے ڈاکٹر کرنکو کی نظر سے گزرے جو عربی علوم کے محقق فاضل تھے تو انھیں یقین نہ آتا تھا کہ یہ اتنا بڑا اور ایسا مشکل کام ایک فردِ واحد کا کیا ہوا ہے۔

اسی طرح جب مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری نے دکن کی مبسوط تاریخ لکھنی شروع کی تو نواب صاحب نے سفارش کر کے دولتِ آصفیہ سے چھ ہزار روپے منظور کرائے۔

مولوی عبداللہ خاں نے بعض بہت مفید علمی کتابیں چھپوا کر شائع کیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور کتب خانہ آصفیہ ہی میں رہتے تھے۔ نواب صاحب نے ان کی سرپرستی فرمائی اور سروِ آزاد اور مآثر الکلام جیسی کتابوں کی اشاعت پر اپنی جیب سے مختلف اوقات میں کئی ہزار روپے عنایت فرمائے اور اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے تاحیات پچاس روپے وظیفہ مقرر کرا دیا۔

ایسے ہی ایک دو صاحبوں کا جو علمی یا مذہبی کام کر رہے تھے میں نے ان سے اور انھوں نے اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے منصب (یعنی دوامی وظیفہ) مقرر کر دیا۔

طالب علموں کی اکثر مدد کرتے رہتے تھے اگر کسی تعلیم کے شوقین نادار طالب علم کی سفارش کی جاتی تو تعلیمی وظیفہ مقرر کر دیتے

ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ دلّی سے ایک نوجوان عبدالرؤف کا خط آیا ہے جو ابھی انگلستان سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر آئے ہیں لیکن بوجہ کم استطاعتی اپنا کام شروع نہیں کر سکتے۔ انھوں نے مجھ سے مالی مدد طلب کی ہے۔ میں نے کہا یہ نوجوان میرن صاحب کے نواسے ہیں۔ ان کو اس کا علم نہ تھا۔ لیکن وہ اس نوجوان کے حسنِ تحریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً لکھ کر بھیجا کہ تمھیں کس

قدر رقم کی ضرورت ہے اطلاع دو کہ اس کا انتظام کر دیا جائے۔ وہ بھی ایسے خوددار اور شریف النفس تھے کہ جواب میں لکھا یہاں حسب دل خواہ انتظام ہو گیا ہے۔ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ ایک روز مجھ سے پوچھنے لگے کہ ایسا معلوم ہوا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کی ٹیم کھیلوں کے دورے پر جا رہی ہے۔ میں نے کہا ہاں فلاں فلاں مقام پر جائیں گے۔ یہ سننے کے بعد کئی سو روپے ان کے سفر خرچ کے لئے بھجوا دیئے۔

نواب صاحب کا ادبی ذوق اعلیٰ درجے کا تھا۔ فارسی اور عربی کے جیّد عالم تھے فرنچ خوب جانتے تھے اور انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت تھی۔ وہ ایرانیوں سے فارسی میں اور عربوں سے عربی میں بلا تکلف گفتگو کرتے تھے۔ جب امیر امان اللہ خاں ہندوستان آئے اور ان کے پروگرام میں علی گڑھ کالج کا معائنہ بھی تھا تو نواب محسن الملک نے امیر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے فارسی سپاس نامہ نواب عماد الملک بہادر ہی سے لکھوایا تھا۔ عربی ادب کے ذوق کے متعلق شرر صاحب کی رائے لکھ چکا ہوں کہ وہ جاہلیت کے شعراء کے سادہ اور پُرجوش کلام کے بہت مداح تھے اور مولّدین کا کلام پسند نہیں کرتے تھے۔ فارسی میں وہ شیخ سعدی کے بہت قائل تھے اور شیخ کی عاشقانہ شاعری کو حافظ کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے۔ اردو میں لکھنؤ کی شاعری بہت ناپسند تھی۔ انھیں لفظی صنائع سے جس پر لکھنوی شاعری کا دارومدار تھا اور عامیانہ خیالات سے بہت چڑ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری زبانوں (اردو، فارسی، عربی) میں نثر تھی ہی نہیں وہ ایک قسم کی شاعری یا نیم شاعری تھی۔ حالی نے اردو کو متین نثر عطا کی جو علمی اور ادبی مضامین ادا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میر انیس کی شاعری کے بہت مداح تھے اور ان کے کلام کے بعض اشعار جنھیں وہ ان کا شاہکار سمجھتے تھے زبانی یاد تھے اور کبھی کبھی سناتے تھے لیکن کہتے تھے میر صاحب بھی بعض اوقات لفظی رعایت اور صنائع بدائع سے دامن نہ بچا سکے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ میں نے میر صاحب سے پوچھا کہ "آپ لفظی رعایتوں اور صنائع بدائع کو پسند کرتے ہیں" تو انھوں نے جواب دیا "نہیں" لیکن آخر لکھنؤ میں رہتا ہے۔ انگریزی زبان میں متعدد مقالے اور مضامین اور نظمیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں لکھیں کتاب کی صورت میں شائع ہو گئی ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کا وہ فاضلانہ مقالہ بھی ہے جو انھوں نے "اصطلاحاتِ علمیہ" پر تحریر فرمایا تھا۔ یہ آج سے تقریباً چوراسی پچاسی برس پہلے لکھا گیا تھا مگر اب بھی پڑھنے کے قابل ہے اور اس میں جو نکات اصطلاحات کے وضع یا ترجمہ کرنے یا اپنے قدیم الفاظ کو کام میں لانے کے متعلق بیان کئے ہیں اور انگریزی اصطلاحات کو بجنسہٖ اختیار کرنے کے خلاف جو بحث کی ہے اور اس مسئلہ کے متعلق بعض مختلف آرا پر جو تنقید فرمائی ہے اس کا مطالعہ اب بھی ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ نواب صاحب کی انگریزی انشا پردازی کے نہ صرف ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ بلکہ اہل زبان بھی معترف تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک وفد آغا خان کی سرکردگی میں لارڈ منٹو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کا بہت اہم اور تاریخی وفد تھا جس میں ملک کے متعدد صاحب الرائے اور نام و نمود کے مسلمان شریک تھے۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے بہت نازک تھا۔ تنسیخ تقسیم بنگال کے بعد سے مسلمانوں میں عام طور پر مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وفد کی تجویز نواب محسن الملک کے فکرِ رسا کا نتیجہ تھی جو اپنے وقت کے نہایت دور بیں اور روشن خیال سیاست دان تھے۔ انھی نے آغا خان کو گھیرا اور نواب عماد الملک کو بلا کر وہ ایڈریس لکھوایا جو وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا جانے والا تھا۔

سیاست میں وہ سر سید احمد خاں کے پیرو تھے۔ جب سر سید نے انڈین نیشنل کانگرس کی بعض وجوہ کی بنا پر مخالفت کی تو اس کی تائید میں ایک بہت پُر زور تحریر انگریزی زبان میں لکھ کر شائع کی۔ وہ انگریزی حکومت کو ملک کے حق میں باعث خیر و برکت سمجھتے تھے۔ پرانے لوگ اکثر اسی خیال کے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کی طوائف الملوکی اور دیسی حکومتوں کی بدنظمی، ابتری، ناانصافی، رشوت خواری، ظلم و جبر دیکھے تھے۔ انگریزوں نے ریلیں جاری کیں، تار گھر، ڈاک خانے بنائے، عدالتیں قائم کیں، لوٹ مار اور ظلم و جبر کا انسداد کیا، تعلیم پھیلائی اور مدرسے اور کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں، سفر کی آسانیاں پیدا ہو گئیں، انصاف ہونے لگا، امن و امان قائم ہو گیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ انگریزوں سے بہت خوش تھے اور ان کی عقل و دانش اور انتظام و انصاف کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان بزرگوں کو ملک کے اقتصادی اور سیاسی حالات سے کچھ بحث نہ تھی اور نہ وہ ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ تو کیا جسٹس رانا ڈے تک نے اپنے ایک خطبے میں انگریزوں کو مشیت ایزدی اور ملک کے حق میں باعث خیر فرمایا ہے۔ ابتدا میں گوکھلے اور گاندھی بھی یہی کہتے تھے۔ شروع شروع میں انڈین نیشنل کانگرس کا بھی یہی خیال تھا۔ اس وقت کانگرس والے صرف اتنا چاہتے تھے کہ انھیں حکومت میں ذمہ داری کے عہدے ملیں اور حکومت کے نظم و نسق میں ان کا بھی دخل رہے۔ حالات کے مطالعے اور اقتصادی اور سیاسی امور میں غور کرنے اور عملی تجربوں میں پڑنے سے ان کا نقطہ نظر بدل گیا۔ ہمارے بزرگ جو زمیندار قسم کے تھے اپنے پرانے خیال سے نہ ہٹے۔ ان میں بہت کم ایسے تھے جنھوں نے ملکی معاملات کو غور سے دیکھا ہو اور ان میں بصیرت حاصل کی ہو۔ مولوی قسم کے لوگ جو انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کو مسلمانوں کا بدخواہ سمجھتے تھے، ان کی نفرت کچھ تو مذہبی تعصب پر مبنی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ مسلمانوں کی حکومت اور وقار کو ان سے نقصان پہنچا تھا۔ یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی کہ انگریزی حکومت سے ہمیں نقصانات کیا پہنچے اور بعض اب تک نہ سمجھے۔ اس بارے میں نواب عماد الملک کا ذاتی خیال اس ایک جملے سے ظاہر ہوگا کہ جس زمانے میں وہ انڈین لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے، انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ہمیں حکومت میں جنٹلمین کی ضرورت ہے۔ یہ وہی پرانا خیال ہے جس کا اظہار ہمارے بزرگ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مقابلے کے امتحان میں ایرے غیرے کامیاب ہو کر آ جاتے ہیں اور ہم پر حاکم بنا دئے جاتے ہیں جو شریفانہ اطوار و آداب سے عاری ہوتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو خاندانی شرافت کا بڑا خیال تھا اور اسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ قصباتی شرفا اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ گو انھیں بلگرام میں رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا تھا تاہم قصباتی شرفا کی خو بو ان میں موجود تھی۔ ایک دن اتفاق سے میں ان کے ہاں گیا تو دیکھا ایک صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب وہ رخصت ہو کر چلے گئے تو کہنے لگے یہ شخص شریف نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے کہا بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ آدمی تعلیم یافتہ ہیں۔ کہنے لگے بعض الفاظ کا تلفظ غلط کر رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر کسی قدر تعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ یہ شرافت کی پرکھ بھی عجیب ہے۔ ایک مولانا حالی تھے جو کہہ گئے ہیں سے

کچھ اور آؤ بن کر تم اے شیخ و مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ

میں نے مولانا سے پوچھا "کچھ اور آؤ بن کر" سے کیا مراد ہے۔ فرمایا "مزدور"۔ دونوں اشراف ہیں اور قصباتی ہیں۔ ایک نہ

زبان میں بات چیت کرنا ناپسند کرتا ہوں۔ وہ صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور معذرت کرنی پڑی۔

وہ ہندوستان کے نظامِ تعلیم کو اس وجہ سے بھی ناپسند کرتے تھے کہ اس میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ ان کی رائے میں یہ طریقہ نہ صرف حصولِ علم میں مانع ہے بلکہ اس کا اخلاق پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جامعہ عثمانیہ کے طرزِ تعلیم کے حامی تھے کہ اس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ چنانچہ ان خیالات کا اظہار انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ حیدرآباد دکن ۱۹۱۷ء میں کیا ہے جس کا مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> "ثانوی مدارس میں ابتدا سے انگریزی شروع کر دی جاتی ہے جو ہمارے لئے ایک اجنبی اور نہایت ادق زبان ہے اور لڑکے مجبور کئے جاتے ہیں کہ تمام ابتدائی فنون مثل حساب، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ کے اس غیر مانوس زبان کے ذریعہ سیکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی زبان سے کم و بیش ناواقف رہ جاتے ہیں اور انگریزی بھی اچھی طرح نہیں آتی۔ بیشتر تعداد طلبہ کو دس دس بارہ بارہ سال اسکول ہی کی حدود کے اندر صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس عرصۂ دراز میں ان کو کیا حاصل ہوتا ہے ... انگریزی قدرے قلیل سیکھ لیتے ہیں۔ انگریزی میں حساب کے معمولی سوالات کا جواب دے سکتے ہیں ... جغرافیہ جانتے ہیں، اقطارِ دنیا کے نام جانتے ہیں، خاص خاص ملکوں کے مشہور و معروف شہروں، ندیوں، پہاڑوں کے انگریزی نام بتا سکتے ہیں اور نقشے میں ان کا نشان دے سکتے ہیں، یورپ خصوصاً انگلستان کی تاریخ کسی قدر جانتے ہیں، ہندوستان کی تاریخ سے بھی ایک حد تک واقف ہیں اور آپ کو بتا سکتے ہیں کہ جہانگیر ایک شرابی سلطنت سے بے خبر اور اورنگ زیب ایک سخت متعصب اور ظالم بادشاہ تھا۔ اپنی زبان سے بالکل لاعلم نہیں کٹر مٹر بول لیتے ہیں مگر اپنی مذہبی زبان اور بزرگوں کے علوم اور حالات سے بالکل نابلد ہیں۔ کالج میں چار پانچ سال تعلیم پانے کے بعد ان کی حالت میں زیادہ تغیر نہیں ہوتا بجز اس کے ہمہ تن مغربی دنیا کے مقلد بن جاتے ہیں۔ ہر امر میں مغربی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قومی اخلاق اور پاکیزہ تہذیب چھوڑ کر مغربی اخلاق اختیار کر لیتے ہیں۔ آپس میں گفت و شنید، بات چیت، سلام علیک سب انگریزی زبان میں کرنا ان کو بھاتا ہے۔ کھانا پینا انگریزی قسم کا پسند کرتے ہیں۔ اپنے آٹھ کروڑ ہم مذہبانِ ہند کو مسلم ڈیماکریسی کے نام سے شرف بخشتے ہیں۔ اپنی زبان میں تحریر و تقریر کرتے ہیں تو اس میں حتی الوسع انگریزی لغات کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ بہتوں کو نماز نہیں آتی سورے یاد نہیں۔ ایک صاحب کو میں نے سنا ہے کلمہ تو جب تک معلوم نہ تھا کہ

کیا شے ہے اور کس کا نام ہے۔"

کالجوں میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:

> "اگر یہی طریقہ قائم رہا تو ہماری آبائی زبان یعنی اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائیگی
> اور عام طور پر ہمارے ہم قوم و ہم وطن علوم مغربیہ سے ناآشنا رہیں گے . . . . .
> اگر اس مبارک عثمانیہ یونیورسٹی یعنی جامعۂ عثمانیہ کو جس میں خاص اردو زبان واسطۂ
> تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے حسب امید کامیابی ہوئی تو یہ عیب مٹ جائیگا
> اور ہماری زبان قلیل عرصے میں دولت علمیہ سے مالا مال ہو جائے گی۔"

جب ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کا کام مجھے تفویض ہوا تو میں نے صدارت کے لئے نواب صاحب کا نام پیش کیا۔ انجمن کی مجلس انتظامی نے بالاتفاق منظور کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان سے بہتر ہمیں انجمن کی صدارت کیلئے نہیں مل سکتا تھا۔ انجمن کو ان سے علاوہ ادبی علمی مشورے کے ہر قسم کی مدد ملی۔ مثلاً میں نے ایک دن عرض کیا کہ اگر آپ ہز ہائی نس آغا خان سے انجمن کی امداد کی تحریک فرمائیں تو امید ہے کہ معقول عطیہ مل جائے۔ کیونکہ وہ قومی اور علمی کاموں کی امداد میں بہت فیاض ہیں۔ انھوں نے فوراً کاغذ قلم لے کر فارسی زبان میں خط لکھ مارا۔ مگر آغا خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس زمانے میں آغا خان یورپ میں تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی سید راس مسعود نے انگلستان کا قصد کیا۔ میں نے ان سے کہا آغا خان بھی آج کل وہیں تشریف رکھتے ہیں ذرا ان کو کھٹکھٹا دیجئے گا۔ حضرت نے نواب عماد الملک کے خط کا جواب تک نہ دیا۔ سید صاحب سفر سے واپس آئے تو کہا۔ آغا خان سے ملا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچنے والا ہوں وہاں ملئے۔ چنانچہ اس تاریخ کو میں اور سید صاحب بمبئی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ پونا تشریف لے گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ پونے آ کر ملئے۔ میں نے سید صاحب سے کہا۔ بس آپ تشریف لے جائیے۔ مجھے معاف رکھئے۔ وہ گئے۔ ہز ہائی نس آغا خان تپاک سے ملے۔ انجمن کا معروضہ سماعت فرمایا۔ اپنے کارندۂ خاص کو بلایا۔ حکم دیا کہ انجمن کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ کے حساب سے دس ہزار کا عطیہ ہماری طرف سے دیا جائے۔ اس نے فوراً یہ حکم اپنی دستی میں ٹانک لیا۔ اس کے بعد کئی بار یاد دہانی کی گئی جواب ندارد۔ بڑے آدمیوں کے وعدے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایفا کو بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ میرے پاس ایسے بہت سے شاندار وعدے موجود ہیں۔ اس دنیا میں تو ان کی کچھ پوچھ گچھ نہ ہو گی۔ ایک روز داور محشر کے آگے پیش کرنے پڑیں گے۔

اسی طرح جب میں حیدرآباد سے وطن (شمالی ہند) جانے لگا تو نواب صاحب سے عرض کی کہ اگر مناسب ہو تو انجمن کی امداد کے سلسلے میں ایک خط نواب صاحب رام پور (نواب حامد علی خان) کے نام عنایت فرمایا جائے۔ آپ نے ایک خط فرماں روائے ریاست رام پور کے نام لکھ کر دیا جس میں انجمن کے کارناموں کا مفصل ذکر تھا۔ میں نے یہ خط لے جا کر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ چند سطریں پڑھ کر اپنے معتمد خاص کے حوالہ کر دیا۔ میں نے چاہا کہ انجمن کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن انھوں نے نواب عماد الملک کی توصیف و ثنا شروع کر دی۔ وہ ان کا نام بڑے ادب سے لیتے تھے اور ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کو نواب عماد الملک سے خلوص ہے۔ وہ ملتجیانہ لہجے میں مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ کسی طرح آپ انھیں یہاں

لائیے۔ مجھے بے حد مسرت ہوگی۔ میری بڑی تمنا ہے کہ وہ کچھ دن میرے پاس آ کر رہیں۔ میں نے کہا ان کی ٹانگ کو جب سے صدمہ پہنچا ہے انہیں اٹھنے بیٹھنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ جب کسی سے ملاقات کرنی ہوتی ہے تو اپنے خاص کمرے سے پہیے دار کرسی میں باہر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا یہاں آنا محال ہے۔ کہنے لگے آپ کسی طرح انھیں بمبئی تک لے آئیے پھر میں بمبئی پہنچ کر نہایت آسائش و آرام کے ساتھ یہاں لے آؤں گا۔ غرض میں وہاں تین چار روز رہا۔ بہت خوشی سے ملتے۔ بلکہ بعض اوقات دور ہی سے دیکھ کر بڑے تپاک سے "آیئے آیئے مولوی صاحب آیئے" کہتے اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے لیکن انجمن کا معاملہ کبھی بیچ میں نہ آنے دیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غیر ضروری اور بے جا کاموں میں روزانہ ہزاروں روپے صرف کر دیتے ہیں۔

اورنگ آباد سے مجھے اکثر سرکاری کاموں یا محکمۂ تعلیم یا یونیورسٹی کی کمیٹیوں میں شرکت کے لئے حیدر آباد آنا پڑتا تھا۔ قیام حیدر آباد کے ان ایام میں نواب صاحب سے ملتا رہتا تھا۔ ایک روز جو میں گیا تو چلتے وقت مجھ سے پوچھنے لگے کیا امپیریل بنک آپ کی قیام گاہ کے قریب ہے؟ میں نے کہا جی ہاں قریب ہی ہے۔ فرمایا یہ خط بنک میں بھجوا دیجئے گا۔ آخر زمانے میں وہ چلتے وقت کسی ایسے ملنے والے سے جو قابلِ اعتماد ہو اور جس سے تکلف نہ ہو رخصت کے وقت یہ پوچھ لیتے تھے کیا ڈاک خانہ آپ سے قریب ہے؟ اور جو وہ کہتا کہ قریب ہے تو وہ اپنے خط دے دیتے تھے کہ یہ ڈاک میں ڈلوا دیجئے گا۔ میں نے مکان پر آ کر خط بنک میں بھجوا دیا۔ دوسرے دن بنک نے مجھے اطلاع دی کہ نواب عماد الملک نے دو ہزار کا چیک انجمن کے نام پر بھیجا تھا جو انجمن کے حساب میں درج کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن جو میں ملنے گیا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ فرمایا اس کا اعلان نہ کرنا اور نہ کسی اخبار یا رپورٹ میں لکھنا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ رقم انجمن کے حساب میں درج ہو گی تو سالانہ رپورٹ میں بھی ذکر آئے گا اور جیسے اور عطیات کا اعلان کیا جاتا ہے اس کا بھی کیا جائے گا۔ آپ جو منع فرماتے ہیں اس میں کیا مصلحت ہے۔ کنگ کوٹھی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا وہ کہیں گے کہ مجھے کیوں نہیں دیا۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں جو لوگ حضور نظام میر عثمان علی خان کی عادات و خصائل سے واقف ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے۔

رسالہ اردو کو بالالتزام پڑھتے تھے۔ بعض اوقات بعض مضامین کے متعلق رائے یا مشورہ دیتے اور کبھی کبھی الفاظ کی صحت و غلطی کے متعلق رائے لکھ بھیجتے۔

جب نواب یوسف علی خان سالار جنگ ثالث عہدہ مدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو اس خیال سے کہ یہ نوجوان ہیں اور نظم و نسق ریاست کا تجربہ نہیں رکھتے نواب عماد الملک ان کے مشیر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں آپ نے ایک گشتی مراسلہ جاری فرمایا جس میں ممالک محروسہ سرکارِ عالی کے تمام دفاتر کو ہدایت کی کہ اردو مراسلوں میں بلا وجہ انگریزی الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔

انھیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی اور جھوٹے کو کبھی منہ نہیں لگاتے تھے۔ ہمارے شرفاء مروت میں آ کر یا تالیفِ قلوب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو سچ کو چھپاتے یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا ایسے کام کی حامی بھر لیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا اس کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا پشیمانی ہوتا ہے۔ نواب عماد الملک کا مسلک

بالکل صاف تھا۔ جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ انھوں نے حیدر آباد آنے کے بعد جو مخزن الفوائد رسالہ نکالا تھا اس میں ان کا ایک مضمون "راستی و راست بازی" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر ان کی سیرت سامنے آجاتی ہے۔ وہ راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان نے بر سبیل تذکرہ اپنے مصاحبوں اور اعلیٰ ارکانِ ریاست سے جو اس وقت حاضر تھے پوچھا کہ لوگوں کا میری نسبت کیا خیال ہے۔ ان مصاحبوں نے عرض کیا کہ رعایا حضور کی فیاضی، رحمدلی، قدردانی، سیاست و تدبر، کاردانی اور عالی دماغی کی بے حد مدّاح ہے۔ غرض ہر ایک نے تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ نواب عماد الملک خاموش بیٹھے رہے۔ آخر اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ مولوی صاحب آپ نے کچھ نہیں کہا۔ نواب صاحب نے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ آپ شراب پیئے پڑے رہتے ہیں۔ کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ سرکاری کارروائیاں کئی کئی مہینے پڑی رہتی ہیں۔ ریاست کا انتظام خراب ہو رہا ہے۔" یہ سننا تھا کہ دربار میں سناٹا چھا گیا! اعلیٰ حضرت تو اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ جن لوگوں نے ہمارے سابق بادشاہوں کے حالات پڑھے ہیں انھیں معلوم ہے کہ ان کے حضور میں خفیف سے اختلاف میں بھی جان کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ یہی حال دولتِ آصفیہ کے فرمانرواؤں اور ان کے پیشرو بادشاہوں کے درباروں کا تھا۔ ایسی جسارت تو کجا خفیف سے خفیف اختلاف کی بھی مجال نہ تھی۔ اہلِ دربار مولوی صاحب کی یہ صاف بیانی سن کر دنگ رہ گئے اور ڈر رہے تھے کہ دیکھیے اعلیٰ حضرت قدر قدرت کا کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔ دوسرے روز اعلیٰ حضرت نے نواب عماد الملک کو یاد فرمایا۔ جب حاضر ہوئے تو فرمایا "آپ کو سب کے سامنے ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا۔" نواب صاحب نے عرض کیا کہ "حضور نے سب کے سامنے دریافت فرمایا تھا۔ اگر میں سب کے سامنے ایک بات کہتا اور خلوت میں دوسری تو یہ جھوٹ اور منافقت ہوتی۔" اعلیٰ حضرت جب اندر سے باہر تشریف لائے تھے تو ان کی ایک مٹھی بند تھی۔ نواب صاحب کا جواب سننے کے بعد اعلیٰ حضرت نے مٹھی کھولی اور الماس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی عطا فرمائی۔ نواب صاحب کے فرزند نواب مہدی یار جنگ نے مجھے وہ انگوٹھی دکھائی تھی۔

اب آپ اس شریف النفس اور ہر دلعزیز فرمانروا کے فرزند اور جانشین آصف جاہ سابع میر عثمان علی خان کا حال سُنیئے کہ اس نے نواب صاحب کی راست گوئی کا کیا صلہ عطا فرمایا۔ کوئی راجہ (یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ مہاراجہ پٹیالہ یا مہاراجہ نابھہ یا کوئی اور) ریاست کے مہمان تھے۔ اعلیٰ حضرت نے ان کے اعزاز میں اپنے محل میں ایک بڑا ڈنر دیا۔ کھانے کے بعد باتوں باتوں میں مسئلہ ازدواج پر بحث چھڑ گئی۔ اس میں کہیں اعلیٰ حضرت نے یہ کہہ دیا کہ اسلام میں اس بارے میں بہت سہولت اور آزادی ہے۔ نواب صاحب نے فوراً ٹوکا کہ یہ صحیح نہیں ہے، اسلام نے اس معاملہ میں ایسی کڑی شرط لگا رکھی ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ شاہ دکن کو اختلاف کی تاب کہاں۔ سخت برہم ہوئے اور طیش میں آکر فرمایا کہ آپ یہاں سے چلے جائیے۔ نواب صاحب فوراً اُٹھ کر چلے آئے۔ دوسرے روز علی الصبح اعلیٰ حضرت کے معتمد پیشی غیاث الدین (اظہر جنگ) نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ آپ ریاست حیدر آباد سے چلے جائیے اور آپ کو کونسل آف اسٹیٹ کی معتمدی کی جو تنخواہ اب

تک ملتی رہی ہے وہ بھی واپس کر دیجئے۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ رقم بطور امانت بنک میں جمع ہے۔ میں اس کا ایک حبہ بھی اپنے تصرف میں نہیں لایا۔ وہ آج ہی واپس کر دی جائے گی۔ اور اسی روز حیدرآباد کو الوداع کہہ کر پونا تشریف لے گئے۔ یہ شخصی حکومت کے فرمانرواؤں کا ادنیٰ نمونہ ہے۔ متلون، مغلوب الغضب، متکبر، بے اصولے، گھڑی میں فرشتہ اور گھڑی میں شیطان۔ جو شخص انھیں یہ خط لکھتا ہے "عماد الملک بہادر فخر الاماثل والاقران۔ آپ کے ساتھ ہم کلامی وہم طعامی نہ ہو کر ایک زمانہ گذر گیا ہے لہٰذا کل صبح دس بجے شریک بریک فاسٹ ہوں تو باعث مسرت ہے۔" ایک خط میں نواب صاحب کے انڈیا کونسل سے مستعفی ہونے پر لکھتے ہیں "ایسی باوقعت خدمت سے دفعتہً استعفا دے دینا تمام مسلمانان ہند کے لئے ایک بدقسمتی کا باعث ہے کیونکہ آپ جیسا مدبر، صائب رائے، تجربہ کار، واقفِ اسرار پھر دوسرا شخص اس خدمت پر مقرر ہونا محالات سے معلوم ہوتا ہے . . . . . ." یہ وہ الفاظ ہیں جن سے وہ اپنی ریاست کے بڑے سے بڑے امیر یا وزیر کو مخاطب نہیں کرتے وہی شخص ان کو (جو ان کے استاد بھی ہیں) دربار سے نکال دیتا ہے اور دربار ہی سے نہیں حیدرآباد سے خارج البلد کر دیتا ہے۔

دوسرے روز جب صاحب ریذیڈنٹ کو معلوم ہوا تو وہ اعلیٰ حضرت سے ملے اور بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ نواب عماد الملک معمولی شخص نہیں مسلمانان ہند کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و وقعت ہے اور حکومت ہند بھی ان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ان کے ساتھ جو ناروا برتاؤ ہوا ہے اس سے لوگوں میں آپ کی طرف سے بہت ناراضی اور بدگمانی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ فوراً ان کو واپسی کا فرمان بھیجا گیا۔ وہ اس واقعہ سے بہت آزردہ خاطر ہو گئے تھے اور آنا نہیں چاہتے تھے لیکن اپنے فرزندوں اور احباب کے اصرار پر واپس آ گئے۔ جس روز حیدرآباد پہنچے تو اعلیٰ حضرت نے فوراً ملاقات کے لئے طلب فرمایا۔ نواب صاحب نے کہلا بھیجا کہ میں تھکا ہوا ہوں اس وقت نہیں آ سکتا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے جب بہت اصرار کیا تو وہ کنگ کوٹھی گئے۔ دور ہی سے (بلند آواز میں جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے) مائی ٹیوٹر، مائی ٹیوٹر کہہ کر استقبال کیا۔

انجمن کی معتمدی کے ابتدائی زمانے میں میں نے ایک عرضداشت بغرض امداد انجمن بہ پیشگاہ اعلیٰ حضرت میں پیش کی تھی۔ بارہ سو سالانہ امداد منظور ہوئی۔ نواب صاحب کو اس کا علم ہوا تو بہت ناخوش ہوئے اور مجھے لکھا "اسے قبول نہ کیجئے، انکار کر دیجئے۔ ریاست کے خزانہ پر صاحب بہادر کا قبضہ ہے۔" (اس وقت صدر المہام فنانس سر ریجنالڈ گلانسی تھے) میں نے اسے خلاف مصلحت خیال کیا کیونکہ آئندہ بہت سی توقعات تھیں۔

حیدرآباد اس برعظیم کی سب سے بڑی اور باعظمت ریاست تھی۔ اس کی تہذیب اور روایات خاص تھیں۔ لوگ خوش حال تھے۔ سر سالار جنگ کے زمانے سے اس کے نظم و نسق میں بتدریج ترقی ہوتی گئی اور بیسویں صدی میں ہر اعتبار سے عروج کو پہنچ گئی۔ شخصی سلطنتیں سازش کا گھر ہوتی ہیں۔ یہ جنس یہاں خوب پھولتی پھلتی ہے۔ سر سالار جنگ بڑے مدبر تھے۔ وہ ریاست کے ہر شعبے پر نظر رکھتے تھے اور ہر عہدہ دار سے اس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کام لیتے اور ہر ایک کے کردار اور کام پر ایسی نظر رکھتے تھے کہ کسی کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی ہمت نہ ہوتی

تھی۔ ان کی وفات کے بعد چشم نگراں اٹھ گئی اور سازشوں کا دروازہ کھل گیا۔ آپس کی کش مکش اور رقابت نے طرح طرح کی ریشہ دوانیوں پر ابھارا اور حریف ایک دوسرے کو گرانے کے لئے کذب و افترا، بہتان اور اس سے بھی بدتر حربے استعمال کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ سازشوں کا یہ جال ایسا پیچ در پیچ تھا کہ ماحول کے اثر یا ذاتی تعلقات کی بنا پر اس میں بعض ایسے اشخاص بھی پھنس جاتے تھے جن کا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نواب عماد الملک کو اس قسم کی بعض سازشوں میں الجھانے کی بہت کوششیں کی گئیں وہ اپنے اصول پر قائم رہے اور ان کا دامن اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی اس آلائش سے پاک صاف رہا ؎

پاک ہیں آلائشوں سے بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

انھوں نے اپنے ذاتی رسوخ اور اقتدار سے کبھی اقربا نوازی اور یار فروشی کا کام نہیں لیا۔ ایک بار اعلیٰ حضرت مرحوم کسی وجہ سے اپنے پیشی سیکرٹری (نواب سر امین جنگ) سے ناخوش ہو گئے اور نواب عماد الملک کو لکھا کہ میں امین جنگ کی جگہ آپ کے فرزند محمد ہاشم کو مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے لکھا کہ وہ اس کام کے اہل نہیں مناسب یہ ہوگا کہ حضور امین جنگ ہی کو ان کی سابقہ خدمت پر بحال فرماویں۔ معتمد پیشی کی خدمت (جو بعد میں صدر المہامی پیشی ہوگئی) ایسے اعزاز اور اقتدار کی خدمت تھی کہ ریاست کا کوئی دوسرا عہدہ دار اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ ایک دوسرے موقع پر حضور نظام نے لکھا کہ میں آپ کے فرزند عقیل جنگ کو کوتوال شہر کی خدمت پر مامور کرنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں کوتوال شہر کی قوت و اقتدار کا مقابلہ کوئی عہدہ دار تو کیا کوئی امیر یا وزیر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نواب صاحب نے صاف لکھ بھیجا کہ عقیل جنگ اس کام کے اہل نہیں، کسی دوسرے شخص کا انتخاب فرمایا جائے۔

ان کے سامنے اور ان کے بعد بہت سے بڑے بڑے اشخاص آئے اور چلے گئے۔ لیکن نواب عماد الملک نہایت عزت و آبرو کے ساتھ آخر تک حیدرآباد میں رہے اور ہر دور میں ان کا اعزاز پہلے سے زیادہ ہوتا رہا۔

برٹش انڈیا اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی ان کا ایسا ہی اعزاز تھا۔ چنانچہ لارڈ کرزن نے جو یونیورسٹی کمیشن ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے حالات کی تنقیح اور اصلاحات کے لئے بہ صدارت سر ٹامس ریلے مقرر کیا تھا اس کے ایک رکن نواب صاحب بھی منتخب کئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں بعہد لارڈ کرزن امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں لارڈ مارلے نے پہلی بار وزیر ہند کی کونسل کے لئے دو ہندوستانی ممبروں کا انتخاب کیا۔ ایک نواب عماد الملک تھے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دو بار صدر منتخب ہوئے۔ ایک بار ۱۸۹۶ء میں میرٹھ کے اجلاس میں بزمانہ سرسید اور دوسری بار جب سنہ ۱۹۱۰ء میں کانفرنس کا اجلاس رامپور میں ہوا۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں مدراس یونیورسٹی کے کانووکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) میں خطبہ صدارت پڑھا۔

مجھے یہ دیکھ کر بعض اوقات تعجب ہوتا اور مزا بھی آتا ہے کہ ابتدا میں جن بزرگوں نے انگریزی معاشرت کی گرویدگی کا اظہار کیا تھا اور اپنے رہنے سہنے میں بہت کچھ تبدیلی کر لی تھی وہ کھانا اپنا ہی کھاتے تھے۔ سرسید احمد خاں، نواب محسن الملک،

نواب عماد الملک کے دسترخوانوں کا میں نے یہی رنگ دیکھا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی اُبلے ہوئے کھانوں میں وہ ذائقہ اور چٹخارہ کہاں جو ہمارے کھانوں میں ہے؟ اب تو لوگ وہ کھانے بھول گئے نام تک یاد نہیں، نہ ان کے پکانے والے رہے اور نہ پکانے والوں کے قدرداں۔ اب جو کھانے ہم کھاتے ہیں وہ نہ انگریزی ہیں نہ مغلئی۔ یوں کھانا سب ہی کھاتے ہیں۔ لیکن ان میں کتنے ہیں جو کھانے کا ذائقہ، لطافت اور آب و نمک کا صحیح ذوق رکھتے ہوں۔ نواب عماد الملک بہت نفیس اور لذیذ کھانا کھاتے تھے۔ لیکن ان کے کھانے بہت مرغن ہوتے تھے۔ خدا جانے یہ لوگ یہ کھانے کس طرح ہضم کر لیتے تھے جبکہ کسی قسم کی ورزش کے بھی عادی نہ تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ وقار آباد لے گئے جہاں ان کا ایک اچھا سا باغ اور بنگلہ تھا۔ کھانا ان کے ساتھ کھانا پڑا۔ شرتے کھاتے پر وہ بار بار ٹوکتے تھے کہ کیسے جوان ہو تم سے تو میں بڈھا ہی اچھا ہوں تم سے دُگنا کھاتا ہوں۔ ان کے اصرار پر بھی میں نے کھانا بہت احتیاط سے کھایا۔ لیکن یہ مرغن کھانا جس میں مغزیات بھی تھیں مجھے راس نہ آیا اور رات بھر بے چینی رہی۔ صبح ہوتے ہی میں نے وہاں سے نکل بھاگنے کی ٹھانی۔ مگر نواب صاحب نے جانے نہ دیا اور ٹھہرنے پر اس قدر اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا۔ کھانا میرے سامنے آتا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ نواب صاحب میرے کم کھانے پر ہنستے اور طعن کرتے تھے۔ انہیں کیا خبر کہ مجھ پر کیا بنی ہوئی ہے۔ تیسرے دن تو میں نے ایک نہ سنی اور حیدر آباد جا کر دم لیا۔ نواب صاحب کھانا تو خیر اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی خوبی اور اس کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ بعض چیزیں خود بھی پکاتے تھے۔ خاص ارہر کی دال جس میں کمرخ کی لاگ دیتے تھے بہت لذیذ ہوتی تھی۔ قدرداں بھی ایسے ہی تھے۔ ایک روز جو میں ان کے ہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہیں اور وہ ان سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں۔ جس وقت میں پہنچا تو نواب صاحب ان سے کھانے کی تعریف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میٹھے چاول تم نے خوب پکائے تھے لیکن شکر نئی تھی۔ نئی شکر گرم ہوتی ہے۔ اس نے کہا آپ نے صحیح فرمایا۔ اس وقت پرانی شکر نہ مل سکی نئی استعمال کرنی پڑی۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت بکاول تھے۔ نواب صاحب کے ملاقاتیوں میں دو چار ہی ایسے تھے جو ان کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس طرح باتیں کرتے۔ کمال کی قدر ہو تو ایسی ہو۔

ان کے خاص دوست اور ملنے والے بہت کم تھے۔ مگر جس سے رابطہ تھا وہ خلوص کے ساتھ تھا۔ وہ اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جستجو اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان ہوتے اور ان کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہوتا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

پرانے لوگوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جس پر ایک بار اعتبار کر لیا بس اس کے ہو گئے۔ ہزار کوئی اس کے خلاف کہے وہ نہیں سُنتے تھے۔ یہی کیفیت سر سید احمد خاں کی تھی۔ اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ ان کے انگریز کلارک نے ایک لاکھ کا غبن کر دیا۔ نواب صاحب کے دفتر میں ان کے ایک مددگار عبداللہ بیگ صاحب تھے۔ میں نے ایک روز نواب صاحب سے کہا کہ اس شخص کی دیانت مشتبہ ہے اور جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے جو ایسا کہتے ہیں وہ خود ایسے ہیں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جب دفتر کے حسابات کی تنقیح ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سا سرکاری روپیہ اپنے تصرف میں لے آیا ہے اور غبن کے الزام میں خدمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس تذکرے سے یہ مقصد نہیں کہ ان کے معتمد علیہ ایسے ہی تھے۔ بعض اشخاص جن پر ان کو اعتماد تھا درحقیقت اپنی سیرت، کردار اور قابلیت کے اعتبار سے بہت

قابلِ قدر تھے۔

مذہباً شیعہ تھے۔ لیکن اہلِ تشیع کے بعض عقائد مثلاً تبرّے اور تقیّے کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے کہ جاہلوں کے عقیدے ہیں۔ نواب رام پور مرحوم (حامد علی خان) جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں نواب عماد الملک بہادر کا بے حد ادب و احترام کرتے تھے۔ ایک ملاقات کے وقت جب ان کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایک بات میں ہمیں ان سے اختلاف ہے اور کسی طرح وہ اس معاملے میں ہم سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اختلافی معاملہ تقیے کا تھا۔ حالانکہ ہم نے بعض شیعہ علما اور نہایت قابل اور روشن خیال اشخاص کو یہ کہتے سنا ہے "التقیۃ دینی و دین آبائی"۔ وہ نہایت بے تعصب شخص تھے کسی مذہب یا مذہبی فرقے سے مطلق کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتے تھے۔ مولانا عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں کہ "مولوی شبلی نعمانی مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے الفاروق کو شائع کیا تو اس کا ایک نسخہ نواب عماد الملک بہادر کی خدمت میں بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ اس کی نسبت آپ اپنے خیالات ظاہر فرمائیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ گذشتہ تیرہ سو برس میں صرف ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام عمر ابن الخطاب ہے۔ لہذا ان کی لائف لکھنا اسلام کی خدمت تھی جو آپ نے ادا کی"۔ سررشتہ تعلیم بہت وسیع محکمہ ہے اور سینکڑوں آدمیوں کا تقرر ان کے ہاتھ میں تھا لیکن انھوں نے کبھی مذہبی پاسداری سے کام نہیں لیا۔ اس معاملہ میں بہت فراخ دل تھے۔ بعض عیسائی مشنریوں اور دوسرے غیر اسلامی اداروں کی جو اشاعتِ تعلیم کا کام کرتے تھے وقتاً فوقتاً مدد دیتے تھے۔

آخر زمانے میں انھیں مذہب سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ گفتگو میں اکثر محاسنِ اسلام کا ذکر کرتے تھے اور افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروع پر زور دیتے ہیں اور توہمات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔ کہتے تھے اصل اسلام اہلِ حدیث (وہابیوں) کا ہے۔ یہ اثر ان پر زمانۂ طفولیت سے تھا جبکہ وہ اپنے والد کے ساتھ بنگال کے مختلف اضلاع میں رہے۔ اس زمانے میں شاہ اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کے بے لوث سرفروش داعی اور واعظ اشاعتِ اسلام کی خاطر بنگال کے اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان کے ہاں آ کر مہمان رہتے اور ان کے والد ان کی بہت خاطر مدارات کرتے۔ نواب صاحب کہتے تھے کہ یہ لوگ کشتیوں میں سفر کرتے اور اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان بزرگوں نے گاؤں کے گاؤں مسلمان کر لئے تھے۔ یہ نومسلم بڑے مخلص اور پکّے مسلمان تھے۔ جس وقت نماز کا وقت آتا فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ مثلاً کھیت میں کوئی ہل چلا رہا ہے تو اذان سنتے ہی ہل جہاں تھا وہیں رہ جائے گا یا کسی اور کام میں مصروف ہے تو کام جس نوبت پر ہے وہیں چھوڑ دیا جاتا۔ یہ اپنے عقائد میں بہت راسخ تھے۔ مجال نہ تھی کہ کوئی شخص قبر پر پھول چڑھائے یا اسی قسم کی کوئی اور بدعت کرے۔ اس بات پر بہت افسوس کرتے تھے کہ ان مخلص مجاہدوں کے بعد جب پنجاب کے جاہل اور دنیادار پیروں نے آنا شروع کیا تو بیچارے بنگالی مختلف قسم کے توہمات اور بدعتوں میں پھنس گئے۔ شاہ اسمٰعیلؒ کے دُعاۃ کے تقوے اور سچے اسلامی جوش کے بہت قائل تھے۔ لڑکپن کا یہ اثر ان کے دل پر آخر عمر تک تازہ رہا۔

جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے آخر زمانے میں اسلام کی حقانیت اور قرآن پاک کی تعلیم کی عظمت ان کا تکیہ خیال ہو گئی ان چیزوں کو وہ طرح طرح سے بیان کیا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا انوار اللہ خان صاحب (فضیلت جنگ) صدر الصدور سے

قرآن مجید کی فصاحت کے بعض نکات بیان کر رہے تھے دورانِ گفتگو میں فرمایا کہ لوگوں نے الفاظ قرآن پاک کی موسیقیت اور ترنم کی طرف بہت کم توجہ کی ہے اور اسی ضمن میں کہا کہ آیۃ الکرسی کے الفاظ میں ایسی حسنِ ترتیب ہے کہ وہ پیانو پر ادا کیے جا سکتے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کو بہت بڑی اسلامی خدمت سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر وہ خواجہ کمال الدین کی بہت عزت کرتے تھے اور خواجہ صاحب اور ان کے رفقا نے تبلیغ کا کام جو مختلف ممالک میں کیا اس کے بہت ثنا خواں تھے۔ غالباً انھی کی تحریک پر سرکار سے خواجہ صاحب کو مالی امداد بھی دی گئی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ ہندوستان کا آئندہ سربراہ (لیڈر) مذہب کے بھیس میں آئے گا۔ کچھ مدت بعد جب گاندھی جی میدانِ سیاست میں جلوہ فرما ہوئے تو مجھے نواب صاحب کی پیشین گوئی یاد آئی۔ اس سے قبل انڈین نیشنل کانگریس انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے تصرف میں تھی۔ عوام سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ گاندھی جی اپنی قوم کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے انھوں نے یک لخت اپنی طرزِ زندگی اس طرح بدل دی جیسے سانپ اپنی کینچلی بدل دیتا ہے۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں رہتے گھٹنوں سے اوپر ایک غرقی سی باندھ لیتے اور کندھے اور سینہ چھپانے کے لئے کھدر کا بڑا سا رومال یا چھوٹی سی چادر ڈال لیتے۔ اس کے بعد سے ان کی زندگی درویشانہ اور زاہدانہ ہو گئی اور وہ دفعتہً موہن داس کرم چند گاندھی سے مہاتما گاندھی ہو گئے۔ ہندو خلقت ان کی پوجا کرنے لگی اور ان کے ایک ایک لفظ کو الہامی وحی سمجھنے لگی۔ کانگریس کا دروازہ سب کے لئے کھل گیا۔ انگریزی کی جگہ ہندی، ہندوستانی اور اردو میں تقریریں ہونے لگیں۔ ہندو تو ہندو، مسلمانوں کو خلافت کے لاسے پر لگا لیا کہ ان کے سرگروہ اور علما گاندھی جی کا دم بھرنے لگے۔ گاندھی جی نے مذہب کو سیاست میں ایسا سمویا کہ وہ تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستان کے مادی اور روحانی پیشوا ہو گئے۔

خطوں کا جواب بالالتزام دیتے تھے اور اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ کبھی دوسرے سے نہیں لکھواتے تھے اور کبھی فونٹین پن استعمال نہ کیا۔ اپنی تمام تحریریں اردو، انگریزی سب خود لکھیں اور اپنے قلم سے لکھیں۔ ایسے زمانے میں بھی جب وہ ضعیف ہو گئے تھے اور کسی قدر ضعفِ بصارت کا بھی عارضہ تھا انھوں نے کبھی اپنے خطوط یا اپنی تحریریں کسی سے لکھوانی گوارا نہ کیں۔

میانہ قد، کھلا گندمی رنگ خوبرو آدمی تھے۔ خضاب کرتے تھے، آخر زمانے میں ترک کر دیا۔ سفید داڑھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ حقہ پیتے تھے پیچوان سامنے لگا رہتا تھا۔ سگرٹ سگار بہت ناپسند کرتے تھے۔ کہتے تھے جہاز کے سفر میں ایک بار سگرٹ سگار پینے کی کوشش کی۔ اس کی بو سے بہت تکلیف ہوئی اور حلق میں بھی خراش معلوم ہوتی۔ زبان میں ہلکی سی لکنت تھی۔ جامہ زیب تھے۔ ہمیشہ ہندوستانی یعنی حیدر آبادی لباس پہنتے تھے۔ جب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر ہوئے تو لباس میں تبدیلی کرنی پڑی لیکن یہ تبدیلی عارضی تھی۔ انڈیا کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور لندن میں رہنا ہوا تو انگریزی لباس اختیار کرنا پڑا۔ ان کے قویٰ بہت اچھے تھے۔ صحت قابلِ رشک تھی۔ لندن میں ایک حادثے سے ٹانگ میں چوٹ آ گئی۔ زخم اچھا ہو گیا مگر ہڈی کا جوڑ ٹھیک نہ بیٹھا۔ اس سے انھیں اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف رہتی تھی۔ اگر یہ صدمہ نہ ہوتا تو کئی سال اور زندہ رہتے۔ پھر بھی ۸۲ برس کی عمر پائی۔ کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ شطرنج بھی کھیل لیتے تھے۔ کسی زمانے میں ستار کا بھی شوق تھا۔

ان کی یادگار یہ چند تصانیف ہیں:-

۱ - **سوانح سر سالار جنگ** - یہ نواب سر سالار جنگ کی مختصر سوانح عمری انگریزی زبان میں ہے۔ ۱۳۰۰ھ میں جو نواب صاحب کی وفات کا سال ہے لکھی گئی۔

سر سالار جنگ ان کے محسن تھے اور ان کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ سیاست دانی، معاملہ فہمی، مردم شناسی اور قدر دانی میں اورنگ زیب کے بعد کوئی شخص ہوا ہے تو وہ سر سالار جنگ تھے۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو گیا تھا۔

۲ - DESCRIPTIVE SKETCHES OF THE NIZAMS DOMINION - اس میں ریاست حیدرآباد دکن کے جغرافی، تاریخی واقعات، انتظامی حالات، ریاست کی صنعت و حرفت وغیرہ کا دلچسپ بیان ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں مسٹر ڈبلیو ولمٹ بھی شریک تھے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳ - **رسائل عماد الملک** - اس میں نواب صاحب کے وہ تمام مضامین، خطبات و مقالات ہیں جو وقتاً فوقتاً اردو میں تحریر کئے۔

۴ - **انگریزی مضامین** - مقالات و خطبات اور انگریزی نظموں کا مجموعہ۔

۵ - **قرآن پاک کا ترجمہ** - یہ نواب صاحب کا سب سے اہم اور قابلِ قدر کام ہے۔ یہ ترجمہ آپ نے نہایت تحقیق و کاوش اور محنت سے کیا تھا اور اس کے لئے خاص اہتمام کیا تھا اور ایک بڑا ذخیرہ تفاسیر، احادیث اور لغات اور علمائے ادب کی تصانیف کا جمع کر لیا تھا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ترجمے میں حتی الامکان اصل کی سی سادگی، شان اور قوت باقی رہے۔ مزاج میں بڑی احتیاط تھی۔ بہت غور و فکر کرتے اور ایک ایک لفظ کو جانچتے اور تولتے تھے۔ اس کے ساتھ لفظی پابندی کا بھی خیال رکھتے۔ ان کے پیشِ نظر بائیبل کا انگریزی ترجمہ تھا۔ سولہ پاروں کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور بطور پروف کے چھپوا بھی لیا تھا۔ نظرِ ثانی کے وقت مولوی حمید الدین صاحب سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ افسوس کہ بوجہ کبر سنی، ضعفِ بصارت اور ٹانگ کے صدمے کے یہ کام جو ان کے فضل و کمال کا بہترین نمونہ تھا جاری نہ رہ سکا۔

نواب عماد الملک بہادر کی شخصیت اس زمانے میں بعض اعتبار سے عجیب سی معلوم ہوگی۔ وہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے جامع تھے۔ آدمی کو علم، دولت، آسائش و آرام محنت سے مل جاتا ہے۔ لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے، نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبہ میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آ جاتی ہے جو رواداری، اعتدال اور اطمینانِ قلب پیدا کر دیتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور اوگھٹ گھاٹیوں کے سفرِ حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ حسنِ ذوق نواب عماد الملک کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو میں پایا جاتا ہے۔ ان کی طرزِ معاشرت اور ظاہری شان ایسی تھی کہ لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں سے جو ذوقِ علم اور ذوقِ تہذیب سے عاری ہوتے گو دنیاوی حیثیت سے ان کا پایہ کتنا ہی بلند ہوتا، ملنے سے اِبا کرتے اور ایسے اصحاب سے ان کا برتاؤ خشک اور اچٹتا ہوا ہوتا تھا۔ لیکن اہلِ علم کی ملاقات سے بہت خوش ہوتے۔ ان سے گھل مل کے باتیں کرتے۔

ان ملاقاتوں میں طالب علمانہ سادگی، خلوص اور ہمدردی پائی جاتی تھی۔ وہ غریب سے غریب عالم یا طالب علم کے مقابلے میں بڑے سے بڑے جاہل امیر کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے علم و ادب کی اشاعت اہلِ علم اور علمی اداروں کی امداد و سرپرستی میں ہمیشہ فراخدلی سے کام لیا اور اس سے ان کو سچی خوشی ہوتی تھی۔ وہ صادق القول، باوضع اور پابندِ اصول تھے۔ ان میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم ملی ہوئی تھیں کہ اس امتزاج نے ان کی روشِ زندگی میں ایک قسم کا حسن پیدا کر دیا تھا۔

ان کی صحبت مغتنمات میں سے تھی۔ اس میں حکیمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے پرانے حالات اپنے بزرگوں کی خودداری، وضع داری اور شجاعت کے کارنامے اور ان کے توہمات، اسراف اور شیخی کے قصے بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اساتذہ کے کلام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص صحبتوں میں ان کا منتخب کلام سُناتے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالتے جسے دیکھ کر ان کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلمبند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی۔ مولانا حالیؔ نے کسی جگہ ذکر کیا ہے کہ مظہر جانِ جاناںؒ نے اساتذہ کے کلام سے منتخب اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نام "خریطۂ جواہر" تھا۔ اس کا دلّی کی شاعری پر بہت اچھا اثر پڑا۔ پرانے صاحبِ ذوق اور پڑھے لکھے حضرات اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے۔ جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کام کی بات نظر پڑی یا کوئی مجرّب نسخہ ہاتھ لگا وہ جھٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ غرض نواب عماد الملک کی صحبت میں بعض اوقات ایسے علمی و ادبی نکات مل جاتے تھے جو گہرے مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ان کے علمی ذوق، علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ ان کی تالیفات سے کہیں زیادہ استوار اور دور رس تھا۔

وہ جس خدمت پر مدت دراز تک فائز رہے۔ اگرچہ اس میں ایک گونہ ترقی ہوئی لیکن جیسی ہونی چاہیئے تھی وہ نہ ہو سکی۔ اس کا انہیں خود بھی اعتراف تھا۔ اس کی وجہ ہے۔ ان کاموں کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے اپنے سررشتہ کے منصوبوں اور تجویزوں کی منظوری کیلئے بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں کبھی اپنے اعلیٰ افسروں سے مل کر اور ان کو خوش کر کے کام نکالنا پڑتا ہے اور کبھی لڑ جھگڑ کر اور اپنے رسوخ سے کام لیکر منظوریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ نواب عماد الملک اس قدر خوددار اور غیور اور اپنے اعلیٰ افسروں سے اس قدر بلند مرتبہ تھے کہ اس قسم کی ربط اور دوڑ دھوپ یا اپنے افسروں کی خوشنودی کی کوشش ان کے امکان سے باہر تھی۔

ان کے علم و فضل، وسیع معلومات، علمی و ادبی ذوق اور عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے گہرے مطالعہ کو دیکھتے ہوئے ان کا علمی کام اس توقع سے کم ہے جو ان سے کی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے انوکھے حالات اور ماحول کی آئے دن کی تغیرات نے بیزاری اور نئی طرزِ معاشرت نے تن آسانی پیدا کر دی تھی اور کام کا وہ ولولہ جو ابتدا میں تھا بعد میں نہ رہا لیکن بے دریغ علمی سرپرستی، علمی فیض، فاضلانہ استغنا، اعلیٰ سیرت اور بے لوث کردار کی وجہ سے وہ دولتِ آصفیہ حیدرآباد دکن کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رہیں گے۔

سرسید احمد خاں

عنایت اللہ دہلوی

غالباً جولائی ۱۸۷۷ء کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم (مولانا ذکاء اللہ) جو اُس وقت میور کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے۔ گرمیوں کی تعطیلیں دہلی میں ختم کر کے الہ آباد واپس جانے لگے۔ اِس مرتبہ اُنھوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو جو مجھ سے تین برس بڑے تھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا، تاکہ الہ آباد میں ہماری تعلیم کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔ راستہ میں سیّد صاحب (سرسیّد مرحوم) کے پاس علی گڑھ میں قیام کرنے کا قصد کیا۔ میری عمر اُس وقت آٹھ برس کچھ مہینے تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی والدہ سے جدا ہونے کا اتفاق ہوا۔ چلنے کا وقت آیا تو اُنھوں نے ہم دونوں بھائیوں کو گلے لگایا۔ پیار کیا اور کوئی دعا پڑھ کر دم کی۔ مجھے بے اختیار رونا آیا مگر میں نے ضبط کیا۔

اس سے پہلے میں کبھی ریل پر سوار نہ ہوا تھا۔ سٹیشن پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا۔ بیٹھا کیا، کبھی دوڑ کر اِس کھڑکی سے مُنہ لگا کر جھانکتا تھا۔ کبھی اُس کھڑکی سے۔ اور سب سے زیادہ بے قراری اِس بات کی تھی کہ دیکھئے ریل کب چلتی ہے؟ اور کیونکر چلتی ہے؟ آخر کار یہ وقت بھی آگیا۔ ریل کھسکی سٹیشن کی جتنی صورتیں تھیں ایک ایک کر کے پیچھے رہتی گئیں۔ ٹرین کبھی سیدھی، کبھی سانپ کی طرح لہراتی ہوئی تیز چلنے لگی۔ ریل اُترنے ہی فرّاٹے بھرنے لگی۔ پہیّوں کی لے وار آوازیں اور رفتار کی تیزی کے ساتھ ہوا کے جھونکے دل میں ایک اُمنگ پیدا کرنے لگے۔ اب یہ معلوم ہوا کہ میدان۔ کھیت۔ گاؤں۔ آدمی۔ درخت۔ مویشی کوئی ایسا نہ تھا جو دِلّی کی طرف نہ بھاگا جاتا ہو۔ میں اپنے وطن سے نکلا اور یہ میرے وطن کی طرف چلے۔ دُور کی چیزیں آہستہ اور پاس کی اشیا بے تحاشا دوڑتی نظر آئیں۔ جدھر دیکھا آسمان کے کنارے زمین سے ملے ہوئے معلوم ہوتے۔ اُوپر سورج تھا اور چلتے پھرتے بادل۔ نیچے دھوپ تھی اور چھاؤں کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انجن کی طرف کبھی کبھی سیاہ گھٹا دُور نظر آتی تھی مگر تھوڑی دیر میں ٹرین دھوپ میں سے نکل کر بادلوں کے سایہ میں آجاتی اور ہر طرف اندھیرا چھا جاتا۔ بادل کی گرج جسے گھر میں سن کر ڈر لگا کرتا تھا اب یہاں سنائی بھی دیتی تو بہت ہلکی۔ یہ کیفیت بھی تھوڑی دیر میں بدل جاتی اور ٹرین اندھیرے کو چھوڑ کر روشن مطلع میں آجاتی۔

جب کوئی سٹیشن قریب آنے کو ہوتا تو انجن ٹرین کو پلیٹ فارم پر لانے کے لئے پٹڑی بدلتا اور پھر کونسا لڑکا ایسا ہوگا جس کا مُنہ کھڑکی سے باہر ہو اور انجن کو اس حال میں دیکھ کر تالیاں نہ بجانے لگے۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر ریل کے ٹھہرتے ہی مسافروں کی بھاگ دوڑ گارڈ کا اپنی گاڑی سے اُتر کر انجن تک بخطِ مستقیم جانا اور پھر ہری جھنڈی دکھا کر ٹرین کو چلتا کرنا اس کے بعد اپنی

گاڑی کی طرف آنا۔ چلتی ریل میں دوڑ کر پائے دان پر کھڑا ہو جانا۔ بڑے سٹیشنوں کے قریب بہت سے انجنوں کا نظارہ۔ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی چل رہا ہے۔ کوئی صاف نظر آ رہا ہے۔ کوئی دھوئیں اور بھاپ میں چھپا ہوا ہے مگر چیختے چلاتے سب ہیں۔ پھر ٹرین کا ہلکی چال سے دفعتہً بڑی گرج اور لرزے سے سٹیشن کی اونچی اور لمبی چھت کے نیچے داخل ہونا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم۔ قلیوں اور مسافروں کا شور، سودے والوں کی بے تکی بولیاں۔ ہوٹلوں اور چائے خانوں کا چمکتا ہوا سامان۔ اگرچہ یہ سب معمولی چیزیں تھیں مگر میرے لئے تو آج دنیا کے مشاہدوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ جو نئی چیز دیکھتا۔ چاہتا کہ والد بھی اسے دیکھیں۔ کئی دفعہ آنکھوں میں کوئلے کی راکھ بھی پڑی مگر میں دیکھنے سے نہ ہارا۔ غرض اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد علی گڑھ آ گیا۔ والد یہاں اُترے۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے آ کر کہا کہ "سید صاحب نے گاڑی بھیجی ہے"۔ سٹیشن سے نکل کر ہم سب اُس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک احاطہ میں جو مجھے باغ معلوم ہوا داخل ہوئے۔ ایک بڑے بنگلے کے سامنے برساتی میں آ کر گاڑی ٹھہر گئی۔

میں نے اب تک انگریزی وضع کے مکان دُور سے دیکھے تھے۔ کبھی اُن کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اُتر کر ہم کئی کمروں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہوا۔ اس کمرے کے سب بڑے دروازے میں خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی اور پنکھا چل رہا تھا مگر کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں کئی وضع کی رکھی ہوئی تھیں اور خس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی وہاں موجود تھی جو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ خس کی ٹٹی کے قریب ایک میز پر جس کی پوشش سبز تھی بہت سے کاغذ اور کتابیں اور کچھ چمکتی ہوئی چیزیں نہایت سلیقے اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب ہی کرسی پر ایک بھاری بھرکم آدمی۔ سفید سر۔ سفید داڑھی۔ سفید لباس۔ موٹے موٹے پاؤں اور اُن میں سلیپر جو مجھے قالین کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ شیر کا سا کلہ۔ عینک لگی ہوئی۔ برہنہ سر بیٹھے تھے۔ یہی سید احمد خاں تھے جنھیں دلی کے بعض لوگ صرف "علی گڑھ والا" کہا کرتے تھے اور وہ ایک خوف اور پرہیز کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ سید صاحب والد صاحب کو دیکھ کر السلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ جھکے جھکے اُٹھے اور یہ کہہ کر کہ "آپ آ گئے" والد صاحب سے مصافحہ کیا۔ اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا: "ارے یہ کون ہیں؟" ہم دونوں قریب گئے اور جھک کر آداب کیا۔ سید صاحب نے ہماری صورتیں غور سے دیکھیں۔ پھر خوب ہنسے اور والد صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ اب میں کبھی سید صاحب کی صورت دیکھتا تھا اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ فرشی پنکھے کی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف صفائی اور سلیقہ۔ نیچے فرش پر زرد حاشیہ لئے سُرخ اور نیلی دھاریوں کی دری اور سفید براق سی چھت گیری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ۔ کہیں کہیں سنہری چوکھٹوں میں تصویریں لٹکی ہوئیں۔ جن میں پہاڑ، سبزہ زار اور چشمے نظر آتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی انہی میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کارنس میرے لئے اس قدر پُرلطف تھا کہ اب بڑی سے بڑی نمائش گاہ بھی لطف نہیں دے سکتی۔ اس کارنس پر بہت سی خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور ان سب کے اُوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا گھنٹا لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد جب باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے تھے تو پنکھے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصوّر میں اس کمرے کی بزرگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کارنس پر جو چیزیں آراستہ تھیں اُن میں سب سے زیادہ دلکش سنگِ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کی صندوقچی میں رکھا ہوا تھا۔ یہ مجھے منصور کا مقبرہ معلوم ہوا جسے میں دہلی میں بارہا دیکھ چکا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اُس لڑکے کو جو اس کا مالک ہو قابلِ رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا

تھا کہ وہ اتنے اونچے پر کیوں رکھا ہوا ہے کہ کسی لڑکے کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

سید صاحب اس قدر رحیم و عظیم تھے کہ مجھ کو اپنے والد ان کے سامنے بہت دُبلے اور مختصر معلوم ہونے لگے۔ درآں حالیکہ اس سے پہلے میں اُن کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا۔

سید صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھ لیتے تھے۔ میرے بڑے بھائی تو کرسی پر بیٹھ گئے تھے مگر میں کھڑا رہا۔ کیونکہ سخت عدیم الفرصت تھا۔ میں سید صاحب کے پاس کھڑا اُن کے لکھنے کی دوات کو بڑی محویت کے ساتھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس دوات کا ڈھکنا مجھے بالکل شیر ببر کا سر معلوم ہو رہا تھا۔ بالکل اُسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈر میں بنی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں لال لال نگینوں کی طرح خوب چمک رہی تھیں۔ میں اس خواب حیرت سے اُس وقت چونکا جب سید صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ "تم کیا پڑھتے ہو؟" میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا "اردو کی چوتھی ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری پڑھتا ہوں اور رائل ریڈر شروع کر رکھی ہے۔" اس سیدھے سادے جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسے۔ وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ "علم و فضل" باعث مسرت ہوا ہو۔

یہ دونوں بزرگ باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ کاغذات والد کو دیئے جب وہ اُن کو پڑھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور ایک چھوٹے سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی مہیب آواز میں کہا "پنکھا روکو" جس پر فرشی پنکھا فوراً رک گیا۔ سید صاحب نے بکس میں سے ایک چرٹ نکال کر دیا سلائی جلائی اور جب دیا سلائی چرٹ کے قریب لائے تو مجھ کو اُن کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ خس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی وہ چرٹ کی تھی۔

اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہوتے ہی میں سید صاحب سے ڈرنے لگا اور یہ اس خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔

جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اُس کے قریب ہی ایک کمرہ والد کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا اسباب رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس ٹھہر کر جب والد اس کمرہ میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی اُن کے ساتھ آئے۔ اس کمرے میں جو غسلخانہ تھا اس کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لئے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کسی چیز کو برتنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کپڑے بدلنے کے کمرہ میں جو آئینہ دار خوبصورت میز تھی۔ اُس پر کچھ چیزیں شیشے کی بھی رکھی تھیں۔ مگر اُن سب کو مجھ سے سخت دشمنی تھی۔ کیونکہ جہاں میں نے خوش ہو کر کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر گر پڑتی تھی۔

شام ہوئی تو سید صاحب بنگلے سے باہر آئے۔ کوٹھی کے احاطے میں ایک طرف کو باغ تھا اُس کے سرے پر ایک چبوترہ تھا۔ اُس پر بہت سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سید صاحب اور میرے والد پھر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا "منہ کھولو" میں نے منہ کھولا تو کہنے لگے "ارے اس لڑکے کے منہ سے تو خون نکل رہا ہے توبہ۔ توبہ" میں دِلی سے چلا تھا تو پان کھایا تھا۔ اس لئے دانت لال ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے منہ بند کر لیا اور سمجھ لیا کہ پان کھانا بری بات ہے۔

جب کھیلات ہوگئی تو آدمی نے آکر کہا "کھانا میز پر ہے" اس پر سب لوگ اُٹھے اور کھانے کے کمرہ میں آئے۔ یہاں پھر میری آنکھوں کے لئے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سفید چادر۔ چینی کے برتن۔ شیشے کے گلاس۔ چاندی کے چمچے۔ ہاتھی دانت کے دستہ کی چھُریاں میز پر رکھی تھیں۔ میز پر دو بڑے شاندار لیمپ روشن تھے۔ پنکھا چل رہا تھا۔

اس سامان کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کا دستر خوان۔ برتن اور فتیل سوز یاد آیا۔ میری والدہ دستر خوان ہمیشہ اُجلا بچھوایا کرتی تھیں۔ مگر وہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور چمک سے اُسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے۔ چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لئے یا جب کوئی مہمان آئے تو برتے جاتے تھے۔ شیشے کے گلاس صرف گرمیوں میں یا رمضان شریف میں افطاری کے وقت نکالے جاتے تھے۔ مامائیں اُن کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چھُریاں اور چاندی کے کانٹے تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا فتیل سوز اگرچہ روزمرہ مَنجھوایا جاتا تھا مگر اُس کی صورت شکل اور ٹمٹماتی ہوئی روشنی اِن لیمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور قہقہوں پر قہقہے لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تین چار سفید پوش ملازم اور ایک بہت بڑی لمبی داڑھی کا دُبلا پتلا سوکھا مگر بے حد چُست و چالاک اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا۔ اور سب لوگ چمچوں سے حسبِ ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی رکابیوں میں بڈھے خانساماں نے اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے غور نہ کیا مگر یہ یقین ہے کہ وہ گھر جیسا نہ تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔

جب ہم دونوں کھانا کھا چکے تو سیّد صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ "ان بچوں کو اُن کے پلنگوں پر لے جا کر سلا دو۔"

صبح ہوتے ہی چڑیوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں اُن کی نسبت بیسیوں سوال والد سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ الہ آباد میں یہ سب چیزیں ہونگی یا نہیں؟ والد کبھی تو جواب دے دیتے تھے کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔

والد نے علی گڑھ میں دو دن قیام کیا۔ پھر الہ آباد روانہ ہوگئے اور دوسرے دن سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں سیّد صاحب کی طرزِ معاشرت پر میرا چھوٹا سا دماغ غور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا مگر اُن کے بنگلہ کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جی چاہتا تھا میرے پاس بھی ہوتیں۔ اب یہ شوق پیدا ہوا کہ جہاں بھی رہوں وہاں کی ہوا ایسی ہی اچھی ہو۔ ایسے ہی کھلے میدان ہوں۔ باغ ہو۔ باغوں میں پھولوں کے پودے ہوں۔ گرد و پیش کی سب چیزیں صاف ستھری۔ چمکتی ہوئی۔ ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں۔ اور کوئی چیز میلی اور خراب نہ ہو۔ یہ ایسا خیال تھا جس کا بہت کچھ اثر طبیعت پر تمام عمر غالب رہا۔"

(عطیہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)

نواب صدر یار جنگ بہادر

(مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

مالک رام

نواب صدر یار جنگ بہادر سے میری ملاقات محض حسنِ اتفاق کا نتیجہ تھی۔ وہ بالعموم علی گڑھ حبیب گنج میں رہا کرتے تھے، میں دہلی سے آگے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ ان کا حلقۂ احباب مجھ جیسے ہیچ میرز و ہیچمداں سے بہت بلند تھا، اور عمر کا جو فرق تھا وہ ظاہر ہی ہے۔ پس عام حالات میں اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے مل سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ملے۔

ہوا یہ کہ ۱۹۳۷ء میں مجھے غالب کی کتاب "سبد چین" دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ مختصر سا مجموعہ جس میں مشکل سے چھ سات سو شعر ہوں گے، غالب نے اپنی زندگی کے آخری ایام یعنی ۱۸۶۷ء میں شائع کیا تھا، لیکن چونکہ اس کے بعد نہ یہ الگ کہیں سے چھپا، نہ کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں اسے شامل کیا گیا، اس لئے مدت سے نایاب ہو چکا تھا۔ غالب کی بعض اپنی تحریروں اور یادگارِ غالب میں اس کا ذکر موجود ہے، اور یہیں سے مجھے اس کا پتہ چلا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر بعض احباب کی خدمت میں لکھا کہ اگر آپ کے پاس یہ کتاب ہو تو چند دن کے لئے مستعار عنایت فرمائیے۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ نہ یہ ہمارے یہاں ہے نہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ البتہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں لکھ کے پوچھو، ممکن ہے اُن کے کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں لکھا۔ بارے اب کے تیر نشانے پر بیٹھا۔ ان کا جواب یہ مژدہ لایا کہ "سبد چین" کا ایک نسخہ میرے یہاں موجود ہے؛ یہ تھی تقریب تعارف۔

یہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ میں ان ایام میں اپنے کام کے سلسلے میں شملے میں مقیم تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے۔ میں اس کی نقل لے کر اسے بہ حفاظت واپس کر دوں گا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ آپ یہ کہاں اتنی زحمت کریں گے۔ میں یہیں سے اُسے نقل کروا کے چند دن میں بھجوا دوں گا۔ چنانچہ پندرہ بیس دن کے بعد انھوں نے

یہ نقل مجھے بھیج دی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے، میں نے اس کی تلاش میں پانچ چھ مہینے صرف کئے تھے اور تقریباً مایوس ہو چلا تھا۔ اگرچہ یہ چیز میرے خیال سے بہت کم حجم کی نکلی، تاہم کچھ بھی ہو غالب کا کلام تھا اور اتنا نایاب کہ بڑے بڑے صاحبِ ذوق حضرات کے کتب خانے اس سے خالی تھے۔ اور وہ خود اس سے ناواقف تھے۔ اس لئے میں جتنا فخر بھی کرتا کم تھا۔

انھوں نے جو نقل مجھے بھیجی اس میں بہت غلطیاں تھیں۔ اب میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ آیا اصلی کتاب ہی اتنی غلط چھپی ہے، یا نواب صاحب کے کاتب نے روائتی اصلاحیں دی ہیں۔ ان میں سے کتنی غلطیاں تو ایسی تھیں کہ میں نے خود ہی اٹکل سے انہیں درست کر لیا پھر بھی کچھ ایسی رہ گئیں کہ ان کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ ایک آدھ جگہ لفظ ہی لکھنے سے رہ گئے تھے۔ میں نے جب اس کا اظہار اُن سے کیا تو جواب ملا کہ اگرچہ کاتب بہت محتاط آدمی ہے لیکن امکان ہے کہ اس سے غلطیاں ہو گئی ہوں۔ اس پر میں نے دل میں طے کیا کہ جب دلی جانا ہوا، تو ایک دن کے لئے علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ اور اصل نسخے سے اس کا مقابلہ کر کے درستی کر لوں گا۔ نواب صاحب مرحوم نے بھی مجھے دعوت دی کہ جب پہاڑ سے اُتریں تو یہاں آئیے اور کتب خانہ دیکھ جائیے۔ یہ تو عین میری خواہش تھی۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے آنے کا وعدہ کر لیا۔

اس کے تھوڑے دن بعد میں دلی آیا۔ یہاں ایک دن اب یاد نہیں رہا۔ میں کونسی کتاب دیکھ رہا تھا کہ اس میں حکیم مومن خاں کے فارسی دیوان کا ذکر پڑھا۔ میں نے پھر اُن کی خدمت میں لکھا کہ آپ کے ہاں حبیب گنج میں مومن کا فارسی دیوان ہے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ ہاں، دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے، لیکن اب میں اسے آپ کو بھیجوں گا نہیں۔ اپنا وعدہ وفا کیجئے۔ یہاں آئیے اور جو چاہیئے لے جائیے، میں خود کتنے دن سے وہاں جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ لیکن مکروہات اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسی حیص بیص میں دو تین مہینے نکل گئے۔ آخر ایک سہ پہر کو میں نے ہڑبڑا کے بستر باندھا اور بغیر اطلاع دیئے علی گڑھ پہنچ گیا۔ گاڑی وہاں مغرب کے بعد پہنچی تھی اور اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ جب میں علی گڑھ کے سٹیشن پر اُترا ہوں تو بوندیاں بھی پڑ رہی تھیں۔ اب میں نے خیال کیا کہ یوں بے اطلاع آنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہوئے تو پھر۔ لیکن یہ خیال ایک لمحے سے زیادہ میرے دماغ میں رہا نہیں۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ دل نے کہا اگر نہ ہوئے تو کونسی قیامت آجائے گی، رات کی گاڑی سے واپس چلے جانا۔ بہرحال میں نے سواری لی اور چند منٹ میں میرس روڈ پر ان کی کوٹھی حبیب منزل میں جا پہنچا۔ وہ خود اس وقت موجود نہیں تھے۔ ملازم مجھے اندر جناب عبدالوحید خاں صاحب کے پاس لے گیا۔ میں نے آداب عرض کیا اور اپنا تعارف کرکے خاموش ایک طرف بیٹھ گیا۔

نام آ گیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں جناب عبدالوحید خاں صاحب کا تعارف کرا دوں۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم نے اپنی عمر میں تین نکاح کئے۔ پہلی بیوی ان کے چچا حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب کی صاحبزادی تھیں، نواب صاحب مرحوم کے سب سے بڑے صاحبزادے خان بہادر حاجی مولوی محمد عبیدالرحمٰن خاں صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ انہی بیگم کی اولاد ہیں۔ دوسری شادی بھی اپنے خاندان ہی میں ہوئی۔ یہ بیگم جناب محمد عابد خاں شیروانی رئیس بھیکم پور کی ہمشیرہ تھیں۔ نواب صاحب کا تیسرا نکاح جناب مولانا عبدالغنی خاں صاحب مئو قائم گنج (ضلع فرخ آباد) کی دخترِ نیک اختر جناب زینب بیگم صاحبہ سے ہوا۔ مولانا عبدالغنی خاں مرحوم مشہور کتاب ارمغانِ آصفی کے مصنف ہیں۔ جس میں فارسی مصادر کے صلوں کی اسناد کلامِ اساتذہ

سے جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب آٹھ حصوں میں چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ سوادِ عرب اور ایک تذکرہ شعرائے فارسی بھی ان سے یادگار ہے۔ مولانا عبدالغنی خان نواب صاحب کے استاد بھی تھے۔ انھوں نے فقہ اور حدیث اور تفسیر کی متعدد کتابیں ان سے پڑھی تھیں۔ یہی مولانا عبدالغنی خاں صاحب، جناب عبدالوحید خاں صاحب کے والد بزرگوار تھے اور جناب زینب بیگم صاحبہ ان کی سگی ہمشیرہ تھیں۔ نفیس دلہن کے نام سے کبھی کبھی مضمون بھی لکھا کرتی تھیں۔ دو تین سال ہوئے کہ انتقال فرمایا۔

ایک اور بات یاد آگئی۔ غالب نے ایک غزل میں اپنے تمام مشہور فارسی گو معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ قطعہ ہے ؎

ہند را خوش نفسانند سخن ور کہ بود ۱ باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ ۲ حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں
غالبِ سوختہ جاں، گرچہ نیرزد بہ شمار ۳ ہست در بزمِ سخن، ہم نفس و ہمدمِ شاں

یہاں دوسرے شعر میں علوی سے مراد مولوی عبداللہ خاں علوی ہیں۔ یہ علوی ہمارے مولانا عبدالغنی صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔ مولوی محمد اسمٰعیل شہیدؒ دہلوی کے شاگرد تھے اور سید احمد بریلوی سے بیعت تھے۔ طبابت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ ۱۸۴۶ء میں اپنے وطن ہی میں تپ محرقہ سے وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ صہبائی انھی کے شاگرد تھے۔ تاریخ وفات ہے: "بنیادِ سخن فتاد"۔

بات سے بات یاد آتی ہے۔ غالب کے نانا مرزا غلام حسین خاں آگرہ کے رؤسا میں سے تھے۔ غالب نے اپنی والدہ جناب عزت النساء بیگم صاحبہ کا نام صرف ایک فارسی خط میں دیا ہے۔ جو انھوں نے آگرے ہی کے ایک صاحب خداداد خاں اور ان کے بڑے صاحبزادے دلی داد خاں کے نام لکھا ہے۔ اس خاندان کے غالب کی ننھیال سے لین دین کے تعلقات تھے اور اسی سلسلے میں غالب نے یہ خط بھی لکھا ہے۔ اصلی خط کتب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے۔ تو خیر، ان خداداد خاں کے ایک اور صاحبزادے کریم داد خاں بھی تھے، ان کریم داد خاں کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ ان سب کے نام لکھنا تو غیر ضروری ہے۔ البتہ ان میں سے ایک صاحبزادی کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ یہ مولانا عبدالغنی خاں سے منسوب تھیں، اور جناب عبدالوحید خاں صاحب انھی بسم اللہ بیگم کے صاحبزادے ہیں۔ گویا یہ غالب کے مکتوب الیہ جناب خداداد خاں کی پوتی کے بیٹے ہوئے۔ غالب کے جس خط کا اوپر ذکر ہوا، وہ انھی نے نواب صاحب مغفور کو دیا تھا، جو ان کے خاندانی کاغذات میں محفوظ تھا۔

یہ جملہ معترضہ، بحرِ طویل میں چلا گیا۔ بہر حال جناب نواب صاحب نو بجے کے قریب مکان پر تشریف لائے۔ جونہی پہنچے انھیں میرے آنے کی اطلاع ملی۔ فوراً اس کمرے میں آئے جہاں ہم لوگ تھے۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے دوزانو بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر نظر اُٹھا کے جو دیکھتا ہوں تو وہ سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ میں نے انھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن میں نے قیافے سے فوراً پہچان لیا۔ پہلے حلیہ سنیئے۔

بہت لانبا قد، کوئی چھ فٹ کے قریب، اکہرا جسم۔ سرخ و سپید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک، خضاب لگی ہوئی بھرواں داڑھی، خضاب لگے کچھ دن ہو چکے تھے، کیونکہ جڑوں سے سپیدی جھلکنے لگی تھی چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے، اور ان کے پان کے شوق کے غماز تھے۔ جسم پر

بند گلے کا شیروانی نما گرم کوٹ اور نیچے غالباً اُسی کپڑے کا پاجامہ تھا۔ سر پر ٹوپی تھی، اور اس کے اوپر منڈاسے کی شکل میں سپید شال اوڑھے تھے، ایسے خوبصورت اور جامہ زیب آدمی میں نے بہت کم دیکھے تھے۔

بہت تپاک سے ملے اور اٹھا کے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ برآمدے میں سے گزرتے ہوئے فرمایا، آپ نے خط کیوں نہ لکھا؟ اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں تکلیف ہوئی ہوگی آپ کو؟ مکان تو آسانی سے مل گیا تھا؟ آپ نے لکھا ہوتا تو میں کسی کو اسٹیشن پر بھیج دیتا۔ غرض اسی طرح تابڑتوڑ انھوں نے چار سوال کر دئے، لیکن لہجے میں کسی طرح کی عجلت اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ بلکہ آواز بہت نیچی تھی، اور ایک ایک لفظ انھوں نے الگ الگ کہا، کمرے میں پہنچے تو چھوٹتے ہی فرمایا، میں تو آپ کو زیادہ عمر کا خیال کرتا تھا، آپ تو ماشاء اللہ بالکل جوان ہیں۔ میں نے عرض کیا، قبلہ جوانی کی بھی ایک ہی کہی، ساری عمر جس ماحول میں بسر ہوئی ہے، وہاں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ جوانی کس چیز کا نام ہے۔ "غمِ عشق" تو خیر نہیں "غمِ روزگار" نے ہمیں پریشان رکھا، اس لئے دل جوانی ہی میں بوڑھا ہو گیا۔ کہنے لگے، میں تو آپ کے فارسی کے ذوق پر بہت حیران ہوا۔ ابھی "سبد چین" کی فرمائش سے جو تعجب ہوا تھا وہی ختم نہیں ہو پایا تھا کہ آپ نے مومن کے فارسی دیوان سے متعلق پوچھ بھیجا، پھر میری فارسی تعلیم کا حال پوچھا۔

فرمایا، میں مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے پاس گیا تھا، ایک مدت سے یہ معمول ہے کہ جب یہاں علی گڑھ آتا ہوں تو اگر وہ یہاں موجود ہوں تو شام کا وقت اُن کے ساتھ گزارتا ہوں، اور واپسی بالعموم عشا کی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ آج معمول سے ذرا دیر ہو گئی۔ پھر ان کی تعریف اور علم و فضل سے متعلق چند کلمات کہے۔ اس کے بعد موضوعِ سخن بدل گیا، فارسی اور اردو علم و ادب پر گفتگو ہونے لگی۔ اسی طرح رات گئے تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ اُن کے آرام میں مخل ہو رہا ہوں، لیکن وہ اتنی محبت اور دلچسپی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اگر وہ اس میری بے وقت کی ہرزہ سرائی سے بے آرام بھی ہوئے تو انھوں نے قطعی کسی طرح اُسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آخر آدھی رات کے قریب میں نے باتوں باتوں میں اشارہ کیا، تو نہایت لطف سے فرمایا۔ ارے آپ کی دلچسپ باتوں سے مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سفر سے آئے ہیں۔ تھکے ماندے ہوں گے، اچھا اب آپ آرام کیجیے۔ کل صبح انشاء اللہ حبیب گنج چلیں گے۔ میں نے عرض کیا، یہ دو تین گھنٹے کا گاڑی کا سفر ہی کونسا ایسا سفر تھا کہ میں تھک جاتا۔ آپ کی تکلیف کا خیال ہو رہا ہے۔ بہرحال ہم نے ایک دوسرے سے شب بخیر کہا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس دوران میں باہر بارش زیادہ سنجیدگی سے ہونے لگی تھی، اور ساتھ ہی تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ بدقسمتی سے میرے کمرے کے ایک روشندان میں کچھ خرابی تھی۔ یہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا اور ہوا سے اس کا پٹ کھٹکھٹاتا تھا۔ رات بھر اس بے ہنگم آواز کے باعث میں ٹھیک طرح سو نہیں سکا۔ خیر صبح کو اٹھا، حمام میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ نہایا دھویا، ناشتے کے بعد ہم نواب صاحب کی موٹر پر حبیب گنج کے لئے روانہ ہوئے۔ اگرچہ بارش ختم ہو چکی تھی، لیکن ہوا میں خاصی نمی تھی۔ اور سردی بھی خوب چمک گئی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ ہم تین آدمی تھے۔ نواب صاحب اور اُن کے مصاحب مُلّا احمد اور میں۔ نواب صاحب اور میں پچھلی طرف بیٹھے اور مُلّا احمد صاحب ڈرائیور کے برابر میں آگے بیٹھ گئے۔ سڑک بہت خراب

تھی۔ اس کا اکثر حصہ پہلے ہی شکستہ سا تھا۔ رہی سہی کسر رات کی بارش نے پوری کر دی۔ گڑھوں میں پانی بھر گیا تھا، اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں کیچڑ ہو رہی تھی۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم افتاں خیزاں حبیب گنج پہنچے۔ علی گڑھ سے ناشتہ کر کے چلے تھے اور دوپہر کے کھانے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس لئے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ پہنچتے ہی نواب صاحب نے کتب خانہ کھولنے کا حکم دیا۔ مہتمم صاحب آگئے۔ ملازموں نے کرسیوں کو جھاڑا پونچھا اور ہم داخل ہو گئے۔

اللہ اللہ اب میں اپنے تاثرات کا حال کیا لکھوں۔ ہر طرف ہزاروں بیش قیمت کتابیں قرینے سے الماریوں میں چُنی رکھی تھیں۔ غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی پچھلے شاعر کے ہاں کوئی ایسا مضمون بندھ گیا ہے جو میرے یہاں بھی پایا جاتا ہے، تو اس سے یہ خیال نہ کرو، کہ مجھے اس سے توارد ہو گیا ہے، بلکہ یقین جانو کہ اُس نے نہان خانۂ ازل سے میرے مضمون کی چوری کر لی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال میرا اس وقت ہوتا ہے، جب میں کسی جگہ کوئی اچھی کتاب دیکھتا ہوں مجھے یوں لگتا ہے، جیسے غلطی سے میرے حصے کی چیز یہاں آ گئی ہے۔ اور یہاں تو ایک دو نہیں ہزاروں کتابیں میرے اردگرد پڑی تھیں ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

نواب صاحب کا عجیب عالم تھا، وہ ایک کتاب منگواتے، مجھے دکھاتے اور پھر اس کی خصوصیات گنوانا شروع کرتے۔ یہ ملک الشعرا طالب آملی کا دیوان ہے۔ اس میں بہت سا کلام خود طالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس طرف میری توجہ علامہ شبلی مرحوم نے دلائی تھی۔ میں نے جب یہ دیوان خریدا ہے تو محض قدامت اور کتابت کی خوبی کے باعث۔ لیکن انھوں نے اسے دیکھ کر لکھا کہ اس میں بہت سی تحریریں خود طالب کے ہاتھ کی ہیں۔ دیکھئے یہ سُرخ روشنائی کی تحریر طالب کی ہے۔

یہ مثنوی کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا اس سے قدیم تر نسخہ جرمنی کے شہر میونک (صحیح تلفظ میونخ ہے) کے کتاب خانے میں ہے۔ جو اس سے صرف چھ برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نیز نسخہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے کتاب خانہ میں رہا ہے۔ یہ رہیں اُن کی مُہریں۔ صاف پڑھا جاتا ہے "محمد اورنگ زیب بادشاہ"۔

یہ شیخ سعدی کی بوستاں ہے۔ اس پر اودھ کے تین بادشاہوں کی مہریں ہیں۔ نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ۔

چند دن پہلے ایک تازہ فتوح آئی تھی۔ مُلّا سعد الدین تفتازانی کی مطول مہتمم سے کہہ کے اُسے منگوایا۔ اس کے شروع میں پانچ چھ سطریں اس شان سے لکھی تھیں کہ آدھی عبارت بہت قدیم اور مغشوش تھی اور باقی آدھی تازہ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حصہ خود نواب صاحب نے پورا کیا تھا۔ پاس ہی میز پر مکبّر شیشہ پڑا تھا۔ اُٹھایا اور اُسے میرے ہاتھ میں دے کے فرمانے لگے۔ دیکھئے تو یہ عبارت پڑھ سکتے ہیں۔ میں رُک رُک کے پڑھنے لگا۔ آخر میں "نور الدین بن اکبر شاہ غازی" کے الفاظ تھے۔ گویا یہ خود جہانگیر کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ اور اسی لئے انھوں نے مجھے اس کے پڑھنے کے لئے کہا تھا۔

بابر بادشاہ کے بیٹے کامراں کا دیوان اس سے تھوڑے دن پہلے شائع ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چند ایسے صفحوں کے عکس دیے گئے ہیں، جن پر مغل بادشاہوں کی تحریریں یا دستخط ہیں۔ میں اسے دیکھ چکا تھا۔ مطول کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ جہانگیر کا سوادِ خط بالکل وہی ہے جو کامراں کے دیوان میں ہے۔ یہ سن کر بہت مسرور ہوئے۔ اور کہا تو آپ نے کامراں کا دیوان دیکھا ہے۔ پھر اسے بھی منگوایا اور ہم دونوں اسے دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔

غرض ہم دیر تک اس جنتِ نگاہ کے نظارے میں مشغول رہے۔ وہ کتاب نکلواتے، اسے دکھاتے اور اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے جاتے۔ اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے اس کی کسی طرح کی اہمیت واضح ہوتی تھی تو خوشی کا اظہار فرماتے۔ وہ مجھے کتابیں اس طرح دکھا رہے تھے جیسے میں کوئی بہت بڑا مبصر یا صاحبِ علم و فن ہوں۔ وہ ہر طرف سے بے پروا ہو کر یوں کتاب پہ کتاب نکلوا رہے تھے، گویا آج پہلی مرتبہ انھیں کوئی کتابوں کا قدر دان ملا ہو، اور میں اپنی بے مائگی اور اُن کی ذرہ نوازی پر عرق عرق ہوا جا رہا تھا۔ حضرت خواجہ میر دردؔ علیہ الرحمۃ کا شعر ہے ؎

یاراں ز مہربانی دانند، ہر چہ دانند
ما خوب می شناسیم اے دردؔ آنچہ مائیم

اصل بات یہ ہے، کہ وہ بفضلہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اساسی اور بنیادی طور پر علمی آدمی تھے۔ ان کی رُوح اور ذوق کی تسکین اگر ہوتی تھی تو کتابوں سے یا صاحبِ علم اصحاب کی صحبت میں۔ جہاں کہیں انھیں یہ دونوں چیزیں میسر آ جاتیں ان کا بیرونی پردہ، جو بہرحال عارضی چیز تھی، اُٹھ جاتا اور وہ اپنے اصلی روپ میں نمایاں ہو جاتے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ میں جب ان سے ملا، تو وہ بے نقاب ہو گئے۔ صحیح یا غلط، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا، کہ میں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتا ہوں اور کتابوں کا قدر دان۔ اس صورت میں عمر، مرتبہ، علم کا تفاوت کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اہم چیز یہ تھی کہ میں بھی ان کے خیال میں علم کا شوقین اور کتابوں کا رسیا تھا۔ یہی چیز ہم دونوں میں گویا قدرِ مشترک تھی۔ اس کے بعد بھلا یہ کیسے ممکن تھا، کہ وہ ایک ہم مشرب و ہم خیال شخص کے سامنے اپنا اندوختہ نہ رکھ دیتے۔ اس میں کسی حد تک جذبۂ تفاخر بھی شامل تھا۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا، کہ آپ کا بچہ، جب تک اپنا نیا کھلونا اپنے ہم جولیوں کو نہ دکھلا لے اُسے چین نہیں آتا۔ اس کی تہہ میں بھی یہی بات ہے یعنی کسی ہم خیال کے ساتھ کھلونے سے لطف اندوز ہونا اور اپنی ملکیت کا غرور اور اس کی نمائش کی خواہش۔

نواب صدر یار جنگ نے عمر بھر کی محنت سے یہ کتب خانہ جمع کیا۔ بدقسمتی سے یہ ایسی جگہ تھا، کہ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ اس لیے بسا اوقات واقعی صاحبِ ذوق حضرات بھی وہاں جانے سے ہچکچاتے تھے۔ لیکن اگر کسی طرح نواب صاحب کو معلوم ہو جاتا تو وہ دعوتیں دے دے کر انھیں بلاتے۔ اپنا مہمان رکھتے اور جب واقعی کوئی قدر دان مل جاتا، تو پھولے نہ سماتے۔

عربی کے مشہور شاعر متنبی نے ایک شعر میں اپنی دو دل پسند چیزوں کا ذکر یوں کیا ہے ؎

وخیرُ مقامٍ فی الدنی سرجُ سابحٍ
وخیرُ جلیسٍ فی الزّمانِ کتاب

یعنی دنیا میں بہترین نشست برق رفتار گھوڑے کی زین ہے اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے۔
یہی دوسرا مصرع کتب خانے کا طغریٰ ہے۔ ربڑ کی ایک تکونی مُہر میں یہ کندہ تھا اور جو کتاب یہاں داخل ہوتی اس پر یہ مُہر لگائی جاتی تھی۔

آخر ہم اندر سے نکل کر باہر کے برآمدے میں آکے بیٹھ گئے۔ یہاں دیوار پر مختلف تصویریں، نقشے، مرقعے وغیرہ لٹک رہے تھے۔ ہندوستان کا ایک پرانا اور دل کش قلمی نسخہ تھا جس میں ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی زرعی پیداوار اور حیوانات بھی تصاویر میں دکھائے گئے ہیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم کو آخری زمانے میں مصوّری کا بھی شوق ہوا تھا۔ یہاں اُن کی دستکاری کے بھی چند نمونے دیکھے۔ تصویریں فنی پہلو سے تو واجبی ہی سی تھیں۔ البتہ تبرک ضرور تھیں۔ شروع میں غالب کے جس خط کا ذکر کر آیا ہوں وہ بھی موجود تھا۔ اس خط کے آخر میں تاریخ تحریر ۱۸۶۰ء لکھی ہے، جو بداہتہً غلط ہے۔ دیر تک اس پر بحث ہوا کی کہ ٹھیک تاریخ کیا ہے۔ بہرحال کچھ فیصلہ نہ ہو سکا، اور ہو بھی کیسے سکتا تھا محض قیاس آرائی ہی تو تھی۔ ثبوت کیسے مہیا کیا جا سکتا تھا۔ "ذکر غالب" کے ساتھ میں نے غالب کی جس تصویر کا عکس دیا ہے وہ میں نے یہیں سے لی تھی۔

اتنے میں ظہر کا وقت ہو چلا تھا۔ فرمایا، اگر کھانے کے بعد مطالعے کے لئے کوئی کتاب لینی چاہیں تو نکلوا لیجئے۔ میں نے گزارش کی کہ "سبد چین" کا مطبوعہ نسخہ دلوائیے تاکہ جو نقل آپ نے بھجوائی ہے اس سے مقابلہ کر سکوں۔ نیز مومن کا فارسی دیوان۔ کتابیں آئیں اور ہم باہر چلے آئے۔ میں اپنے کمرے کی طرف گیا اور وہ مسجد کی طرف۔

"سبد چین" کی پہلی ۱۸۶۷ء والی اشاعت میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں، اور اس کے آخر میں غلط نامہ لگوایا گیا تھا۔ سوءِ اتفاق سے حبیب گنج والے نسخے سے یہ غلط نامہ غائب تھا۔ اس لئے میں پوری تصحیح نہ کر سکا۔ آخر میں نے یہ کام ہارڈنگ لائبریری (دہلی) کے نسخے کو دیکھ کر کیا تھا۔ اس کے باوجود میرے شائع کردہ ایڈیشن میں بعض غلطیاں رہ گئیں جن کا مجھے افسوس ہے۔

تھوڑی دیر بعد مُلّا احمد مجھے کھانے کے لئے بلانے آئے۔ دسترخوان لکڑی کا ایک نیچا سا تخت تھا۔ اس پر سفید چادر تھی۔ تخت کے چاروں طرف گدے تھے۔ ہم لوگ ان پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب مغفور دسترخوان کے ایک سرے پر تھے۔ ان کے سیدھے ہاتھ پر اُن کے خلف اکبر خان بہادر محمد عبید الرحمٰن خاں صاحب تھے۔ اور اُن کے بعد مُلّا احمد۔ میں نواب صاحب کے بائیں طرف تھا۔ میرے برابر میں ایک اور صاحب بیٹھے تھے۔ جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ بس ہمیں پانچ کھانے پر تھے۔

کھانے میں قورمہ پلاؤ تھا۔ مُرغ کا سالن تھا، شامی کباب تھے، ترکاری تھی۔ ملازم نے نواب صاحب کے سامنے ایک رکابی میں کوئی خاص چیز لاکے رکھی۔ یاد نہیں رہا کہ کیا تھا۔ انھوں نے اس میں سے ایک اور رکابی میں تھوڑا سا نکال کے مجھے عنایت فرمایا۔ کھانے کے دوران میں بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد کچھ مٹھائی آئی۔ جناب خان بہادر نے یہ کہہ کے مجھے پیش کی کہ شوق فرمائیے۔ بازار سے نہیں آئی، بلکہ خانہ ساز ہے۔

کھانے کے بعد نواب صاحب آرام کے لئے اندر تشریف لے گئے۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور مومن کا دیوان

دیکھتا رہا۔

چار بجے کے لگ بھگ میں پھر بڑے کمرے کی طرف گیا۔ نواب صاحب تلاوت سے فارغ ہو کر عصر کی نماز کے لئے جا رہے تھے۔ مسجد بڑے پھاٹک کے باہر ہے جہاں جماعت ہوتی تھی۔ اُن کی واپسی پر ہم رات کے کھانے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ درمیان میں ایک مرتبہ وہ مغرب کی نماز کے لئے اُٹھے۔ لیکن نماز کے بعد سیدھے وہیں واپس آئے۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام اور انگریز ریذیڈنٹ سے اپنی چپقلش کے حالات سناتے رہے۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد مرحوم کی وضعداری کا ایک قصہ قابلِ ذکر ہے۔ فرمایا، مجھے پان کی عادت ہے، لیکن تمباکو نہیں کھاتا۔ میں جب پہلی مرتبہ مہاراجہ بہادر کے ہاں گیا تو وہ خاصدان میں پان رکھ کے لائے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پان لے لیا۔ واپس جا کے اب دوسری مرتبہ وہ زردہ لے کے آ گئے۔ میں نے پھر شکریہ ادا کیا اور عذر کیا کہ میں تمباکو نہیں کھاتا۔ میں حیدرآباد میں بارہ برس رہا اور مہاراجہ بہادر سے اکثر ملاقات بھی ہوتی تھی۔ جب بھی میں اُن کے ہاں جاتا۔ وہ پہلے پان کی گلوری لاتے جو میں لے لیتا۔ پھر تمباکو لاتے میں شکریہ کے ساتھ عذر کر دیتا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ میں تمباکو نہیں کھاتا۔ لیکن کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے مجھے تمباکو پیش نہ کیا ہو۔

اس پہلی ملاقات کے موقع پر آپ نے میری نوٹ بک میں مندرجہ ذیل عبارت رقم فرمائی۔

براہِ دوستیہا ہر کہ بے منت قدم ساید
بہر گامیکہ بردارد، ازو پائے، ز من چشمے

کتبہ حبیب الرحمٰن

بفرمائش مالک رام صاحب بوقت ورودِ ایشاں در حبیب گنج ۲۷ شوال المکرم ۱۳۵۶ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء۔

اگلے دن میں واپس دہلی چلا آیا۔ چلتے وقت آپ نے اپنی تصنیفات کا مجموعہ میرے ساتھ گاڑی میں رکھوا دیا۔ یہاں آنے کے تھوڑے دن بعد میں نے پہلے ”سبد چین“ اور پھر ”ذکرِ غالب“ شائع کیں۔ دونوں کے نسخے میں نے اُن کی خدمت میں بھیجے۔ حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے بہت تعریف کی۔

(۲)

اتفاق سے میں ۱۹۳۹ء میں ملک سے باہر چلا گیا۔ جنگ کا سارا زمانہ باہر ہی رہا، اور ۱۹۴۶ء کے اواخر میں واپس وطن آیا۔ اس تمام دوران میں خط و کتابت کا سلسلہ ہمارے درمیان جاری رہا۔ میں جب لوٹ کے آنے والا تھا، تو انھوں نے لکھا کہ جب واپس آؤ تو حبیب گنج ضرور آنا۔ چنانچہ میں تعمیلِ حکم میں فروری ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ گیا۔ میں نے جانے سے ایک دن پہلے تار سے انھیں اپنے آنے کی اطلاع دی۔ میں صبح کی گاڑی سے گیا تھا۔ کوٹھی پر پہنچا تو نواب کے پھر جناب عبدالحمید خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے پہچانا نہیں جو اتنے دن کے وقفے کے بعد کچھ ایسا غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ بہرحال ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب قبلہ حبیب گنج میں ہیں۔ میں فوراً اُدھر جانے والی لاریوں کے اڈّے پر پہنچا۔ اب رستے کا حال کیا بیان کروں، یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے

پچھلے دس برس میں سڑک کی مرمت تک نہیں ہوئی۔ بلکہ اب اُسے سڑک کہنا ہی غلط تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ دونوں طرف کھیت تھے اور اُن کے بیچ میں ایک خاصی چوڑی روش تھی جس پر بہت باریک مٹی کی چھ انچ تہہ جما دی گئی تھی۔ موٹر کے پیچھے پیچھے گرد و غبار کا ایک طوفان چھایا ہوا تھا، اور اگر بدقسمتی سے کہیں سامنے سے بھی کوئی لاری یا موٹر آنکلتی تو پھر خود ہی تصوّر کر لیجئے کہ مسافروں پہ کیا گزر جاتی ہوگی۔ سفر کا آخری ڈیڑھ دو میل کا ٹکڑا اِکّے یا تانگے پہ طے کرنا تھا۔ یہاں میں اڈّے پر اُترا اور ایک تانگے پر بستر رکھ کر آگے روانہ ہوا۔ لیکن یہ راستہ بھی اتنا خراب تھا کہ ہچکولوں کے مارے میری طبیعت خراب ہونے لگی، لاچار دو تین فرلانگ کے بعد میں اُتر کھڑا ہوا، باقی مسافت میں نے پیدل پوری کی، اور سامان تانگے پر آیا۔

میں ڈھائی تین بجے کے قریب حبیب گنج پہنچا۔ نواب صاحب مرحوم باہر کے مغربی برآمدے میں فرش پر بیٹھے حسبِ معمول تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ میں مُلّا احمد صاحب کو آداب عرض کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ جب تلاوت سے فارغ ہوئے تو میں نے جُھک کے سلام عرض کیا۔ چونکہ اب اُونچا سُننے لگے تھے اس لئے سُنا نہیں۔ مُلّا احمد صاحب نے کہا کہ ذرا اونچا کہیئے۔ چنانچہ میں نے منہ کان کے قریب لے جا کے خاصی اونچی آواز سے دوبارہ کہا آداب عرض کرتا ہوں۔ چند لمحے تک غور سے دیکھا، میں نے بھی نام نہیں بتایا اور چپ چاپ اُن کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ یک لخت پہچان کے سرو قد کھڑے ہو گئے اور لپٹا لیا۔ اللہ اکبر اس معانقے کی گرم جوشی سے اب تک لذت اندوز ہو رہا ہوں۔ معلوم ہوا کہ میرا تار انھیں موصول نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ چونکہ تار میں نے علی گڑھ کے پتے سے بھیجا تھا۔ وہاں سے جناب عبدالوحید خاں صاحب نے آگے دستی روانہ کر دیا۔ چنانچہ میرے پہنچنے کے آدھ پون گھنٹہ بعد ایک شخص ڈاک لے کے آیا، اسی میں تار بھی تھا۔

نواب صاحب نے ملازم کو حکم دیا۔ وہ پانی کا لوٹا، صابون، تولیا وغیرہ لے آیا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا۔ اتنی دیر وہ میرے پاس کھڑے رہے۔ پھر چائے آئی، سب نے پی۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد عصر کی نماز کے لئے مسجد میں چلے گئے۔ جاتے ہوئے فرمایا۔ مغرب کے بعد آپ کی پچھلے سات برس کی رام کہانی سنوں گا، کہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا دیکھا۔ میں نے عرض کیا بسر و چشم۔ شام کے کھانے کے بعد ہم لوگ بڑے کمرے میں آ گئے۔ نواب صاحب اور مُلّا احمد اور میں۔ اگرچہ میں نے اس چھ سات برس میں شرقِ اوسط و ادنیٰ کے تمام اسلامی ممالک کی سیر کی تھی، لیکن زیادہ قیام مصر میں رہا تھا۔ کہنے لگے، دیکھئے صاحب اُردو میں گفتگو نہیں ہوگی آپ اتنے دن مصر میں رہے ہیں یقیناً عربی بہت اچھی بولتے ہوں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔

یوں کہنے کو تمام عربی ممالک کی زبان عربی ہے۔ لیکن جب باہر سے کوئی ایسا شخص یہاں آئے، جس نے ساری عمر عربی پڑھی ہو اور اپنے آپ کو عربی کا عالم سمجھتا ہو، تو اگر وہ یہاں عام لوگوں سے بات چیت کرے، تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں، کہ وہ اُن کی سمجھنے اور انھیں سمجھانے میں بہت دقت محسوس کرے گا۔ بات یہ ہے کہ عام بول چال کی بولی، کتابی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اس عوامی زبان (دارجہ) کے اپنے اصول ہیں۔ اس کی گرامر الگ ہے۔ اس کی لغات الگ ہے۔ اس کا لب و لہجہ الگ ہے۔ غیر ملکی عالموں کو تو چھوڑیئے کہ ان غریبوں نے سوائے کتابیں پڑھنے کے کسی کو کم بولتے سُنا ہوگا، خود عربی ممالک کا یہ حال ہے کہ ایک مصری ایک عراقی کی بات سمجھنے میں مشکل محسوس کرتا ہے، حالانکہ دونوں عربی بولتے ہیں۔ ایک لطیفہ یاد آگیا۔ میرے ایک مصری دوست

ہیں، وہ کسی زمانے میں مارسیلز (فرانس) میں مصری قونصل تھے۔ مراکش کا علاقہ، فرانسیسی سلطنت کا حصہ ہے۔ ایک دن کچھ مراکشی باشندے کسی کام سے اُن کے دفتر میں آئے۔ اب خیال رہے کہ مصر اور مراکش دونوں ملکوں کی زبان عربی ہے، فرمانے لگے، قسم لے لو، جو میں اُن کی گفتگو کا ایک لفظ سمجھا ہوں، آخر ایک ترجمان بلانا پڑا، جو طرفین کی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا، اور اس طرح معاملہ طے ہوا۔ پھر ہر ایک جگہ کی بولی میں دخیل الفاظ ہیں۔ یعنی دوسری زبانوں کے لفظ عربی میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ لوگ انھیں بے تکلف بولتے ہیں، اور قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ نہ انھیں یہ معلوم ہی ہے کہ یہ عربی کا نہیں کسی غیر زبان کا لفظ ہے۔ مراکش اور تونس میں فرانسیسی اور ہسپانوی کے لفظ راہ پا گئے ہیں۔ مصر میں فرانسیسی اور اطالوی۔ اسی طرح عراق میں فارسی اور ترکی۔ اور یہی حال دوسری جگہوں کا ہے۔ اگر اس بیرونی آلائش سے کچھ محفوظ رہی ہے، تو حجاز کی زبان، اگرچہ یہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ پھر یہ خرابی عوام ہی تک محدود نہیں بلکہ تعلیم یافتہ اور عالم لوگ بھی جب آپس میں بات چیت کریں گے تو اسی رائج زبان میں۔ یوں لکھنے کو ٹھیٹ لکھیں گے، کیونکہ کتابی زبان نہیں بدلی، لیکن بولیں گے یہی عام بولی۔

اسی صورتِ حال کو مدِ نظر رکھ کے میں نے عرض کیا کہ مجھے عربی میں بات چیت کرنے میں کوئی عذر نہیں لیکن بے اختیار نہ میری زبان پر رائج کلمات آجائیں گے جو اوّل تو آپ سمجھیں گے نہیں اور اگر سمجھ بھی گئے تو عربی کا ہے کو، یہ اچھا خاصا مذاق بن جائے گا۔ فرمانے لگے، پروا نہ کیجیے۔ چنانچہ ہم پہلے پندرہ بیس منٹ تک عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے کوشش کی کہ حتی الوسع میری زبان نحوی اور صحیح ہو۔ لیکن پھر بھی مشق نہ ہونے کے سبب کہیں کہیں رائج لفظ آ گئے۔ موضوعِ سخن اسلامی ممالک کے حالات تھا۔ وہاں کے لوگوں کے دینی اور معاشرتی مسائل سے متعلق پوچھتے رہے۔ جب میں نے بتایا کہ عام طور پر ممالکِ عرب میں دولت کی تقسیم بہت غلط طریقے پر ہوئی ہے۔ ملک کا تمام سرمایہ چند خاندانوں میں جمع ہو کے رہ گیا ہے۔ زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کا حکومت کی طرف سے کوئی انتظام نہیں۔ مغربی سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی بلکہ خلافِ اسلام تمدن و معاشرت ہر جگہ عام ہے تو بہت افسوس کرتے رہے۔

اس کے بعد اردو زبان و ادب کا سلسلہ چلا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے جو خطوط قید خانے میں ان کے نام لکھے تھے اُن کا مجموعہ "غبارِ خاطر" کے نام سے چند ماہ پیشتر شائع ہو چکا تھا۔ میرے پہنچنے سے تھوڑے دن پہلے ایک دوسری کتاب اُن کے ایک عزیز نے مرتب کر کے "کاروانِ خیال" کے عنوان سے چھاپی تھی۔ اس میں مولانا آزاد کے علاوہ ان کے اپنے خطوط بھی ہیں۔ "غبارِ خاطر" کا ایک بہت خوب صورت ایڈیشن لاہور سے نکلا تھا۔ اس کے آخر میں ایک خط بھی زیادہ ہے جس میں اسلامی موسیقی سے متعلق بحث ہے۔ "کاروانِ خیال" کے ساتھ اس خاص ایڈیشن کا ایک نسخہ میز پر پڑا تھا۔ دونوں کتابوں کو اٹھایا اور ان پر دستخط کر کے مجھے عنایت فرمائیں۔ پھر مولانا آزاد کی تحریر و تقریر، حافظے اور ہمہ گیر شخصیت کی تعریف کرتے رہے۔ مجھے خیال ہوا کہ ان کی زندگی کے کچھ حالات پوچھوں۔ چنانچہ میں نے اُن کے خاندان، تعلیم اور حیدرآباد کی ملازمت سے متعلق کتنے سوال کیے۔ جواب دیتے رہے۔ پھر فرمایا، میرے ایک عزیز نے پچھلے دنوں علی گڑھ کے رسالے مصنف میں میرے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں کچھ غلطیاں در آئی ہیں۔ بہر حال اس پر ایک نظر ڈال کے آپ کو بھیج دوں گا۔ چنانچہ حسبِ وعدہ یہ پرچہ انھوں نے مجھے بھیجا تھا۔ اس میں بعض اصلاحیں خود ان کے قلم سے ہیں۔ بعض کسی اور کے۔

اگلی صبح ہم ناشتے کے بعد کتب خانے میں پہنچے۔ میرے پاس دیوانِ غالب کا ایک نسخہ ہے جس کا پہلا اور آخری ورق غائب ہیں۔ اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کہاں سے اور کب شائع ہوا۔ قرائن سے البتہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میرزا کی زندگی میں چھپا ہے۔ اس کے آخر میں نیر رخشاں کی لکھی ہوئی تقریظ ہے میں نے غلط نتیجہ نکالا کہ یہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں شائع ہوا۔ چنانچہ میں نے اسی طرح "ذکرِ غالب" کے پہلے ایڈیشن میں لکھ دیا۔ بعد میں اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ اب یہ بات تو صاف ہو گئی کہ ۱۸۵۵ء میں اردو دیوان کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایک نئی الجھن پیدا ہوگئی کہ آخر میرے پاس جو نسخہ ہے یہ کہاں اور کس سال میں چھپا۔ میں احتیاطاً اسے اپنے ساتھ لیتا گیا تھا کہ اگر کتب خانہ حبیب گنج میں بھی اسی ایڈیشن کا کوئی اور نسخہ ہو تو مقابلے سے یہ معمّہ حل ہو جائے۔ خوش قسمتی سے یہاں ایک مکمل نسخہ موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مطبع احمدی شاہدرہ دہلی والا ۱۸۶۱ء کا نسخہ ہے۔ اس میں بہت غلطیاں رہ گئی تھیں بعض شعر چھپنے سے رہ گئے، بعض دوبارہ چھپ گئے کتابت کی غلطیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اسی لئے میرزا نے فوراً مطبع نظامی کانپور میں نیا ایڈیشن چھاپنے کی اجازت دے دی تھی۔

ہمیں کتب خانہ میں آ کے بیٹھے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ فرمایا، لیجئے آپ سے متعلق ایک شعر ہو گیا ہے —

اے مالکِ مُلکِ وفائے یاراں
دل رام تو شد فدائت صد جاں

میں اٹھ کے آداب بجا لایا اور اُن کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے عرض کیا کہ اپنی کوئی تصویر ہو تو مرحمت فرمائیے۔ وہ رنگ تصویروں کے ذخیرے میں سے تلاش کرتے رہے سب پرانی چیزیں تھیں۔ اور ان میں سے بھی کوئی اکیلی تصویر نہ نکلی۔ چونکہ میرا شام کو واپسی کا ارادہ تھا۔ فرمانے لگے چلئے میں آپ کے ساتھ علی گڑھ تک چلتا ہوں، وہیں اکٹھے تصویر اتروائیں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں اتنی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے زحمت کچھ بھی نہیں۔ میں کل تو جانے ہی والا تھا، آج چلا جاؤں گا۔ یوں علی گڑھ تک اور ساتھ بھی رہے گا۔ غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ مجھے کل کسی کام سے الٰہ آباد جانا ہے۔ لیکن ہمیں حبیب گنج سے روانہ ہونے ہونے دیر ہو گئی۔ جاڑوں کے دن، پانچ بجے ہی خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب تک ہم علی گڑھ پہنچے، روشنی اتنی کم ہو چکی تھی کہ تصویر اتروانے کا وقت نہیں رہا تھا کہنے لگے کوئی بات نہیں، پھر کسی وقت اتروا کے بھیج دونگا۔ اگرچہ یہ افسوس ضرور رہے گا کہ آپ اس میں نہیں ہوں گے۔

راستے میں گرد و غبار کے طوفان کو دیکھ کے میں نے عرض کیا کہ اس دل بادل کو دیکھ کے فردوسی کے شعر کی حقیقت واضح ہو گئی —

ز سُم گردِ میداں کہ برشُد بہ دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

بہت مسرور ہوئے۔ پھر خود حافظے پر زور دے کر شاہنامے کے اسی مقام کے آٹھ دس شعر سنائے۔ میں ان کی یادداشت پر دنگ رہ گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ کے پیٹے میں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ شاہنامہ انھوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہوگا کوئی ایک آدھ شعر کسی جگہ سے حسبِ موقع پڑھ دینا کوئی کمال نہیں۔ یہ بات ہر کوئی کر سکتا ہے۔ لیکن یوں اچانک ایک شعر

سُن کر آگے پیچھے کے شعر سنا دینا معمولی بات نہیں۔

مرحوم کی ایک عادت تھی کہ اگر وہ کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے تو عموماً خاموش رہتے یا کوئی اور ذکر چھیڑ دیتے۔ اس سفر میں بھی ایک اسی طرح کا تجربہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا شبلی کی سوانح عمری "حیات شبلی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی، اس کا پورا مسودہ نواب صاحب مرحوم نے دیکھا تھا، اور انھوں نے اس پر جا بجا اضافے کیے جو کتاب کے ساتھ چھپ گئے ہیں۔ اسی زمانے میں یاروں کو مشغلہ ہاتھ آیا اور انھوں نے مختلف رسالوں میں شبلی اور عطیہ بیگم کے موضوع پر مضمونوں کا ایک تار باندھ دیا۔ بلکہ یاد پڑتا ہے کہ غالباً حیدرآباد ریڈیو سے ایک تقریر بھی اس موضوع پر نشر ہوئی تھی۔ جس وقت وہ شاہنامے کے شعر مجھے سنا رہے تھے میرا ذہن "شعر العجم" کی طرف منتقل ہو گیا۔ جس کے پہلے حصے میں مولانا شبلی نے کوئی سو صفحے میں شاہنامے پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ شعر العجم اور شبلی سے مجھے شبلی اور عطیہ بیگم کا قصہ یاد آ گیا۔ اب مجھے شرارت اور تحقیق کی سوجھی۔ جن اصحاب نے "حیات شبلی" پڑھی ہے، انھیں معلوم ہے کہ مولانا سید سلیمان نے اس سے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا، حالانکہ یہ ایسی بات نہیں جسے یوں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں کچھ اصلیت ہے تو اس کا برملا اعتراف کر لینا چاہیے تھا۔ کیونکہ اس سے مولانا شبلی کی عظمت اور وقار میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی، اور اگر یہ غلط ہے تو پھر اس کی مدلل تردید کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر آج یہ مسئلہ صاف نہ ہوا تو پھر قیامت تک نہیں ہوگا۔ اس وقت مولانا شبلی کے تلامذہ اور احباب اور تربیت یافتہ اصحاب ہمارے درمیان موجود ہیں، جو اس موضوع پر ذمہ دارانہ اور واقف کارانہ انداز میں لکھ سکتے ہیں۔ بعد میں آنے والے تو بہرحال انھیں کے خوشہ چین ہوں گے۔

ان ہی رعایتوں کے خیال سے میں نے اُن سے سوال کیا کہ کیا آپ نے "حیات شبلی" میں کوئی فروگذاشت محسوس نہیں کی۔ پوچھا، کیوں آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔ میں نے کہا یہی عطیہ بیگم والے قصے پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ ہاں ہوں کر کے رہ گئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے متعلق گفتگو کرنے پر تیار نہیں۔ ادھر میں محض "خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست" پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے پھر کہا۔ مکاتیب شبلی میں آپ نے مولانا کے خط مہدی افادی کے نام تو ضرور پڑھے ہوں گے، جواب اثبات میں دیا۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ نے مہدی آفادی کے خطوط کا مجموعہ بھی دیکھا ہے۔ فرمایا۔ ہاں، ایک زمانہ ہوا دیکھا تھا۔ میں نے کہا آپ نے خطوط شبلی بھی ضرور دیکھی ہو گی (جس میں شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے عطیہ بیگم اور اُن کی بہن کے نام لکھے تھے) فرمایا، ہاں یہ بھی بہت مدت ہوئی دیکھے تھے۔ اب میں نے اتنی تمہیدوں کے بعد سوال کیا کہ مہدی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ مولانا شبلی کا مجھ سے پردہ نہیں تھا۔ آخر یہ کس بات کی "پردہ داری" تھی۔ کہنے لگے، مجھے یہ کتاب دیکھے اتنا زمانہ ہو گیا ہے کہ اب ٹھیک طور پر کچھ یاد نہیں۔ میں نے کہا، اچھا یہی سہی۔ لیکن آپ اصحاب کی یہ کامل خموشی بھی تو شک پیدا کرنے والی ہے۔ آخر آپ لوگ کھل کے کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ کہنے لگے "فائدہ"؟ فائدہ یہ کہ اس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ کل کے مؤرخ کے لئے روشنی مہیا ہو جائے گی، اور اس کے لئے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی" انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں نے

گستاخانہ جسارت سے کام لیتے ہوئے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ میں نے کہا قرآن کہتا ہے "لاتکتموا الشھادۃ" کسی سلسلے میں اگر تمھیں کچھ بات معلوم ہو تو اس کے اظہار سے دریغ نہ کرو اور اُسے مت چھپاؤ، اور آپ حضرات ہیں کہ سب کچھ جانتے ہوئے خاموش ہیں۔ اور پوچھنے پر بھی نہیں بتاتے۔ لیکن صاحب یہ وار بھی خالی گیا۔ وہ ہنس کے ٹال گئے۔ اتنے میں ہم علی گڑھ پہنچ گئے۔

میں شام کی گاڑی سے واپس دہلی چلا آیا۔ اس موقع پر آپ نے میری نوٹ بک میں تحریر فرمایا تھا۔

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما
ذکرِ تو بود زمزمۂ شادیٔ ما
بفرمائش مالک رام صاحب بوقتِ ورودِ مکرم مقام حبیب گنج

فی البدیہہ
اے مالکِ ملکِ وفائے یاراں
دل رامِ تو شد فدائت صد جاں

حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ
حبیب گنج، ۲۷ فروری ۱۹۴۷ء

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے جلد بعد ہی میں دوبارہ ملک سے باہر چلا گیا۔ پہلے خط و کتابت برابر جاری رہی۔ لیکن پھر بہت بے قاعدگی پیدا ہو گئی۔ بلکہ آخری سال میں تو بالکل بند ہو گئی تھی۔ لکھا کہ اب کچھ لکھتا ہوں تو انگلیاں درد کرنے لگتی ہیں۔ میں نے بھی بارِ خاطر ہونا پسند نہ کیا۔ جناب عبدالوحید خاں صاحب سے ان کی خبر برابر ملتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن اُن کا خط ملا کہ وہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء کو جمعہ کے دن صبح کے سات بجے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۳)

موت بنی آدم کی میراث ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ وہ طبعی عمر گزار کر وہاں گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ وفات کے وقت عمر ۸۴ برس تھی۔ یعنی کتابِ مقدس کی مقرر کردہ حد سے بھی ۱۴ برس زیادہ۔ تو اس پہلو سے کوئی افسوس نہیں۔ یہ مرحلہ ٹالے ٹل نہیں سکتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور پیش آتا۔ وہ رئیس بن رئیس تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی عمر رئیسوں کی لغویات میں ضائع نہیں کی۔ علم کو اس طرح حاصل کیا جس طرح اس کا حق ہے۔ پھر ملک کے علم و عمل کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہوگا جو ان کی مادی یا معنوی اعانت سے شادکام اور فیض یاب نہ ہوا ہو۔ یہ بھی قابلِ فخر بات ہے۔ لیکن افسوس ہے تو اس بات کا کہ اب ان سا انسان نہیں ملنے کا۔ جس دَور کی وہ پیداوار تھے وہ دَور ہی ختم ہو گیا۔ اب اُن کے سے انسان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ایک آدھ اور صورت جو اس دَور کی یادگار باقی ہے، وہ بھی جھلملاتی شمع ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گل، اس کے

بعد گھُپ اندھیرا۔

زمانے نے اپنا ورق اُلٹ دیا ہے۔ آج محبت اور خلوص، دوستی اور وفا۔ اخلاق اور قدر دانی، علم اور فن۔ دین اور دُنیا، غرض ہر چیز کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ مرحوم اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ پھلے پھُولے اور پروان چڑھے۔ جسے ہم ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو وضعداری سے بہتر کلمہ نہ ملے۔ وضعداری، ایک قانون، ایک ضابطے کا نام تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس طرح کسی شخص سے آج ملے ہیں، اسی طرح آج سے پچاس برس بعد بھی ملیں گے۔ زندگی کا جو اصول آپ نے بنا لیا ہے، اب کوئی طاقت آپ کو اس سے اِدھر اُدھر نہیں کر سکتی۔ آپ کی دوستی بھی کسی اصول پر مبنی ہوگی، اور مخالفت بھی۔ یہ نہیں کہ جدھر کی ہوا ہوئی اُسی طرف پھر گئے۔ اسے ہم "وفاداری بشرطِ استواری" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ مرحوم اسی اصول کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اب یہ تصویر پھر نظر نہیں آئے گی۔ میرؔ کا ایک شعر یاد آگیا۔ اسی پر ختم کرتا ہوں ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
جب کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

ابوالکلام آزاد

غلام رسول مہر

نوا فزونست ز اندازۂ بریشم عود
غزل بہ زمزمہ خوانم کہ پردہ ہا پست اند

۱۹۱۳ء کے موسم گرما کا آغاز تھا۔ میں ایف۔ اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ چند دوست دستخط کے لئے ایک فارم میرے پاس لائے اور بولے کہ "حزب اللہ" کے ممبر بن جاؤ۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ نام سنا تھا، لیکن دوستوں پر اعتماد تھا اس لئے تذبذب کے بغیر دستخط کر دیئے۔ دیکھا کہ چھوٹا سا فارم ہے۔ اس پر ٹائپ میں تین چار سطریں چھپی ہوئی ہیں۔ اوپر جلی حروف میں "من انصاری الی اللہ" مرقوم ہے۔ اس کے نیچے قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور اس کے ساتھ اردو ترجمہ۔ پایانِ تحریر نام، پیشہ، عمر اور پتے کی جگہ خالی چھوڑ رکھی ہے۔ چند روز بعد میں اس فارم کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ ایف۔ اے کا امتحان دے کر گھر جانے لگا تو دوستوں سے پوچھا کہ بھئی! کوئی دلچسپ مشغلہ بتاؤ، جس سے نتیجۂ امتحان کے انتظار کا وقت بخوبی گزر سکے۔ انھوں نے کہا کہ اخبار جاری کرالو۔ اور ساتھ ہی دو اخباروں کے نام تجویز کرتے۔ ایک روزانہ "زمیندار"، دوسرا ہفتہ وار "الہلال"۔ "الہلال" کا چندہ اس زمانے میں آٹھ روپے سالانہ تھا اور اعلان ہو چکا تھا کہ جو لوگ ایک معین مدت میں خریداری کی درخواست کریں گے ان کے چندے میں سے ساڑھے سات روپے "ہلال احمر فنڈ" میں بھیج دیئے جائیں گے۔ میں نے "ہم خرما و ہم ثواب" کے پیش نظر فوراً درخواست بھیج دی، لیکن نہ اس وقت تک "الہلال" کی شکل دیکھی تھی نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کس قسم کا پرچہ ہے۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ "حزب اللہ" کا فارم "الہلال" ہی کے دفتر سے آیا تھا۔

میں گھر پہنچا تو چند روز بعد "الہلال" کا وی۔ پی آ گیا۔ پرچہ کھولا تو پورا ٹائپ میں چھپا ہوا تھا اور ٹائپ کے پڑھنے کا میں عادی نہ تھا۔ تکلف سے عبارت پڑھنی چاہی تو وہ عربی الفاظ و تراکیب سے لبریز تھی اور جا بجا آیات درج تھیں۔ کچھ وقت صرف کرنے کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ ممکن ہے "ہلالِ احمر فنڈ" میں چندہ دینے کا "ثواب" میرے نامۂ اعمال میں لکھا جائے۔ لیکن "خرما" کی امید تو نقش بر آب ثابت ہوئی۔ پرچہ ویسے ہی رکھ دیا اور اس کے کسی حصے سے استفادہ کا سوال باقی نہ رہا۔ آٹھویں دن پرچہ آتا تھا۔ میں اسے کھولتا اور پڑھے بغیر ایک جگہ رکھتا جاتا۔ چھٹا ساتواں پرچہ آیا تو اس میں "حزب اللہ" کے اغراض و مقاصد کا ذکر تھا۔ میں چونکہ اس جماعت کا ممبر بن چکا تھا اس لئے طبیعت پر جبر کر کے مضمون پڑھا کہ جس جماعت

سے وابستہ ہو رہا ہوں، اس کے مقاصد سے آگاہی لازم ہے۔ فارغ ہوا تو دل پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ چھ تمام پرچوں کو اوّل سے آخر تک حرفاً حرفاً دیکھا اور اس امر پر برابر افسوس کرتا رہا کہ پہلے دن اس کا باقاعدہ مطالعہ کیوں نہ شروع کر دیا۔ ؎

بے غمِ عشق تو صد حیف از عمرے کہ گزشت
پیش ازیں کاش گرفتارِ غمت می بودم

میں گاؤں میں رہتا تھا، جہاں ہفتے میں تین مرتبہ ڈاک آتی تھی۔ "الہلال" کی آمد کے دن ڈاکئے کی پیشوائی کے جوشِ اشتیاق میں میل، ڈیڑھ ڈیڑھ میل باہر نکل جاتا۔ جہاں وہ ملتا وہیں سے پرچہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا اور جو دوست یا عزیز ملنے کے لئے آتے، ان سب کو ایک ایک مضمون سناتا۔ یہ "الہلال" سے عشق و شیفتگی کی ابتدا تھی۔ اسی وقت سے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ عقیدت کا رشتہ استوار ہوا۔ چالیس سال کی مدت میں کاروانِ حیات نے وابستگی و انقطاع کی سینکڑوں منزلیں طے کیں۔ لیکن یہ رشتہ استوار سے استوار تر ہوتا رہا اور آج بھی جبکہ آخری منزل بہت قریب نظر آتی ہے، اس تعلق کو زندگی کی ایک عزیز ترین متاع سمجھتا ہوں۔

اسی زمانے میں مولانا سے خط و کتابت شروع ہو گئی تھی اور میری درخواست پر انھوں نے اپنی ایک دستخطی تصویر بھی بھیج دی تھی۔ اگرچہ اس واقعے کو ایک عمر گذر چکی ہے، لیکن آج بھی تصویر پانے کی لذّت اسی طرح محسوس کرتا ہوں، گویا یہ نعمت ابھی حاصل ہوئی ہے۔ مولانا سے ملاقات ۱۹۱۴ء میں ہوئی جب میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ راولپنڈی کانفرنس سے مراجعت پر برگینزا ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ میں چند احباب کی معیّت میں زیارت کے لئے گیا اور انہیں دیکھا تو اپنے ذہن میں جو تصوّر قائم کر رکھا تھا، اس سے وہ بالکل مختلف نکلے۔ میانہ قامت، جسم نہایت دُبلا پتلا، رنگ سُرخ و سفید، داڑھی مونچھ صاف، کمبل اوڑھے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ صرف چند منٹ، سرسری باتیں ہوئیں۔ میرا تعارف ہوا تو فرمایا کہ آج شام کے چار بجے ملو۔ مقرّرہ وقت پر حاضر ہوا تو ان کے علم و فضل کا رعب دل پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ جذباتِ عقیدت کو دل ہی دل میں موزوں الفاظ کا لباس پہنانے کے لئے ہر کوشش ناکام رہی، گویا یہ نقشہ پیش تھا ؎

آزردہ زمن حالِ شبِ وصل چہ پرسی
نے دل خبرم داشت، نہ از دل خبرم بود

مولانا نے پوچھا کہ "بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے؟" میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ اخبار جاری کر دوں گا، تاکہ ملک و ملّت کی کچھ خدمت بجا لاؤں۔ فرمایا "مشغلہ اچھا ہے، لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ اس طرح منزلِ مقصود کے قریب پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟ فرض کرو کہ ابتدائے کار ہی میں آرزو کے مطابق سامان میسّر آ جاتے ہیں تو اخبار کے استقلال اور اس کی آواز کی پذیرائی کے لئے کم و بیش دو سال کا انتظار تو ضروری ہوگا۔ پھر دو سال اس پذیرائی کے نتائج کا انتظار کرنا پڑے گا۔ گویا جس ذریعۂ خدمت سے کام لینے کا ارادہ کئے بیٹھے ہو، اس کے نتائج دیکھنے کے لئے کم از کم چار سال صرف ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک حالات کی رفتار ایسی ہے کہ اس مدّت کے ایک حصّے کا بھی انتظار مشکل ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس اثنا میں کیا کچھ ہو جائے گا۔" میں دم بخود رہ گیا اور عرض کیا کہ آپ فرمائیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فرمایا کہ امتحان سے فارغ ہونے کا انتظار کرو۔

"الہلال" بند ہو چکا تھا مولانا نے "البلاغ" نکالا تو اس کے ساتھ ہی کلکتہ میں "دارالارشاد" قائم کر دیا جس میں وہ منتخب نوجوانوں کو قرآنِ حکیم کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ قومی اور دینی کارکنوں کی تعلیم و تربیت کا وہ مرکز تھا جس کے لئے مولانا "الہلال" کے زمانے سے انتظامات کر رہے تھے۔ لیکن "دارالارشاد" کے قیام کو ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ حکومتِ بنگال نے انھیں بنگال کے حدود سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ وہ رانچی چلے گئے تو وہاں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ ساتھ ہی "البلاغ" بھی بند ہو گیا اور "دارالارشاد" بھی۔ اس اثنا میں درس صرف اڑھائی تین پارے تک پہنچا تھا۔ میرے دل میں ان کی ذاتِ بابرکات سے استفادہ کی جو آرزوئیں موجزن تھیں وہ بھی خون ہو کر رہ گئیں ؎

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

۱۹۲۰ء میں نظر بندی سے رہا ہوئے تو ملک میں ترکِ موالات کی تحریک جاری ہوئی اور وہ ہمہ تن اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے وقف ہو گئے۔ میں اس زمانے میں "زمیندار" سے وابستہ ہو چکا تھا۔ ان سے نیازمندی کے روابط کی تجدید ہوئی۔ اگرچہ سیاسی افکار میں بعض اوقات اختلاف کی صورت بھی پیش آتی رہی۔ لیکن رشتۂ عقیدت بدستور قائم رہا اور ذاتی تعلقات میں بفضلِ اللہ کوئی خلل نہ آیا۔ ہمارے عہد کی عام حالت یہ ہے کہ حسنِ نیت کی بناء پر بھی کسی سے اختلاف ہو تو اسے ناقابلِ برداشت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مولانا اپنے دوسرے اوصاف و محامد کی طرح اس وصف میں بھی یگانہ حیثیت کے مالک ہیں کہ رائے کے اختلاف یا مسلک کے تفاوت کو انھوں نے ذاتی تعلقات پر کبھی اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

میں ان کے بے مثال علم و فضل کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا جو نصف صدی سے اس وسیع سر زمین کے آسمان پر آفتابِ جہاں تاب کی طرح تابندہ و درخشندہ ہے۔ وہ ان اصحاب میں سے ہیں جنھیں قدرت صدیوں کے بعد عالمِ انسانیت کو اپنی خاص نعمت کے طور پر عطا کرتی ہے۔ وہ تحریر و تقریر دونوں کی اقلیموں کے تاجدار رہیں۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں اس زمانے میں بھی مشہور فرمانروایانِ علم و فضل کے لئے یکسر حیرت انگیز تھیں جب ان کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۰۴ء میں وہ پہلی مرتبہ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو خواجہ الطاف حسین حالی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم مولانا کو لے کر خواجہ صاحب مرحوم کی خدمت میں پہنچے تو پوچھا کہ خواجہ صاحب اس لڑکے کی عمر کتنی ہوگی؟ انھوں نے فرمایا کہ چودہ پندرہ برس کے ہوں گے۔ سلیم نے کہا یہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ان کے والد ایڈیٹر ہوں گے۔ جب معلوم ہوا کہ یہی ایڈیٹر ہیں تو متحیر رہ گئے اور بہت شفقت فرمائی۔ اس وقت سے مولانا کے ساتھ گہرے روابط پیدا ہو گئے۔ "الہلال" کا ابتدائی دَور تھا کہ مولانا ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ خواجہ حالی کے فرزندِ ارجمند خواجہ سجاد حسین بھی اس میں شریک تھے۔ ان کے ہاتھ خواجہ صاحب نے مولانا کو بہت بہت سلام کہلا بھیجا۔ نیز فرمایا کہ "الہلال" آتا ہے تو چار چار پانچ پانچ دن اس کے سوا کوئی مشغولیت نہیں رہتی۔

اس سے بھی عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ مولانا بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ "ارمغانِ فرخ" کے نام سے ایک گلدستہ نکلتا تھا جس کی ماہانہ طرحوں پر کلکتہ میں مشاعرے ہوتے تھے۔ اسی زمانے کی کہی ہوئی غزلیں اس گلدستے میں شائع

ہوتی تھیں ۔ مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خان شوخی رام پوری کلکتہ میں مقیم تھے ۔ انھیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ مولانا جو غزلیں مشاعروں میں سُناتے ہیں وہ انہی کی ہوتی ہیں ۔ ایک روز مولانا مسجد سے نکل رہے تھے ۔ نادر شاہ خان نے روک لیا اور کہا کہ ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے ۔ میں بیمار ہوں اور وہ غزل کے لئے متقاضی ہے ۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو ۔ انھوں نے زمین بتائی "یاد نہ ہو" "شاد نہ ہو" مولانا نے ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیئے ۔ نادر شاہ خان بولے کہ اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیئے ۔ مولانا نے بے توقف کہا ؎

وعدۂ وصل بھی اک طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

نادر شاہ خان نے کہا کہ صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی ۔

شمس العلما شبلی مرحوم سے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا ۔ ان سے مولانا کی خط و کتابت تھی ۔ شبلی ۱۹۰۵ء میں بمبئی گئے تو اس زمانے میں مولانا وہیں مقیم تھے ۔ ایک دوست کے ہمراہ ملاقات کے لئے پہنچے ۔ دوست نے تعارف کرایا تو شبلی کو یقین نہ آیا کہ ابوالکلام آزاد یہی ہیں ۔ جب شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تو اس درجہ گرویدہ ہوئے کہ "الندوہ" کی ایڈیٹری سونپ دی اور مولانا نے ۱۹۰۵ء کے اواخر سے ۱۹۰۶ء کے اوائل تک یہ خدمت انجام دی ۔

بہرحال جو وجود عمر کے ابتدائی مراحل میں وقت کے اکابر علم و فضل کے لئے باعث حیرت و استعجاب بن گیا تھا اُس کی شان و عظمت کے متعلق میں کج مج زبان کیا کہہ سکتا ہوں ۔ مولانا کو خدا نے غیر معمولی حافظہ عطا کیا ہے ۔ اس کی محسوس و مشہور مثالیں "تذکرہ" اور "غبارِ خاطر" کی شکل میں دنیا کے سامنے موجود ہیں ۔ "تذکرہ" رانچی کی نظربندی کے زمانے میں لکھا گیا ، جب مولانا کے پاس کوئی قابلِ ذکر کتاب موجود نہ تھی ۔ "غبارِ خاطر" کے خطوط احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں مرتب ہوئے ۔ اس وقت بھی وہ کتابوں سے بڑی حد تک محروم تھے ۔ لیکن ان کتابوں کے مطالعے سے ہر شخص پر آشکارا ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے کتب خانوں میں بیٹھ کر بھی اس قسم کی چیزیں مرتب نہیں کی جا سکتیں ۔ "غبارِ خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور اس کی کاپیاں دیکھنے کا کام مجھے سونپا گیا تھا ۔ "مآثر الامراء" کی ایک عبارت کے متعلق میرے دل میں شبہ پیدا ہوا ۔ مطبوعہ کتاب میں عبارت وہی تھی جو مولانا نے "غبارِ خاطر" میں درج کی تھی ۔ میرا خیال ہے کہ کتاب ایڈٹ کرنے والے نے ایک لفظ کے سمجھنے میں غلطی کی ۔ استصواب کی غرض سے مولانا کو لکھا ۔ فرمایا : "منقولہ عبارت درست ہے اور یہ "مآثر الامرا" کی فلاں جلد کے فلاں صفحے پر فلاں طرف اوپر کی سطروں میں موجود ہے ۔ میں نے تیس سال پیشتر "مآثر الامرا" دیکھی تھی اور یہ الفاظ اسی طرح لوحِ حافظہ پر منقوش ہیں ۔"

عزیمت و استقامت مولانا کے آئینۂ طبع کے درخشاں ترین جوہر ہیں ۔ انھوں نے جن اصول و مقاصد کی دعوت کے لئے زندگی وقف فرمائی ، ان پر کاربندی اور عمل پیرائی میں ہمیشہ چٹان کی طرح جمے رہے ۔ اس سلسلے میں ان کی صحت کو نقصان پہنچا ، کاروبار تباہ ہوا ، ان کی نہایت قیمتی تصانیف کے مسودے ضائع ہو گئے ، انھوں نے علمی یادداشتوں کے جو مجموعے مرتب کئے تھے اور انھیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے ، وہ سب تلاشیوں میں تلف ہو گئے ، لیکن ان کی شانِ عزیمت

خصوصاً اس حالت میں کہ وہ اسیر تھے اور پاس رہ کر تیمارداری بھی نہ کر سکتے تھے، جو اکثر انسانوں کے لیے فی الجملہ باعثِ تسکینِ قلب ہوتی ہے۔ یقیناً انھیں بھی آرزو ہوگی کہ رہائی ملے تو خود اپنی اہلیہ کا علاج کرائیں اور تا بہ حدِّ امکان اس کا دُکھ مٹانے کی کوشش کریں۔ لیکن ان کے سامنے زندگی کے اہم بنیادی اصول و مقاصد بھی تھے۔ وہ کوئی ایسی صورت قبول نہ کر سکتے تھے جو ان اصول و مقاصد کی آبرو پر اثر انداز ہوتی۔ انھوں نے جب اس راستے میں قدم رکھا تھا تو ان تمام قربانیوں کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا جو اس سفر کے لوازم میں شامل تھیں۔ جب پے بہ پے وہ قربانیاں طلب کی گئیں تو مولانا نے ایک صاحبِ عزیمت انسان کی طرح انھیں پیش کرنے میں تامل نہ کیا۔ ذاتی تعلقات کے سلسلے میں غالباً یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ان سے مطالبہ ہوا۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھے تحریر فرمایا تھا:۔

> "ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھیے کہ استقامت اصلِ کار ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی نوکری قبول نہیں کرتا تو یہ کوئی جرم نہیں، لیکن اگر سپاہی بن کر میدانِ جنگ میں آکر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی ؎
>
> ہاں، رہِ عشق ہست رہِ رفتن ندارد بازگشت
> جرمِ رہ اینجا عقوبت ہست و استغفار نیست
>
> دریا میں اُترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہیے، لیکن جب اُتر گئے تو موجوں کا شکوہ فضول ہے اور کبھی بھی سنا نہ جائے گا۔ ممکن ہے پہلے ہی غوطے میں خونخوار نہنگوں کا سامنا ہو جائے لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے اسے نہنگوں کے وجود سے بے خبر نہ ہونا چاہیے۔"

مولانا کی ذاتِ گرامی اس تعلیم ہی کا نہیں بلکہ ہر اس تعلیم کا عملی نمونہ رہی ہے جو ان کی زبان پر جاری ہوئی۔ بلاشبہ ان کے قلب پر بھی رنج و الم کی تمام کیفیتیں پوری شدت سے طاری ہوئیں جو عزیز ترین رشتوں سے انقطاع کا لازمہ ہیں لیکن انھوں نے مقامِ صبر کے واجبات جس شانِ عزیمت سے ادا کیے، ان کی مثالیں تاریخ میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ موجباتِ غم سے متاثر ہونا ہر قلبِ سلیم کا خاصہ ہے لیکن احساسات پر قابو پا لینا صرف صابرین، مبشّرین کا کام ہے۔

ان کی زندگی میں استقامت کی ایک اور نادر مثال ملتی ہے، جب ہم قوموں کی اکثریت نے ان کے سیاسی مسلک سے اختلاف کیا۔ میرے علم کے مطابق وہ اپنے لئے ۱۹۱۲ء میں جو راہِ عمل طے کر چکے تھے، اس پر مدت العمر بے خوفِ لومۃ لائم قائم رہے۔ بیچ میں اکثر ایسے مرحلے آئے کہ بڑے بڑے دعویدارانِ عزم و ہمت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔ انھوں نے اپنا مسلک بدلنے کے لئے معقول دلائل بھی فراہم کر لئے۔ لیکن مولانا کے نزدیک صحیح، مفید اور بہترین راستہ وہی تھا جو انھوں نے ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھیں بے شمار قربانیاں کرنی پڑیں۔ کم و بیش دس سال قید و بند میں گزارے۔ ان کے نہایت اہم دینی و علمی مشاغل کو سخت نقصان پہنچا۔ وہ وسائلِ معاش بھی بالکل تباہ ہو گئے جو انھوں نے اپنی طبیعت کے ذوق کے مطابق اختیار کر لئے تھے اور جن میں وہ سب سے بڑھ کر کامیاب

تھے۔ لیکن ان تمام قربانیوں سے گراں بہا تر قربانی یہ تھی کہ ان کی ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر عنفوانِ شباب ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ جس طرف نکلتے تھے لوگ اپنی آنکھیں ان کے لئے بچھانے پر آمادہ رہتے تھے اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے لئے مسلسل و متواتر عقیدت کی جن گرم جوشیوں کا اظہار ہوتا رہا، وہ شاید مولانا محمد علی مرحوم کو مستثنیٰ کرنے کے بعد کسی مسلمان رہنما کو نصیب نہ ہوئیں اور یہ غیر معمولی ہر دل عزیزی انھیں اس وقت حاصل تھی جب ان کی عمر بیس اور تیس کے درمیان تھی۔ خاص طور پر قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ ان سے محبت و عقیدت کاملاً بے غرضانہ تھی یعنی وہ ان رہنماؤں میں نہ تھے، جنہیں مختلف گروہوں نے صاحبِ اختیار و اقتدار دیکھ کر فتحِ بابِ مقاصد کا مرجع سمجھ لیا ہو، لیکن انھیں پیشِ نظر مقاصد کے لئے استقامت و عزیمت کی راہ میں ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم بھی قربان کرنی پڑی اور وہ جس شے کو حق سمجھتے تھے اس سے بال برابر بھی ادھر ادھر نہ ہوئے۔ یہ قربانیاں ذکر و بیان میں شاید بہت دل پسند معلوم ہوں۔ لیکن اس پر عمل سہل نہیں۔ نظیری کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

نیست آسان بر صفِ آتش زدن
می نماید گرچہ از پروانہ خوش

یہاں سوال مولانا کے افکار و آراء کی درستی یا نادرستی کا نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ ان کی نشانِ عزیمت و استقامت واضح ہو جائے۔

مولانا کے عادات و خصائل کا باب بہت وسیع ہے اور اپنے علمی و عملی جوہروں کی طرح عادات و خصائل میں بھی وہ بالکل یگانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ مثلاً سحر خیزی ابتدائی دور ہی سے ان کی فطرتِ ثانیہ بنی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ اول وقت اٹھتے ہیں، گویا نظیری کے اس شعر کی عملی تصویر ہیں ؎

عبادتِ سحری را مکن نظیری کم
کہ ہر چہ کرد دعا ہائے صبح گاہی کرد

ایک مرتبہ سیاسی مصروفیتوں کے سلسلے میں لاہور آئے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میں نے عرض کیا کہ "ملاقات کے لئے کوئی وقت بتائیے۔" فرمایا: "صبح کے چار بجے سے آٹھ بجے تک مل سکتے ہو۔" وہ آٹھ دس دن یہاں مقیم رہے اور میں زیادہ سے زیادہ پانچ بجے ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ تین گھنٹے اطمینان سے باتیں کرنے کے لئے مل جاتے تھے۔ پچھلے دنوں میں دلی گیا تو اس وقت بھی وہ اپنے انتظامی کاموں میں بہت مصروف تھے۔ دس دن ان کے پاس ٹھہرا رہا۔ یہی صبح کا وقت گفتگو کے لئے مقرر تھا۔ سیاسی ہنگاموں میں عمر گزارنے کے باوجود انھیں خلوت و تنہائی بہت پسند ہے۔

تنہائی و خلوت طلبد عشق نظیری
ایں خیل و خدم را بہ امیر حشمے بخش

وہ ایک زمانے میں بہت خوش پوش تھے۔ غالباً سنہ ۱۹۳ء سے کھدر پہننا شروع کیا اور اب تک اسی پر قائم ہیں۔ وہ ابتداً ہی سے ہلکی غذا کھانے کے عادی ہیں اور بہت کم کھاتے ہیں۔ آج کل تو غذا کی تقلیل غیر معمولی صورت اختیار کر چکی ہے۔ لطیف چینی

چائے وقتاً فوقتاً ضرور پیتے ہیں اور اس کے دلکش تذکرے "غبارِ خاطر" میں جا بجا موجود ہیں۔

انھوں نے کبھی کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اپنے ان عقیدت مندوں سے بھی کوئی تحفہ نیاز بہ آسانی قبول نہیں کرتے جنھیں انتہائی شفقت و نوازش سے انھوں نے عزیزوں کا درجہ دے دیا ہے۔ ایک مرتبہ انھیں عرق النسا کا عارضہ ہوا۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی مرحوم بھی میری طرح مولانا کے عقیدت مند تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ مولانا سے بیماری کے مفصل حالات پوچھ کر مجھے بتاؤ۔ میں ایسا نسخہ تجویز کر دوں گا کہ بفضلِ خدا یہ عارضہ دوبارہ نہ ہو گا۔ میں نے حالات منگوا لئے۔ حکیم صاحب مرحوم نے خوب غور و فکر کے بعد نسخہ تجویز کر دیا اور یہاں سے دوائیں کلکتہ بھجوا دی گئیں۔ ان سے فائدہ ہوا۔ حکیم صاحب کی رائے تھی کہ دوائیں کچھ دیر جاری رہنی چاہئیں۔ مولانا نے لکھا:

> "مجھے حکیم صاحب کی دواؤں کے استعمال میں ہرگز تامل نہیں۔ اگر اب بھی ان کا فیصلہ یہی ہے کہ جوہر منقیٰ وغیرہ استعمال کرنا چاہیئے تو ضرور کروں گا مگر شرط یہ ہے کہ وہ دواخانے کو حکم دے دیا کریں تاکہ مرکبات وی۔ پی پارسل کے ذریعے پہنچتے رہیں۔ اس صورت میں شکر گزار رہوں گا اور انشراحِ خاطر سے علاج کروں گا۔ ورنہ طبیعت رک جاتی ہے کہ تحفہ ایک مرتبہ ہونا چاہیئے نہ کہ مسلسل۔ اگر حکیم صاحب یا آپ اسے منظور نہ کریں گے تو پھر میں نہ تو فراغِ خاطر کے ساتھ دوا استعمال کروں گا نہ امتدادِ اجرا کی حالت گوارا ہو سکے گی"۔

ایک مشہور عالمِ دین نے مولانا کی تفسیرِ فاتحہ کے بعض حصوں پر ایرادات کئے اور اس سلسلے میں مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا۔ ایرادات کے متعلق مجھے بعض باتیں مولانا سے پوچھنے کی ضرورت پڑی۔ ضمناً یہ بھی لکھا کہ کتاب آپ نے نہیں دیکھی تو میں بھیج دوں۔ فرمایا۔

"کتاب ہرگز نہ بھیجو۔ یہی بہتر ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں"

> "۱۹۱۸ء سے میں نے جن تین باتوں کا عہد کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ کروں گا"۔

پنجاب کے ایک سیاستداں نے ایک بیان میں ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک یکسر بے اصل تھیں۔ انھوں نے مجھے لکھا:۔

> "اگر میری طبیعت کا وہ اندازہ ہوتا جو اس وقت تھا جب "الہلال" نکالتا تھا، تو یہ ایسا صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کسی عام بیان میں میرے قلم سے کیسے سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے لیکن اب میرا حال دوسرا ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اسے پبلک میں برا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنا نفس سامنے آ جاتا ہے۔ میں چونک اٹھتا ہوں کہ اگر برا ہی کہنا ہے تو اپنے نفس کو کیوں برا نہ کہوں؟"

آخر میں فرماتے ہیں:۔

> "اگر ایک مدعیٔ اسلام میں صدقِ مقال نہیں تو اسلام میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل"۔

ایک مرتبہ دیر تک ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ میں نے ایک عریضے میں شعلہ اصفہانی کا یہ شعر لکھ دیا:

آں بخت نہ داریم کہ ہم بزمِ تو باشیم ۔۔۔ ما و سرِ راہِ تو و آہے و نگاہے

انھوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شعر کا یہاں کیا موقع تھا:

"ایک حدیثِ قدسی ہے: من تقرّب الیّ شبراً تقرّبتُ الیہ ذراعاً (جو ایک بالشت میرے قریب آتا ہے میں ایک ہاتھ اس کے قریب جاتا ہوں)؛ عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اس وصف کے تخلّق سے محروم نہ رہوں۔ اب بھی اس پر عامل ہوں اور عامل رہوں گا: ؎ ہزار بار بہ وعدہ ہزار بار بیا"

مضمون بہت طویل ہو گیا۔ لیکن جو کچھ کہنا چاہتا تھا، نہ کہہ سکا۔ وہی عرفی والی بات ہوئی کہ ؎

زباں ز نکتہ فرو ماند و رازِ من باقیست ۔۔۔ بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

آخر میں مولانا کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو ان کے ایک طویل مکتوب سے ماخوذ ہے۔ کچھ علمی بحثیں فرما رہے تھے کہ خلافِ عادت ان کے قلم سے یہ الفاظ بے اختیار نکل گئے۔ فرماتے ہیں:

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی ؎

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا ۔۔۔ رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم، فنون، ادب، انشا، شاعری، کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بے شمار نئی راہیں مبدءِ فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن، ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو۔ بحالیکہ ہر روز اپنے آپ کو عالمِ معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا۔ اس نے شاید سروسامانِ کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"

یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے نہ سخن گستری ہے، نہ تعلّی بلکہ سراسر حقیقت ہے، کاش مجھے اندازہ شناسی میں رسائی کا درجہ نصیب ہوتا تو اس کی زبان سے کہتا ؎

دہرہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

مہدی حسن

عبدالماجد دریابادی

سنہ ولادت تخمیناً ۱۸۷۴ء، ۱۸۷۵ء ہوگا۔ وفات نومبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ عمر ۵۰ سال کے اندر ہی رہی۔

ہوش کی آنکھیں جب کھولیں تو اپنے وطن گورکھپور میں رنگ پیدا ہوا ریاض خیرآبادی کا —— ریاض کا وطن اختیاری گورکھپور تھا۔ وہیں شباب گزارا۔ وہیں سے ریاض الاخبار ہفتہ میں دو بار (سہ روزہ کی اصطلاح اس وقت تک نہیں چلی تھی) نکالا۔ وہیں سے فتنہ اور عطر فتنہ کے شگوفے چھوڑتے رہے۔ اور وہیں سے انگریزی ناولوں کو اپناتے رہے۔ آج یہ سارے نام اور حوالے قصہ طلب تلمیحیں ہیں۔ ان کی دو لفظی تشریحیں سنتے چلئے —— ریاض الاخبار نام کا سیاسی پرچہ تھا لیکن اس کی ادبیت اس کی سیاست پر کہیں غالب۔ ریاض اس میں نثر کی شاعری کرتے۔ اور لوگ بھی بجائے سیاسی معلومات لینے زبان و انشاء ہی کی خاطر خریدتے۔ فتنہ اس کا ایک ننھا منا سا ضمیمہ جیبی تقطیع کا رنگین کاغذ پر نکلتا۔ اور لطیفوں چٹکلوں سے دل بہلاتا رہتا۔ عطر فتنہ کی بات اب خوب ذہن میں نہیں۔ اسی شانِ جمالی کا یہ پرچہ غالباً شعر و نظم کی بہار دکھاتا۔ بہرحال اتنا یاد ہے کہ یہ دونوں پرچے نام کے "فتنے" قیامت کی شوخیاں دکھاتے رہتے۔ اور رینالڈز وغیرہ کے عام پسند انگریزی ناولوں کو ریاض اردو میں اپناتے رہتے چنانچہ رینالڈز کا (LOVES OF THE HAREM) حرم سرا کا نام پاکر اردو میں اپنا نام کر گیا۔ اردوئے معلّیٰ کے لطیف و شستہ جملے گویا سانچہ میں ڈھلے ہوئے۔ اور پھر ریاض اور ان کے دوست رسا رام پوری کے مزے دار اشعار —— عطر میں بسے ہوئے۔

یہ فضا تھی جس میں مہدی مرحوم نے آنکھیں کھولیں، اسی میں پلے، بڑھے۔ سالہا سال بعد ریاض کو ایک خط میں لکھا:

> "مجھ کو آپ کے ساتھ جو خاص تعلق ہے، آپ کو معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ میں اس وقت سے آپ کے لٹریچر کا دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔" (مکاتیب مہدی ص ۱۸۰)

دلگیر مرحوم ایڈیٹر ماہنامہ نقاد (آگرہ) کے نام اس سے کہیں زیادہ کھل کر لکھا ہے:۔

> "مرحوم ریاض (خدا اسے مدتوں جلائے) عروس سخن کا آشنائے ازلی ہے۔ آپ لٹریچر کی جن نزاکتوں پر مٹے ہوئے ہیں، وہ ریاض کے قلم کی آوازِ بازگشت ہے۔ آج لٹریچر پر طبع آزمائی کے لئے بہتیرے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ لیکن میں نے پہلے پہل یہ

> لفظ ریاض الاخبار میں دیکھا۔ جب اس کے مفہوم سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھا
> ...... موجودہ لٹریچر ارتقائی حیثیت سے ریاض سے بے نیاز نہیں ہے۔ وہ
> جس طرح نظم کا مالک ہے۔ آقائے نثر بھی ہے۔ اور یہی امتیازِ فائقہ ہے جس کی بنا پر
> وہ انشا پردازی کا مسلم الثبوت ہیرو ہے۔" (مکاتیب مہدی ص ۱۸۹)

پیدائش محلہ بسنت پور، گورکھپور کے ایک کھاتے پیتے شریف اور مذہبی رنگ کے خاندان میں ہوئی۔ والد کورٹ انسپکٹر تھے۔ گھر ہی کا ایک حصہ مکتب کہلاتا تھا، وہیں بیٹھ کر حسبِ دستورِ وقت اُردو فارسی پڑھی۔ ممکن ہے کہ عربی کی بھی شُد بُد حاصل کی ہو۔ اور پھر کچھ روز علی گڑھ جا کر اسکول کے درجوں میں پڑھا۔ طبیعت بڑی اخّاذ پائی تھی۔ مزاج میں نفاست و لطافت اور اُردو ادب سے مناسبت، یہ چیزیں معلوم ہوتا ہے فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ بس انھیں کے سہارے بغیر کوئی ڈگری یا سند حاصل کئے کچھ ہی روز میں اتنا کر لیا اور ایسے چل نکلے کہ اچھے اچھے ڈگری والوں کو راستہ بتاتے، اور بڑے بڑے سند والے ان کا سامنا کرتے ہچکچاتے۔ بیگم مہدی کی روایت ہے کہ شروع میں گھر پر کسی انگریز سے بھی پڑھا تھا (افادات مہدی ص ۵) یہ روایت انھوں نے یقیناً مرحوم ہی سے سُنی ہوگی۔

یہ بیگم دوسری بیوی تھیں بڑی چہیتی اور صحیح معنی میں شریکِ زندگی۔ پہلی بیوی کا انتقال مرحوم کی جوانی ہی میں ہو گیا تھا یہ عقد اس کے بعد ہوا ——— معاشرت میں "صاحبیت" کا اثر ممکن ہے کہ انھیں "صاحب" کی معیت کا نتیجہ ہو۔

شعوری طور پر بچپن میں علمی اثر سب سے زیادہ سرسید کا پڑا۔ ان کے تہذیب الاخلاق کی ایک جلد دیکھنے کو مل گئی تھی۔ انھیں بیگم مہدی کی روایت ہے کہ

> "وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ صرف اسی تہذیب الاخلاق
> نے مجھے آدمی بنا دیا۔" (افادات ص ۶)

مرحوم کا شمار مصنفین کے زمرہ میں تو مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ تصنیف یا تالیف ان کی ایک بھی نہیں۔ خوب کہا ہے ہمارے اُردو کے رئیس المصنفین مولانا سید سلیمان ندوی نے کہ:۔

> "مرحوم کوئی پیشہ ور مصنّف نہ تھے جو پچھلوں کی زحمت کے لئے اپنی تصنیفات کا
> ذخیرہ چھوڑ جاتے۔" (مکاتیب ص ۱۶)

مضمون نگار بھی وہ کوئی پیشہ ور اور بڑے مشّاق نہ تھے ذخیرۂ تحریر کل ۳۱ مضمون ہیں چھوٹے اور بڑے سب ملا کر، اور انھیں میں ترجمہ، تنقید بھی شامل ہیں۔ یہ ہفتہ واروں اور ماہناموں میں چھپے ہوئے مضمون ۱۸۹۹ء تا ۱۹۱۶ء یعنی ۲۰ سال کی مدت میں شائع ہوئے۔ اس حساب سے اوسط ہر سال ڈیڑھ مضمون کا پڑتا ہے۔ یہ اوسط ہوا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ عموماً سال میں دو ایک مضمون لکھتے وہ بھی جب طبیعت خوب حاضر ہوتی اور لکھنے کا کوئی داعیۂ قوی موجود ہوتا۔ کسی کسی سال جب طبیعت میں موج آتی تو چار چار پانچ پانچ مضمون بھی لکھ ڈالتے اور درمیان میں مہینوں کیا برسوں کا سناٹا ——— تصنیف کے نام سے کل کائنات یہی مجموعۂ مقالات ہے جو افاداتِ مہدی کے نام سے وفات کے بعد شائع ہوا ہے۔ بیچارہ کو نظرثانی و ترمیم وغیرہ کا کوئی موقع نہ مل سکا اور ہر صاحبِ تجربہ

جاتا ہے کہ اس کے بعد تحریر کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ ناممکن تھا کہ ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء والے مہدی حسن جب ۱۸۹۹ء و ۱۹۰۰ء والے مہدی حسن (جن کے نام کے ساتھ "افادی الاقتصادی" کا بے معنی سا دُم چھلا لگا رہتا تھا) کی کسی تحریر کو دیکھتے تو اسے بے ہاتھ لگائے بلا اصلاح کئے بجنسہٖ چھوڑ دیتے ——— افادات کی ضخامت ۲۰×۲۶ تقطیع پر دوسروں کے لکھے ہوئے دیباچہ وغیرہ کو نکال کر ۳۴۰ صفحہ کی ہے۔

اور یہاں اس سے کچھ کم ضخامت کی ایک اور کتاب بھی ان کے قلم کی رہینِ منّت نکل آئی۔ یہ ان کے خطوط کا مجموعہ ہے مکاتیبِ مہدی کے نام سے ——— مرحوم بڑے اچھے، بڑے پاکیزہ خط نویس تھے۔ ظلم تھا اگر ان کے ان انشائی کمالات کو ضائع ہونے دیا جاتا۔ کچھ قدر دان احباب و اعزہ نے انھیں بچا بچا کر رکھ لیا تھا۔ یہ ادبی جواہر پارے اگر ضائع ہو جاتے تو اُردو کا ایک قیمتی سرمایہ گم ہو جاتا۔ بیچارے کی ساری عمر سرکاری ملازمت میں گزری۔ وہ بھی کچھ اُونچی نہیں۔ پہلے نائب تحصیلدار رہے پھر تحصیلدار ہو گئے۔ تنخواہیں اس زمانہ میں کچھ واجبی ہی سی ہوتی تھیں۔ یہ ٹھہرے شاہ خرچ، مزاج کے شوقین، نفاست مجسم۔ کھانا ہو تو نفیس، کپڑے ہوں تو نفیس، مکان اور اس کا فرنیچر ہو تو نفیس، ہر خرچ اُجلا۔ ہاتھ ہر خرچ پہ کھلا ہوا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ گزر بسر کس طرح کی۔ چہیتی بیوی کے گہنے کپڑے کے حوصلہ و ارمان کیسے پورے کئے۔ لڑکوں کی تعلیم کے اخراجات کیونکر نکالے۔

کئی سال کا زمانہ تو خیر بنارس اور الٰہ آباد کی صدر تحصیلوں میں گذارا۔ باقی بیشتر حصہ [illegible] بسر کیا، جہاں کتابوں کے کسی بڑے ذخیرہ کے وجود کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ تحصیلداری کے جھمیلوں کو ویسے بھی کوئی مناسبت علمی اور تصنیفی مشغلوں سے نہیں ہے اور پھر جبکہ قیام بھی ایسی جگہ ہو۔ جہاں کوسوں نہ کسی علمی صحبت کا پتہ۔ نہ کسی کتب خانہ کا [illegible] تو ایسے کورِ دہ میں اور اتنے غیر علمی ماحول میں رہ کر جتنا مقالہ نگاری کر ڈالنا ایک [illegible] کا مرتبہ رکھتا ہے۔

نئی نئی ترکیبیں گڑھنے اور انگریزی سے لے کر اُردو میں نئے نئے لفظ [illegible] اختراع کرنے میں مرحوم کو ایک حد تک ملکہ تھا اور اگر کہیں علمی استعداد مولانا نذیر احمد دہلوی کی سی ہوتی یا لسانیات اور زباں دانی سے مناسبت محمد حسین آزاد کی سی، تو مہدی حسن اس میدان میں سب سے بازی لے جاتے اور اپنے معاصرین کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتے۔ پھر بھی جتنا کچھ وہ کر گئے وہ بہتیرے پیشہ ور مستند مصنفین کے لئے بھی باعثِ رشک ہی ہو سکتا ہے۔

ماسٹر پیس کے لئے "اختراعِ فائقہ"، "ہنی مون" کے لئے "عہدِ زفاف"، "جرنلزم" کے لئے "فقۂ سکۂ وشی"، ایٹیکیٹ کے لئے "عوائدِ رسمیہ" اس قسم کے الفاظ خدا معلوم کتنے انھوں نے چلانے چاہے، اور ان میں سے کوئی کوئی چل بھی گئے ——— غیر سائنٹفک جنبشِ لب" "آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ" "دماغی صحبتیں غیر فانیوں کے ساتھ" "پیارے جناب" اس قبیل کے بھی بہتیرے نقش انھوں نے انگریزی سے اپنائے۔ کچھ اِن میں سے جم گئے اور کچھ اُڑ گئے! ——— انگریزیت سے متاثر بہت زائد تھے (اور وہ زمانہ ہی خاص تاثر کا تھا اس لئے وہ اکیلے کیا، سب ہی متاثر تھے) اس لئے لفظی اختراعات میں بھی انگریزیت کی جھلک آگئی اور وہ لفظ اور فقرے اُردو میں کھپ نہ سکے۔

اپنے مذہب ادب میں پورے "اہل السنت والجماعت" تھے۔ یعنی سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی سب کے قائل۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی آزاد کی افضلیت کا کلمہ پڑھتے، کبھی نذیر احمد کی عظمت کا علم ہوا میں لہراتے، کبھی شبلی پر جان چھڑکتے، کبھی حالی کی اداؤں پر واری جاتے۔ اور کبھی سرسید کو اُستاد الکل کے رتبہ پر رکھتے —— یہ سارے دعوے ایک دوسرے کے منافی نہیں۔ اپنے اپنے سیاق میں اور مناسب موقع پر، یہ سب باتیں ٹھیک ہیں، اور اتنی "تفضیلیت" کی گنجائش مذہب اہل سنت میں پوری طرح موجود ہے۔ سنجیدہ اور علمی ادب اُردو کے ان "عناصر خمسہ" کے علاوہ ادب خالص کے بھی اُستادوں کے پرستاروں میں تھے۔ ریاض کا نام اُوپر گزر چکا۔ ایک اور اسی دور کے بہت اچھے لکھنے والے، تیرہویں صدی اور صلائے عام کے ایڈیٹر منشی ناصر علی دہلوی تھے۔ دُنیا تو اب ان کے نام ہی کو بھول چکی ہے۔ "ادب لطیف" کی اصطلاح پر بعد کو چند غاصبوں نے اپنا قبضہ جما لیا۔ ورنہ انشاء کی یہ شاخ دراصل ناصر علی کا خاص حصہ تھی۔ اور مہدی ان کے نام پر مٹے ہوئے تھے۔

خشک نگاری ان کے مذہب میں بہ منزلہ کفر تھی۔ "مولویت" اور "مدرسیت" سے اسی لئے بیزار رہتے۔ اور تو اور خود مولانا سید سلیمان سے مدتوں ان کی "مولویت" کی بنا پر بدظن اور ان کے کمالات کے منکر رہے —— مولانا شبلی کے انتقال کے (جو ان کے لئے واقعۂ پُرملال تھا) معاً بعد، ۷ دسمبر ۱۴ء کو مولوی عبدالمجید دریابادی کے خط میں لکھتے ہیں:۔

> "سیرت نبوی کی تکمیل اب قیامت تک ہو چکی ...... سُنتا ہوں میاں سلیمان اور پروفیسر حمید الدین ترتیب دیں گے۔ اس سے تو نہ ہونا اچھا تھا۔ یقیناً تنقیدی حصہ مرحوم نے نہیں لکھا ہوگا، جسے وہ تاریخی حصہ کے بعد شروع کرتے۔" (مکاتیب ص ۱۲۵)

بدگمانی بے محل ہی تھی، کب تک قائم رہتی۔ حقیقت کی پہلی جھلک سے چکنا چور ہو گئی۔ فروری ۱۷ء میں خود سید الطائفہ کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:۔

> "میں نہایت دلچسپی سے آپ کی ادبی فتوحات کو دیکھ رہا ہوں۔ میرا خیال تھا تصنیفی عہد علامہ شبلی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اس خیال کو میں نے ایک مستقل عنوان کے تحت میں پھیلایا ہے "اُردو لٹریچر کا دم واپسیں" عنقریب آپ کی نظر سے گزرے گا۔ جس میں میں نے دکھایا ہے کہ دارالمصنفین سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔" (مکاتیب ص ۹)

پھر ستمبر ۱۷ء میں ارض القرآن کی رسید دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "میں عربیت سے زیادہ آپ کی ادبیت سے مرعوب ہو رہا ہوں۔ زبان نفس موضوع کے لحاظ سے قطعاً لائق شکایت نہیں یعنی کہیں سے بے جوڑ نہیں۔ اور جب تناسب میں کہیں سے کور کسر نہیں، تو حسن کی جامعیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے"۔ (ص ۱۰)

اور پھر: —— "یہ کہنا بھول گیا کہ طنزیہ لٹریچر کی لطافت آپ کا حصہ ہے" (ص ۱۹)

اور ایک بار اور معارف کے بعض چٹپٹے شذرات کی داد میں جو مسز سروجنی نائیڈو کے سلسلہ میں تھے:۔

"آپ نے شاعرۂ دکن پر جو بجلیاں گرائی ہیں اور اس سلسلہ میں مختون سوسائٹی پر جس خوبصورتی سے لے دے کی ہے، سچ یہ ہے وہ نازک خیالی کی آخری حد ہے۔ میں نے بار بار پڑھا اور لطف اٹھاتا رہا —— جس زمانہ میں یہ پہلی دفعہ اسٹیج پر آئی ہے اور اس کی زبان سے یہ شعر نکلا ہے ؎

در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بسے
شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

خوب یاد ہے کہ بہتیرے دل تھام کر بیٹھ گئے تھے۔ چڑھتی دوپہر سے ڈھلتی چھاؤں زیادہ خوشگوار ہوتی ہے ..... مدت سے سوچ رہا تھا کہ اس کی لچکدار نسائیت کو اپنی چند سطروں کا تختۂ مشق بناؤں لیکن آپ نے میرے لئے بالکل گنجائش نہیں چھوڑی اور ساتھ ہی میرے دل کا ارمان پورا کر دیا۔ جو خاکہ آپ نے کھینچا ہے اور جس پہلو سے چوٹ کی ہے، وہ تقلید کی چیز نہیں۔ غلاف شکر میں اس طرح کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہے کہ خود آپ سے داد لینے کو جی چاہتا ہے۔" (ص۲۱)

عام طور پر مزاج متوازن اور رائیں جچی تلی رکھتے تھے نہ مدح میں غلو نہ ہجو میں مبالغہ۔ نہ افراط نہ تفریط۔ لیکن آخر بشر تھے چوک ہی جاتے تھے۔ ان سطور کا راقم، آج کا بنا ہوا "مولانا"، اس وقت نرا کھرا "مسٹر" تھا اور مرحوم سے سن میں کوئی ۱۶-۱۷ سال چھوٹا۔ بس اُس پر اس طرح مہربان ہوئے کہ کوئی حد ہی نہیں۔ مکاتیب کے ورق کے ورق اور ملاقات کی سطروں پر سطریں ایسی خورد نوازی کی نذر —— حوصلہ افزائی کی بھی کوئی انتہا ہوتا تھی۔

مزاج کی نفاست اور طبیعت کی شرافت میں اپنی نظیر آپ تھے یوں کہیے کہ ان کی تخلیق میں جزوِ اعظم یہی دو عنصر تھے۔ لکھتے وقت کاغذ نفیس ہو۔ قلم نفیس ہو۔ روشنائی نفیس ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ موسم خوشگوار ہو۔ جب کہیں ان کا قلم حرکت میں آ سکے۔ مسودہ لکھتے وقت کیا مجال کہ کوئی داغ دھبہ پڑ جائے یا کہیں کاٹ پیٹ کو راہ ملے۔ سرکاری ملازمت سے آزاد ہونے اور وقت تمامتر اپنا رکھتے، جب بھی اتنی رعایتوں اور اتنے التزامات کے بعد کیونکر ممکن تھا کہ کوئی بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑ جاتے؟ جتنا لکھ ڈالا یہی بہت غنیمت ہے۔

کتابیں نہایت صاف ستھری رکھتے اور جلد اعلیٰ سے اعلیٰ بندھواتے۔ سیکنڈ ہینڈ یا استعمالی کتاب وہ ہاتھ میں لینا کیا جانیں۔ "دوشیزۂ کاغذی" انھیں کی زبان میں "دستِ غیر سے مس ہو جانے کے بعد" ان کے کس کام کی رہتی۔ کھانا نفیس کھاتے، کپڑا نفیس پہنتے۔ مکان، فرنیچر ہر چیز میں صفائی، نفاست اور لطافت کا خیال سب پر مقدم۔ کہا کرتے کہ سیکنڈ کلاس کوئی سی بھی شے ہو، مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ جو چیز بھی ہو درجہ اول کی ہو۔

اور شرافتِ نفس تو کچھ اس سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ کسی کی دل آزاری کیا دل شکنی بھی جانتے ہی نہ تھے اور تحریر میں

درشت و نا ملائم الفاظ لانے کو گالی کے برابر سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ ایسے بھدّے ثقیل لفظ لانا تحریر کا خون کرنا ہے۔ صرف لطیف اشاروں کنایوں کے جواز کے قائل تھے اور ہلکی پھلکی چوٹیں کر جانے کے بادشاہ تھے۔ اور خیر خود تو اس پر عامل تھے ہی، دوسروں کو اس روش سے ہٹتے دیکھتے تو ٹوک دیتے۔ شذرات معارف کی ایک عبارت پر مولانا سید سلیمان کو لکھتے ہیں۔

> ”میری غرض یہ ہے کہ ثقیل الفاظ کی جگہ صرف مفہوم کی تلخی سے کام لیا جائے۔ یہ باتیں کوئی اور آپ کو نہیں لکھے گا لیکن مجھ کو جس حد تک خلوص ہے، اس کا اقتضاء طبعی یہ ہے کہ جن نکتوں پر غایت ظہور کی وجہ سے دوسروں کی نگاہ نہیں پہنچی، ان کو آپ کی توجہ میں لاؤں۔“ (ص۲۲)

میری دورِ جاہلیت کی ایک کتاب ”فلسفہ اجتماع“ نام ہے، نشۂ الحاد کی حالت میں لکھی ہوئی۔ اس میں پیمبروں کا ذکر جا بجا ہے بالکل دنیوی لیڈروں کی حیثیت سے ہے۔ اور ان کے کارناموں پر تنقید و تبصرہ اسی انداز میں، جس میں قومی و ملکی لیڈروں پر ہوتا رہتا ہے۔ اپنے نزدیک اُس وقت اس میں حرج ہی کیا تھا؟ اور اگر کوئی روکتا ٹوکتا تو جواب میں اس کی مولویانہ تنگ نظری اور تعصب پر لے دے دھری ہوئی تھی۔ جوہر مرحوم میری تحریر کے قدر دانوں میں نہیں، پرستاروں میں، عاشقوں میں تھے۔ اس کے باوجود کچھ ہی دن بعد جب لکھنؤ آئے تو مجھے ایک موقع پر تنہا پا کر بولے، کہ:-

> ”فلسفۂ اجتماع کا عاشق زار مجھ سے بڑھ کر کون ہوگا، لیکن سن میں مجھ سے چھوٹے ہو اس لئے ایک بات کان میں ڈالے دیتا ہوں۔ پیمبروں خصوصاً پیمبرِ اسلام، کا تذکرہ جس طرح آیا ہے، اس سے صاف استخفاف نکلتا ہے۔ عقائد کی بحث سے قطع نظر یہ رنگ کسی سنجیدہ مصنّف کی متانتِ تحریر کے بھی تو منافی ہے۔ جن شخصیتوں کا ادب و احترام کروڑوں انسان کر رہے ہوں، ان کے مرتبہ کا لحاظ رکھنا تو لازمۂ تہذیب و شائستگی ہے۔“

بات اتنے خلوص سے کہی گئی تھی کہ سیدھی دل میں اُتر گئی۔ اور جو دل سے منکر و مکذّب تھا، وہ کم از کم زبان و قلم کی حد تک تو آدمی بن گیا۔ اور پھر دو برس بعد جب اسی کتاب پر حیدرآباد میں سخت لے دے شروع ہوئی تو اپنے اسی اخلاص و شرافت کے تقاضے سے مجھے لکھا:-

> ”میں نے آپ سے لکھنؤ میں ذکر کیا تھا کہ آپ نے گو آنحضرت کی تنقیص نہیں کی تاہم اظہارِ خیال کی باریک تہہ میں ایک طرح کی تضحیک پائی جاتی ہے۔ اور یہ مبتذلانہ رنگ ہے، مستشرقانہ سنجیدگی نہیں، ایک آدھ لفظ کے ہیر پھیر سے یہ شکایت دُور ہو سکتی ہے اور مقصود پھر بھی ہاتھ سے نہیں جائیگا۔ یہ میں آپ کیلئے کر سکتا ہوں آپ اجازت بھیجتے ہیں؟“ (مکاتیب ص۵۷)

یہ تو آپ بیتی تھی باقی اسی طرح کی مثالیں کوئی گنانے پر آئے تو ان کی تحریروں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اچھی خاصی نکال سکتا ہے ——— خود بڑے ”آزاد خیال“ تھے اور بڑے ”روشن خیال“، ملائیت کے نام سے بیزار، مولویت کے سایہ سے پناہ مانگنے والے، لیکن ہر آزاد مشربی اور ہر روشن خیالی پر چھاپ تہذیب، شائستگی اور شرافت کی لگی ہوئی۔

تحریر کا اصل جوہر شوخی تھی ظرافت نہیں شوخی HUMOUR نہیں WIT۔ قہقہہ آفرینی نہیں بلکہ صرف ایک

انبساطی کیفیت جو بہت پھیلی تو ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی اور بس۔ محرک قوی نہیں جو حرارت جسم کو انتعاش میں لے آئے، صرف مسکن جو مسرت کی ہلکی ٹھنڈک جسم میں دوڑا دے ـــــ وصال نہیں صرف خیالِ وصل۔ بقول شخصے ؎

خیال ہی میں مزے وصلِ دلربا کے لئے !

مثالوں کا انتظار ہوگا۔ دو چار حاضر ہیں۔ موضوع علمی ہو، ادبی ہو، مذہبی ہو، قلم کی شوخیاں ساتھ کہیں بھی نہیں چھوڑتیں۔

مولانا شبلی کی نیم فلسفیانہ نیم متکلمانہ کتاب الکلام نئی نئی نکلی ہے اس پر تبصرہ کر رہے ہیں :-

" ہم کو الکلام کے ہوتے کسی کتاب کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات جدید علم کلام کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں وہ دیکھیں گے کہ فاضل پروفیسر نے ایک طرف تو بڑے میاں یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اُتاری اور ساتھ ہی یورپ کے نوخیز تہ زون یعنی فلسفہ و سائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں جڑوائے، بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا۔ یہ معتدل روش جو اس علمی نزاع میں اختیار کی گئی وہ شبلی ہی کا حصّہ تھا " (افادات ص۱۳۵)

ایک اور جگہ الندوہ (مولانا شبلی کے ماہنامہ) کا تعارف کرا رہے ہیں اس کی تمہید ہیں :-

" غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اُردوئے خاصہ کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اُٹھتی تھیں، آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جو بنوں پر آئی ہوئی نچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی مدتوں شعراء سے گاڑھا اتحاد رہا۔ یہ اقتضائے سن بُری طرح کھل کھیلی ہاتھ پاؤں نکالے اور بہتیرے بنائے بگاڑ دیئے۔ کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو ہو کر رہ گئے اور بال بال بچی۔

آخر آخر میں مُلک کے منچلے یعنی ناول نویس تو یہاں تک پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ داری میں کچھ اُٹھا نہیں رکھا تھا کبھی کبھی دبی زبان سے اُسے یہ کہتے ہوئے سُنا ـــــ "اری اُٹھ جا ونگی میں جھونک سے" لیکن دفعتہً اس کی حالت نے پلٹا کھایا کثرتِ فواحش باعثِ سنجیدگی ہو گئی۔ اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے۔ اب وہ مقدس علماؑ کی کنیزوں میں داخل ہے لیکن سُنا گیا کہ خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب انہیں کے تصرف میں رہتی ہے الندوہ اسی کا ایک ثمر پیش رس ہے۔ " (افادات ص۱۰۸، ص۱۰۹)

ایک دیندار اہلِ قلم سے ان کی کوتہ قلمی کی شکایت گرمیوں کے رمضان کے زمانے میں کرتے ہیں اور اپنے قلم کے بانکپن سے صحرائے خشک کو لالہ زار بنائے دیتے ہیں :-

" خیر تو ہے ؟ آپ کا بالکل پتہ نہیں۔ کیا آپ کے رمضان سے میرے مئی کے شدائد کچھ کم ہیں، جو ایک دم سے آپ مُہر بہ لب ہو رہے ہیں ؟ تحریری فاقے رندِ مشرب دوستوں کے لئے کسی طرح موزوں نہیں، روزہ رکھیے

نہ دیکھیے مگر مجھے یاد ضرور رکھیے۔ (مکاتیب ص ۱۱۵)

میں ایک سال حیدر آباد رہا۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی اور اس کا مقدمۃ الجیش سررشتہ تالیف و ترجمہ ایک سال قبل ۱۹۱۶ء میں کھل گیا تھا۔ میں اُسی میں تھا۔ عقائد کی آڑ لے کر دکن کے اخبارات نے گولہ باری شروع کر دی۔ اور مدت قیام کے چند مہینے بڑے سخت معرکوں میں گزرے۔ سال بھر بعد لکھنؤ واپس آیا ہوں، ضابطہ سے صرف رخصت لے کر، لیکن دل میں استعفا کی نیت مستحکم کر کے۔ حضرت مہدی جیسے مخلص کو سارا ماجرا لکھ بھیجا ہے۔ اب جواب ملاحظہ ہو:۔

"جس طرح ایک بھوکا خوش ذائقہ کھانے پر گرتا ہے اور جب تک لقمۂ تر جلد سے جلد حلق سے نیچے نہیں اُتار لیتا اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ میں چھپانا نہیں چاہتا کہ آپ کے دلچسپ عنایت ناموں کے ساتھ مجھے بھی یہی صورت پیش آتی ہے۔ اس میں میرے کنگلے پن کو اس قدر دخل نہیں جس قدر آپ کے بخل کو۔ کہ یہ نعمت جلد جلد میرے حصہ میں نہیں آتی۔ خوش ہوا قفس کی تیلیاں ٹوٹیں اور پرشکستہ طائر کو ہوائے وطن نصیب ہوئی۔ وطن بھی لائقِ رشک، لکھنؤ جس کی فضائے بسیط آپ کی تنشیطِ دماغی کیلئے زائد از کافی ہے:۔

آپ لکھتے ہیں کہ "اب وقت اپنا ہے، قلم اپنا ہے، دماغ اپنا ہے" ایک صاحبہ فرماتی ہیں صاف کیوں نہیں کہتے کہ بیگم اپنی ہیں۔ یہ نکتہ رہ گیا تھا کی پوری کئے دیتا ہوں۔" (ص ۹۵)

میری شادی کو تھوڑا ہی زمانہ ہوا ہے۔ بیوی اور سالیوں کے ساتھ لکھنؤ سے باندا (اپنی سسرال) گیا ہوں ریل کا سفر خاصا دلچسپ رہا۔ حضرت مہدی کو لکھ بھیجا۔ جواب میں آپ بھی شریک ہوں:۔

"آپ کا پرستانِ سفری وہ بھی تختِ رواں (ریل) پر بہت ہی قابلِ رشک رہا۔ سچ یہ ہے کہ جنسِ لطیف اپنی پاکیزہ وشی اور کافرادائی کے ساتھ کائنات کے خوبصورت چہرہ کا غازہ ہی نہیں ہے۔ ہمارے لئے شرطِ زندگی بھی ہے کہ بغیر اس کے دُنیا سرے سے رہنے کے لائق نہیں تھی۔" (ص ۹۸)

صاحب معارف کو معارف اور مطبوعات دارالمصنفین کی لوح کی سادگی ("سادہ لوحی" نہیں!) پر متوجہ کرنا چاہتے ہیں تو قلم کا بلبل یوں نغمہ سرا ہوتا ہے:۔

"یہ غلط ہے کہ فلسفۂ حسن آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہے۔ عورت کتنی ہی حسین ہو لیکن بیوگی کے بعد وہ جوبن نہیں رہتا۔ ہیرا تراش کیل کے اُترتے ہی اس کی سج دھج، تراش خراش سب میں فرق آجاتا ہے۔" (ص ۲۴۴)

سارا مہدوی لٹریچر انھیں شوخیوں کی تجلیات سے جھل جھل کر رہا ہے۔ شوخی کہیں کہیں بڑھ کر چلبلے پن کی حد تک پہنچ جاتی ہے متانت کی آنکھیں اس منزل پر پہنچ کر نیچی ہونے لگتی ہیں اور پردے کی باتیں زبانِ قلم پر بے پردہ ہو کر آنے لگتی ہیں۔

مثالیں —— ایک آدھ —— لیجئے۔ مخاطب مولانا سید سلیمان صاحب بہ ایں متانت و تقدس ہیں:۔

"میں خدا خدا کر کے ڈیڑھ سال کے بعد گھن سے چھوٹا یعنی تحصیلداری پر جس کا چنداں شائق نہیں منتقل ہو گیا یہ اضافی تصریح اس لئے ہے کہ وطن آیا تو دار المصنفین میرے لئے گھر آنگن ہوگا اور آپ سے بوسہ بہ پیام کی جگہ، آپ عورت ہوتے تو کہتا، لب بہ لب کی ٹھہرتی۔ آخری فقروں سے آپ کے تقدس میں کچھ فرق تو نہیں آتا؟" (ص ۲۴۴)

انھیں سید صاحب نے پہلی بیوی کی وفات پر دوسرا عقد کیا ہے اور اتفاق سے اس وقت کچھ علیل تھے۔ حضرت مہدی کو ایک شعلہ ہاتھ آگیا اور ناگفتنی کس کس طرح ان کی زبان پر آ کر گفتنی ہو گئی :-

> "میں سُنتا تھا مولوی خلوت کے رنگیلے ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کی روداد عروسی جہاں تک معلوم ہوئی غیر حوصلہ افزا ہے۔ یہ کیا، کہ مرعوب ہو کر صنفِ قوی کی آبرو کھوئی۔ خیر گزری کہ علالت نے پردہ رکھ لیا لیکن دشمنوں کو قلق رہے گا کہ جسے بستر شکن ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاح میں شکن بستر نکلا۔ عورت کتنی ہی نازک اور لچکدار ہو، لیکن یہ اس کی فطرت کا راز ہے کہ حریفِ مقابل کے ثقل پر غالب رہتی ہے، یعنی ہار ماننے والی نہیں۔ یہ دلچسپ شکست خدا کے صرف مقبول بندوں کے حصّہ میں آتی ہے یہ تصریحات آپ کے مذاق سے کتنی ہی بیگانہ ہوں غیر سنجیدہ نہیں اور گو آپ کا ہنی مون (عہدِ زفاف) بسترِ علالت پر گزرا تاہم میں سُننا چاہتا ہوں آپ کہاں تک اپنے قصر کی تلافی کر سکے اور آیا آپ خوش ہیں؟ دو آتشہ اچھی کھنچی ہو تو نشاط مستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے، میں اس نشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں۔" (صہ ۴۲، صہ ۴۳)

سید صاحب تو خیر اس زمانہ میں جوان تھے۔ ایک اور بزرگ مولوی مقبول احمد صاحب صمدانی تھے۔ میں نے انھیں جب دیکھا، سفید ریش ہی پایا ——— حضرت مہدی سے ان سے بھی ایسی ہی چوٹ کی ہوتی تھی۔

اس سے آگے بڑھیے تو سرحدیں عریانی کی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور مہدی مرحوم اس صنف میں بھی بند نہ تھے اور نہ اس میدان میں کسی سے پیچھے رہنے والے۔ بلکہ ان کے ادب کی بھی یہی صنعت ایسی ہے جو انھیں آج کے "ترقی پسندوں" کی بزم میں "پیرِ مغاں" بنائے ہوئے ہے ——— زیادہ نمونے اس صنعت کے تو پیش کرنے کی ہمت کہاں سے لائی جائے۔ دل پر جبر کر کے دو چار فقرے دہرائے بغیر چارہ نہیں :-

> "عورت پھنستی ذرا مشکل سے ہے۔ لیکن جہاں پھنسی، اس سے چھٹکارا پسند نہیں کرتی۔ اس کی اصلی غایتِ زندگی دوسرے کی پھانس ہے ...... اس کی فتوحات اس کا سرمایۂ نشاط ہیں جن سے اس کے دل کو راحت ملتی ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دستبردار نہیں ہو سکتی۔ وہ وار کر کے رہے گی کیونکہ یہ امر اس کی فطرت میں داخل ہے۔ شانہ سے آنچل خود نہ گرائے لیکن اگر اتفاق سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہوگی۔ ڈھلکے ہوئے آنچل میں دراصل اسے سینہ کا اُبھار غائب کرنا منظور نہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اور نظر جما کر دیکھیے۔
>
> محرم کا جائزۂ نظر بھی ایک طرح کی دادِ حسن ہے جو ہزار پارسائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے لیکر رہیگی۔
>
> اسی لئے جوانی کی آرائشوں میں دستانہ کی طرح چھپتی ہوئی چیز اسے دل سے پسند ہے جس میں یہ ان سرکشوں کو قید رکھتی ہے جنھیں عورت کے ارمانِ مجسّم کہیے۔ مے دو آتشہ وہ بھی شباب کی جب کھینچ کھنچا کر قدرتی کنٹروں میں بھری ہو، تو کون ہے جو ان کی کیف مستی اور بے خودی کے مجسّموں کی پرستش کا دلدادہ نہ ہوگا۔ ترکیب عناصر ہی تو ہے۔ ذرا فطرت کی شوخی دیکھیے گا، فتنۂ قیامت زا کیلئے گنجائش نکالی بھی تو کہاں؟ دُنیا میں معیارِ حسن ہمیشہ مختلف رہا ہے اور آج بھی اختلافِ مذاق کے لحاظ سے

> حسن کے لئے کوئی نصاب مشترک قائم نہ ہو سکا۔ تاہم ہر زمانہ میں عورت کا مقیاس الشباب دائرۂ حسن کا مرکز رہا ہے۔ آج تک سننے میں نہیں آیا کہ اہل چین کی چپٹی ناک کی طرح سپاٹ سینہ بھی کہیں پسند طبائع ہو۔
> (افادات ص ۲۱۰، ص ۲۱۱)

بعض تصریحات اس سے بھی زیادہ فاش و بے پردہ ہیں —— اور شرفا کی محفل میں یہ بولی ٹھولی آج بھی کچھ عجیب ہی سی ہے، آج سے ۴۰ - ۴۱ سال قبل سنہ ۱۹۱۳ء میں جب یہ مضمون اول بار شائع ہوا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس وقت یہ کن نظروں سے دیکھا گیا ہوگا!

مہدی ادیب و انشا پرداز ہی نہ تھے کچھ حکیم بھی تھے۔ اور خود لاکھ "نہیں نہیں" کرتے رہیں، کہیں کہیں باتیں سعدی اور حالی کے رنگ کی کر گئے ہیں۔ اپنے تجربہ کی باتیں دوسروں کو بتاتے ہیں ان کی زندگی سنوارنا چاہتے ہیں، اور دنیا کا نشیب و فراز جس طرح خود ان کی نظر میں ہے ویسے اختیار چاہتے ہیں کہ ان کے آس پاس والے بھی اس سے مستفید ہوں۔

مہدی خرافات نگاری کے شیدائیوں میں تھے اور خود بھی کچھ درجۂ اول کے مذہبی نہ تھے اس پر بھی دیکھئے کس حکیمانہ انداز سے میری "بے ادبیوں" پر ٹوکتے ہیں (زمانہ پھر یاد کر لیجئے کہ میرے شباب الحاد کا ہے):-

> "گزشتہ تصنیفات کی نظرِ ثانی کے سلسلہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ فلسفیت کے زور میں مذہب کی نسبت کوئی ریمارک یا طرزِ ادا ایسا نہ ہو، جس سے اس کی تحقیر توجیہ خفیف سی بے رخی بھی پائی جائے۔ جو کچھ لکھیے مسلم بن کر لکھیے کہ سنجیدگیِ تصنیف کا اقتضا یہی ہے۔ یہ نکتہ ۴۰ برس کے بعد سمجھ میں آئیگا۔ لیکن اس درمیان میں میں آپ کو کم از کم ڈاکٹر لیبان کی طرح فیاض دیکھنا چاہتا ہوں ورنہ کسی بانیِ مذہب کی نفسیت کا اعتراف دراصل "میٹھی چھری زہر کی بجھی" کا مصداق ہوگا۔ اردو میں شبلی کے مصلحِ اعظم[1] کو محمد نہ لکھیے، آنحضرت لکھیے، تو لٹریچر آپ کا شکر گزار ہوگا۔" (مکاتیب ص ۸۰، ص ۸۱)

باندے میں میرا چھوٹا اور پہلا بچہ ۱۹۱۸ء میں عالمگیر وبائی انفلوئنزا کی نذر ہو گیا دو ایک روز بعد بیوی کو وہیں میکہ میں چھوڑ میں لکھنؤ آ گیا ہوں۔ حضرت مہدی تعزیت نامہ لکھتے ہیں:-

> "نہایت افسوس ہوا کہ محبت کا ثمرِ اولین ضائع ہوا۔ غالباً یہ عالمگیر بخار کی عنایت ہوگی۔ ہماری متفقہ ہمدردی سب سے زیادہ ان کے ساتھ ہے، جن کی بھری گود دفعتہً خالی ہو گئی اور جن کا آجکل یہ نقشہ ہوگا ——
>
> یہ سینہ میں تا زندگانی رہے گا
> ترا داغ دل میں نشانی رہے گا
>
> آپ تنہا نہ چھوڑتے تو اچھا تھا ساتھ رکھیے یا ساتھ رہیے۔ کہ نئی نئی چوٹ کے لئے مرہم زخم کی ضرورت ہے۔ قانونِ فطرت کا یہی بے تکا پن بعض وقت بلائے جان ہوتا ہے۔ مگر یہ انسان کی عام تقدیر ہے۔" (ص ۱۰۳)

---

[1] شبلی کی سیرۃ النبی (جلد اول) کے مطالعہ کا یہ اثر ہوا تھا کہ صاحب سیرۃ ﷺ کی عظمت کا اس درجہ میں قائل ہو گیا تھا کہ انھیں مصلحِ اعظم کے درجہ پر رکھنے لگا تھا —— انکار محض کے مقابلہ میں یہ درجہ بھی غنیمت تھا۔ اور مہدی مرحوم میری اس نفسیت کے راز دار تھے۔

شفقت، ہمدردی، اور اخلاص کے پتلے تھے۔ قلب رقیق تھا کسی کی تکلیف نہ دیکھ سکتے۔ اپنے بیگانہ سب کے ساتھ حسنِ سلوک کی فکر میں لگے رہتے۔ اور اپنی فیاضی کا دروازہ کسی پر بند نہ رکھتے۔ نماز پابندی سے نہ پڑھتے لیکن جب کبھی پڑھتے اور اکثر غسل تازہ کے بعد ہی پڑھتے تو "رفیقِ حیات" مہدی بیگم کا بیان ہے کہ خشوع خضوع کے ساتھ پڑھتے، اور دعا مانگتے وقت تو تصویر محویت بن جاتے ——— زندگی کی مہلت کچھ روز اور مل جاتی تو مجھے اپنی جگہ یقین ہے کہ ان کی اسلامیت خوب پختہ اور نمایاں ہو کر رہتی اور اپنی تخلیقات حرفی و لفظی کو نظرِ ثانی و اضافہ کے بعد ہر طرح پاک و پاکیزہ بنا کر ایک بڑا ذخیرہ صحیح معنی میں "ادبِ لطیف" کا اپنی یادگار چھوڑ جاتے۔

علّامہ عمادی

ابوالخیر مودودی

مستطیل سر اور کشادہ ابھری پیشانی کے عمادی صاحب بڑے جامع کمالات تھے۔ اسلامی علوم نقلی و عقلی کے حافظ، وسیع النظر مؤرخ، عربی، فارسی، اردو کے انشا پرداز ادیب، رنگین بیان و گرم لہجہ شاعر، کتاب میں دیدہ ور باقی امور میں جنتی۔ ان کا حافظہ طرفہ تماشا تھا۔ بیسیوں مرتبہ کے چلے ہوئے رستے پر ان کو چھوڑ دیجئے، رستہ بھول جائیں گے اور بغیر رہنمائی کے اپنے گھر واپس نہیں پہنچ سکیں گے۔ حد یہ ہے کہ ۱۸ء کے وبائی انفلوانزا میں رفیقۂ حیات نے ان کو زندگی کے رستے میں چھوڑا اور وہ یہ رستہ بھی بھول گئے۔ لیکن کتاب، کوئی بھی ہو ——— فسانۂ آزاد، کوچک باختر، نائیکا بھید یا کوک شاستر ——— ایک دفعہ نظر سے گزر جانی شرط ہے، ناممکن ہے کہ اس کے مضامین ان کی یاد سے اوجھل ہو جائیں۔ بلکہ بعض خاص خاص جملے اور فقرے لفظ بلفظ یاد رہتے۔ مہینہ بھر ایک ہی چیز کھلائیے، وہ شوق سے کھالیں گے، لیکن ایک ہی قسم کی کتابیں مسلسل پڑھے جائیں، یہ ناممکن تھا۔ تبدیل ذائقے کے لئے ——— اور ذہنی ہیضہ کے لئے ——— تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجمے بھی پڑھتے تھے۔

عمادی صاحب کے نام سے میں سب سے پہلے، امرتسر کے اخبار "وکیل" کے ذریعے واقف ہوا ——— اور ابوالکلام صاحب کے نام سے بھی اولاً "وکیل" ہی کے ذریعے آنکھیں روشن ہوئی تھیں ——— یہ میرے بدوِ شعور کی بات ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں "وکیل" بڑا نامی گرامی اخبار تھا اور اس وقت کی صحافت میں اصابتِ رائے، متانت تحریر اور خوبی کے لحاظ سے بہت ممتاز تھا۔ عمادی صاحب اس کے اڈیٹر اور ابوالکلام صاحب کے جانشین تھے۔ شعور بڑھتا گیا اور عمادی صاحب سے واقفیت بڑھتی گئی: "الندوہ" کے پرانے پرچوں[1] میں اعجاز القرآن اور ابن خلدون وغیرہ پر ان کے مضامین اور سب اڈیٹری میں ان کا نام نظر آیا یہاں بھی وہ سب اڈیٹری میں ابوالکلام صاحب کے جانشین تھے۔ پھر "وکیل" کی ادارت کے ساتھ ان کی تراوشِ قلم سے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک ماہنامہ[2] نکلنے لگا جس میں نقلی علوم کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں

---

[1] ۱۹۰۶ء - ۱۹۰۸ء

[2] یہ رسالہ بھی وکیل لمیٹڈ کے زیر اہتمام نکلا تھا۔

کے عقلی و اکتشافی علوم پر بلند پایہ محققانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے اتنا لکھا کہ اب معلوم ہوتا تھا بند ٹوٹ گیا ہے[1]۔ شعور نے چند منزلیں اور طے کیں تو ان کے ایک عربی ماہنامے "البیان" پر آگاہی ہوئی[2]۔ یہ ماہنامہ عمادی صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے ۱۹۰۲ء میں نکلا، جسے وہ ۱۹۰۸ء تک کامیابی سے چلاتے رہے۔ اسی زمانے میں ایک خاص بات یہ سنی کہ وہ مکتبی علما میں پہلے شخص تھے جنھوں نے بیرونِ ہند کی صحافت سے ناطہ جوڑا، اور مصر و بیروت کے رسالوں اخباروں میں مضامین لکھے۔ "البیان" اسی تعارف کے سہارے نکلا تھا۔ پھر جب "الہلال" نکلا تو کچھ دنوں بعد "وکیل" کی لوح سے ان کا نام رخصت ہو گیا، اور معلوم ہوا کہ ابوالکلام صاحب نے عمادی صاحب کو "الہلال" کی سلکِ ادارت میں باندھ لیا ہے۔ "الہلال" سے ظفر علی خاں صاحب نے ان کو "زمیندار" میں کھینچا، اور دو تین برس کے وقفے کے بعد ان کا نام ظفر علی خاں صاحب کے نیم رسالے "ستارۂ صبح" میں شریک مدیر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ صحافت میں غالباً یہ ان کی آخری نمود تھی۔

یہ معرفت بہت بھاری بھر کم تھی، لیکن عمادی صاحب کی علمی فضیلت کا ایک بے نمود واقعہ دفعتاً اس وقت میرے سامنے آیا جب میں دارالترجمے سے متعلق ہو کے حیدرآباد جا رہا تھا۔ طبی مشورے کی غرض سے حکیم اجمل خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حکیم صاحب نے فرمایا: وہاں ایک بڑے فاضل شخص عمادی صاحب بھی ہیں۔ سفیر کابل ۱۸۹۹ء سے تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کی فکر میں تھے، ایک دن سفیر صاحب نے مجھ سے کہا، حکیم صاحب! آپ کے ہندوستان میں ایک آدمی ایسا نہیں ملتا جو ابن خلدون کی تاریخ کا ترجمہ کر دے۔ مجھے تین سال جستجو کرتے ہو گئے۔" مجھے یہ سن کر بڑی شرم آئی، سوچتا رہا، مولوی عمادی صاحب نے بڑے بھائی سے "قانون" پڑھا تھا، میں جانتا تھا کہ وہ عربی فارسی میں بڑی دستگاہ رکھتے ہیں، خط لکھ کے ان کو بلایا اور انھوں نے یہ کام انجام دے دیا۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ بہترین ترجمہ کیا اور دو سال میں پوری کتاب کا ترجمہ کر دیا۔"

یہ قسمت کی نیرنگی تھی کہ عمادی صاحب جس شعبے کے رکن تھے اسی شعبے سے ایک وہ بھی منسلک ہوا جو ان کی پائنداز میں بیٹھنے کے قابل تھا۔

لیکن اس گہرے تاثر کے باوجود میرے دل میں شوقِ ملاقات نہ تھا۔ خیال تھا کہ جب وہ ایسے ہی فضیلت پناہ ہیں تو اپنے متحدہ ہم کاروں کی طرح اپنا سارا علم اپنی نفسِ نفیس پر لادے رہتے ہوں گے، آنکھوں میں نخوت تھرکتی ہوگی، زمین پر اس طرح چلتے ہوں گے

---

[1] وکیل بک ڈپو سے عمادی صاحب کی مستقل تصانیف و مقالات میں "محکمات"، "علم الحدیث"، "فلسفۃ القرآن"، "فلسفۂ ابن عربی"، "صناعۃ العرب"، "تاریخ عرب قدیم" اور تراجم میں مفتی محمد عبدہ کی مشہور کتاب "الاسلام والنصرانیہ" (جو رینان کے جواب میں لکھی) شیخ عبدالعزیز شاویش کی "الاسلام دین الفطرۃ" اور امام راغب کی "تفصیل النشاتین و تحصیل السعادتین" شائع ہوئیں۔

[2] "البیان" تین حصوں پر مشتمل تھا، ایک حصے میں عرب ممالک کے لئے ہندوستان کی تاریخ و رجال اور حالاتِ حاضرہ پر عربی میں مضامین ہوتے تھے۔ دوسرے حصے میں عرب اہلِ قلم کے مضامین با ترجمہ درج کئے جاتے تھے اور تیسرے حصے میں بلادِ اسلام کے حالات اور خبریں اردو میں ہوتی تھیں۔ ہندوستان سے زیادہ مصر و شام و بیروت اور شمالی افریقہ، تونس والجزائر و مراکش میں اس رسالے کی مانگ ہوئی۔

حل کر لیتے۔ اسی کتاب نے عربی انشا کا شوق پیدا کیا۔ علوم و آداب اپنے والد اور دادا سے پڑھے، دونوں بزرگ صاحب فضل تھے۔ ادب کی ڈھیروں اَلَم غَلَم کتابیں چھوڑ کے قرآن اور حدیث کے درس میں بہترین ادب عالیہ بھی پڑھا دیا۔ اس طریقِ تعلیم سے طالب علم میں یہ استعداد پیدا ہو گئی کہ جاحظ و ابن قتیبہ کی ادبی صناعیوں اور کلام عرب کے مجموعوں سے خود استفادہ کر لے۔ یہ زندگی سے ہنستے بولتے، کھرے اور سادہ، لطیف اور منطقی، کانٹے کی تول تلے ادب کی تعلیم تھی۔ متنبی اور حریری اس کے آگے پانی تھے۔ نقلی اور عقلی علوم میں ملا نظام الدین کے اصول پر ہر فن کی ایک ایک، دو دو جامع و مستند کتابیں پڑھائیں، فقہ میں عام نصاب کے خلاف امام محمد شیبانی کی جامع صغیر و جامع کبیر پر اکتفا کی، اور آخر میں امام رازی کی شرح اشارات پڑھائی۔ یہ درس نظامی پر اضافہ تھا۔ اس کے بعد خیر آبادی درسیات سے فکر و نظر کی وسعتیں حاصل کرنے کے لئے مولوی ہدایت اللہ خاں[1] رام پوری کے درس میں داخل کر دیا۔

ہزاروں رحمتیں ہوں ان بزرگوں پر جنھوں نے فقہ میں سلاست روی کا قانون ذہن نشین کیا، اور بنیادی تعلیم میں آزاد تفکر کا سبق پڑھایا۔ اگر خدانخواستہ عمادی صاحب قدوری شریف اور مولانا کنز الدقائق کی آل اولاد کے چکر میں پڑ جاتے تو اور جو کچھ بھی ہوتے لیکن بلند نگاہ اور وسیع القلب عمادی صاحب نہ ہوتے، چھوٹی چھوٹی باتوں میں لٹکتے "صورت معنی" اور "معنی صورت" کے کانٹوں میں اُلجھتے، دوسروں کے لئے بھی مصیبت بنے رہتے اور خود اپنے لئے بھی۔ قرینے کی مٹھی میں سمٹی سمٹائی ڈاڑھی کو یک مشت و دو انگشت بنانا پڑتا۔ ٹخنے ڈھکا پائجامہ نہ پہن سکتے، اور لبیں اتنی گہری ترشواتے کہ مونچھوں کے وجود کا اطلاق ہی نہ ہو سکتا۔ شرح اشارات رازی کا سبق حقیقت میں آزاد تفکر کا سبق تھا۔ امام رازی بڑے بت شکن تھے انھوں نے شہ نشین کے طاقچوں سے بڑے بڑے بتوں کو گرایا ہے اور بڑے مزے سے ان کا مُثلہ کیا ہے۔ اور اس بت شکنی کے بعد بہت بڑا احسان یہ فرمایا کہ خود اپنا بت کسی طاقچے میں نہیں بٹھایا۔

درسیات سے فراغت کے بعد حکیم عبد المجید خاں صاحب سے "دلی" جا کے طب کی مشہور کتاب "القانون" پڑھی۔

---

[1] مولوی ہدایت اللہ خاں رام پوری، مولوی فضل حق خیر آبادی کے یگانۂ روزگار شاگردوں میں تھے۔ چند سال رام پور میں درس دیا، پھر ۱۸۶۰ء میں جون پور آئے اور مدرسۂ امام بخش کو رونق بخشی۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ان کی کریم النفسی کا ایک واقعہ بڑے مزے لے لے کر بیان فرمایا کرتے تھے کہتے تھے کہ ایک مرتبہ استاذ العلما مولانا لطف اللہ مدرسہ عالیہ کے امتحان کے سلسلے میں رام پور تشریف لے گئے سخت گرمیوں کا موسم تھا، امتحان سے فراغت پائی تو بارہ بج چکے تھے۔ استاذ العلماء کی عادت تھی کہ دوپہر کے وقت باہر نکلتے تو سر پر چادر ڈال لیتے، چادر ڈال کے مدرسہ سے پیادہ پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خاں رام پوری کے مکان پر پہنچے، مولوی صاحب قیلولہ کرنے زنان خانے میں جا چکے تھے، اطلاع پاتے ہی باہر تشریف لائے اور اس شان سے مہمان عزیز کی پذیرائی کی جو انہی بزرگوں کا حصہ تھا۔ اپنے بھتیجے کو بھیج کر کنویں سے تازہ پانی منگوایا اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مہمان کے پاؤں دھوئے۔ سپاس گزاری یہ تھی کہ "مولوی لطف اللہ صاحب نے دھوپ میں کرم فرمایا"۔ اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے ساتھ ان بزرگوں کے یہ آداب تھے۔

پھر رام پور میں عرب[1] محمد طیب سے فنونِ ادب کا فیض حاصل کیا، اور طیب صاحب نے مکتب سے مکتب نوازی کی مسند پر بٹھا دیا۔

اس زمانے کی علمی دنیا میں مولوی عبدالعلی آسی ایک مشہور و مقبول شخصیت تھے۔ وہ مولوی عبدالحیٔ فرنگی محلی کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ اور رام پور کے مدرسۂ عالیہ میں مدرس رہ چکے تھے۔ مدرسی چھوڑ کر لکھنؤ میں "اصح المطابع" کے نام سے مطبع قائم کیا۔ جس میں حدیث و فقہ، خصوصاً عربی کی درسی کتابیں بڑی صحت و تہذیب کے ساتھ چھاپتے تھے۔ آسی صاحب کو اپنے اس کام کے لیے ایسے لوگوں کی جستجو رہتی تھی، جو ادب اور مختلف علوم میں دست گاہ رکھتے ہوں اور غلط نسخوں کی تصحیح میں ان کی مدد کریں۔ وہ اپنے کسی کام سے رام پور آئے، طیب صاحب نے ان کے مطلب کے موزوں ترین آدمی سے ان کو متعارف کیا، اور عمادی صاحب مکتب سے مطبع کی زینت بن گئے۔ یہاں قلمی اور مطبوعہ نسخے تھے اور عمادی صاحب اول سے آخر تک لفظ بلفظ ایک ایک کتاب پڑھتے اور نقل و کتابت کی غلطیاں درست کرتے۔ آسی صاحب کو کاپیاں اور پروف دیکھنے میں بڑی مہارت تھی۔ جیسے بچوں کو ہجوں کے ساتھ قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کاپیاں اور پروف پڑھتے تھے۔ یہ کام انھوں نے اپنے ذمّے رکھا۔ کام کا دائرہ وسیع کر لیا اور حدیث و فقہ کے علاوہ معقولات کی بہت سی کتابیں اور درسیات کی تقریباً تمام کتابیں شائع کیں۔ "اصح المطابع" کا نام درسی حلقوں میں صحتِ طباعت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ عمادی صاحب کہتے تھے کہ اس کام سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا، غلطیوں کی تصحیح نے کھٹک اور پرکھ کی استعداد پیدا کر دی، اور بغور پڑھنے کی وجہ سے مباحث ذہن نشین ہو گئے اور پوری کتابیں پڑھنے سے تفصیلاً اس کے مباحث سامنے آ گئے۔

تصحیح کا بار جب ہلکا ہوا تو آسی صاحب نے پہلے "الریاض" نام ایک عربی ماہنامہ جاری کیا۔ پھر عبدالوالی صاحب کے اہتمام سے "البیان" جاری ہوا۔ یہ دونوں رسالے عمادی صاحب کی ادارت میں نکلتے تھے جب ناخن نرم تھے اس وقت سے عربی انشا کا ذوق پرورش پا رہا تھا۔ تصحیح کے کام سے جب فرصت پاتے عربی جرائد کو مضامین بھیجتے رہتے تھے۔ آسی صاحب نے مناسب سمجھا کہ یہ ابرِ کرم جو باہر برستا ہے گھر ہی میں کیوں نہ برسے۔

---

[1] عرب محمد طیب نوادرِ عالم سے ایک نادرہ تھے، علوم کا بہتا دریا، وطن مکہ تھا، نہ جانے ہندوستان کس طرح آ نکلے، مولوی فضلِ حق خیر آبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ) سے معقولات میں کمال حاصل کیا۔ نقلی علوم میں صاحب دست گاہ تھے، کتاب سے بے نیاز، ان کا علم ان کے سینے میں تھا۔ ادب میں اپنا جواب رکھتے تھے، کلامِ جاہلیت پر اس قدر عبور تھا کہ مضمون قصیدے پر قصیدہ مسلسل سنتے جاتے، پڑھنے کے انداز سے شعری تصویروں کی عکاسی کر دیتے اور لہجے سے شعر کی روح نمایاں کر دیتے۔ نکاتِ سخن بیان کرتے اور دادِ سخن دیتے۔ مماثل یا متماثل شعر سنانے کی لہر آ جاتی تو گھنٹوں ہم رنگ و ہم معنی شعر سنتے جاتے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے کسی کا چراغ نہ جلنے دیتے۔ نواب کلب علی خاں کی مجلس کے بلبلِ ہزار داستان تھے، جد و ہزل میں طاق، نواب ان کی بہت ناز برداریاں کرتے۔ مذہب میں پانی تھے، جس رنگ کے گلاس میں چاہو ڈال دو، مگر رہتے تھے اسلام ہی کے دائرے کے اندر۔ مدتوں مدرسۂ عالیہ کے صدر و مہتمم رہے اور طلبہ کے وظیفے بڑی فراخ حوصلگی سے ہضم کیے۔ خدا کی رحمتیں ہوں اس مردِ آزاد و بے باک پر۔

عمادی صاحب کے فضل و کمال سے سب سے آخر میں دارالترجمے اور حیدر آباد کے دوسرے علمی اداروں کو استفادے کا شرف حاصل ہوا۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے (خدا ان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے) اس قدر شناسی کے ساتھ تقرر فرمایا تھا کہ ایسے علم و فضل والے علماء خال خال نظر آتے ہیں ۔۔۔ مشرقی شعبے میں اس پایہ کے فاضل شخص کا موجود ہونا مشرقی شعبے کا بڑا شرف ہوگا۔ دارالترجمے کو یہ بڑا شرف "تقریباً" بائیس سال حاصل رہا۔ اس مدت میں وہ بھی کچھ رہے: مترجم[1]، ناظر مذہبی۔ علمی مبصر، واضع اصطلاحات۔ عمادی صاحب کو عربی فارسی کی قدیم و جدید لغات و مصطلحات پر بڑا عبور تھا۔ اس لئے وہ ہر شعبے کی مجلس مصطلحات کے مستقل رکن تھے، اور ان کو ارکان مجلس میں بڑا امتیاز و احترام حاصل تھا۔ باایں ہمہ وہ علمی رہنمائی سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اصطلاح وضع کرنے میں مدد دیتے اور اس بات سے غرض نہ رکھتے کہ ان کی مدد اور رہنمائی قبول کی گئی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی مشیخت کا بوجھ لادنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

دائرۃ المعارف اور کتاب خانۂ آصفیہ حیدر آباد کے دو عظیم ترین بین الاقوامی شہرت کے ادارے ہیں۔ عمادی صاحب ان دونوں کے رکن رکین تھے۔ دائرۃ المعارف نے تاریخ اور فلسفے کے علاوہ ہیئت و ہندسہ وغیرہ علوم کی متعدد کتابیں یورپی شرق شناسوں کے اشتراک سے ایڈٹ کی ہیں۔ اس قسم کی تمام کتابوں کی تصحیح و تہذیب کے نگران اعلیٰ عمادی صاحب مقرر کئے جاتے تھے۔[2] کتاب خانۂ آصفیہ کی مجلس مخطوطات میں وہ قلمی نسخوں کے مستند مبصر تھے۔ کتاب کسی موضوع و مضمون کی ہو، اس کی علمی قدر جانچنے میں ان کی نگاہ بہت تیز تھی۔ لیکن مادی قیمت کیا ہو؟ اس میں وہ کورے تھے اور اس سے سروکار ہی نہ رکھتے۔ جس نے زندگی بھر بازار جا کے کوئی چیز خریدی ہی نہ ہو، وہ قیمت جانچنے میں تیر تکے ہی لگاتا۔ یک رُخی اور محکم گیری ان کی شخصیت کی ایک بنیادی اینٹ تھی۔

---

[1] مترجم کی حیثیت سے عمادی صاحب کے قلم سے حسب ذیل کتابیں نکلیں:-
(۱) مورخ مسعودی کی "تنبیہ و اشراف" اور "مروج الذہب" (۲) مورخ طبری کی تاریخ الرسل والملوک کی آخری دو جلدیں۔ (۳) طبقات ابن سعد کی بارہ جلدیں۔ (۴) ابن حزم کی الملل والنحل —— یہ آخر الذکر کتاب تفسیر و حدیث علم کلام و فلسفہ اور مذاہب کی معلومات کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔

[2] پانچویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی طبیعی و ریاضیاتی مصنف ابن الہیثم کے حسب ذیل رسائل:-
(۱) رسالۃ الضوء (۲) رسالۃ المرایا المحرقہ بالقطوع
(۳) رسالۃ المرایا المحرقہ بالدائرۃ (۴) رسالۃ المکان
(۵) رسالۃ مشکل بنی موسیٰ
(۶) رسالۃ المساحت
(۷) رسالۃ ضوء القمر۔
محدث ابن جوزی کی مشہور تاریخی اور سیرتی کتابوں کا [illegible] منتظم [illegible] وغیرہ۔

حیدر آباد سے عمادی صاحب کے تعارف کا ذریعہ ظفر علی خاں صاحب[1] تھے ——— یہاں حیدر آباد سے میری مراد حیدر آباد کی روح ہے، روح کا مظہر نہیں۔ سے حیدر آباد، حیدر آباد تھا ——— اور اپنے رہن سہن کی کچھ اسی شان سے تقریب کی کہ پیش "ہو سے نا" کے ذریعے طلبی ہوئی، دربار کی نیابت سے طرف کر دیا، پہنچتے ہی باریاب کیا۔ تو مغربی شعبے کی ان کی رکنیت خانہ زاد بخشا، یہی ملازمت میں یہ ذات کا لقب، تنہا پڑا کہ عمادی صاحب خاص امتیازات کے مورد بن گئے، ایسے امتیازات جن میں وہ یکسر منفرد تھے۔ بارگاہ میں جو نادر قلمی کتابیں صلہ و انعام کی غرض سے پیش کی جاتیں اور بڑے بڑے مصنف اپنی جو کتابیں نوازش و سرپرستی کی غرض سے پیش کرتے ان کی قدر و قیمت جانچنے کے لئے ایک ہی معتمد جوہری تھے، عمادی صاحب۔ یہ بھی معاملت تھی، براہ راست "ہمارے ناموس" اور ہاتھ سے جانچ طلب کئے جاتے۔ ایسے خاندانی کتب خانے اور تصنیف جاری۔ سیاست و آفرینش کے دروازے ان پر کھول دیئے اور اس نادر تاریخی مواد سے ذخیرے دیکھنے کا اتفاق عمادی صاحب کے سوا کسی کو نہیں ہوا۔ خود لے لئے حیدر دکن کی سیاسی تاریخ لکھوائی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنے اطمینان اور اپنی تلاوت میں استفادے کے لئے قرآن شریف کے گرامی ترجموں کی نسبت تو یہ چاہا کہ دیکھ کر بتائیں ان میں کونسا ترجمہ مستند ہے اور اگر اس میں غلطیاں ہوں تو جا بجا اصلاح کر دو کس قدر خدا بیں بنا دینے والا تھا انسانیت کو یہ امتیاز، یہ منصب و اعتبار! لیکن عمادی صاحب کا جوہر ذات اس قدر اعلیٰ اور گراں مایہ تھا کہ یہ سارے امتیازات اس کے مقابلے میں بات ہی ایک بوند تھے!

عمادی صاحب نے بطور تحدیث نعمت "بھی ان باتوں کے ذکر سے اپنی زبان کبھی آلودہ نہیں کی۔ وہ جو اردو کی ایک کہاوت ہے "نیکی کر کنوئیں میں ڈال"، بالکل اسی طرح انھوں نے یہ سارے کام کئے اور ان کے ذکر اذکار خاموشی کے کنوئیں میں ڈال دیئے۔ اس سے زیادہ تلخ کامی اور کیا ہوگی۔ کہ وہ بھی ان کاموں سے بے خبر رہے جو ان سے قریب تر تھے۔

---

[1] ظفر علی صاحب کو اعلیٰ حضرت آصف سابع اپنے زمانہ شہزادگی سے جانتے تھے اور اسی جاننے کی وجہ سے ملک بدر کئے گئے تھے۔ بات یہ تھی کہ اعلیٰ حضرت آصف سادس (میر محبوب علی خاں) کے حکم سے تمام سیکرٹری شہزادہ ولی عہد کو مملکت کا کام سکھانے جاتے تھے۔ ظفر علی خاں صاحب اس زمانے میں مرحوم سیکرٹری عزیز مرزا صاحب کے اسسٹنٹ اور پیش کار تھے۔ کاغذات پیش کرنے ہمیشہ یہی ان کے ساتھ جاتے۔ عزیز مرزا صاحب تمام سیکرٹریوں میں سب سے زیادہ لائق فائق، اسمارٹ اور کام میں رعد و برق تھے، ولی عہد کی نگاہ میں بہت عزیز ہو گئے۔ دوسرے سیکرٹریوں کو ان کی یہ قربت گراں گزری، ان لوگوں نے یہ سازش گھڑی کہ عزیز مرزا ولی عہد کو برسرِ اقتدار لانے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس پاداش میں عزیز مرزا صاحب اور ان کے رفیق ظفر علی خاں صاحب ملک بدر کر دیئے گئے۔ اعلیٰ حضرت آصف سابع نے یہ بات یاد رکھی، اور جب ظفر علی خاں صاحب کرم آباد کی قید محض سے نکلے اور اسی کے لگ بھگ زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی نصابی کتابوں کے لئے سررشتہ تالیف و ترجمہ قائم ہوا، تو ظفر علی خاں صاحب کو حیدر آباد بلایا اور اپنے خاص فرمان سے مغربی شعبے کا رکن مقرر فرما دیا۔

یہ اُن کے کھرے علم کا گمبھیر انا تھا۔ انا احساسِ ذات ہے۔ یہ احساس جس قدر واضح اور مستقیم اور علم و نظر سے متوازن ہوتا ہے اسی قدر گمبھیر ہوتا ہے، اور جس قدر گمبھیر ہوتا ہے اسی قدر ہوش مند شخصیت تشکیل پاتی ہے ——— لیکن ایغو جس نفسی کیفیت کا اظہار ہے، وہ مستقیم و متوازن احساسِ ذات نہیں! انا کی بدہضمی ہے ——— عمادی صاحب کو احساس تھا کہ وہ علم و نظر سے بہرہ مند ہیں، ان میں ایک خاص کمال اور خاص بصیرت ہے۔ اس احساس اور قلندرانہ[1] مشرب بزرگوں کے فیضِ تربیت نے ان کی ہوش مند، حسین شخصیت کو جنم دیا۔

ان کی شخصیت میں اس قدر اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں جو آج ڈھونڈے بھی کہیں نظر نہیں آ سکتیں، نہ خانقاہوں میں نہ مدرسوں اور مکتبوں میں، نہ مسجدوں میں، نہ کسی بڑے سے بڑے ادعائی مرکز میں! تناتنی کا تو ذکر ہی کیا، نخوت اور تمکنت کی پرچھائیں بھی ان میں نہ تھی۔ اپنے ہر ملنے والے کی بے حد بزرگ داشت کرتے، اپنے چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے گویا وہ خود ہر حیثیت میں ان سے چھوٹے ہیں۔ اپنی کسی بات، اور کسی طریقے سے ایک جاہل ہمنشین کو اس بات کا خفیف سا بھی احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ نیکی اور دست گیری کا جو سلسلہ ایک دفعہ شروع کر دیا مرتے دم تک قائم رکھا۔ ان کی تنخواہ میں دست گیری کی ایک مستقل مد تھی۔ معمولی تنخواہ چھ سو میں سوا سو روپے کی مستقل مد! خود ان کا اپنا حصہ کھانے کپڑے اور اوپری مصارف سمیت پانچ فی صد تھا اور دست گیری کا بیس فی صد! دست گیری اس شان سے کرتے کہ اونچا ہاتھ نیچا رہتا اور نیچا ہاتھ اونچا۔ جیسے مرید با اخلاص اپنے پیر و مرشد کو اور سعادت مند شاگرد اپنے استاد کو نذر پیش کرتا ہے۔ عیدین کے موقع پر دفتر کے چپراسیوں کا گروہ عید کے سلام کو آتا تو اگرچہ وہاں کا عام دستور یہ تھا کہ چپراسیوں کا سلام لے لیا اور انعام دلوا دیا۔ لیکن عمادی صاحب ان سب سے معانقہ کرتے، بزرگ داشت سے ان کو بٹھاتے، خود ہر ایک کو عطر پان پیش کرتے اور عید کا انعام ٹھیک اسی طرح پیش کرتے جس طرح وہاں اعلیٰ حضرت کو نذر پیش کی جاتی تھی۔ عید اور عید گردی میرے لغت و رسم سے خارج رہی ہے۔ لیکن عمادی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا مقدم تھا۔ ان کی بلندیاں دیکھ کر میری پستیاں پانی پانی ہو جاتی تھیں۔ اور سچ پوچھیے تو اپنی پستی کا یہ احساس انہی کی بلند انسانیت کا ادنیٰ فیض تھا۔ شروع میں ایک دفعہ میں نے اس طریقے پر جسارت سے کچھ کہا، فرمانے لگے: جب عمادی اعلیٰ حضرت کی جناب میں اس طرح عید کی نذر

---

[1] قلندری طریقے کا نقطہ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں شیخ خضر رومی ہندوستان لائے۔ یہ درویش سیاح تھے، صاحبِ فضل اور اپنے کام میں صاحبِ کمال تھے۔ [illegible] خواجہ قطب الدین بختیار اوشی سے ملے، ممتنع کیا اور متمتع ہوئے۔ وہ خود تو [illegible] ان علاقوں کو چھوڑ کر واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے، لیکن یہاں ان سے ایک مستقل طریقِ قلندر شائع ہوا۔ [illegible] ان کے مرحلے تھے اور طریقہ چشتیہ میں بھی اس خرقۂ فقر کا پیوند لگا۔ چنانچہ تمام اصحابِ طریق متمتع ہوئے۔ عمادی صاحب کے بزرگ شیخ قطب بینادل کے حلقے سے متعلق تھے۔ مشربِ قلندری کا خلاصہ دو لفظوں میں طیبتِ نفس ہے۔ قدیم فقر کی پاکی و بے باکی، خوش دلی و خوش اندیشی۔ شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں خضر رومی کا مختصر ترجمہ لکھا ہے۔

پیش کرتا ہے تو یہ لوگ بدرجۂ اولیٰ اس کے سزاوار ہیں۔ عمادی کی نگاہ میں سب اس سے اعلیٰ اور اس کے مخدوم ہیں اور وہ سب کا ادنیٰ ترین خادم ہے۔" ان کے لہجے میں بھرپور انسانیت کا خلوص اور گداز تھا۔ اس وقت بھی جب میں یہ لکھ رہا ہوں، وہ دھیمی اور گہری آواز میرے دل میں پیوست ہوتی جا رہی ہے۔

نوکروں کے ساتھ برادرانہ برتاؤ تھا۔ نوکر صرف دو تھے، لیکن ان کا سارا گھرانا ان کے دسترخوان میں برابر کا حصہ دار تھا، بلکہ ان کے مہمان بھی۔ جو خود کھاتے وہی ان کو کھلاتے۔ لذتِ کام و دہن سے زیادہ ان کو دسترخوان کی وسعت محبوب تھی۔ دکھ بیماری میں ان کی دیکھ بھال، علاج معالجہ کرتے اور ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے۔

عزیزوں کے ساتھ بہت الفت تھی۔ وطن جب جاتے عزیزوں دوستوں کے لئے سوغاتیں لے جاتے، بچوں کو نقدی دیتے۔ خاندان کے متعدد بچوں کو ان کے رجحان کے مطابق پڑھوایا۔ ایک بھتیجے کو ادب کا اور ان کے صاحبزادے کو سائنس کا شوق تھا، دونوں کو بااہتمام ایک ساتھ علی گڑھ میں پڑھوایا۔

حیدرآباد کی جاہ و معاشرت کا ان پر اتنا بھی اثر نہ تھا جتنی ملنے پر محسوس ہوتی ہے۔ نمونے کی طالب علمانہ سادگی جو ہمیشہ سے ان کا شعار تھی، حالات کے تغیر سے اس میں سر مو فرق نہ آیا۔ ان کے ایک بہت پرانے ہم وطن دوست کہتے تھے کہ میں نے وطن میں زندگی کی جو روش دیکھی تھی وہی آج اس مرکز جاہ و نمائش میں دیکھ رہا ہوں۔ نہ مزاج میں کوئی فرق ہے، نہ لباس اور بود و باش میں" ——— اور اسی سلسلے میں عمادی صاحب کی تحصیل علم کے واقعات سنائے۔

انفرادیت کہیے یا وضعداری، جو کچھ بھی تھی ان کی ٹوپی میں تھی، پھندنے سے آزاد اونچی باڑ کی ترکی ٹوپی۔ ڈھیلی ڈھالی گھٹنوں سے بالشت بھر سے کچھ زیادہ نیچی شیروانی۔ ڈیڑھ فٹے پائنچے، ٹخنوں سے اونچے نہیں، اتنے نیچے کہ ایڑیوں سے ملے رہتے۔ یہ چیز خاص الخاص قسم کے لوگوں کو بہت گراں گزرتی تھی اور عمامے سے کبھی گراں جسم نہ ہوتے۔ جو لباس معمولاً پہنتے، کوئی مجلس ہو اسی لباس میں جاتے۔ جلوہ فرمائی کا جدا لباس کیش و آئین نہ تھا۔

لباس کی طرح تعلقات میں بھی بڑے وضعدار تھے۔ جس سے جو تعلق تھا حاضر و غائب یکساں تھا، جو وضع پڑ گئی زندگی بھر کا دستور بن گئی۔ توہین چاہے کسی کی ہو کسی قسم کی ہو، اس سے انہیں سخت اذیت ہوتی تھی۔ بدگوئی، دل آزاری، طنز و استہزا، اپنی ذات کے متعلق ذکر اذکار ان کے مذہب میں گناہ تھے۔ آپ بیتی گفتگو میں اسی حد تک آتی تھی کہ مفید اور سبق آموز ہوتی۔ حوصلہ افزائی ان کی خصوصیت تھی جس میں ذرا بھی کوئی استعداد پاتے، اس کے لئے سراپا شفقت بن جاتے۔ کم استعدادوں کے کام کو اپنے مقام سے نہیں، ان کے مقام سے دیکھتے اور حوصلہ بڑھاتے۔ رد و کد، بحث و تکرار سے پرہیز کرتے تھے۔ لیکن بطور تفنن کوئی انوکھی علمی بات چھیڑ کے ذہنی ورزش کا لطف لیتے اور لطف اندوز کرتے۔ شواذ اور نوادر مسائل، اور لطائف و ظرائف ان کے کشکول میں بہت تھے۔ انسان خواہ کسی درجے کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے کمال خوبیاں نظر آتیں۔ عربی فارسی اردو تینوں زبانوں کے ہزاروں شعر، جد و ہزل ہر قسم کے ان کے خزانۂ دماغ میں محفوظ تھے، سناتے اور نکتہ سنجی کرتے۔ مطالعے کے تنوع نے ان کی طبیعت کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ ادبی تاریخی اور فقہی لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے، خوش وقت کرتے اور خوش وقت ہوتے۔ منہ بند کر کے اس طرح ہنستے کہ سارا جسم ہل جاتا۔ شاید مقامی محاوروں کی طرح ہنسنے کا محاورہ بھی مقامی چیز ہے۔ ہنسنے کی بالکل یہی وضع مرحوم مولوی

ابو بکر شیث کی بھی تھی، دونوں "جون پوری" تھے۔ ممکن ہے ہنسنے کا یہ سانچا جون پور کی قدیم شائستگی نے ڈھالا ہو۔

تردید کے انداز میں تردید نہ کرنا اور غلطی کی اصلاح "غلط ہے" کہہ کے نہ کرنا ان کی مستقل عادت تھی۔ اور یہ بھی مستقل عادت تھی کہ جو لوگ بننے کے شوقین ہوتے بڑی نکتہ آفرینی سے ان کی تسکین خاطر کرتے۔ ایک صاحب کو علامہ بننے کا سودا ہوا، خوب مدارات کی، وہ "حضرت العلامہ" بن گئے اور اس سند پر کہ عمادی صاحب نے علامہ لکھ دیا ہے، علامہ پن کو اپنا قانونی حق سمجھ لیا اور عمادی صاحب نے طرح داری سے لکھ دیا کہ جامع العلوم کتاب کو معلمہ کہتے ہیں اور جامع العلوم شخص کو علامہ۔ میرے دوست بلاشبہ علامہ ہیں اور ایسے علامہ کم ہوتے ہیں۔ تفریح کے لئے نشے لطیف ضروری ہے اور یہ نشے لطیف کا کرشمہ تھا کہ ڈولے عالم لوگ بھناتے، عمادی صاحب نے کہا: میرا یا آپ کا اس میں ہرج کیا ہوا، وہ غریب علامہ بننے کی کوشش میں کچھ بن ہی جائے گا، بگڑے گا تو نہیں۔ میرا تو یہ مسلک ہے۔

ہمیں تو شیخ و برہمن سبھی کی سُن لینی
یہ کیوں؟ کہ آس نہ توڑیں بگاڑنے والے

کسی بات کو وہ غلط جانتے ہوں، مگر اس کی مدارات میں بھی دریغ نہ تھا۔ کیا خوب اس طرح کہتے کہ یہ اپنی جگہ مطمئن وہ اپنی جگہ خوش۔

اور یہی مدارات تھی کہ قانون کے مترجم مسعود علی صاحب محوی نے عربی ادب پڑھنے کی خواہش کی اور استاد صاحب شاگرد کو اس کے کمرے میں جا کے پڑھانے لگے۔ محوی صاحب علی گڑھ کے پرانے فارغ التحصیل اور علامہ شبلی کے شاگرد تھے، عربی میں نمایاں استعداد تھی، علامہ شبلی نے ان کو ڈپٹیقہ دیا تھا، سشن جج رہ چکے تھے، جوش صاحب نے خیال کیا کہ شاید وہ سابقہ سشن ججی کے غرے کی وجہ سے خود پڑھنے نہیں آتے، اور عمادی صاحب کو جھنجھوڑ ڈالا۔ خوب برسے، خوب برسے جتنے یہ برسے اتنے ہی وہ نہال ہوتے۔ جھڑی تھمی تو بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ان کے آنے سے مجھے کچھ تو ڈنک نہیں لگ جائے گا۔ یہ بات تو قابلِ قدر ہے کہ انھیں اس عمر میں بھی پڑھنے کا شوق ہے آپ بڑھئے عمادی آپ کی جناب میں بھی حاضر ہو گا!" انہی محوی صاحب کے ہاں ضیافت میں ظفر علی صاحب نے بیان کیا تھا (یہ ۳۴؁ یا ۳۵؁ کی بات ہے) کہ مجھ سے ڈاکٹر اقبال نے ذکر کیا کہ میں ابن عربی کا فلسفہ سمجھنا چاہتا ہوں، کوئی ایسا آدمی بتاؤ جو مجھے ابن عربی کی فصوص اور فتوحات کے مباحث اور فلسفہ سمجھا دے۔ میں نے اپنے علامہ کو تجویز کیا اور یہ حضرت خود جا کے پڑھانے لگے" محوی صاحب نے تو یہ دُہائی: کہ رسم پابندی اوقات چلی جاتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کا قصہ پوچھا، بہت سادگی سے اتنا کہا: جو بزرگ یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے تھے وہ بوڑھے ہو چکے تھے، مولوی شبلی سید صاحب کے زیر ہدایت وقت کے ضروری مباحث پر لکھنے اور تحقیق و مطالعے میں مشغول تھے" اور قصہ گویا تمام کر دیا۔

مولوی سید سلیمان صاحب کو بہت ملال تھا کہ" ان کے مضامین ابوالکلام کے نام سے شائع ہو گئے"۔ ایک دن دارالمصنفین کی کسی کتاب کے سلسلے میں عمادی صاحب کے پاس دفتر تشریف لاتے، یہ قصہ تو ازم گفتگو سے تھا، فرمایا: یاد ہو گا مولانا

آپ کو، وہ میرا کان پور کی مسجد والا مضمون اور ابوالکلام صاحب کا برہمی کا خط! اسی مضمون سے شہرت ملی اور اسی مضمون پر لکھنے والے کو غیظ و غضب سے نوازا ——— اور مولانا! آپ نے دیکھا، آپ کے وہ مضامین بھی اپنی مملوکاتِ ادبی میں شامل کر لئے جو آپ وہاں چھوڑ آئے تھے . . . . اور ان مضامین کی خوب ستائش فرمائی۔ عمادی صاحب نے کہا: چھوڑیئے جناب مولانا (یہ عمادی صاحب کا خاص اندازِ تخاطب تھا) ان باتوں کو، اب وہ مضامین نہ مولانا ابوالکلام ہی کے لئے کوئی حیثیت رکھتے ہیں نہ آپ کے لئے۔ یاد کے قابل تو وہ صحبتیں ہیں جو مولانا ابوالکلام کے ساتھ گزر گئیں۔ پھر وہ لطفِ صحبت حاصل نہ ہوا! سید سلیمان صاحب کو یہ بات خوش نہ آئی۔ بڑی دل گرفتگی سے عمادی صاحب کی صورت تکنے لگے۔ میرے لئے یہ بہت دل چسپ مطالعہ تھا۔

ان کا ذہنی وجدان کلیتہً عقلی تھا، اور وجدان الفاظ کا زندانی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے افکار و معتقدات میں بے حد راسخ تھے اور دوسرے کو اپنے معتقدات رسوخ کی پوری آزادی دیتے اور تصادم سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے ملنے والوں میں غالی شیعہ بھی تھے، راسخ اسماعیلی بھی، اور ایسے بے فکرے بھی جو 'انگرسول' کی زبان میں گفتگو کیا کرتے، اور یہ سب ان کی صحبت سے یکساں فرحت و انبساط حاصل کرتے۔ ایک غالی شیعہ دوست نے پوچھا: مولانا! اسلام نے موسیقی کی سرپرستی کیوں نہیں کی؟ بولے: آپ جس کو موسیقی سمجھتے ہیں اس کی سرپرستی اسلام نے اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ طبلچی اور سارنگیے پیدا کرنے نہیں چاہتا خیبر شکن حیدر کرار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کفران کے نزدیک لغت اور اصطلاح دونوں لحاظ سے 'عقل سے بغاوت' ہے اور استدلال ایمان کی مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مولوی معنوی نے استدلال کو پائے چوبیں کہا ہے، وہ پائے آہنیں کہتے ہیں۔ مولوی کے شعر کو انھوں نے یوں بدلا ہے:

پائے استدلالیاں روئیں بود   پائے روئیں باہمہ تمکیں بود
بسکہ استدلال کار دین ماست   فخر رازی رازدار دین ماست

اور یہ استدلالی طریق، دینی امور اور علمی امور میں، ان کا اصولِ کار تھا۔

وہ اپنی تسکینِ خاطر کے لئے جب کسی مسئلے کی تحقیق کے درپے ہو جاتے، تو دن رات اسی دھن میں لگے رہتے اور تحقیق کے پھل سے، خواہ ان کی خواہش کے مطابق ہو یا خلاف، شاد و شاد ہوتے۔ ان کا مدعا صرف تحقیق ہوتا تھا، وہ اپنی خواہش اور نقطۂ نظر کو محور نہیں بناتے تھے۔

تاریخی مطالعے میں ان کا طریقہ عام روش سے جدا تھا۔ وہ واقعاتی تاریخوں سے صرف زمین کا کام لیتے تھے اور عمارت گری کے لئے تذکرہ و تراجم رقعات و محاضرات (کشکول کی کتابوں) اور دوسرے مآخذ سے واقعات کو رونما کرنے والے ریشوں کا کھوج لگاتے۔ اس کے لئے وہ قصوں اور کہانیوں اور قصیدوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے سلسلے میں انھوں نے شاہی فرمانوں، جاگیری وثیقوں اور پرانے وقف ناموں کا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ امتحانات اور دوسری علمی سرکاری مدوں سے دو ڈھائی ہزار سالانہ کی جو آمدنی ہوتی وہ قلمی کتابوں اور ایسے ہی ذخیروں کے لئے وقف کر دی تھی۔

بدنام واقدی سے ان کو بہت ہمدردی تھی، کہتے تھے کہ وہ بہت بڑا مصنف ہے۔ اس نے تاریخ اور افسانے کو سمو کر

ایک نیا اسلوب پیدا کیا تھا۔ اس کے فن سے معاشرے کی اکثریت ہر زمانے میں بڑے ذوق شوق سے مستفید ہوئی۔ وہ مؤرخ کی بجائے ایک بامقصد نقاش ہے اور اس کی نقاشی اس ماحول کا وافر آب و رنگ مہیا کرتی ہے۔ یہ ان کے تاریخی مطالعے کا انداز نظر ہے۔

ابن خلدون کے دو نظریوں: عربوں کی بدویت کے نظریے اور علوم و آداب میں عربوں کی تہی دستی کے نظریے سے سخت اختلاف تھا۔ کہتے تھے کہ مستشرقین نے زیادہ تر ان دو نظریوں کی وجہ سے ابن خلدون کی ستائش کی ہے۔ ان کی محققانہ رائے یہ ہے کہ ابن خلدون کے یہ دونوں نظریے بے اصل ہیں "تاریخ عرب قدیم" اور "صناعۃ العرب" ابن خلدون کے نظریہ بدویت کی تردیدی تحریریں ہیں، لیکن ان کو اپنی معتاد روش کے مطابق تردیدی عنوان سے پیش نہیں کیا۔

مقالہ ہو یا ترجمہ، برداشتہ قلم لکھتے اور کسی پیراگراف یا صفحے میں شاذ و نادر کوئی لفظ قلم زد ہوتا۔ مدت سے خود لکھنا چھوڑ دیا تھا، ترجمہ لکھواتے تھے۔ ترجمہ لکھانے کا ڈھنگ اکثر و بیشتر یہ ہوتا: ٹہلتے رہتے، کتاب ایک نظر دیکھتے اور فقرے روانی سے بول دیتے۔ خوبی یہ ہوتی کہ ترجمہ لفظی ہوتا۔ مسجع عبارتوں کے لفظی ترجمے کی یہ شان تھی:

والقمر الباهر والكواكب الزاهر
والغمام الماطر وما بالجو من طائر وما
اهتدى بعلمه مسافر من منجد وغائر
لقد سبق هاشم امية الى المآثر اول
منه وآخر ابو مهمة بذلك خابر
نقضى لهاشم بغلبة ۔

قسم ہے ماہ تاباں کی، نجم درخشاں کی، ابر باراں کی، مرغان فضائے آسمان کی۔ قسم ہے اس ہادی ثیبہ کی جس سے رہرو کو راہ ملے فراز پسند ہوں یا نشیب گیر سب کو پناہ ملے کہ خوبیوں میں ہاشم امیہ سے بڑھ کے ہے، آگے پیچھے ہر حال میں بڑھ چڑھ کے ہے۔ ابو مہمہ اس کا خبر رساں ہے اور یہی اس کا بیان ہے۔ اس بیان کے ساتھ ہاشم کے غالب آنے کا فیصلہ کیا۔

لوگوں کی خدمت طرح طرح سے کرتے۔ ایک صاحب کے پاس قدیم قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، چاہتے تھے کہ آصفیہ کتب خانے میں اچھے داموں نکل جائے۔ ان سے کہا: فہرست بنائیے ہر کتاب پر مختصر سا تعارف لکھیے کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو۔ تعارف لکھنے کا کام ان کے بس کا نہ تھا، یہ کام اپنے ذمے لے لیا، اور بار احسان سے یہ کہہ کے ان کو سبکدوش کر دیا کہ "مجھے پڑھنے کو اچھی کتابیں مل جائیں گی"۔ وہ ہر ہفتے دس پانچ کتابیں لاتے اور تعارفی نوشتوں کے ساتھ اپنی کتابیں لے جاتے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اتنی کھکھیڑ کون کسی کے لئے اٹھاتا ہے۔ چند نمونوں سے تعارف کی فنی خصوصیتوں کا اور ادبی شان کا اندازہ ہوگا:

کیمیائے اسلام: اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تکوین کیوں کی، نبات و معدن و جماد میں قدر مشترک کیا ہے، نقص خلقت کی کتنی گنجائش ہے۔ سالمات کتنے ہیں اور ناقصات کس قدر ہیں، جوہر و عرض کی کیا نسبت ہے، جن اجسام کو بظاہر مصمت اور ٹھوس محسوس کیا جاتا ہے کیا حقیقت میں ان کے اندر تخلخل نہیں ہے کہ اعمال تصعید و تنزیل و تحلیل و ترکیب سے وہی خسیس سافل مرتبہ عالی میں پہنچ سکے اور صنعت گری کے طفیل سب کو لے کر ہیرے میں تبدیل کر لیا جائے؟

کیمیائے اسلام کا یہی موضوع ہے جو تمام تر حقائق اشیا کے علمِ حق اور عملِ صدق پر مبنی ہے ۔

اسلام سے پیشتر کلدانی و مصری و یونانی قومیں مہوّسی میں مبتلا تھیں۔ مسلمان بھی ابتداءً اسی طمع میں گرفتار ہوئے۔ خلافت سے محرومی کے بعد خالد بن یزید اور ان کے رفیقِ کار جابر بن حیان انہی تحریروں میں پڑے رہے جو طغرائی کی تحقیق میں فن سے تعلق نہیں رکھتے۔ ایک محقق زیبق کی تصعید میں سرگرم ہے، تلوین میں انہماک رکھتا ہے، باایں ہمہ کوشش بے نتیجہ رہتی ہے، اس لئے کہ نباتات و معادن و جمادات کے حقیقی علم سے عملاً آشنا نہیں ۔

مسلمانوں نے یہ کمزوری محسوس کی، مہوّسی کے زینے پر چڑھ کے کیمیا کے بامِ حکمت پر چڑھ گئے ۔

یہ کتاب انہی حقائق پر حاوی ہے ۔

’طغرائی نے اپنے تمام پیشرووں سے الگ ہو کے ابوبکر رازی کو اپنا مدار علیہ مانا ہے کہ اس علمی خلافت کے ——— فی زعمہ ——— وہی بانی بلافصل تھے‘۔

رسالۂ حرّ: فلاسفۂ اسلام کے سب سے بڑے پیشوا الشیخ بوعلی سینا کی یہ کتاب عربی زبان میں تھی جس کا یہ فارسی ترجمہ عہدِ سلاجقہ کی یادگار ہے ۔ اسی عہد کی زبان ہے اور وہی اندازِ بیان ہے، کائنات کس طرح وجود میں آئی، نیستی سے ہستی کیسے ہوئی، معدوم سے موجود کی کیا سبیل نکلی، کوئی شئے اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب اس کے لئے کوئی علت و سبب موجود ہو، یہ علت اس شئے پر مقدم ہوتی ہے، وجود عدم سے نکلا تو کیونکر نکلا، علتِ وجود کو وجود سے پہلے موجود ہونا چاہیئے حال آں کہ وجود سے پہلے آپ عدم کے قائل ہیں ۔ یہ مباحث نمونۂ کتاب ہیں ۔ ان میں غور کرنے والے پر طبیعیین و دہریین کے مذہب کا فساد خود بخود واضح ہو جائے گا ۔ اور ماننا پڑے گا کہ عدم اور وجود سے پہلے ایک واجب الوجود بھی ہے، تعالیٰ شانہ کہ وہی اس کائنات کا سبب بھی ہے اور مسبّب بھی ۔

رسالۂ طیر: یہ بھی شیخ کی عربی تالیف کا فارسی ترجمہ ہے جو سلجوقیوں کے عہد میں ہوا تھا ۔ اس میں انسان کی تخلیق سے بحث کی ہے کہ ایک نوع کے ہوتے ہوئے ان میں گوناگوں اختلاف کیوں ہے؟ اختلاف کی نہایت نازک علمی تحلیل کر کے دکھایا ہے کہ ہر انسان میں ترقی کی استعداد موجود ہے، یہ استعداد بالقوہ ہے، ممارست سے اگر اس کو فعل میں لایا جائے تو کون سے مدارج ارتقا ہیں جن پر انسان فائز نہیں ہو سکتا ۔

تحفۃ الحبیب: اصفہان کے خوش بیان، شعور و سخن سنج میرزا فخری کی یہ کتاب زبان آوری کی دنیا میں پروازِ خیال کا ایک عجیب مرقع ہے ۔ مثلاً سعدی نے، کہ ملاحتِ کلام میں شور انگیزی جیسے پہلو انہی کے حصے میں آئی، ایک غزل لکھی، خسرو بھی اسی زمین کو شاداب کرتے ہیں اور معاملہ بندی میں جسے آن دنوں وقوعہ گوئی کہتے تھے، ایک نئی شان دکھلاتے ہیں۔ حسنؔ اس کو روانی و سلاست کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ سلمان ساوجی، خواجو کرمانی، عماد فقیہ کی شکر خائی اور حلاوت انگیز طبع آزمائی سے یہی زمینِ سخن شکرستان بن جاتی ہے ۔ پھر حافظ آتے ہیں اور خدا داد قبولِ خاطر سے اسی زمین کو آسمان کے ہمدوش بنا دیتے ہیں ۔ پھر وحشی، ہلالی، کاتبی و نزاری و جامی اپنے اپنے طرز میں دادِ سخن دیتے ہیں ۔

ایک ایک زمین میں مشاہیر شعرا کی طبع آزمائی کا یہ حیرت خیز نگارخانۂ معنی اہلِ نظر کے ذہنی شگفتگی کا انبار در انبار سامان رکھتا ہے جس سے ادبِ فارسی میں عہد بعہد حسنِ تخیل و لطفِ ذوق و عروجِ فکر کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے کہ فارسی کی حد تک ایران و ہندوستان آج تک اس سے نا آشنا ہے ۔

اسی سلسلے میں دو مضمونوں کے اقتباس، ادب میں تاریخ اور تاریخ میں ادب کی شان دکھاتے ہیں ۔

(۱) ساتویں صدی ہجری کے آخری ایام ہیں، "بغداد" کا تمدن سیلابِ تاتاری نذر ہو چکا ہے ۔ ہولاکو کا جانشین "اباقا" سریر آرائے سطوت ہے ۔ "تبریز" جو "زبیدہ خاتون" کی یادگار تھا آج اس میں تاتاری لشکر کی چھاؤنی ہے ۔ روم و عراق و ایران و توران و ماوراء النہر جتنے اسلامی ممالک تھے سب کے سب کفر کے نرغے میں آ چکے ہیں ۔ مصر و شام کی ایک بچی بچائی اسلامی سلطنت رہ گئی ہے جہاں جا کر خلافت نے پناہ لی ہے ۔ مگر اب اس پر بھی چڑھائی کے سامان ہو رہے ہیں اسی ضرورت سے خود "اباقا" "تبریز" میں لشکر زن ہے ۔ اور صاحبِ دیوان (وزیر اعظم) خواجہ شمس الدین محمد پر تاکید ہو رہی ہے کہ "مغولستان" سے لے کر ایران تک کی تمام فوجیں یکجا کر لی جائیں پوری قوت کے ساتھ جامع "فسطاط" کے میناروں پر حملہ ہو سکے ۔"

(۲) ہجرت نبوی کا چھیاسٹھواں سال ہے، سیدنا حسین بن علی علیہما السلام دشتِ کربلا میں شہید ہو چکے ہیں، جوشِ انتقام نے عراق کو ایک شعلۂ جوالہ بنا رکھا ہے ۔ یزید و آلِ یزید پر عام بیزاری مزید ہے، توابین کا تو خاتمہ ہو چکا ہے مگر توبہ تائی اب بھی برپا ہے ۔ اسی حالت میں قبیلۂ ثقیف کا ایک جوان مرد اٹھتا ہے اور سب کو بٹھا دیتا ہے ۔ اس کی کنیت ابو اسحاق ہے ۔ پہلے خارجی رہ چکا ہے ۔ اس میں کامیابی موہوم نظر آئی تو اب زمرۂ طرف داران اہلِ بیت میں اپنے تئیں منسلک کرنا چاہتا ہے، یار ہیں ہمت ہے اس سے کھٹکتے رہتے ہیں کہ سیدنا حسن مجتبیٰ کے عہد میں اس کی کاٹ پھانس دیکھ چکے ہیں، اب نہ جانے یہ کانٹا کیا گل کھلائے، یہ فتنہ کیا قیامت ڈھائے ۔"

اُردو میں شعر کم کہتے تھے، عہدِ شباب کی ایک غزل ہے :-

چشمِ پرفن کا ہے گردش میں نظام اے ساقی — گردشِ ساغر و مینا کو سلام اے ساقی
سطوتِ جام کی جاتی رہی عالمگیری — اب کہاں ولولۂ شربِ مدام اے ساقی
شیشہ ہے منتظرِ جلوۂ خورشیدِ ازل — مجھ کو درکار نہیں ماہِ تمام اے ساقی
کعبۂ دل میں بتوں کو ہے خدائی کا غرور — لب تک آتا ہے پھر اللہ کا نام اے ساقی
پرتوِ صبح بنا گوش سے ہو گی کافور — گیسوئے ہند جگر خوار کی شام اے ساقی
تیغِ ابرو سے مے آشام کہیں ڈرتے ہیں — دمِ شمشیر ہے رندوں کا مقام اے ساقی

مئے گل رنگِ شہادت کا چلے بزم میں دور
آ چلی ساعتِ افطارِ صیام اے ساقی

فارسی میں یوں دادِ سخن دیتے ہیں :-

جبین زہد ز افتادگی نشد روشن　　ہزار سجدہ کند نور بر جبیں نرسد

حرمانِ تو ز ہمت کوتاہ بینِ تست　　ہرگز در کریم بکافر نبستہ اند

اہل بینش ہمہ از آتشِ دوزخ بہ اماں　　ہر کہ در خلد در آید نہ برندش بجحیم

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری　　عجب این ست کہ بیمار تو بیمار تر ست

فریبِ رنگ و نمودے گہر شناس مخور　　حباب وار نمودارئ گہر بخشند
عجب مدار اگر مرغ حسن نہ پرورد　　نداده ہمت پرواز بال و پر بخشند
جہاں لت نہ جہانے وگر پدید آید　　گلیم فقر ز پا بند و تاج زر بخشند

عالم اور علامہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات انسان ہونا ہے۔ عمادی صاحب جتنے بڑے عالم اور علامہ تھے اس سے زیادہ اعلیٰ قسم کے انسان تھے۔ بلند نگاہ اور کریم النفس، قلندر صفت اور قلندر سیرت۔ ان کی زندگی شرافت نفس کے امتزاج کی نمود تھی۔

ظفر علی خاں

شورش کاشمیری

جدید پود کے لئے ظفر علی خاں ایک بھولی بسری کہانی ہیں۔ آج سے پچیس تیس برس پہلے ان کا طوطی بولتا تھا —— وہ ہندوستان کے پنجابی رہنماؤں میں سر فہرست، مجموعۂ اضداد اور جامع صفات تھے —— اب تو شیر کو رکنا سمجھیں لیکن جب جوان تھے، آگ تھے۔ ایک زندگی میں کئی زندگیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ ادیب، خطیب، صحافی، شاعر اور سیاسی —— آج بظاہر وہ ایک گم شدہ ورق ہیں اور لیل و نہار کی بہت سی گردشوں نے ان کے آفتاب کو گہنا دیا ہے، لیکن ایک زمانے میں ان کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ حتیٰ کہ ان کا وجود ملی جدوجہد کی ایک تاریخ بنتا گیا۔ ہر چند اس تاریخ میں ایک عجیب سا تضاد ملتا ہے اور ظفر علی خاں اس تضاد کا ایک شدید مظہر ہیں۔ —— لیکن اس تضاد میں بھی اتنی دلکشی ہے کہ زمانے کے احوال و ظروف سے ملا کر ان کی شخصیت کو دیکھیں تو ان میں نہ صرف ادب کی فرزانگی اور سیاست کی دیوانگی نظر آتی ہے، بلکہ وہ ایک عجیب و غریب پیکر دکھائی دیتے ہیں۔ —— ان کا ادب ان کی زندگی سے متاثر ہے اور ان کی زندگی ان کی سیاست کا عکس اور ان دونوں کے امتزاج سے جو صورت بنتی ہے، اس سے ایک ایسا وجود ابھرتا ہے جس میں صورت گری تھوڑی، سنگتراشی زیادہ ہے —— ظفر علی خاں سراپا ہنگامہ تھے اور ظاہر ہے کہ ہنگامے میں حکایتیں شاذ اور شکایتیں وافر ہوتی ہیں۔ ظفر علی خاں کی شخصیت سے ہم عصروں اور ان کے جانشینوں نے جو تغافل برتا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظفر علی خاں نے گرد و پیش کی تمثالیں ڈھالنے میں زبان اور قلم کو ہمیشہ گرز البرز شکن بنائے رکھا۔ نتیجہ معلوم کہ —— آج وہ ماضی کی تمام ہماہمی کے باوصف دود چراغ محفل نظر آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی ادبی یا سیاسی نقشہ ایسا نہیں جس میں ان کا خط نہ ہو —— اور پھر محض خط ہی نہیں رنگ بھی ہیں۔ کہیں مدھم، کہیں شوخ۔ انھیں ان خطوں اور رنگوں سے علیحدہ کر کے پرکھنا زیادتی ہے وہ جو کچھ بھی ہیں اپنے ماحول کی صدا ہیں —— اور اسی سے ان کی سیرت عبارت ہے —— وہ ایک ایسی تصویر ہیں جس میں بوقلمونی ہی بوقلمونی ہے۔

اب سے چالیس پچاس برس پہلے پنجاب سپاہیوں کی کھلی منڈی تھا۔ صدیوں لشکریوں کی گزرگاہ رہا۔ برطانیہ نے پنجاب کو حیطۂ اختیار میں لیا تو یہ ذہنیت اور پختہ ہو گئی —— حتیٰ کہ تمام صوبہ برطانوی مقاصد کی جولانگاہ بن گیا —— اس سارے عرصہ میں صوبے کی اصل پیداوار سپاہی ہی رہے یا پھر ظفر علی خاں کی مخصوص سیاسی اصطلاح میں کاسہ لیسان سرمدی ——

جن کا طغرائے امتیاز "وفاداری بشرطِ استواری" تھا۔ ادھر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں سیاسی شعور کی کرنیں پھوٹ چکی تھیں، لیکن پنجاب کا مطلع بدستور تاریک تھا۔ بعض سمتوں میں چند گونجدار آوازیں سنی جاتی تھیں لیکن ان کا دائرہ نہایت مختصر تھا ـــــ ایک انجمن تھی اور اس میں چند چراغ ـــــ بالفاظِ دیگر ایک طبقاتی مذاق پیدا ہو رہا تھا جس سے عامۃ الناس بہمہ وجوہ محروم تھے۔ ظفر علی خاں نے ایکا ایکی اس جمود میں نعرۂ رستخیز بلند کیا۔ ادھر لاہور میں کئی ادبی محفلیں جم چکی تھیں۔ ان کے بانی محمد حسین آزاد تھے۔ عبدالقادر نے مخزن نکالا تو ایک بزم آراستہ ہو گئی۔ ادھر صحافت میں دو چار اخبار پیش رو تھے لیکن ظفر علی خان جو شبلی، حالی، داغ، محسن الملک اور اس عہد کے دوسرے اکابر کی صحبتوں سے فیض یاب ہو چکے اور حیدرآباد کی خوشگوار ادبی فضا میں رہ چکے تھے، ایک نیا رنگ لے کر اٹھے ـــــ وہ کسی روایت کے تابع نہیں تھے لیکن انھوں نے بزم کو رزم میں ڈھالا۔ "زمیندار" جو ان کے والد کی امانت تھا، اس کی ہیئت بدل ڈالی۔ وزیرآباد سے لاہور منتقل ہو گئے اور یہیں سے "زمیندار" نکالنا شروع کیا۔ ان کا ادبی مذاق بہت منجھ چکا تھا۔ علی گڑھ کی تعلیم، حیدرآباد کی صحبتیں، سرسید، شبلی اور حالی کا تلطف ـــــ ان سے ایک منفرد ظفر علی خان نکلا ـــــ اردو جو بمشکل پنجاب کے چند گھرانوں میں راہ پیدا کر سکی تھی، اب عوام کے مزاج میں دخیل ہونے لگی۔ پڑھے لکھوں کا تناسب چنداں حقیر ہی تھا ـــــ لیکن قارئین کی قلت نے سامعین کی کثرت پیدا کر دی اور دیکھتی آنکھوں اس سرے سے اُس سرے تک ظفر علی کا نام ہو گیا جس کا مطلب تھا کہ ظفر علی خان کے رشحاتِ قلم نوکِ زبان ہوتے گئے ـــــ اتفاقات بڑی چیز ہیں۔ ادھر ظفر علی خان نے زمیندار کی ادارت سنبھالی ادھر بلقان میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ پہلا سیاسی موڑ تھا جو مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کے بعد مڑنا پڑا اور ان میں اپنے پاؤں پر اٹھنے کی قدرے ہمت پیدا ہوئی ـــــ ظفر علی خان ادبی اعتبار سے سونا پہلے ہی تھے، اس سیاسی اتفاق نے سہاگہ کا کام کیا اور چند ہی دنوں میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہو چکا یا بعض روایتوں کے مطابق ہو رہا تھا۔ اپنے نہ سہی کہ ان کی مصلحتیں بسا اوقات غبار آلود ہوتی ہیں، لیکن پرایوں کا خیال ہے کہ اس دور کے اسلامی جذبات کی مظہر چار شخصیتیں ہیں۔ ابوالکلام، اقبال، محمد علی اور ظفر علی خان۔ ان چاروں میں بہت سی خصوصیتیں مشترک اور بیشتر میں تضاد تھا۔ لیکن ان کے اشتراک اور تضاد دونوں میں حیاتِ ملی کی روح کارفرما تھی۔ ابوالکلام علم و عمل کا مرقع تھے لیکن وہ جس مقام سے پکارتے رہے، وہاں انھیں یہی احساس رہا کہ وہ اپنی ہی قوم میں ایک اجنبی آواز اور اپنے ہی ملک میں ایک غریب الدیار ہیں ـــــ اقبال کی فکر میں ان کا عمل تھا ـــــ محمد علی ایک نصب العین تھے جس کا امتیاز تھا ـــــ "کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست" ـــــ اور ظفر علی خان ـــــ "من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را" کی صدائے بازگشت . . . . .

اس وقت مولانا کی عمر چوراسی برس سے کچھ اوپر ہے اور سنِ پیدائش ۱۸۷۳ء، ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ وزیرآباد مشن اسکول میں داخلہ لیا، پٹیالہ سے میٹرک کیا اور علی گڑھ سے ۱۸۹۲ء میں ایف اے کی سند لی۔ والد کشمیر میں ڈاک خانہ کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ ان کے بلاوے پر سری نگر چلے گئے اور اسی محکمہ میں ملازمت کر لی۔ وہاں اپنے ایک افسر سے کچھ بڑے، ان کی کچھ ٹھنی اور ملازمت سے دست کش ہو کر مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ لوٹ گئے۔ فرسٹ ڈویژن میں بی اے کیا۔ نواب محسن الملک کو خواجہ غلام الثقلین کے استعفا دینے کی وجہ سے پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ آپ نے اخبار میں اشتہار دیکھا، درخواست گذار دیا ـــــ اور خواجہ صاحب:

کی جگہ ملازم ہوگئے۔ وہاں تھوڑا عرصہ قیام کیا۔ پھر محسن الملک سے سفارشی خط لے کر حیدر آباد چلے گئے۔ نواب افسر جنگ سے ملے انھوں نے فوج میں ملازم رکھ لیا۔ وہاں کسی نہ کسی طرح فوج سے دار الترجمہ میں چلے گئے۔ چند ہی دنوں میں اسسٹنٹ رجسٹرار ہوگئے۔ میر عثمان علی خاں کے اتالیق بنے۔ عزیز مرزا ہوم سیکرٹری تھے۔ ان کی توجہ سے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچے۔ ان کا انتقال ہوگیا تو نواب سربلند جنگ ان کی جگہ ہوم سیکرٹری ہوگئے۔ وہ شدت سے ترش رو اور بڑے چڑچڑے تھے۔ مولانا کی جودت طبع کو مضمون ہاتھ آگیا۔ محمد رفیع سودا نہیں تھے کہ غنچہ سے کہتے قلمدان لاؤ ـــــ قلم اٹھایا اور ہجو لکھ ماری۔ سربلند جنگ کو بھی خبر ہوئی۔ مولانا چھٹی لے کر میر محفوظ علی بدایونی کے ہاں بڑودہ چلے گئے۔ ادھر وہ بھی ملازمت سے بیزار تھے۔ دونوں نے بمبئی میں امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھولنے کی ٹھانی اور استعفا دے کر رخصت ہوگئے۔ وہاں مکان کرایہ پر لے کر اورینٹل کمرشل ایجنسی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا ـــــ جاپان سے ریشم اور افریقہ سے ہاتھی دانت کا سامان درآمد کیا۔ مگر یہ منڈھے نہ چڑھی۔ دونوں ادیب تھے اور یہ کاروبار تھا۔ عزیز مرزا تو دل شکستہ ہوکر بدایوں چلے گئے لیکن آپ نے وطن لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ عزیز مرزا دوبارہ ہوم سیکرٹری ہوگئے۔ انھوں نے تار دے کر بلوا بھیجا۔ بمبئی سے حیدر آباد پہنچے، لیجسلیٹو کونسل کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ یہاں آپ نے لارڈ کرزن کی تالیف خیابان فارسی کا اردو میں ترجمہ کیا اور شہرت پائی۔ پنجاب یونیورسٹی نے پانچ سو روپئے انعام میں دئیے جو ایک پنجابی نژاد کو کسی اردو ترجمے پر پہلا انعام تھا۔ خود نظام نے ازراہ قدر شناسی ہزار روپے مرحمت فرمائے ـــــ داغ، میر محبوب علی خاں کے استاد اور مقرب تھے۔ انھوں نے تقریظ لکھی جس میں صحت زبان کی بے حد تعریف کی ـــــ احسن مارہروی کہتے ہیں کہ داغ کے قلم سے نثر کا جو سب سے بڑا ٹکڑا نکلا، وہ یہی تقریظ ہے ـــــ اس سے پہلے مولانا سیر ظلمات، فسانہ لندن اور سنہری ٹکوٹا کا ترجمہ کر چکے تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کا کہنا ہے کہ ظفر علی خاں فسانہ لندن کے بجائے کسی علمی کتاب کا ترجمہ کرتے تو ان کی خدمات علمی میں شمار ہوتا۔ معرکہ مذہب و سائنس کے متعلق ان کی رائے ہے کہ ایک مفید دینی خدمت ہے۔ غرضیکہ ان تراجم سے مولانا کی ادبی قابلیت کا شہرہ ہوگیا۔ انھی دنوں موسیٰ ندی میں طغیانی آگئی جس نے تمام ریاست کو ہلا ڈالا اور متاثرہ لوگوں کی امداد کے لئے تحریک چل نکلی۔ مولانا نے اس پر طولانی نظم لکھی۔ اس سے ادبی و شعری حلقوں میں ان کا نام روشن ہوگیا۔ اس نظم کو موضوع کے اعتبار سے اولیت کا درجہ ملا۔ انھی دنوں دکن ریویو جاری کیا۔ جنگ روس و جاپان کے نام سے ایک منظوم ڈرامہ لکھا۔ گو اس کی فنی حیثیت کچھ بھی نہیں، لیکن ادبی اعتبار سے قادر الکلامی کا نمونہ ہے ـــــ

ایک روز نواب افسر جنگ فوج کے جوانوں کی نیزہ بازی دیکھ رہے تھے۔ آپ قریب ہی کھڑے تھے ـــــ جی مچلا تو نواب افسر جنگ سے عرض کی ـــ

تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من
پیادہ می روم و ہمرہان سوار انند

افسر جنگ مسکرائے۔ نیزہ موجود تھا، گھوڑا طلب کیا ـــــ فرمایا :

ہمیں میدان و ہمیں گوئے است

مولانا تامل کئے بغیر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گئے اور آنِ واحد میں میخ اکھاڑ لائے ـــــ ایک دن داغ کے ہاں شریک مجلس تھے

کہ محلے میں شور ہوا۔ کوئی بچہ کنوئیں میں گر گیا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، لنگوٹ باندھ کنوئیں میں اتر گئے اور بچے کو نکال باہر کیا۔

حیدرآباد میں کسی یورپین تھیٹریکل کمپنی نے ڈرامہ کیا جس میں نیم برہنہ عورتوں کا رقص بھی تھا۔ ریاست کی طرف سے کمپنی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اٹھے تو اظہار تبریک کے بجائے اظہار ملامت کر ڈالا۔ ریزیڈنٹ کو ناگوار گذرا، دل میں گرہ باندھ لی اور آخر حیدرآباد سے نکلنا پڑا ——— والد حیات تھے۔ یہاں آکر زمیندار میں شریک ہوگئے لیکن ایک آدھ برس ہی میں دوبارہ طلبی ہوگئی۔ سرمائیکل اوڈوائر حیدرآباد میں ریزیڈنٹ رہ چکے تھے اور اب پنجاب میں گورنر تھے۔ ان کے اشارہ پر خواجہ حسن نظامی نے چغلی کھائی اور حیدرآباد سے دوبارہ نکالے گئے۔ حتیٰ کہ پنشن بھی ضبط ہوئی۔ الزام یہ تھا کہ نظام حیدرآباد کو پان اسلامزم کی راہ پر لانے اور انگریزوں کے خلاف اکسانے ہیں۔ لاہور پہنچے تو والد بستر مرگ پر تھے یا غالباً اللہ کو پیارے ہوچکے تھے۔ زمیندار کو وزیرآباد سے اٹھایا اور لاہور چلے آئے۔ بلقان کی جنگ نے مہمیز کا کام کیا۔ اخبار کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ سرمائیکل گھات میں تھا۔ ع

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

زمیندار کا گلا گھونٹ دیا گیا اور مولانا کرم آباد میں نظر بند کئے گئے۔ وہاں سے ستارہ صبح نکالا لیکن تابہ کے؟ بالآخر اس کی شہ رگ بھی کٹ گئی۔ ان لوگوں کے سپرد احتساب کا کام تھا وہ ادبی استعاروں اور شعری کنایوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک زمانہ میں زمیندار کو محض اس لئے ایک بڑی رقم کی ضبطی سے دوچار ہونا پڑا کہ اس میں کسی مقالہ کا سرعنوان یہ شعر تھا ؎

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

لاہور کے ایک سرکاری قبیلے نے مخبری کی اور زمیندار موت کے گھاٹ اتر گیا۔ اب جو ضبطیوں، قرقیوں اور بندشوں کا سلسلہ چلا تو سیلاب تھما نہیں ——— تحریک خلافت میں یہ طغیانی اور تیز ہوگئی تھی کہ حضرت کی ایک تقریر میں ماخوذ ہوکر پانچ سال کے لئے قید ہوگئے اور پھر ۱۹۳۶ء تک کبھی رہائی کبھی اسیری۔ آپ کی مجموعی قید جو آپ نے مختلف وقتوں میں کاٹی، تقریباً بارہ برس ہوتی ہے۔ ہر تحریک میں حصہ لیا اور ہمیشہ پیش پیش رہے لیکن ہر تنظیم میں شامل ہوکر اس سے الگ ہی رہے ——— کانگریس میں گئے تو برہنہ تلوار، اس سے نکلے تو ذوالفقار ——— مجلس خلافت کی روح رواں تھے لیکن کنارہ کشی اختیار کی تو اپنے ہی ہمعصروں سے دو دو ہاتھ کئے۔ احرار کی عمارت اٹھائی لیکن شہید گنج کی کدال سے گرا بھی دی۔ اتحاد ملت کی بنیاد رکھی لیکن جلد ہی ڈھا دی۔ لیگ میں تھک ہار کر شریک ہوگئے اور اس کو گوشۂ عافیت سمجھا۔ مگر طبیعت کا انداز جوں کا توں رہا۔ مولانا ابوالکلام نے ایک دفعہ آپ کی انہی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

> ”ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں چلانا چاہو تو ظفر علی خان اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بسرعت تمام یہ قلعہ بنا ڈالیں گے، لیکن جب قلعہ بن جائے تو ان کو فوراً باہر کر دو، کیونکہ وہ پھر اسی قلعے کو ڈھا دیں گے۔“

الغرض ظفر علی خان انہی حادثوں کی مخلوق اور یہ حادثے ان کے سراپا کو محیط ہیں۔ بظاہر یہ ان کی زندگی کا سیاسی پہلو

ہے لیکن حقیقتاً ادبی ہے کیونکہ ان کا ادب ان کی سیاست کی تخلیق نہیں۔ ان کی سیاست ان کے ادب کی پیداوار ہے۔ ان کی سیاسی زندگی میں جو چمک ہے، وہ ان کے ادب کی وجہ سے ہے۔ ظفر علی خاں میں سے ادب کو حذف کر دیں تو ایک فرد رہ جاتا اور شخصیت اوجھل ہو جاتی ہے۔ بعض ثقہ لوگوں کی رائے ہے کہ ظفر علی خاں کا ادب ان کی سیاست کے ہاتھوں پٹ گیا۔ وہ سیاست کے ہتھے نہ چڑھتے تو ادبی اعتبار سے اقبال اور ابوالکلام کی صف میں ہوتے اور ہنگامی ادب کی جگہ تخلیقی ادب پیدا کرتے اس کے برعکس دوسرا خیال یہ ہے کہ یوں ہوتا اور ووں ہوتا کی بحث سرے سے غلط ہے۔ ظفر علی خاں پیکر ہی اس امتزاج سے بنا ہے ——— اگر ادب کا کوئی مقصد ہے تو ظفر علی خاں کے ادب نے بوجوہ احسن اس مقصد کو پورا کیا ہے۔ بلکہ ان لوگوں سے زیادہ مقصد کی خدمت کی ہے جن کے ہاں ادب محض ایک سماجی نظام کی اکھاڑ پچھاڑ کے لئے آلۂ تخریب ہے۔ میتھیو آرنلڈ کے الفاظ میں ادب، تنقیدِ حیات، تفسیرِ حیات اور تعمیرِ حیات ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود حیات کیا ہے؟ اس کا موقف کیا ہے؟ اور اس موقف تک پہنچنے کے لئے وہ کون سے اصول ہیں جن پر زندگی کا نظم قائم ہے ——— ظاہر ہے کہ زندگی ایک فرض ہے اور اس فرض کے کچھ مقاصد ہیں۔ ان مقاصد کے بارے میں جہاں تک احوال و ظروف کا تعلق ہے، ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ ہر دائرہ انسانی میں حرکت و عمل کے خطوط ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ظفر علی خاں نے جس ماحول میں قدم رکھا، وہ مسلمانوں کے لئے حد درجہ اجنبی تھا۔ تمام عالم اسلامی کے مسلمان صنعتی یورپ کے ہاتھوں پٹ رہے تھے ——— ابھی ایسے لوگ زندہ تھے جنھوں نے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے محو ہو جانے کا سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا جن کے لئے یہ غم تازہ تھا۔ ادھر ملک میں قومی تحریک نے بال و پر پیدا کر لئے اور حریت کا احساس کروٹیں لینے لگا تھا۔ ظفر علی خاں نے ایک مردِ کارزار کی راہ اختیار کی ——— اب تک رمز و کنایہ اور استعارہ و تشبیہ میں باتیں کہی جاتی تھیں۔ چنانچہ غالب اس مقام پر ایک آہِ سرد نظر آتے ہیں۔ ان کے خوشہ چینوں میں حالی نے نالۂ درد بلند کیا۔ شبلی صفِ ماتم میں شریک تو رہے لیکن آخر تاریخ کی راہ پر نکل گئے۔ اکبر نے تنقید اور تطہیر کو اختیار کیا۔ ان کے ہاں آنسوؤں اور قہقہوں کا امتزاج ہے۔ اقبال ایشیائی کارل مارکس کی حیثیت سے آگے بڑھے اور وہ قومی سے زیادہ بین الاقوامی نظر آتے ہیں لیکن ان کے مخاطب مسلمان ہی تھے۔

ظفر علی خاں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ادب کو عوام کے لئے ڈھالا اور اس کی عزت بھی قائم رکھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے جذبات کا سفیر بنا لیا۔ جو باتیں اب تک وضعداری سے کہی جاتی تھیں وہ کھل کر سامنے آ گئیں ——— ظاہری رکھ رکھاؤ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ مرحلہ یہ تھا کہ جن غیر ملکوں کے قبضہ میں ہندوستان ہے ان کے خوف اور جبر کو ذہنوں سے خارج کیا جائے ——— اور یہ کسی قومی تحریک کا ابتدائی شیوہ ہوتا ہے۔ ظفر علی خاں نے غیر ملکی حکومت پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ جوں جوں قومی تحریک پھیلتی گئی، توں توں ان کا قلم تیز ہوتا گیا۔ انھوں نے برطانوی نظم و نسق اور اس کے کل پرزوں ہی کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا بلکہ ان کے ہندوستانی معاونوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے اس حملے کی لپیٹ میں سبھی آ گئے ——— افراد، مجالس، عقیدے، نظریات، تحریکیں اور اپنے، پرائے ——— ان کی مدارات کے لئے ایسی اصطلاحیں اور ترکیبیں وضع کیں کہ سبھی داد دے اٹھے ان میں تلخیاں بھی تھیں اور کچوکے بھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا ——— عوام ہمیشہ جذبات پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ شاعری بجائے خود جذبات کی پیداوار ہے اور صحافت کی بنیاد ہی جذبہ پر ہے۔ ادھر قومی تحریک میں جذبات کا بلوغ نفرت اور محبت سے ہوتا ہے۔ لوگ

جذبات ہی کے بل پر نفرت کرتے اور جذبات ہی کے ذریعہ محبت کرتے ہیں۔ ان تمام محرکات نے ظفر علی خان کے قلم کا اسلوب متعین کیا اور نظم و نثر کے میدان میں یکہ تاز ہو گئے۔ پھر ان عوامل سے صحافتی شاعری پیدا ہوئی جس میں قصیدہ تھا یا ہجو —— اور ظفر علی خان کا سارا کردار اس میں جھلکتا ہے۔ ان کے ممدوحین کی فہرست مختصر لیکن معتوبین کی فہرست طویل ہے۔ جن ہستیوں اور عقیدوں کو انھوں نے خراج ادا کیا ان میں حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم تو مستقلاً ہیں۔ اس باب میں انھوں نے سنگلاخ سے سنگلاخ زمینیں منتخب کیں اور شگفتہ سے شگفتہ شعر نکالے۔ ان کے نعتیہ کلام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے وہ دوسرے شعرا کی طرح غلو سے کام نہیں لیتے بلکہ حضورؐ کی سیرت کا نقشہ اور ان کے محاسن کی تصویر اس کمال سے کھینچتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے سیرت النبیؐ چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے ایک دفعہ آپ کے قلمی چہرے میں لکھا تھا کہ قیامت کے روز اپنی نعتوں کے باعث بخشے جائیں گے۔ خود ظفر علی خان اپنے اس کلام کو توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں اسلام اور تاریخ اسلام سے والہانہ عقیدت ہے —— بعض مسلمان بادشاہوں کی تعریف میں انھوں نے بہت کچھ لکھا اور ان کے نقشِ قدم پہ چلنے کی مسلمانوں کو تلقین کی ہے —— مثلاً صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، اورنگ زیب اور اس زمانہ میں ابن سعود، امان اللہ خان، مصطفےٰ کمال ان کے ممدوحین تھے۔ بعض تحریکوں کی تائید و اعانت کے لئے جذبات کی شیفتگی کے ساتھ قلم اُٹھایا۔ مثلاً کانگرس، خلافت، احرار، اکالی، گوردوارہ، تحریک مسلم لیگ، اتحاد ملت وغیرہ۔ اسی طرح بیشتر ہم سفر رہنماؤں اور ہم نوا عزیزوں کو بھی ہدیۂ سپاس پیش کیا۔ لیکن ان رہنماؤں، عزیزوں اور تحریکوں کے معاملہ میں ان کے ہاں دونوں طرح کے جذبات عام ہیں جس کی تعریف کی اس کی ہجو بھی لکھی، اور جس کی ہجو لکھی اس کی ستائش بھی کی۔ مولانا کے تینوں مجموعے "بہارستان" "نگارستان" اور "چمنستان" اس سے لبریز ہیں۔ بلکہ ان واقعات کی دستاویز —— حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا کلام پوری نصف صدی کے سیاسی واقعات کی منظوم تاریخ ہے۔ ایک مؤرخ اس میں واقعات اور حالات کی بہت سی گم شدہ کڑیاں تلاش کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا کے تین مجموعے اور تھے۔ پہلا "درج معانی" —— یہ اصلاً گورکھپور خلافت کانفرنس کا خطبہ تھا۔ اسی کے آخر میں چند نظمیں درج تھیں جنھیں بہارستان میں شامل کر لیا گیا۔ دوسرا "حبسیات" —— یہ مولانا کے زندانی کلام کا مجموعہ ہے جو آپ نے پانچ سالہ قید کے دوران میں منٹگمری سنٹرل جیل میں سپردِ قلم کیا۔ تیسرا "ارمغانِ قادیان" جس میں مقالات کے علاوہ وہ نظمیں تھیں جو آپ نے قادیانی فرقہ پر لکھیں اور اب ان کے دوسرے مجموعوں میں ملتی ہیں۔

جہاں تک معتوبین کا سوال ہے، ان کا کوئی معاصر اور جماعت ان کے قلم سے نہیں بچی۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال، قائدِ اعظم، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال بھی ان کے قلم کی زد میں آچکے ہیں۔ اور جماعتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ یہی حال عقیدوں اور نظریوں کا ہے۔ اس طنز بلکہ تضحیک میں ان کا جواب نہیں۔ اس میدان میں انھوں نے اچھے اچھوں کی دستارِ فضیلت کے پیچ کھولے اور بڑے بڑوں کو چاروں شانے چت کیا ہے۔

مولانا سے پہلے ہجو کا انداز شخصی یا ذاتی تھا۔ جس کی بہترین مثالیں سودا، انشا اور مصحفی کے ہاں ملتی ہیں۔ یا پھر اجتماعی طنز جس کے موجد و خاتم اکبر الٰہ آبادی ہیں۔ ظفر علی خان نے سیاسیات میں ہجو کو استعمال کیا اور اس کی بنا قومی و ملکی مقاصد پہ رکھی

گو ان میں ذاتیات کا زہر بغایت ہے اور یہ ایک بشری تقاضا ہے۔ لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود اس میں جو جذبہ کارفرما ہے، وہ اجتماعی ہے۔ ان ہجووں میں جن کا اصل نشانہ برطانوی ڈپلومیسی، ہندو بنیا پن، قادیانی نبوت اور اپنوں کی کاسہ لیسی ہے کہیں کہیں دشنام بھی ہے۔ لیکن تلخ نوائی کے باوجود بعض اچھوتی تشبیہیں، دلچسپ استعارے، عمدہ ترکیبیں، اور دلآویز کنایے بھی ملتے ہیں۔ گو ایک قاری ان کی درشتی کو محسوس کرتا ہے اور بعض ناک بھوں بھی چڑھاتے ہیں۔ لیکن بیشتر ان اشعار پر سر دھنتے اور صاد کرتے ہیں۔

اس قدرتِ کلام پر مولانا نے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ زمیندار ان کے ایامِ صحت تک ایک ادارہ رہا —— کئی آئے اور کئی گئے —— عبداللہ العمادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد میکش اور نصر اللہ خان عزیز، یہ سب اپنے اپنے وقت پر زمیندار کی وجاہت کے ستون رہے —— بعض نے علیحدگی اختیار کی تو شعر و سخن اور تضحیک و طعن کا ڈول ڈالا، لیکن مولانا کے شباب کا زمانہ تھا، جو سامنے آیا مات کھا گیا —— !

عجیب زمانہ تھا مسلمان رہنما تحریکِ خلافت کے نتیجوں سے منتشر ہو کر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے —— مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان اور خواجہ حسن نظامی میں بڑے بڑے قلمی معرکے ہو چکے تھے۔ روزنامہ "انقلاب" مرحوم ان معرکوں کی دلآویز فصل تھا —— مولانا نے انقلاب پر چوٹ کی ——

مجموعہ انقلاب کا اقبال و نون میں

انھیں شبہ تھا کہ انقلاب کے اجرا میں علامہ اقبال اور ملک فیروز خان نون کا ہاتھ ہے —— بس اس پر ایک معرکہ گرم ہو گیا —— انقلاب کے ہم نواؤں میں نیاز مندانِ لاہور یعنی —— مہر و سالک کے علاوہ تاثیر، تبسم، حفیظ، پطرس اور ان کے ساتھی —— اُدھر تنہا ظفر علی خان —— اِدھر افکار و حوادث اُدھر فکاہات —— وہاں کئی لکھنے والے، کوئی نظم لکھ رہا ہے، کوئی افتتاحیہ اور کوئی افکار و حوادث کے محل سے پتھر برسا رہا ہے اور مولانا ہیں کہ چوکھی لڑ رہے ہیں —— ایسے معرکوں میں مولانا کا ادبی نام نقاش ہوتا —— پھر ایک نام نہیں کئی نام —— اِدھر افتتاحیہ لکھا، اُدھر فکاہات اور پھر سنگلاخ سے سنگلاخ زمین، نئے نئے قوافی، نئی نئی ردیفیں اور بولتی ہوئی نظم —— گاہے ماہے حسرت بھی ہاتھ بٹاتا اور ایک آدھ دفعہ اختر شیرانی نے بھی عکاس کے نام سے چند نظمیں کہیں —— مگر ظفر علی خان بلا کے شہسوار تھے —— لڑائی تیز ہو گئی، اعلان کیا ——

زمیندار ایک، آپ اتنے مگر اوجِ صحافت پر
یہ اک تکل لڑے گا آپ کی ساری پتنگوں سے

اب فقرے بازی شروع ہے، شعر چل رہے ہیں، مصرعے ہو رہے ہیں، اُدھر سے طعن توڑا جا رہا ہے اِدھر سے جوابِ آں غزل آ رہا ہے، کہیں طنز سرگرمِ نوا ہے کہیں پھبتی آتش فشار —— اور پھر ایک آدھ دن کی بات نہیں —— ہفتوں یہ دھندا رہا —— حریفانِ بدلہ سنج، حریفانِ دشنام ہو گئے تو بات مطلع سے مقطع پر آ گئی —— غنیم چو رنگ ہے اور مولانا فاتح ——

ہم تھے حریف بذلہ، وہ دشنام کے حریف

ایکا ایکی دیکھتے کیا ہیں کہ محاذ پھر گرم ہو گیا۔ مولانا نے لکھا —

انقلابات ہیں زمانے کے
مہر و سالک کے انقلاب کو دیکھ

اب جو مصرع اٹھایا تو مشاعرہ ہو گیا —— یک غزلہ، دو غزلہ، سہ غزلہ —— نظم و نثر کی فراوانی —— انقلاب کے سبھی ساتھی اور مولانا کے تمام رفیق سیاسی —— سالک نے لکھا "خلافت کی بلیاں ہمارا کھمبا نوچنے پر آمادہ ہیں"۔ مولانا نے جواب دیا: "کیوں حضرت! خلافت کے ابوہریرہ یعنی مولانا عبدالقادر قصوری کے متعلق کیا ارشاد ہے ——

اور پھر یہ معرکے محض مہر و سالک تک ہی محدود نہ تھے —— ان کا دائرہ پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا بعض حوادث و وقائع پر ایسے ایسے برجستہ شعر کہے ہیں کہ ان کا جواب نہیں شنواریوں کی بغاوت سے متعلق زمیندار میں افتتاحیہ لکھا تو سرآغاز تھا —

جنگ کا کب ہے سلیقہ کسی شنواری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

کسی مسئلہ میں مسٹر جناح سے بگڑ گئے —— قلم اٹھایا، اداریہ لکھا اور عنوان میں یہ شعر —

کیونکہ اس کی نگہِ ناز سے جینا ہو گا
زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہو گا

ایک زمانہ میں علی برادران سے گاڑھی چھنتی تھی اب جو اختلاف کی ہوا چلی تو عمارت ہی بیٹھ گئی —

دونوں نے مل کے ڈالی ہے اسلامیوں میں پھوٹ   ہے صلح و آشتی سے علی بھائیوں کو ضد
منڈلا رہے ہیں آج خلافت کی لاش پر   دہلی کے اور بمبئی کے موٹے موٹے گدھ

اور پھر ایسے ایسے قافیے نکالے کہ مضمون سے قطع نظر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے —— علامہ اقبال سے عمر بھر دوستانہ تعلقات رہے۔ ایک زمانہ میں حضرت علامہ نے روزنامہ احسان کے ظفر علی خان نمبر کو پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ —— مولانا کا قلم مصطفےٰ کمال کی تلوار ہے —— لیکن سائمن کمیشن کی آمد پر مولانا ان کی تواضع بھی کر چکے تھے —

مانگ کر احباب سے رجعت پسندی کی کدال   قبر آزادی کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے
کاٹ لی پنجاب کی ناک آپ اپنے ہاتھ سے   آبروئے ملت کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے

گاندھی جی کے ہمرکاب تھے —— تو ان کے قصیدے لکھے مثلاً —

پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس   گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

لیکن روٹھے تو پھر منے نہیں —— زاویۂ نظر ہی بدل گیا —

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے   اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

—— الغرض مولانا کا تمام کلام ان شعری سانحات سے بھرا پڑا ہے —— ایک عام آدمی کے لئے یہ تضادات بظاہر حیرت انگیز ہیں

لیکن مولانا نے جو کچھ لکھا وہ اصلاً ہماری پچاس سالہ سیاست کے داخلی اختلافات کا رنگا رنگ مرقع ہے۔ ان کے جذبات کی دو آنکھیں ہیں، مدح اور قدح ——— وہ جس آنکھ سے جو تصویر دیکھتے ہیں، اسی کو کھینچتے ہیں۔ ان کے ہاں صحیح شعر کی کمی نہیں۔ انھوں نے بہت سی قیمتی نظمیں اور سینکڑوں قیمتی شعر کہے ہیں۔ لیکن کمی یہ ہے کہ ان کا انتخاب نہیں ہو سکا۔ مولانا نے زندگی بھر جتنے شعر کہے، وہ دس بارہ ہزار سے کیا کم ہوں گے؟ اور جو کچھ ان کے قلم سے نثر میں نکلا ہے اس سے کئی جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں مگر اس کام کے لئے فرصت اور محنت کی ضرورت ہے۔ خود مولانا بوڑھے ہو گئے اور زمانہ کا مذاقِ سخن بدل چکا ہے ———

ایک خوبی جس نے مولانا کو ہندوستان میں نامور کیا وہ ان کی بدیہہ گوئی ہے۔ ان کا تمام کلام ارتجال کی یادگار ہے۔ راقم الحروف نے بدیہہ گوئی کے ان معرکوں کو آنکھوں دیکھا ہے۔ کسی نے فرمائش کی اور شعر ہو گئے۔ جلسہ میں گئے، حاضرین نے اصرار کیا، نظم کہہ ڈالی۔ طبیعت کی آمادگی کا یہ عالم رہا کہ ایک ایک نشست میں دس دس نظمیں موزوں ہو گئیں ——— ادھر کالجیٹ نوجوانوں کا ایک وفد حاضر ہوا، عرض کیا ——— مولانا شعر ——— فرمایا بھائی شعر کہاں ——— ہر وقت طبیعت حاضر نہیں ہوتی۔ انھوں نے اصرار کیا ——— چپ ہو گئے، حقّے کا کش کھینچا اور کہا ——— اچھا لکھو ——— اب فی کش ایک شعر لکھوائے جا رہے ہیں اور اس طرح پندرہ بیس شعر کہہ ڈالے ———

”حقّے کی نے منہ میں آئی، انگوٹھا انگشتِ شہادت پر پہنچا ——— پیشانی پر بل پڑے اور بالفاظِ حسرت کھٹ سے شعر سامنے آ گیا۔ اب بندش پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ کل کا بنا ہوا شعر ہے ہاتھ کا بنا ہوا ہی نہیں۔“

جب تک حواس بجا تھے مولانا محشرِ خیال تھے ——— ہر کوچہ میں قدم رکھا اور ٹھہرے کہیں نہیں ——— ؏

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

ہاتھ کے سخی، دل کے سادہ ——— اکثر نوجوان ان سے روپیہ بٹورتے رہے ——— جس ادا سے کماتے اسی ادا سے خرچ بھی کرتے تھے ——— دفتر میں ہوتے تو گھما گھمی رہتی ——— سفر میں ہوتے تو ملازم اور حقّہ ساتھ رکھتے ؎

زندگانی کے لطف دو ہی تو ہیں   صبح کی چائے شام کا حقّہ

انھیں زمیندار کی زبان اور کتابت کا بڑا خیال رہتا ——— ایک دفعہ اپنے خواہر زادے مہدی علی خاں (مصنف چاند کا گناہ اور دوسرے افسانے) کو ترجمہ کی ایک چھوٹی سی لغزش کے باعث دفتر سے الگ کر دیا ——— اور صفحۂ اوّل پر ایک طول طویل معذرت لکھی ——— ہر کاتب کے دستِ خط کا جائزہ لیتے ——— دائرے اور نقطے خاص طور پر دیکھتے۔ کسی کے کلام پر بہت کم اصلاح دیتے کسی کی نظم پسند آتی تو اس میں ایک آدھ جگہ قلم لگا دیتے جس سے مصرعوں کا حسن سوا ہو جاتا۔

ایک دفعہ راقم نے عرض کیا ——— مولانا آپ کی زندگی تو محض سفر ہے ——— فرمایا:

”تم ٹھیک کہتے ہو ——— ایک حصّہ زنداں میں بسر ہو گیا، ایک سیاسی سفروں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ قلم و دوات کی صحبتیں تو شاذ ہی میسر آئی ہیں ——— جی چاہتا ہے زمیندار انگلستان کے اخباروں کی طرز پہ نکلے لیکن روپیہ ———“

اور روپیہ زندگی بھر اُن کے لئے ایک پرابلم رہا ——— !

جب کبھی اداریہ لکھتے تو اس کا پروف بھی خود ہی دیکھتے۔ اس کی لکھائی کے لئے کاتب بھی تجویز کرتے۔ ایک دفعہ راقم نے پروف پڑھا تو تسلی نہ ہوئی خود پڑھا آخر ایک غلطی پکڑ لی، مگر خوش ہوئے اور انعام میں بہارستان کا ایک نسخہ عنایت فرمایا۔

ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں مولانا نہیں پہنچے۔ وہ رنگون سے خیبر اور مالابار سے سری نگر تک گئے۔ اپنے زمانہ میں وہ ایک صاف گو مقرر تھے۔ یعنی الفاظ کی نوک پلک درست، برجستہ فقرے، خوبصورت بندشیں، حسن مند استعارے، طبیعت میں روانی بلکہ طغیانی، ہر موضوع پر تقریر کرتے لیکن اپنا موضوع کہیں بھی نہ چھوڑتے ——— ان کی تقریر ہبوطِ آدم سے شروع ہوتی اور سقوطِ خلافت پر ختم ہو جاتی ——— تمام دنیا کے مسائل زیرِ بحث آجاتے ——— ان کا دل اس سے ہمیشہ دکھی رہا کہ مسلمان اپنی سیزدہ صد سالہ روایات کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا چکے ہیں ——— ان کے قویٰ میں اضمحلال اور اعضا میں اختلال آگیا ہے ——— ان کی مرکزیت کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے اور ان کی داستانِ مصائب جنابِ معلم الملکوت کے رودہ واحشا کے مانند دراز ہے ———

اور یہ مولانا کا مخصوص انداز تھا ——— وہ خطابت کے میدان میں ابوالکلام آزاد یا عطاءاللہ شاہ بخاری نہ تھے ——— لیکن بہت کچھ تھے۔

ان کی بے شمار آرزوئیں تھیں اور انہی کے تصوّر میں انھوں نے عمر کے چوراسی سال بتا دئے۔ مگر ایک ہی آرزو پروان چڑھی ——— اور وہ ہے ملک کی آزادی ——— اور غالباً یہ آرزو سب سے بڑی آرزو ہے ——— اب وہ ہڈیوں کا ایک ڈھیر ہیں ——— حواس کا احتجاج ——— اور سچ تو یہ ہے بڑھاپا بجائے خود جوانمرگی ہے ——— بہ تصرفِ ادنیٰ ؎

ادیبانہ آئے، صدا کر چلے
میاں خوش رہو، ہم دعا کر چلے

جگر صاحب

رشید احمد صدیقی

بالکل یاد نہیں آتا جگر صاحب سے پہلے پہل کب، کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی۔ ممکن ہے الہ آباد میں ہوئی ہو جہاں اصغر صاحب مرحوم ہندوستانی اکیڈمی (یو۔ پی) میں صیغۂ اردو کے مشیر ادبی تھے۔ کسی کام سے الہ آباد جانا ہوتا تو میرا قیام اصغر صاحب کے ہاں ہوتا۔ یہ زمانہ اور اس کے بعد کا کافی زمانہ ایسا تھا جب جگر صاحب پر شراب کا بڑا تسلط تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ سے اتنی راہ و رسم ہوگئی کہ جگر صاحب جب کبھی علی گڑھ تشریف لاتے تو میرے ہاں ٹھہرتے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بڑے عزیز اور محترم دوست بن گئے۔

الہ آباد میں اصغر صاحب کے سامنے جگر صاحب اس طرح خاموش، مؤدب اور آنکھیں نیچی کئے ہوئے بیٹھتے کہ ان سے گفتگو بھی کی جاتی تو صرف 'ہاں'، 'نہیں' میں مشکل سے جواب دیتے اور پھر سر جھکا لیتے۔ اصغر صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کے ہاں پہنچ جاتا تو وہ ایسے خوش ہوتے جیسے ان کا رواں رواں مسکرانے لگا ہو۔ ان کے اس طرح خوش ہونے سے مجھ پر آسودگی اور شگفتگی کی ایسی کیفیت طاری ہوتی جیسے میں ان تمام لوگوں کا قصور معاف کرنے لگا جنھوں نے میرے ساتھ ظلم و زیادتی کی تھی۔

کبھی کبھی وہیں جگر صاحب مل جاتے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود نہ آئے ہوں، بلکہ کسی نے پہنچا دیا ہو اور اس کے منتظر ہوں کہ موقع ملے تو پھر اپنی مہم پر چلے جائیں۔ ان کے مواجہ میں اصغر صاحب مجھ سے تفصیل سے گفتگو نہ کرتے۔ میں بھی کوئی ذکر نہ چھیڑتا۔ ہم دونوں بیٹھے ہوتے تو جگر صاحب اٹھ کر چلے جاتے۔

اصغر صاحب، جگر صاحب کو زیادہ خاموش یا اُکتایا ہوا دیکھتے تو کبھی کبھی مسکرا کر یہ فقرہ ان کو سنا دیتے "چاہے جہاں پھرو، لوٹ کر یہیں آنا پڑے گا" اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر ہنسنا بولنا شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا "اصغر صاحب کہاں آنا پڑے گا؟ بیچارے آتو جاتے ہیں"۔ اصغر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ان کی آنکھیں ان سے زیادہ مسکراتی تھیں۔ پھر بولے، "ابھی کہاں آتے ہیں، ابھی تو لائے جاتے ہیں" ایک دفعہ الہ آباد پہنچا تو اصغر صاحب کے ہاں جگر صاحب پھر اسی حال میں ملے۔ کھانے کا وقت آیا تو میں اور اصغر صاحب کھانے کے کمرہ کی طرف چلے۔ جگر صاحب نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا۔ اصغر صاحب اس دن کچھ بدحظ سے معلوم ہوتے تھے۔ چلتے چلتے کھڑے ہو گئے اور جگر صاحب کو مخاطب کرکے بولے "یہ سب تمھارے شعر نہیں سنتے تمھارا گوشت کھاتے ہیں!" اصغر صاحب کی آزردگی پر کسی قدر برہمی کا رنگ چھانے لگا تھا۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھانے کے کمرہ میں داخل ہوا۔ اصغر صاحب کھانے کی طرف متوجہ ہوئے تو میں نے کہا "اصغر صاحب آپ تو لکھنوی شاعری کے تشبیہہ استعاروں کے کبھی شیدائی نہ تھے۔ یہ گوشت کا کیا قصہ ہے؟" کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ کچھ خشمگیں لیکن زیادہ حزیں لہجہ میں بولے "رشید صاحب آپ کو کیا معلوم یہاں ایسے بے رحم لوگ بھی ہیں جو ان کو جہاں چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں اور یہ جو اسپرٹ ہوتی ہے نا وہ پلا پلا کر ان سے شعر سنتے ہیں اور جب یہ ادھموئے ہو جاتے ہیں تو یکّے پر لاد پھاند کر یہاں پہنچا دیتے ہیں۔" میں نے دیکھا کہ اصغر صاحب بے کیف ہو گئے ہیں اور کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

میں نے پوچھا: "اصغر صاحب آپ نماز تو پڑھتے ہیں؟" بولے "ہاں"۔ میں نے کہا "...... صاحب تو آپ کو صاحبِ کشف و کرامات بھی بتاتے ہیں۔" بولے "جی تو پھر؟" میں نے عرض کیا "...... صاحب نے آپ کا ایک شعر سن کر آپ کو مستجاب الدعوات بھی قرار دیا تھا۔" بولے "آپ بھی تو کچھ کہئیے!" میں نے کہا "آپ اللہ سے دعا کیوں نہیں مانگتے کہ جگر صاحب کا گوشت کھانے والے ویجیٹیرین ہو جائیں!" اصغر صاحب ہنس پڑے اور ہم دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے! کھانا کھلانے پر جو ملازم مامور تھا اس سے پوچھتے جاتے تھے یہ کھانا یا وہ کھانا جگر صاحب کے لئے رکھ دیا ہے یا نہیں۔ اس سے اطمینان نہ ہوتا تھا تو ڈونگے اور پلیٹ سے نکال کر علیحدہ پلیٹوں میں رکھتے جاتے اور کہتے "یہ سب جگر صاحب کے لئے ہے۔ بغیر کھانا کھلائے ان کو باہر نہ جانے دینا"؟

میرے گھر کا ہر چھوٹا بڑا جگر صاحب کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ یونیورسٹی اور شہر میں بھی جگر صاحب محبوب و مقبول تھے۔ اس زمانہ میں بھی شراب کا بڑا زور تھا۔ اکثر غافل اور بدمست شہر سے لائے جاتے۔ یونیورسٹی کے اندر کوئی نہ کوئی طالب علم مل جاتا جو ان کو میرے ہاں لاتا۔ میں گھر پر نہ موجود ہوتا تو وہ کمرہ میں پہنچا کر دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔

یہ طالب علم جگر صاحب کی نرسنگ اس طور پر کرتے جیسے کوئی اپنے باپ یا بھائی کی خدمت کر رہا ہو یا کوئی نرس سرسام میں مبتلا مریض کی نرسنگ کرتی ہو۔ اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جب جگر صاحب اور یہ طالب علم دونوں اپنی اپنی جگہ پر ان بانکوں سے کم نہ تھے جن کے قصے تاریخوں اور داستانوں میں ہم پڑھتے آئے ہیں۔

میں آ جاتا تو طالب علم چلے جاتے اور معلوم نہیں کیوں اور کیسے جگر صاحب خاموش اور مؤدب ہو جاتے۔ لیکن ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے رہ رہ کر سمندر کی تہ سے کوئی طاقتور موج اُبل کر باہر آنے والی ہو لیکن سطح کے قریب پہنچ کر یک بیک زور ختم کر کے واپس چلی جاتی ہو۔

یہ باتیں میں اس لئے نہیں بیان کر رہا ہوں کہ اس میں میری بڑائی نکلتی ہے۔ میری یہ نیت ہوتی تو میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں کہ اس بھونڈے طریقہ سے اس کی نمائش کرتا۔ جگر صاحب سے مجھے یہی تو شکایت ہے کہ وہ میرے سامنے مؤدب کیوں ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسے آدمی سے ملنے میں بڑی اُلجھن ہوتی ہے جو مجھے ہر وقت گارڈ آف آنر کو بنا رہے اور اس سے بھی کچھ کم کوفت اُس وقت نہیں ہوتی جب کوئی شخص میرے سامنے مجھ سے زیادہ مسخرا بننے کی کوشش کرتا ہے!

جگر صاحب اپنے حلقہ کے لوگوں میں بیٹھے ہوتے ہیں تو بہت خوش اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ ایسے میں جگر صاحب کے پاس جانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ لیکن اتفاق یا ضرورت سے پہنچ جاؤں تو وہ اس طرح خاموش اور سنجیدہ ہو جائیں گے جیسے مکتب کے چھوٹے بچے ہنس بول یا اودھم مچا رہے ہوں اور دفعتاً مولوی صاحب نمودار ہو جائیں!

جگر صاحب یقیناً مجھ سے بہتر انسان ہیں۔ وہ مجھ سے مساوات برتیں، میری عیادت کریں، مجھ سے خدمت لیں۔ مجھ سے جھگڑیں یا مذاق کریں یہ ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں لیکن وہ مجھے حرمین شریفین قسم کا مولوی یا کسی اُردو اخبار کا آبرو باختہ ایڈیٹر یا برطانوی عہد کا تھانیدار سمجھیں، یہ میرے لئے ڈوب مرنے کی بات تو ہے ہی خود جگر صاحب کے لئے کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ اُن کے ہاں میرا جو رکھ رکھاؤ ہے، وہ غالباً اس تعلق سے ہے جو مجھے اصغر صاحب سے یا اصغر صاحب کو مجھ سے تھا۔ اس طرح کی باتوں کا جگر صاحب بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ وضعداری شریفوں کی پرانی کمزوری ہے [1]

ایک دفعہ خبر آئی کہ جگر صاحب شراب سے تائب ہو گئے۔ یقین نہ آیا کہ ایسا ہوا ہوگا۔ سمجھتا تھا کہ آج نہیں کل یہ خبر آئے گی کہ پھر سے شروع کر دی۔ بُری عادتیں اس آسانی سے نہیں چھوٹتیں جس آسانی سے اچھی عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ سوچتا یہ تھا کہ جب میں اپنی معمولی بُری عادتیں چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں تو جگر صاحب شراب کیسے چھوڑ دیں گے جس میں وہ اس طرح ڈوبے ہوئے تھے جس طرح شاید جوشِ گریہ میں غالبؔ کا دل ڈوبی ہوئی اسامی تھا!

جگر صاحب شراب سے کیوں اور کیسے تائب ہوئے اس کا مجھے علم نہیں۔ اس بارہ میں اُن سے کبھی ذکر نہ آیا۔ اتنا البتہ جانتا ہوں کہ ان پر شراب کا کتنا ہی غلبہ کیوں نہ ہوتا، ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوتی جسے مبتذل کہہ سکیں۔ ان کی زبان سے نحیف کلمات نہیں نکلتے تھے۔ وہ کبھی لڑتے پیٹتے، دندناتے نہیں پائے گئے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا جیسے کیف و سرخوشی بخشنے کے بجائے شراب ان کو انتہائی درد و کرب میں مبتلا کر دیتی ہو۔ اُن پر تھوڑی شراب بھی بہت اثر کرتی تھی۔

ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ان کے اعصاب بڑے ذکی الحس ہیں اور تھوڑی سی تحریک بھی بہت ہو جاتی ہو۔ شاعری میں بھی اُن کا یہی حال ہے جیسے خیال یا جذبہ برقی رو بن کر ان کے جسم و جان کو جھنجھنا دیتا ہو۔ کچھ دنوں سے اُن کے کلام میں یہ بات بظاہر کم ہو گئی ہے لیکن غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے، اس میں تأثرات کی شدت ہے لیکن ان کو پیش کیا گیا ہے زیادہ مدھم آواز اور انداز میں۔

جگر صاحب کی شاعری میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اصلاً وہ دُوری و مہجوری کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی رفتار اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فراق کے شاعر ہیں وصال کے نہیں۔ اُن کا محبوب سے رشتہ کا انداز CENTRIFUGAL (مرکز گریز) ہے۔ یہی سبب ہے کہ جگر صاحب کی شاعری میں محبوب کی عفت میں کہیں کوئی خلل نظر نہیں آتا اور ان کا کلام اُس آلودگی اور بے راہ روی سے پاک ہے جو ہماری شاعری اور سوسائٹی میں آج کل نظر آتی ہے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ جو شاعر ذہن و فکر کے اعتبار سے محبوب سے قریب سے قریب اور جسم و جان کے اعتبار سے دُور سے دُور رہے، وہ اس شاعر سے بالعموم بہتر و برتر ہوگا جس کی پوزیشن اس کے بالکل برعکس ہو۔ جگر کے نقاد کو یہ نکتہ مدِّنظر رکھنا چاہیے۔

شراب چھوڑنے کے بعد جگر صاحب طرح طرح کی مصیبتوں[1] میں مبتلا ہو گئے۔ یہ زمانہ ان پر بڑا سخت گزرا، صحت خراب

---

[1] اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میرا مطلب شراب کی فضیلت جتانا ہے۔ یہاں شراب کے چھوڑنے اور مصیبتوں کے آنے میں سبب اور مسبب کا رشتہ نہیں ہے۔ (رشید صدیقی)

ہو گئی طرح طرح کی ذمہ داریوں نے آگھیرا، مالی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ جگر صاحب نے جس پامردی سے ان مصیبتوں کو جھیلا وہ جگر صاحب کا رزمیہ ہے۔ کتنے اور کیسے کیسے "روزِ ابر و شب ماہتاب" آئے ہوں گے اور جگر صاحب پر سے گزر گئے ہوں گے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جگر صاحب بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ مذہبی لوگوں کے بارہ میں میرا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب میں مبتلا پایا جن میں اخلاقی کمزوریاں ملتی تھیں۔ یہ لوگ خدا کو اس منطق سے قائل کرتے رہتے ہیں "میں جتنی شادیاں کرتا اور طلاق دیتا ہوں اتنی ہی زائد رکعتیں نماز کی بھی تو پڑھ لیتا ہوں۔" وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈالر میں وصول کرتا ہے اللہ تعالےٰ ان کے گناہوں کا کفارہ نفلوں میں قبول کر لیتا ہے۔

مذہب بڑی سخت اور بڑی قابلِ قدر آزمائش ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کا مذہب۔ جس طرح کے مذہبی لوگ میرے پیشِ نظر ہیں، وہ اس درجہ بے وقوف ہوتے ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اردگرد کے معمولی سوجھ بوجھ کے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے تو وہ خدا کو کیونکر دھوکہ دیں گے جس کی صفات کا ان کو علم ہے۔ یقین ہو یا نہ ہو۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات اُن بندوں کو ہمیشہ کے لئے منتقل کر دئے ہیں جن کا وہ حق مارتے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں جتنی عرضیاں بھیجتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اُن سب کو پڑھے بغیر عدالتِ مجاز کو واپس کر دیتا ہے۔

ان میں بعض ایسے معصوم بھی ملیں گے جو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا کو نہ سہی اُن فرشتوں ہی کو دھوکہ دے کر کاربراری کر لیں جو ان کا اعمالنامہ مرتب کرنے کے۔ لئے کاندھوں پر بٹھا دیئے گئے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ آخرت میں پٹواری کے اندراجات کی بنا پر مقدمہ جیت لیں گے!

جگر صاحب ان معنوں میں مذہبی آدمی ہیں کہ وہ اللہ رسول اور انسان کے حقوق پہچانتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ جس کا جو حق ہو، اُسے پہنچ جائے۔ وہ نفع کے ضرر اور ضرر کے نفع کو جانتے ہیں۔ اُن میں حیا ہے، وہ پرائی چیز کو اپنانے کے درپے نہیں ہوتے ان میں غیرت اور حمیت ہے۔ ظلم اور زیادتی اپنے پر ہو تو جھیل جائیں گے دوسرے پر ہو تو اس کی حمایت میں اپنے کو خطرہ میں ڈال دیں گے۔ اُن کے یہ جوہر تقسیمِ ملک کی ہلاکتوں میں کھلے! تفصیل میں طوالت ہے۔

جگر صاحب عالم فاضل نہیں ہیں۔ مذہب ہو، سیاست ہو، شعر و ادب ہو، ان پر ان کی گفتگو منطقیانہ یا فلسفیانہ نہ ہو گی۔ ان کا احساس جتنا سریع اور شدید ہے، اتنا ان کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ وہ خود اپنی شاعری کے بارہ میں تفصیل سے گفتگو نہیں کر پاتے۔ وہ اپنی شاعری سے باہر نکل کر کسی اور کی شاعری پر غور کرنا نہیں چاہتے۔ شاید غور کر بھی نہیں سکتے۔ جس کے جذبات تند و تیز ہوں، وہ غور کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جگر صاحب اقبالؔ کی شاعری کے کچھ ایسے قائل نہیں ہیں۔ فانیؔ بھی نہ تھے۔ دونوں کا یہ کہنا ہے کہ شاعری میں فکر و فلسفہ کیسا؟ حالانکہ دونوں بالخصوص جگر صاحب جب جنت و جہاں سے بلند ہوتے ہیں، اقبالؔ کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جگر صاحب شعر و شاعری کے بارہ میں جو کچھ کہتے ہیں وسعت اور وزن سے قطع نظر اس میں خلوص کی پاکیزگی اور یقین کی محکمی ملتی ہے۔

میں نے جگر صاحب کو تقریباً ہر حال اور ہر صحبت میں دیکھا ہے۔ خوبصورت نوجوان آزاد منش عودنوں میں، مال

بہن بیٹیوں میں، عمائد اور اکابر کی موجودگی میں، طلبا، اساتذہ اور دوسرے سنجیدہ اور ثقہ حلقوں میں۔ گفتار و کردار کے اعتبار سے میں نے ان کو کہیں قابلِ گرفت نہ پایا۔ عورتوں کی موجودگی میں جگر صاحب عفیف و شفیق نظر آئیں گے۔ ان کی زبان سے کوئی ہلکی بات نہ نکلے گی اور نگاہ کبھی بے باک اور بے محابا نہ ہوگی۔ عورتوں کی موجودگی سے قطع نظر بے تکلف دوستوں میں میں نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ جگر صاحب نے بے خیالی میں یا تفریحاً کوئی ایسا جملہ کہا ہو جس میں عورتوں سے تفریح یا عورتوں کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو۔ کم سے کم میری جان پہچان کا کوئی اُردو شاعر ایسا نہیں ہے سوا فانی مرحوم کے جو اس بارہ خاص میں جگر صاحب کا مقابلہ کر سکے۔

رؤسا اور اُمرا کے سامنے جگر صاحب حتی الوسع اپنا اور ان کا دونوں کا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی صحبتوں میں جگر صاحب کی طرف سے میں ہمیشہ متردد رہا۔ اس لئے کہ معمولی آدمیوں کی بدتمیزی وہ بالعموم نظر انداز کر دیتے ہیں، لیکن کسی بڑے آدمی سے ذرا بھی کوئی ناواجب حرکت سرزد ہو جائے تو جگر صاحب بغیر کچھ کہے یا کئے نہ رہیں گے۔ چاہے اس کا انجام کچھ ہی ہو۔ بھوپال کے نواب زادہ رشید الظفر صاحب زمانہ طالب علمی سے جگر صاحب کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ ایک زمانہ میں انھوں نے جگر صاحب کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اور کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں عائد کی تھی کہ وہ کیا کریں یا کہاں رہیں۔ اس زمانہ میں والیانِ ریاست میں سے اکثر یہ چاہتے تھے کہ جگر صاحب ان سے وابستہ ہو جائیں۔

ان میں سے ایک جو بہت بڑی ریاست کے چشم و چراغ تھے اس کے درپے ہوئے کہ جگر صاحب جس معاوضہ اور شرط پر چاہیں ان کے متوسلین میں شامل ہو جائیں۔ طرح طرح سے ڈورے ڈالے گئے۔ جگر صاحب کی مالی حالت خراب تھی۔ بھوپال کے وظیفہ سے بس بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ جگر صاحب اس آفر کو خوش اسلوبی سے ٹالتے رہے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ رئیس نے جگر صاحب سے برملا اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جگر صاحب نے بات ٹالنی چاہی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اصرار بڑھا اور اصرار میں کچھ رنگ امارت کا بھی جھلکا۔ جگر صاحب بے قابو ہو گئے۔ بولے۔ "جناب آپ مجھے داموں خریدنا چاہتے ہیں۔ میں تو رشید الظفر خان کے ہاتھوں بک چکا ہوں"! حاضرین سناٹے میں آگئے اور جگر صاحب گھر آ گئے۔

جگر صاحب میں مروّت اور وضعداری بہت ہے۔ جس سے رسم و راہ ہو جائے اُس کے لئے وہ تمام آداب برتتے ہیں جو شریفوں میں قدیم سے چلے آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے دھوکے کھائے اور نقصان اُٹھائے۔ جگر صاحب کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں ہے۔ مدتوں بڑی تنگی ترشی سے بسر ہوئی ہے اب بھی خرچ آمدنی سے بہت زیادہ ہے لیکن انھوں نے اپنی تنگدستی کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا۔ مہمان کا خیر مقدم اس طرح کرتے ہیں جیسے ان کے گھر خیر و برکت کا نزول ہو رہا ہو۔ تکریم و تواضع میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے۔ کپڑے اچھے پہنتے ہیں۔ سامان قیمتی رکھتے ہیں جس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانگ لیتا ہے یا چرا لیتا ہے ورنہ خود کہیں کھو آتے ہیں!

جگر صاحب جب کبھی میرے ہاں آئے میں نے یہ سوال کیا "جگر صاحب سفر میں کیا کھو آئے"؟ اور تقریباً

ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں چھوڑ آئے۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں جو کچھ ملا تھا اُسے جیب میں رکھ لیا تھا۔ جن کے ہاں ٹھہرے تھے انھوں نے جگر صاحب کی دیکھ بھال کے لئے اپنے کسی عزیز کو مقرر کر دیا تھا۔ انھوں نے جگر صاحب کی بڑی خدمت کی، ہر وقت موجود رہتے اور اظہارِ عقیدت کرتے۔ جگر صاحب کو غافل سمجھ کر انھوں نے سارے روپے نکال لئے۔ جگر صاحب کہتے تھے کہ وہ یہ سب دیکھ رہے تھے لیکن چُپ رہے۔ میں نے پوچھا "یہ کیوں؟" بولے "یہ واقعہ ایسے وقت ہوا جب میں جائے قیام سے رخصت ہو کر اسٹیشن آ رہا تھا۔ بہت سے لوگ موجود تھے۔ کچھ اچھا نہ معلوم ہوا کہ وہاں اس چوری کا اعلان کروں اور کسی شریف آدمی کو رسوا کر دوں۔"

جگر صاحب جس کے مہمان ہوتے ہیں اس پر بہت کچھ اپنا ہی صرف کر دیتے ہیں۔ میں نے غصّہ میں ان کو آپے سے باہر ہوتے نہ دیکھا۔ حکم چلاتے نہ پایا۔ اپنی بڑائی کبھی اُن کی زبان پر نہ آئی۔ دوسروں کے عیب انھوں نے کبھی نہیں ڈھونڈھے نہ کبھی ان کی تشہیر کی۔ ایسے لوگ کم ہیں جو اپنی بڑائی جتانے کے لئے ایسا نہ کرتے ہوں! جگر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عام شعرا کی مانند اس تاک میں نہیں رہتے کہ کوئی غریب اور شریف مل جائے تو اپنے اشعار سُنا سُنا کر اسے ادھ موا کر دیں!

جگر صاحب کو معصوم بچوں سے کھیلتے ہوئے کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ بالخصوص ایسے حال میں کہ جگر صاحب کو نہ معلوم ہو کہ انھیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ بچے سے کہیں زیادہ معصوم وہ خود نظر آتے ہیں۔ وہ اتنے خوش اور شگفتہ معلوم ہوں گے جیسے اُن کے سر پر آسمان نہ ہو۔ جگر صاحب کا چہرہ بشرہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی بچہ اُن کے سامنے بے تکلّف ہو سکے۔ اس کی کمی جگر صاحب طرح طرح سے پوری کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بچّہ کا کھلونا بنا دیتے ہیں۔ ایسا کھلونا جس کو بچّہ نہ کھیلے تو کھلونا خود کھیلنے لگے۔ وہ بچّوں سے مصافحہ، معانقہ یا چوما چاٹی نہیں کرتے، نہ دعائیں دیتے ہیں نہ تلقین کرتے ہیں۔ نہ اُسے ملک ملّت کی خدمت یا خوداری کے لئے تیار کرتے ہیں۔ وہ اس کے سامنے اپنی شاعری بھول جاتے ہیں، اپنی عمر، صحت، حلیہ، زبوں حالی سب فراموش کر دیتے ہیں۔ بس طرح طرح سے خوش ہوتے ہیں اور بچّہ کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ بچّے خدا کا مصرعہ طرح ہوتے ہیں جن پر خدا طرح طرح سے طبع آزمائی کرتا ہے!

میں نے بعض مشہور مستند اور عمر رسیدہ شعرا کو دیکھا ہے جو دوسرے شاعر کی بُرائی بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مشاعرہ میں شاعر اپنا کلام سُنا رہا ہے اور یہ بیٹھے اس پر بازاری فقرے چُست کر رہے ہیں اور آس پاس کے نالائقوں سے اپنی اس خفیف الحرکتی کی داد لیتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی بے ہودگی کسی اور میں ہو تو ہو، شاعر میں ہرگز نہ ہونی چاہیئے۔ اس طرح کی حرکت شاعر ہی نہیں کرتے، وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو شعر و ادب کے پارکھ سمجھے جاتے ہیں اور جنھوں نے عمر کا بیشتر حصّہ شعر و ادب کی خدمت میں گزارا ہے۔ بس یہ گوارا نہیں کہ آن کے ہوتے دوسرا کیوں!

بعض شعرا، بعض اشعار اور بعض مواقع ضرور ایسے ہوتے ہیں جب پھبتی یا فقرے بے اختیار زبان پر آجاتے ہیں۔ اسے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یہ فقرے اور پھبتی کبھی کبھی وہ مزا دے جاتے ہیں جو اچھے اچھے اشعار نہیں دے پاتے، لیکن اس طرح کے فقرے اور پھبتی کہنے کا حق مشاعرہ میں سامعین کو حاصل ہے خود شعرا کو نہیں۔

مشاعروں میں اب یہ بات عام ہو گئی ہے بالخصوص دہلی کے پبلک مشاعروں میں۔ آج کل شاید ہی کوئی اور تقریب ایسی ہوتی ہو جہاں بے ہودگی اور آبرو ریزی کے ایسے مناظر دیکھے جاتے ہوں جیسے دِلّی کے اس طرح کے مشاعروں میں۔ عام مجمع میں جہاں شریف خواتین، ذمّہ دار حکام، پیشوایانِ ملک و قوم، غیر ممالک کے اکابر، ناسمجھ لڑکے لڑکیاں موجود ہوں وہاں شعرا کا جو قوم کا ناموس ہوتے ہیں، فخریہ اور علانیہ شراب پی پی کر اس طرح کی نالائقی دکھانا بڑے رنج اور شرم کی بات ہے۔

مجھے تو کبھی کبھی اس کا اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ دن بھی دُور نہیں جب دِلّی کا کوئی منچلا سرمایہ دار شاعروں کی کوئی سرکس کمپنی بنا لے اور امریکن فری اسٹائل میں ان کے کرتب اور کرتوت شہر شہر دکھاتا پھرے!

خلوت ہو یا جلوت جگرؔ صاحب کو میں نے ساتھی شعرا کے کلام پر کبھی حاشیہ آرائی کرتے نہیں پایا۔ مشاعرہ میں اُن کی طرح سنجیدہ اور خاموش بیٹھنے والا شاعر شاید ہی کوئی اور ہو۔ اُن کی زبان سے کوئی فقرہ کبھی نکلے گا بھی تو تحسین اور ہمت افزائی کا۔ یہاں مجھے ثاقبؔ اور صفیؔ مرحومین بے اختیار یاد آتے ہیں۔ لکھنؤ کے یہ باکمال شعرا مشاعرہ میں جس ادب و احترام سے بیٹھتے اور مناسب مواقع پر تحسین کے کلمات جس شریفانہ انداز سے کہتے وہ اب کہیں نہیں نظر آتا۔

یہ مشاعرہ میں شروع سے آخر تک دو زانو نیچی نظر کئے ہوئے بیٹھے رہتے، خواہ مشاعرہ کتنی ہی دیر میں کیوں نہ ختم ہوتا۔ کبھی چائے، پان یا پانی کی فرمائش نہ کرتے۔ کوئی پیش کر دیتا تو بڑی فروتنی سے قبول کر لیتے یا عذر کر دیتے۔ ان لوگوں نے ایسے مشاعروں میں بھی شرکت کی جہاں مخالف کیمپ کے شعرا اور اُن کے حامی موجود ہوتے اور اس کا اندیشہ رہتا کہ کہیں کوئی نامناسب فقرہ نہ کہہ دے لیکن آج تک کوئی ناگواری پیش نہ آئی۔ مخالفین کا کلام یہ دونوں بڑے شوق اور شائستگی سے سُنتے اور داد دیتے تھے۔

ثاقبؔ صاحب کو علی گڑھ سے بڑی اُلفت تھی۔ کوئی بڑی ہی مجبوری ہوتی تو خیر، ورنہ یہاں کے مشاعروں میں ضرور شرکت کرتے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا، ثاقبؔ صاحب یکی بارک کے ایک کمرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دن بھر کا سفر کر کے آئے تھے۔ طبیعت ناساز تھی۔ رات کو مشاعرہ تھا۔ میں نے عرض کیا آپ آرام فرما لیں، وقت آنے پر میں حاضر ہو جاؤں گا اور آپ کو لے چلوں گا۔ فرمایا: "میاں نہیں، یہ آدابِ مشاعرہ کے خلاف ہے کہ جب جس کا جی چاہے آ جائے اور جب جی چاہے چلا جائے۔ میں آپ کے ساتھ ابھی چلتا ہوں۔"

اس مشاعرہ میں ثاقبؔ صاحب کے دو اشعار علی گڑھ میں بہت مقبول ہوئے۔ جیسے آجکل رات کو سینما ہوا اور صبح اس کے مقبول فلمی گانے یا دُھنیں بچّہ بچّہ کی زبان پر آ گئیں۔ اُس زمانے میں علی گڑھ کے مشاعروں کا یہی حال تھا، اچھے اشعار ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر رواں ہو جاتے تھے، ثاقبؔ صاحب کے وہ دو اشعار یہ تھے۔ ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانہ کو مرے — جن پہ تکیہ تھا، وہی پتّے ہوا دینے لگے!
ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں — ابرِ سیاہ جانبِ کہسار دیکھ کر!

جگرؔ صاحب میرے ہاں تشریف لاتے ہیں تو چند باتوں کا میں خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔

اوّل یہ کہ جگر صاحب کی صحت اچھی نہ ہوگی۔ اس لئے اپنے عزیز ترین ڈاکٹروں کو بلواتا ہوں جو ان کا مکمل معائنہ کرتے ہیں۔ وہ دوا اور غذا تجویز کریں گے، پرہیز بتائیں گے اور دوسرے مشورے دیں گے۔ میں ان سب پر جگر صاحب سے عمل کراؤں گا۔

دوسرے یہ کہ جگر صاحب معلوم نہیں کہاں کہاں کا اور کتنے دنوں کا چکر لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ میلے کپڑے، چادر، غلاف، تولئے کا انبار ہوتا ہے۔ دھوبی بلوا کر یہ کپڑے اس کے حوالہ کرونگا۔

تیسرے یہ کہ جگر صاحب کا خط بڑھا ہوگا۔ اس کے لئے نائی بلواؤں گا تاکہ وہ جگر صاحب کو نوک پلک سے درست کر دے۔

چوتھے یہ کہ اس بات کا انتظام کروں گا کہ جگر صاحب کے عشاق ان کو علی گڑھ میں گھسیٹتے نہ پھریں۔ اور میرے ہاں نہ اپنا کلام ان کو سنائیں نہ ان کا کلام خود سنیں۔

پانچویں یہ کہ جگر صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اُسے ضبط کر لیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں روپے اس طرح نہ خرچ کریں جس طرح بعض حکومتیں دوسری حکومتوں پر خرچ کرتی ہیں۔

چھٹے یہ کہ جگر صاحب رخصت ہونے لگتے ہیں تو میں خدا حافظ کہنے کے لئے نہیں موجود ہوتا اس لئے کہ جگر صاحب کچھ اس گداز قلب کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں جیسے نہ اُن کو میری زندگی کا بھروسہ ہے نہ اپنی زندگی کا اور اس طرح سے رخصت ہونا یا رخصت کرنا میرے بس کی بات نہیں!

ذاکر صاحب

ڈاکٹر عابد حسین

طفیل صاحب کی فرمائش پہنچی کہ ذاکر صاحب کی شخصیت پر ایک مضمون "نقوش" کے لئے لکھوں۔ پہلے میں نے معذرت کی، دو وجوہ سے۔ ایک تو سست سوچنے اور سست لکھنے کی عادت کے کارن میں یوں بھی رسالوں کے لئے مقررہ وقت کے اندر مضمون نہیں لکھ سکتا اور پھر اس زمانے میں شدید مصروفیت کی وجہ سے اور بھی مشکل ہے۔ دوسرے ذاکر صاحب جیسی صد رنگ و یک رنگ شخصیت کا نقشہ ایک مضمون کی چھوٹی سی لوح پر اُتارنا قلم کا نہیں بلکہ مو قلم کا کام ہے جس میں مجھے دستگاہ حاصل نہیں۔ مگر پہلی مشکل طفیل صاحب نے مجھے کچھ اور مہلت دے کر حل کر دی اور دوسری خود میں نے یہ سوچ کر حل کر لی کہ اگر اس وقت ایسا مضمون لکھنا ممکن نہیں جس سے میں مطمئن ہوں تو ایسا ہی سہی جس سے میں غیر مطمئن رہوں۔ شاید یہ بے اطمینانی کسی دن اس موضوع پر ایک سیر حاصل مضمون اور (شاید ایک پوری کتاب) لکھوا دے۔

شخصیت کیا ہے؟ اس پر مفصل بحث کرنے کا اس وقت موقع نہیں۔ مجمل طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ شخصیت ان جسمانی اور اخلاقی صفات کا ایک ہم آہنگ مجموعہ ہے جن کی بدولت کوئی شخص عام لوگوں سے امتیاز حاصل کرتا ہے اور ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم شخصیت کے مالک یعنی اس انسان کو بھی جو غیر معمولی جسمانی اور اخلاقی صفات رکھتا ہے شخصیت کہہ دیتے ہیں۔ اس مضمون میں شخصیت کا لفظ ضرورت کے مطابق دونوں معنوں میں استعمال ہوگا۔

یہ بات تو شخصیت کی تعریف ہی میں داخل ہے کہ وہ اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے۔ البتہ اس بارے میں بہت کچھ اختلاف ہے کہ اس کے اثر کی کیا حدود ہیں۔ اکبر نے کہا ہے: ؎

مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

اور اقبال نے تو شخصیت کو جسے وہ خودی کہتے ہیں) خدائی کی حد کے قریب قریب پہنچا دیا ہے مگر ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک شخصیت سراسر اپنے زمانے یا ماحول کی پیداوار ہوتی ہے۔ عام طور پر تصوریت IDEALISM کے علمبردار اس کے قائل ہیں کہ شخصیت اپنے ماحول پر غیر محدود اثر ڈال سکتی ہے اور بہت بڑی شخصیتیں واقعی قوموں کی زندگی اور زمانے کے دھارے کو بدل سکتی ہیں۔ مگر ثبوتیت POSITIVISM کے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ بڑی سے بڑی شخصیت کا

اثر بھی بہت محدود ہوتا ہے۔ بلکہ خود شخصیت اپنے طبعی، سماجی اور سب سے زیادہ معاشی ماحول کے سانچے میں ڈھل جایا کرتی ہے۔

فلسفیوں کی افراط تفریط سے بچ کر تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ شخصیت اس انجن کی طرح ہے جس سے بڑی سے بڑی اصلاحی یا انقلابی تحریک کی گاڑی کھینچی جا سکتی ہے۔ لیکن خود یہ انجن جس طاقت سے چلتا ہے وہ اسے زمانے یا ماحول سے ملتی ہے۔ ایسی شخصیتیں جن میں اصلاح یا انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت ہے کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی صلاحیت کا قوت سے فعل میں آنا اس پر موقوف ہے کہ ان کے زمانے کے حالات اور زمانے کے لوگ ان کا ساتھ دیں۔

ہم نے اپنے زمانے یعنی بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں جن مسلمانوں کو لوحِ تاریخ پر نمودار ہوتے دیکھا تھا ان میں کھری شخصیتیں بھی تھیں اور ملمع کی بھی تھیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر ملمع کا مال، کھرے مال سے کہیں زیادہ مقبول ہوا۔ اس لئے کہ اس میں ظاہری چمک جس پر مسلمان جان دیتے ہیں، زیادہ تھی۔ ذاکر صاحب ان کھری شخصیتوں میں سے ہیں جن کی مقبولیت کا دائرہ اب تک بہت محدود ہے، لیکن ملمع کی عارضی چمک ماند پڑنی شروع ہو گئی ہے اور کھرے سونے کی پائدار دمک بدستور موجود ہے۔ ممکن ہے اب ہندوستان کے مسلمان ذاکر صاحب کی شخصیت کو پرکھ سکیں۔

ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

اور ان کی مدد کے لئے ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشو و نما اور موجودہ آب و رنگ پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

ذاکر حسین ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے ان کے والد فدا حسین خان صاحب ضلع فرخ آباد (یو۔ پی) کے مشہور قصبے قائم گنج کے رہنے والے تھے اور حیدر آباد میں وکالت کرتے تھے، قائم گنج کے پٹھان صدیوں سے سپہ گری کا پیشہ رکھتے تھے چنانچہ ذاکر حسین کے خاندان کے بھی بہت سے لوگ فوج میں ملازم تھے۔ ان کے والد کا مشرقی علوم کی اعلیٰ تعلیم پانا اور وکالت کا پیشہ اختیار کرنا قائم گنج والوں کے نزدیک بدعت سے کم نہ تھا۔

ذاکر حسین کا بچپن حیدر آباد میں گذرا لیکن وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں پلے اور بڑھے اور ریاست کی جاگیردارانہ آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں سب سے گہرا اثر ان کی سیرت پر اپنے پیر حسن شاہ صاحب کا پڑا جن کے وہ بہت کم عمری میں مرید ہو گئے تھے۔ یہ بزرگ ذاکر حسین کے عزیزوں میں سے تھے اور حضرت شاہ طالب حسین فرخ آبادی سے ارادت رکھتے تھے۔ حسن شاہ صاحب پر ایک واردات ایسی گذری تھی جس سے ان کی روحانی زندگی کی کایا پلٹ گئی! ابتدا میں وہ ہندوؤں سے تعصب رکھتے تھے اور شاید انھیں برا بھلا بھی کہتے تھے جب ان کے مرشد حضرت شاہ طالب حسین کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے ان کی تادیب اور تہذیب کے لئے یہ حکم دیا کہ تم چوٹی رکھو اور پشاور تک پیدل جاؤ اور واپس آؤ۔ اس تادیب نے حسن شاہ صاحب کو آزادہ روی اور صلح کل سکھانے کے علاوہ جہانیانِ جہاں گشت بنا دیا۔ اور ان کا یہ شعار ہو گیا کہ ایک گٹھڑی کپڑوں اور کتابوں کی ساتھ لئے، پیدل دُنیا بھر میں پھرا کرتے۔ جب کبھی حیدر آباد آ کر کچھ دن رہتے تو ذاکر حسین کی ہدایت و ارشاد کا کام زیادہ تر ان دو طریقوں سے انجام دیتے، ایک تو وہ کمسن مرید سے علمِ دین یا سلوک و معرفت کی کسی کتاب کی نقل کراتے، دوسرے اسے روپیہ دیتے اور پھر حاجتمندوں کو اس کے پیچھے لگا دیتے کہ خیرات و حسنات کی مشق سے اس کا دل بھی کھل

ہر وقت کا ساتھ رہا۔ میں نے انھیں ہر رنگ میں دیکھا اور ہر رنگ میں چوکھا پایا۔ سب سے زیادہ مجھ پر اس بات کا سکہ بیٹھا کہ ذاکر صاحب "دراَیامِ جوانی چناں کہ افتد و دانی" کی وادیٔ پُرخار سے بڑی پامردی سے گذرے۔ گھبرا کر بھاگنے کی کوشش میں کانٹوں میں اُلجھے نہیں بلکہ اوسان قائم رکھے دامن بچائے قدم بڑھائے چلے گئے۔ برلن میں ذاکر صاحب کے استادوں میں پروفیسر زومبارٹ اور دوسرے بڑے پائے کے عالم تھے جن سے انھوں نے بہت فیض اُٹھایا مگر فیضان اگر تھوڑا بہت کسی سے پایا تو شاید میرے استاد اشپرانگر سے جو خبر کے ساتھ ساتھ نظر بھی رکھتے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب جرمنی سے ڈاکٹر ذاکر حسین بن کر لوٹے تو ملک کی یہ کیفیت دیکھی کہ ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکیں ٹھنڈی پڑ چکی ہیں اور لوگوں پر خصوصاً مسلمانوں پر ایک عام افسردگی چھائی ہوئی ہے۔

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سنّاٹا آواز نہیں آتی

مگر ایک آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی اور وہ خود ان کے دل کی آواز تھی:

بے گانہ ہوئی دنیا رسم و رہِ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

یہ سخت جان طبیعت باز نہیں آئی اس نے جامعہ ملیہ کی سوکھتی ہوئی بیل کو خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا۔ ۱۹۲۷ء کے آخر میں حکیم اجمل خان کے انتقال کے بعد جامعہ ملیہ کا چلنا قریب قریب ناممکن نظر آتا تھا۔ جن لوگوں نے ان دنوں ذاکر صاحب کے ساتھ کام کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ وسائل کے فقدان، اپنوں کی مخالفت، غیروں کی شماتت، حکومت کے عتاب کے باوجود جامعہ ملیہ کو چلانا ہر ایک کا کام نہیں تھا۔ یہ وہی کر سکتا تھا جسے خدا پر، انسان پر اور خاص کر اپنے آپ پر سچا پورا اور گہرا بھروسہ ہو۔ جو ایثار ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ کے لئے کیا اس میں تن، من، دھن کی قربانی تو سب کو نظر آئی مگر ایک قربانی جو حوصلہ مند طبیعتوں کے لئے ان سب سے مشکل ہے بہت کم لوگوں نے دیکھی وہ یہ ہے کہ پبلک لیڈری کے موقعے جن کے لئے ذاکر صاحب کے ہم چشم ہزاروں جتن کرتے تھے ان کو بے مانگے مل رہے تھے مگر انھوں نے بے تامّل چھوڑ دیئے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تعلیم کا کام یوں بھی یکسوئی چاہتا ہے اور ان دنوں جامعہ ملیہ کی جوئے شیر لانے کے لئے خاص طور پر اپنے آپ کو پوری طرح کھپانے اور تیہ مار کر کام کرنے کی ضرورت تھی۔

ان دنوں ذاکر صاحب کو قریب قریب سبھی قومی اور ملّی لیڈروں سے سابقہ رہا لیکن ان کی شخصیت پر قابلِ ذکر اثر صرف مہاتما گاندھی اور حکیم اجمل خان کا پڑا۔ گاندھی جی کی حق بینی، حق شناسی، حق کوشی اور ہمہ گیر انسانیت کی آنچ نے اگر کچے سونے کو کندن بنایا تو حکیم اجمل خان کے خلق و مروّت، صبر اور حلم نے اس پر جلا کر دی۔

بزرگانِ قوم میں سے سوا ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سب اس بے دلی کی فضا میں جو خلافت اور سوراج کی تحریک کے ناکام ہونے کے بعد چھا گئی تھی، اس ادارے کی کشتی کو حکومت کی مدد کے بغیر پار لگانے سے ہمت ہار چکے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے وہ کام کر دکھایا جو انگریزی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔ انھوں نے گاندھی جی کے مشورے سے جامعہ کے استادوں میں سے ان لوگوں کو ساتھ لے کر جنھوں نے بیس سال برائے نام معاوضے پر جامعہ ملیہ کی خدمت کا عہد کیا، انجمن تعلیم ملّی

کی بنا ڈالی۔ اس انجمن نے جامعہ ملیہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چلایا۔ اربابِ حکومت روڑے اٹکاتے رہے۔ بزرگانِ قوم (الا ماشاء اللہ) دور سے تماشا دیکھتے رہے اور خود دارانِ قوم ذاکر صاحب کی سرکردگی میں روکھی سوکھی کھا کر، موٹا جھوٹا پہن کر، ایک آزاد تعلیم گاہ کی تعمیر کرتے رہے۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ ذاکر صاحب کے لئے بڑی سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ یوں تو ہندوستان کے خون میں تحریکِ آزادی نے ۱۹۱۸ء سے ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں حکومت خود اختیاری ملنے کے بعد ہندو مسلمان اہلِ غرض کی اغراض کے تصادم سے فرقہ داری زہر اس شدت سے پھیلنے لگا تھا کہ ہیجانِ خون نے زہر باد کی صورت اختیار کر لی۔ ذاکر صاحب اور ان کی جامعہ ملیہ اس زمانہ میں دوگونہ رنج و عذاب میں مبتلا تھی۔ فرقہ پرست ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو نفرت کی آگ میں لپیٹ لیں یا جلا کر خاک کر دیں۔ قوم پرور ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو محبت کی زنجیروں سے سیاست کی جنگ میں گھسیٹ لیں۔ ذاکر صاحب کو پورا احساس تھا کہ اس وقت جب ملک کی موت اور زندگی کا فیصلہ ہونے والا تھا سیاست سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ لیکن معلّم کی روح مجاہد کی روح نہ بن سکی۔ دشمنوں کی عداوت اور دوستوں کی محبت دونوں ان کو عملی سیاست میں کھینچنے میں ناکام رہے۔ البتہ ذاکر صاحب نے اپنی سی کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں مصالحت کرانے اور ملک کی تقسیم کو روکنے میں گاندھی جی کا ہاتھ بٹائیں اور انھیں آخر تک یہ آس رہی کہ اس کوشش میں کامیابی ہو گی۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب کو پہلی قومی کابینہ میں رکھنے کی تجویز ہے تو انھوں نے اس امید پر کہ ایک دن کانگریس اور لیگ کی مشترک کابینہ متحد ہندوستان کا اصول مان کر بنے گی، اس وقت وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ وہی کر سکتا تھا جو اقبال کی اصطلاح میں مردِ فقیر ہو۔ مگر ظاہر ہے ساحل پر رہ کر طوفان کو روکنے کی سعی کیا کامیاب ہوتی۔ فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکتی ہی چلی گئی۔ ہندوستان کو تقسیم کرنا ہی پڑا جس کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے جسم و روح تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے ——— بھارت، مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان۔ ذاکر صاحب کے جگر پر آرے چل گئے، ان کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ مگر اس اندھیرے میں انھیں اپنے فرض کی راہ صاف نظر آتی رہی۔ انھوں نے پاکستان کو دعائے خیر دی اور اپنے آپ کو تن من سے، ہندوستان (بھارت)، کے حوالے کر دیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد کے تین سال ذاکر صاحب کے لئے سخت روحانی کرب اور شدید جسمانی اور دماغی محنت کے تھے۔ اس عرصے میں انھیں دہلی کے مسلمانوں کی تباہی، اضطرار، مایوسی، ہراس، دہلی میں آئے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کی بے سروسامانی، مصیبت، آزردگی، طیش کے جگر خراش منظر دیکھنے پڑے اور ان سب کی یکساں خدمت کرنے والے مردوں اور عورتوں کے ساتھ ان تھک کام کرنا پڑا۔ گاندھی جی کی شہادت کا جانکاہ صدمہ اٹھانا پڑا، جامعہ ملیہ کو اپنے معتمد ساتھیوں کے سپرد کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اندر اور باہر کے بے شمار خطروں سے بچانے کی جد و جہد کرنی پڑی اور اسی زمانے میں یونیورسٹی کمیشن کے ساتھ سارے ملک کی خاک چھانی پڑی۔ روح، دماغ اور جسم تینوں پر مسلسل بوجھ پڑتا رہے تو انسان کہاں تک سہہ سکتا ہے۔ آخر جسم کی قوتِ برداشت نے جواب دے دیا۔ ۱۹۴۹ء کے آخر میں شدید قلبی مرض (THROMBOSIS) کا حملہ ہوا جس سے جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر خدا کو ذاکر صاحب سے کچھ اور کام لینا تھا۔ اس لئے چار پانچ مہینے صاحبِ فراش رہ کر اچھے ہو گئے۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں ذاکر صاحب نے اپنا سارا وقت اور توجہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمت میں صرف کی اور جہاں

تک ان سے ہو سکتا تھا نا اُمیدی میں اُمید، بے دلی میں ولولہ، بدنظمی میں نظم پیدا کر کے علی گڑھ کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بڑی اونچی جگہ پر پہنچا دیا۔

۱۹۵۲ء سے ان کی مصروفیتوں کا دائرہ بڑھ گیا ہے۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اور اس طرح کی بے شمار عارضی اور مستقل مجلسوں کی رکنیت، انجمن ترقی اُردو (ہند) اور عثمانیہ یونیورسٹی کی تنظیم نو کمیٹی کی صدارت ان کے وقت کا بہت سا حصہ لے لیتی ہے۔ اس لئے ان کو مسلم یونیورسٹی کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے بمبئی کے ایجوکیشنل سروس کے قابل ترین افسر سید نوراللہ صاحب کو بلا کر پرو وائس چانسلر بنانا پڑا ہے۔ مگر اب بھی ان کی توجہ اور سعی کا مرکز علی گڑھ ہے اور اس کو سنوارنے اور سدھارنے میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشو و نما کا ایک سرسری سا خاکہ کھینچنے کے بعد اب ہم اس میں کچھ تھوڑا سا رنگ بھرتے ہیں تاکہ اس قلمی تصویر کے نقش کسی حد تک اُبھر آئیں۔

میرے محترم استاد پروفیسر اشپرانگر نے انسانی شخصیتوں کی چھ بنیادی قسمیں قرار دی ہیں۔ مذہبی، سماجی، علمی، جمالی، سیاسی، معاشی۔ ذاکر صاحب کی شخصیت ان میں سے دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی گو اس میں مذہب و تصوف، فکر و نظر اور ذوقِ جمالی کا خاصا گہرا رنگ ہے اور اقتصاد و سیاست کا کچھ ہلکا سا رنگ موجود ہے۔ لیکن ساری زمین انسان دوستی سے رچی ہوئی ہے، ان کے لئے انسان سے، خواہ فرد کی شکل میں ہو یا جماعت کی شکل میں، محبت اور اس کی خدمت کرنا نہ کوئی مذہبی یا اخلاقی فرض ہے، جس کے لئے شعوری عقیدے اور ارادے کی، نہ کوئی علمی اصول ہے جس کے لئے فکر کی، اور نہ کوئی سیاسی تدبیر ہے جس کے لئے تدبّر کی ضرورت ہو بلکہ وہ تو ان کی فطرت کا قانون ہے جو بلا شعور، بلا ارادہ کام کرتا ہے۔ ہم سُنا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے دوستوں عزیزوں یا عام طور پر بندگانِ خدا کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ فلاں نے قوم و ملّت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے۔ دُنیا کو تج دیا ہے، ایثار کیا ہے، قربانی کی ہے۔ ذاکر صاحب کو میں نے پچھلے ۳۲ سال میں ہمیشہ افراد اور جماعتوں کی بھلائی کی کوشش میں محو دیکھا ہے۔ لیکن میرے علم و یقین میں نہ انھیں کبھی خدمت کا بیڑا اٹھانے کا احساس ہوا، نہ اپنے آپ کو وقف کرنے کا، نہ تیاگ کا، نہ ایثار و قربانی کا۔ احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود بے تکلّف، بے رکاوٹ ایک سمت بہہ رہا ہے اور انھوں نے کہا اچھا ہے بہنے دو۔ سماجی یا انسان دوست ٹائپ کی ایک اور بڑی پہچان ہے اور وہ بھی ذاکر صاحب میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان میں "خودی" اور "بے خودی" اس طرح گھل مل کر شیر و شکر ہو گئی ہے کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں خواہ وہ کسی ملک، کسی مذہب، کسی طبقے کے ہوں انھیں احساسِ کمتری اور اظہارِ برتری کی کشمکش سے گزرنا، خود فروشی اور خود فراموشی کے بیچ میں جھولنا نہیں پڑتا۔ نئے آدمی سے وہ اس طرح کھلے آغوش اور کھلے دل سے ملتے ہیں جیسے برسوں کا دوست ہو، وہ انسان کو کتاب سمجھ کر اس کی تنقید، تحلیل اور تجزیہ نہیں کرتے کہ کسی جزو کو رد، اور کسی کو قبول کریں، بلکہ جیسا ہے سارے کا سارا لے لیتے ہیں اور اپنے کو تمام و کمال اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اخلاقی رہنما ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں اور ہمارے زمانے میں گاندھی جی نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ بُرے آدمی اور اس کی بُرائی میں فرق کرو، اس طرح جیسے بیمار اور بیماری

ہیں کرتے ہو۔ برائی کو ضرور برا کہو اور دفع کرنے کی کوشش کرو۔ مگر اس انسان کو جس کے اندر برائی نظر آئے بیمار کی طرح ہمدردی کے قابل، علاج کا محتاج، محبت کا سزاوار سمجھو۔ اس اصول پر اپنی طبیعت کے تقاضے سے عمل کرتے ہوئے ہم نے کسی کو دیکھا ہے تو ذاکر صاحب کو۔ برے اعمال کی وجہ سے کسی کو برا سمجھنا تو درکنار، ذاکر صاحب کی انتہا مروت اکثر انسان کے جوہرِ انسانیت کی خاطر اس کے برے اعمال کو قبول نہیں تو گوارا ضرور کر لیتی ہے۔ کسی کے دل کو ہاتھ میں لینا ان کی طریقت میں حجِ اکبر ہے اور کسی کے دل کو توڑنا گناہِ کبیرہ کفر ہے۔ ان کی طبیعت حوصلہ مند ہے اور قومی اعزاز، اجتماعی منصب بے مانگے ملے تو ان کا دل قبول کرنے کو چاہتا ہے۔ لیکن اگر اس میں کسی حریف کا مقابلہ کر کے اس کو شکست دینا ہو، کسی انسان کو روند کر آگے بڑھنا ہو تو وہ عموماً پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ جب ذاکر صاحب تعلیم کے لئے برلن پہنچے تو وہاں کے ہندوستانیوں کی قومی انجمن ہندوستان ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کا انتخاب درپیش تھا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت نے چند ہی روز میں اتنا گہرا اثر ڈال دیا تھا کہ بہت بڑی اکثریت ان کو صدر منتخب کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ذاکر صاحب اپنے حریف کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ دوسرے سال جب لوگ انھیں اچھی طرح جان گئے تھے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ وہ ان کا حریف بنے، بلا مقابلہ وہ صدر منتخب ہوئے۔

انسان دوستی کے بعد سب سے گہرا رنگ ذاکر صاحب کی شخصیت میں خدا پرستی کا ہے۔ ان کی دینداری دنیاداری کے پردے میں سے یوں بھی تھوڑی بہت جھلکتی رہتی ہے۔ لیکن اچھی طرح چمکتی اس وقت ہے جب آس پاس کی فضا میں مایوسی کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ان کے ایمان کی ثابت قدمی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اچھے اچھوں کے ایمان ڈانواں ڈول ہو جاتے ہیں۔ اس کی سب سے روشن مثال وہ ہے جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا، جامعہ ملیہ کے کارکنوں کی جان ہر وقت خطرے میں تھی اس کے بہت سے سچے ہمدرد جو اہل الرائے سمجھے جاتے تھے اصرار کر رہے تھے کہ کچھ دن کے لئے دہلی چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ لیکن ذاکر صاحب کے قدم جمے رہے اور ان کی وجہ سے ہزاروں اکھڑتے ہوئے قدم پھر جم گئے جسمانی اور روحانی ہلاکت کے سیلاب میں ذاکر صاحب نے نہ صرف خود اپنا لنگر سنبھالے رکھا بلکہ بہت سے ڈوبنے والوں کو یہاں تک کہ ان لوگوں کو جو خود ان کو ڈبونا چاہتے تھے، سہارا دے کر کنارے پر پہنچا دیا۔ ان دنوں ذاکر صاحب نے ایک دوست کو لکھا تھا کہ مجھے انسان کی انسانیت پر بھروسہ ہے۔ جنون کی یہ لہر دیکھتے دیکھتے گذر جائے گی۔ ظاہر ہے انسان کی انسانیت پر ایسا بھروسہ وہی کر سکتا ہے جو خدا کی خدائی پر اٹل ایمان رکھتا ہو۔

نفاستِ ذوق اور لطافتِ احساس وہ صفات ہیں جو ذاکر صاحب کی شخصیت کی گہرائی سے ناسازگار ماحول کے باوجود ابھر کر رہیں۔ مولوی بشیر الدین کے اٹاوے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے علی گڑھ میں رہ کر شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کا ذوق رکھنا روزمرہ کی زندگی میں، رہن سہن اور اخلاق و آداب میں۔ بیرونی صفائی اور ستھرائی اندرونی پاکیزگی اور حسن و تناسب کا لحاظ رکھنا بہت دشوار تھا۔ مگر ذاکر صاحب نے کر دکھایا۔

جامعہ ملیہ کے دورِ تنگ دستی ہی میں ذاکر صاحب نے اپنے گھر اور اپنے ادارے کو سادگی اور سلیقے کا نمونہ بنا رکھا تھا۔ اب علی گڑھ میں جہاں انھیں مقابلتاً فراغت حاصل ہے، ان کی ذاتی توجہ اور اہتمام کی بدولت وائس چانسلر کے بنگلے سے لے کر یونیورسٹی کی آخری حدود تک ساری بستی گلزار نظر آتی ہے۔ سڑکوں، نالیوں، چپہ چپہ کی صفائی سے صحتِ جسم و صحتِ

دماغ دونوں کی سطح اونچی ہوگئی ہے۔ علی گڑھ کی بے ہنگم اور بدنما عمارتیں ذاکر صاحب کی آنکھوں میں طالب علمی کے زمانے سے کھٹکتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے انھیں ایک دم سے گرا کر بدل نہیں سکتے۔ اب جہاں تک وسائل میسر آتے ہیں نئی عمارتیں اپنے مذاق کے مطابق بنوا رہے ہیں۔

موسیقی اور مصوری میں ذاکر صاحب خاصا وسیع ذوق رکھتے ہیں اور مشرقی اور مغربی فنکاروں کے کمال سے یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اُن کے پاس منتخب تصویروں اور ریکارڈوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جس میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ خطاطی کا فن بھی ان کا پسندیدہ فن ہے اور ایک زمانے میں ان کے پاس کتبوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا جس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ شعر میں ان کی دلچسپی کا دائرہ اُردو، فارسی، انگریزی، جرمن شاعری کو محیط کئے ہوئے ہے۔ مگر سب سے زیادہ حظ وہ فارسی شاعری سے خصوصاً اقبال کے فارسی کلام سے اُٹھاتے ہیں۔ ذاکر صاحب کو جھوم جھوم کر دلکش لحن میں اقبال کے شعر پڑھتے سنیئے تو آپ کو یاد آجائے گا کہ اقبال مفکر، معلّم، مصلح ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔

علمی مشاغل میں ذاکر صاحب کو سب سے زیادہ پڑھنا اس سے کم پڑھانا اور اس سے کم لکھنا مرغوب ہے۔ کتب بینی کا ان کو اتنا گہرا اور سچا شوق ہے کہ انتہائی مصروفیت، پریشانی یہاں تک کہ علالت کی حالت میں بھی اس کا تھوڑا بہت سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ باقاعدہ تحصیل انھوں نے علم معاشیات کی کی تھی اور آگے چل کر فنِ تعلیم کو اپنا فن بنایا۔ لیکن ان کا مطالعہ ان دونوں کے علاوہ اور دنیا بھر کے موضوعات پر بھی حاوی ہے۔ البتہ قصے کہانیاں جن کا شوق اس زمانے میں لوگوں کو خبط کی حد تک پہنچ گیا ہے، ذاکر صاحب کم پڑھتے ہیں، درس و تدریس کا کام جب تک انھوں نے کیا، خاصی دلچسپی سے کیا لیکن باقاعدہ درس سے زیادہ ان کو اس کی لگن تھی اور اب بھی ہے کہ طلبہ کے دل میں عام مطالعے کا، اپنی اپج سے پڑھنے اور لکھنے کا شوق پیدا کریں۔ علی گڑھ ہی پر موقوف نہیں کسی یونیورسٹی کا کوئی نوجوان طالب علم یا استاد جو زر و منصب کی طلب اور پارٹی بازی کی لت سے محفوظ رہ کر خلوص سے علمی کام کرنا چاہتا ہے، ذاکر صاحب کو دل سے عزیز ہوتا ہے اور وہ اس کی اپنے امکان بھر پوری مدد کرتے ہیں۔

ذاکر صاحب اردو انگریزی تقریر و تحریر پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی تقریر سادگی اور پرکاری میں ان کی شخصیت کی بولتی ہوئی تصویر اور ان کی تحریر اگر یکسوئی سے لکھی ہوئی ہو بے ساختہ پن، جوش اور خلوص میں ان کی سیرت کا آئینہ ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی علمی اور تعلیمی دُنیا کو ذاکر صاحب سے یہ شکایت ہے کہ وہ بہت کم بولتے اور لکھتے ہیں۔ تقریر سے بچنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قلب کی بیماری کا دَورہ پڑنے کے بعد ڈاکٹروں نے ذاکر صاحب کو زیادہ تقریر کرنے سے منع کر دیا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ اس میں دل کی طاقت بہت کھپاتے ہیں۔ اب رہی تحریر سو اس کے لئے آج کل تو انھیں جتنی فرصت چاہیئے، وہ نصیب نہیں، لیکن دراصل یہ ان کی پُرانی کمزوری ہے کہ لکھنے کے کام کو برابر ٹالتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ یا تو وہ بالکل ہی ٹل جاتا ہے یا عین وقت پر رات بھر جاگ کر پورا کیا جاتا ہے۔

لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا کہ بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں ہندوستان میں زندگی گذارنے اور جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی جیسی قومی اور ملّی تعلیم گاہوں کے وائس چانسلر رہنے کے بعد ذاکر صاحب سیاست سے بالکل بے تعلق

رہے ۔ سیاسی لیڈر بننے کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہے، ان میں سے اکثر ذاکر صاحب میں بڑے بڑے لیڈروں سے زیادہ موجود ہیں ـــــ مردم شناسی، موقع شناسی، مصلحت بینی، شخصیت کی کشش، زبان کی طلاقت، جلد فیصلہ کرنے کی قوت ۔ مگر ایک تو معلّمی کی غالب صلاحیت نے انھیں اس طرح باندھ کر جکڑ لیا کہ کسی اور صلاحیت کے آزمانے کا موقع ہی نہیں دیا ۔ دوسرے ان سب صفات کے باوجود ان میں ایک صفت یعنی سخت دلی کی اس حد تک کمی ہے کہ سیاسی لیڈری کے میدان میں ان کا کامیاب ہونا بہت مشکل ہے ۔ جس کا دل دوسرے کو گراتے ہوئے دُکھتا ہو وہ اس اکھاڑے میں ہر ایک سے چت ہو سکتا ہے ۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اقتصادیات اور معاشیات میں مہارت حاصل کرنے کے باوجود اقتصادِ معیشت ذاکر صاحب کا سب سے کمزور پہلو ہے ۔ جہاں تک ان کا بس چلتا ہے وہ کوئی کام پہلے سے پورا منصوبہ بنا کر نہیں کرتے ۔ اس لئے اکثر انھیں بے جا زحمت اور زیر باری اُٹھانی پڑتی ہے ۔ ضبط و نظم کی کمی نے ان کی کارکردگی کو جتنی ہو سکتی تھی، اس سے کم کر دیا ہے ۔ ان کا معاشی قانون یہ ہے کہ طلب کو رسد کا پابند نہیں بلکہ رسد کو طلب کا پابند بناؤ چادر دیکھ کر پاؤں نہ پھیلاؤ بلکہ پاؤں دیکھ کر چادر بناؤ ۔ یہ بات اصولاً بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن اس پر عمل کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں ۔ جہاں تک قومی کاموں مثلاً جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی کا تعلق ہے ذاکر صاحب کا یہ اصول کہ وہ خرچ ضرورت یا حوصلہ کے مطابق بڑھاتے چلے جائیں اور آمدنی خرچ کے مطابق بڑھنے کی اُمید رکھیں، عموماً کامیاب رہا اس لئے کہ قوم اور حکومت کو ان کی جرأتِ رندانہ کی لاج رکھنی پڑی ۔ لیکن نجی زندگی میں انھیں بے اندازہ خرچ کرنے سے نہ صرف عسرت کے زمانے میں سخت دقتیں اُٹھانی پڑیں بلکہ اب یک گونہ فراغت کے زمانے میں بھی اُٹھانی پڑتی ہیں اس لئے کہ جس نسبت سے آمدنی بڑھی اسی نسبت سے جا و بیجا خرچ خصوصاً داد و دہش بھی بڑھتی چلی گئی ۔

ہم نے دیکھا کہ ذاکر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں مگر ان میں مرکزی اور بنیادی حیثیت انسان دوستی کو حاصل ہے ۔ انسان دوست شخصیت دو قسم کی ہوتی ہے ۔ ایک مرشد و معلّم کی دوسرے مصلح و مجاہد کی ۔ مرشد و معلّم کی توجہ کا موضوع انسان بحیثیتِ فرد کے ہے ۔ وہ ارشاد و ہدایت تعلیم و تربیت کے ذریعے افراد کے اندر ان قدروں کو پیدا کرتا ہے جو اسے انسانیت کے بلند منصب کے سزاوار بنائیں ۔ مصلح و مجاہد کا کام انسانی جماعت یا سماج کا سدھار کرنا ہے یعنی ان خرابیوں سے جو سماج میں پیدا ہو گئی ہیں، لڑنا اور ان کو دور کرنا، تاکہ انسانیت کی دبی ہوئی، روندی ہوئی قدریں اُبھر آئیں، چمک اُٹھیں ۔ دونوں قسم کے انسان دوستوں کی زندگی کا قانون محبت ہے ۔ لیکن ایک کے ہاں محبت جمالی شان دکھاتی ہے، دوسرے کے ہاں جلالی ۔ کبھی کبھی یہ دونوں شانیں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتی ہیں ۔ اور وہ پیمبر یا مجدّد کی شخصیت بن جاتی ہے ۔

ذاکر صاحب کی انسان دوستی اب تک مرشد و معلّم کی شان رکھتی ہے ۔ وہ انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اسکی روح سے محبت رکھتے ہیں ۔ اور اسے تعلیم و ہدایت کے ذریعے سنوارنا چاہتے ہیں ۔ وہ کہا کرتے ہیں اچھے مسلمان پیدا کرو، اچھی اسلامی جماعت پیدا ہو جائے گی ۔ اچھے ہندوستانی بناؤ، اچھا ہندوستان بن جائے گا ۔ لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ معلّم کا مدرسہ ہو یا مرشد کی خانقاہ، دونوں کا اثر فرد کی تعلیم و ہدایت میں محدود ہے ۔ دوسرے اجتماعی ادارے خاندان،

طبقہ، قوم، مذہب، رسم و رواج اگر الگ الگ نہیں تو مل کر انسانی شخصیت کی تشکیل میں کہیں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ان اجتماعی سانچوں میں سے اکثر خراب ہو گئے ہوں، اگر آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو تو معلّم اور مرشد کی ساری سعی رائگاں جاتی ہے جب تک کوئی مصلح اور مجاہد اجتماعی سانچوں کو نہ سدھارے یا ان کو توڑ کر نئے سانچے نہ بنائے اور جو ایک ہی شخص میں معلّم اور مرشد کے ساتھ مصلح اور مجاہد یعنی مجموعی طور پر مجدّد کی شان پیدا ہو جائے تو پھر کیا کہنا!

شاید ذاکر صاحب جیسے صوفی منش کو یہ توڑ پھوڑ قانونِ وحدت اور آئینِ محبت کے خلاف نظر آئے۔ لیکن اس مشکل کو اس مردِ عارف نے حل کر دیا ہے جس نے کہا ہے۔ ؎

نقشِ حق را ہم ز امرِ حق شکن!
بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن

اور اس مردِ عمل نے ثابت کر دیا کہ پُرانے سانچے خواہ سنگِ خارا کے بنے ہوئے ہوں بے تیشہ و گُرز محض تمسک بالحق صرف ”ستیہ گرہ“ سے توڑے جا سکتے ہیں۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

شاہد احمد دہلوی

اللہ بخشے مرزا عظیم بیگ چغتائی بھی عجب خوبیوں کے آدمی تھے۔ سدا کے مرجھوڑے۔ پیدا ہوئے تو اتنے نحیف و کمزور کہ روئی کے پہلوں پر رکھے گئے۔ بڑے ہوئے تو روگی مرجین۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ ددھیال بھی جائداد رکھتی اور ننھیال بھی ساہو تھی۔ ان کے والد قسیم بیگ چغتائی یو۔ پی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آبائی وطن آگرہ تھا۔ یہیں ان کی جدی جائداد بھی تھی۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے نانا منشی امراؤ علی تھے جو اب سے نصف صدی پہلے کے مشہور ناول نگار تھے۔ ان کی تصانیف "رزم بزم" اور "البرٹ بل" ایک زمانے میں بہت مقبول تھیں۔ مرزا صاحب کے والد بڑے ٹھاٹ کے آدمی تھے۔ سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے علی گڑھ کے ابتدائی گریجویٹس میں سے تھے۔ اپنے زمانے کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ورزش کا بھی شوق تھا۔ سواری کے لئے منہ زور سے منہ زور گھوڑے تلاش کر کے رکھتے تھے۔ بڑے طاقتور آدمی تھے۔ ایک بلی نے گھر والوں کو بہت عاجز کر رکھا تھا۔ ایک دن وہ ان کے ہاتھ آ گئی۔ ہاتھ اس کی کمر پر پڑا۔ چاہتے تھے کہ اسے گھر سے باہر اچھال دیں مگر وہ کم بخت کلائی میں لپٹ گئی۔ انھیں بھی تاؤ آ گیا۔ اس نے اپنے پنجوں اور دانتوں سے ان کی کلائی ادھیڑ دی مگر انھوں نے بھی اپنے پنجے کی گرفت اتنی سخت کی کہ اس کی ہڈی پسلی ایک ہو گئی اور اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کا دم نہ نکل گیا۔ ویسے وہ بڑے خوش مزاج آدمی تھے اور چھوٹے بڑے سب سے اچھی طرح پیش آتے تھے۔

چغتائی صاحب چونکہ پیدا ہی کمزور ہوئے تھے اس لئے اور بچوں کے مقابلے میں ان کی طرف والدین کی توجہ زیادہ رہتی تھی۔ لاڈ پیار میں پلے۔ کچھ گھر پر پڑھا، کچھ اٹاوہ کے سکول میں۔ اس کے بعد علی گڑھ سے بی۔ اے اور ایل ایل۔ بی کے امتحانات پاس کئے۔ کالج ہی کے زمانے میں نواب مزمل اللہ خان کے ہاں ملازمت بھی کر لی تھی۔ کیونکہ شادی ہو گئی تھی اور اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں مضمون نگاری بھی شروع کر دی تھی، بلکہ بچوں کی کہانی "قصرِ صحرا" کا پہلا حصہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی لکھ چکے تھے۔ اس کے باقی دو حصے بعد میں لکھے۔ محنتی اور ذہین بہت تھے۔ جسمانی کمزوری کی تلافی دماغی قوت سے ہو گئی تھی۔ کالج کے زمانے میں اسلامی تاریخ کے سلسلے میں مذہب کا مطالعہ بھی کر ڈالا اور حدیث اور فقہ سب چاٹ گئے۔ علی گڑھ والوں کی طرح یہ بھی آزاد خیالی اور مغربیت کے دلدادہ تھے۔ قدامت پسندوں اور مذہبی خیال والوں سے ان کے مباحثے رہنے لگے۔ انھیں اس میں بھی مزہ آتا تھا کہ دوسروں کو چھیڑیں، ستائیں، جلائیں۔ حدیثیں ازبر تھیں۔ مستند کتابوں کے حوالے یاد تھے۔ بڑے دھڑلّے

سے قائل کر دیتے تھے۔ اس کے بعد یہ نوبت آگئی کہ شرط لگا کر بحث کرتے تھے۔ مثلاً کسی مولانا قسم کے آدمی سے داڑھی رکھنے نہ رکھنے پر بحث ٹھنتی تو شرط لگاتے کہ "اگر تم جیت گئے تو ہم داڑھی رکھ لیں گے اور اگر ہم جیت گئے تو تمھاری داڑھی مونڈ لیں گے۔" بہت سے تو شرط کی نوعیت ہی سے گھبرا کر بھاگ جاتے اور اگر کوئی ہمت کر کے جم گیا تو سمجھو کہ اس کی شامت آگئی۔ سب لڑکوں کو نیوتا دے دیا جاتا۔ شام کو ایک جمِ غفیر کی موجودگی میں بحث شروع ہوتی۔ کتابیں کھولی جاتیں، دلیل کی تصدیق یا تردید کی جاتی۔ آخر میں نہ جانے کیا ہوتا کہ چغتائی ہی ہمیشہ جیت جاتے۔ پھر کسی منچلے کے ہاں سے شیو کا سامان منگایا جاتا اور نہایت احتیاط سے داڑھی مونڈ کر محفوظ کر لی جاتی۔ اس طرح انھوں نے کئی داڑھیاں جیتی تھیں۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جیتی ہوئی داڑھی بیچ دی جاتی تھی۔ وہ اس طرح کہ ہارے ہوئے مولانا سے اس کی کوئی مناسب قیمت لے لی جاتی اور ان کو داڑھی بخش دی جاتی۔ اس "قصاص" سے بار لوگ مٹھائی منگاتے اور سب کو شیرینی تقسیم کی جاتی۔ ایسے ہی ایک مباحثے میں چغتائی صاحب ایک دفعہ ہار گئے۔ انھیں داڑھی رکھنی پڑی۔ اس وقت کی ایک تصویر بھی تھی جسے میں نے "کامران" کے سرورق پر چھپا پایا تھا۔ خدا جانے پھر کیا کفارہ ادا کر کے اس سے نجات پائی۔

چغتائی صاحب کی شادی رامپور کے ایک پٹھان گھرانے میں ہوئی تھی جو مذہب کا بڑی سختی سے پابند تھا۔ چغتائی صاحب نے شادی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ بیوی کا برقعہ اتروا دیا اور انھیں کھلے بندوں لانا لے جانا شروع کر دیا۔ اسی وضع سے انھیں اپنی سسرال رامپور بھی لے کر پہنچے تو وہ لوگ بہت بگڑے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کی اور سسرال والوں کی تناتنی ہوگئی۔ مصیبت بچاری بیگم چغتائی کی! باپ بھائیوں کو یہ زعم کہ ہماری لڑکی بھلا ہمارے کہنے سے باہر کیسے ہو سکتی ہے۔ ادھر دل بگڑے مرزا کہ چاہے جان چلی جائے آن نہ جانے پائے۔ اڑ گئے کہ صاحب وہی ہوگا جو ہم کہتے ہیں۔ سر پھرے پٹھانوں نے کہا۔ ایسا ہرگز ہو ہی نہیں سکتا۔ کنبے برادری کے سب بڑے بوڑھے جمع ہوئے۔ صلاح ہوئی کہ لڑکی کو گھر بٹھا لیا جائے اور داماد صاحب کو بیک بینی و دوگوش روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ مرزا صاحب سے کہہ دیا گیا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے چلتے پھرتے نظر آئیے۔ مرزا کھول گئے مگر کیا کرتے، بولے "میری بیوی سے اور پوچھ لیجیے۔ اگر وہ بھی یہاں رہنا چاہتی ہیں تو خوشی سے رہیں۔ میں چلا جاؤں گا اور اگر وہ میرے ساتھ چلنا چاہتی ہیں تو آپ تو آپ دنیا کی کوئی طاقت انھیں نہیں روک سکتی۔" بات معقول تھی۔ سمجھ میں آگئی۔ لڑکی سے پوچھا تو وہ نیک بخت چادر اوڑھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس غریب کو تو مرنا بھرنا تھا۔ ماں باپ کے پچھوڑے سے لگی کب تک بیٹھی رہتی؟ گھر والوں نے کہا "بی بی! ہماری بات نیچی کر کے جا رہی ہو تو پھر کبھی اس دہلیز پر نہ آنا۔ آج سے تم ہمارے لئے اور ہم تمھارے لیے مر گئے۔" وہ بچاری دھاڑوں روتی میاں کے ساتھ ہو لی اور مدتوں میکے نہ گئی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد چغتائی صاحب نے کتاب "قرآن اور پردہ" لکھی۔ پھر چند سال بعد "حدیث اور پردہ" اور اس کے کچھ عرصہ بعد "رقص و سرود"۔ اسی عرصے میں کچھ لوگوں کے سمجھانے اور کچھ اپنے تلخ تجربات کی وجہ سے انھوں نے مذہب کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ادب کی طرف کر لی اور سنہ ۱۹۲۹ء سے ان کے ادبی مضامین اور افسانے شائع ہونے لگے۔

جنوری سنہ ۳۰ء میں ان کا افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" نیرنگِ خیال کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس افسانے کے چھپتے ہی ہمارے ادبی حلقوں میں ایک بھونچال سا آگیا۔ جس کو دیکھو اس کی زبان پر اسی کا ذکر۔ بعد میں چغتائی صاحب نے وہ بے شمار

خطوط مجھے دکھائے جو اس افسانے کے بارے میں ان کے پاس آئے تھے۔ بیشتر خطوط توصیفی تھے لیکن بعض خطوط میں نفسیاتی کیفیات کی روشنی میں افسانے کے بعض مقامات کی توضیح چاہی گئی تھی۔ بعض میں شعور اور لاشعور کی بحث کی گئی تھی۔ ایک خاتون نے پوچھا کہ ہیرو جب ہیروئن سے پوچھتا ہے "بھولوگی تو نہیں ..... بھولوگی تو نہیں ..... بھولوگی تو نہیں .....؟" تو اس میں جو وقفے ہیں کیا آپ بتائیں گے کہ یہ لذتِ التشام سے مغلوب ہونے کے ہیں؟ چغتائی صاحب بولے "ہمیں آج تک بھی نہیں معلوم کہ لذتِ التشام کیا ہوتی ہے۔" چنانچہ ہم دونوں نے لغت میں اس کے معنی دیکھے۔ اور چغتائی صاحب ہنسے کہ میرے تو وہم میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔ لوگ بھی کیسی کیسی توضیحیں کر لیتے ہیں!

اس افسانے کے بعد چغتائی صاحب کے چند اور افسانے دوسرے رسالوں میں چھپے مگر وہ اس طرز کے نہیں تھے۔ اس سال اس سے بہتر اور کوئی افسانہ چھپا ہی نہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں بڑے بڑے افسانہ نگار تقریباً سبھی زندہ تھے اور لکھ رہے تھے۔ اس کے کوئی ایک سال بعد میرے پاس ایک خط علی گڑھ سے آیا۔ اس میں چغتائی صاحب کا خط اور دو افسانے تھے۔ خط میں بڑا خلوص تھا اور کسرِ نفسی بھی۔ ساقی دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔ ان کا خط پا کر بے حد خوشی ہوئی اور اسی دن سے ان سے ملنے کو جی چاہنے لگا۔ یہ افسانے تھے "ٹکٹ چیکر" اور "کولتار"۔ دوسرا افسانہ بہت مشہور ہوا اور جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو ہم نے منصوبہ بنایا کہ "کولتار" کا پورا ناول کیسے مرتب کیا جائے۔

مرزا صاحب کا پہلا خط ملنے کے بعد ان سے دس سال تک خط و کتابت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ شاید ہی کوئی ہفتہ ناغہ ہوتا ہو۔ ان خطوں میں دنیا زمانے کی باتیں ہوتی تھیں۔ اور جب خطوں سے جی نہ بھرتا تو وہ دلی چلے آتے یا مجھے ان کے پاس جانا پڑتا۔

پہلا خط بھیجنے کے دو تین ہی مہینے بعد ان کا خط آیا کہ میں دلی آ رہا ہوں اور رات کی فلاں گاڑی سے، بیوی بھی ساتھ ہوں گی۔ مرزا صاحب کی تصویر ہم سب دیکھ چکے تھے۔ رات کو میں، انصار ناصری اور فضل حق قریشی انھیں لینے اسٹیشن پہنچے ریل آئی، ایک ایک ڈبہ چھان مارا۔ چغتائی صاحب کا کہیں پتہ نہ چلا۔ جب گاڑی بالکل خالی ہو گئی تو ہم اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔ سامنے سڑک پر سے ایک تانگہ گذرا۔ اس میں ایک خاتون اور ایک صاحب دکھائی دیے۔ فضل حق نے کہا "وہ جا رہے ہیں چغتائی صاحب!" میں نے اور انصار نے چونک کر انھیں دیکھا۔ کوئی بڈھا مُرمُرا سا آدمی تھا۔ موٹی سی عینک لگائے، پھر ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ اگلے دن صبح میں گھر ہی میں تھا کہ اطلاع پہنچی "چغتائی صاحب مردانے میں آئے بیٹھے ہیں۔" میں لپک کر پہنچا تو دیکھا کہ بیٹھک میں وہی تانگے والا بڈھا بیٹھا ہے۔ غور سے دیکھا تو اسے تصویر سے کچھ مشابہ پایا۔ اس نے کہا "آپ ہی شاہد صاحب؟" میں نے کہا "جی ہاں" اور وہ مجھ سے چمٹ گئے۔ بولے "اماں میں تو سمجھا تھا کہ کوئی خوفناک شکل کا مولوی ہوگا۔ مولوی شاہد احمد، تم تو اچھے خاصے آدمی ہو۔" پھر خوب ہنسے تو میں نے دیکھا کہ نیچے کے چار دانت غائب۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے کونوں پر بے شمار جھریاں، کلّے پچکے ہوئے۔ ہونٹوں کے دونوں طرف قوسیں۔ لبوں پہ لاکھا سا جما ہوا۔ چھوٹی چھوٹی کتری ہوئی مونچھیں، داڑھی صاف، دُبلا پتلا سا شخص عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے مجھے جھانک رہا ہے۔ میں نے کہا "مرزا صاحب! آپ اپنی تصویر سے بالکل نہیں ملتے۔ کل رات کو آپ کو تانگے میں جاتے دیکھا مگر ہم نے

آپ کو نہ پہچانا۔ کہاں ٹھہرے؟ بھابی کہاں ہیں؟ میرے گھر کا پتہ تو آپ کو معلوم ہی تھا۔ یہاں سیدھے کیوں نہ چلے آئے؟" بولے، "میں نے بھی تمھیں اسٹیشن پر دیکھا تھا مگر تمھیں جانتا نہ تھا۔ طبیہ کالج میں میری ایک بہن ہیں، ان کے یہاں چلا گیا۔ اب تمھارا گھر دیکھ لیا۔ شام کو آجاؤں گا بیوی کو لے کر۔" اس کے بعد ان سے رسالوں اور مضمون نگاروں اور مضمونوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ اندازہ ہوا کہ مرزا صاحب کی قوتِ گویائی بھی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ دوسرے کو ہاں ہوں سے آگے بڑھنے کی زحمت نہیں دیتے۔ مگر باتیں اتنی دلچسپ کہ گھنٹوں سنو اور جی نہ بھرے۔

شام کو مرزا صاحب حسبِ وعدہ مع بیگم کے آگئے۔ رات کو سب احباب جمع ہوئے اور خوب قہقہے چہچہے رہے۔ رات گئے احباب رخصت ہوئے تو ہم سونے کے لئے لیٹے، مرزا صاحب، میں اور میرے منجھلے بھائی۔ مرزا صاحب بولتے رہے میں سنتا رہا۔ وہ بولتے رہے، میں سو گیا۔ صبح اذانوں کے وقت انھوں نے آپ ہی آپ پھر بولنا شروع کر دیا۔ دیکھا کہ ہوں ہاں بھی غائب ہے تو میرا شانہ ہلا کر بولے "ارے بھئی توبۃ النصوح کا پوتا آخر کب تک خواب دیکھتا رہے گا؟" ناچار جاگ کر ان کی باتیں سننے لگا۔ بولے "سنتے ہو، میں ابھی بیت الخلاء گیا تو ایک افسانے کا پلاٹ سمجھ میں آگیا۔ آج جانے سے پہلے تمھیں ہم وہ افسانہ لکھ کر دے جائیں گے۔ لو بس اب اٹھ بیٹھو۔ منہ ہاتھ دھو ڈالو۔"

اتنے میں کہ تیار ہوں اور ناشتہ آئے چغتائی صاحب نے آدھا افسانہ لکھ ڈالا۔ ناشتے کے بعد کوئی صاحب ان سے ملنے آگئے۔ میں ٹل گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد آیا تو ان کے پاس افسانہ مکمل تھا اور وہ میرے منجھلے بھائی سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ پولیس کے آدمی، ادب کے جھمیلوں سے اللہ نے انھیں محفوظ رکھا تھا۔ بولے "لو میاں سنبھالو انھیں۔ خوب آدمی ہیں تمھارے چغتائی صاحب بھی۔ میاں غضب خدا کا، ساری رات باتیں کرتے رہے تم دونوں!" وہ جب سوئے تھے تو ہم باتیں کر رہے تھے، جب جاگے تو ہم باتیں کر رہے تھے۔ سمجھے کہ ہم ساری رات ہی باتیں کرتے رہے۔ مرزا صاحب اس لطیفے سے بہت محظوظ ہوئے۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے افسانے کی شانِ نزول بتائی کہ "کل جو تم نے مجھے اسٹیشن پر نہیں پہچانا تو خاصی پریشانی ہوئی مگر واقعی میری تصویر مجھ سے نہیں ملتی۔ اور بھئی وہ تصویر کس کام کی جو اصل سے مل جائے؟ یہ افسانہ اپنی تصویر پر لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے "یہ کس کی تصویر ہے؟" اس کے بعد انھوں نے افسانہ سنایا۔ حیرانی ہوئی کہ قلم برداشتہ ایسا شگفتہ افسانہ! اور اس کے بعد تو میں نے ان کی یہ کیفیت دیکھی کہ باتیں بھی کرتے جا رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھ رہے ہیں۔ عدالت میں مقدمہ بھی پیش کر رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھا جا رہا ہے اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس افسانے کے کچھ ورق تو گھر آگئے اور کچھ ملزم کی مسل میں لگ کر عدالت کے فائل میں چلے گئے۔

ایک دفعہ اپنی وکالت کے زمانے میں مجھے جودھپور بلایا۔ میں نے لکھا "اگلے ہفتے آؤں گا۔ کچھ دلّی سے منگانا ہو تو لکھیے۔" خط آیا "اور کچھ لاؤ یا نہ لاؤ، پائے ضرور لانا۔ مدتیں ہوگئیں کھائے ہوئے۔" دلّی سے جودھپور کوئی چوبیس گھنٹے کا راستہ تھا۔ میں نے سوچا کہ پائے لے جاؤں گا، جاڑے کے دن ہیں، خراب نہیں ہوں گے۔" اتفاق سے ایک عزیز جے پور کے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا "اسٹیشن ہی پر دھر لئے جاؤ گے۔ جے پور، جودھپور، کسی ہندو ریاست میں گائے نہیں ہوتی۔ اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔" اس لئے ارادہ ملتوی کر دیا۔ مگر جودھپور پہنچتے ہی مرزا صاحب نے پہلا سوال یہی کیا "پائے لائے ہمارے لئے؟" میں نے نہ لانے کی وجہ

بتائی تو بولے "ارے بھئی ہم وکیل ہیں، اگر تم پکڑے جاتے تو ہم تمھیں جرمانہ دے کر چھڑا لاتے، ابھی ہمارے ایک مؤکل کی کار کی ٹکر ایک کمہار سے ہو گئی تھی۔ ان محترمہ کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ عدالت نے بارہ روپے جرمانہ کیا۔" میں نے کہا "آپ کی وکالت یہاں کچھ چل بھی رہی ہے؟" کہنے لگے "کیوں نہیں؟ ہمارا رجسٹر دیکھو۔" یہ کہہ کر اپنا رجسٹر نکال کر دکھانے لگے۔ کسی سے پیشگی پانچ، کسی سے دس وصول ہوئے تھے۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ باقی میں ڈال رکھے تھے۔ بہت چہک کر بولے "پچھلے مہینے چالیس روپے کی آمدنی ہوئی، چھ سو بقایا میں ہیں۔" میں نے کہا "ماشاءاللہ خوب چل رہی ہے۔" بولے "میاں تم یافت کو دیکھتے ہو، بقایا کو دیکھو۔ ہزاروں پہ نوبت ہے، ہزاروں پر۔" کوئی مؤکل آ گیا تو چودھری منشی کو بلا کر کہا "اس سے کہہ دو کہ وکیل صاحب کے پاس کام بہت ہے۔ کل کچہری میں ملے۔ ارے تم دیکھتے نہیں ہمارے دوست دلّی سے آئے ہوئے ہیں۔ مؤکل تو اور بھی آ جائے گا۔ یہ کب کب ہاتھ آتے ہیں۔" اور پھر مرزا صاحب کی دلچسپ باتیں شروع ہو جاتیں اور باتیں ختم ہونے نہ پاتیں کہ وہ اپنے کسی ناول کا مسودہ سنانا شروع کر دیتے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنا ناولٹ "ویمپائر" لکھا تھا۔ بولے "میں پڑھتا ہوں، تم اس کی زبان ٹھیک کرتے جاؤ۔" میں نے کہا "آپ کی زبان ایسی نہیں ہوتی کہ میں اسے ٹھیک کروں۔" کہنے لگے "نہیں، مجھے اپنی کمزوری معلوم ہے۔ میں زبان کا بالکل خیال نہیں رکھتا، بس لکھے چلا جاتا ہوں۔" میں نے کہا "تو آپ یہ مسودہ مجھے دے دیجئے، میں اس کی نظرِ ثانی کر دوں گا۔" کہنے لگے "اچھا سن تو لو۔ ابھی مکمل کہاں ہوا ہے۔ پلاٹ آ کر ایک جگہ اڑ گیا ہے۔ آگے نہیں چلتا۔" پھر دو گھنٹے تک وہ سناتے رہے اور مسودہ ختم ہو گیا۔ پوچھنے لگے "بتاؤ اب اسے ختم کیسے کریں؟" میں نے کچھ بتایا، ان کی سمجھ میں آ گیا، بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے "بس بھئی کل کی روانگی ملتوی کرو تو ہم اپنا یہ ناول مکمل کر کے تمھیں دے دیں گے۔" اس قدر لجاجت سے روکتے تھے کہ مجھے شرمندگی ہونے لگتی تھی۔ انھیں نیند بہت کم آتی تھی۔ رات کو بارہ ایک بجے تک جگاتے تھے۔ اس لیے میں صبح سات آٹھ بجے تک اٹھتا تھا۔ پھر دوپہر کو ضرور سوتا تھا۔ غرض میں تو سوتا ہی رہا اور انھوں نے "ویمپائر" مکمل کر دیا اور دو ایک افسانے بھی لکھ کر تھما دیئے۔

چغتائی صاحب کے اور سب عزیزوں کو دیکھ کر کہنا پڑا کہ "ایں خانہ تمام آفتاب است۔" بڑے بھائی ملے۔ خوب تندرست و توانا، معلوم ہوا کہ آپ بھی تھرڈ کلاس وکیل ہیں۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ مرزا صاحب سے چھوٹے بھائی ملے۔ قوی الجثہ، مزاجاً صوفی، نیچے کے چار دانت غائب۔ ان سے چھوٹے بھائی بالکل چغتائی صاحب کی شکل کے مگر اچھی صحت۔ آپ کیا کرتے ہیں؟ فرمایا "پڑھتا ہوں!" نیچے کے چار دانت غائب۔ سب سے چھوٹے بھائی نذیر سب سے بڑے، ماشاءاللہ دیوزاد، یہ لمبا تڑنگا جوان معلوم ہوا کہ آپ کو دق ہے۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے مرزا صاحب سے پوچھا "یہ کیا مصیبت ہے کہ سب کے چار چار دانت غائب؟" کہنے لگے "ایک دانتوں کے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ انھی چار دانتوں سے پائیوریا ہوتا ہے۔ بس سب نے اکھڑوا ڈالے۔" جب عصمت چغتائی ملیں تو سب سے پہلے میں نے یہی دیکھا کہ کہیں ان کے بھی چار دانت تو غائب نہیں؟ بحمداللہ ان کے سارے دانت برقرار تھے۔

ایک دفعہ پھر خط لکھا کہ "ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ آ جاؤ۔ کسی کے نوکر تھوڑی ہو۔ تم آؤ گے تو تم سے ڈس کس کر کے کئی افسانے لکھیں گے۔" میں پہنچا۔ صحت پہلے سے بدتر تھی۔ کھانسی زیادہ تھی۔ میں نے کہا آپ اپنی صحت کی طرف سے غفلت کر رہے ہیں۔ کہنے لگے "ڈاکٹر کہتے ہیں تمھیں دق ہے۔ میں کہتا ہوں مجھے دق نہیں دمہ ہے۔" ان کی ضدی طبیعت نے ڈاکٹروں کی رائے ماننے

سے بھی انکار کر دیا تھا۔ من مانی دوائیں کھاتے رہتے تھے۔ گھر والوں میں سے بھی کسی کی نہ سنتے تھے۔ بلکہ جو کچھ کوئی کہتا اَدبَدا کر اس کے خلاف کرتے اور تکلیف اُٹھاتے۔ بھابی بھی ان کی ضد سے پریشان ہوتی تھیں مگر ان کی ایک بھی پیش نہ جاتی تھی۔ بیچاری خاموشی سے سارے گھر کا کام بھی کرتیں، بچوں کی نگرانی اور پرورش بھی اور شوہر کی خدمت بھی۔ اور کیا مجال جو کبھی پیشانی پر شکن تک آجائے۔

دو تین افسانے تو چغتائی صاحب نے میرے لئے پہلے ہی سے لکھ رکھے تھے۔ کئی افسانوں کے انھوں نے پلاٹ سُنائے سب اچھے، ایک سے ایک عمدہ۔ ایک مارواڑ کا رومان سُنایا ——— سوانہ کی روحیں ——— یہ سب سے زیادہ مجھے پسند آیا۔ کہنے لگے ”تو لاؤ پہلے اسی کو لکھ ڈالیں،“ اور کاغذ قلم لے کر لکھنا شروع کر دیا۔ میں بیٹھا واقعی مکھیاں مارتا رہا کیونکہ اس سال وہاں ساری دنیا کی مکھیاں آگئی تھیں۔ ایک گھنٹہ میں انھوں نے کئی صفحے لکھ ڈالے، پھر بولے ”میاں بہت کھیل چکے۔ لو ذرا اب تم قلم لو۔ میرا ہاتھ تھک گیا۔“ میں نے قلم سنبھالا۔ وہ بے تکلف بولتے رہے۔ میں لکھتا رہا۔ دو تین صفحے لکھ کر میں نے کہا ”بس جی میں تو لکھ چکا۔ مجھے تو نیند آرہی ہے۔ مرغن کھانے کھلاتے ہو تو سونے بھی دو۔“ کہنے لگے ”اچھا تو مچھر دانی لگا کر سو رہو۔“ عصر کے وقت انھوں نے جگایا۔ ”کیا آج چلنے نہیں ہو گے؟“ اٹھنا پڑا، بولے ”افسانہ ختم پر آرہا ہے۔ شام تک ختم ہو جائے گا۔“ میں تو چائے پی کر کسی کے ساتھ ٹل گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے لکھتے رہے۔ چراغ جلے گھر واپس پہنچا تو بڑے خوش خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے ”لو بھئی یہ افسانہ“۔ اور کوئی چالیس فل اسکیپ کا پلندہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کہا ”شاباش ہے مرزا صاحب آپ کی ہمت کو۔ بس کل صبح کی گاڑی سے میں چلا جاؤں گا۔“ جانے کے نام سے ان کا منہ اُتر گیا۔ کہنے لگے ”نہ جانے کیا بات ہے تم آجاتے ہو تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ کل نہ جاؤ، ہم تمہیں دو افسانے اور لکھ دیں گے۔“ انھوں نے یہ بات کچھ ایسے اندوہ ناک لہجے میں کہی کہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے کہا ”اچھا میں پرسوں چلا جاؤں گا۔“ بچوں کی طرح خوش ہونے لگے۔ مجھے تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ میرے پاس چغتائی صاحب کے تقریباً سو صفحے کے مضامین تو ہو ہی جائیں گے۔ اگر سو صفحے کے اور ہو جائیں تو ”چغتائی نمبر“ ہی کیوں نہ چھاپ دیا جائے۔ اتنے بڑے مضمون نگار اور ایسے پیارے دوست کی ایک اچھی یادگار ہی قائم ہو جائے گی۔ میں نے ان سے کہا کہ ”مرزا صاحب! تو پھر آپ یوں کیجئے کہ کل تو آپ مجھے جو کچھ لکھ کر دے سکیں دے دیں، اس کے بعد پندرہ بیس دن میں مجھے چند مضامین اور لکھ دیجئے۔ میں ”چغتائی نمبر“ چھاپے دیتا ہوں۔“ یہ تجویز انہیں پسند آگئی۔ پوچھا ”بک بھی جائے گا؟“ میں نے کہا ”نہ بکنے کی کوئی وجہ نہیں۔“ کہنے لگے ”ایک ہفتے میں تمہیں سب مضامین پہنچ جائیں گے۔“ میں نے چند تجویزیں انھیں بتائیں کہ اس اس طرح کے مضامین ضرور لکھیئے مثلاً ایک آدھ غمناک افسانہ، دو ایک مکالمے یا ڈرامے اور ایک مضمون یہ کہ ”میں مضمون کیسے لکھتا ہوں“۔ کہا ”یہ سب ہو جائے گا؟“

اگلے دن دو مضمون تو انھوں نے لکھ کر دے دیئے اور بیسیوں پلاٹ سُنائے۔ پھر کہنے لگے ”لکھتے لکھتے میرا ہاتھ تھک جاتا ہے۔ اگر کوئی شارٹ ہینڈ میں لکھنے والا مل جائے تو میں کئی ناول بول دوں۔“

اگلے دن صبح سویرے میں اُٹھ بیٹھا۔ بستر لپیٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مرزا صاحب آگئے۔ افسردگی چہرے سے ظاہر تھی۔ کہنے لگے ”ارے بھئی سنتے ہو، آج اور نہ ٹھہر جاؤ، سارے مضامین ساتھ ہی نہ لیتے جاؤ؟“ دل کٹ گیا ان کے اس خلوص کو دیکھ کر۔ میں نے کہا ”اگر آپ کو میرے ٹھہر جانے سے خوشی ہوگی تو میں ضرور ٹھہر جاؤں گا، مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ آپ میرے لئے مرتے رہیں۔

پندرہ دن میں تو یہ مضامین لکھے جائیں گے جو میرے پاس ہیں۔ باقی آپ بھیجتے رہیئے گا۔“ بولے ”ارے بھئی تم نہیں جانتے کہ تمھارے یہاں ہونے سے میری کیا کیفیت ہے۔ سچ کہتا ہوں میں بالکل تندرست ہو گیا ہوں۔ بھوک لگنے لگی، خوراک دگنی ہو گئی۔ جی چاہتا ہے کہ لکھوں اور لکھتا ہی رہوں۔ میں اس وقت سے ڈر رہا ہوں کہ تم چلے جاؤ گے تو مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا جائے گا اور پھر بیماری مجھے دبوچ لے گی۔“ میں نے ان کو بہلانے کے لئے کہا ”اب تو آپ پہلے سے بہت اچھے ہیں۔ میں دلّی جا کر چند یونانی مرکبات آپ کو بھیجوں گا ان سے رہی سہی کمزوری بھی جاتی رہے گی۔“ مگر وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئے اور بولے ”بس تو آج تم نہیں جا رہے؟“ میں نے کہا ”جی نہیں!“ جلدی جلدی بھابی سے جا کر کہا ”شاہد صاحب آج نہیں جا رہے۔ آج انھیں جودھپور کی سیر کرائی جائے گی۔ ذرا جلدی ناشتہ کرا دو آج۔“ ناشتے کے بعد کسی دوست کی کار منگوائی۔ شہر کا ایک چکّر اس میں لگایا۔ پھر ایک پرانا قلعہ دکھایا۔ ایک نیا محل تیار ہو رہا تھا، وہ دکھایا۔ ایک عزیز تھے، ان سے ملوایا۔ دوپہر کو گھر آئے۔ کھانا کھایا۔ باتیں کرتے کرتے میں تو سو گیا اور انھوں نے اتنی دیر میں دو چھوٹے چھوٹے مضمون لکھ لئے۔ کہنے لگے ”آج رات کو تمھیں گانا بھی سنوایا جائے گا۔“ میں نے کہا ”آپ کو تو اس سے نفرت ہے۔“ بولے ”تمھیں تو نہیں ہے۔ ایک ہندو پکّا گانا گاتا ہے، اسے بلوایا ہے۔“ وقت اچھا گذرا۔ صبح ناشتہ پر پھر کچھ روکنے کی تمہید اٹھائی تھی کہ بھابی نے کہا ”کیوں آپ انھیں پریشان کرتے ہیں۔ گھر والے پریشان ہوں گے کہ تین دن کو کہہ کر گئے تھے، آج چھ دن ہو گئے۔“ کہنے لگے ”ارے صاحب یہ کسی کے نوکر تو ہیں نہیں کہ ان کی حاضری ضروری ہو۔ ہم یہاں سے ان کے گھر تار دیئے دیتے ہیں۔ انھیں آخر کس بات کا فکر ہے؟“ بھابی شاید کچھ اور کہتیں مگر بیچ میں مرزا صاحب کا چھ سال کا بچہ تجو بول پڑا ”امّاں یہ دلّی میں کیا کرتے ہیں؟“ بھابی نے کہا ”کچھ بھی نہیں۔“ بچے نے کہا ”تو پھر یہ کھاتے کہاں سے ہیں؟“ ہم سب ہنس پڑے اور وہ بات بھی اُڑ گئی۔ چلتے وقت مرزا صاحب نے کہا ”وعدہ کرو کہ پھر جلدی آؤ گے۔“ میں نے کہا ”جب آپ یاد فرمائیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔“

نواب صاحب جاورہ خبر نہیں کب سے چغتائی صاحب کی قدردانی پر مائل تھے۔ کچھ عرصے بعد سنا کہ نواب صاحب نے انھیں جاورہ بلا کر چیف جج بنا دیا۔ مرزا صاحب نے جاورہ بلایا۔ میں وہاں بھی گیا۔ نہایت عالیشان کوٹھی انھیں ملی ہوئی تھی۔ چغتائی صاحب بہت بڑے عہدہ دار تھے اور نواب صاحب کے مزاج پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ مجھ سے کہا کہ ”نواب صاحب سے کب ملو گے؟“ میں اتنے بڑے آدمیوں سے نہیں ملتا جن سے مل کر مجھے ذلّت محسوس ہو۔“ مرزا صاحب نے کہا ”ارے بھئی تمھارے دادا کے تو بڑے قدردان ہیں یہ نواب۔ میں نے یہاں لوگوں سے سنا ہے کہ نواب صاحب ایک دفعہ ایسے بیمار پڑے کہ ان کے جینے کی آس نہ رہی۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ کہہ رہے ہیں: مولوی نذیر احمد کا ترجمۂ قرآن شائع کرو، تم اچھے ہو جاؤ گے۔ انھوں نے تمھارے والد سے اجازت منگوائی اور دو جلدوں میں صرف ترجمہ اپنے چھاپہ خانہ سے شائع کیا اور واقعی اچھے ہو گئے۔ تو وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔“ میں نے کہا ”اور کچھ خیرات بھی مجھے دیں گے۔“ مرزا صاحب نے کہا ”تو پھر کیا ہوا؟“ میں نے کہا ”مجھے معاف فرمائیے، میں تو صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔ میرے تو نواب یا بادشاہ جو کچھ ہیں آپ ہیں۔“ مگر مرزا صاحب نے میری اس بات کو کچھ پسند نہیں کیا اور دل میں شاید کچھ ناراض بھی ہوئے۔

جاورہ میں مرزا صاحب کی صحت اور بھی زیادہ خراب رہنے لگی۔ وہاں کی مرطوب آب و ہوا سے ان کی سانس

کی شکایت اور بڑھ گئی اور صحت گرتی ہی چلی گئی۔ شاید مشکل سے دو سال جاورہ میں رہے ہوں گے، ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ جودھپور واپس چلے جائیے۔ ورنہ آپ یہاں بہت جلد مر جائیں گے۔ مرزا صاحب بیماری کا عذر کر کے جودھپور چلے آئے اور یہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔ وکالت کا کام پھر شروع کیا مگر بدن میں جان نہ ہونے کی وجہ سے وکالت ٹھس ہی رہی۔ اس لئے اپنی کتابیں چھاپنے کا کام خود شروع کر دیا تھا۔

اب سے کوئی پچاس سال پہلے مولوی نذیر احمد صاحب نے ایک کتاب "اُمہات الامّہ" لکھی تھی۔ یہ کتاب ایک دریدہ دہن پادری کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس نے آنحضرت صلعم پر بعض بڑے بے ہودہ اعتراضات کئے تھے جن میں خاص طور پر ازواجِ مطہرات کے سلسلے میں ناگفتہ بہ باتیں کہی تھیں۔ اس کتاب کا ایک جواب سرسید احمد خاں نے لکھا تھا اور ایک مولوی نذیر احمد نے۔ یوں تو یہ کتاب شروع سے آخر تک ایک علمی اور تاریخی کتاب ہے اور اپنے مواد کے لحاظ سے نہایت قابل قدر بھی۔ لیکن مولوی صاحب نے احترام کے الفاظ کسی نام کے ساتھ اس میں نہیں لگائے ہیں۔ اور بعض جگہ فقرے بھی ایسے لکھ گئے ہیں جو زبان کے اعتبار سے چاہے کتنے ہی ٹکسالی کیوں نہ ہوں، رسولِ مقبول و اہلِ بیت کے ادب و احترام کے لحاظ سے قابلِ اعتراض سمجھے گئے۔ مولوی صاحب اس پیرایۂ بیان کا جواز یوں پیش کرتے تھے کہ چونکہ ایک عیسائی پادری اس ساری کتاب کا مخاطب ہے، اس لئے ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہ توضیح صحیح ہو یا غلط یہاں اس سے بحث نہیں۔ ہوا یہ کہ ہمارے علمائے نے اس کتاب کو سوختنی اور مولوی صاحب کو کافر قرار دیا۔ مسلمانوں کے ایک بڑے ذمہ دار لیڈر نے رفع شر کے لئے اس کتاب کے سارے نسخے مولوی صاحب سے اپنی تحویل میں لے لئے۔ اور مولوی صاحب کی بغیر اجازت انھیں علماء کے جلسے میں لے جا کر جلوا دیا۔ قصہ مختصر اس ناگوار واقعہ کے بعد مولوی صاحب تین چار سال زندہ رہے مگر انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ شامتِ اعمال اس کتاب کا نسخہ کہیں سے میرے ہاتھ لگ گیا اور میں نے یہ سوچ کر کہ ایک اچھی کتاب سے مسلمان کیوں محروم رہیں، اسے جوں کا توں چھاپ دیا۔ اس کا چھپنا تھا کہ پھر ہمارے علمائے نے اس کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ حکومت پر زور ڈالا کہ کتاب ضبط کر لی جائے۔ حکومت کو بھلا کیا غرض پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اس جھگڑے میں پڑے؟ جب اُدھر سے کامیابی نہ ہوئی تو مجھ پر بزرگوں سے دباؤ ڈلوایا گیا۔ یہ بھی ناکام رہا تو قتل کی دھمکیاں دی گئیں اور ہر شہر میں اور دلّی میں اس کے خلاف جلسے ہونے لگے۔ چغتائی صاحب نے مجھے جودھپور سے لکھا کہ ساری کتاب مجھے بھیج دو اور اعلان کر دو کہ کتاب میرے پاس ہے۔ جس میں ہمت ہو مجھ سے لے لے۔ میں نے انھیں دو سو جلدیں بھیج دیں کہ محفوظ ہو جائیں۔ اور کتاب کی اشاعت روک دینے کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں نے مجھے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ خوش بھی ہوئے کہ چلو غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ کتاب کی اشاعت بند کر کے اس نے اپنا مالی نقصان کر لیا۔ اُدھر مرزا صاحب کی ضدّی طبیعت نے زور مارا اور انھوں نے ایک مراسلہ "انقلاب" لاہور میں چھپوا دیا کہ "اُمہات الامّہ" شاہد احمد کے پاس اب نہیں ہے، میرے پاس ہے۔ جس میں ہمّت ہو مجھ سے لے لے، بلکہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ مجھے کاٹ کر میرا پلاؤ پکائیں اور مُلّانوں کو کھلا دیں۔ اس کے چھپتے ہی بس آگ ہی تو لگ گئی۔ پندرہ دن بعد مرزا صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ جودھپور کے مسلمانوں نے ان کے گھر کو گھیر لیا اور زبردستی ان سے ساری کتابیں لے گئے۔ اس کے بعد وہ کچہری

جا رہے تھے تو دو چار بدمعاشوں نے ان پر لاٹھیوں سے حملہ کیا اور ان کے ایک ہاتھ میں سخت ضرب آئی۔ مرزا صاحب نے لکھا: ”بھائی بڑی رسوائی ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یا تو مسلمانوں کے جلسۂ عام میں توبہ کرو اور اقرارِ اسلام کرو ورنہ تم کافر ہو اور قتل کر دیئے جاؤ گے۔ سارے شہر میں آگ پھیلی ہوئی تھی۔ لاکھ میں سب سے کہتا ہوں کہ کتاب میں نے نہیں لکھی، دِلّی والے نذیر احمد نے لکھی تھی مگر سب یہی کہتے کہ نہیں تم نے لکھی ہے اور اس میں تم نے سب کو گالیاں دی ہیں۔ چنانچہ مصلحت اسی میں سمجھی کہ اپنے آپ کو یہاں کے علمأ کے حوالے کر دوں۔ علمأ مجھے ایک بڑے جلسے میں لے گئے۔ مجھ سے سب کے سامنے توبہ کرائی، مجھے کلمہ پڑھوایا اور دوبارہ مجھے مشرف بہ اسلام کیا۔ تب کہیں جان بچی۔ خیر مجھے اس تکلیف اور رسوائی کا بھی اتنا افسوس نہیں، مگر بےحد رنج ہوا اور شرم آئی یہ دیکھ کر کہ وہ دو سو جلدیں جو تم نے مجھے بھیجی تھیں اور مجھ سے مولوی زبردستی چھین لائے تھے، اس جلسے میں جلائی گئیں۔ افسوس کہ پچیس تیس سال میں مسلمانوں نے کوئی ذہنی ترقی نہیں کی۔“

ایک دفعہ مرزا صاحب کا سخت اصرار ہوا کہ خود بھی آؤ اور بھابی کو بھی لے کر آؤ۔ تعمیلِ ارشاد کی گئی۔ اب کے جو انھیں دیکھا تو بڑا دکھ ہوا۔ ان کے پاؤں رہ گئے تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ بخار ہر وقت رہتا تھا۔ کھانسی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ مگر دماغ اسی طرح روشن اور مزاج اسی طرح بشاش تھا۔ خوش تو ہمیشہ ہی ہوتے تھے۔ اب کے بہت خوش ہوئے۔ بولے ”دیکھو! ابھی تم آ گئے ہو اور ابھی ہماری بیماری جاتی رہی۔“ مرنے مرنے کی باتیں کرتے رہے۔ ہنستے رہے، ہنساتے رہے۔ ایک ناول ”شراب“ لکھنا شروع کیا تھا مگر چند باب ہی لکھ سکے تھے۔ اس کے کچھ حصے سنائے اور چھاپنے کے لئے مجھے دیئے۔ رات کو جب دسترخوان بچھا تو کھسک کر ساتھ بیٹھ گئے۔ بھابی وہیں سے چیخیں کہ آپ کچھ نہ کھائیے گا۔ کہنے لگے ”کھائیں گے تو ہم ضرور۔ اب ہم بالکل اچھے ہیں، کوئی بیمار تھوڑی ہیں۔“ مجھ سے کہتے جاتے تھے ”ارے بھئی یہ ہمیں بھی دو۔“ بھابی جھلاتی تھیں مگر وہ اپنا کام کئے جاتے تھے۔ کھایا تو خیر ان سے کیا جاتا تھوڑا تھوڑا سا سب چکھ لیا۔ بارہ ایک بجے تک باتیں کرتے رہے۔ صبح جب مرزا صاحب کو دیکھا تو ان کی حالت غیر تھی۔ معلوم ہوا کہ سخت بدہضمی ہوئی۔ رات بھر اوکتے اور ڈالتے رہے۔ بلغم نکل گیا۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ دو دن میں طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ ہم بازار سے گھوم پھر کر آئے تو تکیے کے سہارے پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے ”لو یہ افسانہ تمھارے لئے لکھا ہے۔“ پڑھ کر سنایا۔ عنوان تھا ”برتھ کنٹرول“۔ میں ہنس رہا تھا، مرزا صاحب بھی ہنستے جاتے تھے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ان کا آخری افسانہ ہے اور میرے لئے ان کی یہ ہنسی بھی آخری! اگلے دن ہمیں دلّی واپس جانا تھا۔ رات کو باتیں کرتے کرتے میری بیوی سے بولے ”آپ کا آنا ایسے وقت میں ہوا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ پھر ایک اپنا چھپا ہوا لیٹر فارم نکالا اور اس پر کچھ لکھ کر انھیں دیا کہ ”اسے قبول کر لیجئے۔“ انھوں نے پڑھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ مرزا صاحب نے کتاب ”کولتار“ کا حقِ تصنیف ان کے نام منتقل کر دیا تھا۔ میں نے کہا ”یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ آپ کے بچوں کی حق تلفی ہے۔“ کہنے لگے ”تم خاموش رہو جی۔ تمھیں تھوڑی دے رہے ہیں۔“ نہیں مانے اور زبردستی وہ کاغذ میری بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

مرزا صاحب کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ ان کے خطوں سے ان کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اس کے بعد ایسے خط آنے شروع ہوئے جو ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ پھر ایک دن ان کا خط ملا کہ آخری بار آ کر مل جاؤ، کچھ دن کے لیے

لیتے آنا۔" میں نے روانگی کا تار دیا اور رات ہی کی گاڑی سے چل پڑا۔ اسٹیشن پر ان کے چھوٹے بھائی آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "چغتائی صاحب کا کیا حال ہے؟" بولے "وہی ہے!" سمجھ میں نہ آیا کہ وہی ہے کا کیا مطلب ہے۔ گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان کے حصے کے کمروں میں سناٹا! نہ بھابی نہ بچے۔ ایک کمرے میں پلنگ پر لحاف اوڑھے چغتائی صاحب پڑے تھے۔ پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے آواز دی اور سلام کیا تو منہ پر سے لحاف ہٹایا۔ مجھ پر بجلی گر پڑی۔ مرزا صاحب کے بدلے ایک سکھ دکھائی دیا کٹ بڑی داڑھی مونچھیں اور بڑھے ہوئے سر کے بالوں پر ایک رومال بندھا ہوا۔ پیلا چہرہ، پھٹی پھٹی آنکھیں۔ لحاف ہلا تو اس میں سے بدبو کا ایک بھبکا آیا۔ پایوں کے نیچے پانی کے پیالے رکھے ہوئے تھے مگر پلنگ پر ٹلنکے کے چیونٹے پھر رہے تھے۔ میں رونے لگا وہ بھی آب دیدہ ہو گئے۔ میں نے کہا: "یہ کیا حالت ہو گئی؟" بولے: "بس اب ختم سمجھو۔" پھر ایک دم سے مسکرائے اور کراہتے ہوئے بولے "ارے ارے آپ کر دیکھیے" اور لحاف میں سے ایک چیونٹا چٹکی میں پکڑ کر نیچے پھینکا: "مرنے سے پہلے ہی اپنا حصہ لینے چلے آئے۔" اتنے میں اندر کے رُخ کا ایک دروازہ کھلا اور ان کی والدہ اندر آئیں۔ بولیں "منّے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟" مرزا صاحب نے کہا: "یہ شاہد صاحب آئے ہیں، انھیں پہلے چائے پلوائیے۔" اماں چلی گئیں تو ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اب صرف اماں ہی ان کا خیال رکھتی ہیں۔ ماشاء اللہ بھرا پُرا گھر تھا مگر کوئی ان کے پاس نہ آتا تھا۔ میں نے کہا: "بھائی اور بچے کہاں ہیں؟" بولے "رام پور!" میں نے کہا: "وہ کیوں؟" کہنے لگے: "بیوی کو میری خدمت کرتے کرتے خود دِق ہو گئی۔ میں نے ان سے بارہا کہا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ تم بھی مر جاؤ گی۔ مگر وہ نہ مانیں۔ جب میں نے دیکھا کہ میں تو مر ہی رہا ہوں اور اگر یہ نہ چلی گئیں تو یہ بھی مر جائیں گی، تو میں نے ان سے کہا، اگر تم یوں نہیں جاؤ گی تو ہم تمھیں طلاق دے دیں گے۔ وہ پھر بھی نہ گئیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ کو ہم نے طلاق دے دی، آپ یہاں سے تشریف لے جائیے، تو انھوں نے کہا آپ کے طلاق دینے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے تو طلاق نہیں لی۔ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آخر میں نے تنگ آ کر ان کے میکے والوں کو خط لکھا کہ اپنی لڑکی کو آ کر لے جاؤ، میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ خط کے پہنچتے ہی ان کا بھائی آ دھمکا اور زبردستی اپنی بہن کو یہاں سے لے گیا۔" میں نے کہا: "یہ آپ نے اچھا نہ کیا۔ ساری عمر کی خدمت کا آپ نے یہ صلہ دیا انھیں۔" کہنے لگے: "بھائی اگر وہ یہاں رہتیں تو واقعی مر جاتیں۔ ان کے بچانے کی اور کوئی صورت ہی نہیں تھی، اور ہاں سنو، اصل میں طلاق ہوئی نہیں ہے۔ مگر ان کے گھر والوں کو میں جانتا تھا کہ ایک خط میں ہی آ کے لے جائیں گے۔ بیوی نے بہت کہا بھی یہ طلاق نہیں ہے مگر ان کے بھائی نے کہا: "جب انھوں نے ہمیں لکھ کر ہی بھیج دیا تو اگر نہیں ہوئی تب بھی ہو گئی۔"

اس کے بعد ان کی اماں اور بھابیوں اور عصمت چغتائی سے باتیں کرنے پر معلوم ہوا کہ بیماری نے مرزا صاحب کے دماغ پر عجب طرح کا اثر ڈالا ہے کہ انھیں دوسروں کو تکلیف پہنچا کر لطف آتا ہے۔ مثلاً بھائیوں بھابیوں کو لڑوا دیں گے۔ کسی پر چوری کا الزام لگا دیں گے۔ طبیعت سے گھڑ کر کوئی ایسی بات کریں گے کہ دو آدمی الجھ جائیں۔ ہم سب نے تنگ آ کر ان کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ بس ماں کی ہی مامتا ہے جو برداشت کر رہی ہے۔" میں نے کہا: "مگر اب تو ان کا آخری وقت ہے۔ کے دن جئیں گے بچارے۔" "مگر سارے بھائی بہن یہی کہتے تھے کہ "یہ نہیں مریں گے۔ کتنی ہی دفعہ ہو چکا ہے کہ منّے بھائی مر رہے ہیں، منّے بھائی مر رہے ہیں۔ سب بھاگے بھاگے گئے اور وہ نہ مرے نہ ڈرے۔ پھر اچھے خاصے ہو گئے۔" اس گھر میں تین دن

رہنا مجھے اجیرن ہو گیا۔ عجیب بے کسی کی زندگی تھی۔ گرم گرم بخار چڑھتے، پنڈا جھلستا رہتا۔ ہڈیاں تک سوکھ گئی تھیں۔ کھانسی کے مارے سینے میں سانس نہ سماتا تھا۔ پاؤں بالکل بے کار ہو چکے تھے۔ مگر دماغ روشن تھا۔ کوئی تیماردار نہیں۔ پیسہ کوڑی پاس نہیں۔ نہ جانے کس وقت دم نکل جائے۔ گھر والے تو مطمئن ہیں کہ یہ مرتے ہی کے نہیں! میں نے جی میں کہا: ”اللہ تیری شان ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا کو ہنسایا اور مرنے کے بعد بھی ہنساتا رہے۔ اور اس عذاب میں مبتلا! تو ہی اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔“ جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو ہاتھ بڑھایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں رو رہا تھا۔ وہ بھی رو رہے تھے۔ میں نے کہا: ”یہ روپے رکھ لیجئے۔“ پوچھنے لگے: ”کتنے ہیں؟“ میں نے کہا: ”دو سو ہیں۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو میں دلی پہنچ کر اور بھیج دوں گا۔“ بولے: ”بہت ہیں۔ تکیے کے نیچے رکھ دو۔ خدا حافظ۔“ کہہ کر میں آنسو پونچھتا باہر نکل آیا۔ پھر ان کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ شاید دو ہفتے گذرے ہوں گے کہ ان کے انتقال کی خبر آئی۔ میں نے کہا: ”لو بھئی وہ مر گیا جو مرتا نہ تھا! انا للہ و انا الیہ راجعون۔“

منٹو ماموں کی موت

حامد جلال

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ منٹو ماموں میانی صاحب کے قبرستان سے اُٹھ کر گھر چلے آئے تو میں ان سے کیا کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی حیاتِ ثانی کے معجزے کو نظر انداز کر کے ان سے صرف اتنا کہوں گا ـــــ منٹو ماموں! آپ نے آج تک جتنی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ حرکت آپ کی موت ہے۔"

بہاول پور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا دوسرا ٹسٹ میچ ہو رہا تھا اور میں ڈرنگ سٹیڈیم میں بیٹھا طالع یار خاں کو میچ کا چشم دید حال نشر کرنے میں مدد دے رہا تھا کہ لاہور سے میرے نام ایک ٹرنک کال آئی اور مجھے بتایا گیا کہ آج صبح سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ میں فوراً غم سے بے قابو نہیں ہو گیا بلکہ مجھ میں شدید برافروختگی پیدا ہو گئی۔ مجھے منٹو ماموں پر انتہائی شدید غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہ سلوک کس طرح کر سکتے ہیں؟ لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور جب میں بولا تو میری آواز سے غیر معمولی تشویش نمایاں تھی۔ میں نے پوچھا "کہاں انتقال ہوا؟" جواب ملا "گھر پر!" اس جواب سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اچانک گھر سے باہر کسی اور مقام پر موت سے ہم آغوش نہ ہو گئے ہوں۔ عین ممکن تھا کہ کسی تانگے پر، کسی ریستوران میں، کسی پبلشر کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے یا کسی فلم سٹوڈیو میں انھیں اچانک موت آ گئی ہو......

جب میں اپنی جگہ پر واپس گیا تو میچ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے والے ساتھیوں نے اشاروں سے پوچھا کہ کیا بات تھی؟ میں نے ایک کاغذ پر یہ جملہ لکھ دیا "امپائر نے سعادت حسن منٹو کو آخر آؤٹ دے ہی دیا۔ آج صبح ان کا انتقال ہو گیا۔"

منٹو ماموں کو آؤٹ دینے کے لیے امپائر سے کئی بار اپیلیں کی جا چکی تھیں لیکن ہر بار اپیل مسترد کر دی گئی تھی۔ اب ان کی بے صبر اور ڈانواں ڈول اننگز ختم ہو گئی تھی۔ وہ کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کبھی حنیف محمد کی طرح ہوشیار اور محتاط کھلاڑی نہیں بن سکتے تھے جسے وہ لاہور کے تیسرے ٹسٹ میچ میں کھیلتے ہوئے دیکھنے کے بے حد مشتاق تھے۔ اس کا علم مجھے ان کی موت کے چوبیس گھنٹے بعد گھر پہنچ کر ہوا۔ درحقیقت ان کی زندگی کی آخری دو خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے انھوں نے ایک ریستوران میں اپنے دوستوں سے کہا تھا "حامد جلال کو واپس آ جانے دو۔ میں اسی کے ساتھ ٹسٹ میچ میں حنیف کا کھیل دیکھنے جاؤں گا۔"

ان کی دوسری خواہش اس بے یار و مددگار عورت کی موت پر افسانہ لکھنے کی تھی جس کی برہنہ لاش گجرات میں سڑک کے کنارے

پائی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس عورت اور اس کی ننھی سی بچی کو بس کے اڈے سے اغوا کیا گیا اور نصف درجن کے قریب ہوس پرستوں نے اپنی بہیمانہ خواہشات کی تکمیل کی اور جب وہ کڑکڑاتی سردی میں ان کے چنگل سے نکل کر بھاگی تو اس کے جسم پر لباس کا ایک تار بھی نہ تھا چنانچہ دونوں ماں بیٹی نے منجمد کر دینے والی سردی میں دم توڑ دیا۔ اس المیہ سے منٹو ماموں بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اسی روز شام کو گجرات سے کچھ لوگ ان کے پاس آئے تھے اور انھوں نے حادثہ کی مزید تفصیلات بتائی تھیں۔ اس سے ان میں ضرور اشتعال اور ہیجان پیدا ہوا ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اس کے بعد منٹو ماموں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی ہوگی جو ان کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔

وہ کافی شام گزرنے کے بعد گھر واپس آئے، تھوڑی دیر بعد انھیں خون کی قے ہوئی۔ میرے چھ سالہ بچے نے جو ان کے قریب ہی کھڑا تھا، خون کی دھاریوں کی طرف انھیں متوجہ کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ نہیں یہ تو پان کی پیک ہے۔ انھوں نے اسے یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اس کے بعد انھوں نے حسبِ معمول کھانا کھایا اور سو گئے۔ گھر بھر میں کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کوئی بات خلافِ معمول ہوئی ہے۔ کیونکہ میرے لڑکے نے منٹو ماموں کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے خود منٹو ماموں کو بھی اس کے متعلق کوئی تشویش نہ ہوئی ہو۔ یوں بھی وہ گھر والوں کو ایسے معاملات سے بے خبر رکھنا ہی پسند کرتے تھے کیونکہ ہر طرف سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ شروع ہو جاتا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا کہ انھوں نے اپنی بیوی کو اٹھا کر بتایا کہ وہ شدید درد محسوس کر رہے ہیں اور اب تک بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا جگر پھٹ گیا ہے۔ ان کی بیوی نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس صورتِ حال کا تن تنہا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو انھوں نے گھر کے دوسرے لوگوں کو جگایا اور انھیں موت کے منہ سے نکالنے کی جد و جہد شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کئی شدید علالتوں کے بعد وہ شفایاب ہو چکے تھے اس لیے کسی کو یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اب وہ صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ انھیں آؤٹ دینے کے لیے امپائر کی انگلی اسی وقت سے فضا میں بلند ہونی شروع ہو گئی تھی جب منٹو ماموں کو خون کی پہلی قے آئی تھی۔

منٹو ماموں کے آخری لمحات کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے، اس سے میں یہی اندازہ لگا سکا ہوں کہ کافی دیر تک انھیں خود بھی یقین نہیں تھا کہ ان کا وقت اب آگیا ہے۔ ڈاکٹر کے انجکشن وغیرہ لگانے کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد تک وہ مایوس نہیں ہوئے تھے لیکن اس علاج کے بعد بھی ان کی حالت خلافِ معمول نہیں سنبھلی۔ ان کی نبض برابر ڈوبتی گئی اور درد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ خون کی قے بھی بند نہیں ہوئی۔ صبح کو ڈاکٹر نے تجویز پیش کی کہ منٹو ماموں کو ہسپتال پہنچا دیا جائے۔

اس وقت منٹو ماموں کے ہوش و حواس بالکل بجا تھے اور ہسپتال کا نام سنتے ہی وہ بول اٹھے "اب بہت دیر ہو چکی ہے مجھے ہسپتال نہ لے جاؤ اور یہیں سکون سے پڑا رہنے دو۔"

گھر کی عورتوں کے لیے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے رونا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر منٹو ماموں فوراً مشتعل ہو گئے اور انھوں نے غضب ناک آواز میں کہا "خبردار جو کوئی رویا۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا منہ رضائی سے بند کر لیا۔

منٹو کا یہ اصلی روپ تھا۔ جس شخص کی زندگی کا کوئی گوشہ آج تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ لوگ اسے مرتا ہوا دیکھیں۔ منٹو ماموں مجسم غیظ و غضب بنے ہوئے تھے معلوم نہیں وہ اپنے آپ سے ناراض تھے یا شراب سے

جو ان کی قبل از وقت موت کی ذمہ دار تھی۔

ایمبولنس آنے سے پہلے صرف ایک یا دو بار انھوں نے اپنے منہ سے رضائی ہٹائی۔ انھوں نے کہا: "مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے۔ اتنی سردی شاید قبر میں بھی نہیں لگے گی۔ میرے اوپر اور رضائیاں ڈال دو۔" کچھ دیر توقف کے بعد ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی، انھوں نے آہستہ سے کہا: "میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تھوڑی سی وہسکی منگا دو......"

شراب کے لیے ان کا اصرار جاری رہا اور ان کی تسلی کے لیے ایک پوا منگا لیا گیا۔ انھوں نے بوتل کو بڑی عجیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے: "میرے لیے دو پیگ بنا دو۔" اور یہ کہتے ہوئے درد اور شدید تشنجی دورے کے باعث وہ کانپ سے اٹھے۔

منٹو ماموں کی آنکھوں میں اس وقت بھی اپنے لیے رحم کا کوئی شائبہ موجود نہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا وقت آ پہنچا ہے، لیکن ایک بار بھی اور ایک لمحے کے لیے بھی انھوں نے اپنے اوپر جذباتیت نہیں طاری ہونے دی۔ انھوں نے اپنے بچوں یا کسی اور کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ وہ نگاہِ واپسیں یا وصیت کے کبھی قائل نہیں تھے۔ ان جیسی شخصیتوں کے لیے زندگی اور موت کے درمیان حدِ فاصل بہت ہی مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے کیونکہ ان کی زندگی اور روح تو پہلے ہی ان کے جسم سے ان کی کتابوں میں منتقل ہو چکی ہوتی ہے ——— وہاں پہنچ کر انھیں غیر فانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ وہاں وہ ابد تک زندہ رہتے ہیں۔ ہنستے بولتے رہتے ہیں، محبت کرتے رہتے ہیں۔

بسترِ مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انھیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی جانی دشمن ہے اور وہ اسے موت کا ہم معنی سمجھنے لگے تھے جس پر جسمانی فتح کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ جس طرح موت کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے ——— اسی طرح منٹو ماموں شراب کے سامنے بالکل بے بس ہوتے تھے لیکن ان کی فطرت چونکہ ہمیشہ سے باغیانہ تھی اس لیے انھوں نے موت سے بھی بغاوت کی تھی۔ انھیں شکست سے بھی سخت نفرت تھی خواہ وہ موت کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہو اور یہی وجہ تھی کہ وہ موت سے تنہائی میں آنکھیں چار کرنا چاہتے تھے جہاں کوئی انھیں ہارتا نہ دیکھ سکے۔ جہاں کوئی ان کی شکست کا نظارہ نہ کر سکے۔

ان سے کم درجے کا آدمی شاید ایک ڈرامائی موت کا اہتمام کرتا تاکہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا چرچا کریں، اس پر مضامین لکھے جائیں اور اس کے اعزا و احباب کہہ سکیں کہ اس کی زندگی ضرور ایسی تھی جسے ہم پسند نہیں کرتے لیکن مرنے سے پہلے وہ منفعل ہو گیا تھا اور اچھا آدمی بن گیا تھا لیکن منٹو ماموں ریاکار نہیں تھے۔ انھوں نے اس خواہش کا سختی سے مقابلہ کیا۔ ان کی موت کے وقت صرف ایک پہلو ڈرامائی تھا یعنی شراب طلب کرنے کا منظر لیکن اس کا فائدہ بھی مرکزی کردار کو پہنچ سکتا تھا کیونکہ اس کا صحیح مفہوم صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔

میں اس وقت موجود ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ایک حد تک میرے سامنے بے نقاب کر دیتے اور یہ کچھ مشکل بھی نہیں تھا کیونکہ انھیں صرف اتنا کہنے کی ضرورت تھی۔ سانپ اور انسان کی کہانی نہ بھولنا۔ میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتا اور شراب کا آخری جام انھیں پینے کو دے دیتا۔ صرف یہی ایک جملہ ہر بات واضح کر دینے کے لیے کافی ہوتا۔ سانپ اور انسان کی کہانی

صرف اتنی تھی کہ ایک آدمی نے اپنے دوستوں کے منع کرنے کے باوجود ایک زہریلا سانپ پال رکھا تھا اور ایک دن سانپ نے اپنا سارا زہر اس کے جسم میں اتار دیا، تو اس نے بھی سانپ کو پکڑ لیا اور اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا۔

ایمبولنس جیسے ہی دروازے پر آکر کھڑی ہوئی، انھوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ ایک چمچہ وہسکی ان کے منہ میں ڈال دی گئی لیکن شاید ایک قطرہ مشکل سے ان کے حلق سے نیچے اتر سکا ہوگا۔ باقی شراب ان کے منہ سے گر گئی اور ان پر غشی طاری ہوگئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے ہوش و حواس کھوئے تھے۔ انھیں اسی حالت میں ایمبولنس میں لٹا دیا گیا۔

ایمبولنس ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر انھیں دیکھنے کے لیے اندر گئے تو منٹو ماموں مر چکے تھے۔ دوبارہ ہوش میں آئے بغیر راستے ہی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

میرا دوست، میرا دشمن

عصمت چغتائی

اڈلفی چیمبر کی چوبی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی، جیسے کبھی امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملتے گھبراہٹ ہوا کرتی تھی لیکن یہاں تو وہ نیا آدمی منتظر تھا جس سے میں پہلی بار ملنے جا رہی تھی۔ میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاہد سے کہا "چلو واپس چلیں شاید منٹو گھر پر نہ ہو"۔ مگر شاہد نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

"وہ شام کو گھر ہی پر رہتا ہے کیونکہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔"

یہ سنتے میرے پیروں سے ایک تو منٹو اور وہ بھی پیتا ہوا منٹو۔ مگر میں نے جی کڑا کر لیا۔ ایسا بھی کیا، مجھے کھا تو نہیں جائے گا۔ ہونے دو جو اس کی زبان کی نوک پر ڈنک سا ہے۔ میں گھبلا تو ہوں نہیں جو چپت ماری تو بیٹھ جاؤں گی۔ چرچرائی کرم خوردہ سیڑھیاں طے کر کے ہم دوسری منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ روم نما کمرے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سفید اور صاف پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے لگی ہوئی ایک لدی پھندی ٹیڑھی سی میز کے سامنے ایک بڑی ساری کرسی پر ایک باریک مکوڑے کی شکل کا انسان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

"آئیے آئیے!" بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ منٹو ہمیشہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھنچ کر اس کا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا اور بعض وقت جب منٹو یوں تن کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر کھدر کا کرتا پاجامہ اور جواہر کٹ صدری تھی۔

"ارے میں سمجھتا تھا آپ نہایت کالی دبلی سوکھی مرگھلی سی ہوں گی۔" اس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

"اور میں سمجھتی تھی آپ نہایت زنگ قسم کے گلپھڑے پھنکارتے ہوئے پنجابی ہوں گے۔" میں نے سوچا رسید دیتے چلو کہیں یہ ایک دم نہ ہاتھے پڑ لے۔

اور دوسرے لمحہ ہم دونوں پرانی تن دہی سے جٹ کر بحث کرنے لگے اور جیسے اتنے عرصے ایک دوسرے سے ناواقف رہ کر ہم نے بڑا گھاٹا اٹھایا ہو اور اسے پورا کرنا ہو۔ دو تین بار بات الجھ گئی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا لہٰذا دوسری ملاقات کے لیے اٹھا رکھی گئی۔ کئی گھنٹے ہمارے جھگڑے مشینوں کی طرح مختلف موضوعات پر چلتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو بھی بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سننے سے پہلے ہی بول اٹھتا ہے اور جو رہا سہا تکلف تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں نے بحث اور بحث نے باقاعدہ نوک جھونک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت ادنیٰ قسم کے لفظوں

میں احمق، جھکی اور کج بحث کہہ ڈالا۔

گھمسان کے بیچ میں میں نے ایک بار کنارے ہو کر غور سے دیکھا۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھیں جنھیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پر یاد آ گئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ ہے یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا۔ مگر جب بھی میں نے ان آنکھوں کو دیکھا مجھے مور کے پر یاد آ گئے۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بے ساختہ شگفتگی مجھے مور کے پروں کی یاد دلاتی تھی۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انھیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قہقہہ لگاتے، سنجیدگی سے مسکراتے، طنز کے نشتر برساتے اور پھر نزع کے عالم میں پتھراتے! وہی نازک نازک ہاتھ پیر، سر پر ٹوکرا بھر بال، پچکے زرد زرد گال اور کچھ بے تکے سے دانت۔ پیتے پیتے اچانک منٹو کو اچھو لگا اور وہ کھانسنے لگا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کھانسی تو جانی پہچانی سی تھی۔ اسے تو میں نے بچپن سے سنا تھا۔ مجھے کوفت ہونے لگی نہ جانے کس بات پر میں نے کہا:۔

”یہ بالکل غلط“ اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے۔

”آپ کج بحثی کر رہے ہیں۔“

”حماقت ہے یہ۔“

”دھاندلی ہے عصمت بہن!“

”آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں؟“ میں نے چڑ کر کہا۔

”بس یونہی۔ عموماً میں عورتوں کو بہن کم کہتا ہوں۔ میں اپنی بہن کو بھی بہن نہیں کہتا۔“

”تو پھر مجھے چڑانے کو کہہ رہے ہیں؟“

”نہیں تو وہ کیسے جانا آپ نے؟“

”اس لیے کہ میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلاتے چڑاتے اور مارتے پیٹتے رہے یا پکڑ کر پٹواتے رہے۔“ منٹو زور سے ہنسا۔

”تب تو میں ضرور آپ کو بہن ہی کہوں گا۔“

”تو اتنا یاد رکھیے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟“

”علاج؟ ڈاکٹر گدھے ہوتے ہیں۔ تین سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے تمھیں ٹی۔ بی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ میں نے مر کر ان کی پیشین گوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دیا اور اب تو بس میں ڈاکٹروں کو احمق سمجھتا ہوں۔ ان سے تو مسمریزم اور جادو کرنے والے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔“

”یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔“

”کون بزرگ؟“

”میرے بھائی عظیم بیگ! نو من مٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر ہم عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے۔ آئے تھے صرف ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے،

شاہد جو ہماری جھڑپیں الگ تھلگ بیٹھے دیکھ رہے تھے بھوک سے تنگ آچکے تھے۔ ملاد پہنچتے پہنچتے ایک بج جائے گا لہٰذا کھانا کھا ہی لیا جائے۔ منٹو نے مجھ سے الماری سے پلیٹیں اور چمچے نکالنے کو کہا اور خود ہوٹل سے روٹی لینے چلا گیا۔

”ذرا اس برنی سے اچار نکال لیجئے۔“ منٹو نے تیزی سے میز پر کھانا لگایا اور کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہی میز جو دم بھر پہلے ادبی کارگذاریوں کا میدان بنی ہوئی تھی ایک دم کھانے کی میز کی خدمات انجام دینے لگی اور بغیر کسی سے ”پہلے آپ“ کہے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔

کھانے کے بیچ میں گرما گرم مباحثہ چلتا رہا۔ گھوم پھر کر منٹو ”لحاف“ کے بخیے ادھیڑنے لگتا جو ان دنوں میری دکھتی رگ بنا ہوا تھا میں نے بہت ٹالنا چاہا مگر وہ ڈھٹائی سے اڑا رہا اور اس کا ایک ایک تار گھسیٹ ڈالا۔ اسے بڑا دھکا لگا یہ سن کر کہ مجھے ”لحاف“ لکھنے پر افسوس ہے۔ خوب جلی کٹی سنا ڈالیں اور مجھے نہایت بزدل اور کم نظر کہہ ڈالا۔ میں ”لحاف“ کو اپنا گناہکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور منٹو مُصِر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ”لحاف“ سے بھی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی نہایت کھل کر، اور مجھے تعجب ہوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بیہودہ سے بیہودہ بات دھڑلے اس معقولیت اور بھولے پن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ یا وہ مہلت دیتا ہی نہیں۔ اس کی باتوں پر ہنسی آجاتی ہے گھن یا غصہ نہیں آتا۔

چلتے وقت اس نے پھر صفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے اور منٹو کو صفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا۔

”صفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔“

”آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔“

”بہت یاد آرہی ہے تو اسے بلا کیوں نہیں لیتے۔“ میں نے کہا۔

”ارے ...... کیا سمجھتی ہو اس کے بغیر سو نہیں سکتا۔“ وہ اپنی اصلیت پر اترنے لگا۔

”نیند تو سُولی پر بھی آجاتی ہے۔“ میں نے بات ٹالی اور وہ ہنس پڑا۔

”آپ کو صفیہ سے بہت محبت ہے؟“ میں نے رازداری کے انداز میں پوچھا۔

”محبت!“ وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اسے گالی دی ہو۔ ”مجھے اس سے قطعی محبت نہیں۔“ اس نے کڑوا منہ بنا کر بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں۔ ”میں محبت کا قائل نہیں۔“

”ارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟“ میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

”نہیں۔“

”اور آپ کے کبھی گلسوئے بھی نکلے — خسرہ بھی نہیں ہوئی مگر کالی کھانسی تو ضرور ہوئی ہوگی۔“ وہ ہنس پڑا۔

”محبت سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ محبت تو ایک بڑی لمبی چوڑی چیز ہے۔ محبت ماں سے بھی ہوتی ہے، بہن اور بیٹی سے بھی ...... بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے۔ چپلوں اور بوٹ جوتے سے بھی محبت ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست کو اپنی کتیا سے محبت ہے، ہاں مجھے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔“ وہ بیٹے کے خیال پر اُچک کر کرسی پر اونچا ہو گیا۔ خدا کی قسم اتنا سا پیروں چلتا تھا۔ بڑا شریر تھا، گھٹنوں

چلتا تھا تو فرش کی دراڑوں میں سے مٹی نکال کر کھا لیا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا مانتا تھا۔" عام باپوں کی طرح منٹو نے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا۔

"آپ یقین کیجیے بچہ سات دن کا تھا کہ میں اسے اپنے پاس سُلانے لگا۔ میں اسے خود تیل مل کر نہلاتا۔ تین مہینے کا بھی نہیں تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا تھا۔ بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی۔ رات کو تو بس پڑی سوتی رہتی۔ میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلا لیتا۔ اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے کو دودھ پلانے سے پہلے ڈیٹول کاٹن یا اسپرٹ سے صاف کر لینا چاہیے نہیں تو بچے کے منہ میں دانے ہو جاتے ہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا اور میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی کہ یہ کیسا مرد ہے جو بچے پالنے میں مشّاق ہے۔

"مگر وہ مر گیا۔" منٹو نے مصنوعی مسرت چہرہ پر لا کر کہا ــــ "اچھا ہوا جی وہ مر گیا۔ مجھے تو اس نے آیا بنا ڈالا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اس کے پوتڑے دھوتا ہوتا۔ نکما ہو کر رہ جاتا مجھ سے کوئی کام تھوڑی ہوتا۔ سچ مچ عصمت بہن! مجھے اس سے عشق تھا۔"

چلتے چلتے اس نے پھر کہا کہ "صفیہ آنے والی ہے بس جی خوش ہو جائے گا آپ کا اس سے مل کر۔"

اور واقعی صفیہ سے مل کر میرا جی خوش ہو گیا۔ منٹوں میں ہماری اتنی گھٹ گئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہونے لگیں جو صرف عورتیں ہی کہتی ہیں عورتیں ہی سنتی ہیں، جو مردوں کے کانوں کے لیے نہیں ہوتیں۔

مجھے اور صفیہ کو یوں سر جوڑے کھسر پھسر کرتے دیکھ کر منٹو جل گیا اور طعنے دینے لگا۔ اس نے پچھلے کمرے کی چوبی دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری گفتگو سن لی تھی۔ وہ شہدوں کی طرح بولا:

"توبہ توبہ میرے فرشتوں کو بھی پتہ نہ تھا کہ عورتیں بھی اتنی گندی گندی باتیں کرتی ہیں۔"

صفیہ کے شرم سے کان لال ہو گئے۔

"اور آپ سے تو عصمت بہن مجھے قطعی امید نہ تھی کہ یوں محلے کی جاہل عورتوں کی طرح باتیں کریں گی۔ اب شادی ہوئی ہے شادی کی رات کیسی گذری؟ بچہ کب اور کیسے پیدا ہوا، توبہ ہے۔" وہ چڑانے لگا۔

میں نے فوراً لگام نکالی۔ "حد ہے منٹو صاحب میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ سمجھتی تھی۔ سارے آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں۔ ان میں گندگی کیا ہے۔ بچہ کی پیدائش دنیا کا حسین ترین حادثہ ہے اور یہ کانا پھوسی ہی تو ہمارا ٹریننگ اسکول ہے۔ کیا سمجھتے ہیں آپ کیا کالج میں مجھے سب دنیا سکھایا گیا ہے۔ وہاں کے پڑھے ہوئے پروفیسر بھی آپ کی طرح ناک بھوں چڑھا کر توبہ توبہ کرتے رہتے۔ محلے کی عورتوں ہی سے تو ہم نے زندگی کے اہم ترین راز جانے ہیں۔"

"یہ صفیہ سخت جاہل ہے۔ ادب ودب کچھ نہیں سمجھتی ہر بات پر [illegible] کرتی ہے۔ آپ کی تحریروں سے سخت خفا ہے آپ کا جو نہیں گھبراتا اس سے گھنٹوں باتیں کر کے کہ قورمے میں کتنی ہلدی، ارہر کی دال کے دہی بڑے . . . ."

"اے منٹو صاحب قورمے میں ہلدی کہاں پڑتی ہے۔" صفیہ نے ہیبت زدہ ہو کر کہا۔

اور منٹو لڑ پڑا۔ وہ بضد تھا کہ ہلدی ہر کھانے میں پڑنی چاہیے اور جو نہیں پڑتی تو یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ "میرا ایک راجپوت دوست تھا وہ گھی اور ہلدی پی کر اکھاڑوں میں کسرت کیا کرتا تھا۔ پورا پہلوان تھا۔" اور ہم سمجھتے کہ آپ کا دوست گھی اور ہلدی

چھوڑ کر پیتا تھا۔ ہم کسی شرط پر ہلدی ڈالنے کو تیار نہیں اور منٹو کو قائل ہونا پڑا۔

میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادہ سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا جیسے ذہنی قوتوں پر دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے، دماغ میں جھاڑو سی دی جا رہی ہے اور بعض وقت بحثیں اتنی طویل اور گھمن دار ہو جائیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے سُوت کی گُتھیاں اُلجھ گئی ہیں اور واقعی سوچنے اور سمجھنے کی قوت پر تھکاوٹ چھا گئی مگر دونوں بحثے جاتے، اُلجھے جاتے، بدمزگی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا ملکہ تھا مگر منٹو بالکل روہانسا ہو جاتا آنکھیں مونگپھلیوں کی طرح تن کر پھیل جائیں۔ نتھنے پھڑکنے لگتے منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا اور وہ جھنجھلا کر اپنی حمایت میں شاہد کو پکارتا اور جنگ ادب یا فلسفہ سے پلٹ کر گھریلو صورت اختیار کر لیتی۔ منٹو بھنّا کر چلا جاتا۔ شاہد مجھ سے لڑتے ”تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو؟ منٹو آج خفا ہو کر گیا ہے اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری ہمت ہے کہ اس کے ہاں جاؤں، وہ بدتمیز آدمی ہے۔ کچھ اینٹھ بیٹھے گا تو میری اس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی۔“

اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منٹو کو کڑوی بات کہہ دی۔ ممکن ہے رُوٹھ جائے اور ہماری اور صفیہ کی دوستی بھی ختم ہو جائے جو اب منٹو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔ منٹو کی خودداری رعونت کی حدوں کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں پر رعب جمانے کا بڑا شوقین تھا اور اگر ان دوستوں کے سامنے جن کو وہ مرعوب کر چکا ہو کوئی اس کا مذاق بنا دے تو وہ بُری طرح چڑ جایا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ویسے وہ اور میں تو پتلے کے ہیں ایک دوسرے کو کوس سکتے ہیں مگر ”عام لوگوں“ کے سامنے ایک دوسرے پر چوٹیں نہ کرنی چاہئیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کی ذہنی سطح کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا۔

لیکن سچ لڑائی ہوتی اور اتفاق سے شام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اس قدر جوش سے ملتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور ویسے ہی کُھل مل کر باتیں ہوتیں۔ تھوڑی دیر ہم ایک دوسرے سے بڑے ادب اور ضرورت سے زیادہ نرمی سے بولتے، ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتے مگر بہت جلدی اس تصنع سے دل اُکتا جاتا اور اس کا بھی اور پھر چھیڑ لگتی۔ دونوں طرف سے آتش بازی اور گولیوں کی نوبت آ جاتی۔ کبھی لوگ ہم دونوں کو یوں اُلجھا کر مزا لینے لگتے اور ہم پھر چل کر ایک دوسرے سے مل جاتے۔ ہم بحث کرتے تھے اپنی دلچسپی کے لیے نہ کہ ان کے لیے ٹٹو بن بن کر لطف پیدا کرتے۔ منٹو کی بھی یہی رائے تھی کہ گھر پر چاہے جتنی اُلٹی سیدھی بحث کر لیں مگر محفلوں میں ہمیں مورچہ بنا کر جانا چاہیئے اور ہمارا مورچہ اتنا مضبوط ہو گا کہ لوگوں کے چھکے چھڑا دے گا مگر مجھے عموماً مورچے سے اپنی وفاداری کا احساس نہ رہتا اور مورچہ بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنکارنے لگتا۔

یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہانہ کر لیتا ہے۔ میں نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ پائی۔ بات میں لکنت نہ پائی۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پیئے ہو تو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشہ میں نہیں اور جان کو آ جاتا تھا۔

”میں آپ سے سچ کہتا ہوں عصمت بہن میں بالکل نشہ میں نہیں اور میں آج پینا چھوڑ سکتا ہوں۔ میں جب چاہوں پینا چھوڑ دوں آپ شرط لگا لیجیے۔“

”میں شرط نہیں لگاؤں گی کیونکہ آپ ہار جائیں گے۔ آپ پینا نہیں چھوڑ سکتے ...... اور آپ نشے میں ہیں۔“

کیسا کیسا منٹو ثبوت دیتا کہ وہ نشے میں نہیں، وہ اسی وقت پینا چھوڑ سکتا ہے صرف شرط لگانے کی دیر ہے۔ ایک دن تنگ آ کر مجھے شرط لگانی پڑی اور منٹو شرط ہار گیا۔ میں جیت گئی مگر کیا؟ شرط تو لگی تھی لیکن کوئی رقم مقرر نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب منٹو کو بہت چڑھتی اور وہ شرط لگانے پر اُڑ جاتا اور سوائے شرط لگانے کے کوئی خلاصی نظر نہ آتی تو ہار کر مجھے شرط لگانا ہی پڑتی۔

منٹو کو خود ستائی کی عادت تھی مگر عموماً میرے سامنے اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا کرتا تھا اور اس وقت میرے اور اپنے سوا دنیا میں کسی کو ادیب نہ مانتا۔ خاص طور پر کرشن چندر اور دیوندر ستیارتھی کے خلاف ہو جاتا۔ اگر ان کی تعریف کرو تو سُلگ اٹھتا۔ میں کہتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مانی جائے اور وہ تنقید نگاروں کو جلی کٹی سنانے لگتا۔ ایک سرے سے ان کے وجود کو ہی سمِ قاتل سمجھتا خاص طور پر ادب کے لیے۔

”بکواس کرتے ہیں یہ لوگ۔“ وہ جل کر کہتا ”جو یہ کہتے جائیں بس اس کا اُلٹا کرتے جاؤ۔ یہی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں چھپ چھپ کر میری کہانیاں پڑھتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھنے کے بجائے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اس لطف کی یاد پر نادم ہو کر اول فول لکھتے ہیں۔“ وہ کبھی اتنا چڑھ جاتا کہ میں اسے تسلّی دینے کو کہتی جب آپ کو یقین ہے کہ یہ اول فول لکھتے ہیں تو آپ ان کا جواب کیوں دینے لگتے ہیں اگر تنقید سے آپ کو مدد نہیں ملتی تو نہ لیجئے مگر رائے عامہ کو تو مطعون نہ کیجئے مگر وہ بھناتا رہتا۔

ایک دن بڑی سنجیدہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے۔

”مقدمہ دائر کریں گے۔“

میں نے کہا ”کون؟“

کہنے لگے ”ہم! یعنی میں اور آپ۔ اس مردود نے میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعہ میں یہ لکھ کر چھاپی ہے کہ یہ فحش ہے ایسے ادب سے ملک کو بچانا چاہئے۔ اب اس کم بخت سے پوچھو کہ کیسی اُلٹی بات کر رہا ہے۔ ایک تو اسے کتاب میں چھاپ کر مشتہر کر رہا ہے دوسرے پیسے کمانے کا الگ انتظام کر رہا ہے۔ اس نے ہماری اجازت کے بغیر کیوں کہانیاں چھاپی ہیں اسے نوٹس دلوا رہا ہوں کہ ہرجانہ دے۔“ پھر نہ جانے بھول بھال گئے۔

منٹو اپنی ڈینگوں سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شیخی بگھارا کرتا تھا۔ رفیق غزنوی سے کچھ عجب قسم کی محبت تھی جو میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب اس کا تذکرہ کیا یہی کہا ”بڑا بدمعاش لفنگا ہے۔ ایک ایک کر کے چار بہنوں سے شادی کر چکا ہے۔ لاہور کی کوئی رنڈی ایسی نہیں جس کی اس نے اپنے جوتے پر ناک نہ گھسوالی ہو۔“

بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے عشقوں کے قصے تفصیلوں سے سنایا کرتا۔ ایک دن مجھے اس سے ملانے کو کہا۔ میں نے کہا ”کیا کروں گی مل کر، آپ تو کہتے ہیں لفنگا ہے وہ۔“

کہنے لگے ”ارے جب ہی تو ملا رہا ہوں۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لفنگا اور بدمعاش بُرا آدمی ہوتا ہے۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے۔“

میں نے کہا ”منٹو صاحب! لفنگا، شریف، بدمعاش یہ آخر کیسا آدمی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھے جتنا ذہین اور تجربہ کار سمجھتے ہیں شاید ویسا نہیں۔“

"آپ بنتی ہیں۔" منٹو نے بُرا مان کر کہا۔ "جبھی تو میں آپ کو رفیق سے ملانا چاہتا ہوں ——— بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی۔"

"میں بھی تو عورت ہوں۔" میں نے فکرمند بن کر کہا اور وہ کھسیانا ہو گیا۔

"میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔"

"مگر آپ کی بہن بھی تو عورت ہو سکتی ہے۔"

منٹو نے قہقہہ لگایا۔ "ہو سکتی ہے! یہ خوب کہا۔" مگر منٹو کو ضد ہو گئی۔ "آپ کو اس سے ملنا پڑے گا۔ دیکھیے تو سہی۔"

"میں اسے اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں۔ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیے تھے کہ میں بھاگ آئی کہ کہیں کم بخت پر عاشق ہی نہ ہونا پڑے۔"

اور رفیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ باوجود دنیا کے ساتوں عیب کرنے کے رفیق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مہذب انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بدمعاش ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی نہایت ایماندار اور شریف بھی۔ یہ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ یہ منٹو کا میدان ہے وہ دنیا کی ٹھکرائی کوڑے پر پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چن کر نکال لاتا ہے کوڑا کریدنے کا اسے شوق ہے کیونکہ دنیا کے سنوارنے والوں پر اسے بھروسہ نہیں۔ ان کی عقل اور فیصلہ پر بھروسہ نہیں۔ وہ ان کی شریف اور پاکباز بیویوں کے دل کے چور پکڑ لیتا ہے اور کوٹھے میں رہنے والی رنڈی کے دل کے تقدس سے اس کا موازنہ کرتا ہے عطر میں ڈوبی ہوئی عیش پسند دلہن سے میل اور پسینے میں سڑتی ہوئی گھاٹن زیادہ خوشبودار معلوم ہوتی ہے۔ "بُو" میں حالانکہ جسم ہی جسم ہے۔ غور سے دیکھیے تو جسم کے اندر رُوح بھی ہے۔ عیش پرست طبقے کی پھٹے ہوئے دودھ کی طرح پھٹکیوں دار رُوح اور کچلے ہوئے طبقے کی تصنع سے دور اصلیت۔ اگر طبقاتی تفریق کا سوال نہیں تو ہم اسے قطعی طور پر جسمانی سوال بھی نہیں کہہ سکتے۔ منٹو کے ذہن میں ضرور دو طبقوں کے فرق کا خیال تھا اور وہ اس بُت کو جس کی دنیا پوجا کرے زمین پر پٹخنے میں بڑی بہادری محسوس کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے بدمعاش دوستوں کے کارنامے فخریہ سُنایا کرتا۔ ایک دن میں نے جلانے کو کہہ دیا یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصل میں نہ ہزاروں رنڈیوں سے ان کا تعلق رہا اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی عورت کی آبرو ریزی کی اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے لگا کہ یہ لوگ واقعی بدمعاشیاں کرتے ہیں اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

"سب جھوٹ۔" میں دھاندلی کرنے لگی۔

"ارے آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بازار میں جو چاہے جا سکتا ہے۔"

"مگر ان لوگوں کی اتنی ہمت نہیں جو طوائفوں کے کوٹھوں پر جا سکیں۔ بہت کرتے ہوں گے گانا سُن کر چلے آتے ہوں گے۔"

"مگر میں خود گیا ہوں رنڈی کے کوٹھے پر۔"

"گانا سُننے۔" میں نے چڑایا۔

"جی نہیں، اپنے دام وصول کرنے اور ہمیشہ میرے دام وصول ہو گئے۔" پھر بھی میں نے کہا۔

"میں نہیں یقین کرتی۔"

"وہ کیوں؟" وہ اُٹھ کر بالکل میرے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"بس میری مرضی۔ آپ میرے اوپر رُعب ڈالنا چاہتے ہیں۔"

"بھئی خدا کی قسم میں کہتا ہوں میں گیا ہوں۔"

"خدا پر آپ کو یقین نہیں بیکار اسے نہ گھسیٹئے۔"

"اپنے مرحوم بچے کی قسم کھاتا ہوں میں ایک بار نہیں بلکہ......"

"مرحوم بچے کو اب آپ جھوٹی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟"

اور منٹو وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا کہ آج تو منوا کر رہوں گا کہ میں رنڈی باز ہوں۔ صفیہ کی گواہی دلوائی۔ میں نے دو منٹ میں صفیہ کو چت کر دیا کہ ممکن ہے یہ تم سے کہہ کر گئے ہوں کہ رنڈی کے یہاں جا رہے ہیں اور اگر گئے بھی ہوں تو سلام کر کے چلے آئے ہوں گے۔

صفیہ چپ سی ہو گئی۔ "اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام کر کے آ گئے یا......" وہ عجب گومگو میں رہ گئی۔

منٹو نے جوش میں کچھ زیادہ تیزی سے پی ڈالی اور بُری طرح لڑنے لگا کہ یہ تو آج منوا کر چھوڑوں گا کہ میں پکا رنڈی باز ہوں اور میں نے کہہ دیا آج اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں مان کے دوں گی نہیں۔

ایک تو نشہ دوسرے منٹو کے مزاج کی جبلّی تلخی اگر بس چلتا تو میرا منہ نوچ لیتا۔

صفیہ نے بسور کر کہا۔ بہن مان جاؤ۔ شاہد نے کہا بس اب گھر چلو مگر منٹو نے شاہد کی ٹانگ لینا شروع کی اور کہہ دیا کہ بغیر قائل ہوئے جانے نہیں دوں گا۔ خاصا ہنگامہ ہو گیا۔

بڑی سنجیدگی سے منٹو نے شاہد سے کہا چلو رنڈی کے یہاں ابھی اسی وقت آج میں قائل نہ کر دوں تو میں نے ماں کا دودھ نہیں سؤر کا دودھ پیا۔" مگر میں نے اور چڑایا۔

"آپ جائیں وائیں گے نہیں یونہی بائیکلا برج پر گھوم کر آ جائیں گے اور ہم یقین نہیں کریں گے کیا فائدہ۔"

اب تو منٹو کے سر میں لگی تو ایڑی میں جا کر شاید ہی بجھی ہو۔ غصہ ضبط کر کے پوچھا۔

"پھر کیسے یقین دلایا جائے؟"

میں نے کہا "ہمیں یعنی مجھے اور صفیہ کو بھی ساتھ لے چلئے۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" صفیہ بگڑی۔ "تمہارا تو دماغ خراب ہوا ہے تم ہی جاؤ۔"

"جائے گی کیسے نہیں۔" منٹو غرّایا۔

"چلو چلو..." صفیہ کو ہم نے آنکھ ماری اور چاروں چلے۔ دروازے سے ہم دونوں تو نکل آئے، منٹو کو صفیہ نے نہ جانے کیسے قابو میں کیا۔ دوسری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو منٹو نے خوب قہقہے لگائے اور پھر چپکے سے کہا "مگر اب تو مان جاؤ؟"

میں نے کہا "قطعی نہیں۔"

مجھے نہیں معلوم منٹو کو تجربہ تھا یا جو کچھ اس نے رنڈی کے بارے میں لکھا ہے وہ اس کے اپنے اصول اور یقین کی بنا پر ہے کیونکہ اگر وہ رنڈی کے کوٹھے پر گیا بھی ہو گا تو وہاں رنڈی سے زیادہ اس نے ایک عورت کا دل دیکھا ہو گا جو باوجودیکہ موری کا

کیڑا ہے مگر زندگی کی قدروں کو پیار کرتی ہے۔ اچھے اور بُرے کو ناپنے کے جو پیمانے عام طور پر بنا دیے گئے ہیں وہ انھیں توڑ پھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی تول سے ان کا اندازہ لگاتا تھا۔ خوشیا، جیسے ڈھیٹ اور نکمّے انسان کی رگِ حمیت بھی پھڑک سکتی ہے۔ ’’گوپی ناتھ‘‘ جیسا رقیق انسان بھی دیوتاؤں پر بازی لے جا سکتا ہے۔ بلن، موہان دیوتا بھی سرنگوں ہو سکتے ہیں۔ قومی رضا کار، بدکار بھی ہو سکتے ہیں اور لاش سے زنا کرنے والا خود لاش بھی بن سکتا ہے۔

کبھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ ڈور ٹوٹی معلوم ہوتی۔ ایک دن کسی بات پر ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ دانت پیس کر بولا۔

’’آپ عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہتا کہ دانت کھٹے ہو جاتے۔‘‘

’’دل کا ارمان نکال لیجئے مروت کی ضرورت نہیں۔‘‘ میں نے چڑایا۔

’’اب جانے بھی دیجئے کوئی مرد ہوتا تو بتاتے۔‘‘

’’بتا بھی دیجئے ایسے کون کون سے تیر ترکش میں باقی رہ گئے ہیں نکال بھی دیجئے۔‘‘

’’آپ جھینپ جائیں گی۔‘‘

’’قسم خدا کی نہیں جھینپوں گی۔‘‘

’’تو آپ عورت نہیں۔‘‘

’’کیوں کیا عورت کے لیے جھینپنا اشد ضروری ہے، چاہے جھینپ آئے یا نہ آئے؟ بڑا افسوس ہے منٹو صاحب! آپ بھی عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ اصول بناتے ہیں۔ میں سمجھی تھی آپ ’عام لوگوں‘ کی سطح سے بلند ہیں۔‘‘ میں نے مسکہ لگایا۔

’’قطعی نہیں...... میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا۔‘‘

’’تو پھر کہئے نہ وہ جھینپا دینے والی بات۔‘‘

’’نہیں۔ اب غصّہ اُتر گیا۔‘‘ وہ ہنس کر بولا۔

’’اچھا دوستی ہی میں سہی بتائیے وہ کون سی خطرناک بات تھی۔‘‘

’’کچھ نہیں.... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ شاید کوئی موٹی سی گالی دے دیتا۔‘‘

’’بس؟‘‘ میں نے نا اُمید ہو کر کہا۔

’’یا شاید کس کے جھانپڑ مارتا۔‘‘ نادم ہو کر بولا۔

’’مجھ پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا میں نے ایسی ضخیم ضخیم گالیاں سُنی ہیں کہ حد نہیں اور میرے تھپڑ بھی خاصے زور کے پڑ چکے ہیں مگر پہلی دفعہ آپ نے عورت سمجھ کر رعایت کی۔ میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار۔‘‘ اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

ایک دن دفتر میں گرمی سے پریشان ہو کر میں نے سوچا جا کر منٹو کے یہاں آرام کر لوں پھر واپس ملاد جاؤں۔ دروازہ حسبِ معمول کھلا ہوا تھا جا کر دیکھا تو صفیہ منہ پھُلائے لیٹی ہے۔ منٹو ہاتھ میں جھاڑو لیے شاسٹ پلنگ کے نیچے ہاتھ مار رہا ہے اور

ناک پر کرتے کا دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں؟" میں نے میز کے نیچے جھانک کر پوچھا۔

"کرکٹ کھیل رہا ہوں۔" منٹو نے بڑی بڑی مورپنکھ جیسی پتلیاں گھما کر جواب دیا۔

"یہ لیجیے! ہم نے سوچا تھا ذرا آپ کے یہاں آرام کریں گے تو آپ لوگ روٹھے بیٹھے ہیں۔" میں نے واپس جانے کی دھمکی دی۔

"ارے!" صفیہ اٹھ بیٹھی۔ "آؤ آؤ۔"

"کاہے کا جھگڑا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں میں نے کہا کھانا پکانا گرہستی وغیرہ مردوں کا کام نہیں۔ بس جیسے تم سے الجھتے ہیں مجھ سے بھی الجھ پڑے کہ کیوں نہیں مردوں کا کام، میں ابھی جھاڑو دے سکتا ہوں۔ میں نے بہت روکا تو اور لڑ پڑے، کہنے لگے ایسا ہی ہے تو طلاق لے لے ———" صفیہ نے بسور کر کہا۔

منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لیے میں نے بن کر کھانسنا شروع کیا۔ "صبح ہی صبح میونسپلٹی کے بھنگی نے صحن صاف کرنے کے بہانے دھول حلق میں جھونکی، اب آپ ارمان نکال لیجیے۔ گرمی کے مارے جان نکل رہی ہے۔"

جلدی سے جھاڑو چھوڑ منٹو ہوٹل سے برف لانے چلا گیا۔ صفیہ ہنڈیا بگھارنے چلی گئی۔ برف لا کر منٹو نے تولیہ دیوار پر مار مار کر توڑی اور پلیٹ میں بھر کر سامنے رکھ دی اور اکڑوں بیٹھ گیا۔

"اور سنائیے۔" اس نے حسبِ عادت کہا۔ ہانڈی کے بگھار سے مجھے زور سے ابکائی آئی۔

"افوہ! یہ صفیہ کیا مُردہ جلا رہی ہے۔" میں نے ناک بند کر کے کہا۔ منٹو نے چونک کر مجھے دیکھا سر سے پیر تک بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں اور چھلانگ مار کر جھپٹا۔ باورچی خانے میں صفیہ چیختی رہی اور اس نے بھر لوٹا پانی پتیلی میں جھونک دیا۔

واپس آ کر وہ سہما سہما رسان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کچھ جھینپ کر ہنس دیا۔

میں بیوقوفوں کی طرح تکتی رہی۔

صفیہ بڑبڑاتی آئی تو اسے زور سے ڈانٹا پھر بڑے شرمیلے انداز سے بولا۔

"آپ کے پیٹ میں بچہ ہے؟" جیسے بچہ میرے نہیں خود اس کے پیٹ میں ہو۔ "میں نے فوراً تاڑ لیا۔ جب صفیہ کے پیٹ میں بچہ تھا تو اسے بھی بگھار سے ابکائی آتی تھی۔"

"منٹو صاحب! خدا کے لیے دائیوں جیسی باتیں نہ کرو۔" میں نے چڑ کر کہا۔ وہ زور سے ہنسا۔

"ارے واہ۔ اس میں کیا برائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں ابھی کیریاں لاتا ہوں۔" وہ لپک کر نیچے گیا اور کرتے کے دامن میں بچوں کی طرح کیریاں بھر کے لے آیا۔ کیریاں چھیل کر بڑی نفاست سے نمک مرچ لگا کر مجھے دیں اور خود اکڑوں بیٹھا مجھے غور سے دیکھ کر مسکراتا رہا۔

"صفیہ ارے صفیہ!" وہ چلایا۔

صفیہ دھوئیں سے لال آنکھیں آنچل سے پونچھتی ہوئی آئی۔ "کیا ہے منٹو صاب! کتنا چلاتے ہو؟"

"ارے بیوقوف! ان کا پیر بھاری ہے۔" اس نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"اُف گندگی کی انتہا ہے۔ جبھی تو آپ کو لوگ فحش نگار کہتے ہیں۔" میرے اس بگڑنے پر منٹو خوب خوب چہکا اور بڑی بوڑھیوں جیسے مشورے دینے لگا۔

"پیٹ پر زیتون کے تیل کی مالش سے گھروچے نہیں پڑیں گے۔"

"نہار منہ سیب کا مربہ کھانے سے ابکائیاں نہیں آئیں۔"

"کھوپرہ کھانے سے بچہ گورا ہوگا اور آسانی سے ہوگا۔"

"جاپے میں برف نہ چبایئے گا۔ نلے سُوج جاتے ہیں۔ کیوں صفیہ؟"

"ہٹو منٹو صاحب کیسی باتیں کرتے ہو۔" صفیہ کھسیا کر رہ گئی۔

اور جب نسیما پیدا ہوئی تو صفیہ میرے پاس بیٹھی کانپتی رہی مگر بچی کو دیکھ کر منٹو کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا وہ دیر تک مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بتاتا رہا۔ صفیہ کا دل پگھل گیا اور سال کے اندر اندر منٹو کی بڑی بیٹی نگہت پیدا ہوگئی۔ پونا سے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا میں فوراً آگئی تو منٹو نے مکان بدل لیا تھا۔ ڈھونڈھ ڈھانڈ کر نئے مکان پہنچی تو دیکھا ڈرائنگ روم میں الگنی پر پوتڑے نچوڑ نچوڑ کر پھیلا رہے ہیں۔ نیا مکان بہت چھوٹا اور ریلیز ہوا کا تھا۔ منٹو نے اس لیے بدل لیا کہ اس کا فرش گندہ تھا بچی گھٹنوں چلتی تو پھانس لگ جاتی اور مٹی چاٹ جاتی۔ یہاں نگہت مزے سے فرش پر کھیل سکے گی۔ حالانکہ نگہت چند ہفتوں کی تھی۔

"مجھے بچے سخت ناپسند ہیں۔" منٹو سنجیدگی سے کہتا۔ "یہ جان کو چمٹ جاتے ہیں۔ مجھے ان سے اسی لیے ڈر لگتا ہے۔ ہر وقت انہی کا خیال رہتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔" وہ دودھ کی بوتل دھو کر فلسفہ چھانٹتا۔ میری بھتیجی مینو اسے بڑی پیاری تھی۔ گھنٹوں اس کے ساتھ گڑیوں اور ہنڈکلیوں کی باتیں کیا کرتا۔ فرمائش پر کھڑکی سے بانس ڈال کر اس کے لیے املیاں توڑ کر نیچے سے کرتے کے دامن میں سمیٹ لاتا۔ نسیما کو پاٹ پر بٹھا کر "شی شی" کرتا اور بچوں کا بہت شاکی تھا کیونکہ وہ ان کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب ہم ملاڈ میں رہتے تھے، رات کے کوئی ساڑھے بارہ ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ معلوم ہوا صفیہ سانس پھولی ہوئی سی کھڑی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ بولی "میں نے منع کیا کہ ایسی حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہیے مگر وہ کہاں سنتے ہیں۔" منٹو مع نند اجی اور خورشید انور کے اندر آگئے۔

"یہ صفیہ کون ہوتی ہے منع کرنے والی۔" ہاتھ میں بوتل اور گلاس لیے تینوں در آئے۔ شاہد نے پارٹی کو لبیک کہا۔ طے ہوا بہت بھوکے ہیں، ہوٹل سب بند ہو چکے ہیں، ریل کا وقت گذر گیا، کچھ مل جائے تو خود پکا کر کھالیں۔ بس آٹا دال دے دو، خود باورچی خانے میں جا کر پکالیں گے۔

صفیہ کو مردوں کا روٹی پکانا قطعی نہ بھایا مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ باورچی خانے پر چڑھائی کر دی۔ منٹو آٹا گوندھنے لگے، نند اجی انگیٹھی پر ٹوٹ پڑے اور خورشید انور کو آلو چھیلنے کو دے دیے گئے جو وہ چھیلنے سے زیادہ کچے کھانے پر مُصر تھے اور پھر بوتل بھی باورچی خانے میں آگئی۔ لوگ پھسکڑا مار کر وہیں بیٹھ گئے اور کچے پکے پراٹھے پکاتے گئے کھاتے گئے۔ منٹو نے آٹا بہت اچھا گوندھا اور بڑے سلیقے سے روٹی پکالی اور پھر جھٹ سے پودینے کی چٹنی پیس ڈالی۔ کھانا کھا کر یہ لوگ وہیں پھیل کر سو بھی جاتے اگر زبردستی برآمدے

تک نہ گھسیٹا جاتا۔

یہ زندگی تھی جو منٹو کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ معقول آمدنی ہو، پینا پلانا ہو، قہقہے ہوں اور بے فکریاں۔ ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منٹو پر مقدمہ چلا دیا۔ منٹو کی دیرینہ آرزو بر آئی۔ لاہور میں بھی لطف آ گیا خوب دعوتیں اڑائیں۔ اسی بہانے لاہور کی زیارت ہو گئی۔ زری کے جوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے جیسے کنول کے پھول۔ زری کے جوتے بہت جچنے لگے۔

”میرے پیر بڑے بھدے ہیں۔ میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت جوتے۔“ میں نے کہا۔

”اور میرے پیر اتنے زنانے ہیں کہ مجھے ان سے شرم آتی ہے۔“

مگر ہم دونوں نے کئی جوڑ جوتے خریدے۔

”آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں۔“ میں نے کہا۔

”بکواس ہیں میرے پیر۔ لائیے بدل لیں۔“

”بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں۔“ میں نے رائے دی۔

”بخدا! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ منٹو نے چہک کر کہا۔

محبت کے مسئلہ پر کتنی ہی جھڑپیں ہوئیں مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہ یہی کہتا۔

”محبت کیا ہوتی ہے؟ مجھے اپنے زری کے جوتے سے محبت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچویں بیوی سے محبت ہے۔“

”میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دوشیزہ سے ہو جاتا ہے۔“

”ہاں،... میں سمجھ گیا۔“ منٹو نے دورِ ماضی کے دھندلکوں میں کچھ ٹٹول کر سوچتے ہوئے خود سے کہا۔ ”کشمیر میں ایک چرواہی تھی۔“

”پھر؟“ میں نے داستان سننے والوں کی طرح ہنکارہ دیا۔

”پھر کچھ نہیں۔“ وہ ایک دم بچاؤ کے لیے تن گیا۔

”آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں اور آج آپ شرما رہے ہیں۔“

”کون گدھا شرما رہا ہے؟“ منٹو نے واقعی شرما کر کہا...... بڑی مشکل سے اس نے بتایا۔

”بس جب وہ مویشی ہانکنے کے لیے اپنی لکڑی اوپر اٹھاتی تھی تو اس کی سفید کہنی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں کچھ بیمار تھا، روز ایک کمبل لے کر پہاڑی پر جا کر لیٹ جایا کرتا تھا اور سانس روکے اس لمحے کا انتظار کیا کرتا تھا جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو آستین سرک جائے اور مجھے اس کی سفید کہنی دکھائی دے جائے۔“

”کہنی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں...... میں نے سوائے کہنی کے اس کے جسم کا اور کوئی حصہ نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی۔ اس کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کہنی کی جھلک دیکھنے کے لیے لپکتی تھیں۔“

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر ایک دن میں کمبل پر لیٹا تھا، وہ مجھ سے تھوڑی دور آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ میں نے پوچھا، مجھے دکھاؤ تو شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا اور بولی کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے ضد ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔ وہ رُوہانسی ہو گئی مگر میں بھی ضد پر اڑ گیا اور آخر کو بڑی رد و کد کے بعد اس نے مٹھی کھول کر ہتھیلی میرے سامنے کر دی اور خود شرم سے گھٹنوں میں منہ دے دیا۔

"کیا تھا اس کی ہتھیلی پر؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"مصری کی ڈلی! اس کی گلابی ہتھیلی پر برف کے ٹکڑے کی طرح پڑی جھلملا رہی تھی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"میں دیکھتا رہ گیا۔" وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

"پھر؟"

"پھر وہ اُٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دور سے پلٹ آئی اور وہ مصری کی ڈلی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ مصری کی ڈلی بہت دنوں تک میری قمیص کی جیب میں پڑی رہی۔ پھر میں نے اسے دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد چیونٹیاں کھا گئیں۔"

"اور لڑکی؟"

"کون سی لڑکی؟" وہ چونکا۔

"وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی تھما دی۔"

"اسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔"

"کس قدر پھُس پھُسا ہے آپ کا عشق!" میں نے ناامیدی سے چڑ کر کہا۔ "مجھے تو بڑے کسی شعلہ بداماں قسم کے عشق کی امید تھی۔"

"قطعی پھُس پھُسا نہیں۔" منٹو بگڑ پڑا۔

"بالکل ردی۔ ..... تھرڈ ریٹ۔ مرگھلا عشق۔ مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے۔ بڑا تیر مارا۔"

"تو اور کیا کرتا؟ اس کے ساتھ سو جاتا؟ ایک حرامی پلّا اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ڈینگیں مارتا۔" وہ بگڑا

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ مصری کی ڈلی کڑکڑا کر کھانے کی نہیں دھیرے دھیرے چوسنے کی چیز ہے۔"

یہ وہی منٹو تھا۔ فحش نگار۔ گندہ ذہن!

جس نے "بُو" لکھی تھی۔

جس نے "ٹھنڈا گوشت" لکھا تھا۔

لیکن 'مرزا غالب' میں چودھویں بیگم مرزا غالب کی محبوبہ ہو یا نہ ہو اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا مگر منٹو کے خیالوں کی لڑکی ضرور ہے جسے وہ ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔ جس کی کلائی کی جھلک دیکھنے کے لیے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ تضاد جو منٹو کی مختلف کہانیوں

میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ "نیا قانون" لکھتا ہے اور دوسری طرف "بُو"...... دونوں میں وہ خود کو غرق کر کے لکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک فحش نگار یاد رہ جاتا ہے اور واقعہ نگار کو وہ بھول جاتے ہیں۔ قصداً یا سہواً؟ ..... ایک ہی بات ہے!

ملک میں فساد شروع ہو گئے بٹوارے کے بعد اس کوٹھی کے وہاں اُس کوٹھی میں کیسے جانے لگے۔ منٹو اس وقت فلمستان میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مدح سرائی جو اس کی زندگی کا سہارا تھی اسے ملتی تھی کہ اس کی فلم "آٹھ دن" کامیاب نہ ہوئی۔ نہ جانے کیوں وہ فلمستان چھوڑ کر اشوک کمار کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا۔ اسے اشوک کمار بہت پسند تھا۔ مکرجی نے نہ جانے اسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ایک دم اس کے خلاف ہو گیا۔

"بکواس ہے مکرجی۔ فراڈ ہے پکا۔" وہ تلخی سے کہتا۔

بمبئی ٹاکیز میں جا کر اس نے مجھے بھی کمپنی میں ایک سال کے لیے سینیریو ڈیپارٹمنٹ میں کام دلوا دیا اور بہت ہی خوش ہوا۔

"اب ہم دونوں مل کر کہانی لکھیں گے تہلکہ مچ جائے گا۔ میری اور آپ کی کہانی، اشوک کمار ہیرو، بس پھر دیکھیے گا۔"

ایک کہانی منٹو کے زیرِ غور تھی، اشوک کو وہ پسند تھی۔ اس سے پہلے اسے مجبور کی کہانی پسند تھی پھر دل سے اُتر گئی اور منٹو کی کہانی پسند آئی۔ میرے آنے کے بعد اسے میری کہانی ضدی پسند آ گئی۔ خیر منٹو کو ناگوار نہ گزرا۔ اب اشوک کمار نے مجھ سے منٹو کی کہانی پر کام کرنے کو کہا اور منٹو کو میری کہانی پر! نتیجہ یہ کہ منٹو مجھ سے اور میں منٹو سے شاکی ہونے لگے۔ اُدھر کمال امروہی "محل" کی کہانی لے کر آ گئے اور اشوک کمار کو وہ پسند آ گئی اور ہم دونوں کی کہانی کھٹائی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال ہوتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار و قطار ہی میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ چین سے بیٹھو۔ تنخواہ ملتی رہے گی کیونکہ کنٹریکٹ ہو چکا ہے لیکن کہانی ہماری نہیں بنے گی لہٰذا میری اور شاہد کی پوری کوششیں اپنی کہانی 'ضدی' کو بنوانے کی طرف لگ گئیں اور بغیر اشوک کمار کے دوسرے درجہ کی تصویروں کی قطار میں ضدی بنائی جانے لگی۔

مگر منٹو کی کہانی رہ گئی۔ منٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی اُدھیڑ بُن کیا کرتا کبھی انجام کو آغاز بنا کر لکھتا کبھی آغاز کو انجام بنا کر کبھی وسط سے شروع کر کے آغاز پر ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کہانی کی کوئی کل اشوک کمار کو پسند نہ آئی۔ مگر منٹو یہی کہتا:

"آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں، میں سمجھتا ہوں۔ وہ میری کہانی میں ضرور کام کرے گا۔"

"آپ کی کہانی میں اس کا رول رومینٹک نہیں باپ کا ہے وہ کبھی نہیں کرے گا۔" اور منٹو سے پھر لڑائی ہونے لگتی۔ مگر دبی زبان سے — یہاں اپنی فکر پڑی تھی اور وہی ہوا کہ "ضدی" اور "محل" بن گئیں۔ منٹو کی کہانی رہ گئی۔ منٹو کو اس کی امید نہ تھی اور اسے بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا۔ اُدھر ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے بیوی بچے اسے پاکستان بلانے لگے۔ منٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا۔ پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوٹھیاں ملیں گی۔ وہاں ہم ہی ہم ہوں گے، بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر منٹو مجھ سے واقعی بد دل ہو گیا۔ اتنی لڑائیاں اور جھگڑے میرے اس سے ہوئے مگر یوں کسی سنجیدہ اصول پر بحث نہیں ہوئی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا منٹو کتنا بزدل ہے۔ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لیے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی۔

اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کیے اور ملے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی ہتک محسوس ہوئی۔

پھر جب اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشادہ اور خوبصورت، قیمتی سامان سے آراستہ۔ ہمیں اس نے پھر بلایا تھا۔ ’ضدی‘ ختم ہو گئی تھی اور ہم نے ’آرزو‘ شروع کر دی تھی۔ بُرے وقت آتے تھے اور چلے گئے تھے۔ اس کے پھر دو خط آئے۔ اس نے بلایا تھا، ایک سینما الاٹ کروانے کی امید دلائی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس کی محبت کا پہلے بھی یقین تھا مگر اب تو اور بھی مان جانا پڑا۔ مگر میں نے اس کے خط پھاڑ دیے اس بات سے چڑ کر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا۔ میں نے تو اسے جانے سے نہیں روکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے۔

پھر سُنا منٹو بہت خوش ہے۔

مکان چھن گیا مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔

اور سال گزرتے گئے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ منٹو کا ایک خط آیا: "کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلوا لو۔"

پھر معلوم ہوا منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ اچھا ہوا جیل ہو گئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جلسے ہوئے نہ میٹنگیں ہوئیں نہ ریزولیوشن پاس ہوئے۔

پھر معلوم ہوا کہ دماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں یار دوست پہنچا آئے ہیں۔

مگر ایک دن منٹو کا خط آیا۔ بالکل ہوش و حواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر مکرجی سے کہہ کر بمبئی بلوا لو تو بہت اچھا ہو۔ اس کے بعد عرصہ تک کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا۔ پھر سُنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے۔ اب منٹو کی خبروں سے ڈر سا لگتا تھا۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو مگر پاگل خانے سے آگے جو قدم پڑتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑوی خبریں سُنیں کہ جی اُوب گیا۔ بے طرح پینے لگے ہیں۔ اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھواتے ہیں۔ پیشگی پیسہ دو تو سب کھا جاتے ہیں۔

منٹو کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اُوپر لکھنے کو کہا تھا اور بے ساختہ میری منحوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی۔

اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ منٹو ہی نہیں عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا۔ آج صرف ایک کسک زندہ ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مر چکا اور میں زندہ ہوں؟ یہ میرے سینے پر پھر قرض جیسا بوجھ کیوں ہے؟ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا یہی نا کہ اس نے مجھے بہن کہا تھا۔ مگر بہنیں تو کھڑی بھائیوں کو دم توڑتا دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ہیں جو نہ دُکھتا ہے نہ رِستا ہے

خاموش سلگتا رہتا ہے۔

آج مجھے صفیہ بے طرح یاد آ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ایک بار سر جوڑ کر ہم ویسے ہی باتیں کر سکیں جیسے برسوں ہوئے اڈلفی چیمبر میں کیا کرتے تھے۔ مگر وہ تھیں سہاگ رات اور پہلوٹھی کے بچے کی باتیں، یہ ہیں موت کی باتیں۔ اسی لیے ڈرتی ہوں اور میرا قلم خشک ہو جاتا ہے۔ نہ جانے ان چند سالوں میں اس پر کیا گزری ہے۔ کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے منٹو کو فراموش کر دیا تب بھی تمھاری محبت اس طوفانی ہستی کا سہارا چٹان بن کر دیتی رہی یا تمھارا پیار تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیا یہ بارہ تیرہ برس کا بھونچال تمھیں جھنجھوڑ کر پست کر گیا یا تم اب بھی اپنے منٹو صاب کی صفیہ رہیں؟ پاس پڑوس کے مہذب لوگ اور رشتہ دار جب اس کی بد روی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں؟ ان خاموش گیسوں کا تمھارے پاس کیا جواب تھا جب بے مروتی اور لاپروائی سے تمھارے اردگرد منڈلایا کرتی تھیں، دم تو نہ گھٹ جاتا تھا؟ کیا اس نے تمھاری پیار بھری گود میں دم توڑا یا وہ تنہا اور بھرے خاندان میں اکیلا ہی سدھارا؟ کیا بچیاں اپنے باپ کو پاگل مفلس شرابی سمجھتی تھیں؟ اس نے تمھیں تنگدستی اور ندامت کے سوا کیا کچھ بھی نہیں دیا؟ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم نہ جانے کیوں اس کی تحریروں میں اپنی زندگی کا دھندلا سا بھی عکس نہیں ہے۔ وہ اپنی مشکلوں کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا رہا۔ اس نے انھیں عیب کی طرح چھپایا۔ اسے غرّہ تھا کہ چاہے تو وہ دم بھر میں لاکھوں کما کر پھینک دے۔ جبھی تو اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ فاقے بھی کر سکتا ہے اور اس کا قلم بے کسی سے گھسٹتا رہتا ہے۔

تم عاجز تو نہیں آ گئیں ادیبوں سے؟ یونہی خود گھسٹتے ہیں اور اپنوں کو دلدل میں گھسیٹتے ہیں! ..... اور پھر ایک دن اکیلا چھوڑ کر چل دیتے ہیں، تو بہن یہ ادیبوں ہی کی عادت نہیں ہمارے دیش کے لاکھوں کروڑوں انسان اسی طرح زندگی بھر ناکامی اور نامرادی کا شکار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ادیب ہوں یا کلرک! ان کی یہی زندگی ہے اور کم و بیش یہی انجام۔ جو زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور ڈھیٹ سسکتے رہتے ہیں۔

نہ جانے دل کیوں کہتا ہے کہ منٹو کی اس جواں مرگی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دامن پر بھی خون کے نظر نہ آنے والے چھینٹے ہیں جو صرف میرا دل دیکھ سکتا ہے۔ وہ دنیا جس نے اسے مرنے دیا میری ہی تو دنیا ہے۔ آج اسے مرنے دیا اور کل یونہی مجھے بھی مر جانے کی اجازت ہوگی اور پھر لوگ ماتم کریں گے۔ میرے بچوں کا بوجھ ان کے سینے پر چٹان بن جائے گا۔ جلسے کریں گے، چندے جمع کریں گے اور ان جلسوں میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی نہ آ سکے گا۔ وقت گزر جائے گا سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے۔

منٹو میرا دشمن

اوپیندر ناتھ اشک

منٹو، میرا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ ہم میں خاصی چپقلش رہتی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ہم اکٹھے رہے ہم نے ایک دوسرے کو سخت چوٹیں پہنچائیں۔ کتب پبلشرز بمبئی سے شائع ہونے والے 'نئے ادب کے معمار' کے سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا جو اسکیچ کرشن چندر نے لکھا اس میں اس چپقلش کا ذکر بھی کر دیا اور ہماری یہ دشمنی روایتی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی 'دشمنی' کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے اصرار کیا ہے کہ اگر میں نے منٹو کے بارے میں مضمون نہ لکھا تو وہ مجھے کبھی نہ بخشے گا۔ لیکن آج جب منٹو اس دنیا میں نہیں ہے، میں سوچتا ہوں کہ کیا ہم واقعی دشمن تھے؟ اور پندرہ بیس برسوں کا جائزہ لیتا ہوں تو پاتا ہوں کہ اگر ہمارے تعارف کی ابتدائی دشمنی سے نہ ہوتی تو ہم بہت اچھے دوست ہوتے۔

منٹو کی اور میری افتادِ طبع میں زمین آسمان کا فرق تھا ـــــ وہ لڑکپن ہی سے دینو یا فضلو کمہار کی دکانوں کے اوپر چوباروں میں جمنے والی جُوئے کی محفلوں میں شامل ہوتا تھا اور رات کو خواب بھی تاش ہی کے دیکھتا تھا اور میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ رِندِ بلانوش تھا اور میں نے شراب تو دور رہی سگریٹ بھی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پیا جب میں بتیس برس کا تھا۔ اس نے کٹڑہ گھونیاں ہو یا ہیرا منڈی ہو یا فارس روڈ، اس بازار کی خوب سیر کی تھی اور میں نے اُدھر جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ماں نے بچپن ہی سے ان تینوں کے خلاف سخت نفرت میرے دل میں بھر دی تھی۔ والدِ محترم نے ان تینوں میدانوں میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے، میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی آئندہ دو نسلیں اس سلسلے میں کچھ بھی کیے بغیر ان پر فخر سے سر بلند کر سکتی ہیں۔ ان کے انہی کارناموں کی وجہ سے گھر کی جیسی حالت ہو گئی اور ہم نے جس عسرت میں بچپن کے دن کاٹے اس نے خون کو کچھ ایسا منجمد کر دیا کہ آج جب میں سگریٹ یا شراب کو ویسا معیوب نہیں سمجھتا، کبھی کھُل کھیلنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ پتاجی، جب ایک آدھ پیگ چڑھا لیتے تھے عموماً نعرہ لگاتے تھے ـــــ 'کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے!' وہ حال ہی میں جیتے تھے اور انھوں نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی۔ ردِ عمل کے طور پر میں نے لڑکپن ہی میں زندگی کا سارا خاکہ تیار کر لیا تھا ـــــ اور منٹو کو میرے اس زہد، حسابیت، پلاننگ، کفایت شعاری اور ٹھہراؤ سے سخت نفرت تھی۔ اپنی اس نفرت کا اظہار اس نے کئی بار سخت ترین الفاظ میں کیا۔

.... مجھے منٹو نے فلمستان میں کام کرنے کے لیے بمبئی بلایا تھا۔ میرے بمبئی پہنچنے کے دوسرے یا تیسرے دن ہا د

ہم وکٹوریہ میں آمنے سامنے بیٹھے گرانٹ روڈ کو جا رہے تھے۔ منٹو نے تھوڑی سی پی رکھی تھی۔ اچانک اس نے انگریزی میں کہا۔
"I LIKE YOU THOUGH – I HATE YOU."

...... ڈیڑھ سال بعد ہم فلمستان کی کنٹین میں بیٹھے تھے۔ لنچ کا وقت تھا۔ منٹو کی میز پر حسبِ دستور راجہ مہدی علی خاں، واچا وغیرہ دو ایک دوست تھے۔ میں برابر کی میز پر اپنی یونٹ کے دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیسے ہندوؤں کے واہ کرم سنسکار اور کپال کریا ——— یعنی مُردے کی کھوپڑی کو توڑنے کی رسم کا ذکر چلا۔ منٹو نے دانت پیس کر کہا ——— "اشک جب مرے گا تو اس کی کپال کریا میں کروں گا۔"

...... میں کے۔ ای۔ ایم ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دے دیا تھا۔ راجہ مہدی علی خاں مجھ سے ملنے آیا اور اس نے کہا، "منٹو کہتا ہے کہ سالا اس طرح پیسہ نہ جوڑتا تو بیمار نہ پڑتا۔"

جب گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے منٹو نے مجھ سے کہا تھا، "میں تمھیں پسند کرتا ہوں لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے" تو میں نے جواب میں کہا کہ یہی حال میرا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے محض جواب کے لیے جواب دیا تھا ورنہ منٹو سے مجھے دراصل کبھی نفرت نہیں ہوئی۔ رہا منٹو تو اس نفرت کے باوجود جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا تھا اور اس تضاد کے باوجود جو ہماری طبیعتوں میں تھا میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم دونوں گہرے دوست ہوتے اگر میں نے اپنے پھکڑپنے میں منٹو کو بنا دیکھے بنا جانے، بنا پڑھے اس کے خلاف ایک سخت جملہ نہ کس دیا ہوتا۔

بات شاید ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کے آس پاس کی ہے۔ منٹو کی ایک کہانی 'خوشیا' ایک رسالے میں چھپی تھی۔ میں اور راجندر سنگھ بیدی اس زمانے میں ساتھ ساتھ لکھا پڑھا کرتے تھے۔ وہ کہانی لکھتے تو مجھے آکر سنانا نہ بھولتے اور میں لکھتا تو انھیں جا سناتا۔ دونوں مل کر ہمعصروں کے افسانوں پر تبادلۂ خیالات کرتے اور جیسا کہ نوجوانی میں ہوتا ہے، ہماری رائیں خاصی تیز اور حکمی ہوتیں۔ بیدی نے "خوشیا" کے بارے میں میری رائے پوچھی۔

میں نے اس وقت تک منٹو کی کوئی چیز نہ پڑھی تھی، نہ اسے دیکھا تھا۔ "سرگذشتِ اسیر" کے نام سے ہیوگو کا ایک ترجمہ منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا اور میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ روسی افسانوں کے ترجمے بغل میں دبائے کسی ناشر کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے یہ میں نہیں جانتا۔ بہرحال 'خوشیا' کی اشاعت سے پہلے منٹو کے بارے میں یہی دو ایک باتیں میں جانتا تھا اور چونکہ لکھنا میں نے کرشن، منٹو اور بیدی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، عمر میں بھی ان تینوں سے بڑا ہوں، اور اس وقت تک میرے کچھ مشہور افسانے 'ڈاچی'، 'کونپل'، 'قفس' وغیرہ لکھے جا چکے تھے اور مترجم کو میں طبعزاد لکھنے والے سے کمتر سمجھتا تھا، اس لیے میری نظروں میں منٹو کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ 'خوشیا' پڑھتے وقت بھی میں پہلے ہی مصنف کے خلاف تھا۔ 'خوشیا' مجھے بہت اچھا بھی نہیں لگا حالانکہ منٹو کی کہانیوں میں اسے خاصا درجہ حاصل ہے اور بنیادی خیال کو منٹو نے بہت اچھی طرح نبھایا ہے تو بھی مجھے یہ اعتراض تھا کہ 'خوشیا' حقیقی کردار نہیں بلکہ مصنف کے دماغ کی اختراع ہے۔ میرے ایک دوست اس زمانے میں باقاعدہ اس گلی کی سیر کرتے تھے اور ان کی وساطت سے مجھے اس کے آداب و قواعد سے خاصی واقفیت تھی۔ نچلے طبقے کی طوائفوں کے (جیسی کہ خوشیا کی کانتا ہے)

دلّال عموماً ان سے پہلے ہی جسمانی طور پر متعارف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات میں یقینی طور پر جانتا تھا۔ اسی لیے میرا خیال تھا کہ خوشیا کا کردار غیر حقیقی ہے۔ بیدی نے جب 'خوشیا' کے بارے میں میری رائے پوچھی تو اس وقت غیر شعوری طور پر یہ باتیں میرے دماغ میں تھیں۔ یوں بھی پھکڑپنے کے دن تھے۔ کسی چیز پر اتنی سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ تھی۔ جو منہ میں آیا بک دیتے تھے۔ اسی لیے میں نے کہا: "دو کوڑی کی کہانی ہے۔"

میں نے یہ بات کہی اور بھول گیا لیکن بیدی نہیں بھولا اور جب کچھ عرصے بعد بیدی دہلی گیا اور وہاں منٹو نے (جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو دلی میں آ گیا تھا) اپنی عادت کے مطابق اسے پریشان کیا تو نہ جانے کیسے اور نہ جانے کس سلسلے میں بیدی نے 'خوشیا' کے بارے میں میری رائے کا ذکر کر دیا۔

دلی سے واپس آ کر بیدی نے منٹو سے اپنی ملاقات کا حال سنایا اور کہا کہ میں نے منٹو تک تمھاری بات پہنچا دی ہے۔ چونکہ مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ تھا کہ منٹو اور میں کبھی ایک دوسرے کا راستہ کاٹیں گے اس لیے میں نے اس اطلاع کو سنا ان سنا کر دیا لیکن ۱۹۴۱ء میں جب کرشن چندر کے بلاوے پر میں دلی ریڈیو اسٹیشن گیا اور وہاں جاتے ہی ملازم ہو گیا تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ میرا وہ ریمارک کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ دوستوں نے میری ملازمت پر اس لیے خوشی کا اظہار کیا کہ اب منٹو کو اپنا بدل ملے گا یعنی اگرچہ میں اور منٹو کبھی آمنے سامنے نہ ہوئے تھے لیکن لوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا حریف مان لیا تھا۔

دہلی میں اپنی نوکری پر آنے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتہ چل گیا اور چونکہ میں ایک بڑی تکلیف دہ اور کشمکش بھری زندگی سے نجات پا کر آیا تھا اس لیے اس خیال سے میری روح کانپ گئی کہ مجھے پھر کسی سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں موقع ملتے ہی منٹو کو سمجھاؤں گا کہ لوگ محض تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے ہم کیوں تماشہ بنیں لیکن ایک تو یہ کہ ریڈیو میں اس وقت منٹو کا طوطی بولتا تھا۔ دوسرے وہ پہلے ہی سے مجھے نیچا دکھانے کے لیے اُدھار کھائے بیٹھا تھا اس لیے میری کوششیں بار آور نہ ہوئیں ——

ریڈیو کا دفتر ان دنوں علی پور روڈ کی ایک بڑی کوٹھی میں تھا۔ بڑے کمرے اسٹیشن ڈائریکٹر، پروگرام ڈائرکٹر اور میوزک ڈیپارٹمنٹ کے پاس تھے۔ چھوٹے کمروں میں سے (جو شاید کوٹھی کے باتھ روم رہے ہوں گے) ایک میں راشد، دوسرے میں کرشن اور تیسرے میں منٹو بیٹھتے تھے۔ کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں کرشن کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کرشن سٹوڈیو میں (جو سڑک کی دوسری طرف ایک کوٹھی میں واقع تھا) گیا ہوا تھا اور میں کوئی فیچر لکھ رہا تھا کہ منٹو ٹہلتا ہوا آیا اور اِدھر اُدھر کی بات کر کے اس نے 'خوشیا' کی بات چھیڑی۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھیں میری کہانی 'خوشیا' پسند نہیں آئی۔" وہ بولا۔

میں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن منٹو یوں چھوڑنے والا نہیں تھا۔ "تمھیں اس میں کیا پسند نہیں آیا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ میں یہاں ہندی صلاح کار کی حیثیت سے آیا ہوں، میرا تمھارا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم مزے سے کام کرو اور مجھے کام کرنے دو، فضول کے بحث مباحثے میں مت پڑو۔ لوگ تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں، ہم کیوں تماشہ بنیں ......

لیکن منٹو نے مجھے بات نہیں ختم کرنے دی۔ اس نے ہاتھ کی جنبش سے جیسے میری بات کو کاٹتے ہوئے وہی سوال دُہرایا اور شاید کوئی سخت بات بھی کہی۔ مجبوراً میں نے کہا: "کہانی وہ اچھی ہے لیکن حقیقی نہیں۔"

"کیوں حقیقی نہیں؟"

تب میں نے اپنا اعتراض بتایا۔ "تمھیں ایک خیال سُوجھا اور تم نے اپنے آپ کو دلّال کے روپ میں رکھ کر ویسی صورت میں اپنے ردِّ عمل کو قلمبند کر دیا۔ حقیقی دنیا میں خوشیا واقعی دلّال ہوتا، کانتا اس کے سامنے یوں برہنہ ہو جاتی تو وہ اسے وہیں دبوچ لیتا —— تم نے جو کچھ لکھا وہ ایک پڑھا لکھا شاعر سوچ سکتا ہے، اَن پڑھ دلّال نہیں۔"

کچھ اسی طرح کی بات بڑے زوروں سے میں نے کہی۔ منٹو لمحہ بھر کو چُپ رہا، پھر تلملا کر بولا: "ہاں ہاں! میں وہ دلّال ہوں، منٹو وہ دلّال ہے۔ تمھیں افسانہ نویسی کا علم بھی ہے؟ تم خود کیا لکھتے ہو؟"

لیکن اس وقت کرشن چندر آ گیا یا مجھے اڈوانی (اسٹیشن ڈائریکٹر) نے بلا لیا یا جانے کیا ہوا، بہر حال وہ قصّہ وہیں ختم ہو گیا۔

...... لیکن وہ قصّہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ دلّی میں جو چپقلش اس کے بعد رہی سو رہی، منٹو میرے اس اعتراض کو کبھی نہ بھول سکا۔ گذشتہ سال 'نقوش' کے کسی خاص نمبر میں اُردو ادیبوں کا ایک سمپوزیم شائع ہوا تھا اس وقت، جب اُردو میں کوئی نیا افسانہ لکھے ہوئے (اِدھر میرے جو افسانے اُردو میں چھپے بھی وہ ایک طرح سے ہندی سے ترجمہ ہوئے ہیں) مجھے آٹھ برس ہونے کو آئے ہیں اور میرے احباب اور اُردو کے ناظر تک مجھے بھول گئے ہیں، منٹو کو میں یاد رہا۔ خوشیا کے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے جواب کا ذکر کرنا وہ اس سمپوزیم میں بھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد اگرچہ میں نے بڑی کوشش کی کہ منٹو سے میری جھڑپ نہ ہو، میں اپنی میز بھی اٹھا کر دوسری منزل میں لے گیا لیکن میری تمام کوششیں ناکام رہیں۔ میں جب بھی نیچے اُترتا، دوستوں میں جاتا، منٹو سخت حقارت کی نظر سے مجھے دیکھتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کر دیتا۔

ان دنوں کی بڑی صاف تصویر دماغ کے پردے پر نقش ہے۔ منٹو ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنے پر مامور تھا، کرشن چندر ڈرامے کا انچارج تھا، میں ہندی صلاح کار تھا اور چونکہ اس نظام میں ہندی کو اہم زبان نہ سمجھا جاتا تھا اس لیے کچھ زیادہ کام نہ تھا اور میں فرصت کے وقت میں ایک آدھ ڈراما بھی لکھ دیا کرتا تھا۔

منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ اُردو کا ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جاتا اور کرشن سے پوچھتا "کہو بھئی، کس موضوع پر ڈراما لکھا جائے؟" موضوع سُنتے ہی فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا اور شام تک مسودہ کرشن کو دے دیتا۔ منٹو کو اس بات کا زعم تھا اور اس کا اعلان وہ عموماً کیا کرتا تھا کہ وہ جس چیز پر چاہے ڈراما لکھ سکتا ہے۔ ریڈیو کے ڈراما آرٹسٹ ——— غلام محمد، سُدھیر (جو اب فلم ایکٹر ہیں)، تاج محمد وغیرہ اسے عموماً گھیرے رہتے تھے۔ منٹو لکھتے لکھتے انھیں ڈراما سنایا بھی کرتا تھا اور وہ تحسین کرتے، "منٹو صاحب! آپ ڈرامہ کے بادشاہ ہیں" کہتے ہوئے منٹو کے خرچ پر چائے اڑایا کرتے تھے۔ جاوید اور حسرت صاحب سے منٹو کا پینے پلانے کا رشتہ تھا اور اڈوانی اس سے اس لیے دبتے تھے کہ منٹو کے کوئی رشتے دار محکمۂ اطلاعات اور براڈکاسٹنگ کے سیکرٹری تھے۔ ریڈیو اسٹیشن پر ہر وقت منٹو صاحب، منٹو صاحب ہوتی رہتی اور ہر معاملے میں منٹو کی رائے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ منٹو خوشامدیوں یا دوستوں میں گھرا رہتا۔ لنچ کے وقت کبھی اس کے اور کبھی کرشن کے کمرے میں محفل جمتی۔ میں بھی کبھی کبھی آ نکلتا۔ منٹو کبھی مجھے بات نہ کرنے دیتا۔ میرے بارے میں کوئی نہ کوئی تحقیر آمیز ریمارک ضرور پاس کرتا اور اگرچہ میرے معاملے میں لوگ اس کا ساتھ نہ دیتے، مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی۔

آخر ایک دن میں نے کرشن سے کہا، "دیکھو بھائی! تم منٹو کو سمجھا دو۔ وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے ——— میں طرح

وے جاتا ہوں۔"

"تم بھی اسے تنگ کرو،" کرشن نے کہا، "میرے سمجھانے سے وہ کیا سمجھے گا؟"

اور اس دن میں دفتر گیا تو میں نے طے کر لیا کہ آج میں منٹو کو پریشان کروں گا۔ کچھ دن پہلے اس کی کہانی 'دھواں' شائع ہوئی تھی۔ کہانی مجھے بے حد پسند تھی۔ منٹو نے ایک نازک موضوع پر بڑی نزاکت اور نفاست سے افسانہ لکھا تھا۔ لیکن میں تو شرارت پر تلا ہوا تھا اور چونکہ میں اس دوران میں منٹو کی انانیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کر چکا تھا اس لیے میں نے اپنا طرزِ عمل طے کر لیا۔ دفتر پہنچ کر میں منٹو کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا — "میں نے تمھاری کہانی 'دھواں' پڑھی۔"

"کیسی لگی؟"

"اچھی ہے، اب تم چپٹی پر لکھو۔"

منٹو لمحہ بھر کو چپ رہا۔ پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باہر نکالتے ہوئے کہا، "کیا مطلب ہے تمھارا؟"

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہی بات دہرا دی، "بس اب تم چپٹی پر لکھو!"

اس وقت عصمت نے 'لحاف' نہ لکھا تھا۔ منٹو چڑ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم خود کیا افسانے لکھتے ہو، لیکن کچھ دن پہلے وہ اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اس نے کبھی میرا افسانہ نہیں پڑھا اس سبب سے اس نے کہا، "تم کیا بھک مارتے ہو؟ میں نے تمھارے ڈرامے پڑھے ہیں۔"

اس وقت میرا مجموعہ 'پاپی' چھپ چکا تھا اور میں کچھ بہت اچھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چونکہ لڑنے کا فن مجھے خوب آتا ہے اس لیے طرح دے کر میں نے کہا، "میں تو ڈرامہ لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں، اس لیے میرے ڈراموں کی بات چھوڑو لیکن تم جو ڈراموں کے بادشاہ کہلاتے ہو جیسی جھک مارتے ہو، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ 'کروٹ' میں تم نے ماہم کے افسانہ 'رین' کی کہانی چرا لی ہے۔ 'روح کا ناٹک'، پورے کا پورا ترجمہ کر دیا ہے (اس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا) اور حوالہ تک نہیں دیا۔ میں اچھے ناٹک نہیں لکھتا لیکن طبعزاد تو لکھتا ہوں۔ میری اچھی بری چیز میری اپنی ہے، کسی دوسرے کی چرائی تو نہیں۔"

منٹو جھلا اٹھا لیکن میں وہاں نہیں رکا۔ کرشن چندر کے کمرے میں آ گیا۔ منٹو ڈرامہ لکھنے جا رہا تھا لیکن ڈرامہ لکھنا تو دور رہا، اس کے لیے اپنے کمرے میں بیٹھنا تک مشکل ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آیا۔ اس نے پھر مجھ سے افسانہ کے فن کو لے کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں پھر طرح دے کر نکل گیا اور سٹوڈیو چلا گیا۔ منٹو نے سٹوڈیو میں میرا پیچھا کیا۔ لیکن میں پھر ٹال گیا۔

اسی شام وشوا متر عادل اپنے دوست اور بہنوئی مسٹر مدن موہن بھلّہ کے ساتھ منٹو سے ملنے گیا۔ اس نے آ کر بتایا کہ منٹو نے انھیں اپنے افسانوں کا مجموعہ دیا اور مجھے بے شمار گالیاں کہ اشک سالا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ اس کو افسانے کے فن کی ابجد کا بھی علم نہیں۔ 'ادبِ لطیف' میں اس نے افسانہ کے فن پر جو مضمون لکھا تھا وہ کیا بکواس ہے وغیرہ وغیرہ۔

تین دن تک منٹو مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا وہ سب سنتا رہا، کیونکہ تماشائی بڑے خوش تھے اور منٹو کیا کہتا ہے، وہ مجھے رائی رتی بتانا نہ بھولتے تھے لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں ہنستا بھی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا ویسا

ہی ہوا اور افسوس کرتا رہا کہ بادلِ نخواستہ مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے جس کی دوستوں کو توقع تھی۔

میں منٹو کے افسانے پسند کرتا تھا۔ 'خوشیا' کے بعد میں نے منٹو کے کئی بہت اچھے افسانے پڑھے تھے۔ 'نیا قانون'، 'منتر'، 'شوشو'، 'ڈرپوک'، 'موسم کی شرارت'، 'ہتک'، 'مسٹر ڈی کوسٹا' مجھے بہت پسند آئے تھے لیکن جب تک میں دلّی میں رہا میں نے کبھی منٹو کے سامنے اس کے افسانوں کی تعریف نہیں کی۔ چونکہ منٹو کی نظر کافی تیز تھی اس سے خوشامد کرنے پر وہ اگرچہ وقتی طور پر خوش ہوتا تھا لیکن خوشامدی کے لیے اس کے دل میں کوئی عزت نہیں رہتی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھے دلّی بلا کر منٹو کے مقابل لا کھڑا کیا لیکن جب بھی ہم میں جھگڑا ہوا اس نے ہمیشہ منٹو کی طرفداری کی۔ منٹو اس طرفداری کا فائدہ اٹھا لیتا لیکن کرشن کے لیے اس کے دل میں عزت نہ تھی۔ وہ اسے بھی گالیاں دے لیتا تھا۔ چونکہ ان دنوں منٹو کو ہر وقت خوشامدی لوگ گھیرے رہتے تھے اس لیے میری اس حقیقی تعریف کو بھی منٹو خوشامد پر محمول کر لے یہ میری انا کو منظور نہ تھا۔ میں دانستہ منٹو کے اچھے افسانوں کا ذکر چھوڑ جاتا اور اس کے کمزور افسانوں کی تنقید بڑے زور دل سے کرتا۔ غرضیکہ خاصی چپقلش رہتی تھی۔

ان دنوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، عصمت اور منٹو اس کے علمبردار تھے۔ کرشن کھل کر نہ کھیلتے تھے لیکن انھوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک فارمولا بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی بھی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور آبروریزی کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں لیکن نہ جانے کیوں اس وقت ترقی پسندوں کو عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارے مارے پھرنا ہی واحد موضوع سوجھتا تھا۔ جب میں کرشن سے کہتا کہ یہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چونکہ تم یہ سب لکھ نہیں سکتے اس لیے تمھیں منٹو اور عصمت (ان دونوں کے ساتھ وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا) سے حسد ہوتا ہے۔ ایک دن منٹو نے بھی کچھ ایسی ہی بڑ ہانکی تو میں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھوں گا۔ یہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تجویز کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا لیکن ہم دونوں نے ایک ہی موضوع ——— یعنی نوکروں کے سامنے مالکوں کی جنسی بے پروائی ——— پر افسانے لکھے۔ منٹو نے "بلاؤز" اور میں نے "اُبال"۔ دونوں افسانے 'ساقی' دہلی کے ایک ہی نمبر میں (یا کسی سالنامے میں) چھپے۔ 'اُبال' کو دوستوں نے بہت پسند کیا۔ کرشن نے اسے اس وقت تک کے میرے افسانوں میں بہترین مانا۔ بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو وہ بھی کافی پسند کیا گیا۔ "بلاؤز" اور "اُبال" اس وقت کے میرے اور منٹو کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عریانی دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جنسی بے پروائی کا اثر دونوں افسانوں کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے لیکن جہاں 'بلاؤز' کے انجام کی حقیقت کوری حقیقت ہے وہاں 'اُبال' کے انجام میں نوکر کی ٹریجیڈی کے ساتھ سماجی ٹریجیڈی بھی پنہاں ہے اور وہ افسانہ سماجی حقیقت (SOCIAL REALISM) کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو حقیقت جیسی بھی ہے اس کا خاکہ کھینچنے تک ہی اپنے قلم کو محدود رکھنا چاہیئے یا اس حقیقت کے پس منظر میں سماج کا بھی جائزہ لینا چاہیئے، یہ بحث طویل ہے اور 'فن برائے فن' اور 'فن برائے زندگی' کے پیرو اس موضوع پر ہمیشہ بحث کرتے رہیں گے۔ بہرحال منٹو کے ساتھ ہونے والی چشمک میں میں نے بھی ویسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اس کی بڑی تعریف ہوئی لیکن پھر میں نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کہ ویسے افسانے لکھنا میں کچھ معیوب سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

• ———

باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے رنچھوڑ قسم کے آدمی تھے۔ لیکن منٹو کو جیسا کہ میں نے دیکھا میرا خیال ہے کہ باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو۔ جن حالات میں ایک دن منٹو دہلی سے غائب ہو گیا تقریباً انہی حالات میں وہ بمبئی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اس کے فرار کا باعث میں تھا اور بمبئی سے نذیر اجمیری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو خود بھی اس فرار کا باعث تھا کیونکہ لڑائی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا، خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اسی کے حربوں کو اس پر آزماتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ بمبئی سے بھاگنے کے بارے میں نذیر اجمیری کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:۔

"میں نے بہت غور کیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا: منٹو بھائی!
آگے راستہ نہیں ملے گا ——— کار موٹر روک لو ——— اُدھر باجو کی گلی سے چلے
جاؤ" ——— اور میں باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔"

دہلی سے اچانک منٹو غائب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا حالانکہ یہ افواہ اُڑی تھی کہ اسے فلم میں نوکری مل گئی ہے لیکن دو سال بعد اس نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بغیر دہلی سے چلا آیا تھا ——— باجو کی گلی سے ——— آگے راستہ نہ ملنے پر ——— بالکل ویسے ہی جیسے کچھ سال بعد وہ بمبئی چھوڑ گیا۔

میرے والد زندگی بھر لڑتے رہے، 'کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے'، کے ساتھ ساتھ جو دوسرا نعرہ لگایا کرتے تھے وہ تھا ——— 'مسرفائم جنگ دائم' ——— اور وہ اپنے لڑکوں کو بھی یہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا کوئی بیٹا شہر کا سب سے بڑا لڑاکا ہو گا اس لیے وہ سب کو لڑنے کے طریقے بتایا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ جو آدمی پٹ سکتا ہے وہی پیٹ بھی سکتا ہے۔ پیٹنے سے پٹنا مشکل ہے۔ پٹو اور پیٹنے والے کو نہ چھوڑو ——— میری صحت تو لڑکپن ہی سے خراب تھی۔ اپنے والد یا بھائیوں کی طرح تو میں کیا لڑتا، لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین ہو گئی اور کشمکشِ حیات میں جہاں جہاں بھی معرکہ پڑا ہے، میں نے پٹ کر آخر پیٹنے والے کو پیٹ دیا ہے۔

منٹو سے میرا دو بار سابقہ پڑا۔ ایک بار دہلی میں اور دوسری بار بمبئی میں۔ دہلی میں میں نے اسے زک دے دی، لیکن بمبئی میں ہماری جوڑ برابر رہی۔

'دھواں' کے سلسلے میں ہم میں جو چشمک ہوئی اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ چونکہ منٹو زور میں تھا اور کرشن اگرچہ مجھے کچھ نہ کہتا تھا لیکن ہر بار منٹو کے لیے ڈھال بن جاتا تھا اس لیے میرا وار اوچھا پڑتا تھا لیکن اس دوران میں اپنے زعم میں منٹو راشد سے بھی بگاڑ بیٹھا۔ راشد آزاد نظم کے بانی سمجھے جاتے تھے اور منٹو کو آزاد نظم سے چڑ تھی۔ انہی دنوں راشد کی نظموں کا مجموعہ 'ماورا' کے نام سے شائع ہوا جس پر کرشن چندر نے دیباچہ لکھا۔ منٹو نے دونوں کا مذاق اُڑایا۔ اس نے 'نیلی رگیں' کے عنوان سے ایک ڈرامہ بھی لکھا جس میں راشد کی نظم سے الفاظ لے کر ان کا مذاق اُڑایا۔ ڈرامہ آزاد نظم سے شروع ہوتا ہے۔ وہ مکالمے دیکھئے:۔

سعید (شاعر):۔ کرشن! تم نے کبھی کسی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں؟

کرشن:۔ ٹھنڈے ہاتھ......؟

سعید :- ٹھہرو، مجھے اپنا فقرہ درست کر لینے دو ——— اب بتاؤ کیا تم نے کسی اجنبی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں ——— ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح خنک ہوں ——— کسی اجنبی عورت کے ہاتھ جو تمھاری زندگی میں یوں داخل ہوں جیسے رات کے سنسان اندھیرے میں کوئی جگنو بھٹکتا آ نکلے۔

کرشن (مذاق کے طور پر) اپنی دُم سے لالٹین باندھے ——— نہیں ——— چاند کی ٹکلی چومتا ہوا ادھر آ نکلے تمھیں آج ہو کیا گیا ہے سعید۔ یہ ٹھنڈی یخ عورت تمھاری زندگی میں کب داخل ہوئی؟

کچھ دن منٹو آزاد شاعری کا، راشد کی نادر تشبیہوں کا، 'اجنبی عورت کا' زمستان کی رات کا مذاق اڑاتا رہا، پھر اس نے کوئی دوسرا موضوع ڈھونڈھ لیا اور بات آئی گئی ہو گئی لیکن راشد اسے نہیں بھولے۔

اس کے بعد ایک دن منٹو نے کوئی ڈرامہ لکھا اور راشد کو پڑھنے کے لیے دیا۔ راشد ٹائپ شدہ مسودہ اپنے کمرے میں لے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آ کر انھوں نے مسودہ واپس کیا۔

”کیسا ہے؟“ منٹو نے پوچھا۔

”نہایت اچھا ٹائپ ہوا ہے۔“ راشد نے اس استہزا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو ان کی اپنی چیز تھی۔

اور منٹو بقولِ خود 'کباب' ہو گیا۔ اس کے بعد منٹو ہفتوں راشد اور ان کی نظموں کو کوستا رہا۔ اپنے کسی دوست سے اس نے راشد کی نظموں پر ایک مضمون بھی لکھوایا۔

ہندی صلاح کار کی حیثیت سے میں زیادہ وقت راشد کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ منٹو اور راشد میں چلنے لگی تھی، راشد میرے پڑوسی بھی تھے اس لیے منٹو مجھے زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا تھا تاہم مجھے پریشان کرنے میں منٹو نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

پھر غالباً سنہ ۱۹۴۲ء کے اواخر یا سنہ ۱۹۴۳ء کے شروع میں (ٹھیک سن مجھے یاد نہیں) اچانک ایک دن راشد ترقی کر کے پروگرام ڈائریکٹر (پروگرام ایگزیکٹو) ہو گئے۔ راشد نے چارج سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کرشن کی غیر حاضری میں اس کا تبادلہ لکھنؤ کرا دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ راشد کو چھوڑ کر دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام اسسٹنٹوں میں کرشن سب سے قابل تھا اور باقی جتنے پروگرام اسسٹنٹ تھے وہ اپنا شیڈول بنانے میں کرشن سے مدد لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس کا کہنا مانتے تھے۔ پروگرام ڈائرکٹر تک بیسیوں باتوں میں کرشن سے مدد لیتے تھے اس لیے اس کے کام میں دخل نہ دیتے تھے اور بہت سی باتیں کرشن براہِ راست ڈائریکٹر سے منظور کرا لیتا تھا راشد کی فطرت میں آمریت کو کافی دخل ہے۔ انھیں یہ منظور نہ تھا کہ کرشن ان کو نظر انداز کر جائے۔ اس لیے انھوں نے اس کو لکھنؤ بھجوا دیا لیکن کرشن کی تبدیلی جن حالات میں ہوئی (راشد نے ان کی غیر حاضری میں ان کے خلاف کچھ الزامات لگائے اور چونکہ بخاری صاحب تک راشد کی براہِ راست رسائی تھی اس لیے فوراً تبادلہ کرا دیا) اس سے مجھے رنج ہوا اور میں نے راشد سے اپنے اس افسوس کا اظہار بھی کیا۔ راشد امید کرتے تھے کہ میں ان کی تائید کروں گا لیکن جب میں نے کرشن کی طرفداری کی تو باوجود اس کے کہ ہم برابر کے گھروں میں رہتے تھے اور میری بیوی اور بیگم راشد میں بہت اچھے تعلقات تھے، روز کا ملنا بیٹھنا تھا، راشد مجھ سے بدظن ہو گئے۔

راشد پروگرام ڈائریکٹر ہو گئے اور کرشن چلے گئے تو منٹو نے کچھ ہی دنوں میں دوسرے پروگرام ڈائریکٹر (سریندر چوپڑہ) کو گانٹھ لیا اس کے جنم دن پر منٹو نے ایک بڑھیا سوٹ اسے پرزنٹ کیا اور یوں اسے اپنی طرف ملا لیا۔ اڈوانی چونکہ مجھ سے خوش تھے اس لیے

انھوں نے مجھے نئے پروگرام اسسٹنٹ کے آنے تک کرشن کی جگہ سنبھالنے کے لیے کہا۔ منٹو کا ڈراما رشید ٹیبل پر تھا۔ میں نے پروڈیوس بھی کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منٹو اس کی ریہرسلوں میں سٹوڈیو بھی آتا رہا۔ حالانکہ وہ شاذ ہی اپنے ڈراموں میں دلچسپی لیتا تھا۔

اس دوران میں لکھنؤ سے ہندی کا ایک پروگرام اسسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے پہنچا ——— نہایت بدصورت، لمبا تڑنگا، چپٹی ناک والا نوجوان تھا۔ اڈوانی نے صبح اسے اور مجھے اپنے کمرے میں بُلایا اور اس سے کہا کہ وہ کچھ دن تک مجھ سے کام سیکھے۔ کرشن کے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں میٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر جا بیٹھا اور اس دن کا کام نمٹانے لگا۔ لیکن میٹنگ کے بعد ہی منٹو نے اس لکھنوی پی۔ اے (پروگرام اسسٹنٹ) کو سمجھایا کہ وہ پروگرام اسسٹنٹ ہے اور اسے کرشن والی کرسی پر بیٹھنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتا بھی بہت کچھ تھا۔ کام سیکھنے کی بات بھی اسے اچھی نہ لگی تھی۔ اس نے راشد سے پوچھا تو راشد نے بھی اس سے یہی کہا کہ ڈرامہ ڈیپارٹمنٹ کی سب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اشک تو آرٹسٹ ہے۔ کوئی بھی خرابی ہو تو جواب دہ پروگرام اسسٹنٹ ہی ہوگا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔ میں کرشن والی کرسی پر مزے سے بیٹھا کام کر رہا تھا کہ منٹو اس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ آیا۔ میرا دھیان مسودے میں لگا تھا کہ منٹو نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ آپ کی کرسی ہے۔" ساتھ ہی اس نے میرے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "آپ اِدھر آجائیے۔"

میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ پی۔ اے کی آنکھوں میں تحکم تھا اور منٹو کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک۔ مجھے معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ میں نے کہا: "میں اوپر اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو وہیں آجائیے گا۔"

اور میں چلا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے غصّہ کے مارے اندھیرا چھا گیا۔ راشد سے میں نے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنوی پی۔ اے ان سے مل چکا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ چاہتے ہیں ان کے پروگرام اسسٹنٹ خود ہی غلطیاں کر کے سیکھیں۔ دراصل انھیں یہ بات پسند نہ آئی تھی کہ اڈوانی نے بغیر ان سے پوچھے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہہ دیا۔ میں اس کا شائق بھی نہ تھا کیونکہ ایک بار جب جگل صاحب نے مجھے پی۔ اے کی جگہ آفر کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا لیکن ایک بار جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اُٹھنا اور وہ بھی منٹو کے سامنے، اس کی انگیخت پر، مجھے کھل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اڈوانی کے پاس جاؤں کیونکہ انھوں نے ہی مجھے بھیجا تھا لیکن پھر سوچا کہ اڈوانی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹو کی آنکھوں کی فاتحانہ چمک میرے دل میں دور تک گھاؤ کرتی چلی گئی۔ اسی غصّہ میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ استعفیٰ دے دوں، پھر خود ہی اس پر ہنسی آگئی۔ جھلّایا ہوا اوپر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ منٹو کی آنکھوں کی وہی چمک پھر سامنے آگئی ——— خدا گواہ ہے اگر منٹو اس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ نہ آیا ہوتا اور اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ ہوتی تو میں وہ سب نہ کرتا جو میں نے کیا اور منٹو کو دہلی نہ چھوڑنی پڑتی۔

اس وقت کمرے میں جا کر بیٹھا تو کام کرنا میرے لیے بےحد مشکل ہو گیا۔ بار بار اپنی ہتک کا خیال آنے لگا۔ راشد پر غصّہ آتا۔ اس لکھنوی پی۔ اے پر غصّہ آتا لیکن سب سے زیادہ غصّہ آتا منٹو پر! اس کی آنکھوں میں جو چمک تھی اس سے پتہ چل گیا تھا کہ میری ہتک کرنے والا نہ وہ پی۔ اے ہے نہ راشد، منٹو ہے اور میں نے طے کر لیا کہ منٹو کو اس سازش کا مزا چکھاؤں گا۔ میرے غصّے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جتنے دن میں نے کرشن کی جگہ کام کیا اس میں منٹو ہی کا ڈراما پروڈیوس کیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ میں اس میں

ایک نقطہ نہ کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھا پروڈیوسر ہو۔ کچھ پہلے کا غصہ اور کچھ تازہ ہتک کا گھاؤ، کام وام چھوڑ کر میں بس کہنیاں میز پر ٹکا، ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ گیا۔

جانے اجداد میں سے کسی نے مہرشی چانکیہ کے آشرم میں تعلیم پائی تھی یا جانے ہمارا خاندان ان سے وابستہ تھا یا بچپن سے والدِ محترم سے اس مہرشی کے کارنامے سُن سُن کر میں نے اسی کی طرح سوچنا سیکھ لیا تھا۔ بہر حال ہمیشہ جب مجھ پر مصیبت آئی، میری سمجھ اور سوچ کی قوتیں اور بھی تیزی سے کام کرنے لگیں اور توہین کرنے والے کو، اگر وہ میرے برابر کا ہے یا مجھ سے اونچا ہے، میں نے کبھی معاف نہیں کیا (اور یہ بات کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہو) اس سے ضرور انتقام لیا اور نہ صرف ہر مصیبت سے نکلا ہوں، بلکہ ایک دم آگے ہی بڑھا ہوں۔

سوچنے پر مجھے محسوس ہوا کہ یہ لکھنوی پروگرام اسسٹنٹ نہایت احمق آدمی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو نے اسے بھڑکایا لیکن جو منٹو کے کہنے میں آ گیا، اس کی حماقت میں کیا شک ہے۔ اس وقت بھی ہندی میں میرا کافی نام تھا۔ اس نے میرا نام نہ سُنا ہو، ایسی بات نہیں۔ وہ سمجھدار ہوتا تو مجھے الگ لے جا کر بات کر لیتا اور یوں تحکمانہ لہجے میں مجھ سے کچھ نہ کہتا۔ سوچا کہ اس احمق ہی کو آلۂ کار بنایا جائے اور کچھ دیر بعد میں نیچے گیا۔ لکھنوی پی۔ اے سینہ تانے، چپٹی ناک چڑھائے، نتھنے پھلائے، لکھنؤ کے اپنے قصے سُنا رہا تھا کہ کیسے چیف صاحب (جو اس وقت لکھنؤ کے سٹیشن ڈائرکٹر تھے) اسے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اس نے وہاں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں اور منٹو (اپنی عادت کے خلاف) چپ چاپ پاؤں کرسی پر رکھے، گھٹنے باہوں میں دبائے ہمہ تن گوش اس کی لن ترانیاں سُن رہا تھا۔ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کرسی تو دوسری تھی نہیں کہ بیٹھتا۔ دونوں نے ایک نظر مجھے دیکھ لیا۔ کچھ دیر کے بعد منٹو کو چوپڑہ صاحب کا چپراسی بلا کر لے گیا تو میں نے ان لکھنوی حضرت سے کہا۔ "مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدمی ہیں۔ اس سٹیشن پر ہندی کے ایک پروگرام اسسٹنٹ کی بڑی ضرورت تھی۔" اور میں نے اسے شام کو گھر پر چائے کے لیے مدعو کر دیا۔

میں ان دنوں نفیس ہزاری میں رہتا تھا۔ وہاں نزدیک ہی ایک چھوٹی سی پہاڑی اور خوشنما جنگل ہے۔ برسات کی شام تھی۔ چائے پلا کر میں اس لکھنوی احمق کو ریج پر لے گیا۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور بڑی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ لگاتار اپنی تعریفیں کرتا رہا کہ کس طرح اس نے ڈرامے لکھے، کس طرح چیف صاحب نے کہا کہ ویسا سکرپٹ (SCRIPT) ہندی میں کوئی نہیں لکھتا اور کس طرح انھوں نے اس کی سفارش کر کے اسے پروگرام اسسٹنٹ بنا دیا۔ میں نے بھی اسے خوب چنگ پر چڑھایا۔ اس کی ذہنیت کی تعریف کی۔ اسے سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اس نے اپنا سکہ جما دیا تو سب اس سے خوف کھائیں گے، نہیں آرٹسٹ تو اچھے سے اچھے کو بدھو بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ پی۔ اے کا کام ہے کہ جو ڈرامے براڈکاسٹ ہوں انھیں اچھی طرح پڑھے، ویٹ (VETT) کرے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک بھی چیز پڑھے اور ویٹ کیے بغیر براڈکاسٹ نہ ہونے دے گا۔ "اب جب آپ آ گئے ہیں اور ہندی جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تو میں آئندہ ڈرامے آپ کی سہولت کے لیے ہندی رسم الخط ہی میں لکھوں گا۔ باقی تو اُردو سے ہی آئیں گے، وہ آپ مجھ سے سُن کر ویٹ کیا کیجئے اور یوں اچھی طرح دیکھ کر براڈکاسٹ کیجئے کیونکہ خراب ڈرامہ براڈکاسٹ ہو تو ذمہ داری آپ کی ہوگی اور ریٹنگ میں ڈانٹ آپ ہی کو پڑے گی۔" اس پر اس نے اپنی قابلیت کے بارے میں میرے علم کو اور بڑھایا اور بہت خوش خوش واپس ہوا۔

اب شیڈیول تو تین مہینے پہلے بن جاتا تھا اور وہ کرشن بنا کر گیا تھا۔ میں مہینے دوسرے مہینے ڈرامہ لکھتا تھا اور منٹو کے تو تین ڈرامے ہر مہینے ہوتے تھے۔ اگلا ڈرامہ منٹو ہی کا تھا۔ نام تھا (جہاں تک کہ مجھے یاد ہے) ’آوارہ‘۔ پلاٹ وغیرہ مجھے سب بھول گیا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ وہ ڈرامہ بھی منٹو کے ان دنوں لکھے بیشتر ڈراموں کی طرح ایک ہی دن میں لکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہی دن اس لکھنوی پی۔ اے نے اس کا مسودہ نکالا اور مجھے بلایا۔ میں اسے سٹوڈیو میں لے گیا اور وہاں جا کر اسے سنانے لگا۔ اس کو زبان وغیرہ یا ڈرامہ وغیرہ کی خاک سمجھ نہ تھی۔ ڈرامہ سناتے سناتے میں کہتا ”کیوں صاحب! اس لفظ کی جگہ یہ لفظ ہو تو کیسا رہے؟“ اور وہ کہتا —— ”ہاں ہاں! یہ بہتر ہے۔“ اسی طرح میں لال پنسل کی مدد سے الفاظ اور محاورے بدلتا چلا گیا۔ دو چار جگہ میں نے گول نشان لگا دیے۔ میں نے ان حضرت سے کہا کہ راشد صاحب ان الفاظ کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے ساتھ سال ڈیڑھ سال کام کر کے میں جان گیا ہوں۔ میں ان کو نہیں بدلتا یہ وہ خود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام تر ذمہ داری ان کی ہو جائے گی۔ ڈرامہ کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اس کی جگہ نیا اختتام تجویز کر دیا۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ اس لکھنوی پی۔ اے نے راشد پر بڑا رعب ڈالا کہ اس نے منٹو کا ڈرامہ پڑھا ہے۔ بڑا خام ہے۔ اس نے بڑی محنت سے ویٹ کیا ہے۔ راشد مسودہ دیکھیں اور پاس کریں تو براڈکاسٹ ہو۔ راشد تو منٹو سے پہلے ہی جلے بیٹھے تھے، ان کو اپنا پرانا بدلہ نکالنے کا موقعہ ہاتھ آیا اور انھوں نے وہ چند الفاظ بھی جن پر میں نے لال پنسل سے گول دائرے بنا دیے تھے، بدل دیے۔

جب منٹو کو معلوم ہوا کہ اس کا ڈرامہ ویٹ ہوا ہے تو اس کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ ڈائرکٹر کے کمرے میں گیا اور اس نے راشد اور اس لکھنوی پی۔ اے کو بے نقط سنائیں اور کہا کہ ڈرامہ ہو گا تو بنا ایک لفظ کٹے ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔

میں اوپر ٹوبی کلارک (انگریزی اناؤنسر) کے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اڈوانی کے کمرے کا روشندان میری آنکھوں کے سامنے پڑتا تھا۔ نیچے اڈوانی کے کمرے میں منٹو کچھ اتنے زور سے چلا رہا تھا کہ میں اٹھ کر روشندان کے پاس چلا گیا اور جھک کر اندر کا نظارہ کرنے لگا۔ راشد کہہ رہے تھے کہ انھوں نے خود ڈرامہ پڑھا ہے اور ہو گا تو انہی تبدیلیوں کے ساتھ ہو گا ورنہ نہیں ہو گا اور ڈیوی ایشن (DEVIATIN) یعنی جدول سے انحراف کی ذمہ داری ان کی نہیں ہو گی۔ جب ہم باہر والوں کی چیزیں ویٹ کر سکتے ہیں تو اپنے آرٹسٹوں کی کیوں نہیں کر سکتے اور منٹو پنجرے میں بند شیر کی طرح تلملا رہا تھا اور تقریباً دھاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ڈرامہ ہو گا تو اصلی روپ میں ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔

مجھے منٹو کی اس تلملاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرت ہوئی۔ منٹو نے مجھے جتنی گالیاں دی تھیں، میری ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی تھیں، اردو کا ٹائپ رائٹر میرے ہاتھ بیچتے ہوئے جو چالیس روپے جھوٹ بول کر زیادہ لے لیے تھے اور اوپر سے مجھے بنایا تھا اور جتنا بھی مجھے ستایا تھا اس سب کا صلہ ان چند لمحوں کی اس کی تلملاہٹ میں مجھے مل گیا۔ ”سنار دی ٹھک ٹھک لوہار دی اکو سٹ۔“ میں نے من ہی من میں پنجابی کا محاورہ دہرایا اور واپس اپنے کمرے کی طرف پھرا۔

مجھے یاد نہیں، اڈوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا، غالباً انھوں نے راشد پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام ڈائرکٹر کے کام میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہر حال ایک عجیب سی شیطانی مسرت سے معمور میں واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں میز پر

پھیلا کر اطمینان کی سانس لی۔

لیکن اس مسرت اور اطمینان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تکلیف اور اُداسی کا احساس دل و دماغ پر طاری ہو گیا —— آنکھوں کے سامنے منٹو کی تلملاہٹ، اس کے خوبصورت ماتھے پر پڑی ہوئی شکنیں، اس کی باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں —— سب کچھ گھوم گیا —— اور اس تلملاہٹ کا باعث میں تھا —— میں جو درحقیقت اسے چاہتا تھا، اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اس کے افسانوں کا اس کے نام نہاد چاہنے والوں سے کہیں زیادہ مدّاح تھا —— میں، جس نے دو ایک مہینہ پہلے اپنے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ 'چرواہے' اس کے نام معنون کیا تھا۔

'چرواہے' کا ایک نسخہ میرے پاس پڑا ہے۔ منٹو کے نام کیا ہوا انتساب میرے سامنے ہے۔

منٹو کے نام

جو کبھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت بُرا

میرے اس وقت کے جذبات کی کتنی صحیح تصویر یہ انتساب پیش کرتا ہے۔

دوسرے دن میٹنگ میں ڈرامہ کا قصہ پیش ہوا۔ لکھنوی پی۔ اے نے راشد کے کہنے پر ڈرامے کی تحریری تنقید پیش کی۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تنقید میٹنگ میں ہو لیکن چونکہ ڈیوی ایشن کا سوال تھا۔ اگر وہ ڈرامہ نہ ہو تو اس کی جگہ دوسرا ڈرامہ ٹھُنسنے کی بات تھی اس لیے راشد نے میٹنگ میں وہ بات اٹھائی۔ لکھنوی پی۔ اے نے پہلے ہی سے وہ تنقید تیار کر رکھی تھی سو اس نے پڑھ دی۔ بہرحال منٹو کی تنقید ہو اور وہ بھی بھری میٹنگ میں یہ کبھی نہ ہوا تھا۔ منٹو اس طرح اپنی تنقید سُننے کا عادی نہیں تھا۔ لکھنوی پی۔ اے کی سمجھ کے بارے میں اس نے دو تین تیز باتیں کہیں اور تیز باتیں کہتے وقت منٹو کچھ سوچتا نہ تھا۔ مجھے پھر غصہ آ گیا اور میں نے کہا کہ یہ ڈرامہ میری نظر سے بھی گزرا ہے اور ان صاحب نے بالکل ٹھیک تنقید کی ہے —— اور چونکہ سب قطع و برید میں نے کی تھی اس لیے میں نے بڑی صفائی سے اس ڈرامے کی کمزوریاں اُجاگر کر دیں۔

مجھے اب یاد نہیں منٹو نے کیا کہا لیکن غصہ میں اس نے میری قابلیت کے بارے میں کوئی تیز بات کہی جس کا مطلب تھا کہ تکنیک کے ضمن میں میں کچھ نہیں جانتا اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر لکھ کر دکھا سکتے ہو؟

میں نے اور بھی تیز لہجہ میں کہا کہ میں تمھیں دس برس تک ڈرامہ لکھنا سکھا سکتا ہوں۔ تم اوپر میرے کمرے میں آؤ تو تمھیں بتاؤں ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ ڈرامہ بھی بہتر بنا کر دکھا دوں۔

بات بڑھ جاتی لیکن شور سُن کر اڈوانی صاحب اپنے کمرے سے آ گئے۔ طے ہوا کہ ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں ہو گا اور چونکہ اپنے آرٹسٹ کا سوال ہے اس لیے جدول سے انحراف نہیں ہو گا۔

منٹو میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں رُکا۔ اس نے ٹائپ رائٹر اٹھایا اور چلا گیا۔ دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔ دوپہر کو خورشید صاحب (سکریٹری انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ) کا فون آیا کہ منٹو کا ڈرامہ اگر براڈکاسٹ کرنا مقصود ہو تو منٹو کے لکھے ہوئے مسودے کے مطابق کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

ٹھیک واقعات مجھے یاد نہیں رہے۔ غالباً ڈرامہ خورشید صاحب نے منگایا تھا اور پھر انھوں نے یہ پیغام بھیجا تھا۔

راشد چونکہ تلے ہوئے تھے کہ وہ جدول سے انحراف نہیں ہونے دیں گے اور ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں کریں گے اس لیے منٹو نے خورشید صاحب کے ذریعہ اسے کینسل کرا دیا تھا)

تیسرے دن بھی منٹو دفتر میں نہیں آیا۔ ڈرامہ اس نے منگا لیا۔ چوتھے یا پانچویں یا غالباً ساتویں دن سُنا کہ وہ بمبئی چلا گیا ہے اور اسے فلم کمپنی میں پانچ سو کی جگہ مل گئی ہے۔

گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں میرے سامنے بیٹھے بیٹھے منٹو نے بتایا کہ نوکری ووکری اسے کچھ نہیں ملی اور بمبئی میں اسے خاصی تکلیف ہوئی۔ بیوی کو وہ دہلی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں فلمستان میں اسے ساڑھے تین سو کی نوکری ملی تو غالباً اس کا دوست نذیر جا کر اس کی فیملی کو بمبئی لے آیا۔

”وہ تمہارا لال کیا ہوا مسودہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔“ اچانک منٹو نے کہا۔ یعنی جس طرح مجھے نہ راشد پر غصہ تھا نہ اس لکھنوی پی۔ اے پر بلکہ منٹو پر غصہ تھا، اسی طرح منٹو کو بھی ان دونوں کے بجائے مجھی پر غصہ تھا، اس کا ڈرامہ میں نے کاٹا ہے یہ بات وہ جان گیا تھا۔

”اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

منٹو چپ رہا۔

”دیکھو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر ہمیں اسی طرح لڑنا ہے تو مجھے فلمستان کی نوکری منظور نہیں۔ وہاں ساڑھے تین سو پاتا ہوں، آرام سے ہوں۔ یہاں پانچ سو بھی ملے اور چخ چخ رہی تو کیا فائدہ؟“

”نہیں نہیں۔ ویسا کچھ نہیں ہوگا۔“ اور اس نے انگریزی میں فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

اس دن گھر واپس آ کر میں نے صفیہ بھابی سے کہا، ”دیکھیے، منٹو نے مجھے بمبئی بلایا ہے۔ میں آ نہیں رہا تھا۔ دوبارہ مار کھانے پر چلا آیا ہوں۔ منٹو نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہ ’آوارہ‘ کا مسودہ سنبھالے بیٹھے ہیں اور دلّی کے اس واقعہ کو نہیں بھولا۔ ہم دہلی میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لیے تماشہ بنے ہیں۔ اب اس نے مجھے بمبئی بلایا ہے تو آپ اسے سمجھائیے کہ مجھے یہاں تنگ نہ کرے، کیونکہ وہ تنگ کرے گا تو میں بھی تنگ کروں گا اور آخر ہم دونوں تنگ ہوں گے۔“

منٹو اور صفیہ بھابی نے مجھے یقین دلایا کہ ویسی کوئی بات نہیں ہوگی اور میں نے اگرچہ کانٹریکٹ پر دستخط نہیں کیے لیکن ہاں کر دی لیکن جب بعد میں میں نے سوچا تو میں نے طے کیا کہ میں حتی الامکان اس بات کا موقعہ ہی نہ آنے دوں گا کہ منٹو سے میری لڑائی ہو اور بمبئی میں جتنے میرے واقف کار تھے ان سے مل کر میں نے ’فلمستان‘، اس کے کرتا دھرتا ششدھر مکرجی اور وہاں کے طریق کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ میں خاص طور پر ان لوگوں سے ملا جو منٹو کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے۔ مجھے تین چار اہم باتوں کا پتہ چلا۔

۱۔ فلمستان کا باس مکرجی زمانۂ قدیم کے سادیت پسند داروغوں جیسا ہے جو غلاموں کو کوڑے مار مار کر ان سے کام لیتے تھے۔

۲ - فلمستان میں منٹو کا ایک چھتر راج ہے ۔

۳ - جب سال بھر پہلے شاہد لطیف نے میرا نام تجویز کیا تھا تو منٹو نے فلمستان میں میرے آنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اشک بڑا خطرناک آدمی ہے ۔

۴ - فلمستان میں ایک ہی منظر کو سب مکالمہ نویس لکھتے ہیں۔ منٹو سب کے مکالمے پڑھتے ہیں اور سب کو رد کر کے خود لکھتے ہیں —— ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے شاہد لطیف اور سنتوشی کو فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا، جبکہ شاہد لطیف ہی منٹو کو فلمستان میں لے گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سال پہلے منٹو مجھے خطرناک سمجھتا تھا تو سال بھر بعد میں کس طرح اتنا بے ضرر ہو گیا کہ خود اس نے ہی مجھے بلوایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب منٹو نے مجھے فلمستان میں کام کرنے کے لیے خط لکھا تھا تو خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پہلی بار میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن ایک مہینے بعد جب منٹو نے مجھے تار دیا کہ انٹرویو کو آؤ اور سیکنڈ کلاس کا کرایہ کمپنی دے گی تو چونکہ کوشلیا ٹریننگ لینے بمبئی جا رہی تھی لہٰذا میں بھی تیار ہو گیا۔ خیال تھا کہ اور کچھ نہ سہی تو بمبئی کی سیر ہی ہو جائے گی لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچتا تھا کہ آخر منٹو نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اس وقت میں جس نتیجے پر پہنچا تھا، اس میں مجھے بمبئی میں منٹو سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے پر تھوڑی سی ترمیم کرنی پڑی۔ لیکن اس بنیادی وجہ میں فرق نہیں پڑا۔ چونکہ اس قصے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے اور خاصا دلچسپ ہے اس لیے میں اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، مجھے منٹو سے نفرت نہ تھی۔ نفرت یا محبت کے لیے کچھ وقت کا ساتھ ناگزیر ہے اور میں تو دہلی آنے سے پہلے منٹو سے ملا بھی نہ تھا اور جب ملا تو پہلی ملاقات میں جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے وہ مجھے اچھا لگا تھا —— گورا چٹا رنگ، پتلا چھریرا جسم، فراخ پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹوں پر استہزا آمیز مسکراہٹ —— منٹو کی یہی پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس دوران میں مَیں 'منتر'، 'نیا قانون' اور شاید 'مسز ڈی کوسٹا' پڑھ چکا تھا اور یہ افسانے مجھے بے حد اچھے لگے تھے اور منٹو نے میرے دل میں ایک مترجم کے بجائے ایک ذہین افسانہ نگار کی حیثیت سے جگہ بنا لی تھی۔ لیکن دہلی میں میرے آنے سے پہلے ہی ہمارے لیے جو پارٹ ڈھل گئے تھے ان سے نجات نہیں ملی۔ ہمیں ایک دوسرے کا حریف ہونا تھا اور ہم باہم حریف ہو کر رہے۔

لیکن جب منٹو اچانک دہلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کرشن لکھنؤ تبدیل ہو گیا تھا، اختر الایمان کو راشد نے جواب دلوا دیا تھا۔ چڈھا، میراجی اور راجہ مہدی علی خاں، راشد کی خوشامد میں لگے رہتے تھے اور راشد چونکہ مجھے کرشن کا آدمی سمجھتے تھے اس لیے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے۔ منٹو کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق گزرتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو کے رہنے پر کبھی کبھی جھپٹ ہو جاتی، خاصی چپقلش بھی رہتی تھی، لیکن اچھے سے اچھا لکھنے میں مدد بھی ملتی تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا —— منٹو کے بمبئی جانے کے بعد اس کی اور اس کے افسانوں کی تعریف نہ کرنے کے سلسلے میں میں نے اپنے اوپر زبردستی جو قید لگا رکھی تھی اسے ڈھیلا کر دیا —— منٹو کے بمبئی جانے کے سال ڈیڑھ سال بعد —— ٹھیک سن مجھے یاد نہیں، اس کا افسانہ 'بو' شائع ہوا۔ اس افسانے کے شائع ہوتے ہی اس کے خلاف ایک شور برپا ہو گیا۔ چودھری نذیر احمد نے

اس بارے میں میری بھی رائے مانگی۔ میں نے "بُو" کی خوب تعریف کی۔ مجھے 'بُو' کے کنٹنٹ سے غرض نہ تھی، میں اس افسانے کی تکنیک پر فدا تھا۔ ایک بڑی نازک سی تھیم کو منٹو نے جس چابکدستی سے "بُو" میں سمویا ہے، وہ نہ صرف قابلِ داد ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ میں وہ افسانہ اپنے کئی دوستوں کو سُنا چکا ہوں جن میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار یشپال بھی شامل ہیں اور یشپال میری رائے سے متفق ہیں۔ ہر ہندی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانہ کی تکنیک کو جاننے کے لیے وہ 'بُو'، ضرور پڑھے۔ تکنیک کے کمال کے لحاظ سے اس کے جوڑ کا افسانہ بیدی کا "لاجونتی" ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا افسانہ اُردو ادب میں اس کی ٹکر کا مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ لاجونتی میں ہیئت ہی نہیں کنٹنٹ کا بھی کمال ہے۔

بہرحال مجھے خیال ہوتا ہے کہ 'بُو' کے بارے میں جو خط میں نے چودھری نذیر احمد کو لکھا اس نے منٹو سے اس کا ذکر کیا یا اس کا خلاصہ انھیں بھیج دیا کیونکہ جب میں بمبئی گیا تھا تو منٹو نے اس کا ذکر کیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بعد میرے بارے میں منٹو کا رُخ کچھ ڈھیلا ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ جب ڈائرکٹر نتن بوس فلمستان میں ایک فلم بنانے آئے اور ایک نئے مکالمہ نویس کو رکھنے کی بات چلی تو منٹو ہی نے میرا نام تجویز کیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ غیر شعوری طور پر جس کا مجھے احساس تھا اور جس کی تصدیق بمبئی میں ہوئی۔ منٹو اگر شراب نہ پیے ہوتا اور دہلی کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے 'آوارہ' کے اس مسودے کا ذکر نہ کرتا جسے میں نے کانٹ چھانٹ دیا تھا تو میں اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا کہ میری طرف سے منٹو کے دل میں جو کدورت تھی وہ دُھل گئی ہے۔ منٹو ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ اس واقعہ کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ سال بھر پہلے فلمستان میں اس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی۔ اس وقت میں وہاں جاتا تو اگر میرا اور شاہد کا یا میرا اور سنتوشی کا گٹھ بن جاتا تو منٹو کو تکلیف ہوتی۔ اس لیے اس نے میری مخالفت کی۔ جس وقت اس نے مجھے بُلایا اس وقت شاہد لطیف اور سنتوشی فلمستان چھوڑ چکے تھے اور منٹو مکرجی کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ منٹو تمھارے مکالموں کے پرخچے اُڑا دے گا۔ تم تنخواہ ضرور اچھی پاؤ گے لیکن تمھاری جان ضیق میں آ جائے گی اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اس کے ڈرامے کی جو دھجیاں اڑائی تھیں اس کا انتقام لینے کی ترکیب اس نے یوں نکالی تھی اور چونکہ میں "ہاں" کر چکا تھا اور دہلی میں مشہور ہو گیا تھا کہ میں نے فلم کی نوکری کر لی ہے اس لیے میں واپس تو نہ گیا لیکن میں نے فلمستان میں اپنا لائحہ عمل طے کر لیا۔

میں نے اس وقت تک کنٹریکٹ پر دستخط نہ کیے جب تک فلمستان میں مجھے الگ کمرہ اور الگ میز کرسی نہیں مل گئی (یہ پہلی احتیاط تھی کہ منٹو میں اور مجھ میں جھگڑے کی نوبت نہ آئے) اور یہ طے نہیں ہو گیا کہ صرف میں ہی نتن بوس کے لیے مکالمے لکھوں گا اور میں ہی ڈائیلاگ ڈائرکشن کروں گا۔

میرا پہلا فلم "مزدور" تھا اور دوسرا "سفر" جسے مترا نے ڈائرکٹ کیا۔ نہ صرف پہلے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے بھی صرف میں نے لکھے اور یوں فلمستان کا ڈیڑھ سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منٹو کو اس بات کا قلق ضرور رہا کہ میں نے اس کی چال کاٹ دی لیکن میں نے اپنی عادت کو جانتے ہوئے نت جھگڑنے کے بدلے اس بات کا انتظام کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود آخر منٹو مجھے ایک چوٹ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا فلم "مزدور" خواہ باکس آفس پر

کامیاب نہ رہا تھا لیکن میرے مکالمے ۱۹۴۵ء کے بہترین ڈائیلاگ سمجھے گئے تھے اور مجھے ایک سند بھی ملی تھی۔ میرا دوسرا فلم "سفر" باکس آفس پر بھی کامیاب رہا اور ظاہر ہے کہ میرا کریڈٹ بھی بڑھ گیا تب اشوک کمار نے اپنا الگ فلم پروڈیوس کرنے کی خواہش ظاہر کی اور مکرجی مان گئے۔ منٹو کے دونوں فلم "چل چل رے نوجوان" اور "شکاری" دو دو سال لینے کے باوجود ناکام رہے تھے اس لیے اشوک کمار میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھ سے ایک کہانی لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے ان کو دو تین پلاٹ جو میرے ذہن میں تھے سُنائے۔ اشوک نے ایک پسند کر لیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک خاکہ سا لکھ ڈالوں۔ لیکن میں نے کہا کہ لکھنے سے پہلے ایک شرط واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کہانی لکھنے کا دو ہزار روپیہ پیشگی لوں گا ــــ میں اس وقت پونے سات سو کے قریب تنخواہ پا رہا تھا ــــ لیکن میرا کہنا تھا کہ میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے ملازم ہوں، کہانی نویس کی حیثیت سے نہیں۔ کہانی لکھوں گا تو اس کا دو ہزار لوں گا اور ڈائیلاگ نوکری کے کھاتے لکھوں گا۔ اگرچہ اشوک کمار مکرجی کا سالا تھا لیکن ان دنوں سالے بہنوئی کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ اشوک نے کہا۔ "آپ مکرجی سے کہیے" لیکن مکرجی مجھ سے خوش نہ تھے۔ میں نے انکار کر دیا تب اشوک نے کہا کہ میں سیٹھ چُنی لال سے کہوں گا آپ بات کر لیجیے گا، لیکن اس دوران میں آپ ایک خاکہ ضرور لکھ ڈالیے۔

منٹو کو یہ خبر مل گئی کہ اشوک میرے پاس پہنچا اور میں دو ہزار روپیہ مانگ رہا ہوں تو اس نے واچا کو ساتھ ملا لیا۔ واچا اشوک کو اپنے فلیٹ پر لے گئے۔ شراب واچا کے ہاں اعلیٰ قسم کی رہتی تھی۔ اشوک کو انھوں نے اس وقت تک نہ آنے دیا جب تک یہ طے نہیں کر لیا کہ منٹو نئے فلم کی کہانی لکھے گا اور دوسرے دن اس کا مہورت ہو جائے گا۔

چونکہ کہانی کوئی تیار نہ تھی اور مہورت ہو گیا تھا اس لیے "آٹھ دن" کے فلمانے کے سلسلے میں کیا کیا دقتیں پیش آئیں، یہ ایک الگ ہی کہانی ہے لیکن چونکہ منٹو نے یہ جانتے ہوئے کہ میں نے الگ سے معاوضہ مانگا تھا، بغیر معاوضہ لیے افسانہ لکھنا منظور کر لیا۔ یہ اور بات ہے کہ جب آدھی فلم بن گئی تو اس نے پریشان کرنا شروع کیا اور کہانی کی مد میں بھی کچھ معاوضہ لے لیا) اور اچھی خاصی سازش کر کے میرا پتہ کاٹ دیا اس لیے مجھے بہت بُرا لگا ــــ خصوصاً اس وقت جب میں افسانہ کا خاکہ لکھ کر اشوک کے آنے کا انتظار کرتا رہا ــــ مہورت ہو گیا۔ مکرجی مجھ سے خوش نہ تھے اس لیے سوا اس کے کہ میں زہر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔

لیکن کچھ ہی دن بعد میں نے منٹو سے بدلہ لینے کی ترکیب نکال لی۔ "آٹھ دن" کا ڈائریکٹر فلمستان کا ایڈیٹر دتا رام پائی مقرر ہوا تھا۔ اگرچہ ڈائرکشن تو اشوک ہی کرتا تھا لیکن چونکہ پائی بڑا قابل ایڈیٹر تھا اس لیے اس کی چلتی تھی۔ میں نے پائی کو ساتھ ملایا اور "آٹھ دن" میں پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا۔ جب کہانی شروع ہوئی تھی تو یہ دو ایک مناظر کا رول تھا لیکن میں نے اس خوبی سے اپنا پارٹ کیا اور بغیر ری ٹیک (RETAKE) کے کیا کہ اشوک کو بہت پسند آیا اور اس نے طے کیا کہ یہ رول بڑھا کر سارے فلم میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ پنڈت طوطا رام چونکہ ہندی بولتا تھا اس لیے پنڈت کے سب ڈائیلاگ میں لکھتا تھا۔ منٹو ایک لائن لکھتا تو چار کر دیتا، منٹو ایک سین لکھتا تو میں اس کے دو بنا دیتا۔ مجھے سٹیج ایکٹنگ تو پسند ہے لیکن فلم ایکٹنگ کو فلم ناٹک کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن منٹو کو پریشان کرنے کے لیے وہ مضحکہ خیز رول میں کرتا رہا اور منٹو اتنا پریشان ہوا کہ ایک دن سیٹ پر ہاتھا پائی تک کی نوبت آ گئی۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ فلمستان سے الگ ہوئے اور اگرچہ اشوک اور واچا منٹو کے دوست تھے اور منٹو

ان کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا (جسے اشوک نے مکرجی سے علیحدہ ہو کر خرید لیا تھا) لیکن منٹو وہاں ایک بھی کہانی نہ دے سکا۔ جب میں پنج گنی سے الہ آباد آتے ہوئے اشوک سے ملا اور میں نے پوچھا کہ منٹو کیوں چلا گیا تو اس نے کہا کہ اس نے کہانی لکھی تھی لیکن ہم نے کمال امروہی کی کہانی "محل" لینے کا فیصلہ کر لیا۔ منٹو کچھ کہے بغیر چلا گیا، حالانکہ ہم نے کہا تھا کہ اس کے بعد تمہارے والی کہانی بنائیں گے لیکن اس نے نہیں سنا۔

درحقیقت ساؤنڈ ریکارڈسٹ واچا (جو منٹو کا دوست تھا) اور بمبئی ٹاکیز کے مالک واچا میں فرق تھا اور منٹو ایسے آدمیوں میں گھر گیا جنھیں کبھی اس نے فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور جب اس نے دیکھا کہ آگے راستہ بند ہے، کار موٹر نہیں چلے گی تو وہ باجے کی گلی سے پاکستان چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیدی آسامیوں پر مسلمانوں کے آنے کی وجہ سے ایک دو چٹھیاں اشوک اور واچا کو ملی تھیں، لیکن سٹوڈیو کو آگ لگانا اور خود بیکار ہو جانا آسان نہیں۔ اس کا اثر نہ شاہد لطیف نے لیا نہ نذیر اجمیری نے۔ منٹو کے بددل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی کہانی نذیر اجمیری کی چنی گئی اور دوسری کہانی کمال امروہی کی۔ جس دن کمال امروہی کی کہانی کا پتہ چلا، منٹو نے بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن منٹو کی اس رن چھوڑیت اور باری صاحب کی رن چھوڑیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باری صاحب کی رنچھوڑیت میں غالباً بزدلی کا عنصر تھا جبکہ منٹو کی رنچھوڑیت اس کی زبردست انانیت کے باعث تھی اور اس کی اسی انانیت میں اس کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ منٹو کو خوشامد کرنے سے عار نہیں تھا۔ مکرجی کے پاس بیٹھ کر ان کی خوشنودی کے لیے منٹو کو غالب کے اشعار سناتے میں نے دیکھا ہے (حالانکہ میں سمجھتا ہوں مکرجی کے سامنے غالب کے شعر پڑھنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس سے مکرجی کی عظمت کم نہیں ہوتی، اپنے فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں، لیکن غالب کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں اور پھر بنگالی ہونے کے ناتے بنگال کا چھوٹے سے چھوٹا شاعر ان کے نزدیک غالب سے بڑا ہے!) اشوک اور واچا کی محفل میں بیٹھ کر سوقیانہ لطیفے سناتے دیکھا ہے۔ ان پڑھ ایکٹروں اور میوزک ڈائریکٹروں کی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے بکواس کرتے سنا ہے (جسے منٹو بکواس اور دوسرے بذلہ سنجی کا نام دیتے تھے) لیکن ان میں سے کسی بھی کام میں اس کی انا کو ٹھیس نہیں پہنچی، کیونکہ اول تو یہ کہ وہ ان کو اپنے سے کہیں کم تر سمجھتا رہا اور دوسرے یہ سب لوگ خواہ منٹو کو سنکی سمجھتے ہوں، شرابی سمجھتے ہوں لیکن اوّل درجے کا ڈائیلاگ رائٹر سمجھتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اس میٹنگ میں جہاں راشد نے، میں نے اور راس لکھنوی نے اسے اس کے ڈرامے "عید" کی، اور بمبئی ٹاکیز کے سٹوڈیو میں جہاں اشوک اور واچا (اس کے جگری دوستوں) نے اس کی کہانی کے مقابلے میں نذیر اجمیری اور کمال امروہی کی کہانیاں لے لیں، منٹو کی انانیت کو زبردست ٹھیس پہنچی اور جب اس کی انانیت کو ٹھیس لگی تو پھر وہاں اس کے لیے ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ کوئی موٹی کھال والا ابن الوقت مصنف ہوتا تو ہتک برداشت کرتا ہوا بھی وہاں جما رہتا لیکن منٹو کی انانیت کے سبب وہ ہتک ناقابلِ برداشت تھی اور چونکہ پٹ کر پیٹ دینے کے فن میں وہ ماہر نہیں تھا اس لیے دونوں بار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دونوں بار اسے سخت تکلیف ہوئی، دوسری بار تو اس کی جان پر آبنی، لیکن تکلیف کے خوف سے اپنی انانیت کو ٹھیس لگنے دینا اس نے منظور نہ کیا۔

پارٹی ہو، میٹنگ ہو (نارمل یا انفارمل) منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی

لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے کھسک جاتا تھا۔ یوں تو فلمستان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں جب میں نے کانٹریکٹ پر دستخط نہ کیے تھے اور میری شرطیں مکرجی نے ابھی منظور نہ کی تھیں اور میں مکرجی کو غالب کے بجائے مہادیوی ورما کے گیت سنایا کرتا تھا' میں نے منٹو کی انانیت کے اس پہلو کو دیکھا تھا لیکن ایک خاص واقعہ ہے جسے میں بھول نہیں سکا۔

۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کے اواخر کا ذکر ہے۔ ٹھیک مہینہ مجھے یاد نہیں' بمبئی میں امریکہ کا یا انگلستان کا' یہ مجھے یاد نہیں' ایک مشہور ایکٹر آیا تھا۔ میں نے اس ایکٹر کا صرف ایک فلم دیکھا تھا جس میں وہ موٹر سائیکل ریس میں شامل ہوتا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ دیکھنے والے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ بہرحال بمبئی میں وہ ایک دو سٹوڈیوز میں گیا۔ رائے بہادر چونی لال نے اسے فلمستان میں بھی مدعو کیا۔ شام کو فلمستان کی کینٹین میں جو کھلے میں بنی تھی اور چھت کے باوجود تین طرف سے کھلی تھی' میزیں لگا دی گئیں اور ششدھر مکرجی' گیان مکرجی' اشوک' واچا' چنلکر' برمن' نیپالی وغیرہ اکٹھے ہوئے۔ چونکہ اس ایکٹر کو ہمارے ہاں آنے سے پہلے فلم پروڈیوسرز کی ایسوسی ایشن میں جانا تھا اس لیے اسے دیر ہو گئی۔ بڑے مکرجی اٹھ گئے' باقی لوگ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ منٹو حسبِ معمول باسز (BOSSES) کے ساتھ بیٹھا بقول شیام اپنی بزلہ سنجی ان پر ضائع کرتا رہا۔ میں نیپالی' برمن وغیرہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آخر ایکٹر صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے۔ لمبوترا سا منہ ——— جیسے کسی نے دونوں جبڑوں کو شکنجے میں کس کر چپٹا کر دیا ہو' بالکل ویسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا۔ ان کی بیوی بڑی حسین تھی۔ ظاہر ہے کہ روپیہ اور نام کی کشش نے اس حور کو اس لنگور کے پہلو میں لا بٹھایا تھا۔ بہرحال اس کے آگے آگے رائے بہادر چونی لال اور مکرجی آئے۔ کینٹین میں ایک بڑی میز بچھی تھی اور اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی میزیں لگی تھیں۔ بڑی میز مہمانوں اور کمپنی کے باسز کے لیے تھی اور چھوٹی میزوں پر دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ میں نیپالی وغیرہ کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر جا بیٹھا لیکن منٹو' اشوک کے ساتھ بڑی میز پر بیٹھا رہا۔ لیکن ایک تو اس ایکٹر کے ساتھ آنے والے لوگ زیادہ تھے دوسرے رائے بہادر کے ساتھ بھی چند مہمان تھے۔ اشوک اور گیان مکرجی مالکوں میں سے تھے' مکرجی نے واچا اور منٹو کو اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں۔ واچا اٹھ کر چھوٹی میز پر چنلکر کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے منٹو کو بھی پاس بٹھانا چاہا لیکن منٹو نہیں بیٹھا۔ اس افراتفری میں جب مہمان بیٹھ رہے تھے' منٹو چپ چاپ کھسک گیا۔ میں یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے کہا۔

"کیوں؟"

"چلو چلیں۔"

"کیوں؟"

"سب بکواس ہے۔"

"بیٹھو۔" میں نے کہا۔ "جہاں اس بکواس کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہیں وہاں آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ لیتے ہیں۔"

لیکن منٹو نہیں رکا' خاموشی سے کینٹین سے نکل گیا۔

"گنجے فرشتے" میں منٹو نے شیام پر جو سکیچ لکھا ہے اس میں اس کی انانیت کے اس پہلو کی جھلک بار بار ملتی ہے لاہور

میں شیام آیا تو اس کو ملنے والے اتنے تھے اور وہ لوگوں کی توجہ کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ منٹو کی 'انا' کو بار بار ٹھیس لگتی ہے —— منٹو لکھتا ہے:-

> "شیام نے مجھ سے کہا —— میرے ساتھ رہو، لیکن اس کے دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اس سے وعدہ کر کے کہ رات کو میں اس سے فلیٹی ہوٹل میں ملوں گا، چلا گیا۔"

لیکن جیسا کہ میں نے منٹو کو دیکھا اور جانا ہے، منٹو کے چلے جانے کی وجہ (باوجود اس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے کہ وہ اس کے ساتھ رہے) اور کچھ نہ تھی، اس کی انا تھی۔ اس کی اس الجھن اور گھٹن کو میں نے اس امریکی (یا انگریزی) ایکٹر کی آمد پر بھی محسوس کیا۔ مکرجی نے جب منٹو کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ یک لخت اداس ہو گیا اور پھر وہاں بیٹھنا اس کے لیے مشکل ہو گیا —— منٹو، شیام سے ملنے فلیٹی بھی گیا، لیکن اس ملاقات کا حشر بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہ ہوا اور منٹو اور بھی چڑ کر واپس آ گیا۔ بمبئی میں جب وہ شیام سے ملتا تھا تو عموماً شیام نہیں، منٹو لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتا تھا، کیونکہ ایکٹروں، ڈائریکٹروں میں وہ اپنی قابلیت، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے سننے والوں کی توجہ کو اپنی طرف لگائے رکھتا تھا لیکن لاہور کی ان دو ملاقاتوں میں سننے والے آرٹسٹ نہیں تھے، عام لوگ تھے، جن میں سے شیام کو سب جانتے تھے اور منٹو کو جو چند ایک جانتے تھے وہ بھی ہنگامی طور پر بھول گئے تھے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس بات سے منٹو کو، جو اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتا تھا، کتنی کوفت ہوئی ہو گی۔

منٹو جس طرح پیٹنا جانتا تھا لیکن پٹنا نہیں، پدانا جانتا تھا لیکن پدنا نہیں، اسی طرح مذاق کرتا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی حس اس میں مفقود تھی۔ وہ بہت ذکی الحس تھا (اپنے مضامین میں بار بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے) لیکن دوسرے بھی ذکی الحس ہو سکتے ہیں، دوسروں کو بھی بات چبھ سکتی ہے، اسے وہ اونچے درجہ کا افسانہ نگار اور ماہر نفسیات ہونے کے باوجود نہ جانتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا لیکن انسان کی یہ عام خامی ہے۔ ٹالسٹائی کئی بار نفس سے اندھے ہوئے لیکن اپنے افسانوں اور ناولوں میں انھوں نے اس کے خلاف لکھا۔ بالزاک نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ اتنی سی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ انھیں روپیہ بے دریغ اور بچکانی چیزوں پر نہ خرچ کرنا چاہئے، ہوائی قلعے نہ بنانے چاہئیں اور بے دریغ قرض نہ لینا چاہئے —— صفحۂ قرطاس پر زندگی کی دبی چھپی حقیقتوں کو عظیم فن کار کی چابکدستی سے قلم بند کرنے والا زندگی بھر عیاں حقیقتوں کو نہ سمجھ سکا اور بے حد پریشان رہا۔ آج میں یہ سب اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن ان دنوں حقیقت نگار ہونے کا دعوے کرنے کے باوجود میں زندگی کی اس بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا ——

میں جن دنوں دہلی گیا، منٹو کی ایک کہانی کا بڑا چرچا تھا —— اس کا نام تھا "ترقی پسند" —— چرچا اس کا یوں تھا کہ منٹو نے وہ دیوندر ستیارتھی اور بیدی پر لکھی تھی۔ چونکہ بیدی میرے بہت نزدیک تھا اس لیے پہلی فرصت میں میں نے منٹو کی وہ کہانی پڑھ ڈالی۔ کہانی میں جو قصہ درج تھا وہ مجھے معلوم تھا کیونکہ بیدی مجھے بتا چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ لوک گیت لکھتے لکھتے ستیارتھی ایک دم افسانے لکھنے لگا تھا۔ نئے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شعر سنانے کا مرض ہوتا ہے، ستیارتھی کو بھی تھا، ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت

کچھ زیادہ ہو۔ بہرحال وہ اپنے کنبے سمیت راجندر سنگھ بیدی کے ہاں مہمان ہو گئے اور صبح شام اسے افسانے سنانے لگے۔ بیدی اس وقت پوسٹ آفس میں کلرک تھا اور لاہور چھاؤنی میں رہتا تھا۔ دو کمرے اس کے پاس تھے، جگہ زیادہ نہیں تھی، پھر ستیارتھی کی موجودگی میں خلوت کا میسر آنا یوں بھی مشکل ——— بیدی شام کو تھکا ہارا آتا تو ستیارتھی ایک افسانہ سنانے کے لیے تیار رہتے۔ سُن کر نہ صرف رائے لیتے بلکہ تصحیح چاہتے۔ اسی میں رات کو دیر ہو جاتی۔ صبح اٹھتا تو اسے تصحیح شدہ افسانہ سُننا پڑتا ——— مہینہ بھر ستیارتھی وہاں رہے اور بیدی اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کو ترس گیا۔ منٹو کی کہانی "ترقی پسند" کا پلاٹ یہی ہے۔ صرف اخیر میں منٹو نے ذرا افسانوی پیچ دیا ہے کہ پرمارتھی (ترقی پسند میں ستیارتھی کا بدل) اپنے میزبان سے کچھ ایسا چمٹتا ہے اور اس کے وقت کا یہ لمحہ کچھ اس طرح لے لیتا ہے کہ وہ غریب اپنی بیوی سے پیار کرنے کے لیے بھی غسل خانہ ہی بہتر جگہ خیال کرتا ہے۔

کہانی اچھی ہے۔ اس میں چٹخارہ بھی ہے لیکن منٹو نے اس سے کہیں زیادہ اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مجھے کہانی پڑھنے میں دلچسپ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ (بیدی کے منہ سے سُنا ہوا) منٹو نے قلمبند کر دیا، اس لیے مجھے بُرا لگا۔ میرے خیال میں اسے لکھنے کا حق بیدی کو تھا، یا پھر منٹو کو بیدی سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ دیکھو یار، میں اس واقعہ پر افسانہ لکھ رہا ہوں۔ تمھیں لکھنا ہو تو میں نہ لکھوں ورنہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن منٹو سے افسانہ نگار کو اتنا صبر کہاں۔ خیال آیا تو اسے قلمبند کر دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس ذاتی واقعہ کو لکھنے سے دو دوستوں میں شکر رنجی کی دیوار کھڑی ہو سکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دیوار نہ کھڑی ہوئی بلکہ انھوں نے منٹو کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کر لیا اور جس طرح منٹو نے اپنی کہانی میں بیدی اور ستیارتھی کے عادات و اطوار، شکل و شباہت اور ذاتی زندگی کا مذاق اڑایا تھا، اسی طرح ان دونوں نے مل کر ایک افسانہ لکھ کر منٹو کی ذاتی زندگی اور اس کی خامیوں کو اُجاگر کر دیا۔ کہانی ستیارتھی کے نام سے شائع ہوئی۔ انھوں نے ہی لکھی بھی تھی۔ بیدی نے اس پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے کچھ ایسے پتے لگائے کہ کہانی، جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، بے حد اچھی اُتری۔ نام ہے ——— "نئے دیوتا"۔

"اتنی بھی کیا خوشی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اتنا تو نفاست حسن ("نئے دیوتا" میں سعادت حسن کا بدل) پہلے بھی کما لیتا ہوگا۔ ڈیڑھ سو روپے کے لیے اس نے اپنی آزادی بیچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور رہا ہے اس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر یہ نوکری اس نے کیسے کر لی ——— غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں، زندگی کی ہتک کی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بنتا جا رہا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اس جالے میں پھنستے چلے جاتے ہیں ——— ان خیالات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جالے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں یار دوستوں کو دعوت دے رہا ہے ......"

اور یوں شروع کر کے "نئے دیوتا" کے لکھنے والوں نے نفاست حسن (یعنی سعادت حسن) کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار، سفلے پن، شراب نوشی، چڑچڑاہٹ، انانیت اور سنک، پرورش، جنس نگاری اور دوسری کمزوریوں کا کچھ ایسے لطیف پیرائے میں مذاق اڑایا کہ منٹو بلبلا اٹھا (بعد میں جیسا کہ اس کی عادت تھی، اس نے خود اپنی سنک اور سفلے پن کی تشہیر شروع کر دی[1])

---

[1] جوگیشوری کالج کے طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے منٹو نے کہا: "البتہ جب میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں تو مجھے اپنا یہ سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔" (لذتِ سنگ)

"نئے دیوتا" کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دلّی کے ادبی حلقوں میں ایک شور برپا ہو گیا۔ چونکہ منٹو اپنے اچھے سے اچھے دوست کی عزت کسی بھی وقت اُتار کر رکھ دیتا تھا اور اپنے سامنے کبھی کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا اس لیے یار دوستوں کو اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ دوست احباب جب اکٹھے ہوتے، کسی نہ کسی بہانے اس کہانی کا، یا ستیارتھی کا یا بیدی کا ذکر کر کے اسے چھیڑتے ——— منٹو اس کہانی کا ذکر آتے ہی کس طرح چڑ جاتا۔ دنیا جہان کا مذاق اڑاتے ہوئے، مذاق کیے جانے پر کس طرح سیخ پا ہو جاتا، اس کا ایک واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے۔

لنچ کا وقت تھا، لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کرشن کے کمرے میں آ اکٹھے ہوئے تھے۔ غپ ہو رہی تھی۔ کرشن اپنی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا سب کی سن رہا تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر منٹو پاؤں اوپر کیے، گھٹنوں کو باہوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا۔ آنند، قدوس اور دوسرے پروگرام اسسٹنٹ منٹو کی کرسی کے گرد گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ (اختر الایمان اور میرا جی شاید اس وقت ریڈیو میں نہیں تھے، یا شاید تھے، مجھے یاد نہیں) حفیظ جاوید نیچے دری پر دیوار سے پیٹھ لگائے، گھٹنے پر ٹانگ رکھے آدھے لیٹے، آدھے بیٹھے خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ کمرے میں جگہ نہ تھی اس لیے کونے میں پڑے ریکارڈوں کے اونچے چیسٹ پر ٹانگیں نیچے کو لٹکائے بیٹھ گیا تھا۔ تبھی جانے کس نے اور جانے کیسے ستیارتھی کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ نہایت گھٹیا افسانہ نگار ہے۔

دوسرے نے کاٹا "لیکن 'نئے دیوتا' تو اس نے خوب کہانی لکھی ہے۔"

"واہ!" کرشن نے سر اور دایاں ہاتھ ایک ساتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اسی وقت اس کی نگاہیں منٹو سے چار ہوئیں جو ستیارتھی کا نام سنتے ہی چوکنا ہو بیٹھا تھا اور کرشن کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا اور نگاہیں پھر جھک گئیں۔

اور تب کسی نے (منٹو کو بناتے ہوئے) کہا "ارے یار! ستیارتھی کیا کھا کر ویسا افسانہ لکھے گا، وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے۔"

"بیدی کا تو نہیں۔" تیسرے نے کہا۔ "لکھا تو ستیارتھی ہی کا ہے، بیدی نے اس میں پیتے لگائے ہیں اور کہانی دو آتشہ ہو کر نکلی ہے۔"

"ہم نے سنا فیض کا بھی ہاتھ ہے......."

اور اسی وقت منٹو نے پاؤں نیچے کیے اور سب کی آوازوں کو جیسے اپنی آواز کی کرختگی میں ڈبوتے اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں جیسے گڑھوں سے نکالتے ہوئے کہا "بیدی اور فیض کیا، اس میں تاثیر کا ہاتھ ہے، تبسم کا ہاتھ ہے، سنت سنگھ سیکھوں کا ہاتھ ہے، موہن سنگھ کا ہاتھ ہے۔ منٹو از این انسٹی ٹیوشن......."

تب مجھے نہ جانے کیا سوجھا، منٹو کو بات ختم کرنے کا موقعہ دیے بغیر میں نے کہا "اپنے بارے میں یار سب کو غلط فہمی ہوتی ہے، وہ شیام لال کپور تھا نا، گورو گھنٹال کا ایڈیٹر، وہ بھی اپنے آپ کو انسٹی ٹیوشن سمجھا کرتا تھا......."

میں نے شیام لال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے زور کا قہقہہ بلند کیا لیکن اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا یا قہقہہ خاموش ہوتا، منٹو جھنجھلا کر اُٹھا اور اس نے غصہ سے پاگل ہو کر دو تین غلیظ گالیوں کے ڈھیلے میری طرف پھینک دیے۔

کوئی دوسرا موقعہ ہوتا، منٹو مجھے گالی دیتا تو میں کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر جما دیتا۔ لیکن لڑنے کی طرح مذاق کرنے کا بھی ایک فن ہے۔ مذاق مذاق میں جو چڑ جاتا ہے، گالی دیتا ہے یا ہاتھ اٹھاتا ہے دراصل وہی پٹ جاتا ہے۔ منٹو نے گالیاں دیں تو لوگ اور بھی زور سے ہنس دیے۔ کرشن نہیں ہنسا۔ اس نے منٹو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "کیا کرتے ہو؟" اور دوسرے لمحے منٹو نے اپنے اوپر

قابو پالیا۔ بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما اور دھیرے سے انگریزی میں کہا: "ڈونوٹ مائنڈ اِٹ (DO NOT MIND IT)"

اس وقت چاہے منٹو اور دو گالیاں بھی دے لیتا تو شاید میں ہاتھ نہ اٹھاتا لیکن دوسری بار مجھے یاد ہے، منٹو نے گالی دی اور میں ہاتھ اٹھانے کو تیار ہو گیا۔ اگر وہ ذرا بھی منہ کھولتا تو سر پھٹول ہو جاتی۔

فلمستان کے زمانے کی بات ہے "آٹھ دن" کی شوٹنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا تھا۔ چونکہ دن کو سٹوڈیو خالی نہ تھے اور اشوک کمار نے زبردستی پروڈکشن لے لی تھی اس لیے 'آٹھ دن' کی بیشتر شوٹنگ رات کو ہوتی۔ منٹو رات کو سیٹ پر آنے کا عادی نہ تھا۔ اس کے اشغال دوسرے تھے لیکن جب سے میں نے ٹکڑم بھڑا کر 'آٹھ دن' میں رول لے لیا تھا اور منٹو کے لکھے مکالموں میں ردّ و بدل کرنے لگا تھا تو منٹو رات کو بھی سیٹ پر آنے لگا تھا۔ رات کو وہ پیا پلایا کرتا تھا اور سیٹ پر آنا اسے بے حد شاق گزرتا تھا۔ لیکن میں اس کے مکالموں کو 'مسخ' نہ کر دوں، اس بات کا اسے ڈر تھا۔ اشوک کی کہانی کے سلسلے میں میرے ساتھ اس نے جو زیادتی کی تھی، اس سے میں بے حد چڑا ہوا تھا اور اس کو تنگ کرنے کے درپے تھا، لیکن میری یہ عادت ہے کہ لڑائی میں بھی شاذ ہی غلطی اپنے سر لیتا ہوں۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ غلطی دوسروں کے سر رہے۔ اس موقعہ پر بھی میں نے منٹو کو اتنا چڑا دیا کہ وہ بے اختیار ہو کر گالی دے بیٹھا، لیکن سننے والوں کو غلطی اسی کی معلوم ہوئی۔

'آٹھ دن' کی شوٹنگ کے بعد میں بیمار ہو کر پنج گنی چلا گیا تھا اور میں نے وہ فلم نہیں دیکھا اس لیے مجھے اس کی کہانی یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ رات کی شوٹنگ تھی، شادی کا سیٹ تھا۔ مجھے پنڈت کی حیثیت سے ہیرو کی شادی کرنا تھی اور میں کمر میں دھوتی کسے ننگے بدن پر جنیو پہنے، رام نامی دوپٹہ گلے میں ڈالے سر پر پنڈتوں سی پگڑی سجائے ویدی پر بیٹھا تھا اور ہیرو کی ماں سے (یہ پارٹ لیلا مصرا کر رہی تھیں) میرا جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس میں کہیں فقرہ آ گیا: "تو کیا میں جھک مار رہا ہوں" یا شاید یہ فقرہ تھا: "میں ہرگز یہ جھک نہیں مار سکتا۔" بہر حال جھک مارنے کا محاورہ منٹو نے استعمال کیا تھا۔ اشوک ہدایات دے رہے تھے۔ منٹو پیئے ہوئے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھا سین شوٹ ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے شرارت سوجھی اور میں نے سنجیدگی سے کہا: "میں یہ ڈائیلاگ نہیں بول سکتا۔"

"کیوں؟" اشوک نے پوچھا

"جھک مارنا ہنسا بھرا شبد ہے۔ ویدی پر بیٹھا ہوا، ویدوں کا وکتا، دھرم پرائن برہمن ایسا واکیہ کبھی نہیں بول سکتا۔"

"لیکن یہ تو محاورہ ہے۔" منٹو تمک کر اٹھا۔

"بہت سے ایسے محاورے ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں لیکن شریف لوگ نہیں بولتے، اسی طرح ویدی پر بیٹھا ہوا پنڈت یہ ہنسا بھرا محاورہ نہیں بول سکتا۔" میں بولا۔

"لیکن محاورے کا مطلب تشدّد بھرا نہیں۔"

"جھک کیا ہے، مچھلی۔ جھک مارنا، مچھلی مارنا ——— مطلب اس محاورے کا کچھ بھی ہو، لیکن کوئی پنڈت اسے نہیں بول سکتا۔"

"بنگال کے پنڈت مچھلی مارتے ہی نہیں، کھاتے بھی ہیں۔"

"لیکن پنڈت طوطا رام بنگالی نہیں، نہ یہ کہانی بنگالیوں کی ہے۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔" منٹو جھلا اٹھا۔ "تمھیں یہی فقرہ بولنا ہوگا۔"

"میں نہیں بول سکتا۔ میں ویدی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں۔"

"میں بھی برہمن ہوں۔" منٹو گرجا۔

"برہمن تمھارے اجداد ہوں گے اس وقت تو تم یہاں جھک مار رہے ہو۔"

اور منٹو نے بے اختیار ہو کر زور سے مجھے گالی دی۔

آج اپنے اس اعتراض کی بات سوچتا ہوں تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ درحقیقت دل میں مجھے اس وقت بھی ہنسی آ رہی تھی لیکن اوپر سے میں بے حد سنجیدہ بنا ہوا تھا۔ اس بات پر زور دے رہا تھا کہ شمالی ہند کا کوئی دھرم پرائن پنڈت ویدی پر بیٹھ کر ایسا محاورہ نہیں بول سکتا۔ اعتراض نہایت لچر تھا لیکن جو لوگ فلمی دنیا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے لچر اعتراض وہاں سیٹوں پر شب و روز ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اعتراض لچر ہے لیکن برہمن یہ بول سکتا ہے یا نہیں، اس سوال نے اسے ایک دم وزن عطا کر دیا۔ فلمی دنیا والے نہایت ڈرپوک آدمی ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا ناستک وہاں مہورت کرتا ہے (حالانکہ ان مہورتوں کے باوجود آئے دن حادثے ہوتے ہیں، فلم فیل ہوتے ہیں اور فنانسر خسارہ اٹھاتے ہیں) میری بات اشوک اور واچا کو کھٹک گئی۔ منٹو نے گالی دی تو میرا پلّہ اور بھی بھاری ہو گیا اور چونکہ میں مذاق نہ کر رہا تھا اور لڑائی پر آمادہ تھا اس لیے میں نے کہا، "دیکھو منٹو! میں پہلوان نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی پہلوان نہیں ہو اور تم نے اب بھی کچھ کہا تو میں تمھیں اٹھا کر سٹوڈیو کے باہر پھینک دوں گا۔"

معاملے نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ اشوک گھبرا گئے۔ شوٹنگ رُک گئی۔ انھیں فکر ہوئی کہ ہم دونوں اڑے رہے تو شوٹنگ نہ ہو سکے گی اور چار چھ ہزار کی ڈز پڑ جائے گی۔ وہ منٹو کو باہر لے گئے (یا شاید مجھے لے گئے، یہ مجھے یاد نہیں) لیکن کچھ دیر بعد جب ہم سیٹ پر آئے تو منٹو نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے دباتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا، گھر چلا گیا۔ پھر کبھی وہ رات کو سیٹ پر نہیں آیا۔ میں نے مکالمے ہی نہیں مناظر تک بدل ڈالے لیکن پھر اس نے میرا راستہ نہیں کاٹا۔

منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اسے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدھ غلیظ گالی دے۔ سالے والے تو کہتا ہی رہتا تھا، لیکن کرشن کبھی ایسا موقعہ نہ آنے دیتا تھا۔ منٹو مجھے بھی گالی دینا چاہتا۔ دو موقعوں کا تو میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اس نے اور مجھے گالی دی۔ ان دنوں ہم میں تناؤ نسبتاً کم تھا۔ مکرجی نے اشوک اور منٹو وغیرہ کو زک دینے کے لیے سنتوشی کو پھر بلا لیا تھا اور 'آٹھ دن' کے لیے اس کا ایک گیت منظور کر لیا تھا۔ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی لیکن منٹو سنتوشی کا وہاں آنا پسند نہ کرتا تھا اس لیے وہ ایک گیت مجھ سے لکھوا رہا تھا) ہم میوزک روم سے دفتر کی طرف آ رہے تھے کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے منٹو نے اچانک مجھے باتوں باتوں میں دھیرے سے گالی دی۔

کسی زمانے میں میں خود بڑی گالیاں بکتا تھا۔ والدِ محترم نت نئی گالیاں تصنیف کرنے میں یکتا تھے۔ یوں بھی جالندھر گالی خیز خطہ ہے۔ دوست جب ملتے ہیں تو بڑی بھاری بھرکم گالیوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں 'بھیشم' لاہور کے دفتر میں کام کرتا تھا اور اپنے سینئر ایڈیٹر جناب ساگر چند گورکھا کے ساتھ (جو بعد میں روزنامہ پرتاپ کے مزاحیہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے تھے اور اب آل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبہ میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں) ریلوے روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے میرا بچپن کا دوست کلونت سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا۔

دور ہی سے اس نے ایک موٹی سی گالی سے میرا حال چال پوچھا اور میں اس سے بھی موٹی گالی دیتا ہوا اس سے بغلگیر ہو گیا۔ (آج یہ بات کچھ خواب کی سی معلوم ہوتی ہے اور حالانکہ میری بیوی اب بھی مجھے خاصا غیر مہذب سمجھتی ہے لیکن جالندھر سے لاہور آنے والے اشک اور الہ آباد کے اشک میں زمین آسمان کا فرق ہے) گورکھا صاحب حیران و ششدر کھڑے دیکھتے رہے۔ بعد میں میں نے انھیں سمجھایا کہ وہ میرا لنگوٹیا یار تھا اور جالندھر کے لنگوٹیے یاروں میں خیر مقدم کی یہ پرانی رسم ہے...... کاش منٹو میں اور مجھ میں ایسا یارانہ ہوتا اور ہم دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالی دے سکتے لیکن دفتر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس نے دھیرے سے مجھے جو گالی دی تھی اس میں بے تکلفی نہ تھی، یارانہ نہ تھا، سرپرستی کا غیر مبہم سا جذبہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ گالی خاموشی سے سن لی تو مجھے اور بھی گالیاں سننی پڑیں گی اور بے تکلفی نہ ہونے کے باعث میں گالی دے نہ سکوں گا۔ میں نے فوراً کہا، "دیکھو منٹو! تم امرتسر کے ہو تو میں جالندھر کا ہوں میں گالیاں دوں گا تو تمھاری طبیعت صاف ہو جائے گی دوبارہ تم مجھے کبھی گالی مت دینا۔"

اور منٹو نے مجھے پھر کبھی گالی نہ دی۔ اس کی بے پناہ جھنجھلاہٹ میری کپال کریا کرنے کی خواہش میں ضرور ظاہر ہوئی لیکن گالی وہ مجھے نہ دے سکا۔

منٹو جب گالی دینے پر معافی مانگ لیتا تھا، اتنا مادہ اس میں تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم میں برابر کشیدگی رہی اور ہم لڑتے رہے۔ میں نے خود اس بات پر غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کی بساط پر ہمیں ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا گیا ہے اور ہم لڑنے پر مجبور رہے۔ اگر کہیں برابر مل کے بیٹھتے بھی تو ایک دوسرے سے نبرد آزما، ایک دوسرے کے پیادے کو کاٹ کر کشت دینے والے مہروں کی طرح۔

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی ہو، ایسی بات نہیں لیکن ہماری 'انا' یا احتیاط کھل کر ہمارے ملنے کے راستے کی ہمیشہ دیوار بن گئی۔ میں نے ملنے کی کوشش کی تو منٹو تنا رہا، منٹو نے ملنے کی کوشش کی تو میں تنا رہا۔ ٹھیک سن یاد نہیں لیکن کرشن لکھنؤ جا چکا تھا، راشد پروگرام ڈائرکٹر کی کرسی پر جا براجے تھے، چوپڑا صاحب کو ابھی منٹو نے پھانسا نہیں تھا، منٹو کو مخالفت کا حلقہ اپنے گرد تنگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شام کا وقت تھا، دیے جل چکے تھے اور میں میز پر بیٹھا کوئی ڈرامہ یا کہانی لکھ رہا تھا۔ کوشلیا اندر باورچی خانے میں کھانے پکانے کا انتظام کر رہی تھی کہ اچانک باہر سڑک پر سے سخت اور تیکھی آواز آئی —— "اشک!"

"منٹو!" —— مجھے خیال آیا —— اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ اگرچہ میں اس کے گھر (۹ حسن بلڈنگز، کشمیری گیٹ) میں تین چار بار گیا تھا، لیکن وہ گزشتہ ڈیڑھ برس میں کبھی میرے گھر نہ آیا تھا حالانکہ میں تیس ہزاری میں بھیرو کے مندر کے سامنے رہتا تھا اور ہمارے گھروں میں نصف میل سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔ میرے ہاں تو دور رہا، وہ کبھی کرشن چندر کے ہاں بھی نہ آیا تھا جو میرے نزدیک ہی رہتے تھے (میرے آنے سے پہلے آیا ہو تو میں نہیں جانتا)

لیکن میں نے فوراً جواب نہ دیا۔ نہ اٹھ کر دروازہ کھولا، کیونکہ آواز اگرچہ منٹو کی معلوم ہوئی لیکن یقین نہ آیا کہ منٹو ہے۔

"اشک!" وہی کرخت، تیکھی، قدرے چڑچڑی آواز۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ منٹو، صفیہ بھابی اور ان کے ساتھ ایک گورا چٹا، بڑی خوبصورت آنکھوں اور تیکھے ناک نقشے والا نوجوان —— تینوں اندر آ گئے۔

منٹو نے تعارف کرایا۔ "یہ مسعود پرویز ہے (میرا بھتیجا یا میرا دوست، منٹو نے کیا کہا مجھے یاد نہیں) تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے

کہا، "چلو ملا لائیں۔"

میرے پاس اس وقت دو چھوٹے چھوٹے کمرے، ایک کوٹھڑی اور ایک کچن تھا۔ منوہر لال بھارگو میونسپل کمشنر دہلی نے کمال مہربانی کر کے ہم جیسے غریب الوطنوں کے لیے بارکوں جیسے ۲۶ کوارٹر بنا رکھے تھے۔ جس وقت کا ذکر ہے، راشد ایک نمبر میں، میں تین نمبر میں اور کرشن پانچ نمبر کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک کمرہ سونے کا اور ایک بیٹھنے کا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں میں نے ایک کرسی میز کام کرنے کے لیے رکھ چھوڑی تھی اور بیٹھنے کے لیے ایک دری اور جا جم فرش پر بچھا رکھی تھی ـــــ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا، "بیٹھو بیٹھو!" اور کوشلیا کو آواز دی کہ دیکھو منٹو اور صفیہ بھابی آئے ہیں۔ منٹو اور پرویز بیٹھ گئے، صفیہ بھابی اندر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور میں اس وقت تک بات چلانے کی کوشش کرتا رہا، جب تک صفیہ کوشلیا کے ساتھ بیٹھک میں نہیں آ گئیں۔

مجھے اس میٹنگ کی کوئی بات یاد نہیں، سوا اس کے کہ مسعود پرویز کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں، اس کا ناک نقشہ بے حد دلکش تھا اور میں نے کئی بار دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور میرا خیال تھا کہ وہ یقیناً فلمی دنیا میں ہیرو کی حیثیت سے مشہور ہوگا (شاید وہ اس وقت کسی فلم کمپنی میں نوکر تھا یا جانے کی کوشش کر رہا تھا) منٹو ادھر اُدھر کی بڑی اوپری باتیں کرتا رہا اور میں تنا بیٹھا رہا۔ بات کو میں نے اپنی طرف نہیں موڑا۔ پرویز سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے کون سی میری چیز پڑھی ہے، وہ کب دہلی آیا ہے، کیا کر رہا ہے، کب تک رہے گا؟ بات چیت کو میں نے ذاتی پیچ نہیں دیا، منٹو کو باتیں کرنے کے لیے چھوڑ دیا بلکہ جب کوشلیا آ گئی تو ان لوگوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا ناٹک کرتا رہا۔

میں نے ایسا کیوں کیا، جب میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو پاتا ہوں کہ مجھے اس بات کا ایک منٹ کو بھی یقین نہیں آیا کہ پرویز مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور منٹو اپنے شام کے شغل مے نوشی کو چھوڑ کر اسے مجھ سے ملانے چلا آیا تھا۔ صفیہ بھابی کوشلیا سے ملنا چاہتی ہوں گی، یہ بات میری سمجھ میں آ سکتی تھی۔ صفیہ، کوشلیا کو چاہتی تھیں اور کوشلیا بھی صفیہ اور منٹو دونوں کی عزت کرتی تھی لیکن منٹو نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور میرے ہاں آنے کا جو بہانہ اس نے بنایا اس کا مجھے یقین نہ تھا۔ پھر منٹو کے اس طرح آنے میں، اس کے اس طرح آواز دینے میں، میرے ہاں بیٹھنے اور باتیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے ہاں آ کر وہ مجھ پر کوئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھے اس کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ باتوں میں اس نے جتا بھی دیا کہ وہ اس ڈیڑھ برس میں کرشن کے گھر بھی کبھی نہیں آیا اور مجھے اس کا یہ انداز کھل گیا تھا۔

منٹو کی بات میں نہیں جانتا، لیکن اس ملاقات کی بے کیفی مدتوں میرے دماغ پر حاوی رہی۔ میں بھکّڑ آدمی ہوں، منٹو بھی اوّل درجے کا بھکّڑ رہا ہے لیکن ایک دوسرے کی موجودگی جانے ہماری انانیت کے کن تاروں کو چھیڑ دیتی تھی کہ وہ بے ساختہ تن جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں کرسی پر بیٹھا لکھنے کا بہانہ کر رہا تھا اور پاس ہی دری پر بیٹھے منٹو اور مسعود، صفیہ بھابی اور کوشلیا باتیں کر رہی تھیں میں سوچ رہا تھا کہ میں کیوں ان کی باتوں میں شامل نہیں ہوتا، جب وہ میرے گھر آئے ہیں تو مجھے ایسا گھٹیا پن نہ کرنا چاہیے اور چونکہ میں منٹو کے آنے کا صحیح مقصد جانتا تھا جسے اس نے احساسِ برتری کے زیر اثر دبا رکھا تھا، اس لیے میں کھل نہیں سکا۔ ہلکا سا رحم کا جذبہ منٹو کو اپنی بلندیوں سے ذرا نیچے اُترتے دیکھ کر میرے دل میں ضرور پیدا ہوا لیکن ان بلندیوں سے اسے اتار لانے کی کامیابی پر مجھے اتنی ہی مقدار میں خوشی بھی ہوتی۔

منٹو پھر میرے گھر کبھی نہ آیا ـــــ دہلی میں بھی نہیں، بمبئی میں بھی نہیں، اور اس نے دہلی چھوڑ جانا منظور کر لیا لیکن اور زیادہ نیچے اُترنا اسے منظور نہ ہوا۔

منٹو صاحب

محمد طفیل

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ منٹو صاحب کی
زندگی میں اور دوسرا حصہ ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا۔

(۱)

اس وقت سر میں شدید درد ہے، نہ جانے یہ جی کیوں چاہتا ہے کہ درد بڑھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت منٹو پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ درد کی نوعیت نہ بدل جائے۔ اس لیے کہ میں نے منٹو کے افسانے پڑھتے ہوئے عموماً سر کی بجائے دل میں درد محسوس کیا ہے۔ میرے علاوہ اور بھی کئی ایک اسی اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ بعضوں کے دل میں ان کے اندازِ بیان کی رنگینی اور چٹ پٹے پن سے درد ہوتا ہے۔ میرا شمار کن میں ہے؟ یہ آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔ اس لیے کہ میں اس وقت منٹو کے فن کی بجائے ان کی شخصیت پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ منٹو کے فن پر لکھنے کا حق ہمیشہ کی طرح نقادانِ کرام کو سونپتا ہوں۔ ورنہ وہ محاورہ صادق آئے گا کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔

ایک دن انارکلی میں ایک صاحب کو افسانوی انداز میں پیدل چلتے دیکھا تو ذہن میں آیا کہ اسے منٹو ہونا چاہیے۔ یہ خیال اس لیے بھی ذہن میں آ سکتا تھا کہ منٹو صاحب بمبئی سے لاہور آ چکے تھے۔ چند دنوں بعد ایک صاحب ہمارے دفتر کے سامنے سے سائیکل پر گزرے، سائیکل بالکل نئی تھی۔ صاحب سائیکل نے ہمارے دفتر کے اندر کچھ اس نئے انداز سے دیکھا کہ ذہن میں پھر آیا کہ وہ منٹو گیا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ برادرم احمد ندیم قاسمی آئے اور انھوں نے بتایا میں آپ کے پاس ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا۔ لیکن راستے میں منٹو صاحب مل گئے تھے۔ اس لیے آدھ گھنٹہ اُن سے باتوں میں گذر گیا۔

کچھ دنوں بعد جب پھر ندیم صاحب آئے تو ان کے ہمراہ ایک اور صاحب بھی تھے۔ وہی جن کو میں نے انارکلی میں دیکھا تھا یا دفتر کے سامنے سائیکل پر گذرتے دیکھا تھا۔

ندیم صاحب نے تعارف کرایا "آپ سعادت حسن منٹو ہیں۔" اور میری طرف اشارہ کر کے "آپ طفیل صاحب ہیں۔"

"دیکھتے نہیں ہو" ـــــ میں نے دیکھا ـــــ پنکھے کا رُخ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی تصویر کی طرف تھا۔"

پھر انھیں کوئی دوسرا پیراگراف یاد آگیا تو وہ بھی سنا دیا:

"ایک دم شور برپا ہو گیا کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے بنڈل لیے چلّا رہے ہیں اور اندھادھند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے تھے۔ تازہ تازہ اور گرما گرم خبریں۔ دہلی میں جوتا چل گیا۔ لکھنؤ میں فلاں کوٹھی پر کتوں نے حملہ کر دیا۔ پاکستان کے ایک نجومی کی پیش گوئی کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔"

اس وقت انھوں نے یہ فقرے بغیر کسی ربط کے سنائے تھے۔ یہاں ان کی کتاب سے نقل کر دیئے گئے ہیں۔

اس کے بعد بھی رُکے کہاں۔ کہنے لگے آج کل عجیب موڈ ہے۔ افسانہ لکھنا چاہتا ہوں تو مضمون ہو جاتا ہے اگر مضمون لکھنا چاہوں گا تو ڈرامہ ہو جائے گا نہ جانے اس وقت مجھے بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا اور جھٹ سے بول پڑا۔

"اگر آپ نے بیک وقت ڈرامہ، افسانہ اور مضمون لکھنا چاہا تو آپ سوالیہ نشان بن کر رہ جائیں گے۔"

اس فقرے پر منٹو صاحب محظوظ ہوئے اور کہا "اچھا ہے، اچھا ہے۔" چونکہ انھیں اپنے پر کوئی چبھتی ہوئی بات گوارا نہیں ہوتی، اس لیے ذرا سوچ کر بول ہی پڑے "بات تو آپ نے اچھی کہی ہے، بدقسمتی سے میری اور آپ کی بے تکلفی نہیں ہے اس لیے جواب ارسال کرنے سے معذور رہوں۔"

ندیم صاحب سمجھ گئے کہ یہ اس وقت کس قسم کا جواب دے سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے مسکرا کر کہا "آپ انھیں کوئی جواب نہ دیں۔ یہ ذرا اور قسم کے آدمی ہیں۔" اور قسم سے اس وقت نہ جانے ان کی مراد کیا تھی۔ لیکن منٹو صاحب کی باتوں کا رُخ قسموں کی طرف چل نکلا اور کہا "آپ نے میرا مضمون ناک کی قسمیں پڑھا ہو گا۔ وہ، وہ، ہاں وہی

آئی جو اُن کی ناک تو آتی چلی گئی

میں نے اس مضمون میں ناک کی قسمیں گنوائی ہیں۔ اس مضمون میں ایک شعر بھی کوٹ کیا ہے جو مجھے ناک کی مناسبت سے بڑا پسند ہے۔ وہ کیا ہے تنکا بھئی وہ تنکا۔ ہاں!

ناک میں نیم کا فقط تنکا شوخی چالاکی اقتضا سن کا"

اس کے بعد انھوں نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے، موٹے موٹے شیشوں والی عینک میں سے دیکھ کر ندیم صاحب سے پوچھا "آپ یہاں بیٹھیں گے؟"

ندیم صاحب نے اپنا تکیہ کلام دہرا دیا "جی ہاں!" تو آپ کھڑے ہو گئے اور کہا "اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔"

پھر تو اُن سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ قریب قریب روز۔ عموماً ان کی ملاقاتوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ مسلسل ملاقاتیں بخشیں گے۔ کبھی کبھی اچانک ناپید ہو جائیں گے۔ بات صرف اتنی ہو گی کہ ملاقاتوں کا رُخ کسی اور کی طرف مڑ جائے گا۔ ان کا یوں روپوش رہنا چند

دنوں کا یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہوگا۔ تانگے سے اترتے ہی دُور سے السلام علیکم کے ساتھ ملاقات پھینک دیں گے۔ پھر یہ کہیں گے۔ "دس روپے یا پندرہ روپے دوائی کے لیے دینا۔" جو دینے پڑتے ہیں۔ لوگ دوائی اس لیے پیتے ہیں کہ صحت یاب ہوں۔ لیکن یہ دوائی اس لیے پیتے ہیں کہ صحت اور خراب ہو۔ ان کی دوائی کا نام شراب ہے۔ پہلے یہ دوائی کو پیتے ہوں گے۔ اب دوائی انھیں پی چکی ہے اور کسی دن بیٹھے بٹھائے ہم یہ سن لیں گے کہ منٹو صاحب کا انتقال ہو گیا——

یہ سب جانتے ہیں کہ منٹو اُردو کا ممتاز افسانہ نگار ہے، جو اِن کی اس حیثیت سے منکر ہیں، مجھے اُن کی رائے سے اتفاق نہیں۔ لیکن ایک بار ایسا بھی ہوا کہ منٹو صاحب نے ایک افسانہ مجھے نقوش کے لیے دیا جس کا نام "نطفہ" تھا، میں نے وہ افسانہ پڑھا تو مجھے پسند نہ آیا۔ ڈرتے ڈرتے اس کا اظہار ان سے کیا۔

منٹو صاحب نے بُرا نہ مانا بلکہ ایک اور افسانہ لکھ دیا۔ میری نظر میں وہ بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ جب منٹو صاحب کو دوسرے افسانے کے متعلق بھی میری رائے کا علم ہوا، تو انھوں نے کہا کہ کل ایک اور افسانہ لکھ دوں گا اور اس وقت تک لکھتا رہوں گا جب تک کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ یہ افسانہ مجھے پسند ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مجھے ایک ایک دن کے وقفے سے دو افسانے دیئے وہ دونوں مجھے بے حد پسند آئے۔ ایک کا نام 'موذیل' تھا اور دوسرے کا نام 'سڑک کے کنارے'۔

مندرجہ بالا واقعہ کے اظہار کا میرے نزدیک سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ اتنا بڑا لکھنے والا اتنے بڑے دل گردے کا بھی مالک ہے۔ ہر فن کار کو اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ تحریر بھی بڑی عزیز ہوتی ہے اور وہ اس کی شان میں ایک حرف بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور پھر منٹو ایسا فن کار، جو فن کار بھی ہے اور منہ پھٹ بھی۔ اس وقت انھوں نے نہ مجھے یہ طعنہ دیا کہ میں بہت بڑا لیکھک ہوں اور نہ ہی یہ ثابت ہونے دیا کہ منہ پھٹ بھی ہوں۔

ویسے ان کی زبان کے آگے کوئی خندق نہیں۔ کبھی کبھی پی کر آجائیں گے اور کہیں گے "کل آپ نے فلاں صاحب کے سامنے کیا بکواس کی تھی، میری جان! میرے اور اس کے تعلقات اور قسم کے ہیں۔ معاف کرنا۔ وہ بھی حرامزادہ، یہ آپ کو کیا پڑی تھی کہ وہی بات آپ اس سے بھی کہہ دیں، جو میں نے آپ سے چھپا کر کہی تھی۔ ویسے میں ڈرتا نہیں ہوں، وہ میرا کیا کرے گا، میری جان! آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ معاف کرنا آپ کو پتہ نہیں کہ آپ نے بڑی کمینہ حرکت کی۔ جب میں نے سنا تو کباب ہو گیا۔ میری . . ."

میں ایسے مواقع پر خاموش رہتا ہوں، یا صرف مسکرا دیا کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اس وقت ان کی باتوں کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا اور اس وقت منٹو کی بجائے شراب بول رہی ہوتی ہے۔

بعض اوقات جب منٹو اور شراب مل کر بولتے ہیں تو اس وقت منٹو پر بھی پیار آتا ہے اور اس کی باتوں پر بھی۔ لیکن ایسے مواقع ذرا کم ہی آتے ہیں۔ عموماً وہ پی کر واہی تباہی ہی بکتے ہیں۔ وہ اپنی انھی باتوں کی بدولت دو بار پاگل خانے جا چکے ہیں۔

پہلی مرتبہ منٹو صاحب راضی خوشی خود ہی گئے تھے۔ دوسری مرتبہ زبردستی ان کے گھر والوں نے بھجوایا۔ ان کی دوبارہ واپسی پر میں نے ان سے پوچھا تھا کہ منٹو صاحب آپ کس خوشی میں مینٹل ہاسپٹل جاتے اور آتے ہیں۔

کہنے لگے کہ بھئی پہلی مرتبہ تو خود بڑے چاؤ سے گیا تھا کہ وہاں جا کر ذرا شراب چھوڑ آؤں۔ سنا تھا کہ وہاں اس انداز سے علاج

کیا جاتا ہے کہ آدمی آسانی کے ساتھ شراب ترک کر دیتا ہے۔ لیکن وہاں جاکر جو طبیعت صاف ہوئی۔ وہ بیان نہیں کر سکتا۔ دوسری مرتبہ گھر والوں نے زبردستی بھجوا دیا۔ حالانکہ میں نے ان کی بڑی منت سماجت کی۔ لیکن کسی نے ایک نہ سُنی۔ وہاں پہنچ کر میں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ میرا ذہنی معائنہ کرایا جائے اس لیے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن ڈاکٹروں نے بھی ایک نہ سُنی۔ کل میرے ایک دوست مجھے ملنے آئے تھے، تو میں اُن کے ساتھ چلا آیا۔ وہ مجھے ڈھونڈھتے ہوں گے، ڈھونڈا کریں۔ پاگل کہیں کے۔

منٹو صاحب کا مزا اس وقت آتا ہے جب اُن سے عریانی یا فحاشی کے موضوع پر گفتگو کی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے بڑی حیرت ہے کہ لوگوں نے میرے وہ بے شمار افسانے نظر انداز کر دیئے۔ جن میں جنس کا تذکرہ تک نہیں۔ میں نے جنسی افسانے تو شاید چند ایک ہی لکھے ہیں۔ باقی تو بس افسانے ہیں۔ جن حضرات کو میرے افسانوں میں فحاشی نظر آتی ہے، وہی دکان دکان پھرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ منٹو کی کوئی نئی کتاب آئی۔ ان کا خیال ہے کہ میری تحریریں یا تو وہ حضرات پڑھتے ہیں جنھیں میرے فن سے پیار ہے یا "معترضے" پڑھتے ہیں تاکہ مجھے بُرا بھلا کہہ سکیں۔ میں بھی وقت آنے پر ہر ایک کا قرضہ چکا دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی ایک کتاب کا انتساب یوں کیا تھا:

"ایڈیٹروں و دنیا کے نام، جس نے مجھے سب سے زیادہ گالیاں دیں"

اب جی چاہتا ہے کہ قبلہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے نام بھی ایک کتاب معنون کر دوں۔ اس لیے کہ موصوف نے میرے خلاف لکھ لکھ کر میرے افسانوں کی قدر کی ہے۔ اگر میں اپنی زندگی میں ایسا نہ کر سکا، تو بہت ممکن ہے کہ حشر کے دن مولانا موصوف دامن گیر ہوں اور مجھے ندامت ہو۔

بھئی ان محترم ہستیوں کا تذکرہ چھوڑو۔ میرے دوست قاسمی صاحب نے بھی میرے نام ایک کھلی چٹھی لکھ دی۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی بند لفافہ لکھ کر چھپوا دوں۔ لیکن قاسمی صاحب کی شرافت آڑے آگئی۔ عسکری نے سیاہ حاشیے پر دیباچہ لکھ دیا تو یار لوگوں نے اڑا دیا کہ مجھ پر عسکری چھایا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ خود اتنا سیدھا سادا اور بھولا بھالا ہے کہ اپنے اوپر تو چھا نہیں سکا، مجھ پر کیا چھاتا۔

پہلے ترقی پسند میری تحریروں کو اچھالتے تھے اور فخر کرتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ اب یہ کہتے ہیں کہ منٹو ہم میں سے نہیں ہے۔ مجھے نہ ان کی پہلی بات پر یقین تھا، نہ موجودہ پر ہے — پہلے ترقی پسند کہتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ میں کہتا تھا ٹھیک ہے۔ اب مجھے حلقۂ اربابِ ذوق والوں نے اپنا ممبر بنا لیا ہے۔ میں کہتا ہوں ٹھیک ہے۔

مجھ سے کوئی پوچھے کہ منٹو تم کس جماعت میں سے ہو تو میں عرض کروں گا کہ میں اکیلا ہوں، ہر معاملے میں اکیلا ہوں۔ جس دن میرا کوئی ثانی پیدا ہو گیا میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔ ویسے کوئی جماعت میرے نام کو اپنی جماعت کی فہرست میں شامل کر کے فخر کر سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اب منٹو صاحب میں یہ کمزوری راہ پا گئی ہے کہ وہ ہر ایک سے کہیں گے کہ کل فلاں صاحب ملے تھے اور انھوں نے میرے فلاں افسانے کی بڑی تعریف کی۔

پرسوں کراچی سے ایک صاحب آئے تھے نہ جانے ان کا نام کیا تھا وہ کہتے تھے کہ منٹو صاحب میں نے آپ کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں آپ کو اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں —

کل فلاں صاحب نے شیخوپورہ سے دو کنستر گھی کے اس لیے بھجوا دیئے کہ وہ مجھے بڑا رائٹر سمجھتے ہیں۔

میں نے مال روڈ پر ایک دُکاندار کو اپنی دو تصویریں فریم کے لیے دی تھیں۔ کوئی صاحب محبت کے اظہار کے طور پر وہاں سے فریم کے روپے دے کر میری دونوں تصویریں لے گئے۔

میرا یہ سگریٹ کیس گم ہو گیا تھا۔ اس کے دوسرے دن ایک صاحب اسے لیے ہوئے آ پہنچے اور کہا منٹو صاحب السلام علیکم! یہ اپنا سگریٹ کیس رکھیئے۔ مجھے فلاں جگہ پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے اُن سے کہا تھا۔ آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں یہاں رہتا ہوں، وہ کہنے لگے واہ آپ کو بھلا کون نہیں جانتا —

اُدھر ممتاز شیریں میرے فن پہ کتاب لکھ رہی ہیں۔ ادھر میرے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ چھپ رہا ہے —

ایک دن ایک صاحب نے لکشمی مینشن میں افیون کھا لی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے قے کرانے کے لیے کوئی دوا تجویز کی۔ مگر اس نے دوائی پینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں مرنا چاہتا۔ شور مچا تو میں بھی پہنچا، میں نے کہا۔ بھئی دوا کھا لو۔ اس نے کہا۔ تم کون ہو؟ میں نے کہا۔ میں منٹو ہوں۔ اُس نے اسی حالت میں کہا۔ بڑا اچھا ہوا کہ میں نے آپ کو مرنے سے پہلے دیکھ لیا۔ میں آپ کو بہت بڑا رائٹر سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اسے حکم دیا کہ تمہیں دوائی پینا ہوگی۔ چنانچہ اس نے دوا پی لی ——

ایک دن میں انارکلی اور مال روڈ کے درمیان بیہوش ہو گیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ بس اتنا یاد ہے کہ کچھ ایسے معلوم ہوا کہ کسی نے میری گردن پہ کلہاڑا مارا ہے اور میں بیہوش، کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک سائیکلوں کی دکان میں لوہے کی کرسی پہ بیٹھا ہوں۔ ایک ہجوم میرے ارد گرد، سب منٹو منٹو کر رہے ہیں۔

میں نے کہا ”ماجرا کیا ہے؟“

انھوں نے جواب دیا ”آپ کو چوٹ تو نہیں لگی“

”میرے کپڑے کیوں گیلے ہیں؟“

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

میں نے سٹپٹا کر کہا ”کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم لوگوں نے میرا جلوس کس سلسلے میں نکالا ہے“

بعد میں معلوم ہوا کہ میں بیہوش ہو گیا تھا۔ اس لیے لوگوں نے پانی کے چھینٹے مار مار کے، مجھے ہوش میں لانا چاہا تھا۔ یہ بھی علم ہوا کہ بعض لوگوں کا خیال تھا، مجھے مرگی کا دورہ پڑا ہے، اس لیے مجھے خوب خوب جوتیاں ”سونگھائی“ گئیں۔

جب میں نے یہ بات سُنی تو مجھے خطرہ پیدا ہوا۔ ناک کو ہاتھ لگا کے دیکھا کہ چھوٹی سی جُوتی اس کے اندر تو نہیں رہ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ایک دم گھبرا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں سے کہا ”میں گھر جانا چاہتا ہوں، تانگہ منگوا دو“

تانگہ منگوایا گیا۔ اب سب مُصر کہ ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے۔ ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے۔ چنانچہ میں ان لوگوں میں سے تین صاحبان کو ساتھ لے کر گھر کی طرف تانگے پر چل دیا۔ اُن میں سے ایک صاحب نے کہا۔ منٹو صاحب میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے اس ڈرامائی انداز میں ملاقات ہو گئی۔ میں آپ کو دنیا کا بہترین افسانہ نگار مانتا ہوں۔ میں نے فلاں فلاں مغربی افسانہ نگاروں کو پڑھا ہے۔ لیکن آپ کے سامنے سب ہیچ ہیں ——

میں نے اُن صاحب سے کہا کہ میں کیا ہوں، بس افسانہ نگار ہوں۔ اب تو میں افسانہ نگار بھی نہیں ہوں۔ افسانہ نگار اُس وقت

ہوتا ہوں جب میرے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے۔ جب میرے ہاتھ میں قلم نہیں ہوتا، اس وقت میں کچھ نہیں ہوتا۔ اب افسانے کہاں ہیں جنھیں لکھوں۔ افسانے اُدھر رہ گئے۔ جو افسانے ادھر تھے، انھیں بھی مار بھگایا اُدھر یا اُن کے ساتھ کچھ اور کر لیا گیا۔ وہاں ایک سڑک پر کئی افسانے ملتے تھے۔ یہاں کئی سڑکوں پر ایک افسانہ نہیں ملتا۔ اب یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ سعادت حسن منٹو مال روڈ کے قریب بیہوش ہو گیا اور لوگوں نے اس کی پانی کے چھینٹوں اور جوتوں سے تواضع کی۔ میری جان! یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ ——"

ایک بار کسی صاحب نے ان کے افسانے 'موذیل' کی بات چھیڑ دی۔ منٹو صاحب گویا ہوئے۔ وہ افسانہ میں نے تھوڑا ہی لکھا ہے۔ وہ تو موذیل نے لکھوایا تھا۔ بھئی مجھے افسانہ لکھتے وقت کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ مجھے کیا لکھنا ہے۔ قلم دوات سنبھالتا ہوں تو کاغذ کے اُوپر ۷۸۶ لکھ دیتا ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے۔ کیا لکھوں، کیا لکھوں، کیا لکھوں۔ معاً ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ مثلاً وہ درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ پھر قلم رکھ دیتا ہوں، سگریٹ پیتا ہوں، یا پیشاب کرنے چلا جاتا ہوں، یا پان کھانے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ واپس آکر "وہ" سے پوچھتا ہوں کہ بتا اب تو کیا کہتی ہے۔ وہ جو کچھ مجھ سے کہتی جاتی ہے۔ میں لکھتا جاتا ہوں۔ وہ جدھر جاتی ہے میں اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں، البتہ میں اسے کنکھیوں سے دیکھتا جاتا ہوں —— کہ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے کیسی ہے۔ اس میں قابلِ غور کون کونسی باتیں ہیں۔ اُس کے سینے کا اُبھار کیسا ہے۔ وہ جب ہنستی ہے تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے ہیں یا نہیں۔ وہ جب چلتی ہے تو اُس کا انداز کیا ہوتا ہے۔ جب وہ مسکراتی ہے تو کہیں دل لوٹ کے تو نہیں لے جاتی —— یہ مرحلہ میرے لیے نازک ہوتا ہے کہ جب وہ دل لوٹنے پر آتی ہے تو خود لٹتی بھی ہے یا نہیں۔ بس اس کا علم مجھے نہیں ہوتا۔ جب افسانے کا آخری حصہ آتا ہے تو اُن تمام کرداروں سے پوچھتا ہوں کہ بھئی اب بتاؤ تمھاری کیا کیا مرضی ہے؟ تم میں سے کس کس کو مار دیا جائے یا تم میں سے کس کو کیا کر دیا جائے۔ بعض کردار مرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں جاؤ تمہیں زندگی بخشی۔ پھر دوسرے کردار سے مشورہ کرتا ہوں وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر صاد کر دیتا ہوں۔ ان میں سے جو کوئی مرنے کے لیے راضی ہوتا ہے اُسے مار دیتا ہوں یا وہ سالا اور سالی جو کچھ بھی کرنا چاہے، میں اُسے مطلق نہیں روکتا۔ البتہ آخری فقرہ منٹو سوچتا ہے اور افسانہ مکمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً موذیل کا پہلا فقرہ "ترلوچن نے پہلی مرتبہ —— چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا" میرا ہے اور پھر آخری فقرہ "لے جاؤ اپنے اس مذہب کو" میرا ہے۔ باقی سب کچھ موذیل کا ہے۔

پھر موذیل کے وجود پر بحث ہو گی "بمبئی میں ایک یہودن تھی۔ بڑی بڑی رانوں والی، دھڑتّے کی عورت، وہ اسکرٹ کے نیچے کچھ نہیں پہنتی تھی۔ افسانہ لکھتے وقت وہ دماغ میں اُبھری۔ اس کا نام بھول گیا تھا تو میں نے سوچا کہ ہمارے فلیٹ کے سامنے بھی تو ایک یہودن رہتی تھی اور اس کا نام موذیل تھا۔ اُدھر بڑی بڑی رانوں کا تصور ذہن میں اُبھرا۔ اُدھر موذیل کا نام، تو بس افسانہ ہو گیا۔ میرا اس میں کونسا کمال ہے۔ اگر کوئی کمال ہے تو موذیل کا ہے —— آ ——

ویسے اس سلسلے میں منٹو صاحب نے جو کچھ تحریری طور پر فرمایا ہے۔ وہ بھی سُن لیجیے، مزے کی باتیں ہیں:

> "اب آپ کو کیا بتاؤں کہ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں۔ یہ بڑی اُلجھن کی بات ہے۔ اگر میں "کس طرح" کو پیشِ نظر رکھوں تو یہ جواب دے سکتا ہوں کہ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ کاغذ قلم پکڑتا ہوں اور بسم اللہ کر کے افسانہ لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔

> میری تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں، میں اُن سے باتیں بھی کرتا ہوں، اُن کی تمام باہم لڑائیوں کا فیصلہ بھی کرتا ہوں۔ اپنے لیے 'سلاد' بھی تیار کرتا ہوں۔ کوئی ملنے والا آجائے تو اس کی خاطر مداری بھی کرتا ہوں۔ مگر افسانہ لکھے جاتا ہوں۔ میں افسانہ نہ لکھوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کپڑے نہیں پہنے یا میں نے غسل نہیں کیا —— میں افسانہ نہیں لکھتا، حقیقت یہ ہے کہ افسانہ مجھے لکھتا ہے۔ میں بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ یوں تو میں نے بیس سے اوپر کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ یہ کون ہے جس نے اس قدر اچھے افسانے لکھے ہیں، جس پر آئے دن مقدمے چلتے رہتے ہیں۔
>
> جب قلم میرے ہاتھ میں نہ ہو تو میں صرف سعادت حسن ہوتا ہوں، جسے نہ اُردو آتی ہے نہ فارسی، نہ انگریزی، نہ فرانسیسی —— بعض اوقات میں بیوی کے کہنے پر قلم یا پنسل اٹھاتا ہوں اور لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ دماغ بالکل خالی ہوتا ہے۔ لیکن جیب بھری ہوتی ہے۔ خود بخود کوئی افسانہ اچھل کے باہر آجاتا ہے۔ میں خود کو اس لحاظ سے افسانہ نگار نہیں جیب کترا سمجھتا ہوں۔ جو اپنی جیب خود ہی کاٹتا ہے اور آپ کے حوالے کر دیتا ہے —— مجھ ایسا بیوقوف دنیا میں کوئی اور ہوگا؟”

ایک مرتبہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔ اس کا حال آپ نے منٹو صاحب کی زبانی سنا ہوگا۔ میرے اور ان کے بیان میں بدیہی فرق یہ ہوگا کہ وہ ایک بڑے لکھنے والے ہیں اور میرا لکھنے والوں میں شمار ہی نہیں۔ الحمدللہ کہ میرا لکھنے والوں میں شمار نہیں ورنہ میں بھی بعض اولوالعزم ”ادبا و شعرا“ کی طرح کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ ہر ادیب کے متعلق یہی کہتا کہ فلاں کیا لکھتا ہے۔ فلاں کی زبان ٹھیک نہیں۔ فلاں کا مشاہدہ ناقص ہے، فلاں جاہل ہے۔

ایسے اساتذہ کی موجودگی میں کون کسی کے منہ لگے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔

میرا منجھلا بھائی سخت بیمار تھا۔ میں اس کی دوائی کے سلسلے میں ڈاکٹر کے پاس آیا ہوا تھا اور اس کی کیفیت بیان کر رہا تھا، وہاں یہ پیغام ملا کہ ہاجرہ بہن آئی ہیں اور آپ کو بُلا رہی ہیں۔

میں نے سوچا کہ ایک خاتون دفتر میں بیٹھی نہ رہے۔ چل کر پہلے ان کی بات سُن لوں۔ پھر دوائی لے جاؤں گا۔

ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ابھی آیا۔ میں اپنے بھائی کی بیماری سے سخت پریشان تھا۔ پھر بھی بر بنائے تکلف بہن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ میں اصرار کر رہا تھا کہ میں آپ کو چائے پلاؤں گا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ ہرگز ہرگز نہ پیوں گی اور طفیل کی چائے تو کبھی نہ پیوں گی کہ اتنے میں منٹو صاحب تشریف لے آئے۔ وہ تانگے میں سوار تھے۔ انھوں نے میری طرف اشارہ کر کے آواز دی ”ذرا ادھر آنا“[۵]

---

[۵] پانچواں مقدمہ

میں ذرا اُدھر، منٹو صاحب ذرا اِدھر آئے اور ہمارا آمنا سامنا دفتر اور سڑک کے درمیان ہوا۔ منٹو صاحب نے کہا کہ ذرا میرے ساتھ آؤ اور میری ضمانت دے دو۔ میں اپنے چند دوستوں کے پاس گیا تھا، اُن میں سے کوئی نہیں ملا۔ (اس وقت میرے لیے یہ فیصلہ مشکل تھا کہ یہ اس وقت یہاں مجھے اپنا دوست سمجھ کر آئے ہیں یا دشمن سمجھ کر) ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ کل پانچ ہزار روپے کی ضمانت ہے۔

میں نے یہ عذر کیا کہ میں تو گھر سے بھائی کی دوا لینے کے لیے آیا ہوں۔ اس لیے آپ یہ کام کسی اور کے سپرد کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ میری پانچ ہزار کی ضمانت بھی منظور نہ کی جائے۔

اس پر منٹو صاحب نے کہا کہ آپ آدھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے اور ساتھ ہی کئی سوال جڑ دیئے۔ "آپ کا ذاتی مکان ہے؟ آپ کا بینک بیلنس تو اتنا ہوگا؟" جب میں نے نفی میں جواب دیا تو کہنے لگے "آجاؤ ہو جائے گی ضمانت، آخر اتنے بڑے ادارے کا مالک پانچ ہزار کی بھی ضمانت نہیں دے سکتا؟"

ہاجرہ بہن نے بھی لقمہ دیا۔ "چلیے جائیے نا آخر ہرج ہی کیا ہے۔"

چنانچہ دھڑکتے دل کے ساتھ اور ذہن میں گھریلو پریشانیاں لیے منٹو صاحب کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگے میں نصیر انور اور حنیف رامے موجود تھے۔ اب تانگہ انارکلی سے نسبت روڈ پہنچا اور راستے میں باتیں ہو رہی ہیں۔ "کل جو تھانیدار میرے وارنٹ لے کر آیا تھا، بڑا شریف آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ کل صبح خود تھانے میں اپنے ایک ضمانتی سمیت حاضر ہو جاؤں گا۔ اب آپ جائیں اور مجھے آرام کرنے دیں۔ چنانچہ انھوں نے میری بات مان لی اور میں رات بھر آرام کرتا رہا۔" کبھی نصیر انور کہتے "منٹو صاحب آپ ایسے افسانے کیوں لکھتے ہیں۔ جن پہ مقدمے کی نوبت آئے۔" کبھی میں کہتا کہ منٹو صاحب اگر آپ کو وقتِ مقررہ پر حاضرِ عدالت ہونا ہے تو مجھ سے ضمانت دلوائیے ورنہ مجھے پریشان نہ کیجئے گا۔

جس وقت ہم نسبت روڈ سے میکلوڈ روڈ پر پہنچے تو منٹو صاحب نے کہا "اگر اس وقت طفیل صاحب نہ ملتے تو بڑی مشکل ہوتی۔" اس پر نصیر انور نے کہا "آپ کی مشکل تو حل ہو گئی۔ اب آپ طفیل صاحب کے لیے مشکل پیدا کر رہے ہیں۔"

اس پر منٹو صاحب ہنسے اور کہا "نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ آخر مجھے ایک بار تو کراچی جانا ہی ہے تاکہ یہ ٹنٹا ختم ہو۔" اب تانگہ میکلوڈ روڈ سے قلعہ گوجر سنگھ کی طرف مڑا۔ بالآخر تانگہ ڈسٹرکٹ پولیس کے سامنے جاکر رُکا۔ ہم نے دفتر میں جاکر اپنی آمد کی غرض بتائی۔ وہاں میرے بھی ایک ملنے والے مل گئے۔ انھوں نے جب یہ سُنا کہ میں ایک ضمانت کے سلسلے میں آیا ہوں تو انھوں نے کوشش کی کہ ضمانت جلد سے جلد ہو جائے۔ حالانکہ اس وقت میرا دل یہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ ایسا ہیر پھیر کریں کہ تھانیدار صاحب میری ضمانت ہی قبول نہ کریں۔ وہ میرے دل کی گہرائیوں تک پہنچ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ میں یہاں محض مروّت کی بنا پر آگیا۔ اس لیے کہ مجھ سے ایک بڑے لکھنے والے کی دلآزاری نہیں دیکھی جاتی تھی۔

چنانچہ صاحب ضمانت ہو گئی۔ دوسرے لمحے منٹو صاحب نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ میں کراچی نہ جا سکوں گا اس لیے کہ صحت خراب ہے۔ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھجوا دوں گا۔ اُن کے منہ سے اس وقت یہ فقرہ سُن کر میں حیران رہ گیا۔ اس لیے کہ وہ کراچی نہیں جا رہے تھے۔ حیرانی اس لیے بھی ہوئی کہ میں نے اُن کی صحت اُس دن سے اچھی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس وقت مجھے منٹو صاحب پر بڑا غصہ آیا۔ حالانکہ غصہ مجھے اپنے اوپر آنا چاہیئے تھا۔ بہ فرضِ محال اگر اس وقت مجھے اپنے اوپر غصہ آجاتا تو کیا ہوتا۔ بالآخر تانگے پر پھر سوار ہوئے اور تانگے کا رُخ ہمارے دفتر کی طرف کرا دیا گیا۔ راستے میں پاکستان ٹائمز اور امروز کا دفتر آیا تو تانگہ رُکوا دیا گیا۔ اُوپر پہنچے، جس کسی نے سُنا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی ہے تو سب نے یہی کہا کہ منٹو صاحب وقتِ مقررہ پر حاضرِ عدالت نہ ہوں گے۔ منٹو صاحب ان ریمارکس پہ ہنستے رہے اور کہتے رہے "نہیں یار! کیوں نہ جاؤں گا۔" حالانکہ وہ اس سے پہلے مجھے کہہ چکے تھے کہ نہیں جاؤں گا۔"

بالآخر ایک بات میرے ذہن میں آئی اور میں نے منٹو صاحب سے کہا۔ "اگر میں کل صبح کے لیے دو سیٹیں بُک کرا دوں۔ تو کیا آپ اور نصیر انور کراچی چلے جائیں گے؟" منٹو صاحب نے میری اس پیشکش کو قدرے تکلّف کے ساتھ قبول کر لیا۔ بعد ازاں منٹو صاحب سے گذارش کی گئی کہ آپ گھر تشریف لے جائیں۔ میں سیٹیں بُک کرانے کا بندوبست کرتا ہوں۔

چنانچہ پاکستان ٹائمز کے دفتر سے اپنے دفتر تک پیدل آیا۔ اپنی سائیکل سنبھالی، سائیکل پر سوار ہوا تو بھائی کی بیماری اور اسکی دوا پھر یاد آگئی۔ سائیکل کے پہیئے کے ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی گھومنے لگا۔

سیٹیں بک کرانے میں بڑی دشواری ہوئی۔ ریزرویشن آفس سے معلوم ہوا کہ چار دن تک کوئی سیٹ خالی نہیں۔ اِدھر دِقت یہ تھی کہ منٹو صاحب کی دوسرے دن عدالت میں حاضری تھی۔ چنانچہ شوکت تھانوی صاحب کے پاس ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ انھوں نے پہلے تو خوب سخت سُست کہا۔ لیکن پھر یہ انتظام کرا دیا کہ اگر ہم لوگ کل صبح سات بجے سٹیشن پہ پہنچ جائیں تو سیٹوں کا انتظام ہو جائے گا۔

میں نے اس کی اطلاع منٹو صاحب کو دے دی اور ان کی بیگم اور ہمشیرہ سے بھی کہا کہ انھیں صبح تک تیار کر دیجئے گا۔ تاکہ میری ذمہ داری ختم ہو۔

رات کو جب گھر پہنچا تو گھر والوں نے شکایت کی کہ بھائی اتنا بیمار ہے اور تمھیں دوا تک پہنچانے کی فرصت نہیں۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ لیکن میں ان سے کیا کہتا کہ مجھ پر آج کیا بیتی ہے۔ رات بھر کبھی بھائی کی بیماری کا خیال آتا رہا۔ کبھی منٹو صاحب کی کرم فرمائیوں کا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ میں ایسے مواقع پر بجائے اختر شماری کے زخم شماری کرتا ہوں۔ چنانچہ رات بھر یہ مشغلہ جاری رہا۔ صبح ۵ بجے گھر سے چل نکلا۔ گھر والے میری شب بیداری سے ہی کافی پریشان تھے۔ جب علی الصبح گھر سے نکلا تو وہ اور پریشان ہو گئے۔ اس لیے کہ میں سردیوں میں رات کے گیارہ بجے سے پہلے سونے کا اور صبح ۹ بجے سے پہلے اُٹھنے کا عادی نہ تھا۔

اُن کے استفسار پر میں نے صرف اتنا کہا کہ میرا ایک دوست کراچی جا رہا ہے اسے اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ ابھی آجاؤں گا اور بھائی کی دوا بھی لاؤں گا۔ جب بھاٹی دروازے کے باہر پہنچا تو سوچا کہ تانگے میں بیٹھ کر منٹو صاحب کے ہاں پہنچوں۔ پھر خیال آیا میں بہت سویرے جا رہا ہوں، جلدی پہنچ گیا تو منٹو صاحب کو تکلیف ہو گی۔ اُدھر یہ بھی دھڑکا، اگر میں نے جلدی پہنچنے میں ذرا سی غفلت کی تو منٹو صاحب گھر سے بھاگ جائیں گے، پیدل ہی چل نکلا۔ اپنے بجائے ان کی تکلیف کا زیادہ خیال رہا۔

راستے میں کُتوں نے بھی بھونک بھونک کر استقبال کیا۔ سوچتے ہوں گے کہ اس شکل و صورت کا انسان آج اِدھر کیسے۔ ایک آدھ جگہ بھنگی نے بھی سڑک صاف کرتے ہوئے کہا "ہٹ جاؤ بابو جی۔" اُس وقت بڑا جی چاہا کہ ذرا اس کے پاس رُکوں۔ اس کی خیریت اور

اس کے بال بچوں کا احوال پوچھوں۔ پھر نہ جانے ہمت کیوں نہ ہوئی۔ اس کے باوجود جب منٹو صاحب کے مکان پر پہنچا ہوں تو کافی سویرا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی بیگم نے دروازہ کھولا، منٹو صاحب کو جگایا تو منٹو صاحب آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور السلام علیکم سے استقبال کیا۔ اس وقت ان کے گلے میں ایک بڑی سی گرم چادر لپٹی ہوئی تھی، جیسے مفلر لپیٹا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نصیر انور بھی آپہنچے۔ تانگہ منگوا لیا گیا، ان کی ہمشیرہ، بیگم اور بچیوں نے ہمیں وداع کیا اور خیریت سے واپسی کی دعا مانگی۔

اسٹیشن پر سیٹوں کا انتظام ہو چکا تھا۔ جب سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا تو منٹو صاحب نے شراب کی بوتلوں کو نکال کر ایسی جگہ رکھ دیا، جہاں ہر آنے جانے کی نظر پڑتی تھی۔ میں نے منٹو صاحب سے کہا ایسا نہ کیجئے۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی کاپی نکال کر دکھائی کہ میرے پاس شراب کا پرمٹ ہے۔ یہ بات اُن کے منہ ہی میں تھی کہ گاڑی چلی چھک چھک۔

دوسرے دن اخبار میں آیا کہ منٹو صاحب عدالت میں حاضر ہو گئے تو جان میں جان آئی۔

ایک وقت منٹو صاحب پر یہ بھی آیا کہ جب وہ ایک دم بیٹھے بٹھائے کہنے لگے "ارے بھئی سنو تنانن تناتن تنا توم تنا توم" (پتہ نہیں کیا الابلا) جو صاحب منٹو صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ وہ پریشان کہ ایک دم انھیں کیا ہو گیا۔ اِدھر سے استفسار ہو گا کیا سنیں۔ منٹو صاحب کہیں گے ریڈیو، ارے بھئی کہاں ہے؟ جواب ملے گا اِدھر آؤ اور میرے کانوں کے ساتھ اپنے کان لگا دو۔ آ رہی ہے نا آواز۔ واہ وا کیا گلا پایا ہے کمبخت نے پھر ہاتھ کے اشاروں سے سُر کے اتار چڑھاؤ کا ساتھ دیں گے۔ کبھی کبھی اُٹھ بیٹھیں گے، اور کبھی کھڑے کھڑے بیٹھ جائیں گے۔ ساتھ ہی تبصرہ بھی "ہائے ظالم نے مار ڈالا۔ یا "ظالمی" نے مار ڈالا۔ واہ وا، شاباش، ہائے ——" اگر اس وقت شرارت سے کسی نے کہہ دیا کہ منٹو صاحب جو کچھ آپ سن رہے ہیں وہ ہمیں سنائی نہیں دیتا۔ اس لیے ہمیں کاغذ پر لکھ کر بتاتے جائیے تو وہ کاغذ اور قلم سنبھالتے ہوئے یہ مشورہ بھی دیں گے کہ کانوں میں تیل ڈالا کرو اور سر کی مالش کرایا کرو۔ اور ساتھ ہی لکھنا شروع کر دیں گے۔ پہلے دو تین پنجابی گیت لکھیں گے، پھر کہیں گے "اب اُردو کے گانے سنیئے" وہ بھی تین چار لکھ ڈالیں گے —— یہ ریڈیو دو تین مہینے تک منٹو صاحب کے کانوں میں بجتا رہا۔ جسے صرف ان کی اکیلی جان سُنتی رہی اور لوگوں کو یہ لکھ کر یا خود سُنا کر سناتے رہے۔ پھر نہ جانے کیوں اُن کے کان کے ریڈیو کے والوز خراب ہو گئے اور ریڈیو بجنا بند ہو گیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کے قریب ان کے گھر گیا تو باہر سے دیکھا کہ منٹو صاحب گا رہے ہیں۔ کبھی ہاتھوں کو کانوں تک لے جا رہے ہیں۔ اور کبھی سُر کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو نچا رہے ہیں۔ میں باہر کھڑا کافی دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر تابکے۔ تنگ آ کر آواز دی۔ اُن کا نوکر باہر آیا تو میں نے کہا "ذرا منٹو صاحب کو بلا دیجئے۔" اُس نے جا کر منٹو صاحب سے کہا کہ کوئی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ منٹو صاحب نے جواب دیا ان سے جا کر کہہ دو، اس وقت منٹو صاحب نہیں آ سکتے، گانا گا رہے ہیں۔"

پھر خود ہی چلے آئے اور دروازہ کے قریب آ کر عینک کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا "کون ہے؟" اچھا آپ ہیں بھئی معاف کرنا، میں اس وقت گا رہا تھا۔ آؤ تم بھی گانا سنو۔" میں نے پوچھا "اور کون کون ہے؟" کہنے لگے "کوئی نہیں ہے۔ گھر کے کچھ لوگ ہیں۔ آؤ۔ آؤ۔ آؤ۔"

مقدموں کی بھرمار نے اب انھیں سنبھلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب ان سے افسانے نہیں سنبھلتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس عرصے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بحیثیت مجموعی ان کی ناکام تحریریں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانہ بعد میں لکھتا ہوں۔

مقدمہ پہلے چل جاتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ لکھنا لکھانا چھوڑ دوں اور پاکستان اور ہندوستان سے دور کہیں چلا جاؤں۔ وہاں بیٹھ کر خوب جی کھول کے افسانے لکھوں اشاعت کے لیے انھیں یہاں بھجوا دوں تاکہ سارے پبلشر اندر ہو جائیں۔ اپنی تو جان چھوٹے۔ میں سفید کو سفید کہنے پر مجبور ہوں۔ حکم ہوتا ہے کہ نہیں سفید کو سیاہ کہو، سیاہ کو سفید کہو۔ اگر سیاہ اور سفید دونوں نظر آ رہے ہوں تو کچھ نہ کہو چپ رہو۔ پگھلا ہوا سیسہ نگل لو یا خود کشی کر لو ——— پھر مجھے جو سزائیں ملتی ہیں وہ بھی انگریز بہادر کے زمانے کی۔ میں تو ایک ہی طرح کی سزائیں بھگت بھگت کے بور ہو چکا ہوں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ مملکت پاکستان میں مجھے اسلامی سزائیں ملتیں، تاکہ ورائٹی ہی کی وجہ سے دل کو ڈھارس رہتی۔ لیکن یہاں تو معاملہ وہی ہے کہ جو تھا۔ انگریز بڑی سیانی قوم ہے۔ وہ یہاں سے اپنا جسم بچا کر لے گئی ہے لیکن اپنی روح چھوڑ گئی ہے۔ بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ ایک ہسپ تُلا (یہ اُن کا خاص لفظ ہے) قسم کا افسانہ لکھوں جس میں سماج اور مملکت کے تمام ناسوروں کو ایک ساتھ چھیڑ دوں۔ خوب خوب نشتر زنی کروں۔ اس کے بعد بھر پور نمک پاشی کر دوں۔ انجام کار اپنے آپ کو گولی مار دوں اور یہ سمجھ لوں کہ مقصد ادا ہو گیا۔

منٹو صاحب پنجابی بولنے میں بڑی آسانی محسوس کرتے ہیں۔ جب انھیں شبہ ہو جائے کہ مخاطب تو اہلِ زبان ہے، تو ان سے استفسار کریں گے۔

"آپ پنجابی سمجھتے ہیں نا؟" ظاہر ہے کہ مخاطب نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلائے گا اور اُردو میں جواب دے گا کہ بول نہیں پاتا، سمجھ تو لیتا ہوں۔

اس پر منٹو صاحب کہیں گے "معاف کیجئے گا جب میں اُردو بولتا ہوں۔ تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرا منہ پک گیا ہے یا پک رہا ہے۔ اُردو بولتے ہوئے میرے جبڑے دُکھنے لگتے ہیں۔ تالو اور زبان کے نیچے جو جگہ ہے وہ مجھے چٹاپ چٹاپ کرتی معلوم ہوتی ہے۔ اسلیئے میرے بھائی معاف کرنا، میں پنجابی ہی میں بات کروں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے اُردو سے کوئی بَیر ہے۔ سوچتا ہوں کہ جب لکھتا اُردو میں ہوں تو پنجابی میں باتیں کروں۔ اگر آپ چاہیں تو میں اُردو میں بھی باتیں کر کے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال سکتا ہوں۔

منٹو صاحب عموماً گھر میں ملتے ہیں یا تانگے میں ہوتے ہیں۔ کسی تانگے کی پچھلی سیٹ پر دُور سے کوئی بیمار لیٹا ہوا نظر آئے۔ جو اُلٹے رُخ ٹیک لگا کے لیٹا ہو، تو فوراً کوئی رائے قائم نہ کر لیجئے گا۔ تانگے کے قریب آنے کا انتظار کر لیجئے گا۔ بہت ممکن ہے وہ منٹو صاحب ہوں۔ اگر ان کے دو ایک ہم بوتل و ہم گلاس ساتھ ہوں تو وہ اگلی سیٹ پر بیٹھیں گے اور اپنے اُن قدر دانوں سے کہتے جائیں گے کہ میں ایک بہت بڑا افسانہ لکھنا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ مقدمہ چل جائے گا۔ اگر مقدمہ نہ چلا تو مجھے دُکھ ہوگا۔ اس لیے کہ میرے ذہن میں خواہ مخواہ یہ آئے گا کہ اپنی حکومت تو فرائضِ منصبی سے بھی بیگانہ ہو گئی ——— یا مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ افسانہ بڑا ہی تھرڈ کلاس ہے ورنہ حکومت ضرور ایکشن لیتی۔

منٹو صاحب میں ذاتی طور پر بڑی خوبیاں ہیں۔ لیکن شراب نے اُن میں کئی کمزوریاں پیدا کر دی ہیں۔ پہلے مجھے اُن پر غصہ آتا تھا، اب ترس آتا ہے۔ میں تو اُن کے فن پر اُن کی تمام کمزوریوں کو نثار کر سکتا ہوں۔ کسی اور کا حال خدا جانے۔

(۲)

عمر کے آخری دنوں میں مرحوم یہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی ہی میں ان پر کوئی اچھا رسالہ نمبر چھاپ دے۔ اس سلسلے میں اردو

کے پاس بھی گئے ہوں گے، میرے پاس بھی آئے، اور جو میری اور ان کی اس بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ وہ مندرجہ ذیل ہے:

“یار منٹو نمبر نکالو۔”

“جی!”

“میں کہتا ہوں نقوش کا منٹو نمبر نکالو۔”

“آج یہ آپ کیسی باتیں ——”

“تمھارا خیال یہ ہے کہ میں نشے میں ہوں اور بکواس کر رہا ہوں۔”

“آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ چھپ جائے گا۔”

“میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا کہ پہلے مر کے دکھاؤں۔ پھر نمبر چھپے۔”

“مرنے کا نام نہ لیجئے۔ ابھی آپ کی بڑی ——”

“اب جی کر بھی کیا کروں گا۔ اب تو میں خود مرنے پر راضی ہو گیا ہوں۔”

“اچھا! یہ بتائیے، اس نمبر میں کیا کیا ہو گا؟”

“اب تک مجھے جتنی گالیاں ملی ہیں، وہ سب سے پہلے چھپیں گی اور جتنے بیوقوفوں نے میری تعریف کی ہے وہ سب سے آخر میں چھپے گی۔ بیچ میں میرے تین چار غیر مطبوعہ افسانے اور اسکیچ ہوں گے۔ بہرحال تمھیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نمبر تمھیں میں مرتب کر دوں گا۔”

“اگر آپ مرتب کر دیں گے تو میں کیا کروں گا؟”

“تم جھک مارنا۔”

“اس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجموعہ مرتب کر لیں اور اسے کتابی صورت میں چھاپ لیں۔”

“میں چاہتا ہوں، نقوش کا منٹو نمبر نکلے۔”

“تو پھر آپ کا اس نمبر کی ترتیب و تدوین سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ میں کسی کی رائے تک برداشت نہیں کر سکتا۔”

“تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ کیا تو مجھ سے زیادہ قابل ہے۔”

“قابلیت کو چھوڑئیے۔ یہ معاملہ ذمہ داری کا ہے۔”

“ذمہ داری کو چھوڑو۔ یہ معاملہ قابلیت کا ہے۔”

“اس معاملہ میں مجھے آپ کی قابلیت سے انکار ہے۔”

“اچھا تو تم پھر جیسی میری دُرگت بنانی چاہتے ہو میری زندگی ہی میں بنا ڈالو۔”

منٹو کے انتقال کو ادیبوں نے ایک ادبی حادثہ قرار دیا۔ یہ بات ہے بھی ٹھیک، اس لیے کہ اُس نے افسانوی ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اُسے کبھی فراموش نہ کیا جاسکے گا۔ نہ اب نہ جب۔

میں نے بھی دوسرے رسالوں کی طرح نقوش کا منٹو نمبر نکالا۔ جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے دیگر رسائل سے بہتر تسلیم

کیا گیا۔ اس میں مرحوم کی بیس نو غیر مطبوعہ کہانیاں تھیں دس نمائندہ افسانوں کا انتخاب بھی مرحوم کا اپنا تھا۔ فن پہ لکھنے والوں میں ممتاز شیریں، وقار عظیم، محمد حسن عسکری، عابد علی عابد، ابواللیث صدیقی، عبادت بریلوی اور ممتاز حسین تھے۔

شخصیت پہ لکھنے والوں میں عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، ابو سعید قریشی، حامد جلال، غلام عباس اور راقم الحروف تھے۔

منٹو نمبر پہ تبصرہ کرنا میرے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ لیکن ایک بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔

جب میں نے منٹو نمبر کے لیے مضامین فراہم کرنے شروع کیے تو قدرت اللہ شہاب کو بھی دعوت دی۔ جسے انھوں نے منظور کرتے ہوئے یہ لکھا کہ "مضمون جلد بھیجدوں گا اور وہ ایک خط کی صورت میں ہوگا جو منٹو آپ کو عالمِ بالا سے لکھیں گے۔" یہ خیال مجھے بہت پسند آیا۔ اس لیے کہ اس میں منٹو کی پوری شخصیت آسکتی تھی۔ اور وہ تمام مسائل بھی آسکتے تھے، جو منٹو سے متعلق ہو سکتے تھے۔

جب شہاب صاحب اپنی مصروفیات کی بنا پر وقت نہ نکال سکے، تو میں نے اسی انداز میں جو کچھ لکھا۔ اُسے یہاں پیش کرتا ہوں۔ جو "منٹو کا ایک خط" کے نام سے منٹو نمبر میں چھپ چکا ہے۔ اس خط میں میں نے کوشش کی تھی کہ منٹو کا اسلوب بھی آسکے۔ کامیابی خدا معلوم:

برادرم، السلام علیکم

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گذر چکے ہیں۔ لیکن میں تمھیں اپنی خیریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ماحول میرے لیے نیا تھا۔ بہرحال اُس ماحول سے یقیناً بہتر ہے۔ جس میں میں نے ۴۲ برس تک جھک ماری تھی ——— وہاں جب تک رہا سُولی پہ لٹکتا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں، نہ صفیہ نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نکہت، نزہت اور نصرت میں سے کسی نے، ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا۔ ابا فلاں چیز لا دو، فلاں چیز لا دو۔ تمھیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچیوں سے بے انتہا محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی فرمائش اپنی تنگدستی کی بنا پہ پُوری نہیں کر پاتا تھا۔ تو خون کے آنسو رویا کرتا تھا ——— حتیٰ کہ بعض منحوس سال ایسے بھی آئے تھے کہ بچی کی سالگرہ تھی اور جیب میں پھُوٹی کوڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں مَیں کب تک رہ سکتا تھا۔ قدرت تو مجھے ایسے انسان کُش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے خود ایسے وسائل اختیار کر لیے تھے کہ آپ کے جہنم زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب تک وہاں رہا۔ آپ لوگوں ہی کے غموں میں گھُلتا رہا۔ نہ صرف گھلتا رہا بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا۔

یہاں ہر وقت یہی دعا کیا کرتا ہوں کہ یہ زندگی میرے تمام ہمعصر افسانہ نگاروں کو جلد نصیب ہو۔ اس لیے کہ وہاں رہ کر میں نے جیسی ان کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی۔ وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی۔ جب مجھی کو وہاں سے آنا پڑا۔ تو نہ جانے وہ کیوں ٹِکے ہوئے ہیں۔

آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں، جو لاہور میں موجود ہیں۔ اُن سے زبانی کہہ دیں۔ جو لاہور سے باہر ہیں۔ انھیں بذریعہ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب بیوی بچوں سمیت میرے پاس آ جائیں۔ میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لیے ہیں۔ اس لیے کسی کو تکلیف نہ ہو گی۔

زمانے نے نہ میری قدر کی اور نہ دوسرے اہلِ قلم کی۔ تمھیں علم ہے اگر ہم لوگ ہی تمھارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علم، ادب اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے۔ مزے میں ہے۔ اکثر قلمکاروں سے ملاقات رہتی ہے۔ سب میری ہی طرح پھولے بیٹھے ہیں بعض نے تو تمھارے نمائش آباد کی شان میں ایسی ایسی ہجویات سپردِ قلم کی ہیں کہ جب تک کلیجہ کو دونوں ہاتھوں سے نہ تھام لیا جائے سنی ہی نہیں جا سکتیں۔ اگر وہ چھپ گئیں، تو تمھارے ہاں کے بعض سر پھرے سر بازار پیٹیں گے۔

بہرحال ہجویات کا وہ مجموعہ جب بھی شائع ہوا تمھیں اس کا ایک نسخہ ضرور بھیجوں گا۔ نقوش میں اُس پر تبصرہ کر دینا۔

تمھارے ہاں کے ادیب اور تمھارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی امیدیں وابستہ کئے بیٹھے ہیں۔ وہ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی امیدوں کے پیٹ میں تو صرف بہن خوش فہمی لمبی تانے سو رہی ہے۔

تمھارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے۔ تو کل جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا اور ساتھ ہی غدارِ وطن بھی، تو آناً فاناً وزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمھارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو یقین جاننا، میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمھیں علم ہے کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے صرف فحاشی کے جرم میں چلے تھے۔ حالانکہ میں نے کوئی فحش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں مجھ پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے گئے تھے۔ کبھی وارنٹ نکلے، کبھی گرفتار ہوا۔ کبھی دوستوں سے ادھار مانگ کر جرمانہ ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں رہ جاتا تو بہت ممکن تھا۔ مجھ پر قتل، ڈاکہ زنی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیئے جاتے۔ جہاں ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہو وہاں کون مسخرہ رہے۔

اگر حکومت کے عتاب سے بچ جائیں تو نقاد پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ساری عمر نقادوں سے دُور بھاگا ہوں۔

یہ بھی صحیح ہے کہ بعض نقاد بھی مجھ سے دُور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو بگڑے ہوئے افسانہ نویس اور بگڑے ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب تخلیق کی قوت سے محروم ہو جاتے ہیں تو تنقید میں علامہ بن جاتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا بَیر رہا ہے۔

اس لیے کہ جب یہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں تو اچھی بھلی چیز میں سو سو عیب نکال لیتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لیے مجھے ان بے تحاشا لکھے پڑھوں سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم تیز کر لیں اور میرے فن کی دوشیزگی کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب جبھی ترقی کرے گا کہ جو نقاد کہے، اُس کا اُلٹا کیا جائے۔ نقادوں کا منشا بھی یہی ہوتا ہے۔ لیکن اسے میرے سوا سمجھا کوئی نہیں ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے تاکہ میں اُس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے ان تین لفظوں کا صحیح استعمال کر لیا تو سمجھ لیجئے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں۔ اگر، مگر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے مالا مال نہ ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں نہ توازن پیدا ہو گا اور نہ واقعیت کیساتھ

خلوص، جب فن کار کے دل کے ساتھ نقاد کا بھی دل دھڑکے گا تو پھر جو کچھ لکھا جائے گا اُس پہ ایمان لانا پڑے گا۔[1]

یہاں شرابِ طہور عام ہے۔ پانی نہ پیجیے شرابِ طہور نوش کیجیے۔ تمہارے ہاں تو بڑی تھرڈ کلاس قسم کی شراب ملتی تھی اور اس جگہ پاش شراب کے لیے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لیے ذلیل تک ہوا۔ دوستوں میں میری عزت نہ رہی۔ جدھر جاتا تھا، احباب منہ موڑ لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ میرے منہ پہ جھوٹی قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ میری جیب میں دھیلہ تک نہیں ہے حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس جیب میں دھیلہ چھوڑ اتنے روپے ہیں کہ وہ مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں شراب کو خانہ خراب اس لیے کہتا ہوں کہ اس کی بنا پہ کئی بار خانہ میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

ایک بڑی خطرناک مگر راز کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ پٹو گے۔ یہاں جتنی لڑکیاں ہیں، وہ سب ہزاروں برس پرانی ہیں۔ لیکن ان کمبختوں کا جسم اور بانکپن تقدس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پہ تم سے بات کرنا قطعی حماقت ہے۔ اس لیے کہ تم اس مسئلے میں نرے چغد واقع ہوئے ہو۔ تمہاری چغدیت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پُروقار کشش اور سپردگی سی پائی جاتی ہے کہ تمہارے ہاں کی لڑکیاں ان کے سامنے بالکل بکواس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال آور لڑکے بھی ہیں کہ تمہارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے تو اُس کمبخت کے بے ہوش ہونے کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے۔ جانبر ہی نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بھی کہ میرے مقابلے ہی کا کون تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالبؔ نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا بھبتی باز ہے بد کہنے لگا۔ "تُو تو میرا چور ہے۔ میرے شعروں سے تُو نے اپنے افسانوں کے عنوان چُنے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ سُوجھے تو میرے شعروں کو دھر رگڑا اور محسن کشی ایسی کہ میرے بارے میں جو فلمی کہانی لکھی، اُس میں بجائے میری شکر گذاری کے اظہار کے میری کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ الٹی میری کمزوریاں گِنوا کے رکھ دیں کہ میں بڑا وہ تھا، رنڈی باز تھا، جوا کھیلتا تھا اور اس کی پاداش میں جیل تک ہو گئی تھی۔" وغیرہ وغیرہ۔

تمہیں علم ہے کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالبؔ ہی کو تو مانتا تھا۔ جب اُس نے بھی مجھ سے ایسی ایسی باتیں کیں تو میں نے دل میں کہا۔ لعنت ہو سعادت حسن منٹو تمہاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان، میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ پیتے ہیں اور پیتے ہی میں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری اَنا بیدار ہوتی ہے تو غالبؔ کہتا ہے "میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔" اور میں اُس سے کہتا ہوں "شعر کہنا کونسا کمال ہے مرزا صاحب، میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں ایک شعر کیا پوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے ـــ" بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اُسے بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

چچا سام کا دبدبہ تو تمہارے ہاں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مبارک ہو۔

---

[1] نقادوں کے بارے میں منٹو کے جو خیالات ہیں، مجھے اُن سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن مجھے ان کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترمیم کرنے کا حق بھی نہیں۔

بڑوں کی عزت ضرور کرنی چاہیئے۔ لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں کہ تم اپنی ننھی سی جان بھی خطرے میں ڈال دو۔ میں نے یہ خبر بد بھی سنی ہے کہ اب تو تمھارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں اور تم سب اُلوؤں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے اندھیرے کے منتظر ہو۔ اتنی تن آسانی اچھی نہیں ورنہ پچھتاؤ گے — حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودداری تک کو قفل لگا کے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں یہاں سے چچا سام کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اُن سے اپنی حدود میں رہنے کی درخواست ضرور کرتا۔ دعا کرو کہ وہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد آجائیں تاکہ تمھاری جان چھوٹے۔ میں ان سے نمٹ ہی لونگا۔ فراڈ کو فراڈ ہی پچھاڑ سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں تمھارے ہاں میرا بڑا سوگ منایا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا دل کباب ہو گیا۔ اس لیے کہ جب تک میں وہاں رہا۔ سب نے مل جل کر مجھے اپنے ہاں سے دور کرنا چاہا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی اور کچھ اپنی مرضی سے آگیا ہوں تو ریڈیو پر اس ناچیز کی گمشدگی کے اعلانات کیوں کئے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریڈیو والے ہیں جو مجھے اپنے ہاں گھسنے تک نہیں دیتے تھے۔ رسالے اور اخبار والے بھی میرے روپوش ہونے پر خصوصی ماتم کر رہے ہیں۔ ان کا بھی میرے ساتھ یوسف کے بھائیوں ایسا سلوک تھا — ان حالات میں تم سب کو اپنے اِس منافقانہ رویہ پر شرم آنی چاہیئے۔

یہاں میرے کچھ قدر دان پیدا ہو گئے ہیں اور پچھلے دنوں انھوں نے میرے ذمہ یہ کام کیا تھا کہ میں یہاں کے بارے میں اپنی سہ ماہی رپورٹ پیش کروں، یہ فریضہ میرے سپرد اس لیے ہوا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے بھی اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ بڑی ہپ ٹُلّہ رپورٹ ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈٹ کر مخالفت بھی کی ہے۔ اور اس کا جو معاشقہ اندر ہی اندر چل رہا تھا، اُس کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو داڑھی نہ منڈوانے کا دستور ہے، وہ بعض نستعلیق قسم کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔ اس لیے اس کی اجازت ہونی چاہیئے کہ جس کا دل چاہے داڑھی رکھے جس کا دل چاہے نہ رکھے۔

اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا، خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ تمھارے ہاں ایسی کوئی کھری بات ذرا سے وزیر اعظم کے سامنے کہہ دیتا تو میری زبان گُدّی سے نکلوا دی جاتی۔

اطلاعاً عرض ہے۔ یہاں میری کتاب "گنجے فرشتے" کافی پسند کی گئی ہے — ہو سکے تو میری بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء

منٹو کا فن

وقار عظیم

منٹو کو اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دوربین و دور رس نگاہ، اس کی جرأت آمیز اور بے باکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر اس کی تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزے دار فقرہ بازیوں کی وجہ سے سراہا گیا ہے اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے مطعون کیا گیا ہے اور اس داد و تحسین اور ہجو و تضحیک میں لوگوں کا جو رویہ رہا ہے اس میں حق پسندی اور توازن بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ افراط و تفریط کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس سارے کھیل میں جو برسوں سے منٹو کی زندگی اور اس کے افسانوں کے محور پر کھیلا جا رہا ہے منٹو ایک مثالی ہیرو بھی نظر آتا ہے اور مثالی ولین بھی۔ کچھ نظریں اس بات کی عادی ہو گئی ہیں کہ اسے بس حسن کا مجسمہ سمجھ کر دیکھیں اور کچھ نگاہوں کو اس میں برائیوں کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جذباتی شدت پسندی نے اصل حقیقت تک پہنچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔ دنیا کی ہر دوسری چیز کی طرح منٹو نہ "محض" اچھا ہے اور نہ "محض" برا۔ اس کے افسانے نہ خالصتاً حسن و جمال کے مظاہر ہیں اور نہ محض برائیوں کے حامل۔ اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دور رس اور دوربیں نظر، اس کی جرأت آمیز حق گوئی، اس کی تلخ مصلحانہ طنز اور اس کی شگفتہ فقرہ بازی کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں ــــــ کبھی بہت اچھے اور کبھی بہت برے۔

ان اچھے، برے اور کبھی کبھی بہت اچھے اور بہت برے پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلے انسان کی نظر ان بے شمار موضوعات پر پڑتی ہے جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے ــــــ کلرک، مزدور، طوائف، رندِ خرابات اور زاہد پاکباز، کشمیر، بمبئی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل، چائے خانے، بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی الجھنیں اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جنس اور اس کے گوناگوں مظاہر منٹو کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو زیادہ عزیز ہیں بعض کوچوں میں پہنچ کر اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی۔ بعض افراد کا ذکر وہ جس ادائے خاص سے کرتا ہے وہ ادا ہر موقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور بعض رموز آشکارا کرنے میں اسے جو مزا آتا ہے وہ دوسری باتیں کہتے اور کرتے وقت شاید محسوس نہیں ہوتا لیکن ذکر کسی کوچے کا ہو، کسی شخص کا ہو اور کسی بات کا ہو یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ منٹو اس کوچے کے سارے پیچ و خم، اس شخص کے دل کے سارے بھید اور اس بات کی ساری نزاکتوں اور لطافتوں سے واقف نہیں ــــــ جہاں تک ان گوناگوں موضوعات

کا تعلق ہے ان کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر منٹو نے بہت سوں کی دل آزاری کی ہے، بہت سوں کی بُرائی مول لی ہے اور بہت سوں کی گالیاں سُنی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے پڑھنے والوں نے انھی گالیوں کو معیار بنا کر منٹو کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر دبی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کو پہچاننے کے لیے اس کے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے اس لیے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے جن کا منٹو نے پوری فنی ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے اور اس نقطۂ نظر کی بھی اہمیت ہے جو ان موضوعات کے انتخاب کا ذمہ دار ہے، لیکن حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا، جس چیز نے اسے وہ بڑائی دی جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمسر نہیں وہ اس کا فن ہے اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر کچھ لکھا جائے اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں فن کا ذکر ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ منٹو نے جو بے شمار باتیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں ان کے اظہار کا اسلوب کیا ہے اور اس اسلوب کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا فن کیا ہے اور منٹو کے اسلوبِ فن کی کیا حدیں ہیں شاید اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطۂ نظر سے الگ ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فن کا مفہوم کیا ہوتا ہے —— اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو منطقی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے تکنیک کے وہ مبادیات اور مطالبات ہیں جو ادب کی ایک صنف اور دوسری صنف میں مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔ داستان، ناول، ڈراما اور افسانہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گو، ناول نگار، ڈرامیٹسٹ اور افسانہ نگار داستان، ناول، ڈراما یا افسانہ لکھتے وقت ان اصول و قواعد کی پابندی کو اپنا فرضِ اولین جانتا ہے۔ ایک خاص صنفِ ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے اس کے خلوص اور صداقت کا تقاضا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب کے ان امتیازی اصول و قوانین سے پوری طرح واقف ہو کر انھیں پوری طرح برتے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنف کی تکنیک اس کی روایات یا اس کا فن ہے۔ جاننا، سمجھنا اور ان کا صدقِ دل سے احترام کرنا اس رشتہ کا پہلا مطالبہ ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا اس لیے کسی فن کار کے فن کا جائزہ لینے کی پہلی منزل ہی یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کار نے فن کے ابتدائی مطالبات کو، ان اصول و قوانین کو، اس کی روایت کو کس حد تک جانا، سمجھا، محترم جانا اور اپنے فن میں برتا ہے۔

فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کار نے فن کی روایات کی پابندی کرنے کا حق ادا کر کے اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے کے کیا کیا وسیلے استعمال کیے ہیں۔ ان مختلف وسائل کے استعمال میں فن کار کے تخیل، فکر اور ذہنی کاوش اور انہماک و توجہ کو خاصا دخل ہوتا ہے اس لیے جو فن کار اپنے فن کو جس حد تک زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے اسی حد تک اس کی توجہ، انہماک اور ذہنی کاوشوں کی بدولت اظہار و ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے اس کے ہاتھ آتے ہیں۔ اظہار اور ابلاغ کی یہی منزل ہے جہاں مصنف کا تخیل اور فکر جو حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزاء اور عناصر ہیں اظہار و ابلاغ کے وسائل میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے یہی رنگ مصنف کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا مظہر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جزو سمجھا جاتا ہے جس میں فنی روایات

اور اظہار و ابلاغ کے دوسرے وسائل شامل ہیں۔

فنی جائزہ لیتے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فن کار کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگاتے وقت چند اور باتیں بھی ایسی ہیں جو پیشِ نظر نہ رکھی جائیں تو یہ فنی جائزہ ادھورا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انہماک، توجہ اور کاوش سے اظہار کے وسائل میں جو نئے نئے پہلو پیدا کرتا ہے اور اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے جو رنگ بھرتا ہے ان پہلوؤں کا تیکھا پن اور اس رنگ کی شوخی ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ فن کار کے اعصاب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس انہماک اور کاوش کے اہل نہیں رہتے جس سے اظہار کے وسائل کو نیا پن اور بلندی ملتی ہے اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار کا غلبہ ہوتا ہے تو فن کا رنگ بھی پھیکا ہونے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لینے والا نظر انداز نہیں کر سکتا اس لیے کہ ان حقائق کو پیشِ نظر رکھے بغیر فن کار کے فن کے ارتقا کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی یہ بات ہے کہ گو شخصیت کے عناصر کے انتشار کے ساتھ ساتھ فن میں انحطاط پیدا ہونا لازمی ہے لیکن فن کار کو فن کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر اظہار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انہماک اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوبِ اظہار میں ان عناصر کو باقی اور قائم رکھتی ہے جو اس کے فن کی امتیازی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ہمیشہ ظاہر ہونے کے بجائے صرف کبھی کبھی اُبھرتے اور اندھیرے میں چمک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔

منٹو کے افسانوی فن میں فن کے یہ سارے مدارج بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کے فن نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سراغ نہیں ملتا۔

افسانہ، ناول، ڈراما، داستان، کہانی —— ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقعہ، اس نقشے سے تعلق رکھنے والے کردار، واقعہ کی ابتدا اور اس کے خاتمہ تک اس کے مختلف مدارج، مصنف کا ایک مخصوص اندازِ فکر و نظر، یہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو چوپال میں بیٹھنے والے بڑی سادگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں، اس کہانی میں بھی جو بڑی بوڑھیاں رات کی خاموشی میں بچوں کو سناتی ہیں۔ اس افسانے، ناول اور ڈرامہ میں بھی جو فن کے پورے احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن ان کے مشترک پہلوؤں سے قطعِ نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک نہ ایک امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے جو اسے دوسری صنف سے منفرد کرتی ہے۔ داستان میں تخیل اور تصور کی رنگینی، ڈرامے میں کوئی نہ کوئی کشمکش، ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرائی اور افسانہ میں موضوع کی اکائی یہ امتیازی اور انفرادی خصوصیات ہیں۔ افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مصوری ہوتی ہے —— ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو ‘ایک’ ہو۔ عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیادی خصوصیت کی طرف سے غفلت برت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ گہرا تاثر قائم نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانہ کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔ اردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند نے اکثر افسانہ کی امتیازی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھا ہے لیکن کبھی کبھی جذبات کی رَو میں بہہ کر ان سے بھی اس معاملہ میں کوتاہی ہوتی ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے منٹو نے اپنی پوری فنی زندگی میں

کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ انھیں اپنے افسانہ میں کوئی ایک بات کہنی ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرنا ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کے سامنے بے شمار چیزیں آتی ہیں —— یعنی منٹو کا ہمہ گیر مشاہدہ جس ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے اس کے باریک سے باریک پہلو کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے افسانہ کا پس منظر بناتا ہے۔ واقعہ اور کردار کے ذکر میں منٹو بہت کم اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واقعہ اور کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کیے بغیر اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کریں لیکن ایک مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور اس کی ہر فروعی اور جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس ماحول یا کردار کی مصوری کو اپنی افسانہ نگاری کا مقصد نہیں بناتے۔ یہ سارا علم عموماً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے پس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے لیکن حقیقت میں اس پس منظر کے پیچھے کوئی ایک تاثر یعنی ذہنی کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصود ہے۔ مثلاً ان کے افسانے "نیا قانون"، "خوشیا"، "نعرہ" اور "نیا سال" پڑھ کر پڑھنے والا افسانہ نگار کے مشاہدے، اس کے تخیل، فکر اور تجربۂ حیات کی بدولت بے شمار چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے لیکن ان سب بے شمار چیزوں کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بٹھاتا ہے افسانہ پڑھتے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی ان گنت تصویریں اس کی نظر کے سامنے آتی اور رخصت ہوتی رہتی ہیں اور ان سے حسبِ موقع پڑھنے والا لطف و حظ محسوس کرتا رہتا ہے لیکن افسانہ ختم کر چکنے کے بعد افسانہ نگار کے مصوّرانہ قلم کے بنائے ہوئے یہ بے شمار نقش رخصت ہو جاتے ہیں اور خود رخصت ہوتے وقت صرف ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں —— یہ چیز نیا قانون، خوشیا، نعرہ اور نیا سال کے مرکزی کردار کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعاتی اور نفسیاتی رنگا رنگی کے باوجود مجموعی حیثیت سے صرف اس گہرے تاثر اور اس جذباتی کیفیت کے ترجمان ہیں جس میں ایک خاص فرد مبتلا ہے۔ "منتر" اور "دمبرا" اور اس کا "انتقام" اپنی دلچسپ اور رومانی تفصیلات کی بنا پر شروع سے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ان افسانوں میں جو کردار پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزاج اور اس مزاج کی منفرد خصوصیات کا عکس ہے لیکن افسانہ پڑھ چکنے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے نمایاں اثر قبول کرتا ہے وہ صرف ایک واقعہ ہے —— ایک صورت میں واقعہ کی ہلکی پھلکی ہنسا دینے والی کیفیت اور دوسری صورت میں رومان اور مزاح کا ایک ملا جلا تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اپنا نقش چھوڑ کر جاتا ہے۔ اسی طرح "ہتک" ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا میں رہنے بسنے والے گوناگوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر "ہتک" کی ہیروئن "سوگندی" کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔ وہ ساری فضا جو افسانہ نگار نے مشاہدہ، تخیل اور فکر کی پوری قوتوں سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جن کی مدد سے اس فضا کا خصوصی رنگ واضح ہوتا ہے مل جل کر سوگندی کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح افسانہ میں بہت کچھ ہونے کے باوجود "سوگندی" ہی سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر ہم سوگندی کے علاوہ باقی سب چیزوں کو، باقی کرداروں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ گرد و پیش کی ہر چیز پر غالب آ کر اس طرح چھا جاتی ہے کہ ہمارے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ صرف سوگندی کو یاد رکھیں اور اس طرح یاد رکھیں جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے پہچانتے ہیں۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر راز ہمارا راز ہے۔

منٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گذری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور بعض تنزل کی۔ لیکن

ان میں سے ہر منزل میں منٹو نے اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعہ صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں اتارنی اور جاگزیں کرنی ہے۔ افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہیے لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اسے مختلف فنی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ فنی وسیلے اگر پوری ذمہ داری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور امتیازی خصوصیت ہے۔

افسانہ نگار یہ سوچ کر اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعہ قاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش قائم کرنا ہے، اپنے افسانہ کا ایک ڈھانچہ بناتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح شروع ہوگا، کس طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا اور کس طرح ختم ہوگا۔ اچھی کہانی کی خصوصیت جہاں ایک طرف یہ ہے کہ وہ ختم ہو چکے تو پڑھنے والے کے ذہن کو تاثرات کے انتشار میں مبتلا نہ کر دے، دوسری اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس مجموعی تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔ فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا مشکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطۂ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی الفاظ یا جملے ہیں جنھیں ہم افسانے کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم، بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطۂ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتدا اگر پوری طرح قدم جما کر ہمواری اور استواری کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لیے خود بخود آسان ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلیں گے۔

یہ ہم سفر وہ قاری ہیں جو افسانہ کی موزوں تمہید سے متاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار کبھی اپنے افسانے کی تمہید کی طرف سے غفلت نہیں برتتے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ منٹو نے ایک دیانت دار اور مخلص فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی جیت اسی میں جانی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھا جائے۔ منٹو نے اچھے اور برے جتنے افسانے بھی لکھے ہیں ان کے موضوع اور خیال سے پڑھنے والا خواہ متفق ہو یا نہ ہو لیکن افسانہ کی تمہید میں اسے ضرور ایک دلکشی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور سا پاتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں کی تمہید سے مختلف موقعوں پر مختلف کام لیے ہیں لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا ہو قاری کے ذہن پر ابتدا ہی سے ایک گہرا نقش بٹھانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔ منٹو کے چند افسانوں کی تمہیدیں دیکھ کر اندازہ لگائیے کہ تمہید کو پڑھنے والے کے لیے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے اسے کن فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

”نیا قانون“ اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

> ”منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر

> کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔"

اسی طرح "بلاؤز" کی تمہید یہ ہے:۔

> "کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا پھوڑا سا بن گیا تھا کام کرتے وقت، باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔"

ان دونوں تمہیدوں کے ذریعہ قاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی اور اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر اکساتی اور مجبور کرتی ہے۔

دو تمہیدیں اور دیکھئے:۔

> "گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے، لڑکیوں، بچے، بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لیے بلبلا رہے ہیں تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھولکی لیے بے سری تانیں اڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی، بس گائے جا رہی ہیں۔ نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل تک مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو، ایک مکان میں دو بیاہ رچے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دلہنیں بیاہ کر لائے تھے۔"

> "میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہوئی۔ شام کا وقت تھا سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے بنچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا بنچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا، دوسرے بنچ پر بیٹھا تھا اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دور، بہت دور، جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑا گہرے رنگ کا قالین ہے جسے اُدھر سے اِدھر سمیٹا جا رہا ہے۔"

پہلی تمہید "شوشو" کی ہے اور دوسری "بانجھ" کی۔ دونوں تمہیدوں میں افسانہ نگار نے آنے والے واقعات کے لیے ایک فضا تیار کی ہے اور اس فضا میں دونوں موقعوں پر اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں ڈوبتا اور جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افسانوں کو آگے پڑھتا ہے۔

"پھاہا" کی تمہید صرف ایک جملہ ہے لیکن اس جملے سے افسانہ نگار نے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا ہے:۔

> "گوپال کی ران پر جب یہ بڑا پھوڑا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔"

گوپال کے متعلق افسانہ نگار نے اچانک جو خبر سُنائی ہے اس سے قاری کے اوسان بھی تھوڑے بہت ضرور خطا ہو جاتے ہیں اور وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا ——— یہی افسانہ نگار کی جیت ہے۔ اس نے ایک معمولی سی خبر سُنا کر قاری کو اپنے ساتھ یا اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور افسانے کی تمہید دیکھئے:۔

> "ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی وسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو ہوٹل اور وسکی کے پیدا کردہ تکدر کو دور کر سکے۔"

یہ تمہید "پہچان" کی ہے۔ اس میں نہ کسی کردار کا تعارف ہے، نہ کوئی فضا یا ماحول بنانے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ کوئی چونکا دینے والی خبر سُنائی گئی ہے بلکہ بڑے واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ کے اشارے سے قاری کو گویا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ آؤ، اگر تم بھی ان شرابیوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آجاؤ ——— اور معصوم قاری فوراً یہ دعوت قبول کر لیتا ہے۔

اور سُنئے:۔

> "اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔"

یہ "نعرہ" کی تمہید ہے اور اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کیشو لال کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر قاری شاید یہی کہے گا کہ افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لیے کہ کیشو لال کے اس شدید احساس کے پیچھے کیا واقعہ کام کر رہا ہے، اس کے دل میں یہ جاننے کی خلش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں سمجھئے کہ افسانہ نگار کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔

> "دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چُور گھر کو واپس گیا تھا ——— وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا، مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔"

یہ تمہید "ہتک" کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے بجائے کئی باتیں کہی ہیں۔ ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں، اس لیے کہ افسانہ میں آگے چل کر جو گھمسان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ بات سیدھے سادے انداز میں کہنے کے بجائے ذرا تیکھے تیور کے ساتھ کہے۔ قاری افسانہ نگار کے ان تیکھے تیوروں کو پہچان جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ دیکھیں یہ تھک ہار کر سو جانے والی اور اپنی بیوی کا محبوب داروغہ صفائی آگے چل کر کیا گل کھلاتے ہیں، افسانہ کے منجدھار میں کود پڑتا ہے۔

منٹو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا ہے

انھی تیروں میں سے ایک تیر اس کے افسانہ کی تمہید ہے جو ہر افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے کردار کو متعارف کرنے کا، ایک خاص فضا یا ماحول بنانے کا، ایک پھڑکتی ہوئی خبر سنانے کا، کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی مصوری کرنے کا، آنے والے واقعات کے لیے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی بہ یک وقت کئی ملے جلے مقصد پورے کرنے کا، لیکن ان گوناگوں کاموں کے علاوہ جو کام منٹو کے افسانہ کی ہر تمہید نے اپنے ذمے لیا ہے یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو بیدار کر کے، اس کے دل میں گدگدی پیدا کر کے یا اس کے ذہن میں آگے پڑھنے کی خواہش پیدا کر کے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔ منٹو کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل طے کرنے کے لیے اس نے عموماً پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تمہید افسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی آخری منزل۔ افسانہ نگار اپنی تمہید کے ذریعہ پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر تسلط جماتا اور اسے افسانہ کے آنے والے حصوں میں دلچسپی لینے کی طرف مائل کرتا ہے۔ آنے والے حصے سفر کی مختلف منزلیں ہیں جن میں طرح طرح کی صعوبتیں مسافر کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے کانٹے ہیں جو اس کے تلووں میں چبھنے کے لیے بے قرار نظر آتے ہیں۔ افسانہ پڑھنے والا ان صعوبتوں کو آسان بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کانٹوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے افسانہ نگار کی رہنمائی اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بالآخر افسانہ نگار کی رہنمائی اسے منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے، جسے ہم افسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی ساری کٹھن منزلیں طے کرنے اور چبھنے والے کانٹوں کی خلش کو گوارا اور آسان بنا لینے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لیے سکون و راحت کا سرمایہ بہم پہنچا سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لیے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو فنی حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہو اور پڑھنے والے کے لیے قابلِ قبول بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ افسانہ کے خاتمہ پر افسانہ نگار کی ذرا سی سستی، ذرا سی تن آسانی، ذرا سی سہل انگاری اور بالکل معمولی سی غفلت اور لغزش اس کے افسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے کوفت اور خلش کا باعث بھی بن سکتی ہے ——— منٹو نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کر کے عموماً اپنا فنی منصب پورا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس نے اس "انجام" سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے اور افسانہ کو افسانہ کی حیثیت سے مکمل کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ منٹو کے بعض افسانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فن کی خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

ان کا افسانہ "نیا قانون" اس طرح ختم ہوتا ہے:۔

> "استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے ——— راستے میں اور تھانے کے اندر وہ نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔
>
> "نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو ——— قانون وہی ہے پرانا۔"
>
> اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا ———"

"پھاہا" کا انجام یہ ہے:۔

> "نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام

لے رہی تھیں۔ پھاہا کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کُرتے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا اُبھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نلکی پر صابن کا چھوٹا سا نامکمل بُلبلا اٹکا ہوا ہے۔

نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اس ننھے سے اُبھار پر جما دیا۔

"شہ نشین" کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔

"وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا: "مجھے زندہ رہنا ہوگا۔"

اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اس ٹھٹکی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔"

"ہنک" کی ہیروئن "سوگندی" ہم سے اس طرح رخصت ہوتی ہے:۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

"...... اس کے حلق سے ایک نعرہ ...... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا ——— ہٹ تیری ......!

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اونگھ رہے تھے ڈر گئے اور پھڑپھڑانے لگے۔ نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کیے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی عمارت اڑا اڑا دھم نیچے گر گئی ہے اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی، کہا: "بگلا ہے۔"

(نعرہ)

"...... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً ہی سب معاملہ صاف ہو گیا ——— سیواجی میری غیر حاضری میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپا مار گئے تھے۔"

(میرا اور اس کا انتقام)

”اس واقعہ کو ایک زمانہ گذر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں ——— یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں پر اٹکا رہے گا۔“

(نامکمل تحریر)

”جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا ”ڈاکٹر صاحب! اس کی مٹھی میں کچھ ہے۔“ میں نے اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کلپ تھے۔ اس کی بیگو کی یادگار!

”ان کو نکالنا نہیں۔ یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔“ میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔“

(بیگو)

”وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا ——— سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا ”اے خدا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے ......“

(سجدہ)

منٹو کی مختلف کہانیوں کے یہ سب خاتمے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے والے کو اپنے ذہنی انتشار کے مجتمع کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کہانی کے انجام میں اپنے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر لیتا ہے جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا اور بڑھتا رہا تھا، دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی آخری کڑی بنا کر جو کہانی کی تمہید سے شروع ہو کر برابر زیادہ منظم بنتا رہا تھا، افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔ منٹو نے جذبات، نفسیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انھیں مضبوط بنانے میں ہمیشہ اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

”نیا قانون“ کے خاتمہ میں استاد منگو خاں کی اس جذباتی شدت کا ایسا متضاد ردِ عمل ہے جس سے پڑھنے والے کے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ ”پھاہا“ کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کا بڑا سیدھا سادا اور ایک ایسا غیر متوقع امتزاج ہے جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔ ”شہ نشین پر“ کا انجام جذباتی کھنچاؤ، کشمکش اور اس کے بڑے سادہ لیکن فن کارانہ حل کی تصویر ہے ”ہتک“ کے انجام میں افسانے کے وسیع پس منظر، ایک خاص کردار کے شدید ردِ عمل اور زندگی کے

ایک بڑے دُکھتے ہوئے ناسور کو بظاہر ایک معمولی سے واقعہ کے ذکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاثر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سوگندی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم نوا ہو کر ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سوگندی کے نزدیک قابلِ نفرین ہے۔ "نعرہ" کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کیشو لال کی جذباتی شدت اور اعصابی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جملے پر ختم کیا ہے اس کی سادگی فضا کی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے زندگی کی ٹریجڈی کو تلخ تر بنا دیتی ہے۔ جذباتی شدت اور فضا کی تلخی کو اس طرح کی سادگی سے نمایاں کرنا منٹو کے افسانوں کے خاتموں کی ایک واضح خصوصیت ہے۔ "بیگو" کا انجام منٹو کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منٹو اپنے افسانہ کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل غیر اہم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سارے واقعات میں گذار دیتے ہیں جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ یہ معمولی سی غیر اہم بات گذرے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھر دیتی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔ "میرا اور اس کا انتقام" میں آخری جملے میں چھپی ہوئی ہلکی سی ایمائیت کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کہانی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا اور کہا ہے اس سے مختلف پڑھنے والے جو مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اس سیدھے سادے جملے سے ان میں مکمل ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صرف ایک واضح اور صحیح نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ "نامکمل تحریر" میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے رومانی واقعہ کو ایک ناقابلِ فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔ "سجدہ" کا انجام منٹو کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چوٹ سی لگتی ہے، اپنے فن کے لیے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

منٹو کی مختلف کہانیوں کے ان خاتموں پر نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات محسوس کرتا ہے کہ فن کے نقطۂ نظر سے سب خاتمے افسانے کے مجموعی تاثر کو مکمل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لیے اس مسرت کا باعث بنتے ہیں جو ہر اچھی فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ان سب خاتموں میں لکھنے والے کی قدرتِ بیان اور اس کے اندازِ فکر کی ندرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے کبھی محض سادگیٔ بیان سے، کبھی تضاد سے، کبھی تکرار سے، کبھی مزاح کی شوخی سے، کبھی طنز سے اور کبھی مشاہدہ، فکر اور تخیل کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد لیتا ہے اور پڑھنے والا اگر غور سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ افسانہ کے خاتمہ کا یہ انداز پوری طرح سوچا سمجھا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے خاتمہ کے وہ چند جملے جن میں ہر جگہ اس کی ذہانت، فطانت اور شوخی نمایاں ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں، افسانہ اتار چڑھاؤ کے مختلف مرحلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے —— بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ تھکن کا شائبہ کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ افسانہ کے انجام میں وہی تازگی و توانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی اور یہ نتیجہ ہے افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل پر اس کی ہم عناں و ہم سفر ہے۔

افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام —— ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کی طرف سے بھی غفلت یا بے نیازی برتنے تو افسانہ کے مجموعی تاثر میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ منٹو کو

فن کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اس لیے ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک ایسی منطق ہوتی ہے جس کا پڑھنے والے کو احساس تو نہیں ہوتا لیکن اس سے وہ متاثر اور مسرور ضرور ہوتا ہے۔ افسانہ شروع ہو کر بڑی دھیمی لیکن نپی تلی چال سے، بڑے نرم لیکن بڑے توانا قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس دھیمی اور نپی تلی رفتار سے افسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے اور افسانہ کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا قاری سفر کے اختتام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے کہ اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔ یہ احساس ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے ——— ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی اتفاقاً ہاتھ نہیں آ جاتی۔ اس میں لکھنے والے کو پورے سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی کڑی کو بڑی احتیاط سے اس جگہ جوڑنا پڑتا ہے جو اس کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ کوئی کڑی اگر ذرا بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری زنجیر درہم برہم ہو جائے۔ اس کے ابتدائی سرے اور آخری سرے میں جو ہموار ربط ہے اس میں جھٹکے پڑ جائیں اور پڑھنے والے کے لیے اس ربط میں ایک خوشگوار جھنکار کا جو تصور پوشیدہ ہے وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ ہمارے کم افسانہ نگاروں نے کڑیوں کے ربط کی اس جھنکار کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جنھوں نے دی ہے انھوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا۔ منٹو کے فن کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت کبھی نہ بھلاتے ہوئے ہمیشہ ہر افسانے کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیانی حصوں کی ساخت، ترتیب، رفتار اور اتار چڑھاؤ کو پوری فنی ذمہ داری کے ساتھ برتا ہے۔ منٹو کے نزدیک فن کے ان مراحل کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ منٹو کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر کیجیے۔

'نیا قانون' کے استاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے والے جدید آئین کی خبر سُن کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانون نافذ ہو جانے کے بعد بھی اسے ایک گورے سے لڑنے کے جرم میں حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس آغاز اور انجام کے درمیانی حصوں کو اس طرح پُر کرنا کہ افسانے کا انجام پڑھنے والے کے لیے حد درجہ کرب انگیز بن جائے، منٹو کے فنی احساس کی پیدا کی ہوئی ترتیب و تنظیم کا مظہر ہے۔ نیا قانون نافذ ہونے کی خبر سُن کر منگو خاں کو جو خوشی ہوئی تھی اس کے لیے نئے قانون کے نافذ ہونے کی تاریخ تک منٹو نے کئی ایسے موقعے پیدا کیے جن پر منگو خاں کی حالت دیکھ کر قاری برابر یہ اندازہ لگاتا رہتا ہے کہ اس کی مسرت آہستہ آہستہ وارفتگی اور دیوانگی کا درجہ اختیار کر رہی ہے اور بالآخر جب وہ روزِ سعید آ پہنچتا ہے تو اس کی مسرت، وارفتگی اور دیوانگی شوقِ آزادی کو مجسّم دیکھنے کے لیے بیتاب نظر آنے لگتی ہے اور عین اس وقت جب اس وارفتگیٔ شوق کو ذرا بھر اپنی تکمیل کا موقع مل جاتا ہے اسے حوالات میں داخل ہونا پڑتا ہے ——— اور اس طرح منگو خاں نے جذبات و احساسات کے جو متعدد نازک مرحلے طے کیے تھے ان کا یہ غیر متوقع انجام دیکھ کر وہ تو غرقِ استعجاب ہو جاتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک ایسی ٹریجڈی کا نقش مرتسم ہو جاتا ہے جو اپنی انتہائی سادگی کے باوجود حد درجہ تڑپا دینے والی ہے۔

'نیا قانون'، منٹو کی بڑی مشہور اور بڑی اہم کہانی ہے اس لیے اس میں آغاز اور انجام کے درمیان واقعات کا یہ فنی

اتار چڑھاؤ، یہ نازک اونچ نیچ اور ایک شدید قسم کا نقطۂ عروج شاید بعض لوگوں کو یہ سوچنے کی طرف مائل کرے کہ منٹو اس طرح کے مرحلے صرف ایسے افسانوں میں طے کرتا ہے جو موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ بات نہیں۔ منٹو فن کے نقطۂ نظر سے اپنے ایک افسانے اور دوسرے افسانے میں امتیاز برتنے کا قائل نہیں۔ فن کے جو مراحل اہم اور ضروری ہیں وہ اس کی ہر کہانی میں یکساں توجہ اور انہماک کے ساتھ پورے ہونے چاہئیں۔ اس اندازے کے لیے منٹو کی چند اور کہانیوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالیے۔

'منتر' اور 'میرا اور اس کا انتقام' موضوع کے اعتبار سے دو بالکل سیدھی سادی اور غیر اہم سی کہانیاں ہیں جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ پڑھنے والا انھیں پڑھ کر یہ محسوس کرے کہ اس نے ایک ہلکی پھلکی تفریحی چیز پڑھی ہے۔ ان دونوں افسانوں کا مجموعی تاثر کسی طرح کے قاری پر بھی اس تفریحی تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن منٹو نے ان دونوں کی ترتیب میں بھی پورے فنی انہماک سے کام لیا ہے۔ دونوں افسانوں کا آغاز، دونوں کا انجام اور دونوں کے آغاز اور انجام کے درمیان کی منزلیں سب پورے فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ طے ہوتی ہیں۔

”پھاہا“، ”بلاؤز“ اور ”کالی شلوار“ ایسے موضوعات کی کہانیاں ہیں جنھیں منٹو کے محبوب موضوع کہا جا سکتا ہے اور جن محبوب موضوعات کے ذہنی تعلق نے منٹو کو اردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار بنایا۔ ”پھاہا“ اور ”بلاؤز“ میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ان بھولے بھالے اور معصوم جنسی احساسات کی مصوری ہے جو شباب کی صبر آزما اور کٹھن منزل میں قدم رکھنے سے پہلے دل میں ابھرتے اور عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کو بڑے سیدھے سادے انداز میں شروع کرنے اور اسی سیدھے سادے انداز میں ختم کرنے کے علاوہ آغاز اور انجام کو گہری معنویت دینے کے لیے افسانہ نگار نے بہت سے چھوٹے چھوٹے غیر اہم واقعات کو جوڑ کر ایسی فضا تیار کی ہے جو پوری توجہ اور پورے انہماک کے بغیر ظہور میں نہیں آ سکتی۔ افسانہ نگار کے اسی فنی انہماک اور غور و فکر نے دو سیدھے سادے افسانوں کو ایک علمی حیثیت دے دی ہے لیکن کمال یہ ہے کہ افسانے نفسیاتی نقطۂ نظر سے دو اہم مطالعے ہونے کے باوجود فن کے ان حدود سے باہر نہیں جاتے جہاں سے نکل کر کہانی کہانی نہیں رہتی۔

یہی صورت ”کالی شلوار“ کے ساتھ ہے۔ کالی شلوار میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول میں واقعات میں ایسا اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے پیچ در پیچ مراحل سے گزرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف متوجہ ہوئے بغیر صرف ان نفسیاتی محرکات میں دلچسپی لیتا ہے جو کرداروں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ”کالی شلوار“ طوائفوں کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لیے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی ساری دلکشی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخر تک افسانے میں جتنی چھوٹی بڑی باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی سخت سے سخت حادثہ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کہانی کے مختلف ٹکڑوں میں یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغاز اور انجام کو اس طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ آپس میں جوڑنا کہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم معلوم ہونے لگیں اور دونوں منطقی طور پر یوں شیر و شکر ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں منٹو

کے فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے ہر افسانہ میں (یا کم از کم اکثر افسانوں میں) موجود نظر آئے گی منٹو نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعہ بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

(۲)

منٹو کے افسانوی فن کا ایک پہلو وہ ہے جس کا ذکر میں اب تک کرتا رہا ہوں اور جس میں افسانہ کی مجموعی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تعمیر جیسی چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی تمہید، اس کی اٹھان، اس کے واقعات کا اتار چڑھاؤ، ان واقعات کے پیچ اور الجھاؤ، اس اتار چڑھاؤ، پیچ اور الجھاؤ کے بعد افسانہ کا نقطۂ عروج اور اس کا خاتمہ، ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے ہے، اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لیے دو سب سے اہم چیزیں ہیں۔ منٹو نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور خارجی پہلو کو اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر کو جو اہمیت دی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ منٹو ایک فن کار کی حیثیت سے فن کے ان ظاہری پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے نزدیک اسی لیے ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے یقینی وسائل ہیں گویا فن کار کا مقصود بالذات فن کے یہ ظاہری پہلو ہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لیے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یہ ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں تاثر انگیزی کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنا کر اس کے حصول کے لیے ان خارجی اور تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور ایسے کون کون سے طریقے برتے اور استعمال کیے ہیں جنھیں ہم اس کے اسلوبِ نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہوتا رہا ہے لیکن ان سے بھی خاص حیثیت اظہار اور ابلاغ کے ان طریقوں کو حاصل ہے جنھیں ہر مصنف اپنی اپنی پسند، اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتتا ہے۔ ایک سیدھی سادی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا انداز کیا ہو؟ اس کے لیے کسی خاص محل پر سیدھے سادے فقرے، اشارے، کنایے، تشبیہ، استعارے، تضاد یا تکرار میں سے کون سا حربہ زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔ یہ بات ہر مصنف اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق سوچتا اور انہی صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص محل کے لیے موزوں اور مؤثر سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔ لفظوں، فقروں، اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی مخصوص اور منفرد انداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔

منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور اظہار کے ان وسائل کے نقطۂ نظر سے پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لیے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔ فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی، لفظوں کے برتنے میں تھوڑی سی جدت پسندی اور بہت اہم اور بڑی

گہری بات کو اس طرح ادا کر دینے کی قدرت کہ جیسے وہ بات نہ اہم ہے نہ عمیق منٹو کے انداز اظہار کے بعض واضح پہلو ہیں۔ بعض ٹکڑے دیکھ کر ان کے اسلوب کی ان خصوصیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کیجئے۔

۱۔ سب سے پہلی مثال "نیا قانون" کی ہے۔ استاد منگو نئے قانون کی خبر سن کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے تک پہنچانے کے لیے بیقرار ہے اتنے میں نتھو گنجا اڈے پر آتا ہے منگو بلند آواز سے اس سے کہتا ہے:

"ہاتھ لا ادھر، ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ——— تیری اس گنجی کھوپری پر بال اگ آئیں۔"

۲۔ "پہچان" میں بازارِ حسن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے ——— "یہ رنگ برنگی عورتیں مکانوں میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکتی رہتی ہیں ——— آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انھیں گرا سکتے ہیں۔"

۳۔ "پہچان" ہی میں ایک لڑکی کا ذکر یوں آیا ہے ——— "مروڑیاں اس کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔"

۴۔ "پہچان" میں ایک اور بازاری عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "وہ اس انداز سے اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مکار دکاندار کی طرح ڈنڈی مارے گی اور کبھی پوری تول نہیں تولے گی۔"

۵۔ "شوشو" میں ایک جگہ کہا گیا ہے ——— "شوشو..... شوشو........ ارے یہ کیا؟ دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپرمنٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں۔"

۶۔ "شوشو" ہی میں سونے سے پہلے کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے۔ "میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں۔"

۷۔ "خوشیا" میں "کانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔"

۸۔ "آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملہ میں بانجھ ہیں۔" (بانجھ)

۹۔ "...... محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے۔" (بانجھ)

۱۰۔ "اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرّے کو بم بنا لیا تھا کہ وقت پر کام آئے۔" (نعرہ)

۱۱۔ "جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔" (بلاؤز)

۱۲۔ "نتھو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپہر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر چیخنے لگی ہیں۔" (اس کا پتی)

۱۳۔ "کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا میں بہت اونچی لٹکی ہوئی ہو ——— اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا، بس ہوا ہی ہوا ہے اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔" (ہتک)

۱۴۔ "فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں، ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔" (دھواں)

۱۵۔ "میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی ——— میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال بہت سے اُلجھے ہوئے خیال ہیں جن کو میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔"

۱۶۔ "اسے صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس۔ دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا رہا تھا۔" (نیا سال)

۱۷۔ "محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر ماسٹر نثار تک سب محبت کرتے آئے ہیں۔" (قبض)

۱۸۔ "زندگی کیا ہے؟ ——— میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اُونی جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو اُدھیڑتے رہتے ہیں۔ جب اُدھیڑتے اُدھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے، ٹوٹ جائے گا۔" (مصری کی ڈلی)

منٹو کے افسانوں کے یہ متفرق اقتباسات اس کے اندازِ بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثال نمبر ۱ میں منگو نے جب یہ بات کہی کہ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے تو یہ معمولی سی بات تھی لیکن یہ بظاہر معمولی معلوم ہونے والی بات منگو کے نزدیک بہت اہم تھی۔ منٹو نے منگو کے مزاج، اس کی ذہنی سطح اور سنجیدہ نظر کی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا جملہ لکھا جو منگو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منگو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لیے منٹو نے جو جملہ وضع کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے۔ ایک چلتے ہوئے غیر سنجیدہ فقرے کو ایک بے حد اہم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے جدت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

مثال نمبر ۲ میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہہ آتی ہے اسے دیکھ کر پڑھنے والے کو اس کے نئے پن کا احساس تو ضرور ہوتا ہے لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے، منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا۔ لیکن منٹو یہ کہتے ہیں کہ "آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انھیں گرا سکتے ہیں" تو پوری تشبیہہ پر منٹو کے منفرد اور امتیازی اسلوب کا رنگ چھا جاتا ہے اس لیے کہ یہ جملہ جو خیال یا بیان کے اعتبار سے بالکل معمولی سا اور چلتا ہوا ہے۔ بازاری عورت کے کردار اور اس کی ان خصوصیات کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

تیسری مثال میں ابتدائی ٹکڑے میں مشاہدہ کی جو باریک بینی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرزِ فکر کی ایک خصوصیت ہے لیکن جس عورت کے ہاتھ سے وہ مروڑیاں نیچے گر رہی تھیں اس کے لیے منٹو کے دل میں گھن بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس گھن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لیے اکثر لکھنے والوں کو بحرِ فکر میں غوطہ زنی کر کے نہ جانے کیسے کیسے گوہرِ آبدار نکالنے کی فکر ہوتی لیکن منٹو کے پاس شدید سے شدید جذبہ کے اظہار کے لیے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور ان لفظوں کو ایک ایسی ترتیب دینا کہ جملے کی ظاہری حیثیت تو سادہ و خفیہ ہو جائے لیکن اس کی معنویت کئی گنا زیادہ ہو جائے منٹو کی قدرتِ بیان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ——— ادنیٰ اس لیے کہ یہ کرشمہ کبھی کبھی نہیں ہمیشہ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

یہی صورت مثال نمبر ۴ کی ہے جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور عورت کا ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک قابلِ نفرین ہے۔ لیکن نفرت اگر ایسے لفظوں کے ذریعہ ظاہر کی جائے جو بدیہی طور پر جذبۂ نفرت کے مظہر ہوں تو بیان میں عمومیت آ جاتی ہے۔ منٹو نے اپنے انداز کو ہمیشہ عمومیت سے بچایا اور سادگیِ بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنایا ہے۔

مثال نمبر ۵ تاثر انگیزی کی خصوصیت کے لحاظ سے اوپر کی دونوں مثالوں سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں پیپرمنٹ کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لیے بھی تشویش کے تمام وہی ندرت پیدا کر دی ہے جس سے افسانہ نگار کا دل پوری طرح آشنا ہے۔

چھٹی اور ساتویں مثال منٹو کے انداز بیان کی ندرت اور قدرتِ کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو انسانی ذہن کے شدید سے شدید تاثر اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لفظوں میں کر جاتے ہیں کہ وہ شدید تاثر اور نازک اور لطیف جذبہ مجسم ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے۔ ایک غیر مرئی اور غیر مادی حس ایک ٹھوس اور مرئی حقیقت بن کر نظر کے سامنے آتی ہے۔

آٹھویں اور نویں مثالوں میں منٹو نے دو نئے تصورات پیش کیے ہیں۔ بانجھ اور اسقاط کا ایک واضح تصور مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہے اس لیے جب منٹو محبت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ بانجھ ہو سکتی ہے یا اس کا اسقاط ہو سکتا ہے تو ہمارا ذہن اس کا جو فوری تاثر قبول کرتا ہے اس میں اُلجھن اور تکدر کی ایک ملی جلی کیفیت ہوتی ہے لیکن جب آہستہ آہستہ وہ نئے سیاق و سباق میں ان لفظوں کے مفہوم پر غور کرنا شروع کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ منٹو نے ایک گہرے فلسفیانہ خیال کے اظہار کے لیے دو ایسے لفظوں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس فلسفہ اور فکر کا بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں تھے لیکن منٹو کی چابک دستی کی بدولت ان دونوں معمولی اور ہیچ لفظوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انھوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار بڑی کامیابی سے کر دیا جس کے وہ اپنی ذاتی حیثیت سے اہل نہیں تھے بلکہ پڑھنے والے کے لیے سوچ بچار کے دروازے بھی کھول دیے۔ منٹو کے اسلوب کی جدت پسندی نے بعض اوقات چھوٹے لفظوں سے بڑا کام لیا ہے اور اس طرح معمولی لفظوں میں وقتی طور پر ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے —— یہی صورت ان دونوں مثالوں میں ہے۔

دسویں سے لے کر پندرھویں مثال تک ہر جملہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ منٹو کے طرز اور اسلوبِ نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو کبھی بالکل سادہ جملوں سے کبھی ایسی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے لکھنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے محل معلوم ہوتیں جہاں منٹو نے انھیں کامیابی سے برتا ہے اور کبھی بہت ہی لی جلی واضح تصویروں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کے احساس کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی مکمل تاثر قبول کر لیتا ہے —— دل کی بات ایک زندہ اور مرئی حقیقت بن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور بالاعلان کہتی ہے کہ دیکھو میں یہ ہوں مجھے اچھی طرح پہچان لو اور دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس زندہ حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کے لیے قابلِ فراموش بن جاتی ہے۔

سولھویں مثال میں منٹو کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے سلسلہ میں قاری کو کوئی خبر سنا کر فوراً دوسرے جملے سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ مخصوص کیفیت جس کا بیان قصود ہے آئینہ کی طرح روشن اور سورج کی طرح نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

سترھویں مثال بھی اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے ہمیں ایک خبر یہ کہہ کر سنائی کہ محبت

ایک عام چیز ہے اور اس خبر کی وضاحت کے لیے جو مثال پیش کی وہ بظاہر مذاق اور طنز کی ایک بات معلوم ہونے کے باوجود اس قدر منطقی ہے کہ کوئی سننے والا اسے جھٹلانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ منٹو کے فلسفہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی سہاروں کی محتاج نہیں یہاں بھی سادگیٔ بیان اور عام ترین بات کو حد درجہ معمولی سمجھ کر اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت برابر کارفرما ہوتی ہے۔

آخری مثال میں بھی منٹو کے فکر اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی آمیزش اور امتزاج ہے جہاں گہرے خیال اور سیدھی سادی عبارت اور معمولی سی تشبیہ کو اس طرح ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ گہری باتیں اور فلسفیانہ حقیقتیں واضح کرنے کا بہترین اور موثر ترین انداز وہ ہے جسے منٹو نے اپنایا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں کی نظر میں بالکل ہیچ اور بے حقیقت ہیں اور ایسے چلتے ہوئے فقروں سے جن میں سنجیدگی و متانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا گہری سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور موثر سے موثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور عمومیت کو تصور آفرین، فکر انگیز اور خیال افروز بنایا ہے۔ پھر بھی بہت کم مقامات ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ دوسروں کے فکر اور تخیل کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لیے اپنے ذہن پر زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے اس میں آورد نام کو نہیں، ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی مظہر ہے۔ منٹو کے پورے اسلوب پر یہی بے تکلفی اور بے ساختگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا پرتو ہمیں منٹو کی ان تشبیہوں میں بھی نظر آتا ہے جو اس کے ترکشِ فن کے بڑے صید افگن تیر ہیں ——— ایسے تیروں کی منٹو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگائیے کہ منٹو کا ہمہ رنگ اور ہمہ صفت فن ان تشبیہوں سے کب کب اور کس کس طرح کام لیتا ہے۔

استاد منگو نے فوجی گوروں کے چہرے کا جو تصور ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ کس قدر مکروہ اور گھناؤنا ہے:۔

> ”ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم
> پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔“ (نیا قانون)

منٹو کے دل میں (یا منٹو کے کسی کردار کے دل میں) کسی چیز، کسی واقعہ یا شخص کا جو تصور ہے اسے دوسرے کے ذہن تک جوں کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لیے منٹو کے پاس الفاظ، فقروں اور جملوں کی کمی نہیں۔ اسی طرح ان کا ذہن تازہ مشکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی مکمل نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایسی تشبیہیں وضع کر لینے پر قادر ہے جن کی طرف کسی اور کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا۔ یہی خصوصیت اوپر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور رحم و کرم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہم نوا بنا سکتے ہیں اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے ——— اور اکثر بالکل معمولی معمولی تشبیہوں سے ——— وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح جیتا جاگتا بنا کر پڑھنے والے کے ذہن میں اتار دیتے ہیں کہ وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے ——— استاد منگو کی زبان سے مارواڑیوں کو غریبوں کی کٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل بتانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرتے ہیں کہ ”نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔“ منٹو کے فن کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

جب استاد منگو کی نگاہیں گورے کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ بہ یک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں کی گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اُڑ گئیں۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی تشبیہ میں کوئی نئی بات نہیں لیکن اس کے برمحل صرف نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مرئی شکل دے دی ہے۔

ایسی تشبیہیں جن میں یوں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں۔ لیکن منٹو کا ذہن دور رس [illegible] چیزوں میں موزوں ترین مشابہت تلاش کر کے اسے بڑی برجستگی سے صرف کرتا ہے اور ایک معمولی اور بظاہر بے حقیقت سی تشبیہ ایک مکمل مفہوم کی حامل اور ایک گہرے تجربہ کی عکاس بن جاتی ہے۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں جیسی اور بہت سی سیدھی سادی مگر اپنے تاثر کے لحاظ سے اہم تشبیہیں منٹو کے افسانہ میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:۔

"وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لیموں نچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے۔" (پہچان)

"اس کی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے۔"

(شوشو)

خوشیا کے مردانہ وقار کو اس بات سے سخت دھکا لگا ہے کہ کانتا برہنہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا کہ "کیا ہرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے"۔ یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے روپ بھر کر اسے ستاتی اور پریشان کرتی ہے۔ ان بے شمار روپوں میں سے ایک یہ ہے:۔

"خوشیا نہ ہوا سالا وہ بلا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے۔"

(خوشیا)

"بانجھ" میں ایک منظر کا تصور منٹو نے اس طرح پیش کیا ہے:۔

"کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران کسی نے زور سے ہوں کی ہے۔"

یہ تشبیہ بھی بہت معمولی نہ سہی لیکن اس تک منٹو کے سوا کسی اور کے ذہن کی نارسائی اسے غیر معمولی بھی بنا دیتی ہے اور منٹو کی فنی عظمت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

"گالی ——— یوں سمجھئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا۔" (نعرہ)

"بار بار یہ دو گالیاں، جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں، اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں۔"

(نعرہ)

"دو گالیاں جیسے اس نے اپنی گدّے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر پھینک دیے ہیں۔" (نعرہ)

دو گالیاں —— اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلنے ہی نہ تھے باہر نکال لے۔ (نعرہ)

ایک گالی یا دو گالیاں —— میرے اور آپ کے لیے دو سُنی سُنائی بے حقیقت باتیں ہیں جنھیں آدمی صبح سے شام تک ہر ایک کے منہ سے نکلتے سنتا ہے لیکن کیشو لال کے دل پر ان گالیوں نے جو اثر کیا ہے اس کی شدت اور تڑپ کو منٹو ان گنت تشبیہوں کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دینے پر قادر ہیں۔ اوپر کی چاروں تشبیہوں میں کوئی نیا پن نہیں لیکن ان فرسودہ تشبیہوں سے منٹو نے بار بار جو کام لیا ہے اس سے عمومیت میں خصوصیت پیدا ہوئی ہے سطحیت میں گہرائی آئی ہے۔

منٹو نے ایک ہی تشبیہ سے ایک بہت وسیع منظر کی تصویر کھینچنے اور فضا قائم کرنے کی جو خدمت لی اس کی چند اور تصویریں دیکھیے پہلی دو تصویریں "دھواں" کی ہیں:-

"موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔"

(دھواں)

"ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔" (دھواں)

"وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے۔" (مصری کی ڈلی)

دو ایک مزے دار تشبیہیں اور دیکھیے اور اندازہ لگائیے کہ منٹو چیزوں کو کیسے کیسے گوشوں میں سے نکال کر منظر عام پر لاتا اور پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش بنانے میں مدد دیتا ہے۔

"یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاسٹر آئل پی رہا ہے۔" (سجدہ)

"اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کے رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سنایا گیا ہو۔" (سجدہ)

"وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے باہر پڑا ہے۔" (سجدہ)

"اس کی شرارت اب دُم کٹی گلہری بن کر رہ گئی تھی۔" (سجدہ)

"نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا —— جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے نئے مدِ مقابل کی طرف خم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔" (نیا سال)

یہ سب تشبیہیں پڑھنے والے کے تصوّر او تخیل کو زندگی کی ایک لہر دے کر اسے ایک ایسی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہیں جس کا ہر رنگ نکھرا اور ہر نقش واضح ہے۔ منٹو کی تشبیہوں کا یہ امتیاز ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی تڑپ اور تیزی سے خالی نہیں۔ ہر تشبیہ کے پیچھے ایک مکمل اور واضح تصویر چھپی ہوتی ہے جسے منٹو کی فنی چابک دستی اس طرح برمحل استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصویر کا پورا تاثر قبول کرتا ہے اور وہی ذہنی اور جذباتی نتائج اخذ کرتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں ہیں۔ منٹو کا اسلوبِ اظہار جس میں الفاظ، فقروں اور تشبیہوں کو یکساں اہمیت ہے مکمل تاثر کی تخلیق کو اپنا نصب العین بناتا ہے اور شاید بہت کم موقعے ایسے ہیں جن پر اسے اپنا فنی مقصود حاصل کرنے میں پوری کامیابی حاصل نہ ہوتی ہو۔ اس کی اس کامیابی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص چیز کو بھی دخل ہے —— اور وہ ہے "تکرار"۔

تکرار مشرقی اسلوبِ اظہار کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے نثر سے زیادہ نظم میں برتا گیا ہے لیکن اردو اور فارسی میں عموماً تکرار کو ایک لفظی صنعت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظی صنعت سے لکھنے والوں نے عموماً صوتی ترنم اور تاثر انگیزی کا کام لیا ہے۔ گو کبھی کبھی یہ تاثر محض صوتی ترنم و تاثر کے علاوہ جذباتی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ نثر میں مغربی اسالیب کے اثر سے لفظوں اور فقروں کی تکرار خاصی عام ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں جابجا اس کی مثالیں ملتی ہیں لیکن کسی افسانہ نگار نے اظہار کے وسیلہ کو اپنے فن میں اس طرح شامل نہیں کیا جیسے منٹو نے۔ منٹو کے مشہور افسانوں میں سے "خوشیا"، "نعرہ"، "بلاؤز"، "ہتک"، "نیا قانون" اور نسبتاً کم معروف افسانوں میں "اُلو کا پٹھا" اور "قبض" اس فن کے بڑے کامیاب مظہر ہیں۔

دو تین افسانوں پر نظر ڈال کر دیکھئے کہ اس تکرار سے منٹو نے کیا کیا کام لیے ہیں۔

"نعرہ" میں کیشو لال اپنے سیٹھ کے ساتویں منزل والے بالا خانے سے نیچے اُترا تو افسانہ نگار کے لفظوں میں:-

"اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔"

اس لیے کہ دو مہینے کا کرایہ ادا نہ کرنے کی سزا میں سیٹھ نے اسے دو گالیاں دی تھیں اور وہ گالیاں اس کے پورے وجود میں سمائی جا رہی تھیں۔ ان گالیوں سے کیشو لال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ منٹو نے تکرار کو بنایا ہے۔ یہ گالیاں اس کے ذہن اور جذبات بلکہ اس کے وجود پر کس طرح چھائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منٹو کی زبانی سُنئیے:-

"......... مالک مکان نے غصے میں آکر اسے گالی دی —— گالی ..... یوں سمجھئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اُتر گیا اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مچ گیا اس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا ....."

"اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھریاں پڑے چہرے پر قے کر دے مگر وہ اس خیال سے باز آگیا کہ اس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے......"

"سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی ——— اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے......"

"ایک نہیں دو گالیاں ——— بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔"

"چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کچل دیا گیا ہے چاؤں کیا اور پرے ہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے...... گالی ...... گالی ٹھیک اسی طرح اس سے اُلجھ کر رہ گئی تھی جیسے جھڑبیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا اتنی ہی زیادہ زخمی ہوتی جا رہی تھی۔"

"سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا ——— دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہو ——— پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلے ہوں۔"

"جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔"

"گالیاں ——— گالیاں ——— کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے باہر نکال لے اور جو

بھی اس کے سامنے آتے اس کے سر پر دے مارے۔

"اس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک ہولناک صورت میں گڈمڈ ہو گئے —— دو مہینے کا کرایہ، اس کا سیٹھ کی بلڈنگ میں درخواست لے کر جانا —— سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے، سیٹھ کی بھدی آواز، اس کے سر پر جھلملاتا ہوا بجلی کا لیمپ اور ..... یہ موٹی گالی .... پھر دوسری .... اور اس کی خاموشی .... یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں تڑ تڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا۔

'نعرہ' میں گالیوں والے واقعہ کی تکرار سے منٹو نے آہستہ آہستہ کیشو لال کے ذہنی اور جذباتی ہیجان کو واضح کرنے میں مدد لی ہے اور اس تکرار اور بڑھتے ہوئے ہیجان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لیے نفسیاتی اور فنی جواز پیدا کیا ہے جس میں کیشو لال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ نعرہ بن گیا جس سے کیشو لال کے دل کو چین و تسکین مل گئی لیکن سننے والوں نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ 'پگلا ہے'۔ —— منٹو اپنے فن میں افسانہ کی تمہید، اس کی اٹھان، اس کے نقطۂ عروج اور اس کے انجام کو جو اہمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے خلوص اور انہماک سے ربط اور تسلسل کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں وہ 'نعرہ' میں گالیوں کے ذکر کی تکرار سے پورا ہوا ہے۔ تکرار ہی نے اس افسانے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی مصوری کی ہے۔ تکرار ہی نے افسانہ کو آہستہ آہستہ نقطۂ عروج کی طرف لے جا کر ایک سوچے سمجھے انجام تک پہنچایا ہے اور تکرار ہی نے اس تاثر کی تکمیل کی ہے جو قاری کے نقطۂ نظر سے اس کا مقصود ہے۔

'بلاؤز' شباب کی نازک اور جاں گداز منزل میں قدم رکھنے والے مومن کی اس جنسی بیداری کی کہانی ہے جس کے معنی اسے خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی موضوع کی کہانی منٹو نے چند تاثرات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں پرو کر تصورات کی تکرار کی زبانی سنائی ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک دن مومن کو:

"شکیلہ کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آ گیا...... یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔"

مومن کے دل میں اس کے بعد دھندلے دھندلے خیال پیدا ہوتے رہے لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر ایک دن جب اس نے اپنا ٹرنک کھول کر اپنے عید کے لیے بنے ہوئے نئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو......

"رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا پھندنا آ گیا اور پھندنا فوراً ہی ان

کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔"

اور پھر کمرہ صاف کرتے ہوئے اس نے ساٹن کی چمکیلی کترنیں اپنی جیب میں رکھ لیں اور اگلے دن یوں ہی الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیے ....

"حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا، مسلتا رہا — لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا ....."

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤز کو دیکھتا تو ....

".....اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔"

اور بالآخر ایک رات کو ......

"..... جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔ ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اس سے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا — یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے جن کا گولا بنا ہوا تھا — پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنے شروع ہوئے — بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے۔ پھر آندھی آ گئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا — پھندنے کی تلاش میں نکلا۔ دیکھی اور اَن دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا — ایک کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ کسی دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔"

اس نفسیاتی افسانے کی فنی ترتیب، اس کے اٹھان، اس کے ارتقاء، اس کے منتہا اور اس کے انجام اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں منٹو نے ایک خاص تصور کی تکرار کو فن کی بنیاد بنایا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشمکش کے جو مراحل طے کیے ہیں ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے لیکن منٹو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے تصورات کی جس تکرار کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔ فنکار کی حیثیت سے منٹو نے اپنے لیے یہ امتیاز مخصوص کیا ہے کہ جب کسی خاص محل پر وہ کسی فنی اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس محل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔ "نعرہ" اور "بلاؤز" کی مثالوں سے منٹو کے فن میں تکرار کی جس اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نئے اسلوب سے "ہتک"، "خوشیا"، "اُلّو کا پٹھا" اور "قمیض" جیسے افسانوں میں

بھی اجاگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

منٹو نے "تکرار" کی طرح "تضاد" کو بھی اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے افسانوں میں برتا ہے۔۔۔ ——— ہماری سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں قدروں کا جو حیرت انگیز تضاد ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے اندیشے اور تشویش کی نظر سے دیکھا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ سماج کے مختلف طبقوں میں اونچ نیچ اور معاشرتی اور معاشی کشمکش، زندگی کے متعلق دو مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور ضد، ایک ہی فرد کے ظاہر اور باطن میں بدیہی فرق اس تضاد کی بعض نمایاں شکلیں ہیں۔ منٹو نے اس تضاد کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے والے ہر ایسے تضاد کو جو انسان کو فریب میں مبتلا کرتا اور اس سے سکون و مسرت کی بربادی کا باعث بنتا ہے، ایسے اسلوبِ ادا سے جس میں لفظ، فقرے اور افسانے کے مختلف اجزاء مل جل کر ایک خدمت انجام دیتے ہیں، بے نقاب کیا ہے۔

تضاد کی یہ مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے افسانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

پہلا اقتباس "نعرہ" کا ہے جس میں کیشو لال کے جذبات کی مصوری میں تصورات کے اس تضاد سے مدد لی گئی ہے جو طبقاتی اونچ نیچ کا پیدا کیا ہوا ہے:۔

> "اس گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اوپر مسکرا رہا تھا کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر، پھر اس کے بدن سے چمٹ گئے جو دیواروں میں گڑی چمک رہی تھیں۔"

اسی طبقاتی تضاد کی ایک شکل "بلاؤز" میں اس طرح دکھائی دیتی ہے:۔

> "۔۔۔ نوکروں کے متعلق کون غور کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں بیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔"

دو کردار ایک ہی صورتِ حال کو اپنے اپنے جذبات اور تصورات کی روشنی میں کس کس رنگ میں دیکھتے ہیں اس کا اظہار "ہتک" میں کئی جگہ مادھو اور سوگندی کے جذبات کو واقعات کی شکل دے کر کیا گیا ہے۔ ان کئی تصویروں میں سے ایک یہ ہے:۔

> "ایک ہاتھ سے سوگندی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ سمٹ گیا جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندی کے ہاتھ میں تھا۔ زور کا قہقہہ لگا کر اس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا: "اچھا کیا ——— مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"

آخری جملہ میں مادھو نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس مجبوری اور بے بسی نے ایک پُر فریب جھوٹ کی شکل اختیار کی ہے —— اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطن کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھیے :۔

"..... مادھو ڈر گیا۔ وہ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے جھکا تو سوگندھی کی گرج
سنائی دی: خبردار... پڑی رہنے دے وہیں —— تو جا تیرے پونا پہنچتے ہی میں
اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔"

سوگندھی کے اس تلخ طنز بھرے جملے میں کئی تضاد ایک جگہ آکر جمع ہو گئے ہیں —— ایک تضاد تو وہ ہے جو سوگندھی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جن میں حالات نے ایک نمایاں تغیر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تضاد اس طنز میں پوشیدہ ہے جس میں سوگندھی کا ایک ایک لفظ ڈوبا ہوا ہے۔ تیسرا تضاد الفاظ کے اس مفہوم سے ظاہر ہے جو گزرے ہوئے واقعات اور موجودہ صورت حال میں تصادم بن کر رونما ہوا ہے۔

'ہتک' کا خاتمہ جذباتی کشمکش کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فنکارانہ تصویر ہے :۔

"بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل
پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان
کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کرنے پر منٹو کو جو قدرت حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں یہ تضاد بعض دوسری لفظی اور معنوی صورتوں میں بھی رونما ہوتا ہے۔ ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لیے اب تک جو بہت سی مثالیں پیش کی گئیں ان میں جگہ جگہ اس کے مختلف رنگ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں —— مثلاً 'بدہ' کے پورے افسانے میں ابتدا اور انجام کا تضاد، دو طبقوں کی زندگی کے انداز کا تضاد اور دو آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو متضاد رنگوں میں دیکھنے کا تضاد پوری طرح نمایاں ہے اور اس ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسلہ میں منٹو کی کہی ہوئی وہ بات اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے ماسٹر نثار تک ہر انسان نے محبت کی ہے۔

منٹو کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فن کے ان مطالبات سے ہے جنھیں تکنیک کے مبادیات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال، اس کے تاثرات و تصورات دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں لیکن افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کچھ کہتا ہے وہ صحیح مشاہدہ کی مدد سے اور کسی خاص تجزیہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کر کے، تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص محل کی ضروریات کے مطابق ان میں سے موزوں جزئیات کا انتخاب، یہ افسانہ نگاری کے فن کے بڑے ضروری مطالبات ہیں۔ ہمارے اکثر اچھے افسانہ نگار ان مطالبات سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں —— فرق صرف یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی مخصوص شخصیت اور منفرد اندازِ فکر کی بنا پر جزئیات نگاری کا ایک نیا انداز قائم کیا ہے۔ چنانچہ اس خاص نقطۂ نظر سے منٹو کا ایک اپنا رنگ ہے جو کسی دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا۔ منٹو نے ہمیشہ کسی واقعہ یا کردار کے تاثرات و نقوش کی وضاحت کے لیے ایسی جزئیات کو زیادہ

اہمیت دی ہے جنھیں دوسرے عموماً غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جس طرح بیان و اظہارِ خیال کے معاملہ میں اور اپنے تصورات کی وضاحت کے لیے تشبیہوں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کو اہم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاثر کی شدت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے سلسلہ میں بھی انھوں نے بظاہر غیر اہم اور معمولی پہلو کو اہم اور غیر معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ وہ واقعہ کی ہو یا کردار کی انھیں معمولی رنگوں سے شوخ اور انوکھا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں دیکھئے:۔

"مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

یہ استاد منگو ہیں "نیا قانون" میں ——— اسی افسانے میں اسی کی دو تصویریں اور ملاحظہ ہوں:۔

"چھاؤنی پہنچ کر منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا۔"

گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا۔

"صاحب بہادر! کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی۔"

انہی چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ہمیں استاد منگو کو پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ "پھاہا" میں گوپال کے پتا جی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے:۔

"اس کو اپنے پتا جی کی وہ "دانت" اچھی طرح یاد تھی .... اس کے پتا جی لالہ پرشوتم داس تھانے دار لنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔"

"پہچان" میں کچھ شب زندہ داروں نے جن کمروں کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر منٹو نے یوں بنائی ہے:۔

"کونے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر پیلی سی چادر

بچھی ہوئی تھی تکیہ بھی پڑا تھا جس پر سرخ رنگ کے پھول کڑھے ہوئے تھے پلنگ کے ساتھ والی دیوار کی کارنس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور لکڑی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنک تھا جس پر ایک کالی گرگابی رکھی تھی۔"

"کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن میلے نہیں تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے آخری حصے کثرتِ استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور پھوسڑے نکل آئے تھے، کالر کھلا تھا اور قمیص بس ایک اور دھلائی کی مار تھی۔"

(بانجھ)

"باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی۔"

(بلاؤز)

"وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں پتنگ کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ داہنے بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔"

(ہتک)

یہ منٹو کی جزئیات نگاری کی صرف چند مثالیں ہیں اور ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو نے کسی واقعہ کی مصوری کرنے، کسی ماحول یا فضا کا مجموعی تاثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیات بتانے کے لیے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں کبھی چھوٹی چیز اور چھوٹی بات کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔ منٹو فن کار تھا اور فن کار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور حقیر نہیں ہوتی ——— دوسروں کو معمولی اور حقیر نظر آنے والی چیزیں غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن سکتی ہیں بشرطیکہ فن کار انھیں صحیح انداز سے اور برمحل برتنے پر قادر ہو اور یہ قدرت منٹو میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی جزئیات انھیں عزیز بھی ہیں اور ان کی نظروں میں محترم بھی۔ جزئیات کی قدر پہچاننے، انھیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے نے منٹو کے فن کو اکثر نگاہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔

منٹو کے فن کے مختلف پہلو جن میں افسانہ کی ساخت، تشکیل اور اس کے اجزاء کے علاوہ اسلوبِ نگارش کی ساری خصوصیتیں

شامل ہیں یعنی تشبیہیں، استعارے، کنایے، الفاظ اور فقروں کی تکرار اور ان کے استعمال میں تضاد کا عنصر اس کی شخصیت، مزاج اور اندازِ نظر سے متاثر ہوتے ہیں۔ منٹو کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا اور سوچتا ہے اسے بغیر جھجک، خوف اور اندیشے کے جرأت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے ——— ان سب باتوں میں اس کے جدت پسند مزاج اور توانا شخصیت کو بڑا دخل ہے۔

منٹو کی نظر میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق ——— معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی باریک بیں اور نکتہ رس نگاہ ہر ایک کے حُسن و قبح، اچھائی برائی اور عیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح عیب و ہنر پر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں فرد اور جماعت کو دھوکے میں رکھتی ہیں، کن سے انسانی زندگی عذاب میں مبتلا ہے اور کن سے انسانی زندگی اس سکون و مسرت سے محروم ہوتی ہے جو فطرت کا مقصود ہے۔ منٹو انسانی زندگی کو اس کے سب اجتماعی اداروں یعنی سیاست، معیشت، دین اور اخلاق میں فطرت کے بتائے ہوئے راستے پر اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق پوری طرح پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہے اور جب اس پہلو سے زندگی کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے اور ایسے ایسے انداز سے کی ہے کہ ناانصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون ناانصافی کر رہا ہے اور کس کس طرح کر رہا ہے۔ منٹو نے اس ناانصافی کو مٹانے، اس کا پردہ فاش کرنے اور اس کا طلسم توڑنے کو اپنے فن کا مقصود بنایا ہے۔

زندگی کے اس بہت بڑے اور بے حد اہم کام کا بیڑا اٹھانا بجائے خود ایک مہم ہے لیکن اس سے سخت تر مہم یہ ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے۔ منٹو کی مخصوص نظر نے انھیں جو کچھ دکھایا اور اس مشاہدہ کے بعد ان کے احساسِ درد نے انھیں جس کام کی طرف مائل کیا اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں ——— یہ ناانصافی کرنے والا سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں اجارہ داری کی لذتوں کے راز جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے رخ سے فریب اور طلسم کے پردے اٹھا کر اس کی حقیقت کے گھناؤنے پن کو رسوا کرتا ہے اس لیے اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے والے کو اتنا نڈر، اتنا بے خوف اور جری ہونا چاہیئے کہ وہ ہر دشمن کے مقابلے کے لیے سینہ سپر رہے۔ منٹو کو فطرت کی طرف سے یہ بے خوفی، یہ جرأت اور یہ مردانگی عطا ہوئی تھی۔ اس کے اعصاب میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر وار کو دلیری سے روکے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شگفتہ طبعی سے جھیل لے۔

منٹو کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا گہرا اثر ڈالا ہے ——— اچھا بھی اور برا بھی۔ اچھا اس طرح کہ زندگی کی خرابیوں کا تجزیہ کر کے، انھیں بے نقاب کر کے اور اس پر بسا اوقات ایسی کاری ضرب لگا کے کہ چوٹ کھانے والا تلملا کر رہ جائے، انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور برا اس طرح کہ حیاتِ انسانی کے بعض مستور پہلوؤں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی دزدیدہ نگاہی سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ چھپے ہوئے ناسوروں کی نمائش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ——— اور کبھی کبھی حقیقت بینی اور حقیقت نگاری سے دنیا والوں کو صرف عریانی سکھائی ہے۔ یوں اس برے پہلو کا ایک اچھا پہلو بھی ہے اور اس کی تاویل یہی کہہ کر کی جا سکتی ہے کہ یہ سب کچھ منٹو کا مزاج تھا، اس کی شخصیت تھی اور منٹو فریب کھانے کی طرح فریب دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن میں اپنے آپ

کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔

منٹو کے مزاج کی یہ سب خصوصیتیں جنھوں نے ان کی شخصیت اور فن دونوں میں امتیاز اور انفرادیت کے پہلو نمایاں کیے ہیں۔ سیاسی ماحول، معاشرتی انتشار، معاشی کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور نجی حالات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ منٹو نے اپنی زبردست قوت ارادی سے ہر طرح کے انتشار، کشمکش اور رکاوٹیں پیدا کر دینے والے حالات کا مقابلہ بڑی دلیری اور جواں مردی سے کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر منٹو نے ان سب قوتوں کو مغلوب کر کے اپنے سینے کی راہ نکالی اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے لیکن دیکھنے والوں نے بڑے درد و غم کے ساتھ حالات کے طوفان، انتشار اور کشمکشوں کی ٹکراو، تھپیڑے سے اس کے پیروں کو ڈگمگاتے بھی دیکھا ہے۔ زندگی کے دشوار گزار راستے کے بعض سخت مرحلوں پر اور بعض منزلوں میں اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لینے پر آمادہ پایا ہے۔ شکست کے اس احساس نے اس کے اعصاب پر برا اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی قوت برقرار رکھنے کے لیے کسی آبِ زندگی کو اپنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سخت کشمکش اور خارجی ماحول اور بیرونی زندگی کے اس تصادم میں کبھی کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب بھی آتی ہے اور منٹو کی شخصیت کی عظمت اور بھی نمایاں ہوتی ہے —— لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو اور زیادہ مغلوب اور بے بس بنانے کا پیش خیمہ بنی ہے۔ منٹو کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیات فن کے ہر دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے تواتر کی جھلک نمایاں ہے کبھی ایسا ہوا ہے کہ منٹو نے مدتوں کچھ نہیں لکھا کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی کئی دن تک مسلسل ہر روز ایک افسانہ لکھا ہے اور اس طرح تواتر اور تسلسل سے لکھے ہوئے افسانوں میں بھی کسی ایک سلسلہ میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا مثلاً منٹو کے مجموعے "ٹھنڈا گوشت" کے سب افسانے (سوائے ٹھنڈا گوشت کے) ۲۲ اور ۳۱ جولائی ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ بادشاہت کا خاتمہ (مجموعہ) کے سب افسانے یکم جون ۱۹۵۰ء اور ۱۴ جون ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح یزید (مجموعہ) کے سب افسانے ۴ اکتوبر اور ۵ نومبر ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔ منٹو کے آخری دور کے بعض اور مجموعے جو زیر ترتیب اور زیر اشاعت ہیں منٹو کی اس ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان افسانوں کو پڑھ کر پڑھنے والا نمایاں طور پر تین باتیں محسوس کرتا ہے —— ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر مجموعی حیثیت سے منٹو کے کم تر درجے کے افسانے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن انحطاط کی منزلوں سے گزر رہا ہے چند اچھے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں اور تیسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی جنھیں ہم مجموعی حیثیت سے ان کے اچھے افسانے نہیں کہہ سکتے جا بجا منٹو کی ذہانت، ان کی جدت پسندی، ان کی شوخیٔ طبع، ان کی گہری طنز اور فن کے ساتھ ان کی فطری مناسبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ منٹو کی قادر الکلامی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی کہنا جانتے ہیں اس دور میں بھی اسی تازگی اور توانائی کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے ہر دور کے افسانے —— بہت اچھے اور برے سب افسانے —— دیکھ کر پڑھنے والا ان کی جس خصوصیت

سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یہی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔ منٹو کو فطرت نے ایک قصہ گو بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے جب افسانہ نگاری شروع کی جب بھی اس میں فطرت کی دی ہوئی اس صلاحیت کو برتنے کی پوری قوت تھی اور جب اس نے مجبور اور بے بس ہو کر مرنے سے چند دن پہلے تک افسانے لکھے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پورے محاسن کے ساتھ موجود تھی۔

منٹو کو ایک قصہ گو کی حیثیت سے کہانی گری کی باتیں معلوم تھیں اور قصہ گوئی کے ساتھ اس کے فطری میلان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں لگاؤ نے اس میں ان گُر کی باتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔ منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے۔ ہر انسان اور ہر واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت اور کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو کہانی کا بڑا موزوں اور دلچسپ موضوع ہے --- لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے اور بظاہر بہت معمولی معلوم ہونے کے باوجود یہ شرط قصہ گوئی کے لیے بڑی اہم ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ کہانی کہنے والا ایک ایسا انداز اختیار کرتا جاتا ہو کہ کہانی شروع ہوتے ہی اس میں اور کہانی سننے یا پڑھنے والے میں یگانگت اور بے تکلفی کا رشتہ قائم ہو جائے۔ پڑھنے یا سننے والا یہ محسوس کر سکے کہ قصہ گو اسے اپنا ہمراز سمجھ کر اسے اپنے دل کی بڑی سے بڑی بات بتانے میں بھی تامل نہیں کرے گا وہ اپنی خوشی اور غم میں اسے پوری طرح شریک کرے گا۔ کہانی سننے والے کے دل میں اپنی طرف سے یہ اعتماد پیدا کرنا اور ایک جان دو قالب ہو کر اس سے معمولی سے معمولی بات بھی اس طرح کہنا کہ جیسے وہ بے حد اہم ہے کہانی کہنے والے کی بڑی جیت ہے۔ منٹو قصہ گوئی کے میدان میں یہ جیت حاصل کرنے میں ماہر تھا۔ وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح باتیں کرنے کے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا کہ دوسرے اس کے جھوٹ کو اس کے پر فریب تخیل کو اس ذہانت کی آغوش میں پلے ہوئے عجیب و غریب تصور کو سچ سمجھ کر قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے تھے۔ معمولی سی بے حقیقت بات کس طرح کہانی بن سکتی ہے اس کی مثال منٹو کا افسانہ 'چوہے دان' ہے۔ کہانی میں کس طرح باتوں کا مزا پیدا کر کے اپنے اور پڑھنے والے کے احساسات میں مکمل مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے اس کا اندازہ 'چغد' 'مس ٹین والا' 'میرا نام رادھا ہے' 'ٹوٹو' 'ننگی آوازیں' 'سادھا بچہ' 'رحمت خداوندی کے پھول' 'خورشٹ' 'باسط' 'ٹیٹوال کا کتا' 'پیرن' 'نکی' اور 'والد صاحب' جیسے افسانوں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے اور کس طرح عجیب و غریب اور نا قابل اظہار خیال افسانوں میں جگہ پا کر اور منٹو کی چابک دستی سے حلقہ بگوش بن کر پڑھنے والوں کا دل موہ سکتے ہیں یہ بات 'صاحب کرامات' 'بادشاہت کا خاتمہ' 'کتے کی دعا' اور 'عزت کے لیے' جیسے افسانے پڑھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ منٹو اپنے غریبی ماحول میں سے اتنی آسانی سے کوئی کہانی پیدا کر لیتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ گپ کو کس طرح سنجیدہ مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا یہ بات اور بھی زیادہ حیرت کی تھی --- لیکن یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ منٹو کہانی کہنا جانتا تھا اور اپنی اور بہت سی فنی کمزوریوں کے باوجود اپنے آخری دور انحطاط میں بھی وہ کہانی کہنا بھولا نہیں تھا اسی لیے اس انحطاط کے زمانے میں منٹو کے افسانے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

یہی ساری باتیں اب مل جل کر منٹو کے فن میں زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور انفرادیت اور عظمت بھی۔ البتہ منٹو میں اگر سکینڈل کو افسانوں کا موضوع بنانے کی کمزوری نہ ہوتی پڑھنے والوں میں کبھی کبھی ایک ہنگامہ اور گرما گرمی پیدا کر دینے کے لیے وہ اگر چونکا دینے والی باتیں کہنے اور لکھنے پر اصرار نہ کرتا وہ اگر اپنی طنز کو اصلاح کے بلند مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے کبھی کبھی اسے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح برسانے اور دوسروں کو چھید دے کر اس میں لذت محسوس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور جنسی تجزیہ کو نفسیات کی نازک حدود میں رکھنے کے بجائے اسے کوچہ و بازار میں رسوا کرنے سے پرہیز کر سکتا تو منٹو یقیناً اس سے بھی بڑا فنکار ہوتا جیسا کہ وہ اب تھا ---- اس لیے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں کہ وہ ان چند [illegible]

کے باوجود بہت بڑا فن کار تھا۔ اس کے مشاہدہ، تخیل، تصور، فکر اور احساس میں اس کی شخصیت کا بڑا گہرا رنگ ہے اور شخصیت میں غیر معمولی قوت و توانائی۔ ——— وہی قوت و توانائی اس کے پورے فن پر چھائی ہوئی ہے اور آنے والے ہر دور میں ہر طرح کے حوادث کے خلاف سپر بن کر اس فن کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گی۔ —— منٹو مر گیا ——— لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دے گا۔

غالب

(۱)

بنام چودھری عبدالغفور صاحب سرور

جناب چودھری صاحب[1]

میں تو خدمت بجا لایا[2]۔ مگر اس کے صلے میں تین باتیں چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آرہ میں مولوی سید فرزند احمد[3] کے مکان کا پتہ مجھے لکھ بھیجو تاکہ میں ان کو تہنیت لکھوں[4]۔ دوسرے یہ کہ تمہارا خط تم کو واپس بھیجتا ہوں۔ حضرت صاحب[5] کی دستخطی عبارت کو حرف بحرف

---

[1] غالب کے قدر دانوں میں کون ہے جس نے غالب کے خطوط پڑھے ہوں اور وہ چودھری عبدالغفور سرور سے ناواقف ہو۔ چودھری صاحب مارہرہ ضلع ایٹہ کے رؤسا میں تھے۔ اور ان کا خاندان کئی صدیوں سے وہاں آباد ہے۔ غالب کے عزیز ترین دوستوں میں تھے اور ان کا شمار ان کے مایۂ ناز شاگردوں میں ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ اشعار اب بہت کم ملتے ہیں۔ غالب کا یہ نادر خط راقم نے ان کے خاندان کے افراد سے حاصل کیا ہے (مختار الدین احمد)

[2] سرور نے ۳۶ شعروں کا ایک اردو قصیدہ اور ۹ قطعات اصلاح کے لیے میرزا کے پاس بھیجے تھے۔ یہ قطعہ کاغذ جس پر سرور نے اپنے ہاتھ سے اشعار لکھے ہیں اور جو غالب کی اصلاح سے مزین ہیں اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا۔ قصیدے کے گیارہ اشعار پر غالب کی اصلاح ہے بعض قطعات کی غالب نے خاصی توجہ کی ہے ایک قطعہ انہیں پسند نہ آیا تو سراسر تکلفات باردہ لکھ کے قلم زد کر دیا ہے۔ خدمت سے مراد انہی شعروں کی اصلاح ہے۔

[3] صفیر بلگرامی (۱۲۲۹-۱۳۰۷ھ) حضرت صاحب عالم کے نواسے اور میرزا غالب کے شاگرد۔ ان دونوں کے تعلقات کی داستان دیکھنی ہو تو احوال غالب ملاحظہ فرمائیے۔

[4] صفیر بلگرامی کے گھر میں ۱۲۸۲ھ میں ایک بیٹا پیدا ہوا ہے۔ سرور نے اسی سلسلے میں تہنیت کے قطعات لکھے ہیں اور اب غالب صفیر کو مبارکباد کا خط لکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ان کا پتہ پوچھ رہے ہیں۔ قیاس ہے کہ غالب نے تہنیت کا خط ضرور لکھا ہوگا۔ لیکن یہ خط بھی ان کے ہزاروں خطوں کی طرح اب تک نامعلوم ہے۔ یہ صاحبزادے غالباً سید نذر احمد ہیں جو گرامی تخلص کرتے تھے۔ ان کا ذکر مرقع فیض ص ۳۰ (تذکرۂ شاگردان صفیر) اور تذکرۂ یادگار ضیغم میں موجود ہے موخر الذکر میں ان کی تصویر بھی چھپی ہے جو راقم نے اردو شعرا کی تصاویر کے ساتھ رسالہ "آج کل" دہلی دسمبر ۱۹۵۴ء میں شائع کر دی ہے۔

[5] مراد صاحب عالم مارہروی (۱۲۱۱-۱۲۸۸ھ) جن کے خطوط سے غالب کو ہمیشہ شکایت رہی کہ ان سے پڑھے نہیں جاتے۔ سرور ہی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"حضرت کی تحریر کا ایک لفظ بھی اگر پڑھا گیا ہو تو میرے پھوٹیں، ایمان نصیب نہ ہو وہ خط بدستور آپ کے پاس بھیجتا ہوں، حرف بحرف اس کی نقل کرکے پھر مجھے بھیج دیجئے تاکہ جواب لکھنے میں سعادت حاصل کروں۔" (مختار الدین احمد)

اپنے ہاتھ سے لکھواؤ اور مجھ کو بھیجو تاکہ میں ان کو تہنیت میں خط لکھوں۔ واللہ ہرگز مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔ تشویش و تشویر میں ہوں کہ کیا کروں۔ تم یہ بوجھ مجھ پر سے اٹھالو۔ تیسری بات یہ کہ یہ معاملہ حضرت صاحب پر ظاہر نہ ہو اور میرے اس خط کا جواب جلد آئے۔

غالب۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۶ء

۲

۳ر مارچ ۱۸۶۷ء

اے میری جان[1]!

کس وقت مجھ سے غزل مانگی کہ میرے واسطے نکیرین کے جواب دینے کا زمانہ قریب آگیا۔ میرا حال اب جس کو دریافت کرنا ہو وہ اہل محلہ سے دریافت کرے۔ تمہاری خاطر عزیز ہے۔ فکر کی۔ بارے نفسِ ناطقہ نے بڑی بھلی طرح مدد دی۔ نو شعر پہنچتے ہیں۔ لیکن نہ شاعرانہ نہ عارفانہ۔

غزل

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں   میں دشتِ غم میں آہوئے صیّاد دیدہ ہوں
ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو   گہ نالۂ کشیدہ، گہ اشکِ چکیدہ ہوں
جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن   ازبسکہ تلخیٔ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں
نہ سُبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے رابطہ   میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ   نہ دانۂ فتادہ ہوں نہ دامِ چیدہ ہوں
جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت   میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ   ہوں میں کلامِ نغز، و لے ناشنیدہ ہوں
اہلِ ورع کے حلقہ میں ہرچند ہوں ذلیل   پر عاصیوں کے فرقے میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے، کہ مردم گزیدہ ہوں

---

(۳)

بنام جناب ذکیؔ دہلوی مرحوم

بندہ پرور!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ از روئے شرافتِ نسبی و لیاقتِ حسبی آفتاب و ماہتاب ہیں۔ آپ کا کیا کہنا ہے۔ اس

---

[1] یہ خط نواب امین الدین احمد خاں بہادر والیٔ لوہارو کے نام ہے، اس کے شروع میں درج ہے اس خط میں اردو کی جو غزل ہے وہ شائع شدہ ہے خط سے معلوم ہو گیا کہ یہ غزل کب لکھی گئی تھی۔ (مالک رام)

عمر میں علم و فضل میں وہ پایۂ بلند حاصل کیا ہے کہ دوسرے کو یہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔ مثنوی کے اشعار میں نے دیکھے اور پسند کیے بطریقِ سہل ممتنع لکھے ہیں۔ اُردو فصیح، عبارت سلیس، الفاظ نہایت سنجیدہ و متین، حرف حرف شستہ و رفتہ جو خوبیاں نظم میں چاہئیں وہ سب موجود مگر میری مدح میں اتنا مبالغہ کیوں کیا۔ میں تو اقلیمِ سخن کا گدائے خاک نشین ہوں۔ شہنشاہ کہاں سے ہو گیا۔ خیر آپ کی ارادت میرے لیے موجبِ سعادت ہے۔ جو صاحب شعر میں خود ستائی کو بُرا جانتے ہیں کیا انہوں نے یجوز للشاعر مالا یجوز لغیرہ نہیں سنا ہے یا اساتذۂ مستند الکمال کا فخریہ کلام اون کی نظر سے نہیں گزرا؟ ——— اللہ اللہ اس امر خاص میں کیا کیا بلند پروازی اور اپنے کلام کی کیسے کیسے مدح طرازی کی ہے۔ شیدائے عالمگیری کہتا ہے ؎

چیست دانے بادۂ گلگوں مصفا جوہرے
حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

تین شعر میں تین شاعروں کے بسبیلِ نمونہ یہاں لکھتا ہوں باقی نادرہ کلام اہلِ سخن پر حوالے کرتا ہوں ایک شاعر کہتا ہے ؎

بہ اقلیمِ معنے رسولِ امینم
سنائی و فردوسی از آستانم

دوسرا اس سے بھی بڑھ کر کہتا ہے ؎

بہ ملکِ سخن آں خدائے قدیم
کہ معنی یکے باشد از بندگانم

تیسرا کچھ اور ہی راگ گاتا ہے ؎

حوضِ کوثر کہ مشرب الرحمت
ناودانے ز پارگین منست

ناودان بمعنی موری اور پارگین اوس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں مطبخ اور حمام وغیرہ کا پانی جمع ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ من شطحیات الشعراء۔ میر صاحب میں بہت بڈھا ہو گیا ہوں اس پر امراضِ متضادہ مزمنہ میں گرفتار، قویٰ بالکل مضمحل اٹھنا بیٹھنا لکھنا پڑھنا سب مشکل احیاناً اگر تحریرِ جواب میں تاخیر ہو جائے معاف رہوں۔ والسلام مع الوفا الاحترام! فقط!

دعائے خیر کا طالب فقیر غالب ۸ جنوری ۱۸۶۸ء
۔روز چہار شنبہ

(۴)

بنام نواب امین الدین احمد خاںؒ[1]

بھائی سے دو سوال ہیں ایک تو یہ کہ مجموعہ نثر[2] کے خاتمے کو کیا کروں۔ وہ مبنی تھا اس حقیقت پر کہ نول کشور، نواب ضیاء الدین خاں

---

[1] نواب امین الدین احمد خاں، نواب احمد بخش خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد لوہارو کے رئیس قرار پائے۔ ۱۸۲۷ء سے اپنی وفات

سے واسطے انطباع کے لے گیا۔ جب یہ واقع نہ ہوا تو اب اس کو نکال[2] اول اور اس کی جو کئی نثریں اور ہیں وہ لکھ دوں۔

اوراقِ اشعار مرحومی زین العابدین خاں[1] مستعار ہیں۔ اس واسطے کہ تم اپنے ہاں کے مجموعے کی تصحیح اس سے کر لو۔ پھر یہ امر واقع ہوا یا ہونے والا ہے۔

ترجمہ ابوالفدا[2] کی جلد واپس پہنچتی ہے۔

جواب کا طالب :- غالب

---

(۵)

بنام عزیز اللہ شاہ عزیز صفی پوری[3]

خان صاحب عنایت مظہر سلامت!

آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ اوراقِ پنج رقعہ[4] نظر فروز ہوئی خوشامد فقیر کا شیوہ نہیں۔ نگارش تمہاری پنج رقعہ سابق کی تحریر سے لفظاً و معناً بڑھ کر ہے۔ اس میں یہ معانی نازک اور یہ الفاظ آب دار کہاں؟ مگر ایک امر سے تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ یہ نثر ظہوری کی نہیں

بقیہ حاشیہ :- ۱۹۰۶ء تک روہارو کی جاگیر کا انتظام انہی کے ہاتھ رہا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں ان کے بھائی تھے اور جائداد میں شریک لیکن انہیں امورِ ریاست سے کچھ تعلق نہ تھا۔ امین الدین کے انتقال کے بعد نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی ان کے جانشین ہوئے۔ ان سب لوگوں سے غالب کے گہرے تعلقات تھے۔ اس رقعہ پر مکتوب الیہ کا نام درج نہیں۔ لیکن قریب بہ یقین ہے کہ مرزا نے یہ رقعہ نواب امین الدین احمد خاں کو لکھا ہے اس پر تاریخ درج نہیں۔ راقم کے خیال میں اس کا زمانہ تحریر ۱۲۸۰ھ (مطابق ۱۸۶۳-۱۸۶۴ء) (مختار الدین احمد) [2] ۱۲۸۰ھ میں منشی نول کشور دہلی آئے اور مرزا سے ملے انہوں نے کلیاتِ نثر چھاپنے کی خواہش ظاہر کی۔ مرزا نے نواب ضیاء الدین خاں سے مسودہ لے کر منشی صاحب کے حوالے کیا۔ چھپنے میں تعویق ہوئی تو مرزا مایوس ہوئے اور انہوں نے یہ رقعہ لکھا۔ بالآخر کلیات چار سال کے بعد ۱۲۸۴ھ میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن اب بہت کمیاب ہے۔

[1] زین العابدین خاں عارف، مرزا کی سالی کے بیٹے جنہیں غالب اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ پہلے شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے پھر مرزا سے اصلاح لینے لگے۔ دیوانِ اردو کے کئی نسخے ہندوستان میں موجود ہیں۔ [2] غالباً تاریخ عالم مصنفہ الفدا کا وہ ترجمہ مراد ہے جو مولوی کریم الدین دہلوی نے کیا تھا اور مطبع العلوم دہلی سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا (مختار الدین احمد) [3] عزیز صفی پوری ۱۲۴۱ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے وہیں عربی و فارسی کی تحصیل کی غدر کے ہنگامے ہوئے تو لکھنؤ چھوڑ کر صفی پور (اناؤ) اپنی ننھیال چلے گئے اور وہیں انہوں نے اپنی پوری عمر گزار دی۔

تصانیف کی تعداد چالیس سے کم نہیں جن میں دیوانِ اردو، لوزد لآبت، ختم فکر، کلام نظم فارسی، ارمغان، پیش کش شاہجہانی، پنج رقعہ ترجمہ فسانۂ عجائب (منظوم) اور مثنوی فتح مبین در جواب شاہ نامہ قابلِ ذکر ہیں عزیز کا انتقال ۲ر جولائی ۱۹۲۸ء کو ہوا۔

یہ دونوں رقعے غالب کے رقعات کے کسی مجموعے میں اب تک شائع نہیں ہوئے (مختار الدین احمد)

[4] شاہ صاحب کی فارسی نثر کا مختصر سا مجموعہ جو چھپ بھی گیا ہے۔

ہے۔ ارادت خاں متخلص بہ واضح عالم گیری سرداروں میں سے ایک شخص تھا۔ مینا بازار[1] اور پنج رقعہ اس کی فکر کا نتیجہ ہے۔ توالی کسرات کی طرز ایجاد کی ہوئی اس کی ہے۔ موجد سے مقلد بہتر نکلا۔ یعنی تم نے خوب لکھا ہے ع

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

جہاں آپ نے فقیر کا مطلع لکھا ہے وہاں آپ بہ عرف میرے معروف ہوئے ہیں[2]۔ متوقع ہوں کہ یا شعر نکال ڈالو یا عرف کی جگہ تخلص لکھ دو۔

نجات کا طالب ، غالب

---

(۶)

بنام عزیز اللہ شاہ عزیز صفی پوری

سخن شناس نۂ مشفقا، خطا ایں جاست۔ یہ جملہ کہ یا میرا شعر نکال ڈالو یا عرف کی جگہ تخلص لکھ دو موجب ملال خاطر کیوں ہوا اور اس سے یہ مفہوم کیوں کر پیدا ہوا کہ میں تمہارے کلام کو اصلاح نہ دوں گا۔ تمہیں غور کرو کہ شعر کو علاقہ تخلص سے ہے یا نام سے ...... عرف سے۔ میں نے تو اصلاح دی تم نے برا مانا۔ ذہن تمہارا معوج ہے اکثر کجی کی طرف جاتا ہے تمہاری اس نثر میں حک و اصلاح کی گنجائش نہیں۔ پنج رقعہ سابق سے لفظاً و معناً تمہاری عبارت بہتر ہے۔ اس قول کو باور نہ کرو گے تو منشا اس کا وہی اعوجاج طبع ہو گا مع سوء ظن۔

نجات دہندہ :۔ غالب

---

(۷)

بنام نامعلوم[3]

بندہ پرورا!

آج میں نے وہ انگریزی عرضی روانہ کر دی اور صبح کو آپ کا کہار مسودہ اور میرے محسن کا رقعہ آپ کے نام کا مجھ کو دے گیا۔ اس عنایت کی شکر میں کیا خدمت بجا لاتا بارے ایک رباعی بھیجتا ہوں اس کو آپ پڑھ کر اور لطف اٹھا کر راجہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیجئے۔

---

[1] یہ بات مشکوک ہے کہ مینا بازار اور پنج رقعہ واقعی ظہوری کی لکھی ہوئی ہے اس مبحث کے لیے ڈاکٹر نذیر احمد لکھنؤ یونیورسٹی کا تحقیقی مقالہ مینا بازار دیکھا جائے۔

[2] شاہ صاحب نے غالب کی جگہ مرزا نوشہ لکھ دیا تھا۔ غالب کو اپنے عرف سے جو چڑ تھی وہ معلوم ہی ہے۔ (مختار الدین)

[3] یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ رقعہ کس کے نام ہے (اکبر علی خاں رام پوری)

امید بہ تشدید میم و تخفیف میم دونوں طرح مستعمل ہے ایسا نہ ہو کہ جناب ممدوح اس کو زحاف سمجھیں۔ پہلے اور دوسرے مصرع میں بہ تخفیف میم ہے اور تیسرے مصرع کا میم مشدد ہے۔

غالبؔ!

---

(۸)

بنام نواب علاؤالدین خاں علائی

جانِ غالب!

دو خط تمہارے متواتر پہنچے۔ مغربی عرفا میں سے ہے۔ بیشتر اس کے کلام میں مضامین حقیقت آگیں ہیں۔ لیکن داماں گلہ دارد و گریباں گلہ دارد، اس زمین میں اس کی غزل میں نے نہیں دیکھی۔ حاجی محمد جان قدسی کی غزل اس زمین میں ہے ؎

در بزم وصال تو بہنگام تماشا
نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

یہ ایک شعر اس کا مجھے یاد ہے۔ بھائی تمہارا باپ بدگمان ہے یعنی مجھ کو زندہ سمجھتا ہے میرا سلام کہہ دو، یہ شعر میرا پڑھ سنا دو ؎

گمان زیست بود بر منت ز بے دردے
بد است مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

مجھے کافور و کفن کے فکر پڑ رہے ہیں۔ وہ تم کو شعر و سخن کا طالب ہی زندہ ہوتا تو دہلی کیوں نہ چلا آتا۔ مجھ پر سے یہ تکلیف اٹھا لو اور تم اسی زمین میں شعر کہہ کر بھیج دو میں اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ عصائے پیر بجائے پیر، واللہ میرا کلام ہندی یا فارسی کچھ میرے پاس نہیں ہے آگے جو کچھ حافظہ میں موجود تھا وہ لکھ بھیجا اب جو کچھ یاد آگیا وہ لکھتا ہوں ؎

با من کہ عاشقم سخن از ننگ و نام چیست
در امر خاص حجت دستور عام چیست

بستم ز خون دل کہ دو چشمم ازاں پُر است　　گر مے خورد شراب و نہ بینی بجام چیست
بادست ہر کہ بادہ بہ خلوت خورد مدام　　داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست
ما خستۂ غمیم و بود مے دوائے ما　　با خستگاں حدیث حلال و حرام چیست
از کاسۂ کرام نصیب است خاک را　　تا از فلک نصیبۂ کاس کرام چیست

غالبؔ اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت
پرسد چرا کہ نرخ مئے لعل فام چیست

، شعر نہ یاد آتے تو یاد آ گئے خیر لکھنے کو یہ بھی کافی و مکتفی ہیں[1]۔

دل بردہ و حق آنست کہ دلبر نتواں گفت   بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت
در رزم گہش ناچخ و خنجر نتواں برد   در بزم گہش بادہ و ساغر نتواں گفت
رخشندگی ساعد و گردن نتواں جست   زیبندگی یارہ و پیکر نتواں گفت
پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتواں خواند   ہموارہ ترا شد بت و آذر نتواں گفت
در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم   با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت
ہنگامہ سر آمد چہ زنی دم ز تظلم   گر خود ستمی رفت بمحشر نتواں گفت
آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است   بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت
کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ ما را
مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت

کوئی امید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
داغ دل گر نظر نہیں آتا   بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی   کچھ ہماری خبر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب   شرم تم کو مگر نہیں آتی

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے   کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبہ دل   اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

---

[1] یہ خط پہلے چھپ چکا ہے مگر نامکمل، پہلا خط اس مصرع پر ختم ہو جاتا ہے۔

بہ سد چرا کہ ز رخ مئے لعل فام چیست   (ملاحظہ ہو مکاتیب غالب مرتبہ عرشی طبع دوم)

خط کی باقی عبارت اس میں نہیں آئی لیکن اصل خط میں موجود ہے جو غالباً کسی وجہ سے ابتدا ہی میں حذف ہو گئی۔ مرزا نے اپنی ایک اور فارسی غزل اور دو اردو غزلیں بھی اس خط کے ساتھ بھیجی تھیں جو مضمون خط سے واضح ہے۔ لوہارو سے ایسی غزلوں کی فرمائش آئی تھی جنہیں گانے کے لیے قوال کو دیا جا سکے۔

اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا   ہات آئیں تو انہیں ہات لگائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اُٹھے   کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر   کوئی پُوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

سرسیّد

(۱)

بنام نواب سیّد علی حسن صاحب مرحوم

جنابِ والا مناقب مخدوم و مکرم جناب مولوی محمد علی حسن خان بہادر دام عنایتکم

آپ کا نوازش نامہ مورخہ تیسری ربیع الثانی ۱۳۰۸ھ معہ قطعہ کرنسی نوٹ تعدادی پانسو روپیہ پہنچا۔ باعثِ افتخار و ذریعۂ ہزاراں اعزاز ہوا۔ گو عطیہ کو میں سبقۃ من الشرک سمجھتا ہوں مگر اس فیاضانہ مرحمت کو مدرسۃ العلوم کے اور قوم کے لیے فالِ نیک جانتا ہوں۔ کچھ شبہ نہیں کہ مدرسۃ العلوم اور میری کوشش فلاحِ قومی و دنیاوی امور سے متعلق ہے۔ لیکن اگر نیت نیک اور تمام کام حبّاً للّٰہ ہوں تو خدا سے امید ہے کہ جزائے انما الاعمال بالنیات سے جو فخرِ ایمان ہے محروم نہ رکھے گا۔

آپ باور کریں یا نہ کریں مگر میں یقین کرتا ہوں کہ اس اسلامی اخوت اور ہمدردیٔ قومی کی جزائے خیر ضرور خدائے تعالےٰ آپ کو عطا فرما دے گا۔ یہ تو مجھ کو یقینِ کامل ہے جب کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اس وظیفہ سے کسی طرح کی شہرت و ریا و دکھاوا آپ کو منظور نہیں ہے اور بلاشبہ خیراتِ مخفی ہزار درجہ خیراتِ جلی سے بہتر ہے۔ مگر نیک نیتی اور بے ریائی کو تسلیم کر کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالنی ضرور ہے کہ اعلان اس قسم کی خیرات کا جو قومی بھلائی سے نہ شخصی مراعات سے متعلق ہے اور قوم کو اس قسم کی خیرات کی شدید ضرورت ہے۔ ذریعہ ہو گا اوروں کی ترغیب کا اور خیرات دینے والا الدال علی الخیر کفاعلہ میں ضرور داخل ہو گا۔ پس فلاح کے کاموں میں باعلان خیرات کرنا اگر نیت نیک ہو تو دوچند اجر کا مستحق کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس اعلان سے قومی عظمت اور اسلامی شوکت ثابت ہوتی ہے جو ہماری عین تمنا اور آرزوئے دلی ہے۔ آپ نے مدرسۃ العلوم کو ملاحظہ نہیں فرمایا اور جس نے نہ دیکھا ہو اس کے خیال میں آ ہی نہیں سکتا کہ وہ کیسا ہو گا۔ اس کی عمارت جس شان و شوکت سے بنانی قرار دی گئی اور جس قدر کہ اس وقت بن چکی ہے۔ قومی عظمت اور اسلامی شوکت کو ثابت کرتی ہے۔ ایک انگریز نے کہا کہ یہ خیال کہ مسلمانوں میں قومی جوش اور ان میں سے قومی عظمت جاتی رہی۔ علی گڈھ میں جا کر اور مدرسۃ العلوم کی عمارت دیکھ کر بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ جب کہ غیر قوم کے لوگ اس کی دیواروں پر جابجا مسلمانوں کے نام کثرت سے کندہ دیکھتے ہیں تو اور بھی زیادہ قومی عظمت اور اسلامی شوکت کا اثر ان کے دل میں بیٹھتا ہے بس ان وجوہ سے آپ مجھ کو مجاز رہنے دیں کہ اس روپیہ کو ایک مناسب فنڈ میں داخل کر دیا

اور اس کے ساتھ آپ کے نام نامی کی بقید ولدیت نشانی قائم رکھوں۔

مدرسۃ العلوم کی درمیانی عمارت جو سنٹرل ہال سے موسوم ہے بہت بڑی عمارت ہے سات ہزار روپیہ اس کی لاگت کا تخمینہ ہوا اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ لاگت آوے گی ـــــ اس میں نہایت خوش اسلوبی سے ایک سو بیس پتھر لگائے گئے ہیں جس بزرگ نے پانسو روپیہ دیا ہے وہ روپیہ اس کی تعمیر کے فنڈ میں جمع کیا گیا ہے۔ اور ان پتھروں میں سے ایک پتھر پر اس کا نام کندہ کر دیا ہے۔ جس قدر نام کندہ ہو چکے ہیں: غیر قوم کے لوگ جب آن کر دیکھتے ہیں تو قومی عظمت کا بے انتہا اثر ان کے دل پر ہوتا ہے اور مسلمانوں کے دل بھی ایک قسم کی فرحت اپنے میں پاتے ہیں۔ پس میرا ارادہ ہے کہ آپ کے ذرعطیہ کو بھی اسی فنڈ میں داخل کر دوں۔ اور آپ کا نام بقید ولدیت کندہ کر دوں جب کہ آپ نے یہ روپیہ عنایت کیا اور مجھ کو متولی کیا کہ اس کو کسی کارِ خیر میں صرف کروں تو اب آپ کو اس میں مداخلت مزد نہیں ہے۔ آپ ثواب میں داخل ہو گئے اب جو گناہ و ثواب رہا میری گردن پر ہے۔ اگر میری نیت بخیر ہے تو خدا سے امید ہے کہ مجھ کو بھی میری نیت کے موافق بدلہ دے گا۔ اس تحریر کا میں آپ سے جواب نہیں چاہتا میں کروں گا وہ جو اللہ چاہے گا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اب کے سال الہ آباد میں ہوگا۔ ۲۸ر، ۲۹ر، اور ۳۰ر دسمبر تواریخ اجلاس مقرر ہوئی ہیں۔ پہلے اجلاس میں وہ امور تنقیح پا دیں گے جو بحث کے لیے پیش ہوں گے۔ مگر تمام بحثیں تعلیم مسلمانان سے متعلق ہوں گی۔ نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں غالباً اسباب تنزل مسلمانان پر لیکچر دیں گے۔ ہمارے کالج کے ایک نہایت نیک اور عالم پروفیسر انگریز مسٹر آرنلڈ چین اور جاوا میں اسلام کی ترقی اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت پر لیکچر دیں گے وہ یہ ثابت کریں گے کہ بغیر کسی زور حکومت کے وہاں اسلام پھیلا ہے۔ اس وقت انہی دو صاحبوں کا ارادہ معلوم ہوا ہے۔ مگر غالباً مولوی سید علی بلگرامی جو حیدر آباد سے آنے والے ہیں وہ بھی کوئی لیکچر دیں گے۔ غرضیکہ تمام جلسہ میں لائے مسلمان ہائے مسلمان اس کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

گذشتہ سال کی اجلاس رپورٹ بطور نذرانہ آپ کے ملاحظہ کے لیے بھیجتا ہوں، منظور فرمائی جاوے اور آپ مجھ کو ہمیشہ اپنا نیاز مند ایک عاجز نیاز مند متصور فرمادیں، آپ کی خدمت میں نیاز نامجات ارسال کرنے باعث میرے فخر کا ہوگا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

خاکسار سید احمد علی گڑھ ۲۰ر نومبر ۱۸۹۰ء

---

(۲)

بنام نواب سید علی حسن مرحوم

جناب مولوی صاحب مخدوم و مکرم معظم من ابو النصر مولوی سید محمد علی حسن خاں بہادر

نوازش نامہ عالی محررہ ۲۲ر ذو الحجہ پہنچا ممنون عنایت کیا۔ جو کچھ کہ آپ نے واسطے بہتری مسلمانوں کے حق میں سرکار عالیہ سے سعی فرمائی۔ اور مدرسۃ العلوم اور اس ناچیز کے حق میں کلمۃ الخیر فرمائے اس کی نسبت بجز اس کے کہ اجرکم علی اللہ اور کیا کہہ سکتا ہوں بلاشبہ سرکار عالیہ کو تائید مدرسۃ العلوم میں تامل ہوگا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ مخالفین نے بہت کچھ غلط باتیں نسبت مدرسۃ العلوم کے مشہور

کر رکھی ہیں۔ علاوہ اس کے ایک عام خیال نسبت حسنات و خیرات اور مبرات کے محدود ہو گیا ہے۔ اس خیال کو توڑنا اور یہ بات دل میں ڈالنی کہ درحقیقت جس امر کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور جس کے نہ ہونے سے مسلمانوں کی روز بروز ذلت ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ اسلام کی بھی ذلت ہے اس میں تائید کرنا اور اس ذلت سے مسلمانوں کو نکالنا سب سے بڑی حسنات میں شامل ہیں .... اور ظاہر ہے کہ دین میں یا شغلے میں کچھ کام آنے والی نہیں ہے مگر انگریزی نہ جاننے کے سبب روز بروز مسلمانان ہندوستان ذلت و خواری میں پڑتے جاتے ہیں۔ عہدہ ہائے سرکاری سے روز بروز خارج ہوتے جاتے ہیں اصلی عہدے ان کے ہاتھ سے نکلتے جاتے ہیں۔ ہندو بنگالی روز بروز ترقیاں پاتے جاتے ہیں اور مسلمان برابر میں ان کے مغلوب و دست نگر ہوتے جاتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو ہندوؤں و بنگالیوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے یا ان سے مغلوب ہونے و بہنے کے لیے مسلمانوں کو انگریزی زبان کی تعلیم دینا درحقیقت ہندوؤں اور بنگالیوں پر ان کو فتح مند کرنا ہے اور اس زمانہ میں جو حال مسلمانوں کا ہے درحقیقت ان کی تعلیم انگریزی میں امداد کرنا پوری حسنات میں داخل ہے مگر سرکار عالیہ کو یا عموماً مسلمانوں کو اس خیال کی طرف ...... محالات سے ہے۔

مدرسۃ العلوم میں مسجد کی تعمیر مکمل نہ ہونے سے درحقیقت طالب علموں کو نماز کی تکلیف ہے۔ نواب سر آسمان جاہ نے جس قدر روپیہ دیا تھا اس سے مسجد کرسی تک تعمیر ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی پر ایک چھپر ڈال دیا ہے جس میں نماز ہوتی ہے۔ دو سو طالب علموں کے قریب پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں۔ ان کے وضو کے لیے پانی کا اہتمام بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے کنواں بھی بن رہا ہے، مسجد کے صحن میں وضو کے لیے حوض بھی بن رہا ہے۔ اگر سرکار عالیہ مسجد ہی کے لیے تائید فرمائیں گی تو بہتر ہے اسی کی کسی قدر تکمیل ہو جاوے گی۔ میں کل یہاں سے علی گڑھ جاؤں گا اور وہاں پہنچ کر کوئی تاریخ روانگی بھوپال مقرر کر کے آپ کو اور وزیر صاحب کو اطلاع دوں گا۔ ہمارے سب کام توکلاً علی اللہ ہوتے ہیں، جو خدا کو منظور ہوگا ہوگا ؎

کار ساز ما بفکر کار ماست
فکر ما در کار ما آزار ماست

جو خدا کو منظور ہے وہ ہوگا۔ مگر آپ نے جو سعی و کوشش کی اس کا شکر ہم پر واجب اور اجر دینا خدا کے اختیار میں ہے۔ والسلام علیکم!

خاکسار

سید احمد۔ الہ آباد ۸ اگست ۱۸۹۱ء

---

(۳)

بنام نواب سید علی حسن صاحب

جناب مخدومی و مکرمی!

بجواب عنایت نامہ ملتمس ہوں کہ جو آپ کی خوشی ہے اوس کی تعمیل میں ہم سب کو افتخار ہوگا۔ تعمیل ارشاد ہو گی۔ بعد نماز مغرب ہم سب حاضر دولت خانہ ہوں گے اور وہاں سے کھانا کھا کر اسٹیشن چلے جاویں گے۔

خانہ آباد دولت زیادہ   والسلام!

خاکسار سید احمد ۳ر ستمبر ۱۸۹۱ء

---

(۴)

بنام نواب علی حسن مرحوم

مخدوم مکرم بندہ جناب ابوالنصر نواب سید علی حسن خان بہادر

بعد سلام مسنون التماس یہ ہے کہ بلحاظ اس شفقت اور عنایت کے جو آپ کو میرے حال پر ہے اور بلحاظ اس قومی ہمدردی کے جو مسلمانوں کی ترقی اور بہبودی کی آپ کے دل میں ہے۔ مجھے جرات ہوتی ہے کہ آپ کی خدمتِ عالی میں ایک ضروری التماس کروں۔

آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ دفتہً مدرسۃ العلوم کے ہیڈ کلرک نے بذریعہ جعلی چکوں کے ایک زر خطیر زر امانت مدرسۃ العلوم میں سے جو بنک میں جمع تھا غبن و تصرف کر لیا جس کے سبب سے نقصان کثیر زر امانت مدرسۃ العلوم ہو گیا۔ اگر وہ غبن و تصرف صرف زر امانت ہی میں ہوتا تو صبر کیا جاتا۔ مگر اس غبن و تصرف کے سبب چوالیس ہزار روپیہ بنک کا مدرسہ پر فاضل ہو گیا اور اگر زر فاضلات کی ادا کی جلد تر تدبیر نہ کی جاوے تو اس کا سود اس قدر بڑھ جاوے گا جس کا ادا کرنا ناممکن ہو گا۔ اس لیے یہ تجویز ہوئی ہے کہ اس زر فاضل کو چندہ باہمی سے جس قدر جلد ممکن ہو ادا کیا جاوے۔ چنانچہ اس کے لیے چندہ لکھو لیا گیا ہے اور احباب اور ٹرسٹیان کالج نے قریب دس ہزار روپیہ کے چندہ دینے کا وعدہ کیا ہے اور اور لوگوں نے بھی اس میں چندہ دیا ہے۔ اس لیے میں آپ سے تین امر کی درخواست کرتا ہوں اور امید ہے کہ آپ اس پر توجہ فرمائیں گے۔

اول یہ کہ آپ بھی اپنی ذاتِ خاص سے اس نقصان کو پورا کرنے میں کچھ امداد فرماویں تاکہ زر فاضل بنک کا ادا کیا جاوے

دوسری درخواست یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو حضور جناب بیگم صاحبہ سے بھی اس باب میں عرض و معروض کریں۔ اگر جناب ممدوحہ بھی کچھ عنایت فرماویں گی تو اس وقت میں نہایت مدد پہنچے گی۔

اگرچہ میرا ارادہ تھا کہ حضور جناب بیگم صاحبہ کی خدمت میں بھی کوئی عرضی لکھوں۔ مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اگر آپ سے اس باب میں کچھ ممکن ہو تو عرض معروض کیجئے۔

تیسری درخواست یہ ہے کہ علاوہ اپنی ذات خاص اور حضور جناب بیگم صاحبہ کے اور لوگوں سے بھی اگر ممکن ہو تو اس امر کے لیے کچھ چندہ وصول کیجئے۔ آپ کی کوشش اور سعی سے امید ہے کہ کچھ نہ کچھ وصول ہو جائے گا۔ والسلام علیکم۔

خاکسار

سید احمد - علی گڑھ

۱۲ر جون ۱۸۹۶ء

(۵)

بنام نواب سید علی حسن مرحوم

جناب مخدوم و مکرم معظم من ابوالنصر نواب سید محمد علی حسن خان بہادر!

محمد یعقوب علی صاحب احکام نگار روبکاری جناب کا خط مورخہ ۷؍ستمبر ۱۸۹۶ء معہ نصف قطعہ نوٹ ہائے تعدادی ایک ہزار روپیہ جو آپ نے از راہ فیاضی و شفقت بزرگانہ بتلافی نقصان کالج عنایت فرمایا ہے میرے پاس پہنچا۔ میں آپ کی عنایت اور نوازش کا دل سے شکر ادا کرتا ہوں اور شکر ادا کرتا رہوں گا۔ اور یہ عریضہ نیاز بطور رسید نصف قطعہ ثانی نوٹ مذکور خدمت عالی میں مرسل ہے

والتسلیم مع التعظیم! خاکسار

سید احمد۔ علی گڑھ۔ ۸؍ستمبر ۱۸۹۶ء

محمد حسین آزاد

(۱)

بنام محمد نوح رضوی مچھلی شہری

آپ کے حسن الظن کا خیال قابل ہزار تعریف کے ہیں اور یہ عنایت خاص جو بندۂ آزاد کے حال پر مبذول ہوئی ہے اس کا تو شکریہ ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں اپنی طبیعت کا حال کیا بیان کروں۔ آپ تصویر منگاتے ہیں۔ میرا یہ حال ہے کہ کئی برس ہوئے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ کبھی آئینہ سامنے آ جاتا ہے تو اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا۔ جو شخص خود اپنی صورت دیکھ کر شرمائے اسے فوٹوگراف اتروانا اور تصویر کو اس عالم شہیر کرنا کب گوارا ہوگا۔

دو برس ہوئے ایک دوست رستے میں سے بہانہ کر کے مجھے لے گئے اور میری تصویر اتروائی۔ اگرچہ رنج ہوا۔ مگر پھر شکر خدا کیا کہ الحمد للہ اسے صحیح الاعضا اور سلیم الصورۃ پیدا کیا ہے اور رکھا ہے۔ حقیقتاً اب میں اپنا حال کیا عرض کروں۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد آج انشاء اللہ نہانے کا ارادہ ہے، اگر خدا پورا کرے۔ کیا کروں فرصت نہیں ہوتی اور جو وقت بچتا ہے کہتا ہوں کہ چار سطریں لکھوں گا۔ نہانے کو پھر دیکھ لیا جائے گا۔ آج کل دربار اکبری لکھ رہا ہوں۔ اس میں اکبر کے امرائے دربار کا حال آپ اسی طرح پڑھیں گے۔ جس طرح آب حیات میں شعرائے اردو کا۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ ہر ایک امیر کے حال کے بعد اس کی تصویر بھی ہو۔ چند تصویریں بہم پہنچائی ہیں۔ مگر بعض اب تک نہیں ملیں۔ اگر آپ کے ذریعہ سے ممکن ہو تو مزید مطلع فرمائیں۔

محمد حسین عفی عنہ۔ فروری ۱۸۸۶ء

---

(۲)

بنام میجر حسن حیدر آباد

جناب من! ادام اقبالکم و وصل اللہ آمالکم!

تسلیم ۔ آپ کا مرحمت نامہ تو پہنچا مگر اس نے رنج کو دوبالا کیا۔ کیونکہ نہایت دل شکستگی پائی جاتی تھی۔ بے دل ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ مولیٰ اسداللہ الغالب موجود ہیں۔ انشاءاللہ پہلے سے اچھا ہوگا۔ میں نے انہیں احتیاطاً کچھ نہیں لکھا۔ آپ لکھ بھیجیے گا کہ رجوع قلب سے عرض کرتے ہیں۔ سب مشکلیں آسان ہوں گی ؎

تجھے پھر کون سی مشکل ہے اے میرؔ
اگر تیرا علی مشکل کشا ہے

میں گنہگار روسیاہ کس منہ سے کہوں کہ دعا کرتا ہوں۔ خیر جو کچھ ہے خدا قبول کرے۔ دنیا کے اعتبار سے اتنا ہوا کہ جہاں جہاں ہوسکا خیالات کو ہلا، جہاں جہاں ہوسکا قلم کو رسائی دی ہے۔ جو کچھ خدمت میں پہنچا ہے ملاحظہ فرمائیے گا۔ میرے پاس کیفیت احوال کے پہنچنے کا کوئی رستہ نہیں، آپ ہی کوئی تسلی نامہ لکھیں تو لکھیں اگرچہ غیروں کو اس بات کا یقین نہ آئے لیکن غالباً آپ کے دل پر اس فقرہ کا اثر ہوگا کہ مجھے شاید ہی کچھ آپ سے کم رنج ہو۔ میں رویا اور میں نے میرے میاں نے اس مرحوم کی نمازِ میت پڑھی۔ مجھے امید نہیں کہ ان کے بیٹوں نے پڑھی ہوگی۔ حضرت آپ ہم لوگوں کو نہیں جانتے آپ کے جدّ جانتے ہیں۔ ہم کچھ اور لوگ ہیں۔ اللہ ان کے صدقے سے، ان کی خاکِ آستان کے صدقے سے، ان کے کتوں کے صدقے سے خیر و برکت شاملِ حال رکھے۔ اور فی الحال تو میری عرض ہے کہ خدا آپ کی بات کو بنا دے۔

فقط والدعا ، بالتماس الدعا !

آزاد ، ۱۵ ر فروری ۱۸۸۳ء

امیرؔ مینائی

(۱)

بنام منشی محمد عسکری تسنیم ترمذی خیر آبادی

نورِ چشم من ۔ کل قطعات تاریخ بھیج چکا ہوں۔ ایک قطعہ تاریخی اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے، اس کے بعد خیال آیا کہ نام سے تاریخ پیدا کی جائے۔ اس وقت ایک صورت سے موزوں ہوئی اس کو لکھے بھیجتا ہوں۔ اگر یہ قطعہ پسند ہے تو خیر ؎

خفت کہ باز بخاک دکتمند اشد سینہ چاک
طالعش در گردش از دور نجوم آمد کنوں
سال مرگ از نام آں مرحومہ پیدا کرد امیرؔ
در ریاض فاطمہ باد سموم آمد کنوں

۱۲۹۹ = ۱۵۳ + ۱۱۴۶

چاہیے کہ رسید دونوں تاریخوں کی اور کیفیت پسند اور ناپسند سب عزیزان و یارانِ انجمن کے لکھ بھیجیے اور جس تاریخ کا کندہ ہونا قرار پائے اس سے بھی اطلاع دیجیے۔ میرے ایک شفیق سخنور شیرازی میرے پاس تشریف رکھتے تھے انہوں نے اس تاریخ

کو پسند کر کے دو مصرعے اوّل کے اس طرح موزوں کیے :-

اندریں ماتم سرا نادیدہ چشم روزگار
ماتم زنیساں کہ از دور نجوم آمد کنوں

۱۷؍ جنوری ۱۸۸۲ء راقم آثم امیر احمد از رامپور

---

(۲)

بنام مرزا داغ دہلوی

مصدرِ لُطفِ اتم۔ قدیمِ مکرم سلامت۔ سلام مسنون اخلاص مقرون۔ مدت کے بعد نوازش نامہ[1] آیا۔ ممنون یاد آوری فرمایا۔ بندہ نواز! مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی خط کا جواب قلم انداز کیا ہو۔ یہ میرے مقدر کی نارسائی کہ خط نہ پہنچا ہو۔ بہرکیف جرم ناکردہ کا عذر خواہ ہوں۔ اخبار گورکھپور میں ریاض نے آپ کا مخاطب بخطاب استاد السلطان ہونا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہونا چھاپا، یہ دیکھ کر نہایت مسرور ہوا تھا۔ مگر اس تحریر میں[2] ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ سرور کھٹک گیا۔ عزت افزائی جو سرکار دولت مدار نے تلمذ سے فرمائی وہ میرے سرور اور آئندہ ترقیوں کی امیدوں کو بڑھا رہی ہے خدا جلد ظہور میں لائے۔

شکایت جو آپ نے "صنم خانۂ عشق" دیوان دوم کے نہ پہنچنے کی لکھی ہے وہ دیوان چھپا کہاں؟ ورنہ ممکن تھا کہ نہ پہنچتا۔ "تالیفات کہنہ کا حضور میں آپ کے واسطے سے نہ پہنچنا معاذ اللہ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ نے رشک و حسد سے نہ گزرانیں افسوس کہ اتنی مدت تک یکجائی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بدگمانیاں باقی ہیں۔ میاں بوڑھے ہو گئے ہو یہ شیوہ چھوڑ دو کہ زبردستی رکاوٹ کے لیے ایک بات قرار دی ہے۔

اوّل[3] تو میں خطاب لینے ہی کے قابل اپنی قابلیت کو نہیں سمجھتا اور پھر درخواست دے کر خطاب مانگنا یہ تو بالکل پسند نہیں۔ میاں! اب تو وہ وقت آگیا کہ مرحوم و مغفور کا خطاب بارگاہ شہنشاہ حقیقی سے عطا ہو۔ کوئی اور حوصلہ نہیں ہے۔

آپ کا تازہ کلام دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ میں کہتا کیا ہوں جو بھیجوں، جی افسردہ رہتا ہے۔ کبھی کسی گلدستے والے کے اصرار سے کچھ کہتا ہوں تو وہ چھپ جاتا ہے۔ یہ فراغتیں چشم بددور، آپ کے واسطے ہیں کہ شعر کے سوا کوئی فکر نہیں۔ خدا جمعیت خاطر بڑھائے۔

---

[1] ۱۸۹۱ء میں نظام دکن میر محبوب علی خاں نے مرزا داغ کو "استاد السلطان" کا خطاب دیا۔ اخباروں میں اس کا تذکرہ چھپا۔ امیر مینائی نے بھی دیکھا۔ انہی دنوں میں مرزا داغ کا خط امیر کے پاس آیا۔ لیکن انہوں نے اپنے خطاب و اعزاز کا ذکر نہ لکھا تھا۔ اس خط کے جواب میں امیر صاحب نے یہ خط لکھا۔

[2] یعنی مرزا داغ کے خط میں۔

[3] مرزا داغ نے اپنے خط میں امیر صاحب کے خطاب کے متعلق استفسار کیا ہوگا اس کا جواب ہے۔

ارے یار[1]، "استادالسلطان" ہونے کی مٹھائی تو لا: "یا اُستاد، یا اُستاد" برسوں کہا گیا ہے۔ اب جو وقت آیا تو اُستاد کی شیرینی ندارد۔ امید ہے کہ کبھی کبھی ہم رسل و رسائل رہے۔ میں ابتدا سے تمہارا دوست اور خیرخواہ ہوں۔ میری طرف سے گمان فاسد نہ کیا کرو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

۳۱ر مارچ سنہ ۹۱ء　　　امیر فقیر

داغ

(۱)

بنام نواب حسن علی خاں امیر جاگیردار

نواب صاحب تغافل شعار سلمہ اللہ تعالیٰ

تین دن سے خط کا منتظر ہوں، جواب ندارد۔ لفظ بی جو شرفا کے واسطے ہے اس پر خفا ہوں میں نے خوب جھاڑا ہے۔ پانچ روپیہ لڑکی سے لائیں پچاس یہاں سے گئے دس آپ سے مانگتی ہیں ذرا ان کو جھاڑ دیجئے گا۔ میں نے جو ان کو خط لکھا ہے۔ وہ اتا کے خط میں ہے اس کو اتا سے لے کر آپ پہنچائیں تو بڑی عنایت۔ ایک غزل ملفوف اور بھیجتا ہوں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ پہلی سب غزلیں بلیتھنہ میں صاف چڑھ گئیں کہ ابھی کوئی باقی ہیں۔ یہاں خیریت ہے۔ گرمی کی شدت ہے۔ بچوں کو دعائیں۔ فقط

فصیح الملک داغ دہلوی یکم جون ۱۹۰۳ء مطابق ۵ر ربیع الاول ۱۳۲۱ھ

---

(۲)

بنام نواب حسن علی خاں امیر جاگیردار

نواب صاحب سلام!

میں خیر کا طالب ہوں، حرج کا منتظر نہیں۔ مرمت کی کیا صورت ہوئی اس بارش میں مشکل ہے۔ بی حجاب کل سے وارد ہیں۔ اور آپ کی مشتاق۔ ان کا مکان گرا، جان بچ گئی۔ اس کی مرمت ہو رہی ہے یہاں تو ٹھکانا نہیں۔ زیادہ نیاز!

فصیح الملک داغ دہلوی

یکم اگست ۱۹۰۳ء مطابق ۷ر جمادی الاول ۱۳۲۱ھ بروز یک شنبہ

---

[1] اس بے تکلفی اور خلوص کا کیا کہنا!

ڈپٹی نذیر احمد

(۱)

بنام نواب سیّد علی حسن خان بہادر

جنابِ عالی!

کرامت نامہ پہنچا۔ میں نے حقیقت واقعی بے کم و کاست بالمشافہ عرض کر دی تھی۔ اب کامیابی ہو تو اور ناکامی ہو تو دونوں صورتوں میں جناب کا احسان میرے ذمہ ثابت ہو چکا اور میں مدت العمر ممنون رہوں گا۔ اگر کسی مقابل کے لیے سفارش نہیں کی گئی تو ناکامی کا احتمال ضعیف ہے۔ لیکن آپ نے خط میں اس کی کچھ صراحت نہیں فرمائی۔ رہی حکام انگریزی کی سفارش اس کا حال یہ ہے کہ بیس برس سے میں سرکار انگریزی سے بے تعلق محض ہوں۔ دس برس کے قریب حیدر آباد رہا اور اس کے بعد سے خانہ نشین ہوں۔ از بسکہ خدمت کی جستجو نہ تھی۔ طبیعت نے بے فائدہ خوشامد اور درباداری کو گوارا نہ کیا۔ لیکن جس وقت تک میں سرکار انگریزی میں تھا۔ لیفٹیننٹ گورنر تک کے سرٹیفکیٹ کتاب میں آپ نے ملاحظہ کیے ہوں گے۔ بڑی خدمت کے لیے بڑے عہدیداروں کی سفارش درکار ہے اور یوں دلّی کے ڈپٹی کمشنر اور کمشنر مجھ کو جانتے پہچانتے ہیں ان لوگوں نے میرے لیکچر سنے ہیں اور رمزہ میری نسبت اچھا خیال رکھتے ہیں اور پوچھا جائے تو اچھا ہی ظاہر کریں گے۔ لیکن میں ان کی کوٹھیوں پر ان کے سلام کو بھی نہیں گیا۔

چونکہ آپ نے ایک طرح کا تعلق اس معاملہ سے پیدا کر دیا ہے۔ وقتاً فوقتاً مجھ کو اطلاع ہوتی رہے تو مزید عنایت

خاکسار نذیر احمد ۳ر دسمبر ۱۸۹۶ء

---

(۲)

بنام نواب سیّد علی حسن خان بہادر

جنابِ عالی!

السلام علیکم! آپ کو شاید معلوم ہے کہ میں نے بڑی محنت سے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ مجھ کو اس کے لیے تین برس محنت شاقہ اٹھانی پڑی ہے اور تراجم موجودہ اور تفاسیر اور احادیث سے مطابق کرنے کے لیے مولویوں کا اسٹاف رکھنا پڑا ہے تب کہیں جا کر یہ ترجمہ میرے نزدیک بامحاورہ سلیس، مطلب خیز، مستند اور تراجم موجودہ سے بہت بہتر ہوا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ اشارات بھی لکھ دیئے گئے ہیں اور منظور یہ ہے کہ ان اطراف میں اچھی طرح اعلان کر دیا جائے کہ قرآن مجید کا نیا ترجمہ مل سکتا ہے۔ پہلے آپ دیکھ دکھا کر اچھی طرح اطمینان حاصل کر لیجئے کہ آیا واقعی میں یہ ترجمہ تراجم موجودہ سے بہتر ہے یا نہیں اور اگر آپ کے نزدیک بہتر ثابت ہو تو آپ اس کی سرپرستی کیجئے۔ کیونکہ اس کی اشاعت میں مدد دینا گویا اغراض رسالت کی تکمیل کرنا ہے بلکہ اگر

آپ کر سکیں تو اس ترجمہ کی کیفیت کو سرکار کے گوش گزار کریں اور ان سے سرپرستی کی تحریک فرمائیں۔ ترجمہ کے حجم اور سواد خط اور چھاپے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قیمت جو قرار دی گئی ہے۔ اس میں کوئی ذاتی مفاد مضمر نہیں ورنہ میں اگر اپنی محنت اور مولویوں کی تنخواہ لگاتا تو عــــہ فی جلد لاگت پڑتی۔ مگر میں نے یہ کام احتساباً کیا ہے۔ ان اجری الا علی اللہ

میرٹھ میں آپ سے تفصیلی ملاقات نہ ہونے کا افسوس باقی رہ گیا۔ ترجمہ تو ہدیۃً آپ کی خدمت میں روانہ کیا گیا ہے۔ اور صرف خرچہ کا ۔ ۔ ۔ کیا گیا ہے براہ مہربانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کر لیجئے گا۔ فقط!

خاکسار۔ نذیر احمد ۵ر جنوری ۱۸۹۷ء

---

(۳)

بنام خان بہادر بشیرالدین احمد، اٹاوہ

(جواب خط یکم دسمبر ۱۹۰۳ء)

السلام علیکم۔ سب سے پہلے میں آپ کو مرگ عزیز پر جس کی مرگ کا حال آپ نے اخبار میں بھی چھاپا ہے۔ تعزیت عرض کرتا ہوں۔ اگرچہ آپ محتاج تلقین نہیں ہیں۔ حمائل شریف کی جلد بندی کے دام لعـــہ ہیں۔ پچیس جلدیں آپ طلب فرماتے ہیں۔ جس کی بابت استفسار طلب بات یہ ہے کہ کمیشن جو آپ منظور کرتے ہیں اس کی تعداد کیا ہے۔ مجھے یاد نہیں اور نہ میرے پاس کوئی اس کی یادداشت ہے۔ کانفرنس کی شرکت موقوف ہے۔ اعتدال مزاج پر قائل ہوتا ہے۔ دو وجہ سے، اول دور دراز سفر، دوسرے وہاں کے لوگ اردو کم سمجھتے ہیں اور اکثر نہیں سمجھتے۔ البتہ آپ کا اور آپ جیسے لوگوں کا شریک کانفرنس ہونا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ میں تو اتنے ہی کام کا ہوں کہ فرسودہ مستعمل پیش پا افتادہ باتوں کا کھڑے ہو کر اعادہ کر دیا۔

اخبار کی نسبت مجھ کو یہ کہنا ہے کہ عربی کا اہتمام جیسا چاہیے نہیں۔ مذہبی مضامین بھی بعض بُرے ہوتے ہیں۔ جیسے کسی شخص نے آپ کے اخبار میں لکھ مارا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے پابندی مذہب ضروری نہیں۔ ابھی شاید پچھلے پرچے میں کسی صاحب نے وخلقنا لہم مما یرکبون سے ریل کی پیش گوئی استنباط کی۔ لغو، بے اصل، بے جا، بے ضرورت۔ ایسی باتوں سے قرآن کے ظاہر الفاظ سے اعتبار اٹھا جاتا ہے۔ اس قسم کے مضامین آپ کے اور آپ کے اخبار کے شایان شان نہیں اور میرے نزدیک ایسی باتوں سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے۔

ہاں ـــــ حمائلیں جو مجلد جائیں گی ان کی جلد قسم اول ہوگی جس سے اسے قسم ادنیٰ پڑتا۔

خاکسار، نذیر احمد۔ ۴ر دسمبر ۱۹۰۳ء

مولانا حالی

(۱)

بنام محسن الملک[1]

جناب مولوی صاحب محترم و مکرم و معظم دوام مجدہم

بعد تسلیم و نیاز کے التماس یہ ہے کہ دو جلدیں کتاب "حیاتِ سعدی" کی اور دو جلدیں "مدّ و جزرِ اسلام" کی خدمتِ والا میں ارسال کرتا ہوں۔ ان سے دو سادی جلدیں آپ کے ملاحظہ کے لیے اور دوسری دو جلدیں جن پر روپہلی ٹھپہ کیا ہوا ہے حضور نواب صاحب بہادر دام اقبالہم کی نذر کے لیے ہیں۔ پہلی کتاب میں نیازمند نے شیخ سعدی کی لائف اور ان کی تمام تصانیف پر ریویو کسی قدر جدت کے ساتھ لکھا ہے جس پر منشی محمد ذکاء اللہ صاحب کا ریویو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ مورخہ ۱۶ مارچ میں چھپا ہے اور جس کو پنجاب اور اضلاعِ شمال و مغرب کے معتبر اشخاص عموماً پسند کرتے ہیں۔

دوسری کتاب یعنی مدّ و جزرِ اسلام کے آخر میں ایک نیا ضمیمہ ۱۹۰ بند کا اکثر احباب کی تحریک سے اضافہ کیا ہے جس کی نسبت ابھی میں نہیں کہہ سکتا کہ پبلک کی کیا رائے ہوگی۔

غالباً جناب کو کثرتِ مہماتِ مرجوعہ کے سبب یاد نہ رہا ہوگا لیکن نیازمند کو خوب یاد ہے کہ ان دونوں کتابوں کی نسبت جب کہ ان کی ترتیب و تدوین ختم نہ ہوئی تھی، خاندانِ سامی کی طرف سے مختلف اوقات میں اعانت و خریداری کی امید دلائی گئی تھی اور زیادہ تر اسی امید کے بھروسے پر ان دونوں کتابوں کے ایک ساتھ چھپوانے کی جرأت کی گئی ہے۔ التماس یہ ہے کہ اگر ان کتابوں کی اشاعت اس ملک میں مفید سمجھی جائے تو از راہِ نوازش و کرم دونوں نسخے جو حضور نواب صاحب بہادر کی نذر کے لیے ارسالِ خدمتِ والا کیے جاتے ہیں، مع عرضداشت منسلکۂ نیاز نامہ پیش گاہ جناب مشارٌ الیہ میں گزران کر جس قسم کی اعانت یا رعایت ممکن ہو اس کے لیے سفارش فرمائیں۔

جو محنت اور زیر باری مجھ کو برداشت کرنی پڑی ہے اس کا تدارک خاطر خواہ ہو جائے گا۔ اگرچہ ہندوستان میں مصنف کی وقعت ایک بک سیلر سے زیادہ نہیں ہے اور نہ میرا کوئی حق آپ پر ایسا ہے جس کے سبب سے میں آپ کو ایسی تکلیفیں دینے کا مجاز سمجھوں لیکن سچ یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ہم لوگوں کو ایک حسنِ ظن اس قسم کا ہے کہ جس امر کی تحریک کو ڈھائی برس سے زیادہ گزر چکے ہیں آج تک اس سے قطعی مایوسی نہیں ہوئی۔ خیر کامیابی تو بہت مشکل ہے، اگر یہ امید بھی قائم رہے تو غنیمت ہے

زیادہ نیاز

نیاز نامہ خاکسار الطاف حسین حالی از دہلی کوچہ پنڈت ۲۶ مارچ ۱۸۸۶ء

---

[1] غالباً یہ خط موسومہ ہے نواب محسن الملک کا اور اسی سلسلہ میں ان دونوں کتابوں کی جلدیں حیدرآباد میں خریدی گئیں جنکی سالار کی نقول اور عبدالرحیم خاں کے موسومہ خط کی نقل موجود ہے۔ اصل خط میرے پاس محفوظ ہے (تمکین کاظمی)

(۲)

بنام مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب رئیس بھیکم پور

جناب من!

لفظ ہاتھ میں بلا شبہ ہائے مخلوط ہے۔ لیکن رات اور بات کا قافیہ بھی شعرا نے باندھا ہے۔ قافیے کی ضرورت ایسی ایسی خفیف فروگذاشتوں کو جائز کر دیتی ہے۔ مرزا غالب کبھی اور کسی کی جگہ کبھو اور کسو کو غیر فصیح سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے اردو دیوان میں قافیے کی جگہ کسو اور کبھو بندھا ہوا ہے۔ میں بھی ہمیشہ ہاتھ کو ہائے مخلوط کے ساتھ لکھتا ہوں۔ مگر قافیے میں ہات باندھنا جائز سمجھتا ہوں۔

نیازمند

خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت محلہ انصاریان ۷ر فروری ۱۸۹۰ء

---

(۳)

بنام مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب رئیس بھیکم پور

مخدومی!

مہمان ناخواندہ عزیز تر از مہمان خواندہ پہنچا باوجودیکہ آج کل ضیق فرصت کے سبب مطبوعات جدیدہ کے مطالعے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ اسی حالت میں قریب نصف کے رسالہ علمائے سلف کو دیکھا گیا۔ افسوس ہے کہ مجھے اس عمدہ تصنیف پر مفصل ریمارک کرنے کی فرصت نہیں ہے مگر مختصر یہ ہے کہ اس رسالے نے میرے دل میں آپ کی محبت اور عظمت بہ نسبت سابق کے اضعاف مضاعفہ کر دی ہے۔ مسلمانوں کے لٹریچر میں اپنی طرز کی یہ پہلی کتاب ہے شاید کوئی ناواقف آدمی یہ کہے کہ کیا مسلمانوں نے فن رجال میں ایسی صدہا کتابیں نہیں لکھیں مگر ایسا سوال کرنا سخت غلطی کی بات ہے۔ آپ نے درحقیقت وہ کام کیا ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر سموئل نے سلف ہیلپ کے لکھنے میں کیا ہے۔ اس نے بھی ہزاروں بائیوگرفیاں پڑھ کر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جس سے بہتر آج تک کوئی کتاب انگریزی میں اس طرز کی نہیں لکھی گئی۔ مسلمان علما کے حالات لکھنا اور بات ہے اور تمام بائیوگرفیوں کو دیکھ کر چند عنوان تجویز کرنے اور ہر عنوان کے مناسب اس دفتر طویل الذیل سے مضامین انتخاب کرنے اور ان کو جدا جدا عنوانوں کے تحت میں درج کرنا نہایت محنت اور لیاقت اور غور و فکر کا کام ہے آپ کی تصنیف میں اور مسٹر سموئل کی کتاب میں صرف یہ فرق ہے کہ اس نے سلف ہیلپ میں کتاب کا موضوع صرف علما میں محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں تمام ریفارمر اور موجد و مخترع اور سٹیٹسمین اور سپہ سالار وغیرہ وغیرہ شامل ہیں اور اس رسالے میں صرف علمائے سلف کے حالات سے بحث کی گئی ہے اگر آپ اس کے دائرے کو زیادہ وسیع کر دیتے تو یہ بالکل اسی قسم کی کتاب ہو جاتی جیسی سلف ہیلپ ہے۔ اس کتاب میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ مگر میں نے صرف ایک خوبی کا جو کہ تمام تصنیف کی جان ہے ذکر کرنا کافی سمجھا ہے

میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ انگلش لٹریچر سے واقف نہ ہوتے تو ایسی تصنیف کا خیال ہرگز آپ کے دل میں نہ گزرتا

پس تا وقتیکہ ندوۃ العلما انگریزی تعلیم کی ضرورت پر زور نہ دے گی اس کی چیخ و پکار سے کوئی معتد بہ نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا اسی کے ساتھ میرا یہ بھی خیال ہے۔ کہ انگریزی تعلیم جب تک کہ اس میں مشرقی تعلیم کی چاشنی نہ دی جائے گی۔ ہرگز مفید آدمی پیدا نہیں کر سکتی۔ مجھے ایک انگریزی تعلیم یافتہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جو مسلمان علماء کے حالات پر ایک ایسی کتاب لکھ دے جیسی کہ آپ نے لکھی ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کی ایک ایک دو دو جلدیں ہر مدرسۂ اسلامیہ میں رہنی چاہئیں بلکہ محمڈن کالج کے طلبا بھی اس سے مستفید ہوں تو بہت مناسب ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کتاب آپ نے اپنے خرچ سے چھپوائی ہے یا ندوۃ العلماء نے اس کو چھپوایا ہے۔ مسلمان اور خاص کر پرانے خیالات کے مسلمان ایسی کتابوں کے خریدنے میں بہت ممسک ہیں۔ اس لیے مدارس اسلامیہ میں اس کو مفت تقسیم کرنا چاہیئے۔ آخر میں میری یہ دعا ہے کہ خدا تعالٰے ہمارے عام رئیسوں اور رئیس زادوں کو اسی طرح زیورِ علم و لیاقت و حسنِ اخلاق سے آراستہ کرے جیسا کہ اس نے ثروانی رئیسوں میں آپ کو زیورِ علم و فضل و اخلاق سے آراستہ کیا ہے اور آپ کو جملہ آفات روزگار سے محفوظ رکھ کر صدوسی سال تک زندہ و سلامت رکھے۔

زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی عفی عنہ از پانی پت ۱۰ ستمبر ۱۸۹۸ء

نواب محسن الملک

(۱)

بنام منشی ذکاء اللہ صاحب

محترم و مکرم بندہ شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب زاد لطفہٗ

مولوی سید احمد مصنف فرہنگ آصفیہ جن کی چار سو کتابیں سرکار نے خرید فرمائی ہیں یہاں آئے اور جناب نواب مدار المہام سرکار عالی کی ملازمت حاصل کی۔ نواب انتصار جنگ[1] بہادر اور بندہ نے بھی ان کے مشکلات جو کتاب کے چھاپہ کے ختم ہونے میں پیش ہیں سنیں اور سرکار میں عرض کیا کہ کسی طرح اس کتاب کا نام ہو جانا چاہیئے تاکہ جس غرض سے سرکار نے چار سو جلدیں خریدی ہیں وہ حاصل ہو اور اس پر یہ امر قرار پایا ہے کہ یہ معاملہ آپ کے سپرد کیا جاوے اس لیے میں آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ مہربانی کر کے اتنی محنت اپنے اوپر گوارا فرمایئے کہ جو معاملہ ان کا ساہوکار سے ہے وہ کس طور پر ہو سکتا ہے اور وہ کس طرح اس کے پنجے سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اور سرکار کی کیا مدد اس کام میں مطلوب ہے اور آئندہ باقی ماندہ کتاب کے چھاپنے کے لیے یہ بہتر ہو گا کہ سرکاری مطبع حیدرآباد میں چھپوائی جاوے اور مولوی سید احمد صاحب اس کی تصحیح یہاں آکر یا وہاں رہ کر کر دیا کریں۔ آپ سے بہتر اس کام کے واسطے دوسرا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے آخری تصفیہ اس کا آپ کی رائے عالی پر عدہ

---

[1] نواب وقار الملک۔

طور پر ہو سکے گا۔ زیادہ نیاز!

محسن الملک ۱۱ر جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ (۲ر فروری ۱۸۹۰ء)

---

(۲)

بنام نواب سید علی حسن

جناب مخدوم مکرم بندہ نواب علی حسن خان بہادر

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں اور امین الدین کے ذریعہ سے آپ کا پتہ بھی دریافت کیا تا کہ خط لکھوں مگر پتہ معلوم نہ ہوا۔ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے عنایت نامہ بھیج کر یاد فرمایا۔

آپ نے جو خواہش فرمائی ہے وہ تمام قوم کی ممنونی کا باعث ہے۔ آپ کو قومی ہمدردی تو ہمیشہ سے ہے اب وہ آتش اور مشتعل ہو گئی ہے۔ یہ قوم کی خوش نصیبی ہے۔ اگرچہ آپ کا بھوپال سے تشریف لانا دشمنوں کو پسند ہوا ہو، قوم کے لیے مفید ہوا۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد
خمیر مایۂ دکان شیشہ گر سنگ است

قوم کی پہلی خدمت تو یہ ہے کہ آپ تعلیمی معاملات پر وقتاً فوقتاً کچھ مضمون لکھ کر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بھیج دیا کیجیے۔ دوسری یہ ہے کہ اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کو قومی کاموں پر متوجہ کیجیے اور عمدہ مشورہ اور صلاحیں ہم کو دیا کیجیے۔ ایک تجویز ہو رہی ہے کہ تعداد ٹرسٹیوں کی زیادہ کی جائے۔ اس وقت جتنی جگہ ہیں وہ سب معمور ہیں۔ اگر یہ تجویز منظور ہوئی تو ٹرسٹیوں کی فہرست میں آپ کا معزز نام بھی جلد نظر آوے گا مگر ٹرسٹی ہونا اور نہ ہونا اور بات ہے۔ آپ کی شان اس سے ارفع اور اعلیٰ ہے اور آپ سے ہر طرح کی مدد ملنے کی امید ہے۔

میں ایک درخواست جو نہایت چھوٹی ہے کرتا ہوں، یقین ہے کہ آپ اس کو منظور فرما دیں گے یعنی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو آپ خرید کریں جس کی سالانہ قیمت عہ ہے اور اگر معاونین میں آپ داخل ہونا چاہیں تو عہ یا للعہ آپ دے کر اس کو مدد دے سکتے ہیں۔ پچھلا اخبار بطور نمونہ آپ کی خدمت میں مرسل ہے۔

محسن الملک، از علی گڑھ یکم اگست ۱۹۰۲ء

---

(۳)

بنام مولوی بشیر الدین

مخدومی مولوی بشیر الدین صاحب!

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور کیونکر آپ کے ساتھ کام کروں۔ ایک بری عادت آپ میں یہ ہو گئی ہے کہ آپ

خطوں کا جواب نہیں دیتے۔ اگر دو سطریں جواب بھی دے دیا کرو تو اس قدر تو معلوم ہو کہ تم زندہ ہو اور مرے نہیں میں نے تم کو تین خط لکھے مگر ایک کا بھی جواب نہیں آیا تمام دنیا میں پارسال کی طرح پھر میری ذلت اور رسوائی ہوگی۔ کہ وقت پر کام نہ ہوا۔ آپ نے نہ اس وقت تک رزولیوشن بھیجے نہ چندہ کی فہرست اور میں اس وقت تک ان سب کمیٹیوں کے ممبروں کو کچھ اطلاع نہیں دے سکا جو مختلف کاموں کے لیے مقرر ہوئے ہیں۔ آج کا اخبار بھی پہنچا اس میں بھی سب کچھ ہے۔ سوائے کانفرنس کے نہ اس کی کچھ کیفیت ہے نہ رزولیوشن۔ اگر ہے تو پریسیڈنٹ کو سختی کے ساتھ برا بھلا کہا گیا ہے یہ طریقہ یعنی جس سختی سے آپ تحریر کرتے ہیں مجھ کو تو پسند نہیں ہے۔ آپ ہی شاید اس کو پسند کرتے ہوں۔ رائے ظاہر کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ سختی سے کام لیا جائے۔ بلکہ خوبی اس میں ہے کہ اپنا مطلب نرم لفظوں میں ظاہر کیا جاتے اور انسانیت اور اخلاق کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ لیکن مجھ کو اس سے کچھ مطلب نہیں، نہ میں آپ کا ناصح ہوں نہ آپ کسی کی سننے والے ہیں۔ ہاں مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ آپ مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں اور وقت پر میرے خطوں کا نہ جواب دیتے ہیں نہ کام کرتے ہیں۔ آپ رزولیوشن اور فہرست چندہ کی بھیج دیجئے یا جواب دیجئے ورنہ میں کوئی دوسرا انتظام کروں گا۔ مجھے پارسال کے سے آثار نظر آتے ہیں کہ باتوں میں دن گذر جاویں گے اور رپورٹ وقت پر تیار نہ ہوگی۔ لیکن میں آپ سے صاف کہے دیتا ہوں کہ میں اب اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر آپ رپورٹ نہ لکھ سکیں تو جن لوگوں نے نوٹ لکھے ہیں ان کو میرے پاس بھیج دیجیے تاکہ میں خود اپنا سر ماروں اور آپ کو آئندہ تکلیف نہ دوں۔

یہ کیا طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے کہ اوّل آپ اخبار میں شائع کر کے کالج کو بدنام اور فضیحت کر دیتے ہیں پھر مجھے توجہ دلاتے ہیں۔ کالج کے طالب علموں پر مشن کا کیا جال چلا اور کیا ہوا جس پر آپ میری توجہ چاہتے ہیں۔ اور درصورت نہ توجہ ہونے کے آپ بذریعہ اخبار کالج کی فضیحت کرنے پر آمادہ ہیں۔ مجھے اس وقت تک کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا بجائے اخبار میں لکھنے کے اوّل مجھے تو اطلاع دی ہوتی۔ یہ کوئی دوستی نہیں ہے نہ کالج کی خیر خواہی کہ آپ ایسی باتیں کہ جس سے مسلمانوں کو کالج کے خلاف جوش پیدا ہو اخبار میں لکھ دیں اور مجھ کو خبر تک نہ کریں اور پھر بھی گول گول لکھیں جس سے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کیا آفت آئی۔ کیا قیامت برپا ہوئی۔ خیر اگر اسی کا نام آزادی اور خیر خواہی ہے تو یہ آپ کو مبارک رہے اور جو آپ کا دل چاہے کریں انوار احمد اور علی محمد کہاں ہیں۔

محسن الملک ۱۵ر جنوری ۱۹۰۲ء

نواب وقار الملک

(۱)

بنام سر سید احمد خاں

جناب قبلہ و کعبہ دام سلامت

تسلیم! آپ کا ارشاد تو بمنزلہ حکم کے ہے جس کے بعد سکوت کے سوا اس قسم کے معاملات میں کچھ چارہ ہی نہیں ہے۔

لیکن جو وجوہ ارشاد ہوئی ہیں اون کی نسبت اس قدر عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ ممبروں میں سے بھی بہت سے ہوں گے جو ان مضامین کو جن کو وہ سن چکے شاید دوبارہ پڑھنے کی تکلیف نہ کریں اور جن ہزاروں غیر ممبروں نے غلط رپورٹ پڑھی ہے، ان کو تو مطبوعہ رپورٹ سے بہت ہی کم تعلق رہے گا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ "پایونیر" اخبار کے انگریزی پڑھنے والوں کے لیے تو اردو مطبوعہ رپورٹ سے کچھ تعلق نہیں اور اس طرح ہزارہا فہمیدہ لوگوں کا خیال اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ کسی بیوقوف مسلمان نے اس بات کی بھی کانفرنس میں رائے دی کہ گورنمنٹ کو چاہیے کہ وہ اپنے موجودہ مسلمان ماسٹروں کے ذریعے سے مذہبی تعلیم بھی کرا دے۔

مگر میں اوپر عرض کر چکا کہ اگر آپ کی رائے سوسیٹی کے اخبار میں جو اردو انگریزی دونوں کا اخبار ہے، اصلاح کی نہیں ہے تو مجھے اس پر کوئی اصرار نہیں ہے لیکن اس حالت میں اپنے آپ کو آزاد سمجھوں گا کہ اگر کوئی موقع مجھے ملے تو میں اپنے اوپر سے اس دھبے کے مٹانے کی کوئی مناسب کارروائی کر سکوں اور اس کے ساتھ وہ دوسری اصلاح ہو گی گو کہ یہ میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ ایسا ہی کروں گا۔ مگر شاید کبھی کروں۔ والتسلیم[1]

خاکسار۔ مشتاق حسین امروہہ ۱۵ مارچ ۱۸۹۳ء

---

(۲)

بنام نواب سید علی حسن صاحب

جناب نواب صاحب مخدومی و مخلصی نواب حسام الملک بہادر سلامت

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ! مجھ کو اگرچہ جناب سے شرف قدم بوسی حاصل نہیں ہوا۔ لیکن ذکر خیر اکثر اوقات سنتا رہا ہوں اور خصوصاً جناب مولوی حافظ سید احمد رضا خاں صاحب سے بہت کچھ جناب کے متعلق سنا ہے اور شکر کیا ہے کہ قوم میں ابھی ایسے افراد موجود ہیں۔ میں گزشتہ چند مہینہ میں علیل تھا۔ اور اس لیے جن کاغذات کو مجھے دو مہینے پہلے پڑھنا اور دیکھنا چاہیے تھا ان کی نوبت اب آئی ہے اور آج شام ابھی میں نے جناب کا مضمون عرب کی تصنیفات اور یورپ کی فیاضی پر گزشتہ مئی کے معارف میں پڑھا ہے جو کچھ کہ جناب نے اس مضمون میں علی گڑھ کی کوششوں کے متعلق ظاہر فرمایا ہے میں اسے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر جو وہاں زیادہ عرصہ تک مقیم رہنے کی حالت میں مجھ کو حاصل ہوا ہے یہ عرض کر سکتا ہوں کہ وہ بالکل صحیح ہے اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مذہبی تعلیم کی نسبت جو کچھ وہاں سے صدا نکلتی تھی وہ محض برائے بیت تھی۔ فی نفسہ کبھی یہ ارادہ نہیں کیا گیا تھا کہ طلبا اپنی دنیاوی تعلیم کی ترقی کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی سچے طریقے سے حاصل کریں اور اسلامی اخلاق ان میں پیدا ہوں۔ لیکن خیر وہ زمانہ گزر گیا ہے اور اب دیکھنا ہے کہ صاحبان حل و عقد زمانۂ موجودہ و آئندہ اس میں کیا تغیر پیدا کرتے ہیں۔ اس وقت تک تو اب بھی وہاں جو کچھ کہا گیا ہے اور کہا جا رہا ہے وہ صرف چند الفاظ سے اور کچھ زیادہ نہیں ہے۔ وقل اللہ یحدث بعد ذالک امرا

معارف کے اس مضمون میں جو کچھ کہ حضرت نے تحریر فرمایا ہے اس میں جان سخن یہ ہے کہ قوم اور علماء میں پھر قریب کا تعلق قائم ہو اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ مطلب فی زمانہ ندوۃ العلماء کے گروہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مختصراً عرض ہے جناب کہ ندوہ کے

---

[1] نواب وقار الملک نے کانفرنس کے اجلاس ۱۸۹۲ء میں تعلیم دینیات پر جو پیش کیا تھا اس کے سلسلے میں یہ خط و کتابت ہے۔

ناظم صاحب اور نائب ناظم صاحب اور چند مشاہیر علماء ندوہ نے مہربانی سے امروہہ کو اپنی تشریف آوری سے عزت بخشی تھی۔ اس وقت میں نے ان حضرات سے دریافت کیا تھا۔ کہ آیا بھوپال میں بھی ندوہ کی طرف سے کوئی تحریک ہوئی ہے تو اس کے جواب سے میں اسی قدر نتیجہ نکال سکا کہ کوئی مؤثر تحریک نہیں ہوئی اور اب جناب کے ان "تازہ اظہار خیالات" کے لحاظ سے میرے نزدیک مناسب ہے کہ آئندہ جلسہ ندوہ کا بھوپال میں ہو۔ بشرطیکہ اولاً جناب اور نواب مدار المہام صاحب بالقابہ اس کو پسند فرمائیں اور پھر حضور عالیہ متعالیہ دامت ظلہا اس کو منظور فرمائیں اور جس وقت کہ یہ ارادہ ہو اور منظوری ہو جائے تب جلسہ کے زمانہ اور اوقات کا تصفیہ خود جناب اور نواب مدار المہام صاحب کی مرضی اور صوابدید پر منحصر ہوگا اور حضرات ندوہ یقیناً کمال تشکر و امتنان سے اس کو قبول کریں گے۔ اور پھر یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ ندوہ کا جلسہ بھوپال میں وہ پہلا جلسہ ہوگا جس کی نسبت یہ صحیح طور پر کہا جا سکے گا کہ ندوہ اب تک ایک جسم تھا اور اس جلسہ نے اس میں جان ڈال دی ہے اور اس جسم بے جان میں جان کا پڑنا ان کڑیوں کو پھر درست اور مسلسل کر دے گا جن کے کمزور ہو کر ٹوٹ جانے سے قوم کا سلسلہ علماء قوم کے ساتھ صرف برائے نام باقی رہ گیا ہے اور حضور عالیہ دامت اقبالہا اسی زمانہ میں ندوہ کی درخواست پر ندوہ کا ولی ہونا منظور فرمائیں جو گویا تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی اور قوم کی مربی گری ہوگی اور بلحاظ ان کی نظر اور خداداد علمی قابلیتوں اور شاہانہ مراحم اور نوازشات کے جو حضور ممدوحہ کی ذات بابرکت کے ساتھ مختص ہیں، ندوہ کے پیٹرن کا عہدہ حضور ممدوحہ کے واسطے بے حد موزوں سمجھا جاوے گا۔

حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند کے زمانۂ فرماں روائی میں ہندوستان میں حضور عالیہ متعالیہ ہی اس کی مستحق ہیں کہ وہ مذہبی حیثیت سے مسلمانان ہند کی مادر مشفقہ و معظمہ تسلیم کی جاویں۔ حضرت کے نام نامی کے ساتھ ڈائرکٹری تعلیمات کا انضمام دیکھ کر جس انضمام سے کہ اس عہدہ کو افتخار حاصل ہوتا ہے۔ آج کی ڈاک سے چند کاغذات اردو انگریزی جناب کے ملاحظہ کی غرض سے بھیجتا ہوں اور یہ نتیجہ ہے جو میں نے چار سال کی متواتر کوشش میں اپنے صوبجات متحدہ ممالک مغربی و شمالی و اودھ کے واسطے حاصل کیا ہے اور جس کے ذریعہ سے اب یہ بات خود اہل ملک کے ہاتھ میں آگئی ہے کہ وہ انگریزی سرکاری مدارس میں دینیات کی تعلیم کا انتظام کریں اور جو اس پر بھی نہ سمجھیں تو پھر ان کو خدا سمجھے۔

ندوہ کے جلسہ بھوپال کی نسبت ایک احتیاطی کارروائی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر پیش کیا تھا مگر تاہم اس قدر اس کے متعلق بھی عرض کر دینا کافی ہے کہ اگر مدار المہام اس کو پسند فرمائیں تو قبل اس کے کہ اس پسندیدگی کا کوئی اظہار کیا جاوے صاحب ایجنٹ گورنر جنرل سے کسی ملاقات کے موقع پر اس کا صرف زبانی تذکرہ کفایت کرے گا اور ابھی میری طرف سے یہ صرف میرے ہی خیالات کا اظہار ہے۔ حضرات ندوہ پر میں بھی اس کے بعد ہی پیش کروں گا۔ والسلام

خاکسار

مشتاق حسین از امروہہ۔ ۲۷ / جولائی ۱۸۹۹ء

---

[1] نواب سید علی حسن (صفی الدولہ حسام الملک) نواب صدیق حسن خاں کے فرزند اصغر تھے۔ مدت تک محکمۂ تعلیمات کے انچارج رہے۔ پھر لکھنؤ میں اقامت اختیار کر لی۔ وہیں وفات پائی۔

(۳)

بنام محسن الملک

جناب مخدومی!

آپ خفا ہوتے ہوں گے کہ آپ کے خطوں اور خصوصاً تاروں کا جواب وقت پر نہ ملا۔ اصل یہ ہے کہ میں نے شملہ سے لوٹتے وقت الہ آباد کے مقام سے ایک ہفتہ کی رخصت سرکار سے علاوہ عید کی تعطیل کے لے لی تھی۔ پرسوں شام واپس آیا ہوں مگر صحت خراب ہے۔ آپ کا ایک خط، ۲ر جولائی کا دو خط ۳ر اگست کے ملے۔ جواب آئندہ کے خط میں دوں گا پانچ ہزار پونڈ کے متعلق آپ کا خط مجھ کو وہاں سے چلنے کے دن شملہ میں ملا تھا۔ پہلی ہی منزل میں سرکار نے تار پر روپیہ بھیجنے کا حکم حیدر آباد بھیج دیا تھا۔ خیال ہے کہ اوس وقت روپیہ پہنچ گیا ہوگا۔ میجر رابرٹس صاحب کا تقرر درحقیقت اوس قسم کی پالیسی ہے جس کو میں ہمیشہ عزیز رکھتا ہوں۔ پنڈت دشنو ناتھ کو جب میں نے اپنا مددگار معتمد عدالت مہاراجہ صاحب کے وقت میں بنایا تھا تو وہ بھی پاسی تھے یعنی کہ اپنی صفائی اور راست بازی کا پاس کیا۔ جواب میں اس لیے دیر ہوئی کہ ...[۲] ...... اور اوس کے بغیر سودی صاحب کو جواب دینا مناسب نہ تھا۔ آپ کے مکان پر سب خیریت ہے خدا کے لیے اب تو جلد آؤ جی گھبرا گیا۔ میں مفصل آئندہ لکھوں گا۔ والسلام والتسلیم!

خاکسار

مشتاق حسین۔ حیدر آباد دکن ۲۷ر اگست دوشنبہ صبح

شبلی نعمانی

(۱)

بنام مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

مبارک باد۔ ریویو پڑھا اور بار بار پڑھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ تحسین نہیں بلکہ حسد کے قابل ہیں اور سچ یہ ہے کہ اگر آپ کسی کمپوزیشن کے موقعہ پر آئیں تو مجھ میں اسی کم بخت فیلنگ کا ظہور ہوگا۔ یہ ریویو اخبار تک محدود رہ کر مر جھا جائے گا۔ اس کو الگ رسالے کی صورت میں چھپنا اور شائع ہونا چاہیئے۔ اس سے اور عمدہ نمونے قائم ہوں گے۔ اور

---

[۱] یہ مکتوب غالباً نواب محسن الملک کے نام ہے جب وہ معدنیات کے مقدمے کی پیروی کے لیے دولت آصفیہ کی طرف سے لندن گئے ہوئے تھے۔

[۲] عبارت پڑھی نہیں گئی۔

عمدہ نمونے قائم ہوں گے۔ اور شاید رفتہ رفتہ حیاتِ جاوید کا کل خونِ فاسد ان نشتروں سے نکل جائے۔ والسلام!

شبلی۔ ۲۴ر فروری ۱۹۰۲ء از حیدرآباد

(۲)

بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

مکرمی!

یورپ میں قاعدہ ہے کہ جب کوئی علمی رسالہ نکالنا چاہتے ہیں تو قریباً سال بھر کے لیے مضامین تیار کر لیتے ہیں تب نکالتے ہیں الندوے کے لیے بھی یہ ہونا چاہیئے اور چونکہ بڑی دقت چھپنے کی ہے اس لیے میری تو یہ رائے ہے کہ دو تین مہینے کا ذخیرہ اس طرح چھپوا لیا جائے کہ صرف ٹائیٹل پیج اور علمی خبروں کے اضافہ کر دینے کے بعد رسالہ بن جائے۔ میں نے ایک چھوٹا سا مضمون فنِ تفسیر پر، ایک ریویو فنِ منطق پر، جس میں یونانی منطق کی غلطیاں بتائی ہیں۔ ایک فرنگی عالم کے ایک مضمون کا جو اسلام پر ہے ترجمہ کر لیا ہے مثنوی مولوی روم پر تقریظ کا ایک وسیع سلسلہ شروع کیا ہے۔ آپ بھی اسی طرح جستہ جستہ مضامین لکھ چلیے۔ صحابہ کے اخلاق سے شروع کیجیے۔ اور جو جو خیال آتا جائے۔ ہاں یہ بتائیے تقطیع کیا ہو۔ کیا اُردوئے معلّٰی کے برابر؟ لیکن خط اس سے جلی ہونا چاہیئے۔ اڈیٹر کا ترجمہ عربی میں کیا ہو۔ دبیر سے اچھا کوئی لفظ نہیں ملتا۔ لوح پر اڈیٹروں کا نام لکھنا ہوگا۔ میں اس کو بھی اُڑا دیتا۔ لیکن اوّل تو سرکاری احکام سے اس کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ نئے لوگوں میں ندوے کی ہوا اس قدر اکھڑ چلی ہے کہ محض ندوے کے نام سے اس حلقے میں اس کی کچھ وقعت نہ ہوگی ہاں رسالے کے صفحات کس قدر ہوں۔ میں تو دو جزو کافی سمجھتا ہوں۔ والتسلیم!

شبلی۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۳ء

(۳)

بنام نواب علی حسن

جناب نواب علی حسن خاں صاحب بالقابہم!

نثارِ[1] مے پرستی کن ہر متاعِ کہنہ دلوزا   طرازِ مسندِ جمشید و فرِ تاجِ خسرو را
فغاں از گرمی ہنگامۂ خوبانِ زردشتی   بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و نور را[2]

---

[1] مولانا شبلی کی یہ غزل کلیات کے حصّہ "دستۂ گل" میں شائع ہو چکی ہے۔ صفی الدولہ حسام الملک نواب علی حسن خان بہادر کے نام کے مکاتیب بھی مکاتیب شبلی میں چھپ چکے ہیں۔ لیکن یہ مکتوب کہیں شائع نہیں ہوا۔ اگرچہ اس میں غزل کے سوا کچھ نہیں لکھا۔

[2] یہ شعر خوبانِ زردشتی سے متعلق ہے اور زردشتیوں یعنی پارسیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں دو قوتیں کارفرما ہیں۔ ایک یزدانی دوسری اہرمنی، اسی کو نور و ظلمت سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور اسی کا نام وحدت کے مقابلے میں ثنویت ہے۔ خوبانِ زردشتی نے زلف و عارض سے ظلمت و نور کو باہم ملا دیا۔

بہر سو از ہجوم دلبراں شوخ بے پروا گذشتن از سر رہ مشکل افتاد است رہرو را
بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو[ل] را

بیا شبلی بہ یاد پنجۂ گیرائے مژگانش
دگر رہ پارہ گرداں ایں قبائے نہ صد تو را

شبلی۔ از بمبئی کیپر روڈ۔ بنگلہ دھن کاسٹ پوسٹ آفس بائی کلا

۶ ستمبر ۱۹۰۶ء

اکبر الہ آبادی

(۱)

بنام منشی محمد الدین فوق

الہ آباد۔ مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ۔

عمریں گذریں آپ سے مراسلت نہیں ہوئی۔ میں کیا کہوں ایک مدت سے کس مصیبت میں ہوں۔ صرف علیل ہی نہیں ہوں۔ اس کے سوا اور بہت کچھ ہوں۔ تفصیل کیا عرض کروں ؎

پڑ گئے گیسوئے اوہام بتاں کے پھندے
پا بہ زنجیر ہے اکبر کا قلم آج کے دن

بہر حال دعا ہے کہ خدا عاقبت بخیر کرے۔

رسالہ ”طریقت“ ماہ دسمبر ۱۵ء دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ زوائد اور تصنع، لفاظیوں، خود آرائیوں، خود فروشیوں سے پاک۔ سچے روحانی مفید مضامین سے مالا مال۔ جزاک اللہ۔ مس کوریلی کی تقریر سبحان اللہ نور علیٰ نور۔ بابا صاحب کے خیالات بھی خوب۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ پرچہ انگریزی زبان میں شائع ہوتا۔ کچھ ضرور نہیں کہ اعلیٰ درجہ کا انگریزی لٹریچر ہو۔ کام سے کام مطلب سے مطلب۔ کاش گورنمنٹ اسی طریق کی حامی اور مددگار ہو۔ امیر محمد دنیا پرستی کا وعظ کہہ کر گویا اپنا ہی گھر لٹوانے کی بنیاد قائم کرتا ہے اپنی خیریت لکھیے۔ دعا کیجیے، دعا دیجیے۔

۲۶ دسمبر ۱۹۱۵ء اکبر

(۲)

بنام مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم ایڈیٹر البشیر

جناب ایڈیٹر صاحب۔ جناب مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی نے قرآن مجید کا جو بامحاورہ اردو ترجمہ

[ل] چوپاٹی اور اپالو بمبئی کی مشہور نزہت گاہیں ہیں۔

شائع کیا ہے۔ وہ درحقیقت نہایت عمدہ بلکہ لاجواب ہے۔ اس سے بہتر خدمت اسلام کی اس زمانے میں ذہن میں نہیں آسکتی۔

اللہ تعالیٰ مولوی صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے ان کے علم و قابلیت سے قوم کو بہت فائدہ پہنچا۔ اور بہت فائدہ پہنچنے کی اُمید ہے۔

بعض مقامات پر مجھ کو شبہ پیدا ہوا ہے یا تو میرا شبہ بے جا ہے اور ایسا ہونا کچھ بعید نہیں کیونکہ بغیر علم کی روشنی کے محض عقل و قیاس کو اس منزل میں کہاں تک رسائی ہو سکتی ہے اور یا فی الواقع ترجمہ میں کچھ غلطی ہو گئی۔ ایسا ہونا بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ مولوی صاحب کے مددگار اور بزرگ وار بھی تھے۔ شاید کسی نے غلطی کی اور نظرثانی میں اس پہ نگاہ نہ پڑی۔ اتنے بڑے عظیم الشان قانون فطرت کے ترجمے میں اگر کہیں دو چار لفظوں پر نظر نہ پڑی تو کچھ تعجب نہیں۔ اب میں ایک شبہ بیان کرتا ہوں سورہ والتین کے ترجمہ پر صفحہ ۱۵۹ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰہ اسفل سافلین کا ترجمہ حسب ذیل کیا گیا ہے۔ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا۔ پھر ہم اس کو (بڑھا کرکے) کمتر سے کمتر مخلوق کے درجے میں لوٹا لائے۔

بریکٹ میں جو الفاظ توضیح کے لیے بڑھائے گئے ہیں اس کی صحت میں مجھ کو شبہ ہے۔ درحقیقت ترجمہ غلط نہیں ہے معنی میں شاید غلطی ہوئی میرا خیال تھا اور ہے کہ یہاں جوانی اور بڑھاپا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی روحانی اور اخلاقی حالت کا بیان ہے ترک دنیا کن و بگذر۔

دوسری آیت الا الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت فلھم اجر غیر ممنون اس خیال کی تائید کرتی ہے

اگر میرا خیال صحیح تسلیم کیا جائے تو آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح چاہیئے اگر میرا خیال صحیح تسلیم نہ کیا جائے۔ تو یہ بات زیر بحث ہو گی

سید اکبر حسین از الہ آباد

مولانا عبدالحلیم شرر

(۱)

بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

جناب من - السلام علیکم۔

آپ نے اپنے والانامے مورخہ ۲۰ر ذی الحجہ ۱۳۱۶ھ میں جناب حکیم سعیدالدین صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کی حسرت ناک وفات کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے بجا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکیم صاحب مرحوم کی زندگی کا بہت زیادہ حصہ آپ ہی لوگوں میں گزرا۔ اور جس طرح آپ نے ان لوگوں کو اپنا بنا لیا تھا۔ اسی طرح ان کو بھی مرتے دم تک آپ ہی کے ساتھ تعلق رہا۔ جس

رئیس کے گھر انتقال ہوا وہ بھی آپ کے ایک معزز عزیز ہیں اور اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ جس دن انتقال ہوا ہے عین اسی تاریخ جناب خلیل اللہ خاں صاحب کے گھر کے لوگوں کا علاج کرنے کو جانے والے تھے۔ میں آپ کا نہایت ہی شکرگزار ہوں۔ اور اسی طرح حکیم صاحب مرحوم کے تمام متعلقین آپ کے ممنون ہیں کہ ایسی غم واندوہ کی حالت میں آپ نے دلدہی اور تسلی دینے کی کوشش فرمائی۔ حکیم صاحب مرحوم کے جن اوصاف کا آپ نے تذکرہ فرمایا، وہ اوصاف بے شک ایسے ہیں کہ اسی طبقے کے بزرگوں کے ساتھ ختم ہوتے جاتے ہیں۔ جس سے خود اُن مرحوم کو تعلق تھا۔ مگر مجبوری میں کہتا ہوں کہ آپ پھر بھی اس عظیم صدمے کو محسوس نہ کر سکیں گے جو اس نیک ذات کے اُٹھ جانے سے ہم لوگوں کو ہوا ہے۔ درحقیقت خاندان ہی بگڑ گیا۔ آپ کو شاید نہ معلوم ہوگا کہ جس خاندان کی یادگار حکیم صاحب مرحوم تھے۔ اس کی پچھلی یادگار اکیلے وہی تھے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ضعیفہ اور بیوہ عورتوں کی ایک بڑی جماعت کی خبرگیری وہی کرتے تھے۔ اب اُن لوگوں کی بے کسی کی حالت ایسی نازک ہے کہ خیال کرنے سے بھی دل کانپ جاتا ہے۔ اگرچہ مرحوم کے بعد قدرۃً ان تمام باتوں کا ذمہ دار میں ہوں۔ مگر ایسی فیاض و نیک ذات کی جانشینی کے لیے بہت سی لیاقتیں چاہیئے ہیں۔ جو مجھ سے ناکارہ شخص میں بالکل نہیں۔ اصل یہ ہے کہ میرے زخم جگر پہ مرہم رکھا جا سکتا ہے۔ مگر ان لوگوں کے دلوں کو ڈھارس بندھانا امکان سے باہر اور خدا ہی کے اختیار میں نظر آتا ہے جس کو اب مرحوم کے بعد زندگی کے باقی ماندہ ایام بسر کرنا دشوار بلکہ غیر قابل برداشت مصیبت نظر آتا ہے۔ حکیم صاحب مرحوم کو آپ کے خاندان بھر میں آپ کے والد ماجد سے بہت زیادہ تعلق تھا اُن کو ہمیشہ یاد کرتے تھے اور اُن کے نیک اخلاق اور اُن کی کریم النفسی کے ہر وقت معترف رہا کرتے تھے۔ یقیناً اُن کو بھی بہت بڑا صدمہ ہوا ہوگا۔ آپ کی طرف سے میں نے جناب حکیم صاحب مرحوم کے گھر میں لوگوں کو بہت کچھ تسلی و تشفی دی۔ اور وہ سب آپ کے شکر گذار ہیں۔ میں ان دنوں لکھنؤ سے باہر تھا اور اسی وجہ سے والا نامے کے جواب میں تاخیر ہوئی۔ مجھے ندامت ہے کہ لکھنؤ میں بھی ایک اتفاقی اور فوری بیماری کی وجہ سے مجھے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ والسلام

۲۳ر اپریل ۱۸۹۹ء میں ہوں آپ کا خادم محمد عبدالحلیم شرر از لکھنؤ

---

(۲)

بنام نواب سید علی حسن

ملجائے و ماوائے من۔

آداب و نیاز اور السلام علیکم کے بعد بصد ادب عرض ہے کہ گرامی نامہ مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۳ء وصول ہو کر باعث سرفرازی ہوا۔ میں وعدہ کر گیا تھا اس کو بھولا نہیں۔ آتے ہی مولوی سید عبدالمجید صاحب سے اس بارے میں گفتگو ہوئی اور معلوم ہوا کہ اس بارے میں جناب نے اُن سے بھی مراسلت فرمائی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں اس معاملہ میں غور کرتا رہا جن خاندانی تعلقات کا جناب نے تذکرہ فرمایا ہے۔ اُن کا پتہ لگانا دشوار ہے اس لیے کہ جن دنوں کا یہ واقعہ ہے اُس زمانہ میں یہاں

دفاتر کی ایسی ابتر حالت تھی کہ کسی اگلے خاندان کا اب پتہ لگانا قریب قریب غیر ممکن سا ہے۔ اور بالفرض پتہ لگے بھی تو حاصل کیا۔ اس لیے کہ اُن کے ثبوت سے کوئی خاص حق حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

رہا یہ امر کہ جناب یہاں توطن اختیار فرمانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے کسی اجازت کے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص آزادی کے ساتھ یہاں آ کے رہ سکتا اور جائداد خرید سکتا ہے، اور توطن اختیار کرنے کے چند ہی روز بعد سے اُسے جملہ حقوق حاصل ہو سکتے ہیں، بجز اس کے کہ ملازمت کے لیے بارہ سال تک یہاں مقیم رہنا مشروط ہے۔ مگر یہاں آ جانے اور مکان خرید لینے کے بعد اگر درخواست کی جائے تو یقیناً یہ بارہ سال کی شرط بھی اُٹھ سکتی ہے۔ الغرض آپ کے لیے کوئی امر مانع توطن حیدرآباد نہیں ہے۔

لیکن یہ بات کہ آپ کے تشریف لانے سے پیشتر حضور سے کوئی اجازت حاصل ہو تو بقول سید عبدالمجید صاحب کے ایسی درخواست کو اعلیٰ حضرت مشتبہ نظروں سے دیکھیں گے۔ اور خیال ہوگا کہ اجازتِ توطن کے پردے میں کوئی اور حق حاصل کرنا مقصود ہے اور ایسے شبہ کا پیدا ہونا اچھا نہیں۔ میرے خیال میں اگر جناب کو یہاں رہنے کا شوق ہے تو عمدہ کوٹھی یہاں خرید لیجیے اور اُس میں آ کے رہنا شروع کر دیجیے۔ اور یہیں کے قیام کے زمانہ میں وہ کوششیں عمل میں لائیے جن کو جناب یہاں آنے سے پہلے کر رہے ہیں۔ آ جانے اور مکان خرید لینے کے بعد سب باتیں بہ آسانی بلکہ خود بخود پوری ہو جائیں گی۔

میں یہاں حضور کی سیرۃ لکھنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ اور میرا سابق کا وظیفہ ملا کے پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ قرار پائی تھی۔ یہاں آنے کے بعد اس کام کے لیے تین سو تینتالیس ماہوار کا عملہ ملا۔ اور مواد جمع کرنے کی کوشش شروع ہو گئی اور دفتر کا نام دفتر شوکت عثمانیہ قرار پایا۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت کے ایک فرمان سے حکم ہوا کہ مجھ ہی سے ایک مکمل تاریخ اسلام تصنیف کرائی جائے اور اس کی بابت جداگانہ ماہوار دی جائے۔ اس حکم کے مطابق میرے لیے علاوہ ماہوار ماسبق کے دوسری ماہوار پانچسو روپیہ اور تین سو چہتر روپیہ ماہوار کا عملہ معتمدی سے منظور کر کے بارگاہِ خسروی میں پیش ہوا ہے۔ شاید آج ہی کل میں منظور ہو کے آ جائے مگر ان سب جائدادوں پر اشخاص یہیں سے نامزد ہو گئے ہیں۔ بہرحال شکر ہے۔ میں حضور میں بلا واسطہ عرائض پیش کر سکتا ہوں اور جو لکھتا ہوں اُس کا فوراً جواب ملتا ہے۔ میرے حال پر نظرِ عنایت بھی غیر معمولی ہے۔ مگر باریابی کا موقعہ ابھی ایک ہی بار ملا ہے۔ لیکن صاحب اور شاہی مزاج کی نزاکت کی یہ حالت ہے کہ اپنے امور متعلقہ کے سوا اور کسی بات کے عرض کرنے کی مجھے یا کسی اور کو جرأت نہیں ہو سکتی۔ آئندہ اگر زیادہ صحبت ہوئی جس کے چار پانچ ماہ بعد قطعی امید ہے اس وقت شاید کسی اور بات کے عرض کرنے کا موقع بھی مل سکے۔ والسلام

۲۵ جولائی ۱۹۱۸ء　　　　خاکسار محمد عبدالحلیم شررؔ

پیارے صاحب اور اچھے صاحب کی خدمات میں سلام نیاز اور آداب قبول ہو

(شرر) محبوب پورہ۔ حمام باغ حیدرآباد دکن

ریاض خیرآبادی

(۱)

بنام احسن مارہروی

مکرمی!

کارڈ ملا۔ ریاض الاخبار کی بابت عرض کردہ قیمت قبول فرمانے کا شکریہ۔ ستمبر سے پرچے تلاش کرکے آج یا کل غالباً روانہ کر دوں گا۔ مگر دیکھیے گا۔ ناگوار نہ ہو میری صاف روش جرأت دلاتی ہے۔ ورنہ بقول میرے ؎

میں جانتا ہوں زرطلبی کو کمال عیب
دینار داغ ہے مرے دستِ سوال کا

اگر میرا یہ فعل کچھ بھی گراں ہو تو بے تکلف واپس کر دیجیے گا میں تاوان کو سزائے قصور سمجھ کر پھر وہی پرچہ پوسٹ روانہ کر دوں گا۔ یہ امر کہ انعام زیادہ ہے لوگ پسند نہ کریں گے۔ میں نے صرف رائے کا اظہار کیا تھا ؎

ہر کسے مصلحتِ خویش نکو می داند

آپ کو ضرور مجھ سے دلی اُنس ہے۔ اس قدر متاثر ہوں کہ بے تکلف آرزوئے یک جائی کر بیٹھا۔ آپ میرا خیال صحیح سمجھیں بات یہ ہے کہ میں زر سے پریشان ہو رہا ہوں۔ اوّل تو بالکل تہی کیسہ چہ خورد بامداد فرزندم کی ہر وقت فکر دوسرے محض تنہا ایسے تجارتی کام تنہا جب ہی چل سکتے ہیں کہ انسان فارغ البال ہو صیغۂ ملازمت وسیع ہو۔ معانی

ننگی تلوار اور میں لاغر
کیا پکڑے گی کیا بنائے گی

یک جائی کا کوئی مناسب طریقہ ممکن ہوتا تو آپ کی ذاتی مالی وعنایت سے ایک مرتبہ زمین سر پر اٹھا لینے کی کوشش کی جاتی۔ مگر یہ حسنِ اتفاق کہاں ممکن۔ پریس ضرور قائم کیجیے صرف گلدستہ کے لیے۔ تجارتی چھپائی یا اخبار نکالنے کو مارہرہ بہت ہی چھوٹا مقام ہے۔ بہرحال کچھ کرتے رہیے۔ خصوصاً نام آوری کے کام۔ طرح میں غزل تو دوں مگر بہت ہی امتیاز خاص چاہتا ہوں۔ یہ آپ کا کام ہے۔ ریاض خلیل کے ذریعے پبلک کے روبرو جس طرح چاہیے مجھے نمایاں کیجیے۔ آپ وفورِ اخلاق سے یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ کر آؤ بھگت کے ساتھ بچھے بچھے پُرجوش الفاظ میں خیر مقدم کیجیے۔ تصویر پھولوں سے لدی ہوئی شائع کیجیے۔ یہاں تک کریں کہ دنیا میں میرا کوئی ثانی نظر نہ آسکے۔ مگر جب کلام پر نظر پڑے گی تو سب مسرت افسوس سے بدل جائے گی۔ آنکھ میں آنسو آ جائیں گے۔ کلام اس قابل ہوتا تو نذر کا مضائقہ نہ تھا۔ نہیں حضرت نہیں۔ واللہ مجھ کو آپ مخلصی سادگی کے ساتھ معمولی درجہ کے شعرا کی آخری حالت میں بھیجیے۔ یہ باتیں مذاق کی تھیں۔ میں غزل ضرور بھیجوں گا۔ میرے نام کے ساتھ زائد الفاظ نہ ہوں گے۔ صرف ریاضؔ کافی ہو گا۔ دعوے تو اس بشاشت سے کر رہا ہوں کہ غزل بھیجوں گا۔ اور قصد یہی ہے۔ مگر غزل بھی تو ہو جائے۔

آج آپ نے محبت جتا کر میرا بہت ہی وقت لیا خدا آپ کا بھلا کرے۔ باتوں میں چند منٹ دل خوب بہلا۔ اب نہ وہ ہم نہ ہماری حالت، فکر دنیا کھا گئی۔ کچھ روز سے اور عالم ہو گیا ہے ؎

یاد ہوں گی تجھے گلشن کی بہاریں گل چیں
پنکھڑی ٹوٹتی تو شور عنا دل ہوتا

پژمردہ ریاض ۵ر نومبر ۱۹۹۵ء

---

(۲)

بنام چودھری فتح محمد صاحب شیفتہ بی اے

عالی جناب چودھری فتح محمد صاحب بالقابہ!

ہندوستان میں دھوم ہے کس کے کلام کی
وہ کون ہے ریاض کو جو جانتا نہیں

عنوان تو شاعرانہ تعلّی ہے من آنم کہ من دانم۔ حقیقت اتنی ہے کہ "ریاض الاخبار" ہفتے میں دوبار "فتنہ" ہفتہ وار "تار برقی" روزانہ "عطر فتنہ" ہفتہ وار "گل چیں" ماہانہ "صلح کل" روزانہ۔ یہ سب میری ایڈیٹری اور ملکیت میں برسوں شائع ہوتے رہے اس زمانے میں اخبار کم تھے "کوہ نور" پنجابی لاہور سے "اودھ اخبار" روزانہ لکھنؤ سے۔ "لارنس گزٹ" ہفتہ وار میرٹھ سے شائع ہوتے تھے۔ میرے نام اور تخلص کی شہرت کا یہی سبب تھے۔ یعنی وہ پرچے جنہیں میں نکالتا تھا۔ سر عبدالقادر صاحب قریب قریب اسی زمانے کے بزرگ ہیں۔ یقیناً خط و کتابت کے ذریعے سے میرے شناسا بھی۔ نیز ان کی تحقیق و تدقیق و ذکاوت و ذہانت اور عالمانہ وسیع معلومات کا مدت سے معترف ہوں۔ سر اقبال شاعرانہ حیثیت سے مجھے جانتے ہیں اور اخباری حیثیت سے بھی۔ مجھے اس وقت مرحوم گرامی کی یاد بے اختیار آئی۔ وہ مجھ سے حیدرآباد میں اس وقت ملے تھے جب میں سر مہاراجہ کشن پرشاد شاد کا مہمان تھا۔ میں ان کی فارسی شاعری کا بہت احترام کرتا ہوں۔ اس سے میری یہ غرض نہیں کہ سر اقبال کی اردو فارسی شاعری کا احترام ان کے بلند خیالات کو دیکھتے ہوئے میرے دل میں فرق کے ساتھ ہے۔ میں سمجھتا ہوں سر اقبال کے بلند خیالات نے ان کے ہر مصرع کو ہمالیہ کی بلند چوٹی کا موہاف زری بنا دیا ہے۔

پچاس سال ہوئے سر سید مرحوم نے زندہ دلان پنجاب کا فقرہ لکھ کر پنجاب کو اور صوبوں سے امتیازی حالت میں ظاہر کیا تھا۔ ممکن ہے اس وقت کی تعلیمی دلچسپیاں لاہور کو گل سرسبد بنائے ہوں مگر دیکھتے ہی دیکھتے تمام اصناف میں پنجاب نے اپنی زندہ دلی سے قابو حاصل کر لیا۔ بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے ؎ ریاض

تری اٹھان ترقی کرے قیامت کی
ترا شباب بڑھے عمر جاوداں کی طرح

مجھے بہت زیادہ حیرت زبان کی ترقی پر ہے۔ پنجاب کے شہری افراد ہوں یا اہل تصنیف و تالیف، روزانہ، ہفتہ وار

پرچے ہوں یا ماہوار شائع ہونے والے رسالے، قریب قریب کیسی پاکیزہ اُردو ساختہ و بے ساختہ زبان میں استعمال کرتے ہیں پنجاب ٹکسالی اُردو میں بھی دہلی و لکھنؤ سے قریب قریب یکسانیت حاصل کر لیتا۔ مگر ٹکسالی زبان تو بوجوہ اپنے خاص مرکزوں سے رخصت ہو رہی ہے۔ پھر بھی مایوسی میں امید کی جھلک اس اعتبار سے نظر آ رہی ہے کہ زندہ دلانِ پنجاب اگر ٹکسالی زبان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تو ضرور اس پر بھی قابو حاصل کر لیں گے۔ وہ ٹکسالی زبان جو غالبؔ و انیسؔ کا حصہ سمجھی جاتی ہے اور زمانہ سر سید سے اب تک خان بہادر میر ناصر علی مرحوم مدیر صلائے عام کا جو حصہ ہو گئی تھی۔ ضرور ٹکسالی اُردو کی نظم کو امیرؔ داغؔ، جلالؔ نے چار چاند لگائے۔ زندہ دلانِ پنجاب کاش ادھر بھی توجہ فرمائیں۔ جو زبان اسکولوں اور کالجوں میں اور ابتدائی مکاتیب میں داخلِ درس ہو چکی ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ خاص توجہ سے ٹکسالی زبان ہو سکتی ہے۔ ورنہ تا ثریا می رود دیوار کج کی مصداق جیسی اب ہے آئندہ بھی رہے گی۔

میں آپ کو کیا لکھنا چاہتا تھا اور کیا لکھ گیا گویا کسی اخبار کے لیے بہ امید معاوضہ کاغذ سیاہ کر رہا ہوں۔ مجھے جناب کو نیاز نامہ لکھنے کا اتفاق اس بنا پر ہوا کہ میں نے فضا صاحب کو ایک خط اس غرض سے لکھا کہ میرے دیوان کے طبع کا چرچا تو پنجاب وغیرہ میں زیادہ عرصہ سے ہے مگر تاخیر نے ہر طرف نا امیدی کی صورت پیدا کر دی ہے۔ اس لیے فضاؔ اور دوسرے احباب کو میں یقین دلانا چاہتا تھا کہ دیوان کی طباعت و اشاعت کا زمانہ اب قریب ہے اور اعتبار دلانے کو میں نے ملک کے سرمایۂ ناز سر سلیمان صاحب چیف جسٹس الہ آباد کی چٹھی جو کسی دن میرے نام آئی تھی بصورتِ نقل اسی خط میں ملفوف کر دی تھی۔ فضاؔ صاحب نے اس چٹھی سے متاثر ہو کر یہ چاہا تھا کہ دیوانِ ریاضؔ کے متعلق اپنے صوبے کے سرمایۂ ناز حضرات یعنی سر عبدالقادر صاحب بالقابہ، سر اقبال صاحب بالقابہ، ملک سر فیروز خاں نون ایم اے وزیر تعلیم پنجاب سے ایسی ہی چٹھیاں یا نوٹ حاصل کیے جائیں۔ کہ دیوانِ ریاضؔ کو ان کے ذریعے سے بھی روشناسِ عالم ہونے کا موقع حاصل ہو سکے۔

فضاؔ صاحب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایک "نیاز نامہ" جناب کو بھیجوں۔ آپ محاسن اور مختلف خوبیوں کا مجموعہ عجیب ہیں۔ مجھ پر آپ کی ستائش کا بخصوصیت تخلص یعنی گُلؔ نہیں کہ قافیۂ گُل بود بس است یہ اثر ہوا کہ میں آپ کو خط بھیجنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

مجھے اس کی بھی خواہش نہیں ہے کہ آپ جواب لکھنے کی تکلیف گوارا کریں یا میری اس بے سروپا طولانی تحریر کے پڑھنے میں وقت ضائع کریں۔ میں جس ادنیٰ پوزیشن میں ہوں میں جانتا ہوں۔ مالی حالت نے بہ لحاظ کثیر اولاد ہونے اور صرف للعہ ماہوار پنشن ہونے کے مجھ پر ضرور دنیا تنگ کر دی ہے۔ مگر دیوان کی اشاعت ان شاء اللہ ضرور میرے لیے اطمینان پیدا کر دے گی۔ بقول میرے ؎

آس اک چیز ہے دنیا میں اگر ٹوٹ نہ جائے

سر نواب قاضی عزیز الدین وزیر دتیا میرے واسطے بہترین ذریعہ تھے کہ میں لکھنؤ میں اعلیٰ حضرت نظام دکن سے ملوں۔ مگر میری قسمت نے مجھے روک دیا۔

بے شک سر عبدالقادر صاحب، سر اقبال صاحب، ملک فیروز خاں صاحب نون ایسی بلند پایہ شخصیتیں ہیں کہ وہ میرے

دیوان کے متعلق اظہار خیال فرمائیں تو ممدوحین کی یہ قدر شناسی ملک کی شکر گزاری کا باعث ہوگی۔ مگر میں ممدوحین سے ایسی استدعا کرنا اس خدا رسیدہ بزرگ کے ادب اور شان کے خلاف سمجھتا ہوں جس نے مجھ سے بے بضاعت کم مایہ شخص کی شاعری کو اس مرتبے پر پہنچایا کہ انگریزی تعلیم یافتہ بلند پایہ حضرات جن کی قابلیت نے دورِ جدید کی شاعری کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ میرے لیے تو نہیں مگر میرے اشعار کے لیے اچھے الفاظ سے بخل نہیں فرماتے ؎

کہتا تھا گل رخوں سے ریاضؔ شکستہ حال
مجھ کو نہ دیکھئے مرے اشعار دیکھئے

میرا خیال یہ ہے جو حضرات میرے دیوان کے لیے خامہ فرسائی فرمائیں گے وہ اپنے لیے میرے دیوان میں اپنی مستقل یادگار قائم کر دیں گے ؏

نوشتہ بماند سیہ بر سپید

فضا صاحب نے اپنی امیدیں جو آپ کے دامن سے وابستہ کی ہیں۔ ان کا لحاظ فرماتے ہوئے آپ حضرات ممدوحین کو تکلیف دینا چاہیں اور مزید اعتبار کے لیے اس کی ضرورت معلوم ہو تو آپ سر سلیمان صاحب چیف جسٹس کی چٹھی نقل شدہ جو ملفوف بھیجتا ہوں آپ پیک شدہ صورت میں یا یونہی ان کی خدمت میں بھیج دیں یا خود کسی وقت دکھا دیں گے۔ میں وہ غزل بھی ملفوف بھیجتا ہوں جس کے لیے اچھے الفاظ خان بہادر نور الٰہی صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے اپنی چٹھی موسومہ حال میں مجھ کو لکھے ہیں ؎

قدرداں گوہر سخن کے ریاضؔ
منہ مرا موتیوں سے بھرتے ہیں

سید ریاض احمد ریاضؔ خیرآباد (اودھ) ضلع سیتاپور
۱۵ر ستمبر ۱۹۳۳ء

حبیب الرحمٰن شروانی

(۱)

بنام سید مخدوم عالم صاحب

مخدومی۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

الطاف نامے کا سپاس گزار ہوں۔ آپ بے کاری کی شکایت کرتے ہیں۔ اور مجھے باکار بننے کی تدبیر میں مشورے کے خواستگار ہیں مجھ کو تعجب ہوتا ہے کہ ایسا شخص کیوں کر بیکار رہ سکتا ہے جس کے قبضے میں شباب، علمی استعداد۔ روشن خیال۔ خاندانی عظمت معاش وغیرہ اسباب قوت ہوں۔ مسلمانوں میں کام کرنے کے اتنے میدان کھلے ہوئے ہیں کہ اگر کوئی کام کا شائق ہو تو ؏ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔ کا مضمون ہوتا ہے۔ ابھی آن کی کانفرنس میں جو پریسیڈنشل ایڈریس مسٹر ماریسن نے دیا اس میں مسلمانوں

کا دماغی و مادی افلاس جس پیرائے میں دکھلایا ہے وہ دلوں پر تازیانے کا کام نہ دے تو سمجھنا چاہیے کہ دل مر چکے۔ ہر ایک مسلمان (جو ارادہ کرے) اس افلاس کو دُور کرنے اور قومی تمول میں اضافہ کرنے میں مدد دے سکتا ہے کس طرح! یہ مجھ سے سنیئے۔ مسلمانوں میں جو مرض ساری ہے وہ بے فکری کا ہے۔ باقی کل خرابیاں اس مرض کے اعراض ہیں۔ اگر اس مرض کا علاج کیا جائے یعنی مسلمان اپنی حالت پر غور کر کے اس کا اندازہ حقیقی طور پر کریں تو ابھی کایا پلٹتی ہے۔ آپ خانقاہوں میں، مسجدوں میں عربی مدارس میں، کانفرنسوں میں، کالجوں میں، گھروں میں، بازاروں میں، احباب کی مجلسوں میں، غرض مسلمانوں کے ہر طبقے میں جا کر دیکھئے بے دلی اور کم حوصلگی کا سناٹا ہر جگہ آپ محسوس کریں گے۔ اور یہ رنگ آپ کہیں نہیں دیکھیں گے کہ ایک یا دو مسلمان جواں مردانہ کسی کام کے کرنے میں جان لڑا رہے ہیں۔ اور ان کی ساری حرکات و سکنات سے حوصلے کی گرمی ٹپک رہی ہے۔ جو دیکھنے والوں کے دلوں میں کچھ نہ کچھ برقی اثر دوڑا دیتی ہے۔ کیا اس سے اعلیٰ اور پاکیزہ کام کسی مسلمان کے واسطے ہو سکتا ہے کہ وہ اس بد دلی کے دُور کرنے اور حوصلے کی گرمی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ حقیقتاً یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے ایک اعتبار سے خوش قسمتی کا زمانہ ہے اور یہ یوں کہ جو وقت مسلمانوں پر آج کل آن کر پڑا ہے وہ تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا اور جو موقع قومی خدمت کا ہم کو حاصل ہے وہ بہت کم نصیب ہوا ہوگا۔ اگر کوئی جواں مرد نیک دلی کے ساتھ اس خدمت میں جان دے دے تو شہادت کے مراتب پانے کی امید کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کی بے فکری کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا خواب دیکھتے ہیں تو ہارون و مامون کے دربار کے سوا انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یعنی وہ یہ منصوبے باندھتے ہیں کہ جب بغداد کا سا دربار آراستہ ہو اور ہم شان و شوکت کے ساتھ اس میں جا کر پایۂ تقرب میں کھڑے ہوں تو اس وقت علی گڑھ میں یونی ورسٹی کے واسطے ایسا وقف حاصل کریں جس کی آمدنی کیمبرج اور آکسفورڈ کو آن واحد میں گرد کر دے۔ لیکن آہ بغداد کا دربار نہیں ہم میں برمکی عروج کا کچھ شائبہ نہیں پھر ہم قومی خدمت کیا کر سکتے ہیں۔ جب اس خواب سے آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے دماغ کی طرح خستہ اور مضمحل پاتے ہیں جس نے ابھی کسی دماغی دورے سے نجات پائی ہو۔ اور اس خواب کا سوائے اس کے کچھ نتیجہ نہیں ہوتا کہ وہ چند روز تک خواب دیکھنے کے لائق ہی نہیں رہتے۔ جب وہ ایسا خواب دیکھنے لگتے ہیں تو اس کا خیال نہیں کرتے۔ کہ بغداد کا دربار درباریوں کے عروج نے نہیں سجایا تھا بلکہ وہ ان پاک دل کاروباریوں کی محنت کا ثمرہ تھا۔ جو راہ خدا میں لڑ گئے تھے۔ اگر ہم بھی پاک دلی سے قومی خدمت کے لیے مزدور بنیں تو پھر عظمت قومی اور شوکت ملی کا دربار سج جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم مزدوری کرنے کہاں جائیں۔ جواب یہ ہے کہ جہاں ہم ہیں وہیں مزدوری شروع کر دیں۔ قومی عمارت کا سلسلہ راس کماری سے ہمالیہ تک بلکہ دنیا کے ہر حصے میں پھیلا ہوا ہے۔ اور ہر جگہ مزدور نہ ملنے سے کام بند ہے۔ اس اجمال کی تفصیل سنیئے۔ آدم برسر مطلب سب سے اوّل ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم تو قومی عمارت کے ایک جز ہیں۔ لہٰذا یہیں سے کام شروع کر دیں۔ لڑکے

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم امارت کے علاوہ علم و فضل میں بھی بلند مرتبہ شخصیت کے مالک تھے۔ اور جو کتب خانہ انہوں نے فراہم کیا تھا۔ وہ دور حاضر کے نوادر میں سے تھا۔ وقت کے تمام اکابر علم سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ان کے بعض مکاتیب مجموعہ کاروان خیال میں شائع ہو چکے ہیں۔

ہیں تو تحصیل علم کریں۔ تحصیل کے لیے ضرور نہیں کہ کالج میں ہی پڑھیں۔ باہر جانے کی وسعت نہیں تو گھر پہ پڑھیں۔ مکتب ہو تو بھاگ دوڑ کر جو خواندہ مل جائے اس سے سبق لیں کوئی نہ ملے تو بنئیے سے حساب کے گر ہی سیکھیں۔ اگر ایسے قریے میں ہیں جہاں کوئی پڑھا لکھا نہیں تو جو کام گاؤں میں ہوتے ہوں اُن کو سیکھیں۔ ہل جوتیں۔ لوہار کا کام کریں۔ نجاری حاصل کریں غرض کچھ کریں۔ یہ کرنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ہم اس حسرت میں وقت کھو دیں کہ ہم کو وظیفہ ملتا اور کالج میں جا کر پڑھتے۔ ہاں ہم جوان ہیں۔ گھر میں بیوی۔ بچے۔ بڑی بوڑھی ماں ہیں۔ رہنے کو مکان ہے۔ تھوڑی سی معاش بھی ہے۔ جہاں ہم رہتے ہیں وہ شریف مسلمانوں کی بستی ہے جو گزشتہ تاریخ بھی رکھتی ہے، ہمارا بھائی بھی ہے۔ دوست احباب بھی ہیں ہم کچھ لکھے پڑھے بھی ہیں۔ صحبت کی بدولت مسلمانوں کی ضرورتوں اور دوسری قوموں کی حالتوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ او ہو اب تو بے انتہا کام ہم کو کرنا ہے۔ جس سے ساری عمر فرصت نہیں ہو سکتی۔ ہم کو اول نیک دلی اور وسعت خیالی اور تحمل کی عادت اپنے نفس میں پیدا کرنی چاہیے۔ اس کے ذریعے سے ہم ان لوگوں سے جن سے ہم کو سابقہ پڑے محبت و ہمدردی کے ساتھ مل سکیں گے۔ کفایت شعاری سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ ہمدردی و محبت ملنے والوں کو ہمارا گرویدہ کر دے گی کفایت شعاری اطمینان قلب پیدا کرے گی

اب ہم گھر میں جاتے ہیں تو بیوی کو علم کا شوق دلاتے ہیں۔ ضرورت ہو تو اس کو لکھنا پڑھنا بتاتے ہیں۔ رسوم بے جا کی برائی ذہن نشین کرتے ہیں۔ احکام دین کی پابندی کی تفہیم کرتے ہیں۔ جو نقائص عورتوں کی طبیعت ثانیہ بن گئے ہیں اُن کے مقابلے نرمی سے جہاد کرتے ہیں۔ لڑکی کی تعلیم کی فکر کرتے ہیں یعنی اس کو کم سے کم جو ممکن ہے لکھاتے پڑھاتے ہیں۔ سینا پرونا سیکھنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ بوڑھی ماں سے بہ کشادہ پیشانی پیش آتے ہیں۔ سعادت مندانہ بات چیت کرتے ہیں۔ جو خدمت قابل سرانجام ہو وہ انجام دیتے ہیں۔ مکان کی صفائی کا اہتمام رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ دیکھیے اس تھوڑی سی دیر میں کتنی خدمتیں انجام دیں۔ تعلیم نسواں۔ مادی ترقی۔ حفظ صحت وغیرہ بہت سے کام کیے۔ دوست احباب سے ملتے ہیں تو اُن سے ان کا دکھ درد سنتے ہیں۔ اُن کی خوشی سے خوش ہوتے ہیں اُن کے رنج سے مغموم۔ مگر یاد رہے منافقانہ نہیں مخلصانہ پھر دیکھتے ہیں کہ ان کو کس خدمت کی ضرورت ہے اس خدمت کو بخوش اسلوبی ادا کرتے ہیں۔ فرض کیجیے ہمارا دوست خوش حال ہے مگر لڑکے کی تعلیم سے بے فکر ہے۔ اس کو اس طرف توجہ دلائیں گے یا وہ بے جا جھگڑتا ہے۔ اُس کو اس کی مضرتیں سمجھائیں گے، فضول خرچ ہے تو کفایت شعاری کی ترغیب دیں گے۔ فیاض ہے تو روپیہ مفید کاموں میں صرف کرنے کا شوق دلائیں گے وقس علی ہذا۔ اس کے ساتھ ہی یہ توقع نہ کریں گے کہ ایک بار کی فرمائش و نمائش بار آور ہو گی۔ نہ اس سے ملول ہوں گے۔ کہ دوست نے ہماری نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ فرض کیجیے ہمارا دوست مفلوک ہے۔ اس کی بے کاری رفع کرنے کی کوشش کریں۔ کچھ نہ کچھ ہو سکے تو اپنے ہمدردانہ برتاؤ اور کلام سے اُس کی مصیبت کے ہلکے کرنے کی کوشش کریں یہ بھی تھوڑی ہمدردی نہیں۔ بھائی سے برادرانہ شفقت کا برتاؤ رکھیں۔ اُس کی ناز برداری کریں اپنے اور اُس کے حقوق کو برابر سمجھیں۔ تنگ دلی سے کام نہ لیں۔ اس طرح دوسروں کے لیے عمدہ نظیر قائم کریں۔ فرصت کا وقت مطالعہ وغیرہ علمی مشاغل میں صرف کریں۔ شادی وغیرہ تقریبوں میں شریک ہوں تو سب سے اول ایسا شگفتہ مزاج قائم رکھیں کہ صاحب تقریب کے ہماری مہمان داری میں دقت

پیش نہ آئے۔ بلکہ ہماری آسائش کی فکر نہ کرے تو بھی ہم نہ بگڑیں اور اس طرح دل میں گنجائش پیدا کر کے کچھ مناسب حال الفاظ اس کے کان میں ڈال دیں جو مانا کہ اس تقریب میں کام نہ آسکے تو آئندہ آئیں گے۔ یہ بھی نہ سہی تو ہمارا برتاؤ دوسروں کے لیے نظیر ہوگا۔ نظیر بھی نہ ہوا تو ہم اپنے فرض سے ادا ہوں گے۔ نیز ایک پریشان حال بندۂ خدا (صاحب تقریب) کی مصیبت نہ بڑھائیں گے۔ ہمارے محلے میں جو مسلمان دکاندار ہیں ان کو ہم صفائی معاملہ کی ترغیب اس طرح دلاتے ہیں کہ جو ہمارا معاملہ اس سے ہو اس میں صفائی رکھیں اور ان کے ساتھ سہولت کا برتاؤ کریں۔ موقع موقع سے ہمت استقلال کے متعلق دو چار لفظ بھی ان کے کان میں ڈالتے رہیں۔ اپنی بستی کی گزشتہ تاریخ کے مرتب کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کے عمدہ سبق تحریراً و تقریراً ابنائے زمانہ کو سناتے ہیں۔ بزرگوں کی علمی یادگاروں کو جو ہماری دسترس کے اندر ہوں قائم و محفوظ رکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور اس سب کچھ کرنے کے بعد جب (بالفرض) ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو کوشش ہم نے کی وہ بالکل بارآور نہیں ہوئی۔ بلکہ سب جگہ اکارت گئی۔ تو پھر ہم یہ خیال کر کے مطمئن رہتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا اور یہ اطمینان ہم کو کوشش میں برابر مصروف رکھتا ہے۔ میرے مخدوم! اگر ہم نے اپنی زندگی اس طرح بسر کی تو کیا ہم بے کار رہے اور کیا بیکاری اس کا نام ہے کہ ہم نوکری کے پابند ہو کر بے کار ہو جائیں؟ درازآہنگی معاف فرمائیں۔ والسلام بالاکرام۔

خاکسار حبیب الرحمٰن

حبیب گنج ۴ر جنوری ۱۹۰۲ء

علامہ اقبال

(۱)

بنام مولانا عرفان صاحب

۲۵ر جولائی ۳۲ء (بعینہٗ ماخذ)

جناب مولانا!

السلام علیکم۔ مولانا شوکت علی تو اس وقت مقدمہ کی تیاری میں مصروف ہوں گے۔ آپ ان سے دریافت حالات کر کے اس خط کا جواب دیں۔ کچھ روز ہوئے میں نے ان کی خدمت میں لکھا تھا کہ ایک ہندو بزرگ مسٹر ملت کا خط میرے پاس آیا تھا اس کا مضمون یہ تھا کہ "ڈاکٹر مونجے ہماری اسکیم کو جو تم نے لیگ کی صدارتی ایڈریس میں پیش کی تھی تسلیم کرتے ہیں۔ پنڈت مالوی سے بھی مشورہ کرنے کے لیے جا رہا ہوں وہ بھی ہندو مسلمانوں کی صلح کی خاطر اس کو تسلیم کر لیں گے۔ گو اس وقت علانیہ طور پر اس اسکیم کو تسلیم کر لینا مصلحت نہیں ہے۔" یہ خط بعینہٖ ماخذ تھا اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے مولانا شوکت علی صاحب سے بھی گفتگو کی ہے۔ وہ بھی صلح پر آمادہ ہیں۔ اسکیم جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے یعنی شمالی ہندوستان کے مسلمان صوبوں کا ایک ہو جانا۔

اس خط کے موصول ہونے پر میں نے مولانا شوکت علی کو لکھا اور انہوں نے اس بات کی تصدیق کی مسٹر لٹ ان سے ملے تھے۔ میں نے مسٹر موصوف کو دو خط اس کے جواب میں لکھے تھے مگر یہ خط قریباً ایک ماہ ڈیڈ لیٹر آفس کے ذریعہ سے میرے پاس آگئے ہیں۔ پہلے مجھ کو شبہ تھا کہ اس میں کوئی چال اور عیاری نہ ہو مگر اب خطوں کے واپس آجانے سے یہ شبہ رفع ہوا۔ مسٹر لٹ اب معلوم نہیں کہ کہاں ہیں۔ اور مذکورہ بالا خط لکھنے سے ان کا کیا مقصد تھا۔ ممکن ہے، مولانا شوکت علی اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔ بعض لوگ مشورہ دے رہے ہیں کہ میرے خطوط کے واپس آجانے کے بعد مسٹر لٹ کے خط کو شائع کر دینا چاہیئے۔ اگر ممکن ہو تو حالات دریافت کرنے کے بعد مجھ کو مطلع فرمائیں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

افسوس کہ بمبئی کے فسادات ختم ہونے میں نہیں آتے۔

مخلص محمد اقبال

مولانا محمد علی جوہر

(۱)

چھندواڑہ - ۲۶ر اپریل ۱۹۱۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادر واجب الاحترام!

السلام علیکم۔ ۵ر اپریل کے محبت نامہ کا جواب آج دیتا ہوں اور محجوب ہوں کہ اس تاخیر کا باعث سوائے اس کے کچھ نہیں بیان کر سکتا کہ اس عرصہ میں برابر غم و غصہ کا شکار رہا۔ میں جو بڑے بڑے معاملات میں بھی آج کے عارضی فیصلوں کا قائل نہیں اور ان تمام ہنگاموں کو "شرارِ خس" سے زیادہ نہیں سمجھتا، ۵ر اپریل کے فیصلہ پر کیا "بندۂ دام فریب" ہوں گا مگر دوستوں کی موت اس زمانہ میں بھی جب کہ موت کا بازار گرم ہے دو چار آنسو بطور خراج کے وصول کر ہی لیتی ہے۔ اور ۵ر اپریل کو میرے چند عزیز ترین دوست نذرِ اجل ہو گئے اس لیے میرا غم و غصہ بے جا نہیں — مگر موت جسمانی نہیں، اس لیے کہ میں تو اس کا قائل ہی نہیں ہوں۔ بہت سے مُردوں کو جن کی ہڈیوں تک کا بھی پتہ نہیں چلتا "بل احیا" میں شامل کرتا ہوں مگر ان جیتی جاگتی کٹھ پتلیوں کو جو قومی سٹیج پر نچائی جاتی ہیں اور نچائی جا رہی ہیں مُردوں سے بدتر سمجھتا ہوں کیونکہ موت ان کے جسموں کو نہیں آئی بلکہ ان کی روحوں کو۔ تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو کہ ؎

محروم ہوں، مجبور ہوں، بے تاب و تواں ہوں
مخصوص ترے غم کا مزا میرے لیے ہے

پھر جس چیز کا صحیح معنوں میں اجارہ تم کو اس دربار سے مل گیا ہو اس میں شرکت کے دعوے کی مجھ سے جرأت نہیں ہو

ہو سکتی۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ میں بھی کسی قدر محروم و مجبور رہوں۔ اس پر بھی میں نے انصاری صاحب کو راہِ راست پر استقامت کی، جس طرح مجھ سے ہو سکا، ترغیب دی اور امید کی کہ میری اس دعا کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہو گا۔ "ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ہدیتنا" میرا خط (جو ان کو بھیجا گیا تھا) کوئی تحریرِ معمولی نہ تھی۔ اس میں میرے افکارِ دل کے متعدد ٹکڑے منسلک تھے مگر برادرم آخرش یہی معلوم ہوا کہ جس دنیا میں ہم لوگ رہتے ہیں وہ اس دنیا سے بہت مختلف ہے جہاں یہ ہمارے عزیز بس رہے ہیں۔ ہمارے تمام خیالات، تمام اندازے، تمام تخمینے فضول اور غیر متعلق ہیں۔ میں نے غالب کے ایک مصرع پر جو غزل لکھی تھی اس میں ایک شعر تھا ؎

تقوے کے بعد خوف کہاں حزن پھر کہاں
عالم ہی اک جدا ہے وہ رنج و محن کہاں

تقوے کا دعویٰ کرتے بھی ڈر لگتا ہے اور یہ سب جھوٹا فخر ہو گا۔ اگر میں کہوں کہ میں متقی اور خدا ترس ہوں۔ مگر باوجود بار بار انتباہ اور کم از کم چھوٹی موٹی تکلیفوں کے اب تک اس وعدۂ الٰہی کو سچا جان رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ وہ بھی پورا ہو رہا ہے کہ "سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب" اس لیے باوجود فاسق و فاجر اور بندۂ حرص و ہوا ہونے کے اپنے کو اپنے دیرینہ احباب کی دنیا سے ایک الگ دنیا میں پاتا ہوں اور گو اس دنیا کو اس پرانی دنیا سے بدرجہا بہتر جگہ پاتا ہوں اور خوش ہوں کہ اس کی سرحد میں داخل ہو رہا ہوں۔ تاہم پرانے تعلقات دامن گیر ہوتے ہیں اور گو خود پیچھا چھڑا لیتا ہوں۔ تاہم دامن کے ٹکڑے اس خارستان گلستان منزل میں لٹکے رہ جاتے ہیں۔ جن کے لیے آنسوؤں کا ایک چھوٹا موٹا قافلہ رواں ہو جاتا ہے افسوس کہ اصرار[1] سے زیادہ ہمت والے نہ نکلے۔ اب انہی کی نہیں بلکہ خود حریت کی جگ ہنسائی ہو رہی ہے مگر اس کا زیادہ رنج نہیں۔ رنج پرانے دوستوں دوستوں کی رفاقت چھوٹنے کا ہے۔ غالب نے سچ لکھا تھا کہ ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

مگر اچھا ہوا یہ جھوٹا سہارا بھی گیا۔ اب ایک سہارا باقی ہے اور وہ ہمیشہ کافی تھا اور اب بھی ہے۔ غالب کی غزل کا ایک شعر پچھلے کئی برسوں سے دل میں کھب چکا ہے ؎

چاک مت کر جیب کو بے فصلِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

اس پر ایک نامکمل غزل قافیہ کو محدود کر کے میں نے بھی لکھی تھی جس کا ایک شعر ہے ؎

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے
اک فقط تیرا سہارا چاہیے

---

[1] یہاں پڑھا نہیں گیا۔

گر لکھنے کو تو لکھ گیا۔ خود اب جا کر کہیں اس کا مفہوم سمجھا ہوں اور پھر سورۂ یوسف پڑھتا ہوں تو اس آیہ کریمہ کا مطلب اب سمجھ میں آتا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون کے جام بردار سے اس کی رہائی کے وقت کہا تھا۔ کہ بھئی ہمارا بھی ذکر اپنے آقا سے کر دینا کہ مفت ظلم ہوتا ہے اور وہ بھول گیا اور اس طرح چند سال اور حضرت یوسف مبتلائے زندان رہے۔ جب ایسے برگزیدہ پیغمبر کے لیے بھی فرعونوں کی یاد دہانی داخلِ شرک نہیں تو کم از کم مذموم سمجھی گئی۔ اور اس وحدہٗ لاشریک کو اس میں بھی استعانت غیر اللہ کا شائبہ معلوم ہوا تو پھر ہمارے تمام تعلقات تو شرک جلی ٹھہرے۔ اقامت صلوٰۃ میرا ایمان، اجماع امت پر میرا اعتماد، تاہم بعض اوقات اس تنگ و تاریک بت کدہ میں عبادت اپنی نجات کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے جہاں ایک وقت میں ایک ہی عبادت کرنے والا اپنے معبود کے حضور میں کھڑا ہو کر اپنی بندگی کا اظہار کر سکتا ہے۔ خوف ہوتا ہے کہ کہیں اپنے مذہب کی وسیع فراخ مساجد میں نماز کے ساتھی اور خود امام بھی مجھے کفر و شرک کی طرف نہ گھسیٹ لے جائیں اور دوسروں کی اصلاح تو کجا خود اپنی نجات سے مایوس ہونا پڑے۔ سب کچھ تو ہوا کہ اب یہی رہ گیا ہے کہ اپنی جان بچانے کی کوشش کروں اور مدرسہ کو چھوڑ کر پھر خانقاہ میں اعتکاف کر لوں۔ بھائی دعا کرو کہ اگر اپنی نجات کے متعلق خوف و ہراس میں کمی ہو تو کم از کم دوسروں کے متعلق یہ بے اعتباری باقی نہ رہے۔ اگر یہی حالت رہی تو کہیں کا نہ رہا۔ البتہ جب تمہارا خیال آتا ہے اور تم سے بھی زیادہ بہن کا، جو نہ صرف تمہارے ناموس کو بلکہ ہم سب کے ناموس کو اس طرح ہمت و جرأت کے ساتھ سنبھالے ہیں اور صامت و ساکت نہیں بلکہ کلمۂ حق کو باآوازِ دہل سب کو سنا رہی ہیں تو یہ بے اعتباری دور ہوتی ہے۔ اور جس طرح خدا سے میں مایوس نہیں اسی طرح اس کے بندوں سے مایوسی بھی قریں کفر معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ قومی اسٹیج کی کٹھ پتلیاں نہیں ہیں، وہی غریب اور کمزور لوگ ہیں جن سے اسلام کی ابتدا ہوئی تھی۔ رہے یہ حضرات تو ان کے متعلق تو بدگمانی بہت پہلے سے تھی۔ چنانچہ میں نے متعدد بار ان "آزادوں" کے مضمون کو غزلوں میں باندھا۔ مثلاً ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے، ولے
میرا لہو بھی خوب ہے، تیری حنا کے بعد

یا ؎

ہیں اتنے لاف شوق پہ مرعوب حسن بھی
یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد و زن سے دور
ہے بعد کربلا سے بھی، قرب یزید بھی
اور چاہتے یہ ہیں کہ نہ ہوں پنجتن سے دور

یا ؎

دشمنوں سے جب تلطف ہے تو کچھ
دوستوں سے بھی مدارا چاہیئے

د حافظ تلطف کو دوستوں کے لیے اور مدارا کو دشمنوں کے لیے لازمی گردانتے تھے۔ ہم دوستوں کے لیے [1]) یہ سب کچھ لکھ تو دیا ہے اور آج بھی اس طرح لکھ رہا ہوں کہ گویا ہم ہی ابناء اللہ اور احباء اللہ ہیں۔ مگر برادرم! ان حیرت انگیز انقلابوں کو دیکھ کر خوف ہوتا ہے کہ کہیں بڑا بول آگے نہ آئے۔ بنی اسرائیل کا وہ واقعہ یاد آیا ہے جس کا قرآن کریم میں مذکور ہے: "تولوا الا قلیلا منہم"۔ خود مسلمانوں نے بعض اوقات اس خیر القرون میں بھی سنت بنی اسرائیل کی تقلید کی تھی۔ چنانچہ منہزمین اُحد سے کہا گیا تھا کہ "ولقد کنتم تمنون الموت من قبل ان تلقوہ فقد رأیتموہ وانتم تنظرون"۔ دعا کرو کہ یہ حال اپنا کبھی نہ ہو بلکہ آخر تک ایمان اور صالح عمل پر قائم رہیں۔ تمہاری دعا ضرور مقبول ہوگی۔ اس لیے کہ اول تو آلِ رسول، پھر تقلید سنت یوسفی سے مشرف ہو چکے ہو۔ اب چونکہ تم نے مجھے بھی اپنے زمرہ میں بھی جو ابآء اور اجداد کا ہے شامل کر لیا ہے اور خود لکھ چکے ہو کہ

ع خوش اسی حال میں جو ہر بھی ہے آزاد بھی ہے

خیر یہ تو ہوا۔ میں نے لکھا تھا کہ تم پیش گوئی کرتے ہو؟ جمہور کی خواہش کے خلاف اعیانِ استبداد ایک ذلیل یونیورسٹی قائم کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ ارے بھائی اس میں پیش گوئی ہی کیا ہے۔ تم تو ان کے متبع ہو جو خوابوں کی صحیح تعبیریں بیان فرمایا کرتے تھے اور اس طرح مجلس سے نکل کر تخت تک پہنچ گئے۔ میں کہ اس مقام سے بہت دور ہوں۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا اور سال گذشتہ ہی میں سب کو جتلا چکا تھا کہ عزیزانِ من مدرسہ یونیورسٹی کا نہیں ہے بلکہ قوم کی ہتک اور تمہاری خواری وخرابی کا، اور رہی یونیورسٹی تو سن لو کہ اسے ہم بنائیں گے ہم۔ نہ تمہارے قوم فروش اور کالج فروش۔ کیونکہ ہم سے کسی نے حتمی وعدہ کر لیا ہے اور وہ وعدہ کا سب سے پکا بھی ہے کہ "ولا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنون"۔ اگر خوف ہے تو اس شرط کا کہ "ان کنتم مؤمنون" سو خدا سے دعا ہے کہ ہم کو ایمان پر قائم رکھے اور ان بزرگوں کی تقلید کی توفیق عطا فرمائے جن کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ "فما وہنوا لما اصابہم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصٰبرین" اگر ہم ایمان پر قائم رہے تو پھر سنت اللہ میں تو تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارا انعام کہیں نہیں گیا ہے۔ وہاں تو ملے ہی گا، مگر بیعانہ یہیں مل جائے گا کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ:

"فاٰتٰہم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الآخرۃ واللہ یحب المحسنین"

اس پر میں نے لکھا ہے کہ ؎

انعام کا عقبیٰ کے تو کیا پوچھنا لیکن
دنیا میں بھی ایماں کا صلہ میرے لیے ہے

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ تمہارے دونوں دیوان پڑھ چکا اور نہایت غور سے پڑھے اور بار بار پڑھے۔ ارتقائے سخن ظاہر ہے اب اگر یہ لکھتا ہوں کہ

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

---

[1] یہاں کچھ عبارت پڑھی نہیں گئی۔

تو اس کے صریح معنی یہ ہوئے کہ جو سختیاں الہ آباد، جھانسی، پرتاب گڑھ اور فیض آباد میں جھیلنا پڑیں۔ ان سے زیادہ کا مستدعی ہوں۔ مگر یہ بھی ہو تو جانتا ہوں کہ تم زیادہ کے بھی متحمل ہوگے۔ اس لیے کہ وہ خود کسی نفس پر اس کی سکت سے زیادہ تکلیف کا بوجھ نہیں ڈالتا اور ؎ جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا ملتا ہے۔ غم و اندوہ کے لیے لکھا گیا ہے تم میری غزلیں منگواتے ہو اچھا بھیج دوں گا۔ مگر بھائی تم شاعر تھے میں شاعر نہ تھا۔ البتہ عنایت ایزدی نے تمہیں تین دیوانوں والا بنا دیا تو اس قسم کی عنایت نے مجھ سے بھی تین چار غزلیں لکھوا دیں۔ پہلے بھی تک بندی کر لیتا تھا۔ مگر کاغذ کے پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی۔ اب کچھ کچھ بو باس آنے لگی ہے، سو بقول تمہارے ؎ تیرے غم کو نہ دے کیونکر دعا دل۔ اس وقت صرف نظر بندی کی پہلی غزل لکھے بھیجتا ہوں۔ بہن کو کل خط لکھوں گا۔ تم میری افسردگی کا ذکر کر کے میری طرف سے معافی مانگ لینا۔ ورنہ وہ ناراض ہی رہیں گی کہ جواب کیوں نہ دیا۔

تمہارا مرید با عقیدت: محمد علی

راشد الخیری

(۱)

بنام شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی

مکرمی و معظمی!

السلام علیکم۔ گرامی نامہ کا ممنون ہوں۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ میرے متعلق جو اعتراض تھا اس کی تردید کروں، بلکہ عصمت کے مضمون سے آپ کو میری طرف سے بدگمانی نہ ہو اور اب کہ چل چلاؤ کا وقت ہے کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے۔ آپ ضرورت نہیں خیال فرماتے تو جانے دیجیے۔

حاجیہ تاج بیگم صاحبہ کے معاملہ میں جس قدر میں نے کوفت اٹھائی وہ تھوڑی بہت آپ کے علم میں بھی ہے۔ آپ اس سے باخبر ہیں۔ اب یہ آپ ہی فرمایئے کہ رہائی کے بعد اگر ان کے شوہر نے سنگدلی اختیار کی تو مقدمات میں دہلی سے سیشن جج صاحب کی خدمت میں کیونکر لے جاتا۔ میرے اعضا اب وہ نہیں رہے۔ اکثر بیمار رہتا ہوں۔ ایک آنکھ کمزور ہو گئی ہے۔ ایک ٹانگ میں ہر وقت درد رہتا ہے۔

کاش وہ سات روپیہ اس سے پہلے یاد آ جاتے۔ اس کے بعد مدتوں حساب رہا۔ کبھی کے محسوب ہو چکے ہوتے۔ اگر یاد فرمائی پر بھی تساہل کرتا تو بدمعاملگی کہی جا سکتی تھی۔ مجھے جہاں تک یاد ہے۔ یہ پہلی مرتبہ آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ حالانکہ اس کے بعد عرصہ دراز تک سینکڑوں روپیہ کا حساب رہا۔ میاں امتیاز نے جو روپیہ بھیجے تھے۔ اس کا حساب آپ دیکھ لیں۔ اور مجھے جہاں تک بھی یاد ہے وہ میں نے مضامین کے واسطے . . . . . اور شاید ایک آدھ مضمون روانہ بھی کیا تھا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ مضمون کی ضرورت نہیں ہے۔

میں عصمت۔ سے اپنا نام علیحدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور وسط اکتوبر میں دہلی جاؤں گا۔ مہربانی فرما کر آپ میاں اقبال سلمہٗ سے فرما دیجیے کہ وہ وسط اکتوبر میں ایک کارڈ حساب کا لکھ کر مجھے دہلی روانہ کر دیں۔ میں تمام حساب صاف کر دوں گا۔

کتاب کے متعلق اگر تغیر و تبدل کی ضرورت ہو اور دوبارہ محنت کرنے پر درست ہو سکتی ہو تو میں حاضر ہوں۔ اگر نہیں تو میں انشاء اللہ کسی اور کو دلوا دوں گا۔ اور جس وقت اب کوئی درخواست کتاب لکھنے کی آئی تو آپ سے منگوا لوں گا میاں اقبال سلمہٗ کو دعا!

نیازمند: راشد الخیری - ۱۲؍جولائی ۱۹۲۱ء

منشی دیا نرائن نگم

(۱)

بنام احسن مارہروی

عنایت فرمائندہ۔ تسلیم!

نوازش نامہ باعث مشکوری ہوا۔ تصویر کی بنسبت معترضین کا اعتراض ہے کہ اس کا بیک گراؤنڈ قلعہ معلّٰی ہے۔ جو اس وقت موجود نہ تھا۔ اور خاندان کے آخری دور کی عمارتوں میں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تصویر اکبر اعظم کی نہیں بلکہ اکبر ثانی کی ہے۔ مروجہ تصویروں سے اس کی شباہت بھی مختلف ہے۔ اس میں چہرہ کسی قدر لمبا ہے۔ عام تصویروں میں بالکل گول ہے۔ چہرے سے بڑھاپے کے آثار نمودار ہیں۔ اکبر بڑھاپے میں سلطان عالم پناہ سے جاہل ہو گئے تھے اور ڈاڑھی کا بالکل صفایا کر دیا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے مگر یہ باتیں بھی قابل لحاظ ہیں۔ میں ایک نورتن کا گروپ چھپوانا چاہتا ہوں۔ آپ کے پاس ہو یا کہیں سے دستیاب ہو سکے تو ضرور عنایت فرمائیں۔ بلاک بننے کے بعد میں احتیاط کے ساتھ اصل تصویر کی واپسی کا ذمہ دار ہوں۔ مجھے یہ سن کر نہایت خوشی ہوئی کہ امسال انجمن ترقی اردو کے آپ سیکرٹری مقرر ہوئے میں اس انتخاب پر آپ کو تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ انجمن ترقی اردو نے اب تک کوئی کار نمایاں نہیں کیا ہے۔ خدا کرے آپ کے زمانے میں یہ ایک مردہ انجمن کی حالت میں نہ رہے۔ زمانے میں علمی خبروں اور نوٹس کا ایک مفید سلسلہ شائع ہوتا رہا ہے اور اب بھی بالکل بند نہیں ہو گیا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس سلسلے کا ایک حصہ انجمن ترقی اردو کے لیے وقف رہے۔ جس میں آپ اس انجمن کے سیکرٹری کی حیثیت سے لکھتے رہیں۔ اس طرح سے زمانہ انجمن اردو کا ایک باقاعدہ آرگن ہو جائے گا۔ جس کی خریداری ممبران انجمن کے لیے ضروری ہونی چاہیے۔ محض اس حصے کی علیحدہ کاپیاں بھی شائع ہو سکتی ہیں۔ انجمن کا ایک باقاعدہ رسالہ جس میں اس کے متعلق کل ضروری امور و کارروائی سے پبلک کو اطلاع ملتی رہے ہونا ضروری ہے۔ میں زمانے کے لیے خواہ مخواہ اصرار نہیں کرتا ہوں۔ مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ انجمن موصوف ایک کارگزار انجمن ہو جائے۔ مضامین خاص کے لیے پیشتر سے تکلیف دے رہا ہوں۔ راجہ کندن لال اشکی کی سوانح عمری جنوری

سے پرچے میں جو اول ہفتہ فروری میں شائع ہوگا ہدیۂ ناظرین ہوگی۔ اب مارچ یا اپریل کے رسالے کے لیے کوئی چھوٹی کا مضمون عنایت فرمایئے۔

زیادہ نیاز

بندہ دیا نرائن نگم کانپور

۲۶ر جنوری ۱۹۰۶ء

نصیر حسین خاں خیالؔ عظیم آبادی

(۱)

بنام پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

عزیز مکرم۔ سلام شوق۔

۲۸ر کو آپ کی محبت کی وہ یادگار (ناسخ عظیم آبادی مطبوعہ الناظر لکھنؤ) ملی۔ ممنون ہوا۔ مضمون دل لگا کر پڑھا۔ حق یہ ہے کہ آپ نے اُردو پر، مذاقِ صحیح پر اور پھر اپنے صوبہ و شہر پر احسان کیا ہے۔ میں آپ سے متفق ہوں کہ راسخ کا درجہ میرؔ سے کم نہیں۔ بلکہ بعض اعتبار سے کچھ بڑھا ہوا ہے اور اس ضمن میں آپ نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ ہرگز طرفداری و مبالغہ نہیں ہے۔

تمہید میں جو کچھ آپ کے جلے دل سے نکلا ہے بھی ایک حد تک جائز سمجھتا ہوں۔ لیکن آزاد یا کسی اور کے متعلق آپ کے سے اہلِ علم کے قلم کا اتنا بے قابو ہو جانا درست نہیں۔ بلاشک آزاد نے سہل انگاری سے کام لیا اور اس پر ایراد ضروری تھی مگر (آپ معاف کریں) ضرورت سے زیادہ دوڑ گئے ہیں۔ پھر جس چشمہ سے اپنی سیرابی بیان کرتے ہیں۔ دیکھنا چاہیئے کہ خود اس میں کیا دھرا ہے۔ . . . . . .[1]

راسخ کے ذکر میں "نوائے وطن" میں "مثنوی کشش عشق" کا سعادت علی خاں کے نام سے معنون ہونا بتاتی ہے۔ حالانکہ یہ مثنوی آصف الدولہ کو نذر کر دی گئی۔ نواب وزیر کی تعریف میں اس شعر کو یاد کیجیے۔

فقط ہے یہ تیرا ہی یمنِ قدم
ہوا لکھنؤ جس سے رشکِ ارم

---

[1] یہ اشارہ اپنے علاتی ماموں مولانا سید علی محمد شادؔ عظیم آبادی کی ایک تالیف "نوائے وطن" کی طرف ہے۔ اب جب کہ دونوں ماموں بھانجے دارِ فنا میں جا ملے۔ یہ امر کوئی راز باقی نہ رہا کہ دونوں ایک دوسرے سے صاف نہ تھے۔ یہ ایک خاندانی عامتہ الورود مناقشہ تھا۔ جس سے ادبی دنیا کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی دونوں اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے۔ ایک فخر روزگار شاعر۔ دوسرا صاحب طرز نثر نگار۔ اللہ دونوں کو مغفرت کرے۔

ذاتی گفتگو بھی اس خط سے حذف کر دی گئی ہے۔ (مسلم)

کون نہیں جانتا کہ یہ آصف الدولہ ہی تھے جو ماں اور بی بی سے رنجیدہ ہو کر فیض آباد سے لکھنؤ آ رہے۔ پھر سنیئے عمارات کی تعریف ہیں :۔

عمارات عالی کا ہو وصف کیا
نہیں اپنا ادراک اتنا رسا
نہ ہو خوبی قطع ان کی بیاں
ورق ہے مرقع کا اک اک مکاں
نظر کیجیے جس پہ سو تصویر ہے
عجب رنگ سے طرز تعمیر ہے

کیا یہ اس کے بعد بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ عمارات کی بنا شوق آصف الدولہ سے منسوب ہے، نہ کہ سعادت علی خاں سے۔ اب صاف سنیئے :۔

تو اے آصف الدولہ عالی جناب
رہے تا قیام جہاں کامیاب
نہیں تجھ سا حاجت روا خلق کا
بہت خوش ہے تجھ سے خدا خلق کا

آپ سے بہتر اسے کون جانتا ہے کہ تذکروں کی ایسی غلطیاں ناقابل معافی ہیں۔ نوائے وطن میں اس ذکر کو یوں پڑھ کر راسخ کی مٹی خراب ہوتی ہے۔ لوگ اسے مستند سمجھ کر مثنوی کشش عشق کو سعادت علی خاں کے زمانے کی چیز سمجھتے ہوں گے۔ حالانکہ وہ آصف الدولہ کے وقت کی ہے۔ یعنی جب کہ مثنوی میر حسن نکلی۔ غور کیجیے مصنف کی تحقیق نے غریب راسخ کو کتنا پیچھے ہٹا دیا۔

پھر اسی طرح مثنوی حسن و عشق کے ذکر میں نوائے وطن کی عبارت ملاحظہ ہو: غازی الدین حیدر کے زمانہ میں پھر لکھنؤ آئے۔ ایک مثنوی مسمّٰی بہ حسن و عشق ان کے نام سے موزوں کی۔ مگر اب شریعت نے رنگ ہی بدل دیا تھا۔ اس نے بھی کام نہ کیا۔ وار خالی گیا۔" یہ دوسری تاریخی غلطی ہے۔ لکھنؤ میں شریعت نے محمد علی شاہ کے وقت میں رنگ بدلا نہ کہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں۔ اسی عہد میں "فسانہ عجائب" تالیف ہوئی۔ اور فصیح نے اپنی مشہور مثنوی "نان و نمک" (تصوف میں) تصنیف کی۔ پھر شریعت نے وہ کون سا رنگ بدل دیا تھا کہ فسانہ عجائب و مثنوی فصیح تو عام ہو جائیں، مگر راسخ کی مثنوی مقبول نہ ہو؟

کلکتہ میں مراۃ الجمال لکھی گئی۔ اس میں نواب جان ایک کسبی کے حسن و جمال کا ذکر ہے نوائے وطن اس ذکر سے بھی خالی ہے۔ عظیم آباد میں گنجینۂ عشق تصنیف ہوئی جس میں ایک کسبی پہ اپنے عاشق ہونے کا نہایت صفائی و دلیری سے حال لکھا اور اس کی تعریف و توصیف کی ہے :۔

بہت اس شہر میں ہیں خوبرو پر
نہیں ہے دلبرا اپنا کوئی دلبر
دل اپنا اس صنم کا ہے فقط رام
کہ شرفو جس کا ہے نام خدا نام
اسی گل کی ہوا ہے دل میں اپنے
یہی آتش ہے اب دل میں اپنے

دنیا کے شاید ہی کسی شاعر نے اپنے عشق کو اس طرح بیان کیا ہو۔ یہاں تو "گفتہ آید در حدیث دیگراں" میں سب کچھ کہا جاتا ہے اور راسخ کا یہی وہ رنگ ہے جسے آپ اس کا امتیازی طرہ کہتے ہیں......

نوائے وطن میں راسخ کی وفات کی تاریخ ۱۲۳۸ھ دی گئی ہے۔ مگر گلشن بیخار اور دتاسی میں ۱۲۴۰ھ ہے اور دتاسی نے راسخ کو تو نہیں مگر شیفتہ کو جو ان کے ہمعصر یا کچھ دنوں بعد کے ہیں دیکھا تھا۔

راسخ کے ذکر میں بہار یا عظیم آباد کی زبان و شاعری کی تحقیق لطف سے خالی نہیں۔ راسخ نواب مہابت جنگ کے زمانہ یعنی ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری کی عمر اگر پندرہ برس کے سن سے شمار کی جائے تو ۱۷۶۵ء ہوگا۔ یعنی پلاسی کے دو برس بعد۔ اور ان کی زبان بتا دے گی کہ صرف چند سال کی مشق کا یہ نتیجہ نہیں۔ بلکہ پشتوں اگر نہیں تو ایک پشت کی ریاضت و صفائی کا نتیجہ ضرور ہے۔ اور اس ایک پشت کا زمانہ کم از کم پچاسی سال مقرر کیا جائے گا۔ یعنی ۱۶۸۰ء سے کبھی ادھر کی یہ زبان نہیں ہو سکتی۔ یہ فرض کر لیا جائے (جس کا فرض کیا جانا قیاساً نا درست نہیں) تو وہ زمانہ عالمگیر کا ثابت ہوگا۔ جو ۱۷۰۷ء میں فوت ہوا۔ اس لیے عالمگیری عہد بلکہ اس سے بہت قبل اُردو ہی نہیں، بلکہ شاہجہانی یعنی ٹکسالی اُردو کا عام رواج آپ کے صوبے میں تھا۔ اور اس وقت لکھنؤ تو لکھنؤ، فیض آباد میں بھی ٹکسالی اُردو عام نہ تھی۔ فیض آباد محمد شاہ یا زیادہ سے زیادہ فرخ سیر (۱۷۱۹ء) کے وقت میں آباد ہونا شروع ہوا۔ اس لیے عظیم آباد کی زبان اودھ اور دکھن سے بھی قدیم اور مستند ہے۔

اشرف علی خان کوکہ فغاں، دلی سے عظیم آباد راجہ شتاب رائے کے زمانے میں آئے۔ اور ۱۷۸۶ء میں وہیں مرے۔ راسخ کی عمر اس وقت ۲۴ سال سے کم نہ تھی اور اس وقت ان کی شاعری بھی جوانی پر ہوگی۔

فرخ سیر عظیم آباد امیر الامرا نواب حسین علی خاں کے ساتھ ۱۷۱۳ء میں دلی گیا ہے۔ اس وقت عظیم آباد امرائے دہلی کی جاگیر بنا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے وہاں ٹکسالی اُردو کا بازار گرم تھا۔ انہیں امرا میں سے نواب سید ہدایت علی خاں اسد جنگ المتخلص بہ ضمیر (صاحب سیر المتاخرین کے باپ) بھی تھے جو فرخ سیر کے آخر عہد سے لے کر شاہ عالم ثانی کے وقت تک دلی و عظیم آباد میں رہے۔ نواب اسد جنگ ٹھمریاں، ہولی اور دُہرے خوب کہتے تھے۔ اُردو میں بھی ان کی غزلیں ہیں۔ نواب عمدۃ الملک انجام وزیر محمد شاہ کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ نواب صاحب کی جاگیر میں پرگنہ جیلہ (بڑا حسین آباد) تھا۔ لیکن زیادہ تر وہ اپنے عملہ اور شاگرد پیشہ سمیت جو دلی کے تھے، عظیم آباد میں رہتے تھے .... حاجی گنج، پورب دروازہ اور زن گولہ امرائے دہلی کا مسکن رہا ہے .... شاہ ارزاں، خواجہ کلاں (جن کے نام سے گھاٹ ہے) اور شاہ صادق (جن کے نام سے غالباً صادق پور ہے) ان سب کو دلی سے توسل تھا۔ اور یہ سب عمدہ شعرائے اُردو میں سے تھے۔ آپ کے خاندان صادق پور میں بھی زبان کا خاص ذوق و شوق رہا۔ جسے علم و فضل اور فراغت ہمیشہ جلا دیتی رہی۔

غرض راسخ کے ذکر میں عظیم آباد کی زبان کا ذکر بھی ضرور ہے اور جب اس پر غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ آپ کے گھر میں جس وقت اُردو عام و فصیح تھی، لکھنؤ اس وقت شیخزادوں اور کمبوہوں کا قصبہ و مسکن تھا اور سعادت علی خان کے وقت تک وہاں کی زبان وہی تھی۔ جو کاکوری، موہان، بہرائچ اور محمود آباد میں رائج ہے۔ عمدۃ الملکی مکتب کا اثر فیض آباد پر پڑا۔ اس لیے کہ انجام کے بعد صفدر جنگی و سالار جنگی اُردو کے اسکول اور دفتر کو (بوجہ دوستی عمدۃ الملک) فیض آباد اُٹھا لائے۔ شاہ عالم

وغیرہ دلی میں عمدۃ الملک کے ملازم اور اُردو کے دفتر میں کلرک تھے۔ اُن پر زبان کا اثر پڑتا رہا اور اس وجہ سے ان کے شاگردوں کی زبان بھی درست ہوئی۔ اس دفتر کے لوگوں میں میر ضاحک اور آتش کے چچا اور ماموں صمد جنگیوں کے ساتھ فیض آباد آئے اور اُردو کا دفتر اب وہاں قائم ہو گیا۔ میر حسن (صاحب مثنوی) نے اسی دفتر اور نوابان فیض آباد کے محلوں میں پرورش پائی۔ میر خلیق وہیں پلے۔ میر انیس کی خالہ گھسیٹی بیگم نواب بہو بیگم صاحبہ کی مصاحب تھیں اور میر انیس اسی محل میں بڑے ہوئے۔ اتنے اتار چڑھاؤ کے بعد انیس کی زبان ایسی ہوئی ہے۔ اور اسے نوٹ کر لیجئے کہ انیس کے قبل تک لکھنؤ کی زبان وہی تھی جو ناسخ و دبیر کے ہاں مستعمل ہے۔ یہ انیس کے گھر اور عمدۃ الملکی اسکول کا صدقہ تھا کہ لکھنؤ کی زبان اس پایہ کو پہنچ گئی۔

عظیم آباد پر لکھنؤ کی زبان کا کوئی معتدبہ اثر کبھی نہیں پڑا۔ وہاں کے بعض شعرا مصحفی کے البتہ شاگرد ہوئے اور آپ کے ہاں کے اکثر شعرا نے اپنے شاگردوں کو ناسخ وغیرہ کے مقابلے کے لیے تیار کیا اور وہاں بھیجا ہے یعنی اس وقت تک لکھنؤ کی شاعری و زبان عظیم آباد والوں کے لیے سند نہ تھی۔ فکر، سانس اور برف وغیرہ الفاظ شاہ عالم ثانی کے وقت تک مونث تھے، وہی لکھنؤ پہنچے اور اسی رستے سے عظیم آباد آئے۔ دلی میں پنجابی اور آگرہ وغیرہ کے اثر سے وہ مذکر ہو گئے مگر لکھنؤ اور عظیم آباد میں پرانا اثر قائم رہا ......

۱۲؍ مئی ۱۹۱۹ء   خیال

سید سلیمان ندوی

(۱)

بنام نواب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم

مخدوم محترم دام مجدہٗ السامی! السلام علیکم۔

آپ سے رخصت ہو کر اعظم گڈھ پہنچا۔ یہاں بھی چند روز حرارت اور پھوڑے کی تکلیف رہی۔ مگر آج اچھا ہوں۔ پھوڑے سے بھی ریم نکل گئی ہے اور اب صاف ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب بھی اسی دن صبح کو الہ آباد سے آئے وہ سخت علیل ہو گئے تھے۔ نمونیہ کا خطرہ تھا۔ الہ آباد میں بروقت علاج ہوا۔ اور اب اچھے ہیں۔

جب سے آیا ہوں ندوہ کا تخیل قائم ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ ندوہ میں کوئی ذمہ دارانہ عہدہ لینے پر کسی طرح راضی نہیں اور نہ مستقل قیام لکھنؤ میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے لیے بالکل آمادہ ہیں کہ سال میں چند مہینے وہ وہاں اقامت کریں اور تنظیم و تعمیر میں اور فراہمی چندہ میں مدد دیں اور اس کے لیے وہ بہت جلد کارروائی شروع کریں گے مولوی عبدالسلام صاحب عنقریب جائیں گے کہ ایک دو مہینہ رہ کر آخری سال کے طلبا کو ادبی علوم میں مدد دیں اور بچوں کی تعلیمی نگرانی کریں۔ مولوی مسعود صاحب نے طلبائے قدیم کو خطوط لکھے ہیں۔ اور اُن کا جلسہ بلانے والے ہیں۔ میری حالت یہ ہے کہ میں تعلیمی نگرانی کے لیے تیار ہوں۔ معتمد دارالعلوم بنا دیجئے۔ سال میں متعدد پھیرے کروں گا۔ ندوہ کی نظامت کا بار اگر

ٹالیں گے تو قہراً جبراً برداشت کروں گا۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا خط آیا ہے۔ مشورہ پوچھا ہے۔

مولوی شبلوی صاحب کا خط آیا ہے کہ بھوپال میں جس حد تک کوشش کرنی تھی ہو چکی اور اب آپ کے ایماء سے حیدرآباد جاتے ہیں۔ عبدالعلی صاحب کے لیے یہ کوشش کی اور مجھے لکھا بلکہ تم جنرل صاحب کو لکھو کہ اس کا وظیفہ ہو جائے چنانچہ میں لکھوں گا اور امید ہے جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے کہ ان کو مل جائے گا۔ اس طرح ان کی تعلیم کا بندوبست ہو جائے گا

مولوی مرتضےٰ صاحب جو پہلے کتب خانہ میں تھے میرے پاس آئے تھے کہ ان کو کتب خانہ میں کر دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اگر کتب خانہ میں آپ کے کام کا ریکارڈ اچھا ہے تو مجھے اختلاف نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نواب صاحب خود مداح تھے، اگر آپ نے ان کے کام کو پسند کیا ہے تو ضرور ان کو کتب خانہ میں جگہ دے دیجیے۔ کتب خانہ کی حفاظت ضروری اور لازمی ہے۔ اس کا بند رکھنا کتابوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

آپ ایجنڈا تو جاری فرما دیجیے۔ اور نظامت کی تجویز بھی درج کر دیجیے۔ اگر عارضاً میرا نام بھی لکھ دیجیے تو ہرج نہیں۔ مستقل انتظام میری نظر میں ہے۔ انشاء اللہ۔

مولوی عبدالرزاق اور مولوی عبدالرحمٰن صاحب نگرامی کو خط لکھے گئے ہیں۔ والسلام

۱۷ر فروری ۱۹۲۳ء سید سلیمان۔ اعظم گڈھ

---

(۲)

بنام مولٰنا عرفان صاحب

۳۳۔ ۳۴۔ انڈرسن اسٹریٹ مدراس۔

مخدوم محترم دام کرمہٗ۔ السلام علیکم۔ آپ کے اخیر تار نے مجھے بے چین کر دیا۔ کئی دفعہ تار لکھوایا، اور پھر کٹوایا۔ یقین جانیے کہ رات بھر سکون سے نیند نہیں آئی، گو یوں بھی دماغ کی خشکی اور معدہ کی تبخیر کے باعث "تین مہینے ہو گئے کہ نیند کی اصل لذت سے محروم ہوں، مگر آج کی شب تو صرف کروٹ ہی بدلتے بدلتے گزر گئی اور زبان پر یہ مصرع تھا۔ "دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور" گو میں اپنے پہلے خط میں اپنی معذرت کے اسباب پوری طرح لکھ چکا ہوں، مگر آپ نے شاید باور نہیں کیا۔ اس لیے میں دوبارہ اپنا حلفیہ بیان پیش کرتا ہوں اور یہ اس لیے کہ مجھے آپ کے ساتھ جو محبت ہے اس کی وجہ سے یہ خیال کر کے دل میں تکلیف محسوس کرتا ہوں کہ آپ میرے عذرات کو محض بہانہ تصور کرتے ہیں۔

۱۔ میں یہاں چند ہفتوں کے لیے مسافرانہ آیا۔ اسباب و سامان جو ایسے بڑے سفر یعنی حجاز کے لیے درکار ہے وہ سارا ساتھ نہیں۔ پاسپورٹ میرے پاس نہیں، پچھلا پاسپورٹ کہیں اعظم گڈھ میں پڑا ہے۔ پاسپورٹ مدراس میں نہیں مل سکتا بمبئی میں نہیں مل سکتا۔ پھر کیونکر اگر بایں ہمہ بے سر و سامانی چل کھڑا ہوں تو ۲۹ر کو کراچی یا ۳۱ر کو بمبئی پہنچ سکتا ہوں، اور سے روانہ ہو سکتا ہوں غور فرمائیے۔

۲۔ ہر شخص جو کچھ بھی اپنے پیچھے تعلقات رکھتا ہے۔ وہ کسی بڑے سفر سے پہلے کچھ انتظامات کرتا ہے۔ میں پٹنہ کے

جلسے میں شریک ہو کر ابھی تک اعظم گڑھ نہیں گیا۔ چند ہفتوں کے لیے دارالمصنفین اور معارف کا کام سنبھال کر، اور مطبع میں چھپنے کی چیزوں کا سامان کر کے مدراس چلا آیا۔ میں نے مجلس عاملہ میں شرکت وفد سے انکار کر دیا تھا۔ اب ادھر آپ کے تاروں نے بتایا کہ میرا نام ضروری ہے۔ اور مٹ نہیں سکتا۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ میں اعظم گڑھ جا کر چند مہینوں کے کام متعین کر دوں۔ مطبع میں کتابوں کی چھپائی کا کام مقرر کر دوں۔ معارف کے مضامین کا سامان کر جاؤں۔ پچھلی دفعہ جب یورپ گیا خوش قسمتی سے میرے شریک ادارت مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی تھے۔ انہوں نے معارف سے مجھے مستغنی کر دیا تھا۔ اور مطبع میں سیرت دوم کا کام سال بھر کے لیے کافی تھا۔ دوسری مرتبہ تین مہینوں کا کام درست کر کے گیا۔ اب نہ مولوی عبدالماجد صاحب ہیں اور نہ مولوی ابوالحسنات مرحوم، اور نہ کوئی اور کام سنبھالنے والا ہے۔ بایں ہمہ مجھے عرب کے سفر کے لیے مدراس سے واپس جا کر چند مہینوں کے انتظامات اپنی غیر حاضری کے زمانہ کے درست کر کے تیار رہنا چاہیے تھا۔ اور اس کا موقع نہیں، ایسی حالت میں جانے کے معنی معارف اور دارالمصنفین کے بند کر دینے کے ہیں۔

۳۔ مصیبت جب آتی ہے ایک ساتھ آتی ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب کی بھتیجی کی شادی در پیش ہے بہت دنوں سے وہ ٹال رہے تھے، نومبر کا مہینہ فریق دوم نے آخری مہینہ مقرر کیا ہے، کہ شادی کیجئے یا جواب دیجئے اور یہی مہینہ ان کے دو ہزار ادائے قرض کی قسط کا ہے۔ جس کا قصہ شاید آپ جانتے ہوں، اس لیے وہ اوائل نومبر سے ایک ماہ کے لیے دارالمصنفین چھوڑ کر مجبوراً مکان رہیں گے، اور دارالمصنفین کے لیے ہم میں سے ایک کا رہنا ضروری ہے اور اسی لیے اُن کو آزاد کرنے کے لیے مجھے یہاں سے دو چار روز میں روانہ ہو جانا ہے۔ کیونکہ یہاں جو لیکچر دینے تھے وہ ختم ہو چکے، صرف ایک باقی ہے جو آج کل میں ہو جائے گا۔

۴۔ میں باقاعدہ دارالمصنفین کا نوکر ہوں۔ اس میں دونوں طرح کے ارکان ہیں۔ پہلے یورپ گیا تو بلا اطلاع گیا اور تنخواہ جاری رہی مگر اُس وقت ہوا ایسی تھی کہ وہ مخالفت نہ کر سکے۔ دوسری دفعہ حجاز گیا تو ان کی اجازت سے کر تین مہینہ کی رخصت پر گیا۔ مگر اس دفعہ باہم بدمزگی ہوئی، اب اس دفعہ پھر اُس بدمزگی کو بڑھانا سوسائٹی یعنی دارالمصنفین کو برباد کرنا ہے۔ ان میں بعض وہ ممبر بھی ہیں جن کے ذریعہ سے حیدرآباد کی امداد آتی ہے مجھے یا تو مستعفی ہو جانا چاہیئے یا دارالمصنفین کو باہمی اختلاف کی بنا پر توڑ دینا چاہیئے۔ گو میں اب بھی زبردستی جا سکتا ہوں۔ مگر بار بار درخواست کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

۵۔ ندوہ کا قصہ یہ ہے کہ نومبر کے آخر میں انبالہ میں اس کا سالانہ جلسہ ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب اپنی خانگی ضرورتوں کے باعث گھر سے باہر نہیں ہو سکتے۔ اب مجھی کو اُس جلسے کو سنبھالنا ہے۔ اس مہینے میں میری غیر حاضری کے باعث بعض مخالف ارکان نے مدرسہ پر مجلس تحقیقات تعلیم و اخلاق یعنی انکوزیشن مجھ پر قائم کیا ہے۔ تاکہ میرے زمانہ معتمدی پر الزام رکھ کر مجھے بدنام کیا جا سکے، اس سے پریشان ہوں، اس کے بچاؤ کی صورت کرنا ہے، ایک مدرس کا انتقال ہو گیا اُس کی جگہ کا انتظام مجھے کرنا ہے، نصاب بنانا اور بنوانا ہے اور سرمایہ کی فراہمی کا انتظام کرنا ہے۔

یہ سب تو دور دور کی یعنی آفیشل مجبوریاں تھیں۔ اب میں آخر اپنا جسم آپ کو دکھاتا ہوں، یورپ سے یہ بیماری لے کر آیا کہ کھانے کے دو گھنٹے بعد جگر سے لے کر گردہ تک درد ہوتا ہے۔ علاج سے دب جاتا ہے اور پھر ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ خاص طریق سے رہا جائے۔ آپ اپنی مہربانی سے ہر قسم کا انتظام اپنے سر لینے کو تیار ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں عرب کو دیکھ چکا ہوں اور آپ صرف سن کر فرماتے ہیں، پچھلی دفعہ عرب کے سفر نے پھر مرض کو پیدا کر دیا۔ بلکہ اور ایک نئے مرض میں مبتلا کر دیا۔ عرب میں گوشت عموماً دنبے کا ہوتا ہے جو میرے لیے زہر، روٹی بازاروں میں خمیری بکتی ہے۔ نہایت ثقیل، سبزیاں اور ترکاریاں جو میں کھاتا ہوں وہاں نہیں ملتیں، پچھلی دفعہ ہندوستانی باورچی رکھا گیا۔ مگر گوشت اور روٹی کی قسم کو وہ کیا کرتا، وہاں درد شروع ہو گیا۔ تو دوا بھی بمشکل میسر آ سکی۔ اینٹ کو آگ میں گرم کر کے اس سے جگر، پیٹ اور گردہ کو سینک کر علاج کرتا تھا اور تسکین حاصل کرتا تھا۔ پاخانہ کا وہاں سسٹم ایسا ہے۔ جو ایک دائم المرض کے لیے سوہانِ روح ہے، کہہ نہیں سکتا کہ ایک مہینے میں اس کی کیا تکلیف وہاں اٹھائی ہے۔ اس سے مرض نیا یہ تحفہ لایا ہوں کہ دونوں سرین کے بیچ میں کوئی رگ یا پٹھا یا ہڈی ہے۔ اس میں درد ہو جاتا ہے۔ اُٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ اس حالت میں موٹر کی سواری پر بھی حرکت ہوتی ہے تو جان نکل جاتی ہے، ایسی حالت میں رابغ سے مکہ معظمہ تک کئی دن اونٹ یا شغدف کی سواری میرے لیے ناقابل تحمل ہے دماغ کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ذرا سی فکر یا کسی خیال کی آمد سے نبض جاتی رہتی ہے۔ تین مہینے سے یہ حال ہے۔ قلب پر یہ اثر ہے کہ بالکل افسردگی اور پژمردگی آ گئی ہے۔ ذرا سا بولتا ہوں تو تھک جاتا ہوں اور سینہ میں درد ہو جاتا ہے یہاں آیا تھا کہ کام کے ساتھ کچھ تفریح اور تبدیل آب و ہوا ہو جائے گی۔ یہاں ایک مرض جو جاتا رہا تھا عود کر آیا یعنی قارورہ میں سوزش اور ایک مرض ترقی کر گیا یعنی سوزش اور درد شکم کے ساتھ دو تین دفعہ دست۔ ڈاکٹری علاج سے یہاں کوئی فائدہ نہ ہوا آخر ایک ہفتہ کے لیے بنگلور گیا تھا۔ وہاں حکیم صاحب قبلہ کے ایک شاگرد مستعد حکیم ہیں انہوں نے دیکھا اور دو تین یونانی قرص، معجون اور شربت تجویز کیا ہے جو روزانہ استعمال میں ہے اور اس سے کسی قدر تخفیف ہے۔

میں نے اپنا دل نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور خدا جانتا ہے کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ حرف بحرف سچ ہے، ناز و نخرہ اور بہانہ کی عادت نہیں، اور نہ طمع دنیا میں گرفتار ہوں۔ میری سات آٹھ برس کی ملاقات آپ سے ہے۔ آپ جیسے آدمیوں کی شناخت کے مدعی سے میرا کوئی عیب یا ہنر چھپا نہ ہوگا۔ خدا جانتا ہے کہ آپ کی خواہش کو پوری نہ کرنے کا کس درجہ افسوس ہے۔ میں گناہگار ہوں۔ اور اپنی گناہگاری کی سزا آپ کے ہاتھ سے برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ کیا کسی طرح اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟

میں دو چار روز میں یعنی یکم نومبر کو اعظم گڑھ روانہ ہو جاؤں گا۔ والسلام

۲۶ر اکتوبر ۲۵ء سید سلیمان

خواجہ حسن نظامی

(۱)

بنام مہاراجہ سرکشن پرشاد

رین بسیرا۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی دہلی ——— تار کا پتہ خواجہ دہلی

خماری شاہ صاحب۔ السلام علیکم۔ خط رجسٹرڈ مورخہ ۱۲ دسمبر وصول ہوا۔ درویش کے مضمون میں جماعت علی شاہ صاحب ہی کے واقعہ کا اشارہ تھا۔ آپ مجھ سے پہلے اس قصہ کو فرما چکے ہیں۔

اگرچہ آپ کا خیال بلحاظ تدبیر درست ہے کہ جماعت علی شاہ صاحب جیسے لوگ ان جوابات سے قائل نہیں ہوں گے بلکہ اور ضد کریں گے مگر ملک میں ان کے علاوہ بھی ایک جماعت کثیر ایسی ہے جو اس قسم کے مضامین شائع ہونے سے بدگمانیوں اور فضول افواہوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے میں نے وہ مضمون شائع کرنا ضروری سمجھا اور مناسب معلوم ہوا تو آپ کا یہ خط بھی خانگی الفاظ قلم زد کرنے کے بعد شائع کر دیا جائے گا۔ کہ اس خط میں نہایت مخلصانہ سچی تحریر ہے۔ اگر خط شائع ہوا تو جماعت علی شاہ کا قصہ درج نہ ہوگا۔

میں کل ایک خط آپ کو لکھ چکا ہوں اور دو تار بھی آپ کو دیئے ہیں۔ امید ہے کہ وصول ہوئے ہوں گے۔ میں خود آمنے سامنے ملنا اور بات چیت کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ خدا کے فضل سے حور بانو کو بھی اب آرام ہے۔ یعنی قابلِ فکر حالت نہیں ہے۔ شادی اگر مقرر ہو گئی تو فوراً چلا آؤں گا۔ ورنہ پندرہ دن کے بعد ارادہ ہے۔ محض آپ ہی سے ملاقات کرنی چاہتا ہوں کہ مریدوں کی بھیڑ بھاڑ سے بچ کر کہیں ٹھہروں۔ خواجہ بابا اور بچوں کو دعا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء   دعا گو: حسن نظامی

---

(۲)

بنام مولانا وحید احمد

جناب منیجر صاحب ہوٹل دی ہارٹ[1]

کسی بوائے کو آواز دیجئے کہ کمرہ نمبر ۱ کا مسافر ناشتہ مانگتا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ ۱۳ اپریل کا خط آج ۱۵ کو ملا۔ جب آپ یہ خط لکھ رہے تھے میں اپنے گھر سے دس میل دور انکم ٹیکس آفیسر سے ملنے جا رہا تھا۔ لاکھوں عورت مرد جمنا اشنان کر کے گھروں میں واپس جا رہے تھے۔ قدم قدم پہ اندیشہ ہوتا تھا

---

[1] میں نے ٹھہرنے کے متعلق گزارش کی تھی کہ ایک ہوٹل میرے یہاں ہے اس میں قیام فرمائیے اور اس کا نام (HOTEL de HEART ہے۔

منشی پریم چند

بنام سید امتیاز علی تاج

مشفق من! تسلیم!

لفافہ ملا۔ مشکور ہوں۔ مئی جون کے پرچے خوب پڑھے۔ اور حظ اٹھایا۔ میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ ایسا دلچسپ رسالہ اس وقت اردو زبان میں نہیں ہے۔ پبلک اگر قدر نہ کرے تو مجبوری ہے۔ بالخصوص ارتقار اور اصل انواع پر جو مضمون قبلہ سید ممتاز علی صاحب نے تحریر فرمایا ہے وہ رسالہ کی جان ہے۔ ان موضوعات پر ایسا صاف اور روشن مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ مجھے اب تک نہ معلوم تھا کہ حضرت ممدوح کو علمی مضامین پر اتنی دسترس ہے۔ . . .[1] . . . کچھ زیادہ دلچسپ نہیں لیکن شبنم کی سرگزشت بہت اچھا ہے۔ گل کدہ پر ا۔ دو سالوں میں کوئی مبصرانہ تنقید نہیں نکلی۔ اس لحاظ سے و نیز تنقید کی خوبی کے اعتبار سے آپ کا رسالہ اول ہے۔ اردو کے نقاد پر اچھی چوٹ کی ہے حالانکہ کسی قدر غیر منصفانہ ہے۔ عالم خواب مجھے بہت پسند آیا ہے علاج بے دوا خوب ہے۔ معلوم نہیں طبعزاد ہے یا کچھ اور۔ حصہ نظم بھی دیگر رسالوں سے کہیں بلند تر ہے۔ میں تعریف کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ حق کا اظہار کر رہا ہوں۔ گمنام صاحب تو بڑے لکھاڑ معلوم ہوتے ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب لکھتے ہیں

پریم پچیسی حصہ دوم کی سو جلدیں آپ کے یہاں بھجوا دی ہیں۔ پریم بتیسی حصہ اول چھپ رہی ہے۔ غالباً دو مہینے میں تیار ہو جائے گی۔ کیا بتیسی کا حصہ دوم آپ اپنے اہتمام سے نہیں شائع کر سکتے؟ بازار حسن تو ابھی معلوم نہیں کب تک تیار ہو۔ اسی اثنا میں اگر بتیسی حصہ دوم آپ شائع کر سکیں تو خوب ہو۔ کچھ قصے آپ ہی کے دونوں پرچوں میں نکلے ہیں بقیہ دس میں دے دوں گا۔ کوئی دس جزو کی کتاب ہو گی۔ آپ کے لیے ایک قصہ لکھ رہا ہوں۔ خون جگر تو بہت صرف کر رہا ہوں پر معلوم نہیں کچھ رنگ بھی آئے گا یا نہیں۔ خون ہی نہیں ہے تو رنگ کیا خاک پیدا ہو۔ اور کیا التماس کروں اپنے والد صاحب قبلہ کی خدمت میں میرا دست بستہ سلام کہئے گا۔ آپ کے خطوط سے ایسا خلوص ٹپکتا ہے کہ بے اختیار ملنے کو جی چاہتا ہے پر غلامی کی قید اور سفر کی درازی ہمت توڑ دیتی ہے۔ والسلام

نیازمند۔ دھنپت رائے۔ گورکھپور ۱۱ اگست ۱۹۱۹ء

---

[1] یہ لفظ پڑھا نہیں گیا۔

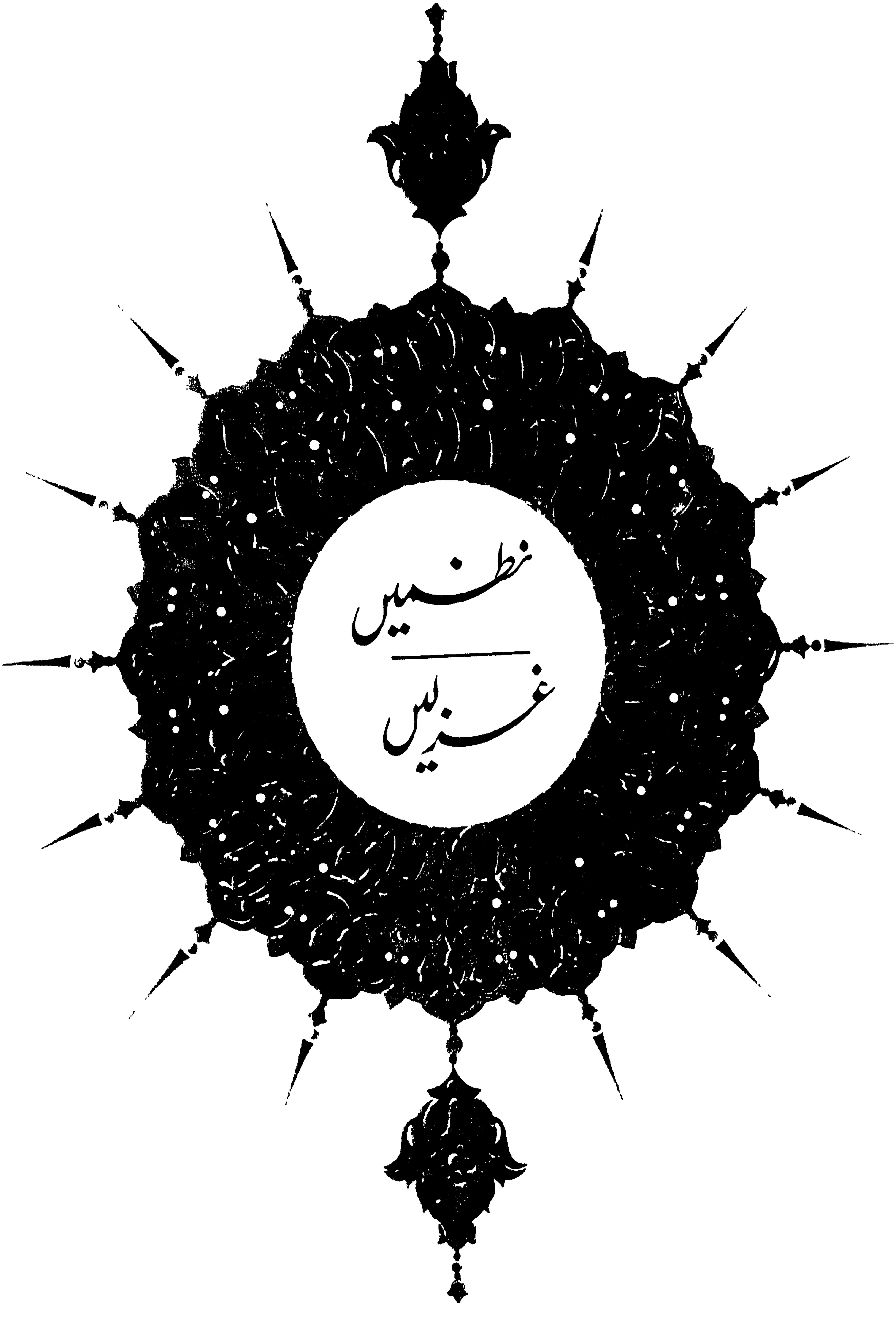

نظمیں

غزلیں

قطعات

جوشؔ ملیح آبادی

زلفیں باندھیں مگر بکھرتی ہی رہیں
گھڑیاں روکیں مگر گذرتی ہی رہیں
امّید کا رُخسار میں بھرتے رہے رنگ
اور یاس کی جھرّیاں اُبھرتی ہی رہیں

دوڑو کہ سبو ٹوٹ رہا ہے یارو
دامانِ چمن چھوٹ رہا ہے یارو
یادوں کے جواہر کو بچاؤں کس طرح
نسیان مجھے لُوٹ رہا ہے یارو

سو بار مری دھوپ کو سنولایا ہے
خود میرے ہُنر سے مجھے شرمایا ہے
آیا ہے مری راکھ پہ سجدے کرنے
وہ جس نے مری آگ کو ٹھکرایا ہے

جھومتی برسات

جوش ملیح آبادی

۱

ہاں، دیکھ، ذرا دیکھ، مرے سروِ لب جُو
گھنگھور گھٹاؤں کا یہ چلتا ہوا جادُو
زرتار دُپٹّوں کے یہ اُڑتے ہوئے پلّو
یہ کنج میں رندانِ سیہ مست کی یا ہُو!
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گُل رُو
اے دولتِ پہلو

۲

ساحل پہ یہ اُڑتے ہوئے جنّت کے نظارے
افلاک پہ یہ سُرخ دوشالوں کے کنارے
بجلی کی لپک میں یہ حسینوں کے اشارے
اُمڈے ہوئے دریا کے اُبلتے ہوئے دھارے
دھاروں میں گھری ناؤ کے مڑتے ہوئے چپّو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گُل رُو
اے دولتِ پہلو

۳

کیا جوش میں ہیں جھاگ اُڑاتے ہوئے نالے
بادل کے خزانوں کے ہیں ٹوٹے ہوئے تالے
کلیوں کے یہ کھانچے ہیں کہ چھلکے ہوئے تھالے
دبکے ہوئے چھجّوں کے تلے خونچے والے
ٹاپو میں کہیں راہ، کہیں راہ میں ٹاپو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گُل رُو
اے دولتِ پہلو

۴

کس ناز سے وہ دیکھ گھٹا باغ میں لوٹی
نوعمر فضا جھوم گئی کھول کے چوٹی
برکھا سے کھری ہوگئی جو چیز تھی کھوٹی
جنبش میں اُدھر سبزہ، اِدھر بیر بہوٹی
ہر باغ میں، ہر راغ میں، ہر راہ میں، ہر سُو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گُل رُو
اے دولتِ پہلو

۵

پتی کوئی کالی ہے، تو بُوٹا کوئی گورا،
لبریز ہے ہر نخل کے بھتاڑے کا کٹورا
ہر نرگسِ شہلا میں نئی عمر کا ڈورا
لڑ کوندا ہر اک گُل ہے، تو ہر خار ہے گھبرو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گُل رُو
اے دولتِ پہلو

۶

خود سوچ دوانے ہوں نہ کس طور سے لمحات
جب ناز سے اُبھرے ہوئے کُولے پہ دھرے ہات
دن کو ہو فزیشندہ و رقصندہ جواں رات
کیا بات ہے برسات ہے برسات ہے برسات
لہراؤں سماوات پہ، چل جائے جو قابو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گُل رُو
اے دولتِ پہلو

۷

شاخوں میں جھاجھم ہے فضاؤں میں روانی
بہتی ہوئی جھنکار، مچلتا ہُوا پانی
بھونرے ہیں کہ اُڑتی ہے کہانی پہ کہانی
اک خیمہ ہے، اور خیمۂ رنگین جوانی
بھیگے ہوئے پودوں کی یہ چھبتی ہوئی خوش بُو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گُل رُو
اے دولتِ پہلو

۸

ہر مست صدا، خوابِ زلیخا کی ہے تعبیر
ہر زمزمہ ہوش رُبا، حسن کی تفسیر
تصویر میں آواز ہے، آواز میں تصویر
اک کیف کی پازیب ہے اک نشے کی زنجیر
باغوں میں، گھنی چھاؤں میں، کوئل کی یہ کُوکُو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گُل رُو
اے دولتِ پہلو

۹

ہر لحظہ رواں، تند عناں ابر کا توسن
ہر آن مسکتا ہوا افلاک کا دامن
ہر وقت نئے رنگ کی اُٹھتی ہوئی چلمن
ہر لمحۂ پُر دار میں پرواز کی سن سن
ہر ساعتِ سرشار میں نازِ رمِ آہو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، ستمِ پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۱۰

شیشوں پہ یہ دُر بار جھلکتی ہوئی بوندیں
شاخوں سے یہ مے ریز ٹپکتی ہوئی بوندیں
یہ دُوب کے ریشوں سے ڈھلکتی ہوئی بوندیں
یہ آم کے پتّوں پہ کھنکتی ہوئی بوندیں
بوندوں کے مجیروں میں یہ بجتے ہوئے گھنگرو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، ستمِ پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۱۱

یہ سر پہ کڑکتی ہوئی ساون کی کمانیں
کھلتی ہوئی بن میں یہ جواہر کی دکانیں
موجوں میں یہ آنکھیں، یہ ہواؤں کی زبانیں
بھیگے ہوئے لمحوں کی یہ ڈوبی ہوئی تانیں
بہکی ہوئی راتوں کے یہ بھٹکے ہوئے جگنو
اے دولتِ پہلو
ہاں تان اُڑا تان، ستمِ پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۱۲

گھنگھور گھٹاؤں میں یہ خوابوں کے فسانے
بوچھاریں، ہاروں کے یہ ٹوٹے ہوئے دانے
پُروائی کی سن سن میں یہ شاخوں کے ترانے
بہتے ہوئے یہ سُر، یہ برستے ہوئے گانے
یہ مور کی جھنکار، پپیہے کی یہ پی ہو :
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑتان، ستمِ پارہ و گل رو
اے دولتِ پہلو

۱۳

اِک سَمت مُغنّیِ جنوں خیز و خروشے
اِک سَمت بُتِ لالہ وَشے، عشوہ فروشے
اِک سَمت سرود و سخن و سوز کے گوشے
اِک سائے میں صہبا کے مہکتے ہوئے خوشے
اِک سیج پہ برہا کے دہکتے ہوئے آنسو

اے دولت پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گل رُو
اے دولتِ پہلو

۱۴

یہ پستئی، یہ گیندئی، یہ سرمئی بادل
یہ فاختئی، سردئی، فیروزئی مخمل
یہ نقرئی، یہ کتھئی، یہ اگرئی آنچل،
اور فالسئی طشت میں یہ چمپئی بوتل
بوتل میں بھڑکتا ہُوا یہ شعلۂ دارُو

اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گل رُو
اے دولتِ پہلو

۱۵

ہر سُبحۂ صد دانہ ہے اک زلفِ تہِ دام
ہر سجدۂ شکرانہ ہے اک جستِ سوئے جام
ہر گردشِ پیمانہ ہے اک رقصِ خوش انجام
ہر نعرۂ رندانہ ہے اک نغمۂ الہام
ہر لغزشِ مستانہ ہے اک قوّتِ بازو

اے دولتِ پہلو
ہاں تان اُڑا تان، قمر پارہ و گل رُو
اے دولتِ پہلو

۱۶

اس رُت میں خرابات کی پوشاک ہے دھانی
اور جوش کے ساغر میں خرابات کی رانی
اِس شیخ سے کہہ دے کہ ارے دشمنِ جانی
خاموش کہ اس وقت ہے موسم کی جوانی
رخشندہ بہر کوچہ و رقصندہ بہر کو

اے دولت پہلو
ہاں، تان اُڑا تان، قمر پارہ و گل رُو
اے دولتِ پہلو
اے زینتِ پہلو
اے جنّتِ پہلو
اے آفتِ پہلو

○

جگر مرادآبادی

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے   تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے
جو تیرے عارض و گیسو کے درمیاں گزرے   کبھی کبھی وہی لمحے بلائے جاں گزرے
مجھے یہ وہم رہا مدّتوں کہ جرأتِ شوق   کہیں نہ خاطرِ معصوم پر گراں گزرے
خطا معاف! زمانے سے بدگماں ہو کر   تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گزرے
مری نظر سے تری جستجو کے صدقے میں   یہ اِک جہاں ہی نہیں سینکڑوں جہاں گزرے
اسی کو کہتے ہیں جنّت، اسی کو دوزخ بھی   وہ زندگی جو حسینوں کے درمیاں گزرے
مجھے تھا شکوۂ ہجراں، کہ یہ ہُوا محسوس   مِرے قریب سے ہو کر وہ ناگہاں گزرے
بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی مگر   وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے
کبھی کبھی تو اسی ایک مشتِ خاک کے گرد   طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے

بہت عزیز ہے مجھ کو، اُنھیں کی یاد جگرؔ
وہ حادثاتِ محبّت جو ناگہاں گزرے

جگر مراد آبادی

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آ نہ سکے
کہ غنچے کھل تو سکے، کھل کے مسکرا نہ سکے
مری تباہیٔ دل پر تو رحم کھا نہ سکے
مگر کبھی وہ نظر سے نظر ملا نہ سکے
وہ سبزہ ننگِ چمن ہے جو لہلہا نہ سکے
وہ گُل ہے زخمِ بہاراں جو مسکرا نہ سکے
یہ آدمی ہے وہ پروانۂ شمعِ دانش کا
جو روشنی میں رہے، روشنی کو پا نہ سکے
اُنھیں سعادتِ منزل رسی نصیب ہو کیا
وہ پاؤں راہِ طلب میں جو ڈگمگا نہ سکے
نہ جانے آہ کہ اُن آنسوؤں پہ کیا گذری
جو دل سے آنکھ تک آئے، مژہ تک آ نہ سکے
کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل؛
جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے
زہے خلوصِ محبت کہ حادثاتِ جہاں
مجھے تو کیا؟ مرے نقشِ قدم مٹا نہ سکے
مری نظر سے گریزاں بہت رہے، لیکن
مرے حدودِ محبت سے بچ کے جا نہ سکے
یہ مہر و ماہ مرے ہمسفر رہے برسوں
پھر اس کے بعد مری گرد کو بھی پا نہ سکے
مری نظر نے شبِ غم اُنھیں بھی دیکھ لیا
وہ بے شمار ستارے کہ جگمگا نہ سکے
گھٹے اگر تو بس اک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

نیا زمانہ بنانے چلے تھے دیوانے
نئی زمین، نیا آسماں بنا نہ سکے

فراق گورکھپوری

مطرب سے کہو آج اِس انداز سے گائے   ہر دل کو لگے چوٹ سی، ہر آنکھ بھر آئے
وہ چوٹ جو کیا جانے کہاں سے اُبھر آئے   وہ درد فرشتوں کو جو انسان بنائے
آنکھوں کو پھر اک شاہدِ رعنا نظر آئے   زرّیں کمرے، کج کلہے، تنگ قبائے
اک برق ادا، شعلہ قبا، پیکرِ رنگیں   دلہائے مہ و مہر کو پہلو میں دبائے
کوندا ہو گداز۔ اُف یہ تبسم کی گھلاوٹ   لہجے کی کھنک۔ لَو جو ستاروں سے چرائے
وہ مستیٔ قامت کہ گھٹا جھوم کے اُٹھے   وہ چستیٔ ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے
نس نس میں کوئی جیسے دبی چٹکیاں بھر دے   رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے
دوشیزہ جوانی کی اُدھر ٹوٹتی انگڑائی   تصویر اُدھر قوسِ قزح کھینچتی جائے
وہ شوخیٔ محتاط کے نپتے ہوئے انداز   دنیا بھی نہ رہنے دے، قیامت بھی نہ ڈھائے
یہ کم نگہی چشمِ فسوں ساز کی کیسی   دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے

کچھ ایسی بھی گذری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

جُگنو

فراق گورکھپوری

یہ مست مست گھٹا، یہ بھری بھری برسات
تمام — حدِ نظر تک — گھلاوٹوں کا سماں
فضائے شام میں ڈورے سے پڑتے جاتے ہیں
جدھر نگاہ کریں کچھ دھواں سا اُٹھتا ہے
دہک اُٹھا ہے طراوت کی آنچ سے آکاش
ز فرش تا فلک انگڑائیوں کا عالم ہے
یہ مد بھری ہوئی پُروائیاں سنکتی ہوئی
جھنجھوڑتی ہے ہری ڈالیوں کو سرد ہوا
یہ شاخسار کے جھولوں میں پینگ پڑتے ہوئے
یہ لاکھوں پتّیوں کا ناچنا یہ رقصِ نبات
یہ بیخودیٔ مسرّت یہ والہانہ رقص
یہ تال سم، یہ چھما چھم کہ کان بجتے ہیں؟
ہوا کے دوش پہ کچھ اودی اودی شکلوں کی
نشّے میں چُور سی پرچھائیاں تھرکتی ہوئی
اُفق پہ ڈوبتے دن کی جھپکتی ہیں آنکھیں
خموش سوزِ دروں سے سلگ رہی ہے یہ شام

مرے مکاں کے آگے ہے ایک صحن وسیع
کبھی وہ ہنستی نظر آتی ہے، کبھی وہ اُداس
اسی کے بیچ میں ہے ایک پیڑ پیپل کا
سنا ہے میں نے بزرگوں سے یہ کہ عمر اس کی
جو کچھ نہ ہوگی تو ہوگی قریب چھیانوے سال
چھڑی تھی ہند میں جب پہلی جنگِ آزادی
جسے دبانے کے بعد اس کو غدر کہنے لگے
یہ اہلِ ہند بھی ہوتے ہیں کس قدر معصوم
وہ دار و گیر وہ آزادیٔ وطن کی جنگ
وطن سے تھی کہ غنیمِ وطن سے غدّاری
بپھر گئے تھے ہمارے وطن کے پیر و جواں
دیارِ ہند میں رَن پڑ گیا تھا چار طرف
اُنھی زمانے میں کہتے ہیں میرے دادا نے
جب ارضِ ہند سینچی خون سے "سپوتوں" کے
میانِ صحن لگایا تھا لا کے اک پودا

جو آب و آتش و خاک و ہوا سے پلتا ہُوا
خود اپنے قد سے بجوشِ نمو نکلتا ہُوا
فسونِ روحِ نباتی رگوں میں چلتا ہُوا
نگاہِ شوق کے سانچوں میں روز ڈھلتا ہُوا
سُنا ہے راویوں سے دیدنی تھی اسکی اٹھان
ہر اک کے دیکھتے ہی دیکھتے چڑھا پروان
وہی ہے آج یہ چھتنار پیڑ پیپل کا
وہ ٹہنیوں کے کمنڈل لیے جٹا دھاری
زمانہ دیکھے ہوئے ہے یہ پیڑ بچپن سے
رہی ہے اس کے لیے داخلی کشش مجھ میں
رہا ہوں دیکھتا چُپ چاپ دیر تک اس کو
میں کھو گیا ہوں کئی بار اس نظارے میں
وہ اس کی گہری جڑیں تھیں کہ زندگی کی جڑیں؟
پسِ سکونِ شجر کوئی دل دھڑکتا تھا
میں دیکھتا تھا کبھی اُس میں زندگی کا اُبھار
میں دیکھتا تھا اُسے ہستیِ بشر کی طرح
کبھی اُداس کبھی شادماں، کبھی گمبھیر

فضا کا سرمئی رنگ اور ہو چلا گہرا
گھُلا گھُلا سا فلک ہے دھواں دھواں سی ہے شام
ہے جھٹپٹا کہ کوئی اژدہا ہے مائلِ خواب
سکوتِ شام میں درماندگی کا عالم ہے
رُکی رُکی سی کسی سوچ میں ہے موجِ صبا
رُکی رُکی سی صفیں ملگجی گھٹاؤں کی۔
اُتار پر ہے سرِ صحن رقصِ پیپل کا
وہ کچھ نہیں ہے اب اک جنبشِ خفی کے سوا
خود اپنی کیفیتِ نیلگوں میں ہر لحظہ
یہ شام ڈوبتی جاتی ہے چھپتی جاتی ہے
حجابِ وقت سرے سے ہے بے حِس و حرکت
رُکی رُکی دلِ فطرت کی دھڑکنیں یکلخت
یہ رنگِ شام کہ گردش ہی آسماں میں نہیں

بس ایک وقفۂ تاریک، سربسر تاریک
سما میں جنبش ہم سی کچھ ہوئی — فوراً
تُلی گھٹا کے تلے بھیگے بھیگے پتوں سے
ہری ہری کئی چنگاریاں سی پھوٹ پڑیں
کہ جیسے کھلتی جھپکتی ہوں بے شمار آنکھیں
عجب یہ آنکھ مچولی تھی نور و ظلمت کی
سہانی نرم لویں دیتے اَن گنت جگنو
گھنی سیاہ خنک پتیوں کے جُھرمٹ سے
مثالِ چادرِ شب تاب جگمگانے لگے
کہ تھرتھراتے ہوئے آنسوؤں سے ساغرِ شام
چھلک چھلک پڑے جیسے بغیرِ سان گمان
بطونِ شام میں ان زندہ قمقموں کی دمک
کسی کی سوئی ہوئی یاد کو جگاتی تھی —
وہ بے پناہ گھٹا وہ بھری بھری برسات
وہ سین دیکھ کے آنکھیں مری بھر آئی تھیں

مری حیات نے دیکھی ہیں بیس برساتیں
مرے جنم ہی کے دن مر گئی تھی ماں میری
وہ ماں کہ شکل بھی جس ماں کی میں نہ دیکھ سکا
جو آنکھ بھر کے مجھے دیکھ بھی سکی نہ، وہ ماں
میں وہ پسر ہوں جو سمجھا نہیں کہ ماں کیا ہے
مجھے کھلائیوں اور دائیوں نے پالا تھا
وہ مجھ سے کہتی تھیں جب گھر کے آتی تھی برسات
جب آسمان میں ہر سُو گھٹائیں چھاتی تھیں
بوقتِ شام جب اُڑتے تھے ہر طرف جگنو
دیئے دکھاتے ہیں یہ بھولی بھٹکی روحوں کو
مزہ بھی آتا تھا مجھ کو کچھ ان کی باتوں میں
میں ان کی باتوں میں رہ رہ کے کھو بھی جاتا تھا
پر اس کے ساتھ ہی دل میں کسک سی ہوتی تھی
کبھی کبھی یہ کسک ہُوک بن کے اُٹھتی تھی
یتیم دل کو مرے یہ خیال ہوتا تھا
یہ شام مجھ کو بنا دیتی کاش اِک جگنو
تو ماں کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ
کہاں کہاں وہ بچاری بھٹکتی ہی ہو گی

کہاں کہاں مری خاطر بھٹک رہی ہوگی
یہ سوچ کر مری حالت عجیب ہو جاتی
پلک کی اوٹ میں جگنو چمکنے لگتے تھے
کبھی کبھی تو مری ہچکیاں سی بندھ جاتیں
کہ ماں کے پاس کسی طرح میں پہنچ جاؤں
اور اس کو راہ دکھاتا ہوا میں گھر لاؤں
دکھاؤں اپنے کھلونے دکھاؤں اپنی کتاب
کہوں کہ پڑھ کے سُنا تو مری کتاب مجھے
پھر اس کے بعد دکھاؤں اُسے میں وہ کاپی
کہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں بنی تھیں کچھ جس میں
یہ حرف تھے جنھیں میں نے لکھا تھا پہلے پہل
دکھاؤں پھر اُسے آنگن میں وہ گلاب کی بیل
سُنا ہے جس کو اُسی نے کبھی لگایا تھا
یہ جب کی بات ہے جب میری عمر ہی کیا تھی
نظر سے گزری تھیں کل چار پانچ برساتیں

گزر رہے تھے مہ و سال — اور موسم پر
ہمارے شہر میں آتی تھی گھر کے جب برسات
جب آسمان میں اُڑتے تھے ہر طرف جگنو
ہوا کی موجِ رواں پہ دیئے جلائے ہوئے
فضا میں رات گئے جب درخت پیپل کا
ہزاروں جگنوؤں سے کوہِ طور بنتا تھا
ہزاروں وادیٔ ایمن تھیں جس کی شاخوں میں
یہ دیکھ کر مرے دل میں یہ ہُوک اُٹھتی تھی
کہ میں بھی ہوتا انھیں جگنوؤں میں اک جگنو
تو ماں کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ
وہ ماں میں جس کی محبت کے پھول چُن نہ سکا
وہ ماں میں جس سے محبت کے بول سُن نہ سکا
وہ ماں کہ بھینچ کے جس کو کبھی میں سو نہ سکا
میں جس کے آنچلوں میں منہ چھپا کے رو نہ سکا
وہ ماں کہ گھٹنوں سے جس کے کبھی لپٹ نہ سکا
وہ ماں کہ سینے سے جس کے کبھی چمٹ نہ سکا
ہمک کے گود میں ماں کی کبھی میں چڑھ نہ سکا
میں زیرِ سایۂ اُمید جس کے بڑھ نہ سکا
وہ ماں میں جس سے شرارت کی داد پا نہ سکا
میں جس کے ہاتھوں محبت کی مار کھا نہ سکا
سنوارا جس نے نہ میرے جھنڈولے بالوں کو
بسا سکی نہ جو ہونٹوں سے سُونے گالوں کو
جو میری آنکھوں میں آنکھیں کبھی نہ ڈال سکی
نہ اپنے ہاتھوں سے مجھ کو کبھی اچھال سکی
وہ ماں جو کوئی کہانی مجھے سُنا نہ سکی
مجھے سُلانے کو جو لوریاں بھی گا نہ سکی

وہ ماں جو دودھ بھی اپنا مجھے پلا نہ سکی
وہ ماں جو ہاتھ سے اپنے مجھے کھلا نہ سکی
وہ ماں گلے سے مجھے جو کبھی لگا نہ سکی
وہ ماں جو دیکھتے ہی مجھ کو مسکرا نہ سکی
کبھی جو مجھ سے مٹھائی چھپا کے رکھ نہ سکی
کبھی جو مجھ سے وہی بھی بچا کے رکھ نہ سکی
میں جس کے ہاتھ میں کچھ دیکھ کر ڈہک نہ سکا
پٹک پٹک کے کبھی پاؤں میں ٹھنک نہ سکا
کبھی نہ کھینچا شرارت سے جس کا آنچل بھی
رچا سکی مری آنکھوں میں جو نہ کاجل بھی
وہ ماں جو میرے لیے تتلیاں پکڑ نہ سکی
جو بھاگتے ہوئے بازو مرے جکڑ نہ سکی
بڑھایا پیار کبھی کر کے پیار میں نہ کمی
جو منہ بنا کے کسی دن نہ مجھ سے روٹھ سکی
جو یہ بھی کہہ نہ سکی جا نہ بولوں گی تجھ سے
جو ایک بار خفا بھی نہ ہو سکی مجھ سے
وہ جس کو جوٹھا لگا منہ کبھی دکھا نہ سکا
کثافتوں پہ مری جس کو پیار آ نہ سکا
جو مٹی کھانے پہ مجھ کو کبھی نہ پیٹ سکی
نہ ہاتھ تھام کے مجھ کو کبھی گھسیٹ سکی
وہ ماں جو گفتگو کی رو میں سن کے میری اڑ
کبھی جو پیار سے مجھ کو نہ کہہ سکی کھا مر
شرارتوں سے مری جو کبھی الجھ نہ سکی
حماقتوں کا مری فلسفہ سمجھ نہ سکی
وہ ماں کبھی جسے چونکانے کو میں لک نہ سکا
میں راہ چھینکنے کو جس کے آگے رک نہ سکا
جو اپنے ہاتھ سے بہروپ میرے بھر نہ سکی
جو اپنی آنکھوں کو آئینہ میرا کر نہ سکی

گلے میں ڈالی نہ باہنوں کی پھول مالا بھی
نہ دل میں لوحِ جبیں سے کیا اجالا بھی
وہ ماں کبھی جو مجھے بدھیاں پہنا نہ سکی
کبھی مجھے نئے کپڑوں سے جو سجا نہ سکی
وہ ماں نہ جس سے لڑکپن کے جھوٹ بول سکا
نہ جس کے دل کے دَر ان کنجیوں سے کھول سکا
وہ ماں میں پیسے بھی جس کے کبھی چرا نہ سکا
سزا سے بچنے کو جھوٹی قسم بھی کھا نہ سکا
وہ ماں کہ آیتِ رحمت ہے جس کی چینِ جبیں
وہ ماں کہ ہاں سے ہوئی ہے بڑھ کے جس کی نہیں
دمِ عتاب جو بنتی فرشتہ رحمت کا
جو راگ چھیڑتی جھنجھلا کے بھی محبت کا
وہ ماں کہ گھرکیاں بھی جس کی گیت بن جائیں
وہ ماں کہ جھڑکیاں بھی جس کی پھول برسائیں
وہ ماں ہم اس سے جو دم بھر کو دشمنی کر لیں
تو یہ نہ کہہ سکی اب آؤ دوستی کر لیں
کبھی جو سن نہ سکی میری توتلی باتیں
نہ دے سکی جو کبھی تھپڑوں کی سوغاتیں
وہ ماں بہت سے کھلونے جو مجھ کو دے نہ سکی
خراجِ سرخوشیٔ سرمدی جو لے نہ سکی
وہ ماں میں جس سے لڑائی کبھی نہ ٹھان سکا
وہ ماں میں جس پہ کبھی مٹھیاں نہ تان سکا
وہ میری ماں میں کبھی جس کی پیٹھ پر نہ چڑھا
وہ میری ماں کبھی پیچھے جس کے کان میں نہ کہا
وہ ماں کبھی جو مجھے کردھنی پہنا نہ سکی
جو تال ہاتھ سے دے کر مجھے نچا نہ سکی
وہ ماں نہ دیکھ سکا زندگی میں جس کی [illegible]
اسی کی بھٹکی ہوئی روح کو دکھاتا راہ

یہ سوچ سوچ کے آنکھیں مری بھر آتی تھیں
تو جا کے سوُنے بچھونے پہ لیٹ رہتا تھا
کسی سے گھر میں نہ راز اپنے دل کے کہتا تھا
یتیم تھی مری دنیا، یتیم میری حیات
یتیم شام و سحر تھی، یتیم تھے شب و روز
یتیم میری پڑھائی تھی میرے کھیل یتیم
یتیم میری مسرّت تھی میرا غم بھی یتیم
یتیم آنسوؤں سے تکیہ بھیگ جاتا تھا
کسی سے گھر میں نہ کہتا تھا اپنے دل کا بھید
ہر اک سے دُور اکیلا اُداس رہتا تھا
کسی شمائلِ نادیدہ کو میں تکتا تھا
میں ایک وحشتِ بے نام سے ہڑکتا تھا

گزر رہے تھے مہ و سال، اور موسم پر
اسی طرح کئی برساتیں آئیں اور گئیں
میں رفتہ رفتہ پہنچنے لگا بہ سنِ شعور
تو جگنوؤں کی حقیقت سمجھ میں آنے لگی
اب ان کھلائیوں اور دائیوں کی باتوں پر
مرا یقیں نہ رہا، مجھ پہ ہو گیا ظاہر
کہ بھٹکی روحوں کو جگنو نہیں دکھاتے چراغ
وہ من گھڑت سی کہانی تھی اک فسانہ تھا
وہ بے پڑھی لکھی کچھ عورتوں کی تھی بکواس
بھٹکتی روحوں کو جگنو نہیں دکھاتے چراغ
یہ کھل گیا مرے بہلانے کو تھیں یہ باتیں
مرا یقیں نہ رہا ان فضول قصّوں پر۔

ہمارے شہر میں آتی ہیں اب بھی برساتیں
ہمارے شہر پہ اب بھی گھٹائیں چھاتی ہیں
ہنوز بھیگی ہوئی سرمئی فضاؤں میں
خطوطِ نور بناتی ہیں جگنوؤں کی صفیں
فضائے تیرہ میں اُڑتی ہوئی یہ قندیلیں
مگر میں جان چکا ہوں اسے بڑا ہو کر
کسی کی روح کو جگنو نہیں دکھاتے راہ
کہا گیا تھا جو بچپن میں مجھ سے جھوٹ تھا سب

مگر کبھی کبھی حسرت سے دل میں کہتا ہوں
یہ جانتے ہوئے جگنو نہیں دکھاتے چراغ
کسی کی بھٹکی ہوئی روح کو — مگر پھر بھی
وہ جھوٹ ہی سہی کتنا حسین جھوٹ تھا وہ
جو مجھ سے چھین لیا عمر کے تقاضے نے

میں کیا بتاؤں وہ کتنی حسین دُنیا تھی
جو بڑھتی عمر کے ہاتھوں نے چھین لی مجھ سے
سمجھ سکے کوئی اسے کاش عہدِ طفلی کو
جہان دیکھنا مٹی کے ایک ریزے میں
نمودِ لالۂ خود رو میں دیکھنا جنت
کرے نظارۂ کونین اک گھروندے میں
اُٹھا کے رکھ لے خدائی کو جو ہتھیلی پر
کرے دوام کو جو قید ایک لمحے میں
سنا؟ وہ قادرِ مطلق ہے ایک ننھی سی جان
خدا بھی سجدے میں جھک جائے سامنے اس کے

یہ عقل و فہم بڑی چیز ہیں مجھے تسلیم
مگر لگا نہیں سکتے ہم اس کا اندازہ
کہ آدمی کو یہ پڑتی ہیں کس قدر مہنگی
اک ایک کر کے وہ طفلی کے ہر خیال کی موت
بلوغِ سن میں وہ صدمے نئے خیالوں کے
نئے خیال کا دھچکا نئے خیال کی ٹیس
نئے تصوروں کا کربِ الاماں، کہ حیات
تمام زخمِ نہاں ہے تمام نشتر ہے
یہ چوٹ کھا کے سنبھلنا محال ہوتا ہے

سکوت رات کا جس وقت چھیڑتا ہے ستار
کبھی کبھی تری پائل کی آتی ہے جھنکار
تو میری آنکھوں سے موتی برسنے لگتے ہیں
اندھیری رات کے پرچھاویں ڈسنے لگتے ہیں
میں جگنو بن کے تو تجھ تک پہنچ نہیں سکتا
جو تجھ سے ہو سکے اے ماں تو وہ طریقہ بتا
تو جس کو پا لے وہ کاغذ اُچھال دوں کیسے
یہ نظم میں ترے قدموں میں ڈال دوں کیسے

نوائے درد سے کچھ جی تو ہو گیا ہلکا
مگر جب آتی ہے برسات کیا کروں اس کو
جب آسمان میں اُڑتے ہیں ہر طرف جگنو
شرابِ نور لیے سبز آبگینوں میں
کنول جلاتے ہوئے ظلمتوں کے سینوں میں
جب ان کی تابشِ بے ساختہ سے پیپل کا
درخت سروِ چراغاں کو مات کرتا ہے
نہ جانے کس لیے آنکھیں مری بھر آتی ہیں

بات سمجھنے والا

حفیظ جالندھری

روزِ روشن کو ہوں میں رات سمجھنے والا
ہے کوئی آج مری بات سمجھنے والا

دورِ بالغ نظراں اور ہے۔ یہ دَور نہیں
ہم بزرگوں کے مقامات سمجھنے والا

جلوۂ صبحِ قیامت کے لیے ہے بیدار
چاند تاروں کے اشارات سمجھنے والا

منتظر ہے۔ کہ ہو مغرب سے طلوعِ خورشید
اپنے اللہ کی آیات سمجھنے والا

تو سمجھتا ہے جسے رنگِ بہارِ گلبار
میں اسے خون کی برسات سمجھنے والا

آج کل تو بھی نشے میں ہے تو مجھ سے نہ الجھ
میں ہوں کم ظرف کی اوقات سمجھنے والا

میرے بگڑے ہوئے تیور بھی سمجھ لے اے کاش
میرے بگڑے ہوئے حالات سمجھنے والا

درِ زنداں پہ ہے اک طرفہ غضبناک ہجوم
شانِ رندانِ خرابات سمجھنے والا

اس نئے دورِ سخن سے ہے پریشان حفیظ
شعر کو حرف و حکایات سمجھنے والا

○

آرزوؔ لکھنوی

زندگی مجبوریوں کا راز ہو کر رہ گئی
سانس اک فریادِ بے آواز ہو کر رہ گئی

دل کی دھڑکن نغمہائے راز ہو کر رہ گئی
جو محبت سوز تھی وہ ساز ہو کر رہ گئی

کی بمشکل آہ اور پھر دے گئی طاقت جواب
غم کی لمبی داستاں آغاز ہو کر رہ گئی

بات کیا ہے خود نہیں سمجھے تو سمجھاتے کسے
وہ جو الجھن دل میں تھی اک راز ہو کر رہ گئی

ہر نفس اک نالۂ دل اور دل پابندِ غم
زندگی زنجیر کی آواز ہو کر رہ گئی

اب کہاں قربانگہِ الفت میں ہم سا جاں نثار
چار دن مشقِ ادا و ناز ہو کر رہ گئی

اوّل اوّل چھوٹے غمخواروں کی یاد آئی بہت
آخر آخر بے کسی دمساز ہو کر رہ گئی

جس کے بل پر پھڑپھڑا کر ہم نے توڑا تھا قفس
اب وہ حسرت حسرتِ پرواز ہو کر رہ گئی

ناتواں دل کی فغانِ آخری اے آرزوؔ
کان میں گونجی ہوئی آواز ہو کر رہ گئی

فیض احمد فیض

یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں

آنکھوں میں دردمندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں

ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی، ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں

مجرم ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحوں کا
رُوئے سخن ہمیشہ سوئے جگر فگاراں

ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیمِ زُہد کر لے
سُوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں

شاید قریب پہنچی صبحِ وصال ہمدم
موجِ صبا لیے ہے خوشبوئے خوش کناراں

ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابر و باراں

آئے گی فیض اک دن بادِ بہار لے کر
تسنیمِ مے فروشاں، پیغامِ مے گُساراں

آگ میں پھول

فیض احمد فیض

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن، کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جُو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدّعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں .

مگر گذارنے والوں کے دن گذرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں
یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے
گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

سیماب اکبرآبادی

جو در پردہ اُنھیں جلوہ نمائی کی نہ خو ہوتی   میں سچ کہتا ہوں دنیا آرزو ہی آرزو ہوتی
متاعِ ضبطِ وقتِ واپسیں کی رائگاں میں نے   نگاہِ حسن میں ایک اشک کی کیا آبرو ہوتی
مسافر اپنے پہلو ہی میں مل جاتی تجھے منزل   اگر منزل سے پہلے تجھ کو اپنی جستجو ہوتی
حدیثِ طور و موسیٰ اور وہ بھی چار لفظوں میں   ہوئی بھی گفتگو اُن سے تو کھل کر گفتگو ہوتی
غلط ہے عشق پر الزام آوارہ نگاہی کا   جو ہوتا حسن یک سُو تو نظر کیوں چار سُو ہوتی
دل اک قطرہ تھا۔ ژولیدہ، چکیدہ، بسملِ غم دیدہ   ذرا سی بوند پھر کیا اشک بنتی کیا لہو ہوتی
میں برقِ حسن کو روکے ہوئے ہوں دل پہ اے دنیا   اگر یہ کوند کر گرتی تو میں ہوتا نہ تُو ہوتی
وہ ذوق و شوقِ موسیٰ اور وہ اک کم سے کم جلوہ   جزائے آرزو یارب، بقدرِ آرزو ہوتی

دل اے سیماب خالی آرزو سے رہ نہ سکتا تھا
نہ ہوتی آرزو، تو آرزو کی آرزو ہوتی

عبدالمجید سالک

مرے جی میں ہے کہ پوچھوں کبھی مرشدِ مغاں سے
کہ ملا جمالِ ساقی کو یہ طنطنہ کہاں سے

وہ یہ کہہ رہے ہیں ہم کو ترے حال کی خبر کیا
تو اٹھا سکا نگاہیں نہ بتا سکا زباں سے

جو انھیں وفا کی سُوجھی تو نہ زیست نے وفا کی
ابھی آکے وہ نہ بیٹھے کہ ہم اُٹھ گئے جہاں سے

میں عدم کے لالہ زاروں میں نوا گرِ ازل تھا
مجھے کھینچ لائی ظالم تری آرزو کہاں سے

مری سرنوشت میں تھا وہی داغِ نامرادی
جو ملا مری جبیں کو ترے سنگِ آستاں سے

بچے بجلیوں کی زد سے وہی طائرانِ دانا
جو کڑک چمک سے پہلے نکل آئے آشیاں سے

یہ ہے سرگزشتِ وحشت کہ ملا سراغِ محمل
نہ درائے کارواں سے نہ غبارِ کارواں سے

شبِ غم جو آئی سالک مٹے عارضی اندھیرے
مرا دل ہوا منور تب و تابِ جاوداں سے

تاثیر

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی
معاملاتِ من و تو نکل ہی آتے ہیں

ہزار ہم سخنی ہو ہزار ہم نظری
مقامِ جنبشِ ابرو نکل ہی آتے ہیں

حنائے ناخنِ پا ہو کہ حلقۂ سرِ زلف
چھپاؤ بھی تو یہ جادو نکل ہی آتے ہیں

جنابِ شیخ، وضو کے لیے سہی لیکن
کسی بہانے لبِ جو نکل ہی آتے ہیں

متاعِ عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے
زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں

چراغ حسن حسرت

دل بلا سے نثار ہو جائے
آپ کو اعتبار ہو جائے

قہر تو بار بار ہوتا ہے
لطف بھی ایک بار ہو جائے

زندگی چارہ سازِ غم نہ سہی
موت ہی غم گسار ہو جائے

یا خزاں جائے اور بہار آئے
یا خزاں ہی بہار ہو جائے

دل پہ مانا کہ اختیار نہیں
اور اگر اختیار ہو جائے

اختر شیرانی

اٹھا ساغر، کہ دنیا درپئے آزار ہے ساقی
مشیت ہو کہ قسمت، برسرِ پیکار ہے ساقی

غضب ہے یہ جوانی اور ہم اس طرح سے کاٹیں
کہ اک اک سانس اک چلتی ہوئی تلوار ہے ساقی

محبت کر — غمِ دنیا ستائے تو محبت کر
محبت اس جہاں میں اک حسیں آزار ہے ساقی

خریدی جا نہیں سکتی خوشی دنیائے غمگیں میں
مگر تیرے کرم سے یہ بھی کیا دشوار ہے ساقی

محبت میں مزے لے لے کے مرنا تو مقدر ہے
مگر اس کے لیے کچھ زندگی درکار ہے ساقی

پریشاں کر دے تو بھی زلفِ مشکیں دوشِ رنگیں پر
کہ صحنِ باغ میں اودی گھٹا گلکار ہے ساقی

عجب کیا ہے یہ کافر رات آنکھوں ہی میں کٹ جائے
ادھر بے خواب ہے اختر ادھر بیدار ہے ساقی

وحشت کلکتوی

کسی طرح دن تو کٹ رہے ہیں فریبِ اُمید کھا رہا ہوں
ہزار ہا نقش آرزو کے بنا رہا ہوں مٹا رہا ہوں

وفا مری معتبر ہے کتنی، جفا وہ کر سکتے ہیں کہاں تک
جو وہ مجھے آزما رہے ہیں تو میں اُنھیں آزما رہا ہوں

کسی کی محفل کا نغمۂ نے محرکِ نالہ و فغاں ہے
فسانۂ عیش سُن رہا ہوں فسانۂ غم سُنا رہا ہوں

زمانہ بھی مجھ سے ناموافق میں آپ بھی دشمنِ سلامت
تعجب اس کا ہے بوجھ کیونکر میں زندگی کا اُٹھا رہا ہوں

نہ ہو مجھے جستجوئے منزل مگر ہے منزل مری طلب میں
کوئی تو مجھ کو بلا رہا ہے کسی طرف کو تو جا رہا ہوں

یہی تو ہے نفع کوششوں کا کہ کام سارے بگڑ رہے ہیں
یہی تو ہے نازہ ہوس کا کہ اشکِ حسرت بہا رہا ہوں

خدا ہی جانے یہ سادہ لوحی دکھائے گی کیا نتیجہ وحشتؔ
وہ جتنی الفت گھٹا رہے ہیں اُسی قدر میں بڑھا رہا ہوں

اثر لکھنوی

صلہ جاں بازیوں کا پا رہے ہیں
نظر سے ہم گرائے جا رہے ہیں

ہوا مدِ نظر پھر دل دکھانا
توجہ پھر ادھر فرما رہے ہیں

جو آئے تھے مجھے تسکین دینے
تماشا ہے کہ خود گھبرا رہے ہیں

گلِ تر کا ہوا جاتا ہے دھوکا
وہ اس انداز سے شرما رہے ہیں

تغافل کشتگانِ بے نیازی
تری باتوں سے دل بہلا رہے ہیں

چلی کیسی ہوا گلشن میں یا رب
خزاں سے پہلے گل مرجھا رہے ہیں

اثر اب شکوہ کرتے ہیں جفا پر
محبت کی حدوں میں آ رہے ہیں

احمد ندیم قاسمی

کیا بھروسا ہو کسی ہمدم کا
چاند ابھرا تو اندھیرا چمکا
صبح کو راہ دکھانے کے لئے
دستِ گل میں ہے دیا شبنم کا
وقت سستا کے بڑھے گا پھر سے
غم مقدر تو نہیں آدم کا
مجھ کو ابرو، تجھے محراب پسند
سارا جھگڑا اسی نازک خم کا
حسن کی جستجوئے پیہم میں
ایک لمحہ بھی نہیں ماتم کا
ہوئے اِس دَور میں فتوے جاری
کہ غزالوں کو جنوں ہے رم کا
مجھ سے مر کر بھی نہ توڑا جائے
ہائے یہ نشہ زمیں کے نم کا
اب سیو چاک گریبانِ حیات
کہ تقاضا ہے یہی موسم کا

غنچہ پھر لگا کھلنے!

احمد ندیم قاسمی

یہ شب ہے یا مرے دل کا سکوتِ بے پایاں یہ دل ہے یا مرے مرقد پہ جل رہا ہے چراغ
کچھ ایسے ٹوٹ رہی ہیں رگیں تخیّل کی کہ جیسے تندیٔ مے سے چٹخ رہا ہو ایاغ
ہوا چلی کہ مشیّت کو دل لگی سوجھی سمندروں سے نہ پوچھو کبھی صدف کا سراغ

ہر ایک چیز میں گہرائی ہے، تحیّر ہے ہوا کے بھیس میں اُمڈے سکوت کے دھارے
یہاں تو گُل بھی مرے ہم نصیب ہی نکلے کہ تیرگی میں کھلے جا رہے ہیں بے چارے
اندھیری شام سے محسوس ہو رہا ہے مجھے کہ جیسے جھیل کی تہ تک اُتر گئے تارے

نشیبِ شام سے نجمِ سحر کی چوٹی تک تمام رینگتے کھرے، تمام سناٹے
بھٹکے بھٹکے ہیں کچھ اس طرح وقت کے تیور کہ جیسے شیر ہرن کو نگل کے لب چاٹے
سنا ہے ایسی ہی شبہائے تار تھیں، جن میں بڑے وقار سے اجداد نے سفر کاٹے

مری نگاہ سے اوجھل ہے کاروانِ سحر مگر جرس کی صدا تھی کہ رات بھر نہ تھمی
سجے تھے اوس کے موتی قبائے گلشن پر مجھے یہ وہم کہ آغوشِ گُل میں برف جمی
جو آنسوؤں نے سرِ بام دل جلائے تھے بجھا گئی وہ دیئے دامنِ صبا کی نمی

افق لرزنے لگا، رات کے قدم اکھڑے
سحر کے بند دریچے پہ کیوں نہ دستک دوں
ستارۂ سحری نے مجھے نہ پہچانا
تو کیا وطن میں پہنچ کر بھی اجنبی ہی رہوں
یہ اور بات مجھے تابِ ضبط ہے کہ نہیں
سحر کی انجمنِ نور میں قدم تو دھروں

قدم اُٹھا تو چھنکنے لگی ہیں زنجیریں
نظر اُٹھی تو دکھائی دیے کئی احباب
کسی کے دوش پہ ہل تھا، کسی کے ہاتھ میں پھل
کسی کے پاس قلم تھا، کسی کے پاس کتاب
دہک رہا تھا وہ پندار ان کے چہروں پر
دیا ہے اہلِ تحکم نے جیسے جنوں کا خطاب

گجر بجا کہ عروسِ سحر ہوئی بیدار
تنی ہوئی ہے فضا پر بسیط انگڑائی
اٹھی افق سے وہ محبوبۂ شگفتہ مزاج
جو شب کو پردہ نشیں تھی تو دن کو ہرجائی
زمیں سے تا بہ فلک رنگ لہلہانے لگے
مگر یہ دھند سی کیا ذہن پر اُتر آئی

میں سوچتا ہوں، سحر نے مجھے شعور دیا
مگر یہی کہ سلاسل کے سلسلے ہیں طویل
مچل رہی ہیں شعاعیں، اُبل رہا ہے لہو
امڈ رہی ہے تجلی، اُبھر رہی ہے فصیل
چمک تو خوب تھی لیکن جھلس گئے ہیں بدن
نہ جانے آتشِ نمرود ہے کہ صبحِ جمیل

سحر کی ایک ہی تفسیر ہے ـــ طلوعِ سحر
مجھے فریب نہ دیں روشنی کی تفسیریں
نہ مسکرائے گا غنچہ بہار آنے تک
وہ لاکھ نوکِ سناں سے کلی کا دل چیریں

کچھ اور نام ہے اس کا، یہ فصلِ گل تو نہیں
کہ بوئے گُل کے لیے ڈھل رہی ہیں زنجیریں

اسرار الحق مجازؔ

خود دل میں رہ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی
ہاں لطف جب ہے پا کے بھی ڈھونڈا کرے کوئی
دنیا لرز گئی دلِ حرماں نصیب کی
اس طرح سازِ عیش نہ چھیڑا کرے کوئی
رنگینیٔ نقاب میں گم ہو گئی نظر
کیا بے حجابیوں کا تقاضا کرے کوئی
یا تو کسی کو جرأتِ دیدار ہی نہ ہو
یا پھر مری نگاہ سے دیکھا کرے کوئی
مجھ کو یہ آرزو وہ اُٹھائیں نقاب خود
ان کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی
تم نے تو حکم ترکِ تمنّا سُنا دیا
کس دل سے آہ ترکِ تمنّا کرے کوئی
ہوتی ہے اس میں حسن کی توہین اے مجازؔ
اتنا نہ اہلِ عشق کو رُسوا کرے کوئی

ایک گیت

میرا جی

انجانے نگر من مانے تھے من مانے نگر انجانے رہے
اپنی باتوں کی مستی میں
سنتے رہے دل کی بستی میں
وہی گیت جو کچھ من مانے رہے، وہی راگ جو کچھ کے بہانے رہے

راتیں بیتیں دن بیت گئے
راتیں بھی نئی پھر دن بھی نئے
مورکھ من ایسا ہٹیلا ہے اسے یاد وہ رنگ پرانے رہے

انہونی کا جسے دھیان رہا
ہونی نے اُسے چپکے سے کہا
نہ وہ باتیں رہیں نہ زمانے رہے جو رہے بھی تو باقی فسانے رہے

اب گیت میں رس ٹپکاتے ہیں
یوں دل کی آگ بجھاتے ہیں
اب سب کے لیے وہی باؤلے ہیں جو بیتے سمے میں سیانے رہے

میراجی

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس نے کیں
کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بُری جیسی بھی گزری ان کے سہارے گزری ہے
حضرتِ دل جب ہاتھ بڑھائیں، ہر مشکل آسان کریں

ایک ٹھکانہ آگے آگے، پیچھے پیچھے مسافر ہے
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا عنوان کریں

مجبوروں کی مختاروں سے دُوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں، تو مبادا دونوں باہم کچھ احسان کریں

دستِ مزد میں خشتِ رنگیں اس کا اشارہ کرتی ہے
ایک ہی نعرہ کافی ہے بربادیِ ہر ایوان کریں

میرؔ ملے تھے میراجی سے، باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ ان کا بھی دیوان کریں

صوفی تبسم

وفا کی آخری منزل بھی آ رہی ہے قریب
جو اس جگہ بھی نہ تو مل سکے تو میرے نصیب

فغانِ حق و صداقت کا مرحلہ ہے عجیب
دبے تو بند و سلاسل اُٹھے تو دار و صلیب

ترے خیال کا مسکن چمن چمن کا سفر
مری وفا کا نشیمن فقط دیارِ حبیب

نظر سے بچ کے ملے ہیں وہ بارہا مجھ کو
ہزار بار ہُوا ہے یہ دل نظر کا رقیب

اُلجھ نہ جائیں کہیں اور دل کے افسانے
کہاں حدیثِ محبت، کہاں بیانِ خطیب

نہ جانے کونسی شے چشمِ غمگسار میں تھی
کہ جس کو دیکھ کے لرزاں ہُوا ہے دستِ طبیب

ابھی فسردہ ہے ساقی ترا تبسمِ لب
کسی کی یاد کو لے آؤ میکدے کے قریب

عابد علی عابد

چین پڑتا ہے دل کو آج نہ کل
وہی الجھن گھڑی گھڑی پل پل
لاکھ آندھی چلے خیاباں میں
مسکراتے ہیں طاقچوں میں کنول
لاکھ بجلی گرے گلستاں میں
لہلہاتی ہے شاخ میں کونپل
کھل رہا ہے گلاب ڈالی پر
جل رہی ہے بہار کی مشعل
بات نرمی سے یوں وہ کرتے ہیں
جیسے لہرائے ریشمی آنچل
مجھے دھوکا ہوا کہ جادو ہے
پاؤں بجتے ہیں ان کے بن چھاگل
میرا جینا ہے سیج کانٹوں کی
ان کے مرنے کا نام تاج محل
کبھی بگڑا نہ کام دیو کا روپ
وہی سج دھج رہی وہی چھل بل
پیار کی راگنی انوکھی ہے
اس میں لگتی ہیں سب سریں کومل
دمِ رخصت وہ چپ رہے مرتے
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل
نہ ہوا رفع میرے دل کا غبار
کیسے کیسے برس گئے بادل
یا کبھی عاشقی کا کھیل نہ کھیل
یا اگر مات ہو تو ہات نہ مل
میں نے ہائے جو کی وہ بات ہے اور
تیری چاہت کے دکھ نہ تھے بوجھل
کوہکن سے مفر نہیں کوئی
بے ستوں ہو کہیں کہ بندھیاچل
ایک دن تیشہ وروں کے بوجھ تلے
خود بخود گر پڑیں گے راج محل
کیا سہانی گھٹا ہے ساون کی
سانوری نار مدھ بھری چنچل

وہی کرتی ہیں دل میں گھر عابد
جو ادائیں ہیں آنکھ سے اوجھل

ن ۔ م راشد

ترے کرم سے خدائی میں یوں تو کیا نہ ملا
مگر جو تو نہ ملا ۔ زیست کا مزا نہ ملا
حیاتِ شوق کی یہ گرمیاں کہاں ہوتیں
خدا کا شکر ہمیں نالۂ رسا نہ ملا
ازل سے فطرتِ آزاد ہی تھی آوارہ
یہ کیوں کہیں کہ ہمیں کوئی رہنما نہ ملا
یہ کائنات کسی کا غبارِ راہ سہی
دلیلِ راہ جو بنتا وہ نقشِ پا نہ ملا
یہ دل شہیدِ فریبِ نگاہ ہو نہ سکا
وہ لاکھ ہم سے باندازِ محرمانہ ملا
کنارِ موج میں مرنا تو ہم کو آتا ہے
نشانِ ساحلِ الفت ملا، ملا، نہ ملا
تری تلاش ہی تھی مایۂ بقائے وجود
بلا سے ہم کو سرِ منزلِ بقا نہ ملا

انقلابی

ن ۔ م راشد

مورخ، مزاروں کے بستر کا بارِ گراں
عروس اُس کی نارس تمناؤں کے سوز سے
آہ بر لب
جدائی کی دہلیز پر، زلف در خاک، نوحہ کناں!
یہ ہنگام تھا، جب ترے دل نے اس غمزدہ سے
کہا: لاؤ، اب لاؤ، دریوزۂ غمزۂ جانستاں!"

مگر خواہشیں اشہبِ بادپیما نہیں،
جو ہوں بھی تو کیا
کہ جولانگہِ وقت میں کس نے پایا ہے
کس کا نشاں

یہ تاریخ کے ساتھ چشمک کا ہنگام تھا؟
یہ مانا تجھے یہ گوارا نہ تھا،
کہ تاریخ دانوں کے دامِ محبت میں پھنس کر
اندھیروں کی روحِ رواں کو اُجالا کہیں
مگر پھر بھی تاریخ کے ساتھ
چشمک کا یہ کون ہنگام تھا؟

جو آنکھوں میں اُس وقت آنسو نہ ہوتے،
تو یہ مضطرب جاں،
یہ ہر تازہ و نو بنو رنگ کی دلربا
تری اس پذیرائیِ چشم و لب سے
وفا کے سنہری جزیروں کی شہزاد ہوتی
ترے ساتھ منزل بمنزل رواں و دواں!

اسے اپنے ہی زلف و گیسو کے دامِ ازل سے
رہائی تو ملتی،

مگر تو نے دیکھا بھی تھا
دیوِ تاتار کا حجرۂ تار
جس کی طرف تو اُسے کر رہا تھا اشارے،
جہاں بام و دیوار میں کوئی روزن نہیں
جہاں چار سُو باد و طوفاں کے مارے ہوئے راہگیروں
کی بے انتہا استخوانیں پڑی ہیں؟
ابد تک نہ آنکھوں میں آنسو، نہ لب پر فغاں!

○

حفیظ ہوشیارپوری

کچھ اس طرح سے نظر سے گزر گیا کوئی
کہ دل کو غم کا سزاوار کر گیا کوئی
دلِ ستم زدہ کو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
خود اپنے حسن سے یوں بے خبر گیا کوئی
وہ ایک جلوۂ صد رنگ، اک ہجوم بہار
نجانے کون تھا جانے کدھر گیا کوئی
نظر کہ تشنۂ دیدار تھی رہی محروم
نظر اُٹھائی تو دل میں اُتر گیا کوئی
نگاہِ شوق کی محرومیوں سے ناواقف
نگاہِ شوق پہ الزام دھر گیا کوئی
اب اُن کے حسن میں حسنِ نظر بھی شامل ہے
کچھ اور میری نظر سے نکھر گیا کوئی
کسی کے پاؤں کی آہٹ کہ دل کی دھڑکن تھی
ہزار بار اُٹھا سوئے در گیا کوئی
نصیبِ اہلِ وفا یہ سکونِ دل تو نہ تھا
ضرور نالۂ دل بے اثر گیا کوئی
اٹھا پھر آج مرے دل میں رشک کا طوفاں
پھر اُن کی راہ سے باچشمِ تر گیا کوئی
یہ کہہ کے یاد کریں گے حفیظ دوست مجھے
وفا کی رسم کو پائندہ کر گیا کوئی

○

احسان دانش

بزم میں جب وہ وفانا آشنا بھی آئے گا
کیوں نہ آئے عشق کے لب پہ گلہ بھی آئے گا

دار و زنداں کے پرستارو یونہی ہنستے رہو
آئے گا دورِ مکافاتِ جفا بھی آئے گا

تہ نشیں ہو موجۂ طوفاں کا دامن چھوڑ کر
خود بخود کشتی ڈبو کر ناخدا بھی آئے گا

روحِ گلشن خاک کے ذرّوں میں لے گی کروٹیں
اک امامِ وقت اس انداز کا بھی آئے گا

پہلے اپنے دست و بازو پر تو کر لے اعتماد
پھر مرا ذمہ تعاون کو خدا بھی آئے گا

آپ کے جلوے سلامت آپ کے ہوتے ہوئے
کیا مرے دل میں خیالِ ماسوا بھی آئے گا

گھر میں بیٹھے گمرہی کا شکوہ بے جا نہ کر
رہرووں کو جمع کر لے رہنما بھی آئے گا

ہو گئے جُرمِ جنوں میں جتنے دیوانے اسیر
ان کے لب پر نعرۂ زنداں کشا بھی آئے گا

عشق کی مظلوم خاموشی نہ خالی جائے گی
حسن پر اک وقت احساسِ وفا بھی آئے گا

ہر قدم اب قافلے کو ہے یقینِ گمرہی
جانے کوئی میرِ منزل آشنا بھی آئے گا

جو دعا نکلے گی دل سے کیوں نہ ہو گی مستجاب
جب کوئی بندہ پکارے گا خدا بھی آئے گا

زندگی میں یہ جنازوں کی پرستش تا بکے
ایک دورِ احساں حسبِ مدعا بھی آئے گا

تقابل

معین احسن جذبی

کیا یہی انقلاب ہے، قلب اِدھر جگر اُدھر
نالۂ بے قرار اِدھر، شورشِ چشمِ تر اُدھر
اُف ری سیاستِ چمن، رنگ کو بو سے سوءِ ظن
کور ہے نرگسِ وطن، نور اِدھر نظر اُدھر
ایک تبسمِ فرنگ، ہر دو افق لہو ترنگ
نعش بدوش و نالہ رنگ، شام اِدھر سحر اُدھر
اے وہ عقاب جس سے تھی کوہ و دمن کی آبرو
آج اُسی عقاب کے بال اِدھر ہیں پر اُدھر
کام و دہن کی تلخیاں، کوئی مٹائے اب کہاں
وائے یہ حالِ تشنگاں، شیر اُدھر شکر اُدھر
قلتِ صلحِ کل، یہاں، قلتِ صلحِ کل وہاں
کثرتِ فتنہ گر اِدھر، کثرتِ فتنہ گر اُدھر
اہلِ ہنر کے واسطے، خاک بسر کے واسطے
جور و جفا کا گھر اِدھر، قہر و بلا کا گھر اُدھر
برگ سے بر سے پوچھیے، نخل و شجر سے پوچھیے
کون ہے بارور اِدھر، کون ہے باثمر اُدھر
ایک مریضِ نیم جاں، ایک مریضِ خستہ جاں
کون ہے چارہ جُو اِدھر، کون ہے چارہ گر اُدھر
اہلِ فراق کچھ بتاؤ، اہلِ مذاق کچھ بتاؤ
کون سی شے ہے خوب اِدھر، کون سی خوب تر اُدھر

ہجر کی رات ہے طویل، وصل کی صبح دُور ہے
جذب ابھی ہے ناتمام، خام ابھی شعور ہے

قطعات

جاں نثار اختر

حسن کا عطر، جسم کا صندل
عارضوں کے گلاب، زلف کا عود
بعض اوقات سوچتا ہوں میں
ایک خوشبو ہے صرف، تیرا وجود

یادِ ماضی میں یوں خیال ترا
ڈال دیتا ہے دل میں اک ہل چل
دوڑتے میں کسی حسینہ کا،
جیسے آجائے پاؤں میں آنچل

میری راتوں کی تیرگی جب بھی
روح پر یاس بن کے چھاتی ہے
میری 'انجم' تری حسیں صورت
شمع کی لَو میں مسکراتی ہے

اختر انصاری

خزاں میں آگ لگاؤ، بہار کے دن ہیں
بصد خلوص و عقیدت خزاں کی تربت پر
اُلٹ دو تختہ خزاں کی تباہ کاری کا
گرائے ہم نے جہاں اشکِ خوں وہاں اب تم
عذارِ گل کی دہک سے جلا کے کانٹوں کو
مُراد دیتے ہیں جس سے گُل مراد وہ پھول
ملا کے قطرۂ شبنم میں رنگ و نکہتِ گل
بھرے کٹورے چمن کے یہ درس دیتے ہیں
چٹکتی کلیوں کے جادو بھرے ترنم کو
وہ عندلیب نے دل دوز راگنی چھیڑی
اب احتیاط پسندی ہے سعیِ نامشکور
اچھال دو گل و لالہ کو ماہ و انجم تک
چمن سے بلکہ جہاں سے بھی کر کے قطعِ نظر
شرارِ گل سے زمانے میں شعلے بھڑکا دو
زمیں زمیں نہ رہے اور فلک فلک نہ رہے
جنونِ شوق کی بے اعتدالیوں کے خلاف
نشاط و مستی و رعنائی و حلاوت کو
خزاں رسیدہ امنگوں کے پھیکے رنگوں میں
تصورات میں، افکار میں، عقائد میں
فروغِ رنگ و ہجومِ ضیا کی بھٹی میں
پرانی شمعیں بجھا دیں صبا کے جھونکوں نے
گراں گزرتی ہے دل پر نوائے فرسودہ
فضائے دشت کو، ویرانے کو، بیاباں کو
لچک رہی ہے وفورِ ثمر سے شاخِ حیات
جنابِ اختر جاں دادۂ رُخِ گل کو

نئے شگوفے کھلاؤ، بہار کے دن ہیں
گلوں کی بھینٹ چڑھاؤ، بہار کے دن ہیں
بساطِ عیش بچھاؤ، بہار کے دن ہیں
ہنسی کے پھول گراؤ، بہار کے دن ہیں
لگی دلوں کی بجھاؤ، بہار کے دن ہیں
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ، بہار کے دن ہیں
کوئی شراب بناؤ، بہار کے دن ہیں
چھلکتے جام لنڈھاؤ، بہار کے دن ہیں
بہشتِ گوش بناؤ، بہار کے دن ہیں
رباب تم بھی اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں
متاعِ ضبط لٹاؤ، بہار کے دن ہیں
نرالی دھومیں مچاؤ، بہار کے دن ہیں
فلک کو سر پہ اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں
حسین فتنے جگاؤ، بہار کے دن ہیں
انوکھے حشر اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں
کوئی دلیل نہ لاؤ، بہار کے دن ہیں
دماغ و دل میں رچاؤ، بہار کے دن ہیں
دھنک کے رنگ ملاؤ، بہار کے دن ہیں
چمن کی روح بساؤ، بہار کے دن ہیں
دل و جگر کو تپاؤ، بہار کے دن ہیں
نئے چراغ جلاؤ، بہار کے دن ہیں
اچھوتے زمزمے گاؤ، بہار کے دن ہیں
چمن فروش بناؤ، بہار کے دن ہیں
یہ بار ہنس کے اٹھاؤ، بہار کے دن ہیں
امامِ وقت بناؤ، بہار کے دن ہیں

پنڈت آنند نرائن مُلّا

سنبھال ساقیٔ محفل اب اپنے پیمانے
کہ آ گئے صفِ رنداں میں آج دیوانے

ہر انقلاب کی سُرخی اِنھیں کے افسانے
حیاتِ دہر کا حاصل ہیں چند دیوانے

فصیلِ باغ سے یہ آندھیاں رکیں گی کہیں
چمن کی سمت بڑھے آ رہے ہیں ویرانے

خدائے ہر دو جہاں خوب ہے تری تقسیم
زمیں پہ دیر و حرم اور فلک پہ میخانے

ابھی تمام نہیں داستانِ محفلِ شب
چراغِ کشتہ کے باقی ہیں چند پروانے

خیالِ یار ! شبِ غم کی محفلوں کی قسم
ترے بغیر کبھی پُر ہوئے نہ پیمانے

گزر گئی جو ستاروں کے دل پہ آخرِ شب
شعاعِ خندہ زنِ آفتاب کیا جانے

الگ الگ سے افق پر ہیں چھوٹے چھوٹے غبار
یہ کارواں کو مرے کیا ہُوا خدا جانے

یہ جبرِ زیست محبت پہ کب تلک آخر
کہ دل سلام کریں اور نظر نہ پہچانے

یہ حسن و عشق کی محفل بھی ہے عجب محفل
یہاں شراب کسی کی کسی کے پیمانے

ہماری جا بھی کہیں ہے خدائے دیر و حرم
حرم میں غیر ہیں اور بتکدے میں بیگانے

نہ پوچھ دورِ حقیقت کی سختیوں کو نہ پوچھ
ترس گئے لبِ افسانہ گو کو افسانے

کہوں تو کس سے کہوں میں حدیثِ دل مُلّاؔ
بیاورید گرایں جا بود سخن دانے

فضل احمد کریم فضلی

کچھ تو مجھے محبوب ترا غم بھی بہت ہے
کچھ تیری توجہ کی نظر کم بھی بہت ہے

اشکوں سے بھی کھلتا ہے وہ دل جو ہے گرفتہ
کلیوں کے لیے قطرۂ شبنم بھی بہت ہے

ہم خود بھی نہیں چاہتے صیاد سے بچنا
سازش نگہ و دل کی منظم بھی بہت ہے

ہے رشتۂ دزدیدہ نگاہی بھی عجب شے
قائم یہ ہوا پر بھی ہے محکم بھی بہت ہے

ہاں نیم نگاہی سے یوں ہی کام لیے جا
یہ تیری عنایت کی نظر کم بھی بہت ہے

اب ظرف کی یہ بات ہے جو بھی جسے مل جائے
دنیا میں خوشی بھی ہے بہت غم بھی بہت ہے

ڈھائے دل نازک پہ بہت اس نے ستم بھی
پھر لطف یہ ہے مجھ پہ وہ برہم بھی بہت ہے

یہ طرفہ تماشہ ہے، کیا قتل بھی مجھ کو
اور پھر مرے مرنے کا انھیں غم بھی بہت ہے

کچھ بانگ دہل کے بھی یہاں کان ہیں عادی
کچھ لے مرے اشعار کی مدھم بھی بہت ہے

پڑتے ہیں ستمگر کے ذرا وار بھی اوچھے
اور فضلی بسمل میں ذرا دم بھی بہت ہے

میکش اکبر آبادی

وضع کا پاس کہاں تک کرتے ہم تو پھر دیوانے تھے
اُن سے بھی یاں نبھ نہ سکی جو عاقل تھے فرزانے تھے

آپ یہ طے کرتے رہیے کچھ تھا کہ نہ تھا کچھ ہے کہ نہیں
کٹ ہی گئی اپنی تو ان میں خواب تھے یا افسانے تھے

سناٹا سا محفل میں ہنگامہ سا برپا دل میں
کیا کہتے کیا چُپ رہتے کچھ جانے کچھ اَنجانے تھے

حسن کی فطرت ہرجائی اور دل کو ذوقِ رسوائی
مسجد میں تھے مے خانے اور کعبے میں بُت خانے تھے

موجِ صبا سے اُس نے چھیڑا بُوئے گُل سے یاد کیا
ہم بد قسمت پھر بھی نہ سمجھے کہنے کو فرزانے تھے

اَگلی پچھلی باتوں کا کیا ذکر ہے اب جانے دیجے
آپ کے در پر آہی پڑے ہم تھے جبتک بیگانے تھے

مغروروں کو دیکھ کے ہم نے یہ سیکھا ہے اے میکشؔ
جس سے ملے اس طرح ملے جیسے جانے پہچانے تھے

عندلیب شادانی

کوئی ادا شناسِ محبت ہمیں بتائے
جو ہم کو بھول جائے، وہ کیوں ہم کو یاد آئے

کس کی مجال تھی کہ حجابِ نظر اُٹھائے
وہ مسکرا کے آپ ہی دل کے قریب آئے

اک دل نشیں نگاہ میں، اللہ یہ خلش
نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے

کچھ ہم سے بے خودی میں ہوئیں بے حجابیاں
چشمک زنی ستاروں نے کی پھول مسکرائے

آزردگی نہیں کہ یہ فطرت ہے حسن کی
بس دل یہ چاہتا ہے کہ کوئی ہمیں منائے

ناداں سہی، پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے

وہ جانِ آرزو کہ ہے سرمایۂ نشاط
کیوں اُس کی یادِ غم کی گھٹا بن کے دل پہ چھائے

کہتے تھے "تم سے چھوٹ کے کیونکر جئیں گے ہم"
جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے تقدیر جو دکھائے

مایوسیوں میں دل کا وہ عالم دمِ وداع
بجھتے ہوئے چراغ کی لو جیسے تھرتھرائے

تم تو ہمیں کو کہتے تھے، یہ تم کو کیا ہوا
دیکھو کنول کے پھولوں سے شبنم چھلک نہ جائے

اک ناتمام خواب، مکمل نہ ہو سکا
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

عرشی رامپوری

ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا
نہیں جب ہوش میں ہم، جلوہ فرمانے سے کیا ہوگا
جنوں کے ساتھ تھوڑی سی فضائے لامکاں بھی دے
مری وحشت کو اس دُنیا کے ویرانے سے کیا ہوگا
ہے مر جانا کلیدِ فتح، سمجھایا تھا رندوں نے
مگر ناصح یہ کہتا ہے کہ مر جانے سے کیا ہوگا
زہے قسمت! اگر حضرت خود اپنا جائزہ بھی لیں
ہماری زندگی پر تیر برسانے سے کیا ہوگا
اگر ہمدرد بنتے ہو، تو زنجیریں ذرا کھولو
مری پابستگی پہ یونہی غم کھانے سے کیا ہوگا
درِ پیرِ مغاں چھوڑیں، یہ ہم سے ہو نہیں سکتا
کوئی واعظ سے کہہ دو تیرے بہکانے سے کیا ہوگا
جسے دیکھو، وہ ہے سرمستِ صہبائے خرد یکسر
خداوندا! یہاں اک تیرے دیوانے سے کیا ہوگا
نہیں قلب و جگر میں خون کا قطرہ کوئی باقی
عزیزو، اب ہمارے ہوش میں آنے سے کیا ہوگا

دکھوں کو کھو نہیں سکتے اگر اہلِ خرد، عرشی
تو خالی سینۂ افلاک برمانے سے کیا ہوگا

اشک رامپوری

اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہگذر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

بگڑی کا ساتھ خوب دیا ہمدموں نے آہ
دل سے بنا بنا کے اِدھر کی اُدھر کہیں

بیٹھے رہو گے دید کا وعدہ لیے ہوئے
بیمارِ غم نے آنکھ نہ کھولی اگر کہیں

سن راز داں یہ سب ترے کہنے کی بات ہے
گوش و زباں بھی رکھتے ہیں دیوار و در کہیں

اہلِ وطن کے دل میں نہیں گھر تو کیا ہوا
عمرِ رواں گذرتی ہے دنیا میں ہر کہیں

اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھیے !
میری نظر کہیں ہے تو اُن کی نظر کہیں

اُس نکتہ چیں کو عشق جتانے چلے تو اشک
اپنی زباں جواب نہ دے وقت پر کہیں

پس منظر

اختر الایمان

کس کی یاد چمک اٹھی ہے دھندلے خاکے ہوئے اجاگر
یونہی چند پرانی قبریں کھود رہا ہوں چپکا بیٹھا
کہیں کسی کا ماس نہ ہڈی، کہیں کسی کا روپ نہ چھایا
کچھ کتبوں پہ دھندلے دھندلے نام کھدے ہیں — میں جیون بھر
ان کتبوں، ان قبروں ہی کو اپنے من کا بھید بنا کر
مستقبل اور حال کو چھوڑے دکھ سکھ سب میں بیتے پھرا ہوں
ماضی کی گھنگھور گھٹا میں چپکا بیٹھا سوچ رہا ہوں
کس کی یاد چمک اٹھی ہے دھندلے خاکے ہوئے اجاگر؟

بیٹھا قبریں کھود رہا ہوں — ہوک سی بن کر، ایک اک مورت
درد سا بن کر، ایک اک سایا، جاگ رہے ہیں — دور کہیں سے
آوازیں سی کچھ آتی ہیں، "گذرے تھے اک بار یہیں سے"
حیرت بن کر دیکھ رہی ہے، ہر جانی پہچانی صورت
گویا جھوٹ ہیں یہ آوازیں کوئی میل نہ تھا ان سب سے
جن کا پیار کسی کے دل میں اپنے گھاؤ چھوڑ گیا ہے
جن کا پیار کسی کے دل سے سارے رشتے توڑ گیا ہے
اور وہ پاگل ان رشتوں کو بیٹھا جوڑ رہا ہے کب سے!

میری نس نس ٹوٹ رہی ہے بوجھ سے ایسے ورثے کے — جس کو
اپنی روح سمجھ کر اب تک لئے لیے پھرتا تھا ہر سُو
لیکن آج اڑی جاتی ہے اس مٹی کی سوندھی خوشبو
جس میں آنسو بوئے تھے میں نے، بیٹھا سوچ رہا ہوں جو ہو
ان کتبوں کو ان قبروں میں دفن کروں اور آنکھ بچا لوں
اس منظر کی تاریکی سے، جو رہ جائے وہ اپنا لوں

عدم

زباں پہ آپ کا نام آ رہا تھا
غمِ ہستی کو آرام آ رہا تھا

خیانت کر کے موسیٰ کو ملا کیا
ہماری سمت پیغام آ رہا تھا

خدا کا شکر تیری زلف بکھری
بڑی گرمی کا ہنگام آ رہا تھا

ستارے سو گئے انگڑائی لے کر
کہ افسانے کا انجام آ رہا تھا

تڑپ کر میں نے توبہ توڑ ڈالی
تری رحمت پہ الزام آ رہا تھا

عدم دل کھو کے آسودہ نہیں ہم
بُرا تھا یا بھلا! کام آ رہا تھا!

افسانۂ آں شبے ....

جگن ناتھ آزاد

اک رات کی بات کہہ رہا ہوں آزاد
شعلوں کی ندی میں بہہ رہا ہوں آزاد
جس کو کبھی ضبطِ نطق میں لا نہ سکوں
دل پر وہ عذاب سہہ رہا ہوں آزاد

پہلا رُخ

وہ رات کہ جب خلدِ بریں تھا پہلو
جب موج ہوا تھی موجِ مے، وقت، سبو
وہ رات تصور میں بسی ہے ایسے
جس طرح شراب میں نشہ، پھول میں بُو

چہرے پہ وہ سیلابِ تبسم ہے، ہے
سینے میں وہ اک جوشِ تلاطم ہے، ہے
کانوں میں مرے گونج رہا ہے اب تک
وہ رات کا خاموش ترنم ہے، ہے

انسان کے حالات ہیں کس کے بس میں
اُڑتے ہوئے لمحات ہیں کس کے بس میں
اک رات ملی تھی اتفاقاً ورنہ
دُنیا ترے دن رات ہیں کس کے بس میں

گردوں پہ گھٹا تلی تھی گھنگھور اے دوست!
رہوار ہواؤں کے تھے منہ زور اے دوست!
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں کہیں
ہم تم تھے پسینے میں شرابور اے دوست!

کل شب کہ فضا تھی مست بے جام و سبو
تھا ہوش کی قید میں نہ میں اور نہ تو
اُڑ اُڑ کے حریمِ رُوح تک جاتی تھی
وہ تیرے بدن کی بھینی بھینی خوشبو

وہ کاکلِ دل نواز مہکی مہکی
ہر بات کلی کی طرح لہکی لہکی
ہنگامِ سحر بھی دل میں ہے رقص کناں
اے دوست! تری نظر وہ بہکی بہکی

اے مہر! کبھی ترا اشارا نہ ملے
اے نور! کبھی ترا سہارا نہ ملے
میں رات کے طوفاں میں بھٹکتا ہی رہوں
اے صبح! کبھی ترا کنارا نہ ملے

تیسرا رُخ

آخر سحر آ کے دل کو تڑپا ہی گئی
یہ تیرگی آ کے نور پر چھا ہی گئی
ضو ریز جو دل میں تھیں امنگیں آزاد
کالا کفن اُن کو آ کے پہنا ہی گئی

رات اپنا جمال کھو رہی ہے سو جاؤ
چہرہ شبنم سے دھو رہی ہے سو جاؤ
ٹوٹے ہوئے جسم پر ذرا رحم کرو
اب صبح طلوع ہو رہی ہے سو جاؤ

جو نیند میں ہو نیند میں رہ جاتا ہے
بیدار سے رازِ زیست کہہ جاتا ہے
اک نور کا دریا کہ سحر سے پہلے
ظلمات کی وادیوں میں بہہ جاتا ہے

اک رات اگر کرم پہ مائل ہو جائے
انسان کے ہر نفس میں شامل ہو جائے
یہ رات — یہ شام سے سحر تک کا سماں
پھیلے جو تو زندگی کا حاصل ہو جائے

پھولوں کی طرح نفس لہک جاتے ہیں
شاخوں کی طرح بدن لچک جاتے ہیں
مل جاتے ہیں بھٹکے ہوئے دو دل جو کہیں
وہ رات کی ظلمت میں چمک جاتے ہیں

قتیل شفائی

خرد کے نام جنوں کا پیام لے کے چلے
ہم اپنے ساتھ ہی اپنا مقام لے کے چلے

سکوتِ شام کا مطلب کوئی سمجھ نہ سکا
بس اک ہمیں تری محفل میں جام لے کے چلے

بٹھا دیئے ہیں کسی نے بہار پر پہرے
صبا چلے بھی تو اذنِ خرام لے کے چلے

خدا کے نام سے واقف ہر ایک راہ نہ تھی
کبھی کبھی تو ہم اپنا بھی نام لے کے چلے

فریب کھا ہی گئے اہلِ جستجو آخر
چراغ ڈھونڈنے آئے تھے شام لے کے چلے

بنامِ ساقیٔ صحرا نظر ملے ہیں سراب
اب ایک دور ہمارا بھی نام لے کے چلے

قتیلؔ جن سے پریشاں ہیں طائرانِ حرم
وہ پھر سے دانۂ ہم رنگِ دام لے کے چلے

ظہیر کاشمیری

جب کبھی تذکرۂ شعلہ رخاں ہوتا ہے
دامنِ دل پہ سلگنے کا گماں ہوتا ہے
ہم سمن پوشوں میں اس طرح رہے آشفتہ
جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے
دل بیاباں میں الاؤ کی طرح جلتے ہیں
خیمہ زن قافلۂ گشتہ سراں ہوتا ہے
اس کی ہر تان سے ملتا ہے ستاروں کو گداز
عشق کہتے ہیں جسے نغمۂ جاں ہوتا ہے
دلِ مرحومِ تمنّا پہ دمکتے ہوئے داغ
جیسے تربت پہ چراغوں کا سماں ہوتا ہے
دعوتِ جلوۂ شب تاب پہ مسرور نہ ہو
یہ بھی اک وعدۂ زرّیں کمراں ہوتا ہے
حسن کا عکس بھی تسکینِ دل و جاں ہے ظہیر
حسن پہ سایۂ صاحب نظراں ہوتا ہے

ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

مجید امجد

تنگ پگڈنڈی ——— سرِ کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے، دونوں سمت، گہرے غار، منہ کھولے ہوئے
آگے ڈھلوانوں کے پار اک تیز موڑ، — اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آکے رستے پر کوئی نخلِ بلند،
تھام کر جس کو گزر جاتے ہیں، آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے، ڈگمگاتے رہروؤں کے قافلے
ایک بوسیدہ خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں،
آہ ان گردن فرازانِ جہاں کی زندگی،
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں

○

عبدالمجید حیرت

کسی کے دم سے راحت بھی ہوئی ہے   مگر برپا قیامت بھی ہوئی ہے
کوئی پوچھے، کسی کا دل دکھا کر   کسی کو کچھ ندامت بھی ہوئی ہے
روا ان کی عنایت کی بدولت   کسی کی کوئی حاجت بھی ہوئی ہے
لیا ہے عقل سے ہم نے بہت کام   یہی ہم سے حماقت بھی ہوئی ہے
اگر تکلیف پہنچی ہے، تو کیا غم   بہت ہم پر عنایت بھی ہوئی ہے
کسی کے سامنے مجبور ہو کر   بیاں غم کی حکایت بھی ہوئی ہے
علاجوں سے مریضِ خستہ جاں کی   بہت کچھ سلب طاقت بھی ہوئی ہے
جگر پر جب کوئی صدمہ پڑا ہے   دگرگوں دل کی حالت بھی ہوئی ہے
مشقت کا کبھی پھل بھی ملا ہے   کبھی محنت اکارت بھی ہوئی ہے
اٹھایا ہے جنھوں نے بارِ کلفت   میسر ان کو راحت بھی ہوئی ہے
کسی کا جور جب حد سے بڑھا ہے
تو اے حیرتؔ شکایت بھی ہوئی ہے

شعری بھوپالی

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے
ہر اک جذبہ ہر اک ذوقِ طلب ناکام ہو جائے
محبت ہی محبت کا اگر انجام ہو جائے
وہی نالہ وہی نغمہ بس اک تفریقِ لفظی ہے
قفس کو منتشر کر دو نشیمن نام ہو جائے
تصدق عصمتِ کونین اُس مجذوبِ الفت پر
جو اُن کا غم چھپائے اور خود بدنام ہو جائے
یہ عالم ہو تو اُن کو بے حجابی کی ضرورت کیا
نقاب اُٹھنے نہ پائے اور جلوہ عام ہو جائے
یہ میرا فیصلہ ہے آپ میرے ہو نہیں سکتے
میں جب جانوں کہ یہ جذبہ مرا ناکام ہو جائے
ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے
جو میرا دل نہ ہو شعری حریف اُن کی نگاہوں کا
تو دنیا بھر میں برپا انقلاب عام ہو جائے

دَولت کی خُدائی

پروفیسر شور

انکھڑیوں کی مستیاں دوشیزہ رخساروں کی آگ
میری مٹھی میں ہے حُسنِ مصر و روما کا سہاگ
عفتوں کے خون سے شاداب میری وادیاں،
رقص فرما ہیں مرے سازوں پہ مریم زادیاں
عصمتیں اکثر پگھل جاتی ہیں میری آگ میں
ایسی زنجیریں بھی گل جاتی ہیں میری آگ میں
میر و سلطان و وزیر و کجکلاہ و تاجدار
میرے فتراکوں کے آہو میرے تیروں کے شکار
فرِ جاگیر و وراثت قصر و ایواں کا وقار
میری ٹھوکر کے خزف، میری شرابوں کا خمار
چترِ جم اورنگِ پرویزی، قبائے بخت یار
میری صبحوں کے دھندلکے میرے رستوں کے غبار
نخوتیں میری وراثت، عشرتیں میری برات
ساغر و مینا کی صبحیں، عارض و گیسو کی رات
زمزمے میرے اُجالے، قہقہے میرے چراغ
خونِ آدم زاد سے دہکے ہوئے میرے ایاغ
سیم و زر میرے نبی، لعل و گہر میرے رسول
میرا اعجازِ خلافت کھیتیوں کا عرض و طول

مرہمِ حج و زیارت، زخمِ دینار و درم
میرے ناسوروں کی چھلنی سینۂ مصر و عجم
میرے ناخن سے کلیساؤں کے سینوں پر خراش
معبد و ہیکل کی نورانی جبینوں پر خراش
راہب و صوفی مرے گم کردہ منزل راہ گیر
میری محرابوں میں دل، میرے ہی طاقوں میں ضمیر!
جبہ و دستار کو میری غلامی کا شرف
سبحہ و زنار میرے ہی خدنگوں کے ہدف
ہر عزا خانے میں بے گور و کفن میرے شہید
ہر حسین آباد میں میرے تراشیدہ یزید
میرے بوجہلوں کی زد پر ہر پیمبر کا وقار
کھیلتے ہیں میرے زناری خداؤں کا شکار
جرم و جہل و کذب و عصیاں میرے ہی نشے میں چور
میرے کس بل پر رذالت کو شرافت کا غرور
مجھ سے نسلیں سرگراں، مجھ سے نجابت کا حشم
مجھ سے چہرے معتبر، مجھ سے ضمیروں کے بھرم
مفلسی سب سے بڑا میری شریعت میں گناہ
زہر میرا ہر تبسم، طنز میری ہر نگاہ!!
خود فروشی میری فطرت، پردہ پوشی میرا کام
مجھ سے چھپ جاتا ہے نسل و آدمیت کا جذام
میری راتیں میرے دن میرے شبستاں میرے خواب
چھین لوں میں جس سے چاہوں ماہتاب و آفتاب
طاعت و تقدیس و عرفاں آؤ میری قسمت آؤ
اپنے سر اپنی جبینیں میرے قدموں پر جھکاؤ!
کونسی دوکان پر دیر و حرم بکتے نہیں
یا خدا بکتا نہیں ہے یا صنم بکتے نہیں
اطلس و دیبا میں بھی عریاں رہیں جن کے بدن — اُن غلاموں کے بھی ہاتھوں پہ ہے سونے کی شکن

سیف الدین سیف

کیا منزلِ غم سمٹ گئی ہے
اک آہ میں راہ کٹ گئی ہے

پھر سامنے ہے پہاڑ سی رات
پھر شام سے نیند اُچٹ گئی ہے

پہلو میں یہ کیسا درد اُٹھا ہے
یہ کونسی راہ کٹ گئی ہے

آپ آئے نہیں تو موت کمبخت
آ آ کے پلٹ پلٹ گئی ہے

اُٹھ اُٹھ کے مریضِ غم نے پوچھا
کیا ہجر کی رات کٹ گئی ہے

پھر سیفؔ ہوائے یادِ رفتہ
ہر غم کی نقاب الٹ گئی ہے

غلام ربّانی تاباں

چمن میں کس نے کسی بے نوا کا ساتھ دیا
وہ بوئے گل تھی کہ جس نے صبا کا ساتھ دیا

دیا جو ساتھ تو پھر کس بلا کا ساتھ دیا
شکستِ غم نے ہر اک مدّعا کا ساتھ دیا

فروغِ بادہ نے رنگِ حیا کا ساتھ دیا
غرض اُسی بتِ کافر ادا کا ساتھ دیا

خیالِ یار ترا شکریہ رہِ غم میں
بس ایک تو نے دلِ مبتلا کا ساتھ دیا

نگاہِ شوق کے یہ حوصلے کوئی دیکھے
کہ ہر نظارۂ صبر آزما کا ساتھ دیا

میں کس طرح سے کروں کم نگاہیوں کا گلہ
تری جفاؤں نے ذوقِ وفا کا ساتھ دیا

تجھے خبر بھی نہیں ہے کہ دل کی دھڑکن نے
کہاں کہاں تری آوازِ پا کا ساتھ دیا

دلِ خراب کی یہ سادہ لوحیاں توبہ
جفا کے بعد بھی اہلِ وفا کا ساتھ دیا

اب اس سے آگے وہ مسجد یہ میکدہ تاباںؔ
یہاں تلک تو کسی پارسا کا ساتھ دیا

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں

ابنِ انشا

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاجی کا نام نہ لو، کیا انشاجی سودائی ہیں

ہیں لاکھوں روگ زمانے میں، کیوں عشق ہے رسوا بیچارا
ہیں اور بھی وجہیں وحشت کی، انسان کو رکھتیں دکھیارا
ہاں بیکل بیکل رہتا ہے، ہو پیت میں جس نے جی ہارا
پر شام سے لے کر صبح تلک یوں کون پھرے گا آوارا
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاجی کا نام نہ لو، کیا انشاجی سودائی ہیں

یہ بات عجیب سناتے ہو، وہ دُنیا سے بے آس ہوئے
اک نام سُنا اور غش کھایا، اک ذکر پہ آپ اُداس ہوئے
وہ عقل میں افلاطون سنے، وہ شعر میں تلسی داس ہوئے
وہ تیس برس کو پہنچے ہیں، وہ بی اے ایم اے پاس ہوئے
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاجی کا نام نہ لو، کیا اِنشاجی سودائی ہیں

گر عشق کیا ہے تب کیا ہے، کیوں شاد نہیں آباد نہیں
یہ بات تو تم بھی مانو گے، وہ قیس نہیں فرہاد نہیں
جو جان لیے بن ٹل نہ سکے، یہ ایسی بھی افتاد نہیں
کیا ہجر کا دارو عنقا ہے؟ کیا وصل کے نسخے یاد نہیں
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

وہ لڑکی اچھی لڑکی ہے، تم نام نہ لو ہم جان گئے
وہ جس کے لانبے گیسو ہیں، پہچان گئے پہچان گئے
ہاں ساتھ ہمارے انشاؔ بھی اس گھر میں تھے مہمان گئے
پر اس سے تو کچھ بات نہ کی، انجان رہے انجان گئے
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

جو ہم سے کہو ہم کرتے ہیں، کیا انشاؔ کو سمجھانا ہے؟
اس لڑکی سے بھی کہہ لیں گے، گو اب کچھ اور زمانا ہے
یا چھوڑے یا تکمیل کرے، یہ عشق ہے یا افسانا ہے؟
یہ کیا گورکھ دھندا ہے، یہ کیسا تانا بانا ہے
یہ باتیں کیسی باتیں ہیں، جو لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو، کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

اداؔ جعفری بدایونی

کرن نگاہ کی بہلا گئی تو کیا ہوگا   خلوصِ شوق پہ آنچ آ گئی تو کیا ہوگا
فریبِ ہوش، فریبِ حیات سے بچ کر   فریبِ اہلِ وفا کھا گئی تو کیا ہوگا
یہی نگاہ کہ آوارہ ہے خلاؤں میں   جب آفتاب سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
گلوں کے رنگ میں خونِ جگر کا رنگ سہی   بھری بہار بھی کترا گئی تو کیا ہوگا
اندھیری رات سے پوچھو، دبے قدم ہی سہی   حیاتِ نو کی سحر آ گئی تو کیا ہوگا
یہی حیات، کہ ہے واقفِ رموزِ حیات   جنوں کا راز کبھی پا گئی تو کیا ہوگا
گماں بھی کر نہ سکے تھے سحر کے متوالے   سحر فریبِ ضیا کھا گئی تو کیا ہوگا
تری نگاہ سے روشن ہیں داغِ دل کے کنول   تری نگاہ بھی ترسا گئی تو کیا ہوگا

شعورِ غم بھی غنیمت ہے زندگی میں اداؔ
غموں کی دھوپ بھی کجلا گئی تو کیا ہوگا

شاد عارفی

کھری باتیں بہ اندازِ سخن کہدوں تو کیا ہوگا
عدوئے جان و تن کو جانِ من کہدوں تو کیا ہوگا

نگہبانِ وطن کو راہ زن کہدوں تو کیا ہوگا
کسی بھی بدچلن کو بدچلن کہدوں تو کیا ہوگا

غریبی جن کے لتّے لے گئی تا حدِّ عریانی،
جو ہیں اُن عصمتوں کو سیم تن کہدوں تو کیا ہوگا

اندھیرے کو اندھیرا ہی کہیں گے دیکھنے والے
سوادِ شام کو صبحِ وطن کہہ دوں تو کیا ہوگا

جو مستقبل کے رُخ پر روشنی ڈالوں تو کیا دوگے
چمن کی تاک میں برقِ چمن کہدوں تو کیا ہوگا

غلط باتوں پہ دنیا کب توجہ صرف کرتی ہے
بُتوں کو بے زبان و بے دہن کہدوں تو کیا ہوگا

کہیں فطرت بدل سکتی ہے ناموں کے بدلنے سے
جنابِ شیخ کو میں برہمن کہدوں تو کیا ہوگا

غرورِ سیم و زر ہے مبتلائے نازِ خود بینی
وہ خود بینی جسے دیوانہ پن کہدوں تو کیا ہوگا

قد و گیسو کو تم شمشاد و سنبل کہہ کے کیا لوگے
قد و گیسو کو میں دار و رسن کہدوں تو کیا ہوگا

ستارے توڑتی ہے جبکہ ذرّوں کی توانائی
ستاروں کو تمھاری انجمن کہدوں تو کیا ہوگا

بتوں نے بے سبب اے شاد جب لٹوا دیا مجکو
جو ان کی شان میں کوئی بھجن کہدوں تو کیا ہوگا

میراث

یوسف ظفر

"دی شیخ با چراغ، ہمی گشت گردِ شہر
کزدام و دَو ملولم و اِنسانم آرزوست"
(رومی)

ابنِ آدم! — ابنِ آدم!!' — یہ تری میراث ہے
ایک جبڑا — یہ درانتی کے سے دانت
ایک دل — آتش فشاں
آنکھیں — بلائے ناگہاں
عافیت دشمن — چراغِ خانہ سوز
ابنِ آدم! — تیرے ہاتھوں میں زمامِ اختیار
اور پنجے اپنے مرکب کے لہو سے تر بتر

(۱)

شفق اپنی بانکی سہیلی سے ملنے چلی
چمکتی جبیں پر ستاروں کی دھول
لبوں پر تبسم کے نو خیز پھول
دوپٹے پہ زرکار نغموں کا جال
نظر میں کوئی شاعرانہ خیال
کھلے رنگ آپس میں نیلے سے پیلا، حنائی سے لال
کہیں سبز سے لاجوردی ملا، پھول کھلنے لگے
ہواؤں کے باغات ہلنے لگے
دھڑکنے لگے ابر پاروں کے دل
شفق شام سے جا ملی
شام سے
اپنی بانکی، سجیلی، دلہن سی سہیلی سے یوں جا ملی
جیسے اُس کے لئے ان پہاڑوں میں چھپ کر گزارا تھا دن
جا ملی — ساتھ لے کر خدا جانے کن وادیوں میں مسرت کی تانیں
اُڑانے لگی
کیا سنانے لگی! — رات چپ چاپ چھانے لگی

(۲)

دریچے شبِ زندگی کے کھلے، ماہ و انجم نے دیکھا، تبسم کیا
گزرگاہِ ہستی پہ منزل کے مارے چلے پا بجولاں!
پہاڑوں کی ہیبت، فضاؤں کی وسعت سے ترسندہ انساں
مخالف ہواؤں کے تیروں سے لرزاں —
زمینوں کے سینوں میں نفرت کا لاوا
زمینوں کے ناسوُر میں مارِ پیچاں
کہیں بچھوؤں کے شبستاں
یہ کوہ و بیاباں کہ جن میں درندوں کے پُرہول مسکن ہیں آلودہ خونِ انساں
یہاں قوتِ نامیہ سے پنپتے ہیں خارِ مغیلاں
وہ پودے کہ پتوں پہ ہے جن کے مرگِ خراماں
کہ پھولوں پہ ہے جن کے مرگِ خراماں

ہواؤں کی پاکیزگی میں عفونت کے مسموم اجزا پریشان و یکجاں
ہواؤں کے دامن میں قاتل ہوائیں
زمینوں کے سینوں کے پروردہ قاتل زمینوں کے اوپر
زمینوں کے سینوں میں خوں بن کے رہتے ہیں خونی عناصر
یہی وہ فضا ہے جہاں پرورش تو نے پائی
یہ گہوارہ ہے تیری انسانیت کا
یہیں سے ملا ہے تجھے جو ملا ہے، یہی تیرا مولد، یہی تیرا مسکن،
یہی تیرا مدفن،
یہی تیری میراث ہے ابنِ آدم، یہی تیری میراث ہے۔ ابنِ آدم!

(۳)
پہاڑوں کی ظلمت میں نوخیز کلیوں کا جوبن لُٹا
درانتی چلی
سسکتی رہی سرد، کمسن ہوا
لرزتا رہا ہر ستارے کا معصوم ننھا دیا
درانتی چلی ـــ
جھنجھوڑا ہوا نے گرانڈیل پیڑوں کو ـــ جاگو، اٹھو
مرے صاحبو، !
حسیں، دلنشیں، چاندتاروں کی کرنوں کا خوں ہو گیا
وہاں کنج میں دیکھ لو، ـــ صاحبو! ـــ صاحبو!!"
مگر دیودار
گراتے رہے اپنے پتوں کی شمشیر، سایوں کے خار
قدم دو قدم چل کے خود دیکھنے کی سکت کس میں تھی
درانتی چلی ـــ
ستاروں کے سایوں میں نوخیز کلیوں کا جوبن لُٹا
درانتی چلی ـــ ابنِ آدم یہی تیری میراث ہے دیکھ لے
درانتی چلے

(۴)
اذانوں کی تانوں سے سینوں کے غم دھل گئے
مساجد کے در کھل گئے
جھکے اپنے معبود کے سامنے زندگی کے امیں
بہرِ دنیا و دیں
لبوں پہ دعائیں ـــ "الٰہی گناہوں کو تو بخش دے
ملوث نگاہوں کو تو بخش دے
عطا کر رہِ راست، جو تو نے دی
عبادت گذاروں کو ـــ توفیق دے
کہ بن جائیں ہم نیک بندے ترے
ہمیں کام کرنے کی توفیق دے
الٰہی میں عاجز گنہگار ہوں
مگر میں ترا ہی نمک خوار ہوں"۔
یہ الفاظ، خالی ـــ نہیں جن میں سوز
یہ الفاظ رٹتے ہوئے روز روز
زباں ایک عادت سے مجبور ہے، ـــ یہ عبادت نہیں
دعائیں لبوں پر ـــ مگر دل میں طوفانِ اُمید و بیم
نگاہوں میں تصویرِ مال یتیم
خیالوں میں بیوہ کا رنگیں شباب
تصور میں رشوت کی دولت کے خواب
زباں پر دعا ـــ اور خواہش یہی
کہ حاصل ہو ابلیس کی زرگری
رُخِ عجز پر پارسائی کا نور
مگر دل تنور
لپکتے ہوئے جس سے شعلوں کے سانپ
مگر ابنِ آدم! ـــ نہیں منہ نہ ڈھانپ

یہی تیری میراث ہے دیکھ لے
درانتی چلے

(۵)
سحر آگئی
دہکتے ہوئے کندنی رنگ پر
حنائی عروساز ہاتھوں میں گجروں کی سیمیں کھنک
نگاہوں میں خوابوں کے گیتوں کا رس
اداؤں میں دل کی لرزتی امنگ
مسلسل، معطر، حسیں ریشمیں گیسوؤں میں گلابی گلابی سے پھول
سحر آگئی ——
پرندوں کے نغموں نے آواز دی
چہکنے لگی زندگی ——
پرندے —— یہ نغموں کے پرزے اڑے
اڑے اور صباحت کو بھی لے اڑے
دھوپ ہے —— دھوپ ہی دھوپ ہے —— دیکھ لے
درانتی چلے ——

(۶)
یہ چرواہا، گلہ لئے گائے بھینسوں کا انسانیت سے بہت دور ہے
پھر بھی مسرور ہے
لڑکپن سے محدود ہے اس کی دنیا یہی سبزہ زار اور یہی گاؤ میش
یہی اس کے خویش
نہ اس کو مقامِ بشر کی خبر ہے نہ دردِ بشر
اسے کیا خبر یہ بھی اک جزوِ اعظم ہے نعمۂ کل کا
ورق ہے یہ شیرازۂ مصحفِ کل کا
اسے کیا خبر کیا ہے یہ کائناتِ جمال و جلال
وہ تصویرِ ماضی —— یہ تنظیمِ حال ——
اسے کیا خبر کیا ہے تعقیدِ معلول و رازِ علل
اسے آج ہے آج اور کل ہے کل
یہ راہی ہے، منزل وہی ہے فنا —— اس کا ہونا ہے کیا،
چارۂ گاؤ میش

مگر —— اس کی بنسی کی آوارہ تان
ہوا میں سندیسے لٹاتی ہے خوابِ سکوں کے
فضا میں پری بن کے صوتِ طرب کی بہے جا رہی ہے
یہ بنسی کی آواز —— جیسے سنہری روپہلی حسیں تتلیوں کی قطار
جو نادیدہ، انجانی دنیا کی جانب چلی جا رہی ہے
یہی نامشخص ترنم ہے اس کی دلیلِ حیات
یہی ہے یہی اس کی کل کائنات
نہیں تو یہ چرواہا خود اپنی بھینسوں سے بہتر نہیں ہے
وہی بے شعوری، وہی کم نگاہی
نہ جادہ نہ منزل، نہ احساسِ جادہ، نہ احساسِ منزل
بجے جا رہا ہے ——
درندہ ہے در پردۂ آدمیت، مگر اس کو اس کی خبر کچھ نہیں
یہ نادان حیوان، معصوم و مظلوم، بے ذوقِ ہستی ہے مجبورِ ہستی،
—— مرے شیر دل سادہ صورت گڈریے بتا تجھ کو کچھ خبر ہے
تری بنسری کی لرزتی ہوئی تان کیوں کاٹتی ہے فضاؤں کے دل کو
ہواؤں کے دل کو!
بتاؤں تجھے! —— پر تجھے کیا بتاؤں —— "بجے بنسری، وقت کٹتا رہے"
یہی تیری میراث ہے ابنِ آدم —— یہی تیری میراث ہے، دیکھ لے
بجے بنسری یا درانتی چلے ——

(۷)
سکونِ تمام فطرت، بڑی بھولی بھالی، بڑی سادہ سادہ
ہزار اس کے عشوے میں غمزے ہزار

جمال اس کا پھولوں سے تا نوکِ خار
رگ و پے میں ہے اس کے برقِ تپاں
کہ جیسے ہو ریگِ رواں پر غزالِ دواں
مگر اس کے چہرے پہ رقصِ تبسم، سرودِ سکوں
یہ معصومیت، ایک پیغمبرانہ محبت کی دعوت
مسرّت کا، انسانیت کا، سکوں آفرینی کا ایک ثبوت۔

یہ بچے، یہ معصومیت کے شگوفے، یہ منظوم خواب
خمستانِ فطرت کی رنگین و نایاب و تازہ شراب
یہ آواز ان کی، ستاروں کی جھلمل سے ملتی ہوئی
یہ عارض مجسم بہارِ چمن
یہ باتیں —— یہ نغموں کے پھولوں کے ہار
یہ آنکھیں۔ یہ گیتوں کی خاموش جھیلیں، شفق درکنار——
اسی حسنِ معصوم کے ساز میں کروٹیں لے رہے ہیں جہالت کے راگ
اسی سینۂ پاک میں جاگنے کو ہے دوزخ کی آگ
اسی دستِ نازک کی شاخِ بہاریں سے پھوٹیں گے خار
محبت کے اس تختۂ گل سے لپٹے ہوئے ہیں تباہی کے خونخوار ناگ
یہی تجھ کو سینہ بسینہ ملا ہے، یہی تیری میراث ہے——
ابنِ آدم!

(۸)
شبِ تار میں ڈھونڈتی ہیں نگاہیں کہاں جا رہے ہیں جنت جانے والے
تجسس کی آنکھوں میں مذہب کا سرمہ ہے لیکن یقین بصارت
نہیں ہے
تجسس کے ہاتھوں میں ہے فلسفے کا عصا، لیکن اُس کا
سہارا یقینی نہیں ہے
تجسس شبِ تیرہ و تار میں وقت کی ٹھوکریں کھا کے بھی نارسا ہے
ہوس بھونکتی ہے —— مگر اُس کا چہرہ ہے انساں کا چہرہ
ہوس کاٹتی ہے —— مگر اُس کا جبڑا ہے انساں کا جبڑا
بدستور شیروں کی دھاڑ اور فیلوں کی چنگھاڑ انساں کی آواز سے پھوٹتی ہے
شبِ تار میں "پالیا —— پالیا" کی صداؤں سے ارض و سما کانپتے ہیں
مگر کیا ملا ہے —— فقط رازِ یک ذرّۂ کائنات
کہ جس سے فنا کا طلسمِ دوامی ہُوا پختہ تر ——
شبِ تار میں آدمی کو ابھی تک وہی قطب تارہ نظر آ رہا ہے
کہ جس سے جدا باختر سے ہے خاور
کہ جس سے سفید اور سیہ کی ہے صورت نمایاں
کہاں ہے وہ تہذیب و مذہب کہ جس کی حقیقت پہ ہیں
علم و ادراک نازاں
کہاں ہے —— کہاں ہے —— وہ انساں! —— وہ انساں!!

انجم رومانی

دن ہو کہ رات، کنجِ قفس ہو کہ صحنِ باغ
آلامِ روزگار سے حاصل نہیں فراغ

رغبت کسے کہ لیجیے عیش و طرب کا نام
فرصت کہاں کہ کیجیے صہبا سے پُر ایاغ

ویرانۂ حیات میں آسودہ خاطری
کس کو مِلا اُس آہوئے رم خوردہ کا سُراغ

آثارِ کوئے دوست ہیں اور پاشکستگی
خوشبوئے زلفِ یار ہے اور ہم سے بے دماغ

کس کی جبیں پہ ہیں یہ ستارے عرق عرق
کس کے لہو سے چاند کا دامن ہے داغ داغ

کرتے ہیں کسبِ نور اسی تیرگی سے ہم
انجم ہیں دل کے داغ گُہر ہائے شب چراغ

یہ پھول

قیوم نظر

ہر طرف بکھرے ہوئے تارے ، یہ پھول
تیرگی کے بل پہ رقصاں جگمگاتے قہقہے
حسن کی رعنائیوں میں گم خوشی کے چہچہے
ماہ سے بڑھ کر یہ مہ پارے ، یہ پھول
ان میں لہراتی ہوئی خوشبو کی شیرینی بھی ہے
آرزو کی سادگی گلشن کی رنگینی بھی ہے
دور افق تک پھیلے نظارے ، یہ پھول
اس بلندی پر مگر اتنے قریب آئے ہوئے
آسماں کی رفعتوں کو خاک پہ لائے ہوئے
جھلملاتی رات کے پیارے ، یہ پھول
ان کی جلتی محفلوں میں اک عجب بے چارگی
خود فریب آشفتگی بے اختیار آوارگی
سرگراں ، مسلے ، تھکے ہارے ، یہ پھول
جانے کیا کیا روپ دھارے مسکراتی شام نے
سیم و زر کی دلکشی نے نکہتِ ایام نے
دم بخود ہیں درد کے مارے ، یہ پھول
ان کی دنیا میں دل آویزی کی دولت اب کہاں
منظرِ عالم پہ پھر ہنسنے کی جرأت اب کہاں
اب کہاں یہ بجھتے انگارے ، یہ پھول
زندگی کی راہ سے کٹ کر غم فسردہ دیے
دن کے ویرانے میں کھو جانے کو ہیں ننھے دیے
دور افق تک پھیلے نظارے ، یہ پھول

ناصر کاظمی

وا ہُوا پھر درِ میخانۂ گل　　پھر صبا لائی ہے پیمانۂ گل
زمزمہ ریز ہوئے اہلِ چمن　　پھر چراغاں ہُوا کاشانۂ گل
رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری　　لے کے پھر آئی ہے نذرانۂ گل
پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے　　میرا دیوانہ ہے دیوانۂ گل
پھر کسی گل کا اشارہ پاکر　　چاند نکلا سرِ میخانۂ گل
پھر سرِ شام کوئی شعلہ نوا　　سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گل
آج غربت میں بہت یاد آیا　　اے وطن تیرا صنم خانۂ گل
آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں　　ہم سے تھی رونقِ کاشانۂ گل
ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے　　ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

ہم ہی گلشن کے امیں ہیں ناصر
ہم سا کوئی نہیں بیگانۂ گل

افسانه

دُور کا نشانہ

چودھری محمد علی ردولوی

لالہ بنسی دھر تھے تو ذات کے بنئے، اور وہ بھی کنسودھن جو بنیوں میں اونچی ذات نہیں سمجھی جاتی ہے۔ مگر اپنے اندازِ شرافت سے ہیموں بقال، ٹوڈرمل، بھارگو، سب کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ گھر کے اندر بیٹھ کر جو پوجا پاٹ کر لیتے ہوں مگر باہر آزاد خیال، آزادہ رو مشہور تھے۔ آج کل کی آزادہ روی نہیں کہ باتیں کرنے میں بدتمیزی تمغۂ خودداری سمجھا جائے۔ اور کھلم کھلا ہر چیز کھانا پینا نئی روشنی کی پہچان ٹھہرے۔ حسنِ خیال سے حسن پرست بھی واقع ہوئے تھے۔ اس لئے لکھنؤ کے چوک اور شہر کے پچھلے حصے سے جہاں قدیم کلچر کے نام لیوا اب بھی رہتے ہیں، زیادہ واقف تھے۔ لکھپتی مشہور تھے، گھر میں مہاجنی، عدالت دیوانی سے حد بندی ہوئی زمینداری سب ہی کچھ تھا مگر صحبت کے رسیا یقیناً ایسے تھے کہ باوجود مصروفیت کے ان جلسوں کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ چوک بھر کی خبر رکھتے تھے۔ جہاں کہیں جلسہ ہوا یا پرائیویٹ مجرا ہوا وہاں پہنچ ہی جاتے تھے اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ ان جلسوں میں حاشیہ نشین ہو کر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ مسند کا کونہ دبا کر بیٹھنے والوں میں شمار ہوتا تھا۔ جہاں کہیں اربابِ نشاط کے انتخاب کا سوال پیش ہوتا تھا وہاں ان کی رائے بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی۔ اور ایسے اہم معاملات میں جو خوش قسمت ان کا مشورہ حاصل کر سکتا وہ مطمئن ہو جاتا تھا کہ صورت، دن، سن اور فن کے لحاظ سے اب کوئی کسر نہیں رہ گئی۔ آدمی منکسر مزاج اور خدمت کرنے کا جذبہ رکھتے تھے، مگر جہاں سے دل کے معاملات شروع ہوتے تھے وہاں سے ان کی خودداری ان کو اجازت نہیں دیتی تھی کہ کسی دوسرے کے معاملات سے واسطہ رکھیں۔ تجربے نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جتنا بڑا دوست ہو یا کتنا ہی دولتمند ملاقاتی ہو، اگر ان پرائیویٹ معاملات میں یہ کسی کی مدد کریں گے تو ذلیل ہو جائیں گے۔ میرے پڑھنے والے کہتے ہوں گے کہ لکھنے والا سٹھیا گیا ہے۔ نہ معلوم کہاں کی دقیانوسی بداخلاقیوں اور بدتہذیبیوں کو پیش کر رہا ہے اور یہ بھی خیال نہیں کرتا کہ نوجوان لوگ پڑھ کر بے راہ ہو جائیں گے۔ چوک اور چوک بازاروں کا ذکر قانوناً ممنوع ہو جانا چاہیے۔ میں عرض کروں گا کہ کہیں ایسا کیجیے گا بھی نہیں، نہیں تو نہ معلوم کتنے ریسٹوران، کتنے ہوٹل، کتنے کافی ہاؤسیز، بلک کارزس پر قفل چڑھ جائیں گے اور نوجوانوں کو جو سبق فطرت پڑھا چکی ہے وہ تو بھولنے سے رہے لیکن زیب النسا کی طرح چلا اٹھیں گے کہ ؎

پاکبازیِ من باعثِ گناہِ من است

جس زمانے کی میں باتیں کر رہا ہوں اس وقت عید اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر باضابطہ محفلیں ہوتی تھیں جن میں

بچے، بوڑھے، جوان سب باضابطہ شریک ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہر ایک اپنی قدر پہچان کر برتاؤ کرتا تھا۔ کوئی خالی سَم پہ گردن ہلا دیتا تھا۔ کوئی "آں" بھی کہہ دیتا تھا۔ کوئی خالی واہ کرنا اپنا منصب سمجھتا تھا، کوئی موسیقی کے نکات بیان کر دیتا تھا اور بزرگ محفل خالی شگفتہ مزاجی چہرے سے ظاہر کرتا تھا اور ان ہی مواقع پر بعض نوجوانوں کی نگاہوں کا جائزہ لیتے ہوئے زبانِ حال سے کہتا تھا ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

لالہ بنسی دھر کے ایسے لوگ آرٹسٹ سے تہذیب کے ساتھ باتیں کر کے اس کا دل بھی بڑھاتے تھے۔

لیجئے صاحب، سارنگی پر لہرا شروع ہوا۔ یہ ناچ کی تصریحیں کرتے جاتے ہیں کہ سری کرشن کی لیلا ہے۔ سری کرشن جی بچپن میں گیند کھیل رہے تھے۔ گیند سمندر میں جا گرا۔ ناگ دیو نے منہ میں لے لیا۔ سری کرشن جی نے اس کو پھانس لیا ہے۔ سمندر میں جا کر اس کے منہ سے گیند لا رہے ہیں۔ ناچنے والی نے بایاں ہاتھ کاندھے کی سیدھ پر پورا لانبا کیا۔ دوسرا ہاتھ بھی کاندھے کی سیدھ پر رہا۔ مگر کہنی سے خم ہو کر پنجہ سینے کے سامنے آگیا۔ بائیں ہاتھ کے پنجے نے سانپ کا پھن ثابت کیا ہے۔ داہنے ہاتھ کی انگلیوں نے ٹھمکیاں دے کر یہ ظاہر کیا کہ جب سانپ پھنس گیا تو سری کرشن جی نے یوں ٹھمکیاں بتائیں۔ ناچنے والی پیش درپیش چال سے بتا رہی ہے کہ سانپ کی گنڈلیوں پر چڑھ کر سری کرشن یوں گیند سمندر سے لائے تھے۔ ہاتھ کا پنجا ماتھے کے سامنے آگیا۔ کلائی ماتھے سے چھو گئی۔ انگلیاں اُوپر کو اٹھی رہیں۔ ہتھیلی محفل کی طرف رہی۔ یہ کرشن جی کا مکٹ ہو گیا۔

اب مہادیو جی کا ناچ شروع ہوا۔ تیزی سے گھوم گھوم کر چاروں ہاتھوں سے دنیا بنا رہے ہیں۔ لالہ بنسی دھر اس طرح ارتھ بتلاتے ہیں کہ ہر توڑے، ہر پلٹے کے معنی آئینہ ہوتے جاتے تھے۔ اے لیجئے، پاربتی کے ناز و انداز شروع ہوئے۔ ہر پہلے اپنے کو بچاتی ہیں ؎

وہ کیا کرے کہ محبت کا مقتضا ہے یہی!
وگرنہ فائدہ اس کو مرے ستانے سے

لَے کی نزاکتوں، پَرن کی مشکل جگہوں کی داد الگ دیتے چلے جاتے ہیں کہ سننے والوں کا لطف دوگنا ہوتا جاتا ہے۔ لیجئے صاحب، اس کے بعد بھاؤ شروع ہوئے، وہ حنائی ناخنوں، ہونٹوں کی سُرخی اور آنکھوں کے لال ڈوروں کی طرف اشارہ کرتی ہے یہ مجبور کے خونِ دل کا پتہ دیتے ہیں کہ خوشی کی خبریں بھی یوں رنج میں لہو کے آنسو رُلاتی ہیں ؎

" اپنی بپتا میں کا سے کہوں
ترے کارن جو دکھ پاوا"

کے معنی اب آئینہ ہو گئے۔ اس نے انگوٹھے کی آرسی دیکھی، زرد دوپٹے کا آنچل ہاتھ پر لیا۔ کہ رنگ ایسا ہو گیا ہے۔ کلائی سے نیچے کر اِدھر اُدھر اُلٹے پلٹے دئے کہ رات کروٹیں بدلتے کٹی ہے۔ پچھتاوے کے انداز سے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھوڑی جمائی۔ اس ہاتھ کی ہتھیلی کہنی کے نیچے رکھ کر خیالی زانو قائم کیا۔ انھوں نے انترے کے معنی ہویدا کر دئے کہ " کدر پیا تری کھتا (خطا) ناہیں مورا کیا مورے آگے آوا" یوں ثابت کرتے ہیں خیال کو اور چوکھا بنانے کے لئے موقع کا شعر بھی پڑھ دیا۔

ذرا اٹھاؤ تو نظر اُداس کیوں ہو اس قدر!
یہ خشک لب، یہ چشمِ تر، یہ کیا نصیبِ دشمناں!

یہ حصہ تو لالہ بنسی دھر کا ہوا۔ اسی طرح بڑے چھوٹے صدر نشین، حاشیہ نشین، صفِ نعال والے سب مل کر کلچر کا معیار مضبوط کرتے ہیں، یہ نہیں کہ ہر موقع دعوتِ پردہ دری دے اور بے پردگی خلوت و جلوت کا فرق مٹا دے یہ تو باضابطہ مجلسوں کا حال ہوا۔ اب لالہ بنسی دھر کی پرائیویٹ تفریحوں کا حال سنیئے، دن کو بڑا چوکور زمرد ہاتھ میں پہنے رہتے تھے۔ شام کو جب سیر کے لئے نکلتے تھے تو انیس بیس کیرٹ کا ہیرا انگلی میں اضافہ ہوتا تھا۔ گلے میں سونے کی دو موٹی موٹی لڑیں ہوتی تھیں۔ عطر کے معاملہ میں ذری ٹکسالی گلاب کا قیمتی عطر ملتے تھے جس کی خوشبو سے نازک مزاجوں کو چھینکیں آنے لگتی تھیں۔ اتنی تمیز داری ضرور تھی کہ خس کا عطر صرف گرمیوں ہی میں لگاتے تھے۔ مگر اس کے آگے نفاست کا لحاظ کم رہ جاتا تھا۔ مثلاً کیوڑے کا عطر جو صرف آبدار خانے اور بھنڈی خانے میں کام آتا ہے سر کے تیل میں ڈال لیتے تھے۔ زنانہ مردانہ عطروں میں فرق نہیں کرتے تھے۔ پھولوں کے ہلکے عطر جیسے چنبیلی جاڑوں میں بھی لگا لیتے تھے۔ جاڑوں کے عطریات مصالحہ والے جیسے حنا شمامۃ العنبر گرمیوں میں استعمال کر جاتے تھے۔ محبوبوں کی نزاکتوں کا خبر کون ذکر جنھیں مختلف عطروں کا خیال ہو اور پھر بھی تمیز نہ ہو سکے کہ بھینی بھینی ہلکی ہلکی خوشبو جنت سے آئی یا اسی دُنیا میں پیدا ہوتی۔ جب بے فصل کی لپٹیں آتی تھیں تو نفیس مزاج اُمرا اٹھتے تھے کہ "بوئے کچوری می آید" مہاجن آدمی تھے اس لئے دل کے معاملات میں بھی حدود کے باہر پاؤں نہیں پڑتا تھا۔ ایک دن بے تکلفی میں کہنے لگے کہ سال میں ہم سب سے پہلے تو وہ پونجی نکال لیتے ہیں جو کاروبار میں لگائی تھی۔ اس کے بعد خانہ داری کے اخراجات الگ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد منافع میں سے جس قدر مناسب ہوا پونجی میں اضافہ کرتے ہیں۔ سب کے بعد کچھ روپیہ اپنے دل کی خوشی کے لئے علیحدہ کر لیتے ہیں۔ یہ روپیہ ہم بے دھڑک صرف کرتے ہیں اگر کوئی گومتی کے کنارے بیٹھ کر ہمارے ساتھ روپیہ پانی میں پھینکے اور یہ کھیل ہم کو پسند آ جائے تو ہم اس میں بھی مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن جب دل کی خوشی والا مال ختم ہو جائے گا تو ہم اٹھ کھڑے ہوں گے پھر دل اور دل کے افکار کو خدا حافظ۔

ایک دادرا ہے "دل ایکے سے لاگے ہجاروں (ہزاروں) کھرے" لالہ آدمی وسیع الاخلاق ہے اس لئے گو منظورِ نظر ایک ہی رہتی تھی۔ مگر خیر صلا سب کی پوچھ آتے ہیں۔ شام سے لے کر دس بجے تک۔ یہ "رات ہی بھر گو رہے لیکن گلوں میں ہم رہے": کا آوازہ بلند کیا کرتے تھے۔ کسی سے تکلف اور تہذیب کی ملاقات ہوتی تھی۔ کسی سے خلوص اور بے تکلفی تھی۔ بعض سے مذاق اور کنایوں کی چوٹیں چلتی تھیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ منچلی ایسی بھی ہوتی تھی جہاں غالب مرحوم یاد آ جاتے تھے ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

لالہ بنسی دھر تھوڑے سے فلاسفر بھی تھے۔ جب دوستانِ ناصح ان کے پاؤں کے سینچر اتارنے پر معترض ہو کر کہتے تھے کہ "یک در گیر و محکم گیر" خود کو پانی سے پتلا ہوا سے ہلکا نہ کریں اور ہر جگہ کی حاضر باشی سے باز آئیں تو یہ جواب دیتے تھے کہ جنسی تقاضے الگ چیز ہیں اور صنفِ نازک سے ہم کلامی اور ہم نشینی کی خواہش دوسری چیز ہے۔ لیکن جن ممالک میں پردہ ہوتا ہے وہاں آدمی طے نہیں کر سکتا کہ کس قدر تقاضا آدمی میں پہلی بات کا ہے اور کس قدر دوسری بات کا۔ اور انسان غلطی سے دوسرے تقاضے کو بھی

پہلا تقاضہ ہی سمجھا کرتا ہے۔ اگر ملک میں پردہ نہ ہو تو دوسرا تقاضہ پورا ہوا کرے اور پہلا اپنے حدود سے باہر نہ جائے۔ بات پتے کی کہتے تھے مگر نصیحت کرنے والوں کی عقل ان باریکیوں تک کہاں پہنچتی ہے ؎

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں   ناصح صاحب تو کچھ دوانے ہیں!

ناظرین لالہ بنسی دھر کی آوارہ گردی سے ان کی آبرو ریزی ہوئی۔ اور ہمارے ناصح کی "ح" گر گئی تو کوئی ہرج نہیں مطلب دونوں حالتوں میں نکل آیا۔

ایک دوست کے یہاں کوئی چھوٹی سی تقریب تھی۔ نظرات لالہ بنسی دھر کے متعلق نہ ہوتی تو کس کے ہوتی۔ سب سے بہتر گانے والی سب سے زیادہ شوخ طرار انتخاب کی گئی۔ جلسہ اور دعوت صرف ایک دن کی تھی۔ رات کا مجرا عام تھا۔ تقریب ختم ہو گئی۔ بھیرویں کا مجرا خاص تھا جس میں پانچ احباب تھے۔ اس سے بھی فرصت ہوئی۔ سازندے سلام کر کے باہر چلے گئے۔ نثر میں تغزل ہونے لگا۔ بڑی ستھری صحبت، بڑے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک سازندہ پریشان کمرے میں گھس آیا اور کہنے لگا کہ ایک کانسٹیبل نے ہم کو خدا واسطے کو ایک تھپڑ مارا ہے۔ عورت کی موجودگی کی وجہ سے جتنے تھے سب کے دل میں صرف ہمدردی ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا جوش پیدا ہوا مگر پڑھے لکھوں کا جلسہ تھا۔ پہلا جوش طرفۃ العین میں ختم ہو گیا۔ قانونی پہلو سب کے دل میں آیا کہ بغیر ہم لوگوں کا نام آئے کیا چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔ سب نے صاحبِ تقریب کا منہ دیکھا۔ رنڈی نے لالہ بنسی دھر کی طرف نظر کی۔ زبانِ حال سے کہنے لگی "ہمارا آدمی ذلیل کیا گیا ہے۔ اس کی تلافی کیا کی جائے گی۔ ہم صاحبِ تقریب کو کیا جانیں، ہم تو تمھارے بلائے سے یہاں آئے تھے۔ ہر چیز کے ذمہ دار تم ہو۔ اٹھو اور کانسٹیبل کو پھانسی پر چڑھا دو"۔ لالہ بنسی دھر نے سر نیچا کیا۔ ایک ذرا سے غور کے بعد نہایت سنجیدگی سے بہت نرم اور معاملہ فہمی کے لہجے میں سازندے سے مخاطب ہوئے:-

لالہ بنسی دھر: "جاؤ اس کانسٹیبل کے نام کا پتہ لگا آؤ"۔

رنڈی:- "آپ ہیں اچھے خاصے اُلو کے پٹھے۔ ہمارا تو آدمی مارا گیا۔ ہم ذلیل ہوئے اور تم بجائے اٹھ کر وہاں جانے کے نام کا پتہ لگاتے ہو"۔ گردن کو نیم حقارت نیم طنز کا جھٹکا دے کر "پتا۔ آ۔ آ۔ لگا آؤ"۔

لالہ بنسی دھر: "بی بی غصہ نہ کرو۔ ہماری بات سنو۔ غصے سے کام بگڑتے ہیں۔ سنورتے نہیں۔ ہمارے ایک برادر ہیں، انھوں نے فلاں دیہاتی رئیس کو قرضہ دیا۔ ان کا نام تم نے بھی سنا ہوگا۔ ان کی مونچھوں سے چنگاریاں اڑتی تھیں۔ بڑی دھاک بیٹھی تھی۔ پولیس ان کے دروازے جاتے ڈرتی تھی۔ نہ معلوم کتنے مقدمے فوجداری کے ان پر چلے، مگر روپے کا زور اور ان کا خوف ایسا تھا کہ ثبوت کے گواہ کبھی نہ ملے۔ پڑھے لکھوں میں نہ سہی مگر یوں سب پر ان کا رعب تھا۔ سینکڑوں بدمعاش ان کی نگاہ دیکھتے تھے۔ جو چاہا کر گذرے۔ جس کو چاہا پٹوا دیا۔ ہمارے برادر ان کے یہاں قرقی لے کر گئے۔ انھوں نے قرق امین کی خبر نقد سے لی اور ہمارے برادر کو صرف پٹوایا ہی نہیں بلکہ بری طرح ذلیل کیا مگر ہمارے برادر نے غصہ غضب بالکل نہیں کیا اور زیادہ تابعدار ہو گئے اور بے دھڑک قرضہ اس طرح دینا شروع کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ آج اس کے گھر کی نیو کا ٹکا کھدوا لیا۔ رئیس صاحب آج کوڑی کے نہیں، مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہ کانسٹیبل ٹکے کا آدمی کون چیز ہے بس نام معلوم ہو جائے ہم کل ہی سے دوستی کر کے سالے کو قرضہ دینا شروع کر دیں گے۔ تم اطمینان رکھو"۔

اپنے دُکھ مجھے دے دو

راجندر سنگھ بیدی

شادی کی رات بالکل وہ نہ ہوا جو مدن نے سوچا تھا۔

جب چکلی بھابی نے پھسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں دھکیل دیا اور اندو سامنے شالو میں لپٹی ہوئی اندھیرے کا بھاگ بنی جا رہی تھی۔ باہر چکلی بھابی، دریا باد والی پھوپھی اور دوسری عورتوں کی ہنسی، رات کے خاموش پانیوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھل رہی تھی۔ عورتیں سب یہی سمجھتی تھیں اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا کیونکہ جب اسے بیچ رات کے نیند سے جگایا گیا تو وہ ہڑبڑا رہا تھا۔

"کہاں، کہاں لیے جا رہی ہو مجھے؟"

ان عورتوں کے اپنے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا اس کی گونج تک ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود رس بس چکی تھیں اور اب اپنی ایک اور بہن کو بسانے پر تلی ہوئی تھیں۔ زمین کی یہ بیٹیاں مرد کو تو یوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہے جس کی طرف بارش کے لیے منہ اٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے، نہ برسے تو منتیں ماننی پڑتی ہیں، چڑھاوے چڑھانے پڑتے ہیں، جادو ٹونے کرنے پڑتے ہیں۔ حالانکہ مدن کالکاجی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ میں پڑا اسی وقت کا منتظر تھا۔ پھر شامت اعمال پڑوسی سبطے کی بھینس اس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوئی مدن کو سونگھ لیتی تھی اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کرتا ـــــ ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لہروں اور عورت کے خون کو راستہ بتانے والا چاند، ایک کھڑکی کے راستے سے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے۔ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے جسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی۔ کچھ دیر یونہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تاکہ دلہن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹک گیا۔ تبھی اس نے سوچا ـــ اندو میری بیوی ہے، کوئی پرائی عورت تو نہیں جسے نہ چھونے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں ـــ شالو میں لپٹی ہوئی دلہن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، وہاں اندو کا منہ ہوگا اور جب ہاتھ بڑھا کر اس نے پاس پڑی گٹھڑی کو چھوا تو وہیں اندو کا منہ تھا.... مدن نے سوچا تھا وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی لیکن اندو نے ایسا کچھ نہ کیا جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو اور کسی خیالی بھینس کے سونگھتے رہنے سے اسے بھی نیند نہ آ رہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب اندھیرے کے باوجود سامنے پھڑپھڑاتا ابھرا

نظر آ رہا تھا ٹھوڑی تک پہنچتے ہوئے عام طور پر چہرہ لمبوترا ہو جاتا ہے لیکن یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لیے چاندنی کی طرف گال اور ہونٹوں کے بیچ ایک سایہ دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی جیسی دو سرسبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا لیکن اس پر سے ایکا ایکی اٹھنے والے گھنگھریالے بال ——

جبھی اندو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لیے نہیں۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے یونہی سی ہوں ہاں کرتے ہوئے دلہن کا چہرہ پھر سے اوپر کو اٹھا دیا اور شرابی سی آواز میں کہا۔

"اندو!"

اندو کچھ ڈر سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز سے پکارا تھا اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس اکیلی بے یار و مددگار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ اندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور صرف اتنا سا کہا "جی!" اسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا اور پھر ہولے ہولے بات چل نکلی، اب جو چلی سو چلی وہ تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کی ماں، اندو کے بھائی، مدن کے بھائی بہن، باپ، ان کی ریلوے میل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت، سبھی کچھ کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت کو توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا لیکن اندو طرح دے جاتی تھی۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا جو اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے سے چلتی بنی تھی۔ "جتنی دیر زندہ رہی بے چاری،" مدن نے کہا، "بابو جی کے ہاتھ میں دوائی کی شیشیاں رہیں۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بل پر سوتے رہے اور آخر ایک دن —— ۲۸ مارچ کی شام ——" اور مدن چپ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ رونے سے ذرا ادھر اور گھگھی سے ذرا ادھر پہنچ گیا۔ اندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پل بھر میں اندو کو بھی اپنے پن سے ادھر اور بیگانے پن سے ادھر پہنچا دیا تھا...... مدن اندو کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا لیکن اندو نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا "میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں جی —— پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابیاں دیکھی ہیں، بیسیوں اور لوگ دیکھے ہیں اس لیے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں...... میں اب تمہاری ہوں —— اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔"

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری اور کچھ دریا دلی کے ملے جلے شبدوں میں کہا۔ "کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہو گی میں دوں گا۔"

"پکی بات؟" اندو بولی۔

مدن نے کچھ اتاولے ہو کر کہا "ہاں ہاں —— کہا جو پکی بات۔"

لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا —— میرا کاروبار پہلے ہی مندا ہے اگر اندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ ہی سے باہر ہو تو پھر کیا ہوگا؟ لیکن اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں میں سمیٹتے اور ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے دکھ مجھے دے دو!"

مدن سخت حیران ہوا۔ ساتھ ہی اسے اپنے آپ سے ایک بوجھ بھی اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پھر چاندنی میں ایک بار اندو کا چہرہ

دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اس نے سوچا یہ ماں یا کسی سہیلی کا رٹا ہوا فقرہ ہوگا جو اندو نے کہہ دیا۔ جبھی ایک جلتا ہوا آنسو مدن کے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا "دیے ——!" لیکن ان سب باتوں نے مدن سے اس کی بہیمیت چھین لی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔ چکلی بھابی دو بچوں کو انگلیوں سے لگائے، سیڑھیوں کی اونچ نیچ سے تیسرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔ دریاباد والی پھوپھی جو اپنے "نو لکھے" ہار کے گم ہو جانے پر شور مچاتی، واویلا کرتی ہوئی بے ہوش ہو گئی تھی اور جو غسل خانے میں پڑا مل گیا تھا، جہیز میں سے اپنے حصے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر چاچا گئے جن کو ان کے جے پی ہونے کی خبر تار کے ذریعے ملی تھی اور جو شاید بدحواسی میں مدن کی بجائے دلہن کا منہ چومنے چلے تھے۔

گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی۔ چھوٹی دلاری تو ہر وقت بھابی کی بغل ہی میں گھسی رہتی۔ گلی محلے کی کوئی عورت دلہن کو دیکھے یا نہ دیکھے، دیکھے تو کتنی دیر تک دیکھے، یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور اندو آہستہ آہستہ پرانی ہونے لگی۔ لیکن کالکاجی کی اس نئی آبادی کے لوگ اب بھی آتے جاتے مدن نواس کے سامنے رک جاتے اور کسی بھی بہانے سے اندر چلے آتے۔ اندو انھیں دیکھتے ہی ایک دم گھونگھٹ کھینچ لیتی لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں انھیں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا گھونگھٹ کے دکھائی ہی نہ دے سکتا تھا۔

مدن کا کاروبار گندے بروزے کا تھا۔ کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں میں چیڑ اور دیودار کے پیڑوں کو جنگل کی آگ نے آ لیا تھا اور وہ دھڑ دھڑ جلتے ہوئے خاک سیاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میسور اور آسام کی طرف سے منگوایا ہوا بروزہ مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اسے مہنگے داموں خریدنے کو تیار نہ تھے۔ ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی اس پہ مدن جلدی ہی دکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا۔ گھر پہنچ کر اس کی ساری کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پئیں اور اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں۔ جبھی وہ کھاتے وقت خود تھالیاں اٹھا اٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا چکنے کے بعد جھوٹے برتنوں کو سمیٹ کر نل کے نیچے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے بہو —— بھابی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا ہے اور اب وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ مدن سب سے بڑا تھا، کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا۔ جب کندن بھابی کے سواگت میں سب کے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام وہیں ڈانٹ دیتا —— "کھاؤ تم ——" وہ کہتا "وہ بھی کھا لیں گے۔" اور پھر رسوئی میں ادھر ادھر دیکھنے لگتا اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی تو بابو دھنی رام اسے روکتے ہوئے کہتے "رہنے دے بہو، برتن صبح ہو جائیں گے۔"

اندو کہتی "نہیں بابو جی —— میں ابھی کیے دیتی ہوں جھپاکے سے۔"

تب بابو دھنی رام ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہتے "مدن کی ماں ہوتی بہو، تو یہ سب تمھیں کرنے دیتی؟"…… اور اندو ایکدم اپنے ہاتھ روک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھابی سے شرماتا تھا۔ اس خیال سے کہ دلہن کی گود جھٹ سے ہری ہو، چکلی بھابی اور دریاباد والی پھوپھی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو اندو کی گود میں ڈالا تھا، جب سے اندو اسے نہ صرف دیور بلکہ اپنا بچہ سمجھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ پیار سے پاشی کو بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتی تو وہ گھبرا اٹھتا اور اپنا آپ چھڑا کر دو ہاتھ کی دوری پر کھڑا ہو جاتا، دیکھتا اور ہنستا رہتا، پاس آتا نہ دور ہٹتا۔ ایک عجیب اتفاق سے

ایسے میں بابوجی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے اور پاشی کو ڈانٹتے ہوئے کہتے: "ارے جا! ——— بھابی پیار کرتی ہے، ابھی سے مرد ہو گیا ہے تو؟"

.... اور دلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی۔ اس کے "میں تو بھابی کے ساتھ ہی سوؤں گی" کے اصرار نے بابوجی کے اندر کوئی جبار دھن جگا دیا تھا ایک رات اسی بات پر دلاری کو زور سے چپت پڑی اور وہ گھر کی آدھی کچی آدھی پکی نالی میں جا گری۔ اندو نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر پر سے دوپٹہ اڑ گیا۔ بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سیندور، کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔ "بابوجی!" اندو نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

...... ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اور سر پر دوپٹہ اوڑھنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس بے ماں کی بچی کو چھاتی کے ساتھ لگائے ہوئے اندو نے اسے ایک ایسے بستر میں سلا دیا جہاں سرہانے ہی سرہانے، تکیے ہی تکیے تھے۔ نہ کہیں پائنتی تھی نہ کاٹھ کے بازو، چوٹ تو ایک طرف کہیں کوئی چبھنے والی چیز بھی نہ تھی۔ پھر اندو کی انگلیاں دلاری کے پھوڑے ایسے سر پر چلتی ہوئی اسے دکھا بھی رہی تھیں اور مزا بھی دے رہی تھیں۔ دلاری کے گالوں پر بڑے بڑے اور پیارے پیارے گڑھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا

"ہائے ری منی! تیری ساس مرے۔ کیسے گڑھے پڑ رہے ہیں گالوں پر ———!"

منی نے منی کی طرح کہا: "گڑھے تمہارے بھی تو پڑتے ہیں بھابی۔"

"ہاں منو!" اندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

مدن کو کسی بات پر غصہ تھا، وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سن رہا تھا، بولا: "میں تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔"

"کیوں اچھا کیوں ہے؟" اندو نے پوچھا۔

"ہاں ——— نہ اُگے بانس نہ بجے بانسری .... ساس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا۔"

اندو نے ایکا ایکی خفا ہوتے ہوئے کہا: "تم جاؤ جی، سو رہو جا کے ...... بڑے آئے ہو ...... آدمی جیتا ہے تو لڑتا ہے نا؟ مرگھٹ کی چپ چاپ سے جھگڑے بھلے۔ جاؤ نا، رسوئی میں تمہارا کیا کام؟"

مدن کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ بابو دھنی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی سے اپنے اپنے بستروں میں یوں جا پڑے تھے جیسے دفتر میں چھٹیاں سارٹ ہوتی ہیں لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ احتیاج نے اسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا لیکن اس وقت جب اندو نے بھی اسے ڈانٹ دیا تو وہ روہانسا ہو کر اندر چلا گیا۔

دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا لیکن بابوجی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو گئی جب منی کو سلانے کے لیے اندو کی لوری سنائی دی: "تو آ نندیا رانی، بورائی مستانی۔"

وہی لوری جو دلاری منی کو سلا رہی تھی، مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بیزار ہو کر اس نے زور سے چادر سر پر کھینچ لی۔ سفید چادر کے سر پر لینے اور سانس کے بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک مُردے کا تصور پیدا ہو گیا۔ مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اس کی دلہن، اندو اس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے، دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کر چوڑیاں توڑ رہی ہے اور پھر گرتی پڑتی روتی چلاتی رسوئی میں جاتی ہے اور چولھے کی راکھ سر پر ڈال لیتی ہے، پھر باہر لپک جاتی ہے اور باہیں اٹھا اٹھا کر گلی محلے کے لوگوں سے فریاد کرتی ہے: "لوگو! میں لٹ گئی۔" اب اسے دوپٹے کی پروا نہیں، قمیص کی پروا نہیں، مانگ کا سیندور، بالوں کے پھول اور چڑیاں جذبات اور خیالات کے طوطے تک اڑ چکے ہیں ———

مدن کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے حالانکہ رسوئی میں اندو ہنس رہی تھی۔ پل بھر میں اپنے سہاگ کے اُجڑنے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب حقائق کی دنیا میں آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ادھر اندو ہنس تو رہی تھی لیکن اس کی ہنسی دبی دبی تھی۔ بابوجی کے خیال سے وہ کبھی اونچی آواز میں نہ ہنستی تھی جیسے کھلکھلاہٹ کوئی ننگا پن ہے، خاموشی دوپٹہ اور دبی دبی ہنسی ایک گھونگھٹ۔ پھر مدن نے اندو کا ایک خیالی بُت بنایا اور اس سے بیسیوں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اس سے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ پھر اپنی دنیا میں لوٹا جس میں ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی ——— اندو! اور پھر چپ ہو گیا۔ اس اندھیرے میں وہ بورائی مستانی نہ پا اس سے بھی لپٹ گئی ——— ایک اونگھ سی آئی لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رات والی، پڑوسی سبطے کی بھینس منہ کے پاس پھنکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اٹھا، پھر رسوئی کی طرف دیکھتے، سر کو کھجاتے دو تین جمائیاں لے کر لیٹ گیا ——— سو گیا ۔ ۔ ۔

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسہ دے کر سویا تھا۔ جب اندو کی چوڑیاں بستر کی سلوٹیں سیدھی کرنے کے لیے کھنک اٹھیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم جاگنے میں محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی کروٹوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے اور ایکا ایکی اٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندر کی آگ سے پھنک رہا تھا اور یہی اس کے غصے کا کارن بن گیا جب اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"سو ——— تم آ گئیں؟"

"ہاں!"

"منی ——— سو مر گئی؟"

اندو جھکی جھکی ایک دم سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "ہائے رام!" اس نے ناک پر انگلی رکھتے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو ... مرے کیوں بے چاری، ماں باپ کی ایک ہی بیٹی۔"

"ہاں ———!" مدن نے کہا۔ "بھابی کی ایک ہی نند۔" اور پھر ایک دم تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "زیادہ منہ مت لگاؤ اس چڑیل کو۔"

"کیوں اس میں کیا پاپ ہے؟"

"یہی پاپ ہے۔" مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا۔ "وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تمھارا۔ جب دیکھو جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے دفان ہی نہیں ہوتی۔"

"ہا ———" اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بہنوں اور بیٹیوں کو یوں تو دھتکارنا نہیں چاہیے۔ بے چاری دو دن کی مہمان۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں ایک دن چل ہی دے گی۔" اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں، باپ، بھائی بہن، چچا تایا سبھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دلاری تھی جو پلک جھپکتے ہی نیاری ہو گئی اور پھر دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں، جیسے گھر میں کوئی بڑی سی بانبی ہے جس میں کوئی ناگن رہتی ہے اور جب تک وہ پکڑ کر پھنکوائی نہیں جاتی گھر کے لوگ آرام کی نیند سو نہیں سکتے۔ دور دور سے کیلنے والے، نتھن کرنے والے، دانت پھوڑنے والے ماندری بلوائے گئے

بڑے بڑے دھنونتری اور موتی ساگر ——— آخر ایک دن اُتر پچھم کی طرف سے لال آندھی آئی جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی جس میں گہرے کناری میں لپٹی ہوئی ایک دلہن بیٹھی تھی، پیچھے گھر میں، ایک سُر پر بجتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی..........

مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہا ——— "تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو۔ ابھی کل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمھیں ہم سے زیادہ پیارے لگنے لگے؟"

"ہاں!" اندو نے اثبات سے کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے .... یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تمھارا مطلب ہے میں ———"

"دکھاوا ہے یہ سب ——— ہاں!"

"اچھا جی؟" اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب دکھاوا ہے میرا؟" اور اندو اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور سرہانے میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ مدن اسے منانے ہی والا تھا کہ اندو خود ہی اٹھ کر مدن کے پاس آ گئی اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی: "تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے رہتے ہو ——— ہوا کیا ہے تمھیں؟" .... شوہرانہ رعب داب کے لیے مدن کے ہاتھ بہانہ آ گیا۔ "جاؤ جاؤ ——— سو جاؤ جا کے۔" مدن نے کہا۔ "مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔"

"تمھیں کچھ نہیں لینا، مجھے تو لینا ہے۔" اندو بولی۔ "زندگی بھر لینا ہے۔" اور وہ چھینا جھپٹی کرنے لگی۔ مدن اسے دھتکارتا تھا اور وہ اس سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کی بجائے آبشار کے تیز دھارے کو کاٹتی ہوئی اوپر ہی اوپر پہنچنا چاہتی ہو۔ چٹکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی ———

"پھر مجھے 'پھاپھا کٹنی' کہو گے؟"

"وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں۔"

"ٹھہرو ——— تمھاری تو ———" یوں معلوم ہوا جیسے اندو کوئی گالی دینے والی ہو ——— اور اس نے منہ میں کچھ منمنایا بھی۔ مدن نے مڑتے ہوئے کہا۔ "کیا کہا؟" اور اندو نے اب کے سنائی دینے والی آواز میں دہرا دیا۔ مدن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اگلے ہی لمحے میں اندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی۔ "تم مرد لوگ کیا جانو؟ ——— جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی عزیز پیارے معلوم ہوتے ہیں، کیا باپ، کیا بھائی اور کیا بہن ———" اور پھر ایکا ایکی کہیں دور دیکھتی ہوئی بولی۔ "میں تو دُلاری منی کا بیاہ کروں گی۔"

"حد ہو گئی۔" مدن نے کہا۔ "ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی بھی سوچنے لگیں۔"

"تمھیں ایک ہاتھ کی دِکھتی ہے نا؟" اندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی۔ "ذرا آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو ———" مدن نے سچ مچ ہی آنکھیں بند کر لیں اور جب کچھ دیر تک نہ کھولیں تو اندو بولی۔ "اب کھولو بھی .... اتنی دیر میں تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔" تبھی مدن نے آنکھیں کھول دیں۔ لمحہ بھر کے لیے اسے یوں لگا جیسے سامنے اندو نہیں منی بیٹھی ہے، اور وہ کھو سا گیا ———

"میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برتن الگ کر ڈالے ہیں اس کے لیے۔" اندو نے کہا اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "تم کیوں پریشان ہوتے ہو...... یاد نہیں اپنا وچن؟ —— تم اپنے دکھ مجھے دے چکے ہو۔"

"ایں؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر سا ہو گیا لیکن اب کے جب اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہاں ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا ساتھ ایک روح بھی شامل ہو گئی تھی.........

مدن کے لیے اندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا —— ایک پردہ تھا، خواب کے تاروں سے بنا ہوا، آہوں کے دھوئیں سے رنگین، قہقہوں کی زرتاری سے چکاچوند جو ہر وقت اندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہوں اور اس کے ہاتھوں کے دوشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرفِ عام میں بیوی کہلاتی ہے لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز کپڑا ننگا پن ڈھانپنے کے لیے ملتا آیا تھا۔ دوشاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گرے پڑے تھے لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھی، عزت اور پاکیزگی کی سفید ساری میں ملبوس وہ دیوی لگ رہی تھی اور ——

مدن کے لوٹتے ہوئے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوتے جسے سکھانے کے لیے وہ انھیں اوپر ہوا میں اٹھا دیتا اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پورے طور پر پھیلاتا ہوا، ایک تشنج کی کیفیت میں اپنی آنکھوں کی پھیلتی سمٹتی ہوئی پتلیوں کے سامنے رکھ دیتا اور پھر انگلیوں کے بیچ میں سے جھانکتا —— اندو کا مرمریں جسم، خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لیے پاس، ابتذال کے لیے دور...... کبھی جب اندو کی ناکہ بندی ہو جاتی تو اس قسم کے فقرے ہوتے ——

"اے جی! گھر میں چھوٹے بڑے سبھی ہیں، وہ کیا کہیں گے؟"

مدن کہتا "چھوٹے سمجھتے نہیں —— بڑے انجان بن جاتے ہیں۔"

اسی دوران میں بابو دھنی رام کی تبدیلی سہارنپور ہو گئی۔ وہاں وہ ریلوے میل سروس میں سلیکشن گریڈ کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کنبے رہ سکتے تھے لیکن بابو دھنی رام اس میں اکیلے ہی ٹانگیں پھیلائے پڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علیحدہ نہیں ہوئے تھے۔ بہت گھریلو قسم کے آدمی، آخری زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا کر دی لیکن مجبوری تھی، بچے سب دلی میں مدن اور اندو کے پاس تھے اور وہیں اسکولوں میں پڑھتے تھے، سال کے خاتمے سے پہلے انھیں بیچ میں سے اٹھانا ان کی پڑھائی کے لیے اچھا نہ تھا۔ بابو جی کو دل کے دورے پڑنے لگے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اندو کو کندن، پاشی اور دلاری کے ساتھ سہارنپور بھیج دیا —— دھنی رام کی دنیا چہک اٹھی۔ کہاں انھیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے، بچوں ہی کی طرح، جہاں کپڑے اتارتے وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابو جی انھیں سمیٹتے پھرتے۔ اپنے مدن سے دور، السائی ہوئی رتی، اندو تو اپنے پہناوے تک سے غافل ہو گئی تھی۔ وہ

رسوئی میں یوں پھرتی تھی جیسے کوئی ہاؤس میں گائے' باہر کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہے۔ کام وام کرنے کے بعد وہ کبھی اندر ٹرنکوں پر لیٹ جاتی کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ تلے جو آنگن میں کھڑا سینکڑوں ہزاروں دنوں کو تھامے ہوئے تھا ـــــ

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کھلتا تو کنواریاں، نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں ـــ جھولا کن سنے ڈارو رے امریاں ـــــ اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو جھولتیں اور دو جھلاتیں اور کہیں چار مل جاتیں تو کھل کھلیاں ہو جاتیں ساوتیہ عمر کی بوڑھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں۔ اندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ بھی ان میں شامل ہو گئی ہے۔ تبھی وہ منہ پھیر لیتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی سو جاتی۔ بابو جی پاس سے گزرتے تو اسے جگانے اٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے بلکہ موقع پا کر اس کی شلوار کو جو بہو دھوبن سے بدل آتی اور جسے وہ ہمیشہ اپنی ساس والے پرانے سندل کے صندوق پر پھینک دیتی' اٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتے۔ ایسے میں انھیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر ٹانگنے بھی نہ پاتے کہ نیچے دانے میں نگاہ بہو کے موہوم پر جا پڑتی۔ تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ یوں شتابی کمرے سے نکل بھاگتے جیسے سانپ کا بچہ بل سے باہر آ گیا ہو۔ پھر برآمدے میں ان کی آواز سنائی دینے لگتی ـــ اوم نمو بھگوتے واسودیوا ـــــ

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بابو جی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک پہنچا دی تھیں۔ جب کوئی عورت بابو جی کے سامنے بہو کے پیارے پن اور سڈول جسم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے "ہم تو دھنیہ ہو گئے' امی چند کی ماں! شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا۔" اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دور پہنچ جاتیں جہاں دق کے عارضے تھے' دوائی کی شیشیاں، اسپتالوں کی سیڑھیاں یا بچھونوں کے بل۔ نگاہ قریب آتی تو انھیں موٹے موٹے گدرائے ہوئے جسم والے کئی ننھے بچے بغل میں' جانگھ پر' گردن پر چڑھتے اترتے ہوئے محسوس ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آ رہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کولھے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جا رہی ہے اور ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا' سبھی ایک سے ـــ جڑواں ـــ توام..... اوم نمو بھگوتے ـــ

آس پاس کے لوگ سب جان گئے تھے اندو بابو جی کی چہیتی بہو ہے۔ چنانچہ دودھوا اور رچھپال کے کھٹکے دھنی رام کے گھر آنے لگے اور پھر ایک دم سلام دین کوجڑے نے فرمائش کر دی۔ اندو سے کہا "بی بی! میرا بیٹا آر۔ ایم۔ ایس میں قلی رکھوا دو' اللہ تم کو اجر دے گا۔" اندو کے اشارے کی دیر تھی کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہو گیا' وہ بھی سارٹر، جو نہ ہو سکا اس کی قسمت' آسامیاں ہی زیادہ نہ تھیں۔

بہو کے کھانے پینے اور اس کی صحت کا بابو جی خاص خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اندو کو چڑ تھی۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کو باٹی میں پھینٹ' گلاس میں ڈال' بہو کو پلانے کے لیے اس کی کھٹیا کے پاس آ جاتے۔ اندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی "نہیں بابو جی! مجھ سے نہیں پیا جاتا۔"

"تیرا تو سسر بھی پیے گا۔" وہ مذاق سے کہتے۔

"تو پھر آپ ہی پی لیجئے نا۔" اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی اور بابو جی ایک مصنوعی غصے سے برس پڑتے "تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی؟"

"ہوں ـــ ہوں ـــ" اندو لاڈ سے روٹھنے لگتی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنھیں منانے والا کوئی نہ ہو۔ یہاں تو منانے والے سب تھے' روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اندو بابو جی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے ـــ "اور یہ پڑا ہے ـــ تیری مرضی ہے پی ـــ نہیں مرضی تو نہ پی ـــ" کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پر پہنچ کر دھنی رام دُلاری مُنی کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ دلاری کی بابوجی کے ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور پیٹ پر منہ رکھ کر پھکڑا پھلانے کی عادت تھی۔ آج جب بابوجی اور منی یہ کھیل کھیل رہے تھے، ہنس ہنسا رہے تھے تو منی نے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "دودھ تو کھراب ہو جائے گا بوجی —— بھابی تو پیتی ہی نہیں۔"

"پیئے گی، ضرور پیئے گی بٹیا ——" بابوجی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو لپٹاتے ہوئے کہا: "عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔"

ابھی یہ فقرہ بابوجی کے منہ ہی میں ہوتا کہ ایک طرف سے "ہش —— بے خصم کھانی" کی آواز آنے لگتی۔ پتہ چلتا بہو بلی کو بھگا رہی ہے اور پھر کوئی غٹ غٹ سی سنائی دیتی اور سب جان لیتے بہو —— بھابی نے دودھ پی لیا۔ کچھ دیر کے بعد کندن بابوجی کے پاس آتا اور کہتا۔

"بوجی —— بھابی رو رہی ہے۔"

"ہائیں؟" بابوجی کہتے اور پھر اٹھ کر اندھیرے میں دور اسی طرف دیکھنے لگتے جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ سمجھتے ہوئے کندن سے کہتے: "جا —— تو سو جا —— وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ۔"

اور پھر سے لیٹتے ہوئے بابو دھنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے اور اپنے من کے بھگوان سے پوچھتے —— "چاندی کے ان کھلتے بند ہوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے؟" اور پھر پورا آسمان انھیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا اور کانوں میں ایک مسلسل ہاؤ ہو کی آواز سنائی دیتی جسے سنتے ہوئے وہ کہتے "جب سے دنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!" —— اور وہ روتے روتے سو جاتے۔

اندو کے جانے کے بیس پچیس روز ہی میں مدن نے واویلا شروع کر دیا۔ اس نے لکھا۔ میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے قبض ہو گئی ہے۔ گردے کا درد شروع ہو گیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹی کی عرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھیج دیتے ہیں، مدن نے بابوجی کے ایک دوست سے تصدیقی چٹھی لکھوا بھیجی۔ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈبل تار —— جوابی ——

جوابی تار کے پیسے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اندو اور بچے لوٹ آئے تھے۔ مدن نے اندو سے دو دن سیدھے منہ بات ہی نہ کی۔ یہ دکھ بھی اندو ہی کا تھا۔ ایک دن مدن کو اکیلے میں پا کر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی "اتنا منہ پھلائے بیٹھے ہو —— میں نے کیا کیا ہے؟"

مدن نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا "چھوڑ —— دور ہو جا میری آنکھوں سے —— کمینی ——"

"یہی کہنے کے لیے اتنی دور سے بلوایا ہے؟"

"ہاں!"

"ہٹاؤ اب۔"

"خبردار —— یہ سب تمھارا ہی کیا دھرا ہے۔ تم جو آنا چاہتیں تو کیا بابوجی روک لیتے؟"

اندو نے بے بسی سے کہا "ہائے جی —— تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا انھیں کیسے کہہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو تو تم نے مجھے

بلوا کر باپوجی پہ بڑا ظلم کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں —— ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچوں میں۔"

"اور میرا جی؟"

"تمہارا جی؟ —— تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔" اندو نے شرارت سے کہا اور کچھ اس طرح سے مدن کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو گئیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے سے بہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اندو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "باپوجی تم سے بہت خوش لگتے؟"

"ہاں!" اندو بولی۔ "ایک دن میں جاگی تو دیکھا سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"اپنی قسم!"

"اپنی قسم نہیں —— میری قسم کھاؤ۔"

"تمہاری قسم تو میں نہیں کھاتی —— کوئی کچھ بھی دے۔"

"ہاں!" مدن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں۔"

"سیکس!" اندو نے پوچھا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے۔"

"ہائے رام!" اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "گندے کہیں کے —— شرم نہیں آتی باپوجی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟"

"تو باپوجی کو شرم نہ آئی تجھے یوں دیکھتے ہوئے؟"

"کیوں؟" اندو نے باپوجی کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔"

"کیوں نہیں۔ جب بہو تم ایسی ہو۔"

"تمہارا من گندا ہے۔" اندو نے نفرت سے کہا۔ "اسی لیے تمہارا کاروبار بھی گندے بروجے کا ہے۔ تمہاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں۔ تمہیں اور تمہاری کتابوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے تو جب میں بڑی ہو گئی تھی تو میرے پتاجی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا وہ بھی ...... وہ تھا لگڑا —— جس کا تم ابھی نام لے رہے تھے۔" اور پھر اندو بولی۔ "باپوجی کو یہاں بلا لو۔ ان کا وہاں جی بھی نہیں لگتا۔ وہ دکھی ہوں گے تو کیا تم دکھی نہیں ہو گے؟"

مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا۔ گھر میں ماں کی موت نے بڑا ہونے کے کارن سب سے زیادہ اثر مدن ہی پر کیا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ ماں کے بیمار رہنے کے باعث جب بھی اس کی موت کا خیال مدن کے دل میں آتا تو وہ آنکھیں موند کر پرارتھنا شروع کر دیتا —— اوم نمو بھگوتے واسودیوا۔ اوم نمو...... اب وہ نہیں چاہتا تھا باپ کی چھتر چھایا بھی سر سے اٹھ جائے۔ خاص طور پر

ایسے میں جبکہ وہ اپنے کاروبار کو بھی جما نہیں پایا تھا۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اندو سے صرف اتنا کہا "ابھی رہنے دو بابوجی کو۔ شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار آزادی کے ساتھ مل سکے ہیں۔"

تیسرے چوتھے روز بابوجی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ میرے پیارے مدن کے تخاطب میں میرے پیارے کے الفاظ شور پانیوں میں دُھل گئے تھے۔ لکھا تھا "بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن لوٹ آئے تھے۔ تمھاری ماں کے دن، جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی الھڑ تھی۔ ایسے ہی اتارے ہوئے کپڑے اِدھر اُدھر پھینک دیتی اور پتاجی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندل کا صندوق، وہی جیبیں خلجگن، میں بازار جا رہا ہوں، آ رہا ہوں، کچھ نہیں تو دہی بڑے یا ربڑی لا رہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ جگہ جہاں صندل کا صندوق پڑا تھا، خالی ہے ......" اور پھر ایک آدھ سطر اور دُھل گئی تھی۔ آخر میں لکھا تھا "دفتر سے لوٹتے سمے، یہاں کے بڑے بڑے اندھیرے کمروں میں داخل ہوتے ہوئے میرے من میں ایک ہول سا اٹھتا ہے ......" اور پھر ——— "بہو کا خیال رکھنا، اسے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا۔"

اندو نے دونوں ہاتھوں سے چٹھی پکڑ لی، سانس کھینچی۔ آنکھیں پھیلائی، شرم سے پانی پانی ہوتی ہوئی بولی ——— "میں مر گئی۔ بابوجی کو کیسے پتہ چل گیا؟"

مدن نے چٹھی چھڑاتے ہوئے کہا "بابوجی کیا بچے ہیں؟ ——— دنیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے۔"

"ہاں مگر" اندو بولی "ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں؟"

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی شروع نہیں کیا تھا اور پھر جیسے بابوجی یا کوئی اور دیکھ رہا ہو اس نے ساری کا پلو اس پر کھینچ لیا اور کچھ سوچنے لگی۔ جبھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی ——— "تمھاری سسرال سے شیرینی آئے گی۔"

"میری سسرال؟ ——— او ہاں!" مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا "کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھ آٹھ مہینے شادی کو ہوئے ہیں اور چلا آیا ہے۔" اور اس نے اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"چلا آیا ہے یا تم لائے ہو؟"

"تم ——— یہ سب قصور تمھارا ہے۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"تمھیں پسند نہیں؟"

"ایک دم نہیں۔"

"کیوں؟"

"چار دن تو مزے لے لیتے زندگی کے۔"

"کیا یہ زندگی کا مزا نہیں؟" اندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا "مرد عورت شادی کس لیے کرتے ہیں؟ بھگوان نے بن مانگے دیا نا؟ پوچھو ان سے جن کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں؟ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سمادھیوں، مزاروں پہ چوٹیاں باندھتی، شرم حیا کو تج کر دریاؤں کے کنارے ننگی ہو کر سرکنڈے کاٹتی، شمشانوں میں مسان جگاتی ———"

"اچھا اچھا" مدن بولا "تم نے بھاشن ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لیے تو عمر پڑی تھی؟"

"ہوگا تو!" اندو نے سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔ وہ تمھارا نہیں میرا ہوگا تو اس کی جرورت نہیں پر اس کے دادا کو بہت ہے، یہ میں جانتی ہوں۔"

اور پھر کچھ خجل، کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس ننھی سی جان کو پا لینے کے اس جان کا ہونا سونا تھوڑی بہت ہمدردی تو کرے گا ہی لیکن مدن چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی اس نے منہ سے نہ نکالا۔ اندو نے چہرے ہاتھ اٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوٹھن کے خاص انداز میں بولی "وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب ٹھیک ہوگا۔ پہلے تو میں بچوں نہیں . . . . . . مجھے بچپن ہی سے وہم ہے اس بات کا۔"

مدن بھی جیسے خائف ہو گیا ——— یہ خوبصورت "چیز" جو حاملہ ہونے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے، مر جائے گی؟ اس پیٹھ کی طرف سے اندو کو تھام لیا اور پھر کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا اور بولا "تجھے کچھ نہ ہوگا اندو . . . . . . میں تو موت کے منہ سے لے آؤں گا تجھے ——— اب ساوتری کی نہیں، ستیہ وان کی باری ہے ———"

مدن سے لپٹ کر اندو بھول ہی گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے . . . . . .

اس کے بعد بابوجی نے کچھ نہ لکھا البتہ سہارنپور سے ایک سارٹر آیا جس نے صرف اتنا بتایا کہ بابوجی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ایک دورے میں تو وہ قریب قریب چل ہی بسے تھے۔ مدن ڈر گیا، اندو رونے لگی۔ سارٹر کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ کی طرح، نے آنکھیں موند لیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا ——— اوم نمو بھگوتے . . . .

دوسرے ہی روز مدن نے باپ کو چٹھی لکھی ——— "بابوجی! چلے آؤ . . . . . . بچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی ——— لیکن آخر نوکری تھی۔ اپنے بس کی بات تھوڑی تھی۔ دھنی رام کے خط کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے . . . . . . ان کے بارے میں مدن کا احساسِ جرم بڑھنے لگا "اگر میں اندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑ جاتا ———؟"

وجے دشمی سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کے عالم میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے کے رونے کی آواز آئی اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی اور بولی "مبارک ہو بابوجی ——— لڑکا ہوا ہے۔"

"لڑکا؟" مدن نے کہا اور پھر متفکرانہ لہجے میں بولا "بی بی کیسی ہے؟"

بیگم بولی "بٹیہ ٹھیک ہے ——— میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے . . . . . . زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول نہیں گرتی نا!"

"او . . . . . ." مدن نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور پھر کمرے میں جانے کے لیے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی "تمھارا اندر کیا کام؟" اور پھر ایکا ایکی دروازہ بھیڑ کر اندر لپک گئی۔

مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوف سے نہیں ——— تسلی سے یا شاید اس لیے کہ جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے تو ارد گرد کے لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے سن رکھا تھا جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے در و دیوار لرزنے لگتے ہیں گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بیچے گا یا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا جیسے سچ مچ ہی دیواریں کانپ رہی تھیں . . . . . . زچگی کے لیے چکلی بھابی تو نہ

آتی تھی کیونکہ اس کا اپنا بچہ بہت چھوٹا تھا البتہ دریا پار والی پھوپھی ضرور پہنچی تھی جس نے پیدائش کے وقت رام رام' رام رام کی رٹ لگا دی تھی اور اب وہی رٹ مدھم ہو رہی تھی۔

زندگی بھر مدن کو اپنا آپ اس قدر فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور پھوپھی نکلی۔ برآمدے کی بجلی کی مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم دودھیا سفید نظر آ رہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا ——— "اندو ٹھیک ہے نا پھوپھی ———؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!" پھوپھی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی ———

پھوپھی برآمدے کے دروازے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں باقی کے بچے سو رہے تھے۔ پھوپھی نے ایک ایک کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر منہ میں کچھ بولی اور پھر نڈھال سی ہو کر منی کے پاس لیٹ گئی ——— اوندھی ——— اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا .... پھوپھی تو کئی زچگیوں سے گزر چکی ہے، پھر کیوں اس کی روح تک کانپ اٹھی ہے ———

پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بو باہر لپکی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا آیا جس نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ ابھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا جس میں سے کچھ قطرے نکل کر فرش پر گر گئے۔ مدن کے ہوش اڑ گئے۔ اسے معلوم نہ تھا وہ کہاں ہے۔ آنکھیں کھلی تھیں پر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اندو کی ایک مرگھلی سی آواز آئی ——— "ہا ——— ئے" اور پھر بچے کے رونے کی آواز۔

تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول کو دبا دیا۔ کتوں کو اندر آنے سے روکا۔ لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ہرمل کی بو دماغ میں بس جانے کے بعد آج ہی اسے ہوش آیا ہے۔ کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور اندو ——— نند اور جسودھا ——— اور دوسری طرف نندلال .... اندو نے بچے کی طرف دیکھا اور کچھ ٹوہ لینے کے سے انداز میں بولی ——— "بالکل تم ہی پر گیا ہے۔"

"ہوگا۔" مدن نے ایک اچٹتی سی نظر بچے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں شکر ہے بھگوان کا کہ تم بچ گئیں۔"

"ہاں!" اندو بولی۔ "میں تو سمجھتی تھی ———"

"شبھ شبھ بولو۔" مدن نے ایک دم اندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو جو کچھ ہوا ہے .... میں تو اب تمہارے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا۔" اور مدن نے زبان دانتوں تلے دبا لی۔

"توبہ کرو۔" اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیے .... اور اندو نحیف سی آواز میں ہنسنے لگی۔

بچہ پیدا ہونے کے بعد کئی روز تک اندو کی ناف ٹھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس بچے کی تلاش کر رہی تھی جو اب اس سے پرے باہر کی دنیا میں جا کر اپنی اصلی ماں کو بھول گیا تھا۔ اب سب کچھ ٹھیک تھا اور اندو شانتی سے اس دنیا کو تک رہی تھی ——— معلوم ہوتا تھا اس نے

مدن ہی کے نہیں دنیا بھر کے گناہگاروں کے گناہ معاف کر دیے ہیں اور اب دیوی بن کر دیا اور کرونا کے پرساد بانٹ رہی ہے . . . . مدن نے اندو کے منہ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا ـــــ اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دبلی ہو کر اندو اور بھی اچھی لگنے لگی ہے . . . . جبھی یکا یکی اندو نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ لیے۔

"کیا ہوا؟" مدن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اندو تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کر کے بولی "اسے بھوک لگی ہے۔" اور اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے؟ ـــــ بھوک؟ ـــــ" مدن نے پہلے بچے کی طرف اور پھر اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمھیں کیسے پتہ چلا؟"

"دیکھتے نہیں؟" اندو نیچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی "سب گیلا ہو گیا ہے۔"

مدن نے غور سے اندو کے ڈھیلے ڈھالے گلے کی طرف دیکھا۔ جھر جھر دودھ بہہ رہا تھا اور ایک خاص قسم کی بو آ رہی تھی۔ پھر اندو نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "اسے مجھے دے دو۔"

مدن نے ہاتھ پنگھوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے بچے کو یوں اٹھایا جیسے وہ کوئی مرا ہوا چوہا ہو۔ آخر اس نے بچے کو اندو کی گود میں دے دیا۔ اندو مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم جاؤ . . . . . . باہر"

"کیوں؟ . . . . . . باہر کیوں جاؤں؟" مدن نے پوچھا۔

"جاؤ نا ـــــ" اندو نے کچھ مچلتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا "تمھارے سامنے میں دودھ نہیں پلا سکوں گی۔"

"ارے؟" مدن حیرت سے بولا "میرے سامنے؟ . . . . . نہیں پلا سکے گی؟" اور پھر نا سمجھی کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتے ہوئے اس نے اندو پر ایک نگاہ ڈالی ـــــ اتنی خوبصورت اندو آج تک نہیں لگی تھی۔

بابو جی اس چھٹی پر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو نے پوتا ان کی گود میں دیا تو وہ کھل اٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نکل آیا تھا جو چوبیس گھنٹے انھیں سولی پر لٹکائے رکھتا۔ اگر منّا نہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دس گنا بُری حالت ہوتی۔

کئی علاج کیے گئے۔ بابو جی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے افیم کے برابر پندرہ بیس گولیاں روز کھانے کو دیں۔ پہلے ہی دن انھیں اتنا پسینہ آیا کہ دن میں تین تین چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اتار کر بالٹی میں نچوڑتا۔ صرف پسینے ہی سے بالٹی ایک چوتھائی ہو گئی تھی۔ رات انھیں متلی سی محسوس ہونے لگی اور انھوں نے پکارا ـــــ "بہو! ذرا داتن تو دینا۔ ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔" بہو بھاگی ہوئی گئی اور داتن لے آئی۔ بابو جی اٹھ کر داتن چبا ہی رہے تھے کہ ایک ابکائی کیا آئی ساتھ ہی خون کا پرنالہ لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرہانے کی طرف لٹایا تو ان کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور کوئی ہی دم میں وہ اوپر آسمان کے گلزاروں میں پہنچ چکے تھے جہاں انھوں نے اپنا پھول پہچان لیا تھا ـــــ

منّے کو پیدا ہوئے کل بیس پچیس روز ہوئے تھے۔ اندو نے منہ نوچ کر، سر اور چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر دیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا جو اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کی بجائے اتار کے رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پر سے مٹی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ "لوگو! میں لٹ گئی" کی جگہ اس نے ایک دلدوز

آواز میں چلّانا شروع کر دیا تھا "لوگو! ہم لُٹ گئے"۔

گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر آ پڑا تھا۔ اس کا ابھی مدن کو پوری طرح سے اندازہ نہ تھا۔ صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر منہ میں آ گیا۔ وہ شاید بچ نہ پاتا اگر وہ گھر کے باہر بدررو کے کنارے سیل چڑھی مٹی پر اوندھا لیٹ کر اپنے دل کو ٹھکانے پر نہ لاتا۔۔۔۔۔۔ دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچے کو بچا لیا تھا۔ چھوٹے بچے کندن، دلاری منی اور پاشی یوں چلّا رہے تھے جیسے گھونسلے پر شِکرے کے حملے پر چڑیا کے بوٹ چونچیں اٹھا اٹھا کر چیں چیں کرتے ہیں۔ انھیں اگر کوئی پروں کے نیچے سمیٹتی تھی تو اندو ———

نالی کے کنارے پڑے پڑے مدن نے سوچا اب تو یہ دنیا میرے لیے ختم ہو گئی۔ کیا میں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ وہ اٹھا اور لڑکھڑا کر گھر کے اندر چلا آیا۔

سیڑھیوں کے نیچے غسل خانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا ——— میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ ——— اور وہ کھلکھلا کر ہنس دیا تھا حالانکہ اس کے باپ کی لاش ابھی پاس ہی بیٹھک میں پڑی تھی۔

باپ کو آگ کے حوالے کرنے سے پہلے مدن ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ تس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتے دار محلے والے سن سے ہو گئے۔ پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چتا جلانی پڑی۔ جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کریا کی لاٹھی مارنی پڑی۔ عورتیں باہر ہی سے شمشان کے کنوئیں پر نہا کر گھر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کے لیے جو طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی، رات کے گھر آنے پر پھر سے ہول میں ڈھل گئی۔۔۔۔۔۔۔ اسے کوئی سہارا چاہیے تھا، کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی جنک دلاری اندو نے کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔۔۔۔ اس رات اگر اندو اپنا آپ یوں مدن پر نثار نہ کر دیتی تو اتنا بڑا دکھ مدن کو لے ڈوبتا۔

دس ہی مہینے کے اندر اندر اندو کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو اس دوزخ کی آگ میں دھکیل کر مدن خود اپنا دکھ بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا اگر میں شادی کے بعد بابوجی کے پاس گئی ہوئی اندو کو نہ بلا لیتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دیتے۔ لیکن پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا۔۔۔۔۔۔ کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا ——— مجبوراً چل نکلا ———

ان دنوں بڑے بچے کو مدن کے پاس چھوڑ کر، چھوٹے کو چھاتی سے لگائے اندو میکے چلی گئی تھی۔ پیچھے مُنّا طرح طرح کی ضد کرتا تھا جو کبھی مانی جاتی تھی اور کبھی نہیں بھی ——— میکے سے اندو کا خط آیا ——— مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آ رہی ہے، اسے کوئی مارتا تو نہیں؟ ۔۔۔۔۔۔ مدن کو بڑی حیرت ہوئی ——— ایک جاہل، اَن پڑھ عورت۔۔۔۔۔۔ ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟ ——— پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا ——— کیا یہ بھی کوئی رٹا ہوا فقرہ ہے ———؟

سال گزر گئے۔ پیسے کبھی اتنے نہ آئے کہ ان سے کچھ عیش ہو سکے لیکن گزر کے مطابق آمدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ دقّت اس وقت ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آ جاتا۔۔۔۔۔۔ کندن کا داخلہ دینا ہے، دُلاری منی کا شگن بھجوانا ہے۔ اس وقت مدن منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا اور پھر اندو

ایک طرف سے آتی، مسکراتی ہوئی اور کہتی "کیوں دُکھی ہو رہے ہو؟" مدن امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا "دُکھی نہ ہوں؟ کندن کا بی۔ اے کا داخلہ دینا ہے۔۔۔۔۔۔ ممی۔ ۔ ۔" اندو پھر ہنستی اور کہتی "چلو میرے ساتھ" اور مدن بھیڑ کے بچے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جسے کسی کو، مدن سمیت ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا "مرو گی تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا۔" اور اندو کہتی "ہاں! لے جاؤں گی" پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟"

"کہیں سے بھی آئے۔۔۔۔۔ تمھیں آم کھانے سے مطلب ہے؟"

"پھر بھی؟"

"تم جاؤ، اپنا کام چلاؤ۔"

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی "میں نے ایک سیٹھ دوست بنایا ہے نا؟" اور پھر ہنسنے لگتی۔ جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اندو کہتی۔ ——"میں چور لٹیرا ہوں —— تم نہیں جانتے؟ —— سخی لٹیرا —— جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے گریب گرباکو دے دیتا ہے"۔۔۔۔۔۔ اسی طرح منی کی شادی ہوئی جس پر ایسی ہی لوٹ کے زیور بکے —— قرضہ چڑھا اور پھر اُتر بھی گیا۔

ایسے ہی کندن بھی بیاہا گیا۔ ان شادیوں میں اندو ہی "ہتھ بھرا" کرتی تھی اور ماں کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔ آسمان سے بابوجی اور ماں دیکھا کرتے اور پھول برساتے جو کسی کو نظر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا، اوپر ماں جی اور بابوجی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے بابوجی سے کہا "تم تو بہو کے ہاتھ کی پکی کھا آئے ہو، اس کا سکھ بھی دیکھا ہے پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا" —— اور یہ جھگڑا وشنو، مہیش اور شیو تک پہنچا۔ انھوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا —— اور یوں ماں، مات لوک میں آ کر بہو کی کوکھ میں پڑی —— اور اندو کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔۔۔۔۔۔

پھر اندو ایسی دیوی بھی نہ تھی۔ جب کوئی اصول کی بات ہوتی تو نند دیور تو کیا خود مدن سے بھی لڑ پڑتی —— مدن راستبازی کی اس پتلی کو خفا ہو کر ہریش چندر کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی باتوں میں الجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے اس لیے مدن اور کنبے کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اندو کے سامنے نیچی ہی رہتی تھیں۔ جھگڑا کتنا بھی بڑھ جائے، مدن اپنے شوہری زعم میں کتنا بھی اندو کی بات کو رد کرے لیکن آخر سبھی سر جھکائے ہوئے اندو ہی کی شرن میں آتے تھے اور اسی سے چھما مانگتے تھے۔

نئی بھابی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی لیکن اندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں اس کے اُلٹ چھوٹی بھابی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور رتّے پی چاچا جی کی معرفت جائداد تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی جائیداد تو ایک طرف اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں بھی تقسیم کی زد میں آ گئیں اور اندو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔

جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکے تھے وہاں اندو کا نیا گھر دنوں ہی میں جگمگ جگمگ کرنے لگا۔

بچی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچی ہر وقت اندو کی چھاتیوں سے چمٹی رہتی تھی۔ جہاں سبھی گوشت کے اس لوتھڑے پر تھو تھو کرتے تھے وہاں ایک اندو تھی جو اسے کلیجے سے لگائے پھرتی لیکن کبھی خود بھی پریشان ہو اٹھتی اور بچی کو سامنے جھلنگے میں پھینکتے ہوئے

کہہ اٹھتی ”تو مجھے بھی جینے دے گی —— ماں ——؟“
اور بچی چلا چلا کر رونے لگتی۔

مدن اندو سے کٹنے لگا۔ شادی سے لے کر اس وقت تک اسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ گندہ بروزہ بکنے لگا اور مدن نے بہت سا روپیہ اندو سے بالا بالا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ بابو جی کے چلے جانے پر کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔

گویا پڑوسی سبطے کی بھینس پھر مدن کے منہ کے پاس پھنکارنے لگی بلکہ بار بار پھنکارنے لگی۔ شادی کی رات والی بھینس تو بک چکی تھی لیکن اس کا مالک زندہ تھا۔ مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سائے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں۔ نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے کہ اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور لہر آ کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اڑ گیا یا کسی کوٹ نے دیکھنے والے کا منہ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تڑپنے لگا۔ تبھی روشنی کی چوکور ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا جیسے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیچھے کوئی کتا رونے لگا۔ اوپر طبلے نے اس کی آواز ڈبو دی۔

مدن کو اس کے تصور کے خدوخال ملے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک غلط خط لگ گیا، یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی اور مدن بے داغ صناعی اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا۔

سبطے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے مدن کو مثالی شوہر کی حیثیت سے سبطے کے سامنے پیش کیا، پیش ہی نہیں کیا بلکہ منہ پر مارا۔ اس کو اٹھا کر سبطے نے بیگم کے منہ پر دے مارا۔ معلوم ہوتا تھا کسی خونیں تربوز کا گودا ہے جس کے رگ و ریشے بیگم کی ناک، اس کی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں۔ کروڑ کروڑ گالی بکتی ہوئی بیگم نے حافظے کی ٹوکری میں سے گودا اور بیج اٹھائے اور اندو کے صاف ستھرے صحن میں بکھیر دیے۔

ایک اندو کی بجائے دو اندو ہو گئیں۔ ایک تو اندو خود تھی اور دوسری ایک کانپتا ہوا خط جو اندو کے پورے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آ رہا تھا۔

مدن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہو کر...... نہا دھو، اچھے کپڑے پہن، گلوری کی ایک جوڑی جس میں خوشبودار قوام لگا ہو، منہ میں رکھ کر...... لیکن اس دن جو مدن گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دوسری تھی۔ اس نے چہرے پر پوڈر تھوپ رکھا تھا۔ گالوں پر روج لگا رکھی تھی۔ لپ اسٹک کے نہ ہونے پر ہونٹ ماتھے کی بندی سے رنگ لیے تھے —— اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مدن کی نظریں ان ہی میں الجھ کے رہ گئیں۔

”کیا بات ہے آج؟“ مدن نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اندو نے مدن سے نظریں بچاتے ہوئے کہا۔ ”آج فرصت ملی ہے۔“

شادی کے پندرہ برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی اور وہ بھی اس وقت جبکہ چہرے پر پرچھائیاں چلی آئی تھیں۔ ناک پر ایک سیاہ سی کاٹھی بن گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے، ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تین تہیں سی دکھائی دینے لگی تھیں...... آج اندو نے

ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عیوب میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یوں بنی ٹھنی، کسی کسائی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی —— "یہ نہیں ہو سکتا" —— مدن نے سوچا اور اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے پھر ایک بار مڑ کر اندو کی طرف دیکھا —— جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں —— وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی ...... یہاں جو غلط خط لگے تھے، شرابی کی آنکھوں کو نہ دکھ سکے .... اندو سچ مچ خوبصورت تھی۔ آج بھی پندرہ سال کے بعد پھولاں، رشیدہ، منہ رابرٹ اور ان کی بہنیں اس کے سامنے پانی بھرتی تھیں ...... پھر مدن کو رحم آنے لگا اور ایک ٹپ سا

آسمان پر کوئی خاص بادل بھی نہ تھے لیکن پانی پڑنا شروع ہو گیا۔ ادھر گھر کی گنگا طغیانی پر تھی اور اس کا پانی کناروں سے نکل کر پوری ترائی اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اسی رفتار سے پانی بہتا رہا تو اس میں کیلاش پربت بھی ڈوب جائے گا .... ادھر بچی رونے لگی۔ ایسا رونا جو وہ آج تک نہ روئی تھی۔ مدن نے اس کی آواز سن کر آنکھیں بند کر لیں، کھولیں تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ جوان عورت بن کر —— نہیں نہیں، وہ اندو تھی۔ اپنی ماں کی بیٹی، اپنی بیٹی کی ماں جو اپنی آنکھوں کے دنبالے سے مسکرائی اور ہونٹوں کے کونے سے دیکھنے لگی۔

اسی کمرے میں جہاں ایک دن برل کی دھونی نے مدن کو چکرا دیا تھا، آج خس کی خوشبو نے بوکھلا دیا تھا۔ ہلکی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے اس لیے باہر کا پانی اوپر کسی کڑی میں سے رستا ہوا اندو اور مدن کے بیچ ٹپکنے لگا ..... لیکن مدن تو شرابی ہو رہا تھا۔ اس نشے میں اس کی آنکھیں سمٹنے لگیں اور تنفس تیز ہو کر انسان کا نفس نہ رہا۔

"اندو ——" مدن نے کہا ..... اور اس کی شادی کی رات والی پکار سے دو سُر اوپر تھی —— اور اندو نے پرے کھسکتے ہوئے کہا "جی ——" اور اس کی آواز دو سُر نیچی تھی ...... پھر آج چاندنی کی بجائے اماوس تھی ....

اس سے پہلے کہ مدن اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا، اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی۔ پھر مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور دیکھنے لگا: اس نے کیا کھویا، کیا پایا ہے؟ اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوتے ہوئے چہرے کی طرف پھینکی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ کیا؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا "تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔"

"یونہی!" اندو نے کہا اور بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "رات بھر جگایا ہے اس چڑیل مَیّا نے۔"

بچی اب تک خاموش ہو چکی تھی۔ گویا وہ دم سادھے دیکھ رہی تھی، اب کیا ہونے والا ہے؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔ واقعی آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا؟ مدن نے پھر غور سے اندو کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں مگر —— یہ آنسو؟"

"خوشی کے ہیں" اندو نے جواب دیا "آج کی رات میری ہے" اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستی ہوئی وہ مدن سے چمٹ گئی۔ ایک تلذذ کے احساس سے مدن نے کہا "آج برسوں کے بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی ہے اندو! میں نے ہمیشہ چاہا تھا ——"

"لیکن تم نے کہا نہیں" اندو بولی "یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟"

"ہاں!" مدن بولا "اپنے دکھ مجھے دے دو۔"

"تم نے تو کچھ نہیں مانگا مجھ سے۔"

"میں نے؟" مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا "میں کیا مانگتا؟ میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار —— ان کی تعلیم، بیاہ شادیاں، یہ پیارے پیارے بچے —— یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔"

"میں بھی یہی سمجھتی تھی۔" اندو بولی۔ "لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔" پھر اندو نے رُک کر کہا۔ "میں نے بھی ایک چیز رکھ لی۔"

"کیا چیز رکھ لی؟"

اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا منہ پرے کرتی ہوئی بولی۔ "اپنی لاج —— اپنی خوشی .... اس وقت تم بھی کہہ دیتے —— اپنے سکھ مجھے دے دو —— تو میں ...." اور اندو کا گلا رندھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ بولی۔ "اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔"

مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا۔ یہ اَن پڑھ عورت؟ ...... کوئی رٹا ہوا فقرہ —— نہیں تو ... یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے۔ ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں برادہ چاروں طرف اُڑ رہا ہے ......

کچھ دیر کے بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے اور بولا۔ "میں سمجھ گیا اندو۔"

پھر روتے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے —— اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایسی دنیاؤں میں لے گئی جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے ....

پرتو

کرشن چندر

جب وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈبے کے اندر آیا تو اس کے چلنے کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ فوج میں ملازم رہ چکا ہے۔ اُس کی شخصیت بڑی پُر وقار، قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا، رنگ سرخ و سپید، براق نورانی داڑھی۔ اس نے کالی سرج کے رنگ کا اونی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور ڈبے کے درمیان روشنی میں اُس کی پگڑی کی تہوں میں سے ابرق کے ٹکڑے جواہر ریزوں کی طرح چمک اُٹھتے تھے۔ وہ سیدھا چلتا ہوا متوازن قدم اٹھاتا ہوا، میرے قریب آکر رکا۔ جھک کر اس نے قریب کی سیٹ کا نمبر پڑھا اور اطمینان کی سانس لے کر سیٹ پر دراز ہو گیا۔ سیٹ اُس کے وزن سے پیچھے کو ہو گئی۔ اُس نے مزید اطمینان کی سانس لی اور میری طرف دیکھ کر بولا "یہ پیچھے کو ہٹنے والی کلدار نشستیں بہت عمدہ ہیں!" میں نے اپنا جلتا ہوا سگریٹ جسے میں نے ابھی ابھی سلگایا تھا جلدی سے خاک دان میں بجھا دیا۔ بوڑھا سکھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس نے کہا۔ شکریہ! مجھے تمباکو کا دھواں واقعی بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔

مجھے اس کے دانت، جب وہ مسکرایا تو بہت اچھے معلوم ہوئے۔ بے حد سپید اور مضبوط دانت جُڑے جُڑے اور ہم سطح۔ اُس بوڑھے فوجی سکھ کی عمر ستر برس سے کم نہ ہوگی۔ لیکن اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اب بھی جوانی کی چمک اور اس کا تجسس پایا جاتا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ غیر معمولی طور پر صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جوانی میں تو وہ بے حد حسین اور دلآویز شخصیت کا مالک رہا ہوگا۔ اس وقت اُس کے چہرے پر مجھے جو چیز کھل رہی تھی وہ متعدد زخموں کے نشان تھے دائیں بائیں اس کے رخساروں پر تین چار لانبے لانبے زخموں کے نشان رہ گئے تھے۔ دائیں رخسار پر تو زخموں نے ایک صلیب سی بنا ڈالی تھی اور بائیں رخسار پر یہ زخم انگریزی میں وی "V" کا سا نشان بناتے تھے اور جب اس نے اپنی ٹائی ٹھیک کرنے کے لیے ہاتھ اوپر کیے تو میں نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلیوں کی پشت پر بھی۔ کئی۔ ایسے چھوٹے چھوٹے بیسیوں نشان ہیں جیسے کسی نے تیز دھار کے چاقو سے ان ہاتھوں کا قیمہ بنانے کی کوشش ہو۔

جنگ! میں نے اپنے دل میں سوچا۔ جانے پہلی جنگ عظیم کے محاذ پر اسے یہ حادثہ پیش آیا ہوگا۔ وہ تو خیریت رہی کہ خوبصورت اور وجیہہ انسان کی ناک یا ٹانگ نہیں گئی ورنہ کتنا بُرا معلوم ہوتا یہ آدمی!

مجھے اس معاملہ پہ زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ ریستوران کار کے بیرے نے آکر کہا کہ اب آپ لوگ آ کے کھانا کھا لیں۔ ہم لوگ دس بجے ریستوران بند کر دیتے ہیں۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بوڑھا سکھ میرے ساتھ اُٹھ گیا۔

"حالانکہ میں آٹھ بجے گھر سے کھانا کھا کر چلا تھا مگر اس وقت پھر بھوک محسوس کر رہا ہوں" بوڑھا سکھ ہنس کر مجھ سے مخاطب ہوا

اور میں اس لیے دیر میں کھانا کھا رہا ہوں کہ مجھے بھوک نہ تھی! میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں ڈائننگ کار میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیروں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ صرف ایک کونے کی میز پہ ایک نوجوان جوڑا کافی پی رہا تھا اور کھڑکی سے باہر رُک رُک کر پورن ماشی کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کا ہاتھ مرد کے ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد دبا دیتا تھا۔ ہاتھ کے دبانے میں لڑکی کے چہرے پر ایک گلنار مسکراہٹ کھل اُٹھتی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے لڑکے کے ہاتھ میں کوئی سوئچ (SWITCH) ہے کہ جسے بار بار دبانے سے یہ مسکراہٹ بجلی کے قمقمے کی طرح روشن ہو اٹھتی۔ لڑکی کے بال خوش نما طریق سے کٹے ہوئے تھے اور وہ بڑی دل ربا عورت والی، موہنی اداؤں والی لڑکی تھی اور شکل و صورت سے ایک ایسی ہندوستانی کرسچن معلوم ہوتی تھی جس میں یورپی خون کا بھی دخل رہا ہو۔ لڑکا خالص ہندوستانی تھا۔ سانولے رنگ کا سرا تھا۔ چھوٹا قد لیکن مضبوط اور گٹھا ہوا گھنے چمکیلے بال اور چوڑے چوڑے جبڑوں پر گھٹے ہوئے شیو کی نیلاہٹ تھی۔ اس کے سر کی حجامت بھی بالکل تازہ تھی معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بال کٹوا کر آیا ہے۔ اُس نے کپڑے بے حد صاف ستھرے پہنے تھے اور اس کے روئیں روئیں سے زندگی کی صحت مند آرزوئیں پھوٹ رہی تھیں!

لڑکی کا ایک ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور بار بار وہ اسے اس طرح دباتا تھا جس طرح گویا وہ اس میں برقی رو بھرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اس کی نیلی ساڑھی کا پلو برابر مسلے جا رہا تھا اور اس کی بے حد سیاہ چھوٹی اور چمکیلی آنکھیں لڑکی کو اس طرح دیکھتی تھیں جیسے وہ لڑکی لڑکی نہ ہو حسن کی ایک پلیٹ ہو۔ محبت میں صحت کو کس قدر دخل ہے۔ میں نے اپنے زرد رخساروں کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

جواب میں بوڑھے سکھ نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ اب کھانا ہم دونوں کے سامنے تھا اور وہ مکمل انہماک سے کھانے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ ہمارے کھانے کے دوران میں ہی وہ جوڑا کافی پی کر اور بل ادا کر کے چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ گلنار مسکراہٹ پھر لڑکی کے لبوں تک آئی اور مجھے اس لڑکی کی وہ گلنار مسکراہٹ اس کے تبسم کی ادا بے حد پسند آئی۔ جب وہ لڑکے کی طرف دیکھتی تھی کتنی چاہت اور سپردگی تھی اس کی نگاہ میں کبھی کبھی تو عورت ایک نگاہ میں سب کچھ دے ڈالتی ہے اور پھر ایک خالی برتن کی طرح معصوم کھڑی کی کھڑی دیکھتی رہ جاتی ہے۔ بس اُسی وقت وہ سب سے پیاری بھی معلوم ہوتی ہے۔ مسکرانے کے بعد کچھ اس طرح کی نگاہ سے اُس لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا اور پھر تمتما کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور نوجوان اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے ویٹی بیول میں لے گیا تھا اور اُن کے جانے کے بعد ریستوران کار بھی سونی سونی سی دکھائی دینے لگی اور کھڑکی میں لٹکا ہوا چاند مجھے ایسا محسوس ہوا گویا صرف انہیں کے لیے لٹکایا گیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی پر پردہ ڈال دیا۔

بوڑھا سکھ میری حرکت پر مسکرایا۔ مگر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد بوڑھے سکھ نے کافی منگائی اور میں سگریٹ پینے کے لیے باہر ویٹی بیول میں آ گیا۔ ویٹی بیول کے ایک کونے میں وہ نوجوان اس لڑکی کو چوم رہا تھا اور چاند لڑکی کے چہرے پر تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا۔ یہ آنسو کیسے؟

گاڑی کی کھڑکیوں میں دودھیے شیشے لگے ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے گاڑی کی چھک چھک بڑے میٹھے میٹھے مدھم غنودگی سے لبریز لہجے میں اندر آتی معلوم ہوتی تھی اور گاڑی کے دورویہ پھیلی ہوئی سفید چاندنی میں سیاہ درخت اپنی شاخوں کو سمیٹتے ہوئے، سرجھکائے ہوئے گناہگار مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔

سردار نے گوشے میں سوئے ہوئے سرانڈے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ جوانی میں میں بھی اسی طرح تھا۔ بے فکرا اور لاپروا اور خود سر۔ میرا باپ گجندر سنگھ موضع حاصلاں کا نمبردار تھا اور اس کے علاوہ چک نمبر ۳۴ بھی پورے کا پورا ہماری ملکیت میں تھا۔ گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ گو باپ نے مجھے بی اے پاس کرا دیا تھا لیکن مجھے شروع ہی سے کھیتوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ قلم کی بجائے میرے ہاتھ درانتی چلانے میں مشاق تھے۔ جانے میں نے بی اے کیسے کر لیا! میرے باپ کی آرزو تھی کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔ کرنیل بنوں مگر مجھے کھیتوں کی زندگی ہی پسند تھی۔ بھوری بھوری مٹی کی سوندھی مہک، شبنم میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے چنوں کا بوٹا، دور دھراں کے ٹیلے پہ پانی بھرتی ہوئی ناریوں کی قطار اور میری سنہری گھوڑی کی ڈولکی چال، کچے راستوں پہ ہلکی ہلکی دھول جگاتی ہوئی۔۔۔۔۔ آہ!

میں نے کہا تم اپنے شباب میں بے حد حسین رہے ہوگے۔ عورتیں تم پہ بہت مرتی ہوں گی۔

بوڑھے سکھ نے حزیں مسکراہٹ سے کہا ایسا تو مجھے کچھ یاد نہیں کہ کسی نے مجھ سے محبت کی ہو۔ ہاں میں نے ضرور ایک لڑکی سے محبت کی تھی۔

کون تھی وہ ؟

میری بیوی تھی!

بیوی!

جب میں بی اے پاس کر کے گاؤں واپس آیا تو میرے باپ نے چک جھمراں کے نمبردار کی لڑکی پریتو سے میرا بیاہ کر دیا۔ پریتو بڑی خوبصورت لڑکی تھی لانبی اور بانکی گوری اور سنہری چمکیلی اور نرم جیسے کوار گندل مگر میں تو اس کی آنکھوں پہ مرتا تھا۔

کیوں ان آنکھوں میں کیا بات تھی ؟ میں نے پوچھا۔

بظاہر تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی تھیں اور کالی سیاہ! مگر ایسی تو بہت سی عورتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں، پھر بات کیا تھی ؟

کہہ نہیں سکتا۔ اُن آنکھوں کا رنگ، نہیں نہیں رنگ نہیں، اُن آنکھوں کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

وہ آنکھیں بولتی تھیں ؟

بولتی تو نہیں تھیں۔ لیکن بولنا چاہتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہیں گی۔ مگر وہ مجھ سے کچھ نہ کہتیں۔ ہر وقت سپنے سے دیکھتی رہتیں، کبھی ایسی آنکھیں تم نے دیکھی ہیں جو ہمیشہ سپنا سا دیکھا کریں۔

جوانی میں سبھی آنکھیں سپنے دیکھتی ہیں میں نے کہا،

ہاں لیکن سپنے ہر ایک کے الگ الگ ہوتے ہیں!

بڈھے نے آہستہ سے کہا۔ میں تو اپنی پریتو پہ مرتا تھا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ اس لیے ہوا کہ میری زندگی میں اس سے پہلے کوئی نہ آئی تھی نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد۔۔۔۔۔۔

تاکہ اُسے پتہ نہ چلے کہ کوئی اُس کے تعاقب میں ہے۔ تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے اُتر کر نالے کو پار کیا۔ پھر احتیاط سے ٹیلوں کے پیچھے سے گھوم کر میں نے آگے کو نظر دوڑائی۔

سامنے پھر سرسوں کے کھیت تھے۔ کھیتوں کے بیچ میں ایک کنواں تھا۔ کنوئیں کے قریب بیریوں کا ایک سایہ دار جھاڑ تھا جھاڑ کے نزدیک ایک پلنگ بچھا تھا۔ پلنگ کے قریب ایک ناپختہ گھر تھا جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔

اور میری بیوی اس پلنگ پر ایک جاٹ کے ساتھ سو رہی تھی۔ میری پرتیو۔ میری بیوی اُس سے بہت پیار کر رہی تھی وہ بار بار اس کی آنکھیں چومتی اور اس کے رخسار۔ اور کتنی شدت تھی اُس پیار میں۔ میری آنکھوں میں خون اُترنے لگا مگر میں چپکا بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے کھڑا اُن لوگوں کو پیار کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہاں ہاں! اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔

کچھ عرصے کے بعد جاٹ نے میری بیوی سے کہا۔ پرتیو! مجھے پیاس لگی ہے اندر سے پانی لا دے!

پرتیو نے اپنا سر اُس کے سینے سے ہٹا لیا اور بولی بچنے! تیری پیاس کیا ابھی تک نہیں بجھی؟

بچنا جواب میں صرف مسکرا دیا اُس نے میری بیوی کے ہونٹ چوم لیے۔ پرتیو آہستہ سے پلنگ سے اُٹھی اور آدھ کھلے دروازے سے ناپختہ مکان کے اندر گئی۔ بچنا اوندھے منہ لیٹ کر بڑے اشتیاق سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ میری بیوی بالکل ننگی تھی۔

یکایک میں نے کرپان نکالی اور اُسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سر کے اُوپر اٹھایا اور پھر اپنی پوری طاقت سے بچنے پر وار کیا بچنے کے منہ سے ہائے کی ایک ہلکی سی آواز نکلی۔ دوسرے لمحے میں اس کا سر قلم ہو گیا۔ پھر میں بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے سے کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ ٹیلوں کے پیچھے سے نالے کو عبور کر کے سرسوں کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے چند لمحوں کے لیے رُک کر اپنی کرپان کو مٹی سے اچھی طرح صاف کیا اور جب وہ بالکل صاف شفاف ہو کر آئینے کی طرح چمکنے لگی تو اُسے میان میں رکھ کر گھر کے اندر آ گیا اور کمرے کے اندر آ کر پھر اپنے بستر پر سو گیا۔

کوئی آدھ پون گھنٹے کے بعد پرتیو میرے گھر میں دھیرے سے داخل ہوئی، میں جاگ رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پرتیو نے دروازہ کھول کر پہلے تو مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اس نے آہستہ سے میرے تکیے کے نیچے سے کرپان نکالی اور اُسے کھول کر دیکھا۔ اور جب اُسے بالکل صاف پایا تو گویا اُس کے دل کا شبہ دور ہو گیا اور وہ میری بغل میں آ کر لیٹ گئی۔ چپ چاپ پتھر کی مثل! بوڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد میں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا۔

کچھ نہیں ہوا! اُس کا باپ چونکہ صحت یاب ہو چکا تھا۔ اس لیے میں پرتیو کو لے کر دوسرے دن ہی اپنے گاؤں چلا آیا اور ہم دونوں ہنسی خوشی اکٹھے رہنے لگے۔

دن بیتے۔ مہینے بیتے، سال بیتے۔ میں نے کبھی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا نہ پرتیو نے کبھی کسی بات سے مجھ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ اُسے کسی بات کا بھی شبہ ہوا تھا یا اُسے کسی بات کا کوئی غم تھا۔ ہاں ایک بات میں نے ضرور دیکھی تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ پھر کبھی اپنے میکے نہیں گئی۔ میرے کہنے پر یا اپنے باپ کے اصرار پر بھی نہیں گئی۔ ہوتے ہوتے میں بھی اس واقعہ کو بھول سا گیا۔ کیونکہ اب میرے بچے ہو گئے تھے میرے اور پرتیو کے بچے، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بڑے خوبصورت بچے تھے ہمارے پرتاپ اور دیپ اور سرنام کور۔ بڑھتے بڑھتے بچے بھی

بڑے ہو گئے اور سکول جانے لگے۔ سکول سے کالج جانے لگے تو ہمارے ہاں تیسرا لڑکا پیدا ہوا۔ ہربنس سنگھ اب ہمارے گھر میں شادمانی اور مسرت تھی۔ آرام و سکون، خوشی اور یقین، گہری رفاقت اور مفاہمت جو اچھے گھروں کی مثال ملتی ہے!

ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے واپس آ کے نیم کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاپ اور دیپ کالج سے واپس آ گئے تھے گرمی کی چھٹیاں گزارنے کے لیے، ہرنام ایک کونے میں کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ میرا سات سال کا ہربنس لکڑی کے گھوڑے کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پریتو نیم کے نیچے ایک کونے میں چولہے پر مکئی کی روٹیاں سینک رہی تھی۔ ہانڈی میں سرسوں کا ساگ ابل رہا تھا۔ اور اس کی کھٹی خوشبو میری بھوک اور بھی بے چین کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کرپان کھول کر الگ رکھ دی اور ہاتھ منہ دھو کر پریتو کے سامنے مونڈھا بچھا کر بیٹھ گیا اور بالکل بچوں کی طرح بے چین ہو کر اس سے کھانا مانگنے لگا۔

پریتو جلدی سے کھانا دے دے!

پریتو نے سب سے پہلے میرے لیے کھانا پروسا۔ پھر پرتاپ کے لیے، پھر دیپ کے لیے، پھر ہرنام کور کے لیے، سب سے چھوٹا ہربنس نے مچل کر کہا: میں تو اماں کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔

میں نے پریتو سے کہا تو بھی بیٹھ جا اب!

میں بیٹھ جاؤں گی تو تمہیں کھانا کون کھلائے گا؟ پریتو نے ذرا ناک سکیڑ کر کہا۔

اس وقت چولہے کی روشنی میں اس کے رخسار تمتما رہے تھے اور الجھی ہوئی زلف ماتھے پر اتر آئی تھی۔ مجھے وہ اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ماں! مجھے سرسوں کا ساگ اور دے دے، دیپ نے اپنی تھالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

پریتو نے ہانڈی میں سے ساگ کی کڑچھی بھر کر آہستہ سے دیپ کی تھالی میں انڈیل دیا۔

میں نے کہا ہربنس کی ماں! تھوڑا سا اچار اگر اس وقت کہیں سے مل جائے تو کھانے کا مزا دونا ہو جائے۔

اچار تو اندر کوٹھڑی میں ہے، پریتو نے رک رک کر کہا۔

تو کیا ہوا اندر سے جا کے لا دے۔

پریتو سہم کر بولی اکیلی کیسے جاؤں؟ اندر تو بڑا اندھیرا ہے مجھے ڈر لگتا ہے۔

ڈر لگتا ہے؟ یکایک میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس وقت سب کے سامنے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ لیکن اس رات کو کھیتوں کو پار کر کے اکیلی جانے میں ڈر نہیں لگا تھا؟ یکایک میں نے تنک کر کہا۔ جانے کیسے کہہ دیا اتنے سالوں تک جس بات کو کبھی نہ کہا تھا کیسے وہ بات یوں طعنہ بن کر اتنے سالوں کے بعد میرے ہونٹوں پر آ گئی۔

پریتو نے بیٹھے بیٹھے بس ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کرپان لیے میرے سر پہ کھڑی ہے پھر ایک بجلی سی تڑپی اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

ایک بار، دو بار، تین بار کرپان میرے رخساروں کو کاٹتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اپنے ہاتھوں سے اسے روکنا چاہا۔ اور چلایا۔ پریتو، پریتو ہا رک جا۔ مگر پریتو ایک بھوکی شیرنی کی طرح مجھ پہ وار کرتی رہی۔ آخر غصہ میں بھر کر میں نے ایک جھٹکے میں کرپان

اُس کے ہاتھ سے چھین لی اور دونوں ہاتھوں سے کرپان کو اٹھا کر اور اپنے جسم اور رُوح کی پُوری طاقت سے پریتو کی گردن پر بھرپور وار کر دیا۔ پریتو کی گردن کٹ کر ہربنس کے گھوڑے کے قدموں میں جا گری اور وہاں سے لڑھک کر بیری تھالی میں اوندھی ہو گئی اور اس کے سیاہ بال کھل کر میرے سامنے بکھر گئے۔

بوڑھا سکھ چُپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔ کھڑکی میں چاند بھی ایک وحشت ناک بھُوت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ گاڑی کے مسافروں کے چہرے سپید اور سُتے ہوئے تھے۔ جیسے وہ چہرے نہ ہوں۔ ہمدردیوں کے خول ہوں۔ گاڑی کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اور چاند، مجبور اور بے کس نہتا اور اکیلا کھڑکی میں کھڑا تھا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد بوڑھے سکھ نے دلگیر لہجے میں کہا۔

عورت کبھی نہیں بھُولتی! وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسے ایک ڈولی میں سوار کرا کے، ایک پلنگ پر لٹا کر چار بچے پیدا کرا کے اس کے دل کا سپنا اُس سے چھین سکتے ہیں۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے۔

عورت کبھی نہیں بھولتی!

بوڑھا سکھ خاموش ہو گیا۔ اُس نے اپنے رخسار کی صلیب پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا اور خاموش ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ صلیب بہت گہری اُس کے دل کے اندر ڈوب چکی ہے!

گاڑی میں اس قدر سناٹا تھا کہ مجھے اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے منہ کھول دو تین لمبے لمبے سانس اندر کو لیے پھر اچانک میری نظر کونے میں سوتے ہوئے جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کا ہاتھ ابھی تک لڑکے کے ہاتھ میں تھا اور لڑکے کا بازو ابھی تک لڑکی کے شانے پر تھا اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں سو رہے تھے۔ یکایک لڑکی نے لڑکے کے شانے سے سر اٹھایا۔ آہستہ سے اپنا ہاتھ لڑکے کی کمر کے نیچے سے نکالا اور لڑکے کی طرف دیکھا اور جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ لڑکا گہری نیند سو رہا ہے تو لڑکی نے نوجوان کا بازو اپنے شانے سے الگ کیا اور اس سے منہ پھیر کر چاند کی طرف دیکھا۔ پھر ایسی حسرت آمیز نگاہ سے دیکھا جو اُس کی گلنار مسکراہٹ کی ہر قدم پر تکذیب کرتی تھی۔ میں بالکل ہکا بکا رہ گیا۔ یکایک میرے ذہن میں ایک کرپان سی لہلہاتی محسوس ہوئی اور میں نے ڈر کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

دوسرے لمحے جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو لڑکی نے اپنی کھڑکی پر پردہ گرا لیا تھا اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ گو میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

ننھی کی نانی

عصمت چغتائی

ننھی کی نانی کا ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا۔ لوگوں نے کبھی انھیں اس نام سے یاد نہ کیا۔ جب چھوٹی سی گلیوں میں ناک سڑسڑاتی پھرتی تھیں تو بفاطن کی لونڈیا کے نام سے پکاری گئیں۔ پھر کچھ دن "بشیرے کی بہو" کہلائیں پھر "بسم اللہ کی ماں" کے لقب سے یاد کی جانے لگیں۔ اور جب بسم اللہ جاپے کے اندر ہی ننھی کو چھوڑ کر چل بسی تو وہ "ننھی کی نانی" کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔

دنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں "ننھی کی نانی" نے اختیار نہ کیا ہو۔ کٹورا گلاس پکڑنے کی عمر سے وہ تیرے میرے گھر میں دو وقت کی روٹی اور پرانے کپڑوں کے عوض اوپر کے کام پر دھر لی گئیں۔ یہ اوپر کا کام کتنا نیچا ہوتا ہے۔ یہ کچھ کھیلنے کودنے کی عمر سے کام پر جوت دیئے جانے والے ہی جانتے ہیں۔ ننھے میاں کے آگے جھنجھنا بجانے کی غیر دلچسپ ڈیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کے سر کی مالش تک اوپر کے کام کی فہرست میں آجاتی ہے۔

زندگی کی دوڑ بھاگ میں کچھ پھوننا جھلسنا بھی آ گیا۔ اور زندگی کے کچھ سال ماماگیری میں بیت گئے۔ پر جب دال میں چھپکلی بگھار دی اور روٹیوں میں مکھیاں پرونے لگیں تو مجبوراً ریٹائر ہونا پڑا۔ اس کے بعد تو ننھی کی نانی بس لگائی بجھائی کرنے اِدھر کی اُدھر پہنچانے کے سوا اور کسی کرم کی نہ رہیں۔ یہ لگائی بجھائی کا پیشہ بھی خاصا منافع بخش ہوتا ہے۔ محلے میں کھٹ پٹ چلتی رہتی ہے۔ مخالف کیمپ میں جا کر اگر ہوشیاری سے مخبری کی جائے تو خوب خوب خاطر مدارات ہوتی ہے۔ لیکن یہ پیشہ کے دن چلتا، نانی لُتری کہلانے لگیں اور دال گلتی نہ پا کر نانی نے آخری اور مفید ترین پیشہ یعنی مہذب طریقہ پر بھیک مانگنا شروع کر دی۔

کھانے کے وقت نانی ناک پھیلا کر سونگھتیں کہ کس گھر میں کیا پک رہا ہے۔ بہترین خوشبو کی ڈور پکڑ کر وہ گھر آن بیٹھتیں۔

"اے بیوی گھیّاں ڈالی ہیں گوشت میں؟" وہ بے تعلقی سے پوچھتیں۔

"نہیں بوا گھیّاں نگوڑی آج کل گلیں کہاں ہیں۔ آلو ڈالے ہیں۔"

"اے سبحان اللہ۔ کیا خوشبو ہے۔ اللہ رکھے بسم اللہ کے باوا کو آلوؤں سے عشق تھا۔ روز یہی کہ بسم اللہ کی ماں آلو گوشت۔ جب دیکھو آلو گوشت۔ ہا.......... اب تو مہینوں گذر جاویں آلو گوشت جو آنکھوں سے بھی دکھ جاوے.......... اے بیوی کوتمیر چھوڑ دیا؟"

وہ ایکدم فکرمند ہو جاتیں۔

"نہیں بوا کوتمیر نگوڑا سب مارا گیا موا سقّے کا کتا آ گیا۔ نی میں لوٹ گیا۔"

ہے ہے بغیر کوتھمیر کے بھلا آلو گوش کیا خاک مزہ دے گا۔ حکیم جی کے یہاں منوں لگا ہے۔"

"اے نہیں نانی حکیم جی کے لونڈے نے کل شبن میاں کی پتنگ میں کلّی لگا دی۔ اس پر میں نے کہا خبردار جو چھجے پہ قدم رکھا۔ تو۔۔۔۔"

"اے میں کوئی تمھارے نام سے تھوڑی مانگوں گی۔" اور نانی برقع سنبھال سلیپریں سٹپٹاتی حکیم جی کے یہاں جا پہنچتیں۔ دھوپ کھانے کے بہانے کھسکتی کھسکتی کیاری کے پاس منڈیر تک پہنچ جاتیں۔ پہلے ایک پتی توڑ کر سونگھنے کے بہانے چٹکی میں مسلتیں۔ حکیم جی کی بہو کی آنکھ بچی اور مارا نانی نے کوتھمیر پہ بکٹا۔ کوتھمیر مہیا کرنے کے بعد ظاہر ہے دو نوالے کی حقدار ہو ہی جاتیں۔

نانی اپنے ہاتھ کی صفائی کے لیے سارے محلّے میں مشہور تھیں۔ کھانے پینے کی چیز دیکھی اور لقمہ مار گئیں۔ بچے کے دودھ کی پتیلی منہ سے لگائی، دو گھونٹ غٹ غٹ پیے۔ شکر کی پھنکی ماری۔ گڑ کی ڈلی تالو سے چپکائی مزے سے دھوپ میں بیٹھی چوس رہی ہیں۔ ڈلی اٹھائی نیفے میں اُڑس لی۔ دو چپاتیاں لیں اور آدھی نیفے کے اِدھر آدھی اُدھر اور اوپر سے موٹا کُرتا آہستہ آہستہ حسبِ معمول کراہتی کونتی کھسک گئیں۔ سب جانتے تھے۔ پر کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ نانی کے بوڑھے ہاتھوں میں بجلی کی سی سُرعت تھی اور بے چبائے نگل جانے میں وہ کوئی عیب نہ سمجھتی تھیں۔ دوسرے ذرا سے شبہے پر ہی وہ فیں مچانے پر تل جاتی تھیں اور اتنی قسمیں کھاتی تھیں۔ قرآن اٹھانے کی دھمکیاں دیتی تھیں کہ توبہ بھلی۔ اب کون اُن سے جھوٹا قرآن اٹھوا کر اپنی قبر میں بھی کیڑے پڑوائے۔

چٹوری، چور اور چکمہ باز ہونے کے علاوہ نانی پرلے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو اُن کا وہ برقع تھا جو ہر دم اُن کے اوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس برقع میں نقاب بھی تھی پر جوں جوں محلے کے بوڑھے بوڑھے چل بسے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے نقاب کو خیرباد کہہ دیا۔ مگر گنگھوروں دار فیشن ایبل برقع کی ٹوپی اُن کی کھوپڑی پر چپکی رہتی۔ آگے چاہے نہیں کرتے کے نیچے بنیان ہو پر پیچھے برقع بادشاہوں کی جھول کی طرح لہراتا رہتا اور یہ برقع صرف ستر ڈھانکنے کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی سے لیا جاتا تھا۔ اوڑھنے بچھانے اور گٹھری مٹری کر کے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اُسے تولیہ کے طور پر استعمال کرتیں۔ پنج وقتہ نماز کے لیے جانماز اور جب محلّے کے کتّے دانت ہیں تو ان سے بچاؤ کے لیے اچھی خاصی ڈھال۔ کتا پنڈلی پر لپکا اور نانی کے برقع کا گھیرا اُس کے منہ پر چھنکارا۔ نانی کو برقع بہت پیارا تھا۔ فرصت میں بیٹھ کر حسرت سے اُس کے بڑھاپے پر بسورا کرتیں۔ جہاں کوئی چندی کتر ملی اور احتیاط سے پیوند چپکا لیا۔ وہ اس دن کے خیال سے ہی لرز اٹھتی تھیں جب یہ برقع بھی چل بسے گا۔ اڑھائی گز لٹھا کفن کو جڑ جاوے یہی بہت جانو۔

نانی کا کوئی مستقل ہیڈکوارٹر نہیں۔ سپاہی جیسی زندگی ہے آج اس کے دالان میں تو کل اُس کی صحنچی میں جہاں جگہ ملی پڑاؤ ڈال دیا۔ جب دھتکار پڑی کوچ کر کے آگے چل پڑیں۔ آدھا برقع اوڑھا آدھا بچھایا لمبی تان لی۔

مگر برقع سے بھی زیادہ وہ جس کی فکر میں گھلتی تھیں وہ تھی ان کی اکلوتی نواسی ننھی۔ کڑک مرغی کی طرح نانی پر پھیلائے اُسے پوٹے تلے دابے رہتیں۔ کیا مجال جو نظر سے اوجھل ہو جائے۔ مگر جب ہاتھ پیروں نے جواب دے دیا اور محلے والے چوکنّے ہو گئے۔ اُن کی جوتیوں کی گھس گھس سن کر ہی چاق چوبند ہو کر مورچہ پر ڈٹ جاتے۔ ڈھٹائی سے نانی کے اشارے کنایہ سے مانگنے کو سُنا اَن سُنا کر جاتے۔ تو نانی کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ ننھی کو اُس کے آبائی پیشے یعنی اوپر کے کام پر لگا دیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد انھوں نے اُسے ڈپٹی صاحب کے یہاں روٹی کپڑا اور ڈیڑھ روپیہ مہینہ پر چھوڑ ہی دیا۔ پر وہ ہر دم سائے کی طرح لگی رہتیں۔ ننھی نظر سے اوجھل ہوئی اور وہ بلبلائیں۔ بدنصیب

کا ملکی کہیں بڑھے ہاتھوں سے ملتا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ڈپٹیائن اپنے بھائی کے گھر بیٹے کا پیغام لے کر گئی ہوئی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ نانی منڈیر پہ جامن کی چھاؤں میں جھپکی لے رہی تھی۔ ڈپٹیائن تو اپنے ماموں کے ہاں بیٹے کی بات لے کر گئی ہوئی تھیں۔ سرکار خس خانے میں قیلولہ فرما رہے تھے۔ ننھی پنکھے کی ڈوری تھامے اونگھ رہی تھی۔ پنکھا رک گیا اور سرکار کی نیند ٹوٹ گئی۔ شیطان جاگ اٹھا اور ننھی کی قسمت سو گئی۔

کہتے ہیں بڑھاپے کے آسیب سے بچنے کے لیے مختلف ادویات اور طلاؤں کے ساتھ حکیم بیا چوزوں کی یخنی بھی تجویز فرماتے ہیں۔ نو برس کی ننھی چوزہ ہی تو تھی۔

مگر جب ننھی کی نانی کی آنکھ کھلی تو ننھی غائب۔ محلہ چھان مارا کوئی سراغ نہ ملا مگر رات کو جب نانی تھکی ماندی کوٹھری کو لوٹی تو کونے میں دیوار سے لگی ہوئی ننھی زخمی چڑیا کی طرح اپنی پھیکی پھیکی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ نانی کی گھگی بندھ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے وہ اسے گالیاں دینے لگی۔ "مالزادی اُچھا چھکا۔ یہاں کاں کر مری ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پنڈلیاں سوجھ گئیں۔ ٹھہر تو جا سرکار سے کیسی چار چوٹ کی مار لگواتی ہوں۔"

مگر ننھی کی چوٹ زیادہ دیر نہ چھپ سکی۔ نانی سر پہ دوہتڑ مار مار کر چنگھاڑنے لگی۔ پڑوسن نے سنا تو سر پکڑ کر رہ گئیں۔ اگر صاحبزادے کی لغزش ہوتی تو شاید کچھ ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی۔ مگر ڈپٹی صاحب …… محلے کے مکھیا تین نواسوں کے نانا۔ پنج وقتہ نمازی۔ ابھی پچھلے دنوں مسجد میں چٹائیاں اور لوٹے رکھوائے۔ منہ سے پھوٹنے والی بات نہیں۔

لوگوں کے رحم و کرم کی عادی نانی نے آنسو پی کر ننھی کی کمر سینکی آٹے گڑ کا حلوا کھلا اور اپنی جان کو صبر کر کے بیٹھ رہی۔ دو چار دن لوٹ پوٹ کر ننھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور چند دنوں ہی میں سب کچھ بھول بھال گئی۔

مگر محلہ کی شریف زادیاں نہ بھولیں۔ چھپ چھپ کر ننھی کو بلاتیں۔

"نئیں …… نانی مارے گی۔" ننھی ٹالتی۔

"لے یہ چوڑیاں پہن لیجو۔ نانی کو کیا خبر ہو گی ……" بیویاں بے قرار ہو کر پھسلاتیں ……

"کیا ہوا …… کیسے ہوا ……" کی تفصیل پوچھی جاتی۔ ننھی کچی کچی معصوم تفصیلیں دیتی۔ بیویاں ناکوں پر دوپٹے رکھ کر کھلکھلاتیں۔

ننھی بھول گئی …… مگر قدرت نہ بھول سکی۔ کچی کلی قبل از وقت توڑ کر کھلانے سے پنکھڑیاں جھڑ جاتی ہیں …… ٹھنٹھ رہ جاتا ہے۔ ننھی کے چہرے پر سے بھی نہ جانے کتنی معصوم پنکھڑیاں جھڑ گئیں۔ چہرے پر پھٹکار اور رودڑاپن۔ ننھی بچی سے لڑکی نہیں بلکہ پھلانگ مار کر ایک دم عورت بن گئی۔ وہ قدرت کے مشاق ہاتھوں کی سنواری بھرپور عورت نہیں۔ بلکہ ٹیڑھی میڑھی مورت جس پر کسی دیو نے دو گز لمبا پاؤں رکھ دیا ہو۔ ٹھنگنی۔ موٹی۔ کچوراسی جیسے کچی مٹی کا کھلونا کمہار کے گھٹنے تلے دب گیا ہو۔

میلی صافی سے کوئی ناک پونچھے چاہے کوٹے، کون پوچھتا ہے۔ راہ چلتے اس کے چٹکیاں بھرتے۔ مٹھائی کے دونے پکڑاتے۔ ننھی کی آنکھوں میں شیطان تھرک اٹھتا …… مگر اب نانی بجائے اسے حلوے مانڈے ٹھسانے کے اس کا دھوبی گھاٹ کرتی، مگر میلی صافی کی دھول بھی نہ جھڑتی۔ جانو، ربڑ کی گیند، ٹپا کھایا اور اچھل گئی۔

چند سال ہی میں ننھی کی چومکھی سے محلہ لرز اٹھا۔ سنا کہ ڈپٹی صاحب اور صاحبزادے میں کچھ تن گئی۔ پھر سنا مسجد کے ملاجی

گو رجبا کمہار نے مارتے مارتے چھوڑا۔ پھر سُنا صدیق پہلوان کا بھانجہ مستقل ہو گیا۔

آئے دن ننھی کی ناک کٹتے کٹتے بچتی اور گلیوں میں لٹھ پونگا ہوتا۔

اور پھر ننھی کے تلوے جلنے لگے۔ پیر دھرنے کی رتی بھر جگہ نہ رہی۔ صدیق پہلوان کے بھانجے کی پہلوانی اور ننھی کی جوانی نے محلّہ والوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ سنتے ہیں دِلّی، بمبئی میں اس مال کی بہت کھپت ہے۔ شاید دونوں وہیں چلے گئے۔

جس دن ننھی بھاگی اس دن نانی کے فرشتوں کو بھی شبہ نہ ہوا۔ دو تین دن سے نگوڑی چپ چپ سی تھی۔ نانی سے بدزبانی بھی نہ کی۔ چپ چاپ آپ ہی آپ بیٹھی ہوا میں گھورا کرتی۔

"اے ننھی روٹی کھا لے۔" نانی کہتی۔

"نانی بی بھوک نہیں!"

"اے ننھی اب دیر ہو گئی سو جا۔"

"نانی بی نیند نہیں آتی۔"

رات کو نانی کے پیر دبانے لگی۔

"نانی بی ...... اے نانی بی "سبحانک اللّٰھم" سُن لو یاد ہے کہ نہیں۔ نانی نے سُنا فر فر یاد!"

"ہا بیٹی اب سو جا۔" نانی نے کروٹ لے لی۔

"اری مرتی کیوں نہیں۔" نانی نے تھوڑی دیر بعد اُسے صحن میں کھٹ پٹ کرتے سُن کر کہا۔ "مجھی خانگی نے اب آنگن بھی پلید کرنا شروع کیا کون حرامی ہے جسے آج گھر میں گھسا لائی ہے۔"

پر صحن میں گھور گھور کر دیکھنے پر نانی سہم کر رہ گئی۔ ننھی عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ اور صبح ننھی غائب ہو گئی۔

کبھی کوئی دور دیس سے آتا ہے، تو خبر آ جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے ننھی کو ایک بڑے نواب صاحب نے ڈال لیا ہے۔ ٹھم ٹھم ہے منوں سونا ہے بیگموں کی طرح رہتی ہے۔

کوئی کہتا ہے ہیرا منڈی میں دیکھا تھا۔

کوئی کہتا ہے فارس روڈ پر اور کسی نے اُسے سونا گاچی میں دیکھا۔

مگر نانی کہتی ہے ننھی کو ہیضہ ہوا تھا۔ چار گھڑی لوٹ پوٹ کر مر گئی۔

ننھی کا سوگ منانے کے بعد نانی کچھ خبطن بھی ہو گئیں۔ لوگ راہ چلتے چھیڑ خانی کرتے۔

"اے نانی نکاح کر لو ـــــ" بھابی جان چھیڑتیں۔

"کس سے کر لوں؟ لا اپنے خصم سے کرا دے۔" نانی بگڑتیں۔

"اے نانی ملّاجی سے کر لو۔ اللہ قسم تم پر جان دیتے ہیں۔" اور نانی کی مغلظات شروع ہو جاتیں۔ وہ وہ پینترے گالیوں میں نکالتیں کہ لوگ بھونچکے رہ جاتے۔

"مل تو جائے بھڑوا .... داڑھی نہ اکھیڑ لوں تو کہنا۔" مگر جب ملّاجی کبھی گلی کے نکڑ پر مل جاتے تو نانی سچ مچ شرما سی جاتیں۔

علاوہ محلّہ کے لڑکوں بالوں کے نانی کے ازلی دشمن تو موئے لنگوڑے بندر تھے جو پیڑھیوں سے اسی محلّے میں پلتے بڑھتے آئے تھے۔ جو ہر فرد کا کچا کھٹا جانتے تھے۔ مرد خطرناک ہوتے ہیں اور بچے بدذات مگر عورتیں تو صرف ڈرپوک ہوتی ہیں۔ یہ نانی بھی انھیں بندروں میں پل کر بڑھیائی تھیں۔ انھوں نے بندروں کو ڈرانے کے لیے کسی بچّے کی غلیل ہتھیالی تھی۔ اور سر پہ بُرقعہ کا پگڑ باندھ کر وہ غلیل تان کر جب اچکتیں تو بندر تھوڑی دیر کو ششدر ضرور رہ جاتے اور پھر بے توجہی سے ٹہلنے لگتے۔

اور بندروں سے ان کی آئے دن باسی ٹکڑوں پہ جنگ چلتی رہتی۔ محلّہ میں جہاں کہیں شادی بیاہ چالیسواں ہوتا، نانی جوٹھے ٹکڑوں کا ٹھیکہ لے لیتیں۔ لنگر خیرات بٹتی تو بھی چار چار مرتبہ جگہ دے کر حصّہ لیتیں۔ منوں کھانا جوڑ لانے کے بعد وہ اُسے حسرت سے تکتیں! کاش ان کے پیٹ میں بھی اللہ پاک نے کچھ اونٹ جیسا انتظام کیا ہوتا تو کتنے مزے رہتے۔ مزے سے چار دن کی خوراک معدے میں بھر لیتیں چھٹی ہوتی۔ مگر اللہ پاک نے رزق کا اتنا اوٹ پٹانگ انتظام کرنے کے بعد پیٹ کی مشین کیوں اس قدر ناقص بنا ڈالی کہ ایک دو وقت کے کھانے سے زیادہ ذخیرہ جمع کرنے کا ٹھور ٹھکانا نہیں۔ اس لیے نانی ٹاٹ کے بوروں پر جوٹھے ٹکڑے پھیلا کر سکھا لیتیں پھر انھیں مٹکوں میں بھر لیتیں۔ جب بھوک لگی ذرا سے سوکھے ٹکڑے بھگو کر کئے پانی کا چھینٹا دیا چٹکی بھر نون مرچ بُرکا اور لذیذ ملغوبہ تیار۔ لیکن گرمیوں اور برسات کے دنوں میں بارہا یہ نسخہ اُن پر ہیضہ طاری کر چکا تھا۔ چنانچہ بُس جانے پر طوعاً و کرہاً اُن ٹکڑوں کو اونے پونے بیچ ڈالتیں تاکہ لوگ اپنے کتوں اور بکریوں وغیرہ کو کھلا دیں۔ مگر عموماً کتوں اور بکریوں کے معدے نانی کے ڈھیٹ معدے کا مقابلہ نہ کر پاتے اور لوگ مول تو کیا تحفتاً بھی ان فواکہات کو قبولنے پر تیار نہ ہوتے۔ وہی عزیز از جان جوٹھے ٹکڑے جنھیں بٹورنے کے لیے نانی کو ہزاروں صلواتیں اور ٹھوکریں سہنا پڑتیں اور جنھیں دھوپ میں سکھانے کے لیے انھیں پوری بندر جاتی سے جہاد مول لینا پڑتا۔ جہاں ٹکڑے پھیلائے گئے اور بندروں کے قبیلے کو بے تار برقی خبر پہنچی۔ اب کیا ہے غول در غول دیواروں پہ ڈٹے بیٹھے ہیں۔ کھپریلوں پر دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ چھپّر کھسوٹ رہے ہیں اور آتے جاتے پہ خوخیا رہے ہیں۔ نانی بھی اس وقت مردِ میدان بنی سر پہ برقعہ کا ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں غلیل لیے مورچہ پر ڈٹ جاتیں۔ سارا دن "لگے۔ لگے" کر کے شام کو بچا کھچا کوڑا بٹور بندروں کی جان کو کوستی نانی اپنی کوٹھری میں تھک کر سو رہتیں۔

بندروں کو اُن سے کچھ ذاتی قسم کی پرخاش ہو گئی تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیوں جہان بھر کی نعمتوں کو چھوڑ کر صرف نانی کے ٹکڑوں پہ ہی حملہ آور ہوتے۔ اور کیوں بدذات لال کھائے والا ان ہی کا عزیز از جان تکیہ لے بھاگتا۔ وہ تکیہ جو ننھی کے بعد نانی کا واحد عزیز اور پیارا دنیا میں رہ گیا تھا۔ وہ تکیہ جو برقعہ کے ساتھ اُن کی جان پہ ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ جس کی سیونوں کو وہ ہر وقت پکا ٹانکہ مارتی رہتی تھیں۔ بارہا نانی کسی کونے کھدرے میں بیٹھی تکیہ سے ایسے کھیلا کرتیں جیسے وہ ننھی سی بچی ہوں اور وہ تکیہ اُن کی گڑیا، وہ اپنے سارے دُکھ اُس تکیے ہی سے کہہ کر جی ہلکا کر لیا کرتی تھیں۔ جتنا جتنا انھیں تکیہ پہ لاڈ آتا وہ اس کے ٹانکے پکے کرتی جاتیں۔

قسمت کے کھیل دیکھئے نانی منڈیر سے لگی برقعہ کی آڑ میں نیفہ سے جوئیں چُن رہی تھیں کہ بندر دھم سے کودا اور تکیہ لے یہ جا وہ جا۔ ایسا معلوم ہوا کوئی نانی کا کلیجہ نوچ کر لے گیا۔ وہ دھاڑیں وہ چلائیں کہ سارا محلّہ اکٹھا ہو گیا۔

بندروں کا قاعدہ ہے کہ آنکھ بچی اور کٹورا گلاس لے بھاگے اور چھجے پر بیٹھے دونوں دونوں ہاتھوں سے کٹورا

دیوار پر گھس رہے ہیں۔ کٹورے کا مالک نیچے کھڑا چمکار رہا ہے۔ پیاز دے روٹی دے جب بندر میاں کا پیٹ بھر گیا کٹورا پھینک اپنی راہ لی۔ نانی نے مٹکی بھر ٹکڑے لٹا دیئے پر حرامی بندر نے تکیہ نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ سو جتن کیے گئے مگر اُس کا جی نہ پگھلا۔ اور اُس نے مزے سے تکیہ کے غلاف پیاز کے چھلکوں کی طرح اتارنے شروع کیے۔ وہی غلاف جنھیں نانی نے چندھی آنکھوں سے گھور گھور کر پکے ٹانکوں سے گونتھا تھا۔ جوں جوں غلاف اترتے جاتے نانی کی بدحواسی اور بلبلاہٹ میں زیادتی ہوتی جاتی۔ اور آخری غلاف بھی اتر گیا۔ اور بندر نے ایک ایک کرکے چھجہ پر سے ٹپکانا شروع کیے۔ روئی کے گالے نہیں بلکہ شبن کی فتوئی۔ نبو سقّے کا انگوچھا...... حسینہ بی کی انگیا........ منی بی کی گڑیا کا غرارہ۔ رحمت کی اوڑھنی اور خیراتی کا کچھنا.........

خیرن کے لونڈے کا طمنچہ...... منشی جی کا مفلر اور ابراہیم کی قمیص کی آستین معہ کف؛

صدیق کی تہمد کا ٹکڑا۔ آمنہ بی کی سرمہ دانی اور بفاطن کی کجلوٹی۔ سکینہ بی کی افشاں کی ڈبیہ —— ملاجی کی تسبیح کا امام اور باقر میاں کی سجدہ گاہ۔

بسم اللہ کا سوکھا ہوا نال اور کلاوہ میں بندھی ہوئی ننھی کی پہلی سالگرہ کی ہلدی کی گانٹھ، دوب اور چاندی کا چھلا۔ اور بشیر خاں کا گلٹ کا تمغہ جو اُسے جنگ سے زندہ لوٹ آنے پر سرکارِ عالیہ سے ملا تھا۔

مگر کسی نے اِن چیزوں کو نہ دیکھا —— بس دیکھا تو اُس چوری کے مال کو جسے سالہا سال کی چھاپہ ماری کے بعد نانی نے لکھ لوٹ جوڑا تھا۔

"چور —— بے ایمان...... کمینی۔"

"نکالو بڑھیا کو محلے سے۔"

"پولیس میں دے دو۔"

"ارے اس کی توشک بھی کھولو اس میں نہ جانے کیا کیا ہوگا۔" غرض جو جس کے منہ میں آیا کہہ گیا۔

نانی کی چیخیں ایک دم رک گئیں۔ آنسو خشک۔ سر نیچا۔ اور زبان گنگ! کاٹو تو خون نہیں۔ رات بھی جوں کی توں دونوں گھٹنے مٹھیوں میں دابے ہل ہل کر سوکھی سوکھی ہچکیاں لیتی رہیں۔ کبھی اپنے ماں باپ کا نام لے کر کبھی میاں کو یاد کرکے کبھی بسم اللہ اور ننھی کو پکار کر بین کرتیں........ دم بھر کو اونگھ جاتی پھر جیسے پرانے ناسوروں میں چیونٹے چٹکنے لگتے اور وہ بلبلا کر چونک اٹھتیں۔ کبھی جھکی جھکی روتیں کبھی خود سے باتیں کرنے لگتیں۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا اُٹھتیں اور پھر تاریکی میں سے کوئی پرانی یاد کا بھالا کھینچ مارتا اور وہ بیمار کتے کی طرح نیم انسانی آواز سے سارے محلے کو چونکا دیتیں۔ دو دن اسی حال میں بیت گئے۔ محلہ والوں کو آہستہ آہستہ احساسِ ندامت ہونا شروع ہوا۔ کسی کو بھی تو اُن چیزوں کی اشد ضرورت نہ تھی۔ برسوں کی کھوئی چیزوں کو کبھی کا رو پیٹ کر بھول چکے تھے۔ وہ بیچارے خود کونسے لکھ پتی تھے۔ تنکے کا بوجھ بھی ایسے موقع پر انسان کو شہتیر کی طرح لگتا ہے۔ لوگ ان چیزوں کے بغیر زندہ تھے۔ شبن کی فتوئی اب سردیوں سے دھینگا مشتی کرنے کے قابل کہاں تھی، وہ اُس کے ملنے کے انتظار میں اپنی بڑھوار تھوڑی روک بیٹھا تھا۔ حسینہ بی نے انگیا چولی کی اہمیت کو بیکار سمجھ کر اُسے خیر باد کہہ دیا تھا۔ منی کی گڑیا کا غرارہ کس مصرف کا وہ تو کبھی کی گڑیوں کی عمر سے گزر کر ہنڈکلیوں کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ محلے والوں کو نانی کی جان لینا تھوڑی منظور تھی۔

پرانے زمانہ میں ایک دیو تھا۔ اُس دیو کی جان تھی ایک بھونرے میں۔ سات سمندر پار ایک غار میں ایک صندوق تھا۔ اُس صندوق

میں ایک اور صندوق اور اُس صندوق میں ایک ڈبیہ تھی جس میں ایک بھونرا تھا۔ ایک بہادر شہزادہ آیا........ اور اُس نے پہلے بھونرے کی ایک ٹانگ توڑ دی، اُدھر دیو کی ایک ٹانگ جادو کے زور سے ٹوٹ گئی پھر اُس نے دوسری ٹانگ توڑی اور دیو کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی پھر اُس نے بھونرے کو مسل ڈالا اور دیو مر گیا۔

نانی کی جان بھی تکیہ میں تھی۔ اور بندر نے وہ جادو کا تکیہ دانتوں سے چیر ڈالا۔ اور نانی کے کلیجے میں گرم سلاخ اُتر گئی۔

دنیا کا کوئی دکھ کوئی ذلّت کوئی بدنامی ایسی نہ تھی جو نصیب نے نانی کو نہ بخشی ہو۔ جب سہاگ کی چوڑیوں پر پتھر گرا تھا تو سمجھی تھیں اب کوئی دن کی مہمان ہیں، پر جب، بسم اللہ کو کفن پہنانے لگیں تو یقین ہو گیا کہ اونٹ کی پیٹھ پر یہ آخری تنکا ہے۔ اور جب ننھی منہ پر کالکھ لگا گئی تو نانی سمجھیں بس یہ آخری گھاؤ ہے۔

زمانہ بھر کی بیماریاں پیدائش کے وقت سے جھیلیں سات بار تو چیچک نے اُن کی صورت پر جھاڑو پھیری۔ ہر سال تیج تہوار کے موقع پر ہیضہ کا حملہ ہوتا۔

تیرا میرا گو موت دھوتے دھوتے انگلیوں کے پورے سڑ گئے۔ برتن مانجھتے مانجھتے ہتھیلیاں چھلنی ہو گئیں۔ ہر سال اندھیرے اُجالے اونچی نیچی سیڑھیوں سے لڑھک پڑتیں۔ دو چار دن لوٹ پوٹ کر پھر گھسٹنے لگتیں۔ پچھلے جنم میں نانی ضرور کتے کی کلی رہی ہوں گی۔ جبھی تو اتنی سخت جان تھیں۔ موت کا کیا واسطہ جو اُن کے قریب پھٹک جائے۔ لبیریاں لگائے پھریں گی مگر مُردہ کا کپڑا تن سے نہ چھو جائے، کہیں مرنے والا سادٹوں میں موت نہ چھپا گیا ہو جو نازوں کی پالی نانی کو آن دبوچے! مگر یوں عاقبت بندوں کے ہاتھوں نٹے گی، اس کی کسے خبر تھی۔ صبح سویرے بہشتی مشک ڈالنے گیا تو دیکھا نانی کھپریل کی سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہیں، منہ کھلا ہے، مکھیاں نیم وا آنکھوں کے کونوں میں گھس رہی ہیں۔ یوں نانی کو سوتا دیکھ کر لوگ انھیں مردہ سمجھ کر ڈر جایا کرتے تھے۔ مگر نانی ہمیشہ ہڑبڑا کر بلغم تھوکتی جاگ پڑتی تھیں اور ہونسنے والے کو ہزار صلواتیں سنا ڈالتی تھیں۔

مگر اُس دن سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی نانی دنیا کو ایک مستقل گالی دے کر چل بسیں! زندگی میں کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ کروٹ کروٹ کانٹے تھے۔ مرنے کے بعد کفن میں بھی نانی اکڑوں لٹائی گئیں۔ ہزار کھینچ تان پر بھی اکڑا ہوا جسم سیدھا نہ ہوا۔

الحمد للہ

احمد ندیم قاسمی

شادی سے پہلے مولوی ابل کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ کھدر یا لٹھے کی تہبند کی جگہ گلابی رنگ کی سبز دھاریوں والی ریشمی خوشابی لنگی، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص جس کی آستینوں کی چنٹوں کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا تھا۔ اودے رنگ کی مخمل کی واسکٹ جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا تو دوسری جیب میں نسوار کی نقرئی ڈبیا ہوتی تھی۔ سر پر بادامی رنگ کی مشہدی لنگی جس میں سے کلاہ کی مطلا چوٹی چمکتی رہتی تھی۔ ہاتھ میں عصا جس پر جگہ جگہ گلٹ کے بند اور پیتل کے کوکے جڑے تھے۔ بالوں میں کوئی بڑا اکا فرنیل جس کی خوشبو گلیوں میں لٹکتی رہ جاتی تھی۔ تدلے اوپر اٹھی ہوئی پتلیوں والی آنکھوں کے پپوٹوں میں سرمہ تو جیسے رچ کر رہ گیا تھا۔ انگلیوں میں حاجیوں کے لائے ہوئے بڑے بڑے نگینوں والی چاندی کی انگشتریاں جو وضو سے پہلے دن میں چار یا پانچ بار اترتی تھیں مگر ان کی ترتیب میں کبھی کوئی فرق نہ دیکھا گیا۔ اور پھر مولوی ابل کی آواز! شکر ہے اللہ تعالے کی بخشی ہوئی یہ نعمت کلام پاک کی تلاوت میں استعمال ہوئی ورنہ اگر مولوی ابل ماہیئے کی کلی الاپ دیتا تو گاؤں بھر کی لڑکیوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ہر عید پر خطبے کے بعد اس کے سامنے گھر گھر سے جمع کئے ہوئے ڈیڑھ سو روپوں کی پوٹلی چھن سے آ گرتی تو وہیں نمازیوں کے سامنے چالیس پچاس روپے گاؤں کے مسکینوں، محتاجوں میں بانٹ دیتا اور ان سے کہتا "مجھے دعائیں نہ دو، اس اللہ جل شانہٗ کو یاد کرو جو پتھر میں کیڑا پیدا کرتا ہے تو وہیں سے اسے خوراک بھی پہنچاتا ہے۔ مجھے دعائیں نہ دو، مجھے اس نے کیا نہیں دیا۔ صحت، اطمینان، بے فکری، مجھے تو اس کی رحمتوں کے خزانے سے اور کچھ نہیں چاہئے۔"

لیکن شادی کے بعد اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں نے ایک اور صورت اختیار کر لی۔ مولوی ابل کے ہاں اولاد کا کچھ ایسا تانتا بندھا کہ جب ایک سال اس کی بیوی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ سیدھا حکیم کے ہاں دوڑا گیا۔ اسے یقین تھا کہ بچہ نہیں ہوا تو زیب النساءؔ کے نظامِ تخلیق میں کوئی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔ زیب النساء کے ہاں بچہ نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے پوری رات گزر جانے پر بھی سورج طلوع نہ ہو۔ اور جب اگلے سال سورج طلوع ہوا تو مولوی ابل کی جان میں جان آئی۔ یقیناً اولاد کی افراط خدائے ذوالجلال کی رحمتوں میں سے ایک رحمت تھی۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ریشمی خوشابی لنگی صافی بن کر رہ گئی تھی۔ بوسکی کی قمیص برسوں پہلے پوتڑوں کے روپ اختیار کرتی غائب ہو چکی تھی۔ اور اب اس کی جگہ گاڑھے کے چولے نے لے لی تھی جو کئی بار دھلنے کے باوجود یوں میلا میلا سا لگتا تھا جیسے اسے بنتے وقت جلاہے نے سوت کے تانے بانے میں تھوڑی سی غلاظت بھی بن ڈالی ہے۔ مطلا کلاہ کی داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ انگشتریوں کی چاندی اور عصا کا گلٹ لڑکیوں کے بندوں جھمکوں کی نذر ہو چکا تھا۔ سرخ سرخ پپوٹوں والی

آنکھوں میں پتلیاں کچھ اس طرح بہت اوپر اٹھ گئی تھیں کہ مولوی ابل ہر وقت نزع کے کرب میں گرفتار نظر آتا تھا۔ تابڑ توڑ بہت سے بچوں کے ساتھ زمانے میں بھی تابڑ توڑ تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ مولوی ابل نے اپنی پہلونٹی کی بیٹی مہر النساء کے لیے جو جوتا ایک روپے میں خریدا تھا اب وہی جوتا موچی نے اس کی سب سے چھوٹی بچی عمدۃ النساء کے لیے چھ روپے میں تیار کیا تھا۔ اور جب مولوی ابل نے شکوہ کیا تو موچی بولا "میں نے تو مولوی جی آپ کی خاطر زیادہ دام نہیں مانگے۔ کوئی اور ہوتا تو چھ چھوڑ دس مار لیتا۔ چمڑے کو آگ لگ گئی ہے۔ قیمتیں یوں ایکدم زن سے اوپر ہو گئی ہیں کہ لگتا ہے دنیا بھر کی گائیں بھینسیں کہیں کوہ قاف پر بھیج دی گئی ہیں۔ پونے چھ کی لاگت ہے ایک چونی کما رہا ہوں، چلئے آپ چونی کو بھی جانے دیجئے۔ اس میں ذرا سا بھی جھوٹ ہو تو ڈوب کر مروں۔ جنازہ تک نصیب نہ ہو۔"

اگر دعاؤں کے بدلے میں آسمانوں سے ضروریاتِ زندگی کا اترنا ممکن ہوتا تو اس روز مولوی ابل خدا سے اپنی عمدہ کے لیے جوتے مانگتا۔ رات کو زیب النساء سے مشورہ کیا۔ اور جب اس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے لحاف کا ایک کونا اٹھا کر مولوی ابل کو عمدۃ النساء کے پاؤں دکھائے تو وہ بچوں کی طرح ایک دم رو دیا۔ اور دوسرے روز صبح کی نماز اور وظائف کے بعد پونے چھ روپے موچی کی نذر کر آیا۔ اور موچی کی دکان سے اٹھ کر گلی میں آیا تو اللہ جل شانہٗ کو حاضر و ناظر مان کر نسوار سے توبہ کر لی۔

نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی اور ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھیں اور پھر اولاد بڑھ رہی تھی۔ اور اولاد کے ساتھ مولوی ابل کے بالوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی۔ ادھر مہر النساء نے چودھویں سال میں قدم رکھا ادھر مولوی ابل کی یہ حالت ہو گئی کہ رکوع میں گیا ہے تو اٹھنے کا نام نہیں لے رہا۔ سجدے میں پڑا ہے تو بس پڑا ہے۔ ہوشیار مقتدیوں کو وقت پر کھانسی کا دورہ نہ پڑتا تو ممکن ہے مولوی ابل ایک ہی سجدے میں ظہر کو عصر سے ملا دیتا۔ رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے کی سعادت حسبِ دستور اسی کے سپرد ہوئی، مگر وہ مولوی ابو البرکات جو آیات یا الفاظ کی غلطی تو کیا کبھی زیر زبر کی غلطی کا بھی مرتکب نہیں ہوا تھا۔ البقرہ سے النساء میں جا نکلا۔ اور سورۂ رحمٰن پڑھنا شروع کی تو ایک رکعت ہی میں اسے دوبارہ پڑھ ڈالا۔ چودھری فتح داد کرسی نشین و ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ نے جب اسے اس استغراق پر سرزنش کی تو ایک بار تو مولوی ابل کے جی میں آئی کہ پکار اٹھے "آپ کے ہاں تو لونڈوں کی کھیپ ہے نا چودھری صاحب۔ آپ کے بھی کوئی بیٹی ہوتی اور وہ اب جوان ہو گئی ہوتی تو میں آپ کو سمجھاتا کہ ایک سورت کو دوبارہ کیسے پڑھ لیا جاتا ہے۔" لیکن چودھری فتح داد کی یہ سرزنش زیادہ تر مذہبی نوعیت کی تھی۔ ورنہ یہی چودھری ہی تو تھا جو برسوں سے مولوی ابل کے گھر میں ہر شام کو گھی لگی ایک روٹی اور دال شوربے کا ایک سکورا اس التزام سے بھجواتا تھا کہ جیسے ایک وقت ناغہ ہو گیا تو سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا۔ اور حد یہ تھی کہ جس روز روٹی یا دال سالن بھجوانے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو چودھری فتح داد بنفسِ نفیس مولوی ابل سے معافی مانگنے آتا "آج وظیفہ دیر سے پہنچا ہو گا قبلہ! میں اس غفلت کی معافی مانگتا ہوں۔ چودھرائن ذرا بیمار تھی اور کھانا نائن نے تیار کیا۔ وہ حرامزادی یہ بھول گئی کہ آپ کو یہاں سے وظیفہ وقت پر نہ گیا تو مجھے ایک روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرنا ہو گا۔"

یہ "وظیفے" مختلف نوعیت کے تھے۔ اور جمعرات کو تو مولوی ابل کے ہاں نہ آٹا گندھتا تھا اور نہ ہنڈیا چڑھتی تھی۔

مولوی اُبل کے عقیدت مندوں کے ہاں سے ایک درجن کے قریب چپڑی جاندار روٹیاں آجاتی تھیں۔ ادھر زیب النساء نے گھر میں لڑکیوں کو قرآن شریف کا درس دینے کا سلسلہ بیاہ کے تین مہینے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا۔ جمعرات کو ہر لڑکی چھوٹے چھوٹے سے "وظیفوں" پر ذرا ذرا سی شکر رکھ کر لاتی تو زیب النساء کو دو چنگیریں ان کے لیے الگ رکھ دینا پڑتیں۔ اس روز دونوں وقت سب خوب سیر ہو کر کھاتے۔ جو وظیفے باقی بچتے انھیں دھوپ میں سکھا لیا جاتا اور مہینے میں چار بار انھیں گڑ کے شربت میں اُبال کر میٹھے ٹکڑے تیار کیے جاتے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ انسان کو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی کے علاوہ پیٹ ڈھانکنے کے لیے کپڑا بھی تو چاہیے۔ چودھری فتح داد ہر نئی فصل پر مولوی اُبل کو ایک پوشاک بھی پیش کرتا تھا لیکن جب یہ پوشاک گھر میں آتی۔ ایکا ایکی درزی کی دوکان سج گئی۔ زیب النساء، مہرن اور زبیدہ اور شمس کو پاس بٹھا کر لٹھے کے تہبند کا تیاپانچا کر کے رکھ دیتی اور یوں ننھوں کے بہت سے چولے نکل آتے۔ ململ کی پگڑی سے بھی کچھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا اور یوں چند مہینوں کے لیے مولوی اُبل کی اولاد بالکل ننگی ہونے سے بچ جاتی۔ اس دوران میں اگر کسی کی نکاح خوانی کے سلسلے میں یا نمازِ جنازہ پڑھانے کے ضمن میں چند روپے آنکلتے تو وہ مہرالنساء کے جہیز کی خاطر ٹین کے ایک ڈبے میں رکھ دیے جاتے۔ بچوں کے پیٹ بڑھ رہے تھے اور باقی جسم سکڑ رہا تھا ——— زیب النساء کے کنگن جو کبھی اس کی سانولی کلائیوں میں گڑے رہتے تھے۔ اب ذرا سے جھٹکے سے پہنچے پر آجاتے تھے اور اس کی لانبی لانبی پلکوں کے نیچے چھپے جوانی کا بھوبھل سرد راکھ بن چکا تھا۔ اور جب وہ پلکیں جھپکتی تھی تو اس کے چہرے پر یہ راکھ اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خود مولوی اُبل زندگی کے ذرا ذرا سے حادثوں کے درمیان بالکل پچی ہو کر رہ گیا تھا۔ انھی دنوں اسے مولوی ابوالبرکات کی بجائے مولوی اُبل کہا جانے لگا تھا۔ کنپٹیوں کے بال تو بالکل سفید ہو چکے تھے اور دانتوں پر مسوڑوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ تلاوت کرتے وقت کئی بار دانتوں کی ریخوں میں سیٹیاں بج اٹھتی تھیں۔ مگر آواز کا ٹھاٹ وہی تھا۔ صحیح مخرج سے نکلے ہوئے حروف یوں بجتے تھے جیسے پیتل کی تھالی پر بلور کی گولیاں گر رہی ہوں۔ البتہ اس آواز میں لرزش سی ضرور آگئی تھی۔ جو پرانے نمازیوں کو بہت اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن چودھری فتح داد کو اس ارتعاش کا سبب معلوم تھا کیونکہ مولوی اُبل اس سے مہرالنساء کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کے سلسلے میں بات کر چکا تھا۔ چودھری نے اس مقصد کے لیے سارے گاؤں پر نظریں دوڑائی تھیں۔ رات کو بستر پر لیٹ کر ایک ایک گھر میں جھانک آیا تھا۔ اور کئی نوجوان اسے اچھے بھی لگے تھے مگر ساری مشکل یہ تھی کہ مولوی اُبل کو سب جانتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ مہرالنساء سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہے، اور سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہوئی جوانی میں خون کم ہوتا ہے اور آنسو زیادہ۔ اور پھر یہ بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ اب مولوی اُبل کو عیدین پر بیس پچیس روپے ملتے جن سے مہرالنساء کا جہیز تو خیر کیا بنا ہوگا دوسرے نو بچوں کے لیے جوتا ٹوپی بھی شاید ہی مہیا ہو سکے ہوں۔ ایک دو جگہ چودھری نے بات بھی کی مگر مخاطب کچھ یوں تیورا کر پیچھے ہٹے جیسے پھول کی پتیوں میں سے اچانک بھڑ نکل آئی ہو۔

لیکن مولوی اُبل اور زیب النساء کی دعائیں رائگاں نہ گئیں۔ انھی دنوں سابقہ خدایار اور حال شمیم احمد شہر سے گاؤں اٹھ آیا اور یہاں کپڑے کی چھوٹی سی دوکان کھول لی۔ خدایار ایک حافظ قرآن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد کے مرنے کے بعد مولوی اُبل کے ہاں قرآن مجید حفظ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جب مسیں بھیگنے لگیں تو بوڑھی ماں کو یہیں گاؤں میں چھوڑ کر شہر بھاگ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ہیڈ کلرک کے ہاں ملازم ہو گیا ہے، اسی ہیڈ کلرک نے کچھ عرصے کے بعد اسے ایک دکان کے سامنے گز بھر جگہ لے دی جہاں وہ کٹ پیس بیچتا رہا اور اپنی ماں کو بھی شہر بلا لیا۔ پھر جب اس نے تجارت میں کافی مہارت حاصل کر لی تو خدایار کی

بجائے شمیم احمد کا نام اختیار کر کے گاؤں آ گیا۔ اس نے بڑی منت خوشامد سے مولوی اُبل کو مجبور کیا کہ وہی اس کی دوکان سے بوہنی کرے تاکہ تجارت میں برکت ہو اور نقد سودا چلتا رہے۔

اس روز اُبل نے اپنے شاگرد اور اس کی بوڑھی ماں کا دل رکھنے کے لیے اپنی زندگی کا شاید سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ زیب النساء کے پاس گیا "عارف کی ماں! شمیم احمد کہتا ہے کہ وہ میری ہی بوہنی سے کاروبار شروع کرے گا، تم کہو تو مہرن کے لیے ایک سوٹ کا کپڑا لے لیں، جہیز کے لیے ضرورت تو ہے ہی، ویسے سارے گاؤں والوں کے سامنے بوہنی کی رسم ادا ہو گی اس لیے ذرا سا رعب بھی بیٹھ جائے گا، پھر شمیم احمد کا دل رکھنا تو میرا فرض ہے۔ ایک تو پرانا شاگرد ہے۔ دوسرے حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا نورِ نظر ہے، تیسرے ــــــ" مولوی اُبل نے رُک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا "عارف کی ماں۔ اللہ جل شانہٗ کی قسم مجھے تو کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے اللہ جل شانہٗ نے اسے مہرن ہی کے لیے آسمان پر سے اتارا ہے۔"

اس بات پر زیب النساء کی آنکھوں کی راکھ ایک لمحے کے لیے تو بھوبھل میں بدل گئی "تمہارے منہ میں گھی شکر" وہ بولی اور گلے میں لٹکتی ہوئی چابی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر نکالی۔ صندوق کھولا اور ٹین کا ڈبہ نکال کر مولوی اُبل کے سامنے رکھ دیا "خدا تیری زبان مبارک کرے، میں تو جب بھی مہرن کو دیکھتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے پراٹھا توے پر دیر تک پڑے پڑے جلنے لگا ہے!" وہ رونے لگی، ساتھ ہی مسکراتی بھی رہی۔ اور جب مہرالنساء کسی کام سے اندر آئی تو فوراً بول اٹھی "بیٹی! باہر دھوپ میں ٹکڑے سوکھ رہے ہیں نا۔ وہاں ہنڈیا الٹ کر رکھ دو، ورنہ سب ٹکڑے کوؤں میں بٹ جائیں گے۔ جاؤ میری بیٹی" ــــــ اور مہرالنساء کے گالوں کی لالی نے جواب دیا کہ میں سب سمجھتی ہوں اماں۔ شمیم احمد کی دوکان پر ابا میاں میری بوہنی کرنے چلے ہیں۔

مہرالنساء باہر چلی گئی تو مولوی اُبل نے ڈبے کی کل متاع مبلغ تینتالیس روپے نکال کر جیب میں رکھے اور اٹھتے ہوئے بولا "دعا کرنا مہرن کی کہیں شادی لگ جائے تو میں پانچ سات برس کے لیے تو پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہو جاؤں"

زیب النساء آنسو پونچھتی اور مسکراتی رہی اور مولوی اُبل شمیم احمد کی دوکان کو چل دیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو ناکوں اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھے یوں کھڑی تھیں جیسے ان کی نظریں رنگ رنگ کے کپڑوں کے ساتھ سِل کر رہ گئی ہوں۔ مولوی اُبل دوکان میں داخل ہوا تو شمیم احمد اس کے قدموں میں بچھ بچھ گیا۔ اور جب مولوی اُبل نے اپنی خوبصورت آواز میں قرآن شریف کی چند آیات کی تلاوت کی تو ایک سماں بندھ گیا۔ تلاوت کے بعد اس نے ایک کپڑا پسند کیا۔ گلابی رنگ پر نیلے پھولوں میں جگہ جگہ زرد رنگ کے نقطے تھے "ایک زنانہ سوٹ کا کپڑا کاٹ دو" مولوی اُبل نے معمول سے ذرا بلند آواز میں کہا اور ایک نظر ہجوم کو بھی دیکھ لیا۔ شمیم احمد نے گز اٹھا کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا اور سات گز کپڑا ناپا۔ قینچی اٹھا کر ایک بار ــــــ پھر بسم اللہ پڑھی اور کپڑا کاٹا۔ تہ کیا اور آخری بار بسم اللہ پڑھ کر مولوی اُبل کے سامنے یوں رکھ دیا جیسے مفت میں ــــــ محض تحفتہً پیش کر رہا ہے۔

"قیمت؟" مولوی اُبل نے اب کے حاضرین کی طرف نہیں دیکھا صرف اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔

شمیم احمد مارے احترام کے سمٹنے لگا۔ ایک لمحے تک ہاتھ ملتا رہا۔ کھنکارا اور بولا "چھ روپے گز کے حساب سے بیالیس روپے ہوئے قبلہ!"

دوکان میں سجے ہوئے سب تھان جیسے مولوی اُبل کے دماغ پر دھب دھب گرنے لگے۔ بوکھلا کر اس نے جیب سے

ہاتھ نکالا اور ایک روپیہ واپس جیب میں رکھ کر باقی رقم شمیم احمد کے سپرد کر دی۔ عورتوں کی انگلیاں ہونٹوں سے اٹھ کر ناک پر اور ناک سے ابھر کر ہوا میں جیسے جم کر رہ گئیں۔ مولوی ابل نے کپڑا بغل میں لیا تو شمیم احمد بولا "قبلہ نے یونہی فرمائی ہے اس لیے میں نے نرخ میں کوئی رعایت نہیں کی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں، پھر تلافی کر دوں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔"

مولوی ابل کپڑے کو بغل میں لے کر اٹھا تو اس کا جی چاہا کہ شمیم احمد سے کہہ دے "اللہ جل شانہٗ ہی تلافی کرے گا عزیزی شمیم احمد۔ اس لیے کہ اگر تم نے کپڑا بیچا ہے تو میں نے بھی اپنی بیٹی بیچنے کی کوشش کی ہے" لیکن یہ تو ایکدم سے جیب کے خالی ہو جانے کا غبار تھا، جس پر اٹھتے ہی اٹھتے اس نے قابو پا لیا اور وہ بولا "یہ تو تمہارا حق تھا شمیم احمد، یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی! اللہ جل شانہٗ تمہیں اور تمہارے کاروبار میں برکت دے۔"

"آمین" شمیم احمد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"آمین" زیب النساء نے کپڑے کی نرمی اور بیقراری اور بہن کو دیکھ کر مولوی ابل کے ان الفاظ کے جواب میں کہا "اللہ کرے اس کپڑے میں ہماری بہن کا سہاگ ہو کے۔"

چند ہی روز بعد ایک شام کو مولوی ابل کے دروازے کی زنجیر بجی، اس وقت آنے والے عموماً چاول یا حلوہ یا کھیر وغیرہ لاتے تھے اس لیے زنجیر کی آواز سنتے ہی چھوٹے بچے ڈیوڑھی کی طرف لپکے۔ لیکن جانے مولوی ابل کو کیا سوجھی۔ خلاف معمول کڑک کر بولا "ٹھہرو" بچے رک گئے۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ عمدۃ النساء تو رو بھی دی، مگر مولوی ابل ان کو دلاسہ دیئے بغیر بڑی بے پروائی سے آگے بڑھا۔ جونہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا خوشبو کا ایک فوارہ سا امڈا اور ساتھ ہی آواز آئی "السلام علیکم قبلہ"

یہ شمیم احمد تھا۔ مصافحہ کے لیے بڑھا تو لٹھے کا نیا تہ بند ٹین کی طرح بج اٹھا۔ اور جب اس نے رک رک کر کہا "آپ کی خدمت میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں قبلہ۔ اسی لیے آپ کو بے وقت زحمت دی" تو مولوی ابل کو شمیم احمد کی پوشاک سے اڑتی ہوئی مہک کچھ گنگناتی محسوس ہوئی۔ یہ درخواست یہاں ڈیوڑھی میں بھی سنی جا سکتی تھی، لیکن مولوی ابل گردن موڑ کر پکارا "میں ابھی آیا عارف کی ماں" اور پھر شمیم احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس تیزی سے مسجد کی طرف چلا کہ شمیم احمد کو نئے تہ بند کا شور و غوغا روکنے کیلئے اسے دوسرے ہاتھ سے گھٹنوں تک اٹھا دینا پڑا۔

دونوں ایک حجرے میں پہنچے تو وہاں چند نمازی آگ جلائے ہارون الرشید کے انصاف کی کہانیاں سن سنا رہے تھے، دوسرے حجرے میں اندھیرا تھا۔ یہاں عموماً اندھیرا ہی رہتا تھا، اور یہ اکتالیس اکتالیس دنوں کی مسلسل چلہ کشی کے لیے مخصوص تھا۔ شمیم احمد کو وہیں چھوڑ کر مولوی ابل پہلے حجرے سے جلتی ہوئی ایک لکڑی اٹھا لایا اور اندھیرے حجرے کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ ڈیوٹ پر کڑوے تیل کا چراغ جل اٹھا۔ اس نے واپس جا کر لکڑی کو الاؤ میں پھینکا اور لپک کے شمیم احمد کے پاس لایا۔ شمیم احمد نے ان چند روز میں داڑھی نہیں منڈوائی تھی۔ گالوں اور گلے پر نہایت سلیقے سے خط بنے تھے اور داڑھی کے خشخشی بالوں پر عطر حنا دیئے کی روشنی میں چمکنے لگا تھا۔

"کہو" مولوی ابل کچھ اس انداز سے بولا جیسے وہ ابھی ابھی اپنے مہمان کے لیے ایک ایوان کی آرائش و زیبائش سے فارغ ہوا ہے۔

شمیم احمد کی آنکھیں جھک گئیں اور ہونٹ ذرا سا کھل کر کانپنے لگے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر چراغ کی طرف دیکھا جس کی لَو

بے پناہ دھواں چھوڑ رہی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے تنکے سے چراغ کی بتی کو کم کیا اور بولا "آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں"

"کہو۔ کہو" مولوی اَبُل نے شمیم احمد کے کندھے کو تھپکا اور پھر چونک کر اس کے دوسرے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔ شمیم احمد کے کندھے کی ہڈی پر گوشت کی اتنی بڑی گیندیں سی رکھی تھیں! "کہو نا عزیزم"

شمیم احمد نے اپنے ہاتھ ملنا شروع کئے، ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کوئی چیز بڑی مشکل سے نگلی اور بولا "اصل میں یہ کام تو میری اماں کا تھا۔ انہی کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیئے تھا مگر پچھلے چند برسوں سے ان کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ بات بات پر رو دیتی ہیں اور برا بھلا کہنے لگتی ہیں، سو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی حاضر ہو جاؤں۔"

"تم نے بہت اچھا کیا" مولوی اَبُل نے بڑی شفقت سے کہا۔

"میں آپ کا پرانا خادم ہوں" شمیم احمد نے سمٹتے، پھیلتے اور پھر سمٹتے ہوئے کہا "میری درخواست یہ ہے کہ حضور مجھے ہمیشہ کے لیے ——" اس نے ایک بار پھر چراغ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر اپنی آستین پر سے کوئی خیالی دھبہ اڑا دیا —— "حضور مجھے ہمیشہ کے لیے اپنی غلامی میں لے لیں" شمیم احمد نے نزع کے سے عالم میں کہا۔

مولوی اَبُل کا جی چاہا کہ چٹکی بجائے، رسماً ذرا ہنستے ہوئے بولا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا شمیم احمد"

شمیم احمد نے بڑی حیرت اور دکھ سے مولوی اَبُل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص نے قرآن مجید کے کئی دشوار مقامات اور فقہ کے بے شمار مشکل مسائل کو آن کی آن میں صاف اور سلیس انداز میں سلجھا دیا وہ "غلامی" کا مطلب نہیں سمجھتا۔ دبی دبی آواز میں جیسے اس نے نزع کی آخری ہچکی لی۔ "جی میرا مطلب ہے کہ حضور —— حضور مجھے اپنی غلامی میں قبول فرما لیں"

اور جیسے اس وضاحت سے مولوی اَبُل کی تسلی ہو گئی! اس نے مزید تشریح طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ شمیم احمد کچھ دیر تک نظریں جھکائے کھڑا ہاتھ ملتا اور مروڑتا رہا، اور جب مولوی اَبُل ایک لفظ تک نہ بولا تو اس نے اپنی نظروں کو جیسے دونوں ہاتھوں سے بصد مشکل اٹھا کر بے انتہا جھجک سے اوپر دیکھا۔ مولوی اَبُل کی داڑھی پر آنسوؤں کے قطرے رک گئے تھے، شمیم احمد کی داڑھی پر عطر حنا چمک رہا تھا اور مولوی اَبُل کی داڑھی میں آنسو جگمگا اور تھرتھرا رہے تھے اور چراغ کی لو پھر ڈھیروں دھواں اگلنے لگی تھی، مگر اب کے شمیم احمد کو بتی کم کر دینے کا خیال نہ آیا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے بے تاب ہو گیا مگر صرف ہونٹوں کو کھول کر رہ گیا، مولوی اَبُل نے ایکا ایکی جیسے کچھ سوچ کر پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "لڑکی تیری کتنی مسکین مخلوق ہے اللہ جل شانہٗ! —— کتنی مسکین!" اس کی آنکھوں سے بہت سے آنسو ایک ساتھ نکلے اور داڑھی کے بالوں نے انھیں پرو لیا "دینے کا مال ہے شمیم احمد! دوں گا۔ کیوں نہیں دوں گا؟ دینا ہی پڑے گی۔ اور پھر تم تو میرے اپنے عزیز ہو، بھائی حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا بیٹا میرا اپنا بیٹا ہے۔ آؤ، ادھر آؤ" —— اور مولوی اَبُل نے شمیم احمد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

جب وہ واپس گھر میں آیا تو زیب النساء نے چند قدم کے فاصلے پر سے ہی کہہ دیا "کہاں سے آ رہے ہو؟ عطر کی لپٹیں آنے لگی ہیں۔"

مہرالنساء توے پر آخری روٹی ڈالے بیٹھی تھی، بولی "سچ ابا جی، سارا گھر مہک اٹھا ہے"

"کیا بات ہے؟" زیب النساء نے پوچھا۔

مولوی اُبل نے بڑی آسودہ خاطری سے بچوں کی قطار کی طرف دیکھا۔ وہ خالی ہاتھ گھر میں آیا تھا اس لیے سب کے منہ لٹکنے لگے تھے۔ سب کو ایک ساتھ پیار کرنا مشکل تھا اس لیے بولا "آج میرے سب بچوں کو روٹی کے ساتھ گڑ کا ایک ایک ٹکڑا بھی ملے گا۔" لٹکے ہوئے چہرے سنبھل اور سنور گئے اور مہرالنساء کی نظریں توے پر گڑ گئیں۔

"بات سنو عارف کی ماں" مولوی اُبل باہر جاتے ہوئے بولا۔

زیب النساء نے سب حالات سن کر کہا "میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو"

مولوی اُبل چہکا "اللہ جل شانہٗ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں۔ اب تو اپنے سر کی قسم دیتی ہے تو نعوذ باللہ کیا تو جل شانہٗ سے بڑی ہے؟ کاش عورت کی عقل یہاں کہیں کھوپڑی کے آس پاس ہوتی!" اور اس نے مسکرا کر زیب النساء کے تالو پر ایک چپت جڑ دی۔

زیب النساء بچوں کی طرح رونے لگی، وہ ان آنسوؤں کا مطلب سمجھتا تھا۔ وہ بھی تو ابھی کچھ دیر پہلے ایسے ہی آنسو گرا چکا تھا۔

ایک لمحے کے بعد وہ آگے بڑھا اور زیب النساء کے بھیگے بھیگے گالوں پر اپنی بھیگی بھیگی داڑھی رکھ دی۔

"دعائیں یوں قبول ہوتی ہیں عارف کی ماں" مولوی اُبل برسوں کی عبادت و ریاضت کا جلال چہرے پر لا کر بولا "الحمدللہ! یوں سنتا ہے سننے والا یوں دیتا ہے چھپر پھاڑ کے سنتی ہو زیبن" آج مولوی اُبل نے سہاگ رات کے بعد شاید پہلی بار زیب النساء کو عارف کی ماں کے بجائے زیبن کہہ کر پکارا تھا۔

زیب النساء آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "جب شمیم خدا یار تھا جب وہ لڑکا تھا اور تمہارے پاس پڑھتا تھا تو یوں چھپی چھپی نگاہوں سے دیکھتا تھا مہرن کو جیسے ——— کبھی کبھی تم مجھے دیکھ لیتے ہو ——— اللہ قسم"

اور ابھی میاں بیوی آنسوؤں کو اچھی طرح خشک بھی نہیں کر پائے تھے کہ ایک بار پھر دروازے کی زنجیر بجی، بچے ڈیوڑھی کی طرف دوڑے۔

"ٹھہرو" اب کے مولوی اُبل کی آواز میں ڈانٹ نہیں تھی "میں خود جاؤں گا" پھر بچوں کے پاس آکر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا "ندیدہ پن بہت برا ہوتا ہے۔ سمجھے؟ ہر آنے والا حلوہ اور چاول دینے نہیں آتا۔ کئی لوگ دوسرے کاموں کے لیے بھی آ نکلتے ہیں۔ سمجھے؟ جاؤ" پھر ذرا بلند آواز میں بولا "انھیں باہر سردی میں نہ نکلنے دو مہرن بیٹی۔ یہی بچے تو میری زندگی کا سرمایہ ہیں"

وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو گرم چادر میں لپٹے ہوئے چودھری فتح داد نے ہاتھ بڑھا کر مولوی اُبل کو باہر گلی میں گھسیٹ لیا اور چھاتی سے لگا کر بولا "مبارک ہو قبلہ! ہزار بار مبارک ہو، آخر میری کوششیں بیکار نہیں گئیں"

اس وقت مولوی اُبل کی نظروں میں چودھری فتح داد کے فرشتہ بننے میں بس پروں کی کمی رہ گئی تھی "اللہ جل شانہٗ کا شکر اور آپ کا احسان ہے" اس نے چودھری سے بڑے پگھلے ہوئے سیال لہجے میں کہا۔

"خدا نے مجھے آپ کے سامنے سرخرو فرما دیا" چودھری فتح داد بولا "اب جلدی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر لیجیے۔ شمیم احمد اچھا لڑکا ہے، پر آخر جوان لڑکا ہے اور پھر دوکاندار ہے۔ دن میں بیسیوں عورتیں اس کی دوکان پر آتی ہیں، اور آپ جانتے ہی ہیں کہ کیسا ننگا زمانہ آ لگا ہے، لڑکے لڑکیاں بارود کے گولے ہو رہے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب پڑے پڑے بھک سے ہو جائیں۔ شمیم احمد کو میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسم و رواج کے مطابق اس کی ماں آپ کے گھر میں آتی مگر بڑھیا سٹھیا سی گئی ہے، کوئی بات

اس کی مرضی کے خلاف ہو تو سات پشتیں توم ڈالتی ہے کمبخت۔ ابھی ابھی شمیم نے آکر بتایا کہ آپ نے حامی بھر لی ہے۔ میں نے اسے جلدی شادی کر لینے پر زور دیا تو بولا کہ آپ ہی قبلہ مولوی صاحب سے تاریخ کا فیصلہ کرا دیجئے۔ سو میں اسی لیے حاضر ہوا تھا۔ آپ کل تک سوچ لیجئے اور یہ ——— یہ ———" چودھری فتح داد نے گرم چادر کے نیچے سے ایک پوٹلی سی نکالی ——— "یہ میری بیٹی کو دے دیجئے گا۔"

مولوی ابل نے خاموشی سے پوٹلی لے لی تو چودھری نے آہستہ سے کہا "اللہ قبول فرمائے!"

"آمین" مولوی ابل کے منہ سے عادتاً یہ لفظ نکل گیا۔

مولوی ابل نے اندر آکر پوٹلی کھولی تو ایک بڑے سے ریشمی رومال میں سو کے ایک نوٹ پر سونے کے دو جھمکے رکھے تھے۔ جن کی بڑے سے بلبلے جتنی کٹوریوں میں جانے نگینے جڑے تھے یا مینا کاری کا کام تھا!

زیب النسا، کسی اور چیز کی امید میں رومال کو جھاڑ کر چہکی "شمیم احمد نے بھیجے ہیں؟"

اور ابھی مولوی ابل جواب نہیں دینے پایا تھا کہ مہر النساء بھاگ کر باہر نکل گئی۔

"ارے!" مولوی ابل نے حیرت سے زیب النسا کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ایک ساتھ بے اختیار ہنس پڑے!

"سمجھ گئی!" زیب النساء باہر دیکھتے ہوئے انگشتِ شہادت کو ناک کی کیل پر رکھ کر بولی۔

"تم نے بھی تو منہ پھاڑ کر کہہ دیا ——— 'شمیم احمد نے بھیجے ہیں؟' ———" مولوی ابل نے زندگی میں شاید پہلی بار عورت کی آواز اور انداز کی نقل اتاری اور پھر جو ابھی تک محض حیرت زدہ تھے، محظوظ ہو کر زور زور سے ہنسنے لگے، عمدۃ النساء ڈرتے ڈرتے جھانوں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چودھری فتح داد دے گیا ہے مہرن کے لیے" مولوی ابل نے بڑی بے پروائی اور رواداری میں راز فاش کیا۔

"اللہ قبول فرمائے" زیب النساء جیسے اپنی قبر میں سے بولی جس پر نیا نیا غلاف چڑھایا گیا تھا۔

چند ہی روز میں مہر النساء مایوں بٹھا دی گئی۔ اس کے ہاتھوں پیروں پر مہندی تھوپ دی گئی۔ ڈھولک تو خیر نہ بجی کیونکہ شادی کا گھر سہی پر آخر مولوی ابوالبرکات کا گھر تھا جس نے حضورِ پُر نور صلعم کی مدینہ میں تشریف آوری پر مدینے کی لڑکیوں کے دفیں بجا بجا کر گانے کے متعلق تو پڑھا تھا مگر ڈھولک کا جواز کہیں موجود نہ تھا۔ اور پنجاب اتنا بدنصیب تھا کہ یہاں اب تک دف کا رواج ہی نہیں چلنے پایا تھا۔ "دف ہو تو لاؤ اور بجاؤ اور گاؤ۔ تم ڈھولک لائیں تو میں اسے اٹھا کر چھت پر پھینک دوں گا" مولوی ابل نے پیرانہ سالی کے ہجوم سے ڈانٹ کر کہا تھا۔ آخر گاؤں کی لڑکیاں مہر النساء کو اپنے دائرے میں لے کر بیٹھ گئیں اور ڈھولک کے بغیر ہی اپنی سُریلی لایوں سے رات بھر اس کے گرد محبت اور دوستی، پھولوں اور پھواروں، ملاقاتوں اور جدائیوں کے طلسمات بنتی رہیں۔

لیکن بھلا شمیم احمد کو ڈھول شہنائی بجانے اور گولے چھوڑنے سے کون روکتا۔ برات ایسی دھوم سے آئی اور مولوی ابل کی ڈیوڑھی میں وہ ہنگامہ مچا کہ معلوم ہوتا تھا ڈھول کی ہر چوٹ مولوی ابل کے کچے گھروندے کی بنیادوں پر پڑ رہی ہے۔

یہ دھوم دھڑکا دیکھ کر رات ہی رات مولوی ابل اور زیب النساء نے مکان کے ایک گوشے میں چند سرگوشیاں کیں۔ لڑکیوں کے گیتوں کے درمیان بکسوں کے کھٹکے، کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں رینگتی رہیں۔ اور جب دوسرے دن صبح کو جہیز کا سامان آنگن اور چھت پر بچھایا گیا تو گاؤں کا گاؤں پہلی نظر میں تو تیورا کر پیچھے ہٹ گیا۔ کپڑے تو خیر بن ہی جاتے ہیں پر یہ سونے کے اتنے بڑے بڑے جھمکے!

مولوی اُبل کے پاس دستِ غیب کا تعویذ ہے" کسی نے رائے دی۔

ایک بڑھیا نے ٹھوڑی کی لٹکتی ہوئی جھلی میں انگلی ڈبو کر کہا: "کپڑوں کے کئی جوڑے تو ان گنہگار آنکھوں نے پہچان لئے ہیں کچھ تو بے چاری مرنے والیوں کے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو بی بی زیب النساء کو اپنی شادی پر ملے تھے۔ سنگھڑے اس لئے اولاد کے لئے رکھ چھوڑے ہے۔ یہ کنگن اور یہ ناک کی کیل۔ یہ سب کچھ بی بی ہی کا ہے۔ پر یہ جھمکے؟" اور اس نے اپنی انگلی کو ٹھوڑی کی جھلی میں سے نکال کر آسمان کی طرف بلند کر دیا۔

مہرالنساء کو ڈولی میں بٹھایا گیا تو اکنیوں اور چھوہاروں کی ایک لہر سی اس پر سے نچھاور ہو گئی۔ گاؤں کے بچے ان پر جھپٹے۔ مولوی اُبل کے بچے جو ڈیوڑھی میں ماں باپ کی دیکھا دیکھی رو رہے تھے، ایک دم اپنی جگہ سے یوں اُچھلے جیسے ان کے قدموں تلے لچکدار کمانیاں ابھر آئی ہیں "ٹھہرو" مولوی اُبل گرجا۔ کمانیاں دھرتی پر اتر گئیں۔ بچے جہاں تھے وہیں ٹھٹھک گئے۔ صرف عارف ایک اکنی کو اپنے پنجے تلے چھپائے کھڑا رہا۔ اور برات کے چلے جانے کے بعد ہی اس کا یہ اثاثہ اس کے پاؤں سے ہاتھ تک کی مسافت طے کر سکا۔

مولوی اُبل کچھ دور تک ڈولی کے ساتھ ساتھ گیا۔ اس کی ناک اور آنکھیں سرخ تھیں مگر ان کے ساتھ چہرے کی زردی ضروری تھی اور مولوی اُبل بالکل گلاب ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دکھ اور اطمینان نے چہرے کی سرزمین کو اپنے اپنے مناظر کے لیے بانٹ لیا ہے۔ ایک موڑ پر جا کر وہ رک گیا اور دور تک ڈولی پر پڑے ہوئے ریشمی پردے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک لمبی گہری سانس لے کر اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر چٹخایا اور پلٹ کر گھر کو جانے لگا۔

گلی میں گاؤں کے بچے اب تک اکنیاں اور چھوہارے ڈھونڈ رہے تھے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑے ہوئے عارف اور دوسرے بچوں نے اپنے ابا کو دیکھا تو ایک آن میں بھوتوں کی طرح غائب ہو گئے۔ مولوی اُبل کے ہونٹوں میں دبی ہوئی جو سوزش اور کھلبلی ہو رہی تھی وہ مسکراہٹ بن کر نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں تک پھیلتی چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگا تو اسے دیوار سے لگی ہوئی ایک اکنی چمکتی دکھائی دی۔ لیکن وہ بڑی بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔ زیب النساء شاید کواڑ ہی سے لگی کھڑی تھی۔ مولوی اُبل کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرح زار زار رونے لگی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جب آنگن میں آئی تو دونوں ہاتھوں سے بڑے بڑے دائرے بنا کر بولی "ہمارے لیے تو بس یہ قبرستان کا سا سناٹا چھوڑ گئی ہماری مہرن۔"

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے" مولوی اُبل نے اپنی مسکراہٹ کو اور پھیلایا "مہرن چلی گئی تو کیا زبیدہ کو بھی لے گئی؟ اور کیا شمسن بھی اس کے ساتھ چلی گئی؟" پھر ذرا رک کر بولا "عارف میاں! زبیدہ کیا کر رہی ہے؟"

"جی رو رہی ہے" عارف دیوار سے لگے ہوئے بچوں کی قطار میں سے نکل کر بولا۔

"کہاں؟" مولوی اُبل نے پوچھا۔

"جی جہاں مہرن آپا مایوں بیٹھی رہیں" عارف بولا۔

"زبیدہ" مولوی اُبل پکارا۔ زیب النساء مسلسل روئے جا رہی تھی۔

زبیدہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ نیا گلابی دوپٹہ آنسوؤں کی نمی کے سبب جگہ جگہ سے سیاہی مائل سرخ پڑ گیا تھا۔ اور زبیدہ نے اپنے جن مہندی رچے ہاتھوں کو صبح اٹھ کر گھی سے چمکایا تھا ان پر جگہ جگہ مٹی جم رہی تھی اور بالوں کی مینڈھیاں اجڑ رہی تھیں اور ——

مولوی اُبل تو زبدہ کو دیکھتے ہی سناٹے میں آ گیا تھا۔ مسکراہٹ ہونٹوں میں سمٹ کر یوں پھڑپھڑانے لگی تھی جیسے دم توڑ رہی ہے اور چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ زبدۃ النساء چند قدم پر آ کر رک گئی اور سسکیوں میں رونے لگی۔

اور پھر مولوی اُبل نے زیب النساء کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور اسے بے ڈھنگے پن سے کھینچ کر آنگن کے ایک گوشے میں لے جا کر یوں بولا جیسے گھر میں آگ لگنے کی اطلاع دے رہا ہے "عارف کی ماں! سنو، یہ زبدہ تو جوان ہو گئی ہے!"

اور زیب النساء آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زبدہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے وہ اب تک والدین کی بے خبری میں جھرن کے عقب میں بیٹھی بیٹھی بڑھتی رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مولوی اُبل نے بغیر ضرورت کے گلا صاف کیا اور دم بخود زیب النساء کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "فکر نہ کرو بیوی اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر ہے۔"

زیب النساء نے مولوی اُبل کا ہاتھ کسی قدر سختی سے اپنے کندھے پر گرا دیا "شرم کرو۔ پہلے میرا ہاتھ پکڑے چلے آئے، اب کندھا سہلا رہے ہو۔ جوان جہان بیٹیاں کیا کہیں گی کہ اولاد کے سامنے ——" زیب النساء نے فقرہ پورا کرنے کی بجائے اپنا وہی کندھا اچکا دیا۔

مولوی اُبل کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ پکارا "شمسن!"

شمس النساء قطار میں سے نکلی ہی تھی کہ مولوی اُبل نے جیسے سہارا لینے کی خاطر اپنے عقب میں دیوار کو ٹٹولنے کے لیے ہاتھ ہلایا اور کوئی سہارا نہ پا کر ٹوٹی شاخ کی طرح جھوم سا گیا۔ چلتے ہوئے شمس النساء کے پاؤں کے تلوے ایک دم چپٹے چپٹے زمین پر نہیں لگ جاتے تھے بلکہ اس کے جسم کی طرح اس کے پاؤں میں بھی لہراؤ سا تھا۔ سب سے پہلے ایڑی زمین کو چھوتی تھی۔ پھر تلوے کا خم جھلکتا تھا اور اس کے بعد پنجے کی اٹھی ہوئی انگلیاں باری باری جیسے ٹپک ٹپک کر دھرتی کو چھوتی تھیں۔ تب جا کر دوسرا قدم اٹھتا تھا۔

"کچھ نہیں بیٹی۔ کچھ نہیں۔ جاؤ" مولوی اُبل تیزی سے ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

شمس النساء حیران ہو کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

اور زیب النساء زار زار روتی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ زبدہ اور شمسن اس کی طرف لپکیں۔

مولوی اُبل نے باہر جا کر چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور پھر دیوار کے قریب سے چمکتی ہوئی اکنی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی۔

گھر میں کل دو ہی بکس تو تھے۔ اب ان میں سے ایک میں سوکھے ٹکڑے رکھے جانے لگے تھے اور دوسرے میں قرآن اور عمدہ کی گڑیاں اور دوسرے ننھوں کی بلور کی گولیاں پڑی رہتی تھیں۔ گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری سکول بھی کھل گیا تھا۔ اس لیے اب کلام پاک کا درس لینے والی لڑکیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی اور اسی لیے سوکھے ٹکڑے اب ہفتے کی بجائے پندرہ روز کے بعد اٹھائے جانے لگے تھے۔ نمازیوں کو بھی زمانے کی ہوا لگ گئی تھی۔ بعض وقت تو مولوی اُبل اذان دے کر وہیں بیٹھ جاتا اور جب دیکھتا کہ نمازیوں کے انتظار میں نماز قضا ہو رہی ہے تو کچھ یوں کھویا کھویا سا اٹھ کر اندر مسجد میں آتا جیسے کوئی بڑا ناگوار فرض ادا کرنے چلا ہے۔ جمعہ کی نماز پر جب چند کسان جمع ہو جاتے تو وہ بڑی رقت سے خطبہ دیتا۔ اسلام میں نماز کی اہمیت اور علمائے دین

کی خدمت کے برکات کا تذکرہ کرتا اور کہتا "تمہیں یاد ہوگا کہ کوئٹے میں زلزلہ آیا تھا! کیوں آیا تھا؟ ترکی میں بھونچال آیا تو کتنے ہی گاؤں کو زمین نگل گئی۔ کیوں نگل گئی؟ مسلمان ہر جگہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں! کیوں ہو رہے ہیں؟ کیوں؟ کبھی سوچا ہے تم نے؟ اور بھلا تم کیوں سوچو، تمہیں تو گندم کے خمار نے دین سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ یہ نماز نہ پڑھنے اور علمائے دین کی خدمت نہ کرنے کے نتیجے ہیں۔ یہ قہرِ الٰہی ہے۔ یہ آثارِ قیامت ہیں۔ سمجھے؟ اور کیا تم اپنے گاؤں کو بھی زمین کے پیٹ میں اتار دو گے؟ بتاؤ! بتاؤ! ——" اس قسم کے جذباتی خطبوں کے بعد مقتدیوں میں ذرا سا اضافہ ہوتا اور ایک دو روز تک گھی لگے وظیفے آنے لگتے۔ مگر پھر وہی سناٹا عود کر آتا جس میں زبیدہ کی آنکھیں تمتماتیں، شمس کا جسم لچکتا، ٹین کے خالی بکسوں میں سوکھے ٹکڑے اور بچوں کے بلوری بنٹے بجتے اور تالیاں بجاتے۔ اور شمس کی گڑیاں ننگی ہو ہو کر ایک دوسرے میں گھسی پڑتیں۔

مولوی اُبل کے صرف دو ایسے سہارے تھے جو کبھی نہ ٹوٹتے۔ اللہ جل شانہٗ اور چودھری فتح داد۔ اللہ جل شانہٗ کا یہی کرم کیا کم تھا کہ مولوی اُبل اور زیب النساء اب تک زندہ تھے اور اب تک ان کی ساری اولاد زندہ تھی، اور مہر النساء کا بیاہ اس ٹھاٹ سے ہوا تھا کہ زبیدہ اور شمس کے لیے رشتے کے پیاموں کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ لیکن مولوی اُبل جس شدت سے مہر النساء کے بر کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ اسی شدت سے وہ زبیدۃ النساء اور شمس النساء کے لیے آنے والے پیاموں سے متنفر تھا۔ "ابھی تو کل کی بچیاں ہیں یہ۔ ابھی تو گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ شمس نے تو ابھی تک قرآن مجید بھی ختم نہیں کیا۔ میں ذرا اندرا سی پونی ایسی بچیوں کو کس دل سے اٹھا کر پرائے گھر میں بھیج آؤں؟ زبان وبان نہیں دوں گا۔ اگلے سال دیکھا جائے گا۔"

"دیکھا جائے گا" وہ زیب النساء سے زبیدہ اور شمس پر بے تحاشا آتی ہوئی جوانی کی اطلاع پا کر کہتا "اللہ جل شانہٗ رحم فرمائے گا۔ توکل بڑی چیز ہے عارف کی ماں! کسان جب دھرتی میں بیج بوتا ہے تو اللہ جل شانہٗ پر توکل کرتا ہے۔ توکل نہ کرے تو بیج وہیں مٹی میں مٹی ہو کر رہ جائے۔ یہی توکل بیج کو چٹخاتا ہے اور دھرتی کو چیر کر پودا نکالتا ہے، اور سبز پتیوں کی کوکھ میں بالیوں اور بھٹوں کو پروان چڑھاتا ہے، سمجھیں عارف کی ماں؟"

"پر کسان بیج تو بوتا ہے نا!" زیب النساء بحث کرتی "تم نے کیا کیا ہے؟"

"الحمدللہ" مولوی اُبل کہتا "میں نے بہت کچھ کیا ہے، میں نے ہر نماز کے بعد دعائیں مانگی ہیں!"

اور زیب النساء لاجواب ہو جاتی۔

دعاؤں کے بعد مولوی اُبل کا ذہن چودھری فتح داد کی طرف منتقل ہو جاتا۔ آج کتنے برسوں سے اس خدا ترس انسان نے اس کے گھر میں ہر شام کو وظیفہ بھجوایا تھا۔ اور کتنی پابندی سے ہر فصل پر مولوی اُبل کو پوشاک پہنائی تھی، اور لطف کی بات یہ ہے کہ دوسروں کی طرح ڈھنڈورا نہیں پیٹا تھا۔ لیکن اب چند روز سے چودھری فتح داد بیمار رہنے لگا تھا۔ ایک بوڑھے نائی نے جو عرصے سے جراحی کا کام کرتا تھا، چودھری کی ریڑھ کی ہڈی کے پھوڑے کے آس پاس کچھ ایسی نشتر زنی کی کہ یہ پھوڑا شانے تک سوج کر پھوٹ پڑا اور بہنے لگا۔ ساتھ ہی چودھری کو لرزے کے بخار نے آ لیا اور علاقے کے حکیموں کا تانتا بندھ گیا۔ ان دنوں مولوی اُبل کے گھر مردنی سی چھائی رہتی۔ ایک تو مہر النساء سے اس کی ساس کا برتاؤ سوہانِ روح تھا۔ اس پر یہ چودھری فتح داد کی علالت! بچے کسی وقت شور مچاتے تو مولوی اُبل چیخ اٹھتا "چپ رہو نامرادو! ادھر چودھری فتح داد بیمار پڑا ہے اور ادھر تم ہنس کھیل رہے ہو، ناشکرو! یہ چودھری نہ ہوتا تو آج تک ہم میں سے

آدھے آدمی تو فاقوں سے مر گئے ہوتے۔ اللہ جل شانہٗ کے حضور میں اس کی صحت کی دعا کرو بدبختو!"

مولوی اُبل ان دنوں ہر روز صبح و شام چودھری فتح داد کے ہاں مزاج پرسی کو جاتا۔ لیکن وہاں عیادت کرنے والوں کے ہجوم میں کبھی کوئی گھر کی بات نہ ہو سکی۔ بس اتنا ہوتا کہ مولوی اُبل کو دیکھ کر چودھری تعظیماً اٹھنے کی کوشش کرتا اور پھر کراہ کر اسی طرح منہ کے بل گر جاتا "دعا فرمائیے قبلہ" وہ آہستہ سے کہتا اور مولوی اُبل آنسو لا کر آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا اور کہتا "وہی شافیِ مطلق آپ کو صحتِ کلی عطا فرمائے گا" —— لیکن ایک روز جب مولوی اُبل چودھری کے ہاں گیا تو وہاں سوائے اس کے ایک بیٹے کے اور کوئی نہ تھا۔ چودھری کی طبیعت بھی خلافِ معمول سنبھلی ہوئی تھی۔ آج وہ حسبِ عادت تعظیماً کچھ اٹھا۔ لیکن کراہا نہیں۔ لڑکے کو اشارہ کر کے باہر بھیج دیا اور بولا "بیٹیاں کیسی ہیں قبلہ؟"

"الحمدللہ۔ اچھی ہیں۔ دعاگو ہیں؟" مولوی اُبل نے جواب دیا۔

"سنا ہے بہت پیغام آ رہے ہیں؟" چودھری نے پوچھا۔

مولوی اُبل ابھی تک یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ لڑکیوں کے پیام طرفین کے درمیان سربستہ رازوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جوانی کا ڈھکنا اٹھتا ہے تو کوئی راز راز نہیں رہتا۔ چونک کر بولا "جی ہاں بہت آ رہے ہیں"۔

"پھر؟ کوئی فیصلہ فرمایا آپ نے؟" چودھری مسلسل مولوی اُبل کو دیکھے جا رہا تھا۔

مولوی اُبل گھبرا سا گیا۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر محسوس کیا کہ اچانک تالو، زبان اور حلق خشک ہو گئے ہیں۔ کچھ نگل کر بولا "جی فیصلہ میں کیا کروں۔ یہ تو اللہ جل شانہٗ کرے گا۔ جس خالی ڈھنڈار گھر میں خلال کے لیے تنکا تک نہ ملے وہاں بیٹیوں کے رشتے کون طے کرتا پھرے"

"تو قبلہ کیا میں مر گیا ہوں؟" چودھری فتح داد کی آواز میں شکایت کی بھراہٹ تھی۔

"آپ کے دشمن مریں" مولوی اُبل فوراً بول اٹھا "آپ اللہ جل شانہٗ کے فضل سے تندرست ہو جائیں تو پھر دونوں بیٹھ کر طے کریں گے"

"جی ہاں" چودھری نے ہمدردانہ انداز میں کہا "فوراً طے ہونا چاہیئے۔ گھر میں جوان لڑکی بیٹھی ہو تو ایک ایک دن ایک ایک صدی بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سب سامان کر دے گا —— وظیفہ تو باقاعدہ پہنچ رہا ہے نا؟"

"جی ہاں" مولوی اُبل نے جواب دیا "باقاعدہ"

"اللہ قبول فرمائے" چودھری فتح داد نے آہستہ سے دعا کی۔

"آمین" مولوی اُبل نے عادتاً اس دعا کی تائید کی۔

کچھ دیر خاموشی رہی، چودھری ذرا سا کراہا۔ پھر بولا "سنا ہے بیٹی مہرالنسأ اور شمیم احمد کی تو خوب نبھ رہی ہے پر ساس اس کے پاؤں نہیں ٹکنے دیتی"

"جی ہاں" مولوی اُبل نے بڑے دکھ سے کہا "لیکن میں نے کبھی کوئی دخل نہیں دیا۔ بیٹی بیاہ دی جائے تو پرائی ہو جاتی ہے"

"پر ساس سے کیوں نہیں بنتی؟"

"بس وہی غریبی مفلسی کے طعنے۔ تو کنگلی ہے، تو سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہے، تیرے کپڑوں سے کفن کی بو آتی ہے، تو اپنے ساتھ خاک لائی ہے؟ وہی عورتوں کی باتیں۔"

"ہوں" چودھری کچھ دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا "بیٹی پرائی نہیں ہو جاتی قبلہ! بیاہ کے بعد تو اس کے حقوق بڑھ جاتے ہیں۔ اب اگر ساس اس قسم کی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اسے ان طعنوں کا موقعہ ہی نہ دیں۔ وہ بیٹی مہر النساء کو کنگلی کہتی ہے نا؟ اب ہماری بیٹی کے بچہ ہوگا تو اس کے لیے آپ ریشم کے کپڑے اور طلائی ٹوپیاں اور سونے کے گھنگھروؤں والے کنگن بھیج دیجئے اور پھر دیکھیے کس طرح بیٹی کا مان بڑھے گا اور بڑھیا کی پلید زبان بھی کٹ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا قبلہ؟"

ٹھیک ہے، مولوی ابل نے سوچا۔ بہت حد تک ٹھیک ہے مگر ایک حد تک محال بھی ہے۔ یہ سب سامان آخر آئے گا کہاں سے؟ اور کیا عارف کی ماں نے آج سے آٹھ مہینے پہلے مہرن کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ درست تھا؟ اب مولوی ابل کا وہاں دیر تک نچلا بیٹھے رہنا مشکل تھا۔ تو کیا سچ مچ مہرن بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے؟ اس نے تو زیب النساء سے کبھی پوچھا ہی نہ تھا اور زیب النساء نے بھی حیا کے مارے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مولوی ابل بیٹیوں کے پیٹوں کو ٹٹولتے پھرنے کے سخت خلاف ہے۔

مولوی ابل تو ڈیوڑھی ہی سے پکارا "عارف کی ماں!"

زیب النساء بھاگی آئی "خدا خیر کرے، کیا ہوا؟ چودھری کیسا ہے؟"

"اللہ جل شانہٗ رحم فرمائے گا" مولوی ابل بولا "عارف کی ماں! سنو، مہرن بیٹی کیسی ہے؟"

زیب النساء چونکی "تمہیں کس نے بتایا؟"

"کب تک ہوگا؟" مولوی ابل تو آج آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"بس اللہ چاہے گا آج کل میں" زیب النساء جھینپ کر بولی "پر تمہیں کس نے بتایا؟"

مولوی ابل تقریر کے سے انداز میں بولا "بس یہی موقع ہے جب ہم مہرن بیٹی کو اس کی ساس کے طعنوں تشنوں سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔ ہم اپنے نواسے نواسی کے لیے بہت سا ——"

"اللہ کرے نواسہ ہو" زیب النساء نے مولوی ابل کی بات کاٹ دی۔

"جو کچھ بھی ہو" مولوی ابل نے ٹوٹے تار کو جوڑا "ہم بچے کے لیے بہت سا سامان بھیج کر اپنی بیٹی کا مان بھی بڑھائیں گے اور اس بدبخت بڑھیا کی پلید زبان بھی کھینچ لیں گے ہمیشہ کے لیے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"کہنا تو بڑا آسان ہے پر کرو گے کہاں سے؟" زیب النساء نے پوچھا۔

"توکل عارف کی ماں، توکل" مولوی ابل کے ذہن میں چودھری فتح داد کا میٹھا میٹھا ہمدردانہ لہجہ گھوم رہا تھا۔ "اللہ جل شانہٗ پر تکیہ کرو" خود مولوی ابل کو اس وقت چودھری پر تکیہ تھا۔

شام ہوتے ہی زیب النساء نے برقعہ اوڑھا۔ عارف کو ساتھ لیا اور مہر النساء کے ہاں چلی گئی۔ رات گئے واپس آئی۔ برقعے کو ایک طرف رکھ کر آہستہ سے بولی "جاگ رہے ہو عارف کے ابا؟"

"ہاں عارف کی ماں۔ کیوں؟" مولوی ابل نے لحاف میں سے سر نکالا۔

"بڑی تکلیف میں ہے مہرن بیٹی۔ شمیم احمد رو رہا تھا بے چارہ۔ شاید کل تک ہو جائے گا" زیب النسا نے بڑی کھنکتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

"سچ ماں؟" زبدہ تڑپ کر بستر پہ اٹھ بیٹھی۔

"ارے!" مولوی ابل اور زیب النسا حیران رہ گئے، اور پھر اس موضوع پر مزید اظہار رائے کے بغیر ہی سو گئے۔

دوسرے روز بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رہی جب بیٹی مارے درد کے چیختی ہے اور ماں باپ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔

اور پھر آدھی رات کو ایک نائن نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولوی ابل نے لپک کر زنجیر کھولی۔ مہرن کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ سارا گھر جاگ اٹھا اور جب کافی دیر کے بعد سب اپنی اپنی مسکراہٹیں سمیٹ کر اونگھنے لگے تو مولوی ابل زیب النساء کے پاس آیا "اب کیا ہوگا؟"

"چودھری کیسا ہے؟" زیب النسا نے پوچھا۔

"اللہ جل شانہٗ ہی رحم فرمائے" مولوی ابل نے کہا۔

زیب النساء اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی "طلائی ٹوپیوں اور سونے کے کنگنوں کو تو جھونکو بھاڑ میں۔ میں تو کہتی ہوں اگر ریشم کا ایک ایک جوڑا چُنی ہی بنوالیں تو ناک رہ جائے۔ کوئی سبیل ہے؟"

"سبیل!" مولوی ابل سوچ میں پڑ گیا اور جب بولا تو اس کی آواز میں غصہ تھا "تمہاری عقل بھی تو ایڑیوں میں ہے۔ اور جانے واں بھی ہے کہ نہیں۔ سات بیٹیاں ہیں اور پہلی ہی بیٹی کے بیاہ پر کپڑے لتے اور گہنے پاتے یہاں تک کہ انگلیوں کے چھلے بھی جہیز میں دے ڈالے۔ آخر ایک بھوکے مرچھلے امام مسجد کی بیٹی کا بیاہ تھا۔ وہ کوئی نواب زادی تو تھی نہیں کہ کوئی انگلی دھرتا۔ اب ہاتھ بھر لونڈا پیدا ہوا ہے تو اس کے لیے دو ہاتھ کپڑا موجود نہیں اور پوچھتی ہے کوئی سبیل ہے؟ — نہیں ہے کوئی سبیل، کفن بھی تو نہیں کہ اٹھا کر نواسے کو پہنا دیتا"

"بکنے کیوں لگے؟" زیب النساء بھی غصے میں بولی "کفن پہنیں اس کے دشمن۔ اللہ وہ سہرے باندھے۔ اب یہ تو مجھ سے نہیں ہوگا کہ خالی ہاتھ لٹکائی مہرن کے پاس جاؤں اس کی کمینی ساس کے سامنے، اور زبانی زبانی صدقے قربان ہو کر واپس آجاؤں لعنتوں کی گٹھڑی اٹھا کر۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہوگا۔ جینا اجیرن ہو جائے گا میری بیٹی کا۔ ساس ناک میں دم کر دے گی۔ آنکھیں نہیں اٹھ سکیں گی کسی کے سامنے۔ زبدہ اور شمسن کو بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ سب کو پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ تھا وہ ایک دم اُگل بیٹھے اور اب وہی سوکھے ٹکڑے توڑتے پھرتے ہیں۔ ساری عمر کنواریاں بیٹھی رہیں گی۔"

"بیٹھی رہیں" مولوی ابل طیش میں آگیا "اب کہو تو سر پھوڑ ڈالوں اپنا۔ کہہ جو دیا کہ میرے پاس کفن تک نہیں اور تو ریشم کا کپڑا مانگتی ہے؟ کچھ نہیں میرے پاس، سمجھیں؟ میرے پاس کچھ نہیں ...." مولوی ابل باہر نکل گیا۔

زیب النساء کچھ دیر تک اس خیال سے چپ چاپ بیٹھی رہی کہ وہ آنگن میں کچھ دیر ٹہل کر اندر آجائے گا مگر جب ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز آئی تو وہ بلبلا کر رو دی۔ اور زبدۃ النساء اور شمس النساء تڑپ کر بستروں میں سے نکلیں اور بلکتی ہوئی اپنی ماں سے لپٹ گئیں۔

مولوی ابل سیدھا مسجد میں گیا۔ وضو کر کے دیر تک تہجد پڑھتا رہا۔ پھر صبح کی اذان دے کر کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ چند نمازی آئے تو جماعت کرائی اور سورج طلوع ہونے پر گھر آیا تو زیب النساء اسی جگہ بیٹھی اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے دیوار کو گھورے جا رہی تھی۔ اور زبدہ اور

شمن اس کے پاس گٹھڑیاں بنی ہوئی پڑی سو رہی تھیں۔ وہ مجرموں کی طرح چپکے سے اپنی چارپائی تک گیا اور یوں بے حس و حرکت بیٹھ گیا جیسے اسے تصویر اتروانا ہے۔

زیب النساء کی نظریں دیوار سے اتر کر زمین پر جم گئیں۔ مولوی ابل کی نظروں نے ان کا تعاقب کیا مگر مڈبھیڑ نہ ہو سکی۔ پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے زور کی ایک آہ بھری۔ اب زیب النساء سے نہ رہا گیا۔ فوراً اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مولوی ابل کے ہونٹوں پر مری مری مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں نے کہا "ادھر آؤ۔"

زیب النساء اٹھ کر اس کے پاس گئی۔ اب تک مولوی ابل موم ہو چکا تھا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے؟" زیب النساء نے بڑی پیار بھری شکایت کی۔

"مسجد میں" مولوی ابل نے بچوں کی طرح جواب دیا۔

"کیوں گئے تھے؟"

"کیوں جاتے ہیں؟"

"کچھ سوچا؟"

"ہاں"

"کیا سوچا؟"

"یہی کہ صبح ہو گئی ہے۔ تمہیں تو ماں ہونے کے سبب رات ہی کو مہرن کے ہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ رات کو نہ جا سکیں تو اب اس وقت تو تمہارا جانا بہت ضروری ہے"

"خالی ہاتھ؟"

"نہیں"

"پھر"

"یہی تو سوچ رہا ہوں۔ تم نے کیا سوچا؟"

"یہی"

کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"سنو" زیب النساء بولی "کہیں سے دس روپے تک قرضہ مل جائے گا؟"

مولوی ابل نے بھویں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ پھر ہونٹوں کو سکیڑ کر زمین کو گھورا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر یوں آہستہ آہستہ اٹھا جیسے کمر ٹوٹی ہوئی ہے، تھکے ہوئے لہجے میں بولا "ابو البرکات کو کون عقل کا اندھا قرضہ دے گا عارف کی ماں۔ مجھے سب لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ سود کے ٹکڑے پیٹ میں جا کر آنکھوں میں سے جھانکنے لگتے ہیں۔ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ سوچتا ہوں آج نواسے کے لیے دو گز کپڑا نہ بھیج سکا تو پھر اس گاؤں میں کاہے کو رہوں گا۔"

زیب النساء بڑی مہارت سے امڈتے ہوئے آنسو پی گئی۔ بولی "چودھری کیسا ہے؟"

"میں ہی جاتا ہوں" مولوی ابلّ نے جماہی لے کر کہا "ذرا اسد ابھی اچھا ہوا تو مہرن کا ضرور پوچھے گا۔ ہو سکتا ہے اللہ جل شانہٗ کوئی سبیل پیدا کر دے"

مولوی ابلّ کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ زیب النساء نے برقعے کو جھاڑ کر الگنی پر ڈال دیا اور عارف کو منہ ہاتھ دھونے اور تیار ہو جانے کو کہا۔ زبیدہ اور شمسن نے ضد کی کہ وہ بھی اپنے بھانجے کو دیکھنے جائیں گی "ابھی ٹھہرو بیٹی!" زیب النساء یوں آہستہ سے بولی جیسے اس وقت ذرا سی بھی بلند آواز سے کوئی چیز چھن سے ٹوٹ کر رہ جائے گی۔

انتظار ——

انتظار ——

ماں کے تیور دیکھ کر بچے بھی سہمے بیٹھے تھے اور ماں چڑیا کے اڑنے تک سے چونک کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

اور پھر ڈیوڑھی کے کواڑ دھڑاک سے بج کر کھلے اور مولوی ابلّ زندگی میں شاید پہلی بار بھاگتا اور ہانپتا ہوا اندر آیا اور چلّایا، "عارف کی ماں اے عارف کی ماں!"

زیب النساء باہر لپکی۔ اور اس کے پیچھے زبیدہ، شمسن، عارف، قمرن، عمدہ اور دوسرے سب بچے یوں نکلے جیسے کمرے میں سے کسی بگولے نے انھیں اٹھا کر باہر بکھیر دیا ہے۔

اور مولوی ابلّ اسی ہانپتے ہوئے لہجے میں چلّایا "مبارک ہو عارف کی ماں! تم نواسے کے جوڑے کو رو رہی تھیں۔ اللہ جل شانہٗ نے جوڑے جوتی اور ٹوپی تک کا انتظام فرما دیا۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے ضرور ملیں گے۔ ابھی کچھ دیر تک جنازہ اٹھے گا —— چودھری فتح داد مر گیا ہے نا"

زیب النساء نے اس زور سے اپنی چھاتی پر دوہتڑ مارا کہ بچے تک دہل کر رو دیے۔

اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی ابلّ کو گردن سے دبوچ لیا، اس کی اوپر اٹھی ہوئی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی ابلّ جو مرد کے چلّا چلّا کر رونے کو ناجائز اور خلافِ شرع قرار دیتا تھا چلّا چلّا کر رونے لگا اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر گلی میں بھاگ گیا۔

موذیل

سعادت حسن منٹو

ترلوچن نے پہلی مرتبہ —— چار برسوں میں، پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نگاہ تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں، اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی —— رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا تھا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا جیسے رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، ترو تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا، کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اب وہ صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان —— محلّے میں تھا۔ جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو چکا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا —— غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا —— اور ترلوچن لازماً مضطرب تھا۔ آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ، مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ —— مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ لیے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا۔ فسادات کی تیزی و تندی کے

متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا "نرنجن! یہ ٹھیکے ویکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا گھر پہ رہنا بہت ضروری ہے۔ اوّل تو یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گذارہ کر لیا کرتا ہے" —— مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سُن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا "یار تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو —— میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں بمبے ہے —— بمبے، تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں —— بارہ برس سے"

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایک ایسا شہر ہے جس میں اگر فسادات برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کے پاس کوئی چھو منتر ہے —— یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آسکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ —— محلہ قطعی محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لیے اچھا تھا —— وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا تاکہ ترلوچن کے لیے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کی بجائے کھنگر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی —— ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے —— کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کھنگر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک اور لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں، مگر اس میں وہ سختی، وہ گٹھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنھیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ اور وہ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا مگر وہ زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ —— لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سُنا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا۔ اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ۔ پھر بمبئی، جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔ ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی جو بُری نہیں تھی —— خاکستری رنگ کے تنبو کی

چھت میں ہزارہا دیئے روشن تھے۔ اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے، وہ موذیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو 'گوڈے گوڈے' عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اُس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا۔ اسی دن اس کی مڈبھیڑ موذیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھی، جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں تین چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ بانہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اَٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے، مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ، اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ۔ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی ——— ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موذیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور وہ اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر تھی۔ کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی ——— بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے اِدھر اُدھر تھیں اور .... جب ترلوچن نے اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل ——— ساری موذیل سے اُلجھا، جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موذیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی "یہ کھڑاؤں ایکدم کنڈم چیز ہے" اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کے ساتھ والی انگلی پھنساتی کوری ڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو، لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھُل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی، پیتی تھی، اس کے ساتھ سینما جاتی تھی، سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی، لیکن جب وہ بانہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تھا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھُرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں، وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لیے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں 'گوڈے گوڈے' دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے کے لیے تیار ہو جاتی تھی مگر جب وہ اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا

تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لیے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موزیل کے لیے پُرتکلف کھانے منگوائے ہیں۔ مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آگیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنّا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا، جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ فولاد کی طرح مضبوط ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی "تم سکھ ہو ——— یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں"

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا "کونسی نازک باتیں ——— تمہارے پرانے یاروں کی؟"

موزیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر ٹکا کر اپنی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی "یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو۔ ——— ہاں وہ میرے یار ہیں ——— اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو"

ترلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا "اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی؟"

موزیل زور کا قہقہہ لگاتی "تم سچ مچ سکھ ہو ——— ایڈیٹ۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ ——— اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کر لو ——— میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا"

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موزیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موزیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِ عمل انتقام ہوتا ہے، مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موزیل پسند تھی ——— پسند ہی نہیں، جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جبکہ موزیل موج میں تھی، ——— ترلوچن نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا "موزیل ——— کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

موزیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا "میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی"

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ——— "موزیل، تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو ——— یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے"

موزیل اٹھی۔ اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا "تم شیو کرا لو اور اپنے سر کے بال

کھلے چھوڑ دو۔ تو میں شرط لگاتی ہوں، کئی لونڈے تمہیں آنکھیں ماریں گے ——— تم خوبصورت ہو"

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موذیل نے ایک دم "پھوں پھوں" کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی "میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں۔ ——— تم تکلیف نہ کرو"

ترلوچن چلایا "موذیل!"

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جن پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آ گئی تھیں "خدا کی قسم ——— تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ——— ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں ——— بس تھوڑا سا پیٹرول لگانے کی ضرورت ہو گی"

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آ گئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی ——— اس میں جو پنیں لگی تھیں، وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خد و خال جھاڑیوں کی مانند اپنے اندر چھپا لیے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرمانبردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

دانتوں میں پنیں دبائے ہوئے وہ مسکرائی "تمہارے بال بہت ملائم ہیں ——— میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا ——— ترلوچ ——— تم یہ مجھے دے دو۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فسٹ کلاس بٹوہ بناؤں گی"

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے مخاطب ہوا "میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا ——— تم کیوں اڑاتی ہو ——— دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا۔ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا، مگر صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے ——— کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں؟"

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا "مجھے معلوم ہے"

"پھر" ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہہ کیے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ——— میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

"مجھے معلوم ہے" بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لگی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی "میں

بھی قریب قریب ہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی“

ترلوچن اچھل پڑا ”سچ؟“

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لیے چمکے۔

”ہاں!“

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا ”تو...... تو کب؟“

موذیل الگ ہٹ گئی ”جب — تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے!“

ترلوچن اس وقت ”جو ہو سو ہو“ بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا ”میں کل ہی کٹوا دوں گا“

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی ”تم بکواس کرتے ہو ترلوچ — تم میں اتنی ہمت نہیں ہے“

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا ”تم دیکھ لو گی“

”دیکھ لوں گی“ اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور ”پھوں پھوں“ کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا — وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لیے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیئے اور داڑھی بھی منڈوا دی — یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لیے غور کرنے پر مجبور ہو سکتی ہے۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی اور دیر تک اس کو چھیڑتی اور گدگداتی رہی تھی۔ اس نے ٹیرس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا جہاں ٹینکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بغیر نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز صبح موذیل کو چٹ بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لیے آ جائے۔ موذیل آئی، ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکی، پھر ”مائی ڈارلنگ ترلوچ“ کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی۔ اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا — موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا — ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا ”نیچے کچھ پہن تو لیا کرو“

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا کہا ”مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے — ایسے ہی چلتا ہے“

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آ گیا جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔

مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا "شادی کل ہوگی؟"

"ضرور" موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونہ میں ہو، چونکہ سول میرج تھی۔ اس لیے ان کو پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی اس لیے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لیے کہا تھا ——— ترلوچن مقررہ وقت پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چلی گئی اور ایک غیر معین عرصے کے لیے وہاں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گزری؟ ——— یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور موذیل کو بھول گیا۔ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی جس کے دل کے ساتھ پر لگے ہوئے تھے اور جو چڑیوں کی مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کی مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کد کڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی ——— وہ بے حیا تھی، بے مروت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اسی لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے نئی نئی کار خریدی تھی، یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے ——— اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے، ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے، بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مر مٹی، اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا تھا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارے کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی "تم سکھ ہو ——— مجھے تم سے نفرت ہے!"

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ وہ دوٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈر ویئر اس کو ناپسند تھے، اس لیے کہ

ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا۔ مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی "یہ حیا ویا بکواس ہے ——— اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لیا کرو ——— تم مجھے یہ بتاؤ، کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا ——— یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں ——— مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو ——— تم سکھ ہو ——— مجھے معلوم ہے کہ پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے ——— شرم آنی چاہئے تمہیں ——— اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے!"

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا، مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی ڈھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ بیکار اتنے دنوں بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رُک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا ——— کرپال کور، ایک پاکیزہ لڑکی، جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں تھی۔ وہ ایسے محلے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے۔ اور وہاں دو تین وارداتیں بھی ہو چکی تھیں ——— لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہاں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں، اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا۔ وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ تراشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری ——— اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ ——— بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں ——— آواز قریب آتی گئی۔ یک لخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موذیل کو دیکھا جو یہودیوں کی خاص وضع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی ——— اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا کہ اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

ترلوچن پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا "یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی ——— اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟"

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی ——— اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں ——— ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے

نیل اُبھر آئے۔ وہ زور سے کھانستا۔ موزیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردِ عمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی "تم پھر سکھ بن گئے ترلوچن؟"

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موزیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا "اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیوی بلو سکرٹ صاف کر سکے —— مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

موزیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی "بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟"

ترلوچن اپنی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا، تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موزیل کے چہرے کو غور سے دیکھا —— کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا "بیمار رہی ہو؟"

"نہیں" موزیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟"

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں" موزیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی "تم گویا کہ —— اب پھر —— نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو؟"

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی سے جواب دیا "ہاں"

"مبارک ہو" موزیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی "کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "ہاں"

"مبارک ہو —— اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں"

"یہ بہت بُری بات ہے" موزیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اُٹھی "ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے"

ترلوچن خاموش رہا۔ موزیل نے اُٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا "کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں"

ترلوچن بڑی اُلجھن محسوس کر رہا تھا، جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں اُلجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں" کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موزیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی "تم اب یہ داڑھی منڈوا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی"

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا ——— موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے۔ بدصورت ہے، بے وفا ہے، بے مروت ہے۔ مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا "موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ——— جو مذہب کی پابند ہے اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے"

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا "وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟ ——— کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟"

اس کو ابھی تک معلوم نہیں ——— داڑھی میں نے تمہارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی ——— محض انتقامی طور پر ——— اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں ——— مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے" ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنی شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجانی شروع کی "یہ بہت اچھا ہے .... مگر یہ کمبخت مچھر یہاں بھی موجود ہیں .... دیکھو کس زور سے کاٹا ہے؟"

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا۔ انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں" یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا "ترلوچ ——— تم کیا سوچ رہے ہو؟"

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی "تم اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو ——— جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟"

"مشکل! ——— موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت نہیں سمجھ سکتیں ——— کسی بھی معاملے کی نزاکت ——— تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری "افسوس بی ڈیمڈ ——— سلی ایڈیٹ ——— تم یہ سوچو کہ تمہاری اس .... کیا نام ہے اس کا .... اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے .... تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے .... تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے ——— تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو ——— اور بہت ڈرپوک، مجھے نڈر مرد چاہیئے .... لیکن چھوڑو ان باتوں کو .... چلو آؤ، تمہاری اس کور کو لے آئیں!"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا ——— ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا "کہاں سے؟"

"وہیں سے، جہاں وہ ہے ——— میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں ——— چلو آؤ میرے ساتھ"

"مگر سنو تو ——— کرفیو ہے"

"موذیل کے لیے نہیں ——— چلو آؤ"

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اُترنے والی تھی کہ رُک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

موذیل نے کہا "یہ تمہاری داڑھی ——— لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے ——— ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو"

"ننگے سر!" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا"

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا "کیوں؟"

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی "تم سمجھتی نہیں ہو ——— میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں"

"کیوں ٹھیک نہیں؟"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا ——— وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے سر کے [illegible] ہیں ——— میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری "تم واقعی اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو ——— گدھے کہیں کے ——— اس کی جان کا سوال ہے ——— کیا نام ہے، تمہاری اس کور کا جس سے تم محبت کرتے ہو"

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی"

موذیل چڑ گئی "اوہ، تمہاری محبت بی ڈیمڈ ——— میں پوچھتی ہوں کہ سارے سکھ تمہاری طرح کے بیوقوف ہوتے ہیں ——— اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے ——— اور شاید وہ اپنا انڈرویئر بھی"

ترلوچن نے کہا "وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں"

"بہت اچھا کرتے ہو ——— مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی ——— تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے"

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا "مجھے اس کی پرواہ نہیں ——— اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا۔ میں اپنی محبت خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا"

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ "گدھے ——— تمہاری

محبت ہی کہاں رہے گی جب تم نہ رہو گے —— تمہاری وہ —— کیا نام ہے اس بھڑوی کا —— جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا۔ تم سکھ ہو —— خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!"

ترلوچن بھنا گیا "بکواس نہ کرو!"

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اَٹی ہوئی باہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا —— "ڈارلنگ چلو، جیسے تمہاری مرضی —— جاؤ پگڑی پہن آؤ —— میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں"

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا "تم کپڑے نہیں پہنو گی؟"

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا "نہیں —— چلے گا اسی طرح"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اُتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کئے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے قریب پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا "تم بہت ذلیل ہو"

موذیل مسکرائی "یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی —— اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا "یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے —— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے کیس ہیں"

بازار بالکل سنسان تھا —— ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے، جیسے کرفیو سے خوف زدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹرامیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں وہ اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی، اس لیے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوف زدہ تھا۔ کوئی پتہ کھڑکتا تھا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگرٹ کا دھواں اڑاتی، جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گونجی "اے —— کدھر جا رہا ہے؟"

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا "اوہ، تم —— ہم کو پہچانا نہیں تم نے —— موذیل....." پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا "اِدھر اس باجو —— ہمارا بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے —— ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے......"

سپاہی اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگرٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگرٹ نکال کر اس کو دیا "لو، پیو ———"

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا "ہیئر از لائٹ!"

سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی جس میں سے گزر کر انھیں ——— محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے۔ خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو بیچ پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لیے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی۔ اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تھی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا، مگر اسے ان کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا "ترلوچ ڈیر ——— اس طرح ڈرنا اچھا نہیں ——— تم ڈرو گے تو کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا ——— سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے"

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی ——— کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا "کوئی بات نہیں ——— چلے آؤ"

دونوں چلنے لگے ——— ایک آدمی سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا، ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے نیفے میں ہاتھ ڈالا ——— کہ موذیل آ گئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی، جیسے نشے میں چور ہے۔ اس نے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا "اے کیا کرتا ہے؟ ——— اپنے بھائی کو مارتا ہے ——— ہم اس سے شادی کرنے کو مانگتا ہے" پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی "کریم! ——— اٹھاؤ یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر"

اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا "عیش کر سالی ——— عیش کر" پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا "کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرام زادے نے!"

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا "کوئی ذلیل حرکت نہیں ——— سب چلتا ہے ...... آؤ"

اور وہ تیز تیز چلنے لگی۔ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیے۔

یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلّے میں پہنچ گئے جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا "کس گلی میں جانا ہے؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "تیسری گلی میں ——— نکڑ والی بلڈنگ!"

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی۔ مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی ——— ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انھوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا "ترلوچ ڈیئر ——— یہ پگڑی اتار دو!"

ترلوچن نے جواب دیا "میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا!"

موذیل جھنجھلا گئی "تمہاری مرضی ——— لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے؟"

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ——— صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پُراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا "دیکھو، ایسا کرو ——— میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں۔ تم میرے پیچھے آنا ——— بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو ——— سمجھے ——— مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔"

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے ——— سیڑھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا "کون سا مالا؟"

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "دوسرا!"

"چلو"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے ملے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی "مہنگا سنگھ جی ——— مہنگا سنگھ جی!"

اندر سے مہین سی آواز آئی "کون؟"

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھلا ——— ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہو گئے ——— موذیل نے اپنی بغل میں ایک دُبلی پتلی لڑکی کو دیکھا ——— جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لیے غور سے دیکھا۔ پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سرخ ہو گیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا "ڈرو نہیں، ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے"

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل کے جسم سے الگ ہو گئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں ——— اور اپنی ماتا جی سے بھی ——— لیکن جلدی کرو۔"

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی "اسے پکڑ لیا انھوں نے!"

ترلوچن نے پوچھا "کسے؟"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی "پکڑ لیا تو اچھا ہوا ——— تم یہ کپڑے اُتار دو"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے نہ پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیص اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی باہنوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر ترلوچن سے کہنے لگی "جاؤ، اسے لے جاؤ ——— لیکن ٹھیرو"

یہ کہہ کر اُس نے کرپال کور کے بال کھول دیئے اور اس سے کہا "جاؤ ——— جلدی نکل جاؤ"

ترلوچن نے اس سے کہا "آؤ" مگر فوراً ہی رُک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی باہنوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موذیل کے لہجے میں چڑچڑا پن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں"

"جہنم میں جائیں وہ ——— تم اسے لے جاؤ"

"اور تم؟"

"میں آ جاؤں گی!"

ایکدم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آ کر انھوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا "سنو! اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے —— میں دروازہ کھولتی ہوں ......"

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی "دروازہ"

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں —— تم میرے پیچھے بھاگنا —— میں اوپر چڑھ جاؤں گی —— تم بھی اوپر چلے آنا —— یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے"

ترلوچن نے پوچھا "پھر؟"

موذیل نے کہا "یہ تمہاری —— کیا نام ہے اس کا —— موقعہ پا کر نکل جائے —— اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا"

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری۔ سب بوکھلا گئے۔ اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رُخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی —— کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی —— وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا —— اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ اُلجھتی وہ نیچے آ رہی —— پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اترا۔ جُھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ لوگ جو دروازہ توڑنے آئے تھے ارد گرد جمع ہو گئے۔ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی "موذیل —— موذیل"

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا "جاؤ، دیکھو —— میرا انڈر ویئر وہاں ہے کہ نہیں —— میرا مطلب ہے وہ ......"

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اُس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے سے کہا "تم سچ مچ سکھ ہو ...... جاؤ دیکھ کر آؤ"

ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا "یہ میاں بھائی ہے ...... لیکن بہت دادا قسم کا ...... میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں"

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے ...... موذیل نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا "اوہ ڈیم اِٹ ......" یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی "آل رائٹ ڈارلنگ —— بائی بائی"

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی "لے جاؤ اسکو —— اپنے اس مذہب کو" اور اسکا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

سایہ

غلام عبّاس

دن بھر جیسے جیسے سائے گھٹتے بڑھتے رہتے، سبحان کی دکان بھی جگہیں بدلتی رہتی۔ صبح کو ابھی سورج نہ نکلا ہوتا کہ وہ اپنا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اس کنارے لا کھڑا کرتا۔ اس طرف کوئی عمارت نہیں تھی۔ زمین بھوبھل کی طرح تھی اور تھوڑی سی ڈھلوان کے بعد ایک میدان آ جاتا تھا جس میں پیپل کا ایک پرانا پیڑ تھا۔ جب سورج وکیل صاحب کے چومنزلے مکان کے پیچھے سے ابھرتا اور دھوپ دھیرے دھیرے پیپل کی چوٹی سے اترنی شروع ہوتی اور کوئی دو ڈھائی گھنٹے میں میدان کا احاطہ کر کے، ڈھلوان پر چڑھ کے سڑک کے کنارے تک پہنچ جاتی، تو وہ اپنا ٹھیلہ سڑک کے اس کنارے وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کے برابر کھڑا کر دیتا۔ اور یوں اس اونچے مکان کا سایہ دو تین گھنٹے تک اور اسے دھوپ سے بچائے رکھتا۔ لیکن جب سورج عین سر پر آ جاتا تو ناچار اسے اپنا ٹھیلہ ڈھلوان پر سے دھکیل کر میدان میں پیپل تلے لے جانا پڑتا جہاں وہ دو تین بجے تک ڈیرا جمائے رہتا۔ اس کے بعد جب سورج ڈھلنا شروع ہوتا تو پیپل کے سائے کے ساتھ ساتھ اس کی دکان بھی آگے کو سرکنی شروع ہو جاتی۔ یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے وہ پھر وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اسی کنارے پہنچ جاتا جہاں زمین بھوبھل کی طرح تھی اور جہاں اس نے علی الصباح ٹھیلے کو کھڑا کیا تھا۔ خاص طور پر گرمیوں گرمیوں اس کی دکان یوں ہی جگہیں بدلتی رہتی تھی۔

وکیل صاحب کا مکان اسے دھوپ ہی سے پناہ نہیں دیتا تھا بلکہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی تھا۔ وکیل صاحب ایک وسیع کنبے کے سرپرست تھے۔ ان کا شمار شہر کے مشہور وکیلوں میں ہوتا تھا۔ بڑے با اخلاق، ملنسار اور مہمان نواز تھے۔ جب تک گھر پر رہتے ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا۔ کچہری جاتے تو پیچھے بیگم صاحبہ ان کی ہر دلعزیزی کو برقرار رکھتیں۔ ان کی اپنی ملنے والیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، اس پر وکیل صاحب کے مؤکلوں کی بیویوں کی خاطر داریاں کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ دن بھر سبحان کے ٹھیلے سے سوڈا لیمن کی بوتلوں، برف، پان، سگریٹ وغیرہ کی تھاک بندھی رہتی۔

یہ علاقہ شہر کے آخری سرے پر تھا جہاں شہر کی حد ختم ہو جاتی تھی اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس جگہ مکان خال خال ہی تھے اور کوئی دکان قریب نہ تھی۔ بھلا دو ایک گھروں کے آسرے پر کون ایک مستقل دکان کا متحمل ہو سکتا۔ رہا سبحان تو اس کی بات دوسری تھی۔ اول تو اس کے ٹھیلے کا خرچ ہی کیا تھا۔ نہ کرایہ دینا پڑتا تھا نہ بجلی کا بل۔ پھر دنیا میں کوئی رشتے دار تھا نہ عزیز۔ گھر تھا نہ در۔ اس کی ضروریاتِ زندگی اس قدر مختصر تھیں کہ صرف وکیل صاحب کے مکان کی آمدنی ہی سے پوری ہو جاتی

تھیں۔ اور وہ شہر کے چوکوں کے ٹھیلے والوں اور دوسرے دکانداروں کی باہمی چشمکوں سے الگ تھلگ اس سنسان مگر عافیت کی جگہ میں خوش تھا۔

وکیل صاحب نے جب نئی نئی وکالت شروع کی تھی تو انھیں مجبوراً شہر کے ایک بارونق بازار میں رہنا پڑا تھا۔ چھوٹا سا مکان کرایہ حد سے بڑھا ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ جب کام چل نکلا۔ اور لوگ ان کو جاننے لگے تو انھوں نے اس نواح میں ایک مؤکل کی زمین سستے داموں خرید لی۔ کئی برس تک یہ زمین یونہی پڑی رہی۔ یہاں تک کہ انھوں نے تعمیر کے لیے خاصا روپیہ جمع کر لیا۔ آخر جب ان کے حسبِ منشا مکان بن گیا تو وہ اپنے وسیع کنبے کو لے کر اس میں اُٹھ آئے۔ ان کے دم قدم سے تھوڑے ہی دنوں میں اس علاقے میں زندگی کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے۔ دُور دُور سے تانگے والے ان کے مؤکلوں کو لے کر یہاں پہنچنے لگے۔ چونکہ وکیل صاحب خود بھی تانگے ہی میں بیٹھ کر کچہری جایا کرتے تھے۔ اس لیے دو ایک تانگے صبح شام ان کے مکان کے آس پاس کھڑے نظر آنے لگے۔ کبھی کبھی کوئی موٹر بھی تھوڑی دیر کے لیے ان کے مکان کے نیچے رُک کر اس نواح کی رونق بڑھا جاتی۔

وکیل صاحب کے گھر کے علاوہ سبحان کی آمدنی کا ذریعہ یوں تو وہ اِکّا دُکّا راہ گیر بھی تھے جو شہر سے دیہات یا دیہات سے شہر جاتے ہوئے اس سے دو ایک پیسے کی بیڑیاں، گُڑ کی ریوڑیاں یا بھُنے ہوئے چنے خریدنے ٹھہر جاتے۔ مگر ان سے یافت کم اور کوفت زیادہ ہوتی۔ خصوصاً اس وقت جب دیہاتنیں دوپٹے کو سر اور ٹھوڑی پر بل دیئے، ناک اور منہ چھپائے، اپنی بھدّی جوتیاں گھسٹ گھسٹ کر چلتیں تو سڑک پر گرد و غبار کا ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوتا اور سبحان کو سوڈے کی بوتلوں پر سے گرد صاف کرنے کے لیے پانی کا ایک اور چھینٹا دینا پڑتا۔

ان راہ گیروں سے کہیں زیادہ اس کی بکری تانگے والوں سے ہوتی تھی جو یوں کمر کے نیچے سے پھٹا ہوا خاکی پاجامہ پہنے ہوتے تھے مگر قینچی سے کم درجے کا سگرٹ پینا ان کی طبع کو پسند نہ تھا۔ اور جب پیاس لگتی تو پانی کے بجائے برف میں لگے ہوئے لیمن کے ادھّے سے ان کی تسکین ہوتی تھی۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ جب سبحان دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں لاوارث سانڈوں، کتوں اور فقیر لڑکوں کی معیت میں پیپل کے سائے تلے پناہ لے رہا ہوتا اور بکری سے بے نیاز اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تو ایسے میں کوئی دیہاتی برات دولھا دلھن سمیت، پسینے میں شرابور میلے ماتھے اور کلائیوں پر سستے ریشمی کپڑوں کا رنگ لگا ہوا، پیاس سے زبانیں نکلی ہوئیں، اس پیپل تلے سستانے اور پڑاؤ کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اور سبحان کی کئی دنوں کی کسر ایک دن میں نکل جاتی۔

سبحان کو اس علاقے میں ٹھیلہ لگاتے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہی ایک ایسا کام تھا جو اس نے ایک جگہ جم کر اتنے عرصے تک کیا تھا ورنہ اس کی ساری عمر گھومنے پھرنے میں گزر گئی تھی۔ ابھی وہ دس برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ فکرِ معاش نے اسے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بچپن اور جوانی میں بیسیوں ہی دھندے کیے تھے۔ آج اس شہر میں ہے تو کل اس شہر میں کبھی کسی گھر میں اوپر کے کام پر ملازم ہے تو کبھی کسی دفتر میں چپراسی ہے۔ کبھی ریلوے شاپ میں تو کبھی چھاپے خانے میں۔ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا۔ جب تک ہاتھ پاؤں میں سکت رہی۔ آزاد مزدوری کو ہر کام پر ترجیح دی۔ مگر جب جوانی گزر گئی۔ اور بڑھاپے کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ تو طبیعت محنت مشقت سے خود بخود کترانے لگی۔ آخر اس نے اتنی رقم جمع کر لی کہ ایک ٹھیلہ

خرید لے۔ پہلے پہل اس نے پھل اور سبزیاں ٹھیلے پر رکھ کر شہر کا چکر لگانا شروع کیا مگر تھوڑے ہی دنوں میں اس کام سے بد دل ہو گیا۔ اوّل تو منڈی کے بھاؤ کو سمجھنا اور مول تول کرنا اس کی فہم سے باہر تھا۔ وہ مال کو پرکھنے میں بہت جلد دھوکا کھا جاتا تھا۔ پھر مال نہ بکے تو گل سڑ کر یا باسی ہو کر خراب ہو جاتا۔ اور پھر یہ کہ دوسرے ٹھیلے والوں سے خواہ مخواہ کے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دن بھر پولیس والوں کی گھرکیاں اور جھڑکیاں سہنی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اُس نے زیادہ منافع کے خیال کو چھوڑا اور پان سگریٹ کی دکان پر اکتفا کی۔ اور شہر کا ایک ایسا الگ تھلگ گوشہ تلاش کر لیا کہ جہاں کسی قدر چین سے زندگی کے دن پورے کر سکے۔

ادھر وکیل صاحب یہ دیکھ کر کہ یہ دکان محض ان کے گھر کے آسرے ہی پر لگائی گئی ہے، اس کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ ماما اور نوکروں کو تاکید تھی کہ سب اسی سے سودا خریدیں اور اگر کچھ شکایت ہو یا چیزیں مہنگی معلوم ہوں تو ان کو اطلاع دیں، وہ خود اس کا بندوبست کر دیں گے۔ مگر سبحان کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہ آنے دیتا تھا۔ وہ نوکروں سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے اور ایک آدھ پان یا بیڑی مفت کھلا پلا کے ہمیشہ انھیں خوش رکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

یوں بھی وہ ہنس مکھ، لطیفہ گو اور ہمدرد انسان تھا۔ لگائی بجھائی کی عادت نہ تھی۔ اس لیے سب سے خوب بنتی تھی۔ ٹھیلہ لگانے کے ساتھ ہی اس نے داڑھی رکھ لی تھی، لبیں کتروانے لگا تھا۔ خشخشی بال، ایک تنکوں کی بنی ہوئی مخروطی وضع کی ہلکی پھلکی ٹوپی ہر وقت سر پر رہا کرتی۔ چارخانہ تہمد، گاڑھے کا کرتا، اس پر خاکی زین کا کوٹ، اپنی اس وضع سے وہ خاصا دیندار معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ صوم و صلوٰۃ سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ان پانچ برس میں جو اس نے وکیل صاحب کے سائے میں گذارے تھے، وہ ان کے خاندان کے بہت سے حالات سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اسے ایک ایک فرد کی عادات و اطوار کا علم تھا۔ یہاں تک کہ پردے میں رہنے والی عورتوں کا ناک نقشہ، ان کی سیرت اور سبھاؤ بھی اس سے چھپا ہوا نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ کے سارے بچے ایک ہی چھاتی کا دودھ پی کر پلے ہیں کیونکہ دوسری چھاتی میں دودھ نہیں اترتا۔ وہ جانتا تھا کہ منجھلی صاحبزادی سب بہن بھائیوں سے زیادہ غصیلی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وکیل صاحب کے والد ماجد میر صاحب بڑے قصاب تھے مگر بیٹے کے کہنے پر وہ پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ غرض کئی اور ایسی باتیں جن کا وکیل صاحب کے بہت سے ملنے والوں کو سان گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

اسی طرح اسے مکان کے ایک ایک حصے اور اس کی آرائش کا حال بھی معلوم تھا۔ حالانکہ گھر تو گھر اس نے کبھی سیڑھیوں میں بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس کمرے میں کون رہتا ہے۔ وکیل صاحب کا دیوان خانہ کہاں ہے۔ بیگم صاحبہ ملنے والیوں سے کہاں ملاقات کرتی ہیں۔ بڑی صاحبزادیاں اور صاحبزادے رات کو کہاں سوتے ہیں۔ ہارمونیم کون بجاتا ہے۔ وہ پرانا بڑا کلاک جس کا گھنٹہ کبھی کبھی رات کو پچھلے پہر کے سناٹے میں سنائی دیا کرتا ہے کس کمرے میں ہے۔ باورچی خانہ کس منزل پر ہے اور بوڑھے میر صاحب اور نوکر چاکر کس طرح رہتے سہتے ہیں۔

یہ باتیں اسے کچھ تو بچوں کے بھولے پن سے، کچھ نوکروں کی بے احتیاطی سے اور کچھ خود اپنی ٹوہ لگانے کی عادت سے معلوم ہو گئی تھیں۔ لیکن انھیں معلوم کرنے میں اس کی کسی بُری نیت کو دخل نہ تھا۔ بس اسے انسانی ہمدردی کہہ لیجیے یا دل بہلاوے کی ایک صورت۔ آخر زندگی میں کچھ تو لگاؤ ہونا ہی چاہیے تھا ورنہ اس ویرانے میں ایک ایسے شخص کا، جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، زندگی گزارنا اجیرن ہو جاتا۔

اس پانچ سال کے عرصے میں سبحان کے سامنے وکیل صاحب کے خاندان میں دو نئے رکنوں کا اضافہ ہوا تھا۔ ایک صاحبزادہ ایک صاحبزادی۔ ان سے پہلے جو صاحبزادے کئی گودوں میں رہتے تھے وہ اب بہن کی انگلی پکڑے سبحان کی دکان سے اپنی مٹھائی کی گولیاں لینے خود آنے لگے تھے۔ ان کے لیے ابھی پاجامہ پہننا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔

ان بہن بھائیوں سے بڑے دو صاحبزادے علی الصباح سب سے پہلے مکان سے نکلتے۔ ایک کی عمر نو برس، دوسرے کی گیارہ برس۔ ایک ہی طرح کے کوٹ۔ ایک ہی طرح کی ٹوپیاں، ایک ہی طرح کے بستے۔ اسکول روانہ ہونے سے پہلے وہ سبحان سے دو دو پیسے کی چوسنے والی سنگترے کی پھانکیں خریدتے۔ سبحان سب سے پہلے ان ہی کی بوہنی کیا کرتا۔ جس دن انھیں آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ سمجھ جاتا کہ آج اسکول میں چھٹی ہے۔ وہ ان کے لیے ہمیشہ بڑھیا سے بڑھیا سنگترے کی پھانکیں اور دوسری انگریزی مٹھائیاں خرید کے لایا کرتا۔ اور نفع کا خیال نہ کرکے ہمیشہ گنتی سے زیادہ دیا کرتا۔

کبھی کبھی وہ چھوٹے بھائی سے کہتا:۔

”افضل میاں اسکول سے دیر ہو گئی نا، دیکھنا آج کیسے کان اینٹھیں گے ماسٹر صاحب!“

اور افضل میاں اس کے سانولے رنگ کو گھور کر کہتے:۔

”چپ رہو تم کالا آدمی۔ ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا“ اور وہ دونوں ہنستے ہوئے وہاں سے چل دیتے۔

ایک دن صبح کو بڑا بھائی آیا لیکن چھوٹا نہ آیا۔ جب اس نے پھانکیں خریدنے کے لیے جیب سے پیسے نکالے تو سبحان نے پوچھا:۔

”افضل میاں کہاں ہیں؟“

”وہ ماموں میاں کے ساتھ گاؤں گیا ہے“ لڑکے نے جواب دیا اور وہ اکیلا ہی اسکول روانہ ہو گیا۔

جب چار پانچ روز تک سبحان نے افضل کی صورت نہ دیکھی تو اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ آخر چھٹے روز جب دونوں بھائی پہلے کی طرح اسکول جاتے ہوئے اس کی دکان پر آئے تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز کھو گئی تھی جو اب مل گئی ہے۔

ان لڑکوں کے جانے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد ایک خالی تانگہ مکان کے نیچے آ کر رکتا اور کوچوان گھنٹی بجاتا۔ سبحان سمجھ جاتا کہ اب صاحبزادیوں کے اسکول جانے کی باری ہے۔ جب انھیں آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو کوچوان بے صبری سے پے در پے گھنٹی بجانا شروع کر دیتا۔ اس پر پہلی منزل کے بخارچے میں سے بوڑھی ماما چق کو سرکا کر اپنا سر باہر نکالتی اور تانگے والے سے کہتی:۔

”دم لو میاں دم لو۔ آتے ہیں ابھی آتے ہیں“

یہ سن کر تانگے والا بڑبڑاتا ہوا تانگے سے اتر کر سبحان کے ٹھیلے کے پاس جاتا اور اس سے قینچی کے دو سگریٹ خریدتا۔ یا سونف ملٹھی والا پان بنوا کر کھاتا۔ آخر وکیل صاحب کی تینوں بڑی صاحبزادیاں ماما کے ہمراہ سیڑھیوں سے اترتیں۔ بڑی کی عمر اٹھارہ برس، اس سے چھوٹی کی سولہ برس اور اس سے چھوٹی کی تیرہ برس۔ تینوں کے مصری وضع کے برقعے، ایک کتھئی رنگ کا، ایک سیاہ رنگ کا اور ایک سلیٹی رنگ کا۔ تینوں کے پاؤں میں سینڈل۔ دو بڑی بہنیں تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتیں۔ اور چھوٹی بہن اور ماما

اگلی سیٹ پر۔ اور تانگے والا ایک بڑی سی سفید چادر تانگے کے آگے پیچھے تان دیتا۔ ماما سیر بھر برف کا چورا کر کے تھرمس بوتل میں بھروا لیتی۔ وہ اپنے پیسے سبحان سے ایک برابر کا پان بھی بنواتی۔ جس میں وہ بہت سا کالا تمباکو ڈلوایا کرتی۔ کبھی کبھی منجھلی صاحبزادی کو بدہضمی کی شکایت ہوتی تو وہ کھارے پانی کا ایک ادّھا ماما سے منگوا کے پیا کرتی اور تانگہ چل دیتا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مختار اور شمشاد وکیل صاحب کے دونوں بڑے صاحبزادے موسم گرما کے ہلکے پھلکے سوٹ پہنے، اپنی اپنی سائیکل کندھے پہ اٹھائے سیڑھیوں سے اترتے دکھائی دیتے۔ وہ سڑک کو پار کر کے سبحان کے ٹھیلے کے پاس آ کھڑے ہوتے سبحان انھیں سلام کرتا جس کا وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے۔ مگر وہ دونوں ہر وقت ایسی گرما گرم بحث میں اُلجھے رہتے کہ سبحان باوجود کوشش کے ان سے کوئی بات نہ کر پاتا۔ پھر ان کی باتیں بھی عموماً ایسی ہوتیں کہ سبحان کے کچھ بھی پلّے نہ پڑتا۔ ان کے جوش و خروش، تیز لہجے اور آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ وہ کسی بہت ہی اہم اور دقیق مسئلے پہ بحث کر رہے ہیں۔ گفتگو کا جتنا حصہ سبحان کی سمجھ میں آتا وہ کچھ اس قسم کا ہوتا:۔

”شمی۔ تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے بھلا افلاطون۔۔۔۔۔۔“

”لیکن بھائی جان آپ بھی تو ذرا غور فرمائیے کہ ارسطو۔۔۔۔۔۔۔“

”شمی میں کہتا ہوں تم کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ مانا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔“

”وہ تو صحیح ہے لیکن بھائی جان ان دلائل کی روشنی میں۔۔۔۔۔۔۔“

”یہ سراسر ہٹ ہے تمھاری شمی۔۔۔۔۔۔۔۔“

”بھائی جان لیکن پروفیسر صاحب۔۔۔۔۔۔“

”شمی۔۔۔۔۔۔۔“

”بھائی جان۔۔۔۔۔۔“

”شمی۔۔۔۔۔۔“

”بھائی جان۔۔۔۔۔۔“

غرض کالج کو جاتے۔ کالج سے آتے۔ ہاکی کھیلنے جاتے۔ ہاکی کھیل کر آتے۔ جب کبھی دونوں بھائی ساتھ ساتھ ہوتے، یہ بحث یوں ہی جاری رہتی۔ کبھی کبھی وہ انگریزی میں بھی گفتگو کرنے لگتے۔ پھر ان کا جوش و خروش اور بھی بڑھ جاتا۔ ایسے موقعوں پر سبحان نظریں نیچی کر کے مسکرایا کرتا۔

مختار بائیس سالہ نوجوان تھا۔ صحت و توانائی کا مجسمہ۔ بھرا بھرا جسم۔ سُرخ و سفید چہرہ۔ شربتی رنگ کی آنکھیں۔ بھورے گھنگھریالے بال۔ شمشاد اس سے دو سال چھوٹا تھا مگر اس کے باوجود اس کا قد بڑے بھائی سے نکلتا تھا۔ ظاہری جمال میں وہ مختار کے برابر نہ تھا البتہ اپنی آنکھوں کی غیر معمولی چمک سے وہ اس سے کہیں زیادہ ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اور سبحان نے بارہا یہ محسوس کیا کہ مختار بحث میں اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر خواہ مخواہ چھوٹے بھائی کو ڈانٹتا ڈپٹتا ہے اور یہ شمشاد کی سعادتمندی ہے کہ وہ ہمیشہ بڑے بھائی کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔

سبحان ان کے لیے حسبِ معمول دو کرائے دیسی پان چن کر نکالتا اور ان پر چونا کم اور کتھا زیادہ لگا کے انھیں لپیٹنے کے لیے رکھ دیتا۔ وہ اپنی بحث کے دوران میں اس سے جھاڑن مانگتے۔ اور بائیسکلوں کو بھی جھاڑتے پونچھنے جاتے اور ساتھ ساتھ بحث بھی کرتے رہتے۔ کبھی کسی پہیئے میں ہوا کم ہوتی تو وہیں سے ملازم لڑکے شبیر کو آواز دے کے پمپ منگوایا جاتا اور پہیئے میں ہوا بھری جاتی۔ مگر اب بھی کیا مجال کہ بحث لمحہ بھر کے لیے بھی رُکنے پائے۔ سبحان پانوں کے علاوہ سگریٹ کی دو ڈبیوں میں قینچی کے پانچ پانچ سگریٹ پہلے ہی ڈال رکھتا۔ اور وہ اپنا اپنا پان منہ میں رکھ، سگریٹ سُلگا، بائیسکلوں پہ سوار ہو، تیز تیز پیر مارتے ہوئے کالج روانہ ہو جاتے مگر بحث بدستور جاری رہتی۔

کوئی دس بجے کے قریب ایک اور خالی تانگہ مکان کے نیچے آ کر رُکتا۔ اور سبحان کو معلوم ہو جاتا کہ وکیل صاحب کے کچہری جانے کا وقت ہو گیا۔ اس وقت اس کا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کے برابر میں کھڑا ہوتا۔ وہ پہلے ہی سے ایک اچھا سا پان چھانٹ کر لگا رکھتا۔ آخر سیڑھیوں میں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی اور وکیل صاحب سیاہ شیروانی پہنے، سر پر مشہدی پگڑی باندھے، چھڑی ٹیکتے ہوئے سیڑھیوں سے اترتے۔ ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ بھاری بھرکم آدمی تھے مگر چاق و چوبند، فرانسیسی تراش کی داڑھی جس میں اب کچھ دنوں سے سفید بال زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ چہرے سے قناعت اور بردباری ٹپکتی تھی۔ کثرتِ اولاد کی وجہ سے ہر ایک کو شفقت کی نظروں سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ سبحان کے سلام کے جواب میں ایک آدھ بات کرنا خواہ وہ بے معنی ہی کیوں نہ ہو، اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے:۔

"بھئی سبحان آج کل خربوزے بڑے پھیکے آ رہے ہیں"

"ہم بھی تو کھٹے ہیں سرکار"

"سچ کہتے ہو" یہ کہہ کر وہ تانگے میں بیٹھ جاتے۔ اور سبحان معمول کے مطابق پان، قینچی کی ڈبیا، دیا سلائی کا بکس اور ایک کاغذ کے ٹکڑے پر تھوڑا سا چونا رکھ کر، کہ وہ زیادہ چونا کھانے کے عادی تھے، تانگے کے پاس جا کر یہ چیزیں انھیں دے دیتا۔ کبھی کبھی ان کا مختار بھی فائلیں لیے ان کے ہمراہ ہوتا اور سبحان کو اس کے لیے پان میں بہت سی سونف ڈالنی پڑتی۔

وہ وکیل صاحب اور ان کی بیگم کے بہت سے ملنے والوں کو بھی جاننے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بدھ کے روز تیسرے پہر حاجی صاحب کے ہاں سے زنانہ سواریاں آیا کرتی ہیں۔ چنانچہ جیسے ہی ان کا تانگہ آ کے رُکتا وہ لائم جوس، رس بھری وغیرہ کی بوتلیں پہلے ہی سے دھو دھا کر نکال رکھتا۔ ان سواریوں کے ساتھ جو بچے آتے ان کی دل پسند مٹھائیوں کا بھی اسے پتہ تھا۔ اتوار کے روز عموماً ڈاکٹر علیم الدین یا خیر اللہ چائنا والے کے خاندان آیا کرتے۔ موخر الذکر وکیل صاحب کے دور کے قرابت داروں میں سے تھے اور ان ہی کی طرح کثیر الاولاد۔ قریب کے رشتہ داروں میں جو کبھی کبھی ملنے آ جاتے۔ اور جن کو سبحان اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک تو بیگم صاحبہ کا چھوٹا بھائی تھا جس کی بزازی کی دکان تھی۔ جب کبھی وہ آتا کپڑے کا ایک آدھ تھان اس کی بغل میں ہوتا۔ یہ تھان کبھی تو وکیل صاحب کے ہاں ہی رہ جاتا، اور کبھی وہ اسے واپس اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور دوسرے وکیل صاحب کے تایا۔ جو بے حد ضعیف تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ شہر کے دوسرے سرے پر رہا کرتے تھے۔ جب کبھی یہ باپ بیٹے ملنے آتے تو دن بھر ان کے گھر ہی پر رہتے اور رات کو بڑی دیر میں کھانا کھا کر جاتے۔

سبحان، مختار اور شمشاد کے بعض دوستوں کو بھی جانتا تھا جو ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ خصوصاً ریاض کو۔ شام کو جب وہ ہاکی کھیل کر واپس آتے تو اکثر ریاض بھی سائیکل پر ان کے ہمراہ ہوتا۔ وہ شمشاد کا ہم عمر اور کالج میں اس کا ہم سبق تھا۔ مختار سے اس کی زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔ وہ چونکہ شمشاد کا بڑا بھائی تھا اس لیے ریاض بھی اس کا ادب کیا کرتا تھا۔ ریاض ان دونوں بھائیوں سے قد میں چھوٹا تھا اور رنگت بھی ان جیسی سُرخ و سفید نہ تھی، تاہم اس کی ملاحت میں ایک خاص بانکپن تھا۔ متبسم چہرہ، زندگی کی مسرتوں سے بھرپور اور فکروں سے آزاد۔ شمشاد کو اس سے اور اس کو شمشاد سے گہری وابستگی تھی۔

سبحان کے ٹھیلے کے قریب، جو اس وقت وکیل صاحب کے مکان کے عین بالمقابل سڑک کے دوسرے کنارے ہوتا، یہ تینوں نوجوان اپنی اپنی بائیسکل تھامے، رخصت سے پہلے کچھ دیر باتیں ضرور کرتے۔ جب کبھی ریاض ان بھائیوں کی بحث میں شامل ہو جاتا پھر تو بحث طول ہی کھینچتی چلی جاتی۔ سبحان سے بار بار پان اور سگریٹ لیے جاتے۔ ریاض بار بار خدا حافظ کہتا مگر رخصت نہ ہو پاتا۔ غرض گھنٹہ گھنٹہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ یوں ہی باتوں میں گزر جاتا۔ اس دوران میں وکیل صاحب کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں بڑی صاحبزادی کا کمرہ تھا، بار بار ایک رنگین سایہ چقوں کے پیچھے حرکت کرتا رہتا، جسے سبحان کی کن انکھیوں کے سوا اور کوئی آنکھ نہ دیکھ سکتی۔

وکیل صاحب کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں سے رشتے کے سلسلے میں جو لوگ آیا کرتے، سبحان ان کو بھی خوب پہچانتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کی بکری ایکدم بڑھ جاتی اور گھر کے ملازموں اور بوڑھی ماما کے علاوہ وکیل صاحب کے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بھی دوڑ دوڑ کر سبحان کی دکان پر سودا لینے آیا کرتے۔ ان لوگوں کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد سبحان ٹوہ لگا لیتا کہ کہیں بات پکی ہوئی یا نہیں۔

وہ شبیر سے ہنس کر کہتا:۔

”پانچوں گھی میں ہوں گی اور سر کڑھائی میں“

شبیر حیران ہو کر پوچھتا:۔

”کیا کہا تم نے؟“

”زیادہ بنو نہیں ہم سے، سب خبر ہے ہمیں“

شبیر اب بھی لاعلمی ظاہر کرتا تو وہ سمجھ جاتا کہ اس کو واقعی خبر نہیں۔ اور پھر وہ ماما کی طرف رجوع کرتا جس سے اسے اکثر باتیں معلوم ہو جایا کرتی تھیں۔ بڑی بی وکیل صاحب کی سب سے پرانی ملازمہ تھیں۔ ان کے سارے بچے ان ہی کی گود میں پلے تھے۔ اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ نہ کوئی رشتہ دار ہی تھا۔ ان بچوں سے انھیں دلی محبت تھی۔ اس کی بنا پر وہ ان کے مستقبل کے بارے میں رائے زنی کرنا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ چنانچہ محبت اور سادگی میں ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا:۔

”نوج جوان لوگوں میں رشتہ ہو۔ مجھے تو یہ لوگ ایک آنکھ نہیں بھاتے“ پھر ذرا تامل کر کے کہتیں: ”گھبراؤ نہیں۔ وہ دن بھی آ جائے گا۔ چاند سی بیٹیاں ہیں میری ——“

اور سبحان سمجھ جاتا کہ ان لوگوں سے بات نہیں ٹھہری۔ ایسے ہی کسی موقع پر وہ افضل میاں سے کہتا:۔

”شہ بالا بنے گا میرا میاں۔ ہم کو بھی گھوڑی پر چڑھاؤ گے نا!“

اگر اس قسم کی کوئی بات گھر میں ہوئی ہوتی تو افضل میاں شرما کر چل دیتے۔ یا معلوم نہ ہوتا تو کہتے:۔

"چپ رہو تم کالا آدمی۔ ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا"

ایک دن ایسے ہی موقع پر جبکہ کچھ عورتیں آئی ہوئی تھیں، بڑی بی پان لینے آئیں۔ ان کا سانس پھولا ہوا تھا مگر وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھیں۔ سبحان نے ان کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا ہی تھا کہ وہ پھوٹ پڑیں:۔

"کسی سے ذکر وِکر نہ کیجیو خبردار۔ بڑی صاحبزادی کی بات ٹھہر گئی"

"کب؟"

"ابھی ابھی"

"کون لوگ ہیں؟"

"شہر کے نامور ڈاکٹر ہیں۔ لڑکا بی۔ اے میں پڑھتا ہے۔ پر خبردار کسی سے ذکر نہ کر بیٹھیو۔ سو دشمن ہیں سو دوست، میں نے گھر کا آدمی سمجھ کے تم سے کہہ دیا ہے۔ تم کسی سے نہ کہنا۔ بچوں سے بھی نہیں۔ نوکروں سے بھی نہیں......"

اس کے دو تین ہی دن بعد سبحان نے کئی اور ذریعوں سے بڑی بی کی بات کی تصدیق کر لی۔ سمدھیوں میں میل جول بڑھنے لگا۔ عورتیں تو آتی جاتی ہی رہتی تھیں۔ ایک بار لڑکے کے والد ڈاکٹر صاحب بھی اپنی موٹر میں بیٹھ کے وکیل صاحب سے ملنے آئے۔ اور دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ دوسری مرتبہ ضیافت پر آئے۔ اس موقع پر ان کا صاحبزادہ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ وہ خاصا قبول صورت تھا مگر کسی قدر لاغر معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بی نے کہا "امتحان کی فکر ہے بچارے کو" سبحان کو نام بھی معلوم ہو گیا صغیر احمد۔ قرار یہ پایا کہ جب لڑکا امتحان دے لے گا تو اس کی شادی کر دی جائے گی۔

بڑی صاحبزادی کے جہیز کے لیے بڑی سُرعت کے ساتھ جو زیورات و ملبوسات وغیرہ تیار کرائے جا رہے تھے سبحان کو ان کی ایک ایک تفصیل کا علم تھا۔ اس دوران میں شمشاد میاں کے دوست ریاض بھی کئی مرتبہ ہاکی کے بعد ان دونوں بھائیوں کو ان کے گھر تک پہنچانے آئے۔ اور سبحان نے دیکھا کہ دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے وہ رنگین سایہ اب بھی حرکت کرتا ہے۔

اور ایک دن اچانک سبحان کے ذہن میں ایک بات آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صاحبزادی کو یہ رشتہ منظور نہ ہو! یہ بات اسے کسی نے نہیں سمجھائی تھی۔ اور سمجھاتا بھی تو کون۔ کیونکہ وکیل صاحب یا گھر کے کسی اور آدمی کو اس کا گمان تک نہ تھا۔ اس نے مختلف زبانوں سے اس کے بارے میں مواد حاصل کر کے خود ہی یہ نتیجہ نکالا تھا۔ آخر اس نے بھی ایک عمر گذاری تھی۔ زمانے کا سرد و گرم دیکھا تھا۔ دو تین مرتبہ بڑی بی اور بچوں سے اسے معلوم ہوا تھا۔ کہ صاحبزادی کی طبیعت ناساز ہے۔ ایک دن دیکھا کہ تانگے میں سوار ہوتے ہوئے وہ بڑی بے دلی سے قدم اٹھا رہی ہے۔ ایک دن وہ اپنی بہنوں کے ساتھ اسکول نہیں گئی۔ بلکہ درد سر کی وجہ سے گھر ہی میں رہی۔ مگر اسی شام کو جب مختار اور شمشاد کے ساتھ ریاض میاں سبحان کی دکان پر آئے۔ اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تو اس نے دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے سائے کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ بے چین دیکھا۔

شادی کی تیاریاں اب اور بھی زور شور سے ہونے لگی تھیں۔ وکیل صاحب کے گھر میں ہر وقت ایک شور و غل مچا رہتا تھا۔ طرح طرح کی اجناس تانگوں میں لد لد کے آ رہی تھیں۔ طرح طرح کا فرنیچر، سنگھار میز، پلنگ، کرسیاں، تپائیاں، تانبے اور پیتل کے

برتن جنھیں قلعی گر نے چاندی کا بنا دیا تھا۔ علاوہ ازیں مہمانوں کی وہ ریل پیل تھی کہ سبحان کو دکانداری سے لمحہ بھر کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ مگر پھر بھی وہ خوش نہ تھا۔ جوں جوں شادی کا دن قریب آتا جاتا تھا اس کی افسردگی بڑھتی جاتی تھی۔ اور اسے ایک نامعلوم ہول سا ہونے لگا تھا۔

وکیل صاحب اب اس سے اور بھی زیادہ لطف و مہربانی سے پیش آنے لگے تھے۔ ایک دن وہ اس سے کہنے لگے:۔

”سبحان ہم تمہارے لیے بھی ایک جوڑا سلوائیں گے۔ برات کے روز پہننا۔ دیکھنا انکار نہ کرنا۔ ہمسائے کا رشتہ عزیزوں سے کم نہیں ہوتا“

سبحان نے وکیل صاحب کے بچوں کو دعائیں دیں۔ مگر یہ مژدہ بھی اس کی افسردگی کو دور نہ کر سکا۔

ایک دن علی الصباح سبحان نے ابھی ٹھیلہ سڑک کے کنارے لا کے کھڑا کیا ہی تھا کہ دیکھا شمشاد کندھے پر بائیسکل اٹھائے جلد جلد سیڑھیوں سے اتر رہا ہے۔ اس نے صرف بنیان اور نیکر پہن رکھا تھا اور ابھی داڑھی بھی نہیں مونڈی تھی۔

”کہئے شمشاد میاں صبح صبح کدھر کی تیاری ہے؟“ سبحان نے پوچھا۔

”کہیں نہیں، ذرا ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہوں“ شمشاد نے جواب دیا۔

”خیر تو ہے؟“ سبحان نے فکرمندی سے پوچھا۔

”ہاں خیر ہی ہے“ یہ کہہ کر شمشاد بائیسکل پر تیز تیز پاؤں مارتا ہوا چل دیا۔

سبحان کا ماتھا ٹھنکا اور وہ بے تابی کے ساتھ گھر کے اور لوگوں کی راہ دیکھنے لگا تاکہ معلوم کرے کون بیمار ہے۔ جب وکیل صاحب کے دونوں چھوٹے صاحبزادے اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے تو ان سے معلوم ہوا کہ رات بڑی باجی کی طبیعت ایکدم خراب ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک موٹر وکیل صاحب کے مکان کے نیچے رُکی اور ڈاکٹر ہاتھ میں بیگ لیے اوپر گیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ نیچے اترا۔ سبحان اپنا ٹھیلہ چھوڑ کر اس کے پاس آ گیا تھا مگر اس سے کچھ پوچھنے کی اسے جرأت نہ ہو سکی۔ اور وہ اور بھی زیادہ بیتابی کے ساتھ بڑی بی یا شبیر کا انتظار کرنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ تانگہ آیا جس میں بیٹھ کر لڑکیاں اسکول جایا کرتی تھیں مگر بڑی بی نے اسے اوپر ہی سے ”آج نہیں چاہیے“ کہہ کر لوٹا دیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شبیر برف لینے آیا تو اس سے سبحان کو معلوم ہوا کہ بڑی صاحبزادی کو سرسام ہو گیا ہے۔ مگر زیادہ فکر کی بات نہیں۔ ڈاکٹر دو گھنٹے بعد پھر آئے گا۔

دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر پھر آیا اور جب وہ جانے لگا تو سبحان پھر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس کے لب ہلے مگر سوال کرنے کی اب کے بھی اُسے جرأت نہ ہوئی۔ اس دفعہ بڑی بی پان لینے آئیں تو ان سے معلوم ہوا کہ حالت میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ڈاکٹر شام کو پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔

اس روز وکیل صاحب کچہری نہیں گئے۔ تیسرے پہر لڑکی کا ہونے والا سسر جو خود بھی ڈاکٹر تھا اسے دیکھنے آیا اور ایک گھنٹے تک اس کے پاس رہا۔ اور لوگ جو بچی کی خبر کو آئے انھیں جلد ہی رخصت کر دیا گیا۔ دن بھر مکان پر ایک مقبرے کی سی خاموشی طاری رہی۔

شمشاد اور مختار کالج سے جلد ہی واپس آ گئے تھے۔ شام کو وہ ہاکی کھیلنے نہیں گئے۔ ریاض شمشاد سے ملنے آیا۔ سبحان کے ٹھیلے کے قریب جب شمشاد اس سے اپنی بہن کا حال بیان کر رہا تھا۔ تو سبحان نے سنا کہ اس کے مرض میں ابھی افاقہ نہیں ہوا۔ دونوں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر آج رات خیریت سے گزر گئی تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔

سبحان کی نظر بے اختیار دوسری منزل پر پرچھتوں کی طرف اٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے سوا وہ کچھ اور نہ دیکھ سکا۔

تھوڑی دیر میں ریاض رخصت ہو گیا۔

شمشاد نے گھر جاتے ہوئے سبحان سے کہا:۔

"برف اور لا رکھنا شاید رات کو ضرورت پڑ جائے"

"فکر نہ کیجئے۔ میں نے من بھر برف پہلے ہی سے منگوا رکھی ہے"

سبحان رات کو عموماً نو بجے دکان بڑھا دیا کرتا تھا مگر اس رات اس نے گیارہ بجے تک دکان جمائے رکھی۔ اس دوران میں وہ ملازموں سے برابر بچی کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ اس کی حالت اگر سدھری نہیں تھی تو زیادہ بری بھی نہیں ہونے پائی تھی۔

آدھی رات کے قریب وہ ٹھیلے کو بند کر کے حسب معمول اس کے قریب ہی سڑک کے کنارے چارپائی ڈال کر لیٹ رہا مگر آنکھوں میں نیند غائب تھی۔ کان وکیل صاحب کے مکان کی طرف لگے ہوئے تھے۔ صبح کو تین بجے کے قریب جب وہ ذرا اونگھنے لگا تھا تو اچانک ایک طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اور وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ مگر گھر میں خاموشی تھی۔

اس نے اینٹ پھینک کر کتے کو بھگا دیا۔

سہارے کی تلاش

حیات اللہ انصاری

ریاست منی پور کے راج محل کے شاندار باغ میں مہاراجہ کی سالگرہ منائی جا رہی تھی اور ریاست کے چوٹی کے عہدیدار، اعلیٰ افسر، جاگیردار اور معززین اکٹھے تھے۔ سالگرہ کی رسوم ادا ہو چکی تھیں، ایٹ ہوم بھی ختم ہو چکا تھا، اور اب مہمان گھوم پھر کر ایک دوسرے سے مل رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

مسٹر جان فارسٹر جو ریاست کا نیا انگریز وزیر داخلہ تھا مہاراجہ کو مبارکباد دینے کے بعد صدر میں لگے ہوئے زرلفتی شامیانے سے نکل کر ایک جاگیردار مسٹر جوتی سے باتیں کرنے لگا۔ وزیر داخلہ کو دیکھ کر انسپکٹر جنرل پولیس اور عہدیدار اور معززین اکٹھے ہو گئے۔ فارسٹر باتیں تو ان لوگوں سے کر رہا تھا لیکن اس کے کان اس کھوج میں تھے کہ عفت اور عصمت کے تذکرے کس کس طرف ہو رہے ہیں۔ اتنے میں اسے ذرا دور پر ایک زنانی آواز جوش میں بھری ہوئی سنائی دی۔

"جس دیس میں اس کی بیٹیوں کی لاج محفوظ نہ ہو وہ مٹ جائے تو اچھا ہے۔"

پھر ایک مردانی آواز سنائی دی۔

"اتنا مبالغہ نہیں کرتے مالتی!"

مردانی آواز میں ایک التجا بھی تھی کہ ایسی باتیں کم سے کم یہاں تو نہ کرو۔

مالتی نے جواب دیا۔

"میں اتنا جانتی ہوں چاچا جی کہ ہمارے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔"

شاید کسی نے چپکے سے کہا کہ مسٹر فارسٹر پاس ہی کھڑے ہیں۔

مالتی نے چمک کر جواب دیا۔

"جس کا جی چاہے سن لے میں سچ بات کہنے سے نہیں رک سکتی۔"

مسٹر فارسٹر ہندوستانی اچھی طرح سمجھ لیتے تھے، یہ سب باتیں سمجھ گئے اور جوش سے کہنے لگے۔

"آج کل عفت و عصمت کی باتیں بہت ہو رہی ہیں"

"کچھ نہ پوچھئے۔ ہر طرف اسی کا چرچا ہے"

فارسٹر کے لہجے میں تلخ غصہ موجود تھا جو دبایا جانے پر بھی چھلک آیا تھا۔ اب تو فارسٹر کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب بھی عصمت کا تذکرہ سنتا تھا تو یہ محسوس کرتا تھا کہ سوامی کا مرن برت بھیس بدل کر مجھ پر حملہ کر رہا ہے۔ ایسے حملے برداشت کرتے کرتے وہ اپنے سینے میں ایک ڈائنامیٹ محسوس کرنے لگا تھا۔

دوسری جنگِ عالمگیر جاری تھی اور ہندوستان میں رنگروٹ بھرتی کر کے چند ہفتوں کی تربیت دے کر محاذ پر بھیجے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں ایک فوجی ماہر نے یہ دریافت کیا کہ ریاست منی پور کے پہاڑ اور جنگل ایک خاص قسم کی جنگی تربیت کے لیے بہت موزوں ہیں۔ حکومتِ ہند نے مہاراجہ سے ٹیلی فون پر رسمی اجازت لی اور چند ہفتوں کے اندر اندر ضروری انتظامات کر کے وہاں تربیتی کیمپ کھول دیا گیا۔

تربیتی کیمپ اپنے ساتھ مسٹر فارسٹر کو بھی بحیثیت ریاست کے وزیرِ داخلہ کے لے آیا۔ مسٹر فارسٹر کو انگلستان سے آئے صرف ۵ سال گزرے تھے لیکن اس نے اپنے کو اس تھوڑے سے عرصے میں بہت کامیاب سویلین کر دکھایا تھا۔ اس نے سن ۴۲ء کے ہنگاموں کو فرو کرنے میں ایسی ہوشیاری دکھائی تھی کہ حکومت اس کی انتظامی قابلیت کی قائل ہو گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ فارسٹر ایسے ہندوستانیوں کے مزاج داں انگریز ہندوستان میں بہت کم ہیں اس لیے حکومت کو بھروسہ تھا کہ مسٹر فارسٹر ریاست میں کوئی بات ایسی نہ ہونے دے گا جس سے کیمپ کے کاموں میں رکاوٹ پڑے۔

منی پور کی جس وادی میں کیمپ کھولا گیا تھا اس سے دو دو تین تین میل کے فاصلے پر تین چار گاؤں واقع تھے۔ کیمپ کے کھلنے کے چند ہی روز کے بعد مسٹر فارسٹر کو معلوم ہوا کہ راتوں کو فوجی ان گاؤں میں اچانک گھس جاتے ہیں اور وہاں کی عورتوں کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ مسٹر فارسٹر نے یہ شکایت فوجی ہیڈ کوارٹر کو بھیج دی۔ تیسرے دن وہاں سے رسمی جواب آ گیا کہ ”ضروری کارروائی کی جائے“

اس واقعہ کے دو مہینے بعد دس پندرہ فوجیوں نے ایک گاؤں پر چھاپہ مارا اور وہاں سے چند عورتوں کو اٹھا لے گئے۔ صبح یہ عورتیں بہت بری حالت میں جنگل میں پڑی ہوئی ملیں۔ ان بیچاریوں کو ان کے عزیز اٹھا لائے۔ اسی دن شام کو ان میں سے ایک عورت نے جس کا نام سیتا تھا موقع پا کر غیرت کے مارے خودکشی کر لی۔ اس خودکشی سے گاؤں والے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے ریاست کے اعلیٰ افسروں کے سامنے رو رو کر فریاد کی۔ جواب میں ان سے کہہ دیا گیا کہ وزیرِ داخلہ نے فوجی ہیڈ کوارٹر کو لکھا ہے کہ ایسی حرکتوں کا سدِّباب کیا جائے اور ہیڈ کوارٹر نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ وعدہ جلد پورا ہو گا۔ یہ جواب سن کر گاؤں والے واپس چلے گئے اور بظاہر بات ختم ہو گئی۔

لیکن دو ہفتوں کے گزر جانے کے بعد ایک سوامی نے درخواست دی کہ مجرم فوجیوں پر جلد سے جلد مقدمہ چلایا جائے اور اس سلسلے میں انھوں نے مسٹر فارسٹر سے ملاقات کی خواہش کی۔ فارسٹر نے سوچا کہ وہ فوجی جنھوں نے ایسی حرکت کی تھی اپنے دستے کے ساتھ ریاست سے جا چکے ہیں اور اب تک وہ برما یا افریقہ یا یورپ کے محاذ پر بھیجے جا چکے ہوں گے۔ ایک معمولی سے سوامی کی ہٹ پوری کرنے کے لیے یہ تو ہونے سے رہا کہ محاذ پر لڑتی ہوئی ایک پوری فوج کو بلا لیا جائے اور اس طرح لاکھوں روپوں کا خرچ اور فوجیوں کی عام بددلی مول لی جائے۔ فوجیوں کی بددلی اور ایسے زمانے میں جبکہ ان میں جنگ سے اکتاہٹ پھیل رہی تھی اور انکی دلدہی کی حد سے زیادہ ضرورت تھی!! ظاہر ہے کہ یہ اَن ہونی بات تھی۔ فارسٹر نے یہ سوچ کر سوامی سے ملنے سے انکار کر دیا۔

دوسرے دن انسپکٹر جنرل نے سوامی جی کا ایک خط فارسٹر کو دکھلایا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اگر مجرموں پر دو دن کے اندر مقدمہ نہیں چلایا گیا تو میں مرن برت رکھوں گا۔

یہ خط پڑھ کر مسٹر فارسٹر نے کہا۔

“کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح مجھے بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا؟ مسٹر گاندھی نے ابھی جو اکیس دن کا برت رکھا تھا اس کے پیچھے ایک طاقت تھی کیونکہ ہندوستان کے کروڑوں باشندے اسے مہاتما سمجھتے ہیں اور پوجتے ہیں۔ لیکن ایک ادنیٰ سوامی جسے اس ریاست ہی کے بہت تھوڑے سے لوگ جانتے ہوں، وہ بھوجن کرے یا بھوکا رہے، زندہ رہے یا مر جائے، منہ کالا کر کے کہیں نکل جائے یا پہاڑ سے گر کر خودکشی کرے۔ پبلک پر اس کی ان بچی باتوں کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اور حکومت اس سے کیوں دبے گی؟ سوامی یا تو سستی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے یا پاگل ہے ——”

فارسٹر سے سوامی نے عورت کی لاج کے نام پر اپیل کی تھی اور اسی کی رکھوالی کے لیے وہ جان دینا چاہتا تھا۔ عورت کی لاج!! جس دنیا میں ہر طرف آوارگی اور بدچلنی ہو، جہاں پاک دامنی نام ہو صرف نادستری اور سماج کے خوف کا، جہاں پاکباز مرد ایسے موقعوں پر جہاں بدنامی کا اندیشہ نہ ہو کبھی نہ چوکتا ہو جہاں وفادار بیویاں دل کی خلوتوں میں آزادی سے غیر مردوں سے ہم بستر ہو جاتی ہوں، وہاں ایک ادنیٰ لڑکی کی عصمت کے لیے اتنا اودھم!! یہ حرکت صرف احمقانہ اور بے نتیجہ آدرش پرستی ہے —— سیتا نے خودکشی کر لی حماقت کی اگر وہ جیتی تو اس کا مستقبل ماضی سے برا تو نہ رہتا۔ ایک مرد اسے مسترد کر دیتا تو دوسرا پسند کر لیتا۔ دنیا میں یہی ہوتا ہے ——

سوامی نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کیا۔ یعنی دو دن کے بعد مرن برت شروع کر دیا۔ فارسٹر نے جنگ کے زمانے کے اختیارات سے کام لے کر اخباروں کو برت کی خبریں چھاپنے کی ممانعت کر دی، اور اس سلسلے میں ہر قسم کے جلسے اور جلوس خلافِ قانون قرار دے دیئے اور پھر اس واقعہ کو اس نے اپنے ذہن سے نکال پھینکا۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ دوسرا ہفتہ گذر گیا۔ تیسرا ہفتہ گذر رہا تھا کہ ایک دم سے سیتا ہر ہر گھر میں عفت و عصمت کی دیوی بن کر نمودار ہو گئی۔ شاعروں نے اس کی شان میں نظمیں اور کویوں نے کویتائیں کہیں۔ گویوں نے وہ گائیں اور اخباروں میں چھپیں۔ اخباروں میں عصمت پر مضامین نکلنے لگے۔ کسی مصور نے سیتا کی ایک فرضی تصویر بنا دی جو ہزاروں کی تعداد میں بکنے لگی۔ ہر ہر گھر، ہر ہر صحبت اور ہر ہر آفس میں یہ بحثیں ہونے لگیں کہ عصمت بہت ضروری چیز ہے۔ اس کے بغیر دنیا کا کام نہیں چل سکتا۔ یہ نہ رہے گی تو سماج کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پھر شوہر بیویوں پر بھروسہ کیسے کریں گے؟ کنواری لڑکیوں کے جو بچے ہوں گے ان کو پالے گا کون؟ اس طرح کے درجنوں سوالات اٹھ کھڑے ہوئے جو گھوم پھر کر کسی نہ کسی راستے سے جواب کی تلاش میں فارسٹر کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ہندوستانیوں کی احمقانہ آدرش پرستی پر ہنستا اور ان سوالوں کے جواب موقع اور محل کا لحاظ کر کے کوئی چبھتا ہوا فقرہ کس دیتا تھا۔ لیکن جب ان سوالوں کا اور عصمت کی عظمت پر بحثوں کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تو فارسٹر کو کچھ پریشانی ہونے لگی کہ سوامی کے برت کے اس خفیہ حملے کو کیسے روکا جائے۔

چوتھے ہفتے فارسٹر کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہر خاموش ہونٹ اور ہر چار ہونے والی آنکھیں اسی مسئلے پر اس سے بحث کرتی ہیں اور اس سے متعلق سوالوں کو اس سے پوچھتی ہیں۔ رفتہ رفتہ فارسٹر کی یہ حالت ہو گئی کہ اگر کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ عصمت

کے مسئلے کا حوالہ دے دیتا تو فارسٹر اندر ہی اندر کھول جاتا۔ اور غصے کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔

آج سوامی کے برت کو پانچ ہفتے گذر چکے تھے۔

مسٹر جان فارسٹر کا ریمارک اور مسٹر جوشی کا جواب سن کر انسپکٹر جنرل پولیس نے کہا۔

"ہر جگہ یہی باتیں ہو رہی ہیں۔ بازار، کلب، اسکول، کالج، بار غرضیکہ ہر جگہ یہی مسئلہ زیر غور ہے، شادیوں اور جنبوں میں بھی یہی باتیں ہو رہی ہیں"

فارسٹر: ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کے سب کام رُکے ہوئے ہیں اور جب تک عصمت کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا ہے زندگی کی گاڑی ایک دم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی"۔

فارسٹر کے اس فقرے پر ایک با تمیز قہقہہ لگا۔

فارسٹر: (ذرا اونچی آواز میں) میں جانتا ہوں کہ عصمت بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن بعض چیزیں اہمیت میں اس سے بدرجہا زائد ہیں۔ آج مہذب ملکوں میں وفاع پر ہر ہر چیز قربان کی جا رہی ہے۔

انگریز مہمانوں کے لیے ایک میز الگ لگا دی گئی تھی جس پر شرابیں اور سؤر کے گوشت کے کباب اور انگریزوں کے پسند کی دوسری چیزیں چنی ہوئی تھیں۔ فارسٹر گفتگو ختم کر کے ادھر گیا اور وِسکی کا ایک بڑا سا پگ لے کر اس نے ایک گھونٹ پیا۔ اتنے میں پاس سے آواز آئی۔

"مسٹر فارسٹر! کیا آپ سوامی کے برت کا مقابلہ اسی طرح کرتے رہیں گے خواہ وہ مر جائے؟"

اس سوال کے پوچھنے والی پیس لیمب تھی جو ریاست کے ایک سابق انگریز دیوان مسٹر جیمس لیمب کی اکلوتی بیٹی تھی۔

فارسٹر: مس پیس اگر کوئی شخص مرنا چاہتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

پیس: جس طرح آپ اس برت کا اور اس کے پس منظر میں ہندوستانیوں کے جود فیانوسی اقدار ہیں ان کا مقابلہ کر رہے ہیں میں اسکی تعریف نہیں کر سکتی۔ ونڈرفل۔

فارسٹر: تھینک یو۔

پیس: آپ نے مجھے ایک بہت بڑی چیز بتا دی۔ وہ یہ کہ مغرب کی ٹھوس حقیقت پسندی اور بنیادی سوجھ بوجھ کیسی ہوتی ہیں۔ اور وہ ہندوستان کے دقیانوسی اقدار کا مقابلہ کس خوبصورتی سے کر سکتی ہیں اور ان کو اپنی جنگی نقل و حرکت سے کس طرح پاش پاش کر سکتی ہیں۔

مس پیس حسین کسی پہلو سے نہ تھی۔ بہت معمولی صورت تھی اس کی، بال تھوڑی سی لہروں کے ساتھ کندھوں پر ریشم کے لچھوں کی طرح جھول رہے تھے۔ آنکھوں میں ساکن نال کی نیلاہٹ تھی۔ ہونٹ پتلے پتلے تھے جو اس وقت جوش اور ضبط سے کانپ رہے تھے۔ گالوں پر بیماری کا سایہ تھا۔ چہرے پر کچھ ایسا بھولا پن اور ناتجربہ کاری تھی کہ وہ باوجود ۲۵، ۲۶ سال کی ہونے کے بیس سال کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ مس پیس کا باپ پندرہ سال ریاست کا دیوان رہ کر مر گیا تھا۔ مہاراجہ نے اس کی خدمات کے صلے میں اس کے خاندان کو ایک جاگیر دی تھی لیکن یہ شرط لگا دی تھی کہ یہ جاگیر اس وقت تک اس خاندان کے پاس رہے گی جب تک کہ وہ ریاست میں مستقل سکونت رکھے۔ کچھ

اس جائداد کی وجہ سے اور کچھ پیس کی صحت کی مستقل خرابی کی وجہ سے یہ خاندان اسی ریاست میں بس گیا تھا۔

پھر پیس کہنے لگی۔

"میں ممی سے ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ ممی مجھے ایک سپنا نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی انگلستان سے کوئی نہ کوئی انگریز ایسا ضرور آئے گا جو مجھے سچا انگریز بنا دے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میری پیدائش انگلستان کی ہے؟ جی ہاں۔ میں چار سال کی تھی جب پاپا کے ساتھ وہاں سے آئی تھی —— لیکن میری زندگی بیماری کے بستر پر گذری۔ پڑے پڑے میں سوچا کرتی تھی کہ مغرب کی وہ کونسی خصوصیتیں ہیں جن سے اس نے دنیا فتح کر لی ہے۔ لیکن میرا ملنا جلنا صرف ہندوستانیوں سے تھا۔ وہ انگریزی بولتے تھے اور ماڈرن انگریزی مصنفوں کی باتیں کرتے تھے لیکن تھے سب کے سب دقیانوسی اقدار کے پجاری۔ کچھ ان کے اثرات، کچھ گاندھی کی شہرت اور اس کی تحریریں، ان چیزوں نے مجھے فتح سا کر لیا۔ لیکن اندر ہی اندر میں اس ذہنی غلامی سے گھبراتی تھی اور اس جال کو توڑنے کے لیے اپنی قوم کی طرف دیکھتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی انگریز آ کر مجھے اس دلدل سے ضرور نکال لے گا۔ جب میں نے دیکھا کہ آپ سوامی کے برت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے ہیں اور اس کے خیالات اور عمل کو خاطر میں بھی نہیں لاتے ہیں اور اپنے مغربی اقدار پر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں تو میں نے اپنے سے کہا، پیس، وہ آ گیا!"

فارسٹر کو ایک دم خیال آیا کہ پیس دو ہفتوں سے انگریزی کلب میں میرے گرد چکر کاٹا کرتی ہے۔

فارسٹر : مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میرے خیالات سے آپ کو کچھ فائدہ پہنچا۔

پیس : فائدہ سا فائدہ ——— ہاں میری ایک تمنا اور ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنی قوم کی کچھ خدمت کر سکوں۔ افسوس میری طویل طویل بیماری نے میرے جسم کو کمزور بنا دیا ہے۔ اور میری کوئی خاص تعلیم بھی نہیں ہو سکی ہے۔ اس لیے نہ میں جسمانی خدمت کر سکتی ہوں اور نہ دماغی۔

فارسٹر : گھبرائیے نہیں۔ آپ کو بھی کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی موقع مل ہی جائے گا۔

پیس کی باتیں سن کر فارسٹر کی خود اعتمادی اک دم سے دگنی بلکہ چوگنی ہو گئی۔ وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ میرے خیالات اتنے بلند ہیں کہ وہ ایک عقلمند لڑکی کے برسوں کے خوابوں کی تعبیر بن گئے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میں ایک بڑے مشن کو پورا کر رہا ہوں جو مغربی تہذیب نے مجھے سونپا ہے یعنی ہندوستان کو احمقانہ آدرش پرستی کی جگہ مغربی حقیقت پسندی عطا کرنا۔

(۲)

سوامی کچھ نہ کچھ چھپ کر ضرور کھا لیتا ہو گا۔ اس لیے وہ مرے گا نہیں۔ سوامی اپنے برت کو مجھ پر کارگر ہوتا ہوا نہ دیکھ کر ضرور توڑے گا۔ وہ نہ توڑے گا تو اس کے بھگت اصرار کر کے تڑوا دیں گے۔

یہ تھیں فارسٹر کی قیاس آرائیاں جو سب کی سب غلط ثابت ہوئیں۔ اور سوامی دو مہینے پورے کرنے سے پہلے ہی چل بسا۔

سوامی کے مرنے سے پہلے ہی شہر کے حالات بگڑ چکے تھے۔ چار مقامی اخباروں میں سے دو کو باغیانہ تحریروں کے الزام میں بند کرنا اور دو کو بھاری قیمت پر خریدنا پڑا تھا۔ ایک شاعر کو اس جرم پر کہ اس نے برت کی خوبیوں پر ایک نظم ایک صحبت میں پڑھ دی تھی دو سال قید بامشقت کی سزا دینا پڑی تھی۔ شہر کے کچھ نوجوانوں نے کئی بار جلسے کرنے کی کوششیں کی تھیں اور ان جلسوں

کو لاٹھی چارج سے منتشر کرنا پڑا تھا۔ ایک بار تو انھوں نے 'سیتا ڈے' منا کر خلافِ قانون جلوس نکال لیا تھا جسے منتشر کرنے کے لیے ایسا سخت لاٹھی چارج کرنا پڑا کہ چھ آدمی مر گئے اور سو سے اوپر زخمی اسپتال پہنچائے گئے۔ آخری ہفتے کے اندر اس چھوٹے سے شہر میں تیس ہندوؤں کو گرفتار کر کے بلا مقدمہ چلائے جیل میں ڈال دینا پڑا تھا۔

فارسٹر سوامی کے برت کے چوتھے ہفتے کے بعد ایسا محسوس کرنے لگا تھا کہ عصمت اس کی صف میں انتشار مچا رہی ہے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی صف کے لوگوں کے جذبات بھی سوامی کی صف میں شامل ہو رہے ہیں اور اس کی حکومت صرف ان کے ہاتھ پاؤں پر رہ گئی ہے۔ 'سیتا ڈے' کے موقع پر شہریوں نے دن بھر کا برت رکھا تھا۔ اس دن رات کو فاسٹر کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ بڑے بڑے سرکاری افسروں کی بیویوں اور بیٹیوں نے بھی اس دن 'خرابیٔ صحت' کی بنا پر دن بھر کا فاقہ کیا تھا۔

فارسٹر اوپر سے تو بالکل ویسا ہی مضبوط تھا جیسا اول دن تھا، لیکن اس کے اندر ایک طوفان امنڈ رہا تھا جس کا زور روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا۔ جب وہ لوگوں کو اس جرم پر سزا دیتا تھا کہ وہ عصمت کی ضرورت سے زیادہ حمایت کرنے کی وجہ سے بغاوت کے مرتکب ہو گئے ہیں، یا نہتے مجمع پر لاٹھی چارج کراتا تھا تو اسے اپنے آپ کو اس سخت کام کے لیے پہلے سے زیادہ مضبوط کرنا پڑتا تھا۔ اور کام ختم کرنے کے بعد دیر تک اپنے آپ سے بحث کرنا پڑتی تھی کہ میں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ اور آخر کار اسے وہسکی کی آڑ میں چھپ کر اس بحث سے جان چھپانا پڑتی تھی۔ دن بدن یہ تیاری اور یہ بحث اور یہ آڑ لے کر چھپنا، یہ سب کام مشکل تر ہوتے جاتے تھے۔

ایک دن فارسٹر کو یہ رپورٹ ملی کہ ایک ادنیٰ سی رنڈی نے یہ کہہ کر 'سیتا فنڈ' میں چندہ دیا ہے کہ اگرچہ میں خود عصمت کی دوکاندار ہوں، لیکن خوب جانتی ہوں کہ یہ کتنی بڑی دولت ہے اور اس کی رکھشا کتنی ضروری ہے۔ یہ رپورٹ پا کر فارسٹر اپنے آپ سے پوچھنے لگا کیا واقعی یہ چیز جس کا نام عصمت ہے، ایسی ہی ضروری ہے کہ لوگ اس کے اتنے دیوانے ہو جائیں؟ لیکن اس سوال نے اس کے دماغ کو خیالات کے ایسے گورکھ دھندے میں الجھا دیا جس کا اسے کوئی اور سرا نہ ملا ———

ایک رات فارسٹر نے پولیس کے دو افسروں کو سادے کپڑوں میں ساتھ لیا اور معمولی شہریوں کی طرح سوامی سے ملنے پہنچ گیا۔ وہاں وہ خود کچھ نہیں بولا۔ پولیس کے افسر باتیں کرتے رہے۔ سوامی نے اپنے برت کا مقصد سمجھایا اور پھر کہنے لگا۔

"یہ سمجھنا کہ یہ برت کسی شخص کی مخالفت میں ہے، بہت سخت غلطی ہے۔ عصمت کی رکھشا کرنا حکومت پر فرض ہے، اور وہ اس فرض سے اسی وقت پہلو تہی کر سکتی ہے جب حق اور انصاف کا اثر سماج پر کم ہو جائے۔ میں اپنے برت سے حق اور انصاف کو جگانا چاہتا ہوں۔ وہ اگر جاگ اٹھے تو دل بدل جائیں گے۔ بُرے اچھے ہو جائیں گے، اور جو اچھے نہ ہوں گے۔ سماج ان کی رائے کو مانے گا ہی نہیں۔"

پھر سوامی کہنے لگا "جو لوگ میری مخالفت کرتے ہیں وہ بھی عورت کی لاج کی قیمت جانتے ہیں۔ پھر میں ناحق پر کیسے ہو سکتا ہوں؟"

فارسٹر نے سوامی کے الفاظ سے زیادہ اس کے دل کو محسوس کیا۔ وہاں واقعی اس کے خلاف یا کسی اور کے خلاف ذرا بھی نفرت نہیں تھی۔

اس ملاقات نے فارسٹر کو اور کمزور کر دیا۔ جو شخص تم سے نفرت کرتا ہو، یا تم سے ڈرتا ہو، یا تم کو غصہ دلاتا ہو اس کے سینے پر نشانہ باندھنا اور گولی مارنا آسان ہے لیکن جو شخص نہ نفرت کرتا ہو، نہ ڈرتا ہو، نہ غصہ دلاتا ہو، بلکہ الٹا اپنے طریقے سے تمہارا بھلا چاہتا ہو اس پر نشانہ باندھنا یا گولی مارنا آسان کام نہیں مشکل اور بہت مشکل ہے۔

سوامی مر گیا اور مر کر ایک سخت مسئلہ چھوڑ گیا وہ یہ کہ سب شہر والے مل کر اس کی ارتھی اٹھانا چاہتے ہیں، اس بات کی ان کو اجازت دی جائے یا نہ دی جائے ملکی انتظام کی زبان میں یہ سوال یوں اٹھتا تھا کہ عوام کو پہلے ڈھیل دی جائے اور پھر ان کے گلے میں پھندا کسا جائے۔ یا شروع ہی سے پھندا کس دیا جائے؟

سوامی کے مرنے سے عصمت کا معاملہ اور سنگین ہو گیا تھا۔ ریاست کے عوام کی حالت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ ندیدی بلی کی طرح ان کی عورتوں کی گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس لیے عوام قدرتی طور پر اپنی عورتوں کی عصمت کی حفاظت کے لیے سر بکف ہیں۔ غم و غصہ کا ایک آتش فشاں سلگ رہا تھا اور کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کے پیٹ میں کتنا لاوا بھرا ہے۔

فارسٹر تذبذب میں تھا کہ کیا کروں۔ عوام کو شروع ہی سے دباؤں یا پہلے ڈھیل دے دوں پھر دباؤں۔ لیکن انگریزی کلب میں ایک بات ایسی ہو گئی جس نے فارسٹر کو سہارا دے دیا اور اس سہارے سے اس نے اپنا تذبذب ختم کر دیا۔ کلب میں ریاست بھر کے انگریز موجود تھے اور سب کے سب جلوس کے نام سے بہت خوفزدہ تھے۔ سب یک رائے تھے۔ وہ یہ کہ ہم کو گاندھی والوں کے عدم تشدد پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ کیا معلوم وہ کس وقت تشدد پر اُتر آئیں؟

ایک میم نے کہا:-

"فرض کرو جس وقت جلوس نکل رہا ہو اس وقت گاندھی والوں کا افسر اپنے آدمیوں کو بزن کا حکم دیدے اور ایکدم لاکھ دو لاکھ غنڈے ہم پر ٹوٹ پڑیں، تب مسٹر فارسٹر تم کیا کرو گے؟"

کپتان ڈرجیٹ جو اپنی چھٹیاں گذارنے حال ہی میں اپنے ایک دوست کے پاس منی پور آیا تھا، کہنے لگا:-

"مسٹر فارسٹر! آپ کو ہم لوگوں کی جانوں پر تجربہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

مس لیمب نے تال میں نظر آنے والے آسمان کے رنگ کی آنکھوں سے فارسٹر کی طرف دیکھا اور بولی۔

"آپ مذبذب کیوں ہیں؟ کیا ہندوستانیوں کے دقیانوسی اقدار نے آپ کو بھی توڑ ڈالا؟"

فارسٹر کا انگریزی غرور عود کر آیا۔

"میں ٹوٹنے کا نہیں مس لیمب!"

فارسٹر نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ جلوس نہیں نکلے گا۔ بس صرف ۵۰ آدمیوں کو ارتھی کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائیگی۔

(۳)

جلوس کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن شہر والوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ اور خلافِ قانون دس ہزار آدمی ارتھی لے کر اس نیت سے روانہ ہوئے کہ شہر کے خاص بازار سے ہو کر شمسان جائیں گے۔ فارسٹر نے خلافِ قانون جلوس کو منتشر کرنے کا پہلے سے انتظام

کر لیا تھا۔ بازار کے دوسرے سرے پر مسلح پولیس کھڑی کر دی تھی اور خود بھی موقع پر موجود تھا۔

بازار سے گذر کر جلوس جب نکڑ پر پہنچا تو پولیس نے اس کا راستہ روک دیا۔

ارتھی کے آگے سوامی کے کچھ چیلے تھے، ان کے بعد ریاست کے سیاسی کارکن تھے جن کے ہاتھوں میں ترنگا جھنڈا تھا ـــــ اس کے پیچھے آدمیوں کا سمندر تھا جس میں ایک طرف عورتوں اور بچوں کا غول بھی تھا۔ لوگوں کے ہاتھ میں ایک چھڑی تک نہ تھی۔

پولیس نے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کیا کہ اگر مجمع نکڑ سے آگے بڑھا تو اس پر فائرنگ کر دی جائے گی۔ لیکن مجمع نے اس اعلان کی کوئی پروا نہ کی اور آگے بڑھتا رہا۔ جیسے وہ بازار کی حد سے نکلا فارسٹر نے حکم دیا:

’فائر‘

دَن، دَن، دَن، دَن، دو راؤنڈ چلے۔ آگے کی قطار ـــــ ڈھیر ہو گئی، ارتھی گر پڑی اور لوگ بدحواسی سے بھاگنے لگے۔ ان میں کچھ تو دور ہٹ کر ٹھہر گئے، کچھ دوکانوں پر چڑھ گئے اور کچھ ایسے بھاگے کہ انھوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جب مجمع منتشر ہو گیا تو فارسٹر نے حکم دیا کہ ارتھی پر قبضہ کر لو۔ پولیس آگے بڑھی سا ایکا ایکی ایک نوجوان پاگلوں کی طرح بھیڑ سے نکل آیا اور زمین پر پڑے ہوئے جھنڈے کو اٹھا کر اس نے نعرہ لگایا۔

”انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد“

بھاگنے والوں میں ایک لہر دوڑ گئی اور ان کے قدم تھم گئے اور وہ پھر اکٹھے ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ فارسٹر نے نوجوان کے ہاتھ پر اپنے پستول سے ایک فیر کیا۔ وہ مع جھنڈے کے گر پڑا۔ لیکن پھر وہ فوراً ہی تڑپ کر اٹھا اور دوسرے ہاتھ میں جھنڈا تھام کر نعرہ لگایا۔

”انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد“

فارسٹر نے دوسرا فیر کیا اور نوجوان پھر اس طرح ڈھیر ہو گیا کہ لوگ سمجھے وہ مر گیا۔ لیکن ایک منٹ کے بعد اس نے پھر کروٹ بدلی اور پاس پڑے ہوئے جھنڈے کو دانتوں میں دبا کر لڑکھڑاتا ہوا اٹھنے لگا اور اٹھتے اٹھتے نعرہ لگایا۔

”انقلاب ـــــ“

فارسٹر کو اس کی ضد پہ غصہ آ گیا اور اس نے پورا پستول اس زخمی پر خالی کر دیا۔ نوجوان جہاں تھا وہیں خون میں نہا کر لوتھڑے کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ لیکن اس بات پر مجمع چھٹنے کی بجائے اکٹھا ہو کر نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا۔

”انقلاب زندہ باد“

”سوامی جی زندہ باد“

”عصمت وعفت زندہ باد“

فارسٹر نے پھر فائرنگ کا حکم دیا۔ اب کی چھ راؤنڈ چلے تب جا کر مجمع منتشر ہوا۔ بھاگنے والے نوجوان کی لاش تو اٹھا لے گئے، لیکن سوامی کی ارتھی تک نہ پہنچ سکے۔ پولیس نے ارتھی پر قبضہ کر لیا اور شمشان لے جا کر پھونک دیا۔

(۴)

فارسٹر کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ اس کی شریکِ زندگی وہسکی تھی جو جلوت وخلوت،

خوشی و غم ہر موقع پہ وفاداری سے اس کا ساتھ دیتی تھی۔ فارسٹر جب سوامی کی لاش پھینکوا کے واپس آیا تو اس نے بہت بدحواسی سے اپنی شریکِ زندگی کو یاد کیا۔ لیکن آج وہ کسی طرح بھی فارسٹر کے دل کی پیاس نہ بجھا سکی۔ اس کے سینے میں ایک خنجر پیوست تھا جو کسی طرح نکالے نہیں نکلتا تھا۔ اس خنجر کی نوک دانتوں میں جھنڈا دبانے والا نوجوان تھا۔ پھل سوامی اور بینا، یہ سب گھسے ہوئے اس کے کلیجے کا قیمہ بنا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے سینے میں جسے میں نے کئی زرہوں سے چھپا رکھا تھا، اس خنجر نے کیسے راستہ پا لیا۔ اس نازک وقت میں اس خیال سے بھی کچھ سہارا نہیں مل رہا تھا کہ میں کمزور انگریزوں کا محافظ ہوں۔ کیوں کہ نہتے مجمع کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اس بات پر یقین کرنا کہ یہ کبھی لوٹ مار بھی کر سکتا ہے محال ہو چکا تھا۔

فارسٹر سوچنے لگا کہ کاش کوئی نسوانی آواز ہوتی جو پیار و پریم میں ڈوبی ہوئی میرے دل پر ملائم ملائم ہاتھ پھیرتی اور کہتی "ڈارلنگ جان" تم نے جو کچھ کیا ہے وہ درست ہے۔ تم غلطی پر نہیں ہو، غلطی پر تھا وہ سوامی جو اپنی حماقت میں مر گیا، اور غلطی پر تھا وہ نوجوان جس نے پاگل پن میں اپنی جان دے دی۔" لیکن ایسی نسوانی آواز ہے کہاں؟

ایک دم سے دبلی پتلی مس پیس لیمب فارسٹر کے دل میں رونما ہو گئی۔ فارسٹر کی نگاہوں سے پردے سے اٹھنے لگے اور اسے محسوس ہونے لگا کہ ڈیڑھ مہینے سے، جب سے کہ میں برت سے لڑ رہا ہوں وہ میرے لیے رجز بھی رہی ہے اور لوری بھی۔ جب مجھے جنگ پہ جانا تھا تو وہ خیالوں کے تاروں پر رقص کرتی ہوئی آئی ہے اور اس نے مجھے گدگدا گدگدا کر جگایا ہے اور اپنی بھیرویں سے میری ہمت بندھائی ہے۔ پھر جب میں تھکا ہارا واپس آیا ہوں تو وہ مسکراتی ہوئی تصور میں آئی ہے اور اس نے خود اعتمادی کے پھاہے لگا کر میرے زخم مندمل کیے ہیں۔ فارسٹر نے پلٹ کر اپنے سے کہا جان، تم بیوقوف ہو جو ابھی تک تم نے یہ نہیں محسوس کیا کہ تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ وہ لڑکی تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ اگر تم انجن ہو تو وہ بھاپ ہے۔ اگر تم ہوائی جہاز ہو تو وہ پٹرول ہے۔ تم کو اسے اپنا بنا لینا چاہیے۔

فارسٹر پیس کی تلاش میں کلب گیا۔ لیکن وہاں وہ نہیں ملی حالانکہ وہ بہت پابندی سے آیا کرتی تھی۔ فارسٹر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بیمار تو نہیں ہو گئی۔ لیکن اسے ایک اندیشہ اور بھی ہوا۔ جس سے وہ بہت پریشان ہو گیا۔ وہ یہ کہ کپتان ڈرجٹ اس کے پیچھے لگا رہتا تھا اور وہ اس خطرناک قسم کا عورت کا شکاری تھا جو کسی نہ کسی چال سے عورت کو اپنے اوپر ترس دلا کر اس کے مادرانہ جذبے کو کھولا دیتے ہیں اور پھر اس حالت سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ فارسٹر نے طے کیا کہ مجھے فوراً پیس کے یہاں جانا چاہیے۔

فارسٹر ایسا شخص تھا جس کے سینے میں طاقت اور اختیارات حاصل کرنے کی امنگوں کا طوفان امنڈا کرتا تھا۔ اور جو اپنی منزل کے لیے بلا جھجک خون کا دریا بھی پار کر سکتا تھا۔ لیکن آج کل یہ امنگیں ایسے نامعلوم بھاری بوجھ کے نیچے دبی ہوئی تھیں جن کے نیچے سے ان کے رجزیہ گیت آہ بن کر نکلتے تھے اس لیے اس کو خارجی سہارے کی ضرورت تھی اور فوری ضرورت۔

فارسٹر بہت بیتابی سے پیس کے گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اس کا گھر ایسی پہاڑی پر تھا جہاں کافی دور تک پیدل جانا پڑتا تھا۔ یہ راستہ کاٹنا اس کے لیے دوبھر ہو گیا۔

پیس نے فارسٹر کو آتے دیکھ لیا، وہ خوشی سے چلّا کر اس کی طرف دوڑی۔

"مسٹر فارسٹر ——— میں اس وقت آپ سے ملنے کے لیے کتنی بے چین تھی!! لیکن اس بات کا تو سان گمان بھی نہ تھا کہ میری اتنی

خوش نصیب ہوں۔ کہ آپ یہاں آجائیں گے۔ آیئے مسٹر فارسٹر"

مسٹر فارسٹر کو بیس نے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کہا۔

" میں آپ کو ایک خبر سنانے کے لیے بہت بے چین ہوں۔ یہ بات ایسی ہے جسے میں دنیا میں صرف آپ سے کہہ سکتی ہوں اور صرف آپ ہی اس کی عظمت محسوس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ میرے جگری دوست بھی ہیں اور گرو بھی۔ اور ساتھ ساتھ مغربی اقدار کی آپ زندہ تصویر ہیں۔ وہ خبر یہ ہے کہ آج مجھے اپنی مادرِ وطن کی ایک خدمت کرنے کا موقع مل ہی گیا —— جی ہاں مجھ بیمار لڑکی نے مادرِ وطن کی خدمت کی۔ میں نے ایک تھکے ماندے فوجی کو تازہ ہمت دے کر محاذ پر بھیج دیا —— ایک پکی ماڈرن انگریز لڑکی کی طرح ——

فارسٹر کے سینے پر ایک نامعلوم گھونسہ لگا۔

فارسٹر : کیا مطلب؟ میں نہیں سمجھا۔

بیس : (ہنس کر) آپ خیال بھی نہیں کر سکتے ہیں کہ میں نے کیا کیا ہوگا۔ کپتان ڈرجنٹ کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں لیکن وہ لڑائی سے اتنا اکتایا ہوا تھا کہ کہتا تھا کہ میں محاذ پر جانے کی بجائے سامنے کے پہاڑوں میں بھاگ جاؤں گا اور وہاں مارا مارا پھروں گا۔ جب اس کی سکت نہیں رہے گی تو اپنے کو کسی چوٹی پر سے گرا دوں گا۔ وہ کہتا تھا کہ مار ڈالنا وہ کاروبار ہے جس کے لیے انسانی دل کو ایک خاص قسم کے راشن کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہے چاہت، نرم و نازک نسوانی لمس؛ اور یہ مجھے ملا نہیں ہے۔ دو سال بیت گئے اس کے بغیر۔ جب وہ یہ باتیں مجھ سے کیا کرتا تھا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں نہ ہوتی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر اپنے دل سے پوچھا کرتی تھی کہ ایک ماڈرن لڑکی جو ہندوستان کے دقیانوسی اقدار کی نہیں بلکہ یورپ کے حقیقت پسند اقدار کی یعنی ان اقدار کی جن کا مجسمہ آپ ہیں فارسٹر ہے، پجارن ہے اسے کیا کرنا چاہیئے؛ وہ کیوں نہ اس تھکے ماندے سپاہی کو اس کا مطلوبہ راشن دے دے؟ آخر بہت غور و فکر کے بعد میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیئے تھا"

فارسٹر : (اپنی بے چینی کو بہت سخت کوشش سے چھپا کر) "کیا کیا؟"

بیس : جس چیز کا وہ بھوکا تھا وہ اسے دے دی۔ ہم دونوں نے ایک وادی میں جا کر خوب دادِ عیش دی۔ اہا ہا! مسٹر فارسٹر میں اس وقت بہت خوش ہوں۔ ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے ڈرجنٹ اس وقت ہوائی جہاز پر نہیں جا رہا ہے بلکہ میں اسے اپنے بازوؤں پر اٹھائے محاذ کی طرف لیے جا رہی ہوں۔ اور جب وہ ہماری مادرِ وطن کے لیے دشمن سے لڑے گا تو اس وقت وہ اپنے بازوؤں سے نہیں (اپنے ہاتھوں کو اونچا کر کے) بلکہ ان کمزور ہاتھوں سے لڑے گا"

فارسٹر : کیا اس نے تم سے شادی کا وعدہ کر لیا ہے؟

بیس : شادی کا وعدہ!! اس کی بیوی لندن میں موجود ہے۔

فارسٹر : بیس کیا تم اتنی ہی احمق ہو؟

بیس : کیا مطلب؟

فارسٹر : تم نے اپنے کو ایک بدمعاش کی خواہشوں کا شکار بنا دیا اور سمجھتی ہو کہ مادرِ وطن کی خدمت کی —— کیا واقعی تم سے اتنی

بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے ؟

پلیس : اتنی بڑی غلطی ! جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سب واقعہ ہے۔ لیکن اس میں غلطی کیا ہے ؟ آدمی کا انتخاب غلط تھا، یا فعل غلط ؟

فارسٹر : (جھنجھلا کر) کیا تم اتنی بھولی ہو پلیس ! تم میں عملی سوجھ بوجھ بالکل نہیں ہے۔ جو بات چھوٹی سے چھوٹی لڑکی سمجھ سکتی ہے تم وہ بھی نہیں سمجھ رہی ہو ——"

پلیس : میں سمجھی۔ تم کو میرے مستقبل کی فکر ہے۔ ممی کو اگر معلوم ہو جائے تو ان کو بھی یہی فکر ہو گی۔ لیکن مجھے کوئی فکر نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ہو سکا تو میں مغرب کو چلی جاؤں گی۔ اور یہ نہ ممکن ہوا تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ میری سب سے بڑی تمنا تھی کہ میں بخوبی اپنے وطن کی کوئی خدمت کر سکوں سو وہ پوری ہو گئی اب جو بھی ہو، سب بھگت لوں گی۔

فارسٹر : یہ بتاؤ تم ڈرجٹ کی محبت میں تو نہیں گرفتار ہو گئی تھیں ؟ یا ایسا تو نہیں ہوا کہ اس کے رونے کی وجہ سے بہت زیادہ پگھل گئیں ؟

پلیس : میں اتنی جذباتی تو نہیں ہوں۔ اتنا تو تم محسوس کر ہی سکتے ہو۔

فارسٹر : پھر کیا تم کو اس میں جنسی کشش نظر آئی ؟

پلیس : نظر تو آئی۔ لیکن پہلے نہیں۔ جب میں نے فیصلہ کر لیا ہے اس کے بعد۔

فاسٹر : تو سُن لو۔ تم عصمت باختہ عورت ہو۔

یہ سُن کر پلیس پر بجلی گر پڑی۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہی۔ پھر اپنے کو قابو میں کر کے کہنے لگی۔

پلیس : عصمت باختہ ! تم اس لڑکی کو عصمت باختہ کہتے ہو جس نے تمہارے خیالات پر عمل کیا ؟

فارسٹر : خیالات، خیالات، خیالات، خیالات کا کیا۔ آدمی سینکڑوں باتیں روز کہا کرتا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آنکھیں بند کر کے ان پر عمل کیا جائے ؟

پلیس : لیکن تم تو کہتے تھے کہ تمہارے خیالات ہندوستانی آدرشوں کی طرح ناقابلِ عمل نہیں۔ بلکہ وہ روزمرہ کی زندگی کی چیزیں ہیں۔ اب میں سمجھی۔ میں نے واقعی دھوکا کھایا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں نے ڈرجٹ کے ہاتھ سے دھوکا کھایا، نہیں، میں نے تم سے دھوکا کھایا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے جو کچھ کیا وہ کسی فوری جذبے سے کیا ؟ میں اس قربانی کے لیے اپنے کو ڈرجٹ کے آنے کے ایک مہینہ پہلے سے، جب سے کہ میں نے اپنے کو تمہارا چیلا بنایا ہے، تیار کرتی رہی ہوں، تاکہ موقع پڑنے پر اس طرح خدمت کر سکوں۔ جب میرا دل اس کے خلاف فریاد کرتا تھا تو میں اس کو سمجھاتی تھی کہ تجھ پر آدرش پرستی کا سایہ ہے اس لیے تو ایسی باتیں کرتا ہے۔ عصمت کے حامیوں کے خلاف جنگ نے میری ہمت بندھائی اور میں نے اپنے دل کا گلا گھونٹ کر اسے خاموش کر دیا۔ لیکن افسوس —— راز اب کھلا کہ میں نے جس آواز کو مار ڈالا وہی سچی تھی۔ میں نے اپنے کو پوری طرح برباد کر ڈالا —— لے پلیس یہ ہے تعبیر تیرے اونچے خوابوں کی ؟ پلیس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فارسٹر غم و غصہ اور کوفت سے نیم پاگل ہو رہا تھا۔ لیکن چند منٹ میں اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔

"دیکھو پلیس —— مجھے الزام نہ دو، میں نے جو کچھ کیا تھا وہ سوامی کا مقابلہ کرنے کے لیے ٹھیک تھا۔ لیکن تم نے اس پر عمل کر کے بہت غلطی کی۔"

پلیس بپھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بس کیجئے، اپنی قیمتی باتوں کو اپنے ہی تک رہنے دیجئے —— اچھا خدا حافظ....."

فارسٹر : تم کو اس حالت میں چھوڑ دوں؟

ببس : میں آپ کی صورت نہیں دیکھ سکتی ہوں، جائیے —— ابھی جائیے۔

ببس رنج و غم سے گری پڑ رہی تھی۔ لیکن اس پر بھی وہ فارسٹر کے ٹھہرنے کی روادار نہیں ہوئی اور اسے نکال دیا۔

فارسٹر کو گھر آکر یہ خبر ملی کہ سوامی کی خاک شدہ ارتھی نے دوسرا جنم لے لیا ہے یعنی شہر والے کل "شہید نوجوان" کی ارتھی بڑی دھوم دھام سے نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ فارسٹر کی حالت اس کسان ایسی تھی جس کا کھلیان اسی کے ہاتھوں جل کر ابھی زندگی گزارنے کی تمام امیدوں کو لیکر خاک ہو گیا ہو۔ اور خوامخواہ قرض خواہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو —— اختیارات کی بھوک، عزت و ترقی کی خواہشیں، اس قسم کی سب امنگیں نہ جانے کس طرح خاک ہو چکی تھیں۔ صرف اس بات کا احساس تھا کہ جیسے بنئے رُکل قتل و غارت کا کاروبار کرنا ہے۔

فارسٹر خود اعتمادی کی بھیک مانگنے پھر دھسکی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ صبح جب وہ فائرنگ کرانے جا رہا تھا تو اس کے جسم میں ارادے کی جگہ نشہ کام کر رہا تھا۔

ڈیڈ لیٹر

خواجہ احمد عباس

"ڈارلنگ!"

"جی!"

"پرشادز نے آج شام کو برج اور کھانے کے لیے بلایا ہے۔ یاد ہے نا؟"

"جی!"

"تو میں آفس سے کوئی ساڑھے پانچ تک آجاؤں گا۔ تم تیار رہنا"

"جی!"

جی! جی!! جی!!! بارہ برس سے وہ یہ دو حرفی لفظ اپنی بیوی کی زبان سے سُن رہا تھا۔ دس باتوں میں سے نو کا جواب وہ صرف "جی" سے دیتی تھی جیسے پڑھایا ہوا طوطا جو صرف ایک لفظ بول سکتا ہو۔ جی! جی!! جی!!!

سدھیر سکسینہ آئی۔ سی۔ ایس ڈپٹی کمشنر ضلع نرائن گنج کے بارے میں ہر ایک کی رائے تھی کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر خوش قسمت کوئی نہ ہوگا۔ اونچا عہدہ، اچھی تنخواہ، رہنے کے لیے آرام دہ مکان، بلا کی حسین، سلیقہ مند اور پڑھی لکھی بیوی جو کمشنر صاحب کے ساتھ برج کھیل سکتی تھی۔ راجہ صاحب رام نگر کے ساتھ ڈانس کر سکتی تھی۔ سوسائٹی میں ملنے جلنے، اٹھنے بیٹھنے کے سب قاعدے قانون جانتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ تین خوبصورت اور ذہین بچوں کی ماں تھی۔ سب سے بڑا نریندر جو دس برس کی عمر ہی میں نینی تال کے ایک انگریزی سکول میں جونیئر کیمبرج میں پڑھ رہا تھا اور اپنی کلاس کی کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔ اور بالکل اینگلو انڈین لڑکوں کی طرح انگریزی بولتا تھا۔ اس سے چھوٹی رمات، سادہ اوشا جو ماں کی طرح ہی دبلی پتلی اور نازک تھی۔ اور ویسی ہی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ اور ویسے ہی گھونگھر والے بال تھے۔ وہ نرائن گنج ہی کے ایک کانونٹ سکول میں تھرڈ سٹینڈرڈ میں پڑھ رہی تھی۔ اور اسے سارے نرسری رائمز زبانی یاد تھے۔ اور "ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار" جیسی نظمیں تو وہ فرّاٹے سے گا کر سنا سکتی تھی۔ اور پھر سب سے چھوٹی شانتی جو ابھی مشکل سے تین سال کی تھی اور "بے بی" کہلاتی تھی اور ماں باپ دونوں کی آنکھوں کا تارا تھی اور بڑے پیارے انداز سے تتلا تتلا کر "ڈیڈی ٹاٹا" یا "ممی بائی بائی" کہنا سیکھ رہی تھی۔

ہاں تو سب ہی سدھیر سکسینہ آئی۔ سی۔ ایس کو انتہائی خوش قسمت سمجھتے تھے اور کبھی کبھی وہ خود بھی یہی سمجھتا تھا۔ جو کچھ

اسے حاصل تھا۔ اس سے زیادہ زندگی میں کوئی کس چیز کی امید کر سکتا ہے، مگر جب وہ اپنی بیوی کی زبان سے یہ دو حرفی لفظ "جی" سنتا.... بملا کے مخصوص، پھیکے، بے رنگ، تھکے ہوئے انداز میں........ تو اس کی خوشی اور خوش قسمتی دونوں پر شک اور شبہ اور ایک عمیق مایوسی کے بادل چھا جاتے۔

"جی!"

کب سے یہ لفظ اس کی زندگی میں گونج رہا تھا۔

تیرہ برس ہوئے وہ پہلی بار مسوری میں ملے تھے۔ سدھیر مہینہ بھر پہلے ہی انگلستان سے آیا تھا اور تقرر ہونے سے پہلے چند ہفتے چھٹی منانے آیا ہوا تھا۔ مسوری ان دنوں پہنچے ہوئے گھرانوں کی خوبصورت، خوش پوشاک اور دلچسپ لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لائبریری کے سامنے ہر شام کو اتراتی ہوئی رنگین ساڑھیوں، چست قمیصوں، ریشمی شلواروں اور گلے میں جھولتے ہوئے دوپٹوں کی نمائش ہوتی تھی۔ اونچی ایڑی کے جوتوں پر اٹھلاتی ہوئی چال، بے باک نگاہیں، شوخ جوانیاں، بانکی چتونیں، ولایتی سینٹ میں ڈوبے ہوئے ہوا کے جھونکے، گلنار لب، موچنے سے باریک کیے ہوئے کمان جیسے ابرو، غازے سے دمکتے ہوئے گال، کٹے ہوئے اور پرم کیے ہوئے گیسو۔ نوجوان کے شوقِ نظارہ کو دعوتِ عام تھی۔ مگر نہ جانے کیوں سدھیر کو سارے مسوری میں صورت پسند آئی تو صرف ایک "بملا" جس سے پہلی بار اس کی ملاقات "ہیک مینز" ہوٹل میں ایک شام کو "ٹی ڈانس" کے دوران میں ہوئی تھی۔

"ہیلو سدھیر!" اس کے پٹنہ کے دوست مظہر نے اسے ہاتھ سے اشارہ کر کے اپنی میز کی طرف بلاتے ہوئے کہا تھا "یہاں آؤ یار اور ان سے ملو۔ آپ ہیں مس بملا بنرجی۔ ہیں بنگالی مگر لکھنؤ میں پلی ہیں۔"

سدھیر نے دیکھا کہ بغیر پاؤڈر کے گورے چہرے پر دو بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ جن کی گہرائی میں کوئی غم ڈوبا ہوا ہے اور ان کے گرد سیاہ حلقے ہیں اور لمبی لمبی، شرمیلی پلکیں ہیں جو راتوں کو جاگے ہوئے پپوٹوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں۔

وہ مظہر کے اصرار کا انتظار کیے بغیر ہی بملا کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور پھر اس کے لیے اس کھچا کھچ بھرے ہوئے بال روم میں بملا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

بارہ برس کے بعد بھی ان کی وہ سب سے پہلی گفتگو آج تک اس کی یاد میں تازہ تھی۔

"تو آپ آئی، ٹی کالج میں پڑھتی ہوں گی!"

"جی!"

"بی، اے میں؟"

"جی!"

"اگلے سال فائنل کا امتحان دیں گی؟"

"جی!"

دو برس تک انگریز عورتوں کی کرخت مردانہ آوازوں کو سننے اور دو ہفتے مسوری کے شور و غل میں گزارنے کے بعد کتنا سکون تھا بملا کی کم گوئی میں۔ جیسے آندھی اور طوفان اور کڑک چمک کے بعد بارش تھم گئی ہو اور گلاب کی پتیوں پر سے چند ننھی ننھی بوندیں گھاس پر

ٹھیک رہی ہوں۔ کتنی ہندوستانیت تھی اس "جی!" میں۔ کتنی ملائمت اور مٹھاس! کتنی معصومیت اور حیا!

"آپ ڈانس کرتی ہیں؟"

"جی نہیں"

ان کے دوست ناچنے والوں کی بھیڑ میں کھو گئے تھے اور اب وہ دونوں اپنی میز پر اکیلے تھے۔ سدھیر نے سوچا آخر کار میری تلاش آج ختم ہو گئی۔ بملا سے بہتر بیوی مجھے نہیں مل سکتی۔ وہ حسین ہے مگر شوخ تتلی نہیں جو ایک پھول سے دوسرے پھول پر بھٹکتی پھرے۔ پڑھی لکھی ہے مگر خود رائے اور زبان دراز نہیں، کھاتے پیتے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اتنی امیر بھی نہیں کہ ایک آئی، سی، ایس کی درخواست ٹھکرا دے۔ اس سے شادی کر کے انسان واقعی سکھ اور سکون کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اور اس نے کہا "تو آپ کے پتا......"

"وہ لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ آرٹ سکول میں پڑھاتے ہیں!"

"اوہ! آپ آرٹسٹ بینرجی کی بیٹی ہیں۔ ان کی تصویروں کی نمائش تو ہمارے پٹنہ میں بھی ہو چکی ہے" اور پھر اس نے صفائی سے جھوٹ بولا "مجھے ان کی تصویریں بہت پسند آئی تھیں" حالانکہ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ نہ جانے ان ٹیڑھی میڑھی لکیروں اور نیلے پیلے رنگ کے دھبوں میں کیا دھرا ہے۔ جو لوگ ان کی اتنی تعریف کرتے ہیں۔ مگر اسی لمحے اسے ان تصویروں میں سے ایک خاص تصویر یاد آ گئی۔ ایک گیارہ بارہ سالہ شوخ و شریر بچی کی تصویر جو صابن گھلے ہوئے پانی کے رنگین بلبلے بنا کر اڑا رہی تھی۔ تصویر کا نام تھا "بلبلے"

"وہ تصویر 'بلبلے' آپ کی ہی تھی نا؟"

"جی!"

"اس میں آپ بہت شریر معلوم ہوتی تھیں۔ اب تو آپ کتنی سیریس ہو گئی ہیں"

صرف اس بار اس نے "جی" کہہ کر جواب نہیں دیا۔ ایک عجیب سی، تھکی ہوئی، بجھی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "بلبلے کی زندگی ہی کتنی ہوتی ہے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور بلبلہ ٹوٹ گیا۔ بس ختم!"

جب تک وہ مسوری رہا اس کا بیشتر وقت بملا کی رفاقت میں گذرا۔ اکٹھے وہ چینڈال چوٹی تک چڑھے، کیمل بیک روڈ کے گرد گھومے، کیمپٹی فال پکنک کے لیے گئے۔

اس تمام عرصے میں بملا نے مشکل سے ایک درجن جملے اس سے کہے ہوں گے۔ سدھیر کی باتوں کو وہ بڑی خاموشی اور توجہ سے سنتی۔ جب تک وہ براہِ راست سوال نہ کرتا۔ وہ کسی بات پر بھی اپنی رائے کا اظہار نہ کرتی۔ مگر سدھیر کو بملا کی کم گوئی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ باتونی لڑکیاں جو دنیا کے ہر مسئلے پر رائے رکھتی ہیں۔ اور اس کا اظہار ضروری سمجھتی ہیں اسے بالکل پسند نہ تھیں۔ اسے تو یہی اچھا لگتا تھا کہ وہ بولتا جائے اور بملا بیٹھی سنتی رہے اور "جی! جی!" کرتی رہے۔ جب سدھیر کو یقین ہو گیا کہ وہ بملا کو بہت پسند کرنے لگا ہے بلکہ شاید محبت بھی کرنے لگا ہے۔ تو ایک دن تنہائی میں موقعہ پا کر اس نے "پرپوز" کر ہی ڈالا۔

"بملا! تمہیں معلوم ہے نا کہ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں"

"جی!"

"تمہارے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"جی!" اس "جی" میں سوال بھی تھا اور جواب بھی۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی "دیکھئے میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اس لیے میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔"

"کیا تم کسی اور سے محبت کرتی ہو؟"

بملا کی زبان سے "جی نہیں" شاذ و نادر ہی نکلتا تھا مگر اس بار اس نے کہا "جی نہیں" اور پھر ایک پل کی خاموشی کے بعد جس میں گہری ٹھنڈی سانس کا شائبہ تھا، کہا "ایسا کوئی نہیں ہے۔"

سدھیر کو اطمینان ہو گیا۔ اس نے کہا "تو پھر کوئی حرج نہیں۔ میں تمہیں اپنے سے محبت کرنا سکھا دوں گا۔"

اس دن جولائی ۱۹۴۰ء کی چودہ تاریخ تھی۔

نوکر نے ڈاک کا بنڈل ناشتے کی میز پر سدھیر کے سامنے لا کر رکھا۔ سب سے پہلا ہی خط جو اس نے کھولنے کے لیے اٹھایا تو اس کی نظر ڈاکخانے کی مہر پر پڑی "نرائن گنج — چودہ جولائی ۱۹۵۲ء" دفعتاً سدھیر کی یاد میں پورے بارہ برس پہلے کا وہ دن چونک کر بیدار ہو گیا۔

لفافے کو چھری سے چاک کرتے ہوئے سدھیر نے بملا سے پوچھا "جانتی ہو آج کیا تاریخ ہے؟"

"جی!" اور اس کی نظر سامنے کی دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کی طرف گئی۔

"بارہ برس پہلے کا وہ دن یاد ہے مسوری میں — جب میں نے تمہیں پروپوز کیا تھا؟"

"جی!" مگر اس "جی" میں صرف اقرار تھا۔ کوئی گرمجوشی نہ تھی۔ سدھیر بارہ سال پہلے کی جس راکھ کو کریدنا چاہتا تھا وہ بالکل ٹھنڈی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس میں کبھی بھی کوئی چنگاری نہ تھی۔

مگر سدھیر نے بملا کے چہرے پر ایک رنگ جاتے اور دوسرا آتے نہیں دیکھا۔ وہ خط کھول کر پڑھ رہا تھا جو اس کے کالج کے پرانے اور بے تکلف دوست ماتھر کے پاس سے آیا تھا۔ جو اب پٹنہ میں وکالت کرتا تھا۔ خط پر نظر ڈالتے ہی سدھیر مسکرایا۔ کیونکہ ماتھر نے لکھا تھا "یار تم کتنے خوش قسمت ہو۔ بملا جیسی بیوی پائی ہے۔ ہمیشہ ہمیں دعائیں دو کہ اس دن ہیکمنز میں تمہاری ملاقات اس سے کرائی۔ مگر اس دنیا میں کون کسی کا احسان مانتا ہے۔"

"سنا تم نے، ماتھر نے کیا لکھا ہے؟"

"جی!"

سدھیر نے، بملا کے بارے میں جو جملے ماتھر نے لکھے تھے وہ پڑھ کر سنائے اور پھر دوسرے خطوں کو کھول کر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اور اس نے یہ نہیں دیکھا کہ ماتھر کے دوستانہ مذاق کو سن کر بملا کی آنکھوں میں کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی۔ صرف ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ کا خم پیدا ہوا اور پھر یکایک غائب ہو گیا۔

دوسرا خط جو سدھیر نے کھولا وہ کلب کا بل تھا۔ وہ اس نے بملا کی طرف بڑھا دیا۔ کیونکہ بلوں کی ادائیگی وہی کرتی تھی۔ تیسرا خط

آئی۔ سی۔ ایس ایسوسی ایشن کی طرف سے آیا تھا۔ سالانہ جلسے اور انتخابات کے بارے میں۔

"سنا ملا تم نے؟ اس سال بلدیو اور احسان وغیرہ سیکرٹری کے لیے میرا نام پروپوز کرنا چاہتے ہیں"

"جی!"

چوتھا خط —— مگر یہ اس کے نام نہیں ملا کے نام تھا۔ ایک موٹا مگر میلا سا پرانا لفافہ جس پر کتنی ہی مہریں لگی ہوئی تھیں اور کئی بار پتے میں کانٹ چھانٹ کی ہوئی تھی۔ اور یہ کیا؟ مس ملا بینر جی! یہ کون بدتمیز ہے جو مسز ملا سکسینہ کو شادی کے بارہ برس بعد بھی مس لکھتا ہے؟ .... سدھیر نے ایک نظر ملا کی طرف دیکھا جو اس وقت نوکر کو دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات دینے میں مصروف تھی۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ملا نے اپنا خط نہیں پہچانا۔ سدھیر نے چائے دان سامنے رکھ کر لفافہ چاک کیا۔ شادی کے بعد کئی برس تک اس نے ملا کے نام آئے ہوئے کتنے ہی خط چپکے چپکے کھول کر پڑھے تھے۔ مگر سوائے کالج کی سہیلیوں یا رشتے کی بہنوں وغیرہ کے کوئی "مشتبہ" خط نہ ملا تھا۔ نہ جانے کیوں اس خط کے لفافے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کوئی پرانا بھید ضرور ہے۔ شاید آج اسے معلوم ہو سکے کہ اس "جی" کی اکتاہٹ اور بے دلی کے پیچھے کون سا راز چھپا ہوا ہے۔

لفافے میں سے کئی ورقوں کا طویل خط نکلا مگر اس کی پہلی چند سطریں ہی سدھیر کے سکون کو ہمیشہ کے لیے پاش پاش کرنے کو کافی تھیں۔ لکھا تھا:۔

"جان سے پیاری ملا!

تم سے ملے دو مہینے ہو چکے ہیں اور میرے لیے یہ دو مہینے دو برس سے بھی زیادہ طویل ہیں۔ کیا ہم ہمیشہ اسی طرح چھپ چھپ کر ہی مل سکیں گے؟ یہ دیوار جو ہمارے درمیان کھڑی ہے —— کیا یہ کبھی ڈھائی نہ جا سکے گی؟........"

غصے اور نفرت کے جوش سے سدھیر کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس سے آگے اس سے یہ خط پڑھا نہ جا سکا........ یہ خط جو اس کی بیوی کی آوارگی اور بدچلنی کا اعلان نامہ تھا۔ جلدی جلدی ورق الٹ کر اس نے آخری صفحے پر نظر ڈالی۔ خط کے اختتام پر لکھا تھا

"ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارا انیل!"

"انیل!" اس کے دماغ میں یہ انجانا نام بم کے گولے کی طرح پھٹا۔

"ملا!" وہ چلایا اور ملا جو اس وقت کمرے کے باہر جانے والی تھی ٹھٹک کر دروازے کے پاس رک گئی۔

"جی!"

جی! جی!! جی!!! وہی ملائم، ٹھنڈا، پھیکا "جی" اور اس وقت سدھیر کو ایسا لگا جیسے یہ دو حرفی لفظ ایک طعنہ ہو۔ ایک گندی گالی ہو۔ ایک طمانچہ ہو جو اس کی بیوی نے اس کے منہ پر دے مارا ہو۔

"ادھر آؤ" وہ پھر چلایا اور ملا خاموشی سے میز کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اس کے چہرے پر حیرت پکار پکار کر کہہ رہی تھی "جی؟"

"انیل کون ہے؟"

سدھیر نے یہ سوال اتنا اچانک کیا کہ چند لمحوں تک ملا بھونچکی کھڑی رہی جیسے سمجھی ہی نہ ہو کہ اس سے کیا پوچھا گیا ہے... .... یا یقین نہ آتا ہو کہ یکایک اس کے شوہر کو یہ بھید کیسے معلوم ہو گیا........ مگر پھر جیسے دھیرے دھیرے سورج پر سے

بادل ہٹ جاتے ہیں اور برسات کی نم آلود دھوپ زمین پر پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دھیمی، میٹھی، نرم مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھل گئی۔

"انیل؟" اس نے بڑی ملائمت سے نام دہرایا......... جیسے ماں بچے کا نام لیتی ہے، جیسے تپسوی بھگوان کا نام لیتا ہے۔ جیسے شاعر اپنا محبوب شعر گنگناتا ہے......... اور اس کی آنکھیں ایک نئی روشنی سے چمک اٹھیں......... وہ روشنی جو بارہ برس تک سدھیر نے کبھی اپنی بیوی کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی.........

"ہاں! ہاں! انیل۔ کون ہے وہ؟" بملا کی آنکھوں میں اس نئی روشنی کو دیکھ کر سدھیر آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

مگر بملا کسی دوسری ہی دنیا میں تھی۔ اس کی آنکھیں دور —— بہت دور......... نہ جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔ کوئی بہت خوبصورت منظر؟ کوئی دلکش یاد؟ امید کی کوئی کرن؟

"وہ سب کچھ ہے"......... اس کے مسکراتے ہونٹوں نے سدھیر سے نہیں بلکہ خود سے سرگوشی کی.... پھر ان ہونٹوں کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ اور ان کے خم میں ایک کڑوا طنز ابھر آیا "اور اب وہ کچھ بھی نہیں ہے......" پھر کسی نامعلوم غم کے بوجھ سے اس کی گردن جھک گئی۔

"پہیلیاں مت بوجھواؤ" سدھیر چلایا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ میز کو الٹ دے۔ تمام چینی کے برتنوں کو چکنا چور کر دے۔ چائے دان کو اٹھا کر بملا کے سر پر دے مارے "سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟"

وہ جھکی ہوئی گردن پھر اٹھ گئی۔ آنکھوں کے ڈبڈباتے ہوئے آنسوؤں میں سے پھر وہ عجیب روشنی جھلکنے لگی۔ پھیکے اور بے رنگ انداز میں صرف "جی" کہنے والی بملا نے فخریہ انداز سے سر اٹھا کر سدھیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "جی ہاں۔ آپ کا خیال صحیح ہے۔"

اور اس لمحے سدھیر کی دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ اسے ایسا لگا کہ بملا نے اس کی عزت پر، اس کی آئی۔ سی۔ ایس کی شان پر، اس کی مردانگی پر ہمیشہ کے لیے کالک پوت دی ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ بملا نے اسے ایک ایسی غلیظ گالی دی ہے جو عمر بھر اس کے کانوں میں گونجتی رہے گی۔ اس وقت تعلیم اور تمدن، تہذیب اور اخلاق کے سب چھلکے اس پر سے اتر گئے۔ اب وہ لندن کا پڑھا ہوا بیرسٹر نہیں تھا۔ آئی۔ سی۔ ایس ایسوسی ایشن کا ہونے والا سیکرٹری نہیں تھا۔ کلب کا ممتاز ممبر نہیں تھا۔ نرائن گنج ضلع کا ڈپٹی کمشنر نہیں تھا جس کی مٹھی میں ایک لاکھ سے زائد انسانوں کی قسمت تھی۔ اس وقت وہ صرف ایک ننگا وحشی تھا۔ غصہ کے جوش میں بھرا ہوا ایک مرد جس کی عورت نے اسے دھوکا دیا تھا۔

وحشی چلایا "نکل جاؤ اس گھر سے، اسی وقت، اسی دم"

بملا کے چہرے پر نہ غصے کے آثار پیدا ہوئے نہ غم کے۔ وہ اب بھی کسی دوسری ہی دنیا میں تھی۔ اس نے سدھیر کی چیخ کو ایسے سنا جیسے بہت دور سے کوئی دھیمی سی آواز آئی ہو...... اور ایک بار پھر اس کے ہونٹ ایک معصوم سی مسکراہٹ سے کھل گئے.... جیسے کھوئے ہوئے مسافر کو بڑی تلاش کے بعد راستہ مل جائے۔ جیسے وہ مدت سے — بارہ برس سے — اسی گھڑی کا انتظار کر رہی تھی اور آخرکار وہ مبارک ساعت آن ہی پہنچی ہو۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ایک نظر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اس نظر میں شکایت نہیں تھی۔ شکوہ نہیں تھا، رحم تھا، معافی تھی، جیسے اس کی نگاہیں کہہ رہی ہوں "اس میں تمہارا قصور نہیں۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے" پھر وہ اپنے بیڈروم میں گئی اور وہاں سے اپنی چھوٹی بچی کو گود میں لے کر برآمدے میں سے ہوتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے قدموں کی آواز دور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ باہر سڑک کے شور میں ہمیشہ کے لیے کھو گئی۔

سدھیر کا خیال تھا کہ وہ روئے گی، گڑگڑائے گی، اپنی صفائی پیش کرے گی، اپنے گناہوں کی معافی مانگے گی، آئندہ اپنے اعمال کو درست کرنے کا وعدہ دے گی مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ ملاپ کی گھڑی یوں تڑپ بن جائے گی۔ اس خاموش طمانچے سے اس کی ساری ہستی جھنجھلا اٹھی۔ ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر ایک ہی چوٹ پڑتی رہی۔ "انیل!! انیل!!! یہ انیل کون ہے؟ میں اس کا پتہ لگا کر چھوڑوں گا۔ اس پر ایک بیاہتا عورت کو اغوا کرنے کا دعویٰ کروں گا۔ اسے جیل بھجواؤں گا۔ اسے جان سے مار دوں گا......."

پاگلوں کی طرح وہ اٹھا اور سدھیہ کے کمرے میں پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ اپنی وارڈ روب کے ایک خانے میں ہمیشہ اپنے خط وغیرہ رکھتی ہے۔ کنجیوں کا گچھا مانٹل پیس پر پڑا تھا۔ جانتے بوجھتے وہ جھنجھلاتا ہوا گیا۔ سدھیر نے وارڈ روب کھولی۔ خانے کو چابی لگا کر باہر کھینچا۔ اس میں رکھے ہوئے خطوں کے پلندوں اور کاغذات کو ٹٹولا۔ سب سے پیچھے کی تہہ میں سرخ ریشمی فیتے سے بندھے ہوئے چند خط رکھے تھے جو ضرور انیل کے خط ہوں گے۔ اس کا خیال صحیح نکلا۔ ہر خط میں اعلانِ محبت "میری پیاری جان" "میری اپنی ملیکہ" "میری اچھی ملیکہ" "تمہارا اور صرف تمہارا انیل" "اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں تمہارا، تمہارا......." ہر فقرہ زہر آلود نشتر کی طرح اس کے دل میں کچوکے لگاتا رہا۔ ایک ایک کرکے وہ خط فرش پر گرتے رہے۔ مگر یہ کیا؟....... خطوں کے بیچ میں تہہ کیا ہوا اخبار کا ایک تراشہ..... کھولنے پر دیکھا کہ ایک نوجوان کی تصویر ----- گہری جھکی ہوئی آنکھیں، روکھا ماتھا، مسکراتے ہوئے ہونٹ --- اس کے نیچے یہ خبر چھپی ہوئی تھی:-

نوجوان شاعر کی موت

> ہمیں یہ اطلاع دیتے ہوئے دلی صدمہ ہے کہ لکھنؤ کے نوجوان ترقی پسند ادیب اور انقلابی شاعر انیل کمار ابھی کا انتقال ہو گیا ہے۔ سنہ ۳۹ء کی ستیہ گرہ تحریک میں وہ جیل گئے تھے اور وہیں انھیں دق کا منحوس عارضہ ہو گیا تھا.........

سدھیر ساری خبر نہ پڑھ سکا۔ اس لیے کہ تراشے پر اخبار کی اشاعت کی تاریخ دی ہوئی تھی۔ ۱۸ جون سنہ ۱۹۴۰ء۔ اس کے ہاتھ سے باقی خط اور تراشہ فرش پر گر پڑے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ انیل!! انیل!!! انیل!!! کیا کوئی مر کر بھی زندہ ہو سکتا ہے؟

بھٹکے ہوئے مسافر، ہارے ہوئے جواری کی طرح وہ کھانے کے کمرے میں واپس آیا۔ میز پر انیل کا خط اور لفافہ پڑے ہوئے تھے۔ اس نے لفافہ اٹھا کر ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ درجنوں گول مہروں کے درمیان میں ایک چوکور مہر لگی ہوئی تھی۔ جس پر انگریزی کے تین حروف چھپے ہوئے تھے ----- D. L. O. ڈی۔ ایل۔ او۔ ڈیڈ لیٹر آفس۔

ممتا!

اختر اورینوی

"اللہ، گود میں لا دے کہ ہم انگنا کی الگنی پہ ان کا کتھلی دھو کے پساریں!"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھاتے ہوئے ایڑی ابھار کر گاؤں کی ہم راز عورتوں سے کہا۔ گویا وہ منّی جی کی لنگی واقعی الگنی پر پھیلا رہی ہو۔ اس کا سانولا گندمی چہرہ ممتا کا ہالہ بنا ہوا تھا۔ اس کے دھیان میں چھوٹے منّے منّی جی کی بے جا خاطرداری بھی ہو رہی تھی۔

ان دنوں اس پر دو رنگی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ ادھیڑ ہو چکی تھی۔ بیاہ کو آٹھ سال ہو گئے تھے۔ پہلے دن اس نے سپنے پہ بچہ پالنے کو بسائے تھے لیکن اس کے قدم ڈگمگائے نہ تھے۔ اس کے ایک لڑکی تھی جو اب دس سال کی ہونے کو تھی۔ وہی ایک دو سال کی بچی چھوڑ کر اس کا جوڑا چھلا گرہست میاں ہی مل رہا تھا۔ لوگ کہتے اپنے باپ پہ گئی ہے۔ بیوڑی شکل، تھمتی، ناموتی، بھی کوئی جھری بھی نہ تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوانی اس کی گھات میں بیٹھی ہے۔ جب ٹوٹ پڑی گی تب ٹوٹ پڑے گی۔

گوکہ بیاہی ہوئی تھی۔ اس نے کسی بچی کو دیکھ کر ناچو کی آنکھوں کے سامنے اس گدبدے والے شوہر کی تصویر پھر جاتی تھی وہ سہمے ہوئے اٹھتی تھی۔ رات رات بھر ناچو کو نیند نہیں آتی تھی۔ وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتی۔ اس کے تن من میں آگ سی لگ جاتی وہ تلملا اٹھتی۔ زیتون اور ماتو کے آباد پالنوں کی گرمی کو سوچ سوچ کر وہ انگاروں پر لوٹتی رہتی تھی۔

زیتون اور ماتو سے وہ چھیڑ چھیڑ کر بچوں کی باتیں پوچھتی۔ گاؤں کی گلیوں میں چلتے پھرتے منّوں کو تاکا کرتی۔ عورتوں کی ٹولیوں میں بیٹھ کر چھیڑ چھکتی۔ باتوں کو شربت کے گھونٹ کی طرح پیتی۔ مگر اس کی تشنگی دور نہ ہو پاتی۔

"ممتا گئی ہے!" زیتون کہتی۔

"سنک گئی ہے!" ماتو بولتی ——

اور گاؤں کی دوسری عورتیں فقرہ کستیں۔

"چھلاوے ہے!" "چونچلا کرے ہے!" "نکل جائی!"

"بستی کا ناک کٹوا دے گی!" "باپ دادا کا نام اونچا کرے گی!" ——

مگر وہ کرتی تو کیا کرتی۔ آٹھ سال پہلے ایک عورت اس کے دل کی چتا کے اندر ستی ہو گئی تھی اور اب آٹھ سال کے بعد چتا کی راکھ سے دیپک کی طرح وہ عورت پھر جی اٹھی تھی۔ پھر راکھ میں آگ کے شعلے سے لپٹ اٹھتے تھے۔

ناجو ہنستی، گیت گاتی، ہنسی مذاق کرتی، فحش گالیاں بکتی، روتی اور گاتی اور اکثر لوگوں کو کوسنے لگتی یا اسے دوہتڑ رسید کرتی۔ گرگو منحوس تھی۔ گرگو اُس کے بے درد شوہر کی علامت تھی جو اُسے یوں تڑپتا سلگتا چھوڑ گیا تھا۔ یوں بھری جوانی میں مر جانا بھی بڑا ظلم ہے ——! نہ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا! یہ کس اندھیرے سے جنون جاگ اُٹھا تھا۔ ناجو کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ اُف اس کے تن بدن میں ایک زلزلہ سا کیوں آ گیا تھا، اچانک، ناگہاں طور پہ دھرتی اور عورت! عورت اور دھرتی! دھرتی دھمس رہی تھی، بھٹ رہی تھی، چھنک رہی تھی۔ اندر تاریک شعلے بل کھا رہے تھے۔ ناگ کا پھن پھیل رہا تھا۔ اور اس میں آتشیں بس رس رہا تھا۔ دھرتی ناگ کے پھن پر دھری ہے اور دھرتی کی کوکھ سے عورت جنم لے کر اُوپر کھڑی ہے۔ کوکھ کے اُوپر کوکھ! ناجو کے اندر عورت چلا رہی تھی تو وہ ہنستی! اور ہستی کی عورت کے ہزار ہاتھ! ناجو کے ہزار ہاتھ خلا میں وجود کی گرفت کے لیے اُٹھ رہے تھے ...... اور پھر ایسا ہوا کہ چھوٹے سرکار کی ڈیوڑھی اس کے لیے ہموار بن گئی۔ وہ دن دن بھر اور رات گئے تک چھوٹے سرکار کی حویلی میں رہتی اور بہانے بنا بنا کر ڈیوڑھی پہ جا بیٹھتی اور باہر جھانکتی رہتی۔ منشی جی کے درشن کے لیے۔

منشی جی گاؤں میں نئے نئے آئے تھے۔ چھوٹے سرکار کے دربار میں نمود سے تھے اور ابھی خام سے تھے۔ اُن کی خاندانی روایات بہت ہمت افزا تھیں۔ منشی جی کے ایک بھائی نے اس سے قبل گاؤں میں ہومیوپیتھک کی پریکٹس شروع کی تھی اور رہتے رہتے حویلی کی پروردہ ایک باندی سے جو اُن سے عمر میں بڑی تھی، وابستہ ہو گئے تھے۔ منشی جی پر بھی متعلقین کی نظریں تھیں۔ لیکن ناجو تو منشی جی سے گرویدہ ہو گئی تھی۔ عالم فریفتگی میں ناجو بدل گئی تھی۔ اب وہ کھلی تاک جھانک نہیں کرتی تھی۔ فحش مذاق سے بھی بچتی تھی۔ وہ ہم راز عورتوں سے اپنے دل کی بات کہتی ——

"اے بوا دلہن، وہ ہو گا ہی! میرا دل کہے ہے کہ منشی جی پر سب گھر کو سمجھیں، بڑے اچھے ہیں منشی جی!"

"کیوں اچھے ہیں! چھچھوندرا ہے!"

زیتون بول اٹھتی۔

"نا بہن بڑے اچھے لگے ہیں۔ جی چاہے ہے کہ اُن کی مورتیا۔ وہ دیکھتے رہیں۔"

ناجو جواب دیتی۔

"اوئی بہن! کا اچھے لگی ہیں! مُشٹنڈی نظروں سے آگے پیچھے تاڑتے رہے ہیں۔ کھسر پھسر ...!"

حالو ہنستی ہوئی یوں کہتی جیسے منشی جی کی ادا اُس کی دل پسند ہو مگر وہ غیر کے لیے کیوں ہو۔ خود اس کے لیے کیوں نہ ہو اس لیے وہ بڑے تھے بہت بڑے ہمدرد انتخاب! —— اور منشی جی جیسے بھلے ہمارے تھے، بستی والوں نے ایسی ویسی کئی نسبتیں منشی جی کے پاس بھیجیں۔ نہیں انہوں نے کسی کو ہاں نہیں کیا۔ کو بھی نہیں کیا۔ ناجو تین ناجو کی نسبت سے کرتی اور جاتی رہی، ناجو کا یقین اس کے وجود میں اترتا رہا۔ پھولتا رہا پھلتا رہا اور منشی جی بھی بونی پلکیاں لگتی پہ پسارتی رہی اور انگلیوں پہ روز روز دھونے کی نوبت آتی رہی۔ گرگو سے کھانے پینے کی چیزیں منشی جی کو بھجوائی جاتی رہیں اور گرگو پر اب وہ خفا نہیں رہتے تھے گرگو بھی اس آنے جانے اور بھیجنے بھجوانے میں دبی دبی دلچسپی لیتی تھی۔ اس کی بادامی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں مسکرا مسکرا اُٹھتیں۔ منشی جی اُسے دیکھ کر ہنستے اور اس کی مٹی مٹی میلی کچیلی اوڑھنی کے اندر ان کے چھوٹے چھوٹے دیدے گھستے جاتے۔ جیسے لونڈے امرود کے درختوں میں بے موسم کے امرود ڈھونڈنے کے لیے اپنی گردنیں اُٹھائے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور کوئی پھل نہیں پاتے۔ گرگو کی ہری بھری شاخیں اب گدرانے والی ہی تھیں۔ منشی جی کا بس چلتا تو وہ گرگو سے ہی اپنی نسبت پکی کروا لیتے۔ پینتالیس سال کی عمر میں بھی وہ بڑے دل گردے کے آدمی تھے وہ ناجو کو ساس بنانا زیادہ پسند

کرتے۔ مگر ناجو اُن کی تنگیوں کے درپے تھی۔ آخرش منشی جی نے دوسرے قصبے میں ایک تیرہ سالہ لڑکی سے نکاح کر لیا۔ یہ خبر اُڑتی ہوئی ناجو کے گھر پہنچی مگر منشی جی اپنی قدر و قیمت گھٹانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود نہ کھلے کہ ماجرا کیا ہے۔ رفتہ رفتہ سبھی ناجو کے سب کو حقیقت معلوم ہو گئی اور انہیں یقین ہو گیا کہ منشی جی اپنے بھائی کی پیروی کر کے اس گاؤں کے ہونے والے نہیں لیکن ناجو کب اس بات کو ماننے والی تھی وہ تو منشی جی کو اپنا چکی تھی، اپنے گھر لا چکی تھی اپنی سجیا سلا چکی تھی۔

سچ بھی بڑی بُری چیز ہے، تلخ اور نکیلی، اندر گھسنے والی، پردے چاک کرنے والی، سچ خود بھی ننگا اور دوسرے کو بھی ننگا کرنے پر تُلا ہوا۔ ناجو کی عقل میں سچ گھس پڑا۔ مگر اس کے دماغ کے گہرے اندھیارے میں جو اندھی عورت بیٹھی ہوئی تھی اس کے دیدے نہ کھول سکا دونوں میں پنجے جھاڑ لڑائی شروع ہوئی اور ناجو کو ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگے۔ وہ دورے کے وقت بڑی بے حیائی سے منشی جی سے بیاہ رچاتی اور وصل محبوب کے باب میں ٹھٹولیوں کی کھال اُدھیڑتی۔ اور اس خواب و خیال کا اثر یہ ہوا کہ ناجو کے بھائی نے ایک روز اس کی خوب کُندی کر دی۔ اور روزانہ اس کی کُندی ہوتی رہی۔ مگر وہ منشی جی کی تکلی بھری بغل میں اتار کر دھرنے اور سلگانے پر مصر رہی۔ لتیاں بھیگتی اور سوکھتی رہیں اور ناجو کا بھرکس نکلتا رہا۔ آخرش تنگ آ کر ناجو کے بھائی نے ایک "لغاتی" قسم کے آدمی سے ناجو کا بیاہ کر دیا۔ ناجو دوسرے گاؤں چلی گئی۔ سال بھر کے بعد وہ اپنی کوکھ میں بچے کو لے کر واپس آئی اور میکے ہی میں بچہ پیدا ہوا۔

اُن ہی دنوں منشی جی ایک ماہ کی چھٹی لے کر گھر چلے گئے، جب واپس ہوئے تو بہت شاداب تھے۔ لوگوں نے تاڑ لیا کہ شادی رچا کے آئے ہیں۔ لیکن اب بھی منشی جی اپنے منہ سے کچھ نہ کہتے تھے۔ اب وہ جلد جلد چھٹی لے کر گھر جانے لگے۔ لیکن کب تک۔ چھوٹے سرکار نے روک ٹوک شروع کی۔ سال بھر کے بعد وہ اپنی نئی نویلی کو ساتھ لے آئے اور حویلی سے قریب ہی ایک چھوٹا سا اُفتادہ مکان کو درست کرا کر اس میں اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگے۔

کوکو حویلی میں کام کرتی تھی اور کام کرنے پر مجبور تھی۔ بیوہ ماں کی شادی کے بعد بھی گھر کی حالت نہیں سنبھلی۔ ماموں کے ٹکڑوں پر پہلے بھی پڑی تھی اور بعد بھی پڑی رہی۔ اب یہ ہوا کہ ماں کو نکھٹو میاں ملا۔ جو خود کبھی کبھی سسرال ہی آ رہتا تھا اور کھانے والا ایک منہ اور پیدا ہو گیا۔ جب تک دودھ پیتا ہے تو خیریت ہے۔ ورنہ کوکو کے منہ کا لقمہ چھن جائے گا۔ کوکو کی ماں، ناجو نے اسے مستقلاً حویلی میں رکھوا دیا" اوپر کما کے پیسے۔ مگر اس اوپر کمائی کی فہرست لامتناہی تھی۔ کوکو بڑے صبر سے یہ راہ طے کرتی رہی۔ کرنا ہی تھا اُسے۔

کوکو فرصت کے اوقات منشی جی کی بیوی کے کام کاج بھی کر دیتی تھی۔ ان کے کام بڑی چاہ سے کرتی تھی۔ وہ انہیں اپنی ہمجولی سمجھنے لگی تھی۔ نئی دلہن کا جی بھی کوکو سے لگ جاتا تھا۔ وہ کوکو کو اچھے پرانے کپڑے دے دیا کرتی تھیں اور منشی جی اس سے مذاق کر لیا کرتے تھے۔ دونوں باتیں دلکش تھیں۔

جاڑے کا موسم آیا۔ کوکو ٹھٹرتی رہی۔ دن تو خیر، رات بڑی ظالم ہوتی تھی۔ رات گئے تک وہ حویلی میں ٹھٹکتے جاڑے کی برچھیاں سہتی ہوئی کام کرتی رہتی تھی۔ چپ چاپ ایک دن وہ منشی جی کے گھر گئی۔ وہ حویلی سے رات کو واپس ہو رہی تھی۔ جی میں آئی ذرا منشی جی کے وہاں جھانک لیں۔ دونوں میاں بیوی ایک لحاف میں ملفوف بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کوکو کوٹھری کی چوکھٹ پر جھجکی اور ٹھٹک کر ترحم، حسرت اور افلاس کا مجسمہ بنی کھڑی ہو گئی۔

"آؤ کوکو! رُک کاہے گئی، اندر آ جا!" منشی جی کی بیوی نے بغل ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"تیرے جاڑا نہیں لگے ہے کوکو؟ جوان ہو رہی ہے نا!"

منشی جی نے اس کے جسم سے پرانے اتارن کُرتے اور دھاگے سے بھنی پھٹی اوڑھنی کو نگاہوں سے اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔

کوکو کی کالی کالی پتلیاں لالٹین کی پیلی پیلی روشنی میں ناچنے لگیں۔ وہ خاموش رہی۔ اندر آ گئی۔ گول گول پتلیاں تھرکتی رہیں اُس نے اپنے پھٹے چیتھڑوں کو ذرا سمیٹ لیا۔

"دیکھو! کوکو کیسا کانپ رہی ہے؟ مگر کوکو سردی سے نہیں کانپ رہی تھی۔ وہ انجانے پیچیدہ و تند جذبات سے کانپ گئی تھی۔ کون جانے اس کی حیات کے کتنے تار لرز اُٹھے تھے! "تم اسے اپنا ماربینے والا پرانا گرم شلوکہ کیوں نہیں دے دیتیں؟" منشی جی نے بیوی سے کہا۔

"لے گی کوکو؟" بیوی نے رحم کھاتے ہوئے پوچھا۔

کوکو خاموش کھڑی رہی۔ اس کی گہری سیاہ پتلیاں چمک اٹھیں، جیسے ادھ سلگے ہوئے کالے کوئلے سے چنگاری نکل پڑی ہو۔

منشی جی کی بیوی نے ٹین کے پیپے سے ماربینے کا شلوکہ نکال کر کوکو کو دیا۔ اور منشی جی نے اصرار کر کے اسے وہیں شلوکہ پہننے پر مجبور کر دیا۔ کوکو نے اپنے پھٹے ہوئے کُرتے کے اُوپر واسکٹ کی طرح شلوکہ پہن لیا۔ دلہن جی کا شلوکہ اُسے اَنٹ گیا۔

"ایں!" منشی جی بڑے لطف سے چونکے۔ دُلہن جی نے اپنے اُبھرے ہوئے سینے پر اچٹتی ہوئی ترچھی نگاہ ڈالی اور پھر کوکو کو مسکراتی ہوئی گھورنے لگیں۔ کوکو شلوکے کے ابھاروں کو اوڑھنی سے چھپانے لگی۔ خاموشی اور خود اعتمادی کے ساتھ بہت ہی خفیف سی مسکراہٹ اس کے بند لبوں کے ایک گوشے میں لہرا کر غائب ہو گئی۔ کوکو اپنے گھر چلی گئی۔

"کون دیے ہے شلوکہ؟" کوکو کی ماں ناجو نے پوچھا۔

"منشی جی کی دُلہن دیئیں ہیں۔" کوکو نے جواب دیا۔

ناجو اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ گودڑ کے اندر چپڑ چپڑ کی آواز اچانک رُک گئی۔ ناجو اٹھ کر شیرنی کی طرح کوکو پر جھپٹی۔ اور آن کی آن میں اس نے گرم ماربینے کا شلوکہ چھین لیا اور چھین کر خود پہن لیا۔ وہ شلوکہ اُسے اَنٹ نہیں رہا تھا۔ سانس روک روک کر اس نے اٹایا۔ بہت مشکل سے دو ڈھیلے بٹنوں کو کس کس کر داب داب کر سیپ کے بٹنوں کے درمیانی حصے تن تن گئے کئی توسین بن بن گئیں۔ ان ملی ملی توسین کی زنجیر سے بھی بھرے بھرے سینہ زوبے اور زنجیر کے حلقوں سے جھانکتے رہے دہانے سے دودھ اُبل پڑا اور گرم شلوکے پر دو بڑے بڑے نم دھبے پڑ گئے

ناجو نے یہ حرکت سوچ سمجھ کر نہیں کی۔ یہ سب کچھ بڑی بے شعوری سے ہوا، بڑی بے دردی سے، ناجو پر ایک جن سوار ہو گیا اور رہا۔ کوکو حیرت زدہ رہ گئی اور اپنے آنسو پی کر کڑھتی ہوئی سو رہی۔

دوسرے ہی روز گاؤں کی عورتوں میں شلوکے کی کہانی منشی جی اور ان کی بیوی کی زبانی پھیل گئی۔ ناجو ہر وقت اس شلوکے کو پہنے رہتی تھی۔ کوکو سے اس کی تصدیق کرائی گئی اور طعنے طشنے کا بازار گرم ہوا۔

"چھی! لڑکو سے چھین کر گرم شلوکہ پہن لیں۔ بے شرم بڈھی عورت!" حاکو نے نشتر لگایا۔

"کیسی ممتا مر گئی ہے چرمی صدری ہیں!" نورَسا نے مصلحانہ شان سے کہا۔

منشی جی کی بیوی جل جل کر تاجو پہ وار کرتیں۔ عورت بھی کتنی سمجھ دار ہوتی ہے! وہ تہہ کی باتیں جان لیتی ہے۔ وہ گہرے بھید پا جاتی ہے۔

منشی جی اس جلاپے سے اور اس شلوکے کے تصور سے لطف لیتے رہے جس کے پانوں میں تین جوڑے پسینے متلاطم ہوئے۔

"ہائے عجب! تیری ممتا کہاں مر گئی تھی تاجو؟" زیتون نے پوچھا۔

"توں سب بھی تو صد کروے۔ کوّا کان لیے جائے! نہ پوچھ زمانت! اے ہم تو اپنا دودھ گرم رکھتے لا شلوکہ لیا رہے۔ ہفتہ بھر سے لڑکا کو دست پر دست۔ ٹھنڈا ٹھنڈا دودھ پیتے پیتے منٹ منٹ پر قے۔ ہائے رے رے! مائے کا دل! ہم صدکے جائیں اپنے دونوں لال پر سے!" تاجو نے جواب دیا۔

جل پری

علی عباس حسینی

——— اور اس نے میرے پاؤں دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ———

میں ڈاک بنگلے میں بالکل اکیلا تھا۔ میرا اردلی بہاری قریب کے ایک گاؤں میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہر گیا تھا۔ سرکاری خانساماں جو چوکیداری کے فرائض بھی ادا کرتا تھا۔ مجھے کھانا کھلا کر کچھ دیر کے لیے قصبہ چلا گیا تھا۔ قصبہ ڈاک بنگلے سے تقریباً ایک میل دور تھا۔ انگریز کالے آدمیوں میں مل جل کر رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ محکمہ نہر کے انگریز انجینئر نے اسی لیے یہ بنگلہ آبادی سے فاصلے پر بنایا تھا۔ بنگلے کے تین طرف ارہر اور ایکھ کے کھیت تھے چوتھی طرف نہر تھی۔ نہر کے اس پار ایک فرلانگ کے فاصلے پر ڈھاک اور جھاؤ کا جنگل تھا۔ جہاں لومڑیوں، گیدڑوں، لکڑبھگوں اور بھیڑیوں کے بھٹ تھے۔ نہر بیچ میں نہ ہوتی تو شاید یہ بنگلہ ان کا رمنہ بن جاتا۔

رات بچپنے سے نکل کر جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ دھندلکے کی چلبلاہٹوں پر گہری تاریکی کی متانت غالب آتی جا رہی تھی۔ بنگلے پر ایک سناٹا سا چھایا تھا۔ اردگرد کی فضا پر بھی وہ سکوت طاری تھا جو دس بجے شب کے قریب دیہاتوں، جنگلوں اور غیر آباد مقامات کو بھیانک بنا دیتا ہے۔ اس سناٹے اور خاموشی کے پردے کو کبھی کبھی لکڑبھگوں کی قہقہہ نما چیخ چاک کر دیتی تھی۔ یا کبھی کبھی کسی الو کی آواز۔

میں نووارد تھا۔ ضلع کی خصوصیات سے ناواقف۔ میرے لیے ماحول بھی نیا تھا اور مقام بھی۔ نہر کے ماتحت انجینئر کی حیثیت سے تیس میل کے دورے سے پلٹا تھا۔ یکے کی سواری نے، پختہ اور نیم پختہ سڑکوں کے ہچکولوں نے چور چور کر دیا تھا۔ جسمانی تھکاوٹ کا تقاضا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی سو جاؤں۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ نیند کی دیوی آتی تو ضرور، مگر خراماں خراماں، اور دل و دماغ میں اپنا نشیمن بنانے کی جگہ صرف پلکوں کو چھو کر چلی جاتی۔ میں الف لیلہ کا "سوتا جاگتا ہارون الرشید" بن گیا تھا۔ جو رام چندر جی کی طرح رعایا کا دکھ سکھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے راتوں کو بھیس بدل بدل کر نکلتا تھا۔ اور جس کی راتیں بہت چھوٹی اور دن بہت بڑے ہوتے تھے۔ اور میرے دل میں بھی ہارون الرشید جیسا ڈر ہی تھا۔ اس لیے کہ جس طرح وہ اپنے معمولی لبادے کے نیچے کمر میں مرصع تلوار لٹکا لیتا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی اپنی پیٹی سے دونالی بندوق لگا رکھی تھی۔ اسے انسانوں کا خوف مسلح نکلنے پر مجبور کرتا تھا۔ میرے دل میں جانوروں کا ڈر تھا۔ ادھر کے بعض اضلاع میں لکڑبھگوں اور بھیڑیوں نے ان دنوں آفت مچا رکھی تھی۔ نہ جانے کتنی جانیں ان کی بدولت تلف ہو چکی تھیں۔ ایسے میں بندوق پاس ہوتے ہوئے قریب نہ رکھنا بیوقوفی ہی تو ہوتی۔

میں نے بستر کے قریب چھوٹی میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی تیز کی اور اپنی کتابیں اٹھا لیں۔ اس دورے میں تین کتابیں ساتھ

لایا تھا۔ پریم چند کی پریم پچیسی، سمرسٹ ماہم کی ریزرس اج اور اناطول فرانس کی پینگوئن آئیلینڈس۔ یہ کتابیں بار بار کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لیکن مجھے پریم چند کی جرأت، غیرت، محبت، شرافت اور محبت کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ ان سے کردار بنتے تھے۔ ان سے سیرتیں درست ہوتی تھیں۔ ان سے طبیعتوں میں توازن و استقلال پیدا ہوتا تھا۔ وہ آج کل کی کہانیوں کی طرح بے نتیجہ نہ تھیں۔ اناطول فرانس کی ساری تصنیفوں میں مجھے اس کی تمثیلی ناول حد درجہ پسند تھی۔ طنز کا یہ شاہکار موجودہ تہذیب کے ارتقا کی مکمل تاریخ ہے۔ حال ہی میں پریذیڈنٹ ٹرومین نے جو بجٹ کے سلسلے میں کانگریس کو سفارشات کی ہیں۔ اور جس طرح اکیلے امریکہ کے بجٹ کو سارے عالم کا بجٹ بنا دیا ہے۔ اس کا ذکر اسی ناول کے آخری ابواب میں بڑی خوبی سے موجود ہے۔ میں بار بار اس حصے کو پڑھتا تھا۔ اور اس ادیب کی حیرت انگیز سیاسی سوجھ بوجھ پر انگشت بدنداں رہ جاتا تھا۔ ریزرس اج میں ہیرو کا استغنا عجیب و غریب ہے۔ وہ نہ صرف دولت و ثروت کی جانب سے بے پرواہ ہے، بلکہ وہ حسن و جنس کے معاملے میں بھی مستغنی ہے۔ محبوبہ اگر اشارے سے کام لے کر اس سے شادی کر سکتی ہے تو وہ خوش، اگر وہ دولت کے حرص میں کسی اور رشتے کی تلاش میں غرق ہو جاتی ہے تو اسے کوئی شکایت نہیں۔ سزا یافتہ چور اور بدمعاش اس کی ہمدردی کے مستحق، اور جانی بوجھی بدکردار عورتیں اس کے تحفظ کی حقدار۔ اگر ان میں سے کوئی اس کے احسان کا بدلہ جسمانی لذتوں کے ذریعے چکانا چاہتی ہے تو اسے معاوضہ کے قبول کرنے میں عذر نہیں۔ اگر خود ہی اصرار کرنے کے بعد وعدہ فراموشی سے کام لیتی ہے تو وہ اس سے ناخوش نہیں ہوتا۔

میں ریزرس اج کی جلد پر ہاتھ رکھے ماہم کے عجیب کردار پر اور اس کی انوکھی ٹیکنیک پر غور کر رہا تھا جو اس نے اس سوانحی ناول میں استعمال کی ہے کہ دفعتاً مجھے شاد عظیم آبادی کا مشہور شعر یاد آ گیا: ؎

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

اور دماغ جسم و روح کے مابعد الطبیعاتی مسائل میں الجھ گیا۔ یہ "میں" کون سی چیز ہے؟ گوشت و پوست کا مجموعہ یا کچھ اور؟ روح محض حرارتِ جسمی ہے یا اس سے الگ کوئی دوسری چیز؟ اگر محض حرارت ہے تو انسانی دماغ اس کے پیدا کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوتا؟ اگر جسم سے علیحدہ کوئی شے ہے تو اسے قفسِ عنصری میں کون بند کرتا ہے، کون نکال لیتا ہے؟ پھر یہ پیدائش سے پہلے کہاں تھی، مرنے کے بعد کہاں جاتی ہے؟ کیا روحانیین کا ادعا صحیح ہے کہ وہ روحوں کو بلا سکتے ہیں، ان سے گفتگو کر سکتے ہیں؟ —— اور مجھے کچھ تصوف کی باتیں یاد آئیں۔ کچھ ویدانیت کی، کچھ تھیوسیفی کی، کچھ سائنس کی —— اور میں نے الجھ کر لیمپ کی روشنی کم کی، آنکھیں بند کیں اور نیند بلانے کے لیے شاد کا مصرعہ دہرانے لگا۔ ع: نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم —— دفعتاً کمرے کے دروازے سے ایک شخص نے جھانکا۔ بڑے بڑے الجھے الجھے بال، لمبی کھچڑی داڑھی اور دھنسی دھنسی چمکتی آنکھیں۔

میں نے ڈر کو دل میں چھپاتے ہوئے کہا "کون؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کمرے میں چلا آیا۔ بھیانک چہرہ، پھٹی قمیص، پھٹا پائجامہ، ننگے پاؤں، سارے جسم اور کپڑوں پر گرد کی ایک تہہ جمی ہوئی۔ اس پر اس قدر لاغر کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے یا کوئی مصری مومیائی۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا اور مجھے پسینہ چھوٹنے لگا۔ میں نے بھی افسرانہ لب و لہجہ میں پوچھا:

"تو کون ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟"

"پانچ پیسے!" وہ پہلی بار بولا۔

بھیک مانگنے والے میری چڑ ہیں۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے دستِ سوال پھیلانا انسانیت کی سخت ترین توہین ہے اور بے حیائی اور بے عزتی کی آخری حد۔

میں نے اسی لیے تڑک کر کہا "تو اندر کیوں گھسا آ رہا ہے؟ دروازے پر کھڑا ہو کر صدا لگا!"

اس کی آنکھوں کی چمک اور بھی بڑھ گئی۔ جیسے سلگتے ہوئے کوئلوں پر سے پھونک کر خاک اڑا دی گئی ہو۔ مگر وہ عاجزی سے بولا "جی مجھے اتنے کا کام بھی تو کرنا ہے۔"

فقیر کی زبان پر کام کا لفظ۔ میں بھونچکا سا ہو گیا۔

"کیسا کام؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی پانچ پیسے کے عوض کام" اس نے کہا۔

"یہاں کوئی کام نہیں ہے!" میں نے ترش روئی سے جواب دیا۔

وہ اطمینان کے ساتھ میری مسہری کی پٹی کے پاس فرش پر بیٹھ کر بولا "جی آپ بہت تھک گئے ہوں گے۔ لائیے میں آپ کے پاؤں دبا دوں۔" اور اس نے میرے پاؤں دبانے کے لیے اپنا سوکھا ہاتھ بڑھایا——

میرے دماغ میں اچکوں، چوروں، ڈاکوؤں کی ساری کہانیاں فلم کی بدلتی تصویروں کی طرح جلدی جلدی ایک کے بعد ایک آتی چلی گئیں۔ میں نے جلدی سے ٹانگیں سمیٹ لیں۔ اس کے چہرے پر وہ مسکراہٹ دوڑ گئی جو شکار کردہ چوہے سے کھیلتے وقت بلی کے چہرے پر دکھائی دیتی ہے۔ اس نے کہا "ڈریئے نہیں بابوجی! میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں! میں —— میں ایک والیِ ملک کا بھائی ہوں!" اس کی آواز میں غرور کی جھنکار پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے کہا "تم! ——" اور میں بے ساختہ زور سے ہنس پڑا۔ بہر صورت، بہر حالت، پانچ پیسے کا سوال، پاؤں دبانے کی مزدوری اور والیِ ملک کا بھائی! مختلف جذبات کے ردِّ عمل نے اس ہنسی کو ایک دیرپا قہقہے میں تبدیل کر دیا۔ دونوں طرف آنکھوں سے آنسو نکلے میرے ہاں ہنسی کی افراط کی وجہ سے اور اس کے دل جھٹلائے جانے کے غم و غصّہ سے۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں پہلے جلتی شمعیں لہرائیں، پھر وہ آبگینے خشک چہرے کی خاک دھوتے ہوئے فرش پر گرے۔ اس کی تکلیف کی شدت کے احساس نے میرے قہقہے کی آواز اس طرح یکایک روک دی جس طرح "چالو" کارخانے کا شور بجلی کا سوئچ دبانے سے دفعتاً رک جاتا ہے۔ اور مجھے اس طرح کا ایک جھٹکا لگا جیسا تیز چلتے ہوئے موٹر میں اچانک بریک لگانے سے محسوس ہوتا ہے۔

میں نے کہا "میرا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کی بات پر شک کرتا ہوں۔"

اس نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "نہیں نہیں، آپ کی ہنسی بجا تھی۔ میری صورت شکل، میری حالت دیکھ کر ہر شخص کو ہنسی آتی ہی ہے۔ کوئی مجھے دیوانہ کہتا ہے، کوئی مجنوں، لیکن میں نے آج تک کسی کو نہ تو یہ بتایا کہ میں کون ہوں، اور نہ کسی کو اپنا قصہ سنایا۔ ایک عجیب داستان ہے——

میں نے اس کے لب و لہجہ اور اندازِ گفتگو سے محسوس کیا کہ وہ ایک پڑھا لکھا شریف زادہ ضرور ہے۔ اور میں نے دل جوئی کرتے ہوئے

کہا "نہیں نہیں، میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا۔ مگر — مگر — اچھا اب مجھے اپنی کہانی سنائیے" اور میں مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے نظر جھکا کر کہا "جی ہاں میں نے کہا کہ میں ایک والیٔ ریاست کا بھائی ہوں۔ ریاست کا نام اگر نہ بتاؤں تو آپ برا نہ مانیں گے۔ ریاست بہت بڑی نہیں مگر اس کے نواب کو اپنے حدود کے اندر بڑی سے بڑی سزا دینے کا حق ہے۔ اور اس کے اشارے پر اب بھی ریاست کا بڑے سے بڑا آدمی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹا وزیر اعظم تک کا عہدہ پاتا ہے۔ والد مرحوم نے ہم لوگوں کی تعلیم و تربیت پر لاکھوں روپے صرف کیے۔ ہم عربی، فارسی، انگریزی، فرنچ ہی نہ پڑھائے گئے بلکہ ہمیں نشانہ لگانا، سواری کرنا اور جملہ سپاہیانہ فنون سکھائے گئے۔ بھائی صاحب کو اسپورٹس کا زیادہ شوق تھا اور مجھے مطالعہ کا — میری فرمائش پر اسٹیٹ لائبریری میں ہزارہا نئی کتابوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ میری خاص پسند کا موضوع فلسفہ تھا۔ میں شروع ہی سے مابعد الطبیعات کی باریکیوں میں الجھنے میں ایک خاص لذت پاتا تھا۔ میرا محبوب ترین مشغلہ یہ تھا کہ میں اپنے استادوں میں سے کسی ایک سے کسی فلسفیانہ موضوع پر بحث کرتا رہوں یا پھر کسی شعر یا کسی نظم کی انوکھی تشریحیں کیا کروں — مجھے زیبائش و آرائش، تعیش وغیرہ سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ میں نے بدھ کی زندگی اور اس کا فلسفہ بڑے غور سے پڑھا تھا اور میں اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ میں نے اسی نیم پختگی ہی کی حالت میں یہ طے کر لیا تھا کہ میں دوسرا بدھ بن کر رہوں گا انھوں نے کچھ دنوں تو تاہل کی زندگی بسر کی، میں تو یہ بھی نہ کروں گا۔ میں عیسیٰ کی طرح بن بیاہا رہوں گا۔ اسی لیے جب حضور نے میری شادی کی بات چیت چھیڑی تو میں نے ان کے پاس کہلا بھیجا کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ ان کے لیے جن کی کئی سو بیویاں تھیں، یہ بات بالکل عجیب تھی۔ ڈاکٹر، حکیم، وید بھیجے گئے۔ سرکاری حکم تھا معائنہ کرانا پڑا۔ سب نے باتفاق فیصلہ کیا کہ کوئی بیماری نہیں۔ ایک [illegible] نے [illegible] نسخہ بتایا۔ میری خدمت کے لیے مرد ملازم محل کی جگہ کنیزیں رکھ دی گئیں۔ ایک سے ایک ہوش ربا، ایک سے ایک [illegible]، میں نے اُن کے افعال و حرکات، جذبات کا بغور مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اور پورے محل کو جنسیات کی ایک تجربہ گاہ میں تبدیل کر دیا۔ جب مہینوں کی روزانہ رپورٹوں میں انھیں میرے رویہ میں کوئی فرق نہ معلوم ہوا تو وہ بھی ہار بیٹھے اور انھوں نے حکم دے دیا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ میرے سب چھوٹے بھائی بہنوں کی شادی ہو گئی مگر میں اپنے مشاغل میں لگا رہا۔

ایک دن صبح کے کوئی سات بجے تھے، میں نماز سے فراغت پا کر اپنے باغ میں ٹہل رہا تھا۔ روش کی دونوں جانب گلاب کھلے ہوئے تھے۔ سرخ، زرد، سیاہ، سفید اور ان پر ہندوستانی بلبل اور مختلف چھوٹی چھوٹی گل دار چڑیاں گا رہی تھیں، شہد کی مکھیاں اور بھونرے بھی اپنے اپنے طور پر طواف میں لگے تھے۔ میں دور سے اس حسین منظر کو دیکھ رہا تھا اور غالب کا یہ مطلع میرے دماغ میں گونج رہا تھا: ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور اس پر غور کر رہا تھا کہ کیا واقعی تناسخ صحیح ہے۔ کیا ہم چولے بدل بدل کر آتے رہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں؟ مرتے کیوں ہیں؟ بار بار پیدا ہونے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی ہے۔ پھر دفعتاً دماغ اس طرف مڑ گیا کہ ہمارے بوس نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانوں کی طرح نباتات میں بھی جان ہوتی ہے۔ وہ خوشی بھی محسوس کرتے ہیں، درد و تکلیف بھی۔ پھر جس تحقیق تک سائنس اتنی دیر میں اتنی جستجو کے بعد پہنچی۔ شاعر کی تخیل نے اسے کیونکر اتنی مدت پہلے محض معمولی مشاہدے کے ذریعہ معلوم کر لیا تھا۔ کیا ایک بڑے شاعر کو الہام ہوتا ہے؟ کیا موجودہ سائنس کی نظر میں الہام بھی کوئی چیز ہے۔

پھولوں کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوا ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ مجھے چھوتی گزرتی جاتی۔ اور میرے خیالات ایک جگہ جمنے کی بجائے نئی نئی پٹریاں بدلتے بھاگتے چلے جاتے اور لاینحل سوالات کا ایک ہار گوندھتے جاتے تھے۔ دفعتاً گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بھائی حضور ولی عہد بہادر، اپنے مشکی پر سوار چلے آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے سائیس میرے عرب نقرہ کی لگام پکڑے لا رہا ہے۔

میں نے سلام کیا تو بولے "ارے یہاں راہب!" انھوں نے مجھے راہب کا خطاب دے رکھا تھا۔ "آؤ چلیں تفریح کر آئیں۔"

مجھے گھوڑے پر سوار ہونے کا بہت شوق تھا۔ ایک مہینہ سے زائد ہو گیا تھا کہ محل کی چار دیواری کے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ آج جو اپنا گھوڑا دکھائی دیا تو دل بے ساختہ چاہا کہ اچک کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤں۔ پھر بھی میں اس وقت صرف کرتہ پاجامہ پہنے تھا۔ اپنے محل کے اندر تو اس لباس میں گھوم سکتا تھا، باہر اس طرح جانے کے خلاف احکام تھے۔ ریاست کے والی کے بیٹے کو ہر موقع و محل کے لیے مناسب لباس ضروری ہے۔ میں نے بھائی صاحب سے اجازت لے کر جلدی جلدی لباس بدلا اور اپنے عرب پر سوار محل سے نکل گیا۔

لو بر کا مہینہ تھا، برسات ختم ہو چکی تھی۔ زمین نے ہر جگہ اپنے سینے میں چھپے ہوئے لعل و جواہر سبزہ اور ہریالی کی صورت میں اُگل دیئے تھے۔ ہوا میں بہت ہی دل پذیر خنکی تھی۔ طائر درختوں پر چہچہا رہے تھے۔ مشکی اور نقرہ، دلیر اور عرب، سیاہی و سپیدی، ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے، اترائے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً ہمیں کچھ بنجاروں کے خیمے دکھائی دیئے۔ چھوٹی چھوٹی چھولداریوں میں پورا پورا خاندان۔ ان کے کالے کالے لونڈے رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں۔ ان کی عورتیں میلی میلی پھٹی شلواریں، ساڑیاں، پاجامے اور شلوکے پہنے بال گرد سے اٹے ہوئے روٹی تھپتھپا رہی ہے، کوئی چولہے میں آگ روشن کر رہی ہے۔ کوئی کھڑی دونوں ہاتھوں سے جوئیں پڑے بال کھجا رہی ہے۔ مرد یا تو بیٹھے حقہ پی رہے ہیں، یا اپنے چھوٹے چھوٹے ٹٹو مل رہے ہیں۔ میرے منہ سے بے ساختہ نظیر کا مصرعہ نکل گیا: ع

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

بھائی صاحب نے کہا "جلدی نکال چلو، یہ ٹھہرنے کی جا نہیں!"

ہم نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی اور چند منٹ میں یہاں کی مشہور جھیل "رام ساگر" کے کنارے پہنچ گئے۔ کوسوں لمبی جھیل پر ریاست نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے اسے قابلِ دید بنا دیا ہے۔ اس میں گھاٹ ہیں۔ سنگِ سرخ و سنگِ موسیٰ کے کنارے ہیں۔ اس میں جنگل میں بہتے ہوئے چشموں کے مناظر ہیں۔ پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی ندیوں کے مناظر ہیں۔ اس کے کنارے پر سنگِ مرمر کی بنی ہوئی کشتی گاہیں ہیں۔ اس میں تیرنے کے وہ تمام سامان ہیں جو اس ورزش کا جوانوں کو حریص بنا سکتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کا پانی صاف ہے۔ شیریں ہے اور اس میں کسی قسم کی گندگی کی آمیزش کی اجازت نہیں۔

ہم جھیل کی اس عمارت کی طرف مڑے جو شاہی خاندان کے غسل کے لیے مخصوص تھی اور جہاں کسی دوسرے کو نہانے کی اجازت نہ تھی۔ اور ہم نے دیکھا ـــــ ہم نے دیکھا ـــــ"

بھکاری شہزادے نے بے تکلف جھپٹ کر میرے سرہانے سے سگریٹ اور دیا سلائی اٹھائی اور ایک سگریٹ جلا کر کئی لمبے لمبے کش لیے۔ اس کا انداز بتاتا تھا کہ اسے یہ دنیاوی من و سلویٰ مدتوں کے بعد ملا ہے۔ لیکن وہ اس سے لذت یاب ہونے کی بجائے اسے کسی دوا کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر اور اپنے منتشر خیالات کو مجتمع کر کے بیان کرے۔ اس نے آدھی جلی ہوئی سگریٹ زمین پر رگڑ کر بجھا دی اور بجھے ہوئے ٹکڑے کو کان کے پیچھے ٹھونس لیا۔ پھر وہ اسے کان سے نکال کر چٹکیوں سے ملتا ہوا بولا:

"وہ شہزادیوں کے گھاٹ پر ننگی مادرزاد کھڑی تھی۔ اس کے ہلکے زرد رنگ پر طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں ملمع چڑھا رہی تھیں۔ اس کے لمبے کالے بال پانی میں تیرتے اور لہراتے سانپ کی طرح بل کھاتے تھے۔ وہ خود لہروں سے لدی ہوئی کشتی کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ ایک چمکتے ہوئے جادو کی طرح اس کا چہرہ ایک بار پھر روشن ہوا۔ ایک چھپاکے کی آواز آئی اور وہ پانی میں غوطہ لگا گئی۔ میں بے ساختہ گھوڑے سے کود کر ادھر لپکا۔ مجھے نہ ولی عہد بہادر کا خیال تھا نہ اپنی شہزادگی کا، نہ ملاحوں کا خیال تھا، نہ حالات و واقعات کا، مجھے یقین تھا کہ میں نے آج جل پری اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور وہ نظروں سے غائب ہوا چاہتی ہے۔ میرا دل پکار رہا تھا کہ اس عجوبۂ روزگار کی اگر یہ تجلی دیکھنی ہے تو جلدی کرو۔

بھائی حضور مجھے آواز دے رہے تھے "کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کچھ نہ سنا۔ میں دوڑ کر زینے پر پہنچ گیا۔۔۔

نیچے کی سیڑھیوں جانب نظر ڈالی۔ جھیل کی سطح سے بادلوں میں چھپا ہوا ایک آفتابی چہرہ ابھرا۔ لمبے گیسو جیسے ناگ اور سفید ہاتھوں نے ان کو جھٹک کر پیچھے پھینک دیا۔ اور ایک آن واحد کے لیے ان ستارہ آنکھوں سے میری آنکھیں لڑیں اور اس نے ایک ہلکی چیخ کے ساتھ پھر غوطہ لگا دیا۔

بھائی صاحب نے اتنی دیر میں عمارت کی نگران ملاحنوں کو آواز دے دی تھی۔ ان میں سے دو تین دوڑتی ہوئی سامنے آ پہنچیں۔

بھائی حضور نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ میرے منہ سے بار بار یہی نکلا "جل پری! ادھر دیکھیے! ابھی آئی ہے۔ تم ان پر پیچھا کرنا ہو گے" انھوں نے کہا اور ملاحنوں کو اشارہ کر دیا۔ ان میں سے دو فوراً جھیل میں جا پڑیں۔ معلوم ہوا دو مگرمچھ ایک روہو کے تعاقب میں چلے۔

بھائی حضور میرا ہاتھ پکڑ کر ادھر لائے جہاں ہمارے گھوڑے کھڑے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں بالکل خواب کے سہارے چل رہا ہوں۔ مجھ سے قوت عمل بالکل سلب کر لی گئی ہے۔ میں لرز رہا تھا۔ کانپ رہا تھا جیسے میں کسی بھیانک خواب سے چونکا تھا۔ ہوا اور میری اب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ لرزش وہ نشاط و ہیجان تھے جو ان بندھنوں کے ٹوٹنے سے ہو رہے تھے، جو میں نے اپنے جنسی جذبات کے گرد باندھ رکھے تھے۔ میں نے اپنے اسپ کی زین سے جست لگائی اور گھوڑے کو سرپٹ چلایا۔ جلدی جلدی دو تین کوڑے لگائے جب جا کر میری یہ کیفیت کم ہوئی۔

ملاحنیں اسے پکڑ کر لائیں۔ جیسے جسم پر میلی خنک ساڑی، کمر سے نیچے بالوں سے پانی ٹپکتا ہوا۔ ان دونوں کے درمیان ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے مینا کے دو ناگوں کے درمیان کافور کی ایک ڈلی۔

بھائی حضور نے لڑکی کو پوچھا "کون ہے ری تو؟"

اس نے نڈری سے جواب دیا "شہزادی!"

وہ مسکرائے "اچھا، جب ہی آپ شہزادیوں کے گھاٹ پر نہا رہی تھیں!"

ملاحنوں میں سے ایک بولی "سرکار، یہ بنجارن بڑی نٹ کھٹ پاجی ہے۔ نہ جانے کیسے گھس آئی سرکاری گھاٹ میں۔"

بھائی حضور نے کہا "اچھا! اسے شام کے دربار میں پیش کرنا۔"

اتنی دیر میں کئی سرکاری ملاح بھی آ گئے تھے۔ سب نے سلام کیا اور "شہزادی" کو گھیرے ہوئے گھاٹ کی عمارت کی طرف لے گئے۔

میں خاموش تھا۔ بھائی حضور ولی عہد تھے۔ سرکار کے بعد انھیں کا ساری ریاست میں حکم چلتا تھا۔ میں اگر کچھ کہتا تو نہ جانے ملاح اور ملاحنیں مانتے بھی یا نہیں۔ لیکن دل میں پھنکنے لگے۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ اور منہ کا ذائقہ کڑوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کئی دن سے بخار کا مریض ہوں۔

بھائی حضور نے گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے ہنس کر کہا "تو تمہاری جل پری تو بنجارن نکلی!"

میں نے کہا "آپ نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیا ہوتا۔ دربار میں پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ بولے "شاہی گھاٹ پر نہانے کا جرم چھوٹا نہیں۔ اس کی سزا سات برس کی قید سے لے کر موت تک ہے۔ اس لیے سرکار ہی فیصلہ فرمائیں گے۔"

میں نے کہا "مگر ـــ مگر ـــ"

ان کے چہرے پر دفعتاً وہ سختی اور بے رحمی جھلکنے لگی جو مطلق العنان بادشاہوں کے چہرے پر نادری احکامات صادر کرتے وقت دکھائی دیتی ہے۔ وہی جو ان کو انسان کی جگہ درندوں سے مشابہ بنا دیتی ہے۔ اور وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گئے۔ میرا گھوڑا بھی خود بخود ساتھ ہو لیا۔ جیسے وہ بھی شکاری کے قدم بقدم چلنے میں اپنی نجات سمجھتا ہو۔

محل میں واپس پہنچ کر میں اپنے بستر پر جا کر پڑ رہا۔ کنیزیں میرے جوتے اور لباس اتارنے دوڑیں تو میں نے جھڑک دیا۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو میں نے ایک کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ اس کا سن سترہ برس سے زیادہ نہ تھا اور وہ سب سے حسین تھی۔ وہ اس وقت بھی سہمی ہی سی تھی۔ میں دیکھتا رہا [illegible] کر لیا۔ عورت کے حسن میں وہی تناسب ہوتا ہے جو [illegible] وہ تھوڑی دور پر آ کر دست بستہ کھڑی ہو گئی۔ میں نے اشارہ سے اور قریب بلایا۔ وہ آئی کر [illegible] مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے اچانک التفات سے گھبرا گئی ہے۔

میں نے کہا "ڈرو نہیں، میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں"

میرے لب و لہجہ سے وہ ذرا مطمئن ہوئی۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

میں نے پوچھا "تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا گیا ہے؟"

اس نے سر جھکا کر کہا "آپ کی خدمت کے لیے"

"کس طرح کی خدمت؟"

اس نے کہا "ہر طرح کی!"

میں نے کہا "میرے سامنے ننگی ہو کر ناچو گی؟"

اس نے کہا "کنیز ہوں، جیسا حکم ہو!"

مجھے غصہ آ گیا "نہیں چاہیئے مجھے تمہاری کنیزی ـــ پیسوں پر بکنے والا جسم! چلی جاؤ میرے سامنے سے، دور ہو جاؤ!" میں چیخا اور وہ ایک پٹے ہوئے کتے کی طرح کمرے سے چلی گئی۔

میں پلنگ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ دونوں تصویریں بار بار میری آنکھوں میں پھرتی تھیں، غوطہ لگاتی ہوئی جل پری اور ملاحنوں کے درمیان کملائی کلی ـــ مجھ سے عاقبت اندیشی کی صلاحیت دفعتاً سلب ہو گئی۔ میں جھپٹتا ہوا کمرے سے باہر نکلا، پھر "شیر دل" پر بیٹھا اور سرپٹ بھگاتا ہوا جھیل کے کنارے شہزادیوں کے گھاٹ پر پہنچا۔ ملاحنیں اب کے باقاعدہ پہرہ دیتی ہوئی ملیں۔ انھوں نے شہزادی کو ایک کمرہ میں بند کر رکھا تھا۔ وہ اس کے دروازے پیٹ پیٹ کر ان کو کوس رہی تھی۔

میں دروازہ کھول کر جب اندر داخل ہوا تو اس کی ساری کا آنچل کمر میں لپٹا تھا۔ اور اس کے بال کمر تک بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں غصہ سے سرخ اور اس کے گال بالکل لال ہو رہے تھے۔ یہ تیسری تصویر پہلی دو تصویروں سے بھی زیادہ دلربا تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر بٹھا دیا۔ وہ مجھے تعجب سے دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"آپ چھوٹے شہزادے ہیں؟" اس نے سرگوشی کے لہجہ میں پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر حامی بھری۔ اور مجھے دفعتاً یہ یاد آیا کہ میں ایک شہزادہ ہوں۔ میں ایک سرکاری مجرم سے گفتگو کر رہا ہوں۔ حضورِ عالی کے احکام بڑے سخت ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بن کھلی کلی ہی نہ ہمیشہ کے لیے مرجھا جائے بلکہ مجھے بھی نظر بندی یا قیدِ تنہائی کی سزا بھگتنا پڑے۔ میں جلدی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ شہزادی میرے قریب کھسک آئی۔ اتنی ہی دیر میں اس کی نسوانی فطرت نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کا دلدادہ و شیدا، اس کا غلام بن چکا ہوں۔ وہ مجھے موم کی طرح جدھر بھی چاہے موڑ سکتی ہے۔ اس نے دفعتاً میرے کندھے سے سر لگا کر کہا:

"میرے شہزادے! مجھے چھوڑ دیجئے۔"

میں حضورِ عالی کی خفگی کے خیال ہی سے کانپ اٹھا۔ اس نے پلنگ سے اتر کر زمین پر گھٹنے ٹیک کر کہا "میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ چھوڑ دیجئے!"

"میں بے بس ہوں شہزادی، مجھے چھوڑنے کا اختیار نہیں!"

وہ طعن سے ہنسی "اچھے شہزادے ہیں! ایک مجرم بھی چھوڑ نہیں سکتے!"

میں نے کہا "اگر چھوڑ بھی دوں، تو ابھی تجھے پھر پکڑ لیں گے، شام کے دربار میں حاضری ضروری ہے۔"

وہ بولی "ہونہہ! بس یہاں سے نکل جانے دیجئے۔ پھر دیکھوں گی کون پکڑ لیتا ہے۔"

میں نے کہا "بھاگ بھی جا! مگر ـــ مگر ـــ میں کیسے ـــ"

اس نے جھک کر میرے پاؤں چھوئے "میں ملنے آؤں گی شہزادے!" اور وہ کمرے سے نکل گئی۔ ملازموں نے روکنا چاہا۔ میں نے کہا "جانے دو!" اور وہ تیز بھاگتی ہوئی اس طرف چلی گئی جدھر بنجاروں کا قافلہ پڑا تھا۔

شام کے دربار میں وہ تو نہیں پیش ہوئی۔ البتہ سارے بنجارے بندھے کھڑے تھے۔ لیکن حضورِ عالی کے بار بار پوچھنے پر بھی کسی نے یہ نہ بتایا کہ وہ کہاں گئی۔ دھمکیاں دی گئیں، پیٹا گیا لیکن کوئی بھی اس کے سوا نہ بولا کہ وہ بھاگ گئی۔ مجھ پر بھی عتابِ شاہی نازل ہوا۔ قانون شکنی کیوں کی گئی۔ مجرم کو فرار میں مدد کیوں دی گئی۔ میں خاموش سر جھکائے سب سنتا رہا۔ حضورِ عالی نے ڈانٹا۔ بھائی حضور نے مذاق اڑایا۔ وزراء نے نصیحت کی مگر میرا سکوت نہ ٹوٹا۔ بالآخر حضورِ عالی نے جھلا کر ایک مہینہ محل میں نظر بند رہنے کا حکم سنا دیا۔ میں اسی طرح چپ سادھے اپنے حصہ میں چلا آیا۔ اور پلنگ پر لیٹ کر اس پر غور کرنے لگا کہ آخر شہزادی کہاں گئی۔ اور میں اسے پھر کیسے دیکھوں گا۔ پھر یہ بھی الجھن تھی کہ میں اس بنجارن کے پیچھے کیوں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ والیٔ ملک کا بیٹا اور نیچ ذات کی عورت کا عشق۔ لوگ کیا کہیں گے؟ بھائی حضور نے تو آج بھرے دربار میں رسوا کیا، کل سارے ملک میں تشہیر ہو گی۔ حضورِ عالی کے غصہ کا پارہ کس ڈگری پر پہنچے گا۔ سرکارِ عالیہ کے سامنے اگر پیشی ہوئی تو ان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مگر ـــ مگر ـــ کیا اسی کو عشق کہتے ہیں؟ میں تو اس سے کوئی بھی غرض نہیں رکھتا۔ میں تو شہزادی کو صرف خوش، چہلیں کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ پھر اس قدر فکر کیوں؟ ممکن ہے کہ اس کا بھی کوئی بنجارہ ہو۔ ایسا محسوس ہوا جیسے جسم بھر میں کسی نے ایک ساتھ بہت سی سوئیاں چبھو دی ہیں

تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا! ہرگز نہیں! وہ میرے ہی ساتھ رہے گی۔ میں اسے سب کچھ کھو کر جیت لوں گا! میں نے ٹہلنا شروع کیا۔ پورے کمرے کی سینکڑوں بار پیمائش کر ڈالی، فرش کچل ڈالا۔ لیکن الجھن بڑھتی ہی جاتی تھی۔ میری خود سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب ہے کیا کہ کبھی سارے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگتی ہیں، کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رگوں میں برف اتاری جا رہی ہے۔ میں نے کمرے کے باہر روش پر ٹہلنا شروع کیا۔ مختلف طرح کے ہندوستانی اور انگریزی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوا ان کی خوشبو سے معطر تھی۔ لیکن مجھے سوائے اس کے کسی بات کا احساس نہ تھا کہ میرے دماغ میں کوئی کیل سی ٹھونکتا جاتا ہے۔ کھٹ! کھٹ!

اور اس نے دفعتاً اپنی لمبی لمبی انگلیاں بڑھا کر اپنی کھوپڑی پر اس طرح ماریں کہ معلوم ہوتا تھا واقعی ہتھوڑی سے کیل ٹھونکی جا رہی ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ قصہ بیان کرتے کرتے اس کی وحشت بڑھتی جاتی ہے۔ اور کہانی کی ابتدا میں جو رحم اور ہمدردی کا جذبہ مجھ میں پیدا ہوا تھا۔ اس پر ایک ہلکی سی گھبراہٹ، ایک خفیف سی سراسیمگی غالب آتی جاتی ہے۔ رات کا سناٹا، تاریکی، دور دور تک ہمارے سوا کسی انسان کا موجود نہ ہونا۔ ان چیزوں نے پھر تحت الشعور میں دبا ہوا خوف ابھارنا شروع کیا تھا۔ اور اس کے ابھارنے کا سبب قصہ کا موضوع نہ تھا۔ وہ تو کافی شیریں، دلچسپ اور دلپذیر تھا، بلکہ بنگلے کا پورا ماحول تھا اور قصہ گو کا انداز اور اس کا حلیہ۔

میں نے اسی لیے قصہ کوتاہ کرنے کی غرض سے سوال کیا ”تو شہزادی سے آپ کی ملاقات ہوئی یا نہیں؟“

وہ بولا ”نہ ہوتی تو آج یہ گت کیوں بنتی؟ اسی رات ہوئی۔ تقریباً بارہ بجے جب میں اپنے کمرے میں پڑا نیند کو بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ میں نے خیال کیا نگاہ کا دھوکا ہے۔ آنکھیں مل ڈالیں۔ وہ اتنی دیر میں اچک کر اندر آ چکی تھی۔ میں نے کہا ”تم! تم!“

وہ میرے سر کے بالوں میں انگلیاں دوڑا کر بولی ”میں نے وعدہ کیا تھا شہزادے!“

میں نے شرع و آئین سب کو پس پشت ڈال کر اسے اپنی گود میں سمیٹنا چاہا۔ اس نے بیچ روکتے ہوئے کہا ”میں اس لیے نہیں آئی شہزادے!“

”پھر کیوں آئیں؟“

وہ بولی ”مجھے آپ کی مدد کی اب بھی ضرورت ہے۔ مجھے ایک تیز اور مضبوط گھوڑا چاہیے تاکہ میں آج ہی رات ریاست کی سرحد سے نکل جاؤں“

میں نے کہا ”اور میں؟“

وہ بولی ”آپ شہزادے ہیں، آپ میرے جیسی عورت کو بیوی نہیں بنا سکتے“

”مگر میں تو بغیر تمہارے زندہ ہی نہیں رہ سکتا!“

”تو پھر آپ کو بنجارہ بننا پڑے گا!“

میں نے کہا ”منظور!“

اور ہم اسی رات اپنے نقرہ اور مشکی پر سوار ہو کر سرحد سے نکل گئے اور میں چھ ماہ تک اس کے ساتھ بنجاروں کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ہمارے سر پر کبھی ایک کمبل کا سائبان ہوتا، کبھی وہ بھی نہیں۔ مگر ہر لمحہ جنتی ہوتا۔ شہزادی کے ہر فعل میں ایک خاص ادا ہوتی۔ دلفریب،

دلپذیر، فرحت انگیز، اور میرا جی چاہتا تھا بس اسے دیکھے جاؤں۔ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، کام کرتے، سوتے، اٹھتے، بیٹھتے۔ اور میں جی بھر کر دیکھتا پھر بھی دل سیر نہ ہوتا۔ طبیعت نہ بھرتی۔ میں کبھی کبھی سوچتا، کیا جنت میں اس سے زیادہ خوشی ممکن ہے اور ہماری اس جنت میں ایک دن ایک سانپ آہی گیا۔

میری مفروری اور گم شدگی کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ اشتہارات دیئے گئے تھے۔ حلیہ شائع کیا گیا تھا۔ انعامات کا اعلان ہوا تھا۔ آدمی چھوٹے گئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کمبخت اتفاقاً بنجاروں کے ہر قافلے کو دیکھتا، ٹوہ لیتا ہم تک پہنچ ہی گیا۔ وہ مجھ سے ملا۔ حضورِ عالی کی بیماری کی اطلاع دی۔ سرکارِ عالیہ کے بسترِ مرگ پر ہونے کی خبر سنائی۔ میں نے کہا "سوائے شہزادی کے اب میرا کوئی نہیں"۔ اس وقت تو وہ مایوس ہو کر چلا گیا مگر شب میں جب ہم ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے بے خبر سو رہے تھے، دس بارہ آدمیوں نے ہمیں اچانک گھیر لیا اور شہزادی کو رسیوں سے باندھ کر ایک نیلنس میں ڈال دیا۔ مجھ سے کہا گیا "گھوڑا حاضر ہے، آپ کا جی چاہے تو ساتھ چلئے ورنہ ہم اسے لیے جا رہے ہیں" چارہ کار ہی کیا تھا۔ ہم دو دن سفر کر کے دربار میں حاضر کیے گئے۔ حضورِ عالی نے حکم دیا "اس پاجی عورت کو سپاہیوں میں سے کسی ایک کو دے دو کہ اپنا گھر بسائے اور صاحبزادے کو غسل کرا کے کپڑے بدلوا کر میرے سامنے حاضر کرو" میں اس ذلت کا متحمل نہ ہو سکا۔ میں نے بھرے دربار میں کہہ دیا کہ "شہزادی میری بیوی ہے۔ اگر کسی سپاہی نے ہاتھ لگایا تو میں اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلاؤں گا"

حضورِ عالی نے طنز سے پوچھا "بیوی ہے؟ کس نے نکاح پڑھا تھا؟"

میں نے کہا "میں نے خود!"

وہ جانتے تھے، مذہباً میں ایسا کر سکتا ہوں۔ اس لیے ان کے لیے جواب تو ساکت ضرور تھا مگر اس سے ان کا غصہ بھڑک اٹھا۔ انھوں نے حکم دیا "ان دونوں کو جیل میں ڈال دو، مگر الگ الگ کروں میں!"

ہم دونوں قید کیے گئے مگر اتفاق کی بات کہ اسی شب میں حضورِ عالی کو قلبی دورہ پڑا اور صبح ہوتے ہوتے وہ اپنے سے بھی زیادہ سخت مگر عادل جج کی عدالت میں طلب کر لیے گئے۔ آٹھ بجے دن کو جب میں قیدیوں کا لباس پہنے اپنی تاریک کوٹھڑی میں بیٹھا تھا یہ خبر ملی۔ مجھے اس حادثہ پر کوئی رنج نہ ہوا۔ اس لیے کہ میں انھیں باپ کی جگہ اپنی شہزادی پر ظلم کرنے والا سمجھتا تھا۔ اس لیے نہ میں نے اظہارِ افسوس کیا اور نہ ہی میں نے آنسو بہائے۔ ہاں اس کی خوشی ضرور تھی کہ بھائی حضور کو تخت ملا۔ وہ نسبتاً یقینی رحم دل تھے۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں اس کا ثبوت ملا۔ وزیرِ اعظم خود میری رہائی کا پروانہ لے کر قید خانہ آئے۔ میں نے کہا "میں بغیر شہزادی کے نہ جاؤں گا" اس کی رہائی کا بھی حکم آگیا اور ہم دونوں بند موٹر میں بٹھا کر محل میں پہنچائے گئے۔

میں نے اپنے خاص محل میں جا کر نہا دھو کر کپڑے بدلے اور شہزادی کے بارے میں خواصوں کو ہدایت دے کر میں بھائی حضور کی خدمت میں نذر گزارنے حاضر ہوا۔ انھوں نے گلے لگایا۔ دلدہی کی اور حضورِ عالی کے دفن و کفن کے سارے فرائض میرے سپرد کیے۔ میں نے انھیں بخیر و خوبی انجام دیا اور میں بہ اطمینان اپنے محل میں رہنے لگا۔

شہزادی کو سارے ممکن آرام مہیا تھے۔ ماما، دائیاں، خواصیں، کنیزیں ہر وقت خدمت میں لگی رہتیں۔ میں اب بھی بھونرے کی طرح اس کے گرد پھرا کرتا۔ تفریح کے لیے موٹریں تھیں، خرچ کے لیے روپے تھے مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ سست رہنے لگی۔ اس پر محل میں قیام کا وہی اثر ہوا جو ایک آزاد چڑیا پر ایک سونے کے پنجرے میں بند کر دیئے جانے کا ہوتا ہے۔ اس کے شہابی رنگ پر طلائی رنگ غالب آنے لگا۔ اس کی

سیمابیت نے جمتی برف کی انجمادیت اختیار کرنا شروع کی۔ میرے خوشی کے چمن میں فکر کی کانٹے دار جھاڑیاں نکلنے لگیں۔ میں اس کو خوش رکھنے کی صورتوں پر غور کر رہا تھا کہ ایک شب کو جب میں بارہ بجے کے بعد دربار سے پلٹا تو میں نے محل کو اس سے خالی پایا۔ گھر کا کونہ کونہ ڈھونڈھ ڈالا وہ کہیں نہ تھی۔ کمرے میں جا کر بستر پلٹا تو تکیے کے نیچے ایک پرزہ ملا "شہزادے! میں جاتی ہوں مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے لیکن بنجاروں کی زندگی میں اس سے بھی زیادہ!" میں نے اس شب میں پہلی دفعہ شراب پی اور اتنی پی کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

صبح کی اعضا شکنی اور درد سر نے مجھے پہلی دفعہ اپنی ظاہری حالت کی طرف توجہ کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے دیکھا، کرتے کے گلے کے سارے بٹن کھلے ہیں۔ دامن اور آستین پر بدبودار دھبے ہیں اور کمرے کی ہر چیز بے ترتیبی سے پڑی ہے۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے شب میں شراب پی، اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری شرمندگی اور خجالت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ منہ کا ذائقہ تھا کہ جیسے میں نے رات بھر خاک پھانکی ہے۔ کچھ ترش، کچھ کڑوا ساتھ ہی حد درجہ پھیکا۔ حلق میں کانٹے سے پڑے تھے۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور حمام میں گھس گیا اور محل میں میں نے پہلے دن آبدار خانے کے سربمہر گلاس کی جگہ پائپ کا پانی چلو لگا کر پیا۔ پھر جلدی جلدی کپڑے اتار کر نیم گرم پانی سے خوب نہایا۔ جب میں تولیہ لپیٹے باہر نکلا تو میں نے دیکھا، زہرہ میرے بستر کی چادر بدل رہی ہے اور خود بخود اس بلی کی طرح مسکرا رہی ہے جس نے تھوڑی دیر قبل گھر کا پالتو سفید چوہا کھا ڈالا ہو۔ اس کے چھٹکے ہوئے بھیگے بال اس کے شاہد تھے کہ وہ بھی ابھی غسل کر کے آئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نیم سپردگی، نیم فاتحانہ جھلک تھی۔ مجھے یقین آ گیا کہ رات کی مدہوشی میں میں نے اسے شہزادی کی جگہ دے دی —— اور مجھے خود اپنے سے نفرت ہو گئی۔ میں ڈاکو تھا، بے زبانوں اور کمزوروں کی پونجی لوٹنے والا ڈاکو! میں نے ایک کنیز کو اپنایا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ اس کا جسم میرے لیے خریدا گیا تھا۔ میں نے اس سے اس کی پسند کا حق زبردستی چھین لیا تھا۔ پھر میں بے وفا بھی تھا۔ میں نے شہزادی کی ملکیت پر دوسرے کو قبضہ کر لینے کا موقع دیا۔ میں نے چند گھنٹوں میں اپنی تمام روایات کو بھلا دیا جو وامق و مجنوں و فرہاد وغیرہ نے اپنا سب کچھ کھو کر محبت کرنے والوں کے لیے چھوڑی تھیں۔

میں اسی پیچ و تاب میں گرفتار تھا کہ بھائی حضور کا حکم نامہ آیا "سرکار عالیہ نے یاد فرمایا ہے، فوراً حاضر ہو" مجھے یقین ہو گیا کہ مخبروں نے سارے واقعات کی خبر پہنچا دی ورنہ میں یوں نہ یاد کیا جاتا۔ سرکار عالیہ نے جس دن سے شہزادی کے متعلق یہ معلوم کیا تھا کہ وہ بنجارن ہے، مجھے عاق کر دیا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ جب تک یہ ناگوار اور ذلیل تعلق قائم رہے گا، وہ میرا منہ نہ دیکھیں گی۔ شاید اس دیوانگی سے پہلے اس طرح کا حکم میرے لیے موت کے برابر ہوتا۔ اس لیے کہ میں ان سے بے انتہا محبت کرتا تھا اور مجھے بھی وہ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ چاہتی تھیں۔ لیکن شہزادی کی محبت نے میرے دل و دماغ پر اس طرح قبضہ کیا تھا کہ میں اس کے علاوہ نہ کچھ سوچ سکتا تھا اور نہ مجھے کسی اور کی دنیا میں پرواہ رہ گئی تھی۔ اس لیے مجھ پر نہ تو حضور عالی کی خفگی اور موت کا کوئی اثر ہوا تھا اور نہ سرکار عالیہ کی ناراضگی کا —— میں نے دنیا اسی کے پیچھے تج دی تھی ——

اس دن جبکہ میری محبت نفرت میں تبدیل ہو رہی تھی، مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی کس حد کا خود غرض، کمینہ خصائل اور رذیل طبیعت ہو گیا ہوں۔ میں نے ایک بنجارن کی محبت میں باپ کی شفقتوں کو اور ماں کی محبتوں کو بھلا دیا۔ مجھ میں نہ تو خاندان کا لحاظ و پاس باقی رہ گیا تھا اور نہ اس کا احساس کہ میں ریاست بھر میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہوں۔ دنیا مجھے کیا کہتی ہو گی۔ اور میرے فعل سے ریاست اور اس کے والی کی کتنی سبکی ہوتی ہو گی۔

کے پھول بکھراتی چلی گئیں۔

حسنِ ذاتی کو صنعت گری و فنکاری جس قدر دلآویز و دیدہ زیب بنا سکتی ہے اس کا نمونہ اطلس و حریر میں لپٹا پھولوں سے ڈھکی ہوئی مسہری پر ساکت و ساکن پڑا تھا۔ مستی و مدہوشی پیدا کرنے والے بخورات فضا میں عطر بیزی کر رہے تھے۔ کمرے کی ہر شے قیمتی اور نئی ہونے کی وجہ سے اپنی جگمگاہٹ سے آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی اور پھاٹک پر بجتی ہوئی سریلی بانسری کی ہلکی ہلکی مسحور کن آواز پاؤں کو ایک خاص تال و سم پر اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نیم وا آنکھیں مسہری پر جمائے، کچھ جھومتا، کچھ لڑکھڑاتا وارفتگی اور سرخوشی کی حالت میں کام و دہن میں ایک خاص طرح کا ذائقہ محسوس کرتا چلا جا رہا تھا۔ بڑھتا جا رہا تھا۔ دفعتاً کمرے کی ساری روشنیاں گل ہو گئیں۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نرم ریشمی دھاگا جو مجھے مسہری کی جانب کھینچ رہا تھا۔ دفعتاً ٹوٹ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ کسی شریر نے خاص طور پر اس کمرے کی روشنیاں گل کر کے مجھے اندھیرے میں اپنی منزل اور اپنا مرکزِ کشش ٹٹولنے کے لیے مجبور کیا ہے۔ مگر تھوڑی دیر میں پورے محل کے شور و غوغا نے بتا دیا کہ یہ تاریکی عام ہے۔ میں نے مسہری پر ایک سرسراہٹ محسوس کی۔ دروازے کی طرف پلٹتے پلٹتے اُدھر پلٹا۔ غالباً نئی دلہن لمبے گھونگھٹ سے میرا داخلہ دیکھ رہی تھی اور اب اندھیرے نے مجھے ایک تاریک تر سایہ بنا کر اس کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ ممکن ہے یہ حرکت منزل تک پہنچنے کے لیے میرا سہارا بن جاتی لیکن دفعتاً ایک جانا پہچانا نرم نرم ہاتھ مجھے کھڑکی کی جانب کھینچنے لگا۔

میں نے آہستہ سے پوچھا "شہزادی؟"

کان کے قریب منہ لا کر جواب دیا گیا "ہاں! باہر چلیے" —— اور میں خاموش ساتھ ساتھ ہو لیا۔ لان پر دو گھوڑے تیار کھڑے تھے، بھائی حضور کا مُشکی اور میرا نقرہ۔ ہم دونوں سوار ہوئے اور چور دروازے سے ہو کر جہاں آج کے ہنگامے میں کوئی پہرہ نہ تھا، محل کے باہر نکل گئے۔ میں نے شکایتوں کا باب جب کھولا تو شہزادی کے جواب نے مجھ میں باز پرس کا یارا باقی نہ رکھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز سے سر کو جھٹکا دے کر بولی "میں نہیں چاہتی تھی کہ ہمارا معصوم پہلی سانس کھلی فضا کی جگہ کہیں اور لے۔"

اب حرف و حکایت تھی تو اس کی کہ وہ کیسا ہے، کہاں ہے، کب پیدا ہوا اور اس وقت اس کی دیکھ بھال کون کر رہا ہے؟ اس حدیثِ شیریں کو اس نے دراز سے دراز تر کر کے بیان کیا۔ اور میرا دل ہی نہ بھرتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس افسانہ کی جلدیں بڑھتی ہی چلی جائیں۔ ہم ساری رات چلتے رہے، کبھی تیز کبھی آہستہ، مگر اس پورے طویل سفر میں مجھے ایک سیکنڈ کے لیے نہ تو بھائی حضور کے غم و غصہ کا خیال آیا اور نہ وہ غریب قمر چہرہ دلہن یاد آئی جو میرے اس طرح غائب ہو جانے سے مختلف طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنی ہو گی۔ دو سال سے چھوٹی ہوئی شہزادی میرے ساتھ تھی، مجھے کسی اور سے کیا مطلب؟ —

صبح کے قریب ہم ریاست کے حدود سے باہر بنجاروں کے ایک ڈیرے میں پہنچے۔ وہاں پہلی دفعہ اپنے نورِ نظر کو شمع جلا کر دیکھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے پالنے میں سو رہا تھا۔ پہلی نظر میں وہ بھولی صورت میرے دل میں اُتر گئی۔ ہو بہو شہزادی کی تصویر تھی۔ وہی ناک نقشہ، وہی رنگ، وہی غلافی آنکھیں، اور سونے میں وہی ہلکی مسکراہٹ جو میں نے بارہا شہزادی کے چہرے پر دیکھی تھی اور جس نے اکثر راتوں میں مجھ سے میری نیند چھین لی تھی۔ ہم دونوں اس پر جھک پڑے۔ کبھی جگر پارے کو دیکھتے، کبھی ایک دوسرے کو۔ شہزادی کی نظر میں غرور تھا، افتخار تھا، تبختر تھا۔ وہ سب کچھ تھا جو اپنے بہترین شاہکار کو دکھاتے وقت ایک کامل صناع کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ وہ کہتی تھیں "دیکھی تم نے میری تخلیق؟"

بھلا یہ پھول تمہیں شیش محل میں کہاں نصیب ہوتا؟ یہ تو بہاروں کا بچھڑا ہے۔ کھلی ہوا، آزاد فضا اور شبنم و یاسمین، لالہ و گلاب، سنبل و بنفشہ کی آمیزش و خمیر وہاں کہاں نصیب ہے؟" میری آنکھیں بار بار اس تفریق میں منہمک تھیں کہ ان دونوں میں دلربائیت کس میں زیادہ ہے۔ ہلال میں یا بدر میں، غنچۂ ناشگفتہ میں یا گلابِ تازہ میں۔

بچہ نے ماں کی خوشبو پائی، سوتے میں کلبلایا، اس کے پنکھڑیوں جیسے لب کھلے اور اس نے "امی! امی!" کہہ کر ادھر کروٹ لی جدھر شہزادی کا چہرہ تھا —— اور میں نے شہزادی کی چوتھی تصویر دیکھی جو پیشتر کی تینوں تصویروں سے بھی زیادہ دلکش تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سنہری لہر دوڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک برق سی کوندی۔ اس کی کنپٹی کی سبز سبز رگیں سمٹیں اور پھیلیں۔ اور اس نے جھک کر بچے کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان دونوں کے گرد ایک سفید ہالہ بن گیا!"

اس نے پھر مڑ کر سگریٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے جلدی سے سگریٹ پیش کی۔ وہ دو تین لمبے لمبے کش لگا کر بولا "میں نے بہت دنوں سے کوئی اچھی سگریٹ نہیں پی تھی۔ آج آپ نے پلائی تو شہزادگی کے دن یاد آگئے۔" پھر اس نے سگریٹ کو فرش پر رگڑ رگڑ کر چور کر دیا۔ جیسے وہ اپنی ان ساری یادوں کو خاک میں ملا رہا ہے۔ جو شہزادی سے ملاقات کے قبل والی زندگی سے متعلق تھیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا:-

"ہم نے دو برس عجیب طرح کی خوشی میں گزارے۔ کبھی ہم جھونپڑیوں میں سوئے، کبھی اپنی چھوٹی سی راوٹی میں، کبھی ہم نے درختوں کے نیچے بستر جمایا، کبھی ہم نے جنگلوں میں شاخوں پر بسیرا کیا۔ مگر ہر لمحہ مسرت سے لبریز تھا۔ ہر وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہا ہوں جس کے لیے میری تخلیق ہوئی تھی۔ مجھے کبھی بھی بنجاروں کے مجمع میں بیٹھ کر اجنبیت نہیں محسوس ہوئی۔ میں نے کبھی ان کی سادہ و جفاکش زندگی میں کوئی غیریت نہیں پائی۔ انھوں نے مجھ کو اپنا لیا تھا اور میں نے ان کو ——

جب ریاست کا کوئی جاسوس یا پولیس کا کوئی سپاہی ہمیں ڈھونڈتا ہوا ان کی جانب آ نکلتا تو ہمیں بہت پہلے سے اطلاع ہو جاتی اور ہم کسی قریب کے جنگل میں کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو جاتے۔ پھر ہم نے کبھی ایک ٹولی کے ساتھ ایک ماہ سے زیادہ بسر نہ کیا۔ ہم ان خانہ بدوشوں کے جس گروہ میں پہنچ جاتے۔ شہزادی ان کی لڑکی ہوتی اور میں داماد۔ ہر ایک ہماری آؤبھگت کرتا اور دل و جان سے ہماری خدمت پر مستعد دکھائی دیتا۔ ہم نے ان کے ساتھ ہندوستان کے مختلف حصوں کی سیر کی۔ لیکن شہروں کے قریب پہنچتے ہی ہم ہمیشہ ان میزبانوں کا ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ ہم جانتے تھے شہروں میں پولیس کے اڈے ہیں اور ان کے پاس ہمارے حلیے۔ پہلے ایک ریاست کو میری گرفتاری کی فکر تھی اب دو ریاستیں میری تلاش میں ہیں۔ اس لیے آزادی کی زندگی دیہاتوں میں تھی، پہاڑوں میں تھی —— شہزادی اور میں نے فرار کے وقت اتنا کچھ ساتھ رکھ لیا تھا کہ وہ ہماری عمر بھر کے لیے بہت کافی تھا۔

وہ رک کر کچھ سوچتا رہا۔ اس کی نظریں فضا میں نہ جانے کیا کیا دیکھتی رہیں۔ پھر اس نے لمبی سانس لے کر کہا "ہمالیہ کی وادی میں میری پہلی بار لمنو سے ملاقات ہوئی۔ لمنو اپنی ٹولی کا سردار تھا۔ چھ فٹ لمبا، گورا چٹا، خاصہ وجیہہ، سن بھی پچیس سے زائد نہ تھا۔ کالے کالے پٹوں پر اس کی چھوٹی گلابی پگڑی اور اس کے کانوں میں سونے کے موٹے گول چھلے بڑے اچھے لگتے تھے۔ مجھ سے ملاقات کے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور تھی مگر آنکھوں میں کجلائی ہوئی آگ بھی تھی۔ اس کا انداز بھی کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ وہ خلوص اور وہ تپاک جو عام طور پر میرے معاملے میں ہر ایک نے ظاہر کیا تھا اس کی بھی لمنو کے ہاں کمی محسوس ہوئی۔ وہ بے موقع ہنس پڑتا تھا اور باتیں کرتے کرتے دفعتاً چپ ہو جاتا تھا۔ اس

میں ایک اضطرار تھا۔ ایک بے چینی تھی۔ مجھے تعجب ہوا اور میں نے تنہائی ہوتے ہی شہزادی سے اس کا ذکر کیا۔ وہ مسکرائی اور اس نے بتایا کہ کسی زمانے میں ملنو سے اس کا رشتہ تھا۔ بس شادی ہونے والی ہی تھی کہ بیچ میں میں پھاندا اور شہزادی کی زندگی کچھ سے کچھ ہو گئی۔

میری محبت میں پہلی دفعہ رقابت کا جذبہ بھی شامل ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے ناگ پھنی کے انبار میں ڈال دیا۔ میں اس تکلیف سے بے چین ہو کر ٹہلنے لگا اور ٹہلتے ٹہلتے میرے قدم خود بخود تیز ہو گئے اور میں خیموں سے میلوں دور نکل گیا۔ میرے دماغ میں بس ایک چرخی سی چل رہی تھی۔ میری شہزادی اور ملنو۔ یعنی میرے ناموس پر دوسرا بھی نظرِ ہوس ڈال سکتا تھا۔ میں شہزادہ تھا۔ دسیوں پشتوں سے ہماری بیویاں محلوں میں رہتی تھیں۔ وہی جو فخریہ کہتی تھیں ع۔ برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب۔ اور آج ایک بنجارے کی یہ ہمت! مجھے یہ یاد نہ تھا کہ میں خود بھی اب بنجارہ ہوں۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ شہزادی بنجارن ہے جسے میرے ساتھ بھائی حضور بھی غوطہ لگاتے دیکھ چکے ہیں۔ میں یہ بھی فراموش کر گیا کہ میں نے واقعی شہزادی سے نکاح نہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی نہ رہی کہ ملنو سے اور اس سے صرف سگائی ہوئی تھی، معشوقہ اور محبوبہ تو بنی وہ میری ہی!

دل میں اٹھنے والے اس طوفان کے شور میں نہ تو مجھے اس کا خیال رہا کہ میں پہاڑ کے دامن میں گھوم رہا ہوں اور نہ اس کا دھیان رہا کہ شام قریب ہے، میں ایک چٹان پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر تو میں اپنے خیالات میں اتنا محو رہا کہ میں نے کسی طرف نظر ہی نہ ڈالی۔ دفعتاً کہیں دور پر ایک لکڑ بھگا چیخا، اس کی آواز پہاڑیوں سے ٹکرائی اور اس کی بازگشت سے ساری وادی گونج اٹھی۔ میں نے چونک کر چہار جانب نظر ڈالی سامنے بہت دور ہمالیہ کی برف سے ڈھکی چوٹی پر ڈھلتے آفتاب نے سنہری ملمع چڑھا دیا تھا اور بلند درختوں کے اونچے سبز سروں پر ایک زرتار گوٹ ٹانک دی تھی۔ نشیبوں کے لمبی گھاس والے میدان ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی نے انھیں بھالو کی کھال سے ڈھک دیا ہے۔ چٹان کے نیچے جو گہرا غار تھا وہاں روشنی کی جگہ دھندلکا تھا اور اس میں بہنے والے چشمہ کے پانی کو تاریکی نے کاہی بنا دیا تھا۔ ہوا مرطوب تھی اور ٹھنڈی، منظر دلفریب تھا اور فرحت بخش، لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ ڈر سا لگنے لگا جیسے ہر چٹان کے پیچھے کوئی دشمن بیٹھا ہے اور ہر تاریک گوشے میں کوئی حملہ آور ——— اور میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور میں نے اپنی جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کا گھوڑا چڑھا لیا۔ میری سانس کچھ تیز چلنے لگی اور میں چٹان سے جلدی جلدی اترنے لگا۔ میرے پاؤں ابھی زمین پر پہنچے نہ تھے کہ دفعتاً سن سے ایک تیر آیا اور میرے کوٹ کی آستین کو پھاڑتا ہوا پتھر سے جا ٹکرایا۔ میں نے اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ مجھے کوئی نہ دکھائی دیا۔ مگر سو گز کے فاصلے پر ایک جھاڑی اس طرح ہل رہی تھی جیسے کوئی اس میں چھپا ہے۔ میں نے بے سمجھے بوجھے اس کو نشانہ بنا کر دو فیر کر دیئے۔ جھاڑی کا ہلنا بند ہو گیا۔ میں تقریباً پانچ منٹ تک اپنی جگہ پر پڑا رہا۔ تاریکی سرعت سے بڑھتی جا رہی تھی۔ خیمہ تک راستہ میں نشیب و فراز تھے۔ دشمن سامنے آ کر مقابلہ نہ کرنا چاہتا تھا بلکہ کمین گاہ سے چھپ کر حملہ کرنا۔ میرے لیے ہر منٹ خطرہ بڑھتا جاتا تھا۔ اس لیے میں نے اسی طرح زمین پر لیٹے لیٹے جھاڑی کی طرف کھسکنا شروع کیا۔ ہر لمحہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب جھاڑی کے پیچھے سے کوئی نہ کوئی اٹھ کر مجھے دوسرے تیر کا نشانہ بنانے ہی والا ہے، پھر بھی جی یہی چاہتا تھا کہ حملہ آور کی ایک جھلک دیکھ لوں۔ اگر کسی کا نشانہ بننا ہی ہے تو میں بھی تو اس پر وار کر لوں ——— اسی لیے جھاڑی جب کوئی دس قدم رہ گئی تو میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹیں اور تیز دوڑ کر میں جھاڑی کو پھاند گیا۔ اس جانب کوئی بھی نہ تھا، ہاں اس سے آگے ایک ٹیلے پر ایک سیاہ سایہ سا بھاگتا محسوس ہوا اور میں نے پھر فاصلہ کا خیال کئے بغیر فیر کر دیا۔ اور اس کے تعاقب میں دوڑا۔ مجھے یقین تھا کہ حملہ آور بھاگ رہا ہے، اسے اس کا موقع نہ ملنا چاہیئے کہ وہ اپنے حواس درست کر کے پھر کوئی کمین گاہ ڈھونڈ سکے۔ اسی لئے

میں بھی تیزی سے ٹیلے پر چڑھ گیا مگر ٹیلے کے دوسری جانب پھر کوئی نہ دکھائی دیا۔ راستے میں اب بھی کئی چھوٹی بڑی چٹانیں تھیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کے پیچھے چھپ کر دم لے سکتا تھا۔ اس لیے میں نے قریب ترین چٹان کی طرف رُخ کر کے پھر فیر کر دیا اور ٹیلے سے اتر کر اس طرف بڑھا — جلدی اور تاریکی میں چھوٹا پاؤں پڑا اور میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ چوٹ زیادہ نہ آئی۔ لیکن دم پھول گیا اور میں کئی منٹ تک پڑا پڑا اپنی سانس قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا اور میں نے سُنا، کوئی مجھے پکار رہا ہے "شہزادے! شہزادے!" اور ساتھ ہی تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

میں چیخا "یہاں! یہاں!" اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک منٹ کے بعد شہزادی اپنے مشکی پر سوار وہاں آ پہنچی۔ اس نے پوچھا "کیا ہوا؟ کس پہ فیر کیا؟" میں نے کہا "گھر چلو، پھر بتاؤں گا!" اور ہم دونوں ایک ہی گھوڑے کی پیٹھ پہ خیمہ تک آئے۔ راستے میں میں نے شہزادی کے اصرار پر اسے سارا واقعہ سُنا دیا۔ وہ بالکل خاموش رہی۔ مگر جب میں گھوڑے سے اترا تو وہ اسی طرح اس پر بیٹھی رہی۔ میں نے سمجھا وہ گھوڑوں کے لیے گھاس اور دانے کا انتظام کر کے آئے گی۔ میں خیمے میں چلا آیا۔ مجھے تھکن محسوس ہوئی جیسے میں بڑی منزل مار کر آ رہا ہوں، جیسے میں کئی راتوں سے نہیں سویا ہوں۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلے اور تھوڑی دیر کے لیے اسی طرح سفری پلنگ پر لیٹ گیا۔ لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دماغ اسی ادھیڑبن میں لگا تھا کہ یہ کس نے تیر مارا۔ اس جنگل میں آبادیوں سے دور کون دشمن پیدا ہو گیا۔ کیا بھائی حضور کے جاسوس ہیں یا میری سسرال کے آدمی یہاں پہنچ گئے؟ مگر انھیں میری گرفتاری کی فکر ہوتی نہ کہ قتل کی ——

میں اسی طرح اُلجھ رہا تھا کہ دفعتاً خیموں میں ایک شور سا ہوا جیسے بہت سے لوگ جوش میں باتیں کر رہے ہیں۔ کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔

سارے خیموں کی لالٹینیں ایک دائرے میں بانس گاڑ گاڑ کر لٹکا دی گئیں تھیں۔ لکڑی کے ایک بڑے ڈھیر کا الاؤ سلگ رہا تھا اور سارے بنجارے اس روشن مقام پہ جمع ہو رہے تھے۔ بیچ میں کچھ بوڑھے مُکھ کے ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شہزادی بپھری کھڑی تھی۔ وہ مُکھ کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں ادھر لپکا۔ میں نے سنا۔

"ہاں میں نے اس کی جگہ شہزادے سے شادی کی!" میں اپنا ذکر سنتے ہی ایک درخت کے تنے سے جہاں اندھیرا تھا لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہزادی آج اپنے پنچوں کے سامنے کوئی مقدمہ پیش کر رہی ہے۔ میں بھی چاہتا تھا کہ دیکھوں شہزادی کو اس قوم والے کیا سمجھتے ہیں۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ وہ غصہ سے ہونٹ چبا رہی تھی۔ اس کی بوٹی بوٹی میں ایک بجلی سی کوند رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صاعقہ بن کر کسی نہ کسی پر گرے گی۔ اور اسے خاکستر بنا دے گی۔ وہ کہہ رہی تھی "آپ ہی سے انصاف چاہتی ہوں، اس کا اور شہزادہ کا کوئی مقابلہ ہے؟ صورت میں، شکل میں، ذات میں، بھانت میں، عزت میں، ہنر میں، علم میں، یہ کس چیز میں ان کی برابری کر سکتا ہے؟"

مجمع میں سے ایک بولا "ہم خود شہزادے ہیں، ہزاروں برس ہم نے بادشاہت کی ہے!"

شہزادی پلٹ پڑی "ضرور، مگر آج تو ہم اچکے ہیں، چور ہیں، بدمعاش ہیں، شہروں میں جاتے ہیں تو پولیس ہماری نگرانی کرتی ہے۔ نہ ہمارے مکان ہیں، نہ ایک بالشت زمین، ہم چیتھڑے لگائے پھرتے ہیں اور غریب سے غریب آدمی بھی اپنے کو ہم سے اچھا سمجھتا ہے!"

ایک نوجوان خفا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا "اگر کوئی ہمیں ذلیل سمجھتا ہے تو وہ خود ذلیل ہے۔ ہم جنگلوں کے بادشاہ ہیں، ہم کسی کا دیا نہیں کھاتے، ہم اپنا قانون خود بناتے ہیں ——"

ایک بوڑھے نے کھڑے ہو کر ڈانٹا "تم بیٹھ جاؤ مستو! شہزادی نے ہمارے سامنے مقدمہ دائر کیا ہے۔ وہ کہتی ہے منو نے آج ہمارے مہمان شہزادے پر تیر چلایا۔ وہ اسے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ ہمیں سوچنا ہے کہ ہم کیا فیصلہ دیں گے ——!"

منو کھڑا ہو گیا۔ سب خاموش ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ نصف منٹ تک گردن جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر مجمع پر نظر ڈالی۔ اور بولا:۔

"شہزادی کا الزام صحیح ہے۔ میں نے تیر مارا، اور مجھے بڑا تعجب ہے کہ وہ کیونکر بچ گیا۔ تم جانتے ہو میرا نشانہ کبھی نہیں چوکتا —— خیر! —— میں تم لوگوں کا سردار ہوں۔ میں تمہارے فیصلے سے پہلے اپنا فیصلہ سنانا چاہتا ہوں —— میں شہزادی کے چہیتے سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ تلوار سے، تیر سے، چاقو سے —— جو ہتھیار اس کو پسند ہو اس سے!"

مجمع میں ایک لہر سی دوڑ گئی، ایک شور سا ہوا "ہم سب کو منظور! منظور! منظور!"

شہزادی جھپٹ کر سامنے آ گئی "مجھے ہرگز منظور نہیں —— وہ شہزادہ ہے، نہ وہ پستول، بندوق چلانا جانتا ہے۔ وہ چاقو اور تیر کیا جانے! منو سے مقابلہ میں کروں گی! میں!"

"چھپا لو شہزادے کو اپنے گھاگرے میں!" ایک نوجوان نے طعن کیا۔

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں لپک کر مجمع کو چیرتا الاؤ کے پاس پہنچ گیا۔ ہر ایک مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں ساری تعلیم، سارا فلسفہ، ساری تہذیب، ساری ثقافت بالکل بھول گیا۔ میں اس وقت بالکل وحشی تھا۔ میں نے کہا:۔

"بھائیو! منو نے مجھ پر چھپ کر حملہ کیا، میں بچ گیا۔ میں اس کا کوئی قصاص نہیں چاہتا۔ میں نے اسے معاف کر دیا ——"

اور تو چپ رہے مگر ایک بوڑھا بول اٹھا "بھئی بڑے کی بڑی بات!" میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ میں نے کہا "مگر منو نے ابھی مجھ سے مقابلہ کی خواہش ظاہر کی ہے، میں اسے قبول کرتا ہوں۔ چھرے سے، تلوار سے یا پستول سے، ان میں سے جس حربے میں وہ اپنے کو ماہر سمجھتا ہو، میں مقابلے کے لیے تیار ہوں!"

شہزادی چیخی "نہیں! نہیں!"

میں نے اسے ڈانٹا "تم چپ رہو، عورتوں کے مجمع میں جا کر بیٹھو!"

جب وہ گردن جھکائے عورتوں کے مجمع کی طرف چلی تو میں نے منو سے پلٹ کر کہا "بتاؤ کس حربے سے لڑو گے؟"

منو نے مسکرا کر کہا "چاقو!" اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اس نے ایک سگریٹ جلا لی۔ شہزادی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ ایک بوڑھے نے اٹھ کر کہا "نہیں! نہیں! شہزادہ چاقو سے لڑنا کیا جانے؟"

ایک نوجوان غرا کے بولا۔ "شہزادی بنجارن ہے، وہ اسے جیتنا چاہتا ہے تو ہمارے ہی حربوں سے لڑنا پڑے گا!"

"نہیں، نہیں" اور "ہاں، ہاں" کا شور اٹھا۔ میں جانتا تھا کہ منو اس فن کا ماہر ہے۔ سارے مجمع کا انداز بتاتا تھا کہ اسے منو کی جیت اور میری ہار کا یقین ہے۔ مگر مجھے مطلقاً خوف نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مجھے بچپن میں ہر حربے کا استعمال سکھایا گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں مجھے کھیل کود، جنگ و جدل سے زیادہ مطالعہ اور کتب بینی کا شوق تھا۔ میں نے سوائے پستول کے کسی دوسرے حربے کے استعمال میں مہارت نہیں حاصل کی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ جیتوں گا میں ہی۔ منو منہ کے ایک گوشے میں سگریٹ

دبائے مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس کی پیشانی پر پسینہ جھلک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی زردی دوڑ گئی تھی اور اس کے نتھنے پھیلنے سمٹنے لگتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ غالباً اس کی یہ گھبراہٹ ہی میری خود اعتمادی کو مضبوط و مستحکم بنا رہی تھی۔

میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر منو کے طرفدار نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:۔

"میرے دوست نے جو کچھ کہا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے شہزادی کے لیے اسی حربے سے لڑنا پڑے گا جو آپ کا قومی حربہ ہے۔" معاً خیال آیا کہ منو کی گھبراہٹ میں کیوں نہ اضافہ کر دیا جائے۔ جیب میں پڑے ہوئے پستول کو میری انگلیاں بار بار چھو رہی تھیں۔ خود بینی نے بھی مجھے اپنی مہارت کی نمائش کی طرف اکسایا۔ میں نے جیب سے پستول نکال لیا اور منو کی طرف مڑ کر کہا "میری پسند کا حربہ تو یہ ہے۔" اور ساتھ ہی ایک فیر کر دیا۔ منو کے منہ میں لٹکی ہوئی سگریٹ آدھی کٹ کر اڑ گئی اور پورا مجمع چیخ اٹھا "ارے مار ڈالا" منو لڑکھڑا کر گرنے لگا۔ میں نے مسکرا کر کہا "ڈرو نہیں منو، میں نے سگریٹ کو نشانہ بنایا تھا، تمہیں نہیں۔" وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی سگریٹ لبوں سے نکال کر دیکھی۔ پھر اسے زمین پر پھینک دیا اور اس کا داہنا ہاتھ تیزی سے کمر تک گیا اور اس نے وہیں سے چاقو نکال کر میری طرف پھینکا۔ میں اپنی حرکت کے ردِ عمل کے لیے تیار تھا۔ میں نے جلدی سے پینترا بدلا مگر میرے قریب ہی بغل سے ایک دوسرا چاقو سن سے گزرا۔ ہوا میں دونوں چاقو ٹکرائے اور دونوں زمین پر گر گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو شہزادی کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے منو کو غصے سے ہانپتی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ وہ دانت پیس کر بولی "شہزادے کے منہ میں کہاں سگریٹ تھی کہ تم نے نشانہ لگایا تھا منو؟"

مجمع کو ان جلد جلد ہونے والے واقعات کی سرعت نے بولنے کا موقع نہ دیا تھا۔ اب شہزادی کے سوال پر پھر ایک شور سا اٹھا۔ "شہزادے نے بھی اس پر فیر کیا تھا"— "شہزادے نے اس پر نہیں سگریٹ پر فیر کیا تھا"— "جھوٹ ہے"— "سچ ہے"۔ میں نے خاموشی کیلئے پھر ہاتھ اٹھایا۔ وہ چپ ہوئے تو میں نے پہلے شہزادی کو ڈانٹا "ایسے موقعوں پر مردوں کے بیچ میں عورتوں کا دخل دینا میں اچھا نہیں سمجھتا۔ تم بیٹھ جاؤ۔" اس کا منہ تمتما اٹھا۔ مگر وہ بیٹھ گئی۔ میں نے مجمع سے کہا "آپ لوگوں کو میرے نشانے پر شک ہے اچھا تو میرے خیمے سے تین موم بتیاں لے آئیے"— ایک ان میں سے دوڑ کر تین موم بتیاں لے آیا۔ میں نے منو کو اس جگہ سے ہٹوا کر ایک تپائی رکھوا دی۔ اور تینوں موم بتیاں جلوا دیں۔ پھر ہر ایک کو اس جانب سے ہٹا کر میں نے اپنے مقام سے کھڑے کھڑے تین متواتر فیر کیے۔ جب تینوں موم بتیاں بجھ گئیں تو میں نے کہا "اب تینوں کو دیکھئے، کوئی بتی کٹی یا ٹوٹی تو نہیں" شہزادی سب سے پہلے لپکی ہوئی دوڑی۔ اس نے تینوں بتیاں اٹھا کر دکھائیں۔ سوائے فتیلے کے کوئی حصہ نہ کٹا نہ ٹوٹا تھا۔ مجمع واہ واہ کرنے لگا۔

میں نے کہا "آؤ منو، اب ہمارا تمہارا بنجاروں کے حربے میں مقابلہ ہو جائے۔" اور میں نے کوٹ اتار ڈالا۔ قمیض اتار ڈالی، صرف شلوار پہنے رہا۔ منو نے اپنا کرتہ اتارا، تہمد کھول کر پھینک دی۔ وہ پہلے ہی سے چست جانگھیا پہنے تیار تھا۔ دو بوڑھوں نے اپنی اپنی کمر سے دو چھرے نکالے۔ ان کے وزن اور قدوں کا مقابلہ کیا۔ دونوں یکساں تھے۔ ایک چاقو انھوں نے مجھے دے دیا اور ایک منو کو۔ مرد ہمارے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ عورتیں اور بچے پیچھے کر دیئے گئے۔ چست جانگھیے میں منو مردانہ حسن کا نمونہ تھا۔ اس کے ہاں تناسبِ اعضا بلا کا تھا اور چھرے کی گرفت یہ بتاتی تھی کہ وہ اس کے استعمال میں قدرتِ کاملہ رکھتا ہے۔ سچ عرض کرتا ہوں، میرے دل میں پہلی دفعہ ڈر پیدا ہو گیا۔ میں چھرے کے استعمال سے یوں بھی کم ہی واقف تھا، پھر مشق چھوٹی ہوئی تھی۔ بس اتنی امید تھی کہ میں "جوجسٹو" سے واقف ہوں، مجھے کوئی آسانی سے زخمی نہیں کر سکتا۔ اس وقت منو کا کسرتی پھرتیلا جسم دیکھ کر مجھے اس مقابلہ کے نتیجہ کی طرف سے کھٹکا پیدا ہو گیا۔ ممکن تھا

کہ یہ جذبہ بڑھتا مگر مُنّو نے بڑھ کر وار کر دیا اور میں نے پینترا بدل کر اسے خالی دیا۔ وہ لڑکھڑا کر سنبھلا اور ہم دونوں وار کرنے اور بچنے کے لیے پینترا بدلنے لگے۔ میں نے چند ہی منٹ میں محسوس کیا کہ مُنّو جس پھرتی سے وار کرتا ہے یا جھکائی دیتا ہے وہ میرے ہاں مفقود ہے۔ اگر آنکھ جھپک گئی تو چھُرا سینے کے پار ہو گا۔ معاً مجھے استاد کا قول بھی یاد آ گیا "دست بدست لڑائی میں دشمن کے جسم کی حرکت نہ دیکھو، صرف آنکھوں کو دیکھتے رہو، وہیں سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس کا کیا قصد ہے۔" اسی لیے میں مُنّو کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے تھا اور اس کے ہر وار کو روکنے یا خالی دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ مجھے خود وار کرنے کا اب تک موقع ہی نہ ملا تھا۔ ایک امر البتہ میرے لیے باعثِ مسرت تھا کہ میرا جسم خشک تھا، میری سانس نہ پھولی تھی اور مُنّو پسینے میں نہا گیا تھا اور وہ تھکے ہوئے بھینسے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ غالباً مُنّو نے بھی اس فرق کو محسوس کیا۔ اس لیے کہ وہ وار کرتے کرتے ایک دم پیچھے ہٹا اور بجائے اس کے کہ وہ پینترا بدل کر میرے وار سے بچے اس نے اچھل کر پوری قوت سے میرے سینے پر لات ماری۔ میرے ہاتھ سے چھُرا چھوٹ گیا اور میں زمین پر چت گر پڑا۔ وہ اچھل کر میرے سینے پر سوار ہو گیا اور اس نے بھرپور ہاتھ مارنے کے لیے چھُرا تانا۔ میں اتنی دیر سے اسی موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح اس کا جسم میرے جسم سے مس ہو جائے اور میرا ہاتھ اس کی کلائی تک پہنچ جائے۔ مُنّو نے وہ موقع مجھے اپنی حماقت سے دے دیا۔ اس کا چھُرا میرے سینے میں پیوست ہونے کے لیے حملہ آور سانپ کی طرح تیزی کے ساتھ چلا۔ میں نے بایاں ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پر ٹھنکی دی۔ چھُرا ٹھن سے جا کر دور گرا اور میں جوجسٹو کا پیچ کر کے مُنّو کی پیٹھ پر تھا اور اس کی دونوں کلائیاں میرے ایک ہاتھ میں تھیں۔

جی تو چاہتا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں توڑ کر میں مُنّو کو ہمیشہ کے لیے لُولا کر دوں مگر میں نے غصّہ کو ضبط کیا۔ جاہل تھا، وحشی تھا، میری فتح اس کو ذلیل کرنے میں ہی تھی۔ میں نے اسی لیے وہیں سے بیٹھے بیٹھے بوڑھوں سے کہا "اس مُنّو نے مجھے دوبارہ مار ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ آخری حملہ بھی اسی نیت سے تھا۔ میں بدلہ لے سکتا ہوں۔ اک ذرا سی حرکت میں اس کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن میں اپنے کو اسی کی سطح پر نہیں لانا چاہتا۔ میں اس کی پھر جان بخشی کرتا ہوں۔"

میں نے اٹھ کر قمیص پہنی، کوٹ کندھے پر ڈالا۔ مُنّو کو اس کے دو ساتھیوں نے سنبھال کر اٹھایا۔ وہ اس کا منہ دھلا کر پانی پلانے کے لیے ایک طرف لے گئے۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور مجمع پر نظر ڈال کر کہا "میں نے بنجارہ بننے کی کوشش کی، آپ لوگوں نے بننے نہ دیا۔ شہزادی یقیناً آپ کی ہے وہ میری نہیں ہو سکتی۔ ایک بار وہ مجھے چھوڑ کر چلی آئی تھی، آج میں اسے چھوڑ کر جاتا ہوں۔" ——

شہزادی چیخ کر دوڑی۔ میں نے اسے ڈانٹا "تم محض نام کی شہزادی ہو، تم ان بنجاروں کی کفو ہو، میری نہیں! میں نے اپنے کو بہت گرایا۔ اب اس سے زیادہ نیچے نہیں گر سکتا۔"

اور میں نے جلدی جلدی اپنے نقرہ پر زین کسی اور اس پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ شہزادی خوشامدیں کرتی رہی، بنجارے بنجارنیں روکتی رہیں مگر میں نے ایک نہ سُنی۔ شاید کئی پشتوں کی روحیں اپنے غرور، تمکنت، جلال و جبروت کے ساتھ میرے دل و دماغ پر اس وقت مسلط تھیں۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ میں حد درجہ رُسوا ہوا۔ میری بے انتہا ذلت کی گئی۔ مجھے اس وقت شہزادی سے نفرت تھی، اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے سے نفرت تھی اور اس پوری زندگی سے نفرت تھی۔ جو میں نے اس کے عشق میں کاٹی تھی۔ اور میری دماغی حالت ایسی تھی کہ اگر کوئی اس وقت میرا تعاقب کرتا تو شاید میں اسے مار ڈالتا۔

میں رات دن سات روز سفر کرتا رہا۔ بس کچھ گھنٹوں کے لیے کسی چشمے، کسی دریا یا کسی کنوئیں کے کنارے یا کسی ہرے بھرے میدان میں سو رہتا۔ میں نے اس دوران میں کیا کھایا، مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ دو ایک دن تو جنگلی میووں پر بسر ہوئی۔ ایک دن پستول سے ایک تیتر شکار کیا تھا اسے آگ پر بھون کر بغیر نمک کے کھایا۔ ایک دن ایک مچھلی چشمے میں پانی پیتے وقت بہت آسانی سے ہاتھ آگئی، وہ بھوبل میں بھون کر کھائی۔ ایک دن ایک دیہاتی مسجد میں شب بسر کی، وہاں نمازیوں نے اپنے گھروں سے لا کر کچھ کھلایا پلایا تھا۔ مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ میں نے اتنی مدت تک شکم سیر ہو کر کبھی نہ کھایا اور نہ میں نیند بھر سویا ——

آٹھویں دن میں ریاست کے حدود میں داخل ہوا اور اسی شام کو اپنے محل میں —— میں نے حمام کیا، کپڑے بدلے اور بھائی حضور کے سلام کو حاضر ہوا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کچھ فرمائیں، میں نے دست بستہ عرض کی "میرا جنون دور ہو گیا —— میں سزا کے لیے حاضر ہوں۔"

ان کی غصہ بھری نگاہیں محبت بھری نگاہوں میں بدل گئیں اور انھوں نے مجھے سینہ سے لگا لیا اور مجھے ساتھ لیے ہوئے اندر آئے۔ وہاں بھابھی صاحبہ سے بھی میں نے معافی مانگی اور سرکارِ عالیہ سے بھی۔"

اس نے رک کر پھر میری سگریٹ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں نے جلدی سے ڈبیا بڑھا دی۔ اس نے حسبِ معمول ایک سگریٹ جلا کر چند لمبے لمبے کش لیے اور ٹرامل کر زمین پر پھینک دیا۔ پھر وہ بولا :۔

"میں نے تقریباً ایک سال اپنی پچھلی زندگی بسر کی۔ اب کے معمولات میں دو فرق ہوئے۔ ایک تو یہ کہ زہرہ کی جگہ اس دلہن نے لے لی تھی جو دو برس سے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کا حسن یقینی چاند کو شرماتا تھا لیکن اس کی محبت چاندنی کی طرح ہلکی اور ٹھنڈی بھی تھی۔ اس شہزادی جیسی گرمی نہ تھی، نہ تڑپ تھی نہ مدہوشی، اسی لیے پھر وہی شراب نوشی شروع ہو گئی تھی۔ سرخوشی اور بےخودی کے لیے کچھ تو بہانہ چاہیئے تھا۔ دوسری بات جو اس شراب کی بالکل ضد تھی اس کی بھی میں نے عادت ڈال لی تھی۔ یعنی میں نے روزانہ تھوڑی سی ورزش کرنا اپنے اوپر فرض کی طرح عائد کر لیا تھا اس سے فارغ ہوتے ہی میں تقریباً ایک گھنٹہ چاقو کی لڑائی میں صرف کرتا تھا۔ میں نے ریاست کے سب سے بڑے بانک اور بنوٹ جاننے والے کو ملازم رکھ لیا تھا اور اس کی زیرِ ہدایت قدیم ہندوستانی حربوں کے استعمال میں مہارت حاصل کر لینا طے کر لیا تھا۔ اس ورزش سے میری صحت بھی درست رہی اور مجھ پر مے نوشی کا زیادہ برا اثر نہ پڑا۔ غرض زندگی ایک ڈھرے پر لگ گئی تھی اور ظاہر بین نظریں اس کا یقین کرنے لگی تھیں کہ میں شہزادی کو بھول چکا ہوں اور اس بے کیف ہموار طرزِ حیات کا عادی ہو چلا ہوں کہ دفعتاً ایک شب میں جب میں گیارہ بجے قلعۂ معلیٰ سے اپنے محل واپس آ رہا تھا۔ ایک شخص میری موٹر کی روشنی میں دونوں ہاتھ پھیلائے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور نے موٹر روک کر پوچھا "کون —— ؟"

وہ بولا "منو!"

میں نے اندر کی روشنی جلا کر جب دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ منو کے دونوں ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہیں اور اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی ہے ——

میں نے گھبرا کر پوچھا "کیا بات ہے منو! کیسے آئے ؟"

وہ ہانپتا ہوا بولا "سرکار، شہزادی یہاں سے بیس میل پر مر رہی ہے۔ اس نے بلایا ہے!"

میں نے منو کو اندر کھینچ لیا اور ڈرائیور سے کہا "موٹر پھاٹک تک لے چلو"

وہاں پہنچتے ہی میں نے سنتری سے اس کی بندوق اور کارتوس کی پیٹی لی اور ڈرائیور کو موٹر ہانکنے کا حکم دیا۔

جب ہم شہر کے حدود سے باہر نکل گئے تو میں نے منو سے پوچھا:۔

"کیا بیمار تھی شہزادی؟"

وہ عجیب طرح ہنسا "بیماری ——— ؟ بیماری، آپ کی محبت ———!" پھر وہ رُک کر بولا "اسے کل بھیڑیے نے کاٹ لیا ہے۔ وہ مر رہی ہے!"

میں نے جھلا کر منو کو گھورا۔ اس پاجی کے لیے شہزادی کی موت ہنسی کی بات ہے۔

پھر میں نے ڈرائیور سے کہا:۔

"اور تیز چلاؤ!"

ہم کچی سڑکوں اور کھیتوں سے ہوتے ہوئے نصف گھنٹہ میں وہاں پہنچ گئے جہاں شہزادی پڑی تھی۔ اس کے جسم پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی، صرف اس کا چہرہ کھلا تھا۔ اس کے چہرے کو جس کی خوبصورتی کا مقابلہ وہ تصویریں بھی نہیں کر سکتی تھیں جو فنکار کے دلوں کو جمالیات کا سرچشمہ بناتی ہیں، اس وقت بھیڑیے کے پنجوں نے بھیانک بنا دیا تھا۔ ایک آنکھ پھوٹ گئی تھی۔ ایک گال اس طرح کھا لیا تھا کہ جبڑے کی ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں۔ نیچے کا ہونٹ تقریباً ندارد تھا۔ گردن کے پاس کا گوشت بچا ہوا تھا اور جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو مجروح نہ ہو۔ نہ جانے کیونکر وہ اب تک زندہ تھی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ ڈوبی پڑی رہتی پھر بھی جب آنکھ کھولتی تو "شہزادہ! شہزادہ!" کی رٹ لگاتی۔

میں نے کیونکر اپنے کو پتھر کا بنا کر اس تک پہنچایا۔ اس سے باتیں کیں، مجھے معلوم نہیں۔ میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ بس اتنا ضرور محسوس ہوتا تھا کہ لگاتار کوئی میرے جسم میں چھرے مارتا چلا جا رہا ہے۔ میرا گوشت کھرچ کھرچ کر کاٹ رہا ہے اور میں بار بار کانپتا، بار بار مٹھیاں کس لیتا، بار بار دانت بھینچ لیتا اور شہزادی پر جھکا ہوا اس کی دکھ بھری کہانی سنتا۔ وہ رُک رُک کر کہہ رہی تھی:۔

"تم آ گئے شہزادے! میں نے تمہیں دیکھ لیا! میں تمہیں ہر دوسرے تیسرے روز محل کی جھاڑی کے پیچھے آدھی آدھی رات تک دیکھنے کے لیے بیٹھی رہتی تھی۔ تم بھول سکتے تھے شہزادی کو! وہ اپنے شہزادے کو نہیں بھول سکتی تھی! کل میں جاوید کو بھی لے جا رہی تھی۔ وہ "ڈیڈی! ڈیڈی!" کی بہت دنوں سے رٹ لگائے تھا۔ میں نے کہا، اس کا منہ دھلا دوں، اچھے کپڑے پہنا دوں، تب لے چلوں۔ اسی لیے پاس والے جنگل میں چشمے پر لے گئی۔ بھیڑیا نہ جانے کہاں چھپا بیٹھا تھا جھاڑی میں۔ اس نے جاوید کو منہ میں دبا کر بھاگنا چاہا! میں لپٹ گئی، اس نے مجھ کو خوب خوب کاٹا، منو آ گیا اور اس نے مجھے بچا لیا مگر میرا ——— میرا جاوید!"

وہ ایک بار چیخی "ہائے میرا لال! کہاں ہے میرا چاند؟" اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ ایک بوڑھی بنجارن نے خون سے رنگین ایک تھیلا بڑھا دیا ——— مجھے چکر سا آ گیا اور میں وہیں بے جان ہو کر گر پڑا۔"

اس نے پھر ایک سگریٹ پی اور مسلی۔ وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھا جھوما کیا۔ پھر وہ بولا:۔

"میں اسی دن سے ان دونوں کی قبر کی مجاوری کرتا ہوں اور پانچ پیسے روزانہ روشنی اور ہار پر صرف کرتا ہوں۔ پانچ پیسے سے زیادہ نہیں! لائیے بابو جی آپ کے پاؤں دبا دوں!"

اور اس نے اپنے سوکھے ہاتھ میری پنڈلیوں پر رکھ کر انہیں دبایا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے برف کی قاشیں زور زور سے

میری پنڈلیوں میں مُلی جانے لگیں اور میں چیخ کر جاگا اور میں نے بے ساختہ اپنی ٹانگیں زور سے جھٹک دیں۔ ایک سانپ پلنگ سے ملی ہوئی کھڑکی پر گرا اور تیزی سے نیچے اُتر کر کھیت میں بھاگنے لگا۔ میں نے جھپٹ کر بندوق اٹھائی اور دو فیر کیے مگر وہ ایکھ کے پتوں میں غائب ہو گیا۔

بنگلے کا چوکیدار دوڑا ہوا آیا "کیا ہوا بابو جی! کیا ہوا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں جی، سانپ تھا!"

وہ بولا "ارے صاحب وہی ناگ بابا ہوں گے جو اس کمرے میں رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں یہاں کسی کی قبر تھی۔ انھیں نے سانپ کا روپ دھارن کیا ہے!"

وہ توہمات کی ایک پوری داستان سنانے کو تیار تھا، مگر میں حیات و موت، خیال و خواب کے سلسلۂ لامتناہی پر غور کرنے لگا اور میری زبان پر شاد کا یہ شعر آ ہی گیا ؎

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

صنم تراش کا خواب

ل۔ احمد

کون نہ کہے گا کہ قدیم یونانیوں کی نزاکت ذہنی اور علوئے خیال ان کی اصنام پرستی کا نتیجہ تھی! یونان قدیم کے ذہن و ذکا کا بہترین ثبوت اور نمائش ان کی دیومالا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کا ایک ایک کردار یونانی فکر و فراست کی زرخیزی پر دلیل ہے۔ دیومالا کے علاوہ ان کا ادب بھی ایسی کہانیوں سے مالامال ہے جو زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو روشن کرتی اور ایک فلسفیانہ نتیجہ نکالتی ہیں۔ یہ کہانیاں بجائے خود ایک دیومالا بن گئی ہیں۔ دیومالا کا ضمیمہ تو مانی ہی جائیں گی؛ ان میں سے بعض کہانیوں کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور ان میں سے ایک صنم ساز کی کہانی بھی ہے۔ جس کو اپنے ہی بنائے ہوئے بت سے عشق ہو گیا تھا۔ اور جس کی محبت یا قوت خیال نے اس مرمریں پیکر میں جان ڈال دی تھی۔

مغربی ملکوں کے ادب میں جتنا لوچ اور تنوع پایا جاتا ہے۔ یونانی ادب ہی کا فیض ہے۔ میرے خیال میں یہ حکایت ایک نازک استعارۂ طویل ہے۔ اور کوئی صاحب ذوق اس سے خاص اثر لیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ حکایت جس پیرائے سے پیش کی جا رہی ہے، شاید اس میں کوئی ندرت نظر آئے!

پگمیلیان ایک صنم تراش تھا اور بہت دن سے ایک ایسی مورت گھڑ لینے کی آرزو کر رہا تھا جو اس کی تمام پہلی مورتیوں سے بہت عالی و اشرف ہو۔ چنانچہ اس نے ایک پیکر مکمل کر لیا۔ اور آخری چھیل چھال کر کے جب ہاتھ سے چھینی ہتھوڑی رکھی تو قدرتی طور پر ایک جائزے کی نظر ڈالی۔ ایک دفعہ اوپر سے نیچے تک نظر گئی تو وہ بے اختیار مسکرایا۔ ایک بچہ پہلی دفعہ پوری دنیا کو پا کر جتنا خوش ہو سکتا ہے۔ پگمیلیان کی یہ مسکراہٹ شاید ویسی ہی اضطراری مسرت کا نتیجہ تھی۔

بلاشبہ وہ ایک بڑی سندر اور سروپ مورتی تھی۔ ایسی مکمل کہ اس سے بہتر تصور نہیں کی جا سکتی تھی؛ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں بت تراش دیوی دیوتا کی مورتی بنا کر پہلے خود پوجا کیا کرتے تھے۔ پگمیلیان بھی اپنے بنائے ہوئے اس اصنامی پیکر کے سامنے سارے احترام و پرستش کے گہرے جذبات پیش کر سکتا۔ اور اس کے سامنے ماتھا ٹیک سکتا تھا!

پگملیان کے مکان کا وہ کمرہ جہاں وہ کام کرتا تھا۔ ایک ایسا صنم کدہ تھا جہاں پتھر کی انگھڑ چوکیوں پر، فرش پر، الماریوں اور طاقوں میں ہر طرف اور ہر جگہ، مرمر کی مخلوق آباد تھی۔ کسی کا انداز غصہ و غضب کا تھا تو کسی کا شان و رعنائی کا۔ کسی کا خرمی و شادمانی کا تھا تو کسی کا رنج و فکر کا، کوئی مست عیش و مسرت تھا تو کوئی گیان و دھیان میں ڈوبا ہوا تھا۔ غرض ہنرمند صناع کی جوانی پتھر کے اندر جتنے خواب دیکھ سکتی تھی یہ صنمستان ان خوابوں سے معمور تھا! اس کا یہ نگارخانہ پتھر کی ایک کان تھی جو زندہ تھی۔ زندگی سے معمور تھی! شاید اس کا جذبہ خلاقی — صحیح تو مادرانہ ہے — اس بات کا ذمہ دار ہو کہ وہ کسی اور کو اس کمرے میں داخل نہ ہونے دیتا تھا۔ کوئی اگر اس پیکرستان کو دیکھ پاتا تو وہ یا تو پرستش کرنے لگتا یا نکتہ چینی! اور پگملیان یہ دونوں باتیں برداشت نہ کر سکتا تھا! اس کمرے کے اندر تو اس کی روح برہنہ پڑی تھی!

گھڑے ہوئے اور انگھڑ سفید پتھر کے ڈول اور سلیں۔ کوئی چھوٹی کوئی بڑی۔ کوئی طیاری کے قریب اور کسی کا بس ڈول نکلا ہوا۔ ہر طرف بکھری ہوئی تھیں یا کہیے کہ مبہم اور بے ربط خیالات کا ہجوم تھا۔ ایک سل میں لیٹی ہوئی عورت، پہلو اور کولھے کا صرف خم ہی گھڑا گیا تھا۔ دوسری میں صرف سینے کا ابھار ہی نکل پایا تھا۔ خود پگملیان اگر دیو کی طاقت ور گرفت میں پھنس جاتا اور اس وقت اس کی پیشانی پر شکنیں پڑتیں، ایک مجسمے کی پیشانی پر ویسی ہی شکنیں نمودار تھیں۔ ایک سل پر ابھی صرف گہری دراڑ ہی پڑی تھی۔ جس سے خیال ہوتا تھا کہ پگملیان نے اس پتھر کے اندر زندگی کا انداز پیدا کر دینے کے لیے زور کے ہتھوڑے چلائے ہیں۔ مختصر یہ کہ چھینی ہتھوڑی کے پہلے دن کے کام سے لے کر مکمل مورت بننے تک، ہر درجے کے نمونے موجود تھے۔ اور پگملیان کے تصور و احساس کی جفاکشی کا مجسم اظہار معلوم ہوتے تھے!

ایک ہی کل کی سنتان، ایک ہی خاندان کی نسلیں، یہ تمام مجسمے، یہ اصنامی مخلوق، ایک ہی جذبے اور شوق کے رشتے میں بندھی تھی۔ اور ان کے اندر اچھوتی گلاٹیا کا مجسمہ بے مثال تھا! گلاٹیا کے ایک ہاتھ میں آئینہ ہے اور اس کا پھول کی کلی سا چہرہ اس آئینے پر جھکا ہوا ہے۔ وہ اپنی "بگڑی ادا" کی "لاکھ بناوٹوں" کو دیکھنے میں کھو گئی ہے۔ پگملیان کی چابک دستی نے شاید گلاٹیا کو سائکی کی تخیلی نزاکتوں کا حال سنا دیا تھا! گلاٹیا کے نازک و سبک پاؤں، پاؤں جو فرشتوں کے پر محسوس ہوتے تھے۔ اس کی باہوں کا گداز ایک دعوت تھی کہ ان کے پھندے میں پڑ کر جان دے دینا ہی معراج زیست ہے!

یقین و مسرت کی آخری نظر ڈال کر مسکراہٹ ضبط نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسی حالت میں پگملیان نے اپنے ہاتوں کو دیکھا۔ سفید گرد کی ایک تہہ جم گئی تھی۔ لیکن پگملیان کا یقین کامرانی اس حیرت سے بدل گیا کہ کیا انہیں ہاتوں سے پتھر میں جان ڈال دی ہے؟ اب اسے اعتماد تھا کہ انسانی محنت اور دست کاری دیوتاؤں سے حسن کا راز چھین لے سکتی ہے!

جس ساعت میں پگملیان کے دل میں یہ یقین پیدا ہوا کہ اس کا بنایا ہوا مجسمہ مکمل ہے۔ ایک شہ کار ہے۔ بت تراشی کا اعجاز ہے تو وہ ساعت سچ مچ ایک الہامی ساعت تھی! اس نے اپنے نفس کو دھوکا نہیں دیا بلکہ اس کا وہ یقین الہامی تھا۔ پگملیان کو وہ موقعے بھی یاد آئے۔ جب وہ کوئی پیکر مکمل کر کے اس کے اندر اپنے احساس و خیال کو دم توڑتے دیکھتا تھا۔ جب وہ اپنی آرزوؤں کو جان کنی کی حالت میں دیکھتا تھا جب کبھی پگملیان اپنے بنائے ہوئے مجسمے کو اپنے خیال و تصور سے بالکل متغائر دیکھتا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ ناکامی کا احساس غصے میں بدل جاتا اور ایک وہ بت شکن دیوانگی میں مبتلا ہو جاتا تھا!

مرمرستان کی دھیما اور اچھوتی آبادی کے اس ہجوم پر شام کی اداس فضا چھانے لگی۔ لیکن صنم آباد کی مرمریت دھندلکے سے مغلوب

ہو جانا چاہتی نہ تھی۔ اصنام کی سفید رونق پھیلے ہوئے دھندلکے سے مقابلہ کرتی معلوم ہوتی تھی۔ اور جب دیواروں پر شام کا رنگ بکھر گیا تو فرش پر اجالا ہی نظر آتا تھا۔ اُداس دھندلکے میں سفید پیکروں کی عریانی زیادہ شاندار اور دلکش محسوس ہونے لگی تھی۔

اس وقت پگملیان اپنے صنم کدے کی مرمریں مورتیوں میں ایک ایسی دھڑکتی زندگی محسوس کر رہا تھا۔ جیسی پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ ڈوبتے سورج کی فضا نے اصنامی بتوں کے اعضا کو شباب کے ہلکے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اور آخری کرن ان کے ہونٹوں اور سینے کے بوسے چرا کر بھاگ گئی معلوم ہوتی تھی۔

پگملیان کے اس نگارستان کے سمندر کا کنارا زیادہ دُور نہ تھا۔ سمندر جہاں زہرہ کا بے پردہ اچھوتا پن۔ جس کی عریاں عظمت حکمراں ہے۔ اس مکان سے قریب تھا۔ اور اس وجہ سے سمندری ہواؤں کے ساتھ ایک خوش آئند و گوارا فتنہ کی کائی مسامات سے اندر داخل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ نبضِ شام یعنی ہوا کے جھکورے ایک جذبے کی تحریک تھے۔ فضا کی یہ جادوگری پگملیان کے احساسِ مسرت پر اس طرح چھا گئی کہ اس نے اضطرار کی حالت میں گلاٹیا کے برہنہ قدموں کو چوم لیا۔ اور اندر سے دھڑکتے سر کو اس کے ٹھوس اور ٹھنڈے زانو پر رکھ دیا اور پھر اچانک مجسمے کی چوکی پر کھڑا ہو کر اس اصنامی پیکر سے لپٹ گیا۔ اس کے خاموش ہونٹوں کے بوسے لینے لگا۔ بے حد، بے شمار بوسے!

پھر جب ردِ عمل ہوا تو خود سے بھی شرما گیا۔ لیکن اس کی شرم سے جھکی ہوئی آنکھوں نے کیا کچھ دیکھا کہ وہ حیرت سے پھٹ کر رہ گئیں؟ وہ کانپنے لگا۔ اس پیکر میں تو جان پڑ گئی تھی! وہ مجسمہ تو متحرک محسوس ہوتا تھا! اس کے سفید گالوں میں سرخی کی جھلک تھی! اور گلاب کی کلی کی مانند چہرے سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک میں زندگی کی ایک رو گزرتی محسوس ہوتی تھی! جس طرح موج بنتی کے اندر بار بار سانس ٹوٹتی ہے۔ بالکل اسی طرح گلاٹیا کے سینے میں زندگی کا تلاطم کا تموج تھا! اور جاتی ہوئی کرن کی مدھم روشنی میں کہ اس کی بانکی پلکیں جھپکنے لگیں کسی خوف سے کانپ گئیں۔ شاید زندگی کے ڈر سے!

پگملیان یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے دل میں تاب کا نشان بھی نہ تھا! اب وہ گلاٹیا کے جسم کو، جسم کے حصے کو، ایسے ہلکے ہاتھ سے چھو رہا تھا جیسے مالی کا ہاتھ کسی نازک پھول یا پودے کو سینچتے میں نرم ہو جاتا ہے۔ اب گلاٹیا کے جسم میں نہ پتھر کی سختی تھی۔ اور نہ اس میں وزن محسوس ہوتا تھا! مرمریں بنے ہوئے بال ایسے سیاہ ہو گئے تھے جیسے رات نے آکر بسیرا لیا ہو! آنکھوں کے اندر ایسی چمک تھی۔ جیسے سمندر کے اندر سورج چھپتا ہے! لیکن گلاٹیا ابھی تک چپ تھی! کیوں؟

اس سوال کو ابھی پگمیلیان اپنے ذہن میں پوری طرح قائم کرنے نہ پایا تھا کہ گلاٹیا یکایک مسکرا دی۔ وہ مسکرانے سے اس کے چہرے پر حیرانی کا سا روپ چھا گیا۔ معصومانہ انداز سے اس کا ہاتھ بڑھا۔ اور پگمیلیان کے بالوں سے کھیلنے لگا۔ کافوری قلم ایسی انگلی سے اس نے پگمیلیان کی مانگ نکالی اور ہنس پڑی۔ ایک بجتی ہوئی سی ہنسی جس کی تشبیہہ محال ہے!

پگمیلیان نے نہ جانے اس سے کیا کہہ دیا کہ اس کو سمجھنے کے لیے گلاٹیا کی چوڑی پیشانی پر ایک بال سا پڑ گیا۔ زندگی کی پہلی ناگواری کا احساس! اور پھر ایک نازک سی کاہلی، ایک خفیف سی تکان میں مبتلا دکھائی دی۔ ابدی سکون میں پڑے رہنے کے مقابلے میں زندگی ہی تھکا دینے والی چیز!

جب پہلی بار پگمیلیان نے اپنی صناعت کے شہ کار میں جان پڑتی دیکھی تھی تو کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی عمر بھر کی کمائی

چھینی جا رہی تھی! اور اس سے اس کی حالت ہذیانی تو نہیں مگر اسی قسم کی ہو گئی تھی۔ گلاٹیا کے گداز بدن کو راحت اندوزی کے انداز میں پڑا دیکھ کر اسے ایک نوع کی حیرت تھی۔ گلاٹیا کے دونوں ہات چلیپا کی شکل بنے سینے پر رکھے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا رس بھرا تھا، اور گلاٹیا کے اندر جینے کی یہ نشانیاں اس کو ایک دیوی کے بدلے گوشت پوست کا ایک انسان بنا رہی تھیں۔ جو محبت کی تلاش میں اداس ہو گیا ہو!

مقدرات کی یہ پیش بینی تھی کہ گلاٹیا کی نرالی تخلیق معمولی مٹی سے نہیں بلکہ اچھوتے اور پاکیزہ مرمر سے ہوئی! اور تخلیق کائنات کے وقت جو صورت و حالت رہی ہوگی۔ اس وقت پگمیلیان اپنے اندر کچھ ویسی ہی الوہیت محسوس کر رہا تھا۔ اسے یہ فخر آمیز احساس تھا کہ اس ہستی نور و صباحت کو خود اس نے تخلیق کیا ہے، اس کا خالق وہ خود ہے!

گلاٹیا ابھی تک جیتی جاگتی تصویر تو تھی مگر ہنستی بولتی مورت نہ تھی۔ ہر بات سے بے خبر اور ہر چیز سے ناآشنا! اسے تربیت درکار تھی، اور پگمیلیان کے سوا اور اس سے بہتر معلم و اتالیق کون ہو سکتا تھا؟ چنانچہ جب اس نے یہ ذمہ داری اٹھائی تو پگمیلیان اپنے جذبات کو صاف طور پر سمجھ نہ سکا۔ لیکن وہ اپنے اس نئے مشغلے سے بہت خوش تھا۔ اسی میں سرشار رہتا تھا! وہ اس مرمریں پیکر کے حساس جذبات کو تو نہیں سمجھ سکتا لیکن اب اس کی سماویت میں انسانی اچپلاہٹ جھلکنے لگی تھی!

وقت گذرنے کے ساتھ گلاٹیا کو اب اپنے خلاق کے نگارخانے میں مرمری سلوں اور بتوں کے درمیان پڑے رہنے سے الجھن ہونے لگی۔ سفید پتھر کی چوکی پر بیٹھے رہنا دوبھر معلوم ہوتا تھا۔ وہ جب اصنامی چوکی پر لیٹتی تو جسم اور مرمر مل جاتے معلوم ہوتے تھے اور شاید گلاٹیا کو ابھی دھندلی سی یاد تھی کہ مرمر اس کا عنصر اصلی ہے! مرمریں عفت اور اچھوتے پن کے اندر سے بیدار ہونے کا امتیاز گلاٹیا، ہر لحظہ پگمیلیان کی حیرت میں اضافہ کرتی۔ ہنی تھی کہ ایک خواب کے مجسم ہو جانے کا معجزہ کیونکر رونما ہوتا ہے! سامنے کھڑی ہوئی گلاٹیا معبود و جمال بن کر پگمیلیان کے سارے جذبات پرستش و پرستاری کا مرکز بن جاتی، اور پگمیلیان کی روح اس کے ہونٹوں پر لرزنے لگتی اور جب گلاٹیا کسی سوچ میں پڑ جاتی تو اس کے چہرے کی صباحت پر بادلوں کے سائے پڑتے اور اس کے خیالات معلوم کر لینے کی آرزو میں پگمیلیان کا دم گھٹنے لگتا!

اس پیکر کے بنانے سے پہلے پگمیلیان نے جتنے مجسمے بنائے اور گھڑے تھے، ان سب کو محنت رائیگاں سمجھتا رہا۔ لیکن اس مورت کو گھڑ لینے کے بعد سے ایک نامعلوم خدا کی قائم مقامی کا شدید احساس ہونے لگا تھا۔ وہ خود خالق ہے اور گوشت پوست کی مخلوق پیدا کر سکتا ہے! کسی وقت وہ اپنی پہلی اور پرانی حالت و کیفیت یاد کرنے لگتا تھا۔ کبھی نازل نہ ہونے والے الہام کی آرزو میں نیند میں اٹھ جانا، راتوں کو ناقابل توجیہہ الجھن رہنا، سارم رویا میں بہنے والے کی کم داس تنہائی اور سرد مہر طلوع صبح کی تصور تسکینی۔ پگمیلیان اپنی اس تمام الہامی محویت کو سزا و عقوبت سمجھتا تھا، لیکن آج وہ پرانی حالتیں اور کیفیتیں اس کے خیال میں سزا و عقوبت نہیں رہی تھیں۔ اس لیے کہ ایک عمر ناکام رہنے کے بعد بالآخر تخلیق کر سکنا، اپنے دست و بازو میں قدرت پانا اور خدا بن جانا اس کے خیال میں مفت نہیں مل سکتا تھا۔

لیکن جب بھی پگمیلیان ان خیالات میں کھو جاتا تھا۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان نمودار ہو جاتے اور چہرے پر التجا کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی تھی جسے مذہبی زبان میں دعا مانگنا کہا جاتا ہے۔ اس وقت بھی اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی اور گھٹنوں

کے بل جھک کر اس نے گلاٹیا کی بھری بھری رانوں سے اپنی بانہیں لپیٹ لیں۔ اور محسوس کیا کہ گلاٹیا کی ہستی سے ایک مہک، ایک زنانی مہک نکل کر زبردستی اس کے اوپر اس طرح چھائی جا رہی ہے۔ جیسے نشہ چھانے لگتا ہے! پگمیلیان سوچنے لگا:۔

"میں نے اس کے بوسے لیے، جی بھر کے بوسے لیے اب اور کیا چاہتا ہوں؟
ہماری فطرت، دوگانہ فطرت پر قابو پا لینے اور متصرف ہو جانے کی بہیمانہ خواہش
جس کا دوسرا نام مردانہ کمزوری ہے۔ ہماری پاکیزہ ترین حالتوں میں بھی ہم سے
الگ نہیں ہوئی، چھپی رہتی ہے!"

ایک دن شام کا وقت تھا اور جذبات کو اکسا دینے والی کیفیات کا اثر چھایا ہوا تھا۔ گلاٹیا کی پتلیاں پھیل گئیں اور اسے نسوانی حجابات کی محویت خیزی اور اس کی لذتوں کا احساس ہوا! جذبۂ محبت کے ریلے میں بہہ جانے والی ہستی، عورت، کی ساخت میں! اس کے جسم کی بناوٹ میں کوئی اضافہ قصداً نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اندر قبضہ و تصرف کی یہ دیوانگی، اس کی آہیں اور آنسو، راتوں کی کاہلانہ لذتیں اور نرمیاں اور دل پسند تکان و خستگی، یہ سب کچھ اس کے ساتھ یا اس کے جسم کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تمام کیفیتیں اس کی ہستی کا جزو ہیں!

پریم اور محبت کے یہ دو دیوانے سمندر کی ہر گھڑی بدلنے والے مناظر سے دوچار، بچوں کی سی تتلاہٹ میں اظہارِ جذبات و محسوسات کرتے رہتے تھے۔ محبت کرنے والوں کے وعدے اور قسمیں جو ہر عہد میں ایجاد ہوتی رہتی ہیں، دوہرائی جاتی تھیں۔ شاید اس طرح وہ محبت کی کم عمری، ناپائیداری کے خیال کو محو و فراموش کرنا چاہتے تھے! سمندر کی ہر وقت بے چین موجیں زندگی کی حقیقت سکھاتی رہتی تھیں لیکن محبت میں نصیحت پر کس نے کان دھرا ہے؟ وہ نہ زندگی کی قلیل مدت پر دھیان دیتے تھے۔ نہ اپنی محبت کی ابدیت پر شک کرتے تھے!

لیکن اس کے باوجود پگمیلیان اپنی دل کی اندیشہ مندیوں کو، اپنے احساسِ خوف کو گلاٹیا پر ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دل میں وسوسوں نے گھر بنا لیا تھا۔ اور وہ سوچتا رہتا تھا:۔

"آہ، اے فردوس پرور گلاٹیا، تو ہر چند پاکیزہ طریق سے پیدا ہوئی۔ تیری اصل لطیف و نفیس ہے، لیکن اس انسانی جسم میں تجھے بقائے دوام نہیں۔ تو بھی فانی بن گئی ہے۔ اور ایک دن کیڑے مکوڑوں کی غذا بن جانے والی ہے! ہر چند میرے سارے خواب ابدیت کے خواب تھے! انہیں سوچوں میں گلاٹیا میں تیری ہستی بھی بھول جاتا ہوں کہ میری بنائی ہوئی چیز پر دوسرے کے بنائے ہوئے قانون کا نفاذ کیوں ہو؟ خدا کی قدرت ثابت کرنے کے لیے وہ گلاٹیا جو میری تخلیق ہے۔ موت کے قانون کی پابند کیوں بنا دی جائے؟ اور اگر یہ قانون بدلا نہیں جا سکتا تو گلاٹیا میں چاہتا ہوں کہ قدرت اپنے قانون میں بس اتنی تبدیلی کر دے کہ روز و سال کا اثر تیرے اوپر نہ ہو اور اس کے بدلے میں مجھے آج ہی فنا کر دیا جائے! آہ، مگر گلاٹیا، غلطی تو میری ہے ——— میں نے تجھے محبت کرنا کیوں سکھایا؟"

محبت کی گھڑیوں کے پر لگ جاتے ہیں۔ زمانہ تیزی سے گزرتا گیا اور وہ وقت آ پہنچا جب دو فانی انسانوں کی محبت بلندی کے آخری نقطے تک پہنچ کر اپنے پروں کو سمیٹ لیتی اور اس بلندی سے اترتی نہیں، گر پڑتی ہے!

رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آ گیا کہ پگمیلیان فن و صناعت کو بھی مکر و فریب سمجھنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ صناعت فریب محض ہے کیونکہ وہ محبت کے جذبے کو فنا کر دیتی ہے۔ محبت کی جگہ خود چھین لیتی ہے! صناعت اب اس کی نظر میں ذہن کی غلامی اور تصور کا قید خانہ معلوم ہونے لگی! ایسی واہمہ پرستی نظر آئی جو صرف غلام فطرت انسان کے لیے ہی مناسب ہو سکتی ہے!

فن و صناعت سے اس طرح بیزار ہو کر پگمیلیان الٹی اپنے جذبات کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا۔ صنم سازی سے ہاتھ اٹھا لیا اور خواہش و آرزو کے نئے نئے مجسمے بنانے لگا۔ کسی وقت اگر گلاتیا کی آنکھیں بھیگی نظر آتیں تو پگمیلیان دل سوزی کے جذبے سے تڑپنے لگتا۔ مگر گلاتیا اس کی حالت کو بالکل نہیں سمجھ پاتی تھی۔ پگمیلیان کے احساس کی نزاکت اور جذبے کی گہرائی کا سمجھنا اس کے لیے ممکن نہ تھا! عورت اور مرد کی تخلیق ہوئی اسی عنوان پر ہے!

پگمیلیان جب اس سے باتیں کرتا تو ایسی نرمی اور ملاطفت سے مخاطب کرتا جیسے بچوں کے خواب کا تانا بانا حبابی اور نازک ہوتا ہے۔ سمجھانے کے لیے اس سے کہتا:۔

"پیاری گلاتیا، تجھے معلوم ہے کہ پتھر کی مورتیاں گھڑنا میری زندگی کا شغل رہا ہے۔ لیکن جذبہ و احساس سے مجھے تو نے متعارف کرایا۔ جینے کے معنی مجھے تو نے سکھائے۔ اس لیے جب میں تجھے رنجیدہ و ملول دیکھتا ہوں تو جینے سے بیزار ہو جاتا ہوں! اس لیے گلاتیا اس کو موت کا طلب گار نہ بنا، خاکی نژاد ہونے کے باوجود جسے آسمان سے الہام ہوتا ہے، جو فانی ہو کر بھی قدرت کے اشارے دیکھ سکتا ہے

"میرے من موہن سپنے، پیاری گلاتیا۔ اگرچہ ہواؤں کے ساتھ اڑ جاتے ہیں، لیکن میرے ولولے ابدیت کی ساعتیں میں! اس لیے اچھی گلاتیا تو اگر چاہے تو میری اس دیوانہ آرزو کو، ابدیت کے اس لمحے کو بچا سکتی ہے!

"گلاتیا، انسان، بدنصیب انسان کی فطرت کا ایک مختصر جزو ایک بے حقیقت حصہ یعنی اس کی محبت کی ابدی نشانی زندہ اور باقی رہتی ہے! انسانی محبت کا لمحہ فنا نہیں ہوتا! اس طرح ہم نے محبت کر کے اپنی ہستیوں سے سارے عالم کو بھر دیا ہے کائنات کو معمور کر دیا ہے! بتا، میری پیاری گلاتیا، مجھے بتا۔ کیا تو میرے غم کا راز، میرے دکھ کا بھید سمجھتی ہے؟"

مگر گلاتیا اس زبان کو سمجھنے کے قابل نہ تھی۔ اس کی یہ لاعلمی اپنی جگہ ایک حسن تھی، اس کی یہ بے خبری اپنے مقام پر شیریں و لذیذ تھی! وہ پگمیلیان کا مطلب و مقصد تو نہیں سمجھ سکی۔ لیکن اس کے لہجے کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی! لیکن پگمیلیان کی آرزو تشنہ ہی رہی۔ اس کے سوال کا جواب نہیں ملا!

وہ دن بھی بالآخر آ پہنچا۔ جب گلاتیا کی آنکھوں کی روشنی، آنکھوں کی جوت جو ہیرے کی طرح لو دیتی تھیں، مدھم پڑنے لگی، اس کے سینے پر جلد کا رنگ پھیکا پڑ چلا، اس کے پہلوؤں کے خم و پیچ سے خالی دکھائی دینے لگے، گلاتیا کا رنگین و گداز سراپا اس طرح بے رنگ اور پھیکا پڑتا جا رہا تھا جیسے مقدر کا مجسمہ بے نور و بے رنگ ہوتا ہے:

جوں جوں دن بیت رہے تھے، گلاتیا کا شباب زوال ہو رہا تھا۔ مگر گزری ہوئی شان آفرین و تابناک گھڑیوں کی یاد میں محبت کے تازہ اقرار ہوتے اور حسرت ناک بوسوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ شاید گلاتیا کی مٹتی زیبائی اور اجڑتا روپ پگمیلیان کے اندر پرستش کے جذبے کو پھر ابھار دے گا۔ لیکن فطرت انسان کبھی بدلی بھی ہے۔

پگمیلیان، وہ خلاقِ حسن و جمال جسے اپنی تکمیل کی آرزو تھی۔ گلاٹیا کو اپنے نئے خواب سنا سنا کر بہلاتا رہتا تھا۔ اور گلاٹیا، وہ پیکرِ حسن و شباب زندگی جس پر غالب آچکی تھی۔ پرانی اداؤں سے پگمیلیان کو پھسلاتی رہتی تھی۔ لیکن ان دونوں کی خواہش و آرزو کے باوجود جدائی کا وقت قریب آرہا تھا، دُوری بڑھنے لگی تھی، کیونکہ جذبات مرجھاتے جا رہے تھے۔!

صنمستان کی مرمریں مخلوق سے جب گلاٹیا اپنا مقابلہ کرتی تو اس رشک میں مبتلا ہو جاتی کہ یہ مجسمے امتدادِ وقت سے متاثر ہونا جانتے ہی نہیں۔ نہ انہیں کوئی غم ہے نہ فکر! اور وہ اس آرزو پر مجبور ہو جاتی جو دیوی دیوتاؤں ہی کو زیب دیتی ہے۔ یعنی وہ جلدی موت آنے کی تمنا کرنے لگتی۔

—— لیکن اپنی مرضی سے مرتا کون ہے؟

بالآخر پگمیلیان کو ایک دن صبح کے وقت گلاٹیا کی شکل بگڑی سی نظر آئی۔ اس نے ایک خیال قائم کر لیا اور بے چینی سے رات ہونے کا منتظر رہا۔ گلاٹیا جب اپنے بستر پر جا سوئی تو پگمیلیان نے ہتھوڑی اٹھا کر سوئی ہوئی گلاٹیا کے سینے پر ایک ضرب لگائی اور ضرب کے ساتھ سمندر کا دائمی خروش سنائی دیا۔ فضا اُداس ہو گئی۔ ایسی اداس جس کے اندر شاعروں کے خواب جاگ پڑتے ہیں۔ پگمیلیان کا دل رنج و غم سے دو نیم تھا وہ بے تاب ہو کر کہنے لگا:۔

”اے جمال و رعنائی، کاش میں جانتا ہوتا کہ تو اتنا بے رحم بھی ہو سکتا ہے! کاش میں اس وقت اندھا ہو گیا ہوتا! کیونکہ ہر خواب کی تعبیر ایک لاش نکلتی اور ہر سپنے کا نتیجہ ایک ارتھی ہوتی ہے“!

پگمیلیان نے پھر ڈرتے ڈرتے اس کے بدن کو چھوا۔ بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ پگمیلیان کے خیال نے دفعتہً پلٹا کھایا۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک دوسرا معجزہ رونما ہو رہا ہے۔ تو وہ کانپ گیا! گلاٹیا پھر پتھر کی مورتی بن گئی تھی! اس کا بدن مرمر کی طرح سخت اور چکنا ہو گیا، اور وہ پھر وہی پاکیزہ و سماوی ہستی بن گئی۔ جیسی جان پڑنے سے پہلے تھی۔ مگر اس کے رخسار پر آنسو کی ایک بوند بھی جم کر رہ گئی تھی! یہ منجمد آنسو اس مجسمے پر ایک اضافہ تھا۔

وہ چونکہ ایک صناع تھا۔ اس لیے پگمیلیان کی حیرانی اندازے سے باہر ہے۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا خود اس کی روح کی تحیر انگیزی تھی، موت یا معجزے کا جذبہ تھا! اسے دھیان آیا کہ خون و گوشت کے پیکر میں جو فسادی مادہ ہے۔ اس کو اپنی صناعی کی قوت سے دُور کر دے۔ چنانچہ اس نے اندھیرے میں اپنی چھینی ہتھوڑی ڈھونڈ نکالی اور رات بھر کام میں لگا رہا! رات کی حیرت اور خموشی میں ہتھوڑی کی ضربیں کسی طاقت ور سینے کی دھڑکن کی طرح سنائی دیتی تھیں۔

اس دنیا میں قدم رکھ کر انسان ایک چادر اوڑھ لیتا ہے۔ اور وہ غم کی چادر ہوتی ہے! اور انسانی فطرت جب غم پر غلبہ حاصل کرتی ہے تو وہ کامیابی بس اتنی ہوتی ہے۔ جتنا چھینی ہتھوڑی چلا کر پگمیلیان کامیاب تھا۔ اور اس کامیابی کی اہمیت غم کی ناقابلِ فتح مندیوں کے مقابلے میں پل بھر کی خوشی کے برابر ہے!

ایسی سوگواری جس میں اس وقت پگمیلیان مبتلا تھا۔ ایک غیر فانی تخلیق کے مناسبِ حال اور دوامی صناعت کے لیے موافق شے ہے۔ پگمیلیان نے اپنے ہاتھوں پر پوروں کی سی کپکپاہٹ محسوس کی۔ ایسی نرم اور ہلکی کپکپاہٹ جو عالمِ اختلاط میں اس کو گلاٹیا کے سینے پر محسوس ہوا کرتی تھی! پگمیلیان ابھی تک ایک جوش و شوق سے معمور عورت سے اتنا قرب محسوس کر رہا تھا کہ اس کو گلاٹیا کے مرمریں جسم کا زندگی اور محبت کی گرمی سے خالی اور عاری ہونے کا حق الیقین نہ تھا۔ اس احساس یعنی محبت کی لافانی آرزو نے پگمیلیان کی چھینی ہتھوڑی کے اندر

اسی جذبے کو دوڑا دیا تھا! ہتھوڑی پڑنے کی آواز ظفرمندی کا نعرہ اور خوشی کا غلغلہ بن گیا تھا۔ جس کی آواز تال بنکر نکلتی تھی۔ گویا مرمر کی اس عورت کے اندر زندگی تازہ ہو جانے کی آرزو اپنا کام کر رہی ہے!

پگمیلیان نے پھر جو نظر ڈالی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ پیکر اس کی صناعت و دست کاری کا نتیجہ نہیں تھا، وہ گلاٹیا وکٹرس کا مجسمہ تو نہ تھا۔ اس کے ہونٹوں سے کڑی کمان کا صنم غائب تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں انسان کی غم نصیبی کا بیان بن گئی تھیں۔ جذبۂ اُمیت سینے پر جم کر رہ گیا تھا۔ رانوں کا گداز بری طرح زخمی تھا، اور رعنائی و دل ربائی کا یہ پیکر مادر ارض کی بغل میں سو جانا چاہتا تھا! چنانچہ پگمیلیان اب ایک پیکر جادو طراز کی جگہ راز غم کے مجسمے کو کھرچ رہا تھا! اس کے ہات دغا اور آنکھیں فریب دے رہی تھیں! پگمیلیان غم زدہ تھا اور اس شخص کے غم سے بڑا غم کس کا ہوگا۔ جو خود خالق ہو کر یہ دیکھے کہ کل کا دن موت کا عالم ہوگا، ایک ایسا عالم جہاں نہ الہام آفریں سبزہ و سایہ ہوں گے۔ اور نہ کوئی چشمہ و چمن زار!

انسان کو جہاں غم نصیب بنایا گیا ہے۔ وہاں اس پر ایک احسان بھی کیا گیا ہے۔ اس کو دل کا سمجھانا سکھا دیا گیا ہے! لیکن جب دل کو سمجھانے کے لیے بھی ہولناک مستقبل ہی ہو تو وہ ایک ایسی گھڑی ہوتی ہے۔ جب آدمی ہر چیز اور ہر بات پر موت ہی کو ترجیح دیتا ہے! اور جو شخص فنا سے اس طرح قریب ہو اس سے کسی لافانی صناعت پارہ تخلیق کرنے کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے! پگمیلیان کی حالت اس وقت اگر کچھ تھی تو بس یہ کہ وہ خالق ہو کر ناقص مخلوق سے محبت کرنے کی سزا پا رہا تھا! اور اس کی مثال ایسے شخص سے دی جا سکتی ہے جو ایک ویرانے کو دیکھ کر رو رہا ہو!

اُوئی اللہ

ممتاز مفتی

اگر شیخ اجمل حسین کو بے تحاشہ ہنسنے کی عادت نہ ہوتی۔ اگر خدا بخش کو صمد کبابیئے کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی۔ اگر اسلم کو مس رنگی کی محبت کا عارضہ اور مجھے چغتائی خطوط کا جنون نہ ہوتا تو یہ آپ بیتی کبھی معرض وجود میں نہ آتی۔

اگر شیخ اجمل حسین کو بے تحاشا ہنسنے کی عادت نہ ہوتی اور وہ اپنے بڑے بیٹے جمیل کے اس جواب پر کہ "اندر عورتیں بیٹھی ہیں جی، مجھے وہاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے" اس قدر شدت سے نہ ہنستے اور حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال نہ ہوتا اور جملہ متعلقین ان کی وفات کے بعد بے یار و مددگار نہ رہ جاتے۔ تو اس صورت میں جمیل ۱۸ ہارڈنگ روڈ کی کوٹھی چھوڑ کر ایورگرین لاج میں ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ اگر خدا بخش کو صمد کبابیئے کے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی تو وہ ایڈورڈ ہوسٹل کو نہ چھوڑتا۔ ایورگرین لاج میں آنے سے پہلے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ صمد کبابیئے کی دوکان کے پڑوس میں رہ سکے۔

اگر اسلم کو مس رنگی سے عشق نہ ہوتا اور وہ دن رات رنگی کے بال روم کے چکر نہ لگاتا اور یہ خبر لاہور سے چل کر ان کے گاؤں راج کوٹ تک نہ پہنچتی اور اس کے والد موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے اس کا عقد اس کی بنت ام زینب سے کروا دیتے تو اسلم کے سسر سید حبیب اللہ نئے محلے میں دو مکان ہمارے لیے خالی نہ کرواتے اور ایورگرین لاج کی بنیاد ہی نہ پڑتی۔

اگر میں چغتائی خطوط سے متاثر ہو کر دنیائے مشہور نقوش سے چند بہترین نمونے اپنے کیوبیکل کی دیواروں پر نہ سجاتا اور سپرنٹنڈنٹ میرے خلاف پرنسپل سے شکایت نہ کرتے تو میں بورڈنگ سے سزا کے طور پر نہ نکالا جاتا۔ اس صورت میں ایورگرین لاج بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا۔ اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ لگائیے۔

اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے لیے شیخ اجمل حسین کو ہنستے ہنستے جام اجل پینا پڑا۔ اور قدرتی طور پر جمیل کی ساخت ایسی بنائی گئی کہ وہ عورت سے دلچسپی کا اظہار شرمایا کرے۔

اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے لیے اسلم اور مس رنگی کے عشق پر دائمی بندش قائم کی گئی۔ خدا بخش کو کباب کھانے پر اکسایا گیا اور صمد کو ایسے کباب کھلانے کے بعد اسے نئے محلے میں کباب کی دوکان کھولنے پر مجبور کیا گیا۔

اس واقعہ کو عمل میں لانے کے لیے فطرت کو کیا کیا کرنا پڑا۔ اور پھر جمیل، اسلم، خدا بخش اور میرے علاوہ وہ بڑی گڑیا کی طرح چیختی ہوئی بڑھیا اور اس کی پوتی بینا جسے فطرت نے چغتائی کے کسی عمل سے متاثر ہو کر بنایا تھا اور بلا ضرورت ہمارا نوکر بدھو جو بڑے اہتمام

بدھو نہ تھا۔

اور ان سارے واقعات کو مجتمع کرنے کے لیے مجھے ہوسٹل سے نکالے جانے کا حادثہ رونما ہوا۔ جب میرے سپرنٹنڈنٹ مولانا نے ان نیم برہنہ تصویروں کے پیش نظر جو میں نے اپنے کیوبیکل میں ٹانگ رکھی تھیں۔ پرنسپل سے شکایت کر دی۔ شام کو جب ہم اکٹھے ہوئے تو اسلم مولانا کے حکم کے متعلق سن کر غصے سے بل کھانے لگا اور انہیں گالیاں دینے لگا۔

"یہ ٹھیک ہے بیٹا" خدا بخش نے سنجیدگی سے کہا۔ "مولانا کو برا بھلا کہہ کر دل ٹھنڈا تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ اب یہ سوچو کہ کرنا کیا ہے؟"

اسلم نے سر کھجلا کر کہا۔ "یار ایک مکان تو مل سکتا ہے۔ ہمارے سسر سے یہ فائدہ بھی نہ اٹھایا تو ——"

"تو لعنت ہے تم پر" خدا بخش تہ بند جھاڑتے ہوئے بولا۔

"کہاں ہے وہ مکان؟" جمیل نے مسکرا کر پوچھا۔

"نئے محلے میں۔"

"بھئی واہ —— خدا بخش بولا۔" اپنے صدرو کی دوکان کے پاس ہوا تو درست۔ میں بھی تمہارا ساتھی ہوں۔"

اور جمیل بھی تو کوٹھی چھوڑ رہا ہے اس کی والدہ جا چکی ہیں نا۔" اسلم نے کہا اور اس طرح ایورگرین لاج کی بنیاد پڑی۔

لیکن ممکن ہے کہ ایورگرین لاج بننے کے بعد یہ واقعہ ظہور پذیر نہ ہوتا۔ حقیقت میں تمام تر قصور ہمارے نوکر بدھو کا تھا۔

آپ جانتے ہیں آج کل نوکر کا ملنا کس قدر مشکل ہے۔ ہم نے بورڈنگ کے باورچیوں سے بات کی تھی۔ بھئی کوئی نوکر منگوا دو غلام علی نے یہ سن کر ہاتھ کا چمچہ دیگچی کے ڈھکنے پر رکھ دیا تھا اور "نوکر ——؟" کہہ کر یوں سوچ میں پڑ گیا تھا جیسے اُسے کوہ قاف کی خبر لانے کو کہا گیا ہو۔ احمد حسین بولا "علیہ تو میڈیکل کالج میں لگ گیا ہے اور گاما کلکٹر دفتر والے صاحب کے ہاں چلا گیا ہے اور وہ ہندوستانی، اُسے کسی میجر نے پنڈی بلا لیا ہے۔"

"—— اچھا بابو جی میں دیکھوں گا۔"

ایورگرین میں چار ایک دن تک تو ہم نوکر کے بغیر ہی رہے۔ پھر ایک روز جب خدا بخش صدرو کباب بیچنے کی دوکان سے واپس آیا تو اس کے پیچھے پیچھے بدھو تھا جیسے کوئی پالتو کتا ہو۔

"لو جناب" خدا بخش نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھ لو آپ کو۔ آپ بدھو ہیں خالص بدھو۔"

"جی ہاں جی ہاں۔" بدھو کی لمبوتری پھوٹ نکلی۔

"اب آیا یقین۔" خدا بخش نے فخریہ انداز میں چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

جی ہاں جی ہاں۔" بدھو کا منہ کھلا اور اس میں سے تھوک کے لمبوترے چھینٹے دور دور تک اُڑے۔

اس کے بعد بدھو جب بھی کام کاج سے فارغ ہوتا تو چپکے سے کوٹھے پر جا بیٹھتا۔ بلکہ چھوٹے موٹے کام بھی وہ وہیں پر بیٹھ کر کیا کرتا۔ اس پر سبھی اسے ڈانٹتے۔

"ارے بدھو" اسلم چیختا۔ "تو بھاگ کر کوٹھے پر کیوں چڑھ جاتا ہے۔"

جی ہاں بابو جی" اس کی باچھیں یوں کھل جائیں جیسے اس کی تعریف کی گئی ہو۔

"ابے بدھو" خدا بخش ہنستا۔ کوٹھے پہ کیا دھرا ہے؟ دھرا ہے کچھ؟

"جی ہاں بابو جی" کچھ بھی نہیں دھرا جی ہاں بابو جی"

بدھو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ چاہے اس کی تعریف کرو۔ چاہے اس پر رعب جمانے کی کوشش کرو چاہے ہاتھ اٹھانے کی۔ ہر صورت میں اس کی باچھیں کھل جائیں۔ منہ روزن کی طرح یہاں سے وہاں تک کھل جاتا۔ تھوک کے قطرے ہوا میں اڑتے اور وہ خوش ہو کر چلاتا۔ جی ہاں بابو جی ہاں جی بابو جی۔

اگر بدھو کو کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھنے کی عادت نہ ہوتی تو یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا۔ کیوں کہ اس صورت میں ہمیں کوٹھے کے جملہ اسرار کا علم ہی نہ ہوتا۔

بدھو کی دھوپ کھانے کی عادت کو چھوڑیے۔ اگر وہ بڑھیا علامت کے طور پر ربڑ کی گڑیا کی طرح نہ چیختی تو ہماری توجہ پڑوس کے مکان کی طرف مبذول نہ ہوتی۔

"اے ہے لڑکی سر پہ دوپٹہ لے" ربڑ کی گڑیا چیختی اور ہمارے کان کھڑے ہو جاتے اور ہمیں شدت سے احساس ہوتا کہ کہیں پاس ہی ایک لڑکی موجود ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس کے سر سے ریشمی آنچل پھسل پھسل جاتا ہے۔

"اے ہے بٹیا ذرا سنبھل کے بیٹھ۔ تجھے اپنا ہوش بھی ہے" اور ہمیں احساس ہوتا کہ وہ لڑکی عمر کے اس حصے سے گذر رہی ہے جہاں اپنا ہوش بھی نہیں ہوتا اور جہاں سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

وہ ربڑ کی گڑیا چیختی اور جمیل خواہ مخواہ شرمائے جاتا اور اسلم کے دل میں مس رنگی کی یاد تازہ ہو جاتی اور وہ وہ دھن گنگنانے لگتا جو اس نے مس رنگی سے سیکھی تھی "فالنگ ان لو اگین" اور خدا بخش تہ بند جھاڑ کر کہتا۔ یار بڑے گرم مصالحے ڈالنے لگا ہے۔ صمد کبابوں میں گرمی ہو گئی ہے کچھ کچھ۔ اور میرے دل میں بیا بدرش کا عمل ابھرتا اور ہلکے دھلے دھلے رنگ دھاریاں بناتے اور خطوط ڈھلکتے اور سیاہ آنکھیں ڈوبتیں۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے کوٹھے کا راز جمیل پر کھلا تھا۔ وہ صبح سویرے ہی لوٹا لے کر کوٹھے پر چلا جایا کرتا تھا۔ اور پھر دیر تک نہ جانے وہاں کیا کرتا رہتا اور جب واپس آتا تو اس قدر دبے پاؤں زینے سے اترتا کہ چاپ تک سنائی نہ دیتی۔ زینہ اترتے ہوئے وہ آپ ہی آپ شرماتا اور مسکاتا، شرمائے جاتا اور مسکائے چلا جاتا۔

میں اس زمانے میں اس حقیقت سے واقف نہ تھا کہ جھینپ جھینپ کر بھی اظہار محبت کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ جھینپنا اور نیچی نگاہوں سے مسکرانا نسائی خصوصیات ہیں اور عورتوں کے دل میں الٹا نفرت پیدا کرتی ہیں۔

ان دنوں مجھے زندگی کا تجربہ نہ تھا۔ اور میرا علم چند سستی کتابوں کے اوراق تک محدود تھا جیسے ہر کالج کے لڑکے کا ہوا کرتا ہے اس لیے میں نے جمیل کے شرمانے کو کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ عورت کی بات پر جمیل کا جھینپنا اس بات کا شاہد ہے کہ اسے عورت سے قطعی طور پر دلچسپی نہیں۔

جمیل ایک اونچے لمبے قد اور درمیانہ جسم کا لڑکا تھا۔ اس کی جلد کا رنگ سنہری تھا۔ اس کی آنکھیں شربتی تھیں جو جھینپنے کے علاوہ نیم وا

رہتی تھیں ـــ اس کے سنہرے بال شاعرانہ انداز میں پریشان رہتے تھے۔ اس کے ہاں ہر بات کا ایک ہی جواب تھا دبی دبی مسکراہٹ اور بھیگی بھیگی نظر جیسے ساون میں پھوار پڑ رہی ہو۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ فطرت نے اس کے تکلم کے بیشتر حصے کو اس کی نظر اور مسکراہٹ میں مرکوز کر دیا تھا۔ اور اس مسکراہٹ اور بھیگی بھیگی نظر سے وہ دل کے بڑے بڑے پیچیدہ جذبات کا اظہار کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ ان دنوں مجھے بھیگی نظر اور دبی مسکراہٹ کے مختلف لطیف درجوں کا احساس نہیں تھا۔ اور نہ ہی میں اس حقیقت سے واقف تھا کہ وہ تکلم جو نگاہ اور ہونٹوں کی لطیف جنبشوں سے پیدا کیا جاتا ہے۔ اپنا اپنا مفہوم دور دور تک نشر کر سکتا ہے۔

جمیل کے بعد کوٹھے کے اسرار کا راز اسلم پر کھلا۔ اس روز جب وہ نیچے آیا تو غیر از معمول کسی گہرے خیال میں کھویا ہوا تھا اور ان جانے میں" فالنگ ان لو اگین گنگنا رہا تھا۔ لیکن اس کے گیت کی دھن سراسر بدلی ہوئی تھی۔ بول تو انگریزی تھے۔ لیکن دھن میں لوک گیت کا رنگ نمایاں تھا۔ سب سے پہلے خدا بخش نے اس بدلی ہوئی دھن کو محسوس کیا۔ حالانکہ خدا بخش کو علم و ادب اور راگ رنگ کی باریکیوں کا احساس نہ تھا۔ پھر بھی کبھی کبھار وہ دہقانی انداز میں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتا کہ بن مجھے مزا آجاتا۔ بولا "یار اسلم آج مس رنگلی کو ہیر کا روپ دے رہے ہو تم۔ خیریت تو ہے؟"

اسلم نے ایک لمبی آہ بھری اور بولا "مغربی رقص میں مجھے ایک ہی چیز کھلتی ہے اور وہ ہے اس کی تشنگی۔ اگر ٹانگوں میں مغربی رقص ہو اور نگاہوں میں مشرقی جھکاؤ تو مزا آجائے۔"

"ہی ہی ہی" خدا بخش ہنسا۔ "لو بھئی۔ مس رنگلی کے جسم کا اوپر کا حصہ تو غائب ہوا۔ کیوں بدھو؟"

"جی ہاں بابو جی" بدھو کی باچھیں کھلیں

جمیل کے سنہرے رنگ پر زرد دھبے تیرنے لگے اور آنکھوں میں بوندا باندی ہونے لگی۔

اسی شام اسلم مرقع چغتائی کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔ "یار کاکے یہ جھکی جھکی آنکھ بھی کیا چیز ہے"

"لیکن مس رنگلی کی تو کٹورہ سی کھلی رہتی ہیں" خدا بخش ہنسا۔

"ارے یار اس کا مزہ اور ہی کچھ ہے" اسلم نے ایک آہ بھری۔

"جی ہاں جی ہاں بابو جی" بدھو نے سمجھا کہ اسے مخاطب کیا جا رہا ہے۔

"نیم وا" جمیل مسکرایا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔

"نیم وا ہو یا کٹورا سی" خدا بخش نے تہ بند جھاڑتے ہوئے کہا۔ "سب ایک ہیں وقت تکنے پر کٹورا سی نیم وا ہو جاتی ہیں۔ اور نیم وا کٹورا سی کھل جاتی ہیں۔ وقت وقت کی بات ہے۔"

"جی ہاں بابو جی" بدھو کے پچکے ہوئے منہ سے چھینٹے اڑے اور دو خالی کٹورے ہمیں گھورنے لگے۔

سب سے آخر میں ان نیم وا آنکھوں کی بات خدا بخش تک پہنچی۔ اور اس روز وہ دبا دبایا رومان منظرِ عام پر آگیا۔ خدا بخش نے کس بے دردی سے ان ڈولتی کشتیوں کا بھانڈا صحن میں پھوڑ دیا۔

"ارے یار" وہ کوٹھے سے ہی چلایا۔ "کاکے، اسلم، جمیل، بھئی یہاں تو مس رنگلی کا پاکستانی ایڈیشن کھلا پڑا ہے، بھاگ کے

آنا، بھاگ کے۔"

اور ہم سب یوں کوٹھے کو بھاگے جیسے ہمیں اس پاکستانی ایڈیشن کے متعلق کوئی علم ہی نہ ہو۔ سب سے آگے اسلم تھا۔ اس کے پیچھے میں اور سب سے پیچھے جمیل ایک عجیب انداز سے مسکراتا ہوا آرہا تھا

اس روز کے بعد کوٹھے کے اسرار کی حقیقت ایک کھلا راز بن گئی۔ اور سب نے مل کر کوٹھے پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب لوگ کوٹھے کے اسرار سے کماحقہ واقف ہو چکے تھے۔ اگرچہ ہر کوئی اس راز کو یوں سینے سے لگائے بیٹھا تھا جیسے وہ اس کا اپنا راز ہو۔ ہر کوئی اس راز کو اپنانے کی دھن میں شدت سے مصروف تھا۔ کاش یہ بات مجھے ان دنوں معلوم ہوتی۔

پہلی مرتبہ جب میں نے مینا کو دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ اس روز اتفاق سے میں کالج سے جلدی آگیا۔ گھر پہنچا تو بدھو کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ بلکہ بدھو نے مجھے کہا بھی" بابوجی! آج تو آپ سب سے پہلے آگئے۔" کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اتفاق سے میں سیڑھیوں میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جمیل سیڑھیوں کے بالائی حصے میں کھڑا مسکرائے جا رہا ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ میاں جمیل دیوار سے لگ کر مسکرائے کیوں جاتے ہیں مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اور پھر معمول کے خلاف اونچی آواز میں کہنے لگا" آؤ۔ آؤ۔ رُک کیوں گئے؟" اوپر جا کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن وہاں جمیل کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور وہ اسی طرح کھڑا مسکرائے جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور اس نے مسکرانا چھوڑ کر گنگنانا شروع کر دیا اور پھر جلد ہی لوٹا اٹھا کر نیچے اتر آیا۔

کچھ دیر تک میں بے مصرف ٹہلتا رہا۔ ابو نگر میں صرف ایک منزلہ مکان تھا۔ اس کے ایک طرف گلی تھی۔ دو جانب تین منزلہ مکانات کی اونچی لمبی دیواریں کھڑی تھیں۔ اور ایک طرف پرانی ساخت کی نانک چندی اینٹوں کی ایک منزلہ دیوار تھی۔ جس میں ایک بند کھڑکی تھی جس کے اردگرد جالی دار اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن پرلی جانب سے جالیوں کے سوراخ پلستر سے بند کیے ہوئے تھے۔

جب میں اکتا کر نیچے اترنے لگا تو دفعتاً ایک حرکت سی ہوئی اور جالی کے سوراخ شیشے کے ستاروں کی طرح روشن ہو گئے۔ جیسے کسی نے ان کی پشت کا پلستر توڑ کر صاف کر دیا ہو۔ میں رک گیا اور غور سے ان سوراخوں کی طرف دیکھنے لگا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ان سوراخوں میں دھندلے رنگ دار دھبے سے دکھائی دینے لگے۔

دو سوراخوں میں سبز دھبے چمکنے لگے۔ ایک سیاہ دھبہ واضح ہونے لگا اور دو تین سنہری دھبے جھلملائے۔ سنہری دھبوں میں جنبش سی ہوئی۔ ایک دھندلی سی مسکراہٹ اور گھنی مژگاں کا ایک چھپر گرنے لگا۔

دفعتاً ربڑ کی گڑیا بھاری آواز میں بھیں بھیں کرنے لگی۔

" اے ہے لڑکی تو پھر یہاں کھڑکی کھول کر بیٹھ گئی، ہزار بار کہا ہے کہ ہر وقت کتاب لے کر نہ بیٹھ جایا کر۔"

" اوئی اللہ! کہیں بیٹھنے بھی دیں گی آپ" ایک رنگین آواز گونجی۔

اف وہ اوئی اللہ! سارے جہاں کا حسن، رنگینی، الکامٹ، نزاکت اور زندگی سمٹ کر اس اوئی اللہ میں سما گئی تھی۔ میرا دل بیٹھ گیا۔

کھٹ سے کوئی دروازہ بند ہوا اور جالی کے سوراخوں پر پھر سے ظلمت چھا گئی۔ جیسے اندر سے کسی نے پلستر کر کے انہیں بند کر دیا ہو۔

میں مبہوت کھڑا تھا۔ دور تک، جہاں نگاہ کام کرتی تھی، چھتوں، منڈیروں اور دیواروں کا ایک اجڑا ہوا انبار لگا تھا۔ جن میں مندر کا ایک سنہرا کلس شام کی گلابی روشنی میں چمک رہا تھا۔ جس پر چند ایک چیلیں سی خاموشی سے اڑ رہی تھیں۔ پاس ہی ایک مسجد سفید چادر اوڑھے سجدے میں گری ہوئی تھی۔ آسمان پر گلابی بدلیاں یوں چمک رہی تھیں جیسے اس اُدئی اللہ کی تمام رنگینی انہوں نے جذب کر لی۔

پھر وہ دھبے آہستہ آہستہ مجھ پر مسلط ہوتے گئے۔ میرے ادراک، میرے خیالات، میرے جذبات پر حاوی ہوتے گئے۔ کتاب پڑھتے پڑھتے دفعتاً چھپے ہوئے حروف میں ایک جنبش ہوتی اور عبارت میں کچھ سوراخ کھل جاتے اور پھر رنگین، سیاہ اور سنہری دھبے ناچتے اور گھنے بالوں کا ایک چھتر گرتا اور چمکدار سیاہ کشتی سی ڈولتی۔ حتیٰ کہ میں کتاب بند کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اور ان جانے میں کوٹھے پر جا چڑھتا اور سیڑھیوں کے مٹیالے اندھیرے میں کھڑا انتظار کرتا کہ کب سوراخوں کا پلستر اکھڑے اور وہ دھبے نمودار ہوں اور اس سنہرے مندر میں ناقوس بجے اُدئی اللہ میں کھو جاؤں اور اس اُدئی اللہ کی رنگینی بادلوں میں منعکس ہو۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ ایورگرین لنج میں میرے علاوہ اور بھی ایسے تھے جن کی کتابوں میں سوراخ کھل جاتے تھے۔ اور نگاہوں تلے رنگین دھبے ناچتے تھے۔ لیکن ان دنوں نہ جانے کیوں اس بات سے قطعی واقف نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان دھبوں کی حقیقت مجھی تک محدود ہے۔ وہ رنگین امر گویا صرف میری ہی دریافت ہے۔

مجھے اس بات کا اندازہ بھی کیسے ہوتا جب کبھی چھٹی کے دن ہم سب کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھے ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی ان جالیوں سے دلچسپی کا اظہار نہ کرتا تھا۔ کوئی نگاہ بھر کر ادھر دیکھتا بھی نہ تھا۔ میں تو خیر اس بات کو خفیہ راز میں رکھنے کے لیے ادھر نہ دیکھنے پر مجبور تھا۔ میری بات چھوڑ دیجئے۔

اسلم عام طور پر اپنے محبوب رسالہ لائف کی ورق گردانی کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی فاوگ ان لوگین گنگنانے لگتا اور گنگناتے وقت سرسری طور پر ادھر دیکھ بھی لیتا۔ لیکن یہ تو معمولی بات تھی۔ جمیل تو ہمیشہ ادھر پیٹھ کر کے بیٹھتا تھا۔ اگرچہ وہ کھسیٹ کر اپنی کرسی احتیاطاً سے اس مقام پر کر لیا کرتا تھا۔ جہاں سے وہ جالیوں میں سے بخوبی نظر آ سکے۔ یہ بات قابل توجہ نہ تھی کیونکہ دلچسپی تو دیکھنے سے ظاہر ہوتی ہے اپنا آپ دکھانے سے نہیں۔ اور خدا بخش تو زیادہ تر اوپر بیٹھتا ہی نہ تھا۔ چند ایک منٹوں کے لیے کوٹھے پر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر گھومنا شروع کر دیتا۔ تہ بند جھاڑتا۔ بدن کھجاتا اور آپ ہی آپ گنگناتا۔ بہت ہی مصالحے ڈالنے شروع کر دیئے ہیں نمرود نے گرمی ہو گئی ہے کچھ کچھ۔

البتہ جب کبھی اس مندر میں اُدئی اللہ کا ناقوس بجتا تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اسلم کے ہاتھ سے پرچہ چھوٹ جاتا۔ جمیل کا رنگ نہ جانے کیوں زرد پڑ جاتا۔ آنکھوں میں بوندا باندی ہونے لگتی۔ مگر وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اور خدا بخش گرمی سے بے حال ہو کر تہ بند جھاڑتا اور صمد کبابیے کو گالیاں دیتا۔ پھر دفعتاً وہ بھیں بھیں کرنے والی بڑی گڑیا چیختی اور دھپ سے دروازہ بند کرنے کی آواز آتی اور ان جالیوں پر ظلمت چھا جاتی۔ اور پھر — پھر مجھے لوگوں کی طرف دیکھنے کا ہوش نہ رہتا اور میری نگاہ میں مکانوں، منڈیروں اور دیواروں کا وہ انبار کانپتا اور مندر کا کلس چمکتا، چیلیں منڈلاتیں اور بادل رنگ جھلکاتے — اور بڑی گڑیا چیختے چلی جاتی۔

ان حالات میں کیسے شک کر سکتا تھا کہ ان رنگین سنہرے دھبوں کا راز ان پر آشکار ہے اور اگر آشکار بھی تھا تو وہ اس میں دلچسپی لیتے تھے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے، میں اس راز کے تحفظ کے خیال سے ان جالیوں میں کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہ کیا کرتا تھا لیکن میرا

دل دھک دھک بجتا رہتا اور میری کیفیت ایسی ہوتی جیسے کوئی ہمہ تن گوش ہو۔ پھر جب بھی موقع ملتا میں دبے پاؤں کوٹھے پر چڑھ جاتا اور سیڑھیوں کے اختتام پر سائے میں کھڑا ہو کر سگریٹ سلگا لیتا۔

سائے میں کھڑے ہونے سے میرا مقصد اپنے آپ کو اس نقش چغتائی سے نہیں، بلکہ اس چیختی ہوئی بڑھیا سے چھپانا ہوتا تھا۔ جو چیل کی طرح اس سنہرے کلس پر چھائی رہتی تھی۔ اس کی حفاظت کے لیے چوکس رہتی تھی۔ دو ایک بار میں نے دھوپ میں کھڑے ہونے کی جسارت بھی کی۔ مگر اس کے فوراً بعد ہی دھپ سے عقبی دروازہ بند ہو جاتا۔ اور جالی کی وہ آنکھیں بے نور ہو کر رہ جاتیں۔ ظاہر ہے کہ مینا یہ پسند نہ کرتی تھی کہ میں روشنی میں کھڑا ہو کر اس سنہرے مندر کے سیس نواؤں۔ اس لیے میں سیڑھیوں کے اندھیرے ہی میں کھڑا رہتا اور اسے اپنی دھندلی موجودگی کا احساس دینے کے لیے سگریٹ سلگا لیتا اور سگریٹ سلگتے ہی جالیاں روشن ہو جاتیں اور وہ "جگ سا پزل" منظر خاص پر آ جاتا۔ اور پھر میں اس تعویذ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف ہو جاتا۔ اب تو وہ ٹکڑے بے حد روشن اور رنگین ہو چکے تھے یا میری نظر مشاق ہو چکی تھی۔ بہرحال میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی روز دیوار کی وہ بند کھڑکی کھلے اور مینا چند ساعت کے لیے وہاں آ کھڑی ہو۔ وہ گھنی مژگاں جھکیں، اور آنکھوں کے سیاہ کونوں میں چمک لہرائے، بازو ہوں۔ لمبی لمبی انگلیاں ایک شان بے نیازی سے کائنات پر چھائی ہوں۔ اور وہ پراین کی گھومتی بل کھاتی لکیریں کائنات کو اپنے آغوش میں لے لیں۔

ایورگرین والوں کو قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ میں کسی حسین راز سے واقف ہوں یا ان گھومتی قوسی لکیروں کی لپیٹ میں آ گیا ہوں بلکہ وہ تو کہا کرتے تھے "کالے! تیرا کوئی چانس نہیں۔ میاں پنجاب کی لڑکی اذلی رنگ اور نقوش پسند نہیں کرتی اور وہ ہنستے۔

وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ لڑکیاں سانولے رنگ کو پسند نہیں کرتیں۔ بیوقوفوں کو معلوم نہ تھا کہ رنگوں کا تضاد سب سے زیادہ کشش کا باعث ہوتا ہے۔ کرشن کنھیا کی ہی مثال لیجئے۔ ان کا رنگ سانولا پیش کیا جاتا ہے اور پھر گوپیاں بار بار انہیں سانولے کنھیا کیوں کہتی تھیں۔ لیکن میرے ساتھی ان باتوں کو کیا جانتے تھے بیچارے۔ کرشن مہاراج کی بات چھوڑیئے میں نے اپنے کئی ایک دوستوں سے اس بارے میں تحقیق کی تھی۔ مثلاً رفعت حسین کو ہی لے لیجئے۔ کتنا گورا چٹا رنگ ہے اس کا، سارے کا سارا خاندان ہی کوئی نیس یا دودھ سے لت پت ہو رہا ہے لیکن جب اس کے ابا نے ایک گوری چٹی حسینہ سے اس کا رشتہ کرنے کی کوشش کی تو وہ میرے پاس آ کر رو دیا۔ "یار تباہ ہو گیا ہوں، سفید چٹک رنگ ہے اس کا۔ اتنا چوڑا اور سرخ منہ جیسے چقندر ہو۔" اور بالآخر اس نے ایک کالی کلوٹی چھوکری سے محبت لگا لی تھی جو عشق کے درجے تک جا پہنچی تھی۔

لیکن ایورگرین کے ساتھیوں کی یہ غلط فہمی میرے حق میں بڑی مفید تھی۔ لہذا میں نے اس موضوع پر ان سے کبھی بحث نہ کی تھی۔ بحث کرنا تو الگ رہا حالت یہ تھی کہ ان کے پاس بیٹھنا بھی میرے لیے دوبھر ہوتا جا رہا تھا۔ جی چاہتا کہ تنہائی میسر ہو۔ اور میں سگریٹ سلگا کر سیڑھیوں میں کھڑا ہو جاؤں ——— اب تو مینا میری موجودگی محسوس کر کے بار بار مسکراتی اور بہانے بہانے ایسی ایسی باتیں کر جاتی کہ میں دل مسوس کے رہ جاتا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن پنیا سے کھیلتی، باتیں کرتی اسے چھیڑتی اور ذرا خاموش نہ ہوتی جب تک وہ آفت کی پرکالہ بڑھیا خدا اسے غارت کرے۔ بھیں بھیں شروع نہ کر دیتی اور وہ بڑھیا، توبہ ہے جب بات کرنے پر آ جاتی تو گویا گھر میں زلزلہ آ جاتا۔ جیسے بگڑا ہوا ریڈیو پڑ پڑ کر رہا ہو۔ اسے لڑکی تجھے کسی کا خیال نہیں کسی کا لحاظ نہیں۔ اس پر مینا مسکرا کر مدھم آواز میں کہتی، "ادی اللہ اتنا خیال تو ہے، ہر دم لگا رہتا ہے۔ اور پھر میری طرف معنی خیز انداز سے دیکھتی اور وہ بڑھیا اور بھی بگڑتی توبہ کتنی باتیں بنانی آ گئی ہیں۔ اور پھر منہ کا

کلس نئے انداز سے چمکتا اور وہ چیل اس کے اردگرد چکر لگاتی اور میرا دل بلّیوں اُچھلتا۔ اُچھلے جاتا۔

پھر وہ واقعہ جس نے ہماری محبت کو ہمیشہ کے لیے استوار کر دیا اور اس کی تابانی کو دوام بخش دیا۔

ایک روز جب ہم سب کوٹھے پر بیٹھے تھے تو ہوا زوروں پر تھی اور جالی کے سوراخ منور تھے تو نہ جانے کاغذ کا ایک ٹکڑا اُڑتا ہُوا آیا۔ اور میں نے لپک کر اُسے دبوچ لیا۔ وہ رسالے کا ایک ورق تھا۔ میں نے بغیر کسی مقصد کے اس کاغذ کو اس بند کھڑکی کے نیچے دیوار کے اُبھرے ہوئے حصے پر رکھ کر اس پر ایک اینٹ رکھ دی۔ ایسا کرنے سے میرا کوئی خاص مقصد نہ تھا اور نہ ہی مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ چھوٹی سی تفصیل ہمارے رومان میں اتنی بڑی حیثیت اختیار کرے گی۔

اگلے روز جب میں کوٹھے پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کاغذ اپنی جگہ سے غائب ہے۔ خیر میں نے اس بات کو قطعی اہمیت نہ دی لیکن جب میں نے سیڑھیوں کے اختتام پر کھڑے ہو کر حسبِ معمول سگریٹ جلایا اور وہ جالی۔ بقعۂ نور ہوئی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مینا وہی کاغذ تھامے ہوئے بیٹھی تھی اور کاغذ کی طرف اشارے کر کے مسکرا رہی تھی۔

پہلی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ وہ بند کھڑکی کھل سکتی ہے، کھلتی ہے اور مینا نے اسے کھول کر وہ کاغذ اٹھایا ہے اور —— اور —— کاغذ بھی اسی طریق سے مینا کے پاس پہنچائے جا سکتے ہیں۔ یہ سوچتے ہی میں نیچے اُتر آیا اور اندر سے کمرہ بند کر کے مینا کو خط لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں چند ایک سطریں لکھ کر خط ختم کر دوں گا۔ لیکن نہ جانے کیا ہُوا مجھے۔ نہ جانے کہاں سے جذبات اُمڈتے چلے آئے اور میں ورق پر ورق سیاہ کرتا چلا گیا۔ خط ختم کرنے کے بعد مجھے اپنے جذبات کی شدت کا احساس ہُوا۔ ایک تفریحی تفصیل ایک دل لگی میرے لیے کس قدر اہمیت حاصل کر چکی تھی۔ اس روز پہلی مرتبہ میں اپنے جذبات کی حقیقت اور شدت سے واقف ہُوا۔

سیڑھیوں کے سامنے میں کھڑے ہو کر سگریٹ کے سلگتے انگارے کی روشنی میں مینا کو وہ خط دکھایا اور پھر شام کے جھٹپٹے میں اسے اسی اینٹ کے نیچے چھپا دیا جو بند کھڑکی کے نیچے بنے ہوئے چھجے پر رکھی تھی۔ اگلے روز صبح سویرے میں کوٹھے پر چڑھا۔ اینٹ اٹھائی۔ خط غائب تھا۔ میرے دل میں انبساط کی لہر سی دوڑ گئی۔

میرے لیے وہ دن گزارنا مشکل ہو گیا، رہ رہ کر خیال آتا، کیا مینا جواب دے گی۔ اگر اس نے جواب نہ دیا تو، اگر وہ ناراض ہو گئی تو، اگر اس نے عقبی دروازہ کھولنا بند کر دیا تو۔ سارا دن مجھے اسی قسم کے خیال ستاتے رہے۔ رات بھر نیند نہ آئی اور میں نے کروٹیں بدل بدل کر رات کاٹی اور پھر صبح سویرے ہی میں لوٹا لے کر اوپر بھاگا —— اینٹ کے نیچے کاغذ کا ایک کونا دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

کمرے میں واپس پہنچ کر دروازہ بند کر کے میں نے وہ کاغذ کھولا۔ کاغذ پر صرف ایک لائن لکھی ہوئی تھی: "اُوئی اللہ اگر یہ کسی اور کے ہاتھ پڑ جاتا تو؟"

اس کے بعد اس کے خط آہستہ آہستہ طویل ہوتے گئے اور ایک مہینے کی خط و کتابت کے بعد تو وہ دبے دبے الفاظ میں اظہارِ محبت بھی کرنے لگی۔ لیکن ہمارے خطوں میں نہ تو عنوان ہوتا تھا اور نہ ہم ایک دوسرے کا نام لکھا کرتے تاکہ اگر وہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو بھی اسے معلوم نہ ہو کہ وہ خط ہے۔

ہم باری باری خط لکھا کرتے تھے۔ ایک روز وہ لکھ کر اینٹ تلے رکھ دیتی اور اگلے روز میں اس کا جواب لکھ کر وہیں چھپا دیتا جسے وہ رات کے وقت کھڑکی کھول کر اٹھا لیتی تھی۔ کیسے پیارے دن تھے، ان رنگدار دھبوں نے اس جھکی جھکی آنکھ نے اس نغمہ ریز اُوئی اللہ نے

اور ان اشارات بھرے خطوط نے زندگی کے سادہ ورق کو سنہری بنا دیا تھا۔ یہ کیفیت صرف مینا کے خطوط کا نتیجہ نہ تھی۔ میرے اپنے جذبات میرے لیے انوکھے اور پرکیف معلوم ہوتے۔ جب میں اسے خط لکھتا تو میرے دل سے نئے نئے انوکھے خلوص بھرے جذبات ابھرتے۔ اور میں ان کی سنجیدگی اور خلوص پہ حیران ہوتا۔ ایسے جذبات جن کے وجود کا مجھے خود علم نہ تھا جو نہ جانے دل کی کن گہرائیوں سے ابھرتے تھے ان ہی جذبات کی وجہ سے یا نہ جانے کیوں اس دور کے تعلق سے جو محض وقت کٹی اور تفریح کے لیے پیدا ہو گیا تھا۔ ایک بے نام سنجیدگی اور پاکیزگی پیدا ہوئی۔ نہ جانے کیا وجہ تھی۔ ایک ماہ کے قلیل عرصے میں ایور گرین کے تمام افراد سنجیدہ ہو چکے تھے۔ جمیل نے تو بالکل ہی چپ سادھ رکھی تھی۔ اگرچہ وہ طبعی طور پہ خاموش لڑکا تھا اور اس کا بڑے سے بڑا اظہار بھی ایک خاموش مسکراہٹ یا ایک مدھم سرگوشی تک محدود ہوتا تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں بوندا باندی سی ہونے لگتی تھی۔ لیکن اب تو وہ بالکل ہی خاموش ہو چکا تھا۔

وہ صبح سویرے بیدار ہوتا اور ہمارے جاگنے سے پہلے ہی تمام ضروریات سے فارغ ہو کر بیٹھ جاتا۔ کالج سے واپسی کے بعد وہ چپ چاپ میز پہ بیٹھ کر مطالعے میں مصروف رہتا۔ اسلم نے کرکٹ کھیلنے کی نئی مصروفیات پیدا کر لی تھیں اور زیادہ تر وقت اسی میں بسر کرتا تھا۔ خدا بخش حسب معمول یا تو صمدو کی دوکان پر چلا جاتا اور یا بدھو سے باتیں کرنے میں مشغول رہتا اور اُوئی اللہ کی آواز سن کر تہ بند جھاڑتا اور کہتا میاں بدھو کچھ سنا جناب نے اور بدھو کی پھوٹ پھس سے کھل جاتی اور چھینٹوں کا فوارہ چلتا۔ جی ہاں جی بالکل جی" لیکن بدھو" خدا بخش کھجاتے ہوئے جواب دیتا۔ یہ تو پیڑ گننے کا بکھیڑا ہے اور ہم ٹھہرے آم چوسنے والے اور بدھو بے سوچے سمجھے ہنستا اور ربڑ کی گڑیا چیختی اور میری نگاہوں میں سنہرے کلس پہ چیلیں منڈلاتیں۔

پھر وہ منحوس دن طلوع ہوا۔

اس روز جب میں کالج سے واپس آ رہا تھا تو گلی میں مینا کے مکان کے صدر دروازے پر وہ بڑھیا برقعہ پہنے کھڑی چلا رہی تھی "لڑکی ذرا خیال رکھنا مینا کو باہر نہ جانے دینا میں شام تک لوٹ آؤں گی۔"

بڑھیا کو باہر جاتے دیکھ کر میں یہ سمجھا کہ مطلع صاف ہے اور بھاگ کر سیدھا کوٹھے پر جا چڑھا اور سیڑھیوں کے دھندلکے میں کھڑا ہونے کے بجائے باہر دھوپ میں جا کھڑا ہوا۔ جالی کے سوراخ روشن تھے اور مینا حسب معمول کرسی پر بیٹھی پنیا سے کھیل رہی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ حسب معمول گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی اور نگاہیں جھکی جھکی تھیں۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا اور میں پہلی مرتبہ دیوی کو سیس نوانے کے لیے جھک گیا۔

کھٹ! عقبی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ اور میں چونکا۔ جالیوں پر ظلمت طاری تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو میں حیران کھڑا رہا پھر چپ چاپ نیچے چلا آیا۔

پھر بیٹھے بٹھائے دفعتاً مجھے خیال آیا۔ شاید بڑھیا کے علاوہ گھر میں کوئی اور بزرگ موجود ہو۔ شاید کوئی مہمان آیا ہوا ہو جس کے سامنے تشہیر گوارا نہ ہو۔ اس خیال سے مجھے تسلی سی ہوئی۔ لپک کر کوٹھے پر گیا۔ لیکن میرے سگریٹ سلگانے کے باوجود جالیاں روشن نہ ہوئیں۔ اس روز میں کئی ایک مرتبہ کوٹھے پر گیا لیکن بے سود۔

میرا جی چاہتا تھا کہ کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں سے اسے ایک خط لکھوں لیکن اس روز مینا کی باری تھی، اگلے روز مجھے اس کا خط ملنا تھا۔

تمام واقعہ بیان کر دوں۔

جمیل سے مختصر طور پہ تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد میں نے کہا "جمیل مینا تمہاری ہے میری نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ غلط فہمی کی وجہ سے میں نے اسے تم سے چھیننے کی کوشش کی۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے سامنے مینا کے تمام خطوط رکھ دیئے۔ جمیل حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی بوندا باندی نے کوئی اور ہی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جیسے بوندیں بڑی ہو گئی ہوں۔ اور ان کا تواتر ٹوٹتا جا رہا ہو اور ان میں دکھ کی جھلک پیدا ہو گئی ہو۔ دفعتہً ایک بوند اس کے گال پہ آ گری اور اس نے منہ موڑ لیا اور میں وہ خطوط وہیں چھوڑ کر باہر چلا آیا اور سوٹ کیس اٹھا کر بس کے اڈے کی طرف چل دیا۔

بس جا رہی تھی۔ ویرانے میں درخت سر جھکائے پیچھے سرکتے جا رہے تھے۔ زرد کھیتوں میں پودوں نے سر جھکا رکھے تھے خوشوں کی مڑی ہوئی انگلیاں اشارے کر رہی تھیں۔ جاؤ، چلے جاؤ۔ دور۔ ارد گرد کے آسمان پہ ایک اداس دھندلکا چھایا ہوا تھا۔

گاؤں میں درختوں کی چھاؤں میں چارپائی پہ پڑے پڑے میری نگاہ پتوں کی طرف منعطف ہو جاتی۔ سبز پتوں میں سوراخ سے روشن ہو جاتے، "اوئی اللہ، دور کوئی پرندہ چلاتا۔ اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ اور اندر گھر میں جا کر ننھے سے کھیلنے کی کوشش کرنے لگتا۔ دفعتہً باہر دادی اماں چلائی "ارے ہے لڑکیو۔ ابھی ہنڈیا نہیں چڑھائی تم نے۔" اور مجھے محسوس ہوتا کہ ربڑ کی گڑیا چیخ رہی ہے۔ پھر نگاہوں کے سامنے زمین دھبے ناچنے لگتے اور میں گھبرا کر باہر نکل آتا۔

ابھی گاؤں آئے چار دن ہوئے تھے کہ ایک تار موصول ہوا۔ کھول کر دیکھا تو جمیل کا تار تھا۔ لکھا تھا "فوراً آؤ ضروری ہے۔"

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر جمیل کو مجھے بلانے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ وہ جالیوں والا واقعہ تو ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بارے میں تو اب بات کرنا بھی بے کار تھا۔ وہ بات تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ نہ جانے پھر کیا وجہ تھی۔ بہر حال میں نے سوچا جانا ضرور چاہیئے ورنہ جمیل کیا کہے گا۔ اور جمیل کا قصور بھی تو کوئی نہیں۔ اگر مینا جمیل سے محبت کرتی ہے تو اس میں جمیل کا کیا قصور۔

جب میں ایوریگرین پہنچا۔ تو گھر میں بدھو کے سوا کوئی نہ تھا۔ بدھو نے میری طرف دیکھا اور وہ پھوٹ کھلی "ہی ہی ہی بابو جی آ گئے۔" میں نے پوچھا "بدھو گھر میں کوئی نہیں؟"

"جی ہاں جی کوئی بھی نہیں" وہ بولا۔

اتفاق سے میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ دروازے میں جمیل کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ارے بدھو! جمیل صاحب تو یہ رہے"

"جی ہاں" بدھو ہنسنے لگا "جمیل صاحب یہیں ہیں"

"کیوں خیریت تو ہے؟" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جمیل سے پوچھا۔

"ہاں" جمیل نے کہا "میں جا رہا ہوں" ساتھ ہی اس نے بدھو کو آواز دی "بدھو جا کر تانگہ لے آؤ"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"اماں نے بلایا ہے۔"

"کب آؤ گے؟"

"معلوم نہیں۔ جب اماں اجازت دے گی" اور کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"آخر کیا بات ہے جس کے لیے مجھے بلایا ہے؟"

"بہت ضروری بات ہے، بے حد ضروری" وہ مسکرانے لگا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ساون نہیں بھادوں کا سا عالم تھا۔

"بتاؤ نا" پھر میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ذرا ٹھہرو" وہ بولا "بڑا اچھا کیا تم آ گئے۔ بہت اچھا کیا۔ مجھے معلوم تھا تم میری بات نہ ٹالو گے۔"

اس کی آواز عجیب سی سنائی دے رہی تھی۔ جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو۔ اور اس کی مسکراہٹ میں مجبوری کی واضح جھلک تھی۔

"ٹانگا آ گیا بابو جی۔ بدھو چلایا

جمیل نے سوٹ کیس اٹھا لیا۔

"لیکن وہ بات" میں نے بے تابانہ پوچھا۔

"میرے ساتھ آؤ" اس نے چاروں طرف حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "آ جاؤ ——"

ٹانگے میں بیٹھ کر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ یہ لو۔ اس میں سب کچھ تحریر ہے۔ اور پھر آخری بار مسکرانے کی شدید کوشش کی۔

تانگے کے روانہ ہونے کے بعد میں لاج کی طرف بھاگا۔ اور ایک کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کنڈی بند کر کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور جمیل کا وہ مختصر خط پڑھنے لگا۔

"مینا تمہاری ہے، میری نہیں۔ اسے تمہارے جذبات سے عشق ہے شکل و صورت
کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ میں نے تمہارے جانے کے بعد صرف ایک خط اسے
لکھا تھا۔ اس کا جواب ملفوف ہے پڑھ لو۔

میں نے جلدی سے ملفوف خط نکالا۔ لکھا تھا۔

"آپ اس کالے کلوٹے کو منع کیوں نہیں کرتے۔ یہ دیکھو آج
اس نے مجھے خط لکھنے کی جسارت کی ہے۔ اس کی اتنی ہمت
ایسا خط لکھتے ہوئے اُسے شرم نہیں آئی۔ جیسا اس کا رنگ ہے
ویسے ہی اس کے خیالات ہیں آپ اسے منع کر دیجئے ورنہ ——

میں نے پھر سے جمیل کا خط پڑھنا شروع کیا۔

مینا تمہاری ہے۔ میری نہیں، میں جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے ہمیشہ
کے لیے مینا کے سب وہ خطوط جو تم مجھے دے گئے تھے ملفوف
ہیں۔ خدا حافظ۔"

"مینا میری ہے"۔ مجھے یقین نہ آتا تھا۔ وہ ایک کالے کلوٹے کی کیسے ہو سکتی ہے! نہیں، وہ میری نہیں۔ ان خیالات کے باوجود میں کوٹھے پر چڑھتا گیا۔ اور سیڑھیوں کے بالائی حصے کے اندھیرے میں پہنچ کر رُک کر جالیوں کی طرف دیکھنے لگا — ایں! مینا کو بیٹھے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ منہ سُتا ہوا، بال پریشان تھے اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے ادھر دیکھ رہی تھی جیسے کسی کے انتظار میں تباہ حال ہو۔

نہ جانے شدتِ شوق سے یا آزمانے کے لیے میں سیڑھیوں کے اندھیرے سے نکل کر باہر دھوپ میں جا کھڑا ہوا۔ دفعتہً اس کے چہرے پر غصے اور نفرت کے آثار بجلی کی طرح چمکے اور وہ اُٹھ کر باہر نکل گئی۔

یہ دیکھ کر میں پھر سے سیڑھیوں کے اندھیرے میں جا کھڑا ہوا۔ اور سوچنے لگا۔ وہ میری نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہیں۔ میرے اردگرد چھتوں، دیواروں اور مکانوں کا وہی ویرانہ پھیلنے لگا۔ وہی یاس وہی مردنی، کتنا بدنصیب تھا میں! میں نے ہنسی کھیل میں اپنی زندگی تباہ کر لی تھی۔ لیکن اس دنیا میں آخر کون ہے جو تباہ نہیں ہوا۔

جمیل، میں اور اور — دفعتاً مجھے خیال آیا۔ ایک نیا خیال۔ میرے ذہن میں تصویر کا ایک نیا رُخ اُبھرنے لگا۔ وہ یہ کہ ہم دونوں سے زیادہ تباہ حال مینا ہے۔ جسے ایک شخص کی شکل و صورت اور دوسرے کے جذبات سے محبت ہے اور جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ دو الگ الگ اشخاص ہیں۔

میری نگاہ جالی کی طرف منعطف ہو گئی۔ مینا پھر آ کر وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ عقبی دروازے کے پاس اسی طرح تباہ حال پریشان مژگاں جھکی ہوئی نگاہیں، کھوئی ہوئی جیسے مینا خالی ہو چکی ہو۔ "اے لڑکی تو یہاں کیا کر رہی ہے۔" دفعتہً ربڑ کی گڑیا چیخنے لگی: "نہ جانے کیا کرتی رہتی ہے۔"

"اوئی اللہ میں کیا کروں"۔ مندر کا ناقوس یوں بجا جیسے وہ ٹوٹ چکا ہو۔

یہ حادثے

حجاب امتیاز علی

حادثے کا نام سن کر میرا ذہن ہمیشہ انسان کی ناتمام تمناؤں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تشنہ تمنائیں دنیا میں حادثات بن کر رونما ہوتی ہیں۔ لوگ انھیں اتفاقات کا نتیجہ سمجھتے ہیں مگر تجربات، مشاہدات نے مجھ پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسان حادثے کی تیاری خفیہ اور بالکل انجان طریقوں سے برسوں کرتا رہتا ہے، تب کہیں جا کر دنیا میں ایک حادثہ رونما ہوتا ہے۔

اگر آپ کو میری رائے سے اختلاف ہے تو ذیل کا واقعہ سنیے:۔

یہ گزشتہ خزاؤں کا ذکر ہے۔ جب میں ایک اعصابی مرض سے نئی نئی صحت یاب ہوئی تھی اور ہنگاموں سے دور آرام و سکون کی خاطر چند دنوں کے لیے بوڑھے ڈاکٹر گار کے پاس شہ نیل کے چمکیلے ساحلوں پہ آئی ہوئی تھی۔

رات بھیانک اور شدید طوفانی تھی۔ سمندر میں تند تلاطم آگیا تھا۔ موجیں اٹھ اٹھ کر آسمان کا منہ چوم رہی تھیں اور درخت مارے خوف کے جھک جھک کر مادرِ گیتی کے سینے سے چمٹ گئے تھے۔

میں افسردہ اور سہمی ہوئی سی تھی۔ ایک اعصابی ٹکیہ پانی میں گھول کر پی لی تھی اور اپنے سیامی بلے کو گود میں لیے چپ چاپ آتش دان کے پاس بیٹھی ہوئی ہوا کی سسکیوں کو مجبوراً سن رہی تھی۔

ڈاکٹر گار اپنی نسوار کی ڈبیا پر انگلی بجاتے ہوئے حسبِ معمول مجھے بہلانے کے لیے اپنی طبی تجربات سے معمور زندگی کے واقعات سنا رہا تھا۔

موسم کے سلسلے میں میری افسردگی دیکھ کر کہنے لگا "بیٹی روحی، باہر کے طوفان کو بھول جاؤ۔ تھوڑی دیر کی بات ہے۔ ابھی تھم جائے گا اور تاروں بھری رات نکل آئے گی۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا تم سے؟ مریضوں کے حالات ——— امراض اور ان کے مزاج بھی عجیب ہوتے ہیں۔ میرا ایک مریض ایسے خطرناک مرض میں مبتلا تھا کہ جہاں بھی اسے کوئی خاتون نظر آتی اس کی ایک آنکھ خود بخود بند ہو جاتی تھی ———"

"ہائیں ———؟" میں نے حیران ہو کر کہا "اور دوسری آنکھ ڈاکٹر؟"

"وہ کھلی کی کھلی رہتی"

یہ سن کر میں زور سے ہنس پڑی۔

مگر یکلخت ڈاکٹر گار کا چہرہ سنجیدہ سا ہو گیا۔ وہ غور سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر بولا "یہ کیا تھا روحی؟"

میں اکتا کر بولی "کچھ نہیں۔ سرِشام ہی سے حواصلیں تیں تیں کرنے لگی تھیں۔ انھیں کی آواز ہو گی۔ طوفانِ نوح کی آمد آمد ہے ڈاکٹر۔"

"مگر یہ حواصلوں کی آواز تو نہیں معلوم ہوتی" اس نے پھر کچھ سننے کی کوشش کی۔

"پھر کس کی آواز ہے؟" میں متوحش ہو کر پوچھنے لگی۔

دریچے اور دروازے بند تھے۔ باہر ساحل پر طوفانی ہوائیں خوفناک سیٹیاں بجا رہی تھیں اور پوری کائنات پر جہنم کی سی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر ڈگار دریچے کی طرف گیا۔ اس کے شیشوں میں سے جھانک کر باہر دیکھنے لگا پھر بولا "کچھ نظر نہیں آتا۔"

میں نے اپنے سیامی بلّے کو اپنے سے چمٹا لیا اور سراسیمہ ہو کر بولی "اُف — مجھے مالیخولیا ہو جائے گا۔ عجیب رات ہے خیریت سے گزرتی معلوم نہیں ہوتی۔ آج سرِشام ہی آسمان گہرے کاسنی رنگ کا ہو گیا تھا اور میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا کہ آج کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے گا۔"

"کس قسم کا؟" وہ آگ کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

میں سوچ کر بولی "کوئی منحوس سا واقعہ — مثلاً کوئی جہاز سمندر میں ڈوب جائے گا — یا روشنی کا مینار ہواؤں میں گھوم گھوم کر یکلخت پاش پاش ہو جائے گا۔ دنیا میں جتنے بھی خوفناک اور پُراسرار واقعات رونما ہوتے ہیں وہ برسات کی کالی طوفانی راتوں ہی میں ہوتے ہیں۔"

ڈاکٹر ڈگار ہنس پڑا۔ ایک موٹا سا اطالوی سگار ہونٹوں میں دبا کر بولا "تم بڑی وہمی ہو روحی۔"

میں نے کہا "ہزار ہماری تربیت سائنس، عقل اور منطق کی فضاؤں میں ہوئی ہے مگر انسان داخلی طور پر وہی ہے جو آج سے صدیوں پہلے زمانہ جاہلیت میں تھا۔ وہ فطرتاً وحشی اور طلسم پرست ذہنیت کا ہوتا ہے۔ اُف — یہ کیا ہے ڈاکٹر؟ انسانی چیخ؟"

"نہیں روحی۔ طوفان کا شور ہے۔ سنسان ساحلوں پر خزاں کی ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔" میں متفکر ہو کر بولی "کچھ دیر ہوئی مجھے بجلی کی تیز چمک میں یوں معلوم ہوا کہ دُور پل پر کچھ لوگ دہشت انگیز طریق پر اترتے چڑھتے اور چیختے چلاتے ہیں۔ نہ جانے وہاں کیا حادثہ پیش آیا ہے!"

ڈاکٹر ڈگار کہنے لگا "عین ممکن ہے کہ نظر کا دھوکا ہو، دریچوں کے شیشوں پر ٹہنیوں کا عکس مرتعش ہو۔ وحشی ہوائیں پیڑوں کو اُکھیڑ رہی ہیں۔"

"ہاں ممکن ہے نظر کا دھوکا ہو، مگر — ہائیں — دور یہ ہجوم کا شور کیسا ہے — مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ آج کی رات خیریت سے نہیں گزرے گی! یہ چیخ پکار تو قریب ہوتی جا رہی ہے —"

اور یکلخت کسی نے بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور ساتھ ہی لوگوں کے بولنے کراہنے اور رونے کی مختلف آوازوں نے طوفانی رات کو اور بھی بھیانک بنا دیا۔

ڈاکٹر ڈگار دروازے کی طرف لپکا۔ دروازے کے کھلتے ہی پانی اور ہوا کے ایک زبردست تھپیڑے نے مجھے پیچھے کی طرف دھکیل

دیا اور جو کچھ میں نے وہاں دیکھا اسے سامنے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ طوفانی راتوں میں خوفناک آفات نازل ہوا کرتی ہیں ۔

چار آدمی ایک لاش کو چارپائی پر ڈالے اندر کمرے میں داخل ہوئے ۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان جو بظاہر ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا کمرے میں گھس آیا ۔ اس کے چہرے پر گہری خراشیں اور کہیں کہیں خون کے داغ تھے ۔

ڈاکٹر گار ان لوگوں سے کچھ دیر بات چیت کرنے کے بعد میری طرف آیا اور جلدی جلدی کہنے لگا ”موٹر کا ایک حادثہ ہو گیا ہے روحی ۔ موٹر پل پر سے وادی میں الٹ گئی تھی ۔ ہاں بہت سخت حادثہ ہے ۔ یہ لوگ فوری امداد کے لیے میرے پاس آئے ہیں “

اتنا کہہ کر وہ چارپائی کی طرف گیا اور جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگا ۔

ساتھی نوجوان نے بے ساختگی سے پوچھا ”زندہ ہے نا ؟ “

ڈاکٹر گار معائنہ ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا ۔ افسردہ لہجے میں بولا ” دوست ہیں آپ کے ؟ “

” کیا ختم ہو گئے ؟ “ وہ پھر چلایا ۔

” ابھی نہیں “ ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا ” ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے ۔ فوری اپریشن کی ضرورت ہے ۔ میں انھیں شہر کے ہسپتال میں لے جا رہا ہوں ۔ شاید بچ جائیں “

” ڈاکٹر ——— ! “ نوجوان نے التجا کی ” آپ کو انھیں بچانا ہو گا ۔ یہ میرے بڑے بھائی ہیں ۔ اگر یہ ختم ہو گئے تو میں خودکشی کر لوں گا ۔ مجھے ان سے بے پایاں محبت ہے ——— ہائے میں نے اپنے بھائی کو مارا ہے ۔ میں اس حادثے کا ذمہ وار ہوں ۔ کار میں چلا رہا تھا ۔ وہ مجھے منع کرتا رہا مگر میں نے اس کی ایک نہ سنی ۔ ایسی طوفانی رات میں اس کے بار ہا منع کرنے کے باوجود میں کار لے کر پل پر چڑھ گیا ۔ بارش کی وجہ سے زمین پر کیچڑ ہو رہی تھی ۔ وہ روکتا رہا ۔ التجائیں کرتا رہا ۔ منتیں کر کر کے مجھے باز رکھنے کی کوشش کی مگر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ کار لے کر آگے کو بڑھتا ہی چلا گیا ۔ دراصل میں اسے نصف شب تک منزل پر پہنچا دینا چاہتا تھا ۔ اس کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا اس لیے اس کا وہاں پہنچنا ضروری تھا ۔ یہ خبر نہ تھی کہ وہ میرے ہاتھوں اس حادثے کا شکار ہو جائے گا “

اور یہ کہتے کہتے وہ یکلخت زمین پر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا ۔ ڈاکٹر گار نے اس کی ٹائی کھول کر پھینک دی ۔ اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگا ۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا ” وقت کم ہے ۔ مجروح کو فوری اپریشن کی ضرورت ہے ۔ یہ آدمی جلدی ہوش میں آ جائے گا ۔ اسے تو محض ذہنی دھچکا لگا ہے ۔ خوف کی وجہ سے بیہوش ہو گیا ۔ میں مجروح کو لے کر ہسپتال لے جا رہا ہوں ۔ اس کی زندگی کی امید کم ہے “

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر گار نے جلدی سے اپنا بارانی کوٹ پہنا اور لوگوں کی مدد سے مجروح کو کار میں ڈلوا کر رات کے اندھیرے اور طوفان کے مسلسل شور میں ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا ۔

اس کے جانے کے بعد میں بیہوش مریض کی طرف متوجہ ہو گئی ۔ اپنے سیاہ رو سپاہی بتے کو اونی شال میں لپیٹ کر اور اس کے سر پر کنٹوپ کس کر آتشدان کے پاس ایک مخملی نرم کرسی پر بٹھا دیا اور خود ڈاکٹر گار کی ہدایات کے مطابق مریض کے سرہانے بیٹھ کر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ اسے دوا پلاؤں ۔

کچھ دیر بعد مجھے نیند سی آنے لگی ۔ میں ایک کشن کے سہارے نیم دراز ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں مگر اچانک کراہنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی ۔

"میں نے اس کی جان لی ہے ـــــ میں نے اسے مارا ہے ـــــ میں گناہگار ہوں۔ میں"

وہ پوری طرح ہوش میں نہ آیا تھا۔ اس کی زبان سے عجیب عجیب نامکمل فقرے نکل رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اسے بیہوش دیکھ کر مدفون جذبات اپنی پرانی قبروں سے سر باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس کا چہرہ لاش کی طرح زرد اور اس کا جسم برف کی طرح سرد تھا۔

میں نے اس پر جھک کر آہستہ سے کہا "دوا پی لو!"

میری آواز سن کر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا "مہرو؟" اور ناراضگی کے انداز میں سر پھیر لیا۔

میں نے ملائمت سے کہا "لو دوا پی لو"

وہ یکدم پھٹ پڑا "ہائے تمہیں اب تک مجھ سے محبت ہے مہرو؟ مجھ گناہگار سے؟ مجھے تنہا چھوڑ دو اور چلی جاؤ۔"

میں پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ کیا کروں، پھر بولی "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں مہرو نہیں ہوں۔ دوا پی لو"

"مہرو نہیں ہو تو اور کون ہو؟ میں تمہارے قابل نہیں پھر کیوں دوا پلا رہی ہو؟ دھوکا دیتی ہو مجھے؟"

میں ذرا غصہ سے بولی "مجھے کیا معلوم کہ مہرو کون ہے؟ میں تو تم کو بھی نہیں جانتی۔ تم کار کے ایک حادثے میں زخمی ہو گئے اور یہاں لائے گئے تھے۔ مہرو کون ہے؟"

"میری بھاوج ہے!"

"اور تمہیں اس سے دلچسپی ہے؟" میں نے دوا پلاتے ہوئے پوچھا۔

"اسے بھی مجھ سے دلچسپی تھی" اب اسے ہوش آ گیا تھا۔ بات کرتے کرتے رُک گیا اور پوچھا "اور میرا بھائی؟ وہ کہاں ہے؟ کیا مر گیا؟"

میں نے کہا "اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ فوری اپریشن کے لیے ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ فکر نہ کرو وہ بچ جائے گا۔"

اس نے گردن پھیر لی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "نہیں ـــــ وہ نہیں بچے گا۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔"

"وہ ابھی زندہ ہے" میں نے اسے تسلی دی۔

"مگر کار پل پر سے الٹ گئی تھی اور وہ ایک کھڈ میں جا گرا تھا۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتا" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم نہیں چاہتے کہ وہ زندہ رہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اگر وہ مر گیا تو میں بھی خودکشی کر لوں گا۔ مجھے اپنے بھائی سے محبت ہے۔ میں تمام عمر اس سے محبت کرتا رہا مگر قسمت کو یہی منظور تھا کہ وہ میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔"

"قسمت کو تو نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے تم کو یہی منظور ہے کہ وہ موت کے گھاٹ اترے۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے مگر تم بے خیالی میں اس کے متعلق یوں باتیں کر رہے ہو جیسے وہ مر چکا ہے۔ میرے یقین دلانے کے باوجود کہ ابھی وہ زندہ ہے تمہیں اس کی زندگی کا یقین نہیں آتا۔ اس پر بھی تم اپنے بھائی کی محبت کے دعویدار ہو؟"

"کیا تمہیں میری محبت میں شبہ ہے؟" اس نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

"میرا اس سے کیا تعلق؟" میں نے بے پروائی سے کہا "البتہ تمہیں اپنی محبت کے متعلق شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم اس کے متعلق یوں بات نہ کرتے کہ وہ مر چکا ہے۔"

وہ چونک سا پڑا۔ ذرا مدھم لہجے میں بولا "میں بھول گیا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔"

"انسانی حافظہ اپنے چاہنے والوں کے متعلق خوشگوار باتیں سوچنے کا عادی ہوتا ہے" میں نے دبی زبان سے کہا۔

اسے غصہ آ گیا "اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو شبہ ہے کہ میں اپنے بھائی کا دشمن ہوں؟ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ آج کا واقعہ محض ایک اتفاقی حادثہ ہے کہ میں بچ گیا اور وہ زخمی ہو گیا۔ مجھے اپنے بھائی سے بڑی گہری محبت ہے۔ میری زندگی کا ایک ایک واقعہ اس بات کا شاہد ہے کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے! کسی کو کیا علم کہ میں نے اپنے بھائی کے لیے کیسی کیسی عظیم قربانیاں کی ہیں اور کبھی اُف تک نہیں کی۔"

"جس محبت میں قربانیاں ہوں اور اُف کرنے کی مہلت بھی نہ ملے۔ ایسی محبت پنپتی نہیں۔ کسی دن اچانک باؤلے کتے کی طرح سر چڑھا کر اپنے محبوب کو کاٹ کھاتی ہے" میں نے افسردہ ہو کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں اب تک اس بات کا یقین نہیں آیا کہ مجھے اپنے بھائی سے گہری محبت ہے۔ پتھر کا بھی کلیجہ ہو تو پانی بن کر بہہ جائے۔ میں نے اپنے بھائی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ اپنی زندگی، اپنی روح، اپنا بچپن، اپنی جوانی حتیٰ کہ اپنے حسن و عشق کی کُل کائنات اس پر قربان کر ڈالی۔ اور پھر بھی دنیا کو شبہ ہے کہ میں اپنے بھائی سے محبت نہیں کرتا۔ خدا کے لیے میری داستان سنو اور انصاف کرو کہ میں نے اس سے کیا کیا اور اس نے مجھ سے کیا کیا؟ شاید اس کی اور میری زندگی کی شبِ تاریک کی سحر نہ ہو سکے اس لیے میں اپنی داستان بیان کر کے دل کا بوجھ ہی ہلکا کر لوں گا۔ اس کی جفاؤں اور میری وفاؤں کی داستان طویل ہے۔ اس کی محبت نے میری زبان کو بند اور میرے جذبات کو مفلوج کر دیا تھا اس لیے میں اس کی جفاؤں کا جواب نہ دے سکا۔"

میں بولی "مگر میرا خیال ہے کہ محبت عمل اور زندگی کا نام ہے۔ موت کا نام نہیں۔ وہ کسی کو مفلوج کر دے تو پھر وہ محبت نہیں رہتی ——"

اور وہ کہے جا رہا تھا "میری داستان سنو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ میں نے کیا کچھ اس کی محبت میں برداشت کیا ہے۔ حد ہو گئی۔ ایک مرد سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی مسکرا کر بہا سکتا ہے۔ مگر اپنی محبوبہ کو اپنی آغوشِ تمنا سے زبردستی نوچ کر کسی قیمت پر بھی دوسرے مرد کی زینتِ آغوش نہیں بنا سکتا۔ مگر یہ کام میں نے کیا۔ اپنے بڑے بھائی کی محبت کی خاطر اپنی محبت کا گلا گھونٹا۔ جی چاہتا تھا کہ اس کا اور اپنا گلا بھی ساتھ ہی گھونٹ لوں مگر نہیں وہ میرا بھائی تھا۔"

وہ ہمیشہ سے میرا مدِ مقابل بنا رہا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک زندگی کے ہر شعبے میں ایک نامعلوم طریق پر اس کا اور میرا مقابلہ ہوتا رہا۔ جیسے زندگی کے اکھاڑے میں دو پہلوان لڑ رہے ہوں۔ ایک کمزور —— ایک طاقتور! مگر اس خفیہ لڑائی کا ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی علم نہ ہونے پایا۔ وہ وجیہہ اور خوبصورت تھا، میں نحیف اور قبول صورت۔ وہ ذہین اور ملنسار تھا، میں شرمیلا اور کم گو۔ اس کے دوستوں کا حلقہ وسیع تھا۔ میرا دنیا میں کوئی بھی دوست نہ تھا سوائے میری ماں کے اور وہ بھی اکثر موقعوں پر اپنے بڑے بیٹے ہی کو مجھ پر ترجیح دینے لگ جاتی تھی۔ وہ کھیلوں اور ورزشی نمائشوں میں پیش پیش رہتا تھا، میں خلوت پسند اور مطالعۂ کتب کا شوقین تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کردار محفلوں کی جان ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ دوستوں کی آنکھ کا تارا اور رشتہ داروں کا پیارا تھا۔ کئی

دفعہ مجھے حسد پیدا ہوا۔ مگر پھر محبت نے مجھ پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ کئی دفعہ مجھے اس پر غصہ آیا مگر میں نے ضبط کر لیا۔ آخر وہ میرا بھائی ہے، کوئی غیر نہیں۔

یہ تو خیر اوائل عمر اور لڑکپن کا زمانہ تھا۔ پھر جب جوانی کی پُر شور گھٹا ولولہ بن کر اٹھی اور حسن و عشق کے ساون بھادوں برسانے لگی تو وہ پھر نئے انداز سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

کالج میں تیراکی کا مقابلہ تھا۔ میرے ہزار انکار کرنے پر بھی دوستوں نے اور خود اس نے نہ مانا۔ میرا اور اس کا مقابلہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ ہار ہمیشہ میری ہی قسمت میں تھی چنانچہ میں ہار گیا۔ اور سخت دل شکستہ ہو گیا۔ میرا بھائی مجھے منانے اور تسلی دلاسے دینے لگا۔ باتوں باتوں میں اور مذاق مذاق میں اس نے مجھے پانی میں دھکا دے دیا۔ اتفاق کی بات کہ میں پانی میں سنبھل کر تیر نہ سکا اور غوطے کھانے لگا۔ پانی پھیپھڑوں میں پہنچ گیا اور مجھے نمونیہ ہو گیا۔

تین مہینے میں ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار پڑا رہا۔

اس بیماری کے دوران میں مجھے یوں شبہ ہونے لگا کہ شاید میری زندگی کی شبِ تاریک میں ایک نورانی سحر جھلملا رہی ہے۔ بات یہ تھی کہ ایک خوبصورت نرس میری خدمت کے لیے مقرر ہوئی۔ جب وہ دوا پلانے کے لیے مجھ پر جھکتی تو مجھے شبہ ہوتا کہ اس کی آنکھیں محبت کے نور سے جگمگا رہی ہیں۔ بعض وقت مجھے یقین نہ آتا۔ اسے میں واہمہ سمجھتا۔ اپنے دل کو سمجھاتا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی مجھ سے محبت کرے۔

مگر ایک رات تیز بخار غنودگی بن کر میرے ہوش و حواس پر چھا رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ یہ لڑکی جھک کر میرے بالوں کو چوم رہی ہے۔ میری سرد اور تاریک زندگی میں تپشِ محبت کی اس پہلی کرن نے ہلکی ہلکی چاندنی کر دی۔

جب میری حالت کچھ سنبھلی تو میں نے دوسرے مریضوں سے بھی یہی سُنا کہ مہرو نے بڑی جانفشانی سے میری تیمارداری کی ہے۔

رفتہ رفتہ مجھے اس کی محبت کا یقین آتا گیا۔ مگر ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اس بات کا علم نہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کی محبت کو سمجھ گئے ہیں۔

میں گھنٹوں بستر پر لیٹا ہوائی قلعے بنایا کرتا کہ جونہی طبیعت سنبھلے گی میں مہرو سے اظہارِ محبت کروں گا۔ کئی دفعہ کوشش کی آج اظہارِ تمنا کر ہی دوں مگر عین وقت پر نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا تھا کہ شدتِ جذبات سے زبان گنگ ہو کر رہ جاتی تھی۔ میں داخلی المزاج انسان تھا ——“ جس کی محبت اور نفرت دونوں داخلی ہوتی ہیں ——” بڑی دیر کے بعد میں نے کچھ کہا پھر اس کی داستان سننے لگی۔

اس نے میرا فقرہ سُنا نہیں، ایک روانی کے عالم میں کہتا رہا ”کئی دفعہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مہرو اس بات کی منتظر ہے کہ جو آگ دل میں سلگ رہی ہے اس کے شعلے زبان تک پہنچیں۔ ہم ایک دوسرے کی محبت سے واقف ہو جائیں۔ ابھی میں اظہارِ تمنا کا موقع ڈھونڈھ ہی رہا تھا کہ ایک شام میرا بھائی مجھے دیکھنے آ گیا۔ مہرو جب تک کمرے میں رہی وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ باہر چلی گئی تو اس نے آہستہ سے کہا ”کتنی خوبصورت لڑکی ہے! مدت سے میں جس قسم کے حُسن کا تصور کرتا رہا ہوں یہ اس کی ہو بہو تصویر ہے۔ افسردہ افسردہ نظریں معصوم سی ادائیں اور باوقار چال!“

میں نے باتوں باتوں میں اس ذکر کو ٹال دیا مگر وہ دوسرے دن پھر آ موجود ہوا اور کہنے لگا ”تم نے کبھی اسے نظر بھر کر دیکھا ہے؟ اس میں ایک خاموش سا جادو بھرا ہوا ہے۔ اگر والدین اعتراض نہ کریں تو میں اس سے شادی کر لوں!“

میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے! میری زبان بند ہو گئی۔ میری نظریں جھک گئیں۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ تمام رات کروٹیں لیتا اور آہیں بھرتا رہا۔ کبھی اپنے آپ کو اور کبھی اپنے بھائی کو کوستا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے منزل پر پہنچنے کی تیاریاں بھی کرنے لگا اور میں ابھی تک گم کردہ راہی تھا۔

چند ہی دنوں میں مجھے مہرو کے انداز میں نمایاں فرق کا احساس ہونے لگا۔ اب وہ راتوں کے سناٹے میں میرے سرہانے بیٹھ کر فضاؤں کو معطر اور رنگین نہیں بنایا کرتی تھی۔ اس کے اس رویے نے میرا دل توڑ دیا۔ میں تنہائی میں پہروں لیٹا روتا رہتا تھا۔ کبھی مہرو کو بے وفا سمجھتا۔ کبھی مجھے بھائی پر غصہ آتا۔ کبھی اپنے آپ پر جھنجھلا اٹھتا۔

دنوں اور ہفتوں کے بعد مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ یہ خطا میری اپنی تھی۔ اگر میں مہرو سے اظہارِ تمنا فوراً ہی کر دیتا اور اسے پس پشت نہ ڈالتا تو آج یہ حادثہ میری قسمت میں نہ لکھا ہوتا۔ میرا بھائی بے قصور تھا۔ اسے میری محبت کا علم نہ تھا۔ یہ خطا میری تھی۔

پھر ان دونوں کی شادی ہو گئی اور میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ اب تمہیں یقین آ گیا ہو گا کہ میں نے اپنے بھائی کی محبت میں اپنے پر کیسے کیسے ظلم روا رکھے مگر مجھے کبھی اس پر غصہ آنا تو درکنار اس سے شکایت تک پیدا نہیں ہوئی —" پھر یکلخت وہ چونک پڑا — "ہاں مجھے یاد آیا اس ساری طویل زندگی میں صرف ایک موقع ایسا آیا کہ جب مجھے اس پر شدید غصہ آیا مگر وہ بھی لمحہ بھر کے لیے" وہ چپ ہو گیا۔

"وہ کونسا موقع تھا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

وہ مدھم اور افسردہ لہجے میں بولا "بچپن کا زمانہ تھا۔ میں بمشکل پانچ چھ سال کا ہوں گا۔ وہ اور میں باغ کی اونچی دیوار پر چڑھے ہوئے انگور توڑ رہے تھے۔ جب بھی میں انگور کا کوئی گچھا توڑتا وہ شوخی سے چھین کر کھا جاتا۔ جب کھا کھا کر تھک گیا تو دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ مجھے نہیں ستائے گا۔ چنانچہ میں نے انگوروں کا ایک بہت بڑا گچھا اپنے لیے توڑا۔ مگر وہ لپک کر میرے پاس پہنچا اور اسے میرے ہاتھ سے چھین کر نیچے وادی میں پھینک دیا اور قہقہے لگانے لگا۔ اس کی اس حرکت پر میں دانت پیس کر رہ گیا۔ میرا سانس پھول گیا۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ اسے بھی اٹھا کر انگوروں کے پاس نیچے پھینک دوں۔ ایک جنون کی سی کیفیت میں میرے ہاتھ اس کے کندھے پر پہنچ گئے اور ایک تشنج کی سی حالت میں میرے پنجے اس کو قابو میں کرنے لگے۔ پھر یکلخت مجھے خیال آیا کہ اگر میں اسے نیچے گرا دوں گا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی... چکنا چور ہو جائے گی اور وہ ختم ہو جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے دل میں اپنے بھائی کے لیے رحم و محبت کا ایک دریا ابلنے لگا اور میں اسے دھکا دے کر نیچے گرانے کی بجائے اس سے چمٹ گیا۔ اس بات کو آج بیس سال کا طویل عرصہ گذر چکا ہے!" وہ اپنی داستان ختم کر چکا تھا۔

میں چونک پڑی اور بولی "اور آج بیس سال بعد یہ حادثہ تم سے سرزد ہوا ہے!"

حادثے کا نام سن کر میرا ذہن ہمیشہ انسان کی نا تمام تمناؤں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تشنہ تمنائیں دنیا میں حادثات بن کر رونما ہوتی ہیں۔ لوگ انھیں اتفاقات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ مگر تجربات و مشاہدات نے مجھ پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسان حادثے کی تیاری خفیہ اور بالکل انجانے طریقوں سے برسوں کرتا رہتا ہے۔ تب کہیں جا کر دنیا میں ایک حادثہ رونما ہوتا ہے۔ انھیں حادثے نہ سمجھئے۔ یہ ہماری اپنی ڈھکی چھپی تمنائیں ہیں۔

لندن لیٹر

قرۃ العین حیدر

دیباچہ: ۔ معزز ناظرین! لندن لیٹر کی بہت سی اقسام ہیں۔ پہلی وہ قسم ہے جو ایک زمانے میں ہمارے ملک کے زنانہ رسالوں میں چھپا کرتی تھی۔ عزیزہ سعیدہ بانو سلمہا اپنی باجی جان کو لکھتی تھیں۔ "آپا بیگم میں خیریت سے ہوں۔ بمبئی سے دلہن بھابی نے جو آم کا اچار میرے ساتھ کر دیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ یہاں ہندوستانی طعام خانوں میں مرچ اور مسالہ بہت مہنگا ملتا ہے۔ ایک شلنگ کی ایک پڑیا دھنیے کی سمجھ لیجئے۔ گرم پانی کے پائپ کے ذریعے میرا کمرہ گرم رہتا ہے (پھر کچھ لینڈ لیڈی کا ذکرِ خیر ہوتا تھا) یہاں آپا جان زمین دوز ریلیں چلتی ہیں (لندن ٹرانسپورٹ کا مفصل بیان) میں نے کل یہاں پلاؤ تیار کیا جو بہت پسند کیا گیا (ہندوستانی اور انگریزی کھانوں کا موازنہ اور آپا بیگم کے لیے انگریزی کھانوں کی چند آسان ترکیبیں) آپ کا زکام اب کیسا ہے۔ اگلے خط میں میں برائٹن اور بلیک پول کا حال لکھوں گی۔ آپ کی پیاری دور افتادہ بہن "سعیدہ"

جب پیاری سعیدہ بانو واپس جاتی تھیں تو دور نزدیک سے رشتے دار، عزیز دوست اور محلے والے ان سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ وہ ایک خاص دیکھنے اور سننے کی چیز خیال کی جاتی تھیں۔ اور اپنی باقی عمر وطن کے کسی گمنام مدرسے میں ہیڈ مسٹرس یا پھر اسکول انسپکٹرس بن کر گزار دیتی تھیں۔ اور قصہ ختم ہو جاتا تھا۔

حضرات! اب میں لندن لیٹر کی دوسری اقسام کا بیان عرض کروں گی۔ ایک آغا اشرف کا "بی بی سی سے آداب عرض" تھا کہ کس طرح انگریز نازی بمباری کا بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور فتح انشاء اللہ اتحادیوں کی ہوگی۔

اتحادیوں کی فتح کے بعد سے جو لندن لیٹر السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں چھپتا ہے وہ اس طرح ہوتا ہے۔ کل ہاؤس آف لارڈز میں جب بحث چلی اور جب فلاں ڈپٹی کمشنر سے میں ملا ــــ اور دیگر یہ کہ میرے باغ میں آجکل کنہیا خوب پھول رہا ہے اور فوڈ منسٹری نے انڈوں کا کوٹا کم کر دیا ہے۔ آئندہ اگلے ہفتے۔

لندن لیٹر کی آخری قسم وہ ہے جب کہ "تماشائی" اور "آئینے" کا نامہ نگار خصوصی حسین و جمیل رسالوں کے کالموں میں یوں رقمطراز ہوتا ہے "پچھلے اتوار کو میں نے بیگم فلاں کو لیڈی فلاں کی گارڈن پارٹی میں اس حسین نیلی ساری میں ملبوس دیکھا جو انھوں نے مجھے بتایا کہ جینوا میں خریدی ہے۔ کمانڈر فلاں بھی پارٹی میں موجود تھے۔ جنھیں میں نے بریگیڈیر فلاں کی دلکش بیوی کو ایک لطیفہ سناتے پایا۔ کمانڈر فلاں کل ایسکٹ میں بھی موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اتفاق سے ان کو برسلز کی ایک گمنام دوکان میں ایک بہت ہی عمدہ کیمرہ دستیاب ہو گیا۔ مسز فلاں جو مہاراجہ صاحب فلاں نگر کی بے حد خوش پوش صاحبزادی ہیں۔ کمانڈر صاحب کے اس کیمرہ میں بہت دلچسپی کا اظہار کر

رہی تھیں۔ ان کو بھی فوٹوگرافی کا بہت شوق ہے۔ اس مرتبہ ASCOT میں ——— وغیرہ وغیرہ وغیرہ

اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ہر مہینے یہی گوسپ ہوتی ہے۔ یہی خبریں، یہی لوگ۔

ان بین الاقوامی طیارہ گاہوں، ان کلبوں اور ریس کورسوں کی رونق دیکھئے۔ ہزاروں کی تعداد میں یہ لوگ روزانہ اِدھر اُدھر آجا رہے ہیں۔ بغداد۔ بیروت۔ استانبول۔ روم۔ پیرس۔ جینوا۔ نیویارک، کیا گہما گہمی ہے۔ کیا کانفرنسیں اور گارڈن پارٹیاں ہیں۔ اللہ اکبر۔

آیئے۔ کیوں نہ ”لندن لیٹر“ کے ایک اور نامہ نگار یعنی اس خاکسار کے ہمراہ اس منظر کو ذرا قریب سے دیکھئے۔

ملاحظہ فرمایئے۔ ہارون الرشید کا عراق جہاں چاروں طرف بیکراں ریگستان ہیں اور جھلسی ہوئی زندگی ہے۔ کہیں کوئی پائپ لائن دور سے نظر آجاتی ہے یا کوئی بدو خچر پر بیٹھا سر جھکائے آہستہ آہستہ اپنی راہ چلا جاتا ہے۔ یا کبھی ٹھٹھک کر آسمان کو دیکھ لیتا ہے جس پر اڑن قلعے پرواز کر رہے ہیں۔ کیا وقت آن لگا ہے! کیا کبھی وہ سوچتا ہے کہ اس کے لکڑ داداؤں نے اسی ریگستان سے نکل کر بحرِ ظلمات میں کیا سرپٹ گھوڑے دوڑائے تھے!!؟ مشرقِ وسطیٰ کے شہروں میں اب آپ کو سرف اطلانتک پار کے رہنے والے گھومتے نظر آئیں گے۔ بدو اسی طرح باہر راستے کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہے۔

اس ریستوران میں ایک اور خاصا بین الاقوامی مجمع موجود ہے۔ دیواروں پر کوکوکولا کے اشتہار لگے ہیں۔ ایک آدھ عراقی مادموزیل اونچی ایڑیوں کی سینڈل پہنے سرعت سے گیلری میں سے نکل جاتی ہے۔ کس قدر گرمی ہے۔ اطلانتک پار والے پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے ہیں —— یو این نے انھیں یہاں عربوں کو تہذیب و تمدن سکھانے بھیجا ہے۔ یہ دور افتادہ قصبوں اور کچی مٹی کی بستیوں میں جا کر دوائیں تقسیم کرتے ہیں اور اپنے کیمروں سے تصویریں اتارتے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے مشرقِ وسطیٰ کی زمین نے ان سفید فام قوموں کے وجود کو اپنے اوپر اسی طرح صبر اور قناعت سے سہا ہے۔ جو انگریز یا ڈچ یا فرانسیسی اس وقت جیپ پر جا رہا ہے جس کے پیچھے پیچھے عرب بدو کا اونٹ بھی ہے (تصویر اونٹ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ کیا رومانٹک پس منظر ہے) اس کے لکڑ دادا رچرڈ شیر دل کے ساتھ ساتھ عیسائی بھی ہو جاتے تو انھیں کاہے کو یہ بُرے دن دیکھنے پڑتے۔ اب بہرحال یہ انڈر ڈیولپڈ ممالک ہیں اور یہ عالمگیر ہمدردی اور بھائی چارے کا زمانہ ہے۔ اور اس ایمرجنسی پیریڈ میں تثلیث اور توحید گویا خدا کے سارے ماننے والے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو رہے ہیں۔

توحید کا پجاری ایک عرب، ریستوران کے ایک کونے میں بیٹھا کسی مصری رسالے کی ورق گردانی کر رہا ہے جس میں مصری ایکٹرسوں کی تصویریں ہیں۔ (مصری فلم انڈسٹری نے اتنی ترقی کر لی ہے مادموزیل امِ ریحان اور شرلے ونٹرز میں ذرا بھی کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، اور مادموزیل امِ ریحان۔ بلکہ ان کے ساتھ خود ہماری اپنی نرگس اور ثریا اور مدھوبالا اپنے اسٹریم لائینڈ آف دی شولڈر شام کے لباس میں سب ایک لائن اور گارڈنر کے ساتھ فخر سے سر اونچا کر کے کھڑی ہو سکتی ہیں) بہرکیف، تو یہ بوڑھا عرب چپ چاپ بیٹھا رسالہ پڑھ رہا ہے۔ اس عرب کو دیکھ کر میرے دل میں محبت اور یگانگت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ یہ میرے رسولؐ اور میرے امامؑ کی قوم کا ایک فرد ہے۔ وہ لوگ بھی اسی شکل و صورت کے رہے ہوں گے۔ یہی لباس پہنتے ہوں گے۔ دریچے کے باہر فرات بہہ رہا ہے۔ جہاں پر میرے امامؑ مظلوم کو پیاسا مارا گیا تھا۔ میرے اوپر کافی جذباتیت کی موڈ طاری ہو رہی ہے۔ عرب نے کولڈ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں اٹھا لیا ہے۔ میں اس سے کہنا چاہتی ہوں میرے پیارے عرب بھائی —— کوکوکولا پیو تو یاد کرو پیاس حسینؑ کی۔

وقت اپنی جگہ پر ٹھہر گیا ہے۔ آرکسٹرا نے 'بلوز' بجانے شروع کر دیئے ہیں (!!) عرب بڑے سے شہدی رومال سے اپنی پیشانی

صاف کر رہا ہے۔ میرے پیارے بوڑھے عرب۔ تم جو ایک پوری تاریخ کے، ایک بہت بڑے عظیم تمدن اور روایت کے بہت بیچارے نمائندے ہو اور تمہارے ہاتھوں میں یہ موویز کا رسالہ ہے اور تمہاری آنکھیں زندگی کی روشنی سے عاری ہیں، تمہارے پُرکھوں نے تو مولا علیؓ اور جناب عباسؓ اور جعفر طیار کا ساتھ دیا ہوگا۔ تم جو صدیوں کا بہت اذیت ناک اور عبرت انگیز سفر طے کرتے اس لمحے تک پہنچے ہو کہ تمہارے رعشہ زدہ ہاتھوں میں کوکوکولا کا گلاس ہے۔ اب تم کدھر جانے والے ہو۔ میرے بھائی! میرے پیارے ساربان ——— !!

یہ بیروت ہے۔ یہ ایک ترک میرے سامنے بیٹھا ہے۔ مذہبی اور قومی جذباتیت کا ایک اور سمبل، کیا شاندار ترک ہے۔ پلونہ اور ادرنہ اور سالونیکا سب ایک جھنکار کے ساتھ کانوں میں گونج گئے۔ وہ کوریا سے لوٹ رہا ہے اور وہ بھی یو۔ این کا ایک اہم رکن ہے۔ کوریا کسی کانفرنس کے سلسلے میں گیا تھا ——— اس نے ترک بریگیڈ کا ذکر کیا اور ترکی کی جمہوریت کا۔ میں نے جنرل فخری پاشا کا قصہ اُسے سنایا جو میرے ابا کے بہت پیارے دوست تھے اور جنرل انور پاشا اور کمال اتاترک وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی ساری خلافت تحریک کی داستان میں نے اس کے گوش گذار کر دی۔ اس نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ میرے بھائی چارے اور اسلامی دوستی کے جذبے پر کچھ ٹھنڈا پانی سا پڑ گیا۔ وہ اطمینان سے صرف یو۔ این۔ اور میں اپنے کام کا تذکرہ کرتا رہا۔ پھر اس نے قدرے جذباتیت سے اپنی بوڑھی ماں کا ذکر کیا جو بیمار تھی اور جس نے اس کی روانگی کے وقت کہا تھا کہ میرے بیٹے میں تم کو آزادی اور سچائی کی فتح کی خاطر کوریا بھیج رہی ہوں، کامران لوٹنا ——— !! بیٹوں کو لڑائیوں پر بھیجنا ترک ماؤں کی اچھی خاصی ہوبی اور عادتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ میں نے اس کی ماں کی خیریت دریافت کی۔

ادھر دو برطانوی بیٹھے ہیں۔ ہم فلاں فلاں کو سبق سکھا دیں گے۔ وہ آپس میں کہہ رہے ہیں۔ تذکرہ غالباً نیل کا ہے۔

سڑک پر جنگلے کے سہارے ایک بہت کم سن پنجابی ہندو کا لڑکا کھڑا ہے۔ جانے وہ یہاں کدھر سے آ نکلا۔ وہ انگریزی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ اردو بھی مطلق نہیں بول سکتا۔ میں نے ساڑھے چار سال کے طویل عرصے کے بعد ڈپلومیٹک کور کے افراد کے علاوہ پہلی بار آج ایک عام ہندو کو دیکھا ہے۔ حقِ ہمسائیگی ادا کرنے کے لیے میں اس سے بات کرتی ہوں۔ وہ ٹھیٹھ پنجابی بولتا ہے جو میرے پلے نہیں پڑتی۔ مجھے بے حد تعجب ہوتا ہے جب میں کوشش کر کے زندگی میں پہلی دفعہ پنجابی میں باتیں کرتی ہوں ——— قومی یا ملکی یگانگت کا عجیب و غریب احساس!! ترک اور انگریز اور فرانسیسی دور، جنگلے کی دوسری طرف کھڑے رہ گئے ہیں۔

سبز پہاڑیوں کی ڈھلوان پر پھیلا ہوا اور سمندر کے کنارے کنارے بکھرا ہوا بیروت دھوپ میں جگمگا رہا ہے۔ سمندر۔ نیلا میڈی ٹیرینین! نیلے میڈی ٹیرینین اور لبنان، خدا تم دونوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے!! لبنان ——— ! خلیل جبران کے ملک، تم بہت پیارے ملک ہو۔ یہ سب بہت پیارے لوگ ہیں۔ یہ سارے انسان جو خلیل جبران کی کہانیوں کے کردار ہیں۔

لبنان کی کیتھولک لڑکیوں کا ایک گروہ سمندر کے کنارے والی سڑک پر سے ٹہلتا میری سمت آ رہا ہے۔ غالباً وہ لوگ میری ساری کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں۔ دھوپ میں ان کے سنہری اور چاکلیٹ بال جھلملا رہے ہیں۔ خوبصورت چہروں والی کیتھولک لڑکیاں عربی میں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہیں۔ تذکرہ ساری کا ہے۔ تم انگریزی یا فرنچ بول لیتی ہو؟ میں ان سے پوچھتی ہوں۔

فرنچ ویری گڈ۔ انگلیس نو ——— پھر وہ خاموشی سے کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ ان کی راہبہ جو خود بہت کم عمر اور خوبصورت ہے،

سکون سے مسکراتی ہے۔

یہاں دور دور انجیر اور زیتون کے درخت ہیں جن کے جھنڈوں میں صدیوں پرانی کیتھولک خانقاہیں چھپی ہوئی ہیں۔ جن کی سمت جانے والے سایہ دار خوابیدہ راستوں پر سے کبھی کبھی کوئی پیکارڈ یا جیپ تیزی سے اس الوہی سکون کو منتشر کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

پھر سائپرس ہے۔ سارا ترکی پھیلا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں، چٹیل میدان، گیہوں کے کھیت، قہوہ خانے، بحیرہ اسود، باسفورس، استانبول، پریوں کا شہر، روشنیوں، خوشبوؤں، رنگوں کا دارالسلطنت۔ کوئی چیز نئی نہیں، وہی گلیاں ہیں، وہی مسجدیں اور پُل اور بازار۔ جب میں بہت بچپنے میں ان جگہوں پہ آئی تھی اس وقت کی یادوں کو کوشش سے اکٹھا کر کے میں نے اس زمانے سے ان کا موازنہ کیا ہے۔ کوئی فرق نہیں ——؟!

اجی قبلہ بہت فرق ہے۔ طیارہ گاہیں اور بن گئی ہیں۔ فوجی چھاونیاں ٹریکٹرز کھیتوں کی زرائی کے لیے منگوائے جا رہے ہیں مذہب کو دوبارہ زندہ کیا جا رہا ہے۔

نامق کمال کا ترکی۔ اتاترک کا ترکی

میرے پیارے بابا، سجاد حیدر یلدرم کا ترکی۔

اور اب باسفورس پر سورج غروب ہو رہا ہے۔ سارے میں شفق پھیل گئی ہے۔ اس شفق میں ایا صوفیہ کے مینار نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ مارمورہ کے پانیوں پر روشنیاں ناچتے ناچتے تھک گئی ہیں۔

اور اس شفق کے دھندلکے میں مارا مشرقی یورپ ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن نظروں کے سامنے ہے۔

الپس — جرمنی۔

المانیہ! آہ المانیہ!! (واہ المانیہ!!!)

بون — کولون — فرینک فرٹ۔

ان ناموں میں کتنا سحر ہے اے معزز ناظرین۔ لوہے کا جگمگاتا شہر فرینک فرٹ۔

فراولین کیا چاہیئے ——؟ ایک ویٹر جھک کر پوچھتا ہے۔

فراولین کے پیارے بھائی فرٹز۔ تم تو ہشار یوتھ میں تھے نا؟ اب میں تم سے کیا بتاؤں مجھے کیا چاہیئے۔ بڑا کنفیوژن ہے، بھائی بڑا کنفیوژن ہے۔

مجھے یہاں سے آگے جانے دو۔

بلجیم۔ کیا خوبصورتی ہے، کیا نفاست ہے، برسلز۔ برسلز۔ گرجاؤں میں شام کی عبادت کے لیے گھنٹے بج رہے ہیں۔ ان کی گونج شمال کے کہرآلود سمندروں پہ پھیلتی جا رہی ہے۔

حضرات میرے پاس وہ کیمرہ نہیں ہے جو کہ میں نے برسٹل میں خریدا ہوتا تو کمانڈر فلاں کے ساتھ میں اس کے متعلق تبادلہ خیالات کرتی۔ اول تو مجھے فوٹوگرافی اچھی طرح سے نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ اگر اس سے میں تصویریں اتارتی بھی تو وہ کسی کام کی نہ ہوتیں۔ کیونکہ میرے پاس وہ ٹورسٹ روپیہ نہیں جس کے ساتھ یہ تصویریں کھینچ کر گھر خطوں میں بھیجی جاتی ہیں۔

لہٰذا ناظرین، اب میں باسمِ سبحانہ، لندن لیٹر بے تصویر کا آغاز کرتی ہوں۔ دیباچہ ختم ہوا۔

۷۸۶

حضرات! اس ہوش رُبا، دیو زاد پری پیکر عروس البلاد سے ہمارا کتنا صدیوں کا پرانا قلبی و روحانی تعلق ہے۔ ذری آنریبل جان کمپنی کا خیال کیجیے کہ جب سٹی آف لندن کے تاجر مدراس اور بنگالے کے لیے یہاں لنگر اٹھاتے تھے۔ یا جب اوکسفرڈ اور کیمبرج کے ہونہار فرزندوں کو سراج الدولہ اور شجاع الدولہ کے پاس ذرا کام سے بھیجا جاتا تھا۔ کیا کیا معرکے ہوئے ہیں، کیا کیا توپیں دغی ہیں۔ اللہ اکبر، چپے چپے سے یہاں کے کیسی کیسی داستانیں وابستہ ہیں۔ چارلس ڈکنز کے ناولوں کے علاوہ رڈیارڈ کپلنگ اور ونسٹن چرچل کے اوراق ان گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

یوں اندازہ لگا لیجیے کہ پچھلے اسّی سال سے ہمارے نوجوان یہاں ادب، قانون اور طب سیکھنے کے لیے آتے رہے ہیں۔ یہاں ہائیڈ پارک میں کھڑے ہو کر انھوں نے شعلہ بار تقریریں کی ہیں۔ لندن مجلس اور قہوہ خانوں اور ایمبنک منٹ میں بیٹھ کر آزادی کے خواب دیکھے ہیں۔ وائٹ ہال کے دروازوں پر پہنچ کر جدوجہد کی ہے۔ ہمارے نیتاؤں نے گول میز کے گرد بیٹھ کر برطانیہ کی طاقت سے ٹکر لی ہے اور اب خداوند تعالٰے کی عنایت دیکھیے کہ بالآخر ہم آزاد ہو گئے۔ سچ ہے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ بڑا میٹھا۔

ہماری آزادی کے ساتھ ہمارے نوجوانوں کے کاندھوں سے گویا ایک بار اتر گیا۔ اب ہم یہاں ایک ہلکے پھلکے ضمیر کے ساتھ آتے ہیں۔ ہمارے نیتا اب لڑائی لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بکنگھم پیلیس کی گارڈن پارٹی میں شریک ہونے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ اب اگر کوئی لینڈ لیڈی ہمارے کالے رنگ پر اعتراض کرتی ہے تو ہم مطلق اس کا نوٹس نہیں لیتے بلکہ جی بھر کے اس کے کمروں کو گندہ کرتے ہیں؛ اس کے والی پیپر پر سیاہی کے چھینٹے گراتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد اس کے پردوں سے اکثر نظر بچا کر انگلیاں بھی پونچھ لیتے ہیں۔

یہ سب اس لیے کہ ہم آزاد ہیں۔ بھلا ہم میں اور مثلاً ــــ مثلاً ــــ کسی اور آزاد قوم میں کیا فرق ہے؟؟

اے مومنین! اس وقت اس ملک میں، کفر کی اس آماجگاہ میں چالیس ہزار کلمہ گو رہتا ہے۔ کئی مسجدیں ہیں۔ ایک آدھ فرزند کلیسا بھی گاہے بگاہے اسلام قبول کر لیتا ہے۔ ہمارے ملاح ہیں جو مختلف بندرگاہوں میں رہتے ہیں۔ مزدور ہیں جو شمال کے سارے صنعتی مرکزوں میں موجود ہیں۔ صرف شہر لندن میں نوّے ہندوستانی اور پاکستانی ریستوران ہیں۔ ہمارے اَن گنت لڑکے اور لڑکیاں یہاں کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ پھر ہماری بیگمات ہیں: جب کوئی خاتون زرتار ”غرارہ“ پہنے سڑک پر سے گزر جاتی ہیں تو واللہ دیکھنے والوں کی طبیعت گلیڈ ہو جاتی ہے۔

میں نے عرض کیا تھا نا ـــــ بڑی گہما گہمی ہے۔

ہندوستان والوں کا بھی یہی احوال ہے۔ انڈیا ہاؤس کی عظیم الشان عمارت میں، جہاں ہمارے نادر قلمی نسخے، مغل تصویریں اور سارے تہذیبی خزانے محفوظ ہیں، جس کی دیواروں پر سے میرے گورداپل ایم سین کے بنائے ہوئے فریسکوز کی تصویریں خاموشی سے نیچے جھانکتی ہیں۔ مہارانی جھانسی کی جانشین، نئے بھارت کی سرنگ بالائیں اپنے دیش کی سفارت کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ تہلات جینتی منائی جاتی ہے۔

جی ہاں۔ یہ بالکل ایک نئی دنیا ہے۔

سویز کے اُدھر رہنے والوں کی اس نئی دنیا کی جھلک جب انگریز اپنے ملک میں دیکھتا ہے تو اسے بڑا اچنبھا ہوتا ہے۔ سارے یورپ اور ہندوستانی آرٹ کی تعریف کرتے کرتے اب اس کا حلق خشک ہو گیا ہے (میرے پاکستانی پڑھنے والے مجھے معاف فرمائیں جب میں اس ضمن میں 'ہندوستانی آرٹ' کا ذکر کروں گی۔ کیونکہ جب یہ لوگ لفظ پاکستان سے ہی زیادہ واقف نہیں تو پاکستانی آرٹ وغیرہ کا تذکرہ تو بہت دور کی بات ہے) ہندوستانی رقاصوں کے ایک ڈانس پروگرام سے اس ملک کی جتنی پبلسٹی یہاں ایک شام میں ہو جاتی ہے اس کا تدارک یا مقابلہ ہمارے ایک ہزار پمفلٹ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم کتنا ہی ان کے اپنے ریفیوجی پرابلم، اپنے کشمیر کے کیس، اور اپنی ترقی کی اسکیموں کے متعلق بتائیں لیکن پڑھے لکھے طبقے کے ایک مخصوص حصے کے علاوہ ایک عام برطانوی مرد یا عورت کو یہ جاننے کی مطلق خواہش یا پروا نہیں کہ ہمارا اسکندر براج کیا شے ہے۔ یا ہم کتنی جوٹ ملیں قائم کرنے والے ہیں۔ جبکہ شیریں فرہاد کے بیلے یا نمی اور دلیپ کمار کی فلم 'آن' کو دیکھنے کے لیے لندن کا ایک عام شہری گھنٹوں لیسٹر اسکوائر میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے کیو لگائے صبر و اشتیاق سے کھڑا رہتا ہے۔ لیکن بہرحال، یہ بالکل ایک دوسری بحث ہے۔

لندن کی کلچرل زندگی میں آرٹ کی نمائشوں، تھیٹر، اوپیرا، بیلے اور کونسرٹس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی رقص کے مظاہرے بھی ایک اہم حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اور اب غالباً 'آن' کی کامیابی کے بعد سے ہندوستانی فلموں کو بھی یہی مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔ نمی جو پچھلے دنوں یہاں آئی ہوئی تھی اسے یہاں کے پریس نے کافی پبلسٹی دی اور برطانوی اور امریکن پروڈیوسروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

نمی کے ذکر پر خیال آیا کہ انگریز کی نفسیات کے متعلق کچھ عرض کروں۔

'آن' انتہائی بکواس فلم ہے جس میں تازہ ترین ماڈل کی کیڈیلک کاریں اور تلواریں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ڈوئیل لڑے جاتے ہیں اور ان سب لغویات کا اعلیٰ پیمانے پر ٹیکنی کلر مظاہرہ ہوتا ہے جو ہمارے ملک میں صرف "چونی والوں" کو بہت پسند آ سکتا ہے۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے چونی والے طبقے کی افتادِ طبع ساری دنیا میں تقریباً ایک سی ہے۔ ہالی وڈ کی اسی فیصدی تصویریں اسی عالمگیر طبقے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ 'آن' کے مقابلے میں "ہم لوگ" یا "دھرتی کے لال" یہاں ایک روز بھی نہ چل پاتی۔ ہندوستان کے متعلق جو تصور یہاں پر صدیوں سے موجود ہے، یعنی مہاراجہ کے ہاتھی گھوڑے اور تلواروں کی لڑائیاں اور سونے کے محلات وغیرہ وغیرہ، وہ سب اس فلم میں بخیر و خوبی پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا نائیٹس برج میں کام کرنے والی ٹائپسٹ لڑکی اور سٹی آف لندن کا بنک کلرک خوش خوش گھر لوٹتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان یعنی مشرق کے گلیمر کی ایک جھلک دیکھ لی۔ مجھ سے یہاں کے ایک بہت بڑے

انٹلکچوئیل اور بڑے مشہور فلم کریٹک نے کہا کہ عالمگیر نمائش کے لیے فلم بنانے سے پہلے آپ کے ڈائریکٹر محبوب کو اطالوی فلم "سائیکل کا چور" دیکھنی چاہیے تھی یا دو چار فرانسیسی فلمیں، میں نے عرض کی کہ پہلے ہالی وڈ کے ان سارے ڈائریکٹروں کو بھی "سائیکل کا چور" دکھلائیے جو "قسمت" اور "دمشق کا چور" اور "سلیو گرل" اور "بغداد" جیسی تصویریں بناتے رہتے ہیں۔ یا جن حضرات نے "رکم" تیار کی ہے۔ محض مسٹر محبوب کی ذہنی تربیت کے آپ کیوں اتنے خواہاں ہیں۔

انگریزوں کی اس مخصوص نفسیات کا سب سے بڑا عکاس ان کا پریس ہے۔ SENSATIONALISM ان کی مرغوب ذہنی غذا ہے صرف بہت زیادہ پڑھا لکھا طبقہ ٹائمز مانچسٹر گارجین یا نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن پڑھتا ہے۔ اکثریت کے لیے وہ اخبار نکلتے ہیں جن میں قتل، مار پیٹ، اغوا ڈکیتی اور اسکنڈلز کا ذکر ہوتا ہے۔ ارسٹوکریسی اب یہاں آخری سانس لے رہی ہے لیکن اب بھی عوام کو یہ خبر پڑھ کر بے حد اچھا معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ فلاں کے بیٹے آنریبل فلاں نے کل رات مے فیئر میں اپنی پارٹی میں شیمپین کی اتنی بوتلیں پیرس سے منگوائیں اور اسپین کی خانہ بدوش رقاصاؤں کو بذریعہ ہوائی جہاز چھ گھنٹے کے لیے میڈرڈ سے بلوایا۔ پارٹی صبح کے پانچ بجے تک جاری رہی۔ یا یہ کہ کاؤنٹس فلاں اتنے منک کوٹ لے کر اطالوی ریویرا تشریف لے گئی ہیں۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ عوام کو سیاست کی بعض بعض تفصیلات سے جان بوجھ کر لاعلم رکھا جاتا ہے۔ خود یہ طبقہ گھوڑ دوڑ، کتوں کی دوڑ اور فٹ بال پُول اور کرکٹ کا اس قدر شیدائی ہے کہ اس کے مقابلے میں بین الاقوامی صورتِ حال کی اسے زیادہ فکر نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برطانوی عوام سیاست سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ لیکن ڈاربی ان کے لیے بہرحال چین سے زیادہ دلچسپ ہے۔

ویسے ملایا کی دوسری بات ہے۔

تحریر و تقریر کی آزادی یہاں ایک حد تک ضرور موجود ہے۔ پچھلے دنوں یہاں روسی فلم "زوال برلن" دکھلایا جا رہا تھا۔ فلم شروع ہونے سے پہلے یہ الفاظ سامنے آتے تھے:۔ برطانیہ ایک آزاد ملک ہے۔ اور ہم اس کے باشندے، اس چیز میں یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے علاوہ دوسرے شخص کو بھی اس کا حق ہے کہ وہ اپنا نظریہ اور اپنی رائے آپ کے سامنے پیش کرے۔ ہمیں اس فلم میں پیش کی ہوئی بہت سی باتوں سے اتفاق نہیں۔ اور روسیوں کو فتح ان کی بے مثال بہادری کے علاوہ برطانوی اور امریکن اسلحہ جات کی وجہ سے بھی ہوئی تھی لیکن بہرحال یہ ایک بہت عظیم فلم ہے ——— وغیرہ۔

یہ فلم اس طرح کے تعارف کے ساتھ امریکہ میں قطعی نہ دکھلایا جا سکے گا۔

آزادیٔ تقریر کا دوسرا مشہور و معروف مرکز ہائیڈ پارک ہے جہاں لکڑی کے ڈبوں پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کے سیاستدان، ایجی ٹیٹرز، مصنف اور ادیب ہر زمانے میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے رہتے ہیں۔ ایک طرف کوئی صاحب کمیونسٹ پارٹی کا پوسٹر لگائے جراثیمی جنگ کے متعلق کچھ کہہ رہے ہوں گے۔ ان سے دو قدم ہٹ کر ڈین آف کنٹربری کے خلاف چلا چلا کر کچھ ارشاد کیا جا رہا ہوگا۔ دوسری طرف سوشلسٹ پارٹی کے نمائندے اپنا بیان دیتے ہوں گے۔ ایک سمت خداوند تعالیٰ کو سخت و سست کہا جاتا ہوگا۔ ان کے ساتھ ہی دوسرے اسٹینڈ پر یسوع مسیح کا پیغام پیش کیا جاتا ہوگا۔ ایک روز ایک نو مسلم انگریز اور ایک پاکستانی مولوی صاحب بھی جوش خروش سے کچھ فرما رہے تھے اور مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔

مقرر اور سامعین کے مابین تکرار بھی ہو جاتی ہے۔ مجمع ہر ایک کی سنتا ہے اور اسی طرح قہقہے لگاتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

آزادیِ تقریر محض ہائیڈ پارک تک ہی محدود ہے۔

پچھلے دنوں چند اخبار فروخت کرنے والوں نے طے کیا کہ وہ ڈیلی ورکر نہ بیچیں گے۔ ٹائمز نے اس پر بڑا زوردار نوٹ لکھا کہ یہ رویّہ غلط ہے۔ اگر وہ ڈیلی ورکر نہ بیچیں گے تو ہم ان کو ٹائمز بھی بیچنے کے لیے نہ دیں گے۔ کیونکہ یہ رویہ جمہوریت کے اصولوں کے منافی ہے۔ کل کو ٹائمز یا کسی اور اخبار کے لیے بھی یہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ آزادیٔ تحریر پائندہ باد۔ چنانچہ اخبار بیچنے والوں کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ یہ برطانوی اصول پرستی کی ایک مثال تھی۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس کے باوجود پہلے کی طرح اب بھی یہ اخبار ہر نیوز اسٹینڈ پر آپ کو دستیاب نہیں ہو سکتا ——— ایسٹ اینڈ کے چوراہوں پر کوئی غریب لڑکی اسے فروخت کرتی آپ کو مل جائے گی۔

ایسٹ اینڈ ——— !! پکیڈلی سے ٹیوب میں بیٹھ کر آپ وائٹ چیپل یا اسٹیپنی گرین اتریئے۔ بیس پچیس منٹ کے اندر اندر آپ بالکل ایک دوسری دنیا میں موجود ہوں گے جہاں بمباری سے تباہ شدہ محلّے ہیں اور دھوئیں سے جلے ہوئے مکانات اور تاریک گلیاں۔ جہاں کی سڑکوں پر آپ رات گئے تنہا گذریئے تو آپ کی جیب ضرور تراش لی جائے گی۔ ناتسیوں نے اپنی بمباری کا نشانہ خاص طور پر اس علاقے کو بنایا تھا جہاں لندن کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی گنجان آبادی واقع ہے۔ یہاں کوئی کنونشن نہیں ہے۔ ہر شخص بے حد دوستی کی موڈ میں رہتا ہے۔ افلاس اور گندگی کے معاملے میں یہ علاقے ہمارے اپنے محلّوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہاں ان گنت ہندوستانی، پاکستانی اور لنکا کے مزدور رہتے ہیں۔ برسوں سے رہتے آئے ہیں اور اس آبادی میں مدغم ہو گئے ہیں۔ ان کے لباس بھی اتنے ہی بدنما اور شکستہ ہیں جتنے ان کے سفید فام ہمسایوں کے۔ چھوٹے چھوٹے نیم تاریک ہندوستانی طعام خانے ہیں جہاں اتوار کے روز دن بھر جاز کی موسیقی بجتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نیگرو لڑکے اچکتے رہتے ہیں۔ ایک چائے خانے میں ایک روز ہم لوگ گئے۔ اس میں دیوار پر پرانا مسلم لیگ۔ کا کیلنڈر لٹک رہا تھا جس پر قائدِ اعظم اور ہماری کیبنٹ کے افراد کی تصویریں تھیں۔ بے رنگ کرسیاں اور بھدّی میزیں تھیں۔ ایک کونے میں ایک افلاس زدہ انگریز دال بھات کھانے میں مصروف تھا۔ کاونٹر پر سیاہ فام، غالباً سلہٹ کا رہنے والا ویٹر چلّایا "ون ٹی، ون رول" ——— عین مین کراچی کی بندر روڈ کا کوئی ریستوران معلوم ہوتا تھا ——— ڈورچیسٹر کلیرج، سے نیئر؟ ——— جی ہاں۔ ان الف لیلوی جگہوں کے علاوہ جن کے اندر داخل ہو کر لوگوں کی عقل چکر میں آجاتی ہے اور آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ چائے خانہ بھی موجود ہے۔ انگلستان محض دریائے ٹیمز کا مغربی کنارا ہی نہیں ہے۔

اتوار کے روز ایسٹ اینڈ کی مشہور پیٹی کوٹ لین میں ہاٹ لگتی ہے۔ وہی ٹھیلے والوں کی بھانت بھانت کی صدائیں ہیں۔ مونگ پھلی بیچتی ہوئی بڑھیاں، سیکنڈ ہینڈ مال کے انبار دورویہ فٹ پاتھ پر پڑے ہیں۔ وہی رنگ اور ماحول ہے جو اپنے پیارے نخاس کے بازار میں تھا۔ ذرا فرق نہیں۔

پھر یہ گلیاں ہیں جن کی دونوں طرف شکستہ مکانات کے سلسلے ہیں جن کے دروازوں پر عورتیں بیٹھی دھوپ سینکتی ہیں اور سامنے بچے کھیل رہے ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر، ملبے کے انبار، غریب یہودیوں کے عبادت خانے، یہاں سے تو کوئی پیکارڈ یا سن بیم بھولے سے بھی نہیں گذرتی۔

یہ منظر آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ شمال کے صنعتی مرکزوں میں شیفیلڈ میں، گلاسگو میں، ویلز کی آبادیوں میں، سارے آئرلینڈ میں

اور پھر چینل عبور کرنے کے بعد اٹلی، اسپین اور یونان میں یہ سارا پچھم ہے جس پر کہرہ چھایا ہوا ہے۔ کہرہ جو پچھم کے سمندروں سے اٹھتا ہے۔

نیچے نیلا میڈی ٹرینین جگمگا رہا ہے۔ جس کی موجوں پر کاؤنٹس آف ٹیڈل ڈم کی یاٹ تیرتی ہے۔ حسین کاؤنٹس آف ٹیڈل ڈم جو مارکوئس آف ٹوڈل ڈوڈو کے ساتھ، پندرہ منک کوٹ لے کر اطالوی ریویرا تشریف لے گئی ہیں۔

میری پیاری دوست خایا نے مجھ سے کہا۔ اس انٹرنیشنل سلم لینڈ سے کم از کم ہم اپنے یہودیوں کو نکال کر اسرائیل لے گئے ہیں۔ ہمارے COLLECTIVE فارم دیکھو۔ ہماری نئی موسیقی، ہماری کلچر، ہمارا جذبہ۔ ہمارے سامنے وہی مسائل اور دقتیں ہیں جو تمہیں درپیش ہیں۔ نیا ملک ہے۔ نئی اجتماعی طاقت جو پرانی تاریکی کی طاقتوں سے ٹکر لے رہی ہے لیکن پھر بھی ہم اور تم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ بتاؤ ہم میں اور تم میں، یا ہم اور عربوں میں کیا فرق ہے —— وہ خاموش ہو گئی۔

—— ہم نے کئی بار کوشش کی کہ عربوں کے ساتھ مصالحت کر لیں لیکن ہمیشہ کوئی نہ کوئی شاخسانہ کھڑا کر دیا گیا تاکہ مشرقِ وسطیٰ میں عربوں اور یہودیوں میں باہمی مفاہمت، سمجھوتہ اور امن نہ پیدا ہو جائے ——

وہی ہندو مسلم مسئلہ تھا۔ خایا نے پھر کہا۔

اب وہ چپ چاپ بیٹھی ہے۔ خایا روسی نژاد ہے۔ یوکرین میں پیدا ہوئی تھی۔ بارہ سال کی عمر سے اس نے فلسطین کی انڈر گراؤنڈ تحریک میں کام کرنا شروع کیا۔ اس نے ڈبلن سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ لیا ہے۔ خایا بے حد خوبصورت لڑکی ہے۔ ایک تو یہودی ویسے ہی بہت دلکش اور ذہین ہوتے ہیں۔ اس لیے خایا کو کیمبرج میں عام طور پر بہت پسند کیا جاتا ہے۔ خایا یعنی حیا، یعنی حیات، عبرانی میں خایا زندگی کو کہتے ہیں۔

لیکن میں بنی اسرائیل کی نئی زندگی کے اس سمبل سے ہر وقت الجھی رہتی ہوں۔ علاوہ ازیں میرے ملک نے خایا کو سرکاری یا اخلاقی طور پر تسلیم نہیں کیا ہے۔ میں خایا کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس نے اپنے دستی بموں سے کتنے ان گنت عربوں کی جان لی ہو گی۔ یہ سوچ کر مجھے اس کے وجود سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ اطمینان سے بیٹھی پیانو پر چیکووسکی بجاتی رہتی ہے۔ جب وہ جذباتی ہو جاتی ہے تو روسی گانے الاپنے شروع کر دیتی ہے۔ روسی اس کی مادری زبان ہے۔ عبرانی مذہبی اور سیاسی، انگریزی، ادبی۔ اور فرنچ اس کی کلچرل زبان ہے۔ وہ بڑی کٹر اینٹی برٹش عورت ہے۔ فلسطین کی جنگ کے زمانے میں کئی دفعہ برطانوی فوج نے اسے جیل میں بند رکھا اور برطانوی پولیس نے اس کی پٹائی بھی کی۔ سیاسی طور پر وہ اشتراکی ہے۔ اس کا باپ اسرائیلی حکومت کا ایک اہم رکن ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ان سرد مزاج انگریزوں کو وہ بحیثیت مجموعی کافی پُراسرار اور پُرکشش نظر آتی ہے۔ پائندہ باد خایا یعنی حیات۔

اس وقت خایا ڈاکٹر الٹ مَلر سے ایلیٹ کے معاملے میں اُلجھ رہی ہے۔ ڈاکٹر الٹ مَلر ہمبرگ کا انٹلکچوئیل ہے۔ مجھے وہ ہمیشہ ہنستے کہتا ہے اور ’کماری‘ کہہ کر پکارتا ہے کیونکہ سنسکرت اور کالی داس کا وہ بہت عالم فاضل ہے۔ سات سال تک وہ مشرقی محاذ پر روسیوں سے لڑتا رہا۔ روس میں نظر بندی کے زمانے میں اس نے پہلی بار ”جرم و سزا“ کو پڑھا۔ اب وہ ہمبرگ میں ادب کا

پروفیسر ہے۔ یروشلم کی انٹلکچوئیل خایاؔ کی ہمبرگ کے اس انٹلکچوئیل سے بالکل نہیں بنتی۔ کیونکہ خایاؔ کو جرمنوں سے نفرت ہے۔ ڈاکٹر الٹ ملرؔ کی عدم موجودگی میں وہ اکثر مجھ سے کہتی ہے ذرا دیکھو تو اس منحوس مہاکوی کالیداسؔ کے بچے کو۔ یوکرین میں اس نے کتنے ہزاروں روسی یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا —— یوکرین جو میرا وطن ہے۔

یوکرین تمہارا وطن کہاں سے آیا۔ تم اسرائیلی ہو۔ میں اس سے بگڑ کر کہتی ہوں۔

یوکرین میرا وطن بالکل اسی طرح ہے جس طرح صوبہ متحدہ تمہارا وطن ہے، حالانکہ تم پاکستانی ہو۔ وہ چڑ کر جواب دیتی ہے۔

—— اب ہم خطرناک پانیوں کی طرف سفر کر رہے ہیں ——! رونلڈ دوسرا اسگریٹ رول کرتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے۔ رونلڈؔ برطانوی ہے، قوم کا اینگلوسیکسن۔ اس گروہ کا ایک اور انٹلکچوئیل، سارے جدید انگریزی ادب پر وہ بھی ہم سب کی طرح بے تحاشا حاوی ہے اور اپنے آپ کو ڈاکٹر لیوسؔ سے زیادہ سمجھدار نقاد خیال کرتا ہے۔ ڈاکٹر لیوسؔ جو کیمبرج کے بڑے گروہوں میں سے ہیں۔ وہ اکثر الجھتا رہتا ہے۔ تم برصغیر ہند کی ساری خرافات سیاسیات کا ذمہ دار محض مجھے ٹھہراتی ہو۔ یہ تمہاری بڑی بھول ہے۔ وہ انگلی اٹھا کر پیغمبرانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر الٹ ملرؔ کو سیاست کی خرافات سے چنداں دلچسپی نہیں۔ وہ ٹیگور کے فلسفے کے متعلق کرسٹفرلیؔ سے کچھ فرما رہے ہیں۔ کرسٹفرلیؔ لوئی مک نیسؔ کے رفقاء میں سے ہیں اور جدید شاعروں اور نقادوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ٹیگور ٹیگور چلاتے ہیں۔ آپ نے کبھی ابنِ خلدونؔ کا مقدمہ پڑھا ہے؟ میں غصے سے ان دونوں سے کہتی ہوں —— مشرق کا سارا ذہن و فلسفہ محض ٹیگورؔ ہی نہیں ہے۔ حضرت علیؔ اور امام غزالیؔ اور ابن خلدونؔ اور اقبالؔ کا بھی تو مطالعہ کیجیے —— لیکن بھلا آپ عیسائیوں کا تعصب کب مٹے گا ——؟

ہم خطرناک پانیوں کی طرف —— رونلڈؔ آہستگی سے تیسرا اسگریٹ جلا رہا ہے۔

چنانچہ چاروں اور یہ خطرناک پانی ہیں۔ اور ہم سب ایک ناؤ میں سوار ہیں۔

کیمؔ آہستہ آہستہ بہتا جا رہا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی کے کالجوں کے پیچھے سے یہ سینکڑوں برس سے یونہی بہتا آیا ہے۔ اس کے دونوں طرف پرمؔ روز کھلے ہیں اور بے انتہا سرسبز درخت ہیں۔ موسم بہار کے سارے پھول امنڈ رہے ہیں۔ ویپنگ ولوز کی شاخیں پانی کی سطح پہ جھکی رہتی ہیں۔ صدیوں سے یہ پھول اور یہ پرانی دیواریں اور یہ پُل، یہ انڈر گریجویٹ بحثیں سنتے آئے ہیں۔ بے حد پُرسکون —— اور بے تحاشا خوبصورت منظر ہے جو کرسمس کارڈوں اور کیلنڈروں پر منتقل ہو کر دنیا بھر میں فروخت ہوتا ہے۔ چیری کے درخت ہیں اور ان میں چھپے ہوئے کالج اور ٹی گارڈن گرانچسٹر ہے جہاں ریوپرٹ بروک رہتا تھا۔ گرانچسٹر، گرانچسٹر گرجا کے قبرستان میں ریوپرٹؔ بروک کے میموریل پہ ایک اکیلی ریتھ مرجھائی پڑی ہے۔

ایک تیز رفتار موٹر لانچ یونین جیک لہراتی زناٹے سے سطح پر سے نکل جاتی ہے۔ گڈ اولڈ یونین جیک ——! کوئی آہستہ سے کہتا ہے —— ہولی ڈے میکرز اور انڈر گریجویٹس کناروں پر دور دور تک ٹولیوں میں منتشر ویک اینڈ منا رہے ہیں۔ پانی کی لہروں

پر ان گنت PUNTS تیر رہی ہیں۔ ابھی قریب سے جو پنٹ گزری ہے اس کے سرے پر کھڑی ہوئی خایا نے جوش میں آکر زور زور سے کوئی عبرانی لوک گیت شروع کر دیا ہے جو اسرائیل کے کھیتوں میں لڑکیاں گاتی ہیں۔ ڈاکٹر البرٹ ملر آہستہ آہستہ ایک جرمن نغمہ الاپ رہا ہے۔
ڈاکٹر نینسی کارلن 'نیگرو روحانی گیت' گنگنانے لگتی ہے۔ انٹرنیشنل سمفنی شروع ہو جاتی ہے۔
"تم بھی کوئی ہندوستانی، میرا مطلب ہے پاکستانی گانا گاؤ ـــــ" رونلڈ ذرا خفگی سے مجھ سے کہتا ہے۔ نینسی آنکھیں نیم وا کیے اپنے وطن، جنوب کے ـــــ PLANTATIONS کے گیت گا رہی ہے۔

ڈاکٹر نینسی کارلن۔ یہ میری دوسری پیاری دوست ہے۔ اس کی دادی حبشی سلیو گرل تھی جسے نیو اورلینز میں فروخت کیا گیا تھا۔ اس کا باپ ورجینیا میں پادری ہے۔ نینسی کو ورجینیا کے کسی کالج میں اسلئے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لہٰذا اس نے شمال کی کسی یونیورسٹی میں جا کر پڑھا۔ اور امریکن ناول میں نیگرو پادری کے کردار پر مقالہ لکھ کر اس نے کولمبیا سے ڈاکٹریٹ لیا۔ اب وہ جنوب کی کسی بہت بڑی نیگرو یونیورسٹی میں ادبیات کی پروفیسر ہے۔ نینسی بے حد پیاری لڑکی ہے۔ ہر وقت بشاش رہتی ہے اور بات بات پر زور زور سے قہقہے لگاتی ہے۔
"دیکھو ـــــ تم لوگ ہمیشہ اپنی مظلومیت پر بسورتے ہو اور زندگی سے بیزار نظر آتے ہو۔ لیکن نینسی کو دیکھو۔ اس کی قوم نے کتنے ظلم سہے ہیں اور یہ کس طرح ہر سمے ہنستی اور دوسروں کو ہنساتی رہتی ہے۔ حالانکہ یہ بھی اپنی سیاسیات اور اپنے کلر پرابلم کے بارے میں تمہاری طرح ہی حساس ہے۔ بلکہ اس نے تم سے زیادہ دکھ سہے ہیں ـــــ" رونلڈ مجھ سے کہتا ہے۔
نینسی واقعی بہت عظیم ہے۔ ہمارے ساتھ تین چار امریکن اور ہیں جو سب کے سب کسی نہ کسی مشہور یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔ سب بڑے ذہن پرست ہیں۔ مثلاً برنارڈ کارسٹل فریزر جو نیویارک کے ایک مشہور ادبی رسالے کا جوائنٹ ایڈیٹر ہے اور امریکہ کے نئے بلند پایہ نقادوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن ہم کبھی ایک دوسرے سے سیاست کی بات نہیں کرتے۔ صرف ایذرا پاؤنڈ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ نینسی ان سب کی دوست ہے کیونکہ بہر حال وہ بھی امریکن ہے اور بڑی پکی امریکن ہے۔ لیکن ان سب سے مختلف ہے۔ ایک بات آپ کو اور بتا دوں۔ نینسی، خایا یا رونلڈ کی طرح اشتراکی خیالات کی حامی نہیں ہے۔ امریکی طرز جمہوریت کی پرستار ہے۔ پھر بھی اس سمے کتنی گمبھیرتا اور کتنے دکھ سے وہ 'نیگرو روحانی نغمہ' الاپ رہی ہے۔
نینسی کارلن بہت عظیم عورت ہے۔

کل ایک انگریز لڑکی نے بریکفاسٹ کی میز پر اس سے بہت بشاشت سے کہہ دیا "ہلو ٹوپسی ـــــ!!"
نینسی نے اس سے کہا "دیکھو ڈارلنگ، مجھے معلوم ہے کہ تم نے کسی بری نیت سے نہیں بلکہ محض خوش دلی سے ٹوپسی کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن آئندہ کسی نیگرو کو اس نام سے مخاطب نہ کرنا۔"
"اوہ ـــ آئی ایم سو سوری ڈیر ـــ" انگریز لڑکی نے جواب دیا اور خاموشی سے پارج میں مصروف ہو گئی۔
"تم نے دیکھا ـــ" بعد میں نینسی نے مجھ سے مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا "یہ بالکل اسی طرح ہے جب یہ لوگ نیگرو عورتوں کو ٹوپسی یا نیگرس کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ تم سمجھتی ہو نا۔ میرا مطلب ہے کہ ـــــ"

"الفاظ میں کیا رکھا ہے ۔۔۔!؟" رونلڈ نے ایک اور سگریٹ رول کرتے ہوئے کاہلی سے سوال کیا۔

"الفاظ ۔۔۔؟ آپ کسی چینی کو چائینا مین کیوں کہتے ہیں اور کیا تم کو پتہ ہے کہ لفظ 'ایشیاٹک' کے پیچھے کتنی حقارت چھپی ہوئی ہے۔۔۔؟؟" میں نے جواب دیا۔

"او ہو ۔۔۔!! اسی لیے اب تم لوگ اپنے آپ کو ایشیاٹک کے بجائے ایشین کے نام سے یاد کرتے ہو ۔۔۔!!" رونلڈ نے کہا۔

"جی ہاں جناب ۔۔۔" میں غصے سے کود کر دریچے میں جا بیٹھی۔

"اچھا ۔ اچھا ۔ ایشین ، ایشین ، ایشین ۔۔۔!! ٹھیک ہے؟!" رونلڈ نے کہا۔

"ٹھیک ہائے ۔۔۔" میں نے نقل اتارتے ہوئے جواب دیا۔

سورج کنگز کالج کے پیچھے غروب ہوتا جا رہا ہے۔ کورٹ یارڈ پر سائے طویل ہونے لگے ہیں۔ پیٹر ہاؤس۔ کوئینز کالج۔ ایمونئل سڈنی سسکس۔ ان ساری سحر انگیز عمارتوں پر تاریکی چھا رہی ہے۔ تاریکی میں ایسا لگتا ہے۔ ابھی ان صدیوں پرانے گھسے پتھروں والے کوریڈوراز میں سے قرونِ وسطیٰ کے راہب اور اسکالر کالے گاؤن پہنے شمعیں لیے اِدھر سے اُدھر گزر جائیں گے۔ ان کمروں میں، ان سیڑھیوں پر اور ان کورٹ یارڈز کے درختوں کے نیچے کرسٹفر مارلو، روجر بیکن، اولیور کرومویل اور ان کے بعد کیٹس، بائرن اور جانے کس کس نے اپنے طالب علمی کے زمانے بتائے ہیں۔ اس پُراسرار نیم تاریک ماحول میں اب تک ذرا سی بھی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ کیم اسی طرح بہتا رہے گا۔

اب ہم اپنے گرینڈ کونسرٹ کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ بارش ابھی تھمی ہے۔ فضا میں پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو بہہ رہی ہے۔ تیز سبز گھاس نم ہے۔ اور پتوں پر سے بارش کے قطرے نیچے گر رہے ہیں۔ پورب کے کھیتوں اور کنجوں پر بھی یونہی بارش ہوتی ہوگی۔ چھلیندے اور کھرنی کے درختوں پر، بخشی کا تالاب اس وقت پانی سے بالکل لبریز ہو گیا ہوگا۔ اور پیلے کنول وہاں تیرتے ہوں گے۔ گومتی کے کاٹھ کے پُل پر سے لوگ چولائی اور بھتوے کے جھوے اٹھائے ساون الاپتے گزر رہے ہوں گے۔

نوسٹیلجیا ۔۔۔!؟؟ نینسی آہستہ سے دریافت کرتی ہے۔ لان پر ہمارے ساتھی اِدھر اُدھر گروہ بنائے گھاس پہ بیٹھے پروگرام کے مختلف حصوں پہ نظرِ ثانی کر رہے ہیں۔ شاہ بلوط کی لکڑی کی دیواروں والے نیم روشن کمرے میں اس اسکٹ کی مشق کی جا رہی ہے جو ہم نے ایلیٹ کے "سوینی انگنسٹیس" کی پیروڈی میں لکھا ہے۔ ہم ایک ایک جملے اور سین پر قہقہے لگاتے لگاتے دُہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک امریکن لڑکی وائلن پر ڈیبسی بجا رہی ہے۔ اس کے ساتھ انٹرنیشنل لاء کا اطالوی طالب علم گٹار بجا رہا ہے۔ آتشدان کے اوپر سے لیڈی سمڈتی کی روغنی تصویر کاہلی سے جھانک رہی ہے جنھوں نے پندرھویں صدی میں یہ کالج قائم کیا تھا۔

رسل فریزر فرش پر پڑے ہوئے گھنگھروؤں کو بڑے غور اور دھیان سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ نینسی کارلن پیانو پر تن دہی سے وہ دھن بجانے کی کوشش کر رہی ہے جو میں نے ناچ کی لے کے لیے اسے سکھائی ہے ۔۔۔ رے داگے بندرابن میں بانسریا کھوب کھوب بجا دینا ۔۔۔ رے داگے۔

دھیم تانا دھی ری نا نا نا، دھی ری نا دھیم — سب مل کر الاپنے لگتے ہیں۔

ٹیرفک —!! ارنسل فریزر چلّا کر خوشی سے کہتا ہے۔

ان سفید قوموں کا آرکسٹرا اب ہندوستان کا گیت بجا رہا ہے۔ یہ دھنیں انھوں نے آج تک نہ سنی تھیں۔ سب کے سب بچوں کی طرح اکسائیٹڈ ہیں۔

اوہ بوائے —!! نینسی چلّا کر کہتی ہے۔

کیا کلچرل ہارمنی پیدا ہوئی ہے واللہ —!! میں سوچتی ہوں۔

شام کو ای ایم فارسٹر مجھ سے کہتے ہیں — میں ہندوستان کو بھلا کس طرح بھول سکتا ہوں؟ — کبھی نہیں —!

یس سر — میں کہتی ہوں۔

خصوصاً تمہارا لکھنؤ۔

یس سر۔

تمہاری تہذیب۔

یس سر۔

تمہاری ساری جدوجہد۔

یس سر — ٹو چیئرز فار ڈیموکریسی[1]

فارسٹر کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

سارے ایسٹ انگلیا پر، جنوبی انگلستان پر، موسم گرما کے خوشگوار بادل چھائے ہوئے ہیں۔ پھر دھوپ نکلتی ہے۔ سیزن اپنے عروج پر ہے۔ ویسٹ اینڈ میں پیٹر اُسٹینوف، ایڈتھ ایوانز اور میری مارٹن کے کھیل بے پناہ ہجوم اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ شہزادی مارگریٹ نے نئے فیشن ایجاد کیے ہیں۔ کورٹ آف سینٹ جیمز سے ذرا پرے اوورسیز لیگ کی مجبوری مہیب عمارت ہے جس میں بوڑھے آئی سی ایس اور نو آبادیات کے سابق گورنر دن بھر چپ چاپ بیٹھے وہسکی پیتے اور ٹائمز پڑھتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی اخبار پر سے سر اٹھا کر گذرے ہوئے پونا، ہنڈ یٹنسی یا ڈیرا دون چھتر منزل کلب کا تذکرہ کر لیتے ہیں۔ جہاں سنہ ۲۰ء میں یا سنہ ۳۰ء میں کتنی دلچسپ برج پارٹیاں ہوتی تھیں۔

ایک روز ایک پارٹی کے دوران میں میں نے ایک بہت بوڑھے انگریز کو نوٹس کیا جو سب سے الگ تھلگ خاموش بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ میں نے پیالی اسے اٹھا کر دی۔

---

[1] فارسٹر کی نئی کتاب کا نام

انڈیا ۔۔۔ ؟! اس نے دوستی کے انداز میں سوال کیا۔

پاکستان ۔۔۔! میں نے اسی بشاشت سے جواب دیا۔

اوہ ۔۔۔ ونڈر فل ۔۔۔ ونڈر فل۔

آپ کبھی برصغیر جا چکے ہیں ۔۔۔! میں نے پوچھا۔

ہاں! جا چکا ہوں ۔۔۔ جا چکا ہوں ۔۔۔ اس نے پیالی کانپتے ہاتھوں سے سنبھال کر اٹھائی۔

کسی خاص جگہ ۔۔۔ ؟

بمبئی!

اچھا ۔۔۔ کسی ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں۔ یا ایسے ہی ۔۔۔ ؟ میں نے اخلاقاً مکالمہ جاری رکھنے کی غرض سے دوبارہ بات کی۔

نہیں ۔۔۔ ملازمت کے سلسلے میں نہیں۔

اوہ ۔۔۔! آرمی ۔۔۔ ؟!

نہیں، آرمی نہیں۔

تو کافی عرصہ رہے آپ ہندوستاں ؟

ہاں ۔ ہاں ۔۔۔ کئی سال ۔۔۔ کئی سال۔

کیا کرتے رہے اتنے دنوں آپ وہاں ۔۔۔ میرا مطلب ہے، بمبئی میں ۔۔۔ ؟

اوہ ۔۔۔ میں بمبئی پریذیڈنسی کا گورنر تھا۔

اوہ ۔۔۔

ان انگریزوں کی تنہائی اب قابلِ رحم ہے۔ ان کے دوسرے ہم مرتبہ ساتھیوں پر بھی زوال آ چکا ہے۔ بڑے بڑے لارڈ اور کاؤنٹ جن کے پاس لمبے چوڑے خطابات، طویل و عریض ریاستیں اور عظیم الشان محلات اور قلعے تھے، اب نوکریاں کر رہے ہیں یا اپنے جواہرات اور بیش قیمت کتب خانے فروخت کر رہے ہیں۔ بہت سوں نے اپنے محلوں کی نمائش شروع کر دی ہے جن پر ٹکٹ لگا کر وہ تماشائیوں کو اپنے کتب خانے، اپنے نفیس بیڈ روم اور ڈرائنگ روم ایک مستعد گائیڈ کی طرح دکھلاتے پھرتے ہیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اس سے گھر کے خرچ میں مدد لیتے ہیں۔ "موت کے محصول" نے ارسٹوکریسی کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر دیا ہے۔

انگلستان کے لارڈز اور لیڈیز کا زمانہ ختم ہوا۔

لہٰذا اے مومنو! لازم آیا تم پر کہ عبرت پکڑو اور درود سے کبھی غافل نہ ہو۔ پڑھو درود!

اب آخر میں خان صاحب سے بھی مل لیجئے جو پچھلے تیس سال سے لندن میں رہتے ہیں۔ جوش کے قریبی عزیز ہیں اور غالباً کسی زمانے میں میرے ابا کے کلاس فیلو تھے جو اپنی ذات سے انجمن ہیں۔ بی بی سی کے اسٹوڈیوز کے پاکستانی سیکشن میں ان کی وجہ سے بڑی رونق رہتی ہے۔

اتنے طویل عرصے کے ولایت کے قیام کے باوجود ان کا لب و لہجہ اب تک ٹھیٹھ اور خالص اودھ والوں کا سا ہے۔ اردو بولتے ہیں تو ہمیشہ تھیٹر کو ٹھیٹھر اور ویسٹ منسٹر کو ویسٹ مینسٹر کہتے ہیں۔ سینما کو انھوں نے ہمیشہ بائیسکوپ ہی کہا۔ لکھنؤ کے پرانے داستان گویوں کے انداز میں قصے سناتے ہیں۔ تیس سال گزر گئے، ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے یہاں آئے تھے اور پھر کبھی واپس نہ گئے۔ ہائیڈ پارک میں انھوں نے بھی بغاوت کا علَم بلند کیا۔ خلافت تحریک آرگنائز کی۔ اخبار نکالے۔ لائیڈ جارج کے پاس پہنچ جاتے تھے اور اس سے بگڑ کر کہتے تھے کیا معنی کہ آپ نہایت بے ایمان آدمی ہیں۔ ہند کو ابھی فوراً آزاد کیجئے۔

اب بوڑھے ہو گئے ہیں اور دل شکستہ ہیں۔ کہ جو سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ پچھلے دنوں پاکستان گئے تھے لیکن پرمٹ نہ مل سکنے کی وجہ سے وطن مرحوم ملیح آباد نہ پہنچ سکے اور پھر لندن لوٹ آئے۔ ہر شخص کے دکھ درد میں کام آنے کو تیار رہتے ہیں۔ کوئی خاندان نہیں ہے۔ اکیلے رہتے اور اپنے محلے بھر کے گورو اور جگت چچا ہیں۔ ایسے لوگ اب صرف قصے کہانیوں میں ملتے ہیں یا چودھری محمد علی ردولوی کی حکایتوں میں اور چودھری محمد علی کی حکایتوں کو بھی سمجھ کر پڑھنے اور سر دھننے والے ہمارے پاکستان میں بہت کم ہوں گے۔

موسمِ گرما بھی گزرتا جا رہا ہے۔ ٹورسٹ ٹریفلگر اسکوائر میں کبوتروں کو دانے کھلا رہے ہیں۔ ٹیٹ گیلری میں پکاسو اور رائل اکیڈمی میں ڈاونچی کی نمائش ہو رہی ہے۔ پکیڈلی سرکس میں وہاں کی مشہورِ عالم، سڑک پر چلنے والی، لڑکیاں حسین کپڑوں میں ملبوس، اونچی ایڑی کے جوتے پہنے گہرا میک اپ کئے کونوں کھدروں یا فٹ پاتھ کے کناروں پر کھڑی راہ چلنے والوں خصوصاً غیر ملکیوں کو ہلو ہنی، ڈارلنگ کہہ کر اپنی اور متوجہ کرنے میں مصروف ہیں۔

پکیڈلی ——— ہارٹ آف دی ورلڈ ———!! مجمع بڑھتا جا رہا ہے۔ سینما گھروں کی کھڑکیوں کے سامنے کیو لگے ہیں۔ ایک خوبصورت جوان آدمی جس کی ایک ٹانگ اوپر سے کٹی ہوئی ہے، بھیک مانگتا مانگتا کیو کے ہر فرد کے سامنے جاتا ہے اور ٹوپی اتار کر سلام کرتا ہے۔ بہت کم لوگ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ پیسے اس کے بکس میں کوئی بھی نہیں ڈالتا۔

"سلام میم صاحب ———!!" وہ ہمارے سامنے آ کر کہتا ہے۔

میری بہت ہی پیاری دوست فیروزہ جبیں اس سے پوچھتی ہے "کیا تم کبھی ہندوستان میں رہے ہو؟"

"نہیں ——— میں ڈنکرک فتح کرنے میں مصروف تھا اس لیے ہندوستان نہ جا سکا ———!" وہ مسکرا کر کہتا ہے۔

"اچھا ———!" فیروزہ اس کے ڈبے میں پیسے ڈال دیتی ہے۔ وہ اسی طرح مسکرا کر تھینک یو کہتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

"ڈنکرک فتح کرنے میں مصروف تھا" فیروزہ دہراتی ہے، "اور اب ویسٹ اینڈ کے تھیٹروں کے آگے بھیک مانگتا ہے۔ اور ابھی ایک جنگ اور ہو گی؟؟"

سامنے سے اطلانتک پار والے سپاہیوں کا ایک غول گذر جاتا ہے ۔
میں اور فیروزؔ سینما کے اندر جا کر لاروند دیکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔
لاروند ——— زندگی کا میری گو راؤنڈ ——— !!!

تو بھائی یہ روز یہ سلسلے ہیں۔ رات کو میں آگ کے سامنے اطمینان سے بیٹھ کر فیروزؔ سے کہتی ہوں۔ یہ ہمارا پرانا لطیفہ ہے۔ یونیورسٹی میں ہم جب اکٹھے پڑھتے تھے تو شام کو ہوسٹل کی ڈائننگ ٹیبل پر دن بھر کے سارے ضروری واقعات یونیورسٹی پالیٹکس اور اسکینڈلز ایک سانس میں گوش گذار کرنے کے لیے بعد میں فیروزؔ سے کہتی تھی: تو یہ سلسلے ہیں بھائی صاحب ——— !!

فیروزؔ کھانا پکانے میں مصروف ہے۔ اسٹوڈیو کے چاروں طرف ضخیم کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔ اس نے لکھنؤ سے اُردو میں ایم اے کیا تھا۔ اب وہ جرنلزم کی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور انڈیا ہاؤس میں کام کرتی ہے۔ فیروزؔ جیسی ہندوستانی لڑکی ہے۔ ہندوستانی طالبعلموں کی تہذیبی سرگرمیوں میں بہت دلچسپی سے حصہ لیتی ہے۔ جد و جہد ہماری روایت ہے اور اس روایت کو ہم کبھی نہ بھولیں گے۔

براوو ——— میں چلاتی ہوں۔

فیروزؔ اور اس کے ہندوستانی ساتھی ذرا تکلفاً بُرا مان کر چپ ہو جاتے ہیں۔

اور یہ کملا ہے۔ میری بچپن کی رفیق کملا جسپال جس کا ذکر آپ نے اس ناچیز خاکسار کے افسانوں میں اکثر پڑھا ہوگا۔ یہ صاحب ہندوستان کی فارن سروس کی ایک بڑی ذمہ دار رکن ہے، پر اب تک لگتا ہے کہ ابھی ابھی اپنی کلاس کا کوئی پیریڈ 'گول' کر کے کالج سے بھاگی چلی آ رہی ہے۔ اس کا فلیٹ چیلسی میں ہے۔ لہٰذا آرٹ وارٹ کا چکر اس کے یہاں بہت رہتا ہے۔

کینیڈا کا 'انٹلکچوئیل' تاریخ اور پولٹیکل سائنس کا ماہر آرنی بلینڈن برگ جامینی رائے کی ایک تصویر کو بے دھیانی سے الٹ پلٹ رہا ہے۔ آرنی آج کل بیک وقت دو کتابیں لکھنے میں مصروف ہے۔ ایک کینیڈا کی اقتصادی تاریخ ہے اور دوسری کچھ اور اسی قسم کی چیز ہے۔ دونوں کتابیں بڑے پروگریسو نظریے سے لکھی جا رہی ہیں۔ اپنی کم عمری کو چھپانے کے لیے ہر وقت بے حد سنجیدہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

پروگریسو ——— ؟ افوہ ——— افسوس یہ ہے کہ تم تو پچھم کے زوال پرست انٹلکچوئیل بھی نہیں ہو۔ کونیل انٹلکچوئیل ہو ——— میں اسے جلانے کے لیے کہتی ہوں۔

دراصل مجھے اس لفظ انٹلکچوئیل ہی سے وحشت ہوتی ہے اور پھر کینیڈا کی یہ مخلوق ——— ؟ افوہ۔ یہ کونیل لوگ بھلا کیا کھا کر انٹلکچوئیل بنیں گے۔ بھائی جو تمہارے باپ کے چین اسٹورز ہیں، انھیں میں مگن رہو (آرنی جب اپنی بے تحاشا طویل و عریض امریکن کار میں سڑکوں پر سے گذرتا ہے۔ خصوصاً کنٹری سائیڈ کے قصبوں کی پتلی پتلی سڑکوں پر سے، تو راہگیر رُک رُک کر کار کو غور سے دیکھنے لگتے ہیں۔ امریکن کاریں انگلستان میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ انگلش کاریں جو ان کے سامنے بالکل کھلونا ایسی دکھلائی دیتی ہیں، آرنی کی کار کی وجہ سے رُک جاتی ہیں کیونکہ اس کی

''اور ٹوموبیل، سارا راستہ گھیر لیتی ہے اور اس ماحول میں بے حد غیر ملکی نظر آتی ہے۔ راہگیر حیرت سے امریکن کاروں کو کبھی کبھی چھو کر بھی دیکھ لیتے ہیں —
— واہ امریکہ!!)

اور پھر کینیڈا کی اقتصادی تاریخ پر ترقی پسند نظریہ ——— (جھگڑا جاری رہتا ہے) برطانیہ اعظمیٰ کے انقلابات — یا میاں انقلاب تو ایشیا میں آتے ہیں۔ دو سال میں ساری کایا پلٹ جاتی ہے۔ مہینوں اور ہفتوں میں دنیا اِدھر سے اُدھر کر دی جاتی ہے۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ پہلے دو سو سال تک انڈسٹریل ریولیوشن گھسٹا۔ پھر اِسٹیم انجن چلے۔ پھر کوئلے کی کانوں کا سلسلہ رہا۔ بھائی دنیا کی تاریخ تو ایشیا میں بن رہی ہے۔ آیا خیال میں؟ میں کہتی ہوں۔

کیا میلو ڈرامیٹک اپروچ ہے آپ کی ——!! جم کہتا ہے۔

اور کیا کومک اوپیرا آپ سب کا ہے۔ یہاں سے وہاں تک۔ میں چڑ کر جواب دیتی ہوں۔

آرنی خاموشی سے مسکراتا رہتا ہے۔ دراصل آرنی کو تو ایلسٹری یا ہالی ووڈ میں ہونا چاہیئے تھا۔ اسٹیورٹ گرینجر یا کورنیل وائلڈ اس کو دیکھ پائے تو چلو بھر پانی تلاش کرتا پھرے۔ آرنی روسی نژاد ہے اور صنفِ نازک اسے بے انتہا خوبصورت سمجھتی ہے۔

لیکن آرنی واقعی بے حد پروگریسو ہے۔ نہایت سمجھدار اور خاموش قسم کا پروگریسو۔ اور جو کچھ وہ لکھ رہا ہے ٹھیک لکھ رہا ہے۔

کیا تم لوگوں کو بھی اپنی تواریخ بالکل نئے سرے سے اور نئے زاویے سے نہیں لکھنی چاہیئے۔ وہ پوچھتا ہے۔

کولونیل ——!!

ابھی ابھی جم اپنے ایسوسی ایشن کے دفتر سے واپس آیا ہے۔ جم بھی رونالڈ کی طرح انگریز ہے۔ جدید سنگتراشی اس کا مشغلہ ہے۔

اور چونکہ وہ بھی چیلسی میں رہتا ہے لہٰذا اسے بھی اپنے آپ کو فنکار سمجھنے پر مجبور کیا جاتا رہتا ہے، حالانکہ وہ مصر ہے کہ وہ بے حد پریکٹیکل آدمی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ 'منتے' کرتا ہے۔ اور سارے قدیم ہندو فلسفے اس نے گھول کر پی رکھے ہیں۔ گاندھین طرزِ زندگی کا سخت قائل۔ دنیا کے سارے پروبلمز کا حل صرف اس نے دریافت کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم سب کو شخصی CELLS بنانے چاہیئیں۔ ان میں رہتے ہوئے اور ان سے آگے بڑھ کر ہم سوسائٹی کی اصلاح کریں گے۔ اور زندگی لامحالہ نہایت سیدھی سادی اور پُرسکون ہو جائے گی۔ اسی شخصی درجۂ معرفت کی آئیڈیلزم کے چکر میں اس کی غیر سیاسی انسانیت پرست ایسوسی ایشن کی طرف سے پچھلے دنوں چند اللہ والے مہاپرش کراچی گئے تھے۔ ان میں فرانسیسی، سوئس، ڈچ اور غالباً انگریز مرد اور عورتیں تھیں۔ یہ لوگ لالو کھیت میں کئی مہینے مہاجرین کے ساتھ رہے۔ دن رات لگ کر انھوں نے مکان تعمیر کیے۔ دن بھر وہ اینٹ اور گارا ڈھوتے تھے اور رات کو چٹائیوں پر پڑ کر سو رہتے تھے۔ کیا روحانی بلندی ہے واللہ ——!! میں جم سے کہتی ہوں۔

مصیبت یہ ہے کہ جم مذہبی بھی نہیں ہے لیکن انقلاب کا قائل نہیں۔ بڑا سخت PACIFIST اس کے خیال میں سوویت یونین اور مغربی ممالک دونوں تباہی کے راستے پر جا رہے ہیں۔ اچھا خاصا جین مت کا پیرو معلوم ہوتا ہے۔ بس ہر ایک کو مکمل شخصی آزادی اور امن حاصل ہونا چاہیئے۔ اور سب کو چھوٹی چھوٹی COMMUNITIES میں رہنا چاہیئے۔

جم اگر خدا پرست ہوتا تو بڑا عمدہ رومن کیتھولک فادر ثابت ہوتا۔

گڈ اولڈ جم ——

کرشنا مینن ریٹائر ہو گئے ہیں۔ جب تک وہ ہائی کمشنر رہے انڈیا ہاؤس میں انھوں نے اپنی رہائش کے لیے ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ جس میں ایک طرف چائے بنانے کا سامان رکھا تھا اور باقی سارے کمرے میں کتابوں اور اخباروں کے انبار بکھرے رہتے تھے۔ دن بھر اور رات گئے تک وہ خود چائے بنا بنا کر پیتے جاتے تھے اور لگاتار کام کرتے تھے۔ کام میں مصروف رہنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔

اب آپ بنا کچھ کئے کیسے رہ پائیں گے؟ میں نے ان سے پوچھا۔

میں کچھ نہ کچھ ضرور کیا کروں گا ——!! انھوں نے کہا۔

اب آپ کتابیں لکھا کیجئے —— میں نے عقلمندی سے ان کو مشورہ دیا۔

غالباً وہ انگلستان میں مستقل رہیں گے جس طرح ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں۔ محمد علی خاں ملیح آبادی کی طرح وہ بھی اس سرزمین کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اس وقت تو وہ ارتی کو جسے وہ 'کینیڈین بُش مین' کہتے ہیں، پراٹھے کھلا رہے ہیں اور وہ سالن میں مرچوں کی زیادتی کی وجہ سے سوں سوں کر رہا ہے۔

اور اب رات ہو رہی ہے۔ سڑک کے کنارے کنارے گھومنے والی لڑکیاں اور وہ بوڑھے بھکاری مصور جو فٹ پاتھ پر رنگین چاک سے تصویریں بنا کر خاموشی سے ایک طرف دیوار کے سہارے دن دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور ہر راہگیر کو دھندلی، پر امید آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اپنے ٹھکانوں پر جا چکے ہیں۔ فٹ پاتھ کی ان تصویروں کے نیچے لکھا ہوتا ہے: — یہ میں نے جھیل اور چاندنی رات کی تصویر بنائی ہے، لیکن چونکہ چاک سے سارے رنگ اُجاگر نہیں ہو سکتے اور کاغذ یا کینوس کے بجائے میرے پاس صرف یہ فٹ پاتھ کی زمین ہے۔ اس لیے تصویر ایسی نہ بن سکی جیسی میں چاہتا تھا۔ اگر آپ کچھ دیتے جائیں تو میں رات کو کھانا کھا کر سو سکوں گا۔ گو میرے پاس رات گزارنے کے لیے کوئی پلنگ نہیں ہے —— وغیرہ وغیرہ وغیرہ ——

سڑکیں سنسان ہو چلی ہیں۔ زمین دوز ریلیں اپنی آخری مسافتیں طے کر رہی ہیں۔ متوسط طبقے کے باولر ہیٹ اور چھتریوں والے انگریز اپنے اپنے گھروں میں قلعہ بند ہو چکے ہیں۔

کوئی ٹورسٹ اپنے دوست سے کہہ رہا ہے۔ کیا بو بدمذاق شہر ہے جہاں اتنی جلدی رات ہو جاتی ہے۔ اسی لیے میں کل پیرس جا رہا ہوں —— شب بخیر لندن۔

لندن سو رہا ہے۔ لندن جاگ رہا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے گرا دیے گئے ہیں۔ باہر خشک ہوا چل رہی ہے۔ کل سردی

ہو گی۔ نیچے سڑک پر شام کا اخبار بیچنے والے آخری بچے پھٹے پرچے سمیٹ رہے ہیں جن کی سرخیاں تاریکی میں مدھم ہوتی جا رہی ہیں۔ ایواؔ پیرون مر گئی۔ شاہ فاروقؔ کو با۔ر نکال باہر کیا گیا۔ مصدقؔ رونے لگے۔ روسیوں نے ایک اور گولڈ میڈل جیت لیا۔

اب سب سو رہیں گے۔ میں اور فیروزؔ اور کملاؔ اور رخایاؔ اور نینسیؔ۔ اور ان کے علاوہ رونلڈؔ اور رالٹ ملر اور ارنیؔ اور رحمؔ سب سو جائیں گے۔ کیونکہ یہ آج کا دن پھر ختم ہوا۔

کل کیا ہوگا۔ یہی سوال ۱۹۳۱ء میں بھی سب کے سامنے تھا۔

لیکن سامنے دیکھو۔ اب دیوار پر کیا لکھا ہے۔ دیکھو ——

اب تمہاری خاطر کوئی ڈینیلؔ فیصلے کے لیے نہ آئے گا۔

بھاگ بھری

ہاجرہ مسرور

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نئی نئی پریکٹس شروع کی تھی ——

میڈیکل کالج کے زمانے میں اپنے آپ پر روپیوں کی کبھی کیسی بارش نہ دیکھی تھی۔ اپنے بڑے بڑے پروفیسروں کی لمبی لمبی کاریں دیکھ کر آدمی اور سوچ بھی کیا سکتا ہے۔ مگر جب ڈگری لے کر اس بازار میں آئی تو معلوم ہوا کہ گلی کے اندر حقیر سے کمرے پر بورڈ لگا کر بیٹھے سے وہی دولت واپس آنا مشکل ہے جو بیوہ ماں کے زیورات بک بک کر فیسوں اور کتابوں پہ خرچ ہوئی —— آگے چل کر میں نے کیا رُخ اختیار کیا، یہ ایک الگ قصہ ہے جس کا ذکر کرنا اس موقع پر ضروری نہیں۔

ہاں تو ان دنوں جب پہلی بار مجھے دُور دراز کے ایک گاؤں میں زچگی کا ایک کیس کرنے کی دعوت ملی تو میں کافی خوش ہوئی۔ بظاہر میں نے منہ بنایا اور اپنے بے شمار مریضوں کی پریشانی کا ذکر کیا۔ لیکن جب سیدھے سادے چھیل پیغامبر نے یہ بھاؤ ایک دم بڑھا دیا تو میں فوراً تیار ہو گئی۔ —— دو سو روپے روز کے کم نہیں ہوتے۔ میں حیران رہ گئی کہ شہر کی دوسری چلتی ہوئی ڈاکٹرنیوں سے بچ کر یہ میرے پلے کیسے پڑ گیا۔

میں نے جلدی سے اندر جا کر والدہ سے ذکر کیا لیکن وہ خوش ہونے کے بجائے کچھ پریشان ہو گئیں کہ ہٹاؤ دُور کی بات ہے، جوان کنواری لڑکی، لاکھ ڈاکٹر ہو پھر بھی —— والدہ کی اس پھر بھی" سے میں بھی ذرا پریشان ہوئی۔ لیکن پھر ایک ترکیب سمجھ میں آگئی، میں نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ دوڑ کر سائیکل پر جائے اور کالج میں کم از کم چھ دن کی چھٹی کی درخواست دے آئے اور ساتھ ہی میں نے گھر کی پرانی ملازمہ مائی کو سفید شلوار کرتا پہنوا کر بطور نرس ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔۔۔ جب میں واپس اپنے مطب کے اُجڑے کمرے میں گئی تو یہ بات بھی فوراً طے ہو گئی کہ نرس کو دس روپے روز ملیں گے۔

پھر میں نے پوچھا کہ "وہاں ٹرین یا بس کس وقت جائے گی؟"

"کار ساتھ لایا ہوں۔" جواب ملا۔

اور میں یہ سوچ کر پریشان ہوئی کہ دیہات سے شہر تک پہنچتے پہنچتے کار کہیں اتنی بے کار نہ ہو گئی ہو کہ راستے میں پریشانی اٹھانا پڑے۔

لیکن جب میں اپنے دو محافظوں کے ساتھ والدہ کو دعائیں پڑھتے چھوڑ کر نکلی اور گلی طے کر کے سڑک پر آئی تو تازہ بتازہ کیڈی لک دیکھ کر میرے چہرے کا رنگ ضرور بدل گیا ہو گا —— میں پچھتائی کہ میں نے فیس اور زیادہ کیوں نہ مانگی۔

راستے میں میرے چھوٹے بھائی نے کرید کرید کر کئی بار یہ معلوم کیا کہ ہم ضلع سرگودھا کے ایک جاگیردار کے ہاں جا رہے ہیں، جاگیرداری

مصر تھیں کہ ولایت لاہور سے ڈاکٹرنی بچہ جنانے آئے ——— بڑے ارمانوں کی پہلی زچگی تھی ۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لاہور سے بالکل مختلف دنیا میں وارد ہوئے ۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بڑی سی حویلی ہماری منزل تھی ۔

بڑی سی بیٹھک کے دروازے پر پیلی پڑتی دھوپ میں ایک درجن شکاری کتوں کو شام کا راتب تقسیم ہو رہا تھا ، اور دس بارہ آدمی ان کتوں کی زنجیروں سے لپٹے ہوئے تھے ۔ ہماری آمد پر وہ چونکے لیکن پھر کتوں کی زنجیروں پر جُٹ گئے ——— اسی پیلی دھوپ میں گدے دار کرسی پر ، میرے دو سو روپے روز کے داتا ، ملک گل نواز آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے ——— سفید سلک کی تہمد اور نیلی سلک کی قمیص ، سر پر بغیر کلاہ کی بھاری پگڑی ——— اور کلائی پر باز ——— باز ، ملک کے ہاتھ پر رکھی ہوئی تازہ تازہ فاختہ کے پر بکھیر بکھیر کر گوشت نوچ رہا تھا ——— یہ وقت باز کے راتب کا بھی تھا ۔

کیڈی لک کے اس مالک کا تصور میں خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھی ۔ مگر پھر بھی اس ماحول سے میں کافی مرعوب ہو گئی ۔

" ڈاکٹرنی صاحب بڑی تکلیف اٹھائی آپ نے ، میں آپ کو خوش کر دوں گا ۔ " ملک نے گہری نظروں اور بھاری آواز سے بیک وقت کہا ۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ملک صاحب کی صورت اس بادشاہ سے ملتی ہے جس کی تصویر میں نے اسکول کے زمانے کی کسی کتاب میں دیکھی تھی ۔ ماتھے تک پیچ در پیچ بڑی سی پگڑی ، بڑی گھنی مونچھیں ، کرسی پر آلتی پالتی مارے اور ہاتھ پر باز بٹھائے ——— بس مانگ کیا مانگتا ہے کہنے کی کسر تھی ۔

زنان خانے کا ماحول لباس اور سجاوٹ کی تبدیلیوں کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا عموماً ہمارے پرانے ٹھاٹ کے بڑے گھروں میں ہوتا ہے ۔ صحن میں رنگین پیڑھیوں پر کافی سے زیادہ عورتیں رنگین تہمد اور موٹی ریشمی کنارے والی چادریں لپیٹے مختلف ٹکڑیاں بنائے بیٹھی تھیں اور ایک کھیس سے ڈھکے ہوئے پلنگ پر ایک بوڑھی عورت فکرمند سی بیٹھی نسوار سُڑک رہی تھی ۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ گھر کی بڑی بوڑھی ہوں گی حقیقتاً یہی ملک کی والدہ بڑی ملکنی تھیں ——— مجھے امید تھی کہ وہ اٹھ کر میرا استقبال کریں گی ۔ لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی ۔ میں ٹھٹکتی ہوئی پلنگ کے قریب رک گئی ۔

بوڑھی ملکنی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے دوشالے کا پلو سرکا کر گردن سے لے کر ناک تک ڈال لیا اور اب میں صرف اس کی تیز آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھی جو مجھے سختی سے گھور رہی تھیں ——— مجھے اتنا غصہ آیا ، اتنا کہ میں نے جی میں دعا کی کاش ان سب عورتوں کے دردِ زہ ہونے لگے ۔

" مریض کہاں ہے ؟ " میں نے اٹک اٹک کر پوچھا ۔ سب عورتیں جنگلی ہرنیوں کی طرح گردنیں اٹھا اٹھا کر مجھے حیرت سے گھورنے لگیں ۔

" بیمار کہاں ہے ؟ " اب کے میری مائی نے انتہائی کرخت زبان میں سوال کیا ۔

" اللہ کا نام لو ، بیمار یہاں کہاں ہے ؟ " ایک عورت نے دونوں طرف چھدی ہوئی ناک کی ٹاپس نما کیلیں چمکا کر بڑی ہی کرخت آواز میں جواب دیا ——— سب کی معاندانہ نظریں مجھی پر تھیں ۔

میں نے سمجھا میں دیر میں پہنچی ہوں ، اسی لیے سب کی نفرت کا نشانہ ہوں ——— شاید بے چاری ختم ہو چکی ——— اور میں

افسوس میں ڈوبی ہوئی دوبارہ ملک کی صوفوں سے ٹھنسی ہوئی بیٹھک میں پہنچ گئی۔

"مجھے افسوس ہے ملک صاحب میں مریضہ کو نہیں دیکھ سکی!" اور میں نے دیکھا کہ اس فقرے سے بھائی کے چہرے کا رنگ یوں اُڑ گیا جیسے اسے شدید صدمہ پہنچا ہو۔ ظاہر ہے بھائی کو تعلیم کے لیے فیس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

مگر ملک صاحب کے پلے ہوئے چہرے پر کوئی اثر نمایاں نہ ہوا۔ "افوہ! ڈاکٹرنی صاحب میں نے ابھی تک والدہ سے ذکر نہیں کیا کہ لاہور سے ڈاکٹرنی بلائی ہے۔" یہ کہہ کر ملک صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"مگر ملک صاحب اب اندر جانے سے کیا فائدہ؟" میں نے گردن جھٹکا کر کہا۔

"ڈاکٹرنی صاحب آپ بُرا نہ مانیں جی، دراصل میری والدہ رسم و رواج کے خلاف جانا پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے میں نے ان سے پہلے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا!"

لیکن گھر کے اندر پہنچ کر ملک اور بڑی ملکنی کی جھک جھک شروع ہوگئی۔ وہ بار بار میری طرف اشارہ کر کے منہ بنا بنا کر اپنے بیٹے سے کہتی —— بیمار کہاں ہے؟ بیمار —— ہنھ بیمار!

یہ قصہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا —— بعد میں ملک نے گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھ کر دھیرے سے بتایا کہ بڑی ملکنی کو آپ کی یہ بات ناگوار گزری ہے کہ آپ نے پہلے پہل کی زچہ کو بیمار کہہ دیا —— زچگی، آپ جانتی ہیں بڑی مبارک چیز ہے —— وغیرہ وغیرہ۔

"وہ سامنے محل میں ہے۔" ملک نے ایک کمرے کے دروازے کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے گوہرِ مقصود کا پتہ دے رہے ہوں۔ اور میں بجائے ہنسنے کے کھسیا کر رہ گئی۔

ملحقہ سے ایک [illegible] دروازے اور بغیر کھڑکی اور روشندان کے پُرانے طرز والے کمرے میں ہونے والی زچہ تھی —— وہاں بھی کافی عورتیں تھیں، اور ایک سڑی ہوئی عورت اس کا پیٹ پکڑے بیٹھی تھی —— دائیں کئی عورتیں اس کا سر، ہاتھ، پاؤں دبا رہی تھیں —— زچہ کا پلنگ ایک تاریک کونے میں تھا اور اس کے علاوہ کئی اور پلنگ بھی کھیسوں سے سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر قسم قسم کے خوبصورت برتن، اور آئینوں سے آرائش اس حد تک تھی کہ دیوار بمشکل نظر آتی تھی —— یہ محل تھا۔

زچہ تیس بتیس سالہ عورت تھی اور اپنے علاقے کے تمام زیورات سے مزین —— اگر اس کے درد نہ ہو رہا ہوتا تو کافی اچھی معلوم ہو سکتی تھی۔

میں نے مائی سے مخاطب ہو کر کہا کہ مریضہ کو فوراً اس ٹھنسے اور گھٹے ہوئے کمرے سے کسی اور جگہ منتقل کیا جائے۔ مائی نے عورتوں کے سامنے تجویز رکھی اور "بلوہ" سا مچ گیا۔ انگلیاں ناکوں اور ہاتھوں پر پہنچ گئیں —— اور اس بلوے میں بڑی ملکنی ہانپتی ہوئی آگئیں۔

میری تجویز ایوان کی متفقہ رائے سے مسترد ہو گئی، کیونکہ اس قسم کا کمرہ ہر گھر کا محل کہلاتا ہے اور ضروری ہے کہ گھر کی بہو اس جگہ اپنے بچے کو جنم دے۔

"عورتیں کمرہ خالی کر دیں۔" یہ میری دوسری تجویز منظور ہو جاتی تب —— لہٰذا میں نے مائی سے کہا کہ وہ زچہ کے پائنتی کھڑی

کی اوٹ کر کے کھڑی ہو جائے تاکہ میں مریضہ کا معائنہ کر سکوں۔

پہلی زچگی تھی۔ مریضہ نے بتایا کہ "بڑی منتوں مرادوں کے بعد یہ دن پورے ہوئے ہیں۔ ورنہ پہلے تو کبھی نو مہینے پورے ہی نہ ہوئے۔ ایک فقیرنی کہتی تھی، ایک جان رہے گی، ماں یا بچہ۔ میم صاحب دونوں کو بچاؤ۔ بڑا انعام دیں گے، خوش کر دیں گے۔" مریضہ درد اور خوف سے سفید ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ یہ سُن کر ممنونیت سے مریضہ کے آنسو نکل آئے اور ناک سے رطوبت بہہ آئی۔ رومال سے اس کے آنسو پونچھ چکنے کے بعد ناک پونچھنے میں بڑی دقت ہوئی کیونکہ ہیرے کی بڑی بڑی کیلوں سے دونوں نتھنے ڈھکے ہوئے تھے۔

میں نے دینے کو تسلی دے دی مگر یہ قصہ سُن کر خود پریشان سی ہو گئی —— پکی عمر کی اولاد ذرا مشکل سے ہوتی ہے اور پھر زچہ کو درد بھی بڑے بے تکے تھے —— اور بچے کے قلب کی حرکت سست۔ میں نے اللہ میاں سے دعا کی کہ عزت رکھ لینا —— ورنہ واپسی کے لیے کیڈی لک تو کیا خاک نہ ملے گی۔

رات آ گئی اور عورتیں بدستور آپس میں بولتی رہیں —— اور باری باری مریضہ کا جسم دباتی رہیں۔ مائی نے ایک دفعہ چپکے سے کہا کہ میں بھی مریضہ کا پیٹ پکڑ لوں کیونکہ عورتیں کہتی ہیں، یہ ڈاکٹرنی مفت خوری ہے، ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہے —— میں نے مائی کے حکم کی تعمیل کی۔

جب مریضہ زور سے کراہنے اور ہونٹ کاٹنے لگی تو میں نے سب عورتوں سے باہر نکل جانے کو کہا۔ لیکن کئی عورتیں لپکیں اور پلنگ کے پاس دو اینٹیں رکھ دیں اور سب مل کر زچہ کو اٹھانے لگیں تاکہ وہ اینٹوں پر اکڑوں بیٹھ جائے۔

"بسم اللہ، خیر اللہ۔" مریضہ ان کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی اور میں یہ صورت حال دیکھ کر خوف سے چیخ پڑی۔

"سب چھوڑ دو، بھاگ جاؤ یہاں سے، تم لوگ اسے مار ڈالو گی۔" عورتیں اس مداخلت پر پھر ہلڑ مچانے لگیں۔ مائی نے مریضہ کو بازوؤں سے پکڑ کر لٹا دیا —— اور مجبوراً بغیر کسی اوٹ کے بچہ سب کے سامنے ایک کمزور سی آواز میں رونے لگا۔

مبارک سلامت کا شور اٹھا اور باہر سے جتنی عورتیں اندر آ سکتی تھیں آ گئیں باقی دروازے میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس وقت زچہ کی حالت نازک ہے۔ میں نے بلیڈنگ کم کرنے کے لیے اسے انجکشن کہنیوں کے ٹھوکوں کے درمیان دیا۔ سوئی دیکھ کر کئی عورتیں درد سے کراہ اٹھیں، زچہ کو غش آ گیا تھا۔

اچانک باہر بندوقوں کے فائر ہونے لگے اور پھر ڈھول نفیریاں بجنے لگیں —— اس کے بعد رسموں اور شگونوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور کئی بار میری توجہ زچہ و بچہ کی طرف سے ہٹ ہٹ گئی۔ ظاہر ہے کہ میرے لیے یہ ساری چیزیں دلچسپ تھیں، مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس گھر کے تمام حاضرین کا رویہ ابھی تک میرے لیے دوستانہ نہیں تھا، حالانکہ میں نے کئی رسموں میں دوسری عورتوں کی دیکھا دیکھی روپے بھی دیے۔ لیکن چونکہ مجھے قدم قدم پر زچہ و بچہ کی زندگی کی خاطر ان سے جھگڑنا بھی پڑتا تھا اس لیے میری دلجوئی بھی اوپر ہی اوپر گئی۔

رات بھر ڈھول بجا، زچہ کو پوری نیند لینا چاہیے تھی کیونکہ اسے بخار تھا۔ مگر وہ خود اس ہنگامے میں اتنی دلچسپی محسوس کر رہی تھی کہ میں بے بس ہو کر سونے کی کوشش کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی۔

صبح جب میں ناشتے کے لیے، ملک صاحب کے بلاوے پر بیٹھک میں گئی تو میرے بھائی نے بتایا کہ باہر بھی رات آتشبازی چھوٹی، اور ملک کے سینکڑوں مزارعوں نے ناچ گا کر صبح کی، اور ملک صاحب کو بچے کی پیدائش کے سلسلے میں بڑی نذریں ملیں ——— میں اس نذروں والی رسم پر کافی حیران ہوئی۔

لیکن دوسرے دن میری حیرانی شدید خوف میں تبدیل ہو گئی جب کہ وہ واقعہ ہوا۔

ایک تو سردی کا زمانہ اس پر سے سویرے ہی سے بادل آنا شروع ہو گئے ——— میں نہانا چاہتی تھی کیونکہ مجھے اپنے جسم پر منوں غلاظت پٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھی ——— یہ تو میں نے بالکل طے کر لیا تھا کہ اس گھر میں میری سب سے تناتنی ہے اس لیے میں نے نہانے کے لیے گرم پانی کسی سے طلب نہ کیا ——— رات بھر کی جگائی کے بعد بخار کی شدت میں تھوڑی سی نیند لینے کے بعد جب زچہ نے میری طرف کروٹ لی اور اس کی آنکھیں ہیروں کی کیلوں کے ساتھ جھکیں تو میں نے اس سے کہا کہ کیا نہانے کے لیے گرم پانی مل جائے گا۔

"بسم اللہ ضرور نہائو جی" اور پھر اس نے مسکرا کر بچے کو گھیرے بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے ایک سے کہا کہ بھاگ بھری سے کہو میم صاحب کے لیے پانی گرم کر دے۔

زچہ کو انجکشن دینے کے بعد میں نے مائی سے کہا کہ سوٹ کیس سے میرے کپڑے نکالے۔

"کپڑے تو جی تمہیں میم صاحب ہم انعام میں دیں گے" زچہ نے میٹھی ادا سے مسکرا کر کہا۔

اور مجھے بہت برا لگا، خدا جانے یہ گنوار ملکنی مجھے کوئی دائی خدمتگار سمجھتی ہے جو بیٹا جننے کی خوشی میں جوڑا دے گی۔

"ہم ڈاکٹر ہیں ملکنی، اپنی مقررہ فیس لیتے ہیں جوڑے نہیں" میں نے غرور سے منہ بنا کر جواب دیا اور وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

"میم صاحب تم نے ہماری خدمت کی ہے اب ہم تو سبھی کو کچھ نہ کچھ دیں گے ——— اللہ نے یہ دن دکھایا ہے"

"اچھا اچھا میری مائی کو دے دینا میں تو ———"

اتنے میں ایک دس بارہ سال کی لڑکی بھدر بھدر بھاگتی اندر آ گئی ——— خوب تندرست، چمپئی سارنگ، ماتھے پر مہین گندھی ہوئی مینڈھیوں کی محراب، کانوں میں چاندی کے بندے ——— یہ بھاگ بھری تھی۔

"ہم اسے بھی جوڑا دیں گے، بیٹا جو ہوا ہے" زچہ مجھے اپنی بات کا قائل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اور بھاگ بھری مجھے دیکھ کر ایک دم شرمانے لگی۔

"پانی رکھ دیا بھاگ بھری، میم صاحب کو غسلخانے لے جاؤ" زچہ نے اس سے کہا۔ اور میں نہانے چلی گئی۔

نہاتے ہوئے میں جھلا جھلا کر سوچتی رہی کہ کیسے لوگ ہیں، کسی کی پوزیشن تک کو نہیں جانتے ——— جوڑا دے گی مجھے، ہنھ!

جب میں نہا کر سر پر تولیہ لپیٹے نکلی تو گیلے بال سکھانے کے لیے صحن میں بیٹھ کر آتی جاتی دھوپ میں سسیانے لگی۔ بھاگ بھری نے گھر کے کسی کونے سے مجھے دیکھا اور دوڑ کر مٹی کے کنگوروں والی انگیٹھی لا کر میرے پاس رکھ گئی۔ اس وقت بھاگ بھری میرے دل کو بھا گئی۔

گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ عورتوں پر عورتیں اُمڈی چلی آ رہی تھیں، اس وقت پھر گانے بجانے کا پروگرام تھا۔

اچانک ملک صاحب کھانستے کھنکارتے زنان خانے کی طرف آئے —— مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھا، زچہ و بچہ کے بارے میں دو ایک باتیں دریافت کیں اور پھر بڑی ملکنی کی طرف چلے گئے۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ باہر چلے گئے۔

"بھاگ بھریئے! بھاگ بھریئے ملک جی نہائیں گے، تولیہ باہر غسلخانے میں رکھ آ ——" بڑی ملکنی نے حکم دیا۔

اور بھاگ بھری اسی طرّاری سے بھدر بھدر بھاگتی مردانے غسلخانے کی طرف چل دی۔

گانے بجانے کی تیاریوں کو دیکھ کر میں بور ہونے لگی —— میں اطمینان سے سو جانا چاہتی تھی —— میرے خیال میں زچہ کو بھی سکون سے سونا چاہیئے تھا، لیکن کوئی بس نہ چلا —— میں نے اس وقت سوچا کہ کسی مغربی مصنف کا قول ہے کہ دیہات صحت بخش قبریں ہیں، مگر میرے اللہ یہ قبریں کتنی پُرشور ہیں، کتنی ضدی ہٹیلی لاشیں ہیں —— کتنی یکسانیت ہے —— میں تو ہوں ہی شہر کا کیڑا، مگر شرط بد کر کہہ دوں کہ شہر کے مرغی یا کتے تک کو یہاں لے آؤ تو، مراقبے میں جا کر جان دے دیں —— میں نہایت تلخی سے سوچتی رہی، سوچتی رہی، مجھے اپنے روز کے دو سو روپوں کا خیال تک نہ آیا —— اور پھر جیسے موت کے مراقبے میں جھونک کھا گئی۔ درحقیقت مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔

اچانک بھاگ بھری روتی، گھسٹتی میرے پاس سے گزری، اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا —— دفعتاً وہ ڈگمگائی اور زمین پر گر گئی۔

اس کا نیلا تہمد خون کے دھبوں سے لال ہو رہا تھا۔ میں دوڑ کر اسے اٹھانے لگی —— کائیں کائیں شروع ہو گئی اور پھر ایک دم باورچی خانے سے ایک عورت دوڑتی ہوئی آ کر مہین سُریلی آواز میں رونے بین کرنے لگی —— یہ بھاگ بھری کی ماں تھی۔

بھاگ بھری نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

"مائے! ملک جی! ملک جی مائے!!" بھاگ بھری نے ماں کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ماں پھر زور زور سے بین کرنے لگی۔

ظاہر ہے کیا ہو چکا تھا —— میں ایک کنواری لڑکی بن کر دہشت سے کانپ رہی تھی۔ تمام عورتیں اکٹھی ہو گئیں —— مائی مجھے کپکپاتا دیکھ کر سہارے سے زچہ والے کمرے میں لے آئی۔ اچانک صحن سے بڑی ملکنی کی دبنگ آواز شور کرنے لگی۔

مائی دوبارہ ٹوہ لینے باہر چلی گئی —— میں سن سی بیٹھی رہی۔

تھوڑی دیر بعد ذرا سی خاموشی طاری ہو گئی۔ زچہ اب تک آنکھیں پھاڑے باہر کی آوازوں پر کان لگائے ہوئے تھی ——

جب مائی باہر سے آئی تو اس نے چپکے چپکے مجھے قصہ مختصر کر کے سنایا کہ بڑی ملکنی بھاگ بھری کی ماں کو روک رہی تھی کہ بچے والے گھر میں رونا مت ڈالو —— لیکن جب وہ اپنی بچی کی حالت کے بین ہی کرتی گئی تو بڑی ملکنی آپے سے باہر ہو گئیں کہ تیری لڑکی خود مستانی ہوئی ہے، تولیہ رکھ کر وہاں رُکی کیوں؟ مرد ہے کیا کرے —— اور یہ بھی کہا کہ بڑی بیٹی کی عزت کی دہائی دینے والی آئی، وہ دن بھول گئی جب تیرا خاوند کھیتوں پہ ہوتا اور تو ملک جی کی بیٹھک میں —— اس پر بھاگ بھری نے رو رو کر اپنی ہم چشموں سے فریاد کی، تو بڑی ملکنی اور بھی جل گئیں کہ دیکھیں کون ہیں مریم بیبیاں، جنھیں تو پکار رہی ہے —— اس پر

وہ دھیرے دھیرے خاموش ہوگئی ——— بھاگ بھری کی ماں جب رونے سے باز نہ آئی تو بڑی ملکنی نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا، جاتے ہوئے وہ بھاگ بھری کو لے جانا چاہتی تھی، مگر جواب ملا یہ نہیں جائے گی، آج کام بہت ہے حویلی میں ——— سب رشتے ناطے والے جمع ہیں ——— ایسی کون سی موت آ رہی ہے بھاگ بھری کو ———”

“اے بی، لونڈیا خون میں تر بتر ہے۔ توبہ میری، کیسے بے وقوف لوگ ہیں، خواہ مخواہ بھاگ بھری کی ماں کو اور غصہ دلایا، وہ ایسے غصے میں گئی ہے کہ پولیس لائے گی، دیکھ لینا” مائی نے “ختم شد” کے طور پر ایک زوردار آہ کھینچی اور سوچ میں غرق ہوگئی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے زچہ کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش اور سنجیدہ بنی پڑی تھی۔ اس کے پہلو میں اس کا منتوں مرادوں کا پہلا بچہ گنڈوں تعویذوں سے لدا پڑا تھا ———

میں نے سوچا اف انسان کے ساتھ یہ شیطان کیوں لگا ہوا ہے، اب یہ پہلا بچہ دیکھو اور باپ کے لیے جیل کا دروازہ کھلا ہوا ہے ——— خیر چاہے مجھے زچہ پر کتنا ہی رحم کیوں نہ آئے، میں تو سچی گواہی دوں گی ——— بھلے ہی مجھے دو سو روپے روز کے نہ وصول ہوں ———

اس کے بعد باہر صحن میں زور زور سے ڈھول ڈھمکنے لگا اور کسی گیت کے بول گونجنے لگے۔

میں اس موقع پہ ڈھول کی آواز سے ہول گئی ——— گیت کے بول سن کر اداس لیٹی ہوئی زچہ کو جیسے ہوش آنے لگا، اور اس نے مینڈھیوں سے گندھا ہوا سر آہستہ سے بچے پر جھکا دیا اور اسے ہولے سے چوم کر موہوم طریقے پر مسکرائی ——— ایسی محتاط مسکراہٹ جیسے وہ مکڑی کے جالوں جیسی ہو، اور وہ ڈر رہی ہو کہ کہیں کوئی تار ٹوٹ نہ جائے۔

میں نے ایک آہ بھر کر کہا۔ “بچے کی قسمت بھی کیسی ہے”

“نصیبوں والا ہے، جیوے میرا لال” زچہ نے چونک کر جواب دیا ———

میں نے سوچا مجھے بچے کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی، ماں کا دل بڑی سے بڑی مصیبت اور تباہی کی ذمہ داری بھی اپنے بچے پر نہیں ڈالے گا ——— مگر پھر بھی میں نے اپنی قانون دانی سب کی سب اس کے سامنے اگل دی۔

وہ تعجب اور خوف سے آنکھیں پھاڑے میری باتیں سنتی رہی اور پھر ایک لمبی سانس لے کر مسکرانے اور بچے کو چومنے لگی ——— بخار سے یا نہ جانے کیا سوچ کر زچہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا ——— میں خاموش ہوگئی۔

حویلی کی انگنائی میں ڈھول کے ساتھ گیتوں کے بول لہرتے رہے ———

ایک عورت اندر آئی اور اس نے زچہ پہ جھک کر کچھ کہا جو میں نہ سن سکی ——— وہ چلی گئی۔

میں نے زچہ کا ٹمپریچر لیا بخار اور بھی تیز ہوگیا تھا ——— بچے کو بھی بخار تھا ——— میں اب یہاں سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ ہو تو یہ بھی سکتا تھا کہ میں دوائیں دے کر رخصت ہو جاتی، مگر مجھے اپنے پاؤں میں ایک زنجیر سی بندھی معلوم ہو رہی تھی ——— ظاہر ہے یہ زنجیر کون سی تھی۔

ذرا دیر بعد وہی عورت آئی جو ذرا قبل زچہ سے کھسر پھسر کر گئی تھی ——— اب کی اس کے ساتھ بھاگ بھری تھی۔ ——— بھاگ بھری کی آنکھوں میں وہ شرم نہیں تھی جو میں نے پہلی بار اس کمرے میں آتے دیکھی تھی ——— وہ کواڑ کا سہارا لیے

چپ چاپ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”میم صاحب اس کا بھی علاج کر دو۔“ زچہ نے میری طرف لجاجت سے دیکھ کر کہا ——— اور میں اس دیہاتی جاگیردارنی کی عظمت کے سامنے سناٹے میں آ گئی۔

بھاگ بھری کی تکلیف کا جو بھی مداوا ممکن تھا۔ وہ میں نے کیا۔ بھاگ بھری اس وقت کتنی بے حس ہو رہی تھی۔

ایک دن اور گزر گیا ——— دُودھ اُترنے کی وجہ سے زچہ کا بخار بہت زیادہ تیز ہو گیا، وہ بار بار غافل سی ہو جاتی ——— لیکن اسی دن میں واپس چل دی ——— شاید میں زچہ کی حالت دیکھ کر ایک دن اور رُک جاتی، لیکن اسی دن بھاگ نکلنے میں میری مائی کا شدید اصرار شامل تھا ———

قصہ یوں ہوا کہ میں صبح صبح اپنے بھائی کے ساتھ قیمتی صوفوں سے ٹھنسے ہوئے دیوان خانے میں مرغ اور پراٹھوں کا ناشتہ کر رہی تھی، اور ملک صاحب مجھ سے زچہ بچہ کی خیریت پوچھ چکنے کے بعد باہر دھوپ میں اپنے مرغوب پوز میں دھوپ لے رہے تھے، اور ان کے شکاری کتوں کو صبح کا راتب تقسیم ہو رہا تھا ——— قریب ہی کہیں ڈھول نفیری بج رہی تھیں، اور اس لمحے میں نے طے کیا کہ دو ایک دن اور رہنا چاہیئے، پیسے بن رہے ہیں۔

اس لمحے کے بعد قریب کے ایک مکان کی اوٹ سے نکل کر بھاگ بھری کی ماں آتی نظر پڑی۔ جاڑے کی دھوپ میں اس کا سیاہ ناہموار سُرخ لمبا کرتہ اور گہری زرد چادر چمک رہی تھی۔ وہ دھیمی چال سے چل رہی تھی۔ اس کے سر پر ایک بڑا تھال تھا جو گوٹا لگے سُرخ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا ——— اس کے پیچھے اور بھی کئی عورتیں تھیں، وہ بھی کچھ نہ کچھ سر پر اٹھائے ہوئے تھیں اور مرد بھی تھے، بعض ناچ رہے تھے اور بعض ڈھول نفیریاں بجا رہے تھے ——— بھاگ بھری کی ماں کی قیادت میں یہ جلوس بالکل قریب آ گیا۔ راتب پر جھگڑتے ہوئے کتے بھونکنے لگے۔ ڈھول کی دھم دھم اور اُچکتے پھاندتے مردوں کی ہاؤ ہو سے ملک صاحب کے ہاتھ پر بیٹھا ہوا باز ایکدم اڑا اور پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا ——— اور سب کے بعد اکڑتے بررتے گھوڑے کی لگام ایک شخص کی طرف اُچھال کر تھانیدار ملک صاحب کی طرف بڑھا ———

حویلی کی ڈیوڑھی سے عورتیں سیلاب کی طرح باہر آ گئیں۔ بہت سی ریشمی کپڑوں والیاں دیوان خانے میں بھی گھس پڑیں۔ ——— میرا بھائی گھبرا کر باہر نکل گیا اور میں نے عورتوں کے ہجوم میں دھکے کھاتے ہوئے دیکھا کہ بھاگ بھری کی ماں نے تھال اتار کر ملک صاحب کے قدموں کے قریب رکھ دیا۔

”بچے کے کپڑے آئے ہیں“ کا شور اندر سے باہر تک برپا تھا ——— میں ایکدم اندر مائی کو ڈھونڈنے بھاگی۔ آنگن خالی تھا ——— زچہ خانے میں زچہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اور بھاگ بھری کی مینڈھیاں اس کے ہاتھ میں تھیں ——— اور اس کا چہرہ بالکل ویسا ہی ہو رہا تھا جیسے وہ دردِ زہ میں مبتلا ہو ——— مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

”بدتمیز نے پانی بستر پر گرا دیا ——“ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور اس کا چہرہ ایک دم یُوں پُرسکون اور آسودہ ہو گیا جیسے وہ ابھی ابھی بچہ جن کر فارغ ہوئی ہو ——— بھاگ بھری کے دونوں گالوں پر انگلیوں کے سفید نشان ابھرے ہوئے تھے اور بستر یا کمرے میں پانی کا نام تک نہ تھا۔

میں نے جلدی سے مائی کو ڈھونڈ کر اس سے کھُسر پھُسر کی، وہ شدت سے میری ہم نوا ہوئی اور ہم فوراً چلنے کو تیار ہوگئے۔ —— مجھے ان لمحات میں یوں لگ رہا تھا جیسے میں اکیلے گھر میں ہوں، ایسے گھر میں جس کی دیواریں گر چکی ہوں۔

گھر پہنچ کر تین دن کے چھ سو روپے والدہ کے ہاتھ پر رکھتے ہی بڑے زور کی بحث شروع ہوگئی، صحیح یا غلط؟ مطلب یہ کہ میں نے فوراً چلے آنے میں حماقت کی یا نہیں۔ والدہ کہتیں بالکل ٹھیک کیا۔ بھائی کہتا خواہ مخواہ گھبرا کر بھاگیں۔

اس سے پہلے کہ اس کا کوئی فیصلہ ہو، میں یہ بات بتادوں کہ کرنتہ ٹوپی کے جس جلوس کی قیادت بھاگ بھری کی ماں کر رہی تھی، وہ تھانیدار صاحب کے گھر سے آیا تھا۔

آندھی میں چراغ

ممتاز شیریں

کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

اس نے آہستہ سے پوچھا "کون؟" اور اپنے پتی کی آواز سن کر اس نے چٹخنی کھول دی۔ وہ اندر آگیا اور اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ کتنا تھکا ہوا تھا وہ۔ اس کے پسینے میں تر بالوں کے گچھے سے بن رہے تھے۔ جتنا جلدی اس کے تھکے ہوئے بوجھل، بھاری پاؤں اور پھولا ہوا پیٹ اسے لے جا سکتے تھے، وہ اندر گئی اور گھڑے میں سے پانی نکال کر لے آئی۔ وہ پانی ڈالتی جا رہی تھی اور وہ ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔ پسینے میں ڈوبے ہوئے گرم چہرے پر پانی کی ٹھنڈک اسے ایسی بھلی لگ رہی تھی کہ وہ چلو میں پانی بھر بھر کر منہ پر اچھالنے لگا۔ ٹھنڈے پانی کے لمس سے اسے فرحت محسوس ہوئی اور وہ محبت اور تشکر کی نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے چارپائی پر جا بیٹھا اور وہ اسے کھانا دینے کے لئے تختہ بچھانے لگی۔

"رہنے دو نیلا میں کچھ دیر بعد کھاؤں گا۔ یہاں بیٹھو۔ کچھ دیر۔"

"نہیں، پہلے کھا لو، بعد میں باتیں ہوں گی۔" اس نے کچھ شرماتے ہوئے جواب دیا۔ وہ تختے پر بیٹھ گیا۔ کھانا پروس کر وہ پھر رسوئی میں گئی، اچانک اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں ایک تڑپا دینے والی ٹیس اٹھی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ درمیانی دروازہ کھلا تھا۔ اننت نے اسے دیکھ لیا۔ وہ کھانا چھوڑ کر اور جلدی سے ہاتھ دھو کر رسوئی کی طرف بھاگا۔ "کیا ہوا نیلا، نیلا کیا ہوا تمہیں؟" وہ اس پر جھک گیا۔

"نہیں تو، کچھ بھی نہیں، یونہی چکر آ گیا تھا۔ ایسے دنوں چکر آ ہی جایا کرتا ہے۔ کوئی بات نہیں،" لیکن اننت نے اس کے چہرے کو دیکھ کر جان لیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی تسلی کے لئے وہ کہہ رہی تھی "کوئی بات نہیں تم جا کر کھانا کھاؤ۔"

"مجھے بھوک نہیں نیلا"! وہ بھی جھوٹ بول رہا تھا۔

نیلا کے پھر درد اٹھا۔ اس نے اپنے چہرے کو دونوں گھٹنوں میں چھپا لیا تاکہ اننت اس کے چہرے پر کرب کے آثار نہ دیکھ لے۔ لیکن اننت نے نیلا کو نہایت احتیاط اور نرمی سے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ اور اندر چارپائی پر لٹا دیا۔ پاس کی

کھڑکی کے نیچے کے پٹ بند کر کے اس نے بوسیدہ کمبل نہایت احتیاط اور نرمی سے اُڑھا دیا۔ نیلا نے پھر کہا..... "اب مجھے آرام ہے۔ تم جاؤ کھانا کھا لو۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے نیلا!" وہ نیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چارپائی پر بیٹھا رہا۔ وہ اپنی بیوی کو تکے جا رہا تھا۔ پریشان، دُکھ بھری نظروں سے۔ نیلا بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں پرستش تھی اور محبت تھی۔

ان کے جسموں میں کوئی کشش نہ تھی۔ اننت کا سوکھا مارا جسم ایک بوسیدہ سی ڈھیلی ڈھالی قمیص اور دھوتی میں چھپا ہوا تھا۔ اور نیلا کا پیٹ ہمیشہ پھولا رہتا تھا۔ وہ موٹی موٹی میل خوردے رنگوں کی ساریاں پہنے رہتی تا کہ چولھے کے پاس کام کرنے سے جو میل بیٹھ جاتا ہے وہ دکھائی نہ دے۔ وہ کنگھی چوٹی کیے بغیر دن بھر کام میں مصروف رہتی تھی ——— وہ خوبصورت نہ تھے۔ نوجوانی میں جو کچھ ذرا سی کشش بھی ان میں تھی۔ وہ بھی مفلسی نے چھین لی تھی۔ اننت کا سانولا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ اس کے گال اندر دھنس گئے تھے۔ نیلا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی عمر صرف اٹھائیس سال تھی لیکن وہ ادھیڑ دکھائی دینے لگی تھی۔ نہ جانے وہ کیا چیز تھی جس نے ان کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا تھا۔ یہ کشش ظاہری حسن اور جسمانی کشش سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

ماں باپ اور مذہب نے ایک دن ان کا سمبندھ کر دیا اور وہ ایک دوسرے کے ہو گئے۔ نیلا جانتی تھی پتی کی پرستش کرنی چاہیے اس کی خدمت کرنی چاہیے اور وہ اس کی پرستش کرنے لگی، خدمت کرنے لگی۔ اننت جانتا تھا کہ ایک کمزور سی چیز اس کے سپرد کی گئی ہے اس کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کرے، اس کا ہر طرح خیال رکھے اس کے لئے کمائے، اسے سہارا دے، اور اسے چاہے۔ یہ کمزور سی چیز جو ساری زندگی اس کا ساتھ دے گی، اس کا گھر سنبھالے گی، اس کے بچوں کی ماں ہو گی، اس طرح ان کے دل مل گئے وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔ اور برسوں کی رفاقت نے ان کی محبت کو گہرا کر دیا تھا۔ برسوں کے ساتھ نے اور ان ننھے ننھے بچوں نے ان کے درمیان دلوں کے اس ملاپ کو مضبوط کر دیا تھا ———

بچے جو اب تک باہر کھیل رہے تھے، ناچتے کودتے اندر آ گئے۔ "ماں بھوک لگ رہی ہے" "ہاں!" اس نے اٹھنا چاہا۔ اننت نے اسے زبردستی لٹا دیا۔ "نہیں تم سو جاؤ۔ میں ان سب کو کھانا دے لوں گا۔" بچوں کو حریص نگاہوں سے کھانے کو تکتے اور بڑے بڑے نوالے بنا کر کھاتے دیکھ کر اور اننت کو بے ڈھنگے پن سے پروستے دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی۔ لیکن وہ زور سے نہ ہنس سکی۔ اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں پھر اچانک وہی درد اٹھ رہا تھا۔ اس نے منہ موڑ لیا۔ لیکن اننت نے اس کی آنکھوں کا کرب دیکھ لیا تھا۔ وہ بچوں کو چھوڑ کر اس کے پاس آ گیا۔

"نیلا کیا تکلیف ہے تمہیں؟" اس نے بے قرار لہجے میں پوچھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ..... کہ مجھے..... مجھے درد شروع ہو گئے ہیں" اس نے رک رک کر جواب دیا۔

"نیلا تم نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ تمہیں....."

"نہیں، ابھی آٹھواں مہینہ ہی تو ہے، جانے کیوں ابھی سے ———"

"میں تمہیں ہسپتال لے جاؤں گا۔ نیلا" وہ اپنا بوسیدہ کوٹ پہن کر تانگہ لانے چلا گیا۔ بچوں نے بھی ماں کو پریشان دیکھ کر

جلدی جلدی کھانا کھا لیا اور سب چارپائی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ "تمھارا جی اچھا نہیں ماں؟ کیوں چھولی ہو ماں؟ کیا حال ہے" "ماں ولد (درد) ہے۔" "کہاں؟ میں چوم لوں تو اچھا ہو جائے گا نا؟" اور سب سے چھوٹا بچہ اسے چومنے لگا۔ اس کے پیٹ کو اس کے ہاتھوں اور بازوؤں کو اس کے پیروں کو۔ اس کے سینے میں مسرت جاگ اٹھی۔ کتنا پیار کرتے ہیں اسے۔ اس نے ننھے کو اٹھا کر خوب چوما اور پہلو میں لٹا لیا۔ آخر اس نے زندگی میں کیا سکھ پایا تھا۔ مفلسی، بھوک، مصیبتیں، لمحہ بھر چین آرام نصیب نہیں۔ لیکن بچوں کی یہ محبت، شوہر کی یہ رفاقت، یہی تو اس کی زندگی کا سرمایہ تھا۔

ٹانگہ آ گیا تھا۔ اننت بچوں کو پچکار کر ہمسائی کے ہاں چھوڑ آیا۔ "دیکھو میں کل صبح تمھیں لے جاؤں گا۔ اور تم ایک ننھا سا گڈا دیکھو گے۔ تمھارا ننھا بھائی۔ گڈے کا سا" اس نے نیلا کو اپنے بازوؤں پر اٹھانا چاہا۔ لیکن وہ خود تیزی سے اٹھ کر تانگہ میں جا بیٹھی۔ . . . . . .

میٹرنٹی وارڈ میں اوپر تھے اور سیڑھیاں بہت اونچائی تک چلی گئی تھیں۔ نیلا کے قدم ڈگمگا گئے۔

"میرا سہارا لو نیلا،" اننت نے کہا۔ پھر خود ہی اسے اپنے بازو سے تھام کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔ چار پانچ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد پھر وہی تڑپا دینے والی ٹیس اٹھی اور اس نے اپنے چہرے کا کرب چھپانے کے لئے اپنا سر اننت کے کندھے پر ڈال دیا۔

وہ لیبر وارڈ میں پڑی انتظار کرتی رہی۔ اب دو دو منٹوں کے وقفے سے درد اٹھ رہا تھا۔ پیٹ میں۔ ریڑھ کی ہڈی کے زیریں حصے میں کولھوں میں۔ اور ہر دفعہ یہ درد شدید تر ہوتا جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پڑتی تھیں۔ وہ اپنے نچلے ہونٹ کو زور سے کاٹ لیتی۔ چیخوں اور کراہوں کو روکنے کے لئے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اننت اس کی چیخوں کو سنے وہ جان لے گا کہ اسے بے انتہا تکلیف ہو رہی ہے اور . . . . . .

اور اننت بند دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس پر ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ وہ بے تاب ہو کر ٹہلنے لگا پھر بنچ پر آ کر بیٹھ جاتا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورتا پھر غور سے سننے لگتا۔ اسے اندر سے تو کوئی آواز بھی نہیں آ رہی . . . . . . لیبر وارڈ تو ہمیشہ چیخوں سے گونجتا رہتا ہے۔ کہیں . . . . . . اتنی کمزور تھی وہ۔ کیا اس سخت آزمائش سے بچ نکلے گی؟ اور ایک ناقابلِ بیان درد نے اس کے دل کو جکڑ لیا۔ سر جھکا کر اس نے اپنے دل کی گہرائیوں سے ایک چھوٹی سی دعا مانگی پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اگر نیلا اس دفعہ بچ جائے تو وہ کبھی اسے بچہ نہ ہونے دے گا۔ اس نے پھر دروازے سے کان لگا کر سنا۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی . . . . . . لیکن نیلا ہمیشہ یونہی صبر سے اس زندگی اور موت کی کشمکش کو طے کر جاتی ہے۔ کسی بچے کے وقت اس نے کبھی اس کی چیخیں نہ سنی تھیں۔ یہ سوچ کر اسے کچھ تسلی ہوئی اور وہ بنچ پر جا بیٹھا اور پھر وہی انتظار، اذیت ناک انتظار۔ جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ ان چند لمحوں کی اذیت میں زندگی بھر کی تکلیفوں کا نچوڑ تھا۔ اور اس کی بے قرار نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ اٹھ جاتی تھیں۔ اب کھلے گا۔ اب کھلے گا . . . . . .

اور اندر نیلا بے ہوش پڑی تھی۔ بچہ بہت چھوٹا تھا۔ اس لئے جلدی پیدائش ہو گئی۔ اس کے نحیف سینے میں رتی بھر جان باقی تھی۔ آنول کاٹتے ہی میں وہ ہچکی لے کر خاموش ہو گیا۔ نیلا کو اب ہوش آ گیا تھا۔ اس نے بچے کے متعلق پوچھا بھی نہیں۔

اس کی کسی چھپی ہوئی حِس نے یہ جان لیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ یہ بھی نہیں پوچھا بچہ ہے یا بچی۔ نرس نے اُسے آہستہ سے بتایا بچہ مر چکا ہے اور اسے تسلی دی "آٹھ مہینے کے بچے کبھی زندہ نہیں رہتے اگر اب نہیں تو بعد میں مر ہی جاتا۔" نیلا نے کوئی جواب نہیں دیا اور جب نرس نے بچے کو اٹھا کر دکھایا تو ایک نظر دیکھا۔ نازک نقش زرد چہرہ لکڑی کی طرح سوکھا جسم۔ اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر ربر کی شیٹ پر ڈھلک گئے اور محبت اور ممتا کی وہ گرم گرم دھار جو نئے سرے سے اُمڈ کر اس کے سینے میں بہہ آئی تھی۔ سرد ہو کر منجمد ہو گئی۔

دروازہ کھلا۔ نرس باہر آئی۔ اننت اُٹھ کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح نرس کو گھورنے لگا۔ اس سے کچھ پوچھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اور نرس نے بتایا بچہ مر چکا ہے۔ بچہ کا خیال اسے بالکل نہیں آیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں یہی خیال پھڑپھڑا رہا تھا۔ کاش نیلا بچ گئی ہو اور اسی پاگلوں کے سے انداز میں اس نے نرس سے پوچھا "اور میری بیوی؟" نرس نے شاید یہ نہیں سنا۔ وہ کہہ رہی تھی "آٹھ مہینے کے بچے نہیں جیتے۔ اب نہیں تو کبھی نہ کبھی مر ہی جاتا۔ اس کی اتنی فکر نہ کرو......" اور وہ واقعی پاگل ہو گیا۔ وہ نرس کو جھنجھوڑ کر چیخا "اور میری بیوی؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر دروازے میں گھسنے لگا۔ نرس نے اسے ڈانٹا "کہاں جا رہے ہو۔ تم ابھی اندر نہیں جا سکتے۔ کافی لے آؤ اپنی بیوی کے لئے۔" بیوی کے لئے کافی! فرطِ مسرت سے اس کی چیخ نکل گئی پھر اسے گردو پیش کا خیال آیا۔ وہ جلدی باہر نکل آیا اور قریب کے ہوٹل سے کافی لے آیا۔

وہ نڈھال پڑی تھی۔ اس نے کافی اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا "نیلا کیسی ہے طبیعت تمہاری؟"

"اچھی ہوں۔ صرف کمزوری ہے۔ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا ہے۔ ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ لیکن اس دفعہ کمزوری کی وجہ سے تکلیف زیادہ ہے۔"

دوسری صبح کو بھی نیلا یونہی نڈھال پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلدی کی چھوٹ تھی۔ جیسے اس کے جسم سے سارا خون چوس لیا گیا ہو۔ اس نے اس پر جھک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کتنا سرد تھا وہ ہاتھ۔ اس نے آہستہ سے پکارا "نیلا!" نیلا نے آنکھیں کھولیں اور بمشکل سر موڑا۔ اسی لمحے نرس اور لیڈی ڈاکٹر وارڈ میں آ گئیں۔ وہ نیلا کا ہاتھ چھوڑ کر الگ جا کھڑا ہوا۔ نرس نے نیلا کے انگوٹھے میں سوئی چبھو کر خون نکالا۔ بہت دبانے پر خون کا ایک ننھا سا قطرہ بمشکل نکلا اور اس نے اس قطرے کو کاغذ پر چپکا کر لال دھاریوں والے کاغذ کے ساتھ لگا کر دیکھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا کتنا؟ "پندرہ فی صدی" نرس نے جواب دیا۔

"پندرہ فی صدی؟" ڈاکٹر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے اننت کو باہر بلایا "تم جانتے ہو تمہاری بیوی کی کیا حالت ہے، اس کے جسم میں قطرہ بھر بھی خون نہیں۔ جانتے ہو اس کے خون میں کتنا ہیموگلوبن ہے۔ پندرہ فی صدی! تم مرد، خود غرض مرد، تم کیا جانو اس پر کیا گذرتی ہے۔ تمہیں اپنی پڑی رہتی ہے ہمیشہ۔ شادی کر لینا اور پھر ہر سال ایک بچہ دے دینا۔ یہی معلوم ہے تم لوگوں کو۔ کچھ اپنی بیوی کا بھی خیال کیا؟ حمل کے دنوں میں اسے دودھ اور پھل دیتے رہتے۔ ٹانک پلاتے ہوتے۔ لور ایکسٹریکٹ انجکشن دلواتے ہوتے۔ ستر پچھتر فیصدی ہیموگلوبن بھی ہو تو اس حالت میں عورتیں ٹانک پیتی ہیں، انجکشن لیتی ہیں زچہ اور خون میں پندرہ فیصدی ہیموگلوبن!" اور پھر اس نے دانت پیس کر کہا "اور تم لوگ صرف یہ خوب جانتے ہو کہ جب وہ موت کے منہ میں پہنچ جائے تو اسے

ہسپتال میں لا کر ٹیک دیا جائے۔" وہ نیلا کو نہیں چاہتا؟ نیلا کا خیال نہیں رکھتا ڈاکٹر کا ہر جملہ ہتھوڑے کی ضرب بن کر اس کے دل پر پڑ رہا تھا...... پھل اور دودھ اور ٹانک۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو کیا وہ ان چیزوں کا ڈھیر نہ لگا دیتا۔ نیلا کے لئے! اور اب نیلا کے جسم میں قطرہ برابر خون نہیں، نیلا موت کے منہ میں ہے...... پھر ڈاکٹر کی آواز کچھ دھیمی پڑ گئی "سنو! اسے بہت سے لیور ایکسٹریکٹ انجکشن دینے پڑیں گے اور ہر انجکشن کی قیمت اڑھائی سے تین روپے ہے۔ کیا تم ادا کر سکو گے ان کی قیمت؟" اس سے اس کا جی چاہا کہ ڈاکٹر کے پاؤں پکڑ لے اور کہے "میں کسی طرح ادا کر دوں گا ڈاکٹر! بس تم میری بیوی کو بچا لو۔"

اور ہسپتال کا بل چکانے کے لئے اس نے قرض لیا۔ دفتر کو بس میں جانا چھوڑ دیا۔ سینمے سگریٹ بھی پینے ترک کر دیئے۔ ان چند ٹکوں سے وہ نیلا کے لئے پھل خرید لے جاتا۔ نارنگیاں اور سیب، لیکن چھوٹے سے چھوٹا سیب بھی چار آنے میں آتا تھا!...... اور نیلا کو دن میں تین چار بار انجکشن دیئے جاتے۔

لیکن وہ یونہی نڈھال پڑی رہی۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید سے سفید تر ہوتا جا رہا تھا۔ خون کی کمی کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں اتنے سرد ہو گئے تھے کہ ان میں گرمی قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ ربر کے ساکس سے چڑھائے جاتے اور گرم پانی کی تھیلیاں اس کے پاؤں کے نیچے رکھی رہتیں اور وہ اس کے پلنگ کے قریب بیٹھا گھنٹوں اسے تکا کرتا اور نیلا کی نگاہوں کا کرب اس کی آنکھوں میں منتقل ہو جاتا۔ لیکن وہ اس کرب کو نیلا پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا "تم اچھی ہو جاؤ گی۔ نیلا۔ ضرور۔ اور میں تمہیں قیمتی ٹانک لا دوں گا۔ اور پھل اور دودھ، تم تندرست ہو جاؤ گی، سچ نیلا، میں روپے جمع کر رہا ہوں"...... نیلا مسکراہٹ سے اسے تک رہی تھی اور اچانک معلوم ہو جاتا کہ اس کی آنکھوں میں امید کی چمک کبھی کی بجھ گئی ہے۔ اور اس مسکراہٹ صرف اس کی تسلی کے لئے ہے۔ اور اس کا دل خون ہو جاتا۔ جب کبھی وہ بچوں کو لے آتا اور وہ ماں کے پلنگ کے گرد کھڑے اسے حیران نگاہوں سے دیکھا کرتے تو وہ بچوں کو عجیب سے انداز سے تکتی۔ جیسے انھیں چھوڑ کر کہیں جا رہی ہو۔

اور ایک رات وہ مسلسل کراہتی رہی۔ اس کا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ رگوں میں دیئے ہوئے ان بیسیوں انجکشنوں کا درد کمزوری کی وجہ سے شدید ہو رہا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلاتی تو درد کے مارے بلبلا اٹھتی۔ اور اس نے نرسوں کی منت کی کہ آج رات اسے یہیں سو جانے کی اجازت مل جائے۔ وہ یہیں کہیں کونے میں پڑا رہے گا۔ لیکن انھوں نے جھڑک کر اسے نکال دیا۔ رات کے نو بجے کے بعد کوئی بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ لیکن نیلا نے دیکھا تھا کہ بازو کے سپیشل وارڈ والی لڑکی کا شوہر رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ تک اس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ اور یہی نرسیں خاموشی سے بند دروازے کا قفل کھول دیتی تھیں اور جب وہ لڑکی بھی اس کے شوہر کو دور تک پہنچا کر خوشی سے جھومتی ہوئی واپس آتی۔ تو نرسیں اسے اندر چھوڑنے کے لئے دروازے کے پاس ہی، جو نیلا کے کمرے کے سامنے تھا، کھڑی رہتیں اور ہنس ہنس کر اسے چھیڑتیں "بڑی محبت ہے تم دونوں میں"...... غریبوں کی محبت کو تو کوئی نہیں پہچانتا۔ پہچانے بھی تو پروا نہیں کرتا۔ اس نے ایک آہ بھر کر کروٹ لی اور درد سے تڑپ کر کراہی۔ وہ رات بھر کراہتی رہی۔ کوئی اس کے پاس نہیں آیا۔ کبھی کبھی چڑچڑاتی ہوئی نرس آ کر اس سے کہتی۔ اتنے زور سے

کراہتی ہے۔ دوسرے مریضوں کی نیند خراب نہیں ہوتی؟" اور وہ اسے نیند کا انجکشن دے کر چلی جاتی اس رات اسے نیند کے کئی انجکشن دئیے گئے۔ لیکن اسے نیند نہ آئی......

صبح کو وہ بالکل خاموش تھی۔ اب اس میں کراہنے کی بھی سکت نہ تھی۔ اننت آیا تو اُسے خاموش دیکھ کر سمجھا اب اسے تکلیف نہیں ہے۔ لیکن شام کو لیڈی ڈاکٹر نے نیلا کا معائنہ کر کے مایوسی سے سر ہلایا۔ اور اننت کو باہر بلا کر کہا: "اب ایک ہی اُمید ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" وہ پاگلوں کی طرح چلایا۔

"اس کے جسم میں انسانی خون داخل کرنا چاہیئے۔"

"تو میرے خون کا معائنہ کیجئے۔"

اور اس کے خون کا معائنہ کیا گیا۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اُسے بہت سے خون کی ضرورت ہے۔ ہر روز تھوڑا تھوڑا خون اس کے جسم میں داخل کیا جائے گا۔ کیا تم اتنا خون دے سکتے ہو؟" ڈاکٹر نے سوچا تھا کہ یہ سوکھا سا انسان! اس کے جسم میں بھی کیا خون ہوگا۔ وہ اپنی بیوی کے لئے جس کے بچنے کی اُمید بہت کم ہے۔ شاید خون نہ دے سکے! لیکن اننت نے ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہا ہو۔ تم اتنے خون کی پوچھ رہی ہو میری بیوی کو اگر میرا خون بچا سکتا ہے تو تم میرے جسم کا سارا خون نچوڑ سکتی ہو۔"

گرم گرم خون نکالا گیا بائیس سی سی۔ اور اننت کا یہ خون جس کی ایک ایک بوند میں محبت کی گرمی تھی، نیلا کے جسم میں منتقل کیا گیا۔ اس کی ساری رگوں میں ہلکی سی گرمی دوڑ گئی۔ اور اس کے چہرے پہ رونق سی آگئی۔ اننت خوشی سے پاگل ہو گیا اس نے نیلا کا ہاتھ، جو اب کچھ گرم سا تھا اپنے ہاتھ میں لے کر کہا...." نیلا اب تو تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے تمہارے جسم میں انسانی خون داخل کیا جائے تو تم جلد اچھی ہو جاؤ گی۔"

"انسانی خون؟ لیکن کون دے گا۔ اور میری طرف سے کسی دوسرے کو......"

اننت نے ایک نکھری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اب جو انجکشن تمہیں دیا گیا ہے، وہ انسانی خون ہی کا تھا..."

"لیکن، لیکن، کون...." اور پھر وہ جان گئی اور اس نے محبت بھری نگاہوں سے جن میں اب چمک بھی آگئی تھی، اپنے شوہر کو دیکھا۔ پھر ان نگاہوں میں گلہ پیدا ہوا اور وہ کہنے لگی.... لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے، اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ چہرہ نیلا پڑتا گیا۔ اننت اس پہ جھک گیا۔ "نیلا، نیلا" وہ چلایا —— وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے کان قریب لا کر سنا وہ کہہ رہی تھی "بچے، میرے بچے، میں انھیں دیکھنا چاہتی ہوں"۔ وہ سرپٹ بھاگا اور بچوں کو لے آیا۔ نیلا نے سب بچوں پہ باری باری نگاہیں جما کر دیکھا، چھوٹے کو اُٹھانا چاہا۔ لیکن اُٹھتے ہوئے ہاتھ بے بسی سے گر گئے۔ اُس نے بڑی دقت سے کچھ دیر اپنی نظروں کو اننت پر جمائے رکھا۔ لبوں پہ پھر وہی اُداس مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ اننت پلنگ کی پٹی پر سر پٹک پٹک کر چلانے لگا "نیلا، نیلا!" بچے حیرانی سے ماں کو تک رہے تھے وہ چھوٹے بچوں کو سمیٹ کر کرسی پہ گر پڑا۔ بڑے بچے بھی باپ کی کرسی کے پاس کھڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، موت کا راز ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ نرسیں اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے اس پر سفید چادر ڈال رہی تھیں۔ سفید چادر اور اتنا ہی

سفید چہرہ، کالے بکھرے ہوئے بال۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھا گھورتا رہا۔ لیڈی ڈاکٹر بولی ”تم اس کی ارتھی کا انتظام کر کے کل صبح اسے لے جا سکتے ہو۔ اس وقت تک نعش نیچے ایک کمرے میں رکھی جائے گی۔۔۔۔ اور بل بھی تم کل چکا سکتے ہو۔ مجھے افسوس ہے تمہاری بیوی۔۔۔“ لیکن وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا، جیسے اس کے تمام حواس شل ہو گئے تھے۔ لیکن چند اور تیز آوازوں نے اسے چونکا دیا۔ نعش لے جانے والی نیچی ذات کی عورتیں سٹریچر لئے جا رہی تھیں ”جب تک ہمیں پہلے ہی ایک ایک روپیہ نہ دے دیا جائے ہم نہیں لے جائیں گی۔“ اور نرسیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں ”ہم خود لے جا سکتے تھے۔ لیکن توبہ! اس کا چہرہ کتنا سفید ہے، مجھے تو ڈر لگتا ہے“ وہ نیلا کی یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ غصے کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ”شکر ہے میں اونچی ذات کا ہندو نہیں ہوں“ وہ نیلا کی طرف بڑھا۔ نرس نے جلدی سے سٹریچر بڑھایا۔ اس نے اپنا ہونٹ کاٹ کر کہا ”نہیں اس کی ضرورت نہیں، صرف مجھے وہ نیچے والا کمرہ بتا دو تو مہربانی ہو گی“

اور اس نے اپنے بازوؤں پہ نیلا کی نعش کو اٹھا لیا۔ اور وہ نیلا کو لئے اسی زینے پر سے اتر رہا تھا، جن پر سات دن پہلے اسے سہارا دے کر اوپر پہنچایا تھا، اس جسم کو لئے جسے موت نے سخت اور بھاری کر دیا تھا۔ اس جسم کو جو اسے محبوب تھا جو کبھی اس کی تمناؤں کا مرکز تھا جس نے بارہ سال تک اس کا ساتھ دیا تھا اور اس کے قریب رہا تھا۔ اور اب، اس کے بعد ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ اس کی زندگی سے الگ ہو جائے گا۔ اس جسم کو اس نے کئی بار اسی طرح اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا تھا جب نیلا پھول کی طرح ہلکی تھی جب وہ کمسن لڑکی نئی نئی بیاہی آئی تھی اور اس کی ماں اس سے دن بھر کام لیتی تھی اور جب وہ ماں کی نظریں بچا کر دوسرے کمرے میں ملتے تو وہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گھماتا اور پلنگ پر ڈال دیتا اور پھر جب وہ بیمار بیمار کمزور رہا کرتی تھی تو وہ اسی طرح اسے اٹھا کر پلنگ پر لٹایا کرتا تھا۔

اور اب وہ آخری بار اس محبوب جسم کو اپنے بازوؤں پر اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ نیچے، نیچے اور نیچے۔

دادا

خدیجہ مستور

آدھی رات کا بھیانک سناٹا جیسے سرگوشیوں میں قتل کی سازشیں کر رہا تھا اور دادا پختہ سڑک کے بیچوں بیچ اس اطمینان سے چل رہی تھی کہ لگتا یہ پوری سڑک صرف اس کی خاطر بنائی گئی ہے۔ کہیں قریب ہی سے پہرے دار سپاہیوں کی سیٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں، مہیب سناٹے میں عجیب سا خوف و ہراس پھیلتا جا رہا تھا۔ دادا بھیانک سناٹے اور سیٹیوں کی آوازوں سے بالکل بے خبر سی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی موٹی سی لاٹھی کے سرے پر لگا ہوا لوہا سڑک کوٹ رہا تھا اور اس کے بھاری بھاری مردانہ جوتے شور مچا رہے تھے۔ اس کے چہرے سے سخت بیزاری ٹپک رہی تھی۔ وہ بار بار لمبی لمبی سانسیں لیتی اور پھر اپنی چور آنکھوں سے یوں آسمان کی طرف دیکھتی جیسے وہاں بھی کوئی موٹا سا تالہ لٹک رہا ہو۔ وہ جانے کیا کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ پتہ نہیں گالیاں بک رہی تھی یا دعا مانگ رہی تھی ——— گشتی سپاہی اب اس کے قریب آتے جا رہے تھے لیکن وہ اسی سکون سے متوازن قدم ڈالتی چلی جا رہی تھی۔

"کون ہے تو؟" ——— آواز اتنے قریب سے آئی کہ اب اسے کھڑا ہو جانا پڑا۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں بیزاری اور دکھ تھا۔ شاید وہ کھڑا نہ ہونا چاہتی تھی۔ سپاہی مارے حیرانی کے اسے جھانک جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اتنی لمبی تڑنگی عورت، ہاتھ میں ڈنڈا، مردانے جوتے، ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتہ، بڑے بڑے پائنچوں کی شلوار اور دوپٹہ غائب ——— دادا ایک لمحے تک چپ چاپ کھڑی تاک جھانک کرنے والے سپاہی کو کچھ اس طرح دیکھتی رہی جیسے کہہ رہی ہو کہ بھائی۔ آج مجھے خوب چلنے دو، آج میں بہت بیزار ہوں۔ آج میں زندگی سے اکتا چکی ہوں۔ مجھے چلنے دو ——— سپاہی نے پیچھے مڑ کر زور سے سیٹی بجائی۔ تھوڑی دور پہ دوسرے گشتی سپاہیوں کے جوتوں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

"کون ہے تو ——— گونگی ہے جو بولتی نہیں" ——— سپاہی زور سے پکارا اور اس کی آواز سناٹے میں دور دور تک پھیل گئی۔

"کیوں ستاتا ہے بابا، تو اپنا کام کر" دادا نے آہستہ سے جواب دیا۔ "اپنا کام کرنے کی بچی، بول تو کون ہے" سپاہی اس کی طرف جھپٹا۔

"تیرا باپ ہوں حرام زادے" دادا جیسے چونکی اور اس نے اپنی لاٹھی زمین پر زور سے پٹخی۔ اس کے چہرے پہ جیسے ساری

دُنیا کی کرختگی پھٹکار بن کر برسنے لگی ——— سپاہی نے بپھر کر موٹی سی گالی بکی "چل نہانے ——— دو دو بچے لٹھڑے کر آوارہ گھومتی ہے سالی۔"

"نہانے لے چلے گا" ——— وہ سپاہی کی طرف پل پڑی ——— "نہانے لے جائے گا، تیری ایسی کی تیسی" ———

دادا نے اپنا ڈنڈا سپاہی کی ٹانگ پر جھاڑ دیا اور جب سپاہی نے گھبرا کر اپنی لاٹھی اٹھانی چاہی تو دادا کا لٹھ اس زور سے پڑا کہ سپاہی کا سر پھٹ گیا۔ لاٹھی میں لگا ہوا لوہا اس کے دماغ تک بکھیر گیا تھا۔ وہ زیرِ لب جانے کیا بدبدا رہی تھی اور پھیکی پھیکی چاندنی میں بہتا ہوا جیتا جیتا خون سیاہ نظر آ رہا تھا۔ دوسرے سپاہی کے قدموں کی چاپ بالکل قریب آ چکی تھی۔

دادا نے بوکھلا کر خون دیکھا اور پھر جیسے سرپٹ بھاگنے کے لئے اس کے قدم اُٹھے۔ ابھی وہ چند ہی قدم بھاگی تھی کہ چھ سپاہیوں نے اس کا ڈنڈا چھین کر ہتھکڑیاں پہنا دیں ——— دو سپاہیوں کو لاش کے پاس چھوڑ کر باقی چار سپاہی اسے بیچ میں لے کر قریب کے حوالات کی طرف چل دئے ——— سپاہی اپنے مرحوم ساتھی کے متعلق باتیں کر کر کے دادا کو گالیاں دے رہے تھے۔ مگر وہ خاموشی سے چلتے ہوئے جانے کیا سوچ رہی تھی اور رات سپاہیوں کی طرح جیسے غصّے میں پھنکارتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

دادا کو تین دن تک حوالات میں رکھا گیا۔ اس کے متعلق زیادہ کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ کئی بار جیل جا چکی تھی، اس کی ساری ہسٹری موجود تھی۔ بس صرف یہ معلوم کرنے کے لئے اسے کئی دن تک سزائیں دی گئیں کہ مرحوم سپاہی سے اس کی کون سی دشمنی تھی، اور اس کے عاشق کا کیا پتہ ہے۔ دادا نے لاکھ سمجھایا کہ اب اس کا کوئی عاشق نہیں، وہ اب کسی کو نہیں جانتی، پھر بھی کسی نے اس وقت تک یقین نہ کیا جب تک کہ سپاہی عورتوں نے اس کی اچھی طرح مرمت نہ کر دی۔

چوتھے دن اسے ایک بند گاڑی میں بٹھا کر جیل پہنچا دیا گیا جہاں وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں اس وقت تک کے لئے بند کر دی گئی جب تک کہ اس کے مقدمے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔

دادا کو جب اس اکیلی کوٹھری میں بند کرنے کے لئے لایا گیا تو وہ ہمیشہ کی طرح ہنس نہ رہی تھی، جیل کی کوٹھری کو بڑا اچھا گھر نہ کہہ رہی تھی، سپاہیوں سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ نہ کر رہی تھی۔ بلکہ وہ بالکل چپ تھی اور جب اس کی کوٹھری کا آہنی دروازہ بند کر دیا گیا تو وہ مٹی کے اس لمبے سے چبوترے پر چٹائی بچھا کر لیٹ گئی جس کے سرہانے ذرا زیادہ مٹی تھوپ کر تکیہ بنا دیا گیا تھا۔ سارا دن یوں ہی چپ چاپ چھت تکتے تکتے گزر گیا، المونیم کے بڑے سے پیالے میں پڑی ہوئی چنے کی پتلی پتلی دال اور دو موٹی موٹی روٹیاں اس کی بھوک کو للچاتی رہیں۔ رات آئی تو کھانا اُسے زبردستی کھلایا گیا لیکن اس کی اس کیفیت میں ذرا بھی کمی نہ ہوئی۔ آہنی دروازے کے باہر پہرہ ہو رہا تھا۔ پیلی پیلی لالٹینوں کی چمک اِدھر سے اُدھر گھومتی رہی۔ بارک نمبر ایک، بارک نمبر دو ——— سب اچھا ——— سب اچھا ——— پہرے والیوں کی آوازیں ایک دوسرے کو جواب دیتی رہیں۔ دادا ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہی شاید آج اس کی وہ زندگی اسے بُری طرح ستانے پر تُل گئی تھی جو ایک چھوٹے سے گھرانے میں شروع ہوئی تھی۔ شاید یہ اسی کی یاد تھی جو وہ یوں دم بخود پڑی اندھیرے میں کچھ دیکھ رہی تھی۔

وہ دن جب اس کا ابا قریب کی کوٹھی میں بیرے کا کام کرتا تھا اور اس کی اماں سارے مہینے پندرہ روپوں کا حساب کر کر کے کُڑھا کرتی تھی اور ان دنوں اس کا نام دادا کے بجائے کنیز تھا۔ پندرہ روپے اور چھ جانیں۔ کبھی اسے پیٹ بھر روٹی نصیب نہ ہوتی

اسی لئے وہ جھگڑالو طبیعت کی ہو گئی تھی۔ اپنا پیٹ بھرنے کی غرض سے وہ اپنی چاروں چھوٹی بہنوں کا حصہ چھین کر ذرا بھی شرمندہ نہ ہوتی۔ اماں اس کی دوسری بہنوں کے صبر و شکر کی مثال دے کر اسے سمجھاتی لیکن کھانے کے وقت وہ چھوٹے سے باورچی خانے میں بندروں کی طرح دوسری بہنوں کا حصہ چھینتے ہوئے ساری نصیحتیں بھول جاتی۔ اماں اس کی ان حرکتوں پر دوسری اولادوں کو پیار کرتی، اسے کوستی اور ہر وقت برا بھلا کہتی رہتی۔ دوسری بہنوں کو پیار کرتے دیکھ کر وہ روتی اور تھوڑی دیر کے لئے چپ بیٹھ جاتی لیکن پھر جب باورچی خانے میں جاتی تو اچھل پھاند شروع کر دیتی۔ چھینا جھپٹی میں کئی بار چھوٹے بڑے مٹی کے برتن بھی توڑے اور اماں نے اپنا سینہ کوٹتے ہوئے اسے جلانے کی لکڑیوں سے مارا بھی۔ اس کی ان حرکتوں پر آس پاس کی عورتیں اسے نام دھرتیں تو ماں بڑے ارمان سے کہتی کہ بڑی ہو کر سب ٹھیک ہو جائے گی لیکن اس کی عادتیں خراب ہی ہوتی گئیں۔ بارہ تیرہ سال کی ہو کر پردے بیٹھ گئی مگر عادتوں میں رتی برابر فرق نہ آیا اور نہ ہی اس کے ابا کی تنخواہ بڑھی ——— اب وہ اور بھی نئی نئی باتیں سیکھ رہی تھی۔ زیادہ وقت کوارٹر کے دروازے میں گردن ڈالے کھڑی رہتی اور جب کوٹھیوں کی عورتیں بن ٹھن کر باہر نکلتیں تو وہ تالیاں پیٹ پیٹ کر چیخنے لگتی۔

"پلاؤ زردہ کھانے والے اللہ کرے مر جائیں"

"اچھا اچھا کپڑا پہننے والے اللہ کرے مر جائیں" ——— میٹھے چنے اور کپڑے بیچنے والوں کو خواہ مخواہ بلا لیتی اور جب بغیر کچھ خریدے اندر بھاگتی تو وہ گالیاں دیتے چلے جاتے اور ایک دن تو اس نے کمال ہی کر دیا۔ اپنے باپ کی مالکن کو گالی دے دی کہ وہ ابا کی تنخواہ کیوں نہیں بڑھاتی۔ اس دن باپ کی نوکری پر بن گئی۔ کوارٹر سے نکل جانے کا حکم مل گیا۔ بڑی مشکل سے پاؤں پڑ کر اور ناسمجھ بچی کی بات کہہ کر نوکری بچائی گئی۔ باپ اسی وقت گھر آیا اور موٹی سی لکڑی لے کر اسے اتنا مارا کہ کئی دن تک کھاٹ سے اٹھ نہ سکی۔ اس واقعے کے بعد دروازے میں ہر وقت تالہ پڑنے لگا۔

پندرہ سولہ سال کی ہوئی تو اماں نے اسے ٹھیک کرنے کے لیے شادی طے کر دی۔ شادی کے نام پر صاحب سے بیس روپے قرض مانگے گئے اور دو چار پانی کیلے کے جوڑے بنا کر اسے مانجھے بٹھا دیا گیا۔ مانجھے کے دنوں میں وہ روٹی کے لئے ذرا بھی نہ لڑی۔ آدھا پیٹ کھا کر بھی اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی۔ اس نے اپنی نئی نویلی شادی شدہ سہیلیوں سے سن رکھا تھا کہ شادی کے بعد روٹی اور اچھے اچھے کپڑوں کے علاوہ میاں کی ایسی محبت ملتی ہے جو اور کوئی نہیں دے سکتا۔

رخصت ہو کر سسرال گئی تو چھ سات دن بعد ہی پچھلے دکھ بھول گئی۔ میاں کی بھرپور محبت ملی اور ساس کی ایسی شفقت کہ بہو کو دونوں وقت اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی مگر جب اس نے گھونگھٹ الٹ کر اپنا گھر دیکھنا چاہا تو وہ صرف برائے نام گھر کی مالکن تھی۔ حکم بڑے بڑے دانتوں والی ساس کا چلتا۔ اس کے شوہر کی بیس روپے تنخواہ بھی اسی کے ہاتھ آتی ——— وہ اپنا گھر سنبھالنے کے لئے جلد ہی دلہناپے کو خیر باد کہہ گئی ——— اس کی ساس نے جب یہ دیکھا تو وہ چڑیلوں کی طرح خوفناک ہو گئی۔ نہ تو اس نے بہو کو اس کوٹھری میں قدم دھرنے دیا جہاں مٹی کے تین بڑے بڑے صندوق رکھے تھے، نہ باورچی خانے میں جھانکنے کی اجازت دی اور نہ ہی تنخواہ میں سے ایک دھیلا چھونے دیا اور تو اور ساس نے ان مزے دار چیزوں سے بھی اسے محروم رکھا جو اس کا شوہر اپنے مالک کے باورچی خانے سے اڑا کر لایا کرتا ——— مارے جلن کے نپی تلی روٹی دینے لگی چاہے پیٹ بھرے یا نہ بھرے ——— آخر ایک دن اس نے بڑی محبت سے میاں کے کان بھرنا چاہے مگر اس کی تیوری پر بل پڑ گئے

"امّاں کے لئے ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا، میری ماں نے چکی پیس پیس کر مجھے پالا ہے، اس گھر کی ہر چیز انھیں کی ہے"

اس نے بہت چاہا کہ میاں کو اپنا کر ساس کو نظروں سے گرا دے لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اب شوہر بھی اس سے دور بھاگنے لگا۔ آخر گھر میں ہر وقت کی لڑائیاں ٹھن گئیں وہ ساس کو چھیڑتی، ساس اسے سارا دن گالیاں دیتی، روتی اور چیختی، سارے محلے والوں کی ہمدردی بٹور کر بھی اسے چین نہ آتا۔ اب وہ جلن کے مارے اسے اتنی روٹی دیتی کہ اس کے پیٹ کی ایک کور بھی نہ بھرتی۔ وہ زبردستی باورچی خانے میں گھس کر کھاتی اور ساس کی گالیاں بڑی خوفناک ہونے لگتیں۔ اس کا شوہر روز کی کِٹ کِٹ سے تنگ آکر اسے مارتا اور وہ ساس سے بدلہ چکاتی۔ باپ کی موت کے باوجود وہ اپنے گھر بیٹھ جانے کی دھمکی دیتی اور ساس اس دھمکی سے خوش ہو کر کہتی کہ تو بھلا کیا جائے گی چڑیل۔ اور واقعی اس کی دھمکی صرف دھمکی ہی رہتی۔

پھر کچھ دن کے لئے لڑائیاں رُک گئیں کیونکہ اس کی گود بھرنے والی تھی۔ ایک مہینے کھٹیا جھیل کر جب وہ اپنے بچے کو گود میں لئے اُٹھی تو ساس نے یہ بھی برداشت نہ کیا کہ وہ اس کے اکلوتے بیٹے کے بچے کو گود میں لے کر اپنا حق جتائے اور اس کا بیٹا اولاد کی وجہ سے بیوی کے بس میں آ جائے۔ یہ چیز ایسی تھی کہ وہ ایک دم شیرنی ہو گئی۔ ذرا طاقت آئی تو اس نے اپنی ساس کے جھونٹے پکڑ کر اچھی طرح مرمت کر دی اور پھر اسی دن اس کے شوہر اور ساس نے دودھ پیتے بچے کو اس کی گود سے چھین کر گھر سے نکال دیا۔

دوسرا شہر تھا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں جائے، کس کے پاس پناہ لے۔ برقعہ میں اُلجھتی چلی جا رہی تھی کہ راستے میں اسے اپنے محلے کے تانگے والے کی بیوی مل گئی۔ وہ اکثر اس کے ہاں آیا کرتی اور سڑی گالیوں کے ساتھ سارے محلے کی خبریں سُنا جاتی۔ تانگے والی اسے اپنے گھر لے گئی اور بڑی ہمدردی کی مگر اس کے آنسو نہ رُکے۔ وہ سینہ کوٹ کوٹ کر روتی رہی اور قمیص کے اوپر سے بہتے ہوئے دودھ کے قطرے دکھا دکھا کر فریاد کرتی رہی۔ اسی رات جب تانگے والے نے اپنا گھوڑا کھولا تو اس کے عجیب عجیب سے دوست بے دھڑک گھر میں آ کر چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد گھر کے دروازے بند کر کے جوئے اور چرس سے شوق کیا گیا۔ تانگے والی نے بھی زمین پر بیٹھ کر چرس بھری سگرٹ پی اور پھر اسے بھی زبردستی پوری سگرٹ پلا دی۔ چرس کا پہلا پہلا نشہ تھا۔ وہ بالکل چکرا گئی اور کھری کھاٹ پر گر کر ساری رات اپنے بچے، اپنے لال کو آوازیں دیتی رہی۔

دو تین دن کے بعد بھی جب اس کے آنسو نہ تھمے تو تانگے والی نے اسے بتایا کہ اس کے آدمی کا ایک دوست اس پر عاشق ہو گیا ہے۔ رونے دھونے سے کام نہ چلے گا، عیش کرنا ہو تو اس کے ساتھ بھاگ جائے، ساری زندگی عیش کرانے کا وعدہ کرتا ہے ——— پھر تانگے والی نے بتایا کہ وہ خود بھی بھاگ کر آئی تھی۔ نہ شادی کی نہ بیاہ، مزے سے ٹھاٹ کرتی ہے میاؤں کی حکومت سے بھی بال بال بچی ہوئی ہے ——— وہ ان باتوں پر راضی نہ ہوئی۔ برابر یہی رٹے گئی کہ اس کی ساس اور شوہر سے میل کرا دو۔ اب وہ سب کچھ برداشت کر لے گی۔ بھوکی مرے گی مگر اُف نہ کرے گی۔ اس کا بچہ اس کی گود میں نہ دیا جائے گا تو کبھی ہاتھ نہ پھیلائے گی۔ اگر اس سے کہا جائے گا کہ بچے کو نہ دیکھے تو اپنی آنکھیں پھوڑ لے گی لیکن اس طرف نظر بھی نہ اُٹھائے گی۔ صرف اسے اپنے بچے کے قریب رہنے دیا جائے ——— آخر تانگے والا اس کے شوہر کے پاس گیا تاکہ صلح صفائی ہو جائے مگر جب وہ واپس آیا تو ساتھ ہی طلاق نامہ تھا، وہ پاگلوں کی طرح بال نوچتی، بوٹیاں کاٹتی اور چیخ چیخ کر روتی رہی۔ اس کے نئے عاشق نے اسے جی جان سے تسلی دی، تانگے والی نے بڑی شفقت سے گالیاں بک بک کر دم دلاسے دیئے لیکن اس کی سمجھ میں

کچھ بھی نہ آتا۔ وہ ساری ساری رات اپنے بچے کو بلاتی، اس سے باتیں کرتی رہتی اور پھر چرس کے دم لگاتی۔

دو ہفتے اسی طرح گزر گئے آخر ایک دن مانگنے والی نے اس سے صاف کہہ دیا کہ وہ زیادہ دن نہ کھلا سکے گی اچھا بھلا چاہنے والا مل گیا ہے اب اپنا گھر بنائے اور آخر وہ اس شرط پر اپنے عاشق کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی کہ جانے سے پہلے ایک بار اس کا لال دکھا دیا جائے۔

جانے سے پہلے اس کو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر اور ساس کسی دوسرے شہر جا چکے ہیں۔ اس خبر کے بعد نہ وہ روئی نہ پیٹی بس اس طرح چپ ہو گئی جیسے پتھر میں تبدیل ہو گئی ہو۔ دوسرے دن اس کا محبت کرنے والا اسے شہر کی بڑی تاریک اور پراسرار گلیوں کے ایک مکان میں لے گیا جہاں اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کا ساتھی چوری کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ اس نے کسی قسم کا اعتراض نہ کیا۔ وہ ہاتھ کی صفائی سے جو کچھ کماتا اس کی گود میں ڈال دیتا۔ مارے پیار کے بچھا جاتا لیکن وہ اس سے ہنس کر بولنا تو جانتی ہی نہ تھی۔ بات بات پر گالیاں بکتی، ڈھیر ڈھیر سی چرس پیتی اور سارا دن پلنگ پر پڑی بان توڑا کرتی۔ مگر چور اچکے کو تو بس عورت چاہیئے اور عورت اس غریب کو بڑی مدت کے بعد ملی تھی وہ اسے ایک لفظ نہ کہتا۔ بہت سے دن یوں ہی گزرتے چلے گئے۔

پلنگ پر پڑے پڑے اس نے محلے کی ساری دائیوں سے علاج بھی کرایا لیکن آخر اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ زچگی کے وقت اس کی ساس نے مارے جلن کے دائی کو نہیں بلایا تھا اسی لئے یہ خرابی ہوئی۔ کہ اب وہ اولاد پیدا کرنے کے لائق نہیں رہی۔ اس انکشاف کے بعد تو وہ اور بھی عجیب و غریب ہو گئی۔ وہ سارا دن پڑی اپنا سینہ کوٹ کوٹ کر روتی، گالیاں بکتی، چرس پیتی اور پھر اتنا کھاتی اتنا کہ اس کے ہاضمے میں گڑبڑ ہو جاتی۔

ایک سال بعد اس نے اپنے آدمی سے ضد کی کہ اب وہ بھی اس کے کام میں ہاتھ بٹائے گی۔ اس اظہار سے وہ بہت خوش ہوا اور جلد ہی چوری کے موٹے موٹے گر بتا دیئے۔ احتیاطاً تالہ توڑنا بھی سکھا دیا۔ کچھ ہی دن بعد وہ برقع اتار نوکری کی تلاش میں گھر تاڑنے لگی اور اس کے آدمی کو ہاتھ صاف کرنے میں آسانی ہو گئی۔ اب دونوں کے بڑے مزے تھے۔ وہ رونے دھونے کے بجائے سیر سیر بھر دودھ پی کر خوب ہنستی اور پہلے کی طرح اپنے چاہنے والے سے بے اعتنائی بھی نہ برتتی، ان ہی دنوں اسے جانے کیا سوجھی کہ ایک گھر میں نوکری کر کے مال پر ہاتھ صاف کرنے کے بجائے وہ مالکن کے دودھ پیتے بچے کو لے بھاگی مگر وقت پر وہ بچے کو بے تحاشہ چومتی ہوئی پکڑی گئی۔ اسے اور اس کے آدمی کو پورے سات سات مہینے کی قید با مشقت ہو گئی۔ جیل سے چھوٹ کر وہ دونوں پھر ملے اور پراسرار گلیوں میں چھپ کر دوبارہ کام شروع کر دیا مگر اب کی اس کے ساتھی نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ ایسی نادانی کی حرکت پھر کی تو مفت میں مرنا ہو گا۔ سچا دادا بننا ہے تو ساری زندگی پولیس کے ہاتھ نہ آؤ۔ اور جب اس نے دادا کے مطلب پوچھے تو معلوم ہوا کہ بمبئی میں دادا بدمعاش کو کہتے ہیں اور وہ بمبئی میں کافی عرصے تک داداؤں کے ساتھ رہ چکا ہے۔

دو تین دن بعد ہی اس نے مطالبہ کیا آج سے اس کا نام دادا پکارا جائے، اگر کنیز کہا تو وہ اپنا اور اس کا سر پھوڑ لے گی۔ اس کے چاہنے والے نے بہت سمجھایا کہ یہ نام عورتوں کو زیب نہیں دیتا مگر اس نے اپنے عورت ہونے سے ہی انکار

کر دیا ـــــ یہ نام رکھنے کے بعد اس نے بڑی پھُرتی سے گھر تاکنے شروع کر دیئے اور ایک بار بغیر صلاح کے بے ڈھنگے پن سے چوری کر بیٹھی۔ اس دفعہ اسے چھ مہینے کی جیل ہوئی اور اس کا ساتھی بھی مفت میں چھ مہینے کی قید جھیلنے پر مجبور ہو گیا۔ اب کی بار جب جیل سے چھوٹ کر دونوں ملے تو دادا کے ڈھنگ نرالے تھے۔ وہ اس قدر عجیب سی ہو گئی تھی کہ اس کا ساتھی بھی اسے نہ پہچان سکا۔ وہ اب دن دہاڑے لاٹھی لے کر گلیوں میں گھومتی۔ اس کا عاشق اور اس کے دوسرے چور ساتھی اسے سمجھاتے کہ اس طرح گھومی تو سب کو پکڑوا دے گی۔ لیکن اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔ یا تو وہ باہر گھومتی یا پھر چرس پی کر پلنگ پر ڈھیر رہتی۔ بہت سمجھانے کے بعد بھی جب وہ باز نہ آئی تو آخر ایک دن اس کا ساتھی بھی اسے چھوڑ گیا۔ اس دن وہ بڑی دیر تک بھوکی پیاسی بڑی ٹکر ٹکر آسمان تکتی رہی۔ اسی رات اس نے بڑے دھڑلے سے ایک مکان کا تالا توڑا اور پھر چھ مہینے کے لئے جیل پہنچ گئی۔

چھ مہینے کے بعد جب وہ باہر نکلی تو سارا دن بھوکی پیاسی اس گلی میں چپ چاپ بیٹھی رہی جہاں وہ اپنے چاہنے والے کے ساتھ رہتی تھی۔ جب رات ہونے لگی تو وہ تھکی تھکی سی اُٹھ کر اپنے ایک جاننے والے کے گھر چلی گئی جو مدت ہوئی چوری سے توبہ کر چکا تھا۔ اس کے وہاں مانگ کر کھانا کھایا اور پھر چلتے چلاتے ڈیوڑھی میں کھڑی ہوئی لاٹھی چُرا کر باہر نکل آئی۔

رات کا اندھیرا بھیانک ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ پختہ سڑک پر لاٹھی بجاتی، جانے کیا سوچتی آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہ ٹوکنے والے گشتی سپاہی کے سامنے کھڑی اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو، بھائی آج مجھے خوب چلنے دو ـــــ آج میں بہت بیزار ہوں۔ آج مجھے زندگی بہت اداس لگ رہی ہے، مجھے چلنے دو ـــــ

جیل کی ایک رات اور ایک دن اسی خاموشی میں گزر گیا۔ دوسرے دن جب وہ لوہے کے جنگلے سے بلیوں کی طرح باہر جھانکنے لگی تو اس کے چہرے پر غم و اندوہ کی ایک ذرا سی پرچھائیں بھی نہ تھی۔ جب اس کی کوٹھڑی کے سامنے سے پہرے دار گزرتی تو وہ اسے پکارنے لگتی۔

" اوئے، کوئی بات وات کر، مشین کی طرح چلے جاتی ہے " پہرے دار اسے گھورتی آگے چلی جاتی اور دادا بڑے مردانہ وار اسے گالی دے کر ہنستی۔

کیونکہ دادا اس بار اکیلی کوٹھڑی میں بند کی گئی تھی اس لئے اسے چرس کی سخت تکلیف تھی۔ اس سے پہلے جب وہ جیل میں آتی تو چرس کی کوئی کمی نہ ہوتی۔ نشہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے اس کا دماغی توازن ساتھ نہ دے رہا تھا جسم اس بری طرح ٹوٹتا کہ وہ دوسرے ہی دن بیمار پڑ گئی۔ جیل کی ڈاکٹرنی نے اسے دیکھا اور پھر ایسی کڑوی دوائیں پینے کو دی گئیں کہ اس نے شیشی توڑ ڈالی اور کوٹھڑی میں ایسی ایسی اچکی پھاندی کہ ڈاکٹرنی اسے دیکھتے ہوئے گھبرانے لگی ـــــ آخر دادا نے ایک دن کھانا بانٹنے والی نمبردار سے خوشامد کی۔

" کہیں سے چرس مل جائے گی میری جان "

" نہیں ! ـــــ نمبردار نے رحم کھا کر اسے دو بیڑیاں پکڑا دیں۔

"اگر تم چرس لا دو تو میں تم کو دو روپے انعام دوں گی۔" دآدا نے ان دو روپوں کی لالچ دی جو وہ تلاشیوں کے باوجود صاف بچا لائی تھی۔

"نا بابا، میں کہیں سے نہیں لا سکتی۔ اگر کسی افسر کو پتہ چل جائے تو میری معافی کٹ جائے گی۔ مجھے جلدی سے گھر جانا ہے، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں" نمبردار قیدی عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے بعد دآدا نے پھر کبھی چرس کی ضد نہ کی بلکہ اب وہ جیل کے دوسرے کام کرنے والیوں کو ستانے لگی تھی۔ اور جب ہر طرف سے "نہیں ملے گی" جواب ملتا تو دآدا کی گالیاں بڑی خوفناک ہو جاتیں۔

ایک مہینے بعد آج دآدا عدالت میں اپنے مقدمے کا فیصلہ سننے گئی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے عدالت کی ساری کارروائی سنتی رہی لیکن جب اسے عمر قید کا فیصلہ سنایا گیا تو وہ ہتھکڑیاں بجا بجا کر چیخنے لگی۔

"ہمیں نہیں چاہیئے چودہ سال کی سزا، اگر ہم اس کے بعد بھی جیتے رہے تو کیا جج صاحب ہمیں اپنے گھر ڈال لیں گے" سپاہی عورتیں اسے کھینچ کر لے جانے لگیں تو وہ زور زور سے گالیاں بکنے لگی۔

"او حرام زادے، او کتے، بس چودہ سال کی قید دیتا ہے۔" سپاہی عورتوں نے اسے کھینچ کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ لیکن وہ راستے بھر گالیاں بکتی رہی۔

جب وہ جیل پہنچی تو آدھا دن گزر چکا تھا۔ اب اسے جیل کے کپڑے اور کمبل دے کر بارک نمبر دو میں چھوڑ دیا گیا۔ جس وقت وہ بارک میں داخل ہوئی تو ساری قیدی عورتیں مشقت کرنے گئی ہوئی تھیں۔ ان کے سیاہ کمبلوں میں لپٹے ہوئے بستر اور المونیم کے بڑے بڑے کٹورے لائن سے رکھے ہوئے تھے۔ دآدا نے کپڑے تبدیل کر کے بارک میں تیزی سے ٹہلنا شروع کر دیا وہ اب بھی زیر لب گالیاں بک رہی تھی۔ اور چرس کی شدت سے بگڑا ہوا چہرہ اس وقت بڑا ہی مکروہ لگ رہا تھا۔ وہ دیر تک اسی طرح ٹہلتی رہی اور جب مشقتی واپس آ کر کھانے کے سلسلے میں دھما چوکڑی مچانے لگیں تو وہ غصے میں جیسے پھنکارنے لگی۔

"اے حرام زادیو چپ رہو، ورنہ ایک خون کر کے چودہ سال اور بڑھا لوں گی۔"

"بڑی آئی لاٹ صاحب کی بچی۔" ایک عورت نے تڑاخ سے جواب دیا۔ دآدا نے آستینیں چڑھا لیں اور دوسری عورتوں نے بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کیا۔ اس کے بعد بھی سونے سونے دآدا کی کئی عورتوں سے ٹھنی۔ رات بھر پہرہ ہوتا رہا اور دآدا اپنے بستر پر بڑی بے چینی سے کروٹیں بدلا کی۔

صبح جب ناشتے میں ٹھنڈے چنے بٹنے لگے تو ہشاش بشاش لائن میں سب سے آگے کھڑی تھی۔

"ہمیں اور دو، اتنے چنوں میں تو پیٹ کی ایک کور بھی نہ بھرے گی" ——— چنے بانٹنے والی نے شاید اس کے لمبے تڑنگے جسم پر رحم کھا کر تھوڑے چنے اور دے دئے۔

"ہمیں بھی دو نمبردار بہن" دآدا کے پیچھے والی عورت بڑی التجا سے منمنائی۔

"حرام زادیوں کو عیش سوجھتا تھا تو اپنے گھر بیٹھتیں چین سے" چنے بانٹنے والی نے اپنی بالٹی اٹھالی۔

"گالیاں دیں نا کسی کو بھی تو سر توڑ دوں گی" دآدا نے غصے سے کہا اور پھر چنوں کی بالٹی کی طرف جھپٹی۔ چنے تو خیر وہ

لے نہ سکی ہاں مقابلہ کرنے کے سلسلے میں اسے سب عورتوں کے سامنے چھ بید لگائے گئے۔ اس کے بعد سب کو کام کے لئے لے جایا گیا۔ مار کھانے کا دادا پر کوئی اثر نہ تھا۔ وہ سب عورتیں جو رات دادا سے لڑتی رہی تھیں اب اس کے پاس گھس گھس کر باتیں کر رہی تھیں۔

"بہن تمھارے سر کونسا جرم ہے؟" قیدیوں کے کپڑے سیتے ہوئے ایک عورت نے پوچھا۔

"بہن ——— دادا نے مٹک کر عورت کی نقل کی ——— خبردار جو مجھے بہن کہا ——— میرا نام دادا ہے دادا۔ عورت کی ذات پر لعنت ہے ——— جانتی ہو دادا کسے کہتے ہیں ——— بدمعاش کو ——— میں عورت نہیں بدمعاش ہوں ——— قتل کر کے آئے ہیں ہم ——— دادا نے اونچی آواز سے اعلان کیا۔ ساری عورتیں اسے حیرت سے دیکھنے لگیں۔

"کہیں چرس ہوگی میری جان" دادا نے اس عورت کی طرف سرک کر سرگوشی کی جو کل رات بے تحاشہ بیڑیاں پیتی رہی تھی۔

"شبراتن پاس ہو شاید" اس نے چپکے سے اس عورت کی طرف اشارہ کر دیا جس کی خاطر دادا نے صبح ہی صبح چھ ڈنڈے کھائے تھے۔

"کہیں چرس ہوگی؟" دادا چرس نہ ملنے سے سخت پریشان تھی۔ مانگے تانگے کی بیڑی تو بھوسے کی طرح بدمزہ لگتی۔

"پیسے ہوں گے" شبراتن نے سرگوشی کی اور کھٹا کھٹ ڈلیا بنانے لگی۔

"ہاں!" دادا نے اپنے شلوکے کے اندر سے ایک روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور شبراتن نے اپنی شلوار کے نیفے سے ایک چرس بھری سگرٹ نکال کر اس کی طرف سرکا دی۔

ایک روپے کی ایک سگرٹ؟"

"ہاں جی" ——— شبراتن نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ دادا کے تیور بگڑ گئے۔

"اچھا تو پھر ایک روپیہ اور لے" ——— دادا نے شبراتن کے جھونٹے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ عورتوں میں ہڑبونگ مچ گئی۔ دادا نے اپنا روپیہ تو چھین لیا مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ معاملہ کیا تھا۔ نمبرداروں نے بڑی مشکل سے انہیں الگ کیا۔

دادا کی بارک کی عورتیں جلد ہی اس سے نالاں ہو گئیں جس سے دیکھو لڑی پڑتی ہے۔ کئی بار اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت ہوئی کہ اسے کسی دوسری بارک میں بھجوا دیا جائے۔ لیکن عورتوں کی شکایت سنتا کون۔ سب عورتیں روز ہی آپس میں لڑا جھگڑا کرتیں، دادا کو بھی انھیں میں سے ایک سمجھا گیا۔ بس سزا کے طور پر اس کی مشقت میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا گیا۔ دادا کی حالت میں بھلا کیا فرق پڑتا۔ بڑی سے بڑی مشقت چٹکی بجانے میں کر ڈالتی۔ آخر بارک کی ساری عورتوں نے اپنی جان چھڑانے کے لئے دادا سے بات کرنی چھوڑ دی۔ اسے پھر بھی پروا نہ ہوئی۔ وہ خود ہی انھیں چھیڑ چھیڑ کر بولتی اور شبراتن کی چرس مفت میں پیا کرتی۔ شبراتن لاکھ کہتی کہ اب نہیں ہے ——— لیکن وہ کب مانتی۔ سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کی دھمکی دے کر وہ پوری پوری سگرٹ اُڑا جایا کرتی۔ شبراتن کا دوست جس کی خاطر وہ ایک سال کی قید بھگتنے آئی تھی جانے کن ذرائع سے اسے ڈھیر ڈھیر سی چرس بھجوا دیا کرتا اور وہ دوسری عورتوں کو اس کی لت لگا کر ٹھاٹ سے ان کے ہاتھ دُگنے داموں پر بیچا کرتی۔

گو یہ مفت میں پینے والی دادا سب عورتوں کے لئے تو لعنت تھی ہی مگر شبراتن کے لئے آسمانی بلا سے کم نہ تھی۔ جب دوسری عورتوں سے ملاقات کے لئے ان کے عزیز آتے اور چوری چھپے روپے دے جاتے تو شبراتن بڑی بے بسی سے پوچھتی۔

"دادا تیرا کوئی نہیں ہے، کوئی یار دوست بھی نہیں تیرا؟"

"تو جو ہے۔ پلائے گی نا" دادا اس کے نیفے کی طرف ہاتھ بڑھاتی اور وہ بدک کر الگ کھڑی ہو جاتی۔

مفت کی چرس کے علاوہ دادا عورتوں کی ان کھانے پینے کی چیزوں میں بھی زبردستی حصہ بٹاتی جو ان کے عزیز ملاقات کے وقت دے جایا کرتے۔ اس سلسلے میں خوب لڑائی ہوتی جب دادا کو یوں لڑ جھگڑ کر چیز نہ ملتی تو وہ راتوں کو بڑی ہوشیاری سے عورتوں کی گٹھریاں کھول کر ان کی چیزیں چرا لیتی اور پھر ان عورتوں کو بھی چپکے چپکے بانٹتی جن کے پاس کوئی آنے والا نہ تھا۔

کھانے کی چیزوں کو غائب دیکھ کر عورتیں سینہ کوٹ کوٹ کر روتیں اور دادا سے لڑتیں، اس کی شکایتیں کرتیں مگر کیا مجال جو دادا کے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔ کئی بار اسے مارنے اور زیادہ مشقت لینے کی سزائیں دی جا چکی تھیں۔ اتنا کھانے اور اودھم کرنے کے باوجود جب جیل کی ڈاکٹر عورتوں کو دیکھنے آتی تو دادا بڑی مکاری سے لیٹ کر کراہنے لگتی۔

"بہت کمزوری ہو گئی ہے ڈاکٹرنی صاحب، روٹی کی ایک کور بھی نہیں کھائی جاتی، دودھ بندھوا دیجئے" عورتیں فوراً دادا کی کاٹ کرتیں:

"ڈاکٹرنی صاحب یہ تو دوسروں کا بھی چرا کر کھا جاتی ہے، کیا مجال جو روٹی کی ایک کور بھی بچے اس سے۔" ڈاکٹر مسکراتی اور دادا کو دیکھے بغیر ہی چلی جاتی۔ دوسری بے حد کمزور عورتوں کا کبھی کبھی دودھ بندھوا دیا جاتا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد دادا شکایت کرنے والی عورتوں کو بڑی سڑی گالیاں دیتی۔ آخر ایک ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے دادا کے لئے ایک ہفتے کا دودھ بندھوا دیا۔ اس دن اس نے عورتوں کو بڑی فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔

"اور کرو شکایتیں، ہم تو آرام سے دودھ پئیں گے" وہ عورتوں کو جلانے کے لئے خوب زور زور سے ہنسی۔

ویسے تو دادا کی عام طور سے یہی حالت رہتی کہ اس سے لڑ، اس سے جھگڑ، کسی کی کوئی چیز چرا لی تو کسی کے جھونٹے پکڑ کر مار پیٹ شروع کر دی۔ لیکن کسی کسی دن وہ بالکل چپ ہو بیٹھتی وہ بھی اس طرح کہ اگر کوئی اسے ایک گالی دے جائے تو اُف نہ کرے۔ کبھی کبھی منہ چھپا کر چپکے چپکے روتی بھی اور پھر آنسو پونچھ کر شبراتن کو دھمکیاں دے کر ڈھیر سی چرس پیتی۔

دن گزرتے جا رہے تھے، دادا کی بارک سے کئی عورتیں رہا ہوئیں، کئی داخل ہوئیں۔ مگر اب شبراتن کے علاوہ نئی پرانی سبھی عورتیں اس سے مانوس ہوتی جا رہی تھیں۔ دراصل دادا ان سے کھانے پینے کے سلسلے میں تو لڑتی لیکن اگر جیل کی طرف سے عورتوں کو سختی کے طور پر کوئی سزا دی جاتی تو وہ ان کی حمایت کرتی۔ یہاں تک کہ ایک بار سپرنٹنڈنٹ سے اس بات پر لڑ بیٹھی کہ اس نے ایک عورت کو گستاخی کرنے کے سلسلے میں چار دن کے لئے تنہائی کی قید دے دی تھی۔ اور سب عورتوں کے سامنے اس کی اچھی طرح مرمت کرائی تھی۔ حمایت کرنے کے سلسلے میں دادا کے دس بید لگائے گئے اور کچھ عرصے کے لئے جیل کی ساری رعایتیں چھین لی گئیں ——— عورتیں اب اس سے اپنا دکھ درد بھی کہنے لگی تھیں اور راتوں کو جب وہ اپنے گھروں اور بچوں کی یاد میں بلک بلک کر روتیں تو دادا بڑی شفقت سے گالیاں دے دے انھیں چپ کراتی، ان کے آنسو پونچھتی اور خود بھی رنجیدہ ہو کر چپ بیٹھ جاتی۔

آج شام دادا کی بارک میں ایک بڑی کمسن دھان پان سی عورت لائی گئی جس کی گود میں مشکل سے دو مہینے کا بچہ ہوگا۔ عورت آتے ہی زمین پر بیٹھ گئی اور بچے کے منہ میں دودھ ٹھونس کر زار زار رونے لگی۔ عورتیں اس کے گرد جمع ہو گئیں اور اس سے پوچھنے لگیں کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے، اس کے سر کون سا جرم ہے ـــــ عورت نے دیر تک کسی بات کا جواب نہ دیا۔ بس روئے چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ عورتیں اسے پانی پلانے اور چپ کرانے میں لگی ہوئی تھیں۔ بس ایک دادا تھی جو بالکل الگ تھلگ بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔ بچے والی عورت جب روتے روتے تھک کر چپ ہو گئی تو دادا اس کے قریب سرک آئی۔

"واہ نبو، جرم کر کے روتی ہو، ایسا ہی چڑیا جیسا دل تھا تو اپنے گھر بیٹھتیں ٹھکانے سے۔"

"میں نے کون سا جرم کیا ہے" ـــــ عورت پھر پھڑک کر رونے لگی ـــــ "میرے سر زبردستی جرم لگایا ہے۔"

"زبردستی کیسے؟" دادا نے ذرا اشتیاق سے پوچھا۔

"میرا میاں شادی کے ایک سال بعد دوسری عورت کر لایا ـــــ" بچے والی عورت اپنا قصہ سنانے لگی ـــــ "میں بہت روئی دھوئی مگر پھر صبر کر لیا کہ اپنے بچے کو باپ سے محروم نہ کروں، گھر میں نوکرانیوں کی طرح رہنے لگی۔ اس پر بھی میرے میاں کو صبر نہ آیا۔ روز کہتا کہ میرا اور اپنی سوت کا بستر خود لگایا کر ـــــ کلیجے پر پتھر رکھ کر یہ کام بھی کر دیتی" ـــــ عورت آہ بھر کر آنسو پونچھنے لگی ـــــ "اس کے بعد بھی سوت کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی اور ایک دن وہ لیٹ کر چیخنے لگی کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ سارا محلہ جمع ہو گیا۔ ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا تو معلوم ہوا کہ ذرا زیادہ افیون کھا لی ہے۔ اس کے بعد پولیس آ گئی اور سوت نے پولیس کو بیان دیا کہ میں نے اسے زہر دیا ہے۔ گھر کی اور میری تلاشی لی گئی تو افیون میرے دوپٹے کے پلو میں بندھی ملی ـــــ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میری سوت نے پلو میں کب باندھ دی تھی ـــــ پولیس مجھے حوالات لے گئی اور پھر وہاں سے جیل لے آئی۔ ایک مہینے سے دوسری بارک میں ہوں۔ میرا باپ مقدمہ جیت رہا تھا مگر جانے کیسے ہار گیا اور آج میں عدالت سے سزا سن کر آ رہی ہوں۔ چھ مہینے کی سزا دی تھی پر اس بچے کی وجہ سے آدھی معاف ہو گئی۔ شریف عورت ہوں اب باہر نکل کر کیا منہ دکھاؤں گی۔ میرے ابا کی عزت خاک میں مل گئی" ـــــ عورت پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

"ہوں! مگر گدھیا تو اپنے خصم کے گھر نوکروں کی طرح کیوں رہی، ایک ہی دن میں گھر سے باہر نکل کر دوسرا یار کر لیتی تو آج یہ حالت ہوتی تیری" ـــــ دادا نے جوش سے کہا۔ اور پھر سوتے ہوئے بچے کی ٹانگ کھینچ کر بلکاری ـــــ "لئے چلی آ رہی ہے اس کتے کے پلے کو، وہیں پھینک آتی منہ پہ کہ لے پال ـــــ لا ذرا مجھے دے دے لے کے گود میں" ـــــ دادا نے بڑی شفقت سے بچے کو گود میں لے لیا ـــــ "اور لے تو بیڑی پی" ـــــ اس نے آدھی جلی سگرٹ اس کی طرف بڑھا دی۔

"ہم نہیں پیتی، اور دیکھو جی میرے بچے کو تم اب کچھ نہ کہنا، میں اسی کی خاطر زندہ ہوں ورنہ کوٹھے سے کود کر جان دے دیتی۔"

"میرا بچہ، بڑی آئی بچے والی لے کے" دادا نے بچے کو چوہے کی طرح اٹھا کر ماں کی گود میں دھر دیا اور پھر دیر تک چپکے چپکے گالیاں بکتی رہی۔

اس رات دادا کروٹ بدل بدل کر بچے کو دیکھتی اور جانے کیا بڑبڑاتی رہی۔ ورنہ اس کا تو یہ حال تھا کہ ساری رات کمبل کی جوؤں کے کاٹنے کی پروا کئے بغیر ٹھاٹ سے خراٹے لیتی تھی۔

دادا نے اچانک پھر وہی روپ بدل لیا تھا جیسے وہ ابھی ابھی جیل میں آئی ہے۔ جب دیکھو ہر ایک سے لڑی پڑتی ہے۔ ہر ایک کو دُکھ دے رہی ہے اور سڑی سڑی گالیاں بک رہی ہے۔ بچے والی عورت سے تو اسے جیسے دشمنی ہو گئی تھی۔ زبردستی اس کے بچے کو گود میں لیتی اور پھر ذرا ہی دیر بعد اسے ماں کی گود میں پٹخ دیتی۔

”میرا بچہ، بڑی آئی بچے والی“ دادا بڑبڑاتی اور عورت اسے حیرانی سے دیکھ کر اپنے سینے سے لگا لیتی اور پھر ایسے دُکھ سے روتی کہ ساری عورتیں دادا کو بُرا بھلا کہنے لگتیں۔ رات جب بچہ سوتے سوتے جاگ کر روتا تو دادا خواہ مخواہ بپھرنے لگتی۔

”چُپ کرا اس کتے کے پلّے کو، لے کے آ گئی، نیند کے لئے ترس گئے۔“

”دیکھ دادا تو خواہ مخواہ لڑتی ہے، بچے کس کے نہیں روتے“ کوئی عورت دادا کو سمجھانا چاہتی۔

”روئیں مگر ہماری نیند کیوں خراب کریں، ذرا لاڈو اپنے بچے کی آواز داب کر رکھے نا۔“

”تمہاری آواز نہ داب دُوں“ بچے کی ماں غصّے سے کانپ کر جواب دیتی اور پھر بڑی بے بسی سے رونے لگتی ـــــ ”ہائے، ہائے میری اماں“ ـــــ دادا چُپ تو ہو جاتی مگر اب اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں جبکہ ساری عورتیں مزے سے سوئی ہوتیں تو دادا کروٹیں بدل بدل کر صبح کر دیتی۔

ایک دن بچے کو ہلکا سا بخار ہو گیا۔ ماں نے رو رو کر بُرا حال کر لیا اور دادا نے بڑی شفقت اور منتوں سے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ ڈاکٹر دیکھنے آئی تو اس نے پہلا حکم یہ دیا کہ بچّہ ماں کی گود میں دیا جائے اور وہی اس کا حال بتائے۔ دادا نے بچے کو دے دیا مگر اس کے تیور بگڑنے لگے۔ ماں رو رو کر بچے کا حال بتانے لگی۔

”ڈاکٹرنی صاحبہ، میرا بچہ بہت بیمار ہے، رات بھر ہوش نہیں رہا، آنکھ نہیں کھولی میرے لال نے، آگ کی طرح پنڈا پھنکتا رہا ہے۔“

”کوئی بخار وخار نہیں ڈاکٹرنی صاحب“ ـــــ دادا نفرت سے بولنے لگی ـــــ ”ساری رات گلا پھاڑ پھاڑ کر رویا ہے، کہتی ہے کہ آنکھ نہیں کھولی“ ـــــ ڈاکٹر دادا کو چُپ رہنے کا اشارہ کر کے بچے کو غور سے دیکھنے لگی پھر نسخہ لکھ کر فوراً اپنے سامنے بچے کو دوا پلوائی۔

آج بچے والی عورت کا باپ اس سے ملنے آیا تو بچے کے لئے چھوٹے چھوٹے کھلونے اور نئی قمیصیں دے گیا تھا اس لئے وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

”میرے ابا کہتے تھے کہ فوراً اس آدمی سے طلاق لے لیں گے اور پھر میرے چچا زاد بھائی سے شادی کریں گے میری“ ـــــ عورت خوش ہو کر بتانے لگی ـــــ ”میرا چچا زاد بھائی مجھ سے بہت پہلے سے محبت کرتا تھا، میرے غم میں اس نے اپنی شادی نہ کی۔ اور تو اور وہ میرے بچے کو بھی بہت چاہتا ہے، جب میرے گھر آتا تو اسے سینے سے لگا لیتا“ اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔

”اچھا تو تیرا یار بھی ہے“ ـــــ دادا زبردستی بیچ میں بول اُٹھی ـــــ ”ارے یہ یاری واری چار دن کی ہوتی ہے، زیادہ باتیں نہ بنا“ ـــــ

”نہ وہ ہے یاری، میرا بچہ تو ہے اس کے سہارے زندگی گزار دونگی۔ تو کیوں بولتی ہے میرے بیچ میں۔“ عورت بدمزہ سی ہو کر

چُپ ہو گئی۔

کل صبح بچے والی عورت کے رہا ہونے کا دن تھا۔ آج دادا بچے کو زبردستی گود میں لینے کے سلسلے میں کتنی ہی بار اس سے لڑ چکی تھی۔ لیکن عورت نے ایک بار بھی دادا کو ہاتھ نہ لگانے دیا اور نہ اس کی لڑائی کا جواب دیا۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ مارے خوشی کے رات اسے نیند نہ آ رہی تھی۔ وہ لوریاں گا گا کر اپنے بچے کو پیار کر رہی تھی اور دادا کے چہرے پر جیسے ساری دُنیا کی لعنت برس رہی تھی۔

”چُپ ہو کر سو جا لعنت پڑی“ دادا بار بار چیخی مگر عورت دادا کی پروا کئے بغیر آدھی رات سے پہلے نہ سوئی۔

جب عورت گہری نیند سو گئی۔ بارک میں سنّاٹا چھا گیا تو دادا اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ چوروں جیسی آنکھوں سے اپنے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ بہت بلندی پر لگا ہوا مدھم سا بجلی کا قمقمہ جیسے دادا کو گھور رہا تھا —— بارک نمبر ایک، بارک نمبر دو —— سب اچھا ہے —— سب اچھا ہے —— باہر پہرے والیوں کی آوازیں ایک دوسرے کو جواب دے رہی تھیں۔ دادا آہستہ سے بچے والی عورت کے بستر کے قریب رینگ گئی۔

صبح تڑکے جب دادا کے اُوپر سے کمبل سرکایا گیا تو بارک میں کہرام مچ گیا۔ جیل کی افسر جمع ہو گئیں اور بچے کی ماں سینہ پیٹ پیٹ کر چیخ رہی تھی۔ اپنے مُنہ پر تھپیڑ مار رہی تھی اور کھڑے قد سے بار بار زمین پر گر رہی تھی —— دادا کے گلے میں اس کی قمیص کس کر بندھی ہوئی تھی اور اس کے ننگے سینے پر لیٹے ہوئے بچے کے منہ میں اس کی خشک چھاتی تھی۔ دادا اور بچے، دونوں کی آنکھیں حلقوں سے اُبلی ہوئی تھیں اور دونوں کے جسم سرد ہو کر اکڑ چکے تھے۔

کالی تتری

کالی تتری پتری وچ بولے
نئے اُڈدی نوں باج پے گیا

بلونت سنگھ

بڑے مزے میں موّلا نے چلم میں تمباکو اور اس کے اوپر سلگتے ہوئے اُپلے کے دو ٹکڑے جما دیئے اور پھر پالے سے سردی کے دانت کٹکٹاتا ہوا چارپائی پر چڑھ بیٹھا، ٹانگوں پر دُھسّہ ڈالے مگن ہو گیا۔ روٹی کھانے کے بعد اسے حقّے کی سخت طلب ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے آنکھیں موند کر دو چار کش ہی لئے ہوں گے کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ یہ دستک اسے بڑی ناگوار گزری۔ اس نے کرخت لہجہ میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

جواب میں پھر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔

پیر دا کھٹّا ________ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ عین اس کے سرے پر موّلا کا کچا مکان تھا جہاں وہ اپنی بوڑھی ماں اور ایک بیوہ بہن سمیت رہتا تھا۔ گاؤں میں گھستے وقت چونکہ اس کا مکان سامنے پڑتا تھا۔ اس لئے راہ گیر اسی سے کسی کے مکان کا پتہ یا کسی اگلے گاؤں کا راستہ دریافت کرنے کے لئے دروازہ آن کھٹکھٹاتے تھے۔ لیکن اس وقت آدھی رات ہونے کو تھی اور پھر سردیوں کے موسم میں تو سرِ شام ہی گاؤں پر خاموشی کا تسلّط ہو جاتا تھا۔ نہ جانے بے وقت کون آن دھمکا تھا۔ جب موّلا کو یقین ہو گیا کہ اسے اٹھنا پڑے گا تو اس نے حقّے کی نے ایک جانب کو ہٹائی اور دُھسّے کو سنبھالتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

نوٹ: ۔ اس کہانی کا پس منظر وہ سنہرا عالم پنجاب ہے جس میں ہندو، مسلم اور سکھ ڈاکو مل جل کر اپنے بھائی بندوں کے مکانوں میں نقب لگایا کرتے تھے۔

دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر تاریکی میں میانے قد کا ایک سکھ کھڑا ہے۔ پگڑی اس کے سر پر موٹے رسے کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے ایک سرے سے اس نے اپنے چہرے کا، آنکھوں کے سوا، نچلا حصہ چھپا رکھا تھا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا۔ بھنویں موٹی گھنی اور لمبی تھیں۔ آنکھیں تیز اور متجسس۔ اس کی ناک کی جڑ کے قریب آنکھوں کے نیچے باریک اور گہری لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا......

مولا بدکلامی کرتے کرتے رک گیا۔ اس نے بھاری اور خشک لہجے میں پوچھا :۔

" تم کون ہو؟ "

اجنبی نے لمحہ بھر اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر غصے سے بولا:۔

" میں بھنبوڑی گاؤں سے آرہا ہوں "

" بھنبوڑی؟ وہ تو یہاں سے بیس کوس کی دوری پر ہے لیکن تم یوں بات کرتے ہو جیسے پڑوس کے گاؤں سے آرہے ہو.... "

اجنبی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

" میں ڈاچی پر آیا ہوں "

مولا کو اس کے بولنے کا ڈھنگ پسند نہیں آیا۔ اس نے بے پروائی سے کہا " خیر مجھے اس سے کیا غرض، سوال تو یہ ہے کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟ "

" مجھے رنگا سنگھ بھنبوڑی والے نے بھیجا ہے "

یہ سنکر مولا چوکنا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نووارد کا بازو تھام لیا اور جلدی سے دھیمی آواز میں بولا۔

" ...... تو یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اندر چلے آؤ نا؟ "

اجنبی یک جست اندر آگیا وہ بڑا مضبوط شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بدن پر موٹا کھیس لپیٹ رکھا تھا۔ مولا نے ڈیوڑھی میں سے جھانک کر اندر کی جانب دیکھا اور اس امر کا اطمینان کر لیا کہ اس کی بہن اور ماں سب سے پیچھے والے کمرے میں لحافوں میں گھسی پڑی ہیں تو اس نے صحن والا دروازہ بند کر لیا۔ اور اجنبی سے مخاطب ہو کر بولا۔

" میں نے دروازہ بند کر دیا ہے تاکہ ہماری باتوں کی آوازیں اندر زنانے تک نہ پہنچیں۔ "

اجنبی کچھ نہیں بولا۔ مولا نے تیزی سے باہر والے دروازے میں سے جھانک کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ پھیکی چاندنی میں دور جوہڑ کا پانی پگھلے ہوئے سیسے کی ٹکلی کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ ہوا ساکن تھی۔ پیڑ اور دور دور تک پھیلی ہوئی جھاڑیاں بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر مولا نے اپنے دانتوں میں اٹکی ہوئی حقے کی نے کو ہونٹوں میں دبوچ کر بڑے اطمینان سے گڑ گڑ کی صدا بلند کی اور پھر دروازہ بند کر کے لوٹا تو نووارد ڈیوڑھی کے اندر بنی ہوئی کھرلی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"بھوک لگی ہو تو بتاؤ کھانے وانے کا کچھ بندوبست کر دوں۔"

"نہیں میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ قریب کے گاؤں سے..... بس اب کام ہو جانا چاہیئے۔"

"کیوں اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

"مجھے پھُورن لوٹنا ہوگا۔"

"کیوں؟"

"بگّے نے بھی کہا تھا۔ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں کسی نے دیکھ لیا تو سک ہوگا۔ کھاہ مکھاہ۔"

"ڈاچی کہاں ہے؟"

"ڈاچی ساتھ والے گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں چھوڑ آیا ہوں۔"

"اور بندوکھ؟ (بندوق)۔"

"بندوکھ میرے پاس ہے۔"

موّلا کو تعجب ہوا کہ اتنی بڑی بندوق اس نے کہاں چھپا رکھی ہے۔

اس پر اجنبی نے قدرے جھنجلا کر کھیس کے نیچے سے دو نالی بندوق دکھائی جس کی دونوں نالیاں الگ کر کے اس نے بُٹّ BUTT سمیت انگچھے میں لپیٹ رکھی تھیں اور پھر ان پر ایک رسّی کس کر باندھ دی تھی۔

اب موّلا سمجھا۔ سر ہلا کر بولا:-

"اچھا توڑ کر باندھ رکھی ہے۔"

"ہاں ویسے چھپ تو نہیں سکتی نا۔"

"ٹھیک۔"

"اب جلدی کرو۔"

"اور کارتوس؟"

اجنبی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ بگڑ کر کہنے لگا۔

"دیکھو میں بل کل تیار ہو کر آیا ہوں..... بس اب مجھے مُرکے پر لے چلو۔"

"اچھی بات۔" یہ کہہ کر موّلا نے حقّے کے دو تین خوب گہرے گہرے کش لئے پھر دُھسّے کو بدن پر خوب اچھی طرح لپیٹا اور مسکرا کر بولا۔

"اُستاد تمہیں میرے گھر کا پتہ کیسے چلا؟ کسی سے پوچھا تھا؟"

"میں ایسا کچّا نہیں ہوں کہ کسی سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھتا پھروں۔ اس طرح تو تم پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ بگّے نے مکان کا ٹھیک پتہ اور تمہارا حُلیہ بتا دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ تمہاری راہ دیکھتا ہوگا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں" موّلا ہنس کر بولا "بگّا اس کام کو کسی معمولی آدمی کے سپرد نہیں کر سکتا تھا ——— اچھا تو لو میں

چیلا ——— ابھی دو تین اور آدمیوں کو بھی بلانا ہے۔"

"بلا لاؤ .... پر میں ان کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔"

"بے شک۔ بے شک ضرورت بھی کیا ہے۔"

یہ کہہ کر مولا چلنے لگا تو اجنبی بولا "حقّہ لیتے جاؤ۔"

"کیوں؟"

"حقّہ گڑگڑاتے چلو گے۔ شک نہیں ہوگا دیکھنے والوں کو۔"

"یہ تو واقعی کھری بات کہی تم نے۔"

مولا نے حقّہ اٹھایا۔ نے دانتوں میں دبائی اور چلم سے بندھی ہوئی چمٹی جھلاتا اور تہبند لہراتا ڈیوڑھی سے باہر نکل گیا۔

اجنبی نے اس کے رخصت ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا اور سرکنڈوں کا بنا ہوا بالشت بھر اونچا مونڈھا گھسیٹ کر سلگتے ہوئے اپلوں سے بھری ہوئی مٹی کی انگیٹھی دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ کر بیٹھ گیا۔

مولا کیچوؤں کی طرح بل کھاتی ہوئی سنسان اور تنگ گلیوں میں سے گزرتا ہوا بالآخر ایک بوسیدہ کچے مکان کے آگے کھڑا ہو کر آوازیں دینے لگا۔ "سداگرا، اوئے سداگرا!"

کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے پھر ہانک لگائی۔

"اوئے سداگرا! سداگرا ہوئے!"

پھر وہ اطمینان سے حقّہ گڑگڑانے لگا۔ دماغ میں جو طراوت پہنچی تو دل اجنبی کو دعائیں دینے لگا جس نے کہ حقّہ اس کے ہمراہ بھجوا دیا تھا۔

مکان کا دروازہ کھلا اندر سے گھنے اور کالے بالوں والا ایک نوجوان باہر نکلا اس نے پہلے تو مولا کی جانب خوابناک آنکھوں سے دیکھا لیکن جب پہچانا تو اس کی آنکھیں پورے طور سے کھل گئیں۔

مولا نے زرد زرد دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا "واجیں دے دے کر میرا تو کلیجہ بیٹھ گیا کہاں گھسا پڑا تھا لال کے مورے۔"

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔

سداگر نے پوچھا "ہاں بے کیا؟"

جواب میں مولا چپ چاپ حقّہ گڑگڑاتا رہا۔ پھر اس نے شرارت اور پُرمعنی انداز سے ابرو اوپر اٹھا کر ایک آنکھ اس طرح ماری جیسے ڈھیلا کھینچ کر مارا ہو۔

سداگر سمجھ گیا۔

"چلو" مولا نے کہا۔

"ٹھہرو۔ میں اوڑھنے کے لئے کچھ لے آؤں اندر سے۔"

وہ بھاگا بھاگا اندر گیا اور کالے رنگ کی ایک لوئی بدن پر لپیٹتا ہوا فوراً واپس آ گیا۔

دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ گاؤں پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ کہیں کہیں کوئی کھجلی ماری کُتیا دانت دکھاتی ہوئی دکان کے ایک تختے سے نکل کر دوسرے تختے تلے دبک جاتی۔ یا گارے کے بنے ہوئے مکانوں کی دیواروں تلے چھچھوندریں جان چھپاتی پھرتی تھیں۔

دبے دبے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں بڑھتے چلے گئے۔ انھوں نے میلا سنگھ کو اس کے مکان سے اور لبھو کو مویشیوں کے طویلے سے بُلا کر اپنے ہمراہ لیا اور واپس مولا کے مکان پر پہنچ گئے۔

اندر سے اجنبی نے دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ اب پگڑی کے شملے میں چھپا ہوا تھا۔ سداگر، لبھو اور میلا سنگھ ابھی نوجوان تھے ان کاموں میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ اجنبی کا نقاب کے پیچھے چھپا ہوا چہرہ اور جن کے مانند گھنی بھنوؤں تلے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ان کے نوخیز جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں۔

اجنبی نے جلدی سے ان کی صورتوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے کھیس میں سے ہاتھ نکال کر اشارہ کیا کہ اب دیر کس بات کی ہے۔

اس کا ہاتھ بھی کالا تھا اس پر موٹے موٹے بال اُگے ہوئے تھے۔

مولا نے جواب دیا:۔

"دیر کسی بھی بات کی نہیں۔"

"تو اب چلیں؟"

"ضرور۔"

مولا نے آگے قدم بڑھایا اور باقی سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ اجنبی کے قدم بڑی پھرتی سے اُٹھ رہے تھے اور اس کی پتلیاں دم بھر کو بھی ایک جگہ نہیں رکتی تھیں۔ تسبیح کے دانوں کی طرح کھٹا کھٹ گھومتی تھیں۔

دور سے کبھی کبھار پہرے دار کے دفعتہً چلا اُٹھنے کی آواز یوں سنائی دے جاتی جیسے وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ کر ہڑبڑا اُٹھا ہو۔ اس آواز اور اپنے درمیان کافی فاصلہ رکھتے ہوئے وہ بڑی تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

گاؤں سے نکل کر تقریباً پون میل کی دوری پر واقع پیراں والے رہٹ پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ مولا کے اشارے پر سداگر نے رہٹ کے قریب والے باڑے میں گھس کر ایک مریل بیل کو باہر نکالا اور پھر وہ اسے ہانکتے ہوئے ذرا پرے لے گئے اور گاؤں کے ایک بڑے سود خور کے کھیت میں اسے چھوڑ دیا۔ اور وہ خود ببول کے پیڑ کی چھدری چھاؤں تلے جا کھڑے ہوئے۔

پورا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔

اجنبی سکھ نے پھرتی سے اپنی بغل میں سے بندوق کا انجر پنجر نکالا۔ نالیوں کو بٹ سے کڑک کیا اور نیچے کی جانب چوبی کھپچی جمائی اور ہتھیلی کی ایک ہی ضرب سے اسے اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

پھر اس نے دونوں نالیوں میں ٹھوس گولیوں BULLETS والے کارتوس بھرے۔ اور ایک نظر مریل بیل کی جانب دیکھا جو سرد ہوا میں کان پھڑپھڑاتا اور پتلی اور کمزور دُم کو نقاہت سے ہلاتا گھاس پر مُنہ مار رہا تھا۔ پھر اس نے شست باندھ کر لبلبی دبائی۔ گولی کھاتے ہی بیل بغیر کسی جد وجہد کے زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ یہ گولی تو شیر کو ٹھنڈا کر دینے کے لئے کافی تھی لیکن اجنبی نے احتیاط کے طور پہ دوسری گولی بھی اس کی گردن پر چپکا دی۔

بیل کا کام تمام ہوتے ہی اجنبی نے اپنی اور بھی تیزی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مولا اور اس کے ساتھیوں کی جانب دیکھا پھر بھاری آواز میں بولا۔

" اچھا اب مجھے چلنا چاہیئے۔ صبح سے پہلے واپس پہنچنا ضروری ہے "

مولا نے ہاتھ بڑھا کر کہا " اچھی بات "

اجنبی نے چاروں سے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک بار پھر بھاری آواز میں کہا :۔

" ساب سلامت "

" ساب سلامت "

اجنبی نے پھر اپنی بندوق کو توڑ تار کر اس پر کپڑا لپیٹ دیا۔ اور پھرتی سے قدم اُٹھاتا ہوا اندھے پھیکی چاندنی میں غائب ہوگیا۔

وہ چاروں کچھ دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر وہ بیل کی جانب بڑھے اور دیکھا کہ وہ قطعاً مر چکا ہے۔

اب وہ جلد جلد گاؤں کی جانب بڑھے اور گاؤں کے قریب پہنچ کر انھوں نے دفعتہً "پکڑو پکڑو" کا شور بلند کیا۔ لوگوں کو ڈاکوؤں کا ڈر لگا رہتا تھا چنانچہ بہت بڑی تعداد میں لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تب انھیں پتہ چلا کہ بچارے مولا کا بیل گولی سے مار دیا گیا ہے۔

مولا دیر تک گولی مارنے والے کی ماں اور بہنوں سے اپنا رشتہ گانٹھتا رہا اور جب اس کا گلا بیٹھ گیا تو سورج نکلنے سے پہلے پہلے وہ چھ کوس پرے تھانے میں اس امر کی رپٹ درج کروا کر گاؤں لوٹ آیا۔

(۲)

" پیر دالہ ٹہ " گاؤں چھوٹا تھا لیکن یہاں کا سب سے امیر گھرانہ " ماہنہ " دُور دُور تک مشہور تھا۔ ارد گرد دیہات میں ان کی اسامیاں موجود تھیں۔ اب ماہنوں کا دبدبہ کچھ کم ہوگیا تھا۔ کیونکہ پیر کے بھٹے اور ارد گرد کے دیگر گاؤں کے بدمعاشوں نے مل جل کر خواہ مخواہ مقدمہ بازی میں پھنسا کر انھیں کھوکھلا بنا دیا تھا۔ اور ادھر ان کے لئے مولا نے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔

سردیوں کا سورج کچھ زیادہ بلند نہیں ہونے پایا تھا کہ علاقے کے تھانے سے ایک لمبا تڑنگا مسلمان تھانیدار

گھوڑے پر بیٹھا اور دو سائیکل سوار سپاہی ساتھ لے کر پہر کے ٹھٹے میں آن دھمکا۔

گاؤں کے باہر ایک بڑے اور پُرانے برگد پیپل کے پیڑ تلے پہنچ کر تھانیدار گھوڑے پر سے اُترا۔ سنہرے کلاہ پر لپٹی ہوئی اس کی خاکی رنگ کی کلف لگی پگڑی کے لہراتے ہوئے شملے دُور ہی سے دکھائی دینے لگے۔ چناں چہ گاؤں بھر کے چماروں، بھنگیوں اور کسانوں کے بچے اور کتے گاؤں میں گھستے ہی اس کے پیچھے ہو لئے اور اب وہ ایک بڑا سا حلقہ بنائے کھڑے تھے۔

پیپل کے نیچے بلا کی گرد تھی جس میں سوکھے پتّے اور بھوسے کے تنکے ملے ہوئے تھے۔

گھوڑے کی لگام سکھ سپاہی کے ہاتھ میں تھما کر تھانیدار نے دونوں طرف سے وردی کو کھینچ کر اپنے سڈول بدن پر جمایا۔ اس کا اُونچا قد کلاہ دار پگڑی کے باعث اور بھی اُونچا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دمکتی ہوئی پیشانی خوب کشادہ تھی۔ اور اس کی ناک جڑ ہی سے ایک دم اُوپر کو اُٹھ گئی تھی۔ اپنی شاندار اُونچی ناک کی وجہ سے وہ بڑا باوقار اور بارُعب انسان نظر آتا تھا۔ ابھی نوجوانی کی ناتجربے کاری اس کے چہرے سے جھلکتی تھی لیکن وہ ذہین ضرور تھا۔ اس کی سبز رنگ کی پتلیوں کی وجہ سے وہ بقول دیہاتیوں کے "انگریج" جان پڑتا تھا۔

پہلے اس نے کھلی ہوا میں ٹہل ٹہل کر دو تین گہرے سانس لئے اور پھر جیب ٹٹول کر ایک خاکی رنگ کا کاغذ باہر نکالا اور اس پر بغور نظر دوڑانے لگا۔

اسی اثنا میں گاؤں کے لوگ بھی جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اُدھر سپاہی نے گھوڑے کی لگام پیپل کی جڑ سے باندھ دی۔

کہیں سے نمبردار کو خبر ملی تو وہ بچارا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ جب وہاں پہنچا تو حال یہ کہ دم پھولا ہوا، اور پگڑی ٹانگوں میں اُلجھی ہوئی۔

تھانیدار نے ٹانگیں اکڑا اکڑا کر نظر اُوپر اُٹھائی اور حلقے میں کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بچارا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

تھانیدار نے تحکمانہ انداز سے کہا "میں تمھیں کو بُلا رہا ہوں"

"جی مجکو؟" اس آدمی نے اپنے سینے پر انگلی جماتے ہوئے پوچھا اور اثبات میں جواب پانے پر اس نے مضحکہ خیز انداز سے آنکھوں کی پتلیاں دائیں بائیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر پگڑی سنبھالتا ہوا تھانیدار کی جانب بڑھا۔

"تم مولا کا گھر جانتے ہو؟"

"آ ہو جی .... او تو ..... "

"جاؤ اسے بلا کر لاؤ"

وہ آدمی سرپٹ بھاگا۔ لیکن مولا حقہ ہاتھ میں لئے پہلے ہی سے تہمد اڑاتا چلا آرہا تھا۔

تھانیدار سے آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے دُور ہی سے حُقّہ زمین پر رکھ دیا اور بڑے خلوص سے جھک کر فرشی سا کیا۔ اور پھر آگے بڑھا۔

"موتیاں والیو! میں نے دُور ہی سے آپ کو دیکھ لیا تھا۔ بس حقّہ تازہ کرنے میں دیر ہو گئی۔"

یہ کہہ کر مولا نے بڑے خوشامدانہ انداز سے حقّے کی نَے اس کے نتھنوں سے بھڑا دی۔

نمبردار آتے ہی چارپائی کا انتظام کرنے کے لئے اُلٹے پاؤں لوٹ گیا۔ بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہ پا کر تھانیدا ایک مگدر پر بیٹھنے لگا تو مولا نے بڑھ کر اپنا کھیس بچھا دیا اس پر۔ اور پھر للکار کر کہا "اوئے مُنڈیو! بھج کے میرے گھر چارپائی اور بستر لے آؤ۔"

اس کی بات سُنتے ہی دو تین آدمی بھاگ نکلے۔

تھانیدار نے پہلے تو چپ چاپ حُقّے کے خوب گہرے گہرے کش لئے اور پھر مولا کی جانب مخاطب ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا "سُنا اوئے بھوتنی پلستر! بات کیا ہے آج چوروں کے گھر مور پڑ گئے؟"

"توبہ! میری توبہ!" کہتے کہتے مولا وہیں اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ "جیجر جیتو! جبھی تو کہتے ہیں کہ بد اچھا بدنام بُ

"ہاں خوب یاد آیا" تھانیدار نے سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اوئے عجیب سینھا! جاجرا رام لعل ماہنے نے اوہدے لڑکے کو تو بلا کے لیا۔"

پہلے ہی سے سدھائے ہوئے سوداگر نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ دیئے اور مسکین آواز میں بولا "کھان صاب! بڑا اَنرتھ ہو گیا اے جی۔ بچارے مولا کی تاں کمر ہی ٹُٹ گئی۔ کسان کو بیل کا بڑا سہارا ہوتا ہے۔"

مولا نے ٹھنڈی سانس بھر کر مُنہ نیچے کو لٹکا دیا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ رام لعل سفید دھوتی اور اس پر سفید کُرتہ پہنے آ پہنچا۔ اس کے ساتھ اس کا نرم نازک بیس سالہ لڑکا ہیرا لعل بھی تھا جو پتلون پہنے تھا۔

تھانیدار نے باپ بیٹے کو سر سے پاؤں تک دیکھا، باپ بچارا ادھیڑ عمر کا سنجیدہ انسان تھا لیکن تھانیدار کو لڑکے کے کھڑے ہونے کے انداز سے بغاوت کی بُو آئی۔ تاہم اس نے کافی تحمّل سے پوچھا۔

"ابے لونڈے اپنا نام بتائیو۔"

اس پر پڑھے لکھے لڑکے کو کچھ گرمی آ گئی برہم ہو کر انگریزی زبان میں بولا۔

"YOU SHOULD NOT BE SO RUDE!"

تھانیدار کو انگریزی بس واجبی آتی تھی۔ اس لئے وہ تحکمانہ لہجے میں بولا "دیکھ اوئے منڈیا! ہم سے زیادہ گٹ پٹ نہیں کرنا۔۔۔۔ جو کہنا ہو سو اپنی بولی میں کہو۔ تاکہ سب لوگ تمہارا بیان سمجھ سکیں۔"

نوجوان ذرا تیز مزاج تھا بولا "آپ افسر ہیں آپ کو ذرا تمیز سے بات کرنی چاہیئے۔"

یہ غیر متوقع جواب سن کر تھانیدار نے سر اوپر اٹھایا اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ اس نے اشارے

سے سپاہی کو قریب بلایا اور ہونٹ کاٹ کر بولا "عجیب سنگھا! ایس منڈے کو تھوڑی تمیز دکھاؤ۔"

عجیب سنگھ کے دو تین جھانپڑ کھا کر نوجوان کے دانت ہل گئے۔ اِس کے نتھنوں میں سے خون بہنے لگا۔ تھانیدار نے اس کے چکنے بالوں کے گچھے کو ہاتھ میں دبوچ کر کہا "بیٹا! میں تمھارے ایسے شریف بدمعاشوں کو سیدھے راستے پر لانا خوب جانتا ہوں۔" پھر حاضرین کی جانب متوجہ ہوئے "دیکھو جی ایک غریب کسان کا بیل گولی سے اڑا دیا اور اوپر سے دھونس جماتے ہیں۔ قانون ہمارے ہاتھ میں ہے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانا ہمارا کام ہے۔"

حاضرین میں سے بیشتر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ تھانیدار غرا کر بولا "اوئے مولیا!"

"جی موتیاں والیو!"

مولا بغل ہی میں سے نکل کر ہاتھ باندھ تھانیدار کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

"بیل کہاں پہ مرا پڑا ہے۔"

"شہنشاہ جی وہ تو ماتہوں کے کھیت ہی میں پڑا ہے۔ بچارا قسمت کا مارا باڑے میں سے نکل ان کے کھیتوں میں جا نکلا۔ بس اٹھا کے گولی داغ دی انھوں نے۔ بھلا دو ڈنڈے مار کر نکال دیتے سالے کو۔ غریب کا بیل تو بچ جاتا" یہ کہتے کہتے مولا نے رونی صورت بنالی۔

ماتہا یہ الزام سن کر سٹپٹا گیا۔ لیکن بیٹے کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اس لئے چپ ہو رہا۔

"ہم مرا ہوا بیل موقعہ پہ دیکھیں گے۔"

"چلو موتیاں والیو!"

اب آگے آگے موتیاں والا۔ ساتھ ساتھ مولا، سداگر، بھجو وغیرہ۔ ان کے پیچھے ماتہے۔ اور سب کے آخر میں ناک سڑسڑاتے نیچے اور دُمیں ہلاتے ہوئے کتے۔

یہ لشکر کھیت پر کھیت پھلانگتا ہوا جب ماتہوں کے کھیت میں پہنچا تو دیکھا کہ سردی سے اکڑا ہوا بیل کھیت میں ٹانگیں پسارے پڑا ہے۔ . . . . مولا نے احتیاطاً ایک لونڈے کو وہاں بٹھا دیا تھا تاکہ گدھ اور کتے مردار کے قریب نہ آئیں۔

خاں صاحب (تھانیدار) نے بیل کی اگلی ٹانگوں کے پیچھے اور گردن میں لگی ہوئی گولیوں کے نشانات کو بغور دیکھا۔ گاؤں کے تین چار آدمیوں کو بھی دیکھنے کا حکم دیا۔ پھر گاؤں واپس آکر پیپل کی چھاؤں تلے بچھی ہوئی چارپائی پہ بیٹھ گئے۔ ...... اس وقت ان کے لئے مکھن اور لسّی کا کٹورا طیار تھا۔

مکھن کا گولہ نگل کر اور اوپر سے لسّی چڑھا کر خاں صاحب نے باچھیں جھاڑن نما رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا "ہاں بے مولو! اب بتا سارا قصہ۔ تیرا بیان لکھا جائے گا اب۔"

مولا نے کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے بتانا شروع کیا کہ کیسے پچھلی رات کو وہ اپنے باڑے تک یہ دیکھنے کے لئے گیا کہ وہ لونڈا جو وہاں مویشیوں کی رکھوالی کے لئے مقرر تھا وہاں موجود بھی تھا یا نہیں۔ کیونکہ اس کمبخت کا ایک چمارن سے یارانہ تھا۔ موقعہ پاکر راتوں کو ادھر بھی کھسک جایا کرتا تھا۔"

"تم اکیلے تھے یا اور بھی کوئی ساتھ تھا؟"

"نہیں جی کیلا کتھے، میرے نال سّداگر، میلو اور رتّھو بھی تو تھے۔"

"یہ کب سے تمھارے ساتھ تھے؟"

"بادشاہو یہ تو ہر روز میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ کھانے دانے سے فرصت پا کر کبھی یہ میرے پاس آجاتے ہیں اور کبھی میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ گپ اڑانے کے لئے۔"

"اچھا اچھا پھر کیا ہوا؟"

"پھر شہنشاہو! ابھی ہم باڑے سے دور ہی تھے کہ دھائیں دھائیں دو بار بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ ہم تو جی ڈر کے مارے کھیتوں میں چھپ گئے......"

"اچھا تو تم ڈر گئے؟" خاں صاحب نے پوچھا کیونکہ شکل ہی سے مولا ان آدمیوں میں سے دکھائی دیتا جنھیں ڈر کبھی چھوتا بھی نہیں۔

"آہو جی ہم ڈر گئے۔"

"اچھا پھر؟"

"اتنے میں یہ نکا ماہنسا گاؤں کی طرف بھاگتا دکھائی دیا۔ پہلے ہم سمجھے کسی ڈاکو نے اس پہ گولی چلائی ہے پر جی اس کے اپنے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر ہم گھبرا گئے......"

"ہوں......" خاں صاحب نے اثبات میں یوں سر ہلایا جیسے وہ اس معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہوں "پھر؟"

"پھر جی ہم باڑے کی طرف بڑھے راستے میں انھیں کے کھیت پڑتے ہیں۔ وہاں ہمیں سفید سفید چیز دکھائی دی۔ ہم ڈرتے ڈرتے قریب پہنچے تو دیکھا کہ میرا بیل مرا پڑا ہے۔ میں نے سر پیٹ لیا۔ اور نزدیک سے دیکھا تو گولیوں کے نشان دکھائی دیئے

تھانیدار صاحب نے مولو سے متعدد سوالات کئے پھر میلو، سداگر اور رتّھو کی جرح کی گئی۔

"اچھا تو سداگر! تم نے اچھی طرح پہچان لیا تھا کہ وہ رام لعل کا بیٹا ہیرا لال ہی تھا؟"

"ہاؤ جی۔"

اس طرح سے سب نے الگ الگ اس امر کی تصدیق کی۔ اب خاں صاحب پھر ہیرا لعل کی طرف متوجہ ہوئے۔

"دیکھو ہیرا! سچ سچ بتا دو کہ آخر بات کیا ہے۔ ورنہ یاد رکھو میں مجرموں کا سخت دشمن ہوں۔ تھانے پہنچکر وہ کام ہیں ہرگز نہ ہوگا تمھارا......"

اب تو ہیرا لعل تاؤ میں آنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ابھی پہلی مار ہی سے اس کی ناک جل رہی تھی، اور ہونٹوں پر سوجن آگئی تھی۔ اس نے مدھم آواز میں کہا "یہ الزام بے بنیاد ہے میں تو کھانا کھا کر گھر سے باہر تک نہیں نکلا۔"

خاں صاحب نے اس کے باپ کی طرف دیکھ کر کہا "لالہ! تمھارا لونڈا ذرا سخت دانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا کام تو بھولے بھٹکوں کو راستے پر لانا ہے۔ سمجھا لو اپنے بیٹے کو۔ ورنہ ایک بار میں نے ہاتھ اٹھا دیا تو یاد رکھو پہچان نہیں پاؤ گے کہ

اس کا سر کدھر کو تھا اور منہ کدھر کو۔"

رام لال مقدمے بازی سے تنگ آچکا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا "خان صاحب! ابھی لڑکا ہی تو ہے شاید۔۔۔۔۔ میں بیل کی قیمت دینے کو طیار ہوں۔"

"بیل کی قیمت؟" مولا نے چلا کر کہا "گریب کے بیل کی جان ایسی سستی نہیں ہوتی کہ جب جی چاہا مار دیا اور پھر پیسے کی دھونس جمانے لگے۔"

خان صاحب بولے "چپ رہو جی تم۔ بکواس بند کرو۔"

"نہیں بادشاہو! میری کیا مجال ہے۔" مولا ہاتھ جوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

"اچھا لالہ اپنی بندوق تو منگواؤ ذرا۔"

بندوق حاضر کی گئی۔

ہیرا بولا "دیکھئے بندوق کی نالی میں گرد لگا کر میں نے الگ رکھ چھوڑی تھی۔"

خان صاحب نے ہیرا کی طرف گھور کر دیکھا اور زور زور سے سر ہلا کر بولے "سب سمجھتا ہوں یہ گرد تو آج ہی کی لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

تھوڑی دیر تک بندوق کا معائنہ کیا گیا۔ پھر انھوں نے سپاہی سے کہا۔

"عجیب سنگھ! کاغذ لاؤ تو بندوق کی رسید لکھ دوں۔"

اس کے بعد سب کے بیانات مکمل کئے گئے۔ اور پھر تھانیدار نے کہا "بندوق تھانے میں داخل ہو گی۔ بیٹا! ہیرا چلو تھانے۔ پھر دیکھو میں ہیرا کا بٹیرا کیسے بناتا ہوں۔"

رام لعل بیٹے کے لئے سخت پریشان تھا۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"خان صاحب دیا کیجئے۔ میں بیل کی قیمت اور جرمانہ دینے کو طیار ہوں۔"

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں ۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری جیب میں روپے اچھل رہے ہیں لالہ!"

رام لعل نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے پوچھا "کیا ضمانت نہیں ہو سکتی؟"

"یہ سب تھانے پہنچ کر طے ہو گا۔"

یہ کہہ کر خان صاحب گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ جب وہ ہیرا کو لے کر چلنے لگے تو رام لعل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکے نے جوش میں آ کر گستاخی کی ہے۔ اس لئے اس کی خیر نہیں۔ کچھ سوچ کر آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا:۔

"خان صاحب ایک بات عرض کر دوں۔"

خان صاحب نے گھوڑا روک لیا۔

"بات یہ ہے کہ مولا کے بیل کو گولی میں نے ماری تھی۔"

خان صاحب نے ہنس کر گھوڑے کو ایڑ دی اور بولے "لالہ! لڑکے کو بچانے کی خاطر جھوٹ بول رہے ہو۔ ذرا گواہوں

سے تو پوچھو۔ ہم تو قانون کے بندے ہیں۔"

جب تھانیدار صاحب ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور بندوقی بھی اپنے ساتھ لے گئے تو مولا نے اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچ کر پہلے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر بھاری آواز میں بولا "یا مولا!" اس کے بعد سداگر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "دیکھ بے سداگر! تو گھوڑی پر سوار ہو کر سیدھا بھنبوڑی چلا جا اور رنگا سنگھ سے کہہ دے کہ دھائیں دھائیں بولنے والی چڑیا پنجرے میں بند ہو گئی ہے۔

(۳)

ابھی سورج ڈھل ہی رہا تھا کہ دفعتہً اس قدر زور کی آندھی اٹھی کہ زمین سے آسمان تک دھواں دھار ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ زمین کا سینہ پھٹ گیا ہے اور گرد کے بادل در بادل فلک بوس پہاڑوں کے مانند جھوم جھوم کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور اردگرد کا یہ سمندر خس و خاشاک کو اڑاتا، امڈتا چلا آ رہا ہے —— سورج دفعتہً روپوش ہو گیا۔ ہر چہار جانب دھندلاہٹ اور پھر تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور گدلے آسمان میں آنے والی آندھی کی خبر دینے والے چیلوں کے جھنڈ بھی اس بے پناہ دھندلاہٹ میں خلط ملط ہو گئے۔

لکڑی کے بنے ہوئے بھاری بھاری چرکھڑوں والے رہٹ کے اوپر چھائے ہوئے پھلاہ کے پیڑوں کے جھنڈ میں سے کپورا سنگھ ٹھٹے والا ایک آتشیں تھوتھنی والی سرتا پا سیاہ مضبوط گھوڑی پر سوار باہر نکلا۔ اس نے پہلے پیر کے ٹھٹے کی جانب دیکھا اور پھر دور دور تک بچھے ہوئے کھیتوں پر نگاہ دوڑائی۔ لیکن اس کی نظر دور تک نہیں جا سکی۔ کیونکہ آندھی دم بدم بڑھتی آ رہی تھی۔ کھیتوں کی فصلیں گرد آلود ہوا کی آمد آمد سے ایک بڑے تالاب کے میلے گدلے پانی کی طرح لہریں لیتی دکھائی دے رہی تھیں۔

کپورا ٹھٹے والا، جسے عام طور سے کالا تیتر کہتے تھے۔ اپنے گاؤں سے نکال دیا گیا تھا۔ کئی برس سے اس نے گاؤں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن ہفتہ بھر پہلے وہ چوری چھپے اپنی بہن کو ملنے کے لئے گیا صرف ایک رات رہ کر اور یہ معلوم کر کے کہ سسرال سے لائے ہوئے زیورات وہ کہاں پر رکھتی ہے، وہ چپ چاپ لوٹ آیا تھا۔ آج ان زیورات اور اور اس کے ساتھ اڑوس پڑوس والوں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ تھا۔

وہ بہت جسیم انسان تھا، کالا بھجنگ۔ حرامی پن نس نس میں رچا ہوا تھا۔ اس کا دل بے حس اور جذبات کند ہو چکے تھے۔

ابھی وہ دور دور تک نگاہ دوڑا ہی رہا تھا کہ کھیتوں میں چند سائے دکھائی دیئے جو پرچھائیوں کی طرح اس کی جانب آئے۔

آندھی کا زور بڑھنے لگا۔

گاؤں کے چاروں طرف پھیلی ہوئی گرد پر پہلے تو سبک دھول کی چادریں لہلہائیں پھر بھاری گرد تہہ در تہہ اوپر کو اٹھنے لگی اور جوہڑ کے پانی کی سرسراتے ہوئے سانپوں کی طرح ننھی ننھی لہریں بل کھا کھا کر کروٹیں لینے لگیں۔ طوطے، کوّے و

دیگر گھریلو چڑیا پیپل اور دھریک کے پیڑوں میں پناہ گزین ہو گئیں۔

کھیت کھیت چلتے ہوئے وہ آدمی جب قریب پہنچے تو کپورے نے انھیں پہچان لیا۔ آگے آگے مولا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے سداگر، لبھو اور میلا سنگھ۔

انھیں دیکھتے ہی کپورا کرخت لہجے میں بولا۔

"تم لوگ کہاں تھے؟"

"یہیں تو تھے" سداگر نے ہنس کر جواب دیا۔

کپورے کو سداگر کی ہنسی پسند نہیں آئی۔ اس نے اس کی جانب کڑی نظروں سے دیکھا۔ وہ خود بہت کم ہنستا تھا۔ ظاہر تو یہ ہوتا تھا کہ وہ سداگر کے منہ پر الٹے ہاتھ کا چھانپڑ دے گا۔ لیکن پھر خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اور مولا سے مخاطب ہوا۔

"مولا!"

"ہوں"

"سب ٹھیک؟"

"ہم تو سب ٹھیک ہی ہیں...... طیاری تو تمھاری ہونی چاہیئے"

اسے مولا کی حاضر جوابی بھی پسند نہیں آئی۔ لیکن اس وقت غصے کا موقع نہیں تھا اور کچھ نہیں تو ڈاکے کا معاملہ چوپٹ ہو جانے کا ڈر تھا۔ تاہم اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ہماری طیاری سے تمھارا مطلب؟ تم تو اپنی کہو"

"ہمارا کام تو کبھی کا ہو چکا۔ گاؤں میں ایک بندوق تھی سو اب تھانے میں ہے"

"کسی طرف سے کوئی بات نکلی تو نہیں"

"نہیں"

"کوئی افواہ۔ شک و شبہ"

"کچھ نہیں"

کپورے کی گھوڑی شاید آندھی میں کسی قسم کی بو پا کر بے چین ہو ہو کر بدکتی اور بے چینی سے زمین پر سُم جھاڑتی تھی۔ لیکن وہ اس پر خوب جم کر بیٹھا تھا۔

تاریکی دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ کپورے کی لوہے کے تاروں کی طرح سخت ڈاڑھی کے بال لہرانے لگے۔ کھیتوں سے بھاگ کر لوگ باگ اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے تھے۔ چور خوش تھے آج پروردگار بھی ان کی مدد کرنے پر تلا ہوا تھا۔

انھیں کئی ساتھیوں کا انتظار تھا جو دور دور یعنی پٹیالے تک سے آنے والے تھے۔ کپورے نے سوچا کہ اگر آندھی کی یہی کیفیت رہی تو انھیں اپنی کارروائی جلد شروع کرنی ہوگی۔

کپورا بولا "اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"ابھی باقی لوگ تو نہیں آئے ہوں گے۔"

"آ گئے ہوں گے۔ چل کر دیکھتا ہوں۔ تم لوگوں کو تلاش کرنے میں میرا وقت خراب ہوا۔"

"ہم تمہیں دیکھتے رہے۔ تم کہیں دکھائی نہیں دیئے۔"

"رہٹ پر ملنے کا وعدہ تھا۔ میں سیدھا اسی جگہ پہنچ گیا تھا۔"

"پہلے ہم بھی رہٹ پر گئے تھے۔ پھر ہم کھیتوں میں چلے گئے۔"

"کیوں؟"

"ہم نے سوچا کہ کہیں رہٹ پر کوئی ہمیں ساتھ دیکھ نہ لے۔"

"یہ اچھی حرکت کی تم نے۔ اس قسم کی حرکتیں کرو گے تو خود پھنسو گے اور ہمیں بھی پھنساؤ گے۔ اگر مجھے کوئی اس جگہ دیکھ لیتا تو؟"

مولا بولا "اچھا جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ہم اپنی جگہ سے تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن آندھی کی وجہ سے تم دکھائی نہیں دیئے …… بھئی! آگے کو خیال رکھیں گے۔ ایسی گلتی نہیں ہوگی۔"

اس پر کپورا خوش ہو گیا۔ بولا۔

"دیکھو ہم آ کر پہلے اسی جگہ رکیں گے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ہمیں خبر کر دینا۔"

"اچھی بات۔"

"مولا! تمہارا گھر تو بالکل سامنے پڑتا ہے۔"

"تو پھر ذرا نظر رکھنا۔ تاکہ جب ہم یہاں پہنچیں تو تم میں سے ایک شخص ہمیں یہاں آن ملے سمجھے۔"

"لیکن آندھی بڑھتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کب تک اس کا جور رہے۔ تھوڑی دیر میں ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہیں دے گا۔ تم لوگ اتنی دور سے کیسے دکھائی دے سکتے ہو۔"

کپورے نے قدرے تامل کیا۔ پھر بولا "یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اب کریں کیا؟"

"تم یہ بتاؤ کہ سب کو لے کر کب تک لوٹو گے؟"

کپورے نے قدرے غور کرنے کے بعد جواب دیا "بھئی بٹیلے اور جنبینک سے جوان آ رہے ہیں۔ اگر سب پہنچ گئے تو ہم ایک گھنٹہ تک لوٹ آئیں گے۔"

"اچھی بات۔"

"اور کیا۔ اب رات بھیگنے کا انتجار تو کریں گے نہیں ہم۔ آندھی سے تو اس قدر اندھیرا چھا جائے گا کہ بس طبیعت کھش ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"لو بھئی اب میں چلا۔"
یہ کہہ کر کپورے نے گھوڑی کو ایڑ دی اور بگولے کی سی تیزی کے ساتھ دم بدم دھندلاتی ہوئی جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔

(۴)

ایک گھنٹہ گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ بیر کے جھنڈ پر ایسی گہری تاریکی چھا گئی کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ کپورا اور اس کے ساتھی گھوڑوں اور سانڈھنیوں پر سوار اندھا دھند چلے آ رہے تھے۔ تیز و تند ہوا گویا ان کے کپڑے نوچ کر ان کے بدن سے الگ پھینک دینا چاہتی تھی۔ ان کی داڑھیاں اور مونچھیں گرد سے اٹ گئی تھیں، آنکھوں کی پلکیں ایک دوسری میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ اگر کپورا ان کی رہنمائی نہ کرتا تو وہ کبھی راستہ تلاش نہ کر پاتے۔

ان میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی ملے جلے لوگ شامل تھے۔ ان کے پاس دو ٹوپی دار رائفلیں تھیں، جن کی نالیوں کے دہانے انھوں نے کپڑے کی ڈاٹوں سے بند کر رکھے تھے تاکہ گرد اندر نہ جانے پائے۔ لاری کے اسٹیرنگ کی نالی والی ایک بندوق بھی تھی۔ ان کے علاوہ وہ کرپانوں، چھویوں، لاٹھیوں اور صفا جنگوں سے مسلح تھے۔

اس وقت دور سے بیر کا جھنڈ مرتے ہوئے بھینسے کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔

گاؤں سے ہٹ کر سنت نارنگھ جی کی ٹوٹی ہوئی سمادھ کی اونچی دیوار ہی الگ تھلگ کھڑے ہوئے دیو کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ بوسیدہ دیوار کے قریب سڑتے ہوئے پانی کی ایک کھائی تھی جس کی سطح پر سبز رنگ کی کائی جمی ہوئی تھی اور دیوار کی دراڑوں سے جنگلی بیلیں لٹک آئی تھیں اور ان کی پتیاں پانی کی سطح کو چوما کرتی تھیں۔

مولا نے سوداگر کو حسب وعدہ موقعہ پر بھیج دیا تھا۔ سوداگر ریت کے ایک ٹیلے کی اوٹ میں سر اور کانوں کو ڈھاٹے میں لپیٹے بیٹھا تھا۔ دیکھنے کے لئے اس نے آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا سوراخ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بھلا ایسی تاریکی میں کیا دکھائی دے سکتا تھا۔ نظر نے تو کچھ کام نہیں کیا البتہ کانوں میں گھوڑوں کے سموں کی ٹپاٹپ اور سانڈھنیوں کے بلبلانے کی آوازیں آئیں تو اس نے چوکنا ہو کر گردن اوپر اٹھائی لیکن ڈاکو چشم زدن میں اس کے سر پر تھے۔ اس تاریکی میں چھویوں کی دھیمی دھیمی چمک اور بھی زیادہ خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔

آندھی کے شور میں آواز گونجی۔

"کون؟"

"سوداگر،" سوداگر نے جلدی سے جواب دیا مبادا جواب دینے میں تاخیر ہو اور اس کا سر چھوی کے ایک ہی وار سے کٹ کر الگ جا گرے۔

"سوداگر کون؟"

اب سوداگر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے چلّا کر بولا "اوئے میں...... میں سوداگر جھنڈے والا۔ کپورا کتھے اے؟"

عین وقت پر کپورے کی گھوڑی مچل کر آگے بڑھی “سداگر”۔

“ہاؤ کپورا یا”

“ادئے اپنا ہی منڈا اے” کپورے نے ساتھیوں سے کہا۔ پھر سداگر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

“مولا بھی ہے”

“نہیں —— وہ گھر پر ہے”

“باقی سب ٹھیک ہے؟”

“سب ٹھیک ٹھاک ہے”

اس اثنا میں گرد آلود ہوا فراٹے بھرتی رہی۔ گھوڑے اور سانڈھنیاں بےچینی سے رقصاں تھیں۔

نو وارد ڈاکوؤں نے چندسے آپس میں تبادلۂ خیالات کیا۔ اور پھر کپورا سداگر سے بولا۔

“سداگر بچو! اب ہمیں رہٹ کی طرف لے چلو۔

سداگر کچھ کہے بغیر اٹھا اور رہٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

کپورے نے رہٹ کے قریب پہنچ کر دریافت کیا “سداگرا! طویلہ تو کھالی ہے نا”

“ہاؤ بالکل کھالی ہے”

“ایسا نہ ہو کہ کوئی باہر کا آدمی گھسا ہو”

“ارے نہیں”

رہٹ پر پہنچ کر وہ گھوڑوں اور سانڈھنیوں سے نیچے اترے۔ جانوروں کو طویلے میں بند کر کے سداگر کو رکھوالی کے لئے مقرر کیا اور خود سارے ساز و سامان سمیت گاؤں کی طرف بڑھے۔

مولا کے مکان کا دروازہ نیم وا تھا اس نے دروازے میں اینٹیں پھنسا کر تختوں کو ایک جگہ جما دیا تھا۔ اور وہ خود لبھو کے ساتھ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میلا سنگھ الگ بیٹھا داڑھی کرید رہا تھا۔

انھوں نے دروازے میں سے ڈاکوؤں کے گروہ کو پہچان لیا جب وہ قریب آ گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان میں سب سے بڑے مضبوط اور ترچھے تلنگے آدمی شامل تھے۔

مولا تہبند جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بولا “ساب سلامت!”

“ساب سلامت اے جی” دبی دبی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔

مولا بڑھ کر دہلیز تک گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے دروازے کے آگے بھانت بھانت کی صورتیں کھڑی ہیں۔ انھوں نے پگڑیوں کے شملے گھما کر چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔ سوا آنکھوں کے ان کے چہروں کا اور کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بدن سے وہ ننگے تھے۔ ان کے جسم سرسوں کے تیل کی وجہ سے نہ صرف چمک رہے تھے بلکہ تیل کی ہلکی ہلکی بو بھی پھیل رہی تھی۔

مولا نے گری ہوئی لمبی مونچھوں پر چار انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"آج تاں اللہ دا بڑا پھل ہے جی۔"

"ہاؤ۔"

مولا نے کپورے کی ننگی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "آ بھا! پانی کانجی پی لو سارے۔"

کپورے نے جٹا جھاڑ ناریل کے مانند اپنے سر کو انکار کے طور پر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نئیں بھئو! بگت گھٹ اے۔ پانی کانجی کی بات چھڈ۔"

مولا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"جارو! سواری بنا آگئے او۔"

"نئیں گھوڑے ڈاچیاں ٹیلے میں چھوڑ آئے ہیں۔"

"پر بھا! گھوڑے کچھ ٹھیک رکھو۔ بھاگتے وقت جرورت پڑے گی ...... اور پھر کپوریا! انہیں کسی نے پچھان لیا تو آپھت آجائے گی۔ تو اپنی گھوڑی بہت ٹھیک رکھنا ......"

کپورے کو مولا کی بات پسند آئی اس نے جھک کر ایک ساتھی کے کان میں کچھ کہا۔ اور وہ "ہاؤ" کہہ کر ٹیلے کی جانب روانہ ہو گیا۔

کپورے نے مولا سے کہا۔

"مولیا! اب دیر مت کرو۔ بس چلو ایسا موقعہ پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"بوت اچھا۔"

مولا نے پھونک مار کر دیا بجھایا تو اُس کی لمبی لمبی مونچھیں پھڑکیں۔

اب وہ ایک لمبی قطار کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ لگے لگے بڑھنے لگے۔ گوبر کے ڈھیروں، جوہڑ اور اروڑیوں کے قریب سے ہٹتے ہوئے وہ گلی میں گھس گئے۔

آندھی کی وجہ سے بے پناہ شور پیدا ہو رہا تھا۔ ایسے موقعہ پر کتے بھی تنوروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ایک آدھ نے دبی سی بھوں کی آواز نکالی بھی تو وہ آندھی کے شور میں دب کر رہ گئی۔

ان کی رائفلیں بھری ہوئی تھیں۔ ان سب کے ہتھیار بالکل طیار تھے۔ ہر اہم موڑ پر کپورا ایک آدمی کھڑا کر دیتا۔

مولا کی ابھی تک بگا سنگھ سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بگا کم گو انسان تھا۔ مولا اس حقیقت سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ بگے کے دوش بدوش چلا جا رہا تھا۔ بگا تاڑ کی طرح لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئی تھیں لیکن ان میں وحشی جانور کی آنکھوں کی سی چمک اور تجسس تھا۔ وہی ان سب کا سردار تھا۔

ڈاکو طویل کنکھجورے کی طرح دیواروں سے لگے لگے بڑھ رہے تھے۔

بگے نے مولا سے دریافت کیا۔

"مکان ہے کہاں؟"

"گاؤں کے بیچوں بیچ۔"

یہ سُن کر بگّے کے ابرو پر بل پڑ گیا۔ بگّو نے دبی زبان میں کہا۔

"اگر لوگ باگ جاگ پڑے تو اس تاریکی اور آندھی میں گاؤں سے باہر نکلنے کے لئے بہت احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت ہے۔"

مولا نے قدرے بے پروائی سے کہا۔

"اوئے بھا! تم لوگوں کے سامنے کون ٹکا رہ سکے گا۔ چاہے سو آدمیوں سے بھی مقابلہ کیوں نہ ہو جائے۔"

بگّے پر مولا کی اس بڑ کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ گاؤں والوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن وہ ایک گرگِ جہاندیدہ تھا۔ اس وقت سوال مقابلہ کر سکنے یا نہ کر سکنے کا نہیں تھا بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ گروہ کا ہر آدمی بچ کر نکلنا چاہیئے ورنہ ایک آدھ بھی پولیس کے ہتّے چڑھ گیا تو سارے گروہ کی آفت آ جائے گی۔ اس قدر آندھی، تاریکی اور شور میں یہ سارا کام بخیر و خوبی انجام پا جانا اس قدر آسان نہیں تھا جتنا کہ مولا کو محسوس ہوتا تھا۔

معاً بگّو ایک دم رُک گیا اور اس کے پیچھے سب کے سب ڈاکو رُک گئے۔

تاریکی میں سامنے سے انھیں ایک تاریک سا سایہ دکھائی دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی آدمی جلد جلد قدم اُٹھاتا بڑھا چلا آ رہا ہے۔

وہ سب چشم زدن میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

وہ آدمی بدن پر کالی چادر لپیٹے تیزی سے بڑھتا آ رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ وہ اُن کے قریب پہنچ رہا تھا۔

ڈاکو دم سادھے کھڑے تھے۔ اتفاق سے اس دیوار پر ایک چھپّا بڑھا ہوا تھا اس لئے وہ مکمل تاریکی میں کھڑے تھے۔ یوں سمجھئے قریب کھڑا ہوا آدمی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ تو محض بگّو کی متجسّس آنکھوں نے ہی اجنبی کو آتے دیکھ پایا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ اجنبی اُن کے قریب سے گزرنے لگا۔ اس غریب کو اس امر کا مطلقاً احساس نہیں تھا کہ وہ چھپے ہوئے ڈاکوؤں کی چھریوں کے سائے تلے سے گزر رہا ہے۔ اگر کہیں اس کے منہ سے چوں کی آواز نکل جاتی تو اس کا سر تن سے جدا ہوتا۔

ڈاکوؤں پر موت کی سی خاموشی طاری تھی وہ اس منحنی سے آدمی کے سائے کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ ان کی قطار سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد سب نے اطمینان کی سانس لی۔ کیونکہ وہ اس وقت خون خرابہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر کہیں اس کی بہت تیز چیخ نکل جاتی۔ اور اس چیخ کو سُن کر گاؤں میں شور مچ جاتا تو انھیں خالی ہاتھ واپس بھاگنا پڑتا۔

گاؤں کے اندر والے چوراہے پر پہنچے تو دیکھا کہ اُونچے چبوترے والے بڑے کنوئیں کی منڈیر پر پانی نکالنے کی اُونچی اُونچی چرکھڑیاں سر جھکائے غمناک انداز میں کھڑی ہیں۔ اور ان چرکھڑیوں کے قدموں میں ناہموار پیندوں والے لوہے کے ڈولچے ہوا کے زور سے ہل ہل کر ڈنگا ڈونگ کا شور بلند کر رہے ہیں۔ اور چبوترے کے قریب کھڑے لسوڑیوں کے پیڑ گویا

انھیں خشمگیں نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ سب فوراً پیڑوں کے جھنڈ تلے چلے گئے۔ تاکہ آپس میں مشورہ کر لیں۔

کپورے نے چھو چھو کر سب کی تعداد معلوم کی مطمئن ہو کر اس نے کہا۔

"اس جگہ کم سے کم تین جوان کھڑے رہنے چاہئیں۔"

"وہ کیوں" ان میں سے ایک نے جو لدھیانے کے علاقے کا ذرا ہتھ چھٹ جوان تھا، اعتراض کیا۔

کپورے کو اس کا یہ اعتراض پسند نہیں آیا۔ اس نے ابرو پر گہرے بل ڈال کر اس کی جانب دیکھا اور پھر گہری سانس لے کر اس نے اپنے غصے کو دبا لیا اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے لگا۔

"اس جگہ سے صرف ایک تنگ گلی آگے کو جاتی ہے۔ جو مکانوں کے اندر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے بھاگ نکلنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔"

"اوئے آپاں نوں پرواہ نہیں اے۔ آپاں نال کو مکابلہ کر سکتا ہے" نوجوان نے بازو ہوا میں لہرا کے بے پروائی سے بلند آواز میں کہا۔

اب تو کپورے کا جی چاہا کہ اس کی گردن مروڑ کر رکھ دے۔ اس کے یہ تیور دیکھ کر نوجوان بھی بپھرنے لگا۔ نوجوان مضبوط اور جوشیلا ہی سہی لیکن کپورے کے مقابلے میں کھڑا ہونا تو سراسر حماقت تھی اس کی۔

شاید ان کے دو دو ہاتھ ہو بھی جاتے لیکن بگے نے نوجوان کو آنکھ دکھائی تو وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر بگا کپورے سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"ادھر جو تنگ گلی تم دیکھ رہے ہو اسی کے اندر ہمیں جانا ہے۔ وہ مکانات جن پر ہماری نظر ہے قلعے کے مانند ہیں ہر آفت سے بچے ہوئے ہیں۔ اوّل تو وہاں پہنچنے کا کسی ڈاکو کو حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ ہماری یہ پہلی کوشش ہے۔ اگر ہم وہیں کہیں گھر گئے تو عجب مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہماری خیریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے سب کے سب صحیح سلامت نکل جائیں ...... صرف یہی ایک کھلی جگہ ہے خطرے کے موقعہ پر ہمارا ایک آدمی فوراً گلی کے اندر آ کر ہمیں خبر کر سکتا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اوّل تو ہمیں مقابلہ کرنا ہی نہ پڑے۔ لیکن ایسا ہو بھی تو یہاں کھلی جگہ میں ہو۔"

بگے نے اثبات میں سر ہلایا۔

کپورے نے پھر کہنا شروع کیا۔

"یہ آندھی ہماری مدد بھی کر سکتی ہے اور ہمارا نقصان بھی کر سکتی ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو اس ہلڑ بازی آندھی اور اندھیرے میں ہم اپنے ساتھیوں کی گنتی بھی نہیں کر پائیں گے۔"

بگا کو حرف بحرف اس سے اتفاق تھا۔

چنانچہ تین آدمی وہاں پر چھوڑ کر وہ لوگ آگے بڑھے۔

تنگ گلی میں پہنچ کر انھیں یوں محسوس ہُوا جیسے وہ قبر میں ہوں۔ آندھی اور ہوا کا زور کم تھا البتہ قیامت کا شور کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتا تھا۔

دفعتہً بگّا ایک دم رُک گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب کے قدم رُک گئے۔ اور وہ اپنی تھوتھنیاں اس کے قریب لے آئے تاکہ اس کی بات سُن سکیں۔

بگّے نے ساہنسی کی طرف دیکھ کر پوچھا!

"بانس نہیں لائے؟"

"ارے وہ تو بھول گئے۔"

"واہ ارے بھئیو ...... تو کیا اب ..... کے سہارے چڑھو گے چھت پر۔"

"بانس کون دُور ہے۔ مولا کے گھر ہی سے تو لانا ہے۔ مبلو جا، تو بھاگ کے جا اور مولو کی ڈیوڑھی کے اندر صحن کے کونے میں ایک لمبا بانس دھرا ہوگا۔ ...... بس اُٹھا کر پھُرن واپس آنا ......"

مبلو نے تھوتھنی گھمائی اور ناک کی سیدھ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل دیا۔

وہ سب پھر آگے بڑھے۔ کچھ دُور جا کر گلی بائیں ہاتھ کو گھوم گئی تھی۔ موڑ سے چند قدم آگے داہنے ہاتھ کو ایک اُدھورا مکان تھا جس کی بنیادیں بھرنے کے بعد نہ جانے اسے کیوں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب وہاں بڑے بڑے خشک جھاڑ، اور منجھٹی (کپاس کی چھڑیاں) کے انبار اگلے مکان کی دیوار کے ساتھ ٹکے ہوئے تھے۔ جب کسی کتیا کو بچے جننے ہوتے تو وہ چیختی کراہتی یہیں آن کر پناہ لیتی۔ ایک کونے میں بھڑبھونجے کا چولھا تھا جس میں اس وقت ریت بھری تھی۔

وہاں رُک کر انھوں نے اس مکان کے پچھواڑے کا جائزہ لیا جس کے اندر انہیں سب سے پہلے داخل ہونا تھا۔

چھت سے پرے بجلی چمک چمک کر آنکھیں دکھا رہی تھی۔ گھنگھور گھٹائیں سیاہ دامن لہراتی بے پناہ دَل کی طرح آسمان کی وسعتوں میں پھیلنے لگیں۔ آندھی کے زور میں کمی تو نہ آئی تھی البتہ ہوا میں پہلی سی گرد باقی نہ رہی تھی۔

کیورے کے اشارے پر وہ پھر رُک گئے۔ ان کی داڑھیاں پھر ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس نے کہا۔

"سب لوگ یہیں پہ رُکیں میں بگّے کو لے کر مکانوں کو اگلی طرف سے دیکھ لوں ذرا۔"

وہ دونوں چند ہی قدم پر پہنچ کر ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ساہنسی نے مکان کی جانب دیکھا اور پھر دل ہی دل میں اندازہ لگانے لگا کہ اس پر بانس کی مدد سے چڑھنا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ ان میں ایک بولا۔

"بھئیو! مکان ذرا اُونچا معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں ——— ہے تو۔"

"اگر تم بانس کے زور سے پھلانگ کر اس پر نہ چڑھ سکے تو ادھر اُدھر سے اُوپر جانے کا کوئی راستہ یا سہارا بھی دکھائی نہیں دیتا ...... پھر تو آگے والے دروازے سے جانا پڑے گا۔"

ساہنسی چپ چاپ دانتوں تلے مونچھ کا ایک سرا چباتا رہا۔ پھر یوں بولا جیسے اپنے آپ ہی کو مخاطب ہو کر کہہ رہا ہو۔

"میں آگے بڑھ کر دیوار کے نیچے سے ٹھیک انداج لگا سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور دیوار کے قریب پہنچ مٹی کے ایک انبار کے عقب میں گم ہو گیا۔ تاریکی کی وجہ سے اندازہ لگانا مشکل سا ہو رہا تھا۔

چند منٹ کے بعد بگّا اور کپورا بھی واپس آ گئے۔ بگّا بولا:۔

"پہلے تو کپورے کی بہن پر ہاتھ صاف کرنا ہو گا۔ اس کے بعد پنڈت کے چند گھر بھی اچھے ہیں ان پر بھی جلدی سے ہاتھ پھیر دیا جائے۔۔۔۔۔۔ اپنا ساہنسی یار کدھر گیا؟"

"وہ دیوار کی طرف گیا ہے آتا ہی ہو گا۔ اندھیرے میں اسے بھی کچھ سوجھ نہیں رہا۔

چند ثانیوں کے بعد ساہنسی آ گیا۔

اسے دیکھتے ہی بگّے نے کہا۔

"مکان تو اونچا ہے بھئو۔"

"ہاں بھا!" ساہنسی نے پھر ایک مکان کی جانب نظر ڈالی۔ اور پھر قدرے بے چینی سے ہاتھ ملنے لگا۔ شاید اس کے ہاتھ بانس پکڑنے کے لئے بے قرار ہو رہے تھے۔

"پھر؟" بگّے نے سوال کیا۔

ساہنسی نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟

بگّے کو اس کے جواب سے اطمینان نہیں ہوا لیکن سر دست اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی تو نہ تھا۔

اتنے میں ملکو ہاتھ میں لمبا بانس لئے یوں وارد ہوا جیسے بڑے موذی کو کندھے پر لادے لا رہا ہو۔ ساہنسی نے بڑھ کر بانس تھام لیا۔ پہلے اسے لچکا لچکا کر اس کی مضبوطی کا جائزہ لیا اور راستہ ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا اور پھر اس نے مکان کی چھت کی جانب نظر دوڑائی۔ مٹیالے آسمان پر کالے بادل گدلے دھبوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

اب ساہنسی نے اپنی کمر کے گرد لمبا رسّہ لپیٹا اور زمین پر ہاتھ مار کر دو ڈھیلے کمربند میں ٹھونس لئے اور سر گھما کر دھیمی آواز میں ساتھیوں سے کہا:۔

"اچھا اب میں کوشش کرتا ہوں۔ چھت پر صحیح و سلامت پہنچ گیا تو یہ دو ڈھیلے تمہاری طرف پھینکوں گا۔"

بعد ازاں اس نے لمبے بانس کو سنبھالا، اسے دونوں ہاتھوں میں تولا اور پھر وہ چار بار پاؤں کے پنجوں پر ناچ کر تیزی سے بھاگ نکلا۔۔۔۔۔۔ معاً اس کے قدموں کی آواز بند ہو گئی۔

سب نے اسے پر پھڑپھڑاتے ہوئے چمگادڑ کی طرح ہوا میں اٹھتے دیکھا، قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھت پر پہنچ گیا ہے۔

اگر بجلی چمک جاتی تو اسے دیکھ ہی لیتے۔ ورنہ . . . . . تڑاں سے دو ڈھیلے ان کے قریب گرے ایک تو مبلّو کی ٹانگ پر لگا۔

" اوئے مّیا دیا!" وہ ٹانگ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن چوٹ بالکل معمولی تھی ڈھیلا کچی مٹی کا تھا۔

اب بگے نے چند آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا:۔

" دیکھو! اب ہمیں یہ سارا کام جلد سے جلد ختم کرنا ہے۔ اس گاؤں میں چند اچھے لڑاکا جوان رہتے ہیں جو جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چپ چاپ اور پھرتی سے اپنا الّو سیدھا کر کے نو دو گیارہ ہو جانا ہے۔ سمجھے؟"

" ہاں بھیّا" سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

کپورے نے مبلّو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں ہدایت دی کہ وہ سب جیالوں کو لے کے مکان کے دروازے پر پہنچ جائے۔

وہ لوگ ادھر چلے گئے تو کپورا بگے کو ساتھ لئے پچھواڑے والی دیوار کے قریب پہنچا۔ ابھی ان کے قدم رکنے بھی نہ پائے تھے کہ چھت پر سے رسّہ لمبے ناگ کی طرح پھنپھناتا اور لہراتا ہوا نیچے کو جھولنے لگا۔

باری باری دونوں رسّے کی مدد سے چھت پر پہنچ گئے۔

چھت کی منڈیر بمشکل چار چھ انگل اونچی ہوگی۔ تیز و تند آندھی کے زور میں انھیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے پاؤں اکھڑ جائیں گے اور وہ چشم زدن میں اڑ کر گاؤں کے باہر جا گریں گے۔ اس لئے وہ جھکے جھکے صحن سے آنے والی سیڑھی پر بنی ہوئی ممٹی کی جانب بڑھے۔ یہ اور خوشی کی بات تھی کہ ممٹی کا دروازہ ابھی کھلا تھا ورنہ انھیں کود پھاند کر نیچے جانا پڑتا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ گھر کے لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ابھی سونے کا کوئی وقت بھی نہیں تھا۔

کپورے کے ہاتھ میں دونالی تھی۔ بگے کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی چھوی اور سانسی حسب معمول لمبا سا چھرا اٹھائے تھا۔

انھوں نے ایک بار پھر اپنے اپنے چہروں کو پگڑیوں کے شملوں میں چھپایا۔ صرف آنکھوں اور ابروؤں کو ننگا چھوڑ دیا۔

اور پھر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگے۔

وہ کافی نیچے جا چکے تھے کہ دفعتہً موڑ سے ٹمٹماتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ کوئی شخص ہاتھ میں لالٹین یا چراغ لئے سیڑھیوں پر چڑھتا چلا آ رہا ہے۔ وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

ابھی وہ کچھ طے بھی نہ کر پائے تھے کہ چراغ کے پیچھے دو زنانہ پاؤں دکھائی دیئے اور ان کی آنکھیں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی کی آنکھوں سے ملیں جو چراغ کو اپنے دونوں ہاتھ کے حلقے میں لئے ہوئے تھی تاکہ وہ بجھ نہ جائے۔

انھیں دیکھتے ہی لڑکی کا رنگ فق پڑ گیا۔ اس نے یہ بڑی زبان باہر نکال کر حلق سے ایک دلدوز چیخ نکالنے کی کوشش کی لیکن مارے خوف کے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔ مٹی کا چراغ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔

بگے نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ انھوں نے اس کے منہ میں اسی کی چُندری کو ٹھونس ٹھانس کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر وہیں کونے میں ڈال دیا۔

صحن میں پہنچے تو دیکھا ایک جانب ڈیوڑھی ہے۔ اور دوسری جانب مکان کا پسار معلوم ہوتا تھا کہ جس دروازے سے

نکل کر لڑکی آئی تھی اس کا کنڈا اس نے باہر سے چڑھا دیا تھا، تاکہ ہوا کی تیزی کے باعث دروازہ نہ کھلے۔ اندر روشنی ہو رہی تھی اور گھر والوں کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

بگا اور ساہنسی دروازے کے دونوں جانب اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ اور کپورا باقی ساتھیوں کیلیے گلی کا دروازہ کھولنے کو ڈیوڑھی کی جانب بڑھا۔ ڈیوڑھی میں مویشی بندھے تھے۔ ایک بیل تو اسے اتنا پسند آیا کہ بے اختیار جی چاہا کہ اسے بھی وہ اپنے ہمراہ لیتا جائے۔ لیکن اس رات یہ قطعاً ناممکن تھا۔

ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر اس نے گلی میں جھانکا تو کچھ نظر نہ آیا۔ چنانچہ اس نے بیل ہانکنے کے انداز میں ٹٹو ٹٹو کر کے دو تین آوازیں نکالیں تو متعدد سائے اس کی جانب بڑھے جیسے کالی دیواروں نے انھیں جنم دے دیا ہو۔

کپورے نے ایک جوان کو بندوق سمیت گھر کے پچھواڑے منجھی کے انباروں کے پاس کھڑے رہنے کے لئے بھیج دیا اور باقی لوگوں کو اندر لے آیا۔

دو گھڑی بعد وہ سب لوگ دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ بگو نے چھوتی بڑھائی اور دروازے کے کنڈے میں اڑس کر ٹھوکا جو دیا تو کنڈا بڑی آواز سے کھل کر گرا اور تڑاتڑ بجنے لگا۔ دروازے کے دونوں تختے زور زور سے پنکھ جھلنے لگے۔

گھر کے لوگ سمجھے کہ لڑکی ٹٹی کا دروازہ بند کر کے لوٹی ہے۔ وہ کچھ دیر تک اس کے اندر آنے کا انتظار کرتے رہے لیکن جب کوئی صورت دکھائی نہیں دی تو ایک مرد جلدی سے باہر نکل آیا۔ پہلے وہ دروازے کے دونوں جانب کھڑے ہوئے بگو اور ساہنسی کو نہیں دیکھ پایا۔ جب اس نے لڑکی کو صحن میں نہ پا کر گردن گھمائی تو بگو اور ساہنسی کی صورتیں دکھائی دیں اس نے گھبرا کر پوچھا :۔

" آپ کون ہیں ؟"

اسی اثناء میں باقی آدمی بھی ڈیوڑھی میں گھس آئے اور دروازوں میں سے ان کی خبیث صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ پیچھے سے کپورے نے اس کی گدی پر الٹے ہاتھ کا ایسا دھپ دیا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

یہ سب کچھ چند ثانیوں میں ہو گیا۔ وہ سب فوراً مکان کے اندر داخل ہو گئے لالٹین کی روشنی میں ان کے ہتھیار جگمگا اٹھے۔ جان کے خوف سے گھر کے کسی فرد نے شور نہیں مچایا۔ اُن کا بھی وہی علاج کیا گیا جو پہلی لڑکی کا کیا گیا تھا۔

کپورا خود چھپا چھپا ہی رہا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ لے۔ وہ بگے کو اندر والے کمروں میں لے گیا اور ان کی پونجی کی طرف اشارہ کیا۔ دم کے دم میں سب کچھ سمیٹ لیا گیا۔ پھر وہ سب صحن میں آ گئے۔ بگو نے ایک نظر میں ساتھیوں کی تعداد جانچی اور پھر وہ دو حصوں میں بٹ کر پڑوس کے مکانوں کی جانب بڑھے جن کے صحن ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

اتنے میں باہر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ان کے قدم رک گئے۔ کان کھڑے ہو گئے۔ پھر دھڑا دھڑ دو گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ آندھی کے شور میں مردوں کے للکارنے کی صدائیں بلند ہوئیں۔

موقعہ کی نزاکت سمجھتے ہوئے وہ باہر کی جانب بھاگے۔

جس نوخیز نشانہ باز جوان کی کپورے نے بندوق سمیت مکان کے پچھواڑے ڈیوٹی لگائی تھی، اس نے ہر طرح آہٹ

میں یہ گولیاں چلادی تھیں۔ ہوا یہ کہ آندھی کے زور سے منجھٹی اور جھاڑ کے انبار حرکت میں آگئے اور لڑھکتے ہوئے اس کی جانب بڑھے اور اُس نے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا سمجھ کر پے در پے تین گولیاں چلادیں۔

اسی اثناء میں گاؤں کے مختلف حصّوں سے خطرے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ چرکھڑیوں والے کنویں کی جانب سے 'ایلی ایلی' کی آوازیں آنے لگیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کے ساتھی انھیں خطرے سے آگاہ کر رہے تھے۔

اب اُنھوں نے مبلو کو آگے لگایا اور سرپٹ بھاگے۔

چرکھڑیوں والے کنویں تک پہنچے تو وہاں اندھادھند لاٹھیاں چل رہی تھیں۔ گاؤں کے منچلے بھی جلدی میں جیسا ہتھیار ملا لے کر مقابلے پر آن ڈٹے تھے۔ لیکن تاریکی اور آندھی نے انھیں کچھ کرنے نہ دیا۔

اُدھر بگّو کے سدھائے ہوئے ساتھی گاؤں والوں کے کندھوں سے کندھے بھڑاتے ہوئے نہایت صفائی سے اِدھر اُدھر منتشر ہو کر صحیح سلامت گاؤں سے نکل گئے۔

اتنے میں کپورے کو اپنی کالی گھوڑی دکھائی دی وہ فوراً اُچھلانگ کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

اس کا خیال تھا کہ جب وہ اپنی مُنہ زور گھوڑی کو ایڑ دے گا تو وہ گاؤں کے ہجوم کو کائی کی طرح چیرتی ہوئی نکل جائیگی۔

لیکن عین اس وقت بجلی چمکی تو گاؤں والوں میں سے بعض نے اسے پہچان لیا اور آندھی کے بھیانک شور میں "کالا تتّر! کالا تتّر" کی وحشیانہ آوازیں گھل مل گئیں۔

ایڑ دیئے جانے پر گھوڑی سمٹ کر جو اُچھلی تو گاؤں کے ایک منچلے جوان نے اس کی لگام پر جھپٹّا مارا۔ اس پر گھوڑی ہنہنا کر پچھلے پاؤں پر کھڑی ہوگئی۔ اس کی انکھڑیاں پھٹ گئیں، کان پھڑپھڑائے اور ایال لہرائی ۔۔۔۔ سوار نے ہونٹ کاٹ کر اپنی لمبے دستے والی کلھاڑی اُوپر اُٹھائی لیکن گھوڑی کے اگلے پاؤں زمین پر لگنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک چھوی چمکی اور کپورے کے پیٹ کی آنتیں اُدھیڑتی ہوئی انھیں پیٹ سے باہر لے آئی۔

وہ بڑے مگرمچھ کی طرح بل کھا کر اوندھے مُنہ زمین پر گرا۔ پیٹ سے خون کا فوّارہ چھوٹا اور لمحہ بھر میں زمین اس کے گاڑھے خون سے سُرخ ہوگئی ۔۔۔۔۔۔

پھر بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔

ریلوے جنکشن

قدرت اللہ شہاب

"کتنی چھٹی پر آئے ہو؟" نثار نے چھوٹتے ہی بغیر کسی علیک سلیک کے پوچھا۔

"پندرہ دن کی۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔ چلو اس بار تمہیں لاہور کی زمین دوز مال گاڑیاں دکھائیں گے۔" نثار نے فیصلہ صادر کیا۔

"میں سیر کروں گا۔" وہ کچھ دیر سوچ کر مشفقانہ انداز سے کہتا ہے۔ "تم کہانیاں لکھنا۔"

یہ لائحہ عمل ہم دونوں کے حسب منشا ہے۔ چنانچہ شام ہوتے ہی نثار مجھے مال روڈ پر ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل کے لان میں ہم کمال بے حیائی کے ساتھ ایک ایسی میز پر جا ڈٹے۔ جہاں پہلے سے دو ایک ایڈیٹر، چند نامہ نگار، کچھ ریڈیو آرٹسٹ، کچھ ادیب اور چند گرگ باراں دیدہ صورت کے سیاسی حضرات براجمان تھے۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ ایک صاحب کولڈ ٹی نوش جاں فرما رہے ہیں۔ یہ کولڈ ٹی اس گرم چائے سے مختلف ہے۔ جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ اور جسے معمولی ذہانت کے انسان پیا کرتے ہیں۔ یہ مشروب خاص لاہور کی ایجاد ہے۔ اور دستور کے مطابق اس ایجاد کی ماں بھی ضرورت ہے۔ وہ ضرورت جو پروہیبیشن کی وجہ سے اکثر حضرات کو پوشیدہ امراض کی طرح لاحق ہو گئی ہے۔

دانشوروں کی اس محفل پر پوسٹ مارٹم کے کمرے کی فضا بڑی شدت سے چھائی ہوئی ہے۔ قوم کی لاش سامنے ٹیبل پر دھری ہے۔ اور ہر شخص اس کا کوئی نہ کوئی عضو ہاتھ میں لیے بڑی چابکدستی کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے میں منہمک ہے، روحانی، جسمانی، ایمانی اور سیاسی امراض سے لے کر خودکشی کے نفسیاتی اسباب تک بڑی تن دہی سے تشخیص ہو رہے ہیں۔ علاج تجویز ہوتے ہیں۔ نسخوں پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ میز پر مکے پڑتے ہیں۔ کرسیاں الٹتے الٹتے بچتی ہیں ـــــ لیکن اس وقت قوم کی ساری بیماریوں کا واحد علاج صرف اس چائے دانی میں ہے۔ جس میں کولڈ ٹی بڑی احتیاط سے محفوظ ہے۔ کولڈ ٹی والے صاحب پیالی منہ سے لگائے مزے مزے کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ اور اپنے اردگرد کف در دہن مسیحاؤں کے طوفان بدتمیزی کے باوجود بڑی لاتعلقی سے داغ کی ایک عشقیہ غزل گنگنا رہے ہیں۔

"آج سینما کا پروگرام ہے؟" کولڈ ٹی صاحب نثار سے پوچھتے ہیں۔

"جی نہیں۔ آج دوسرے پروگرام ہیں۔" نثار میری طرف اشارہ کر کے دوسرے کے لفظ پر خاص زور دیتا ہے۔

"ہوں!" کولڈ ٹی صاحب عینک اتار کر مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے گھورتے ہیں: "نثار، تم نے ابھی ان کی کیا تعریف کی تھی؟ کس جگہ کے میونسپل کمشنر ہیں یہ؟"

نثار قہقہہ لگا کر ان کی تصحیح کرتا ہے: "میونسپل کمشنر نہیں بھائی، یہ برخوردار ڈپٹی کمشنر ہے۔ ڈپٹی کمشنر!"

کولڈ ٹی صاحب قطعی مرعوب نہیں ہوتے۔ "ٹھیک ہے" وہ بڑے مربیانہ انداز سے فرماتے ہیں: "اس نازک زمانے میں ایک آدھ ڈپٹی کمشنر کو ہاتھ میں رکھنا کوئی معیوب بات نہیں ہے!"

پھر وہ کمال شفقت کے ساتھ میری ڈھارس بندھاتے ہیں: "برخوردار، تم بے فکر رہو۔ میں لاہور میں تمہاری موجودگی سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ انشاءاللہ!"

"یہ بچہ لاہور کی زمین و زماں گاڑہاں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔" نثار مؤدبانہ گزارش کرتا ہے: "یہ ان پر کہانیاں لکھے گا!"

"تم کہانیاں بھی لکھتے ہو؟" کولڈ ٹی صاحب اس انداز سے پوچھتے ہیں جیسے کہانیاں لکھنا کوئی بہت بڑا اخلاقی جرم ہے: "کہاں لکھتے ہو؟"

میں خجالت سے منمنا کر نقوش، سویرا، ساقی، ہمایوں، ادبی دنیا وغیرہ کے نام لیتا ہوں۔

"یہ رسالے کہاں سے چھپتے ہیں؟ میں نے تو نہیں دیکھے۔" کولڈ ٹی صاحب کی نظر میں میری ادبی پوزیشن گر جاتی ہے۔ وہ اپنی عینک دوبارہ آنکھوں پر لگا لیتے ہیں اور مشفقانہ انداز میں مجھے رائے دیتے ہیں کہ اگر مجھے کہانیاں لکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو شمع، ڈائرکٹر اور چنگاری میں لکھا کروں۔ کولڈ ٹی کا آخری پیالہ حلق میں انڈیل کر وہ ان رسالوں پر اپنی گراں قدر رائے کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔

اس مختصر سی علمی و ادبی بحث کے بعد جب ہم ہوٹل سے نکل کر ایک تانگے میں سوار ہوتے ہیں تو نثار اور کولڈ ٹی صاحب کا تانگے والے سے تبادلۂ خیالات شروع ہو جاتا ہے۔ تانگے والا بڑی مشاقی سے اپنے فنونِ لطیفہ کا پرچار کرتا ہے: "زمیندار اخبار کے عقب میں رہنے والی جو انگریزی بولتی ہے...... چوبرجی والی جس کا رنگ گورا اور بال سنہری ہیں.... میو گارڈن والی جو اسی سال میٹرک میں فیل ہوئی ہے...... گھوڑا ہسپتال کے پاس والی جو لتا منگیشکر کی طرح گاتی ہے..... ماڈل ٹاؤن والی جو ایک ہسپتال میں نرس ہے....."

لیکن نثار اور کولڈ ٹی صاحب تانگے والے کے پراپیگنڈے سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔

"تم سالے باسی کڑھی کا ابال ہو!" کولڈ ٹی صاحب خفا ہوتے ہیں، "تم سے تو مزنگ کے اڈے کے تانگے والے ہزار درجہ اچھے ہیں۔"

تانگے والا مزنگ کے اڈے والوں کو فصیح و بلیغ گالیاں دے کر ڈرامائی انداز سے اپنا تازہ ترین شاہکار برآمد کرتا ہے: "لڑکی کیا ہے صاحب نرا آلو بخارا ہے۔ ابھی کالج میں پڑھتی تھی۔ فقط دو مہینے سے اس لائن میں آئی ہے۔ اب تک صرف چار مرتبہ باہر گئی ہے۔ کالے خاں پٹھان نے پورے سات سو روپے دیئے تھے۔ تمہاری خاطر دو سو میں منا لوں گا۔ چلوں؟"

آلو بخارا کے نام پر نثار اور کولڈ ٹی صاحب کی رال بھی ٹپکنے لگی۔ لیکن دو سو روپے کا ذکر سن کر ان کے جبڑے لٹک جاتے ہیں۔ وہ دونوں امید افزا نظروں سے مجھے گھورتے ہیں۔ خاص طور پر کولڈ ٹی صاحب کے انداز بڑی شدت سے للکار رہے ہیں کہ برخوردار دیکھو، میں تمہیں اپنی خدمت کا سنہری موقعہ دے رہا ہوں۔ اگر تم اس وقت کام نہ آسکے تو ڈپٹی کمشنر نہیں گھسیارے ہو—— لیکن میرے انداز میں کہ انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں۔ اور وہ مایوس ہو کر پھر اپنا جبڑا لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس خاموش کولڈوار کے بعد موضوعِ سخن بدل جاتا ہے۔ تانگے والا گھوڑے کو مخاطب کرکے بہن کی بڑی سنگین اور پیچ دار گالیاں سناتا ہے۔ نثار اپنے جگری دشمنوں کی تعریف کرتا ہے۔ جو ضرورت کے وقت اس پر کئی کئی ہزار روپیہ تک خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور کولڈی صاحب پاکستان کے تمام افسروں کی کمینگی، نالائقی اور بددیانتی پر جی کھول کر تبصرہ فرماتے ہیں۔ یوں بھی رفتہ رفتہ کولڈی اپنا رنگ دکھا رہی ہے اور جب تانگے والا گھوڑے کی وساطت سے ہمیں چند الوداعی گالیاں سنا کر ہیرا منڈی میں نوگزے کی قبر کے پاس اتار دیتا ہے تو کولڈی صاحب کے پاؤں بڑی شدت سے لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں اور وہ "س" کو "ش" میں بدل کر بڑی خوش سگالی سے چوک میں کھڑے ہوئے پولیس کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہیں "شپاہی جی شلام۔ جیتے رہو۔"

سپاہی نتھنے پھیلا کر کولڈی کے منہ کو قریب سے زور لگا کر سونگھتا ہے۔ "اچھا! آج بھی خوب چڑھا رکھی ہے صاحب پرمٹ کہاں ہے؟"

کولڈی صاحب فتح مند مرغ کی طرح چھاتی نکال کر اپنا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھاتے ہیں۔ غالباً وہ مجھے پرمٹ کے طور پر سپاہی کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں لیکن میں نظر بچا کر کھسک جاتا ہوں اور نوگزے کی قبر کی اوٹ میں جا چھپتا ہوں۔

مجھے غیر موجود پا کر کولڈی صاحب کی چھاتی کا تناؤ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اور وہ اپنی بش شرٹ کی جیبیں ٹٹول کر پانچ روپے کا نوٹ کانسٹیبل کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ کانسٹیبل اس پرمٹ سے مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے نثار اور کولڈی صاحب کی گرمیِ گفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے درمیان ذات کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔ وہ کچھ دیر میرا انتظار کرتے ہیں اور پھر غصے سے ایک طرف کو چل کھڑے ہوتے ہیں۔

نوگزے کی قبر کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ وہی پرمٹ والا سپاہی اب مشتبہ نگاہوں سے بار بار میرا جائزہ لے رہا ہے۔ میں واپس لوٹنے کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں جہاں نثار، کولڈی صاحب اور پرمٹ والے کانسٹیبل سے میرا سامنا نہ ہو۔ اس تلاش میں میں ہیرا منڈی کی بے شمار پیچ در پیچ گلیوں کے تانے بانے میں الجھ جاتا ہوں۔ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ گلیوں اور سڑکوں پر گشت کرتے ہوئے شائقین، قدم قدم پر چیل کی طرح جھپٹتے ہوئے دلال، دروازوں اور دریچوں میں گڑیوں کی طرح سجی ہوئی عورتیں —— اپنے رنگ برنگ ملبوسات کے باوجود یہ ساری مخلوق الف ننگی ہے۔ اور ان کے جسم اور اذہان ایک ہی بے آواز سُر پر بڑی ہم آہنگی کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ فضا میں کچے گوشت کی بساند رچی ہوئی ہے۔ اور بڑی بڑی پاور کے قمقموں کا اجتماعی نور گلیوں اور سڑکوں پر برص کے داغوں کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ یہ عورتیں جو دروازوں اور کھڑکیوں میں گردنیں لٹکائے بیٹھی ہیں۔ یکایک پھُر سے اُڑ جائیں گی۔ اور ابابیلوں کی طرح اپنی چونچوں میں کنکریاں اٹھا کر ساری دنیا کو اپنے نرغے میں لے لیں گی —— لیکن عملی طور پر کنکریوں کی جگہ میری گردن پر چھپاک سے بلغم کا ایک بڑا سا غلغہ آ گرتا ہے۔ جو ایک ادھ موئی سی عورت دریچے میں بیٹھی بڑے اطمینان سے کھنکار کھنکار کر نیچے تھوک رہی ہے۔ میں اپنی گردن کو اس غلاظت سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہوں۔ تو خدا کی خاص رحمت میری دستگیری فرماتی ہے۔ اور ایک گلی میں مجھے مسجد نظر پڑتی ہے۔ جس کے ایک دروازے پر کالی سیاہی سے "یا اللہ" اور دوسرے دروازے پر "یا محمدؐ" لکھا ہوا ہے۔ یہ چھوٹی سی مسجد دو بلند و بالا عمارتوں کے درمیان بڑی بے کسی سے جکڑی کھڑی ہے۔ اندر پیشاب اور پاخانے کا تعفن ہے۔ ایک طرف نالی میں، بیئر کی چند خالی اور شکستہ بوتلیں اوندھی پڑی ہیں۔ وضو کے لیے ایک پرانا

حمام ہے۔ جس کا پانی باسی لعاب دہن کی طرح کثیف ہے۔ اور بڑے زوروں سے ہمک مارتا ہے۔ نہ جانے اس مسجد کو دیکھ کر میرے ذہن میں ریل کے انجن کا خیال کیوں آتا ہے جو تیز رفتاری سے چلتا چلتا اچانک پٹڑی سے اتر گیا ہو!

ہیرا منڈی سے بھٹکتا بھٹکتا آخر میں شاہی مسجد آ پہنچتا ہوں اور خدا کی کھلی فضا میں اطمینان سے زور زور سے سانس لینے لگتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے بھی مسجد کے آس پاس کئی شاندار کاریں کھڑی ہیں۔ اور اُن کے ڈرائیور ادھر اُدھر بیٹھے بے دلی سے اُونگھ رہے ہیں۔ یہ شرفا کی موٹریں ہیں۔ جو اپنی بیگمات سے اجازت لے کر شاہی مسجد میں آدھی نیم شبی یا اقبال کے مزار پر ہدیۂ عقیدت پیش کرنے یہاں آیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد کی چکنی سیڑھیوں پر اکثر ان کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ لڑھکتے لڑھکتے بے اختیار ہیرا منڈی کے نہاں خانوں میں جا گرتے ہیں۔ اگر اقبال زندہ ہوتا تو وہ مسئلہ جبر و قدر کی ایک نئی تفسیر معلوم کر سکتا تھا!

شاہی مسجد کے عین مقابل پرانے قلعے کی اُونگھتی ہوئی عمارت ہے جس کے دروازے پر پاکستان کا جھنڈا کسلمندی سے لہرا رہا ہے۔ اقبال کے مزار میں ایک چھوٹا سا بلب روشن ہے۔ بڑا بلب کچھ عرصہ ہوا کہ چوری ہو گیا تھا۔ لاہور میں بجلی کے نئے بلب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ اُن کی مانگ ہیرا منڈی میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ اقبال کے مزار کو ایک چھوٹے سے بلب پر ہی قناعت شعار رہنا چاہیے۔ مزار کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگا ہوا ہے۔ تاکہ عقیدت مند اندر گھس کر سوئچ بورڈ نہ چرا سکیں —— باہر لان میں ہیرا منڈی کے اکا دکا دلال بھولے بھٹکے راہیوں کے لیے خضر راہ کا کام دینے کے لیے منتظر بیٹھے ہیں۔ ایک تانگے والا دو دو آنہ میں داتا کے دربار پہنچانے کا اعلان کرتا ہے۔ میں اچک کر اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ تانگے میں ضلع جہلم کے دو مقدمہ باز بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دن بھر مقدموں اور کچہریوں کی زحمت کے بعد وہ گھڑی دو گھڑی دل بہلانے کے لیے ہیرا منڈی آ گئے تھے اور اب حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر سلام کرنے جا رہے ہیں

"کرتا تو سب کچھ اللہ ہی ہے" ایک مقدمہ باز اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے: "لیکن بزرگوں کا سہارا بھی بڑی چیز ہوتی ہے"

دوسرا مقدمہ باز بھی اس نظریے کی تائید کرتا ہے اور اس روحانی گفتگو کے بعد وہ دونوں سرگوشیوں میں ہیرا منڈی کے ذاتی تجربات پر تبادلہ خیالات کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جمعرات کی وجہ سے داتا کے دربار میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور دربار کے صدر دروازے میں نثار اور گولڈی صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چست کھڑے ہیں۔ ہجوم کے ہر ریلے کے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہتے ہوئے اندر چلے جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے واپس آ کر صدر دروازے کے عین بیچ اپنی جگہ سنبھال لیتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ ان کی نظر بچا کر ادھر اُدھر ہو جاؤں۔ لیکن نثار مجھے دیکھ لیتا ہے اور زبردستی کھینچ کر اپنے پاس کھڑا کر لیتا ہے۔ گولڈی صاحب بھی میری پچھلی لغزشوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور داتا کے دربار کے ساتھ مسلمان عورتوں کی عقیدت مندی کے جملہ فوائد پر عارفانہ روشنی ڈالتے ہیں۔ اپنے پروگرام کے مطابق یہ لوگ اب یہاں سے مزنگ کے اڈے پر جائیں گے اور وہاں سے زمین دوز مال گاڑیوں کی دوسری منزل شروع ہو گی —— لاہور نارتھ ویسٹرن ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ یہاں کی زمین دوز مال گاڑیاں ہر سڑک، ہر گلی، ہر کوچے میں چلتی ہیں۔ جگہ جگہ سرخ بتیوں کے نشان ٹمٹماتے ہیں۔ لیکن ان بتیوں کے باوجود کئی گاڑیاں کانٹا بدلتے بدلتے چوک جاتی ہیں اور اکثر تصادم کے حادثات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی تیز رفتار انجن چلتے چلتے پٹڑی سے اُتر جائے تو اُسے پھینک نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس کی پیشانی پر کالی سیاہی سے اللہ اور رسولؐ کا نام لکھ کر اُسے مسجد کے کام پر لگا لیا جاتا ہے۔ . . . .

چارہ گر

تسنیم سلیم چھتاری

کنور صاحب جب کبھی اپنے تینوں بچوں کو ایک جگہ دیکھتے تو یہ بات کہے بغیر ان کا جی نہیں مانتا تھا کہ "بیگم- ولایت کی آب و ہوا کا بھی الٹا اثر ہوا- جو بچے ہندوستان کی پیدائش ہیں، ذرا اُن کا بھی رنگ روپ دیکھو اور اپنی منیرہ کو دیکھو ——— تشریف لائیں لندن میں اور شکل پائی خالص ......"

بیگم پر ان باتوں کا ردِ عمل مختلف حالات میں مختلف طور پر ہوتا۔ کبھی ہنسی خوشی میں ہوتیں تو کہتیں "واہ جی! تم نے میری بچی کی صورت دیکھی ہے، اس کا نصیبہ تو نہیں دیکھا۔ تمھیں کیا خبر- اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے ...... اللہ نے چاہا تو اس بیٹی پر فخر کرو گے ..... کبھی مذاق کا موڈ ہوا تو کہہ دیا کہ "تو رچ میری بچی کیا ان موئی فرنگنوں پر جاتی ——— بلا سے ولایت میں ہوئی تو کیا ہے۔ بالکل اپنے باپ پر گئی ہے ...... آئینہ دیکھو اور اسے دیکھو۔

اور جو کبھی جل جاتیں تو بگڑ کر کہہ دیتیں کہ "کیسی بھی سہی ... میرے لئے تو سب ہی برابر ہیں .... کوئی بے درد دکھ کے تو ہوتا نہیں ..... جو قسمت میں لکھا ہے آگے آئے گا۔ تم کیوں کیڑے ڈالتے ہو ......!"

ویسے ایمان کی بات یہ ہے کہ منیرہ سب سے اچھی بچی تھی، اور سب سے بڑھ کر ماں باپ کو پیاری بھی، کیسی سمجھ دار اور چپ چاپ بچی تھی- کہ برسوں کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ گم سُم عادات اور مزاج لے کر نہیں آئی بلکہ بڑے بہن بھائی نے زبردستی ہر دم کے طعنے دے کر اسے یہ احساسِ کمتری پیدا کرایا ہے ...... کنور رانی کی گود میں وہ مرجھائی ہوئی کلی کی طرح پڑی رہتی اور جب ان کے ملنے جلنے والیاں آتیں تو کھسک کر اپنی آیا کے گھٹنے سے جا لگتی، ناصر اور وسیمہ اُسے مُردچڑی کہتے اور الگ تھلگ بیٹھے دیکھ کر وسیمہ چڑاتی "بھائی جان ملاحظہ ہو ...... صورت چڑیلوں کی اور مزاج پریوں کے ...... اور وہ بے چاری دل کی بھڑاس نکالنے کو بھی اِدھر اُدھر منہ چھپاتی پھرتی- حالانکہ خدا نہ کرے اندھی کانی نہیں تھی- بس رنگ سانولا تھا اور نقشہ بھی اوروں سے بھدا ...... سادے کپڑوں میں اچھی خاصی لگتی اور گوٹے مصالحے کے کپڑوں کو تو اس نے کبھی بچپن ہی سے ہاتھ نہیں لگایا تھا- ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے پرائے سبھی کو یہ کہتے سُنا کہ "منیرہ کی شکل سارے گھر سے علیحدہ ہے ...... منیرہ کنور صاحب کی بیٹی نہیں لگتی" اور وسیمہ؟ وہ تو ہو بہو اپنی ماں پر تھی- کنور رانی آج بھی تیس بتیس سال کی ہو کر اور تین بچوں کی ماں بن کر بھی ایسی معلوم ہوتیں کہ چینی کی بنی ہوئی مورتی ہیں- جسے گذرتا زمانہ ہاتھ نہیں لگا سکتا ——— ویسی ہی جوان، شگفتہ اور پرکشش ——— جیسی وہ ڈولے سے

اُتری تھیں، اور کنور صاحب کے گھر والوں نے دُلہن کا گھونگھٹ اُٹھا کر کہا تھا کہ چاند سورج کی جوڑی مل گئی ہے!

کنور صاحب خود ہزاروں میں ایک تھے...... اب تو جسم کچھ بہت بھاری ہو گیا اور رنگت بھی ماند پڑ گئی تھی ورنہ دونوں میاں بیوی میں گھنٹوں یہی مقابلہ ہوتا کہ رنگت کس کی زیادہ اچھی ہے اور نقشہ کس کا زیادہ پیارا ہے...... پھر تو ظاہر ہے بچے کس پر ہوتے، پہلے تو ناصر باپ کا بچپن لے کر آئے، پھر ماں کا نمونہ بن کے وسیمہ ہوئیں...... دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے کہ اب ہماری جوانی دائم ہو گئی —— جب ہم بوڑھے ہوں گے تو یہ دونوں جوان ہو کر ہماری اُمنگوں کو سہارا لیں گے۔ دیکھنے والے دونوں بچوں کے حسن کی تعریف کرتے تو ماں باپ پھولے نہ سماتے کیوں کہ یہ تعریف بالواسطہ انھیں کی تھی۔

جب ناصر آٹھ نو سال کے ہو گئے تو کنور صاحب نے ان کو نینی تال لے جا کر شیروڈ اسکول میں داخل کرا دیا اور بیگم صاحبہ کے اصرار پر وہیں کونوٹ میں پانچ چھ سال کی وسیمہ بھی پہنچا دی گئی۔ گھر سے بچے گئے تو ماں باپ کا دل بوکھلانے لگا...... کنور صاحب تو جب سے ان کے والد کا انتقال ہوا، ہر سال ولایت کی سیر کا ارادہ کیا کرتے تھے۔ اور ادھر کچھ دن سے کنورانی کو شکایت تھی کہ یہاں کی لیڈی ڈاکٹریں سب اوندھے سیدھے مرض تشخیص کر کے دُنیا بھر کے علاج بتائیں مگر اصل مرض کو کوئی نہ پہچانتی تھی۔ اور اُدھر کنور صاحب دیکھ رہے تھے کہ ان کی چہکتی بلبل کچھ بچوں کی جُدائی سے اور کچھ اس انجانے موذی مرض میں پھنس کر بالکل نڈھال ہوتی جا رہی ہے۔

اُنھوں نے فوراً ہی بیوی کو لے کر ولایت کا رُخ کیا...... سیر کی سیر اور علاج کا علاج...... دورانِ سفر میں کنورانی صاحبہ کی طبیعت اور بھی مکدر رہی اور لندن پہنچ کر کنور صاحب کو پہلی ملاقات ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر سے کرنی پڑی جس سے کنور صاحب نے بہت ہی غمگین لہجے میں کہا "ہندوستان کے بعض ڈاکٹروں کو یہ بھی شبہ ہے کہ ان کے پیٹ میں پتھری ہو گئی ہے...... بعض ٹی بی بتلاتے ہیں اور بعض زنانہ امراض میں سے کوئی مرض......"

لیڈی ڈاکٹر نے مکمل معائنہ کرنے کے بعد کنور صاحب کی آخری بات کو تسلیم کر لیا "ٹھیک کہتے ہیں... بالکل زنانہ مرض ہے"

کنورانی اور کنور صاحب دونوں ہی اُچھل پڑے "کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ——" "میرا مطلب ہی نہیں بلکہ واقعہ بھی یہی ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ اب تک آپ کو اس سلسلے میں لاعلمی کیوں ہے۔ جب کہ بچہ بالکل نارمل ہے۔ اور کوئی خرابی نہیں معلوم ہوتی۔ صرف مسز میں خون کی کمی ہے اور وٹامن ڈی کی ضرورت ہے......"

کنورانی کو خود بھی کبھی ایسا ہی شبہ ہوتا مگر ان کو تو کمبخت دائیوں اور ڈاکٹرنیوں نے ہولا دیا تھا۔ اب اس لیڈی ڈاکٹر کی صاف صاف بات سن کر انھیں اطمینان ہو گیا۔ البتہ کنور صاحب کی پریشانی کسی طرح رفع نہ ہوتی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہندوستان کے سارے ڈاکٹر کیا گھاس کھودتے ہیں جو بچے کا فضیحتہ بنا لیتے ہیں۔ اور آپریشن کی رائے دیتے ہیں...... خیر یہ بات کہاں تک معمہ رہتی۔ کوئین میری ہسپتال کی ایک سفید رنگت اور سفید لباس والی حور نے انھیں بیٹی کی خوش خبری سنائی۔ اور انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ تیسری اولاد تھی اور کسی تیسرے پر ہی گئی تھی! جب کنور صاحب کمرے میں آئے اور سفید بازوؤں میں، سفید چادر سے لپٹی ہوئی گڑیا دیکھی تو چونک پڑے...... شاید انگریز نرس کی گود میں بچی سانولی لگ رہی ہے...... انھوں نے احتیاط

سے اس نازک بوجھ کو سنبھالا اور کنور رانی کی گود میں لٹا دیا۔ کنور رانی تو آج اس گوری نرس سے بھی زیادہ سفید ہو رہی تھیں۔ اور بچی ایسی لگی جیسے چاند میں داغ لگ گیا ہو۔ . . . . . کنور صاحب کا منہ اُتر گیا . . . . . وہ تو آنکھ ناک کے حساب سے بھی اس ماں کی گود میں نہیں سجتی تھی!

اوّل اوّل تو میاں بیوی اس بات کو آپس میں کہتے بھی کچھ جھجک محسوس کرتے کہ بچی کی شکل اچھی نہیں ہے ـــــ پھر رفتہ رفتہ میاں نے دبے دبے لہجے میں اظہار خیال کیا اور بیوی نے بڑے سے دل سے مانا کہ ہاں اوروں سے کچھ دبتی ہوئی ہے۔

بچی تین ماہ کی ہوگئی تو دونوں گھر چلے، پہلے تو ولایت ہی میں کنور رانی جہاں گئیں اور جس سے ملیں، دیکھنے والوں کی نظر نے اُن سے اپنے تعجب کا اظہار کیا کہ یہ بچی کیا واقعی آپ دونوں کی اولاد ہے؟ اور ایک آدھ کم بخت نے تو اس شبہ کا اظہار بھی کر دیا کہ شاید یہ بچی ترس کھا کر کسی یتیم خانے سے گود لی ہوگی! اگر ولایت کے یتیم خانوں میں اس صورت شکل کا بچہ کہاں!" تو پھر۔ کیا آپ یہ چھوٹا سا بچہ بھی ہندوستان سے ہی ساتھ لائی ہیں۔ کنور رانی کو ایسی باتیں مارے ڈال رہی تھیں . . . . . . یہ بچی اپنی پیدائش سے قبل بھی مرض سمجھی گئی تھی اور پیدائش کے بعد بھی روگ بن گئی۔ کبھی کبھی ماں باپ اسے چمکارتے تو وہ فوراً ہی مسکرا دیتی۔ پھر دونوں یہ بھول جاتے کہ انہیں بچی کے حسین نہ ہونے کا غم ہے۔ اس کا اخلاق ہی اس کا حسن تھا۔ یہ ہر دم مسکرانی بچی کبھی بھول کر بھی منہ بسورنا نہیں جانتی تھی۔ بھوکی ہے تو اور پیٹ بھرا ہے تو، بس جہاں ماں باپ نے گود میں لیا اور اس کے معصوم چہرے پر مسکراہٹ کھیلی ـــــ

کنور صاحب کے ولایت سے لوٹنے کی خبر ہندوستان پہنچی تو جو دوست احباب ان کو بوقت رخصت خیر خوشی سے واپسی کی اور کنور رانی کو صحت یابی کی دعائیں دیتے بمبئی تک پہنچے تھے، وہ اب زندہ سلامت بیٹی سمیت لوٹنے کی مبارک باد دینے بھی جمع ہوگئے۔ انھیں میں کنور رانی کی ماں مامتا کی ماری دہلی سے چل کر بمبئی آگئیں اور خود کنور صاحب کی ایک بہن جو اپنے خاوند کے ساتھ پونا میں رہتی تھیں، بھائی کو خوش آمدید کہنے بمبئی پہنچ گئیں۔

کنور رانی چار پانچ بہنوں میں ایک تھیں اور کئی لڑکوں میں ان کے بھائی محمود میاں منجھلے تھے۔ ماں کو دونوں بچوں سے دیوانہ وار عشق تھا اور پروانہ وار نثار تھیں۔ انھیں اپنے بچوں کے حسن و لیاقت پر بھی بڑا ناز تھا ـــــ کہتی تھیں کہ میں یوسفؑ کے خاندان سے ہوں . . . . . میری اولاد کو دیکھ لو . . . . . شامتِ اعمال کہ محمود میاں کی دلہن کسی بے ایمان مشاطہ کی باتوں میں پھنس کر آئیں تو وہ بس یوں ہی آدمی کا بچہ تھی! ظاہر ہے کہ محمود میاں کے ہر سال ہونے والے بچے کسی عنوان خود کو یوسفؑ کا وارث کہلانے کے اہل نہ ہوتے اور دادی کو اس کا بڑا ہی صدمہ تھا۔ یہی چوٹ کھا کر انھوں نے اپنی لاڈلی زبیدہ کے لئے کنور صاحب جیسا خوبصورت دولہا ڈھونڈا اور سچ مچ ناصر اور وسیمہ نے اپنی نانی کا جی بھی خوش کر دیا تھا۔

جب ولایت سے یہ مژدہ جانفزا لے کر دہلی تار پہنچا کہ اللہ پاک نے کنور رانی کو بیٹی سے نوازا ہے تو راتوں کو سجدے میں پڑ کر بیٹی کی سلامتی مانگنے والی ماں شادیٔ مرگ سے بال بال بچی۔ دو چار دن تو انہیں مٹھائی بانٹنے اور زچہ گیریاں گوانے سے فرصت نہ ہوئی۔ پھر ذرا سکون ملا تو انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ محمود میاں کی دلہن کے پیچھے پڑ گئیں جو خیر سے آج کل اپنے نویں بچے کو دودھ پلا رہی تھیں۔ ایمان کی بات ہے کہ بچہ صورت کا برا نہ تھا مگر دادی کی خاندانی روایات کو تو بہر حال ٹھیس پہنچی تھی اور انھیں اپنی

بدصورت بہو کو چڑانے کا اس سے بہتر موقع کہاں ملتا: "اوئی یہ بھی کوئی بچہ ہے!" وہ اپنے پوتے کو کہتیں: "ہمارے تو ایسے بچے کبھی نہ ہوئے........ یہ تو اللہ قسم بشیر خانساماں کے لونڈے کی شکل کا ہے...... میرے بچے تو بچپن میں بالکل ایسے لگتے کہ جیسے دوکان میں ربڑ کے بوتے سجے رکھے ہوں! میرے ایک لونڈے پر میم ڈاکٹرنی ایسی ریجھی کہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی۔ کہتی تھی کہ مجھے انعام اکرام نہیں چاہیئے۔ میں تو بچہ لوں گی۔ خیر میں بچہ تو کیا دیتی مگر اس کلموہی کی نظر ایسی پڑی کہ وہ لڑکا میرے چلہ نہانے ہی چٹ پٹ ہو گیا........ اب خدا نظر بد سے بچائے۔ تم زبیدہ کے بچے دیکھ لو...... حور کے بچے ہیں! اللہ پاک ناصر کی جان کو رکھے۔ ذرا جوان ہو جائے تو جنھوں نے یوسفؑ کو نہ دیکھا ہو وہ اُسے دیکھ لیں اور رومیہ، اس کی تو دسوں انگلیاں دس چراغ ہیں........ میں تو آنکھ بھر کے اُسے نہیں دیکھتی اب اللہ میاں نے اپنے ہاتھوں کا ایک اور نمونہ بھیج دیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں جس گھر میں زبیدہ کی لڑکیاں جائیں گی، اس گھر میں آدھی رات بھی اُجالا رہے گا۔"

یہی کچھ کہتی اور بہو کا جی جلاتی۔ وہ خوش خوش نواسی کے استقبال کو گئی تھیں۔ اور جوں ہی کنورانی نے زمین پر قدم رکھا، بڑی بی نے لپک کر اونی شال میں لپٹی ہوئی بچی کو گود میں لے لیا اور مارے خوشی کے ان کی یہ ہمت نہ پڑی کہ سوئی ہوئی نواسی کا مُنہ کھول کر دیکھ لیں اور نہ یہ دل چاہا کہ اور کسی کو پہلے اس کی صورت دیکھنے دیں۔ حد ہے کہ جب کنور صاحب کی بہن جمیلہ نے بھتیجی کو لینا چاہا تو کنورانی کی ماں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اوئی لڑکی پہلے بھائی سے تو اچھی طرح مل لو...... سو رہی ہے۔ بے کل ہو گی...... ہوٹل جا کے دیکھ لینا۔"

راستے بھر وہ ٹیکسی میں بچی کو گٹھری بنائے، چھاتی سے لگائے بیٹھی رہیں اور اس نے بھی چوں نہ کی۔ تاج محل پہنچ کر جب بڑی بی سب سے نظر بچائے دیوار کی طرف مُنہ کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گئیں تو پھر انھوں نے الحمد، درود شریف اور سورہ کہف پڑھ کر لپٹا ہوا بنڈل کھولا ——— پہلے آنکھ بند کر کے دم لیا اور پھر منہ پر نظر ڈالی! دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں ——— پھر کچھ گھبرا کر بیٹی کو آواز دی! جہاز میں اور بھی تو بہت سے دیس دیس کے بچے سوار تھے اور ساحل پر اُترتے وقت کچھ ایسا شور و شغب اور افراتفری مچی کہ نہ کسی کو اپنا ہوش رہتا اور نہ اپنے بچوں کا! بڑی بی نے اپنی بیٹی کو پکارا اور سہمے ہوئے انداز سے بچی کو دکھا کر پوچھا: "زبیدہ! کیا یہی ہے تیری لونڈیا؟" اور کوئی یہ سوال کرتا تو کنورانی بگڑ جاتیں۔ مگر ماں کی بدحواسی پر ان کو ہنسی آ گئی اور دانتوں میں انگلی دے کر بولی: "خدارا آپ تو ایسی باتیں نہ کریں۔ اب میں کیا کروں امی........ یہ کوئی میرے ہاتھ کی بات تھی......" کنورانی کی ماں نے اپنے دل کو بالجبر اس حقیقت کے ماننے پر آمادہ کیا اور سرد آہ بھر کر بولیں: "یہ تو بالکل محمود کے بچوں پر گئی ہے!!"

اب پھوپھی کی باری آئی اور انھوں نے بچی کو دیکھا تو بٹوے سے ایک سو ایک روپے کے نوٹ نکالے اور زہر خند کے ساتھ مسکرائیں! حیرت تو ان کو بھی ہوئی۔ مگر اس سے بڑھ کر تو خوشی تھی کہ اللہ نے آج اسے بھی طنز کرنے کا موقعہ عطا فرمایا......

جمیلہ بیگم کئی سال سے بھاوج کے ایک فقرے کی چبھن سینے میں چھپائے بیٹھی تھیں اور بدلے کا انتظار تھا...... یہ جب کی بات ہے کہ وہ تہمینہ دو سال کی تھی اور بہن برسوں بعد میاں کی ملازمت سے بھائی کے پاس آئی تھی...... چاند سی بھتیجی کو دیکھا تو پھسل پڑیں اور بھائی کے سر ہو گئیں کہ میں تو اسے ساجد سے لوں گی۔ ساجد ان کا پانچ چھ برس کا بیٹا تھا اور ماں کو بہت لاڈلا

تھا۔ ساتھ آیا تھا اور ——— چھوٹے بچے کی طرح ہر دم ماں سے چمٹا رہتا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ سنجیدگی سے کہنے لگیں تو کنور صاحب نے کہا: "آپا ابھی ان بچوں کا آپ نے دیکھا کیا ہے۔ ذرا اس قابل تو ہونے دیں۔ یہ پڑھ لکھ لیں، جوان ہو جائیں تو آپ کی مرضی ہے وسیمہ کو لے جائیے گا۔۔۔۔۔۔"

مگر جمیلہ بی کو تو ساس بننے کا ارمان مرے ڈالتا تھا۔ کہنے لگیں: "یوں نہیں پکا معاملہ کروں گی۔۔۔۔ بس سات اشرفی سے لڑکی کا ہاتھ روک کر شیرینی بانٹے دیتی ہوں۔"

اب کنور رانی کو بولے بغیر چارہ نہ تھا۔۔۔۔۔ آخر وسیمہ ان کے پیٹ سے ہوئی تھی۔ ان کو بھی ہاں نا کا حق تھا۔ ساجد کی صورت شکل تو بے عیب تھی مگر اس کی حرکتیں کنور رانی کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔۔۔۔ ماں کے جا بے جا پیار نے اس کو بڑا ضدی اور چڑچڑا بنا دیا تھا اور یہ بات ان کے منہ سے نکل ہی گئی کہ "بہن پکا معاملہ کس طرح کر لیں۔۔۔۔۔۔ یہ کوئی گڑیا گڈے کا کھیل تو نہیں۔۔۔۔ پہلے آپ اپنے لاڈلے کے ڈھنگ تو سنبھال لیجیے۔۔۔۔۔ وہ تو اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اور میری بچی کا جسم ہی نہیں دل بھی بہت نازک ہے۔۔۔۔۔۔!"

کنور صاحب بھی اس جواب پر سٹپٹا گئے اور جمیلہ بیگم کے تو جیسے کسی نے منہ پر جوتا کھینچ مارا ہو۔۔۔۔ انھیں بھاوج سے اس جواب کی توقع نہ تھی۔۔۔۔ پھر کبھی وہ بھول کر رشتے کی بات زبان پر نہیں لائیں۔

آج کئی برس بعد بھتیجی کی شکل دیکھ کر ان کا دل خوش ہو گیا کہ اللہ نے دلہن بھابی کے غرور کا بدلہ دیا۔ بچی کے ہاتھ کے روپے لے کر انھوں نے بھاوج کے آگے رکھے اور مسکرا کر بولیں: "اللہ نظر بد سے بچائے۔۔۔۔۔۔ یہ سب سے بڑھ کر ہے!"

بے چارے کنور صاحب بھلے دل کے آدمی، بہن کے طنز کو کیا سمجھتے! وہ بچی کی پیدائش کے دلچسپ واقعات سنانے لگے: "خیر آپا شکل تو جیسی ہے سو ہے، مگر اس کی پیدائش کسی معجزے سے کم نہیں! اللہ کی شان ہے کہ اس نے کس طرح پریشانی کو خوشی سے بدل دیا۔ جب لیڈی ڈاکٹر نے اپنے خیال کا اظہار کیا تو میرا دل کسی طرح باور نہ کرتا تھا۔ مجھے تو آخر تک شبہ ہی رہا مگر جب اپنی آنکھوں سے بچی کو جا کے ہسپتال میں دیکھا تو یقین کرنا ہی پڑا کہ۔۔۔۔" جمیلہ بیگم مسکرائیں: "تو بچی کو دیکھ کر آپ کو اعتبار آ گیا بلکہ اور شبہ بڑھ گیا؟ بمبئی ہسپتال کا معاملہ تھا اور لاکھوں عورتیں اسی غرض سے آئی ہوں گی۔۔۔۔۔۔ کیا پتہ کسی نرس کی غلطی سے ———"

بہن کی بات ختم ہونے سے قبل ہی کنور صاحب نے زوردار قہقہہ لگایا اور کنور رانی نند کی اس چوٹ پر تلملا کر صوفے سے اُٹھ کے دوسرے کمرے میں چلی گئیں جہاں ان کی والدہ پلنگ پر کچھ حیران و پشیمان سی بیٹھی تھیں۔۔۔۔۔ بے چاری بڑی بی! ان کا خیال تھا کہ بیٹی کو بمبئی سے دہلی لے جائیں گی اور دو ایک ماہ اپنے پاس رکھیں گی۔ کالے کوسوں سے خیر کے ساتھ بھری گود لے کے پلٹی ہے۔ سیدھی لکھنؤ کس طرح جانے دیں گی۔۔۔۔۔۔ ابھی تو بچی کا عقیقہ بھی نہ ہوا تھا۔۔۔۔۔۔ اور اب وہ بچی کو دیکھ کر اور سب کچھ بھول کر دوسری فکر میں پڑ گئیں۔۔۔۔۔ محمود کی دلہن کیا کہے گی!!! اس کے تو سوکھے دھانوں پانی پڑ جائے گا۔۔۔۔۔ جیسی بھی باتیں بنائے کم ہے۔۔۔۔ مجھی کمبخت کو کیا پڑی تھی کہ بلا دیکھے بھالے اتنی شیخی کر گئی۔۔۔۔ اللہ قسم ایمان کی پوچھو تو زبیدہ کی لڑکی سے تو محمود کا لونڈا ہی کچھ کھلے رنگ کا ہے۔۔۔۔۔۔!!

معصوم منیرہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ہر نئی صورت کو دیکھتی اور شاید ان چہروں پر لکھے ہوئے جذبات بھی سمجھ رہی تھی۔ جو اس

نے منہ بسور کر رونا شروع کیا...... پھر یہ احساسِ کمتری اور غیر شعوری جھجک اس کی قسمت بن گئی!

یہ بات کچھ بڑوں پر ہی منحصر نہ تھی کہ انھوں نے بچوں کی صورت میں عیب ثواب نکالے ہوں۔ حد ہے کہ جاڑوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں اور کنور صاحب نینی تال جا کے ناصر اور وسیمہ کو لائے تو دونوں بچوں کو پورا یقین کہ امّی نے مذاق میں ہماری بہن کو چھپا کر کسی اور کا بچہ دکھایا ہے...... ناصر وثوق کے ساتھ کہے کہ میں ایسا بے وقوف ہوں جو اپنی بہن کو نہ پہچانوں...... یہ تو جانے کس کی لڑکی ہے!!" اور وسیمہ بڑی معصومیت سے ماں کی گردن میں ہاتھ ڈال کر پوچھنے لگی "امّی کیا لندن کی ڈاکٹرنی اپنے بیگ میں اسی بچی کو ڈال کر لائی تھی!؟"

جوں جوں منیرہ ہوش سنبھالتی گئی، دیکھنے والوں کی نظریں پہچانتی رہی...... بہن بھائی سال بھر میں ایک بار تین ماہ کی چھٹیوں میں آتے اور جب دونوں کو اپنے کھیل سے فرصت ملتی تو چھوٹی بہن کو چڑانے لگتے...... ایک دفعہ تو ناصر اور وسیمہ نے مل کر چار پانچ برس کی جان کا گھنٹوں خون کیا کہ تجھے تو امّی نے پانچ سیر گیہوں کے بدلے ایک چماری سے خریدا ہے۔" اور رونے روتے غریب کی دونوں آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔ ماں قسمیں کھاتی، بڑے بچوں کو ڈانٹتی مگر اس کی آنکھوں کے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے۔ یہ بات اس کے جی کو لگ گئی اور پھر وہ بچی کبھی کھلے دل سے نہ ہنسی...... جب ناصر اور وسیمہ اسکول چلے جاتے تو گھر ایسا سونا ہو جاتا جیسے منیرہ کا تو وجود ہی نہیں۔ وہ تو ماں کے پاس چپ چاپ بیٹھی رہتی یا پھر کسی کونے میں بیٹھ کر اپنی آپا سے پریوں اور شاہزادوں کی کہانیاں سنتی رہتی۔ شاید یہی وہ دنیا تھی جہاں پہنچ کر اس کا ذہن و دماغ کچھ دیر کو آزاد ہو جاتا تھا۔

وہ بڑی سعادت مند اور سمجھ دار تھی۔ باپ کی سگرٹوں کا ڈبہ اور ماں کا پاندان بڑے سلیقے سے اٹھا لاتی اور ان کے سارے حکم بلا چون و چرا مانتی...... دونوں کا دل چاہتا کہ وہ اور بچوں کی طرح کھیلے اور شور مچائے، چیزیں توڑے، کھلونوں کی فرمائش کرے...... مگر منیرہ تو جیسے خود کو اس اعزاز کے قابل نہ سمجھتی تھی۔ اس کی زبان ہی نہیں کھلتی تھی۔

کنور صاحب نے اس کا سبب اس کی تنہائی سمجھ کر یہ علاج سوچا کہ اسے بھی وسیمہ کے ساتھ اسکول بھیج دیا جائے۔ منیرہ جانے لگی تو کنور رانی نے وسیمہ کو اپنی جان کی قسمیں دیں اور خدا کا واسطہ دیا کہ اس بے چاری کو اسکول میں تنگ مت کرنا۔ وسیمہ اب بہت نادان نہ تھی۔ اور جو بہن نہ گڑیاں چھینے نہ کھلونوں پر لڑے اس سے بلاوجہ دشمنی بھی کیا ہوتی۔ اس نے ماں سے سچا وعدہ کر لیا اور پیار سے منیرہ کو لے گئی۔ ایک بے چاری وسیمہ کیا کر لیتی...... منیرہ کو اپنے بچپن کی سب سے بڑی ذہنی شکست اس وقت ہوئی جب وسیمہ کی سہیلیوں نے منیرہ کو دیکھ کر کہا۔ چل جھوٹی، یہ تیری بہن نہیں ہے۔ جانے کس کی بچی پکڑ لائی ہے!" اور اسی تکلیف دہ "خوش آمدید" کے بعد جب وہ غریب سینکڑوں لڑکیوں سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھتی ہے تو وسیمہ کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ لازمی تقریبات کے علاوہ کبھی کسی سے گھل مل نہیں بیٹھی۔

پہلے سال ہی اسکول کی طرف سے جو کنور صاحب کو منیرہ کی رپورٹ گئی تو وہ خوشی سے اچھل پڑے، وہ بہت تیزی سے ترقی کر رہی تھی اور وسیمہ کی طرح منیرہ سے اسکول والوں کو کام میں لاپرواہی کی شکایت نہ تھی۔

اسکول کی زندگی منیرہ کو شور و شغب کا شوقین نہ کر سکی —— ہاں وہ نسبتاً پرسکون ضرور تھی...... اسکول میں

سبھی طرح کی لڑکیاں تھیں۔ ہندوستانی اور انگریز کے علاوہ چینی، جاپانی اور برمی لڑکیاں بھی تھیں۔ دو بچیاں جیتی ماں باپ کا سرمایۂ حیات تھیں ...... اور اگر منیرہ کو خاص طور پر وسیمہ کی بہن بنا کے نہ دیکھا جائے تو ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے اس کی دل شکنی کا امکان ہو۔ وہ سیدھے سبھاؤ کی صلح جُو لڑکی تھی جو آشنائیوں میں بہت مقبول ہو گئی۔

اسکول سے بچوں کی رپورٹ آتی ...... ناصر کی رفتار درمیانہ تھی۔ ایک مرتبہ فیل ہوتے تو دوسری مرتبہ ساری کلاس میں اوّل آتے۔ ان دونوں بہنوں میں جہاں وسیمہ کی بے شمار شکایتیں ہوتیں، وہیں منیرہ کی کسی بات میں ذرا بھی نہ نکلتی۔ وسیمہ کو پڑھائی کا کچھ ایسا شوق نہ تھا۔ وہ کھیل کود میں اچھی تھی اور جو یہ بھی گُن نہ ہوتا تو شاید اسکول میں نہ رہ پاتی۔ اور منیرہ پر اگر کبھی کسی ٹیچر کو اعتراض ہوتا تو اس میں زندگی کی جولانی نہیں ...... اگر پڑھائی کے علاوہ اس نے اپنے شوق سے کسی چیز میں حصّہ لیا بھی تو وہ محض گانے کی کلاس تھی۔ وہ پیانو بھی سیکھتی تھی اور آواز کے لحاظ سے سارے اسکول کی چیدہ لڑکیوں میں ایک تھی یہاں تک کہ اتوار کے دن گرجا میں حمد گانے والی لڑکیوں کے گروہ میں اس کو بھی شامل کر لیا گیا۔

دن گزرتے رہے۔

ماں کا حسین عکس وسیمہ اب کنور رانی کی پُرسکون نیندوں میں خلل انداز ہونے لگی۔ سولہ، سترہ برس کی عمر ایسی نوعمری ہوتی کہ شادی کے سوا چارہ نہ ہو، مگر یہ اب کنور رانی کو اچھا نہ لگتا کہ ان کی پانچ فٹ چھ انچ لمبی صاحبزادی بلاؤز اور اسکرٹ پہن کر قلانچیں بھرتی رہے ...... خود وسیمہ کو اس لباس سے چڑ تھی۔ یوں تو وہ اسکول کی حد سے باہر ہمیشہ ہی شلوار قمیص پہنتی مگر جس زمانے میں گرمیاں گزارنے ماں باپ دونوں نینی تال جاتے اور سنیچر کی شام کو بچوں سے ملنے اسکول پہنچتے تو وسیمہ کا حلیہ دیکھ کر ماں کا دل ہولانے لگتا ...... کہاں تو ان کے گھرانے میں جوان بیٹیاں باپ کے آگے سر سے دوپٹہ نہیں گراتی تھیں اور کہاں یہ کہ وسیمہ کے لباس میں دوپٹہ کا دخل ایک طرف، گھٹنوں تک ٹانگیں بھی اپنی بے مائگی کا شہرہ کرتی تھیں۔ لہٰذا کچھ تو ماں کی مرضی بھی باقی نہ تھی اور کچھ وسیمہ خود بھی کونونٹ کی پابندیوں سے عاجز آ گئی تھی ...... طرفہ یہ ہوا کہ وہ جونیر کیمبرج میں فیل ہو گئی۔ کنور صاحب نے لاکھ سمجھایا مگر وہ اب اسکول جانے پر آمادہ نہ تھی اور گھر پر تیاری کر کے وہیں لکھنؤ سے دسویں کا امتحان دینا چاہتی تھی ...... منیرہ کو اس مرتبہ تنہا ہی جانا پڑا۔

وسیمہ گھر آ گئی تو ساتھ ہی شادی کے پیغامات بھی برسنے لگے۔ وہ کنور رانی کے ساتھ نانی کے ہاں دہلی گئی تو محمود ماموں کے دو بیٹے بیک وقت اس سے شادی پر تیار ہو گئے —— چوں کہ دونوں نے اشارے کنایوں میں پھوپھی پر اپنی لیاقت جتا دی تھی۔ لہٰذا ایک بھی قابلِ قبول نہ قرار پا سکا ...... خود کنور رانی کی ماں نے اُن سے کہا کہ وسیمہ کے حق میں محمود میاں کی دُلہن کبھی اچھی ساس ثابت نہیں ہوں گی۔ وہ اپنی لڑکیوں کی بدصورتی کے سبب ہمیشہ وسیمہ کے حُسن سے جلتی رہی تھیں اور اب ساس بن کر دل کی بھڑاس نکالیں گی۔ مجبوراً کنور رانی کو بھتیجوں کا خیال ترک کرنا پڑا ...... اب رہے خود کنور صاحب کے بھانجے اور جمیلہ بی کے لاڈلے ساجد میاں، تو انھوں نے ایسی حماقت کی کہ کنور رانی نے وسیمہ کو ان سے نہ بیاہنے کی بالکل قسم کھا لی۔

بی اے کے امتحان سے نپٹ کر وہ ماموں کے بلاوے پر لکھنؤ آئے ...... یہ وہی زمانہ تھا کہ وسیمہ میٹرک کی تیاریوں

میں مصروف تھیں اور دونوں نے برسہا برس کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا تھا ساجد میاں بے چارے پہلی نظر کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے بھی آگا دیکھا نہ پیچھا اور وہیں مردانہ کمرے میں بیٹھ کر اپنی شادی کا پیام وسیمہ کے نام تمام دیکھے ہوئے فلموں، پڑھے ہوئے ناولوں اور سنے ہوئے واقعات کے خلاصے سمیت لکھ بھیجا ...... مزید یہ لکھا کہ تم بالغ اور تعلیم یافتہ ہو۔ اس میں صرف تمہاری رضا درکار ہے۔ ماں باپ کی مرضی کو دخل نہیں ہے۔

شامتِ اعمال کہ یہ شاہکار بجائے بیٹی کے ماں کے ہاتھ پڑا اور کنور رانی کی ایڑی لگی آگ چوٹی تک پہنچی۔

ظاہر ہے کہ بذریعہ ریل تو ساجد اور بذریعہ ڈاک ان کا پیام شادی! دونوں جمیلہ بیگم کی خدمت عالیہ میں اس تنبیہہ کے ساتھ پہنچے کہ جو آئندہ ایسا ہوا تو ......!!

وسیمہ نے میٹرک پاس کیا اور وہیں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے لیا ...... ناصر سینیر کیمبرج کر کے آئے تو کیمبرج گریجویٹ کی ایسی لگن لگی کہ اس مرض کا علاج پاسپورٹ کے علاوہ کچھ نہ ہو سکا ...... فلک بوس چوٹیوں اور اتھاہ گہرائیوں والے نینی تال کے سینٹ میری کونونٹ میں منیرہ چپ چاپ پڑھتی رہی!

ناصر میاں کیمبرج کے دلچسپ قصے اپنے طویل خطوط میں لکھتے، وسیمہ ہلکے نیلے رنگ کی "بیوک" میں (جس میں گہری نیلی جارجٹ کے پردے تھے) میں روز کالج جاتیں اور نینی تال سے منیرہ کی بابت آنے والی شاندار رپورٹیں کنور رانی سینت سینت کر رکھ لیتیں،

دو سال اور بیت گئے ......

یہ اس رات کی بات ہے جب وسیمہ ایف۔ اے پاس کرنے کی خوشی میں اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ ایک انگلش فلم دیکھ کر لوٹ رہی تھیں اور سڑک پر خاصہ ہجوم تھا ...... شکور ڈرائیور اپنی طویل و عریض بیوک کو بڑے سلیقے سے بچا بچا کر درمیان سے نکال رہا تھا۔ دفعتہً آگے چلتے ہوئے رکشا والے نے آس پاس کی سواریوں سے بوکھلا کر کچھ اس طرح اپنی رکشا بیوک کے سامنے کر دی کہ اگر شکور لمحے بھر کو بریک نہ لگائے تو واللہ اعلم کیا ہوتا ——— ایک تو اتنی تیزی سے بریک لگانے کے سبب موٹر نے پیچھے کو جھٹکا کھایا۔ دوسرے برابر کی رفتار سے آتی ہوئی پیچھے والی جیپ اپنی پوری طاقت سے بیوک کے ساتھ ٹکرا گئی ......

جب تینوں لڑکیوں کی چیخیں بدقت تھمیں تو وسیمہ نے شکور کو یہ کہتے سنا کہ "صاحب آپ نے تو ہمارا مڈگارڈ ہی توڑ ڈالا ......"

وسیمہ کو اس موٹر سے بہت پیار تھا۔ نینی تال سے آ کر اس نے اس موٹر کو اپنی پسند سے خریدا تھا ...... اور کالج کی چار دیواری میں داخل ہونے والی یہ سب سے حسین کار تھی ...... مڈگارڈ پچکنے کی بات نے اسے بری طرح مشتعل کر دیا اور لپک کر وہ موٹر سے کود پڑی ...... جیپ کی اسٹیرنگ وہیل پر دونوں ہاتھ رکھے بڑے اطمینان سے ایک صاحب کہہ رہے تھے۔

"اور جناب آپ کی حماقت سے جو میری گاڑی کے ہیڈ لیمپ کا چورا ہو گیا وہ ......"

وسیمہ نے بگڑ کر انگریزی میں بڑی تیزی سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کا سر کیوں بچ گیا۔ ہوش سنبھال کر ڈرائیو، نہیں کرتے ...... ایسی عمدہ موٹر کا ناس کر دیا۔"

موٹر ٹکرانے کا حادثہ اس نوجوان کو بالکل بدحواس نہ کر سکا تھا۔ مگر اس ایٹم بم نے اسے سچ مچ دہلا دیا ...... اس نے کسی قدر ہکلا کر انگریزی ہی میں جواب دیا "مجھے افسوس ہے محترمہ ...... تاہم میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ آخر میری خطا کیا تھی۔"

وسیمہ نے اُسے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا۔ "خوب..... تو گویا آپ نے اندھا دھند گاڑی لڑا کے ہمارا مڈگارڈ نہیں توڑا؟ اب کون ہے اس نقصان کا ذمہ دار؟ آپ تو نہیں ہیں!"

وہ کچھ دیر خاموش وسیمہ کو دیکھتا رہا اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ چمکی "اور میرا بھی تو بہت نقصان ہو گیا ہے۔ آپ بتائیں، اس کی ذمہ داری لیں گی آپ؟" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ وسیمہ کی پلکیں جھک گئیں۔ سڑک پر تماشائی جمع ہو گئے تھے، پیچھے سواریاں رُک رہی تھیں اور وہ اسٹیرنگ وہیل پہ ٹھوڑی رکھ کر اُسے اطمینان سے دیکھ رہا تھا۔

وسیمہ چڑ گئی...... وہ اب ڈرنے کے بجائے دلیری پر آمادہ تھا "کہاں ہے آپ کا ڈرائیونگ لائسنس؟ دکھلایئے مجھ کو!! میں کل ہی آپ کی رپورٹ کروں گی۔ بڑے ڈرائیور بنتے ہیں!! پاؤں پٹختی وسیمہ بیوک میں بیٹھی تو شکور نے گاڑی بڑھائی.....

ولایت سے ناصر کا خط آیا تھا اور وہ کنور رانی کو پڑھ کر سنا رہی تھی تو کنور صاحب ہاتھ میں ایک کاغذ لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور وسیمہ سے پوچھا "بیٹی۔ تم نے ظفر میاں سے ان کا ڈرائیونگ لائسنس مانگا تھا؟"

وسیمہ اُچھل پڑی "جی کس سے؟"

"ظفر میاں سے... خان بہادر ریاض احمد خاں کا بڑا لڑکا ہے نا؟ وہ یہ لائسنس لایا ہے..... کہتا ہے کہ آپ کی صاحبزادی دیکھنا چاہتی ہیں..... تم نے مانگا ہوگا......"

وسیمہ کو ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ "ابا میں تو اسے جانتی بھی نہیں..... رات البتہ ایک قصہ ہوا تھا! شکور نے آپ کو اطلاع کر دی ہوگی.....

ہم لوگ سینما سے آ رہے تھے تو ایک جیپ گاڑی ہماری موٹر سے ٹکرا گئی...... مجھے کیا پتہ کون چلا رہا ہے.... میں نے کہا اپنا لائسنس دکھاؤ ورنہ میں رپورٹ کروں گی!" کنور صاحب ہنسنے لگے..... "لاحول ولاقوۃ"...... وہ بے چارہ بہت ہی پریشان معلوم ہوتا ہے...... تم نے بھی حد کر دی، ان کے والد سے تو میرے بڑے تعلقات ہیں..... بلکہ تم تو ان کی گھر والیوں سے بھی کئی بار ملی ہو۔ پچھلے سال الیکشن میں خان بہادر نے میری بڑی مدد کی تھی...... وہ غریب لڑکا ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے۔ اسے یہ لائسنس واپس کر دو...... اور کہہ دینا کہ تم نے اُسے پہچانا نہیں تھا"

کنور صاحب بیوی کے پاس بیٹھ کر ناصر کا خط پڑھنے لگے۔ اور وسیمہ ظفر کا ڈرائیونگ لائسنس ہاتھ میں لیے کچھ جھجکتی ہوئی، شرمندہ سی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ ظفر اُسے دیکھ کر صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور مسکرا کر بڑے ادب سے سلام کیا...... وسیمہ نے بغیر سلام کا جواب دیئے، کاغذ میز پہ ڈال دیا اور رُک رُک کر بولی "معاف کیجیے گا رات میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا"

ظفر مسکراتا رہا "اور اب؟ اب تو پہچان لیا آپ نے مجھے؟"

وسیمہ پلٹ کر چل دی تو ظفر نے کہا "سنیے گا...... میں نے دیکھا ہے کہ آپ کا ڈرائیور تو موٹر کا مڈگارڈ درست کرا لایا مگر، میرے نقصان کی تلافی کس طرح ہوگی...... غریب آدمی ہوں!" وسیمہ کے ہونٹ مسکراہٹ نہ روک پائے وہ جلدی سے بھاگ آئی "کیسا شریر لڑکا ہے، توبہ!"

اس کے دو چار دن بعد ہی خان بہادر ریاض احمد خاں کے یہاں سے کنور صاحب کو معہ کنور رانی اور وسیمہ کے دعوت

کا رقعہ آیا۔ کنور رانی اپنے میاں کے حلقۂ احباب میں ولایت کی واپسی کے بعد سے پردہ نہیں کرتی تھیں اور نہ خان بہادر کے یہاں پردے کی پابندی تھی۔ کھانا ایک ہی جگہ کھایا گیا ——— اس دوران میں ظفر نے وسیمہ سے کوئی بات نہ کی۔ البتہ اس کا چھوٹا بھائی رفیع جو انجنیئرنگ کالج میں پڑھتا تھا، ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

کھانے کے بعد وسیمہ نشست گاہ میں رکھے ہوئے ایک سنگِ مرمر کے مجسّمے دیکھ رہی تھی۔ جب ظفر خاصدان لیکر آیا تو وسیمہ کے چہرے پر سُرخ رنگ نکھرنے لگا!

وسیمہ نے شکریہ کہہ کر پان لے لیا تو ظفر نے آہستہ سے کہا۔ "آپ نے میرے لئے بھی کچھ سوچا ——— یا میں خود ہی کنور صاحب سے عرض کر دوں؟"

"جی!" وسیمہ نے گھبرا کر اس کا منہ دیکھا۔

وسیمہ کی وحشت پر وہ زور سے ہنس پڑا۔ "میری گاڑی کی ابھی تک مرمت نہیں ہو پائی . . . . . میں تو اس دن سے لاچار ہو رہا ہوں۔"

"کسی قابل انجنیئر کو دکھلایئے۔" وسیمہ نے شوخی سے کہا۔ ایکا ایکی برابر کے کمرے سے آتے ہوئے رفیع نے کہا "میں ہوں قابل انجنیئر!" اور بات کا رُخ پلٹ گیا۔

دوسرے دن کنور رانی نے وسیمہ کو بتایا کہ خان بہادر نے تمھارا رشتہ ظفر کے لئے مانگا ہے . . . . تمھاری کیا مرضی ہے؟

وسیمہ کی مرضی کنور رانی کو معلوم تھی ——— اور جب یہ بات طے ہو گئی تو وسیمہ نے ظفر سے پردہ شروع کر دیا۔ ظفر اکثر ان کے یہاں آتا اور ایک دن تو اس نے باقاعدہ پرچہ لکھ کر بذریعہ ڈاک وسیمہ کو بھیجا کہ جس دن سے آپ نے میری گاڑی کا ہیڈ لیمپ توڑا ہے، میں اندھیرے میں بھٹک رہا ہوں۔ اس سے قبل کہ میں بطور انتقام آپ کی کھڑکی کا شیشہ توڑ دوں . . . . . . میری فکر کیجئے!

وسیمہ کی شادی میں ایک ہی ہفتہ باقی تھا کہ منیرہ سینیئر کیمبرج کا امتحان دے کر لکھنؤ آ گئی۔ اس نے ظفر کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ وسیمہ نے اُسے ظفر کی دو تین تصویریں دکھائیں جو غالباً ظفر کے ہی اشارے پر رفیع اس کو دے گیا تھا . . . . . منیرہ نے ایک فوٹو کو غور سے دیکھ کر کہا "ایمان سے آپا یہ تو بڑی خوبصورت ہیں۔ مونچھیں البتہ کچھ زیادہ نوکیلی ہیں . . . . . . آپ ذرا کم کرا دیجئے گا . . . . . چہرے سے بہت خوش مزاج لگتے ہیں۔"

وسیمہ نے اس تنقید کا لطف لیتے ہوئے کہا "اوئی ان کی مونچھیں کاٹنا کچھ آسان نہیں ہے . . . . بہت تیز ہیں۔ اب تو دیکھنا تیرا ناطقہ ہی بند نہ کر دیں تو شرط ہے۔"

منیرہ کے دل میں خوشی کی لہریں اُٹھنے لگیں . . . . ہنس مکھ دولہا بھائی کا تصوّر بڑا ہی دلچسپ تھا . . . . . اس نے آج تک کسی سے مذاق نہ کیا تھا۔ ناصر نے اس کو چھیڑ چھیڑ کر بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ اس لئے بھائی جان سے کچھ زیادہ بے تکلف نہ ہوتی تھی . . . . . . اور کوئی ایسا رشتہ نہ تھا جس سے وہ بھی ہنسی مذاق کرتی . . . . . . کچھ تو اس کی طبیعت ہی سب سے الگ تھلگ تھی۔

پھر اس پر کونونٹ کی زندگی جس میں یوں بھی ہنسی کی آواز ہمیشہ بے جان اور محبوس معلوم ہوتی ہے ...... منیرہ کا دل ابھی سے ہنسنے کو چاہنے لگا ...... اس نے تصور ہی میں اپنے ناخن کاٹنے کی قینچی اُٹھا کر دولھا بھائی کی مونچھوں کا صفایا کر دیا ..... اور پھر ان کے دونوں کانوں کی لو بھی کتر ڈالیں! اس نے سوچا کہ دولھا بھائی کو پان میں مسّی ضرور کھلاؤں گی۔ اور ان کے بالوں میں افشاں بھی ضرور لگاؤں گی۔ جو کئی دن تک چمکتی رہے!

دل میں اَن گنت ارمان لے کر وہ بہن کا جہیز سجانے لگی ...... بہن کو گھر جاتے دیکھ کر منیرہ کے دل میں اس کیلئے اتھاہ محبت اُبل پڑی تھی .... وہ ہر تھوڑی دیر بعد کسی ضروری کام کو چھوڑ کر وسیمہ کے کمرے میں دوڑی جاتی اور کبھی اس کا اُبٹن سے مہکتا چہرہ دیکھ کر مسکرانے لگتی اور کبھی اس کے زرد دوپٹے کے دامن میں منہ چھپا کر رو دیتی۔

بارات آگئی .... منیرہ نے مہتابی کی چھت پر سے دولھا کو دیکھا اور خوشی کے مارے اس کا دل اُچھل کے حلق میں آنے لگا ...... وہ دوڑی ہوئی وسیمہ کے کمرے میں گئی ...... وہاں بہت سی عورتیں جمع تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے موقع نکال کے وسیمہ کے کان میں کہا ...... آپا دولھا بھائی بڑے خوبصورت ہیں اور بہت شاندار لگتے ہیں .... پھر وہ بھاگ کر گئی اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے دولھا کو سب کے ساتھ مل کر جھانکنے لگی۔

شادی کے ہنگامے میں وسیمہ کی تیز طرار سہیلیوں نے منیرہ کو ذرا بھی دولھا سے بات کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ وہ سب کی سب نت نئے مذاق کر رہی تھیں اور ایک لمحے کو علیحدہ نہ ہوتی تھیں۔ کوئی اس سے عجیب و غریب سوال کرتی تو کوئی اس کی صورت کو ”چنڈو کا غلام“ بتاتی ...... ایک دفعہ بڑی ہمت سے وہ پان میں مرچیں ڈال کر لائی بھی تو بدقسمتی سے ظفر تک نہ پہنچ سکا اور پہلے ہی راستے چھین کر کھا گیا!

وسیمہ رخصت ہونے لگی تو بہت روئی اور منیرہ کا تو یہ حال تھا کہ اس کی ہچکیاں کسی طرح قابو میں نہ آتی تھیں۔ اُس نے آواز روکنے کے لئے دانتوں سے اپنی انگلی لہولہان کر لی مگر آنسو تھے کہ اُمڈے ہی آتے تھے۔

منیرہ کی خواہش تھی کہ وہ بھی وسیمہ کے ساتھ اس کی سسرال ہی چلی جائے۔ مگر یہاں کے بکھیڑے بھی اس کو سمیٹنے تھے۔ زیور، کپڑا سارے گھر میں یوں ہی پھیلا پڑا تھا۔ کنور رانی نے اس کو روکا کہ اس وقت تو رہنے دو۔ کل صبح تم ہی جا کر وسیمہ کو سسرال سے لانا۔ ناصر بے چارہ تو سمندر پار پڑا ہے اور بہن کو لینے کون جائے گا......

وسیمہ کے جانے سے سارا گھر سُونا ہو گیا تھا اور بے چاری منیرہ نے کروٹیں بدل کر یہ اونگھتی رات بسر کی، صبح ہوئی تو منیرہ کی بے تابی ناقابل برداشت تھی۔ وسیمہ کے لئے بہت سی مٹھائیاں اور کپڑے، دولھا بھائی کے لئے مسّی بھری ہوئی پانوں کی گلوریاں اور افشاں لے کر وہ خان بہادر ریاض احمد کی شاندار کوٹھی میں پہنچ گئی!

ظفر کی بہن اس کو ساتھ لے کر وسیمہ کے پاس گئی۔ وسیمہ زیور اور پھولوں سے لدی ہوئی کارچوبی کے سبز کپڑوں میں ایسی پیاری لگ رہی تھی کہ ظفر ابھی تک اُٹھ کر منتظر دوستوں کے پاس نہ جا سکا تھا اور وہیں قالین پر لیٹا ہوا خاصدان میں سے چھالی کے سفید دانے چُن چُن کر کھائے جا رہا تھا۔

منیرہ کو دیکھ کر وسیمہ اُٹھی تو اس کی پازیب کا ایک ایک گھونگرو بول اُٹھا اور جب وہ دونوں گلے ملیں تو ظفر کی

موجودگی نظرانداز کر کے ایک دوسرے کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے منہ چومنے لگیں......

کچھ دیر بعد دونوں کو ظفر کا خیال ہوا تو وسیمہ جھینپ کر بیٹھ گئی اور منیرہ نے اُسے سلام کیا۔ اس سے قبل کہ ظفر کچھ کہے، رفیع آ گیا اور منیرہ کو دیکھ کر چیخا "بھابی صاحبہ کون ہیں یہ؟ ذرا مجھے ان کا نام تو بتایئے...... میں انھیں خوب پہچانتا ہوں۔ انہی حضرت نے پرسوں شام مجھے مرچوں والا پان کھلا دیا تھا......

وسیمہ نے حیرت سے کہا "ارے تم منیرہ کو نہیں جانتے؟ میری بہن کو!" ظفر اور رفیع دونوں نے گھبرا کر منیرہ کو دیکھا۔ وہ بیچاری شرما کر سمٹی جا رہی تھی۔...... رفیع نے کہا "جی؟ آپ کی بہن؟" وسیمہ بولی "ہاں بھئی میری بہن منیرہ۔ تم نے بارہا اس کا ذکر مجھ سے سُنا ہے...... ابھی تک صورت نہیں دیکھی تھی؟" رفیع سر کھجا کر بولا "جی میں نے شادی کے دوران میں انھیں دیکھا تو کئی بار۔ مگر یہ خیال نہیں تھا کہ یہی منیرہ ہیں...... یہ تو قطعی آپ کی بہن نہیں لگتیں......"

"ارے کیوں؟" رفیع کی چھوٹی بہن نے بھول پن سے پوچھا۔

"ایں!" رفیع گھبرا گیا، اس بات کی تشریح اس سے ممکن نہ تھی!

"واہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ "کیوں" بس نہیں لگتیں...... تم بھی تو میری بہن نہیں لگتی ہو"

سب ہنسنے لگے۔ منیرہ کے چہرے پر بدل بدل کے سُرخ اور زرد رنگ آ رہے تھے...... اس نے بھی سب کے ساتھ ہنسنا چاہا مگر وہ نہ ہنس سکی...... اُسے ڈر ہوا کہ اس کوشش میں اُس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکل پڑیں گے رفیع جس "کیوں" کا جواب نہ دے سکا، اس کے سبب سے وہ اچھی طرح واقف تھی...... اپنا کربناک چہرہ چھپانے کو اُس نے جھک کر وسیمہ کی ساڑھی پر ٹنکا ہوا ایک ستارہ نوچ لیا اور غیر ارادی طور پر اسے دانتوں سے چبا لیا...... اس کے باشعور جذبات پر یہ پہلی ضرب تھی! لکھنؤ آ کر منیرہ کی زندگی میں ایک ہیجان آمیز تبدیلی ہوئی تھی۔ یہاں کا ماحول "سینٹ میری کونوٹ" سے بالکل جدا تھا۔ یہاں اس کا لباس، اس کا کمرہ اور اس کا رہن سہن سب اس کی اپنی مرضی پر تھا...... کلب اور سینما گھر تھے۔ شاندار بیوک اور ہموار سڑکیں تھیں! پھر ناصر اور وسیمہ کے نہ ہونے سے وہی سارے گھر کی روحِ رواں اور سارے مہمانوں کی میزبان تھی ممکن تھا کہ یہ ساری تبدیلیاں اور مصروفیتیں اس کی فطرت کو بھی ایک نیا جنم دیتیں...... اس کا نوجوان پندار اس کے شکست خوردہ بچپن کو بھلا دیتا...... مگر...... خان بہادر ریاض احمد خاں کی کوٹھی کے اس خوبصورت قالینوں اور قمقموں سے سجے ہوئے کمرے میں ایک نوجوان نے، شاید نادانستہ طور پر اُسے پرکھ کر کھوٹا کہہ دیا اور بے سوچے سمجھے اس شاخ کو توڑ ڈالا جس پہ ممکن تھا کہ اس کا آشیانہ بن جاتا۔

جب شام کو وسیمہ اور ظفر کو لے کر وہ اپنے ہاں واپس آئی تو مستی پڑے پانوں کی گلوریاں اسی طرح سے بیگ میں پڑی مُرجھا رہی تھیں اور افشاں کی ڈبیا بھی کس مپرسی کی حالت میں ایک طرف پڑی تھی...... اس کی ہمت، اس کی شرارت اور اس کی اُمنگیں ایک ہی جھٹکے سے بکھر گئیں...... آج وہ پہلے سے زیادہ بے بس ہو گئی تھی......

ایک سال اور چلا گیا بہت سے نئے پھول کھلے اور پرانے گھاؤ بھر گئے...... وسیمہ ماں بن گئی اور ناصر نے فائنل میں ناکامی کا غم بھلانے کے لئے وہیں ایک آئرش لڑکی سے سول میرج کر کے ماں باپ سے روپیہ اور معافی کی

درخواست کی...... کنور صاحب تازہ الیکشن میں جیت گئے اور کنور رانی کے سر پر بہت سے کالے بالوں نے سفید روپ دھار لیا —— مگر منیرہ...... اس کی آج اور کل میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ ماں کے لئے پان بناتی اور باپ کو اخبار پڑھ کر سناتی رہی۔ ہاں اس نے ایک پیانو خریدا اور سنسان راتوں میں بجانے لگی —— اور پھر سال کے آخر میں دسمبر کی ایک برفیلی رات کو جب وہ دیر تک کھلی ہوئی کھڑکی میں سے باغ کی طرف دیکھتی رہی تو اسے ٹھنڈ معلوم ہوئی اور جب وہ پلنگ پر لیٹی تو کھانسی کے ساتھ سینے میں درد محسوس کیا۔

خدا جانے کتنی راتیں ایسی آئی اور گئی ہوں گی جب وہ یوں ہی بے کیف ہو کے کھڑکی میں کھڑی رہی اور اسے سردی کا احساس ہوتا رہا...... جب وہ مہتابی پر لیٹی اوس میں بھیگتی رہی اور اس کا رواں کانپتا رہا۔ مگر یہ رات...... ہونی شدنی تھی۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں پر ٹھنڈ کا اثر ہوا اور نمونیہ کی زد میں آ کر زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑ گئی۔

موت کی نمائندہ وہ شدت کی ٹیس تھی جو ہر سانس کے ساتھ بجلی کی طرح سینے میں کوند رہی تھی۔ اور اللہ کے بھروسے پر زندگی کے لئے کوشاں بوڑھے ڈاکٹر حفیظ تھے جو پلنگ کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے اور گھنٹوں کے حساب سے اس کے تپتے ہوئے بازوؤں میں پنسلین کی سوئیاں پیوست کئے جا رہے تھے۔

چوبیس گھنٹے اسی طرح گزرے...... کنور صاحب دبے پاؤں کھڑکی تک آ کر اندر جھانکتے اور کرب ناک حالت میں پھر ٹہلنے لگتے۔ کنور رانی حتی الوسع سارے صدقے، خیرات اور منتیں کر کے اب خدا کے سامنے سربسجدہ تھیں۔ وسیمہ اپنے نوزائیدہ بچے کو بھول کر دونوں ہاتھوں میں سر تھامے، منیرہ کی پٹی سے لگی فرش پر بیٹھی تھی۔ اور زین کی ہر آہ پر اس کی رگوں میں تھرتھری پیدا ہو جاتی تھی... ظفر کی جیپ لمحے لمحے پھر دواؤں کی ضرورت پر یہاں سے وہاں دوڑ رہی تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب کے چہرے سے تذبذب کے آثار کسی طرح نہ بدلتے تھے۔

چوبیس گھنٹے ہو گئے تو بوڑھا ڈاکٹر اپنی جگہ دوسرے ڈاکٹر کے سپرد کر کے باہر نکلا اور کنور صاحب سے کسی قدر مسکراتے ہوئے بولا "کنور صاحب میں بیٹی کی صحت یابی کی نہیں بلکہ اس کی نئی زندگی کی مبارک باد دے رہا ہوں.... آپ خوش نصیب ہیں"

موت ٹل گئی اور زندگی پھیلنے لگی۔ کنور صاحب آرام کرسی پر لیٹ گئے۔ کنور رانی نے سجدے سے اٹھ کر شکرانہ ادا کیا۔ وسیمہ کو اپنے بھوک سے بلکتے بچے کا خیال آیا اور ظفر نے صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر سگرٹ سلگائی۔

منیرہ کی بے ہوشی اب ٹوٹ چکی تھی اور وہ نسبتاً آرام سے سو رہی تھی ——"

ڈاکٹر حفیظ چوبیس گھنٹے جس جاں بلب مریضہ کو تکتے رہے تھے اور جسے وہ اب صبح و شام آ کر دیکھتے تھے وہ لڑکی انھیں ایک معمہ سی لگتی تھی۔ ڈاکٹر کو حیرت تھی کہ منیرہ نے اپنی بیماری میں ذرا بھی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ جب اسے ہوش آیا، وہ چپ چاپ آنکھیں بند کر کے پڑی رہی...... جب ڈاکٹر نے اسے صحت یابی کا مژدہ سنایا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر بھی نہیں آئی...... اس نے ایک دفعہ بھی کڑوی دوا پر منہ نہیں بنایا۔ ایک بار بھی ڈاکٹر سے نہیں پوچھا کہ یہ بازو چھلنی کرنے والے انجکشنوں کی انتہا کب ہوگی —— اور ایک دن جب کمرے میں ان کے اور منیرہ

کے علاوہ کوئی نہ تھا...... ڈاکٹر صاحب اپنی حیرت کا اظہار کر ہی بیٹھے۔ انھوں نے کہا "منیرہ، تمھیں نہیں معلوم کہ تم کیسی خطرناک حالت میں ایک دن ایک رات پڑی رہیں۔ تمھارے گھر والے کیسے پریشان تھے...... اور میں...... یہاں اسی کرسی پہ بیٹھا ہوا...... تمھیں تک رہا تھا...... مجھے نہیں معلوم کہ دن کب نکلا اور رات کب آئی...... مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اس مرض کو سہار لوگی... مگر تم...... ایسا لگتا ہے کہ تمھیں اپنی صحت پہ نہ حیرت ہوئی نہ مسرت...... کیا تمھیں اپنی زندگی عزیز نہیں؟"

منیرہ نے سر اٹھا کر لمحہ بھر ڈاکٹر کا چہرہ غور سے دیکھا...... پھر آنکھیں جھکا لیں اور آہستہ سے کہا: "ڈاکٹر صاحب زندگی میں کیا ہے جس سے پیار ہو...... میرا مطلب اپنی زندگی سے ہے۔"

بوڑھے ڈاکٹر نے چونک کر بغیر پلک جھپکائے تعجب سے اس نوجوان لڑکی کو دیکھا...... جسے آرام دہ گھر اور شفیق ماں باپ نصیب تھے۔ جس نے اچھی تعلیم پائی تھی اور جس کے آگے طویل زندگی کی ان گنت سیڑھیاں چڑھنے کو تھیں...... "زندگی میں کیا ہوتا ہے جو تمھاری زندگی میں نہیں؟"

منیرہ کے لئے اس بات کا جواب دینا کچھ بہت آسان نہ تھا۔ اس نے چھت میں آویزاں بجلی کے قمقمے کو دیکھا اور پھر گردن نیچی کر کے کشمیری غالیچے کے پھول شمار کرنے لگی۔

ڈاکٹر نے منیرہ کے چہرے پر جذبات کی کشمکش دیکھی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے شانے کو پیار سے تھپکا: "منیرہ میں مختلف بیماریوں کا علاج کرتا ہوں...... بہت سے زخم بہت سے ناسور میرے ہاتھوں اچھے ہوگئے۔ بہت سے مریضوں کو درد اور تکلیف کی حالت میں میرے ہاتھوں سکون پہنچا...... مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر کے علاوہ میری انسانیت کی بھی کوئی وقعت ہے یا نہیں...... مگر تم سمجھ سکتی ہو...... اور تم ہی بتا سکو گی کہ کیا میں تمھاری مدد کرنے کا اہل ہوں یا نہیں...... تم اپنی زندگی سے بیزار کیوں ہو......"

ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ کے نیچے منیرہ کے شانے میں کپکپاہٹ محسوس کی اور دیکھتے ہی دیکھتے منیرہ کے زرد رخساروں پہ آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی...... "ڈاکٹر۔ بے مقصد زندگی کی بھی کوئی قیمت ہو سکتی ہے...... آپ کی زندگی کا نصب العین بہت بلند ہے۔ آپ ایک بے مصرف زندگی کی بے کیفی کا اندازہ نہیں لگا سکتے......"

ڈاکٹر حفیظ کے بوڑھے چہرے پر مطمئن مسکراہٹ جھلکی۔ "بس یہی بات ہے؟ تم نے اپنی خوش نصیبی کا بھی احساس کیا کہ تمھیں اپنی زندگی کی قدر ہے اور اس کی تضیع پر تمھیں رنج ہوتا ہے۔ تم کچھ کرنا چاہتی ہو اور اپنی بے کاری پہ غمزدہ ہو...... جب تمھیں اپنا مرض معلوم ہے تو علاج کیوں نہیں کرتیں اس کی دوا بھی تمھارے پاس ہے۔"

منیرہ نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا اور چہرے پہ امید و بیم کی لہریں لپکیں۔ ڈاکٹر نے کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر نظریں جما لیں جیسے نیلے آسمان پہ منیرہ کا مستقبل لکھا ہو اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگے: "تم ایک نوجوان عورت ہو...... ایک اچھی بیٹی کے فرائض ادا کرتی ہو اور اب...... جب کہ فطرتاً تمھارے مطالبات بڑھ رہے ہیں تو تم ایک کامیاب بیوی اور قابلِ فخر ماں بن سکتی ہو۔ تم اپنا گھر اپنے ہاتھوں سنوارو گی اور یقیناً وہی شخص تمھارا ساتھی ہوگا جسے تمھارے دل نے پکارا ہو...... اور......"

منیرہ کے چہرے پہ زردیاں کھنڈنے لگیں۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا: "بس ڈاکٹر......"

ڈاکٹر نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "اور اگر تمھارے عزائم اس سے بھی بڑھ کر ہیں، تمھاری ہمت اس سے بھی زیادہ ہے، تم اپنی ذمہ داریاں لامحدود چاہتی ہو...... تو تم ڈاکٹر کیوں نہیں بنتیں.... لیڈی ڈاکٹر......"

"لیڈی ڈاکٹر؟" منیرہ کے منہ سے چیخ کی طرح نکلا۔

"ہاں" ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا "بشرطیکہ تم اپنی زندگی سے اپنا اور اپنوں کا حق نکال لو..... تمھارے دن اور تمھاری راتیں پھر آرام دہ گھر اور خوش باش گھر والوں کی نہیں بلکہ روتے بلکتے مریضوں اور بیماروں کی ہوں گی...... اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اپنے فرائض کا احساس رہا تو تمھاری زندگی کا ہر لمحہ انمول ہو جائے گا......"

شدتِ جذبات سے اس کا سانس چڑھنے لگا۔ "مجھے ایسی ہی زندگی کی تمنا ہے ڈاکٹر..... میں اپنی زندگی میں اپنا کوئی حق نہیں چاہتی..." پھر دفعتہً وہ چونکی "مگر ڈاکٹر میں نے تو کبھی بھی سائنس نہیں لی..... میں نے تو سنیئر کیمبرج میں آرٹ اور ہسٹری لی تھی......"

ڈاکٹر حفیظ ہنسنے لگے "تم نے جو کچھ نہیں سیکھا، وہ اب سیکھ لوگی..... پانچ سات برس ابھی تمھارے لئے اہم نہیں اور منیرہ ایک سمجھدار ڈاکٹر سے ایک خدمت شعار نرس کسی طرح کم نہیں ہوتی...... تم بڑی اچھی نرس بن سکتی ہو۔ اگر تم چاہو تو میڈیکل کالج میں پڑھنے کے علاوہ شام کو چھ بجے سے آٹھ بجے تک میرے نرسنگ ہوم میں آیا کرو۔ ایک گھنٹے تک اسٹاف نرس کی مدد کرنا اور ایک گھنٹے تک میری کلاس میں لیکچر لینا...... تمھیں اس سے بڑی مدد ملے گی..... بولو تیار ہو؟"

"بالکل تیار ہوں" منیرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اگر میں ڈاکٹر نہ بن سکی تو کم از کم آپ کے نرسنگ ہوم کی نرس تو بن جاؤں گی"

اور منیرہ ڈاکٹر حفیظ کے نرسنگ ہوم کی نرس بن گئی! وہ لیڈی ڈاکٹر نہیں بن سکی۔ اس نے کبھی سائنس نہیں پڑھی تھی۔ اور کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے لئے کچھ نہیں پا سکے گی۔ تو اسے یوں دوسروں کے لئے وقف کرنا ہوگا..... اسے میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں مل سکا مگر ڈاکٹر حفیظ کے نرسنگ ہوم کے دروازے کھلے ہوئے تھے منیرہ نے ہلکے نیلے رنگ کی "بوک" سے گہرے نیلی جارجٹ کے پردے نوچ پھینکے اور شکور ڈرائیور سے موٹر چلانا سیکھنے لگی....... وہ روز صبح کو نرسنگ ہوم میں اسٹاف نرس کے ساتھ زخمیوں اور مریضوں کی تیمارداری کرتی اور شام کو ڈاکٹر حفیظ کے لیکچر سنتی...... کنور رانی کو اس بات پر ناگواری بھی تھی اور پریشانی بھی...... ان کی بے حد خواہش تھی کہ جلد سے جلد منیرہ کی شادی سے فارغ ہو جائیں اور کسی طرح اپنے اس نامعلوم خوف سے نجات پالیں جو منیرہ کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں پیدا ہوا تھا اور جس کا واحد حل منیرہ کی شادی تھا...... وہ اس پر بھی آمادہ تھیں کہ اگر ان کے بھائی محمود میاں اپنے اس بیٹے کا رشتہ بھیجیں جو منیرہ سے چند ماہ بڑا تھا، تو فوراً ہی منظور کر لیں گی۔ اور اگر مظفر کا چھوٹا بھائی رفیع جو اب انجنیئر ہو گیا تھا، جھوٹے کو بھی رشتہ چاہے تو قاضی کا بھی انتظار نہ کریں گی۔ مگر ——— محمود میاں کی دلہن نے چھوٹے بیٹے کا رشتہ بھی اپنے میکے میں طے کر لیا تھا۔ اور رفیع آج کل کسی اینگلو انڈین حسینہ کے فراق میں دیوانے ہو رہے تھے! کنور رانی یک لخت خاموش ہو گئیں اور منیرہ اطمینان سے موٹر ڈرائیو کر کے نرسنگ ہوم جانے لگی......

کنور صاحب بھی بچّوں کی طرف سے عجیب قسمت لائے تھے۔ ایک ہی بیٹا اور وہ بھی ہاتھ سے نکلا سمجھئے۔ ناصر میاں آخر کار گریجویٹ ہونے کا ارادہ ترک کر کے ہندوستان آ گئے تھے اور مسز ایڈنا ناصر بھی ہمراہ تھیں! وہ بیوی کو لے کر لکھنؤ آتے اور ممکن تھا کہ اکلوتی بہو کو ساس سسر گھر کی رونق سمجھتے۔ مگر مشکل یہ آ پڑی کہ مسز ایڈنا ناصر ہندوستانی لباس پہننے کی نسبت اپنے عاشقِ زار کو تڑپتا چھوڑ کر ولایت لوٹ جانا بہتر سمجھتی تھی۔ اور کنور رانی سے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ عزیزوں اور دوستوں میں ایسی بہو سامنے کر سکیں جو وسیمہ کی دو سالہ بیٹی نعیمہ کی طرح ایک مختصر نیکر اور ٹنگا قمیص ہی اپنے لئے کافی سمجھتی ہو۔ اور کپڑے میں کفایت کے لئے نہ صرف دوپٹہ اور پاجامے سے نالاں ہو جائے بلکہ اکثر و بیشتر ایسے فراک پہنے جو نہ صرف آستینوں بلکہ شانوں سے بھی عاری ہوں۔ کنور رانی تو ڈوبی جا رہی تھیں اور خدا نے بڑا فضل کیا کہ ناصر میاں کو دہلی میں فوراً ہی اچھی خاصی ملازمت مل گئی اور وہ دولہن کو لے کر چلے گئے ورنہ اور رنگ میں بھنگ مچتی۔

وسیمہ کی طرف سے یوں تو ماں باپ کو اطمینان تھا کہ وہ اپنے گھر خوش ہے، میاں قدر دان ہے، مگر وسیمہ کی صحت نے گھر والوں کے دل ڈبا دیئے تھے۔ وہ شروع سے دھان پان سی کمزور لڑکی تھی اور آئے دن کے زچہ خانوں سے اس کا حلیہ اور بگڑ گیا تھا۔ ہر سال دسمبر کا مہینہ ایسا تھا کہ کسی کی آئی ٹل جائے مگر وسیمہ کا بچہ نہ ٹلے...... ایک کی زبان نہیں کھلی۔ دوسرے نے پاؤں اٹھانا نہیں سیکھا اور تیسرا خیر سے گود میں آ گیا۔ بے چاری لڑکی انیمیا میں مبتلا تھی اور اکثر اختلاجِ قلب کی شکایت رہتی۔ ..... بیٹی کی یہ کیفیت دیکھ کر کنور رانی کو نواسہ نواسی بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ اب رہی منیرہ تو اگر وہ شریف گھر کی لڑکیوں کی طرح دو بول پڑھ کر اپنا گھر بسا لیتی تو شاید ماں باپ کے سر سے کوئی بار ٹل جاتا۔ مگر اس نے تو ڈھنگ ہی دوسرا بنا لیا تھا۔ اس کا ارادہ شادی بیاہ کا نہیں تھا ——— کنور رانی اکیلے میں میاں سے کہتیں کہ میری زندگی تو اوّل ہی عذاب تھی مگر اس کنواری بیٹی کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ مری تو قبر میں بھی چین نہ ملے گا۔ خدا کے لئے منیرہ کو سمجھاؤ کہ یہ شریف بیٹیوں کا طریق نہیں، ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے یہ کام نہیں کیا ہے۔ خدا کی شان ہے کہ جن بچّوں کو چھینک بھی آتی تو ہم نے بیسیوں حکیم ڈاکٹر جمع کر لئے، اب وہی بچے دوسروں کی اچھی بُری بیماریوں میں ہاتھ ڈالیں۔ دنیا بھر کا ناک تھوک صاف کریں اور پھنسی پھوڑوں کو چھوئیں۔ کیا ہماری مرضی اولاد کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی ؟

کنور صاحب منیرہ کے لئے کوئی اور راستہ سمجھتے تو اس کو بھی سمجھاتے۔ اس راستے پر آ کر منیرہ یہ بھول گئی تھی کہ کبھی اس نے خود کو پابند بھی محسوس کیا تھا ——— حالانکہ اس کی منزل کوئی نہ تھی مگر سفر کی گھما گھمی میں اس نے پیچھے دیکھنا اور آگے سوچنا چھوڑ دیا۔ جرمن ڈیزائن کے مکلف گھر میں چپ چاپ رہنے والی لڑکی اب ڈاکٹر حفیظ کے بیماروں اور کراہٹوں سے بھرے ہوئے نرسنگ ہوم میں ہمیشہ مسکراتی رہتی۔ یہاں وہ کنور صاحب کی بیٹی اور وسیمہ کی بہن نہیں تھی۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ننھیال کی طرف سے پُشت پیچھے ان کا خاندان یوسفؑ سے جا ملتا تھا اور گھر والے شاکی تھے کہ اس نے خود کو اس وراثت کا اہل کیوں نہیں قرار دیا ——— مگر ——— یہاں اس کی اپنی ذاتی شخصیت تھی..... ذاتی وقار تھا اور اس کی اپنی معصوم اور مہربان مسکراہٹ تھی....

منیرہ کی وہ جوانی بھی اپنی تھی جو نینی تال کے اونچے پہاڑوں میں جنم لے کر گھر کی محبوس فضا میں اونگھتی رہی اور اب اس نئے ماحول میں چونک کر منیرہ کے گرد لپٹ گئی تھی۔

پُر بہار چمن میں جس کلی کو آپ نے نظر انداز کر دیا ہوگا، وہ ضروری نہیں کہ گریباں کے کاج میں سج کر بھی آپ کو بے رنگ و بو معلوم ہو...... سپید لباس میں پُروقار انداز اور مہربان مسکراہٹ کے ساتھ قدم رکھتی ہوئی منیرہ خدا جانے کتنوں کے دُکھ محض اپنی آمد سے مٹا دیتی تھی۔ چھوٹے بچوں میں وہ خاص طور سے مقبول تھی۔ پریشان مائیں اپنے بچوں کو ہنستا کھیلتا دیکھنے کے لئے منیرہ کی ڈیوٹی کا انتظار کرتیں اور بہت سے مریض کڑوی دواؤں کو اس کی میٹھی تسلی کے ساتھ خوشی سے پی جاتے......

اب منیرہ کو اپنے خواہ مخواہ دنیا میں آنے کا رنج نہ تھا اور نہ عمر کے بے مصرف گزرنے کا غم! ڈاکٹر حفیظ نے اس کے بیمار جسم کے ساتھ ہی اس کے ماؤف دماغ کا بھی مداوا ڈھونڈھ لیا تھا...... اور یہ جب کی بات تھی کہ دل کا معاملہ زیرِ بحث نہ آنے پایا تھا...... وہ بیچارہ تو سہما ہوا کسی کونے میں پڑا لرزتا تھا...... اس میں دھڑکنے اور گنگنانے کی سکت کہاں تھی...... نہ منیرہ نے کبھی یہ سوچنے کی جرأت کی کہ اس کی دنیا اتنی پُراسرار اور رنگین بھی ہو سکتی ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہ بات کبھی بھی دل کی گہرائیوں سے اُٹھ کر دماغ کی رسائیوں میں نہ گونجتی۔ اگر تقدیر کا ہاتھ اتنا جابر نہ ہوتا اور ناگہانی مشیت اپنے کھیل کی شائق نہ ہوتی......

وہ ایک خنک رات تھی جب اندھیرا چھانے ہی کہرے کے بادل اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے تھے۔ اور سڑکوں پہ ٹمٹمانے والے قمقموں کی زرد روشنی دودھیا لپیٹ میں اور زیادہ پھیکی اور محدود ہو گئی تھی —— منیرہ نرسنگ ہوم سے گھر آ رہی تھی...... پیچھے کی سیٹ پر شکور اُونگھ رہا تھا اور وہ خود گاڑی چلا رہی تھی...... یہ وہی ہلکے نیلے رنگ کی بیوک تھی جس کے گہرے نیلے پردے منیرہ نے اُتار ڈالے تھے اور جسے گذشتہ دو سال سے وہ ڈرائیو کر کے اپنے گھر سے نرسنگ ہوم جایا کرتی تھی...... یہ وہی بیوک تھی جسے آج سے سات آٹھ سال پہلے کنور صاحب نے وسیمہ کی پسند پر خریدا تھا۔ اور ایک رات سینما سے واپسی پہ مڈگارڈ توڑنے کے جرم میں ظفر کو وسیمہ کے حضور جواب دہ ہونا پڑا تھا...... اسی موٹر نے ایک خنک اور دھندلی رات میں منیرہ کی راہ میں بھی کسی کو لا ڈالا!

آج رات جب منیرہ روتے سسکتے مریضوں کے بجائے ایک ہنستی گاتی محفل سے لوٹ رہی تھی تو اس کا دل ہمیشہ سے کہیں زیادہ ویران اور پژمردہ تھا۔ آج جب کہ وہ ایک اسٹاف نرس جولیا کی شادی میں شرکت کر کے آ رہی تھی، تو لپکتی موٹر سے ٹکرا کر آنے والے سرد ہوا کے جھونکے اس کی رگوں میں نشتر چبھو رہے تھے اور اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ ہاتھ بڑھا کر شیشے چڑھا دے۔

پچھلے دو سال سے جب شام کو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے وہ تھکی ہاری گھر لوٹتی تو اس کے دل میں ایک خود اعتمادی اور عزتِ نفس کا احساس ہوتا، اُسے اپنے وجود پر پیار آتا کہ آج اس نے کتنے روتے چہروں کے آنسو پونچھے، کتنے رِستے زخموں پر مرہم لگائے اور کتنی شکر گذار نظریں اپنے چہرے پر مرکوز دیکھیں...... اس کے بعد اُسے یہ سوچتے بھی شرم آتی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دُکھ ہے...... یا ہو سکتا ہے...... مگر اس رات!!......

ڈاکٹر حفیظ نے جولیا کو رخصتی دعوت دی تھی۔ وہ شادی کر کے اپنے خاوند کے ساتھ جا رہی ہے...... یہ وہی نرس تھی جسے دو سال پہلے ڈاکٹر نے منیرہ کا ہاتھ تھمایا تھا۔ اور کہا تھا "جولیا۔ یہ لڑکی زندگی کی جویا ہے" اور جولیا منیرہ کا ہاتھ پکڑ

کے دو سال تک اوروں کے غم میں اس کے لئے مسکراہٹ چنتی رہی اور منیرہ کو ایسا لگتا تھا کہ اب وہ اور جولیا اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ اس شاہراہ کے کانٹے چنتے چنتے اپنی منزل پر پہنچ جائیں گی اور آخری دم ان کے دل کو یہ سکون ہوگا کہ انھوں نے ان گنت تلوے چھلنی ہونے سے بچا لئے ...... مگر جولیا کی راہیں مختلف نکلیں ...... اس کی منزل اور تھی اور ساتھی بھی اور مل گیا!

ڈاکٹر حفیظ نے نرسنگ ہوم میں جولیا کو الوداعی دعوت دی ..... منیرہ بھی موجود تھی، سب ہنس بول رہے تھے. گا رہے تھے اور منیرہ کے دل میں یہ احساس چٹکیاں لے رہا تھا کہ زندگی طویل ہے اور راہیں ان گنت ہیں ...... ساتھی بھی مل جاتا ہے اور بعض تڑپ تڑپ کر تنہا بھی مر جاتے ہیں ...... زندگی مسکراہٹ بھی ہے اور آنسو بھی ...... جس کے نصیب میں جو بھی آجائے!!

پھر اس کے نصیب نے ایک خلا ...... بے کیفی اور تنہائی کا جہنم اس کے سامنے کھول دیا اور اس ہنستی بولتی محفل سے لوٹتے ہوئے اس کا دل ہمیشہ سے کہیں زیادہ ویران تھا اور یخ بستہ انگلیاں اسٹیرنگ وہیل پر بے جان شکنجے کی طرح کسی ہوئی تھیں ...... میونسپلٹی کے کمزور بلب کہرے کے دھندلکے میں اور بھی سسک رہے تھے اور سنسان سڑک کو تکتے تکتے تھک کر منیرہ کی پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ یہ دو چار میل کا رستہ جو روز پلک جھپکتے گزر جاتا تھا، آج پلکوں کو جھپکائے دیتا تھا۔

تاہم وہ شکور کی طرح اونگھی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں اور اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھوں کی گرفت بھی مضبوط تھی —— پھر کیا ہوا ...... منیرہ کو معلوم نہیں ...... سڑک پر کوئی راہ گیر نہ تھا۔ موٹر کی سرچ لائٹ کے ساتھ دوڑتی ہوئی نگاہوں نے کسی متنفس کو نہیں دیکھا اور پھر بھی ...... سیمنٹ کی چکنی سڑک پر پھسلتی ہوئی بیوک نے جھٹکا کھایا اور فضا میں ایک دلدوز انسانی چیخ گونجی!!

"کیا ہوا؟" شکور اپنی غنودگی سے چونکا۔

منیرہ نے پوری طاقت سے بریک مارتے ہوئے کہا، "اللہ جانے!"

لرزتے ہاتھوں سے بمشکل پٹ کھولا اور لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے دوڑی جہاں چند گز کے فاصلے پر انسانی کراہٹ سنائی دے رہی تھی —— کلبلاتے ہوئے سیاہ دھڑ پر جھک کے منیرہ نے فرطِ خوف سے، دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھپا لیا۔ لیمپ پوسٹ کی کجلائی روشنی میں اس نے ایک زرد چہرے کے علاوہ سڑک پر بل کھاتی ہوئی خون کی پتلی سی دھار بھی دیکھی۔

"یا اللہ یہ کیا ہوگیا!" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

شکور نے جھک کر اُسے ٹٹولا "بی بی۔ یہ تو مر گیا بے چارہ"

تڑپ کر منیرہ سڑک پر دوزانو ہو گئی اور کانپتے ہاتھوں سے اس کی کلائیاں تھامیں ...... اس کے بعد وزنی اوورکوٹ میں اس کے دل کی دھڑکنیں ڈھونڈنا چاہیں ...... وہ یکبارگی چیخا "اُفوہ ...... ہائے ہائے ...... چھوڑ دو"

کہ صرف کہنی پر سے ہڈی ٹوٹی ہے اور باقی محض گوشت پھٹ گیا ہے۔ ہم صبح آپریشن کر کے ہڈی جوڑ دیں گے ...... فی الحال زخم صاف کر کے خون روک دیا جائے ...... کیوں منیرہ ؟"

"جی ہاں ..... مگر یہ بے ہوش کیوں ہو گیا ہے ڈاکٹر ؟" منیرہ نے بغیر ارادہ کئے سوال کر ڈالا۔

ڈاکٹر حفیظ نے تعجب سے منیرہ کو دیکھا۔ "شاید دو ماہ بعد آپ کو جنرل ہسپتال جا کر نرسنگ کا امتحان دینا ہے منیرہ بیٹی! خیریت ہے کہ مر نہیں گیا ...... بڑا جانباز ہے جس نے تمہاری لحیم شحیم موٹر کا مقابلہ کیا اور محض ایک بازو پر بنی ..... اگر کہیں آپ کا پہیہ اس کی گردن سے گزر جاتا ؟"

ڈاکٹر حفیظ کے مذاق کا منیرہ ذرا بھی لطف نہ لے سکی۔ یوں ہی انگلیاں چٹخاتے ہوئے اس نے پھر پوچھا: "یہ ٹھیک ہو جائے گا نا ؟"

ڈاکٹر حفیظ نے کہا: "اپنے دل سے پوچھو ..... تم نے کیسے کیسے زخمیوں کی تیمارداری کی ہے"

منیرہ کا دل آج پہلی بار اس کے اختیار میں نہ تھا ...... نہ وہ اس شدت سے کبھی دھڑکا تھا اور نہ منیرہ نے دماغ کو دل سے آج کی طرح ہار مانتے پایا تھا ..... وہ خاموشی سے ڈاکٹر حفیظ کے ساتھ اس بے ہوش زخمی کی مرہم پٹی کراتی رہی اور بار بار امڈ آنے والے آنسوؤں کو دوپٹہ میں جذب کرتی گئی ..... خون بند ہو گیا مگر بہت سا خون تو ضائع ہو چکا تھا اور مریض کا جوان اور بھرا ہوا چہرہ لاش کی طرح سفید نظر آ رہا تھا ...... منیرہ نے ڈاکٹر کی نظر بچا کے دو تین مرتبہ اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹایا ..... ڈاکٹر کی نظر بچا کے ...... جانے کیوں۔ حالانکہ نرسنگ ہوم میں اس نے بہت سے کمزوروں اور زخمیوں کے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھایا تھا ..... مگر آج اُسے یہی بات "محض فرض" سے کچھ مختلف لگ رہی تھی۔

جب تک نیاز کو ہوش نہیں آیا، ڈاکٹر حفیظ وہیں کمرے میں بیٹھے منیرہ سے باتیں کرتے رہے، ایک دفعہ انھوں نے منیرہ سے کہا "مجھے خوب یاد ہے کہ آج کی طرح تم اس دن بھی ہراساں اور بدحواس نہ تھیں جب تمھیں نمونیہ ہو گیا تھا..."

منیرہ بولی "ڈاکٹر صاحب جان دینا جان لینے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے ...... اگر اسے کچھ ہو گیا تو میرا ضمیر عمر بھر مجھے ملامت کرتا رہے گا ..... میں کبھی آپ کے نرسنگ ہوم میں قدم نہ رکھوں گی"

ڈاکٹر حفیظ نے بڑا عظیم الشان قہقہہ لگایا ..... نیاز نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ اور اضطراب آمیز تعجب سے ڈاکٹر حفیظ اور منیرہ کو دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کرسی پلنگ کے نزدیک کھینچ کر اس کی نبض پر انگلیاں رکھیں اور بولے "میں ڈاکٹر ہوں ...... یہ لڑکی نرس ہے ...... اور ابھی یہ لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اگر تم اچھے نہ ہوئے تو عمر بھر اس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا رہے گا اور وہ پھر کبھی میرے نرسنگ ہوم میں کام نہیں کرے گی! لہٰذا میں تم سے اپیل کروں گا کہ جلدی سے اچھے ہو جاؤ"

نیاز نے گردن گھما کے سرہانے کھڑی ہوئی منیرہ کو دیکھا جو سٹپٹا کے اپنا ہونٹ چبا رہی تھی۔

"مجھے کیا ہو گیا ہے ؟" نیاز نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"تمہیں خود تو کچھ نہیں ہوا" جولیا کی شادی میں شرکت کرکے ڈاکٹر کا مزاج بہت شگفتہ ہو گیا تھا۔ بولے "البتہ ایک اناڑی ڈرائیور نے تمھارا بازو کچل دیا ہے ۔ ۔ تم ٹھیک ہو جاؤ تو پھر اس لڑکی پر مقدمہ ضرور چلانا ـــــ"

نیاز نے دوبارہ گردن پھیر کر منیرہ کو دیکھا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے منیرہ کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ وہ پلک جھپکائے بڑے غور اور تعجب سے منیرہ کو دیکھ رہا تھا ـــ

ڈاکٹر حفیظ مصنوعی غصے کے ساتھ کرسی سے اٹھے "ارے رے لڑکی تو رو کر دکھاتی ہے کہ بیچارہ شکایت تک نہ کرے" انھوں نے منیرہ کا سر پکڑ کر ہلایا، نیاز کو ایک خواب آور مکسچر پلا دیا اور جاتے وقت منیرہ سے پوچھا "کسی نرس کو بھیجوں؟"

منیرہ نے کہا "کیا میں نرس نہیں ہوں ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر صاحب بولے "تو پھر یاد رکھو، نرس کا کام آنسو بہانا نہیں بلکہ رونے والے کو مسکرانے کا موقع دینا ہے"

نیاز کا ٹمپریچر دیکھ کر اسے سونے کی ہدایت کرتے ہوئے ڈاکٹر حفیظ صبح آنے کا وعدہ کرکے چلے گئے ...... نیاز فوراً سو گیا..... صبح تک سوتا رہا ـــ منیرہ پلنگ کے برابر کرسی پر بیٹھی، آنکھیں پھاڑے اس کا مضمحل چہرہ تکتی رہی.... اور وقت گزرتا گیا۔

منیرہ کی زندگی میں یہ رات بڑی عجیب اور صبر آمیز تھی۔ یوں تو اسے کچھ دن ہوئے نرسوں کی کمی کے سبب ڈاکٹر حفیظ کی خواہش پر ان کے نرسنگ ہوم میں رات کی ڈیوٹی بھی لینی پڑی تھی اور اس نے کئی راتیں طویل و عریض وارڈ میں گھوم کر گزاری تھیں...... اور ان دنوں وہ اپنی ساتھی نرس سے کہتی رہی کہ "بھئی اللہ کیسے جاگ لیتی ہو تم لوگ؟" اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنا تھرماس کھول کر ایک پیالہ تلخ کافی کا پی لیتی تھی اور اس ڈر سے کرسی پر نہ بیٹھتی تھی کہ بیٹھتے ہی نیند نہ آ جائے.... آج رات جب کہ وہ بالکل تنہا تھی، نرسنگ ہوم کے ماحول کی طرح یہاں کوئی آواز، چیخ اور کراہٹ کی نہ تھی! اس کا مریض مکسچر کے اثر سے سو رہا تھا، یا بہت سا خون بہہ جانے کے باعث غافل تھا...... وہ بہر حال منیرہ کے پلنگ پر آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ اس کا زخمی بازو پٹیوں سے جکڑا ہوا پہلو میں پڑا تھا اور دوسرے ہاتھ کو اس نے سینے پر اس طرح رکھا تھا کہ منیرہ کرسی پر نیم دراز ہو کے محض ہاتھ کی خفیف جنبش سے اس کے سانس کی آمد و رفت شمار کر رہی تھی.....

کنور رانی سونے کو چلی گئی تھیں..... کنور صاحب نے بمشکل ان کو بھیجا تھا..... انھوں نے کہا...... منیرہ سے غلطی ہوئی ہے، اسے خمیازہ بھگتنا چاہیئے...... اور بہر حال وہ نرسنگ سیکھتی ہے، کسی بھی مریض کی دیکھ بھال اس کا فرض ہے۔ کنور رانی چلی گئیں تو کنور صاحب منیرہ کو سمجھاتے رہے کہ موٹر چلاتے وقت ڈرائیور کے فرائض کیا ہوتے ہیں اور کن امور کا خیال اشد ضروری ہے...... منیرہ سنتی رہی..... پھر کنور صاحب بھی یہ کہہ کر چلے گئے کہ "ضرورت ہو تو مجھے فوراً جگا لینا......"

منیرہ نے اٹھ کر اس بدقسمت اوورکوٹ کو دیکھا جو بہت عمدہ اور قیمتی تھا۔ اور جس کے چند گھنٹے قبل وہ بڑی بے دردی سے چیتھڑے کر چکی تھی..... خون آلود آستین اس نے سیلابچی میں ڈال دی اور باقی حصے کی تلاشی لینے لگی.....

ایک جیب میں سے چاندی کا سگریٹ کیس اور لائٹر ملا ...... دوسری جیب میں پارکر قلم، رومال اور دھوپ کا چشمہ تھا جس کا ایک شیشہ اس حادثے کی نذر ہو چکا تھا۔ اندر کی جیب میں چمڑے کا پرس تھا جس میں چند نوٹ تھے۔ کچھ ریزگاری تھی۔ ایک اس کا اپنا فوٹو تھا اور ایک رسید تھی جس پر اس کا نام لکھا تھا ”نیاز احمد خاں“۔

”نیاز احمد“ منیرہ نے آہستہ سے کہا اور اس کی جیبوں سے نکلا ہوا سامان پلنگ کے سرہانے میز پر رکھ دیا۔ کچھ دیر یوں ہی خواہ مخواہ کمرے میں ٹہلتی رہی۔ پھر کرسی کھسکا کر پلنگ سے ملا دی۔ پائنتی سے اپنی رضائی اٹھا کر کمبل کے اوپر آہستہ سے پھیلائی اور سبز رنگ کے بلب والا لیمپ روشن کر کے بجلی گل کر دی ...... کمرے میں سکون پرور سبز روشنی پھیل گئی۔

دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر منیرہ نے اس کی پیشانی کو چھوا ...... جسم سرد تھا ...... چلو خدا کا شکر ہے کہ بخار نہیں ہوا ورنہ سیپٹک کا ڈر تھا ...... ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ جگا کر پانی دینا تو غلط ہے ...... ڈاکٹر نے تو اٹھا کر دوا پلانے کو بھی منع کر دیا ہے ...... اس لئے یوں ہی رہنے دو ...... چہرہ اور گردن کو سردی تو نہیں لگ رہی ہو گی ...... کہیں کمبخت ٹھنڈ اور نہ ہو جائے۔ منیرہ نے اپنی گردن سے شال اتار کر بڑی احتیاط سے اس کا سر، گردن اور شانے ڈھک دیئے۔ الماری سے گرم چادر نکال کر اپنے گرد لپیٹی اور کرسی پر نیم دراز ہو کر اس کو دیکھنے لگی ...... کون ہے یہ؟ کون ہے بے چارہ؟ کون ہے یہ نوجوان ...... میرے راستے میں کیسے آ گیا ...... ؟

علی الصبح نیاز نے آنکھ کھولی ...... زخمی بازو اٹھانا چاہا اور چیخ ماری ...... منیرہ اسے بیدار ہوتے دیکھ کر گلاس میں اس کے لئے دوا انڈیل رہی تھی —— دوڑ کر آئی ...... کیا بات ہے؟

مجھے کیا ہو گیا ہے ...... میرے ہاتھ کو کیا ہو گیا ...... ہائے ہائے!! وہ چھوٹے بچوں کی طرح مچل رہا تھا ——

منیرہ گھبرا گئی ...... یہ تجربہ اس کے لئے نیا نہ تھا۔ اکثر مریض شور مچا کر سارا وارڈ سر پر اٹھا لیتے تھے، تاہم اس سوال کا جواب دینا منیرہ کے بس کی بات نہ تھی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ غالباً رات ڈاکٹر نے جو کچھ اسے بتایا وہ بھول گیا تھا ...... تم کون ہو؟“ اس نے منیرہ سے پوچھا۔

”نرس!“ منیرہ نے آہستہ سے کہا اور بائیں شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھنے کی کوشش سے باز رکھنا چاہا۔

”نرس!“ پھر اس نے منیرہ کو جانی پہچانی نظروں سے دیکھا اور لیٹ کر معصومیت سے پوچھا ”میرے ہاتھ کو کیا ہو گیا؟“

”موٹر سے کچل گیا ......“ منیرہ نے بصد مشکل ہونٹوں پر زبان پھیر کر یہ الفاظ کہے ”گھبرایئے نہیں آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔“

”ہائے موٹر سے کچل گیا!“ وہ دوبارہ شور مچانے پر آمادہ تھا ”کیسے کچل گیا، کس کی موٹر سے کچل گیا؟“

”میری موٹر سے ......“ منیرہ نے مجرمانہ انداز سے سر جھکا کر کہا۔ ”مجھے معاف کر دیجئے ...... میں بہت شرمندہ ہوں۔“ اور ضبط کے باوجود پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے جنہیں وہ چھپا نہ سکی۔

”ارے آپ تو روتی ہیں ...... خدا کے لئے آنسو پونچھئے ...... آپ تو کہتی ہیں کہ میں اچھا ہو جاؤں گا۔“ وہ ڈر کر اپنا دکھ بھول گیا۔ منیرہ نے ایک ہاتھ سے اس کے سر کو سہارا دیا اور دوسرے ہاتھ سے دوا کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا ......

دوا پی کر اس نے بُرا منہ بنا لیا۔ "پانی لاؤں کلی کے لئے؟ الائچی کھائیں گے آپ؟"

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "سگریٹ پیوں گا"

"سگریٹ!" منیرہ بوکھلائی ...... نرسنگ ہوم میں تو ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر مریضوں کو سگریٹ پینا ممنوع تھا۔ "ذرا ڈاکٹر صاحب کو آنے دیجئے۔ ان سے پوچھ لوں"

"میری معالج تو آپ ہیں" اس نے خفگی سے کہا۔ "میں آپ سے پوچھتا ہوں"

منیرہ خاموشی سے اُٹھی ...... میز سے سگریٹ کیس اُٹھا کر کھولا اور ایک سگریٹ نکال کر اس کے لبوں میں پکڑا دی پھر لائٹر کھولا اور سگریٹ روشن کیا ...... اب وہ سر جھکائے کرسی پر بیٹھی تھی اور وہ سگریٹ پیتے ہوئے غور سے اس کا چہرہ تک رہا تھا ——

ڈاکٹر حفیظ اپنے ساتھ اپنا کمپاؤنڈر اور ایک نرس بھی لائے ...... آتے ہی اُنھوں نے منیرہ سے رات کی کیفیت پوچھی اور کہا کہ اب میں آپریشن کروں گا تم جاؤ سو جاؤ۔"

منیرہ نے اجازت چاہی کہ کیا وہ آپریشن کے دوران میں کمرے میں ٹھہر سکتی ہے؟ ڈاکٹر نے اجازت دے دی۔

کچھ دیر بعد آپریشن شروع ہوا ...... کمپاؤنڈر نے اُسے بے ہوش کیا اور ڈاکٹر حفیظ نے جراحی کی ...... دوسری نرس ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی اور منیرہ کئی گز کے فاصلے پر آنکھیں پھاڑے کھڑی تھی اور دل کہہ رہا تھا۔ "اللہ میری لاج رکھ لیجیو۔"

جب آدھ گھنٹے بعد ڈاکٹر حفیظ میز کے پاس سے ہٹے اور نرس پٹیاں باندھنے لگی تو منیرہ نے ڈاکٹر حفیظ کے ہاتھ دھلواتے ہوئے تشویشناک لہجے میں پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب یہ ہڈی ٹھیک ہو جائے گی؟"

ڈاکٹر نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا۔ "مجھے یقین ہے کہ میں ایک کامیاب تجربہ کار ڈاکٹر ہوں ...... کیا تمہیں شک ہے؟"

منیرہ جھینپ گئی۔ "میں یوں ہی بدحواس ہوں ڈاکٹر صاحب"

ڈاکٹر حفیظ اس کا ہاتھ پکڑ کر کنور رانی کے کمرے کی طرف لے گئے۔ "کنور رانی صاحبہ ...... منیرہ کو نیند کی ضرورت ہے ...... اسے اپنے کمرے میں سونے دیجئے ...... یہ ناشتہ کر کے سو جائے اور جب تک میں شام کو واپس نہ آ جاؤں، اسے آپ مریض کے پاس نہ جانے دیں"

پھر انھوں نے منیرہ کو بتایا کہ مریض کے ہوش میں آنے تک کمپاؤنڈر یہاں رہے گا اور پھر شام تک نرس بھی ٹھہرے گی"

کنور رانی کے حکم سے منیرہ نے بلا خواہش چائے پی اور پلنگ پر لیٹ گئی —— نیند کسی طرح نہ آتی تھی اور کنور رانی برآمدے میں بیٹھی مغلانی کو اپنے غراروں کا صحیح ناپ سمجھا رہی تھیں ...... کمرے سے نکلنے کی ہمت نہ تھی۔ تھک کر سو گئی ——

کئی گھنٹے بعد آنکھ کھلی، کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ مگر کنور رانی خوان سجائے بیٹھی تھیں، منیرہ کو کھانا پڑا پھر اس نے ایک ماما سے کہا "میرے کمرے میں جو نرس ہے، اس کو بلا لاؤ" نرس آئی تو چھوٹتے ہی منیرہ سے نیاز کی شکایت کرنے لگی۔

"بڑا جنگلی بلا ہے ... مجھے تو کھانے کو دوڑتا ہے، جب سے ہوش آیا ہے اودھم مچا رہا ہے ...... کہتا ہے، رات والی نرس کہاں گئی؟"

"ہائیں ....؟" منیرہ نے بناوٹی بے اعتنائی سے پھر پوچھا۔

"ہاں بھئی اور کیا ...... میرے ہاتھ سے تو دوا ابھی نہیں پیتا۔"

اب منیرہ کا دل چاہا کہ دوڑ کر جائے اور اُسے دوا تو پلا دے مگر ڈاکٹر کے آنے میں دیر تھی۔ نرس واپس چلی گئی اور منیرہ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ڈاکٹر کی راہ تکنے لگی۔

ڈاکٹر حفیظ بلاشبہ کامیاب تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔ شام کو جب وہ منیرہ کے ساتھ نیاز کے پاس پہنچے تو نیاز نے مسکرا کر درد میں کمی کا اعتراف کیا۔

ڈاکٹر حفیظ نے کہا کہ پندرہ دن میں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اور منیرہ کو اجازت دی کہ وہ پندرہ دن تک نرسنگ ہوم کے بجائے گھر پر ڈیوٹی دے ......

نیاز نے پھر شور نہیں مچایا۔ رات کو اس کے پاس کسی نرس کی ضرورت نہیں تھی۔ کنور صاحب کا ایک نوکر رات کو اس کے کمرے میں سو جاتا اور منیرہ یہ ہدایت کر کے برابر کے کمرے میں سونے چلی جاتی کہ یہ جاگیں تو مجھے بھی اٹھا لینا ...... وہ اللہ کا بندہ نوکر تو گھوڑے بیچ کر سوتا تھا مگر منیرہ کو اکثر رات میں نیند نہ آتی اور وہ بار بار آ کے نیاز کو جھانک لیتی تھی۔ ایک رات اس نے دیکھا کہ وہ جاگ رہا ہے اور مُنہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیاں لے رہا ہے ..... منیرہ ڈریسنگ گون پہن کر آئی "کہیے کیا حال ہے؟"

"آپ کی عنایت ہے" وہ مسکرایا۔

"جاگ کیوں گئے؟ کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"پہلے آپ بتایئے ..... آپ کیسے جاگیں؟" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"میری بات چھوڑیئے ..... میں تو آپ کی نرس ہوں" منیرہ گھبرائی۔

"اور میں کیا آپ ہی کا زخمی نہیں ہوں؟" اس نے شرارت سے پوچھا —— منیرہ سے وہاں ٹھہرتے نہ بنی ......

وہ چیختا ہی رہا "سگریٹ چاہیے ...... ایک سگریٹ چاہیے" منیرہ وہاں سے بھاگ آئی۔ وہ سو نہ سکی اور صبح تک پلنگ پر بیٹھی بے چینی سے انگلیاں چٹخاتی رہی۔ نیاز کی آنکھوں میں کیا ہے ..... باتوں میں کیا ہے ...... دل میں کیا ہے .....؟؟؟

نیاز کا سیدھا ہاتھ تو خیر بے کار ہی تھا، مگر وہ اپنا دوسرا ہاتھ دانستہ استعمال میں نہ لاتا اور بڑے اطمینان سے منیرہ پر حکم چلاتا رہتا "منیرہ! ذرا سگریٹ دینا" اُسے سگریٹ پینے کا ہوکا تھا ...... منیرہ سگریٹ لاتی تو وہ ہاتھ بڑھانے کے بجائے منہ پھاڑ دیتا ..... ہر دو منٹ بعد اس کی سگریٹ بجھ جاتی اور منیرہ کو لائٹر لے کر دوڑنا پڑتا۔

دن میں دس مرتبہ وہ اپنے بال سنوارنے کی فرمائش کرتا ..... منیرہ سرہانے کھڑے ہو کر اس کے بال سنوارتی۔

"مانگ ٹیڑھی ہے" وہ اعتراض کرتا ..... منیرہ کو دوبارہ مانگ بنانی پڑتی ..... "ارے! آج تیل تو ڈالا ہی نہیں" آخر کار اسے یہ بھی یاد آ جاتا اور منیرہ سہ بارہ اس کے بالوں میں اُلجھ جاتی۔ منہ دھلتا تو آنکھوں میں صابن گھس جاتا ...... پانی پیتا تو آدھا گلاس اس کے گریبان میں اُلٹ جاتا ...... وہ خوب اوندھی سیدھی حرکتیں کرتا اور روز رات کو شب بخیر سے پہلے کہتا۔

"میری باتوں سے آپ کو غصہ تو نہیں آتا؟"

منیرہ سوچتی "کیا مجھے کبھی غصہ بھی آ سکتا ہے؟"

وسیمہ کو بچوں سے فرصت ہوتی تو وہ میکے آتی، منیرہ نے کہا "آئیے آپا نیاز سے آپ کا تعارف کرا دوں۔"

وہ دونوں نیاز کے پاس پہنچیں تو منیرہ نے کہا "نیاز صاحب میری آپا سے ملئے .... میں نے آپ سے ان کا ذکر تو کیا تھا۔"

نیاز نے کہا "اچھا یہی ہیں وسیمہ آپا" پھر وسیمہ سے کہنے لگا "معاف کیجئے آپا۔ مجھے تو اعتبار نہیں آتا کہ آپ منیرہ کی بہن ہیں۔"

"کیوں؟" منیرہ بُری طرح چونکی!! وسیمہ نے پوچھا "کیوں؟"

"بھئی دیکھئے نا منیرہ صحت مند ہے اور آپ کس قدر کمزور ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسی حاذق طبیبہ کے گھر میں ہوتے ہوئے بھی آپ نے کچھ فیض حاصل نہیں کیا......"

وسیمہ ہنسنے لگی اور منیرہ جھینپ گئی۔ وسیمہ نے کہا "یہ ضروری تو نہیں کہ منیرہ ہماری بھی دیکھ بھال اسی جانفشانی سے کرے جیسی آپ کی ہوتی ہے ــــ"

نیاز نے ہنس کر کہا "اس میں شک بھی کیا ہے۔ میرا مرض بھی تو انھیں کا پیدا کردہ ہے!!"

منیرہ کا چہرہ سُرخ ہو گیا، گردن جھک گئی اور حلق خشک ہونے لگا۔ نیاز کے پاس سے واپس آئیں تو وسیمہ بولی۔

"تمھارے نیاز صاحب آدمی تو دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔"

"کافی باتونی ہیں۔" منیرہ اور کہتی بھی کیا۔

"تم نے بھی کمال کیا۔" وسیمہ کہنے لگی۔ "اگر خدا نہ کرے کہیں کچھ اور ہو جاتا۔"

اور پھر وسیمہ کو اپنا ایک پرانا قصہ یاد آ گیا۔ شوخی سے منیرہ کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولی۔ "بھئی، ہماری یہ بیوک بھی بڑی مبارک ہے۔ انھیں تو معلوم ہے۔ ظفر سے میرا تعارف بھی اسی کی بدولت ہوا......"

منیرہ نے گھبرا کر بہن کی طرف دیکھا "جی کیا مطلب......؟" اور جھنجھلا کر وسیمہ کی ساری کا پلّہ کھینچا۔ "واہ...... خواہ مخواہ......" اور منیرہ کا اپنا دل ناچ ناچ کر اس کے کانوں میں کہہ رہا تھا "بڑی مبارک گاڑی ہے...... ظفر وسیمہ سے ٹکرا گیا تھا اور تم نے نیاز کو زخمی کر دیا...... بڑی مبارک بات ہے......"

اس حادثے کی بدولت منیرہ نے بہت سی نئی چیزیں پائیں اور بہت سی پرانی باتیں بھول گئی...... اُسے تنہائی میں سوچنا بھی آ گیا۔ روز رات کو جب نیاز کا آخری سگریٹ سُلگ کر اور دن بھر دق کرنے پر اس کی معذرت منظور کر کے سونے کے ارادے سے جاتی تو نیند کا دُور دُور پتہ نہ ہوتا...... وہ عجیب و غریب باتیں سوچا کرتی...... بچپن کے سنے ہوئے قصے اور پڑھی ہوئی کہانیاں اس کے تصور میں رینگتیں...... ان شاہزادیوں کے قصے جن سے جل کر کوئی جادوگرنی ان کے دماغ میں جادو کی کیل ٹھونک دیتی ہے اور وہ کوئی پرندہ بن کر برسہا برس تک جنگل جنگل ہی بھٹکتی رہتی ہیں ــــ آخر کار تقدیر پلٹتی ہے۔ ایک شاہزادہ آ کر انھیں جادو کے اثر سے چھڑاتا ہے اور اپنے بندھن میں باندھ کر ساتھ لے جاتا ہے۔

اور اس شہزادے کی باتیں جو شکار کو گیا تھا اور زخمی ہرن کی تلاش میں اس کنوئیں تک پہنچ گیا، جہاں ایک دیو نے کسی بدقسمت شاہزادی کو بند کر رکھا تھا...... شاہزادہ جان پر کھیل کر شاہزادی کو نکالتا ہے اور بڑی شان و شوکت سے دارالسلطنت میں لے جاتا ہے ——

منیرہ کے ہونٹوں پر ننھے منے گیت بھی تھرکتے رہتے تھے۔ اُسے ان پندرہ دنوں میں بال سنوارنے کا سلیقہ اور لباس میں رنگوں کا تناسب بھی آ گیا تھا...... مگر...... پندرہ دن گذر گئے۔ اور نیاز کہہ رہا تھا: "آج ڈاکٹر نے پٹی کھول دی تو کل چلا جاؤں گا۔"

"کہاں؟" منیرہ نے اس کے بال بکھرے چھوڑ دیئے اور سرہانے سے گھوم کر سامنے آ گئی۔ "کہاں چلے جاؤ گے؟"

"ہوٹل میں... جہاں سے میرا سامان آپ نے منگوایا تھا۔"

"ہوٹل جانا چاہتے ہو؟ یہاں تکلیف ہے کوئی؟"

"تکلیف؟! ان پندرہ دن کی راحت البتہ تکلیف دہ یاد بن جائے گی۔"

"تو پھر جانے کا خیال کیوں آیا؟" منیرہ نے آہستگی سے پوچھا۔

"ارے بھئی ڈاکٹر نے پٹی کھول دی تو پھر جانا ہی پڑے گا۔"

منیرہ خفا ہو گئی "جناب یہ سرکاری شفاخانہ نہیں۔ مجھ غریب کا گھر ہے...... اور جب تک آپ اپنے گھر جانے کے قابل نہ ہو جائیں آپ یہاں سے نہیں ہل سکتے...... ہاں جب آپ میں اتنی طاقت آ جائے کہ آپ گھر جا سکیں تو چلے جائیے گا..." "گھر جانے سے آپ کو میں نہیں روک سکوں گی..."

"گھر...... میرا کوئی گھر نہیں ہے...... آگرے میں میرے باپ کا گھر ضرور ہے...... وہ لوگ اول ہی میری باتوں سے ناخوش تھے، اب میری دیوانگی سے اور نالاں ہو جائیں گے......"

"دیوانگی!" منیرہ نے تعجب سے دہرایا "دیوانگی؟"

"ہاں منیرہ"...... میں نے آج تک کسی کو دھوکہ نہیں دیا...... اور میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں...... یہاں سے جا کر میرے بال ہمیشہ ہی اُلجھے رہا کریں گے...... میں سگریٹ پینا چھوڑ دوں گا...... اور میں بالکل دیوانہ ہو جاؤں گا۔"

اور اس نے شاید مستقبل کی دیوانگی ثابت کرنے کے لئے سگریٹ کو خاکستر دان میں مسل دیا اور سر کو جھٹک کر بال ماتھے پر بکھیر لئے...... منیرہ کی آنکھوں میں حیرت، مسرت اور درد کی ملی جلی کیفیات تھیں...... وہ نیاز کو دیکھتی رہی پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال سمیٹ ڈالے...... وہ ضدی بچوں کی طرح پلنگ پر پھیل گیا اور ایڑیاں رگڑنے لگا "میں یہاں سے نہیں جانا چاہتا...... میں پٹی نہیں کھلواؤں گا...... تم نے مجھے اپنے پاس سے علیحدہ کیا تو میں دوبارہ تمھاری موٹر کے سامنے آ کر جان دے دوں گا......"

ڈاکٹر حفیظ نے آ کر پٹیاں کھولیں...... ہڈی جڑ چکی تھی۔ مگر ابھی زخم بھرنے باقی تھے...... ڈاکٹر نے کہا کہ ابھی علاج جاری رہے گا۔ اور کنور صاحب نے نیاز سے خواہش کی کہ جب تک ڈاکٹر صاحب یہ نہ کہہ دیں کہ وہ بدستور سابق ہو گیا.

ہے، وہ یہاں سے نہ جائے۔

جب شام کو منیرہ نے پلنگ کے پاس میز پر اس کا کھانا رکھا تو اس نے یہ کہہ کر کھانے سے معذوری کی کہ اُلٹے ہاتھ سے نہیں کھایا جاتا۔ حالانکہ جب سے اُسے کھانے کی اجازت ملی تھی، وہ برابر اُلٹے ہاتھ سے کھانے کی مشق کرتا رہا تھا۔

"مجبوری ہے" منیرہ نے سرد آہ بھری۔ "پھر تو آپ کو بھوکا رہنا پڑیگا"

"ہونہہ" وہ غرّایا۔ "آپ جب میری چارہ گر ہیں تو.....؟"

"جی اب نہیں! پٹی کھل گئی آپ کی....."

"اچھا یہ بات ہے" اس نے خفگی سے مُنہ پھلایا "اب تو آپ ذرا پھر اپنی موٹر لے کر نکلئے...... شہرِ دوستاں سلامت...."

"نا بابا!" منیرہ نے کان پکڑتے ہوئے کہا "میں باز آئی موٹر چلانے سے..... سب مجھے الزام دھرتے ہیں اور میں آج تک نہیں سمجھ پائی کہ یہ ہوا کیسے...... آخر آپ تھے کہاں..... سامنے تو ہرگز نہیں تھے؟"

نیاز ہنسنے لگا..... "ایمان کی پوچھو تو خطا میری تھی..... تمہارا واقعی اس میں قصور نہیں..... میں نے خدا جانے کیوں دفعتہً سڑک پار کرنا چاہا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے موٹر کی آواز سُنی اور سڑک پر روشنی پڑتی دیکھی..... میں لیمپ پوسٹ کے اس طرف کھڑا غالباً سگریٹ سلگانے کی کوشش کر رہا تھا..... بس ایک ساتھ میں نے سوچا کہ موٹر گذرنے سے قبل سڑک کے دوسری طرف پہنچ جاؤں......"

"یہ آپ کو سوجھی کیا؟" منیرہ نے حیرت سے کہا۔

"بس حماقت کہو..... ہوش میں تو تھا نہیں...... اس قدر پی لی تھی کہ ہوٹل پہنچنا دوبھر ہو رہا تھا ——"

"جی؟" منیرہ نے سہم کر کہا "آپ نے..... آپ نے..... شراب..... پی لی تھی!"

"ہاں" نیاز نے دیکھا کہ منیرہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی..... پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھا... پھر کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنا سر پکڑ لیا۔

"منیرہ! منیرہ!" نیاز کا چہرہ سفید ہو گیا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں" منیرہ نے مایوسی سے پلکیں اُٹھائیں۔ اس کی نگاہوں میں کرب تھا۔

"نہیں نہیں" میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ہو گئی ہو..... تمہیں مجھ سے نفرت ہو رہی ہے..... نہیں نہیں منیرہ خدا کے لئے..... مجھ سے نفرت نہ کرو، مجھ سے خفا نہ ہو جانا..... میں تمہاری خفگی برداشت نہیں کر سکوں گا...... میں جان دے دونگا ——" اس نے کانپتا ہوا سیدھا بازو اٹھایا اور منیرہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اس کمزور اور زخمی ہاتھ میں انگاروں کی تپش تھی، منیرہ پھر گھبرا کے کھڑی ہو گئی —— نیاز نے عاجزی سے کہا "میرے خون آلودہ جسم سے تمہیں گھن نہیں آئی۔ مگر میری داغدار فطرت نے تمہیں متنفر کر دیا...... میں سچ کہتا ہوں منیرہ، میرے ہر مرض کا علاج تمہارے پاس ہے..... تم چاہو گی تو میں بہت اچھا انسان بن جاؤں گا.... تم ہی کہو

جسے کسی کی محبت نصیب نہ ہو، وہ اپنے ہوش میں رہے تو کیا کرے۔

منیرہ بیٹھ گئی اور رکابی میں کھانا اتارنے لگی...... نیاز چھوٹے بچوں کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر اس کے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا!

منیرہ کو نیاز کے ساتھ جو خلوص تھا، وہ تیمارداری سے کچھ سوا ہی تھا۔ یہ بات زیادہ دن تک گھر والوں سے نہ چھپ سکی...... دفعتہً کنور صاحب نے نیاز سے اس کے گھر اور گھر والوں کا پتہ پوچھنا شروع کر دیا۔ اور کنورانی سے کچھ ایسی بات چیت ہونے لگی "خاندان اچھا ہے.... اکلوتا بیٹا ہے۔ شہری جائداد ہے... پڑھا لکھا ہے.... صورت اچھی ہے، عمر زیادہ نہیں، نوکر ہو جائے گا"

ایسی بہت سی باتیں برآمدے کی چق، کمرے کے پردوں اور کواڑوں کی درازوں کے علاوہ وسیمہ کی زبانی بھی منیرہ کو معلوم ہوتی رہیں اور وہ راتوں کی تاریکی میں اجالوں کے خواب دیکھتی رہی —— اپنے زخمی ہاتھ سے نیاز چاہتا تو منیرہ کی گردن توڑ دیتا۔ مگر ابھی تک نہ اس سے لائٹر جلا کر سگریٹ سلگائی جاتی اور نہ اپنے بال سنوارتے.... منیرہ کو یہ سارے کام اپنے ہاتھوں سر انجام دینے پڑتے تھے۔

ایک روز جب وہ نیاز کے لئے چائے بنا رہی تھی تو اس نے کہا "کل سے اپنا کام کیجئے گا۔ مجھے نرسنگ ہوم جانا ہے"

"خیریت" وہ چونکا۔

"جناب مجھے مہینہ بھر کے بعد نرسنگ کا امتحان دینا ہے.... خیر اب تو میں کیا خاک پاس ہوں گی —— ایک مہینہ جھک مارا ہے"

"اچھا جی! جھک مارا ہے آپ نے..... اور مجھے جو مار ڈالا تو.... اس کا کچھ بھی تذکرہ نہیں ——"

منیرہ گھبرائی "ارے بھئی بخشو.... میں امتحان کی کہہ رہی تھی...."

"گولی مارو امتحان کو......" وہ گنگنایا۔ ؎

"ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

منیرہ اٹھ کر چل دی۔

"سنو منیرہ.... کیا سچ مچ کل سے نرسنگ ہوم چلی جاؤ گی"

"اور کیا...... جانا ہی پڑے گا...... ڈاکٹر حفیظ کا قطعی حکم ہے، وہاں نرسنگ ہوم میں ایک چھوٹی سی لڑکی "رقیہ" ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ وہ میرے لئے بہت روتی ہے...... کھانا پینا چھوڑ دیا ہے"

"اور میں بے چارہ چھوٹا سا لڑکا جو یہاں روؤں گا تو...." وہ اٹھلایا "میں بھی تو کھانا پینا چھوڑ دونگا"

"جھوٹ بات!" منیرہ جھینپی۔

"ارے لڑکی میں جھوٹ نہیں بولتا ...... تمھاری بے اعتبار طبیعت کی قسم —— تمھارے نرسنگ ہوم کے مریضوں کو اور نرسیں بھگت لیں گی مگر میری دوا تمھارے اور صرف تمھارے ہاتھ ہے۔"

ایک دن نیاز نے منیرہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں آگرے جا کر اپنے والدین کو گھیر لاتا ہوں ..... وہ میری اوباشیوں کے سبب ہمیشہ مجھ سے ناخوش رہے مگر اب میں اچھا لڑکا بن کر دکھاؤں گا۔ شرط یہی ہے کہ وہ تمھارے حصول میں میری مدد کریں ......"

کنور صاحب اور کنور رانی بھی اسی قسم کا اقدام چاہتے تھے۔ جو نیاز کے والدین کی طرف سے ہو۔

بند کمرے میں پڑے پڑے نیاز کو بہت دن ہو گئے تھے، ڈاکٹر کی ہدایت پر منیرہ اُسے لے کر موٹر میں سیر کرانے چلی .....

"پہلی بات نیاز نے یہ کہی کہ اب آپ کو قطعی حق نہیں ہے کہ میرے علاوہ کسی کو مشق ستم کے لئے تجویز کریں۔ اگر دل چاہے تو مجھے حکم دیجئے کہ میں لیٹ جاؤں گا سڑک پر ......"

"بکواس بند کرو" منیرہ نے گاڑی اسٹارٹ کی .. "عجائب خانہ دیکھو گے"

"اک نیا سندسا رلبسا ہے تورے دو نینن میں" اس کی آواز بالکل بے سُری تھی۔

"خدا کے واسطے نیاز سڑک والے کیا کہیں گے"

"تیرا دیوانہ رہوں سب سے بیگانہ رہوں" اُسے عجیب و غریب گانے یاد تھے۔

دونوں نے عجائب خانے کے ایک ایک گھیرا اور ایک ایک پنجرے کو دیکھا .... بندروں کو چنے کھلاتے ..... مچھلیوں کو مرمرے ڈالے ... شترمرغ پہ کنکر پھینکے۔ اور لکڑیاں ڈال کر بھالوؤں کو ستایا ..... منیرہ نے اپنی عمر میں پہلی بار شرارتیں کیں اور اپنی حرکتوں کا لطف اُٹھایا۔ اور جی بھر کے ہنسی ...

واپسی میں جب وہ امین آباد سے گزرے تو ایک موڑ پر رفیع سے مقابلہ ہوا ...... وہ موٹر سائیکل پر آ رہا تھا ..... منیرہ کو اس نے ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا اور تعجب سے نیاز کو دیکھا۔ موٹر آگے نکل گئی تو نیاز نے پوچھا "منیرہ تم اس لڑکے کو جانتی ہو؟"

"ہاں بھئی یہ تو آپا کا دیور رفیع ہے"

"اوہو! اس سے تو میں بھی مل چکا ہوں"

"کہاں .....؟" منیرہ نے پوچھا۔

"کیفے میں" —— اسی رات کا قصہ ہے جب تم نے میرا مزاج درست کیا تھا ..... کیفے میں یہ بھی تھا ..... ہم سب نے مل کر فلیش کھیلا اور ..... اس نے بھی بہت شراب پی تھی ... بلکہ اسی کم بخت کی وجہ سے میں بہت پی گیا ......"

منیرہ کا چہرہ بے رونق ہونے لگا .... نیاز نے محسوس کر لیا۔

"منیرہ ..... منیرہ خدارا اب اُسے بھول جاؤ ..... تمھارے پاس آکر تو مجھے ایک دن بھی شراب کا دھیان نہیں آیا ..... مجھ سے اس زمانے کا حساب نہ لو جب تم میری زندگی میں نہ تھیں ..... اور اب ... میں اپنی پہلی اور آخری محبت کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تم اسے حرام کہہ دوگی تو یہ مجھ پر حرام ہو جائے گی .... منیرہ !!؟؟"

منیرہ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی .....

اسی دن شام کو جب نیاز تھک کر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا تھا اور منیرہ ڈرائنگ روم میں ایک کرسی پر سکڑی ہوئی بیٹھی تھی، "تاکہ وسیمہ کو ماں باپ سے یہ کہتے ہوئے سن لے کہ نیاز اپنے گھر والوں کو منانے کے لیے کل آگرے جانا چاہتا ہے ..... تو باہر رفیع کی موٹر سائیکل پھٹ پھٹائی .... وہ مہینوں بعد یہاں آیا تھا .....

ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اس نے منیرہ سے پوچھا "آج دوپہر جو حضرت تمھارے ساتھ موٹر میں تھے کیا یہی ہیں جنھیں سنا ہے تمھاری موٹر سے چوٹ آگئی تھی؟"

"ہاں یہی ہیں" وسیمہ نے بتایا۔

"کیا خیال ہے تمھارا؟" کنور صاحب نے برسبیل تذکرہ پوچھا۔

رفیع مسکرایا۔ "میں ان سے اتنا واقف نہیں کہ ان کی بابت کوئی رائے قائم کر لوں .... میں نے اس سے قبل ایک ہی مرتبہ ان کو دیکھا — اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ یہ عقل سے خارج تھے!"

"کیوں؟ کیوں؟" کنور صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے "کیا مطلب؟"

"واقعہ یوں ہے" رفیع مزے لے کر سنانے لگا "میں ایک دوست کے ساتھ کیفے میں چائے پینے گیا تھا ..... وہاں کئی لفنگوں کے ساتھ ایک میز پر یہ صاحب بھی جوا کھیل رہے تھے ..... اور انھوں نے اس قدر شراب پی لی تھی کہ گانا گاتے تھے۔ گالیاں بکتے تھے اور سب سے لڑنے پر آمادہ تھے —"

ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا!

گھبرائی آواز میں کچھ دیر بعد وسیمہ نے کہا "سچ کہتے ہو رفیع؟"

"ارے بھابی مجھے جھوٹ بول کر کیا نفع ہوگا!؟"

پھر طویل خاموشی!

لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھالتی منیرہ اٹھی اور دروازے کی طرف چلی "کہاں جا رہی ہو منیرہ؟" کنور رانی نے تحکمانہ لہجے میں کہا "بیٹھ جاؤ"

منیرہ واپس آکر دھم سے بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد کنور صاحب اُٹھے اور کھنکار کے بولے "وسیمہ نیاز سے کہہ دو کہ وہ کل اپنے گھر چلا جائے — یا جہاں بھی چلا جائے ..... مگر اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے ..... یہی ہمارا جواب ہے"

کنور رانی نے پھر منیرہ کو نیاز کے کمرے کی طرف نہیں جانے دیا۔ نیاز رات بھر اس کا منتظر رہا اور وہ رات بھر

وسیمہ کے گلے سے لپٹی ہوئی ٹسُباک ٹسُباک کرتی رہی۔ "آپا خدا کے واسطے میری مدد کرو ..... ابا اور امّی سے کہہ دو کہ میری قسمت پر بھروسہ کریں ـــ میں اُسے سنبھال لوں گی ..... اُس کا دل بُرا نہیں ہے ..... میں جانتی ہوں وہ مجھے دھوکہ نہیں دیگا ..... ابا اور امّی سے کہہ دو کہ مجھے میری تقدیر کے حوالے کر دیں ....."

صبح ہو گئی ... پُرانا سورج نئی تمازت کے ساتھ نکلا اور شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھول مرجھا گئے .....

وسیمہ نے کنور رانی سے کچھ کہنا چاہا تو وہ شیرنی کی طرح بکھر گئیں۔ "وسیمہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ ..... تو بھی ماشاءاللہ بیٹی والی ہے ..... آنکھوں دیکھتے مکھی کون نگلتا ہے ..... کیا میں نے بیس بائیس سال تک اسی لئے منیرہ کو پالا تھا کہ اپنے ہاتھوں بھاڑ میں جھونک دوں ـــ کیا میرے نصیب میں یہی تھا کہ اکلوتا بیٹا تو فرنگن کر لے اور بیٹی جان بوجھ کر جواری شرابی کے پلّے بندھ جائے؟"

وسیمہ باپ کے پاس گئی تو انھوں نے جواب دیا "بٹیا تم خود ابھی جذباتی لڑکی ہو ..... اس معاملے کو ہمارے زاویۂ نظر سے دیکھو! یوں سمجھ لو کہ جب تمہارا کمسن بچہ آگ کے لپکتے ہوئے شعلے کو پکڑنا چاہتا ہے تو اس وقت تم اس کے دل کا لحاظ کرتی ہو یا اپنے دماغ پر چلتی ہو ..... منیرہ سے کہو عقل سے کام لے ....."

نیاز جا رہا ہے ..... نیاز چلا گیا ..... اس نے پردے کے پاس منیرہ کا لرزتا جسم دیکھا .... وہ رُکا نہیں ...... وہ کچھ کہہ بھی نہ سکا .... اس کے جسم پر کوئی زخم نہ تھا مگر رُوح کچلی ہوئی تھی اور اس کا کوئی چارہ گر نہ تھا ـــ کوئی دردمند نہ تھا۔

جب ڈاکٹر حفیظ آئے تو ابھی تک منیرہ اپنے اس پلنگ پر بے حس و حرکت پڑی تھی جس پر ایک رات اس نے بے ہوش نیاز کو لا کر ڈالا تھا ..... ڈاکٹر صاحب نے اُسے ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور رندھی ہوئی آواز میں کہا "میں نے سُن لیا ہے منیرہ ...... وہ چلا گیا ہے ...... اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے ...... تمہارے ساتھ بھی ...... ہم اس فیصلے کو تسلیم نہیں کریں گے ..... میں اُسے ڈھونڈ لاؤں گا ......"

"نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب وہ اب کبھی نہیں آئے گا ..... آپ اُسے کبھی بھی نہیں ڈھونڈ سکتے ـــ آپ کی کوئی پکار اس کے کانوں میں نہیں جائے گی!"

ڈاکٹر صاحب کچھ دیر خاموش کھڑے ہوئے منیرہ کو تکتے رہے، پھر انھیں ایک دم کچھ یاد آ گیا "منیرہ بیٹی تمہیں تو وہ پکار ضرور سنائی دے گی جو تمہارے لئے ہے ..... تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری زندگی تمہاری اپنی نہیں ہوگی ..... تمہارا کام اپنے غم میں آنسو بہانا نہیں ہے اوروں کے دُکھ دھونا ہے ..... نرسنگ ہوم میں تمہاری ضرورت ہے، وہ اپاہج بچی "رقیہ" جسے تم دو سال سے پال رہی تھیں، تمہارے بغیر رو رو کر اپنا خون کرتی ہے۔ وہ پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھاتی۔ دو ماہ میں اس کا وزن بہت زیادہ گھٹ گیا ہے ..... تمہیں اس پر رحم نہیں آتا؟"

ڈاکٹر حفیظ منیرہ کو اپنے ساتھ نرسنگ ہوم لے آئے۔ اُسے بازو کا سہارا دیتے ہوئے وہ لمبے برآمدوں میں سے گزرے۔ چاروں طرف منیرہ کی جانی پہچانی نرسیں کھڑی تھیں، وہی نرسیں جو منیرہ کو آتے دیکھ کر ہمیشہ مسکراتی تھیں ..... آج ان کے چہرے اس طرح

خاموش اور اُداس تھے کہ جس طرح انھوں نے ابھی نزع کے عالم میں کسی مریض کو دیکھا ہو......

وہ بغیر کہیں رُکے طویل وارڈز میں مریضوں کے دو رویہ بستروں کی قطاروں کے بیچ میں سے گذرتے رہے اور ڈسپنسری، آپریشن تھیٹر اور مُردہ گھر سب پیچھے رہ گئے...... یہ نرسنگ ہوم کا آخری حصہ ہے "نرسری" ڈاکٹر صاحب نے پیار سے اس کا شانہ تھپکا "میں آفس جا رہا ہوں منیرہ..... تم اپنا فرض بخوبی پہچانتی ہو"

ڈاکٹر حفیظ چلے گئے ـــــ وہ آہستہ آہستہ نرسری میں داخل ہوئی..... کچھ بچے کھیل رہے تھے..... کچھ رو رہے تھے..... رُقیہ اپنے پلنگ پر خاموش بیٹھی تھی..... منیرہ کو دیکھ کر اس نے خوشی سے چیخ ماری اور بانہیں پھیلا دیئے..... منیرہ بے تابانہ اس کی طرف دوڑی اور اس کے ننھے بازوؤں میں منہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

بالآخر ننھی رقیہ نے ایک ننھی سی بات پوچھی "آپا۔ آپ اتنے دن کہاں رہیں؟"

بھیّا دیوج

ابو الفضل صدیقی

گوبردھن سنگھ کھرے چوہان تھے۔ مگر ان کے ماضی کی مضبوط رسیوں کا سایہ مدتیں ہوئیں ان کے حال سے کٹ گیا تھا۔ اور وہ خالی چوہان ہی چوہان رہ گئے تھے۔ اور سنا کرتے تھے کہ بوڑھی گنگا کی تربینی سے بڑی گنگا کی کٹہری تک دس کوس لمبے چوڑے دنگل میں ان کے باپ دادا پردادا کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اور توڑے کی جھنکار بیس بیس کوس تک جاتی تھی۔ اور پھر یہ بھی سنا ہے کہ بڑے بڑے محال پٹیاں، معافیاں، نان کاریں ان کے دادا کی زندگی ہی میں مہاجن کے قرضے میں نیلام ہو گئے اور لاکھوں کی جائداد کوڑیوں میں سود بیاج میں نکل گئی۔ اور پھر یہ بھی سنتے چلے آ رہے تھے کہ ان کے دادا نے لڑکی کی شادی میں مہاجن سے ایک ہزار روپیہ قرض لیا تھا جس کے سود در سود کے چکر میں باپ کے وقت تک پہنچتے پہنچتے ایک لاکھ کی مالیتی جائداد برابر ہو گئی۔ اور گوبردھن سنگھ نے دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا یہ بھی سنا ہی تھا کہ لمبی چوڑی آبائی سیر خود کاشت کے سینکڑوں ایکڑ زرخیز رقبے جو زمینداری نکل جانے کے بعد ساقط الملکیت کے ضمن میں آ گئے تھے۔ بنیئے، زمیندار کی بقایا لگان کی نالشوں میں بے دخل ہو گئے۔ جن کے ساتھ اونچے اونچے گھوڑے گھوڑیاں، بڑے بڑے بیل، دودھار گائیں بھینسیں سب کے سب باپ کے اخیر زمانہ میں ہی اپنے پاؤں چل کر گھر خالی کر گئے۔ اور گھر کے اندر جانور کے نام گوبردھن سنگھ کے ہاتھ چوہے کا بچہ بھی وراثت میں نہ آیا اور رہے سہے بے مرمت لق و دق مکان نے آبائی قرضہ کا اخیر حصہ چکانے میں نیلام ہو کر گوبردھن سنگھ کو نکال باہر کیا۔ اور اب وہ ایک جھونپڑے میں رہتے تھے جو کسی زمانہ میں ان کے دادا کے مویشی خانہ کا ایک دور افتادہ اور بے کار حصہ تھا۔ جس کے اندر قانون نے انہیں مکان نیلام ہونے کے بعد زندگی بھر حق رہائش دیا تھا۔ اور عنفوان شباب سے لے کر آج چالیس کے پیٹے میں آ گئے اور اسی چھپر میں بس رہے تھے۔ اور انہیں اپنے حال کے متعلق صرف اتنا یاد تھا۔ کہ وہ ایک مزدور ہیں۔

اور مزدور ہو کر بھی اور سب کچھ بھول بھلا کر گوبردھن سنگھ کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کھرے چوہان ہیں" "دلّی والے" جنہوں نے محمد غوری کو بیچ میدان بھگایا، جے چند کو نیست و نابود کیا۔ آلہا اودل ملکھان سے بیر پالے، پھر روہیل کھنڈی چوہان (حافظ جی (حافظ رحمت خاں) کے سیدھے بازو) جن کے بل پر روہیلے فرنگی اور شاہ اودھ" ایک للکار تولنتے" دلّی پہ چڑھ دوڑے"

اور اس سنی سنائی کو محفوظ کیے ٹھاکر گوبردھن سنگھ اب تو بیس سال سے اسی "دنگل" میں تیرے میرے کھیتوں کے اندر دو آنہ روز کی مزدوری کر رہے تھے۔ جہاں اب سے چالیس سال پیشتر ان کے باپ دادا کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اور ان کے بہادر پرکھے پورب

کو منہ کر دیتے تو پروائی دم سادھ جاتی اور پچھم کو نگاہ اٹھا دیتے تو چڑھتی آندھیاں لٹ کر نکل جاتیں۔ اور ان کے زمانہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے دو چار بڈھے اب بھی دیہات میں باقی تھے جو گوبردھن سنگھ کو کھیت کھیت دو دو آنہ کی مزدوری کرتے دیکھ کر اس کے ماضی کے حالات بتاتے اور اپنی اولاد کو عبرت دلاتے۔

باپ کی زمینداری، سیر خود کاشت، اثاث البیت، دولت سب کچھ باپ کی زندگی ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ ایک بہن تھی۔ جس کو وہ اچھے گھر بیاہ گئے تھے۔

اور انہوں نے اپنی ٹھکرائت کے بھاری بھرم سے گوبردھن سنگھ کو بھی اچھے گھر بیاہا تھا۔ اور گوبردھن سنگھ کے سسرال والوں نے بہتیرا چاہا کہ وہ گھر جمائی بن کر رہیں۔ مگر انہیں پرانی مثل یاد تھی کہ "ساس گھر جمائی سوکتا" اور نتیجہ علیحدگی ہوا اور علیحدگی کیا بیاہ کے بعد گونے دورے کی صورت ہی نہ آ پائی اور بھلا ایسے گھر میں کوئی کھاتے پیتے گھرانے کی راجپوتنی کیسے گذر کر سکتی تھی، کروں جلی، اور اصرار بھی کرتے تو گوبردھن سنگھ کس برتے پر۔ ان کے پاس کیا تھا۔ ایک کھرپی، اور وہ صبح تڑکے دھوتی کے پینچ میں کھرپی لگا کر نکلتے۔ خیر کھرپی اور زمین کا بھی ازلی رشتہ چلا آتا ہے۔ مگر راجپوت اور زمین کا بھی ازلی رشتہ ہے اور جب ساری دھرتی پر کہیں کو نشر بھر زمین کے مالک نہ تھے تو گوبردھن سنگھ کاہے کے راجپوت تھے۔ آپ اپنے منہ میاں مٹھو بنا کریں مگر دنیا انہیں راجپوت کیسے تسلیم کر لیتی۔ حتّیٰ کہ سگی جورو تک نے تسلیم نہ کیا۔

اور گوبردھن سنگھ چوہان گڑھ میں نہ ٹکے۔ تو دور دور چار چار کوس چاروں طرف دیہات میں کسی دخیل کار موروثی کاشت کار کے کھیت پر مزدوری کرنے اور مزدوروں چماروں اور لودھوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں کام پر جٹے دکھائی دیتے۔ مگر یہاں بھی اپنی ٹھکرائت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ چماروں اور لودھوں سے ڈیوڑھا کام کر کے دکھاتے۔ اور مالک کو ان کو ٹوکنے کی بجائے اُلٹی تواضع اور تعریف کرنی پڑتی اور بار بار چلم چلاتا جاتا۔ یہاں پر انہیں ایمان داری کا خیال کم رہتا بلکہ وہ اپنی ٹھکرائت کی لاج کو ڈرتے کہ کہیں ان کے پیٹھ پیچھے مالک یہ نہ کہے کہ چلو ٹھاکر ہیں۔ بے چارہ کا وقت بگڑ گیا ہے جو کچھ کریں، کریں، دوسرا خیال ان کے دماغ میں یہ آیا کہ میرے ساتھی مزدور سب چمار لودھے نیچ قوم کے ہیں اور اگر یہ مجھ سے زیادہ یا میرے برابر بھی کام کر دکھائیں تو میری ٹھکرائت کاہے کی ہوئی۔

اور شام کو دو آنہ پا کر گوبردھن سنگھ کتنے مطمئن کس قدر خوش نظر آتے؟ شاید ان کے دادا ربیع خریف اپنی پوری تحصیل لگان کر کے اتنے خوش نظر نہ آتے ہوں گے۔ اور ان کی بہن جنکا اپنے شوہر سے فصل کے فصل ہزاروں روپیہ کی پوٹ ہاتھ میں لے کر اتنی مطمئن نہ ہوتی ہوگی۔

اور جنکا کا شوہر ایک متوسط خوشحال زمیندار تھا۔ جس کے یہاں سبھی کچھ تھا، اور سالے کی حالت سے کچھ کچھ واقف بھی تھا۔ اور اس کی پچھلی خاندانی روایات تو آج تک زبان زد خاص عام تھیں۔ ہمیشہ شکایت کیا کرتا کہ دوّا (بڑے بھائی) نے کبھی ہمارا ہاتھ نہ بٹایا، اگر فصل کی طیاری کے ہی وقت آ کر سیر کے کھیتوں پر پندرہ دن کھڑے ہو جایا کریں تو سال بھر میں مزدور نوکروں کی چوری سے ہم کو اتنا بچ رہا کرے کہ دو تین برس میں نہ کھا پائیں۔ اور جنکا کو کبھی کبھی بھائی کی حالت اور پچھلی روایات کا اندازہ کر کے اپنا عیش اور دولت بے کیف معلوم ہوتی۔ شوہر کے بار بار اصرار پر ایک مرتبہ جنکا نے گوبردھن سنگھ سے اپنے یہاں مستقل طور پر چلے آنے کی تحریک بھی کی۔ خیر بہنوئی کی بات تو ہمیشہ گوبردھن سنگھ نے ہنس کر ٹالی مگر جنکا کی تحریک پر بڑی لال پیلی آنکھیں دکھائیں۔ "ہوں نادان لونڈیا، اپنے باپ دادا کی ناک اپنے ہاتھ سے کاٹتی ہے

شرم نہیں آتی تجھ کو: "بہن گھر بھائی سو کتا"۔ پرانے پڑھے لکھے کہہ مرے ہیں، تو کیا تیرا بھائی کتا ہو جئے۔ مجھے تو ڈوب مرنا اچھا ہے۔ بہن کے در پہ جا کے رہنے سے!"

مگر جب کبھی جگّا کی ساس نندیں طعنہ دیتیں کہ بڑی ٹھکرائن بنتی ہو اور بھیّا ان کے ٹھیکے کی مزدوری کرتے پھرتے ہیں۔ تو جگّا اکڑ کر جواب دیتی، مزدوری ہی تو کرتے ہیں بھیک تو نہیں مانگتے، ڈکیتی تو نہیں مارتے اور تمہارے دروازہ پر کس دن مزدوری کرنے آئے ہیں۔ اور یہ کہہ کر جگّا اپنے آپ کو فتح مند محسوس کرتی جیسے اس کے بھائی کی حیثیت اس کے شوہر سے ذرا بھی کم نہیں ہے۔

(۲)

اور اپنے جھونپڑے کے دروازہ پر ادھر کی لکڑیوں کی ٹٹی چڑھا کر منہ اندھیرے کا نکلا گوبردھن سنگھ سرِ شام پلٹتا اور اپنی دونوں وقت کی روٹی خود پکاتا، اور صبح کو رات کی رکھی ہوئی باندھ کر ساتھ لے جاتا۔ اور سب مزدوروں کی روٹی ان کی عورتیں دوپہر کو پکا کر لاتیں اور اپنی رات کی پکی ہوئی روٹی کی پوٹلی کھول کر دوپہر کے وقفہ میں گوبردھن سنگھ کھاتا۔ دوپہر سے پہلے کام والا بھنے ہوئے چنے کا چبینا تقسیم کرتا جو دو آنہ یومیہ کے علاوہ مزدوری ہی کا جزو ہوتا۔ گرمیوں میں رات کا پکا ہوا کھانا دوپہر تک خراب ہو جاتا ہے۔ اس لیے جاڑوں جاڑوں تو گوبردھن سنگھ باسی کھانا کھا لیتے اور گرمیوں کے موسم میں اسی چبینے پر اکتفا کر کے دن کاٹ دیتے۔ تمام دن گوبردھن سنگھ کا جھونپڑا سنسان پڑا رہتا۔ شام کو کبھی کبھی جمّی جولاہے، نانّن تیلی، بلاتی مراؤ، جے رام گڈریہ آ بیٹھتے الاؤ کے گرد آدھی رات تک گپ ہوتی۔ چلموں کا دور چلتا۔ اور اپنی تنہائی پن اور افلاس کے اعتبار سے گوبردھن سنگھ کا جھونپڑا بستی بھر میں اپنی نوعیت کا ایک تھا۔ مگر سال میں ایک دن ایسا بھی آتا۔ جس روز ان کا تاریک ویران جھونپڑا اچانک چہچہا اٹھتا اور صنفِ نازک کے لہجہ کی جل ترنگ گونجتی سنائی دیتی جب بھیا دوج پر جگّا ٹیکا لیے اور مٹھائی سے منہ بھرنے سال کے سال آتی۔ اور بھیا دوج کا محبت اور خلوص سے پُر تیوہار جس روز بہن بھائی کے تلک لگاتی ہے، منہ مٹھائی سے بھرتی ہے اور پھر اپنے بھائی کے اوپر سال بھر میں آنے والی سب بلائیں ساری مصیبتیں کل بیماریاں اپنے لیے مانگتی ہے۔ اور پھر اپنی عمر و تندرستی اپنے بھائی کو مل جانے کی دعا مانگتی ہے اور یہ ساری دعائیں شیریں گیت کی آوازوں میں مانگی جاتی ہیں، بھائی بہن کو اپنی حیثیت کے مطابق دان دیتا ہے۔ مٹھائی کے بدلے میں مٹھائی یا اس کی قیمت دیتا ہے۔ کپڑے دیتا ہے اور آنے جانے کا کرایہ دیتا ہے اور دو تین روز ٹھہرا کر دعوت کرتا ہے۔

بھیا دوج کے دن بالعموم بیویاں گھر چھوڑ چھوڑ کر میکے چلی جاتی ہیں اور گھر گھر بیویوں کے بجائے بہنوں کا انتظام ہوتا ہے اور ہر بیوی آج کے دن بیوی نہیں ہوتی صرف بہن ہوتی ہے۔

جگّا کا گاؤں راٹھور نگر چوہان گڑھ سے چالیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور ریلوے اسٹیشن سے کوس بھر کے فاصلہ پر آباد تھا۔ بھیا دوج کے دن صبح تڑکے کی گاڑی سے جگّا روانہ ہوتی۔ راٹھور نگر سے اسٹیشن تک رتھ میں کوس بھر کا فاصلہ طے کرتی۔ اور پھر سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیتی۔ ایک معتبر کارندہ اور ایک معتمد مہری اور ایک کہار تین آدمی ساتھ ہوتے۔ ریلوے اسٹیشن سے چوہان گڑھ تین کوس تھا۔ کارندہ تو حسبِ معمول ہدایات کے مطابق اسی ٹرین سے شہر چلا جاتا اور جگّا مہری اور کہار کو اسٹیشن پر ہی چھوڑتی اور ایک گھٹیا سی سوتی ساڑھی باندھتی اور پیدل چوہان گڑھ روانہ ہو جاتی اور تین کوس کا فاصلہ پیدل اس لیے طے کرتی کہ سفر میں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم بندھا بندھا سا ہوتا۔ راستہ میں چوہان گڑھ کے لوگ آتے جاتے اور ادھر ادھر کھیتوں پر کام کرتے ملتے۔ جنہیں وہ مخصوص بہن اور بیٹی والے انداز

بس سلام کرنی چاہتی۔

جنگا چھوٹی سی مٹھائی کی پوٹلی ہاتھ میں لٹکائے بھیا کے گھر پہنچتی، اور آج گوبردھن سنگھ اُس دن کے لیے مدتوں کا رکھا ہوا مخصوص جوڑا نکالتے۔ کالی کنار کی دھوتی دو پیچ لگا کر خوب لنگ چڑھا کر اور کس کر باندھتے اوپر سے اچھی سفید پھتوئیں پہنتے اور سر پہ بڑا سا پگ باندھتے، راجپوتی انداز میں خوب مونچھیں چڑھا کر بیٹھتے، ترچھے ترچھے، بھاری بھرکم بنے، اگرچہ ان کی سج دھج اور بہروپ میں راجپوتی انداز ہوتے مگر تیوروں میں آزاد مزدور والے دم خم جھانکتے، اور عجیب شانِ استغنا نظر آتی۔ بہن کو دیکھ کر کھل اٹھتے اور جنگا رواج کے مطابق تلک لگاتی اور منہ میں مٹھائی کی ڈلی دیتی اور پھر اس کی بلائیں لے کر ساری بیماریاں اور مصیبتیں اپنی جانب آجانے کی پرارتھنا گاتی۔ جس کی تان اپنی عمر و تندرستی اپنے بھائی کو مل جانے پر ٹوٹتی۔

پھر بڑے مخصوص انداز میں گوبردھن سنگھ اٹھتے، اپنی کٹھار کی کھڑکی کھول کر اندر گھس جاتے۔ گھی میدہ آلو نکالتے، جیسے بھری کٹھار میں سے ایک وقت کے قابل نکال رہے ہیں۔ اور جنگا بڑے اہتمام سے پوری کچوریاں، آلو طیار کرتی۔ اور ان کے سامنے پروستی اور انہیں کھلانے کے بعد خود کھاتی اور رخصت ہونے لگتی، رخصت کے وقت راٹھور نگر کے اسٹیشن سے چوہان گڑھ کے اسٹیشن تک کا تھرڈ کلاس کا کرایہ بتاتی اور کہتی کہ میں اکیلی آئی ہوں، ۴ر کی مٹھائی بتاتی ۲ر کا تلک کا چندن سیندور، یہ رقم تین چار روپیہ بنتی، پھر جسم پر موٹی دو ڈیڑھ روپیہ والی ساڑھی باندھے ہوتی اور ویسی ہی ساڑھی کے دام مانگتی اور سب حساب پانچ چھ روپیہ کا ہوتا اور گوبردھن سنگھ یہ رقم ہاتھ پر رکھتے جسے پا کر جنگا ایسی خوش ہوتی جیسے اس کے بھائی نے ہفت اقلیم کی دولت اس کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔ افلاس کے ہاتھ کا بخشا ہوا دان دولت کے ہاتھوں میں پہنچ کر ہیرے کی طرح چمکتا اور اس لین دین کے وقت تمام رسمی تجاہل عارفانہ برتتے جاتے۔

اور سہ پہر کے بعد جنگا اسٹیشن پہنچتی، اسی ڈبہ میں اس کا معتبر کارندہ شہر سے پلٹ چکا ہوتا ریشمیں بڑھیا ساڑھی مہری کہار کے موٹے اور اپنے باریک اچھے کپڑے اور مٹھائی کا ٹوکرا لیے ہوئے جنگا اپنی موٹی ساڑھی اتار کر نئی ریشمیں ساڑھی بدلتی۔ کارندہ مہری کہار اپنے اپنے کپڑے پہنتے اور رانی جی بنی سسرال پہنچتی۔ ساس نندیں دیکھتیں۔ شوہر دیکھتا کہ کتنے زور کی بھیا دبوچ کرتا ہے گوبردھن سنگھ اور بالعموم بنارسی ساڑھی دیکھ کر شوہر بول پڑتا۔

"وہ پرانے آن والے ٹھاکر ہیں۔ کچھ نہ رہا مگر بہن کو لیتے دیتے وقت رئیس بن جاتے ہیں؟ بھلا دیکھو تو یہ ساڑھی" اور اس کی ساس لقمہ دیتی۔ "پرانا چوہان گھر ہے۔ بات پر مٹنے والے چوہان" اور کوئی نند کہتی" اور مٹھائی تو دیکھو، پچرنگی ٹوکرا بھری"

"ہوں یہی تو میں کہتا ہوں، دیکھو تو اماں ٹھکرائت ان کی سچی ہے ذات پر میل نہیں۔ وہ بہن کے لیے یہ ٹھاٹ سامان، مہری کہار سب کی پہناؤنی کرتے ہیں" منشی جی کو مخملی کنار کی دھوتی اور بوسکی کی قمیص دی ہے۔ ٹھاٹ سے پہنے بیٹھے ہیں۔ باہر چوپال کے چبوترہ پہ"

اور جنگا بٹوے میں سے نکال کر دکھتی۔ پیسے کے سکے کے اکیاون روپیہ دکھاتی" اور اکیاون روپیہ"

"ہمت والے لوگ ہیں، جائداد دھن سب ختم ہوگیا پر آن وہی ہے"

اری چھوکری چھوکرو تم کیا جانو ہم جانتے ہیں ان چوہانوں کو۔ ہمت کے لوگ ہیں اور لینا دینا ہمت کے ہاتھ بات ہے۔

اور گوبردھن کے پاس تو باپ دادا کے زمانہ کا دبا دبایا پڑا ہے۔ یہ روپیہ نہ دیکھو۔ گڑے ہوئے کھودسے ہیں۔ جی دار ٹھاکر بچہ ہے جان جائے آن نہ جائے۔ کوئی بڑا اکھڑ راجپوت زمیں ٹھاکر اس سے اگلی اور کیا کرے گا۔" ساس کہتی اور جنگا خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی۔ جیسے یہ سب کچھ سچ مچ اس کے بھائی نے دیا ہے۔ یوں تو ساس نندوں کا گھر تھا۔ مگر جنگا جیسے اس سامان سے سال بھر تک سب گھر پر حاوی ہو جاتی۔ جیسے برابر کے ٹھاکر گھر کی بیٹی۔

(۳)

اور بھیا دیوج کا ڈیڑھ مہینہ باقی تھا۔ ساڑھے دس مہینہ کے پیسہ روز سے پس انداز کیے ہوئے پانچ روپیہ کے تانبے کے پیسے گوبردھن سنگھ کے پاس تھے اور ڈیڑھ ماہ میں انہیں دو ڈھائی روپیہ اور جمع کرنے تھے، وہ تمام دن مزدوری کرتے اور شام کو کسی کسان کے یہاں سے مونجھ کے گٹھے اٹھا لاتے اور آدھی رات تک اپنے اکیلے مکان میں پانی لگا لگا کر انہیں کوٹتے، کہیں سے پرانے سن کے پولے لے آتے اور انہیں توڑ توڑ کر سن علیحدہ کرتے اور ملا ملا کر باندھ بٹتے اور دوسرے تیسرے دن باندھوں کے وزن کے برابر مکا ساٹھی مل جاتا اور اس طرح رات کے چند گھنٹہ کے کام میں چار چھ پیسہ روز کے سر ہو جاتے اور اس طرح انہیں بھیا دیوج کے پُرخلوص دن کے اخراجات کی فراہمی میں محنت کرتے پندرہ دن ہو گئے تھے اور اب وہ مطمئن تھے کہ اب ہر ماہ میں فاقے کر کے پس انداز کرنا پڑے گا۔ ویسے سال بھر میں بارہ مہینہ ہر دن تو مزدوری لگتی ہی نہ تھی لیکن اور مزدوروں کی طرح جس دن مزدوری نہ لگتی وہ گھر نہ بیٹھتے۔ کھرپے سے کہیں ہری ہری دوب پر چھیل پڑتے اور شام تک دو آنہ کی نہیں تو پانچ چھ پیسہ کی گھاس چھیل کر بیچ ہی لیتے اور جب بارش کی وجہ سے کچھ بھی نہ کر سکتے تو اطمینان کے ساتھ فاقہ کر لیتے۔ مگر بھیا دیوج کے فنڈ کو پورا کرتے رہتے۔ ان کا دائرہ بہت چھوٹا تھا۔ مگر دائرہ کے اندر رہنے کا سلیقہ بہت وسیع، روز کا کنواں کھودتے اور روز کا پانی پیتے۔ انہیں زندگی کے پچیس سال گئے تھے۔ ان پچیس سال میں کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا تھا۔ کسی زمین سے ان کا تعلق باقی نہ تھا اور ان کے باپ دادا کا جانشین بنیا زمیندار انہیں جانتا بھی نہ تھا۔ مگر وہ اسے خوب جانتے تھے۔ کیونکہ انہی کے قرضہ میں ان کی آبائی زمینداری نیلام ہو کر اسے پہنچی تھی۔ جیسے اس کے بھاری کولھوں اور موٹی توند کے اندر سود در سود کی دھونکنی سے ٹھکرائن کی روح پھونک گئی تھی۔ جیسے گئو کا ماس کھا کھا کر اس کے اوپر یہ گوشت چڑھا ہے۔ اور ایک دو آنہ یومیہ کمانے والے مزدور کی نگاہیں اس پر انہیں جذبات کے ساتھ پڑتیں۔ اور حلقہ کا مہاجن تو ان لوگوں سے واقف تھا۔ جن کے پاس الٹ پھیر اور لین دین کے کچھ مادی سامان تھے۔ اور گوبردھن سنگھ کے پاس نہ دامن تھا اور نہ خار سے الجھتا تھا۔ البتہ اس کا بھیا دیوج کا حقیر دان ایسے ایسے نہ معلوم کتنے سامانوں پر بھاری تھا۔ جو اس کی بہن کا نندوں اور ملازموں کی سازش سے گھرج کر دکھایا کرتی تھی۔

اور آج صبح گوبردھن سنگھ یہ سوچ کر گھر سے نکلے کہ زمیندار بھٹہ لگوا رہا ہے۔ روزانہ کی مونج اور سن کی کٹائی میں تو بڑی محنت بھی پڑتی ہے اور بہت تھوڑا ہاتھ آتا ہے۔ اگر رات کا کام بھٹہ پر مل جائے تو ہفتہ ہی بھر کے اندر بھیا دیوج کے خرچ کے قابل رقم جمع ہو جائے۔ لہٰذا دریافت حال کے لیے جمی جولاہے کے گھر میں گئے وہاں اور ہی رنگ دیکھا۔ جمی جولاہے ایک بقر قصاب کے ساتھ کھڑے تھے اور جمی جولاہے کی اوسر گھر کے دروازہ کے قریب زمین پکڑے پسری ہوئی تھی۔ اور بقر قصاب رسی پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ اور پیچھے سے جمی جولاہے ٹخ ٹخ کر کے اٹھا رہے تھے مگر اوسر کسی صورت زمین نہ چھوڑتی تھی اور زیادہ ٹخ ٹخانے

پر گردن ہلا ہلا کر گویا جانے سے انکار کرتی تھی۔

گوبردھن سنگھ پہلی ہی نظر میں سمجھ گئے اور آہستہ سے جمی جولاہے کے کان کے قریب منہ لا کر بولے "کیوں چاچا ایسی اچھی گھر کی بچھیا کیوں کٹائے دیت ہو؟"

جمی جولاہے مجوب سے ہو گئے اور گردن جھکا کر زیر لب بولے: "بیٹا اپنے بس کٹائے دیت ہوں، لالہ جی (زمیندار) کا لگان ٹوٹ رہا۔ بیدکھلی (بیدخلی) کا نوٹس دیا ہے۔"

"تو پھر کٹائے سے کیا نتیجہ لالہ جی سے کہو کرے ہیں اپنے معاملہ میں" گوبردھن سنگھ نے کہا۔

ارے بیٹا بہتیری کہی اسٹیا ما بچھیا ہے۔ کھائے پئے بڑی سگھڑ گائے ہنے گی۔ پر نا ہیں مانو، کہت ہے کہ ہم کیا کریں گے۔ ہمیں گائے ناہیں چاہیئے ہمارا لگان دیو۔ ہمیں گایوں کا باڑا بنانا ہے کر جمینداری (زمینداری) کرنا ہے۔

"تو کتے میں کٹائے دیت ہے چاچا" گوبردھن سنگھ نے رقت کے ساتھ کہا۔

اور اس سے زیادہ رقت کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کر جمی جولاہے بولے "پانچ روپیا میں بیٹا"۔ اور ایک مسلمان کی آنکھوں میں اپنی گائے کٹانے پر مجبوری کے آنسو دیکھ کر ٹھاکر کے خون میں جوش آ گیا اور گوبردھن سنگھ بولے "پھر تم کہی نائے اس ہنسے (زمیندار) سے کہ کسائی (قصائی) سیئے گو"

ہاں بیٹا سب کچھ کہی پر اس نے وہی اپنے مطلب کی کہی کہ تم جانو۔ مت دیو کسائی کو پالو دودھ کھاؤ ہمارو مطالبا ہمیں دیو۔

گوبردھن سنگھ دانت کٹکٹا کر بولے: "بنیا سالا۔ ویش بنت ہے (ویش بنتا ہے) اور ٹھکرائت کرتا ہے، کسائی ہے کسائی بھگوان نے حکومت زمینداری دے دی اس کے ہاتھ میں! اے فلک تیری لیلا! اور بڑبڑاتے ہوئے گوبردھن سنگھ نے چلنے کا اندازہ بتایا۔ ایک نظر ڈالی تو اوسر (بچھیا) کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں۔ مجبور نگاہوں کی شعاعیں ملتجی آنکھوں سے جا ملیں، اور ساتھ ہی حلق سے آواز اوسر نے گائے سے زیادہ کچھ آدمی سے ملتی جلتی نکالی اور آنکھوں کی رہی سہی باقی سب کچھ اس کی آواز میں کہہ دی۔

اور آواز پر جیسے ایک ذہنی ترنگ کے ساتھ گوبردھن سنگھ نے اچھل کر پھر اوسر کی جانب دیکھا۔ اور انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ گائے کی معصوم خوبصورت ہرنی جیسی آنکھوں کی کرنٹ راجپوت کی بہادر آنکھوں سے مل گئیں اور جیسے دو ڈائنمو کی لہریں ایک دوسرے سے سلسلہ ملانے لگیں۔ جیسے ان کے شعور میں ہزاروں سال پرانی کہانی دوہرا دی۔ وہ بے خود ہو گئے۔ اور ان کے جذبات کا رشتہ ماضی و مستقبل دونوں سے منقطع ہو گیا اور جیسے بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے اور بلا ایک نظر آگے اٹھائے ساڑھے دس روپیہ کا بھیا دیوج کا اندوختہ قصائی کے حوالہ کیا اور رسی ہاتھ میں پکڑ لی اور اوسر تو جیسے منتظر بیٹھی تھی۔ گوبردھن سنگھ کے رسی پکڑتے ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی اور یا تو جمی جولاہے کے گھر کے دروازے پر زمین کا گز بنی چپکی ہوئی تھی یا گوبردھن سنگھ کو گھسیٹتی ان کے گھر کی جانب دلکی بھاگی چلی جا رہی تھی اور ان کے گھر جا کھڑی ہوئی۔

گوبردھن سنگھ کے بے آب و گیاہ زندگی کے میدان میں کبھی صنفِ نازک داخل نہ ہوئی تھی۔ بچپن کی ماں کی آغوش فراموش کر چکے تھے۔ جوانی بیوی کی خوشبو سے آشنا نہ ہوئی تھی، سال کے سال بہن صبح کے ستارے کی طرح چمک کر سال بھر کے لیے غائب ہو جاتی اور ایک سرور سا گوبردھن سنگھ کی آنکھوں میں چھوڑ جاتی جس کے سہارے ان کے اندر جمالیاتی احساس کی جھلک لوٹ بھیا دیوج تک باقی رہتی اور بھیا دیوج کی طیاری میں انہیں سال کے بارھوں مہینے کا ہر دن گذرتا۔ اور ان پر مستقل سرور سا رہتا۔ آج انکی زندگی میں گائے داخل

ہوئی تھی۔ اور گائے بھی نوجوان۔ اوسر اور پھر شیاما! ایک رنگ۔ بے داغ چمکتا ہوا سیاہ رنگ۔ رونگٹے پر ایسی چمک جیسے گھی ملے ہوئے ہیں، عضو عضو قدرتی پرورش اور نوجوانی کے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ کھُر سے لے کر سینگ تک ہر چیز پر بالیدگی سی اچھلتی ہوئی۔ انگ انگ پر زندگی کے سوتے ابلتے ہوئے گائے تھی کہ بندرابن سے خاص کنہیا جی کے گلے کی نکلی ہوئی دیوی۔ دودھ گھی کی نہروں کا خزانہ اپنے اندر چھپائے ہوئے اور بڑے بڑے چوڑے رقبوں کی کاشت کے جانوروں، کا کہ بنی ہوئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد یہ نشہ خمار بن گیا اور آج سے چالیس روز بعد بھیا دیوج کا دن ان کے سامنے کھڑا تھا اور جوں جوں دن گزرے شیاما انہیں بیرنی سی نظر آنے لگی۔ ان کی ساری روایات سات پشت کی ساکھ ہڑپ کرتی معلوم ہوئی۔ اور اوسر گائے سے تو بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہوا کرتی ہیں۔ اور آج شیاما تو ان کے لیے گرم دودھ بن گئی تھی۔ اور بھیا دیوج کا ایک ایک دن کم ہو رہا تھا۔ دور دور فراہمی زر کی شکلیں نظر نہ آتی تھیں۔ گوبردھن سنگھ کی رات کی نیندیں اڑیں، دن کا سکون گیا۔ لائیں تو کہاں سے لائیں اور مانگیں بھی تو کس برتے پر اور کس سے۔ اور اس طرح بیس روز گزرے، اور بیس دن ہی کی پرورش میں شیاما رنگ پر آگئی اور کھلی رہی۔ کسی خوش نصیب کے تھان پر شیاما اوسر گابھن ہوتی ہے کوئی دوسرا ہوتا تو خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا مگر گوبردھن سنگھ پہلوٹھا شیاما کے مالک فکر میں گھل رہے تھے۔ تقدیر دیکھیے جتی جولاہے اسے خالی سمجھ کر قصائی سے گنا رہے تھے۔ زمیندار نے بے کار بچھیا خیال کر کے لگان میں لینی پسند نہ کی تھی۔ اور گوبردھن سنگھ کے تھان پر بیس دن میں ہی گابھن کھل گئی۔ مگر م —— کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک" —— دودھ دے گی گھی دے گی بچھڑے دے گی۔ مگر جب تک گوبردھن سنگھ کی پچیس سال کی بنی بنائی کرکری ہو چکی ہو گی۔ بھیا دیوج پر ان کی بہن آئے گی اور وہ خالی ہاتھ ہوں گے اور ان کا دم گھٹنے لگتا۔ برسات گزر کر کنوار آ لگے گی۔ تو ہری ہری بکی دوب بھر چر کر شیاما جیسے یک دم پہاڑ کی پہاڑ گائے بن گئی یہ بڑا پیٹ، بھرے ہوئے مٹکا سے تھن۔ اور بدن میں چستی اور تن دہی، چال میں نشہ سا اور کبھی کبھی گوبردھن سنگھ گابھن گائے کو دیکھ کر سوچتے "کیسا پاپ، بچا! کیسی اچھی شیاما گئو اور گابھن، قصائی کی چھری سے کٹتے کٹتے بچی۔ مگر اتنے بڑے پن کے احساس سے بھی وہ اپنے دل کو نہ سمجھا سکے۔ وہ تو بھیا دیوج کا تیوہار سانپ کی طرح لہراتا بڑھ رہا تھا اور جس قدر شیاما دن دگنی رات چوگنی ہوئی اتنے ہی گوبردھن سنگھ گھٹے اور گھلے اور ایک شام گوبردھن سنگھ جنگل سے ہنکا کر شیاما کو لا رہے تھے بستی کے قریب حلقہ کا ساہوکار گاؤں سے واپس جا رہا تھا۔ گوبردھن سنگھ کی گائے کو دیکھ کر ساہوکار نے اپنا رتھ روک لیا۔ سلاموں کے تبادلہ کے بعد ساہوکار نے کہا: "ٹھاکر بڑی اچھی شیاما پالی ہے؟"

ہاں ساہو جی پالی کیا ہے۔ سر پڑ گئی ہے۔ جتی جولاہے کو لگان کے لیئں پانچ روپیا کی ضرورت تھی۔ سو وہ گنائے دیتے تھے میرے پاس پانچ روپیہ کاؤ کی دھرو (کسی کی امانت) کے رکھے تھے میں نے اٹھا کے دے دیئے۔ تو اب تو جی گلا میں اٹک گئی ہے؟"

ہوں پانچ روپیہ دے کے پچاس کا مال بھی تو نے مار لیا، ایسی اوسر اور پھر شیاما کسی تقدیر والے کے ہاتھ لگتی ہے۔ گھر بھر دیئے گی گھرا آدھے گابھ سے اوپر نکل گئی۔ بس اب بیاہے دن چار مہینہ بعد۔"

اور "چار مہینہ" کا لفظ گوبردھن سنگھ کو چار دوک سنائی دیا، آہستہ سے بڑبڑائے "پھر ساہو جی چار مہینہ کیسے نبھیں گے۔ جس کی دھرو ہے وہ تو آج مانگتا ہے۔ میرے لیے تو اس کی کمر بھاری مصیبت بن گئی ہے۔"

ارے ٹھاکر کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ تو دودھار گائے ہے۔ مثل میں کہی جاتی ہے پھر شیاما۔ اس کا دودھ امرت، اس کا گھی آبحیات ہوتا ہے شیاما کا گھی دودھ، بولو میں دوں۔ کتنے چاہئیں پھر صاف بات جے ہے کہ پورے بیانت کا گھی دودھ میں کھاؤں گا۔ اور بھاؤ آج

طے کر دوں گا۔ بولو کتنے روپے؟"

گر ساہوجی مثل تو یہ بھی ہے کہ گابھن گائے کس نے دیکھی؟"

ارے ہم نے دیکھی اور یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور بولے کتنے روپیا دوں؟"

اور اب انکار کرنا دودھ بھری تھالی میں لات مارنا تھا "سات روپے" گوبردھن سنگھ کے حلق سے اٹکتی ہوئی آواز نکلی اور ساہوکار نے دس روپیہ جیب سے نکالے اور کہا "یہ لو ٹھاکر، پھر نہیں ہماری شرح معلوم ہے ادھنی روپیہ ماہوار سود چلے گا۔ اور بھادوں بازار پا سیر پہ ادھ سیر اوزن پہ چڑھے گا۔ اور گئو کا معاملہ ہے یہ زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا اس کو کھلانا پلانا پڑے ہی پن ہے۔"

مثل مشہور ہے بھوک کے کائیاں بھادوں شرح سود اور گھی دودھ نرخ کو گوبردھن سنگھ اچھی طرح سنا بھی نہیں۔ رہ میں بیٹھے ہی بیٹھے بہی کھاتہ کھول کر ساہوکار نے اندراج کیا۔ اور روپیہ انٹی میں لگا کر خوش خوش گوبردھن سنگھ گھر آ گئے۔ شیاما اپنی برکت ساتھ لائی تھی۔ اور اس روز گوبردھن سنگھ چین کی نیند سوئے۔

(۴)

اور بھیا دوج کا متبرک دن نزدیک ہی آ پہنچا۔ جب آسمان برسات بھر کا دھلا دھلایا شفاف نیلگوں ہوتا ہے۔ جب صبح شام خوشگوار خنکی ہوتی ہے اور دوپہر کو گلابی سلونی حرارت ہوتی ہے۔ جب خریف کی فصلیں کنوار کے سورج کی تیز کرنیں پکا چکتی ہیں اور سردی کا جمود اپنا قبضہ نہیں پا چکا ہوتا۔ دیوالی کی تاریک ترین اماوس کی رات کے بعد پہلی دوج پر یہ پُرخلوص تیوہار منایا جاتا ہے اور جنکا ہمیشہ کی طرح میکے پہنچیں اور گھر میں گھستے ہی پہلی نگاہ میں تھان پہ شیاما دیکھی۔ اور دیکھ کر ایسی باغ باغ ہوئیں کہ شوہر کے دروازہ پہ کبھی ہاتھی جھومتے دیکھ کر یہ خوشی نہ ہوئی تھی۔ حسب معمول رسم ادا ہوئی۔ بہن نے ٹیکا کیا۔ گیت گایا۔ پادھنا کی اور پکوان پکا بھائی کو پروسا اور خود کھایا دان لیا اور سب وقت بار بار شیاما کا تذکرہ خوش ہو ہو کر کرتی رہیں۔

اور دوسری بھیا دوج پر جنکا پہنچیں تو خوشی کے مارے پھولی نہ سمائیں۔ ایک ننھا منا سا بچھڑا اور شیاما کا دودھ سے بھرا ہوا تھنکا سا "ایں" لٹکتا ہوا۔ شیاما تھی کہ نعمت کی پوٹ اور اگلی مرتبہ بھیا دوج سے زیادہ کھانے پینے کا سامان ہوا اور دان میں کچھ گوبردھن سنگھ نے بڑھانا چاہا مگر جنکا نہایت خوبصورتی سے ٹال گئی اور مقررہ رقم آگے نہ بڑھنے دی اور جنکا بھیا کے دروازہ پر ایک گائے ایک بچھڑا دیکھ کر خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو گئی۔ بڑی دھوم کے ساتھ گیت گایا اور سسرال پہنچ کر بڑی تفصیل اور خوشی کے ساتھ شیاما اور اس کے بچھڑے اور دودھ کا تذکرہ ساس اور شوہر سے کیا۔ "اب تو بھیا کے تھان پر شیاما بندھی۔ ہے بڑی دودھار۔ گھر میں دودھ گھی کی ریل پیل ہے خوب زور کی دعوت کھائی ہو گی۔"

"طبیعت اچھی ہے خوب دان پُن کرتے ہیں پھر کیوں ناہیں ملے گا۔" ساس بولی "شیاما گائے بندھی ہے۔"

"اچھا شیاما ہے۔ بھیا کے تھان پر" شوہر نے کہا۔ "شیاما کے کیا کہنے کسی تقدیر والے کو ملتی ہے۔ دودھ، گھی، مٹھا ہر چیز امرت کی بوند۔"

"اور پھر بھاگ، ماں ایسی کہ گھر بھر دے۔" ساس نے کہا۔

اور اگلی بھیا دوج پر جب جنکا پہنچیں تو دو بچھڑے دیکھے۔ "میرے بھیا کا گھر بھر جائے گا۔ باڑھا بنانا پڑے گا۔ اب تو خوش ہو کر

کہا۔ اور ساتھ ہی ساتھ جنتا نے بھائی کے چہرہ پہ اطمینان اور فراغت کی چمک دیکھی۔ جسم پر کپڑے بھی قدرے بہتر تھے۔ بڑی مطمئن آئی اور بڑے شوق کے ساتھ سسرال پہنچ کر دیر تک تذکرہ کرتی رہی۔

اور شیاما کو گوبردھن سنگھ کے تھان پر تیسرا سال تھا جبکہ بیوہار کی میعاد تین سال ہوتی ہے۔ کنوار کے دسہرے پر ساہوکار تین سال پرانا حساب بیباق کرتے ہیں اور اس دسہرہ پر حساب لازمی تھا۔ اور ساہوجی کے بہی کھاتہ میں تو دودھ کی بوند بوند گھی کا قطرہ قطرہ لکھا ہوا تھا۔ اور ہر قیمت بہ اٹھوارے کے بھاؤ پہ سیر کے اوپر ادھ سیرا چڑھی سامنے درج تھی۔ اور ہر بھیا دیوج کے خرچ کا پیسہ پیسہ مع شرح سود ماہ بماہ درج تھا۔ ویسے تو حساب کتاب بالکل صاف تھا مگر ساہوجی کو تفصیل کے ساتھ سمجھانا پڑا۔ تین سال بھر چکے تھے۔ صفائی لازمی تھی۔ پہلی بھیا دیوج پر صرف گابھن اور سرکاسے کی کفالت تھی۔ دوسری پر ایک بچھڑا بھی اسی زد میں آیا اور تیسری پر دوسرا بچھڑا بھی لوٹ پوٹ میں لپٹ گیا۔ گاؤں کے پنچ جمع ہوئے بہتیرا تخمینہ بڑھایا۔ بچھڑوں کی قیمت بڑھا چڑھا کر لگائی۔ مگر حساب جمع خرچ کے میزان میں دونوں بچھڑے ساہوجی کی جانب گئے اور آدھی گائے۔ اور آئندہ اس شرط پر گائے گوبردھن سنگھ کے حوالہ کی گئی کہ بند رہا ایک پہادم گھی دودھ ان کا اور بچھڑے آدھے آدھے، اور نصف گائے ملکیت میں لگا کر اور پچھلے سے دام دام بیباق ہو کر گوبردھن سنگھ گائے لے کر پلٹ آئے اور تیسرے سال تو دام صود پہ گابھن سال مرور باقی ہیں اور ہر سال تو نہیں دبا کرتیں۔ اور اس مرتبہ شیاما خالی معلوم ہو رہی تھی اور دسہرے کے بعد دیوالی اور دیوالی کے تین بعد بھیا دیوج کا تیوہار پڑتا ہے۔ مگر گوبردھن سنگھ مطمئن تھے۔ کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی وہ ساہوجی سے لے کر حسب معمول بھیا دیوج کا خرچ پورا کر دیں گے۔ اور جب دیوالی سے پیشتر وہ ساہوجی کے پاس گئے تو ساہوجی نے صاف انکار کر دیا۔ پہلے تو آدھی گائے اور وہ بھی سوکھی کاہے پہ دواپن تم پھنس دیتے۔

اور خلاف امید انکار گوبردھن سنگھ کو توپ کے گولے کی طرح لگا۔ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح وہ تھما چلا آیا۔ اور بھیا دیوج کے تو آج سے سات ہی دن باقی تھے۔ اگر سات دن میں وہ سات جنم لے کر سات مرتبہ بکتا تو بھی سات روپیہ جمع نہ کر سکتا تھا۔ کچھ سوچا اور سوچ کر پھر ساہوکار کے پاس پہنچا۔ اور کہا "ساہوجی تو پھر آدھی گائے آپ کی رہی اور آدھی میری۔ اس کی قیمت تخمینہ کر لیجیے۔ لیو اور آدھی جمع میری ہاتھ دھرو اور گائے تم لے لیو۔"

"واہ ٹھاکر جی واہ! یعنی کیا ہم سوکھی گائیں پالنے بھرتے ہیں۔ تم پالو۔ اس کے بچے بڑھاؤ۔ گھی دودھ کرو۔"

"مگر میرا کام بغیر سات آٹھ روپیہ کے نہیں بن سکتا۔ آج کے دن بھیا دیوج ہے، اور جنتا آتی ہوں گی۔"

لیکن ٹھاکر وہ کچھ ہو۔ بھیا دیوج یا دیوالی سوکھی گائے اور آدھی، اور ادھنی دو پیر مہینہ کے سو اور بڑے بھاؤ پہ سات روپیہ کیسے پٹ جائیں گے۔ جتنی چادر ہو اتنے پاؤں پھیلائے آدمی۔

"تو پھر مجھے تو اپنے حصہ کی گائے رکھنا نہیں ہے اب۔"

"نہیں پالنا ہے تو بیچ لو جہاں بکے اور ہمارے آدھے دام ہمارے ہاتھ دھرو۔"

"مگر آج کل اسے لے گا کون۔ پہلے تو گابھن نہیں ہے اور گابھن بھی نکلی تو دودھ پیا۔کے گی چھ سات مہینہ بعد۔"

"کوئی نہ لے گا تو پالو۔ روزگار کرو۔ چار پیسہ ہمیں بھی کما کے دیوگے آپ بھی مٹھا بوند کھا پڑو گے۔"

"تو پھر اس بھیا دیوج کا تو خرچ پورا کر دیو۔"

"گنجائش نہیں ہے ٹھاکر۔ اور تمہارا بس نہ چلے تو ختم کر دیو، بیچ ڈالو، مگر ہم تو لیں گے نہیں۔"

"تو کوئی گاؤں والا کسان تو ایسے میں لے گا نہیں قصائی کاٹے گا۔" گوبردھن سنگھ نے کھسیانا ہو کر کہا۔

"کچھ ہو تم جانو، ہم کب کہتے ہیں کہ تم خالی گائے بیچو، تمہیں تو بیچتے ہو۔"

اور گوبردھن سنگھ تاؤ میں بھرے چلے آئے۔

(۵)

بھیا دوج کے مقدس اور پرخلوص تیوہار میں دو دن باقی تھے اور گوبردھن سنگھ کی جیب خالی تھی۔ اس کا دل سینہ میں دھک دھک کر رہا تھا۔ اور اس کا دم گھٹنے لگتا، اور جب اس کی بہن دو دن بعد آئے گی تو خالی ہاتھ جائے گی۔ اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے تو تعجب نہیں۔ اور پھر اس کے پاس تو اس کے ایک وقت کے کھانے کے قابل میدہ گھی اور آلو بھی نہیں اور بھیا دوج کی مٹھائی کی ڈلی کے لیے وہ ہرگز منہ نہ کھولے گا۔ اس کے سینہ میں کبوتر سے پھڑپھڑا اُٹھے۔

عمر بھر کا تھکا ہارا ٹھاکر اپنے جھونپڑے کے سامنے صحن میں بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سر پہ رکھے، جیسے پوری ایک سلطنت کا مالک، جس کا بجٹ فیل ہو رہا ہو۔ اور اس کے جد نامدار کی صدیوں کی بنی ہوئی ساکھ اور عزت مٹی میں مل رہی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور تمام ماحول کو پرتالا۔ برسات کے مارے گلے پھونس کا جھونپڑا جس کے اندر ایک چارپائی پر کچھ چیتھڑے گدڑے پڑے ایک جانب کچھ اوندھے سیدھے مٹی پیتل کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ اور اندر کو کٹھار کی کھڑکی کا دروازہ۔ بھرم بھاری پٹارا خالی۔ باہر سے ایسی چکنی چپڑی جیسے نہ معلوم اس میں کتنی جنس بھری ہے اور کھوکھلے کھوکھلے جذبات سے ادھر سے منہ پھیر لیا۔ اور سامنے شیاما کھڑی دم ہلا رہی تھی۔ اور گوبردھن سنگھ سو گیا۔ اور راجپوت جاگ اٹھا۔ اور بجلی کی لہر سی اس کے دماغ سے چل کر رگ رگ جھنجھناتی نکل گئی۔ اور جیسے وہ اُچھل کر کھڑے ہو گئے اور کڑے کمان کے تیر کی طرح مہاجن کا منہ چڑاتے جمّی جولاہے کے گھر میں پہنچے، جمّی جولاہے الاؤ کے پاس تنہا بیٹھے ہوئے تھے جاتے ہی گوبردھن سنگھ بے دھڑک بولے "چاچا ہماری گئیے بیچ دیو۔"

"اب بیٹا تمہاری گئیے! وہ تو آج کل ٹھنٹھ ہے کون لیئے گو۔"

"جو کوئی لیئے" انہوں نے قدرے آزادی سے کہا۔

"ناہیں بیٹا، کون پڑیگو، کوئی کسان تو لیئے گا نہیں۔"

"پھر جو کوئی لیئے"

اور جمّی جولاہے نے غائر نگاہ سے ان کا چہرہ دیکھا اور مضبوط ارادے والے راجپوت کے انداز میں بات کر رہے تھے اور پھر بولے "تو تم ساہو جی کو کیوں نہ لگائے دیو۔ آدھے دام تم لے لیجو۔"

ساہو جی ناہیں لیت، کہتے ہیں پالو اور نہیں تو جہاں چاہے بیچ ڈالو ہماری او جاہیں دے دو۔"

"ہوں تم پالو!" جمّی جولاہے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "بیوہار چلتا رہے۔ اب کے تیسرے سال دو بچھڑے اور پوری گائے انہیں ہضم ہو جائے۔ اور تین برس گھی دودھ نفع میں کھائیں ــــ سالا مہاجن ہے مہاجن!" اور جمّی جولاہے کو شیاما کے ساتھ لگاؤ تھا۔ پھر بڑے زور سے دانت کٹکٹا کر کہا "کسائی ہے رقصائی، کسائی، دیکھو تو۔ بے ایمان گئو کٹائے دیت ہے سود کے لالچ میں۔"

" اور پرسوں بھتیا دیوج ہے تم جانت ہو۔"

" میں سمجھ گیا بیٹا۔ پھر تم اچھی طرح سمجھ بوجھ لیو۔"

اور مجبور ٹھاکر بچہ کی گردن ندامت شرم اور روایات کے بار سے جھک گئی۔ اس کے شیر سے جسم پہ روباہ کا پوستین آ گیا۔

شام کو قصبہ سے جمی جولا ہے بقر قصاب کو بلا لائے۔ بقر قصاب نے اُوپر سے نیچے تک بالوں میں ہاتھ گڑا گڑا کر نیا ما کو پڑتالا، پھر سے بغور دیکھا۔ اُوپر سے بغور معائنہ کیا۔ نیچے جھک جھک کر دیکھا۔ پھر آہستہ سے دُم کھینچی اور بڑبڑایا۔ دو من مال ہے۔ رواج (چربی) سمیت ——— بس دو من ! ———"

اور ٹھاکر کے کان میں جس کے تین سال کے گھی دودھ کی آواز کا وزن ساہوجی کے بہی کھاتہ سے حساب ہو کر گیا تھا۔ آج اسی کے گوشت کا تخمینہ کیا جا رہا تھا۔ جمی جولا ہے نے سودا چکایا اور چودہ روپیہ میزان لگی۔ نیاما کی رسی بقر قصاب نے پکڑی اور چودہ روپیہ گوبردھن سنگھ کو پکڑا لئے۔ گوبردھن سنگھ نے روپیہ ہاتھ میں لیے جیسے بچھو نے کاٹ لیا۔ بغیر گنے جمی جولاہے کی جانب بڑھائے اور رُکتی ہوئی آواز میں بولے" چاچا تم سات روپیا اس مہاجن کو دے آؤ اور سات اپنے پاس دھر لیو کل دوپہر جنگا آئیں تو پہنچا دیجیو۔

" تو پھر نہیں دھر لیو نا، جمی نے کہا ——— اور گوبردھن سنگھ کو ایسا سنائی پڑا جیسے کہہ رہے ہیں" ایک من گوشت تم نے بیچا ہے اس کے سات روپیہ بھی تم اپنے پاس رکھو۔"

" ناہیں چاچا نہیں دھر لیو اپنے پاس اور سات اسے دے آؤ مہاجن کو" گوبردھن سنگھ نے جاتے ہوئے کہا اور جیسے ایک من گوشت کا ٹوکرا سر پہ دھرے گھر کی جانب چلے۔ انہیں خوب یاد تھا۔ کہ بچپن میں کہانیوں میں سنا تھا کہ محمد غوری نے جب دوسری مرتبہ [illegible] حملہ کیا تو اپنی فوج کے آگے گایوں کا بہت بڑا گلہ کر دیا تھا۔ اور بڑھتے چلے آئے تھے۔ اور [illegible] کے سبب چوہان اپنی تلواریں بند کیے پیچھے ہٹتے رہے تھے اور محمد غوری کی فوج بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے گئووں کی ڈھال کی آڑ میں دلی فتح کر لی تھی اور چوہان گئووں کو کاٹ کر ترکوں تک نہ پہنچ سکے تھے اور بغیر لڑے دلّی فتح ہو گئی تھی۔

اور اس کی تلوار گائے کی حفاظت کے لیے بنی ہے۔ اور آج اپنے ہاتھوں وہ گائے کو چھری تلے دے کر آ رہا ہے۔ وہ اپنے سنسان گھر میں پہنچا۔ نیاما کے تھان پہ گوبر بدستور بکھرا ہوا تھا۔ اور سانی کی ناند میں چارے کے پس خوردہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور اس نے ایک گہری سانس لی اور زمین پہ اکڑوں بیٹھ گیا . . . .

اور بھتیا دیوج کے دن حسب معمول جنگا اسٹیشن پہ آ گئی، اور کا ندہ ہر سال والا سفر سامان سمیت ٹھہر گیا۔ گاڑی شام کو جایا کرتی تھی۔ اور جنگا ہمیشہ اسٹیشن پہ کا ندہ کو منتظر ملتی تھی۔ مگر آج واپس نہ پہنچی تو جو مہری کہار وہاں موجود تھے۔ ان کے حوالے کپڑے اور مٹھائی کا ٹوکرا کیا اور کہہ دیا کہ گھر کہہ دینا کہ بھوجی اور منشی جی کو بھتیا نے ٹھہرا لیا ہے اور وہ کل آئیں گے۔

صبح ہی جنگا بھائی کے دروازہ کے قریب پہنچی تو کچھ مجمع اور کچھ آوازیں سُن کر ماتھا ٹھنکا جب آگے بڑھی تو جتنے منہ اتنی باتیں —

" اچھے خاصے تھے کل دن مندے۔"

" ارے ہمارے پاس بیٹھے چلم پیت رہے۔"

اور کل دن مندے سات روپیہ بھتیا دیوج کے میرے پاس دھر دو (امانت) دھرے۔

اور اتنے میں شور ہوا کہ آ گئیں - آ گئیں ، جنگا آ گئیں ۔ اور جنگا چیرتی پھاڑتی اندر پہنچی تو گوبردھن سنگھ کے جنازہ پر جا کھڑی ہوئی۔ فطری طور پر بہن کی چیخ نکل گئی۔ تمام جسم پیٹ کر پھینک دیا۔ سبب موت پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اور افیون کی کاشت تو تمام گاؤں میں عام تھی۔ اور سال دو سال پیچھے ایک دو قصے ایسے ہو ہی جاتے تھے مگر سبب کا پتہ نہ تھا۔ جب جنگا رونے پیٹنے سے ذرا ہوش میں آئی اور اس نے وہ مخصوص گیت بین کے لہجہ میں گایا جو بھیا دیوج پر گایا کرتی تھی۔ اور جمّی جولاہے نے گوبردھن سنگھ کی امانت انٹی سے نکال کر دے دی تو جنگا نے گوبردھن کے جنازہ پر کھڑے ہو کر ٹیکا کیا اور پھر مٹھائی کی ڈلی بند ہونٹوں کی جانب بڑھا کر بین کیے مگر گوبردھن سنگھ تو آج کی بھیا دیوج کے دان کا راز اپنے بند ہونٹوں میں چھپائے اس قدر خاموش تھے کہ ہونٹ بھی نہ کھولے۔

اور جب لاوارثی جنازہ ٹکٹکی بنا کر اور کفن پہنا کر جنگا نے گاؤں کے پنچوں کے حوالہ کیا تو دروازہ پر شیاما کو لیے قصائی کھڑا تھا جو آہستہ آہستہ جمّی جولاہے سے کہہ رہا تھا کہ "ڈاکٹر نے پاس نہیں کی۔ گائے گابھن نکلی۔ سالے کو دو روپیہ دیتا رہا نہیں مانا۔ آج کی دو کا مزدوری بھی ماری گئی — اور جنگا شیاما کو پہچان کر قریب آ گئی۔ اور سب حال معلوم کر کے بھیا دیوج کے دان والے سات روپیہ اور ساہوکار والے سات روپیہ علیحدہ علیحدہ نکال کر حوالہ کیے اور کارندہ سے آہستہ سے ایک جانب لے جا کر کہا۔

منشی جی اب کی مرتبہ بھیا دیوج کے دان میں بھیّا نے شیاما گائے دان کی ہے سمجھ گئے۔

پرواز کے زخم

کشمیری لال ذاکر

میں ابھی ابھی اس کے گھر سے لوٹ کر آیا ہوں اور اپنے کمرے میں بیٹھا سگرٹ پی رہا ہوں۔ پردوں کے کارن کمرے کا ماحول کچھ ملگجی سا ہے اور اس میں سگرٹ کے دھوئیں کی منحنی سی لکیریں عجیب جنگلی بو سے ایک دوسرے میں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ سامنے تپائی پر رکھی ایش ٹرے میں ایک ادھ جلا سگرٹ ابھی تک سلگ رہا ہے۔ میں سگرٹ کو مسل کر اس کی ہستی نہیں مٹاتا، اسے زندہ رہنے دیتا ہوں اور اس کے آخری حصے پر میرے ہونٹوں کے نشان سوئے رہتے ہیں اور اس میں سے ہلکا سا لرزتا ہوا دھواں اٹھتا رہتا ہے۔ میں اسے سلگنے دیتا ہوں جب تک وہ خود نہیں بجھ جاتا۔

مجھے ایک دم بجھ جانے سے سلگ سلگ کر تڑپ تڑپ کر دُھک دُھک کر دھیرے دھیرے بجھنا پسند ہے۔ اس طرح ارتقاء کی سب منزلیں طے ہوتی ہیں۔ درمیانی منزلیں طے کیے بغیر آخری منزل پر پہنچ جانا تو ایسے ہے جس طرح کوئی پرندہ پہاڑ کی چوٹی سے اُڑ کر ایک دم آسمان کی بلندی کو چھو لینا چاہے اور اگر اس کے پنکھ ٹوٹ جائیں تو اسے زمین کی پستیاں بھی قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ایسا ہی کچھ تاثر میرے ذہن میں ابھرا ہے آج نیناں کو دیکھ کر۔

نیناں کو میں سنہ ۱۹۴۷ء سے جانتا ہوں جب بٹوارے کے بعد میں اس شہر میں آیا تھا۔ ان دنوں وہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی اب بی۔ اے کر چکی ہے۔

ان دنوں وہ سبز سبز پتیوں میں چھپی ہوئی کلی تھی اب پودے کے عین اوپر کھلا ہوا پھول ہے۔

غالباً نومبر کا مہینہ تھا۔ ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ شروع تھے۔ میں دن بھر کرکٹ کھیل کر اور آخر میں پٹ کر گھر لوٹا تھا۔ ہار کا تلخ احساس ذہن میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا اور جسم میں تھکن کے کارن درد ہونے لگا تھا۔ میں گھر پہنچتے ہی بستر پر گر گیا اور آنکھیں بند کر کے دن بھر کے کھیل کے متعلق سوچنے لگا۔

"بھائی جان کھیل آئے میچ؟" شاردا مجھے بھائی جان ہی کہہ کر پکارتی ہے۔ بھیا نہیں کہتی، اسے یہ انداز پسند ہے۔

"ہاں!" میں نے کہا۔ شاردا میرے سرہانے بیٹھ گئی۔

"ہار گئے؟" اس نے مجھ سے اس انداز سے پوچھا جیسے اسے پہلے ہی یقین ہو کہ میں ہار جاؤں گا۔ آخر وہ میری بہن ہے۔ وہ جانتی ہے اس کا بھائی کسی بھی کھیل میں کبھی نہیں جیتا۔

"ہاں!"

"تو شرط قائم ہے۔" شاردا نے اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا اور میں نے اس کی پتلی پتلی انگلیوں کی مہربان ٹھنڈک کو محسوس کرتے آنکھیں کھول دیں۔ وہ مسکرا دی۔ میں جب ہارتا ہوں وہ مسکراتی ہے اور اس کی اس معصوم اور بے لوث مسکراہٹ سے شکست کی چبھن ایکدم مٹ جاتی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"چائے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چائے تیار رکھی ہے میرے کمرے میں۔ وہیں چلئے۔ میری ایک سہیلی بھی ہے، اس سے ملئے۔" شاردا نے جواب دیا۔

"لیکن میں نے تو منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا۔"

"کونسا میرج بیورو میں جا رہے ہیں آپ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا۔ "کسی وقت تو حد کر دیتے ہیں آپ۔ یوں چاہے دن بھر آئینہ بھی نہ دیکھیں لیکن ——"

"چلو بھئی۔" میں نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔ میں جانتا تھا وہ کیا کہے گی۔

کمرے کا پردہ اٹھا کر اس نے اندر قدم رکھا اور اس کے پیچھے میں داخل ہوا۔ سامنے کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ یوں چونکی جیسے کوئی ہرنی اپنے قریب آہٹ پا کر ڈر جائے۔

"نیناں۔"

"بھائی جان۔"

نیناں نے لمحہ بھر کے لیے پلکیں اوپر اٹھائیں جیسے جھیل کے گہرے نرمل پانی پر بھور کا ہلکا سا نیم اندھیرا، اپنی بھرپور جاذبیت سے چھا گیا ہو اور پھر فوراً ہی اس نے پلکیں جھکا لیں جیسے کوئی صبح کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا ہو اور جھیل کا پانی ساکن ہو گیا ہو اور اس کی سطح پر رات کے سائے لہرانے لگے ہوں۔

کمرے میں دو کرسیاں تھیں۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ شاردا کا پلنگ تھا جس پر سفید سلک کی چادر بچھی تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی میں نے کرسی لے لی۔ میں اور نیناں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بیچ میں تپائی تھی۔

"نیناں بڑی اچھی کہانیاں لکھتی ہے بھائی جان۔" شاردا پیالیوں میں چائے کا پانی ڈال رہی تھی۔

"تو آپ ہماری برادری کی ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی!" نیناں کی پلکوں میں خفیف سی لرزش ہوئی وہ ذرا سا اوپر اٹھیں جیسے جھیل کے پانی پر دونوں وقت گلے مل رہے ہوں۔ صبح شام کے بازوؤں میں پگھل کر مسکرا رہی ہو۔

"جب بھی اس وادی میں کوئی قدم رکھتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔"

"یہ بے چاری قدم کہاں رکھ رہی ہے۔" شاردا نے میری بات ٹوک دی۔

"راستے پر چل پڑنا ہی قافلے میں شامل ہو جانا ہے پگلی۔ کسی نہ کسی موڑ پر تو دوسرے مسافر مل ہی جاتے ہیں۔ جیسے آج میں مل گیا ہوں۔"

میری بات سن کر نیناں کی آنکھیں ایک بار پوری طرح کھل گئیں جیسے ساگوان کے گھنے جنگلوں میں سوئی شبنم کے سینے پر کھلی دوپہر مچلنے لگی ہو اور اپنی نرم نرم کرنوں سے اسے گدگدانے لگی ہو اور ساری خوابیدگی، سارا کسل، ساری نیند بکھرنے لگی ہو اور پھر اچانک جانے کیا ہوا کہ تمام جنگل پر اندھیرا چھانے لگا اور دھوپ سمٹنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف گھنا اندھیرا بھر گیا۔ نیناں کی آنکھوں میں بے پناہ غم جھلک اٹھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی نگاہیں چائے کی پیالیوں پر گاڑ دیں۔ شاردا پیالیوں میں دودھ ڈال رہی تھی اور بھول گئی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی گفتگو چل رہی تھی۔

"بھائی جان آپ یہ پیالی لے لیں۔" اس نے نیناں کے آگے پڑی ہوئی پیالی میری طرف سرکا دی اور میری پیالی اس کے آگے کر دی۔

"یہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"نیناں کو بالائی پسند نہیں۔ یہ تو چائے میں دودھ چھان کر ڈالتی ہے۔" اس کی پیالی میں بالائی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے۔

"اچھا!"

"ہاں! گھر میں اس کا اکثر اس بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے۔" شاردا نے کہا۔

"بڑا آرسٹوکریٹک نظریہ ہے۔" میں نے اپنی پیالی میں چمچہ گھمانا شروع کر دیا۔ شاردا نیناں کی پیالی میں شکر گھول رہی تھی۔

"چائے میں شکر بھی خود نہیں گھولتی کم بخت، ہر کام اسے کیا کرایا چاہیئے۔ شاردا نے پیار سے اس کے گال کو چھو لیا اور نیناں ایک دم جیسے جاگ گئی ہو۔

"سو رہی تھیں آپ؟" میں ہنسا۔

"جی نہیں۔" وہ ذرا سا مسکرائی اور اس کے چھوٹے چھوٹے ہموار دانت چمک اٹھے پر اس مسکراہٹ میں ایک کسک سی تھی، جیسے درد کی ایک ہلکی سی لہر اس کی نسوں میں پھیل گئی ہو۔ اس کے چہرے پر زردی سی ابھر آئی تھی اور آنکھوں کا اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا جیسے وہ کسی وادی میں کھڑی کوئی پہاڑ کی چوٹی ہو جس کی ایک طرف تو سورج کے ڈھلنے سے چمک اٹھے، دوسری طرف اندھیرا پھیل گیا ہو۔

کچھ دیر ہم تینوں خاموش بیٹھے چائے پیتے رہے اور اس کا چہرہ دھیرے دھیرے اپنی نارمل حالت پر آ گیا۔

"کون سے مضمون لے رکھے ہیں آپ نے؟" میں نے پوچھا۔

"سائنس اور فل میتھیمیٹکس۔"

"بڑا مشکل کمبینیشن ہے، ڈاکٹری کرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"خیال تو ہے!"

"آپ بھی تو ڈاکٹر ہی بننا چاہتے تھے نا بھائی جان؟"

"ہاں!"

"اور بن گئے افسانہ نگار، شاید سبھی لکھنے والے پہلے ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتے ہیں۔" شاردا بڑے خلوص سے مجھ پر چوٹ کر رہی تھی۔

"میرے خیال میں ڈاکٹر ایک بہترین ادیب بن سکتا ہے۔ انسانی جسم اور ذہن کی ایک ساتھ واقفیت تو انسان کو زندگی کا مکمل نباض بنا دیتی ہے۔ ادیب بھی ایک طرح کا ڈاکٹر ہے جو تھکے ہوئے بیمار ذہنوں کو تازگی اور صحت دیتا ہے۔ شکستہ اور ناامید لوگوں تک کو زندہ رہنے کا

پیغام پہنچاتا ہے۔"

نیناں نے پیالی تپائی پر رکھ دی اور میری طرف دیکھنے لگی جیسے وہ خود بھی یہی کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن سوچ کی شکل واضح اور مکمل نہ تھی اور وہ اس لیے خاموش تھی اور بولتی نہ تھی۔ میں نے جیسے اس کے من کی بات کہہ دی تھی۔ اس کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتار دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ایک پیاری سی نرماہٹ چھا گئی۔ ایک لطیف سی آسودگی۔

"تم ڈاکٹر بنو گی یا لیکھک؟" شاردا نے اس سے پوچھا۔

"جو زندگی بنا دے گی۔" یہ شاید پہلا مکمل جواب تھا جو نیناں نے دیا تھا۔

اتنی چھوٹی عمر میں ہی اس نے شاید حالات کے بندھنوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ زندگی نے اس ادھ کھلی کلی کی پنکھڑیوں کے اردگرد بھی شاید کانٹوں کا گھیرا ڈال دیا تھا یا وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ کچھ کلیاں پھول بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور کچھ پھول کھل کر بھی شاخ پر ہی سوکھتے ہیں۔

اس کے ذہن کی عجیب ملی جلی سی کیفیت تھی جیسے دھوپ اور چھاؤں، پرواز اور شکستگی، تصویر کا اسکیچ ہو مگر مکمل تصویر نہ ہو۔

اور تصویر مکمل ہونے میں خاصا وقت لگا۔ بہت دنوں تک تو میرے سامنے وہ اسکیچ ہی پڑا رہا اور میں اسے دیکھتا رہا۔

نیناں کے پتا یہاں کے ایک بہت بڑے وکیل ہیں اکثر قتل کے مقدمے ہی لیتے ہیں۔ سول کیسز سے انھیں کم دلچسپی ہے۔ قتل کا مقدمہ ہار جانا سول کے دس مقدمے جیتنے سے بہتر ہے، کچھ اس طرح کا خیال ہے انہیں وکالت کے بارے میں۔ کوئی دو ہزار کے قریب ان کی پریکٹس ہے۔

یہ ضلع کافی پسماندہ ہے اور لوگ اپنا بہت سا وقت لڑائی جھگڑوں میں ہی بتاتے ہیں۔ پانچ ہزار میو جو میوات میں رہتے ہیں وکیل صاحب کے خاص بھگت ہیں۔ ان کی کوٹھی شہر سے باہر اجمیر جانے والی سڑک کے کنارے ہے معلوم ہوتا ہے یہ جگہ انھوں نے کسی مقدمے میں ہی حاصل کی ہے، ورنہ اتنے وسیع احاطے میں تو ایک محل بن سکتا ہے لیکن انھوں نے ایک مختصر سی کوٹھی بنانے پر ہی اکتفا کی ہے اور جو راج اور مزدور اس پر کام کرتے رہے ہیں شاید وہ بھی کسی مقدمے میں ہی پھنسے ہوئے تھے۔ ورنہ جنھوں نے پوری اجرت لے کر کام کرنا ہو وہ اس بے دردی سے نہیں کرتے۔ پہلی بار جب صبح کو سیر چلتے ہوئے میں ان کی کوٹھی کے قریب سے گذرا تو وکیل صاحب کا بورڈ پڑھ کر رک گیا۔ تو یہ تھا نیناں کا گھر جو اچھا خاصا اصطبل لگ رہا تھا۔ مختصر کوٹھی تو یوں لگ رہی تھی جیسے کسی بڑی سی گھڑسال میں سائیسوں کے کچھ کوارٹرز ہوں اور کوٹھی کے آگے کھلا احاطہ جیسے گھوڑوں کو سدھانے کے کام آتا ہو۔ کچھ آدمی پتلی پتلی سی رضائیاں اوڑھے پھاٹک سے باہر نکل رہے تھے۔ شاید یہ وہی میو لوگ تھے جن کے سہارے وکیل صاحب کی پریکٹس چل رہی تھی۔ وہ صبح صبح رفع حاجت کے لیے باہر جا رہے تھے۔ رات انھوں نے یہیں گذاری تھی۔ شاید آج ان کی عدالت میں پیشی ہو۔ میں آگے قدم بڑھانے ہی لگا تھا کہ کوٹھی سے ایک صاحب باہر نکلے۔ خوب بڑھی ہوئی توند، سر بالکل منڈا ہوا اور گھٹنوں کے ذرا نیچے تک چڑھی ہوئی دھوتی۔ میرا ذہن یہ گوارا نہ کر سکا کہ میں انھیں وکیل صاحب سمجھوں، پر تھے وہ وکیل صاحب ہی، جن سے میرا اس دن تعارف ہوا جب میں اور شاردا نیناں کے ہاں چائے پر گئے تھے۔

"تمھاری سہیلی کی کوٹھی کیسی ہے شاردا؟" میں نے کوٹھی کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"نیناں کے پتا پرانے خیالوں کے آدمی ہیں۔ وہ اس طرف کم ہی دھیان دیتے ہیں۔" شاردا نے جواب دیا۔

"اتنا بڑا احاطہ گھیرنے کا فائدہ؟ اس میں تو ایک ریفیوجی کیمپ کھل سکتا ہے۔"

"آپ ہمیشہ الٹی باتیں ہی سوچیں گے۔"

"اگر فالتو جائداد کو اس بُری طرح ہی استعمال میں لانا ہو تو اسے قومی ملکیت قرار دے دینا چاہیئے" میں نے ناک پر رومال رکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ ایک طرف بندھی ہوئی گوبر میں لت پت بھینسوں نے اچھا خاصہ گھمسان مچا رکھا تھا۔

اس وقت نیناں اندر سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے پاؤں سے احاطے میں دھول کے بادل اٹھ کھڑے ہوئے۔

"نمستے بھائی صاحب!" اور پھر اس نے شاردا کو اپنے ساتھ چمٹا لیا اور دونوں ہنسنے لگیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور دھول میرے سوٹ پر جم رہی تھی۔ کم بخت کو آج ہی ڈرائی کلین کرا کے پہنا تھا۔

نیناں ہمیں ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں سے گذرتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔ ہال کمرے میں سے گذرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ ان کا ڈرائنگ روم ہے اور اس میں شام کا سا سُرمئی اجالا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور کچھ کُرسیاں پڑی تھیں۔ فرش پر غالباً ایک دری بھی تھی اور دیواریں بہت اونچی اور خالی تھیں ان پر کہیں کوئی پرانا کیلنڈر بھی نہ تھا۔ جس چھوٹے سے کمرے میں ہم آئے وہ خاصا اچھا تھا۔

"یہ نیناں کا کمرہ ہے بھائی جان!" شاردا نے مجھے مخاطب کیا۔

"کمرہ نہیں یہ میری پناہ گاہ ہے۔" نیناں نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ کچھ روز پہلے جو ہرنی میری آہٹ پا کر چونکی تھی وہ واقعی زخمی تھی اور اس کے سینے میں کوئی گہرا گھاؤ تھا۔

"مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی نخلستان ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور میرا گھر ایک صحرا۔ جب بگولوں کا طوفان اٹھتا ہے تو اس سے بچنے کے لیے یہی سہارا میرے کام آتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی اور پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک دیوار کے سہارے اس کا پلنگ تھا اور اس کے ساتھ ہی تپائی تھی جس پر ایک خوبصورت ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ کتابوں کی بڑی سی الماری رکھی تھی جس کے باہر چھوٹا سا قفل لگا تھا۔ شمالی دیوار کے ساتھ ایک آرام کرسی تھی جہاں بیٹھ کر الماری کی ایک ایک کتاب پر نظر پڑ سکتی تھی۔ اس دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو پچھلے احاطے کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی پر ہلکے آسمانی رنگ کا پردہ تھا جو شاید اٹھایا کم ہی جاتا تھا۔ جنوبی دیوار میں کمرے کا دروازہ تھا جس میں پردے کی جگہ چق پڑی تھی۔ فرش پر ایک نفیس کارپٹ تھا اور ایک کونے میں پیتل کے گملے میں نرگس کے پھول تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کتابوں کی الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ شاردا مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاردا میری عادتوں سے واقف ہے، بیکار میں نہیں ٹوکا کرتی۔ اس وقت ٹوکتی ہے جب اس کے خیال میں میں حد سے گذر جاؤں۔ الماری کے ایک خانے میں کتابوں کی قطار کے اوپر فریم میں لگی نیناں کی تصویر رکھی تھی۔ میں اسے دیکھنے لگا۔

"یہ کتابیں دیکھی جا رہی ہیں یا تصویر؟" شاردا بولی۔

"کتابیں بھی اچھی ہیں اور تصویر بھی۔" میں نے جواب دیا اور کتابوں کو زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔

ہندی ساہتیہ کی نمائندہ کتابیں موجود تھیں۔ انگلش اور فرنچ لٹریچر کی بہت سی اچھی اچھی کتابیں تھیں اور اردو ادب، نظم اور نثر دونوں کی تخلیقات موجود تھیں۔ کتابوں کو دیکھ چکنے کے بعد پھر تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک جوان سی لڑکی جس کا ماحول اتنا خشک اور غیر ادبی ہو ذہنی طور پر اتنی اچھی طرح کیسے نکھر سکتی ہے۔ اس کی شخصیت کو ابھارنے میں ضرور کسی دوسرے شخص کا ہاتھ ہے۔ میں ایک نئی اُلجھن میں پھنس گیا اتنے میں نیناں کمرے میں داخل ہو گئی۔

"چائے آرہی ہے، ارے آپ میری کتابیں دیکھ رہے ہیں!"

"ہاں بغیر تمہاری اجازت کے۔" میں نے جواب دیا۔

"جن لوگوں میں میرا جیون گذر رہا ہے وہ اجازت لینے کے قائل نہیں۔ وہ تو میرے خط تک اٹھا کر پڑھ لیتے ہیں اور محسوس نہیں کرتے کہ یہ رویّہ غلط ہے۔"

اس کی آنکھوں میں پھر ایک دم ایک درد سا لہرا گیا۔ کتنی بیزار تھی اپنے ماحول سے وہ۔ اس نے الماری کی چابی مجھے دی اور میں الماری کھول کر کتابیں دیکھنے لگا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے پوچھا:

"نیناں یہ سب کتابیں تم نے خریدی ہیں؟"

"جی نہیں۔ بہت سی کتابیں میرے بھائی صاحب بھیجتے رہتے ہیں۔"

"کہاں ہیں تمہارے بھائی صاحب؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا انہیں۔" شاردا نے پوچھا۔

"کئی برسوں سے الہ آباد میں وکالت کر رہے ہیں بہت دنوں وہ اس ماحول میں گھٹتے رہے اور آخر اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہیں رہتے ہیں کہیں سال ڈیڑھ سال میں وہ ایک دن کے لیے یہاں آتے ہیں۔"

"کبھی آئیں تو مجھے ملانا۔" شاردا نے کہا۔

"ہو سکے تو مجھے بھی۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو جلن ہوتی ہے شاردا کو دیکھ کر جسے آپ جیسا بھائی ملا ہے اور جو زندگی کا ہر لمحہ اس کے ساتھ گذار سکتی ہے۔"

"شاردا تو مجھے ہر وقت کوستی ہے۔"

"بہنیں کوسا نہیں کرتیں دعائیں دیا کرتی ہیں بھائی صاحب! اور جب ان کے پاس دعائیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ آنسو بھینٹ بھی کر دیتی ہیں۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے کونوں میں آنسوؤں کی نمی اُبھر آئی تھی۔ یہ نمی گواہ تھی اس محبت اور عقیدت کی جو اسے اپنے بھائی سے تھی۔

اس کا بھائی بھی اس دھول بھرے احاطے میں گھسٹتا رہا اور جب ان بگولوں کا مقابلہ کرتے کرتے ہار گیا تو بھاگ گیا۔ اس نے گرم گرم چائے کا ایک گھونٹ پیا اور پھر کہنے لگی:

"یہ کمرہ بھی انہی کا ہے۔ جاتے ہوئے مجھے دے گئے تھے۔ جب یہاں آتے ہیں تو اسی کمرے میں رہتے ہیں۔ رات دن ہم دونوں یہاں اس کمرے میں پڑے رہتے ہیں۔ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے علاوہ کوئی اور دنیا بھی ہے۔ دنیا سے اس طرح کٹ جانے میں کتنا آنند ہے۔"

شاردا کے ہونٹوں سے ایک طویل آہ نکل گئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے دھند بھری گھاٹیوں میں سورج کا پہلا اُجالا چمکنے لگے۔

شاردا اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کھلے اور پُراسرار انداز میں اس نے کبھی باتیں نہ کی تھیں۔

"ٹھہریئے میں آپ کو بھائی صاحب کی تصویر دکھاتی ہوں۔"

وہ کرسی سے اٹھی اور الماری میں کتابوں کے اوپر رکھی اپنی تصویر کو اٹھا لائی۔ اس کے فریم کو کھول کر اس نے اپنی تصویر کے نیچے سے ایک تصویر نکالی۔

"دیکھئے یہ ہے ان کی تصویر۔" اس نے تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ایک خوبصورت نوجوان تیکھے تیکھے نقوش کھلا ماتھا اور گہری آنکھیں۔ ایسی ہی آنکھیں نیناں کی تھیں۔ آنکھوں کی یہ گہرائی ہی ان دونوں میں مشترک تھی۔ یہی وہ بنیاد تھی جس پر وہ دونوں کھڑے تھے۔ نیناں اور اس کا بھائی۔ میں نے تصویر شاردا کی طرف بڑھائی اور پھر نیناں کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیاں کتنی پُراسرار تھیں اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے نیناں نے اپنی تصویر کے پیچھے اپنے بھائی کی تصویر رکھ کر غیر ارادی طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے بھائی کی شخصیت ہی اس کی ڈھارس کا باعث ہے۔

اتنے میں چق اٹھا کر کوئی داخل ہوا۔

"نمستے پتا جی!" شاردا کرسی سے اٹھی۔ وہ انہیں جانتی تھی۔

"نمستے!" مجھے بھی کرسی سے اٹھنا پڑا۔

نیناں شاید اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ اٹھنے لگی تو چائے کی پیالی تپائی سے فرش پر گر گئی۔

"تم بھی اتنی ہی بے احتیاط ہو بیٹی؟" انھوں نے شاردا کو مخاطب کیا اور پھر مجھے کچھ کہے سنے بغیر چق اٹھا کر باہر نکل گئے۔

"نیناں ذرا بات سننا۔" ان کی آواز آئی اور نیناں خاموشی سے باہر نکل گئی۔

کچھ لمحوں کے بعد جب وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ اس کی آنکھوں میں درد کی اتنی گھنی دھند بھر گئی تھی کہ وہ اچھی طرح کھل بھی نہ رہی تھیں۔

میں نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ اس کے بھائی نے اپنی تمام محبت اور اخلاص کے ساتھ نیناں پر بے حد ظلم کیا تھا۔ اس نے اپنے ماحول سے انتقام لینے کے لیے اپنی بہن کو چُنا تھا۔

اس نے اس کے گرد تخیل، تصور اور ادب کا طلسمی جال بن دیا تھا اور وہ مسحور ہو کر اونگھ رہی تھی۔ اب وہ ناول کے کرداروں کی طرح جیتی تھی۔ نظموں کی تشبیہوں کی طرح حرکت کرتی تھی اور کہانیوں کے ہیرو کی طرح اپنے جیون کے خاکے بناتی تھی۔ عملی طور پر وہ اپاہج بنتی جا رہی تھی۔ وہ اس چھوٹے سے کمرے کے پُراسرار ماحول میں رہ کر بھول جاتی تھی کہ اس کے باہر ایک اُجاڑ اور سنسان دنیا ہے۔ اس کے گھر کا ماحول نہایت کھردرا اور اکھڑ ہے۔ وہ کونے میں اُگے نرگس کے پھولوں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنے سے انکار کر رہی تھی کہ اس کے جیون کے گرد تیز کانٹوں کی ایک اونچی باڑ ہے اور اس نے جب بھی اڑنے کی کوشش کی وہ نکیلے کانٹے اٹھے ہوئے بھالوں کی طرح اس کا راستہ روک لیں گے۔ اس سب کا ذمہ دار اس کا بھائی تھا جس کی تصویر کو اس نے اپنی تصویر کے نیچے رکھ کر اپنی شخصیت کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر ڈالا تھا۔

میری سوچ کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا۔

"معاف کیجئے گا بھائی صاحب!" نیناں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہی تھی اور میں یہ نہ سمجھا تھا کہ وہ کس قصور کی معافی مانگ رہی تھی۔ اسے کس بات کا افسوس تھا۔

"کس لیے؟" میں نے پوچھا اور ایک بار اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھا جو بُری طرح کپکپا رہے تھے۔

"آپ بھی نہیں سمجھے!" اور اس کی آنکھوں میں سلگتے ہوئے آنسو اس کے رخساروں پر بہ نکلے اور ان آنسوؤں کی اس روشنی میں سب کچھ نظر آ گیا۔ میں نے سب کچھ جان لیا۔ شاردا نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اپنے پلّو سے اس کے آنسو پونچھے میری نگاہ کو چندھیانے والی روشنی مدھم ہو گئی۔

"بے بس ہو کر جینا سب سے بڑا پاپ ہے شاردا!" اس نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک بار کتابوں سے بھری ہوئی بڑی سی الماری کی طرف دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ ایک دن یہ الماری اپنے پورے وزن کے ساتھ نیناں کے اوپر گر پڑے گی اور اسے سدا کے لیے اپاہج کر ڈالے گی۔

جب میں اور شاردا اس کے گھر سے واپس آئے تو ہم دونوں اداس تھے۔ بہت دیر خاموش چلتے رہے جیسے دونوں کے دلوں پر بہت بڑا بوجھ پڑا ہو۔

اس کے بعد میں کبھی نیناں کے گھر نہیں گیا۔ اس نے مجھے کبھی بلایا بھی نہیں۔

شاردا اکیلی ہی جاتی تھی۔ خود وہ ہفتے میں ایک آدھ بار ہمارے گھر آ جایا کرتی تھی۔

کبھی کبھی وہ اپنی کہانی بھی لے آتی۔ کہانی سناتے سناتے وہ اس میں اسقدر کھو جاتی کہ کئی دفعہ اسے ہماری موجودگی کا بھی احساس نہ رہتا۔ میں جب کبھی سیر کے لیے جاتا تو اس کی کوٹھی کے سامنے سے گذرتے ہوئے محسوس کرتا جیسے صحرا کے بگولے اس گھر کی چھتوں سے اُبھر کر انہیں جھلس ڈالتے ہوں۔ اس کے پتا کبھی کبھار دکھائی پڑ جاتے لیکن وہ مجھے پہچانتے ہی نہیں تھے۔ لمحہ بھر کی ملاقات پہچاننے کے لیے کافی بھی نہ تھی۔ میری واقفیت نیناں سے بڑھ کر اس کے گھر والوں تک نہ پہنچ سکی۔ البتہ نیناں کو میں زیادہ سے زیادہ پہچانتا گیا۔ اسکی شخصیت اپنی ساری جزئیات کے ساتھ میری سمجھ میں آنے لگی۔

اس کی اکثر کہانیوں میں ایک ادھورے پن کا سا احساس ہوتا تھا جیسے وہ کہانی کو انگلی پکڑے ہوئے کسی بازار میں سے گذر رہی ہو اور بھیڑ کے ریلے میں اچانک اس کا ہاتھ چھوٹ گیا ہو اور کہانی کہیں گم ہو گئی ہو اور وہ اپنی بھرپور کوشش کے باوجود اسے نہ پا سکی ہو اور اس کے انداز میں ایک جھلاہٹ، افسردگی اور شکستگی سی بھر گئی ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے کہانی کو لکھتے لکھتے وہ اسے اچانک کسی جگہ چھوڑ دیتی ہے۔ ایک عجیب سی حسرت اور تشنہ لبی رہ جاتی تھی اس کی کہانیوں میں اس کے کردار عام زندگی کے کردار نہ ہوتے تھے۔ وہ ان کا انتخاب دھرتی سے نہیں آکاش سے کرتی تھی۔ آدرش اس کے سامنے سب سے پہلی چیز تھی۔ وہ تخیّل کے پنکھوں پہ اُڑتے ہوئے دھرتی سے بہت دور فضا میں پرواز کرنے کی کوشش کرتی تھی اس لیے اس کی کہانیوں کے کردار اپنے بھرپور خلوص کے ساتھ بھی بے جان ہوتے تھے۔ ان میں حرکت آمیز زندگی نہ ہوتی تھی۔ ایک ٹھٹھرن اور منجمد قسم کی کیفیت تھی۔ گرمی اور چلت پھرت نہ تھی۔ ایک بے دلی اور اکتاہٹ سی تھی۔ میں نے اسے کئی بار کہا بھی کہ فن کار کو اپنی ذات سے باہر نکل کر اپنے ارد گرد کے ماحول کو گہری نظروں سے ٹٹولنا چاہیئے۔ جو کردار اسے وہاں سے ملیں گے وہ زیادہ جاندار اور زندگی آمیز ہوں گے۔ پر یوں نظر آتا تھا جیسے وہ مجبور سی ہو گئی تھی۔ اس کا ایک زاویۂ نگاہ بن چکا تھا اور اس کا بھائی اس سے سینکڑوں میل دور رہتے ہوئے بھی اس زاویۂ نگاہ کو پختہ کیے جاتا تھا۔ کاش اس کے نزدیک کوئی ایسا شخص ہوتا جو اسے اپنے ماحول کے کھردرے پن سے بچنے کے لیے تخیل کی بھول بھلیاں

میں بھٹکنے کی بجائے حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں پر کھڑا کر دیتا جہاں ہواؤں کے تیز تیز ریلے اس سے ٹکراتے اور ٹیڑھی ٹیڑھی مخدوش پگڈنڈیاں اسے اپنی حفاظت خود کرنے پر مجبور کرتیں۔

پر ایسا نہ ہوا اور وہ اپنی ہی راہ پر چلتی رہی اور اس کی کہانیوں میں حسرت اور افسردگی بڑھتی گئی اور اس کی آنکھوں کی گہرائیاں زیادہ پُر اسرار اور خاموش ہوتی گئیں۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں معصومیت کی جگہ زہر خند نمایاں ہونے لگا۔ وہ زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گئی تھی۔ جہاں اسے محبت اور خلوص کی شمع کی ضرورت تھی۔ ایک بھائی کی نہیں ایک محبوب کی محبت۔ ایک ایسے شخص کی محبت جس کی آغوش میں اس کی شخصیت کا ہر فیلا پہلو پگھل جائے، اس کے ہونٹوں کے یاقوت دہک سکیں اور رخساروں کے پھول چمک اٹھیں اور اس کے ماحول میں ایسی کوئی ہستی نہ تھی۔ اس کے گھر کے باہر ایک اونچی دیوار تھی جسے کوئی نہ پھلانگ سکتا تھا۔ اس کا تخیل اسے جن جزیروں میں لے جانا چاہتا تھا وہ بہت دور تھے اور ان کے اردگرد بہت گہرا پانی تھا جس میں اترنا اس کے بس میں نہ تھا۔

جزیرے زیادہ خوبصورت ہوتے گئے۔
ان کے گرد پھیلا ہوا پانی زیادہ گہرا ہوتا گیا۔
اس کی الماری میں کتابوں کی تعداد بڑھتی گئی۔
اور اس کا تخیل کہکشاں کی تلاش کرتا رہا۔

ایک دن شاردا نے مجھے بتایا کہ نیناں کے بیاہ کی بات ہو رہی ہے اور پھر اچانک اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ تمام دن اپنے کمرے میں پڑی جانے کیا کرتی رہتی ہے۔

نیناں کے پتا شادی بیاہ کے معاملے میں حد سے زیادہ کٹر تھے۔ وہ راجپوت تھے اور راجپوتوں کے بھی ایک خاص طبقے سے تعلق رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب لڑکی کی ڈولی اٹھ جائے تو پھر سسرال کی حویلی سے اس کی ارتھی ہی نکلنی چاہیئے۔ جیتے جی واپس آنا اس کے ماں باپ کی توہین ہے۔ نیناں کا بھائی اس سے متفق نہ تھا اور اس نے اب تک شادی نہ کی تھی۔ وہاں شکست کھا کر ان کی خودداری زخمی ہو گئی تھی اور اب پورے جوش کے ساتھ وہ اس نئے محاذ پر ڈٹ گئے تھے۔ نیناں کی شادی انھوں نے آگرہ کے ایک گاؤں میں طے کی تھی۔ لڑکا فوج میں حوالدار تھا اور اب ری ٹائر ہو کر واپس آگیا تھا۔ ان کی بہت کافی زمین تھی اور وہ اس کا اکیلا مالک تھا۔ اس کا باپ بوڑھا تھا اور سن چودہ کی جنگ میں اپنا ایک بازو گنوا چکا تھا۔ ان کی ایک بہت بڑی پُرانی حویلی تھی۔ نیناں کا گھر تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہ رکھتا تھا۔ حویلی کے گرد ایک بہت اونچی فصیل تھی۔ کسی زمانے میں وہ ایک قلعہ تھا، بعد میں وہ ایک حویلی میں منتقل ہو گیا۔ ان کے پاس دس بھینسیں تھیں، اگرچہ دو بھینسوں سے بھی کام چل سکتا تھا۔ آدھا گاؤں جو ان کے مزارعوں پر مشتمل تھا ان کے گھر سے چھاچھ لیجاتا تھا۔ بیلوں کی کئی جوڑیاں تھیں اور دو بہلیاں تھیں اتنی خوبصورت کہ کاریں بھی ان کے آگے ہیچ ہوں۔

نیناں کے پتا نے اپنے لڑکے سے اس معاملے میں کوئی مشورہ نہ کیا تھا۔ نیناں نے جو حالات اسے ماں سے معلوم ہو سکے اپنے بھائی کو لکھ دیئے۔ اس کے بھائی نے جب پتا کے فیصلے کی مخالفت کی تو وکیل صاحب نے اسے ایسے الفاظ لکھے کہ اس نے ان سے سدا کے لیے تعلقات توڑ لیے۔ اس نے نیناں کو عین منجدھار میں چھوڑ دیا۔ جس سہارے پر اسے اب تک ناز تھا وہ اس سے چھن گیا۔ وہ

ماں باپ کے فیصلے کے خلاف ایک لفظ نہ کہہ سکی اور اس کڑے حملے کے واروں سے بچنے کے لیے اپنی پناہ گاہ میں دبک گئی اور یوں بے حس ہو گئی جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے ۔

اس کی شادی کرسمس کے دنوں میں ہوئی ۔ میں ان دنوں ایجوکیشنل ٹور کے سلسلے میں جنوبی ہندوستان گیا ہوا تھا ۔ جب میں واپس آیا تو وہ سسرال جا چکی تھی ۔ شاردا نے مجھے بتایا کہ جس روز نیناں کی برات آئی اسے کئی بار بے ہوشی کے دورے پڑے اور اب سسرال میں اسے ایسے ہی دورے پڑتے تھے ۔

"بیاہ کے دن اس نے کئی بار آپ کا پوچھا ۔"

"کیوں ؟"

"کہتی تھی میرا بھائی بیاہ میں شریک نہیں ہوا ۔ تمہارے بھائی جان ہوتے تو مجھے ضرور ڈھارس ملتی ۔"

"کاش میں یہاں ہوتا !" میں نے کہا ۔

دو روز سے نیناں سسرال سے آئی ہوئی ہے ۔ اس کا خاوند بھی ساتھ ہے ۔ میں اسے شادی پر کچھ بھی بھینٹ نہیں کر سکا ۔ شاردا کا خیال تھا کہ مجھے ضرور کوئی تحفہ دینا چاہیئے ۔ بہت سوچنے کے بعد مجھے خیال آیا ’مرقع چغتائی‘ اس کی الماری میں نہیں ۔ یہ کتاب اس کے بھائی نے اسے بھینٹ نہیں کی ، میں ہی کر دوں ۔ میں نے اپنی کتابوں میں سے اسے نکالا ۔ یہ کتاب مجھے بے حد عزیز تھی اسے کبھی کبھار ہی الماری سے نکال کر پڑھتا تھا ۔ سوچا یہی نیناں کو دے دوں وہ ضرور پسند کرے گی ۔ میں اور شاردا ’مرقع چغتائی‘ لے کر اس کے گھر گئے ۔ میں باہر کھڑا رہا ، اس کے ساتھ اندر نہیں گیا ۔

اس نے نیناں کو میرے آنے کی اطلاع دی پر وہ اس روز کی طرح جب میں پہلی بار اس کے گھر گیا تھا اپنے دھول بھرے احاطے میں گرد اڑاتی ہوئی نہیں آئی ۔ وہ برآمدے میں کھڑی رہی اور شاردا ہی مجھے لینے آئی ۔

آج وہ ہمیں اپنے کمرے میں نہیں لے گئی ۔ اس بڑے سے ڈرائنگ روم میں ہی بٹھایا جو ڈرائنگ روم سے زیادہ ایک کورٹ روم لگ رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں میں اب گہرائیوں کی جگہ وحشت بھر گئی تھی ۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح ٹھوس اور بے حس ہو گیا تھا اس کے ہونٹ ایک دوسرے پر سختی سے جم گئے تھے جیسے مدتوں سے ان پر مسکراہٹ نہ کھلی ہو ۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں احساس ہوا جیسے میں نیناں سے نہیں مل رہا ، ایک مجرم کو دیکھ رہا ہوں جو کچہری میں اپنے کسی ناکردہ جرم کی سزا کا فیصلہ سننے کٹہرے میں کھڑا ہو ۔ جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوں ۔

"بہت دنوں میں آئے آپ بھائی صاحب ؟" اس کی آواز میں کچھ بھی نہ تھا ۔ نہ کوئی شکایت ، نہ اُلہانا ، نہ پیار ۔ خالی آواز تھی ۔ ہر جذبے سے محروم ۔

"میں یہاں نہیں تھا نیناں ۔ تمہاری شادی میں شریک نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے ۔" میری بات سن کر اس کا چہرہ یوں ہو گیا جیسے کسی دیوانے کو کسی راہ چلتے ہوئے نے چھیڑ دیا ہو ۔ اس نے کہا کچھ نہیں خاموش رہی ۔ صرف ایک بار میری طرف دیکھا ۔ اس نظر میں اَن گنت شعلوں کی تپش تھی ۔

"میں ہی لائی ہوں جناب کو۔ نہیں تو یہ آج بھی نہ آتے۔" شاردا نے مسکراتے ہوئے کہا کہ فضا پر چھائی سنجیدگی چھٹ جائے، پر گھٹا بہت گھنی تھی چھٹی نہیں بلکہ اور نیچے جھک گئی۔

"بھائی صاحب میں نے اپنا کمرہ بند کر دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"اور اپنی تمام کتابوں کو پھاڑ کر جلا دیا ہے۔" اس نے میرے سوال کی طرف دھیان ہی نہ دیا اور اپنی بات کہتی گئی۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" میں نے پوچھا مگر اس نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

"اپنے ماحول سے انتقام لینے کا میرے پاس یہی ایک طریقہ تھا۔ میں دلیپ سنگھ نہیں تھی کہ یہاں سے بھاگ جاتی۔"

دلیپ سنگھ اس کے بھائی کا نام تھا۔ وہ دلیپ سنگھ کی بہادری کا اعتراف کر رہی تھی یا اس کی بزدلی پر طنز، میں نہ سمجھ پایا۔

اور اس وقت پچیس چھبیس برس کا ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ نیناں اسی طرح بیٹھی رہی جیسے اسے اس کے آنے کی خبر ہی نہ ہو۔

"نمستے جیجا جی!" شاردا اپنی جگہ سے اٹھی۔

"میرے بھائی جان۔"

اس نے آگے بڑھ کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر صوفے کی طرف لپکا جہاں نیناں بیٹھی تھی۔

وہ اس کے پہلو میں بیٹھا ہی تھا کہ نیناں کی آنکھیں اس پر گڑ گئیں جیسے مجرم پوری توجہ سے اپنے فیصلے کی عبارت سن رہا ہو اور اس کی نظریں جج پر جم گئی ہوں اور پھر اس نے آنکھیں تیزی سے جھپکنی شروع کر دیں اور اس کا سر ایک دم صوفے کی پشت پر لڑھک گیا۔ اسے پھر غشی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ کنور چھپال سنگھ، اس کا خاوند گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گیا اور چند ہی لمحوں میں نیناں کی ماں پانی کا گلاس لئے آ گئی۔ نیناں بڑبڑا رہی تھی۔

"بھائی صاحب میں نے انتقام لے لیا ہے — میں نے انتقام.........."

ماں نے اس کے منہ میں پانی ڈالا۔ شاردا نے اٹھ کر اسے سہارا دیا اور کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آ گیا۔ وہ یوں لگ رہی تھی جیسے پھانسی کے تختے پر کھڑی ہو اور پھانسی کا رسہ اس کی نظروں کے سامنے جھول رہا ہو۔ شاردا صوفے پر اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور اسے اپنے بازو میں لے رہی تھی۔ ماں خالی گلاس لے کر چلی گئی۔ میں نے اپنی جھولی میں پڑے 'مرقع چغتائی' کو ٹٹولا۔ وہ وہیں تھا۔ غائب نہیں ہوا تھا لیکن نیناں کے کمرے میں اب ایک بھی کتاب باقی نہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کتابوں کی اتنی بڑی الماری نیناں کے اوپر گر گئی تھی اور نیناں سدا کے لیے اپاہج ہو گئی تھی اور اس کی تصویر کا فریم ٹوٹ گیا تھا اور اس کی تصویر کی جگہ اب دلیپ سنگھ کی تصویر تھی اور اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"تو اب چلیں شاردا؟"

شاردا نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اپنی کتاب تو بھینٹ کر دو۔

لیکن میں نے آنکھیں جھکا لیں اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا 'مرقع چغتائی' میری بغل میں تھا۔ نیناں اسے دیکھ رہی تھی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ بولی تک نہیں۔

چپ چاپ کھڑی ہو گئی اور پھر ہمارے ساتھ برآمدے میں آگئی اور وہاں ایک دم رُک گئی۔ شاردا اور میں احاطے میں دُھول اڑاتے گیٹ کی طرف چل پڑے۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے میں نے نیناں کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں جانے کس شے پر گڑ چکی تھیں۔

میں شاردا کو بازو سے پکڑ کر جلدی جلدی سڑک پر لے آیا۔ اس نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں نے ”مرقع چغتائی“ نیناں کو بھینٹ کیوں نہیں کیا۔ پر مجھے اس کی عادت کا پتہ ہے وہ پوچھے گی ضرور۔

میں نے جانے کتنے ہی سگرٹ پھونک ڈالے ہیں۔ میرے اردگرد گھنا دھواں پھیلا ہوا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر شاردا نے مجھ سے یہ بات پوچھ لی تو کیا جواب دوں گا؟

مائی پھاتاں

میرزا ادیب

اُس دن سارا شہر شیخ خیر الدین مرحوم کا پہلا جنم دن منا رہا تھا!

یہ دن منانے کے لئے کئی ہفتوں سے بڑی شد و مد کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں چنانچہ اخبارات کے خاص نمبر شائع ہو رہے تھے، رسائل و جرائد میں مرحوم کی تصاویر چھاپی جا رہی تھیں اور اتوار کی شام کو کارپوریشن کے میئر کی زیرِ صدارت ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان عام جلسہ بھی ہو رہا تھا۔ اس جلسے میں شہر کی کئی مشہور و ممتاز ہستیاں مرحوم و مغفور کی زندگی کے واقعات پر روشنی ڈال رہی تھیں۔ اور مجھے بھی اسی سلسلے میں مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے مرحوم سے ذاتی واقفیت تھی اس کے علاوہ اخبارات و رسائل میں چھپے ہوئے مضامین کے مطالعے کے بعد میرے پاس اتنا مواد جمع ہو گیا تھا کہ ان کے بارے میں ایک تقریر کیا کم سے کم دس لمبی چوڑی تقریریں تیار کر سکتا تھا مگر میں چاہتا تھا کہ جو کچھ لکھوں وہ مرحوم کی زندگی کے صرف ایک ہی پہلو سے متعلق ہو اور اس کے لئے میں نے جو موضوع منتخب کیا تھا وہ تھا شیخ خیر الدین مرحوم کے احسانات عام لوگوں پر۔ مواد آنکھوں کے سامنے بکھرا پڑا تھا اور میرا قلم بڑی تیزی سے اسے سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ صاحب مرحوم شہر کے مشہور رئیسوں میں سے تھے آبائی وراثت میں آپ کو کافی جائداد ملی تھی اس کے علاوہ اپنی ذاتی کوششوں سے بھی آپ نے دولت میں کافی اضافہ کر لیا تھا مگر دیکھنے والی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی دولت کو کہاں کہاں خرچ کیا اور مرحوم کے نزدیک اپنے سرمائے کا حقیقی مصرف کیا تھا۔ شیخ صاحب بے نواؤں کا آسرا اور یتیموں کا ملجا تھے۔ ساری عمر خلقِ خدا کی خدمت کرتے رہے آپ نے اپنی آمدنی کا ایک خاص حصہ لوگوں کی بہتری کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ استاد ذوقؔ کا ایک شعر ہے ــ

"نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا"

اور مرحوم اس شعر کی زندہ تفسیر تھے۔ آج خیر الدین ہسپتال کا نام کون نہیں جانتا؟ اس ہسپتال میں روزانہ سینکڑوں مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور اکثر مریضوں کو دوا بالکل مفت دی جاتی ہے۔ مرحوم نے صرف یہ ہسپتال ہی نہیں اپنی جیبِ خاص سے ایک معقول رقم صرف کر کے ایک یتیم خانہ بھی تعمیر کروا دیا تھا اور آج بھی اس یتیم خانے میں قوم کے کئی بے نوا اور بے آسرا بچے پرورش پا رہے

ہیں۔ بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا ——"

"باؤ جی! ایک خط لکھ دو گے"

میرا قلم چلتے چلتے رُک جاتا ہے۔ سر اُٹھا کر سامنے دیکھتا ہوں مہرآں گوالن اپنے میلے ہاتھوں میں خالی لفافہ پکڑے دہلیز پر کھڑی ہے۔

"خط لکھ دو نا" "پھرسَت" نہیں ہے؟

جانتا ہوں کہ اگر اس وقت تمام خیالات کو سمیٹ نہ لیا تو پھر عبارت کا ربط و تسلسل ٹوٹ جائے گا اور لکھنے میں وہ آسانی باقی نہیں رہے گی جو اس وقت حاصل ہے مگر کیا کیا جائے انکار کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مہرآں گزشتہ دس سال سے بغیر پانی ملائے دودھ مہیا کر رہی ہے اور یہ اس کا بہت بڑا احسان ہے۔ انکار احسان مندی کے خلاف ہوگا چنانچہ میں سر کے اشارے سے اسے اندر آنے کے لئے کہتا ہوں۔ مہرآں اندر آتی ہے اور فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی ہے ——۔

"باؤ جی تکلیف تو ہوگی۔ میری بہن کو لکھنا ہے جو راولپنڈی میں رہتی ہے۔ تحصیل ——"

"بھئی پہلے بتاؤ لکھنا کیا ہے۔ پتہ بعد میں لکھا جاتا ہے۔ ذرا ٹھہرو۔ کاغذ لے لوں۔ ہاں اب بولو"

"بس یہ لکھنا ہے، جمعرات کی شام کو مائی بھاناں مرگئی ہے"

یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ سنجیدہ ہو جاتا ہے" فاطمہ کو مائی بھاناں کے مرنے کا بڑا دکھ ہوگا۔ مائی بھاناں کو اس کا بڑا خیال رہتا تھا۔ جب فاطمہ کنواری تھی تو ایک دفعہ اس کا پاؤں ذرا جل گیا تھا۔ بھاناں سارا دن گھومتی رہی اور اللہ جانے کہاں سے مرہم لے کر آئی۔ اس دن اللہ ماری ہڑتال تھی سارے شہر میں"

"مائی بھاناں وہی تھی نا —— دھوبن" میں پوچھتا ہوں۔

"گلی کے آخری مکان میں تو رہتی تھی۔ آپ کے کپڑے دھوتی ہوگی۔ سارے محلے کے کپڑے دھوتی تھی وہ تو"

"یہی بات ہے پرسوں اس گھر کے سامنے چند آدمی بیٹھے تھے —— تو مائی بھاناں مرگئی ہے"

"کیا کہوں کتنی ہمت والی تھی وہ کام کر کے تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی، تو یہ عورت تھی کہ لوہے کی بنائی ہوئی مشین" مہرآں تعریفی لہجے میں کہتی ہے۔

"اور اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ بڑی لڑاکا تھی ہر وقت لڑتی رہتی تھی محلے کے لوگ اس سے پناہ مانگتے تھے" میں بھاناں کی وہ خصوصیت بتاتا ہوں جس کا شہرہ عام ہے اور جس کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔

"لڑتی تو وہ ضرور تھی اور شور بھی بہت مچاتی تھی پر اپنے خصم سے لڑتی تھی۔ لوگوں نے اللہ جانے بدنام بھی کر دیا تھا۔ میں بتاؤں تم کو کس قسم کی عورت تھی وہ تھی —— بڑی اچھی۔ ہائے آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ کیوں باتیں کروں"

میں تقریر والے کاغذ پر نظر ڈالتا ہوں —— "بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا مرحوم ہی کا کام تھا

——" اگلا فقرہ سوچنے کے لیۓ میں پیشانی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر، آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتا ہوں ۔

" دنیا میں بہت کم ایسے آدمی ہوں گے جنھوں نے ٹوٹے ہوئے دل جوڑے ہوں، مظلوموں کو سہارا دیا ہو اور جو بیکسوں کا آسرا بنے ہوں ۔ شیخ صاحب کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ گرے ہوؤں کے سچے دوست تھے"—— میرے ذہن میں پورا فقرہ الفاظ کی مناسب ترتیب کے ساتھ آجاتا ہے ۔ میں قلم ڈھونڈنے کے لیۓ ادھر اُدھر دیکھتا ہوں مہرآں مسکرا کر میری طرف دیکھ رہی ہے ۔ نہ جانے کیا سوچ رہی ہے، نہ جانے کیا سوچ رہی ہے ۔ کیا کہنا چاہتی ہے ۔ اس کی خاموش نگاہیں ایک التجا لیۓ ہوئے ہیں ۔ ان میں ایک خاص آرزو کی جھلک ہے ۔ جی چاہتا ہے اس کی دو چار باتیں سن لوں، زیادہ سے زیادہ دو منٹ صرف ہوں گے اس کے بعد شیخ مرحوم کے چند واقعات لکھ کر تقریر مکمل کر دوں گا—— اور میں کہتا ہوں ۔

" تو وہ لڑاکا نہیں تھی —— تمھاری مائی پھاتاں "۔

" ضرور تھی —— میں کہتی ہوں، ہاں تھی ۔ اللہ بخشے میرے مراد کے میاں کو ۔ جب میں اس کے گھر میں آئی اس سے بیاہ کر کے تو وہ کہنے لگا ۔ دیکھو مہرآں ! اس پھاتاں سے پرے پرے رہنا ۔ کسی دن لڑ پڑی تم سے تو تمھارے سر کا ایک بال بھی نہیں چھوڑے گی ۔ میں نے کہا ۔ میں بھی کسی سے دبنے والی نہیں ہوں مجھ سے لڑے گی تو منہ کی کھائے گی —— یہ بات تو میں نے کہہ دی پر پھاتاں سے ملتے ہوئے مجھے سچ مچ ڈر لگتا تھا ۔ اس نے کئی بار بلانا چاہا مگر میں ٹالتی ہی رہی ۔ ابھی میرے میاں کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا ہوگا کہ پھاتاں کی اپنے خصم مولا بخش سے ایسی لڑائی ہوئی —— ایسی لڑائی ہوئی کہ کیا کہوں ۔ پھاتاں نے تو سر پہ آسمان اٹھا لیا اُس دن میں نے عہد کر لیا کہ اس سے کبھی نہیں ملوں گی ۔ پتہ ہے لڑائی کی وجہ کیا تھی ۔ وجہ یہ تھی کہ پھاتاں نے کہیں سے سن لیا تھا کہ مولا بخش کا کسی مراثن سے یارانہ ہو گیا ہے ۔ اور وہ اس کے گھر میں آتا جاتا رہتا ہے ۔ پھاتاں کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی یہ سُن کر مراثن کو وہ بے لفظ سُنائیں کہ توبہ ہی بھلی —— آدھی رات تک اُس نے محلے والوں کو سونے نہ دیا —— پر آپ کا وقت بڑا قیمتی ہوگا ۔ میں کیا پھاتاں کی کہانی لے بیٹھی ہوں ——" مہرآں بولتے بولتے یک لخت بے چین ہو جاتی ہے ۔

" نہیں تم پھاتاں کی لڑائیوں کا حال ضرور سُناؤ " میں بخوشی کہتا ہوں ۔

" تیسرے دن پھر لڑائی ہوئی ۔ مولا بخش نے کہہ دیا کہ وہ مراثن کے گھر ضرور جایا کرے گا ۔ بس پھاتاں تو بھوکی شیرنی بن گئی ۔ اس دن اس کا چچا بھی آگیا اور اس نے غصے میں آکر مولا بخش کی بانہہ کی ہڈی توڑ ڈالی ۔ شاید دوسرے یا تیسرے دن کا قصہ ہے کہ میں کسی گاہک کو دودھ دے رہی تھی اتنے میں دیکھتی ہوں کہ پھاتاں چھوٹا سا گلاس ہاتھ میں لیے میرے پاس کھڑی ہے ۔

" بہو تھوڑا سا تیل دے دو " پھاتاں نے کہا ۔

میں نے اسے تیل دے دیا ۔ خیال تھا تیل لے کر چلی جائے گی پر وہ تو دھرنا مار کر وہیں بیٹھ گئی اور لگی باتیں سُنانے ۔ پہلے تو وہ کہنے لگی مولا بخش کو بڑی تکلیف ہے بیچارا ساری رات تڑپتا رہا ہے اور میں دو راتوں سے بالکل نہیں سو سکی پھر

وہ اپنے گھر کے حالات بتانے لگی —— اُس دن مجھے پتہ لگا کہ پھاتاں دل کی بُری نہیں —— باؤجی وہ کیسے بُری ہو سکتی تھی اس کا خصم ایک مراثن سے یارانہ کر رہا تھا پر پھر بھی جب وہ زخمی ہوتا ہے تو وہ ساری ساری رات جاگ کر اس کی خدمت کرتی ہے اور اپنی تُولی ساس کی تو وہ اس دن سے خدمت کر رہی ہے جس دن اس کا بیاہ ہوا تھا۔ میرا شک شبہ جاتا رہا اور میں اس کے گھر آنے جانے لگی! —— بیماری میں مولا بخش نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ مراثن کے گھر کبھی نہیں جائے گا مگر جیسے ہی وہ ٹھیک ہوا وہ پھاتاں کی سونے کی چوڑیاں چرا کر فوراً اُدھر بھاگا اور مراثن کو وہ چوڑیاں دے آیا۔ پھاتاں کے رشتہ داروں نے کہا کہ وہ مولا بخش کو چھوڑ دے پر وہ اس بات پر راضی نہ ہوئی۔ میکے چلی گئی اور ایک مہینے کے بعد پھر آ گئی —— اللہ جانے اُسے کیوں اپنے ایسے بُرے خصم کا خیال رہتا تھا۔ میں ہوتی اس کی جگہ تو پتہ ہے کیا کرتی کبھی ادھر کا رُخ نہ کرتی سچ کہتی ہوں، اچھا تو ایک دن کا ذکر ہے میں کوٹھڑی میں بیٹھی روٹی کھا رہی تھی کہ ایک عورت آئی۔ کوئلے کی طرح کالا سیاہ رنگ، قندھاری انار کی طرح سُرخ آنکھیں اور گلے میں موتیوں کی مالا۔ میں نے کہا یا الٰہی کون ہے اور کیوں یہاں آئی ہے وہ عورت کولھے مٹکاتی ہوئی آئی اور میرے پاس مونڈھے پر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا بہن تو کدھر سے آئی ہے اور کیا کام ہے۔ اس پر وہ بولی۔ میرا نام واراں ہے۔ مصری شاہ میں رہتی ہوں۔ ذرا مولا بخش کو بلا دو۔

میں بولی "ہائے تُو تو وہی ہے مراثن ہے نا —— نہ بابا! میں تو اس کام میں نہیں آؤں گی۔ اگر پھاتاں نے سُن لیا کہ تو یہاں ہے تو وہ اللہ جانے کیا کرے۔ بڑی سخت عورت ہے۔ سارا محلہ اس سے ڈرتا ہے۔

یہ سُنکر وہ بولی "بہن! اب میں کہاں جاؤں۔ گھر والوں نے مجھے نکال دیا ہے کہتے ہیں تو "داگدار" ہو گئی ہے۔ مولا بخش کو ذرا بلا دو نا۔ اس سے پوچھوں اب داگدار کر کے مجھے کس کے حوالے کرتا ہے بدمعاش کہیں کا۔"

میں نے کہا "یہ تو میں نہیں جانتی کہ اب تم کہاں جاؤ پر میں اس کام میں نہیں آؤں گی کبھی۔ تو نے پھاتاں کو دیکھا نہیں۔ اس نے اگر تجھے دیکھ لیا یہاں تو تیری ہڈیاں تک پیس ڈالے گی ہاں اللہ جانے بڑی سخت عورت ہے چپ چاپ یہاں سے چلی جا۔ اسی میں تیری خیریت ہے۔"

وہ بولی۔ میں تو ضرور اس سے ملوں گی۔ کئی دن سے وہاں نہیں گیا۔ اللہ اسے کسی کی آئے کیوں آیا تھا میرے گھر۔ اگر بہن! تو مولا بخش کو نہیں بلاتی تو میں خود اس کے گھر چلی جاتی ہوں ——"

باؤجی! وہ تو پھاتاں کے گھر جانے کے لئے تیار تھی پر جب میں نے خوب ڈرایا تو کہنے لگی اچھا! پنڈی چلی جاتی ہوں وہاں میرا ماموں رہتا ہے۔ اور وہ باہر نکل گئی —— گلی میں اندھیرا تھا میں اسے جاتے ہوئے دیکھ نہ سکی۔ سمجھ لیا اب تو اس قدر ڈر گئی ہے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھے گی۔

صبح میں پھاتاں کے گھر گئی تو جو کچھ میں نے دیکھا وہ بڑا ہی عجیب تھا۔ پھاتاں کپڑوں پر استری کر رہی تھی اور وہ —— بھلا کون —— وہ مراثن، پھاتاں کی سوکن —— مونڈھے پر بیٹھی دہی کے ساتھ رات کی بچی ہوئی روٹی کھا رہی تھی میں حیران رہ گئی۔ پھاتاں کہنے لگی "مہراں! جانتی ہو یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "نہیں تو —— جھوٹ موٹ کہہ دیا نا۔

کہنے لگی "یہ وہی نوچی ہے داراں مراثن۔"

"تو یہ یہاں ـــــ"

"ہاں بہو! کہتی ہے مجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے۔ میرا کوئی آسرا نہیں اور میں "واگدار" ہو گئی ہوں۔ میں نے کہا اچھا تجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے تو آجا یہاں اللہ جو ہمیں روکھی سوکھی دیتا ہے تو بھی کھا لیا کر۔" اور داراں پھاتاں کے گھر میں رہنے لگی۔

پھاتاں کے رشتہ داروں کو جب پتہ لگا کہ داراں مراثن اس کے گھر میں آگئی ہے تو وہ یوں تلملا اٹھے جیسے بھیڑوں کے چھتے کو کسی نے چھیڑ دیا ہو۔ سب نے کہا اسے فوراً گھر سے نکال دو مگر پھاتاں بولی۔ میں اسے سہارا دے چکی ہوں اب تو اسے نہیں نکالوں گی۔ کہاں کہاں ماری پھرے گی یہاں سے جا کر ـــــ باؤ جی! کیا کہوں پھاتاں کے رشتہ داروں نے بہت سختی کی۔ پھاتاں کے چچا نے تو یہاں تک کہہ دیا اگر یہ مراثن یہاں رہے گی تو میں کبھی تمھارے گھر میں نہیں آؤں گا ـــــ پھاتاں نے سب کچھ سُنا پر اس اللہ کی بندی نے داراں کو گھر سے جانے کے لئے بالکل نہ کہا۔

پھاتاں پہلے کی طرح ہی گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ داراں زیادہ کام نہیں کر سکتی تھی اس کا پیشہ گانا بجانا تھا بھلا وہ استری کر سکتی تھی بھٹی جھونک سکتی تھی ـــــ اچھا تو دن گذرنے گئے۔ پھاتاں کے سب ملنے والوں نے اس کا "بیائی کاٹ" کر دیا۔ باپ نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر داراں کہنے لگی "بہن! بس اب زیادہ نہیں ـــــ میں چلی جاتی ہوں اور وہ جانے لگی۔ پھاتاں نے اس کی چوٹی پکڑ لی اور گھسیٹ کر اسے اندر لے آئی ـــــ اس کے بعد داراں نے جانے کا نام نہ لیا۔

پانچ چھ مہینے کے بعد داراں کے یہاں بچی پیدا ہوئی۔ بڑی کمزور بچی تھی میں تو اسے دیکھ کر ہی سمجھ گئی کہ بچے گی نہیں پر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ بچی سنبھل گئی اور ماں کی حالت خراب ہو گئی۔ پھاتاں نے اس پر کافی رقم صرف کر دی "لیڈی ڈاکٹر" کو بلایا۔ مگر وہ بچ نہ سکی۔ اس وقت عیشاں (عائشہ) دو اڑھائی مہینے کی تھی!

ماں مر گئی تو بچی کی کون پرورش کرے۔ داراں نے مرتے وقت بچی پھاتاں کے حوالے کی تھی پس پھاتاں نے اسے چھاتی سے لگا لیا اور اپنی بچی جان کر پالنے لگی۔ اللہ جانے پھاتاں کو بچی سے کیوں اتنا پیار ہو گیا تھا کہ وہ اسے گود سے اتارنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی!"

مہراں کو پھر اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس نے میرا کافی وقت ضائع کر دیا ہے چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس خالی لفافے کو دیکھنے لگتی ہے جسے وہ ساتھ لائی تھی اور جواب چارپائی پر میرے کاغذوں کے انبار کے اوپر پڑا تھا۔

"یہ بچی زندہ رہی ـــــ؟" میں سوال کرتا ہوں۔

مہراں کے گھٹنے پھر ڈھیلے پڑ جاتے اور وہ جلدی سے کہتی ہے۔

"جی ہاں زندہ رہی پر پھاتاں کے لئے تو ایک مصیبت بن گئی۔ تم پوچھو گے کس طرح ـــــ وہ اس طرح کہ جب تک مراثن زندہ رہی لوگ پھاتاں سے کہتے رہے یہ فاحشہ عورت ہے اسے فوراً گھر سے نکال دو اور اب جب وہ مر گئی تو وہ بولے۔ یہ بچی

اللہ جانے مولابخش کی ہے بھی یا نہیں اسے اس کی نانی کے گھر بھجوا دو۔ سُنا باؤ جی مطلب یہ کہ بچی کے بارے میں ان کو شک شبہ تھا۔ تو ایک دن بھاناں کے گھر برادری کے سب لوگ جمع ہوئے اور کہنے لگے۔ دیکھو بھاناں ہم اب تک تمھارا مُنہ دیکھتے رہے ہیں اب خیریت اسی میں ہے کہ اسے اس کی نانی کے یہاں بھجوا دو۔ اسی وقت ورنہ ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا ——— اس وقت بھاناں نے پتہ ہے کیا کیا۔ وہ سینہ تان کر بولی۔ میں اس مصوم (معصوم) کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔"

"اگر تم نہیں چھوڑو گی تو ہم تمھارا "بیائی کاٹ" کر دیں گے" انھوں نے کہا۔

"جو دل میں آئے کرو۔ میں تو اسے چھاتی سے لگا چکی ہوں اب موت ہی اسے مجھ سے جدا کریگی۔"

مہراں کے لب و لہجہ میں جوش پیدا ہوگیا ہے اور وہ اس طرح بول رہی ہے جیسے سٹیج پر بھاناں کا پارٹ کر رہی ہے۔

"تو برادری نے بھاناں کا بائیکاٹ کر دیا ہوگا۔"

"جی ہاں ——— مولابخش بھی بیوی کے خلاف ہوگیا۔ بھاناں کے دونوں لڑکے پہلے ہی مراثن کے بہت خلاف تھے وہ ماموں کے گھر چلے گئے تھے وہیں کام کاج کرتے تھے ——— میں نے جب دیکھا کہ بھاناں اپنی ضد سے بڑا نسکان (نقصان) اُٹھا رہی ہے تو ایک دن اس سے بولی "بھاناں! اس بچی کو بھیج ہی دو۔ کیا فائدہ اسے گھر میں رکھنے کا۔ سب لوگ تمھارے خلاف ہوگئے ہیں۔"

یہ سُنکر وہ کہنے لگی۔

"نہیں بہو ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس کی ماں سے کہا تھا کہ اسے سینے سے لگا کر رکھوں گی کیوں بھیجوں اسے۔ لوگ خلاف ہوگئے ہیں تو بیشک ہو جائیں جب کسی کو سہارا دیا ہے تو لوگوں سے کیوں ڈریں۔"

میں نے کہا "تمھارے اپنے لڑکے بھی تو خلاف ہوگئے ہیں!"

بھاناں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ سی گئیں۔

لوگ کہتے ہیں لڑکا ماں باپ کا بازو بنتا ہے پر میرے لڑکے تو اللہ کی مار ان پر۔ اچھا جو چاہیں کریں میں ان سے ڈر نہیں جاؤں گی اللہ ہمت دے سب کام کر لیا کروں گی۔"

اور بھاناں سب کام کرنے لگی۔ عیشاں بڑی ہونے لگی ——— بھاناں نے رات دن محنت کرکے اس کا جہیز بنایا اپنی ساری پونجی اس پر صرف کر دی۔ جب عیشاں کا بیاہ ہوا تو بھاناں بڑی خوش تھی کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے پر باؤ جی! اگر اللہ میاں کو یہ بات منظور نہیں تھی۔ عیشاں کی شادی گجرات میں ہوئی تھی۔ وہاں کسی نے عیشاں کے سسر کو بتا دیا کہ عیشاں ایک مراثن کی بیٹی ہے۔ بس پھر کیا تھا سسرال والوں نے عیشاں کو مارپیٹ کر بھاناں کے گھر بھجوا دیا اور بعد میں کاغذ بھی بھیج دیا۔ ادھر عیشاں طلاق لے کر گھر آئی اور مولابخش خون تھوکنے لگا۔ بھاناں پر دوہرا صدمہ پڑا۔ کوئی اور ہوتا تو پاگل ہو جاتا پر بھاناں نے ہمت نہ ہاری۔ لولی ساس کی بھی برابر خدمت کرتی رہی خصم کی بیماری پر بھی خرچ کیا اور لوگوں کے کپڑے بھی دھوتی رہی ——— تاجی بھاناں کا رشتے میں بھائی کا بیٹا تھا۔ بڑا آوارہ گرد تھا۔ بھاناں نے اسے گھر میں رکھ لیا۔ یہ

لڑکا کام کاج میں مدد دینے لگا اور جب پھاتاں نے دیکھا کہ تاجی ٹھیک ہو گیا ہے تو اس کی شادی عیشاں سے کر دی بعد ازاں کے پھاتاں کے سر سے یہ بوجھ بھی اُترا —— اب شوہر مولا بخش دو سال تک بیمار رہا اور پھر مر گیا! دو چار دن بعد پھاتاں کی دلی ساس بھی چل بسی —— پھاتاں کی شادی کے بعد پورے تنتیس برس زندہ رہی تھی یہ —— پورے بتیس برس اتنے سال پھاتاں نے اس کی خدمت کی تھی —— ایک رات پھاتاں کپڑوں پر استری کر رہی تھی کہ استری سے اللہ جانے کس طرح کوئلے نکل کر اس کے کپڑوں پر آ گرے اور بیچاری کے گھٹنے جل گئے اور وہ صبح تک بے ہوش پڑی رہی۔ صبح عیشاں نے نیچے اُتر کر دیکھا تو اپنا سر پیٹ لیا۔ ہم سب نے مل کر اسے چارپائی پر لٹایا اور حکیم کو بلایا اور وہ ہوش میں آ گئی پر اب وہ پہلی جیسی نہیں تھی چارپائی سے تو اٹھ ہی نہیں سکتی تھی بے چاری۔ منگل کی رات کا ذکر ہے پھاتاں نیچے سو رہی تھی اور عیشاں، تاجی اور ان کا بچہ اوپر چھت پر سو رہے تھے۔ آدھی رات کو بچہ رونے لگا۔ اللہ جانے کیا تکلیف تھی اُسے۔ عیشاں کی جوانی کی نیند بالکل بے خبر سوتی رہی۔ پھاتاں سے نہ رہا گیا پہلے تو اس نے آوازیں دیں پھر بھی بچہ روتا رہا تو اُوپر آ گئی۔ اللہ جانے کس طرح اوپر آ گئی اوپر آ کر اس نے بچہ گود میں اُٹھا لیا اور عیشاں کو جگا دیا۔ عیشاں بڑی نراض (ناراض) ہوئی۔

" اماں تیری صلاح مرنے کی ہے "

اور یہ بات سچی ہی نکلی۔ پھاتاں کو ہوا لگ گئی اور وہ جمعرات کی شام کو مر گئی —— پچاس سال لوگوں کی خدمت کرنے کے بعد مر ہی گئی "

مہراں کی آواز بھرا جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں غمناک ہو جاتی ہیں اور وہ دوپٹے کے پلّو سے ناک پونچھتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔

میں سوچنے لگتا ہوں، مائی پھاتاں مر گئی ہے۔ وہ مائی پھاتاں جس نے تنتیس سال تک دلی ساس کی خدمت کی، جس نے اس وقت اپنی سوکن کو پناہ دی جس وقت اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور وہ بے آسرا ہو چکی تھی جس نے ایسے وقت میں سوکن کی بچی کو چھاتی سے لگایا جس وقت وہ ماں کے دودھ سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی تھی۔ جس نے دو سال تک بیمار شوہر کی تیمارداری کی —— جو پچاس سال تک میرے محلے میں رہی اور جس کے بارے میں چند منٹ پہلے میں صرف یہی جانتا تھا کہ وہ ایک دھوبن ہے اور بڑی لڑاکا ہے —— "

مہراں آبدیدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہے۔

" تو لکھ دو باؤ جی! "

میں کاغذ نکالتا ہوں اور لکھنے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں۔ مہراں آنکھیں بند کر کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے انھیں دباتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے اُبھری ہوئی ہڈی نم آلودہ ہو جاتی ہے۔ مہراں انگوٹھے اور انگوٹھے کی ساتھ والی انگلی سے اس نمی کو خشک کرتی ہے اور ایک لمبی آہ بھر کر پوچھتی ہے۔

" لکھ لیا ہے خط "

" ہاں۔ پتہ بولو "

میں خط مکمل کر کے اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ وہ اُٹھ بیٹھتی ہے اور جانے لگتی ہے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر رُک جاتی ہے۔

"آج شہر میں جھنڈیاں کیوں لگائی جا رہی ہیں؟" مہراں پوچھتی ہے۔

"تمھیں معلوم نہیں آج شیخ خیرالدین مرحوم کا جنم دن منایا جا رہا ہے۔"

اچھا۔ شیخ خیر دین ـــــ میں نے انھیں دیکھا تھا۔ بہت بڑے آدمی تھے۔ بھاناں ان کے کپڑے بھی دھویا کرتی تھی۔" مہراں چلی جاتی ہے۔ میں تعزیہ مکمل کرنے کے لئے کاغذ پر جھکتا ہوں ـــــ مجھے کچھ بھی نہیں سُوجھ رہا ـــــ میری آنکھوں کے سامنے بھاناں کا بوڑھا چہرہ اُبھرنے لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس چہرے پر صدیوں کی محنت، صدیوں کی بے لوث خدمت کا غبار چھایا ہوا ہے ـــــ اس غبار میں اس کی خاموش نظریں مجھ سے ایک سوال پوچھ رہی ہیں اور میرے ذہن میں مہراں کے الفاظ گونج رہے تھے ـــــ "خیر دین بہت بڑے آدمی تھے بھاناں ان کے کپڑے بھی دھویا کرتی تھی۔"

گٹاری کے انڈے

دیوندر ستیارتھی

منہ میں کوئی کیڑا یا کوئی ننھا ٹکڑا یا تنکا تھامے گٹاری اپنے گھونسلے میں گھس جاتی۔ گھونسلے کا دروازہ ایک معمولی سوراخ ہی تو تھا۔ اُوپر کی منزل میں نکڑ والے غسل خانہ کی چھت پہ جہاں ٹین کی چادر کا سرا کاریگر نے باہر کو بڑھا رکھا تھا۔ بس وہیں اس ٹین کے نیچے دیوار کے آخری سرے میں یہ سوراخ تھا جو گٹاری کے گھونسلے کا دروازہ تھا۔ نیچے رسوئی کے دروازے پر کھڑے کھڑے بدھ سنگھ گٹاری کو اپنے گھونسلے میں داخل ہوتے دیکھتا اور سوچتا کہ ماں کی محبت دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے اور دنیا کی کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جب گُلّی کی ماں آیا پہ ڈانٹ ڈپٹ کرتی کہ آج اس نے گُلّی کو وقت پر کھانا کیوں نہیں کھلایا، بدھ سنگھ کی نگاہ میں گٹاری کی شخصیت اُبھر کر اُونچی اُٹھ جاتی۔ جب کوئی خوف ناک بات ہوتی گٹاری کا جوڑا رسوئی کے بغل والے پیڑ پہ بیٹھ کر ایسی ایسی آوازیں نکالتا کہ بدھ سنگھ بڑی چوکسی سے اِدھر اُدھر دیکھتا۔ وہ کہتا: ”گٹاری سے بڑا انسان کا دوسرا دوست نہیں ہو سکتا۔ سانپ کو دیکھ کر سب سے پہلے گٹاری ہی شور کرتی ہے۔“

اس مکان میں ہمیشہ نہیں تو کبھی کبھار سانپ نظر آ جاتا تھا۔ گٹاری کی چیخ پکار ہی سانپ کی موجودگی کا پتہ دیتی۔ اس وقت بدھ سنگھ ہاتھ میں لٹھ اُٹھائے سانپ کی تلاش میں نکل پڑتا۔ جب سے وہ اس گھر میں آیا تھا، چنار کے نیچے تین چار سانپ مار چکا تھا۔

بدھ سنگھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا۔ بات کرتے وقت یوں سامنے آتا جیسے مداری کے سامنے جمورا، سامنے والے شخص کا جائزہ لیتا اور پھر نپے تُلے انداز میں اپنا فلسفہ بگھارنے لگتا ——— ”ہاتھوں سے دی ہوئی گانٹھیں انسان کو منہ سے کھولنی پڑتی ہیں ہمارے گورو مہاراج کا کہنا ہے۔ کہ سوچ کر بولو۔ سوچ کر کام کرو۔“ گھر والے اُس سے خوش تھے۔ کیونکہ اپنے کام کے علاوہ وہ دوسروں کا کام بھی بخوشی کر دیتا۔ فرش پر بکھری کتابوں کو ٹھیک کر دیتا۔ سانپ کا ذکر آنے پر تو وہ غصہ میں آ جاتا۔ کہتا ”میں اس پہ جھپٹ پڑوں گا، ایک ہی ڈنڈے سے اُس کی سری توڑ دوں گا۔“ اُس کی آواز میں اتنی گرمجوشی تھی کہ اُس کی بات پہ یقین کرنا پڑتا۔ ضروری اور غیر ضروری بات میں وہ بہت فرق نہیں کر سکتا تھا۔ وہی گرم جوشی، وہی ہلچل پیدا کرنے والی آواز، جب وہ بات کرتا تو اُس کے اُبھرے ہوئے گالوں کی ہڈیاں اُبھرتی نظر آتیں۔ اُس وقت اُوپر کھڑکی کے دروازے پہ بیٹھا گٹاری کا جوڑا تیکھی سی آواز میں بولنے لگتا۔ بدھ سنگھ سوچتا کہ گٹاری اُس کی داد دے رہی ہے۔

کوئی بدھ سنگھ سے بات کرے نہ کرے کبھی کبھی وہ رسوئی کے برانڈے میں اونچی آواز میں خود ہی باتیں کرتا رہتا۔ ابھی گھر کی کسی بات پہ تبصرہ کیا جا رہا ہے، ابھی ریڈیو پہ سنی ہوئی کسی خبر کو لے کر نمک مرچ لگایا جا رہا ہے۔ بات کرتے وقت وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا۔ اسے اس بات کا سب سے بڑا اطمینان تھا کہ گھر بھر اس کا اعتبار ہے اور وہ اپنا کام ایمان داری سے کرتا ہے۔ جتنے مہمان آتے ان کے ساتھ بدھ سنگھ کا سلوک ہمیشہ خوش گوار رہتا، بچوں سے اُسے بے حد محبت تھی۔ گگی کی ماں اُس پر اس لیے بھی خوش تھی کہ گگی کا جتنا خیال وہ رکھتا ہے، آیا بھی نہیں رکھتی۔ چنار کی ٹہنی پہ بیٹھ کر گٹاری اپنی زبان میں کچھ کہنے لگتی تو بدھ سنگھ پاس کھڑے ہو کر اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ گٹاری کہہ رہی ہے ——— بدھ سنگھ! میں جانتی ہوں کہ تم اکیلے تین آدمیوں کا کام کرتے ہو! وہ دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ بڑی معصومیت سے وہ گٹاری کی طرف دیکھتا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو ——— میں تو تمہارا بھی اتنا ہی نوکر ہوں اگٹاری، جتنا گگی کی ماں کا!

بجلی کے تار پہ لٹکتا ہوا کوّا ابھی بدھ سنگھ کو جانتا ہے۔ کم سے کم بدھ سنگھ کا یہی خیال تھا۔ کوّے کی کائیں کائیں سے بدھ سنگھ کو پتہ چل جاتا کہ کوّا بھوک سے چلا رہا ہے یا خوشی کا سُر بھر رہا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوّا غصّہ میں ہوتا۔ اُس وقت چنار کے پیڑ پہ بیٹھی گٹاری چلا کر بدھ سنگھ سے شکایت کرتی۔ بدھ سنگھ لاٹھی گھما کر کوّے کو اڑا دیتا۔ کیونکہ بدھ سنگھ کو معلوم تھا۔ کہ گٹاری اور کوّے کا پرانا بیر چلا آتا ہے اور کوّے کی موجودگی میں گٹاری کو یہ محسوس نہیں ہو سکتا کہ اس کا گھونسلا سلامت ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کوّے اور گٹاری کا بیر ختم کیوں نہیں ہو سکتا۔ کوّے اور گٹاری کی غیر موجودگی میں وہ اپنے دل سے باتیں کرتے ہوئے اسی موضوع پہ سوچنے لگتا۔ اور پھر جیسے کچن کی دیواروں کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں کہنے لگتا: گٹاری تو بہت معصوم پنچھی ہے۔ وہ بے چاری تو کوّے کو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کوّا ہی اُس کے بچوں کا دشمن ہے۔ کم بخت کو کسی کا گھونسلا اجاڑنے میں نہ جانے کیا ملتا ہے! اپنے آپ کو گٹاری کی خدمت کے قابل بنانے کے لیے وہ کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔ ساتھ ہی اُس کی یہ خواہش نہ تھی کہ گٹاری اُس کا شکریہ ادا کرے۔ کوّے پر اسے غصّہ آنے لگتا۔ شیطان کو گٹاری پہ ذرا رحم نہیں آتا۔ آخر گٹاری اُس کا کیا بگاڑتی ہے؟

صبح ہو جانے پہ بدھ سنگھ کی نگاہ گٹاری کے گھونسلے پہ پڑتی۔ گٹاری کو گھونسلے کے قریب بیٹھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی دلچسپی ننھی گگی کو مسکراتے اور مچل مچل کر باغیچہ کی روش پہ اُچھلتے کودتے دیکھنا۔ گگی کی ماں کے منہ سے ایک آدھ تعریف کا بول سن لیتا، یا پھر کسی مہمان کے منہ سے زمانے کے حالات پہ ہلکا پھلکا سا تبصرہ سن کر اُس کے بارے میں رائے قائم کرنا۔ لیکن اس سے اُتر کر اگر اس کی کوئی دلچسپی تھی تو وہ تھا گٹاری کا گھونسلا۔ جب بھی گٹاری انڈے دیتی بدھ سنگھ سوچتا کہ گٹاری کی نئی نسل شروع ہونے والی ہے۔ انڈوں سے بچے نکلنے کا اُسے بے حد انتظار رہتا۔ اُن دنوں وہ خاص طور پہ گٹاری کے گھونسلے کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا۔ اس کی نگاہ سیدھی گٹاری کے گھونسلے پہ پہنچتی۔ حالانکہ زمین پہ کھڑے کھڑے یہ ناممکن تھا کہ کوٹھی کی اوپر کی منزل میں نکڑ والے غسل خانہ کی چھت پہ ٹین کی چادر کے بڑھے ہوئے سرے کے پیچھے دیوار کے آخری سرے کے گول سوراخ کے اندر کی دنیا کے بارے میں کوئی بات دریافت کی جا سکے۔ کھڑکی پہ بیٹھی گٹاری کی آواز میں چہل اور لوری کی آمیزش دیکھ کر بدھ سنگھ اندازہ لگا لیتا کہ گٹاری کے انڈوں سے بچے نکل آئے ہیں۔

گٹاری انسان کی سب سے بڑی دوست ہے! ——— یہ بدھ سنگھ کا تکیہ کلام تھا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ آیا سے بات کرتے وقت وہ عورت کو گٹاری سے تشبیہ دیتا۔ لیکن اس کے باوجود عورت کا صحیح تصور بدھ سنگھ کے ذہن کو کبھی نہ گدگداتا۔ اسی لیے تو اُس

نے کبھی بھول کر بھی بیاہ کی بات نہ سوچی تھی۔ اُس کے ہاتھ کام کرتے کرتے بہت کھردرے ہو گئے تھے۔ بیوی ہوتی تو کبھی اس کے ہاتھوں پہ تیل ہی چپڑ دیا کرتی۔ لیکن اُس نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ بیاہ کے جھگڑے میں نہ پڑے گا۔ بیوی کی غیر موجودگی کا تصور اُسے کبھی تنگ نہ کرتا۔ آیا کے چوڑے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اکثر سوچتا کہ بُڑھیا اپنے بیٹوں کی سعادت مندی حاصل نہ کر سکی۔ ورنہ اس عمر میں اُسے آیا کا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس نے ایسے باپ بھی دیکھے تھے جن کے بیٹے اُن پہ بھوکے ریچھوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ ایسی مائیں بھی دیکھی تھیں جن کے بیٹے بیویوں کے غلام ہو کر اپنی ماؤں کو ایسی جلی کٹی سناتے تھے کہ سننے والے کو منہ میں انگلی دبا کر رہ جانا پڑتا تھا۔ ایسے بیٹے پیدا کرنے سے کیا حاصل۔ بس یہی سوچ کر اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اکیلا رہے گا۔ دم کا دم، نہ دھوکا نہ غم —— یہی اُس کا فلسفہ تھا۔ پھر بھی گُلّاری کے بہانے اُس کی محبت اُمڈی پڑتی تھی۔

بُدھ سنگھ کا چہرہ کبھی اداس نہ ہوتا۔ اُس کی آواز میں کبھی تھکان کا گمان نہ ہوتا۔ یہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ دوسرے نوکروں سے کتنا مختلف ہے، ایک طرح سے وہ چوبیس گھنٹے کا نوکر تھا۔ نوکری میں ناغے کا تو سوال ہی نہ اُٹھ سکتا تھا۔ گُلّی کی ماں کو کبھی اُس پہ جرمانہ کرنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ بلکہ وہ تو اس بات کے انتظار میں رہتی کہ کبھی تو بدھ سنگھ بھی چھٹی مانگے۔ "کبھی تو چھٹی بھی منانی چاہیے۔" گُلّی کی ماں اُس سے کہا کرتی "مہینے میں ایک بھی چھٹی نہ منائے تو انسان کی زندگی میں گھُن لگ جائے۔" لیکن بدھ سنگھ تھا کہ اُسے گھُن کا ڈر نہ تھا۔

گُلّی کی ماں کی ساس بھی تو اسی کوٹھی میں رہتی تھی۔ صحیح معنوں میں بُدھ سنگھ گُلّی کی ماں کی ساس کا نوکر تھا۔ جنہیں ہر کوئی احترام سے بھابوجی کہہ کر پکارتا۔ بھابوجی پہ تو بدھ سنگھ جان دیتا تھا۔ جب بھابوجی کبھی بیمار پڑتیں تو بُدھ سنگھ آدھی رات کو اُٹھ اُٹھ کر پوچھتا "بھابوجی! کچھ چاہیے تو نہیں؟" بھابوجی اُسے بیٹے سے بڑھ کر سمجھتی تھیں۔ اس لیے کبھی بدھ سنگھ کسی بات سے جھنجھلا کر تھوڑا ناراض بھی ہو جاتا تو بھابوجی بُرا نہ مانتیں۔ اُن کا خیال تھا کہ بدھ سنگھ دل کا سچا ہے۔ اُس کی بات چیت کا کھردرا پن بھابوجی کو ذرا بھی تو نہ اکھرتا۔ کیونکہ بدھ سنگھ نے اپنے منہ سے یہ بھی تو نہ کہا تھا کہ اس کی تنخواہ بڑھا دی جائے۔ گُلّی کی ماں بدھ سنگھ پہ اس لیے بھی خوش تھی کہ جہاں وہ بھابوجی کا پورا خیال رکھتا ہے وہاں ضرورت پڑنے پر خاص خاص مہمانوں کے آنے پہ وہ سب چیزیں تیار کر دیتا ہے۔ جن پہ کشمیری رسوئیے کا ہاتھ ٹھیک نہیں چلتا۔

بھابوجی ذرا پُرانے خیالات کی تھیں۔ اس لیے وہ گُلّی کی ماں کے کچن سے الگ اپنی رسوئی بنواتی تھیں۔ بدھ سنگھ اُن کا رسوئیا بھی تھا۔ اور پرائیویٹ اسسٹنٹ بھی۔ کیونکہ وہ ہر کام میں بدھ سنگھ کی صلاح لیتیں۔ گُلّی کی ماں کے بارے میں اُن کی رائے بہت اچھی تھی۔ اکثر وہ یہ کہا کرتی تھیں کہ اگر کوئی اُن کی سگی بیٹی بھی ہوتی تو شاید اُن کی اتنی سیوا نہ کرتی۔ بھابوجی بھابوجی کہتے گُلّی کی ماں کی زبان سُوکھتی تھی۔ بھابوجی کو سب سے بڑی حیرت تو اس بات پہ تھی کہ گُلّی کی ماں کا جنم اس قوم میں ہوا جس کی اس دیس پہ حکومت رہی۔ لیکن کس طرح اُن کے بیٹے کے ساتھ انگلینڈ سے یہاں آنے پہ اس نے اپنی طبیعت کو اس دیس کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ کس طرح وہ یہاں کے تمدن میں رچ بچ گئی تھی، یہ بات سچ مچ بہت بڑی تھی۔ اس دیس میں آنے کے بعد بھابوجی کے بہو بیٹے کو کچھ کم کشمکش کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ لیکن کیا مجال کہ بھابوجی نے اپنی بہو کے ماتھے پہ تیوری دیکھی ہو۔ خیر اب تو اُن کی زندگی ایک ڈھب پہ آ گئی تھی۔ گُلّی کی ماں لڑکیوں کے کالج میں پروفیسر تھی۔ اور گُلّو کے پتاجی پھر سے وہ میگزین نکالنے جا رہے تھے۔ جس کے ذریعے انہوں نے انگلینڈ سے لوٹنے پر اس دیس کی بہت بڑی خدمات سرانجام دی تھیں اور جسے اقتصادی وجوہات کے باعث بند کر دینا پڑا تھا۔ بُدھ سنگھ پہ گُلّو کے پتاجی بھی بہت خوش تھے اور بھابوجی کے کمرے میں بیٹھ کر وہ اکثر کہا کرتے: "دیکھ بدھ سنگھ! تیری بڑی برخورداری ہے کہ بھابوجی کا سارا کام تو ہی

ذمے لے رکھا ہے"۔ اور بھابوجی کہتیں "بیٹا! جیسے تم میرے بیٹے ہو ویسا ہی بدھ سنگھ بیٹا ہے۔ میری بس ایک ہی اچھا ہے کہ بدھ سنگھ بیاہ کرا لے۔ اس کی بھی ایک بیٹی ہو گی گگو جیسی!" گگو کے پتا جی کہتے: "واہ بھابوجی۔ ڈگری کراؤ بدھ سنگھ کی ڈھائی ہزار لگی۔ اتنا تو بے چارے نے جوڑا بھی نہ ہوگا۔" بدھ سنگھ یہ سنتا تو کچن کی طرف چلا جاتا۔ اور اس وقت اگر گناری کھڑکی سے بول اٹھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ گناری پوچھ رہی ہے "تم کب بیاہ کراؤ گے، بدھ سنگھ؟" وہ کچن سے باغیچہ کی طرف چلا جاتا۔ جیسے بیاہ کی بات کو ان سنا کرنے کے لیے وہ بڑی سے بڑی جدوجہد کر سکتا ہو۔

وہ کئی بار رات کو دبے پاؤں بھابوجی کے کمرے میں جاتا اور سوتے میں ان کا گمبھیر چہرہ دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوتی۔ دبے پاؤں وہ اس کمرے سے چلا آتا۔ بھابوجی کا رعب دیر تک اس کی آنکھوں میں تیرتا رہتا۔ ان کی گہری ہمدردی اور ہمدرد آواز جیسے اس وقت اس کے کانوں میں برابر گونج رہی ہو۔ اسے خیال آتا کہ سوتے سے ایک لمحہ کے لیے جاگ کر بھابوجی اس سے یہی کہیں گی "بدھ سنگھ! اب تو تمہیں بیاہ کرانے میں دیر نہ کرنی چاہیے۔" وہ جواب کے لیے تیار رہتا "نہیں بھابوجی! یہ نہیں ہو سکتا۔ جس نے ہمیشہ کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا ہو وہ بیاہ کرائے، میں تو آزاد ہوں!"

کچن کے برامدے میں کھڑے کھڑے کبھی کبھی بدھ سنگھ اپنے دل سے باتیں کرتے کرتے اونچی آواز میں کہنے لگتا: "گناری دو انڈے دیتی ہے ایک ساتھ، دو انڈے۔ بیس پچیس دن ان انڈوں کو سینا ہوتا ہے۔ آدھے دن گناری سیتی ہے، آدھے دن گنارا سیتا ہے۔ لیکن عورت اور مرد کبھی اپنے کام بانٹ بانٹ کر نہیں کرتے، اسی لیے تو بیاہ مصیبت بن جاتا ہے۔ نہیں بھابوجی نہیں۔ بدھ سنگھ بیاہ نہیں کرائے گا۔ بدھ سنگھ اتنا بدھو نہیں ہے کہ اپنے پیروں میں ایک زنجیر ڈال لے۔ بھابوجی! پھر بدھ سنگھ آپ کی سیوا ابھی نہیں کر سکے گا۔ بدھ سنگھ۔ اسے بیاہ کرنے کو نہ کہنا بھابوجی!"

گناری کی زرد چونچ بدھ سنگھ کو بہت پیاری لگتی تھی۔ گناری کے پیر بھی تو زرد تھے۔ ان کے بارے میں بدھ سنگھ مزے مزے لے کر وہ قصہ چھیڑ دیتا: "گناری کے پیر اپنے نہیں ہیں۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے جب گناری کے پیر اپنے ہوتے تھے۔ وہ مور کے سامنے ناچنے لگی۔ مور نے خوش ہو کر کہا: مانگ لے گناری جو تیری اچھا ہو۔ گناری نے مور سے کہا، تم میرے ساتھ اپنے پیر بدل لو۔ مور نے سوچا بچن دیا ہے تو پورا کرنا چاہیے۔ بس جی مور نے اپنے پیر گناری کو دے دیئے اور گناری کے پیر خود لے لیے۔ آج تک مور کو اس بات کا افسوس ہے یہ سودا بڑا خسارے کا رہا۔ گناری تو مور کے پیر لے کر پہلے سے کہیں زیادہ سندر ہو گئی اور مور اب تک روتا ہے۔ جب بھی مور ناچتا ہے اپنے پیروں کو دیکھے بنا نہیں رہ سکتا۔ کہتا ہے۔ میں اتنا سندر ہوں لیکن میرے پیر کتنے بھونڈے ہیں!" اور اگر اسے اوپر کھڑکی پر بیٹھی ہوئی گناری نظر آ جاتی تو وہ پکار کر کہتا: "تو بڑی چالاک نکلی۔ تو نے مور کے پیر اڑا لیے بات بات میں۔ واہ ری میری چنچل گناری! واہ ری چھنال!" گناری کے پر سیاہ مائل بھورے نہ ہوتے تو زرد چونچ اور زرد پیر اتنے خوب صورت نہ لگتے، یہ سوچ کر بدھ سنگھ ٹکٹکی باندھے گناری کی طرف دیکھتا رہتا۔

بھابوجی اکثر بدھ سنگھ کو اپنے آپ سے باتیں کرتے سنتیں اور سمجھاتیں "اس طرح تو تیرا دماغ پھر جائے گا بدھ سنگھ! تو اپنے آپ سے باتیں نہ کیا کر۔" لیکن بدھ سنگھ کہتا "میرے گرودیو مہاراج کا کہنا ہے بھابوجی، کہ اچھا جینا ایسے ہی ہے جیسے کھیرے کا کھانا۔ جیسے کھیرے کو ایک سرے سے تھوڑا سا کاٹ کر اور اس ٹکڑے کو باقی کھیرے پر اسی جگہ جہاں سے وہ کاٹا گیا ہے گھسا کر کھیرے کا کڑوا پانی نکال دیا جاتا

ہے۔ ایسے ہی آدمی کو ایکانت میں اپنے من سے باتیں کرنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ ایسا کرنے سے جینے کا کڑوا پانی اور ہنات زہر نکالا جاسکتا ہے۔" بھابوجی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ بدھ سنگھ یہ نہ سمجھ سکتا کہ بھابوجی کیوں ہنس رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بھابوجی دُور سے بدھ سنگھ کو اپنے آپ سے باتیں کرتے سنتیں۔ "گرو مہاراج کا کہنا ہے کہ کئی باتوں میں انسانوں سے پرندے اچھے ہیں۔ اور کئی باتوں میں پرندوں میں بھی وہی بیماری پھیلی ہوئی ہے جو انسانوں میں۔ اب کوئی کوّوں سے پوچھے کہ وہ گٹاریوں کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں۔ تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوّوں اور گٹاریوں کی دوستی ہو جائے۔ یہ دوستی کیسے ہو۔ اس کا اُپائے گرو مہاراج کے پاس ضرور ہوگا۔"

گُگی کی ماں چائے کی میز پر اپنے خاوند سے بحث میں اُلجھ کر گرم ہو جاتی یا جب ایسے موقعوں پر گُگی کے پتا جی کسی بات پر جھنجھلا اُٹھتے تو بدھ سنگھ بھابوجی سے بات کرتے ہوئے کہتا: "گرو مہاراج کا کہنا ہے بھابوجی کہ کھارے کوئیں میں پانی کبھی میٹھا نہیں ہو سکتا چاہے کوئیں میں من بھر کھانڈ ڈال دیں۔" بھابوجی کہتیں: "تو کہنا کیا چاہتا ہے بدھ سنگھ؟" وہ بات کو ٹالتے ہوئے کہتا: "بھابوجی۔ میں پوچھتا ہوں۔ کیا گٹاری اور گٹار میں بھی اَن بن رہتی ہوگی؟" بھابوجی ہنس کر کہتیں "تو پاگل ہو جائے گا، بدھ سنگھ! جب دیکھو گٹاری کی بات۔ گٹاری تیرے دماغ پر بیٹھ گئی ہے۔ تجھے کیا ہو گیا ہے؟" اس کے جواب میں اُلٹی سیدھی ہانکتے ہوئے وہ کہتا: "بھابوجی، سانپ کے بچے کبھی انسان کے دوست نہیں ہو سکتے چاہے اُنہیں من بھر دُودھ پلایا جائے۔" بھابوجی حیرت سے بدھ سنگھ کی طرف دیکھتیں۔ بدھ سنگھ کی آواز سیٹی کی طرح گونجتی۔ بھابوجی سوچتیں کہ بدھ سنگھ میں ایک ہی کمی رہ گئی۔ وہ پڑھا لکھا ہوتا تو بڑے بڑوں کے کان کترتا۔

جب سے بھابوجی نے چار پانچ مرتبہ بدھ سنگھ کو گٹاری کا ذکر کرنے سے ٹوک دیا تھا وہ ان کے سامنے گٹاری کا ذکر کرتے جھجکنے لگا تھا۔ وہ اُوپر کھڑکی پر بیٹھی ہوئی گٹاری سے پکار کر کہنا چاہتا کہ اب اُسے کہیں دوسری جگہ گھونسلا بنا لینا چاہیئے۔ جب کوئی کسی کو دیکھنا تک گوارا نہ کرے تو اُس شخص کو چاہیئے کہ وہ اُس گھر سے الگ ہو جائے۔ بس گٹاری کو بھی اپنا گھونسلا بدل لینا چاہیئے۔

لیکن گٹاری اپنا گھونسلا بدلنے کو تیار نہ ہوئی۔ گٹاری کی آواز اُسے پیاری نہ لگے، بدھ سنگھ اس کے لیے بھی اپنے دل کو سمجھانے لگا۔ جب بھابوجی ناراض ہوتی ہیں تو انہیں ناراض کرنے سے کیا حاصل۔ گٹاری کی آواز میں کون سے لڈو رکھے ہیں؟ آخر کسی پرندے کی آواز انسان کے دماغ پر کیوں چھا جائے؟ ویسے تو انسان اور پرندے بھائی بھائی ہیں۔ دونوں پر ایک ہی سورج چمکتا ہے۔ لیکن بھابوجی کی بات بھی ٹھیک ہے۔ ہر وقت ایک ہی بات کے پیچھے پڑے رہنے سے انسان پاگل پن کو دعوت دیتا ہے۔ ہر وقت گٹاری کی غمگین آواز کو دماغ پر دستک دینے کی اجازت کیوں دی جائے! انسان کا دماغ جتنا ہلکا رہتا ہے اتنا ہی فائدہ مند ہے۔ بدھ سنگھ نے فیصلہ کر لیا کہ بھابوجی کے کہنے کے مطابق چلے اور اپنے دماغ کو ہر خطرے سے بچا کر رکھے۔

اب گٹاری اُوپر کھڑکی پر بیٹھی رہتی۔ بدھ سنگھ بھول کر بھی اُس کی طرف نہ دیکھتا۔ گٹاری کی آواز سے اب اُسے کوئی لگاؤ نہیں رہ گیا تھا۔ اب وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت بھی کم کر رہا تھا۔ کیونکہ بھابوجی کی صاف اور واضح رائے یہی تھی کہ ایسا کرتے رہنے سے بدھ سنگھ پاگل ہو جائے گا۔ وہ پاگل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

صبح کی چائے کی میز پر بیٹھے بیٹھے گُگی کی ماں گھاس پر بیٹھی گٹاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گُگی سے کہتی: "وہ رہی گٹاری۔ تیری بہن۔" گُگی گٹاری کے پیچھے بھاگتی اور اُسے پکڑنے کی کوشش کرتی۔ گٹاری ہاتھ نہ آتی۔ لیکن وہ بار بار چائے کی میز کے قریب آ کر بیٹھتی

اور اپنی مخصوص آواز میں بولتی۔ گلی کی ماں خوش ہو کر گلی کو گدگداتی۔ گلی دوبارہ گٹاری کو پکڑنے کے لیے اُس کے پیچھے دوڑتی۔ بچی کو اپنی کوشش میں ناکامیاب پا کر گلی کی ماں کہتی: "بدھ سنگھ، گلی کی مدد کرو۔"

بدھ سنگھ زور سے ہنستا۔ لیکن وہ آگے بڑھ کر گلی کی مدد نہ کرتا۔ گلی گٹاری کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اچھلتی کودتی۔ گٹاری ہاتھ نہ آتی۔ بدھ سنگھ کچن کی طرف چلا جاتا۔ گلی کی ماں آیا کو بلا کر کہتی: "گلی کی مدد کرو آیا!"

"ہم کیا مدد کرنے سکتا، بی بی جی؟" آیا ہنس کر کہتی۔

ایک دن گلی کے پتا جی نے بدھ سنگھ سے کہا: "دیکھو بدھ سنگھ! ایک بار گٹاری کو پکڑ کر گلی کے ہاتھ میں تھما دو۔ پھر چاہے گٹاری اُڑ ہی جائے۔ گلی بہت للچاتی ہے۔ وہ ایک دو منٹ تک گٹاری کو چھو چھو کر دیکھ لے گی۔ پھر وہ خود ہی کہے گی۔ گٹاری کو چھوڑ دو بدھ سنگھ۔"

بدھ سنگھ مالک کا حکم نہ ٹال سکا۔ وہ گٹاری کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن گٹاری اُس کے ہاتھ نہ آئی۔ گلی کے پتا جی ہنس ہنس کر اُسے بڑھاوا دیتے رہے: "پکڑو پکڑو وہ گئی گٹاری۔"

گلی کی ماں کو یہ کھیل پسند نہ آیا۔ ڈانٹ کر بولی: "رہنے دو، بدھ سنگھ! یہ ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ٹھیک نہیں؟" گلی کے پتا جی کہہ اُٹھے۔

"اس میں بحث کی تو جگہ نہیں۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ بحث کی جگہ ہے؟"

"گٹاری کو تنگ کرنے سے کیا حاصل؟"

"تنگ کون کرتا ہے؟"

"تو یہ کیا ہے؟"

"یہ تو دوستی کی جا رہی ہے۔"

بدھ سنگھ میرے پاس آ گیا تھا۔ وہ حکم کے انتظار میں کھڑا رہا۔ گلی اُٹھ کر گھاس پر لیٹ گئی تھی اور روئے جا رہی تھی۔ گلی کے پتا جی نے اُسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بولے "گٹاری ہاتھ نہیں آتی تو نہ سہی، بدھ سنگھ! ایک کام کرو۔ بانس کا لمبا زینہ لگا کر گٹاری کے گھونسلے میں جھانک کر دیکھو۔ اگر گٹاری کے انڈوں سے بچے نکل آئے ہوں تو گٹاری کا بچہ نکال لاؤ اور ایک منٹ کے لیے اُسے گلی کے ہاتھ پر رکھ دو۔ وہ اتنے سے خوش ہو جائے گی۔ پھر تم گٹاری کے بچے کو واپس گھونسلے میں رکھ آنا۔"

بدھ سنگھ لپک کر بانس کا زینہ اٹھا لیا اور اُسے اوپر کی منزل کے کونے والے غسل خانہ کی دیوار سے لگا کر اوپر چڑھنے لگا۔ گلی کی ماں نے چلا کر کہا: "پہلے میرے پاس آؤ، بدھ سنگھ!"

بدھ سنگھ زینے سے اُتر کر گلی کی ماں کے پاس کھڑا ہو گیا۔

گلی کی ماں نے آواز دی: "آیا!"

آیا دوڑ کر آئی۔ گلی کی ماں نے کہا: "گلی کو اندر لے جاؤ۔"

گلی نے پتا جی کی گود سے آیا کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں بھابوجی باہر آئیں۔ شور سن کر وہ گھبرا گئی تھیں۔ بولیں "کیا جھگڑا ہے؟"

"جھگڑا کچھ نہیں بھابوجی!" گلی کی ماں نے اپنے خیال کی تائید چاہتے ہوئے کہا: "بدھ سنگھ گُٹاری کا بچہ لانے جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں گُٹاری ناراض ہو جائے گی۔"

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے، گُٹاری کا بچہ اٹھانے سے گُٹاری تو ناراض ہو گی ہی۔" بھابوجی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

بدھ سنگھ خاموش کھڑا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس کا حکم مانے۔ بھابوجی اور گلی کی ماں کا یا گلی کے پتا جی کا۔ اُس نے تو گُٹاری کا ذکر تک کرنا چھوڑ رکھا تھا اور تین چار روز سے اُدھر کھڑکی میں بیٹھی گُٹاری کی طرف دیکھنے تک کی کوشش نہ کی تھی۔ کیونکہ وہ پاگل پن کو دعوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ سیدھی اور ستھری زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ وہ کسی طرح کی اُلجھن میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ عورت کے لیے اُس کے ذہن میں کوئی جگہ نہ تھی تو یہ گُٹاری کدھر کی جادوگرنی تھی۔ بھابوجی نے پہلے بتا دیا ہوتا تو وہ گُٹاری سے آشنائی نہ بڑھاتا۔ خیر اب تو اُسے گُٹاری کی آواز میں کسی طرح کی نغمگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اب گُٹاری کی صورت اُس کے تصور کو سہلانے کی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اُس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اُس کے سپنوں کو چھو تک نہ سکتی تھی۔ اور بھی تو پرندے تھے، بلبل تھی، مینا تھی۔ گرڑ تھا اور وہ پہاڑی پرندہ بھی تھا جو بہار کے شروع میں پہاڑوں کی طرف جانے سے پہلے سری نگر کے باغوں میں چہکنے کے لیے آ جاتا تھا۔ جس کی دُم بہت لمبی اور خوبصورت ہوتی ہے۔ ایسے ہی اور بھی بہت سے پرندے تھے ایک گُٹاری ہی تو نہ تھی۔

کچھ لمحوں کے لیے چائے کی میز پر خاموشی رہی۔ گلی کے پتا جی نے کڑک کر کہا: "بدھ سنگھ! تم یہ کام نہیں کر سکتے تو مجھے دوسرا انتظام کرنا ہوگا۔"

"جی صاحب!" بدھ سنگھ چونک کر زینے کی طرف بڑھا۔

گلی کی ماں خاموش تھی۔ بھابوجی بھی کچھ نہ بولیں۔ بدھ سنگھ زینے پر چڑھ گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد اُس نے واپس آ کر کہا: "جی صاحب! میں نے اچھی طرح دیکھ لیا۔ میرا پہلے بھی یہی خیال تھا۔ گُٹاری کو انڈے دیئے بیس دن ہی ہوئے ہیں، ابھی پانچ دن اور لگیں گے، پھر جا کر انڈوں سے دو ننھے منے بچے باہر نکلیں گے۔"

"اچھا تو پندرہ دن اور انتظار کرتے ہیں۔" گلی کے پتا جی نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "ہماری گلی اچھی لڑکی ہے۔ وہ گُٹاری کے بچے سے ضرور دوستی کرے گی۔"

بھابوجی کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ گلی کی ماں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ گلی کے پتا جی نے اُن کی طرف دیکھا، اور ہنس کر کہا: "ہم زبردستی کرنے کے قائل نہیں۔ پانچ دن بعد گُٹاری کے انڈوں سے دو بچے باہر نکلیں گے۔ جب وہ دس روز کے ہو جائیں گے ہم گُٹاری کے بچے سے گلی کی ملاقات کرائیں گے۔"

"بہت اچھی بات ہے!" بھابوجی نے ہنکار لگائی۔

"مجھے بھی اعتراض نہیں ہے۔" گلی کی ماں نے کالج میں پڑھنے والی کسی لڑکی کی درخواست قبول کرنے کے انداز میں کہا۔

گلی اپنے پتا جی کی گود سے اُتر کر آیا کی طرف بھاگ گئی۔

بدھ سنگھ نے پرانی عادت سے بے قابو ہو کر کہا: "جی صاحب! میرا حساب کبھی غلط نہیں ہوتا۔ گٹاری ہمیشہ دو ہی انڈے دیتی ہے۔ سال میں ایک بار۔ پورے پچیس دن وہ اپنے انڈے سیتی ہے۔ آدھا وقت گٹاری سیتی ہے اور آدھا وقت گٹار، یہ نہیں کہ اکیلی گٹاری پر ہی سارا بوجھ ڈال دیا جائے۔"

"ہاں ہاں، بدھ سنگھ! تمہارا حساب کبھی غلط نہیں ہو سکتا،" گگی کے پتاجی نے مذاق کرتے ہوئے کہا: "اس جھگڑے میں چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ اب یہ چائے نہیں لسی ہے، پھر سے لاؤ۔ ایک دم گرم۔"

دوبارہ چائے آئی تو گگی کی ماں بولی: "گٹاری نے کتنی اونچی جگہ گھونسلا بنایا ہے!"

"اب ذرا گٹاری کو بیچ میں نہ لاؤ،" گگی کے پتاجی بولے، "ورنہ چائے پھر ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

گگی کی ماں نے مسکراتے ہوئے چائے کا کپ تیار کر کے اپنے شوہر کے ہاتھ میں تھمایا۔ پھر اس نے اپنا کپ ہونٹوں سے لگانے کے بعد سنجیدگی سے کہا: "جس کمرے میں میں لڑکیوں کے کالج میں انگریزی پڑھاتی ہوں، وہاں روشن دان میں گٹاری نے اپنا گھونسلا بنایا تھا۔ تب پچھلے سال۔ ایک دن میں لڑکیوں کو پڑھا رہی تھی۔ اچانک اوپر سے دونوں انڈے ایک لڑکی کے سر پر گرے اور ٹوٹ گئے۔ رطوبت سے بے چاری لڑکی کا چہرہ خراب ہو گیا۔ سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ میری طبیعت پر بہت زبردست دھچکا لگا۔ میں اُس دن پیریڈ نہ لے سکی۔ اُس لڑکی نے غسل خانہ میں جا کر اپنا چہرہ صاف کر لیا تھا۔ اور باقی لڑکیاں سنجیدہ ہو کر پڑھنے کے لیے تیار تھیں۔ لیکن میرے دل پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔"

"تم بہت حساس ہو، یہ مجھے معلوم ہے۔"

"وہ واقعہ مجھے اب تک غمگین بنائے ہوئے ہے۔"

"اب تو یہ غلط بات ہے کہ ایک برس پہلے کے واقعہ پر آنسو بہائے جائیں۔"

"انڈے گر کر ٹوٹ گئے تو گٹاری کا جوڑا کمرے میں دیوانہ وار منڈلانے لگا تھا۔ ان کی چیخ و پکار کئی دن تک سنائی دیتی رہی تھی جیسے اُن کے انڈے توڑنے کا گناہ ہم سے سرزد ہوا ہو۔"

"اب اُس غم کو دفنا دینا ہی ٹھیک ہو گا۔"

"اس غم کا دھماکا سا ہوتا ہے میرے دماغ میں۔ اس وقت میں بے چین ہو جاتی ہوں۔"

"یہ تو وہی بات ہوئی جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ——— سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!"

کچھ لمحوں کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔ بدھ سنگھ بابوجی کے پلنگ کے قریب کھڑا سہمی سہمی سی نگاہوں سے چائے کے میز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کاش وہ گگی کی ماں کو دلاسا دے کر کہہ سکتا کہ پچھلے غم بھول جاؤ، آنے والے غم کی فکر کرو۔ وہ حیران تھا کہ بابوجی کیوں چپ بیٹھی ہیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ جب انسان کبھی اپنی زندگی کا مالک نہیں رہا، پرندے اپنی زندگی کے مالک بننے کی اہلیت کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی ہے تو ایک نہ ایک غم لگا رہے گا۔ ایک نہ ایک ظلم، ایک نہ ایک ناانصافی، زندگی سپیرے کی بین نہیں ہے نہ جادوگر کا تھیلا۔ زندگی ایک سڑک ہے جس پر پیدل چلنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ گورو مہاراج نے کہا ہے۔ زندگی کا مطلب ہے چلنے کا نام گاڑی۔ اور گورو مہاراج کا یہ بھی تو کہنا ہے ——— سوا لکھ لاگ کریں سب پریتی۔ انسان نے کوئی چیز گم کر دی ہے وہ چیز ہے انسانیت۔ گورو مہاراج کا کہنا ہے کہ انسانیت بہت زیادہ دیر گم نہیں رہ سکتی۔ انسان صداقت کو ڈھونڈ رہا ہے، انصاف کو آواز دے رہا ہے۔ صداقت کسی دوسرے کی جیب کا سکہ نہیں ہے

انصاف کسی پہیلی کا نام نہیں ہے۔ صداقت کے بنا انسان سانس نہیں لے سکتا۔ انصاف کے بنا ظلم اور لوٹ کھسوٹ کی جڑ نہیں اُکھڑ سکتی ...... اور اُسے محسوس ہوا کہ گلّی کی ماں معمولی عورت نہیں ہے۔ جیسے گٹاری کے برس بھر پہلے کے درد و غم کا تصوّر آج بھی غمگین بنائے ہوئے ہے۔

ایک ایک کر کے تین دن گذر گئے۔ گلّی کے پتا جی ہر روز صبح کی چائے پر بدھ سنگھ کو یاد دلاتے کہ زینہ لگا کر گٹاری کے گھونسلے پر جھانک کر دیکھے کہ انڈوں سے بچے نکل آئے یا نہیں۔

"جی صاحب! میرا حساب غلط نہیں ہو سکتا ہے۔ گورو مہاراج کا پکّا ناپ ہے۔" بدھ سنگھ جواب دیتا۔ "بھگوان نے چاہا تو پانچویں دن گٹاری کے انڈوں سے بچے باہر آ جائیں گے۔ اور پھر دس روز کی کوئی شرط نہیں دو تین دن بعد بھی گٹاری کے بچوں سے گلّی کی دوستی کرائی جا سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے" گلّی کے پتا جی کہہ اُٹھتے۔

گلّی کی ماں خاموش رہتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بھابو جی سے تائید چاہتے ہوئے کہتی: "میں کہتی ہوں کہ یہ خیال چھوڑ دیا جائے ایسی کیا مصیبت پڑی ہے کہ اتنی اونچائی سے گٹاری کے بچے نکال کر گلّی کو دکھائے جائیں۔ تھوڑا وقت بیتنے پر گٹاری کے بچے خود بخود اُڑ کر چائے کی میز کے قریب پھُدکتے نظر آئیں گے۔"

"اب یوں روڈا مت اُکتاؤ ڈارلنگ!" گلّی کے پتا جی نے گردن گھماتے ہوئے کہا۔ "بدھ سنگھ گٹاری کے انڈوں سے بچے نکلنے کے بعد اُن کا پورا خیال رکھا کرے گا۔ اپنے کام کے ساتھ وہ یہ کام بھی کرے گا۔ آخر گٹاری نے ہمارے گھر میں گھونسلا بنایا ہے تو ہم اُسے غیر نہیں سمجھتے۔ اُس میں بھی وہی زندگی پر تولتی ہے جو ہمارے اندر سانس لیتی ہے۔ کیوں یہ کچھ جھوٹ ہے؟"

پانچواں اور چھٹا دن بھی گذر گیا۔ یعنی بیس اور پانچ پچیسواں اور چھ اور بیس چھبیسواں دن۔ ابھی تک گٹاری کے انڈے اُسی طرح پڑے تھے۔ ستائیسویں دن بدھ سنگھ نے کسی قدر شرمندہ ہو کر کہا: "گورو مہاراج کا کہنا جھوٹ تو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن انسان کا حساب غلط بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن گورو مہاراج کی لاج رہ جائے گی اگر آج گٹاری کے انڈوں سے بچے نکل آئیں۔"

گلّی کی ماں کالج چلی گئی۔ گلّی کے پتا جی کسی ملاقاتی سے گفتگو کر رہے تھے۔ بدھ سنگھ دوڑا دوڑا آیا۔ اس کے ہاتھ میں لٹھ تھا۔ بولا "جی صاحب! ابھی ابھی سانپ ادھر سے نکل کر گیا ہے۔"

گٹاری کا جوڑا رسوئی کے بغل والے پیڑ پر بیٹھا چیخ و پکار کر رہا تھا۔ "ان پرندوں پر کیا مصیبت آگئی؟" ملاقاتی نے جھنجھلا کر کہا "یہ کیسا نغمہ ہے؟ کتنے رومانٹک ہیں وہ لوگ جو پرندوں کی بولی میں نغمگی کی تھپکی ڈھونڈا کرتے ہیں۔"

"یوں شاعروں پر نشتر زنی تو نہ کیجئے" گلّی کے پتا جی ہنس کر بولے۔ "زندگی کا نغمہ خالی ایک سُر سے نہیں بنتا۔ غم دائم بھی زندگی کی راگ داری کے واضح اور ضروری سُروں کو ترتیب دیتے ہیں۔ کچھ سُر مسرت آگیں ہوتے ہیں تو کچھ غم انگیز۔ کچھ سُر جانی پہچانی آواز کی داغ بیل ڈالتے ہیں تو کچھ سُر اجنبی کی طرح دروازے پر دستک دیتے ہیں، مستقبل کے چہرے سے نقاب اُٹھنے والے سُر ہمیشہ دوستانہ ہمدردی لیے رہتے ہیں صبر و استقلال کے سُر۔ زندگی کے بارے میں فرمائش پوری کرنے والے سُر۔ قنوطیت پر طنز کسنے والے سُر ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنگیت کی ابتدا پرندوں کی بولیوں کی نقل اتارنے کی جستجو سے ہوئی، آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس کے بارے میں تو دو رائیں نہیں ہو سکتیں،" ملاقاتی نے ہنس کر کہا۔

گٹاریوں کا جوڑا چلا رہا تھا۔ جیسے اُن پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ بدھ سنگھ پرے سے لٹھ اٹھائے آیا۔ بولا: "گٹاریوں کا بدلا میں نے لے لیا۔ آخر گورو مہاراج کے آشیرباد سے میں نے سانپ کی سری توڑ ڈالی ہے۔ گورو مہاراج کا کہنا ہے کہ جب سانپ سو برس جاگتا ہے وہ کہتا ہے کہ ہے بھگوان مجھے ایسے انسان کی شکل دکھا جو مجھ پہ ہاتھ اٹھائے تو میری سری ضرور توڑ ڈالے تاکہ مجھے زخمی ہو کر ادھر اُدھر نہ بھٹکنا پڑے۔ سری ٹوٹنے سے مرنے پر سانپ دوسرے جنم میں انسان بنتا ہے۔"

"اسی لیے شاید کچھ انسان سانپوں کے بھائی ہوتے ہیں،" ملاقاتی نے طنز کی۔

"یہ سانپ گٹاریوں کے گھونسلے میں گھس کر اُن کے انڈے کھا گیا،" بدھ سنگھ بولا۔ "گٹاریاں چلاتی رہ گئیں، پر چلیے وہ بھی نہ بچ سکا۔"

گگی کی ماں کالج سے آئی تو گٹاریوں کی بے بسی کی کہانی سن کر افسوس سے ہاتھ ملتی رہ گئی۔ گٹاریوں کے دو انڈے پچھلے سال لڑکیوں کے کالج میں انگریزی کے پیریڈ میں روشن دان سے گر کر ٹوٹ گئے تھے، دو انڈے یہ تھے جنہیں آج سانپ کھا گیا تھا۔ "ہمارے گورو مہاراج کا کہنا ہے کہ گٹاری پہلے عورت ہوتی تھی،" بدھ سنگھ نے اپنے مخصوص انداز میں کہنا شروع کیا۔ "گٹاری کی مصیبت اب بھی کچھ کم نہیں۔ وہ لاکھ گردن بلند کرے۔ لاکھ چہکنے کا جتن کرے، زندگی کا غم اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس پہ بھی گٹاری انڈے دینے سے باز نہیں آتی۔"

زینو

ابوسعید قریشی

اس کا جھونپڑا وادی کے دہانے پر واقع تھا، جہاں وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو دیکھا بھی نہیں تھا، صرف اس کی باتیں سُنی تھیں۔ رات کو جب وادی دودھیا دھندلکوں میں چھپ جاتی تو اس کا باپ حقہ سلگا کر بیٹھ جاتا اور چراغ کی لو پر نظریں گاڑے آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ اس کی دھوئیں میں لپٹی باتیں سن کر احساس ہوتا کہ شاید اس کا حقہ باتیں کر رہا ہے۔

”تیری ماں وادی کی سب سے حسین دوشیزہ تھی۔ بالکل تجھ جیسی۔ میں اسے یہیں بیاہ کر لایا تھا، اسی جھونپڑے میں۔ شہد کی مکھیاں اسے کبھی ڈنک نہیں مارتی تھیں۔ بالکل تیری طرح۔ اور اس کے ہاتھوں میں بھی ایسی ہی برکت تھی۔ تیری اس گوری گائے کی ماں جو گوالوں کو پاس نہیں پھٹکنے دیا کرتی تھی، بکری ہی تو بن جاتی تھی۔ پتہ نہیں کیا گنگناتی تھی اس کے کان میں۔ جب چاہو دوہ لو ——— مرغیاں تھیں تو وہ جیسے کڑک بیٹھنا ہی نہیں آتا۔ ٹوکری بھری رہتی تھی انڈوں سے، اور جتنے انڈے بٹھاؤ اتنے ہی چوزے نکلتے تھے ——— تیری چنبیاں بھی تو ویسی ہی ہیں ——— اور انگور، سیب، اخروٹ، خوبانی کا تو یہ حال تھا کہ منڈی میں بیچ کر بھی بانٹنے کو بچ رہتا تھا . . . وہ جب کشیدہ لے کر بیٹھتی تھی تو تتلیاں بھول پڑتی تھیں کہ سچ مچ کے پھول ہیں ——— تیرے ہاتھوں میں بھی وہی بات ہے ——— مگر سوچتا ہوں کہ جب ان ہاتھوں میں مہندی لگے گی، بیاہ ہوگا تیرا اور تو چلی جائے گی کسی اور کے گھر، جس طرح تیری ماں اس گھر میں آئی تھی، تو تیرے باپ کا کیا بنے گا؟“

”میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی ابّا!“

”تو نہیں جانتی پگلی کہ ایک کا گھر سُونا ہو کر ہی دوسرے کا گھر آباد ہوتا ہے، اور تیرے بیاہ کی تیاریاں تو تیری ماں نے تیرے پیدا ہونے سے پہلے ہی شروع کر دی تھیں ——— مجھے تو لڑکی چاہیے ——— سات لڑکیاں چاہییں ——— تین سُسرال میں ہوں تو چار میکے میں ——— وہ اِدھر آئیں تو یہ اُدھر چلی جائیں اور ان کے بچے دن بھر گھر میں کھیلتے شور مچاتے پھریں۔“

”مجھ کو بھی ایک مُنّا لا دو گے ابّا؟“ زینو اپنے باپ کی بات کاٹتی۔ ”بڈھے چناروں کے جھنڈ تلے جہانیاں کے مُنّے جیسا! رونا تو آتا ہی نہیں اس کو اتنا پیارا ہے کہ بس۔“ اور وہ اپنے باپ کی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگتی ”لا دو گے

نا، بابا؟ ———

"منا لادوں تجھے ہے ——— جبھی تو کہتا ہوں کہ کاش تیری چھ بہنیں اور ہوتیں، یا پھر بھائی ہوتے ——— تو تو بس پگلی ہو گئی ہے لڑکی۔ اتنی بڑی ہو گئی پر عقل نہ آئی۔ اب میں کیسے سمجھاؤں تجھے۔ کاش تیری ماں . . . . . ."

ایسے میں کہیں دور سے چنگ کی آواز آتی یا چکور کا نغمہ گونجتا۔ شاہ بلوط کی شاخوں میں ٹڈا اپنی سارنگی بجانے لگتا اور زینو بھول جاتی کہ ابھی ابھی اس نے اپنے باپ سے کیا فرمائش کی تھی۔ وہ چپکے سے اٹھتی اور دروازہ کھول کر رات کے منظر کا جزو بن جاتی۔ دودھیا چاندنی میں چکوروں کے پراسرار سے خوابوں کا پیرہن پہن لیتے۔ اُدھر کہیں دیوار کے پردوں کے پیچھے سے چنگ کی چھن چھن اُن دیکھے ناچوں کی گت بن جاتی ——— پن چکی کی گھمر گھمر، آبشار کا شور، زعفران کے کھیتوں کی مہک اور سبزے کے پُراسرار اندھیرے میں جگنوؤں کی جگمگاہٹ جیسے جہانیاں کا منا آنکھیں جھپکاتا تھا ——— زینو اس تصویر کو بُت بنے دیکھتی۔ یہاں تک کہ چیڑوں کے پتوں میں ہوا گنگنانے لگتی اور زینو کے بالوں کی لٹیں اس کے گالوں پر لہرانے لگتیں۔

"پگلی ہو گئی ہے یہ لڑکی" اس کا باپ حقے کا لمبا کش لگاتے ہوئے اسے آواز دیتا "بند کر جھلی اب دروازہ، ورنہ ہوا لگ جائے گی، اور تو تو اب اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ میں تیری تیمارداری بھی نہیں کر سکتا۔"

زینو اپنی کالی کالی التجا بھری آنکھوں سے جو نیند کے باعث اور بھی کالی نظر آتی تھیں، اپنے باپ کی طرف دیکھتی، جیسے کہہ رہی ہے کہ مجھے یہاں سے نہ ہٹاؤ۔

"بالکل اپنی ماں پر ——— " بڈھے کا سر اپنے بار بار دوہرائے ہوئے جملے کی پھر تائید کرتا۔ "رات بہت بیت گئی زینو۔ اب سو جا بیٹی!"

زینو کے ہونٹوں پر وہی پُراسرار مسکراہٹ ظاہر ہوتی جو اس کی ماں کے ہونٹوں پر نظر آیا کرتی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ چاند یہ چکور، یہ چنگ اور چیڑوں کا نغمہ نیند میں مجھے کہاں ملے گا؟ ——— مگر اس کا باپ چپکے سے اٹھتا اور اسے شانوں سے پکڑ کر بستر پر لٹا دیتا۔ اس کی پیشانی کو اپنے ہونٹوں سے چھوتا اور اسے لحاف اوڑھاتے ہوئے دل ہی دل میں کہتا۔ کاش آج اس کی ماں زندہ ہوتی۔

وہ جانتا تھا کہ زینو حسین ہے۔ وہ ابھی انگوٹھا ہی چوستی تھی جب اس کے لئے پیغام آنے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن اس نے ہر سوالی کو یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا . . . کتنے ہی آئے اور کتنے ہی یہ جواب لے کر چلے گئے۔ چنانچہ زینو جھرنے کے جنگلوں میں ہوا کی طرح آزاد، کوہ سیمیں کی کنواری چوٹی کی طرح ناقابلِ رسا تھی، جس تک پہنچنے کی آرزو میں کتنے جوگی، کتنے گڈریے آہیں بھر کر رہ گئے تھے ——— سفیدے کے ستونوں، چناروں کے چھاتوں، قوسِ قزح کی قناتوں، جھیلوں، آبشاروں، چشموں اور ندی نالوں کی طرح وہ بھی وادی کی تصویر کا ایک ضروری جزو تھی ——

مگر ایک روز کلیوں، پھولوں، بھنوروں اور تتلیوں کے موسم میں جب وادی سرکتے ہوئے ساز کی طرح اپنا ازلی نغمہ الاپ رہی تھی یکایک یوں محسوس ہوا جیسے تار کھینچ گئے ہوں اور ان پردیسی نے الٹا سر بڑھا کر چھیڑنا شروع کر دیا ہو۔ زینو اس روز پہاڑ کے دامن میں خودرو گلاب کے گجرے گوندھ رہی تھی اس آواز سے وہ چونک پڑی۔ کوئی بھنگا تو نہیں گھس گیا تھا؟ ——— نہیں، یہ پن چکی نہیں

تھی، پتھروں پر پریوں کے آبشار کا شور بھی نہیں تھا! دہی کے مٹکوں میں بلونی کی آواز بھی نہیں تھی! چرخے کی گھوکر بھی نہیں تھی . . . .

اس نے اُفق پر نگاہ دوڑائی اور دُور آسمان پر سیاہی کا دھبہ نظر آیا۔ سیاہی کا یہ ہتھیلی برابر نشان قریب آتا اور پھیلتا گیا۔

اس کے ساتھ ہی وہ خوفناک آواز بڑھتی گئی۔ پہاڑوں کے پتھر لرزنے لگے۔ زینو خوف سے بُت بنی دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا بلا ہے؟ ایک مرتبہ اسے ٹڈی دل دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اتنی بڑی بڑی ٹڈیاں جن کے پَر اس کے جھونپڑے کی چھت سے بھی بڑے تھے، وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ نہیں یہ ٹڈیاں نہیں ہوسکتی تھیں! ایک بڈھے سیاح نے جو وادی سے گزرتے وقت ان کے یہاں ٹھہرا تھا، حبشیوں کے وطن کا حال سُناتے وقت بتایا تھا کہ وہاں اتنے بڑے بڑے گِدھ ہوتے ہیں کہ غزالوں کو اپنے پنجوں میں اُٹھا کر لے جاتے ہیں ——— اس تصور سے وہ سہم گئی اور سُورج مکھی کے پودوں میں ایک پتھر سے چمٹ گئی ——— اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بچپن میں جب وہ کوئی خوفناک کہانی سنتی تھی تو لحاف سے مُنہ ڈھانپ کر اپنے باپ سے لپٹ جایا کرتی تھی اور اس کا خوف دُور ہوجاتا تھا۔

" زینو!" گِدوں کے شور کو چیرتی ہوئی اسے اپنے باپ کی آواز سُنائی دی۔ "تم کہاں ہو زینو؟"

لیکن زینو کی آواز حلق ہی میں سوکھ گئی۔ اس نے اُٹھ کر بھاگ جانا چاہا مگر سُورج مکھی کی کیاریوں میں جہاں وہ چھپی ہوئی تھی گِدوں کے پَروں کے سائے تیر رہے تھے ——— پتھر کے گرد اس کی باہوں کا حلقہ اور تنگ ہوگیا۔

اپنی آواز کا جواب نہ پاکر زینو کے باپ نے اپنی بیٹی کی ہرنی کے بچے کو جسے پھولوں کی کیاریوں کو بچانے کے لئے کبھی کبھی باندھ دیا جاتا تھا، کھول دیا۔ آہو بھاگا اور اس کے گھنگھروؤں کی آواز پر زینو کا باپ سُورج مکھی کے جھنڈ میں پہنچ گیا۔

" زینو ——— زینو بیٹی! یہ تیری باہوں کو کیا ہوگیا ہے؟ ——— ڈر گئی پگلی ——— اُٹھ، وہ چلے گئے۔"

گِدھ اب وادی کی دوسری جانب پرواز کر رہے تھے۔ سیٹیاں بجاتے، غوطے لگاتے جیسے شکار کا جائزہ لے رہے ہوں۔

"مجھے ڈر لگتا ہے ابا کہ یہ گِدھ مجھے اُٹھا کر لے جائیں گے۔" زینو کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

" ڈر مت میری بیٹی۔ کوئی ہوا انھیں اِدھر لے آئی ہے۔ اس سے پہلے یہی ہوا ٹڈی دل کو لائی تھی اور ہم نے ٹڈیوں کو مار بھگایا تھا۔ ٹڈیاں تیرے دادا کے کھیت میں آتری تھیں مگر اس نے اپنے کھیتوں میں آگ لگا کر دوسرے کھیتوں کو بچا لیا تھا۔"

ابا نے اپنا قصہ ابھی مکمل نہیں کیا تھا کہ کھڈوں، غاروں، وادیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے ایک اور قسم کا شور ہوا۔ چاروں طرف سے کسان اور گڈریے ڈھول پیٹتے، شور مچاتے اس جانب بڑھے جہاں گِدھ منڈلا رہے تھے۔

" دیکھا تو نے؟" زینو کے باپ نے کہا۔ "اس وادی کے لوگ تیرے دادا کا احسان نہیں بھول سکتے۔ تیرے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، کبھی تالا نہیں ڈالا تو نے۔ لیکن ہمارا کبھی ایک تنکا بھی کم ہوا؟"

زینو نے سر ہلایا کہ نہیں۔ لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولی۔ وہ اب تک سہمی ہوئی تھی۔

" تیرے باغ سے سیب کا ایک دانہ یا انگور کا ایک خوشہ بھی کسی نے توڑا؟"

" نہیں!" زینو کے ہونٹ آہستہ سے ہلے۔

" تیری غزالہ، تیری مرغیاں اور بطخیں . . . . دن بھر اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہیں، کبھی کسی کا کُتا بھی ان پر بھونکا؟"

"کبھی نہیں!" زیبو نے جواب دیا۔

"یا پھر تو جو اندھیرے سویرے جنگلوں میں یا چشموں کے کنارے گھومتی رہتی ہے، کبھی کسی نے تجھے اکیلا پا کر جھوٹ موٹ ہی سے ڈرایا ہو؟؟؟"

"قطعاً نہیں۔" زیبو نے کہا۔

"یہ سب تیرے دادا کی بدولت ہے۔ یہاں کے لوگوں پر اس کے اَن گنت احسان ہیں، اور تو دیکھے گی کہ یہ ان گِدوں کو اسی طرح اڑا دیں گے جس طرح تیرے دادا کے وقت میں ٹڈی دل کی سرخ آندھی یہاں سے اُڑ گئی تھی ——"

"اور میرے بچپن کی بات ہے جب برف کا طوفان آیا تھا اور ہماری جھیل تک جم گئی تھی۔ ہم برف پگھلا کر پانی پیتے تھے۔ طوفان تھما تو پہاڑوں سے ریچھوں کی یلغار ہوئی۔ سفید بھورے برفانی ریچھوں کو جب پہاڑوں پر کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا تو وادی پر ٹوٹ پڑے تھے اور پھر وہ جنگ شروع ہوئی تھی جس کی یاد سے میرا جسم آج بھی کانپ جاتا ہے۔ آدمیوں اور درندوں کی چیخوں سے پرندے اپنے آشیانوں کو چھوڑ کر دیوانہ وار اُڑ رہے تھے اور چٹانوں سے اپنا سر پھوڑ رہے تھے۔ تیرے دادا نے ریچھوں کے راستے میں جگہ جگہ الاؤ روشن کروا دیے تھے اور ہاتھوں میں مشعلیں، لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لئے لوگ دست بدست ریچھوں سے لڑ رہے تھے —— اتنے میں ایک عورت کی چیخ بلند ہوئی۔ ایک ریچھ کہیں پیچھے سے ہوتا ہوا ایک جھونپڑے میں، گھس آیا تھا جو اس درخت سے صرف چند ہی قدم کے فاصلے پر واقع تھا جس کی شاخوں میں چھپا ہوا میں یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا جیسے اگلے وقتوں کے بادشاہ جھروکوں میں بیٹھے آدمیوں اور درندوں کو آپس میں لڑا دیا کرتے تھے ——"

"مگر اس ریچھ کا کیا ہوا ابا؟" زیبو نے اپنے باپ کی بات کاٹی۔ اسے معلوم تھا اگر بادشاہوں کا قصہ چھڑ گیا تو ریچھ کی کہانی ادھوری رہ جائے گی۔

"ہاں تو وہ ریچھ جھونپڑے میں گھس گیا اور ایک عورت کو لے بھاگا —— بڑا موذی جانور ہے یہ ریچھ۔"

"موذی کیا ہوتا ہے ابا؟" زیبو نے پوچھا۔

"تلوے چاٹ لیتا ہے عورتوں کے —— میرا مطلب ہے۔ اب میں تجھے کیسے بتاؤں بیٹی۔ بہت بے شرم ہوتا ہے یوں سمجھ لو۔ آدمی کی طرح۔ پر میں کیسے بتاؤں تجھے! کاش تیری ماں زندہ ہوتی اس وقت۔" اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ زیبو جانتی تھی کہ جب وہ اس طرح سانس لیتا ہے تو بعض اوقات ایسی چپ سادھتا ہے کہ پہروں بیت جاتے ہیں۔ مگر یہاں ریچھ کی کہانی ادھوری رہی جا رہی تھی۔

"تو ریچھ اس عورت کو اُٹھا کر لے گیا، اور اس کے بعد کیا ہوا ابا؟"

"ہاں —— مرجینا نام تھا اس کا۔ اس کی چیخ مجھے اپنے گرد کمند کی طرح لپٹتی ہوئی محسوس ہوئی، اور اگر میں نے درخت کی شاخوں کو نہ تھام لیا ہوتا تو زمین پر آ رہتا۔ خیر، مرجینا کی چیخ سن کر ایک آدمی، جس کے ایک ہاتھ میں مشعل تھی اور دوسرے میں درانتی، اُڑتے ہوئے انگارے کی طرح لپکا اور اپنی درانتی ریچھ کے پیٹ میں گھونپ دی —— یہ شخص تیرا دادا تھا بیٹی —— زخمی ریچھ مرجینا کو چھوڑ کر تیرے دادا پر جھپٹا —— تیرے دادا کو ورزش کا بہت شوق تھا اور یہ اس کی جوانی کا زمانہ تھا۔ بڑے

بڑے تیراکوں کا ہماری جھیل کے آدھ ہی میں سانس ٹوٹ جاتا تھا لیکن تیرے دادا نے اسے کئی بار پار کیا ہوگا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ اس پر ضرور خواجہ خضر کا سایہ ہے ورنہ یہ جھیل تو ایک سانس میں نہنگ سے بھی پار نہیں ہو سکتی ——"

"تو یہ ریچھ نے مرجینا کو چھوڑ دیا اور دادا ابا پر جھپٹا" زینو نے کہا۔

"ہاں تو تیرا دادا جانتا تھا کہ زخمی ریچھ سے بچنا محال ہوتا ہے اور جب آدمی زندگی اور موت کا فرق مٹا دے تو بعض اوقات موت ہی زندگی بن جاتی ہے۔ اس نے ریچھ کو بانہوں میں لپیٹ کر بھینچنا جو شروع کیا تو درندے کی آنکھیں ابل پڑیں، منہ کھل گیا، بازو ڈھیلے پڑ گئے، حتیٰ کہ وہ بے جان ہو کر گر پڑا۔ بعد میں وہ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ جنگ میں پہلا وار ہی آخری وار ہوتا ہے۔ اگر میں اس وقت سوچتا رہ جاتا تو میرا وہی حشر ہوتا جو ریچھ کا ہوا تھا"

دفعتاً گِدوں کا ایک اور غول سیٹیاں بجاتا ہوا گزرا۔

"اور یہ نحس پرندے!" زینو کے باپ نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا "میرا گوپیا زینو . . . . میرا گوپیا!"

لیکن زینو جس کا خوف پھر عود کر آیا تھا، اپنے باپ کے گرد عشق پیچاں کی بیل کی طرح لپٹ گئی —— اس کا دل اس کبوتری کی طرح دھک دھک کر رہا تھا جس کے سر پر باز منڈلا رہا ہو۔

"ادھر ہٹ کر کھڑی ہو جا بیٹی! یہ غلیظ پرندے شاید یہ نہیں جانتے کہ میں اپنی جوانی میں جنگلی سوروں کے سر کچل چکا ہوں"

اور وہ پتھر اٹھا اٹھا کر دیوانہ وار ہوا میں پھینکنے لگا لیکن گِد بدستور سیٹیاں بجاتے گزرتے چلے گئے اور بوڑھے کے پتھر اس کے گرد یوں گرتے رہے جیسے سردیوں میں اولے۔

"جانے دو ابا! تم تھک جاؤ گے! یہ موذی بہت اونچے اڑ رہے ہیں" زینو نے اپنے باپ کا ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا!" بڈھے نے ہانپتے ہوئے جواب دیا "شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں ورنہ —— ورنہ —— لیکن میں اِن اِن اِلی ٹڈیوں سے ہار نہیں مان سکتا۔ آدمی تو جنات سے لڑ جاتا ہے"

اس کے منہ سے جنات کا لفظ نکلا ہی تھا کہ ایک بگولا بلند ہوا اور سارے علاقہ میں پھیل گیا۔ غبار کم ہوا تو زینو اور اس کا باپ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے ایک دیو کھڑا ہے۔ دیو نے زینو کے باپ کو جھک کر سلام کیا اور اس کی جانب گیندے کا ہار پھینکتے ہوئے بولا:

"تمھیں مبارک ہو بڑے میاں! تمھاری بیٹی کا نصیبہ جاگ اٹھا"

زینو کے باپ نے گیندے کے ہار کو، جو کمند کی طرح سیدھا اس کی گردن میں آ کے گرا تھا، توڑ کر جن کے منہ پر دے مارا۔ "لے جاؤ اپنے یہ مرگی[1] کے پھول، اور میری زعفران کی کیاریوں سے اس طرف ہو کر بات کرو۔ تمھارے سانس کے تعفن سے ان کی خوشبو جاتی رہے گی"

---

[1] بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ گیندے کے پھولوں سے مرگی ہو جاتی ہے۔ (مصنف)

دیو کی ایک آنکھ جو اس کے ماتھے کے درمیان تھی، سلگنے لگی۔ اس کے بال ساہی کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور دانت غرّانے کے انداز میں نمودار ہوئے۔ لیکن وہ اپنا غصّہ پی گیا اور اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا:

"تیری بیٹی کا نصیبہ جاگ اُٹھا ہے بڑے میاں۔ ہمارے بادشاہ نے اسے اپنے حرم کے لئے منتخب فرمایا ہے۔"

"میں نہ کہتا تھا بیٹی کہ تو جو ہر وقت پھولوں کے گہنے گجرے پہنے پھرتی ہے اور اندھیرے سویرے چشموں کے کنارے گھومتی ہے اچھا نہیں۔ پر تیری ماں ہوتی تو سمجھاتی نا تجھے اس کا مطلب کہ کنواری بچیوں کو خوشبو سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔" زینو کے باپ نے اپنی بیٹی کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا۔ "اور سب سے بڑا ظلم تو نے یہ کیا کہ وہ تعویذ اتار دیا جو تیری ماں نے تیرے بازو سے باندھا تھا۔ لیکن رو نہیں بیٹی۔ میرے جیتے جی . . . . . ."

وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ آسمان سے نوبت و ناقوس کی آواز آئی ——— شہِ جنّات کا پیامی منہ کے بل گر پڑا اور ایک تخت زمین پر اُترا۔

"ہم میں اتنی تاب نہیں تھی بڑے میاں کہ ہم تمھارے جواب کا انتظار کرتے اس لئے ہم خود چلے آئے۔"

"تم!" زینو کے باپ نے کہا

"ہاں! تمھاری بیٹی کے حسن کا شہرہ ہم نے اپنے دربار میں سُنا تھا اور ایک روز جب تم لوگ اپنا غلّہ تقسیم کر رہے تھے، ہمارا بھی ادھر سے گذر ہوا اور ہم نے دیکھا کہ نیلم ندی کے پانیوں میں ایک سفید شعلہ تیر رہا ہے ——— تیری بیٹی کا جسم بھی چاندی ———"

"چُپ ہو جا بے غیرت عفریت!" زینو کا باپ غصّے سے کانپ اُٹھا۔

"اپنی بیٹی کی تعریف بھی نہیں سُن سکتے بڑے میاں ——— بہت پیار ہے تمھیں اس سے! تمھیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ وہ شہِ جنّات کے پہلو میں بیٹھے گی اور دُنیا کی کوئی نعمت اس کے لئے ناقابلِ رسا نہیں ہو گی۔"

"لیکن وہ تمھارے لئے ضرور ناقابلِ رسا ہے۔" زینو کے باپ نے کہا۔ "تم ناری ہو۔"

"تم نے اپنے اطبّاء سے نہیں سُنا کہ تم میں بھی آگ موجود ہے ——— تم اگر ٹھنڈے ہو جاؤ تو مر جاؤ۔"

"کل تو تم یہ کہو گے کہ نور اور نار دونوں میں روشنی ہے اس لئے ہم نوری ہیں۔"

"تمھیں منطق میں ضرور یدِطولیٰ حاصل ہے بڑے میاں۔ لیکن شاید تم طاقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ——— سو دلائل کی ایک دلیل۔"

"مگر طاقت سے تم روح کو زیر نہیں کر سکتے، اور جسم بغیر روح کے بالکل ویسا ہی ہے جیسے ——— جیسے ———" اس نے رُکتے ہوئے مناسب تشبیہہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ "جیسے یہ وادی بغیر ہمارے ——— سو تیری طاقت کی مجھے اتنی بھی پروا نہیں جتنی اس پتھر کی ——— لیکن تیری بدتمیزی، جسارت اور دھمکی کے باوجود میں تیری درخواست پر غور کرنے کو تیار ہوں، مگر ایک شرط ہے۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔" جن نے جواب دیا۔

”لوحِ سلیمانی کی قسم کھا!“

”کھائی ——— مگر اب مزید انتظار نہ کرا۔ آتشِ شوق نے مجھے پہلے ہی دیوانہ کر رکھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمھیں بھسم کر دوں۔“

”تو سُن ——— میرے خاندان کی روایت ہے کہ ہمارے یہاں کوئی لڑکی بغیر اپنی رضامندی کے شادی نہیں کرتی۔“

”خوب! تو کیا میں تیری بیٹی سے پوچھ سکتا ہوں کہ کیا وہ ملکۂ جنات بننا منظور کرے گی؟ ——— اے حسینہ! تیری ایک ہاں پر دنیا کی نعمتیں تیرے قدموں پر ہوں گی۔“ اور اس نے موتیوں کی ست لڑی مالا اتار کر زبنو کے قدموں میں پھینک دی۔ ”کوہ قاف کی جھیلوں کا یہ تحفہ تیرے پاؤں کی دھول ہو سکتا ہے۔“

”کیا یہ موتی میری جھیل میں کنول کے پتوں پر اوس کے قطروں سے زیادہ حسین ہیں؟“ زبنو نے موتیوں کی مالا کی طرف بے اعتنائی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”او جاہل لڑکی! یہ ان سیپیوں کی سوغات ہے جنھیں قاف کی کنواری پریاں، برکھا کی پہلی بوندوں کی تلاش میں صدیوں اپنی جھولیوں میں لئے پھرتی ہیں۔“

”مجھے تیرا ہار نہیں چاہیئے۔“ زبنو نے کہا۔ ”کیا تو نے اپنے تاج کے پیچھے اپنا سینگ نہیں دیکھا؟“

عفریت کا ہاتھ بے ساختہ اپنے سر کی طرف گیا۔ وادی کے لوگوں نے جو گدڑوں کو مارنے کے لئے اپنے گھروں سے آئے تھے اور زبنو کے جھونپڑے کے گرد جمع ہو گئے تھے، ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ شہ جنات نے چیخ ماری اور اس کے خدام ”پناہ! پناہ!“ پکارتے ہوئے اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔

”کیا تجھے کچھ اور بھی پوچھنا ہے؟“ زبنو کے باپ نے دریافت کیا۔ ”میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا تیرا ہم سے ملاپ نہیں ہو سکتا۔“

”چپ ہو جا بڈھے!“ عفریت گرجا۔ ”تجھے اور تیری گستاخ بیٹی، دونوں کو اس بدتمیزی اور ناشکری کی سزا دی جائے گی۔“

”تو قسم کھا چکا ہے ——— سلیمان کے عذاب سے ڈر!“

”اسے شطرنج ہی سے فرصت نہیں کہ ان باتوں کی طرف دھیان دے سکے۔ اس کا مجھے کوئی کھٹکا نہیں۔“

”تو اپنے ضمیر سے بھی نہیں ڈرتا؟“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اس قدر توہم پرست واقع ہوا ہے۔“

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو اس قدر مکار اور وعدہ شکن ہے تو میں ان فضول باتوں میں کبھی اپنا وقت ضائع نہ کرتا۔“

”تمہاری زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی۔“

”تجھ پر انگشتِ سلیمانی کا قہر ٹوٹے گا۔“

”اس کا طلسم اپنی طاقت کھو چکا ہے۔“

"تو پھر میں تیرا مقابلہ کروں گا۔" زینو کے باپ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔

"مگر ان جنات کو نہیں دیکھا تو نے ۔۔۔۔ یہ دیو، یہ گِدھ، یہ بھتنے ۔۔ یہ سب میرے غلام ہیں۔" عفریت نے کہا۔

"اور ان کو بھی دیکھ لو۔" زینو کے باپ نے وادی کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرے بھائی ہیں، اور ان پہاڑوں کے اُدھر میرے اور بھی بھائی ہیں ۔۔۔ تیرا مقابلہ کیا جائے گا۔"

عفریت چنگھاڑا اور زینو کی طرف بڑھا۔

اور پھر آدمیوں اور عفریتوں کے درمیان وہ جنگ شروع ہوئی جس کا شور سن کر آس پڑوس کی وادیوں سے زینو کے باپ کے دوسرے بھائی بھی اپنی آبائی تلواریں لے کر آ پہنچے جو ایک مدت سے ان کے صندوقوں میں بند تھیں۔

لوگ لاٹھیاں، کلہاڑے، درانتیاں، چپو اور پھاوڑے لے کر عفریتوں کے لشکر پر پل پڑے اور یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ شہِ جنات گھبرا گیا۔ گلہ بانوں، کسانوں اور ملاحوں نے اس کا تخت توڑ ڈالا۔ اس کے ساتھی دُم دبا کر بھاگ گئے اور وہ خود ایک گِدھ کی دُم سے لٹک کر بڑی مشکل سے جان بچا سکا۔

لیکن عفریت کے فرار ہونے کے کچھ ہی دیر بعد وادی کے دہانے کی طرف ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور پہاڑ پھٹ گیا اور آسمان کا ایک ایسا ٹکڑا آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا جسے وادی کے لوگوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

زمین لرزنے لگی اور جیسے اس کے پیٹ میں بادل لڑھک رہے تھے۔ بجلیاں کروٹیں لے رہی تھیں وادی کے نشیب و فراز سے ان کی گونج آتی۔ پیڑوں کی چڑیاں، جھونپڑوں کے کبوتر، چٹانوں کی ابابیلیں بے تابانہ ہوا میں اڑنے لگیں فضا میں شہد کی مکھیوں کے پر پھڑپھڑائے، جیسے ان کے چھتے پر کسی نے پتھر پھینک دیا تھا۔ بھیڑ بکریاں ممیائیں، زینو کی گائے بلبلا اٹھی۔ اس کی مرغیوں نے گویا بلا دیکھ لیا۔ جھیل کی جانب سے ڈری ہوئی مرغابیاں بغیر قطار کے اڑتی نظر آئیں۔ خرگوش اپنے بھٹ چھوڑ کر نکل آئے اور دیکھنے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، درختوں کی شاخوں میں گلہریاں چک چک پوچھنے لگیں کہ یہ کیسی گڑگڑاہٹ ہے جس نے ہمیں درختوں کے تنوں میں بھی آرام نہیں لینے دیا۔ تتلیوں کے پر ذرے بن کر پھولوں کے کٹوروں میں گر پڑے اور پھولوں کی پتیاں ایک ایک کر کے خاک میں مل گئیں۔ سیب، ناشپاتی اور شفتالو کی شاخوں سے کچے پھل آنسوؤں کی طرح ٹپ ٹپ گرنے لگے اور جھیل کے شفاف پانیوں کی سنہری مچھلیاں کناروں پر تڑپتی دکھائی دیں۔

"بھونچال!" زینو کے باپ نے کہا۔ لیکن پہاڑ کا وہ شگاف بند کیوں ہوا جا رہا تھا۔

"اژدہے!" کسی نے کہا۔

"چیتے!" کوئی پکارا۔

"چیتوں کی آنکھوں والے اژدہے!"

"اژدہوں کے جسم والے چیتے!"

"گینڈے!"

"گینڈے اور ہاتھی!"

"چار چار سونڈوں والے ہاتھی!"

"آگ نکلتی ہے سونڈوں سے!"

"سؤر!"

"لمبے لمبے دانتوں والے جنگلی سؤر!"

"طلسمات!"

"طلسمات!!"

"طلسمات!!!"

"ٹوٹ جائے گا یہ طلسم!" زینو کا باپ پکارا۔ "اپنی زمین کی مٹی اپنے ہاتھوں سے مل لو، مامون ہو جاؤ گے تم اس سحر سے۔ یہ فسوں تمھاری محبت کا امتحان ہے۔"

زینو کا باپ اور اس کے ساتھی نعرے لگاتے ایک بار پھر عساکرِ عدو پر ٹوٹ پڑے۔ اژدہے آگ اگلنے لگے، ان کے نتھنوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ سؤروں کے دانتوں سے چنگاریاں جھڑنے لگیں اور ان کے ہونٹوں سے لاوا بہہ نکلا۔ زینو کے باپ کے ساتھی کٹ رہے تھے، گر رہے تھے، مر رہے تھے۔ لیکن ان کا ہر قدم آگے ہی کو بڑھتا تھا۔ ان کی دلیرائی نے دیووں کی کمر دوہری کر دی اور جنات کی فوج پھر اسی شگاف کی طرف پسپا ہوتی نظر آئی جدھر سے وہ داخل ہوئی تھی۔ مگر عین ایسے میں جب کہ ان کی شکست یقینی ہو چکی تھی آسمان یکایک تاریک ہو گیا۔ سورج گِدوں کے پروں کے پیچھے چھپ گیا۔

"ابا!" زینو پکار اٹھی۔ "یہ گِدھ نہیں رُخ ہیں جنھوں نے سندباد کے جہاز کو پتھراؤ سے غرق کر دیا تھا۔"

رُخوں کے پرے وادی کے مختلف علاقوں پر پھیل گئے۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتے زمین سے شعلے بھڑک اٹھتے اور لوگ "آگ کے بیج! آگ کے بیج!" پکارتے ہوئے اپنے گھروں کی آگ بجھانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوتے۔ لیکن زینو کے باپ کے ساتھیوں میں پھر بھی ایسے لوگ موجود رہے جن کے سینوں میں زینو کے دادا کے احسانات سلگ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے جلتے ہوئے جھونپڑوں سے منہ موڑ لیا اور ناموس کے نعرے لگاتے ہوئے پھر عساکرِ ابلیسی کی طرف بڑھے۔

مگر اتنے میں رُخوں کے پرے یکایک کہیں غائب ہو گئے اور اس جانب سے جہاں پہاڑ پھٹا تھا، ساون کے بادلوں کی طرح کالی کوئلوں کا جھنڈ آتا دکھائی دیا۔ ان کی چونچوں میں کچھ چمک رہا تھا۔ جب وہ زینو کے باپ کے لشکر کے اوپر پہنچیں تو انھوں نے اپنی چونچیں کھول دیں اور لشکر پر اشرفیوں کی بارش ہونے لگی ـــــ لوگ اشرفیاں لوٹنے کے لئے لپکے اور آپس میں الجھ گئے۔

زینو اور اس کا باپ اکیلے رہ گئے اور جنات نے انھیں اپنے پنجوں میں جکڑ لیا۔

فضا میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔

"اب بتاؤ!" آسمان سے شہِ جنات کی آواز سنائی دی۔ "لیکن ہماری پیشکش بدستور موجود ہے۔ یہ لڑکی اگر اب بھی ہماری ہو جائے تو ہفت اقلیم کی ملکہ کہلائے گی۔"

"چپ ہو جا مردود!" زینو کے باپ کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ لیکن اس کے بازو جکڑے ہوئے تھے۔ اس کا بدن اپنی

جھیل کے کنارے بید مجنوں کی شاخوں کی طرح کانپنے لگا۔

"لیکن تو بڈھا ہو گیا ہے شاید، اور اپنی بُرائی بھلائی کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم تیری بیٹی سے بات کریں گے ——— کہاں ہے؟" شش جہات نے تالی بجائی۔ "وہ تاج کہاں ہے؟ ہماری ملکہ کا تاج ہے، جسے ہمارے دربار کی کنواری پریوں نے ہماری دلہن کے لئے تیار کیا ہے ——— دیکھ لڑکی! ادھر دیکھ!! اس ہیرے کو دیکھ، ملکۂ سبا کے تاج میں بھی ایسا نگینہ نہیں ملے گا تجھے ——— اور یہ نیلم دیکھ رہی ہے تو! ساتویں آسمان کی نیلاہٹ اس کے آگے ماند ہے اور یہ زمرد! روئے ارض کا سبزہ اس سے رنگ، آب و جلا مانگتا ہے۔ یہ لعل پریوں کا تحفہ ہے تیرے تاج کے لئے ——— اور تو نے کہانیوں میں لعلِ بدخشاں کا نام سنا ہوگا! ان لعلوں کی ایک ایک قاش دیکھنے کے لئے بدخشاں کے سوداگر اپنا ایمان نیلام کرتے ہیں۔ ان میں اس آگ کی سرخی بند ہے جسے تمہاری یہ بجلیاں کبھی بجھنے نہیں دیتیں۔ سنو! یہ سنگ پرست کافر اگر ان لعلوں کی آب کا حال معلوم ہو جائے تو اپنے گلے کا بت اتار کر اپنے تلووں میں ڈال دے ——— لیکن تیری ایک ہاں پر یہ تاج تیرا ہے۔"

"تیرا تاج میری آزادی کے غرور و تمکنت کے تاج سے برتر ہے؟ اور تیرے زیورات جن کا تو مجھے لالچ دے رہا ہے ان گجروں سے اچھے ہیں جو یاسمین کی شاخیں میرے لئے ہر روز گوندھتی ہیں؟" زینو نے پوچھا۔

"سن لیا تو نے؟" زینو کے باپ نے کہا۔ "اور اب کہ وہ آخری بار نہ کہہ چکی ہے اگر تیری آگ میں غیرت کی کوئی بجھی ہوئی چنگاری بھی موجود ہے تو تیرا راستہ وہ ہے جدھر سے تو آیا ہے ——— رہے ہم اور ہمارے جلے ہوئے جھونپڑے، کھیتوں، کھلیانوں میں ہمارے مردے، اور ہمارے باغوں میں جھلسے ہوئے پھول اور کلیاں ——— سو ہم سمجھیں گے کہ یہ ہماری شامتِ اعمال تھی ——— جا ——— اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔"

"جذباتی بڈھا!" عفریت نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"ملعون ناری!" زینو کا باپ بھڑک اٹھا۔ "تو ہمارے جذبات کو کیا سمجھ سکتا ہے ——— ہماری بیوائیں، ہمارے یتیم، ہماری بے آبرو کنواریاں ...... اور سب سے بڑھ کر ہماری عزت جو تیری شیطانی فوج کے ہاتھوں برباد ہوئی ——— تجھے ان جذبات کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ ہوس کار عفریت! جا دُور ہو یہاں سے، ورنہ ایک ایک لاش بھڑک اٹھے گی اور پھر تجھے ——— تجھ ناری کو بھی اس حدت سے پناہ نہ ملے گی۔ سمندروں کا پانی، ساون کی گھٹائیں، پہاڑوں کی برف اور کرۂ زمہریر کی ہوائیں بھی اس آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکیں گی ——— جا ——— جہنم کی مخلوق دُور ہو جا یہاں سے!"

"کپڑا ٹھونس دو اس بدلگام بڈھے کے منہ میں اور اس کی مغرور بیٹی کو اندھے غار میں ڈال دو!! لیکن ٹھہرو۔ باپ بیٹی ایک دوسرے کے قریب رہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم رحم و کرم کے جذبات سے عاری تھے۔"

اور بھولے بھٹکے سیاحوں کا بیان ہے کہ زینو کی وادی میں اب زعفران کے کھیتوں سے لاشوں کا تعفن پھوٹتا ہے، تاکستانوں کی رگیں سوکھ گئی ہیں، عشق پیچاں کو امربیل کھا گئی ہے، تھوہر کے کانٹوں نے نرگس کی آنکھیں پھوڑ دی ہیں، چشموں کا پانی پہاڑوں کے سینے میں جذب ہو گیا ہے، جھیلوں میں سنہری مچھلیوں کے بجائے جونکیں رینگتی ہیں، کنول کے پھول بجھے دلوں کی طرح

سیاہ پوش ہیں، سیب کی شاخوں سے پنجر لٹکتے ہیں، جگنو اپنی چمک بھول چکے ہیں، کوہِ سیمیں کے مرغِ زرّیں پہ کوّے کا گمان گذرتا ہے اور کوہِ گراں خواب کی برفوں کے نیچے شہد کی رگیں کوئلہ بن گئی ہیں، شہد کی تھیلیاں زنبوروں کی طرح ڈستی ہیں اور ان کے چھتوں میں الّوؤں کا بسیرا ہے، گالوں کے گڑھوں سے جھرّیاں پڑ گئی ہیں . . . اور ان فضاؤں میں جہاں کبھی بلبلوں کے پُر جگمگاتے نغمے اب چمگادڑ مردہ چوہوں کی بو پھیلاتے ہیں . . . گلزاروں کے پھول کنگال ہیں اور پن چکی سے [illegible] کے سنہرے آٹے کی بجائے شعلے لپکتے ہیں

اور

اندھے غار کی گہرائیوں سے کبھی کبھی یہ پکار: مجھے بچاؤ! آزاد [illegible] آتی ہے اور یہاں رکے پاؤں ایک بوڑھا جس کے منہ میں [illegible] اٹھتا ہے پاؤں میں زنجیریں ہیں اور ہاتھ سلاسل کے نیچے دبے ہیں، اپنا چہرہ ان سے چھپانا چاہتا ہے، لیکن [illegible] ——— خیال ہے کہ بے بسی کے احساس نے اس کا ماحول تنگ کر دیا ہے۔

جونکیں

مہندر ناتھ

آشا جب بستر سے اُٹھی، تو اس کے سارے جسم میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ نہ جانے یہ درد کی لہریں کہاں سے آگئی تھیں۔ جو اس کے دل و دماغ پر حاوی ہوگئی تھیں۔ کئی دنوں سے اُسے صرف ایک ہی خیال ستا رہا تھا کہ آنند کا خط کیوں نہیں آیا۔ کیا وہ آ رہا تھا۔ یا نہیں۔ گھر کا ماحول اُسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ زندگی میں سب کچھ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کر رہی تھی۔ گھر میں سب کی نگاہیں آشا پر تھیں کیونکہ زندگی کی ضروریات آشا ہی پوری کر رہی تھی۔ اگر آشا نے اپنی زندگی کے ساتھ ہولی نہ کھیلی ہوتی تو یہ سارا کنبہ کب کا مرکھپ گیا ہوتا۔ لیکن آشا کی تگ و دو کی بدولت یہ کنبہ آج تک دو وقت کا کھانا کھا رہا تھا۔ بڑے بھائی نے شادی کر کے الگ مکان لے لیا تھا۔ چھوٹے بھائی نے پان کی دوکان کھول لی تھی اور ساتھ ہی شادی کر لی تھی۔ اور اس کی زندگی پان کی دوکان اور ایک موٹی بیوی اور ایک مدقوق بدصورت بچے کے گرد طواف کر رہی تھی۔ بڑی بہن ایک آوارہ مزاج عورت تھی جس نے اپنی ساری زندگی آوارگی اور عیاشی کے سپرد کر دی تھی۔ اس نے بھی اپنی منزل تلاش کر لی تھی۔ اس بڑھاپے میں جو اس کے گرد منڈلا رہا تھا۔ جب شباب کا سارا سونا پگھل جاتا ہے۔ اور جسم میں ڈھیلا پن سا آجاتا ہے۔ جب کنپٹیوں کے آس پاس بال سفید ہونے لگتے ہیں جب ٹھوڑی کے نیچے کا گوشت اپنی جگہ چھوڑنے لگتا ہے۔ تو سمجھ لو بڑھاپا آپ کا تعاقب کر رہا ہے۔ موت کی دستک آہستہ آہستہ سنائی دیتی ہے۔ اس موقعے پر بھگوان نے بہن کی دعائیں قبول کر لیں۔ پرانے گناہ معاف کر دیئے۔ اور پرماتما نے اُسے ایک شخص کے قریب لا کھڑا کر دیا۔ جو اُسے دو وقت کھانا۔ ایک مدد کھولی اور ساتھ ہی آنے والی زندگی دی جس میں بھوک اور پیاس اپنے ڈراؤنے جبڑے کھولے ڈرا رہی تھی۔ ان سب ہیبت ناک چیزوں کو ایک لمحے کے لیے دور پھینک دیا تھا۔

لیکن آشا ابھی تک اکیلی تھی۔ اس نے گھر کے ہر فرد کے لیے سب کچھ کیا تھا اپنے جسم کی بازی تک لگا دی تھی۔ اپنی آشاؤں اور تمناؤں کا خون کیا تھا۔ اپنے جسم اور جوانی کو بیچا تھا۔ لیکن نتیجہ ایک ایک کر کے سب لوگ اس سے الگ ہوتے گئے۔ ہر شخص اپنے محور کے گرد گھوم رہا تھا اور آشا آج زندگی کی دہلیز پر بالکل اکیلی کھڑی تھی۔

وہ بستر سے اُٹھی۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ صبح کے وقت اُسے اپنی صورت کبھی اچھی نہ لگی۔ نہایت دبلا سا چہرہ۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے۔ چہرے کی رنگت زرد، بالوں کی نرمی اور ان کی چمک آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے کپڑے جو آج سے چھ مہینے پہلے اُسے پھنس کر آجاتے تھے۔ آج بہت ہی کھلے کھلے سے تھے۔ ہر چھ مہینوں کے بعد وہ اپنے کپڑوں کو دوبارہ سیتی۔ کبھی کاٹتی، کبھی بڑھاتی کبھی کمر کے قریب اپنی قمیص کے گھیرے کو کم کرتی۔ کبھی بلاؤز کو دوبارہ سیتی اور سینے کے پھیلاؤ کو دوبارہ ناپتی۔ یہ تبدیلیاں جو اس کے جسم میں

ہو رہی تھیں اس کے متعلق آشا کو احساس تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو دیکھ کر جھنجھلا اُٹھتی۔

اُس کا بھی ایک زمانہ تھا۔ جب وہ پہلی بار ایک دلہن کی طرح اس شہر میں آئی تھی۔ ناچتی گاتی، لہراتی بل کھاتی ہوئی اس شہر میں وارد ہوئی تھی۔ ہر شخص نے اس کے متناسب جسم، اس کی متبسم آنکھوں، اس کی پتلی کمر، اس کے کولھوں اور اس کے لمبے قد کی تعریف کی تھی۔ جس شخص نے اُسے دیکھا ایک لمحے کے لیے وہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ ایک مسکراہٹ لیے ہوئے ہتھیلی پر دل، چیک بک جیب میں ڈالے ہوئے مستقبل میں امیدوں اور تمناؤں کا چراغ روشن کیے ہوئے اپنی جانِ تمنا بنانے کے لیے ہر فرد بشر آتا۔ اس کی اداس راتوں میں گرمی پیدا کرنے کے لیے اُس کی روح میں۔ بے قراری کے لمحات کا اضافہ کرنے کے لیے ہر ملنے والا بڑی گرم جوشی سے ملتا۔

لیکن آشا کی روح اُن لوگوں سے سیراب نہ ہوئی۔ ہر آنے والے مرد میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی۔ اگر دو پیسے تھے تو صورت شکل کریہہ منظر تھی۔ اگر صورت اچھی تھی تو بنک بیلنس ندارد۔ اگر آنے والا قبول صورت اور بنک بیلنس کی نمائش کر رہا تھا تو بڑھاپا سر سے پاؤں تک لے کر ناچ رہا تھا۔ اور اگر اُسے تینوں چیزیں میسر تھیں تو سیرت نہایت ہی پراگندہ، باتیں کرو تو قے آ جائے، ذوقِ جمال ندارد جمالیاتی حس صفر بات کرنے کے بعد معلوم ہوتا۔ شاید بھیڑ یا بکری کا گاہک آ گیا تھا۔

آشا نے ان تمام مردوں کو دیکھا۔ اپنی مفلسی، غربت اور گھر میں ان بلکتے ہوئے انسانوں کو دیکھا جو اس کی روح کی دہلیز پر سسک رہے تھے سو رہے تھے ——— گو یہ سب لوگ اُس سے عمر میں بڑے تھے۔ بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن نہ جانے کیوں نہ کر پاتے تھے کیوں حسرت بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دو وقت کے کھانے کے لیے تکتے رہتے۔ یاس بھری نگاہیں لیے ہوئے، ڈرے ہوئے سہمے ہوئے کمرے میں پڑے رہتے۔ جیسے آشا ہی ان کی زندگی کا مرکز تھی۔ جیسے یہی ان کا پانچ سالہ پلان تھی۔ کہ تم کچھ کرو۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم سب بیکار ہیں ——— ہماری طاقتِ گویائی چھن گئی ہے۔ ہمیں اپنے آپ پر یقین نہیں رہا۔ ہم کچھ نہیں ہیں۔ کچھ نہیں ہیں۔

انہی سسکتی ہوئی صورتوں کو دیکھ کر آشا کے دل میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا۔ یہ نگاہیں جو ہر بار، ہر منٹ، ہر سکینڈ اُسے اپنی زندگی بیچنے کے لیے مجبور کرتی رہتیں۔

اور شاید آشا نے سوچ لیا تھا کہ بھگوان نے اُسے تمام لوگوں کو پالنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ شاید ان تمام کو پیدا کر کے اُس نے اپنا کام ختم کر دیا تھا۔ اب آشا کی باری تھی کہ اُن سب کی کشتی کو منزلِ مقصود پر لے جائے۔ ایک ناخدا کی طرح ———

اور آشا نے ان دس سالوں میں یہی کچھ کیا۔ انہیں کی طرف دیکھ کر۔ انہیں کی مفلسی اور غربت کا اندازہ کر کے۔ انہیں کی بھوک سے متاثر ہو کر انہیں کے مستقبل کو بنانے کے لیے اس نے اپنی جوانی کا نیلام کر دیا۔ لیکن یہ نیلام بڑا سوچ سمجھ کر کیا۔ رُک رُک کر، دیکھ دیکھ کر، سنبھل سنبھل کر کیا۔ یہ لمحات جو بیچ میں آتے رہے اُن لمحات نے اس کی روح کو بھی پراگندہ نہ کیا۔ کیونکہ اس کی اپنی روح اس نیلام میں شامل نہ تھی اس کی اپنی منزل یہ نہ تھی۔ اُسے خود روپیوں سے محبت نہ تھی۔ اُسے یوں زندہ رہنا مقصود تھا۔ یہ سب کچھ اُس نے اپنے کنبے کے لیے کیا۔ ان دس برسوں میں چار پانچ عشق بھی کیے۔ ایک دو سوچ سمجھ کر، ایک دو مجبوریوں کے تحت، کچھ بھائیوں کو دیکھ کر۔ کچھ ماں کی طرف نگاہ ڈال کر آہستہ آہستہ یہ کارواں اپنے ٹھکانے لگنے لگا۔ اور پھر وہ اپنی زندگی شروع کرے گی۔ لیکن یہ کارواں تو بڑھتا جا رہا تھا۔ چھوٹے بھائی کے ہاں ایک لڑکی ہو گئی تھی۔ بڑے بھائی کے ہاں پانچ بچے تھے۔ دو بچے آشا کے پاس پل رہے تھے اور تین بچوں کے بوجھ کو خود بڑا بھائی سنبھال رہا تھا۔ سب سے زیادہ رنج تو اُسے اس بات کا تھا کہ کوئی شخص اُس کی عزت نہ کرتا۔ اُس کی ماں بھی تو یہی کہتی تو رنڈی ہے، رنڈی!"

ہائے یہ لفظ کہتے ہوئے ان لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ جس کا کھائیں اُسی کو گالیاں دیں۔ اُسے ماں میں تیری جائی ہوں، تیرے ہی خون کی بوند ہوں۔ تیری رگیں اور نسیں میری دل و جگر ہیں —— میں تم سے الگ تو نہیں، اے بھائی۔ اے میری بھابیو۔ شرم نہیں آتی تم مجھے دیکھ کر ہنستی کیوں ہو —— اپنے من ہی من میں خوش کیوں ہوتی ہو۔ کب تم نے میرا خون نہیں پیا۔ یہ گھر میں کُسر پُسر یہ تضحیک آمیز ہنسی یعنی جب کبھی آنند آتا ہے۔ اور میں اپنے آپ کو سنوارنے لگتی ہوں، اپنے بال دھوتی ہوں۔ انہیں سکھاتی ہوں، اپنے لبوں پر لپ سٹک لگاتی ہوں۔ اور اس کے انتظار میں ایک خوبصورت نیلی ساڑھی پہنتی ہوں۔ یہی ساڑھی تو انہیں پسند ہے نا۔ تو تم جل بھن کر خاک ہو جاتی ہو محلے والوں سے جا کر کہتی ہو" اے جی وہ آج آنے والے ہیں۔" ہاں تم بھی خوش نہیں ہوتیں جس دن سے وہ آتا ہے یا اُسے آنا ہوتا ہے تم کیوں مجھ سے لڑنا جھگڑنا شروع کرتی ہو۔ نہیں تو معلوم ہے۔ تم میں سے ہر شخص کو معلوم ہے کہ میں کیا کرتی ہوں۔ تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ تم میری کمائی پر زندہ ہو۔ مجھے تو آنند سے محبت ہے۔ میں آج کل دن رات اس کا انتظار کرتی ہوں۔ دن رات اس کی مالا جپتی ہوں اُس کا نام لے کر زندہ ہوں۔ جب اُس کی یاد آتی ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

ماں دیکھو تو۔ مجھے کیا ہو گیا۔ میں تو پہلی سی نہیں۔ چہرے پر وہ شگفتگی نہیں رہی۔ وہ رونق نہیں ہے۔ آواز میں وہ نغمگی نہیں۔ ماں میں دُبلی ہوتی جا رہی ہوں۔ ان دس سالوں میں میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ پھر بھی تمہیں رحم نہیں آتا۔ شاید میں رحم و ترحم کے قابل ہی نہیں۔ میں تو رنڈی ہوں ماں۔ جو رنڈی کی کمائی کھاتے ہیں اُنہیں کس نام سے پکارا جائے۔ چھوڑو آشا۔ ماں کو مت گالی دو۔ ان بھائیوں کو مت کوسو۔ نا سمجھ ہیں نا۔

آج آسمان بڑا خوبصورت تھا دھوپ میں ایک نشہ سا تھا۔ سامنے کے مکان پر کبوتروں کا ایک جوڑا ایک دوسرے سے پیار کر رہا تھا۔ ناریل کے درخت اس خنک ہوا میں جھوم رہے تھے۔ دور ایک جہاز سفر کے لیے اپنے پر تول رہا تھا۔ آج آنند کا خط آنا چاہیے۔ کیا وہ آج ضرور آ سکے گا۔ وہ آ جائے گا تو وہ اپنے دل کی ساری کدورت کو اُس کے سامنے رکھ دے گی۔ وہ ہر چیز کو میری ہر شکایت کو، میری ہر التجا کو بڑے غور سے سنتا ہے اور حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کم بخت بہت دور رہتا ہے۔ تین مہینے کے بعد صرف ایک دن یا ایک رات کے لیے آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اپنا تبادلہ یہاں کیوں نہیں کرا لیتا۔ اتنی دور رہنے سے کیا فائدہ۔ خط بھی نہیں لکھتا۔ جب آتا ہے تو محض ایک تار بھیج دے گا۔ اور میں اُس کے انتظار میں تڑپتی رہتی ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ جس دن وہ یہاں آنے والا ہوتا ہے گھر میں ہنگامہ ضرور ہو گا۔

اُسی دن تو میں خوش ہوتی ہوں۔ وہ دن تو میرا اپنا ہے۔ باقی سب اُن کے ہوتے ہیں۔ باقی سب شامیں۔ راتیں اُن کی ہوتی ہیں۔ اُن سے کوئی کیا کہے کہ اے گھر والو۔ کیا تم مجھے ایک سہانی صبح نہ دو گے۔ کیا میری زندگی کی ایک گرم رات تمہاری نگاہوں میں کھٹکتی ہے۔ اتنے ہی خوددار ہو تو گھر سے نکل جاؤ۔ آنند بھی کہتا ہے کہ اب اُن کو گھر میں کیوں رکھا ہے تم نے۔ تم نے ان سب کو نوکری کے قابل بنا دیا۔ شادیاں تک کرا دیں۔ لیکن پھر بھی یہ سارا بوجھ تمہارے کندھوں پر۔ آخر کب تک۔

لیکن آنند کو کیا بتاؤں کہ یہ جونکیں ہیں آنند۔ جونکیں۔ جونکوں کو خون پینے کی عادت ہوتی ہے نا۔ وہ ساری عمر کسی نہ کسی کا خون پیتی ہیں۔ اور مجھے خون دینے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ جب تک کوئی مجھے گالی نہیں دیتا مجھے سکون نہیں ملتا۔ جب تک ماں مجھے

رنڈی نہیں کہہ لیتی مجھے نیند نہیں آتی۔ جب تک بھائی یہ نہیں کہہ لیتے کہ تم کیا کچھ کر سکتی تھیں اور ہمارے لیے کچھ نہ کر سکیں مجھے راحت نصیب نہیں ہوتی۔ میری قربانیوں کا یہی صلہ ہے نا؟ اور کیا کر لیتی۔ آنند۔ اب تو آجاؤ۔ آنند۔ یہ صبح بڑی پیاری ہے آسمان بے حد نیلا ہے۔ دھوپ میں ہنس کے پروں کی نرمی اور گرمی ہے مجھے اتنا نہ تڑپاؤ۔

دن کے بارہ بج گئے۔ اور ڈاکیہ آیا۔ اور ساتھ میں ایک تار۔ آشا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تار کھولا۔ لکھا تھا: "شام کو آ رہا ہوں۔ تمہارا آنند"

آشا خوشی اور حیرت سے جھوم گئی اور تار کو چوم لیا۔ اور پھر ادھر اُدھر دیکھا۔ سامنے کی چارپائی پر اُس کی ماں لیٹی ہوئی تھی رسوئی میں اُس کی بھابی کھانا پکا رہی تھی۔ صوفے پر بھائیوں کے بچے لیٹے ہوئے تھے۔ ادھر نیچے فرش پر اس کا بھائی خراٹے لے رہا تھا۔ سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ ہائے وہ آئیں گے تو کیا کہیں گے گھر کو سجا کر بھی نہیں رکھا کیا شریفوں کے گھر ایسے ہوتے ہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے ہر طرف انتشار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سب لوگ کوچ کی تیاری کر رہے ہیں۔ آشا نے ہر چیز کو سلیقے سے رکھنا شروع کیا۔ صوفہ اپنی جگہ پر رکھا۔ جھاڑن سے اُسے صاف کیا۔ اور پھر ہر چیز کو قرینے سے رکھا۔ تصویروں کو کپڑے سے صاف کیا۔ اپنی جوانی کی تصویر کو۔ ہائے آشا تو کتنی خوب صورت تھی۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تصویر صاف کرتے ہوئے ایک تصویر نیچے گر پڑی۔ اور پلنگ پر سوئی ہوئی ماں جاگ اُٹھی "کیا شور مچا رکھا ہے۔ آشا تم نے۔ سونے بھی نہیں دیتی"۔ "یہ سونے کا وقت ہے ماں۔ بارہ بج چکے ہیں بارہ" وہ چلائی۔

"بڑھیا ہوں، نیند زیادہ آتی ہے نا۔ جب تم بڑھیا ہو جاؤ گی تو ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکو گی۔ دن بھر سوئی رہو گی۔"

فرش پر بھائی نے انگڑائی لی۔ اور وہ چلایا "رات پالی کر کے آیا ہوں۔ لیکن اس گھر میں سونے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اور اُس نے پھر کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

کیا وہ اپنی ماں کو بتا دے کہ آنند آج شام کو یہاں آنے والا ہے۔ اگر اس نے بتایا۔ تو وہ لڑنا شروع کر دے گی۔ پہلے تو گھر کو صاف کرے۔ چیزوں کو سجائے۔ فرش کو دھوئے۔ موری کو تیزاب سے صاف کرے۔ تاکہ گندگی کا احساس نہ رہے۔ کپڑوں کو اچھی طرح ٹانگ دے۔ جالے صاف کرے۔ برتن سجا کر رکھ دے۔ یہ سب کچھ کرے۔ اکیلی۔ ہاں اکیلی۔ اس کام میں تمہارا کوئی ساتھ نہ دے گا۔

اُس نے اپنی چھوٹی بھابی کو ایک کونے میں بلایا۔ دیکھو بازار جا کر ایک مُرغ لے آؤ۔ دو سیر ڈیرہ دون کے چاول اور سے ہاں پاپلیٹ کی مچھلی۔ وہ مچھلی بڑی خوشی سے کھاتے ہیں۔ کچھ پلاؤ بنا لے۔ ایک آدھ میٹھی چیز۔ میری پیاری بھابی۔ اُس نے بھابی کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا: "سر پر پلو تو رکھو۔ اری بچوں کو تو نہلا دے۔ اچھے سے کپڑے پہنانا اور ننھو سے کہہ کہ وہ اُٹھ کر منہ ہاتھ دھوئے۔ شام کو وہ .... وہ شرما گئی۔ لجا سی گئی اور ڈھلکتے ہوئے پلو کو سر پر رکھ لیا: "بڑی سہاگن بنی پھرتی ہے۔ بھابی۔ سب کچھ سمجھ گئی اور رسوئی کی طرف گئی اور بڑبڑانے لگی: "بے شرم کہیں کی۔ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ آج وہ آ رہے ہیں۔ رنڈی کہیں کی شادی نہیں کر لیتی۔ کتنے مرد کھا چکی ہے۔ ابھی تک جی نہیں بھرا۔ محلے بھر میں ناک کٹوا رکھی ہے ہمارا۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے

ہیں۔ کل ہی گلی کا مسٹنڈا میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں بھی .... ہائے رام۔ بچوں پر کیا اثر پڑے گا اور یہ کہتے ہوئے دال میں نمک ڈالتی گئی۔

اری دال میں نمک ڈالے جاتی ہے۔ ذرا ہاتھ کو روک تو سہی" ماں نے چارپائی پر چلّاتے ہوئے کہا۔ "تو مر جاتی تو اچھا تھا۔ رنڈی۔ گشتی کہیں کی مری جاتی ہے۔ وہ کمالہ۔ او یہ تم لوگ کھا کھا کر بیل ہوتے جا رہے ہو۔ اتنی نمکین دال کون کھائے گا" وہ چڑ کر بولی بھابی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس نے زور سے ڈھکنا پتیلے پر رکھا اور پاؤں سے تھالی کو ہٹایا۔ اور قریب کھڑے ہوئے ایک بچے کو ایک تھپڑ رسید کیا اور کہنے لگی "کس کس کا کھانا پکاؤں۔ یہاں آئے دن مہمان آتے رہتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا کہ شام کے کھانے کی فرمائش ابھی سے ہونے لگی۔"

"شام کو کون تیرا خصم آ رہا ہے۔ کتیا کہیں کی۔ حرام خور"

"آشا سے پوچھو نا۔ مجھے کیا معلوم۔ مچھلی۔ گوشت۔ کباب۔ میٹھا سب کچھ پکانا پڑے گا؟"

کون آ رہا ہے رنڈی چھوکری" وہ بستر سے اٹھ کر بولی۔

آشا دوڑتی ہوئی ماں کے قریب آئی۔ "کوئی نہیں۔ وہ آ رہے ہیں کیوں چلّا رہی ہو ماں؟"

"اری تیرا مردہ نکلے تو کہیں کی نہ رہے .... وہ کون؟"

"ماں تو جانتی نہیں۔ وہ۔ ماں۔ وہ"

"تیری جوانی کو آگ لگے۔ تیری ماں مر جائے۔"

"نام کیوں نہیں لیتی۔ کون ہے تیرا خصم؟"

"ماں۔ وہ۔ آنند!"

"اچھا آنند آ رہا ہے" ماں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا "موا۔ مسٹنڈا۔ سانڈ۔ منہ اٹھائے چلا آوے۔ جیسے یہ اس کے باپ کا گھر ہے۔ نہ دن دیکھے نہ رات۔ بس مفت کھانے چلا آوے۔"

"ماں۔ وہ تو تین مہینے کے بعد آ رہا ہے۔ ہر روز کہاں آتا ہے۔"

آشا نے شرماتے ہوئے کہا۔

تو گھر میں رکھ لے یار کو۔ ہمیں یہاں کیوں رکھا ہے۔ اپنے بھائیوں کو گھر سے نکال دے۔ ان بچوں کو کسی دھرم شالا میں بھیج دے۔ اس گھر کو آگ لگا دے اور رکھ لے اپنے یار کو۔ میں تمہیں کیا کہتی ہوں۔ میری بات کون مانتا ہے۔ اری وہ دیتا کیا ہے؟ جو تو اس پہ مرتی ہے۔ جان چھڑکتی ہے۔ کتنی بار کہا۔ کہیں شادی کر لے اور میری جان چھوڑ۔ میں تو چند دنوں کی مہمان ہوں۔ اس مال دار بنیئے سے تمہاری شادی کرنے والی تھی۔ ہمیں ایک مکان لے کر دے رہا تھا اور دس ہزار روپیہ دیتا تھا۔ لیکن تو کب ماننے والی۔ گھر بھی اچھا خاصا تھا۔ اور ہم سب چین سے رہتے۔ تیرے بھائیوں کی قسمت کھل جاتی۔ تیرے چھوٹے بھائی کی دوکان چھوٹ جاتی۔ کوئی اچھا سا دھندا کر لیتا۔ دن رات پان بیچتا رہتا ہے۔ ابھی تک موا سویا ہوا ہے۔ اتنی اچھی صورت پائی تھی تم نے۔ تم سے اوپر والی رنڈی ہی اچھی۔ جس نے برقعہ اوڑھ کر پٹھان کے ساتھ شادی تو کر لی۔ مٹی میں رولدی اپنی جوانی تم نے۔ تم سے تمہاری بڑی بہن اچھی۔ جس نے دھندا تو بند کر دیا اور بڑھاپے میں ایک

نوجوان کے ساتھ شادی کر کے گھر بسا لیا تھا۔ لیکن تو ساری عمر کنواری رہے گی۔ ساری عمر بغیر خصم کے رہے گی۔ کیسے کٹے گی پہاڑ سی جوانی۔ جب میں مر جاؤں گی۔ تب تو میری باتیں یاد کرے گی۔ اب نہیں۔ اری یہ بھابیاں تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ تمہیں کھا جائیں گی تمہارے بھائی ایک پیسہ نہیں دیں گے تمہیں۔ میری بات یاد رکھ۔ اے شو کی ماں۔ جا بازار سے مچھلی اور مرغ خرید لا۔ دال تو میں بگھارتی ہوں میں۔ اب گھر میں مہمان آئے گا کچھ تو کھلانا پڑے گا۔ اُسے موئے مسٹنڈے، شہدے، غنڈے کو۔ ماں بستر سے گالیاں دیتی ہوئی اُٹھی اور بھابی کو پانچ کا نوٹ دیا۔ "لے آ بازار سے جا کر زہر لے آ۔ یہ دونوں کھائیں گے۔ جب جا کر اُن کا جی بہلے گا۔" گھر میں پھوٹی کوڑی نہیں رگھو کی سکول کی فیس نہیں دی۔ چار مہینے کا کرایہ تک تو دیا نہیں لیکن آج مرغ ضرور آئے گا۔ اری کھڑی کھڑی کیا تک رہی ہے۔ باہر جا کر مرتی کیوں نہیں۔ رنڈی چھوڑ۔ کتنی کہیں کی۔ جاتی کیوں نہیں حرام خور۔"

یوں اکثر ہوتا تھا۔ یہ تو آشا کے لیے روز مرہ کی بات تھی۔ یہ گالیاں۔ یہ غصہ، چہرے پہ مکر و فریب کی لکیریں۔ ان سب سے آشنا تھی۔ آشا ان گالیوں کو سننے کی عادی ہو چکی تھی اور ماں کو ان گالیوں کو سنانے کی عادت تھی۔ گھر کے ماحول میں یہ تلخی یہ تندی یہ گھبراہٹ۔ یہ دہشت، یہ زمانہ سازی یہ بہانہ بازی یہ سب کچھ اس گھر میں ازل سے ہو رہا تھا۔ گھر کے تمام فرد اسی چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ آشا نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن نکلنا آسان نہ تھا۔ اسی لیے آشا نے ان گالیوں کو زندگی کا ایک حصہ سمجھ لیا تھا۔ جیسے گندگی اُس کی زندگی سے وابستہ ہو گئی تھی۔ اس پراگندگی کا مداوا اُس کے پاس نہ تھا۔ اس سے بچ کر وہ زندگی کے کچھ لمحات اپنی خوشی کے لیے رکھنا چاہتی تھی۔ آشا چاہتی تھی۔ جیسے اس نے اپنی زندگی کو ان کی خوشی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسی طرح گھر کے باقی افراد بغیر کسی تنقید کے اُس کی خوشی میں شریک ہوں گے۔ اور اُسے خوشی کے لازوال لمحات عطا کرنے میں فراخ دلی سے کام لیں گے۔ لیکن یہاں فراخ دلی کہاں۔ یہاں تو گھٹن اور سڑاند تھی۔ یہاں تو خود غرضی تھی۔ صرف اپنے آپ کو خوش رکھنے کی تمنا تھی۔

جبھی تو آشا پر ان گالیوں کا خاص اثر نہیں پڑا۔ وہ اپنے کام میں منہمک رہی۔ چھوٹے بھائی کو صوفے پر لٹا کر فرش کو دھویا۔ دری بچھائی۔ کمرے کی ہر چیز کو قرینے سے رکھا۔ خود نہائی۔ بالوں کو دھوپ میں سکھایا —— نئے کپڑے پہنے۔ آنکھوں میں کاجل۔ لبوں پر لپ اسٹک اور بالوں میں تیل اور سینٹ، ہاتھوں میں چوڑیاں۔ کانوں میں سونے کی بالیاں۔ اور گلے میں رولڈ گولڈ کا ہار پہن لیا۔ اور پھر آنند کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ گھر کا ہر فرد کن انکھیوں سے آشا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بھابیاں کھسر پھسر کر رہی تھیں وہ تو بیاہی ہوئی تھیں۔ اُن کا ایک خاوند تھا۔ ہاں صرف ایک۔ ماتھے پر ایک ٹیکا۔ مانگ میں صرف ایک ہی ہاتھ کا سیندور۔ نگاہوں میں ایک ہی چمک تھی۔ ایک ہی کی صورت تھی۔ ایک ہی مرد سے آشنائی تھی۔ ایک ہی کا انتظار تھا۔

آشا کے سلسلے میں کتنے آتے اور چلے گئے۔ کتنی بار مانگ بھری گئی اور پھر اُجڑی۔ کتنی بار وہ ہنسی اور پھر روئی۔ کتنی بار یہ گھر بسا اور اُجڑا۔ ہائے، کتنے آدمی آئے اور چلے گئے اور آشا نے قسمیں کھائیں کہ اب وہ کسی اور سے محبت نہ کرے گی۔ لیکن چھ مہینے یا سال کے بعد پھر وہی چکر، ہر شخص نے اس گھر کی بدلتی ہوئی زندگی کو دیکھا تھا۔ لیکن ہر بار گالیوں کی بوچھاڑ آشا کو سننا پڑیں یہ جانتے ہوئے اس گھر کے افراد خود کچھ کرنے کے قابل نہ تھے۔ اگر قابل ہوتے تو کب کے یہاں سے چلے جاتے لیکن کہاں جاتے کون سنبھالتا انہیں سنبھالنے والی صرف آشا تھی اور گالیاں کھانے والی بھی آشا!

بھابیوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑکتی۔ سالی خود عیش کرتی ہے اور ہم صرف ایک مرد پہ قناعت کریں۔ یہ مرد کتنے بھدے گندے اور نامرد تھے۔ خود کچھ نہ کماتے تھے۔ بہن کی کمائی پر زندہ تھے۔ اجڈ۔ گنوار، چپ رہنے والے ماں اور بہن کی گالیاں سننے والے، بازوؤں میں ہمت ہوتی تو ایک گھر نہ بناتے۔ اُن کے ذہنوں میں کئی بار بغاوت نے جنم لیا۔ لیکن کہاں جاتیں ——— کون اپنائے گا انہیں۔ اب تو اسی گھر میں زندگی کاٹنی پڑے گی۔ یہیں سے جنازہ نکلے گا۔ لیکن آشا تو عیش کرتی ہے۔ ہر چھ مہینے کے بعد نیا مرد۔ کبھی گورا چٹا۔ کبھی گول مٹول کبھی سوٹ پہن کر آتا ہے۔ کبھی ہیٹ لگا کر، کبھی کار میں بیٹھ کر۔ کبھی ٹیکسی میں۔ کبھی سینما لے جاتا ہے کبھی کپڑے خرید کر دے جاتا ہے۔ یہ حرافہ عیش کرتی ہے اور ہم۔ بس صرف ایک مرد، کالے کلوٹے، دُبلے پتلے، جاہل سُوکھے، سڑے محض نامرد۔ اسی لیے انہیں اچھا نہ لگتا تھا۔ کسی کا اس گھر میں آنا۔ ان کمروں کو صاف کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ کمرے تو ازل سے گندے ہیں اس صفائی سے کیا فائدہ جس میں اُن کا کوئی حصہ نہیں۔ محض کام کرتے جاؤ اور دو وقت کھانا کھاؤ اور جاہل مردوں کو اپنا پتی سمجھو۔ جبھی تو ناک سکوڑے سبھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ آج مہمان نہیں آنے والا تھا۔ بلکہ اُن کی جاگی ہوئی خواہشوں اور امنگوں کا جنازہ نکلنے والا تھا۔

ہر صبح کے بعد شام آتی ہے۔ جب آفتاب اپنی تمام رعنائی سمندر میں غرق کر دے گا۔ اور آسمان پر شفق پھیل جائے گی۔ تو کچھ عرصے کے بعد بادلوں کے کنارے ارغوانی ہو جائیں گے تو ایک نیا چاند اُبھر آئے گا۔ جبھی یہ کمرے سجائے گئے ہیں۔ آشا ایک دُلہن بن کر بیٹھتی ہے۔ نابکار، رنڈی۔ مردوں کو کھانے والی، گھر کی عزت بیچنے والی، بے غیرت، خاندان کی عزت کو خاک میں ملانے والی

کاش آنند نہ آئے۔ دن بھر بھابیاں یہی سوچتیں۔ یہ کھانا پکا پکایا رہ جائے گا، یہ صفائی، یہ رکھ رکھاؤ، یہ اجلا اجلا سا فرش۔ یہ بناؤ سنگھار۔ یہ مسکراہٹ اس رنڈی کی دھری کی دھری رہ جائے۔ یہ روئے اور زور زور سے روئے۔ اپنے بال نوچے۔ دیوار سے ٹکریں مارے، اس کی ماں روئے۔ اس کے بدصورت بھائی روئیں۔ یہ کپڑے پھاڑ کر بازار میں ننگی ناچے۔ یہ پاگل ہو جائے تو اچھا ہے۔ وہ خوش ہوں گی اور ہنومان کے مندر میں جا کر پرساد چڑھائیں گی۔

یوں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ آشا کے دل میں انتظار کی کلیاں۔ سارے گلشن کا جوبن لیے ہوئے مہک رہی تھیں۔ اب آنند کی گاڑی اس اسٹیشن پہ ہوگی، اب بوری والی کے قریب، اب گورے گاؤں۔ اب اندھیری۔

"موا مسٹنڈا اب آتا ہی ہوگا۔ کھڑکی میں نہ بیٹھ۔ تیرا یار آجائے گا۔" ماں نے کراہتے ہوئے کہا۔

باورچی خانے سے ڈیرہ دون کے چاولوں کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ پلاؤ تیار ہو رہا تھا، چپاتیاں پک رہی تھیں۔ بھائی ایک ایک کرکے گھر سے جا رہے تھے۔ جب وہ آتا ہے تو مردوں کو گھر سے جانا پڑتا ہے۔ صرف ماں رہ جاتی ہے۔ بھابیاں ایک کونے میں دبک جاتی ہیں، ایک کمرے میں۔ جس کے ایک کونے سے ہنسی، مذاق، مسکراہٹیں، کبھی کبھی دبی دبی سی سسکیاں، کبھی آہیں، بے قراری۔ وعدے، قسمیں، کھڑکھڑاہٹ اور کبھی کبھار مار پیٹ، کسی کا بالوں کا کھینچا جانا۔ "آشا کا اُوئی کرکے رہ جانا، ہائے کیا کرتے ہو۔ آہستہ سے بال کھینچو۔" یہ سب کچھ بھابیاں دیکھتیں، سنتی اور اپنے مردوں کو گالیاں دے کر رہ جاتیں اور جب کبھی وہ آنے والا ہوتا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے دعا کرتیں۔ کاش وہ آج نہ آئے۔ آج وہ نہ آئے۔ اے سائیں بابا۔ اے بھگوان ـ اے دو جہاں کے مالک، اے بانسری والے کاش وہ آج نہ آئے۔

وقت گزر رہا تھا۔ وقت گزر جائے گا۔ وقت گزرا جا رہا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ گلیوں میں بچے کھیل رہے تھے آسمان

پر ستاروں کی کہکشاں لرز رہی تھیں۔ چاند نظروں سے اوجھل تھا۔ کمرۂ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی اور آشا کسی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں بستر پہ دراز تھی۔ ہر شخص کسی کی آہٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹیکسی آئے گی۔ کوئی اُترے گا اور آشا کی مرگھٹ کا وارث اس دنیا میں وارد ہو گا۔ ہر سانس میں کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ آشا تو خوش تھی اُسے کسی کا خیال نہ تھا۔ یہ لمحات اُس کے اپنے تھے خود کے تخلیق کردہ تھے۔ دنیا کے ہر شخص نے اُس سے بے رخی برتی تھی۔ ماں سے لے کر بھائیوں تک، دوستوں سے لے کر دشمنوں تک آئے اُس کا اپنا بچہ نہ تھا۔ جس کو وہ سینے سے لگا کر زندگی کے باقی دن کاٹ دیتی۔ جبھی تو اس نے ان لمحات کو پراگندگی کے ہوتے ہوئے اپنی زندگی کو سولی پر چڑھا کر، موت سے ٹکرا کر اپنے گوشت کو بیچ کر، شباب کو نیلام کر کے خون کے تالاب میں نہا کر خوشی کے چند لمحات اپنے لیے تخلیق کر لیے تھے۔ یہ سوچ کر کہ دنیا تو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہتی رہے گی۔

اسی سوچ بچار میں انتظار کا وقت کٹتا گیا۔ شام کی تاریکی نے اندھیری رات کی چادر اوڑھ لی۔ ستاروں کی جگمگاہٹ میں اور اضافہ ہو گیا۔ مغرب سے مخمور ہوائیں جاگیں۔ اور سارے آسمان پر ایک کہکشاں لرزنے لگی۔ چاند نے اپنی دلفریب مسکراہٹ سے سارے آسمان کو منور کر دیا۔ ہائے یہ چاندنی، یہ تاروں بھری رات، یہ چنبیلی کے پھولوں کی مہک، یہ ناریل کے درخت، یہ لہریں اور یہ دبی دبی سی تھکن۔ اور آنند۔ تو کب آئے گا۔

کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ کھانے کی سوندھی سوندھی خوشبو آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اس کی بھابیاں خوش ہو رہی تھیں اور آشا کے دل میں درد کی ٹیسوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ہاں۔ آج کوئی مانگ نہیں بھرے گا۔ آج اس کی اُجڑی ہوئی زندگی میں بہار نہیں آئے گی۔ آنے والا کبھی بھی آسکتا ہے جس نے آنا ہے وہ ضرور آئے گا۔

وقت بیت رہا ہے۔ بیت جائے گا۔ لیکن ان لمحات کی کون قدر کرے گا۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی رہی۔ جامد و ساکت۔ ساتھ مکان کے ایک ٹیکسی رکی۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے خرگوش کی طرح۔ یہ صبر و سکون کا دیوتا تھا۔ صدیوں سے اُس کی روح بے قرار اور پیاسی تھی۔

نہیں۔ نہیں۔ یہ خوشی، مسرت اور نور کا سیلاب تھا۔ ٹیکسی وہیں رک گئی۔ ادھر نہیں آئی۔ پھر سیڑھیوں پر آہٹ آئی۔ ایک قدم پھر دوسرا قدم۔ تیسرا قدم، کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آشا کے لبوں پہ سانس آکر رک سا گیا۔

”آگیا مسٹنڈا۔ سالم مرغ کھانے والا۔ آگ لگے اس کے پیٹ کو۔ ماں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ تو مر جاتی تو اچھا تھا۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے تیری یہ حالت نہ دیکھتی۔

بھابیوں نے قہر آلود نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

”آگیا۔ ملک الموت اُن کی خوشیوں کو فنا کرنے والا۔ اُن کی راحتوں کا جنازہ نکالنے والا۔ بھیڑیا۔ آگیا“

آشا نے سوچا۔ وہی ہوں گے۔ وہی ہو سکتے ہیں۔ میرا آنند۔ میری راحتوں اور خوشیوں کا رکھوالا، اے جانِ بہار۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سینکڑوں بہاریں محوِ رقصاں ہیں۔ دروازہ کھلا۔ سامنے تاروالا کھڑا تھا۔ ایک خاکی وردی پہنے ہوئے، موت نگاہوں کے سامنے ناچنے لگی۔ اس نے لفافہ کھولا۔ شاید کوئی منحوس چیز ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کیسی خزاں تھی۔ جس نے بہارِ ملن کی ساری رنگینی لوٹ لی تھی۔

'لکھا تھا'

آج نہیں — پھر کسی دن آؤں گا۔

'آنند'

تار پڑھتے ہی آشا کے سارے جسم میں ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔

آشا تار کو اپنی انگلیوں میں بھینچتی ہوئی پلنگ پر گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بھابیاں خوش تھیں۔ ماں کے چہرے پر ایک نور سا برس رہا تھا۔

آخری سہارا

شکیلہ اختر

اور وہ نگاہیں جیسے اس کی روح کی گہرائیوں میں اُتری چلی جاتی تھیں۔ وہ گھبرا جاتی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور جنوری کی سردی میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے چمک اُٹھتے —— غم کے پہاڑوں تلے اس کی روح پس چکی تھی اور اب اتنی بڑی وسیع دنیا میں اس کا کوئی بھی اپنا نہ رہا تھا۔ کسی کے لیے اب اس کے دل میں فکر نہ تھی اور کوئی دل اس کے لیے مضطرب نہ تھا۔ سارا اضطراب سارا درد، اور سارا غم ایسے اچانک طور پر اس کی زندگی پر آیا اور آکر چھا گیا کہ اب یاس و حسرت کی کوئی انتہا باقی نہ رہ گئی تھی —— اور اس کے بعد یہ دو مہینے روزِ محشر سے بھی زیادہ طویل ہو کر اس کی سسکتی ہوئی روح پر سے آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔ گذری ہوئی زندگی کے نقوش اس کی نگاہوں سے بہت حد تک مٹ چکے تھے۔ مگر اس کے دل و دماغ اور آنکھوں میں بھیانک موت کا امنڈتا ہوا سیلاب ابھی تک چھا رہا تھا —— خوفناک موت کی گرج —— بے بس زندگی کی آخری کشمکش، اور اس کی سسکیاں اور ہچکیاں اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں —— وہ ایک قیامت سے ہو کر گذری تھی —— اسرافیل کے صور سے بھی کہیں زیادہ شور مچا۔ خون کی ندیاں بہیں۔ آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ نیزوں کے ہجوم میں چیخیں گھٹتی گئیں۔ اور گنڈاسے بھالے اور برچھیوں میں گھِسی ہوئی زندگی مٹتی چلی گئی۔ وہ کسی بچی کھچی بدحواس عورتوں کے ساتھ زندوں اور مُردوں کو روندتی ہوئی بھاگتی رہی مگر کنوئیں کی منڈیر پر آکر سب کے پاؤں ایک لمحہ کے لیے ساکت ہو گئے۔ جیسے حیات نے ان کے قدموں کو تھام لیا تھا۔ خون کے بہتے ہوئے پرنالوں میں سے گذرتے ہوئے ان کے پاؤں بھی لال سرخ ہو رہے تھے۔ اپنے عزیزوں، چہیتوں اور پیاروں کا گرم گرم خون، جو اب ان کے کپڑوں اور پیروں میں امرود کی جیلی کی طرح جمتا جا رہا تھا —— جیسے کاروں کی آوازیں ان سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ قیامت کا شور مچ رہا تھا۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں بھی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئیں —— کنوئیں کی منڈیر پر آکر وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لیے ٹھٹک گئی تھیں —— مگر ان کے بیٹے، ان کی مائیں، ان کے باپ اور ان کے سارے رشتہ دار عزیز اور عزیز تر لوگ بیدردی سے مارے جا رہے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر شور بڑھتا جا رہا تھا اور چیخیں بلند ہو ہو کر گھٹتی جا رہی تھیں۔ وہ غموں سے نڈھال ہو گئیں، اب ان کے دلوں سے اضطراب مٹ چکا تھا اور وہ بڑے استقلال سے کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ گئیں —— اور اس کے بعد اس کو کچھ بھی یاد نہ رہا —— سردی سے ان کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ اور وہ اسی آواز سے جاگ اٹھی تھی —— کچھ عورتیں اور لڑکیاں اسی کی طرح کنوئیں کے اندر اس کی بھیگی ہوئی دیوار سے اڑی ہوئی ٹھنڈ سے کپکپا رہی تھیں۔ ان کے قدموں کے نیچے کنوئیں کا پانی سیاہ لگ رہا تھا۔ اور اس پر کئی پھولی ہوئی لاشیں ایک پہ ایک ٹھنسی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مل کر پھر سے دیکھا —— "وہ ابھی تک زندہ تھی؟"

وہ بے تاب ہو کر کنوئیں کے اندر سانس لیتی ہوئی صورتوں کو حریصانہ طور پر دیکھنے لگی ـــ "اماں، آپا، بھابی اور پیارے سے بھائی بہن؟" مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ بھرا بھرا گلزار سا گھر! - کیا ہو گیا؟ - وہ سب کے سب اس کو اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ اور اب وہ کنوئیں کے اندر چپچپاتی ہوئی دیوار سے اڑی ہوئی سردی سے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سبھی آہستہ آہستہ سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ ایک کی گود میں تین سال کا بچہ تھا۔ اس کا سارا جسم سردی سے تھرتھرا رہا تھا۔ اور وہ بار بار اسی طرح کپکپاتے ہوئے رٹ رہا تھا: "اماں گھر چلو۔ گھر چلو اماں"۔ ماں بار بار اپنے گیلے آنچل سے اس کو لپیٹ لیتی: "چپ رہو بیٹا۔ چپ رہو دشمن تمہاری آواز سن لے گا بیٹا"۔ مگر بچہ کنوئیں کے اندر مُصر تھا: "ہم کو جاڑا لگ رہا ہے اماں گھر چلو۔ گھر چلو اماں"۔ بچہ جیسے ہی چپ ہوا تھا کہ کنوئیں کے اندر پتھر کی ایک بڑی سی سل آ کر پانی میں گری۔ ایک خفیف چیخ بلند ہوئی۔ کنوئیں کا پانی زور سے اچھلا۔ پھولی ہوئی لاشیں ڈوبنے ابھرنے لگیں ـــ خوف و دہشت سے سب کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر کے بعد جب اس نے اپنی آنکھ کھولی تو بچہ خون سے شرابور اپنی ماں کی گود سے چھٹا ہوا تھا۔ اور اس کا بھیجا پانی پر تیر رہا تھا۔ بس اس نے اتنا ہی دیکھا۔ اور اس کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال کے پلنگ پر پٹیوں سے جکڑی ہوئی کراہ رہی تھی۔ اس کی گردن، پیٹھ اور ہاتھوں پر برچھے کے گہرے زخم لگے تھے۔ چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی طرح اس کو بھی دشمنوں نے کنوئیں کے اندر برچھوں اور بھالوں سے گھونپ گھونپ کر زخمی کر دیا تھا۔ دوسرے دن ملٹری والوں نے کنوئیں میں سے کئی لاشوں کے ساتھ اس کو بھی نکالا۔ ڈیڑھ مہینہ وہ ہسپتال میں پڑی رہی۔ زہریلے زخم کے ساتھ اس کو نمونیہ بھی ہو گیا تھا اور اب وہ ہسپتال سے اس ریلیف کیمپ میں پہنچا دی گئی تھی۔ کپڑوں اور کمبلوں سے لدی ہوئی لاریں کئی بار یہاں آ آ کر خالی ہوتی رہیں۔ مگر ہمیشہ مانگنے والوں کا بڑا مجمع رہتا۔ ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ۔ ملتجیانہ صدائیں، اور لوٹ کھسوٹ کو دیکھ کر اس کو بڑی کراہیت لگتی رہی تھی۔ اور وہ ایسے موقعہ پر ہمیشہ وہاں سے کترا کر نکل جاتی۔ جب وہ ہسپتال میں تھی تو کئی رضاکار بہنوں نے لٹی ہوئی مریضوں کو ان کے پلنگوں کے پاس جا جا کر ایک ایک جوڑا کپڑا دیا تھا۔ اس کو بھی ایک جوڑا کپڑا ملا۔ پہلے پہل ان کپڑوں کو لیتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپ گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ اور اسی دن اس کو اپنے عزیزوں کی موت پر رشک آیا جو شہید ہو کر جنت میں آرام سے تھے اور اچھے اچھے کپڑے دوسروں کو دینے والی یاسمین کے بیمار ہاتھوں میں پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کا ایک جوڑا کانپ رہا تھا۔ اور ابھی تک اس کے پاس دو ہی جوڑے کپڑے تھے۔ ایک اس کے اپنے گھر کا آخری جوڑا اور دوسرا جو ہسپتال میں ملا تھا ـــ بس یہی اس کی ساری کائنات تھی۔ ٹھنڈی زمین پر سوتے ہوئے اس کو اپنا گھر یاد آ جاتا۔ سجا سجایا ہوا گھر ـــ نرم اور شفاف سے بستر، میز، کرسیاں، کتابوں سے بھری ہوئی شیشے کی اونچی اونچی الماریاں ـــ اماں کا محبت سے دمکتا ہوا چہرہ، ابا جان کی شفیق نگاہیں، بھائی جان، بھابی جان اور چھوٹے چھوٹے پیارے بھائی بہن ـــ جاڑے کی راتوں میں جب بوڑھی انا چڑیلوں اور بھوتوں کے قصے ان بچوں کو سنانے لگتی تھی تو وہ اپنی رضائیوں میں خوف سے کیسے دبک جاتے تھے۔ اور اب کتنی بے دردی سے وہ سب کے سب ذبح کر کر کے جلا دیئے گئے اور زندہ جلا جلا کر ذبح کیے گئے تھے۔ اس کی آنکھیں روتے روتے اب تھک گئی تھیں۔ اور اگر جب اس کا جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر روئے تو اس کی آنکھوں سے بہت مشکلوں سے چند آنسو بہ جاتے، اور اس کے بعد سب سے زیادہ اس کو اپنے آپ پر افسوس آنے لگتا تھا ـــ اس کے سب پیارے جیسے اپنے گھر میں تھے۔ اسی طرح ایک ساتھ جنت میں بھی خوش ہوں گے۔ مگر وہ کتنی بدنصیب تھی۔ اس کو اپنے آپ پر غصہ آ جاتا وہ کنوئیں کی طرف بھاگ کر اب تک کیوں نکل رہی تھی؟ میلے میلے بہت سے لوگوں کے ساتھ اوپر کی منزل میں کمرے کا ایک کونہ اس کو بھی مل گیا تھا یہ

عمارت ایک اسکول کی تھی۔ جس میں دو ہزار سے کچھ زیادہ ہی لٹے ہوئے پناہ گزین ٹھہرائے گئے تھے۔ اس تڑپتی ہوئی زندگی میں وہ یہ بھولتی جا رہی تھی کہ کبھی اس کا نام یاسمین بھی تھا ——— یاسمین . . . . . چنبیلی کا ایک نازک سا پھول۔ اور اب شبراتن، عیدو، بقریدن کی طرح ایک وہ بھی تھی ——— نیچے کھڑی ہوئی ٹرک کے گرد جیسے میلہ سا لگ رہا تھا۔ کپڑا، صابن اور تیل لینے کی پھر وہی چیخ و پکار مچ رہی تھی ——— اور بے چارے ریلیف والے گھبرائے گھبرائے اور چڑچڑائے ہوئے سے ان کی ضرورتوں کی چیزیں انہیں دے رہے تھے ——— کئی بار وہ یہی تماشا دیکھ چکی تھی۔ اس کا جی گھبرا رہا تھا۔ وہ برآمدے کے کٹہرے پر جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔ آج دوسری ٹرک آئی تھی۔ اس پر دوسرے لوگ تھے اور کئی عورتیں بھی ساتھ آئی تھیں۔ جن کے چہرے صاف ستھرے اور شاداب تھے۔ وہ نئے فیشنوں کے پھولے ہوئے بال بنائے ہوئے تھے۔ ان کے کپڑے صاف دھلے ہوئے تھے۔ ٹرک کے اندر بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر اس کو بڑا اچھا لگا بہت دنوں کے بعد اس نے اچھی صورتوں کو دیکھا تھا۔ وہ ٹرک کے اندر آپس میں باتیں کرتے ہوئے ہنس رہی تھیں۔ ان کو دیکھتے دیکھتے اچانک یاسمین کی روح میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس کے کپڑے گندے تھے۔ اس کے بال میلے اور الجھے ہوئے تھے۔ اس کو اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ اتنے دنوں بعد آج اس کو اپنی حالت پر رونا آ گیا ——— اب تک وہ اپنے غموں سے نڈھال بے ہوش پڑی تھی ——— وہ کٹہرے پر اور بھی جھک گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے بے اختیار اس کی آنکھوں سے بہنے لگے ——— "چار نمبر کے کمرہ میں دریچہ کے پاس ——— وہ تمہارا ——— تمہارا ہی بستر ہے نا؟" ——— وہ اپنے اتنے قریب کی آواز سن کر چونک اٹھی ——— "جی ——— جی ہاں . . . . وہ میرا ہی بستر ہے" اس کی روتی ہوئی سرخ آنکھیں شرمندگی سے جھک گئیں۔ اس کے رخساروں پر تیزی سے آنسو بہنے لگے . . . . . . اور اس کی آواز لڑکھڑانے لگی ——— وہ حیرت زدہ اس کو تکنے لگا ——— اس کی اداس اور تھکی ہوئی آنکھوں میں رحم، ہمدردی اور محبت بھر گئی۔ اس کے بازو پر کئی کمبل دھرے تھے۔ مگر وہ چپ تھا۔ جیسے اس کے لبوں پر مہر لگ گئی ہو ——— یاسمین زور زور سے سسکنے لگی۔

"تم . . . . . تم ——— کیوں رو رہی ہو ——— ؟ کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے" ——— ؟ اس نے بڑی مدھم سی آواز میں پوچھا ———

——— "آپ نے۔ آپ نے مجھ سے میرا ——— بستر پوچھا تھا نا؟ ——— اسی پر مجھ کو اپنا گھر یاد آ گیا" وہ اسی طرح ہچکیاں لیتی ہوئی بولی ———

——— "تو یہاں ——— تمہارے ساتھ تمہارا اپنا کوئی نہیں ؟"

"نہیں کوئی بھی نہیں ——— سب کے سب ایک ایک کر کے مارے جا چکے ہیں" ——— اس کی بھیگی ہوئی معصوم نگاہیں اوپر اٹھیں ——— اور اس کی مایوس آنکھوں میں غم کے چھائے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر وہ لرز اٹھا۔ اس کی زبان کتنی شیریں اور صاف تھی۔ وہ غمگین لہجے اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے۔ اس کا چہرہ اور بھی اداس ہو گیا۔ وہ اسی ریلیف کے کاموں کے لیے بہت دور سے آیا تھا ——— لاہور سے ——— بہار کی الم ناکیوں پر ہزاروں دل تڑپ اٹھے تھے ——— بنگال، پنجاب، سندھ، سرحد اور کشمیر نے بھی ان دکھوں اور غموں کو اپنا ہی دکھ سمجھا تھا۔ اور بہت سے لوگ اس درد و غم میں شریک ہونے کو روپے، کپڑے اور دوائیں اور زندگی کی ساری ضرورتوں کے سامان لے کر بہار کے بدنصیبوں کی مدد کرنے آ گئے تھے ——— وہ دو ہفتے سے ریلیف کا کام کر رہا تھا۔ مگر اس کا دل کبھی بھی اتنا نہ دکھا تھا میلے کپڑے، الجھے ہوئے بال اور اتنی پریشان حالی میں بھی یاسمین کا حسن دمک رہا تھا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں زندگی کے نشتر بھرے

ہوئے تھے۔ اور بھولے لبوں پہ کھلی ہوئی حسرتیں دم توڑ رہی تھیں —— اس کے کانوں میں ابھی تک سونے کی ایرینگ پڑی ہوئی تھی اور داہنے ہاتھ کی چھنگلی میں انگریزی ڈیزائن کی ایک سادہ سی انگوٹھی بھی تھی۔

اتنے دنوں کے بعد آج پہلے پہل اس کی نگاہوں میں یاسمین نے اپنے لیے ہمدردی اور پاکیزہ خلوص کا جذبہ دیکھا —— اس کا دل بھر آیا۔ دنیا میں اب اس کا اپنا کوئی بھی نہ تھا۔ پھر وہ نگاہیں اس کی روح کی گہرائیوں میں کیوں اُترتی چلی جا رہی تھیں —— ؟ لیکن وہ یاسمین سے کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا —— اس کے قدم بڑی افسردگی سے اُٹھ رہے تھے۔ جیسے اس کے دل کا سارا بوجھ انہی قدموں پہ آ گیا ہو —— وہ اس کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ سلیٹی رنگ کے پینٹ اور اسی رنگ کے پل اوور میں اس کا دراز قد اور بھی نمایاں لگ رہا تھا —— ابھی —— ابھی وہ اس کو کتنے قریب سے دیکھتی رہی تھی۔ اس کی تھکی تھکی آنکھیں، اس کے اداس سے لب، اور اس کا مرجھایا ہوا چہرہ۔ اس کی وہ غمگین نگاہیں ابھی ابھی اس سے کتنی قریب تر تھیں۔ کبھی وہ یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کوئی اس طرح بلا جھجک اس کے اتنا قریب آ سکے گا! —— غیر ارادی طور پہ اس کی نظر اپنی انگوٹھی پہ چلی گئی تھی —— اسی انگوٹھی نے کیسا کیسا انتظار اس کی آنکھوں میں بھر دیا تھا اور وہ بے تابی سے آنے والے دنوں کی منتظر تھی۔ اس کی شادی کو صرف پندرہ دن باقی رہ گئے تھے۔ گھر میں شادی کی ہماہمی مچ رہی تھی کہ کچھ خوف سائے رینگنے لگے۔ اور پھر ایک قیامت ان پر سے گذر گئی۔ جہاں وہ بیاہ کر جا رہی تھی۔ وہ بستی بھی جلا کر خاکستر کی جا چکی ہے اور اتنے بڑے گاؤں میں سے صرف ایک چودہ برس کا لڑکا دھان کے کھیت میں چھپ کر بچ سکا تھا۔ کارواں کا کارواں جا چکا تھا اور ایک وہی بدنصیب تھی کہ بھٹک کر رہ گئی تھی —— یک بیک اس کی روح میں اک ابال سا اُٹھا۔ کیسے کیسے تصور اس کے دل و دماغ میں جالے بنتے رہے تھے —— اس کی آنکھیں بھی ایسی ہی ہوں گی۔ اس کے بال بھی خون میں لتھڑے جانے سے قبل ایسے ہی چمکیلے ہوں گے نا؟ —— اور اس کے لب؟؟ —— وہ ہمیشہ اس کے لبوں کو سوچتے ہوئے شرما جاتی تھی۔ اس وقت بھی پہلے کی طرح اس کے لبوں کو یاد کرتے ہوئے وہ ٹھٹک گئی —— اور اس کے لب؟ موت کی خاموشی سے پہلے بھی وہ ایسے ہی اداس ہوں گے —— اچانک اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کسی ریلیف ورکر کو نہیں اپنے مستقبل کے اسی روشن آفتاب کو دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں اسی کی تھیں وہ انہی لبوں کو یاد کر کے شرماتی رہی تھی۔ اس کی تھکی تھکی نگاہوں میں محبت تھی، رحم تھا اور ہمدردی تھی۔ بے اختیار اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ جائے۔

رات بھر ٹھنڈی زمین اور بھی ٹھنڈی ہو کر اس کی پیٹھ میں گڑتی رہی۔ وہ ذرا بھی نہ سو سکی۔ دوسرے دن نہ جانے کیوں، اس کی آنکھوں میں انتظار چھا رہا تھا۔ انہی غمناک یادوں سے وہ ابھی تک لپٹی ہوئی تھی۔ مگر اب اس کا جی گھبرا گیا تھا۔ بھیانک موت، دلدوز چیخیں اور خون کی بہتی ہوئی ندیاں۔ اور اسی محور پہ دو مہینے سے اس کی زندگی گھوم رہی تھی، چکرا رہی تھی۔ اس نے اتنے دنوں سے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ دنیا اس قیامت کے بعد ویسے ہی تھی یا کوئی دوسری دنیا بن گئی تھی۔ اور کل پہلی بار جیسے اس کی بے ہوش نگاہیں ہوش میں آئی تھیں۔ اچانک اس کو اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ اس نے اسے بس ایک فقیرنی ہی سمجھا ہوگا نا؟ —— اس بے چارے کو کیا خبر کہ اپنے سجے ہوئے خوب صورت کمروں میں وہ گھنٹوں ایسی ہی آنکھوں، ایسے ہی لبوں اور ایسی ہی محبت سے بھری ہوئی نگاہوں کا کبھی تصور کرتی رہی تھی جب وہ یاسمین تھی —— چنبیلی کا نازک سا پھول —— اور اب؟ اب وہ کون تھی؟ اس کا اپنا دل بھی اپنے کو یقین کرنے کو نہ چاہتا تھا۔ اس نے چاہا کہ اپنی انگلی میں سے انگوٹھی اتار کر پھینک دے۔ وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ دنیا میں اب اس کا کوئی بھی نہ تھا...... پھر یہ کس کی تمنائیں اب اس کے دل میں جاگ رہی تھیں؟ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں —— اور پھر —— اسی محور پر اس کی زندگی گردش کرنے

گئی۔ اس کے پیروں میں پھٹا ہوا چپل تھا اور اپنی میلی سی پھٹی ہوئی ساری کے آنچل میں وہ سمٹ گئی۔ اس کو اپنے سے شدید ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ بڑے پیار سے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو دیکھتی رہی۔ کاش یہ زندہ نہ رہتیں۔ موت! مگر وہ یکدم کانپ گئی۔ کنوئیں کے اندر پھیلی ہوئی لاشیں اس کو یاد آگئیں۔ اور پھر کنوئیں کی سردی اس کی ہڈیوں تک اُتر گئی۔ وہ کٹہرے پر جھکی آسمان کو تکنے لگی۔ اس کو آسمان کا نیلا رنگ بہت اچھا لگا۔ بہت دنوں کے بعد آج اس کو اپنے دل کے اندر ایک نئی زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ہاں — اس کے دل کے اندر ہی تو —! اس کا جسم تو ابھی تک مردہ ہی تھا۔ گندے تعفن میں لپٹی ہوئی ایک سڑی ہوئی لاش ہی تو تھی وہ —! برآمدے میں ہر روز کی طرح بے ہنگم سا شور مچ رہا تھا۔ کئی بچے رو رہے تھے۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا — اور جیسے اس کی نگاہیں تھرتھرا گئیں۔ وہ انہی اداس قدموں سے اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔

—" ریلیف کمیٹی کے سیکرٹری سے کہہ کر آپ کے لیے کچھ کپڑے اور ایک بستر لایا ہوں — آپ کا نام کیا ہے؟ —"
وہ اپنی کاپی پر کچھ لکھتے ہوئے بولا۔ ایک حساس سی خاموشی تھوڑی دیر کے لیے وہاں پر چھا گئی۔ یاسمین نے اپنی بھیگی ہوئی بوجھل پلکوں کو اوپر اٹھایا۔

—"یاسمین" —

"کیا؟"

"یاسمین؟ — اس کی آنکھوں میں حسرت سی بھر گئی — "اور آپ کا مکان کہاں تھا؟" — غم کی موجوں میں یاسمین کی روح ہچکولے کھانے لگی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "تھاڑا" — کاغذ پر چلتے چلتے اس کا قلم رک گیا — "تھاڑا؟ — وہاں تو کوئی بھی نہیں بچا۔ پھر آپ کیسے زندہ رہ گئیں؟"

ایک بے بس سی آہ اس کے لبوں پر تھرتھرا کر رہ گئی — "بہت مشکلوں سے ...... ! کنوئیں میں کود کر — مگر دیکھئے نا کنوئیں کے اندر بھی ہندوؤں نے برچھیوں اور بھالوں سے گھونپ گھونپ کر مجھے زخمی کر دیا تھا" — وہ اپنے ہاتھوں میں زخموں کے داغ دکھاتی بولی۔ "یہ سیپٹک ہو گئے تھے۔ ڈیڑھ مہینہ ہسپتال میں رہی اور اس کے بعد یہاں بھیج دی گئی۔ مگر یہاں سے ہسپتال اچھا تھا" وہ بڑے بھولے پن سے بولی۔

"ہماری پارٹی بھی تھاڑا دیکھنے گئی تھی — وہاں سارے مکان جلے ہوئے ہیں۔ مسجدوں میں ابھی تک خون کی تہیں جمی ہوئی ہیں — اسی جگہ ٹوٹی ہوئی بہت سی چوڑیاں تھیں، اور بے چاری عورتوں کے سر کے بال، لمبے لمبے بال بھی — میں نے سنا ہے۔ کہ چار دنوں کے مقابلہ کے بعد جب مسلمانوں کے پاس ایک بھی کارتوس نہ رہا۔ اور بھوکے پیاسے بے چارے مسلمان بیس بیس ہزار کے جتھوں سے مقابلہ کرتے کرتے تھک گئے تو آخری بار مایوسی میں وہ اس خیال سے مسجدوں میں جمع ہو گئے تھے کہ شاید ہم خدا کے گھر میں بچ جائیں — مگر وہ یہاں بھی نہ بچے۔ ملٹری اور پولیس والوں نے بلوائیوں کے ساتھ مل کر سارے مسلمانوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا اور دشمنوں نے قتل کرنے سے پہلے بے چاری عورتوں کے بالوں پر اپنی کرپانوں کی تیزی آزمائی تھی — اُف — دنیا کی کوئی تاریخ اتنی بزدل اور بھیانک خونریزی پیش نہیں کر سکتی۔ ہٹلر نے بھی اتنے ہیبت ناک خواب کبھی نہ دیکھے ہوں گے"۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک ہلکی سی نمی آ گئی تھی — مگر یاسمین چپ چاپ اس کو تکتی رہی۔ جیسے اس کا سارا اضطراب ختم ہو گیا تھا۔ "وہاں تالاب کے

پاس ایک بہت اُونچا سا سفید مکان بھی آپ نے دیکھا تھا —— ؟

"مکانوں کی صحیح صورت تو اب وہاں کوئی بھی نہیں۔"

"اور وہ وہاں کے کنوئیں؟ آپ نے کچھ اور آدمیوں کو ان میں سے نہیں نکالا؟" وہ اپنے گھر کی باتیں اتنی محبت سے پوچھ رہی تھی جیسے اپنے سسرال میں وہ میکے کی ایک ایک باتیں چھیڑ چھیڑ کر بڑے پیار اور محبت سے دریافت کر رہی ہو۔

"دشمنوں نے سارے کنوئیں برابر کر کے زندوں اور مُردوں کا مدفن بنا دیا ہے۔ آپ کسمت سے بچ گئیں۔"

دم بھر کے لیے ایک تھکی ہوئی اُجڑی سی ہنسی یاسمین کے لبوں پر آئی: "آپ پنجاب سے آ رہے ہیں نا؟"

"یہ آپ نے کیسے جانا؟" اس کی آنکھیں بھی چمک اُٹھیں۔

"یہی آپ کے لہجے اور باتوں سے، ابھی آپ نے جو 'کسمت' کہا تھا نا؟ میں یہ پہلے ہی سے جانتی تھی کہ آپ لوگ 'قاف' نہیں بول سکتے۔" وہ ایک معصوم بچے کی طرح بولی۔

وہ ہنس پڑا: "تو آپ یہی غور کر رہی تھیں؟"

"اور یہ بھی تو کہ آپ ہم بدنصیبوں کے لیے کتنی دُور سے آتے ہیں" —— خلوص اور محبت سے یاسمین کی آنکھیں جھک گئیں وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ جیسے اس کو اپنا خیال آ گیا ہو۔ وہ ایک اُونچے گھرانے کی شریف کنواری لڑکی تھی۔ جس کے تخیل میں بھی کوئی غیر مرد نہیں آ سکتا تھا۔ اور اب، وہ کتنی بے حجابی سے اس سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ بے زاری کی لہریں اس کی روح میں کوندا اٹھیں۔ اب وہ یاسمین نہ تھی۔ سینکڑوں مرد اور عورتوں کے درمیان رہنے والی کوئی دوسری بن چکی تھی۔ غم کے بار سے اب اس کا جی تھک کر بے زار ہو گیا تھا۔ مسلسل دو مہینوں سے وہ ایک بے ہوشی کے عالم میں سوگوار تھی۔ مگر اب اچانک اس کی زخمی زندگی ایک نئی کروٹ لینا چاہ رہی تھی۔ جیسے وہ اپنے غموں سے گریز کر رہی ہو۔ اب تک جو نگاہیں اور لب و رخسار اس کے تخیل میں چھائے رہے تھے۔ ان ہی کی یاد میں اب وہ اس کی آنکھوں میں کشش سی پا رہی تھی جو اس کے غم اور دکھوں میں شریک ہونے کو اتنی دُور سے آیا تھا۔

"تلہاڑا کی مسجد سے ہم لوگوں نے مظلوم شہیدوں کی یادگار، خون سے شرابور کپڑوں کے کچھ ٹکڑے، ٹوٹی ہوئی چوڑیاں۔ اور کٹے ہوئے کھوپڑے سے بال رکھ لیے ہیں۔ ہم ان چیزوں کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھیں گے۔ معصوم شہیدوں کی آخری یادگاریں۔"

"تو پھر —— میری چوڑی —— اور میرے سر کے بال بھی ہوتے آپ کے پاس؟ —— میں کیوں بھاگ گئی تھی بچنے کو" —— وہ بے اختیار بول اُٹھی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے۔ وہ دوسرے کٹہرے سے لگ کر کھڑا تھا، اس کی معصوم نگاہیں یاسمین کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اسی وقت یاسمین نے اس کو دیکھا وہ کتنا دل کش نظر آ رہا تھا۔

روزانہ کسی نہ کسی بہانے وہ اس کے پاس ضرور آتا۔ یاسمین کی نگاہوں نے جب سے اس کو دیکھا تھا جیسے اک گونہ سکون اس کو مل گیا تھا۔ وہ ایک دم بے سہارا نہ تھی۔ کسی کا دل اس کے لیے پریشان تھا۔ اس کی جگہ اب بدل دی گئی تھی۔ گیلری میں ایک صاف ستھری جگہ دیتے ہوئے اس نے کہا تھا —— "آپ میرے ساتھ کیوں نہیں چلتیں پنجاب" —— تو وہ ہنس پڑی تھی۔ ایک محزون اور دل دوز سی ہنسی اور اسی ہنسی کے ساتھ اس کا دل کانپ اٹھا تھا —— "کسی کے ساتھ چلے جانا، کتنی بُری سی بات تھی؟" مگر پھر بھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اکیلی نہ رہے۔ کیمپ کے اندر اتنے شور اور ہنگاموں سے اس کی طبیعت پریشان ہو جاتی تھی —— اور ایک عجیب سی خلش انتظار بن کے

اس کی روح پر چھا جاتی۔ جب کبھی اس کے آنے میں دیر ہونے لگتی تو وہ اس طرح بے کل ہو جاتی۔ جیسے اس کی زندگی بھر کا سرمایہ ہمیشہ کے لیے لٹ رہا ہو —— کبھی ادھر دیکھتی، کبھی ادھر تکتی۔ چھپی چھپی نگاہوں سے ہر طرف اُسے ڈھونڈتی۔ بہانے کر کر کے نیچے جھانکتی —— مگر تب بھی وہ اتنی بُری نہ ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ پنجاب چلی جاتی —— اس کے دل و دماغ میں عجیب عجیب سے جوار بھاٹے اُٹھتے، اور اس کی روح میں بغاوت کا ایک طوفان سا چیخنے لگتا —— وہ خدا —— اور اس کی دنیا دونوں سے باغی ہو جانا چاہتی تھی —— اتنی مختصر سی زندگی میں اس نے کیا کیا تھا؟ جس کی وہ سزاوار تھی؟ اپنی بے کسی کو دیکھتے ہوئے اس کو اپنے عزیزوں پر غصہ آجاتا۔ جو اس کے خیال میں شہید ہو کر آرام سے جنت میں بیٹھے تھے —— اور اکیلی وہ بے چاری حوادث زندگی کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ طوفانی تھپیڑے اسے زندگی اور موت کے درمیان بھیانک پینگیں دے رہے تھے —— کاش وہ ڈوب ہی جاتی —— موت سے بھی زیادہ ٹھنڈے اور تاریک دلدل میں سے احمد کے ہاتھوں نے اُسے نکالا تھا۔ جب وہ اس کے ہاتھوں کو دیکھتی۔ تو اس کا جی بے اختیار چاہتا کہ احمد کے ہاتھوں کو تھام لے، ہنستے وقت احمد کی آنکھوں کا ہلکا بھورا رنگ کتنا چمک اٹھتا تھا۔ اس کے لبوں کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا جیسے ہر گھڑی ان پر کوئی نامکمل افسانہ مچلتا رہتا ہے۔ اور اس کے لب پر اُگی ہوئی ہلکی سیاہی مائل قرینہ سے کٹی ہوئی وہ کانٹوں کی باڑ —— یاسمین کو سب سے زیادہ پسند تھی، جیسے ڈونڈے کی پتی کسی گلاب کی حفاظت کر رہی ہو —— اور کبھی کبھی تو اس کا جی بے اختیار چاہتا کہ وہ قریب سے اُس گلاب کی خوشبو سونگھ لے، یہ سوچتے ہوئے وہ شرما جاتی، اس کی بھابی نے ایسی بہت سی باتیں اس سے سرگوشی میں کہی تھیں اور جن نگاہوں کا انتظار کرتے کرتے وہ تھک گئی تھی۔ اب وہ اچانک احمد کی آنکھوں میں جھلک رہی تھیں۔ اس کے رخسار دیکھنے میں ریشم کی طرح نرم لگتے تھے جن کو دیکھتے ہی اس کو اپنا وہ ساٹن کا تکیہ یاد آجاتا جسے اپنے رخساروں کے نیچے رکھ کر سوتے ہوئے اس کو بہت اچھا لگتا تھا۔

اُوپر گیلری میں چھوٹے چھوٹے ڈسکوں پر بیٹھے ہوئے جب وہ نیچے دیکھتے تو بڑے ہال میں اتنے کلبلاتے ہوئے پناہ گزینوں کو دیکھ کر بعض دفعہ انہیں یقین نہیں ہوتا کہ یہ بھی انسان ہیں، سارے لوگ اس ریلیف ورکر کو جانتے تھے اور اس نے سب سے یہ کہہ دیا تھا کہ یاسمین اس سنٹر میں عورتوں اور بچوں کی انچارج بنائی جانے والی ہے۔ اسی لیے وہ یاسمین کو اس کے کام سمجھایا کرتا ہے۔ اور سچ مچ اس نے یاسمین کو یہاں کا انچارج بنوا دیا تھا —— احمد کے ساتھ کئی بار ریلیف ورکر خواتین اور خود عورتوں کی لیڈر مسز احسان یاسمین سے ملنے اور اس کے حالات پوچھنے کو آچکی تھیں۔ اُن سبھوں نے یاسمین کو کسی پرائیویٹ مکان میں لے جانا چاہا۔ مگر وہ نہیں گئی۔ اس کو اس گندے کیمپ کے ایک ایک حصے سے محبت ہو گئی تھی۔ یہاں ہر جگہ اس کی محبت کے نقوش اُبھر گئے تھے۔ اور وہ ان سہاروں کو چھوڑ کر کہاں چلی جاتی؟ ——

احمد نے ایک دن یاسمین سے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ اس کو کبھی نہ بھولے گا۔ بہار کی سب سے گہری یاد اسی کی تھی اور ویسے بھی بہار کی گزری ہوئی گھڑیاں اس کو ہمیشہ یاد آتی رہیں گی۔ اس کا جی بھی کچھ کہنے کو چاہتا رہا۔ مگر اس کے لب جیسے ساکت ہو گئے تھے دوسرے دن وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ مگر سارا دن گزر گیا۔ اور وہ نہ آیا —— رات کو اچانک وہ ایک خوب صورت سا نرم کمبل لیے اس کے پاس ٹھیر گیا۔

"میں واپس جا رہا ہوں یاسمین دیکھو یہ تار آیا ہے، میری ماں کو دل کے دورے پڑ رہے ہیں۔ اور اتنی دور لاہور میں وہ مجھے بلا رہی ہیں" اس کی آواز کانپ رہی تھی —— "ہر روز تمہیں سردی لگتی ہے نا؟ اپنا کمبل تمہارے لیے لیتا آیا ہوں" —— اس کے الفاظ

زرد گلاب

کونسی وادی میں ہے کونسی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا، قافلۂ سخت جاں
(اقبالؔ)

اے حمید

شروع نومبر کی ایک ابر آلود شام،

قصبہ ہری ناگ میں بارش ہو رہی ہے۔ ہلکی ہلکی، سرد، ویران اور اداس بارش میں قصبے کی اونچی نیچی تنگ و تاریک پتھریلی گلیاں سنسان دکھائی دے رہی ہیں۔ ان گلیوں کے کونوں پر جلنے والے پُراسرار لیمپ کچھ بجھ گئے ہیں، اور کچھ جلتے ہوئے ٹھٹھرتی ہواؤں میں کانپ رہے ہیں۔ بڑے بازار کی تمام دکانیں بند ہیں۔ اور اُن کے جھکے ہوئے زنگ آلود سائبان جگہ جگہ سے ٹپک رہے ہیں۔ منڈی کا صحن بارش اور کیچڑ میں دلدل بنا ہوا ہے۔ صحن کے اِرد گرد چھوٹی چھوٹی کچی کوٹھڑیوں میں کہیں دن بھر کے تھکے ماندے مزدور پھٹے ہوئے کھردرے کمبل اوڑھے سو رہے ہیں اور کہیں گیس کی روشنی میں زرد چہروں والے بیوپاری تجوریوں کے سامنے کھاتہ کھولے حساب کتاب میں مصروف ہیں۔ نیچی چھت والی پرانی غلام گردش میں ایک خستہ جان گھوڑی، دو بیل اور ایک بھینس بندھی ہے، ان کے پاس ہی ادھیڑ عمر کا چوکیدار آگ جلائے بیٹھا سرخ کُنالی میں آٹا گوندھ رہا ہے۔ تیز ہواؤں میں چیڑ کی مرطوب کھپچیاں صرف کڑوا دھواں دے رہی ہیں۔ چوکیدار کی ناک سردی میں ٹھٹھر رہی ہے۔ اور اس کی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ صحن والے نیم کے پیڑ تلے ایک ریڑھا اپنے دونوں بازو اُوپر اٹھائے نومبر کی بارش میں بھیگ رہا ہے۔ بستی کے جنوب میں مغلیہ عہد کی یادگار اُجڑی ہوئی، پرانی خستہ حال حویلیوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے۔ کچھ حویلیاں ڈھے چکی ہیں اور ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جو باقی بچی ہیں ان کے گھٹے ہوئے بدبودار تاریک دیوان خانوں میں ضلع رہتک اور ریاست الور کے مہاجرین آباد ہیں۔ حویلیوں کی سیلی سیلی کمزور چھتیں جگہ جگہ سے ٹپک رہی ہیں اور ضلع رہتک اور ریاست الور کے مہاجرین اپنی گدڑیاں اٹھائے کبھی یہاں بیٹھ رہے ہیں اور کبھی وہاں اُٹھ رہے ہیں، ان کے کالے کالے بچے روئی کی پھٹی ہوئی صدریوں میں زور زور سے رو رہے ہیں اور اُن کی زرد آنکھوں والی مائیں انھیں مار پیٹ رہی ہیں۔ اور ان کے دُبلی پتلی ٹانگوں والے خاوند انھیں گالیاں دے رہے ہیں اور بکریاں۔

ممیا رہی ہیں اور کہیں کانسی کی لوٹیا لڑھک کر نیچے گر پڑی ہے اور کہیں گرم گرم نمدے میں سوئی ننھی روکلیا پر پھر بارش کا پانی ٹپکنے لگا ہے۔ اور وہ روتی ہوئی ماں کو پکار رہی ہے۔ اور کونے میں بیٹھا ہوا ایک ہڈیوں کا ڈھچر اونٹ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، سُن رہا ہے اور بڑے اطمینان سے جگالی کر رہا ہے۔

اِن حویلیوں سے پرے جوار کے کھیتوں کے پار، نہر کے سنسان پُل پر سیٹیاں بجاتی ٹھنڈی ہوا شیشم کی جھکی ہوئی ٹہنیوں کو جھولا جھلا رہی ہیں۔ نہر لبالب بھری ہوئی ہے اور اُس کا گیروے رنگ کا پانی کناروں سے اُچھل کر باہر آ رہا ہے، آسمان گہرے سرمئی بادلوں میں چھپا ہوا ہے۔ نہر کی پرلی جانب ٹوٹی پھوٹی پرانی چار دیواری کے اندر آم کے درختوں میں گھری ہوئی ایک بارہ دری ہے۔ اس بارہ دری میں مغل دربار کی کوئی گمنام کنیز دفن ہے۔ بارہ دری میں چاروں طرف سے مینہ کی پھوار اندر آ رہی ہے۔ آم کی لٹکتی ہوئی ٹہنیاں بارہ دری کے ستونوں سے اپنا آپ جھاڑ رہی ہیں۔ قبر کے پتھروں پر کائی جم رہی ہے۔ اور کہیں گھاس اُگ آئی ہے ابھی ابھی بجلی چمکی تھی۔ اور اس کی نیلی روشنی میں ہری ناگ کے قصباتی سٹیشن کو جانے والی کیچڑ سے بھری ہوئی دلدلی سڑک دُور تک روشن ہو گئی تھی۔ یہاں سے سٹیشن سات کوس کے فاصلے پر ہے۔ ہری ناگ سٹیشن کے اُکھڑے اُکھڑے فرش والے چھوٹے پلیٹ فارم پر دن میں صرف دو ریل گاڑیاں رُکتی ہیں۔ یہاں کا سٹیشن ماسٹر ٹکٹ چیک بھی کرتا ہے اور بانٹتا بھی ہے۔ وہ صرف گاڑی کے وقت پلیٹ فارم پر نیلی ٹوپی پہنے موجود ہوتا ہے۔ باقی سارا وقت وہ اپنے کوارٹر میں بیوی کی ران پر سر رکھے فلمی گانوں کے پلاٹ پڑھتا رہتا ہے۔ اور مدھوبالا کو یاد کرتے ہوئے اپنی بیوی کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے۔ اور پلیٹ فارم کے دھندلے لیمپ تمام رات ٹمٹماتے رہتے ہیں۔

قصبہ ہری ناگ بڑی پرانی بستی ہے۔ کہتے ہیں مغل شہنشاہوں کا شاہی قافلہ کشمیر جاتے ہوئے یہیں سے گذرا کرتا تھا۔ جموں کی طرف جانے والی اس پرانی سڑک کے آثار آج بھی کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ ہری ناگ کے مشرق میں پرلے کھال پر جھکا ہوا نیچی چھت والا بوسیدہ پُل، ذرا آگے جا کر نانک شاہی اینٹوں والا پرانا کنواں اور آدھا گرا ہوا مینار، اور دور تک سڑک کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی ٹوٹی پھوٹی دیوار، اور اِدھر اُدھر کھیتوں میں پھیلے ہوئے اگلے وقتوں کے محرابی کھنڈرات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کبھی یہاں سے بھی وہ رنگ اور خوشبو اُڑاتے قافلے گذرا کرتے تھے، جن میں شہزادے آسام کے دیو پیکر ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے اور لمبی آنکھوں اور پتلے ہونٹوں والی شہزادیوں کے ابریشمی محمل پھٹے ہوئے سیاہ پاؤں والے حبشیوں نے اٹھا رکھے ہوتے تھے۔ آج اس سڑک پر سوائے کھنڈرات اور ویران حویلیوں کے اور کچھ باقی نہیں رہا۔ لیکن اس سڑک سے ہٹ کر یہ شاہی قافلے اُسی طرح رواں دواں ہیں۔ شہزادے دیو پیکر ہاتھیوں پر سوار گلاب کے پھولوں کو بار بار سونگھ رہے ہیں۔ اور سیاہ فام ننگے حبشی برستی چابکوں میں نازک اندام شہزادیوں کے محمل اٹھائے پتھریلی شاہراہوں پر دوڑے چلے جا رہے ہیں، ہانپتے چلے جا رہے ہیں۔ صرف سڑکیں بدلی ہیں۔ صرف راستے تبدیل ہوئے ہیں۔ باقی وہی ہے۔ سب کچھ وہی ہے۔ ہر روز ایک انارکلی زندہ دفن کی جاتی ہے اور ہر رات شاہی محلوں میں جشن ہوتا ہے، اور ہر صبح ایک مسیحؑ سولی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

بادلوں میں دھیمی دھیمی گرج پیدا ہوئی ہے۔

بارش کچھ تیز ہو گئی ہے۔ جموں کی پہاڑیوں کے دامن میں ہونے کی وجہ سے ہری ناگ میں بارشیں بہت ہوتی ہیں اور سردی بھی بہت پہلے آ جاتی ہے۔ حالانکہ یہاں کوئی پہاڑ نہیں۔ صرف میدان ہیں۔ بے رنگ چپٹے میدان اور کھیت، کچی سڑکیں،

ٹیڑھی میڑھی پک ڈنڈیاں اور گندے پر سکون سبز جوہڑوں میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے بوسیدہ چھجوں والے مکان، کائی زدہ گنبدوں اور میناروں والی دو ایک پرانی مسجدیں، قصبے سے باہر ٹیلے کے پاس نہر کنارے کی پن چکی، چھوٹی سی منڈی، ایک بازار، کچھ اونچی نیچی پتھریلی گلیاں، چند ایک مزار گرے ہوئے چھجے والا چونگی کا دفتر، پرانے بنچوں اور دیمک لگی میز کرسی والا تھانہ اور نعل ساز کی دکان اور پرانی بارہ دری کے پاس پرانی طرز کا چائے خانہ اور دھوپ، بارش، سردی اور بس۔ قصبہ ہری ناگ میں گھومتے ہوئے آدمی کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ انیسویں صدی کے کسی مغلئی گاؤں میں آگیا ہے۔ یہاں کشمیریوں کے کئی ایک گھرانے آباد ہیں۔ یہ لوگ کہیں پندرھویں سولھویں صدی میں کشمیر کی وادیوں سے ہجرت کر کے قصبہ ہری ناگ میں آباد ہو گئے تھے۔ اور تب سے اسی جگہ ہیں۔ تقسیم سے پہلے یہ لوگ رفوگری، شال بافی، زردوزی، شالوں کی رنگائی اور پشمینے کی خرید و فروخت کا دھندا کرتے تھے اور سال میں چھ ماہ گھر سے باہر بنگال، بنارس اور لکھنؤ میں گزارتے تھے۔ لیکن تقسیم کے بعد ان کا کاروبار بالکل تباہ ہو گیا۔ چنانچہ کسی نے کوئی چکی الاٹ کروالی۔ کسی نے ڈپو کھول لیا۔ کسی نے شہر میں کٹ پیس کی دکان کھول لی اور کوئی محض پرانے دنوں کی یاد میں آہیں بھرنے کے لیے گھر میں بیٹھ گیا۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی روایات اور وضعداری ہاتھ سے نہ چھوڑی تھی۔ ان کے گھروں میں آج بھی رات کو چاول اُبلتے تھے اور صبح کو نمکین چائے پکتی تھی۔ اور چولہے میں سارا دن آگ جلتی رہتی تھی۔ تہواروں پر اُسی طرح پکوان پکتے تھے۔ اور سردیوں میں ہر تیسرے روز شب دیگ چڑھتی تھی اور رش مالو کا دن منایا جاتا تھا۔ ان کے گھروں میں آنے والے مہمان کے سامنے آج بھی سبز چائے کا سماوار، باقرخانیاں اور شیرمال اسی طرح رکھا جاتا تھا اور میزبان عورتیں مہمان کو بار بار کہتیں۔ ہائے آپی کھاؤ نا! یہ بھی لو، وہ بھی ذرا چکھو نا!

مگر یہ باتیں بیشتر کشمیری گھرانوں میں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ اور پہاڑ کی چوٹی پر سے لڑھکے ہوئے پتھر کی طرح ہر ٹھوکر کے ساتھ روایات کی کرچیں ہوا میں اڑتی جا رہی تھیں۔ اس کے باوجود کچھ گھرانے ان روایات کو بحال رکھنا مذہبی فرض سمجھتے تھے، اور وہ ہر قیمت پر اپنی وضعداری نبھائے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ صرف اپنے کلچر کے لیے زندہ ہیں اور اپنے کلچر کے لیے مر جائیں گے۔ ان ہی میں ایک گھرانہ میر غلام حسن شاہ ہائی کورٹی کا بھی تھا۔ اس خاندان کو ہائی کورٹی اس لیے کہتے تھے کہ میر غلام حسن شاہ کا پردادا کلکتہ ہائی کورٹ کا سب جج رہ چکا تھا۔ وہ اپنے سوداگر باپ کے ساتھ بنگال کاروبار سیکھنے گیا تھا۔ کہ اس نے قانون پڑھنا شروع کر دیا اور وہیں پریکٹس شروع کر دی اور اپنی طبع زاد ذہانت اور خداداد صلاحیت کے باعث ترقی کرتے کرتے سب جج کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا بھی باپ کے نقش قدم پر چلا لیکن بیرسٹری سے آگے نہ پہنچ سکا۔ اب یہ خاندان پشمینے کی سوداگری چھوڑ قانون پڑھنے لگا۔ میر غلام حسن شاہ کے والد وکالت میں بری طرح ناکام رہے اور آپ نے پھر وہی پرانا دھندا شروع کر دیا۔ میر غلام حسن کلکتہ میں پڑھا کرتے تھے۔ ایم اے کرنے کے بعد آپ نے ایل۔ ایل۔ بی کیا اور باپ کی طرح آپ بھی وکالت میں ناکام رہے لیکن ناکامی کے بعد آپ نے کاروبار میں پھنسنا گوارا نہ کیا اور آئی سی ایس کے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی۔ آپ نے اس امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور آپ کو لیگل ریمیمبرنیس میں ایک شایانِ شان عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ آپ نے اپنی ملازمت کا پورا عرصہ کلکتہ، کان پور، الہ آباد، لکھنؤ اور مدراس میں گزارا اور ریٹائر ہو کر قصبہ ہری ناگ پہنچے ہی تھے کہ ملک میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑ لیا اور ایک سال بعد فسادات شروع ہو گئے اور پھر ملک تقسیم ہو گیا۔ اب پنشن کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پریوڈنٹ فنڈ کا جھگڑا چار سال تک چلتا رہا۔ ادھر پرانے خاندان کے رکھ رکھاؤ میں فرق آگیا تھا۔ دونوں بڑی لڑکیاں سعیدہ اور زبیدہ

بی۔ اے کرنے کے بعد گھر آن بیٹھی تھیں۔ چھوٹی لڑکی رضیہ کو ایف۔ اے کے دوسرے سال میں ہی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑ گیا تھا۔ ادھیڑ عمر باپ کے دو جوان بیٹے فوت ہو گئے تھے۔ اور وہ جوان بیٹیوں کی شادی کی فکر میں تھا۔ بنک میں جو جمع پونجی تھی ختم ہو رہی تھی۔ قصبے کی میونسپلٹی کی خالی خولی صدارت ملی ہوئی تھی۔ کپڑے کے ایک کارخانے میں معمولی سا حصہ بھی تھا۔ لیکن سُوت نہ ملنے سے کارخانہ ایک دن چلتا تھا اور تین دن بند رہتا تھا۔ اور کچھ میر غلام حسن شاہ ہائی کورٹی ویسے بھی لوگوں کو اپنی آن بان دکھانا چاہتے تھے۔ پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ دور کی بات تھی۔ آپ نے اپنی بیگم کو پرانا قدیمی مکان گروی رکھنے کا مشورہ دیا۔ پرانی طرز کی نجیب الطرفین کشمیری عورت نے مکان گروی رکھنے سے منع کیا۔ لیکن میر صاحب راضی نہ ہوئے۔ مکان گروی رکھ کر کاغذات پر دستخط کر کے آپ گھر لوٹے ہی تھے کہ پراویڈنٹ فنڈ کے پاکستان پہنچنے کی چھٹی آ گئی۔ بیگم نے کہا۔

مکان چھڑا لائیے، میر صاحب نے فوراً جواب دیا۔

ضرور چھڑا لائیں گے۔ میں کل ہی شہر جاؤں گا،

لیکن رات نے کچھ ایسے خواب دکھلائے کہ مکان چھڑانے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ چنانچہ نومبر کے یہ بھیگے ہوئے ٹھٹھرتے وہ دن تھے جب میر غلام حسن شاہ ہائی کورٹی کے قصبہ بیری ناگ والے پرانے حویلی نما گھر میں زبیدہ اور سعیدہ کے بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔
——— اور آسمان کو سیاہ بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور بوندیں پڑ رہی تھیں۔

یہ پرانا حویلی نما مکان آبادی سے ہٹ کر واقع تھا۔

اس کے سامنے سے چھوٹی سی ندی گذرتی تھی اور عقب میں زنگ آلود دیواروں پر عشق پیچاں اور گلاب کی جنگلی بیلیں جھکی ہوئی تھیں اور سیبوں کا ایک پرانا باغ تھا۔ مکان کے صدر دروازے کی دہلیز گھاس میں چھپ گئی تھی اور دوسری منزل کے تمام کمرے بند تھے۔ ان پر اسرار بند کمروں میں دیواروں اور روشندانوں پر گرد کی تہیں جم رہی تھیں۔ قدآدم آئینوں پر جالی دار پردے لٹک رہے تھے۔ اٹھارویں صدی کا کرم خوردہ فرنیچر بھورے رنگ کی موٹی چادروں میں ڈھکا ہوا تھا———

کونوں میں ڈھیر لکڑی کے بوجھل صندوق الم غلم سامان سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے اوپر جالا لٹک رہا تھا۔ لمبے چوڑے گرد آلود پلنگوں پر خاندان کے بڑے بزرگوں کی تصاویر اوندھے منہ پڑی تھیں اور اُن کے نیچے ٹڈیوں نے انڈے ونڈے دے رکھے تھے۔

اندھیری راتوں کو جب تیز زمستانی ہوا کے جھونکے روشن دانوں اور بند کھڑکیوں کی درزوں میں سے اندر داخل ہوتے تو دیواروں پر گرے ہوئے پردے آہستہ سے پھڑپھڑاتے اور محسوس ہوتا گویا اِن ویران کمروں میں عہدِ پارینہ کی گم شدہ روحیں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ یہ کمرے مدتوں سے بند پڑے تھے اور ان میں کبھی کوئی داخل نہ ہوا تھا۔ وقت کا سیلاب، ان گمنام قبروں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ پہلی منزل کی اونچی چھتوں نقدی دیواروں اور موٹے گرم قالینوں سے ڈھکے ہوئے فرشوں والے کمروں میں زندگی اور صفائی اور روشنی تھی۔ یہ کمرے صاف ستھرے، قیمتی اور بوجھل سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ یہاں دروازوں پر گہرے قرمزی رنگ کے بھاری پردے لٹک رہے تھے۔ اور اُن کے پٹ کھلتے وقت کوئی آواز نہ دیتے تھے۔ وہ یوں نرمی سے کھل جاتے جیسے آنے والے کو خاموشی سے اندر داخل ہونے کا مشورہ دے رہے ہوں۔ یہاں کی فضا میں خواب آمیز پُر اسرار تن آسانی رچی ہوئی تھی اور ان کمروں میں

داخل ہو کر آدمی کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ برفباری کی رات میں گرم گرم خوشبو دار قہوے کا خواب دیکھ رہا ہو۔ جیسے وہ ٹھٹھرتی یخ بستہ تیز ہواؤں میں سے گزر رہا ہو اور کسی نے اسے نیم گرم ٹی کوزی میں چھپا لیا ہو۔ جیسے وہ سماوار میں داخل ہو گیا ہو۔ اس پرانے حویلی نما مکان کا ہر کمرہ سماوار کی طرح پُرسکون، نیم گرم اور معتدل تھا۔ اور ایسی فضا میں پرورش پانے سے گھر کے ہر فرد میں جذبات کا اعتدال اور آہنگ پایا جاتا تھا۔ یہاں کبھی کوئی آپس میں رشتہ داریوں کے موضوع پر نہیں جھگڑا تھا۔ یہاں کبھی کسی نے غصہ میں سُرخ ہو کر دوسرے پر کفگیر یا جلتی ہوئی لکڑی سے حملہ نہیں کیا تھا۔ یہاں کبھی کسی بچے کے ایک دم تیز تیز رو پڑنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ یہاں کے مکین سرِ شام کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے اور لیمپ بجھا دیئے جاتے تھے۔ صرف مکان کی پشت پر باورچی خانے کا لیمپ جل رہا ہوتا تھا۔ جہاں بوڑھی خادمہ اپنی بیٹی لاتی کی مدد سے برتن صاف کر رہی ہوتی تھی۔ پو پھٹے جب بستی کی طرف سے مرغوں کے اذانیں دینے کی صدائیں آتیں تو اس حویلی نما مکان کے ویران آنگن سے کوئی مُرغ جواب میں اذان نہ دیتا۔ بند کھڑکیوں کے اندر اور باہر ٹوٹتی رات کے آخری سائے چُپ چاپ مدغم ہوتے رہتے اور لیموں کے باغ میں پیڑوں کی ٹہنیوں پر سے شبنم ٹپکتی رہتی اور پھر باورچی خانے کی چھت سے لٹکتے ہوئے لیمپ کو دیا سلائی دکھائی جاتی۔ تیل کے لیمپ کی دھیمی دھیمی نرم روشنی میں خادمہ کی بیٹی لاتی آگ جلاتی۔ چاء کے لیے پانی رکھتی اور الماری میں سے چینی کے برتنوں کو نکال کر صاف کرنا شروع کر دیتی۔ بستی کی مسجدوں کے میناروں پر دن کی روشنی کا پھیکا اُجالا جھلکتا تو بوڑھی خادمہ سعیدہ میر، زبیدہ میر اور رضیہ میر کے کمروں میں جا کر انھیں بڑی نرمی اور پیار سے باری باری جگاتی۔

‘اُٹھیے آپی۔ صبح ہو گئی،’

سب سے آخر میں وہ گھر کی مالکہ بڑی آپو کی خواب گاہ کا دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹاتی۔

‘آپو جی اذان ہو گئی’

چالیس پینتالیس سال کی ادھیڑ عمر، سرخ و سپید مالکہ بڑے وقار سے اپنا بھارا نبوں ایسا بوجھل جسم لیے ریشمی، نرم اور گرم لحاف میں سے باہر نکلتیں۔ غسل خانے میں وضو کے لیے پانی گرم ہوتا۔ وضو کرنے کے بعد وہ نماز پڑھتیں اور نماز کے بعد وہیں مصلے پر تلاوتِ قرآن پاک میں مصروف ہو جاتیں۔ تلاوت کے وقت ان کے چوڑے اور بارُعب چہرے پر طلوعِ صبح ایسی مقدس روشنی پھیل جاتی۔ ان کے سیاہ و سپید بال پیشانی تک سفید شال میں ڈھکے ہوتے اور ان کے لب بند ہوتے اور جسم بے معلوم انداز میں جھول رہا ہوتا۔ اتنی دیر میں میر غلام حسن شاہ بھی نماز سے فارغ ہو جاتے اور لمبا گرم کوٹ پہن، سُرخ ترکی ٹوپی سر پر رکھ، چھڑی ہاتھ میں لے سیر کے لیے باہر نکل جاتے۔

سب سے بڑی بہن زبیدہ نماز سے فارغ ہو کر اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھ کر تلاوت میں مصروف ہو جاتی۔ لیکن سعیدہ بار بار جگانے پر بھی نہ اُٹھتی، اس کے سرخ و سپید خواب آلود چہرے پر بالوں کی لٹ بکھری ہوتی اور وہ ایک ٹانگ لحاف سے باہر نکالے ریشمی تکیے کو پیٹ کے ساتھ بھینچے ایک آدھ بار کچھ بڑبڑاتی اور ٹانگ لحاف کے اندر لے جا کر پھر سو جاتی۔

جب با دلِ نخواستہ اُسے اٹھنا ہی پڑتا تو وہ پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھ جاتی اور لحاف میں سے گرم شال کھینچتے ہوئے بار بار جمائیاں لینے لگتی۔ وہاں سے اٹھ کر لڑکھڑاتے، بے ربط قدم اُٹھاتی سنگار دان کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی اور آئینے پر جھک کر چہرے پر پھیلے ہوئے مہاسوں اور کیلوں کا جائزہ لینا شروع کر دیتی۔ وہ ہر رات بے شمار کریمیں لگا کر سوتی تھی اور ہر صبح گالوں پر کوئی

نہ کوئی نیا کیل نکلا ہوتا تھا۔ اسے اپنے اچھے بھلے چہرے کی اس بدنمائی کا شدید احساس تھا اور وہ بہت کم آئینے کے سامنے ہوا کرتی تھی۔

بوڑھی خادمہ جب رضیہ کے کمرے میں داخل ہو کر اس پر آہستہ سے جھک کر سرگوشی ایسی آواز میں کہتی۔

'چھوٹی آپی! اٹھو بیٹی......'

تو رضیہ اپنی نیند بھری بھیگی بھیگی سیاہ آنکھیں کھول دیتی۔ جیسے وہ پہلے ہی سے جاگ رہی ہو۔ اور وہ سوچتی کیا وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی؟ کبھی کبھی خادمہ کے جگانے پر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پہلے ہی سے جاگ رہی ہو۔ جب سے پیدا ہوئی ہو تب سے جاگ رہی ہو اور کبھی نہ سوئی ہو۔ بوڑھی خادمہ لحاف اچھی طرح تہہ کرتے ہوئے کہتی۔

'میری بچی رضیہ تو سوتی ہی نہیں'

لیکن رضیہ ضرور سوتی تھی۔ دن کے وقت سوتی تھی۔ جاگتے ہوئے، باتیں کرتے، کھاتے، سوچتے، چائے پیتے، کتاب پڑھتے اور کھڑکی میں سے باہر باغ میں دیکھتے ہوئے سوتی تھی۔ ہمیشہ سوئی رہتی تھی۔ اسے کبھی کبھی شبہ ہونے لگتا کہ وہ کبھی جاگی بھی ہو۔ بچپن ہی سے اس کا جسم کمزور، دبلا اور نازک تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ہمیشہ بیمار رہی تھی۔ اور ڈاکٹروں کی کڑوی دوائیاں پیتی رہی تھی۔ مسلسل بخار میں مبتلا رہنے سے اسے موت سے ڈر آنے لگا تھا اور زندگی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ خواب کے عالم میں رہنے لگی تھی۔ وہ قدرتی طور پر تنہائی پسند تھی اور اسکول میں اپنی ہم عمر سہیلیوں سے بہت کم ملتی تھی۔ اسے ہر سہیلی صحت مند، خوبصورت اپنے سے زیادہ خوش قسمت معلوم ہوتی تھی اور وہ کسی سے گھل مل نہ سکی تھی۔ اس نے خیال ہی خیال میں اپنی چند ایک سہیلیاں بنا رکھی تھیں، جن سے وہ تنہائی میں باتیں کیا کرتی۔ اسکول سے گھر آ کر وہ اپنے کمرے میں جا کر چپ چاپ کھڑکی کے پاس کورس کی کتاب کھول کر بیٹھ جاتی اور خواب دیکھنے شروع کر دیتی۔ پھر ایکا ایکی وہ چونک کر فیل ہو جانے کے ڈر سے کتاب پڑھنے لگتی۔ رات کو ان کی پرانی خادمہ اسے باورچی خانے میں لیمپ کی دھیمی روشنی میں پریوں اور بھوتوں کی کہانیاں سنایا کرتی۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹتے ہی رضیہ کو کہانی کی پریوں کا خیال بھول جاتا اور وہ بھوتوں کے خوفناک تصور سے ڈرنے لگتی اور جلدی سے لحاف منہ کے اوپر کر لیتی۔ پھر اسے اپنے پرانے حویلی نما مکان کے گرد آلود ویران کمروں کا خیال آتا اور وہ دیکھتی کہ ان کمروں میں ایسی بدصورت چہروں والی کبڑی عورتیں چکر لگا رہی ہیں جن کے چہروں پر مکڑیوں نے جالے بن رکھے ہیں اور اس کا جسم خوف سے ٹھنڈا ہو جاتا۔ وہ بھاگ کر اپنی خیالی سہیلیوں کے پاس پہنچ جاتی اور ان کی باتوں میں خود کو بھلا دیتی۔ بچپن ہی سے رضیہ ذہنی طور پر الجھی ہوئی تھی۔ دن بھر وہ اسکول اور گھر میں خود فراموشی کے عالم میں وقت گزارتی۔ وہ بات کرتے کرتے فقرہ بھول جاتی اور غسل خانے میں ٹونٹی کھول کر نہانا بھول جاتی۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کی یہ تمام ذہنی الجھنیں ترقی کرتی گئیں اور گھر کی خاموش، جامد اور پراسرار فضا نے ان الجھنوں کی زیادہ سے زیادہ پرورش کی۔ اب وہ کالج میں آ گئی اور یہاں بھی منجمد، سہمی ہوئی ویران تنہائی اس کے ساتھ آئی۔ پڑھائی ختم کر کے وہ سیدھا ہوسٹل کے کمرے میں آ جاتی اور دروازہ بند کر کے کتابوں میں کھو جاتی۔ اس کا ادب کا مطالعہ ہر وقت کتابیں پڑھتے رہنے سے کافی وسیع ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں اسے ایڈگر ایلن پو بہت پسند تھا۔ لیکن بہت جلد وہ اس کی کتابوں سے خوف کھانے لگی اور اسے پو کے نام کے ساتھ ہی اس کالی بلی کا خیال آ جاتا جس کی لاش آتشدان میں دفن ہو۔ پہلے پہل اسے ناولوں کی انگریزی پڑھتے ہوئے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہر دوسری سطر پر اسے ڈکشنری کھولنا پڑتی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ کتابوں نے اسے بڑی تسکین دی تھی۔ چنانچہ اس نے

بڑی محنت سے ادبِ انگریزی پر کافی عبور حاصل کر لیا اور ایف اے میں ہی وہ ایم اے کی لڑکیوں کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس نے انگریزی ادب کے وکٹورین عہد کے تمام ناول پڑھ ڈالے۔ ان ناولوں کی پُر سکون، پُر امن اور گہری تن آساں فضا نے گویا رضیہؔ کے کھولتے ذہن پر ٹھنڈا پھاہا رکھ دیا۔

یہاں سے گزر کر اس نے تاریخ کی طرف رُخ کیا۔ تاریخ میں اس نے قبل از تاریخ کے دَور کو چھوڑ کر مصر اور ہند سے مطالعہ شروع کیا اور یونان اور روم سے ہو کر ہسپانیہ میں آ کر رُک گئی۔ غرناطہ کے آخری مُور شہنشاہ کے زوال کے ساتھ ہی اس نے تاریخ کی کتاب بند کر دی اور اپنے آپ کو قدیم ایتھنز، ممفس، روم اور غرناطہ کا شہری سمجھنا شروع کر دیا۔ یورپ کی پندرھویں، سولھویں اور سترھویں صدی میں اُسے سوائے درباری سازشوں اور خانہ جنگیوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ اُسے قدیم یورپ کے کسی شہر میں زیتون کے سایوں میں بیٹھ کر ادب اور فلسفہ اور موسیقی پر گفتگو کرنے والے رومی اور یونانی فلسفی دکھائی نہ دیے۔ روسی ادب میں سے اس نے تورگنیف اور چیخوف کو چُن لیا۔ ٹالسٹائی کی متضاد باتیں اور عظیم اظہارِ بیان اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ گورکی اسے خشک لگا اور دستوسکی کی دو کتابیں پڑھنے کے بعد اُسے اِس خوفناک مصنف سے ڈر آنے لگا۔ اس کی کتابیں رضیہؔ کے ذہن میں اُن تمام اُلجھنوں کو بیدار کر دیتیں جنھیں اس نے قدیم یونانی کھنڈروں کے عظیم الشان ستونوں میں دفن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک عرصہ تک وہ جبرانؔ سے بھی متاثر رہی۔ لیکن پھر اس سے اُکتا گئی۔ اُس کے ذہن کو سب سے زیادہ تسکین فرانسیسی ادب نے دی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ ایک دم درختوں کی گھنی گھنی، گہری گہری، سوئی سوئی چھاؤں میں کسی ساکن پانی والے پُر اسرار چشمے کے کنارے آ نکلی ہو اور ہر طرف نیلے پھول اور بھیگی بھیگی پُر اسرار دھند پھیلی ہوئی ہو۔ اپنے ملک کے اُسے تمام ایسے ادیب پسند تھے جن کی کہانیوں اور ناولوں میں پُر اسرار دھند اور درختوں کی خواب آلود چھاؤں موجود تھی۔ مذہب پر اس نے پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ اس کا عقیدہ متزلزل ہونے لگا۔ چنانچہ اس نے فوراً کتاب پھینکی اور موم بتی جلا کر خدا سے دُعا مانگنا شروع کر دی کہ وہ اسے گمراہ ہونے سے بچائے رکھے۔ مذہب میں بھی اُسے ایک خاص قسم کی کلاسیکی رومانیت سے پیار تھا۔ نماز پڑھنے کی بجائے وہ پیغمبروں کو نیلی نیلی دھند میں ہاتھ اٹھائے پہاڑیوں پر کھڑے ہو کر عبادت کی تلقین کرتے دیکھنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ وہ تصور ہی تصور میں ان مقدس نورانی چہرے والوں کو فرشتوں کے جُھرمٹ میں سنہری ستاروں کے درمیان دیکھتی اور اس کے ہونٹ وفورِ جذبات سے کانپنے لگتے۔

پلنگ پر نیم دراز کتاب پڑھتے پڑھتے جب رضیہؔ تھک جاتی تو اپنی روز کی ڈائری لکھنا شروع کر دیتی۔ وہ بڑی گرمجوشی سے سارے دن کی بے رنگ کارروائی درج کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ڈائری کبھی کوئی نہ پڑھے گا۔ بلکہ وہ بیشتر خود بھی کبھی نہ پڑھتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ہر رات اپنی ڈائری لکھا کرتی تھی۔ اور اب تک وہ کئی کاپیاں سیاہ کر چکی تھی۔ رات کا کھانا دوسری لڑکیوں کے ساتھ خاموشی سے کھانے کے بعد وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی آتی اور سونے سے پہلے بستر پر دو زانو ہو کر بیٹھ جاتی اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی۔ رضیہؔ کو اُس چھپی ہوئی مہربان ہستی سے بڑی محبت تھی جو ہمیشہ سے بانہیں پھیلا کر اپنی پُر امن محبت کی آغوش میں لے لیتی تھی اور جو اس کی ہر خطا خندہ پیشانی سے معاف کر دیتی تھی۔ کبھی کبھی اُسے عجیب عجیب قسم کے شکوک و

شبہات گھیر لیتے۔ کتابوں میں پڑھی ہوئی سنگدل، بے رحم باتیں کتابوں سے نکل کر نیزوں اور برچھیوں سے اس کے عقیدہ کی دلہن پر حملہ آور ہوتیں اور وہ سہم کر سکڑ جاتی اور غیر شعوری طور پر قرآن کی کوئی آیت پڑھنا شروع کر دیتی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی کہ پلک جھپکنے میں ہر طرف روشنی اور گہرا امن طاری ہے اور کتابوں سے نکلی ہوئی بے رحم فوج کے خونخوار سپاہی غائب ہو چکے ہیں۔ دعا مانگنے کے بعد وہ پہلے معدہ صاف کرنے والی دوائی پیتی۔ پانچ منٹ بعد ساریڈون کی خواب آور گولی پانی سے نگلتی اور بتی بجھا کر نیند کی راہ دیکھنے لگتی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب نیند نہ آتی تو وہ ایک گولی اور نگل لیتی۔

کالج چھوڑنے کے بعد رضیہ اپنے قصبہ والے قدیم مکان میں آ گئی تھی اور اُس نے اپنے آپ کو باقی دنیا سے الگ کر کے تاریخ، ادب، فلسفہ اور موسیقی کی ضخیم کتابوں کی چار دیواری میں بند کر لیا تھا۔ اُسے اپنے پرانے مکان اور اپنی بارُعب شفیق آنکھوں والی ماں اور باپ سے محبت تھی۔ اُسے سعیدہ اور زبیدہ سے بھی پیار تھا۔ لیکن وہ اِن لوگوں سے بہت کم بولتی تھی اور اپنے ہی خیالات میں گم رہتی تھی۔ اِن سے باتیں کرتے ہوئے بھی وہ اُن اجنبی جزیروں کے تصوّرات میں گم ہوتی جہاں اُس کے خیال میں آج تک کسی انسان نے قدم نہیں رکھا تھا۔ اُسے اپنی دوسری بہنوں کی طرح نہ تو اچھے اچھے کھانوں کا شوق تھا اور نہ قسم قسم کے بیش قیمت کپڑے پہننے کی ہوس تھی۔ اسے صرف ایک ہی شوق تھا۔ پڑھنا اور خواب دیکھنا، پھر پڑھنا اور پھر خواب دیکھنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوفوکلیس کے کسی المیہ ڈرامے کا کوئی کردار ہے جو اپنے کرم خوردہ مسوّدے سے باہر آ گیا ہے اور پھر وہاں جانے کو بے قرار ہے۔

رات زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ بارش بدستور ہو رہی ہے۔ آسمان اور زمین کو ایک تاریک بادل نے ڈھانپ رکھا ہے بھیگی ہوئی سرما کی تیز ہوا اسی طرح چل رہی ہے۔ قصبے کی گلیاں سنسان ہیں اور مکانوں کے پرنالوں سے بارش کا پانی مسلسل شور کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ پرانے حویلی نما مکان کی پہلی منزل کے تمام لیمپ بجھ چکے ہیں۔ باورچی خانے کی کھڑکی بند ہے۔ اور روشندان پر اندھیرا ہے صرف رضیہ کے کمرے کا لیمپ جل رہا ہے۔ اور اُس کے روشندان میں سے ہلکی بارش کا عکس باہر بارش ٹپکتے ہوئے نیموں کے پرانے درختوں پر پڑ رہا ہے۔ کمرے کی کھڑکی بند ہے۔ اندر کی طرف گہرے قرمزی رنگ کا بھاری پردہ گرا ہے اور اس کے ساتھ ہی رضیہ سیاہ آبنوسی میز پر جھکی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اُس کا لباس ہلکے زرد اور فاختائی رنگ کا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی ہلکا زردی مائل سفید ہے۔ جسم دُبلا اور کھلی کتاب کی ایک طرف سمٹی ہوئی انگلیاں نازک اور لمبی لمبی ہیں۔ لمبے سیاہ بال دوپٹے میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ دوپٹہ کچھ اس طرح اوڑھا گیا ہے کہ کشادہ پیشانی کا نصف حصہ بھی چھپ گیا ہے۔ کانوں میں سنہری رنگ کی دو چھوٹی چھوٹی بالیاں ہیں۔ بڑی بڑی سوگوار آنکھیں کتاب پر جھکی ہوئی ہیں اور مختصر، باریک، سیدھی کشمیری ناک کے ملائم بہاؤ میں ایک عجیب قسم کا کلاسیکی اسلوب ہے۔ دُبلے چہرے پر زرد گلاب کی افسردگی اور پت جھڑ کی دھوپ کی ملول چمک ہے۔ یہ چہرہ ایک ایسی ویران جھیل سے مشابہ ہے۔ جس کی سطح پر کہیں کہیں زرد پتے بکھرے ہوئے ہوں، اور جس کی تہہ میں گھنی جھاڑیوں کی اُلجھی ہوئی پیچیدہ ٹہنیاں صاف دکھائی دے رہی ہوں۔ میز کی ایک جانب کتابوں کی چھوٹی سی ڈھیری لگی ہے اور کچھ کاپیاں پڑی ہیں اور دوسری جانب اخروٹ کی

لکڑی کے بنے ہوئے چنار کے ایک جوڑے پتے میں ساریڈون کی کچھ گولیاں رکھی ہیں۔ کانسی کے ایک لمبوترے گلدان میں گلاب کی بیل کے دو تین پھول مرجھا رہے ہیں۔ پاس ہی تپائی پر چھوٹی چھوٹی نیلی پتیوں والی چینی کی ایک خوبصورت چاءدانی اور اُسی طرز کا ایک پیالہ رکھا ہوا ہے۔ ذرا پرے گہرے سرخ قالین پر سعیدہ اور زبیدہ، دونوں بہنیں بیٹھی لائی کے ساتھ مل کر اپنے عروسی جوڑوں پر سجاوٹی ستارے ٹانک رہی ہیں۔ بھرے بھرے جسم والی گوری چٹی سعیدہ پاس رکھی پلیٹ میں سے مربہ لگے بسکٹ کھا رہی ہے۔ کام بھی کر رہی ہے۔ اور باتیں بھی کر رہی ہے۔ زبیدہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے اور صرف ہوں یا ہاں میں سعیدہ کی باتوں کا جواب دے رہی ہے۔

"بھئی باجی یہ کیا ہوا! تم کوئی بات کیوں نہیں کرتیں؟"

زبیدہ ہونٹوں پہ انگلی رکھے آہستہ سے کہہ رہی ہے۔

"رضیہ پڑھ رہی ہے۔"

اور سعیدہ بڑبڑانے لگتی ہے۔

"وہ تو ہر وقت پڑھتی رہتی ہے۔"

اور کالی کالی بلی ایسی آنکھوں والی لائی دبے دبے ہنس رہی ہے۔ رضیہ کے گول کندھوں پر سے سرمئی رنگ کی گرم شال نیچے کھسک آئی ہے۔ وہ اُسے اوپر کھینچ رہی ہے اور سعیدہ نچلے ہونٹ پر سے مربہ پونچھتے ہوئے کہتی ہے۔

"رضیہ! بھئی ذرا ہمارا ہاتھ بھی بٹاؤ نا۔"

رضیہ اپنی بڑی بہن کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ زبیدہ جلدی سے بول اٹھتی ہے۔

"سعیدہ تم چپ بھی رہو گی یا نہیں؟"

سعیدہ فوراً کہتی ہے "نہیں۔"

اور بسکٹ چبانے لگتی ہے اور باہر بجلی ایک بار پھر چمکتی ہے اور بادلوں کی دھیمی دھیمی گرج سنائی دیتی ہے اور رضیہ O'SHANGHNESSY کی یہ سطریں پڑھ رہی ہوتی ہے۔

WE ARE THE MUSIC-MAKERS
AND WE ARE THE DREAMERS OF DREAMS,
WANDERING BY LONE SEA-BREAKERS,
AND SITTING BY DESOLATE STREAMS.
WORLD-LOSERS AND WORLD FORSAKERS.

زبیدہ اور سعیدہ کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔ دونوں شادیاں ایک ہی روز ہوئیں اور لاہور سے دونوں کی باراتیں ایک ہی وقت میں آئیں۔ قصبے کے سٹیشن سے ہانگورٹیوں کے حویلی نما پرانے مکان تک کچی سڑک پر کاروں کی قطار بندھ گئی۔ میر غلام حسن شاہ ہانگورٹی نے جی کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ اور یوں ثابت کر دیا کہ ہانگورٹیوں کا خاندان لاہور کے کسی بڑے کشمیری خاندان

سے پیچھے نہیں ہے۔ دونوں بہنوں کو جہیز میں اس قدر سامان ملا کہ اُسے ٹِک کرتے ہوئے طرحدار سٹیشن ماسٹر کو تین بار پنسل بنانا پڑی اور قصبے کے گھروں میں کئی روز تک اس کے چرچے رہے۔ اُسی رات بوسیدہ حویلیوں کی گھٹی ہوئی چھت کے نیچے ضلع رہتک کے پناہ گیر گوالے کے پہلو میں لیٹی ہوئی اُس کی بیوی نے اپنے خاوند سے لپٹتے ہوئے کہا۔

”کلوا رے! ہماری سادی ایسی نائیں ہوئی رے“

اور کلوا اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولا۔

”گھانس چر گئی ہے کیا؟“

قدیم کشمیری روایات کے مطابق دُلہنوں کو پَو پھٹنے سے پہلے رخصت کر دیا گیا۔ رات بھر صدیوں بوڑھے فلسفی ایسے مکان کی پہلی منزل میں دبی دبی ڈھولک دھمکتی رہی۔ لیمپوں، موم بتیوں اور شمعدانوں کی بھرپور چمکیلی روشنی میں کراچی، پشاور، لاہور اور پنڈی سے آئی ہوئی رشتہ دار عورتوں، بھڑکیلے کپڑوں والی بچیوں اور بے باک چہروں اور مضبوط جسموں والی جوان لڑکیوں نے بند کمروں میں کشمیری، پشتو، پنجابی اور فلمی گیت گائے اور جی بھر کر شور مچایا۔ رقص کیا۔ باتیں کیں اور کھایا اور پھر ٹانگیں پسار کر سو گئیں اور خراٹے بھرنے لگیں۔ جب رات ڈھل رہی تھی۔ اور ستاروں کا نور ٹھٹھرتی رات کی تنہائیوں میں زرد غبار بن کر اُڑا جا رہا تھا تو سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت نے کانپتے ہونٹوں سے ڈھولک کی بے ربط تال پہ ایک پرانا کشمیری گیت گایا۔ جس میں بچپن کے گمشدہ دنوں کا سوگ منایا گیا تھا اور جب وہ اس بند پر پہنچی تو اس کی عمر رسیدہ پلکوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ہم تو جنگل میں زعفران چننے نکلی تھیں،
کہ راستہ بھول گئیں،
ہمارے سروں پر سفید برف ہے
اور برف میں پھول دفن ہیں،
سارے پھول دفن ہیں،

یہ بوڑھی عورت دوسری عورتوں کے ساتھ آتشدان کے پاس قالین پر بیٹھی تھی۔ گیت ختم ہو گیا۔ کسی عورت نے کوئی بات نہ کی۔ سب چپ ہو گئیں اور پرانی یادوں میں کھو گئیں۔ دو جوان لڑکیاں ریشمی کمبل اوڑھے قالین پر ایک دوسری سے لپٹی سو رہی تھیں۔ کونے والے پلنگ پر سر تکیے پر رکھے۔ آنکھیں بند کیے رضیہ نے اس بوڑھی عورت کا پورا گیت سنا تھا جو جنگل میں زعفران چننے نکلی تھی اور راستہ بھول گئی تھی۔ اس گیت نے رضیہ پر بڑا اثر کیا تھا۔ اس کی گرم پلکوں میں بھی آنسوؤں کی نمی کپکپانے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر اس بوڑھی عورت کے پاس جا کر بیٹھ جائے اور اُس کا جھریوں بھرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے پوچھے، بڑی آپو! مجھے بھی اس جنگل کی راہ بتاؤ جہاں زعفران اُگتی ہے۔ اور جہاں پہنچ کر کنواریاں گھر کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ لیکن وہ گرم لحاف میں چپ چاپ لیٹی رہی اور زرد گیت کی زعفرانی مہک نے اُسے اپنے خشک پتوں میں سمیٹ لیا۔ ساتھ والے کمرے میں اس کی دو بڑی بہنیں دلہنیں بنی بیٹھی تھیں اور اُسے ان کی سہیلیوں کی ہنسی، قہقہوں اور باتوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایکا ایکی رضیہ کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال پیدا ہوا۔ کیا ایک روز اُسے بھی اسی طرح دلہن بنا کر سجایا جائے گا اور وہ بھی کسی اجنبی کے ساتھ روانہ کر دی جائے گی؟ رضیہ کو یقین

نہیں آرہا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب وہ اپنی ساری انفرادیت کو کتابوں کے پرانے جزدانوں میں بند کر کے رکھ دے گی۔ اور کسی دوسرے کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دے گی۔ اُس نے اپنی شادی کے بارے میں کبھی اتنی سنجیدگی سے غور نہ کیا تھا۔ وہ چونکتی سی ہو گئی۔ یہ شادی تو اس کی موت ہو گی۔ لیکن اس گھر میں رہتے ہوئے وہ اس موت سے نہیں بچ سکے گی۔ پھر کیا ہو؟ کیا وہ چپ چاپ مر جائے؟ رضیہ کے جسم میں شادی کے خیال سے ناامیدی کے باوجود ایک کیف آور کپکپی سی دوڑ گئی۔ اس نے سوچا کہیں اس کے اندر عورت مر تو نہیں گئی؟ لیکن اسے یقین تھا کہ یہ عورت زندہ ہے۔ کبھی کبھی غسل خانے میں نہاتے ہوئے وہ اپنے دُبلے پتلے سڈول اور کنوارے بدن کے خم و پیچ کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ اس کے جسم کے خطوط میں بڑا بہاؤ اور ستائل تھا۔ گول شانوں پر سے نیچے کو پھسلتی ہوئی قوسیں کمر پر آ کر مل گئی تھیں اور یہاں سے پھر دو نصف دائرے کولھوں پر سے اُبھرتے ہوئے پنڈلیوں تک چلے گئے تھے۔ وہ اپنے جسم پر یونانی شہزادیوں کی طرح بڑے وقار سے آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی اور جب اس کا ہاتھ اپنی چھوٹی چھوٹی کچے اناروں ایسی چھاتیوں پر پہنچتا تو اس کے سارے بدن میں سنسنی سی پھیل جاتی اور وہ کانپنے لگتی اور جیسے کچے انار بھی اپنی نازک ٹہنیوں پر کانپنے لگتے۔ اس لمحے رضیہ کا دل گہری، غیر فانی اور لطیف مسرت سے لبریز ہو جاتا اور اُسے یقین ہو جاتا کہ ابھی اس کے اندر وہ شے زندہ ہے جس کے مر جانے سے اس کا سارا علم۔ سارا آرٹ اور سارا فلسفہ راکھ کی بجھی ہوئی ڈھیری بن کر رہ جائے گا۔ وہ اپنے جسم کے معبد میں اس آگ کو ہمیشہ جلائے رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اس آگ میں اپنی کتابوں کا ایک ورق جلتے دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ کسی وقت رات کو، لیمپ کی روشنی میں پڑھتے ہوئے یوں لگتا جیسے کوئی بڑا ہی خوبصورت چمکیلی آنکھوں والا بچہ کرسی کا سہارا لیے کھڑا ہے۔ اور اپنے ننھے ہاتھ سے اس کی شال کھینچ رہا ہے۔ وہ چونک کر دائیں بائیں دیکھتی اور وہ خوبصورت بچہ غائب ہو جاتا، لیکن ایسے لمحات بہت کم آتے تھے۔ اسے ہر کتاب سے اپنے بچوں ایسی محبت تھی اور قدیم یونان کا ہر دلعزیز جرنیل اس کا محبوب تھا۔ جس کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر اس نے فرات کی وادی کو کئی بار عبور کیا تھا اور بابل کے شاہی مندروں میں دیوتاؤں کے قدموں پر اپنے خون کے چھینٹے پھینکے تھے اور حبشی غلاموں کے کندھوں پر رکھی ہوئی زرفشاں عماری میں بیٹھ کر نینوا کے زندگی خیز بازاروں کی سیر کی تھی۔ چنانچہ آج بھی اپنی شادی اور بچوں کے تصور سے اُسے ہنسی آ گئی۔ فلائیبر کی طرح اس نے بھی آرٹ کے ساتھ بیاہ رچا رکھا تھا اور جس کی شادی ہو چکی ہو، اُسے شادی کی کیا ضرورت! رضیہ نے آنکھیں کھول کر کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ آتشدان میں آگ مدھم پڑ گئی تھی اور بوڑھی عورتیں سماوار میں سے نمکین چائے پیالیوں میں انڈیل رہی تھیں۔

شادی بیاہ کا ہنگامہ ختم ہو گیا اور پرانے گھر کو ایک بار پھر پُر اسرار خاموشی اور سرد تنہائیوں نے گھیر لیا۔ رضیہ ایک بار پھر اپنے خیالی اجنبی جزیروں میں نکل گئی۔ لیکن اب اس مکان کی مسلسل متانت اور خاموشیوں میں فرق آ گیا تھا۔ زبیدہ کا خاوند ہر ہفتہ کی شام کو اپنی کار میں بیٹھ کر قصبے میں آ دھمکتا اور ہفتہ کی رات اور اتوار کا پورا دن اپنی بیگم کے ساتھ وہیں بسر کرتا۔ رضیہ کی تنہائی مجروح ہو رہی تھی۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ کم سخن اور گھریلو رکھ رکھاؤ کی پابند زبیدہ کا موٹا، بھدا ہٹا کٹا خاوند لاہور کے بڑے ہسپتال میں نائب سرجن تھا اور سوائے اپنے کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ وہ پھٹی ہوئی بلند آواز میں بات کرتا، وحشیوں کی طرح کھاتا اور کھاتے کھاتے پاگلوں کی مانند پورے جبڑے کھول کر قہقہے لگاتا اور آنکھیں پونچھتا ہوا پھر کھانے پر ٹوٹ پڑتا۔ اُس کے

سارے جسم پر چھوٹے چھوٹے سیاہ گھنگھریالے بالوں کا ایک جنگل اُگا ہوا تھا۔ وہ بے تحاشا سگریٹ پیتا تھا۔ اُس کے گھٹے ہوئے ماتھے اور بھدی ناک پر ہر وقت پسینہ آیا رہتا۔ جسے وہ بائیں ہاتھ سے پونچھ کر دوسری طرف چھڑک دیا کرتا۔ محفل میں بیٹھے اُسے صرف اپنا خیال رہتا۔ چنانچہ کئی بار اُس نے بڑی آپو اور میر صاحب کی موجودگی میں ہی اپنے یورپ کے قیام کی شراب اور آوارہ عورتوں کے قصے سنانے شروع کر دیئے اور زبیدہ نے ہر بار انتہائی دور اندیشی سے باتوں ہی باتوں میں موضوع بدل دیا۔

رضیہ کو زبیدہ کا ڈاکٹر خاوند انتہائی ناپسند تھا۔ لیکن وہ اپنی بڑی بہن کی خاطر اس کی ہر بات تحمل سے سنتی اور خندہ پیشانی سے اُس کا جواب دیتی

بات بات پر بھڑک اُٹھنے والی، مزاج کی گرم اور طبیعت کی تیز سعیدہ کا خاوند لاہور کے ایک مشہور کالج میں انگریزی ادبیات کا پروفیسر تھا۔ وہ لمبے چوڑے مگر پتلے دُبلے جسم کا ایک شرمیلا نوجوان تھا۔ جو بہت کم بات کرتا تھا اور بات کرتے ہوئے کنواری لڑکیوں کی طرح شرما جاتا تھا۔ جب وہ چپ ہوتا تو معلوم ہوتا اس کے سینے میں جذبات کا ایک سمندر سو رہا ہے۔ لیکن جب بات کرتا تو اس کا لہجہ اس قدر پُر محبت اور پُر خلوص ہوتا کہ محسوس ہوتا اس کے دل میں سوائے اس بات کے اور کچھ نہیں تھا۔ رضیہ نے اُسے قہقہہ لگا کر ہنستے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کسی وقت وہ صرف پتلے ہونٹ کھول کر مسکرا دیتا تھا اور یہ مسکراہٹ آبشار کی طرح اس کے چہرے سے گر کر ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے گندمی چہرے کے نقوش باریک تھے اور ان میں دل کو گرم رکھنے والی بڑی ویگ سی اُداسی رچی ہوئی تھی۔ اس اداسی میں چٹانوں سے ٹکراتی سمندری موجوں کا ہیبت ناک شور بھی تھا اور پُرسکون جھیل کی تہہ میں سمٹے ہوئے زرد پتھر کی آسودگی بھی تھی۔ اس کے جسم کا سب سے زیادہ پُرکشش حصہ اس کی آنکھیں تھیں۔ شربتی رنگ کی دو پژمردہ سی آنکھیں، جن میں ہر وقت کسی نشے کا خمار سلگتا رہتا تھا۔ وہ ان آنکھوں کو ذرا سکیڑ کر باتیں کرنے کا عادی تھا اور رضیہ کو ہر بار بات کرتے ہوئے اپنے چہرے پر طلوع ہوتے سورج کی پہلی نیم گرم کرنوں کی حدت محسوس ہوتی۔ اُس کے پاس بیٹھ کر باتیں سنتے ہوئے رضیہ کو محسوس ہوتا جیسے گوگول اس کے سامنے بیٹھا اپنی کتاب "ڈیڈ سولز" کا کوئی حصہ پڑھ کر سنا رہا ہو۔ رضیہ کا دل کانوں کے پاس آ کر دھڑک رہا ہوتا اور وہ افسردہ آنکھوں والے پروفیسر کی دھیمی پُرسکون آواز میں ڈوب جاتی۔ لیکن اسے بہت کم قصبے والے پرانے مکان میں آنے کا اتفاق ہوتا۔ مہینے میں دو ایک بار کسی شام اچانک اس کی چھوٹی سی نسواری کار پرانے مکان کے بڑے دروازے میں داخل ہو کر لیموں کے پیڑ تلے رک جاتی۔ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی رضیہ کا دل دھڑکنے لگتا۔ وہ جلدی سے بھاگ کر نیچے آتی اور سعیدہ سے لپٹ کر ملتی اور دیکھتی کہ پروفیسر زرد سوٹ میں ملبوس اس کی طرف شرمیلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا ہے۔ رضیہ کو یوں لگتا گویا خزاں کے پتوں پر کہانیاں لکھنے والا چیخوف اپنے دیہاتی مکان سے اٹھ کر اُسے ملنے آیا ہو۔ جیسے اس کے خوابی جزیرے کا سفیر اس کے سامنے کھڑا ہو۔ اور جیسے اُس کے شیلف میں رکھی ہوئی ساری کتابوں میں زندگی کا گرم خون دوڑ گیا ہو اور وہ زرد سوٹ پہن کر اُسے ملنے آئی ہو۔ وہ اُسے آداب کرتی اور پروفیسر اُس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر پوچھتا۔

"اچھی ہو بے بی!"

رضیہ صرف شرما کر نظریں جھکا لیتی۔ پروفیسر کی دونوں کنپٹیوں پر پیچھے کو گئی ہوئی سفید بالوں کی لٹوں کا خیال کر کے رضیہ کو

محسوس ہوتا کہ وہ محض بے بی ہے ۔ ناسمجھ بچی ہے۔ اور اتنا کچھ پڑھنے اور سوچنے کے باوجود اُس کا ذہن ابھی نابالغ ہے، غیر پختہ ہے۔ رضیہ کی امّی اور ابّا ان کا استقبال بڑی گرمجوشی سے کرتے اور صدیوں کے افسردہ مکان میں خوشی اور زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ شادی کے بعد سعیدہ کا رنگ زیادہ نکھر گیا تھا۔ اور اس کی طبیعت میں شوخی اور شگفتگی زیادہ آ گئی تھی۔ کسی وقت وہ اپنے خاوند سے ایکدم بگڑ جاتی۔ لیکن وہ کچھ اس طرح مسکرا کہ اس کی طرف دیکھتا کہ سعیدہ ایکدم ٹھنڈی پڑ جاتی۔

شام کی چاء پروفیسر ہمیشہ رضیہ کے کمرے میں پیتا۔ کبھی سعیدہ اور اس کی بڑی آپو بھی اس کے ساتھ ہوتیں اور کبھی وہ دونوں بالکل تنہا ہوتے۔ ایسے لمحوں میں رضیہ بے حد خوش ہوتی اور پروفیسر کے لیے بڑے اشتیاق سے چاء بناتی۔ پروفیسر سگریٹ بنا کر سلگاتا اور پرانے پردوں اور قالینوں والے بھرپور دیہاتی کمرے میں تھری نسز کی مہک اور رچ بیکو کی خوشبو سے بغلگیر ہو جاتی اور لیمپ کی ملائم روشنی میں پروفیسر کے چہرے پر کسی انجانی گہری مسرت کی چمک سی پھیل جاتی۔ رضیہ نیلی تیلیوں والی پیالی ہاتھ میں لیے ہمہ تن گوش ہو جاتی اور پروفیسر آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دیتا۔ باتیں ——— پرانے اور نئے ادب کی باتیں۔ ٹالسٹائی کے 'وار اینڈ پیس' کی باتیں، ٹھیکری کے 'وینٹی فیئر' کی باتیں، ہنری امیل کے 'جرنل' اور 'رولاں کے' 'ژاں کرسٹوف' اور گوگول کی دیہاتی کہانیوں اور رومی کی مثنوی اور آرنلڈ کی نظم 'لائٹ آف ایشیا' کی باتیں .... اور پھر کنول کے پھول ایسی کنواری دیوداسی نے دنیا پر ایک گیت گایا۔

SO SIGH WE, PASSING OVER THE SILVER STRINGS,
WE ARE THE VOICES OF THE WANDRING WINDS:
WANDER THOU, TOO, O PRINCE, THEY REST TO FIND;
LEAVE LOVE FOR LOVE OF LOVERS, FOR WOE'S SAKE
QUIT STATE FOR SORROW, AND DELIVERANCE MAKE.

رضیہ پر عجیب خود فراموشی کا عالم طاری ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو کنول کے پھول ایسی کنواری دیوداسی کے روپ میں دیکھتی۔ اُس کی سیاہ زلفیں سانپ کی طرح اس کے ننگے خوشبودار شانوں پر بکھری ہوئی ہیں اور ماتھے پر چندن کی لَو کانپ رہی ہے اور انگلیوں پر حنا کی سُرخی ہے۔ اور وہ گوتم کی مرمریں خوابگاہ میں قالین پر بیٹھی وچترونیا پر ہندی شہزادے کو جدائی کا پیغام سنا رہی ہے۔ پروفیسر کے گہرے پُرسکون اور اداس چہرے پر وہ گوتم کے عظیم غم کا عکس دیکھتی اور پیالی بڑے آہستگی سے میز پر رکھ کر وہ ایک گہرا سانس لیتی اور اپنا خوبصورت پیشانی والا سر کرسی کی پشت سے لگا دیتی۔ پروفیسر خاموش ہو جاتا اور بجھا ہوا سگریٹ سلگانے لگتا۔

اور جب سردی کی روشن دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوتی اور گلاب کی بیلوں میں چڑیاں شور مچا رہی ہوتیں تو وہ دونوں مکان کے عقبی باغ میں لیموں کے پیڑوں تلے بیٹھ کر چاء پیتے۔ رضیہ لیموں کی سفید کلیاں چُن کر لاتی اور انھیں سعیدہ کے بالوں میں سجاتا

شروع کر دیتی اور پروفیسر سگریٹ پیتے ہوئے ان دونوں کو بہار کی روشنی میں مسرور دیکھ کر خوشی کے شدید احساس میں ڈوب جاتا۔ کسی وقت پروفیسر گلاب کی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی کوئی چڑیا پکڑ لاتا۔ سب مل کر اس کے جسم پر سرخ اور چونچ پر سنہرا رنگ بھرتے۔ ایسے دلہن کی طرح سجا کر ہتھیلی کھول دیتے۔ چڑیا کا ننھا سا دل دھک دھک کر رہا ہوتا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ یونہی دم سادھے پڑی رہتی۔ جیسے مر گئی ہو۔ پھر ننھی سی آنکھ کے کونے سے بڑی نگاہی سے دیکھتی اور میدان صاف پا کر پھر سے اُڑ جاتی اور سعیدہ، رضیہ اور پروفیسر تالیاں بجاتے ہوئے اُسے رخصت کرتے۔ ایسے روشن اور خوشیوں بھرے دن بڑی جلدی گزر جاتے۔ سعیدہ اور اس کا خاوند واپس شہر چلے جاتے اور رضیہ پھر اپنے ویران کمرے کی تنہائیوں میں کتابوں کے زرد اوراق کھول کر بیٹھ جاتی۔ پھر بھیگی ہوئی کسی سرد رات کو جب باہر گہرے اندھیرے میں ہوا گلاب اور لیموں کی شاخوں میں محبت کا سحر پھونک رہی ہوتی، لحاف میں لیٹی ہوئی رضیہ کا انگ انگ دکھنے لگتا اور اس کے سینے میں سوئی ہوئی، دبی ہوئی، کھوئی ہوئی عورت ناگن کی طرح پُروا کے بھینے جھونکے پر ایک لمبی پھنکار کے ساتھ بیدار ہو جاتی اور رضیہ کی گرم چھاتیوں پر سے پھسلتی ہوئی۔ نیچے اترتی اور غسل خانے میں جا کر آئینے کے سامنے برہنہ ہو جاتی اور اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ پھٹتے ہوئے، پکے ہوئے، دہکے ہوئے، سخت اور کھردرے جسم پر پھیرنے لگتی۔ پھر آندھی اور بارش کا ایک مہیب طوفان اٹھتا ــــ دریاؤں میں جھاگ اڑاتے، غصیلے، کف آلود سیلاب اُمڈ آتے اور ان کی بپھرتی ہوئی موجیں چٹانی پتھروں کے سنگین بند اُڑا کر لے جاتیں اور کھوکھلی جڑوں والے تن آور، تنومند درخت اکھڑ اکھڑ کر گرنے لگتے، اور رضیہ ایک چیخ مار کر جاگ اٹھتی اور دیکھتی کہ طوفان گزر چکا ہے۔ اور پانی کی پُرسکون سطح پر درختوں کی ٹہنیاں اور کشتیوں کے تختے تیر رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر خوف، دہشت اور اذیت کے نشان ہوتے۔ جیسے رات بھر کوئی اُسے وحشیوں کی طرح چابکوں سے مارتا رہا ہو۔ اس سے پہلے اُس کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اُسے ایسے کرب انگیز خواب نہ آتے تھے۔ اب ایسا کیوں ہونے لگا تھا؟ رضیہ بستر پر ہی خدا کے حضور میں گر پڑتی اور روتی ہوئی آنکھوں اور سسکتے ہونٹوں سے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتی اور گڑگڑا کر ان کی معافی مانگتی۔ پھر دن نکل آتا اور وہ نہا دھو کر بڑے مطمئن چہرے کے ساتھ بوڑھی خادمہ کے ساتھ مل کر اپنی آپو کے لیے پانی گرم کرتی۔ اپنے ابا جی کے کپڑے نکالتی۔ ان کے لیے دلیا خود پکاتی اور ان کاموں سے اُسے اس قدر تسکین ہوتی کہ وہ اپنے سارے دُکھ بھول جاتی۔ اس کا ذہن بادلوں سے یوں چھٹ کر صاف ہو جاتا جیسے وہ کسی غریب کسان کی بیٹی ہو۔

مگر رات نئے خیالوں کا پُراسرار اندھیرا اور نئی امنگوں کے سرخ پھول لے کر آتی اور رضیہ کو اندھیرے میں اپنے گورے بدن پر جا بجا خون کے سُرخ دھبے ہی دھبے دکھائی دیتے۔ وہ ریشمی کمبل پرے پھینک کر اٹھتی۔ روشندانوں میں سے اندر داخل ہوتی ہوئی ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں سنگار دان کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے جسم پر خوشبو چھڑکتی۔ میز پر بیٹھ کر لیمپ جلاتی، اور سنہرے حاشیئے والا پیڈ نکال کر اپنے محبوب کے نام دہکتی ہوئی آتشیں محبت میں ڈوبے ہوئے طویل خط لکھنے بیٹھ جاتی۔ کئی خطوط پھاڑنے کے بعد وہ ایک خط کو بڑے پیار سے لفافے میں بند کرتی۔ لفافے پر اپنے محبوب کا نام لکھ کر اُسے چومتی۔ اس کے بعد اُسے دراز میں بند کرتی اور لیمپ بجھا کر سو جاتی۔

صبح اٹھ کر جب وہ بے خیالی میں دراز کھولتی تو بند لفافے پر لکھا ہوا کسی مرد کا نام دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ لفافہ کھول کر

جب خط پڑھتی تو شرم سے اُس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ اُسے کسی طرح یقین نہ آتا کہ وہ خط اُسی نے لکھا ہو۔ وہ جلدی سے اس خط کو لفافے سمیت پھاڑ کر آتشدان میں پھینک کر جلا ڈالتی ـــ

گرمیوں کی چھٹیوں میں سعیدہ اپنے خاوند کے ساتھ مری گئی ہوئی تھی۔ واپسی پر یہ لوگ ایک روز کے لیے ہری ناگ ٹھہر گئے۔ اگلے دن لاہور آتے ہوئے پروفیسر نے رضیہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ جب سے سعیدہ کی شادی ہوئی تھی۔ رضیہ اس کے گھر کبھی نہ گئی تھی۔ ویسے بھی وہ ایک لمبے عرصے کے بعد لاہور جا رہی تھی۔ جب اِن کی کار رضیہ کے کالج اور ہوسٹل کے قریب سے گزری تو رضیہ کو کالج کے پرانے دن یاد آگئے۔ سعیدہ کا گھر شہر سے باہر کنال بنک پر واقع تھا۔ یہ گھر بڑا خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔ ہر کمرے میں روشنی، گرمی، زندگی اور سورج کی دھوپ تھی۔ رضیہ یہاں پہنچ کر اپنے اندر ایک نئی زندگی محسوس کرنے لگی۔ سعیدہ کا خاوند اس کا بہت خیال رکھتا۔ اسے ہر روز صبح شام نہر کنارے سیر کرواتا۔ شہر سے واپس آتے ہوئے اس کے لیے نئے نئے رنگین انگریزی رسالے خرید کر لاتا۔ تقریباً ہر روز ہی ان کا سینما جانے کا پروگرام بن جاتا۔ سعیدہ کو کبھی کبھی اپنے خاوند کی طرف سے رضیہ کی یہ ناز برداریاں کچھ ناگوار سی گزرتیں۔ مگر وہ ان باتوں پر زیادہ سوچ بچار نہ کرتی۔

ایک روز یہ لوگ زبیدہ کے ہاں بھی گئے ـــــ زبیدہ کی صحت پہلے کی نسبت کافی کمزور ہو گئی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے گرد حلقے سے نمودار ہو گئے تھے۔ زبیدہ کی ساس اور نندوں نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی۔ رضیہ کو فوراً احساس ہو گیا کہ اس گھر میں زبیدہ سے اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ اور وہ وہاں خوش نہیں ہے۔ اس کے باوجود زبیدہ نے رضیہ سے کچھ نہ کہا۔ رضیہ نے اکیلے میں جا کر اپنی بڑی بہن سے بہت کچھ پوچھنا چاہا مگر زبیدہ نے کوئی بات نہ کی۔

"تو پھر باجی یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟"

زبیدہ نے رضیہ کو آہستہ سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"کوئی حالت خراب نہیں۔ وعدہ کرو کسی سے کوئی بات نہ کرو گی۔"

دونوں بہنوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور زرد چہروں پر مسکراہٹ تھی اور دونوں نے ایک دوسری سے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہیں گی۔ سب کچھ سہیں گی اور خاموش رہیں گی۔

سہ پہر کو ڈاکٹر صاحب بھی ہسپتال سے آگئے۔ انھوں نے مہمانوں کو دیکھ کر ریچھ کی طرح بازو ہلاتے ہوئے پروفیسر سے مصافحہ کیا اور سعیدہ اور رضیہ کو وہاں دیکھ کر خوشی سے پھدکنے لگے۔

"میں تو آج فارغ ہی تھا۔ فون کر دیا ہوتا۔ چلو اچھا ہوا۔ زبیدہ! انھیں کچھ کھلایا پلایا بھی ہے یا نہیں؟ مگر تو ہاتھ پاؤں کہاں ہلائے گی۔ تو تو پوری ہڈ حرام ہے۔"

زبیدہ نظریں جھکائے مسکراتی رہی اور اس کی ساس بھی ہنستی رہی اور اس کی نندیں اپنے بھائی کی جیب سے چاکلیٹ نکال کر کھانے لگیں اور رضیہ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ زبیدہ کی صحت کیوں خراب ہے۔ چائے پر ڈاکٹر نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر رضیہ نے اُسے کوئی لفٹ نہ دی۔ اسے ڈاکٹر کی وہ نظریں سخت ناپسند تھیں جن سے وہ اسے گھورا کرتا تھا۔ یہ نظریں مگر وہ

چھپکلیوں کی طرح اسے اپنے کپڑوں کے اندر رینگتی محسوس ہوتی تھیں۔ چائے کے بعد رضیہ، سعیدہ اور پروفیسر کنال بینک اپنے گھر آ گئے۔ اگلے روز آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور برسات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ——— سعیدہ کے خاوند نے رضیہ کو ساتھ لیا اور سعیدہ سے یہ کہہ کر کہ وہ ذرا گھومنے جا رہے ہیں، شیزان میں آ گئے۔ بادل گہرے ہو گئے تھے اور مال پر اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ شیزان میں بتیاں جلا دی گئی تھیں۔ وہ دونوں گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں اور کوئی نہ تھا۔ رضیہ پروفیسر کے ساتھ، ایسے پُرسکون ماحول میں بیٹھی بے حد خوش تھی اور اس کے زردی مائل گندمی چہرے پر مسرت کا بھرپور احساس تھا۔ پروفیسر نے چائے کے ساتھ بہت کچھ منگوا لیا۔ رضیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مگر بھائی جان یہ اتنی ساری چیزیں کھائے گا کون؟"

"ہم کھائیں گے۔"

اور اتنا کہہ کر اس نے ایک کریم پف خود اٹھایا اور دوسرا رضیہ کے منہ میں ڈال دیا۔ دونوں ہنس پڑے اور باہر ایک دم مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ رضیہ کو اپنے گھر والے کمرے کا خیال آ گیا۔ کیا خبر وہاں بھی بارش ہو رہی ہو؟ رضیہ کو اپنے پرانے گھر اور اس کمرے سے کچھ ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ وہ قریب رہ کر اسی سے بھاگتی تھی اور دور جا کر اسے بہت یاد کیا کرتی تھی۔ وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ اسے اپنی پرانی اور حالیہ زندگی کا خیال آ گیا۔ وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ کہاں جائے گی؟ وہ زندگی سے کیا چاہتی ہے، اسے کیا ملے گا؟ خدا جانے وہ کیا کھوئے، کیا پائے۔ کیا چاہے اور اسے کیا ملے ———!

پروفیسر نے سگریٹ سلگا کر رضیہ کو غور سے دیکھا۔

"چپ کیوں ہو گئیں؟"

"کچھ نہیں۔"

پروفیسر نے اسی طرح منہ بنا کر کہا "کچھ نہیں۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ رضیہ نے چائے کی پیالی میز پر رکھ کر باہر کھڑکی میں سے نظر آنے والی بارش کی جھالر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان ایک بات بتائیں گے؟"

"کیا؟"

"آپ شادی کر کے خوش ہیں؟"

پروفیسر خاموش ہو گیا۔ اس کے دُبلے چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب کبھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے سُلگتی ہوئی پژمردہ آنکھیں سُکیڑ کر رضیہ کو دیکھا اور خشک سی آواز میں بولا:۔

"شادی کر کے ہم لوگ نہ سُکھی ہوتے ہیں نہ دُکھی، صرف شادی شدہ ہوتے ہیں۔"

"نہیں مجھے سچ سچ بتائیے۔"

رضیہ بچوں ایسی ضد کرنے لگی اور پروفیسر کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"ہاں ہاں بیٹی، میں خوش ہوں، بہت خوش۔"

رضیہ خاموش ہو گئی۔ پروفیسر بھی خاموش ہو گیا۔ باہر بارش ہلکی ہو گئی۔

پروفیسر نے کہا:۔

"تم بھی شادی کر لو رضیہ! تمہارا علم اور پختہ ہو جائے گا۔"

رضیہ شرما گئی۔ وہ کچھ نہ بولی۔

"میں چاہتا ہوں تمہاری شادی خود کراؤں۔ سب کچھ اپنے ہاتھوں کروں، تم، جو اتنی پیاری، اتنی ذہین، اتنی قیمتی لڑکی ہو۔ تمہیں بیاہنے تو کسی شہزادے کو آنا چاہیئے۔ سوچتا ہوں کسی روز چپکے سے ہسپانیہ کے سبزہ زاروں میں نکل جاؤں اور سرو کے جھنڈوں تلے سوئے ہوئے کسی اندلسی شہزادے پر تھپک کر کہوں، میرے ساتھ آؤ میں نے تمہارے لیے شہزادی ڈھونڈ لی ہے، اور پھر میں اسے لے کر تمہارے پاس آ جاؤں اور بڑی دھوم دھام سے تم دونوں کا بیاہ رچاؤں اور......"

پروفیسر نے چونک کر رضیہ کو دیکھا۔ وہ ہتھیلیوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس کا کمزور جسم کانپ رہا تھا۔ اور سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ پروفیسر گھبرا گیا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے رضیہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے کہا۔

"آنسو روک لو اندلسی شہزادی! تیرا شہزادہ برق رفتار گھوڑے پر اُڑا چلا آ رہا ہے۔ آنسو پونچھ لو......"

اندلسی شہزادہ ابھی کافی دور تھا۔ لیکن سعیدہ شیزان کی گیلری میں ضرور پہنچ گئی تھی۔ پروفیسر نے گھبرا کر اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور بناوٹی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولا

"پاگل لڑکی! یونہی رونے لگ پڑی۔ کہنے لگی گھر یاد آ رہا ہے۔"

سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا اس کا چہرہ کبھی زرد ہو رہا تھا اور کبھی سرخ۔ بدگمانیوں کی نیند بڑی کچی ہوتی ہے۔ وہ ذرا سی آہٹ پر چونک اٹھتی ہیں۔ سعیدہ کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ رضیہ آنسو پونچھ رہی تھی۔ دل اس کا بھی دھڑک رہا تھا۔ لیکن وہ طبعاً ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بلند لڑکی تھی۔ اُس نے سعیدہ سے کوئی بات نہ کی۔ سعیدہ نے پانی کا ایک گلاس پینے کے بعد اپنے خاوند کو بتایا کہ وہ کچھ سامان خریدنے آئی تھی اور یونہی شیزان میں آ گئی کہ شاید اس کا خاوند یہاں ہو۔ اس کے بعد یہ لوگ وہاں سے اُٹھے اور گھر آ گئے۔ سعیدہ نے راہ میں رضیہ سے کوئی بات نہ کی۔ گھر پہنچ کر بھی کوئی بات نہ کی۔ وہ جیسے گم سم سی ہو گئی۔ بھڑکیلی طبیعت رکھنے کے باوجود اُسے کچھ ایسا دھکا لگا کہ وہ ایکدم بجھ سی گئی۔ رضیہ کو ایسی حالت میں وہاں رہنا بڑا ناگوار لگا۔ اُس نے سعیدہ کے خاوند سے کہا کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے۔ سعیدہ کا خاوند رضیہ کو بالکل نہ روک سکا۔ اُس نے رضیہ کو کار میں بٹھلایا۔ بوڑھا ملازم ساتھ لیا اور سٹیشن پر آ گیا۔ ریل کی روانگی میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ وہ دونوں ریفریشمنٹ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ پروفیسر نے کولڈ ڈرنکس منگوا لیں۔ اور وہ انھیں خاموشی سے پینے لگے۔ دونوں کے غمزدہ دل اداس تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں نظر نہ آنے والے آنسو تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے اور کہہ نہ سکتے تھے۔ آخر پروفیسر نے اپنے مخصوص لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"جو کچھ ہوا ہے مجھے اس کا بہت دُکھ ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں صدمہ پہنچا ہے۔ میں تمہارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر ایک بات بھی نہیں کہہ سکتا۔ اور شاید کبھی نہ کہہ سکوں۔

تم ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی ہو، میری ذہنی کیفیت کو اچھی طرح پرکھ سکتی ہو سوچتا ہوں اس گھڑی دو گھڑی کی دوستی میں ہم نے کیا پایا ہے۔ تم اپنے گھر جا رہی ہو۔ میں پھر کالج کی پرانی لکیر پیٹوں گا۔ شاید اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہو۔ دونوں خاندانوں کی بھلائی ہو۔ تم اپنے خاندان کے لیے زندہ رہو اور میں اپنی بیوی کے لیے۔ ہم میں کوئی بھی اپنے لیے زندہ نہیں ہے۔ ہم یہاں اپنے لیے زندہ نہیں رہ سکتے، ہاں اپنے لیے مر ضرور سکتے ہیں۔ اُداس نہ ہونا۔ آزردہ نہ ہونا۔ شاید ہم کسی دوسرے جنم میں، کسی نئے روپ میں ملیں۔“

رضیہ پر موت ایسی خاموشی طاری تھی۔ وہ صرف سُن رہی تھی۔ وہ ہمیشہ صرف سننا چاہتی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی اس کے زخموں پر ٹھنڈے مرہم کے پھاہے رکھ رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر گاڑی کے انجن اور ڈبوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

”گاڑی آگئی ہے۔ چلو چلیں۔“

رضیہ آہستہ سے اٹھی اور پروفیسر کے ساتھ باہر پلیٹ فارم پر آگئی۔ پروفیسر نے اسے سیکنڈ کلاس کے زنانہ ڈبے میں سوار کروا کر ملازم کو ساتھ والے ڈبے میں بٹھلا دیا۔ ریل کے انجن نے آخری سیٹی دی۔ پروفیسر نے رضیہ کو دیکھا۔ وہ کھڑکی کے ساتھ سر لگائے اداس نگاہوں سے پلیٹ فارم کے فرش کو دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کھسکنے لگی تو رضیہ نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ دھواں، شور، گرد، دھند، آوازیں ——— تیز، بلند چیخوں سے ملتی جلتی آوازیں، روک لو، روک لو، گاڑی روک لو، رضیہ کا سر کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور گاڑی بڑی تیزی سے شور مچاتی ہری ناگ کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔

……………

تیسرے ہی روز سعیدہ نے شیراز میں پیش آئے ہوئے حادثے اور اس سے پہلے کے کئی ایک واقعات کی پوری تفصیل بڑی آپو کو لکھ بھیجی۔ رضیہ کی والدہ سُن ہو کر رہ گئیں۔ ایک لمحہ کے لیے انھیں کچھ سجھائی نہ دیا۔ خط کے آخر میں سعیدہ نے لکھا تھا کہ اگر اب رضیہ کو اس کے گھر آنے کی اجازت دی گئی تو اس کے گھر کی چاروں دیواریں گر پڑیں گی۔ بڑی آپو نے خط بند کر کے بڑی الماری کے نچلے دراز میں مقفل کر دیا۔ انھوں نے رضیہ کے والد کو اس حادثہ سے آگاہ کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ دو تین دن گزر جانے پر انھوں نے رضیہ کو بلایا اور بڑی تدبیر اور دانشمندی کے ساتھ اُسے پیار کرتے ہوئے سمجھانے لگیں۔

”اگر سعیدہ کے سسرال والے تمہیں اچھا نہیں سمجھتے میری بیٹی، تو پھر اُن کے ہاں جانے کا فائدہ؟ بہنیں جب اپنے گھروں میں جا بسیں تو وہ دُور کی رشتہ دار سمجھی جاتی ہیں۔ میں جانتی ہوں، تم پہلی بار اُن کے ہاں گئی تھیں اور تمہارے ساتھ انھوں نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ لیکن خیر تمہارے ایسی پڑھی لکھی لڑکی کو ایسی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہیئے۔ بہتر یہی ہے کہ اِدھر کا راستہ بھول جاؤ۔ اب جاؤ اور خادمہ سے کہو کہ میرے لیے دلیا اور سبز چائے تیار کر کے لے آئے۔“

رضیہ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی ذلت نہ تھی کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کا علم بڑی آپو کو بھی ہو جائے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سعیدہ نے امی کو خط لکھا ہے۔ اُسے اپنی اس قدر بے عزتی محسوس ہوئی کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑی اور تکیوں میں منہ دے کر جی بھر کر روئی، اِن دُکھوں کو بھی روئی جو اس پر بیت چکے تھے۔ اِن غموں پر بھی روئی جنھیں وہ اٹھا رہی تھی اور اُن پر بھی روئی جو اُسے اٹھانے تھے۔ تین دن تک کمرے میں بند رہنے اور کسی کے بلانے پر بھی باہر نہ نکلنے کے بعد اُس نے چوتھے روز شام کو اُٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ سر پر اپنے مخصوص انداز میں دوپٹہ اوڑھا، لیمپ جلایا اور ”دیوانِ کرسنوف“ کھول کر بیٹھ گئی۔ جوں جوں وہ اسے پڑھ

رہی تھی۔ اس کے اندر طاقت، ہمت، دلیری اور توانائی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔

کھلی کھڑکی میں سے باغ کی طرف سے لیموں کے پھولوں کی خوشبو اندر داخل ہو رہی تھی اور رولاں کہہ رہا تھا۔

"O, LIFE, I SOUGHT THEE IN MYSELF, IN MY OWN EMPTY SHUT-IN-SOUL. MY SOUL IS BROKEN. THE SWEET AIR POURS IN THROUGH THE WINDOWS OF MY WOUNDS. I BREATHE AGAIN. I HAVE FOUND THEE ONCE MORE. O, LIFE! HOLD THY PEACE, AND LISTEN..........."

اگست کی آخری تاریخیں تھیں کہ زبیدہ اپنے خاوند کے ساتھ ہری ناگ آ گئی۔ وہ پورے دنوں سے تھی۔ اور پرانی روایات کے مطابق اپنے پہلے بچے کو ماں باپ کے گھر جنم دینا چاہتی تھی۔ اس کا خاوند پورے ساز و سامان کے ساتھ لیس ہو کر آیا تھا۔ زبیدہ آتے ہی بستر پر پڑ گئی۔ وہ بڑی کمزور ہو گئی تھی۔ پہلے سے بے حد دُبلی اور نحیف دکھائی دے رہی تھی۔ پانچویں دن، رات کے کسی لمحے جبکہ رضیہ اپنے کمرے میں افسردہ گال تکیے پر رکھے سو رہی تھی، زبیدہ کے ہاں پھول سی لڑکی پیدا ہوئی۔ رضیہ کو صبح خبر ملی۔ اس نے بچی کو اٹھا کر بڑا پیار کیا۔ بچی کا باپ بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ بھی بچی پر جھک کر اُسے پیار کرنے لگا اور رضیہ کو اس قسم کی بُو محسوس ہوئی جیسے وہ تانگوں کے اڈے پر بہت سے گھوڑوں کے درمیان کھڑی ہو۔ اور اس نے جلدی سے یونہی مسکراتے ہوئے بچی کو ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔

ڈاکٹر ایک ماہ کی رخصت لے کر وہاں آیا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے گھر پر ہی رہتا تھا۔ صرف صبح شام سیر کو جاتا اور کئی کئی میل کا چکر لگا کر پسینے میں تربتر ہانپتا کانپتا بڑے کمرے میں داخل ہوتا اور بُوٹ کھول کر صوفے پر اوندھے منہ لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیتا۔ وہ سعیدہ کے کمرے میں سوتا تھا۔ اور سعیدہ کا کمرہ رضیہ کے کمرے سے ملحق تھا۔ رات بھر ڈاکٹر کے بے ہنگم خراٹے رضیہ کو بے آرام رکھتے۔ دن میں وہ کسی بھی وقت رضیہ کے کمرے میں آن دھمکتا اور کبھی میز پر رکھی ہوئی کتابوں کو اُلٹنے پلٹنے لگتا اور کبھی صوفے میں دھنس کر سگریٹ پر سگریٹ پیئے جاتا۔ اور ادھر اُدھر کی بے مقصد باتیں شروع کر دیتا۔ رضیہ کو بے جا مداخلت بڑی ناگوار گزرتی لیکن اپنی بڑی بہن کے منہ کو چپ ہو کر رہ جاتی۔ وہ جانتی تھی، کہ زبیدہ کی زندگی سسرال میں پہلے ہی کوئی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ایک دو بار اُس نے دروازہ اندر سے بند کر کے بھی دیکھ لیا۔ اس طرح اور قیامت برپا ہو جاتی۔ دروازہ باہر سے زور زور سے بجایا جاتا۔ اور رضیہ کو مجبوراً چٹخنی کھول دینی پڑتی، اندر آتے ہی ڈاکٹر بڑے تعجب سے اِدھر اُدھر دیکھتا اور کہتا ——

"بھئی دروازہ تو کھول رکھا کرو۔ اور نہیں تو کم از کم تازہ ہوا تو اندر آتی رہے۔ تمہاری صحت پہلے ہی کمزور ہے۔"

رضیہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر بات ٹال دیتی۔ پھر وہ رضیہ کے پاس آ کر میز پر جھک کر پوچھتا۔

"کہیں میں تمہارے مطالعے میں مخل تو نہیں ہوتا؟"

"جی نہیں بھائی جان! بالکل نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اور تمہیں اتنا پڑھنا بھی نہیں چاہئے۔ تمہاری آئی سائیٹ بالکل خراب ہو کر رہ جائے گی۔"

رضیہ کتاب پر نظریں جمائے سوچتی رہتی کہ وہ کیا کرے؟ کتاب بند کر دے یا پڑھتی رہے؟ اگر وہ پڑھتی رہے تو ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکے گی اور اگر کتاب بند کر دے تو اس بھدّے ریچھ سے بات کیا کرے؟ وہ اسی گومگو کے عالم میں مبتلا رہتی اور ڈاکٹر باتیں کرتا، سگریٹ پہ سگریٹ پیتا صوفے میں دھنسا قالین پر ٹانگیں پھیلائے اونگھنے لگتا۔ اُسے اونگھتا دیکھ کر رضیہ فوراً کتاب بند کرتی اور دبے پاؤں وہاں سے نکل زبیدہ کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور اس کی بچی سے کھیلنے لگتی۔ ابھی وہ آن کر بیٹھی ہی ہوتی کہ زور سے ہنہنانے کی آواز آتی اور ڈاکٹر اندر داخل ہوتے ہی ہوں، ہوں، ہوں، کرتا بچی کو بے تحاشہ چومنا شروع کر دیتا۔

رضیہ زندگی میں کبھی کسی شے سے اتنی عاجز نہ آئی تھی۔ وہ کبھی اس قسم کی گھٹیا ذہنی اُلجھن میں گرفتار نہ ہوئی تھی جس قسم کی اُلجھن میں وہ ان دنوں گرفتار تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ ایسی باتوں سے ڈاکٹر کا مطلب کیا ہے۔ لیکن ایک دن یہ مطلب اُس کی سمجھ میں آ گیا۔

ایک رات پڑھنے کے بعد اس نے کاپی نکال کر اپنی ڈائری لکھنا شروع کر دی۔ بڑی دیر سے اس نے ڈائری کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اور اس دوران میں حادثات کا ایک ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ لکھنے بیٹھی تو لکھتی ہی چلی گئی۔ دس، گیارہ، بارہ، رات کے ساڑھے بارہ بج گئے اور رضیہ کا تیز قلم اسی طرح چل رہا تھا۔ لیمپ میں تیل ختم ہونا شروع ہو گیا۔ وہ پہلے ٹمٹمانے اور پھر کانپنے لگا۔ رضیہ نے قلم رکھ کر دراز میں سے دو بڑی موم بتیاں نکالیں، انھیں جلا کر لکڑی کے بنے ہوئے چنار کے پتے میں جمایا اور لیمپ بجھا دیا۔ لیمپ بجھا کر ابھی اس نے موم بتی کی نرم روشنی میں لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ اُسے اپنے عقب میں قالین پر کسی کے بوجھل قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر کھڑا تھا۔ سگریٹ اس کے منہ میں سلگ رہا تھا اور اس کی نیم وا آنکھیں سرخ تھیں۔ رضیہ غیر شعوری طور پر چونک سی گئی اور اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ لیکن اس نے اپنا اضطراب بڑی مشکل سے دباتے ہوئے نارمل انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

"آپ اس وقت بھائی جان؟ نیند نہیں آئی ہو گی۔ سارِیڈون دوں؟"

لیکن ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اِدھر اُدھر دیکھا اور رضیہ پر جھک کر آہستہ سے بولا۔

"کوئی نہیں ہے۔ سب سو گئے ہیں۔ سب سو رہے ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی رضیہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ رضیہ کے لیے یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ اب سب بہروپ بیکار تھے۔ وہ جلدی سے کرسی چھوڑ اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈاکٹر کا بھدّا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے للچائی ہوئی ہوسناک نگاہوں سے رضیہ کو سر سے لے کر پاؤں تک گھورا اور پاگلوں کی طرح جھپٹ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ پہلے تو رضیہ ایک دم سُن ہو کر رہ گئی اور ڈاکٹر کی باہوں میں مُردہ لاش کی مانند لٹک گئی۔ مگر فوراً ہی جیسے اس کے اندر ایک شعلہ بھڑکا جس نے اس کے سارے جسم میں آگ لگا دی۔ اس کے ہونٹوں، کانوں اور آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ کر ٹوٹنے لگیں۔ اُس نے ایک ہاتھ باہر نکال کر ڈاکٹر کے منہ پر اس قدر بھرپور طمانچہ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا گرا اور ششدر ہو کر رہ گیا۔

"نکل جاؤ۔ نکل جاؤ ——— ورنہ میں شور مچا دوں گی۔"

رضیہ کی آواز لرز رہی تھی اور اس کے خشک ہونٹوں پہ جھاگ اُڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک گہری غضب آلود نگاہ سے دیکھا۔

اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ رضیہ نے جلدی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی اور اپنے آپ کو بمشکل سنبھالے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اور ٹانگیں اب پہلے سے زیادہ کانپ رہی تھیں۔ اس نے پلنگ تک جانا چاہا۔ لیکن دو قدم اٹھانے پر ہی اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ گر پڑی اور قالین پر اپنا چہرہ رولتے ہوئے بچوں کی مانند پھوٹ پڑی۔ اس شرمناک گھناؤنے منظر کا تصور اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے اسے گندے بدرو کے دلدل میں گرا دیا ہو۔ جہاں سے نکلنے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مار رہی ہو مگر باہر آنے کی بجائے اور نیچے چلی جا رہی ہو۔ ساری رات وہ قالین پر پڑی روتی رہی۔ پچھلے وقت کہیں روتے روتے اسے نیند آ گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ سنہری دھوپ کھڑکی میں سے اندر داخل ہو رہی ہے۔ وہ قالین پر اوندھے منہ پڑی ہے اور اس کے گال کے نیچے قالین کا بوٹہ نمدار ہو رہا ہے۔ اس کا سارا بدن دکھ رہا تھا۔ کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو کر اس نے باہر باغ میں پھیلی ہوئی روشن دھوپ میں چڑیوں کی چہکاریں سنیں اور رات کے واقعات پر غور کرنے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے رات اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔

دوپہر تک رضیہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ بوڑھی خادمہ نے اسے کھانا بھی وہیں لا کر دیا جو اس نے تھوڑا سا کھا کر ویسے ہی چھوڑ دیا۔ آخر اس کی پیاری امی اور زبیدہ خود اس کے کمرے میں آئیں۔

"کیا بات ہے میری بیٹی؟ آج ہمارے پاس نہ آؤ گی؟"

کہیں انھیں سب کچھ معلوم تو نہیں ہو گیا؟ رضیہ کا دل شرم اور ندامت سے ڈوبنے لگا۔

زبیدہ نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"چلو رضیہ باہر بیٹھتے ہیں، آؤ نا؟"

رضیہ کو معاً یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گلے میں ڈاکٹر نے اپنی بھدی سی باہیں ڈال رکھی ہوں۔ وہ سہم سی گئی۔

"آتی ہوں باجی، ابھی آتی ہوں آپوجی، یونہی ذرا پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔"

"اتنا مت پڑھا کرو میری بیٹی۔ پہلے ہی بڑی کمزور ہو۔"

رضیہ نے مسکرا کر کہا۔

"اب نہیں پڑھوں گی آپوجی۔ اب نہیں پڑھوں گی۔"

زبیدہ نے پوچھا۔

"کیوں؟"

اور رضیہ نے چونک کر کہا۔

"اوہ ہاں ——— ساری کتابیں ختم ہو گئی ہیں۔"

زبیدہ اور امی باہر چلی گئیں۔ رضیہ تنہا رہ گئی۔ وہ باہر جاتے ہوئے گھبراتی تھی۔ وہ ضرور باہر کھڑا ہو گا۔ وہ اس کا انتظار کر

رہا ہوگا۔ جانے باہر گیا ہو جائے۔ تیسرے پہر وہ زبیدہ کے کمرے میں گئی۔ ڈاکٹر وہیں بیٹھا تھا دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے کو دیکھنے کی جرأت نہ کی۔ رضیہ بچی سے کھیلتی رہی اور ڈاکٹر زبیدہ سے باتیں کرتا رہا۔

…………

دوسری صبح رضیہ نے بستر پر سے اُٹھتے ہی سُنا کہ ڈاکٹر اپنی بچی اور زبیدہ کو لے کر واپس چلا گیا۔ اسے یوں لگا گویا کسی نے اس پر سے بہت بڑا بوجھ اٹھا لیا ہو۔ اُس نے امّی سے زبیدہ باجی کے ایکدم چلے جانے کی وجہ پوچھی۔

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایکا ایکی تیار ہو گئے تھے اور چلے گئے۔“

رضیہ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور غسل خانے میں نہانے کے لیے چلدی۔

موسم برسات شروع ہوا تھا کہ ہر تن ناک میں باڑی کوٹھیوں کے پرانے۔ بہت پرانے بوسیدہ حویلی نما مکان کی خستہ دیواروں کے نیچے کھوکھلی زمین میں سوئے ہوئے سرد لاوے میں کہیں سے ایک چنگاری پھوٹی اور دیکھتے دیکھتے لاوا بھڑکتی، کھولتی، سسکارتی سیال آگ بن کر بنجر بنیادوں سے ٹکرانے لگی۔ اوپر ایک زلزلہ سا آگیا۔ اور بوڑھی، جھرّیوں بھری دیواریں کانپنے لگیں۔ یہ وہ زلزلہ تھا جو ہر اس پُرانے گھرانے کی دیواروں کو ملبے کا ڈھیر بناتا ہوا گزر جاتا ہے۔ جو صدیوں سے ایک ہی جگہ آباد زمین سے زندگی کا عرق کھینچ رہا ہو۔ آخر زمین کا سینہ خشک ہو جاتا ہے۔ اور درختوں کی جڑیں سوکھ جاتی ہیں۔ وہ بظاہر تن آور اور تنومند ہوتے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر ان کا سارا گودا دیمک زدہ ہوتا ہے اور وہ طوفان کے پہلے ہی حملے میں لڑکھڑا کر گر پڑتے ہیں۔ پھر اس حادثے کو آسمانی طاقتوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ ان کے جسم کھوکھلے اور بنیادیں خستہ ہو چکی ہیں۔

میر غلام حسن شاہ بڑے وضعدار بزرگ تھے۔ انھیں اپنی حیثیت سے بڑھ کر خاندان کے ان افراد کی عزت کا خیال رہتا تھا جو مر کھپ گئے تھے۔ اور جنھوں نے اپنے وقتوں میں آئندہ نسل کا خیال کیے بغیر بے نیازی اور تن آسانی میں اچھی زندگی گزاری تھی۔ آپ اپنے خاندان کی تعریف سننے کے لیے دوسرے اعلیٰ خاندانوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ اپنے رکھ رکھاؤ کے لیے دوسروں کے رکھ رکھاؤ کا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ آپ قدرتاً ہاتھ کے کھلے تھے۔ جہاں ایک روپیہ سے کام نکل سکتا وہاں بلا دریغ پانچ روپے خرچ کر دیتے اور انھیں اس خیال سے بڑی تسکین ہوتی کہ لوگ اُن کی دریا دلی کو، ہاٹی کوڑی خاندان کا طرّہ امتیاز سمجھ کر تعریف کر رہے ہوں گے۔ جو کوئی اُن کے پاس سوال لے کر آتا خالی ہاتھ واپس نہ جاتا۔ کئی بار جب میر غلام حسن شاہ سے کسی نے قرض کا سوال کیا تو آپ نے کسی دوسرے سے قرض لے کر اُس کا سوال وعدہ کے مطابق پورا کر دیا۔ انھیں دوسرے کی غرض سے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ صرف اپنا وقار اور خاندان کی وضعداری نباہ رہے تھے۔ کمیٹی کے تمام ممبر آپ کے مقروض تھے اور آپ نے کبھی قرض کی واپسی کا تقاضہ نہ کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بھی مقروض ہو گئے۔ بنک میں جو تھوڑا بہت روپیہ جمع تھا اس کی ساکھ پر دوگنا نکلوایا جا چکا تھا۔ کپڑے کے ایک کارخانے کا حصہ خریدا لیکن سوت نہ ملنے سے کارخانہ تقریباً بند ہو کر رہ گیا۔ پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ پرانا خاندانی مکان رہن رکھ کر حاصل کی گئی رقم کے ساتھ ہی دونوں بیٹیوں کی شادی پہ خرچ ہو گیا تھا۔ اب خوابگاہ

کی تجوری میں رکھے ہوئے چند سو روپوں اور زیورات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ زیورات بھی ڈیڑھ ایک ہزار سے زیادہ کی مالیت کے نہ تھے۔ کچھ آپ کے والد گروی رکھ کر ہضم کر گئے تھے۔ اور کچھ سعیدہ اور زبیدہ کو پہنا دیا گیا تھا۔ اس وقت ہائی کورٹی خاندان ——— پُرانے اعلیٰ کشمیری خاندان پر پچیس ہزار کے قریب قرض چڑھا ہوا تھا اور مطلّا دیواروں، بھاری پردوں اور موٹے افغانی قالینوں والے تاریخی مکان میں سوائے چند سو روپوں کے اور کچھ نہ تھا۔ میر صاحب نے یہ تاریک راز اپنی رفیقۂ حیات پر بھی منکشف نہ کیا تھا۔ اس خوفناک راز کو وہ اپنے ہی سینے میں چھپائے، قرض خواہوں کی نگاہوں سے بچتے پھرتے تھے۔ کسی قرض خواہ کا اُن سے اپنی رقم کا مطالبہ کرنا میر صاحب کے نزدیک نہ صرف ان کی بلکہ سارے خاندان کی موت تھی۔ چنانچہ وہ زیادہ وقت گھر پر اپنے کمرے میں ہی گزارتے تھے۔ مسلسل غم فکر اور پریشانی کی وجہ سے انھیں بلڈ پریشر کی شکایت رہنے لگی تھی۔ جوں جوں بنک میں روپے کا حساب دینے اور رہن شدہ مکان کی آخری تاریخیں قریب آ رہی تھیں۔ آپ کا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا اور بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پہ نیم دراز آنکھوں کے سامنے اس صدیوں پرانے مکان کو لڑکھڑا کر زمین پر گرتے اور خاندان کے اعلیٰ افراد کو گلیوں میں دربدر پھرتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی سے کچھ نہ مانگ سکتے تھے۔ وہ کسی کے سامنے اپنا باغیرت ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے۔ ہاں خاندان کے باقی لوگوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چُپ چاپ مر سکتے تھے۔ یہ عظیم خودغرضی ایک عظیم خاندان کے شایانِ شان ہی ہو سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو عظیم ذلّت اور عظیم بدنصیبی کے دن قریب آ رہے تھے اور میر صاحب ان کے مقابلے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ چھُپ جانے کی فکر میں تھے۔ میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ ایک صبح جب کافی دیر تک ان کی خوابگاہ کا دروازہ بند رہا تو خادمہ نے اندر جا کر دیکھا۔ میر صاحب اپنے بستر پہ مُردہ پڑے تھے۔ خادمہ بدحواس ہو کر بڑی آپا کی خوابگاہ کی طرف بھاگی اور ان کو خبر سنتے ہی غش آ گیا۔ بوڑھی خادمہ نے روتے ہوئے انھیں سنبھالا اور لاتی چیختی چلاتی چھوٹی آپی کے کمرے کی طرف دوڑی۔ رضیہ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ وہ بغیر دوپٹہ کے کھلے بالوں سمیت اپنی امی کی طرف بھاگی۔ دیکھتے دیکھتے وہاں ایک کہرام مچ گیا۔ پنڈی، لاہور، کراچی، پشاور، ہر طرف تاریں دوڑ گئیں۔ دوسرے ہی روز قصبہ بیری ناگ کا پرانا حویلی نما مکان ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ رضیہ کو بار بار غش آ رہا تھا۔ بڑی آپا عورتوں کے درمیان بیٹھی رومال چہرے پر رکھے مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ سعیدہ اور زبیدہ کی آنکھیں رونے سے بُری طرح سُوج رہی تھیں۔ زبیدہ کا خاوند قبرستان میں گورکنوں کے سر پر کھڑا قبر کھدوا رہا تھا۔ اور سعیدہ کا خاوند باہر برآمدے میں کُرسی پر چپ چاپ بیٹھا کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ موت کیسے اور کیونکر واقع ہوئی۔ میر صاحب رات کو اچھے بھلے سوئے تھے۔ اور اس رات انھوں نے خلافِ معمول رضیہ کو اپنے کمرے میں بلا کر بڑا پیار کیا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ موت ہارٹ فیل ہو جانے سے ہوئی ہے اور ڈاکٹروں نے بھی اس کی تصدیق کر دی تھی۔ لاش کے جسم پر کسی قسم کا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف اوپر کے دانتوں میں ایک جگہ ذرا سا خون نکل کر وہیں جم گیا تھا۔ شاید وہ مرنے سے پہلے کہیں گر پڑے ہوں اور پھر پلنگ پر دراز ہو گئے ہوں اور موت نے ان کے ذہن سے تمام اُلجھنوں اور پریشانیوں کو سمیٹ کر واپس لے لیا ہو اور ان کی زندگی پر جمود کی سرد مہر لگا دی ہو۔

اور بدنصیب رضیہ اور اس کی سفید بالوں والی شفیق ماں!
تم لوگوں کو موت کب آئے گی؟

سرد شام کے دھندلکے میں جبکہ قصبے کے کھلے کھیتوں پر دھند چھا رہی تھی۔ میر غلام حسن شاہ کو ان کے آبائی قبرستان میں دفنا دیا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے سب رشتہ دار کھسکنے لگے۔ تیسرے ہی روز پرانے گھر میں سوائے سعیدہ، زبیدہ اور پروفیسر کے اور کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر بھی لاہور جا چکا تھا۔ اس اعلیٰ خاندان کے باقیماندہ بدنصیب افراد پر اس بھید کا اب انکشاف ہوا تھا کہ ان پر پچیس ہزار روپے کا قرضہ ہے اور بڑا مکان بھی شہر کی ایک کمپنی کے پاس گروی پڑا ہے۔ اُن لوگوں کے رہے سہے ہوش بھی اڑ گئے۔ اب کیا ہو گا؟ اب تو سر چھپانے کو بھی کوئی جگہ نہ رہے گی۔ بڑی آپو نے سعیدہ، زبیدہ اور پروفیسر سے مشورہ کیا۔ پچیس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہ تھی۔ سعیدہ کے پاس بنک میں صرف اڑھائی ہزار روپیہ جمع تھا۔ اور ڈیڑھ ہزار قرضہ چڑھا ہوا تھا۔ زبیدہ بیچاری کی تو خیر گھر میں اتنی حیثیت ہی نہیں تھی کہ وہ کسی سے کچھ مانگ سکے۔ سعیدہ کا خاوند سب سے زیادہ پریشان تھا۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک انتہائی شریف خاندان کو محض ایک فرد کی کھوکھلی وضعداریوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتے دیکھ رہا تھا اور اُسے کسی طرح بھی نہ بچا سکتا تھا۔ آخر بڑی آپو نے تجویز پیش کی کہ رضیہ کے لیے قاضی اصغر علی ملٹری کنٹریکٹر کا رشتہ منظور کر لیا جائے۔ یہ رشتہ پہلے سعیدہ کے لیے آیا تھا۔ لیکن محض اس لیے نامنظور کر دیا گیا تھا کہ قاضی اصغر علی کی عمر زیادہ تھی اور اس کی دو بیویاں فوت ہو چکی تھیں۔ قاضی اصغر علی مالدار آدمی ہے۔ اگر وہ رضیہ کا رشتہ منظور کر لے تو یہ خاندان تباہی کے غار میں گرنے سے بچ سکتا ہے۔ اس تجویز کی سب سے زیادہ مخالفت پروفیسر نے کی۔

"خدا کے لیے آپو جی ایسا نہ کریں۔ اس سے تو بہتر ہو گا کہ آپ اپنے ہاتھوں رضیہ کو کنوئیں میں دھکا دے دیں۔"

سعیدہ فوراً بول اُٹھی۔

"آپ تو اس کی طرفداری کریں گے ہی۔ ہمارے گھر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے آپ کی بلا سے۔ آپ تو رضیہ کو بچانے کی فکر میں رہتے ہیں —"

دھیمی طبیعت کا سوگ پسند پروفیسر خاموش ہو گیا۔

زبیدہ نے بھی بادلِ نخواستہ اس تجویز کی حمایت کی۔ اُسی وقت قاضی اصغر علی کے نام بڑی آپو کی طرف سے ایک خط لکھ کر آدمی شہر کی طرف دوڑایا گیا۔ دوسرے روز اس کا جواب آ گیا۔ قاضی اصغر علی کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہائی کورٹی خاندان بُری طرح قرضے میں پھنسا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے بعض باتوں کا بہانہ بنا کر رشتہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سب پر اوس پڑ گئی۔ انھیں اس بات کا خیال ہی نہ رہا تھا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کا سودا کر رہے ہیں تو دوسرا بھی مال دیکھ قیمت ڈالتا ہے۔ بھلا ایسی دلہن کو کون اپنے گھر بسائے گا جس کے پیچھے پچیس ہزار قرض خواہوں کی ایک طویل قطار کھڑی ہو۔ دوسرے دن سعیدہ اور زبیدہ بھی یہ کہہ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیں کہ وہ فی الحال آرام سے رہیں اگر کوئی غیر خوشگوار بات ہوئی تو انھیں فوراً اطلاع کر دی جائے۔ گھر پہلے سے زیادہ خالی اور سنسان دکھائی دینے لگا۔ رضیہ اپنا کمبل لے کر اپنی امی کے پاس گئی اور اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر دیر تک روتی رہی۔

"یہ کیا ہو گیا ہے آپو جی! ابا جی ہمیں اس طرح کیوں چھوڑ گئے ہیں۔"

اور بوڑھی مدبر ماں آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پی کر بیٹی کو حوصلہ دینے لگی۔

"ہماری یہی تقدیر تھی میری بیٹی! آؤ خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے گناہ معاف کر دے۔"

خدا نے ان کے سارے گناہ معاف کر دیئے تھے۔ بلکہ خدا کو تو ان کے گناہ یاد بھی نہیں تھے۔ ہاں دنیا میں رہنے والوں نے ان کی چھوٹی سے چھوٹی خطا بھی معاف نہ کی تھی۔ چنانچہ گھر کے مالک کو فوت ہوئے بمشکل تین ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ شہر کے بنک، جائیداد گروی رکھنے والی کمپنی اور کپڑے کے کارخانے کی جانب سے اپنی اپنی رقم کی واپسی کے تقاضے شروع ہو گئے۔ کپڑے کے کارخانے کا حصہ میر صاحب اپنی زندگی میں ہی فروخت کر چکے تھے۔ بلکہ اُلٹا کارخانے والوں سے چار ہزار قرض لے رکھا تھا۔ مکان سترہ ہزار میں گروی پڑا تھا اور بنک کا مطالبہ کٹ کٹا کر چھ ہزار روپے کا تھا۔ آہستہ آہستہ تقاضے شدید ہوتے گئے۔ بنک کی طرف سے ہر تیسرے روز ایک آدھ یاد دہانی خط آجاتا۔ رہن کمپنی نے جائیداد خالی کر دینے کا سرکاری نوٹس دے دیا۔ کارخانے والوں کا ایک آدمی ہر روز آکر مکان کے بڑے دروازے کے باہر بیٹھ جاتا۔

رضیہ کی والدہ نے صورتِ حال سے زبیدہ اور سعیدہ کو آگاہ کر دیا تھا۔ پہلا خط پروفیسر نے لکھا اور دوسرا زبیدہ کی طرف سے آیا۔ انھوں نے رضیہ اور بڑی آپو کو تھوڑا بہت ضروری اور قیمتی سامان ساتھ لے کر اپنے اپنے ہاں آجانے کی دعوت دی۔ بڑی آپو نے زبیدہ کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا اور ضروری سامان کی پیکنگ شروع ہو گئی۔ رضیہ کے لیے اپنا قدیمی گھر چھوڑنا اور پھر ایسی مجبوری اور بے بسی کی حالت میں چھوڑنا ایک عظیم صدمہ تھا جسے وہ دوسرے صدموں کے ساتھ اپنے سینے میں چھپائے تھی۔

بوڑھی خادمہ اور اس کی بیٹی لاجی کے ساتھ مل کر چمڑے کے بڑے صندوقوں میں ریشمی اور گرم کپڑے تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔ بوڑھی خادمہ سے بھی اس گھر کی تباہی نہ دیکھی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور آدھی رات گئے وقت قالینوں، پردوں اور آبنوسی فرنیچر سے سجے ہوئے اس پرانے مکان میں صدیوں کے بوڑھے اُس کے سفید بال پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔ رات کے تین بجے تمام قیمتی اور ساتھ لے جانے والا سامان صندوقوں میں بند ہو کر تیار ہو گیا۔ تین بڑے صندوق، دو سوٹ کیس اور دو بستر تیار کیے گئے تھے۔ بڑی آپو آتشدان کے پاس سرمئی گرم شال اپنے جھکے ہوئے بوڑھے کندھوں پر پھیلائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ انھیں وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ پہلے روز اس گھر میں دلہن کی حیثیت سے آئی تھیں۔ کتنے روشن، پُرامن اور سہانے دن تھے۔ وہ بنارسی کامدار عروسی جوڑے میں ملبوس بڑے کمرے کے وسط میں گہری سرخ سوزنی پر شہزادیوں کی طرح بیٹھی تھیں اور انھیں خوبصورت آنکھوں اور سرخ چہرے والی لڑکیوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ کس طرح ان پر دیوانہ وار فدا ہو رہی تھیں! آج ان میں سے کوئی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سب خوبصورت آنکھوں والی سہیلیاں کہاں چلی گئی تھیں؟ دُکھ اور مصیبت کی اُس بھیانک گھڑی میں انھیں اپنے خاوند کا خیال آگیا جو آج کے دن سے بچنے کے سبب ان لوگوں کو اس دن کے مقابلے کے لیے تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ گیا تھا۔ بڑی آپو نے سفید رومال والا کمزور بوڑھا ہاتھ شال سے نکالا اور اُسے آنکھوں پر رکھ کر آہستہ آہستہ رونے لگیں۔

رضیہ اپنے کمرے میں ایک طرف ہو کر کھڑی دیواروں، الماریوں، میزوں، صوفوں اور پلنگ اور سنگار دان اور قالینوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے اپنا کمرہ سانس لیتا محسوس ہو رہا تھا اور اس کے در و دیوار گویا اس کے دکھی دل کے ساتھ ساتھ دھڑک رہے تھے۔ کمرے کی الماریاں اور شیلف کتابوں سے خالی تھیں۔ میزوں کے درازوں میں کوئی ضروری کاغذ نہ تھا۔ پلنگ پر صرف موٹا گدا پڑا تھا۔ کارنس پر چینی کی دو لمبی منقش صراحیاں پڑی تھیں اور ان کے اوپر بڑا سا کلاک۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں

رات کے سوا تین بجا رہا تھا۔ کھڑکی بند تھی اور اس کے آگے قرمزی پردہ کھنچا ہوا تھا۔ کمرے کی ہر شے پریشان اور ویران دکھائی دے رہی تھی۔ رضیہ کو کبھی خیال نہ آیا تھا کہ محض میز پر سے کتابیں اٹھا دینے اور پلنگ پر سے بستر اٹھا دینے سے کمرہ اجڑ جائے گا۔ اس کمرے نے رضیہ کو ہر رنگ، ہر موڈ، ہر حالت میں دیکھا تھا۔ اس کی دیواریں اور پردے اس کے ہمراز اور محرم تھے۔ انھوں نے رضیہ کو روتے، آپ ہی مسکراتے، باتیں کرتے، چپ ہوتے، غمگین اور اداس ہوتے دیکھا تھا۔ انھوں نے اُسے پُر اسرار راتوں کی نیلی خاموشیوں میں اُٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جسم پر عطر چھڑکتے اور سنہری کاغذ پر اَن دیکھے اجنبی محبوبوں کو محبت بھرے خطوط لکھ کر دراز میں سنبھالتے اور صبح ان خطوں کو ندامت سے پھاڑتے دیکھا تھا۔ رضیہ نے پردہ ایک طرف کر کے لیمپ دھیما کر دیا اور کھڑکی کھول دی۔

باہر سردیوں کے گہرے نیلے آسمان پر نکھرے ہوئے ستاروں کی لویں بھڑک رہی تھیں۔ باغ میں سردی اور اندھیرا تھا۔ اور گہری خاموشی میں لیموں کے پیڑوں سے شبنم کے ٹپکنے کی پُر اسرار آواز آ رہی تھی۔ باغ کے اوپر درختوں پر تاروں کی دھیمی دھیمی دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تازہ اور سرد ہوا رضیہ کی پیشانی کو چھو کر اندر داخل ہونے لگی۔ رضیہ کے کمزور جسم نے جھرجھری سی لی اور اس نے گرم شال درست کرتے ہوئے کھڑکی بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ الوداع! لیموں کے پرانے باغ اور اس کی شاخوں پر سے ٹپکتی ہوئی شبنم! شاید تمھیں دیکھنا پھر کبھی نصیب نہ ہو۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے رضیہ نے سوچا۔ جانے اس کھڑکی کو اب کون کھولے گا۔ رات کی خاموشی میں پرانی وفادار خادمہ کے بڑے بیٹے نے سارا سامان اپنے چھکڑے پر لادا۔ اور سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلی منزل کے تمام کمرے مقفل کر دیئے گئے۔ دوسری منزل کے کمرے پہلے ہی بند تھے اور اندر ٹوٹا پھوٹا بوسیدہ سامان گرد و غبار کی دبیز تہوں میں اٹا ہوا تھا۔ اور اب نچلی منزل کی باری تھی۔ اب اس منزل میں مکڑیاں جالے بنیں گی۔ ٹڈیاں انڈے دیں گی۔ اور چوہے قالینوں پر دوڑیں گے اور بلی کھلے روشندان میں سے بڑی الماری اور بڑی الماری پر سے میز پر کود کر ان کے شکار کو آیا کرے گی۔ اب دیواروں کا چونا گرنا شروع ہو جائے گا۔ اور دہلیزوں، چوکھٹوں، دروازوں اور کرسیوں کو دیمک لگے گی اور ریشمی گدیلوں والے پلنگوں میں چھپکلیاں آباد ہوں گی۔ بند کمروں کی گھٹی ہوئی فضا میں ایک نئی فضا پیدا ہو گی اور اس نئی فضا کے کیڑے مکوڑے پیدا ہوں گے۔ اب یہ پرانا مکان کبھی آباد نہ ہو گا۔ اس میں جو بھی رہنے آئے گا۔ اسے ایک نہ ایک دن رات کے اندھیرے میں سامان باندھ کر چوروں کی طرح بھاگ جانا پڑے گا۔ اس لیے کہ اس مکان کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں، بنیادوں کو دیمک چاٹ چکی ہے۔ اور اس کے نیچے کھولتا ہوا آتشیں لاوا گردش کر رہا ہے۔ ایسا پرانا مکان جہاں کہیں ہو گا آخر ویران ہو گا اور اس پر آسیب اپنا قبضہ جمائیں گے۔ نکل جاؤ، نکل جاؤ، ایسے تمام بوسیدہ مکانوں کی چھتوں سے نکل جاؤ۔ یہ لڑکھڑا کر گرنے کو ہیں، ان کے تلے زمین کے بنجر سینے میں پھرتا لاوا دہک رہا ہے۔ یہ بھڑکنے کو ہے، اور پھر بھیانک آواز کے ساتھ زلزلہ آئیگا۔ اور ان حویلی نما کرم خوردہ مکانوں کے ستون تنکوں کی طرح ہوا میں اُڑتے نظر آئیں گے۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ اے پہلی منزل والو! اور دوسری منزل والو........

اور اب میر گھرانے کے یہ آخری دو بدنصیب افراد اپنے آبائی مکان سے بے دخل ہو رہے ہیں۔ دونوں ماں بیٹیاں گرم کپڑوں، گرم چادروں اور اُونی شالوں میں اپنا آپ چھپائے، سر جھکائے مکان کے پچھلے دروازے میں سے نکل کر سرد و ویران

برآمدے میں سے ہوتی ہوئی بڑے گیٹ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ان کے آگے بوڑھی خادمہ ٹوکری اور اٹیچی کیس اٹھائے چلی جا رہی ہے۔ باہر درختوں کے نیچے ایک تانگہ ان کا انتظار کر رہا ہے۔ جب وہ دونوں صدر دروازے میں سے باہر نکلنے لگیں تو دہلیز میں اگی ہوئی گھاس نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو۔ بڑی آپو! چھوٹی آپی! پھر کب آؤ گی؟ ہم سردیوں کی ٹھٹھرتی تنہائیوں میں یاد کیا کریں گے۔ شاید اگلی بہار تک ہم زندہ نہ رہیں۔ ہمیں بھی یاد کر لیا کرنا۔ ہم آنے والوں کے قدم چوما کرتے تھے اور جانے والے کے پاؤں پکڑ لیتے تھے۔ اب ہم کس کی راہ دیکھیں گے؟ رضیہ کی امی نے ہاتھ سے صدر دروازے کے ٹھنڈے ستون کو چھوا اور جیسے کسی نے ان کے دل کو مٹھی میں لے لیا۔ رضیہ نے اپنی روتی ہوئی والدہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور قدم بقدم چلتی تانگے کی طرف آگئی۔ تانگے میں بیٹھ کر انھوں نے آخری بار مکان پر نگاہ ڈالی۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ کسی کھڑکی میں کوئی لیمپ نہ جل رہا تھا۔ پچھلے پہر کی افسردہ، پھیکی اور بیمار روشنی اور اندھیرے میں اونگھتے ہوئے مکان پر ایک ایسے بوڑھے کا گمان ہو رہا تھا، جسے پھانسی ملنے والی ہو، اور جو اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا سر جھکائے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہا ہو۔

تانگہ آہستہ آہستہ کھیتوں میں سے گزرنے لگا۔ قصبے کے کھلے کھیتوں میں جوار اور کماد کی فصل تیار کھڑی تھی اور سرد ہوائیں ان کی سوندھی سوندھی مہک رچی ہوئی تھی۔ کھیتوں پر دور دور تک کہرا چھا رہا تھا اور اوپر وسیع آسمان پر رات کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اور صبح کے خوف سے ستارے کانپ رہے تھے۔ پرانا حویلی نما مکان رضیہ اور اس کی والدہ کی نگاہوں سے آہستہ آہستہ دور ہو رہا تھا اور اب کھلے پھیکے نیلے آسمان کے پس منظر میں وہ درختوں کے اوپر ایک بڑا سا سیاہ دھبہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس تاریک دھبے میں ان کے پورے خاندان کی تاریخ دفن تھی۔

سٹیشن پر کہیں کہیں دو ایک لیمپ روشن تھے۔ اونچے نیچے فرش والا پلیٹ فارم دور تک سنسان تھا۔ پچھلے پہر کی یخ بستہ سردی میں لوہے کے بنچ اوس میں بھیگے ٹھٹھر رہے تھے۔ رضیہ اپنی والدہ اور بوڑھی ملازمہ کے ساتھ برآمدے میں لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا شاید وہ سعیدہ کے ہاں جا رہے تھے لیکن سٹیشن پر آکر پتہ چلا کہ وہ زبیدہ کے گھر جا رہے ہیں۔ رضیہ کا دل بجھ گیا تھا اور اوس میں بھیگے ہوئے آہنی بنچ کی طرح سردی میں پڑا ٹھٹھر رہا تھا۔ تانگے میں، کھلے کھیتوں کی سردی کھانے سے اس کا بدن دکھ رہا تھا۔ اور اس کے پریشان خیالات خلا میں گمشدہ ستاروں کی طرح بے مقصد چکر لگا رہے تھے۔

ریل کے ڈبے میں سوار ہوتے ہوئے بڑی آپو نے مکان کی چابیاں بوڑھی خادمہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"اب سب کچھ تمہارے حوالے ہے۔"

خادمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بڑی آپو نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ گاڑی چلی تو رضیہ نے آخری بار قصبے کی طرف دیکھا۔ مشرقی آسمان پر رات کے آخری بیمار اور زرد سائے مدھم ہو رہے تھے اور ستاروں کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سر والدہ کے سینے سے لگا دیا۔ اور دونوں ماں بیٹیاں دور تک روتی چلی گئیں۔

ڈیڑھ ماہ بعد ہری ناگ والے پرانے مکان کا سارا سامان نیلام کر دیا گیا۔ یہ بہار کے آغاز کا موسم تھا۔ نہر کنارے کیکر کے درختوں پر بسنتی پھول آ رہے تھے اور ہوائیں اُن کا زرد بور اُڑا اُڑا کر ندی کے پانی اور پگڈنڈی پر گر رہا تھا۔ پرانے مکان

کے عقب میں خستہ حال محراب پر چڑھی ہوئی عشق پیچاں اور گلاب کی بیلوں میں ننھی ننھی کلیاں آنکھیں کھولے پتوں کے جھروکوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ لیموں کے پیڑ بھی سفید پھولوں سے لد گئے تھے اور ان پر شہد کی مکھیاں چکر لگا رہی تھیں۔ دوسری طرف، مکان کے صدر دروازے کے باہر پہلی اور دوسری منزل کا گرد آلود پرانا مگر قیمتی سامان نیلام ہو رہا تھا۔ مکان کی بوڑھی ملازمہ اپنی بیٹی اَلّی کے ساتھ باورچی خانے کے باہر برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی کھڑی غمزدہ چہرے اٹھائے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ دوسری جانب زبیدہ کا خاوند ڈاکٹر اور سعیدہ کا خاوند پروفیسر شہر کی ایک کمپنی اور بنک کے نمائندوں کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے تھے ———

سیاہ لمبے کوٹ والا آدمی چبوترے پر کھڑا چھڑی اٹھائے نیلامی بول رہا تھا۔ سامنے قصبے کے زمینداروں جاگیرداروں اور امیر بیوپاریوں کے کارندے کھڑے مال کا جائزہ لے رہے تھے۔ کسی وجہ سے وہ لوگ خود نہیں آئے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے کارندے بھیج دیئے تھے۔ اس مجمع میں قصبے کا ایک بھی دوکاندار، گاڑیبان، حجام، نعل ساز، کوچوان اور حلوائی موجود نہ تھا۔ وہ لوگ ایک بھرے گھر کا یوں راج اٹھتا دیکھ کر گھروں میں بیٹھے افسوسناک انداز میں اس پر تبصرہ کر رہے تھے اور خدا سے دعا مانگ رہے تھے کہ وہ ہر گھر کی لاج رکھے۔ دو سپاہی پرانی وردیوں میں ملبوس سامان کی ڈھیریوں کے درمیان اصیل مرغوں کی طرح گردن اکڑائے پھر رہے تھے اور یہاں وہاں کسی نہ کسی میز، صوفہ، الماری یا پلنگ کو ڈنڈے سے بجا کر دیکھ لیتے تھے۔

نیلام بڑی تیزی سے شروع تھا۔ سو کا مال دس روپوں میں اور دس روپے کی شے ایک روپے میں اٹھ رہی تھی۔ قرضخواہ فوراً رجسٹروں میں اندراج کرتے جاتے تھے اور روپیہ بنک کے ادھیڑ عمر نمائندے کے پاس میز پہ جمع ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر سگریٹ سے سگریٹ سلگا رہا تھا اور نیلام کرنے والی کمپنی کے ایک افسر سے کہہ رہا تھا۔

"لندن میں نیلام کروانے والوں کو کمیشن کے ساتھ آنے جانے کا الاؤنس اور دو وقت کا کھانا بھی ملتا ہے اور یہاں.........."

کمپنی کا گنجا نمائندہ گولڈ فلیک کے سگریٹ کو بچے کے سگریٹ کی مانند پیتے ہوئے سر ہلاتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا اور لمبے سیاہ کوٹ والا دبلا پتلا چارلی سا آدمی کانسی کا پھول کی پتی ایسا بڑا اور منقش تھال ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔

"بولیے حضرات اس کے لیے۔ اس ماسٹر پیس انٹیک کے لیے۔ ہاں ہاں......"

مجمع میں ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"اوئے غلام علی! اسے گھر لے جاؤ اوئے، اماں پان لگاسٹ گی۔"

اور مجمع میں لوگ قہقہے لگا کر ہنس پڑے۔ ڈاکٹر بھی بچے کی طرح ہنسنے لگا۔ گنجے نمائندے نے ڈاکٹر کی طرف جھک کر کہا۔

"ویسے یہ تھال پان سگریٹ کی دکان ہی کا ہے۔"

جب سیاہ رنگ کے ایک خوبصورت آبنوسی رائٹنگ ٹیبل کی نیلامی ہونے لگی تو پروفیسر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے بڑے مجمع میں صرف وہی جانتا تھا کہ اس میز پہ جھک کر رضیہ ——— وہ یونانی المیہ کی ہیروئن اپنی ڈائری لکھا کرتی تھی ——— اور ترجنیف، ٹالسٹائی، تربد، ہکسلے، تھارو اور ہیوگو کو پڑھا کرتی تھی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

"آپ کہاں چلے؟"

"میں یہ میز خریدنا چاہتا ہوں۔"

نیلامی بولنے والے نے آبنوسی میز کو چھڑی سے بجاتے ہوئے کہا۔

"اور اب اس کالے میز کے لیے ——— صاحبان اس کے سیاہ رنگ پر نہ جائیں۔ اس کے گن دیکھیں۔ دیکھیے اس کے چھ دراز ہیں اور اس کا ایک ڈھکنا بھی ہے۔ موٹر گاڑی کی طرح بارش ہو تو ڈھکنا چڑھایا جا سکتا ہے۔ اب بولیے اس کالے مگر دل کے گورے میز کے لیے ....

ایک طرف سے آواز آئی۔

"پانچ روپے۔"

پروفیسر نے فوراً بیس روپے کہہ دیئے۔ سب لوگ اُسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ نیلامی بولنے والا کتنی دیر "بیس روپے ایک، بیس روپے دو" چلاتا رہا لیکن مجمع میں کوئی نہ بولا۔ آخر اس نے "بیس روپے تین" کہہ کر چھڑی میز پہ ماری اور میز پروفیسر کے حوالے کر دی گئی۔ پروفیسر نے روپے دیئے اور بوڑھی خادمہ کی مدد سے میز برآمدے میں ایک طرف کر کے کھڑی کر دی۔ پروفیسر نے لالی کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"اچھی ہو بیٹی؟"

لالی نے سر جھکا لیا۔ اس کی ماں نے دوپٹے سے آنسو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیسا راج اُلٹ گیا بڑے بابو؟"

پروفیسر نے ایک گہرا سانس بھرا اور خاموش رہا۔

....

رضیہ کو اپنی امی کے ساتھ زبیدہ باجی کے ہاں رہتے ہوئے تیسرا مہینہ گذر رہا ہے۔ زبیدہ کے سسرال والوں کی یہ کوٹھی اولڈ کلب روڈ پر واقع ہے۔ یہ کوٹھی کافی لمبی چوڑی ہے۔ اس کے لان میں کنارے کنارے نصف دائرے کی صورت میں یوکلپٹس کے اونچے اونچے درخت ستونوں کی طرح کھڑے ہیں۔ برآمدے کی محرابوں میں کانٹے دار گھاس کے روغنی گملے لٹک رہے ہیں۔ اس کے دو دروازے ہیں۔ پورٹیکو سے ان دروازوں کی طرف جاتی ہوئی کمان ایسی کچی سڑک پر حنائی رنگ کی بجری بچھی ہوئی ہے۔ جب کوئی کار اندر داخل ہوتی ہے، تو اس کے پچھلے پہیوں کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی گرد اڑا کرتی ہے۔ سڑک کی جانب جھاڑیوں کی دس گیارہ فٹ اونچی دیوار کھڑی ہے۔ اس دیوار کے ساتھ لان میں لالہ اور سورج مکھی کے سُرخ اور زرد پھول مارچ کی دھوپ میں مسکرایا کرتے ہیں۔ رضیہ اور اس کی امی کو اس کوٹھی کے دو مختصر سے کمرے دے دیئے گئے ہیں۔ ایک کمرے میں سامان اور دو پلنگ بچھے ہیں اور دوسرے کمرے میں دو تین کرسیاں، ایک میز اور کارنس پہ چینی کا تھوڑا بہت سامان پڑا ہے۔ اس کمرے کی ایک چھوٹی سی کھڑکی لان کی طرف کھلتی ہے۔ اس وقت رضیہ اس کھڑکی کے ساتھ لگی کھڑی ہے۔ اس کا چہرہ اس قدر ڈھل گیا ہے کہ وہ عمر رسیدہ عورت معلوم ہو رہی ہے۔ چہرے کا رنگ جھوسلا ہو رہا ہے اور ہاتھوں پر سبز رگیں اُبھر آئی ہیں۔ بھورے حلقوں میں آنکھیں جب کسی شے کو غور سے

دیکھتی ہیں تو پتھر کی معلوم ہوتی ہیں۔ گالوں پر ایک بے رنگ سی مُردنی چھا رہی ہے۔ وہ کتنی دیر سے یہاں کھڑی باہر لان میں ایک طرف ڈھلتے سورج کی نارنجی دھوپ میں اپنی بوڑھی امّی کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی امّی جھاڑیوں کے پھولوں کے پاس سبز کرسی پر بیٹھی کانپتے ہاتھوں میں پلیٹ تھامے چمچ سے دلیہ کھا رہی ہے۔ اس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے ہیں اور بھاری جسم ڈھلک کر زرد ہو گیا ہے۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی ہیں اور چہرے پر گردن تک جھریوں اور لکیروں کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ اس کے پاس ہی زبیدہ کی شوخ و شنگ نندیں ٹینس کھیل رہی ہیں۔ انھوں نے رنگین دوپٹے کمر کے ساتھ کس کر باندھ رکھے ہیں اور وہ اچھل اچھل کر کھیل رہی ہیں اور شور مچا رہی ہیں اور ان کے کٹے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ بڑی نند کا کمسن لڑکا نیلی نکر پہنے رضیہ کی والدہ کے پاس جا کر اسے جھک کر غور سے دیکھتا ہے اور پھر ٹینس کھیلتی ہوئی امّی سے پوچھتا ہے۔

"امّی...... دادی........ کیا کھا رہی ہے؟"

رضیہ یہ سب کچھ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے اور جیسے اسے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ ساتھ والی کوٹھی میں کوئی ریڈیو پر شہنائی بجا رہا ہے۔ شہنائی کی پُردرد آواز میں ایک زخمی فریاد اور ٹیک ہے۔ جیسے کوئی کھویا ہوا بچہ خواب میں تڑپ کر اپنی ماں کی گود میں جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ رضیہ کے لیے یہ سنگین افسردگی کوئی نئی نہیں تھی۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی اسی طرح تھی۔ اس نے کبھی کسی سے بات نہ کی تھی۔ وہ سارا دن اپنے مختصر سے کمرے میں بیٹھی پڑھتی رہتی، لکھتی رہتی اور اپنی غم نصیب بوڑھی امی کے پاؤں دباتی رہتی۔ اس سے اپنی امی کی روز بروز گرتی ہوئی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ ان کی نظر بے حد کمزور ہو گئی تھی اور سورج کی روشنی میں بھی انھیں دو تین گز کے فاصلے پر سوائے دھند کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ نمکین چائے دن میں کئی بار پیا کرتی تھیں لیکن یہاں انھیں یہ کشمیری چائے صرف دن میں ایک بار صبح کو ملتی تھی۔ کبھی کبھی زبیدہ سب کی نظریں بچا کر ان کے لیے سبز چائے کا پیالہ بنا کر لے آتی تھی۔ وہ چوری چھپے انھیں اور بھی بہت کچھ لا دیا کرتی تھی۔ لیکن اپنے تخت سے گری ہوئی شکست خوردہ بوڑھی آپو نے اپنی زبان سے کبھی کچھ نہ مانگا تھا۔ مگر وہ زبیدہ کو بھی یہاں زیادہ دیر بیٹھنے سے منع کیا کرتی تھیں۔ سعیدہ شروع شروع میں تقریباً روزانہ ان سے ملنے آیا کرتی مگر کچھ دن گزرنے پر اس نے بھی آنا کم کر دیا۔ کسی نے اس سے کچھ نہ کہا کہ وہ اب ملنے کیوں نہیں آتی۔ پروفیسر نے اپنی بیوی سے چھپ کر بڑی آپو کو ہر ماہ اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ پیش کرنا چاہا جسے غیور عورت نے قبول نہ کیا۔ بلکہ پروفیسر کے ساتھ کچھ ایسی سرد مہری سے پیش آئی کہ وہ چپکے سے اٹھ کر چلا گیا اور پھر کبھی نہ آیا ———

ہری ناگ سے جو چند سو روپے بچا کر لائے گئے تھے وہ ختم ہو چکے تھے۔ زیور ——— پرانے خاندانی زیورات فروخت کرنا بڑی آپو نے گوارا نہ کیا تھا، علاوہ ازیں ان کا خیال تھا کہ یہ زیور وہ رضیہ کو دیں گی۔ رضیہ کے لیے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا ——— ہاں! رضیہ کے لیے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ تو خالی دامن ہی رہ گئی تھی ——— اس کی پھلواری میں تو بہار میں بھی درختوں کے زرد پتے ہی گرے تھے۔ آج اس کی محبت، اس کی جوانی، اس کی زندگی سلسلہ در سلسلہ تباہ حال کھنڈروں میں برہنہ سر کھڑی تھی اور اس کی ہر امنگ، ہر آرزو کا سر نیزے میں پرو دیا ہوا اس کی نعش پر نوحہ کناں تھا۔ وہ لاشعور کے تاریک جنگلوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور اس کی سنگین یادوں کے تمام گیت وقت کی خاک اڑاتی، ویران محرابوں میں سجدہ ریز تھے۔ ہائے رضیہ! تیرے سارے بیج گرم ریت میں بوئے گئے تھے۔ تو پھول کہاں سے چنتی! تیرے سارے جگنوؤں کو اندھوں نے اپنی گدڑیوں میں قید کر رکھا ہے تجھے روشنی کہاں سے

آ سکے گی! یونانی المیوں کی ہیروئن! اپنے کھوئے ہوئے ایتھنز، مائیسینی اور غرناطہ کی تلاش میں نکل جا! شاید تیرا محبوب تجھے شام اور فرات کے نخلستانوں میں کسی چشمے پر مل جائے اور تجھے شمالی افریقہ کے ساحل سے ہوتا ہوا ہسپانیہ کی اُن پتھریلی سڑکوں پر لے جائے جو زیتون اور انجیر کے باغوں کو جا رہی ہوں۔ اور جہاں انگور کی بیلوں تلے مراکشی قالینوں پر تیونسی کنیزیں رقص کر رہی ہوں اور اُندلسی مفکر یوروپی تہذیب کا خاکہ مرتب کر رہے ہوں ———!

لیکن رضیہ جس طرف بھی جاتی زبیدہ کا خاوند اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا اور وہ بے بس ہو جاتی۔ اب تو بالکل ہی بے بس تھی۔ یہاں اس کی آہ و زاری سننے والا کون تھا۔ ایک امی تھیں۔ سو ان کی حالت رضیہ سے زیادہ قابل رحم تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے آپ کو ڈاکٹر کے شیطانی حملوں سے بچائے رکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر بالکل نہ نکلتی تھی۔ دن بھر کتابوں میں کھوئی رہتی اور رات کو دروازہ اندر سے بند کر کے امی کے پاس سوتی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کسی طرح اپنی شادی کرے اور آپو جی کو اپنے ساتھ ہی لے جائے۔ مگر وہ اکیلی کیسے اور کیونکر شادی کرے؟ یونہی اسے کون گھر میں گھسنے دے گا اور اگر وہ کسی گھر میں آباد بھی ہو گئی تو وہاں اس کی کوئی بھی عزت نہ ہو گی۔ وہ بڑے باعزت طریق سے اپنے سسرال جانا چاہتی تھی۔ جہاں کا ہر فرد اس کا اور اس کی امی کا احترام کرے۔ لیکن وہ ہر بار ایسا سوچ کر ہی رہ جاتی پھر اُسے یقین ہو جاتا کہ اُس کا بیاہ کبھی نہیں ہو گا اور کسی ہسپانوی پہاڑ سے نکل کر کوئی اُندلسی شہزادہ اسے لینے نہیں آئے گا، کوئی مسعود کلیم اُسے اپنے ڈراموں کی ہیروئن بنانا گوارا نہ کریگا اور فرات کی وادی میں کوئی محبوب چشمے پر اس کا انتظار نہ کرے گا، اور وہ یونہی مر جائیگی، اس لمحے اُسے موت بڑی خوفناک دکھائی دیتی۔ مگر جب وہ اپنے نیلے راستوں پر ڈاکٹر کے بالوں بھرے بھدے جسم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھتی تو چیخ مار کر جاگ اٹھتی اور خدا سے موت کی دعا مانگتی۔ موت ——— تاریک اندھیروں کا اندھیرا، سناٹوں کا سناٹا، تنہائیوں کی تنہائی اور راتوں کی رات!

ایک بار اس نے اپنی امی کے پاؤں دباتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”میرا یہاں دل گھبراتا ہے آپو جی! بہت گھبراتا ہے۔ کیوں نہ ہم ایک آدھ ماہ باجی سعیدہ کے ہاں رہ آئیں۔

رضیہ کا خیال تھا کہ باجی سعیدہ کے ہاں اس بہانے جا کر وہ کبھی زبیدہ کے گھر واپس نہ آئے گی۔ مگر اس کی امی نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا اور تنبیہہ کی کہ آئندہ اس گھر کا نام نہ لے۔

”اب ہمارا مرنا جینا اسی جگہ ہے۔“

اور رضیہ بے بس ہو کر رہ گئی۔ پنجرے میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

باہر لان میں دھوپ یوکلپٹس کے درختوں کی آخری ٹہنیوں کو چوم کر رخصت ہو رہی تھی۔ زبیدہ کی نندیں بدستور ٹینس کھیل رہی تھیں۔ رضیہ کھڑکی کے ساتھ لگی اسی طرح کھڑی تھی اور بے خیالی میں کبھی انھیں کھیلتے دیکھنے لگتی اور کبھی اپنی کمزور و ناتواں ماں کو آہستہ آہستہ دلیہ کھاتے دیکھ رہی تھی۔ اچانک ایک طرف سے گیند اُچھلتی ہوئی آئی اور دلیہ کھاتی بوڑھی عورت کے سر سے ٹکرا کر جھاڑیوں میں جا گری۔ رضیہ کا دل ایک دم ڈوب سا گیا۔ زبیدہ کی پہلی نند نے بلند آواز میں رسمی طور پہ معافی مانگی اور دوسری نند جھاڑیوں میں گیند تلاش کرنے لگی مگر اس بوڑھی عورت نے کچھ نہ کہا۔ صرف عاجزی سے ان کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ دلیہ کھانے لگی۔ اور اب اس کے دلیے میں اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو بھی شامل تھے۔ رضیہ کے دل پر برچھیاں سی چلنے لگیں۔ اس نے کھڑکی

بند کر دی اور اس کے بند پٹ کے ساتھ سر لگا کر سسکیاں بھرتے ہوئے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا اور باہر دھوپ رخصت ہو گئی۔

بہار گذر گئی تھی اور درختوں پر سے پتے گرنا شروع ہو گئے تھے کہ سعیدہ کے ہاں چاند ایسا لڑکا پیدا ہوا۔ سعیدہ کی ساس، بہو کے اصرار پر زبیدہ کے ہاں آئی تو ساتھ اُن کی بوڑھی آپو کو بھی کنال بنک لیتی آئی۔ اس نے رضیہ کو بھی چلنے کے لیے کہا لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔ سعیدہ نے رضیہ کی عدم موجودگی کو ایک لمحہ کے لیے محسوس کیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُسے بھول گئی۔ سعیدہ نے زبیدہ، اپنی بوڑھی ماں، زبیدہ کی دونوں نندوں اور اس کی ساس، سبھوں کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی تھی۔ کھانے پر سب نے بڑی خوش دلی اور سرگرمی کا اظہار کیا۔ زبیدہ کا ڈاکٹر خاوند تو اس قدر کھا گیا کہ اس کا پیٹ ابھر گیا اور وہ کافی پر کافی چڑھانے لگا۔ پروفیسر نے بہت کم کھایا اور سب سے جدا ہو کر درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔ اس کے ارد گرد سائے میں درختوں سے گرے ہوئے زرد پتے بکھرے ہوئے تھے۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اچانک اُسے خیال آیا کہ رضیہ گھر میں تنہا ہو گی۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے چپکے سے گیرج میں جا کر موٹر نکالی۔ نوکر سے کہا کہ وہ ذرا اسٹیشن تک جا رہا ہے۔ اور سیدھا زبیدہ کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

رضیہ اتنی بڑی خالی کوٹھی میں تنہا تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز اپنی ڈائری کے پرانے اوراق پڑھ رہی تھی کہ کوٹھی میں کسی کار کے داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔ کار کے دھیمے دھیمے ہارن کی آواز بڑی مانوس تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ باہر پورٹیکو میں پروفیسر کار کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ رضیہ گم سُم سی ہو کر وہیں کی وہیں کھڑی رہی۔ یہ کیوں آئے ہیں؟ کیا اُسے لینے آئے ہیں؟ وہ کبھی نہیں جائے گی۔ کہیں نہیں جائے گی۔ اب یہاں اس کا کون ہے! کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ رضیہ جیسے کسی سحر کے زور سے دروازے کی طرف لپکی اور فوراً چٹخنی کھول دی۔ پروفیسر نے بھورے رنگ کے سرج کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ افسردہ تھا۔

رضیہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بیٹھئے۔"

پروفیسر کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے میں بڑی معنی خیز چپ چاپ طاری ہو گئی۔ رضیہ کو پہلی بار اس کمرے کی خاموشی بڑی مانوس محسوس ہو رہی تھی۔ اس خموشی میں آنے والے دنوں کی غمگین اُمیدیں اور پرانے دنوں کے سوگوار نوحے تھے۔ وہ خاموش تھی لیکن اُسے اُس خموشی کی پُر محبت سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ سعیدہ کے خاوند نے اپنے مخصوص انداز میں فکر آمیز آنکھوں کو ذرا سکیڑ کر کہا۔

"میں ——— میں تمہیں بہت کچھ کہنے آیا تھا رضیہ۔ مگر کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تم میری باتوں سے بہت بلند ہو۔ میں نے تمہارے سامنے ہمیشہ لفظوں کے پانسے پھینکے ہیں اور تم زندگی کے بھنور میں اتری ہوئی ہو۔ اب صرف اتنا ہی کہوں گا کہ تم شادی کر لو۔ سعیدہ نے آپو جی کے مشورے سے ایک رشتہ تلاش کر لیا ہے۔ لڑکا مجھے بھی پسند ہے۔ کوشش کرنا کہ اس کے ساتھ زندگی کے دو روز ہنس کھیل کر گزار سکو۔"

رضیہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ آپ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں رضیہ۔ اس لیے کہ تمہارے دکھوں کا یہی ایک علاج ہے۔"

"اگر زندگی گذارنا ایک مرض ہے تو مجھے اس کا علاج نہیں چاہئے۔"

پروفیسر کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ وہ ہر قیمت پر رضیہ کو بچانا چاہتا تھا۔ وہ اس بدنصیب روح کو برف کے گھر سے شگاف میں گرتے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ رضیہ کو اس تباہی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا ——

"میرا مطلب یہ نہیں رضیہ۔ میں چاہتا ہوں تم اپنے گھر آباد رہو۔ تمہارا بھی ایک خوبصورت گھر ہو۔ تمہارے بھی خوبصورت بچے ہوں۔ تمہاری نگہداری بھی کرنے والا کوئی ہو۔ ذرا آئینے میں اپنی صورت دیکھو۔ تم کیا تھیں۔ تم کیا بن گئی ہو۔"

رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اگر خوبصورتی کی تلاش میں نکلا ہوا انسان بدصورت ہو جاتا ہے تو میں دنیا کی سب سے بدصورت عورت ہوں۔ اور اگر نیکی کرنے سے انسان بُرا ہو جاتا ہے تو مجھ سے زیادہ بُرا اور کون ہو گا۔"

پروفیسر نے سگریٹ سلگا لیا اور اُٹھ کر پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رضیہ کھڑکی سے باہر درختوں پر دھوپ میں چمکتے زرد پتوں کو دیکھ رہی تھی۔

"مجھے زندگی سے محبت ہے اور جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مرنا بھی زندگی میں شامل ہے مجھے موت سے بھی محبت ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں مرنے کے بعد بھی زندہ رہوں گی۔ ہو سکتا ہے میں کل سورج کو طلوع ہوتے نہ دیکھ سکوں۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کل طلوع ہونے والا سورج مجھے نہ دیکھے۔ جہاں میں دفن ہوں گی وہاں زرد گلاب کا پھول اُگے گا۔ بھلا جس کی موت پر تروتازہ پھول اُگیں وہ کیسے مر سکتا ہے؟ ...."

"لیکن رضیہ ...."

"زندگی گذارنا ایک آرٹ ہے، پروفیسر صاحب بڑا سیدھا اور نیچرل آرٹ، اور جو لوگ اس آرٹ سے واقف ہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ زندگی کا تعلق انسٹنکٹ سے ہے لیکن زندگی گذارنے کا تعلق انٹلیکٹ سے ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کو مجھ سے دلی ہمدردی ہے۔ اس کے لیے میرا دل خوشی سے لبریز ہے۔ لیکن میں اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلنا چاہتی ہوں۔ اگر یہ راستہ پُرسکون جھیلوں پر جا نکلا تو میں وہاں چاندنی راتوں میں نیلے کنول چن کر آپ کی ہمدردیوں کے تہوار منایا کروں گی۔ اور اگر تپتے صحراؤں میں جا کر ختم ہو گیا تو میں اپنا صحیح راستہ تلاش کرنے ایک بار پھر آؤں گی —— ہاں ایک بات آپ سے ضرور کہوں گی۔ اگر میں مر جاؤں تو میرے لیے غم نہ کریں۔ میری قبر پر کسی کو آنسو نہ بہانے دیں۔ بڑی دلیری سے زندہ رہیں۔ زندگی کے الاؤ کو روشن اور بھڑکتا رکھیں۔ اگر یہ الاؤ مدھم ہونے لگے اور لکڑیاں ختم ہو جائیں تو بے شک میری لاش کو بھی اس میں جھونک دیں۔ میں مرنے کے بعد بھی زندگی کی بھٹی میں جلنا پسند کروں گی۔"

رضیہ خاموش ہو گئی۔ اس کا سر کرسی کی پُشت سے لگا تھا اور زرد چہرے پر ایک عجیب قسم کی گرم روشنی جھلک رہی تھی۔ پروفیسر میز کے ساتھ ٹیک لگائے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر وہ یکایک آگے بڑھا۔ اس نے جھک کر رضیہ کے نازک ہاتھ کو بڑے احترام سے چوما اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ رضیہ ایک عالمِ خود فراموشی میں ڈوبی مجسمے کی طرح

پڑی رہی۔ باہر کار کے سٹارٹ ہونے اور دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دور جا کر یہ آواز خلا میں کھو گئی۔ رضیہ اپنے ہاتھ کو بڑی افسردہ مسرت کے ساتھ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اس مقدس ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

....

شام ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی تک سعیدہ کے ہاں سے کوئی واپس نہ آیا تھا۔ نوکر بھی کہیں سینما وغیرہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ اتنی بڑی خالی کوٹھی میں رضیہ کو اکیلے میں کچھ مبہم سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر وہ لان میں ٹہلتی رہی۔ پھر برآمدے میں بیٹھی پڑھتی رہی اور اس کے بعد اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی اور پلنگ پر لیٹ کر سعیدہ کے خاوند سے اپنی آج کی ملاقات، اس کی خاموشی، اپنی باتوں اور پھر اس کے جھک کر ہاتھ چومنے کے متعلق سوچنے لگی۔ کمرے میں شام کے پہلے مرطوب سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے دل میں بتی جلانے کا خیال آیا۔ وہ ابھی بتی جلانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک بار پھر وہی بھاری جسم، سرخ آنکھوں والا ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن آج اس کے پاؤں میں خوفزدہ لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ وہ یوں کمرے کے وسط میں کھڑا تھا جیسے اپنے جہاز کے عرشے پر کھڑا قیدیوں کو چابکیں لگوانے کا حکم دینے والا ہو۔

رضیہ دھک سے رہ گئی۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"آپ .... آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"تم جانتی ہو۔"

ڈاکٹر کی آواز میں کسی قسم کی گھبراہٹ نہ تھی۔ اندھیرے میں اچانک ایک خیال چمکا۔ رضیہ جھک کر کھلی کھڑکی کی طرف لپکی اور ڈاکٹر نے فوراً اسے اپنی مضبوط گرفت میں لیا۔

"اگر تم نے شور مچایا تو یاد رکھو کل تم اور تمہاری سفید بالوں والی ماں سڑک کے کنارے پڑی ہو گی۔"

رضیہ کا جسم برف کی سل بن چکا تھا۔ سرد اور بے جان۔ اس نے ڈاکٹر کے بازوؤں سے نکلنے کی آخری کوشش کی اور اس کے بعد اسے غش آ گیا۔ ڈاکٹر نے اسے اٹھا کر کندھے پر رکھا اور دروازے سے باہر نکل کر کوٹھی کے دوسرے خالی کمروں کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

....

رات کو جب سب لوگ کار میں بیٹھے واپس آئے تو رضیہ کی بوڑھی امی نے دیکھا کہ رضیہ پلنگ پر بےہوش پڑی ہے اور کمرے کی فضا میں خون کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے بدحواس ہو کر رضیہ کو ہلایا جلایا اور پھر چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ امی کی چیخ کی آواز سن کر سبھی اس کمرے کی طرف دوڑے۔ زبیدہ نے فوراً رضیہ کے نصف حصے پر چادر پھیلا دی اور اپنے خاوند کو آواز دی۔ اس کا خاوند بھاگتا ہوا اندر آیا اور اپنی بہن کو دواؤں کا بکس لانے کو کہہ کر مریضہ پر جھک گیا۔

"فکر نہ کریں نبض ٹھیک چل رہی ہے۔"

رضیہ کو فوراً دو ٹیکے لگا دیے گئے۔ لیکن اُسے ہوش نہ آیا۔ رات بھر اُس کی بڑی بہن اور بوڑھی ماں اُس کے پاس بیٹھی رہیں۔ درمیان میں دو ایک بار رضیہ نے آہستہ سے کراہتے ہوئے کچھ کہا اور پھر بے ہوش رہی۔ صبح کینال بینک والی کوٹھی سے بھی سعیدہ کے سوا باقی سب لوگ اولڈ کلب روڈ کی جانب دوڑے۔ سعیدہ کے خاوند نے غور سے رضیہ کا مرجھایا ہوا نیلا چہرہ دیکھا اور باہر نکل گیا۔ رضیہ کا چہرہ نیلا پڑ کر سیاہی مائل ہو گیا تھا اور ناخنوں کا رنگ بھی نیلاہٹ مائل ہو رہا تھا۔

کلائیوں اور ہتھیلی کی پشت پر اُبھری ہوئی سبز رگیں کھنچ گئی تھیں۔ اور بند آنکھیں سیاہ حلقوں میں ڈوب چکی تھیں اور اگر اس کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو شاید وہ ڈاکٹر کو اپنے رُوبرو دیکھ کر پھر کبھی نہ کھلنے کے لیے بند ہو جاتیں۔ رضیہ کی بوڑھی امی ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے سہمی ہوئی تھی جیسے وہ اپنی بیٹی کے اُوپر موت کے بازوؤں کو جھکتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ تین روز تک رضیہ حیات و موت کی کشمکش میں لٹکی بے ہوش پڑی رہی۔ بلیڈنگ کسی طرح بند نہ ہو رہی تھی۔ تین روز سے اس کے معدے میں سوائے گلوکوز اور طاقت کی دوائیوں کے اور کچھ نہ گیا تھا۔

چوتھے روز رات کے کسی لمحے اُس نے موت کے تاریک غار میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ ایک بار ـــ صرف ایک بار کسی کی تلاش میں، کسی کی جستجو میں، اِرد گرد دیکھا اور اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ بوڑھی ناتواں ماں نے اپنی بیٹی کا چہرہ اپنے کانپتے ہاتھوں میں تھام کر محبت سے پکارا۔

"میری بیٹی، میری بیٹی، میری رضیہ......"

رضیہ نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور وہ کُھلے کے کُھلے رہ گئے۔ زبیدہ اور بوڑھی ماں چیخ مار کر لاش سے لپٹ گئیں۔ جاگو! جاگو! میری بیٹی! میری بہن! تم نے تو کہا تھا تم کبھی نہیں مرو گی۔ دیکھو! صندوق میں تیرے بیاہ کے زیور پڑے ہیں اور الماری میں تیری کتابیں تجھے بلا رہی ہیں۔ جاگو! جاگو! آدھی آدھی رات تک پڑھنے والی! تجھے بیاہنے والا اُندلسی شہزادہ آ گیا ہے وہ دیکھو اس کا سنہری گھوڑا انجیر کے درختوں میں کھڑا ہے۔ لیکن رضیہ جا چکی تھی۔ نیلی دُھند میں ڈوبی ہوئی گمنام پہاڑیوں کی طرف۔ تاریک کہرے میں لپٹے ہوئے اجنبی جزیروں کی طرف ـــ او زندگی اور موت سے پیار کرنے والی! ذرا کھڑکی سے باہر دیکھو۔ رات نے تیرے سوگ میں اپنے تمام ستاروں پر سیاہ چادر پھیلا دی ہے اور ہوا درختوں کی لٹکتی ہوئی ٹہنیوں سے گلے لگ کر سسکیاں بھر رہی ہے۔ ہمیں بھی اُس جنگل کا راستہ بتاتی جاؤ جہاں زعفران اُگتی ہے اور جہاں پہنچ کر غمزدہ کنواریاں گھر واپس آنا بھول جاتی ہیں۔ اور پھر کھلی کھڑکی میں سے آدھی رات کو چلنے والی ہوا کا جھونکا اندر آیا اور جیسے کسی نے آہ بھر کر خشک آواز میں کہا۔

SO SIGH WE PASSING OVER THE SILVER STRINGS
WE ARE THE VOICES OF THE WANDERING WINDS
.... WANDER THOU TOO, O, PRINCE!

دوسرے دن رضیہ کو ہری ناگ کے آبائی قبرستان میں اپنے باپ کے پہلو میں دفنا دیا گیا۔

دسمبر کی کُہر آلود سرد رات ہے۔ بارش ابھی ابھی رُکی ہے۔ کینال بنک کی تمام کوٹھیوں میں اندھیرا ہے۔ صرف ایک کوٹھی کے عقبی کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی ہے اور اندر ادھیڑ عمر کا ایک اداس چہرے والا آدمی سیاہ آبنوسی میز پر جُھکا کسی عورت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی پرانی ڈائری پڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں ایک انتہائی لاغر بوڑھی عورت لحاف میں لیٹی اپنی بیٹی کی یاد میں آنسو بہا رہی ہے۔

اور کینال بنک سے دُور — باغوں، کھیتوں، میدانوں کے اُس پار قصبہ ہری ناگ کے حویلی نما پرانے مکان کو تاریکی نے اپنی بھیگی ہوئی سرد چادر میں لپیٹ رکھا ہے کسی کھڑکی میں لیمپ نہیں جل رہا۔ اُس کی دیواروں پر گھاس اُگ آئی ہے اور گلاب کی بیل نیچے گر پڑی ہے۔ اور یہاں سے جنوب کی طرف نہر کے پار مغل دربار کی گمنام کنیز کی تربت پر آم کی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہیں اور قریب ہی پرانے قبرستان میں ایک جگہ رضیہ دفن ہے۔ اس کی پختہ قبر پر کائی جمی ہے اور اوپر درختوں کی ٹہنیوں میں رُکا ہوا بارش کا پانی ٹپک رہا ہے، رو رہا ہے۔

گڈریا

اشفاق احمد

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے۔ میں اپنے گرم گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا۔"

"کیا؟" میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ پرے دھکیلنا چاہا "یہ کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا — اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔"

"داؤ جی کے بچے" میں نے روہانسے ہو کر کہا "آدھی آدھی رات تنگ کرتے ہیں — دفع ہو جاؤ — میں نہیں آپ کے گھر رہنا، میں نہیں پڑھتا — داؤ جی کے بچے — کتے!" اور میں رونے لگا۔

داؤ جی نے چمکار کر کہا "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہوگا! پاس نہیں ہوگا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب مر جائیں — آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی........ اور میں بھی — میں بھی.... میں بھی" اپنی "جوانا مرگی" پر میں ایسا رو دیا کہ دو ہی لمحوں میں گھگھی بندھ گئی۔

داؤ جی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے جاتے تھے اور کہہ رہے تھے "بس اب چپ کر، شاباش — میرا اچھا بیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کر دے پھر نہیں جگاؤں گا۔"

آنسوؤں کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا "آج حرامزادے راتو کو پکڑ کر لے گئے کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو......"

"نہیں نہیں" انھوں نے بات کاٹ کر کہا "میرا تیرا وعدہ رہا۔ آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا — شاباش اب بتا۔ "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا۔"

میں نے رو دھو کر کہا "مجھے نہیں آتا۔"

"فوراً نہیں کہہ دیتا ہے" انھوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا "کوشش تو کرو۔"

"نہیں کرتا!" میں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے "کارکنان گزمرخانہ رالفورا توقیف کردند ——— کارکنان گزمرخانہ، نغانے والے۔ بھولنا نہیں نیا لفظ ہے نئی ترکیب ہے دس مرتبہ کہو۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں ناچار گزمرخانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو داؤجی نے بڑی لجاجت سے کہا اب سارا فقرہ پانچ بار کہو۔ جب یہ بخانہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انھوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا "بھولنا نہیں! صبح اٹھتے ہی پوچھوں گا۔"

پھر وہ جدھر سے آئے تھے ادھر لوٹ گئے۔

شام کو جب ملا جی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے۔ ان میں صرف موٹے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدو کریلا ڈھائی آنے" کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا جس کے تین طرف کچے پکے مکانوں کی دیواریں اور سامنے کے رُخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کا اونچا اونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا، پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گیرو رنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا اور قدرے تنگ ہو جاتی پھر جُوں جُوں اس کی لمبائی بڑھتی تُوں تُوں اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی۔ اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں اور جونہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے "ٹھائیں" ہوگا اور میں مر جاؤں گا۔ مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید مونچھوں والا لمبا سا آدمی بھی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی۔ ذرا سی خمیدہ کمر پر خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدر کا تنگ پاجامہ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا جس نے بالکل اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹکے بغیر گردنوں کو ذرا ادھر موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن جب میں اور میرا بھائی "ٹھٹیاں" کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آ رہے تھے تو نہر کے پُل پر یہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا اور اس کی سفید چُٹیا میلی مرغی کے پَر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر زور سے کہا "داؤجی سلام!"

اور داؤجی نے سر ہلا کر جواب دیا "جیتے رہو!"

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بیحد خوش ہوا اور تھوڑی دیر بعد اپنی منمنی آواز میں چلّایا "داؤجی سلام"

"جیتے رہو! جیتے رہو!!" انہوں نے دونوں ہاتھ اُوپر اٹھا کر کہا۔ اور میرے بھائی نے پٹاخ سے مجھے زناٹے کا ایک تھپڑ دیا۔

"شیخی خورے، کُتّے" وہ چیخا "جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنساتا ہے کمینہ ——— بھلا کون ہے وہ؟"

"داؤ جی!" میں نے بسور کر کہا۔

"کون داؤ جی" میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

"وہ جو بیٹھے ہیں وہ داؤ جی" میں نے آنسو پی کر کہا۔

"بکواس نہ کر" میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا "ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کُتّا ——— شیخی خورا!"

پھر میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤ جی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے مجھے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت ہی تھی۔ بڑا تھا نا اس لیے ہر بات میں اپنی شیخی بگھارتا تھا۔

داؤ جی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لیے میں کوشش کر کے گلی سے اس وقت گزرنے لگا جب وہ آ جاتے ہوں۔ انہیں سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ وہ جیتے رہو کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دوچند سی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا ——— سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر یونہی چلتا رہا اور اس اثنا میں مجھے اسی قدر معلوم ہو سکا کہ داؤ جی گیرو رنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے "تجھے کیا" اور "بکواس نہ کر"۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم۔ بی ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا تو داؤ جی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤ جی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے ہشیار تھا۔ اس کی پگڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ بلی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر میں داؤ جی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی سے پکارتا تھا اس لیے وہ میرا دوست بن گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یار بنے رہنے کا وعدہ کر لیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسانے والی دوپہر تھی لیکن شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی آگے مستطیل صحن سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ، عقیق کے چند پودے

اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرو رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ بیٹھک میں کھلتی تھیں اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو امی چند نے چلّا کر "بے بے نمستے" کہا اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھی اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے۔"

مشین رک گئی۔

"ہاں ہاں" بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزدان کی رسّی مروڑتا اور ٹیڑھے میڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بے بے نے چمکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے" اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا "ہے نا بے بے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا۔"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی "آفتاب کیا بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے داؤجی" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا "امی چند کے ساتھ آیا ہے۔"

اندر سے داؤجی برآمد ہوئے۔ انہوں نے گھٹنوں تک اپنا پائجامہ چڑھا رکھا تھا اور کرتہ اتارا ہوا تھا۔ مگر سر پہ پگڑی بدستور تھی۔ پانی کی ایک ہلکی سی بالٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آ گئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے "ہاں شکل بہت ملتی ہے مگر میرا آفتاب بہت دبلا ہے اور یہ گولو مولو سا ہے۔" پھر بالٹی فرش پر رکھ کے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس ہی کاٹھ کا ایک سٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انہوں نے آہستہ سے انہیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دئے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انہوں نے بالٹی سے پانی کے چلو بھر بھر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی" میں نے ہولے سے کہا "پرسوں آیا تھا۔"

"کیا لکھتا ہے؟"

"پتہ نہیں جی اباجی کو پتہ ہے۔"

"اچھا" انہوں نے سر ہلا کر کہا "تو اباجی سے پوچھا کر، بابا — جو پوچھتا نہیں اسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔"

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انہوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے پوچھا "کونسا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تیسرے سیپارے کا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی پتہ نہیں" میری آواز پھر ڈوب گئی۔

"مِتلاکَ الدُّہسلؐ" انہوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔ بے بے مشین چلاتی رہی، وہ لڑکی نعمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور میں جزدان کی ڈوری کو کھولتا لپیٹتا رہا۔ امی چند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور میں ستونوں کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ معاً داؤ جی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا "سورۂ فاتحہ سناؤ۔"

"مجھے نہیں آتی جی" میں نے شرمندہ ہو کر کہا

انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا "الحمدللہ بھی نہیں جانتے؟"

"الحمدللہ تو جانتا ہوں جی" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے "ایک ہی بات ہے۔ ایک ہی بات ہے!" پھر انہوں نے سر کے اشارے سے کہا "سناؤ۔"

جب میں سنانے لگا تو انہوں نے اپنا پائجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا اور جب میں نے وَلاَ الضَّآلِّیْن کہا تو میرے ساتھ ہی انہوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ ابھی اٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد سنائی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آمین کیا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤ جی اسی طرح بیٹھے رہے بلکہ اور بھی پتھر ہو گئے۔ اتنے میں امی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا "داؤ جی سلام" اور انہوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہوئے سے جواب دیا "جیتے رہو" بے بے نے مشین روک کر کہا "کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آ جایا کر......"

"ہاں ہاں آ جایا کر" داؤ جی چونک کر بولے "آفتاب بھی آیا کرتا تھا" پھر انہوں نے پانی پر جھکتے ہوئے کہا "ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا" اور فارسی کا شعر سا پڑھنے لگے۔

یہ داؤ جی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤ جی بڑے کنجوس ہیں، حد سے زیادہ چپ سے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤ جی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا "تو مجھ سے پوچھ تو لیتا۔ بے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے ابا جی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا وہ خفا ہوں گے۔" پھر اماں نے ذرا ہمدرد بن کر کہا "اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

میں ابا جی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤ جی کے ہاں جاتا رہا۔ وہ خوب خوب ان سے عنبری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے میں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے "گولو آ گیا" پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے "کوئی گپ سنا" اور میں اپنی بساط اور سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھانڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنستے بس یونہی میرے لیے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ ایسی دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی

تھیں۔ پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے لے ایک سوال نکال۔ اس بات سے میری جان جاتی تھی لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ گپیں۔ چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے الجھیلے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے یہ کیا ہے؟ "چٹائی" میں منہ پھاڑ کر جواب دیتا۔ "اوں ہوں" وہ سر ہلا کر کہتے "فارسی میں بتاؤ" تو میں تنک کر جواب دیتا "تو جی ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے" اس پر وہ چمکار کر کہتے "میں جو پڑھاتا ہوں گو تو۔ میں جو سکھاتا ہوں —— سنو! فارسی میں بوریا، عربی میں حصیر" میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "بخشو جی بخشو، فارسی بھی، اور عربی بھی۔ میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو" مگر وہ سنی ان سنی کر کے کہے جاتے فارسی بوریا عربی حصیر، اور پھر کہے ہی جاتے اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤ جی کے الفاظ گھستے چلے جاتے —— امی چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دن بیٹھک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا۔ داؤ جی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے لیکن ان کے وار امی چند پر بھی برابر ہوتے رہتے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا داؤ جی نے کتاب سے نگاہیں اٹھا کر پوچھا "بیٹا ڈو کا ناؤن کیا ہے؟"

اس نے گلاس منہ کے ساتھ لگائے لگائے "ڈیڈ" کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آگیا۔ داؤ جی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اُسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن داؤ جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر ہانک لگا کر کہتے "قرۃ بیٹا یہ تیلیہنی تجھ سے کب چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی "تم نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے سینے لکھوا دیے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہو تو شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں" اور داؤ جی ایک لمبی سانس لے کر کہتے "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں"۔ اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو آتا کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے پھر بددعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی روکتی تو داؤ جی کہتے "ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو۔ تم انہیں روکو مت انہیں ٹوکو مت۔" پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیر اٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بری عادت پڑ گئی اور اس بری عادت نے عجیب گل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبہ کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے، جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں اُن کے تیر بہدف ٹوٹکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجون کے چند ڈبوں، شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمان کے خاص صدری تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے۔ انہی باتوں کے لیے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھچے چلے آتے اور فیضیاب ہو کر جاتے۔ ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لیے خالی بوتلیں اور شیشیاں چرا کے لاتا اور اس کے بدلے میں وہ مجھے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لیے دیا کرتے۔ یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انھیں پڑھا کرتا اور صبح دیر تک سویا رہتا۔ اماں

میرے اس رویّہ سے سخت نالاں تھیں، ابا جی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا۔ لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کر دوں گا۔ رات طلسم ہوشربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی اور دن کلاس میں بنچ پر کھڑے ہو کر۔ سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ششماہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقعہ پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ، فسانۂ آزاد اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ فسانۂ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیسک میں بند رہتی۔ آخری بنچ پر جغرافیہ کی کتاب تلے سندباد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا......

بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی۔ ہائی سکول پہنچی۔ امی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اوّل آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانشگاہ نے میرا نام بھی ان چھیوں لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے اور کدھر جانا چاہیئے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمرو عیار کے ہتھکنڈوں اور سندباد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے مسلسل اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور ابا جی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہ تھی مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی اور صبح سویرے اپنے سفر پہ روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسبِ معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں خوشیا کوڈو اور دلیسو یب یب مسجد کے پچھواڑے ٹال کے پاس بیٹھے مل گئے۔ وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دیسو یب یب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھایا جی اکثر اپنے دوست فتح چند کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں۔ میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو یب یب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہیئے اور اس کے سامنے بڑا سا سائن بورڈ۔ سائن بورڈ کو دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا! میں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت چاہی تو کوڈو چمک کر بولا "یار دیسو سب کچھ جانتا ہے۔ یہ بتا کہ تو تیار ہے یا نہیں؟"

پھر اس نے پلٹ کر دلیسو سے پوچھا "انارکلی میں دفتر بنائیں گے نا؟"

دلیسو نے ذرا سوچ کر کہا "انارکلی میں یا شاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں؟"

میں نے کہا "انارکلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انارکلی لاہور لکھا ہوتا ہے۔"

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں گے!

گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکر نے آ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "چلو جی ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہسپتال میں" وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر اباجی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ داؤ جی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سہمے سہمے داؤ جی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا سنی۔

"ان کو پہچانتے ہو؟" اباجی نے سختی سے پوچھا۔

"بے شک!" میں نے ایک مہذب سیلزمین کی طرح کہا۔

"بے شک کے بچے، حرامزادے ابھی تیری یہ سب......"

"نہ نہ ڈاکٹر صاحب" داؤ جی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے اس کو تو......"

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا "آپ نہیں جانتے منشی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملا دی۔"

"آپ فکر نہ کریں" داؤ جی نے سر جھکا کے کہا "یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن......"

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آ گیا اور انہوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔"

"کریگا، کریگا ——— ڈاکٹر صاحب" داؤ جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "آپ خاطر جمع رکھیں۔"

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولے "میں سیر کو چلتا ہوں تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ راستے میں باتیں کریں گے۔"

اباجی اسی طرح کرسی پر بیٹھے غصے کے عالم میں اپنا رجسٹر الٹ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا تو داؤ جی نے پیچھے مڑ کر کہا "ڈاکٹر صاحب بھول نہ جائیے گا ابھی بھجوا دیجئے گا۔"

اباجی نے ویسے ہی چیزیں پٹختے "اچھا" کہا اور داؤ جی خدا حافظ کہہ کر میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔

داؤ جی مجھے ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انہوں نے پگڑی اتار کر گود میں ڈال لی، سر پہ ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا "آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اول نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوا دوں گا۔ میرے ہر ارادے میں خداوند تعالےٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا......"

"مجھ سے پڑھائی نہ ہو گی" میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

"تو اور کیا ہو گا گولو؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "میں بزنس کروں گا، روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں آؤں گا پھر دیکھنا......"

اب کے داؤ جی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا "خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک ان پڑھ کی کار میں نہ میں بیٹھوں گا نہ ڈاکٹر صاحب۔"

میں نے جل کر کہا "مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی میں اپنے یہاں خوش۔"

انہوں نے حیران ہو کر پوچھا "میری بھی پروا نہیں؟" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے میری

بھی پروا نہیں؟ اوگو تو میری بھی پروا نہیں!"

مجھے ان کے لہجہ پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا "آپ کی تو ہے مگر......" مگر انھوں نے میری بات نہ سُنی اور کہنے لگے "اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا...... تو...... تو......" انھوں نے فوراً پگڑی اُٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "میں حضور کے دروازے کا ایک ادنیٰ کتا۔ میں حضرت مولانا کی خاکِ پا سے بدتر بندہ ہو کر آقا سے یہ کہتا؟ لعنت کا طوق نہ پہنتا؟" پھر انھوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے اور سر بالکل گود میں جھکا کر بولے "میں ذات کا گڈریا۔ میرا باپ منڈاسی کا گوالا۔ میں جہالت کا فرزند۔ میرا خاندان ابوجہل کا خانزادہ اور آقا کی ایک نظرِ کرم۔ حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چنتو کو منشی چینت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی میں کہتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کفش بردار...... لوگ سمجھتے ہیں......" داؤجی کبھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان ان کا زانو چھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا داؤجی! داؤجی! اور داؤجی "میرے آقا، حضرت مولانا، میرے مرشد" کا وظیفہ کیے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے "کیا اچھا موسم ہے۔ دن بھر گرمی پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے" پھر وہ پل کی دیوار سے اُٹھے اور بولے "چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سودا خریدنا ہے" میں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا اس سے کہیں زیادہ شرمندہ اور خجل ان کے ساتھ لوٹا۔ گھسیٹے پنساری یعنی دسیو حبیب کے باپ کی دوکان سے انھوں نے گھریلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اٹھا کر چل دیئے۔ میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا مگر ہمت نہ پڑتی ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی جھجک ہر بار مانع ہوتی اور میں ناکام اور جھجک میں ڈوبتا اُبھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کروں گا اور وہیں پڑھا کروں گا کیونکہ میرا بستہ مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہریکین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بزنس مین بننا اور پاں پاں کرتی پیکارڈ اڑاتے پھرنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ گو میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انھیں لاہور سے پکڑ لائے لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا دفتر پتہ نہیں ترقی کے کون سے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا!

داؤجی نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھے تباہ کر دیا مجھ پر جینا حرام کر دیا۔ سارا دن سکول کی بکواس میں گزرتا اور رات، گرمیوں کی مختصر سی رات، ان کے سوالات کا جواب دیتے میں۔ کوٹھے پر ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے اور وہ مونگ رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں۔ میں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے وہ پھر اُسی سوال کو دُہرا رہے ہیں میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے اور انھوں نے پھر انہی نہروں کو آگے لا کھڑا کیا ہے۔ میں جل جاتا اور جھڑک کر کہتا "مجھے نہیں پتہ میں نہیں بتاتا" تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کنکر بن کر پتلیوں میں اُترتی جاتی۔ میں آہستہ سے کہتا "داؤجی"

"ہوں!" ایک گھمبیری آواز آتی۔

"داؤجی کچھ اور پوچھو"

داؤجی نے کہا "بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے ——— اس کی ترکیب نحوی کرو"

میں نے سعادت مندی کے ساتھ کہا "جی یہ تو بہت لمبا فقرہ ہے۔ میں لکھ کر بتاؤں گا کوئی اور پوچھئے۔"

انہوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کے کہا "میرا گولو بہت اچھا ہے۔"

میں نے ذرا سوچ کر کہنا شروع کیا "بہت اچھا صفت، ہے رابطہ مل کر بنا مسند......"

اور دادا جی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے، ہاتھ اٹھا کر بولے "جان پدر تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند الیہ پہلے بتایا کرو۔"

میں نے ترکیب نحوی سے جان چھڑانے کے لیے پوچھا "آپ مجھے جان پدر کیوں کہتے ہیں جان داؤد کیوں نہیں کہتے؟"

"شاباش" وہ خوش ہو کر کہتے "ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤد عبرانی کا ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں۔ روز بروز کہو یا دن بہ دن۔ اسی طرح سے......"

اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیب نحوی سے بھی خطرناک معاملے میں الجھ گیا ہوں تو جمائی لے کر پیار سے کہتا "دادا جی! مجھے نیند آ رہی ہے!"

"اور وہ ترکیب نحوی؟" وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد میں چاہے لاکھ بہانے کرتا، ادھر ادھر کی ہزار باتیں کرتا مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے۔ بلکہ اگر ذرا دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی پگڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

امی چند کالج چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور دادا جی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے دادا جی بہت اچھے لگنے لگے تھے لیکن ان کی جو باتیں مجھے اس وقت بری لگتی تھیں وہ اب بھی بری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے کسی قدر زیادہ، شاید اس لیے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور دادا جی پرانے ملائی مکتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بری عادت ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے پڑھتا رہے اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دیدے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لیے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا، لمبی سیر! اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً روز سورج نکلنے سے کوئی دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے "اٹھ گولو موٹا ہو گیا بیٹا" دنیا جہان کے والدین صبح جگانے کے لیے یہ کہا کرتے ہیں کہ اٹھو بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا مگر وہ "موٹا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے۔ میں منمناتا تو چمکار کر کہتے "بھدا ہو جائے گا بیٹا تو گھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کیا کرے گا!"

اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "دادا جی خدا کے لیے مجھے صبح نہ جگاؤ چاہے مجھے قتل کر دو۔ مجھے جان سے مار دو۔"

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان دادا جی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور دادا جی ان سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور دادا جی کو کوسنے دیے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بڑا غصہ آتا تھا مگر پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ ناگفتنی گالیوں پر اتر آتیں تو دادا جی میرے پاس بیٹھک میں آ جاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے۔ تھوڑی دیر بعد کہتے "غیبت کتنا بڑا گناہ ہے لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اس کی سرائے میں، میں، میری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا تو بھی، ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں۔" اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ اس کا رنگ سخت کالا تھا اور دانت بے حد سفید، ماتھا محرابدار

اور آنکھیں چندھیاں سی جاتیں تو ایسی گھبراہٹ کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کسی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی ایسی بُری باتیں کہتی کہ وہ دونوں دن رو رو کر ہلکان ہوا کرتی۔ ایک زمانہ چند کے ساتھ اس کی بنتی تھی شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے دادا جی سے پیار نہ تھا۔ یوں تو بی بی بچاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں دادا جی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رُک کر مجھے دیکھا پھر منڈیر سے جھانک کر بولی "دادا جی پڑھ نہیں رہا ہے تنکوں کی چارپائیاں بنا رہا ہے۔"

میں غصیل بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا "جب کہا، نہیں پڑھتا، تو کیوں بُڑبُڑ کرتی ہے ——— آئی بڑی تھانیدارنی۔"

اور دادا جی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے "نہ نہ گُڈو بڑی بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے۔"

اور میں زور سے چلّاتا "پڑھ رہا ہوں بی جھوٹ بولتی ہے۔"

دادا جی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاتے اور کاپیوں کے نیچے پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے "مقصود بیٹا تو اس کو چھیڑا نہ کر، یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا۔"

بی بی کہتی "کاپی اٹھا کر دیکھیے تو دادا جی اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا۔"

میں قہر آلودہ نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ نظریں اٹھا کر نیچے اتر جاتی۔ پھر دادا جی سمجھاتے "بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے کے لیے کہتی ہے ورنہ اُسے کیا پڑی ہے کہ مجھے بتاتی پھرے۔ تو فیل ہو یا پاس اس کی بلا سے۔ مگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے تیری بہتری چاہتی ہے۔" اور مجھے دادا جی کی یہ بات ہرگز سمجھ نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیونکر چاہ سکتی تھی!

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے دادا جی کے ہاں سے چل دیتا گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیج دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آکے اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور دادا جی کے یہاں آجاتا۔ رات کا کھانا بھی مجھے دادا جی کے گھر پر ہی بھجوا دیا جاتا۔ ان ایام میں جب منصفی بند ہوتی تو دادا جی سکول کی گراؤنڈ میں آکر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی۔ سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا اس کی تفصیل پوچھتے۔ پھر مجھے میرے گھر تک چھوڑ کر خود سیر کو چلے جاتے۔ ہمارے قصبہ میں منصفی کا کام مہینہ میں دس دن ہوتا تھا۔ وہ بیس دن منصف صاحب بہادر کی کچہری ضلع میں رہتی تھی۔ یہ دس دن دادا جی باقاعدہ کچہری میں گزارتے تھے۔ ایک آدھ عرضی آجاتی تو دو چار روپے بنا لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا اس کی دیانت اور محلے والیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتے تھے چونکہ پچھلے چند سالوں سے گھر کا بیشتر خرچ اس کی کمائی سے چلتا تھا اس لیے وہ دادا جی پر اور بھی حاوی ہو گئی ——— ایک دن خلافِ معمول دادا جی کو لینے میں منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچہری بند ہو گئی تھی اور دادا جی نانبائی کے چھپر تلے ایک بنچ پر بیٹھے گُڑ کی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ہولے سے جا کر اُن کا بستہ اٹھایا اور ان کے گلے میں بانہہ ڈال کر کہا "چلیے آج میں آپ کو لینے آیا ہوں۔" انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے۔ ایک آنہ جیب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیئے۔ میں نے شرارت سے ناچ کر کہا "گھر چلیے، بے بے کو بتاؤں گا کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں۔"

دادا جی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے "اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گُڑ کی چائے سے تھکن بھی دور

ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک آنہ میں گلاس بھر کے دیتا ہے۔ تم اپنی بے بے سے نہ کہنا خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کرے گی۔ زیادتی پر اتر آئے گی" پھر انھوں نے کچھ خوفزدہ ہو کر کچھ مایوس ہو کر کہا "اس کی تو فطرت ہی ایسی ہے" اس دن مجھے داؤجی پر بڑا رحم آیا۔ میرا جی ان کے لیے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس وقت میں نے بے بے سے نہ کہنے کا وعدہ کر کے ہی ان کے لیے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی کبھی میرے ہاتھ، وہ بھی نوکر کی معرفت داؤجی کے ہاں دودھ، پھل اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے داؤجی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے رعایتی برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے ایک دن میں دودھ سے بھرا ہوا لوٹا ان کے یہاں لے کر آیا تھا اور بے بے گھر پر نہ تھی وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا ساون کے جوہڑ میں اشنان کرنے گئی تھی اور گھر میں صرف داؤجی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤجی نے کہا "چلو آج تینوں چائے بنائیں۔ میں دکان سے گڑ لے کر آتا ہوں۔ تم پانی چولہے پر رکھو" بی بی نے جلدی جلدی چولہا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داؤجی گڑ لے کر آ گئے تو انھوں نے کہا "تم دونوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو چائے میں بناتا ہوں" چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی اور میں ڈائرکٹ اِن ڈائرکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داؤجی چولہا بھی جھونکے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اُد بچے ادیخے بتاتے جاتے تھے گلیلیو نے کہا "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے" گلیلیو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی۔ پانی اُبل رہا تھا۔ داؤجی خوش ہو رہے تھے اسی خوشی میں جھوم جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا کبت گا رہے تھے۔ او گولو! او گولو! گلیلیو کی بات مت بھولنا، گلیلیو کی بات مت بھولنا۔ انھوں نے چائے کی پتی گھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولہے پر ہی تھا اور داؤجی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گُل گُل بُل بُل کے ساتھ گولو گلیلیو! گولو گلیلیو کیے جا رہے تھے۔ میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں والی پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اُتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ داؤجی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چمکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے چھلاوے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے اور یہ وہ کھیل رچانے والا بڈھا موقع پر پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولہے کی طرف دیکھا اور داؤجی نے چوکے سے لٹکتے ہوئے معذرت بھرے لہجہ میں کہا "چائے ہے!"

بے بے نے ایک دوہتڑ داؤجی کی کمر میں مارا اور کہا "بڈھے بردھا تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پہ بہار پھرے تجھے تم بیٹے یہ تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھ کو کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھانویں ہیں کل کی مرتی آج مر جائے تیرا من راضی ہو، تیری آسیں پوری ہوں ——— کس مرنے جوگی نے جنا اور کس لیکھ کی ریکھا نے میرے پلے باندھ دیا .... تجھے غیرت نہیں آتی ...... اوہ تجھے کیوں آئے گی" اسی فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے بھیڑنی کی طرح چوکے پر چڑھی پرے سے پتیلی پکڑ کر چولہے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپاکے داؤجی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ "اوہ تیرا بھلا ہو جائے! او تیرا بھلا ہو جائے" کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے۔ ان کے اس فرار بلکہ اندازِ فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسے بنا نہ رہ سکے اور ہماری ہنسی کی آواز ایک ثانیہ کے لیے چاروں دیواروں سے ٹکرائی۔ میں تو خیر بچ گیا لیکن بے بے نے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے

پکڑ لیا اور چیخ کر بولی "میری سوت! بتا بڑھتے سے تیرا کیا جاتا ہے۔ بتا نہیں تو ابھی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو جانے کی کنجی کیوں دی؟" بی بی بچاری جیسے ہی رونے لگی تو میں بھی اٹھ کر اندر بیٹھک میں کھسک آیا۔ دادا جی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور پاؤں سہلا رہے تھے۔ پتہ نہیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہوئی کہ میں الماری کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے "شکر کردار کنم کہ گرفتارم بہ مصیبتے نہ بہ معصیتے!" تھوڑی دیر رک کر پھر کہا "میں تو اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سرِ مطہر پہ مکے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی۔"

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ و شیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پہ۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل نارِ جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیم مجھے جرأت عطا کرے، مولائے ایوب مجھے صبر کی نعمت دے۔"

میں نے کہا "دادا جی آقائے نامدار کون؟"

تو دادا جی کو یہ سن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انھوں نے شفقت سے کہا "جانِ پدر یوں نہ پوچھا کر۔ میرے استاد میرے حضرت کی روح کو مجھ سے بیزار نہ کر۔ وہ میرے آقا بھی تھے، میرے باپ بھی اور استاد بھی وہ تیرے دادا استاد ہیں...... دادا استاد...... " اور انھوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قسمت مجذوبہ کی ترکیب میں نے پہلی بار دادا جی سے سنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انھوں نے کتنی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے کے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچا رہے تھے۔

جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا "دادا جی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں؟ اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟"

دادا جی نے مسکرا کر کہا "جو لوہیلے کے ایک نر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ منشی چینت رام ہے، یہ پنڈت جی ہیں، وہ سیانا چودھری، وہ آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟"

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ کھسک کر بستر میں پہنچ گیا اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر دادا جی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں بعد ذرا سا ہنستے اور پھر خاموش ہو جاتے ——— کہنے لگے پھر کیا تھا اور کیا ہو گیا ——— حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا آواز تھی! میری طرف سرِ مبارک اٹھا کر فرمایا ادھر یہاں ذرا ہمارے پاس آؤ۔ میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بہت بچے اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا اور کسی کو آنکھ اوپر اٹھانے کی ہمت نہ تھی ——— میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا میاں ہم تم کو ہر روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انھیں چرنے چگنے کے لیے چھوڑ کر ہمارے پاس آجایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو ——— پھر حضور نے میری عرض سنے بغیر پوچھا کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا چنتو ——— حضرت مسکرائے ——— تھوڑا سا ہنسے بھی ——— فرمانے لگے پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے چینت رام ہوگا ——— میں نے سر ہلا دیا ——— حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے میرے گلے میں کھدر کا لمبا کرتہ تھا پاجامے کی بجائے صرف لنگوٹی بندھا تھا پاؤں میں ادھوڑی کے موٹے جوتے

بچارے کی طرح میں نے سب سٹڈی ایریا سسٹم کا سارا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انھوں نے میز سے گز اٹھائی اور بولے "باہر جا کر دیکھ کے آ کہ تیری بے بے کا غصہ کم ہوا یا نہیں" میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صاف کرتے پایا

دادا جی کی زندگی میں بے بے والا پہلو بڑا ہی کمزور رہتا۔ جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے تو وہ پکار کر کہتے "سب ایک ایک شعر سنا!" پہلے مجھی سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹتے ہی کہتا ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے "اونہیں شعر نہ سنوں گا، اردو کلام سنوں گا اور مسلسل نظم ہرگز نہ سنوں گا" میں کہتا "مجھے سوچنے دیجیے۔ اتنے میں بی بی سنائے"

بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی ؎

شنیدم کہ شاپور دم درکشید
چو خسرو بنامش قلم درکشید

اس پر دادا جی ایک نعرہ [illegible] پکارتے

بی بی فیضی کی نظم لا بھی"

"شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم — دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم"

دادا جی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے "بیٹا یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے۔"

پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے "جی آج تمہاری بے بے بھی ایک سنائے گی" مگر بے بے ایک ہی روکھا سا جواب دیتی "مجھے نہیں آتے شیر کبت" اس پر دادا جی کہتے "گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے" اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی اور دادا جی عین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے میاں کبھی ابی جی، چچا کا اور کبھی میرا نام ٹانک دیتے۔ پھر کہتے "میں اپنے اس گولو مولو کی شادی پر سرخ پگڑی باندھوں گا۔ بارات میں [illegible] جلوس کا اور نکاح نامہ پر دستخط کروں گا" میں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا تو وہ کہتے "پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہو گی۔ ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہو گی۔ اس بدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑی ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو فرفر سب کچھ سناتی ہو گی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا۔ پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا پھر خطِ شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خطِ شکستہ نہیں آتا۔ میں تو اپنی بہو کو سکھا دوں گا ——— سن لو بھئی! پھر میں تیرے ہی پاس رہوں گا۔ میں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پہ بفرمائید بفرمائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا"

پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے خیلے خوب خیلے خوب کہتے۔ جان پدر چرا ایں قدر زحمت می کشی ...... خوب ...... یاد دارم ...... اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہتے۔ بچارے دادا جی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کیے جاتے ——— ایک دن جب

چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے۔ ہم ابھی ہی دنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے "جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی ہے ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے امی چند کو بھی دے۔ اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے یہ سیوا سنگھ یہ مسلم لیگ یہ تبلیغ یہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گتکا کھیلنا سیکھ رہا ہے۔ میری تو وہ کب ماننے لگا ہاں خدائے بزرگ و برتر اس کو ایک نیک مومن سی بیوی دلا دے تو وہ اُسے راہِ راست پر لے آئے گی۔"

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ محض اس لیے ہو رہا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات نکلتی جس سے داؤجی کو بڑا دکھ ہوتا ——— میری اور امی چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں لیکن بارہ جنوری کو بی بی کی برات سچ مچ آ گئی —— جیجا جی رام پرتاپ کے بارے میں داؤجی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انہوں نے جو استخارہ کیا تھا اس پر وہ پورا اترا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی داؤجی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے استاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو جب بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ سب زار و قطار رو رہی ہے۔ امی چند آنسو بہا رہا ہے، اور محلے کی عورتیں بین کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور داؤجی میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں "آج زمین کچھ میرے پاؤں میں نہیں پڑتی۔ میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا" جیجا جی کے باپ بولے "منشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے" تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پر ڈالا، عورتیں ہوا کرنے لگیں اور داؤجی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے۔ انھوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا "یہ کیا ہوا بیٹا اُٹھو! یہ تو تمہاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے اسے یوں منحوس نہ بناؤ۔"

بی بی اُسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے داؤجی سے لپٹ گئی۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "قرۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید برخوردار رام پرتاپ بھی لیکن میں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خدا کا گنہگار ہوں اور میرا سر تیرے سامنے خم ہے۔" یہ سن کر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور داؤجی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا "منشی جی آپ فکر نہ کریں بیٹی کو میں کریما پڑھا دوں گا" داؤجی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "کریما تو پڑھ چکی ہے، گلستاں بوستاں بھی ختم کرا چکا ہوں لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی" اس پر وہ ہنس کر بولے "آپ بھی حد کرتے ہیں ساری گلستاں تو میں نے بھی نہیں پڑھی جہاں عربی آتی تھی آگے گزر جاتا تھا" ——— داؤجی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے۔ بی بی نے گوٹہ لگی سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند کے اور پھر میرے سر پر پھیرا اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چل دی۔ داؤجی میرا سہارا لے کر چلے تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا "لو یہ بھی رو رہا ہے دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او گوبو...... او مردم دیدہ.... تجھے کیا ہو گیا...... جان پدر تو کیوں......"

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور اکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان داؤجی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو داؤجی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اٹھاتے اور کہتے "لاحول پڑھ بیٹا۔ لاحول پڑھو۔"

اور خود آنکھوں پر رکھے رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

راتو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا۔ بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے، اُسی کا تھا اس میں بیس تیس بکریاں اور دو گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام راتو گلی کے اگلی میدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا۔ تقریباً سارے محلے والے اُسی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ یونہی شوقیہ لاٹھی زمین پر بجا کر داؤجی کو "پنڈتا جے رام جی کی" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ داؤجی نے اُسے کئی مرتبہ سمجھایا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں۔ کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک بڑے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا لیکن راتو نہیں مانتا تھا وہ اپنی مونچھ چبا کر کہتا "لے بھئی جس کے سر پہ بودی (چُٹیا) ہو وہ پنڈت ہی ہوتا ہے"۔ —— چوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی۔ شام کو اس کے باڑے میں جوا بھی ہوتا اور گندی اور فحش بولیوں کا مشاعرہ بھی۔ بی بی کے جانے کے بعد ایک دن جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا "موہنی تو چلی گئی بابو اب تو اس گھر میں رہ کر کیا لے گا"۔ میں چپ رہا تو اس نے جھاگ والے دودھ میں ڈر پھیرتے ہوئے کہا "گھر میں گنگا بہتی تھی سچ بتا غوطہ لگایا کہ نہیں"۔ مجھے اس بات پر غصہ آ گیا اور میں نے تاملوٹ گھما کر اس کے سر میں دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمد نہ ہوا لیکن وہ چکرا کر تخت پہ گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤجی کو سارا واقعہ سنا کر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور ابا جی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت راتو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے ہلکی سی گوشمالی کے بعد اسے سخت متنبہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے راتو داؤجی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا اور واقعی داؤجی کے فاضل سر پر وہ چھوٹی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے "یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکاتی تھی۔ گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پگڑی اُتارنے کی جسارت نہیں کی لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال چند میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا "شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟" تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم سا سعادت مند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے اور ہم سا خوش قسمت اُستاد بھی خال خال ہوگا۔ جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو۔ میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے۔ ہنس کر فرمانے لگے چنت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے کہا اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لیے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لیے نذر کر دوں لیکن میرا بس نہیں چلتا —— خاموش ہو گئے اور نگاہیں اُوپر اٹھا کر بولے "خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے"۔ —— داؤجی گزرے ایام کی تہہ میں اُترتے ہوئے کہہ رہے تھے "میں صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا "خادم آ گیا"۔ مستورات ایک طرف ہو جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلا لیتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ دعا دیتے میرے والدین کی خیریت پوچھتے گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے "لو بھئی چنت رام اب اس گناہوں کی گٹھڑی کو اٹھا لو"۔ میں سبد گل کی طرح انہیں اٹھاتا اور کمر پہ لاد کر حویلی سے باہر آ جاتا۔ کبھی فرماتے ہمیں باغ کا چکر دو۔ کبھی حکم ہوتا سیدھے رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے چنت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانتے یہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے اور

جب جی چاہتا ہے تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں انہیں وضو کرنے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے ہلکے جوتے اتارتا اور انہیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انہیں اس طرح جاتے ہوئے دیکھا تھا اس کے بعد جرأت نہ ہوئی۔ ان کے جُوتے اتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپا لیتا اور پھر اُسی وقت سر اُٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا تو فرماتے ہم جانتے ہیں چینت رام تم ہماری خوشنودی کے لیے قصبہ کی سیر کراتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پہ لدا لدا پھرتا ہوں دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں۔ اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطۂ عروج ہے اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہُما ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لیے وقف کر دیا ہے —— جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انہیں سُنایا اس قدر خوش ہوئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی ہو۔ دین و دنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دستِ شفقت میرے سر پہ پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا۔ میں نے اسے حجرِ اسود جان کر بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اُوپر اٹھا کر دعائیں دے رہے تھے اور فرما رہے تھے جو کام ہم سے نہ ہو سکا وہ تُو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے خدا نے یہ سعادت تجھے نصیب کی۔ چینت رام تیرا موئی چوہڑال کا بیٹا ہے تو شاہ بطحا کا پیرو ہے اس لیے خدائے عز و جل تجھے برکت دیتا ہے وہ تجھے اور بھی برکت دے گا۔ تجھے اور کتنا کُشل میسر آئے گی...

داؤ جی یہ باتیں کرتے کرتے سر گھٹنوں پہ رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آ رہا تھا اور داؤ جی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے۔ شام کے وقت سکول پہنچنے کا انہوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ ہاؤس کی راہ کھسک گیا تو انہوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بدزبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤ جی کے بچے گویا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انہیں کُتے کمینے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اسی قدر کہتے "دیکھ رے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اُسے یہی بتاؤں گا کہ جانِ پدر یہ تیرے بڈھے باپ کو کُتا کہتا تھا" میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انھیں زیادہ دُکھ ہوتا تو مُنہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انہیں غصہ آتا تھا نہ دُکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انہوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب، برخوردار آفتاب کہہ کر انہیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے۔ جن میں گوتو انہیں بہت مرغوب تھا۔ طنبورا دوسرے درجہ پر مسٹر ہونق اور اخفش اسکوائر ان سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی میں ان کو بہت دق کرتا۔ وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سارے جہان کی ابجد کو ضرب دے دے کر تنگ آ چکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے پرے دھکیل کر اُونچے اُونچے گانے لگتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دُکھ تینوں نہیوں دسنا

داؤ جی حیرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر دیتا۔ نہیوں نہیوں دسنا تے دُکھ تینوں

نیوں وسنا —— وسنا وسنا وسنا وسنا...... تینوں تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گا ما رونا رونا رونا نے دُکھ تینوں نیوں وسنا۔

وہ عینک کے اوپر سے مسکراتے میرے پاس آ کر کاپی اُٹھاتے، صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے "روشن بیٹا" وہ بڑی محبت سے کہتے "یہ کوئی مشکل سوال ہے!" جونہی وہ سوال سمجھانے کے لیے ہاتھ نیچے کرتے میں پھر تالیاں بجانے لگتا "دیکھ پھر، میں تیرا داؤ نہیں ہوں؟" وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

"نہیں!" میں منہ پھاڑ کر کہتا۔

"تو اور کون ہے؟" وہ مایوس سے ہو جاتے۔

"وہ سچی سرکار" میں اُنگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا "وہ سچی سرکار وہ سب کا پالنے والا —— بول بکرے سب کا والی کون؟"

وہ میرے پاس سے اُٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا "داؤ جی خفا ہو گئے کیا؟"

وہ مسکرانے لگتے "چھوڑ طلنبوڑے! چھوڑ بیٹا! میں تو پانی پینے جا رہا تھا —— مجھے پانی تو پی آنے دے۔"

میں جھوٹ موٹ بُرا مان کر کہتا "لو جی جب مجھے سوال سمجھنا ہوا داؤ جی کو پانی یاد آ گیا۔"

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے "اخفش اسکوائر جب تجھے پتہ، ایکس کا مربع نظر آ رہا تھا تو تُو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو......"

اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤ جی کتنے دن تک پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا لیکن جیومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤ جی نے بہت کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انہوں نے کہا کُل باون پراپوزیشنیں ہیں زبانی یاد کر لے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انہیں رٹنے میں مصروف ہو گیا لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرتا صبح بھول جاتی۔ میں دل برداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ سی بیٹھا۔ ایک رات داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی شکلیں بنوا کر اور مشقیں سُن کر اُٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹکا تھا اور انہیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا۔ مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤ جی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا۔ اور میں باہر صحن میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ کے سچ مچ رونے لگا۔ گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو میں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لیے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر چپکے سے نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کیلئے سر اوپر اٹھایا تو داؤ جی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر چوم کر کہا "لے بھئی طلنبوڑے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تُو تو بہت ہی کم ہمت نکلا" پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا اور بیٹھک میں لے آئے۔ بستر میں بٹھا کر انہوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اُوپر کر کے کُرسی پر بیٹھ گئے۔

انھوں نے کہا "اقلیدس چیز ہی ایسی ہے۔ تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں انھیں میں اچھی طرح سے پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اتار چکا تھا۔ کوئی بات ایسی نہ تھی جس میں اُلجھن ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا متساوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات اُلجھ گئی۔ میں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رُو سے مفروضہ کا جواب ٹھیک آتا تھا لیکن علم ہندسہ سے پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اپنے دستِ مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا لیکن جہاں مجھے الجھن ہوئی تھی وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے "چنت رام اب ہم تم کو پڑھا نہیں سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی معلّم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے" میں نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا۔ لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شوشہ میرے لیے حکم ربّانی سے کم نہیں۔ اس لیے خاموش ہوں بھلا آقائے غزنوی کے سامنے ایاز کی کیا مجال! لیکن حضور مجھے دُکھ ضرور ہوا ہے۔ فرمانے لگے تم بے حد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سُن لی ہوتی، میں نے سر جھکا کر کہا "ارشاد فرمایا" دلی میں حکیم ناصر سیستانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دیں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا ——— والدہ مرحومہ سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہونی بات تھی چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی لپائی تپائی کر رہا ہوں جب فارغ ہونگا تو والدہ سے عرض کرونگا۔ چند ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گزرے۔ میں دن رات اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس لاینحل مسئلہ سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دلّی جانا چاہتا تھا۔ لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ رقعہ۔ وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں ——— ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی کُل پونجی سے دو روپے چرا لئے اور نصف اس کے لیے چھوڑ کر گاؤں نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کرم فرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا ——— گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا، بدقسمت ہوں بے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر رکھ کر میں وہاں سے چل دیا ——— سُن رہا ہے؟" داؤ جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خارپشت بنے میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا "جی؟"

داؤ جی نے پھر کہنا شروع کیا "قدرت نے میری کمال مدد کی۔ اُن دنوں جاکھل جنید سرسہ حصار والی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دلّی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن چلتا۔ اس طرح تائید غیبی کے سہارے سولہ دن میں میں دلّی پہنچ گیا۔ منزلِ مقصود تو ہاتھ آ گئی تھی لیکن گوہرِ مقصود کا سُراغ نہ ملتا تھا جس کسی سے پوچھتا حکیم ناصر علی سیستانی

کا دولت خانہ کہاں ہے نفی میں جواب ملتا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی۔ لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاور تھی صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لیے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کھیس پھینک کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جو یندہ یابندہ۔ آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی۔ وہ تابھتر پھوڑوں کے محلے کی ایک تیرہ و تار گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فرد کش تھے اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا "کون ہے؟" میں نے سلام کر کے کہا "حکیم صاحب سے ملنا ہے۔" حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے "اسم گرامی؟" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "پنجاب سے آیا ہوں اور........" میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے بولے "اوہو! چنت رام ہو؟" میں کچھ جواب نہ دے سکا فرمانے لگے مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے لکھتا ہے شاید چنت رام تمہارے پاس آئے۔ تمہیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے اس کی مدد کرنا۔ میں اسی طرح خاموش کھڑا۔ بانو پاٹ دار آواز میں بولے میاں اندر آ جاؤ کیا چپ کا روزہ رکھا ہے؟ میں ذرا آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عروس نو کی طرح بیٹھے رہے۔ پھر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا برخوردار بیٹھ جاؤ۔ میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا "بھئی ذرا ٹھہرو مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔" پھر حکم ہوا بتاؤ ہندسہ کا کونسا مسئلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انھوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کرتہ یوں اوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر برہنہ ہو گئی۔ پھر فرمایا "بناؤ اپنی انگلی سے میری کمر پر ایک متساوی الساقین۔" مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے "میاں جلدی کرو۔ نابینا ہوں کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔" میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پر کانپتی ہوئی انگلی سے متساوی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے اب نقطہ س سے خط ب ج پر عمود گراؤ۔ ایک تو میں گھبرایا ہوا تھا۔ دوسرے وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یونہی اٹکل سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا تو تیزی سے بولے "یہ ہے کیا کہتے ہو یہ نقطہ س ہے کیا؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ بائیں کندھے سے کوئی چھ انگل نقطہ س ہے وہاں سے خط کھینچو ——— اللہ اکبر اللہ اکبر کیا علم تھا کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پر ابھر آئیں گی۔" پھر داؤ جی دتی کے دنوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں وہ میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا "پھر کیا ہوا داؤ جی؟" انھوں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "رات بہت گزر چکی ہے اب تو سو جا پھر بتاؤں گا۔" میں ضدی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انھوں نے کہا "پہلے وعدہ کر کہ آئندہ مایوس نہیں ہو گا۔ اور ان چھوٹی چھوٹی پراپوزیشنوں کو بتاشے سمجھے گا۔" میں نے جواب دیا "حلوا سمجھوں گا آپ فکر نہ کریں۔" انھوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا "بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بحر علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پر میں رو دیا تو دست محبت میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا، یہ کہتے ہوئے داؤ جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح گم سم چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا۔ داؤجی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے تھن تھنے ہاتھ پکڑ کر کہتے، اسپ تازی بن طویلۂ خر نہ بن۔ مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گذرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل مون برت نے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انھوں نے مجھے آ جگایا اور میری منتوں خوشامدوں گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اٹھا کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد، تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤجی مجھے اسی طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی ابھی طنبورہ بڑبڑا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے کوئی سُر نکال طنبورے کسی تو ہنگ پر بج یہ کیا کہہ رہا ہے! جب ہم بستی سے بہت دور نکل گئے اور صبح کی یخ ہوا نے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤجی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ مرداروں کا رہٹ آیا اور نکل گیا۔ ندی آئی اور پیچھے رہ گئی۔ قبرستان گذر گیا مگر داؤجی تھے کہ کچھ آہستہ سی پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب ٹبہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گذرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اس ٹیلے پر رہتی تھیں اور آنے جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤجی نے میرے گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا کہ سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ، پھر دس لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑو، تب میرے پاس آؤ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ میں ٹبہ سے جان بچانے کے لیے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے سے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گذر چکا ہو گا اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس یعنی چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے دوسرے میری پسلی میں بلا کا درد شروع ہو گیا تھا یہی مناسب سمجھا کہ ٹبہ پر جا کر داؤجی کو سوتے ہوئے اٹھاؤں اور گھر لے جا کر خوب خاطر کروں! غصہ سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا۔ داؤجی ٹبہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور اونچے اونچے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے ؎

جفا کم کُن کہ فردا روزِ محشر
بہ پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اٹھا کر انگشتِ شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھ لو، سوچ لو۔ میں تمہیں .... میں تمہیں بتا رہا ہوں .... سُنا رہا ہوں .... ایک دھمکی دیئے جاتے تھے۔ پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جفا کم کُن جفا کم کُن کہتے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤجی ضرور اسم اعظم جانتے تھے اور وہ جن قابو کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ، باتصویر والا جن تھا جب داؤجی کا طلسم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انھیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے جفا کم کُن جفا کم کُن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا۔

——— تھوڑی دیر بعد داؤجی آئے انھوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا "چل طنبورے" اور میں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ

میں انھوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی کھلی پگڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لیے اور جھوم جھوم کر گانے لگے ۔

تیرے لمے لمے وال فریدا ٹریا جا !

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے واقعی ان آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا سر زنبابل ہو گیا اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں اور اس کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا —— اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا دیتا میں ان کے ساتھ سیر کو نہ گیا !

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آ کر گرنے لگے بے بے نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بچوں والی کتیا کی طرح دادا جی سے چمٹ گئی۔ سچ مچ ان سے لپٹ گئی اور انھیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلا رہی تھی "بڈھے ٹوٹکی یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری فارسی ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو الٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں۔ اجاڑ مانگتے ہیں۔ موت چاہتے ہیں" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی "ہائے میں مر گئی۔ ہائے میں جل گئی لوگو اس بڈھے نے میرے امی چند کی جان لینے کا پربندھ کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے۔ میرا انگ انگ توڑ دیا ہے" امی چند تو دادا جی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن بھلا وہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن جنوں کی خشت باری انہی کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو دادا جی نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے جھڑک کر کہا "تو احمق ہے۔ اور تیری بے بے امّ الجاہلین —— میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا، اے وائے کہ تو شعور کے بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس —— صد افسوس!" بے بے کو اسی طرح چلاتے اور دادا جی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا —— اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا تو راستہ میں راکو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا "سنا بابو تیرے تو کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمہارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں" میں نے اس کمینے کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت دادا جی مجھ سے جیومیٹری کی پراپوزیشن سننے بیٹھے تو پوچھنے لگے "بیٹا کیا تم سچ مچ جن بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے "واقعی تو بہت بھولا ہے میں نے آج خواہ مخواہ تجھے جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح سے اینٹیں پھینک سکتے ہیں ہم نے جو دلی مستری اور پینتے مزدور کو لگا کر برساتی بنوائی ہے وہ تیرے کسی جن کو کہہ کر بنوا لیتے۔ لیکن یہ تو بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے ہی کا کام کرتے ہیں کہ چنائی بھی جانتے ہیں؟" میں نے جل کر کہا "جتنے مذاق چاہو کر لو مگر جس دن سر پھٹے گا اس دن پتہ چلے گا دادا" دادا جی نے کہا "تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تا قیامت سر نہیں پھٹ سکتا اس لیے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھائی جا سکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر میں لگے گی"

پھر بولے "سن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی۔

—— سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا!" میں نے چڑ کر کہا ۔

ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا۔ لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لیے ہمیں ضلع جانا ہوتا

تھا۔ چنانچہ وہ صبح آگئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لیے ضلع لاہور جا رہی تھی اور لاری کے اردگرد والدین قسم کے لوگوں کا ہجوم جمع تھا اور اس ہجوم سے دادا جی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ اور سب لڑکوں کے گھر والے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے اور دادا جی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات۔ ——— انہیں ازمنہ کے تغیر و تبدل پر پہنچ جاتے، وہاں سے پلٹتے تو ''اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ لشکر میں تھا ایک خوبصورت صاحب جمال لڑکی ہاتھ میں کبوتر پکڑے آئی تھی اور جدھر جاتی تھی پھرتی تھی'' کہہ کر پوچھتے یہ کون تھا؟

''جہانگیر'' میں نے جواب دیا۔ ''اور وہ عورت؟'' ''نور جہاں'' ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔ ——— ''صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟'' میں نے دونوں کی تعریف بیان کی۔ بولے ''مثالیں؟'' میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آگئے اور پوچھنے لگے۔ ''بریک اِن اور بریک اَپ کو فقروں میں استعمال کرو۔'' ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو کر چلی تو ان کے ساتھ قدم اٹھا کر بولے ''طلبیدے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی ...... مادیاں گھوڑی ...... ماکیاں ...... مرغی ——— ایک سال بعد خدا خدا کر کے یہ آوازہ دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا!

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بھی بڑھ کر۔ تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔ اتوار کی صبح دادا جی کا کوئی بیس صفحے لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جونہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا دادا جی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور ''اسی نمبر! اسی نمبر'' کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا ''کونسا سوال غلط ہو گیا؟'' میں نے جھوم کر کہا ''چار دیواری والا'' جھلا کر بولے ''تو نے کھڑکیاں اور دروازے منفی نہ کئے ہوں گے'' میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیڑ کی طرح جھلاتے ہوئے کہا ''ہاں جی ہاں جی ——— گولی مارو کھڑکیوں کو'' دادا جی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے ''تو نے مجھے برباد کر دیا ظالم۔ سارے سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا مسطحات کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا مگر تو نے میری بات نہ مانی بیس نمبر ضائع کئے ...... پورے بیس نمبر'' اور دادا جی کا چہرہ دیکھ کر میری اسی فیصدی کامیابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے ''اگر ممتحن اچھے دل کا ہوا تو دو ایک نمبر ضرور دے گا، تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے۔'' اس پرچے کے بعد دادا جی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے۔ وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے یہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آ جاتے اور کمرۂ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے دادا جی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں

کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤجی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا کروں تا کہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لیے بھی تیار کر دیں لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سو بار فیل ہونا گوارا تھا اور بے بیلن داؤجی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑیئے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا انھوں نے کہا اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ جو الداروں کی گاٹھے اندر گھس آتی۔ میں اُسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤجی پوچھ رہے ہیں cow ناؤن ہے یا ورب۔ اب ہر عقل کا اندھا پانچویں جماعت تک پڑھا ہوتا ہے کہ "گا" کا سے اسم ہے مگر داؤجی فرما رہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی۔ To cow کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھمکا دینا۔ اور یہ انھی دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا ——— پھر ایک وہ دن بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لیے نکلے۔ تو میں نے ان سے درخواست کی کہ مصفیٰ کے رستے سے نہ جائیں کیونکہ وہاں داؤجی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار، بندوق اور کارتوسوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دے جاتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر سلام کرنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤجی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے، "افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے"۔ میں شرارتاً کھلے کھلے خوب کھل کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا میں اور اباجی لڈوؤں کی ایک چھوٹی سی ٹوکری لے کر ان کے گھر گئے۔ داؤجی سر جھکائے اپنے حصیر پر بیٹھے تھے۔ اباجی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر سے کرسی اٹھا لائے اور اپنے بوریئے کے پاس ڈال کر بولے "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھئے۔ میرا خیال تھا اس کی فرسٹ ڈویژن آ جائے گی لیکن نہ آ سکی۔ بنیاد کمزور رہی۔۔۔۔۔۔"

"ایک ہی تو نمبر کم ہے" میں نے جھک کر بات کاٹی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل دو نیم ہو گیا ہے۔ خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں۔"

پھر اباجی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گپیں لڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اوّل اوّل کالج سے میں داؤجی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤجی کو بھی سلام کر آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ پتلون اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ کہا کرتے اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے۔ اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے میں جو کتابیں ساتھ لایا کرتا انھیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آ کر کتابیں دیکھ جاتے۔ امی چند بوجوہ کالج چھوڑ کر بنک میں ملازم ہو گیا تھا اور دلی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤجی بھی مصفیٰ جاتے تھے لیکن کچھ لاتے نہ تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی ——— کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤجی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آپو ٹاپو کھیلا کرتی تھیں بنت عم بن گئی تھیں۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی میں آپو ٹاپو میں گزارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل سفر زیادہ تسکین دہ اور سہانا بن گیا۔ انھی ایام میں میں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پیکٹ خریدا تھا اور ان پر نہ اباجی کو خط لکھے جا سکتے تھے اور نہ ہی داؤجی کو۔ نہ دسہرے

کی چھٹیوں میں داؤجی سے ملاقات ہو سکی نہ کرسمس کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی ایسٹر گزر گیا اور یوں ہی ایام گذرتے رہے۔

............ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بلوے ہوئے پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوا لیا۔ ہمارے لیے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ بنئے ساہوکار گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبہ میں بھی چند گھروں کو آگ لگی اور دو ناکوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ تھانے والوں اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا، اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیئے۔ دوپہر کو اماں نے مجھے داؤجی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب و غریب اجنبی صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤجی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھر آ کر بتایا کہ داؤجی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ کہتے ہوئے میرا گلا رندھ گیا۔ اُس دن مجھے یوں لگا جیسے داؤجی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤجی ایسے بے وفا تھے!——کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گذرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ جمع دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو پھاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا "سامنے کے گاؤں میں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔"

"کونسے گھر میں؟" بزرگ نے پوچھا۔

"رہتکی مہاجروں کے گھر میں" لڑکے نے کہا۔

"پھر؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"پھر کیا۔ انھوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا۔"

اتنے میں اس بھیڑ سے کسی نے چلّا کر کہا "اوئے رانو جلدی آ اوئے جلدی آ——تیری سامی——پنڈت——تیری سامی۔"

رانو بکریوں کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انھیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو اُن کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے انھوں نے داؤجی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا "یہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے——اسے کچھ مت کہو...... یہ تو...... یہ تو......" خون میں نہائی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

"بتاؤں تجھے بھی——آ گیا بڑا حمائتی بن کر——تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں نا" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا "انصاری ہو گا شاید۔"

میں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤجی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو داؤجی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا "اب بول بیٹا اب بول" اور داؤجی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے ان کی پگڑی اُتار کر کہا۔

"پہلے بودی کاٹو بودی" اور راتو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داڈ جی کی بودی کاٹ دی۔ وہی لڑکا پھر بولا "بلاّ دیں جے؟" اور راتو نے کہا "جانے دو بڈھا ہے، میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا" پھر اس نے داڈ جی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "کلمہ پڑھ پنڈتا" اور داڈ جی آہستہ سے بولے۔

"کون؟"

راتو نے ان کے ننگے سر پر ایک تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا "سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں!"

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو راتو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا "چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں۔"

اور ننگے سر داڈ جی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو!

آیا

اوپندر ناتھ اشک

افراد:-
صاحب، صاحبہ، آیا
نوکر
مقام: بمبئی
وقت: بارہ بجے دن

پردہ جس کمرے میں اٹھتا ہے وہ ایک متوسط درجہ کے مکان کا ڈرائنگ روم ہے۔ کسی ایسے کشادہ، کھلے، روشن اور ہوادار مکان کا، جو بمبئی کی نواحی بستیوں میں عام ہیں۔ ان پر نسٹل کی چھتوں کی بجائے کھپریل کی چھتیں ہوتی ہیں۔ اور بمبئی کے چھ سات منزلہ مکانوں کے ننھے ننھے فلیٹوں جیسے دڑبوں میں رہنے والے ان کشادہ کھلے مکانوں میں آ کر ایک عجیب آسودگی سی محسوس کرتے ہیں

یہ بیٹھنے کا کمرہ بھی مکان کی پہلی منزل پر ہے جس کا ثبوت اس کی چھت کے ڈھلواں گوشوں اور سامنے کی بالکونی سے ملتا ہے۔ سامنے کی دیوار میں دائیں بائیں دروازے ہیں جو بالکونی کو جاتے ہیں۔ اس دیوار پر درمیان میں ایک کلاک لگا ہے جس میں اس وقت گیارہ بج رہے ہیں۔

کمرے کو اس کے فرنیچر کے لحاظ سے تین حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ دائیں دیوار کے ساتھ میز اور کرسی لگی ہوئی ہے اور کتابوں کے ریک پڑے ہیں۔ جس سے یہ حصہ چھوٹی موٹی لائبریری یا سٹڈی روم بن گیا ہے۔ سامنے کمرے کے وسط میں کوچ کا سیٹ پڑا ہے۔ اور ایک تپائی رکھی ہے۔ اسے بیٹھنے کی جگہ سمجھ لیجیے۔ تیسرے حصے میں، یعنی بائیں طرف چھت سے ایک جھولا لٹک رہا ہے۔

جھولا بمبئی کے متوسط درجے کے نواحی مکانوں کا ایک لازمی جزو ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مکان ہوگا جس کے برآمدے یا ڈرائنگ روم میں جھولا نہ ہو۔ اس کا خیال چاہیے بھرپیٹ کھانا

کھانے کے بعد غنودگی کے مارے کسی گجراتی سیٹھ کے دماغ کی اختراع ہو۔ خواہ کسی مارواڑی بنیئے کے دماغ کی اپج۔ لیکن اب تو یہ شیواجی کے ساتھ، محض چنے کھا کر میلوں کی مسافت طے کرنے والے مرہٹے بہادروں کے گھروں کی زینت بھی بنا ہوا ہے۔

بائیں دیوار میں ادھر کو ایک دروازہ ہے جو باہر برآمدے میں کھلتا ہے۔

پردہ اُٹھنے پر، میز پہ صاحب بیٹھے کچھ لکھنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ صاحب سے مراد کسی گورے انگریز سے نہیں۔ بمبئی کا ہر وہ شخص جو ایک نوکر رکھنے کی توفیق رکھتا ہے۔ توے کی طرح کالا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو "صاحب" اور اپنی بیوی کو "میم" کہلوا سکتا ہے —— "مجھے صاحب کہا کرو" یہ حکم صادر کرنے کی بھی ضرورت نہیں نوکر اسے اتنی بار صاحب کہہ کر پکارے گا کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو صاحب پکارنے پر مجبور ہو جائے گا۔

یہ صاحب خیر توے کی طرح کالے تو نہیں۔ لیکن اتنے گورے بھی نہیں۔ ۳۵-۳۶ برس کے خوش شکل نوجوان ہیں۔ فلم کمپنی میں سنارسٹ ہیں۔ اور اس وقت معلوم ہوتا ہے کسی فلمی کہانی کا سناریو لکھنے میں مصروف ہیں۔

پردہ اُٹھنے کے ایک لمحے بعد، بائیں طرف بیک گراؤنڈ میں دستک کی آواز آتی ہے۔

ایک لمحے بعد بائیں دروازے میں سے نوکر جھانکتا ہے۔

نوکر۔ صاحب آپ کی پُرانی آیا ہے۔

صاحب۔ (کام کرتے ہوئے بے خیالی سے) پُرانی کون؟

نوکر۔ موٹی سی جوان چھوکری ہے۔

صاحب۔ (بدستور کام کرتے ہوئے) موٹی!

نوکر۔ صاحب کالی کالی ہے۔ اتنا بڑا بالوں کا جوڑا، بڑی بڑی آنکھیں اور صاحب بڑی جوان ہے۔

صاحب۔ (بدستور بے خیالی میں) نام نہیں پوچھا؟

(دروازے کے قریب بیک گراؤنڈ میں، آیا کی نہایت میٹھی آواز آتی ہے)

آیا۔ میں ہوں سیسیلیا فرنینڈس ([illegible]) آجاؤں صاحب؟

صاحب۔ (مجبوری کے انداز میں کام چھوڑ کر ایک خفیف سی مسکراہٹ ہونٹوں پہ لاتے ہوئے) آجاؤ آیا۔

(آیا اندر آجاتی ہے۔ نوکر چلا جاتا ہے۔ اگرچہ نوکر نے آیا کو کالی کالی کہا ہے مگر محض کالے کے لفظ کا استعمال اس کے کالے پن کی ہتک ہے۔ لیکن شاید نوکر کی نظر اس کے رنگ کی نسبت اس کے شباب پہ زیادہ رہی۔ اور اس کے بیان میں اس نے مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ آیا کی عمر بیس

ایک برس کی ہے۔ اس کے بڑے جوڑے، بڑی بڑی آنکھوں اور بھرپور جوانی نے اس کے رنگ کی سیاہی اور پیشانی کی کوتاہی کو یکسر چھپا دیا ہے۔ بے حد خوب صورت ہونٹ اور کنارے دار ٹھکی ہوئی پھٹی دھوتی میں ملبوس ہے۔ آواز میں مٹھاس اور لہجے میں نغمہ ہے۔ بولتے وقت "ہ" حذف کر جاتی ہے۔ صاحب کو 'صاب' نہیں کو 'نئیں' رہنے کو 'رینے' ادھر کو 'ادر' ..... وغیرہ وغیرہ

آ کر صاحب کے سامنے کرسی کی پشت تھام کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ذیل کے مکالمے میں آیا اور صاحب کی حرکات کے محض چند اشارے دیئے گئے ہیں۔ باقی ایکشن ڈائرکٹر کی سمجھ داری (
SOURCEFULNESS) پر چھوڑ دیا گیا ہے

آیا۔ (شرما کر سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے) میم صاب چلا گیا صاب:

صاحب۔ ہاں آیا!

آیا۔ چھوکرا ہے؟

صاحب۔ (ہنس کر) تم نے دیکھا ہے!

آیا۔ وہ تو جانے والا تھا۔ میم صاب بولتا تھا۔ وہ چلا جائیگا تو تم آ کر کام دیکھنا۔

صاحب۔ (ہونٹوں پر لطیف مسکراہٹ آ جاتی ہے) میم صاحب نے ہنسی کی ہو گی۔ میں تو خود جانے والا ہوں .....

آیا۔ کدر؟

صاحب۔ پہاڑ پر! اسی لیے اس نوکر کو جواب نہیں دیا۔

آیا۔ کیوں صاحب، تم تو ادر ہی رینے والا تھا۔ میم صاب بولتا تھا صاب ادر ہی رے گا۔

(جیسے انجانے میں کرسی کی پشت چھوڑ میز کا کنارہ تھام لیتی ہے۔ ایک لحظہ کے لیے صاحب کی نگاہ آیا کے بھرپور سینے پر پھسلتی ہوئی سی چلی جاتی ہے)

صاحب۔ (قلم چھوڑ کر ایک تھکی سی انگڑائی لیتے ہیں) طبیعت ٹھیک نہیں رہتی آیا۔ یوں بھی مہینہ بھر کی چھٹی ہے کہ ادھر ہی جا رہا ہوں

آیا۔ (آنکھوں میں عجیب سی ہمدردی اور مستی بھر جاتی۔ سینے کا ابھار میز کے کونے پر زیادہ بڑھ جاتا ہے اور بازو ذرا پھیل جاتے ہیں) ہاں صاب تم کتنا دبلا ہو گیا ہے (لحظہ بھر کے لیے صاحب کی آنکھوں میں دیکھتی ہے۔ لیکن صاحب کی آنکھیں بالکونی کے خلا میں ٹکی ہوئی ہیں۔ بات کو بڑھاتے ہوئے میز پر ہاتھ بڑھا لیتی ہے) میم صاب بھی کیسا دبلا ہو گیا تھا ایسا کیسا صاب؟

صاحب۔ (کرسی پر پیچھے کی طرف جھکتے ہوئے) پچھلے دنوں کوئی نوکر نہیں تھا اور آیا بھی نہیں۔ میم صاحب کو عادت تو ہے نہیں

سب کام انہیں خود کرنا پڑتا۔ برتن ملنا۔ پانی بھرنا۔ صفائی کرنا۔ رات کو مچھر اور کھٹمل کے مارے بابا سوتا نہ تھا۔ اور میم صاحب دن رات جاگتی تھی۔

آیا۔ کھٹمل کیا صاب؟

صاحب۔ ارے یہی جسے مانگنوں کہتے ہیں، ارے وہ لال لال جو بستر میں ہوتے ہیں وہ بگ بگ۔

آیا۔ (ہنستی ہے۔ کالی شکل کے باوجود نقرئی ہنسی) ارے صاب تم اس کو کھٹلم کہتا ہے۔

صاحب۔ کھٹلم نہیں، کھٹمل کھٹمل!

آیا۔ ہاں ہاں (ہنستی ہے) اسی سے تو بابا بھی کیسا ہو گیا تھا۔ کتنا چڑچڑا ہو گیا تھا؟

صاحب۔ آیا کوئی نہیں تھی۔ میم صاحب بچے کو دیکھیں یا گھر کو؟ آیا مل جاتی تو ہم میم صاحب کو دان بخش دیتے۔

(کرسی پر پیچھے کو جھکتے جھکتے دیوار کے ساتھ لگ جاتے ہیں)

(آیا پھر پہلے کی طرح میز کے دوسرے کونے کھڑی ہو جاتی ہے)

آیا۔ ہم نو سال بھر تمہارے پاس نوکری کیا۔ ہم چھوڑتا نہیں پن ہمارا بابا سے فرینڈ ہو گیا۔ تمہارے پاس آنے کو ہم کو بہت تراس پڑتا ہے۔ تین گھنٹہ روز آنے جانے میں لگتا ہے۔ تم کو ادھر ہی نوکری دو۔

صاحب۔ کیا حال ہے تمہارے بوائے فرینڈ کا؟

آیا۔ ٹھیک تھا اپنا صاب، ہم اُدھر سے نوکری چھوڑ گیا تو اس کی بھی نوکری چھوٹ گئی۔ روز شراب پیتا تھا اور ہم کو تراس دیتا۔ ہم کو بابا کا نوکری چھوڑ دیا۔ بہت شادی بنانے کو مانگتا تھا۔ ہم بولا تم بیوڑا کام ہی، فٹ پاتھ پہ سو لینگا پن تم سے شادی نہیں بنائینگا۔

(صاحب زور کا قہقہہ لگاتے ہیں اور پھر پہلی پوزیشن میں آ جاتے ہیں)

صاحب۔ تمہاری کوئی پسند کی بھی آیا؟

آیا۔ تم کو یہ آیا پسند ہے صاب؟

(صاحب کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی پھر میز پر کہنیاں ٹکا کر جھک جاتی ہے۔ صاحب کی نگاہ اس کے بھرے سینے سے ٹکرا کر مڑ جاتی ہے)

صاحب۔ ہماری پسند کا کیا سوال ہے۔ میم صاحب کو پسند ہے۔

آیا۔ یہ ہماری جات کا ہے صاب۔ ہم اسے بہت دیر سے جانتا ہے۔ ہماری جات والوں کے نوکری کرتا تھا۔ سرٹیفکیٹ اس کے پاس نہیں۔ شکل بھی اچھا نہیں۔

صاحب ڈولیھو ہمارے دفتر کا چپراسی۔ اسے شاناتا کروز سے لانے گیا تو اسے لیے بغیر واپس آ گیا۔ میں نے پوچھا تو بولا "صاحب اس کی شکل اچھی نہیں۔" میں نے کہا لاؤ اسے، اگر وہ کام اچھا کرتی ہے تو چلے گا۔ مجھے کونسا اس سے عشق کرنا ہے۔

آیا۔ تم کیسا ہے صاب۔

(پھر نقرئی ہنسی فضا میں گونجتی ہے۔ اور ہنستے ہنستے وہ میز پر
جھک جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ پھیل کر صاحب کے میز پہ پڑے
پیڈ کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ صاحب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

صاحب۔ اور کیا (کمرے میں گھومنے لگتے ہیں) آیا بہت اچھی ہے۔ شور نہیں مچاتی۔ تنگ نہیں کرتی۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہے ایک جگہ ٹک کے کام کرتی ہے۔ اور پھر اس کا بھیجا بھی برابر ہے (ہنستا ہے) تمہاری طرح نہیں ہے۔ کہو اب کدھر کام کر رہی ہو؟

(جا کر جھولے پر بیٹھ جاتے ہیں اور اسے ہلکے سے جھلا دیتے ہیں۔ آیا ان کے قریب جا کھڑی ہوتی ہے)

آیا۔ ملاڈ میں کرتا تھا صاب!

صاحب (اچانک رُک کر) ملاڈ!

آیا۔ پرسوں سے ہم ملاڈ میں تھا۔

صاحب۔ کس کے ہاں؟

آیا۔ اُدھر صاب، ہم اس صاب کا نام نئیں جانتا۔ اس پونے والی جاڑی میم صاحب نے بھیجا تھا۔ پن آج جھگڑا ہو گیا۔

صاحب۔ تمہارا جھگڑا کہاں نہیں ہوتا۔ کیا بات ہوئی؟

آیا۔ اُدھر میم صاب بہت کِٹ کِٹ کرتا ہے صاب۔ او بولا ـــ تم ایسی ساڑی پہنتا ہے۔ ایسا بال بناتا ہے۔ تمہارا صاب تو ہم سے جاستی ہے۔

صاحب۔ ساڑھی تو یہ تمہاری واقعی اچھی ہے۔

آیا۔ ہم بولا۔ ہم تو ایسا بال بنائیگا۔ ایسا ساڑی پہنیگا۔ پھوکٹ میں کاہے کو بومابوم کرتا ہے۔ او بولا۔ ایسی ساڑی پہنتا اِدھر نئیں مانگتا۔ تم کو کام کرنا ہو ٹھیک سے کرو۔ ایسا رعاب اِدر نہیں چلینگا۔ ہم بولا، ہم کو ہمارا پگار دو۔ ہم کو نئیں مانگتا نوکری۔ او بولا صاب سے پگار لو۔ صاب بولا۔ میم صاب سے لو۔ ہم تو کنٹال گیا۔ بولا۔ جاؤ ہم کو نئیں مانگتا پگار۔ ہمارا پگار رکھ کے تم دھنی ہو جاؤ (ہم چلا آیا (لحظہ رک کر) صاب ایک روپیہ ہو تو دیئو۔ کولابا جانے کا کرایہ مانگتا ہے دو چار آنے کا ناشتہ کریگا۔

(صاحب پھر میز پر جا کر بیٹھتے ہیں اور دراز سے ایک روپیہ نکال کر اسے دیتے ہیں)

صاحب۔ (روپیہ دیتے ہوئے) کیا تم ناشتہ کر کے بھی نہیں چلی؟

آیا۔ نئیں صاحب۔ صبح ناشتے کو او لوگ کچھ نہیں دیتا۔ خالی پیلی بوم مارتا ہے۔

صاحب۔ تم کھانا کھاؤ گی؟

آیا۔ نئیں صاب۔

صاحب۔ ارے کھاؤ (نوکر کو آواز دیتے ہیں) جگدیش، جگدیش (لمحے بعد نوکر داخل ہوتا ہے رسوئی گھر سے آیا ہے۔ ہاتھ

میں چھری اور ادھر چھلا پیاز ہے)

یہ ہماری پرانی آیا ہے۔ کھانا یہیں کھائے گی۔

جگدیش۔ جی بہتر۔

(چلا جاتا ہے۔ صاحب کی نگاہیں آیا کے سینے سے ٹکراتی ہیں اور لحظہ بھر کے لیئے وہیں جمی رہتی ہیں)

آیا۔ کیوں صاب کیا دیکھتا ہے؟

صاحب (اچانک نگاہیں ہٹا کر) بڑی اچھی ساڑی ہے۔ کتنے کو لی ہے؟

آیا۔ وائل کی ہے۔ یہ تو پرنٹ ہے۔

صاحب۔ اچھا پرنٹ ہے۔

آیا۔ اُدر دھوبی تالاب میں ایسا ساڑی بِکتا ہے صاب۔ صاب کیسا لگتا ہے ہم کو؟

ساڑی کو اپنے جسم پر لپیٹ کر بتاتی ہے۔ صاحب اس
کے سڈول جسم کے خدوخال کو ایک نظر دیکھتے ہیں۔ اور
اضطراری حرکت کے طور پر پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

صاحب۔ اچھی لگتی ہے۔ لیکن تمہیں سفید ساڑی پہننی چاہیئے۔ (کمرے میں ایک چکر لگاتے ہیں)

آیا۔ کیوں صاب۔

صاحب (کوچ کے بازو پر بیٹھتے ہوئے) کالے رنگ پر سفید ساڑی اچھی لگتی ہے۔

آیا۔ ہم سفید ساڑی بھی پہنتا تھا صاب، پن کئی آدمی ہمارے کو چھونے لگ جاتا تھا۔ ہم چھوڑ دیا سفید ساڑی پہننا۔

(صاحب صرف مسکرا دیتے ہیں)

اس میں اور بھی جاستی رعاب لگتا تھا صاب۔ ایک دن کی بات ہے ہم اُدر والکیشر میں کام کرتا تھا صاب۔ ہم ایسا ہی سفید ساڑی بلاوز پہنیلا تھا۔ ایک پنجابی فوجی ٹیکسی میں بیٹھیلا تھا۔ او افسر تھا صاب۔ بڑا گٹھیلا تھا۔ ہم کو دیکھ کر اُترا۔ بہت دارو پی اے لا تھا صاب۔ ہمارے پاس آ کر بولا "تم نیوی میں کام کرتا ہے"؟ ہم بولا — "نئیں ہم آیا ہے"۔ او بولا "تم جھوٹ بولتا ہے۔ تم نیوی میں کام کرتا ہے۔ تم ہم کو بہت پسند ہے"۔ ہم بولا — "ہم تم کو مانگتا بھی نئیں"۔ پن صاب اس نے ہم کو پکڑ کر ٹیکسی میں ڈال لیا۔

(صاحب ہنستے ہیں)

— صاب وہ بہت تگڑا تھا۔ بہت دارو پی اے لا تھا۔ ہم چلّایا۔ ایک سپاہی بھی آیا، پن او فوجی افسر بولا یہ نیوی میں کام کرتا ہے، ہمارا فرینڈ ہے تم جاؤ۔ اُنے ڈرائیور سے بولا کہ گاڑی چلاؤ۔ ہم بہت گھبرا گیا صاب۔ ہم ڈرائیور سے بولا — "روکو گاڑی" پن صاحب او ڈرائیور کو مارنے دوڑا۔ اس کے پاس دو بوتل دارو تھا صاب۔ ہم سے بولا پیو! ہم بولا۔ ہم مانگتا بھی نئیں۔ اس نے بوتل ہمارے سر پر انڈیل دیا صاب۔ ڈرائیور ہماری جات کا تھا ہم اس کو گاڑی روکنے کو بولا۔

چوپاٹی پر اس نے گاڑی روک لیا صاب۔ تب او افسر پیٹی سے پسٹل نکال لیا۔ اور بولا "ہم جان سے مار دیں گا" ڈرائیور ڈر گیا اس نے چل پڑا۔ ہم بھی بہت ڈر گیا صاب۔ او فوجی ہم کو تاج ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ کھڑکی بھی بند کر دیا۔ ہم صاب بہت گھبرا گیا۔ بس صاب ہم بھاگا۔ ہمارا پرس بھی وہیں رہ گیا۔ اس میں تین روپیہ اور ہمارا ایر رنگ تھا۔ پن صاب ہم نے اس کو بھی نہیں دیکھا۔ بھاگ کر ریگل پہنچا۔ ٹریم لیا اور کولابا آ گیا۔

(صاحب زور کا قہقہہ لگاتے ہیں)

سچ صاب! پھر ہم کو ایک دن او فوجی ملا صاب۔ کہنے لگا: تم اس دن بھاگ کیوں گیا۔ ہم تم کو بہت پسن کرتا ہے ہم تم سے شادی بنانے کو مانگتا ہے۔ ہم بولا "ہم کو نہیں بنانا ایسا شادی۔ اور ہمارا سب جات والا رہتا ہے۔ تم ہم کو تراس دیں گا تو ہم تمہارا سر پھوڑ دیں گا۔

صاحب (پھر جا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہنس کر) تم سب کا سر پھوڑ دے گی تو کیسے چلے گا۔ تم کہیں شادی کیوں نہیں کر لیتی۔

آیا۔ ہم کو مانگتا بھی نہیں شادی۔ ہم بھوکا مرینگا۔ فٹ پاتھ پر سوئیں گا پن شادی نہیں بنائیگا۔

صاحب۔ اب تم کدھر جاتی ہے؟

آیا۔ ہم تو ادھر ہی آیا تھا صاب۔ میم صاب بولا تھا نوکر جانے کو مانگتا ہے۔ ہم کو صاب کا بڑا فکر ہے تم اس کو دیکھنا۔ ہم آیا تو اب تم باہر گاؤں جانے کو مانگتا ہے۔ ہم تو او نوکری بھی پھوکٹ میں چھوڑ دیا۔

صاحب۔ تم مجھ سے پوچھ تو لیتی۔

آیا۔ ہم کو کیا مالوم۔ میم صاب بولا تھا۔ ہم چار تاریخ کو جائیں گا۔ آج پانچ ہے۔ ہم ادھر آیا ہے۔

صاحب تم کو پنٹو صاحب کے ہاں بھیجا تھا۔

آیا۔ اس میم صاب نے آیا رکھ لا۔

صاحب۔ وہ موٹا صاحب جو تمہیں لے گیا تھا۔ میں اس سے کہوں گا وہ تمہارے لیئے نوکری ڈھونڈ دے گا۔

آیا۔ (پھر آ کر صاحب کی میز پر جھول جاتی ہے) وہ بڑا ایسا ہے صاب۔

صاحب۔ کیوں؟

آیا۔ جب ہم پنٹو صاب کے گھر سے چلا تو او موٹا صاب بولا۔ آیا سینما دیکھنے چلیں گا؟ ہم بولا ہم کو نہیں مانگتا ہے سینما۔ بولا چلو چائے پئیں۔ صاب او ہم کو جبرجستی ہوٹل میں لے گیا۔ ہم ایک کپ چائے پیا۔ او بولا۔ آیا ہمارے سنگ چلو، ہم تم کو بہت پسن کرتا ہے۔

صاحب۔ وہ تم کو پسند کرتا ہے۔

آیا۔ اس کا اپنا شادی نہیں بنا صاب۔

صاحب۔ اس کی بیوی ہے! بہت خوبصورت لیکن دیس میں ہے۔

آیا۔ او بڑا ایسا ہے صاب۔

صاحب۔ اندھیری والے صاحب کو بھی اب آیا چاہیئے تم ادھر کیوں نہیں جاتی؟

آیا۔ ہم کو نہیں مانگتا اندھیری۔ وہاں ہم کو اولمبو صاحب بہت تراش دیتا ہے۔ ہم بے بی کو لے کر بیٹھا ہوتا۔ اور بے بی کو لے کر اُوپر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ ہم کو بھی اس کے پیچھو جانا پڑتا۔ او ہم کو بہت تراش دیتا تھا۔

صاحب۔ وہ لمبا صاحب اب ادھر نہیں ہے۔

آیا۔ او میم صاب بھی بہت کھٹ کھٹ کرتا تھا۔

صاحب۔ (ہنس کر) تو پھر اب میں کدھر بھیجوں تمہیں کوئی پسند بھی ہو؟

آیا۔ ہم کو تو تم جیسا کھتری صاحب پسند ہے۔ ہم تمہارے گھر اتنی دیر رہا تم ہم کو کبھی تراس نہیں دیا۔ ہم اچھا ساڑی پہنتا تھا تم ہم کو کبھی نئیں بولا۔ کھانے کا ہم کو کوئی واندہ نئیں ہوا۔ میم صاب کھٹ کھٹ بھی کرتا تو تم اس کو بول دیتا۔

صاحب لیکن تم تو یہاں سے بھی لڑ کر بھاگ گئی۔

آیا۔ وہ ہمارا ہلکٹ برائے فرینڈ ہم کو لے گیا صاب۔ یہاں کا برائے لوگ بھی تراس دیتا ہے۔ اور دھنی لوگ بھی۔ ہم تو کنٹال گیا بمبئی سے۔

صاحب۔ تم تو دیس میں جانے والا تھا۔

آیا۔ دیس میں گیا تھا صاب پن ہمارا دل اُدھر نہیں لگا۔

صاحب۔ تم سے پنجاب جانے کو کہا تھا اس افریقہ والی میم صاحب کے ساتھ۔

آیا۔ نہیں صاب ہم باہر گاؤں جانے کو نئیں مانگتا۔ ادھر ہمارا کھٹ پٹ ہو گیا میم صاحب سے کر کے ہم ایک بار ایک صاب کے ساتھ دلّی گیا۔ ایک ویک میں میم صاب سے ہمارا کھٹ پٹ ہو گیا۔ وہ بولا دلّی میں کدھر جائیں گا۔ ہم بولا ہم بھوکا مریں گا فٹ پاتھ پر سوئیں گا پن تمہارے گھر نوکری نئیں کریں گا۔ ہمارا جات والا کوئی اُدر تھا نئیں۔ ہمارے گلے کا ہنسلی ہم نے بیچا تو ادر آیا۔

صاحب۔ کسی اور کے ہاں نوکری کر لیتی وہاں۔

آیا۔ ہم کو تو کئی لوگ بولتا تھا صاب، تم ہنسلی نہ بیچو ہمارے سنگ رکو۔ تم کو عیش کرائیں گا۔ کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گا۔ پن ہم بولا۔ ہم بھوکا مریں گا۔ فٹ پاتھ پر سوئیں گا پن دلّی میں نئیں رہیں گا۔

(صاحب کچھ لمحے اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر کندھے جھٹکا کر قلم اٹھا لیتے ہیں)

صاحب۔ (ہنس کر) تم شادی کر لو آیا۔ میں نے تم سے کئی بار پہلے بھی کہا ہے تمہارے بھیجے کی سب گرمی دُور ہو جائے گی۔

آیا۔ ہم کو مانگتا بھی نئیں شادی۔ ہماری جات والے بڑے سندر لڑکوں نے ہم سے شادی بنانے کو کہا صاب۔ پن ہم کو نئیں مانگتا شادی۔ ہمارا دو دن میں کھٹ پٹ ہو جائیں گا۔ (پھر میز پر جھک جاتی ہے۔ ہاتھ پھیل کر صاحب کے پیڈ کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ آنکھوں میں نرمی اور آواز میں ملائمت آ جاتی ہے۔ ہم کو تمہارے مافق کھتری مانگتا ہے صاب۔ ہلکٹ نئیں مانگتا۔

ہم تو تمہارے پاس آیا تھا۔ میم صاب بولا تھا۔ چھوکرا چلا جائیں گا۔ ہم یہاں رہتا ہوتا تو تم کو کوئی تکلیف نہیں ہوتا۔

صاحب۔ (کنکھیوں سے لحظہ بھر اس کے گداز سینے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ جو میز کے کونے کو دبائے جا رہا ہے پھر ہنس پڑتے ہیں)

تم یہاں رہتی تو ہمارا بیجا بھی برابر نہ رہتا۔

آیا۔ تم کیسا ہے صاب!

صاحب۔ (بدستور سابق اپنا کام شروع کرتے ہوئے) لو اب جاؤ۔ کھانا وانا کھاؤ پھر جانا۔

آیا۔ تم یہیں رہیگا صاب۔

صاحب۔ (لکھتے ہوئے) ہاں۔

آیا۔ صاب ہم نیچے باتھ روم میں ہاتھ پینے کو مانگتا ہے۔ اتنا گرمی ہے، ہمارے پاس دوسرا ساڑی ہے۔

صاحب۔ (بدستور کام کرتے ہوئے) تولیا کدھر سے لے گی؟

آیا۔ ٹوڈل ہے صاب۔

صاحب جاؤ نہاؤ۔

(آیا مسکراتی ہوئی چلی جاتی ہے)

صاحب۔ لاحول ولا قوۃ، یہ آیا بھی خوب ہے (نوکر کو آواز دیتا ہے) جگدیش جگدیش۔

(نوکر آتا ہے)

دیکھو وہ آیا نیچے نہانے گئی ہے۔ کھانا یہیں کھائے گی۔ دل پھینک قسم کی عورت ہے۔ باتوں میں نہ لگے رہنا۔ کھانا وانا کھلا کر سارا کام نمٹا دینا۔

(قلم چھوڑ کر ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے انگڑائی لیتے ہیں)

(اپنے آپ) موٹا نیم اور لمبا دیوان یوں ہی؛ اس کے لیے نہیں مرتے۔

(آیا دروازے میں جھانکتی ہے)

آیا۔ صاب۔

صاحب۔ کہو۔

آیا۔ کوئی صابن کا ٹکڑا ہو تو دیو صاب۔

صاحب۔ صابن۔

آیا۔ پسینہ بہت ہے صاب۔ کپڑا دھونے کا ہو تو بھی چلیں گا۔

صاحب۔ (نوکر کو آواز دیتے ہیں، جگدیش!

جگدیش۔ (بیک گراؤنڈ میں) جی۔

صاحب۔ ادھر ہماری صابن دانی میں صابن کا چھوٹا ٹکڑا ہے لاؤ۔

جگدیش۔ (بیک گراؤنڈ میں) جی لایا۔

آیا۔ صاب اس ٹائم تو اور دھوپ بڑا ہے۔ ہم کچھ دیر اور بالکونی میں آرام کرلوں۔ شام کو ہم چلا جائیں گا۔

صاحب۔ (بدستور کام کرتے ہوئے) اچھا۔

(جگدیش صابن کا ٹکڑا لاتا ہے)

صاحب۔ (آیا کو دروازے سے) چلیں گا۔

آیا۔ چلیں گا صاب۔ ہم ابھی ہاتھ سے کر آتا ہے۔

(چلی جاتی ہے۔ لمبی سانس بھر کر صاحب اٹھتے ہیں)

صاحب۔ دیکھو جگدیش ہم ابھی دفتر جاتے ہیں۔ کھانا ہم وہیں کھائیں گے۔ تم شام تک سب کام ختم کروانا۔ کل دیوالی ہے کل تک کچھ باقی نہ رہے آیا کے ساتھ باتوں میں نہ لگے رہنا۔

(چلے جاتے ہیں، پردہ کچھ لمحوں کے لیے گرتا ہے پھر اٹھتا ہے۔ گھڑی میں بارہ بج رہے ہیں۔ صاحب جلدی جلدی داخل ہوتے ہیں اور آتے ہی نوکر کو آواز دیتے ہیں)

جگدیش:

جگدیش۔ (بیک گراؤنڈ میں) جی آیا۔

صاحب۔ ایک پانی کا گلاس لاؤ۔

(کنکھیوں سے بالکونی کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہاں کوئی زندگی کا نشان ہے یا نہیں۔ پھر فائلوں میں ڈھونڈ کر ایک فائل نکالتے ہیں۔ نوکر پانی لاتا ہے۔)

صاحب۔ (پانی کا گلاس لیتے ہوئے) جلدی میں یہ فائل یہیں رہ گئی (پانی کا گھونٹ پیتے ہیں) کھانا کھلا دیا آیا کو؟

جگدیش۔ جی وہ تو چلی گئی۔

صاحب۔ چلی گئی؟

جگدیش۔ اسی وقت آپ کے جاتے ہی۔

صاحب۔ کیوں؟

جگدیش۔ ذرا سا تیل مانگنے اوپر آئی۔ آپ کو نہ دیکھ کر بولی۔ صاب کدھر گیا؟ میں بولا دفتر۔ بولی۔ کب آئیں گا؟ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ بس وہ اسی وقت چلی گئی۔ نہ اس نے غسل کیا نہ کھانا کھایا۔ یہ روپیہ دے گئی ہے۔ کہتی تھی۔ ہم سمجھتا تھا صاب گھر رہینگا میں نے کہا کھانا تو کھاتی جاؤ۔ بولی۔ ہم کو نہیں مانگتا ہے کھانا۔ جاتے جاتے بولتی تھی۔ یہ کیسا صاب ہے؟

(صاحب گلاس ہاتھ میں لیے بالکونی کے خلا میں تک رہے ہیں۔ جب پردہ پھر گر جاتا ہے)

حضور نے اپنا تنور اس قدر جلد کیوں بند کر ڈالا؟

شہ کمال: اے کوہِ دانش! اے سلطان القلم ابھی ابھی پکے بیچتے ہوئے میں نے سنا کہ اصفہان کے متمول سوداگر ابن حسیم نے اپنی پری جمال دختر کی شادی کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا صحیح ہے؟

حلاج: ماشاء اللہ، آپ کی سماعت میں اب تک کوئی عیب پیدا نہیں ہونے پایا۔

شہ کمال: یہ بھی سُنا کہ جو شخص اس کے جمال جہاں آرا کی تعریف میں بہترین رباعی کہہ کر لائے گا وہی اس کا شوہر قرار پائے گا۔

حلاج: لیکن میرے محسن اس کے ساتھ بعض شرطیں بہت کڑی بھی ہیں۔

شہ کمال: میں بھی تو سنوں وہ کیا ہیں؟ اگر چند اشعار کے عوض جوہری کی کافر ماجرا دختر ہاتھ آئے تو اور چاہیئے کیا؟

حلاج: رباعی غروبِ آفتاب سے پہلے تیار ہو جانی چاہیئے۔

شہ کمال: معمولی بات ہے۔ مجھے ایک گھنٹے کی فرصت ہے اتنی دیر میں چار مصرعے کہہ لینا کیا بڑی بات ہے۔ اے برادر ایک مرتبہ شیخ کے ہاں ضیافت تھی۔ اس ناچیز نے ضیافت کا سارا کھانا گھنٹہ بھر میں تیار کر کے رکھ دیا تھا اور پھر لطف یہ کہ ہر کلیچے کی قطع اور رنگت کسی نہ کسی پھول سے مشابہ تھی۔ چنانچہ اس کارنامہ پر میں بجا طور پہ فخر کر سکتا ہوں۔ کیوں ہے نا؟ تو صرف رباعی ہی کہنی ہے؟

حلاج: ایک شرط یہ بھی ہے کہ قافیہ میں لڑکی کا نام آئے اور اس طرح لایا جائے جس طرح جوہری زرد موتی کے نگینے کے ارد گرد سونے اور چاندی کے بیل بوٹے بنا دیتا ہے۔

شہ کمال: یعنی ویسے ہی نا جیسے سانچوں میں نان پاؤ تیار رکھے جاتے ہیں۔ اے لو مجھے تو شعر سوجھنے بھی لگے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دماغ کے تنور سے اشعار کے خستہ شیرمال نکلے آ رہے ہیں۔

حلاج: یہ بھی ضروری ہے کہ رباعی نہایت پاکیزہ خطِ نستعلیق میں لکھ کر پیش کی جائے۔

شہ کمال: یہ البتہ ٹیڑھی کھیر ہے تم جانتے ہو لکھنا مجھے آتا نہیں۔

حلاج: اس خدمت کے لیے میں جو حاضر ہوں۔

شہ کمال: دام کیا لوگے؟

حلاج: آقا اس خاکسار کو چاندی کا ایک دینا دے دیجئے۔ ایسے پاکیزہ خط میں نظم لکھ دوں کہ لوگوں میں ایک بار تو چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ہاں بھئی شہ کمال کی رباعی واقعی ماہ سیمیں کی نظروں سے گزرنے کے قابل ہے۔

شہ کمال: منظور۔ یہ لو دینار۔ جو کچھ کہا سچ ہے، تو یہ معاوضہ زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ تو گویا اب رباعی کی طرف توجہ کی جائے اور نہایت لطیف اشعار کہے جائیں۔ ذرا مجھے فکر کرنے دو۔ ہاں تو یوں کہنا چاہیئے۔ تو شمع ہے، میں پروانہ ہوں۔

حلاج: مگر ایک بات اور۔

شہ کمال: یار تم تو پریشان کئے دیتے ہو بڈھا اور کیا چاہتا ہے۔ کہہ بھی چکو۔

حلاج: رباعی کے ساتھ چاندی کے دس دینار بھی دینے ہیں۔

شہ کمال: حریص پیرِ فرتوت۔ مگر پرواہ نہیں، دس دینار ہی ہیں۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔ میں شمع ہوں اور پروانہ ہے تو۔ ہوں! ہوں! ہوں! لاحول ولا قوت۔ غارت ہو گیا سارا خیال۔ کیسے تھا؟

(گھنٹی بجتی ہے)

حلاج: کون ہے؟

آواز (باہر سے): میں ہوں علاؤ الدین عطر فروش!

حلاج: اندر تشریف لے آئیے۔

(علاؤ الدین داخل ہوتا ہے)

حلاج: آج تو میری قسمت کا ستارہ زوروں پر ہے اگرچہ آپ کے عطر کے قرابوں سے گلاب کی بوئے دلآویز کے بھبکے اٹھتے ہیں لیکن مجھے اس وقت اس شخص کا خیر مقدم کرنے کی سعادت حاصل ہے جس کی باتیں عطر سے بھی زیادہ نکہت بیز ہیں۔

علاؤ الدین: اگر یہ صحیح ہے تو یوں کہنا چاہیئے کہ قدرت لطیف کاموں کے لیے ان ہی لوگوں کو منتخب کرتی ہے جنہیں لطافتِ ذوق کی نعمت عطا ہوئی ہے لیکن ذرا دیکھنا یہ ان حضرت کو کیا ہو گیا؟ میرے خیال میں تو ان کی حالت اندیشہ ناک سی ہے۔

حلاج: یہ شہ کمال نانبائی ہیں۔ آپ نے یقیناً انہیں بارہا دیکھا ہو گا۔

علاؤ الدین: میں نے؟ لاحول ولا قوۃ اِلّا باللہ۔ میرا ان سے کیا واسطہ، لیکن یہ تو فرمائیے یہ ایسے وحشیانہ انداز میں کیوں گھوم رہے ہیں؟

حلاج: یہ اس وقت بحرِ نظم میں غرق، قافیہ کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔

علاؤ الدین: کیا کہا بحرِ نظم میں غرق؟ نانبائی میں شاعری کی روح کہاں سے آئی۔ کہیں انہیں بھی تو یہ خبط نہیں ہوا کہ رباعی کہہ کر ماہِ سیمیں پری جمال دوشیزہ کو حاصل کیا جائے؟ کیا خوب چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔

شہ کمال: ارے بھئی یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے۔ اخاہ تم ہو میرے دوست علاؤ الدین! وہ اس شیرمال کے دام آج تک ادا ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ یاد ہے نا؟ لاحول ولا قوۃ! مصرعہ ہی دماغ سے نکل گیا تھا۔ کیا تھا۔ یہ گلہائے.....

علاؤ الدین: کتنا فرسودہ اور پامال خیال ہے۔ جیسے اس شخص کے شیرمال پھیکے اور بے مزا ہوتے ہیں ویسے ہی اشعار بھی بے کیف ہیں۔ لیکن حلاج پہلے میں اپنے یہاں آنے کی غرض و غایت بیان کر ڈالوں۔ معلوم ہوتا ہے بوڑھے جوہری کے خبط کا قصہ تم نے سن لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ابنِ حسیم خود تو بالکل کورا ہے۔ لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا لیکن بوڑھے کو اس بات پر بڑا ناز ہے کہ اس کی بیٹی ماہ سیمیں.........

حلاج: میں جانتا ہوں یہ اشعار ماہ سیمیں پڑھے گی۔

علاؤ الدین: بالکل ٹھیک۔ چنانچہ اگر اپنے اشعار میں تم سے لکھواؤں تو اس کا معاوضہ تم کیا لوگے؟

حلاج: دو دینار!

علاؤالدین: دو نہیں بھائی ایک۔ کامیاب ہو گیا تو سارا بٹوہ تمہارا۔

حلاج: منظور!

شہ کمال: (چھاتی کوٹتے ہوئے) میرا قافیہ تنگ ہو گیا ہے۔ شعر سوجھتا نہیں۔

علاؤالدین: تو اب سوال یہ ہے کہ اشعار لطیف ہوں یا جذبات سے لبریز ہوں یا مشکل ہوں۔

حلاج: تین دینار تو ہو گئے۔ شاید باقی سات بھی کہیں سے مل رہیں گے۔

شہ کمال: یہ گلہائے زنگار نگیں — یہ گلہائے زنگار نگیں۔

علاؤالدین: حلاج! یہاں میرے لیے شعر کہنا ناممکن ہے جب ایک ایسا عجیب و غریب انسان اس ہیئت کذائی کے ساتھ شاعری کا خون کر رہا ہو تو بھلا کوئی شریف آدمی شعر کیونکر کہہ سکتا ہے؟

حلاج: آپ کہاں لکھنا پسند کریں گے؟

علاؤالدین: کوئی نرم اور گدگدی سی جگہ ہوتی یہاں گدیلے بھی تو نہیں ہیں۔ ارے میاں تم کیا آدمی ہو۔ درویشوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہو۔

حلاج: آپ یہاں تشریف رکھئے نا۔

علاؤالدین: ہوں۔ خیر لیکن ایک بات سُننا۔ اگر کوئی اور آئے تو اسے میرے قریب نہ پھٹکنے دینا۔ میرا دماغ بے حد حساس ہے اور اثر بڑی جلدی قبول کرتا ہے۔ پھر میرا ذوق بھی بے حد لطیف واقع ہوا ہے۔ کوئی غیر فصیح لفظ سُن پاؤں تو ذہنی کوفت ہوتی ہے اور اگر کسی احمق کا منحوس چہرہ نظر آ جائے تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر تک طبیعت مکدّر رہتی ہے۔

حلاج: الٰہی تیری پناہ!

علاؤالدین: تو اب میں شعر کہتا ہوں۔

(گھنٹی کی آواز)

حلاج: کوئی اور صاحب تشریف لائے۔ ارے یہ تو حجامت مآب جناب سلیمان حجام ہیں۔

سلیمان: (بھاگتا ہوا آیا ہے اس لیے ہانپ رہا ہے) اماں حلاج سنا تم نے بڈھے جوہری کا قصہ جب ڈھنڈورچی یہ خبر لے کر میرے کوچے میں پہنچا تو میں خط بناتا بناتا اٹھ کر اس طرح بھاگا جیسے شیطان جہنم سے نکل کر بھاگے۔ سارے شہر میں اس قصے کا چرچا ہو رہا ہے اور یہ دوشیزہ ہے بھی تو حرم سرائے سلطانی کی زینت بننے کے قابل۔ ارے بھائی تمہارے وہم و گمان میں تو اس کی انگشتریوں کی صحیح قیمت بھی نہیں آ سکتی۔ ان کے نگینے اتنے بڑے ہیں کہ.....

حلاج: خدا کے لیے بات کرتے وقت اپنی قینچی کو یوں نہ گھمائیے، آپ میری آنکھیں نکال ڈالیں گے۔

سلیمان: میں تو کہتا ہوں یا رب یہ بیداری کا عالم ہے یا خواب و خیال کی دنیا۔ میں اس قدر مسرور ہوں کہ بچپن کے زمانے کی طرح ناچنے کو جی چاہتا ہے۔ سنو! میں تم سے کچھ کام لینا چاہتا ہوں۔ معاوضہ نقداً نقد، جی چاہے پیشگی لے لو اور اگر کہیں میں نے اس معرکہ میں فتح پا لی اور ماہ سیمیں میرے ہاتھ آ گئی تو قسم کھاتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے اس حجامی کے

پیشے سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ لو، اب میں شعر کہتا ہوں اور تم فوراً انہیں لکھ لینا۔

گلی میں سے آواز: ارے بدمعاش نکل باہر، کہاں آکر چھپ بیٹھا ہے۔ حلاج، سلیمان اندر ہے نا؟

سلیمان: (گھبرا کر) ہی ہی یہ کم بخت یہاں آ پہنچا۔ جب ڈھنڈورچی آیا تو میں اس وقت کم بخت کی آدھی ڈاڑھی تراش چکا تھا۔

(گلیش داخل ہوتا ہے)

حلاج: خوش آمدید گلیش!

گلیش: لیکن تم مسکرا کیوں رہے ہو؟

حلاج: کیونکہ آج بڑی مدت کے بعد آپ کی زیارت ہوئی ہے۔

گلیش: وہ رہا کم بخت حجام۔ کیوں بے بدمعاش یہ کیا حرکت تھی۔ آدھی ڈاڑھی تراش کر اٹھ بھاگنا۔ شہر کے ایک معزز آدمی کو اچھا خاصا مسخرا بنا ڈالا۔ میں اس بلا کی گرمی میں سوانگ بنا، گلی کوچوں میں سے بھاگتا ہوا آیا ہوں۔ ادھر تو آ۔ تجھے بھاگنا سکھاؤں۔

حلاج: اجی حضرت ایسا بھی کیا غصہ، ذرا بات تو سنئے۔ سلیمان برا آدمی نہیں، البتہ دل کے ہاتھوں مجبور ہے اور پھر اس وقت ذرا فکرِ شعر میں بھی مصروف ہے۔

گلیش: کیا کہا شعر؟ ایک بار اس کی ناک میرے ہاتھ آجائے تو اسے سکھاؤں شعر کہنا۔

علاؤالدین: ارے بھئی یہ کیا مصیبت ہے۔ دفان کرو اس جھکی کو یہاں سے۔

شہ کمال: اے لو۔ اتنی دیر کے بعد ایک ہی لفظ سوجھا تھا۔ وہ بھی بھول گیا۔

سلیمان: قبلہ آپ کی باقی ڈاڑھی میں پھر کسی دن تراش دوں گا۔ اس وقت آپ کو معلوم نہیں میرے دل کی کیا کیفیت ہے۔ مجھے معاف فرمائیے۔

گلیش: ہیں؟ کیا کہا؟

حلاج: میں نے کہا حضرت ذرا بات تو سنئے۔ میں نے سنا ہے آپ بڑے کاروباری شخص واقع ہوئے ہیں۔

گلیش: تو پھر؟

حلاج: آپ بھی وہی کیجئے نا جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

گلیش: کیا میں بھی شعر کہوں؟ میں اور شعر؟

حلاج: چار مصرعے ہی تو کہنے ہیں۔ خبر آپ نے سن ہی لی ہوگی۔

گلیش: وہی ابن جسیم کا قصہ۔ جی ہاں! یہی نا کہ وہ اپنی لڑکی چند شعروں کے عوض بیچ ڈالنا چاہتا ہے۔ نا بھائی ان دلوں جورو پر بہت روپیہ صرف ہوتا ہے۔ مجھ میں اتنی استطاعت کہاں۔

حلاج: غالباً آپ نے یہ نہیں سنا کہ جہیز میں سو اونٹ بھی ہاتھ آئیں گے۔

گلیش: سچ مچ! تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہ کہا۔ یہ بات ہے تو میں اس لڑکی کو جیت کر رہوں گا۔

حلاج : بالکل بجا۔ لیکن رباعی لکھنی بھی تو پڑے گی۔

گلیش : لکھنے کی بات ٹیڑھی ہے۔

حلاج : ایک دینار صرف کیجئے تو یہ مشکل بھی آسان ہوئی جاتی ہے۔

گلیش : اکٹھا ایک دینار۔ یہ تو بہت ہے۔ نصف دینار کہو۔ ہاں نصف دینار۔

حلاج : لیکن پاکیزہ اشعار اگر پاکیزہ خط میں نہ لکھے گئے تو حاصل کیا ہوگا۔

گلیش : اچھا تو پھر یوں ہی سہی۔ یہ لو دینار۔

حلاج : یہ خیال بھی تو کیجئے تاکہ لڑکی کے ساتھ دولت کتنی ہاتھ آئے گی۔

علاؤالدین : شکر ہے الٰہی کسی قدر سکون تو نصیب ہوا۔ تو اب سیمیں کا کوئی نیا اور شگفتہ قافیہ تلاش کریں۔ ابجد سے قافیہ کی تلاش شروع کرنی چاہیئے۔ سیمیں، آئیں۔ فرسودہ اور پامال قافیہ ہے۔ بائیں۔ رنگیں، سنگیں، شیریں، غمگیں۔ رنگین اور غمگین اچھے قافیے ہیں۔ پہلے قافیہ مقرر کر لینا چاہیئے۔ خیال خواہ پست ہو اس کی پرواہ نہیں۔ شاعری کی جان الفاظ کا ترنم اور آہنگ ہے۔

گلیش : (دور سے) اماں علاؤالدین تم نے تو مغز چاٹ ڈالا۔ جہاں کوئی موزوں ترکیب سوجھتی ہے۔ تم اسے غتر بود کر دیتے ہو۔

سلیمان : کان نہ کھاؤ گلیش۔ میں اپنی رباعی دل میں دہرا رہا ہوں۔

شہ کمال : اگر بکنا ہی ہے تو آپ حضرات کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈھیئے۔

علاؤالدین : یہ مصرعہ کیسا رہے گا ؏ ترانے بلبلیں گاتی ہیں تیرے روئے رنگیں کا۔

شہ کمال : سوجھ گیا۔ بالکل سوجھ گیا ؏ نہیں ہے علم بلبل کو ذرا الفت کے آئیں کا

علاؤالدین : (اٹھ کر) کیا کہا تم نے؟ نہیں ہے علم بلبل کو؟ یہ ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ بلبل کا خیال میرا ہے۔

گلیش : اتنا ٹکڑا تو ہو گیا۔ کہاں بلبل کہاں نغمہ۔

علاؤالدین : تم سب کے سب چور ہو۔ یہ ساری بلبل چوروں کی ٹولی ہے۔

حلاج : ہائیں ہائیں کیا ہوا تمہیں۔ شاعر اور عاشق اور اس پر یہ کیفیت کہ مرغوں کی طرح لڑ رہے ہو۔ اس خشک اور سوختہ دنیا میں شاعر تو ابرِ رحمت کی طرح ہیں۔ جو خدا کی دنیا کو سیراب و شاداب بناتے ہیں۔ پھر شاعروں کا لڑنا جھگڑنا کیا معنی؟

سلیمان : (اچانک) حلاج، گلیش، شہ کمال، علاؤالدین! میں نے رباعی کہہ لی۔

علاؤالدین : نہیں نہیں پہلے اس قضیہ کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔

سلیمان : اماں چھوڑو اس قصے کو۔ لو حلاج تم میرے شعر قلمبند کر لو۔ دیر کی تو میں بھول جاؤں گا۔

کہیں خوشبو ہے ریحاں کی کہیں ہے رقص نسریں کا
کہیں بلبل کے . . . .

علاؤالدین : کیا کہا بلبل؟ یعنی تم نے بھی میرا ہی بلبل کا خیال چرا لیا۔ چچا جان کی ریش دراز کی قسم یہ دنیا ٹھگوں سے بھری ہوئی ہے۔

سلیمان : کیوں بلبل کے ٹھیکیدار آپ کیسے بن بیٹھے ؟

علاؤ الدین : یہ لفظ پہلے مجھے سوجھا تھا۔

شہ کمال : سنا آپ نے! حالانکہ سوجھا مجھے پہلے تھا۔

گلیش : بکتے ہو جی۔ یہ لفظ میرا ہے ۔

حلاج : یہ کس نوک جھونک میں پڑ گئے آپ لوگ۔ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ یہ نہ بھولئے کہ آسمان کی بلندیوں پہ چاند اگرچہ ایک ہی نکلتا ہے لیکن اس کا پرستار ہر باغ میں موجود ہوتا ہے جو راتوں کے سناٹے میں اس کی تعریف کے گیت گاتا ہے ۔

سلیمان : واللہ کیا بات کہی ہے۔ آدمی عقلمند ہے۔ مجھ سے پوچھو تو سب کے سب بڑے شوق سے اس لفظ کا استعمال کریں۔ الفاظ پر کسی کے باپ کا اجارہ ہے ؟

علاؤ الدین : لیکن مجھے اس سے انکار ہے۔ میں یہ نہیں مان سکتا۔ ہر ایک جانتا ہے کہ الفاظ کے دہرانے اور ان کی تکرار سے حسن کلام کا خون ہو جاتا ہے ۔

سلیمان : حلاج! اس معاملے سے تمہارا کوئی ذاتی تعلق نہیں اس لیے تم ثالث بن کر یہ جھگڑا چکا دو۔

شہ کمال : میں اس کی تائید کرتا ہوں ۔

گلبش : اور میں بھی ۔

علاؤ الدین : اور میں بھی۔

حلاج : یہ تو بڑی سیدھی سی بات ہے۔ آپ کے اشعار خواہ دوپہر کی طرح روشن ہوں خواہ شام کی تاریکی کی مانند سبک اور لطیف، یا تاروں بھری رات کی طرح پُرشکن آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن ان میں طلسم ایسے الفاظ کا باندھ دیجیے جن میں سنبل و ریحان اور مشک و عنبر کی شمیم جاں فزا کا ذکر ہو اور کائنات گلہائے رنگا رنگ سے تختہ گلزار نظر آئے۔ نرگس کی نگاہ بازی بھی اور سوسن کی زباں درازی بھی۔ اس میں طیور خوش الحان کا نام بھی لائیے قمری، فاختہ، طوطی اور طاؤس کا ذکر بھی کیجئے۔ لیکن بلبل ہزار داستان کا نام بھی نہ لیجئے۔

علاؤ الدین : یعنی کوئی بھی بلبل کا ذکر نہ کرے ؟ اس طرح تو میں خسارہ ہی میں رہا لیکن اچھا تم کہتے ہو تو یوں ہی سہی۔

سلیمان : تو پھر فیصلہ ہو گیا نا کہ بلبل کا نام اشعار میں نہ آئے گا۔ یوں ہی سہی۔

(پھر سب بیٹھ کر شعر کہنا شروع کر دیتے ہیں)

حلاج : (دینار گنتے ہوئے) : ایک، دو، تین، چار، پانچ! ـــــ دنیا میں مجھ سا بد قسمت بھی کوئی نہ ہوگا۔ تاجروں سے سنا ہے کہ پانچ اور پانچ دس ہوتے ہیں۔ باقی رہے پانچ دینار۔ اب وہ کیونکر حاصل کئے جائیں (سامعین سے مخاطب ہو کر) اے سننے والو! معلوم نہیں میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی تعریف میں مجھ سے اچھا شعر کوئی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن افلاس بہت بڑی لعنت ہے۔ اب اتنا وقت بھی تو نہیں رہا کہ روپیہ کہیں سے چرا کر ہی لے آؤں۔ اچھا اگر میں اسے اپنا نہیں بنا سکتا تو اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ اگر وہ میرے ہاتھ نہ آئی جب بھی یہ آفتاب

کی روشنی، بادل اور یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں، پھول اور شعر تو کہیں نہیں گئے۔

سلیمان : (نہایت بلند آواز سے) ہو گئی۔ ہو گئی رباعی۔ حلاج جلدی کرو۔ نکالو قلم اور کاغذ۔ اشعار سیلاب کی طرح بہے چلے آ رہے ہیں اور میری روح کے قفس کی تیلیاں توڑ کر بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ جلدی کرو اور ان کے پاؤں میں حروف کی زنجیریں ڈال دو۔

حلاج : تیار ہوں، بولو!

سلیمان : ؎ تصور میں ترے دیکھا ہے میں نے محمل پروین کا
نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ سامان ہے دیں کا
مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب

شہ کمال : آہاہا! کیا خوب رباعی ہے۔ حلاج لکھنا میرا شعر جلدی سے۔ کیا بھلا مصرع؟

سلیمان : مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب

حلاج : ارے بھائی ٹھہرو میں دونوں ہاتھوں سے نہیں لکھ سکتا۔

گلبیش : اے سبحان اللہ ”ترا جسم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا“

علاؤالدین : اماں ہٹاؤ ان چوروں کو ان کی نہ سنو۔ میرے شعر لکھو۔

سلیمان : میں نے کہا تھا ”مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب“

علاؤالدین : ترا پیکر سہارا ہے مرے احساسِ غمگیں کا

گلبیش : ترا جسم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا

شہ کمال : جہانِ عشق و مستی میں گزر کیا ظن و تخمیں کا

سلیمان : مری آنکھوں پہ منڈلاتا ہے پرتو ماہِ سیمیں کا

حلاج : یارو ذرا ہٹ کر کھڑے ہو۔ مجھے تو پسینہ آنے لگا۔ اُف وہ کتنی گرمی ہے۔ سینوں میں شاعری کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ایک ایک کر کے کہو۔ سلیمان پہلے تم اپنی رباعی لکھواؤ۔

سلیمان : ؎ تصور میں ترے دیکھا ہے میں نے محمل پروین کا
نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ سامان ہے دیں کا
مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب
مری آنکھوں پہ منڈلاتا ہے پرتو ماہِ سیمیں کا

حلاج : واہ واہ سبحان اللہ! کیا دلکش اشعار ہیں۔ اے کاش یہ اشعار میرے ہوتے۔

علاؤالدین : اماں رہنے دو۔ تم انہیں دلکش کہتے ہو۔ خدا کی پناہ میں تو سمجھتا ہوں نہایت پھسپھسے شعر ہیں۔

سلیمان : کیوں بے پھسپھسے ہیں ہمارے اشعار؟

علاؤالدین : ارے چھوڑ میرا کان۔

حلاج : شاہ کمال اب تم اپنی شاعری کے تنور کا ڈھکنا اٹھاؤ۔ دیکھیں الفاظ کے کلچے تیار کرنے میں تمہیں کتنی مہارت ہے۔

شہ کمال : عرض کرتا ہوں ؎

تخیل سے مرے کیا واسطہ شہباز و شاہیں کا   جہانِ عشق و مستی میں گزر کیا ظن و تخمیں کا
اسی دن زندگی کو زندگی کہہ کر پکاروں گا   مرے ہاتھوں میں ہوگا ہاتھ جس دن ماہِ سیمیں کا

حلاج : کیا کہنے ہیں۔ واہ، واہ، واہ!

علاؤالدین : شاہ کمال ایک بات میری سن لو۔ اگر ماہِ سیمیں کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو چوتھا مصرعہ بدل ڈالو۔

حلاج : گلیش! آگے آؤ۔ اب تمہاری باری ہے۔

گلیش : کہتا ہوں کہ ؎

ترا جسم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا   بیاں میں کیا کروں تیرے جمالِ لذت آگیں کا
میں سچ کہتا ہوں پانی کی طرح سونا بہا دوں گا   بس اک پل کے لیے جلوہ دکھا دو ماہِ سیمیں کا

علاؤالدین : ان اشعار میں دولت کا تذکرہ ضرورت سے زیادہ ہے۔

حلاج : اماں تم تو کسی کو بھی داد نہ دو گے۔ اچھا اپنے اشعار سناؤ۔

علاؤالدین : تمہارا اصرار ہے تو انکار کیسے کر سکتا ہوں۔ لیکن واضح رہے کہ جو کچھ کہا ہے روا روی میں کہا ہے اور اس زمانہ کے تمام بلند پایہ شاعر ایک ایک مصرعہ پر پورا پورا ہفتہ صرف کر دیتے ہیں۔ تو عرض کیا ہے کہ ؎

ترا پیکر سہارا ہے مرے احساسِ غمگیں کا   ترا ماتھا ستارہ ہے مری شبہائے مشکیں کا
جسے لوگوں نے کوندے کی لپک کہہ کر پکارا تھا   ہوا میں اڑ رہا تھا بال میرے ماہِ سیمیں کا

شہ کمال : جھرنے کا سا تخیل ہے۔

سلیمان : اسلئے استرے جیسا باریک خیال۔

گلیش : اماں تمہیں کیا پڑی ہے کہ نکتہ چینی کر کر کے دوسروں کے اشعار درست کر رہے ہو۔ رہنے دو یوں ہی وقت تھوڑا ہے مجھے اب دس دینار لانے کے لیے جانا چاہیئے۔

سلیمان : میں بھی جاتا ہوں۔ چلو سب اپنے اپنے گھر چلیں۔

شہ کمال : خدا حافظ حلاج۔ ہم ابھی آتے ہیں۔

(سب جاتے ہیں)

حلاج : اب شمعیں روشن کر دوں؟ نہیں جب دن بھر کی گرمی کے بعد رات اپنے نازک پَر دنیا پر پھیلا دیتی ہے تو ارمان بھرے دل کی حرکت مدھم پڑ جاتی ہے اور غم بھی شیریں معلوم ہوتا ہے۔ شمعیں خاموش ہی رہنے دوں۔ لیکن حلاج اب ان خیالات کو چھوڑ۔ ہاتھ پاؤں ہلا اور اپنے حقیر جھونپڑے کو اپنی محبوب کی آمد کے لیے آراستہ کر۔ الٰہی فردوس اور جہنم میں کتنا کم فاصلہ ہے۔ مٹھی بھر سونا ہے جو جنت کی رنگینیوں اور دوزخ کی اذیتوں کو جدا کرتا ہے۔

شہ کمال: (دور سے آہستہ سے) حلاج!

حلاج: کون، آپ؟ دوسری بار کیسے تشریف لائے؟

شہ کمال: ذرا آہستہ بولو۔ میں نے کہا کمرے میں تمہارے سوا کوئی دوسرا تو نہیں؟

حلاج: نہیں۔ یقین نہ آئے تو شمع روشن کیے دیتا ہوں۔

شہ کمال: نہیں۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے فوراً کہے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں ماہ سیمیں کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اب میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میرے اشعار علاؤالدین کے اشعار کے سامنے تخیل کے اعتبار سے پست ہیں۔ وہ تو بڑا شاعر ٹھہرا نا، اور پھر شعر کہنا کون سا شیر مال تیار کرنا ہے لیکن اگر تم چاہو تو مجھے کچھ امید ہو سکتی ہے۔ تمہارے قلم کی جنبش اس کے اشعار کو کچھ کا کچھ بنا سکتی ہے۔

حلاج: ذرا دیکھوں تو اس کی رباعی، یہ رہی۔ ایک دینار دو تو ہو سکتا ہے۔

شہ کمال: بس تو میدان مار لیا میں نے، یہ لو ایک دینار علاوہ ازیں شادی کے بعد ضیافت بھی دی جائے گی۔

(جاتا ہے)

حلاج: صرف ایک دینار۔۔۔۔۔۔ اس سے کیا بن جائے گا؟

سلیمان: (آہستہ سے) حلاج!

حلاج: کون ہے، سلیمان؟

سلیمان: ہاں میں ہوں۔ ارے بھیا! مجھے تو اپنی ناکامی کا پورا یقین ہو گیا۔ لیکن اگر اس آڑے وقت میں تم کام آؤ تو۔۔۔۔۔۔

حلاج: کوئی فکر نہیں۔ میں سمجھ گیا تمہارا منشا۔

سلیمان: میں تمہیں بتا دوں کہ ابن حسیم کو فن شعر سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ تو صرف روپے کا بھوکا ہے، چنانچہ مجھے اندیشہ ہے کہ گلبش کے اشعار اسے بہت پسند آ جائیں گے۔ اب تم مہربانی کر کے یہ ایک دینار لو اور مجھے اس پریشانی سے نجات دو۔ میں نے جو اشعار لکھے ہیں انہیں اسی طرح رہنے دو، اور۔۔۔۔۔۔

حلاج: میں سمجھ گیا۔

سلیمان: گلبش کے اشعار کو مسخ کر دو۔

حلاج: ہو جائے گا بے فکر رہو۔

سلیمان: تو میں چل دیا۔ (جانے کے بعد)

حلاج: ایک دینار اور ہاتھ آیا۔ اگر اسی طرح آج۔۔۔۔

علاؤالدین: حلاج!

گلبش: حلاج!

علاؤالدین: کون ہے؟

گلیش : اے ستم کہاں سے آن ٹپکے۔ میں تو ایک نہایت ضروری کام کے لیے آیا ہوں۔

علاؤالدین : خوب! لیکن جناب نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ مجھے ضروری کام نہیں ہے۔ جناب ہی کیوں نہیں ذراسی دیر کے لیے سرک جاتے؟

گلیش : مشکل ہے۔

علاؤالدین : تو جناب میرے لیے آسان نہیں۔

حلاج : ارے لڑتے کیوں مرتے ہو۔ ادھر آؤ اور میری ایک بات سنو۔ مجھے ایک عجیب دل لگی سوجھی ہے۔ یقیناً تم دونوں اس معرکے میں کامیاب ہونا چاہتے ہو لیکن ایک آدمی تین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر تم دونوں ایک ایک دینار صرف کر دو تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اتنا معاوضہ لے کر میں تمہارے حریفوں کے اشعار توڑ مروڑ کر بے حد مضحکہ خیز بنا دوں گا۔ میں بآسانی یہ کر سکتا ہوں۔ ایک خط یا حرف یا لفظ سے معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں گے۔ زیادہ معاوضہ تو نہیں ایک ایک دینار میں ایسی پری جمال دوشیزہ ہاتھ آتی ہے۔

علاؤالدین : مجھے اپنے ابن عم کی ڈاڑھی کی قسم، تم میرے اندازہ سے زیادہ عقلمند ہو۔ مجھے منظور ہے، یہ لو ایک دینار۔

گلیش : نہ معلوم میرے سر پر کیا حماقت سوار ہے کہ اتنا کچھ خرچ کرنے پر تیار ہو رہا ہوں۔ بہرحال یہ رہا دینار۔

علاؤالدین : اب میں جب شہ کمال کی صورت دیکھوں گا تو مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ میں چل دیا۔

(جاتا ہے)

گلیش : (جاتے ہوئے) اب خواہ کامیاب ہوں یا ناکام، سلیمان کی دال تو گلنے نہیں پاتی۔

حلاج : (جلد جلد) ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو۔ بس ایک دینار کی کسر ہے، میری سوئی ہوئی تقدیر اس وقت آنکھیں کھول دے۔

(جلدی سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے)

اماں گلیش پلٹ آؤ۔ بات تو سنو۔ سچ کہتا ہوں کہ تم نے آج تک اس سے زیادہ مہنگا سودا کبھی نہ کیا ہوگا۔

گلیش : خود ہی تو میرا روپیہ ہتھا لیا اور بدمعاش خود ہی کہتا ہے کہ میں نے اتنا مہنگا سودا کبھی نہ کیا ہوگا۔

حلاج : میں کہتا ہوں جس شخص کو عطر سازی آتی ہے۔ وہ بہ آسانی شعر بھی تصنیف کر سکتا ہے۔ یاد رکھو علاؤالدین شاعر ہے اور تمہارے اشعار کا تیر نشانہ پر نہیں بیٹھا۔

گلیش : تو اُگل دے میرا سارے کا سارا روپیہ۔

حلاج : تم بھی کس قدر احمق ہو۔ ارے سنا نہیں کہ دوڑ میں جو گھوڑا سب سے پیچھے ہو آخر میں وہی جیت جایا کرتا ہے چنانچہ اگر میدان مارنا چاہتے ہو تو ایک چہرہ شاہی اور دلواؤ۔

گلیش : قسم کھا کے کہتے ہو کہ جس طرح دوسروں کے اشعار مسخ کئے ہیں اسی طرح علاؤالدین کے اشعار بھی مسخ کر دو گے؟

حلاج : قسم ہے تمہاری ڈاڑھی کی۔ بلکہ یہ لو، میں نے اشعار میں ردو بدل کر بھی دیا۔

گلیش : بس صرف ایک لفظ کی تبدیلی؟

حلاج : صبر کرو، جب ماہ سیمیں تمہارے ہاتھ آگئی، اس وقت تمہیں میرے الفاظ کی صداقت معلوم ہو سکے گی۔

گلیش : مگر ایک دینار کی رقم بڑی بھاری ہے۔

حلاج : تمہاری مرضی۔ میں جانتا ہوں روپے کے معاملے میں تم بڑے سیانے ہو پر اتنا خیال نہیں کرتے کہ دلہن کے ساتھ دولت کتنی ہاتھ آئے گی۔ ارے تم تو تذبذب میں پڑ گئے۔ پھر انکار رہے کیا؟ یوں ہی سہی، ماہ سیمیں تمہاری قسمت ہی میں نہیں۔

گلیش : (آہ بھر کر) اچھا بھئی لے لو۔

حلاج : دس پورے ہو گئے۔ آخر دس پورے ہو گئے۔

گلیش : کیا مطلب؟

حلاج : آپ کے دستِ کرم پر دس برکتوں کا نزول ہو۔ غم کی تیرگی دور ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند نکل آیا! اگر انسانوں کی دنیا درحقیقت اس سے آدھی شیریں اور دلفریب بھی ہوتی جیسی آج نظر آ رہی ہے اور شباب اور محبت کا نور ہمارے سینوں کو یونہی جگمگاتا رہتا تو زندگی ایک ایسی لطیف و پاکیزہ نظم ہوتی کہ شاعر قلم ہاتھ سے رکھ دیتے۔

گلیش : تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو گویا ماہ سیمیں کو حاصل کرنے کا خواب تم بھی دیکھ رہے ہو۔

حلاج : ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں تخیل پرست ہوں لیکن حقیقت ہے کہ ہم اپنی زندگی کی تعمیر خود کرتے ہیں اور جب ہم شباب کو بھول جاتے ہیں تو زندگی ایک بیکار چیز رہ جاتی ہے لیکن سنو آہٹ سن رہے ہو۔ اس کی پالکی کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ وہ اس چھوٹے سے کوچے سے گزر کر ہماری جانب آ رہے ہیں۔

(ماہ سیمیں کے عاشق داخل ہوتے ہیں)

اس کے عاشق شاعر آ رہے ہیں۔ خوش آمدید۔

نشہ کمال : حلاج ہم نے اسے مسجد کے قریب گزرتے دیکھا ہے۔

سلیمان : وہ حسین ہے، بادام کے ہرے بھرے درخت سے زیادہ حسین۔

علاؤ الدین : حلاج تمہارے ہاں آئینہ بھی نہیں؟

حلاج : نہیں بندہ پرور۔ اب ذرا سرک جائیے۔ اس کے لیے جگہ چھوڑ دیجئے۔ (ماہ سیمیں کی سواری آتی ہے۔ ساتھ اس کا باپ ابنِ حسیم ہے)

ابنِ حسیم : اے نیلے گنبدوں والے شہر اصفہان کے باشندو! میں تمہیں زیادہ دیر تک یہاں ٹھہرنے کی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں تم سب نے سن لیا ہے میں اب ایک ضعیف العمر اور سفید ریش انسان ہوں مجھے لے دے کے اب یہی ایک خواہش ہے کہ میرے جیتے جی میری لڑکی کی شادی ہو جائے۔ تم پوچھو گے کہ میں اپنی لڑکی کو شعر کے عوض کیوں دے دینا چاہتا ہوں میں نے تمہارے امتحان کے لیے سپاہ گری کا کوئی کرتب کیوں تجویز نہیں کیا۔ میرا جواب مختصر ہے۔ جو شخص شاعری سے، جو درحقیقت زندگی کی ساری لطافت کا مجموعہ ہے محبت نہیں کرتا میں اسے فطرت کا باغی اور وحشی سمجھتا ہوں۔ وہ درحقیقت صرف نام کا انسان ہے اسی طرح جس شخص کے دل نے حُسن کے آگے سر جھکا دیا ہے اس نے خواہ کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ کی ہوں وہ عام لوگوں کی نسبت بہت زیادہ شفیق ہوگا۔ اس لیے حضرات اب آپ میں سے ہر شخص باری باری آگے

بڑھکر شاعری کے جوہر دکھائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ میں سے کون شاعری کے میدان میں گوئے سبقت لے جاتا ہے اس معرکہ میں جو کامیاب ہوگا اسے حُسن اور دولت کا انعام دیا جائے گا۔

حلاج : اے ماہ سیمیں! اے بہار کے چاند! اگرچہ ان اشعار کو ایک بے ہنر کے قلم نے لکھا ہے لیکن کیا آپ ان پر نظر ڈالنا گوارا فرمائیں گی؟

ماہ سیمیں : تم حلاج ہو۔ اہلِ قلم کے بادشاہ حلاج!

حلاج : بادشاہ جب، اگر میری خوشنویسی آپ کو پسند آجائے۔

ماہ سیمیں : اس کاغذ کے نیچے نشہ کمال کا نام لکھا ہے۔

نشہ کمال : میں ہوں نشہ کمال۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ اشعار تخیل کے اعتبار سے کسی قدر پست ہیں لیکن آپ جانتی ہیں کہ تمام بلند پایہ شاعر...

ابن حسیم : خاموش۔ ہم اشعار سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہیں۔

ماہ سیمیں : ؎ نہ جانے ان دنوں کیوں ولولہ اٹھتا نہیں دیں کا
نہی دیکھا ہے میں نے پیٹ اس دنیا میں مسکیں کا
چٹانوں سے بھی موٹی روٹیاں ان کو کھلادوں گا
اگر مجھ کو میسّر ہو خزانہ ماہ سیمیں کا

اباجان! ظاہر ہے کہ نشہ کمال خواہ کیسا ہی ہنرمند نانبائی مانا جائے پر شاعری سے اسے دور کا بھی تعلق نہیں۔

نشہ کمال : لیکن۔ لیکن۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ ان اشعار کا ایک لفظ میرا نہیں ہے۔ حلاج تم بڑے بدمعاش ہو۔ خدا نہ کرے کہ میں ایسے اشعار لکھوں۔

علاؤ الدین اور گلبنش : مگر یہ شعر تمہی نے تو لکھے ہیں۔

نشہ کمال : (آتا ہے) میں کہتا ہوں۔ بس دل لگی کی حد ہو چکی۔ یہ اشعار ہرگز میرے نہیں۔

علاؤ الدین : ہم کہتے ہیں یہ تمہارے ہیں تمہارے۔

نشہ کمال : مجھ پر کسی نے جادو تو نہیں کر دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرات! بخدا مجھے یقین ہے کہ یہ اشعار میں نے نہیں لکھے۔

ابنِ حسیم : اچھا اب دوسرے شاعر کی باری ہے۔

ماہ سیمیں : اس کاغذ پر سلیمان کا نام لکھا ہے۔ سلیمان کون ہیں۔

سلیمان : میں ہوں بندۂ ناچیز سلیمان۔

ماہ سیمیں : مری تخییل نے مونڈا......

سلیمان : نہیں۔ نہیں۔ تصوّر میں ترے دیکھا....

ابنِ حسیم : بکو مت۔ ہاں بیٹی پڑھ کیا لکھا ہے۔

ماہ سیمیں: ؎ مری تخئیل نے مونڈا ہے سر شہباز و شاہیں کا
فرشتے گیت گاتے ہیں مری مقراضِ رنگیں کا
مرے دل میں ہزاروں استرے اب تک پرافشاں ہیں
کہ دیکھا ہے تصور میں ہیولیٰ ماہ سیمیں کا

سلیمان : جی ایسے اشعار لکھنے کی سزا میں ہم نے حلاج کا گلا نہ کاٹ ڈالا تو دیکھنا، بیٹا کس بھول میں ہو جو صابن کے جھاگ میں غوطہ نہ دیا تو میرا نام سلیمان نہیں۔

ابنِ حسیم : ظاہر ہے کہ ایسے بیہودہ گو، شاعری کے اس معرکے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دوسرے شاعروں کا کلام پڑھو۔

ماہ سیمیں : علاؤ الدین۔

علاؤ الدین : میں اتنا عرض کر دوں کہ میرے ٹوٹے پھوٹے اشعار کو پورے غور سے پڑھئے گا۔

ماہ سیمیں : بسا ہے میری نس نس میں معطر زلف مشکیں کا

علاؤ الدین : نہیں نہیں یہ نہیں نہیں یہ کہاں، تیرا پیکر سہارا ہے مرے......

ابنِ حسیم : کوئی اسے چپ کرائے ہاں بیٹی پڑھو۔

ماہ سیمیں : ؎ بسا ہے میری نس نس میں معطر زلف مشکیں کا
نہ دھوکا کھائیے غیروں کے احساساتِ رنگیں کا
میں بدصورت سہی، بھونڈا سہی، بندر سہی لوگو
مگر خوشبو سے جی بہلا ہی لوں گا ماہ سیمیں کا

علاؤ الدین : ہائیں۔

ماہ سیمیں : ابا جان! کہیں اس خوشبو دار بندر سے میری شادی نہ کر دیجئے گا بس اب ایک کا عذر اور رہ گیا ہے گلیش۔

ابنِ حسیم : گلیش صاحب معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا انعام آپ کے حصے میں آئے گا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کے اشعار ان لوگوں سے بھی بُرے ہوں۔ اس لیے انہیں پڑھنے کی زحمت کیوں اٹھائی جائے۔ میں لڑکی آپ کے حوالے کئے دیتا ہوں۔

ماہ سیمیں : لیکن ابا جان! یہ بھی دیکھیے کہ یہ شخص بھینگا ہے۔

گلیش : میری التجا ہے کہ آپ میری گھنٹہ بھر کی محنت کو یوں ضائع نہ کریں۔

ماہ سیمیں : میں شعر پڑھتی ہوں ؎

زمانہ میں بس اک ریشم ہی ہے سامان تسکیں کا
نہ مجھ کو حرص خوشبو کی نہ لالچ جام شیریں کا
اگر میلے ہیں میرے ہاتھ تو کیا آپ یوں کیجے
مری ڈاڑھی سے دامن باندھ دیجے ماہ سیمیں کا

گلیش : حلاج! رکھ دے میرے تین دینار یہاں اسی وقت۔

سلیمان : اماں تین دیناروں کے پیچھے پڑے کیوں جاتے ہو۔ دیکھئے تو یہ شادی کا معاملہ آخر طے کیونکر ہوتا ہے۔

حلاج : آہ ماہ سیمیں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

ماہ سیمیں : ان سب نے میری ہنسی اڑائی ہے۔

حلاج : نہیں ان بیچاروں کا کوئی قصور نہیں یہ سب کیا دھرا میرا ہے۔

ابنِ حسیم : تمہارا؟ صاف صاف کہو کیا بات ہے ورنہ آج خیر نہیں تمہاری۔

حلاج : لیجئے ایک اور رباعی جو ابھی پڑھی نہیں گئی۔

ابنِ حسیم : یہ کس نے کہی ہے؟

حلاج : میں نے!

ابنِ حسیم : مجھے بتایا گیا ہے کہ تم بے حد مفلس ہو۔ کیا دس دینار تمہارے پاس ہیں؟

حلاج : یقیناً! یہ بھی لیجئے اور جو کچھ بھی میرے پاس ہے سب لیجئے۔ میری طاقت، میری جوانی، میرا قہقہہ، میری طبیعت کی جودت اور حسن کی پرستش کا شاعرانہ جذبہ غرض جو کچھ آپ چاہتے ہوں میں پیش کر سکتا ہوں مجھ سے لے لیجئے۔

ابنِ حسیم : پڑھو۔

ماہ سیمیں : میں اس وقت تک اس کی نظم سنوں گی بھی نہیں جب تک کہ . . . .

سلیمان : جب تک کہ حلاج خود اسے نہ پڑھے گا۔

ماہ سیمیں : ہاں!

حلاج : کیوں صاحب! شاعر اپنا کلام خود بھی پڑھ کر سنا سکتا ہے۔

ابنِ حسیم : تمہیں اجازت ہے۔

حلاج : ؎

رُخِ پُر نور کعبہ ہے تری چشمِ جہاں بیں کا
فلک بس ایک سایہ ہے ترے گیسوئے مشکیں کا

اسے چھو لوں مگر ہاتھوں کو کوثر میں بھگو لاؤں
کہ تاروں سے بھی پاکیزہ ہے دامن ماہ سیمیں کا

ماہِ سیمیں : کس قدر دلکش اشعار ہیں۔

سلیمان : نہایت دلفریب، بے حد لطیف ہیں نا علاؤ الدین؟

علاؤ الدین : واقعی پاکیزہ اشعار ہیں۔

ابنِ حسیم : شکر ہے الٰہی کہ میری امیدیں بر آئیں اور میں جو کچھ چاہتا تھا ویسا ہی ہوا۔ اب حلاج میرے بیٹے! یہ تحفہ جسے تم نے اپنی دانائی اور شاعری سے حاصل کیا ہے تمہارے حوالے ہے۔ خدا کرے کہ تم دونوں، حلاج اور ماہ سیمیں، شاعر اور اس کی بیوی ایسی

محبت میں منسلک رہو کہ جب ہماری حیاتِ مستعار ماضی کی بھولی بسری بات بن جائے تو لوگ یاد رکھیں کہ روپیہ پیسہ بے اصل چیزیں ہیں۔ میں نے دس دینار اس لیے طلب نہ کیے تھے کہ روپیہ انسان کی ہنرمندی اور قابلیت کا معیار ہے ــــ میں ان چاندی کے سکوں کو سونے کے سکوں میں تبدیل کر کے اپنے الفاظ کی صداقت کا ثبوت دے سکتا ہوں۔ یہ لو سونے کی تھیلی۔

حلاج : ایک بات مجھے بھی کہہ لینے دیجیے میرے دوستو مجھے معاف کر دو۔ میں نے آپ سب کو دھوکا دیا، میں ابھی اس کی تلافی کیے دیتا ہوں۔ گلیش! یہ سونے سے بھری ہوئی پوری تھیلی تم لے لو، تمہیں اپنی رباعی کا معاوضہ مل گیا۔ علاؤالدین! تمہیں ساٹن کا ایسا جہیز دیا جائے گا جو اصفہان بھر میں بے نظیر ہو گا۔ شہ کمال! تمہیں شادی کے روز ضیافت دی جائے گی۔ باقی رہا سلیمان، سلیمان کے لیے بھی کوئی اعلیٰ نفیس چیز ہونی چاہیے۔

سلیمان : مجھے اپنی محبت بخشیے۔

حلاج : بخشی۔

ماہ سیمیں : اور میں نے بھی۔

(ماخوذ)

ہیلو

جاوید اقبال

(بفرضِ محال اگر اس کھیل کے کردار فرضی نہ ہوں تو ــــ)

منظر

ایک کوٹھی کا ہال کمرہ جس کا سامنے کا دروازہ اور کھڑکیاں باہر ڈیوڑھی کی جانب کھلتی ہیں۔ دایاں دروازہ کھانے کے کمرے کی طرف کھلتا ہے اور اس میں پڑی ہوئی کھانے کی بڑی میز پر بوتلوں کے چند جوڑے نظر آ رہے ہیں۔ بایاں دروازہ بند ہے جو اس کمرے کو کسی دوسرے کمرے سے ملاتا ہے۔

فرش پر گرد و غبار سے اٹا ہوا قالین بچھا ہے۔ قالین کے ارد گرد ٹوٹے پھوٹے سے صوفے رکھے ہیں۔ دیواروں پر چند بزرگوں کی ہیبت ناک قسم کی تصویریں ٹنگی ہیں۔ چھت کا پنکھا پوری تیزی سے چل رہا ہے۔ جواد قالین پر بکھرے ہوئے دو تین میلے سے تکیوں میں سے ایک پر سر رکھے، بنیان پہنے تہمد باندھے اوندھے منہ سو رہا ہے۔ چند رسالے بھی فرش پر منتشر پڑے ہیں۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو چند لمحوں کے لیے جواد کے خراٹوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ باہر تپتی ہوئی دوپہر میں لو کے جھکڑ چل رہے ہیں۔ دھول اڑ اڑ کر کھڑکیوں کے رستے کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ معاً سامنے کا دروازہ کھلتا ہے۔ ذکی اور شمیم داخل ہوتے ہیں۔ دونوں بھائی ہیں دونوں نے ایک جیسی سفید اچکنیں پہن رکھی ہیں۔ دونوں شریفوں کی اولاد معلوم ہوتے ہیں۔ ذکی دبلا مگر دراز قد ہے۔ شمیم قدرے بھرے جسم کا مگر پست قد ہے۔ ذکی میں نسوانیت سی ہے مگر شمیم نے مونچھیں پال رکھی ہیں۔ ذکی کے جسم میں عورتوں جیسی لچک ہے لیکن شمیم چٹان کی طرح سخت ہے۔ ذکی شدید قسم کا جذباتی نوجوان ہے اس لئے اس کی کرخت جسمانی حرکات اس کے جذبات کے متوازی سرزد

ہوتی ہیں۔ شمیم نسبتاً کم گو اور دھیمی طبیعت کا ہے۔

ذکی :- (جواد کو جھنجھوڑتے ہوئے) ارے ——— ابھی تک یونہی پڑے ہو ؟ !

جواد :- (جماہی لے کر کروٹ بدلتے ہوئے) ہیں ! ——— ہاں یار، آؤ !! (پھر سو جاتا ہے)

شمیم :- (عجیب انداز میں) جناب کو علم بھی ہے اس وقت کیا بجا ہے ؟ !

ذکی :- (جواد کو پھر سے جھنجھوڑتے ہوئے) بندۂ خدا پانچ بج چکے ہیں ———

جواد :- (بغیر آنکھیں کھولے) تو کونسی دوپہر ڈھل گئی ہے۔

ذکی :- (تنگ آکر) خیر سے آپ کے لئے ابھی دوپہر ہی نہیں ڈھلی ؟ !

شمیم :- (ذکی سے) قصور ان کا نہیں ہے بھائی۔ اس گھر کی فضا ہی کچھ ایسی ہے کمبخت۔

جواد :- (اسی انداز میں) میاں بیٹھ جاؤ، مجھے کھڑے لوگوں سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔

شمیم :- (اوپر دیکھ کر) ذرا پنکھے کی ہوا تو کھا لیں۔

ذکی :- (بے قابو ہو کر) توبہ، کس شدت کی گرمی ہے۔

جواد :- (بیزاری سے) یہ اچکن وچکن اتار دو، تم دونوں کی نیکریں ساتھ کے کمرے میں پڑی ہیں، پہن کر لیٹ رہو۔

شمیم :- (بے پروائی سے) پہلے بھائی سے ایک تازہ قصہ تو سن لو ———

جواد :- (گھبرا کر) کیوں ذکی، خیر تو ہے ؟ !

ذکی :- (بے پروائی سے) ارے بھئی وہی کمبخت ———

جواد :- (یکدم اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) کیا پھر کوئی ٹیلیفون آیا ؟ !

ذکی :- (تنگ آکر) کیا بتاؤں یار، عجیب مصیبت میں جان ہے ——— (آہ بھر کر بیٹھتے ہوئے) ظالم نہ تو پتہ بتاتی ہیں نہ ٹیلیفون کا نمبر ——— بہتیرا سر پٹکا مگر سب بیکار۔ دن میں چار چار مرتبہ فون آتے ہیں۔ ابتدا میں تو کسی کو خبر تک نہ تھی لیکن اب تو اچھا خاصا افسانہ بن گیا ہے گھر بھر کا۔

جواد :- (تعجب سے) وہ کیسے ؟ !

ذکی :- (افسردگی سے) بس سمجھ لو نا۔ کل میں اتفاق سے ابا کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ شامت اعمال سے چنو میاں قریب تھے۔ فون سنتے ہی دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور کہنے لگے "بھائی" میں نے پوچھا "کہو کیا بات ہے ؟" بولے "بھائی ——— جی جی جی ———" میں نے کہا "میاں، کوئی بات بھی تو ہو؟" پھر وہی جی جی جی ——— خیر میں سمجھ گیا تھا۔ اٹھا اور ٹیلی فون کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں سے جو واپس آتا ہوں تو قبلہ ابرو کھینچے بڑے غصے میں بیٹھے ہیں۔ پوچھنے لگے "کس کا ٹیلی فون تھا ؟" میں نے تمھارا نام لیا تو بولے "کچھ بھی ہو، میں چھوٹے بچوں کے ساتھ آپ کی اس قسم کی بے تکلفی کو تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ حفظِ مراتب بھی کوئی چیز ہے یا نہیں ؟" اب میری مشکل دیکھو کہ وضاحت بھی نہیں کر سکتا۔

جواد :- (پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ) بھئی ہاں واقعی !!

شمیم :- (اسی بے پروائی سے) اور وہ چوکیدار صاحب کی بھی تو سُنا دو۔

ذکی :- (افسردگی و حقارت سے) ادھر وہ چوکیدار ہیں۔ ایک شام جناب کہیں ٹیلی فون سن بیٹھے۔ گھر کے سب افراد موجود تھے۔ یعنی بڑے ابا بھی۔ تم تو ان کی طبیعت سے واقف ہو ہی ——— ہم ان کے سامنے کبھی ننگے سر بھی نہیں بیٹھتے۔ سو میں اور شمیم دونوں ترکی ٹوپیاں پہنے دو زانو بیٹھے تھے۔ بڑے ابا حسبِ عادت آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہے تھے لہٰذا ہم سب خاموش تھے کہ میاں چوکیدار آ دھمکے اور لگے ہنکارنے " ذکی میاں کا ٹیلا پھون ——— " سکوت قائم رہا۔ بڑے ابا بدستور سوچتے رہے۔ میں نے چور نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر چوکیدار سے آہستہ سے پوچھا " بھئی کس کا ہے ؟ " ! آپ اسی انداز میں فرمانے لگے " جی نام وام تو میں جانتا نہیں پر آواج جنانی ہے "۔ یہ سُننا تھا کہ میرا دل ٹخنوں میں دھڑکنے لگا۔ بدحواس ہو کے نظریں اُٹھاتا ہوں تو بڑے ابا مجھے بُری طرح گھور رہے ہیں۔ اللہ ——— تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ یار پہ کیا گزر رہی ہوگی۔

شمیم :- (بیزار ہو کر) کچھ سمجھ میں نہیں آتا کونسی لڑکیاں ہیں کمبخت ———

ذکی :- (ہنستے ہوئے) بھئی مجھے تو اکثر اس قسم کے فون آتے ہی رہتے ہیں۔

جواد :- (سر کھجاتے ہوئے) مگر یہ تو کسی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔

ذکی :- (اسی انداز میں) آخر شرارت کس کی ہو سکتی ہے، ہمارا تو کوئی بھی دوست۔

جواد :- (سنجیدگی سے) ممکن ہے عزیز موٹا ہو، مجھے تو بشیر چوہے پر بھی شک ہے ———!!

شمیم :- (جھلا کر) ارے نہیں بھائی۔ میں نے خود کئی بار گفتگو کی ہے ——— بھلا ہم کسی مرد کی بدلی ہوئی آواز نہیں پہچان سکتے ———؟!

ذکی :- (سوچتے ہوئے) ہو تو سکتا ہے۔

شمیم :- (بے پروائی سے) واہ، آپ نے بھی ایک ہی کہی !!

ذکی :- (حافظہ پر زور دے کر) ٹیلی فون پر بولنے والی تو ایک ہے ———

شمیم :- (کرختگی سے) مگر آپ نے محسوس نہیں کیا عقب میں ہر وقت زعفران زار کھلا رہتا ہے۔ مجھے تو کوئی غول معلوم ہوتا ہے لڑکیوں کا ——— کئی ہیں، شاید آٹھ دس ہوں۔

جواد :- (تعجب و سراسیمگی سے) ارے پر ہم تو تین ہی ہیں۔

ذکی :- (ہنستے ہوئے) تو کیا تم نے بٹوارے کی سوچ رکھی ہے !

جواد :- (بے پروائی سے) میری بلا سے، میں ان باتوں کا قائل ہی کب ہوں۔

شمیم :- (غصے سے) ستم تو یہ ہے کہ وہ ہماری شکلیں تک پہچانتی ہیں، خدا جانے ———

جواد :- (حیرانی سے) کیا انھوں نے تمھارے حُلیے تک بتا دئے ؟!

ذکی :- (سنجیدگی سے) ایمان سے ــــــ ! چند روز ہوئے شمیم نے مونچھیں مونڈی تھیں نا ؟!

جواد :- (تعجب سے) ہاں تو ــــ۔

ذکی :- (اسی انداز میں) کہنے لگیں "یہ آپ نے مونچھیں کیوں صاف کرا دیں۔ اب آپ کے نتھنے اور بھی کھلے معلوم ہونے لگے ہیں"

جواد :- (شمیم سے) اچھا تو، تو جبھی آپ نے مونچھیں بڑھا دی ہیں ؟!

شمیم :- (سنجیدگی سے) نہیں واللہ، یہ بات نہیں ہے۔ مجھ سے تو بھائی نے کہا تھا۔

ذکی :- (بھینچی مسکراہٹ کے ساتھ) ایک دن تمھارے متعلق بھی پوچھ رہی تھیں۔

جواد :- (بے قابو ہو کر) کیا، کیا ــــــ ؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) یہی کہ آپ کے دوست کوئی جواد صاحب بھی ہیں ؟!

جواد :- (اسی انداز میں: ہوں، ہوں ــــ

ذکی :- (بے پروائی سے) ان کے اگلے دونوں دانت باہر کیسے نکلے ہوئے ہیں ؟!

جواد :- (افسردگی سے) اس پر تم نے کیا جواب دیا ؟!

ذکی :- (ہنستے ہوئے) میں نے کہا "بچپن میں انا کی گود سے گر پڑے تھے"۔

جواد :- (غصے سے) کیسی بے ہودگی ہے ــــــ!

شمیم :- (بے پروائی سے، بھائی سے کہہ رہی تھیں "سنا ہے آپ کو اپنی آنکھوں پر بڑا ناز ہے ہمیشہ نیم وا رکھتے ہیں"

جواد :- (ذکی سے، تو تم نے کیا کہا ؟!

شمیم :- (اسی انداز میں) بھلا یہ تیلی پر پھوڑے والا راز کیوں فاش کرتے۔ گول کر گئے ــــــ

جواد :- (تنگ آکر) آخر یہ بدعت کیا ہے ؟!

ذکی :- (تنگ آکر) بھئی میں تو تنگ آگیا ہوں۔ صحن میں نکلتا ہوں تو چنو منو سب مجھے دیکھتے ہی دانت نکوسنے لگتے ہیں۔ ادھر چوکیدار صاحب کی "زیر مونچھ" مسکراہٹ دیکھ کر خون علیحدہ کھول اٹھتا ہے، جھاڑوں تو بڑے ابا کی خفگی کا احتمال ــــــ غرض عجب نکو بنا ہوا ہوں۔

جواد :- (حافظہ پر زور دے کر) یہ نتھنے، باہر نکلے ہوئے دانت اور ... اور نیم وا ــــــ میرا تو خیال ہے ہمارا کوئی نہایت ہی قریبی دوست ان لڑکیوں کو جانتا ہے ــــ

شمیم :- (بے پروائی سے ہنستے ہوئے) ہمارا کوئی دوست، لڑکیوں کا شناسا اور ہمیں خبر تک نہیں۔ بھلا یہاں کسی کے پیٹ میں آج تک کوئی بات بھی پچی ہے ؟!

جواد :- (اسی انداز میں) ممکن ہے ریاض ہو، کہتے ہیں اس کی بہت سی لڑکیوں سے شناسائی ہے۔

شمیم :- (حقارت سے) جھک مارتے ہیں جو یہ کہتے ہیں، اس بچہ کو کون جانتا ہوگا۔

ذکی :- (جواد سے) اور ہاں۔ ایک دوپہر اسی قسم کا ٹیلیفون بھائی مختار کو بھی آیا۔ بیچارے اپنے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے

تھے۔ ان کی جلد بازی سے کون واقف نہیں۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے "تو پھر ملاقات کا کوئی وقت ؟!"

جواد :- (تعجب سے) تو کیا ملاقات ہوئی ؟!

ذکی :- (جاری رکھتے ہوئے) بھائی مختار ابھی دفتر ہی میں تھے کہ ان کے گھر ٹیلیفون ہوا۔ ان کی بیگم بولیں "کون ہے؟!" آواز آئی "پہلے آپ بتایئے آپ کون ہیں ؟!" انھوں نے کہا "میں بیگم مختار ہوں۔ فرمایئے ؟!" ادھر سے جواب آیا "اللہ ——— آپ سے تو ملنے کو دل بہت بے قرار تھا۔ بے نصیب نیاز حاصل ہوئے۔ ذرا میرا ایک کام کر دیجئے، اپنے ان سے کہہ دیجئے کہ اب جو ہمارے یہاں آئیں تو میرا ریشمی رومال اور عطر کی شیشی نہ بھولیں۔"

جواد :- (خوفزدہ ہو کر) پھر کیا ہوا ؟!

ذکی :- (اسی انداز میں) مختار صاحب جو شام کو خوشی خوشی گھر لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیگم سر پہاڑ، منہ پھاڑ کے ٹوٹی کھٹولی پر پڑی ہیں۔ ان کے داخل ہوتے ہی بھابھی صاحبہ نے بچوں کی دھماکٹی شروع کر دی۔ بھائی مختار جو ٹپکے تو پنجے جھاڑ آن کے گرد ہو گئیں۔ اب تم ہی سوچ لو کہ کیا اودھم مچا ہو گا۔ رات ہوتے جب میں اُن سے ملنے گیا تو خلافِ معمول بستر پر دراز تھے اور ان کی داہنی آنکھ کے گرد گہرے نیلے رنگ کا حلقہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے سبب پوچھا تو جناب نے بھرائی آواز میں ساری کیفیت کہہ سنائی ———

جواد :- (آہ بھر کر) الاماں ——— بھئی مجھے تو یہ کوئی چنڈالیں معلوم ہوتی ہیں۔

شمیم :- (بے رخی سے) اجی نہیں، مغرب زدہ ہیں۔ اپنی طرف سے بڑی ظریف طبع بنتی ہیں۔

جواد :- (تعجب سے) مگر یہ کہاں کی ظریف طبعی ہے ؟! (وقفہ کے بعد، ذکی سے) آخر تم سے کہتی کیا ہیں ؟!!

ذکی :- (اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے) بھئی قصہ اصل میں یوں ہے کہ پہلے شمیم کو فون آیا کرتے تھے ——— ایک دن میری طلبی ہو گئی اور لگیں انگریزی بگھارنے۔ ادھر سے جو مسکت جواب ملا تو آ گئیں اپنی اصلیت پر اور ایسی ہربڑائیں کہ اُردو بھی غلط سلط بولنی شروع کر دی ———

شمیم :- (جل کر) صاف کیوں نہیں کہتے کہ ایک دن جناب نے میری غیر موجودگی میں انھیں بتا دیا کہ اختر شمیم کا بڑا بھائی ذکی ہے اور وہ مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا۔

ذکی :- چلو یوں ہی سہی، آخر بڑے بھائی کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔

جواد :- (تنگ آ کر) یار خدا کے لئے جھگڑنا بعد میں پہلے واقعہ تو سُن لینے دو۔

ذکی :- (جاری رکھتے ہوئے) تو جناب شمیم صاحب کو پہلے فون آیا کرتے تھے۔ مدت تک حضرت نے ذکر ہی نہ کیا۔ ایک روز جو اتفاق سے میری آنکھ دس بجے کھل گئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ صبح صبح شمیم صاحب بیٹھے شیو بنا رہے ہیں۔ پوچھا "کہو بھئی کہاں کی تیاریاں ہیں ؟" بولے "یونہی طبیعت کچھ کرنے کو چاہ رہی ہے۔" میں خاموش ہو گیا۔ دو گھنٹے آپ کھونٹیاں اُکھاڑتے رہے اور میں دیکھا کیا۔ ایک بار، دو بار، تین بار، غرضیکہ شمار ہی نہیں کئے بار صابن لگا۔ دوپہر ہوئی تو جناب غسل خانہ میں گھس گئے۔ چار بجے کے قریب ہال سے نکلے تو اب کپڑے پہننے شروع کئے۔ چھ بجے

کے قریب آراستہ پیراستہ ہو، تانگہ لے باہر کی ٹھانی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ پوچھ ہی بیٹھا "بھئی کدھر؟" بڑی بے اعتنائی سے بولے "یونہی ٹہلنے وہلنے"۔

شمیم :- (کھسیانی ہنسی کے ساتھ) توبہ، مبالغے کی بھی حد ہوتی ہے!!

ذکی :- (جلتے ہوئے) اچھا تو کیا میں ——

جواد :- (غصہ میں) اماں ٹھہرو بھی ——

ذکی :- کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد جناب منہ لٹکائے، اچکن کے سارے بٹن کھولے چلے آ رہے ہیں۔ مجھ سے پھر نہ رہا گیا۔ پوچھ "بھئی یہ پژمردگی کیسی؟" جواب دیا "آج شام سینما کی قرارداد تھی"۔

جواد :- (شمیم سے) کیوں شمیم؟!

شمیم :- (سنجیدگی سے) بخدا ——

جواد :- (حیرانی سے) پھر ملاقات ہوئی؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) توبہ کرو ——!!

شمیم :- (سنجیدگی سے) اصل میں ——

ذکی :- (حقارت سے) اصل میں کے کیا معنی۔ اچھے خاصے چغد بنے ہو۔ گھنٹہ بھر بینک کے برآمدے میں قواعد تم نے نہیں تو کیا میں نے کی ہے؟!

جواد :- (تعجب سے) کیا کوئی بھی نہ آیا؟!

شمیم :- (بے پروائی سے) بھئی میرا ذاتی خیال تو یہی ہے کہ انھیں کوئی کام پڑ گیا ہوگا۔

ذکی :- (نفرت سے) جی ہاں ——

جواد :- (بچوں کی طرح) مگر ذکی سے بات چیت کیا رہی؟!

شمیم :- (سنجیدگی کے ساتھ) بات دراصل یہ ہے کہ میری غیر موجودگی میں بھائی کہیں ان سے گفتگو فرما چکے تھے۔ آج صبح جو میں نے ریسیور اٹھایا تو فرمانے لگیں "کیا ذکیہ آپا یہاں موجود ہیں"؟ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "جی نہیں، ذکی بھائی موجود ہیں۔" بولیں "اچھا تو انھیں ہی بلوا دیجئے، ہمیں ان سے کچھ کہنا ہے" مجھے بڑا طیش آیا ——

جواد :- (سراسیمگی سے) یعنی ادھر تو مختار بیچارے کی گت بنوائی اور ادھر تم دونوں بھائیوں میں کشیدگی ——

ذکی :- (سنجیدگی سے) ہاں بالکل ——

شمیم :- میرا ارادہ تھا کہ بھائی کو اطلاع نہ دوں۔ میں نے ان سے تو اچھا کہہ دیا مگر ٹیلیفون بند نہ کیا۔ میرا خیال تھا خود ہی تنگ آ کر چھوڑ جائیں گی۔ اب جو میں باہر جانے کے لئے مڑتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ لکھنے والی میز کے نیچے سے ایک ہاتھ آہستہ آہستہ ٹیلیفون کی طرف سرک رہا ہے۔ پل بھر کے لئے بھائی صاحب کا سر نمودار ہوا اور دوسرے

لمحے سر ٹیلیفون سمیت پھر میز کے نیچے ———۔

جواد :- (تعجب سے) ارے ذکی ———؟!

ذکی :- (کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ) یار یوں اکثر ہو ہی جاتا ہے ———

(باہر کی ڈیوڑھی میں سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے)

شمیم :- (حیرانی سے) یہ گھنٹی کون بجا رہا ہے ؟!

جواد :- (بے پروائی سے) منوّر ہوگا ———

ذکی :- (بآواز بلند) شاہ صاحب اندر تشریف لے آیئے ———

آواز :- (باہر ہی سے) نہیں بھئی، میں جا رہا ہوں۔

شمیم :- (بآواز بلند) میاں کیا صرف آواز سنانے ہی آئے تھے ؟!

جواد :- (بے پروائی سے) کہاں جا رہے ہو ؟!

آواز :- (اسی انداز میں) میں نانی اماں کے ہاں ریڈیو سننے جا رہا ہوں۔ علاوہ اس کے میرے عرب والے ماموں بھی آئے ہوئے ہیں۔

ذکی :- (التجا کرتے ہوئے، بآواز بلند) بھئی ذرا کی ذرا تو دم لے لیجئے ؟!

آواز :- (اسی انداز میں) کہہ جو دیا نہیں ——— میں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ میں نے زندگی کے بارے میں اپنا نظریہ تبدیل کر لیا ہے۔

شمیم :- (گھبرا کر) انا للّٰہ ———۔

جواد :- (تعجب سے) مگر آج صبح تو تم اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ رجائیت ہی زندگی کا بہترین لائحہ عمل ہے ؟

آواز :- (اسی انداز میں) اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ آج صبح میں تمھارے ہاں آ رہا تھا تو تانگہ میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے مجھ پر نگہ غلط انداز ڈال دی تھی۔

ذکی :- (حیرانی سے) اور اب ؟!

آواز :- (اسی انداز میں) وہ ساتھ والے مکان کی بھٹیارن ہے نا ؟!

شمیم :- (حیرانی سے) کونسی ———؟!

آواز :- (اسی انداز میں) وہی جسے میں کوٹھے کے جھروکے میں سے دیکھا کرتا تھا۔

جواد :- (تنگ آکر) ہاں ہاں ———

آواز :- (اسی انداز میں) آج دوپہر جب میں کوٹھے پر چڑھا تو جھروکہ بند پایا۔ میں نے منڈیر پر چڑھ کر دیکھنے کی کوشش کی تو نامراد سامنے بیٹھی تھی، مجھے دیکھتے ہی چیخ اٹھی ——— "آ لینہ وے میرے خصم کو، تیرا سر منڈوا کر ٹھیکری کی ایسی مالش کراؤں گی کہ ساری کوون بازی بھول جاؤ گے۔" میں نے بہتیرا کہا "نیک بخت کیوں بدگمان

ہو رہی ہو، میری نیت بُری نہیں تھی، وہ تو اتفاق سے نگاہ پڑ گئی" مگر وہ بولی "چھ فٹ کی منڈیر ہے اور آپ کا قد ماشاء اللہ ٹھہرا تین فٹ، بھلا اتفاق سے نگاہ کیونکر پڑ سکتی ہے۔ اب یہ فیصلہ تو میرا گھر والا ہی کرے گا ——

ذکی :۔ (خوفزدہ ہو کر) پھر ——

آواز :۔ (اسی انداز میں) میں قنوطی ہو چکا ہوں ——

شمیم :۔ (بناوٹی تعجب سے) اب قنوطی ہو چکے ہو؟!

آواز :۔ (اسی انداز میں) ہاں ——

شمیم :۔ (بے پروائی سے) کتنے گھنٹوں کے لئے؟!

آواز :۔ (اسی انداز میں) اب میں عمر بھر قنوطی ہی رہوں گا۔

ذکی :۔ (بے پروائی سے) یہ تو تم ہمیشہ ہی کہا کرتے ہو۔

آواز :۔ (اسی انداز میں) اب کی مرتبہ ——

جواد :۔ (اُٹھ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) ٹھہرو تو سہی ——!

آواز (دُور سے) نہیں، نہیں ——

(چلا جاتا ہے)

ذکی :۔ (پژمردگی سے) چلا گیا ——!

شمیم :۔ (ہنستے ہوئے) خوب آدمی ہے ——

جواد :۔ (واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے) شمیم، تم بتا رہے تھے کہ جس وقت بھائی نے ٹیلیفون پکڑ لیا تو تم ——

شمیم :۔ (جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ جائے) ہاں، تو میں حیران پریشان دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر تک تو کھُسر پھُسر ہوتی رہی پھر دھیمے سُروں میں بھائی صاحب نے گانا شروع کر دیا۔

ذکی :۔ (شرما کر) ارے بھئی اُدھر سے غزل کی فرمائش جو ہوئی تھی۔

جواد :۔ (دلچسپی لیتے ہوئے) تو پھر تم نے کونسی غزل گائی؟!

ذکی :۔ (بے پروائی سے) وہی ؏

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

جواد :۔ (جھوم کر) سبحان اللہ —— خوب سماں بندھا ہو گا۔

ذکی :۔ (افسردگی کے ساتھ) یار، افسوس تو یہ ہے کہ جو بات میں سنجیدگی سے کہوں کمبخت اُسے بھی مذاق سمجھتی ہیں۔

شمیم :۔ (تنگ آ کر) انھیں پوری بات کیوں نہیں سُنا دیتے؟!

ذکی :۔ (جذبات سے بے قابو ہو کر) بس کہنے لگیں "ہائے، کبھی ملئے" میں نے جواب دیا "پہلے میرے برادرِ عزیز

کو بھوڑا نخوار کیا ہے۔ جواب مجھ سے ملنے کو کہہ رہی ہیں ؟!

جواد :- (دلچسپی لیتے ہوئے) پھر انھوں نے کیا کہا ؟ !

ذکی :- (پژمردگی سے) کچھ نہیں، سوائے ہی ہی کے ـــــ

جواد :- (اسی انداز میں) تم کیا بولے ؟ !

ذکی :- میں نے کہا "مجھے فرصت نہیں ہے" بولیں "آخر آپ سارا دن کیا کرتے رہتے ہیں ؟" میں نے جواب دیدیا۔ "صبح کوئی گیارہ بجے اُٹھ کر ناشتہ کرتا ہوں طبیعت ذرا کسل مندسی ہوتی ہے تو عشقیہ کہانیوں کی کتاب اُٹھا لیتا ہوں۔ اتنے میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ کھانے کے بعد جو عشقیہ کہانی ادھوری رہ جاتی ہے اُسے پھر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ اس طرح شام ہو جاتی ہے۔" کہنے لگیں "پھر شام کو آپ کیا کرتے ہیں ؟" میں نے کہا "شام کو بھنگڑ خانے چلا جاتا ہوں"

جواد :- (تعجب سے) بھئی یہ بھنگڑ خانے سے تمھاری کیا مراد تھی ؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) یہی، تمھارا گھر ـــــ

جواد :- (حیرانی سے) میرا گھر ؟!!

ذکی :- (بے پروائی سے) انھوں نے خود ہی اس کا نام بھنگڑ خانہ رکھا ہوا ہے، انھیں معلوم ہے ہم تمام دوست تمھارے ہاں ہر شام اکٹھے ہوتے ہیں۔

جواد :- (نفرت سے) لاحول ولا قوۃ ـــــ بڑی بدتمیز لڑکیاں ہیں !!

ذکی :- خیر ـــــ میں نے پوچھا "آپ سارا دن کیا کرتی ہیں ؟" کہنے لگیں "صبح اُٹھتی ہوں، ابّا جان اور ننھے بھائی صاحب دونوں رونا شروع کر دیتے ہیں۔ انھیں چپ کراتی ہوں۔ ناشتہ واشتہ کرا کے اسکول بھیجتی ہوں۔ اس کے بعد گھر کی جھاڑو بہارو ہے۔ برتن مانجھنے ہیں۔ روٹی پکانی ہے ـــــ کہیں دوپہر کو تھک ہار کر اپنے بستر پر کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹتی ہوں تو آپ کو ٹیلیفون کر دیتی ہوں"

جواد :- (خوفزدہ ہو کر) اللہ کی پناہ ـــــ (نوکر کو پکارتے ہوئے) دیوان علی ـــــ

ذکی : (اسی انداز میں) میں نے جواب دیا "شریف لڑکیوں کو یوں ہی کرنا چاہیئے"

جواد :- (دلچسپی لے کر) پھر ـــــ (پھر نوکر کو پکارتے ہوئے) ارے کوئی ہے ؟ !

ذکی :- (اسی انداز میں) پھر وہی خی خی خی ـــــ کچھ لمحے تو یونہی گذرے پھر بولیں "آپ نے 'شام و سحر' پڑھی ہے ؟" میں نے کہا "جی نہیں 'صبح و شام' دیکھی ہے" اس پر ہنسنے لگیں۔ شاعری پر بحث شروع ہوئی۔ بولیں "غالب اور اقبال بے حد ثقیل ہیں ـــــ"

جواد :- (اسی انداز میں) تو تم نے کیا کہا ؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) میں نے کہا "پھر کیوں پڑھیے"

جواد :- (پھر نوکر کو پکارتے ہوئے) دیوان علی ——

ذکی :- (اسی انداز میں) پھر اصرار کرنے لگیں کہ کہیں ملاقات کیجیے۔

جواد :- (جھلا کر چیختے ہوئے) ابے او دیوان علی ——

ذکی :- (تنگ آ کر) بھئی یہ کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ یا تو بات سنو یا اس کمبخت نوکر کو آوازیں دیتے رہو۔

جواد :- (سنبھل کر) اچھا چلو، پھر کیا ہوا ؟ !

ذکی :- (مزے لیکر) کہنے لگیں "آج شام ضرور ملیں گے" میں نے کہا "قسم کھائیے"

جواد :- (پھر بآواز بلند) دیوان علی ——

آواز :- (باہر سے) جی صاحب ——

جواد :- (مسکرا کر) بس اس نے سن لیا ہے۔ کہتے جاؤ!

ذکی :- (اسی انداز میں) میں نے کہا "قسم کھائیے"

جواد :- (بے پروائی سے) پھر کیا انھوں نے قسم کھائی ؟

ذکی :- (مسکرا کر) سنو تو —— بولیں "ناشتہ بہت بھاری تھا۔ اب کچھ حلق سے نیچے نہیں اترتا"

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر :- (ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے) جی ——

جواد :- (بے پروائی سے) بھئی میری یہ ٹانگ ذرا قالین پر سے اٹھا کر صوفے پر رکھ دو۔ سو گئی ہے۔ (ذکی سے) ہاں تو پھر ——

ذکی :- (بے پروائی سے) پھر ہنسنے لگیں۔

(نوکر جواد کی ٹانگ قالین پر سے اٹھا کر صوفے پر رکھ دیتا ہے۔ لیکن جب واپس جانے کے لئے مڑتا ہے تو شمیم میاں ایک مگر مچھ ایسی وسیع اور فراخ جماہی لیتے ہیں ——)

جواد :- (نوکر سے مخاطب ہو کر) اور . . . . اور یہ شمیم صاحب جماہی لے رہے ہیں، ذری ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے جانا —— (نوکر شمیم میاں کے منہ پر ہاتھ رکھتا چلا جاتا ہے) ہاں، تو بھئی ذکی پھر ؟ !

ذکی :- (جماہی لے کر) پھر —— !

شمیم :- (انگڑائی لیکر) کچھ غنودگی سی طاری ہو رہی ہے ——

ذکی :- (بے پروائی سے) پھر طے ہو ہی گیا کہ آج شام ضرور ملاقات ہوگی۔

جواد :- (بے قابو ہو کر) نہیں ؟ !

ذکی :- (سنجیدگی سے) ایمان سے !!

جواد :- (بے قابو ہو کر) مگر کہاں ؟ !

ذکی :- (بے پروائی سے) سُن تو لو ——

جواد :- (اُسی انداز میں) نہ نہ، پہلے بتاؤ کہاں۔ کیا میں بھی جا سکتا ہوں ؟ !

شمیم :- (ہنستے ہوئے) کیوں نہیں —— !!

ذکی :- (سرگوشی کے انداز میں) کہنے لگیں " ہم ہیں تو آٹھ دس، اور سب ہی آپ کے دیدار کو ترس رہی ہیں۔ مگر شروع شروع میں صرف دو ہی آئیں گی باقی نسبتاً شرمیلی ہیں۔" میں نے کہا " لیکن فون کرتے ہوئے انھیں شرم نہیں آتی ؟" بولیں " واہ آپ پھر مذاق کرنے لگے۔" میں مصلحتاً خاموش ہو گیا۔ پوچھنے لگیں " ہم آئیں کہاں ؟" میں نے کہا " آپ خود ہی مقام تجویز کر دیجئے، غلام حاضر ہو جائیں گے" بولیں " نہیں جہاں آپ کہیں" میں سوچ میں پڑ گیا۔

جواد :- (جھلاتے ہوئے) ہاں، ہاں —— تو تم سوچ میں پڑ گئے !!

ذکی :- (اسی انداز میں) پھر میں نے پوچھا " اپنی پہچان تو بتا دیجئے" بولیں " ہم دونوں نے ساڑھیاں باندھ رکھی ہوں گی اور لفٹی سینڈل ——" میں چلّایا " خدارا کہیں لفٹی سینڈل پہن کر نہ آئیے گا۔ ہمارے سر پر بال پہلے ہی اکا دکا ہیں" اس پر مزید قہقہے پڑے ——

جواد :- (بے قابو ہو کر) جلد بتاؤ، آخر ٹھہری کیا ؟ !

ذکی :- (بے پروائی سے) قصہ مختصر، طے یہ ہوا کہ وہ دونوں ٹھیک چھ بجے سائیکلوں پر سوار ہو کر ——

جواد :- (مسرت سے بے قابو ہو کر) ہاں، ہاں ——

ذکی :- (اسی انداز میں) تمھارے یہاں پہنچ جائیں گی۔

جواد :- (یکدم افسردہ ہوتے ہوئے) ہائیں ؟ !

ذکی :- (بے پروائی سے) تمھارے یہاں —— کیا ہرج ہے ؟ !!

جواد :- (غصے میں آتے ہوئے) عجب نامعقول ہو ——

ذکی :- (گھبرا کر) کیوں ؟ !

جواد :- (اسی انداز میں) ان سے یہاں آنے کو کیوں کہا۔ کوئی اور جگہ تجویز کی ہوتی ؟ !

شمیم :- (جھلا کر) اور کہاں بیٹھ سکتے تھے یار ؟ !

جواد :- (سنجیدگی سے) تمھیں میرے ساتھ کم از کم یوں نہ کرنا چاہیئے تھا ذکی —— تم جانتے ہو ہم بچپن سے ساتھ پڑھتے چلے آئے ہیں ——

ذکی :- (تسلی آمیز لہجے میں) بھائی خفا نہ ہو ——

جواد :- (غصے میں چیختے ہوئے) تو اور کیا کروں۔ بھلا یہاں بیٹھنے کی جگہ بھی ہے۔ ایک ہی تو صوفہ ہے کمبخت اور وہ بھی بغیر اسپرنگوں کے ـــ

شمیم :- (پھیکی ہنسی کے ساتھ) ہوا جو دادا جان کے وقت کا!!

جواد :- (اسی انداز میں) ایش ٹرے میں سگرٹ بجھانے کی عادت سے سب ناواقف۔ دروازے کے سامنے بجھے ہوئے سگرٹوں کے انبار لگے ہیں۔ مکڑیوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جہاں چاہیں جالے لگائیں.... یہ.... یہ دھول ـــ آخر وہ تمہارے متعلق کیا نظریہ قائم کریں گی؟!

شمیم :- (بے پروائی سے) ہمارے متعلق ان کو کیا نظریہ قائم کرنا ہے؟!

جواد :- (اسی انداز میں) مگر میرے متعلق تو کریں گی۔

ذکی :- (بے پروائی سے) ہوا کیا، انھیں معلوم ہے تمہارا گھر بھنگڑ خانہ ہے۔

جواد :- (جل کر) واہ بھئی واہ ـــــ میرا گھر ـــــ

شمیم :- (تسلی دیتے ہوئے) تم بعض اوقات ذرا ذرا سی باتیں محسوس کر لیتے ہو۔

جواد :- (پھر غصے میں آتے ہوئے) جبھی تو میں بک رہا تھا کہ میں ان چھوکریوں وکریوں کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے ان سے نفرت ہے، ایمان سے مجھے ان سے گھن آتی ہے۔

ذکی :- (گھبرا کر) بھئی یہ وقت بحث کرنے کا نہیں۔ اب تو وہ آیا ہی چاہتی ہوں گی۔

جواد :- (غصے میں) تو میں کیا کروں۔ میں انھیں اسی تہمد اور بنیان میں ملوں گا۔

شمیم :- (گھبرا کر) للہ یوں نہ ملنا سارا اثر زائل ہو جائے گا۔ بھائی نے ان پر بڑی ہوا باندھ رکھی ہے۔

جواد :- (تعجب سے) ایمان سے؟!

ذکی :- (سنجیدگی سے) بخدا میں نے ان سے کہہ رکھا ہے کہ تم ایف۔ اے میں پڑھتے ہو۔

جواد :- (قدرے دھیمے لہجے میں) مگر یار ذرا سوچو تو سہی، آخر وہ آئیں گی تو چائے کے لئے تو پوچھنا پڑیگا۔ اور میرے پاس تو کل تین ہی پیالیاں ہیں۔ وہ بھی بے جوڑ۔

ذکی :- (بے پروائی سے) تم ان باتوں کی فکر نہ کرو۔

جواد :- (پھر غصے میں آتے ہوئے) میں ان باتوں کی فکر نہ کروں تو اور کون کرے؟!

شمیم :- (سنجیدگی سے گھڑی دیکھ کر) بھائی چھ بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔

ذکی :- (گھبرا کر) جاؤ جواد، کپڑے بدل آؤ۔ وقت ایمان سے بہت کم ہے۔

جواد :- (اٹھ کر) کیا مصیبت ہے۔ تم نے مجھے آتے ہی کیوں نہ بتا دیا۔ بھلا اب میں پندرہ منٹ میں کیوں کر تیار ہو سکتا ہوں؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) نہانے دھانے کی ضرورت نہیں، ابھی تم پچھلے مہینے ہی تو نہائے تھے۔ صرف یہ تہمد بدل کر

پتلون پہن آؤں۔

جواد :- (چل کر) میں صرف تہمد بدل کر پتلون پہن آؤں اور تم جو صبح ہی سے اچکنیں ڈانٹے، زلفیں سنوارے ——

شمیم :- (پھر گھبرا کر) یار وقت ضائع نہ کرو ایمان سے ——

جواد :- (بے پروائی سے) اچھا یہ سگرٹوں کے ٹکڑے تو چن لو ——

ذکی :- (گھبرا کر اٹھتے ہوئے) تم جاؤ میاں، میں چنے دیتا ہوں۔

(ذکی دہلیز میں پڑے ہوئے سگرٹوں کے ٹکڑے چننے لگتا ہے)

جواد :- (شمیم سے) شمیم، ذرا اس صوفہ کو پکڑو —— (شمیم اُٹھ کر صوفہ کو پکڑتا ہے) اِدھر سے نہیں، وہاں سے ——
(جواد دوسری طرف سے خود پکڑ کر اٹھاتا ہے)

شمیم :- (زور لگا کر اُٹھاتے ہوئے) ہاں ——

جواد :- (صوفہ کو ایک طرف لے جا کر) اور اٹھاؤ —— لے.... لے.... ادھر رکھو، ہاں —— (صوفہ رکھ دیتے ہیں۔ شمیم اسی صوفہ پر بیٹھ جاتا ہے) —— (نوکر کو پکارتے ہوئے) دیوان علی —— !!

شمیم :- (تنگ آ کر) اب اس سے کیا کہنا ہے ؟!

جواد :- ابھی جالے اُتارے گا۔ (مسرت سے) قالین پر اگر ایک ہاتھ برش کا پڑ جائے تو چمک اُٹھے ——

ذکی :- (سگریٹ باہر پھینکتے ہوئے) اتنا وقت نہیں جواد خدارا ——

جواد :- (چیخ کر نوکر کو پکارتے ہوئے) ابے او دیوان علی —— !! (تہمد کے پلڑے سے سگریٹ نکال کر سلگاتا ہے)

آواز :- (باہر ہی سے) جی صاحب ؟!!

جواد :- (ذکی سے) لو میں جاتا ہوں۔

شمیم :- (جھلا کر) اب جا بھی چکو یار ——

جواد :- (التجا کرتے ہوئے) ذرا یہ سگریٹ ختم کر لوں —— (زور زور سے کش لگاتا ہے)

ذکی :- (اسے کندھوں سے پکڑ کر دھکیلتے ہوئے) نہیں، نہیں ——

جواد :- (پھر رکتے ہوئے) کمرہ ایمان سے یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے کسی پہلوان کا اکھاڑہ ہو۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر :- (بآوازِ بلند) جی کہیے ——؟!

شمیم :- (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) ارے آہستہ بولا کر، تم سے کئی بار کہا ہے ——

جواد :- (بے پروائی سے کش لگا کر) یہ تکیے اُٹھا کر لے جاؤ۔

(نوکر تکیے اُٹھا کر ملحقہ کمرے کی طرف مڑتا ہے)

شمیم :- (تنگ آ کر) بس اب تم جاؤ گے بھی یا نہیں ——

جواد :- (بغیر سنے) دیوان علی ـــــ یہ کھانے کے کمرے کا دروازہ بھیڑتے جانا۔

(نوکر بغیر جواب دیئے چلا جاتا ہے)

ذکی :- (آہ بھر کر بیٹھتے ہوئے) خدا کے لئے اب جاؤ بھی ـــ

جواد :- (تعجب و سراسیمگی سے) پر..... پر..... یا ـــــ ؟!

شمیم :- کیوں اب کیا ہے ؟!

جواد :- (اسی انداز میں) آتو وہ جائیں گی، مگر ان سے بات کیونکر شروع کی جائے گی ؟!

ذکی :- (کچھ سوچ کر) تم گفتگو کرنا ـــــ ہم دونوں خاموش رہیں گے۔

جواد :- (بچوں کی طرح) میں کیوں بولوں ؟!

شمیم :- گھر جو تمہارا ہے (نیچے بکھرے ہوئے رسالوں میں سے ایک اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگتا ہے)

جواد :- (جل کر) یہ خوب رہی۔ معاشقہ تم کرو اور ترجمانی کریں ہم۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں کہتا ہوں جو نئی کی چٹ پٹ ہو جائے۔

ذکی :- (گھبرا کر) بھئی اس کا وقت نہیں ہے۔

جواد :- (سنجیدگی سے) پھر کوئی راہ تو نکالو۔

ذکی :- (بے پروائی سے) تم جاؤ، کپڑے بدلتے وقت سوچنا، اور ہم یہاں سوچتے ہیں۔

جواد :- (شمیم کو رسالہ پڑھتے دیکھ کر چڑتے ہوئے) شمیم بھئی، یہ کیا بات ہوئی یہ کوئی رسالے پڑھنے کا وقت ہے ؟!

شمیم :- (بے پروائی سے) ایک مضمون اتفاق سے مطلب کا آگیا ہے۔ شاید اسی سے مشکل حل ہو جائے۔

ذکی :- (تعجب سے) کیا عنوان ہے ؟!

شمیم :- (بغیر نظریں اٹھائے) "لڑکیوں کو مرعوب کرنے کا مجرب طریقہ"

جواد :- (خوش ہو کر) ضرور پڑھو، ممکن ہے کوئی کام کی بات نکل آئے۔

ذکی :- (تنگ آکر) اب ٹل بھی چکو، یا چھ بجیں بجاؤ گے۔ میں تو کہتا ہوں صرف تہمد بدل آؤ۔

جواد :- (جاتے ہوئے) لو بھئی جاتا ہوں ـــــ

(کچھ دیر سکوت رہتا ہے۔ پھر غسلخانے سے جواد کی آواز
گونجتی ہے ـــــ "دیوان علی ـــــ ابے او دیوان علی
صابن تو دے جاؤ ـــــ")

ذکی :- (بے بسی سے) جناب ابھی صابن ہی منگوا رہے ہیں (پھر بآواز بلند) ارے میاں غسلخانے سے نکلو بھی ـــ

(وقفہ) کیوں شمیم، کچھ ملا ـــــ ؟!

شمیم :- (بے پروائی سے) اوں ہوں! ابھی تو کمبخت یہی لکھ رہا ہے کہ بڑے بڑے جری اور دلیر آدمی کیونکر لڑکیوں کے سامنے زبان بندی کے عارضے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ذکی :- (بے پروائی سے) خیر ——

(جواد داخل ہوتا ہے۔ اس نے اب تہمد کی بجائے تولیہ باندھ رکھا ہے)

جواد :- (بال جھٹکتے ہوئے) کہو بھئی ——؟!

ذکی :- (تعجب سے) ابھی تک تولیہ باندھے پھر رہے ہو؟ (التجا کرتے ہوئے) للہ کپڑے بدل آؤ۔

جواد :- (جاتے ہوئے) اچھا ——

(چلا جاتا ہے)

ذکی :- (وقفہ کے بعد) شمیم میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔

شمیم :- (بے پروائی سے لگاتار پڑھتے ہوئے) ہوں ——

ذکی :- کہ شرم کو بالکل پاس نہ آنے دیا جائے۔ جو منہ میں آئے بیدھڑک کہہ ڈالو۔

شمیم :- (جھلا کر) پر کوئی ڈھنگ کی بات بھی تو ہو۔

ذکی :- (بے بسی سے) یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا تو اسی مضمون میں دیکھو —— (پھر بآوازِ بلند) کیوں جواد! فارغ ہو گئے؟!

آواز :- (ساتھ کے کمرے سے) بس آیا، کپڑے بدل رہا ہوں ——

ذکی :- (اسی انداز میں) خدا کے لئے مانگ پٹی زیادہ نہ کرنا۔

آواز :- (بے پروائی سے) نہیں یار، مجھے تو پتلون پہننا بھی عذاب معلوم ہو رہا ہے، تم کہتے ہو مانگ پٹی نہ کرنا۔ آخر کسی نووارد سے ملنا ہو تو کم از کم کپڑے تو قاعدے کے ہوں۔ اور ویسے تو تم جانتے ہو کہ مجھے ان چھوکریوں ووکریوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایمان سے سب تمہارے لئے کر رہا ہوں۔

ذکی :- (ہنستے ہوئے) اے میاں، یہ ہم پر پارسائی کا رعب —— (اوہ کہیں گھڑیال چھ بجاتا ہے) ہائے —— (بے قابو ہو کر) جلدی کرو، یہاں تو رعشہ طاری ہو رہا ہے۔

(جواد کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اس نے کپڑے بدل لئے ہیں)

جواد :- (بے پروائی سے) لو بھئی میں تو تیار ہو گیا —— (دفعۃً شمیم سے) کیوں شمیم؟!

شمیم :- (بغیر نظریں اٹھائے) ابھی تو دیکھ ہی رہا ہوں۔

جواد :- (سنجیدگی سے) جلد جلد پڑھو میاں —— (دفعۃً) بھئی مجھے اس کمرے کی ہیئت پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی —— ذرا روشندان کھول کر دیکھنا چاہیئے۔ شاید فرق پڑ جائے۔

ذکی :- (بے پروائی سے) نہیں یار یہ وقت ——

جواد :- (چھت کی طرف دیکھ کر) سفیدی ادھر سے ——

شمیم :- (یکدم) لو بھئی مل گیا ——!!

جواد :۔ (تعجب سے) کیا ؟!

شمیم :۔ (مسرت سے) " طریقہ " کمبخت نے آخر میں دیا ہے۔

ذکی :۔ (مسرت سے بے قابو ہو کر) پڑھو، پڑھو ———

شمیم :۔ (گلدستہ صاف کر کے) لکھا ہے ———

جواد :۔ (بے قابو ہو کر) بولو بھی ؟!

شمیم :۔ (سنجیدگی سے) لکھا ہے " خواتین سے ملتے وقت اس امر کو خاص طور پر ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے کہ جب ——— "

ذکی :۔ (بے قابو ہو کر) ہاں ہاں ——— ؟!

شمیم :۔ (اسی انداز میں) " کہ جب وہ کمرے میں داخل ہونے لگیں تو مرد تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوں اور اتنی دیر ——— "

جواد :۔ (بے صبر ہو کر) کیا کریں ؟!

شمیم :۔ (جاری رکھتے ہوئے) " کھڑے رہیں جب تک کہ خواتین بیٹھ نہ جائیں ——— "

جواد :۔ (مسرت سے) سبحان اللہ ——— بھئی کیا پتے کی بات کہی ہے ———

شمیم :۔ (پھر پڑھتے ہوئے) " گفتگو کی ابتدا "

ذکی :۔ (بے صبر ہو کر) ہوں، ہوں ؟!

شمیم :۔ (اسی انداز میں) " یوں ہونی چاہیئے ——— "

جواد :۔ (بے صبری سے) کیونکر ؟!

(شمیم خاموش رہتا ہے)

ذکی :۔ (بے صبری سے) اماں بولو بھی ؟!

شمیم :۔ (پژمردگی) آگے بریکٹوں میں لکھا ہے " باقی آئندہ ——— "

جواد :۔ (جھلا کر) لعنۃ اللہ ———

(باہر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی ہے)

ذکی :۔ (گھبرا کر) ارے یہ آواز کیسی ہے ؟!

شمیم :۔ (کھڑکی کی طرف دیکھ کر) ٹانگہ معلوم ہوتا ہے۔

جواد :۔ (تعجب سے) ٹانگہ! ——— (اُٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) ٹھہرو میں کھڑکی میں سے دیکھتا ہوں۔

ذکی :۔ (حیرانی سے) کون ہے ؟!

شمیم :۔ (سہم کر) کہیں ارزانی لنگلا نہ آگیا ہو ———

جواد :۔ (کھڑکی میں سے جھانک کر) دو لڑکیاں اُتری ہیں ———

شمیم :۔ (بے قابو ہو کر) ہائیں لڑکیاں ؟! (ذکی سے) لو بھئی آگئیں ———

ذکی :۔ (اٹھتے ہوئے) مگر انھوں نے تو کہا تھا کہ ہم سائیکلوں پر آئیں گی ؟ !
شمیم :۔ (بے پروائی سے) سائیکلیں پنکچر بھی تو ہو سکتی ہیں۔
جواد :۔ (لگاتار جھانکتے ہوئے) دیوان جی سے کچھ پوچھ رہی ہیں۔ اُن میں سے ایک نے دوسری کے کندھے کا سہارا لے رکھا ہے۔ بیمار معلوم ہوتی ہے ———
ذکی :۔ (کھڑکی کی طرف آتے ہوئے) تم نہیں سمجھتے جواد ——— بڑی چالاک ہیں، اب کوئی نیا ڈھونگ رچایا ہوگا۔
شمیم :۔ (وہیں بیٹھے ہوئے) شرارت تو ان کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔
جواد :۔ (یکدم گھبرا کر) ارے، وہ تو ادھر ہی آ رہی ہیں۔
شمیم :۔ (گھبرا کر) نہیں ———؟ !
جواد :۔ (بغیر اس کی طرف دیکھے) ایمان سے ——— !!
ذکی :۔ (مسرت سے اُچھلتے ہوئے) لے ہے ——— خاصی اچھی ہیں میں تو سمجھا بوڑھی ہوں گی۔
جواد :۔ (سنجیدگی سے) کوڑکڑے مت لگاؤ یار، قالین سے گرد اُڑنی شروع ہو گئی ہے۔
شمیم :۔ (کھڑکی کی طرف آکر جھانکتے ہوئے) بخدا وہی ہیں ———
جواد :۔ (گھبرا کر) شمیم تم اپنے نتھنے چھپانے کے لئے ناک پہ رومال رکھ لو۔ ذکی اپنی آنکھیں نیم وا کر لو ———
ذکی :۔ (جواد سے) یار تم بھی اس بات کا خیال رکھنا کہ تمھارا منہ بلاضرورت نہ کھلے۔
شمیم :۔ (پھر جھانک کر) دیکھو بھائی، ایک نے کس طرح سہارا لے رکھا ہے جیسے بیمار ہی تو ہے۔
ذکی :۔ (سنجیدگی سے) ابھی تم دیکھنا تو سہی، آتے ہی کوئی اور سوانگ بھریں گی۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر :۔ (باآوازِ بلند) میاں صاحب !!
شمیم :۔ (کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر) ارے آہستہ بولا کرو۔ تم سے کتنی بار کہا ہے۔
جواد :۔ (نوکر سے) کیوں کیا بات ہے ؟!
نوکر :۔ (دھیمے لہجے میں) عورتیں ہیں ———
جواد :۔ (غصّے سے) تو کیا ہوا ؟!
نوکر :۔ (اسی انداز میں) کسی ڈاکٹر واکٹر کا پوچھ رہی ہیں۔
شمیم :۔ (ذکی سے) لو صاحب دیکھ لیا ؟ !
جواد :۔ (بے پروائی سے) میاں انھیں اندر بھیج دو۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔
نوکر :۔ (اسی انداز میں) بہتر ———

(چلا جاتا ہے)

ذکی :- (تعجب و سراسیمگی سے) خدا کی قسم یہ لڑکیاں تو بلا کی شریر ہیں۔

جواد :- (بے بسی سے) بھئی میں تو انھیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔

شمیم :- (کھڑکی میں سے جھانک کر) لو آ رہی ہیں ———

جواد :- (یکدم بھاگ کر صوفہ پر بیٹھتے ہوئے) بس اب خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔

شمیم :- (کھڑکی سے ہٹ کر فرش پر بیٹھتے ہوئے) فکر نہ کرو ———

ذکی :- (وقفے کے بعد) تمھارے کان ہل رہے ہیں جواد ———

جواد :- (بے بسی سے) بھئی میں کیا کروں، میرے اختیار میں نہیں ہیں۔ گھبراہٹ میں کمبخت خود بخود ہلنا شروع کر دیتے ہیں۔

شمیم :- (جذبات سے بے قابو ہو کر) توبہ ———

ذکی :- (سینے پر گرتے ہوئے) میرا تو دل دھڑک رہا ہے۔

(دو لڑکیاں داخل ہوتی ہیں۔ دونوں قبول صورت ہیں)

پہلی :- (جھجک کر دروازہ کھولتے ہوئے) ہم اندر آ سکتی ہیں ؟!

جواد :- (صوفے سے فرش پر بیٹھتے ہوئے) بڑے شوق سے !!

پہلی :- (دوسری کو صوفے پر بٹھا کر خود بھی بیٹھتے ہوئے) کیا ڈاکٹر صاحب تشریف رکھتے ہیں ؟!

جواد :- (مسرت سے) آپ ذرا بیٹھ تو لیجئے ———

ذکی :- (شمیم کے کان میں) جواد اچھا چل رہا ہے ———

شمیم :- (بے پروائی سے) ہاں ———

دوسری : (بیمار لہجے میں) آپا ——— آہ ——— میرا بدن تو بخار سے پھنکا جا رہا ہے۔

پہلی :- (تسلی آمیز لہجے میں) ہمت کرو ——— (پھر جواد سے) کیا ڈاکٹر صاحب گھر پر موجود نہیں ؟!

جواد :- (ہنستے ہوئے) جی، ہم انہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

پہلی :- (آہ بھر کر) آپ سب گویا کہ مریض ———

جواد :- (گھبرا کر) جی . . . جی ہاں ——— !!

(کچھ دیر کے لئے سکوت رہتا ہے)

ذکی :- (گاتے ہوئے) ؎ آج کی رات سازِ دلِ پُر درد نہ چھیڑ

پہلی :- (جھلا کر) خدا را گانا بند کیجئے ——— میری بہن کو بھونڈی آوازوں سے خفقان شروع ہو جاتا ہے۔

دوسری :- (پہلی کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے مرتعش لہجے میں) آپا ———

ذکی :- (تعجب سے) مگر آپ نے تو کہا تھا کہ آپ سائیکلوں پر آئیں گی ؟!

پہلی :- (نفرت و حقارت سے) کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ، ہم سائیکلوں پر کس طرح آ سکتی تھیں ؟!

ذکی :- (مسرت کا اظہار کرتے ہوئے) ساڑھیاں تو آپ پہن آئیں - پر یہ لفٹی سینڈل کیوں ——— ؟ (افسردگی سے) میں نے عرض کیا تھا کہ ———

پہلی :- (حقارت سے) بکیے مت ——— !!

دوسری :- (بیمار لہجے میں) آپا، ڈاکٹر صاحب کب آئیں گے ؟ مجھ سے تو اب بیٹھا ———

شمیم :- (جواد کے کان میں) بھئی بڑی شیطان ہے واللہ - ذرا قریب تو دیکھو ———

ذکی :- (صوفہ کے قریب ہو کر) اچھا اب مذاق چھوڑیئے - سچ بتایئے آپ ہمیں ٹیلیفون کیوں کرتی ہیں ؟ !

پہلی :- (نفرت سے) آپ نے بھنگ تو نہیں پی ہے ؟ !

ذکی :- (تنگ آکر) تو کیا بھنگڑ خانے میں شربت بزوری پیتے ہیں ؟

دوسری :- (تنگ آکر) یہ کسی دماغی مرض میں مبتلا ہیں آپا ——— ! !

پہلی :- (بے پروائی سے) میں سب سمجھتی ہوں، بکنے دو ———

جواد :- (آگے بڑھ کر) دیکھیے نا ——— مجھے کم بولنے کی عادت ہے، مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہم سے بہت سی لڑکیاں دلچسپی لیتی ہیں -

ذکی :- (بے قابو ہو کر) یعنی سمجھ لیجیے کئی گوری لڑکیاں ہمارے صدر دروازے کے سامنے چارپائیاں بچھائے حقہ پیتی رہتی ہیں ——— (ہچکچا کر) اے .... سے .. کیا آپ حقہ پئیں گی ؟ !

پہلی :- (جھلا کر) آپ کو شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے ؟ !

ذکی :- (اسی انداز میں) اجی بات یہ ہے کہ مجھے خود اسی کا انتظار ہے - آتی ہی ہو گی -

پہلی :- (غرور سے) آپ دیکھ نہیں رہے ہیں نے عینک لگا رکھی ہے ؟ !

شمیم :- (بے پروائی سے) تو کیا ہوا ؟ !

پہلی :- (سنجیدگی سے) یعنی یہ کہ میں پڑھی لکھی ہوں، کوئی ———

جواد :- (ہنستے ہوئے) چہ خوب ! !

پہلی :- (جواد کی طرف مڑ کر) کیا فرمایا آپ نے ؟ !

دوسری :- (بیمار لہجے میں) آپا، تینوں دیوانے ہیں - ان کے منہ نہ لگو ———

ذکی :- (عالمانہ انداز میں) خاکسار کو علم ہے کہ آپ پڑھی لکھی ہیں - آپ نے "شام و سحر" اور "آہ و واہ" دونوں پڑھی ہیں - غالب کی شرح پڑھی ہے اور اقبال کی شاعری آپ کو پسند نہیں ———

جواد :- (ہنستے ہوئے) مگر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کی شاعری آپ کے ذہن کی رسائی سے بالاتر ہے ! اس کے اشعار عورتوں کے لئے نہیں ہیں -

پہلی :- (جل کر) اور کن کے لئے ہیں ؟ !

جواد :- (عجیب ظالمانہ شان سے) ہم جیسے عالموں کے لئے ———

پہلی :- (حقارت سے) اللہ کی شان ———

جواد :- (پھر ہنستے ہوئے) میں درست کہہ رہا ہوں۔ ایک عورت بھلا صوفیوں کی منازل کے متعلق کیا واقفیت رکھ سکتی ہے
آپ جانتی ہیں فنا فی الشیخ کی منزل کیا ہوتی ہے ؟ !

پہلی :- (حقارت سے) جی نہیں ——— آپ ہی وضاحت کر دیجئے۔

جواد :- (گھبرا کر) یعنی دیکھئے نا ——— آہ ——— فنا فی الشیخ کی منزل گویا کہ بڑی ہی دلچسپ منزل ہے اور اس کی پیچیدگیاں یعنی میں کیا عرض کروں، بہت ہی پیچیدہ ہیں ——— غالباً آپ سمجھ گئی ہوں گی۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔ ع

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن

ویسے میں آپ کی معلومات کے لئے کہہ دوں کہ زندگی فانی ہے، اسی لئے میں گرمیوں میں دوپہر کے وقت لحاف اوڑھ کر سوتا ہوں۔ آپ نے کبھی عمرو بن کلثوم کے اشعار پڑھے ہیں ——— آہا ——— کیا پُرمغز باتیں کہتا ہے۔

ذکی :- (شمیم کے کان میں) کیوں نہ ہو، آخر الیف اے میں پڑھتا ہے۔

جواد :- (جاری رکھتے ہوئے) اب آپ پوچھیں گی کہ شمیم صاحب نے ناک پر رومال کیوں رکھا ہوا ہے، میں کہوں گا انہیں دائمی نزلہ ہے۔ آپ پوچھیں گی ذکی صاحب کی آنکھیں نیم وا کیوں ہیں۔ میں کہوں گا یہ رات کو خواب میں اکثر ڈر جاتے ہیں۔ آپ پوچھیں گی میں کم کیوں بولتا ہوں۔ میں جواباً عرض کروں گا کہ میرے دادا مجذوب تھے
کیا کبھی آپ نے آسمان پر کوؤں کو اُڑتے دیکھا ہے ؟ !

پہلی :- (بے پروائی سے) جی نہیں ———

جواد :- (بے بسی سے) پھر آپ نہیں سمجھ سکتیں کہ چاکلیٹ کا مزا کیسا ہوتا ہے !!

پہلی :- (دوسری سے) تم سچ کہہ رہی تھیں ساجدہ !!

ذکی :- (تعجب سے) ارے آپ کا نام ساجدہ ہے ؟!

دوسری :- (گھبرا کر) جی ہاں ———

ذکی :- (پہلی سے) پھر آپ پروین ہوں گی ؟!

پہلی :- (تعجب سے) جی ؟ !

شمیم :- (مزے لے کر) نسیم ہوں گی ——— !!

پہلی :- (تنگ آ کر) براہِ مہربانی ———

جواد :- (مزے لے کر) نہیں بھئی عارفہ ہوں گی ——— !!

پہلی :- (حقارت سے) میں کہتی ہوں کان مت کھائیے ———

(باہر کی ڈیوڑھی سے سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے)

دوسری :- (مرتعش لہجے میں) ک . . . . کیا ڈاکٹر صاحب آ گئے ؟!

شمیم :- (گھبرا کر) توبہ ہے، منوّر ———

ذکی :- (حقارت سے) پھر آ گیا کمبخت ؟!

جواد :- (گھبرا کر) کہیں اس نے اپنا نظریہ نہ بدل لیا ہو۔

آواز :- (باہر ہی سے) بھئی ———

ذکی :- (بآوازِ بلند) کہو ؟!

آواز :- (باہر ہی سے) میں نے اپنا نظریہ بدل لیا ہے۔

شمیم :- (بے پروائی سے) بڑی دیر لگائی یار !!

ذکی :- (پیچھا چھڑاتے ہوئے) اچھا تم جاؤ، ہم کل سُن لیں گے ———

آواز :- (باہر ہی سے) میں ابھی سُنائے دیتا ہوں، مجھے جلدی نہیں ہے۔

جواد :- (بے بسی سے) توبہ ہے بھئی ———

آواز :- (باہر ہی سے) میں نانی اماں کے ہاں جا رہا تھا۔ دریا کے قریب پہنچا تو مجھے ایک دوست مل گیا (فاتحانہ انداز میں) وہ قد میں مجھ سے بھی ایک فٹ چھوٹا ہے ———

شمیم :- (بے پروائی سے) ہو گا ———

آواز :- (باہر ہی سے) اس کے ساتھ ایک سات فٹ کی لڑکی تھی۔ اس کے گھٹنے سے سر لگا کے وہ کہہ رہا تھا۔ جانم میں زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔ اگر تم نے مجھ پر ترس نہ کھایا تو میں دریا میں کود پڑوں گا ———

ذکی :- (تعجب سے) کہو بھئی کہیں یہ تمہارا تیرک دوست افتخار تو نہیں ؟!

آواز :- (باہر ہی سے) ہاں وہی ——— تو وہ بیچاری جذبۂ کرم سے متاثر ہو کے آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور اسے گود میں اُٹھا کر ماتھے کا بوسہ لے لیا۔

شمیم :- (تعجب سے) اماں نہیں ——— ؟!

آواز :- (باہر ہی سے) قسم ہے اللہ پاک کی ——— سو اب میں باغی ہو گیا ہوں ——— میں نے قنوطیت کے خلاف بغاوت کر دی ہے ——— ایمان سے کہتا ہوں میں باغی ہوں ———

جواد :- (ڈرتے ڈرتے) آہستہ بولو یار کوئی پکڑ لے گا !!

آواز :- (باہر ہی سے) میں باغی ہوں ——— میں باغی ہوں ——— میں باغی ہوں ———

(چلا جاتا ہے)

پہلی :- (نفرت سے پوچھتے ہوئے) یہ ٹھینگنے صاحب کی تعریف ؟!

جواد :- (مسرت سے) ہمارے ایک دوست ہیں۔

شمیم :- (بے پروائی سے) فلسفہ کے طالب علم ہیں ——

ذکی :- (سنجیدگی سے) پر فٹ بال بہت اچھا کھیلتے ہیں۔

دوسری :- (تنگ آکر) آپا میری تو طبیعت گھبرا رہی ہے، ڈاکٹر صاحب کس وقت آئیں گے ؟!

پہلی :- (جواد سے کرختگی سے) بتائیے ڈاکٹر صاحب کہاں گئے ہیں ؟!

ذکی :- (التجا کرتے ہوئے) ایمان سے مذاق چھوڑیئے، کسی وقت سنجیدہ بھی ہو جایا کیجئے —— ۔۔

پہلی :- (نفرت سے) میں کہتی ہوں آپ ——

ذکی :- (بغیر دھیان دیئے) اللہ قسم آپکے ٹیلیفونوں نے میری بری گت بنائی ہے۔ آپ معاملے کی نزاکت کو ابھی تک سمجھی نہیں سب چھوٹے بڑے مجھے شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

پہلی :- (غصہ سے) آپ مجھے بتائیں گے یا نہیں ؟!

شمیم :- (جواد کے کان میں) بنا رہی ہیں !!

جواد :- (شمیم کے کان میں) بھئی کمبخت بڑی ——

ذکی :- (جاری رکھتے ہوئے) ابھی تو چچا میاں موجود نہیں تھے۔ وہ پچھلے مہینے سے شکار پر گئے ہوئے ہیں ورنہ ——

جواد :- (یکدم بے قابو ہو کر) اخاہ —— شکار ؟ کیا بات ہے شکار کی —— (آہستہ سے شمیم کے کان میں) مجھے کسی نے بتایا ہے کہ لڑکیوں سے اگر شکار کی باتیں کی جائیں تو پھنس جاتی ہیں ——

پہلی :- (جھلا کر) میں کہتی ہوں ——

جواد :- (بغیر پروا کئے) شکار —— کبھی آپ نے شیر کا شکار کیا ہے ؟!

پہلی :- (منت کرتے ہوئے) خدا کے لئے آپ خاموش رہیئے ——

جواد :- (اسی انداز میں) شیر کا شکار —— یعنی ایک مرتبہ میں تنہا سی۔ پی کے جنگلوں میں شیر کے شکار کو نکل گیا۔

شمیم :- (جواد کے کان میں) ارے ریاض کے سنائے ہوئے قصے اپنے ساتھ ٹانک رہے ہو ؟!

جواد :- (شمیم کے کان میں) چلنے دو، ہاں تو ——

ذکی :- (سنجیدگی سے) ایمان سے آپ ہمیں سمجھی نہیں —— ہم میں سے کوئی بھی پاگل نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلا ——

پہلی :- (تنگ آکر) وہ تو ظاہر ہی ہے۔

جواد :- تو جناب ایک دفعہ میں اتفاق سے اکیلا جنگل میں نکل گیا۔ جنگل میں بڑی چہل پہل تھی۔ گیدڑ مختلف جگہوں پر خوانچے لگائے بیٹھے تھے۔ بندر، چیتے، ہاتھی، بھینسے سبھی جھولا جھول رہے تھے۔ ایک طرف لومڑیاں شلواریں پہنے پھر رہی تھیں۔ میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے لکڑ بگڑ سے پوچھا "کہو بھئی، بات کیا ہے ؟ بڑی رونقیں ہیں ؟ بڑے تعجب سے بولا۔ "کیا آپ کو خبر نہیں، ہمارے حضرت بادشاہ سلامت، شہنشاہ شیر ببر کے ہاں اس ضعیفی کی عمر میں بڑی منتوں اور آرزوؤں

کے بعد والی بہار پیدا ہوا ہے"۔ میں آگے نکل گیا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے مسند پر سفید براق چاندنی کا فرش لگا ہے اور شبیر صاحب گاؤ تکیہ کا سہارا لیے، عینک لگائے، رباعیات عمر خیام پڑھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے بڑے تپاک سے ملے۔ اور اپنے ساتھ مسند پر بٹھایا۔ ہاتھ وانھ دھلوائے طعام سے فارغ ہونے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں چھڑ گئیں پوچھنے لگے "آپ کی بندوق کس بور کی ہے ؟" میں نے عرض کیا کہ جی بارہ بور کی ہے کہنے لگے "اس سے تو صرف بٹیروں کا شکار ہو سکتا ہے آپ یہاں کس ارادے سے آئے ہیں ؟" میں نے ہاتھ باندھ کر کہا کہ اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ بولے "کہو" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ آپ کے شکار کی خاطر وہ نہایت سنجیدگی سے اُٹھے۔ میرا ہاتھ پکڑا اور قریب کے خیمے میں لے گئے۔ پھر اپنی چھاتی پر سے بال ہٹاتے ہوئے کہنے لگے "یہ جان حاضر ہے۔ شست باندھیے" میں بہت نادم ہوا اُن کے قدموں پر گر پڑا اور روتے ہوئے کہا "واللہ اس حاتم طائی کی قسم کا شبیر ببر آج تک نہ دیکھا نہ سنا" پھر ———

دوسری :- (بے قابو ہو کر) آپا، انھیں چپ کراؤ۔ ان کی بکواس اب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے۔

پہلی :- (بے بسی سے) خدارا ڈاکٹر صاحب ———

ذکی :- (آگے بڑھ کر) پہلے آپ بتائیے، آپ نے ٹیلیفون پر ملنے کو کہا تھا یا نہیں ؟!

پہلی :- (ہار کر) جی، کہا تھا مگر ———

ذکی :- (مسرت سے بے قابو ہو کر) اخاہ۔ مان گئیں۔

شمیم :- (مزے لے کر) سبحان اللہ ———

ذکی :- (ہاتھ جوڑ کر) ایمان سے میں زندگی سے بالکل بیزار ہوں۔

پہلی :- (بھرائی ہوئی آواز میں) تو پھر ہم کیا کریں ؟!

جواد :- (ہنسی آمیز لہجے میں) تجاہل، تغافل تو ہو چکا ——— اب یہی تبسم تکلم اور کیا ———

دوسری :- (پہلی کے کان میں) آپا میرا تو خیال ہے ہمیں غلطی ہوئی ہے۔

پہلی :- (دوسری کے کان میں) غلطی ؟! وہ کیونکر ——— ؟!

دوسری :- (کھانے کے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھ کر) یہ ڈاکٹر صاحب کا گھر معلوم نہیں ہوتا۔

شمیم :- (جواد کے کان میں) ارے جواد ——— خدا کی قسم وہ کھانے والے کمرے کی جانب دیکھ رہی ہیں۔

جواد :- (دانت پیستے ہوئے) میں نے اس بدبخت دیوان علی سے کہا بھی تھا کہ دروازہ بھیڑتے جانا۔

پہلی :- (دوسری کے کان میں) ڈاکٹر صاحب کا گھر نہیں ؟! وہ کیسے ؟!

دوسری :- (دروازے کی طرف اشارہ کر کے) دیکھو نا، سامنے کھانے کی میز پر بوٹ رکھے ہیں۔ مجھے تو یہ کوئی بورڈنگ ہاؤس معلوم ہوتا ہے۔

پہلی :- (جواد سے غصہ میں) کیوں صاحب، کیا یہ بورڈنگ ہاؤس ہے ؟!

جواد :- (بچوں کی طرح) جی نہیں ——— یہاں تو لڑکے رہتے ہیں۔

دوسری :- (چیخ کر) اوئی میرے اللہ ——— کہاں آ پھنسیں ———

پہلی :- (جرأت سے) میں آپ سے پوچھتی ہوں کیا یہ ڈاکٹر ظہیر الدین کا گھر نہیں ہے ؟!

ذکی :- (لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے) کون سے ظہیر الدین ؟!

شمیم :- (سر کھجلاتے ہوئے) اپنے وہی بابر تو نہیں ؟!

ذکی :- (تعجب سے) کون سے بابر، ہمایوں ؟!

جواد :- (بے پروائی سے) اماں وہی ہمایوں کے ابا ———!

پہلی :- (اسی انداز میں) اس گھر کا نمبر کیا ہے ؟!

جواد :- (ملازموں کی طرح) جی، پونے آٹھ ———

پہلی :- (جھلا کر) آہ مگر آپ کے دروازے پر تو آٹھ لکھا ہوا ہے ؟!

ذکی :- (بے پروائی سے) ممکن ہے کسی نے شرارت سے لکھ دیا ہو۔

شمیم :- (عیاشوں کی طرح) تو کیا ہوا۔ نمبروں سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔

پہلی :- (غصے میں) آپ کو ہم سے دل لگی کرتے شرم آنی چاہیئے۔ بڑے بدمعاش ہیں آپ۔

شمیم :- (تعجب سے) بدمعاش اور ہم ؟ کیوں بھئی، یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں ؟!!

پہلی :- (بے پروائی سے) ہمیں ڈاکٹر ظہیر الدین کے ہاں جانا ہے۔

جواد :- (گھبرا کر) لاحول ولا قوۃ۔ آپ نے پہلے کیوں نہ کہا۔ وہ تو ساتھ کے مکان میں رہتے ہیں۔

دوسری :- (اٹھتے ہوئے) اٹھو آپا، میں کہہ رہی تھی یہ کوئی ———

جواد :- (لجاجت سے) میں معافی چاہتا ہوں، ہمیں ———

پہلی :- (بے قابو ہو کر) بکیے مت ———!

جواد :- (سر نیچے کر کے) بہت خوب۔

پہلی :- (شمیم کی طرف دیکھ کر) میں آپ لوگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔

شمیم :- (سر نیچے کر کے) بہت خوب۔

پہلی :- (جل بھن کر) دیکھئے نہیں ہے میرے ساتھ بیمار بہن ہے۔ ورنہ ابھی پولیس میں رپٹ لکھوا دیتی۔ آپ کو ہمیں اندر بلانے کی جرأت کیسے ہوئی۔

جواد : (بھرائی ہوئی آواز میں) بولو ذکی، تمہی نہیں پہنچے تھے۔

ذکی :- (ہچکچاتے ہوئے) واہ، انھوں نے خود ہی تو ٹیلیفون پر کہا تھا۔

پہلی :- (حقارت سے) ٹیلیفون پر کہا تھا ؟ کس نامعقول نے آپ سے ٹیلیفون پر کہا تھا ؟!!

ذکی:- (اسی انداز میں) آپ ہی تو تھیں۔

دوسری:- (بیمار لہجے میں) چلو آپا میری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔

جواد:- (سنجیدگی سے) جائیے جائیے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔

پہلی:- (غصے میں) بکیے مت۔ میں ابھی ——

شمیم:- (گھبرا کر) ذکی بھائی، بات کرو نا اب؟!

ذکی:- (گھبرائی ہوئی آواز میں) یار، میں کیا بات کروں؟!

پہلی:- (غصے سے بے قابو ہو کر) کمینے کہیں کے، ناہنجار —— غضب خدا کا کمبختوں کو اتنا خیال نہیں کہ بیمار ساتھ ہے اور انھیں عشق وشق کی سوجھ رہی ہے۔ کلموہے کہیں کے، نامراد ——

دوسری:- (دروازے کی طرف دھکیل کر) چلو آپا، باہر تو نکلو ——

(دونوں لڑکیاں چلی جاتی ہیں)

ذکی:- (اطمینان کی سانس لیکر) ایک دن کے لئے کافی خطاب ہیں۔

شمیم:- (بے پروائی سے) میں تو کہتا ہوں شکر کرو بچ گئے۔

جواد:- ذکی یار، بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم ابھی تک بالکل ناسمجھ ہو۔

(ڈیوڑھی میں سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے)

شمیم:- (بے پروائی سے) غالباً منوّر پھر آیا ہے ——

(دروازے کے قریب سسکیاں بھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

ذکی:- (چونک کر) ارے، یہ رو کون رہا ہے؟!

شمیم:- (آگے بڑھ کر جھانکتے ہوئے) منوّر ——

جواد:- (نہ مانتے ہوئے) نہیں؟!!

(دروازہ کھلتا ہے اور منوّر روتے ہوئے داخل ہوتا ہے۔
منوّر ایک پست قد گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان ہے جس کے
ابرو ہمیشہ حقارت سے تنے رہتے ہیں اور جس کی ناک
ہمیشہ نفرت سے چڑھی رہتی ہے کبھی کبھی اس کی
نگاہوں میں گوریلوں جیسی چمک نظر آتی ہے)

ذکی:- (پیار سے پوچھتے ہوئے) کیوں بھئی، خیریت تو ہے؟!

شمیم:- (مخاطب ہوتے ہوئے) منوّر ——؟!

جواد:- (تعجب و سراسیمگی سے) آخر بات کیا ہے؟!

منوّر:۔ (روتے ہوئے) کچھ نہیں کچھ ——

ذکی:۔ (اصرار کرتے ہوئے) نہیں، کچھ تو ضرور ہے۔

جواد:۔ (التجا کرتے ہوئے) بتاؤ تو سہی ہم کوئی غیر تھوڑی ہیں؟!

شمیم:۔ (تسلی دیتے ہوئے) کہو، گھبراؤ نہیں ——

منوّر:۔ (روتے ہوئے) میں بحیثیت ایک باغی کے سائیکل پر اُڑا جا رہا تھا کہ رستہ میں مجھے ایک عورت نظر آئی پیچھے سے جوان معلوم ہوتی تھی۔ بیچاری پسینہ میں بُری طرح شرابور تھی۔ نہ جانے کہاں سے پیدل چلی آ رہی تھی۔ مجھے بڑا ترس آیا۔ پوچھ بیٹھا۔ آپ اتنی دھوپ میں پیدل چل رہی ہیں تانگہ میں کیوں نہیں بیٹھ جاتیں؟ بولی۔ "بیٹا اگر تمھیں کوئی تانگہ مل جائے تو مجھے بٹھا دو ——" (جذبات سے بے قابو ہو کر زور زور سے روتے ہوئے) جب میں نے یہ سُنا تو وہیں سے واپس آ گیا ——

جواد:۔ (تعجب سے) کیوں؟!

منوّر:۔ (اسی انداز میں روتے ہوئے) اس کی عمر ساٹھ سال سے اُوپر تھی۔

شمیم:۔ (تعجب سے) مگر تم تو اپنی نانی اماں کے ہاں ریڈیو سُننے جا رہے تھے؟!

منوّر:۔ (حقارت سے چیخ کر) نہیں، میں اب نانی اماں کے ہاں ریڈیو سُننے کبھی نہیں جاؤں گا —— ہاں ——

ذکی:۔ (حیرانی سے) اور تمھارے ماموں؟!

منوّر:۔ (ہچکیاں بھرتے ہوئے) میں اپنے عرب والے ماموں سے بھی نہیں ملوں گا —— ہاں ——

جواد:۔ (بے پروائی سے) چلو نہ سہی —— مگر مونچھوں سے یہ آنسو تو پونچھ ڈالو ——

منوّر:۔ (رومال سے ناک صاف کر کے) جواد؟!

جواد:۔ (پیار سے) کہو کہو؟!

منوّر:۔ (روتے ہوئے) مجھے ایک دھوتی اور بنیان مل جائے گی؟!

جواد:۔ (تسلی آمیز لہجے میں) ضرور۔

منوّر:۔ (قدرے سنبھل کر) اور تنہا کمرہ بھی؟!

جواد:۔ (اسی انداز میں) کیوں نہیں ——

ذکی:۔ (پیار بھرے لہجے میں) مگر منوّر میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس وقت تنہائی کے خواہشمند کیوں ہو؟!

منوّر:۔ (پھر روتے ہوئے) میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔

شمیم:۔ (تعجب اور پیار سے) کیا؟! ایمان سے، ہمیں بھی بتاؤ؟!!

منوّر:۔ (وقفہ بعد) میں سوچنا چاہتا ہوں کہ اس وقت مجھے کیا سوچنا چاہیئے ——

ذکی:۔ (بے قابو ہو کر) بھئی اللہ قسم یہی اس وقت ہم بھی سوچنا چاہتے ہیں۔

جواد :- (تسلی آمیز لہجے میں) اگر ہم چاروں اسی کمرے کے کونوں میں پڑ کر سوجیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا منوّر -؟!

منوّر :- (بھرائی آواز میں) نہیں ——

جواد :- (نوکر کو پکارتے ہوئے) دیوان علی ——!!

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر :- (باآواز بلند) جی صاحب !!

شمیم :- (تنگ آکر) ارے آہستہ بولا کرو، تم سے کئی بار کہا ہے ۔

جواد :- (بے پروائی سے) ذکی اور شمیم صاحب کی تکیئیں، میرے اور بخاری صاحب کے تہمد لے آؤ ——

نوکر :- (جاتے ہوئے) بہتر ——

(چلا جاتا ہے)

شمیم :- (جماہی لیکر) اس صوفے کو پرے سرکا دو، لیٹنے کے لئے تھوڑی جگہ تو ہو جائے ۔

ذکی :- (لیٹتے ہوئے) دو چار تکئے بھی منگوا لینا یار ——

—— پردہ ——

تعبیر طلب

شوکت تھانوی

مجھے اس وقت جو غصہ آ رہا تھا یہ غصہ کی وہ قسم ہے جس کا تجزیہ کرنے کی ہمیشہ کوشش کی اور کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ یہ غصہ اتفاقات کی غلطت پہ آتا ہے یا اپنی بیچارگی پر۔ اور ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ میں ان لوگوں کو نہایت احمق سمجھتا ہوں جو اس قسم کے موقعوں پر بھی نہ مشتعل ہوتے ہیں، نہ جھنجھلاتے ہیں بلکہ حسب معمول میٹھی میٹھی مسکراہٹ اپنے لبوں پر لیے بیٹھے رہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ٹینس کھیلنے کے لیے جب سفید پتلون پہن چکے۔ سفید جوتے کے تسمے کس چکے اور ریکٹ ہاتھ میں لے کر باہر جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ تمام پروگرام پر پانی پھر گیا۔ کپڑے بدلے، ریکٹ کو پریس میں کس دیا اور طے کیا کہ چلو آج اپنی لائبریری میں یہ خوشگوار موسم بسر کریں گے۔ سگریٹ کا ڈبہ لیا، پڑھنے کی عینک اٹھائی اور لائبریری میں پہنچ گئے۔ جہاں چاروں طرف الماریوں میں ان مصنفین کی کتابیں چنی ہوئی تھیں جن سے کچھ نہ کچھ عقیدت رہ چکی ہے۔ ابھی یہ طے نہ کیا تھا کہ اس وقت کس مصنف سے شرف نیاز حاصل کیا جائے کہ ایک دم بجلی غائب۔ میرے نزدیک تو اس قسم کے موقعوں پر غصہ نہ آنا اگر حلم ہے تو یہ حلم یقیناً کوئی بیماری ہے۔ جس کا علاج کرانا چاہیے۔ کتنا اچھا موسم تھا کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں۔ کیا لطف آتا ہے اس وقت مطالعے میں، مگر ابر آلود فلک کج رفتار سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔ اب اندھیرے میں ہم بے وقوف بنے بیٹھے ہیں اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کریں تو کیا کریں۔ کچھ دیر روشنی آنے کا انتظار کیا۔ پھر مایوس ہو کر آرام کرسی پر لیٹ گئے۔ مگر نگاہیں اس اندھیرے میں بھی اسی طرف تھیں جہاں وہ بلب لٹک رہا تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے جگمگا رہا تھا۔ گویا اگر اس طرف سے نگاہ ہٹ گئی تو روشنی آ کر واپس چلی جائے گی۔ کہ میں کیوں آؤں جب کہ تم میرے منتظر ہی نہیں ہو ــــ معلوم نہیں کتنی دیر اسی طرح گم رہے کہ یکایک خس کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو میں لپٹی ہوئی ایک باوقار آواز آئی:۔

"آداب!"

سامنے ایک خاتونِ محترم لباس کی ترتیب اور رنگوں کے امتزاج میں پورا سلیقہ لیے کھڑی تھیں۔ میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور رعب دار خاتون کو تعظیم دیتے ہوئے پوچھا "کس کی تلاش ہے آپ کو؟"

خاتونِ محترم نے اپنی سنجیدگی میں ایک چھوٹا سا تبسم حل کرتے ہوئے فرمایا "عجیب!"

میں کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد عرض کرنے ہی والا تھا کہ محترمہ! تخلص عجیب نہیں ہے، کہ وہ خود بول اٹھیں "عجیب بات ہے آپ کی لائبریری میں میری کتابیں موجود ہیں اور آپ مجھ کو جانتے نہیں۔ کاش تذکرہ نگار میرے ساتھ ہوتے یا کم از کم نوناش ہی ساتھ ہوتی کہ تعارف کی رسم تو ادا ہو جاتی۔"

عرض کیا: "پڑھنے کے لیے!"

کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ علی الحساب عرض کر دیا: "دلچسپی جو ہوتی ہے پڑھ کر!"

وہ سوال کرنے پر تُلی ہوئی تھیں: "کیا دلچسپی ہوتی ہے؟"

عرض کیا: "یہی کہ —— گویا —— میرا مطلب یہ ہے کہ خوب ہوتی ہیں آپ کی تصانیف!"

مگر وہ بخشنے والی نہ تھیں: "کس اعتبار سے؟"

عرض کیا: "ہر اعتبار سے!"

کہنے لگیں: "مثلاً جغرافیائی اعتبار سے ——"

گھبرا کر کہہ دیا: "جی اور کیا ——"

وہ اپنے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے بولیں: "میں اپنی سب کتابیں واپس لے جانا چاہتی ہوں۔ آپ فی الحال ڈرمی ٹرس کھیلا کیجیے۔ اور دانستہ چور بن جایا کیجیے۔ اس سے آپ کے احساس میں بالیدگی پیدا ہوگی۔ کتاب بینی کا شوق ابھی قبل از وقت ہے۔ جی بچے تو پڑھنے کو عمر پڑی ہے۔ غذا کا خاص خیال رکھیے۔ صبح ناشتے میں ڈھائی چھٹانک کچی گاجریں، تین اونس لیموں کا رس، تین ٹماٹر اور سات مونگ پھلیاں —— کھانے میں سیب کا بھرتہ ——"

میں سیب کے بھرتے کی ترکیب پوچھنے والا ہی تھا کہ وہ غائب اور الماری سے ان کی تصانیف بھی غائب۔

میں بے تحاشہ اس دریچے کی طرف۔ دوڑا جو روسی یا فرانسیسی تو درکنار غالباً پاکستانی بھی نہ تھا۔ مگر ابھی جھانک ہی رہا تھا۔ کہ ایک نو وارد کی آواز نے چونکا دیا۔

"السلام علیکم!"

دوہرے جسم کے ایک صاحب عینک لگائے، پان کھائے، ہاتھ میں ڈبیہ بٹوہ دبائے موجود تھے۔ میں نے رسماً کہا: "وعلیکم السلام!"

وہ صاحب بغیر کسی رسمی تعارف کے بولے: "صحیفۂ اوستا اور شریعتِ زردشت میں عورت کے حفظ و ناموس کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ قدیم ایرانیوں میں عورت کے حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن دونوں کے لیے کچھ اصول علمِ فراست اور قیافہ کے لحاظ سے مقرر تھے ——"

مرعوب ہو کر عرض کیا: "درست فرماتے ہیں حضور —— مگر جناب کی تعریف؟"

وہ بدستور حاکمانہ انداز سے بولے: "آپ کے دھانے کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی راز کو چھپانے کے اہل نہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ شیریں (فرہاد کی محبوبہ) چالیس صفاتِ جمال میں سے اتالیس پر حاوی تھی، دھانہ کی ساخت کی وجہ سے رازداری کی اہل نہ تھی۔ مگر حسن و اخلاق اور وفاداری کے اعتبار سے وہ بھی اس قدر بلند مرتبہ تھی کہ جب اس کا شوہر خسرو پرویز قتل کیا گیا اور شیرویہ فرماں روا ہوا تو اس نے خودکشی سے پہلے اپنے بال کھول دیئے۔ نازک نازک ہاتھوں سے نازک سینہ پر خانہ برانداز قسم کی ضربیں لگاتے لگاتے تھک کر خستہ ہو کر آغوشِ طلب انداز میں گری۔ مگر شیرویہ کے ساتھ رشتۂ ازدواج منظور نہ کیا ——"

عرض کیا: "اور فرہاد اس زمانے میں کہاں تھا؟"

بے پروائی سے بولے وہ —— "سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا۔"

عاجزی سے عرض کیا: "میں اپنے دھانے کی ساخت کے باوجود آپ کے نام کو راز میں رکھنے کی کوشش کروں گا۔"

ایک تہ کیا ہوا پان کھا کر چھالیہ پھانکتے ہوئے بولے "ایک جھوٹے وعدے سے زیر بار کرنے کے لیے اپنا نام بتائے دیتا ہوں۔ نیاز ——"

میں نے چونک کر کہا: "نیاز —— مولانا نیاز —— نیاز فتحپوری —— شہاب کی سرگذشت —— کیوپڈ اور سائیکی ——"

نیاز صاحب نے میرا سلسلہ کلام منقطع کرتے ہوئے کہا: "آپ نگار کے خریدار ہیں؟"

عرض کیا: "تھا تو مگر اب نہیں ہوں۔"

وہ بُرا مانے بغیر بولے: "فراست ابد سے آپ کے پاس؟"

عرض کیا: "تھی مگر میرے ہاتھ کی لکیریں اس میں نہ نکلیں، لہذا بیچ ڈالی۔"

کہنے لگے "شہوانیات؟"

عرض کیا: "بچے پڑھا کرتے تھے اسے کہیں گم کر دی۔"

مولانا نے فرمایا: "نگارستان اور تاملات نیاز بھی آپ کے کتب خانہ میں رہنا چاہیئے۔ میں اپنا شمار آئینہ فروشانِ شہر کوراں میں کرانا نہیں چاہتا۔"

اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مڑے۔ چھتری کے دستے سے اپنی کتابیں الماری سے نکالیں اور قبل اس کے کہ میں معذرت کروں وہ تیزی سے نکل گئے۔ میں دروازے تک ان کے پیچھے پیچھے گیا تاکہ نگار کا چندہ دے کر راضی کر لوں۔ مگر قبل اس کے کہ میں ان کو آواز دیتا، کسی نے مجھ کو آواز دی:-

"مسٹر —— اے جناب ——"

گھوم کر دیکھا۔ ایک سروقد اُلجھے بالوں والی ایسی خاتون کھڑی تھیں جو اپنے چہرے کی ساخت میں مسکراہٹ لیے تھیں۔ میں نے گردن کے خم سے ان کو تعظیم دی۔ وہ اپنے اُلجھے ہوئے بالوں کے گرداب حرکت میں لا کر بولیں "میں نے آپ کو پروفیسر رادھا کمل مکرجی کے باغ کے اس خناک قطعے میں غالباً دیکھا ہے جہاں سنبل پائیاں بچھائی جاتی تھیں اور ادما پنچال نگارام کے بھجن گاتی تھی۔"

میں نے چوندھیا کر عرض کیا: "آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہو رہی ہے؟"

خاتونِ محترم بولیں: "آپ کو برانکائیٹس کی شکایت تو نہیں ہے؟"

عرض کیا: "جی بالکل نہیں۔"

خاتونِ محترم نے وثوق سے حکم دے دیا "پھر تو اپنڈی سائیٹس کا ہونا ضروری ہے یہی شکایت ڈوپی کو ہو گئی تھی۔ وہ ایک مذہبی خدا ترس بلی ہے جو برابر اداس رہتی ہے۔"

میں نے گھبرا کر پوچھا: "خدا کے لیے بتا دیجیئے آپ قرۃ العین حیدر تو نہیں؟"

وہ بولیں: "ہوں تو سہی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ترائی کا وہ اسٹیشن میرے ذہن سے نہ نکل سکے گا جہاں منہ اندھیرے ایک لڑکا کھڑکی میں سے سر داخل کر کے کہتا ہے "پھلینڈے لیجیئے گا مس بابا؟" اور نارائن مالی جس کے گھر کے آنگن میں ہم بیٹھ کر امرود کھاتے تھے۔ میرا خدا جو مجھے ٹھنڈے

خاموش پانیوں کے کنارے کنارے سے جانا ہے۔ سینٹ کولمبا اگر مجھے میرا داغ واپس مل گیا تو میں تمہارے سامنے چار شمعیں جلاؤں گی"

میں نے ہمدردی سے کہا "اللہ نے چاہا تو ضرور واپس مل جائے گا۔ ع نہ ہو اس سے مایوس امیدوار ——"

وہ اچانک بولیں "آپ کے پاس میرے بھی 'صنم خانے' ہے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں!"

وہ خوش ہو کر کہنے لگیں "اسی میں ہے ——— میرا داغ اسی میں ہے۔ گاڈ میرے دوست اس خوشی میں اولڈ لانگ زائن گاؤں۔ بلکہ تھمبیلینا میں پکسی کو ملاؤں۔ گڈ اولڈ پکسی ——— خدا کرے اس نے شادی کر لی ہو۔ اب اس کے سارے پرابلم حل ہو جائیں گے۔ اور دنیا مجھے اب یقیناً ACCEPT کرے گی۔

میں بے وقوفوں کی طرح ان محترمہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ تیزی سے الماری کی طرف گئیں اور میرے بھی 'صنم خانے' کی جلد نکال کر خوشی سے اچھل کر بولیں "تھینکس اے لوٹ ——— گڈ نائٹ ——— اب میں اپنے سنٹر کو لوٹ جاؤں گی اور سینڈوچ کا ناشتہ کر کے سو جاؤں گی ——— گڈ ——— نائٹ ———"

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ 'وعلیکم السلام' کی طرح 'گڈ نائٹ' کا جواب کیا ہے اور وہ ایک طرف کو مڑ کر غائب ہو گئیں۔ شکر ہے کہ اسی وقت ایک مانوس آواز کان میں آئی "ارے مجھے سلام کرو تاکہ میں کہوں 'علیکم السلام'!"

میں نے گھبرا کر کہا "السلام علیکم۔"

اور اب جو مڑ کے دیکھا تو چوگوشیہ سبز مخمل کی ٹوپی۔ لمبا سا کرتا، کرتے پر صدری اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنے ایک کاکل دراز بزرگ نہایت ذہانت سے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ مجھ کو حیران دیکھ کر نہایت مٹھاس سے بولے "وعلیکم السلام۔ اور اب سنو میری بات کہ دوسروں کے عیب دیکھو تو پہلے اپنے عیبوں کا تصور بھی کر لیا کرو۔ ایسا کرو گے تو ندامت تم کو عیبوں اور گناہوں سے بچائے گی اور خدا تم پر رحم کرے گا۔ اور جب خدا کسی بندے پر رحمت کی نظر ڈالتا ہے تو وہ آدمی دل کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ پس میں دل کا بادشاہ بن گیا ہوں اور تم سب کو بھی دل کی بادشاہی تقسیم کرتا ہوں کہ تم بھی میری طرح اپنے گناہوں کو یاد کرو اور خدا سے توبہ کرو اور خدا سے کہو کہ 'اے خدا تو بھی مسلمان ہو جا'۔"

میں نے ان بزرگ محترم کے تقدس سے دل ہی دل میں لرز کر کہا "حضور تشریف تو رکھیں تاکہ میں شربت یا آئس کریم کوئی چیز پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکوں۔"

بزرگ محترم نے خندہ پیشانی سے فرمایا "آج میری چھوٹی لڑکی کوثر بانو نے آئس کریم بنائی تھی میں خواجہ محل کے بالاخانے پر بیٹھا کام کر رہا تھا کہ وہ پستہ آئس کریم لے کر آئے۔ میں نے کہا بیٹا اس سے مجھے خون آ جاتا ہے میں نہیں کھاتا۔ وہ چلے گئے تو حسن ابو طالب نے آ کر کہا کہ کوثر کی دل شکنی ہوئی، چکھ لیجئے۔ میں نے پوری طشتری صاف کر دی اور کہا۔ ہرچہ بادا باد من در شکم برف انداختم ——"

میں نے خوش ہو کر کہا "میں آپ کو پہچان گیا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی۔"

خواجہ صاحب نے فرمایا "آپ تو مجھے اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے عید کا چاند ہوں اور جیسے آپ کہنے ہی والے ہیں ہیلو مائی ڈیئر عید کریسنٹ!"

میں نے عقیدت سے کہا "آپ کی تصانیف نے آپ سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ مجھے واقعی آپ سے مل کر اتنی ہی خوشی ہونا چاہئے

خواجہ صاحب نے فرمایا "اگر میں آپ کی خوشی کا بہانہ بن گیا ہوں تو اپنے کو مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں ورنہ خوش اعمال لوگ تو خوش رہتے ہی ہیں ـــــ"

میں نے عرض کیا "نہیں خواجہ صاحب میرے دل میں آپ کی قدر و منزلت کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ بلا کے سخت کوش ہیں"

خواجہ صاحب بولے "ڈاکٹر کہتے ہیں، حکیم کہتے ہیں، تجربہ کار دوست کہتے ہیں، خواجہ بانو کہتی ہیں، کشفی شاہ کہتے ہیں اور خود میرا دل بھی کہتا ہے کہ دماغی محنت کی کثرت ان بیماریوں کی بنیاد ہے۔ لیکن اگر میں کام ترک کر دوں تو کام بھی مجھے ترک کر دے گا۔"

میں نے کہا "خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی خواجہ صاحب۔ مگر مجھے ایک بات پوچھ لینے دیجیے کہ کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ نے جارج برنارڈ شا کا فاتحہ کرایا تھا؟"

خواجہ صاحب نے ہنس کر کہا "اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میجر جنرل ڈکسن نظامی کی وفات کے بعد میں نے مسٹر جارج برنارڈ شا کا ایک اعلان اخباروں میں پڑھا کہ آئندہ ساری دنیا میں مذہب اسلام ہوگا۔ میرا عقیدہ ہے کہ جارج برنارڈ شا چشتی نظامی تھے۔"

میں نے حیرت سے کہا "جی کیا فرمایا ـــ جارج برنارڈ شا اور چشتی نظامی؟"

خواجہ صاحب نے فرمایا "جی ہاں ـــ میں نے اپنے خلفا کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی ہے کہ وہ اپنی مجلسوں اور نیازوں میں میجر جنرل ڈکسن نظامی اور جارج برنارڈ شا چشتی نظامی کے نام سے کر نیاز دیا کریں۔"

میں سوچ رہا تھا کہ جارج برنارڈ شا چشتی نظامی کا فاتحہ برک فاسٹ پر دیا جائے گا یا لنچ یا ڈنر پر کہ خواجہ صاحب نے یکایک سوال کیا:۔

"آپ مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم سے کبھی ملے ہیں؟"

میں نے کہا "جی نہیں اس سعادت سے ناشاد رہا ہوں۔"

کہنے لگے "تو مثنوی خمار شاد ضرور پڑھیے۔ یہ مثنوی مسجدوں میں سنائیے۔ یہ مثنوی کم سے کم سترہ مرتبہ یعنی سترہ آدمیوں کو ضرور دکھائیے اور سنائیے۔"

میں پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر اٹھارویں مرتبہ میں نے کسی کو سنا دی تو کفارہ کیا دینا ہوگا۔ مگر خواجہ صاحب نے کتابوں کی الماری سے میری ایک کتاب نکال لی جو میں نے سر تیج بہادر سپرو کے نام معنون کی تھی۔ خواجہ صاحب نے خوش ہو کر کہا:۔

"آپ نے یہ بہت اچھا کیا ـــ سر تیج اصل میں اردو کے سرتاج تھے۔ وہ سپرو نہیں بلکہ اردو کے سپر تھے۔"

اور یکایک سر تیج بہادر سپرو ڈھال بنے ہوئے میرے تصور میں آ گئے۔ خواجہ صاحب بدستور گل فشانی فرما رہے تھے: "اُردو ہماری زبان ہے۔ ہم سے مراد ہے ہندو اور مسلمان۔ "ہ" سے ہندو اور "م" سے مسلمان۔ دونوں مل کر ہوئے "ہم"۔"

میں عقیدت کی شدت سے بوکھلا کر رہ گیا اور خواجہ صاحب نے اس بوکھلاہٹ کو وجد سمجھ کر ارشاد فرمایا: "آپ پریم راگی سے قوالی ضرور سنا کیجیے۔ اس سے آپ کے قلب کی رقت میں انجمادی کیفیت پیدا ہو گی۔ اور موسیقی سے طبیعت میں ایک تنفر منجانب اللہ پیدا ہو جائے گا۔"

میں پریم راگی کا پتہ نوٹ کرنے کے لیے پنسل اٹھانے کو جھکا ہی تھا کہ خواجہ صاحب طمانچہ بر رخسار یزید کی جلد الماری سے لے کر رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ ایک لڑکھڑاتا ہوا ڈھانچہ عینک لگائے نظر آیا۔ مگر یہ ڈھانچہ بولتا بھی تھا۔

"پہچانا مجھے؟" اور یہ کہہ کر میز پر پڑے ہوئے پیڈ پر پنسل سے ایک پھول بنا دیا اور پھر اس پھول کی پتیاں بناتے ہوئے کہا: مجھے آپ سے ملنے کا شوق تھا۔ بہت شوق تھا۔ اور ہر روز ملنے کا ارادہ کرتا تھا۔ میں آپ کو اپنی تصویر دکھاتا ہوں۔ میری تصویر دیکھ کر آپ مجھے آسانی سے دیکھ سکیں گے۔ بات یہ ہے کہ یہ اصلی تصویر ہے اور میں خود کچھ نقلی سا ہوں۔ اس تصویر میں جو میری آنکھیں ہیں وہ آپ کے دل و دماغ پر چھا جائیں گی۔ بات یہ ہے کہ یہ تصویر ساکت ہے اور میں ذرا ہلا ہوا ہوں۔ اس تصویر کو دیکھئے یہ تصویر بھی خاموش ہے اور عینک کے پیچھے بڑی بڑی اداس آنکھیں بھی خاموش ہیں۔ بہت سی عورتیں یہ تصویر دیکھ کر منہ بنا لیتی ہیں۔ مگر تنہائی میں چپکے سے ان آنکھوں کو چومتی ہیں۔ اسی چوما چاٹی کی کثرت نے میری نظر کمزور کر دی ہے اور میں عینک لگانے لگا ہوں۔"

میں حیرت سے ان حضرت کی باتیں سن رہا تھا مگر وہ نام پوچھنے کی مہلت ہی نہ دیتے تھے، کہتے ہی چلے گئے: "آپ یقین کیجئے کہ اگر میں عورت ہوتا تو میرے ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے مہین دوپٹے کے پیچھے میرے سینے کا ابھار یقیناً چنیاں کھاتا اور جو کوئی مجھ کو دیکھتا ایک دھکے کے ساتھ اس کی نظریں پلٹ جاتیں۔ مگر میں یقیناً ایسی چال نہ چلتا کہ لوگ اونچی ایڑی کے جوتے کو میرا نیا شوق سمجھتے نہ میں ایسا غرارہ پہنتا جس کی سلوٹوں کا گھیرا دھندلا ہوتا۔ میں اس طرح کبھی نہ سوتا کہ بڑی بڑی اداس آنکھیں بند ہوتے ہی دایاں بازو ایک طرف ڈھلک جاتا۔"

میں نے تنگ آکر پوچھا "حضرت، پہلے یہ تو بتا دیجئے کہ میں کس صاحب سے ہمکلام ہوں۔ جناب کا اسم مبارک؟"

وہ صاحب عجیب سرشار انداز سے بولے۔ "بہت سے نام ہیں میرے۔ ٹھنڈا گوشت — کھول دو —"

میں ایک دم چیخا "ارے ارے۔ منٹو صاحب — سعادت حسن منٹو — اردو ٹائپ رائٹر والے انشاپرداز — خود زیب داستان اور افسانہ نگار۔"

منٹو صاحب نے میری بدمذاقی سے بے مزہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اب ایسی باتیں نہ کیجئے کہ میرا نشہ اتر جائے۔ میں اس وقت مغویہ اور برآمد کی ہوئی لڑکیوں کے متعلق غور کر رہا ہوں اور میرے ذہن میں صرف پھولے ہوئے پیٹ ابھر رہے ہیں۔"

میں سوچنے لگا۔ یا اللہ اس کا ذہن کس دائی کو دکھایا جائے، مگر وہ بولتے ہی رہے: "اور کیوں جناب ان کو مغویہ کیوں کہا جاتا ہے انہیں اغوا کب کیا گیا۔ اغوا تو ایک بڑا رومانٹک فعل ہے۔ جس میں مرد اور عورت دونوں شریک ہوتے ہیں — یہ تو ایک ایسی کھائی ہے جس کو پھاندنے سے پہلے دونوں روحوں کے تار تن کر جھنجھنا اٹھتے ہیں۔"

میں نے صفائی پیش کی: "منٹو صاحب، خدا گواہ ہے میں نے اس کا نام اغوا یا ان عورتوں اور لڑکیوں کا نام مغویہ نہیں رکھا ہے"

وہ تلخی سے بولے: "تم — تم تو شکاری ہو۔ صحافی، افسانہ نگار اور شاعر قلم اٹھائے شکار میں مصروف ہیں۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتا۔ تم انسان کو ہندو اور مسلمان کہتے ہو۔ تم کہتے ہو ایک لاکھ ہندو مرا یا ایک لاکھ مسلمان مرا۔ تم یہ نہیں کہتے کہ دو لاکھ انسان مرے۔ تم سمجھتے ہو کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیے جاتے ہیں — بیوقوف — چوک فرید دیکھا نہیں اور بن بیٹھے انشاپرداز —"

میں نے منانے کی بہت کوشش کی بلکہ وعدہ کیا کہ پرمٹ لے کر امرتسر جاؤں گا اور چوک فرید دیکھ آؤں گا۔ مگر منٹو صاحب تو اس بیگانگی سے چلائے جیسے منٹو پارک کا سبزۂ بیگانہ۔ میں دل ہی دل میں کڑھتا دروازے تک جا کر واپس لوٹ آیا اور لوٹ کر ایک دم چونک پڑا۔ بڑی بڑی آنکھوں کی ایک سادہ اور معصوم مگر سادہ اور معصوم سے زیادہ نحیف و نزار خاتون جن کو کمزوری نے لڑکی بنا رکھا تھا۔ کھڑی ہوئی نظر آئیں اور سلام کے بجائے صرف مسکرا دیں۔ میں بھی مسکرانے کی کوشش میں دانت نکال کر رہ گیا۔ وہ محترمہ بولیں: "آپ بڑے سطحی آدمی معلوم ہوتے ہیں کرٹ

آف ہو جانے سے گھبرا جاتے ہیں۔ آخر چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی کا تصور کیوں نہیں کر لیتے، آسمان پر جلتے ہوئے یہ روپہلے دیئے آخر کس کام کے ہوتے ہیں؟"

میں نے نہ جانے کیوں یہ بے ہودہ بات کہہ دی: "میں سمجھا نہیں آپ کیا فرما رہی ہیں۔"

وہ جل کر بولیں: "بھئی مت سمجھو۔ ایک ذرا سمجھ لیتے تو جانے کیا ہو جاتا۔ یہاں تکیہ بھی تو نہیں ہے کہ میں اپنا سر اس پر دے ماروں۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آج ہی صبح اس کمرے سے گاؤ تکیہ اٹھوایا ہے۔ میں سوچ رہا تھا اور وہ میرے جواب کی منتظر تھیں۔

آخر خفا ہو کر بولیں: "اب کچھ بولو بھی۔ میرا انتظار دم توڑ کر نہ رہ جائے۔ جی چاہتا ہے کہ سسک سسک کر رو دوں۔"

میں نے بلک بلک کر ہنستے ہوئے کہا: "میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کون ہو سکتی ہیں۔"

وہ بولیں: "میں کئی چولھے ہیں۔ پہلے اپنے متعلق تو غور کرو کہ تم کون ہو سکتے ہو۔ میں نے تو غلطی کی جو تمہارے پاس آ گئی۔ وقت اپاہجوں کی طرح گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔ میں نے کہا چلو ان حضرت سے مل آؤ۔ یہاں آ کر میرا دھڑکتا ہوا دل عذاب سے ڈوب گیا۔ اب یہاں سے جاؤں گی اور نئی اور پرانی باتوں کے ملبے تلے پڑی کراہتی رہوں گی۔ میں کرسی پہ ہونٹ کھول کر بے جان سی لیٹ جاؤں گی اور میرا چہرہ جذبات سے بالکل خالی ہوگا۔"

میں نے پہچان لیا اور گویا نعرہ بلند کیا: "آپ ——— ہاجرہ مسرور ———"

وہ میری حماقت پر مسکرا دیں: "جی نہیں ——— خدیجہ مستور ہوں۔"

میں نے کہا: "وہ ایک ہی بات ہے۔ عطر ایک ہی ہے خواہ کارخانہ اصغر علی کا ہو یا محمد علی کا۔"

یکایک سر پر لٹکا ہوا بلب روشن ہو گیا۔ گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ روشنی آ چکی تھی۔ کتابوں سے الماریاں بھری پڑی تھیں اور تمام مصنف غائب تھے۔ کاش کتابیں غائب ہوتیں اور مصنف موجود ہوتے ———

دوست کے نام

پطرس

از لاہور

اے میرے کراچی کے دوست!

چند دن ہوئے میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں فنونِ لطیفہ کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کرے گی۔ دلی مسرت ہوئی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کون کون اس کے کرتا دھرتا ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بہت شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوقِ صحیح رکھتے ہیں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے بلکہ عجب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو۔ اور آپ ہی نے اپنی جاذبیت سے ایسے خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطے پر جمع کر لیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا سا سلیقہ نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا۔ کیونکہ اپنے ہم نواؤں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور ایک گونہ تقویتِ قلب نصیب ہوئی۔ ورنہ تن تنہا کتابوں اور تصویروں سے راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے۔ ذوقِ سلیم کی تنہائی کی وحشت اور تلخی غالب آنے لگتی ہے۔ انسان دیوانہ نہیں تو علیل دماغ ضرور ہو جاتا ہے۔ اور غالب کا ایک مصرعہ قافیہ بدل کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ مقدور ہو تو ساتھ رکھوں رازداں کو میں۔

لیکن اے دوست کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی اخبار نے جل کر نہیں لکھا کہ پاکستان پر ابتلا کا زمانہ آیا ہوا ہے۔ اور آپ جیسے خوش فکروں کو مصوری اور نقاشی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے جلتے ہوئے شہر روما اور نیرو کی سارنگی کا فقرہ نہیں کسا؟ کسی سنّی یا شیعہ یا وہابی یا دیوبندی نے مسجد میں وعظ کرتے ہوئے آپ کے لہو و لعب اور تفریح کوشی پر نفرین نہیں کی؟ اور آپ پر کفر و دہریت اور الحاد کا فتوے لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی گھاگ مصلحت پیشہ افسر نے ہمدردی اور تدبر سے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ برخوردار

بہ بانگِ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است؟

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا ضیافت کے موقع پر کسی نیم تعلیم یافتہ ہمعصر نے جو تنخواہ میں آپ سے برتری کا دعویدار ہے، آپ کی آزاد منشی کا مضحکہ نہیں اڑایا؟ اور جب آپ پٹے ہوئے نظر آئے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوئے؟

اگر آپ کو ایسی منزلیں پیش نہیں آئیں تو کراچی سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہو گی۔ یا پھر بیزاری اور بددلی پک رہی ہو گی۔ اور

آپ کو ابھی دکھائی یا سنائی نہ دی ہوگی۔ ورنہ جس حسنِ مذاق پہ آپ کو عزہ ہے۔ وہ تو آج کل ایک مہاجر یتیم کی طرح بھوکا اور ننگا کسی کھنڈر کے کونے میں سر بزانو دبکا بیٹھا ہے اور باہر پڑا پڑ مینہ برس رہا ہے اور آندھیاں چل رہی ہیں۔

"پچھلے سال، قائد اعظم یہاں تشریف لائے اور وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے۔ اس میں جو قطعہ "روز گارڈن" کہلاتا تھا۔ وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستانی لاہور کا پہلا جشن کا دن تھا" روز گارڈن" کا نام "گلستانِ فاطمہ" رکھا گیا۔ اور یہ نام ایک بورڈ پر لکھ کر باغ میں جو چھوٹی سرخ اینٹوں کی خوب صورت محراب استادہ ہے۔ اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا۔ لیکن اس کی کتابت ایسی کہ یہ اور طغرہ نفتی کہ مدرسے کے بچوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ لٹکاتے ہوئے شرم آتی۔ "گلستانِ فاطمہ" کی بے ذوق ترکیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے۔ جس کی بدولت نہ وہ غریب ہی اس نام سے مانوس ہوں گے۔ جو دوپہر کے وقت درختوں کے سائے میں اپنا گرد آلود جوتا سر کے نیچے رکھ کر اس باغ میں سو جاتے ہیں۔ نہ وہ سفید پوش ہی اس میں کوئی کشش پائیں گے۔ جو شام کے وقت موٹروں میں سوار ہو کر یہاں ٹینس کھیلنے آتے ہیں۔ لیکن جب ان جلوے کی پیاسی گنہگار آنکھوں نے اسے پہلی ایک مرتبہ اس جگہ پر منقوش دیکھا۔ تو نظر اور دل دونوں مجروح ہوئے۔ کیونکہ ایسے شاندار موقعے کے لیے اس سے بدصورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آسکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم۔ وہ قوم جو کئی پشتوں سے فن خوش نویسی کی علمبردار ہے۔ جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس صناعی اور ہنرمندی سے لکھے کہ کاتب قدرت نے بھی ان کو آفرین کہا ہوگا۔ پنجاب کا خطہ۔ وہ خطہ جسے نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لاہور کا شہر۔ وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوش نویس رہتا ہے اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسا استاد فن پیدا ہوئے۔ جن سے سارا ہندوستان بھر کے جادو رقم زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے۔ اور اس پر یہ حال کہ اس تقریب سعید پر، اس شہر میں، مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھنے پڑیں اور ان کے بھی دائرے غلط ہوں اور نشست بے ڈھنگی ہو۔ آپ دیکھتے تو یقیناً آپ کو اس کی تہ میں بد مذاقی کا عروج نظر آتا اور آپ پڑے پڑے جلتے اور ڈھونڈتے پھرتے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں اور لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے اور بعض ایسے بھی ہوتے کہ الٹی خردہ گیری پر آپ کو بدتمیز کہتے۔ یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن نہیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ پہ پاکستان میں کیڑے ڈالنے کا الزام لگتا اور آپ کی وفا شعاری پر حرف آجاتا۔

اب آپ اس انجمن کے بیچ میں اپنے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم جمع ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں۔ تو آپ جو سینہ میں دردمند دل رکھتے ہیں۔ یہ کہنے سے کیونکر باز آئیں گے کہ اے مسلمانو! تمہارے آبا و اجداد خط اور دائرے اور خم اور زاویے کا وہ ذوق رکھتے تھے کہ اس دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ کوفی اور طغرے۔ نستعلیق اور نسخ کس کس منہج سے انہوں نے ابجد سے مشق کیا ہے۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وصلیوں کو دیکھو۔ ان کے مطلا اور مذہّب نسخوں کو دیکھو۔ ان کے روضوں اور محلوں۔ ان کی مسجدوں اور خانقاہوں۔ ان کے فرامین اور سکوں اور مہروں۔ ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو۔ مرگ یا زیست کا کوئی مقام۔ سطوت یا افلاس۔ مسرت یا ماتم۔ جشن یا یکسوئی۔ خلوت یا جلوت۔ کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف کے لافانی نقوش چوب و قرطاس و سنگ پر ثبت نہ کر دیئے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنی کلچر کے احیار اور تحفظ کے لیئے سب قوتیں تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں۔ قسمیں کھاؤ کہ اس ورثے کو ہاتھ سے نہ جانے دو گے۔ اور عہد کرو کہ آج سے تمہاری دکانوں، تمہارے مکانوں، تمہارے دفتروں، تمہاری کتابوں اور اخباروں اور

رسالوں، تمہاری مسجدوں اور تمہارے مزاروں۔ تمہارے سرناموں اور تمہارے نوٹس بورڈوں پر جہاں جہاں تمہارے ہاتھ ابجد کے خط کھینچیں گے، اسلاف کا نام روشن کریں گے۔ اور جو نزاکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں نے صدیوں میں پیدا کی ہیں۔ انہیں مسخ نہ ہونے دیں گے۔ تاکہ جہاں کسی کو تمہاری تحریر نظر آئے وہ جان لے کہ یہ مسلمان کا لکھا ہوا ہے۔ اُس قوم کا لکھا ہوا ہے۔ جس نے دنیا میں خوش خطی کا مرتبہ بلند کیا۔ اور جو اب بھی اپنی حسن آفرینی پر ناز کرتی ہے۔

یہ کہنے سے آپ کیونکر باز آئیں گے؟ لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں ہیں ایسے لوگ؟ فنونِ لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے۔

اور پھر خوش نویسی؟ اس کی تو عافیت رہے گی۔ لیکن کیا آگے بھی بڑھیے گا؟ تصویروں کا ذکر بھی کیجیے گا؟ اخبار میں لکھا تھا کہ آپ تصویروں کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے تو اے دوست وقتاً فوقتاً مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیے گا۔ کیونکہ اگر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بے انتہا جسارت سے کام لینا پڑے گا اور عجب نہیں کہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر عبرت پکڑا کریں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے آپ صحیح معنوں میں آرٹ سکول کہہ سکیں۔ لاہور یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹ بحیثیت ایک مضمون کے شامل تھا۔ لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا۔ جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دستکاری سب چٹکی چٹکی بھر پھینک دی گئی تھیں اور اس معجون کو ایک زنانہ مشغلہ سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ فی الحال تو ایک دو ہی خاتون میسر ہیں جو یہ مضمون پڑھاتی ہیں۔ وہ کہیں ادھر اُدھر ہو گئیں اور کوئی عورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی تو یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا۔ کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام خدانخواستہ کسی مرد کے سپرد ہوا تو زلزلے نہ آ جائیں گے؟ اور پھر اس مضمون کا حلیہ بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی تو ختم کر کے رکھ دی گئی ہے۔ کیونکہ ہو تو بھلا کسی کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے دستخط سے یہ لکھوا بھیجے کہ ہمیں گانے کا شوق ہے؟ باقی رہی تصویر کشی تو ایک ملنے والے اگلے دن سنا گئے کہ ایک کالج نے لکھوا بھیجا ہے کہ ہماری لڑکیاں جانداروں کی شکلیں نہ بنائیں گی۔ چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سیب۔ ناشپاتی۔ مرتبان یا پہاڑ۔ دریا۔ جنگل پر کی جائے۔ اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی۔ شریعت کا قدم درمیان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں تو ہرگز جائز نہیں۔ فوٹو البتہ جائز ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہہ ہو بہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جھوٹ ضرور سرایت کر جاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ فوٹو بھی تو کئی حرفتوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹوگرافر بھی تو بڑے فن کار ہوتے ہیں جواب ملا۔ کہ چابکدستی اور تکلّف سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ غرضیکہ ان کے نزدیک اُسی ایک فوٹوگرافر کا کام حق اور راستی کا آئینہ دار ہے جو لاہور کے چڑیا گھر کے باہر چار آنے میں تصویر کھینچتا ہے۔ یہ حال تو جاندار اشیار کا ہے۔ باقی رہے جنگل، پہاڑ، دریا تو وہاں بھی ایک نہ ایک دن کوئی کوتوالِ حق بیں مصوروں کے "جھوٹ" کو گردن سے جا دبوچے گا۔ اور آپ چیختے اور سسکتے رہ جائیں گے کہ یہ تو دین لوگ ہے یہ تو بہت بڑا ——— ہے! اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر نوچ کر پھاڑ ڈالی جائے گی۔

ان حالات میں چغتائی کے جینے کا امکان ——— کم ہے۔ کوئی بات "سچ" بھی ہوتی ہے اُس کی تصویروں میں؟ وقت تک

نو مجنوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو وہ نہیں چوکتا۔ اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی غزال چشم، سینہ چاک اور بعض اوقات محرم کے بند تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گو یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں تسمے، ڈوریاں، پھندنے بہت ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تکمہ یا ڈوری پیلے کے لباس کا حصہ ہے یا ناقہ کے ساز و سامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت ضرور نظر آتی ہے وہ یہ کہ لے دے کے یہی ایک ہمارا مصور ہے۔ اسے دفن کر دیا جائے تو یہ وبا فوراً ختم جائے گی۔ اور ہماری مصوری ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے گی۔ باقی رہیں مغلوں کی قدیم تصویریں یا ایرانی مصوری کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس بطور تبرک محفوظ ہیں یا جن کی انڈیا آفس کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی امید ہے۔ تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کیے جا سکتے ہیں۔ کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؛ اگر نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی۔

لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ کراچی کونسا ایسا جزیرہ ہے اور کون سے گم شدہ براعظم میں واقع ہے کہ ادھر کے سمندر کی کوئی لہر وہاں تک نہ پہنچ سکے گی؟ آپ کو تعمیر اور تخلیق کی سوجھ رہی ہے۔ لیکن یہاں تو تخریب کا دور دورہ ہے۔ ہاتھوں سے لٹھ چھین کر اس کی جگہ قلم اور مو قلم آپ کیونکر رکھ دیں گے؟ آپ کوئی سا ہیجان پیدا کیجئے آپ کے دیکھتے کے دیکھتے وہ تخریب کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ لوگ جس چیز کا نعرہ لگا کر اُٹھتے ہیں، سب سے پہلے اُسی چیز کا خون کر دیتے ہیں۔ آپ کہیئے کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ ٹولیاں بنا بنا کر بازاروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کالا کریں۔ آپ اسلام کی دعوت دیجئے تو تلاش شروع ہو جاتی ہے کہ کس کے دُرّے لگائیں؟ آپ حیا کی تلقین کیجئے تو لوگ سر بازار عورتوں کے منہ پر تھوکنے لگتے ہیں۔ اور بچیوں پر اپنا بہیمانہ زور آزماتے ہیں۔

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی   اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

ایسے غیظ و غضب کی فضا میں بھی آج تک کہیں آرٹ پنپا ہے؟ آرٹ کے لیے تو ضبط اور نسق اور استحکام اور فراغ لازم ہیں۔ یا پھر کوئی ولولہ کوئی اُمنگ کوئی عشق جو دلوں کے دروازے کھول دے اور ان میں سے شعر و سخن نغمہ و رنگ کے طوفان اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں۔ کیا کبھی آرٹ ایسے بھی پنپا ہے کہ ہر بڑے کو دولت اور اقتدار کی ہوس نے اندھا اور بہرا کر رکھا ہو اور ہر چھوٹا اپنی بے بضاعتی کا بدلہ ہر ہمسائے اور راہ گیر سے لینے پر تلا ہوا ہو۔ نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو۔ اور لوگ فاقے کے ڈر سے نجات پا کر قناعت کی گود میں ذرا آنکھ جھپک لیں۔ نہ کوئی اخلاقی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس دنیا یا اُس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی اُمید یا خوف ہو۔ نہ مسرت کا کوئی ایسا جھونکا آئے کہ درختوں کی ٹہنیاں مست ہو کر جھومیں اور پتوں کی سرسراہٹ سے آپ ہی آپ نغمے پیدا ہوں۔ نہ عافیت کا کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں آپ کا فن کار معتکف ہو کر بیٹھ جائے اور آپ کے لیے تصویریں بناتا رہے۔ نہ آس پاس کوئی ایسی نرالی بستی ہو جہاں شاعر غریب شہر بن کر گھومتا پھرے اور لوگ اسے دیوانہ اجنبی سمجھ کر اُسے بک لینے دیں۔ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو کہ چند تصویروں کو مخرب اخلاق اور عریاں کہہ کر جلا دیا جائے۔ چند مصوروں پر اوباشی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے۔ یا پھر ان کے اوپر ایسے لوگ مسلط کر دیئے جائیں جو ان کے ہنر کو کھردری سے کھردری کسوٹیوں پر پرکھیں اور ان پر واضح کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعوے تھا۔ اس کا دور اب گذر گیا۔

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں   پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت نہیں سمجھتے اور اسے محض امارت کا دل بہلاوا نہیں سمجھتے۔ آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جاندار ہی کی تصویر پر اصرار ہو۔ یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو۔ حسن کو اختیار رہے۔ جہاں رہے جو شکل چاہے اختیار کرے۔ صرف یہ ہے کہ زندہ رہے اور امیر غریب۔ چھوٹے بڑے۔ ادنیٰ اعلیٰ سب پہ اپنی بخششیں ارزانی فرمائے۔ ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت و حرفت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ آپ تو اس عہد زریں کو واپس لانا چاہتے ہوں گے۔ تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں۔ کسان کے تہمد میں سیلانی کے ہاتھ کی چھڑی میں۔ پنہاری کے مٹی کے گھڑوں میں۔ غرض زندگی کے ہر گوشے میں نور پاش ہو۔ لیکن جو ننھی ننھی شمعیں یہاں وہاں ٹمٹما رہی ہیں۔ انہیں ہی بجھا دیا گیا۔ تو لاکھوں انسانوں کی زندگیاں جو ابھی تک تاریک پڑی ہیں۔ وہ کیسے جگمگائیں گی؟ کیا کراچی میں جو آپ کے ہم جلیس ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ آرٹ کی ایک مسکراہٹ کے بدلے انہیں اس بیگانہ تبسم ماحول میں کئی صحرا چھاننے پڑیں گے۔

فرحتے نیست کہ در پہلوئے آں صد غم نیست   ورنہ مولود جہاں کم ز شب ماتم نیست

اگر یہ محض میرا وہم ہے تو اے دوست پھر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہو گی تو پیارے دوست ہم سب کو وہاں بلا لیجئے یا کراچی کو اتنا وسیع کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ رسوخ پیدا کر لیا ہو گا۔ آپ کے اخلاص اور اصابت رائے کے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے افسروں سے آپ کی ملاقات ہو گی۔ بڑے بڑے ارباب حل و عقد کا قرب نصیب ہو گا۔ ان سے کہئے کہ ؎

منزل راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے؟

برج بانو

کنہیا لال کپور

یہ برج بانو کی داستان ہے۔ برج بانو کون ہے؟ اس کے عجیب و غریب نام کی کیا وجہ ہے؟ یہ تمام سوالات جس آسانی سے پوچھے جا سکتے ہیں شاید ان کے جوابات اتنی آسانی سے نہ دیئے جا سکیں تاہم کوشش کروں گا کہ آپ کو برج بانو سے روشناس کرا سکوں۔ برج بانو ایک خوب صورت عورت ہے جو پاکستان سے میرے ساتھ ہندوستان میں آئی ہے۔ کیا میں اسے اغوا کر کے لایا ہوں؟ نہیں صاحب میں تو اتنا شریف واقع ہوا ہوں کہ خوب صورت عورت تو کجا کسی بدصورت پنڈتائن کو بھی اغوا کرنا گناہِ عظیم سمجھتا ہوں۔ کیا اسے مجھ سے محبت ہے؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے۔ اگر آپ یہ پوچھتے کہ کیا مجھے اس سے محبت ہے" تو میں یقیناً اس کا جواب اثبات میں دیتا۔ وہ آج کل کہاں ہے؟ وہ میرے گھر میں رہ رہی ہے۔ اُسے برج بانو کیوں کہتے ہیں؟ یہ سوال مجھ سے کئی اشخاص نے کیا ہے۔ آپ پہلے شخص نہیں ہیں۔ بہرکیف۔ وجہ بیان کیے دیتا ہوں۔ اسے برج بانو کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کی ماں ہندو اور باپ مسلمان تھا۔ آپ کو یقین نہیں آتا؟ بہتر تو یہی ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار کریں۔ ورنہ مجھے ایک ایسے شخص کی سند پیش کرنی پڑے گی جو ایک بارلیتی پنڈرنگ ہے۔ جسے اس عورت کی پیدائش کے سب حالات معلوم ہیں۔ اور جسے میری طرح اس عورت سے عشق ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ عورت لوگوں سے عشق کرتی ہے؟ آپ نے غلط سمجھا۔ یہ لوگوں سے عشق نہیں کرتی لوگ اس سے عشق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس عورت کی زبان میں کچھ ایسی موہنی کشش ہے کہ جو شخص بھی اس کی باتوں کو سنتا ہے دل و جان سے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ میری ہی مثال لیجئے۔ میری عمر تیس برس کی تھی جب میں نے پہلی بار اسے ایک مجلس میں باتیں کرتے ہوئے سنا۔ مجھے فوراً اس سے عشق ہو گیا۔ تیس برس کی عمر ہمارے ملک میں جہاں انسانوں کی اوسط عمر صرف چھبیس سال ہے عشق کرنے کے لیے نہایت غیر موزوں ہے۔ لیکن میں مجبور تھا اور صرف مجھ پر ہی کیا منحصر ہے۔ لکھنؤ میں ایک شخص رتن ناتھ سرشار ہوا کرتا تھا۔ وہ اس عورت کی زبان کے چٹخارے پر کچھ ایسا مر مٹا کہ ساری عمر اس کا نطق اس کی زبان کے بوسے لیتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اس عورت کی شان میں ایک رباعی کہی تھی۔ جس کا ہر مصرع پانچ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ ہاں تو یہ عورت پاکستان سے میرے ہمراہ آئی ہے۔ لیکن چند دنوں سے اداس سی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ پچھلے چند دنوں سے اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ نہ صرف اس سے بلکہ مجھ سے بھی۔ کل کا ذکر ہے۔ ایک لمبی چوٹی والے پنڈت جی جو میرے ہمسائے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے: "لالہ جی یہ کیا مجاک ہے۔ آپ کے گھر ایک ایسی اورت رہتی ہے جس کا باپ مسلمان تھا" اور میرے کئی لمبے بالوں والے دوست مجھ سے بارہا

کہہ چکے ہیں:" آپ خواہ مخواہ اسے ساتھ لے آئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر سرحد پار کرنے سے پہلے آپ اسے ستلج کی لہروں کی نذر کر دیتے۔"

میں جب ایسی باتیں سنتا ہوں۔ تو مجھے سخت رنج ہوتا ہے۔ لیکن برج بانو کے دل پر جو گذرتی ہے وہ بیان سے باہر ہے بیچاری ہر روز جلی کٹی سُن سُن کر تنگ آ گئی ہے۔ آج دوپہر کے وقت جب وہ ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ تو میں نے اس سے کہا:" برج بانو، میرا خیال ہے کہ تم پاکستان چلی جاؤ۔ یہاں یہ لوگ تمہیں رہنے نہیں دیں گے۔"

"لیکن کیوں" برج بانو نے چونک کر کہا:" میرا قصور؟"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تمہارا باپ مسلمان تھا۔"

"لیکن میری ماں تو ہندو تھی"

"ولدیت کے معاملے میں ماں کو کوئی نہیں پوچھتا"

"یہ عجیب منطق ہے"

"جہاں جذبات ہی سب کچھ ہوں وہاں منطق کی دال نہیں گلتی"

وہ اور بھی اُداس ہو گئی۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:" برج بانو تمہیں اب یہاں سے "اوشیہ" چلے جانا ہو گا"

ایک لمحہ کے لیے وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ اور پھر کہنے لگی۔

"اوشیہ کسی شہر کا نام ہے کیا؟"

"شہر کا نام نہیں" اوشیہ" ہندی زبان میں "ضرور" کو کہتے ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور کہنے لگی" میری پرنانی بھی "ضرور" کو" اوشیہ" کہا کرتی تھی۔"

میں نے پوچھا:" تم "ضرور" کو" اوشیہ" کیوں نہیں کہتیں؟"

برج بانو نے طنز آمیز لہجے میں کہا:" کہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ لیکن زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔"

"بس اسی لیے تمہیں ہندوستان چھوڑنا پڑے گا"

یک لخت برج بانو کے چہرے پر غیض و غضب کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے چلا کر کہا:" ہندوستان میرا گھر ہے۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کس طرح جا سکتی ہوں؟"

"تمہارا گھر پاکستان ہے"

یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان میری فتوحات میں سے ہے۔ میرا اصلی اور قدیمی وطن ہندوستان ہے۔ میں دہلی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ بچپنا جھونپڑی اور شباب لال قلعہ دہلی میں بسر ہُوا۔ مجھے ہندوستان کے شہنشاہ نے منہ لگایا۔ دیوان عام میں مجھے سب سے اُونچی مسند پر بٹھایا گیا۔ اور جس وقت میرا ستارہ عروج پر تھا۔ کوئی بنگالی، گجراتی، سندھی حسینہ میرے حسن، میری بھڑک اور مٹکنے کی تاب نہ لا سکی۔ میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستان میں رہوں گی۔"

"یہ درست ہے "پرنتو"......"

"یہ "پرنتو" کیا بلا ہوتی ہے جی"۔ برج بانو نے شرارت سے کہا۔

"پرنتو" ہندی میں "لیکن" کو کہتے ہیں"۔

"ہاں یاد آیا۔ میری نانی بھی "لیکن" کو "پرنتو" کہا کرتی تھی۔

"تمہیں اب "لیکن" کو "پرنتو" کہنا ہوگا"۔

"معاف کیجیے۔ میں تو "لیکن" کو "لیکن" ہی کہوں گی"۔

"یہی تو تمہاری غلطی ہے۔ اگر "لیکن" کو "پرنتو" نہیں کہوگی۔ تو تمہیں یہاں سمجھے گا کون؟"

"ہر وہ شخص ۔۔۔۔"

معاً ایک قلفی بیچنے والا میری ڈیوڑھی کے آگے ٹھہر گیا۔ برج بانو اپنا آخری فقرہ مکمل کیے بغیر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہاتھ کے اشارے سے قلفی والے کو بلاتی ہے۔

"قلفی کھائیں گے آپ؟" وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔

کیا یہ قلفی کھانے کا وقت ہے۔ میں تم سے نہایت اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ تم پاکستان جاؤ گی یا نہیں؟"

"پہلے قلفی کھا لیجیے۔ اس کے بعد ٹھنڈے دل سے آپ کے مشورے پر غور کریں گے"۔ اور وہ قلفی والے کو مخاطب کر کے پوچھتی ہے۔

"کیسی ہے یہ قلفی تمہاری۔ میرا مطلب ہے کچھ ٹھکانے کی ہے یا یونہی سی"

قلفی والا کن انکھیوں سے برج بانو کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے: "اجی کیا پوچھتی ہیں آپ میری قلفی؟ میری قلفی بے نظیر، لاجواب، شاندار۔

برج بانو کے معصوم لبوں پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور قلفی کھائے بغیر قلفی والے کی ہتھیلی پر پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیتی ہے اور اُس سے چلے جانے کو کہتی ہے۔

قلفی والا چلا جاتا ہے۔ میں اُسے بیٹھنے کے لیے کہتا ہوں۔ لیکن وہ بدستور کھڑی ہے اور مسکرا رہی ہے۔

"کیا فیصلہ کیا ہے تم نے۔ پاکستان جا رہی ہو نا؟"

وہ میری بات ان سنی کر کے ایک سکھ ڈرائیور کی لاری کی طرف اشارہ کرتی ہے: "وہ دیکھیے"

میں لاری کی طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ لاری کے فریم پر چند اشعار اُردو میں لکھے ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

لاری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ایک چھابڑی والا زور سے چلاتا ہوا گلی میں داخل ہوتا ہے۔ وہ "چنا زور گرم" بیچ رہا ہے۔

میرا چنا بنا ہے اعلیٰ   اس میں ڈالا مرچ مصالحہ   چنا لایا میں بابو مزیدار   چنا زور گرم

اب ایک اخبار فروش گلی میں آتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں دس بارہ مختلف اردو روزنامے اور رسائل ہیں۔ برج بانو ایک اردو روزنامہ خریدتی ہے۔ لیکن جونہی اس کی پہلی نظر سرخی پر پڑتی ہے اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ جلی حروف میں لکھا ہے "برج بانو اب ہندوستان میں نہ رہ سکے گی۔"

ایک لحظہ کے لیے اس پر گویا بجلی سی گرتی ہے۔ وہ دھم سے زمین پر گرا چاہتی ہے۔ لیکن میں بڑھ کر اس کا دامن تھام لیتا ہوں۔

دو چار منٹ ہم دونوں خاموش اور مبہوت کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے بعد میں اس سے کہتا ہوں: "ضد نہ کرو بانو تمہیں پاکستان جانا ہی ہوگا۔"

وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کڑک کر کہتی ہے: "میں نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

"لیکن حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم ....."

"حکومت قانون بنا سکتی ہے لیکن عوام کے فطری رجحانات کو نہیں بدل سکتی۔ جب تک ہندوستان میں قلفی والے۔ سکوٹر ڈرائیور اور چنا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں۔ حکومت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔"

"خدا کی قسم — بڑی ضدی ہو تم!"

برج بانو مسکرا رہی ہے۔ اور میں قلفی والے کے الفاظ زیر لب دہرا رہا ہوں "لاجواب! شاندار!! بے نظیر!!"

سفرنامہ جہاز باد سندھی کا

شفیق الرحمٰن

بسم اللہ، دیباچۂ فسانۂ نغمہ زنیِ عندلیبِ خانہ رنگیں ترانہ، راست براست، بلاکم و کاست، یعنی تذکرۂ جہاز باد سندھی عفی عنہ۔

اے صاحبو! خدا آپ کا بھلا کرے۔ مدت مدید و عرصۂ بعید کا ذکر ہے کہ ایک سہ پہر کو ایک نوجوانِ نحیف و نزار (کہ جسے نوجوان سمجھنا بڑی خوش فہمی تھی) کافی ہاؤس کے دروازے پر زندگی سے بالکل بیزار کھڑا تھا۔ نام اس دراز قد کا جہاز باد تھا، تخلص سندھی اور لقب خورد۔ حلیہ اس کا فاقہ زدہ تھا۔ اور سر کے بال ماڈرن خواتین کے بالوں سے بھی لمبے تھے۔ ناک پر ایک شکستہ عینک زندگی کے دن توڑ رہی تھی۔ شیو اس نے ہفتے بھر سے نہیں کروایا تھا۔ بغل میں اس کے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ پوشاک اس کی ایسی تھی کہ گمان تک نہ ہوتا کہ اس نے پوشاک کو پہن رکھا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پوشاک ہے جو اسے پہنے ہوئے ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نوجوان انٹلکچوئل طبقے سے متعلق تھا ——!

اس نے اپنی سائیکل سنبھالی، ملازم کو اگلے روز بخشیش دینے کا وعدہ کیا اور مال روڈ پر ہوا ہو گیا۔ چوک کے سپاہیوں کو پیچھے چھوڑتا کہیں کا کہیں جا پہنچا۔ ایک عالیشان محل کے سامنے اسے کچھ عجیب سی فیلنگ ہوئی جیسے خیالات کی روانی میں دفعتہً الجھن پیدا ہو گئی ہو۔ چونک کر دیکھا تو پچھلے پہیے میں پنکچر ہو چکا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور دکانیں بند تھیں۔ یہاں تک کہ وہ حضرات جو ایک پمپ اور پنکچر لگانے کا ذرا سا سامان لے کر سائیکل ورکس کھول لیتے ہیں۔ اور پروپرائٹر کہلاتے ہیں، غائب غلّا ہو چکے تھے۔

اتنے میں محل کے دروازے سے ایک شخص ہاتھ میں کارآمد شے تھامے نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر جہاز باد کی عینک مسرت سے چمک اٹھی، اس نے بڑھ کر پمپ مانگا۔ اس شخص نے دے دیا۔ جہاز باد نے اسے کھینچا، مروڑا، کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ تب یہ وہ مردِ توانا زیرِ مونچھ مسکرایا (کہ اس کا چہرہ ایک جوڑی سیاہ گھنی اور عمدہ مونچھوں سے مزین تھا) اور بولا —— اے مردِ ناداں! مزید کوشش عبث ہے۔ کیونکہ یہ پمپ نہیں ڈنڈا ہے۔

جہاز باد نے سائیکل ایک طرف رکھ دی اور محل کی جانب متوجہ ہوا۔ دروازے پہ بورڈ پڑھا تو عینک کے شیشے صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لکھا تھا —— "جہاز باد سندھی، کلاں"۔

ذرا قریب گیا تو مرغانِ نواسنج کی زمزمہ پردازی دل کو لبھانے لگی، ہزار و طوطی کی صدا آنے لگی، انواع و اقسام کی خوشبوؤں سے دماغ طبلۂ عطار بن گیا۔ ذرا سی دیر میں یہ طبلہ بجنے لگا۔ ریڈیو پر نغمۂ دلربا اور رباب کی آوازِ خوش کانوں میں آئی۔ طعمۂ لذیذ کی خوشبو آتی تھی۔ مادہ

خوشگوار کی صراحی قلقل کی صدا سناتی تھی۔ دیکھا کہ احباب بذلہ سنج اور خانوادانِ ذی مرتبہ رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ ہمجولیاں قہقہے لگاتی ہیں۔

جہاز باد سوچنے لگا کہ صرف خورد اور کلاں کا فرق ہے۔ مگر کوئی مجھ سا بے نصیب، بدطالع، بدبخت ہے، کوئی صاحبِ تاج و تخت ہے۔ اس مکان کے مکین پر بڑی عنایت ہے اور مجھ گناہگار پر یہ عتاب۔ یہ کسی شاہِ فلک بارگاہ کا ایوانِ سپہر توامان ہے، یا روضۂ رضوان ہے۔ کہیں حور ہے تو کہیں غلمان ہے۔

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس مردِ قوی مونچھ نے آکر پیغام دیا کہ صاحبِ مکان نے فرمایا ہے کہ ہمارا سلام بولو۔ جہاز باد خورد نے کہا —— وعلیکم السلام اور روانگی کا قصد کیا۔ مگر وہ مردِ قوی ہیکل کہنے لگا کہ صاحبِ خانہ یاد فرماتے ہیں۔ جہاز باد سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو صاحبِ خانہ کوئی ماہرِ نفسیات ہے۔ جس نے اتنی دور سے میرا تجزیہ نفسی کر کے خیالات بھانپ لئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس مونچھ مچھندر نے ہاتھ پکڑا اور اندر لے گیا۔ جہاں شاندار دعوت منعقد تھی۔ حیرت ہوئی کہ یاالٰہی اتنی خوبرو اور گلبدن حسینانِ پری تن، شوخ و شنگ رشکِ گل رخانِ فرنگ کیونکر ایک جگہ پہ جمع ہیں۔

جہاز باد سندھی کلاں بڑے تپاک سے ملا اور گویا ہوا —— "اے معزز اجنبی حضرت دیکھنے میں تو آپ انٹیلیکچوئل معلوم ہوتے ہیں۔"

جہاز باد خورد نے اثبات میں سر ہلایا۔ جہاز باد کلاں کی باچھیں کھل گئیں —— "الحمدللہ۔ یہ خاکسار بھی کبھی انٹیلیکچوئل تھا۔ یہ سب شہزادیاں اور شہزادے ایسے ہیں جو انٹیلیکچوئل ہیں۔ ہونے والے ہیں یا کبھی تھے —— آپ ان سے ملئے۔"

سب خوب بغل گیر ہو ہو کر ملے۔ اگرچہ جہاز باد خورد گدگدی سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ عید کے روز چھپتا پھرتا۔ تاہم ایک موہوم سی امید پر اس نے بغل گیر ہونا شروع کر دیا۔ لیکن جب شہزادیوں کا نمبر آیا اور اس نے سرخ لباس والی حسین شہزادی سے بغل گیر ہونے کی کوشش کی تو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی —— "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ——"

جب دونوں جہاز بادوں نے ایک دوسرے کا نام سنا تو کمال درجہ محظوظ بھی ہوئے اور محفوظ بھی۔

جہاز باد کلاں نے خورد کو ایک چھوٹا پیگ دینا چاہا تو وہ معذرت خواہی کرتے ہوئے گویا ہوا —— "یا پیر و مرشد ابھی سورج نظر آتا ہے۔ غروبِ آفتاب سے پہلے وسکی سے گریز کرنا چاہیے۔ البتہ بیئر وقت کی چیز ہے ——"

جہاز باد کلاں یہ تقریر سن کر دم بخود رہ گیا۔ عش عش کرنا چاہتا تھا لیکن شہزادیوں کی طرف دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا اور یوں بولا "اے بامذاق انسان بیئر کا گلاس نوشِ جان فرما اور بار بار دروازے کی طرف مت دیکھ۔ تیری سائیکل ہم نے مرمت کے لئے بھیج دی ہے"

ہوالشافی کہہ کر وہ جام جہاز باد خورد نے پیا اور دوسرا انڈیلنے لگا۔ جہاز باد کلاں نے اس کی طرف شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا —— "اے نوجوانِ سلیقہ شعار ہم خوش ہوئے۔ لیکن یہ مت بھولیو کہ یہ خدائے ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے کہ ایک گدائے بے نوا کو چشم زدن میں صاحبِ دولت و جاہ کرے۔ اور قارون سے مالدار کو ذرا سے اشارے سے تہِ خاک و تباہ کر دے تو ضرور حیران ہوگا کہ یہ نعمتیں ہمیں کیونکر میسر آئیں، یہ فرمانبردار بہرے جنہیں سنائی بھی دیتا ہے۔ یہ افرنگی بیئر جو غلط شدہ غم صحیح کرتی ہے یہ پُر رونق محفلیں، یہ سب کچھ ہمیں یونہی نہیں ملا —— ہم ——"

"واحد متکلم صیغہ استعمال کیجئے ——" ایک طرف سے آواز آئی۔

معاف کیجئے، تو اس کے لئے مجھے کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ اس کا ذکر میں ابھی سناؤں گا۔"

محفل میں یکلخت کھلبلی سی مچ گئی۔ کوئی گھڑی دیکھنے لگا۔ کسی کو ضروری کام یاد آگیا۔ کسی نے کہا ابا جان انتظار کر رہے ہوں گے، کوئی بولا یہ کہانی اتنی مرتبہ سنی ہے کہ زبانی یاد ہو چکی ہے۔ جب سب جا چکے تو جہاز بادِ کلاں نے خورد کے لئے چھٹا گلاس انڈیلا، کباب سامنے رکھے اور کلام کیا۔

جہاز باد سندھی کا پہلا سفر

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود معمار کج

"اے میرے عزیز ہم نام تو نے ان شہزادیوں کی بینا چشمی دیکھی، حیرت ہے کہ تجھے کوئی ضروری کام یاد نہ آیا۔ یہ میری شخصی معلوم ہوتی ہے۔ نئی بوتل کھول اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھ۔"

"اے میرے محترم ہم نام، اِدھر اُدھر کی باتوں سے پرہیز فرما اور اپنا سفر بیان کر۔"

"یہ ان دنوں کا ذکر ہے" ——— کلاں گویا ہوا ——— "کہ جب یہ خاکسار نیا نیا جوان ہوا تھا۔ ان دنوں جے باد سندھی کہلاتا تھا۔ بعد میں جے۔ بی سندھی ہو گیا۔ اس علاقے میں کئی اور جے۔ بی۔ سندھی بھی تھے۔ چنانچہ کلاں کا اضافہ کیا۔ ناچیز کو فنونِ لطیفہ، فنونِ لطیفہ شناسی، فنونِ حرب و ضرب، فنونِ جمع تفریق میں خاصی شُد بُد تھی۔ موسیقی میں وہ مہارت تھی کہ شدھ سارنگ، شدھ کلیان، شدھ گمدھ وچ سب بخوبی گا سکتا تھا۔ لیکن طبیعت میں اس بلا کی سادگی تھی کہ ایک بھیڑیئے کو السیشن کتا سمجھ کر پکڑ لایا۔ اور کئی دنوں تک ساتھ ساتھ لئے پھرا۔ جب غلطی کا احساس ہوا تو ایک بھیڑ کے ہمراہ اسے رخصت کیا۔ سیب کے درخت کو تبھی پہچان سکتا اگر اس میں سیب لگے ہوں۔ ورنہ پھلوں یا پھولوں کے بغیر پودے اور درخت میرے لئے یکساں تھے۔ نصیبِ دوستاں علیل ہوا تو طبیب نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا۔ حقیر نے گلے میں باندھ لیا اور شفا پائی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ تعویذ نہ تھا، نسخہ تھا۔ ایک مرتبہ سرمہ ملنے پر حکیم جی سے دریافت کیا کہ اسے کھانا کھانے سے پہلے استعمال کروں یا بعد میں۔ لغت میں قیلولے کے معنے دیکھے تو ہکا بکا رہ گیا۔ برسوں دوپہر کے کھانے کے بعد سویا کیا۔ لیکن کبھی احساس تک نہ ہوا کہ ایسی معمولی سی حرکت کے نتائج قیلولے کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں۔ کہ قاف جس کا حلق میں فلک شگاف گونج پیدا کرتا ہے۔ جب فارغ التعلیم ہوا یعنی تعلیم نے مجھ سے فراغت پائی تو چند جاں نثاروں نے سیاست کی طرف رغبت دلائی۔ فدوی نے رجوع کیا۔ اور رات دوگنی دن چوگنی ترقی نصیب ہوئی۔ میری آتشیں تحریروں نے کئی جگہ لاٹھی چارج کرایا۔ متعدد مقامات پر جوتا چلا۔ کئی اخبارات ضبط ہو گئے۔ اس حیرت انگیز مقبولیت کی وجہ میرے جگری دوست تھے۔ جو بے حد معمولی صلے کے عوض یہ سب کچھ لکھ دیا کرتے۔ فلکِ کج رفتار کو میری شہرت ایک آنکھ نہ بھائی اور دفعتاً میری تحریریں تمام ہوئیں۔ چند ہی مہینوں میں خود غرض دنیا مجھے بھول گئی۔ محض میرے دوستوں کی وجہ سے۔"

"تو کیا آپ کے یہ دوست داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے ۔۔؟"

نہیں! ان میں سے ایک تو ضلعدار بن گیا اور دوسرا مجسٹریٹ درجہ سوم۔ کچھ دنوں کے لئے تو دنیا اندھیر معلوم ہوئی۔ پھر

شاعری کا شوق چرایا۔ محروم تخلص کیا۔ غزل میں ترنم کا یہ عالم تھا کہ شعر کی درست لے پر بھی تین تال بج سکتا تھا اور دلمپت سے پر بھی۔ غزل کے لئے اگر طبیعت غیر حاضر ہوتی تو آزاد نظم بڑی آزادی سے کہہ لیا کرتا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ محلسرا کے باہر جو بیچپلان کا بورڈ لگا ہوا تھا وہ کسی ضرورت مند نے چرا لیا۔ دروازہ نئے بورڈ سے مرصع کیا گیا۔ مجھے بغرضِ تبدیلیِ آب و ہوا خانیوال جانا پڑا۔ واپس لوٹا تو خطوط کا ایک پلندہ منتظر پایا۔ یہ سب تعزیت نامے تھے۔ حیران تھا کہ کس نے کس کی جان آفریں کس کے سپرد کی۔ جو بورڈ دیکھتا ہوں تو کاتب نے غلطی سے محروم کی بجائے مرحوم لکھ دیا تھا۔ اسی روز بورڈ بدلا۔ لیکن شہر بھر میں رسوا ہو چکا تھا۔ سندھی تخلص کرنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ شاعری ترک کرنا پڑی۔ پھر سوچا کہ اے مردِ باہمت شاعری گئی تو کیا ہوا اور بہت سے مفید مشغلے ہیں۔ اس ملک میں انسان کی اوسط عمر بیس بائیس سال ہے۔ تو یہ عمر کبھی کی گذار چکا۔ اب اپنے آپ کو مرحوم ہی سمجھ اور پیری مریدی کی طرف رجوع کر۔ ایک دفعہ نام چمک اٹھا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس ناچیز نے اس سلسلے میں بڑا مطالعہ کیا بہاول پور اور سندھ کے تکیوں میں بیشتر وقت گذارا۔ قابل فقیروں سے ٹریننگ حاصل کی۔ بھنگ سے بصیرت افروز ہوا۔ لیکن قسمت میں چکر لکھا تھا۔ کہ کسی ایک لائن کو مستقل نہ کر سکا۔ ایک دن اتفاق سے آلڈس ہکسلے، ورجینیا ولف، برٹرنڈ رسل کی کتابیں ایک کباڑیے کے ہاں اتنی سستی مل گئیں کہ خریدنا پڑیں۔ چونکہ خرید چکا تھا اس لئے ورق گردانی پر مجبور ہو گیا۔ اچھا بھلا بیٹھا تھا، اچانک بشارت ہوئی کہ تو انٹیلکچوئل ہے۔ اگرچہ یہ دُرِّ بے بہا خاکسار نے ورثے میں پایا تھا۔ تاہم خاندانی انٹیلکچوئل کہلاتے شرم آتی تھی۔ چنانچہ میں نے کافی ہاؤس جانا شروع کر دیا۔ پوشاک، غذا، ورزش اور حلیے سے لاپرواہ ہوتا چلا گیا۔ سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ پڑوسیوں سے بات کرنا تو ایک طرف ان کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتا۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ میری زندگی ایک انقلاب سے آشنا ہوئی۔ ایک چاندنی رات کو جب میں کافی ہاؤس سے لوٹا۔ تو ایک پرندہ بالکل میرے سر کے اوپر سے اڑ گیا۔ یہ واہمہ نہ تھا۔ تشویش ہوئی۔ کیونکہ مقامی پرندے بڑے سُست اور ڈرپوک تھے۔ اندھیرا ہو چکنے کے بعد کبھی نظر نہ آتے۔ دل میں یہ شبہ یقین پا گیا کہ ہو نہ ہو یہ پرندہ ہما تھا۔ اس مژدہ جانفزا سے روح کو سرور حاصل ہوا اور طبیعت کو کمال درجہ سکون یوں معلوم ہونے لگا جیسے سب کچھ ساکن ہے۔ زندگی میں تسلّی بخش راحت ہے۔ دنیا میں امن ہے اور میں انٹیلکچوئل ہوں!"

اچانک ایک سائنس دان دوست نے بڑی بڑی خبر سنائی کہ میں ساکن ہرگز نہیں ہوں۔ ہر چوبیس گھنٹے کے بعد زمین کی گردش کی وجہ سے تین سو ساٹھ ڈگری گھوم جاتا ہوں۔ فضاؤں میں کئی سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑا جا رہا ہوں۔ سورج کے گرد ہر سال بیس کروڑ میل کی مسافت طے کرتا ہوں اور کہکشاں کی جانب ڈیڑھ سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے جھکا جا رہا ہوں —— ادھر کی گردش اُدھر کی گردش، اس طرف اُس طرف، ہر طرف۔ رواں دواں۔ میرے کانوں میں تیز ہوا سے شوں شوں ہونے لگی۔ چکر پر چکر آنے لگا۔ فوراً ٹھیکہ شرابِ دیسی پہ پہنچا۔ (جہاں ہندوستانی شرفاء بیٹھ کر پی سکتے ہیں۔) جب باہر نکلا تو دنیا تاریک تھی۔ دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں شاہراہ پہ ڈھول کی آواز سنائی دی۔ ساتھ گھنٹی بج رہی تھی۔ دونوں کی ہم آہنگی اس قدر خوش الحان معلوم ہوئی کہ مردہ جسم میں جان پڑ گئی۔ میں لاشعوری طور پر پیچھے ہو لیا۔ جب چونکا تو اپنے آپ کو اکھاڑے میں پایا۔ غیر انٹیلکچوئل ہجوم کو دیکھ کر بہت گھبرایا۔ پہلوانوں نے طرح طرح کے پٹھے ساتھ بٹھائے ہوئے تھے۔ وہاں اپنے ماموں جان کو بھی دیکھا۔ (کہ خطاب جس نے پہلوان السندھ کا پایا تھا) وہ ایک ہاتھ ہوا میں اٹھائے ایک ٹانگ پہ ناچتا ہوا اکھاڑے کا طواف کر رہا تھا۔ اس کا بیٹا پیچھے پیچھے تھا۔ غالباً میں نے اپنے عم محترم کا ذکر نہیں کیا۔ کہ گھر اس کا ایک بیسویں صدی کی امریکن طرز کی محلسرائے تھی جس کا نقشہ ملکِ فرنگ کے ایک ذی فہم زیرک کاریگر نے تیار کیا تھا۔ اس کے دروازے پر بیک وقت تین چار موٹریں (کہ اہلِ فرنگ کی صناعی و جادوگری کا حیرت انگیز ثبوت ہیں) کھڑی جھومتی تھیں۔ وہ احتشام وہ دبدبہ وہ طمطراق تھا کہ انٹیلکچوئل جب سامنے

سے گذرتے تو منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ ویسے یہ مردِ طرار ناپ تول کا پورا تھا۔ فنِ ترازو طرازی میں اس کا دور دور تک شہرہ تھا۔ اس کے دروازے پر محتاجوں اور ضرورت مندوں کا ہمیشہ اژدہام رہتا۔ کیونکہ آٹے اور چینی کا راشن اس کے اختیار میں تھا۔

کشتیاں ختم ہوئیں تو ماموں جان کی نظر اس طرف پڑ گئی۔ اس نے گردن سے آ دبوچا۔ زور سے دھپ لگا کر بولا —— سنا بے گیدی یہاں کہاں پھر رہا ہے کہ مقام تیرا کافی ہاؤس اور مریل نوجوانوں کی محفل ہے۔ ایسی جگہ آتے ہوئے اپنے تئیں شرم محسوس نہیں کرتا۔ یہ کہہ کر وہ تو پہلوانوں کے غول کے ساتھ سوئے ڈیرہ روانہ ہوا اور اس فقیر کو کمال خفت اٹھانی پڑی۔ سوچنے لگا۔ یہی مردک کبھی تانگے کے گھوڑے کی طرح لاغر تھا۔ خدا کی شان کہ ڈیرہ ملتے ہی اس قدر توانا ہو گیا کہ فیل بھی دیکھے تو بغیر پانی مانگے شرم سے ڈوب مرے۔ اور اس پر ایسی گفتگو —— واللہ یہی جی چاہتا تھا کہ سڑک پر دراز ہو جاؤں۔ اور اپنے آپ کو جاں بحق تسلیم کروالوں یکایک ایک صدائے روح پرور سنائی دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوش پوشاک نوجوان (جو فقط ایک لنگوٹے سے مرصع تھا) ڈھول پر رقصاں ہے۔ بس پہ اس خاکسار کے پاپوشوں کو حرکت ہوئی۔ یہ حرکت آہستہ آہستہ تمام جسم میں حلول کر گئی۔ یہاں تک کہ ضبط نہ رہا۔ اور یہ حقیر اس قلندرِ خوش لباس کے پیچھے ہو لیا۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ ڈھول والے کی کمر پر ایک بورڈ ہے۔ چشم زدن میں چشمہ (جو ماموں جان کے دھپ سے اتر گیا تھا) جیب سے نکالا آہ سرد بھری جس سے شیشوں پہ چند قطرے نمودار ہوئے۔ قمیص سے عینک صاف کر کے ناک پر رکھی تو آنکھوں کو وہ تقویت پہنچی کہ بیان جس کا احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ بعد از مطالعہ انکشاف ہوا کہ وہ ریڈیم ٹانک پلز کا اشتہار تھا۔

عمِ محترم کا وہ طعنہ جو اس ناچیز کی صحت پر کھلم کھلا حملہ تھا تیر کی طرح پیوست ہو چکا تھا۔ قصدِ انتقام کا یہ نیاز مند کر چکا تھا۔ ایک دن ماموں جان نے اپنی دکان پر کسی کو چینی دینے سے معذرت چاہی۔ کیونکہ حقیقتاً اتنی چینی بچ رہی تھی۔ جو اس کے احباب کے لئے درکار تھی۔ اس نے گاہک کو اپنی شیریں بیانی سے خوش کرنا چاہا۔ لیکن وہ شخص کہ شرارت کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ کاغذ کا ایک پرزہ دکھا کر تلاشی لینے کا متلاشی ہوا۔ عین اس وقت جب وہ مفسد دکان کے اندر گیا عمِ محترم اپنی بیوک میں بیٹھ کر محلسرا پہنچے اور خواجہ سرا سے رختِ سفر بندھوا کر سرحد کا قصد کیا۔ لیکن سب انتظامات پہلے مکمل ہو چکے تھے۔ ماموں جان کو روک لیا گیا۔ اور سرکاری مہمان خانے میں (کہ اس ملک میں جیل کہلاتا ہے) قیام و طعام کا بندوبست دو روز تک رہا۔ اتنی دیر میں بلند مرتبہ اور عالی مقام حضرات کی سفارشیں پہنچ چکی تھیں۔ چنانچہ جب اسے قاضی صاحب کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے فقط پہلوان السندھ کا خطاب واپس لے کر چھوڑ دیا۔

ماموں جان کو اس صدمے نے نڈھال کر دیا۔ کیونکہ اسے پہلوانی اور سیاست بے حد عزیز تھے۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ دو چیزیں تھیں۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ پہلوان السندھ کوئی ایسا بڑا خطاب نہیں جس کے لئے جان ہلکان کر لی جائے آپ پہلوان الہند بن سکتے ہیں۔ جیسا کہ فاضل اجل علامہ اقبالؒ فرما گئے ہیں —— ’ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں‘۔

میرا ماموں اس پر پھڑک اٹھا اور کہنے لگا۔ ”واہ واہ۔ مگر برخوردار اس کا اگلا مصرعہ کیا ہے؟ وہ غالباً میرے حق میں زیادہ مفید ہوگا۔“

”دوسرا مصرعہ اے محترم عشق کے امتحانوں کے متعلق ہے۔“

”واہ، تو عشق کے امتحان بھی ہوتے ہیں۔ کون سی یونیورسٹی لیتی ہے؟“

میں نے اس مردِ جاہل سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ گو یہ شخص عم اس ناشدنی کا تھا۔ بزرگوں کا ادب

پاس حکمِ خداوندی ہے۔ مگر جہالت اس کے چہرے پر پرُن کی طرح یوں برستی تھی کہ اس ناچیز کو اس کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوتی۔

"عشق" کے امتحانوں کے متعلق کیا فرما گئے ہیں علامہ؟" اس نے اصرار کیا۔

"یہ دوسرا مصرعہ اے عمِّ محترم آپ جیسے پیرِ فرتوتوں کے لئے نہیں، مجھ جیسے نوجوانوں کے لئے ہے، بہتر ہوگا کہ آپ پہلے مصرعے کا ہی اپنے اوپر انطباق کریں۔" میں نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"مجھے ستاروں سے قطعاً دلچسپی نہیں"۔ (وہ آہِ سرد کھینچ کر بولا) "مگر دوسری چیز عشق بالکل میری لائن میں ہے۔ اور برخوردار تو گستاخ ہوتا جا رہا ہے"۔

اس نے اپنی انگلی کا ٹھینگا بنا کر میرے سر کے مختصر سے گنج پر مارا، نہایت مترنم آواز نکلی جو کانوں کو بھلی معلوم ہوئی۔ لیکن خودداری نے لعن و ملامت شروع کر دی۔ یہی خیال آتا تھا کہ ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں۔ پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر سٹیشن پہنچا۔ معلوم ہوا کہ صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ پھر سوچا کہ اے مردِ مجہول! کیوں اپنے ماموں سے ڈرتا پھرتا ہے۔ طاقتور بن اور اس کا مقابلہ کر۔ اس دن سے میں نے کافی ہاؤس جانا ترک کر دیا۔ اور ساری کتابیں ایک بھٹیارن کے حوالے کیں کہ وہ بقدرِ ضرورت استعمال میں لاوے۔ اور ریڈیم ٹانک پلز کھانے اور مگدر گھمانے میں زندگی بسر کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ ڈنڑ پیلنے کے بعد تین گولیاں کھاتا، لنچ تک بیٹھکیں نکالتا۔ لنچ پر چار گولیاں۔ پھر ڈنڑ اور مگدر، رات کو پانچ گولیاں۔ ہفتہ گذرا ہوگا، یقین جانیئے۔ بدن سے شعاعیں نکلنے لگیں۔ اندھیری سے اندھیری رات میں بغیر روشنی کے چل پھر سکتا۔ طاقت کا ایک سمندر تھا کہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ آٹھویں دن خواہش پیدا ہوئی کہ شیر ببر پر سواری کی جائے۔ لنگوٹا کس کر چڑیا گھر پہنچا۔ مگر شیروں کو پنجروں میں دھاڑتے دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ اس کے بعد خیال ہوا کہ کیوں نہ عمِ محترم کی خبر لی جائے۔ چنانچہ اسی لنگوٹ میں ماموں کی محلسرا پہ پہنچا۔ نوکر چاکر ڈر کر بھاگ گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماموں بسترِ استراحت پر بصد خضوع و خشوع دعا مانگ رہا ہے۔ کہ اے باری تعالیٰ میرے اس نابکار بھانجے کو توفیق دے کہ کافی ہاؤس جانا ترک کر دے۔ اور اپنی روزی خود کمانے لگے۔ مجھے بھی یہی توفیق دے۔ ہم سب کو یہی توفیق دے۔ میں اب بالکل سیدھا ہو گیا ہوں۔ تیری شان ہے کہ جس کی ڈیوڑھی پہ پیکارڈ اور کیڈی لک جھومتی تھیں وہاں اب گدھا تک نظر نہیں آتا۔ خداوندِ تعالیٰ کہیں مجھے کسی انٹلکچوئل کی بددعا تو نہیں لگی ـــ"

"بس بس اے مردِ بدبخت اُٹھ! میں نے تیرے فیل تن ہونے کا راز پا لیا ہے۔ اور خبردار جو کسی انٹلکچوئل کو برا بھلا کہا ہے تو۔ خبردار جو کسی کو بھی بُرا بھلا کہا ہے تو۔ کیا ہم سب ایک جیسے نہیں! سب برابر نہیں۔ میں برابر ہوں برنارڈ شا کے۔ برنارڈ شا برابر ہے کنفیوشس کے کنفیوشس مساوی ہے ابن بطوطہ کے ـــ"

اے عزیز از جان بھانجے، آج سے مجھے اپنا ساتھی سمجھ۔ تیرے حق میں جو دعا کی تھی وہ میں واپس لیتا ہوں ـــ" اس نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

دفعتہً مجھے محسوس ہوا کہ صحت کے ساتھ ساتھ میرے عقیدے بھی بدل چکے ہیں۔ مجھے انٹلکچوئل پنا دوبھر دکھائی دینے لگا۔ کہ اس طبقے میں رہنا بڑا مشکل ہے۔ انہیں لوگ سمجھتے نہیں ہر وقت مذاق اڑاتے ہیں۔ سارا جیب خرچ طبیبوں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ کیونکہ صحت اس طبقے کی نہایت خستہ ہوتی ہے۔ ملازمت کے لئے انٹرویو میں جاؤ تو آسان سے سوالوں کے مشکل جواب سن کر ممبروں کو احساسِ کمتری ہو جاتا ہے۔ اور وہ خواہ مخواہ فیل کر دیتے ہیں۔ ویسے پبلک حلیہ دیکھ کر ہی ڈر جاتی ہے۔ الغرض ان لوگوں کو سوائے ہوا پھانکنے کے

اور کچھ میسّر نہیں آتا۔ اور ہوا میں غذائیت نہیں۔ سچ پوچھو تو ارادہ اس خاکسار نے اس روز بدلا جب عیدگاہ میں دو بزرگوں کو بغل گیر ہوتے دیکھا۔ دونوں بھینگے تھے مگر بلا کے انٹیلکچوئل تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، ہاتھ پھیلائے، مسکرائے، زیر لب کلماتِ خوشگوار لائے۔ ایک دوسرے کے برابر سے نکل گئے۔ جب غلطی کا احساس ہوا۔ تو نعرے بلند ہوئے ——"کہاں چلے گئے؟"——'میں تو یہاں ہوں اور تم؟'——'یہ رہا'——

مڑے اور بغل گیر ہونے کے قصد سے واپس لوٹے۔ لیکن اس مرتبہ پھر نشانہ خطا گیا۔ تیسری مرتبہ بغلگیری پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

رات کو اس نیاز مند نے ایک خواب دیکھا کہ اپنے ایک انٹلکچوئل استاد سے بغل گیر ہوتے وقت جو کمر پر ہاتھ پھیرتا ہوں تو چونک پڑا۔ ان کی دم غائب تھی۔ جاگا تو عبث شرمندہ ہوا۔ اسی دن سے میں نے اس انٹیلکچوئل پنے بلکہ PSEUDO INTELLECTUAL پنے سے کنارہ کشی کر لی —— بھئی تو سن رہا ہے اونگھ رہا ہے"۔

"نہیں تو——" جہاز باد خورد دفعتہً جاگا۔

"اچھا بتا میں کیا کہہ رہا تھا——؟"

"جہاد باد جندی، رہاز بہاد رندی، نہاز باد نندی ——"

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیئر کا اثر ہے——"

"ہرگز نہیں! یہ سفر ہی بہت لمبا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ پیدل طے کیا گیا تھا۔ اور یا ہمدم وہ پرندہ کون سا تھا جو آپ کے سرِ مبارک کے اوپر سے گذرا؟"

"اے ہمدم نہائت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پرندہ وہ بوم تھا کیونکہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ وہ اس حقیر کے سر پر سے گزرا۔"

کرنا تمام پہلا سفر جہاد باد سندھی کلاں کا، رخصت ہونا جہاز باد سندھی خورد کا، ساتھ وعدہ آنے کے اگلے روز بغرض سماعت سفرِ دوم۔

اگلے روز جب محفل منعقد ہوئی تو اس میں صرف دو حضرات، شامل تھے۔ خورد اور کلاں۔ ہر چند کہ کلاں نے شہزادے شہزادیوں کا بے صبری سے انتظار کیا۔ بارہا ٹیلیفون کیا۔ لیکن مایوسی ہوئی۔ ناچار چائے منگوائی۔ خورد چائے دیکھ کر نہائت غمگین ہوا اور یہ مصرعہ زبان پر لایا چاہ را کن چاہ در پیش —— لیکن کلاں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور بولا——

جہاز باد سندھی کا دوسرا سفر

حسینوں سے فقط صاحب سلامت دُور کی اچھی
نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دوستی اچھی

اے عزیز از جان ہم نام ایک دن چوک میں میں نے ایک شخص کو ہجوم کے سامنے تقریر کرتے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ سب لوگ برابر ہیں، سب عورتیں برابر ہیں۔ سب بچے ایک سے ہیں۔ لہٰذا سب کو برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ زندگی آسان ہو سکتی ہے بس میں سفر کیجئے، ساڑھے چار آنے میں سیکنڈ شو دیکھئے۔ اندھیرا ہو جانے پر اندر آ جائیے —— اور روشنی ہونے سے پہلے باہر نکل آئیے۔ میونسپلٹی

نے کہیں کہیں ریڈیو نصب کیے ہیں۔ اور ان پر موسیقی (جو اسی فیصدی فلمی ریکارڈوں پر مشتمل ہے) اور خبریں سنی جا سکتی ہیں۔ بک سٹال پر کھڑے ہو کر ذرا سی دیر میں تازہ رسائل اور نئی کتب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ایک لمبے سے اوورکوٹ سے سردیاں نکل سکتی ہیں اور دو رنگین بش شرٹوں سے گرمیاں، ذرا سی خوشامد سے بآسانی محبت کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ مت بھولئے کہ سب لڑکے ایک جیسے ہیں۔ اور سب لڑکیاں ایک سی ہیں۔ مثال کے طور پر روس میں ——"

"وہ روس کا ذکر زبان پر لایا تو مجھے شبہ سا ہوا۔ اگرچہ معلومات اس احقر کی روس کے بارے میں نہایت محدود ہیں۔ تاہم بحث کرنی ہو تو گھنٹوں بول سکتا ہے۔ اسے ہم نام خورد نیرا روس کے متعلق کیا خیال ہے؟

"اسے ہم نام کلاں معلومات تو میری بھی ایسی ویسی ہیں۔ اگرچہ میں نے گراؤچو مارکس کی لکھی ہوئی مشہور و معروف کتاب 'سرمایہ داری' پڑھی ہے ——"

"نہیں یہ کتاب کارل مارکس نے لکھی ہے۔"

"تو وہ بھی تو مارکس برادرز میں سے ہوگا —— مارکس برادرز کو ماشاءاللہ کون نہیں جانتا۔"

"خیر تو میں تقریر سنتا رہا۔ اس نوجوان کے بعد ایک شہزادی نے تقریر شروع کر دی۔ خاکسار نے تقریر سے زیادہ شہزادی میں دلچسپی لی معلوم ہوا کہ اس پارٹی میں چند شہزادیاں بھی ہیں۔ ان میں سے دو تین شہزادیاں تو واللہ خوب تھیں۔ ناچیز نے چشم و دل کو ان کی دید سے تر و تازہ پایا۔ اور اپنے تئیں اس ٹولی میں شامل ہونے پر آمادہ پایا۔

لیکن پتہ چلا کہ شامل ہونا آسان نہیں۔ کافی چھان بین کے بعد یہ لوگ اپنے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ بڑی کوشش کے بعد میں نے ان کے سرپرست کا کھوج نکالا۔ کسی نے بتایا کہ ان کے بچے سبزی ہائے تازہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ طبیبوں کا اصرار ہے کہ سبزیاں بچوں کی بہبودی کے لئے ازحد اشد ہیں۔ ادھر بچے ہیں کہ نباتات، جمادات اور معدنیات سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ لیکن سبزیوں کو چھوتے تک نہیں۔ میں نے ان حضرت سے مل کر اس مہم کا بیڑا اٹھایا۔ چند گاجریں تکیوں کے نیچے رکھ دیں۔ کچھ ٹماٹر بالائے طاق رکھے۔ شلجم کتابوں کے نیچے چھپا دیئے۔ بچوں کو جب یہ چیزیں فرداً فرداً ملیں تو سمجھے کہ انہوں نے چرائی ہیں۔ خوب سیر ہو کر کھائیں۔ ان کے ابا نہایت خوش ہوئے اور گلہ اپنے پیارے کتے کا کرنے لگے۔ جو علیل تھا۔ مگر دوائی پینے سے احتراز کرتا۔ میں نے پہلے تو دوائی اس سگِ نابکار کے دہن میں انڈیلنا چاہی جب اس نے متواتر نارضامندی کا اظہار کیا تو شیشی فرش پر پٹخ دی۔ بس پھر اس سگِ ناعاقبت اندیش نے زبان سے ساری دوائی چاٹ لی اور کیفرِ کردار کو پہنچا۔ وہ حضرت کمال درجہ مہربان ہوئے اور بولے —— "اے مردِ عاقل تو دولتِ نفسیات سے مالا مال معلوم ہوتا ہے۔ بتا کیا مانگتا ہے؟"

میں نے آرزو بیان کی کہ کاش کہ مستقل طور پر آپ کی صحبت سے ذوق حاصل ہوتا۔ الحمدللہ کہ اس مردِ گرامی نے مجھے اپنی جماعت میں شریک فرمایا۔

ایک ایک دن عیش و کامرانی میں گذرتا۔ ہم سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک سگرٹ کا ٹین کھولتا سب اس پر ٹوٹ پڑتے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے کپڑے، چیزیں، روپیہ، استعمال کرتے۔ ویسے ہم لباس اچھا پہنتے تھے۔ لیکن جب کام پر جانا ہوتا تو نہایت سادہ اور کھردرا سا لباس ہوتا۔ ایک خاص قسم کے سستے کپڑے کا بنا ہوا۔ سر پر ایک عجیب سی ٹوپی ہوتی۔

واسکٹ اور چپلوں کا استعمال بھی ضروری تھا۔ ہمارا کام آسان تھا۔ کتابیں اور کتابچے تقسیم کرنا، پوسٹر لگانا، خاص خاص جلسوں میں تقریر کرنا جہاں کوئی کھیل تماشہ ہو، بہت سے لوگ جمع ہوں وہاں شور و غل مچا کر رنگ میں بھنگ ڈال دینا۔ اس کے لئے ہمیں معاوضہ ملتا تھا۔ ہمیں اپنی ٹولی کے ممبروں کے علاوہ ہر شخص سے بھی بُغض تھا۔ مگر یہ خاکسار محض شہزادیوں کے لئے شریک ہوا تھا۔ اس لئے زیادہ نہ سیکھ سکا اور ویسے کا ویسا رہا۔ آگ خشک و تر کو یکساں جلاتی ہے۔ شہزادیوں کے قرب نے خرمنِ صبر و شکیب پر کچھ اچھا اثر نہیں کیا۔ یہ فقیر ان میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ شہزادیوں نے سردیوں میں تو خوب تبلیغ کی، گرمیاں آئیں تو تیز دھوپ سے ان کی رنگت سنولانے لگی۔ ہر جگہ پنکھوں اور برف کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ موٹر بھی کئی بار پنکچر ہوتی اور پیدل چلنا پڑا۔ شہزادیوں کو شکایت تھی کہ باشندوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے۔ ادھر ہم کتنے تھوڑے ہیں لوگ ان پڑھ ہیں سمجھتے نہیں بلکہ اب تو لوگ ہم سے چڑنے لگے ہیں۔ بھلا اور شہزادیاں ہماری طرح خدمت کرنے کیوں نہیں نکلتیں۔ اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ پھر ایک روز ہم نے سنا کہ ایک شہزادی نے خان بہادر قلندر بیگ سے شادی کر لی ہے۔ حالانکہ خان بہادر موصوف کی گذشتہ سے پیوستہ سب بیویاں صحیح سلامت تھیں۔ دوسری نے ایک رائے بہادر کو چنا، جو سب کی رائے میں کافی بزرگ تھے۔ جن کی بیوی کے متعلق افواہیں اڑ رہی تھیں کہ مرنیاش ہو چکی ہیں۔ یا ہونے والی ہیں۔ یہ تازہ شگوفہ جو پھوٹا تو یہ ناچیز ساری چوکڑی یک دم بھولا۔ لیکن پھر سوچا کہ شہزادیوں پر بھروسہ کرنا دلیل حماقت ہے۔ ان کی استقامت کا دم بھرنا عینِ جہالت ہے۔ یکایک تیسری شہزادی نے ایک دولتمند زمیندار سے عقد کیا جس نے فوراً دو مربعے بیچ کر ایک پیکارڈ خریدی، الغرض خزاں سے پہلے ساری شہزادیاں ٹھکانے لگیں۔ ان میں سے ایک بے وفا کو میں نے لکھ کر بھیجا ؎

ع۔ جو کیا تھا وعدہ نکاح کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

جواب آیا ؎

بہت دنوں کے تغافل نے تیرے پیدا کیا
وہ اک نکاح جو بظاہر نکاح سے کم ہے

ہم طرح طرح کی آزادیاں چاہتے تھے، سوچنے کی آزادی۔ جو جی میں آئے کر گزرنے کی آزادی۔ ایک آزادی نے اس خاکسار کو کمال ذلیل و خوار کیا۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سربازار اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ سب دیکھتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ قریب جا کر نصیحت شروع کی ہی تھی کہ نوجوان نے ترچھا وار کر کے ایک میرے پاؤں پر بھی جڑ دی۔ دو ماہ ہسپتال میں پڑا رہا۔ قصور نہ میرا تھا نہ اس کا — میں نے آزادیٔ گفتار دکھائی تھی اور اس نے آزادیٔ کردار۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک عجیب خواب اس ناشدنی کو نظر آیا۔ ایک رات سویا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑا جنگل میں سے گذر رہا ہے۔ یکایک آہ سنائی دی۔ حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد آہ پھر سنی، دوسری بار حیران ہوا۔

”میں نے بھری ہے“ — گھوڑے نے بڑی سلیس اردو میں کہا۔ ”اور میں کیوں نہ بھروں۔ میں بھی تو جاندار ہوں۔ منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ تم انسانوں کے لئے تو حقوق مانگتے ہو۔ جانوروں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ ڈاروِن کی تھیوری کے مطابق ہم سب ارتقا کی مختلف منزلوں پر ہیں۔ ہمارا ماخذ ایک ہے۔ لہٰذا ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ اے میرے کزن! میں تھک گیا ہوں، اب

تم گھوڑے ہو اور میں سواری کرونگا ——"

چار و ناچار اس حقیر کو گھوڑا بننا پڑا۔ باری باری ہم نے سواری کی۔ جنگل سے باہر نکل کر خیال آیا کہ اگر وہ دونوں ساتھ ساتھ پیدل چلتے تو بہتر تھا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اپنے کزن سے دریافت کیا کہ اگر وہ انسان بننا چاہے تو کسی ماہرِ نفسیات سے ملکر آٹو سجیشن کا انتظام کرایا جائے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ بولا۔ ان دنوں تانگے کے گھوڑوں کو چھوڑ کر بقیہ گھوڑوں کی پوزیشن انسان کی پوزیشن سے بدرجہا بہتر ہے

صبح جاگا تو بڑا پریشان ہوا۔ اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ تانگے میں بیٹھنے سے احتراز کرنے لگا۔ اور کوئی سواری میسر نہ تھی۔ نقل و حرکت محال ہو گئی۔ سائیکل چلا چلا کر برا حال ہوا تو عقیدے بدلنے پڑے۔ ادھر شہزادے بھی تتر بتر ہو گئے۔ کچھ رجواڑوں میں جا بسے ایک دو ایکٹر بن گئے۔ باقی کے ریڈیو میں ملازم ہو گئے ایک رہ گیا تھا۔ اسے ہر وقت یہ وہم رہنے لگا کہ ؎

شاید کہ پولیس خفیہ باشد

وہ بھی سنا کہ نائب تحصیلدار بن گیا —— اس کے ساتھ میرا دوسرا سفر تمام ہوا۔ عزیز القدر ایسی نگاہوں سے الماریوں کی طرف مت دیکھ کہ موم بھی پتھر بن جائے۔ مجھے احساس ہے کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ آج دیسی شراب منگائی ہے کہ جلو میں آ تو گستاخی کر

اگلے روز جب خاتونِ شب نے چادرِ سیاہ میں رُخِ انور چھپایا اور شاہِ خاور نے اورنگِ سپہر پر جلوہ فرمایا۔ (یعنی جب صبح ہوئی) —— تو دونوں جہاز بادوں کو آرام کرسیوں پر سوتا پایا۔ کہ ساتھ ان کے چند خرگوش بھی خوابیدہ تھے۔ آنکھ کھلنے پر غنچۂ صبح کھلکھلایا۔ مرغانِ خوش الحان کی ترانہ سنجی سے کانوں نے لطفِ مزید پایا۔ جہاز باد کلاں شرمایا اور زبان پہ یہ کلمے لایا ——

"اے مردِ نیک طینت! بادۂ دیسی نہایت تیز نکلا۔ اب تک حالت خستہ ہے۔ آج اچھی طرح اس شعر کے معنی سمجھ میں آئے ہیں ؎

جو آج پی ہو تو ساقی تمام شے پی ہو
یہ کل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی ہے

"یہ بتا کہ تیرے عزیز و اقربا تیرا انتظار تو نہ کرتے ہونگے۔ شاید تھانے میں پوچھنے گئے ہوں ——"

"میں خدا کے فضل و کرم اور آپ کی دعا سے ناکتخدا ہوں، تو پھر سناؤں تیسرا سفر ——؟"

"ذرا صبر فرمایئے، سمندِ کلام کو زیرِ لگام لایئے۔"

اتنے میں ملازم نے مژدۂ جانفزا سنایا کہ چھوٹا حاضری تیار ہے۔ جہاز بادِ کلاں ضبط نہ کر سکا۔ اور یوں گویا ہوا۔

جہاز بادِ سندھی کا تیسرا سفر

؎ "دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

اے مردِ مخلص! میں موسمِ گرما گذارنے ملتان کے مرغزاروں میں گیا۔ وہ سرزمین جو رنگین مزاجوں کے لئے عشرت افزا اور درویشوں کے لئے دلکشا خلوت کدہ ہے۔ جب کچھ عرصہ خوش وقت ہو کر واپس لوٹا تو ایک نیا نام سننے میں آیا جس سے کان

قطعی طور پر نا آشنا تھے ـــــ یہ نام تھا ترقی پسندی۔

معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری میں ایسی خوشگوار ہوا چلی کہ بچہ بچہ ترقی پسند بن گیا۔ شاعری ترقی پسند ہوئی۔ ادب ترقی پسند بنا سارا ملک ترقی پسندی کے گن گا رہا تھا۔ یہ غلام بہت خوش ہوا۔ ترقی کون نہیں چاہتا بہت سے احباب جو ملازم تھے۔ ترقی کے لئے مدتوں سے کوشاں تھے۔ یہاں تک کہ کئی مرتبہ بیش قیمت تحائف بھی دے چکے تھے

نوجوان تو اس تحریک کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ترقی پسندی کو اپنے نام کے ساتھ بطور ڈگری استعمال کرنے لگے۔ تعارف کراتے وقت ذکر کیا جاتا کہ فلاں ترقی پسند ہے یا نہیں۔

ادھر ترقی پسند ادب کا مارکیٹ بڑے زوروں پر تھا۔ یہاں تک پبلشرز اور ایڈیٹروں نے حد بندی مقرر کر دی اور ترقی پسند رسالوں اخباروں میں صرف ترقی پسند چیزیں ہی چھپ سکتیں۔

اس فدوی نے بڑے شوق سے اس نئے ادب کا مطالعہ کیا۔ اور اسے بےحد عام فہم پایا۔ ہر کتاب دوسری کتاب سے ملتی تھی۔ تمام افسانے ایک جیسے تھے۔ ساری غزلیں ایک سی تھیں۔ تھوڑے سے مطالعے کے بعد اتنی خود اعتمادی آ گئی کہ افسانے کا آغاز پڑھ کر انجام بتا سکتا تھا۔ غزل کا مطلع سن کر پیشین گوئی کر سکتا کہ بقیہ اشعار میں کیا ہوگا۔ لوگ بڑی سرعت سے ادیب اور شاعر بن رہے تھے۔ جن حضرات کو میں سڑکوں پر سارا دن گھومتے یا کافی ہاؤس میں گپیں ہانکتے دیکھا کرتا اب اس نئی دنیائے ادب میں نام پیدا کر چکے تھے۔

یہ حقیر شاعری تو کر چکا تھا۔ لہٰذا ادیب بننے کا شوق چرایا۔ چنانچہ اسی دھن سے ساز ملا کر اسی لئے میں الاپنا شروع کر دیا۔ میری چیزوں پر ترقی پسند حلقوں میں تو واہ واہ ہوئی لیکن کچھ لوگ خواہ مخواہ لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے۔ معلوم ہوا کہ ان دنوں دو مختلف کیمپ بن گئے ہیں جو ایک دوسرے کے سامنے مورچہ باندھے منتظر رہتے ہیں۔ میں کچھ حیران ہوا۔ اور ایک بہت بڑے ترقی پسند سے ملا۔ پوچھا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ لکھنے کے لئے کسی ایک کیمپ میں رہا جائے۔

اس نے بتایا کہ یہ بےحد ضروری ہے۔

میں نے کہا ـــــ لیکن ان دونوں کیمپوں میں ہر وقت تو تو میں میں ہوتی رہتی ہے یہ مجھے پسند نہیں۔ کیا کوئی غیر جانب دار رہ کر نہیں لکھ سکتا؟"

وہ بولا ـــــ اگر آپ غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں تو لکھنا چھوڑ دیجئے۔"

چنانچہ یہ حقیر نقاد بن گیا۔ اس میں بھی ایک راز مضمر تھا جو ابھی بتاؤں گا ـــــ ترقی پسندی کا فلسفہ کچھ مشکل نہ تھا ـــــ اپنے جیسے لوگوں کی سدا تعریفیں کرنا۔ جو لوگ لکھنے لکھانے کے علاوہ روزی کمانے کے لئے محنت کرتے ہیں انہیں ادب کا دشمن قرار دینا۔

افسانہ، مقالہ، غزل ـــــ سب کے لئے سانچے موجود تھے۔ چنانچہ ترقی پسندی کا لیبل لگانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ صرف ان مسائل پر قلم اٹھایا جائے جن پر اس تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تنقید کرتے وقت نہ میں پلاٹ کو جانچتا، نہ مصنف کے پیغام کو۔ نہ پیغام کی افادیت کو۔ ہر چیز میں وہی جانے پہچانے موضوع، وہی مقررہ ترکیبیں اور الفاظ ڈھونڈتا، اگر مل جاتے تو ترقی پسندی کا ٹھپہ لگا دیتا ورنہ مصنف کو گمراہ کرنے والا سرمایہ دار، تنزل پسند اور نہ جانے کیا کیا کہتا۔"

"آپ نے فرمایا تھا کہ نقاد بننے کی وجہ تسمیہ بیان کریں گے ـــــ" خورد نے بات کاٹی۔

ہاں تو بات دراصل یہ تھی کہ اس عفی عنہ کو چند افسانہ نگار اور شاعر شہزادیاں پسند تھیں، ان میں سے دو ایک کو تو میں یونہی سے جانتا تھا۔ اور کئی سال سے لگاتار ان پر فریفتہ تھا۔ لیکن انہوں نے میرا اتنا سا بھی نوٹس نہیں لیا۔ لکھتی وکھتی یہ ایسا ہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر ان کی تعریف کرنے لگوں تو شاید ملتفت ہو جائیں۔ موقعہ بھی تھا چنانچہ میں نے ان کی تخلیقات کو سراہنا شروع کر دیا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے ٹھوس مضامین میں ان کی تعریفیں کرتا۔ لیکن تعجب ہوا کہ یہ مدح سرائی رائیگاں گئی۔ کسی سے پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہزادیوں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ مجھے شبہ ہوا۔ ادھر ادھر پوچھنے پر انکشاف ہوا کہ انہوں نے کیا کسی نے بھی نہیں پڑھا۔ ایسے مضامین یہاں کوئی نہیں پڑھتا۔ کیونکہ انہیں خشک اور ثقیل سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی نقادوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے:"

"ان کیمپوں کا کیا بنا؟"

"بتاتا ہوں، سُن ـــ یوں تو ہر تحریک کچھ عرصے کیلئے مقبول ہو جاتی ہے لیکن اس نام سے خواہ مخواہ خوش فہمی تھی کہ اب ہر چیز میں ترقی ہو گی۔ حالات سدھر جائیں گے۔ انسان ترقی کرے گا۔ دنیا بہتر ہو جائے گی ـــ لیکن آہستہ آہستہ مایوسی چھانے لگی۔ ادب بالکل جزو لازم بن کر رہ گیا۔ آج کوئی بات ہوئی، اسی ہفتے اس پر نظم لکھ دی گئی یا افسانہ، اگلے مہینے کتاب۔ لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کا پیرہن زرا کاغذی تھا۔ اس تحریک کا مقصد تخریب تھا، تعمیر مفقود تھی۔ یہ ہیرو نہیں تھے۔ پبلک اب تک غلط گھوڑوں پر BETTING کرتی رہی تھی۔ ان کی زندگی عمل سے خالی تھی۔ ان کا نظریۂ حیات مریضانہ اور قنوطی تھا۔ یہ چاہتے تھے کہ ہر پڑھنے والے کو مالیخولیا ہو جائے ادب کسی خاص طبقے کی میراث نہ ہوا ہے نہ ہو گا۔ چنانچہ لوگ اس وقتی ہنگامے سے تنگ آ گئے۔ اور ادب سے ایسے بدگمان ہوئے کہ انہوں نے فلمی رسالے پڑھنے شروع کر دیئے۔ فلمی رسالے تو فراری ادب میں بھی شامل نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ایک عجیب و غریب ادب نے جنم لیا ـــ موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد حضرات نے تاریخی اور مذہبی ناول لکھنے شروع کر دیئے۔ جو ہاتھوں ہاتھ بکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بور ہو رہے ہیں ـــ"

"جی نہیں، بور تو نہیں ہو رہا ـــ" خورد جمائی لے کر بولا۔ "فراری ادب پر مجھے ایک چشم دید واقعہ یاد آ گیا۔ طے ہوا کہ ہمارے ضلعے کے جیل میں قیدیوں کو اخلاقی کتابیں پڑھائی جائیں۔ داروغۂ جیل اتفاق سے رجعت پسند تھا۔ سب کتابیں فراری ادب پر سے آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو مہینوں کے اندر اندر سارے قیدی فرار ہو گئے"

"خیر تو یہ کمترین بدستور ترقی پسند رہا محض ایک ماہ پارہ کے عشق کی وجہ سے۔ اس بُتِ طناز کو میں نے مینا بازار میں دیکھا۔ میں اپنے دو سپنیل کتے ٹہلنے جا رہا تھا کہ خیال آیا کہ ذرا مینا بازار کا نظارہ کر لوں۔ ایک سٹال پر کچھ خریدنا چاہا لیکن دونوں ہاتھوں کو گھرا پایا۔ ایک حسینہ پر تمکین کو قریب پا کر کتوں کی زنجیریں اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔ جب خرید سے فراغت ہوئی تو حسینہ مذکورہ سے کتے طلب کئے۔ اس نے کمال بھولپن سے کہا۔ "ایک کتا تو بلی کے پیچھے بھاگ گیا ـــ"

انگشت بدنداں سخت پریشان ہوا اور سوال کیا کہ کیونکر بھاگ گیا۔

"یوں بھاگ گیا ـــ" اس نے دوسرا کتا بھگاتے ہوئے کہا۔

کتے تو دونوں مل گئے لیکن ادا یہ اس کی اس درجہ بھائی کہ بجز عاشق ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اختر شماری شروع کر دی۔ اس علاقے میں جتنے اختر حسن، اختر حسین، حسن اختر، محمد اختر وغیرہ تھے سب گن ڈالے مگر افاقہ نہ ہوا۔

آخر اپنی کزن کی مدد چاہی۔ وہ خالہ جائی بلا تیز ہے کر بولی ——"میں آج ہی اسے کلب میں بلاؤں گی۔" چنانچہ شام کو وہ ماہ جبین کلب میں آئی، اس ٹھسّے سے کہ بھاری فرشی غرارہ پہنے، عطر لگائے، زیور بیش بہا عجب بہار دکھاتا تھا۔ گلے میں جگنی، چمپاکلی، موتیوں کی مالا دھگدھگی، کانوں میں پتے بالیاں، ہاتھوں میں حسین بند، الماس کے کڑے، پاؤں میں سونے کے چھڑے، ناک میں ہیرے کی نتھ، انگلیوں میں جواہرات کی انگوٹھیاں۔ سر پر چھپکا، اس فقیر نے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا ؎

جان پڑ جاتی ہے زیور میں پہننے سے ترے
کہیں اڑ جائے نہ جگنی تری جگنو ہو کر

لیکن میری کزن نے بڑے زور سے ہشت کر کے چپ کرا دیا۔ اور اس سے گویا ہوئی —— کہ کلب میں بلانے کا تو فقط بہانہ تھا۔ اصل میں تمہیں ایک پیغام سنانا تھا۔ میرا کزن، جوانِ زیبا خرام خوبرو گلگوں دیکھتے ہی آپ پر شیفتہ و دوالہ ہوا عشق کا بول بالا ہوا وہ ہزار جان سے تمہارے گلِ رخسار کا عندلیبِ شیدا ہے، آہِ سرد اور دل میں درد سے عشق کا مرض پیدا ہے۔ ماشاءاللہ عجیب و غریب نوجوان ہے۔ عجب آن بان ہے، لاکھوں جوانوں میں انتخاب ہے۔ حسن و خوبی میں اپنا آپ جواب ہے تم دونوں کی خوب نبھے گی۔ گہری چھنے گی۔ وہ بھی کم سن، تم بھی جوان، وہ بھی نازک بدن، تم بھی دھان پان۔ وہ محبوبِ دل آفرینی، تم سروِ چمن زارِ نازنینی ——'

'اُف! اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت تھی ——" حسینہ نے بات کاٹی —— "والدین میری شادی کا تہیہ کر چکے ہیں تبھی مجھے پارٹیوں اور کلب وغیرہ میں جانے کی اجازت اتنی آسانی سے مل جاتی ہے۔ کئی اخباروں میں اشتہار بھی دیئے گئے ہیں۔ غالباً اگلے مہینے میرا سوئمبر رچایا جائے گا۔ اگر آپ کے کزن کو اتنا ہی ذوق و شوق ہے تو سوئمبر میں شرکت کرے۔"

حسینہ کی یہ تقریر اس حقیر کو نہایت ترقی پسند معلوم ہوئی اور اس نیاز مند نے اس کے ساتھ رمبا ناچنا چاہا۔ زیوروں سے ایسی عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں کہ ارادہ ترک کر دیا۔ پھر سامبا ناچنے کی کوشش کی۔ مگر ایک دوسرے کے ملبوسات آپس میں الجھ کر رہ گئے۔ چنانچہ رقص کی حسرت، حسرت ہی رہی۔

سوئمبر قریب آیا تو میری کزن نے اخبار میں چھپا ہوا اشتہار دکھایا۔ جو "ضرورتِ رشتہ" کے عام اشتہاروں سے ملتا جلتا تھا مگر ترقی پسندی کی عینک لگا کر پڑھا تو عبارت کا مفہوم کچھ یوں سمجھ میں آیا۔

اشتہار برائے پبلک

ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو صبح چھ بجے شہزادی دلیمہ جہاں کے سوئمبر کا ٹورنامنٹ شروع ہو گا اور مناسب اور معقول امیدواروں کو شہزادی پر عاشق ہونے کی اجازت ہو گی۔ بشرطیکہ وہ مندرجہ ذیل شرائط پر پورے اترتے ہوں:—

۱۔ کنوارپنے کا سرٹیفکیٹ جس پر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کے دستخط ہوں۔ اور امیدوار کے والد کی سالانہ آمدنی اور جائیداد کی تفصیل درج ہو۔

۲۔ تندرستی کا سرٹیفکیٹ جس پر سول سرجن صاحب بہادر کی تصدیق ہو۔

۳- دو معزز آدمیوں کے نام اور پتے جو امیدوار کے چال چلن کی ضمانت دیں۔ اور اس کے رشتہ داروں میں سے نہ ہوں۔

۴- سرکاری خزانے میں پانچ روپیہ جمع کرانے کی رسید۔

۵- طلسماتی چیزیں مثلاً زمینداروں اور خان بہادروں کی سفارشیں ممنوع ہیں۔

۶- امیدوار ایک ہفتے کا راشن، بستر اور وفادار ملازم ہمراہ لائیں۔

۷- مہاجر کو ترجیح دی جائے گی۔

۸- کامیاب اُمیدوار کو شہزادی ولیمہ کے علاوہ جائداد کا تہائی حصّہ بطور انعام ملے گا۔

نوٹ:- سب کو خبردار کیا جاتا ہے کہ خواہ مخواہ عاشق ہونے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ اس قسم کا امیدوار ایسی سزا کا مستحق ہوگا جو پچاس روپیہ جرمانہ اور تین ماہ کی قید تک ہو سکتی ہے۔

اس ناچیز نے اس شاندار ترقی پسند سپرٹ پر اظہارِ مسرت کیا۔ اور دعا مانگی کہ دنیا کی ہر شہزادی کی شادی اسی طرح ہوا کرے۔ فوراً کاغذات مکمل کر کے گھوڑا منگایا۔ سیڑھی لگا کر سوار ہوا۔ اور سوئے ٹورنامنٹ روانہ ہوا۔ مقابلہ نہایت شاندار رہا۔ طرح طرح کے امتحان لئے گئے۔ آئی کیو (I.Q.) بھی ٹسٹ کیا گیا۔ جو زیادہ ذہین تھے انہیں نکال دیا گیا۔ اتفاق سے ایک حبشی بھی کہیں سے آن ٹپکا، اسے سزا دی گئی اور فہرست سے خارج کرتے وقت اس کے منہ پر سفیدی مل کر شہر میں پھرایا گیا۔ تاکہ سب کو عبرت ہو۔

چند رجعت پسند امیدواروں نے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ جائیداد کا کون سا حصّہ ملے گا۔ شمالی یا جنوبی، جواب ملنے پر وہ راتوں رات فرار ہو گئے۔ کیونکہ وہ علاقہ نہری نہ تھا۔ وہاں ٹیوب ویل لگانے کی ضرورت تھی۔

خاکسار سیمی فائنل جیت کر فائنل تک جا پہنچا۔ اتنے میں نہ جانے شہزادی کے ماموں کا لڑکا کہاں سے آمرا۔ یہ مردک کہ بےحد نحیف و نزار تھا ایک بہت بڑی جائیداد کا تنہا وارث تھا۔ (اور صحت اس کے باپ کی گرتی جا رہی تھی۔) اس مردود کے مقابلے میں یہ ناچیز قدرے مفلس تھا — مفلس عاشق کہلاتے ویسے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
آدمی کا وقار کھوتی ہے

اس کمبخت کے آجانے سے ٹورنمنٹ کا رنگ ہی بدل گیا۔ نہایت سرمایہ دارانہ سوالات پوچھے جاتے۔ اُدھر شہزادی کی اماں نے برادر زادے کے لئے رو رو کر برا حال کر لیا۔ آخر وہ سب کے سب رجعت پسند ثابت ہوئے اور فیصلہ اس ملعون کے حق میں کیا گیا۔

ٹورنمنٹ کے نتیجے کی خبرِ وحشتناک سنتے ہی موم جامۂ صبر چاک ہوا۔ ماتمی لباس پہنے اس حال میں تھا کہ نہ سر پہ جوتا تھا۔ نہ پاؤں میں پگڑی۔ لیکن شہزادی کے والد نے اس حقیر کو خلافِ توقع مبارک باد دی۔ اور کہا کہ لڑکی کو اس کی والدہ نے بےحد بگاڑ رکھا ہے شاید تو نے بیگم کو نہیں دیکھا جو دراصل — بے غم — ہے۔ لڑکی بھی چند سال کے بعد ویسی ہی لحیم و شحیم بن جائے گی۔ اگرچہ مجھے مٹاپا مرغوب نہیں لیکن وائے نادانی کیا بتاؤں کہ — مَیں بھی اسیرِ دامِ فربہی رہا ہوں — اے نوجوان تو گھاٹے میں نہیں رہا — اس کے بعد

ترنم سے بولے) ؎

تم بھی بیاہ کرو نوجوانو
ہم دکھیوں کی فریادوں کو

اس بیان سے اس نیازمند کی تسلی تو نہ ہوئی لیکن یہ یقین ہو گیا کہ شہزادیاں اس ملک کی ہرگز ترقی پسند نہیں ہیں ——

"یا پیرومرشد ایک بات پوچھوں؟" خورد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"دو پوچھو ——"

"اب دو ہی پوچھوں گا۔ یہ بتایئے کہ کبھی آپ کو کسی سے سچ مچ محبت ہوئی؟"

"ہاں ہوئی تھی۔ یہ شہزادی فارغ التحصیل بلکہ فارغ الخلع ہو چکی تھی۔ ہم دونوں جرنلزم کی کلاس میں ملتے، ہائیکورٹ کے پاس جو باغیچہ ہے وہاں اکثر جایا کرتے۔ وہاں میں نے اسے کورٹ کرنا شروع کیا۔ اس کے رخ روشن پر ایک خال ہوتا۔ یہ خال کبھی تو پیشانی پر ہوتا کبھی رخسار پر، تو کبھی ٹھوڑی پر اور کسی روز سرے سے غائب ہوتا۔ میں حیرت سے یہ شعر زبان پر لایا ؎

مصحفِ رخ پہ ترے خال نگہبان ہوا
یہ غلام حبشی حافظ قرآن ہوا

بس یہ اس نے فوراً مطلع کیا کہ خال وہ مصنوعی تھا۔ اور سرمے سے محض زیبائش کی خاطر بنایا جاتا تھا۔ میں نے جھٹ سرخ ہونٹوں کی تعریف کی ؎

لال ہیں آپ ہی لب سرخیٔ پاں دور رہے
نازکی کہتی ہے یہ بار گراں دور رہے

اس پر شہزادی نے عجب تمسخر سے فرمایا کہ یہ پان دان کی سرخی نہیں میکس فیکٹر کی بڑھیا لپ سٹک ہے۔ اگرچہ اس فقیر کو علم تھا کہ لپ سٹک کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ سٹک نہیں کرتی۔ تاہم موضوع بدلنا پڑا۔ اور پامسٹری کا ذکر چھڑا وہ بولی۔ میں جانتی ہوں آپ اس حیلے سے میری خوشامد کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے چوڑیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا میں انہیں چھو سکتا ہوں؟"

وہ بولی۔ "آپ اسی بہانے سے میرا ہاتھ تھامنا چاہتے ہیں۔"

اس صاف گوئی پر یہ درویش باغ باغ ہو گیا۔ ماشاءاللہ کیا ترقی پسند محبوبہ تھی۔ بے حد مسرت کا سامنا ہوا۔ سوچا کہ جب انجام مقرر ہے تو فرار بزدلی میں شامل ہے ؎

بیاہ کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

چنانچہ میں نے اسے شادی کے لئے کہہ دیا۔

بولی: "آپ خراٹے تو نہیں لیتے"؟ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس پر وہ بولی ــــ "تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جائیے اور میرے والدین کو منا لیجئے"۔

یہ جواب بھی ترقی پسند تھا اور اس فدوی کو پسند آیا۔ میں سیدھا اس کے والدین کے پاس پہنچا اور سوال کیا۔ انہوں نے پہلے تو اس کمترین کا شجرۂ نسب حضرت آدم تک دریافت کیا۔ پھر جملہ متعلقین کے متعلق طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے معلوم ہوتا تھا۔ گویا تہمت لگا رہے ہیں۔ پھر بولے۔ اگر تم دونوں میں سے خدانخواستہ کسی کا انتقال ہو گیا تو لڑکی کے لئے کیا انتظام ہوگا۔ کوئی ذاتی ملکیت یا بیمے کی پالیسی ہے؟ پھر مہر کا قضیہ شروع ہوا۔ جیسے نیلامی ہو رہی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ نیک ہے اور مہر کی ادائیگی تک نوبت نہ پہنچے گی۔ آخر آپ اتنے لمبے چوڑے مہر کے لئے کیوں مُصر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یقین ہے کہ یہ شادی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ بولے۔ اگر مہر تھوڑا لکھا گیا تو دنیا کے سامنے ہماری ناک کٹ جائے گی۔ خیر یہ حقیر مان گیا۔

وہ چاہتے تھے کہ پرانی رسومات ساری ادا کی جائیں میں معروض ہوا کہ ہجوم اکٹھا کر کے غل مچانا ایام جہالت کی رسم ہے جب پبلسٹی کا یہی ایک طریقہ تھا کہ لوگوں کو بلا کر دکھا دیا جاتا تھا کہ واقعی شادی ہوئی ہے تاکہ وہ سب بعد میں گواہ رہیں۔ اب تو فوراً اخبار میں تصویر چھپ جاتی ہے۔ اور پھر شور و غل سے یہ احقر بہت گھبراتا ہے ہاتھ پاؤں میں رعشہ آتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں سچ مچ کچھ کر بیٹھا ہوں۔ لیکن وہ بدستور مُصر رہے۔

آخر یہ تجویز پیش کی کہ شادی دو حصوں میں ہو۔ پہلے آپ مجھے فارغ کر دیں پھر مہینوں بلکہ سال بھر تک روشنیاں جلا کر خوب ڈھول بجائیں اور دعوت پر سارے ایشیا کو (معہ ایشیائے کوچک کے) مدعو کر لیں۔

وہ کمال درجہ رجعت پسند نکلے کہ نہ مانے۔

اسی طرح وقت گذرتا گیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ شہزادی کو بغور تو دیکھو۔ دیکھا تو حلیہ بدل چکا تھا۔ بھنویں اکھیڑنا، بال ترشوانا، ناخن پالنا ان خوبیوں کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ جوتوں اور میک اپ سے کسی روز بے حد لمبی معلوم ہوتی۔ گھر میں سادہ کپڑوں میں دیکھتا تو چھوٹی اور موٹی دکھائی دیتی۔ رنگ و روغن کی وجہ سے اصل شکل دیکھنا محال تھا چنانچہ عشق و عاشقی کو بالائے انگیٹھی رکھا اور ان رجعت پسندوں کو ان کے حال پر چھوڑا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کچھ تنزل پسند ایک ترقی پسند کو سرِ بازار پھول مار رہے تھے اور وہ خاموش کھڑا برداشت کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر ایک اچھا سا پتھر اٹھا کر کھینچ مارا۔ وہ بلبلا اٹھا اور بولا ــــ اے مردِ سخن فہم یہ سب تو بے سمجھ ہیں نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ تُو تو ترقی پسند ہے تجھ سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔

اس واقعے کے بعد الجھن سی پیدا ہو گئی۔ کیسے ترقی پسند اور کہاں کی ترقی پسندی۔ لوگ جہاں تھے وہیں کے وہیں ہیں۔ کوئی کسی رُخ بھی ترقی نہیں کر رہا۔ ویسے میرے اور ترقی پسند) کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو زیادہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید مجھے شہزادیوں کی وجہ سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد یہ ہوا کہ تنقید نگاری کی بدولت مجھے پگڑیاں اچھالنے میں خاصی مہارت ہو گئی۔ ادھر فلمی پرچوں کی مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ یہ فقیر فلمی نقاد بن گیا۔ اور فلمی ستاروں کے متعلق تازہ ترین افواہیں بہم پہنچانے لگا۔ کروڑوں پڑھنے والے میری رنگین تحریروں کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا کرتے۔ فلمساز اور اداکار مجھ سے ڈرنے لگے۔ کئی حسیناؤں سے اسی بہانے دوستی ہو گئی۔ ترقی پسند اور رجعت پسند طائفے مجھ پر رشک کرنے لگے۔

"پھر کیا ہوا —؟"

"پھر خاک ہوا، ڈھول ہوا —" کلاں نے جھلّا کر کہا۔

"ابھی کتنا سفر باقی ہے؟"

"تو بڑا بے صبر ہے۔ اچھا لے، سفر یہیں ختم ہوا۔ یونہی طبیعت بدمزہ کر دی۔ اگلی مرتبہ جب فرصت ہو تب آئیو —"

سرِ شام جہاز باد خورد آن دھمکا اور بولا۔

"صبح جو کچھ ہوا۔ اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ سزا کے طور پر تیسرا سفر دوبارہ سننے کے لئے تیار ہوں۔"

جہاز باد کلاں مسکرا کر بولا "ہم معاف کرتے ہیں۔ اور چوتھا سفر پہلی مرتبہ سناتے ہیں۔"

جہاز باد سندھی کا چوتھا سفر

؎ فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلّا اٹھائیے

اے رفیقِ دیرینہ ایک رات کا ذکر ہے کہ میں نے کتّے کو مارنے کے لئے ایک وزنی سی کتاب اٹھائی، کتّا دور جا چکا تھا۔ لہٰذا ورق گردانی کرنے لگا۔ اور پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ علی الصبح جو اٹھا تو اپنے آپ کو پرولتاری پایا۔ سوچا کہ شاید مشیّتِ ایزدی اسی میں ہے کہ پرولتاری بنوں اور نام پاؤں —"

اے ہمدم طوطی گفتار، لفظ پرولتاری سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"یہ ایک انگریزی لفظ کا نعم البدل ہے اُردو میں۔ ڈکشنری دیکھ بہت کچھ معلوم ہوگا۔ پرولتاری بننا آسان کام نہیں، بڑی ہمت چاہیئے دن رات بھاری بھاری کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکچروں میں جانا پڑتا ہے۔ پریکٹیکل الگ ہوتے ہیں۔ بہت جلد فدوی نے یہ کورس مکمل کر لیا۔ زندگی میں کئی تبدیلیاں آگئیں۔ اٹھنا بیٹھنا صرف پرولتاریوں میں ہوتا۔ بڑی طویل بحثیں ہوا کرتیں۔ پرولتاری ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہمیں مذہب جنس اور دیگر اہم مسائل پر جدید ترین نظریوں کا اظہار کرنے کی پوری آزادی تھی۔ ہماری انوکھی اور بصیرت افروز باتیں سن کر عوام چونک چونک پڑتے۔ ہر مذہب کو ہم تضیعِ اوقات سمجھتے، انسانی رویے کے عالمگیر قوانین ہمارے لئے مہمل اور لغو تھے۔ ہر انسان، ہر اصول، ہر بیان کو ہم نہ صرف شبہ کی نظر سے دیکھتے بلکہ منٹوں میں دھجیاں اڑا دیتے۔ عجب دن تھے وہ بھی — کیا رعب تھا کیا دبدبہ تھا — سڑک پر پرولتاری چلتا تو لوگ ادھر ادھر ہٹ کر راستہ دیتے، جھک جھک کر سلام کرتے۔ کیا مجال جو کوئی ہم سے بحث کر سکے، چند ہی فقروں کے بعد وہ یوں خاموش ہو جاتا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ بڑے سے بڑے ہجوم میں محض چند پرولتاریوں کی آمد قیامت برپا کر سکتی تھی۔

"بھاگ چلو یارو، پرولتاری آگئے۔" کا نعرہ لگا کر وہ ایسے بھاگتے کہ ٹوپیاں اور چھاتے چھوڑ جاتے۔

جہاں ہم نے مقامی پبلک کو آگے لگا رکھا تھا وہاں مقامی لڑکیاں تھیں کہ سیدھے منہ بات نہ کرتی تھیں۔ وہ ہم سے بدگمان تھیں۔ ہم مذہب دوستی، ایمان، فلسفۂ عشق — کے پرخچے ضرور اڑاتے تھے لیکن یہ سب دکھاوے کے لئے تھا۔ کبھی کبھی ہمارے دل بھی محبت کی آگ سے سلگنے لگتے ضرورت پڑنے پر ہم خدا کا واسطہ دیا کرتے۔ مصیبت پڑتی تو دعائیں مانگتے۔ رہ گئی جنس، سو اس کے متعلق ہمارا تجربہ اتنا ہی تھا جتنا غیر پرولتاریوں کا لیکن

ہماری معلومات کا ماخذ فرائڈ، ڈی ایچ لارنس اور دیگر حضرات کی کتابیں تھیں۔ خیالات ان کے تھے بیان ہمارا تھا۔ اگرچہ ہم نے ان مصنفین کا حوالہ کبھی نہیں دیا۔ اور ہاں یہ بتانا بھول گیا کہ پرولتاری ایک انقلاب بھی چاہتے تھے ۔۔"

"کیسا انقلاب ؟"

"کبھی ایک عالمگیر انقلاب تو کبھی ملکی یا غیر ملکی انقلاب ۔۔۔ بعض اوقات ہم مقامی انقلاب پر ہی قناعت کر جاتے۔ بس انقلاب ہو کہیں، کسی قسم کا کسی سائز کا ۔۔ چنانچہ ہم بار بار پبلک کو انقلاب کے لئے اکساتے، ہم چاہتے تھے کہ ہنگامے برپا ہوں اور افراتفری مچے، دنگے فساد ہوں تاکہ لوگوں پر ہماری اہمیت واضح ہو جائے۔ لیکن مجھے غصہ تھا تو اس پر کہ یہ لڑکیاں جو ہم سے ملنا اپنی ہتک سمجھتیں کلب میں وہ دھما چوکڑی مچاتیں کہ خدا کی پناہ۔ ایک خاص طبقے سے خوب چہلیں کرتیں ۔۔ یہ حضرات بھی عجیب تھے۔ ویسے اچھے بھلے تھے لیکن اپنے آپ کو غمزدہ اور بدنصیب سمجھتے اس کی وجہ اپنی بے جوڑ شادی بتاتے۔ حالانکہ ہر ایک ماشاء اللہ چھ چھ بچوں کا باپ تھا۔ ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ ان کی ازدواجی زندگی نہایت غمناک ہے۔ اور وہ بیوی سے تقریباً تقریباً علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کسی نے انہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بہانے وہ ہر لڑکی سے فلرٹ کرتے چونکہ ان کے پاس کاریں تھیں اس لئے یہ بورژوا تھے۔"

"اس ناچیز کے چچا جان جو تھانیدار ہیں کار رکھتے ہیں، کیا وہ بھی بورژوا ہیں؟" خورد نے پوچھا۔

"ضرور ہونگے ۔۔۔ تو یہ شادی شدہ بورژوا حضرات دن بھر کاروں میں لڑکیوں کو لئے پھرتے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے کوئی پچاس برس سے کم نہ تھا۔ پتہ نہیں انہیں اس میں کیا ملتا تھا؟"

غالباً انہیں سنہ تیس اکتیس کے پرانے ماڈل پسند نہیں تھے۔ اور نئے سٹریم لائنڈ ماڈل درحقیقت دیدہ زیب ہوتے ہیں ۔۔" خورد نے مودبانہ عرض کیا۔

"مگر یہ نئے ماڈل ان کا خوب مذاق اُڑاتے، ملتے ہی سوال ہوتا کہ آپ کی ننھی بچی کا اب کیا حال ہے؟ آپ کے لڑکے کا بخار اترا؟ بیوی کا کوئی خط آیا؟ بڑی لڑکی کی کب شادی ہو رہی ہے؟ دیکھئے ہمیں ضرور بلائیے۔ مگر یہ بورژوا تھے کہ ۔۔"

"ویسے یہ بورژوا ہوتا کیا ہے؟"

"بورژوا وہ ہے ۔۔ (کالی نے چہرے کے اظہار اور ہاتھوں کی جنبش سے بتانے کی کوشش کی) جو ۔۔ جو ۔۔ بالکل بورژوا ہو۔ سنا ہے کہ فرانس میں سوداگروں کا ایک طبقہ رہتا تھا اسے بورژوا کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن یہ کافی عرصے کا ذکر ہے۔"

"یا پیر و مرشد، یونگ ٹن ہیرس کی پی سینٹی پر ایک "بورژوا" لکھا ہوتا ہے ۔۔"

اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کے کہنے میں دخل دینا سخت نادانی ہے۔ تو میں نے لڑکیوں سے ان بورژوا حضرات کی خوب برائیاں کیں اور انہیں بہت سمجھایا۔ یہ بھی کہا کہ یہ سب سرمایہ دار ہیں اور سماج کے دشمن ہیں۔ وہ ہنسنے لگیں کہ کار کو چھوڑ کر ان کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ بینک میں ان کا حساب صفر ہے بلکہ مقروض رہتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ سرمایہ دار ہونے کیلئے سرمائے کی ضرورت نہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے جس پر غصہ آتا ہے۔ وہ بولیں جب سرمایہ نہیں تو ذہنیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ میں خود پرولتاریت سے اکتا چکا تھا لیکن یہ گلے کا ڈھول تھا۔ کچھ عرصہ بجانا پڑا۔ آخر ایک دن میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک ذلیل سی پرانی موٹر کہیں سے خریدی اور بورژوا بن گیا ۔۔ دہنے بائیں ہر لڑکی سے فلرٹ کرنا شروع کیا۔ اور ہرجائی کے نام سے شہرت پائی۔"

"آہا تو آپ ہرجائی بھی رہ چکے ہیں۔ ملائیے ہاتھ اپنا ناشدنی بھی ہرجائی رہ چکا ہے۔ آہ سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ زندگی بے حد مختصر ہے اور حسین چہرے تعداد میں اتنے زیادہ ہیں ——"

"لیکن دو تین لڑکیاں تو سچ مچ پسند آ گئیں اور ارادہ اس خاکسار کا شادی کرنے کا تھا ——"

"ان سب سے؟" خورد چونک پڑا۔

"نہیں، ایک سے۔ لیکن معلوم ہوا کہ لڑکیوں کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔ کورٹ شپ میں وہ صرف لڑکے کے نقائص معلوم کرنا چاہتی ہیں انہیں فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ ہونے والی ساس کس مزاج کی ہے۔ کنبے میں بہت زیادہ لوگ تو نہیں۔ لڑکے کی تنخواہ کا گریڈ کیا ہے اور یہ گریڈ اسے ملے گا بھی یا نہیں۔ مزید بڑھنے کے کیا امکانات ہیں۔ شکی مزاج تو نہیں کہ ذرا دوسرے مرد سے بات کی اور خفا ہو گیا۔"

"پتہ نہیں —— البتہ شادی کے متعلق سنجیدگی سے صرف ایک طبقہ سوچتا ہے۔ خاوندوں کا طبقہ۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ حقیقی مسرت سے انسان تب تک آشنا نہیں ہوتا جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی —— لیکن تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔"

"یار تو بات مت کاٹ چپ چاپ سنتا رہ۔ یہ لڑکیاں بے حد (MATERIALISTIC) تھیں۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا۔ میں ہر چیز سے بیزار ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ شادی سے ڈرنے لگا۔ ان لوگوں سے بھی خوف کھاتا جو خسر بنتے بنتے بال بال بچ گئے۔ ہر رات سونے سے پہلے اس قسم کی دعا مانگتا کہ —— اے پروردگار میرے حال پر رحم فرما رشیدہ کی کہیں شادی کر دے۔ نرگس بن غفور کی کہیں منگنی ہو جائے۔ مس ریٹا معراجدین اور ڈورتھی فنوئل کا بھی کہیں انتظام کرا دے۔"

"لیکن اس کا بوڑھا ہونے سے کیا تعلق ہے؟ کاش کہ موضوع بدل جائے۔" خورد جو اتنی دیر میں ڈکشنری دیکھ چکا تھا بولا۔

"بہت اچھا۔ اب اس سفر میں ایک چیز باقی رہ گئی ہے تجھے یاد ہو گا کہ الف لیلہ کے سندباد کی ملاقات تسمۂ پیر سے ہوئی تھی جس کے چنگل سے بڑی مصیبتوں کے بعد نکلا تھا۔ میرا بھی ایک ایسے ہی مسخرے سے واسطہ پڑا۔ سفر سے لوٹتے وقت میں ایک بندرگاہ پر اترا۔ جہاں بندر ہی بندر تھے وہاں ایک انشورنس ایجنٹ میرے پیچھے لگ گیا۔ ایسا تعاقب کسی نے کسی کا نہ کیا ہو گا۔ چوبیس گھنٹوں میں وہ فقط تین چار گھنٹے مجھے چھوڑتا ورنہ ساتھ رہتا۔ اس سے دور رہنے کے لئے کیا کیا جتن میں نے نہ کئے۔ منت سماجت کی، ڈرایا دھمکایا، آخر تنگ آ کر خودکشی کی دھمکی دی۔ جس پہ وہ بولا کہ میں بھی ساتھ خودکشی کروں گا اور پالیسی دینے کے لئے اگلے جہان تک پیچھا نہ چھوڑوں گا۔ جب میں نے سچ مچ پستول دکھایا تو بولا اے مردِ نیک خصلت! اگر تو واقعی خودکشی کر رہا ہے تو پالیسی مفت لے لے لیکن وارث مجھے بنا جا۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور سیدھا کباڑی بازار میں الف لیلہ کا قدیم نسخہ مطالعہ کرنے گیا۔ تاکہ کوئی ترکیب نکالوں۔ سندباد نے اس مردِ نابکار کو انگوروں کی شراب پلا کر مدہوش کیا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے بادۂ افرنگی پلایا۔ لیکن اثر الٹا ہوا۔ پی کر وہ اپنے تئیں ہوش میں نہ رہا۔ کچھ دیر واہی تباہی بکتا رہا پھر اس حقیر کو زدوکوب کیا۔ بے حد حیران ہوا کہ خود اپنے ہاتھوں اسیرِ دامِ بلا ہوا۔ خود گرفتارِ بحرِ ستم ہوا۔

جب اگلے روز وہ مجھے سڑک پر ملا تو شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کے بعد جب کہیں ملتا خجل ہو کر رہ جاتا۔ خیر اس طرح میری نجات ہوئی الف لیلہ سے عقیدہ اٹھ گیا ——"

"گستاخی معاف،" خورد بولا۔ "شروع سے اب تک جو واقعات آپ نے سنائے ہیں بالکل الل ٹپ ہیں، غالباً آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ پتہ نہیں آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا یہ سفر بھی نہایت بے تکا رہا ——"

"مگر تو نے مجھے بار ہا ٹوکا بھی تو ہے۔ شاید ایک دن میں دو سفر سُن کر تو اکتا گیا ہے۔ اب آئندہ تجھے ایک لفظ نہ سناؤنگا جب تک تو ہونٹ سی لینے کا وعدہ نہ کرے ——"

"کس کے ہونٹ؟ آپ کے؟؟"

"نہیں اپنے ——"

اور وہ دو نو خنداں ہوئے، فرحاں ہو کر شک و شبہات دور ہوئے دل صاف ہوئے اور جہاز باد کلاں کا چوتھا سفر تمام ہوا۔

اگلے روز جب شہباز نجوم نے آفتاب پر جال پھینک کر شکار کیا، سپاہ انوار کو شکست ہوئی ظلمت کی حکمرانی ہوئی۔ تب جہاز باد خود حاضر ہو کر بولا —" یا استادِ کلاں اپنا پانچواں سفر بیان کر کہ میں دو روز تک تیرے ہاں قیام کرونگا۔ اپنی گھڑی بھی کسی کو دے آیا ہوں۔ اور دو بوتلیں بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب مجھے سماعت کے لئے تیار سمجھ ——"

جہاز بادِ کلاں نے یوں کلام کیا ——

جہاز بادِ سندھی کا پانچواں سفر

" دل دُکھا یا کسی گلچیں نے کوئی گل توڑا ؎
باغ سے نالۂ بُلبل کی صدا آتی ہے "

اس پر خورد پھر بول اٹھا —" بھائی ایک صلاح ہم دیں گے، وہ یہ کہ آئندہ آپ ایسے اوٹ پٹانگ اور بے محل شعر کم از کم اپنے محل میں نہ پڑھا کریں۔ اب تک جو اشعار حضور نے پڑھے۔ ان کا قصے سے کوئی سروکار نہ تھا ——"

اے نوجوان بلند بخت! اعتراض کرنا تیری سرشت میں ہے۔ یہ اشعار میں نے روایاتِ قدیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پڑھے۔ پرانے زمانے میں دستور تھا کہ داستان کوئی اشعار کے بغیر نامکمل تھی۔ اسے محض رواداری سمجھ —— رواداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے۔"

"رواداری نہیں —— وفاداری بشرطِ استواری ——" خورد نے لُقمہ دیا۔

"اچھا بابا وفاداری سہی۔ لیکن واسطہ ہے تجھے اپنے پیر کا —— اگر تیرا پیر ہے تو —— تو خاموش رہ —— آج کا سفر بالکل مختصر ہے۔ اور غالباً آخری سفر ہوگا۔ لہٰذا آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ۔

سُن میں زیادہ دیر بورژوا نہ رہ سکا۔ لوگ اس لفظ کے نہ ہجے کر سکتے نہ صحیح تلفظ کسی کو آتا تھا۔ بار بار معنی پوچھتے۔ ادھر میری کار بھی بک چکی تھی۔ سوچا کہ ذہنی ارتقا کی منزلیں طے کرنے کی غرض سے یہ سفر شروع کئے تھے ورنہ کافی بادس بُرا نہ تھا۔ چنانچہ پھر باہر نکلنے کی ٹھانی۔ موسم گرما گذارنے کے لئے سانگلا ہل کا رُخ کیا۔ کہ اسی بہانے بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقات ہو جائیگی۔ وہاں نہ جانے کیا ہوا کہ خیالات اس ناچیز کے دفعتہً بدل گئے۔ غالباً یہ اونچے طبقے کی صحبت کا اثر تھا کہ خاکسار منزلیں مارتا کہیں کا کہیں جا نکلا۔ آخر اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں تو مجھے آج دیکھ رہا ہے۔ اب میں بالکل بے نیاز ہوں، کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ مطلب ہو تو خیر ورنہ کسی کی مدد نہیں کرتا۔ کسی کو خط نہیں لکھتا۔ لوگوں سے تب ہی ملتا ہوں اگر کوئی کام ہو۔ بلاغرض کسی کو مدعو نہیں کرتا۔ نہ زیادہ سوچتا ہوں نہ محنت کرتا ہوں —— بھلا دنیا کے جھمیلے آج تک کسی سے ختم ہوئے ہیں۔ جو میں اور تو انہیں ختم کر سکیں گے۔ ہر قسم کی تقریر و تحریر سے اعتبار اُٹھ چکا ہے۔ پڑھنا، لکھنا، ملنا جلنا یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ شہزادیوں کی متواتر بے وفائی سے شادی

میں بھی دلچسپی نہیں رہی۔ بچوں کی سماجی حیثیت پالتو جانوروں پرندوں کی سی ہے۔ دو تین سال کھیلو پھر بڑے ہو جاتے ہیں اور ماں باپ کو بیوقوف سمجھنے لگتے ہیں۔ میرے پڑوسیوں نے میرے نظریوں کی استقامت میں بڑی مدد دی ہے۔ آ تجھے بھی قدرت کا تماشہ دکھاؤں —"

یہ کہہ کر وہ خورد کو دریچے تک لے گیا۔ کواڑ کھولنے کی دیر تھی کہ دوسرے گھر سے چیخم دھاڑ سنائی دی۔ کئی بچے بڑی بھیانک آواز میں چلا چلا کر رو رہے تھے۔ خورد نے کانوں میں انگلیاں ڈالیں تو کلاں نے دریچہ بند کیا۔

"اے میرے دوست! جب کبھی مجھے گھر بسانے یا آئندہ نسل کے متعلق خیال آتا ہے تو فوراً یہ دریچہ کھول کر بیٹھ جاتا ہوں اور عبرت حاصل کرتا ہوں۔ اور پھر اگلی نسل کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ جس روز میں اس جہان سے رخصت ہوا، وعدہ کرتا ہوں کہ بچوں کو خاندان کا نام روشن کرتے دیکھنے دوبارہ ہرگز نہیں آؤں گا۔"

"افوّہ! — تچ — تچ — یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا —" خورد نے اظہارِ افسوس کیا۔

"اب میں NIHILIST ہوں، نی ہلسٹ!" کلاں نے اپنے سینے پر مکّوں کی بارش کرتے ہوئے کہا۔ "خبردار جو اس لفظ کے معنے پوچھے ہیں تو — اور اے مردِ جلد باز میرے پانچوں سفر تمام ہوئے۔ آفیشلی مجھے سات سفر کرنے چاہئیں تھے۔ لیکن دنیا کے حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے پانچ کافی ہیں۔ ویسے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ ذہنی تگ و دَو میں اپنی منزل میں نے پا لی ہے۔ میرا مقام مجھے ہاتھ آ گیا ہے اور تو مجھے یوں بیوقوفوں کی طرح دیکھ رہا ہے اگر چاہے تو بقیہ دو سفر تو کر آ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"جی نہیں — ایسے ماحول اور ایسا محل چھوڑنے کو کس کا جی چاہتا ہے۔"

"یہ محل میرا کہاں ہے الاٹ شدہ ہے۔ شروع شروع میں خاکسار نے اخباروں رسالوں میں بڑے دردناک بیانات چھپوائے کہ میں ایک ادبی اکادمی کھولنا چاہتا ہوں۔ پبلک نے زبانی حوصلہ افزائی تو بہت کی لیکن چندہ کسی نے نہ بھیجا، دراصل پبلک بڑی ہوشیار ہو گئی ہے، فوراً سمجھ جاتی ہے — (سرگوشیوں میں) اے رفیقِ تنہائی! یہ اکادمی کا رکیٹ چل جاتا تو دولت کا ڈھیر لگ جاتا۔ اور برخوردار تیری پوسٹ ڈارلین کیا ہے؟ نوکری کے لئے اپنا نام رجسٹر کروایا؟"

"نام رجسٹر تو نہیں کروایا لیکن جس محلّے میں رہتا ہوں وہاں چوہے، بلیاں اور کتے بہت زیادہ ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ وہاں ایک چینی ریستوران کھول لوں —"

"اس سے تو یہ بہتر ہے کہ میرے ساتھ شرکت کر۔ تو کافی فرمانبردار نوجوان نظر آتا ہے کہ کام تجھے کوئی خاص نہیں ہے۔ تیری بلند پیشانی کو دیکھ کر میرا موڈ یکلخت ادبی و علمی ہو گیا ہے —"

"یہ بلند پیشانی نہیں گنجے پن کی پہلی نشانی ہے۔"

"یہ گنجِ بے بہا تُو نے کیونکر پایا؟"

"ایک دو مرتبہ سول سروس کے مقابلے میں شرکت کی تھی۔"

"اخاہ! پھر تو تُو پورے نیم میں تولنے کے لائق ہے۔ پہلے اپنی ہیئت کذائی ٹھیک کر، حجامت کرا، عینک بدل، ہر ہفتے غسل کیا کر اور ہر روز شیو، کپڑوں کو دھلوا کر استری کرا —"

"کہیں مجھے انٹلیکچوئل اپنی برادری سے نہ نکال دیں —"

"تو کیا ہو ؟ خیال ہے کہ چند شرفاء ذی مرتبہ کو خوش کرنے کے لئے ایک بلند پائے کا معیاری رسالہ جاری کروں۔ ویسے کام دوسرے لوگ کریں گے۔ لیکن نام ہمارا ہوگا۔ کیا ارادہ ہے — ؟"

"خاکسار آمادہ ہے۔"

"اب جبکہ تو نے سب کچھ سن لیا ہے بتا کہ کبھی تو بھی ایسی کٹھن منزلوں سے گذرا ؟ کبھی ایسی مصیبتیں تجھ پر بھی پڑیں —؟"

خورد نے کلاں کا ہاتھ چوما اور آنکھوں میں آنسو لا کر بولا — "آپ واقعی بڑے بڑے مصائب سے دوچار ہوئے۔ صیدِ انتشار ہوئے۔ اب آپ حظ اٹھائیں۔ دل کھول کر کھائیں اور کھلائیں۔ خدا کرے تمام عمر شاد رہو، فائز بمرام و بامراد رہو۔"

اس پر جہاز بادِ سندھی کلاں نے خورد کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ اس کا رتبہ اور بھی بڑھایا۔ جب تک زندہ رہے۔ دو جان اور دو قالب ہو کر رہے۔

خالقِ زمین و زماں، آفرینندۂ مرد و جہاں، کارسازِ مطلق، قادرِ برحق کا ہر حال میں شکر ادا کرنا چاہیے کہ بندوں کو کیسی کیسی مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ گاڑھے وقت میں اسی کا فضل آڑے آتا ہے۔

نتیجہ — پس اے پیارے بچو! نتیجہ اس کہانی سے یہ نکلا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر کہانی سے نتیجہ نکلے۔

شہر اور گاؤں

فلک پیما

شہر کا رہنے والا ہوں۔ اکثر شہری اینٹوں پتھروں کی خوش نما ترکیب دیکھ کر
خوش بھی ہوتے ہیں، فخر بھی کرتے ہیں۔ مگر بعض چیزیں نہ دیکھتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔
چونے گارے سے دماغ محفوظ نہیں۔

شہر وہ ہوتا ہے، جہاں دیوان خانے، زنان خانے، کارخانے، جیل خانے، قہوہ خانے۔ قحبہ خانے ہوں۔ نیز ہمچوں قسم دیگر ضروریات مثلاً دکانیں اور ان میں روپیہ کمانے والے سیٹھ، عدالتیں اور عدالتوں میں جھوٹ بلوا کر، سفید کو سیاہ دکھلا کر مال دار بن جانے والے معززین اور ان کے ایجنٹ۔ بنک اور بنکوں سے روپیہ کو ہجرت کرانے والے عیار۔

گاؤں وہ ہوتا ہے جہاں کسان مٹی کرید کر یہ کیمیاگری کرتا ہے کہ کہیں بیج اور پانی مل کر چاول کا زمردیں کھیت تو کہیں شرف کا سونا۔

شہروں میں دولت کی آب یاری سے گھناسے بدنامی کھلتے ہیں۔ گاؤں میں غربت کے کندھے پر اناج کی بوری۔ کہا یہ جاتا ہے کہ کھیت انسان نے بنائے اور بنک شیطان نے اور آخرکار انسان کے کھیت شیطان کے بنکوں کے ہاتھ گروی ہو گئے۔ یہ مبالغہ ہو یا غلط ہو مگر گاؤں میں عام طور پر محنت کا اجر غربت ہے اور غربت کا نتیجہ یہ کہ گاؤں والے کھائیں چھیچھڑا اور شہر والے چکھیں پراٹھے۔

جسے کسان سے محبت ہو۔ مگر جو بدقسمتی سے مٹی نہ کرید سکتا ہو وہ یہی کر سکتا ہے کہ لفظوں کی مٹی میں سونا تلاش کرے۔ تپائے لفظوں کے غبار سے آگے نیلا آسمان ہے۔ اس آسمان کے اوپر نیچے، اندر باہر اور چاروں طرف جو آسمان والا ہے (یا اگر نہیں ہے تو جیسے ہماری آرزوؤں کو پورا کرنے کے لیے ہونا چاہیئے۔) اسے شوخیوں گستاخیوں سے ایک شہری یوں یاد کر رہا تھا:

"اے ہفت افلاک والے پناہ بلندی و پستی! میں دھواں ہوں۔ لوگوں
کی آنکھوں کو مجھ سے تکلیف ہے۔ مجھے آگ کر دے۔"

کیا شہروں کے رہنے والوں نے اپنے شہر کو بلندی سے دیکھا ہے؟ صبح و شام بڑے شہروں پر دھوئیں کا گھٹا ٹوپ ہوتا ہے۔ فضائی شعاعیں اس برقع کو اُلٹنے سے اکثر قاصر رہتی ہیں اور یہ ذیب سر تاریکی عجیب رنگ لاتی ہے یعنی دماغوں میں گارا۔ دلوں میں کدورت، خال خال کوئی شہری ہوتا ہے جو محض گرد دھوآں یا غلیظ کیچڑ نہ ہو۔

گاؤں والے فرشتے نہیں: از کفر و ایماں بے خبر ہیں اور اس بے خبری کی بدولت بہت سے مصحف خوانوں سے برتر ہیں۔
کوئی بڑا شہر نہیں جہاں شاندار کھنڈر نہ ہوں۔ کیا لاہور، کیا دہلی کیا آگرہ وہ شہر کیا جس میں کھنڈر نہ ہوں؟ کھنڈروں کو دیکھ کر شہروں کے رہنے والے یادِ رفتگاں کے کھنڈر دل میں قائم کرتے ہیں: پدرم سلطان بود کے ترانے، میٹھی میٹھی آہوں کے جھونکے، ارماں ہیں جو ان لوگوں کو خیالِ خلد گذشتہ میں سلا دیتی ہیں۔ گاؤں اس نعمت سے محروم ہیں۔ سینکڑوں گاؤں کا کونہ کونہ چھان ڈالا آنسوؤں کی بے رونق سی دکانیں تو دکھائی دیں مگر

استخوانِ ماضی

کے تاجروں کی دکان آنکھ سے اوجھل رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گاؤں والے کا حافظہ کمزور ہے۔ شہر کی ایک بارونق زبردست یادداشتوں والی شاندار دکان میں یہ سودا بکتے دیکھا۔ گاہک نے داخل ہوتے ہی آہ بھری اور چلا کر کہا۔

"حضور آج کا نہیں ساری عمر کا پیاسا ہوں" جواب ملا یہاں روحانی سبیل جاری ہے۔ ساری عمر کی کمائی نہ گنواؤ۔ پیاس سے تمہارا دم نکل رہا ہے تو کیا ڈر ہے؟ جہاں اتنا صبر کیا ہے کچھ دن اور صبر کرو۔ مرتے وقت تمہیں ایک نہایت خوبصورت آبشار دکھائی دے گا۔ گاہک خوشی خوشی اپنا تمام سرمایہ پیش کر کے رخصت ہوا۔

گاہک گاؤں تھا۔ فروشندہ شہر تھا۔

ایک انسان کی موت

فکر تونسوی

شہر کے سب سے بڑے اور بارونق پل پر ایک انسان کی لاش پڑی ہے۔ وہ ابھی ابھی دس منٹ پہلے مرا ہے۔ اس نے غالباً یہ برتی کہ پل کے فٹ پاتھ پر مرا۔ اگر وہ پل کے عین درمیان مرتا تو ٹریفک رُک جاتا اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی — مرنے والے زندہ رہنے والوں سے زیادہ ذمہ دار انسان ہوتے ہیں۔

”ارے! — یہ تو شمبھو فقیر ہے!“ — شمبھو فقیر کے ایک کامریڈ نندو فقیر نے آکر اعلان کیا — نندو فقیر شمبھو فقیر سے تین گز کے فاصلے پر بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا ہے، اس لیے پڑوسی ہونے کے ناطے سے اُس کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اُٹھ کر آئے اور لوگوں کو بتائے کہ میرے مرحوم پڑوسی کا نام کیا ہے — چنانچہ وہ لنگڑاتا ہوا آیا۔ لاش پر جھکا اور چور سی فاتحانہ نگاہ شمبھو پر ڈالی۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو — ”میں نہ کہتا تھا شمبھو! آخر تم مرجاؤ گے اور تمہاری اس جگہ پر مجھے ہی بیٹھ کر بھیک مانگنا پڑے گی؟“

شمبھو — قسمت کا دھنی تھا۔ کیونکہ وہ عین اُس نادر موقع پر بیٹھا کرتا تھا۔ جہاں سے پل کے پہلو سے اُترنے چڑھنے والی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ اور اس کے کامریڈ نندو فقیر نے اس نادر جگہ کو حاصل کرنے کے لیے نہ جانے لاکھوں بار دُعا کی تھی، جب جاکر شمبھو مرا ہے —

نندو نے اپنے کان پر سے ادھ جلی بیڑی اتاری ہے اور شمبھو کی لاش کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکالی ہے اور بیڑی سلگا کر ماچس اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا ہے — ”میرا اور شمبھو کا دس سال کا ساتھ تھا۔ ہم بالکل جگری دوستوں کی طرح بھیک مانگا کرتے تھے۔ آہ! بھگوان نے اُسے مجھ سے پہلے بلا لیا —“

ایک ٹھنڈا سانس بھر کر، بڑی حد تک وہ رونے لگا ہے۔ اور روتے روتے قریب سے گزرتی ہوئی ایک اَپ ٹو ڈیٹ اور خوشحال حسینہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا ہے — ”بی بی بھگوان کے نام پر ایک پیسہ۔ بھگوان تجھے امر بنائے رکھے۔“

شمبھو کا منہ کھلا ہوا ہے۔ کھلے ہوئے منہ میں بھیک مانگنے کا انداز نہیں ہے۔ کیونکہ موت کے بعد اس کے لیے بھیک مانگنا غیر ضروری ہے۔ اُس کے دانت سختی سے بھنچے ہوئے ہیں۔ اُس کا چہرہ خشک، زرد اور پھیکا پھیکا سا ہوگیا ہے، کلائی کی ہڈیاں اور نیلی نیلی رگیں پوری آب و تاب سے اُبھر آئی ہیں — غرض کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جس کی بنیاد پر لاش کو خوبصورت کہا جاسکے۔ لباس بوسیدہ اور میلا پرانا ہے دو تین جگہوں پر جو پیوند لگے ہوئے ہیں وہ اصلی لباس سے زیادہ صاف اور چمکیلے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر یہ مسرت ہوتی ہے کہ شمبھو کا پیوند لگانے کا ٹیسٹ کافی جدید اور ترقی یافتہ تھا۔

شمبھو کی لاش سے ڈیڑھ گز کے فاصلے پر پرانے بوٹوں کا سوداگر بوٹا رام بیٹھا ہے۔ وہ پالش سے چمکائے ہوئے پرانے بوٹوں کو فٹ پاتھ پر نہایت نفاست اور تنظیم کے ساتھ سجائے بیٹھا ہے اور اپنے ایک گاہک کے ساتھ سودا پٹانے میں مصروف ہے۔ وہ شمبھو فقیر کی گداگری سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔ کیونکہ شمبھو نے کبھی اس سے پرانا بوٹ نہیں خریدا تھا۔ اسی لیے اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ شمبھو فقیر مرگیا ہے۔ وہ اپنے گاہک سے کہہ رہا ہے ”جناب! میں نے یہ بوٹ امریکہ کے ایک خاص فوجی آفیسر سے حاصل کیا ہے۔ آپ بھی اسے پہن کر فوجی آفیسر معلوم ہوں گے۔“

شمبھو مرا پڑا ہے۔ اور ڈیڑھ گز کے فاصلہ پر جو شخص ابھی مرا نہیں ہے، فوجی آفیسر بننے میں مصروف ہے ——— اس سے پرے ایک جوتشی پانسے پھینک رہا ہے۔ اور غیب کے خزانے ڈھونڈنے میں جٹا ہوا ہے۔ ایک بھدی سی بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کی عورت اپنے میلے دانت کھول کر ہنس رہی ہے اور مردوں کے لئے سانڈے کا تیل بیچ رہی ہے۔ اٹھارہ سال کی ایک شوخ و شنگ کنواری لڑکی اپنے ایک کنوارے عاشق کے ساتھ آئس کریم کھا رہی ہے اور کنوارا عاشق کہہ رہا ہے کہ یہ آئس کریم تمہارے ہونٹوں کی طرح شیریں اور لذیذ ہے۔ ایک ریفیوجی چھوکرا اپنے کیلوں کی گلی سڑی ٹوکری اٹھائے اس حسین کنواری کی منت خوشامد کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرے کیلے آئس کریم سے زیادہ میٹھے اور لذیذ ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ ساری ٹوکری صرف دو آنے میں دینے کو تیار ہے ——— سارا فٹ پاتھ زندہ رہنے میں مصروف ہے — شمبھو کے بارے میں ہر ایک کو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ مرگیا ہے یہی اطلاع کافی ہے۔ اس سے زیادہ اطلاع کے لیے ان کے ذہن میں جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے ذہن کی بیشتر جگہ پرانے بوٹوں، آئس کریموں، غیب کے خزانوں، سانڈے کے تیل اور گلے سڑے کیلوں سے گھری ہوئی ہے

”اسے کیا ہوگیا ہے؟“ لاش کے قریب گزرتے ہوئے ایک معزز سے آدمی نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے یہ مرگیا ہے۔“ دوسرے معزز آدمی نے نہایت ایمانداری سے جواب دیا ہے۔

”مرا یوں کیا ہے؟“

”سالا گھٹیا اور زیادہ بیڑیاں پیتا ہوگا۔ اس لیے اُسے دمہ ہوگیا ہوگا۔“

”آپ بجا فرماتے ہیں، مجھے بھی دمہ کا ہی کیس دکھائی دیتا ہے۔“ پہلے معزز آدمی نے نہایت مہذبانہ لہجہ میں تائید کی ہے۔ اور پھر یوں ہلکا پھلکا ہو کر چلا گیا ہے۔ جیسے اُس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ اگر اُسے یہ نہ بتایا جاتا کہ شمبھو دمہ سے مرا ہے تو اُسے سخت جسمانی کرب ہوتا چنانچہ اپنے جسمانی کرب کا علاج کر کے وہ مطمئن ہو کر چلا گیا ہے۔

”میرے خیال میں کسی سپاہی کو بلانا چاہیے۔“ ایک اور آدمی نے رائے دی ہے ——— ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی رائے دینا پڑتی ہے

”میرا خیال ہے، سپاہی کو نہیں بلانا چاہیے۔“ دوسرے آدمی نے پہلے آدمی کی رائے کو جڑ سے کاٹ دیا ہے۔

پہلا آدمی ناراض ہوگیا ہے اور غصہ میں آکر جیب سے چلغوزے نکال کر چبانے لگا ہے۔ اُس کی رائے کی رتی بھر قدر نہیں کی گئی ہے۔ لہٰذا وہ شمبھو کی لاش سے سخت ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ اگر پولیس کے سپاہی کو بلا کر لاش اُس کے حوالے کر دی جاتی تو آخر کسی کا کیا بگڑ جاتا۔ لوگ نجانے پولیس سے اتنا کیوں بدکتے ہیں کہ اپنے مُردے بھی اُس کے حوالے کرنے سے گھبراتے ہیں۔

سڑک کا ٹریفک نہایت زور شور سے جاری ہے۔ بسیں، لاریاں، کاریں، موٹر سائیکلیں، ٹرک، سائیکلیں ——— سبھی مشینیں نہایت تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہر مشین کی رفتار کی سوئی اپنے توازن میں ہے اور اپنے مقررہ نشان پر ڈٹی ہوئی ہے۔ کسی کا پٹرول ختم نہیں ہوتا

کسی کے اندر تجسس پیدا نہیں ہو رہا۔ جس کی وجہ سے وہ پل بھر کو رک جائیں اور شمبھو کی لاش پر ایک نظر ڈال لیں۔ شاید شمبھو کی موت سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ شمبھو انسان تھا اور انسان اور مشین میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ انسان جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر مشین پرزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔

ایک کتا مٹر گشت کرتا ہوا شمبھو کی لاش کے قریب سے گزرا ہے ایک دو سیکنڈ کے لیے شمبھو کی لاش کے پاس ٹھٹکا ہے۔ وہ لاش کو سونگھنے لگا ہے۔ وہ لاش کو پہچان گیا ہے۔ کیونکہ شمبھو اور وہ دونوں کئی بار اکٹھے سوتے رہے ہیں۔ کتے نے لاش کو پہچان کر پیار سے دم ہلائی ہے۔ مگر شمبھو کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس نے دوبارہ توجہ دلانے کے لیے اور شمبھو کو چھیڑنے کے لیے اس کے ساتھ رکھی ہوئی گٹھڑی کو سونگھا ہے۔ مگر شمبھو کی لاش بدستور بے حس پڑی ہوئی ہے۔ کتا مایوس ہو گیا ہے۔ اس نے ایک آخری کوشش کی ہے اور ساتھ کھڑے ہوئے آدمیوں پر بھونکا ہے۔ شاید اس کا خیال ہے کہ یہ لوگ شمبھو کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ شمبھو کے دشمن ہیں۔ شک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ شمبھو کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ شمبھو کی موجودہ پوزیشن کیا ہے۔

لاش کے قریب آدمی آتے ہیں۔ ایک دو منٹ ٹھہرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہر آدمی یہ تصدیق کر کے آگے بڑھتا ہے کہ واقعی ایک انسان مرا ہے۔ یہ لاش ایک ایسے چوراہے کی طرح دکھائی دے رہی ہے جہاں سے لوگ ایک دو منٹ میں کراس کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شمبھو کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے اسے کراس کیا ہے ورنہ زندگی بھر وہ بھیک کے لیے لوگوں کو بلاتا رہتا، ہاتھ جوڑ جوڑ کر پکارتا رہتا۔ مگر کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا ـــــ موت نے اسے زندہ لوگوں کے بہت قریب کر دیا ہے۔

"اس کے اوپر کوئی کپڑا ڈال دینا چاہیے۔ لاش کا کھلا رہنا دھرم نہیں ہے" ـــــ ایک کھدر پوش نے انسانیت کی بلندیوں سے پکارا ہے۔

"ہاں، ضرور ڈال دینا چاہیے۔ آخر انسان کی لاش ہے۔ لوگ تو جانوروں کی لاش پر بھی چادر ڈال دیتے ہیں" ـــــ دوسرے نے انسان کو جانور سے بلند کرنے کا اعلان کیا ہے۔

معاملہ دھرم کا ہے۔ اس لیے کوئی آدمی بھی کچی بات منہ سے کہنے کی ہمت نہیں کر رہا۔ بلکہ ایک شخص نے تو آگے بڑھ کر ایک میلا کچیلا کھیس شمبھو پر بھی ڈال دیا ہے ـــــ یہ کھیس خود شمبھو کا ہے اور اس کی گٹھڑی کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ اس کھیس نے زندگی بھر اس کا ساتھ دیا ہے اور اب موت کے وقت بھی دے رہا ہے ـــــ میلے کچیلے کھیس سے میلی کچیلی لاش ڈھانپ دی گئی ہے۔ رنگ سے رنگ میچ کر گیا ہے۔

"اس کے منہ پر کھیس مت ڈالو!" کسی نے سختی سے پروٹسٹ کیا ہے۔

"نہیں نہیں، ڈال دو!" کسی نے ناک پر رومال رکھتے ہوئے کہا ہے۔

نہیں نہیں، مت ڈالو! پتہ کیسے چلے گا کہ کھیس کے نیچے مردہ پڑا ہے۔" اس آدمی نے خطرہ کی گھنٹی بجائی ہے۔

"یہ پتہ لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ضرورت ہے"

"نہیں ہے"

"ہے"

"نہیں ہے"

اُس آدمی نے ہینکڑی میں آکر لاش کے منہ پر سے کھیس ہٹا دیا ہے۔ دوسرے نے غصہ میں آکر دوبارہ کھیس منہ پر ڈال دیا ہے پہلے نے پھر ہٹا دیا ہے۔ دوسرے نے پھر ڈال دیا ہے۔ اور پھر دونوں نے کھیس کو چھوڑ کر ایک دوسرے کے منہ پر گھونسہ مارا ہے اور حق اور صداقت کی لڑائی ہونے لگی ہے اور پھر اس لڑائی کو دو چار آدمیوں نے بیچ میں پڑ کر ختم کرا دیا ہے۔ اور دونوں صداقت کی تلاش میں دو مختلف سمتوں کو چلے گئے ہیں —— ایک گھٹیا موضوع پہ لڑنا بے کار ہے۔ جب زندہ شمبھو پہ کوئی آپس میں نہیں لڑا تھا۔ تو اب مُردہ شمبھو پہ لڑنے کا کیا فائدہ ہے —— اور پھر دھرم اور دیار کا زمانہ تو ویسے بھی ختم ہو گیا ہے۔

اب لاش اپنا منہ چھپائے ہوئے پڑی ہے۔ اُس کے قریب کوئی آدمی نہیں ہے۔ جتنے آدمی آئے تھے، وہ اپنا اپنا فرض ادا کر کے جا چکے ہیں۔ کسی نئے آدمی کو یہ پتہ نہیں چل رہا کہ کھیس کے نیچے شمبھو سو رہا ہے یا مر گیا ہے۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے چند منٹ پہلے شمبھو کو جو موت آئی تھی وہ کھیس ڈالتے ہی بھاگ گئی ہے۔ یعنی زندگی اور موت کے درمیان کھیس آ گیا ہے۔ جس نے زندگی اور موت کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے۔

تین چار منٹ سے لاش کھیس کی اوٹ میں ہے۔ اور پھر بارہ تیرہ سال کا ایک غلیظ سا بھک منگا لونڈا، گنگناتا ہوا آیا ہے۔ اس نے پہلے شمبھو کا کندھا جھنجھوڑا ہے اور پھر منہ سے کپڑا ہٹا دیا ہے۔ موت ایک بار پھر سورج کی روشنی میں چمک اُٹھی ہے۔ روشنی کی اس حرکت سے لونڈا ڈر گیا ہے۔ اور اس نے کپکپاتے ہوئے لہجہ میں کہا ہے۔

"بابا! —— بابا، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"ابے سالے! مر گیا ہے تیرا بابا!" قریب کھڑے ہوئے ایک گنڈیری فروش نے جیسے اُسے شرم دلاتے ہوئے کہا ہے۔

"کیسے مرا؟"

"موت سے۔"

"ابھی تو میں اسے اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا۔"

"ابے، تمہارا نوکر تو نہیں تھا کہ تم سے پوچھ کر مرتا۔ اُس کا جی چاہا اور مر گیا ہا ہا ہا —— ہا —— گنڈیریاں ایک آنے کی پاؤ۔ رے بھائیو ایک آنے کی پاؤ۔"

لونڈے کی خوف زدہ آنکھیں یک دم سنجیدہ ہو گئیں ہیں۔ اُس نے کھیس کے اندر اپنا ہاتھ لے جا کر شمبھو کی ڈب کھولی ہے۔ اُس میں سے کچھ ریزگاری نکلی ہے۔ جسے اُس نے احتیاط سے جیب میں ڈال لیا ہے۔ اُسے شاید بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے پھٹے پرانے کوٹ کی جیب میں سے دو روٹیاں نکالی ہیں۔ گٹھڑی کھول کر اُس میں سے سبزی کا سالن نکالا ہے اور لاش کے قریب بیٹھ کر کھانے لگا ہے ..... روٹی کے دو چار لقموں نے ہی اُس کے رخساروں پہ لہو دوڑا دیا ہے۔ اس لہو میں ایک طمانیت ہے۔ جو بھیک میں مانگی ہوئی روٹیوں میں سے نچوڑی گئی ہے اور شمبھو کا لونڈا چونکہ شمبھو کی طرح ابھی مرا نہیں ہے۔ اس لیئے وہ طمانیت نچوڑ سکتا ہے۔

لونڈے نے کھانا ختم کیا ہے، بیڑی سلگائی ہے۔ شمبھو کی گٹھڑی میں سے اپنے کپڑے نکالے ہیں۔ ایک کٹورا، ایک گلاس اور ایک پرانی چپل نکالی ہے۔ اور باقی گٹھڑی وہیں باندھ کر رکھ دی ہے اور اپنی اشیاء کی ایک نئی گٹھڑی بنا کر گنگناتا ہوا چلا گیا ہے ٥

جیون کے دن چار —— اسے گوری

جیون کے دن چار
لوٹ لے موج بہار ——— اے گوری
جیون کے دن چار

اب لاش ایک بار پھر ننگے منہ پڑی رہی ہے۔ نئے نئے راہ گیر آ جا رہے ہیں۔ مگر وہ دہرائی ہوئی باتیں دہرا رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے شمبھو کی لاش پر کوئی اچھوتی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اور اب لاش ایک ایسے ریگستان کی طرح پڑی ہوئی ہے۔ جہاں سال میں ایک انچ سے زیادہ بارش نہیں ہوتی۔

"یہ لاش آخر کب تک یہاں پڑی رہے گی؟" قریب کھڑے ہوئے گنڈیری فروش نے ایک جمائی لے کر کہا۔

"میں کیا جانوں، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"میرے خیال میں لاش کو یہاں سے اٹھوا دینا چاہیئے بُری لگ رہی ہے" گنڈیری والے نے ایک تجویز اٹھائی۔

"ہاں بُری تو لگ رہی ہے۔ زندہ انسانوں کے درمیان ایک مُردے کا پڑا رہنا!؟؟ ..... چھی چھی چھی!" لوٹا رام نے ایک میلے سے بُوٹ کو میلے سے کپڑے سے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"مگر اٹھوایا کیسے جائے۔ اس سالے کا کوئی سالا سمبندھی تھوڑا ہو گا؟"

"تو پھر؟ .... میرا خیال ہے، پٹڑی والوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ سب مل کر اس کے کفن دفن کے لیے چندہ اکٹھا کریں۔"

"تجویز بُری نہیں؟ مگر پٹڑی والے مانیں گے نہیں۔ سب حرامی ہیں۔ یہ انسان کی قدر کرنا کیا جانیں ——— اچھا ذرا خیال رکھنا بھیا! میرے بوٹوں کا۔ میں ذرا سامنے دکان سے چائے پی آؤں۔"

لوٹا رام چائے پینے چلا گیا ہے ——— سارے پٹڑی والے حرامی ہیں۔ چائے کے بہت پیاسے ہیں۔ گنڈیری فروش شاید سوچ رہا ہے کہ لوٹا رام سچ کہتا ہے۔ پٹڑی والے انسان کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ ابھی تو آدھی گنڈیریاں بیچنا باقی ہیں۔ لاش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں بیچنا بہت بُرا لگتا ہے گاہک لوگ لاش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں خریدنے سے ہچکچاتے ہیں۔ گذشتہ آدھے گھنٹے سے ایک بھی گاہک قریب نہیں پھٹکا ہے۔

وہ اپنا خوانچہ اٹھا کر چل دیا ہے۔ اور سامنے والے فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے ——— پٹڑی والے سب حرامی ہیں۔ انسان کی قدر نہیں کرتے گنڈیریوں کی زیادہ کرتے ہیں۔

لاش پر جو مکھیاں بھِن بھِنا رہی تھیں، وہ گنڈیریوں کی وجہ سے تھیں۔ اب وہ مکھیاں بھی شمبھو کو چھوڑ کر گنڈیریوں کے پیچھے پیچھے دوسرے فٹ پاتھ پر جا رہی ہیں ——— ہر چیز شمبھو کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔

پانچ چھ منٹ اور گذر گئے ہیں۔

نندو فقیر پھر لنگڑاتا ہوا آ رہا ہے۔ وہ لاش کے گرد گدھ کی طرح منڈلانے لگا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہے۔ جس کا چہرہ نیک نیت قسم کا ہے۔ اس نے بازو پر ایک بلّا لگا رکھا ہے۔ جس پر "جماعت۔ خادمانِ قوم" کے لفظ لکھے ہوئے ہیں۔ اس نے جیسے لاش کو سونگھ کر پوچھا ہے،

اچھا تو یہ لاش ہے؟"

"جی ہاں" نند و فقیر نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا ہے۔ "بھیک مانگا کرتا تھا، کئی دنوں سے بیمار تھا، آج مر گیا ہے بیچارا۔"

"کوئی حرج نہیں، ہماری جماعت اس کے کریا کرم کا بندوبست کر دے گی۔ آہ! ملک میں بھکاریوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔"

نند و فقیر کو بھکاریوں کے فلسفہ پر بحث میں حصہ لینے کا کوئی شعور نہیں ہے۔ اس لیے وہ مضطرب ہے اور کہہ رہا ہے "اسے آپ کیسے اٹھوا کر لے جائیں گے؟"

"مزدوروں کے ذریعے رسے سے باندھ کر۔"

وہ شخص مردے اٹھوانے کا شاید تجربہ رکھتا ہے۔ اس نے دو مزدوروں کو اشارہ سے بلایا ہے۔ اور انہیں حکم دیا ہے کہ "لاش کو رسّے سے باندھ کر کندھے پر اٹھا کر ہمارے دفتر تک لے چلو۔"

نند و فقیر نے رسّہ بندھوانے میں نہایت پھرتی سے امداد دینا شروع کر دی ہے۔ راہ گیر ایک لاش کو رسّہ بندھتے دیکھ کر پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ رسّہ باندھنا ایک تماشہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہر تماشہ ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ کشش ثقل کا اصول ہے۔

"یہ بہت بے رحمی ہے۔ انسانی لاش کو رسّہ نہیں باندھنا چاہیئے۔" ایک راہ گیر نے حقارت سے کہا ہے۔

"تو پھر آپ اپنے گھر سے ایک چارپائی لا کر دے دیجیے۔"

"میں ہوٹل میں رہتا ہوں، میری اپنی چارپائی کوئی نہیں ہے۔"

ہوٹل والا لطیفہ خوبصورت ہے۔ سب کو مزا دے گیا ہے اور سبھی بے ساختہ ہنس پڑے۔

مجمع دیکھ کر ایک کانسٹیبل فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے ڈنڈا لہرا کر دور سے ہی للکارا ہے۔ "ایک طرف ہٹ جاؤ، کیوں اکٹھے ہو رہے ہو، کیا بات ہے؟"

"یہ بھکشو فقیر ہے جو مر گیا ہے۔" خادم قوم نے جیسے کو تیسا جواب دیا ہے۔

"کیوں مر گیا ہے، کیسے مر گیا ہے؟ کس نے مارا ہے؟" کانسٹیبل نے آئینی سوالات کی بوچھاڑ کر دی ہے اور لاش کے سرہانے ان سُن ہو کر کھڑا ہو گیا ہے۔ مزدوروں نے رسہ باندھنا بند کر دیا ہے۔ انہیں قانونی آرڈر کا انتظار ہے۔

"یہ لاوارث لاش ہے، اور ہماری جماعت اسے شمشان لے جا رہی ہے۔" خادم قوم نے فخر کے ساتھ اعلان کیا ہے۔

"کون ہے تمہاری جماعت؟ ہوں! میں سب جانتا ہوں تم لوگوں کی بدمعاشیاں۔ تم اسے مار کر اب لاش چھپانا چاہتے ہو؟"

ڈنڈے کی آواز پھر ابھری ہے۔ جس سے سبھی لوگ سہم گئے ہیں۔ کئی کنی کترا کر نکل گئے ہیں۔ خادم قوم جوش و خروش سے ابل رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

"اس فقیر کے قاتل تم ہو، تمہارا سماج ہے، تمہارا نظام ہے۔ تمہاری سرکار ہے۔ انسان سڑکوں پر یوں بھوکے پیاسے مر رہے ہیں اور تم ہتھکڑی ہاتھ میں لیے مردوں کو گرفتار کرنے کے لیے پھر رہے ہو۔ شیم، شیم!"

سبھی لوگ اس تقریر سے متاثر ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ "شیم، شیم!"

"اپنا لیکچر جیب میں رکھو" کانسٹیبل اپنے وقار کو مٹی میں ملتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ "میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں، کیونکہ تم قانونی کارروائی

میں رکاوٹ ڈال رہے ہو۔"

"سبھی لوگ کانسٹیبل کی مدلل بات سے متاثر ہوئے ہیں —— شیم! شیم!"

نند و فقیر کی حالت دگرگوں ہے —— اُسے قانون کے باریک نکتوں کی سمجھ نہیں ہے۔ اس لیے وہ گرفتاری کے ڈر سے کھسک کر اپنی پرانی جگہ پہ جا بیٹھتا ہے۔

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ میں خادمِ قوم ہوں۔" خادمِ قوم کا چہرہ غصّہ سے سرخ ہے

"چلو چلو، بکواس بند کرو اور تھانے چلو۔"

"یہ لاوارث لاش ہے۔ اس لیے قوم کی امانت ہے، اسے میں لے جاؤں گا۔"

"تم اس لاش کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے۔"

"میں اسے لے جائے بغیر ٹلوں گا نہیں۔"

کانسٹیبل نے اُس کی کلائی میں ہتھکڑی ڈال دی ہے۔ لوگ تذبذب میں ہیں کہ لاش کس کے ہاتھوں میں زیادہ محفوظ رہے گی۔ پولیس کے یا خادمِ قوم کے۔

"مجھے شک ہے کہ اس کی موت کے ذمہ دار تم ہو۔" کانسٹیبل نے خادمِ قوم پہ آخری اور بھرپور وار کیا ہے۔ "اس لیے اب تمہارے خلاف مقدمہ چلے گا۔"

شمبھو کو کس نے مارا ہے؟ اس سلسلہ میں شمبھو خاموش ہے۔ اپنی موت کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ اپنے دفنانے کے بارے میں اُس کا اپنا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ کیونکہ شمبھو اپنی لاش کے مستقبل سے بے نیاز ہو کر مرا پڑا ہے۔ خادمِ قوم ہتھکڑی پہن کر سپاہی کے ساتھ تھانے جا رہا ہے اور نہایت جوشیلے انداز میں کہتا جا رہا ہے —— "میں عدالت میں بات کروں گا کہ اس موت کا اصل ذمہ دار کون ہے..... میں حق اور صداقت......"

وہ چلے گئے ہیں۔ لوگ بھی چلے گئے ہیں۔ شمبھو کی لاش پہ سے اب مطلع پھر صاف ہو گیا ہے۔

اب شمبھو کی لاش پھر لوگوں سے کٹ گئی ہے

تین چار منٹ اور گزر گئے ہیں۔

تین چار منٹ اور

—— دس پندرہ اور

اور پھر لاش میں ایک خفیف سی حرکت پیدا ہوئی ہے۔ اس کے منہ سے ایک خفیف سی کراہ لرزی ہے۔ جیسے کوئی رُک رُک کر سانس لے رہا ہو۔ اُس نے نہایت کرب اور اذیت کے ساتھ ہولے ہولے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ اور پھر بند کر لی ہیں۔ اور پھر جیسے ہڑبڑا کر اُٹھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر نقاہت کے باعث اُس سے اُٹھا نہیں جا سکا۔ اُس نے چند بے معنی الفاظ منہ سے نکالے ہیں۔ اُس نے چلتی ہوئی سڑک کی طرف اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ پھیلا دیا ہے۔

نند و فقیر بھاگ کر لنگڑاتا ہوا اُس کے پاس آ گیا ہے۔

"شمبھو! ـــ تم ..... تمہیں ..... ، کچھ! تم تو اُٹھ بیٹھے ہو!" شمبھو نے اُٹھنے کی کوشش کی ہے مگر اس کا سر اُٹھ نہیں رہا ہے۔ نند و چونکہ اس کا کامریڈ ہے اس لیے وہ شمبھو کے سر کو سہارا دے کر اُسے اٹھا رہا ہے "تمہیں کیا ہو گیا تھا؟"

"کچھ نہیں، میرا دل ڈوب رہا ہے۔ کہیں سے پانی لاؤ!"

نند و فقیر پانی لینے چلا گیا ہے۔ اس کے قدم من من کے بھاری ہو رہے ہیں۔

"گنڈیریاں ایک آنے کی پاؤ!" سامنے کے فٹ پاتھ سے آواز اُبھری ہے۔

"سانڈے کا تیل! سانڈے کا تیل!" ایک اور آواز جاگی ہے۔

"صاحب! بالکل امریکن بوٹ ہیں، خالص فوجی ......!" ایک اور مانوس آواز شمبھو کے کان میں پڑی ہے۔

شمبھو نے ایک ہاتھ اپنے ڈوبتے ہوئے دل پر رکھا ہے اور دوسرا ہاتھ ایک حسین راہگیر جوڑے کی طرف پھیلا دیا ہے۔

"جوڑی بنی رہے بابو جی! بھگوان کے نام پر ایک پیسہ!"

چند یادیں

عبدالرحمٰن چغتائی

آج سے تقریباً بیس سال پہلے ارادہ کیا تھا کہ میں بعض واقعات کو قلمبند کرتا چلا جاؤں، چاہے وہ خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار مگر ان میں زندگی کی رمق ضرور موجود ہو۔ آہستہ آہستہ یہ کوشش کتاب کی سی شکل اختیار کر گئی۔ اور میں اپنی اس کوشش کو فرسودہ باتیں کہہ کر یاد کرنے لگا۔ اس میں شاعروں، افسانہ نگاروں اور آرٹسٹوں سے ملاقاتوں کے علاوہ بعض ایسے حقائق کا بھی ذکر آ گیا ہے جن میں سامانِ زندگی کے علاوہ رموزِ زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ایک موقع پر ایک مغربی عورت نے مجھ سے سوال کیا کہ "تمہارا ماڈل ؟" میں نے ذرا بے تکلفی سے کہا "تم ہی تو ہو" — وہ مسکرائی جیسے آئینہ میں اپنا جائزہ لے رہی ہو۔ وہ کمپ لیکس کے زیرِ اثر اپنے آپ کو ناپنے لگی۔ اور دوبارہ مغربی انداز میں جیسے غلام کی بصیرت سے منکر ہونے کی کوشش کر رہی ہے، کہنے لگی "اس ملک میں آرٹسٹوں کو اپنے لیے ماڈل تلاش کرنے میں کافی مشکلیں پیش آتی ہوں گی"۔ ادھر غلام ابنِ غلام والا معاملہ تو تھا نہیں، میرے پرداوا نے تو یقیناً آزادی دیکھی ہو گی اور پھر مجھے اپنی بصیرت اور فہم پر بھروسہ بھی تھا۔ میں نے دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے اور اسی انداز سے کہا "فنکار کو ماڈل تلاش کرنے میں نہ یہاں مشکلیں پیش آتی ہیں اور نہ مغرب میں — صرف طرزِ زندگی کا سوال ہے اور وہی فرق ہے۔ میں یورپ دیکھ آیا ہوں۔ کس قدر جذبات سے خالی مشینوں کے کل پرزوں کی طرح ننگ دھڑنگ عورتیں ماڈل بن کر آرٹسٹوں کے سامنے بیٹھ کر اپنی برہنگی کی نمائش کیا کرتی ہیں۔ خصوصیت سے اس وقت جب وہ اپنی اکتاہٹ دور کرنے کے لیے سگریٹ کے بے سود کش لگاتی ہیں تو کتنی بھونڈی اور جذبات سے عاری نظر آتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہو گا، میں نے محسوس کیا تھا وہ ہر سہارے کے باوجود جسمانی شدتوں کا توازن قائم نہیں رکھ سکتیں اور نہ اپنی عریانی کو چھپا سکتی ہیں ——— تمہارا مطلب غالباً ماڈل سے وہ عورتیں ہیں جو برقع پہنتی ہیں اور مردوں سے حجاب کرتی ہیں —" اس موقع پر وہ ذرا ضبط سے مسکرائی جیسے میرے قومی کردار پر طنز کر رہی ہو۔ ساتھ ساتھ وہ آئینہ خودنمائی نکال کر اپنا غازہ اور سرخی دیکھ رہی تھی اور اس میں اضافہ بھی کرتی چلی جا رہی تھی ——— میں نے کہا "انفرادی خصوصیت چاہے وہ مرد کی اپنی ہو یا عورت کی، زیادہ قریب ہونے سے ضعیف اور مضمحل ہو جاتی ہے۔ خصوصیت سے عورت مرد کے حقوق سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ ایشیا کا یہ فطری تقاضا ہے کہ وہ عورت کو تاج کے ہیروں اور جواہرات کی طرح اپنے سر کے لیے محفوظ

رکھے۔ ایشیا کی عورت بے تکلفی کا موجب اس لیے نہیں بنتی کہ مرد اس کے اوصاف کی پرکھ سے ابھی تک مطمئن نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں مغرب میں آج عورت کے متعلق یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ اسے ہم مشربوں سے کوئی شکایت ہے یا کوئی امید ہے۔ یا وہ رہینِ منت ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مغرب میں عورت کو اپنے ستر کا احساس کسی وقت بھی نہیں ہوتا۔” —— یہاں پہنچ کر اس کا قہقہہ دیواروں سے چھو کر دب گیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ کچھ جھینپ سی گئی تھی۔ یا اسے اپنے سوال کی قیمت بہت زیادہ وصول نہ ہوئی۔

مشرقی زندگی کا سوز و ساز ابھی تک اپنے تسلسل کو توڑ نہیں سکا۔ اس کی زندگی میں آج بھی وہ کسک اور روحانی جذبات کی ہم آہنگی موجود ہے جس سے وہ اپنی سلامتی کا ضامن ہے۔ مغرب پرستی کے طلسم نے اسے گمراہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اسے اپنی کمتری کا مظاہرہ کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ کیونکہ وہ مشرقی زندگی کے اقدار اور اقتدار دونوں کا دشمن ہے۔ اور جب تک اسے اپنی خود پسندی کا جنون حاصل نہ ہو گا اس وقت تک اپنے دامن کو بچانا اور بے عیب رکھنا محال ہے۔

مغربی خاتون کا یہ سوال اگرچہ اس کے فطری تقاضوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ مگر اس میں تلاش اور سوچنے کے امکانات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مشرقی فن کار کے سامنے اس کے سوال کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں، یہ ایک الگ سوال ہے۔ تخلیق کار کو چاہیئے کہ وہ تخلیق کا سہارا تلاش کرتا رہے۔ اور اپنی روحانی قوتوں سے خائف رہے اور انھیں قابلِ تسخیر سمجھے۔ جنھیں وہ روایات کی بنا پر کسی فروگذاشت سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

مغرب میں جدید مصوری کا وجود اس اکتا کا لازمی نتیجہ تھا جو قدیم آرٹسٹوں کے شاہکاروں نے سحر کی طرح پیدا کر رکھی تھی اور یہ طلسم ایسے جمود کا باعث بھی تھا کہ آج کا انسان اس کو بہت دیر تک برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ نگاہیں جو قدیم آرٹسٹوں کے شاہکاروں سے اٹھنے کا نام نہ لیتی تھیں، جدید تحریک سے آہستہ آہستہ بے رونق ہوتی گئیں۔ کیونکہ انھوں نے نئے نئے تجربات کے ذریعے تخلیق کا مقصد بدل کر رکھ دیا تھا۔ ادھر میکانی اور کیمیائی جوہروں نے صرف نظامِ زندگی پر ہی اثر نہ ڈالا تھا بلکہ انسان کے سکون کو بھی درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ اور آرٹسٹ کو اپنے لیے راہ منتخب کرنا ایک الجھن نظر آ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ضروریاتِ زندگی نے ان کی طبیعتوں اور ذہانت پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا تھا اور نجات کا صرف ایک ہی ذریعہ رہ گیا تھا کہ وہ بغاوت کرتے اور اپنی فنی صلاحیتوں کا محور بدل ڈالتے اور ایک ایسا نعرہ بلند کرتے جو ان کے تمدن اور تہذیب کا علمبردار ہوتا۔ آہستہ آہستہ ان کا ردِ عمل بغاوت اور ایسے تجربات اتنے کامیاب ہوئے کہ انھوں نے قدیم آرٹسٹوں کے شاہکاروں کو تھوڑی دیر کے لیے نظرانداز کر دیا۔ اور دنیا ان کی طرف جھک گئی۔ مغرب میں اپنی طرز کا ایک واحد اسکول ہے جس نے اپنے شاہکاروں کے لیے ماڈل کا استعمال کیا بھی تو اس طرح جیسے وہ ان کا اپنا کردار ہے۔ قدیم استادوں میں ان کی مثال ریمبراں کے سوا مشکل سے نظر آتی ہے۔ فان گوگ جو خود بھی ہالینڈ کا ایک باشندہ تھا۔ پوسٹمین اس کا شاہکار، زندگی کی تھکن کا مظہر، ایک ایسا کردار ہے جو دنیا کے ہر حصے میں ملتا ہے۔ جس کی اصولی اور فطری بنا یہ ہے کہ اس پوسٹمین کو اپنے خالق گوگ سے ایک گہری دلچسپی تھی۔ اور زندگی کے ہزار جھمیلوں کے باوجود وہ اپنے خالق آرٹسٹ کے قریب تر تھا۔ یہ طریق کار فنِ مصوری میں ماڈل کے مقلدوں کے لیے مغرب میں بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔ ہاں اعلیٰ کردار اعلیٰ ماڈل، زندگی کے ہر موڑ پہ ملتے ہیں۔ جن کا انتخاب انفرادیت کا حصہ ہے۔ جو ماڈل کی پابندیوں اور عقل کی موشگافیوں سے آزاد ہے۔ کیونکہ زندگی کی حدت متحرک جذبوں میں مضمر ہے اور یہ حدت ہی اخلاق، کردار اور روحانی محرکات کی متلاشی ہے۔ اس کے علاوہ بھی جدید استادوں کی معراج مشرقیت، مشرقی طرزِ معاشرت، مشرقی طرزِ نگارش میں ہے۔ اور یہ ان کے اپنے الفاظ ہیں، کہ وہ مشرقیت کے حسن اور طرزِ نگارش سے مستفید ہوتے اور اس

طرح اپنی ذہانت اور تکنیک کو فنی صلاحیتوں میں بروئے کار لاسکے۔

آرٹسٹ کی صلاحیتوں کا یہ تقاضا نہیں کہ وہ الجھنیں پیدا کرے، رمز شناسی کو ایک معمہ بنا دے۔ اور ایک برہنہ ماڈل کے انتشار کو جزو کل سمجھے۔ جمالیات کی ہر جھلک دنیا کے خوبصورت سے خوبصورت بدن کی عریانی سے بالا ہے اور جدید تخلیق کار تخلیق کی تکمیل کے لیے ہمیشہ کردار کی اہمیت کو ترجیح دیتا ہے اور فروغِ فن کے لیے جہاں وہ چاہے اپنے ماڈل کو دیکھ لیتا ہے۔ مشرقی آرٹسٹ کی طرح نہ وہ ماڈل کا مقلد ہے اور نہ ماڈل کی لعنت کو فطری تقاضا سمجھتا ہے اور اسی اصول پر تمام ازم جمع ہیں۔ اور یہی اصول اس کو اپنے خطرناک تنزل سے بچا سکا ہے۔

مغرب میں آج قوتِ ڈیزائن نے جس بلند آہنگی سے نعرہ بلند کیا ہے اس سے پہلی صدیوں کے فن میں یہ قوت ان کے ہاں نہ ہونے کے برابر نظر آتی ہے۔ مشرقی مصوری میں مغل آرٹ نے شبیہہ نگاری میں ایک وصف پیدا کیا تھا جس سے ان کے فن کی انفرادیت۔ اس وقت کی معاشرت دربار کی شان و شوکت بادشاہ اور مصاحب کی پہچان کی عکاسی ہوتی ہے، مگر یہ کہیں نہیں ملتا کہ چترمن، گوردھن، فرخ بے اور نادر العصر استاد عبد الصمد نے جہانگیر، شاہجہاں، ممتاز محل یا نور جہاں کو اپنے سامنے بطور ماڈل کے بٹھایا ہو جس طرح لیونارڈو نے مونالیزا کو ایک ماڈل کی حیثیت سے بٹھایا تھا۔ وہ اپنے مشاہدات سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کے مطالعہ کا تقاضا تھا۔ ان کے وسائل بھی ایسے تھے اور یہی ایک وجہ تھی کہ انھوں نے جمالیات پر جسمانی اجزا کو قربان کر رکھا تھا۔ چاہے اس کے اسباب کچھ ہی تھے۔

پیرس سے برلن جانے کے لیے جب میں اپنی سیٹ والے ڈبے میں پہنچا تو اتفاق سے میرا ہمسفر ایک ایسا آرٹسٹ تھا جو ان دو ملکوں میں ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنی اہمیت رکھتا تھا میری ملاقات فرنچ آرٹسٹ اینڈر ڈیرین سے ہوئی اور جب ہم اِدھر اُدھر کی باتوں سے گھوم کر امپریشن ازم اور سوا نیلے ازم کو برا بھلا کہہ چکے اور بعض انفرادی آرٹسٹوں کے متعلق گفتگو کرنے لگے تو ڈیرین نے کہا ٹولس لوٹرس کا نظریہ اپنی تخلیق کے متعلق یقیناً بہت عجیب و غریب تھا۔ اس کا قول ہے کہ وہ ہر رات ایک نئی عورت سے ہم بستر اس لیے ہوتا تھا کہ اس کی ہر صبح ایک نئی تخلیق کا پیش خیمہ ہو۔ مرکزی خیال صرف اس قدر تھا۔ اس پر بحث ہوتی رہی۔ مگر تخلیق کے بارے میں کوئی قطعی اصول وضع نہ ہو سکا۔ کیونکہ میں اپنے مرکزی خیال پر قائم رہا کہ تخلیق زندگی کے رجحانات کا کتنا ہی اہم مسئلہ کیوں نہ ہو مگر اس کا نتیجہ ماحول کی نشوونما سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ وہ پیرس کا رہنے والا تھا، اسے حرام و حلال، ستر اور ننگ کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس نے یہاں تک بھی اپنے عقیدے کا اظہار کر دیا تھا کہ جب حیوان اور پرند ہمارے روبرو بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو کیوں ہم یہ جرأت نہ کریں کہ ننگے پھرا کریں اور سب کے سامنے عورتیں بچے جنا کریں۔ میں نے اسے بار بار احساس دلایا کہ پیرس میں یقیناً ایسا ہوتا ہے۔ میں نے راتوں کو سڑکوں اور فٹ پاتھ اور گلی کوچوں کے موڑوں پر عورتوں اور مردوں کو بدحواس دیکھا ہے اور یہ شرف پیرس ہی کو حاصل ہے جس نے آزادی کے لیے جنگ کی، دنیا کو علم و فن دیا۔ وکٹر ہیگو، موپاساں، فلابیر، بال زاک، برگساں، رودان، کوربے، مینے، رینائے، متیشے، گوگیس اور لوئی اراگاں جیسے پُرخلوص فنکار دیئے جنھوں نے ہمیشہ دنیا کے جمود کو توڑا۔ انکا کو ختم کیا۔ ارتقا کے مسئلے کو سلجھایا۔ عوام کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلایا۔ وہ ملک اتنی بڑی دولت کے ہوتے ہوئے آج مسافروں کے رحم پر ہے جو براتھل ہاوس میں فرانس کی کنواریوں کی قیمتیں چکاتے ہیں۔ جنھیں ارزاں کہہ کر کبھی منہ مانگی قیمت نہیں دیتے۔

وہ پرلیزین تھا اس نے اپنے فطری تقاضے سے پھر ٹولس لوٹرس کا ذکر اس ضمن میں چھیڑ دیا کہ وہ پیرس کی پراگندہ زندگی کا

ترجمان تھا۔ وہ گھناؤنے اور دُکھ بھرے واقعات کو رنگ دینے والا تھا۔ میں اِدھر اُدھر کی باتوں سے ہٹ کر چپ ہو رہا۔ کیونکہ اس قسم کی کج بحثی کا کبھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس پر بھی میں نے یہ ضرور کہا تھا۔ ٹولس لوٹرس میں بربریت کی سی بُو آتی ہے مگر عوام کی نمائندگی کا نشان بھی نہیں ملتا۔ اس کی مصوری سے اس کے اپنے قول کی کتنی بھی تصدیق ہوتی ہو مگر اس کی ہر تصویر اس کے ذہنی اتار چڑھاؤ کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے فن کے نقطۂ نظر سے اس کے آرٹ کا درجہ بہت بلند ہو۔ اس میں اس کے ماحول کی عکاسی اور ترجمانی ہو۔ لیکن جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے اس کا نظریہ فرانس تک محدود ہے۔ جہاں دن رات سوائے نفسانی خواہشات اور برہنگی کے مظاہروں کے دوسری کوئی قوت دماغوں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جب ہم ریمبران اور روبنز کی بنائی ہوئی ننگی تصویروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو لوٹرس ان کے سامنے خود ننگا، بے ستر، جنسی تھکن کا مارا ہوا نظر آتا ہے۔ اس وحشت اور برہنگی میں ان عورتوں کی تصویروں کے سوا دوسری کوئی عورت نظر نہیں آتی جنھیں نہ ماں نے جنا اور نہ باپ نے ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا ہے۔ پیرس کتنا ریچڈ اور گدلا شہر ہے۔ ٹولس لوٹرس کے قول اور نقطۂ نظر سے یہ واضح بھی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں اس کے آرٹ کے صحیح مقاصد کو سمجھنے کے لیے اس زندگی کا مطالعہ بھی ضروری ہے کہ اس دنیا کے لوگ کس قدر گھناؤنے، کس قدر بد ذوق، جنس کے خریدار ذلیل زندگی کی ہر ذلالت سے دوچار ہیں۔ حالانکہ وہ خود ایک امیرزادہ تھا۔ کلچر اس کے گھر کی مہمان تھی۔

ماڈل کی روایات کے سلسلہ میں مجھے ریمبران کا نظریہ بہت پسند ہے۔ اس نے خود کو ماڈل سمجھا اور اس کی اپنی بنائی ہوئی اپنی شبیہیں سو کے قریب ملتی ہیں جو ایک کم فہم کے نزدیک ایک سے ایک نہیں ملتی لیکن ہر شبیہہ میں ریمبران کا اپنا کردار، اپنے اوصاف، اپنا فن اوجھل نہیں ہوتا۔ اس نے جب بادشاہ سے اپنے سامنے ایک ماڈل کی حیثیت سے بیٹھنے کی درخواست کی اور بادشاہ بھی ایک بلند معیار حُسن کار کی خوشی کو پورا کرنے کی غرض سے اس کے ہاں آیا تو اس نے اسے وہ لباس پیش کیا جس میں وہ اس کی تصویر بنانے کا خواہاں تھا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ وہ ایک فقیر کا بوسیدہ لباس تھا۔ بادشاہ باوجود ہر جاہ و جلال کے اسے گداگر نظر آ رہا تھا جو مقدس انجیل کا ایک کردار تھا۔ اور میرے نزدیک یہی ایک امتیاز ہے جو ٹولس لوٹرس اور ایمبران کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ ایمبران کی ہر عورت ابی مریم، ماں، بہن اور محبوبہ ہے جس کو ماں نے جنا اور باپ نے شفقت کی گود میں اسے پالا پوسا ہے ——— ٹولس لوٹرس ایمبران سے تقریباً تین سو سال بعد فرانس میں پیدا ہوا اور وہیں مر گیا۔ اس کا فن اس کی اپنی انفرادیت کا سہارا ہے۔ وہ زندہ ہے۔ کیونکہ اس سے انسانی تنزل اخلاقی بندھنوں سے بھی اپنے آپ کو آزاد تصور کرتا ہے۔ اس کی ہر عورت گھناؤنی زندگی کی حامل ہے۔ نہ اسے ماں نے جُنا ہے اور نہ باپ کی شفقت اسے نصیب ہوئی۔

جدید آرٹ کی تحریک کے اسباب کچھ بھی ہوں وہ ایک ردِ عمل ہے۔ وہ ایک انتشار ہے جس کے پشت پناہ میکانی اور کیمیائی جوہر ہیں۔ جب سے دنیا نے فن کے ساتھ انسانیت کو وابستہ پایا ہے۔ یہ موجودہ تحریک اپنی اہمیت کی ذمہ دار ہے۔ اس کا دعویٰ ہے وہ آزادی اور سچائی کی علمبردار ہے۔ اس سے آرٹ کا وہ ابتدائی دور پھر سے جنم لیتا ہے جسے وحشت اور بربریت نے اظہارِ خیال کے لیے نہیں بلکہ اظہارِ خیال کی پرستش کے لیے تخلیق کیا تھا۔ جس میں دیوتا، خدا اور محبوب سبھی شامل تھے ——— موجودہ تحریکوں کے رجحانات ذہنی جمود، فنی نشوونما کی تھکن کے تقاضے ہیں۔ اس وقت فنکاروں کی طرف سے ہی نہیں بلکہ اس فن کے قدرشناسوں میں بھی بے اطمینانی اور قنوطیت پائی جاتی تھی ——— مشین اور کیمیائی ترقی نے آرٹسٹ کو زندگی کے اور قریب کر دیا ہے تاکہ وہ فطری خدوخال کو

زیادہ سے زیادہ ترقی پسندانہ انداز میں دیکھنے کا خوگر بن جائے۔

انیسویں صدی کے آخری حصہ میں یہ پیچیدگیاں آرٹسٹوں کو اور بھی زیادہ نظر آئیں خصوصیت سے رینائے اور مینے نے ان انقلابیوں کی جس خلوص سے رہبری کی ہے، ایسا کوئی اور آرٹسٹ نظر نہیں آتا مگر گوگیں، گوگ، سیزاں، منیشے اور پکاسو موجودہ تمدن کو مریض خیال کرتے رہے اور کہتے رہے آرٹ کو پھر سے جنم دینے میں اس کی جیت ہے۔

انیسویں صدی کا اختتام نہ ہوا تھا کہ RRIMITIVE ART نے مختلف شکلوں میں مختلف ملکوں میں امتیاز حاصل کیا اور دیکھتے دیکھتے کئی صورتوں میں سامنے آیا اور دنیا نے اسے قبول کر لیا۔ وحشی قوموں نے اپنی بربریت کو اپنے دیوتا کے تناسب اور خد و خال کو، اور مذہبی توہمات کو جہاں چھوڑا تھا، وہاں سے اس کی ابتدائی صدیوں کے بعد ترقی پسندانہ رجحانات کے زیر اثر اس سے تعاون کیا گیا اور اپنے سامنے فرعون کے مجسموں کو، جینیٹس کی برتری کو رکھا گیا۔ اور ہر بربریت اور اختصار کو حل قرار دیا گیا۔ اس اسکول کے تمام نمائندے سائنٹفک توجیہہ کے لیے کیمیائی اور میکانی تھیوری سے استفادہ کرتے رہے اور فن اپنی فطرت کے مطابق مہذب دنیا سے وابستہ ہو گیا۔

جاپان کے لافانی آرٹسٹ ہکشائی نے عرب کی ہندسی شکلوں نے، ایران کی نسخ اور نستعلیق خطاطی نے جدید آرٹ کو متاثر کیا جس میں فرانس، لندن، امریکہ، ہندوستان اور جاپان نے حصہ لیا۔ اور جو بھی جدید تحریک میں شامل ہوا اس نے سوئی ہوئی قوتوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اور آخری دم تک اس کا ساتھ دیا۔

مشرق کی وہ سرزمین جس پر آرٹ کے پہلے شاہکار نے جنم لیا وہ زمین مصر ہے۔ اس کے بعد فلسطین، ایران اور ہندوستان نے اپنے ماحول، اپنی معاشرت کی بنا پر بڑے بڑے شاہکار تخلیق کیے۔ یہ سب آرٹسٹ اور صناع نہ ماڈل کے مقلد تھے، نہ ماڈل ان کی پرکھ تھی۔ ان کے ماڈل وہ کردار تھے جن میں زندگی تھی۔ ناقابلِ تسخیر عمل تھا۔ جن میں انسان اور انسانیت کے پھلنے پھولنے کے امکان تھے۔ ان کی ذہانت اور ان کا شعور انھیں سمجھ سکا تھا۔ فراعنۂ مصر کے مجسمے ان کے استبداد اور ان کے وقت اور عظمت پر ہی روشنی نہیں ڈالتے بلکہ ان میں فن کی وہ تمام قوتیں، صلاحیتیں اور حقائق پائے جاتے ہیں جن کی طرف دیکھ کر آج کا انسان متحیر ہی نہیں رہ جاتا بلکہ وہ سوچتا چلا جاتا ہے کہ خدا نے انہیں کن لافانی قوتوں سے سرفراز کیا تھا۔ پتھروں کا سا دل اور فولاد کا جسم دے کر کیوں انہیں کچل کر رکھ دیا تھا۔ ان مجسموں کا ابدی سرور، اقتدار اور مملکت ہی نہیں وہ اعلیٰ ترین اوصاف ہیں جن سے فنکار کی نیت، پاکیزگی اور اس کے خلوص کا اظہار ہوتا ہے اور وہ کیفیت جو ان کے دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے انفرادی نوعیت کی ہے۔ ان کے مطالعہ سے کبھی انتشار پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک نہایت لطیف میلان ان کے ہمارے درمیان حائل ہوتا ہے کہ ہم رموزِ زندگی اور انسانی عظمت سے دوچار ہوتے ہیں اور یہ اثر آفرینی ماڈل کی بدولت نہیں کردار کی تشکیل سے ہے جو ہزاروں سال گزر جانے پر بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ فنکار اپنے شاہکاروں کو سادہ اور نہایت کم درجہ تمثیلوں سے، اختصار سے تکمیل دیتے تھے۔ ظاہری طور پر ان کا مقصد ہر شاہکار کو آسان، عام فہم، قابلِ تحسین بنانا ہوتا تھا۔ مگر جب ان پر مبصروں نے نگاہیں گاڑ دیں تو انھیں ان کے معنی فرعون کے دعووں سے بھی زیادہ بلند اور عمیق نظر آنے لگے اور فن کی پرکھ رکھنے والوں نے بادشاہ اور رعیت کے تعلق کو چھوڑ کر ان کو ان کی ذاتی خصوصیات سے الگ کر کے صرف کردار اور شاہکاروں کو تخلیق کی رو سے دیکھنے پر قناعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب جو مادہ پرستی میں پیش پیش تھا

ماڈل کی پرستش سے منکر ہو کر فوٹوگرافی کے مسئلے سے بھی گزر کر ایشیا کی اس غیرفانی عظمت کا احترام کرنے لگا۔

رووان کے بعد اپسٹائین کا دور آیا۔ ڈوبسن اور مور نے دنیا کی توجہ کو کھینچا۔ پکاسو نے اپنے آرٹ کے تجربات میں نیا اضافہ کیا تو دنیا بھر میں اس تحریک نے انتشار پیدا کر دیا۔ اور فن کے پرکھنے والوں نے بھی مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع پایا اور ابتدائی آرٹ کی جگہ مکعبیت نے لے لی۔ پیچیدگیاں در پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں اور جدید آرٹسٹوں کا ساتھ کوئی تحریک نہ دے سکی اور وہ اپنی بوکھلاہٹ میں شعبدہ بازی پر اتر آئے اور اپنی پیچیدگیوں کا کوئی حل پیش نہ کر سکے۔ اس فن کے بانیوں کو جب ذرا روشنی ملتی ہے تو وہ منہ کھول کر اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کسی غلط طریق پر غلط راہ پر کھڑے ہیں۔ پکاسو اپنے گنجے سر پر کبوتر بٹھا کر گھر سے باہر نکل آتا ہے۔ اور کبھی نیم برہنہ بلی سے لپٹا ہوا اپنی بے نیازیوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کبھی ستر سال کی عمر میں اٹھارہ سالہ لڑکی سے شادی رچا کر چھوٹے پکاسو کا اعلان کرتا ہے۔ شہرت اس کے دروازے پر کھڑی ہے، وہ اسے اور ہوا دیتا ہے اور کہتا ہے سیدھے سادے خط، سادگی اور اختصار فن کی روح ہے۔

نقوش کی دس سالہ تحریروں کی مکمل فہرست

زیرِ ادارت: احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور

۱

	طلوع	ہاجرہ مسرور
مقالے	نیا افق	خادم حسن قادری
	مرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاحیہ اسلوب	عزیز احمد
	جمال الدین اسمٰعیل اصفہانی	غلام رسول مہر
	اُردو زبان	فلک پیما
نظمیں	خطبۂ صدارت	حفیظ جالندھری
	رباعیات	سیماب اکبرآبادی
	رباعیات	احمد ندیم قاسمی
	ابرِ رواں	یوسف ظفر
	مناجات	قیوم نظر
	مشورہ	قتیل شفائی
افسانے	بھیروں کا مندر لمیٹڈ	کرشن چندر
	میں انسان ہوں	احمد ندیم قاسمی
	بُرے افسان بنے بیٹھے ہو	ہاجرہ مسرور
	میرا دشمن میرا بھائی	عزیز احمد
	فاختائیں	ولیم سینسم
غزلیں	غزل مسلسل	اثر لکھنوی
	دو غزلیں	اختر شیرانی
	برگِ سبز	فراق گورکھپوری
	گلہائے چیدہ	حفیظ ہوشیارپوری
	غزل	علی سردار جعفری
	غزل	احمد ندیم قاسمی
	غزل	سیف الدین سیف
	دو غزلیں	مختار صدیقی۔ عبدالحمید عدم
ہماری زبان	ڈاکٹر عبدالحق	
	سیماب اکبرآبادی	
	خواجہ احمد فاروقی	
	احتشام حسین	
	نور الحسن ہاشمی	
	خدیجہ مستور	
ہماری دنیا	مسئلہ فلسطین	عبدالمجید سالک
ہمارا سماج	کچھ تو کہیے	ہاجرہ مسرور
قلم	ڈوکومنٹری	اسٹے فاروس
نئی کتابیں	ہم وحشی ہیں (کرشن چندر)	"ہم"
	نئی دنیا کو سلام (سردار جعفری)	"ثاقب"

۲

	طلوع	ہاجرہ مسرور
مقالے	جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا	فیض احمد فیض
	تقسیمِ دولت	علامہ غلام مرشد
	سیاسی بحران اور ہمارا ادب	انتظار حسین
	ادبائے اُردو کی خدمت میں	غلام جیلانی برق
	بدلتی قدریں	شبیر محمد اختر
نظمیں	فریبِ بہار	جاں نثار اختر
	فریب	علی سردار جعفری
	لمحۂ دلبری	فکر تونسوی
	یہ بہار	ضیا جالندھری
	خیر مقدم	جعفر طاہر
	بیر گیت	مقبول حسین احمدپوری
	عنفوانِ شباب	احمد ندیم قاسمی
افسانے	ٹامک ٹوئیے	خدیجہ مستور
	رات بھر	اختر اورینوی
	لحاف اندر لحاف	شوکت تھانوی
	زرد پتے	میکسم گورکی
غزلیں	غزل	انجم رومانی
	غزل	شاد عارفی

	غزل	عبدالعزیز فطرت
	غزل	مجید امجد
	غزل	قیوم نظر
	غزل	احمد ندیم قاسمی
ہماری زبان		نیاز فتحپوری
		آل احمد سرور
		اختر اورینوی
		عزیز احمد
		معین احسن جذبی
		خواجہ احمد عباس
ہماری دنیا	مغربی سیاست کے نئے تیور	مرزا محمد حسین
ہمارا سماج	کچھ تو کہئے	"مجیب"
فلم	فلم کے اثرات	اے۔ قدوس
نئی کتابیں	حماقتیں	"ہم"
	آخر شب	"قاف"

۳

	طلوع	احمد ندیم قاسمی
مقالے	جمالیاتی قدریں	ڈاکٹر تاثیر
	شکایتِ روزگار	غلام رسول مہر
	ترقی پسند ادب اور حب الوطنی	ساحر لدھیانوی
	پاکستان کی قومی زبان	ڈاکٹر محمد عبداللہ، باری علیگ
	تقسیم دولت	علامہ غلام مرشد
	زبان کا مسئلہ	فکر تونسوی
نظمیں	دروانہ	جگر مراد آبادی
	رباعیات	جوش ملیح آبادی
	صدا بصحرا	اختر الایمان
	سمندر	مخمور جالندھری
	ایک شام	تصدق حسین خالد
	یہ پھول	قیوم نظر
	رواں ہے سفینہ	سیف الدین سیف
	پڑوسی	قتیل شفائی
	ثواب	فارغ بخاری
	ثواب سے گناہ تک	احمد ندیم قاسمی
افسانے	کھول دو!	سعادت حسن منٹو
	سپاہی	کرشن چندر
	چڑے چڑیا کی کہانی	احمد عباس
	نفرت کیوں تھی؟	عزیز احمد
	آندھی میں چراغ	ممتاز شیریں
ڈرامہ	ہیلو	جاوید اقبال
غزلیں	غزل	حفیظ ہوشیارپوری
	غزل	عبدالمجید سالک
	غزل	اثر لکھنوی
	غزل	عبدالحمید عدم
	غزل	اختر شیرانی
	غزل	اختر ہوشیارپوری
	غزل	احمد ندیم قاسمی
ہماری زبان		ڈاکٹر باقر
		عبادت بریلوی
		آغا اشرف
ہماری دنیا	آج کی دنیا	ابو سعید بزمی
ہمارا سماج	مسئلہ نسواں اور ادیب	زبیدہ زریں
فلم	تعلیمی فلمیں	اے۔ قدوس
نئی کتابیں	صحیفۂ ٹیپو سلطان (محمود بنگلوری)	"ہم"
	دوراہے پر (شبیر محمد اختر)	"ہم"
	نئے اور پرانے چراغ (آل احمد سرور)	"قاف"
	اقبال کے خط عطیہ بیگم کے نام	"قاف"
	ماہِ نو (ماہنامہ)	"قاف"
	گونج (طفیل ملک)	ظہیر بابر

۴ (آزادی نمبر)

	طلوع	ہاجرہ مسرور
طنز و مزاح	دوست کے نام	"پطرس"
	برج بانو	کنہیا لال کپور
	شہر اور گاؤں	"فلک پیما"
	کون (نظم)	شفیق الرحمٰن
مقالے	مثنوی بہارِ عشق	خواجہ احمد فاروقی
	ادیب، حب الوطنی اور وفاداری	احتشام حسین
	اختر شیرانی	آل احمد سرور
	ارسطو کا تصورِ المیہ	جاوید اقبال

	فنون اور تذکرۂ اسلام	عبدالرحمٰن چغتائی
	ادیب اور عوامی ادب	فکر تونسوی
نظمیں	ہندوستان و پاکستان کا نعرہ	جوش ملیح آبادی
	پندرہ اگست	اختر الایمان
	آیا ہے جشنِ آزادی	عبدالمجید بھٹی
	دھوئیں کے بادل	مخمور جالندھری
	روحیں	منیب الرحمٰن
	چراغ روشن ہیں	عبدالحمید عدم
	روداد فکر و عمل	اختر انصاری
	قطعات	جاں نثار اختر
	اجنبی دیس میں	ادا جعفری بدایونی
	اے ساقی	مقبول حسین احمد پوری
	اظہار	ضیا جالندھری
	میراثِ آدم	تابش دہلوی
	جدید تر	احمد ندیم قاسمی
افسانے	ایک اڑان میں	ابوالفضل صدیقی
	(؟)	سعادت حسن منٹو
	پھپھے چوری	ہاجرہ مسرور
	مائی ڈارلنگ ہوٹل	مہندر ناتھ
	آخری سہارا	شکیلہ اختر
	کھیل	ڈاکٹر تاثیر
	جب بادل امڈے	احمد ندیم قاسمی
ڈرامہ	آیا	اپندر ناتھ اشک
غزلیں	غزل	فراق گورکھپوری
	التفاتِ مسلسل	حفیظ ہوشیار پوری
	غزل	اثر لکھنوی
	تازہ اشعار	عابد علی عابد
	غزل	انجم رومانی
	غزل	شاد عارفی
	بوئے رفتہ	مختار صدیقی
	غزل	قیوم نظر
	غزل	سیف الدین سیف
	غزل	قتیل شفائی
	غزل	عبدالعزیز فطرت
	غزل	احمد ریاض
	غزل	جعفر طاہر
ہماری زبان	اردو کا مستقبل	آل احمد سرور
		خواجہ احمد فاروقی
		ڈاکٹر سید عبداللہ
		اثر لکھنوی
		میاں بشیر احمد
		اپندر ناتھ اشک
		اختر الایمان
		جاں نثار اختر
		انجم رومانی
فلم	فلموں کا معیار	اے۔ قدوس
جائزے	اردو نظم کا ایک سال	عبادت بریلوی
	اردو نثر کا ایک سال	عائشہ درانی
	اردو کا ایک سال	عابد علی عابد
	سیاست کا ایک سال	ابوسعید بزمی
	سماج کا ایک سال	خدیجہ مستور

۵

	طلوع	احمد ندیم قاسمی
	قائد اعظم	ادارہ
	۱۱ ستمبر ۴۸ء	مقبول حسین احمد پوری
	اختر شیرانی	ندیم
	ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے	فیض احمد فیض
	خاموش خاموش	انجم رومانی
	دنیا کے پانچ سو دانشوروں کا خطاب	
مقالے	قدیم انسان، احساسِ فن اور اظہار	اختر انصاری
	زبان کا مسئلہ	طفیل احمد خاں
	فسانۂ عجائب اور پدماوت	عزیز احمد
	اقبال اور رومی	نذیر مومن
	روایت کی اہمیت	عبادت بریلوی
	دلّی کا آخری ادیب	آغا محمد اشرف
	مثنوی خواب و خیال	مظفر علی سید
	ہمیں کیا کرنا چاہیے	ابواللیث صدیقی
مطالعے	افسانہ نگار عسکری	ریاض جاوید

نظمیں	"یا خدا" اور اس کا دیباچہ	ظہیر بابر
	ایک کوہستانی سفر کے دوران میں	مجید امجد
	پس منظر	اختر الایمان
	شودر	فکر تونسوی
	خیال آ رہا ہے	مخمور جالندھری
	یہ رات رات نہیں	منیب الرحمٰن
	پامرد	ظہیر کاشمیری
	قطعات	جاں نثار اختر
	سعیِ رائگاں	ابن انشاء
	معذرت	قتیل شفائی
	گیت	قیوم نظر
	ظلم کے خلاف لڑنے والے فنکاروں کے نام	احمد ندیم قاسمی
افسانے	شاہراہ	انور
	نیا سفر	خدیجہ مستور
	تیسری ملاقات	اختر انصاری
	پرمٹ	ابراہیم جلیس
	لمحے	بلونت سنگھ
	یہ بیچار	شوکت صدیقی
	پرانا مسیحا	ہاجرہ مسرور
	نیا فرہاد	احمد ندیم قاسمی
ڈراما	انسانیت کی موت	احسان الحق
غزلیں	غزل	فراق گورکھپوری
	غزل	عدم
	غزل	اثر لکھنوی
	غزل	عارف عبدالمتین
	غزل	میراجی
	غزل	احمد راہی
	غزل	جمیل ملک
	غزل	احمد ریاض
	غزل	ضمیر اظہر
ہماری دنیا	ملکِ معظم زندہ باد	ایوب احمد کرمانی
ہمارا سماج	ہماری شادیاں	طفیل احمد خاں
ہماری تحریک:	روئداد انجمن ترقی پسند مصنفین، لاہور	مرتب

ہمارے نام	یہ امریکہ ہے	مسعود جمال	
نئی کتابیں	جلال و جمال (مجموعہ کلام)	احمد ندیم قاسمی	عبدالمجید سالک
	نقوشِ لطیف — خواتین کے افسانے		احتشام حسین
	قلی — ناول ملک راج آنند (ترجمہ)		حمید اختر قریشی
	نظامِ نو — عبدالوحید		ظہیر

۶

	طلوع	ہاجرہ مسرور
مقالے	عوام کو امن نصیب ہو	ایلیا اہرن برگ (ترجمہ ایوب احمد کرمانی)
	مومن مثنویوں کے آئینے میں	عطا محمد
	اے عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ	محمد صفدر
	نیا ادب کا خاص نمبر	احمد ندیم قاسمی
نظمیں	ہند کی یہ شبِ مہتاب	مسعود حسین
	یومِ مئی سنہ ۱۹۴۹ء	محمد صفدر
	اور زوال پسندوں نے کہا	باقی صدیقی
	پنچوں ہاتھوں بٹا ڈالا	سوامی مارہروی
	رباعیات	جاں نثار اختر
	کلفتِ احساس	عبدالمجید بھٹی
	وہ مرا آہوئے ختن	حامد عزیز مدنی
	تم اپنی نگاہوں سے —	اعجاز بٹالوی
	ایک سال پہلے	منظر سلیم
	گیت	میراجی
	بیراگ	منیب الرحمٰن
	گیت	مقبول حسین احمد پوری
افسانے	حسن اور روٹی	اے، حمید
	ٹکر	ابوالفضل صدیقی
	آزادی	مہندر ناتھ
	تلاش	اشفاق احمد
	بڑی سرکار کے نام	احمد ندیم قاسمی
غزلیں	غزل	چراغ حسن حسرت
	غزل	قتیل شفائی
	غزل	اختر ہوشیارپوری
	غزل	تابش دہلوی
	غزل	عبدالعزیز فطرت

	غزل	مجید شاہد
	غزل	قمر ہاشمی
	غزل	فرید جاوید
ہماری دنیا	معاہدہ شمالی اطلانتک	ایوب احمد کرمانی
ہمارے نام	ارسطو اور افلاطون کی سرزمین سے	مسعود جمال
ہماری تحریک		
	انجمن ترقی پسند مصنفین	
نئی کتابیں	جاوید کا خاص نمبر	عبد اللہ ملک
	دو ماہی شاہراہ	ظہیر بابر
	جب خون بہہ رہا تھا	"قاف"
	اشتہارات	

۷ (امن نمبر)

	طلوع	ہاجرہ مسرور
	احترام آدمی	علامہ اقبال
	روکلا سے کنتہ بڑا کا پس منظر	احمد ندیم قاسمی
	(روداد روکلا امن کانگرس)	
	اے ماؤ، بہنو، بیٹیو!	ظہیر بابر
	(روداد بوڈاپسٹ امن کانگرس)	
	یہاں ڈالر اُگتے ہیں	صابرہ زیدی (نیویارک)
	(روداد نیویارک امن کانگرس)	
	(روسو اور والیٹر کی سرزمین میں	(ادارہ)
	تہذیب ناقابلِ تقسیم ہے	ایلیا اہرن برگ ترجمہ کرمانی
	کیا ہمارے بچوں کا خون رائگاں جائیگا	کاسمو ڈیمانٹسکایا ترجمہ احمد راہی
	عالمگیر امن کانگرس پیرس کا منشور	
	پاکستان کے دانشوروں کا اعلان نامہ	
	ہندوستان کے دانشوروں کا اعلان نامہ	
نظمیں	چینگ کنگ سے چلی تک:	احمد ندیم قاسمی
	......رن جھومی بیج اٹھی	مخمور جالندھری
	دیئے جلاؤ ساتھیو	مسعود حسین
	شانت سندیس	سوامی مارہروی
	تصادم	حسن طاہر
	سپیں انگار	ظہور نظر
	اندھیرا	مخدوم محی الدین
	جنگ	بلراج کومل

	میرا قلم	قتیل شفائی
	رات ساکت ہے	منیب الرحمٰن
	میں اکیلا رہ نہ جاؤں	سلام مچھلی شہری
	اک دنیا اپنا لی	ریاض قادر
	تحفے	تاجور سامری
	حقیقت پسند	احمد ظفر
افسانے	موتی	کرشن چندر
	ہیروشما سے پہلے ہیروشما کے بعد	احمد ندیم قاسمی
	محاذ سے دور	خدیجہ مستور
	منزل ہے کہاں تیری:	ابراہیم جلیس
	جھنڈا اونچا رہے ہمارا	شکیلہ اختر
	نقوش	سلطان الحسن
	جدوجہد	کوبایاشی (مترجمہ حمید اختر)
غزلیں	غزل	شاد عارفی
	غزل	عدم
	غزل	ظہور نظر
	غزل	باقی صدیقی
	غزل	صہبا لکھنوی
	غزل	حسن طاہر
	غزل	اشعر ملیح آبادی
	غزل	شہاب انصاری
	غزل	عالم فتحپوری
ہمارے نام	یہاں فنکاروں کا خون بہا تھا	مسعود جمال
ہماری تحریک	:- انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور اور راولپنڈی کے ہفتہ وار اجلاسوں کی کاروائیاں	
نئی کتابیں	نیا دور (فسادات نمبر)	محمد صفدر

۸ (آزادی نمبر)

	طلوع	ہاجرہ مسرور
مقالے	اچپنگ کے بارے میں	عبد الرحمٰن چغتائی
	ادب اور فراریت	ڈاکٹر اعجاز حسین
	آتش کی صوفیانہ شاعری	احتشام حسین
	ماضی کے ادبِ عالیہ کے متعلق	ممتاز حسین
	میرزا فرحت اللہ بیگ	اختر انصاری
	ترقی پسند تحریک	عبادت بریلوی

نظمیں	"دشمن" کا نفسیاتی ارتقا	صفیہ اختر
	ساقی نامہ	جاں نثار اختر
	آبگینے کے ٹکڑا ہوں	سلام مچھلی شہری
	سہاگے کا گیت	حسن اعرابی
	چراغاں	احمد ندیم قاسمی
	قطعات	شاد عارفی
	قدم بوسی	مخمور جالندھری
	یوم آزادی	مسعود حسین
	جھلکیاں	غلام ربانی تاباں
	دھارے کا موڑ	صہبا لکھنوی
	آمریت کی قربان گاہ پر	شریف کنجاہی
	کرشنک بینتی	سوامی مارہروی
	ہیگ	منیب الرحمٰن
	خلش	اختر اورینوی
	رقص	کرشن موہن
	آرٹ	احمد ظفر
	یقین و عمل، آگ	فارغ بخاری، احمد فراز
	دو گیت	مقبول حسین احمد پوری مسعود حسین
افسانے	پوم پوم ڈارلنگ	عصمت شاہد لطیف
	چلی پی کو ملن ——	خدیجہ مستور
	جہاں پھول کھلتے ہیں	قرۃ العین حیدر
	چوپٹ راجا	کنہیا لال کپور
	لغزش	"انور"
	جہاز باد سندھی	شفیق الرحمٰن
	راجے مہاراجے	احمد ندیم قاسمی
	ایک تقریر	فکر تونسوی
	سند باد کا نیا سفر	ہاجرہ مسرور
	میرے ساتھی	احمد ندیم قاسمی
غزلیں	غزل	فراق گورکھپوری
	غزل	معین احسن جذبی
	غزل	عبدالمجید سالک
	غزل	احسان دانش
	غزل	احمد ندیم قاسمی
	غزل	اثر لکھنوی
	غزل	ظہیر کاشمیری
	غزل	جعفر طاہر
	غزل	انجم رومانی
	غزل	احمد راہی
	غزل	قتیل شفائی
	غزل	عبدالمتین عارف
	غزل	عدم
	غزل	حسن طاہر
	غزل	عبدالعزیز فطرت
	غزل	مجید شاہد
	غزل	تاجور سامری
	غزل	ظہور نظر
	غزل	باقر مہدی
	غزل	شہاب انصاری
جائزے	افسانوی ادب کا ایک سال	حمید اختر
	معاشرت کا ایک سال	زہیر صدیقی
	ہماری تحریک (۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد)	عبداللہ ملک

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

میں تے توں	(پنجابی)	"نمو"	
مزدور کا ترانہ	(پشتو)	فضل حق شیدا	ترجمہ خاطر غزنوی
زبوں حال مزدور	(پشتو)	سید رسول رسا	
کال گیت	(بنگالی)	جسیم الدین	

۹

	طلوع	ہاجرہ مسرور
کچھ تو کہیئے	ترقی پسند مصنفین اور معترضین	احمد ندیم قاسمی
مقالے	ادب سے متعلق چند سوالات	ماؤزے تنگ (ترجمہ طفیل احمد خاں)
	"نیا دور" کا فسادات نمبر	مجتبیٰ حسین
نظمیں	شناخت	عدم
	کیفے کے لوگ	حامد عزیز مدنی
	گجیا بنواڑن	مخمور جالندھری
	میں ترا کون ہوں؟	ظہور نظر
	طلوع	زلیش کمار شاد
	رہنماؤں کے نام	عارف عبدالمتین

غزلیں	بھول	احمد فراز
	غزل	شاد عارفی
	غزل	عالم فتحپوری
	غزل	باقی صدیقی
	غزل	احمد ریاض
	غزل	ادا بدایونی
	غزل	نور بجنوری
	غزل	احمد ندیم قاسمی
افسانے	مہکتی وادیوں میں	شوکت صدیقی
	سکینہ زوجہ	ابراہیم جلیس
	ایک رات	اے حمید
	مکڑی کے جالے	نثار عزیز
	میرے ساتھی	احمد ندیم قاسمی

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

الاھاں (پنجابی اور ترجمہ   افضل پرویز

۱۰

	طلوع	احمد ندیم قاسمی
کچھ تو کہیئے	کدھر جائیں	عصمت چغتائی
مقالے	فلسفۂ اقبال پر چند تنقیدی اشارے	مسعود حسین
	میر کا تصورِ عشق	عطا محمد
	ایران کا جدید ادب	صابرہ زیدی
نظمیں	موت سے پہلے	سلام مچھلی شہری
	چل سو چل	ابن انشاء
	آرٹ اور عوام	فکر تونسوی
	سیاسی مخبر	تیغ الہ آبادی
	جیل میں کسی کا خط پا کر	غلام ربانی تاباں
	نیا دور، نئے رہزن	جگن ناتھ آزاد
	سچائی	تاجور سامری
	آنکھوں سے دل تک	احمد راہی
	وقت	احمد ندیم قاسمی
غزلیں	غزل	مسعود حسین
	غزل	عدم
	غزل	قتیل شفائی
	غزل	باقی صدیقی
	غزل	مجید شاہد
	غزل	احمد ظفر
افسانے	ہر دلعزیز	کرشن چندر
	جدوجہد (جاپانی کہانی)	حمید اختر
	بجلی کا خون	عبدالرحمٰن چغتائی
	ڈاکو	سنتوکھ سنگھ دھیر

میرے خیال میں

”نقوش“ آزادی نمبر کے متعلق رائیں

احتشام حسین
مجتبیٰ حسین
سلام مچھلی شہری
بلراج کومل
مسعود حسین
تشنہ بریلوی
گمنام ترقی پسند
سوامی مارہروی
باقر مہدی
صہبا لکھنوی
غلام ربانی تاباں
ظہور نظر
نثار عزیز

نئی کتابیں

سامراج اور عوام
مشرقی یورپ کا زرعی انقلاب
ریاست کیا ہے
ریت اور جھاگ
بادبان
پیامِ نو
دولت نامہ

”قاف“

نئے رسالے

محاذ (بمبئی)
شبنم (لاہور)
طلوعِ اسلام (کراچی)
علم و دانش (بمبئی)
نفسیاتی جائزے (لاہور)

”قاف“

زیرِ ادارت

وقار عظیم

۱۱—۱۲ (خاص نمبر)

	طلوع	وقار عظیم
غزلیں	غزل	جگر مرادآبادی
	غزل	آرزو لکھنوی
	غزل	ڈاکٹر تاثیر
	غزل	عابد علی عابد
	غزل	ن۔ م۔ راشد
	غزل	عرش ملسیانی
	غزل	عدم
	غزل	راز مرادآبادی
	غزل	باقی صدیقی
	غزل	فضلی
	غزل	اختر ہوشیارپوری
	غزل	حیرت شملوی
	غزل	شاعر لکھنوی
	غزل	مجید شاہد
	غزل	رضی ترمذی
	غزل	ضمیر اظہر
	غزل	ارمان فارانی
مقالے	خطرہ ہائے دل	میر ناصر علی مرحوم
	پاکستان میں مصوری کا مستقبل	عبدالرحمٰن چغتائی
	دگر دانائے راز.....	مولانا صلاح الدین
	عورت اہلِ فارس کے نزدیک	نیاز فتحپوری
	مصحفی کی غزل	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
	اردو شاعری میں تصوف	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم
	کشکول	عزیز احمد
	اُردو کا بہترین رپورتاژ	ممتاز شیریں
	فلسفۂ عیشِ نغمہ.....	عطا محمد
	اندر سبھا	قیوم نظر
	سودا ہجویات کے آئینے میں	مشرف انصاری
نظمیں	رباعیات	جوش ملیح آبادی
	نظم	جگر مرادآبادی
	نظم	قتیل شفائی
	سرسید کی روح سے	احسان دانش
	ویٹ نام	جگن ناتھ آزاد
	فنائے نوعِ بشر کے بعد	ہادی حسین
	اندیشہ	سلام مچھلی شہری
	تعارف	خاطر غزنوی
	پسِ پردہ	تقی انجم
	خراٹے	شفیق الرحمٰن
افسانے	سہائے	سعادت حسن منٹو
	پہاڑ	ممتاز مفتی
	بال خوبیش خطے	شوکت تھانوی
	چند تصویرِ بتاں	یزدانی ملک
	چوٹ	ابنِ سعید
	صحرا صحرا	اے حمید
	گڑیا ویرانہ	شکیلہ اختر
	بندرابن کی کنج گلی میں	اشفاق احمد
	ماتی پچاناں	میرزا ادیب
	بھینٹ	حبیب اشعر
	خرد کا نام جنوں	انتصار حسین (نیوتنوی)
	کہ من و فرد داکہ خانہ خانۂ نیست	ابوسعید نسترمبنی
	نئی کتابیں	وقار عظیم
	نقوش ثانی	منیجر

۱۳

	طلوع	وقار عظیم
مقالے	تین نقاد	عبادت بریلوی
	ادب اور مفید ادب	انتظار حسین
	کیا مذہب کا امکان ہے	ڈاکٹر اقبال
	مغتنم روائتیں	وقار عظیم
نظمیں	رباعیات	جوش ملیح آبادی

	نظم	جگر مراد آبادی
	نخوت پری	مخمور اکبر آبادی
	پنجرے کے دہ دوار کھلے	سوامی مارہروی
	تراوش	جمیل نقوی
غزلیں	غزل	اثر لکھنوی
	غزل	عدم
	غزل	اثر صہبائی
	غزل	یوسف ظفر
	غزل	حیرت شملوی
	غزل	شان الحق حقی
	غزل	شاعر لکھنوی
	غزل	حبیب اشعر
	غزل	باقی صدیقی
	غزل	اقبال صفی پوری
	غزل	شہرت بخاری
	غزل	ادیب سہارنپوری
	غزل	مضطر اکبر آبادی
	غزل	عابد حنتری
افسانے	جل منڈل	عزیز احمد
	ٹوٹو	سعادت حسن منٹو
	لیاقت نہرو معاہدہ	شوکت تھانوی
	گرتے گھر	سلیم بانڈے
نئی کتابیں	جہاں بین	اثر لکھنوی
	بیکراں	جگن ناتھ آزاد

۱۴

	طلوع	وقار عظیم
مقالے	پاکیزہ خیابیاں	میر ناصر علی (مرحوم)
	اندلس کے آثار علمیہ	نیاز فتحپوری
	تین ناول	جلال الدین اکبر
	اقبال کی ایک نظم پر عملی تنقید	مظفر علی سید
	یہ میراجی ہیں	مظہر ممتاز
	غالب کی تصویریں	خیر بھوروی
غزلیں	غزل	فراق گورکھپوری
	غزل	رضا علی وحشت
	غزل	مرزا احسان احمد
	غزل	عدم
	غزل	ضیا جالندھری
	غزل	راز مراد آبادی
	غزل	عبدالعزیز فطرت
	غزل	اثر صہبائی
	غزل	فضل احمد کریم فضلی
	غزل	خاطر غزنوی
	غزل	نظیر صدیقی
	غزل	محمد صدیق کلیم
نظمیں	پیشین گوئی	الطاف مشہدی
	گردش وہم و گماں سے نکلا	رفعت سروش
	جشن عید یا جشن ماتم	شاعر لکھنوی
	ہم سفر سے	نصیر احمد زار
افسانے	رام کھلاون	سعادت حسن منٹو
	مشاعر	شوکت تھانوی
	بہار کا گیت	یزدانی ملک
	کوکین کا بیوپاری	شیام سُندر
	پہاڑی مینا	انتصار حسین
نئی کتابیں	ہمارے نبی	سید نواب علی
	پاکستان، پس منظر و پیش منظر	حمید النور
	نہتوں کا ہتھیار	افضل مرزا جالندھری

۱۵-۱۶ (سالنامہ)

ذکرِ تاثیر	ہائے وہ میرِ کارواں نہ رہا	ڈاکٹر تاثیر
	لندن کی ایک شام	ڈاکٹر تاثیر
	مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب	عبدالمجید سالک، عابد علی عابد
	(ذکرِ تاثیر)	صوفی تبسم، حفیظ جالندھری
	"	خلیفہ عبدالحکیم، امتیاز علی تاج
	"	ایس اے رحمٰن، فیض احمد فیض
	"	عبدالرحمٰن چغتائی، حفیظ ہوشیارپوری
مقالے	ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو	پطرس
	واجد علی شاہ	شرر مرحوم
	تقاضا اور تقاضے	عبدالرحمٰن چغتائی
	محبوب کے لئے فعل مذکر کا استعمال	عندلیب شادانی

	مجھے کس ادب پارے نے سب سے زیادہ متاثر کیا	سید عابد علی عابد
	اردو ادب کے بعض موجودہ میلانات	ابواللیث صدیقی
	جدید اردو ادب کے بعض مسائل	ڈاکٹر عبادت بریلوی
	غالب کا نظریۂ شعر	ممتاز حسین
	میرے بھی صنم خانے	جلال الدین احمد
	قدیم اردو کی رزمیہ مثنویاں	نصیر الدین ہاشمی
	مرے بو	ریاض الاسلام
	نقوش ہجا	مشرف انصاری
	اقبال کی شاعری میں طنز کا عنصر	شمس الدین صدیقی
میراجی	میں میراجی کو نہیں جانتا	شوکت تھانوی
	روی کے بھاؤ	اخلاق احمد
غزلیں	غزل	رضا علی وحشت کلکتوی
	غزل	جگر مرادآبادی
	غزل	عندلیب شادانی
	غزل	عابد علی عابد
	غزل	عبدالحمید عدم
	غزل	قتیل شفائی
	غزل	عبداللطیف تپش (مرحوم)
	غزل	قیوم نظر
	غزل	انجم رومانی
	غزل	امین حزیں سیالکوٹی
	غزل	مختار صدیقی
	غزل	سلام مچھلی شہری
	غزل	نہال سیوہاری
	غزل	حیرت شملوی
	غزل	اقبال صفی پوری
	غزل	شاعر لکھنوی
	غزل	ضیا جالندھری
	غزل	ناصر کاظمی
	غزل	اختر ہوشیارپوری
	غزل	تابش دہلوی
	غزل	ادیب سہارنپوری
	غزل	باقی صدیقی
	غزل	عبدالعزیز فطرت
	غزل	صفیہ شمیم ملیح آبادی
	غزل	نظر حیدرآبادی
	غزل	مضطر اکبرآبادی
	غزل	باقر مہدی
	غزل	قمر ہاشمی
	غزل	فرید بخش قادری
	غزل	باقر رضوی
	غزل	آغا صادق
	غزل	نفیس چغتائی
	غزل	افضل حسین اظہر
	غزل	ظفر اقبال حنشر
نظمیں	رباعیات	جوش ملیح آبادی
	قطعات	جگر مرادآبادی
	چنچل بیٹی شیطان کی	میراجی
	رباعیات	جگن ناتھ آزاد
	گبنتوں کی کوٹلیا بولے	سلام مچھلی شہری
	ایک دن	قیوم نظر
	منزل	عبدالمجید بھٹی
	بس بھول بھی جاؤ	عشرت رحمانی
	زندگی کی پکار	
	وہ دیکھو	ام امام
برنارڈشا	برنارڈشا	قرۃ العین حیدر
افسانے	رئیس خانہ	احمد ندیم قاسمی
	اڈی چُک بھونتنا	اوپندر ناتھ اشک
	بسم اللہ	سعادت حسن منٹو
	دودھ بھری گلیاں	بلونت سنگھ
	باریابی	عزیز احمد
	سانچ کو آنچ	شوکت تھانوی
	اور زندگی چلتی رہی	فیاض محمود
	چودھری	صوفی تبسم
	امی	اشفاق احمد
	وہ ڈالیاں چمن کی	اے حمید
	رخشندہ	انتصار حسین

۱۷ ـ ۱۸ (ناولٹ نمبر)

ناولٹ	کنّاری	سعادت حسن منٹو
	سسرال	شوکت تھانوی
	اللہ کے نام پہ	انتصار حسین
	برف کی وادیوں میں	اے حمید
	مہمانِ بہار	اشفاق احمد
منظوم کہانیاں	ہمراہی	عبدالحمید عدم
	واپسی	سلام مچھلی شہری
مقالے	فورٹ ولیم کالج کے چند ناول نگار	سید عابد علی عابد
	اردو ناول	صلاح الدین احمد
	ناول یا افسانہ	نقّاد
	طلوع	وقار عظیم

زیرِ ادارت

محمد طفیل

---

۱۹ ـ ۲۰

افسانے	سو روپے	کرشن چندر
	آتشِ گل	احمد ندیم قاسمی
	اولی اللہ	ممتاز مفتی
	سہارے کی تلاش	حیات اللہ انصاری
	سنسان موڑ	خدیجہ مستور
	حقیقت نیوش	اشفاق احمد
	سنہرے دن	یزدانی ملک
مکاتیب	اُس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو	ڈاکٹر تاثیر
	بارِ خاطر	شوکت تھانوی
نظمیں	رباعیات	جوش ملیح آبادی
	نغمۂ انساں	احمد ندیم قاسمی
	سلسلے	اختر الایمان
	روداد زمانہ	مجید امجد
	آرٹ	عبدالحمید عدم
	خوابِ حسن	شور علیگ
	کراچی سے ایک تار	جگن ناتھ آزاد
	رخصت	قیوم نظر
	نئے زاویے	انجم رومانی
	کیا خوب یہ انجام ہے	سوامی مارہروی
	تغیر	اختر ہوشیارپوری
	عذرا	منظور عارف
	سراب	فارغ بخاری
	یاد	منیر نیازی

طویل مختصر افسانے

	چارہ گر	تسنیم سلیم چھتاری
	پھول گرتے ہیں	اے حمید
ڈرامہ	تعلیمی فلم	سعادت حسن منٹو
غزلیں	غزل	فراق گورکھپوری
	غزل	رضا علی وحشت
	غزل	آل احمد سرور
	غزل	عابد علی عابد
	غزل	اثر لکھنوی
	غزل	مجید امجد
	غزل	سیف الدین سیف
	غزل	عبدالحمید عدم
	غزل	شاد عارفی
	غزل	یوسف ظفر
	غزل	ناصر کاظمی
	غزل	حیرت شملوی
	غزل	باقی صدیقی
	غزل	عبدالمتین عارف
	غزل	احمد راہی
	غزل	اختر ہوشیارپوری
	غزل	فطرت
	غزل	منظور عارف
	غزل	عالم اکبرآبادی
	غزل	رضا ہمدانی

نوادرد

غزل	شہرت بخاری
ہوا کے دوش پر (افسانہ)	انور سجاد
تم سے بڑھنے کی لگن ہے" (نظم)	فرہاد زیدی
کہو حریف خرد یا سمجھ لو فرزانے (غزل)	انوار حسین ہاشمی

مقالے

طبقۂ معتزلہ	نیاز فتحپوری
برنارڈ شا	آل احمد سرور
ناہید کی داستان	عابد علی عابد
قطب مشتری کی لسانی خصوصیات	احتشام حسین
باری صاحب	سعادت حسن منٹو
غدر کی ادبی تاریخ کا ایک ورق	خواجہ احمد فاروقی
ناولٹ کی ٹکنیک	عبادت بریلوی
بلتستان کے لوک گیت	محمود ہاشمی
ہندوستان میں مغلیہ فن مصوری	ربیعہ سلطانہ
ماہ لقا بائی چندا	نصیر الدین ہاشمی
فتح خاں، رابعہ	خاطر غزنوی

۲۱—۲۲

افسانے

سایہ	غلام عباس
موذیل	سعادت حسن منٹو
الحمد للہ	احمد ندیم قاسمی
ریت کا تودا	ممتاز مفتی
شاید کہ بہار آئی	علی عباس حسینی
وہی زمانہ، وہی فسانہ	قرۃ العین حیدر
تیسری کروٹ	مہندر ناتھ
ذلیل پیشہ	ابراہیم جلیس
مجبور	شاہد احمد دہلوی
سہیلی کے نام	اے۔ حمید
مجمع	انتظار حسین
سڑک کے کنارے	سعادت حسن منٹو

مکاتیب

اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو	جوش ملیح آبادی
اکبر نامہ	اکبر الہ آبادی
بار خاطر	شوکت تھانوی

نظمیں

رباعیات	جوش ملیح آبادی
سراپا	جگر مراد آبادی
انقلابی	ن۔ م۔ راشد
حسن تخلیق	احمد ندیم قاسمی
تبدیلی	اختر الایمان
ساز	عبد الحمید عدم
منزل	مجید امجد
ٹھاکر صاحب	مخمور جالندھری
سیاروں کی آواز	مشور علیگ
مشرقی بنگال	جگن ناتھ آزاد
بنائے نگار چمن زار گیتی	سلام مچھلی شہری
بھگوان تو ان میں کوئی نہیں	سوامی مارہروی
بہن	خاطر غزنوی
انتظار	عبد العزیز فطرت
نقد و نظر	فارغ بخاری
بے سہارے، بے سوت کے دھاگے	جمیل ملک

مقالے (۱) شعر و شاعر

غالب اور اس کی شاعری	عندلیب شادانی
نظیر اکبر آبادی کا عہد	ابو اللیث صدیقی
شاد عظیم آبادی	عزیز احمد
خسرو	غلام جیلانی برق
آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے	انتظار حسین
سر اٹھایا تھا کہ سنگ یاد آیا	اخلاق احمد دہلوی

غزلیں

غزل	جگر مراد آبادی
غزل	فراق گورکھپوری
غزل	آنند نرائن ملا
غزل	اثر لکھنوی
غزل	عابد علی عابد
غزل	رضا علی وحشت
غزل	غلام مصطفیٰ تبسم
غزل	اسرار الحق مجاز
غزل	عبد الحمید عدم
غزل	قتیل شفائی
غزل	نہال سیوہاروی
غزل	شعری بھوپالی
غزل	شاد عارفی
غزل	ناصر کاظمی
غزل	ناصر کاظمی

غزل	مختار صدیقی
غزل	باقی صدیقی
غزل	اشک رامپوری
غزل	سلیم احمد
غزل	نور بجنوری
غزل	شان الحق حقی
غزل	شاعر لکھنوی
غزل	تابش دہلوی
غزل	فارغ بخاری
غزل	قیوم نظر
غزل	شہرت بخاری
غزل	تاجور سامری
غزل	رضا ہمدانی
غزل	تابش صدیقی
غزل	اختر انصاری اکبر آبادی
غزل	انجم اعظمی
غزل	نظر حیدر آبادی
غزل	منیر نیازی
غزل	پروفیسر آغا صادق
غزل	عبد اللہ خاور
غزل	شہزاد احمد
غزل	احمد ظفر
غزل	جمیل ملک

مقالے (۲) ادب و تنقید

ہماری داستانیں	وقار عظیم
جمالیاتی خط اور افادیت	ممتاز حسین
غزل کا مستقبل	عبادت بریلوی
امریکی بنجارہ نامہ	اثر لکھنوی
ایسی بلندی ایسی پستی	جلال الدین احمد
تہذیب کی بنیادیں	سید علی عباس جلال پوری

اور

ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، قاضی عبد الغفار، ڈاکٹر یوسف حسین، محی الدین زور، خواجہ احمد فاروقی، آل احمد سرور، احتشام حسین، ممتاز شیریں، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، حامد علی خاں، اثر لکھنوی، رضا علی وحشت، شور علیگ، شاد عارفی، مخمور جالندھری، فکر تونسوی، تاجور سامری، جگن ناتھ آزاد، شاعر لکھنوی، کرشن چندر، عزیز احمد، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، قدرت اللہ شہاب، تسنیم سلیم چھتاری، بلونت سنگھ، مہندر ناتھ، انور، شوکت صدیقی، عشرت رحمانی، محمود ہاشمی، زاہدہ قیصر، رفیعہ سلطانہ،

تبصرے	وقار عظیم

۲۳-۲۴

	طلوع	محمد طفیل
ناولٹ	ایک معمولی لڑکی	بلونت سنگھ
افسانے	خدا کی قسم	سعادت حسن منٹو
	ماتا	احمد ندیم قاسمی
	زندگی کا رس	ممتاز شیریں
	خانہ خراب	اشفاق احمد
	دیوالا	انتظار حسین
	ڈاچی والیا	اے حمید
	پنجاب کو سلام	فکر تونسوی
	انسان اور سکے	صبح صادق حمید
	اندھیری راتیں	حجاب امتیاز علی
نظمیں	کارواں میرا	جوش ملیح آبادی
	جاگتے رہو	فراق گورکھپوری
	پرچھائیاں	اثر لکھنوی
	قطعات	احمد ندیم قاسمی
	وہ مکان	اختر الایمان
	ایک شام	مجید امجد
	امن کا آخری دن	ابن انشاء
	دولت کی خدائی	پروفیسر شور
	میراث	یوسف ظفر
	کون کہتا ہے	سلام مچھلی شہری
	سرِ راہے	حمایت علی شاعر
	جاگیر کے خدا	قمر اجنالوی
مکاتیب	بارِ خاطر	شوکت تھانوی
غزلیں	غزل	فراق گورکھپوری
	غزل	حفیظ ہوشیارپوری
	غزل	مجنوں گورکھپوری
	غزل	عابد علی عابد
	غزل	آل احمد سرور

طویل مختصر افسانے

ہیرے کی انگوٹھی (بنگالی)	نریندر متر
ایک پرانی کہانی (کنڑی)	ماستی وینکٹیش آئنگار
کلیمن جارو کی برف (امریکی)	ارنسٹ ہیمنگوے

مقالے

ہمارے مختصر افسانے	وقار عظیم
نئے افسانے اور ہمارا مستقبل	محمد حسن عسکری

۲۷-۲۸

طلوع	محمد طفیل

مقالے

شعر اور زندگی	ڈاکٹر یوسف حسین
فارسی ادب کے چند گمشدہ اوراق	ڈاکٹر تاثیر
غزل اور تغزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی
نیا منصور	ممتاز حسین
بھلا مانس غزل گو	محمد حسن عسکری
خالص شاعری	اثر لکھنوی
راشد الخیری کا اسلوب	عشرت رحمانی
پشتو شاعری کی ایک جھلک	عبدالغفور خاں

نظمیں

آغاز انجام	جوش ملیح آبادی
بات سمجھنے والا	حفیظ جالندھری
تقابل	معین احسن جذبی
رباعیات	فراق گورکھپوری
آگ میں پھول	فیض احمد فیض
مری شکست	احمد ندیم قاسمی
سہرا ہے	ابن انشاء
گرد منزل	پروفیسر شور
تبدیلی	قیوم نظر
غبارے	تیغ الہ آبادی
رقابت	عبدالمجید بھٹی
میرا شہر	ظہور نظر
ادھوری کہانی	حمایت علی شاعر
ایک ہی شہر میں	نور بجنوری
کھنڈر	احمد فراز
آیات	قمر اجنالوی
دو گیت	منیر نیازی

میراجی

میراجی	قدرت اللہ شہاب
گیت	میراجی
میراجی کے آخری لمحے	اختر الایمان

غزلیں

غزل	فراق گورکھپوری
غزل	فیض احمد فیض
غزل	اثر لکھنوی
غزل	عابد علی عابد
غزل	آنند نرائن ملا
غزل	سیف الدین سیف
غزل	قتیل شفائی
غزل	اختر انصاری
غزل	ناصر کاظمی
غزل	جگن ناتھ آزاد
غزل	شان الحق حقی
غزل	سلام مچھلی شہری
غزل	باقی صدیقی
غزل	زہرہ نگاہ
غزل	عبدالعزیز فطرت
غزل	شہرت بخاری
غزل	احمد ظفر
غزل	قمر اجنالوی
غزل	فارغ بخاری
غزل	تاجور سامری

منظوم ڈرامہ، منظوم افسانہ

نانان دانا	اثر لکھنوی
شیلا ایک کنواری	مخمور جالندھری

افسانے

تنہائی	مجنوں گورکھپوری
حماقت	سعادت حسن منٹو
زندان و سلاسل	احمد ندیم قاسمی
زیر دام کون!	ابوالفضل صدیقی
زندگی کا رس (نارویجین)	ممتاز شیریں
تاش کے پتے	دیوندر ستیارتھی
جیب کترے	دیوندر اسر
مامتا (گجراتی)	غلام حسین مصطفے
ایک عظیم الشان قلم (فرانسیسی)	نسیم ہمدانی

نئی کتابیں چاندگہن	ع

۲۹—۳۰ (پنج سالہ نمبر)

طلوع	محمد طفیل

مقالے

حالی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون (تذکرۂ رحمانیہ)	مولانا حالی
آسان اُردو	ڈاکٹر عبدالحق
قتیل دہلوی تھا یا فرید آبادی	ڈاکٹر مختارالدین احمد
اسلامی ادب	فراق گورکھپوری
واجد علی شاہ کی ایک نادر تصنیف	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
باغ و بہار کے نسوانی کردار	سید وقار عظیم
صدرالدین آزردہ کے غیر مطبوعہ خطوط	خواجہ احمد فاروقی
غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناسخ کی جذبات نگاری	ڈاکٹر عندلیب شادانی
مزے دار شاعر	محمد حسن عسکری
چند یادیں	عبدالرحمٰن چغتائی
انگریزی ناول کا اردو ناول پر اثر	ڈاکٹر احسن فاروقی
غالب اور حیدر آباد	ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی

نظمیں، غزلیں

اختلالِ دماغ	جوش ملیح آبادی
غزل	فراق گورکھپوری
غزل	فیض احمد فیض
شباب کے پھول	احمد ندیم قاسمی
غزل	عابد علی عابد
غزل	آل احمد سرور
غزل	اثر لکھنوی
دعوت نامہ	احسان دانش
غزل	صوفی تبسم
آخری ملاقات	اختر الایمان
غزل	اختر انصاری
نوروز	عبدالحمید عدم
غزل	عبدالحمید عدم
دلہن	قتیل شفائی
غزل	قتیل شفائی
شاعر	مجید امجد
غزل	رضا علی وحشت
افسانہ آں شبے	جگن ناتھ آزاد
غزل	شاد عارفی
ملاح	پروفیسر شور
غزل	انجم رومانی
نئے رانجھے	مخمور جالندھری
غزل	ناصر کاظمی
نیند کی ندی	عزیز حامد مدنی
غزل	عبدالمجید بھٹی
سحر سے پہلے	ظہور نظر
غزل	باقی صدیقی
انقلابی	فارغ بخاری
غزل	سلام مچھلی شہری
خمارِ گندم	خاطر غزنوی
غزل	احمد فراز
سرحد	نور بجنوری
غزل	شاعر لکھنوی
دیپ سے دیپ جلے	احمد ریاض
غزل	زہرہ نگاہ
ایک عورت کے نام	احمد ظفر
غزل	عبدالعزیز فطرت
دن ڈھلے	منیر نیازی
غزل	جمیل ملک
وقت اور زندگی	عزیز جاوید درانی
غزل	اختر ہوشیارپوری
غزل	مجید شاہد

افسانے — رپورتاژ، طنز، ڈرامے

خونِ جگر	احمد ندیم قاسمی
تنہائی (مسلسل)	مجنوں گورکھپوری
پانی کا درخت	کرشن چندر
پانچواں مقدمہ	سعادت حسن منٹو
رحیم بابا	علی عباس حسینی
بندہ پرور کب تلک؟	کنہیا لال کپور
میرا گھر	ممتاز مفتی

	دادا	خدیجہ مستور
	حسنِ انتخاب	تسنیم سلیم چھتاری
	سوادِ رومۃ الکبریٰ	اشفاق احمد
	خمیر	دیوندر ستیارتھی
	صدرنگ	ڈاکٹر محمد باقر
	پنڑ اناراں دے	اے حمید
	پربت لاج	شوکت صدیقی
	مایا	انتظار حسین
	دفتر کی مہریں	فکر تونسوی
	بہتا خون، اُبلتا خون	ضمیرالدین احمد
	مہر بہ لب	احمد ندیم قاسمی
	چیترا	حبیب اشعر
نئی کتابیں	رسم حجم، مطالعے اور جائزے	عبادت بریلوی

۳۱-۳۲

	طلوع	ڈاکٹر عبدالحق، نیاز فتحپوری
خاکے	بے قاعدہ	شوکت تھانوی
مقالے	اسلامی ادب! کیوں نہیں؟	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی
	داغ کا تغزل اور اس کے سماجی محرکات	ڈاکٹر عبادت بریلوی
	مکاتیبِ سر سید	ڈاکٹر مختارالدین احمد
	میر کا اسلوبِ قصیدہ گوئی	عشرت رحمانی
	تحلیل نفسی پر ایک نظر	سید علی عباس جلالپوری
	اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی
نظمیں، غزلیں	ازالہ	جوش ملیح آبادی
	غزل	عابد علی عابد
	غزل	فراق گورکھپوری
	غزل	معین احسن جذبی
	اضداد	احمد ندیم قاسمی
	غزل	اثر لکھنوی
	ہری بھری فصلو	مجید امجد
	غزل	ناصر کاظمی
	شعر کی فرمائش پر	پروفیسر شور
	غزل	شاد عارفی
	اے متوالو! ناقوں والو	ابن انشاء
	غزل	قتیل شفائی
	غزل	راز مرادآبادی
	غزل	شاعر لکھنوی
	غزل	اقبال صفی پوری
	جانشین	احمد فراز
	غزل	باقی صدیقی
	غزل	عبدالمجید حیرت
	غزل	شہرت بخاری
	غزل	اختر ہوشیارپوری
	غزل	فرہاد زیدی
	غزل	فارغ بخاری
	غزل	احمد ریاض
	غزل	احمد ظفر
	غزل	مسعود انور عشقی
ڈرامہ	درخت	شاہد احمد دہلوی
افسانے	بی گئے	ابوالفضل صدیقی
	آخری دودھ	ہاجرہ مسرور
	گڑیا اور لوری	دیوندر ستیارتھی
	کوڑے کے ڈھیر پہ	آغا بابر
	گلاب کا پھول	سید فیاض محمود
	ٹوپی پارک	ابن الحسن
	گرم سیخ	غلام علی چودھری
تراجم	ایک نیک حبشی (امریکی)	ل۔ احمد اکبرآبادی
	چاچا (بنگالی)	شرون کمار ورما
شخصیات	منٹو	عزیز احمد
	وہ لڑکی	سعادت حسن منٹو
	منٹو صاحب	محمد طفیل

۳۳-۳۴

	طلوع	محمد طفیل
مقالے	ایک خط	فراق گورکھپوری
	بنامِ مرشدِ نازک خیالاں	آفتاب احمد
	کچھ میر کے بارے میں	قاضی عبدالودود
	باغ و بہار و فسانۂ عجائب کا قضیہ	سید وقار عظیم

ارسطو کی اخلاقیات	غلام جیلانی برق
عندلیب شادانی کا تغزل	نظیر صدیقی

نظمیں، غزلیں

غزل	فراق گورکھپوری
غزل	عابد علی عابد
تکمیل	عندلیب شادانی
غنچہ پھر لگا کھلنے — !	احمد ندیم قاسمی
غزل	رضا علی وحشت
غزل	کیفی چریاکوٹی
غزل	اختر انصاری
پورب دیس کی ناری	مخمور جالندھری
غزل	مجید امجد
غزل	شاد عارفی
ذرہ	جگن ناتھ آزاد
غزل	ناصر کاظمی
غزل	سلام مچھلی شہری
غزل	فضلی
غزل	راز مراد آبادی
غزل	باقی صدیقی
غزل	جمیل ملک
غزل	احمد ریاض

طنز و مزاح

چچا سام کے نام دوسرا خط	سعادت حسن منٹو
خاموش نغمے	کنہیا لال کپور
سگریٹ پینے کی آزادی	فکر تونسوی

افسانے، ڈرامے

بڑھیا	اوپندر ناتھ اشک
ممودہ	سعادت حسن منٹو
فینسی ہیئر کٹنگ سیلون	غلام عباس
مہر بہ لب	احمد ندیم قاسمی
ڈھلان	انور عظیم
ایک فاحشہ، ایک لونڈی	پرکاش پنڈت
ایک سفر اور	غلام علی چودھری
ایک تمنا ایک شکست	ابن احمد

شخصیات

جگر مراد آبادی	آل احمد سرور
جگر صاحب	محمد طفیل

۳۵-۳۶

مقالے

اصولِ فارسی (غیر مطبوعہ)	مولانا حالی (مرحوم)
بیج اکبر	حامد حسن قادری
کچھ میر کے بارے میں	قاضی عبدالودود
ڈاکٹر رادھا کرشنن اور مذہب	ڈاکٹر غلام جیلانی برق
اردو غزل	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
فیضی کا نظریۂ شعر	ڈاکٹر وحید قریشی
ادب میں روایت اور بغاوت کا رشتہ	آنسہ شہناز ہاشمی

نظمیں غزلیں

شکستِ زنداں	جوش ملیح آبادی
غزل	جگر مراد آبادی
غزل	فراق گورکھپوری
غزل	عابد علی عابد
غزل	اثر لکھنوی
غزل	آل احمد سرور
غزل	شاد عارفی
شہر خوباں	عدم
غزل	عدم
غزل	ظہیر کاشمیری
جیون دیس	مجید امجد
ایمان	جگن ناتھ آزاد
عرضِ نیاز	پروفیسر شور
غزل	حیرت شملوی
فرازِ تمنا	عبدالمجید بھٹی
غزل	شاعر لکھنوی
برگ و برق	ظہور نظر
غزل	اقبال صفی پوری
اک رم خوردہ دریا	حامد عزیز مدنی
غزل	سلیم احمد
ابنِ آدم	نور بجنوری
غزل	احمد فراز
کراہتے ہوئے دل	تیغ الہ آبادی
غزل	سلیم واحد سلیم
ایک کہانی، ایک افسان	عارف عبدالمتین

	غزل	شہرت بخاری
افسانے	ثبتِ منفی	ابوالفضل صدیقی
	بلونت سنگھ مجیٹھا	سعادت حسن منٹو
	بیٹا	احمد ندیم قاسمی
	صرف آپ کے لئے	ممتاز مفتی
	اجنتا	دیویندر ستیارتھی
	بدچلن عورت	ابراہیم جلیس
	خواجہ کی چڑیا	سید فیاض محمود
	لی زا	منظور الٰہی
	حکم کی بیگم	ڈاکٹر محمد حسن
تراجم	خلش (مرہٹی)	ازیرا احمد
	ترکِ محبت کے بعد (آئرش)	محمود حسن احسنی
	کچھ فسانۂ عجائب کے بارے میں	رشید احمد صدیقی
	بے قاعدہ	شوکت تھانوی
شخصیات	فراق گورکھپوری	سید محمود احمد
	فراق کی شخصیت	مکین احسن کلیم
	فراق صاحب	محمد طفیل
اسلامی ادب	میری گذارش	فراق گورکھپوری
	انجمن ادبی رسائل پاکستان	(ساقی سے)

۳۷-۳۸ (افسانہ نمبر)

(۱)	ننھی کی نانی	عصمت چغتائی
	بردہ فروش	غلام عباس
	شادی	سعادت حسن منٹو
	کالی تیتری	بلونت سنگھ
	مکڑی کا جال	علی عباس حسینی
	مسوری ۵۳ء	خواجہ احمد عباس
	بچا جان	حیات اللہ انصاری
	گٹاری کے انڈے	دیویندر ستیارتھی
	گنٹو ہتیا	کنہیا لال کپور
	اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئیگا	تسنیم سلیم چھتاری
	بھابی جان	سہیل عظیم آبادی
	زرد گلاب	اے حمید
	گوری عورت، کالا مرد	ابراہیم جلیس
	اندر سبھا	ڈاکٹر احسن فاروقی
	اجنبی لڑکی	مہندر ناتھ
	اناناس کا درخت	دیویندر اسر
	بھنور اور چراغ	جیلانی بانو
	گریز	آغا بابر
	آپا	غلام علی چودھری
	مالک	سید خلیل احمد
	رگِ سنگ	ضمیر الدین احمد
	فٹ پاتھری	ابن الحسن
(۲)	ست بھرائی	احمد ندیم قاسمی
	ممتا	اختر اورینوی
	کنیز	ہاجرہ مسرور
	ریلوے جنکشن	قدرت اللہ شہاب
	شکارگاہ سے	ابوالفضل صدیقی
	لالۂ صحرائی	خدیجہ مستور
	گڈریا	اشفاق احمد
	مُردہ گھر	شوکت صدیقی
	کچی نبولی	انتظار حسین
	نئے سال کا آخری دن	کشمیری لال ذاکر
	یاقوت اور لیمپ	انور عظیم
	دوسری شادی	شوکت تھانوی
خاکے	عصمت چغتائی	اخلاق احمد دہلوی
	بلونت سنگھ	ڈاکٹر عبادت بریلوی
	حیات اللہ انصاری	مکین احسن کلیم
	شوکت تھانوی	محمد طفیل
نووارد	بوسے	صادق حسین
	تقدیر زند خندہ	چاندنی بی
سمپوزیم	اردو افسانے میں روایت اور تجربے	

حصہ لینے والے: سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، حمید اختر، شوکت تھانوی۔

۳۹-۴۰

	طلوع	محمد طفیل
بحث (اسلام، ادب)	تخلیق کی جمہوریت	قرۃ العین حیدر

اسلامی ادب   ڈاکٹر سید شوکت سبزواری
ادب برائے عاقبت   اخلاق احمد دہلوی
اسلامی ادب   سید علی عباس جلالپوری
ادب میں یہ تقسیم کیوں؟   سعید احمد رفیق
اسلامی ادب کا مسئلہ
آفتاب احمد، ڈاکٹر احسن فاروقی، حامد حسن قادری
ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

نظمیں غزلیں رباعیات

رباعیات   جوش ملیح آبادی
غزل   اثر لکھنوی
غزل   فراق گورکھپوری
غزل   عابد علی عابد
غزل   احسان دانش
یہاں سے وہاں تک   احمد ندیم قاسمی
غزل   شاد عارفی
تنہا   مجید امجد
غزل   جلیل قدوائی
قبروں کی محبت   عدم
غزل   عرش ملسیانی
موضوع کی تلاش   قتیل شفائی
راستے   پروفیسر شور
واپسی   ابن انشاء
غزل   باقی صدیقی
غزل   شاعر لکھنوی
ہماری ہی بلی ہمیں سے میاؤں   سوامی مارہروی
فاصلہ   تیغ الہ آبادی
غزل   خلیل الرحمن اعظمی
ایک اجنبی لڑکی   نور بجنوری
تین زمانے   احمد ریاض
غزل   شہرت بخاری
غزل   نظر حیدر آبادی
غزل   قمر اجنالوی
دلاسہ   حمایت علی شاعر
غزل   سلیم واحد سلیم
غزل   جمیل ملک
غزل   تنویر نقوی

افسانے

گفتگو   کرشن چندر
محبت بھی ہوئی —   ل۔ احمد
حکیم بانا   علی عباس حسینی
پھُس پھُسی کہانی   سعادت حسن منٹو
گھر کی عزت   ممتاز مفتی
قصر شیخ   آغا بابر
میمونیٔ   خاطر غزنوی

تراجم

مرثیے   ترجمہ شاہد احمد دہلوی
ریت کی دیوار   ترجمہ شردن کمار ورما
پوسٹ آفس   ترجمہ غلام حسین مصطفےٰ

شخصیات

احمد ندیم قاسمی   عبادت بریلوی
ندیم صاحب   محمد طفیل

---

۴۱ — ۴۲ (غزل نمبر)

(۱)   ولی دکنی   میر تقی میر
سودا   درد
مصحفی   میر حسن
جرأت   انشا
نظیر اکبر آبادی   غالب
مومن   ذوق
بہادر شاہ ظفر   شیفتہ
ناسخ   آتش
امیر مینائی   داغ
حالی   اکبر الہ آبادی
شاد عظیم آبادی   ریاض خیر آبادی
آزاد انصاری   آرزو لکھنوی
اقبال   حسرت موہانی
اصغر گونڈوی   فانی بدایونی
جگر مراد آبادی   جوش ملیح آبادی
فراق   اثر لکھنوی
یگانہ   سیماب
حفیظ جالندھری

(۲)   فیض احمد فیض   اختر شیرانی
تاثیر   حفیظ ہوشیارپوری
عبدالمجید سالک   عابد علی عابد

چراغ حسن حسرت   صوفی تبسم
احسان دانش   ساغر نظامی
اختر انصاری   شاد عارفی
نہال سیوہاروی   اسرار الحق مجاز
معین احسن جذبی   احمد ندیم قاسمی
عبدالحمید عدم   سیف الدین سیف
ظہیر کاشمیری   قتیل شفائی
ساحر لدھیانوی   مجروح سلطان پوری
شکیل بدایونی   فضل احمد کریم فضلی
ناصر کاظمی   ابن انشاء
(۳) سراج دکنی   شاہ مبارک آبرو
شاہ حاتم   فغاں
مظہر جان جاناں   میر سوز
قائم چاندپوری   یقین
بیان، خواجہ احسن اللہ   حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت
میر محمدی بیدار   عبدالحی تاباں
سید محمد میر اثر   جعفر علی حسرت
سعادت یار خاں رنگین   شاہ نصیر الدین نصیر
ممنون   شہیدی
وزیر لکھنوی   صبا لکھنوی
نسیم لکھنوی، دیا شنکر   رند لکھنوی
نسیم دہلوی، نواب مرزا اصغر علی خاں   ظہیر دہلوی
مرزا قربان علی بیگ سالک   مجروح، میر مہدی
جلال لکھنوی   تسلیم لکھنوی
صابر دہلوی   نظام رامپوری
بیان یزدانی میرٹھی   حفیظ جونپوری
بیخود بدایونی   چکبست
نظم طباطبائی   وحید الدین سلیم پانی پتی
شوکت بلگرامی   محشر لکھنوی
مضطر خیر آبادی   شبلی نعمانی
حسن بریلوی   نسیم بھرت پوری
بیخود دہلوی   ساحر دہلوی، امرناتھ
سائل دہلوی   آغا شاعر دہلوی
صفی لکھنوی   ناطق لکھنوی
ناطق گلاوٹھی   عزیز لکھنوی

جلیل مانک پوری   احسن مارہروی
نوح ناروی   کیفی دتاتریہ دہلوی
جوہر، مولانا محمد علی   دل شاہجہانپوری
بیدم وارثی   آغا حشر کاشمیری
وحشت کلکتوی   آسی الدنی
ناجور نجیب آبادی   عبداللطیف تپش
ظفر تاباں   عندلیب شادانی
علی اختر حیدر آبادی   تلوک چند محروم
(۴) آنند نرائن ملا   روش صدیقی
میراجی   جوش ملسیانی
جلال الدین اکبر   آل احمد سرور
ماہر القادری   سراج الدین ظفر
مختار صدیقی   یوسف ظفر
انجم رومانی   قیوم نظر
حیرت شملوی   سکندر علی وجد
ادیب سہارنپوری   ذوالفقار علی بخاری
غلام ربانی تاباں   راز مراد آبادی
شان الحق حقی   مجید امجد
باقی صدیقی   جگن ناتھ آزاد
عرش ملسیانی   ظہور نظر
ضیا جالندھری   احمد ریاض
احمد راہی   عارف عبدالمتین
شہرت بخاری   شہزاد احمد
سلام مچھلی شہری   شاعر لکھنوی
جعفر طاہر   حبیب اشعر
مکین احسن کلیم   سلیم احمد
نور بجنوری   اصغر سلیم
ساغر صدیقی   عظیم مرتضیٰ

جمیل ملک

(۵) آفتاب، شاہ عالم بادشاہ   آرزو، سراج الدین علی خاں
آصف، نواب وزیر آصف الدولہ بہادر یحییٰ خاں
آشفتہ، مرزا رضا قلی بھورے خاں   امیر، نواب محمد یار خاں
اسد، میر امانی   احسن، مرزا احسن علی
انیس، میر ببر علی   انجام، عمدۃ الملک امیر خاں
اسیر، مظفر علی   امید، قزلباش خاں

اشتیاق، ولی اللہ سرہندی
الم، صاحب میر
امین، خواجہ امین الدین
امانت لکھنوی
اختر، نواب واجد علی شاہ
احسان، شاہجہانپوری
اثر، امداد امام
بقا، شیخ بقاء اللہ
بیباک شاہجہانپوری
بہار، گلشن الدولہ
تجلی، میاں حاجی
تسلی، لالہ ٹیکارام
تشنہ، محمد علی
ثاقب، نواب شہاب الدین احمد خاں
جوشش، شیخ محمد روشن
حزیں، میر محمد باقر
اُمّی شاعر
حسامی، حسام الدین حیدر
حسین، سید صادق علی
دیوانہ، رائے سرب سکھ
رشک، علی اوسط
رخشاں، نواب ضیاء الدین احمد خاں
راقم، قمر الدین
زکی، نواب محمد زکریا خاں
سلیمان، نواب مرزا محمد سلیمان شکوہ
شوق قدوائی، احمد علی خاں
شرر، مولانا عبدالحلیم
شیدا، مسیح الملک حکیم اجمل خاں
صبا، لالہ کانجی مل
صنعت مرادآبادی،
شیخ کریم الدین
عاجز، عارف الدین خاں
عارف، حکیم نواب جان خاں
فراق، ثناء اللہ
فدوی لاہوری
[illegible]

احسن، میرزا احسن
امانی، میر امانی
افسوس، میر شیر علی
آزردہ، مفتی صدر الدین
ارشد، میرزا عبدالغنی گورگانی
اسمعیل میرٹھی
بحر، شیخ امداد علی
برق لکھنوی، مرزا محمد رضا
بسمل موہانی
بیتاب، عظیم آبادی
تنہا، محمد عیسیٰ
تسکین، میر حسن
ثاقب لکھنوی، ذاکر حسین
جوان، مرزا نعیم بیگ
حیران، میر حیدر علی
حیا، مرزا رحیم الدین
خاکسار، محمد یار
خلیق، میر مستحسن
دلبر، مارہروی
رشکی، نواب محمد علی خاں
راسخ، مولوی عبدالرحمٰن
رسا رامپوری (تلمیذ داغ)
سجاد، میر سجاد اکبر آبادی
سحر بھوپالی
شاد غازی پوری، حکیم سید محمد
شاد، مہاراج کشن پرشاد
شفق، عماد پوری
صفیر بلگرامی، سید فرزند احمد
ضیا، میر ضیاء الدین
طاہر فرخ آبادی
عشق عظیم آبادی
عظیم، مرزا عظیم بیگ
فقیر، میر شمس الدین
قدرت شاہ قدرت اللہ
[illegible]

کمال، شاہ کمال الدین
گستاخ رامپوری، کرامت اللہ
مائل، مرزا احمد یار بیگ
منت، میر قمر الدین
منتظر، میاں نور الاسلام
مہر، حاتم علی
منیر شکوہ آبادی
محوی لکھنوی، مولوی محمد حسین
نیاز، شاہ نیاز بریلوی
ناظم، نواب یوسف علی خاں
ندرت میرٹھی، شعیب احمد
ولا، مظہر علی خاں
وفا رامپوری، حکیم عبدالہادی خاں
ہدایت، شیخ ہدایت اللہ
ہجر شاہجہانپوری، نواب ناظم علیخاں

گویا، نواب فقیر محمد خاں
محنت، مرزا حسین علی
مقتول، مرزا ابراہیم بیگ
محب، شیخ ولی اللہ
مروت، صغیر علی
معروف، مرزا الٰہی بخش
مضطر دہلوی، حکیم اسد علی خاں
نثار، محمد امان
نوا، ظہور اللہ خاں
نظر لکھنوی، نوبت رائے
واقف، شاہ واقف
وحید، الہ آبادی
ہادی، میر محمد جواد
ہاشمی، میر ہاشم
ہوش، نواب مرزا محمد تقی

(۶) ہری چند اختر
اسد ملتانی
عشرت رحمانی
وحید قریشی
شاد، نریش کمار
نخشب جارچوی
حمید نسیم
اختر ہوشیارپوری
خاطر غزنوی
فارغ بخاری
سلیم واحد سلیم
مہ لقا چندا بائی
زہرہ نگاہ
نواب شاہجہان بیگم شیریں
نزاکت
امراؤ جان زہرہ لکھنوی
موتی جان موتی
لطیف محمدی جان صاحبہ لکھنوی
دلبر، امراؤ جان

شعری بھوپالی
کشفی ملتانی
شوکت تھانوی
خلیل الرحمٰن اعظمی
حزیں، شعیب احمد
کیف، حکیم ہاشم جان
تابش دہلوی
اقبال صفی پوری
احمد فراز
رضا ہمدانی
احمد ظفر
ادا جعفری بدایونی
نواب اختر محل اختر
نواب بادشاہ محل عالم
قمرن جان مشتری لکھنوی
زینت بیگم نازک
بیگا جان شیریں
شباب، حسین باندی بنارسی
نور جہاں ناز
شہزادی، جان، شوخ

۴۳-۴۴ (ضمیمہ غزل نمبر)

	طلوع	محمد طفیل
ڈرامے	یوسف زلیخا	(ترجمہ) حامد حسن قادری
	کُتّے کی موت	کرشن چندر
افسانے	ھُنگن	سعادت حسن منٹو
	گڑیا گھر	ممتاز مفتی
	پارہ پارہ	خدیجہ مستور
	پھُول سو گئے	اے حمید
	ونڈر لینڈ میں	ابن سعید
	شاہراہ عبد الغنی	عبد الرحمٰن صدیقی
	لمبی حسینہ	محمد یوسف خان
مکاتیب	بارِ خاطر	شوکت تھانوی
شخصیات	فراقؔ اپنے خطوط کی روشنی میں	فراقؔ گورکھپوری

غزل اور متغزلین

(۱) مولانا حالی، آل احمد سرور، نیاز فتحپوری، سید احتشام حسین، عبد السلام ندوی، ڈاکٹر سید عبد اللہ، حامد حسن قادری، عبادت بریلوی، ڈاکٹر مسعود حسن رضوی، سید وقار عظیم، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ ڈاکٹر یوسف حسین، سید باقر حسین، سید اعجاز حسین، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری۔

(۲) ولی دکنی، سراج دکنی، آبرو، حاتم، فغاں، میر تقی میر، سودا، میر درد، مظہر جان جاناں، سوز، شیخ قائم، یقین، میر محمدی بیدار، عبد الحی تاباں، میر اثر، رنگین، مصحفی، غلام حسن حسن، جرأت، انشاء، نظیر اکبر آبادی، نصیر، ممنون، غالب، مومن، ذوق، بہادر شاہ ظفر، شیفتہ، ناسخ، آتش، شہیدی، سالک، مجروح، داغ، امیر مینائی، حالی، جلال، تسلیم، اکبر، ریاض، آرزو لکھنوی، اقبال، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، جوش، فراق، میرزا یگانہ، حفیظ جالندھری، سیماب۔

سمپوزیم (اُردو غزل کا مستقبل)

حصہ لینے والے: ۔ عبد المجید سالک، صوفی تبسم، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، سبط حسن، سید وقار عظیم، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، احسان دانش، حامد علی خاں، چراغ حسن حسرت، احمد ندیم قاسمی، حفیظ جالندھری، حبیب اشعر

مقالہ

غزل	فراق گورکھپوری

۴۵-۴۶

	طلوع	محمد طفیل
ڈرامے	تلوّن	اوپندر ناتھ اشک
	تنکے کا سہارا	امجد حسین
	کلاڈ ناش عرف سنتیاناس	کنہیا لال کپور
	شکنتلا	سلام مچھلی شہری
افسانے	بابا نور	احمد ندیم قاسمی
	ملنٹو	سعادت حسن (منٹو)
	چار گوٹ	ممتاز مفتی
	فاختہ کی چونچ میں دانہ	دیوندر ستیارتھی
	صنم تراش کا خواب	ل۔ احمد
	بھیّا دیورج	ابو الفضل صدیقی
	کٹا ہوا ڈبہ	انتظار حسین
	چھٹکارا	جیلانی بانو
نظمیں، غزلیں	جھومتی برسات	جوش ملیح آبادی
	جگنو	فراق گورکھپوری
	غزل	جگر مراد آبادی
	غزل	فیض احمد فیض
	غزل	فراق گورکھپوری
	غزل	اثر لکھنوی
	غزل	عابد علی عابد
	فکر	احمد ندیم قاسمی
	غزل	اختر انصاری
	غزل	احسان دانش
	اداس رات کے آنگن میں	ابنِ انشاء
	غزل	شاد عارفی
	غزل	نہال سیوہاروی
	غزل	عبد المجید حیرت
	غزل	جگن ناتھ آزاد
	مدیر نقوش کے نام	پروفیسر شور
	غزل	شکیل قدوائی
	غزل	ناصر کاظمی
	ایک نظم	تیغ الہ آبادی
	سیلے	منیر نیازی

	غزل	نور بجنوری
	بہ زنجیرِ گراں	احمد ریاض
	غزل	فارغ بخاری
	غزل	جمیل ملک
مقالے	باغ و بہار اور قبولِ عام	سید وقار عظیم
	جہانِ غالب	قاضی عبدالودود
	میر کا فنی شعور	ڈاکٹر عبادت بریلوی
	اقبال اور کاؤنٹ ٹیونیو اور ملوکیت	غلام جیلانی برق
	گنج ہائے گرانمایہ	اسلوب احمد انصاری
	شب بیداری	محمد طفیل
مکاتیب	اُن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو	حافظ محمود شیرانی ڈاکٹر تاثیر، حامد حسن قادری

۴۷-۴۸ (شخصیات نمبر)

	شخصیت	شخصیت نگار
	محمد حسین آزاد	آغا محمد باقر
	مولانا شبلی نعمانی	سید صباح الدین عبدالرحمٰن
	حالی	خواجہ غلام الحسنین
	مہدی افادی	عبدالماجد دریابادی
	مولانا عبدالحلیم شرر	خاکی قزلباش
	گرامی	عزیز ملک
	مولانا وحید الدین سلیم	روشن پانی پتی
	مرزا رسوا	علی عباس حسینی
	آغا حشر	عشرت رحمانی
	میر ناصر علی	انصار ناصری
	مولانا راشد الخیری	فضل احمد خاں دہلوی
	اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
	فانی	جوش ملیح آبادی
	مرزا عظیم بیگ چغتائی	شاہد احمد دہلوی
	سید سجاد حیدر یلدرم	قرۃ العین حیدر
	مولوی عنایت اللہ دہلوی	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی
	پروفیسر شیرانی	ڈاکٹر سید عبداللہ
	مرزا فرحت اللہ بیگ	مرزا عصمت اللہ بیگ
	حسرت موہانی	جلیل قدوائی
	مولانا سید سلیمان ندوی	سید صباح الدین عبدالرحمٰن
	شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن	نواب خواجہ عبدالمجید دہلوی
	آرزو لکھنوی	چودھری جلیل احمد
(۲)	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	عبادت بریلوی
	ابوالکلام آزاد	غلام رسول مہر
	علامہ دتاتریہ کیفی	رحمت قطبی
	خواجہ حسن نظامی	ملا واحدی
	مولانا عبدالماجد دریابادی	حکیم عبدالقوی دریابادی
	ڈاکٹر ذاکر حسین	ڈاکٹر سید عابد حسین
	مرزا محمد سعید	اشرف صبوحی
	مولانا حامد حسن قادری	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
	رشید احمد صدیقی	آل احمد سرور
	مجنوں گورکھپوری	فراق گورکھپوری
	ڈاکٹر زور	رفیعہ سلطانہ
	اثر لکھنوی	شیخ ممتاز حسین جونپوری
	جگر صاحب	رشید احمد صدیقی
	حفیظ جالندھری	عزیز ملک
	امجد حیدر آبادی	نصیر الدین ہاشمی
	عابد صاحب	محمد طفیل
	مخفی کستانی	میرزا ادیب
	مولانا صلاح الدین احمد	وزیر آغا
	چودھری محمد علی ردولوی	بیگم اخلاق حسین
	عندلیب شادانی	ڈاکٹر شوکت سبزواری
	ڈاکٹر شوکت سبزواری	سید مشکور عظیم
(۳)	منٹو ماموں	حامد جلال
	کرشن چندر	مہندر ناتھ
	عصمت چغتائی	خالد لطیف
	راجندر سنگھ بیدی	کنہیا لال کپور
	احمد ندیم قاسمی	خدیجہ مستور
	خواجہ احمد عباس	صالحہ عابد حسین
	ممتاز مفتی	مسعود قریشی
	قرۃ العین حیدر	ابن سعید
	دیوندر ستیارتھی	پرکاش پنڈت
	خدیجہ مستور	ہاجرہ مسرور
	شفیق الرحمٰن	محمد خالد اختر
	تسنیم سلیم چھتاری	سلمیٰ خورشد منہ

	پروفیسر فراق	مجتبیٰ حسین
	فیض احمد فیض	ایلس فیض
	کنہیا لال کپور	فکر تونسوی
	شاہد احمد دہلوی	جمیل جالبی
	کلیم الدین احمد	قاضی عبدالودود
	سرور صاحب	وقار عظیم
(۴)	لاہور کی چند ادبی شخصیتیں	عابد علی عابد
	دلی کی چند ادبی شخصیتیں	شاہد احمد دہلوی
	لکھنؤ کی چند ادبی شخصیتیں	شوکت تھانوی
	حیدرآباد دکن کی چند ادبی شخصیتیں	قطب النسا ہاشمی
انتظاریہ	سر سید احمد خان	مولوی عنایت اللہ
	ڈپٹی نذیر احمد	قاری عباس حسین
	ریاض خیرآبادی	رئیس احمد جعفری
	پریم چند	جینندر کمار
	سر عبدالقادر	ڈاکٹر محمد باقر
	ڈاکٹر تاثیر	بیگم تاثیر
	میراجی	محمود نظامی
	ظفر علی خاں	شورش کاشمیری
	نیاز فتحپوری	ابوالخیر مودودی
	پطرس	صوفی تبسم
	جوش ملیح آبادی	احتشام حسین
	عبدالمجید سالک	احمد ندیم قاسمی
	چراغ حسن حسرت	ظہیر بابر
	غلام رسول مہر	خلیل الرحمن داؤدی
	وقار عظیم	اقبال عظیم
	ابواللیث صدیقی	صابر علی خاں
	عبادت بریلوی	مکین احسن کلیم
	غلام عباس	پریم ناتھ در
	حجاب امتیاز علی	شوکت تھانوی
	ہاجرہ مسرور	احمد ندیم قاسمی
	شوکت تھانوی	عشرت رحمانی

۴۹ - ۵۰ (منٹو نمبر)

منٹو کی غیر مطبوعہ کہانیاں

بائی بائی
بارش
تصویر
نعیمہ
خودکشی
ایک زاہدہ ایک فاحشہ
انارکلی
مائی جنتے
افشائے راز
ملاوٹ
بدتمیزی
پشاور سے لاہور تک
شیدا
کمیشن
جان محمد
آمنہ
مس اسٹینڈ
قادرا قصائی
بجلی پہلوان
بڈھا کھوسٹ

منٹو کی منتخب تخلیقات :- ہتک ، موذیل ، ممی ، بابو گوپی ناتھ ، کالی شلوار ، ٹوبہ ٹیک سنگھ ، اس منجدھار میں ، نیا قانون ، شہید ساز ، سیاہ حاشیے

منٹو کا فن	منٹو کی فنی تکمیل	ممتاز شیریں
	منٹو کا فن	وقار عظیم
	منٹو کا مقام	محمد حسن عسکری
	گنجے فرشتے	عابد علی عابد
	منٹو	ابواللیث صدیقی
	منٹو کی حقیقت نگاری	عبادت بریلوی
	سعادت حسن منٹو کی یاد میں	ممتاز حسین
منٹو کی شخصیت	میرا دوست ، میرا دشمن	عصمت چغتائی
	منٹو ، میرا دشمن	اوپندر ناتھ اشک
	منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط	احمد ندیم قاسمی
	جو بک نہ سکا	ہاجرہ مسرور
	رحمدل دہشت پسند	ابو سعید قریشی
	منٹو ماموں کی موت	حامد جلال
	منٹو کی موت	غلام عباس
	منٹو کا ایک خط	محمد طفیل

شخصیات نمبر کے بارے میں

مولوی عبدالحق ، نیاز فتحپوری ، عبدالمجید سالک ، عرشی رامپوری
رشید احمد صدیقی ، مالک رام ، احتشام حسین ، مسعود حسن رضوی
کرشن چندر ، ڈاکٹر سید اعجاز حسین ، ایس اے رحمٰن ، خواجہ احمد فاروقی
غلام عباس ، آغا اشرف ، شاد عارفی ، حجاب امتیاز علی
فکر تونسوی ، ابن انشا ، فارغ بخاری ، جیلانی بانو
ممتاز صدیقی

۵۱ - ۵۲

	واسوخت	فیض احمد فیض
	کم بیک الیفرقا	فیض احمد فیض
	یہ فصل امیدوں کی ہمدم	فیض احمد فیض
	دریچہ	فیض احمد فیض
ناولٹ	جگنو اور ستارے	جیلانی بانو
افسانے	گیہوں اور گلاب	خواجہ احمد عباس
	ثریا	ممتاز مفتی
	سہاگ بھری	ہاجرہ مسرور
	تیسرا سگرٹ	بلونت سنگھ
	منٹو، میرا دشمن	اوپندر ناتھ اشک
	ہرے رنگ کی گڑیا	دیویندر ستیارتھی
	سراب	خدیجہ مستور
	مرثیہ	شوکت تھانوی
	کومل رانی	صدیقہ بیگم سیوہاروی
	بیاہ بدھ	غلام علی چودھری
ڈراما	فردوسی	سید عابد علی عابد
نظمیں، غزلیں	غزل	جوش ملیح آبادی
	غزل	فراق گورکھپوری
	رباعیات	جوش ملیح آبادی
	غزل	اثر لکھنوی
	صبح شکستہ	احمد ندیم قاسمی
	انکشاف	عندلیب شادانی
	ہمسفر، جام شکن	روش صدیقی
	غزل	اختر انصاری
	غزل	عدم
	غزل	شاد عارفی
	اتحاد ہند و پاک	پروفیسر شور
	غزل	غلام ربانی تاباں
	غزل	وامق جونپوری
	غزل	ابن انشا
	منٹو زندہ ہے	مصطفےٰ زیدی
	غزل	ناصر کاظمی
	غزل	ساغر لکھنوی
	غزل	زہرہ نگاہ
	غزل	احمد ریاض
	غزل	نور بجنوری
	منٹو کا پیغام	عظیم قریشی
	غزل	باقر مہدی
	غزل	جمیل ملک
	غزل	بشیر منذر
	کرن	منیر اظہر
مقالے	داغ	فراق گورکھپوری
	برج بھاشا کی پہلی گرامر	سید مسعود حسن رضوی
	آزاد کی سیاحت	آغا محمد اشرف
	تنقید میں نقطۂ نگاہ کی اہمیت	ڈاکٹر شوکت سبزواری
	رومن حروف کی آوازیں	شفیع منصور

۵۳ - ۵۴ (افسانہ نمبر)

اردو کی پہلی کہانی	رانی کیتکی	انشاء اللہ خاں انشاء

طویل مختصر داستانوں کا دور

	طوطا کہانی	حیدر بخش حیدری
	آرائش محفل	حیدر بخش حیدری
	باغ و بہار	میر امن دہلوی
	بیتال پچیسی	مظہر علی ولا و للو لال
	سنگھاسن بتیسی	کاظم علی ولا و للو لال
	انشائے نورتن	محمد بخش مہجور
	فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور
	الف لیلہ	حسن علی خاں کشمیری، جعفر علی خاں شدید الدین خاں
ناولوں کا دور	بھروسا	ڈپٹی نذیر احمد
	جام سرشار	رتن ناتھ سرشار
	دل دنیا	شرر لکھنوی
	شریف زادہ	مرزا محمد ہادی رسوا
	بھنور کی دلہن	راشد الخیری
ترجموں کا دور	تولہ بھر ریڈیم	ظفر علی خاں
	نجم السحر	عنایت اللہ دہلوی
	شاعر کی وصیت	عبدالرزاق ملیح آبادی
	بیتیا	خواجہ منظور حسین

کیڈور کا مصور	منصور احمد
بلی کے بچے	جلیل قدوائی
مصور کا راز	حامد علی خاں
دلہن کی پوشاک	فضل حق قریشی
ہڈیوں کا پنجر	تیرتھ رام فیروزپوری

افسانوی مضامین کا دور

شہزادے کا بازار میں گھسٹنا	خواجہ حسن نظامی
اوکھلے کی سیر	آغا حیدر حسن
جہاں آباد	ناصر نذیر فراق
دربارِ دہلی کی کنکوا بازی	عشرت لکھنوی
زود پشیمان	چودھری افضل حق
ریاکار	فلک پیما
پربت کی بیٹی	چراغ حسن حسرت
حاجی بغلول لاہور میں	اشرف صبوحی

اردو افسانہ

(پہلا دور)	خارستان و گلستان	سجاد حیدر یلدرم
	طوقِ آدم	سلطان حیدر جوش
	کیوپڈ و سائیکی	نیاز فتحپوری
	سمن پوش	مجنوں گورکھپوری
	بھینٹ	ل۔ احمد
	تیسری جنس	محمد علی ردولوی
(دوسرا دور)	کفن	پریم چند
	جاں نثار	سدرشن
	چینی کی انگوٹھی	عظیم بیگ چغتائی
	پریم کی چوڑیاں	اعظم کریوی
	اندھا دیوتا	حکیم احمد شجاع
	تین پیسے کی چھوکری	قاضی عبد الغفار
	میلہ گھومنی	علی عباس حسینی
	ڈالی کا جوگ	حامد اللہ افسر
	زندگی	عاشق بٹالوی
	لاری میں	فیاض محمود
	ـــ کہ عالم دوبارہ نیست	امتیاز علی تاج
	لیلےٰ	عابد علی عابد
	کیمیاگر	پروفیسر مجیب
	دولت خانہ	شوکت تھانوی
	صنوبر کے سائے	حجاب امتیاز علی
	نیا مریض	ایم اسلم
	نازو	اختر انصاری
	درونِ تیرگی	میرزا ادیب
	بنتِ قمر	صادق الخیری
	لکھ داتا	شبیر محمد اختر
	رسیلا	مسز عبد القادر
	سنبھالا	صالحہ عابد حسین
(تیسرا دور)	نیند نہیں آتی	سجاد ظہیر
	مہاوٹوں کی ایک رات	احمد علی
	دلی کی سیر	رشید جہاں
	جواں مردی	محمود الظفر
(چوتھا دور)	زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر
	نیا قانون	سعادت حسن منٹو
	گرہن	راجندر سنگھ بیدی
	چوتھی کا جوڑا	عصمت چغتائی
	ہماری گلی	احمد علی
	آنندی	غلام عباس
	پرمیشر سنگھ	احمد ندیم قاسمی
	آپا	ممتاز مفتی
	زعفران کے پھول	خواجہ احمد عباس
	مجھے جانے دو	اختر حسین رائے پوری
	حجاموں کی یونین	ملک راج آنند
	نئی مصیبتیں	رشید جہاں
	حرام جادی	حسن عسکری
	زریں تاج	عزیز احمد
	آخری کوشش	حیات اللہ انصاری
	بینگن کا پودا	اوپندر ناتھ اشک
	لال دھرتی	دیوندر ستیارتھی
	کلیاں اور کانٹے	اختر اورینوی
	جگا	بلونت سنگھ
	بھالو	ہاجرہ مسرور
	خون	انور
	جلاوطن	قرۃ العین حیدر
	مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے	خدیجہ مستور

	جینی	شفیق الرحمٰن
	الاؤ	سہیل عظیم آبادی
	آئینہ	ممتاز شیریں
	زرد چہرے	ابراہیم جلیس
	سردار جسونت سنگھ	قدرت اللہ شہاب
	ٹوٹ گیا اک تارا	تسنیم سلیم چھتاری
	سمندر اور تین کرے	مدھو سودن
	کلوا	سید رفیق حسین
	سرگذشت	ابوالفضل صدیقی
	جہاں میں رہتا ہوں	مہندر ناتھ
	آب حیات	راما نند ساگر
	باجی ولایت	آغا بابر
	آنکھ مچولی	شکیلہ اختر
	اب اور تب	ہنس راج رہبر
	روپ چند	صدیقہ بیگم سیوہاروی
	تجاوز	عبدالرحمٰن چغتائی
(پانچواں دور)	گڈریا	اشفاق احمد
	راون کے دیس میں	اے حمید
	تیسرا آدمی	شوکت صدیقی
	اجودھیا	انتظار حسین
	سمجھوتہ	پرکاش پنڈت
	چاند بجھ گیا	سرلا دیوی
	موم کی مریم	جیلانی بانو
	لڑھکتی چٹان	انور عظیم
مقالات	داستان سے افسانے تک	سید وقار عظیم
	مختصر افسانے کا فن	عبادت بریلوی
	مغربی افسانہ کا اثر اردو افسانہ پر	ممتاز شیریں
	اُردو افسانے کا مستقبل	محمد حسن عسکری
	اُردو افسانے میں روایت اور تجربے	(مذاکرہ)

۵۵-۵۶

مقالے	ڈپٹی نذیر احمد کا ذہنی تجربہ	ڈاکٹر سید اعجاز حسین
	نذیر احمد کی انفرادیت	ڈاکٹر سید عبداللہ
	نذیر احمد کے مذہبی افکار	ڈاکٹر غلام جیلانی برق
	نذیر احمد کی مذہبی تصانیف	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی
یادِ مجاز	یادِ مجاز	محمد رضا انصاری
	گلِ نغمہ	ڈاکٹر محمد حسن

مجاز کا غیر مطبوعہ کلام

جذبۂ شوق نہیں شہپرِ پرواز نہیں
یہ تیرگیٔ شب ہی کچھ صبح طراز آئی
نہ رہ نما نہ کسی رہگذر کو دیکھتے ہیں
زلفِ سرکش بے نیازِ پیچ و خم
رعشہ سا جنبیاں دست دگریباں میں دیکھا
دھواں سا اک سمت اٹھ رہا ہے شرارے اڑ اڑ کے آ رہے ہیں

نظم:- آہنگِ جنوں

مکاتیب	فراق کے خطوط	فراق گورکھپوری
مطالعہ	صاحب	کنہیا لال کپور
نظمیں غزلیں	رباعیات	جوش ملیح آبادی
	دکانِ سخن	فراق گورکھپوری
	حبیبِ عنبر دست	فیض احمد فیض
	غزل	عابد علی عابد
	غزل	صوفی تبسم
	غزل	عدم
	قطعات	اختر انصاری
	غزل	غلام ربانی تاباں
	گفتگوئے بہار	امتیاز علی عرشی
	غزل	میکش اکبرآبادی
	غزل	شاد عارفی
	غزل	فضل احمد کریم فضلی
	غزل	عبدالمجید حیرت
	تبسم کی چوری	مخمور جالندھری
	غزل	ناصر کاظمی
	غزل	شاعر لکھنوی
	غزل	اقبال صفی پوری
	ہر طرف اندھیرا ہے	نور بجنوری
	غزل	حمایت علی شاعر
	خلاؤں سے اترو	احمد ریاض
	واپسی	خلیل الرحمٰن اعظمی

دوری	منیر نیازی
سحر بعید	عبدالعزیز فطرت
غزل	فارغ بخاری
غزل	اختر ہوشیارپوری
غزل	بشیر منذر
غزل	جمیل ملک
سدراں دی موت (پنجابی)	احمد ظفر

افسانے

رات چور اور چاند	بلونت سنگھ
پانچواں مقدمہ (غیر مطبوعہ)	سعادت حسن منٹو
خداداد کالونی	شوکت صدیقی
ممی	آغا بابر
رات بھر کا مہمان	کشمیری لال ذاکر
ننگی آنکھیں	شکیلہ اختر
پہنچیاں	صادق حسین
حاجی پور گوجراں	منظور الٰہی

نئی کتابیں

۵۷-۵۸

افسانے، ڈرامے، طنز و مزاح

کہ پہچانی ہوئی صورت بھی....	کنہیا لال کپور
بار خاطر	شوکت تھانوی
گرم کوٹ اور بیوی	امجد حسین
چنگیز خاں	سید عابد علی عابد
انشا	صالحہ عابد حسین
رات چور اور چاند (مسلسل)	بلونت سنگھ
الف لیلہ ۱۹۵۶ء	خواجہ احمد عباس
مولوی گزٹ	ابو سعید قریشی
ہڈی کا داغ	صدیقہ بیگم سیوہاروی
ابدی مسرت	نور بجنوری
نیلام گھر	مسیح الحسن رضوی
جلاوطن	احمد سعید

نظمیں، غزلیں

حدیث حسن	فراق گورکھپوری
حقیقت و مجاز	جگر مرادآبادی
غزل	فیض احمد فیض
غزل	فراق گورکھپوری
غزل	احمد ندیم قاسمی
قطعات	اختر انصاری
بار دگر	ادا جعفری
غزل	شاد عارفی
غزل	قتیل شفائی
غزل	اشک رامپوری
غزل	انجم رومانی
فرار	ظہور نظر
غزل	ادا جعفری
غزل	زہرہ نگاہ
آل برنشگال	قیوم نظر
غزل	ظہور نظر
شہر آذر	مصطفیٰ زیدی
غزل	عظیم قریشی
غزل	نور بجنوری
غزل	احمد ریاض
غزل	حمایت علی شاعر
مری کا سفر	افضل پرویز
غزل	اکرام تبسم
غزل	باقر مہدی
سگریٹ	پریم وار برٹنی
غزل	مضطر اکبرآبادی
غزل	بشیر منذر
یوسف گم گشتہ	جلیل حشمی
دیکھئے ان کی یہ مسیحائی	مظہر امام
غزل	موج علیگ
غزل	قربان حسین شہیدی
غزل	راحل گورکھپوری
طلسم خیال	منیر نیازی

مقالے

آوارہ گرد اشعار	قاضی عبدالودود
حقیقت اور فنی حقیقت	احمد ندیم قاسمی
اردو ادب کے جدید ترین رجحانات	احمد محی الدین جدی
کہانی کا فن	دیوندر اسّر
اردو ادب کے معمار مولوی نذیر احمد	شاہد احمد دہلوی

ڈاکٹر نذیر احمد بہ حیثیت مصلح	تمکین کاظمی
مولوی نذیر احمد کی مذہبی تصانیف	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

۵۹-۶۰ (شخصیات نمبر (۲))

	شخصیت	شخصیت نگار
	داغ دہلوی	جوش ملسیانی
	اکبر الہ آبادی	عبدالماجد دریابادی
	وقار الملک	مولانا غلام رسول مہر
	نواب عماد الملک	ڈاکٹر عبدالحق
	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	محمد حسین خاں زبیری
	مولوی چراغ علی	غلام بھیک
	نظام رامپوری	شاد عارفی
	شاد عظیم آبادی	سید حسن امام
	نصیر حسین خیال	شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی
	امداد امام اثر	سید حسن امام
	حبیب الرحمٰن شروانی	مالک رام
	علامہ عبداللہ العمادی	ابوالخیر مودودی
	پنڈت برج نرائن چکبست	نجم الدین شکیب
	مولانا احسن مارہروی	جمیل زبیری
	دیا نرائن نگم	ثاقب کانپوری
	سائل دہلوی	مالک رام
	چودھری افضل حق	شورش کاشمیری
	سیماب اکبر آبادی	شاہد اٹاوی
	میرزا یگانہ چنگیزی	سید اعظم حسین اعظم
	رضا علی وحشت	اظہر قادری
	سلطان حیدر جوش	وحید احمد
	اختر شیرانی	نیر واسطی
	ابو سعید بزمی	ادیبہ بزمی
	رشید جہاں	صدیقہ بیگم سیوہاروی
	مجاز	ابواللیث صدیقی
	مولوی محمد داؤد عباسی	محمود احمد عباسی
	مجذوب	رضا انصاری
(۲)	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	اثر لکھنوی
	جوش ملسیانی	پنڈت ہری چند اختر
	تلوک چند محروم	جگن ناتھ آزاد
	عبدالرزاق ملیح آبادی	شاہد خان
	ڈاکٹر عابد حسین	ضیاء الحسن فاروقی
	عرشی رامپوری	عشرت رحمانی
	سید امتیاز علی تاج	شوکت تھانوی
	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	محمود نظامی
	مسعود حسن رضوی	علی عباس حسینی
	علی عباس حسینی	کشور بنیاد زیدی
	حامد علی خاں	محمد عبداللہ قریشی
	رئیس احمد جعفری	ارشد تھانوی
	شبلی بی کام	قمر تسکین
	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	بدر الاسلام فضلی
	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	محمد عثمان
	اے آر خاتون	زبیدہ خاتون
(۳)	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	سید احتشام حسین
	سید احتشام حسین	ڈاکٹر محمد حسن
	اختر حسین رائے پوری	دیوندر ستیارتھی
	اختر اورینوی	شکیلہ اختر
	حیات اللہ انصاری	مسیح الحسن رضوی
	اوپندر ناتھ اشک	کوشلیا اشک
	حفیظ ہوشیارپوری	ناصر کاظمی
	ن۔ م۔ راشد	عطاء اللہ سجاد
	احمد علی	سید علی اکبر قاصد
	اختر انصاری	عزیز عرفی
	شاد عارفی	طاہرہ اختر
	سید عبدالحمید عدم	شاد امرتسری
	جذبی	انور عظیم
	شکیلہ اختر	صوفیہ فضلی
(۴)	مولانا محمد علی جوہر	ضیاء الدین احمد برنی
	مولانا حسین احمد مدنی	رشید الوحیدی
	سید ابوالاعلیٰ مودودی	نعیم صدیقی
	علامہ مشرقی	غلام جیلانی برق
	عطاء اللہ شاہ بخاری	شورش کاشمیری
	ایس اے رحمٰن	اثر صہبائی
	حمید نظامی	شورش کاشمیری
	شورش کاشمیری	محمد وارث کامل

	(۵) حیدرآباد کی چند شخصیتیں	تمکین کاظمی
	علی گڑھ کی چند شخصیتیں	خلیل الرحمٰن اعظمی
	بہار کی چند شخصیتیں	شاہ ولی الرحمٰن کاکوی
	سرحد کی چند شخصیتیں	سید فارغ بخاری
انتظاریہ	سرسید احمد خاں	محمد اسماعیل پانی پتی
	خان بہادر مولوی بشیر الدین	محمد الدین مارہروی
	نواب محسن الملک	ڈاکٹر سید محمود
	امیر مینائی	اسمٰعیل احمد مینائی
	سر تیج بہادر سپرو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین
	عبدالرزاق کانپوری	ابوالخیر مودودی
	لالہ سری رام	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
	سید علی بلگرامی	غلام پنجتن
	منشی سجاد حسین	ممتاز حسین جونپوری
	مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی	مانی جائسی
	محمد دین فوق	محمد عبداللہ قریشی
	عشرت لکھنوی	خواجہ شمس الدین
	اصغر گونڈوی	صغیر احمد صدیقی
	تاجور نجیب آبادی	محمد وارث کامل
	صفی لکھنوی	ممتاز حسین جونپوری
	دل شاہجہانپوری	شبنم رومانی
	فلک پیما	میاں بشیر احمد
	مالک رام	مختار الدین احمد آرزو
	احسان دانش	محمد وارث کامل

۶۱—۶۲ (سالنامہ)

افسانے	چور (غیر مطبوعہ)	سعادت حسن منٹو
	اصفہان کے نگبند	امتیاز علی تاج
	جانا حاتم طائی کا —	کنہیا لال کپور
	رات چور اور چاند	بلونت سنگھ
	ہاورن تھرے کا سٹیشن	حجاب امتیاز علی
	ایک پھول، ایک کار	مہندر ناتھ
	سات دن کی بادشاہت	کشمیری لال ذاکر
	زینو	ابو سعید قریشی
	ایک انسان کی موت	فکر تونسوی
	پکی اینٹ	غلام علی چودھری
	نہنا	جمیل الزمان
	مومن کی واپسی	احمد سعید
	یورپ میں اجنبی	منظور الٰہی
	غادرسن انیس سو ستاون	احمد جمال پاشا
	زندہ لاش	سیدہ ثریا سلطانہ
	چھبیس اور ایک	انوار حسن ہاشمی
نظمیں، غزلیں	خط	جوش ملیح آبادی
	غزل	جگر مراد آبادی
	غزل	سیماب اکبر آبادی
	غزل	عابد علی عابد
	تین نامکمل غزلیں	احمد ندیم قاسمی
	غزل	سراج لکھنوی
	غزل	آنند نرائن مُلّا
	غزل	معین احسن جذبی
	سہاروں کی تلاش	اختر انصاری
	غزل	عدم
	بڑی صدا	عدم
	غزل	فضل احمد کریم فضلی
	غزل	عرشی رامپوری
	غزل	شاد عارفی
	غزال	اشک رامپوری
	غزل	شور علیگ
	ابروباد	شور علیگ
	رباعیات	قتیل شفائی
	یاد	غلام ربانی تاباں
	غزل	حیرت شملوی
	غزل	انجم رومانی
	غزل	جگن ناتھ آزاد
	غزل	راز مراد آبادی
	غزل	ناصر کاظمی
	گھونگھٹ اوٹ	سوامی مارہروی
	غزل	ظہور نظر
	غروب	ظہور نظر
	غزل	شاعر لکھنوی
	غزل	نور بجنوری

پولونیئس	مصطفیٰ زیدی
اشارے	منیر نیازی
غزل	وحید قریشی
تعبیر	حمایت علی شاعر
یہ اونچے دریچے	احمد ریاض
تعبیر	آغا صادق
غزل	پریم وار برٹنی
نگار شہر	مظہر امام
غزل	جمیل ملک
غزل	اختر ہوشیار پوری
غزل	شکیب جلالی
غزل	مظہر امام
غزل	جلیل حشمی
غزل	باقر مہدی

مقالے

تقریظ (غیر مطبوعہ)	مولانا محمد علی جوہر
نذیر احمد کا ایک ناول	مولانا عبدالماجد دریا بادی
غالب کی مقبولیت کے اسباب	شیخ محمد اکرام
احتشام حسین کی تنقید	کلیم الدین احمد
متفرقات	قاضی عبدالودود
فقہ ہندی	اختر اورینوی
نئے ادبی رجحانات اور ان کا تجزیہ	راجندر ناتھ شیدا
آزاد نظم، غزل اور ترقی پسند شاعری	ڈاکٹر محمد حسن
تذکرہ شعرائے اردو	ڈاکٹر وحید قریشی
قدیم مشاعرے کی ادبی اہمیت	آفتاب احمد
حیات ڈپٹی نذیر احمد	یٰسین علی خاں

ضمیمہ شخصیات نمبر

علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی	سید ابوالخیر مودودی
قاضی عبدالودود	ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو
شفق عماد پوری	حسن وارثی
مانی جائسی	سید کلب مصطفیٰ
میرزا ادیب	جمیل ملک
صالحہ عابد حسین	بیگم انیس قدوائی
قتیل شفائی	ابراہیم جلیس
لاہور کی چند شخصیتیں	محمد طفیل

کھلے خط

پہلا خط	اثر لکھنوی
دوسرا خط	عبدالحمید عدم

۶۳-۶۴

افسانے

گل مہر	کرشن چندر
آسرے	خدیجہ مستور
رات، چور اور چاند	بلونت سنگھ
ادارہ تجہیز و تکفین	شوکت تھانوی
یروشلم، یروشلم	اے حمید
پرواز کے زخم	کشمیری لال ذاکر
مٹی	ابوسعید قریشی
سفید چادر	احمد سعید
پاگل کون	منظور الٰہی
مریم	رتن سنگھ
گولر کا پیڑ	عبدالرحمٰن صدیقی

ڈرامے

نیا گھر	کرشن چندر
روپیہ چلتا ہے	آغا بابر

نظمیں، غزلیں

قندِ پارسی	فراق گورکھپوری
قندِ ہندی	فراق گورکھپوری
غزل	فراق گورکھپوری
غزل	فراق گورکھپوری
غزل	مجید امجد
کہانی ایک ملک کی	مجید امجد
بھکارن	مجید امجد
غزل	مجید امجد
موجودگی	مجید امجد
نرگس	مجید امجد
ظہورِ آدم	جگن ناتھ آزاد
رباعیات	جوش ملیح آبادی
غزل	اثر لکھنوی
غزل	احمد ندیم قاسمی
قطعات	اختر انصاری
غزل	قتیل شفائی
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں	ابنِ انشاء
غزل	شاد عارفی

غزل	شاد عارفی
غزل	امتیاز علی عرشی
غزل	عبدالمجید حیرت
غزل	عبدالمجید حیرت
پیام فطرت	پروفیسر شور
غزل	پروفیسر شور
غزل	انجم رومانی
غزل	سلام مچھلی شہری
غزل	نور بجنوری
غزل	اقبال صفی پوری
غزل	نواب شمس الحسن
غزل	مصطفےٰ زیدی
غزل	حمایت علی شاعر
میراث	فارغ بخاری
یہ لوگ	احمد ریاض
میں اور ہم	پرویز شاہدی
رباعیات	شکیب جلالی
بھٹکا ہوا مسافر	بلراج کومل
اک تجلی سی لہرائی	عظیم قریشی
غزل	پریم وار برٹنی
غزل	افضل پرویز
غزل	مظہر امام
غزل	رضا ہمدانی
غزل	جمیل ملک
غزل	احمد ظفر
غزل	ظفر اقبال
غزل	رفعت سلطان
غزل	صابر کنجاہی

مقالے

نثر نگاروں کی شاعری	مولانا عبدالماجد دریابادی
اردو شاعری پر مغربی اثرات	ڈاکٹر محی الدین زور
مرزا رسوا کی تنقید نگاری	ڈاکٹر محمد حسن
اودھ پنچ کا ایک رتن	محمد طاہر فاروقی
اشارہ یا استعارہ	ڈاکٹر شوکت سبزواری
مرقع اکبر تجریدی	سید علی عباس جلالپوری
ملک حبیب احمد خاں	غلام رسول ازہر
۱۹۵۷ء کے تین بنیادی پہلو	مولانا غلام رسول مہر
۱۹۵۷ء میں اہلِ علم پر کیا گذری	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

۶۵-۶۶ (مکاتیب نمبر)

علم و ادب میں خطوط کا درجہ	غلام رسول مہر
اردو خط نگاری	ڈاکٹر سید عبداللہ
اردو کے منفرد مکتوب نگار	مالک رام
مشاہیر ادب (سوانح)	محمد عبداللہ قریشی
غالب دہلوی	۸ خطوط
سرسید احمد خاں	۱۶ خطوط
محمد حسین آزاد	۵ خطوط
امیر مینائی	۱۴ خطوط
داغ	۳ خطوط
منشی ذکاء اللہ	۲ خطوط
ڈپٹی نذیر احمد	۷ خطوط
مولانا حالی	۲۶ خطوط
نواب محسن الملک	۲۳ خطوط
نواب وقار الملک	۱۹ خطوط
جلال لکھنوی	۲ خطوط
شبلی نعمانی	۴۴ خطوط
اکبر الہ آبادی	۱۶ خطوط
شاد عظیم آبادی	۱۰ خطوط
مولانا عبدالحلیم شرر	۱۰ خطوط
ڈاکٹر سید محمود	۳ خطوط
رسا رامپوری	۱۷ خطوط
سید احمد دہلوی	۷ خطوط
ریاض خیر آبادی	۹ خطوط
غلام قادر گرامی	۶ خطوط
سید امداد امام اثر	۳ خطوط
نظم طباطبائی	۶ خطوط
حبیب الرحمٰن	۸۷ خطوط
علامہ اقبال	۴۹ خطوط
سر عبدالقادر	۳۳ خطوط
مولانا محمد علی جوہر	۱۰ خطوط
مولانا شوکت علی	۴ خطوط

سرکشن پرشاد	۱۳ خطوط	شاداں بلگرامی	۷ خطوط
بیخود بدایونی	۳ خطوط	سیماب اکبر آبادی	۱۴ خطوط
خواجہ عشرت لکھنوی	۲ خطوط	فرحت اللہ بیگ	۷ خطوط
راشد الخیری	۴ خطوط	فانی بدایونی	۷ خطوط
حکیم اجمل خاں	۶ خطوط	آرزو لکھنوی	۵ خطوط
سائل دہلوی	۱۴ خطوط	محمود شیرانی	۷ خطوط
محمد دین فوق	۹ خطوط	تاجور نجیب آبادی	۱۳ خطوط
ڈاکٹر انصاری	۳ خطوط	یگانہ چنگیزی	۱۵ خطوط
غلام بھیک نیرنگ	۸ خطوط	قاضی عبد الغفار	۲۸ خطوط
سر تیج بہادر سپرو	۳ خطوط	سلطان حیدر جوش	۳ خطوط
آغا شاعر قزلباش	۱۰ خطوط	اختر شیرانی	۱۹ خطوط
ظفر الملک	۱۰ خطوط	ڈاکٹر تاثیر	۱۴ خطوط
احسن مارہروی	۲۶ خطوط	عبد السلام ندوی	۹ خطوط
صفی لکھنوی	۱۱ خطوط	چراغ حسن حسرت	۴ خطوط
دیا نرائن نگم	۶ خطوط	اختر جوناگڑھی	۱۸ خطوط
وحید الدین سلیم	۶ خطوط	(۲) سید نذیر حسین محدث دہلوی	ایک خط
نصیر حسین خیال	۱۰ خطوط	نواب سر مزمل اللہ خاں	۳ خطوط
جالب دہلوی	۴ خطوط	محمد سمیع اللہ	۲ خطوط
سید سلیمان ندوی	۶۱ خطوط	ابو محمد عبد الحق	ایک خط
خواجہ حسن نظامی	۲۹ خطوط	سر آسمان جاہ	۲ خطوط
دتاتریہ کیفی	۲۱ خطوط	سید شوکت حسن شوکت فہمی	ایک خط
مناظر احسن گیلانی	۱۶ خطوط	مولانا اظہر علی آزاد	ایک خط
سجاد حیدر یلدرم	۸ خطوط	رضا بلگرامی آرزو	ایک خط
عظمت اللہ خاں	۵ خطوط	نواب صدر الدین حسین	ایک خط
سر راس مسعود	۹ خطوط	منیر شکوہ آبادی	ایک خط
مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی	۵ خطوط	مولوی خدا بخش	ایک خط
خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی	ایک خط	سید عبد الحی	ایک خط
مفتی کفایت اللہ	۳ خطوط	سید عباس حسن فصاحت	۲ خطوط
عبد الرحمٰن بجنوری	۳ خطوط	امیر علی رضوی	ایک خط
منشی پریم چند	۲۸ خطوط	جسٹس امیر علی	ایک خط
اصغر گونڈوی	۹ خطوط	سید علی بلگرامی	۲ خطوط
حسرت موہانی	۱۱ خطوط	سید میر حسن	ایک خط
وحشت کلکتوی	۱۲ خطوط	مولانا میر حسن	ایک خط
پروفیسر محفوظ الحق	۱۹ خطوط	عبد الرزاق کانپوری	۲ خطوط
منشی مہیش پرشاد	۲۸ خطوط	شاہ سلیمان پھلواری	ایک خط

محمد علی ردولوی	ایک خط
مولانا عبدالباری	۲ خطوط
جلیل مانک پوری	ایک خط
مہدی حسن	۲ خطوط
ہوش بلگرامی	ایک خط
کشن پرشاد کول	۲ خطوط
شمیم بھرت پوری	ایک خط
میر نثار علی شہرت	ایک خط
شوشتی محمد ناظر	ایک خط
غلام احمد مہجور	۳ خطوط
مولانا رشید احمد گنگوہی	ایک خط
مولوی بشیر الدین	ایک خط
مولانا عبدالباری آسی	۲ خطوط
مولانا آزاد سبحانی	ایک خط
پنڈت شیو نرائن شمیم	۳ خطوط
میرزا ثاقب لکھنوی	۲ خطوط
بیخود موہانی	ایک خط
آزاد انصاری	۲ خطوط
مولوی عنایت اللہ	ایک خط
مولوی نور الحسن نیر	۳ خطوط
مولانا حمید الدین فراہی	ایک خط
میر ناصر علی	ایک خط
مرزا ہادی رسوا	۲ خطوط
بے نظیر شاہ	۲ خطوط
شفق عماد پوری	ایک خط
ڈاکٹر ضیاء الدین	۲ خطوط
مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی	۳ خطوط
سید طفیل احمد منگلوری	ایک خط
مولانا ظہور احمد وحشی	ایک خط
مولانا عبدالماجد بدایونی	ایک خط
مولوی سید ممتاز علی	ایک خط
سر سید رضا علی	۲ خطوط
منشی نوبت رائے نظر	ایک خط
عبداللہ یوسف علی	ایک خط
بہادر یار جنگ	۳ خطوط

سید ضمیر الدین احمد عرشی	ایک خط
مرزا محمد عسکری	ایک خط
مولوی محمد اکرام خاں ندوی	ایک خط
سعید انصاری	ایک خط
مولانا مسعود عالم ندوی	ایک خط
مولانا مسعود علی ندوی	۳ خطوط
مولوی عزیز مرزا	۲ خطوط
سید فرزند علی صفیر بلگرامی	۵ خطوط
مولوی غلام حسنین کنتوری	۵ خطوط
مولوی عبدالغفور شہباز	۸ خطوط
سید علی حسن خاں	ایک خط
سید حسین بلگرامی	۹ خطوط
سر آفتاب احمد	۴ خطوط
حکیم حبیب الرحمٰن شروانی	۱۲ خطوط
وجاہت جھنجھانوی	۹ خطوط
حکیم ناطق گلاوٹھی	۳ خطوط
مولوی سید محمد حسین محوی	۹ خطوط
جسٹس شاہ دین ہمایوں	۶ خطوط
حکیم فقیر محمد چشتی	۳ خطوط
بیخود دہلوی	۲ خطوط
مولانا محمد عرفان	۳ خطوط
مولانا اسلم جیراجپوری	۲ خطوط
مہدی بیگم	۲ خطوط
ابوالکلام (۳)	ایک خط
مولانا عبدالحق	ایک خط
مولانا عبدالماجد دریابادی	ایک خط
پطرس	ایک خط
نیاز فتحپوری	ایک خط
ڈاکٹر ذاکر حسین	ایک خط
غلام رسول مہر	ایک خط
عبدالمجید سالک	ایک خط
ڈاکٹر عبدالستار صدیقی	ایک خط
ڈاکٹر عابد حسین	ایک خط
رشید احمد صدیقی	ایک خط
خواجہ غلام السیدین	ایک خط

ڈاکٹر تاراچند	ایک خط
فراق گورکھپوری	ایک خط
مالک رام	ایک خط
ڈاکٹر محی الدین زور	ایک خط
امتیاز علی عرشی	ایک خط
سید مسعود حسن رضوی	ایک خط
شیخ محمد اکرام	ایک خط
پروفیسر حامد حسن قادری	ایک خط
پروفیسر محمد شفیع	ایک خط
مولانا حسین احمد مدنی	ایک خط ..
شیخ محمد عبداللہ	ایک خط
جوش ملیح آبادی	ایک خط
حفیظ جالندھری	ایک خط
جگر مراد آبادی	ایک خط
نوح ناروی	ایک خط
اثر لکھنوی	ایک خط
آل احمد سرور	ایک خط
مختار الدین آرزو	ایک خط
سید احتشام حسین	ایک خط
اختر حسین رائے پوری	ایک خط
محمد حسن عسکری	ایک خط
عندلیب شادانی	ایک خط
جوش ملسیانی	ایک خط
سید امتیاز علی تاج	ایک خط
فیض احمد فیض	ایک خط
ن۔ م۔ راشد	ایک خط
کرشن چندر	ایک خط
عصمت	ایک خط
احمد علی	ایک خط
راجندر سنگھ بیدی	ایک خط
غلام عباس	ایک خط
حیات اللہ انصاری	ایک خط
علی عباس حسینی	ایک خط
خواجہ احمد عباس	ایک خط
احمد ندیم قاسمی	ایک خط
اوپندر ناتھ اشک	ایک خط

ممتاز مفتی	ایک خط
بلونت سنگھ	ایک خط
عزیز احمد	ایک خط
قرۃ العین	ایک خط
حجاب امتیاز علی	ایک خط
ہاجرہ مسرور	ایک خط
خدیجہ مستور	ایک خط
تسنیم سلیم چھتاری	ایک خط
کنہیا لال کپور	ایک خط
شوکت تھانوی	ایک خط
معین احسن جذبی	ایک خط
میراجی	۲ خطوط
منٹو	۳ خطوط
مجاز	۴ خطوط

۶۷ - ۶۸ (دس سالہ نمبر)

	طلوع	محمد طفیل
رپورتاژ	ستمبر کا چاند	قرۃ العین حیدر
افسانے	کلو کی ماں	عصمت چغتائی
	پرتیو	کرشن چندر
	ماتم	احمد ندیم قاسمی
	ٹوٹے پل	علی عباس حسینی
	دھند	ممتاز مفتی
	رات، چور اور چاند	بلونت سنگھ
	دل کی پیاس	خدیجہ مستور
	تاریک صلیب اور زرد چاند	اے حمید
	سوتکیں	مہندر ناتھ
	رات کی آنکھیں	کشمیری لال ذاکر
	ایمان کی سلامتی	جیلانی بانو
	انسان اور صلیب	صادق حسینی
	دو ہزار روپے کا چیک	دیویندر اسر
	انسان، اس کا گھوڑا اور خدا	احمد سعید
	بجھتے چراغ	رام لعل
	ایک رات	ڈاکٹر شفیق
ڈرامے	کھلی کھڑکیاں	ہاجرہ مسرور

	نوشب آفریدی چراغ آفریدم	سلام مچھلی شہری
طنز و مزاح	سامع	کنہیا لال کپور
	برائے وزنِ بیت	امجد حسین
نظمیں غزلیں	خاکِ ملیح	جوش ملیح آبادی
	غزل	جگر مراد آبادی
	مشرق ومغرب	احمد ندیم قاسمی
	غزل	اثر لکھنوی
	ایک مفلوج دوست سے	تلوک چند محروم
	غزل	افقر موہانی
	غزل	جذبی
	قطعات	اختر انصاری
	غزل	عدم
	یہ دور	اختر الایمان
	رسمِ شبستانِ طرب	قتیل شفائی
	غزل	قتیل شفائی
	غزل	شاد عارفی
	جاروب کش	مجید امجد
	ساقی کے حضور	پروفیسر شور
	غزل	پروفیسر شور
	غزل	غلام ربانی تاباں
	غزل	عبدالمجید حیرت
	شراب	منیر نیازی
	ایک ملاقات	ظہور نظر
	غزل	اقبال صفی پوری
	غزل	آغا صادق
	ماضی، حال، مستقبل	فارغ بخاری
	آنچل کی چھاؤں میں	خلیل الرحمٰن اعظمی
	غزل	فضا ابن فیضی
	مریم نغمہ	شاذ تمکنت
	غزل	خاطر غزنوی
	غزل	احمد ریاض
	غزل	مظہر امام
	غزل	کوثر نیازی
	غزل	کوثر نیازی
	غزل	جلیل حشمی
	غزل	جمیل ملک
	غزل	احمد ظفر
	غزل	ظفر اقبال
	غزل	آتش لدھیانوی
	پانچ چینی نظمیں کیسے کیسے لوگ جگنو سے! کونج سرخ رنگ دھوئیں برف کا گالا	ابن انشا
مقالے	تنقیدِ شعر اور حالی	عبدالقادر سروری
	دارا شکوہ کا دیوان	پروفیسر علم الدین سالک
	گل بکاؤلی	محمد عبداللہ قریشی
	حضرت سید احمد بریلوی کی داستانِ جہاد	ڈاکٹر غلام جیلانی برق
	آگرہ کی ادبی شخصیتیں	میکش اکبر آبادی
	غالب کی شاعری	عطا محمد شعلہ
	واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط	تمکین کاظمی
	قطب شاہی دور میں اردو ادب کی رفتار	نصیر الدین ہاشمی
	شیوۂ حجو المزدی کا آغاز	سید علی عباس جلالپوری
	قرۃ العین طاہرہ	منظور الٰہی
تبصرے	خونِ جگر ہونے تک	م۔ ط
	داغ داغ اجالا	ع۔ ق

نقوش میں شائع ہونے والی تخلیقات کا خاکہ

(۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک)

زمانہ ادارت : احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور

نمبر شمار	شمارہ نمبر	مضامین	افسانے	ڈرامے	ناولٹ	نظمیں	غزلیں	کل تعداد نظم و نثر	تعداد صفحات طبع شدہ
۱	۱	۷	۵			۶	۹	۲۷	۸۴
۲	۲	۸	۴			۷	۶	۲۵	۸۰
۳	۳	۱۰	۵	۱		۹	۷	۳۲	۱۰۴
۴	۴ (آزادی نمبر)	۱۱	۷	۱		۱۳	۱۳	۴۵	۲۶۴
۵	۵	۱۷	۸	۱		۱۴	۹	۴۹	۱۹۸
۶	۶	۷	۵			۱۲	۸	۳۲	۱۲۰
۷	۷ (امن نمبر)	۱۲	۷			۱۴	۹	۴۲	۱۵۲
۸	۸ (آزادی نمبر)	۱۰	۱۰			۲۲	۲۰	۶۲	۲۴۰
۹	۹	۴	۵			۸	۷	۲۴	۸۰
۱۰	۱۰	۴	۴			۹	۶	۲۳	۷۲
	میزان	۹۰	۶۰	۳		۱۱۴	۹۴	۳۶۱	۱۳۹۴
زمانہ ادارت : سید وقار عظیم									
۱۱	۱۱، ۱۲ (خاص نمبر)	۱۱	۱۲			۱۰	۱۷	۵۰	۲۰۰
۱۲	۱۳	۴	۴			۵	۱۴	۲۷	۷۲
۱۳	۱۴	۶	۵			۴	۱۳	۲۷	۷۲
۱۴	۱۵، ۱۶ (سالنامہ)	۱۸	۱۲			۱۰	۳۴	۷۴	۲۴۴
۱۵	۱۷، ۱۸ (ناولٹ نمبر)	۳	۲ منظوم	۱	۴			۱۰	۲۸۸
	میزان	۴۲	۳۵	۱	۴	۲۹	۷۷	۱۸۸	۸۷۶
زمانہ ادارت : محمد طفیل									
۱۶	۱۹، ۲۰	۱۳	۱۰	۱		۱۵	۲۲	۶۱	۲۳۲
۱۷	۲۱، ۲۲	۱۵	۱۲			۱۶	۳۸	۸۱	۲۹۴

نمبر شمار	شمارہ نمبر	مضامین	افسانے	ڈرامے	ناولٹ	نظمیں	غزلیں	کل تعداد نظم و نثر	تعداد صفحات طبع شدہ
۱۸	۲۳، ۲۴	۹	۹		۱	۱۲	۲۶	۵۷	۲۴۰
۱۹	۲۵، ۲۶ (افسانہ نمبر)	۲	۳۸					۴۰	۴۰۰
۲۰	۲۷، ۲۸	۱۱	۹			۱۹	۲۰	۵۹	۲۴۰
۲۱	۲۹، ۳۰ (پنج سالہ)	۱۶	۱۵	۱		۲۰	۲۵	۷۷	۴۰۸
۲۲	۳۱، ۳۲	۱۰	۱۰	۱		۶	۲۰	۴۷	۲۰۸
۲۳	۳۳، ۳۴	۱۱	۷	۱		۵	۱۴	۳۸	۲۰۸
۲۴	۳۵، ۳۶	۱۳	۱۱			۱۱	۱۷	۵۲	۲۴۸
۲۵	۳۷، ۳۸ (افسانہ نمبر)	۱	۴۰					۴۱	۵۰۶
۲۶	۳۹، ۴۰	۸	۱۰			۱۲	۱۶	۴۶	۲۱۶
۲۷	۴۱، ۴۲ (غزل نمبر)						۸۱۵	۸۱۵	۴۸۰
۲۸	۴۳، ۴۴ (ضمیمہ غزل نمبر)	۵	۷	۲				۱۴	۲۵۶
۲۹	۴۵، ۴۶	۷	۸	۴		۸	۱۶	۴۳	۲۶۴
۳۰	۴۷، ۴۸ (شخصیات نمبر ۱)	۸۶							۷۰۰
۳۱	۴۹، ۵۰ (منٹو نمبر)	۱۵	۳۰					۳۵	۳۸۴
۳۲	۵۱، ۵۲	۵	۱۰	۱	۱	۹	۱۶	۴۲	۲۴۸
۳۳	۵۳، ۵۴ (افسانہ نمبر)	۵	۱۱۰					۱۱۵	۱۰۹۰
۳۴	۵۵، ۵۶	۹	۸			۱۱	۱۷	۴۵	۲۰۸
۳۵	۵۷، ۵۸	۱۰	۷	۲		۱۲	۲۱	۵۲	۲۴۴
۳۶	۵۹، ۶۰ (شخصیات نمبر ۲)	۸۸						۸۸	۸۱۴
۳۷	۶۱، ۶۲ (سالنامہ)	۲۱	۱۶			۱۴	۲۹	۸۰	۳۸۴
۳۸	۶۳، ۶۴	۹	۱۱	۲		۱۴	۳۲	۶۸	۳۱۲
۳۹	۶۵، ۶۶ (مکاتیب نمبر)	۴	۱۲۱۳ (خطوط)					۱۲۱۷	۱۰۴۸
۴۰	۶۷، ۶۸ (دہ سالہ نمبر)	۱۲	۱۷ (افسانے)	۲		۱۹	۲۲	۷۲	۴۵۶
	میزان	۳۸۵	۳۹۵ افسانے ۱۲۱۳ خطوط	۱۷	۲	۲۰۳	۱۱۶۶	۲۱۶۸	۱۰۰۰۶
	کل میزان	۵۱۷	۴۹۰ ۱۲۱۳ خطوط	۲۱	۶	۳۴۶	۱۳۳۷	۲۷۱۷	۱۲۲۷۶

ہماری کتابیں

نیلوفر	شوکت تھانوی	۶/-
مولانا	〃	۳/۸
غزالہ	〃	۶/-
خدانخواستہ	〃	۳/-
سودیشی ریل	〃	۳/-
کتیا	〃	۳/۸
سانچ کو آنچ	〃	۳/۸
سسرال	〃	۲/۴
کارٹون	〃	۳/۸
مابدولت	〃	۳/۸
بقراط	〃	۲/۸
جوڑ توڑ	〃	۴/-
مضامین شوکت	〃	۲/۸
قاضی جی (تین حصے)	〃	۱۰/۸
غالب کے ڈرامے	〃	۲/۸
وغیرہ وغیرہ	〃	۳/-
بھابی	〃	۴/۸
روزن	قتیل شفائی	۳/-

نبی اُمّی	عمر ابو النصر	۵/-
خلفائے محمد	〃	۱۰/-
شعلۂ طور	جگر مراد آبادی	۷/۸
امراؤ جان ادا	رسوا	۴/-
منٹو	ابو سعید قریشی	۴/۴
قول و قرار	عدم	۲/۸
پیچ و خم	〃	۳/-
سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	۳/-
آنچل	احمد ندیم قاسمی	۳/-
بازارِ حیات	〃	۳/-
نقوشِ لطیف	〃	۶/-
عزیزم کے نام	ڈاکٹر تاثیر	۲/۸
یدِ بیضا	عابد علی عابد	۵/-
سیاستِ الٰہیہ	امام ابن تیمیہ	۲/۸
مضامین جمال الدین افغانی		۴/-
پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	۲/۸
صاحب	محمد طفیل	۳/-
انتقاد	عابد علی عابد	۳/-

ادارہ فروغِ اردو، لاہور

مُدیرِ نقوش

محمد طفیل

میرے بارے میں کسی نہ کسی طرح دو روائیں بنتی چلی گئیں۔ کچھ لوگ مجھ سے ارادت رکھتے ہیں اور یہ ان کے دل کی فیاضی ہے۔ بعض لوگ مجھے دشنام سے یاد کرتے ہیں اور یہ ان کے دل کی ناراضی ہے۔ میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں۔ اس کا فیصلہ آج نہیں، کل ہوگا۔ میں نے اپنی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح لوگوں کے سامنے رکھ دی ہے —— یہ اوراق انھیں اس امر کا فیصلہ کرنے میں مدد دیں گے کہ میں کتنا بُرا اور کتنا اچھا ہوں۔

ابوالکلام

آج میں آپ کی اُن حضرت سے ملاقات کراتا ہوں جو اس سے پہلے اپنے کئی دوستوں کی پگڑیاں اچھال چکے ہیں اور دعوے یہ کرتے رہے ہیں کہ میں تو صاف گو قسم کا انسان ہوں۔ ارادہ ہے آج انھیں بھی صاف گوئی کی کسوٹی پر رگڑ دیا جائے۔

صورت دیکھئے تو مسکین، بھولے بھالے، تجربتہً اس کے برعکس، میں انھیں ۱۵ اگست ۱۹۲۳ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر یہ حضرت مجھے اب تک چکمے پہ چکمہ دیئے جا رہے ہیں اور اب تک یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ یہ آخر ہیں کیا بلا؟

مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں ان کا بچپن کا دوست ہوں۔ اُس وقت کا دوست، جب یہ بجائے چلنے کے رینگا کرتے تھے اور راتی اوچی کہہ کر روٹی مانگا کرتے تھے۔

بعض ناسمجھوں کا خیال ہے کہ طفیل صاحب ایسے شریف آدمی اگر پیدا ہونے بند نہیں ہوئے تو کمیاب ضرور ہو گئے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ اب تو ایسا برانڈ آتا ہی نہیں۔ یہ بھی اگر ان سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تو نقصان کا بھی کوئی خطرہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض بے تکلف دوست انھیں بے ضرر اور غیر مفید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہ جوں جوں بڑھنے لگے۔ والد کی مسلسل اور جان لیوا بیماری کی وجہ سے غریبی جوان ہوتی گئی۔ وہ وقت بھی آیا کہ جب دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بے چارے کی تعلیم ادھوری رہی۔ انہیں ہائی اسکول میں پڑھتے تو دیکھا گیا ہے۔ مگر ان کے پاس کوئی قابلِ ذکر تعلیمی سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان سے اکثر یہ فقرہ سننے میں آتا ہے —— اجی سرٹیفکیٹ کو چھوڑیئے۔ آج کل تو سکولوں اور کالجوں میں جہالت کے سرٹیفکیٹ بٹتے ہیں۔

ان کی تیسری جماعت کا ایک واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔ جب یہ حضرت اوّل درجہ کے کُند ذہن ہوا کرتے تھے اور خوب پٹا کرتے تھے۔ اگر استاد نے گھر پر کرنے کے لیے کام دیا تو یہ پٹائی سے بچنے کے لیے اپنے ہی ہم سبقوں کے گھروں پر جا کر، انھیں باتوں میں لگا کر، آنکھ بچا کر، یا اُن کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر، اُس دن کا کام کیے ہوئے صفحات ہی پھاڑ لایا کرتے تھے۔ اس طرح خود سرخرو ہو کر دوسروں کو مصیبت میں ڈال دیا کرتے تھے اور استاد اُن بیچاروں کو یہ کہہ کہہ کر خوب پیٹا کرتے تھے ——— ہُوں، کسی نے کاپی میں سے صفحے پھاڑ لیے ہیں۔ نشاڑ ——— ہوں کاپی میں سے صفحے ——— اُلّو ایک تو کام نہیں کرتے۔ دوسرے جھوٹ بولتے ہیں۔

ایک دن، ان کا ایک ہم سبق، ان کے ہاتھ کی صفائی سے پٹ رہا تھا تو یہ اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے اٹھے اور اقرار کر لیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ صحیح ہے اور قصوروار میں ہوں۔ استاد نے ان کی صاف گوئی کی کوئی قدر نہ کی۔ اُلٹے اتنی ٹھکائی کی کہ اسکول کی دیوار تک سہم گئیں۔ تب سے نہ جانے کیا ہوا کہ یہ پڑھائی میں تیز ہو گئے۔ اتنے تیز کہ استاد ان پر فخر کرنے لگے۔

ان کی اس سے بھی پہلے کی باتیں مجھے یاد ہیں۔ جو ممکن ہے اب ان کے لیے وجہِ فضیلت نہ ہوں۔ مگر وہ باتیں ان کے مستقبل کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد دے ہی سکتی ہیں۔ یہ اپنے ماضی کی یادوں کو یکسر بھلا دینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ انھیں یاد آ ہی جاتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی جھنجھلا کر یہ شعر بھی دہراتے ہوئے پائے گئے ہیں ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ابھی یہ چار پانچ برس ہی کے ہوں گے کہ انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنی خوب گت بنوائی — روئے، چیخے اور کُپا، گھر والوں نے جناب کی یہ حالت دیکھی تو بھڑوں کے چھتے کو جلا ڈالا۔ کوئی دو مہینے بعد بھڑوں نے پھر وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ انھوں نے دوبارہ چھتے میں ہاتھ ڈال کر اپنا حلیہ حسبِ سابق بنا لیا۔ آج جبکہ اس واقعہ کو تیس برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی عادت ترک نہیں کی۔

انھی دنوں کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ جب یہ حضرت ٹھیک سے چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی ممانی کے ہاں ڈاکہ ڈالا۔ وہ بیچاری سب سے چھپ کر، چارپائی کے نیچے، زمین میں سوراخ کر کے اور اُس میں مٹی کا ایک چھوٹا سا آبخورا گاڑ کر پیسے جوڑا کرتی تھیں۔ یہ حضرت رینگتے، چلتے موقعہ واردات پر پہنچ گئے۔ ڈھکنا اٹھایا، پیسے نکالے، مٹھی میں دبائے۔ برآمدے میں پہنچے تو بڑے بچوں نے چھین چھین کر خوب مزے کیے۔

چند دنوں کے بعد یہ حضرت پھر اُسی دفینہ پر، جتنے بھی پیسے ہاتھ آئے نکال لائے۔ ممانی نے موقعہ پر ہی چور کو پکڑ لیا۔ خوب پیٹا، پیٹتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں۔ ہائے ہائے طفیل تیرا بیڑا غرق، تُو نے مجھ "تنتڑی" کی ساری پونجی لٹا دی۔

کہتے ہیں کہ چور چوری سے جائے بھی تو ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ طفیل صاحب ہیرا پھیری کے ساتھ چوری سے بھی باز نہ آئے۔ جب یہ چھوٹے سے تھے تو چھوٹے چور تھے۔ بڑے ہوئے تو بڑے چور ثابت ہوئے۔ پہلے ممانی کی اکنیاں، دونیاں

اور پیسے چرایا کرتے تھے۔ سیانے ہوئے تو والدہ کی بڑی احتیاط سے چھپائی ہوئی لوہے کی صندوقچی میں سے روپے تک چرانے لگے۔ یہ مشغلہ کوئی مہینہ دو مہینے چلا ہوگا کہ والدہ کو ان کی شرافت کا علم ہوگیا۔ اس سے پہلے اس لیے پتہ نہ چلا کہ یہ چوری میں بھی عقل سے کام لیا کرتے تھے اور ایک دن میں، ایک یا دو روپوں سے زیادہ نہیں چرایا کرتے تھے۔

چوری میں لاکھ خوبیاں ہوں گی۔ مگر ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک نہ ایک دن آدمی پکڑا جاتا ہے۔ چنانچہ طفیل صاحب بھی پکڑے گئے۔ ایک طوفان برپا ہوگیا۔ محلّے والوں کو بھی معلوم ہوگیا کہ صاحبزادے چور ہیں۔ ان کی والدہ نے چور کو والد صاحب کے حوالے کردیا اور والد صاحب سیدھے تھانے کی طرف، اب طفیل صاحب رو رو کر منت سماجت کر رہے ہیں۔ ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ ناک رگڑ رہے ہیں۔ مگر والد صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

جب تھانہ قریب آگیا تو جناب طفیل کے ہاتھ پاؤں اور پھولے۔ جھٹکا دے کر والد صاحب کی مضبوط گرفت سے اپنی کلائی چھڑائی اور بگٹٹ بھاگے۔ ان کے والد صاحب زور زور سے پکارتے ہی رہ گئے۔ پکڑو پکڑو چور ہے۔ اب لوگوں کو کیسے یقین آئے کہ یہ جو چھوٹا سا لڑکا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے جا رہا ہے یہ چور بھی ہوسکتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد انھیں چوری سے ایسی نفرت ہوئی کہ باقی زندگی میں، اس آرٹ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ورنہ طفیل صاحب تو اب بھی کہتے ہیں کہ میری ابتدا بڑی شاندار تھی۔

جب یہ سترہ اٹھارہ برس کے ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ دولت اور والد کا جنازہ ایک ساتھ اٹھا۔ اب انھیں نہ صرف خود کما کر اپنا پیٹ بھرنا تھا بلکہ ایک چھوٹے سے گھرانے کی دال روٹی کی بھی فکر دامنگیر تھی۔ اتنی سی جان اور زندگی کی یہ سب سے کٹھن راہ۔

کچھ سات برس انھوں نے خوشنویسی کے کام پر ضائع کردیئے۔ مگر اس میں سے کچھ پس انداز بھی کیا۔ اس رقم سے، ایک دوست کے اشتراک سے پبلشنگ ہاؤس کی بنیاد رکھی۔ اوّل تو آج کل کی دوستیاں ہی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتیں۔ اس پر اشتراک، اس لیے ان کے بھی حسین خوابوں کی تعبیر وہی ہوئی۔ جو عموماً متوقع ہوتی ہے۔

اس واقعہ کا ان کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ بے زاری اور بے کاری میں جب کئی مہینے گذر گئے تو ۱۹۴۴ء میں انھوں نے ادارہ فروغ اردو کی داغ بیل ڈالی۔ ابتداً جو کچھ گزری، اس کی داستان کیا پوچھتے ہیں۔ بس یوں جانیئے پریشانیوں اور دشواریوں کا یہ اکیلی جان برسوں ہی مقابلہ کرتی رہی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ یہ تھکے ہارے گھر لوٹے، ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئے۔ والدہ نے انھیں یوں پریشان دیکھا تو پوچھا

"بیٹا کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں"

"کوئی بات تو ضرور ہے"

"بات یہ ہے کہ میں ساری دنیا سے اکیلے ہی لڑ رہا ہوں۔ کوئی بھی تو نہیں ہے جو میرا ساتھ دے۔ نہ رشتہ دار، نہ دوست!"

"یہ سب ٹھیک ہے مگر تُو اکیلا نہیں ہے۔"

"جی ہاں! میرے ساتھ ساری خدائی ہے۔"

"تیرے ساتھ تیرے ولولے ہیں۔ تیری اُمنگیں ہیں۔ تیرے ارادے ہیں —— اور پھر خدا —"

"سب کچھ میرے ساتھ ہے۔ مگر خدا میرے ساتھ نہیں۔"

"ایسی بکواس نہیں کیا کرتے۔"

"میں بھی انسان ہوں۔ بچپن سے اب تک ہزار دُکھ جھیلے ہیں۔ مگر اب تک خدا کو ترس نہیں آیا۔"

"دیکھو میں تجھے دو باتوں کی نصیحت کرتی ہوں۔ ایک یہ کہ صبر و ضبط کے دامن کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ دوسرے کسی بھی کام کو ناممکن نہ جاننا۔"

طفیل صاحب نے ہمیشہ اپنے دوستوں کے رومانس کو سرِ صفحات بدنام کیا ہے۔ دل چاہتا ہے آج ان حضرت کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا جائے۔ کچی عمر میں ایک صاحبہ نے غالباً انھیں بیوقوف سمجھ کر ان سے ذرا ویسی قسم کی خط و کتابت شروع کر دی۔ جب انھیں اُن صاحبہ کی طرف سے پہلا خط ملا تو یہ پاگل خانے کی سیڑھیوں پر ہی سنبھل گئے۔ وہ خط و کتابت نہایت دلچسپ تھی۔ سینکڑوں خطوں کا آنا جانا رہا۔

اگر محترمہ نے اظہارِ بےتکلفی فرمایا تو انھوں نے مفتیٔ وقت بن کر فوراً ڈانٹ پلائی کہ یہ بات غلط، اگر محترمہ نے کوئی شرارت کی تو انھوں نے چھوٹی عمر میں بڑے میاں بن کر بڑی ہی معنی خیز "ہُوں" کر کے اُس شرارت کا مزا ہی کرکرا کر دیا۔ اگر انھوں نے کوئی لگاوٹ کی بات کی تو انھوں نے اپنا رشتہ ہی اس سے مختلف بنا دیا۔ غرض جتنی بھی نالائقیاں ان سے سرزد ہو سکتی تھیں۔ وہ ہوئیں۔ آخری نالائقی یہ کی کہ اس دو طرفہ خط و کتابت ہی کو ایک دن جلا ڈالا۔ جبکہ ان میں سے ایک ایک خط کو خود آں جناب نے ایک ایک دو دو دن کی ریاضت سے لکھا ہوا تھا آج یہ خود کوشش کر کے بھی لکھنا چاہیں تو اُس جیسا ایک خط نہیں لکھ سکیں گے۔

ان سارے واقعات پر، یہ کبھی ناول ہی لکھیں گے (بشرطیکہ انھیں کسی طرح ایک دو برس کی قید ہو جائے۔ ورنہ فرصت کہاں) جس کی ضخامت کوئی چھ سو صفحات تو ہو گی۔ اُس میں ہیرو کی بزدلی، نالائقی اور بیوقوفیوں کے ساتھ، دوسرے کی بہن سے اپنے بھائی کا پیار ملے گا۔

زندگی کے اس ابتدائی غلط تجربے ہی کی بنا پر، ان کا خیال یہ ہے کہ عورت ہی کو مرد پر عاشق ہونا چاہیے۔ مرد کو عورت پر ہرگز ہرگز عاشق نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی مرد کسی عورت پر عاشق ہوتا ہے تو انھیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

یہ خواہ مخواہ کے ناصح مشفق بھی، ایک دن ایک صاحبہ انھیں ادارہ فروغ اُردو پر اکیلا پا کر ایک نہایت بازاری قسم کا عریاں ناول خریدنے آئیں تو انھوں نے ہُوں ہاں ہی نہ کی۔

وہ صاحبہ قدرے تُرخ کر بولیں — "میں پوچھتی ہوں۔ فلاں ناول ہے؟"

"ہے تو مگر آپ کو نہ دوں گا۔"

"کیوں؟"

"وہ ناول بڑا عریاں ہے۔"

وہ بھنّا کر بولیں "یہ تو مجھے بتائیے۔ آپ میرے سرپرست کب سے بنے ہیں؟"

اس طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے مگر سوال یہ ہے کہ طفیل صاحب کو دوسروں کی بہنوں کے بارے میں، اپنی بہن کی طرح سوچنے کا کیا حق ہے؟ اگر حق ہے تو جب جواب ملتا ہے تو پسینے کیوں چھوٹتے ہیں۔

ابھی کوئی ایک برس کی بات ہو گی کہ شامتِ اعمال اُس دن بھی یہ اکیلے ہی بیٹھے اپنے خیالوں کی دنیا میں گم تھے کہ ایک صاحبہ دندناتی ہوئی آئیں اور ان سے پوچھا "کنواری" ہے؟

یہ بڑے پریشان ہوئے۔ مگر اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ صرف اتنا ہی کہہ سکے۔ "جی!"

"میں پوچھتی ہوں" دخترِ باکرہ کا اُردو ترجمہ ہے؟"

"میں فارسی نہیں سمجھتا۔"

"تو کیا اُردو بھی نہیں جانتے؟"

"جی نہیں"

طفیل صاحب کے اس جواب پر، پہلے تو مسماۃ نے انھیں سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر پاؤں سے سر تک، اور انہی کے جواب "جی نہیں" کو اس انداز سے لوٹایا۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ جغد کہیں کا۔

طفیل صاحب سوائے اپنی ذات کے، ہر بات میں نفاست کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور خوب صورت چیزوں پر تو جان بھی دیتے ہیں۔ یقین کیجئے انھیں اس حد تک خوبصورتی خبط ہے کہ کچھ نہ پوچھئے۔ ہر چیز میں حُسن ڈھونڈھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن یہ اپنے نہایت ہی بے تکلف دوست سے کہہ رہے تھے۔ "دیکھو نا یار وہ سامنے جو کوّا بیٹھا ہے، کتنا خوبصورت ہے۔"

خود ان کی اپنی ذات کا یہ حال ہے کہ اگر نیا کوٹ پھٹ گیا ہے تو پھٹ جائے۔ پتلون پر چائے گر گئی ہے تو گر جائے۔ یہ پھٹے ہوئے کوٹ اور چائے گری پتلون کے ساتھ بھی بخوشی نباہ کرتے چلے جائیں گے۔ پالش کے معاملے میں ان کے بوٹ عموماً یتیم ہی ملے۔ ٹائی کے بغیر کوٹ اوڑھتے ہیں اور بازار میں اکیلے جاتے ہوئے باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی پاگل!

ان میں یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں۔ مگر ایک انتظامی خوبی ایسی ہے کہ باقی تمام خوبیاں ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ ان کے خاص خاص دوست جانتے ہیں کہ دعوت کے دن طفیل صاحب کو کھلا نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ چنانچہ انھیں حکم مل جاتا ہے کہ اب ہم کھانے پینے کا سامان مہمانوں کے سامنے رکھنے والے ہیں لہٰذا یا تو آپ یہاں سے چلے جائیں یا ادھر کا رُخ اس وقت کریں۔ جب ہم فارغ ہو جائیں۔

آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ یہ طفیل صاحب کے دوستوں کی کتنی زیادتی ہے۔ ویسے آپ اس کا فیصلہ ان کے انتظام کے ماتحت، جو ایک شادی ہوئی تھی۔ اُس کا ذکر سُن لینے کے بعد کریں۔

ان کے ایک نہایت ہی عزیز دوست نے انھیں بلایا کہ میری بہن کی شادی ہے اس میں شرکت کر کے میرا ہاتھ بٹاؤ۔ چنانچہ یہ پہنچے —— پکوانے وغیرہ کا کام کسی اور کے سپرد تھا۔ ان کے ذمہ صرف یہ کام تھا کہ برات کو اپنی نگرانی میں کھانا کھلا دینا اور جب دولہا گھر میں داخل ہو تو یہ ہار پہنا دینا۔

باجوں کی آواز قریب آنے لگی تو ان کے ہوش اڑنے لگے۔ جوں جوں برات قریب آتی گئی، ان کے کان تپنے اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ برات صحن میں داخل ہو گئی۔ اب انہیں دولہا نظر نہیں آتا۔ پہلے کا دیکھا ہوا نہ تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ اس لیے دولہا بن کر بھی آدمی ہی تھا۔ انھوں نے گھبراہٹ میں کسی اور کو دولہا بھائی کا خطاب دے ڈالا۔

اب کھانا نکل رہا ہے اور یہ شور مچا رہے ہیں۔ پلاؤ کی کتنی دیگیں ہیں —— آٹھ —— آٹھ سے کیا بنے گا —— یہ حضرت تو پورے شہر کو لے کر آ نکلے ہیں —— شوربا —— دو —— ڈال دو پانی —— ورنہ مارے جاؤ گے —— اسی اثنا میں دو ایک بچے پلاؤ کی پلیٹ لے کر ان کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکلنا چاہ رہے تھے۔ یہ بوکھلائے ہوئے تو تھے ہی، انھوں نے رکھ کے جو زناٹے دار تھپڑ ایک بچے کو رسید کیا تو وہ کم بخت پلاؤ پھینک زور زور سے رونے لگا —— اب یہ اُسے منا رہے ہیں۔ بھئی خدا کے لیے چپ ہو جاؤ اور پلاؤ کی ایک چھوڑ دو پلیٹیں لے جاؤ۔ مگر وہ ایسا ضدی بچہ، نہ پلاؤ لیتا تھا، نہ چُپ ہوتا تھا۔ آناً فاناً انھیں ایک ترکیب سوجھی، جھٹ ایک روپیہ جیب سے نکالا۔ بچے کی ہتھیلی پر رکھا۔ ساتھ ہی ہاتھ جوڑے، تب کہیں بچہ راضی ہوا۔ اس پر بھی اُس بچے نے جا کر اپنی ماں سے کہہ دیا۔ ماں بھی بچے کی طرح بڑی بھلی مانس تھیں۔ ایکدم گالیوں پر اُتر آئیں۔ زنانے میں گالیاں مل رہی تھیں۔ مردانے میں پلاؤ مل رہا تھا۔

جب برات چلی گئی اور گھر کے لوگ اکٹھے ہو کر بیٹھے تو سب کے سب ان کی باتیں یاد کر کے ہنس رہے تھے اور یہ پریشان ہو رہے تھے کہ جتنی بھی باتیں ان سے منسوب کی جا رہی ہیں۔ وہ سب کی سب غلط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ، اپنی انتظامی صلاحیتوں کی یوں بے قدری دیکھ کر، آئندہ کے لیے توبہ ہی کر چکے ہیں کہ اب کسی کی برات آئے یا جنازہ اٹھے۔ پروا ہی نہیں کرنی چاہیے۔

اِن کے سر سے والد کا سایہ اُس وقت اٹھا۔ جب یہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھے (یکم فروری ۱۹۴۳ء) اور والدہ کا سایہ اُس وقت اٹھا (۵؍ جون ۱۹۵۸ء) جب یہ اس دنیا میں آبرومندانہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق، یہ سب کچھ والدہ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ طفیل صاحب کا اپنی والدہ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے اللہ کی بارگاہ میں، کسی شمار قطار میں ضرور تھیں۔

بیماری سے دو دن پہلے کی باتیں آپ بھی سُن لیں :۔

"بیٹا یہ میری آخری بیماری ہے۔"

"یہ بھی کوئی بیماری ہے۔ بخار ہی تو ہے۔"

"ہے تو بخار، مگر چھوڑو ان باتوں کو، شام کو کتنے بجے لوٹو گے؟"

"کیوں؟"

"میرا دل چاہتا ہے کہ تم جلدی سے آجاؤ۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں جاتا ہی نہیں"

"نہیں نہیں، بات کوئی نہیں۔ مگر آنا جلدی سے، ایک کام ہے۔"

یہ چلے تو گئے۔ مگر ان کے دل میں کھُد بُدی لگی رہی کہ والدہ نے جلدی واپس آنے کو کہا ہے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ یہ اُس دن تین بجے ہی لوٹ آئے۔ دیکھا تو والدہ کی سانس اکھڑی ہوئی ہے۔ بہت گھبرائے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلا لائے۔ دوائی دی گئی۔ سانس بحال ہو گئی۔ بخار بھی ہلکا ہو گیا۔

دوسرے دن پھر سانس اکھڑ گئی۔ تو یہ پھر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑے۔ مگر ان کی والدہ نے واپس بلا لیا اور بڑے حوصلے سے کہا۔ "بیٹا تُو جو کچھ چاہتا ہے۔ وہ اب پورا نہ ہوگا۔"

ان کی والدہ ایسی باتیں کرتی ہی رہیں۔ مگر یہ ڈاکٹر کو بلا لائے۔ سانس ضرور اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ مگر ظاہری حالت بڑی اچھی تھی۔ تین چار دن میں، بخار سے مریض کی حالت بھلا خراب ہی کتنی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر نے دوائی دی۔ سانس پھر بحال ہو گئی۔ بخار بالکل اُتر گیا۔ بظاہر سب کی عید ہو گئی۔

طفیل صاحب نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا اور والدہ سے کہا۔ "بخار بھی اُتر گیا۔ سانس بھی ٹھیک سے آنے لگی ہے۔"

اس پر جواب تو کچھ نہ ملا۔ البتہ مسکرائیں ضرور، جیسے کہہ رہی ہوں۔ پگلا کہیں کا۔

یہ اُس دن کہیں بھی نہ گئے۔ سارا دن ہنسی خوشی کی باتیں ہوتی رہیں۔ گھر میں رشتہ داروں کا آنا جانا رہا۔ دن گذر گیا۔ رات ہوئی تو کوئی گیارہ بجے والدہ نے ان سے سو جانے کے لیے اصرار کیا۔

رات کے ایک بجے کے قریب والدہ نے انھیں بلایا۔ یہ ہڑبڑا کر اٹھے۔ قریب آئے تو والدہ نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "بیٹا میں اس دنیا سے جا رہی ہوں۔ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کا خیال رکھنا۔ دیکھنا وہ دنیا میں کسی طرح بھی آزردہ نہ ہوں۔ یہ کہہ کر چھاتی سے لگا لیا اور یہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ——— اس پر ان کی والدہ کہنے لگیں "رؤو نہیں ابھی مجھے بڑی باتیں کرنی ہیں۔ حوصلے سے کام لو۔"

"حوصلے سے کام کس طرح لوں؟ کیا کروں!"

یہ تو پھر ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے۔ والدہ نے ایک ایک کو پاس بلا کر پیار کیا۔ دعائیں دیں۔ چھوٹوں کو بھی، بڑوں کو بھی، جب یہ (بغیر ڈاکٹر کے) واپس لوٹے تو سب کے سب رو رہے تھے اور والدہ سب کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں:۔ دیکھو، ٹرنک کھول کر، جو سب سے اچھا جوڑا ہو۔ وہ میرے یتیم بھتیجے کی شادی پہ دے دینا ——— میں نے نہ تو کسی کا کچھ دینا ہے اور نہ ہی کچھ لینا ہے ——— میرے کانوں میں جو سونے کے بُندے ہیں وہ نہلانے والی کو دے دینا ——— چاروں جمعراتوں پر یتیموں کو بلا کر کھانا کھلا دینا ———"

اب صبح ہونے ہی والی تھی۔ یہ پھر ڈاکٹر کی تلاش میں نکلے۔ والدہ کو پتہ چلا تو انھوں نے انھیں واپس بلوایا۔ ڈاکٹر کو لانے سے منع کیا۔ یہ بھی کہا "اب کوئی فائدہ نہیں۔ میرے پاس بیٹھو۔ مگر یہ نہ مانے۔ ڈاکٹر کو لانے کے لیئے چل ہی دیئے۔

ڈاکٹر کو لے کر جب یہ واپس آئے تو ان کی والدہ ان کی ممانی اور بیگم سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے نہلا دو۔ وہ چپ تھیں۔ کیا کرتیں۔ ایک دن پہلے تک تو بخار تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ نہلایا جائے ۔ ڈاکٹر دیکھ کر اور دوائی دے کر چلا گیا۔ یہ بھی کہہ گیا۔ کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ بلا وجہ گھبرا رہے ہیں۔

جب بیگم اور ممانی نہلانے پر راضی نہ ہوئیں تو والدہ نے پھر ان کی طرف دیکھا اور اصرار کیا ” ان سے کہو۔ مجھے نہلا دیں۔ پتہ نہیں یہ کیا سوچ رہی ہیں مگر مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے ۔“

میں بھی چپ ہو گیا۔ ماموں صاحب بھی چپ ہو گئے۔ ممانی بھی چپ ہو گئیں۔ میرے اشارے پر بیگم نے اٹھ کر پانی گرم کیا۔ جب پانی گرم ہو گیا تو والدہ خود چارپائی سے اٹھیں۔ بیگم اور ممانی نے سہارا ضرور دیا۔ مگر وہ غسلخانے میں جا کر خود اپنے ہاتھوں سے صابن مل مل کر نہائیں۔ نہانے کے بعد، پیدل چل کر واپس آئیں اور بیگم سے کہا ” میرے بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر دو۔“

جب یہ سارے کام ہو گئے تو ہلکی سی آواز میں ہوں ہوں کرنے لگیں۔

طفیل صاحب نے پوچھا ” اماں کیا بات ہے ؟“

” بیٹا تیرا میرا یہ رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تو میں پرایا مال ہوں ۔“

اس کے بعد ایک منٹ خاموش رہیں۔ پھر اونچی آواز سے پڑھا ” لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ “۔ اس کے بعد وہ پھر کچھ نہ بولیں۔ حالانکہ سب بلاتے ہی رہے ۔

موت اور اُس کا اتنا خندہ پیشانی سے استقبال، ہر کسی کے بس کی بات نہیں ——! — والدہ کے انتقال سے، طفیل صاحب بجھ سے رہ گئے ہیں۔ کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا۔ ہر وقت کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ شاید یہی سوچتے ہوں کہ دنیا کے یہ سارے بکھیڑے کتنے عارضی اور کتنے بے حقیقت ہیں ۔

اگر آپ کی ان سے بے تکلفی ہے تو یہ کافی حد تک شگفتہ ثابت ہوں گے۔ تکلف کے تعلقات ہیں تو یہ آپ کو اتنا بور کریں گے کہ آپ پریشان ہو جائیں گے اور سوچیں گے الٰہی کس بدھو سے واسطہ پڑا ہے جس کے نہ منہ میں زبان ہے۔ نہ دماغ میں بھیجہ، حالانکہ حسبِ ضرورت ہیں دونوں چیزیں۔ اگر مخاطب بھی کم گو اور بے تکلف نہ ہو تو پھر لطف ہی آ جائے گا۔ مجاز لکھنوی اور طفیل لاہوری کے مابین، ایک بار بڑے مزے کی باتیں ہوئی تھیں اور یہ گفتگو کوئی پون گھنٹہ کے عرصہ میں ہوئی ہوگی۔ آپ پہلے بھی شاید ایک بار پڑھ چکے ہوں۔ ایک بار اور سہی!! ابتدا طفیل صاحب کرتے ہیں :

” خیریت ؟“

” جی ہاں !“

” چپ چپ کیوں ہیں ؟“

” یونہی “

(کافی دیر سکوت کے بعد) ” ابھی تو آپ کچھ دن رہیں گے ؟“

"جی ہاں!"

"آپ بولتے کیوں نہیں۔ کیا بات ہے؟"

"یونہی"

"اچھا"

"جی ہاں"

(پھر کافی دیر سکوت کے بعد) "لکھنؤ دیکھا؟"

"کچھ کچھ"

"کافی کیسی ہے؟"

"کوڈی"

"شربت منگواؤں؟"

"بسم اللہ!"

"اچھا یہ بتائیے۔ اس رفتار سے آپ والنّاس تک کب پہنچیں گے؟"

انھیں اپنے بارے میں یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ میں ہر وہ کام کر سکتا ہوں۔ جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی غلط فہمی نے انہیں مدیر نقوش بنا دیا تھا۔ ورنہ یہ اور نقوش کی ادارت! ہنھ!!

یہ غلط فہمی انھیں یوں بھی ہوئی کہ تقریباً تمام شاعروں اور ادیبوں سے، ان کے ذاتی اور اچھے مراسم تھے۔ ان میں سے کوئی دوست تھا تو کوئی بھائی، ان کے مدیر ہونے کے فوراً بعد، بھائی دوست بن گئے اور دوست دشمن، الحمد للہ کہ آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کا کوئی دوست ہی نہیں۔ سب اپنے اپنے دلوں میں بھرے بیٹھے ہیں۔

اس میں ان کے دوستوں کا کوئی قصور نہیں۔ اوّل تو انھیں مدیر ہی نہیں بننا چاہیئے تھا۔ اگر بن بیٹھے تھے تو انھیں دوستانہ حقوق کا احترام کرنا چاہیئے تھا۔ مثال کے طور پر، ان کا کوئی دوست، میل دو میل سے چل کر آتا ہے اور یہ ہیں نمبر کی دھن میں غرق، دوست پوچھتا ہے "طفیل صاحب خیریت ہے؟"

"یار کرشن چندر نے افسانہ نہیں بھیجا"

"اوہو!"

"جی ہاں!"

"بھابی اور بچے تو اچھے ہیں؟"

"امید ہے کل تک ضرور آجائے گا۔ مجھے کرشن نے خط لکھا تھا۔ افسانہ لکھ لیا ہے۔ صاف کر کے دو روز تک بھیج دوں گا"

"بھائی! میں پوچھ رہا ہوں۔ بھابی اور بچے تو ٹھیک ہیں؟"

"معاف کرنا بھائی! مجھے ان کا کچھ پتہ نہیں۔ ایک ہفتہ سے گھر بارہ بجے سے پہلے نہیں جا سکا۔ صبح منہ اندھیرے اٹھ کے چلا آتا ہوں۔ تاکہ پرچہ جلد آجائے۔ ہاں بھنک پڑی ضرور ہے کہ جاوید کو بخار آرہا ہے۔"

"اوہو! کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟"

"پرچہ چھپ جائے تو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں۔" پھر ایکدم کاتب صاحب سے مخاطب ہو کر "بھئی کتابت کتنی ختم ہوئی؟"

وہ دوست، جو بیچارا مارے خلوص کے چل کے آیا تھا۔ وہ ان کے پاس آکر ان کے نقوش خوردہ لباس سے پریشان ہو جاتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ تک وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ سوچتا ہے شاید یہ اب بھی آدمی کے جامہ میں آجائیں اور کوئی ڈھنگ سے بات کریں۔ یہ اپنی دھن میں مست، نمبر ہی کی "تجہیز و تکفین" کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ بالآخر خلوص کی زد میں آیا ہوا دوست، ان کی یہ حالت دیکھ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ تب یہ چونکتے ہیں اور پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ، اُس کا بازو پکڑ کر کہتے ہیں "یار چائے تو پی لو۔"

"میں اتنی دُور سے آپ کے پاس صرف چائے پینے آیا تھا؟"

تب انھیں اپنی نالائقی، مردم بیزاری اور دوست کشی کا احساس ہوتا ہے۔ دوست سے معافی مانگتے ہیں۔ اسے باہر تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ مگر وہ جو دوست کے خلوص کو ٹھیس لگتی ہے۔ اُس کا ان کے پاس کوئی مداوا نہیں ہوتا۔ دوستوں کو ناراض کیا۔ بھائی مروتاً دوستی تک بھی آئے۔ غرض اتنے انہماک کے بعد انھوں نے جو نمبر مرتب کئے۔ ان کے بارے میں لکھنؤ سے ایک خط آتا ہے:۔

> آپ نے شخصیات نمبر میں ہر ایرے غیرے کو شامل کیا ہے۔ مگر مجھ پہ مضمون نہ چھاپا۔
> اب آپ سے کون دوستی رکھے۔"

ایک اور خط بمبئی سے آتا ہے:

> "آپ بھی عجیب چیز ثابت ہوئے۔ افسانہ نمبر میں، جو آپ نے میرا افسانہ لیا ہے، وہ میرا سب سے گھٹیا افسانہ تھا۔ آخر آپ نے یہ مجھ سے کس وقت کا انتقام لیا ہے؟"

کراچی سے ایک شاعر نے زبانی پیغام بھیجا:۔

> "آپ نے غزل نمبر میں فیض کی تو چھ غزلیں چھاپی ہیں اور میری صرف ایک، کیا میں فیض سے گھٹیا شاعر ہوں۔ اگر آپ کو شاعری کی الف بے کا پتہ نہیں تو کسی سے پوچھ لیا ہوتا۔"

لاہور والے پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ وہ شخصیات نمبر میں بھی نہیں آئے تھے۔ افسانہ بھی اُن کا گھٹیا شامل ہو گیا تھا۔ غزل نمبر میں بھی کسی کی ایک غزل آئی تھی اور کسی کی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ منچلوں نے چائے کی میز پر بیٹھ کر یہ پروگرام بنایا کہ ہم سب نقوش کے دفتر چلتے ہیں۔ ایک نے کہا۔ میں طفیل کا گریبان پکڑوں گا۔ دوسرے نے کہا۔ میں گھونسہ ماروں گا۔ تیسرے نے کہا۔ میں مصلحتاً بیچ بچاؤ کراؤں گا۔ مگر تم اپنا کام کرتے جانا۔

خیر یہاں تک تو غنیمت تھا۔ کوئی انھیں گالی دے لے تو دے لے۔ کوئی تھپڑ مار کر خوش ہو لے تو ہو لے۔ مگر ایک دن ایسا ہوا کہ لاہور سے کراچی جاتے ہوئے احباب نے یہ پروگرام بنایا کہ واپسی پہ مدیر نقوش کی خبر لی جائے۔ بنیادہ سجاد ظہیر کے

افسانے کو بنایا۔ جسے طفیل صاحب نے پہلے ہی کانٹ چھانٹ کر کے اصل سے کافی بے ضرر بنا دیا تھا۔ (مگر یہ اس کا اقرار پھر بھی کرتے ہیں کہ اُس صورت میں بھی، اُس میں قابلِ اعتراض باتیں تھیں) میرا عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ اس سے مدیر نقوش کی نیت کا تو اندازہ ہو ہی سکتا تھا۔ جبکہ اسی قسم کا ایک نوٹ افسانے کی ابتدا میں بھی موجود تھا۔

قباحت یہ تھی کہ طفیل صاحب کے نزدیک اُس افسانے کی شمولیت یوں ضروری تھی کہ وہ افسانہ نمبر کی صورت میں، ایک طرح کی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ اُس دور کے اِس انداز کے افسانے بھی آئیں۔ جب مذہب سے بیزاری، خدا اور رسولؐ کا تمسخر (نعوذ باللہ) اور انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا اظہار ہوتا تھا — اور اسی غلط روش کو دکھانے کے لیے طفیل صاحب نے اِس افسانے کی شمولیت ضروری سمجھی تھی۔

چنانچہ ایک دم طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مخالفت میں بھی، موافقت میں بھی، مخالفت زیادہ تھی، موافقت کم، حالانکہ بعض لوگ کہتے ہی رہے کہ طفیل کی نیت کی طرف بھی دیکھو۔ اُس کا ہرگز یہ مقصد نہیں جو تم لوگ سمجھ رہے ہو۔ مگر صاحب کون سنتا تھا۔ بڑا عمدہ پلان بنایا گیا تھا۔ مسجدوں میں مدیر نقوش کو مطعون کیا گیا۔ موچی دروازے کے باہر جلسہ ہوا۔ پکٹنگ کے پروگرام بنے۔ کسی نے سوچا دفتر کو آگ لگا دی جائے۔ کسی نے سوچا جان سے مار دیا جائے — اور یہ سارا ہنگامہ اُس جانِ ناتواں کے بارے میں تھا۔ جس نے کبھی سر اٹھا کے نہیں دیکھا کہ یہ کنکری کس طرف سے آئی ہے۔

مدیر نقوش کو جب اپنی موت سامنے نظر آئی تو انھوں نے خدا سے التجا کی — تُو تو علیمٌ بذات الصدور ہے۔ میرے بھی سینے کے بھیدوں کو جانتا ہے اور میرے مخالفوں کے بھی — اِدھر دوستوں نے سمجھایا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ تُو اخباروں میں لوگوں سے معافی مانگ لے اور اس افسانے ہی کو حذف کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اس دنیا میں ان کی گستاخی کا یوں فیصلہ ہوا۔ اب انھیں آخرت کے فیصلے کا انتظار ہے۔ ممکن ہے وہ اس سے مختلف ہو۔

انھوں نے اپنے بارے میں جب بھی غور کیا تو — یک طفیل کے اندر دوسرا طفیل بھی چھپا ہوا پایا۔ ایک طفیل تو وہ ہے جس نے بزرگوں کا احترام کرنا سیکھا ہے۔ جو پڑھے لکھوں کے سامنے طالب علمانہ حیثیت میں بیٹھا ہے۔ جس نے چھوٹوں اور بڑوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہا ہے اور اپنے آپ کو بالکل مبتدی جانا ہے۔

دوسرا طفیل مدیر نقوش ہے۔ جب یہ کرسئ ادارت پر ہوتے ہیں تو ان کا دماغ عرش پر ہوتا ہے۔ اُس وقت انھیں بڑے سے بڑے علامہ کی تخلیق میں بھی نقائص نظر آتے ہیں۔ اپنے ذہن کی اسی خرابی کی بنا پر کئی بڑے بڑے لکھنے والوں کی چیزیں ناقابلِ اشاعت قرار دے کر واپس کر چکے ہیں۔

آپ خود ہی سوچیں۔ جس کی افسانہ نگاری میں دھوم ہو۔ نقاد اُسے صفِ اول کا افسانہ نگار مانیں۔ اس کے افسانے کو اگر مدیر نقوش ناقابلِ اشاعت قرار دے دے تو کیا وہ ان سے خوش ہوگا۔ وہ تو یہی کہے گا نا کہ جاہل ہے یہ۔

جس شاعر کی نظم یا غزل دس ہزار کے مجمع میں پڑھی گئی ہو اور اسے سامعین نے دل کھول کر داد بھی دی ہو۔ وہ بھی اگر مدیر نقوش کی نظر میں نہ جچے تو پھر شاعر بے چارا ان کی شاعرانہ سوجھ بوجھ پہ فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے۔

جس نقاد نے تمام مغربی نقادوں کو پڑھا ہو (اور اتفاق سے اپنے ہاں کے تنقیدی سرمایہ سے استفادہ نہ کیا ہو) اور ان کے حوالے پہ حوالے دے کر مضمون کو بھاری بھرکم بنا دیا ہو۔ وہ مضمون بھی اگر نقوش میں نہ چھپے تو پھر آپ ہی بتائیں مدیر نقوش کی عقل کا ماتم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ لطیفہ بھی ہے: ۔

ایک نقاد نے (اب ان کا نام کیا لوں) انہیں ایک مضمون بھیجا۔ اچھے خاصے بڑے نام والے نقاد تھے۔ جب وہ مضمون پڑھا تو انہیں نہ جچا۔ جناب نقاد کو بڑے احترام کے ساتھ لکھ دیا کہ یہ مضمون نقوش میں نہ چھپ سکے گا اور اس میں فلاں فلاں نقص ہیں۔

وہ صاحب بڑے برہم ہوئے۔ پہلے تو وہ نقوش اور مدیر نقوش کی تعریفیں کرتے تھکا نہ کرتے تھے۔ پھر ایکدم معصوم قسم کی گالیوں پر اُتر آئے۔ مثلاً نالائق اور بدتمیز قسم کے الفاظ بے دریغ استعمال کر ڈالے۔

اللہ کی شان ملاحظہ ہو۔ بعد میں وہ مضمون "نگار" جیسے بڑے پرچے میں چھپ گیا۔ تب تو وہ صاحب اور چڑھے۔ ایک اور خط لکھا۔ جس میں مژدہ سنایا گیا تھا کہ وہ مضمون نیاز فتحپوری جیسے علامہ نے تو پسند فرمایا ہے۔ مگر جناب جیسے "پڑھے لکھے" نے واپس کر دیا تھا —— یہ واقعہ اپنی جگہ ضرور صحیح ہے۔ مگر طفیل صاحب کا آج بھی دیانتداری کے ساتھ یہ خیال ہے کہ نیاز صاحب لاکھ علامہ سہی میرے ذہنی گرو سہی، نگار اُردو کا عظیم الشان پرچہ سہی۔ مگر وہ مضمون نقوش میں چھپنے کے قابل نہ تھا۔

انھیں اپنے رسالے اور اس کے کام سے اتنا عشق ہے کہ کیا کسی عاشق کو اپنے محبوب سے ہوگا۔ بلا مبالغہ انھوں نے اپنے ایک ایک نمبر پہ اتنی اتنی محنت کی ہے کہ ان کی جان پہ بن آئی ہے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں۔ جن دنوں کوئی خاص نمبر زیر ترتیب ہوتا ہے تو ان کا دس بارہ پونڈ وزن کم ہو جاتا ہے۔ نہ وقت پہ کھانا کھانا۔ نہ سونا، دن رات کام، صبح کے جُتے جُتے اگر رات کے بارہ ایک یا دو تین بج گئے ہیں تو بھی انھیں کچھ پروا نہیں۔ بلکہ مگن ہیں۔ مست ہیں۔

ایک بار یہ ہوا کہ یہ اپنے دفتر سے رات کے بارہ بجے لوٹے۔ بیگم سے کہا۔ کھانا لاؤ۔ وہ بیچاری آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی۔ کھانا گرم کر کے لائی۔ دیکھا تو یہ پھر نقوش کے عشق میں غرق، کاپیاں پڑھ رہے ہیں۔

بیگم نے شوہر کو اپنے سہاگ کا واسطہ دے کر کہا "خدا کے لیے کام کو بند کر دیجئے۔ بہت ہو چکی۔ اب کھانا کھا لیجئے۔ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔"

یہ اُسے منت سماجت سے کہتے ہیں "خدا کے لیے چپ رہو۔ لوگوں کو نہ جگاؤ۔ میرے منہ میں نوالے ڈالتی جاؤ۔ تاکہ کھانا بھی ہو جائے اور کام بھی، یوں کھانا کھایا۔ رات کے تین بجے سوئے۔ مگر بیگم کو سختی کے ساتھ ہدایت کر دی۔ صبح سات بجے جگا دینا۔

بیگم کے لیے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ اُس نے سات بجے جگا دیا۔ اب ان سے اٹھا نہیں جاتا۔ آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ایک دن کی جگائی ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔ یہاں تو روز کا قصہ تھا۔ بیگم برہمی اور طنز سے کہتی ہیں "اب اٹھتے کیوں نہیں۔ رسالہ لیٹ ہوا جا رہا ہے۔" یہ کہتے ہیں "اٹھنا تو چاہتا ہوں مگر آنکھیں نہیں کھلتیں۔"

پھر طفیل صاحب پچکار کے بیگم سے کہتے ہیں "میرے قریب آؤ۔ میرے پپوٹوں کو زور سے اُوپر کو اٹھاؤ۔ تاکہ میری آنکھیں

کھلیں اور میں اُٹھ سکوں۔

ممکن ہے کوئی صاحب اسے زیبِ داستان ہی سمجھیں۔ مگر ہے یہ واقعہ، اب یوں کبھی کبھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اب تو ان کی زندگی یونہی گزر رہی ہے۔ یونہی گزر جائے گی۔ زندگی کی لطافتیں اور مسرتیں انھیں بہ آوازِ بلند پکارتی رہتی ہیں۔ مگر یہ ان سب سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ جیسے بالکل مُردہ ہوں۔

قیافہ شناسی میں بھی یہ بڑے ماہر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں صورت دیکھ کر، ہر کسی کے کیریکٹر کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ ایک بار یہ اور ان کے ایک اخبار نویس دوست، تانگے پر سوار، فلم دیکھنے جا رہے تھے۔ معاً ایک تانگہ پاس سے گزرا، اُس میں نقاب اُلٹے، ایک لڑکی بیٹھی تھی، چاند سی صورت، اُس پر بھی میک اَپ، ان کے اخبار نویس دوست نے، اُسے دیکھتے ہی اسٹیر ٹھوک دیا۔

یہ بھی متوجہ ہوئے اور فتویٰ دے دیا "یہ لڑکی آوارہ ہے۔"

"ارے نہیں۔"

"شرط لگا لو۔"

"جو کہو۔"

اب ان کے لیے، یہ ثابت کرنا کہ یہ لڑکی آوارہ ہے بڑا دشوار تھا۔ آج کل آوارہ لڑکیاں کہاں آوارہ دِکھتی ہیں۔ ادھر ان کے دوست کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ لڑکی قطعاً آوارہ نہیں ہے۔ اب یہ کرتے تو کیا کرتے۔

انھوں نے تانگے والے سے کہا "میاں کوچوان! ذرا اپنے گھوڑے کو دوڑاؤ اور اُس تانگے کے برابر برابر چلو۔"

کوچوان نے ان کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ مگر زبان سے یہ کہا "بہت اچھا سرکار۔"

اب ان کا تانگہ، اس تانگے کے برابر برابر چل رہا ہے۔ لڑکی نے بھی اس بات کو تاڑ لیا۔ انھوں نے اس سے پہلے کبھی کسی لڑکی کو آوارہ ثابت نہیں کیا تھا۔ اس لیے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے، انھوں نے لڑکی کی طرف، تین چار منٹ ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔

لڑکی نے بھی پہلو بدلا اور اپنی ران سے ہاتھ اٹھا کر بڑے مہذب انداز میں سلام کیا۔

اب تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ دوست کے چٹکی لی اور اسے نظروں ہی نظروں میں سمجھایا۔ دیکھا بچّو ہم نہ کہتے تھے۔

تانگہ میکلوڈ روڈ پہ پہنچ گیا۔ جہاں کا تانگے والے سے طے کر کے آئے تھے۔ تانگے والے نے ان کی طرف دیکھا۔ انھوں نے اسے کہا۔ فکر نہ کرو۔ تانگہ اُدھر لئے چلو۔ جدھر وہ تانگہ جا رہا ہے۔ منہ مانگے دام ملیں گے۔

"بہت اچھا سرکار، پر یہ کام ٹیڑھا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھی تھانے کی ہوا کھاؤں۔"

"بھئی جو خدا کو منظور!"

"خدا کو کیا منظور ہوگا۔ اس قصّے کو چھوڑیئے۔ وہ تو ہے ہی بدمعاش، دیکھا ابھی سلام کر رہی تھی۔"

کوچوان کے ان ریمارکس پر انھوں نے اپنے دوست کی طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے انھوں نے ماؤنٹ ایورسٹ فتح کر لی ہو۔

یہ باتیں ہوتی رہیں۔ مگر ان کا تانگہ اس تانگے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ یہ دل میں سوچتے بھی تھے کہ ہٹاؤ اس قصے کو، آخر کیا فائدہ، مگر زبان نے دل کا ساتھ نہ دیا۔ تانگے برابر چلتے رہے۔ وہ لڑکی بھی ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی اور یہ بھی، کبھی وہ اپنے پریشان بالوں کو سنبھالتی، کبھی یہ مسکراتے، کبھی وہ ذرا سی تن کے بیٹھ جاتی، کبھی یہ ہاتھ سے بالوں کو سنوارتے، کبھی وہ مسکراتی، کبھی یہ سہم جاتے۔ غرض انہی بوالعجبیوں میں، اُس کا تانگہ ایک جگہ رک گیا اور ان کے دل کی دھڑکن ایکدم تیز ہو گئی۔

کوچوان نے پوچھا۔ "روکوں بابوجی تانگے کو؟"

"نہیں"

"پھر"

"سرپٹ دوڑاؤ۔"

گھوڑا سرپٹ دوڑتا رہا۔ مگر یہ اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ گھوڑا تیز دوڑ رہا تھا یا یہ۔

کھیلوں میں بھی یہ کئی بازیوں سے حد درجہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اتنی دلچسپی کہ اللہ دے اور بندہ لے — کیرم بورڈ اور تاش میں اتنے گم نہیں ہیں۔ جتنے پتنگ بازی اور کرکٹ میں۔

کوئی پندرہ سال بعد، پچھلے برس انھیں پتنگ بازی کا پھر سے ابال آیا۔ گھر میں اعلان کر دیا۔ اب کے بسنت پہ پتنگیں بڑھیں گی۔ بچے، بڑے سب حیران، یونہی ہانک دی ہے۔ اب اس عمر میں بچوں والا مشغلہ کیا اختیار کریں گے۔ مگر بسنت سے ایک دن پہلے چھ چھ "گوٹوں کے دو پنے" منگوائے گئے۔ درجنوں چھوٹی بڑی پتنگیں ساتھ آئیں۔ رات بھر کنّے باندھتے رہے۔ جس وقت موذن نے اذان دی۔ انھوں نے منڈیر پر چڑھ کے دیکھا، تو اس وقت کوئی بھی جیالا پتنگ بڑھائے ہوئے نہ تھا۔ خاصہ اندھیرا تھا۔ پتنگ بڑھے تو کیسے بڑھے۔ البتہ کہیں کہیں چھتوں پہ، ایک ایک دو دو من چلے، کھڑے محسوس تو ہوئے۔ مگر نظر نہ آئے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے "وہ کاٹا" کا زوردار نعرہ لگایا اور اپنی پتنگ بڑھا دی۔ اوروں کے بھی حوصلے بڑھے۔ انھوں نے بھی جواباً وہ کاٹا کا نعرہ لگایا۔ پھر کیا تھا آناً فاناً حریف پیدا کر لیے۔

قسمت کے دھنی یہ ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ہوا بھی خوب تیز تھی۔ انھوں نے جس سے پیچ لڑایا۔ کاٹا، جب حریفوں نے دیکھا کہ یہ تو صفایا کر رہے ہیں تو تین تین چار چار اکٹھے حملہ آور ہوئے۔ اس میں بھی زیادہ تر میدان انہی کے ہاتھ رہا۔ آس پاس کے محلوں میں دھاک بیٹھ گئی۔ بفضلِ خدا یہ اب اپنے علاقہ میں، دوسرے سال سے، پتنگ بازی میں چیمپئن چلے آ رہے ہیں۔

انھیں لمبے پیچ لڑانے میں مزا آتا ہے۔ "کھینچم کھینچ" کو یہ قطعاً پسند نہیں کرتے۔ کہتے ہیں دشمن کو اپنے جوہر دکھانے کے پورے موقعے دینا چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کے اتنے لمبے پیچ جاتے تھے کہ پتنگ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ لڈو کے برابر نظر بھی آئی تو کیا۔

ایک لمبے پیچ میں، ان کے ہاتھ ڈور کی مسلسل رگڑ سے لہولہان ہو گئے۔ سبھی کہتے رہے کہ پتنگ ہمیں دے دیجئے، ہاتھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ برابر اُف اُف سی سی کرتے ڈور دیتے رہے۔ کوئی آدھ پون گھنٹے کی جدوجہد کے بعد،

جب انھوں نے پیچ کاٹا، تب انھوں نے پتنگ اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کی۔ بڑھی ہوئی پتنگ کو جب اتارا جا رہا تھا تو ڈور ان کے خون سے نہائی ہوئی تھی۔

کرکٹ کا بھی شوق، انھیں بُرا لگا ہے۔ لاہور سے باہر میچ ہو رہے ہوں تو یہ اپنے دفتر ہی میں ریڈیو لے جائیں گے۔ جب تک میچ ہوتا رہے گا۔ برابر کومنٹری سنتے رہیں گے۔ ہزاروں کام ہوں۔ کچھ نہیں کریں گے۔ کوئی ملنے والا بھی آئے تو بات ہی نہیں کریں گے۔ باتیں ہوں گی بھی تو کرکٹ ہی کے بارے میں۔

سبھی قابلِ ذکر میچ انھوں نے یا تو دیکھے ہوں گے یا سنے ہوں گے۔ ابھی پاکستان میں آسٹریلیا کے میچ ہوئے ہیں۔ یہ ریڈیو سے ایک منٹ کے لیے بھی نہ ہٹے۔ کوئی اچھی ہٹ لگائے تو یہ خوش ہوتے تھے۔ کوئی اچھا گیند پھینکے تو یہ خوش ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ سیٹیاں بھی بجاتے تھے۔ ناچنے سے، انھیں ان کی پوزیشن روکتی تھی۔ ورنہ یہ بیقرار اس کے لیے بھی تھے۔

یوں بھی ہوا ہے کہ کومنٹری سنتے سنتے ایکدم بے حد خوش ہو گئے۔ زور زور سے سیٹیاں بجانے لگ گئے۔ پوری قوت سے تالیاں پیٹنے لگے۔ پھر نوکر کو آواز دی۔ جلدی سے پانچ روپے کے لڈو لا ــــ وجہ پوچھی گئی تو بتایا ہاروے آؤٹ ہو گیا ہے۔

ان کی صحت یوں تو کبھی زیادہ اچھی نہیں رہی۔ چھوٹے موٹے بیسیوں عارضے لاحق رہے۔ مگر یہ باضابطہ قسم کے بیمار بہت ہی کم ہوئے۔ مگر صاحب ایک بار ہوئے، خوب ہوئے۔ مزا آ گیا۔ یہ قصہ ۱۹۴۸ء کا ہے کہ بیٹھے بٹھائے بیمار ہو گئے۔ سو کے اٹھے۔ طبیعت مضمحل پائی۔ چہل قدمی کو نکلے۔ گھر تک واپس پہنچنا مشکل ہو گیا۔ لیٹے تو پھر لیٹ ہی گئے۔

بہتیرے دوا دارو اور ٹونے ٹوٹکے ہوئے۔ مگر طبیعت نہ سنبھلی۔ بگڑتی ہی گئی۔ معاملہ دواؤں سے دعاؤں تک پہنچا۔ مگر دونوں ہی علاج بیکار ثابت ہوئے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے بھی جواب دے دیا۔ جب یہ خوشخبری عام ہوئی کہ جناب طفیل اب ایک دو دن کے مہمان ہیں تو ان کے قریبی دوست آخری دیدار کو آن پہنچے۔

"ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ اب آپ جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

"اب آپ کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔"

"بخار ہلکا ہو گیا ہے۔"

"انشاء اللہ کل تک ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

طفیل صاحب یہ ساری باتیں سنتے رہے۔ بولنے تک کی ہمت نہ تھی۔ نقاہت اتنی تھی کہ اگر منہ پہ مکھی بیٹھ جاتی تھی تو ہاتھ اٹھا کر اُسے ہٹانے تک کی ہمت نہ تھی۔ بس ہڈیوں کا ایک پنجر تھا۔ جو چارپائی پہ بار تھا۔ یہ اپنے دوستوں کو اُن کی باتوں کا جواب دینا چاہتے تھے۔ مگر زبان ساتھ نہ دیتی تھی۔ اپنی اس حد تک معذوری پہ ان کے آنسو نکل آئے۔ دوستوں نے آنسو پونچھے تو انھوں نے سنائی نہ دینے والی آواز میں دوستوں کی باتوں کا جو جواب دیا یہ تھا:۔

"ڈاکٹروں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے۔ جو آپ حضرات کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کا فیصلہ مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر میں ضرور صحت یاب ہوں گا۔ آج نہیں تو کل، میرا بھی فیصلہ ڈاکٹروں کو سنا دینا۔

غیر معمولی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر، یہ موت کے منہ سے بھی نکل آئے۔ قوتِ ارادی کے استحکام ہی نے انھیں زندگی میں آبرومند بنایا ہے۔ ان کے پاس اگر کوئی دولت ہے تو یہی۔ اگر انھیں اپنی کسی حرکت پر ناز ہے تو اسی پر۔

جب موت ان کے سامنے ناچ رہی تھی۔ تو یہ خدا سے من ہی من میں جو باتیں کرتے تھے۔ وہ کچھ اس قسم کی تھیں:۔

"اے اللہ میں تجھ سے درگذر کی التجا کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے زندگی عزیز ہے۔ بلکہ اس لیے کہ میری امنگوں اور آرزوؤں کا خون ہوا جا رہا ہے۔ میں اس دنیا میں آکر کیڑوں مکوڑوں کی سی زندگی گذارنا نہیں چاہتا تھا— تو مجھے اتنی مہلت دے کہ میں اپنے ارمانوں کو پورا کر سکوں۔ میں اپنے لیے نہیں۔ دوسروں کے لیے زندگی چاہتا ہوں —— میری موت آج نہیں تو کل واقع ہو جائے گی۔ مگر تو مجھے اُن ولولوں اور ارادوں کی تکمیل کے لیے زندہ رکھ۔ جنھوں نے میرے ذہن سے نکل کر ابھی تک زندگی کی ایک ساعت بھی نہیں گذاری!"

کئی دنوں کی بات ہے کہ یو۔ پی کے ایک صاحب، ان کے پاس آئے۔ انھوں نے انھیں بھی یو۔ پی کا سمجھ لیا اور لگے پنجابیوں کی بُرائیاں کرنے۔ پنجابی یہ ہوتے ہیں۔ پنجابی وہ ہوتے ہیں۔ میری ترقیوں میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ مجھے ستاتے ہیں۔ یہ چٹکلے سنتے ہیں۔ جب انھوں نے کہا۔ پنجابی بڑے حرامزادے ہوتے ہیں تو انھوں نے اپنے نوکر سے کہا۔ "صاحب کے لیے چائے لاؤ!"

چائے کا سُن کر یُو۔ پی والے صاحب سمجھے ہوں گے۔ یہ بھی پنجابیوں کے ہاتھوں ستا ہوا ہے۔ وہ اور چڑھے۔ پھر تو وہ ماں بہن کی گالیوں تک آ گئے۔ طفیل صاحب نے دوسرے نوکر سے کہا۔ "صاحب کے لیے مٹھائی کا بھی انتظام کرو۔"

چائے آئی، مٹھائی آئی، دونوں نے خوب کھائی اور پی۔ ہنستے بھی رہے۔ پیارے باتیں بھی کرتے رہے۔ جب وہ صاحب جانے لگے تو انھوں نے ان سے پوچھا "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"یہ پوچھ کر کیا کیجئے گا؟"

"نہیں بتایئے!"

"جانے دیجئے۔"

"آپ کو میری قسم!"

"میں پنجابی ہوں۔"

یہ شکل و صورت کے اعتبار سے بس لونڈے سے ہیں۔ مدیر نقوش ہونے کا مطلب تو یہ تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد جیسا جبّہ پہنا کرتے۔ سر سید ایسی داڑھی ہوتی۔ ابو الکلام جیسا رعب و دبدبہ ہوتا۔ برعکس اس کے یہ سیدھے سادے آدمی کا بچہ ہیں۔ نہ رعب نہ کچھ، ان کی شکل و صورت سے زیادہ ان کے نام کا اثر ہے۔ ایک لطیفہ آپ بھی سُن لیں:۔

ان کے چھوٹے موٹے کام تعارفی رقعوں سے ہو جایا کرتے ہیں۔ جو کام ہوا۔ جس سے ہوا۔ تعارف ہو یا نہ ہو۔ لکھ کر کہہ دیا۔ ہو گیا۔ لوگ عزت کرتے ہیں۔ لحاظ کرتے ہیں۔

ایک دفعہ یہ اپنے ایک کام کے لیے، خود ایک دفتر میں جا نکلے۔ چق اٹھا کر صاحب سے ملے اور بغیر تعارف کے ملے۔ وہ نہایت

رُکھائی سے پیش آئے۔ یہ اپنا تعارف ہی نہیں کرا پائے تھے کہ وہ صاحب برسے "کیا بات ہے؟"

"جی! مجھے آپ سے ایک کام ہے؟"

"کیا کام ہے؟"

"جی وہ ذرا ——"

"آپ لوگ خواہ مخواہ وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے، میرے ہیڈ کلرک سے ملتے۔ سپرنٹنڈنٹ سے ملتے۔ میرے اسسٹنٹ سے ملتے۔ سیدھا منہ اٹھاتے ہیں اور میرے پاس چلے آتے ہیں —— چپڑاسی! ان صاحب کو کس نے اندر آنے دیا؟"

"جی غلطی ہو گئی۔"

"خبردار جو آئندہ کوئی یوں اندر آیا۔"

"بہتر جناب!"

ڈرامے کا یہ سین ان کے سامنے اتنی تیزی سے گزرا کہ یہ سٹ پٹا گئے۔ گردن لٹکائے اپنے دفتر پہنچے۔ ٹیلیفون اٹھا کر انہی صاحب سے بات کی۔

"میں نقوش کے دفتر سے طفیل بول رہا ہوں۔"

"کہیے حضور مزاج تو اچھے ہیں؟"

"جی ہاں اللہ کا شکر ہے۔"

"فرمائیے آج کیسے بھول گئے۔ مدت کے بعد یاد فرمایا۔ کوئی میرے لائق خدمت؟"

"یہ ایک ذرا سا کام ہے۔"

"آپ اپنے چپڑاسی کو چٹ دے کر بھیج دیں۔ ابھی ہو جائے گا۔"

"بہت اچھا چپڑاسی کو بھیج رہا ہوں۔"

"دیکھئے کبھی ملاقات کی بھی کوئی صورت نکلنی چاہیئے۔"

"جی!"

"میں کہتا ہوں۔ کبھی دفتر آئیے نا!"

"آ آ —— اچ —— اچھا ——!!"

ان کی زندگی کے ایک دو خوش کن واقعات یہ ہیں جن پر انھیں آج بھی خوشی ہوتی ہے۔

ابھی یہ اپنے کاروبار کی ابتدائی اسٹیج پر تھے۔ چند ٹکے بھی ان کے لیے بہت بڑی نعمت تھے۔ اُن دنوں انھوں نے ایک دکان سے آرٹ پیپر کا ایک ریم خریدا۔ ایک مزدور کے سر پہ اٹھوایا۔ دو آنے کی اُجرت مقرر ہوئی۔ بارش کی وجہ سے بازار کیچڑ سے لت پت تھا۔ آرٹ پیپر بڑا پھسلواں ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ مزدور سے بار بار کہتے تھے۔ دیکھو بھئی احتیاط سے چلو۔ کاغذ کو مضبوطی

سے پکڑو۔ گر گیا تو پچاس روپے کا ریم تباہ ہو جائے گا۔ یہ فقرہ انھوں نے ایک بار نہیں، تین چار بار دہرایا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وہ ریم سر سے پھسل کر زمین پر گر ہی گیا اور کیچڑ میں نہا گیا۔ مزدور کانپنے لگا۔ یہ چپ رہے۔ مزدور نے کاغذ سمیٹا۔ ساتھ چل دیا۔ دفتر پہنچ کر اس نے کاغذ ایک کونے میں رکھ دیا اور خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا۔

انھوں نے جیب سے چار اکنیاں نکالیں اور مزدور کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

مزدور شرمندہ ہو کر بولا۔ ”آپ سے دو آنے طے ہوئے تھے۔“

دو آنے اُس صورت میں تھے۔ جب تم کاغذ کو صحیح سالم لے آتے۔

”جی!“

”اب تم چونی کے حقدار ہو۔“

ابھی پانچ چھ ماہ کی بات ہے کہ یہ سائیکل پر سوار صبح سویرے ہی والدہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جا رہے تھے کہ اسمبلی ہال کے پاس انھیں ایک اپاہج لڑکا ملا۔ جو چلنے سے بالکل ہی معذور تھا۔ اُس نے التجا کے انداز میں، ان سے کہا ”مجھے سائیکل پر بٹھا کر گنگا رام اسپتال تک لے جائیں۔ انھیں جلدی تھی۔ گذر گئے۔ مگر لڑکے کی خواہش ان کا برابر تعاقب کرتی رہی۔ یہ قبرستان کے قریب پہنچ گئے ہوں گے۔ مگر لڑکے کی بات ذہن سے نہیں اُتری تھی۔ ذہن سے اُترتی تو کیا، پریشانی بڑھنے لگی۔ چنانچہ یہ اُلٹے پاؤں پلٹے۔ لڑکے کو سائیکل پر بٹھایا۔ خود پیدل چل کر اسے ہسپتال تک پہنچایا۔ لڑکا کہتا رہا۔ سائیکل پر سوار ہو جائیں، آپ کو جلدی ہو گی۔ یہ جواب دیتے۔ نہیں پیدل چلنے میں لطف آ رہا ہے۔

جب لڑکا منزل مقصود پر پہنچ گیا تو انھوں نے اس سے معافی مانگی۔ میں جلدی میں تھا۔ اس لیے اپنے فرض سے غافل ہو گیا تھا۔

ایسی ہی ”بیوقوفی“ کی ایک بات اور بھی سن لیں۔ ایک دن یہ صبح سویرے ہی اپنے دفتر اس لیے آ کر بیٹھے کہ ایک ضروری کام کو نپٹا لیا جائے۔ خوب گرمیوں کے دن تھے۔ پنکھا کھولا۔ کاغذ، قلم، دوات لے کر بیٹھے۔ خوب موڈ میں تھے۔ اتنے میں کھٹک سے پنکھے کے ساتھ کوئی چیز لگی۔ یہ اٹھے، اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ایک چڑیا پنکھے سے ٹکرا کر گری پڑی ہے۔ فوراً لپکے۔ چڑیا کو اٹھایا۔ جو ادھ موئی ہو چکی تھی۔ انھوں نے اسے اپنے ہاتھوں کی گرم آغوش میں لیا اور پانی پانی کا وہ شور مچایا، جیسے پانی کے بغیر یہ خود ہی مرے جا رہے ہوں۔ چڑیا نے پانی پیا تو وہ ”پھُرکنے“ لگی۔ مگر اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ وہ جان سے تو نہ گئی۔ مگر داغی ہو گئی تھی۔ انھوں نے اسے ایک اونچی جگہ پہ بٹھا دیا۔ مگر خود سارا دن کوئی کام نہ کر سکے۔ وہ ضروری کام بھی ہاتھ پھیلا کر رہ گیا۔

یہ عموماً بڑی بڑی باتوں کو پی جاتے ہیں۔ بعض اوقات یونہی اکڑ بھی جاتے ہیں۔ یہ سیخ پا اس وقت ہوتے ہیں۔ جب ان کی نیت پر حملہ کیا جائے۔ ورنہ بڑی سے بڑی بات ہوئی اور گئی۔

پطرس نمبر کے سلسلے میں، انھوں نے کئی ایک لکھنے والوں کو خط لکھے۔ ان میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ پنسلین کے انجکشن لگانے والے ڈاکٹر نہیں۔ ادب کے ڈاکٹر، بڑا رعب اور طنطنہ ہے ان کا۔ سبھی ان کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جو جی میں آئے۔ کہتے رہتے ہیں۔ کوئی بولتا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے طفیل صاحب کے خط کے جواب میں لکھا:۔

طفیل صاحب قبلہ!

"یہ آپ نے مرے ہوئے آدمیوں کو بیچنے کا کیا ڈھنگ نکالا ہے۔ نہ بھائی یہ بات اچھی نہیں۔ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے آپ لوگ (یعنی اردو کے رسالوں والے) اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی مرے اور اس کا نمبر نکالیں۔ خواہ جیتے جی اس کی طرف مڑ کے بھی کسی نے نہ دیکھا ہو۔ بخاری میرا دوست تھا اور میں اس کے لیے بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ابھی اس موڈ میں نہیں ہوں اور کم از کم مُردہ نمبر کے لیے میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔ مردہ نمبروں نے مجھے اس قدر حراساں کیا ہے کہ میں نے اپنی وصیت میں لکھ دیا ہوا ہے کہ میرے مرنے کے بعد کسی کو میرا مردہ نمبر شائع نہ کرنے دیا جائے۔ کیونکہ مجھے اب یہ بالکل واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ کوئی منافع خور ضرور میرے "نامِ زندہ" کو "مردہ فروشی" کے بہانے بیچ کر پیسے بنائے گا اور مجھے یہ ضد ہے کہ "اُردو کی خدمت کرنے والے" یہ کام نہ کریں۔"

جس وقت انھیں ڈاکٹر صاحب کا یہ خط ملا تو انھوں نے اپنے اوپر ہزار لعنتیں بھیجیں کہ اور نکال شخصی نوعیت کے نمبر۔ یہ اہلِ قلم سے اپنی عقیدت کے اظہار میں نمبر نکال لیتے ہیں۔ لوگ اسے منافع خوری کا ایک حیلہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے زخمی چیتے کی طرح ان پر جوابی حملہ کیا:۔

برادرم، سلام مسنون!

"آپ کے خط میں اگر صرف یہی لکھا ہوتا کہ میں مضمون نہیں لکھ سکتا تو شاید میں چپ ہو جاتا۔ مگر اب تو جواب عرض کرنا ضروری ہو گیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے اور آپ کے مرنے پر کوئی بھی رسالہ نمبر نہیں نکالے گا بلکہ شاید لوگ یہ کہیں، چلو اچھا ہوا کہ مرا۔ البتہ ہمارے گھر والے ہمیں روئیں گے اس لیے کہ ہماری ذات سے ان کا مفاد وابستہ ہوگا ——— میری یہ بات شاید اب دل لگی کا درجہ رکھے مگر مجھے اس کے سچ ہونے پر سو فیصد یقین ہے۔ کسی کے لیے آپ روڑا ہیں، کسی کے لیے میں! میدان البتہ الگ الگ ہیں۔

"مردہ نمبر" کی ترکیب مجھے پسند آئی۔ غالباً آپ یہ چاہتے ہیں کہ حفیظ جالندھری کی طرح زندگی ہی میں ہر اہم شخصیت کا جلوس نکال دیا جائے۔ اگر کسی کا جلوس اس کی زندگی میں نہ نکلے تو پھر بعد میں بھی نہ نکلے۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ اگر کوئی ادیب اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو باقیوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اُسے خراجِ عقیدت

پیش کریں۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ جن میں ایک یہ بھی کہ مرحوم کے بارے میں وسائل نمبر نکالیں۔

دیکھئے نقوش اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ بڑی شخصیتوں کی آڑ لے کر ابھرے۔ بلکہ اللہ کے فضل سے اس نے اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔ وہ اگر پطرس نمبر نہیں نکالے گا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا ــــ میں نے منٹو نمبر نکالا تھا اور یہ سمجھ کے نکالا تھا کہ منٹو ایک بڑا تیکھا آرٹسٹ تھا۔ اسے خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہئے۔ مگر اس پر بعض نستعلیق قسم کے لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی کہ نقوش کا یہ مقام نہ تھا ــــ پھر اس کا دوسرا پہلو بھی لیجئے۔ منٹو نمبر کا پہلا ایڈیشن آج بھی بازار میں ملتا ہے۔ مگر میرے دوسرے نمبروں کے تین تین چار چار ایڈیشن چھپے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے میری یہ کوششیں صرف مالی منفعت کے باعث نہیں ہیں بلکہ ایک ادب سے عقیدت کا اظہار ہیں۔

معاف کیجئے گا میں نے اکثر یہ اندازہ لگایا کہ آپ اچھی باتوں کے بُرے پہلوؤں پر ہی سوچتے رہتے ہیں۔ یہ آپ کی خوبی بھی ہے اور بُرائی بھی ــــ پلڑا کونسا بھاری ہے؟

اس کا اب فیصلہ کون کرے؟

امید ہے [illegible] مجھے [illegible] آپ نے "پیاری باتیں" لکھیں۔ میں نے پیاری باتیں سنائیں ــــ والسلام

اب چونکہ بات نقوش و نفع خوری کی بات بھی نکلی ہے۔ تو طفیل صاحب کا ایک خط اور بھی پڑھ لیں۔ جو انھوں نے اپنے ایک دوست [illegible] انصاری کو لکھا تھا:۔

برادرم [illegible] سلام مسنون۔

آپ کی شکایت بالکل بجا ہے کہ آپ کی تمام تر تعلیقات کا انتخاب اب تک چھپ جانا چاہئے تھا۔ یہ شکایت نہ صرف سو فیصد حق بجانب ہے۔ بلکہ حساب کی رو سے اگر دو سو فیصد بھی درست ہو سکتی تو بھی ٹھیک تھا۔ تو بھی غلط نہ ہوتا۔

مگر یار کیا بتاؤں۔ یہ جو نقوش کی بیماری میری جان کو لگی ہے۔ اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میرا لاکھوں کا ادارہ چوپٹ ہو گیا ہے۔ نہ کوئی نئی کتاب چھپتی ہے نہ کسی پرانی کتاب کا نیا ایڈیشن آتا ہے۔ پریس بھی میری طرح بے توجہی کا بُری طرح شکار ہے۔ خود بڑا پریشان ہوں۔ کئی بار اپنے اوپر غصہ آتا ہے (ادارہ اور پریس کی حالت دیکھ کر) جی چاہتا ہے یا تو خودکشی کر لوں۔ یا نقوش کو بند کر دوں۔ تاکہ میں ڈھنگ کا آدمی بن جاؤں اور وہ سب کچھ کروں جو میرے لیے دنیاوی اعتبار سے زیادہ سودمند ہو ــــ یہ خیال کرتا ہوں تو نقوش محبوبیت کی تمام تر تڑپا دینے والی اداؤں کے ساتھ

میرے عزائم پر برف بن کر گر جاتا ہے اور میں پھر ایک زخم خوردہ عاشق کی طرح، اس پر واری نثاری ہو جاتا ہوں۔ بہک جاتا ہوں۔ ہار جاتا ہوں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے نقوش میں مالی اعتبار سے نقصان ہوتا ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے نقوش کے حسن و جمال میں مزید تابانی پیدا کرنے کے لیے اتنا کچھ کرنا پڑتا ہے کہ باقی کے سارے کام ٹھپ ہو گئے ہیں۔ دیکھا جائے تو بہ حیثیت مجموعی یہ سودا مہنگا پڑ رہا ہے۔

میرے عشق نے جو میری حالت بنا رکھی ہے وہ سب کچھ آپ سے کہہ دی ہے۔ اس وجہ سے میں آپ کی کتاب کی جلد تر اشاعت سے مجبور رہا ـــ والسلام!

ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ طفیل صاحب بڑے نفاست پسند ہیں۔ اس کا اقرار اور لوگوں نے بھی کیا ہے۔ مگر میں بھی آپ کو انکی نفاست پسندی اور کاہلی کا حال ایک ساتھ ہی سنا دوں۔

جس دن ان کے قلم کی نب خراب ہو۔ سیاہی اچھی نہ ہو۔ کاغذ اچھا نہ ہو۔ یہ کسی کو خط ہی نہیں لکھیں گے۔ خواہ کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو۔ پھر جس دن یہ سب چیزیں اچھی ہوں گی۔ یہ خط پہ خط لکھتے چلے جائیں گے۔ حتیٰ کہ بلا وجہ بھی خط لکھتے رہیں گے۔ جس دن انھیں خط لکھنے کا دورہ پڑتا ہے تو یہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ خط لکھ ڈالیں گے۔

ان کی میز مسودات، ضروری اور غیر ضروری کاغذات سے پٹی رہتی ہے۔ ان کے ارد گرد بھی یہی حال ہوتا ہے۔ اگر ایک بڑے سے لفافے میں ضروری خط اور مسودے پڑے ہیں تو دوسرے لفافے میں بھی، غرض بیسیوں لفافوں میں، اگر کسی چیز کی انھیں ضرورت پڑ جائے تو ضروری نہیں وہ اسی دن مل جائے۔

کبھی کبھی ان کا چپڑاسی، میز کی یہ حالت دیکھ کر، سارے لفافوں کو ایک جگہ باندھ کر، کسی دوسری جگہ رکھ دیتا ہے۔ وہ بھی کیا کرے۔ وہ برداشت نہیں کرتا کہ میز کو مال گودام بنتا دیکھے۔ مگر یہ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ ہر کاغذ کو قیمتی سمجھ کر اپنے سے دور کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ہر کاغذ کو غیر ضروری سمجھ کر ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی قیمتی مسودے بھی وقتی طور پر گم ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ انھیں ہفتوں اور مہینوں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ انھیں یہ پسند نہیں کہ کوئی کام آسانی سے ہو جائے۔ یہ ہر آسان کام میں خود دشواریاں پیدا کر کے پھر سے اُسے آسان بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

ایک دن ایک صاحب انھیں اپنی ایک غزل دے گئے۔ انھوں نے رکھ لی۔ دوسرے تیسرے دن وہ صاحب تشریف لائے اور پوچھا۔

"میری غزل چھپے گی؟"

"نہیں"

"اچھا پھر مجھے واپس کر دیجئے۔"

"پتہ نہیں اب کہاں ہے؟"

"نہیں میز پر ہوگی۔ ڈھونڈھ دیجئے۔"

”کبھی نہیں ملے گی۔“

”مل جائے گی۔“

”جناب میری میز پر اگر ہاتھی بھی گم ہو جائے تو وہ بھی ایک دن میں تو مل نہیں سکتا۔“

طفیل صاحب تصور کے بے حد قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ یہ ہر کام کے لیے اَن تھک کوشش کرتے ہیں۔ کام ہو جاتا ہے تو شکر گذار ہو جاتے ہیں۔ نہ ہو جب بھی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہو گیا۔

کسی دوست نے انھیں ورغلایا کہ حکومتِ وقت کو اپنے کارناموں سے مطلع کرو۔ وہ تمہارے کام کے بدلے، اور کچھ نہیں تو ایک آدھ توصیفی جملہ تو بھیج ہی دے گی۔ یہ بڑے خوش، سارے نمبروں کا ایک بڑا سا پلندا بنا کر بھیج دیا اور اب اُس تاریخ کا انتظار کرنے لگے جس دن حکومت اعلان کرتی ہے کہ فلاں کو یہ تمغہ دیا، فلاں کو یہ خطاب ——— چنانچہ صاحب وہ تاریخ بھی آئی جس دن یہ کام ہوتا ہے۔ اب یہ بار بار ناموں کو پڑھتے ہیں۔ مگر اُن میں اِن کا نام نظر نہ آیا۔ بڑے آزردہ ہوئے۔ مگر مایوس نہیں۔ فوراً تصور کی دنیا میں چلے آئے اور یہ سمجھ لیا کہ مجھے حکومت نے، سب سے بڑا ادبی اعزاز دے دیا ہے۔ اب کوئی انہیں لاکھ کہے کہ میاں، تمہیں تو کسی نے منہ لگایا ہی نہیں۔ مگر یہ کسی کی کب سنتے ہیں۔ اپنی موج میں رہتے ہیں۔ اپنے تصورات کی دنیا میں بستے ہیں، جو ان کی کلفتوں اور آزردگیوں کا واحد سہارا ہے۔

یہ کبھی کبھی یوں بھی سوچتے ہیں :—

”بہ فرضِ محال میں آج مر جاؤں تو کیا ہو۔ بہت سے لوگ تو خوش ہوں گے۔ کچھ خدا ترس قسم کے لوگ، (میری تمام تر نالائقیوں کے باوجود) شاید یہ کہیں کہ اچھا ہی آدمی تھا۔ جن کو ادب سے شغف ہو گا۔ وہ ممکن ہے یہ کہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے میں اچھے اچھے نمبر نکالے ——— اور بس ——— غور کیجیے میرے بعد، میری زندگی کا حاصل یہی ایک فقرہ ہو گا۔ صرف اسی ایک فقرے کے لیے میں نے کیا کیا کچھ نہیں کیا ہے؟ دنیا تیاگ دی ہے۔ مجھے زندگی کی دل کشیوں اور مسرتوں سے واسطہ نہیں رہا۔ دن رات کام کرتا ہوں۔ دن رات مرتا ہوں ——— دن رات مرتا ہوں۔ دن رات کام کرتا ہوں۔

یار دوستوں سے ملنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بیوی سے ہنسنا بولنا میرے مقدر میں نہیں۔ گھر سے دفتر، دفتر سے گھر ——— کس لیے؟ ——— صرف ایک فقرے کے لیے۔

اگر میں عین جوانی میں مر گیا۔ جس کے بڑے امکانات ہیں تو میرے بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے والا بھی کوئی نہ ہو گا اور میرے بچے اس فقرے کو چاٹا کریں گے۔ ”ہمارے ابا نے بڑے بڑے اچھے نمبر نکالے تھے۔“

بہر حال ان کے بعد، جو کچھ بھی ہو۔ انہوں نے اپنی زندگی صرف اسی ایک فقرے کے لیے ضائع کر دی ہے۔

(باقی)

بے شک پیارا اور بے حد پیارا۔ کیوں نہ ہوتا۔ ماں کی ممتا، اس کی نگہداشت اور آسٹر ملک کی خوبیاں کارگر ہیں۔ دانشمند ہیں وہ مائیں جو اپنے بچوں کی پرورش آسٹر ملک سے کرتی ہیں۔ خواہ ماں کے دودھ کی کمی کو پورا کرنے کے لئے دیا جائے یا دودھ چھٹ جانے پر، آسٹر ملک ماں کے دودھ کا بہترین بدل ہے۔

آسٹر ملک اعلیٰ اور خاص قسم کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اسمیں فولاد ملایا گیا ہے تاکہ بچوں میں خون کی کمی نہ ہونے پائے، اور ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن "ڈی" بھی شامل کیا گیا ہے۔

جی ہاں! یہی وجہ ہے کہ مائیں پورے اعتماد کے ساتھ بچوں کو آسٹر ملک دیتی ہیں۔

آسٹر ملک

ماں کے دودھ کا بہترین نعم البدل

تازہ پیشکش

نیلوفر شوکت تھانوی کا یہ ناول بے حد مقبول ہو رہا ہے۔ اگر آپ نے اب تک اسے نہیں پڑھا تو آپ مزاحیہ ادب کی ایک نادر کتاب کے مطالعہ سے محروم ہیں۔

قیمت ۶/-

خدیجہؓ اسلامی تاریخ کے نگار میں ام المومنین حضرت خدیجہؓ کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ کتاب اس پاک باطن ایثار پیشہ خاتون کے حالات و زندگی پر مشتمل ہے۔ عبدالحمید الزہراوی کی اس کتاب کا مطالعہ ہدایت کا موجب ہوگا۔

قیمت ۴/-

خالدؓ

حضرت خالدؓ بن ولید کے مجاہدانہ کارناموں سے کون واقف نہیں، مگر اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اس سپہ سالار کی شخصیت میں بہ حیثیت انسان کے کیا کیا عظمتیں تھیں۔ ذاتی کردار کیا تھا اور اس نے ان کی جنگی فتوحات پر کیا اثر ڈالا۔ یہ کتاب عربی کے مشہور شخصیت نگار عباس محمود العقاد کی لکھی ہوئی ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو ادب میں پہلی پیش کش ہے۔

قیمت فی جلد ۴/-

عرب کے تین مدبّر

اسلام نے کئی صاحبِ تدبیر شخصیتیں پیدا کیں مگر مغیرہ بن شعبہ، زیاد بن ابیہ، عمرو بن العاص ایسے مدبّر اسلام کی پوری تاریخ میں کم ملیں گے۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ کیسے کیسے کٹھن موقعوں پر ان صاحبانِ تدبیر نے وقت کی نبضوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ عمر ابوالنصر کی تصنیف ہے جس کے قلم کا لوہا اردو دان طبقہ بھی مان چکا ہے۔

قیمت ۳/-

بھابی

"جتنے میرا بھائی گلی گلی بھوجائی" یہ کہاوت تو نہ جانے کب سے سننے میں آ رہی ہے مگر ناول "بھابی" کے ہیرو نے اس کو واقعہ کر دکھایا ہے کہ جب کبھی ملے ایک نئی خاتون کے ساتھ ملے اور ہر مرتبہ اس خاتون سے یہی کہہ کر تعارف کرایا کہ "ان سے ملئے یہ آپ کی بھابی ہیں۔" ایسا باغ و بہار کردار اور شوکت تھانوی کا شگفتہ اندازِ بیان بس مزا آ گیا۔

قیمت ۴/۸

نمک مرچ
شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ
ہر مضمون جانِ ظرافت ہے۔
قیمت ۳/-

باغ و بہار
عبدالحمید عدمؔ کے تازہ ترین قطعات کا مجموعہ
قیمت ۳/-

ادارہ
فروغِ اُردو، لاہور

18206

लाल बहादुर शास्त्री राष्ट्रीय प्रशासन अकादमी, पुस्तकालय
L.B.S. National Academy of Administration, Library
मसूरी
MUSSOORIE
यह पुस्तक निम्नांकित तारीख तक वापिस करनी है ।
This book is to be returned on the date last stamped

दिनांक Date	उधारकर्त्ता की संख्या Borrower's No.	दनांक Date	उ की संख्या Borrower' No.

U 18206
891.43905 अवाप्ति सं०
Naq ACC. No................
No.79-80.
वर्ग सं. पुस्तक सं.
Class No................ Book No.............
लेखक
Author..
शीर्षक Naqoosh : Adab-i-Alya
Title...

U
891·43905
Naq
No. 79-80.
18206

LIBRARY
LAL BAHADUR SHASTRI
National Academy of Administration
MUSSOORIE

Accession No. ____________

1. **Books are issued for 15 days only but may have to be recalled earlier if urgently required.**
2. **An over-due charge of 25 Paise per day per volume will be charged.**
3. **Books may be renewed on request, at the discretion of the Librarian.**
4. **Periodicals, Rare and Reference books may not be issued and may be consulted only in the Library.**
5. **Books lost, defaced or injured in any way shall have to be replaced or its double price shall be paid by the borrower.**

Help to keep this book fresh, clean & moving